جدید نظر ثانی شدہ کمپیوٹر ایڈیشن

زبان و بیان کے نئے اسلوب میں

مظاہرِ حق جدید

شرح

مشکوٰۃ شریف اردو

4

از افادات

علامہ نواب محمد قطب الدین خان دہلوی رحمہ اللہ

ترجمہ و ترتیب جدید

مولانا عبداللہ جاوید غازی پوری (فاضل دیوبند)

دار الاشاعت

اردو بازار ایم اے جناح روڈ کراچی پاکستان 2213768

جدید نظر ثانی شدہ کمپیوٹر ایڈیشن

زبان و بیان کے نئے اسلوب میں

مظاہر حق جدید

شرح

مشکوٰۃ شریف اردو

جلد چہارم

از افادات

علامہ نواب محمد قطب الدین خان دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ

تزئین و ترتیب جدید

مولانا عبداللہ جاوید غازی پوری (فاضل دیوبند)

دار الاشاعت

اردو بازار، ایم اے جناح روڈ کراچی پاکستان 2213768

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی دارالاشاعت کراچی
طباعت : مارچ ۲۰۰۹ء شکیل پریس کراچی۔
ضخامت : صفحات ۹۰۴

مصححین : مولانا محمد شفیق صاحب فاضل جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن
مولانا محمد اصغر مغل صاحب فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی
مولانا دلشاد صاحب مدرس دارالعلوم حسینیہ شہداد پور

......ملنے کے پتے......

ادارۃ المعارف کورنگی کراچی نمبر ۱۴
ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی لاہور
ادارۃ القرآن D/437 گارڈن ایسٹ لسبیلہ کراچی
مکتبہ دارالعلوم کورنگی کراچی نمبر ۱۴
کشمیر بک ڈپو، چنیوٹ بازار فیصل آباد
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور

بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت العلوم 20 نابھہ روڈ، پرانی انارکلی لاہور
مکتبہ رحمانیہ ۱۸ اردو بازار لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور
مکتبہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ، راجہ بازار راولپنڈی
الفیصل تاجران کتب اردو بازار لاہور
ادارہ اسلامیات اردو بازار کراچی

فہرست —— مظاہر حق جدید (جلد چہارم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الصید والذبائح

شکار اور ذبیحوں کا بیان

شکار کا حکم: حدود حرم سے باہر ہر جگہ شکار کرنا حلال ہے بشرطیکہ شکار کرنے والا حالت احرام میں نہ ہو، چنانچہ شکار کا مباح ہونا کتاب وسنت (یعنی قرآن مجید اور احادیث نبوی) سے ثابت ہے اور اجماع اُمت بھی اسی پر ہے البتہ حضرت امام مالکؒ کے مسلک کی ایک کتاب "رسالہ ابن ابوزید" میں لکھا ہے کہ محض لہو ولعب کی خاطر شکار کرنا مکروہ ہے اور لہو ولعب کے قصد وارادے کے بغیر مباح ہے۔ جہاں تک آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کا تعلق ہے تو یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے بنفس خود کبھی شکار کیا ہو لیکن یہ ثابت ہے کہ اگر کبھی آپ ﷺ کے سامنے کسی نے شکار کیا تو آپ ﷺ نے اس کو منع نہیں فرمایا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

کتے اور تیر کے ذریعہ کئے گئے شکار کا مسئلہ

① عَنْ عَدِیِّ بْنِ حَاتِمٍ قَالَ قَالَ لِی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَرْسَلْتَ کَلْبَکَ فَاذْکُرِ اسْمَ اللّٰہِ فَاِنْ اَمْسَکَ عَلَیْکَ فَاَدْرَکْتَہٗ حَیًّا فَاذْبَحْہُ وَاِنْ اَدْرَکْتَہٗ قَدْ قُتِلَ وَلَمْ یَاْکُلْ مِنْہُ فَکُلْہُ وَاِنْ اَکَلَ فَلَا تَکُلْ فَاِنَّمَا اَمْسَکَ عَلٰی نَفْسِہٖ فَاِنْ وَجَدْتَّ مَعَ کَلْبِکَ کَلْبًا غَیْرَہٗ وَقَدْ قَتَلَ فَلَا تَاْکُلْ فَاِنَّکَ لَا تَدْرِی اَیُّھُمَا قَتَلَہٗ وَاِذَا رَمَیْتَ بِسَھْمِکَ فَاذْکُرِ اسْمَ اللّٰہِ فَاِنْ غَابَ عَنْکَ یَوْمًا فَلَمْ تَجِدْ فِیْہِ اِلَّا اَثَرَ سَھْمِکَ فَکُلْ اِنْ شِئْتَ وَاِنْ وَجَدْتَّہٗ غَرِیْقًا فِی الْمَاءِ فَلَا تَاْکُلْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عدی ابن حاتمؓ کہتے ہیں رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ "جب تم اپنے کتے کو چھوڑو تو اللہ کا نام ذکر کرو (یعنی جب تم شکار کے لئے اپنے سکھائے ہوئے کتے کو چھوڑنے کا ارادہ کرو تو اس کو بسم اللہ اکبر کہہ کر چھوڑو) اور پھر اگر اس کتے نے تمہارے لئے شکار کو پکڑ لیا ہو اور وہ شکار تم کو زندہ ملے تو اس کو ذبح کر لو، (اگر اس کو قصداً ذبح نہیں کرو گے تو اس کا کھانا حرام ہوگا کیونکہ اس صورت میں وہ مردار ہوگا) اور اگر تم اس شکار کو اس حالت میں پاؤ کہ کتے نے اس کو مار ڈالا ہے لیکن اس نے اس میں سے کچھ کھایا نہیں ہے تو اس (شکار) کو کھاؤ لیکن اگر کتے نے اس میں سے کچھ کھالیا ہے تو پھر تم اس کو نہ کھاؤ کیونکہ اس صورت میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کتے نے اس شکار کو اپنے لئے پکڑا ہوگا (جو اس بات کی علامت ہوگی کہ کتا سکھایا ہوا نہیں ہے جب کہ اس کتے کا پکڑا ہوا شکار حلال ہے جو سکھایا ہوا ہو) اور اگر تم شکار کے پاس) اپنے کتے کے ساتھ کسی دوسرے کا کتا بھی پاؤ، درآنحالیکہ (ان دونوں میں سے کسی ایک کتے نے) اس شکار کو

مار ڈالا ہو تو اس صورت میں بھی اس شکار کو مت کھاؤ کیونکہ تمہیں یہ معلوم نہیں ہو گا کہ اس شکار کو ان دونوں کتوں میں سے کس نے مارا ہو گا تو ہو سکتا ہے کہ وہ سکھایا ہوا نہ ہو یا اس کو چھوڑنے والے نے چھوڑتے وقت بسم اللہ نہ کہی ہو اور یا اس کو کسی ایسے شخص نے چھوڑا ہو جس کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال نہیں ہوتا جیسے مجوسی یا بت پرست وغیرہ) اور جب تم (کسی شکار پر) اپنا تیر چلاؤ تو (اس وقت) اللہ کا نام ذکر کرو یعنی بسم اللہ کہہ کر تیر چلاؤ اور پھر اگر وہ شکار ایک دن تک تم سے اوجھل رہا (اور اس کے بعد تمہیں ملا) تو تم چاہو تو اس کو کھا لو بشرطیکہ تم نے اس شکار میں اپنے تیر کے نشان کے علاوہ اور کوئی نشان نہ پایا ہو اور اگر وہ شکار تمہیں پانی میں ڈوبا ہوا ملے (اور اس میں تمہارے تیر کا نشان بھی موجود ہو) تو تم اس کو نہ کھاؤ (کیونکہ ممکن ہے وہ تمہارے تیر سے نہ مرا ہو بلکہ پانی میں ڈوب کر مرا ہو۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "اللہ کا نام ذکر کرو" کا مطلب یہ ہے کہ کتے کا چھوڑنا بمنزلہ چھری چلانے کے ہے اس لئے جس طرح چھری کے ذریعہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جاتا ہے اس طرح شکار پر سکھایا ہوا کتا چھوڑتے وقت اللہ کا نام لیا جانا یعنی بسم اللہ اللہ اکبر کہنا ضروری ہے۔ اگر کسی نے بھول کر بسم اللہ اللہ اکبر نہیں کہا تو اس صورت میں اس شکار کو کھانا حلال ہو گا اور اگر یہ صورت ہے کہ کتا چھوڑتے وقت قصداً بسم اللہ اللہ اکبر نہیں کہا پھر اس نے کتے کو ڈانٹا کتا جہاں تھا وہیں رک گیا، اب (کتے کے رکنے کے بعد اس نے بسم اللہ اللہ اکبر کہا اور اس کے بعد کتے نے شکار کو پکڑ کر مار ڈالا تو وہ شکار حلال نہیں رہے گا۔

یہ ضروری ہے کہ کتے کو چھوڑنے والا مسلمان یا اہل کتاب (جیسے عیسائی یا یہودی) ہو اگر کتا کسی کے چھوڑے بغیر خود بخود جائے اور شکار کو زخمی کر دے تو وہ حلال نہیں رہے گا، اسی طرح اگر کسی شخص نے کتے کو چھوڑتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر نہیں کہا مگر اس نے شکار کو زندہ پایا اور اس کو ذبح کر لیا تو وہ شکار کے حکم میں نہیں ہو گا۔

جس طرح سکھائے ہوئے ذی ناب جانوروں جیسے کتے اور چیتے وغیرہ کا پکڑا ہوا شکار حلال ہے اسی طرح سکھائے ہوئے ذی مخلب جانوروں جیسے باز اور شاہین وغیرہ کا پکڑا ہوا شکار بھی حلال ہے۔

ذی مخلب جانور کے سکھائے ہوئے ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ تین دفعہ شکار کو پکڑ کر چھوڑ دے خود نہ کھائے اور ذی مخلب جانور کے سکھائے ہوئے ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کو چھوڑنے کے بعد بلایا جائے تو فوراً واپس آجائے، لہٰذا اگر ذی مخلب جانور یعنی باز وغیرہ نے شکار میں سے کچھ خود کھا لیا تو بھی وہ شکار حلال رہے گا اور اس کو کھانا درست ہو گا جب کہ اگر ذی ناب جانور یعنی کتا وغیرہ شکار میں سے کچھ خود کھا لے تو وہ شکار حلال نہیں رہے گا۔ اسی طرح اگر کسی سکھائے ہوئے کتے وغیرہ نے تین بار شکار کو پکڑ کر چھوڑ دینے کے بعد ایک بار بھی شکار میں سے کچھ کھا لیا تو وہ بے سیکھے ہوئے کتے کے حکم میں ہے یہاں تک کہ وہ دوبارہ سیکھا ہوا ہو جائے۔

اور پھر وہ شکار ایک دن تک تم سے اوجھل رہا الخ، حنفی علماء کے نزدیک تیر کے ذریعہ مارے گئے شکار کے حلال ہونے کی شرط یہ ہے کہ تیر پھینکتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہا گیا ہو اس تیر نے شکار کو زخمی کر دیا ہو اور یہ کہ اگر وہ شکار اس تیر کے ذریعہ زخمی ہو کر شکاری کی نظر سے غائب ہو گیا تو اس کو تلاش کرنے سے بیٹھ نہ رہا جائے کیونکہ ابن ابی شیبہؒ نے اپنی کتاب مصنف میں اور طبرانیؒ نے اپنی معجم میں ابورزینؒ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے اس شکار کے سلسلے میں کہ جو شکاری کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا، رسول کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا لعل ھوام الارض قتلہ نیز عبدالرحمٰن نے بھی اسی طرح کی روایت حضرت عائشہؓ سے بطریق مرفوع نقل کی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شکار پر کوئی کتا یا چیتا یا باز وغیرہ چھوڑا گیا اور اس نے شکار کو مار ڈالا تو وہ (شکار) حلال ہو گا بشرطیکہ وہ کتا وغیرہ معلّم یعنی سیکھا ہوا ہو۔ غیر معلّم کتے وغیرہ کا مارا ہوا شکار حلال نہیں ہو گا۔

(۲) وَعَنْهُ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نُرْسِلُ الْكِلَابَ الْمُعَلَّمَةَ قَالَ كُلْ مَا اَمْسَكْنَ عَلَيْكَ قُلْتُ وَاِنْ قَتَلْنَ قَالَ وَاِنْ قَتَلْنَ قُلْتُ اِنَّا نَرْمِي بِالْمِعْرَاضِ قَالَ كُلْ مَا خَزَقَ وَمَا اَصَابَ بِعَرْضِهٖ فَقَتَلَ فَاِنَّهٗ وَقِيْذٌ فَلَا تَاْكُلْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عدیؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ ہم تربیت یافتہ (یعنی سکھائے ہوئے) کتوں کو (شکار کے پیچھے) چھوڑتے ہیں!؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "تمہارے کتے تمہارے لئے جو شکار پکڑ کر رکھیں اس کو کھالو۔" میں نے عرض کیا "اگرچہ وہ کتے شکار کو مار ڈالیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں اگرچہ مار ڈالیں!" پھر میں نے عرض کیا کہ "ہم شکار پر بغیر پر کا تیر چلاتے ہیں (اور اس کے ذریعہ شکار کر لیتے ہیں تو کیا وہ شکار کھانا درست ہے؟)" آپ ﷺ نے فرمایا جس شکار کو وہ تیر زخمی کردے (یعنی اگر وہ تیر سیدھا جاکر نوک کی جانب سے شکار کو لگے اور وہ مرجائے) تو اس کو کھالو اور اگر وہ تیر (نوک کی جانب سے نہیں بلکہ) عرض یعنی چوڑائی کی جانب سے جاکر اس شکار کو (اس طرح) لگے (کہ وہ شکار کو زخمی نہ کرے) اور وہ مرجائے تو وہ وقیذ ہے اس کو نہ کھاؤ۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: معراض "اس تیر کو کہتے ہیں جو بے پر کا ہو۔ ایسا تیر سیدھا جاکر نوک کی طرف سے نہیں بلکہ چوڑائی کی طرف سے جاکر لگتا ہے۔

"وہ وقیذ ہے۔" اصل میں وقیذ اور موقوذ اس جانور کو کہتے ہیں جو غیر دھار دار چیز سے مارا جائے خواہ وہ لکڑی ہو یا پتھر یا اور کوئی چیز۔ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ معراض یعنی بغیر پر کے تیر کے ذریعہ شکار کرنے کی صورت میں اگر وہ (معراض) اس شکار کو اپنی دھار کے ذریعہ مار ڈالے تو وہ حلال ہوگا اور اگر معراض نے اس کو اپنی چوڑائی کے ذریعہ مارا ہے تو وہ حلال نہیں ہوگا، نیز علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ اس حدیث معراض سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ شکار حلال نہیں ہے جس کو بندقہ یعنی گولی اور غلہ کے ذریعہ مار ڈالا گیا ہو۔

اور وہ شکار جو معراض کے چوڑان کی طرف سے (چوٹ کھاکر) مرا ہو اس لئے حلال نہیں ہوتا کہ مذکورہ صورت میں شکار کا زخمی ہونا ضروری ہے تاکہ ذبح کے معنی متحقق ہوجائیں جب کہ معراض کا چوڑان شکار کو زخمی نہیں کرتا اسی لئے وہ شکار بھی حلال نہیں ہوتا، جو موٹی دھار کے بندقہ کے ذریعہ مار ڈالا گیا ہو۔ کیونکہ بندقہ ہڈی کو توڑ دیتا ہے زخمی نہیں کرتا اس لئے وہ معراض کے حکم میں ہوتا ہے ہاں اگر بندقہ میں ہلکی دھار ہو اور شکار اس کے ذریعہ مرگیا ہو تو وہ حرام نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں اس کی موت زخم کے ساتھ محقق ہوئی ہے۔

اگر کسی شخص نے شکار پر چھری یا تلوار پھینک کر ماری اور وہ شکار مرگیا تو وہ حلال ہوگا بشرطیکہ وہ چھری یا تلوار دھار کی طرف سے جاکر لگی ہو ورنہ حلال نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر شکار کے کوئی ایسا ہلکا پتھر پھینک کر مارا گیا ہو جس میں دھار ہو اور شکار کو زخمی کردے تو اس شکار کو بھی کھایا جاسکتا ہے کیونکہ اس صورت میں اس شکار کی موت زخم کے ذریعہ متیقن ہوگی جب کہ اگر شکار کو بھاری پتھر پھینک کر مارا گیا ہو تو اس کو کھانا جائز نہیں ہوگا اگرچہ وہ زخمی بھی کردے کیونکہ اس صورت میں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ وہ شکار اس پتھر کی چوٹ کے ذریعہ (جیسے ہڈی وغیرہ ٹوٹنے کی وجہ سے) مرا ہو۔

حاصل یہ ہے کہ اگر شکار کی موت اس کے زخمی ہوجانے کی وجہ سے واقع ہوئی ہو اور اس کا یقین بھی ہو تو اس کو کھایا جاسکتا ہے اور اگر اس کی موت چوٹ کے اثر سے واقع ہوئی اور اس کا یقین ہو تو اس شکار کو قطعاً نہ کھایا جائے اور اگر شک کی صورت ہو (کہ اس کا مرنا زخمی ہونے کی وجہ سے بھی محتمل ہو اور چوٹ کے اثر سے بھی محتمل ہو) تو بھی احتیاطاً اس کو نہ کھایا جائے۔

(۳) وَعَنْ اَبِي ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيِّ قَالَ قُلْتُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اِنَّ بِاَرْضِ قَوْمٍ اَهْلِ الْكِتَابِ اَفَنَاْكُلُ فِي اٰنِيَتِهِمْ وَبِاَرْضِ صَيْدٍ اَصِيْدُ بِقَوْسِيْ وَبِكَلْبِي الَّذِي لَيْسَ بِمُعَلَّمٍ وَبِكَلْبِي الْمُعَلَّمِ فَمَا يَصْلُحُ لِي قَالَ اَمَّا مَا ذَكَرْتَ مِنْ اٰنِيَةِ اَهْلِ الْكِتَابِ فَاِنْ وَجَدْتُمْ غَيْرَهَا فَلَا تَاْكُلُوْا فِيْهَا وَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاغْسِلُوْهَا وَكُلُوْا فِيْهَا وَمَا صِدْتَّ بِقَوْسِكَ فَذَكَرْتَ اسْمَ اللّٰهِ فَكُلْ وَمَا صِدْتَّ بِكَلْبِكَ الْمُعَلَّمِ فَذَكَرْتَ اسْمَ اللّٰهِ فَكُلْ وَمَا صِدْتَّ بِكَلْبِكَ غَيْرَ مُعَلَّمٍ فَاَدْرَكْتَ ذَكَاتَهُ فَكُلْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا "اے اللہ کے نبی! ہم ایک ایسی قوم کے درمیان سکونت پذیر ہیں جو اہل کتاب ہے، تو کیا ہم ان کے برتنوں میں کھاپی سکتے ہیں، اور ہم ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں شکار بہت ہیں میں اپنی کمان (یعنی تیر) اور تربیت یافتہ کتے کے ذریعہ بھی شکار مارتا ہوں اور غیر تربیت یافتہ کتے کے ذریعہ بھی شکار مار لیا کرتا ہوں تو میرے لئے کون سی چیز درست ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "جہاں تک اس چیز کا تعلق ہے جو تم نے اہل کتاب کے برتنوں کے بارے میں پوچھی ہے تو (ان کے متعلق یہ حکم ہے کہ) اگر ان

برتنوں کے علاوہ اور برتن مل سکیں تو پھر ان کے برتنوں میں مت کھاؤ پیو اور اگر دوسرے برتن نہ مل سکیں تو (پہلے) ان کو دھومانج لو اور پھر ان میں کھاپی لو۔ رہی شکار کی بات تو جس جانور کو تم نے اپنے تیر سے شکار کیا ہے اور (تیر چھوڑتے وقت) اللہ کا نام لیا ہے اس کو کھالو اسی طرح جس جانور کو تم نے تربیت یافتہ کتے کے ذریعہ شکار کیا ہے اور (اس کتے کو چھوڑتے وقت) اللہ کا نام لیا ہے تو اس کو بھی کھالو اور نیز جو شکار تم نے غیر تربیت یافتہ کتے کے ذریعہ پکڑا اور اس کو ذبح کرنے کے قابل (یعنی زندہ) پایا (اور پھر اس کو ذبح کر لیا ہے) تو اس کو بھی کھا سکتے ہو۔"
(بخاری و مسلم)

تشریح: "ان کے برتنوں میں مت کھاؤ" یہ حکم احتیاط کے پیش نظر ہے اور اس کے کئی سبب ہیں ایک تو یہ کہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے دع مایریبک الی مالا یریبک دوسرے اس بات سے آگاہ کرنا مقصود ہے کہ حتی الامکان ان کے مستعمل برتنوں میں کھانے پینے سے احتراز کیا جائے اگرچہ ان کو دھو لیا گیا ہو۔ اور تیسرے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات زیادہ سے زیادہ اہمیت کے ساتھ راسخ کرنا بھی مقصود ہے کہ مسلمانوں کے سامنے ان کا یہ ملی تقاضہ بہر صورت رہنا چاہئے کہ وہ ان (اہل کتاب) کے ساتھ رہن سہن اور باہمی اختلاط رکھنے سے نفرت کریں۔ تاہم یہ حکم کہ "ان کے برتنوں میں مت کھاؤ" دراصل تقویٰ کی راہ ہے اور اس بارے میں جو کچھ فتویٰ ہے وہ خود حدیث نے آگے بیان کر دیا ہے۔

"ان کو دھومانج لو" یہ حکم اس صورت میں تو بطریق وجوب ہوگا جب کہ ان برتنوں کے نجس و ناپاک ہونے کا ظن غالب ہو اور اس صورت میں بطریق استحباب ہوگا جب کہ ان کی نجاست کا ظن غالب نہ ہو۔

ابن مالکؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے غیر مسلموں کے ان برتنوں کو دھونے کا حکم دیا ہے جن کی نجاست و ناپاکی کا یقین ہو اور یہ یقین نہ ہو تو پھر ان برتنوں کو بغیر دھوئے استعمال کرنا بھی مکروہ تنزیہی ہوگا۔

برماویؒ نے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر ان (اہل کتاب) کے برتنوں کے علاوہ اور دوسرے برتن مل سکتے ہوں تو اس صورت میں ان کے برتنوں کو دھو کر بھی اپنے کھانے پینے کے استعمال میں نہیں لانا چاہئے۔ جب کہ فقہاء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ ان کے برتنوں کے دھو لینے کے بعد استعمال کرنا بہر صورت جائز ہے۔ خواہ اور دوسرے برتن مل سکتے ہوں یا نہ مل سکتے ہوں۔ اس صورت میں کہا جائے گا کہ حدیث سے جو کراہت ثابت ہوتی ہے وہ ان برتنوں پر محمول ہے جن میں وہ لوگ سؤر کا گوشت پکاتے کھاتے ہوں یا جن میں شراب پینے کے لئے رکھتے ہوں، لہٰذا ایسے برتن چونکہ ایمانی نقطۂ نظر سے بے حد گھناؤنے ہوتے ہیں، اس لئے ان کو اپنے استعمال میں لانا مکروہ ہے خواہ ان کو کتنا ہی دھومانج کیوں نہ لیا جائے اور فقہاء نے جو مسئلہ بیان کیا ہے وہ ان برتنوں پر محمول ہے جو سور کے گوشت جیسی نجاستوں اور ناپاکیوں میں زیادہ مستعمل نہیں ہوتے۔

بدبودار گوشت کا حکم

(۴) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَمَيْتَ بِسَهْمِكَ فَغَابَ عَنْكَ فَاَدْرَكْتَهٗ فَكُلْ مَالَمْ يُنْتِنْ۔
(رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر تم (اللہ کا نام لے کر کسی شکار پر) اپنا تیر چلاؤ اور پھر وہ (شکار تیر کھا کر) تمہاری نظروں سے اوجھل ہو جائے، (یعنی کسی ایسی جگہ گر کر مر جائے جو اس وقت تمہیں نہ مل سکے) اور پھر وہ تمہارے ہاتھ لگ جائے (اور تم اس میں اپنے تیر کا نشان دیکھ کر یہ یقین کر لو کہ یہ تمہارے اس تیر کے لگنے سے مرا ہے) تم اس کو کھا سکتے ہو جب تک کہ اس (کی بو) میں تغیر پیدا نہ ہو جائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حنفی علماء لکھتے ہیں کہ "جب تک کہ اس میں تغیر پیدا نہ ہو جائے" کا حکم بطریق استحباب ہے، ورنہ تو گوشت میں بُو کا پیدا ہو جانا اس

گوشت کے حرام ہونے کو واجب نہیں کرتا۔ چنانچہ ایک روایت میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایسا گوشت کھایا ہے جس میں بو پیدا ہو چکی تھی۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ بدبودار گوشت کھانے کی ممانعت، محض نہی تنزیہہ پر محمول ہے نہ کہ نہی تحریم پر، بلکہ یہی حکم ہر اس کھانے کا ہے جو بدبودار ہو گیا ہو الایہ کہ اس کو کھانے کی وجہ سے کسی تکلیف و نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

⑤ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِي الَّذِيْ يُدْرِكُ صَيْدَهٗ بَعْدَ ثَلَاثٍ فَكُلْهُ مَالَمْ يُنْتِنْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس شکاری کے حق میں کہ جو اپنے شکار کو تین دن کے بعد پائے فرمایا (اس کو کھالو تاوقتیکہ اس میں بو پیدا نہ ہو گئی ہو۔" (مسلم)

مشتبہ ذبیحہ کا حکم

⑥ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ هُنَا اَقْوَامًا حَدِيْثٌ عَهْدُهُمْ بِشِرْكٍ يَاْتُوْنَنَا بِلُحْمَانٍ لَا نَدْرِيْ اَيَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا اَمْ لَا قَالَ اُذْكُرُوْا اَنْتُمْ اسْمَ اللّٰهِ وَكُلُوْا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک مرتبہ) صحابہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ (ﷺ)! یہاں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے شرک کا زمانہ بہت قریب کا ہے (یعنی وہ نو مسلم جنہوں نے اسلام کے احکام اور دینی مسائل پوری طرح ابھی نہیں سیکھے ہیں) وہ لوگ ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں اور ہمیں اس کا علم نہیں ہوتا کہ آیا انہوں نے اس کے ذبح کے وقت خدا کا نام لیا ہے یا نہیں (تو کیا ان کا لایا ہوا گوشت ہم کھا سکتے ہیں یا نہیں؟) آنحضرت ﷺ نے فرمایا "تم اللہ کا نام لے لیا کرو اور اس کو کھا لیا کرو" (بخاریؒ)

تشریح: "تم اللہ کا نام لے لیا کرو الخ" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم بسم اللہ پڑھ کر اس گوشت کو کھالو تو اس وقت تمہارا بسم اللہ پڑھنا ذبح کرنے والے کے بسم اللہ پڑھنے کے قائم مقام ہو جائے گا بلکہ دراصل اس ارشاد کے ذریعہ آپ ﷺ نے یہ بیان فرمایا ہے، کہ کھانے کے وقت بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جو گوشت تمہارے پاس لایا گیا ہے اس کے بارے میں تم یہ نہیں جانتے کہ آیا وہ اس ذبیحہ کا ہے جو بسم اللہ پڑھ کر ذبح کیا گیا ہے یا بسم اللہ پڑھے بغیر ذبح کر دیا گیا ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس گوشت کو کھانا جائز ہے بشرطیکہ اس کو ذبح کرنے والا ان میں سے ہو جن کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا شرعاً جائز ہے اور یہ جواز اس حسن ظن کی بنیاد ہے جو ایک مسلمان کی حالت و کیفیت کو صلاح و نیکی ہی پر محمول کرنے کا متقاضی ہوتا ہے لہٰذا اگر اس طرح کا کوئی شخص تمہیں گوشت دے جائے تو تم یہی حسن ظن رکھو کہ وہ چونکہ بہرحال مسلمان ہے اس لئے اس نے ذبح کرتے وقت اللہ کا نام ضرور لیا ہوگا۔

غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام ہے

⑦ وَعَنْ اَبِي الطُّفَيْلِ قَالَ سُئِلَ عَلِيٌّ هَلْ خَصَّكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشَيْئٍ فَقَالَ مَا خَصَّنَا بِشَيْئٍ لَمْ يَعُمَّ بِهِ النَّاسَ اِلَّا مَا فِيْ قِرَابِ سَيْفِيْ هٰذَا فَاَخْرَجَ صَحِيْفَةً فِيْهَا لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللّٰهِ وَلَعَنَ اللّٰهُ مَنْ سَرَقَ مَنَارَ الْاَرْضِ وَفِيْ رِوَايَةٍ مَنْ غَيَّرَ مَنَارَ الْاَرْضِ وَلَعَنَ اللّٰهُ مَنْ لَعَنَ وَالِدَهٗ وَلَعَنَ اللّٰهُ مَنْ اٰوٰى مُحْدِثًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو طفیل کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے یہ سوال کیا گیا کہ "کیا رسول کریم ﷺ نے آپ (اہل بیت) کو کسی چیز کے ذریعہ خصوصیت و امتیاز عطا کیا ہے یعنی کیا یہ صحیح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے آپ لوگوں کو جو اہل بیت رسول ﷺ ہیں کچھ ایسے احکام دیئے ہیں جو اور دوسرے لوگوں کو نہیں دیئے ہیں؟" حضرت علیؓ نے فرمایا "(نہیں!) آنحضرت ﷺ نے ہمارے لئے کوئی ایسی چیز مخصوص نہیں کی ہے جو اور دوسروں کے لئے عام نہ کی گئی ہو، علاوہ اس چیز کے جو میری تلوار کی نیام میں (چند احکام کے مجموعہ کی صورت میں) موجود ہے

(لیکن ان احکام کے بارے میں بھی، میں یہ نہیں جانتا کہ وہ احکام آیا محض ہم اہل بیت کے لئے خاص ہیں یا ان کا تعلق عمومی طور پر پوری امت سے ہے)" پھر حضرت علیؓ نے (اپنی تلوار کی نیام میں سے) ایک کاغذ نکالا جن میں یہ احکام درج تھے کہ "اس شخص پر اللہ کی لعنت ہو جو غیر اللہ کے نام پر کسی جانور کو ذبح کرے، اس شخص پر اللہ کی لعنت ہو جو زمین کا نشان چرائے۔" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (اس شخص پر اللہ کی لعنت ہو) جو زمین کے نشان میں تغیر و تبدل کرے۔ اس شخص پر اللہ کی لعنت ہو جو اپنے باپ پر لعنت کرے اور اس شخص پر لعنت ہو جو کسی بدعتی کو ٹھکانا دے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "زمین کے نشان" سے مراد وہ علامتی پتھر وغیرہ ہے جو زمین کی حدود پر نصب ہوتا ہے اور جس کے ذریعہ ایک دوسرے کی زمین کے درمیان فرق و امتیاز کیا جاتا ہے۔ اور اس نشان کو چرانے یا اس میں تغیر و تبدل کرنے کا مطلب یہ ہے، کہ وہ شخص بزور و زبردستی اپنے ہمسایہ کی زمین دبالینا چاہتا ہو۔

"جو اپنے باپ پر لعنت کرے" یعنی یا تو اپنے باپ پر خود صریحاً لعنت کرے یا کسی دوسرے شخص کے باپ پر لعنت کرے اور وہ شخص انتقاماً اس کے باپ پر لعنت کرے، اس دوسری صورت میں اس نے اگرچہ اپنے باپ پر خود صریحاً لعنت نہیں کی ہے مگر اس لعنت کا سبب چونکہ وہی بنا ہے اس لئے کہا جائے گا کہ گویا اس نے اپنے باپ پر لعنت کی ہے۔

"جو کسی بدعتی کو ٹھکانا دے" بدعتی اس شخص کو کہتے ہیں جو دین میں کوئی ایسی بات پیدا کرے جس کی کچھ اصل موجود نہ ہو اور وہ بات شریعت کے خلاف اور سُنّت میں تبدیلی پیدا کرنے والی ہو۔ ایسے شخص یعنی بدعتی کو ٹھکانا دینا اس کی عزت و تعظیم کرنا اور اس کی مدد و حمایت کرنا، شریعت کی نظر میں قابل مواخذہ ہے۔

جو چیز بھی خون بہادے اس سے ذبح کرنا جائز ہے

(۸) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّا لَاقُوا الْعَدُوَّ غَدًا وَلَيْسَتْ مَعَنَا مُدًى اَفَنَذْبَحُ بِالْقَصَبِ قَالَ مَا اَنْهَرَ الدَّمَ وَذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ فَكُلْ لَيْسَ السِّنَّ وَالظُّفُرَ وَسَأُحَدِّثُكَ عَنْهُ اَمَّا السِّنُّ فَعَظْمٌ وَاَمَّا الظُّفُرُ فَمُدَى الْحَبَشِ وَاَصَبْنَا نَهْبَ اِبِلٍ وَغَنَمٍ فَنَدَّ مِنْهَا بَعِيْرٌ فَرَمَاهُ رَجُلٌ بِسَهْمٍ فَحَبَسَهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِهٰذِهِ الْاِبِلِ اَوَابِدَ كَاَوَابِدِ الْوَحْشِ فَاِذَا غَلَبَكُمْ مِنْهَا شَيْءٌ فَافْعَلُوْا بِهٖ هٰكَذَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت رافعؓ بن خدیج کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! کل دشمن (یعنی کفار) سے ہمارا مقابلہ ہونے والا ہے اور ہمارے پاس چھریاں نہیں ہیں (یعنی ہو سکتا ہے کہ جنگی ہنگاموں کی وجہ سے ہمارے پاس چھریاں موجود نہ رہیں اور ہمیں جانوروں کو ذبح کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اس صورت میں) کیا ہم کھپچ (کھپچی) سے ذبح کر سکتے ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس چیز سے خون بہہ جائے اور اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو تو اس کو کھا سکتے ہو (یعنی اس جانور کو کھانا جائز ہے جو کسی بھی ایسی چیز سے ذبح کیا گیا ہو جس سے خون بہہ جائے خواہ وہ لوہا ہو یا کوئی اور چیز) مگر دانت اور ناخن کے ذریعہ (ذبح کرنا جائز نہیں ہے اور میں تمہیں ان دونوں کے بارے میں بتاتا ہوں (کہ ان کے ذریعہ ذبح کرنا کیوں جائز نہیں ہے) تو (سنو کہ) دانت تو ہڈی ہے اور جہاں تک ناخن کا تعلق ہے تو وہ حبشیوں کی چھری ہے۔ (حضرت رافعؓ کہتے ہیں کہ دشمن کے) کچھ اونٹ اور بکریاں لوٹ میں ہمارے ہاتھ آئیں، ان میں سے ایک اونٹ (بھڑک کر) بھاگ نکلا، لیکن (ہم میں سے) ایک شخص نے تیر مار کر اس کو روک دیا (یعنی وہ اونٹ تیر کھا کر زمین پر ڈھیر ہو گیا) آنحضرت ﷺ نے (یہ دیکھ کر) فرمایا "ان اونٹوں میں بعض اونٹ بھی اس طرح انسانوں سے بھڑکنے والے ہوتے ہیں جس طرح جنگلی جانور، انسانوں سے بھڑکتے ہیں، لہٰذا اگر ان اونٹوں میں سے کوئی اونٹ تمہارے قبضے سے نکل بھاگے تو اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "دانت تو ہڈی ہے" یعنی دانت چونکہ ہڈی ہے اور ہڈی سے ذبح کرنا درست نہیں ہے اس لئے دانت کے ذریعہ ذبح کیا ہوا جانور

کھانا جائز نہیں ہو گا۔

شیخ ابن صلاح" کہتے ہیں کہ اس موضوع پر بہت زیادہ تحقیق و تفتیش اور غور و فکر کے باوجود میں یہ جاننے میں ناکام رہا ہوں کہ ہڈی کے ذریعہ ذبح کرنے کی ممانعت کا کیا مطلب ہے اور اس کی کیا وجہ ہے! شیخ عبدالسلام" سے بھی اس طرح کی بات منقول ہے، جہاں تک حدیث کا تعلق ہے اس میں بھی صرف یہی فرمایا گیا ہے کہ دانت سے ذبح کرنا اس لئے درست نہیں ہے کہ وہ ہڈی ہے اس کے علاوہ اور کسی ظاہری علت و سبب کی طرف اشارہ نہیں ہے لیکن حضرت امام نووی" نے ہڈی سے ذبح کرنے کی ممانعت کی یہ علت بیان کی ہے کہ اگر ہڈی سے ذبح کیا جائے گا تو وہ ہڈی، ذبیحہ کے خون سے نجس ہو جائے گی اور ہڈی کو نجس و ناپاک کرنے کی ممانعت منقول ہے کیونکہ اس (ہڈی) کو جنات کی خوراک بتایا گیا ہے۔

"وہ حبشیوں کی چھری ہیں " یہ گویا ناخن سے ذبح کرنے کی ممانعت کی علت ہے، یعنی اگر ناخن کے ذریعہ ذبح کیا جائے گا تو اس میں حبشیوں کی مشابہت اختیار کرنا لازم آئے گا کیونکہ ناخن کے ذریعہ جانوروں کو چیر پھاڑ کر کھانا حبشیوں کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ حبشی غیر مسلم ہیں، جب کہ مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ غیر مسلموں کے طور طریقوں کو اختیار نہ کریں بلکہ ان کے خلاف کریں!

واضح رہے کہ دانت اور ناخن کے ذریعہ ذبح کرنے کی ممانعت تینوں آئمہ کے نزدیک مطلق ہے، جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ" کا مسلک یہ ہے کہ ان دانتوں اور ناخنوں سے ذبح کرنا تو جائز نہیں ہے جو اپنی جگہ پر یعنی منہ اور انگلیوں میں ہوں ہاں جو دانت اور ناخن اپنی جگہ سے اکھڑ کر (منہ اور انگلیوں سے) الگ ہو چکے ہوں ان کے ذریعہ ذبح کرنا جائز ہے لیکن یہ جواز کراہت کے ساتھ ہے تاہم اس ذبیحہ کا گوشت کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ تینوں آئمہ کی دلیل مذکورہ حدیث ہے جس میں دانت اور ناخن کے ذریعہ ذبح کرنے کی ممانعت کسی قید اور کسی استثناء کے بغیر منقول ہے، جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ" کی دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ انهر الدم بماشئت اور وافر الاوداج۔ اور جہاں تک حضرت رافع" کی اس روایت کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں حضرت امام اعظم" کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث بغیر اکھڑے ہوئے دانت اور ناخن کے ذریعہ ذبح کرنے پر محمول ہے کیونکہ حبشیوں کا یہی طریقہ تھا۔

"تو اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرو" کا مطلب یہ ہے کہ اگر گھر کا پالتو کوئی جانور جیسے اونٹ، گائے اور بکری وغیرہ بھاگ کھڑا ہو تو وہ ذبح کے معاملہ میں وحشی جانور کے شکار کی مانند ہو گا کہ جس طرح وحشی جانور پر بسم اللہ پڑھ کر مثلاً تیر چلایا جائے تو وہ تیر اس جانور کے جسم کے جس حصہ پر بھی لگ کر اس کو ختم کر دے گا وہ ذبیحہ کے حکم میں ہو جائے گا، اسی طرح اس بھاگنے والے پالتو جانور کا سارا جسم اور اس کے سارے اعضاء بھی "ذبح کی جگہ" ہوں گے، چنانچہ بسم اللہ پڑھ کر اس پر چلایا جانے والا تیر اس کے جسم کے جس حصے میں لگ کر اس کو ختم کر دے گا اس کا گوشت حلال ہو گا۔ اور یہی حکم اس صورت میں ہے جب کہ اونٹ وغیرہ کنوئیں یا اس طرح کے کسی اور کھڈ وغیرہ میں گر پڑیں! یہاں خاص طور پر صرف اونٹ کا ذکر شاید اس لئے کیا گیا ہو کہ اس میں توحش بہت زیادہ ہوتا ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ "ذبح" کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم تو اختیاری ہے اور دوسری قسم اضطراری ہے اختیاری کی ایک صورت تو جانور کے لیہ اور لحیتین کے درمیان کسی دھار دار چیز جیسے چھری وغیرہ سے جراحت کے ساتھ رگوں کو کاٹنے کی ہوتی ہے اور دوسری صورت نحر کے ساتھ یعنی اونٹ کے سینے میں نیزہ وغیرہ مارنے کی ہوتی ہے، اور اضطراری کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جانور کے جسم کے کسی بھی حصے کو زخمی کر کے مار دیا جائے۔

پتھر کے ذریعہ ذبح کیا ہوا جانور حلال ہے

(۹) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّهٗ كَانَ لَهٗ غَنَمٌ تَرْعٰى بِسَلْعٍ فَاَبْصَرَتْ جَارِيَةٌ لَنَا بِشَاةٍ مِنْ غَنَمِنَا مَوْتًا فَكَسَرَتْ حَجَرًا فَذَبَحَتْهَا بِهٖ فَسَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَهٗ بِاَكْلِهَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت کعب ابن مالکؓ سے روایت ہے کہ ان (کعبؓ) کے پاس (بکریوں کا) ایک ریوڑ تھا جو مدینہ کی ایک پہاڑی سلع پر چرا کرتا تھا، (ایک دن) ہماری ایک لونڈی نے ایک بکری کو دیکھا کہ وہ مراہی چاہتی ہے تو اس نے ایک پتھر کا ٹکڑا توڑا اور اس ٹکڑے کے ذریعہ اس بکری کو ذبح کر دیا، پھر (کعبؓ نے) نبی کریم ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا (اس صورت میں اس بکری کا گوشت کھانا حلال ہے یہ نہیں؟)۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو اس بکری (کے گوشت) کو کھانے کا حکم دے دیا۔" (بخاریؒ)

ذبح کئے جانے والے جانوروں کو خوبی و نرمی کے ساتھ ذبح کرو

(۱۰) وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى كَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذَّبْحَ وَلْيُحِدَّ اَحَدُكُمْ شَفْرَتَهٗ وَلْيُرِحْ ذَبِيْحَتَهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت شداد ابن اوسؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کرنے کو لازم کیا ہے یعنی حق تعالیٰ کی طرف سے ہر کام کو حسن و خوبی اور نرمی کے ساتھ انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ "سزاء" کسی کو قتل کرنے یا جانوروں کو ذبح کرنے میں بھی مہربانی و نرم دلی اور خوبی و نرمی کا طریقہ اختیار کرنا لازم ہے) لہٰذا جب تم (کسی شخص کو قصاص یا حد کے طور پر) قتل کرو تو اس کو نرمی و خوبی کے ساتھ کرو (تاکہ اس کو ایذاء نہ ہو جیسے تیز تلوار استعمال کرو اور قتل کرنے میں جلدی کرو) اور جب تم کسی جانور کو ذبح کرو تو خوبی و نرمی کے ساتھ ذبح کرو لہٰذا یہ ضروری ہے کہ تم میں سے کوئی بھی شخص (جو جانور کو ذبح کرنا چاہتا ہو) اپنی چھری کو (خوب تیز کرلے اور ذبح کئے جانے والے جانور کو آرام دے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "آرام دے" کا مطلب یہ ہے کہ ذبح کرنے کے بعد اس جانور کو چھوڑ دے تاکہ اس کا دم نکل جائے اور وہ ٹھنڈا ہو جائے! گویا اوپر کی عبارت اور یہ جملہ اصل میں "ذبح کرنے میں احسان کرنے" کی توضیح ہے کہ خوبی و نرمی کے ساتھ ذبح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس جانور کو تیز چھری سے ذبح کرے اور جلدی ذبح کر ڈالے نیز ذبح کے بعد اس کو اچھی طرح ٹھنڈا ہو جانے دے۔

حنفی علماء فرماتے ہیں کہ ذبح کئے ہوئے جانور کی کھال اتارنا اس وقت تک مکروہ ہے جب تک کہ وہ اچھی طرح ٹھنڈا نہ ہو جائے! نیز مستحب یہ ہے کہ جس جانور کو ذبح کیا جانے والا ہے اس کے سامنے چھری تیز نہ کی جائے، اگر ایک سے زائد جانور ذبح کئے جانے والے ہیں تو ان کو ایک دوسرے کے سامنے ذبح نہ کیا جائے اور ذبح کئے جانے والے جانور کے پاؤں پکڑ کر کھینچتے ہوئے ذبح کی جگہ نہ لے جایا جائے۔

جانور کو باندھ کر نشانہ لگانے کی ممانعت

(۱۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهٰى اَنْ تُصْبَرَ بَهِيْمَةٌ اَوْغَيْرُهَا لِلْقَتْلِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے سنا ہے، آپ ﷺ اس بات سے منع فرماتے تھے کہ کسی چوپایہ وغیرہ کو مارنے کے لئے باندھ کر اس پر نشانہ لگایا جائے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس کے یا تو یہ معنی ہے کہ کسی جانور کو باندھ کر پھر اس کو تیروں پتھروں یا گولیوں سے مارنا ممنوع ہے یا یہ معنی ہیں کہ کسی جانور کو بغیر دانے پانی کے بند کر کے مار ڈالنا ممنوع ہے۔

(۱۲) وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ مَنِ اتَّخَذَ شَيْئًا فِيْهِ الرُّوْحُ غَرَضًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس شخص پر لعنت فرمائی ہے جو کسی جاندار چیز کو باندھ کر اس پر نشانہ لگائے۔" (مسلمؒ)

(۱۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَتَّخِذُوْا شَيْئًا فِيْهِ الرُّوْحُ غَرَضًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "کسی جاندار چیز کو (باندھ کر) نشانہ نہ بناؤ۔" (مسلمؒ)

تشریح: یہ ممانعت نہی تحریم کے طور پر ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے "جس شخص نے ایسا کیا اس پر اللہ کی لعنت ہو۔" اور اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس فعل کے ذریعہ نہ صرف ایک ذی روح (جانور) کو اذیت و تکلیف میں مبتلا کرنا ہے بلکہ مال کا ضائع کرنا بھی ہے۔

منہ پر مارنے یا منہ کو داغنے کی ممانعت

(۱۴) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الضَّرْبِ فِي الْوَجْهِ وَعَنِ الْوَسْمِ فِي الْوَجْهِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے منہ پر مارنے اور منہ پر داغ دینے سے منع فرمایا ہے یعنی کسی آدمی یا جانور کے منہ پر طمانچہ یا کوڑا وغیرہ نہ مارا جائے اور نہ کسی کے منہ پر داغ دیا جائے۔" (مسلمؒ)

(۱۵) وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلَيْهِ حِمَارٌ وَقَدْ وُسِمَ فِي وَجْهِهٖ قَالَ لَعَنَ اللّٰهُ الَّذِيْ وَسَمَهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کے سامنے سے ایک گدھا گزرا جس پر داغ دیا گیا تھا آپ ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) فرمایا کہ "اس شخص پر اللہ کی لعنت ہو جس نے اس کو داغا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اگر یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ آنحضرت ﷺ نے اس گدھے کے منہ پر داغ دینے والے پر لعنت فرمائی حالانکہ مسلمانوں پر لعنت کرنے سے منع کیا گیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہو گا کہ ہو سکتا ہے کہ داغنے والا مسلمان نہ رہا ہو یا منافقین میں سے ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ آپ ﷺ کا یہ لعنت کرنا بددعا کے طور پر نہ ہو بلکہ "اخبار بالغیب" کے طور پر ہو یعنی آپ ﷺ نے اس جملہ کے ذریعہ گویا یہ خبر دی کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں لعنت کا مستوجب قرار پا گیا ہے۔

جاننا چاہئے کہ کسی بھی جاندار کے منہ پر داغ دینا متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک ممنوع ہے، خواہ آدمی ہو یا کوئی بھی جانور و حیوان! جانور کے منہ کے علاوہ اس کے جسم کے کسی اور حصہ پر داغ دینے کا مسئلہ یہ ہے کہ امتیاز و تعین کے مقصد سے زکوۃ اور جزیہ کے جانوروں کو داغنے کو تو بعض علماء نے مستحب کہا ہے اور ان کے علاوہ دوسرے جانوروں کو داغنا بھی محض جائز ہے۔

جہاں تک آدمیوں پر داغ دینے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ وغیرہ کے مختلف اخبار و آثار قولاً اور فعلاً منقول ہیں۔ بعض اقوال اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ کوئی اچھا فعل نہیں ہے، بعض اقوال مدح ترک پر دلالت کرتے ہیں اور بعض اقوال صریح ممانعت کو ثابت کرتے ہیں، جب کہ آنحضرت ﷺ کا یہ عمل جواز پر دلالت کرتا ہے آپ ﷺ نے ایک طبیب کو حضرت ابی بن کعبؓ کے پاس بھیجا جس نے ان کی فصد کھولی اور داغا، اسی طرح جب حضرت سعد ابن معاذؓ زخمی ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے ان پر داغ دینے کی اجازت دی، بلکہ جب ورم ہوا تو ان پر اور داغ دیا گیا، نیز حضرت جابرؓ اور حضرت ابوزرارہؓ کے جسم پر داغ دیا جانا بھی منقول ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ جن اقوال میں انسانی جسم کو داغنے کی مانعت مذکور ہے ان کا تعلق قصداً بلا ضرورت و احتیاج داغنے سے ہے، ہاں اگر کسی مرض وغیرہ کے سلسلے میں داغ دینے کی ضرورت ہو تو جائز ہے۔

علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ (علاج کی نیت سے) انسانی جسم کے کسی حصہ کو داغنا، اسباب وہمیہ میں سے ہے کہ اس کو اختیار کرنا جذبہ توکل و اعتماد علی اللہ کے اعتبار سے مناسب نہیں ہے جب کہ دوسرے علاج اسباب ظنیہ میں سے ہونے کی وجہ سے توکل کے قطعاً منافی نہیں ہیں، ہاں اگر اس بات کا ظن غالب ہو کہ داغنا، مرض کے دفعیہ کے لئے ایک سودمند علاج ہو گا تو اس صورت میں اس کو اختیار کرنا غیر مناسب نہیں ہو گا۔ چنانچہ اہل فتویٰ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے کہ داغنا بذاتہ مکروہ تحریمی ہے مگر ظن غالب حاصل ہونے کی صورت

میں بایں طور کہ طبیب حاذق یہ کہہ دے کہ مرض کے دفعیہ کا انحصار صرف داغنے پر ہے اور اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا علاج نہیں ہے تو داغنا مکروہ تحریمی نہیں ہوگا۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ داغنے کی ممانعت اس بنیاد پر ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب اس بات کا پختہ عقیدہ رکھتے تھے کہ داغنا مرض کے دفعیہ کے لئے ایک قطعی اور یقینی علاج ہے، ظاہر ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ ایک باطل عقیدہ تھا۔ اس لئے مسلمانوں کو اس سے منع کیا گیا تاکہ وہ اس کو اختیار کرنے سے شرک خفی کے جال میں نہ پھنس جائیں۔

جانوروں کو کسی ضرورت و مصلحت کی وجہ سے داغنا جائز ہے

(١٦) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ غَدَوْتُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِعَبْدِ اللّٰہِ بْنِ اَبِیْ طَلْحَۃَ لِیُحَنِّکَہٗ فَوَافَیْتُہٗ فِیْ یَدِہِ الْمِیْسَمَ یَسِمُ اِبِلَ الصَّدَقَۃِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں (ایک دن) صبح کے وقت عبداللہ ابن ابوطلحہ کو رسول کریم ﷺ کی خدمت میں لے گیا تاکہ آپ ﷺ کھجور چبا کر اس کے تالو میں لگادیں، چنانچہ اس وقت میں نے آپ ﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ آپ ﷺ کے دست مبارک میں داغنے کا آلہ تھا جس کے ذریعہ زکوٰۃ کے اونٹوں کو داغ رہے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: عبداللہ ابن طلحہؓ ماں کی طرف سے حضرت انسؓ کے بھائی تھے" یعنی ماں کی طرف سے حقیقی بھائی تھے اور باپ کی طرف سے سوتیلے بھائی تھے اور ابوطلحہؓ، حضرت انسؓ کی ماں کے دوسرے خاوند تھے جن سے عبداللہ پیدا ہوئے تھے کھجور چبا کر اس کا لعاب بچے کے تالو میں لگانا سنت ہے۔

آنحضرت ﷺ کا ان اونٹوں کو داغنا کسی خلجان کا باعث نہیں بننا چاہئے کیونکہ آپ ﷺ منہ کے علاوہ جسم کے دوسرے حصوں پر داغ دے رہے تھے اور داغنے کی جو ممانعت منقول ہے اس کا تعلق خاص طور پر منہ سے ہے، یا بلاضرورت داغنے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جب کہ زکوٰۃ کے اونٹوں کو اس ضرورت کے تحت داغا جا رہا تھا کہ ان کے اور دوسرے اونٹوں کے درمیان فرق و امتیاز کیا جا سکے۔

(١٧) وَعَنْ ہِشَامِ بْنِ زَیْدٍ عَنْ اَنَسٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَہُوَ فِیْ مِرْبَدٍ فَرَاَیْتُہٗ یَسِمُ شَاءً حَسِبْتُہٗ قَالَ فِیْ اٰذَانِہَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ہشام ابن زید، حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ ﷺ جانوروں کے باڑے میں تھے، میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ بکریوں وغیرہ کے کسی عضو پر داغ دے رہے تھے۔" ہشام کہتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ حضرت انسؓ نے یہ بیان کیا تھا کہ (آپ ﷺ) ان بکریوں وغیرہ کے کان پر (داغ دے رہے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ منہ یعنی چہرہ میں کان شامل نہیں ہے، کیونکہ (چہرہ) پر داغ دینے سے تو منع فرمایا گیا ہے اگر کان کا تعلق بھی چہرہ سے ہوتا تو آپ ﷺ کان پر داغ کیوں دیتے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

جو چیز خون بہا دے اس کے ذریعہ ذبح کرنا درست ہے

(١٨) عَنْ عَدِیِّ بْنِ حَاتِمٍ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَرَاَیْتَ اَحَدُنَا اَصَابَ صَیْدًا وَلَیْسَ مَعَہٗ سِکِّیْنٌ اَیَذْبَحُ بِالْمَرْوَۃِ وَشِقَّۃِ الْعَصَا فَقَالَ اَمْرِرِ الدَّمَ بِمَ شِئْتَ وَاذْکُرِ اسْمَ اللّٰہِ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عدی ابن حاتمؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا "یارسول اللہ! مجھے یہ بتائیے کہ اگر ہم میں سے کوئی شخص (کسی جانور کا) شکار پکڑے اور اس وقت اس کے پاس چھری نہ ہو تو کیا وہ کسی پتھر کے ٹکڑے یا کسی لکڑی کی کھپچ سے اس شکار کو ذبح کر سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "تم جس چیز سے چاہو بسم اللہ پڑھ کر خون بہادو۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

ذبح اضطراری کا حکم

(۱۹) وَعَنْ اَبِی الْعُشَرَاءِ عَنْ اَبِیْهِ اَنَّهٗ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَمَا تَکُوْنُ الذَّکَاةُ اِلَّا فِی الْحَلْقِ وَاللَّبَّةِ فَقَالَ لَوْ طَعَنْتَ فِی فَخِذِهَا لَاَجْزَاَ عَنْكَ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤدَ وَالنَّسَائِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِیُّ وَقَالَ اَبُوْدَاؤدَ هٰذَا ذَکَاةُ الْمُتَرَدِّیِ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا فِی الضَّرُوْرَةِ۔

"اور حضرت ابوالعشراء اپنے والد محترم سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا "یارسول اللہ (ﷺ)! کیا (شرعی) ذبح کا تعلق حلق اور سینہ کے سرے کے درمیانی حصے سے ہے؟ یعنی کیا شرعی طور پر ذبح صرف اسی کو کہا جائے گا کہ جانور کے حلق اور سینے کے سرے کے درمیان جراحت کے ساتھ خون بہایا جائے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "اگر تم شکار کی ران میں بھی جراحت پہنچادو گے تو تمہارے لئے کافی ہوگا۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ) امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ یہ (یعنی حدیث میں مذکورہ ذبح کی اجازت دینا، اس جانور سے متعلق ہے جو کنویں میں گر پڑا ہو یعنی یہ "ذبح اضطراری" کی صورت کا حکم ہے اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ ضرورت کی حالت کا حکم ہے۔"

تشریح: امام ترمذیؒ نے گویا امام ابوداؤد کی وضاحت کو اور زیادہ توسع کے ساتھ بیان کیا تاکہ اس حکم میں بھاگے ہوئے اونٹ کو ذبح کرنے کی صورت بھی شامل ہو جائے۔

اگر تربیت یافتہ کتے وغیرہ کا پکڑا ہوا شکار مر بھی جائے تو اس کا کھانا جائز ہے

(۲۰) وَعَنْ عَدِیِّ بْنِ حَاتِمٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا عَلَّمْتَ مِنْ کَلْبٍ اَوْ بَازٍ ثُمَّ اَرْسَلْتَهٗ وَذَکَرْتَ اسْمَ اللّٰهِ فَکُلْ مِمَّا اَمْسَكَ عَلَیْكَ قُلْتُ وَاِنْ قَتَلَ قَالَ اِذَا قَتَلَهٗ وَلَمْ یَاْکُلْ مِنْهُ شَیْئًا فَاِنَّمَا اَمْسَکَهٗ عَلَیْكَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عدی ابن حاتمؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جس جانور کو تم نے سکھلایا خواہ وہ کتا ہو یا باز اور پھر تم نے (ان میں سے) کسی کو شکار پر چھوڑا اور (چھوڑتے وقت) اللہ کا نام لیا تو تم اس جانور کو کھالو جس کو اس (کتے یا باز نے) تمہارے لئے پکڑا ہے۔" میں نے عرض کیا کہ "اگرچہ اس نے اس (شکار) کو مار ڈالا ہو؟" آپ ﷺ نے فرمایا "جب کہ وہ کتا یا باز شکار کو مار ڈالے اور خود اس میں سے کچھ نہ کھائے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس نے اس شکار کو تمہارے (ہی) لئے پکڑ رکھا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تیر کے شکار کا حکم

(۲۱) وَعَنْهُ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرْمِی الصَّیْدَ فَاَجِدُ فِیْهِ مِنَ الْغَدِ سَهْمِیْ قَالَ اِذَا عَلِمْتَ اَنَّ سَهْمَكَ قَتَلَهٗ وَلَمْ تَرَ فِیْهِ اَثَرَ سَبُعٍ فَکُلْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عدی ابن حاتم کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں شکار پر اپنا تیر چلاتا ہوں اور پھر اگلے دن (جب وہ شکار کہیں پڑا ہوا مجھے ملتا ہے تو) اس میں میں اپنا تیر پاتا ہوں (کیا میں وہ شکار کھا سکتا ہوں؟)" آپ ﷺ نے فرمایا "اس صورت میں اگر تم یہ جانو کہ اس شکار کو تمہارے ہی تیر نے مار ڈالا ہے اور اس (شکار) میں تم کسی درندے کا کوئی نشان نہ پاؤ تو اس کو کھا سکتے ہو (اور اگر اس شکار میں کسی

درندے کے دانت یا پنجے وغیرہ کا کوئی نشان پاؤ یا کسی دوسرے کے تیر کی علامت پاؤ تو اس صورت میں اس کو مت کھاؤ۔" (ابوداؤد)

جس غیر مسلم کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال نہیں، اس کا کتے وغیرہ کے ذریعہ پکڑا ہوا شکار بھی حلال نہیں

(۲۲) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نُهِينَا عَنْ صَيْدِ كَلْبِ الْمَجُوْسِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ہمیں مجوسیوں کے کتے کا پکڑا ہوا شکار کھانے سے منع کیا گیا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شکار کو مجوسی اپنے کتے یا کسی مسلمان کے کتے کے ذریعہ پکڑے اس کو کھانا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ شکار زندہ ہاتھ لگے اور اس کو ذبح کر لیا جائے تو اس صورت میں اس کو کھانا جائز ہوگا، اور اسی طرح اگر مسلمان نے مجوسی کے کتے کے ذریعہ شکار مارا ہے تو اس کو کھانا بھی جائز ہوگا اور اگر کتے چھوڑنے یا تیر چلانے میں مسلمان اور مجوسی دونوں شریک ہوں، اور وہ شکار ماریں تو وہ شکار حلال نہیں ہوگا۔

یہ حدیث گویا اس بات کی دلیل ہے کہ جس غیر مسلم کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال نہیں ہے اگر وہ کتے وغیرہ کے ذریعہ شکار مارے تو وہ شکار بھی حلال نہیں ہوگا۔

غیر مسلم کے برتن میں کھانے پینے کی مشروط اجازت

(۲۳) وَعَنْ اَبِيْ ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيِّ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا اَهْلُ سَفَرٍ نَمُرُّ بِالْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى وَالْمَجُوْسِ فَلَا نَجِدُ غَيْرَ اٰنِيَتِهِمْ قَالَ فَاِنْ لَمْ تَجِدُوْا غَيْرَهَا فَاغْسِلُوْهَا بِالْمَاءِ ثُمَّ كُلُوْا فِيْهَا وَاشْرَبُوْا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ کہتے ہیں میں نے عرض کیا۔ "یارسول اللہ ﷺ! ہم (اکثر) سفر کرنے والے لوگوں میں سے ہیں، ہمارا گزر یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں (کی آبادیوں) پر سے (بھی) ہوتا ہے، اس وقت ان کے برتنوں کے علاوہ اور برتن ہمارے پاس نہیں ہوتے (تو کیا ہم ان کے برتنوں میں کھا پی سکتے ہیں؟)" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اگر تمہیں ان کے برتنوں کے علاوہ برتن دستیاب نہ ہوں تو ان کے برتنوں کو پانی سے دھو مانج لو اور پھر ان میں کھاؤ پیو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: غیر مسلم کے برتن میں کھانے پینے کے سلسلے میں الفصل الاول میں بھی حدیث گزری ہے اور اس موقع پر اس مسئلہ کی وضاحت کی جاچکی ہے۔

غیر مسلموں کے ہاں کا کھانا حلال ہے

(۲۴) وَعَنْ قَبِيْصَةَ بْنِ هُلْبٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ سَاَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ طَعَامِ النَّصَارٰى، وَفِيْ رِوَايَةٍ سَاَلَهٗ رَجُلٌ فَقَالَ اِنَّ مِنَ الطَّعَامِ طَعَامًا اَتَحَرَّجُ مِنْهُ فَقَالَ لَا يَتَخَلَّجَنَّ فِيْ صَدْرِكَ شَيْءٌ ضَارَعْتَ فِيْهِ النَّصْرَانِيَّةَ۔

(رواہ الترمذی و ابوداؤد)

"اور حضرت قبیصہؓ بن ہلب اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے عیسائیوں کے کھانوں کے بارے میں دریافت کیا (کہ ہم لوگ کھائیں یا نہیں؟) اور ایک روایت میں یوں ہے کہ (اس بارے میں) ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے مسئلہ پوچھا، چنانچہ اس نے عرض کیا کہ کھانوں میں سے ایک کھانا (یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کا کھانا) ایسا ہے جس سے میں پرہیز کرتا ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے دل میں کسی چیز یعنی شک و شبہ کی کھٹک نہ پیدا ہونی چاہئے، تم نے اپنے اس عمل کے ذریعہ عیسائیت کی مشابہت اختیار کی ہے۔" (ترمذیؒ ابوداؤدؒ)

تشریح: "تم نے اپنے اس عمل کے ذریعہ عیسائیت کی مشابہت اختیار کی" کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے سائل پر یہ واضح کیا کہ تمہارا عیسائیوں کے تیار کئے ہوئے کھانے سے پرہیز کرنا ایک ایسا عمل ہے جس نے تمہیں عیسائیوں کے مشابہ کر دیا ہے کیونکہ یہ عیسائیوں ہی کا شیوہ ہے کہ انہوں نے کھانے پینے کے معاملہ میں اپنے اوپر بے جا پابندیاں عائد کر لی ہیں اور ان کے پادریوں نے دین میں سختی پیدا کر دی ہے چنانچہ اگر ان کے دل میں کسی بھی اچھے خاصے اور حلال کھانے کے بارے میں یہ کھٹک پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ حرام ہے یا مکروہ ہے تو وہ بلا سوچے سمجھے اس سے پرہیز کرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا تم بلا دلیل شک و شبہ میں پڑ کر ان کے کھانے سے پرہیز نہ کرو، تم مسلمان ہو اور تمہارا دین نہایت سیدھا سادا اور آسان ہے اس میں سختی اور دشواری کا نام نہیں ہے، تمہیں اپنے عمل سے اپنے دین کی نرمی اور آسانی کو ظاہر کرنا چاہئے، اگر تم بلا تحقیق کسی کھانے کو حرام سمجھنے لگو گے تو یہ اپنے اوپر بے جا قسم کی پابندی عائد کرنے اور اپنے دین کو سخت ظاہر کرنے کے مرادف ہی نہیں ہوگا بلکہ عیسائیت کی مشابہت اختیار کرنے کے برابر بھی ہوگا۔

بعض حضرات نے حدیث کے آخری جزو کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ "تمہارے دل میں کوئی خدشہ اس بات کا نہ گزرے کہ عیسائیوں کا کھانا کھانے سے تم ان کے مشابہ ہو گئے۔" اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ کسی کھانے کو محض اس لئے اپنے اوپر حرام نہ کر لو کہ وہ کسی غیر مسلم کا تیار کیا ہوا ہے اور اس کی وجہ سے اس غیر مسلم کی مشابہت لازم آئے گی کیونکہ کھانے پینے کی چیزوں میں کسی قوم کی مشابہت ضرر نہیں کرتی بشرطیکہ تشبیہ کی نیت نہ ہو۔

اس ارشاد گرامی میں "عیسائیت" کی تخصیص محض اس بنیاد پر ہے کہ سوال کرنے والے صحابی حضرت عدی بن حاتمؓ تھے جو اسلام قبول کرنے سے پہلے عیسائیت کے پیرو تھے۔

بہر حال! حدیث سے یہ واضح ہوا کہ جب تک کسی کھانے کی حرمت کا یقین نہ ہو محض شک کی وجہ سے اس سے پرہیز کرنا یا اس کو کھانے میں تردد کرنا مناسب نہیں ہے، غیر مسلم اقوام کی طرح اسلام میں کھانے پینے کا پرہیز نہیں ہے کہ ذرا کسی کا ہاتھ لگ گیا تو وہ کھانا چھوت ہو گیا، بلکہ مسلمانوں کو اجازت ہے کہ وہ ہر قوم کا پکا ہوا کھانا کھا سکتے ہیں، بشرطیکہ یہ یقین نہ ہو کہ اس کھانے میں کوئی حرام چیز ملائی گئی ہے یا وہ نجس برتنوں میں پکایا گیا ہے۔ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم کوئی حرام چیز پکائے مثلاً غیر مذبوحہ گوشت یا مردار یا سؤر اور یا کھانے میں شراب ملائے تو اس کو بھی کھا لیا جائے۔

مجثمہ کا کھانا ممنوع ہے

(۲۵) وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَكْلِ الْمُجَثَّمَةِ وَهِيَ الَّتِيْ تُصْبَرُ بِالنَّبْلِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجثمہ کو کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اور "مجثمہ" اس جانور کو کہتے ہیں، جس کو باندھ کر نشانہ کی مانند کھڑا کیا جائے اور پھر اس پر تیر مارا جائے۔" (ترمذی)

تشریح: روایت میں "مجثمہ" کی وضاحت کے لئے جو الفاظ منقول ہیں وہ کسی راوی کے ہیں۔ یہ جاہل اور بے رحم لوگ کیا کرتے ہیں، کہ بے زبان پرندوں اور جانوروں کو باندھ کر ان کو نشانہ بناتے ہیں، شریعت نے اس عمل سے بھی منع کیا ہے اور ایسے جانور کا گوشت کھانا بھی ممنوع قرار دیا ہے کیونکہ اس طرح قتل کئے جانے سے "ذبح" کا مقصد اور مفہوم حاصل نہیں ہوتا اور جب وہ جانور شرعی طور پر ذبیحہ نہیں ہوگا تو اس کا کھانا بھی حرام ہوگا۔

وہ جانور جن کا کھانا حرام ہے

(۲۶) وَعَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى يَوْمَ خَيْبَرَ عَنْ كُلِّ ذِيْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ وَعَنْ

كُلِّ ذِى مِخْلَبٍ مِنَ الطَّيْرِ وَعَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْاَهْلِيَّةِ وَعَنِ الْمُجَثَّمَةِ وَعَنِ الْخَلِيْسَةِ وَاَنْ تُوْطَأَ الْحَبَالٰى حَتّٰى يَضَعْنَ مَافِى بُطُوْنِهِنَّ قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيٰى سُئِلَ اَبُوْعَاصِمٍ عَنِ الْمُجَثَّمَةِ فَقَالَ اَنْ يُنْصَبَ الطَّيْرُ اَوِ الشَّىْءُ فَيُرْمٰى وَسُئِلَ عَنِ الْخَلِيْسَةِ فَقَالَ الذِّئْبُ اَوِ السَّبُعُ يُدْرِكُهُ الرَّجُلُ فَيَأْخُذُ مِنْهُ فَيَمُوْتُ فِى يَدِهٖ قَبْلَ اَنْ يُذَكِّيَهَا۔ (رواه الترمذی)

"اور حضرت عرباض ابن ساریہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے خیبر کے دن ان جانوروں کو کھانے سے منع فرمایا، کچلی والا درندہ، پنجہ والا پرندہ، گھر کے پالتو گدھوں کا گوشت، مجثمہ اور خلیسہ۔ نیز آپ نے (جہاد میں پکڑی گئی) ان لونڈیوں سے جماع کرنے سے بھی منع فرمایا جو حاملہ ہوں جب تک کہ وہ اس بچہ کو نہ جن لیں جو ان کے پیٹ میں ہے۔ حضرت محمد ابن یحیٰی (جو امام ترمذیؒ کے شیخ و استاد ہیں اور حدیث کے راویوں میں سے ایک راوی ہیں) کہتے ہیں کہ (میرے شیخ و استاد) حضرت ابوعاصمؒ سے مجثمہ کے معنی دریافت کئے گئے تو انہوں نے فرمایا کہ (مجثمہ کا مطلب یہ ہے کہ) کسی پرندہ یا چرندہ کو (باندھ کر) کھڑا کیا جائے اور پھر اس پر تیر مارا جائے۔" اسی طرح حضرت ابوعاصمؒ سے خلیسہ کے معنی دریافت کئے گئے تو انہوں نے فرمایا کہ (اس کا مطلب یہ ہے کہ) بھیڑیئے یا کسی اور درندے نے کسی جانور کو پکڑ لیا ہو اور پھر کوئی شخص اس (درندے) سے وہ جانور چھین لے اور وہ جانور ذبح کئے جانے سے پہلے ہی اس (شخص) کے ہاتھ میں مر جائے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "خیبر کے دن" سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مذکورہ چیزوں کی ممانعت کا حکم اس سال جاری فرمایا جس میں خیبر فتح ہوا تھا، یا عین خیبر کی فتح کے وقت جاری فرمایا اور یہ بھی ممکن ہے کہ جن دنوں میں خیبر میں جہاد جاری تھا انہی دنوں میں سے کسی ایک دن یہ حکم جاری فرمایا گیا۔

"ذی ناب" اس درندے کو کہتے ہیں جس کے کچلی یعنی نوکدار دانت ہوں اور اپنی کچلی کے ذریعہ (جانور وغیرہ) کو پھاڑتا ہو جیسے شیر، بھیڑیا، چیتا، ریچھ، بندر، سوّر، لومڑی اور بجو وغیرہ۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگر لومڑی اور بجو درندوں میں شامل نہیں ہیں تو وہ حلال ہیں۔

"ذی مخلب" اس پرندے کو کہتے ہیں جو اپنے پنجے سے شکار کرتا ہے، جیسے باز، بحری شکرہ، چرغ، الو، چیل اور گدھ وغیرہ۔

"گھر کے پالتو گدھوں" سے مراد وہ گدھے ہیں جو بستی میں رہتے ہیں، چنانچہ جنگلی گدھے کا گوشت حلال ہے، حدیث میں مذکورہ ممانعت سے پہلے پالتو گدھے کا گوشت بھی حلال تھا۔

"لونڈیوں سے جماع کرنے سے بھی منع فرمایا الخ" یہ حکم ان لونڈیوں کا ہے جو حاملہ ہونے کی حالت میں کسی کے شرعی قبضہ و تسلط میں آئی ہوں، اور جو لونڈی ایسی حالت میں کسی کے شرعی قبضہ و تسلط میں آئی ہو کہ وہ حاملہ نہ ہو تو اس کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اس کے ساتھ اس وقت تک ہم بستری نہ کی جائے جب تک کہ اس کو ایک حیض نہ آجائے۔

شریطہ کا کھانا ممنوع ہے

(۲۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَاَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ شَرِيْطَةِ الشَّيْطَانِ زَادَ ابْنُ عِيْسٰى هِىَ الذَّبِيْحَةُ يُقْطَعُ مِنْهَا الْجِلْدُ وَلَا تُفْرَى الْاَوْدَاجُ ثُمَّ تُتْرَكُ حَتّٰى تَمُوْتَ۔ (رواه ابوداؤد)

"حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے شریطہ شیطان سے منع فرمایا ہے۔ ابن عیسیٰ (حدیث کے ایک راوی) نے یہ مزید بیان کیا کہ شریطہ شیطان یہ ہے کہ جانور (کے حلق کے اوپر) کی کھال کاٹ دی جائے اور اس کی پوری رگیں نہ کاٹی جائیں اور پھر اس کو چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ وہ مر جائے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: زمانۂ جاہلیت میں مشرک ایسا کرتے تھے کہ جانور حلق کے اوپر کی ٹھوڑی کی کھال کاٹ کر چھوڑ دیتے تھے چونکہ ان کی رگیں پوری نہیں کٹتی تھیں اس لئے وہ آسانی کے ساتھ مرنے کی بجائے بڑی سختی کے ساتھ تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا۔ اس کو "شریط" اس سبب سے

فرمایا گیا ہے کہ "شرط" جو "شرط حجام" سے ماخوذ ہے، کے معنی نشتر مارنے کے ہیں، یا "شرط" علامت کے معنی میں ہے اور اس کی نسبت شیطان کی طرف اس اعتبار سے کی گئی ہے کہ اس فعل شنیع کا باعث وہی (شیطان) ہے، اور وہ اس طرح کا ذبیحہ کرنے والے سے بہت خوش ہوتا ہے۔

ذبیحہ کے پیٹ کے بچہ کا حکم

(۲۸) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ذَكَاةُ الْجَنِيْنِ ذَكَاةُ اُمِّهٖ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالدَّارِمِيُّ وَرَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ۔

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ماں کا ذبح کرنا اس کے پیٹ کا بھی ذبح کرنا ہے۔" (ابوداؤدؒ، دارمیؒ)۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو حضرت ابوسعیدؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: حدیث کا ظاہری مطلب تو یہ ہے کہ ماں کا ذبح ہونا اس کے پیٹ کے بچہ کے حلال ہونے کے لئے کافی ہے، مثلاً کسی شخص نے اونٹنی کو نحر کیا یا بکری کو ذبح کیا اور اس کے پیٹ سے مرا ہوا بچہ نکلا تو اس کو کھانا جائز ہے، چنانچہ حضرت امام مالکؒ حضرت امام شافعیؒ، اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا یہ مسلک ہے لیکن حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک تو اس بچہ کا کھانا ہر حال میں درست ہوگا، خواہ اس کے جسم پر بال ہوں یا نہ ہوں اور حضرت امام مالکؒ کے نزدیک اس بچہ کو کھانا اسی صورت میں جائز ہوگا جب کہ اس کی جسمانی ساخت مکمل ہو چکی ہو، اور اس کے بدن پر بال نکل چکے ہوں۔

ان تینوں ائمہ کے برخلاف حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ اس بچہ کو کھانا حلال نہیں ہے ہاں اگر وہ بچہ ماں کے پیٹ سے زندہ نکلے اور پھر اس کو ذبح کیا جائے تو اس صورت میں اس کو کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں، حنفیہ میں سے امام زفرؒ اور حضرت امام حسنؒ ابن زیاد کا بھی یہی قول ہے، ان حضرات کی طرف سے اپنے مسلک کی دلیل کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر شکار (گولی یا تیر وغیرہ کھا کر) پانی میں گر پڑے اور پھر اس میں سے مردہ نکلے تو اس کو کھانا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ احتمال ہے کہ وہ شکار پانی میں ڈوبنے کی وجہ سے مرا ہو۔ جب آنحضرت ﷺ نے جان نکلنے کے سبب میں شک واقع ہو جانے کی وجہ سے اس شکار کو کھانا حرام قرار دیا تو چونکہ وہی چیز یعنی جان نکلنے کے سبب میں شک کا واقع ہونا، ذبیحہ کے پیٹ سے نکلنے والے مردہ بچہ کے بارے میں بھی موجود ہے اس لئے وہ بھی حرام ہوگا کیونکہ جس طرح پانی میں گر جائے اور شکار کی موت کا سبب معلوم نہیں ہو سکتا اسی طرح اس مردہ بچہ کی موت کا سبب بھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ آیا وہ اپنی ماں کے ذبح کئے جانے کے سبب سے مرا ہے یا دم گھٹنے کی وجہ سے مر گیا ہے۔

جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے تو حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک اس حدیث کے صحیح ہونے میں کلام کیا گیا ہے۔

(۲۹) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَنْحَرُ النَّاقَةَ وَنَذْبَحُ الْبَقَرَةَ وَالشَّاةَ فَنَجِدُ فِيْ بَطْنِهَا الْجَنِيْنَ اَنُلْقِيْهِ اَمْ نَاْكُلُهٗ قَالَ كُلُوْهُ اِنْ شِئْتُمْ فَاِنَّ ذَكَاتَهٗ ذَكَاةُ اُمِّهٖ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا "یا رسول اللہ جب ہم اونٹنی کو نحر کرتے ہیں یا گائے اور بکری کو ذبح کرتے ہیں تو (بسا اوقات) ہم اس ذبیحہ کے پیٹ میں مردہ بچہ پاتے ہیں، آیا ہم اس بچہ کو پھینک دیا کریں یا کھا لیا کریں؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اگر تم چاہو تو اس کو کھا لیا کرو کیونکہ اس کی ماں کا ذبح کرنا اس بچہ کا بھی ذبح کرنا ہے۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مفہوم کے اعتبار سے یہ روایت بھی وہی ہے جو اوپر نقل کی گئی ہے۔ اور اس سلسلے میں ائمہ کے جو اختلافی اقوال ہیں ان کو بھی اوپر ہی ذکر کیا جا چکا ہے۔

نحر اور ذبح کی تفصیل: پہلے صفحات میں بتایا گیا تھا کہ "ذبح" کرنے کی دو قسمیں ہیں ایک تو اختیاری اور دوسری اضطراری، پھر اختیاری

کی بھی دو صورتیں ہیں ایک تو "نحر" اور دوسری "ذبح" چنانچہ نحر تو یہ ہے کہ اونٹ کے سینہ میں نیزہ مارا جائے (یعنی اس کے سینے کو نیزہ سے چیرا دیا جائے) اور اونٹ میں مستحب نحر کرنا ہے اگرچہ اس کو ذبح کرنا جائز ہے لیکن کراہت کے ساتھ۔

اور "ذبح یہ ہے کہ جانور کی حلق کی رگ کو کاٹا جائے، ذبح کی صورت میں جانور کی حلق کی جو رگیں کاٹی جاتی ہیں وہ چار ہیں۔ ایک تو نرخرہ کہ جس کے ذریعہ سانس کی آمد ورفت ہوتی ہے، دوسری مری یعنی وہ رگ جس سے منہ سے پانی جاتا ہے اور دو شہ رگیں جو نرخرہ کے دائیں بائیں ہوتی ہیں۔ ان چاروں رگوں کو کاٹنا ہی شرعی طور پر "ذبح" کہلاتا ہے، اگر ان چاروں میں سے تین ہی رگیں کٹ جائیں تب بھی ذبح درست ہے اور اس جانور کا کھانا حلال ہے اور اگر دو ہی رگیں کٹیں تو وہ جانور مردار ہو جائے گا جس کا کھانا حلال نہیں ہوگا۔

جس طرح اونٹوں میں نحر کرنا مستحب ہے اسی طرح گائے اور بکریوں وغیرہ میں ذبح کرنا مستحب ہے لیکن اگر کسی نے ان کو نحر کر لیا تب بھی جائز ہوگا مگر کراہت کے ساتھ۔

اگر کسی شخص نے بکری وغیرہ کو گدی کی طرف سے ذبح کیا تو اگر وہ اتنی دیر تک زندہ رہی کہ اس شخص نے اس کی رگیں کاٹ دیں تو اس کا کھانا جائز ہے لیکن کراہت کے ساتھ کیونکہ اس طرح ذبح کرنا سُنّت کے خلاف ہے اور اگر وہ رگوں کے کٹنے سے پہلے ہی مرگئی تو اس کا کھانا جائز نہیں۔

اگر کسی شخص نے کسی جانور مثلاً مرغی کو ذبح کرتے ہوئے چھری کو حرام مغز تک پہنچا دیا اور سرکٹ کر جدا ہو گیا تو اس کا کھانا جائز ہے در مکروہ بھی نہیں ہے لیکن اتنا زیادہ ذبح کرنا یا اس طرح ذبح کرنا کہ سر جدا ہو جائے مکروہ ہے۔

بلاوجہ کسی جانور و پرندہ کو ماردینا ناجائز ہے

(۳۰) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو ابْنِ الْعَاصِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَتَلَ عُصْفُوْرًا فَمَا فَوْقَهَا بِغَيْرِ حَقِّهَا سَأَلَهُ اللّٰهُ عَنْ قَتْلِهِ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا حَقُّهَا قَالَ اَنْ يَذْبَحَهَا فَيَاْكُلَهَا وَلَا يَقْطَعَ رَأْسَهَا فَيَرْمِيَ بِهَا۔

(رواہ احمد والنسائی والدارمی)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاص سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اگر کوئی شخص کسی چڑیا یا اس سے چھوٹے بڑے کسی اور جانور و پرندہ کو ناحق مار ڈالے گا تو اللہ تعالیٰ اس شخص سے اس (ناحق مارنے) کے بارے میں باز پرس کرے گا۔" عرض کیا گیا "یارسول اللہ ﷺ اور اس (چڑیا وغیرہ) کا حق کیا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "یہ کہ اس کو ذبح کیا جائے (کسی اور طرح اس کی جان نہ ماری جائے) اور پھر اس کو کھایا جائے، یہ نہیں کہ اس کا سر کاٹ کر پھینک دیا جائے۔" (احمدؒ، النسائیؒ، دارمیؒ)

تشریح: اسلامی تعلیمات کے مطابق خدا کی اس وسیع کائنات میں ہر جاندار اپنی جان کی حفاظت کا حق رکھتا ہے خواہ وہ اشرف المخلوقات انسان ہو یا حیوان، جس طرح کسی انسان کی جان کو ناحق مارنا شریعت کی نظر میں بہت بڑا گناہ اور بہت بڑا ظلم ہے، اسی طرح کسی حیوان کی جان ناحق ختم کرنا بھی ایک انتہائی غیر مناسب فعل اور ایک انتہائی بے رحمی کی بات ہے۔

اگر قادر مطلق نے انسان کو طاقت و قوت عطا کر کے حیوانات پر تسلط و اختیار عطا کیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان اپنی اس طاقت اور اپنے اس اختیار کے بل پر محض اپنا شوق پورا کرنے کے لئے یا محض تفریح طبع کی خاطر بے زبان جانوروں کو اپنا تختہ مشق بنائے۔ اور ان کی جانوں کو کھلونا بنا کر ان کو ناحق مارتا رہے۔

جس جانور کے گوشت کو حق تعالیٰ نے انسان کے لئے حلال قرار دیا ہے اگر وہ اس جانور کو بطور شکار مار کر یا اس کو ذبح کر کے اس کا گوشت کھاتا ہے اور اس سے فائدہ حاصل کرتا ہے تو وہ اپنے اختیار کا جائز استعمال کرتا ہے اور اگر محض لہو ولعب اور تفریح طبع کے لئے اس جانور کی جان ناحق یعنی بلا فائدہ ختم کرتا ہے اور اس کے گوشت وغیرہ سے کوئی نفع حاصل کئے بغیر اس کو مار کر پھینک دیتا ہے تو اس

طرح نہ صرف وہ اپنے اختیار کا ناجائز استعمال کرتا ہے بلکہ ایک جاندار پر ظلم کرنے والے کے برابر ہوتا ہے اس لئے حدیث میں ایسے شخص کو آگاہ کیا گیا ہے کہ تمہارا یہ فعل (یعنی جانوروں اور پرندوں کو ناحق مارنا) بارگاہ احکم الحاکمین میں قابل مواخذہ ہے۔ اور کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تم سے اس بارے میں سخت بازپرس کرے گا اور تمہیں عتاب وعذاب میں مبتلا کرے گا۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی جانور کو کھانے کے مقصد کے علاوہ ذبح کرنا یا کسی اور طرح اس کی جان مارنا مکروہ ہے۔ لیکن دوسرے علماء لکھتے ہیں کہ یہ کراہت بھی تحریمی ہے، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے جانوروں کی جان مارنے سے منع فرمایا ہے جو کھائے نہیں جاتے یا جن کا کھانا حلال نہیں ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ کسی جانور کا حق، اس سے منتفع ہونے سے عبارت ہے، جس طرح کہ بلا مقصد اس کا سر کاٹ کر پھینک دینا، اس کا حق ضائع کرنے سے عبارت ہے، لہٰذا کہا جائے گا کہ حدیث کے یہ الفاظ ولا یقطع رسھا فیرمی بھا ماسبق کی عبارت کی گویا تاکید وتوثیق کے طور پر ہے

زندہ جانور کے جسم سے کاٹا گیا کوئی بھی حصہ مردار ہے

(۳۱) وَعَنْ اَبِی وَاقِدِ اللَّیْثِیِّ قَالَ قَدِمَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِیْنَةَ وَهُمْ یَجُبُّوْنَ اَسْنِمَةَ الْاِبِلِ وَیَقْطَعُوْنَ اَلْیَاتِ الْغَنَمِ فَقَالَ مَا یُقْطَعُ مِنَ الْبَهِیْمَةِ وَهِیَ حَیَّةٌ فَهِیَ مَیْتَةٌ لَا تُؤْکَلُ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابوواقد لیثیؓ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ (مکہ سے ہجرت فرما کر) مدینہ تشریف لائے تو اس وقت مدینہ کے لوگ (ایسا کرتے تھے کہ) اونٹ کے کوہان اور دنبوں کی چکتیاں کاٹ لیا کرتے تھے (اور پھر اس کو کھاتے تھے) چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو چیز بھی کہ ایسے جانور کے جسم سے کاٹی جائے جو زندہ ہو تو وہ (کاٹی گئی چیز) مردار ہے، اس کو نہ کھایا جائے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: زمانۂ اسلام سے قبل چونکہ جاہلیت نے انسانی عقل وطبائع کو ماؤف کر رکھا تھا اس لئے اس وقت کے انسان ایسے ایسے طور طریقوں میں مبتلا تھے جن سے انسانیت بھی پناہ مانگتی تھی، انھی طور طریقوں میں ایک رواج مدینہ والوں میں یہ بھی جاری تھا کہ وہ جب چاہتے اپنے زندہ اونٹوں کے کوہان، زندہ دنبوں کی چکتیاں کاٹ لیتے تھے اور ان کو بھون پکا کر کھا لیتے تھے۔ یہ جانوروں کے تئیں ایک انتہائی بے رحمانہ طریقہ ہی نہیں تھا بلکہ طبع سلیم کے منافی بھی تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے مدینہ پہنچ کر وہاں کے لوگوں کو اس مذموم فعل سے باز رکھا اور ان پر واضح کیا کہ زندہ جانور کے جسم سے جو بھی عضو کاٹا جائے گا وہ مردار ہوگا، اور اس کا کھانا حرام ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ذبح کی اصل، جراحت کے ساتھ خون کا بہنا ہے

(۳۲) عَنْ عَطَاءِ بْنِ یَسَارٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ بَنِی حَارِثَةَ اَنَّهٗ کَانَ یَرْعٰی لِقْحَةً بِشِعْبٍ مِنْ شِعَابِ اُحُدٍ فَرَاٰی بِهَا الْمَوْتَ فَلَمْ یَجِدْ مَا یَنْحَرُهَا بِهٖ فَاَخَذَ وَتِدًا فَوَجَاَبِهٖ فِیْ لَبَّتِهَا حَتّٰی اَهْرَاقَ دَمَهَا ثُمَّ اَخْبَرَ رَسُوْلَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَهٗ بِاَکْلِهَا رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَمَالِكٌ۔ وَفِیْ رِوَایَتِهٖ قَالَ فَذَکَّاهَا بِشِظَاظٍ۔

"حضرت عطاء ابن یسار قبیلہ بنی حارثہ کے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ وہ (ایک دن) اونٹنی کو جو بیانے کے قریب تھی احد پہاڑ کے ایک درہ میں چرا رہا تھا کہ اس نے اونٹنی میں موت کے آثار پائے یعنی اس نے دیکھا کہ اونٹنی کسی وجہ سے مرا ہی چاہتی ہے، (اس وقت) اس کو کوئی ایسی چیز دستیاب نہیں ہو سکی جس کے ذریعہ وہ اونٹنی کو نحر کرتا، آخر کار اس نے ایک میخ اٹھائی اور اس کو نوک کی طرف سے (اس کو اونٹنی کے سینے میں بھونک دیا، تاآنکہ اس کا خون بہا دیا، پھر اس نے (اس واقعہ کو) رسول کریم ﷺ سے بیان کیا (اور اس کے گوشت

کے بارہ میں دریافت کیا کہ اس صورت میں اس کا کھانا کیسا ہے؟) آنحضرت ﷺ نے اس کو اس (کے گوشت) کے کھانے کی اجازت دی (ابوداؤدؒ، مالکؒ) اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "آخر کار اس نے ایک دھار دار لکڑی سے ذبح کر دیا۔"

تشریح: "وتد" لکڑی کی اس میخ یا کھونٹی کو کہتے ہیں جو زمین یا دیوار میں گاڑی جاتی ہے۔ اور "شظاظ" اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کے دونوں کنارے نوکدار ہوتے ہیں اس کو دونوں تھیلوں کے درمیان اڑا کر اونٹ پر لادتے ہیں تاکہ وہ دونوں تھیلے الگ الگ ہو کر گریں نہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شرعی طور پر ذبح یا نحر کا اصل مفہوم یہ ہے کہ جراحت کے ساتھ خون بہایا جائے، اور یہ بات جس چیز سے بھی حاصل ہو جائے اس کے ذریعہ جانور کو ذبح یا نحر کیا جاسکتا ہے خواہ وہ لوہے کی چھری وغیرہ ہو، یا کوئی دھار دار اور نوکدار لکڑی وغیرہ ہو۔

دریائی جانوروں میں سے صرف مچھلی حلال ہے

(۳۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ دَابَّةٍ فِى الْبَحْرِ اِلَّا وَقَدْ ذَكَّاهَا اللّٰهُ لِبَنِىْ اٰدَمَ۔ (رواہ الدارقطنی)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" پانی کا ایسا کوئی جانور نہیں ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کے لئے ذبح نہ کر دیا ہو۔" (دارقطنیؒ)

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دریائی جانوروں کو بغیر ذبح کئے ہوئے کھانا حلال ہے، ان کو محض شکار کر لینا اور پانی میں سے زندہ نکال لینا ذبح کا حکم رکھتا ہے۔

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام دریائی جانور حلال ہیں، خواہ وہ خود سے مر جائیں اور خواہ ان کا شکار کیا جائے۔ لیکن جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے وہ یوں نہیں ہے، بلکہ مچھلی کے حلال ہونے پر تو تمام علماء کا اتفاق ہے اور مچھلی کے علاوہ دوسرے جانوروں کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں۔

چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ دریائی جانوروں میں سے مچھلی کے علاوہ اور کوئی جانور حلال نہیں ہے اور وہ مچھلی بھی حلال نہیں ہے جو سردی و گرمی کی آفت کے بغیر خود بخود مر کر پانی کے اوپر آجائے اور الٹی تیرنے لگے۔ اور جو مچھلی سردی و گرمی کی آفت سے مر کر پانی کے اوپر آجائے تو وہ حلال ہے۔

ذبیحہ سے متعلق چند مسائل: جو جانور اور جو پرندے شکار کر کے کھاتے رہتے ہیں یا ان کی غذا صرف گندگی ہے، ان کا کھانا جائز نہیں ہے جیسے شیر، بھیڑیا، گیدڑ، بلی، کتا، بندر، شکرا، باز اور گدھ وغیرہ اور جو جانور اس طرح کے نہ ہوں جیسے طوطا، مینا، فاختہ، چڑیا، بیڑ، مرغابی، کبوتر، نیل گائے، ہرن، بطخ، اور خرگوش وغیرہ ان کا کھانا جائز ہے۔

بجو، گوہ، کچھوا، خچر اور گدھا، گدھی کا گوشت کھانا اور گدھی کا دودھ پینا جائز نہیں ہے، گھوڑا اگرچہ حلال ہے اور اس کا گوشت کھایا جاسکتا ہے مگر اس کا کھانا بہتر نہیں ہے۔

مچھلی اور ٹڈی کے علاوہ اور کوئی جانور بغیر ذبح کئے ہوئے کھانا درست نہیں ہے، جو حلال جانور (بغیر ذبح کئے ہوئے) خود بخود مر جائے گا وہ مردار ہو گا اس کا کھانا حرام ہے۔

اگر کسی چیز میں چیونٹیاں گر کر مر جائیں تو ان چیونٹیوں کو نکالے بغیر اس چیز کو کھانا درست نہیں ہے، اگر قصداً ایک آدھ چیونٹی کو بھی حلق کے نیچے جانے دیا تو مردار کھانے کا گناہ ہو گا۔

مسلمان کا ذبح کرنا ہر حالت میں درست ہے چاہے عورت ذبح کرے اور چاہے مرد، اسی طرح خواہ پاک ہو یا ناپاک، ہر حال میں اس

کا ذبح کیا ہوا جانور کھانا حلال ہے۔ کافر یعنی مرتد، آتش پرست اور بت پرست وغیرہ کا ذبح کیا ہوا جانور کھانا حرام ہے۔

اگر کوئی کافر گوشت بیچتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میں نے مسلمان سے ذبح کرایا ہے تو اس سے گوشت خرید کر کھانا درست نہیں، البتہ جس وقت مسلمان نے ذبح کیا ہے اگر اسی وقت سے کوئی مسلمان اس گوشت کے پاس برابر بیٹھا دیکھ رہا ہے، یا وہ جانے لگا تو کوئی دوسرا مسلمان اس کی جگہ بیٹھ گیا ہے، تب اس گوشت کا کھانا درست ہوگا۔

اگر کسی ایسے جانور کو ذبح کیا گیا جس کا کھانا حلال نہیں ہے تو اس کی کھال اور گوشت پاک ہو جاتے ہیں (کہ ان کو کھانے کے علاوہ کسی اور استعمال میں لانا بلا کراہت درست ہوتا ہے) علاوہ آدمی اور سوّر کے کہ ان دونوں میں ذبح کرنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آدمی کی کھال کا ناپاک ہونا تو اس کی عزت و حرمت کی وجہ سے ہے اور سور کی کھال وغیرہ کا ناپاک ہونا اس کے نجس ہونے ہی کی وجہ سے ہے کہ وہ پاک کرنے سے بھی ہرگز پاک نہیں ہو سکتی۔

جو مرغی، گندی اور پلید چیزیں کھاتی پھرتی ہو، اس کو تین دن بند رکھ کر ذبح کرنا چاہئے، اس کو بغیر بند کئے ذبح کر کے اس کا گوشت کھانا مکروہ ہے۔

جانور کو کند چھری سے ذبح کرنا مکروہ اور ممنوع ہے کیونکہ اس میں جانور کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اسی طرح ذبح کے بعد ٹھنڈا ہونے سے پہلے اس کی کھال کھینچنا، ہاتھ پاؤں توڑنا کاٹنا، اور ذبح میں جن چار رگوں کو کاٹنا چاہئے ان کے کٹ جانے کے بعد بھی گلا کاٹے جانا، یہ سب مکروہ ہے۔

ٹڈی کو کھانا جائز ہے اور مچھلی کی طرح اس کو بھی ذبح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے اور جن کا نہیں کھایا جاتا، شکار دونوں کا کرنا جائز ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ شکار کا مقصد محض لہو ولعب اور تفریح طبع نہ ہو بلکہ اس سے فائدہ حاصل کرنے کی نیت ہو، جو جانور حلال ہیں ان کا گوشت کھانا ہی ان سے سب سے بڑا نفع حاصل کرنا ہے، ہاں جو جانور حلال نہیں ہیں ان کا شکار اگر اس مقصد سے کیا جائے کہ ان کی کھال وغیرہ سے فائدہ اٹھایا جائے گا تو کوئی مضائقہ نہیں۔

حاصل یہ کہ جانوروں کی جان کی بھی قدر کرنی چاہئے، ان کو خواہ مخواہ کے لئے مار ڈالنا اور بلا ضرورت و بلا مقصد کے ان کا شکار کرتے پھرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

ذبح کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ جانور کا منہ قبلہ کی طرف کر کے تیز چھری ہاتھ میں لے کر بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہہ کے اس کے گلے کو کاٹا جائے، یہاں تک کہ چاروں رگیں کٹ جائیں۔

بَابُ ذِكْرِ الْكَلْبِ

کتے سے متعلق احکام کا بیان

اس باب میں وہ احادیث نقل کی جائیں گی جن سے کتوں سے متعلق احکام معلوم ہوں گے کہ کن مقاصد کے لئے، اور کون سا کتا پالنا جائز ہے اور کون سا نا جائز ہے، اور یہ کہ کس کتے کا مارنا جائز ہے اور کس کا مارنا جائز نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

بلا ضرورت کتا پالنا، اپنے ذخیرۂ ثواب میں کمی کرنا ہے

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اقْتَنٰى كَلْبًا اِلَّا كَلْبَ مَاشِيَةٍ اَوْ ضَارٍ نُقِصَ مِنْ عَمَلِهٖ

كُلَّ يَوْمٍ قِيْرَاطَانِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، جو شخص مویشیوں کی حفاظت کرنے والے کتے اور شکاری کتے کے علاوہ کوئی کتا پالتا ہے اس کے اعمال (کے ثواب) میں سے روزانہ دو قیراط کے برابر کمی کر دی جاتی ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "قیراط" اصل میں ایک وزن کا نام ہے جو آدھے دانگ، یا بقول بعض، دینار کے ۶/۴ ۱اور بقول بعض دینار کے دسویں حصے کے آدھے حصے کے برابر ہوتا ہے، اور ایک دانگ چہ رتی کے وزن، یا ایک درم کے چھٹے حصے کے برابر ہوتا ہے، لیکن حدیث میں "قیراط" کا استعمال اس مقدار کے لئے کیا گیا ہے جس کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اگرچہ بعض احادیث میں اس "مقدار" کو احد پہاڑ کے برابر بتایا گیا ہے، اس بنیاد پر اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ شریعت نے جن مقاصد کے لئے کتوں کو پالنے کی اجازت دی ہے جیسے مویشیوں (یا گھر، کھیت) کی حفاظت اور شکار، ان کے علاوہ محض تفریح طبع اور شوق کی خاطر اگر کوئی شخص کتا پالے گا تو اس نے جو نیک اعمال کئے ہیں اور حق تعالیٰ نے ان اعمال کی بناء پر اپنے فضل و کرم سے اس کے نامۂ اعمال میں اجر و ثواب کے جو ذخیرے رکھے ہیں، ان میں سے روزانہ اس مقدار میں کمی آتی رہے گی کہ اگر اس مقدار کو جسم تصور کیا جائے تو وہ دو احد پہاڑ کے برابر ہو! یا یہ کہ دو قیراط سے مراد اس شخص کی نیکیوں کے حصول میں سے دو حصے کی کمی و نقصان ہے۔

بہر حال "دو قیراط" سے کچھ ہی مراد لیا جائے، حدیث کا اصل منشاء تو صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ بلا ضرورت شرعی، کتا پالنا اپنے اعمال کے اجر و ثواب کے ایک بہت بڑے حصے سے ہاتھ دھونا ہے۔

جہاں تک اس سبب کا تعلق ہے جو کتے پالنے کی وجہ سے ثواب اعمال میں کمی ہونے کی بنیاد ہے تو اس بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں۔

چنانچہ بعض حضرات کے نزدیک اس کمی و نقصان کا سبب ملائکہ رحمت کا گھر میں نہ آنا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ جس گھر میں کتا ہوتا ہے وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔

اور بعض حضرات نے یہ سبب بیان کیا ہے کہ وہ شخص (کتا پال کر) دوسرے لوگوں کو ایذاء پہنچانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ کمی و نقصان اس سبب سے ہے کہ جب گھر میں کتا پلا ہوا ہوتا ہے تو وہ گھر والوں کی بے خبری میں کھانے پینے کے برتن باسن میں منہ ڈالتا رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ گھر والے چونکہ بے خبر ہوتے ہی اس لئے وہ ان برتنوں کو دھوئے مانجے بغیر ان میں کھاتے پیتے ہیں۔

② وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اتَّخَذَ كَلْبًا اِلَّا كَلْبَ مَاشِيَةٍ اَوْصَيْدٍ اَوْزَرْعٍ اِنْتَقَصَ مِنْ اَجْرِهٖ كُلَّ يَوْمٍ قِيْرَاطٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص مویشیوں کی حفاظت کرنے والے شکار پکڑنے والے اور کھیت کھلیان کی چوکسی کرنے والے کتے کے علاوہ کوئی کتا پالتا ہے تو اس کے ثواب میں سے ہر روز ایک قیراط کے برابر کمی کر دی جاتی ہے۔"
(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مضمون و مفہوم کے اعتبار سے یہ حدیث بھی پہلی حدیث کی طرح ہے، البتہ اس حدیث میں اس کتے کے استثناء کو بھی ذکر کیا گیا ہے جو کھیت کھلیان کی حفاظت کرنے کے لئے پالا جاتا ہے، نیز اس حدیث میں "ایک قیراط" کا ذکر ہے جب کہ پہلی حدیث میں دو قیراط کا ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ فرق کتوں کی مختلف اقسام کی بنیاد پر ہے کہ بلا ضرورت پالے جانے والے کتوں میں بعض کتے ایسے ہوتے ہیں جو لوگوں کو کم ایذاء پہنچاتے ہیں، ان کو پالنے کی صورت میں ایک قیراط کے برابر کمی کی جاتی ہے یا یہ فرق "مقام و جگہ" کے اعتبار سے ہے کہ

بعض جگہ تو بلا ضرورت کتے پالنے کی وجہ سے ثواب میں دو قیرط کے برابر کمی کی جاتی ہے۔ جیسے مکہ اور مدینہ کہ دونوں مقدس شہر اپنی عظمت وبزرگی کے لحاظ سے ایسے ہیں کہ اگر ان کی حدود میں رہنے والا کوئی شخص بلا ضرورت کتا پالتا ہے تو وہ زیادہ گنہگار ہوتا ہے اس لئے اس کے ذخیرۂ ثواب میں روزانہ دو قیراط کے برابر کمی ہو جاتی ہے جب کہ ان دونوں مقدس شہروں کے علاوہ کسی دوسرے شہر میں کتا پالنے والا نسبتاً کم گنہ گار ہوتا ہے، اس لئے اس کے ثواب میں سے ایک قیراط کے برابر کم کیا جاتا ہے، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو لوگ شہر یا دیہات (کسی بھی آبادی) میں کتا پالتے ہیں ان کے ثواب میں دو قیراط کے برابر کمی ہوتی ہے اور جو لوگ جنگل و بیابان میں کتا پالتے ہیں ان کے ثواب میں ایک قیراط کی کمی ہوتی ہے کیونکہ آبادی میں کتے پالنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ایذاء پہنچانے کا ذریعہ پیدا ہو جب کہ جنگل و بیابان میں یہ صورت نہیں ہوتی۔

اور یا یہ فرق اختلاف زمانہ کے سبب سے ہے کہ پہلے تو ایک ہی قیراط کے برابر کم ہونے کے ساتھ تنبیہ کی گئی تھی، مگر جب بعد میں لوگوں نے کتوں کو زیادہ پالنا شروع کر دیا اور ان کے ساتھ رہن سہن اختیار کیا، نیز ان کی طرف زیادہ رغبت و شوق رکھنے لگے تو شریعت کی طرف سے زجر و تنبیہ میں بھی زیادتی اور شدت اختیار کی گئی اور ثواب میں روزانہ دو قیراط کے برابر کمی ہو جانے کی وعید بیان فرمائی گئی۔

کتوں کو مار ڈالنے کا حکم

(۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِقَتْلِ الْکِلَابِ حَتّٰی اِنَّ الْمَرْأَۃَ تَقْدَمُ مِنَ الْبَادِیَۃِ بِکَلْبِھَا فَنَقْتُلُہٗ ثُمَّ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِھَا وَقَالَ عَلَیْکُمْ بِالْاَسْوَدِ الْبَھِیْمِ ذِی النُّقْطَتَیْنِ فَاِنَّہٗ شَیْطَانٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں (مدینہ کے) کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دے دیا تھا چنانچہ (ہم مدینہ اور اطراف مدینہ کے کتوں کو مار ڈالتے تھے) یہاں تک کہ جو عورت جنگل سے آتی اور اس کا کتا اس کے ساتھ ہوتا تو ہم اس کو بھی ختم کر دیتے تھے، پھر بعد میں آنحضرت ﷺ نے عام کتوں کو مار ڈالنے سے منع فرما دیا اور یہ حکم دیا کہ خالص سیاہ کتے کو جو دو نقطوں والا ہو مار ڈالنا تمہارے لئے ضروری ہے کیونکہ وہ شیطان ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ کتوں کو مار ڈالنے کا حکم صرف مدینہ منورہ کے ساتھ مخصوص تھا کیونکہ وہ شہر مقدس محض اسی اعتبار سے تقدیس کا حامل نہیں تھا کہ اس میں سرکار دو عالم ﷺ اقامت پذیر تھے بلکہ اس اعتبار سے بھی اس کو پاکیزگی کی عظمت حاصل تھی کہ وہ وحی کے نازل ہونے اور ملائکہ کی آمد و رفت کی جگہ تھا، لہٰذا یہ بات بالکل موزوں اور مناسب تھی کہ اس کی سرزمین کو کتوں کے وجود سے پاک رکھا جاتا۔

عورتوں کی تخصیص یا تو اس وجہ سے ہے کہ جو عورتیں جنگل میں بود و باش رکھتی تھیں ان کو (مویشیوں وغیرہ کی حفاظت کے لئے) کتوں کی زیادہ ضرورت ہوتی تھی، اور جب وہ شہر میں آتیں تو اس وقت بھی ان کا کتا ان کے ہمراہ ہوتا تھا۔

یا یہ کہا جائے کہ یہاں عورت کی قید محض اتفاقی ہے اور مراد یہ ہے کہ ان کتوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑا جاتا تھا جو جنگل سے شہر آ جاتے تھے خواہ وہ کسی عورت کے ساتھ آتے یا کسی مرد وغیرہ کے ساتھ۔

"جو دو نقطوں والا ہو" یعنی وہ کالا بھجنگ کتا جس کی دونوں آنکھوں پر دو سفید نقطے (ٹیکے) ہوتے ہیں۔ اس قسم کا کتا چونکہ انتہائی شریر اور لوگوں کے لئے سخت تکلیف اور ایذاء پہنچانے والا ہوتا ہے اس لئے اس کو "شیطان" فرمایا گیا ہے۔

اس کو "شیطان" کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایسا کتا نہ نگہبانی کے کام کا ہوتا ہے اور نہ شکار پکڑنے کے مصرف کا، چنانچہ اسی سبب سے حضرت امام احمدؒ و اسحٰق نے یہ کہا ہے کہ سیاہ کتے کا پکڑا ہوا شکار حلال نہیں کیونکہ وہ شیطان ہے۔

حضرت امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ عقور یعنی کٹ کھنے کتے کو مار ڈالنے پر تو علماء کا اتفاق ہے اگرچہ وہ سیاہ رنگ کا نہ ہو لیکن اس کتے کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں جو نقصان و ضرر پہنچانے والا نہ ہو۔

امام حرمین کہتے ہیں کہ کتوں کو مار ڈالنے کے حکم کی اصل صورت حال یہ ہے کہ پہلے تو نبی کریم ﷺ نے ہر قسم کے کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دیا تھا، بعد میں اس حکم کی عمومیت منسوخ کر کے اس کے صرف یک رنگ سیاہ کتے تک محدود کر دیا گیا اور پھر آخری طور پر ان تمام کتوں کو مار ڈالنے کی ممانعت نافذ ہوئی جو نقصان و ضرر پہنچانے والے نہ ہوں، یہاں تک کہ یک رنگ سیاہ کتے کو بھی اس حکم میں شامل کر دیا گیا اگر اس سے نقصان و ضرر پہنچنے کا خطرہ نہ ہو تو اس کو بھی ختم نہ کیا جائے۔

④ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِقَتْلِ الْكِلَابِ اِلَّا كَلْبَ صَيْدٍ اَوْ كَلْبَ غَنَمٍ اَوْ مَاشِيَةٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہم کو (سارے کتوں کے یا مدینہ کے) کتوں کے مار ڈالنے کا حکم دیا۔ لیکن شکاری کتوں اور بکریوں کی حفاظت کرنے والے کتوں اور مویشیوں کی حفاظت کرنے والے کتوں کو مستثنیٰ رکھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اَوْمَاشِيَةٍ" (اور مویشیوں کی حفاظت کرنے والے کتے) یہ جملہ تعمیم بعد تخصیص کے طور پر ہے۔ یعنی استثناء کے سلسلے میں پہلے تو خاص طور پر بکریوں کو حفاظت کرنے والے کتوں کا ذکر کیا پھر اور بعد میں عمومی طور پر تمام جانوروں کی حفاظت کرنے والے کتوں کا ذکر کر دیا، لہٰذا اس صورت میں حرف "اَوْ" تنویع کے لئے ہوگا جیسا کہ ماقبل کی عبارت میں ہے۔

یا یہ کہ "اَوْمَاشِيَةٍ" میں حرف "اَوْ" راوی کے شک کو ظاہر کرنے کے لئے ہے یعنی اس کے ذریعہ حدیث کے راوی نے بتانا چاہا ہے کہ مجھے صحیح یاد نہیں ہے کہ اس موقع پر "الا کلب صید او کلب....." کے بعد "غَنَمٍ" فرمایا گیا تھا یا "مَاشِيَةٍ"۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

سارے کتوں کو مار ڈالنے کا حکم نہ دینے کی علت

⑤ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْلَا اِنَّ الْكِلَابَ اُمَّةٌ مِنَ الْاُمَمِ لَاَمَرْتُ بِقَتْلِهَا كُلِّهَا فَاقْتُلُوْا مِنْهَا كُلَّ اَسْوَدَ بَهِيْمٍ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالدَّارِمِيُّ وَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَمَا مِنْ اَهْلِ بَيْتٍ يَرْتَبِطُوْنَ كَلْبًا اِلَّا نُقِصَ مِنْ عَمَلِهِمْ كُلَّ يَوْمٍ قِيْرَاطٌ اِلَّا كَلْبَ صَيْدٍ اَوْ كَلْبَ حَرْثٍ اَوْ كَلْبَ غَنَمٍ۔

"حضرت عبداللہ ابن مغفلؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اگر یہ بات نہ ہوتی کہ کتے (بھی) گروہوں میں سے ایک گروہ ہیں تو میں یقیناً یہ حکم دے دیتا کہ ان سب کو مار ڈالا جائے پس ان میں جو (بھی) کتا خالص سیاہ رنگ کا ہو اس کو مار ڈالو (ابوداؤدؒ، دارمیؒ) اور ترمذیؒ ونسائیؒ نے یہ عبارت مزید نقل کی ہے کہ "اور جو گھر والے "بلا ضرورت" کتا پالتے ہیں ان کے عمل (کے ثواب میں سے روزانہ ایک قیراط کے بقدر کمی کر دی جاتی ہے، ہاں شکاری کتا اور کھیت کی حفاظت کرنے والا اور ریوڑ کی چوکسی کرنے والا کتا اس سے مستثنیٰ ہے۔"

تشریح: "کتے (بھی) گروہوں میں سے ایک گروہ ہیں الخ" اس ارشاد کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے گویا قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ فرمایا:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طَآئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ۔

"اور جتنی قسم کے جاندار زمین پر چلنے والے ہیں اور جتنی قسم کے پرند جانور ہیں کہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتے ہیں ان میں کوئی قسم ایسی نہیں جو کہ تمہاری طرح گروہ نہ ہوں۔"

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسان ایک اُمت اور ایک جنس ہیں اسی طرح جانور بھی ایک اُمت اور ایک جنس ہیں، خواہ وہ زمین پر چلنے والے ہوں یا فضا میں اڑنے والے ہوں، جس طرح انسان اپنے مختلف نام اور اپنے مختلف انواع کے ذریعہ ایک دوسرے سے پہچانے جاتے ہیں، اسی طرح جانوروں کے بھی مختلف نام اور مختلف نوع ہیں جن کے ذریعہ ایک دوسرے کے درمیان فرق امتیاز کیا جاتا ہے۔ اور جس طرح انسان اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہیں۔ کہ ہر شخص کو اپنے اپنے مقدر کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق ملتا ہے، اسی طرح جانوروں کو بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے رزق ملتا ہے، نیز یہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی خاص مصلحت وحکمت کی بناء پر پیدا کیا ہے اسی طرح جانوروں کو بھی مصلحت وحکمت ہی کے مطابق پیدا کیا ہے، اس اعتبار سے جس طرح انسان کی جان کی اہمیت ہے، اسی طرح جانوروں کی جان کی بھی اہمیت ہے کہ ان کو بلا ضرورت اور بلا مقصد مار ڈالنا تخلیق خداوندی کی مصلحت وحکمت کے منافی ہے۔

لہٰذا، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس آیت کریمہ کے بموجب یہ تو ممکن نہیں ہے کہ سارے کتوں کو مار ڈالا جائے کیونکہ مخلوق خداوندی میں جتنے گروہ اور جتنی جماعتیں ہیں ان میں ایک گروہ اور ایک جماعت کتے بھی ہیں اور کسی جماعت کے گروہ کو فنا کر دینا اللہ تعالیٰ کی اس حکمت ومصلحت کے بالکل منافی ہے جو ہر جاندار کی تخلیق میں کارفرما ہے، البتہ ان کتوں میں جو کتے خالص سیاہ رنگ کے ہوں ان کو مار ڈالنا چاہئے کیونکہ اس قسم کے کتے نہایت شریر اور سخت خطرناک ہوتے ہیں جن سے لوگوں کو سوائے تکلیف وایذاء کے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اور باقی دوسری قسم کے کتے چونکہ کھیت کھلیان اور مویشیوں کی چوکسی کرنے وغیرہ کے کام میں آتے ہیں اور وہ ایک طرح سے انسان کی خدمت کرتے ہیں اس لئے آیت کریمہ کی تعلیم کے علاوہ یوں بھی مفاد عامہ کے پیش نظر ان کو زندہ رکھنا ہی زیادہ بہتر اور فائدہ مند ہے۔

حدیث میں لفظ "فاقتلوا" ترکیب نحوی کے اعتبار سے جواب ہے شرط محذوف کا، گویا آپ ﷺ نے یوں فرمایا کہ جب مذکورہ سبب (آیت کریمہ کے بموجب) تمام کتوں کو مار ڈالنے کا کوئی راستہ نظر آتا تو کم سے کم ان کتوں کو مار ڈالو جو خالص سیاہ رنگ کے ہوں۔

جانوروں کو لڑانے کی ممانعت

(۶) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ التَّحْرِيْشِ بَيْنَ الْبَهَائِمِ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جانوروں کو ایک دوسرے پر ابھارنے (یعنی ان کو آپس میں لڑانے سے) منع فرمایا ہے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اونٹوں، ہاتھیوں، مینڈھوں، بیلوں، بھینسوں اور ان کے علاوہ دوسرے چوپایوں کو آپس میں لڑانا نہیں چاہئے، اسی طرح پرند جانوروں کا بھی یہی حکم ہے۔ مرغوں اور بٹیروں وغیرہ کو بھی آپس میں لڑانا ممنوع ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب جانوروں کو لڑانے کی ممانعت ہے تو آدمیوں کو آپس میں لڑانا بطریق اولی ممنوع ہوگا۔

بَابُ مَا يَحِلُّ اَكْلُهٗ وَمَا يَحْرُمُ

جن جانوروں کا کھانا حلال ہے اور جن جانوروں کا کھانا حرام ہے ان کا بیان

واضح رہے کہ جس چیز کا حرام ہونا کتاب اللہ (یعنی قرآن مجید) سے ثابت ہے وہ اول تو میتۃ یعنی مردار ہے۔ دوم دم مسفوح یعنی بہتا ہوا خون ہے، سوم سؤر کا گوشت ہے اور چہارم اس جانور کا گوشت ہے جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو چنانچہ اس آیت کریمہ سے یہی

ثابت ہے۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ط (سورہ الانعام)

"(اے محمد ﷺ !) کہہ دیجئے کہ جو احکام (بذریعہ وحی) میرے پاس آئے ہیں ان میں تو میں کوئی حرام غذا پاتا نہیں کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھائے مگر یہ کہ وہ مردار (مرا ہوا جانور) ہو یا بہتا ہوا خون ہو یا سوّر کا گوشت ہو کیونکہ وہ بالکل ناپاک ہے یا جو (جانور) شرک کا ذریعہ ہو کہ غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو۔"

اس کے بعد سُنّت نبوی ﷺ نے ان حرام چیزوں میں کچھ اور جانوروں کا اضافہ کیا جیسے ذی ناب، ذی مخلب اور گھر کے پلے ہوئے گدھے وغیرہ۔ چنانچہ جن جانوروں کا احادیث نبوی کے ذریعہ حرام قرار پانا ثابت ہے ان میں سے بعض جانور تو بسبب قطعیت احادیث کے متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک حرام ہیں اور بعض جانوروں کے بارے میں ائمہ حضرات کے اختلافی مسلک ہیں کیونکہ ان کے سلسلے میں احادیث بھی مختلف منقول ہیں بعض جانوروں کے سلسلے میں اس آیت کریمہ کی بناء پر بھی علماء کے درمیان اختلاف پیدا ہوا ہے۔

وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ۔

"اور وہ (رسول کریم ﷺ) پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال بتاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں۔"

چنانچہ حنفی علماء نے اسی آیت کی بنیاد پر مچھلی کے علاوہ پانی کے اور تمام جانوروں کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ ان حضرات کے نزدیک مچھلی کے علاوہ پانی کا اور جو بھی جانور ہے وہ خبیث یعنی گندا ہے۔ بایں دلیل کہ "خبیث" سے مراد وہ چیز ہے جس کو طبیعت سلیم، طیب کی ضد یعنی گندی اور گھناؤنی جانے اور پانی میں مچھلی کے علاوہ جو بھی جاندار چیز ہوتی ہے اس کو طبیعت سلیم گھناؤنی جانتی ہے؟

ہدایہ میں لکھا ہے کہ حضرت امام مالکؒ اور علماء کی ایک جماعت کا مسلک یہ ہے کہ پانی کے تمام جانور مطلق حلال ہیں لیکن ان میں سے بعض علماء نے دریائی سور، دریائی کتے اور دریائی انسان کا استثناء کیا ہے۔ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک مطلق دریا کے جانور حلال ہیں۔ ان کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

اُحِلَّ لَكُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ۔

"تمہارے نزدیک دریا کا شکار پکڑنا اور اس کا کھانا حلال کیا گیا ہے۔"

نیز وہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے بھی استدلال کرتے ہیں جو آپ ﷺ نے دریا کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

هو الطهور ماؤه والحل ميتته۔

"اس (دریا) کا پانی پاک کرنے والا ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔"

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

ذی ناب درندہ حرام ہے

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ ذِیْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ فَاَكْلُهٗ حَرَامٌ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "درندوں میں جو جانور کچلی والا ہو (یعنی جو دانت سے اپنا شکار پکڑتا ہو جیسے شیر اور بھیڑیا وغیرہ) اس کا کھانا حرام ہے۔" (مسلم)

ذی مخلب پرندہ کا گوشت کھانا حرام ہے

(۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ كُلِّ ذِىْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ وَكُلِّ ذِىْ مِخْلَبٍ مِنَ الطَّيْرِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہر اس درندے (کے گوشت) کو کھانے سے منع فرمایا ہے جو کچلی والا ہو اور ہر اس پرندے (کا گوشت کھانے) سے منع فرمایا ہے جو چنگل گیر ہو یعنی جو اپنے پنجہ سے شکار کرتا ہو جیسے باز وغیرہ۔" (مسلمؒ)

گھریلو گدھے کا گوشت کھانا حرام ہے

(۳) وَعَنْ اَبِىْ ثَعْلَبَةَ قَالَ حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لُحُوْمَ الْحُمُرِ الْاَهْلِيَّةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوثعلبہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے گھریلو گدھوں کا گوشت حرام قرار دیا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: لیکن جنگلی گدھے کہ جن کو گورخر کہتے ہیں بالاتفاق تمام علماء کے نزدیک حلال ہیں۔

گھوڑا حلال ہے

(۴) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى يَوْمَ خَيْبَرَ عَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْاَهْلِيَّةِ وَاَذِنَ فِىْ لُحُوْمِ الْخَيْلِ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے خیبر کے دن گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے کی ممانعت جاری فرمائی تھی اور گھوڑوں کا گوشت کھانے کی اجازت دی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: دیگر ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ گھوڑے کا گوشت کھانا مباح ہے لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ گھوڑے کا گوشت کھانا مکروہ ہے، بعضے کہتے ہیں کہ کراہت تحریمی مراد ہے اور بعضے کراہت تنزیہی مراد لیتے ہی لیکن کفایت المنتہی میں منقول ہے کہ بعض علماء نے واضح کیا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے اپنے انتقال سے تین دن پہلے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا تھا یعنی دیگر ائمہ کی طرح وہ بھی گھوڑے کے گوشت کی اباحت کے قائل ہو گئے تھے چنانچہ حنفی مسلک میں اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح فقہ حنفی کی مشہور اور معتبر کتاب در مختار میں بھی یہ لکھا ہے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک گھوڑے کا گوشت حلال نہیں ہے جب کہ حضرت امام شافعیؒ اور حنفیہ میں سے حضرت امام ابویوسف "اور حضرت امام محمدؒ کے نزدیک حلال ہے اور بعض علماء نے صراحت کی ہے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اپنے انتقال سے تین دن پہلے حرمت کے قول سے رجوع کر لیا تھا چنانچہ اسی پر فتوے ہے۔"

حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی روایت کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے کہ حضرت امام اعظمؒ نے اپنے قول سے رجوع کر لیا تھا اور حنفی مسلک میں گھوڑے کا گوشت کھانا حلال ہے۔

گورخر کا گوشت حلال ہے

(۵) وَعَنْ اَبِىْ قَتَادَةَ اَنَّهٗ رَاٰى حِمَارًا وَحْشِيًّا فَعَقَرَهٗ فَقَالَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ مَعَكُمْ مِنْ لَحْمِهٖ شَىْءٌ قَالَ مَعَنَا رِجْلُهٗ فَاَخَذَهَا فَاَكَلَهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے گورخر کو دیکھا اور اس کو مار ڈالا (اور پھر رسول کریم ﷺ سے اس کا گوشت کھانے کا مسئلہ پوچھا) تو نبی کریم ﷺ نے دریافت کیا کہ "کیا تمہارے پاس اس کے گوشت میں سے کچھ موجود ہے؟ ابوقتادہؓ نے کہا کہ "ہمارے

پاس اس کے پائے موجود ہیں چنانچہ آنحضرت ﷺ نے وہ پائے لے لئے اور اس کو کھایا۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

خرگوش حلال ہے

⑥ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اَنْفَجْنَا اَرْنَبًا بِمَرِّ الظَّهْرَانِ فَاَخَذْتُهَا فَاَتَيْتُ بِهَا اَبَا طَلْحَةَ فَذَبَحَهَا وَبَعَثَ اِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِوَرِكِهَا وَفَخِذَيْهَا فَقَبِلَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم نے مقام مرالظہران میں (شکار کے لئے) ایک خرگوش تعاقب کیا چنانچہ میں نے (دوڑ کر) اس کو پکڑ لیا اور پھر اس کو ابو طلحہ ؓ کے پاس لایا۔ ابو طلحہ ؓ نے اس کو ذبح کیا اور اس کا ایک سرین اور دونوں رانیں رسول کریم ﷺ کے پاس بھیجیں آنحضرت ﷺ نے اس کو قبول فرمالیا۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

تشریح: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ خرگوش ایک حلال جانور ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اس کا گوشت قبول فرمایا، اگر اس کا گوشت کھانا حلال نہ ہوتا تو آپ ﷺ اس کو قبول نہ فرماتے بلکہ دوسروں کو بھی اس کے کھانے سے منع فرماتے۔ چنانچہ کتاب الرحمۃ فی اختلاف الائمۃ میں لکھا ہے کہ بالاتفاق تمام علماء کے نزدیک خرگوش حلال ہے۔

گوہ کا گوشت کھانے کا مسئلہ

⑦ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلضَّبُّ لَسْتُ اٰكُلُهٗ وَلَا اُحَرِّمُهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمر ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "گوہ کو نہ میں کھاتا ہوں اور نہ اس کو حرام قرار دیتا ہوں۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ)

تشریح: گوہ کو گور پھوڑ بھی کہتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ اس کی عمر سات سو سال تک کی ہوتی ہے، اس کی بڑی عجیب خصوصیات بیان کی جاتی ہیں مثلاً یہ پانی نہیں پیتی بلکہ ہوا کے سہارے زندہ رہتی ہے، چالیس دن میں ایک قطرہ پیشاب کرتی ہے، اور اس کے دانت کبھی نہیں ٹوٹتے۔

بعض علماء لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا گوہ کو نہ کھانا کراہت طبعی کی بناء پر تھا اور اس کو حرام قرار نہ دینے کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک آنحضرت ﷺ کے پاس وحی کے ذریعہ اس کے بارے میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ آگے وہ حدیث آرہی ہے جو گوہ کی حرمت پر دلالت کرتی ہے چنانچہ اسی حدیث کے بموجب حضرت امام اعظم ابوحنیفہ ؒ کے نزدیک گوہ کا کھانا حرام ہے، جب کہ حضرت امام احمد ؒ اور حضرت امام شافعی ؒ کے نزدیک اس کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے ان کی دلیل مذکورہ بالا حدیث ہے۔

⑧ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ خَالِدَ بْنَ الْوَلِيْدِ اَخْبَرَهٗ اَنَّهٗ دَخَلَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى مَيْمُوْنَةَ وَهِىَ خَالَتُهٗ وَخَالَةُ ابْنِ عَبَّاسٍ فَوَجَدَ عِنْدَهَا ضَبًّا مَحْنُوْذًا فَقَدَّمَتِ الضَّبَّ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَهٗ عَنِ الضَّبِّ فَقَالَ خَالِدٌ اَحَرَامٌ الضَّبُّ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لَا وَلٰكِنْ لَمْ يَكُنْ بِاَرْضِ قَوْمِىْ فَاَجِدُنِىْ اَعَافُهٗ قَالَ خَالِدٌ فَاجْتَرَرْتُهٗ فَاَكَلْتُهٗ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْظُرُ اِلَىَّ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباس ؓ سے مروی ہے کہ حضرت خالد بن ولید ؓ نے ان سے بیان کیا کہ (ایک دن) وہ (خالد ؓ) رسول کریم ﷺ کے ہمراہ حضرت میمونہ ؓ کے گھر گئے جو ان (خالد ؓ) کی بھی خالہ تھیں اور حضرت ابن عباس ؓ کی بھی وہاں ان کے پاس انہوں نے (یعنی آنحضرت ﷺ نے یا حضرت خالد ؓ نے) ایک گوہ بھنی ہوئی رکھی پائی! حضرت میمونہ ؓ نے اس گوہ کو رسول کریم ﷺ کے سامنے پیش کیا لیکن رسول کریم ﷺ نے اس گوہ کی طرف سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا حضرت خالد ؓ نے (یہ دیکھا تو) پوچھا کہ "یا رسول اللہ! کیا گوہ حرام ہے؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "نہیں بلکہ یہ میری قوم کی زمین (یعنی حجاز) میں نہیں پائی جاتی اس لئے میں اس سے اپنے اندر کراہت (یعنی طبعی

کراہت) محسوس کرتا ہوں۔" حضرت خالدؓ کا بیان ہے کہ (یہ سن کر) میں نے اس گوہ کو اپنی طرف کھینچ لیا اور کھانے لگا اور آنحضرت ﷺ میری طرف دیکھتے رہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آگے جو حدیث آئے گی اور جس میں گوہ کو کھانے کی ممانعت منقول ہے، یہ واقعہ اس سے پہلے کا ہے اس اعتبار سے یہ حدیث منسوخ قرار پائے گی۔

مرغ کا گوشت کھانا حلال ہے

(۹) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَاْکُلُ لَحْمَ الدَّجَاجِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو مرغ کا گوشت کھاتے دیکھا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

ٹڈی کا کھانا جائز ہے

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ اَبِیْ اَوْفٰی قَالَ غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَبْعَ غَزَوَاتٍ کُنَّا نَاْکُلُ مَعَہُ الْجَرَادَ۔ (متفق علیہ)

"اور ابن ابی اوفیٰؓ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول کریم ﷺ کے ہمراہ سات جہاد کئے، ہم (ان موقعوں پر) آنحضرت ﷺ کے ساتھ ٹڈی کھاتے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: کنا نا کل معہ الجراد میں لفظ معہ (آنحضرت ﷺ کے ساتھ) نہ تو مسلم کی اصل روایت میں ہے اور نہ ترمذی میں، بلکہ اس حدیث کو جن اور محدثین نے نقل کیا ہے ان میں سے اکثر کی روایت اس لفظ سے خالی ہے، تاہم جن محدثین نے اپنی روایت میں یہ لفظ مزید نقل کیا ہے انہوں نے اس عبارت کے یہ معنی مراد لئے ہیں کہ "ہم آنحضرت ﷺ کے ہمراہ رہتے ہوئے ٹڈی کھاتے تھے۔ اور آنحضرت ﷺ ہمیں اس سے منع نہیں فرماتے تھے۔" نہ یہ کہ ہم اور آنحضرت ﷺ ساتھ ٹڈی کھاتے تھے۔" یہ تاویل اگرچہ حدیث میں منقول الفاظ کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہے لیکن یہ ضروری اس لئے ہے کہ یہ ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ٹڈی نہیں کھائی ہے۔ بلکہ اس کے بارے میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ "نہ میں کھاتا ہوں اور نہ حرام قرار دیتا ہوں۔"

دریا کے مرے ہوئے جانور کو کھانے کا واقعہ

(۱۱) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ غَزَوْتُ جَیْشَ الْخَبَطِ وَاُمِّرَ اَبُوْ عُبَیْدَۃَ فَجُعْنَا جُوْعًا شَدِیْدًا فَاَلْقَی الْبَحْرُ حُوْتًا مَیِّتًا لَمْ نَرَ مِثْلَہٗ یُقَالُ لَہُ الْعَنْبَرُ فَاَکَلْنَا مِنْہُ نِصْفَ شَھْرٍ فَاَخَذَ اَبُوْ عُبَیْدَۃَ عَظْمًا مِنْ عِظَامِہٖ فَمَرَّ الرَّاکِبُ تَحْتَہٗ فَلَمَّا قَدِمْنَا ذَکَرْنَا لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ کُلُوْا رِزْقًا اَخْرَجَہُ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ وَاَطْعِمُوْنَا اِنْ کَانَ مَعَکُمْ قَالَ فَاَرْسَلْنَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْہُ فَاَکَلَہٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ جیش الخبط یعنی پتے جھاڑ کر کھانے والے لشکر کے ساتھ جہاد کے لئے جانے والوں میں میں بھی شریک تھا، حضرت ابوعبیدہؓ اس لشکر کے امیر (سپہ سالار) بنائے گئے تھے چنانچہ (جب) ہم سخت بھوکے ہوئے تو دریا (سمندر) نے ایک مری ہوئی مچھلی (اپنے کنارے پر) پھینک دی ہم نے اتنی بڑی مچھلی کبھی نہیں دیکھی تھی اس قسم کی مچھلی کو عنبر کہا جاتا تھا، چنانچہ ہم نے اس میں سے آدھے مہینے تک (بڑی فراخی کے ساتھ) کھایا، پھر حضرت ابوعبیدہؓ نے اس کی ہڈیوں میں سے ایک ہڈی یعنی اس کی ایک پسلی کھڑی کی تو اس کے نیچے سے ایک اونٹ سوار (بڑی آسانی کے ساتھ) گذر گیا، اس کے بعد جب ہم (مدینہ واپس) آئے تو ہم نے نبی کریم ﷺ کے سامنے اس واقعہ کا ذکر

کیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "جس رزق کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے بہم پہنچایا ہے اس کو کھاؤ (یعنی تم نے یہ اچھا کیا کہ اس مچھلی کو کھایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو تمہارا رزق بنا کر تمہارے لئے بہم پہنچایا تھا۔ یا یہ کہ اگر اس طرح کا کوئی اور رزق پاؤ تو اس کو کھاؤ) اور اگر اس مچھلی میں کا کوئی حصہ تمہارے پاس (باقی رہا) ہو تو ہم کو بھی کھلاؤ (یہ بات گویا آپ ﷺ نے ان کا دل خوش کرنے کے لئے اور اس مچھلی کے حلال ہونے کے حکم کو مؤکد کرنے کی غرض سے فرمائی تاکہ ان لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ وہ مچھلی اصل میں تو جائز نہیں تھی مگر ہماری اضطراری حالت کے پیش نظر اس کو ہمارے لئے حلال کر دیا گیا ہے)" حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ "چنانچہ ہم نے اس مچھلی کا کچھ حصہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں بھیج دیا اور آپ ﷺ نے اس میں سے کھایا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: خبط اصل میں تو خ اور ب کے زبر کے ساتھ ہے لیکن ب کے جزم کے ساتھ بھی منقول ہے۔ اس کے معنی ہیں "درخت کے پتے جو لاٹھی و ڈنڈے سے مار کر گرائے جائیں۔"

حدیث میں مذکورہ واقعہ کا تعلق جس اسلامی لشکر سے ہے اس کو اتنی سخت صورت حال سے دوچار ہونا پڑا تھا کہ زاد راہ کے فقدان کی وجہ سے لشکر والوں کو اپنی زندگیاں بچانے کے لئے مجبوراً درختوں کے پتے جھاڑ جھاڑ کر کھانے پڑتے تھے یہاں تک کہ اس کی وجہ سے ان کے منہ اور ہونٹ زخمی ہو گئے تھے بلکہ ان کے ہونٹ اونٹ کے ہونٹوں کے مشابہ ہو گئے تھے۔ اسی بناء پر اس لشکر کا نام "جیش الخبط" یعنی پتے جھاڑ کر کھانے والا لشکر مشہور ہو گیا۔ یہ واقعہ ۶ھ میں صلح حدیبیہ سے پہلے کا ہے۔

"عنبر" ایک خوشبو کا نام ہے جس کے بارے میں قاموس میں لکھا کہ یہ اصل میں ایک سمندری جانور کا فضلہ ہوتا ہے، یا یہ ایک خاص قسم کے چشمے سے برآمد ہوتا ہے جو سمندر کی تہ میں ہے۔ اور ایک قسم کی بڑی سمندری مچھلی کو بھی عنبر کہتے ہیں جس کی کھال سے ڈھال بنائی جاتی ہے۔

"آدھے مہینہ تک۔" بعض روایتوں میں "ایک مہینہ تک" کے الفاظ ہیں اور بعض روایت میں یہ آیا ہے کہ لشکر والوں نے اس مچھلی میں سے اٹھارہ دن تک کھایا۔ ان تمام روایتوں میں یوں مطابقت پیدا کی جائے کہ اس مچھلی میں سے آدھے مہینہ تک تو پورا لشکر کھاتا رہا اس کے بعد لشکر میں سے کچھ لوگ اٹھارہ دن تک اور کچھ لوگ پورے مہینے تک کھاتے رہے۔

کھانے پینے کی چیز میں مکھی گر پڑے تو اس کا حکم

(۱۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِیْ اِنَاءِ اَحَدِکُمْ فَلْیَغْمِسْهُ کُلَّهٗ ثُمَّ لِیَطْرَحْهُ فَاِنَّ فِیْ اَحَدِ جَنَاحَیْهِ شِفَاءً وَفِی الْاٰخَرِ دَاءً۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب تم میں سے کسی شخص کے برتن میں (کہ جس میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہو) مکھی گر پڑے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس پوری مکھی کو غوطہ دے اور پھر نکال کر پھینک دے کیونکہ اس (مکھی کے دونوں پروں میں سے ایک پر میں شفا ہے اور دوسرے پر میں بیماری ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اسی طرح کی ایک حدیث جو حضرت ابوہریرہؓ ہی سے منقول ہے دوسری فصل میں بھی نقل ہو گی۔ اس میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مکھی بیماری کے پر کو پہلے ڈالتی ہے لہٰذا پوری مکھی کو غوطہ دے لو تاکہ اس کا دوا والا پر بھی ڈوب جائے اور اس طرح اس کھانے پینے کی چیز سے وہ مضر اثرات زائل ہو جائیں جو بیماری والے پر کے ذریعہ پہنچے ہیں۔

جس گھی میں چوہا گر جائے اس کا حکم

(۱۳) وَعَنْ مَیْمُوْنَةَ اَنَّ فَارَةً وَقَعَتْ فِیْ سَمْنٍ فَمَاتَتْ فَسُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْهَا فَقَالَ اَلْقُوْهَا

وَمَاحَوْلَهَا وَكُلُوْهُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت میمونہؓ سے روایت ہے کہ ایک چوہا گھی میں گر پڑا اور مر گیا۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ سے پوچھا گیا (اس گھی کا کیا کیا جائے) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس چوہے کو اور اس کے ارد گرد کے گھی کو نکال کر پھینک دو اور (باقی) گھی کو کھاؤ۔" (بخاریؒ)

تشریح: یہ اس گھی کا حکم ہے جو جما ہوا ہو اور جو گھی پگھلا ہوا ہو وہ اس صورت میں سارا نجس ہو جاتا ہے اور بالاتفاق تمام علماء کے نزدیک اس کا کھانا جائز نہیں، اس طرح اس گھی کو بیچنا بھی اکثر ائمہ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ البتہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اس کے بیچنے کو جائز رکھا ہے۔

اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ آیا اس گھی سے کوئی اور فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ بعض حضرات کے نزدیک اس سے کوئی بھی فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، جب کہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس کو چراغ میں جلانے، کشتیوں پر ملنے یا اس طرح کے کسی اور مصرف میں لاکر اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ قول حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا ہے، اور حضرت امام شافعیؒ کے دو قولوں میں سے ایک قول جو زیادہ مشہور ہے، بھی یہی ہے۔ لیکن یہ جواز کراہت کے ساتھ ہے۔ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمدؒ سے دو روایتیں منقول ہیں۔ حضرت امام مالکؒ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس گھی کو مسجد کے چراغ میں جلانا جائز نہیں ہے۔

سانپ کو مار ڈالنے کا حکم

(۱۴) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اقْتُلُوا الْحَيَّاتِ وَاقْتُلُوْا ذَا الطُّفْيَتَيْنِ وَالْاَبْتَرَ فَاِنَّهُمَا يَطْمِسَانِ الْبَصَرَ وَيَسْتَسْقِطَانِ الْحَبَلَ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ فَبَيْنَا اَنَا اُطَارِدُ حَيَّةً اَقْتُلُهَا نَادَانِي اَبُوْ لُبَابَةَ لَا تَقْتُلْهَا فَقُلْتُ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِقَتْلِ الْحَيَّاتِ فَقَالَ اِنَّهُ نَهٰى بَعْدَ ذٰلِكَ عَنْ ذَوَاتِ الْبُيُوْتِ وَهُنَّ الْعَوَامِرُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "(عموماً تمام) سانپوں کو مار ڈالو، اور (خصوصاً) اس سانپ کو کہ جس کی پشت پر دو سیاہ دھاریاں ہوں اور اس سانپ کو جس کو بتر کہتے ہیں مار ڈالو کیونکہ یہ دونوں قسم کے سانپ بینائی کو زائل کر دیتے ہیں (یعنی محض ان کو دیکھنے سے آدمی اندھا ہو جاتا ہے اور اس کا سبب اس زہر کی خاصیت ہے جو ان سانپوں میں ہوتا ہے اسی طرح (یہ دونوں سانپ) حمل کو گرا دیتے ہیں (یعنی اگر حاملہ عورت ان کو دیکھے تو اس زہر کی خاصیت کے سبب سے یا خوف و دہشت کی وجہ سے اس کا حمل گر جاتا ہے۔" حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) جب کہ میں ایک سانپ پر حملہ کر کے اس کو مار ڈالنے کے درپے تھا کہ (ایک صحابی) حضرت ابولبابہ انصاریؓ نے مجھ کو آواز دے کر کہا کہ اس کو مت مارو، میں نے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے تمام سانپوں کو مار ڈالنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابولبابہؓ نے کہا کہ لیکن آنحضرت ﷺ نے اس (عام حکم) کے بعد گھر میں رہنے والے سانپوں کو مار ڈالنے سے منع فرما دیا تھا کیونکہ وہ گھر کو آباد کرنے والے ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "وہ گھر کو آباد کرنے والے ہیں۔" اصل میں عَمْرٌ اور عُمْرٌ کے معنی ہیں آباد کرنا، مدت دراز تک زندہ رہنا، چنانچہ ان سانپوں کو "عوامر" اسی لئے کہا گیا ہے کہ ان کی عمر بہت زیادہ ہوتی ہے اور اس وجہ سے وہ ہمیشہ گھر میں رہتے ہیں، ہمارے یہاں اس قسم کے سانپ کو "بھومیا" کہا جاتا ہے۔

اور تورپشتیؒ نے کہا ہے کہ اصل میں "عوامر" کا اطلاق جنات پر ہوتا ہے، اس اعتبار سے وہ "گھر کو آباد کرنے والے ہیں۔" سے مراد یہ ہوگی کہ گھروں میں اکثر و بیشتر جو سانپ نظر آتے ہیں وہ حقیقت میں جنات ہوتے ہیں جو سانپ کی صورت اختیار کئے ہوتے ہیں، لہٰذا گھروں میں رہنے والے سانپوں کو قتل کرنے میں احتیاط کرنی چاہئے کہ مبادا جس سانپ کو مار ڈالا گیا ہے وہ حقیقت کے اعتبار سے گھر

میں رہنے والا جن رہا ہو اور اس کے قتل سے گھر والوں کو کوئی نقصان و ضرر پہنچ جائے۔
طبرانیؒ نے ابن عباسؓ سے بطریق مرفوع یہ روایت نقل کی ہے کہ:

اقتلو الحیة والعقرب وان کنتم فی الصلوۃ۔

"سانپ اور بچھو کو مار ڈالو اگرچہ تم نماز کی حالت میں کیوں نہ ہو۔"

اسی طرح ابوداؤد و نسائی نے حضرت ابن مسعودؓ سے اور طبرانی نے جریر سے اور انہوں نے حضرت عثمان بن ابو العاص سے بطریق مرفوع یہ روایت نقل کی ہے کہ:

اقتلوا الحیات کلھن فمن خاف ثارھن فلیس منی۔

ہر قسم کے سانپوں کو مار ڈالو جو شخص ان (سانپوں کے بدلے انتقام لئے) ڈر اسکی وجہ سے ان کو نہیں مارا) تو وہ مجھ سے نہیں ہے۔"

لیکن یہ روایتیں کہ جن سے مطلق سانپوں کو مار ڈالنے کا حکم ثابت ہوتا ہے، اصل میں یہ گھروں میں رہنے والے سانپوں کے علاوہ دوسرے سانپوں پر محمول ہیں جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ کی مذکورہ بالا روایت یا آگے آنے والی دوسری روایتوں سے واضح ہوتا ہے۔

(۱۵) وَعَنْ اَبِی السَّائِبِ قَالَ دَخَلْنَا عَلٰی اَبِی سَعِیْدِ الْخُدْرِیّ فَبَیْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ اِذَا سَمِعْنَا تَحْتَ سَرِیْرِہٖ حَرَکَةً فَنَظَرْنَا فَاِذَا فِیْهِ حَیَّةٌ فَوَثَبْتُ لِاَ قْتُلَهَا وَاَبُوْ سَعِیْدٍ یُصَلِّی فَاَشَارَ اِلَیَّ اَنْ اَجْلِسْ فَجَلَسْتُ فَلَمَّا انْصَرَفَ اَشَارَ اِلٰی بَیْتٍ فِی الدَّارِ فَقَالَ اَتَرٰی هٰذَا الْبَیْتَ فَقُلْتُ نَعَمْ فَقَالَ کَانَ فِیْهِ فَتًی مِنَّا حَدِیْثُ عَهْدٍ بِعُرْسٍ قَالَ فَخَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِلَی الْخَنْدَقِ فَکَانَ ذٰلِکَ الْفَتٰی یَسْتَأْذِنُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِاَنْصَافِ النَّهَارِ فَیَرْجِعُ اِلٰی اَهْلِهٖ فَاسْتَأْذَنَهٗ یَوْمًا فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خُذْ عَلَیْکَ سَلَاحَکَ فَاِنِّیْ اَخْشٰی عَلَیْکَ قُرَیْظَةَ فَاَخَذَ الرَّجُلُ سَلَاحَهٗ ثُمَّ رَجَعَ فَاِذَا امْرَأَتُهٗ بَیْنَ الْبَابَیْنِ قَائِمَةٌ فَاَهْوٰی اِلَیْهَا بِالرُّمْحِ لِیَطْعَنَهَا بِهٖ وَاَصَابَتْهُ غَیْرَةٌ فَقَالَتْ لَهٗ اُکْفُفْ عَلَیْکَ رُمْحَکَ وَادْخُلِ الْبَیْتَ حَتّٰی تَنْظُرَ مَا الَّذِیْ اَخْرَجَنِیْ فَدَخَلَ فَاِذَا بِحَیَّةٍ عَظِیْمَةٍ مُنْطَوِیَةٍ عَلَی الْفِرَاشِ فَاَهْوٰی اِلَیْهَا بِالرُّمْحِ فَانْتَظَمَهَا بِهٖ ثُمَّ خَرَجَ فَرَکَزَهٗ فِی الدَّارِ فَاضْطَرَبَتْ عَلَیْهِ فَمَا یُدْرٰی اَیُّهُمَا کَانَ اَسْرَعَ مَوْتًا الْحَیَّةُ اَمِ الْفَتٰی قَالَ فَجِئْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَذَکَرْنَا ذٰلِکَ لَهٗ وَقُلْنَا اُدْعُ اللّٰهَ یُحْیِیْهِ لَنَا فَقَالَ اسْتَغْفِرُوْا لِصَاحِبِکُمْ ثُمَّ قَالَ اِنَّ لِهٰذِهِ الْبُیُوْتِ عَوَامِرَ فَاِذَا رَأَیْتُمْ مِنْهُمْ شَیْئًا فَحَرِّجُوْا عَلَیْهَا ثَلَاثًا فَاِنْ ذَهَبَ وَاِلَّا فَاقْتُلُوْهُ فَاِنَّهٗ کَافِرٌ وَقَالَ لَهُمْ اذْهَبُوْا فَادْفِنُوْا صَاحِبَکُمْ وَفِیْ رِوَایَةٍ قَالَ اِنَّ بِالْمَدِیْنَةِ جِنًّا قَدْ اَسْلَمُوْا فَاِذَا رَأَیْتُمْ مِنْهُمْ شَیْئًا فَاٰذِنُوْهُ ثَلَاثَةَ اَیَّامٍ فَاِنْ بَدَالَکُمْ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاقْتُلُوْهُ فَاِنَّمَا هُوَ شَیْطَانٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سائبؒ (جو حضرت ہشام ابن زہرہؓ کے آزاد کردہ غلام تھے اور تابعی ہیں) کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم حضرت ابوسعید خدریؓ کے پاس ان کے گھر گئے، چنانچہ جب کہ ہم وہاں بیٹھے ہوئے تھے اچانک ہم نے ان (ابوسعیدؓ) کے تخت کے نیچے ایک سرسراہٹ سنی ہم نے دیکھا تو وہاں ایک سانپ تھا، میں اس کو مارنے کے لئے جھپٹا، مگر حضرت ابوسعیدؓ نماز پڑھ چکے تو انہوں نے مکان کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ "کیا تم نے اس کمرے کو دیکھا ہے؟" میں نے کہا کہ "ہاں!" پھر حضرت ابوسعیدؓ نے کہا کہ "اس کمرے میں ہمارے خاندان کا ایک نوجوان رہا کرتا تھا جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔" حضرت ابوسعیدؓ نے کہا کہ "ہم سب لوگ (یعنی وہ نوجوان بھی) رسول کریم ﷺ کے ہمراہ غزوۂ خندق میں گئے، (جس کا محاذ مدینہ کے مضافات میں قائم کیا گیا تھا) (روزانہ) دوپہر کے وقت رسول کریم ﷺ سے (گھر جانے کی) اجازت مانگ لیا کرتا تھا (کیونکہ دلہن کی محبت اس کو اس پر مجبور کرتی تھی) چنانچہ (اجازت ملنے پر) وہ اپنے اہل خانہ کے پاس چلا جاتا (اور رات گھر میں گزار کر صبح کے وقت پھر آکر مجاہدین میں شامل ہو جاتا) ایک دن حسب معمول، اس نے رسول کریم ﷺ

سے اجازت طلب کی تو آنحضرت ﷺ نے (اس کو اجازت دیتے ہوئے) فرمایا کہ اپنے ہتھیار اپنے ساتھ رکھو، کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں بنو قریظہ تم پر حملہ نہ کر دیں (بنو قریظہ مدینہ میں یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا جو اس موقع پر قریش مکہ کا حلیف بن کر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شریک تھا اس نوجوان نے ہتھیار لے لئے اور (اپنے) گھر کو) روانہ ہو گیا (جب وہ اپنے گھر کے سامنے پہنچا تو) کیا دیکھتا ہے کہ اس کی بیوی (گھر کے) دونوں دروازوں (یعنی اندر اور باہر کے دروازے) کے درمیان کھڑی ہے، نوجوان نے عورت کو مار ڈالنے کے لئے اس کی طرف نیزہ اٹھایا کیونکہ (یہ دیکھ کر کہ اس کی بیوی باہر کھڑی ہے) اس کو بڑی غیرت آئی لیکن عورت نے (جبھی) اس سے کہا کہ "اپنے نیزے کو اپنے پاس روک لو اور ذرا گھر میں جا کر دیکھو کہ کیا چیز میرے باہر نکلنے کا سبب ہوئی ہے۔" (یہ سن کر) وہ نوجوان گھر میں داخل ہوا، وہاں یکبارگی اس کی نظر ایک بڑے سانپ پر پڑی جو بستر پر کنڈلی مارے پڑا تھا۔ نوجوان نیزہ لے کر سانپ پر جھپٹا اور اس کو نیزہ میں پرولیا پھر اندر سے نکل کر باہر آیا اور نیزے کو گھر کے صحن میں گاڑ دیا، سانپ نے تڑپ کر نوجوان پر حملہ کیا، پھر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ دونوں میں سے پہلے کون مرا، سانپ یا نوجوان؟ (یعنی وہ دونوں اس طرح ساتھ مرے کہ یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ پہلے کس کی موت واقع ہوئی)۔

حضرت ابوسعید ؓ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد ہم رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کے سامنے یہ ماجرا بیان کر کے عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ اس نوجوان کو ہمارے لئے زندہ کر دے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اپنے ساتھی اور رفیق کے لئے مغفرت طلب کرو۔" اور پھر فرمایا کہ۔ " (مدینہ کے ان گھروں میں "عوامر" یعنی جنات رہتے ہیں (جن میں مؤمن بھی ہیں اور کافر بھی) لہٰذا جب تم ان میں سے کسی کو (سانپ کی صورت میں) دیکھو تو تین بار یا تین دن اس پر تنگی اختیار کرو پھر اگر وہ چلا جائے تو فبہا ورنہ اس کو مار ڈالو کیونکہ (اس صورت میں یہی سمجھا جائے گا کہ) وہ (جنات میں کا) کافر ہے۔" پھر آپ ﷺ نے انصار سے فرمایا کہ۔ "جاؤ اپنے ساتھی کی تکفین و تدفین کرو۔"

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "مدینہ میں (کچھ) جن ہیں (اور ان میں وہ بھی ہیں) جو مسلمان ہو گئے ہیں ان میں سے، جب تم کسی کو (سانپ کی صورت میں) دیکھو تو تین دن اس کو خبردار کرو، پھر تین دن کے بعد بھی اگر وہ دکھائی دے تو اس کو مار ڈالو کہ وہ شیطان ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے۔" علماء نے لکھا ہے کہ صحابہؓ کی یہ روش نہیں تھی کہ وہ اس طرح کی کوئی استدعا آنحضرت ﷺ سے کریں۔ اس موقع پر ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ نوجوان حقیقت میں مرا نہیں ہے بلکہ زہر کے اثر سے بیہوش ہو گیا ہے۔ اس خیال سے انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس دعا کی استدعا کی تھی۔

"مغفرت طلب کرو۔" اس ارشاد سے آنحضرت ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ اس کو زندہ کرنے کی دعا کی درخواست کیوں کرتے ہو کیونکہ وہ تو اپنی راہ پر چل کر موت کی گود میں پہنچ گیا ہے جس کے حق میں زندگی کی دعا قطعاً فائدہ مند نہیں ہے، اب تو اس کے حق میں سب سے مفید چیز یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کی مغفرت اور بخشش کی درخواست کرو۔

"اس پر تنگی اختیار کرو یا اس کو خبردار کرو۔" کا مطلب یہ ہے کہ جب سانپ نظر آئے تو اس سے کہو کہ تو تنگی اور گھیرے میں ہے اب نہ نکلنا اگر پھر نکلے گا تو ہم تجھ پر حملہ کریں گے اور تجھ کو مار ڈالیں گے، آگے تو جان۔

ایک روایت میں آنحضرت ﷺ سے یہ منقول ہے کہ سانپ کو دیکھ کر یہ کہا جائے:

انشد کم بالعهد الذی اخذ علیکم سلیمان بن داؤد علیهما السلام لا تاذونا ولا تظهروا لنا۔

"میں تجھ کو اس عہد کی قسم دیتا ہوں جو حضرت سلیمان ابن داؤد علیہما السلام نے تجھ سے لیا تھا کہ ہم کو ایذاء نہ دے اور ہمارے سامنے مت آ۔"

"وہ شیطان ہے۔" یعنی خبردار کر دینے کے بعد بھی وہ غائب ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ مسلمان جن نہیں ہے بلکہ یا تو کافر جن ہے یا حقیقت میں سانپ ہے اور یا ابلیس کی ذریات میں سے ہے اس صورت میں اس کو فوراً مار ڈالنا چاہئے۔ اس کو "شیطان" اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ آگاہی کے بعد بھی نظروں سے غائب نہ ہو کر اس نے اپنے آپ کو سرکش ثابت کیا ہے اور عام بات کہ جو بھی سرکش ہوتا ہے خواہ وہ جنات میں کا ہو یا آدمیوں میں کا اور یا جانوروں میں کا اس کو شیطان کہا جاتا ہے۔

گرگٹ کو مار ڈالنے کا حکم

⑯ وَعَنْ اُمِّ شَرِيْكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِقَتْلِ الْوَزَغِ وَقَالَ كَانَ يَنْفُخُ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اُمّ شریکؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے گرگٹ کو مار ڈالنے کے حکم دیا اور فرمایا کہ "وہ (گرگٹ) حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ پھونکتا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "آگ پھونکتا تھا" یہ گویا گرگٹ کی خباثت کو بیان کیا گیا ہے کہ جب نمرود نے حضرت ابرہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا تو یہ (گرگٹ) اس آگ کو بھڑکانے کے لئے اس میں پھونک مارتا تھا۔

یوں بھی تجربہ سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ یہ جانور بڑا زہریلا اور موذی ہوتا ہے، اگر کھانے پینے کی چیزوں میں اس کے زہریلے جراثیم پہنچ جائیں تو اس سے لوگوں کو بہت سخت نقصان پہنچ سکتا ہے۔

⑰ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِيْ وَقَّاصٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِقَتْلِ الْوَزَغِ وَسَمَّاهُ فُوَيْسِقًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے گرگٹ کو مار ڈالنے کا حکم دیا اور اس کا نام فویسق رکھا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "فویسق" اصل میں "فاسق" کی تصغیر ہے جس کے معنی ہیں "چھوٹا فاسق۔" گرگٹ کو فویسق یعنی چھوٹا فاسق اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ یہ فواسق خمسہ یعنی ان پانچ بد جانوروں کی قسم سے ہے جن کو ہر حالت میں مار ڈالنے کا حکم ہے خواہ وہ حل میں یعنی حدود حرم سے باہر ہوں یا حرم میں ہوں۔ ویسے لغت میں "فسق" کے معنی "خروج" کے ہیں اور شرعی اصطلاح میں فسق سے مراد ہوتا ہے "اطاعت حق سے نکل جانا اور صحیح راستہ سے روگردانی کرنا۔"

⑱ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَتَلَ وَزَغًا فِيْ اَوَّلِ ضَرْبَةٍ كُتِبَتْ لَهٗ مِائَةُ حَسَنَةٍ وَفِي الثَّانِيَةِ دُوْنَ ذٰلِكَ وَفِي الثَّالِثَةِ دُوْنَ ذٰلِكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص گرگٹ کو ایک ہی وار میں مار ڈالے۔ اس کے لئے سو نیکیاں لکھی جائیں گی، دوسرے وار میں اس سے کم اور تیسرے وار میں اس سے بھی کم نیکیاں لکھی جائیں گی۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کے ذریعہ گویا اس بات کی طرف راغب کیا گیا ہے کہ گرگٹ کو جلد سے جلد مار ڈالا جائے۔

چیونٹی کو مارنے کا مسئلہ

⑲ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَصَتْ نَمْلَةٌ نَبِيًّا مِنَ الْاَنْبِيَاءِ فَاَمَرَ بِقَرْيَةِ النَّمْلِ فَاُحْرِقَتْ فَاَوْحَى اللّٰهُ تَعَالٰى اِلَيْهِ اَنْ قَرَصَتْكَ نَمْلَةٌ اَحْرَقْتَ اُمَّةً مِنَ الْاُمَمِ تُسَبِّحُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "(اللہ کے جو) انبیاء (پہلے گزر چکے ہیں ان میں سے کسی نبی (کا واقعہ ہے کہ ایک دن ان کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا، انہوں نے چیونٹیوں کے بل کے بارے میں حکم دیا کہ اس کو جلا دیا جائے، چنانچہ بل کو جلا دیا گیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ وحی نازل کی کہ تمہیں ایک چیونٹی نے کاٹا تھا اور تم نے جماعتوں میں سے ایک جماعت کو جلا ڈالا جو تسبیح (یعنی اللہ کی پاکی

بیان کرنے) میں مشغول رہتی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "چنانچہ بل کو جلادیا گیا" کے بارے میں بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی نے اس درخت کو جلانے کا حکم دیا تھا جس میں چیونٹیوں کا بل تھا، چنانچہ اس درخت کو جلاڈالا گیا۔ اس واقعہ کا پس منظر یہ روایت ہے کہ ایک مرتبہ ان نبی ﷤ نے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا تھا کہ (پروردگار!) تو کسی آبادی کو اس کے باشندوں کے گناہوں کے سبب عذاب میں مبتلا کرتا ہے اور وہ پوری آبادی تہس نہس ہوجاتی ہے، درآنحالیکہ اس آبادی میں مطیع و فرمانبردار لوگوں کی بھی کچھ تعداد ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کرلیا کہ ان کی عبرت کے لئے کوئی مثال پیش ہونی چاہئے۔ چنانچہ ان نبی ﷤ پر سخت ترین گرمی مسلط کردی گئی، یہاں تک کہ وہ اس گرمی سے نجات پانے کے لئے ایک سایہ دار درخت کے نیچے چلے گئے، وہاں ان پر نیند کا غلبہ ہوگیا اور وہ سو رہے تھے تو ایک چیونٹی نے ان کو کاٹ لیا، انہوں نے حکم دیا کہ ساری چیونٹیوں کو جلادیا جائے، کیونکہ ان کے لئے یہ آسان نہیں تھا کہ وہ اس خاص چیونٹی کو پہچان کر جلواتے جس نے ان کو کاٹا تھا یا یہ کہ ان کے نزدیک ساری چیونٹیاں موذی تھیں اور موذی کی پوری جنس کو مار ڈالنا جائز ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ "قریۃ نمل" سے چیونٹیوں کا بل مراد ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل کی الخ" یہ گویا ان نبی پر حق تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہ اس بات پر محمول ہے کہ نبی ﷤ کی شریعت میں چیونٹیوں کو مار ڈالنا یا جلاڈالنا جائز تھا، اور عتاب اس سبب سے ہوا کہ انہوں نے ایک چیونٹی سے زیادہ کو جلایا۔ لیکن واضح رہے کہ شریعت محمدی ﷺ میں کسی بھی حیوان و جانور کو جلانا جائز نہیں ہے اگرچہ جوئیں اور کھٹمل وغیرہ ہی کیوں نہ ہوں، نیز موذی جانوروں کے علاوہ دوسرے جانوروں کو مار ڈالنا بھی جائز نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ رسول کریم ﷺ نے کسی بھی جاندار کو مار ڈالنے سے منع فرمایا ہے الا یہ کہ وہ ایذا پہنچانے والا ہو۔

مطالب المؤمنین میں محمد ابن مسلمؒ سے چیونٹی کا مار ڈالنے کے بارے میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ اگر چیونٹی نے تمہیں ایذاء پہنچائی ہے تو اس کو مار ڈالو، اور اگر اس نے کوئی ایذا نہیں پہنچائی ہے تو مت مارو، چنانچہ فقہاء نے کہا ہے کہ ہم اسی قول پر فتویٰ دیتے ہیں۔

اسی طرح چیونٹی کو پانی میں ڈالنا بھی مکروہ ہے۔ نیز کسی ایک چیونٹی کو (جس نے ایذاء پہنچائی ہو) مار ڈالنے کے لئے ساری چیونٹیوں کے بل کو نہ جلایا جائے اور نہ تباہ کیا جائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِی

گھی میں چوہے کے گر جانے کا مسئلہ

(۲۰) وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وَقَعَتِ الْفَارَةُ فِی السَّمَنِ فَاِنْ كَانَ جَامِدًا فَالْقُوْهَا وَمَا حَوْلَهَا وَاِنْ كَانَ مَائِعًا فَلَا تَقْرَبُوْهُ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْ دَاؤُدَ وَرَوَاهُ الدَّارِمِیُّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ۔

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر گھی میں چوہا گر جائے (اور مر جائے) اور وہ گھی جما ہوا ہو تو اس چوہے کو اور اس کے چاروں طرف کے گھی کو نکال کر پھینک دو (اور باقی گھی کھانے کے مصرف میں لاؤ) اور اگر وہ گھی پتلا یعنی پگھلا ہوا ہو تو پھر اس کے نزدیک (بھی) مت جاؤ یعنی اس کو مطلقاً نہ کھاؤ" احمدؒ، ابوداؤدؒ، اور دارمیؒ نے اس روایت کو ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔"

سرخاب کا گوشت کھانا جائز ہے

(۲۱) وَعَنْ سَفِیْنَةَ قَالَ اَكَلْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَحْمَ حُبَارٰی۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سفینہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کے ساتھ حباری کا گوشت کھایا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "حباری" یعنی تعذری وہ جانور (پرندہ) ہے جس کے بارے میں عربی میں مشہور ہے کہ وہ احمق ترین پرندہ ہوتا ہے اسی وجہ سے کسی شخص کی حماقت ظاہری کرنے کے لئے حباری کی مثال دی جاتی ہے اردو میں حباری سرخاب کو کہتے ہیں۔

جلالہ کا گوشت کھانے کی ممانعت

(۲۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَكْلِ الْجَلَّالَةِ وَاَلْبَانِهَا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَفِي رِوَايَةِ اَبِيْ دَاوُدَ قَالَ نَهٰى عَنْ رُكُوْبِ الْجَلَّالَةِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں، رسول کریم ﷺ نے جلالہ کا گوشت کھانے اور اس کا دودھ پینے سے منع فرمایا ہے (ترمذیؒ) اور ابوداؤدؒ کی روایت میں یوں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے کہا۔ "آنحضرت ﷺ نے جلالہ پر سوار ہونے سے منع فرمایا ہے۔"

تشریح: "جلالہ" اس جانور کو کہتے ہیں۔ جس کا گوشت کھانا حلال ہو، لیکن اس کو نجاست، پلیدی کھانے کی عادت ہو، اس بارے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر وہ جانور کبھی کبھی نجاست وپلیدی کھاتا ہو تو اس کو "جلالہ" نہیں کہیں گے، اور اس کا گوشت کھانا حرام نہیں ہو گا۔ جیسے مرغی، اور اگر وہ جانور ایسا ہو کہ اس کی خوراک ہی عام طور پر نجاست وپلیدی ہو، یہاں تک کہ اس کی وجہ سے اس کے گوشت اور دودھ میں بدبو آنے لگے۔ تو اس کا گوشت کھانا حلال نہیں ہو گا۔ الا یہ کہ اس کو باندھ کر یا بند کر کے رکھا جائے اور اس کو غیر نجس چیزیں کھلائی جائیں تا آنکہ اس کا گوشت اور دودھ ٹھیک ہو جائے تو اس کا گوشت کھانا اور دودھ پینا درست ہو گا۔ یہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام محمدؒ کا قول ہے لیکن حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد بھی یعنی اس کو بند کر کے رکھنے اور غیر نجس چیزیں کھلانے کے بعد اس کا گوشت مبالغہ کی حد تک دھونا ضروری ہو گا۔ فتاویٰ کبریٰ میں لکھا ہے کہ جب تک مخلات مرغ کو تین روز تک اور جلالہ کو دس روز تک بند کر کے یا باندھ کر نہ رکھا جائے اس وقت تک اس کا گوشت کھانا حلال نہیں ہو گا۔

"جلالہ" پر سواری کرنے سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ اس کا پسینہ جو گوشت کے پیدا ہونے کی وجہ سے گندا اور پلید ہوتا ہے سوار کے جسم کو لگے گا۔

گوہ کا گوشت کھانا حرام ہے

(۲۳) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ شِبْلٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ اَكْلِ لَحْمِ الضَّبِّ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن شبلؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے گوہ کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: یہ حدیث گوہ کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہے جیسا کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے۔ اور شاید کہ پہلے گوہ کا کھانا مباح رہا ہو اور پھر بعد میں اس حکم ممانعت کے ذریعہ اس اباحت کو منسوخ قرار دیا گیا ہو۔

بلی حرام ہے

(۲۴) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ اَكْلِ الْهِرَّةِ وَاَكْلِ ثَمَنِهَا (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے بلی کا گوشت اور اس کی قیمت کھانے سے منع فرمایا ہے۔" (ابوداؤد، ترمذیؒ)

تشریح: بلی کا گوشت کھانا تو بالاتفاق تمام علماء کرام کے نزدیک حرام ہے البتہ بلی کو بیچنا اور اس کی قیمت کو کھانے پینے کی چیزوں میں خرچ کرنا حرام نہیں ہے بلکہ مکروہ ہے۔

گھریلو گدھے، خچر اور درندوں اور ذی مخلب پرندوں کا گوشت حرام ہے

(۲۵) وَعَنْهُ قَالَ حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْنِي يَوْمَ خَيْبَرَ الْحُمُرَ الْاِنْسِيَّةَ وَلُحُوْمَ الْبِغَالِ وَكُلَّ ذِيْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ وَكُلَّ ذِي مِخْلَبٍ مِنَ الطَّيْرِ رَوَاهُ التِرمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے خیبر کے دن گھر میں پلے ہوئے گدھوں، خچر، ہر کچلی والے درندے اور پنجوں سے شکار کرنے والے پرندے کا گوشت حرام قرار دیا تھا امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

گھوڑے کا گوشت کھانے کی ممانعت

(۲۶) وَعَنْ خَالِدِبْنِ الْوَلِيْدِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ اَكْلِ لُحُوْمِ الْخَيْلِ وَ الْبِغَالِ وَ الْحَمِيْرِ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت خالد بن ولیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے گھوڑے، خچروں اور گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: یہ حدیث کہ جس سے گھوڑے کا گوشت کھانے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے ضعیف ہے اس لئے یہ حضرت جابرؓ کی اس حدیث کے معارض نہیں ہو سکتی جو پہلے گزر چکی ہے اور جس سے گھوڑے کے گوشت کی اباحت ثابت ہوتی ہے، تاہم گھوڑے کے گوشت کھانے کی یہ ممانعت اکثر علماء کے نزدیک اس حدیث کے ذریعہ منسوخ قرار پائی ہے جو پہلے گزر چکی ہے جیسا کہ حضرت جابرؓ کی روایت کی تشریح میں یہ مسئلہ پوری وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔

معاہد کے مال کا حکم

(۲۷) وَعَنْهُ قَالَ غَزَوْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ خَيْبَرَ فَأَتَتِ الْيَهُوْدُ فَشَكَوْا اَنَّ النَّاسَ قَدْ اَسْرَعُوْا اِلٰى حَظَائِرِهِمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا لَا يَحِلُّ اَمْوَالُ الْمُعَاهِدِيْنَ اِلَّا بِحَقِّهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت خالد بن ولیدؓ کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ خیبر کے دن جہاد میں شریک تھا (ایک موقع پر) یہودی آپ ﷺ کی خدمت میں آئے اور یہ شکایت کی کہ لوگوں نے ان کی کھجوروں کی طرف جلد روی اختیار کی ہے (یعنی مسلمانوں نے ہمارے کھجور کے درختوں پر سے پھل توڑ لئے ہیں جب کہ ہم معاہد ہیں) چنانچہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "خبردار! ان لوگوں کا مال حلال نہیں ہے جن سے عہد و پیمان ہو چکا ہے۔ علاوہ اس حق کے جو اس مال سے متعلق۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "معاہد" اس شخص کو کہتے ہیں جس سے عہد و پیمان ہوا ہو، چنانچہ اگر وہ معاہد ذمی ہے تو وہ حق جو اس کے مال سے متعلق ہے جزیہ ہے اور اگر وہ معاہد مستامن ہے اور اس کے پاس مال تجارت ہے۔ تو اس کے مال سے جو حق متعلق ہو گا وہ اس پر لاگو ہونے والا عشر ہے۔

مچھلی، ٹڈی، کلیجی اور تلی حلال ہے

(۲۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ وَدَمَانِ اَلْمَيْتَتَانِ اَلْحُوْتُ وَالْجَرَادُ وَالدَّمَانِ اَلْكَبِدُ وَالطِّحَالُ۔ (رواہ احمد وابن ماجۃ والدارقطنی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا۔ "ہمارے لئے دو بغیر ذبح کے مری ہوئی چیزیں اور دو خون حلال ہیں۔ دو

بغیر ذبح کے مری ہوئی چیزیں تو مچھلی اور ٹڈی ہیں اور دو خون کلیجی اور تلی ہیں (کہ یہ دونوں اصل میں بستہ خون ہیں نہ کہ گوشت۔"

(احمدؒ، ابن ماجہؒ، دار قطنیؒ)

جو مچھلی پانی میں مر کر اوپر آجائے اس کا مسئلہ

(۲۹) وَعَنْ اَبِی الزُّبَیْرِ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَلْقَاہُ الْبَحْرُ وَجَزَرَ عَنْہُ الْمَآءُ فَکُلُوْہُ وَمَا مَاتَ فِیْہِ وَطَفَا فَلَا تَاْکُلُوْہُ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤُدَ وَابْنُ مَاجَۃَ وَقَالَ مُحْیُ السُّنَّۃِ الْاَکْثَرُوْنَ عَلٰی اَنَّہٗ مَوْقُوْفٌ عَلٰی جَابِرٍ۔

"اور حضرت ابوزبیرؒ، حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" جس (مچھلی) کو دریا نے کنارے پر پھینک دیا ہو، یا پانی سے اس کا ساتھ چھوٹ گیا ہو (یعنی دریا کا پانی بالکل خشک ہو گیا ہو یا کسی دوسری طرف چلا گیا ہو) تو اس مچھلی کو کھالو، اور جو مچھلی دریا میں مر کر پانی کے اوپر آجائے اس کو مت کھاؤ۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ) اور محی السنۃ نے کہا ہے کہ اکثر (محدثینؒ) اس بات کے قائل ہیں کہ یہ حدیث حضرت جابرؓ پر موقوف ہے۔ یعنی ان کے نزدیک یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد نہیں ہے بلکہ حضرت جابرؓ کا اپنا قول ہے۔

تشریح: یہ حدیث حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس مسلک کی دلیل ہے کہ طافی مچھلی (یعنی وہ مچھلی جو پانی میں مر کر اوپر آجائے حرام ہے، چنانچہ صحابہؓ کی ایک جماعت سے بھی اسی طرح منقول ہے، لیکن حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک اس مچھلی کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں، کیوں کہ آنحضرت ﷺ مطلق (بلاقید اور استثناء کے) احل لکم المیتتان (تمہارے لئے دو بغیر ذبح کے مری ہوئی چیزیں حلال ہیں، فرمایا ہے لہٰذا میتہ بحر یعنی پانی کی مری ہوئی چیز (مچھلی) مطلق حلال ہوگی (خواہ وہ پانی سے نکلنے کے بعد مری ہو، یا پانی میں مر کر اوپر آگئی ہو) جب کہ حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ میتہ بحر سے وہ مچھلی مراد ہے جس کو بحر یعنی دریا باہر پھینک دے اور وہ اس کی وجہ سے مرجائے نہ کہ وہ مچھلی مراد ہے جو بغیر کسی آفت کے پانی میں خود مر گئی ہو۔

ٹڈی کا حکم

(۳۰) وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ سُئِلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْجَرَادِ فَقَالَ اَکْثَرُ جُنُوْدِ اللّٰہِ لَا اٰکُلُہٗ وَلَا اُحَرِّمُہٗ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤُدَ وَقَالَ مُحْیُ السُّنَّۃِ ضَعِیْفٌ۔

"اور حضرت سلمانؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے ٹڈی کے (کھانے اور اس کی حقیقت کے) بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ٹڈیاں اللہ تعالیٰ کا (پرندوں میں) سب سے بڑا لشکر ہیں، نہ تو میں اس کو کھاتا ہوں (کیونکہ طبعاً مجھے کراہت محسوس ہوتی ہے) اور نہ (دوسروں پر) شرعاً اس کو حرام قرار دیتا ہوں (کیوں کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حلال کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے یہ حدیث گزری ہے کہ احلت لنا میتتان ابوداؤدؒ! اور محی السنۃ نے کہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔"

تشریح: ٹڈیاں اللہ تعالیٰ کا لشکر اس اعتبار سے ہیں کہ جب کسی گروہ اور کسی قوم پر غضب آتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کی طرف ٹڈیوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیجتا ہے تاکہ وہ اس قوم کی کھیتوں اور ان کے درختوں کو کھا جائیں، جس سے ان میں قحط پھیل جائے، چنانچہ پچھلے زمانوں میں ایسا بارہا ہوا ہے کہ جب کسی جگہ کے کھیتوں اور باغات کو غضب خداوندی کی بنا پر ٹڈیوں نے نیست و نابود کر دیا اور اس کی وجہ سے وہاں قحط پھیل گیا تو ایک انسان دوسرے انسان کو کھانے لگا اس طرح وہاں کی پوری کی پوری آبادی تباہ و برباد ہو گئی۔

جہاں تک ٹڈی کا مسئلہ ہے تو اس کا کھانا اکثر احادیث کے بموجب حلال ہے، چنانچہ چاروں ائمہؒ کا یہ مسلک ہے کہ ٹڈی کو کھانا حلال ہے، خواہ وہ خود سے مر گئی ہو یا اس کو ذبح کیا گیا ہو، یا شکار کے ذریعہ مری ہو، اور شکار بھی خواہ کسی مسلمان نے کیا ہو، یا مجوسی نے اور خواہ اس میں سے کچھ کاٹا جائے یا نہیں۔

مرغ کو برا کہنے کی ممانعت

(۳۱) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ سَبِّ الدِّيْكِ وَقَالَ اِنَّهُ يُؤَذِّنُ لِلصَّلٰوةِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت زید ابن خالدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مرغ کو برا کہنے سے منع فرمایا ہے۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ "بلاشبہ وہ (مرغ) نماز کے لئے آگاہ کرتا ہے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: نماز سے تہجد کی نماز مراد ہے! حدیث شریف میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ تہجد کی نماز کے لئے اس وقت اٹھتے تھے جب کہ مرغ بانگ دیا کرتا تھا؛ اور یہ بھی احتمال ہے کہ فجر کی نماز مراد ہو، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنی بانگ کے ذریعہ آگاہ کرتا ہے کہ فجر کی نماز کا وقت قریب آگیا ہے اور پھر دوبارہ اس کی بانگ تاکید و تنبیہ کے لئے ہوتی ہے، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب حیوان میں بھی پائی جانے والی اچھی خصلتیں اس کو برا کہنے سے روکتی ہیں، تو کسی مؤمن کو برا کہنے والے کا کیا حشر ہوگا؟

(۳۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسُبُّوا الدِّيْكَ فَاِنَّهُ يُوْقِظُ لِلصَّلٰوةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت زیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مرغ کو برا نہ کہو، کیوں کہ وہ نماز کے لئے جگاتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

گھر میں سانپ دکھائی دے تو اس سے کیا کیا جائے

(۳۳) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ اَبِيْ لَيْلٰى قَالَ قَالَ اَبُوْ لَيْلٰى قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا ظَهَرَتِ الْحَيَّةُ فِي الْمَسْكَنِ فَقُوْلُوْا لَهَا اِنَّا نَسْئَلُكَ بِعَهْدِ نُوْحٍ وَّبِعَهْدِ سُلَيْمَانَ ابْنِ دَاوُدَ اَنْ لَا تُؤْذِيَنَا فَاِنْ عَادَتْ فَاقْتُلُوْهَا۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت عبدالرحمٰنؓ ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ حضرت ابولیلیٰ نے بیان کیا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب گھر میں سانپ نکلے تو اس کے سامنے کہا جائے کہ۔ "ہم تجھ سے حضرت نوح (علیہ السلام) کے عہد اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) ابن داؤد (علیہ السلام) کے عہد کا واسطہ دے کر یہ چاہتے ہیں کہ تو ہمیں ایذاء نہ پہنچا۔" اگر اس کے بعد وہ پھر نظر آئے تو اس کو مار ڈالو۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت نوح علیہ السلام نے سانپ سے عہد اس وقت لیا تھا جب کہ انہوں نے اپنی کشتی میں حیوانات کو داخل کیا تھا۔

انتقام کے خوف سے سانپ کو نہ مارنے والے کے بارے میں وعید

(۳۴) وَعَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَا اَعْلَمُهُ اِلَّا رَفَعَ الْحَدِيْثَ اَنَّهُ كَانَ يَاْمُرُ بِقَتْلِ الْحَيَّاتِ وَقَالَ مَنْ تَرَكَهُنَّ خَشْيَةَ ثَائِرٍ فَلَيْسَ مِنَّا۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت عکرمہؓ، حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا کہ حضرت ابن عباسؓ نے بطریق مرفوع یہ حدیث بیان کی ہے کہ نبی کریم ﷺ سانپوں کو مار ڈالنے کا حکم دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ "جو شخص بدلے (انتقام) کے خوف سے ان (سانپوں) کو مارنا چھوڑ دے تو وہ ایک موذی کو نہ مارنے اور قضاو قدر الٰہی پر بھروسہ نہ کرنے کے سبب) ہم میں سے نہیں ہے۔ یعنی ہمارے راستے پر گامزن نہیں ہے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "بدلے کے خوف" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس ڈر کی وجہ سے سانپ کو نہ مارے کہ کہیں اس کا جوڑا مجھ سے انتقام نہ لے، چنانچہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص نے کسی سانپ کو مار ڈالا اور پھر اس کے جوڑے نے آکر اس شخص کو کاٹ لیا اور بدلہ لیا، مارا جانے والا

سانپ اگر نر ہوتا ہے تو اس کی مادہ انتقام لینے آتی ہے اور اگر وہ مادہ تھی تو اس کا نر بدلہ لینے آتا ہے، زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب کے ہاں یہ خوف ایک عقیدے کی حد تک تھا وہ کہا کرتے تھے کہ سانپ کو ہرگز نہیں مارنا چاہئے، اگر اس کو مارا جائے گا تو اس کا جوڑا آکر انتقام لے گا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس طرح کے قول واعتقاد سے منع فرمایا۔

(۳۵) وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا سَالَمْنَاهُمْ مُنْذُ حَارَبْنَاهُمْ وَمَنْ تَرَكَ شَیْأً مِّنْهُمْ خِیْفَةً فَلَیْسَ مِنَّا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب سے ہم نے سانپوں سے لڑائی شروع کی ہے اس وقت سے ہم نے ان سے مصالحت نہیں کی ہے۔ لہٰذا جو شخص ان سانپوں میں سے کسی سانپ کو (اس) خوف کی وجہ سے (مارنے سے) باز رہے (کہ خود وہ سانپ یا اس کا جوڑا نقصان پہنچائے گا اور بدلہ لے گا، تو وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: ایک دوسری روایت میں منذ حاربناهم کے بجائے منذ عادیناهم کے الفاظ منقول ہیں۔ "یعنی جب سے ہمارے اور سانپوں کے درمیان لڑائی اور دشمنی واقع ہوئی ہے" بہر حال مراد یہ کہ انسان اور سانپ کے درمیان دشمنی اور لڑائی ایک طبعی اور جبلی چیز ہے کہ ہر ایک دوسرے کو نقصان پہنچاتا ہے، اگر انسان سانپ کو دیکھتا ہے تو اس کو ضرور مار ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر سانپ موقع پاتا ہے تو اس کو کاٹے اور ڈسے بغیر نہیں رہتا، بلکہ بعض علماء نے تو یہ کہا ہے کہ اس لڑائی اور دشمنی سے مراد دراصل وہ عداوت ہے جو اولاد آدم علیہ السلام کی تخلیق سے بھی پہلے حضرت آدم علیہ السلام اور سانپ کے درمیان قائم ہوئی تھی، جیسا کہ ایک روایت میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب ابلیس لعین نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لئے جنت میں داخل ہونا چاہا، تو جنت کے داروغہ نے اس کو روک دیا چنانچہ یہ سانپ ہی تھا جو ابلیس کا کام آیا اس نے ابلیس کو اپنے منہ کے اندر لے کر جنت میں پہنچا دیا اور پھر ابلیس لعین نے حضرت آدم علیہ السلام وحوا کے لئے اپنے مکر وفریب کا جال پھیلا کر ان کو وسوسہ میں ڈال دیا اور ان دونوں نے جنت کے اس درخت سے کھالیا، جس کے پاس جانے سے بھی ان کو منع کر دیا تھا اور آخر کار ان دونوں کو جنت سے نکال دیا گیا اور حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام وحوا علیہا ، اور ابلیس وسانپ کو خطاب کر کے فرمایا اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔

بیان کیا جاتا ہے کہ پہلے سانپ کی شکل وصورت بہت اچھی اور خوشنما تھی مگر اس کے اس سخت جرم کے عذاب میں کہ وہ ابلیس کا آلہ کار بنا اس کی صورت مسخ کر دی گئی، لہٰذا سانپ اس کے مستحق ہے کہ اس کے تئیں یہ عداوت ونفرت ہمیشہ باقی رکھی جائے۔

واضح رہے کہ ماسلمناهم منذ حاربناهم میں سانپوں کے لئے ذوی العقول کی ضمیر اس لئے استعمال ہوئی ہے کہ ان کی طرف صلح کی نسبت کی گئی ہے جو ذوی العقول کے افعال میں سے ہے۔ جیسے کہ اس آیت کریمہ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ میں سورج اور چاند کے لئے ذوی العقول کی ضمیر لائی گئی ہے ورنہ قاعدے کے اعتبار سے ان کے لئے غیر ذوی العقول کی ضمیر استعمال کرتے ہوئے یہ کہنا چاہئے تھا ماسالمناهن منذ حاربناهن۔

(۳٦) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اُقْتُلُوا الْحَیَّاتِ كُلَّهُنَّ فَمَنْ خَافَ ثَارَهُنَّ فَلَیْسَ مِنِّیْ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تمام سانپوں کو قتل کر دو اگر کوئی شخص ان کے انتقام کے خوف زدہ ہوا تو وہ مجھ سے نہیں ہے۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے تو یہ واضح ہوتا ہے ہر قسم کے سانپوں کو مارنا چاہئے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس عمومی حکم سے عوامر یعنی گھروں میں رہنے والے سانپوں کا استثناء کیا جانا چاہئے یا پھر یہ کہا جائے کہ "قتل" سے مراد یہ ہے کہ آگاہ کرنے کے بعد مارو، جیسا کہ

پہلے حضرت ابو سائب ؓ کی حدیث میں بیان ہوا ہے۔

(۳۷) وَعَنِ الْعَبَّاسِ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نُرِيْدُ اَنْ نَكْنُسَ زَمْزَمَ وَاِنَّ فِيْهَا مِنْ هٰذِهِ الْجِنَانِ يَعْنِي الْحَيَّاتِ الصِّغَارِ فَاَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَتْلِهِنَّ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عباس ؓ سے روایت ہے انہوں نے (ایک دن) عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! ہم زمزم کے کنوئیں کی صفائی کرنا چاہتے ہیں لیکن اس میں سانپ یعنی چھوٹے سانپ ہیں؟" چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ان سانپوں کو مار ڈالنے کا حکم دے دیا۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہر قسم کے چھوٹے سانپوں کو مار ڈالنے کا حکم دے دیا تھا، لیکن آگے جو حدیث آرہی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ان میں سے ایک قسم کے سانپوں کو مارنے سے منع فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس موقع پر چاہ زمزم کو صاف کرنا ان سب سانپوں کو مار ڈالنے بغیر ممکن نہیں تھا، جب کہ دوسری صورتوں میں ان میں سے بعض قسم کے سانپوں کا استثناء ممکن ہے۔

سفید چھوٹے سانپ کو مارنے کی ممانعت

(۳۸) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اُقْتُلُوا الْحَيَّاتِ كُلَّهَا اِلَّا الْجَانَّ الْاَبْيَضَ الَّذِيْ كَاَنَّهُ قَضِيْبُ فِضَّةٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن مسعود ؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تمام سانپوں کو مار و علاوہ جان یعنی سفید چھوٹے سانپ کے جو چاندی کی چھڑی کی طرح ہوتا ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس سانپ کو مارنے سے شاید اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ وہ ضرر نہیں پہنچاتا۔

کھانے پینے کی چیز میں مکھی گر جائے تو اس کو غوطہ دے کر نکال دو

(۳۹) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِيْ اِنَاءِ اَحَدِكُمْ فَامْقُلُوْهُ فَاِنَّ فِيْ اَحَدِ جَنَاحَيْهِ دَاءً وَفِي الْاٰخَرِ شِفَاءً فَاِنَّهٗ يَتَّقِيْ بِجَنَاحِهِ الَّذِيْ فِيْهِ الدَّاءُ فَلْيَغْمِسْهُ كُلَّهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا۔ "جب تم میں سے کسی شخص کے برتن میں (کہ جس میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہو) مکھی گر جائے تو اس کو غوطہ دو کیوں کہ اس کے ایک بازو میں بیماری ہے اور دوسرے بازو میں شفاء، اور مکھی (کسی چیز میں) پہلے اپنے اسی بازو کو ڈالتی ہے جس میں بیماری ہے لہذا پوری مکھی کو غوطہ دینا چاہئے (تاکہ شفا والے بازو سے ان جراثیم کا دفعیہ ہو جائے جو بیمار والے بازو کی وجہ سے کھانے پینے کی چیز میں پہنچ گئے ہیں۔" (ابوداؤد)

(۴۰) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِي الطَّعَامِ فَامْقُلُوْهُ فَاِنَّ فِيْ اَحَدِ جَنَاحَيْهِ سَمًّا وَفِي الْاٰخَرِ شِفَاءً فَاِنَّهٗ يُقَدِّمُ السَّمَّ وَيُؤَخِّرُ الشِّفَاءَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابوسعید خدری ؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب کھانے میں مکھی گر جائے تو اس کو غوطہ دے لو۔ کیونکہ اس کے ایک بازو میں زہر ہے اور دوسرے بازو میں شفا ہے اور مکھی اپنے زہر والے بازو کو پہلے ڈالتی ہے اور پھر شفاء والے بازو کو۔" (شرح السنۃ)

وہ چار جانور جن کا مارنا ممنوع ہے

(۴۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ اَرْبَعٍ مِنَ الدَّوَابِّ النَّمْلَةِ وَالنَّخْلَةِ وَالْهُدْهُدِ

وَالصُّرَدِ۔ (رواہ ابوداؤد والدارمی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (ان) چار جانوروں کو مارنے سے منع فرمایا ہے چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور کلچڑی۔" (ابوداؤدؒ، دارمیؒ)

تشریح: چیونٹی کو مارنے سے منع کرنے کی مراد یہ ہے کہ اس کو اس وقت تک نہ مارا جائے جب تک کہ وہ نہ کاٹے، اگر وہ کاٹے تو پھر اس کو مارنا جائز ہوگا۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ جس چیونٹی کو مارنے سے منع فرمایا گیا ہے اس سے وہ بڑی چیونٹی مراد ہے جس کے پیر لمبے ہوتے ہیں اور اس کو مارنا ممنوع اس لئے ہے کہ اس کے کاٹنے سے ضرر نہیں پہنچتا۔

شہد کی مکھی کو مارنا اس لئے ممنوع ہے کہ اس سے انسان کو بہت زیادہ فوائد پہنچتے ہیں بایں طور کہ شہد اور موم اسی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔

"ہدہد" ایک پرندہ ہے جس کو کھٹ بڑھئی کہتے ہیں "صرد" بھی ایک پرندہ ہے جو بڑے سر، بڑی چونچ اور بڑے بڑے پر والا ہوتا ہے، وہ آدھا سیاہ ہوتا ہے اور آدھا سفید، اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ شکاری پرندہ ہوتا ہے جو چڑیوں کا شکار کرتا ہے، ان دونوں پرندوں کو مارنے سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ ان کا گوشت کھانا حرام ہے اور جو جانور و پرندہ کھایا نہ جاتا ہو اس کو مارنا ممنوع قرار دیا گیا ہے، اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ ہدہد میں بدبو ہوتی ہے اس لئے وہ جلالہ کے حکم میں ہوگا۔ اہل عرب ہدہد اور صرد کی آوازوں کو منحوس اور بد فالی سمجھتے تھے، اس لئے بھی آنحضرت ﷺ نے ان کو مارنے سے منع فرمایا کہ لوگوں کے دلوں سے ان کی نحوست کا اعتقاد نکل جائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حلت و حرمت کے احکام میں خواہش نفس کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہئے

(۴۲) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ اَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ يَاْكُلُوْنَ اَشْيَاءَ وَيَتْرُكُوْنَ اَشْيَاءَ تَقَذُّرًا فَبَعَثَ اللّٰهُ نَبِيَّهٗ وَاَنْزَلَ كِتَابَهٗ وَاَحَلَّ حَلَالَهٗ وَحَرَّمَ حَرَامَهٗ فَمَا اَحَلَّ فَهُوَ حَلَالٌ وَمَا حَرَّمَ فَهُوَ حَرَامٌ وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ عَفْوٌ وَتَلَا قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْمَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا الْاٰيَةَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ (اپنی خواہش نفس کے مطابق) کچھ چیزوں کو کھاتے تھے، اور کچھ چیزوں کو چھوڑ دیتے تھے، یعنی جن چیزوں سے ان کو نفرت ہوتی ان کو نہیں کھاتے تھے) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو مبعوث فرمایا اور (ان نبی ﷺ پر اور ان کے ذریعہ ان کی اُمت پر) اپنی کتاب نازل کی اور اپنی حلال چیزوں کو حلال قرار دیا اور اپنی حرام چیزوں کو حرام قرار دیا (یعنی یہ بیان کر دیا کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام ہے نیز اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حلال کیا ہے وہی حلال ہے اس کے علاوہ حلال نہیں ہے) اور جس چیز کو حرام کہا ہے وہی حرام ہے اور جس چیز سے سکوت اختیار کیا (یعنی جس چیز کے بارے میں یہ نہیں بتایا کہ یہ حلال ہے یا حرام) تو وہ چیز معاف ہے (کہ اس پر مواخذہ نہیں) اور پھر حضرت ابن عباسؓ نے یہ آیت پڑھی "اے محمد (ﷺ) کہہ دیجئے کہ جو احکام بذریعہ وحی میرے پاس آتے ہیں ان میں تو میں کوئی حرام غذا پاتا نہیں کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھائے مگر یہ کہ وہ مردار ہو یا خون۔ الخ۔" (ابوداؤد)

تشریح: لفظ "حلالہ" میں مصدر استعمال کیا گیا ہے جو مفعول کے قائم مقام ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی بعثت اور اپنی کتاب ہدایت (قرآن مجید) کے نزول کے ذریعہ اس چیز کو ظاہر و واضح کر دیا جو حلال کی گئی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے جو آیت تلاوت کی وہ پوری یوں ہے:

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْمَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ۔ (الانعام ۶: ۱۴۵)

"(اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے کہ جو احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ہیں ان میں تو کوئی حرام غذا پاتا نہیں کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھائے مگر یہ کہ وہ مردار (مرا ہوا جانور) ہو یا بہتا ہوا خون ہو، یا سور کا گوشت ہو کیونکہ وہ بالکل ناپاک ہے یا جو جانور شرک کا ذریعہ ہو کہ غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو۔"

یہ آیت کریمہ حضرت ابن عباسؓ نے ان لوگوں کی تردید میں پڑھی جو محض اپنی خواہش نفس کی بنا پر کسی چیز کی حلت و حرمت کے فیصلہ کرتے تھے، کہ جس چیز کی طرف ان کی طبیعت راغب ہوئی اس کو حلال جان کر کھاتے اور جس چیز سے ان کو کراہت و نفرت ہوتی، اس کو حرام سمجھ کر ترک کر دیتے، لہٰذا حضرت ابن عباسؓ نے ان لوگوں پر اس آیت کے ذریعہ گویا یہ واضح کیا کہ حلال وہی چیز ہے، جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ السلام نے حلال قرار دیا ہو اور حرام وہی چیز ہے، جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہو نہ کہ حلت و حرمت کا تعلق خواہش نفس سے ہے۔

از قسم جانور و گوشت جن چیزوں کے حرام ہونے کا حکم کتاب اللہ میں بیان کیا گیا ہے، وہ بس یہی ہیں جو اس آیت میں ذکر ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ اور دوسری چیزوں کی حرمت سُنّت نبوی ﷺ سے ثابت ہوئی ہے۔ اور وہ چونکہ زیادہ ہیں اس لئے حضرت ابن عباسؓ نے ان کے بارے میں منقول احادیث بیان نہیں کیں، محض اس آیت کی تلاوت پر اکتفا کیا۔

گدھے کا گوشت کھانے کی ممانعت

(۴۳) وَعَنْ زَاهِرِ الْاَسْلَمِيِّ قَالَ اِنِّيْ لَاُوْقِدُ تَحْتَ الْقُدُوْرِ بِلُحُوْمِ الْحُمُرِ اِذْ نَادٰى مُنَادِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهَاكُمْ عَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت زاہر اسلمیؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں اس ہانڈی کے نیچے آگ جلا رہا تھا، جس میں گدھے کا گوشت (پکنے کے لئے رکھا ہوا) تھا کہ اچانک رسول کریم ﷺ کی طرف سے اعلان کرنے والے نے یہ اعلان کیا کہ "رسول اللہ ﷺ تمہیں گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرماتے ہیں۔" (بخاریؒ)

جنات کی قسمیں

(۴۴) وَعَنْ اَبِيْ ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيِّ يَرْفَعُهُ الْجِنُّ ثَلَاثَةُ اَصْنَافٍ صِنْفٌ لَهُمْ اَجْنِحَةٌ يَطِيْرُوْنَ فِي الْهَوَاءِ وَصِنْفٌ حَيَّاتٌ وَكِلَابٌ وَصِنْفٌ يَحُلُّوْنَ وَيَظْعَنُوْنَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ بطریق مرفوع نقل کرتے ہیں کہ (آنحضرت ﷺ نے فرمایا جنات کی تین قسمیں ہیں، ایک تو وہ جن کے پر ہوتے ہیں اور وہ ہوا میں اڑتے ہیں، دوسری قسم وہ ہیں جو سانپ اور کتے (کی شکل میں نظر آتے ہیں، اور تیسری قسم وہ ہیں جو منزل پر اترتے اور کوچ کرتے ہیں۔" (شرح السنۃ)

بَابُ الْعَقِيْقَةِ

عقیقہ کا بیان

عقیقہ "عقٌّ" سے مشتق ہے، لغت میں عق کے معنی ہیں "چیرنا، پھاڑنا" اصلاح میں عقیقہ ان بالوں کو کہتے ہیں جو نوزائیدہ کے سر پر

ہوتے ہیں۔ ان بالوں کو عقیقہ اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ وہ بال ساتویں دن مونڈے جاتے ہیں اور اس مناسبت سے عقیقہ اس بکری کو بھی کہتے ہیں جو بچے کے سر مونڈنے کے وقت ذبح کی جاتی ہے۔

عقیقہ کی شرعی حیثیت: عقیقہ کی شرعی حیثیت کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں، ائمہ ثلاثہ یعنی حضرت امام احمدؒ، حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک عقیقہ سُنّت ہے اور اکثر احادیث سے بھی اس کا سُنّت ہونا معلوم ہوتا ہے حضرت امام احمدؒ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ عقیقہ واجب ہے۔ جہاں تک حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے نزدیک عقیقہ سُنّت نہیں ہیں بلکہ مستحب ہے جو سُنّت سے ثابت ہے۔ مشہور حنفی مجتہد حضرت امام محمدؒ نے اپنی کتاب مؤطا میں یہ لکھا ہے کہ "ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ عقیقہ (اصل میں) زمانہ جاہلیت کی ایک رسم تھی جو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں بھی رائج رہی مگر پھر قربانی نے ہر اس ذبح (کے وجوب) کو منسوخ قرار دیا جو قربانی سے پہلے رائج تھا، رمضان کے روزوں نے ہر اس روزے (کے وجوب) کو منسوخ قرار دیا جو اس سے پہلے رائج تھا، غسل جنابت نے ہر اس غسل (کے وجوب کو) منسوخ قرار دے دیا جو اس سے پہلے رائج تھا، زکوۃ نے ہر اس صدقہ (کے وجوب) کو منسوخ قرار دے دیا جو اس سے پہلے رائج تھا۔

عقیقہ کے احکام: جو احکام و شرائط قربانی کے سلسلے میں منقول و معتبر ہیں وہی احکام و شرائط عقیقہ کے بارے میں بھی مقبول و معتبر ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

عقیقہ کرنے کا حکم

(۱) عَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرِ الضَّبِّيِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَعَ الْغُلَامِ عَقِيْقَةٌ فَاهْرِيْقُوْا عَنْهُ دَمًا وَاَمِيْطُوْا عَنْهُ الْاَذٰى۔ (رواہ البخاری)

"حضرت سلمان ابن عامر ضبیؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا "لڑکے کی پیدائش پر عقیقہ کرنا (مسنون یا مستحب) ہے لہٰذا اس کی طرف سے جانور ذبح کرو اور اس سے ایذا (یعنی اس کے سر کے بال اور میل کچیل) دور کرو۔" (بخاریؒ)

تحنیک ایک مسنون عمل ہے

(۲) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُؤْتٰى بِالصِّبْيَانِ فَيُبَرِّكُ عَلَيْهِمْ وَيُحَنِّكُهُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ کے پاس (نوزائیدہ) بچے لائے جاتے چنانچہ آپ ﷺ ان کے لئے برکت کی دعا کرتے یعنی ان کے سامنے فرماتے، بَارَكَ اللّٰهُ عَلَيْكَ اللہ تعالیٰ تجھ پر برکت و رحمت نازل فرمائے) اور ان کے تحنیک کرتے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "تحنیک" یہ ہے کہ کھجور یا کسی اور میٹھی چیز کو چبا کر بچے کے تالو میں لگایا جائے چنانچہ یہ تحنیک ایک مسنون عمل ہے اور بہتر یہ ہے کہ تحنیک کرنے والا کوئی نیک اور صالح آدمی ہو۔

(۳) وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِيْ بَكْرٍ اَنَّهَا حَمَلَتْ بِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ بِمَكَّةَ قَالَتْ فَوَلَدْتُ بِقُبَاءٍ ثُمَّ اَتَيْتُ بِهٖ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَضَعْتُهُ فِيْ حَجْرِهٖ ثُمَّ دَعَا بِتَمْرَةٍ فَمَضَغَهَا ثُمَّ تَفَلَ فِيْ فِيْهِ ثُمَّ حَنَّكَهٗ ثُمَّ دَعَا لَهٗ وَبَرَّكَ عَلَيْهِ وَكَانَ اَوَّلَ مَوْلُوْدٍ وُلِدَ فِي الْاِسْلَامِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ مکہ میں عبداللہ ابن زبیرؓ ان کے پیٹ میں آئے، حضرت اسماءؓ کہتی ہیں کہ قباء کے مقام پر میرے ولادت ہوئی تو میں ان (عبداللہؓ) کو لے کر رسول کریم ﷺ کی خدمت میں آئی، اور ان کو آنحضرت ﷺ کی گود میں دے دیا

آنحضرت ﷺ نے کھجور منگائی، اور اس کو چبایا، پھر اپنا آب دہن ان کے منہ میں ڈالا یعنی آپ ﷺ نے، اس کھجور کو جو آپ ﷺ کے لعاب مبارک کے ساتھ مخلوط ہوگئی تھی، عبداللہؓ کے منہ میں رکھا اور پھر وہ کھجور ان کے تالو میں لگائی، اس کے بعد آپ ﷺ نے ان کے لئے دعا کی اور برکت چاہی (یعنی یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس پر برکت نازل فرمائے) چنانچہ عبداللہ ابن زبیرؓ پہلے شخص تھے، جو اسلام (کے عہد) میں پیدا ہوئے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "قبا" مدینہ شہر سے جنوب مغربی سمت تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک آبادی ہے۔ مکہ سے مدینہ کے لئے سفر ہجرت میں آنحضرت ﷺ کی یہ آخری منزل تھی، جہاں آپ ﷺ مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے اترے اور تین دن یا چار دن قیام فرمایا، جس جگہ آپ ﷺ نے قیام فرمایا تھا اس جگہ آپ ﷺ نے ایک مسجد کی بنیاد رکھی، جس کو مسجد قبا کہتے ہیں، قبا اگرچہ مدینہ منورہ سے باہر ہے، لیکن اس کا تعلق ایک طرح سے ایسا ہی ہے جیسا کہ محلہ کا ہوتا ہے۔ اس جگہ بڑی شادابی ہے۔ اور مختلف پھلوں اور میووں کے باغات ہیں، اسی قبا میں بئر اریس نامی کنواں ہے، جہاں آپ ﷺ نے چند صحابہؓ کو جنت کی بشارت دی تھی، اور جس میں حضرت عثمانؓ کے عہد میں آنحضرت کی وہ انگوٹھی گر گئی تھی، جس سے آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدینؓ مہر لگایا کرتے تھے، اس کنویں کا پانی بہت کھارا تھا، کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنا لعب دہن شامل فرمایا جب سے اس کا پانی میٹھا ہے، مگر اب یہ کنواں خشک ہو گیا ہے۔

عبداللہ ابن زبیرؓ پہلے شخص تھے الخ کا مطلب یہ ہے کہ ہجرت کے بعد مہاجرین میں جو سب سے پہلا بچہ پیدا ہوا وہ عبداللہ ابن زبیرؓ تھے، "مہاجرین" کی قید اس لئے لگائی گئی کہ ہجرت کے بعد حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی پیدائش سے بھی پہلے مدینہ میں مسلمانوں کے یہاں سب سے پہلا پیدا ہونے والا بچہ نعمان ابن بشیر انصاریؓ تھے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

عقیقہ کے جانوروں کی تعداد

④ عَنْ اُمِّ كُرْزٍ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَقِرُّوا الطَّيْرَ عَلٰى مَكِنَاتِهَا قَالَتْ وَسَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ وَلَا يَضُرُّكُمْ ذُكْرَانًا كُنَّ اَوْ اِنَاثًا رواه ابو داؤد والترمذی والنسائی من قوله يقول عن الغلام الی اٰخره وقال الترمذی هذا حديث صحيح۔

"حضرت اُمّ کرزؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں قرار دو، اُمّ کرزؓ کہتی ہیں کہ۔ اور میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا کہ "(عقیقہ میں) لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ہے، اور اس میں تمہارے لئے کوئی نقصان نہیں ہے کہ وہ (بکری) نر ہو یا مادہ، یعنی اس بات کا لحاظ ضروری نہیں کہ لڑکے کے عقیقہ میں بکرے ذبح کئے جائیں اور لڑکی کے عقیقہ میں بکری ذبح کی جائے (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ) نسائی کی روایت میں يقول عن الغلام سے آخر تک ہے۔ نیز ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔"

تشریح: "مَكِنَاتِ" میم کے زبر اور کاف کے زیر اور زبر دونوں کے ساتھ ہے اور مشکوٰۃ کے ایک نسخہ میں کاف کے پیش کے ساتھ بھی منقول ہے۔ اس کے معنی "مکان" کے ہیں۔

اس ارشاد گرامی "پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں قرار دو" کا مطلب یہ ہے کہ ان (پرندوں) کو ان کے گھونسلوں میں رہنے دو اڑاؤ نہیں۔ اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ مَكِنَات اصل میں جمع ہے مَكِنَةٌ کی جس کے معنی "سوسمار (گوہ) کے انڈے" کے ہیں، لیکن یہاں

یہ لفظ مطلق انڈوں کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، اس صورت میں اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر پرندے انڈوں پر بیٹھے ہوں تو ان کے گھونسلوں کو ہلا کر ان کو ستاؤ مت۔ یا پھر اس ارشاد گرامی کا تعلق تطیر اور فال بد لینے کی ممانعت سے ہے، جیسا کہ عرب میں لوگوں کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی شخص کسی کام کا قصد کرتا، یا کہیں کا سفر کرنے کا ارادہ کرتا، تو پرندے کے گھونسلے پر آتا اور اس کو چھیڑ کر اڑاتا، اگر وہ پرندہ داہنی طرف اڑتا تو مبارک جان کر اور فال نیک سمجھ کر اس کام کو کرتا، یا سفر پر روانہ ہو جاتا، اور اگر وہ پرندہ بائیں طرف اڑتا تو اس کو منحوس سمجھ کر اس کام یا سفر سے باز رہتا، اس کو تطیر کہتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا، کہ پرندہ جہاں ہو اس کو وہیں رہنے دو کہ اس کو مت اڑاؤ اور نہ اس سے بدفالی لو۔

عقیقہ کی اہمیت

⑤ وَعَنِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْغُلَامُ مُرْتَهَنٌ بِعَقِيْقَتِهٖ يُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ السَّابِعِ وَيُسَمّٰى وَيُحْلَقُ رَأْسُهٗ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاؤُدَ وَالنَّسَائِيُّ لٰكِنَّ فِيْ رِوَايَتِهِمَا رَهِيْنَةٌ بَدَلَ مُرْتَهَنٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِاَحْمَدَ وَاَبِيْ دَاؤُدَ وَيُدَمّٰى مَكَانَ وَيُسَمّٰى وَقَالَ اَبُوْدَاؤُدَ وَيُسَمّٰى اَصَحُّ۔

"اور حضرت حسن بصریؒ حضرت سمرہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہر (بچہ) اپنے عقیقہ کے بدلے گروی ہے (اس کی پیدائش کے) ساتویں دن اس کی (عقیقہ کے) لئے (جانور) ذبح کیا جائے (ساتویں ہی دن) اس کا نام رکھا جائے اور اس کا سر مونڈا جائے۔" اس روایت کو احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ نے نقل کیا ہے لیکن ابوداؤدؒ نسائیؒ کی روایت میں مرتھن کے بجائے رَهِيْنَةٌ ہے اور احمدؒ وابوداؤدؒ کی ایک روایت میں يُسَمّٰى کے بجائے وَيُدَمّٰى ہے اور ابوداؤدؒ نے کہا ہے کہ لفظ یسمی ہی زیادہ صحیح ہے۔"

تشریح: ظاہر ہے کہ بچہ چونکہ مکلّف نہیں ہے کہ اگر اس کا عقیقہ نہ کیا جائے تو اس کے ماخوذ و معتوب ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوگا، اس صورت میں بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر عقیقہ کے عوض بچے کے گروی ہونے کا کیا مطلب ہے؟ چنانچہ حضرت امام احمدؒ نے تو اس ارشاد گرامی ﷺ کا مطلب یہ بیان کیا ہے، کہ جس بچے کا عقیقہ نہیں ہوتا اور وہ کم سنی میں مرجاتا ہے تو اس کو اپنے والدین کی شفاعت کرنے سے روک دیا جاتا ہے کہ جب تک والدین اس کا عقیقہ نہ کردیں وہ اس کے حق میں شفاعت کرنے کا اہل نہیں ہوگا۔ بعض حضرات نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ جب تک والدین بچہ کا عقیقہ نہیں کرتے اس کو بھلائیوں سلامتی آفات اور بہتر نشو ونما سے باز رکھا جاتا ہے اور پھر اس کے جو برے نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ حقیقت میں والدین کے مواخذہ کا سبب بنتے ہیں کہ ترک عقیقہ انہوں نے ہی کیا ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ گروی ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ بچہ اپنے بالوں وغیرہ کی گندگی واذیت میں مبتلا رہتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے۔ فَاَمِيْطُوْا عَنْهُ الْاَذٰى (بچے کو اذیت سے ہٹاؤ) یعنی اس کے بال میل کچیل اور خون وغیرہ صاف کرو) لہٰذا جب بچہ کا عقیقہ ہوتا ہے تو وہ گویا سر کے بال وغیرہ صاف ہو جانے سے اس اذیت سے نجات پا جاتا ہے۔

لفظ يُدَمّٰى۔ یا کے پیش دال کے زبر اور میم مفتوحہ کی تشدید کے ساتھ تدمیه سے مشتق ہے جس کے معنی "خون آلود کرنے" کے ہیں۔ لہٰذا ایک روایت میں ویسمی (اور اس کا نام رکھا جائے) کی جگہ وَيُدَمّٰى ہے۔ لیکن جیسا کہ ابوداؤدؒ نے کہا ہے کہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس جگہ لفظ ویسمی ہی ہونا چاہئے۔ تاہم قتادہؒ نے وَيُدَمّٰى کی تشریح یہ کی ہے کہ جب عقیقہ کے جانور کو ذبح کیا جائے تو اس کے تھوڑے سے بال لے کر اس کی گردن کے سامنے رکھ دیا جائے تاکہ وہ (بال) اس کے خون سے آلودہ ہو جائیں جو ذبح کے وقت اس جانور کی گردن کی رگوں سے نکلے اور پھر وہ خون آلودہ بال اس بچے کی چندیا پر اس طرح رکھ دیا جائے کہ خون اس کی چندیا پر ایک لکیر کی صورت میں بہے اور اس کے بعد بچہ کا سر دھو کر منڈوا دیا جائے۔ سفر السعادۃ کے مصنف نے لکھا ہے کہ یہ (تدمیہ) نہ کیا جائے کیونکہ روایت میں لفظ یدمی دراصل کسی راوی کی طرف سے تحریف ہے جس کا آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ

آنحضرت ﷺ سے تدمیہ ثابت ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کا عقیقہ کیا، لیکن یہ عملی (تدمیہ) نہیں کیا تھا، نیز یہ بھی لکھا ہے کہ یہ عمل دراصل زمانہ جاہلیت کی ایک رسم تھی جس کو منسوخ قرار دیا گیا، جیسا کہ اس باب کی تیسری فصل میں آنے والی حدیث سے واضح ہوگا۔

علماء نے لکھا ہے کہ ابوداؤدؒ کی روایت میں لفظ یدمی کا منقول ہونا حدیث کے ایک راوی ہمامؒ کا وہم ہے اور قتادہؒ نے اس لفظ کی تشریح میں جو کچھ لکھا ہے وہ منسوخ ہے، خطابیؒ نے کہا کہ جب آنحضرت ﷺ نے بچے کے بدن سے اذیت اور سوکھی پلیدی کو دور کرنے کا حکم فرمایا تو اس کے سر کو تر خون سے آلودہ کر کے نجس کرنے کا حکم کیسے دیا جا سکتا ہے، تاہم بعض علماء نے بچے کے سر کو خون سے آلودہ کرنے کے بجائے خلوق اور زعفران جیسی خوشبوؤں سے لتھیڑنا نقل کیا ہے۔

لڑکے کے عقیقہ میں ایک بکری ذبح کرنے کا مسئلہ

(٦) وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنٍ عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ قَالَ عَقَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْحَسَنِ بِشَاةٍ وَقَالَ يَا فَاطِمَةُ اَحْلِقِيْ رَأْسَهُ وَ تَصَدَّقِيْ بِزِنَةِ شَعْرِهِ فِضَّةً فَوَزَنَّاهُ فَكَانَ وَزْنُهُ دِرْهَمًا اَوْبَعْضَ دِرْهَمٍ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ وَاِسْنَادُهُ لَيْسَ بِمُتَّصِلٍ لِاَنَّ مُحَمَّدَ بْنَ عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنٍ لَمْ يُدْرِكْ عَلِيَّ بْنَ اَبِيْ طَالِبٍ۔

"حضرت محمد ابن علی ابن حسینؓ (یعنی حضرت امام محمد باقر ابن امام زین العابدینؒ ابن امام حسین شہیدؓ) حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ، سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا "رسول کریم ﷺ نے (اپنے نواسے اور میرے بچے) حسنؓ کے عقیقہ میں ایک بکری ذبح کی تھی اور فرمایا کہ "فاطمہؓ! اس (حسنؓ) کا سر مونڈو اور اس کے بال کے ہم وزن چاندی صدقہ کر دو۔" چنانچہ ہم نے ان بالوں کا وزن کیا تو وہ ایک درہم یا ایک درہم سے کم وزن کے تھے۔" ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اور اس کی اسناد متصل یعنی مسلسل نہیں ہے۔ کیونکہ محمد ابن علی ابن حسین نے حضرت علی ابن ابی طالبؓ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ لڑکے کے عقیقہ میں ایک بکری یا بکرا بھی ذبح کیا جا سکتا ہے، نیز ابوداؤدؒ نے بھی حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی طرف سے عقیقہ میں ایک ایک مینڈھا ذبح کیا، یہ حدیث آگے آرہی ہے، لیکن نسائیؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے دو دو مینڈھے روایت کئے ہیں اور حضرت بریدہؓ نے مطلق نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی طرف سے عقیقہ کیا۔ سفر السعادۃ کے مصنف نے لکھا ہے کہ اگرچہ ایک بکری کی روایت بھی صحیح ہے۔ لیکن زیادہ مضبوط اور زیادہ صحیح وہی روایت ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ لڑکے کے عقیقہ میں دو بکریاں ذبح کی جائیں، کیونکہ اس روایت کو صحابہؓ کی ایک پوری جماعت نے نقل کیا ہے نیز لڑکے کے عقیقہ میں دو بکری کو ذبح کرنے کو ترجیح دینے کی ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ایک بکری ذبح کرنا آپ ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔ اور دو بکریاں ذبح کرنا آپ ﷺ کے ارشاد سے ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز قول سے ثابت ہو وہ فعل سے کہیں زیادہ مضبوط اور کہیں زیادہ مکمل سمجھی جاتی ہے، کیوں کہ فعل کے بارے میں یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ وہ کسی مخصوص حالت سے متعلق ہو، جب کہ قول میں عمومیت و اکملیت ہوتی ہے، اور ایک بات یہ بھی ہے کہ فعل تو محض جواز پر دلالت کرتا ہے اور قول سے جواز کے ساتھ استحباب بھی ثابت ہوتا ہے، ترمذیؒ نے کہا ہے کہ اس سلسلے میں جن صحابہؓ کی روایتیں منقول ہیں، وہ یہ ہیں، حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت اُمّ کرزؓ، حضرت بریدہؓ، حضرت سمرہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہؓ ابن عمرؓ، حضرت انسؓ، حضرت سلمان ابن عامرؓ اور حضرت ابن عباسؓ۔

اور ملا علی قاریؒ نے یہ لکھا ہے، حتمال ہے کہ لڑکے کے حق میں استحباب کا کم سے کم درجہ ایک بکری ہو اور کمال استحباب دو بکری ہو

جس حدیث میں ایک بکری یا ایک مینڈھے کا ذکر ہے اس کے بارے میں احتمال ہے کہ یہ حدیث کم سے کم درجہ پا اکتفا کرنے کے جواز کو ظاہر کرنے کے لئے ہو یا یہ کہ یہ حدیث دراصل اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ لازم اور ضروری نہیں ہے کہ لڑے کے عقیقہ میں جو دو بکری یا جو دو مینڈھے ذبح کئے جاتے ہیں، وہ دونوں ساتویں ہی دن ذبح ہوں، لہٰذا ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حسنؓ و حسینؓ کی طرف سے ایک ایک بکری یا ایک ایک مینڈھا تو ان کی پیدائش کے دن ہی ذبح کر دیا ہو اور دوسری بکری یا دوسرے مینڈھے کو ساتویں دن ذبح کیا ہو اس تاویل و توضیح کی صورت میں تمام روایتوں کے درمیان مطابقت و یکسانیت پیدا ہو جائے گی اور کوئی اشکال باقی نہیں رہے گا، یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک ہی مینڈھا یا ایک بکری کے ذریعہ عقیقہ کیا اور اس کے ساتھ حضرت علیؓ یا حضرت فاطمہؓ کو حکم فرمایا کہ دوسرا مینڈھا یا دوسری بکری وہ ذبح کر دیں، لہٰذا جس روایت میں ایک بکری یا ایک مینڈھے کا ذکر ہے اس میں تو گویا آنحضرت ﷺ کی طرف یہ نسبت کہ آپ ﷺ نے ایک بکری یا ایک مینڈھے کے ذریعہ عقیقہ کیا حقیقت کے اعتبار سے ہے۔ اور جس روایت میں آپ ﷺ کی طرف دو بکری یا دو دنبے کو ذبح کرنے کی نسبت کی گئی ہے وہ مجازاً ہے۔

"اس کا سر مونڈو"۔ یہ حکم یا تو حقیقۃً تھا کہ فاطمہؓ تم اپنے ہاتھ سے اس کا سر مونڈو، یا یہ مطلب تھا کہ کسی دوسرے شخص کو حکم دو کہ اس کا سر مونڈ دے۔ یہ امر (یعنی آنحضرت ﷺ کی طرف سے سر مونڈنے کا حکم دیا جانا، استحباب کے طور پر ہے۔ اسی طرح بالوں کو وزن کرنے کا حکم بھی بطریق استحباب کے ہے۔

⑦ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَقَّ عَنِ الْحَسَنِ وَالْحُسَیْنِ کَبْشًا کَبْشًا رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ وَعِنْدَ النَّسَائِیِّ کَبْشَیْنِ کَبْشَیْنِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کے عقیقہ میں ایک ایک مینڈھا ذبح کیا۔ (ابوداؤدؒ) اور نسائیؒ نے دو دو مینڈھے نقل کئے ہیں۔"

بچے کو عقوق سے بچانے کے لئے اس کا عقیقہ کرو

⑧ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْعَقِیْقَۃِ فَقَالَ لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْعُقُوْقَ کَاَنَّہٗ کَرِہَ الْاِسْمَ وَقَالَ مَنْ وُلِدَ لَہٗ وَلَدٌ فَاَحَبَّ اَنْ یَّنْسُکَ عَنْہُ فَلْیَنْسُکْ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَیْنِ وَعَنِ الْجَارِیَۃِ شَاۃً۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا رسول کریم ﷺ سے عقیقہ کے بارے میں پوچھا گیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عقوق کو پسند نہیں کرتا۔ گویا آنحضرت ﷺ نے اس فعل کو لفظ عقیقہ سے موسوم کئے جانے کو ناپسند فرمایا۔ اور پھر فرمایا کہ جس شخص کے ہاں لڑکا پیدا ہو اس کو چاہئے، کہ وہ اس لڑکے کی طرف سے دو بکریاں ذبح کرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: "اللہ تعالیٰ عقوق کو پسند نہیں کرتا" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کا لڑکا بڑی عمر میں پہنچ کر والدین کے حق میں عاق نہ ہو یعنی والدین کی نافرمانی کرنے والا نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کی چھوٹی عمر میں عقیقہ (کا جانور) ذبح کرے۔ کیونکہ والدین کا عقوق (یعنی والدین کا اپنے بچے کا عقیقہ نہ کرکے گویا ایک طرح کی نافرمانی کرنا) دراصل لڑکے کے عقوق (یعنی لڑکے کے نافرمان بردار ہو جانے کا باعث ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ عقوق کو کسی حالت میں پسند نہیں کرتا۔ اس اعتبار سے حدیث کے الفاظ گویا من ولد لہ (جس شخص کے ہاں لڑکا پیدا ہو الخ) کی تمہید کے طور پر ہیں۔

"گویا آنحضرت ﷺ نے اس فعل کو لفظ عقیقہ سے موسوم کئے جانے کو ناپسند فرمایا۔" روایت کے یہ الفاظ کسی راوی کے اپنے ہیں کہ

آنحضرت ﷺ نے عقیقہ کو "عقیقہ" کے لفظ سے موسوم کئے جانے کو پسند نہیں فرمایا۔ تاکہ یہ گمان نہ ہو کہ یہ "عقیقہ" عقوق سے مشتق ہے، جس کے معنی والدین سے سرکشی اور ان کی نافرمانی کرنا ہیں) جب کہ آپ ﷺ نے یہ پسند فرمایا کہ اس کو اس سے بہتر نام جیسے ذبیحہ یا نسیکہ سے موسوم کیا جائے (نہایہ) لیکن تورپشتی نے کہا ہے۔ کہ آنحضرت ﷺ کی طرف اس بات کی نسبت کہ (گویا آپ ﷺ نے "عقیقہ" کہے جانے کو ناپسند فرمایا) غیر موزوں ہے۔ کیوں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے کتنے ہی ارشادات میں "عقیقہ" ہی کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اگر آپ ﷺ کے نزدیک یہ لفظ ناپسندیدہ ہوتا، تو آپ ﷺ اس کا ذکر کیوں فرماتے، لیکن اس سلسلے میں اگر یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔ کہ یہ احتمال ہے کہ سوال کرنے والے نے یہ گمان کیا ہو کہ مادۂ اشتقاق میں عقیقہ اور عقوق کا مشترک ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ حکم کے اعتبار سے عقیقہ کی زیادہ اہمیت نہ ہو۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے اپنے جواب کے ذریعہ یہ واضح کر دیا کہ امر واقعی اس کے خلاف ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے نہایہ کی مذکورہ بالا وضاحت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ جن احادیث میں آنحضرت کا عقیقہ کا لفظ ذکر کرنا منقول ہے وہ اس کراہت سے پہلے کی ہوں گی۔

بچے کے کان میں اذان دینا مسنون ہے

⑨ وَعَنْ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَذَّنَ فِيْ اُذُنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ حِيْنَ وَلَدَتْهُ فَاطِمَةُ بِالصَّلٰوةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاؤدَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت ابورافعؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے حسنؓ ابن علیؓ کے کان میں اذان دی، جب کہ حضرت فاطمہؓ کے ہاں ان کی ولادت ہوئی، اور وہ اذان نماز کی اذان کی طرح تھی۔ (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بچہ کی پیدائش کے بعد اس کے کان میں اذان دینا سُنّت ہے۔ مسند ابویعلی موصلی میں حضرت حسینؓ نے بطریق مرفوع (یعنی آنحضرت ﷺ کا ارشاد) نقل کیا ہے کہ "جس شخص کے ہاں بچہ پیدا ہو اور وہ اس کے دائیں کان میں اذان دے اور بائیں کان میں تکبیر کہے، تو اس کو ام الصبیان سے ضرر نہیں پہنچے گا۔ نیز امام نوویؒ کے کتاب الروضہ میں لکھا ہے کہ بچے کے کان میں یہ الفاظ کہنے بھی مستحب ہیں۔ اِنِّیْ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

عقیقہ کا دن

⑩ عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ كُنَّا فِى الْجَاهِلِيَّةِ اِذَا وُلِدَ لِاَحَدِنَا غُلَامٌ ذَبَحَ شَاةً وَلَطَخَ رَاْسَهٗ بِدَمِهَا فَلَمَّا جَآءَ الْاِسْلَامُ كُنَّا نَذْبَحُ الشَّاةَ يَوْمَ السَّابِعِ وَنَحْلِقُ رَاْسَهٗ وَنَلْطَخُهٗ بِزَعْفَرَانٍ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَزَادَ رَزِيْنٌ وَنُسَمِّيْهِ۔

"حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں ہمارا یہ دستور تھا کہ جب ہم میں سے کسی کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا تو وہ بکری ذبح کرتا اور اس (بکری) کا خون اس (لڑکے) کے سر پر لگاتا، لیکن جب اسلام کا زمانہ آیا، تو ہم (بچے کی پیدائش کے) ساتویں دن بکری ذبح کرتے، اس کا سر مونڈتے اور اس کے سر پر زعفران لگاتے (ابوداؤدؒ) اور رزینؒ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ ہم (ساتویں ہی دن) اس کا نام رکھتے۔"

تشریح : واضح رہے.... کہ اکثر احادیث کے بموجب بچہ کا عقیقہ اس کی پیدائش کے ساتویں دن ہونا چاہئے، اور حضرت امام شافعیؒ و حضرت امام احمدؒ یہ فرماتے ہیں کہ اگر ساتویں دن عقیقہ کرنا ممکن نہ ہو سکے تو پھر چودھویں دن کیا جائے، اگر چودھویں دن بھی نہ کر سکے تو اکیسویں دن، ورنہ اٹھائیسویں دن، پھر پینتیسویں دن علی ہذا القیاس۔

ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنا عقیقہ ظہور نبوت کے بعد کیا تھا، کیوں کہ آپ ﷺ کو یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ پیدائش کے دن آپ ﷺ کا عقیقہ ہوا تھا یا نہیں۔ لیکن اول تو اس روایت کی اسناد ضعیف ہے، دوسرے معنوی طور پر بھی یہ روایت بعد سے خالی نہیں ہے۔

حضرت امام مالکؒ کے نزدیک عقیقہ کی ہڈیاں توڑنی درست نہیں (بلکہ گوشت نکال کر ہڈیوں کو دفن کر دیا جائے، جب کہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک اس کی ہڈیاں توڑنا درست ہے۔ نیز شوافع کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر عقیقہ کا گوشت پکا کر صدقہ کیا جائے تو بہتر ہے، اور اگر حلاوت یعنی لڑکے کے اچھے اخلاق و طوار کے ساتھ تفاول کے پیش نظر اس گوشت کی کوئی میٹھی چیز پکا کر صدقہ کی جائے تو اور بہتر ہے۔

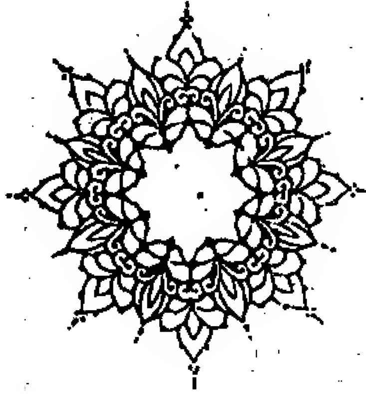

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الاطعمة

کھانوں کا بیان

"کتاب الاطعمہ" کے تحت جو ابواب آئیں گے اور ان میں جو احادیث نقل کی جائیں گی ان سے یہ واضح ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے کیا کیا چیزیں کھائی ہیں اور کون کون سی چیزیں نہیں کھائی ہیں، نیز کھانے پینے کے جو آداب و قواعد ہیں وہ بھی ان احادیث سے معلوم ہوں گے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

کھانے کے تین آداب

(۱) عَنْ عُمَرَ بْنِ اَبِیْ سَلَمَةَ قَالَ كُنْتُ غُلَامًا فِیْ حِجْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَتْ يَدِیْ تَطِيْشُ فِی الصَّحْفَةِ فَقَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِّ اللّٰهَ وَكُلْ بِيَمِيْنِكَ وَكُلْ مِمَّا يَلِيْكَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عمر ابن ابی سلمہؓ کہتے ہیں کہ میں بچہ تھا اور رسول کریم ﷺ کی پرورش و تربیت میں تھا (ایک دن میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا) اور میرا ہاتھ رکابی میں جلدی جلدی گھوم رہا تھا (یعنی جیسا کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے، میں اپنے سامنے سے کھانے کے بجائے ادھر ادھر ہاتھ ڈال رہا تھا) چنانچہ رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ "بسم اللہ کہو دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اس جانب سے کھاؤ جو تمہارے نزدیک ہے (یعنی اپنے سامنے سے کھاؤ۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں کھانے کے تین بنیادی آداب کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ سب سے پہلا ادب تو یہ ہے کہ کھانے کی ابتداء بسم اللہ کہہ کر ہونی چاہئے۔ دوسرا ادب یہ ہے کہ دائیں ہاتھ سے کھانا چاہئے اور تیسرا ادب یہ ہے کہ کھانے کے برتن میں اپنے سامنے سے کھانا چاہئے۔ جمہور علماء کا رجحان اس طرف ہے کہ اس حدیث میں مذکورہ بالا تینوں باتوں کا جو حکم دیا گیا ہے، وہ استحباب کے طور پر ہے۔ اسی طرح دوسری روایت میں کھانے کے بعد خدا کی حمد و شکر کا جو حکم دیا گیا ہے وہ بھی مسئلہ ہے کہ اگر ایک دسترخوان پر کئی آدمی کھانے بیٹھیں تو سب لوگ بسم اللہ کہیں! جب کہ بعض علماء کے نزدیک کہ جن میں حضرت امام شافعیؒ بھی شامل ہیں یہ کہتے ہیں کہ محض ایک آدمی کا بسم اللہ کہہ لینا سب کے لئے کافی ہو جائے گا۔ پانی یا دوا وغیرہ پینے کے وقت بسم اللہ کہنے کا بھی وہی حکم ہے جو کھانے کے شروع میں بسم اللہ کہنے کا ہے۔

کھاتے وقت بسم اللہ پڑھنے کی اہمیت

(۲) وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّيْطَانَ يَسْتَحِلُّ الطَّعَامَ اَنْ لَّا يُذْكَرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس کھانے پر خدا کا نام نہ لیا جائے، اس کو شیطان اپنے لئے حلال سمجھتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "حلال سمجھتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ (شیطان) اس کے کھانے پر قادر ہو جاتا ہے (یعنی کھانے والے کے ساتھ وہ بھی اس میں سے کھاتا ہے) یہ مطلب اس صورت میں ہے جب کہ حدیث کو اس کے ظاہری معنی پر محمول کیا جائے، اور بعض حضرات نے یہ تاویل بیان کی ہے کہ جو کھانا بسم اللہ پڑھ کر نہ کھایا گیا ہو وہ ایسا ہے گویا اس کو شیطان کھا گیا ہے، یا یہ مراد ہو کہ اس کھانے کو اللہ تعالیٰ کی غیر مرضی کی جگہ صرف کرنا ہے۔

③ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلَ الرَّجُلُ بَيْتَهٗ فَذَكَرَ اللّٰهَ عِنْدَ دُخُوْلِهٖ وَعِنْدَ طَعَامِهٖ قَالَ الشَّيْطَانُ لَا مَبِيْتَ لَكُمْ وَلَا عَشَاءَ وَإِذَا دَخَلَ فَلَمْ يَذْكُرِ اللّٰهَ عِنْدَ دُخُوْلِهٖ قَالَ الشَّيْطَانُ اَدْرَكْتُمُ الْمَبِيْتَ وَإِذَا لَمْ يَذْكُرِ اللّٰهَ عِنْدَ طَعَامِهٖ قَالَ اَدْرَكْتُمُ الْمَبِيْتَ وَالْعَشَاءَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب آدمی اپنے گھر (یعنی اپنی خواب گاہ) میں داخل ہوتا ہے اور داخل ہوتے وقت خدا کا نام لیتا ہے (یعنی بسم اللہ کہہ کر خواب گاہ میں داخل ہوتا ہے) اور پھر کھانا کھاتے وقت ہی خدا کا نام لیتا ہے تو شیطان (اپنے تابعداروں سے کہتا ہے کہ اس گھر میں تمہارے لئے نہ کوئی جگہ ہے نہ کھانا ہے۔ اور جب آدمی گھر و خوابگاہ میں داخل ہوتے وقت خدا کا نام نہیں لیتا تو شیطان اپنے تابعداروں سے) کہتا ہے کہ (اس گھر میں) تمہیں جگہ مل گئی اور جب آدمی کھانا کھاتے وقت خدا کا نام نہیں لیتا، تو شیطان (اپنے تابعداروں سے) کہتا ہے کہ (اس گھر میں تمہیں جگہ بھی مل گئی اور کھانا بھی مل گیا۔" (مسلمؒ)

دائیں ہاتھ سے کھانا پینا چاہئے

④ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اَكَلَ اَحَدُكُمْ فَلْيَاْكُلْ بِيَمِيْنِهٖ وَإِذَا شَرِبَ فَلْيَشْرَبْ بِيَمِيْنِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے، تو داہنے ہاتھ سے کھائے اور جب کوئی چیز پئے، تو دائیں ہاتھ سے پئے یعنی پانی وغیرہ کا برتن داہنے ہاتھ سے پکڑے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں جو حکم دیا گیا ہے وہ بظاہر وجوب کے لئے ہے۔ جیسا کہ بعض علماء کا مسلک ہے اس کی تائید صحیح مسلم کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو سلمہ ابن اکوعؓ نے بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو بائیں ہاتھ سے کھاتے دیکھا تو فرمایا کہ دائیں ہاتھ سے کھاو اس شخص نے کہا کہ میں داہنے ہاتھ سے کھانے کی قدرت نہیں رکھتا (راوی کا بیان ہے کہ اس شخص کا داہنا ہاتھ درست تھا، اس نے محض تکبر سے یہ الفاظ کہے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا (خدا کرے) تجھے داہنے ہاتھ سے کھانے کی طاقت نصیب نہ ہو۔ چنانچہ اس کے بعد وہ شخص (کبھی بھی) اپنا داہنا ہاتھ اپنے منہ کی طرف نہیں اٹھا سکا اس طرح طبرانیؒ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے (ایک دن) سلبیہ اسلمیہ کو بائیں ہاتھ سے کھانا کھاتے دیکھا تو اس کے لئے بددعا فرمائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ طاعون میں مبتلا ہو کر مرگئی! تاہم جمہور علماء جن کے نزدیک دائیں ہاتھ سے کھانا کھانے کا حکم وجوب کے طور پر نہیں ہے بطریق استحباب ہے وہ ان روایتوں کو زجر و تنبیہ اور مصالح شریعت پر محمول کرتے ہیں۔

بائیں ہاتھ سے کھانے پینے کی ممانعت

⑤ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَاْكُلَنَّ اَحَدُكُمْ بِشِمَالِهٖ وَلَا يَشْرَبَنَّ بِهَا فَاِنَّ الشَّيْطَانَ يَاْكُلُ

بِشِمَالِهٖ وَيَشْرَبُ بِهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص بائیں ہاتھ سے کھانا نہ کھائے، اور نہ بائیں ہاتھ سے (کوئی چیز) پئے کیوں کہ (یہ) شیطان کا شیوہ ہے کہ وہ) اپنے بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: تورپشتی نے۔ "بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے۔" کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جو لوگ شیطان کے زیر اثر اور اس کے تابعدار ہوتے ہیں، وہ ان کو بائیں ہاتھ سے کھانے پینے پر ابھارتا ہے جب کہ طیبیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث اپنے ظاہری معنی پر محمول ہے یعنی حقیقت میں شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا پیتا ہے۔

حسن ابن سفیانؒ نے اپنی مسند میں حضرت ابوہریرہؓ سے بسند حسن یہ روایت نقل کی ہے کہ "جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے، تو اس کو چاہئے کہ دائیں ہاتھ سے کھائے اور دائیں ہاتھ سے پئے (اگر کسی کو کوئی چیز دے یا کسی سے کوئی چیز لے تو) دائیں ہاتھ سے لے اور دائیں ہاتھ سے دے کیوں کہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے۔ بائیں ہاتھ سے پیتا ہے اور بائیں ہاتھ سے لیتا دیتا ہے۔

تین انگلیوں سے کھانا اور انگلیاں چاٹنا سُنّت ہے

(۶) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْكُلُ بِثَلَاثَةِ اَصَابِعَ وَيَلْعَقُ يَدَهٗ قَبْلَ اَنْ يَّمْسَحَهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت کعبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ تین انگلیوں سے (یعنی انگوٹھے، شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کے ساتھ) کھانا کھایا کرتے تھے اور (کھانے سے فراغت کے بعد) اپنا ہاتھ (کسی رومال وغیرہ سے) پونچھنے۔ (یا دھونے) سے پہلے چاٹ لیا کرتے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: نوویؒ کہتے ہیں کہ انگلیوں سے کھانا سُنّت ہے، لہٰذا ان تینوں کے ساتھ چوتھی اور پانچویں انگلی نہ ملائی جائے، الا یہ کہ چوتھی اور پانچویں انگلی کو ملانا ضروری ہو۔

"ہاتھ کو چاٹنے" سے مراد یہ ہے کہ جن انگلیوں سے کھاتے تھے، ان کو چاٹ لیا کرتے تھے، چنانچہ پہلے بیچ کی انگلی کو چاٹتے، پھر اس کے پاس کی انگلی کو، پھر انگوٹھے کو چاٹتے تھے۔

طبرانیؒ نے عامر ابن ربیعہ سے اس طرح نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ تین انگلیوں سے کھاتے تھے، اور ان کی مدد کے لئے چوتھی انگلی بھی ملا لیا کرتے تھے! نیز ایک حدیث مرسل میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ پانچوں انگلیوں سے کھاتے تھے۔" یا تو یہ پتلی چیز کھانے پر محمول ہے یہ یہ کہ آپ ﷺ بیان جواز کی خاطر کبھی کبھی اس طرح بھی کھاتے تھے، لیکن اکثر اوقات تین ہی انگلیوں سے کھانے کی عادت تھی۔

بعض روایت میں یمسحھا کے بعد بشیء کا لفظ بھی منقول ہے اور یہ الفاظ بھی نقل کئے گئے ہیں کہ ثم یغسلھا یعنی (ہاتھ کو چاٹتے اور) پھر اس کو دھو لیتے۔

(۷) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِلَعْقِ الْاَصَابِعِ وَالصَّحْفَةِ وَقَالَ اِنَّكُمْ لَا تَدْرُوْنَ فِيْ اَيَّةِ الْبَرَكَةُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انگلیوں اور رکابی کو چاٹنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ تم نہیں جانتے کہ کس انگلی یا نوالے میں برکت ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "والصحفة" میں حرف واو مطلق جمع کے لئے ہے لہٰذا پہلے رکابی و برتن وغیرہ کو صاف کیا جائے اور پھر انگلی کو چاٹا جائے۔

لفظ "ایۃ" تاء تانیث کے ساتھ منقول ہے اس لئے ترجمہ "انگلی یا نوالہ" کیا گیا ہے۔ لیکن بعض نسخوں میں یہ لفظ "ہ" (یعنی مذکر) ضمیر کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ (تم نہیں جانتے کہ) کس کھانے میں برکت ہے (آیا اس کھانے میں جو کھا چکے ہو یا اس کھانے میں جو چاٹو گے) اس کی تائید آگے آنے والی حدیث کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔ کہ فانہ لا یدری فی ای طعام تکون البرکۃ اس سے معلوم ہوا کہ اصل میں سُنت انگلیوں کو چاٹنا ہے اور اس چیز کو صاف کرنا ہے جو انگلیوں کو لگی ہے نہ کہ محض انگلیوں کو بمبالغہ منہ میں داخل کرنا۔

⑧ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَكَلَ اَحَدُكُمْ فَلَا يَمْسَحْ يَدَهُ حَتّٰى يَلْعَقَهَا اَوْ يُلْعِقَهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھا چکے تو وہ ہاتھ کو اس وقت تک (کسی چیز سے) نہ پونچھے (اور نہ دھوئے) جب تک کہ ہاتھ کی انگلیوں کو چاٹ نہ لے یا چٹوا نہ دے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "چٹوا نہ دے" کا مطلب یہ ہے کہ اگر انگلیوں کو خود نہ چاٹے تو ان لوگوں میں سے کسی کو چٹوا دے جو اس سے گھن اور کراہت محسوس نہ کریں، جیسے بیوی، بچے، لونڈی، اور خادم و غلام وغیرہ، کیونکہ ان کو اپنے طبعی تعلق و محبت کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اس سے کوئی گھن اور کراہت محسوس نہیں ہوتی، بلکہ ایک خاص قسم کی لذت محسوس کرتے ہیں، انہیں کے حکم میں شاگرد اور وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اس کو حصول سعادت سمجھتے ہوں۔

کھاتے وقت کوئی لقمہ گر جائے تو اس کو صاف کر کے کھا لینا چاہئے

⑨ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ الشَّيْطَانَ يَحْضُرُ اَحَدَكُمْ عِنْدَ كُلِّ شَيْءٍ مِنْ شَاْنِهٖ حَتّٰى يَحْضُرَهُ عِنْدَ طَعَامِهٖ فَاِذَا سَقَطَتْ مِنْ اَحَدِكُمُ اللُّقْمَةُ فَلْيُمِطْ مَا كَانَ بِهَا مِنْ اَذًى ثُمَّ لِيَاْكُلْهَا وَلَا يَدَعْهَا لِلشَّيْطَانِ فَاِذَا فَرَغَ فَلْيَلْعَقْ اَصَابِعَهٗ فَاِنَّهٗ لَا يَدْرِيْ فِيْ اَيِّ طَعَامِهٖ يَكُوْنُ الْبَرَكَةُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ شیطان تمہارے ہر کام کے وقت تمہارے پاس موجود ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ تمہارے کھانے کے وقت بھی تمہارے پاس موجود رہتا ہے، لہٰذا تم میں سے جب کسی شخص کا کوئی نوالہ گر جائے تو چاہئے کہ (اس کو اٹھا لے اور از قسم مٹی وغیرہ) جو چیز اس کو لگ گئی ہو اس کو صاف کر کے کھا لے، اس کو شیطان کے لئے نہ چھوڑے، نیز جب کھانا کھا چکے تو چاہئے کہ اپنی انگلیاں چاٹ لیں کیوں کہ اس کو یہ نہیں معلوم کہ اس کے کون سے کھانے میں (یعنی کھانے کے کس حصہ میں) برکت ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "اس کو صاف کر کے کھا لے" لیکن اگر وہ لقمہ کسی نجاست و گندگی پر گرا ہو تو اس کو دھو کر کھائے، بشرطیکہ اس کو دھونا ممکن ہو۔ یا طبیعت اس پر آمادہ ہو، اور اگر یہ ممکن نہ ہو، تو پھر اس کو کتے یا بلی وغیرہ کو کھلا دے۔

"اس کو شیطان کے لئے نہ چھوڑے" یہ یا تو حقیقت پر محمول ہے کہ وہ واقعۃً کھاتا ہے، یا یہ کنایہ ہے اس لقمہ کو ضائع کرنے اور اس کو حقیر جاننے سے۔ نیز اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ایسا کرنا (یعنی اس گرے ہوئے لقمہ کو حقیر و کمتر جان کر نہ اٹھانا) دراصل متکبر لوگوں کی مشابہت اور ان کی عادت کو اختیار کرنا ہے، کیونکہ وہ (متکبر لوگ) گرے ہوئے لقمہ کو اٹھا کر کھانا عار سمجھتے ہیں اور یہ ساری چیزیں (یعنی اس لقمہ کو ضائع کرنا اور اس کو حقیر جاننا، اور متکبر لوگوں کی عادت اختیار کرنا) شیطانی افعال میں سے ہیں۔

"نیز جب کھانا کھا چکے تو الخ" یہ اگرچہ ایک علیحدہ حکم ہے۔ مگر حقیقت میں پہلے حکم سے حاصل ہونے والے مفہوم "تکبر کو ترک کرنے اور تواضع و انکساری کو اختیار کرنے" کو مؤکد کرنے کے لئے ہے کہ کھانا کھا چکنے کے بعد ہاتھ کو دھونے سے پہلے انگلیوں کو چاٹ لینا

جائے تاکہ اللہ کے رزق کے تئیں اپنے کامل احتیاج اور تواضع و انکساری کا اظہار ہو اور تکبر و نخوت کا کوئی شائبہ نہ پایا جائے۔

ٹیک لگا کر کھانا کھانے کی ممانعت

(۱۰) وَعَنْ اَبِی جُحَیْفَةَ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا اٰکُلُ مُتَّکِئًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابو جحیفہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "میں ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھاتا۔" (بخاریؒ)

تشریح: "سفر السعادت" کے مصنف نے لکھا ہے کہ کھانا کھاتے وقت ٹیک لگانے کی تین صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ پہلو زمین پر رکھا جائے، دوسرے یہ کہ چارزانو بیٹھا جائے، اور تیسرے یہ کہ ایک ہاتھ ٹیک کر بیٹھا جائے، اور دوسرے ہاتھ سے کھانا کھایا جائے، یہ تینوں صورتیں مذموم ہیں اور بعض حضرات نے چوتھی صورت یہ بیان کی ہے کہ تکیہ یا دیوار اور اسی طرح کی کسی اور چیز سے ٹیک لگا کر بیٹھا جائے! مسنون یہ ہے کہ کھاتے وقت کھانے کی طرف جھک کر اور متوجہ ہو کر بیٹھا جائے اور اکثر حضرات نے "ٹیک لگانے" کی وضاحت یہ کی ہے کہ دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کی طرف جھک کر اور اس پر سہارا لے کر بیٹھا جائے۔ کھاتے وقت بیٹھنے کی یہ صورت اس لئے غیر مسنون ہے کہ ایسی حالت میں کھانا ضرر پہنچاتا ہے بایں طور کہ وہ بدن میں اپنی جگہ پر ٹھیک طرح سے نہیں پہنچتا، جو طبیعت پر گراں ہو کر سوء ہضم کی شکایت پیدا کرتا ہے۔

سیوطیؒ نے کتاب عمل الیوم واللیلۃ میں لکھا ہے کہ ٹیک لگا کر، منہ کے بل پڑ کر اور کھڑے ہو کر کھانا نہ کھایا جائے۔ بلکہ اس طرح بیٹھ کر کھائے کہ یا تو دوزانو ہو یا بصورت اقعاء ہو یعنی دونوں کولہے ٹیک لے اور دونوں زانو کھڑے کر لے یا دونوں پاؤں پر بیٹھے اکڑوں اور یا داہنا زانو کھڑا کر لے اور بائیں زانو پر بیٹھ جائے۔

منبر و چوکی پر کھانا رکھ کر کھانے کا مسئلہ

(۱۱) وَعَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ قَالَ مَا اَکَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلٰی خِوَانٍ وَلَا فِی سُکُرُّجَةٍ وَلَا خُبِزَ لَهٗ مُرَقَّقٌ قِیْلَ لِقَتَادَةَ عَلٰی مَا یَاْکُلُوْنَ قَالَ عَلَی السُّفَرِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ، حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی خوان پر کھانا نہیں کھایا اور نہ تشتری میں کھایا اور نہ آپ ﷺ کے لئے چپاتی پکائی گئی! حضرت قتادہؒ سے پوچھا گیا کہ وہ کس چیز پر کھانا کھاتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ دسترخوان پر۔"

(بخاریؒ)

تشریح: "خِوَان" یا "خُوَان" کے معنی دسترخوان کے ہیں، لیکن خوان سے مراد چوکی یا میز ہے جس پر کھانا رکھ کر کھایا جائے تاکہ کھانے میں جھکنا نہ پڑے، چنانچہ یہ مال دار، عیش پسند، متکبر اور غیر اسلامی تہذیب کے حامل لوگوں کا شیوہ ہے کہ وہ میز پر یا چوکی پر کھانا رکھ کر کھاتے ہیں اسی لئے آنحضرت ﷺ نے کبھی بھی اس طریقہ سے کھانا پسند نہیں فرمایا۔

"سُکُرُّجَةٌ" یا جیسا کہ بعض حضرات نے سُکُرُجَةٌ کو زیادہ فصیح کہا ہے، کے معنی چھوٹی پیالی یا تشتری کے ہیں جس میں دسترخوان پر چٹنی اچار اور جوارش و مربہ وغیرہ رکھا جاتا ہے اس غرض سے کہ کھانے کے ساتھ اس کو کھاتے جائیں تاکہ بھوک بڑھے، کھانے کی طرف رغبت زیادہ ہو اور جو کچھ کھایا جائے ہضم ہو، چنانچہ اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے دسترخوان پر کوئی طشتری یا پیالی نہیں ہوتی تھی جیسا کہ عام طور پر مال دار، عیش پسند اور متکبر لوگوں کے دسترخوان پر ایسی تشتریاں رکھنے کا رواج ہے۔

"اور نہ آپ ﷺ کے لئے چپاتی پکائی گئی۔" کا مطلب یہ ہے نہ تو کبھی خاص طور پر آپ ﷺ کے لئے چپاتی پکائی گئی اور نہ کبھی آپ ﷺ نے چپاتی کھائی، خواہ آپ ﷺ کے لئے پکائی گئی ہو یا دوسروں کے لئے پکائی گئی ہو، جیسا کہ دوسری حدیث میں بیان کیا گیا

ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی بھی چپاتی نہیں کھائی! حضرت شیخ عبدالحق ؒ نے اپنی کتاب میں اس موقع پر جو قول نقل کیا ہے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاص طور پر آنحضرت ﷺ کے لئے چاپاتی نہیں پکائی جاتی تھی لیکن اگر کوئی شخص اپنے لئے چپاتی پکاتا یا پکواتا اور پھر وہ چپاتی آپ ﷺ کے سامنے لاتا تو آپ ﷺ اس کو تناول فرمالیتے تھے۔ اس کو کھانے سے انکار نہیں فرماتے تھے! مگر یہ قول آگے آنے والی حدیث کے منافی ہے، جو حضرت انس ؓ نے بیان کی ہے۔ حدیث میں چپاتی کے علاوہ دو چیزوں کی نفی بیان کی گئی ہے، ایک تو خوان پر کھانے کی اور دوسری طشتری میں کھانے کی، ان دونوں میں سے طشتری میں کھانے کی نفی کے بیان کے وقت کسی سوال کا کوئی موقع نہ تھا کیوں کہ اس کی نفی مطلق ہے، جب کہ خوان پر کھانے کی نفی کے بیان کے وقت سوال کا موقع تھا کہ پھر کھانا کس چیز پر رکھ کر کھاتے تھے آیا خوان کے علاوہ کوئی اور چیز تھی جس پر کھانا رکھا جاتا تھا یا کوئی بھی چیز نہیں ہوتی تھی، چنانچہ یہ سوال کیا گیا، اور حضرت قتادہ ؒ نے جواب دیا کہ دسترخوان پر۔ چنانچہ مسنون طریقہ یہی ہے کہ کھانے والا جہاں بھی بیٹھے وہاں دسترخوان بچھا کر اس پر کھانا رکھ کر کھائے۔

"وہ کس چیز پر کھانا کھاتے تھے" سے سائل کی مراد صحابہ ؓ کے بارے میں معلوم کرنا تھا، کیونکہ صحابہ ؓ اصل میں آنحضرت ﷺ کی سُنّت ہی کے پیرو اور آپ ﷺ کے طریقہ پر عامل تھے اس لئے صحابہ ؓ کے بارے میں سوال کرنا حقیقت میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں سوال کرنا تھا، یا یہ بھی صحیح ہے کہ یاکلون کی ضمیر آنحضرت ﷺ اور صحابہ ؓ دونوں کی طرف راجع کی جائے۔

روایت کے آخری جز سے ثابت ہوا کہ دسترخوان پر کھانا رکھ کر کھانا سُنّت ہے اور خالص اسلامی تہذیب ہے، جب کہ خوان (یعنی میز یا چوکی وغیرہ پر) کھانا رکھ کر کھانا بدعت اور تکلفات محض میں سے ہے، ہاں اگر میز و چوکی پر کھانے کی صورت میں کسی تکبر و نخوت کی نیت کار فرما نہ ہو، تو پھر مجبوری کے تحت میز و چوکی پر کھانا رکھ کر کھانا بھی جائز ہوگا۔

آنحضرت ﷺ نے کبھی چپاتی دیکھی بھی نہیں

(۱۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ مَا اَعْلَمُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَى رَغِيْفًا مُرَقَّقًا حَتّٰى لَحِقَ بِاللّٰهِ وَلَا رَأَى شَاةً سَمِيْطًا بِعَيْنِهٖ قَطُّ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی پتلی روٹی یعنی چپاتی دیکھی ہو، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اللہ سے ملاقات کی (یعنی آپ ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں کبھی چپاتی کی صورت بھی نہیں دیکھی چہ جائیکہ کبھی چپاتی کھائی ہو) اسی طرح آپ ﷺ نے دم پخت بکری بھی کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی۔" (بخاریؒ)

تشریح: "سَمِیط" اس بکری یا بکری کے بچے کو کہتے ہیں جس کو بال صاف کرنے کے بعد چمڑے سمیت پانی کی بھاپ کے ذریعہ بھونا یا پکایا گیا ہو۔ یہ اس زمانہ میں اہل چین کا خاص کھانا تھا جو اپنے دور میں انتہائی متمول و متمدن اور عیش پرست تھے، اسی لئے خاص طور پر اس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے، لفظ بعینہ محض تاکید کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کتب بیدہ (اس نے اپنے ہاتھ سے لکھا) یا مشی برجلہ (وہ اپنے پیروں کے ذریعہ چلا)

آنحضرت ﷺ نے میدہ کی تیار کی ہوئی کوئی چیز نہیں کھائی

(۱۳) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ مَا رَأَى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّقِيَّ مِنْ حِيْنَ ابْتَعَثَهُ اللّٰهُ حَتّٰى قَبَضَهُ اللّٰهُ وَقَالَ مَا رَأَى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُنْخُلًا مِنْ حِيْنَ ابْتَعَثَهُ اللّٰهُ حَتّٰى قَبَضَهُ اللّٰهُ قِيْلَ كَيْفَ كُنْتُمْ تَاْكُلُوْنَ الشَّعِيْرَ غَيْرَ مَنْخُوْلٍ قَالَ كُنَّا نَطْحَنُهٗ وَنَنْفُخُهٗ فَيَطِيْرُ مَا طَارَ وَمَا بَقِيَ ثَرَّيْنَاهُ فَاَكَلْنَاهُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت سہل ابن سعد ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جب رسول بنایا آپ ﷺ نے اس وقت سے کبھی میدہ کو

نہیں دیکھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی روح قبض کی، نیز حضرت سہلؓ نے کہا کہ رسول کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جب سے رسول بنایا آپ ﷺ نے اس وقت سے کبھی چھلنی کو نہیں دیکھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح قبض کی (یعنی آنحضرت ﷺ مرتبہ رسالت پر فائز ہونے کے وقت سے اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک میدہ کی تیار کی ہوئی کوئی چیز یا چھلنی کے چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کیا کھاتے کہ کبھی آپ ﷺ نے ان چیزوں کی صورت بھی نہیں دیکھی) حضرت سہیلؓ سے پوچھا گیا پھر آپ لوگ جو (کے بغیر چھنے آٹے کی روٹی) کسی طرح کھاتے تھے؟ حضرت سہیلؓ نے کہا کہ ہم جو کو پینے کے بعد اس میں پھونک مارتے، چنانچہ اس میں سے جو چیز اڑنے والی ہوتی (یعنی بھوسی) وہ اڑ جاتی اور جو چیز باقی رہتی (یعنی آٹا) اس کو ہم پانی میں گوندھ لیتے، (اور پھر اس کی روٹی پکا کر) کھا لیتے۔" (بخاری)

تشریح: "اللہ تعالیٰ نے جب سے رسول بنایا آپ ﷺ اس وقت سے .....الخ۔" عسقلانیؒ کہتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ حضرت سہلؓ نے ان الفاظ کے ذریعہ اس زمانہ کو ذکر کرنے سے احتراز کیا ہے، جو مرتبہ رسالت پر فائز ہونے سے پہلے گزرا تھا، اور اس احتراز کا سبب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو دو مرتبہ ملک شام کا تجارتی سفر اختیار فرمایا تھا وہ بعثت رسالت کے قبل کے زمانہ ہی کا واقعہ ہے اور اس سفر کے دوران بحیرہ راہب نے آپ ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل کیا اور آپ ﷺ نے اس کے یہاں دعوت کھائی، اور چونکہ وہاں کے لوگ خوش حال و مالدار تھے اس لئے بظاہر یہ امکان ہے کہ آپ ﷺ نے ان کے یہاں چیزیں ضرور دیکھی ہوں گی، لیکن آپ ﷺ نے بعثت رسالت کے بعد سے اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک جو زمانہ گذارا، وہ تنگی معاش اور اقتصادی زبوں حالی کے لئے مشہور و معروف ہے ظاہر ہے کہ اس میں ایسی چیزوں کا کیا ذکر تھا۔

یہ حدیث دراصل آنحضرت ﷺ کی سادہ طبیعت اور بے تکلف زندگی کی واضح غماز ہے کہ آپ ﷺ کو اپنے کھانے پینے کا اتنا اہتمام بھی عزیز نہیں تھا، جتنا عام طور پر ایک معمولی حیثیت کے انسان کے یہاں بھی ہوتا ہے اور یہی وہ بنیادی سبق ہے جو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کی طرف متوجہ رہنا محض مقصد ناآشنا، بے وقوف اور غافل لوگوں کا شیوۂ زندگی ہے۔

آنحضرت ﷺ کسی کھانے کو برا نہیں کہتے تھے

(۱۴) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ مَا عَابَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَعَامًا قَطُّ اِنِ اشْتَهَاهُ اَكَلَهٗ وَاِنْ كَرِهَهٗ تَرَكَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے کبھی بھی کسی کھانے کو برا نہیں کہا اگر آپ ﷺ کو رغبت ہوتی تو اس کو کھا لیتے اور اگر ناپسند فرماتے تو اس کو چھوڑ دیتے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کھانے کی چیزوں کے سلسلہ میں آپ ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جو چیز آپ ﷺ کی پسندیدہ ہوتی، اس کو آپ ﷺ رغبت کے ساتھ کھا لیتے، اور جو چیز آپ ﷺ کو مرغوب و پسندیدہ نہ ہوتی تھی، اس کو نہیں کھاتے تھے، یہ نہیں تھا کہ جو چیز پسندیدہ نہ ہوتی اس کو برا کہتے اس میں عیب نکالتے۔

مؤمن ایک آنت سے اور کافر سات آنتوں سے کھاتا ہے

(۱۵) وَعَنْهُ اَنَّ رَجُلًا كَانَ يَاْكُلُ اَكْلًا كَثِيْرًا فَاَسْلَمَ وَكَانَ يَاْكُلُ قَلِيْلًا فَذُكِرَ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ يَاْكُلُ فِيْ مِعًى وَاحِدٍ وَاِنَّ الْكَافِرَ يَاْكُلُ فِيْ سَبْعَةِ اَمْعَاءٍ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَرَوٰى مُسْلِمٌ عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى وَابْنِ عُمَرَ الْمُسْنَدَ مِنْهُ فَقَطْ وَفِيْ اُخْرٰى لَهٗ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَافَهٗ ضَيْفٌ وَهُوَ كَافِرٌ فَاَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشَاةٍ فَحُلِبَتْ فَشَرِبَ حِلَابَهَا ثُمَّ اُخْرٰى فَشَرِبَهٗ ثُمَّ اُخْرٰى فَشَرِبَهٗ حَتّٰى شَرِبَ حِلَابَ سَبْعِ شِيَاهٍ ثُمَّ اِنَّهٗ اَصْبَحَ فَاَسْلَمَ فَاَمَرَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشَاةٍ فَحُلِبَتْ فَشَرِبَ حِلَابَهَا ثُمَّ

اَمَرَ بِاُخْرٰی فَلَمْ يَسْتَتِمَّهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُؤْمِنُ يَشْرَبُ فِيْ مِعًا وَاحِدٍ وَالْكَافِرُ يَشْرَبُ فِيْ سَبْعَةِ اَمْعَاءٍ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص تھا، جو (پہلے تو) بہت زیادہ کھایا کرتا تھا، مگر جب مسلمان ہوا تو کم کھانے لگا، چنانچہ نبی کریم ﷺ کے سامنے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "حقیقت یہ ہے کہ مؤمن تو ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے (بخاریؒ) اور مسلمؒ نے اس روایت کو حضرت ابوموسیٰؓ اور حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے جس میں (یہ واقعہ مذکور نہیں ہے بلکہ) محض آنحضرت ﷺ کا ارشاد مذکور ہے، لیکن مسلمؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے ایک اور روایت نقل کی ہے جس میں یوں ہے۔ کہ "(ایک دن) رسول کریم ﷺ کے ہاں ایک مہمان آیا جو کافر تھا، رسول کریم ﷺ نے اس کے لئے ایک بکری دوہنے کا حکم دیا، بکری دوہی گئی اور اس کافر نے اس دودھ کو پی لیا، پھر آپ ﷺ کے حکم سے دوسری بکری دوہی گئی، وہ اس دودھ کو بھی پی گیا، پھر جب صبح ہوئی تو وہ مسلمان ہو گیا، رسول کریم ﷺ نے (اس وقت بھی) اس کے لئے ایک بکری دوہنے کا حکم دیا۔ بکری دوہی گئی اور اس نے اس کا دودھ پی لیا پھر آپ ﷺ نے دوسری بکری دوہنے کا حکم دیا (بکری دوہی گئی) لیکن (اب) وہ اس کا پورا دودھ نہ پی سکا، رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" مؤمن ایک آنت میں پیتا ہے اور کافر سات آنتوں میں۔"

تشریح: کہا جاتا ہے کہ انسان کے پیٹ میں سات آنتیں ہوتی ہیں لیکن اس سے قطع نظر یہاں ایک آنت اور سات آنت سے مراد قلب حرص اور کثرت حرص ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کھانے پینے میں کم حرص رکھتا ہے، اور کافر زیادہ حرص رکھتا ہے اور یہ بات اکثر واغلب کے اعتبار سے ہے یا اس مخصوص شخص کی حالت بیان کرنا مراد ہے، جس کا روایت میں ذکر کیا گیا ہے کہ وہ جب مسلمان ہوا تو کم کھانے لگا، لیکن جب کافر تھا تو زیادہ کھاتا، یا کامل الایمان مؤمن مراد ہے کہ وہ ذکر الٰہی کی برکت اور نور و معرفت ایمان کے سبب ہمہ وقت سیر رہتا ہے کہ اس کو نہ کھانے پینے کی حرص ہوتی ہے اور نہ کھانے پینے کے اہتمام کی طرف رغبت، اس کے برعکس کافر کا حال دوسرا ہوتا ہے! درحقیقت اس حدیث میں یہ تنبیہ ہے کہ مؤمن کی شان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ صبر و قناعت کو لازم جانے، زہد و ریاضت کی راہ کو اختیار کرنے، خور و نوش کی اسی حد پر اکتفا کرے جو زندگی کی بقاء کے لئے ضروری ہو، اور اپنے معدے کو اتنا خالی رکھے۔ جو نورانیت دل، صفائی باطن اور شب بیداری وغیرہ کے لئے ممد و معاون ہو۔

منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک فقیر حضرت عمر فاروقؓ کے پاس آیا اور بہت زیادہ کھا کر اٹھا، حضرت عمرؓ نے جب اس کو اتنا زیادہ کھاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ آئندہ اس کو میرے پاس نہ آنے دیا جائے، علماء نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ جب اس فقیر نے اس قدر غیر معمولی طور پر کھایا تو گویا وہ کفار کے مشابہ ہوا، اور جو شخص کافروں کی مشابہت اختیار کرے اس سے ملنا جلنا ترک کر دینا چاہئے، واضح رہے کہ کم کھانے کی عادت اختیار کرنا، عقلاء باہمت اور اہل حقیقت کے نزدیک مستحسن و محمود ہے، اور اس کا برعکس مذموم ہے، لیکن وہ بھوک جو حد افراط کو پہنچ جائے، ضعف بدن اور قوائے جسمانی کے اختلال کا باعث ہو اور جس کی وجہ سے دین و دنیا کے امور کی انجام دہی میں رکاوٹ پیدا ہو، وہ ممنوع اور طریقہ حکمت کے منافی ہے۔

تھوڑے کھانے میں بھی دوسروں کو شریک کر لینا بہتر ہے

(۱۶) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَعَامُ الْاِثْنَيْنِ كَافِي الثَّلَاثَةِ وَطَعَامُ الثَّلَاثَةِ كَافِي الْاَرْبَعَةِ۔
(متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "دو آدمیوں کا کھانا تین آدمیوں کو اور تین کا کھانا چار کو کافی ہوتا ہے۔"
(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو کھانا دو آدمیوں کو سیر کر دیتا ہے وہ تین آدمیوں کو بھی سیر کر دیتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس کھانے کو دو آدمی سیر ہو کر کھاتے ہیں۔ وہ تین آدمیوں کے لئے بطور قناعت کافی ہو جاتا ہے، کہ وہ تینوں کی بھوک ختم کر دیتا ہے ان کو عبادت و طاعت کی طاقت و قوت عطا کر دیتا ہے اور ان کے ضعف کو دور کر دیتا ہے اس پر مابعد کی عبارت "تین آدمیوں کا کھانا چار کو کافی ہوتا ہے" کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے، اصل میں حدیث کی غرض اس طرف متوجہ کرنا ہے کہ اگر تمہیں اتنا کھانا میسر ہو جو تمہارا پیٹ پوری طرح بھر سکتا ہے تو اس کو محض اپنے پیٹ بھرنے میں صرف نہ کرو، بلکہ درجۂ قناعت اختیار کر کے اس میں سے اتنا ہی کھاؤ جو تمہاری غذائی ضرورت کے بقدر ہو، جو تمہاری ضرورت واقعی سے زائد ہو، اس کو کسی دوسرے محتاج کو کھلا دو۔

⑰ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ طَعَامُ الْوَاحِدِ يَكْفِي الْاِثْنَيْنِ وَ طَعَامُ الْاِثْنَيْنِ يَكْفِي الْاَرْبَعَةَ وَطَعَامُ الْاَرْبَعَةِ يَكْفِي الثَّمَانِيَةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا، کہ ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کو، دو کا کھانا چار کو، اور چار کا کھانا آٹھ کو کافی ہوتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں بھی وہی تاویل ہوگی جو اوپر بیان ہوئی، لیکن اوپر کی حدیث میں ثلث و ربع کے حساب سے فرمایا گیا ہے۔ (کہ ایک کا کھانا دو کو اور دو کا تین کو کافی ہوتا ہے) اور اس حدیث میں بطریق تضاعف (دگنے کے حساب سے) فرمایا گیا ہے (کہ ایک کا کھانا دو کو اور دو کا چار کو کافی ہوتا ہے) یہ اختلاف اشخاص و احوال کے تفاوت کے سبب سے ہے، کہ جس جذبۂ قناعت اور ایثار کی صورت میں دو آدمیوں کا کھانا تین آدمیوں کے لئے کافی ہوتا ہے، بعض حالات اور بعض آدمیوں کی صورت میں وہی جذبۂ قناعت و ایثار کچھ اور بڑھ کر دو آدمیوں کا کھانا چار آدمیوں کے لئے بھی کافی قرار دے دیتا ہے۔

منقول ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک مرتبہ قحط سالی کے دنوں میں فرمایا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں ہر گھر والوں کے پاس ان کی تعداد کے بقدر آدمی بھیج دوں، کیونکہ آدمی آدھا پیٹ کھانے سے ہلاک نہیں ہوتا (حضرت عمرؓ کا مطلب یہ تھا کہ اس قحط کے زمانہ میں بھی کچھ لوگوں کو اسباب معیشت میسر ہیں اور وہ دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہیں، جب کہ کتنے ہی بندگان خدا ایسے ہیں جنہیں بقاء زندگی کے بقدر بھی خوراک میسر نہیں ہے، میں چاہتا ہوں کہ جن گھروں کو خدا نے پیٹ بھر کھانے کے بقدر میسر کر رکھا ہے، ان میں سے ہر گھر کے ذمہ اتنے محتاج نادار لوگوں کا کھانا کر دوں، جتنے خود گھر والے ہیں، مثلاً جس گھر میں پانچ آدمی ہیں، اس گھر کے ذمہ پانچ ہی ناداروں کا کھانا کر دوں، کہ وہ اپنے اتنے ہی کھانے میں کہ جو وہ اپنے لئے تیار کرتے ہیں، ان پانچوں ناداروں کو بھی شریک کر لیں۔ اس طرح وہ اپنا آدھا پیٹ کاٹ کر ان ناداروں کی زندگی کی بقاء کا ذریعہ بن جائیں گے جن کو کچھ بھی کھانے کے لئے میسر نہیں تھا، اور ظاہر ہے کہ آدھا پیٹ بھرنے سے جسم کی توانائی میں کچھ کمی بے شک آجائے مگر اس کی وجہ سے آدمی ہلاک نہیں ہوتا۔

بہر حال ان احادیث و روایات کا اصل مقصد غرباء کی خبر گیری اور اپنی تئیں ایثار و قناعت کو اختیار کرنے کی طرف راغب کرنا ہے اور اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہ نفس امارہ کا تقاضا تو ہو سکتا ہے کہ جو کچھ بھی میسر ہو وہ اپنے پیٹ میں ڈال لیا جائے، لیکن انسانیت کا تقاضا یہی ہے کہ خدا نے تمہیں جو کچھ دیا ہے کہ اس میں ان لوگوں کو بھی شریک کرو، جنہیں کچھ بھی میسر نہیں ہو سکا ہے۔

تلبینہ بیمار کے لئے بہترین چیز ہے

⑱ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ التَّلْبِيْنَةُ مُجِمَّةٌ لِفُؤَادِ الْمَرِيْضِ تَذْهَبُ بِبَعْضِ الْحُزْنِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا "تلبینہ" بیمار کے دل کو تسکین و قوت دیتا ہے اور بعض

غموں کو دور کرتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: تلبینہ اس حریرے کو کہتے ہیں، جو آٹے اور دودھ سے بنایا جاتا ہے، کبھی اس میں شہد بھی ملا دیتے ہیں، چونکہ اس حریرہ کا خاص جز دودھ ہوتا ہے اور دودھ کی طرح سفید بھی ہوتا ہے اس لئے اس کو تلبینہ کہتے ہیں "لبن" (دودھ) سے مشتق ہے۔

(۱۹) وعن انس ان خياطا دعا النبي صلى الله عليه وسلم لطعام صنعه فذهبت مع النبي صلى الله عليه وسلم فقرب خبز شعير ومرقا فيه دباء وقديد فرايت النبي صلى الله عليه وسلم يتتبع الدباء من حوالي القصعة فلم ازل احب الدباء بعد يومئذ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ایک درزی نے نبی کریم ﷺ کو اپنے تیار کئے ہوئے کھانے پر مدعو کیا، نبی کریم ﷺ کے ہمراہ میں بھی گیا، اس نے جو کی روٹی اور شوربا لاکر (دسترخوان پر) رکھا جس میں کدو اور خشک گوشت تھا، چنانچہ میں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ (کو کدو چونکہ بہت مرغوب تھا اس لئے آپ ﷺ) پیالے کے کناروں میں سے کدو کو تلاش کر کر کے کھاتے تھے، اسی لئے اس دن کے بعد سے میں کدو کو بہت پسند کرتا ہوں (کیونکہ وہ آنحضرت ﷺ کو بہت پسند تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت انسؓ کا اس دعوت میں جانا یا تو اس بنا پر تھا، کہ ان کو بھی مدعو کیا گیا ہوگا یا وہ چونکہ آنحضرت ﷺ کے خادم خاص تھے اور کسی بھی دعوت میں خادم کے ساتھ ہونے کی اجازت رائی کی طرف سے عام طور پر ہوتی ہے، اس لئے حضرت انسؓ، آنحضرت ﷺ کے ہمراہ اس دعوت میں شریک ہوئے، اس حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ اگر دسترخوان پر کسی پیالے یا برتن میں کھانے کی مختلف چیزیں ایک ساتھ ہوں تو اس پیالے یا برتن کے دوسرے کنارہ تک ہاتھ بڑھانا جائز ہے، اس صورت میں محض اپنے سامنے کے کنارے تک اپنے ہاتھ کو محدود رکھنا ضروری نہیں ہوگا، بشرطیکہ دسترخوان پر بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ اس کو ناپسند کریں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ غرباء اور دست کاروں کی دعوت قبول کرنا چاہئے اور وہ دسترخوان پر کھانے کی جو بھی چیز لاکر رکھیں اس کو برضا و رغبت کھانا چاہئے، تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر کھانے کے وقت اپنا خادم ساتھ ہو تو اس کو اپنے ساتھ ہی کھانا کھلانا چاہئے، یہ خالص دنیا داروں کا طریقہ ہے کہ خود تو الگ بیٹھ کر کھائیں اور خادم کو دوسری جگہ بٹھا کر کھلائیں۔ اور چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ کدو کو اپنی پسندیدہ غذا قرار دینا مسنون ہے، اور اس طرح ہر اس چیز کو پسند و مرغوب رکھنا مسنون ہے، جس کو آنحضرت ﷺ پسندیدہ و مرغوب رکھتے تھے۔

چھری کانٹے سے کھانے کا مسئلہ

(۲۰) وعن عمرو بن امية انه رأى النبي صلى الله عليه وسلم يحتز من كتف شاة في يده فدعي الى الصلوة فالقاها والسكين التي يحتز بها ثم قام فصلى ولم يتوضأ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرو ابن امیہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا، کہ آپ بکری کا شانہ جو آپ کے ہاتھ میں تھا چھری سے کاٹتے تھے، پھر آپ ﷺ کو (اسی دوران) نماز کے لئے بلایا گیا، تو آپ ﷺ شانے کو اور اس چھری کو کہ جس سے وہ شانہ کاٹ رہے تھے وہیں چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور نماز ادا کی، آپ ﷺ نے (اس وقت) وضو نہیں کیا (کیونکہ آپ وضو سے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کھاتے وقت گوشت یا کھانے کی کوئی بھی چیز کاٹ کاٹ کر کھانا جائز ہے، بشرطیکہ اس کی ضرورت ہو اور اگر وہ گوشت یا کوئی بھی چیز گلی ہوئی اور نرم ہو کہ اس کو چھری سے کاٹنے کی ضرورت نہ ہوتی ہو، تو پھر چھری سے کاٹ کر کھانا مکروہ ہوگا، کیوں کہ اس طرح بلا ضرورت چھری کانٹے سے کھانا عجمیوں (یعنی غیر مسلموں کے) تکلفات میں شمار کیا گیا ہے، جیسا کہ دوسری فصل میں بیان ہوگا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ داعی حق (نماز کے لئے بلانے والے یا اذان) کی آواز سن کر کھڑے ہو جانا اور نماز میں پہنچ جانا

چاہئے اگرچہ کھانا سامنے رکھا ہوا ہو، لیکن یہ اس صورت کا حکم ہے جب کہ کھانے کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو، اس کھانے کی طرف شدید احتیاج نہ ہو، یعنی اتنی سخت بھوک نہ ہو کہ اگر وہ کھانا کھائے بغیر اٹھ کر نماز کے لئے چلا گیا تو نماز میں جی نہ لگے اور اس بات کا خوف نہ ہو کہ نماز سے واپس آنے کے بعد پھر کھانا نہیں ملے گا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کرنا ضروری نہیں ہوتا جیسا کہ بعض علماء کا مسلک ہے کہ ان کے نزدیک آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو میٹھی چیز بہت پسند تھی

(۲۱) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّ الْحَلْوٰٓءَ وَالْعَسَلَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ میٹھی چیز اور شہد کو بہت پسند فرماتے تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: عربی میں حَلْوآءَ (مد کے ساتھ) اور حَلْوَاءَ (قصر کے ساتھ) دونوں کا اطلاق اس میٹھی چیز پر ہوتا ہے جو مٹھاس اور چکنائی کے ذریعہ بنے، جس کو اردو میں حلوہ کہا جاتا ہے، اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ مطلق یعنی ہر میٹھی چیز کو حلوا کہتے ہیں اس صورت میں الحلواء کے بعد لفظ والعسل کا ذکر تخصیص بعد تعمیم کے طور پر ہوگا (یعنی پہلے تو حلوہ کا ذکر کیا) جو ایک عام لفظ ہے اور جس کے حکم میں شہد بھی داخل ہے، لیکن پھر بعد میں خاص طور پر شہد کو بھی ذکر کر دیا، خطابیؒ نے کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا میٹھی چیز کو بہت پسند کرنا طبعی خواہش کی زیادتی کی بنا پر نہیں تھا کہ آپ ﷺ اکثر و بیشتر میٹھی چیز کھانا پسند فرماتے ہوں بلکہ "بہت پسند کرنے" کا مطلب محض یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے سامنے دسترخوان پر میٹھی چیز آتی تو آپ ﷺ اس کو اتنی رغبت کے ساتھ تناول فرماتے کہ معلوم ہوتا کہ یہ آپ ﷺ کو بہت مرغوب ہے۔

سرکہ ایک بہترین سالن ہے

(۲۲) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَأَلَ اَهْلَهُ الْاُدُمَ فَقَالُوْا مَاعِنْدَنَا اِلَّا خَلٌّ فَدَعَابِهٖ فَجَعَلَ يَاْكُلُ بِهٖ وَيَقُوْلُ نِعْمَ الْاِدَامُ الْخَلُّ نِعْمَ الْاِدَامُ الْخَلُّ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے اپنے گھر والوں سے سالن مانگا، گھر والوں نے کہا کہ ہمارے پاس سالن نہیں ہے البتہ سرکہ ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے سرکہ منگوایا اور اس کے ساتھ روٹی کھانے لگیں اور یہ فرماتے جاتے تھے کہ "سرکہ بہترین ہے، سرکہ بہترین سالن ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "سرکہ بہترین سالن ہے" یہ بار بار آپ ﷺ نے اس لئے فرمایا کہ سرکہ کی زیادہ سے زیادہ تعریف ہو، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کھانے پینے میں اعتدال و میانہ روی اختیار کرنا اور اپنے نفس کو لذیذ چیزوں سے باز رکھنا اچھی بات ہے۔ حدیث سے یہ بھی مفہوم ہوا کہ اگر کوئی شخص یہ قسم کھالے کہ میں سالن سے روٹی نہیں کھاؤں گا اور پھر سرکہ سے روٹی کھالے تو وہ حانث (یعنی قسم کو توڑنے والا) ہوگا کیونکہ سرکہ کا سالن ہونا اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ سرکہ انبیاء کرام صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین کا سالن ہے اور طبی طور پر سرکہ کے جو منافع و فوائد ہیں، وہ بہت زیادہ ہیں، جن کی تصدیق طبی کتابوں اور اطباء کے ذریعہ کی جاسکتی ہے۔

کھنبی کی فضیلت و خاصیت

(۲۳) وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَ مَاؤُهَا شِفَآءٌ لِّلْعَيْنِ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ

رِوَایَةٍ لِمُسْلِمٍ مِنَ الْمَنِّ الَّذِیْ اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی مُوْسٰی عَلَیْهِ السَّلَامُ۔

"اور حضرت سعید ابن زیدؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "کھنبی من کی ایک قسم ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفاء ہے (بخاریؒ و مسلمؒ) اور مسلمؒ کی ایک روایت میں ہے کہ کھنبی اس من میں سے ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا تھا۔"

تشریح: "کَمْأَۃَ" کاف کے زبر، میم کے جزم اور ہمزہ کے زبر کے ساتھ۔ رحمت کے وزن پر ہے، کماۃ، کھنبی کو کہتے ہیں، جو از قسم نباتات چربی کی مانند ایک چیز ہوتی ہے اور اکثر برسات میں از خود پیدا ہو جاتی ہے، عربی میں اس کو شحم الارض (زمین کی چربی) بھی کہتے ہیں اور ہمارے یہاں عام طور پر اس کو سانپ کی چھتری کہا جاتا ہے۔ کھنبی حلال ہے اور بہت لوگ اس کو تل کر کھاتے بھی ہیں اگرچہ بعض مقامات پر اس کو کھانا طبعی طور پر مکروہ سمجھا جاتا ہے کیوں کہ وہاں اس کو کھانے کی عادت نہیں ہوتی۔

"کھنبی من کی ایک قسم ہے" کا مطلب یہ نہیں ہے، کھنبی اصل میں وہ من ہے جو اس آیت کریمہ وَاَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی (اور ہم نے بنی اسرائیل پر من و سلویٰ اتارا) کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل پر اترتا تھا، کیونکہ من تو ترنجبین کی طرح کی ایک چیز تھی جو آسمان سے اترتی تھی، اور یہ کھنبی زمین سے اگتی ہے، بلکہ "کھنبی، من کی ایک قسم ہے) کہ جس طرح من اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت تھی، جو بلا محنت و مشقت آسمان سے نازل ہوتی تھی اس طرح کھنبی بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو بلا محنت و مشقت زمین سے پیدا ہوتی ہیں، یا یہ مراد ہے کہ کھنبی اپنے منافع و فوائد کے لحاظ سے من کے مشابہ ہے۔

"اس کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے" بعض علماء نے کہا ہے اس کا پانی آنکھ کے لئے اس صورت میں شفاء کا حکم رکھتا ہے جب کہ اس کو دوسری دواؤں (جیسے سرمہ یا طوطیا وغیرہ) میں ملا کر آنکھوں میں لگایا جائے، اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ فقط کھنبی کا پانی بھی آنکھ کے لئے فائدہ ہے، اور حدیث کے مطلق مفہوم کی بناء پر یہی بات زیادہ صحیح ہے، بعض علماء نے اپنا ذاتی مشاہدہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا، جس کی بصارت جاتی رہی تھی اس نے کھنبی کا پانی لگایا تو اس کی بصارت درست ہو گئی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ قول بھی نقل کیا جاتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ میں نے تین یا پانچ کھنبیاں لے کر ان کو نچوڑا اور ان کا پانی ایک شیشی میں رکھا، ایک چھوکری نے اس کو آنکھوں میں لگایا تو وہ اچھی ہو گئی، بہر حال اس سلسلے میں تفصیل انشاء اللہ باب الطب والرقی میں بیان ہو گی۔

ککڑی اور کھجور کو ملا کر کھانے کا ذکر

(۴۴) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَاْکُلُ الرُّطَبَ بِالْقِثَّاءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن جعفرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو ککڑی اور تازہ کھجور ملا کر کھاتے دیکھا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ککڑی اور کھجور کو ملا کر کھانے کی صورت یا تو یہ ہوتی تھی، کہ دونوں کو ملا کر ایک ساتھ منہ میں رکھتے اور کھاتے تھے، یا یہ کہ پہلے ایک کھجور منہ میں رکھ لیتے اور پھر ایک ٹکڑا ککڑی کا رکھتے اور دونوں کو ساتھ کھاتے، آپ ﷺ دونوں کو ملا کر اس لئے کھاتے کہ دونوں مل کر معتدل ہو جائیں کیوں کہ کھجور میں حرارت ہوتی ہے اور ککڑی میں برودت اور مرکبات کی سب سے بڑی اصل اعتدال ہے کہ معتدل چیز تعدیل مزاج کی باعث بھی ہوتی ہے اور بہت زیادہ نفع بھی بخشتی ہے۔

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ ایک وقت میں کھانے کی دو چیزوں کو غذا بنانا، یا کھانے پینے میں وسعت و فراخی اختیار کرنا، یعنی کھانے کی ایک سے زائد چیزیں تیار کرانا اور کھانا جائز ہے، چنانچہ اس کے جواز کے بارے میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ جن علماء نے اس کو مکروہ کہا ہے وہ اس صورت پر محمول ہے جب کہ کھانوں کی زیادہ مقدار و قسمیں تیار کرانا اور کھانا اور عمدہ اقسام و انواع کے کھانوں کو غذا بنانا بطور عادت اختیار کیا جائے اور کھانے کی اس تنوع و کثرت کی بنیاد کسی دینی مصلحت و فائدے کے بجائے محض لذت کام

بودوباش اور حصول عیش پر ہو۔

پیلو کے پھل کی فضیلت

(۲۵) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَرِّ الظَّهْرَانِ نَجْنِي الْكَبَاثَ فَقَالَ عَلَيْكُمْ بِالْاَسْوَدِ مِنْهُ فَاِنَّهٗ اَطْيَبُ فَقِيْلَ اَكُنْتَ تَرْعِي الْغَنَمَ قَالَ نَعَمْ وَهَلْ مِنْ نَبِيٍّ اِلَّا رَعَاهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک موقع پر) ہم رسول کریم ﷺ کے ہمراہ مقام مرالظہران میں تھے (جو مکہ کے قریب ایک جگہ ہے) اور پیلو کے پکے پکے پھل جمع کر رہے تھے، کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اس کا جو پھل سیاہ ہو، وہ لے لو) کیونکہ وہ اچھا ہوتا ہے اور فائدہ بھی پہنچاتا ہے" ہم نے عرض کیا (یارسول اللہ ﷺ) کیا آپ (ﷺ) نے بکریاں چرائی ہیں؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "ہاں! اور کونسا نبی ہے جس نے بکریاں نہیں چرائی ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "کیا آپ ﷺ نے بکریاں چرائی ہیں" اس سوال کا مطلب یہ تھا کہ پیلو کے پھل چونکہ ان لوگوں کی خاص خوراک وغذا ہے جو جنگل میں بودوباش رکھتے ہیں، یا بکریاں چرایا کرتے ہیں اور اسی اعتبار سے وہی لوگ اس پھل کے اچھے برے کی تمیز رکھتے ہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟

"اور کون سا نبی ہے جس نے بکریاں نہیں چرائی ہیں" اس ارشاد کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ نے نبوت کا منصب کبھی بھی دنیاداروں، بادشاہوں اور متکبر و مغرور لوگوں کے طبقہ کو عطا نہیں فرمایا، بلکہ دین و دنیا کے اس سب سے بڑے منصب کی ذمہ داری ہمیشہ ان لوگوں کے سپرد کی گئی جو بکریاں چراتے تھے، مفلس و نادار ہوتے تھے، اور انتہائی تواضع وانکساری کے ساتھ دست کاری و کاریگری کا پیشہ اختیار کئے ہوتے تھے، چنانچہ منقول ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام خیاطی کا کام کرتے تھے، حضرت زکریا علیہ السلام بخاری کرتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اجرت پر، حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چرایا کرتے تھے، اور اس میں حق تعالیٰ کی مصلحت و حکمت یہ ہوتی تھی کہ طبقۂ انسانی کے ان برگزیدہ ترین لوگوں کی پرورش و نمو حلال رزق کے ذریعہ ہو جو عام طور پر سخت محنت و مشقت ہی کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے عمل صالح کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر ہوں، اور وہ زیادہ زیادہ نیک کام کریں، اور خاص طور پر بکریاں چرانے میں ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ لوگوں سے یکسوئی اور حق تعالیٰ جل شانہ کے ساتھ خلوت کا موقع حاصل ہوتا نیز رعایا پروری کے طور طریقے، اور کمزور و نادار لوگوں کے ساتھ شفقت و نرمی کا برتاؤ رکھنے کا سبق ملتا تھا۔

چنانچہ ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ (ایک دن) اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل کی کہ "موسیٰ (علیہ السلام)! جانتے ہو ہم نے تمہیں نبوت کا منصب اعظم کیوں عطا کیا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا "پروردگارا! تو ہی جانتا ہے" اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اس دن کو یاد کرو.... جب تم وادی الایمن میں بکریاں چرا رہے تھے، اور ایک بکری بھاگ کھڑی ہوئی تھی، تم اس کے پیچھے دوڑے، جس کی وجہ سے تمہیں بہت زیادہ تکلیف و مشقت برداشت کرنا پڑی، پھر جب تم نے اس بکری کو جالیا، تو تم نے نہ اس بکری کو مارا، اور نہ اس پر غیظ و غضب کا اظہار کیا، بلکہ اس کے ساتھ شفقت و نرمی کا برتاؤ کیا، اور اس کو مخاطب کر کے کہا کہ اوہ بیچاری! تو نے اپنے آپ کو بھی تکلیف و مصیبت میں مبتلا کیا اور مجھے بھی کلفت و تعب میں ڈالا۔ جب ہم نے اس حیوان کے تئیں تمہاری یہ شفقت و رحم پروری دیکھی، تو ہم پر ہماری رحمت متوجہ ہوئی، کہ تمہیں نبوت سے سرفراز کیا اور اپنا برگزیدہ بندہ قرار دیا۔"

آنحضرت ﷺ کس طرح بیٹھ کر کھاتے تھے

(۲۶) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُقْعِيًا يَاْكُلُ تَمْرًا وَفِيْ رِوَايَةٍ يَاْكُلُ مِنْهُ اَكْلًا ذَرِيْعًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو بہ ہیئت اقعاء بیٹھ کر کھجوریں کھاتے دیکھا ہے۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ ﷺ کھجوروں کو جلدی جلدی کھا رہے تھے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "بہ ہیئت اقعاء" سے مراد بیٹھنے کی وہ صورت ہے، جس میں دونوں سرین زمین پر رکھے جائیں اور دونوں زانو کھڑے کر لئے جائیں۔

کھجوروں کو جلدی جلدی کھانے کا سبب یہ تھا کہ اس وقت آپ ﷺ کو کوئی کام درپیش ہوگا اس لئے آپ ﷺ نے کھجوروں کو جلدی جلدی کھایا تاکہ اس سے فارغ ہو کر اس کام میں مشغول ہو جائیں۔

کئی آدمی ہوں تو دو دو کھجوریں ساتھ ساتھ نہ کھاؤ

(۲۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّقْرِنَ الرَّجُلُ بَيْنَ التَّمْرَ تَيْنِ حَتّٰى يَسْتَأْذِ نَ اَصْحَابَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص دو کھجوروں کو جمع کرے، یعنی ایک ساتھ دو دو کھجوریں کھائے الا یہ کہ وہ اپنے ساتھیوں سے اجازت لے لے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: سیوطیؒ کہتے ہیں کہ اس ممانعت کا تعلق اس وقت سے تھا، جب کہ مسلمان فقر و افلاس اور تنگی معاش میں مبتلا تھے، لیکن جب انہیں خدا نے معاش میں وسعت و فراخی اور خوشحالی عطا فرمائی، تو آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی کے ذریعہ ممانعت منسوخ ہو گئی کہ۔ "میں تمہیں کھجوروں کو جمع کرنے سے (یعنی ایک سے زائد کھجوروں کو ایک ساتھ کھانے سے) منع کرتا تھا، مگر اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں رزق کی وسعت و فراخی عطا فرمائی ہے تو جمع کرو، یعنی اگر تم اب ایک سے زائد کھجوریں ایک ساتھ کھاؤ تو یہ حرام یا مکروہ نہیں ہوگا۔" لیکن اس سلسلے میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اگر چند لوگ کسی بھی کھانے کی چیز اپنی غذائی ضرورت میں صرف کرنے کا مشترکہ طور پر یکساں حق رکھتے ہوں اور ان کی طرف سے اس چیز کو خرچ سے مقررہ مقدار سے زیادہ کھانے پر پابندی) نہ ہو تو اس صورت میں بھی مروت و ادب کا تقاضا بہر حال یہی ہوگا کہ ایسا نہ کیا جائے (یعنی دوسرے ساتھیوں سے زیادہ کھانے مقررہ مقدار سے تجاوز کرنے کی کوشش نہ کی جائے کہ یہ کھانے کے آداب کے بھی منافی ہے اور مروت کے بھی خلاف ہے، ہاں اگر تمام ساتھی ایسا کرنے کی صریح اجازت دے دیں یا کوئی ایسی چیز ہو جو ان کی طرف سے اجازت پر دلالت کرے تو کوئی مضائقہ نہیں، لہٰذا سابقہ ممانعت کا تعلق دونوں صورتوں (یعنی حالت فقر و افلاس اور شرکت) سے ہوگا اور اباحت و استثناء کا تعلق شرکت کے علاوہ دوسری صورت سے ہوگا۔

کھجور کی فضیلت

(۲۸) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَجُوْعُ اَهْلُ بَيْتٍ عِنْدَهُمُ التَّمْرُ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ يَا عَائِشَةُ بَيْتٌ لَا تَمْرَ فِيْهِ جِيَاعٌ اَهْلُهٗ قَالَهَا مَرَّتَيْنِ اَوْ ثَلَاثًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اس گھر کے لوگ بھوکے نہیں رہتے جس گھر میں کھجور ہو۔" اور ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "عائشہؓ! جس گھر میں کھجور نہ ہو اس گھر کے رہنے والے بھوکے ہیں۔" آپ ﷺ نے یہ الفاظ تین مرتبہ فرمائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: بعض علماء نے وضاحت کی ہے کہ "اس گھر کے رہنے والوں" سے مراد اہل مدینہ اور وہ لوگ ہیں جن کی غذا کھجور ہے۔ نووی نے کہا ہے کہ اس حدیث میں در حقیقت کھجوروں کی فضیلت و اہمیت کا بیان ہے، اور اس کے ذریعہ اپنے گھر والوں کی غذائی ضروریات

کے لئے کھجوروں کا ذخیرہ کرنے کے جواز کا اظہار اور اس کی ترغیب دینا مقصود ہے۔

عجوہ کھجور کی تاثیر

(۲۹) وَعَنْ سَعِيْدٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ تَصَبَّحَ بِسَبْعِ تَمَرَاتٍ عَجْوَةٍ لَمْ يَضُرَّهُ ذٰلِكَ الْيَوْمَ سَمٌّ وَلَا سِحْرٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جو شخص صبح کے وقت (کوئی اور چیز کھانے سے پہلے) سات عجوہ کھجوریں کھائے گا اس کو اس دن کوئی زہر اور جادو نقصان نہیں پہنچائے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "عجوہ" مدینہ کی کھجوروں میں سے ایک قسم ہے جو صیحانی سے بڑی اور مائل بہ سیاہی ہوتی ہے، یہ قسم مدینہ کی کھجوروں میں سب سے عمدہ اور اعلےٰ ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کھجور کا اصل درخت آنحضرت ﷺ نے لگایا تھا۔

"زہر" سے مراد وہی زہر ہے جو مشہور ہے (یعنی وہ چیز جس کو کھانے سے آدمی مرجاتا ہے) یا سانپ، بچھو اور ان جیسے دوسرے زہریلے جانوروں کا زہر بھی مراد ہو سکتا ہے مذکورہ خاصیت (یعنی دافع سحر و زہر ہونا) اس کھجور میں حق تعالیٰ کی طرف سے پیدا کی گئی ہے جیسا کہ قدرت نے از قسم نباتات دوسری چیزوں (جڑی بوٹیوں وغیرہ) میں مختلف اقسام کی خاصیتیں رکھی ہیں، اور یہ بات آنحضرت ﷺ کو بذریعہ وحی معلوم ہوئی ہوگی کہ کھجور میں یہ خاصیت ہے، یا یہ کہ آنحضرت ﷺ کی دعا کی برکت سے اس کھجور میں یہ خاصیت ہے۔ جہاں تک سات کے عدد کی تخصیص کا سوال ہے تو اس کی وجہ شارع کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں، بلکہ اس کا علم توقیفی ہے یعنی آنحضرت ﷺ سے سماعت پر موقوف ہے، کہ آپ ﷺ نے سات ہی کا عدد فرمایا اور سننے والوں نے اسی کو نقل کیا، نہ تو آنحضرت ﷺ نے اس تخصیص کی وجہ بیان فرمائی اور نہ سننے والوں نے دریافت کیا جیسا کہ رکعات وغیرہ کے اعداد کا مسئلہ ہے۔

(۳۰) وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ فِي عَجْوَةِ الْعَالِيَةِ شِفَاءً وَإِنَّهَا تِرْيَاقٌ أَوَّلَ الْبُكْرَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "عالیہ کی عجوہ (کھجوروں) میں شفا ہے اور وہ (زہر وغیرہ کے لئے) تریاق کی خاصیت رکھتی ہے۔ جب کہ اس کو دن کے ابتدائی حصے میں (یعنی نہار منہ کھایا جائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مدینہ منورہ کے اطراف میں قبا کی جانب جو علاقہ بلندی پر واقع ہے وہ عالیہ یا عوالی کہلاتا ہے، اسی مناسبت سے ان اطراف میں جتنے گاؤں اور دیہات ہیں ان سب کو عالیہ یا عوالی کہتے ہیں، اسی سمت نجد کا علاقہ ہے اور اس کے مقابل سمت میں جو علاقہ ہے وہ نشیبی ہے اور اس کو سافلہ کہا جاتا تھا۔ اس سمت میں تہامہ کا علاقہ ہے۔ اس زمانہ میں عالیہ یا عوالی کا سب سے نزدیک والا گاؤں مدینہ سے تین یا چار میل اور سب سے دور والا گاؤں سات یا آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔

"عالیہ کی عجوہ میں شفا ہے" کا مطلب یا تو یہ ہے کہ دوسری جگہوں کی عجوہ کھجوروں کی بہ نسبت عالیہ کی عجوہ کھجوروں میں زیادہ شفا ہے، یا اس سے حدیث سابق کے مطلق مفہوم کی تقیید مراد ہے، یعنی پچھلی حدیث میں مطلق عجوہ کھجور کی جو تاثیر و خاصیت بیان کی گئی ہے اس کو اس حدیث کے ذریعہ واضح فرمادیا گیا ہے کہ مذکورہ تاثیر و خاصیت عالیہ کی عجوہ کھجوروں میں ہوتی ہے۔

تریاق: ت کے پیش اور زیر دونوں کے ساتھ۔ وہ مشہور دوا ہے جو دافع زہر وغیرہ ہوتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی تنگئ معاش

(۳۱) وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ يَأْتِيْ عَلَيْنَا الشَّهْرُ مَا نُوْقِدُ فِيْهِ نَارًا إِنَّمَا هُوَ التَّمْرُ وَالْمَاءُ إِلَّا أَنْ يُّؤْتٰى بِاللُّحَيْمِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ بعض مہینہ ہم پر ایسا گزرتا تھا کہ ہم اس میں آگ نہ جلاتے تھے (یعنی بعض مرتبہ پورا پورا مہینہ ایسا گزرتا تھا کہ ہمارے گھر میں سامان خوارک نہ ہونے کی وجہ سے چھولھے میں آگ بھی نہیں جلتی تھی) اور (اس عرصہ میں) ہماری غذا کا انحصار (صرف) کھجور اور پانی پر ہوتا تھا۔ الا یہ کہ کہیں سے تھوڑا سا گوشت آجاتا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "الاّ یہ کہ کہیں سے تھوڑا سا گوشت آجاتا تھا" کا مطلب یہ ہے کہ تنگی معاش کے اس عرصہ میں ہم صرف کھجوریں کھا کھا کر اور پانی پی پی کر گزر کر لیا کرتے تھے، یا اگر کوئی شخص تھوڑا بہت گوشت بھیج دیا کرتا تھا تو اس کو کھالیتے تھے۔ یا یہ مطلب ہے کہ گھر میں خوراک کا کوئی سامان نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے چولھے میں آگ نہیں جلتی تھی، ہاں اگر کہیں سے کچھ گوشت آجاتا تو اس کو پکانے کے لئے آگ جلالیا کرتے تھے۔

(۳۲) وعنھا قالت مَاشَبِعَ اٰلُ مُحَمَّدٍ یَوْمَیْنِ مِنْ خُبْزِ بُرٍّ اِلَّاوَاَحَدُھُمَا تَمْرٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایسا (کبھی نہیں ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے گھر والوں نے دو دن گیہوں کی روٹی سے اپنا پیٹ بھرا ہو، اور ان دو دنوں میں سے ایک دن کی غذا کھجور نہ ہوئی ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ اور آپ ﷺ کے اہل و عیال کبھی بھی مسلسل دو دنوں تک گیہوں کی روٹی نہیں کھاتے تھے، جہاں تک گیہوں کی روٹی کی قید لگانے کا سوال ہے تو ہو سکتا ہے کہ جو کی روٹی میسر ہو جاتی ہو۔

(۳۳) وَعَنْھَا قَالَتْ تُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمَاشَبِعْنَامِنَ الْاَسْوَدَیْنِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ اور ہم نے (آپ ﷺ کی حیات میں کبھی) دو سیاہ چیزوں یعنی کھجور اور پانی سے پیٹ نہیں بھرا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ حدیث بھی واضح کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے اہل و عیال کس تنگی و سختی کے ساتھ اپنی زندگی گذارتے تھے اور باوجویکہ اگر آپ چاہتے تو دنیا کی تمام لذات اور ایک خوش حال، بافراغت زندگی گذارنے کے سارے وسائل و ذرائع آپ ﷺ کے قدموں میں ہوتے مگر آپ ﷺ ہمیشہ کمال ایثار و استغناء اور نفس کشی و ترک لذات پر عامل رہے۔

اسودین (دو سیاہ چیزوں) میں سے ایک سیاہ چیز کھجور ہے اور دوسری سیاہ چیز پانی! کو سیاہ چیز سے تعبیر کرنا مجاورت و مقارنت کی وجہ سے ہے اور اس طرح کا طرز کلام اہل عرب کی یہاں مستعمل ہے، جیسا کہ ماں اور باپ کو ابوین یا چاند اور سورج کو قمرین کہتے ہیں، اس کو عربی میں "تغلیب" کہتے ہیں۔ تاہم واضح رہے کہ اس ارشاد میں "پانی کا ذکر کھجور کے ضمن و طفیل میں ہے، اصل مقصد کھجور ہی کا ذکر کرنا ہے، کیوں کہ پانی نہ تو پیٹ بھرنے کے مصرف میں آتا ہے اور نہ اس کی کوئی کمی ہی تھی، اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ آنحضرت ﷺ اور ان کے گھر والوں کو غذا کے طور پر کھجوریں بھی اتنی مقدار میں مہیا نہیں ہوتی تھیں جو پیٹ بھرنے کے بقدر رہوں، بلکہ بس اتنی ہی مہیا ہو جاتی تھیں جس سے پیٹ کو سہارا مل جاتا تھا۔

(۳۴) وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِیْرٍ قَالَ اَلَسْتُمْ فِیْ طَعَامٍ وَّشَرَابٍ مَاشِئْتُمْ لَقَدْ رَاَیْتُ نَبِیَّکُمْ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمَایَجِدُ مِنَ الدَّقَلِ مَایَمْلَاُ بَطْنَہٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت نعمان ابن بشیرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے (ایک موقع پر) فرمایا۔ "کیا تم لوگ اپنے کھانے پینے میں جس طرح چاہتے ہو عیش نہیں کرتے (یعنی تم اپنے کھانے پینے کی چیزوں میں اپنی خواہش کے مطابق وسعت و افراط اختیار کر کے عیش و راحت کی زندگی گذار رہے ہو) جب کہ میں نے تمہارے نبی ﷺ کو اس حال میں دیکھا ہے کہ آپ ﷺ کو ناکارہ کھجوریں۔ بھی اس قدر میسر نہیں ہوتی تھیں جو آپ ﷺ کا پیٹ بھر دیتیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: "کیا تم..... الخ، حضرت نعمان ابن بشیرؓ نے یہ بات یا تو تابعین کو مخاطب کر کے کہی، یا آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد صحابۂ کرامؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہی۔

"تمہارے نبی ﷺ..... الخ" مخاطبین کی طرف نبی ﷺ کی اضافت و نسبت ان کو الزام دینے یا یوں کہا جائے کہ غیرت دلانے کے لئے کی، کہ تم جس نبی ﷺ کی اُمت میں ہو اور جن کا نام لیوا ہونے پر فخر کرتے ہو، ان نبی ﷺ کا تو یہ حال تھا کہ ان کو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے ناکارہ کھجوریں بھی میسر نہیں آتی تھیں اور ایک تم ہو کہ انواع و اقسام کے کھانے کھاتے ہو، اور عیش و عشرت کی زندگی اختیار کئے ہوئے ہو، اور اس طرح گویا تم نے دنیا اور دنیا کی لذتوں سے اجتناب کرنے کے اپنے نبی ﷺ کے طریقہ کو اختیار کرنے سے اعراض کیا ہے۔

واضح رہے کہ پہلی حدیث میں تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ پر بعض ایام ایسے گزرتے تھے جن میں آپ ﷺ کی غذا محض کھجوریں ہوتی تھیں، دوسری حدیث میں بیان کیا گیا کہ وہ کھجوریں بھی اتنی مقدار میں میسر نہیں ہوتی تھیں جس سے پیٹ ہی بھر لیا جاتا، اور یہاں یہ بیان کیا گیا کہ وہ قلیل مقدار بھی اچھی کھجوروں پر مشتمل نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ ناکارہ کھجوریں ہوتی تھیں جن کو بالکل ہی محتاج و مفلس شخص کے علاوہ کوئی دوسرا کھانا بھی پسند نہ کرے اور یہ ساری باتیں اس حقیقت کی غماز ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے نزدیک لذات دنیا کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں تھی، اور آپ ﷺ معمولی درجہ کی بھی خوش حال و راحت بخش زندگی گذارنے سے کوئی دل چسپی نہیں رکھتے تھے، بلکہ آپ ﷺ نے بنیادی طور پر فقرا اور ترک لذات کو اختیار کیا تھا اور یہی آپ ﷺ کا معمول بن گیا تھا، جس پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ہر حالت میں قائم رکھا، جب اسلام اور اہل اسلام پر سخت عسرت و تنگی کا زمانہ تھا اس وقت بھی آپ ﷺ اس پر عامل رہے اور جب اسلام و اہل اسلام کو شوکت نصیب ہوئی اور دنیا کے خزانے آپ ﷺ کے قدموں میں آگئے اس حالت میں بھی آپ ﷺ نے اسی فقر و عسرت کی زندگی گذارنے پر قناعت کی ایسا کیوں تھا؟ محض اس لئے نہیں کہ آپ ﷺ واقعۃً مفلس و محتاج تھے اور آپ ﷺ خواہش و طلب کے باوجود ایک خوش گوار و خوش حال زندگی کے اسباب و وسائل مہیا کرنے پر قادر نہیں تھے، کیوں کہ یہ بتایا جا چکا ہے کہ بعد میں مسلمانوں کو اسباب معیشت کی بڑی وسعت و فراوانی نصیب ہوئی بلکہ بجا طور پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عسرت و تنگی کے زمانہ میں بھی اگر آپ ﷺ چاہتے تو عیش و تنعم کے وہ کون سے وسائل تھے جو آپ ﷺ کو حاصل نہیں ہو سکتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ کا اتنی سخت و تنگ زندگی گذارنا اس سخاوت کی بناء پر تھا کہ گھر میں جو کچھ بھی آیا دوسروں پر صرف کر دیا، اس ایثار کی بناء پر تھا جو خود کو سخت سے سخت تکلیف میں مبتلا کر کے بھی دوسروں کی راحت چاہتا تھا، اس زہد و تقویٰ اور قناعت و توکل کی بنا پر تھا جس نے آخرت کی سربلندی اپنے پروردگار کی رضا جوئی اور اپنی عبدیت و بے چارگی کے مکمل اظہار کے لئے دنیا کی ہر لذت، دنیا کا ہر عیش و تنعم اور دنیا کی ہر خواہش کو کلیۃً پس پشت ڈال دیا تھا، اور ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ آپ ﷺ اپنی اس عملی زندگی کے ذریعہ اپنی اُمت کو عیش و تنعم کی زندگی سے اجتناب کرنے قناعت و توکل اور ایثار کا وصف پیدا کرنے اور اپنے حقیقی مقصد حیات کی راہ میں سختی و مشقت برداشت کرنے کی تعلیم و تربیت دیں۔

لہسن کھانا جائز ہے

(۳۵) وَعَنْ اَبِی اَیُّوْبَ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُتِیَ بِطَعَامٍ اَکَلَ مِنْهُ وَ بَعَثَ بِفَضْلِهٖ اِلَیَّ وَ اِنَّهٗ بَعَثَ اِلَیَّ یَوْمًا بِقَصْعَةٍ لَمْ یَاْکُلْ مِنْهَا لِاَنَّ فِیْهَا ثُوْمًا فَسَاَلْتُهٗ اَحَرَامٌ هُوَ قَالَ لَا وَلٰکِنْ اَکْرَهُهٗ مِنْ اَجْلِ رِیْحِهٖ قَالَ فَاِنِّیْ اَکْرَهُ مَا کَرِهْتَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس جب کھانا لایا جاتا تو آپ ﷺ اس میں سے کھاتے، اور باقی بچا ہوا

میرے پاس بھیج دیتے۔ ایک روز آپ ﷺ نے میرے پاس (ایسا) پیالہ بھیجا (جس میں کھانا تھا) اور اس میں سے خود کچھ نہیں کھایا تھا اس لئے کہ اس میں لہسن تھا، میں نے پوچھا کہ کیا لہسن حرام ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "نہیں! بلکہ اس کی بو کے سبب میں اس کو (کھانا) پسند نہیں کرتا۔" حضرت ابوایوبؓ نے عرض کیا۔ "تو پھر (میں بھی اس کھانے کو نہیں کھاؤں گا کیونکہ) جس چیز کو آپ ﷺ نے ناپسند کیا ہے اس کو میں بھی ناپسند کرتا ہوں۔" (مسلم)

تشریح: حضرت ابوایوب انصاریؓ بڑے جلیل القدر انصاری صحابی ہیں ان کو ایک امتیازی درجہ حاصل ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے اپنے گھربار چھوڑ کر مکہ سے ہجرت فرمائی اور مدینہ منورہ تشریف لائے، تو سب سے پہلے حضرت ابوایوب انصاریؓ ہی کے ہاں اترے اور ان کو میزبان رسول ﷺ بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اور ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوایوبؓ نے جس معمول کا ذکر کیا ہے، (کہ آنحضرت ﷺ باقی بچا ہوا کھانا ان کے پاس بھجواتے تھے) وہ انہی دنوں کا ہو جب کہ آپ ﷺ حضرت ابوایوبؓ کے ہاں قیام فرما تھے۔

"میں اس کو پسند نہیں کرتا" اس ارشاد میں کھانے کو عیب لگانا مقصود نہیں ہے، بلکہ اصل میں اس چیز کا اظہار مقصود ہے کہ اس کی بو مسجد میں جانے اور ملائکہ کے سامنے آنے سے روکتی ہے۔

نوویؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ لہسن کا کھانا مباح ہے، لیکن اس شخص کے لئے مکروہ ہے جو جماعت میں شریک ہونے کا ارادہ رکھتا ہو (یعنی لہسن کھا کر نماز کے لئے مسجد میں جانا مکروہ ہے) اور یہی حکم ہر اس چیز کا ہے جس سے بدبو پیدا ہوتی ہو، جہاں تک آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کا تعلق ہے تو چونکہ آپ ﷺ ہر لمحہ وحی کے نازل ہونے کے متوقع رہتے تھے، اس لئے آپ ﷺ کبھی بھی لہسن نہیں کھاتے اور اس سے مکمل اجتناب فرماتے تھے۔

اس بارہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، کہ پیاز، لہسن اور گندنا کا حکم آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کے لئے کیا تھا، آیا یہ چیزیں آپ ﷺ کے لئے حرام تھیں یا نہیں؟ چنانچہ بعض حنفی علماء نے یہ کہا ہے کہ یہ چیزیں آنحضرت ﷺ کی ذات خاص کے لئے حرام نہیں تھیں ان کے نزدیک زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مکروہ تنزیہی تھیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کھانے والے اور پینے والے کے لئے یہ مستحب ہے کہ وہ جو چیز کھا یا پی رہا ہو اس میں سے کچھ باقی چھوڑ دے، اور پھر اس کو اپنے محتاج ہمسایوں میں تقسیم کر دے۔

"جس چیز کو آپ ﷺ نے ناپسند کیا ہے.....الخ اس بات میں یا تو آنحضرت ﷺ کی اتباع کامل کی طرف اشارہ ہے، کہ آپ لہسن کو چونکہ ناپسند کرتے ہیں اس لئے میں بھی اس کو ہمیشہ ناپسند کروں گا، یا یہ کہ حضرت ابوایوبؓ نے اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ جماعت میں شریک ہونے کے لئے مسجد جاتے وقت میں لہسن کا استعمال نہیں کروں گا۔

لہسن، پیاز کھا کر مسجد و مجالس ذکر وغیرہ میں مت جاؤ

(۳۶) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَكَلَ ثُوْمًا اَوْ بَصَلًا فَلْيَعْتَزِلْنَا اَوْ قَالَ فَلْيَعْتَزِلْ مَسْجِدَنَا اَوْ لِيَقْعُدْ فِي بَيْتِهٖ وَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُتِيَ بِقِدْرٍ فِيْهِ خَضِرَاتٌ مِنْ بُقُوْلٍ فَوَجَدَ لَهَا رِيْحًا فَقَالَ قَرِّبُوْهَا اِلٰى بَعْضِ اَصْحَابِهٖ وَقَالَ كُلْ فَاِنِّيْ اُنَاجِيْ مَنْ لَا تُنَاجِيْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص لہسن یا (کچی) پیاز کھائے ہوئے ہو، تو اس کو چاہئے کو وہ ہم سے الگ رہے یعنی ہماری مجالس میں نہ آئے یا یہ فرمایا کہ تو اس کو چاہئے کہ وہ (کہیں جانے کے بجائے) اپنے گھر میں بیٹھا رہے۔" اور (ایک دن کا واقعہ ہے کہ) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک ہانڈی لائی گئی جس میں از قسم ترکاری سبزیاں تھیں (یعنی لہسن، پیاز اور گندنا وغیرہ) آپ ﷺ کو اس میں بو محسوس ہوئی تو اپنے صحابہ میں سے ایک شخص کی طرف اشارہ کر کے (کسی خادم سے) فرمایا کہ اس کو اس (فلاں

شخص) کے پاس لے جاؤ اور پھر (اس شخص کو) مخاطب کر کے) فرمایا کہ اس کو تم کھاؤ، میں نہیں کھاؤں گا کیونکہ میں جس ہستی کے ساتھ سرگوشیاں کرتا ہوں اس کے ساتھ تم سرگوشی نہیں کرتے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "ہماری مسجد" میں مفرد لفظ یعنی "مسجد" سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف مسجد نبوی ﷺ کے لئے ہے۔ اور صیغۂ متکلم میں مع الغیر کا استعمال (یعنی میری مسجد کہنے کے بجائے ہماری مسجد کہنا) مسجد نبوی ﷺ کی تعظیم واکرام کے پیش نظر ہے لیکن چونکہ اس حکم کی علت اور اس کے سبب میں تمام ہی مساجد بلکہ مجالس خیر جیسے مجلس ذکر وغیرہ، مجلس درس و تدریس اور اولیاء اللہ و علماء دین کی مجالس بھی شامل ہیں اس لئے جو حکم مسجد نبوی ﷺ کا ہے کہ لہسن وغیرہ کھا کر اس میں نہ جایا جائے یہی حکم دیگر مساجد و مجالس خیر کا بھی ہوگا اور اگر اس احتمال کو بھی مدنظر رکھا جائے کہ اس ارشاد گرامی میں مفرد لفظ مسجد سے مراد جنس ہے (کہ آپ ﷺ نے لفظ مسجد بول کر تمام مساجد مراد لی ہیں) تو پھر اس تاویل کی بھی ضرورت نہیں ہوگی، علاوہ ازیں بعض روایت میں مساجدنا یعنی ہماری مساجد کا لفظ منقول ہے، اس صورت میں تو تمام مساجد کے لئے یہ حکم بالکل صریح ہوگا۔

اولیقعد فی بیته میں حرف او (یعنی یا) اگر راوی کے شک کے اظہار کے لئے ہے تو مراد یہ ہوگی کہ آنحضرت ﷺ نے یا تو فلیعتزلنا تو اس کو چاہئے کہ وہ ہم سے الگ رہے) فرمایا تھا، یا یہ فرمایا تھا کہ فلیعتزل مسجدنا (تو اس کو چاہئے کہ ہماری مسجد سے دور رہے) اور یا یہ فرمایا تھا کہ من اکل ثوما او بصلا فلیقعد فی بیته یعنی جو شخص لہسن یا پیاز کھائے ہوئے ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھا رہے، کسی دوسرے کے پاس نہ جائے خواہ مسجد میں خواہ مسجد کے علاوہ کسی دوسری جگہ۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ او لیقعد فی بیته میں حرف او راوی کے شک کے اظہار کے لئے نہ ہو، بلکہ تنویع و تقسیم کے لئے ہو اور اس کا تعلق ماقبل کے فقرہ یعنی فلیعتزل مسجدنا سے ہو اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ لہسن، پیاز کھا کر مسجد میں آنا مکروہ ہے، کہ وہاں ملائکہ، رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ موجود رہتے ہیں اور ان چیزوں کو کھا کر عام لوگوں کے ساتھ اختلاط و مجالست مباح ہے اور یا اس سے بھی پرہیز کرنا چاہئے کہ اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور مطلق اختلاط و مجالست سے باز رہے کیونکہ یہ زیادہ بہتر ہے۔

"اس ہستی" سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام اور ملائکہ ہیں، مطلب یہ تھا، کہ یہ فرشتے میرے پاس آتے رہتے ہیں اور میں ان سے بات چیت کرتا ہوں جب کہ تمہارے ساتھ یہ چیز نہیں ہے، اس لئے جو چیز (یعنی لہسن پیاز وغیرہ کھانا) میرے لئے جائز نہیں وہ تمہارے لئے جائز ہے، اس ارشاد گرامی میں گویا اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ اپنے ہم نشین و مصاحب کی طبیعت و عادات اور اس کے حل کی رعایت ملحوظ رکھے اور اس کی جائز خوشی و مرضی کو پورا کرے۔

اشیاء خوراک کو ماپ تول کر لینے دینے اور پکانے کا حکم

(۳۷) وَعَنِ الْمِقْدَامِ ابْنِ مَعْدِيْكَرَبَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كِيْلُوْا طَعَامَكُمْ يُبَارَكْ لَكُمْ فِيْهِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت مقداد ابن معدیکربؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "کھانے پینے کی چیزوں کو) ناپ تول لیا کرو تمہارے لئے اس میں برکت عطا کی جائے گی۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو چیز پیمانہ و اوزان کے ذریعہ ناپی تولی جاتی ہے اس کو قرض، لین دین، بیچنے خریدنے اور پکانے کے لئے دیتے وقت ناپ تول لیا کرو تاکہ اس کا صحیح اندازہ و توازن قائم رہ سکے اور کمی بیشی کا کوئی خدشہ نہ رہے، چنانچہ یہ چیز (یعنی اناج و غلہ وغیرہ کا ناپنا تولنا) شارع علیہ السلام کے اس حکم کی بناء پر خیر و برکت میں اضافہ کی خاصیت و تاثیر رکھتی ہے، خاص طور پر جب کہ سُنّت کی رعایت ملحوظ ہو اور آنحضرت ﷺ کے حکم کی بجا آوری کا قصد ہو۔ (شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ)

ملا علی قاریؒ نے بھی مظہر سے اسی طرح کی بات نقل کر کے یہ لکھا ہے کہ اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ اس حدیث اور اس حدیث کے

درمیان مطابقت کیوں کر ہوگی جو حضرت عائشہؓ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے بیان کیا۔" جب رسول کریم ﷺ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اس وقت میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا جو کوئی جاندار کھاتا علاوہ اس تھوڑے سے جو کے جو بخاری میں تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو کی اس تھوڑی سی مقدار میں اتنی برکت عطا فرما رکھی تھی کہ) میں ایک مدت تک اس میں سے نکال نکال کر اپنے کھانے کا انتظام کرتی رہی پھر (ایک دن) میں نے اس کو ماپ ڈالا۔ بس جب ہی سے اس کی برکت جاتی رہی اس کا جواب یہ ہے اصل میں خرید و فروخت کے وقت ماپنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ برابری اور توازن قائم رہے اور خرچ کے وقت ناپنا در حقیقت احصار و ضبط ہے جو ایک طرح سے بخل اور تنگی قلب کا مظہر ہوتا ہے اور اس سے منع فرمایا گیا ہے، چنانچہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا "بلال! تم بس خرچ کرو صاحب عرش (اللہ تعالیٰ) کی طرف سے کمی کئے جانے کا خوف نہ کرو۔" پس شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے حوالہ سے جو مطلب نقل کیا گیا ہے، اس کے مطابق ناپنے تولنے کا حکم مطلق ناپ تول پر محمول ہے کہ لین دین اور خرید و فروخت کے وقت بھی ناپنا تولنا چاہئے اور خرچ کے وقت بھی ناپ تول کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ جب کہ ملا علی قاریؒ سے منقول مذکورہ بلا اشکال اور اس کا جواب یہ واضح کرتا ہے کہ ناپ تول کرنے کا حکم محض لین دین اور خرید و فروخت کی صورت پر محمول ہے۔ واللہ اعلم۔

کھانے کے بعد اللہ کی حمد و ثنا

(۳۸) وَعَنْ اَبِي اُمَامَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا رُفِعَ مَائِدَتُهٗ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبٰرَكًا فِيْهِ غَيْرَ مَكْفِيٍّ وَلَا مُوَدَّعٍ وَلَا مُسْتَغْنًى عَنْهُ رَبَّنَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے سے جب دسترخوان اٹھایا جاتا یعنی جب آپ ﷺ کھانا کھا کر فارغ ہوتے تو (اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا میں اس طرح) فرماتے۔" سب تعریف اللہ کے لئے ہے ایسی تعریف جو بہت ہے اور پاکیزہ (یعنی ظاہر داری اور دکھاوے سے خالی ہے) جس میں برکت عطا کی گئی ہے، یعنی وہ ایسی بابرکت حمد ہے کہ ہمیشہ جاری و قائم رہے اور کبھی منقطع نہ ہو، وہ نہ کفایت کی گئی ہے اور نہ اس سے بے پروائی ہو اے رب ہمارے۔" (بخاریؒ)

تشریح: "غیر مکفی" کو علماء نے کئی طرح سے صحیح کہا ہے اور اس کے معنی بیان کئے ہیں، اگر ان کی پوری تفصیل کو یہاں نقل کیا جائے تو غیر معمولی طوالت اختیار کرنی پڑے گی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ لفظ غیر اور ربنا کو مرفوع بھی قرار دیا گیا ہے اور منصوب بھی، یا ان دونوں میں سے ایک کو منصوب اور دوسرے کو مرفوع۔ اسی طرح علماء نے جو معنی و مطلب بیان کئے ہیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ یہ الفاظ "وہ نہ کفایت کی گئی ہے اور نہ متروک اور نہ اس سے بے پروائی ہو" یا تو حمد و تعریف کے احوال و صفات کے اظہار کے لئے ہیں کہ انسان کو چاہئے کہ اپنے پروردگار کی اس طرح تعریف و ثنا بیان کرے کہ وہ کسی بھی درجہ پر کافی نہ سمجھی جائے نہ حمد و ثنا بیان کرنے کو ترک کیا جائے اور نہ اس سے بے نیازی برتی جائے بلکہ جس طرح حق تعالیٰ ہمہ وقت انسان پر اپنی رحمت کے ساتھ متوجہ رہتا ہے اور ہر لمحہ تسلسل و دوام کے ساتھ اس کو اپنی نعمتیں عطا کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی ہر لمحہ اور ہمہ وقت تسلسل و دوام کے ساتھ حق تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتا رہے کہ یہ اپنے منعم حقیقی۔ کے حضور ادائیگی شکر بھی ہے اور اپنے پروردگار کی تعریف بھی۔ یا یہ کہ یہ الفاظ اصل میں کھانے کے حق میں درجہ صفت رکھتے ہیں کہ کھانا اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے کہ اس کو کسی بھی درجہ میں اپنے لئے کافی نہ سمجھا جائے بلکہ ہمہ وقت اپنے آپ کو رزق الٰہی کا محتاج تصور کیا جائے کہ اس کی خواہش و طلب کو ترک نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس سے بے نیازی برتی جا سکتی ہے۔ اور یا یہ کہ یہ الفاظ حق تعالیٰ شانہ کے اوصاف جلیلہ کے اظہار کے لئے ہیں کہ ایسی کوئی ذات یا ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ جو اس ذات کبریائی کو کافی ہو بلکہ وہ خود سارے جہان اور ساری چیزوں کے لئے کافی ہے، اس کی قربت کی طلب و خواہش کو ترک نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کے فضل و کرم سے مستغنی و بے نیاز ہو سکتے ہیں۔

(۳۹) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی لَیَرْضٰی عَنِ الْعَبْدِ اَنْ یَّاْکُلَ الْاَکْلَةَ فَیَحْمَدَهٗ عَلَیْهَا اَوْیَشْرَبَ الشَّرْبَةَ فَیَحْمَدَهٗ عَلَیْهَا رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَسَنَذْکُرُ حَدِیْثَیْ عَائِشَةَ وَاَبِیْ هُرَیْرَةَ مَاشَبِعَ اٰلُ مُحَمَّدٍ وَخَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الدُّنْیَا، فِیْ بَابِ فَضْلِ الْفُقَرَآءِ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ بندے کی اس بات سے راضی وخوش ہوتا ہے کہ وہ ایک لقمہ کھائے اور اس پر خدا کی حمد وثنا کرے یا ایک مرتبہ پئے اور اس پر خدا کی حمد وثنا کرے۔" (مسلم) اور دو روایتیں جن میں سے ایک روایت حضرت عائشہؓ کی ہے ماشبع ال محمد صلی اللہ علیہ وسلم الخ اور دوسری روایت خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم الخ حضرت ابوہریرہؓ کی ہے۔ ان دونوں روایتوں کو ہم انشاء باب فضل الفقراء میں نقل کریں گے۔ یعنی یہ دونوں روایتیں صاحب مصابیح نے کتاب الاطعمه میں نقل کیں تھیں لیکن ہم نے ان کو باب فضل الفقراء میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: "اکلہ" الف کے زبر کے ساتھ، کے معنی ہیں "ایک بار سیر ہو کر کھانا۔" ویسے یہ لفظ الف کے پیش کے ساتھ بھی منقول ہے جس کے معنی لقمہ کے ہیں۔

حدیث کا ماحصل یہ ہے کہ جب کوئی شخص کھانا کھا کر فارغ ہو جاتا ہے یا کوئی چیز پیتا ہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتا ہے اور اس کی حمد وثنا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اس عمل سے بہت خوش ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کرنا کھانے میں برکت کا باعث ہوتا ہے

(۴۰) عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ قَالَ کُنَّا عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقُرِّبَ اِلَیْهِ طَعَامٌ فَلَمْ اَرَ طَعَامًا کَانَ اَعْظَمَ بَرَکَةً مِنْهُ اَوَّلَ مَا اَکَلْنَا وَلَا اَقَلَّ بَرَکَةً فِیْ اٰخِرِهٖ فَقُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کَیْفَ هٰذَا قَالَ اِنَّا ذَکَرْنَا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهِ حِیْنَ اَکَلْنَا ثُمَّ قَعَدَ مَنْ اَکَلَ وَلَمْ یُسَمِّ اللّٰهَ فَاَکَلَ مَعَهُ الشَّیْطَانُ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"حضرت ابوایوب انصاریؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس تھے کہ کھانا سامنے لایا گیا (کھانے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ) میں نے اس کھانے میں اس وقت جو بڑی برکت دیکھی جب کہ ہم نے کھانا شروع کیا تھا ایسی برکت میں نے کسی اور کھانے میں نہیں دیکھی اور اس کھانے کے آخر میں میں نے جو کمتر برکت دیکھی ایسی کم برکت بھی اور کسی کھانے میں نہیں دیکھی، چنانچہ ہم نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! اس کا کیا سبب تھا (کہ اس کھانے میں شروع میں تو اتنی زیادہ برکت دیکھی گئی اور آخر میں اس طرح بے برکتی نظر آئی)؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا در حقیقت کھانے کے شروع میں ہم نے اللہ کا نام لیا تھا لیکن بعد میں ایک ایسا شخص آکر بیٹھ گیا جس نے کھانا کھایا مگر اللہ کا نام نہیں لیا لہٰذا اس کے ساتھ شیطان نے بھی کھانا کھایا (اس سبب سے آخر میں بے برکتی ہوئی۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "ہم نے اللہ کا نام لیا تھا" اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ بسم اللہ پڑھنے کی سنّت محض "بسم اللہ" کہہ لینے سے حاصل ہو جاتی ہے لیکن افضل یہ ہے کہ پوری بسم اللہ یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی جائے۔

کھانا شروع کرتے وقت بسم اللہ کہنا مستحب ہے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص جنبی (حالت ناپاکی میں) ہو یا کوئی عورت ایام حیض یا حالت نفاس میں ہو تو یہ استحباب اس کے لئے بھی ہے بشرطیکہ بسم اللہ پڑھتے وقت تلاوت کی نیت نہ کرے بلکہ ذکر کی نیت سے پڑھے ورنہ حرام ہو گا (کیونکہ ناپاکی اور حیض ونفاس کی حالت میں قرآن کریم کی تلاوت حرام ہے اور بسم اللہ بھی قرآن کریم ہی کا ایک فقرہ ہے۔)

جن چیزوں کو کھانا پینا شریعت کی رو سے مکروہ یا حرام ہے ان کو کھاتے پیتے وقت بسم اللہ پڑھنا مستحب نہیں ہے بلکہ اگر کوئی شخص شراب

پیتے وقت بسم اللہ پڑھے گا تو وہ کافر ہو جائے گا (بعض علماء نے مطلق کسی بھی حرام چیز کو کھاتے وقت بسم اللہ پڑھنے کو کفر کہا ہے۔

شیطان کا کھانے میں شریک ہونا اکثر علماء سلف و خلف کے نزدیک حقیقت پر محمول ہے کہ وہ بسم اللہ نہ پڑھ کر، کھانے والے کے ساتھ کھانے میں حقیقۃً شریک ہوتا ہے جس کی وجہ سے کھانے میں بے برکتی ہو جاتی ہے۔

پہلے جو یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ بعض علماء کے نزدیک اجتماعی طور پر کھانا کھانے کی صورت میں کسی ایک شخص کا بسم اللہ پڑھ لینا اس کھانے پر موجود سب لوگوں کے لئے کافی ہے اور ہر ایک شخص کا بسم اللہ پڑھنا ضروری نہیں ہے تو یہ حدیث ان علماء کے مسلک کے خلاف ایک دلیل ہے۔

کھانے کے درمیان بھی بسم اللہ پڑھی جا سکتی ہے

(۴۱) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَكَلَ اَحَدُكُمْ فَنَسِيَ اَنْ يَذْكُرَ اللّٰهَ عَلٰى طَعَامِهٖ فَلْيَقُلْ بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھانے بیٹھے اور (شروع میں) اپنے کھانے پر اللہ کا نام لینا بھول جائے (اور کھانے کے درمیان یاد آئے) تو اس کو چاہئے کہ وہ یہ کہے بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ۔" (ترمذیؒ، ابوداؤد)

تشریح: اللہ کا نام لینا بھول جائے الخ سے یہ معلوم ہوا کہ کھانا شروع کرتے وقت محض اللہ کے نام کا ذکر کافی ہے لیکن بسم اللہ کہنا افضل ہے۔

محیط میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص وضو کرتے وقت (بسم اللہ کے بجائے) لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اور یا اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے تو وہ سُنّت ادا کرنے والا کہلائے گا اسی طرح کھانے کی صورت میں بھی یہ مسئلہ ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص ابتداء وضو میں بسم اللہ کہنا بھول جائے اور پھر درمیان وضو (یاد آنے پر) بسم اللہ کہہ لے تو اس کو سُنّت پر عمل کرنے کا درجہ حاصل نہیں ہوگا بخلاف کھانے کے (کہ کھانے کے درمیان یاد آنے پر بسم اللہ کہہ لینا ادائیگی سُنّت کے لئے کافی ہو جائے گا۔)

(۴۲) وَعَنْ اُمَيَّةَ ابْنِ مَخْشِيٍّ قَالَ كَانَ رَجُلٌ يَاْكُلُ فَلَمْ يُسَمِّ حَتّٰى لَمْ يَبْقَ مِنْ طَعَامِهٖ اِلَّا لُقْمَةٌ فَلَمَّا رَفَعَهَا اِلٰى فِيْهِ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ فَضَحِكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ مَازَالَ الشَّيْطَانُ يَاْكُلُ مَعَهٗ فَلَمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ اسْتَقَاءَ مَا فِيْ بَطْنِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت امیہ ابن مخشیؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ایک شخص کھانا کھانے بیٹھا تو اس نے اللہ کا نام نہیں لیا (یعنی بسم اللہ کہے بغیر کھانا کھانے لگا) یہاں تک کہ جب اس کھانے میں سوائے ایک لقمہ کے کچھ باقی نہیں رہا (اور اس کو یاد آیا کہ میں کھانا شروع کرتے وقت بسم اللہ کہنا بھول گیا ہوں) تو اس نے وہ آخری لقمہ اپنے منہ میں لے جاتے وقت کہا بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ۔ رسول کریم ﷺ (یہ دیکھ کر) ہنسے اور پھر فرمایا کہ شیطان اس شخص کے ساتھ برابر کھانا کھا رہا تھا لیکن جب اس نے اللہ کا نام لیا تو اس (شیطان) نے وہ سب کچھ اگل دیا جو اس کے پیٹ میں تھا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: شیطان کا اپنے پیٹ کا سارا کھانا اگل دینا، حقیقت پر محمول ہے۔ یا یہ مراد ہے کہ کھاتے وقت بسم اللہ نہ کہنے کی وجہ سے جو برکت جاتی رہی تھی اس نے اس کو واپس کر دیا۔ گویا وہ برکت اس شیطان کے پیٹ میں امانت تھی جب اس شخص نے بسم اللہ کہی تو وہ برکت بھی کھانے میں واپس آ گئی۔

کھانے کے بعد شکر و حمد

(۴۳) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا فَرَغَ مِنْ طَعَامِهٖ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ

اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مُسْلِمِيْنَ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب کھانے سے فارغ ہوتے تو فرماتے۔ ہر طرح کی تعریف اس اللہ کو سزاوار ہے جس نے ہمیں کھانے کو دیا۔ ہمیں پینے کو دیا اور ہمیں مسلمان بنایا۔" (ترمذیؒ ، ابوداؤدؒ ، ابن ماجہؒ)

(۴۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الطَّاعِمُ الشَّاكِرُ كَالصَّائِمِ الصَّابِرِ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِیُّ عَنْ سِنَانِ بْنِ سَنَّةَ عَنْ اَبِيْهِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کھانا کھا کر (اللہ تعالیٰ کا) شکر ادا کرنے والا صابر روزہ دار کی طرح ہے۔" (ترمذیؒ) ابن ماجہؒ اور دارمیؒ نے اس روایت کو سنان بن سنہ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: ادائیگی شکر کا ادنی درجہ یہ ہے کہ کھانا شروع کرتے وقت بسم اللہ کہے اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے اور "صابر روزہ دار" ہونے کا ادنی درجہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو مفسدات صوم سے باز رکھے۔

"صابر روزہ دار کی طرح ہے۔" یہ تشبیہ اصل ثواب میں ہے کہ دونوں اصل ثواب میں شریک ہیں نہ یہ کہ مقدار میں تشبیہ دینا مراد ہے اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھا جائے کہ کہا جاتا ہے زَيْدٌ كَعَمْرٍو یعنی زید، عمرو کی طرح ہے اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ زید بعض خصائل و عادات میں عمرو کے مشابہ ہے نہ کہ وہ تمام خصائل و عادات میں عمرو کے ہم مثل ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ صابر فقیر، شاکر مالدار سے افضل ہے کیونکہ مشبہ بہ، مشبہ سے اقوی ہوتا ہے۔

(۴۵) وَعَنْ اَبِیْ اَيُّوْبَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَكَلَ اَوْشَرِبَ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَ وَسَقٰى وَسَوَّغَهٗ وَجَعَلَ لَهٗ مَخْرَجًا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوایوبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب کھاتے اور پیتے تو فرماتے "ہر طرح کی تعریف اللہ کو سزاوار ہے جس نے کھلایا پلایا اور اس کھانے پینے کی چیز کو آسانی کے ساتھ حلق سے اتارا اور اس کے نکلنے کی راہ پیدا فرمائی۔" (ابوداؤدؒ)

کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ منہ دھونا کھانے میں برکت کا ذریعہ ہے

(۴۶) وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَرَأْتُ فِی التَّوْرَاةِ اِنَّ بَرَكَةَ الطَّعَامِ الْوُضُوْءُ بَعْدَهٗ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَرَكَةُ الطَّعَامِ الْوُضُوْءُ قَبْلَهٗ وَالْوُضُوْءُ بَعْدَهٗ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت سلمان کہتے ہیں کہ میں نے (اسلام قبول کرنے سے پہلے) تورات میں پڑھا تھا کہ کھانے میں برکت کا ذریعہ کھانے کے بعد وضو کرنا چنانچہ (قبولیت اسلام) کے بعد (ایک دن) میں نے نبی کریم ﷺ کے سامنے (تورات کے اس مضمون کا) ذکر کیا تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ کھانے میں برکت کا ذریعہ کھانے سے پہلے وضو کرنا ہے اور کھانے کے بعد وضو کرنا ہے۔" (ترمذیؒ ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "وضو" سے مراد کھانے سے پہلے ہاتھوں کو اور کھانے کے بعد دونوں ہاتھوں اور منہ کو دھونا ہے۔ کھانے سے پہلے وضو یعنی ہاتھ دھونا اس کھانے میں برکت کا ذریعہ اس طور پر ہوتا ہے کہ اس (ہاتھ دھونے) کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کھانے میں زیادتی عطا فرماتا ہے اور کھانے کے بعد وضو کا اس کھانے میں برکت کا ذریعہ ہونا یہ ہے کہ اس کی وجہ سے طبیعت کو سکون حاصل ہوتا ہے اور یہ (یعنی کھانے کے بعد ہاتھ منہ کا دھونا یا ہاتھ منہ دھونے سے طبیعت کو سکون حاصل ہونا) عبادات، اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ میں تقویت و دل جمعی کا سبب ہوتا ہے۔

(۴۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ مِنَ الْخَلَاءِ فَقُدِّمَ اِلَيْهِ طَعَامٌ فَقَالُوْا اَلَا نَاْتِيْكَ بِوَضُوْءٍ قَالَ

اِنَّمَا اُمِرْتُ بِالْوُضُوْءِ اِذَا قُمْتُ اِلَى الصَّلٰوةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِیُّ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ بیت الخلاء سے واپس آئے تو آپ ﷺ کے سامنے کھانا لایا گیا۔ بعض صحابہؓ نے عرض کیا کہ کیا ہم آپ کے سامنے وضو کا پانی لائیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "مجھے (حدث کے بعد) وضو کرنے کا حکم (بطریق وجوب) اس صورت میں دیا گیا ہے جب کہ میں نماز کے لئے کھڑا ہونے کا ارادہ کروں" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ،) اور ابن ماجہؒ نے اس روایت کو حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: یہ آپ ﷺ نے اغلب واکثر کے اعتبار سے فرمایا کہ بطریق وجوب وضو کرنے کا حکم صرف نماز کے لئے ہے ورنہ سجدۂ تلاوت کرنے، قرآن مجید کو چھونے اور طواف کرنے کے لئے بھی وضو کرنا واجب ہے۔ اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے گویا یہ سمجھا کہ صحابہؓ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ کھانے سے پہلے وضو شرعی کرنا واجب ہے چنانچہ آپ ﷺ نے ان کے اس اعتقاد کی نفی کو اچھی طرح واضح کرنے کے لئے اپنے ارشاد میں حصر کا اسلوب اختیار فرمایا اور یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ کھانے سے پہلے وضو کرنا جائز بلکہ مستحب ہے۔ لہٰذا یہاں "وضو" سے مراد وہی وضو ہے جو نماز کے لئے کیا جاتا ہے نہ کہ کھانے کا وضو یعنی ہاتھ اور منہ دھونا حدیث کا سیاق بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ تاہم اگر اس جملہ اَلَا نَأْتِیْكَ بِوَضُوْءٍ (کیا ہم آپ کے لئے وضو کا پانی لائیں؟) میں وضو سے مراد کھانے کا وضو اور اس جملہ اِنَّمَا اُمِرْتُ بِالْوُضُوْءِ (مجھے وضو کرنے کا حکم اس صورت میں دیا گیا ہے الخ) میں وضو سے مراد نماز کا وضو لیا جائے تو یہ بھی ہو سکتا ہے اور چونکہ کھانے سے پہلے ہاتھوں کا دھونا سنن اور آداب میں سے ہے نہ کہ واجب، اس لئے آپ ﷺ نے اس موقع پر تعلیم جواز کے پیش نظر اس کو ترک کیا اور اس صورت میں حدیث کا حاصل یہ ہوگا کہ یہ وضو یعنی کھانے سے پہلے ہاتھوں کو دھونا کہ جس کے لئے تم مجھ سے درخواست کرتے ہو کوئی واجب اور مامور نہیں ہے اگر میں اس کو ترک کروں یعنی کھانے سے پہلے اپنے ہاتھ نہ دھوؤں تو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا ہاں یہاں ایک اور وضو ہے اور وہ نماز کا وضو ہے جو واجب ہے۔

اپنے آگے سے کھانے کا حکم

(۴۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ اُتِیَ بِقَصْعَةٍ مِنْ ثَرِيْدٍ فَقَالَ كُلُوْا مِنْ جَوَانِبِهَا وَلَا تَاْكُلُوْا مِنْ وَسْطِهَا فَاِنَّ الْبَرَكَةَ تَنْزِلُ فِیْ وَسْطِهَا رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِیُّ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ وَفِیْ رِوَايَةِ اَبِیْ دَاوُدَ قَالَ اِذَا اَكَلَ اَحَدُكُمْ طَعَامًا فَلَا يَاْكُلْ مِنْ اَعْلَى الصَّحْفَةِ وَلٰكِنْ يَاْكُلُ مِنْ اَسْفَلِهَا فَاِنَّ الْبَرَكَةَ تَنْزِلُ مِنْ اَعْلَاهَا۔

"اور حضرت ابن عباسؓ، نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ (ایک دن) آپ ﷺ کی خدمت میں ثرید کا ایک پیالہ لایا گیا۔ آپ ﷺ نے (مجلس میں موجود صحابہؓ سے) فرمایا کہ اس پیالے کے کناروں سے کھاؤ۔ اس کے درمیان میں سے نہ کھاؤ کیونکہ برکت اس کے درمیان میں نازل ہوتی ہے (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی) ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، اور ابوداؤد کی روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھانے بیٹھے تو اس کو چاہئے کہ وہ پیالہ کے اوپر سے نہ کھائے البتہ پیالے کے نیچے سے کھائے کیونکہ برکت اوپر کے حصے میں نازل ہوتی ہے۔"

تشریح: "ثرید" اس کھانے کو کہتے ہیں جو روٹی کو شوربے میں تیار کیا گیا ہو۔ "کناروں" جمع کا لفظ "جمع کے صیغے کے مقابلے میں لایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے سامنے کے کنارے سے کھائے۔ درمیان کے حصے میں برکت کا نازل ہونا اس سبب سے ہے کہ کسی بھی چیز کا درمیانی حصہ اس کے اور حصوں کی بہ نسبت افضل ہوتا ہے لہٰذا کھانے کے برتن کا درمیانی حصہ ہی اس کا مستحق ہے کہ خیر وبرکت کا نزول اس پر ہو اور جب کھانے کا درمیانی حصہ خیر وبرکت کے اترنے کی جگہ قرار پایا تو اس سے بہتر بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ

وہ حصہ آخر کھانے تک باقی رہے تاکہ کھانے کی برکت بھی آخر تک برقرار رہے لہذا اپنے سامنے کے کناروں کو چھوڑ کر پہلے درمیانی حصہ پر ہاتھ ڈالنا اور اس کو ختم کر دینا مناسب نہیں ہے۔

"پیالہ کے اوپر" سے مراد اس کا درمیانی حصہ ہے اور "اس کے نیچے" سے مراد اس کے کنارے ہیں اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اپنے سامنے سے کھانا چاہئے۔

آنحضرت ﷺ نے کبھی ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھایا

(۴۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ مَارُؤِیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْكُلُ مُتَّكِئًا قَطُّ وَلَا يَطَأُ عَقِبَهُ رَجُلَانِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کبھی ٹیک لگا کر کھانا کھاتے ہوئے نہیں دیکھے گئے اور آنحضرت ﷺ کے پیچھے دو آدمی بھی نہیں چلتے تھے۔" (ابوداؤد)

تشریح: ٹیک لگا کر کھانا کھانے کے سلسلے میں تفصیلی بات پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ پیچھے چلنے کا مطلب یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کہیں جاتے آتے تو آپ ﷺ کے پیچھے زیادہ آدمیوں کا تو ذکر ہی نہیں دو آدمی بھی نہیں چلتے تھے، بلکہ آپ ﷺ انتہائی تواضع اور انکسار کے تحت اپنے صحابہ کے ساتھ اس طرح چلتے کہ یا تو آپ ﷺ سب کے درمیان میں رہتے یا سب سے پیچھے رہتے جیسا کہ ایک اور حدیث میں الفاظ منقول ہیں کہ ویسوق اصحابه (آپ ﷺ اپنے صحابہؓ سے پیچھے چلتے تھے) آپ ﷺ اپنے اور صحابہؓ کے آگے ہو کر نہیں چلتے تھے۔ جیسے امراء و سلاطین متکبر و جاہ پرست لوگوں اور دنیادار پیروں کا طریقہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنے ہمراہیوں کے آگے آگے چلنے ہی میں اپنی بڑائی سمجھتے ہیں بلکہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا ہجوم ان کے پیچھے پیچھے چلے۔ "دو" کی قید سے معلوم ہوا کہ کبھی کبھار ایک آدھ آدمی جیسے حضرت انسؓ وغیرہ آنحضرت ﷺ کے پیچھے رہا کرتے تھے، اور یہ بھی ضرورت کے تحت اور یہ تواضع و انکسار کے منافی بھی نہیں۔

مسجد میں کھانے پینے کا مسئلہ

(۵۰) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْحَارِثِ ابْنِ جَزْءٍ قَالَ اُتِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِخُبْزٍ وَلَحْمٍ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ فَاَكَلَ وَاَكَلْنَا مَعَهٗ ثُمَّ قَامَ فَصَلّٰى وَصَلَّيْنَا مَعَهٗ وَلَمْ نَزِدْ عَلٰى اَنْ مَسَحْنَا اَيْدِيَنَا بِالْحَصْبَاءِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت عبداللہ بن حارث بن جز کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں روٹی اور گوشت (پر مشتمل کھانا) لایا گیا جب کہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے، چنانچہ (اس کھانے کو) آنحضرت ﷺ نے بھی کھایا اور آنحضرت کے ہمراہ ہم نے بھی کھایا، پھر کھڑے ہوئے اور آنحضرت ﷺ نے نماز پڑھی، آپ ﷺ کے ساتھ ہم نے بھی نماز ادا کی اور اس سے زیادہ ہم نے کچھ نہیں کیا کہ (کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اپنے ہاتھوں کو ان کنکریوں سے پونچھ ڈالا تھا جو مسجد میں تھیں ابن ماجہؒ۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کھانا کھانے کے بعد ہم نے اپنے ہاتھوں کو پانی سے دھویا نہیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کھانے میں چکنائی نہیں تھی یا یہ کہ نماز کے لئے ہمیں جلدی تھی اور یا اس کا سبب یہ تھا کہ ہم نے تکلف کو ترک کر کے رخصت (آسانی) پر عمل کرنا چاہا تھا کیوں کہ غیر واجب امور میں کبھی کبھی رخصت پر عمل کر لینا بھی حق تعالیٰ کے نزدیک اسی طرح پسندیدہ ہے جس طرح وہ اکثر اوقات میں عزیمت پر عمل کرنے کو محبوب رکھتا ہے۔

احیاء العلوم میں بعض صحابہؓ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا۔ "کھانے کے بعد ہمارے پاؤں کی پاشنی (ایڑی) ہمارے لئے رومال کا کام دیا کرتی تھی یعنی ہم کھانا کھا کر اپنے ہاتھوں کو اپنے پاؤں کی ایڑیوں سے پونچھ لیا کرتے تھے جیسا کہ رومال سے پونچھا جاتا ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے الفاظ لم نزد اور مسحنا میں متکلم مع الغیر کا صیغہ آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ سب کو شامل ہے یعنی آنحضرت ﷺ اور وہاں موجود سارے صحابہؓ نے اپنے ہاتھ کنکریوں سے پونچھے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد میں کھانا پینا جائز ہے اور یہ بات اکثر احادیث میں منقول ہے خاص طور پر کھجوروں اور اس طرح کی دوسری چیزوں کے بارے میں زیادہ منقولات ہیں لیکن علماء نے لکھا ہے کہ یہ جواز اس امر کے ساتھ مقید ہے کہ اس کی وجہ سے مسجد میں گندگی وغیرہ پیدا نہ ہو ورنہ (گندگی پیدا ہونے کی صورت میں) مسجد میں کھانا پینا حرام یا مکروہ ہوگا اور فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے جو شخص اعتکاف کی حالت میں نہ ہو وہ مسجد میں نہ تو کھائے پئے نہ سوئے اور نہ خرید و فروخت کرے کہ یہ مکروہ ہے، ہاں اس مسافر کے لئے اجازت ہے جس کا مسجد کے علاوہ اور کوئی ٹھکانا نہ ہو۔

علماء نے لکھا ہے کہ آدمی کو چاہئے کو وہ جب مسجد میں داخل ہو تو اعتکاف کی نیت کر لیا کرے تاکہ یہ چیزیں (مسجد میں کھانا پینا وغیرہ) اس کے لئے مباح بھی ہو جائیں اور اس کو (اعتکاف کا) ثواب بھی مل جائے۔

آنحضرت ﷺ کو دست کا گوشت بہت پسند تھا

(۵۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ اُتِیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِلَحْمٍ فَرُفِعَ اِلَيْهِ الذِّرَاعُ وَكَانَتْ تَعْجِبُهٗ فَنَهَسَ مِنْهَا۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں (پکایا بھنا ہوا) گوشت لایا گیا، اس میں سے آپ ﷺ کو دست کا حصہ دیا گیا کیونکہ دست کا گوشت آپ ﷺ کو بہت پسند تھا چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو دانتوں سے نوچ نوچ کے کھایا۔"

(ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: آپ ﷺ نے بے تکلفی و سادگی اور تواضع کے سبب دست کی ہڈیوں سے گوشت کو دانتوں کے ذریعہ نوچ نوچ کر کھایا، چنانچہ اس طرح گوشت کھانا مستحب ہے۔ طیبیؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا دست کے گوشت کو پسند کرنا اس وجہ سے تھا کہ وہ اچھی طرح گل جاتا ہے جلد ہضم ہوتا ہے اور زیادہ لذیذ ہوتا ہے یا اس پسندیدگی کی وجہ یہ تھی کہ دست کا گوشت نجاست کی جگہوں (جیسے آنت وغیرہ) سے دور ہوتا ہے۔ شمائل ترمذی میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت منقول ہے کہ دست کا گوشت آنحضرت ﷺ کو زیادہ پسند نہیں تھا لیکن چونکہ آپ کو گوشت مدت کے بعد (کبھی کبھی) میسر آتا تھا اور دست کا گوشت جلدی گل جاتا ہے اس لئے آپ دست کے گوشت کو پسند فرماتے تھے۔ ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "مزیدار اور زیادہ پسند آنے والا گوشت، پشت کا گوشت ہے۔

چھری سے کاٹ کر گوشت کھانا غیر پسندیدہ طریقہ ہے

(۵۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقْطَعُوا اللَّحْمَ بِالسِّكِّيْنِ فَاِنَّهٗ مِنْ صُنْعِ الْاَعَاجِمِ وَانْهَسُوْهُ فَاِنَّهٗ اَهْنَأُ وَاَمْرَأُ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَقَالَا لَيْسَ هُوَ بِالْقَوِيِّ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "گوشت کو چھری سے نہ کاٹو یعنی چھری سے کاٹ کاٹ کر نہ کھاؤ کیونکہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے بلکہ گوشت کو دانتوں سے نوچ نوچ کر کھاؤ کیوں کہ دانتوں سے نوچ کر کھانا زیادہ لذت بخش اور زیادہ خوش گوار ہے۔"

اس روایت کو ابوداؤدؒ نے اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور دونوں نے کہا ہے کہ یہ حدیث (باعتبار سند کے) قوی نہیں ہے (بلکہ ضعیف ہے۔"

تشریح: عرب کے لوگ اپنے علاوہ دنیا کے اور سارے ہی لوگوں کو عجمی (گونگا) کہا کرتے تھے لیکن یہاں اہل فارس (ایرانی) مراد ہیں کہ وہ

لوگ ازراہ تکبر و غرور گوشت وغیرہ چھریوں سے کاٹ کر کھاتے تھے، مگر بعض مواقع پر آنحضرت ﷺ سے بھی یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے چھری سے کاٹ کر کھایا ہے لہٰذا ان دونوں روایتوں میں یوں مطابقت پیدا کی جائے گی کہ اگر گوشت نرم اور گلا ہوا ہو تو اس کو چھری کے بجائے دانتوں سے کاٹ کر کھانا چاہئے اور اگر سخت ہو تو پھر چھری سے کاٹ کر کھانا جائز ہوگا واضح رہے کہ مذکورہ بالا ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے۔

بیمار کے لئے پرہیز ضروری ہے

(۵۳) وَعَنْ اُمِّ الْمُنْذِرِ قَالَتْ دَخَلَ عَلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَهٗ عَلِيٌّ وَلَنَا دَوَالٍ مُعَلَّقَةٌ فَجَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْكُلُ وَعَلِيٌّ مَعَهٗ يَاْكُلُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعَلِيٍّ مَهْ يَا عَلِيُّ فَاِنَّكَ نَاقِهٌ قَالَتْ فَجَعَلْتُ لَهُمْ سِلْقًا وَشَعِيْرًا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَلِيُّ مِنْ هٰذَا فَاَصِبْ فَاِنَّهٗ اَوْفَقُ لَكَ۔

(رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت اُمّ منذر انصاریہؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ میرے یہاں تشریف لائے، آپ کے ہمراہ حضرت علیؓ بھی تھے (اس وقت) ہمارے گھر میں کھجوروں کے خوشے لٹکے ہوئے تھے چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ان خوشوں میں سے کھانا شروع کیا، اور آپ کے ساتھ حضرت علیؓ بھی کھانے لگے۔ رسول کریم ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ "علی! تم ان کھجوروں کو کھانے سے اجتناب کرو کیونکہ تمہیں کمزوری لاحق ہے یعنی تم ابھی بیماری سے اٹھے ہو اور تم پر ضعف کا اثر غالب ہے اس لئے تمہارے لئے پرہیز ضروری ہے۔" حضرت اُمّ منذرؓ کہتی ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ اور آنحضرت ﷺ کے رفقاءؓ کے لئے چقندر اور جو تیار کئے تھے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "علی! تم اس میں سے کھاؤ اس لئے کہ یہ تمہارے لئے بہت مفید اور موافق ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بیمار اور بیماری سے اٹھے ہوئے شخص کے لئے پرہیز بہت ضروری ہے بلکہ بعض اطباء نے کہا ہے کہ جو شخص بیماری سے اٹھا ہو اور اس پر ضعف و کمزوری کا غلبہ ہو اس کے لئے پرہیز بہت ہی فائدہ مند ہوتا ہے، جب کہ تندرست کے لئے پرہیز کرنا مضر ہوتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو کھرچن پسند تھی

(۵۴) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْجِبُهُ الثُّفْلُ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کو کھرچن یعنی تہ دیگی اچھی طرح لگتی تھی۔" (ترمذیؒ، بیہقیؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کی عادت یہ تھی کہ آپ ﷺ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے تھے چنانچہ پہلے تو آپ اوپر کا کھانا اپنے اہل و عیال، مہمانوں اور محتاج و فقراء کو بانٹ دیتے تھے اور نیچے کا جو کھانا بچتا اس کو اپنے لئے رکھتے، یہ آپ ﷺ کے جذبۂ ایثار و سخاوت کا غماز بھی تھا اور آپ ﷺ کے وصف تواضع و انکسار اور صبر و قناعت کا مظہر بھی! نیز یہ بات ان مالداروں کے لئے ایک واضح دلیل بھی ہے جو عام طور پر ازراہ تکبر و نخوت نیچے کے کھانے کو عار سمجھتے ہیں اور اس کو ضائع کر دیتے ہیں۔

کھانے کے بعد پیالہ و تشتری کو صاف کرنا مغفرت و بخشش کا ذریعہ ہے

(۵۵) وَعَنْ نُبَيْشَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَكَلَ فِيْ قَصْعَةٍ فَلَحِسَهَا اِسْتَغْفَرَتْ لَهُ الْقَصْعَةُ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت نبیشہؓ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی پیالے (یا تشتری) میں کھائے اور پھر اس کو (انگلیوں سے) چاٹ لے تو وہ پیالہ اس کے لئے استغفار کرتا ہے (احمد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی) ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: ظاہر بات یہ ہے کہ پیالہ حقیقت میں استغفار کرتا ہے! علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ تشتری پیالے کو چاٹنا اصل میں تواضع کو اختیار کرنا اور تکبر سے بری ہونا ہے اور یہ چیز گناہوں سے مغفرت و بخشش کا سبب ہے اور پیالہ کی طرف استغفار کی نسبت اس اعتبار سے ہے کہ بظاہر اس مغفرت و بخشش کا سبب پیالہ ہی ہوتا ہے۔

کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے بغیر نہ سوؤ

(۵۶) وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ بَاتَ وَفِی یَدِهٖ غَمَرٌ لَمْ یَغْسِلْهُ فَاَصَابَهٗ شَیْءٌ فَلَا یَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَهٗ۔ (رواہ الترمذی وابوداود وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص اس حالت میں رات گذارے کہ اس کے ہاتھ میں چکنائی لگی ہوئی ہو کہ (کھانے کے بعد) اس نے اس کو دھویا نہ ہو اور پھر اس کو کوئی ضرر پہنچ جائے (یعنی ایذا پہنچانے والے جو جانور کھانے کی بو یا چکنائی پر آتے ہیں وہ اس کو ضرر پہنچائیں) تو وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے (کیونکہ چکنے ہاتھوں کے ساتھ سو کر وہ اس ضرر کا خود سبب بنا ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

ثرید آنحضرت ﷺ کا پسندیدہ کھانا تھا

(۵۷) وعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ اَحَبَّ الطَّعَامِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الثَّرِیْدُ مِنَ الْخُبْزِ وَالثَّرِیْدُ مِنَ الْحَیْسِ۔ (رواہ ابوداود)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے نزدیک روٹی کا ثرید اور حیس کا ثرید سب سے زیادہ پسندیدہ کھانا تھا۔" (ابوداؤد)

تشریح: "روٹی کا ثرید" یعنی روٹی کے ٹکڑے شوربے میں بھیگے ہوئے۔ اور حیس کا ثرید اس کھانے کو کہتے ہیں۔ جو چھوہارے گھی اور قردت (یعنی دہی کے بنے ہوئے پنیر) کو ملا کر مالیدہ کی طرح بنایا جائے۔

زیتون کی فضیلت

(۵۸) وَعَنْ اَبِی اُسَیْدٍ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كُلُوا الزَّیْتَ وَادَّهِنُوْا بِهٖ فَاِنَّهٗ مِنْ شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت ابواسید انصاری کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "زیت یعنی روغن زیتون کو کھایا اور بدن پر اس کی مالش کیا کرو کیونکہ وہ ایک بابرکت درخت (زیتون) کا تیل ہے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: "زیتون" بابرکت درخت اس اعتبار سے ہے کہ اس میں بہت زیادہ خیر و برکت اور منافع ہیں چنانچہ قرآن کریم کی اس آیت اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ میں جس درخت کو "شجرۂ مبارک" کہا گیا ہے اس سے زیتون ہی کا درخت مراد ہے جس کی سب سے عمدہ قسم ملک شام میں پیدا ہوتی ہے نیز سورۂ وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ میں اللہ تعالیٰ اسی درخت کی قسم کھائی ہے۔ عرب کے لوگ خصوصا اہل شام اس درخت کے میٹھے تیل کو کھانے کے مصرف میں لاتے ہیں اور اس کے کڑوے تیل کو چراغ وغیرہ میں جلانے کے کام میں لاتے ہیں۔

طبی طور پر یہ ثابت ہے کہ جسم پر زیتون کے تیل کی مالش کرنے سے جسم کو بہت زیادہ فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

سرکہ کی فضیلت

۵۹ وَعَنْ اُمِّ هَانِیءٍ قَالَتْ دَخَلَ عَلَیَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَعِنْدَكِ شَیْءٌ قُلْتُ لَا اِلَّا خُبْزٌ یَابِسٌ وَخَلٌّ فَقَالَ هَاتِیْ مَا اَقْفَرَ بَیْتٌ مِنْ اُدْمٍ فِیْهِ خَلٌّ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت اُمّ ہانیؓ (جو ابوطالب کی بیٹی اور حضرت علیؓ کی ہمشیرہ تھیں) کہتی ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ میرے گھر تشریف لائے، آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ (کھانے کے لئے) تمہارے پاس کیا چیز ہے؟ میں نے کہا کہ سوکھی روٹی اور سرکے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "وہی لے آؤ وہ گھر سالن سے خالی نہیں جس میں سرکہ ہو۔" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ نے انتہائی بے تکلفی کے ساتھ جو مذکورہ کھانا طلب فرمایا اس کا سبب یہ تھا کہ اُمّ ہانی کا دل بھی خوش ہو جائے اور ان پر یہ بھی واضح ہو جائے کہ گھر میں موجود جو بھی کم سے کم چیز غذائی ضرورت کو پورا کر دے اس پر قناعت کرنا چاہئے۔

کھجور سالن کی جگہ

۶۰ وَعَنْ یُوْسُفَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ رَاَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَخَذَ كِسْرَةً مِّنْ خُبْزِ الشَّعِیْرِ فَوَضَعَ عَلَیْهَا تَمْرَةً فَقَالَ هٰذِهٖ اِدَامُ هٰذِهٖ وَاَكَلَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت یوسف بن عبداللہ ابن سلامؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن کہ نبی کریم ﷺ نے جو کی روٹی کا ایک ٹکڑا لیا اور اس پر کھجور رکھ کر فرمایا کہ یہ اس روٹی کے ٹکڑے کا سالن ہے۔" (ابوداؤد)

غیر مسلم معالج سے رجوع کرنا جائز ہے

۶۱ وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ مَرِضْتُ مَرَضًا اَتَانِی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَعُوْدُنِیْ فَوَضَعَ یَدَهٗ بَیْنَ ثَدْیَیَّ حَتّٰی وَجَدْتُّ بَرْدَهَا عَلٰی فُؤَادِیْ وَقَالَ اِنَّكَ رَجُلٌ مَفْؤُوْدٌ اِئْتِ الْحَارِثَ بْنَ كَلَدَةَ اَخَا ثَقِیْفٍ فَاِنَّهٗ رَجُلٌ یَتَطَبَّبُ فَلْیَاْخُذْ سَبْعَ تَمَرَاتٍ مِنْ عَجْوَةِ الْمَدِیْنَةِ فَلْیَجَاْهُنَّ بِنَوَاهُنَّ ثُمَّ لِیَلُدَّكَ بِهِنَّ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) میں بہت سخت بیمار ہوا (تو) نبی کریم ﷺ عیادت کی غرض سے میرے پاس تشریف لائے، آپ ﷺ نے (اس وقت) میری دونوں چھاتیوں کے درمیان (یعنی سینہ پر) اپنا دست مبارک رکھا جس کی ٹھنڈک میں نے اپنے دل پر محسوس کی پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم ایک ایسے شخص ہو جو دل کے درد میں مبتلا ہے (یعنی تم قلب کے مریض ہو) لہٰذا تم حارث بن کلدہ کے پاس جاؤ جو قبیلۂ ثقیف سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ وہ شخص طب (علاج معالجہ کرنا) جانتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ مدینہ کی (سب سے اعلیٰ قسم کی کھجور) عجوہ میں سے سات کھجوریں لے۔ پھر ان کو گٹھلیوں سمیت کوٹ لے اور اس کے بعد ان کو (دوا کی صورت میں تمہارے منہ میں ڈالے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اگر یہ سوال پیدا ہو کہ اس کا کیا سبب تھا کہ آپ نے سعد کو پہلے تو ایک معالج کے پاس جانے کا حکم دیا اور پھر خود ہی علاج بھی تجویز کیا لیکن دوا بنانے کا کام معالج کے سپرد کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے تو آپ نے سعد کو معالج کے پاس جانے کا مشورہ دیا تاکہ وہ ان کو دیکھ کر ان کا علاج کرے، پھر جب آپ ﷺ کو ان کے مرض کا ایک آسان علاج یاد آ گیا جو جلد فائدہ کرنے والا تھا تو آپ ﷺ

نے ازراہ شفقت و تعلق اس کو تجویز کیا۔ گویا ان کو معالج کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا کہ وہ مبادا ان کو دور دراز کے علاج میں ڈال دے اور چونکہ اس دوا کا بنانا اور اس کو استعمال کرانا معالج کے لئے زیادہ آسان تھا اس لئے اس کام کو اس کے سپرد فرمایا۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ غیر مسلم معالج سے رجوع و مشورہ کرنا جائز ہے کیوں کہ حارث بن کلدہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں مرا ہے اس کا اسلام قبول کرنا ثابت نہیں ہے۔

غذا کو معتدل کر کے کھاؤ

(۶۲) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَاكُلُ الْبِطِّيْخَ بِالرُّطَبِ رَوَاهُ التِّرمِذِيُّ وَزَادَ اَبُوْدَاوُدَ وَيَقُوْلُ يُكْسَرُ حَرُّ هٰذَا بِبَرْدِ هٰذَا وَبَرْدُ هٰذَا بِحَرِّ هٰذَا وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ خربزہ، تازہ کھجوروں کے ساتھ کھاتے تھے۔ (ترمذیؒ) اور ابوداؤد نے اس روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ "اور آپ یہ فرماتے تھے کہ اس (کھجور) کی گرمی اس (خربزے) کی سردی سے توڑی جاتی ہے اور خربزے کی سردی کھجور کی گرمی سے توڑی جاتی ہے۔ نیز ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: مذکورہ بالا دونوں چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر کھانے میں بڑی حکمت یہ ہے کہ ایک سرد دوسری گرم ہے۔ دونوں ملا کر معتدل غذا ہو جاتی ہے! طیبی نے کہا ہے خربزے سے مراد شاید کچا خربزہ ہو گا کیونکہ وہ سرد تر ہوتا ہے ورنہ پکا خربزہ گرم ہوتا ہے لیکن کھجور کی بہ نسبت وہ بھی سرد ہوتا ہے۔ اکثر علماء نے یہ لکھا ہے کہ "بطیخ" سے مراد خربزہ نہیں ہے بلکہ تربوز ہے کہ وہ سرد ہوتا ہے۔

کھانے پینے کی چیز میں کیڑے پڑ جانے کا مسئلہ

(۶۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِتَمْرٍ عَتِيْقٍ فَجَعَلَ يُفَتِّشُهُ وَيُخْرِجُ السُّوْسَ مِنْهُ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پرانی کھجور لائی گئی (جس میں کیڑے پڑ گئے تھے چنانچہ آپ ﷺ اس کو چیرتے اور اس میں سے کیڑا نکال (کر پھینک) دیتے۔" (ابوداؤد)

تشریح: طبرانیؒ نے بسند حسن حضرت ابن عمرؓ سے بطریق مرفوع یہ نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کھجور کو چیرنے سے منع فرمایا ہے! اس صورت میں چونکہ آنحضرت ﷺ کے فعل اور قول میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے اس لئے کہا جائے گا کہ حضرت ابن عمرؓ سے جو ممانعت منقول ہے اس کا تعلق نئی کھجوروں سے ہے اور اس کا مقصد وہم و وسوسہ سے بچانا ہے۔ یا یہ کہ حضرت انسؓ سے جو فعل منقول ہے، وہ بیان جواز پر محمول ہے اور مذکورہ بالا ممانعت نہیں تنزیہی کے طور پر ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اگر کھانے میں کیڑا پڑ جائے تو وہ کھانا نجس نہیں ہوتا اور مطالب المؤمنین، میں یہ لکھا ہے کہ اگر کیڑا پنیر یا سیب میں پڑ جائے (اور کھاتے وقت پیٹ میں چلا جائے) تو وہ حلال ہو گا کیونکہ اس سے احتراز ممکن نہیں، ہاں اگر ان چیزوں سے نکل دیا گیا ہو تو پھر اس کا حکم مکھی، بھڑ، پسو اور ہر اس جانور کا سا ہو گا جو دم مسفوح (جاری خون) نہیں رکھتا کہ اس کا کھانا حرام ہو گا لیکن اگر وہ پانی یا کھانے میں پڑ جائے تو وہ ناپاک نہیں ہو گا۔

چستہ پاک ہوتا ہے

(۶۴) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِجُبْنَةٍ فِيْ تَبُوْكٍ فَدَعَا بِالسِّكِّيْنِ فَسَمّٰى وَقَطَعَ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ غزوہ تبوک کے دوران (ایک موقعہ پر) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پنیر کا ایک ٹکڑا لایا گیا تو آپ ﷺ

نے چھری منگوائی اور بسم اللہ کہہ کر اس کو کاٹا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: یہ بسم اللہ کہنا کھانا شروع کرتے وقت بسم اللہ پڑھنے کی جگہ تھا نہ کہ وہ بسم اللہ جو ذبح کرتے وقت پڑھی جاتی ہے جیسا کہ بعض جاہل لوگ کدو کو کاٹتے وقت ذبح کی نیت سے بسم اللہ کہتے ہیں۔ مظہرؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ چستہ یعنی اونٹ یا بکری کے بچہ کا اوجھ پاک ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ ناپاک ہوتا تو پنیر کو بھی ناپاک ہونا چاہئے تھا اس لئے کہ پنیر اس کے بغیر نہیں بنتا تھا۔

جن چیزوں کو شریعت نے حلال یا حرام نہیں کہا ہے ان کا استعمال مباح ہے

(۶۵) وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ السَّمْنِ وَالْجُبْنِ وَالْفِرَآءِ فَقَالَ الْحَلَالُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ فِي كِتَابِهٖ وَالْحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فِي كِتَابِهٖ وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ مِمَّا عَفَا عَنْهُ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَمَوْقُوْفٌ عَلَى الْاَصَحِّ۔

"اور حضرت سلمانؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے گھی پنیر اور پوستین یا گورخر کے بارے میں پوچھا گیا (کہ یہ چیزیں حلال ہیں یا حرام ہیں؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ (حلت و حرمت کے سلسلے میں یہ اصول مدنظر رکھو کہ) حلال وہی چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دیا ہے (یعنی جس کا حلال ہونا قرآن کریم میں بیان فرمایا ہے) اور حرام وہی چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے، اور جس چیز سے سکوت فرمایا (یعنی جس چیز کو نہ حلال فرمایا نہ حرام) وہ اس قسم سے ہے جس کو معاف رکھا گیا ہے (یعنی اس کے استعمال کرنے کو مباح رکھا ہے) اس روایت کو ابن ماجہ اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور (ترمذی نے) کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے لیکن زیادہ صحیح یہ بات ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے۔"

تشریح: گھی کے بارے میں تو اس لئے پوچھا گیا کہ بظاہر ابتداء اسلام میں بعض لوگوں کو اس کے حلال ہونے میں شبہ ہوا ہوگا۔ پنیر کا معاملہ بذات خود محل اشتباہ و سوال تھا کیونکہ اس زمانہ میں وہ چستہ (یعنی اونٹ یا بکری کے اوجھ) کے ذریعہ بنتا تھا تیسری چیز جس کے بارے میں سوال کیا گیا فراء تھی۔ اس لفظ فراء کے بارے میں اکثر شارحین نے کہا ہے کہ یہ فَرْئِی کی جمع ہے جس کے معنی گورخر کے ہیں۔ اور بعضوں نے اس کو فرو کی جمع کہا ہے جس کے معنی پوستین (جانور کی کھال کے کوٹ) کے ہیں۔ اسی لئے ترمذی نے اس روایت کو باب اللباس میں نقل کیا ہے، اس صورت میں کہا جائے گا کہ فراء کے بارے میں سوال کفار کے عمل سے اجتناب کرنے کے جذبہ سے کیا گیا تھا، کیونکہ وہ (کفار) مردار کی کھال کو دباغت دیئے بغیر اس کی پوستین بنایا کرتے تھے۔

"اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ یا تو وہ چیزیں حرام ہیں جن کے حرام ہونے کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے یا اس آیت کریمہ وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا کے ذریعہ بطریق اجمال بیان کیا۔ ہے یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے تاکہ ان اکثر چیزوں کے بارے میں اشکال پیدا نہ ہو جو حرام ہیں مگر ان کی حرمت کتاب اللہ میں صراحت کے ساتھ بیان نہیں ہوئی ہے بلکہ ان کا حرام ہونا احادیث نبوی کے ذریعہ ثابت ہے۔ حدیث کا آخری جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمام چیزیں اپنی اصل کے اعتبار سے مباح ہیں لہٰذا جن چیزوں کو شریعت نے حرام قرار نہیں دیا ہے وہ مباح ہوں گی۔

"یہ حدیث موقوف ہے" کا مطلب یہ ہے کہ یہ حضرت سلمان کا اپنا قول ہے نہ کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔ چنانچہ فن حدیث کی اصطلاح میں صحابہؓ کے قول و فعل کو موقوف کہا جاتا ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ کے قول و فعل کو مرفوع کہتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی طرف سے عمدہ کھانے کی خواہش کا اظہار

(۶۶) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَدِدْتُ اَنَّ عِنْدِيْ خُبْزَةً بَيْضَآءَ مِنْ بُرَّةٍ سَمْرَآءَ مُلَبَّقَةً

بِسَمْنٍ وَلَبَنٍ فَقَامَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ فَاتَّخَذَهُ فَجَاءَ بِهِ فَقَالَ فِي اَيِّ شَيْءٍ كَانَ هٰذَا قَالَ فِيْ عُكَّةِ ضَبٍّ قَالَ ارْفَعْهُ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ اَبُوْدَاوُدَ وَهٰذَا حَدِيْثٌ مُنْكَرٌ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے (مجلس میں) فرمایا کہ "میں پسند کرتا ہوں کہ میرے سامنے سفید گیہوں کی روٹی ہو جس کو گھی اور دودھ میں تر کیا گیا ہو۔" (یہ سن کر) جماعت میں سے ایک شخص اٹھ کر چلا گیا اور مذکورہ روٹی تیار کر کے لایا، آنحضرت ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) فرمایا کہ "اس روٹی کو جو گھی لگا ہوا ہے وہ کس برتن میں تھا؟" اس نے کہا کہ گوہ کی کھال کے کپے میں تھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا (میں نہیں کھاؤں گا) اس کو میرے سامنے سے اٹھالو (ابوداؤد، ابن ماجہ) اور ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ نے اس روٹی کو اپنے سامنے سے اٹھانے کا حکم اس بنا پر دیا کہ آپ ﷺ گوہ سے طبعی نفرت رکھتے تھے کیونکہ وہ آپ ﷺ کی قوم کے علاقے میں نہیں پائی جاتی تھی جیسا کہ پچھلے صفحات میں حضرت خالد کی روایت اس کے متعلق گزر چکی ہے، نہ کہ اس کے اٹھانے کا حکم اس سبب سے تھا کہ گوہ کی کھال نجس ہوتی ہے کیونکہ اگر گوہ کی کھال نجس ہوتی تو اس کھال کے کپے میں رکھے ہوئے گھی سے ترکی ہوئی روٹی کو آپ ﷺ پھینک دینے کا حکم دیتے اور دوسروں کو بھی اس کے کھانے سے منع فرمادیتے۔

آنحضرت ﷺ کا مذکورہ روٹی کو طلب کرنا اور خواہش نفس کے مطابق اس طرح کی تمنا کا اظہار کرنا ایک ایسا واقعہ ہے جو آپ ﷺ کی عادت مبارکہ اور آپ ﷺ کے مزاج کے بالکل خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے ابوداؤدؒ نے اس روایت کو منکر کہا ہے اور اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس صورت میں یہی توجیہ ہو سکتی ہے کہ آپ ﷺ نے اس طرح کی خواہش کا اظہار محض بیان جواز کی خاطر کیا۔

کچا لہسن کھانے کی ممانعت

(۶۷) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَكْلِ الثُّوْمِ اِلَّا مَطْبُوْخًا۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے لہسن کھانے سے منع فرمایا الایہ کہ وہ پکا ہوا ہو۔" (ترمذی، ابوداؤدؒ)

تشریح: پکے ہوئے لہسن کو کھانے سے اس لئے منع نہیں فرمایا گیا ہے کہ پکنے سے اس کی بو جاتی رہتی ہے۔ یہی حکم پیاز اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا بھی ہے لیکن واضح رہے کہ مذکورہ ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے۔

آنحضرت ﷺ کے پیاز کھانے کا مسئلہ

(۶۸) وَعَنْ اَبِيْ زِيَادٍ قَالَ سَاَلْتُ عَائِشَةَ عَنِ الْبَصَلِ فَقَالَتْ اِنَّ اٰخِرَ طَعَامٍ اَكَلَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَعَامٌ فِيْهِ بَصَلٌ۔ (رواہ البوداؤد)

"اور حضرت ابوزیاد کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ سے (پکی ہوئی) پیاز کے بارے میں پوچھا گیا (کہ وہ حرام ہے یا حلال؟) تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ نے (اپنی زندگی میں) جو سب سے آخری کھانا کھایا تھا اس میں (پکی ہوئی) پیاز تھی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس مسئلہ میں تفصیل یہ ہے کہ روایتوں میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پیاز و لہسن نہیں کھایا بلکہ بعض روایت میں یہ ہے، کہ اُمت کو بھی اس سے منع فرمایا ہے لیکن حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے پیاز کھائی ہے لہٰذا بعض حضرات کہتے ہیں کہ پیاز و لہسن کھانے کی جو ممانعت منقول ہے اس کا تعلق کچی پیاز اور لہسن سے ہے نہ کہ اس لہسن و پیاز سے جو کھانے میں پکا ہوا ہو۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ کچے کے بارے میں ممانعت بھی محض نہی تنزیہی کے طور پر ہے۔ بطور تحریمی نہیں ہے، چنانچہ یہ

چیزیں نہ تو آنحضرت ﷺ پر حرام تھیں اور نہ اُمت پر حرام ہیں بلکہ طحاویؒ نے شرح آثار میں ایسی احادیث نقل کی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ پیاز و لہسن اور گندنا وغیرہ کھانا مباح ہے خواہ وہ کچے ہوں یا کھانے کے ساتھ پکے ہوئے ہوں، لیکن یہ اباحت اس شخص کے لئے ہے جو ان کو کھانے کے بعد گھر میں بیٹھا رہے اور ان کی بو آنے تک مسجد میں نہ جائے کیونکہ ان چیزوں کو کھا کر مسجد میں جانا مکروہ ہے، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ، حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کا قول بھی یہی ہے۔ ابن ملک کہتے ہیں کہ جہاں تک آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کا تعلق ہے کہ آپ کا اپنی زندگی کے آخر میں ایسے کھانے کو کھانا جس میں پیاز تھی بیان جواز کی خاطر تھا اور یہ واضح کرنا تھا کہ ان چیزوں کے کھانے کی ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے نہ کہ بطور تحریمی۔

مکھن آنحضرت ﷺ کو پسند تھا

(۶۹) وَعَنِ ابْنَیْ بُسْرِ السُّلَمِیَّیْنِ قَالَا دَخَلَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَدَّمْنَا زُبْدًا اَوْ تَمْرًا وَکَانَ یُحِبُّ الزُّبْدَ وَالتَّمْرَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور بسر کے دونوں بیٹوں (یعنی حضرت عبداللہ اور حضرت عطیہ) سے جو اسلمی (اور صحابی) ہیں روایت ہے کہ ان دونوں نے کہا (ایک دن رسول کریم ﷺ) ہمارے گھر تشریف لائے تو ہم نے آپ ﷺ کے سامنے مسکہ (مکھن) اور کھجوریں پیش کیں (جن کو آپ ﷺ نے کھایا) آنحضرت ﷺ مسکہ اور کھجور کو پسند فرماتے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

ایک برتن میں کھانے کی چیز مختلف قسموں کی ہو تو اپنے سامنے سے کھانے کی قید نہیں ہوگی

(۷۰) وَعَنْ عِکْرَاشِ بْنِ ذُؤَیْبٍ قَالَ اُتِیْنَا بِجَفْنَۃٍ کَثِیْرَۃِ الثَّرِیْدِ وَالْوَذْرِ فَخَبَطْتُ بِیَدِیْ فِیْ نَوَاحِیْھَا وَاَکَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ فَقَبَضَ بِیَدِہِ الْیُسْرٰی عَلٰی یَدِی الْیُمْنٰی ثُمَّ قَالَ یَا عِکْرَاشُ کُلْ مِنْ مَوْضِعٍ وَاحِدٍ فَاِنَّہٗ طَعَامٌ وَاحِدٌ ثُمَّ اُتِیْنَا بِطَبَقٍ فِیْہِ اَلْوَانُ التَّمْرِ فَجَعَلْتُ اٰکُلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیَّ وَجَالَتْ یَدُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی الطَّبَقِ فَقَالَ یَا عِکْرَاشُ کُلْ مِنْ حَیْثُ شِئْتَ فَاِنَّہٗ غَیْرُ لَوْنٍ وَاحِدٍ ثُمَّ اُتِیْنَا بِمَآءٍ فَغَسَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَدَیْہِ وَمَسَحَ بِبَلَلِ کَفَّیْہِ وَجْھَہٗ وَذِرَاعَیْہِ وَرَاْسَہٗ وَقَالَ یَا عِکْرَاشُ ھٰذَا الْوُضُوْءُ مِمَّا غَیَّرَتِ النَّارُ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت عکراش بن ذویبؓ کہتے ہیں کہ (ایک موقع پر) ہمارے سامنے ایک بڑا پیالہ لایا گیا جس میں بہت سا ثرید (یعنی شوربے میں بھیگے ہوئے روٹی کے ٹکڑے) اور (گوشت کی) بوٹیاں تھیں، (کھانے کے دوران) میں اپنا ہاتھ پیالے کے ہر طرف دوڑانے لگا۔ (یعنی اپنے سامنے سے لقمہ اٹھانے کے بجائے ہر طرف ہاتھ ڈالنے لگا) جب کہ رسول کریم ﷺ اپنے آگے سے کھا رہے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے بائیں ہاتھ سے میرا داہنا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا کہ عکراش۔ ایک جگہ سے (یعنی اپنے آگے سے) کھاؤ، کیونکہ یہ ایک (ہی طرح کا کھانا ہے۔" پھر ہمارے آگے ایک طباق لایا گیا جس میں قسم قسم کی کھجوریں تھیں، میں نے (آنحضرت ﷺ کی ہدایت کے مطابق) اپنے سامنے سے (کھجوریں اٹھا اٹھا کر) کھانا شروع کیا لیکن (اب) رسول کریم ﷺ کا ہاتھ طباق میں (ہر طرف) گردش کرنے لگا (یعنی آپ ﷺ اپنی طبعی پسند کے مطابق طباق کے ہر کنارے سے کھجوریں اٹھا اٹھا کر کھانے لگے اور اس کا مقصد لوگوں پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو کھجوریں ہر طرف سے اٹھا کر کھا سکتے ہیں اور پھر آپ ﷺ نے محض اپنے اس فعل کے ذریعہ ہی بیان نہیں کیا بلکہ قول کے ذریعہ بھی تعلیم دی کہ) پھر فرمایا، عکراش! جس طرف سے چاہو کھاؤ کیونکہ یہ کھجوریں ایک (ہی) قسم کی نہیں ہیں۔" اس کے بعد ہمارے پاس پانی لایا گیا چنانچہ رسول کریم ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ دھوئے اور اپنے ہاتھوں کی تری (اپنے منہ اور کہنیوں تک ہاتھوں پر اور سر پر مل لی اور فرمایا" عکراش: یہ اس کھانے کے بعد کا وضو ہے جس کو آگ نے متغیر کیا ہے (یعنی یہ ہاتھ اور منہ دھونا کہ جس کو وضو طعام کہا جاتا ہے اس کھانے کی وجہ سے

ہے جس کو آگ پر پکایا گیا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "ایک طرح کا کھانا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جب پورے پیالے میں یکساں قسم کا کھانا ہے اور اس کی ہر طرف ایک ہی طرح کی چیز ہے تو پھر پیالے کی ساری اطراف میں ہاتھ پکانا طمع و حرص کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے یعنی اگر کھانا کئی طرح کا ہوتا یا ایک ہی ہوتا لیکن پیالے کے ہر حصے میں الگ الگ رنگ ہوتا تو اپنی طبیعت کے میلان کی بناء پر ہر طرف سے کھانا مناسب معلوم ہوتا مگر جب کہ کھانا ایک ہی طرح کا ہے اور یکساں رنگ کا ہے تو پھر ہر طرف ہاتھ دوڑانا معیوب و مکروہ ہے! "جس طرف سے چاہو کھاؤ" میں بظاہر درمیان کی جگہ مستثنیٰ ہے کیونکہ برکت نازل ہونے کی وہی جگہ ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ درمیان کی جگہ سے نہ کھایا جانا اس کھانے کے ساتھ مخصوص ہو جو ایک رنگ کا ہو اور چونکہ یہاں (کھجور کھانے کی صورت میں) ایک رنگت نہیں تھی اس لئے درمیان میں سے بھی کھجور اٹھا کر کھانے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا گیا ہو! ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ اس ارشاد سے یہ مفہوم بھی لیا گیا ہے کہ اگر کھانے کی چیز از قسم میوہ و پھل ہو اور وہ ایک ہی طرح اور ایک ہی رنگ کی ہو تو اس صورت میں برتن کے ہر طرف ہاتھ نہ لپکانا چاہئے۔ جیسا کہ طعام کا حکم ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر ایک برتن میں کھانا مختلف رنگت کا ہو تو صرف اپنے سامنے سے کھانے کی قید نہیں ہوگی بلکہ جس طرف سے جی چاہے کھایا جاسکتا ہے۔

حریرے کا فائدہ

۷۱ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَخَذَ اَهْلَهُ الْوَعْكُ اَمَرَ بِالْحَسَاءِ فَصُنِعَ ثُمَّ اَمَرَهُمْ فَحَسَوْا مِنْهُ وَكَانَ يَقُوْلُ اِنَّهُ لَيَرْتُوْ فُؤَادَ الْحَزِيْنِ وَيَسْرُوْ عَنْ فُؤَادِ السَّقِيْمِ كَمَا تَسْرُوْ اِحْدَاكُنَّ الْوَسَخَ بِالْمَاءِ عَنْ وَجْهِهَا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ کے گھر والوں کو بخار آجاتا تو آپ حساء تیار کرنے کا حکم دیتے چنانچہ وہ تیار کیا جاتا اور پھر آپ ﷺ مریضوں کو اس حساء کے پینے کا حکم دیتے جس کو وہ (مریض) پیتے، آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ "درحقیقت حساء غمزدہ دل کو طاقت پہنچاتا ہے اور بیمار کے دل سے رنج و کلفت کو اس طرح دور کر دیتا ہے جس طرح (عورتوں) میں سے کوئی اپنے منہ کے میل کو پانی سے صاف کر ڈالتی ہے۔" ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: حساء کھانے کی قسم سے ایک رقیق چیز ہوتی ہے جو آٹا، پانی اور گھی کو ملا کر پکائی جاتی ہے کبھی اس میں شکر بھی ملا دی جاتی ہے، مکہ کے لوگ اس کو حریرہ بھی کہتے تھے اور تبینہ بھی، جس کا ذکر فصل اول کی ایک حدیث میں گزر چکا ہے، آنحضرت ﷺ سے اس ارشاد میں حریرے کے فائدے کو ظاہر کرنے کے لئے اپنا روئے سخن عورتوں کی طرف اُس لئے منعطف کیا کہ اصل میں عورتیں اپنے جسم کا میل دھونے اور اپنے چہرے کو صاف رکھنے کی زیادہ سے زیادہ سعی کرتی ہیں یا یہ کہ جس وقت آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا اس وقت عورتیں موجود تھیں اس لئے انہی کو خطاب کیا۔

عجوہ جنّت کی کھجور ہے

۷۲ وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعَجْوَةُ مِنَ الْجَنَّةِ وَفِيْهَا شِفَاءٌ مِّنَ السَّمِّ وَالْكُمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَمَاءُ هَا شِفَاءٌ لِّلْعَيْنِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "عجوہ (جو کھجور کی سب سے اچھی قسم ہے) جنّت کی (کھجور) ہے اور اس میں زہر کی شفاء ہے اور کھنبی، من (کی قسم) سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفاء ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "عجوہ جنت کی کھجور ہے" کا مطلب یا تو یہ ہے کہ عجوہ کی اصل جنت سے آتی ہے یا یہ کہ جنت میں جو کھجور ہوگی وہ عجوہ ہے اور یا یہ کہ عجوہ ایسی سودمند اور راحت بخش کھجور ہے گویا وہ جنت کا میوہ ہے، زیادہ صحیح مطلب پہلا ہی ہے حدیث کے باقی حصے کی وضاحت پہلی فصل میں گزر چکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

چھری سے گوشت کاٹ کر کھانا جائز ہے

(۷۳) عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ ضِفْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَاَمَرَ بِجَنْبٍ فَشُوِيَ ثُمَّ اَخَذَ الشَّفْرَةَ فَجَعَلَ يَحُزُّ لِيْ بِهَا مِنْهُ فَجَآءَ بِلَالٌ يُؤْذِنُهُ بِالصَّلَاةِ فَاَلْقَى الشَّفْرَةَ فَقَالَ مَالَهُ تَرِبَتْ يَدَاهُ قَالَ وَكَانَ شَارِبُهُ وَفَاءً فَقَالَ لِيْ اُقُصُّهُ لَكَ عَلٰى سِوَاكٍ اَوْ قُصَّهُ عَلٰى سِوَاكٍ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ ایک رات میں رسول کریم ﷺ کے ساتھ "کسی شخص کے ہاں" مہمان ہوا۔ اس شخص نے (ہمارے لئے) ایک بکری ذبح کی اور رسول کریم ﷺ نے اس (بکری) کا ایک پہلو بھوننے کا حکم دیا۔ جب وہ پہلو بھون دیا گیا آنحضرت ﷺ نے ایک چھری لی۔ پھر اس کے ذریعہ اس پہلو میں سے میرے لئے (بوٹیاں کاٹنے لگے، اتنے میں حضرت بلالؓ آنحضرت ﷺ کو نماز کی اطلاع دینے کے لئے آگئے، آپ ﷺ نے چھری کو ڈال دیا اور (بطریق تعجب) فرمایا کہ بلال کو کیا ہوا؟ (کہ ایسے وقت بلانے آگیا) اس کے دونوں ہاتھ خاک آلود ہوں۔" حضرت مغیرہؓ کہتے ہیں کہ (اس وقت) اس کی لبیں (یعنی مونچھیں) بڑھی ہوئی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ۔" میں تمہارے لئے (تمہاری) لبیں مسواک پر کتر دوں۔ یا یہ فرمایا کہ۔ لبیں مسواک پر) کتر ڈالو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "اس کے دونوں ہاتھ خاک آلود ہوں۔" یہ اصل میں ذلت و خواری اور فقر و افلاس سے کنایہ ہے اور ایک طرح بددعا کے مراوف ہے اس جملہ کا استعمال عام طور پر اہل عرب کے ہاں اس شخص کے لئے کیا جاتا ہے جس کو ملامت کرنا مقصود ہوتا ہے اور حقیقت میں اس بددعا کے واقع ہو جانے کی طلب و خواہش نہیں ہوتی بلکہ روزمرہ کے محاورے کے طور پر اس جملہ کو بولتے ہیں اس سے مراد محض سرزنش و ملامت ہوتی ہے چنانچہ اس موقعہ پر بھی گویا آنحضرت ﷺ کو یہ ناگوار گزرا کہ جب نماز کا ابھی کافی وقت باقی ہے تو بلالؓ نے کھانے کی مشغولیت کے دوران نماز کے لئے کیوں اٹھانا چاہا اور یہ بھی احتمال ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس جملہ کا استعمال میزبان کی کیفیات و حالات کو دیکھتے ہوئے فرمایا ہو کہ اس وقت یقیناً میزبان کو بڑی ذہنی اذیت و کوفت ہوئی ہوگی اس لئے آپ ﷺ نے ان کی طرف سے یا ان کی دلجوئی کے لئے حضرت بلالؓ پر اس جملہ کے ذریعہ اظہار ناگواری فرمایا۔

"اس کی لبیں بڑھی ہوئی تھیں" شارحین نے اس جملہ کی وضاحت کئی طرح کی ہے، ایک یہ کہ شاربہ کی ضمیر حدیث کے راوی حضرت مغیرہ کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں اگرچہ ظاہری اسلوب کا تقاضا یہ تھا کہ یوں کہا جاتا وَكَانَ شَارِبِيْ (اور میری لبیں بڑھی ہوئی تھیں) یعنی ضمیر متکلم کا استعمال ہوتا لیکن اس کے بجائے وشاربہ کہہ کر غائب کی ضمیر استعمال کی اس کی وجہ محض تفنن کلام ہے جس کو اہل معانی کی اصطلاح میں تجرید والتفات کہا جاتا ہے، لہٰذا اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ میری لبیں بڑھی ہوئی تھیں، "نیز مسواک پر کترنے" کا مطلب یہ تھا کہ لبوں کے نیچے مسواک رکھ کر لبوں کو چھری سے کاٹ ڈالوں۔

"اور یا یہ فرمایا۔" یہ اصل میں راوی کا اپنے شک کو ظاہر کرنا ہے کہ یا تو آپ ﷺ نے پہلا جملہ ارشاد فرمایا کہ لبیں مسواک پر رکھ کا کاٹ ڈالو یعنی آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں تمہاری لبیں کاٹوں بلکہ انہیں (حضرت مغیرہ) کو حکم فرمایا کہ خود اپنی لبیں کاٹ ڈالیں۔ شارحین نے دوسری وضاحت یہ بیان کی ہے کہ شاربہ کی ضمیر آنحضرت ﷺ کی طرف راجع کی جائے یعنی حضرت مغیرہؓ کے کہنے کا

مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی لبیں بڑھی ہوئی تھیں چنانچہ آنحضرت ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ میں اپنی لبوں کو تمہارے لئے کتر دوں گا کہ وہ بال مجھ سے جدا ہو کر تمہارے پاس رہیں اور تم ان سے برکت حاصل کرو، یا یہ کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت مغیرہؓ کو حکم دیا کہ تم میری لبوں کے بال کتر دو۔

بسم اللہ پڑھ کر کھانا نہ کھانا شیطانی اثر ہے

(۷۴) وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ كُنَّا اِذَا حَضَرْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَعَامًا لَمْ نَضَعْ اَيْدِيَنَا حَتّٰى يَبْدَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَضَعُ يَدَهُ وَاِنَّا حَضَرْنَا مَعَهُ مَرَّةً طَعَامًا فَجَاءَتْ جَارِيَةٌ كَاَنَّهَا تُدْفَعُ فَذَهَبَتْ لِتَضَعَ يَدَهَا فِي الطَّعَامِ فَاَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهَا ثُمَّ جَآءَ اَعْرَابِيٌّ كَاَنَّمَا يُدْفَعُ فَاَخَذَ بِيَدِهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّيْطَانَ يَسْتَحِلُّ الطَّعَامَ اَنْ لَّا يُذْكَرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ جَآءَ بِهٰذِهِ الْجَارِيَةِ لِيَسْتَحِلَّ بِهَا فَاَخَذْتُ بِيَدِهَا فَجَآءَ بِهٰذَا الاَعْرَابِيِّ لِيَسْتَحِلَّ بِهٖ فَاَخَذْتُ بِيَدِهٖ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنَّ يَدَهٗ فِيْ يَدَيَّ مَعَ يَدِهَا. زَادَ فِيْ رِوَايَةٍ ثُمَّ ذَكَرَ اسْمَ اللّٰهِ وَاَكَلَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ جب ہم رسول کریم ﷺ کے ساتھ کسی کھانے پر ہوتے تو ہم اس وقت تک کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھاتے جب تک رسول کریم ﷺ شروع نہ فرماتے، آپ ﷺ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے (تو اس کے بعد ہم اپنا ہاتھ بڑھاتے) چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہم رسول کریم ﷺ کے ساتھ کھانے پر بیٹھے، اتنے میں ایک لڑکی (کھانے پر) اس طرح آئی گویا وہ ڈھکیل دی گئی ہے (یعنی وہ بھوک کی شدت سے بے اختیار ہو کر کھانے پر اس طرح ٹوٹی جیسے اس کو کسی نے پیچھے سے دسترخوان پر ڈھکیل دیا ہو) پھر اس نے (جوں ہی) یہ چاہا کہ (بسم اللہ کہے بغیر) کھانے پر ہاتھ ڈالے، تو رسول کریم ﷺ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر ایک دیہاتی (بھی اسی طرح بیتابی کے ساتھ) آیا کہ گویا اس کو (کھانے پر) ڈھکیل دیا گیا ہے (اور اس نے بھی بسم اللہ کہے بغیر کھانے پر ہاتھ ڈالنا چاہا کہ) آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ (بھی) پکڑ لیا۔ اور پھر رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ حقیقت یہ ہے کہ شیطان اس کھانے کو اپنے لئے حلال کرتا ہے (اور اس کے کھانے پر قادر ہوتا ہے) جس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا جاتا چنانچہ شیطان اس لڑکی کو لے کر آیا تاکہ اس (کے بسم اللہ نہ پڑھنے کے سبب اس کھانے کو اپنے لئے حلال کرے لیکن میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر شیطان اس دیہاتی کو لایا تاکہ اس کے ذریعہ کھانے کو اپنے لئے حلال کرے مگر میں نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، بلاشبہ (اس وقت) شیطان کا ہاتھ اس لڑکی کے ہاتھ کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔" ایک روایت میں (حذیفہ یا مسلم نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ۔" اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اللہ کا نام لیا (یعنی بسم اللہ پڑھی) اور کھانا کھایا۔" (مسلمؒ)

تشریح: ایک روایت میں مع یدھا (اس لڑکی کے ہاتھ کے ساتھ) کے بجائے مع یدیھما (اس لڑکی اور اس اعرابی کے ہاتھ کے ساتھ) کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے تاہم جس روایت میں لفظ یدھا ہے وہ گویا اس لڑکی کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ اس اعرابی کا ہاتھ بھی آپ کے ہاتھ میں ہو کیوں کہ پہلے آپ نے یہ فرمایا تھا کہ میں نے اس اعرابی کا ہاتھ بھی پکڑ لیا البتہ چونکہ پہلے لڑکی ہی کا ہاتھ پکڑا تھا اس لئے خاص طور پر محض اس کا ذکر کیا۔

زیادہ کھانا بے برکتی کی علامت ہے

(۷۵) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرَادَ اَنْ يَّشْتَرِيَ غُلَامًا فَاَلْقٰى بَيْنَ يَدَيْهِ تَمْرًا فَاَكَلَ الْغُلَامُ فَاَكْثَرَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ كَثْرَةَ الْاَكْلِ شُؤْمٌ وَاَمَرَ بِرَدِّهٖ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ نے ایک غلام کو خریدنے کا ارادہ فرمایا تو (آزمائش کے طور پر) اس کے آگے کھجوریں رکھ دیں، چنانچہ وہ غلام (خوراک سے) بہت زیادہ کھجوریں کھا گیا، رسول کریم ﷺ نے (یہ دیکھ کر فرمایا کہ "زیادہ کھانا، بے برکتی کا سبب اور بے برکتی کی علامت ہے۔" پھر آپ ﷺ نے اس غلام کو واپس کر دینے کا حکم دیا۔" (بیہقی)

نمک بہترین سالن ہے

(۷۶) وَعَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَيِّدُ اِدَامِكُمُ الْمِلْحُ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "تمہارے سالنوں میں بہترین سالن نمک ہے۔" (ابن ماجہ)

تشریح: نمک کو "بہترین سالن" اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ وہ کم سے کم محنت اور بڑی آسانی کے ساتھ دستیاب ہو جاتا ہے اور قناعت کا سب سے قریبی ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے اکثر عارفین اور اہل اللہ نمک ہی پر قناعت کرتے تھے، اس اعتبار سے یہ ارشاد آنحضرت ﷺ کے اس قول کے منافی نہیں ہے کہ سید الادم فی الدنیا و الاخرۃ اللحم (یعنی دنیا و آخرت میں سالنوں کا سردار گوشت ہے)۔

جوتا اتار کر کھانا کھاؤ

(۷۷) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وُضِعَ الطَّعَامُ فَاخْلَعُوْا نِعَالَكُمْ فَاِنَّهُ اَرْوَحُ لِاَقْدَامِكُمْ۔

"اور حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب (تمہارے سامنے کھانا رکھا جائے (اور تم کھانے بیٹھو) تو اپنے جوتے اتار دو کیونکہ جوتے اتار دینا پیروں کے لئے بہت راحت بخش ہے۔"

کھانا ٹھنڈا کر کے کھانا چاہئے

(۷۸) وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ اَبِيْ بَكْرٍ اَنَّهَا كَانَتْ اِذَا اُتِيَتْ بِثَرِيْدٍ اَمَرَتْ بِهٖ فَغُطِّيَ حَتّٰى تَذْهَبَ فَوْرَةُ دُخَانِهٖ وَتَقُوْلُ اِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ هُوَ اَعْظَمُ لِلْبَرَكَةِ رَوَاهُمَا الدَّارِمِيُّ۔

"اور حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کے بارے میں روایت ہے کہ جب ان کے سامنے ثرید لایا جاتا تو وہ اس کو ڈھانک دینے کا حکم دیتیں، چنانچہ اس کو ڈھانک کر رکھ دیا جاتا تھا، یہاں تک کہ اس کے دھویں اور بھاپ کا جوش نکل جاتا تھا (یعنی اس کی گرمی کی شدت ختم ہو جاتی تھی اس کے بعد وہ اس کو کھاتی تھیں) نیز وہ فرماتی تھیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "کھانے میں سے گرمی کا نکل جانا برکت میں زیادتی کا موجب ہے۔" (ان دونوں روایتوں کو دارمی نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "ثرید" کا ذکر محض اتفاقی ہے کہ اس وقت کا عام کھانا ثرید ہی ہوتا تھا اس لئے اس کا ذکر کیا ورنہ دوسرے کھانوں کا بھی یہی حکم ہے، چنانچہ جامع الصغیر میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ ابردوا بالطعام فان الحار لا برکۃ فیہ (کھانے کو ٹھنڈا کر کے کھاؤ کیوں کہ گرم میں برکت نہیں ہوتی) اسی طرح بیہقی نے بطریق ارسال یہ روایت نقل کی ہے کہ نھی عن الطعام الحار حتی یبرد (آنحضرت ﷺ نے گرم کھانا کھانے سے منع فرمایا ہے یہاں تک کہ وہ ٹھنڈا ہو جائے)۔

کھانے کے برتن کو چاٹ لینا چاہئے

(۷۹) وَعَنْ نُبَيْشَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَكَلَ فِيْ قَصْعَةٍ لَحِسَهَا تَقُوْلُ لَهُ الْقَصْعَةُ اَعْتَقَكَ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ كَمَا اَعْتَقْتَنِيْ مِنَ الشَّيْطَانِ۔ (رواہ رزین)

"اور حضرت نبیشہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص پیالے (یا طشتری وغیرہ) میں کھائے اور پھر اس کو (انگلیوں سے) چاٹ

لے تو وہ پیالہ (زبان حال سے یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ زبان قال سے) اس شخص سے کہتا ہے کہ جس طرح تو نے شیطان کے (کھانے یا اس کے خوش ہونے) سے مجھ کو نجات دی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ تجھ کو دوزخ کی آگ سے نجات دے" (رزین)

تشریح: ترمذی، احمد، ابن ماجہ اور دارمی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ استغفرت له القصعة (وہ پیالہ اس شخص کے لئے بخشش و مغفرت طلب کرتا ہے اور طبرانی نے حضرت عرباض سے یہ نقل کیا ہے من لعق الصحفة ولعق صابعه اشبعه اللّٰه فى الدنيا والاخرة (یعنی جس شخص نے رکابی اور اپنی انگلیوں کو چاٹا اللہ تعالیٰ اس کو دنیا و آخرت میں سیر کرے)

بَابُ الضِّيَافَةِ

ضیافت کا بیان

ضاف کے معنی ہیں مہمان ہونا۔ اضاف کے معنی ہیں مہمان داری کرنا، ضیف کے معنی ہیں مہمان اور مضیف کے معنی ہیں میزبان اس عنوان کے تحت جو احادیث نقل ہوں گی ان سے معلوم ہوگا کہ ضیافت اور مہمان داری کی کیا فضیلت ہے؟ شریعت کی نظر میں اس کے کیا طور طریقے اور آداب ہیں اور یہ کہ مہمان و میزبان کے درمیان حفظ مراتب اور ان دونوں سے متعلق تہذیب و شائستگی کی کیا حدود ہیں؟

ضیافت کا حکم: اکثر علماء کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ ضیافت (مہمان داری) کے حقوق و آداب کی رعایت، اچھے اخلاق اور تہذیب و شائستگی کی علامت بھی ہے اور مستحب بھی۔ چنانچہ اکثر احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں، بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ایک دن کی مہمان داری کرنا تو واجب ہے اور ایک دن کے بعد مستحب ہے۔ ضیافت کی جو آٹھ قسمیں علماء نے بیان کی ہیں ان کی تفصیل باب الولیمہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

مہمان کی خاطر کرنا کمال ایمان کی علامت ہے

① عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يُؤْذِ جَارَهٗ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا اَوْ لِيَصْمُتْ وَفِىْ رِوَايَةٍ بَدَلَ الْجَارِ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی خاطر کرے، جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے، اور جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ بھلی بات کہے یا چپ رہے۔" اور (بخاری کی) ایک روایت میں (یعنی پڑوسی کا ذکر کرنے کے بجائے یہ ہے کہ جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے ناتے کو باقی رکھے، یعنی اپنے ناتے داروں اور عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کا معاملہ کرے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے الخ" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایمان کا پایا جانا مذکورہ باتوں پر موقوف ہے اور یہ کہ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے مہمان کی خاطر نہیں کرتا یا اپنے پڑوسی کو تکلیف پہنچاتا ہے تو وہ مؤمن نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ اصل مقصد ان

چیزوں کی اہمیت کو بیان کرنا اور ان پر عمل کرنے کی زیادہ سے زیادہ تاکید کرنا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے بیٹے کو اطاعت و فرماں برداری کی راہ پر لگانے کے لئے یوں کہے کہ اگر تو میرا بیٹا ہے تو اطاعت و فرماں برداری کر ظاہر ہے کہ اگر وہ اطاعت و فرماں برداری نہ کرے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوگا کہ وہ اس کا بیٹا نہیں ہے۔

یا یہ مراد ہے کہ جس شخص کا ایمان درجہ کمال کا ہوگا (یعنی جو مسلمان کامل الایمان ہوگا) اس کی شان یہی ہوگی کہ وہ ان باتوں پر عمل کرے گا گویا ان چیزوں کو اختیار کرنا کمال ایمان کی علامت ہے۔

اکرام ضیف یعنی مہمان کی خاطر کرنا شرعی طور پر یہ ہے، کہ جب کوئی مہمان آئے تو اس کے ساتھ کشادہ پیشانی، خوش خلقی اور ہنس مکھ چہرے کے ساتھ پیش آئے، اس کے ساتھ خوش گفتاری، نرم گوئی اور ملاطفت کے ساتھ بات چیت کرے؛ اور اس کو تین دن تک اس طرح کھلائے پلائے کہ پہلے دن تو اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق کچھ پر تکلف میزبانی کرے بشرطیکہ اس کی وجہ سے اپنے متعلقین و لواحقین کی حق تلفی نہ ہو اور پھر تین دن کے بعد (بھی اگر مہمان ٹھہرا رہے تو) اس کو کھلانا پلانا، "صدقہ" کے حکم میں ہوگا کہ میزبان چاہے تو کھلائے پلائے اور چاہے کھلانے پلانے سے انکار کر دے۔

"اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے" یعنی یہ پڑوسی کا سب سے کم درجہ ہے کہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے، ورنہ تو جہاں تک حقوق ہمسائیگی کا تعلق ہے وہ بہت ہمہ گیری نوعیت کے ہیں چنانچہ بخاری و مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ فلیکرم جارہ (تو اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کے ساتھ تکریم کا معاملہ کرے) اور بخاری و مسلم ہی کی ایک روایت میں یوں منقول ہے کہ فلیحسن الی جارہ یعنی اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کی اس چیز میں مدد کرے جس کا وہ اس سے حاجت مند ہے اور اس کی مصیبت کو دور کرے۔ اسی طرح امام غزالیؒ نے اربعین میں یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے (صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا کہ۔ "تم جانتے بھی ہو پڑوسی کا کیا حق ہے؟ اگر وہ (پڑوسی) تم سے مدد چاہے تو تم اس کی مدد کرو، اور اگر وہ تم سے قرض مانگے تو اس کو قرض دو، اگر وہ محتاج و مفلس ہو تو اس کو کچھ دو، اور وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کرو، اور اگر وہ تم سے قرض مانگے تو اس کو قرض دو، اگر اس کو کوئی خوشی حاصل ہو تو اس کو مبارک باد دو، اگر اس کو کوئی مصیبت پہنچے تو اس کو تسلی دو، مثلاً اس کے ہاں کوئی موت ہو جائے تو اس کے گھر جا کر تعزیت کرو، اس کے مکان کے پاس اونچا مکان نہ بناؤ، کہ اس کی ہوا وغیرہ رک جائے، اگر تم پھل وغیرہ خریدو تو تحفہ کے طور پر اس کے یہاں بھی بھجوا دو اور یہ ممکن نہ ہو سکے تو پھر تم اس (پھل وغیرہ) کو گھر میں پوشیدہ طور پر لے آؤ اور اپنے بچوں کو بھی تاکید کر دو کہ وہ اس (پھل وغیرہ کو لے کر گھر سے باہر نہ نکلیں تاکہ تمہارے پڑوسی کے بچے (تمہارے بچوں کو پھل وغیرہ کھاتا دیکھ کو اپنی محرومی کی بنا پر) رنج و افسوس نہ کریں، اور تم اپنی ہانڈی (چولھے) کے دھوئیں سے اس کو تکلیف نہ پہنچاؤ اور یہ کہ اس ہانڈی میں سے کچھ اس کے یہاں بھی بھجواؤ۔ اور کیا تم جانتے ہو کہ پڑوسی کا حق کیا ہے؟ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اپنے پڑوسی کا حق وہی شخص پہچانتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے۔"

"بھلی بات کہے یا چپ رہے" کا مطلب یہ ہے کہ جب زبان سے کوئی بات نکالنے کا ارادہ کرے اور یہ معلوم ہو کہ وہ بات خیر و بھلائی کی ہے کہ جس پر ثواب ملتا ہے خواہ وہ واجب ہو یا مستحب، تب اس کو زبان سے نکالے اور اگر اس بات کی بھلائی اس پر عیاں نہ ہو اور یا اس کو یہ معلوم ہو کہ یہ بات حرام ہے یا مکروہ ہے تو اس کو زبان سے نہ نکالے، حاصل یہ کہ بھلائی اس میں ہے کہ زبان کو حتی الامکان خاموش رکھا جائے، اگر بولنا ضروری ہی ہو تو زبان سے وہی بات نکالی جائے جو خیر و بھلائی کی حامل ہو، نہ صرف یہ کہ حرام و مکروہ باتوں میں زبان کو مشغول رکھنا ممنوع ہے بلکہ مباح باتوں سے بھی زبان کو بچانا دانشمندی کا تقاضا ہے کہ مبادا مباح باتیں ہی زبان کو حرام باتوں تک کھینچ کر لے جائیں۔

"اپنے ناتے کو باقی رکھے" میں اس طرف اشارہ ہے کہ صلہ رحمی ایمان کی علامت ہے کہ جس شخص نے ناتوں کو توڑ ڈالا، وہ گویا اللہ

اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والا نہیں ہے کیونکہ ناتا توڑنے پر جس عذاب سے ڈرایا گیا ہے اس کی پرواہ نہ کرنا اپنے ایمان کی خود نفی کرنے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

مہمان کو تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہئے

(۲) وَعَنْ اَبِي شُرَيْحِ الْكَعْبِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ جَائِزَتَهٗ يَوْمٌ وَلَيْلَةٌ وَالضِّيَافَةُ ثَلَاثَةُ اَيَّامٍ فَمَا بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ صَدَقَةٌ وَلَا يَحِلُّ لَهٗ اَنْ يَثْوِيَ عِنْدَهٗ حَتّٰى يُحْرِجَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت شریح کعبیؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی تعظیم و خاطرداری کرے مہمان کے ساتھ تکلف و احسان کرنے کا زمانہ ایک دن و ایک رات ہے اور مہمان داری کرنے کا زمانہ تین دن ہے، اس (تین دن کے بعد جو دیا جائے گا وہ ہدیہ و خیرات ہوگا اور مہمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ میزبان کے ہاں تین دن کے بعد اس کی استدعا کے بغیر) ٹھہرے کہ وہ تنگی میں مبتلا ہو جائے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: نہایہ جزری میں اس حدیث کی وضاحت میں لکھا ہے کہ مہمان کی تین دن اس طرح مہمان داری کی جائے کہ پہلے دن اس کے کھانے پینے کی چیزوں میں جو تکلف و اہتمام ہو سکے وہ کیا جائے، اور پھر دوسرے و تیسرے دن بلا تکلف و اہتمام جو کچھ حاضر ہو اس کو مہمان کے سامنے پیش کر دے، اس کے بعد اس کو کھانے پینے کی اتنی چیزیں دے دے جن کے سہارے وہ ایک دن اور ایک رات کا سفر طے کر سکے۔

حدیث میں "جائزہ" کا...... جو لفظ آیا ہے اس کا مفہوم یہی ہے، ویسے لغت کے اعتبار سے "جائزہ" کے معنی بخشش تحفہ اور انعام کے ہیں، لیکن یہاں وہ چیز مراد ہے جو ایک دن کی غذا کی ضرورت کے بقدر ہو اس کے سہارے منزل تک پہنچ جائے مہمان کو "جائزہ" کے بعد جو کچھ دیا جائے گا وہ ایک زائد چیز ہوگی اور صدقہ بھلائی اور احسان کے حکم میں ہوگا۔ اس وضاحت کے مطابق "جائزہ" یعنی مہمان کو ایک دن کے بقدر زادراہ دینا ضیافت یعنی مہمان داری کے بعد ہوگا (جب کہ حدیث میں اس کا ذکر ضیافت سے پہلے کیا گیا ہے) نیز یہ جائزہ، مہمان داری کرنے سے ایک زاہد چیز ہوگا۔

یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ "جائزہ" تین دن مہمان داری کرنے سے زائد کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ حدیث میں اس کا ذکر اس تکلف و اہتمام اور الطاف و عنایات کی وضاحت کے طور پر ہے جو میزبان مہمان داری کے تین دنوں میں سے پہلے دن اپنے مہمان کے لئے کرتا ہے، چنانچہ ابوداؤدؒ کی عبارت سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ "جائزہ" مہمان کی اس خاطرداری اور تواضع و مدارات کو کہا گیا ہے جو پہلے دن کی جاتی ہے اسی طرح حضرت مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ بھی یہی فرماتے تھے کہ ہمارا علم بھی یہ ہے کہ "جائزہ" کے یہی معنی ہیں۔

"مہمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے..... الخ" سے معلوم ہوا کہ جو شخص کسی کے ہاں مہمان جائے اس کے لئے یہ مطلقاً مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے میزبان کے ہاں تین دن سے زائد ٹھہرے، ہاں اگر خود میزبان کی خواہش ہو اور وہ درخواست کرے تو اس کی استدعا پر تین دن سے زائد ٹھہرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا! اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی مسافر (مہمان) کسی کے یہاں ٹھہرے اور کسی عذر مثلاً بیماری وغیرہ کے سبب اس کو تین دن سے زائد قیام کرنا پڑ جائے تو وہ تین دن کے بعد اپنے پاس سے کھائے پیئے صاحب خانہ کو تنگی و کلفت میں نہ ڈالے۔

مہمان داری کرنا واجب نہیں ہے

(۳) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قُلْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّكَ تَبْعَثُنَا فَنَنْزِلُ بِقَوْمٍ لَا يَقْرُوْنَنَا فَمَا تَرٰى فَقَالَ لَنَا اِنْ

نَزَلْتُم بِقَوْمٍ فَامَرُوْالَكُمْ بِمَا يَنْبَغِي لِلضَّيْفِ فَاقْبَلُوْا فَاِنْ لَمْ يَفْعَلُوْا فَخُذُوْا مِنْهُ حَقَّ الضَّيْفِ الَّذِي يَنْبَغِي لَهُمْ (متفق علیہ)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ جب آپ ﷺ ہمیں (جہاد یا کسی اور کام کے لئے) کہیں بھیجتے ہیں تو (ایسا بھی ہوتا ہے کہ) ہمیں ایسے لوگوں میں (بھی) قیام کرنا پڑتا ہے جو ہماری مہمان داری نہیں کرتے (ایسی صورت میں) آپ ﷺ کیا حکم دیتے ہیں (آیا ہم ان سے زبردستی اپنی مہمان داری کرا سکتے ہیں یا نہیں؟) چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ "اگر تم (اپنے سفر کے دوران) کسی قوم کے درمیان قیام کرو، اور وہ تمہیں وہ چیزیں دیں جو ایک مہمان (کو دینے) کے لائق ہے تو تم اس کو قبول کرو، اور اگر وہ ایسا نہ کریں (یعنی مہمان داری کا حق ادا نہ کریں) تو تم ان سے مہمان کا وہ حق لے سکتے ہو جو ایک مہمان کے لائق ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کا ظاہری مفہوم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اگر میزبان مہمان داری کے حقوق ادا نہ کرے تو مہمان اس سے اپنا حق زبردستی لے سکتا ہے، اس اعتبار سے یہ حدیث ان حضرات کے مسلک کی دلیل بھی ہے جو ضیافت یعنی مہمان کو کھلانا پلانا ایک واجب حق قرار دیتے ہیں، لیکن جمہور علماء کا مسلک چوں کہ یہ نہیں ہے اس لئے ان کی طرف سے اس حدیث کی کئی تاویلیں کی جاتی ہیں، ایک تو یہ کہ یہ حدیث اصل میں مخمصہ (خالی پیٹ ہونے) اور اضطرار بھوک کی وجہ سے بیتاب و مضطر ہونے) کی صورت پر محمول ہے اور ایسی صورت میں جب کہ مہمان سخت بھوکا اور مضطر ہو اس کی ضیافت کرنا بلاشبہ میزبان پر واجب ہوگا کہ اگر وہ (میزبان) اس حق کو ادا نہ کرے تو یہ حق اس سے زبردستی لیا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا اس وقت محتاج اور فقراء کی خبر گیری کرنی واجب تھی مگر جب بعد میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں عام طور پر فقر و احتیاج کی جگہ وسعت و فراخی پیدا فرمادی تو یہ حکم منسوخ قرار دیا گیا، اور تیسرے یہ کہ اس ارشاد گرامی کا تعلق اہل ذمہ وہ غیر مسلم جن کا مسلمان سے جان و مال کی مصالحت کا معاہدہ ہو چکا ہو) کے یہاں قیام کرنے سے تھا جب کہ ان کے ساتھ معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر مسلمان ان کے یہاں قیام کریں تو ان (مسلمانوں) کی ضیافت کرنا ان (اہل ذمہ) کے لئے ضروری ہوگا، چنانچہ اس شرط کی بنا پر مسلمانوں کی مہمان داری کرنا ان پر واجب تھا اور جو حق واجب ہو اس کو زبردستی بھی لیا جا سکتا ہے، اور چوتھے یہ کہ یہ حدیث "معاوضہ اور بدلہ" کی صورت پر محمول ہے یعنی اگر کچھ لوگ (مثلاً مسافر) کسی جگہ قیام کریں، اور وہاں کے لوگ (نہ صرف یہ کہ ان کی ضیافت نہ کریں بلکہ ان کے ہاتھ ایسی چیز فروخت کرنے سے انکار کریں جو ان (مہمان مسافروں) کے پاس نہیں ہے۔ نیز وہ اضطرار (بیتابی) کی حالت میں ہوں تو ان کے لئے جائز ہے کہ وہ (وہاں کے لوگوں سے) اس چیز کو زبردستی خرید لیں۔

جس میزبان پر اعتماد ہو اس کے ہاں دوسرے آدمیوں کو ہمراہ لے جانا درست ہے

(۴) وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ اَوْلَيْلَةٍ فَاِذَا هُوَ بِاَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ فَقَالَ مَا اَخْرَجَكُمَا مِنْ بُيُوْتِكُمَا هٰذِهِ السَّاعَةَ قَالَا الْجُوْعُ قَالَ وَاَنَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَاَخْرَجَنِي الَّذِي اَخْرَجَكُمَا قُوْمُوْا فَقَامُوْا مَعَهُ فَاَتٰى رَجُلًا مِنَ الْاَنْصَارِ فَاِذَا هُوَ لَيْسَ فِي بَيْتِهِ فَلَمَّا رَاَتْهُ الْمَرْاَةُ قَالَتْ مَرْحَبًا وَّاَهْلًا فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيْنَ فُلَانٌ قَالَتْ ذَهَبَ يَسْتَعْذِبُ لَنَا مِنَ الْمَاءِ اِذْجَآءَ الْاَنْصَارِيُّ فَنَظَرَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصَاحِبَيْهِ ثُمَّ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ مَا اَحَدٌ الْيَوْمَ اَكْرَمُ اَضْيَافًا مِنِّي قَالَ فَانْطَلَقَ فَجَآءَهُمْ بِعِذْقٍ فِيْهِ بُسْرٌ وَتَمْرٌ وَرُطَبٌ فَقَالَ كُلُوْا مِنْ هٰذِهِ وَاَخَذَ الْمُدْيَةَ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِيَّاكَ وَالْحَلُوْبَ فَذَبَحَ لَهُمْ فَاَكَلُوْا مِنَ الشَّاةِ وَمِنْ ذٰلِكَ الْعِذْقِ وَشَرِبُوْا فَلَمَّا اَنْ شَبِعُوْا وَرَوُوْا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتُسْاَلُنَّ عَنْ هٰذَا النَّعِيْمِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَخْرَجَكُمْ مِنْ بُيُوْتِكُمُ الْجُوْعُ ثُمَّ لَمْ تَرْجِعُوْا حَتّٰى اَصَابَكُمْ هٰذَا النَّعِيْمُ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَبِي مَسْعُوْدٍ كَانَ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ فِي بَابِ الْوَلِيْمَةِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ دن یا رات کے وقت (کہیں جانے کے لئے گھر سے) نکلے کہ اچانک حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوگئی۔ آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ تم کو کس چیز نے تمہارے گھروں سے نکال دیا ہے (یعنی اس وقت چوں کہ گھر سے نکلنے کی تم لوگوں کی عادت نہیں ہے اس لئے ایسی کیا ضرورت پیش آگئی جو تمہارے گھر سے نکلنے کا باعث ہوئی ہے) ان دونوں نے عرض کیا کہ "بھوک نے ہمیں گھر سے نکلنے پر مجبور کیا ہے، یعنی ہم بھوک کی شدت سے بیتاب ہو کر گھر سے نکلے ہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا" اور مجھے بھی اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اسی چیز نے (گھر سے) نکالا ہے، جس چیز نے تمہیں نکالا ہے یعنی میں بھی بھوک ہی کہ وجہ سے گھر سے نکلا ہوں، اٹھو (میرے ساتھ چلو)" چنانچہ وہ دونوں (بھی) اٹھے (اور آپ ﷺ کے ساتھ ہوئے) پھر آپ ﷺ ایک انصاری کے گھر پہنچے (جن کا نام ابو الہیثمؓ تھا) مگر وہ اپنے گھر میں موجود نہیں تھے، ان کی بیوی نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا تو کہا کہ "خوش آمدید! آپ ﷺ اپنے ہی لوگوں میں آئے ہیں، آپ ﷺ کا تشریف لانا مبارک)" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "فلاں شخص یعنی تمہارے شوہر کہاں ہیں؟" اس نے عرض کیا کہ "وہ ہمارے لئے میٹھا پانی لانے گئے ہیں۔" اتنے میں وہ انصاری (یعنی صاحب خانہ بھی) آگئے، انہوں نے جب رسول کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے دونوں صحابہؓ (حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ کو اپنے گھر میں) دیکھا تو (اپنی اس خوش بختی پر پھولے نہیں سمائے اور) کہنے لگے "الحمد للہ! خدا کا شکر ہے) بزرگ تر مہمانوں کے اعتبار سے آج کے دن مجھ سے زیادہ کوئی خوش نصیب نہیں ہے، یعنی آج کے دن میرے مہمان دوسرے لوگوں کے مہمانوں سے زیادہ بزرگ ومعزز ہیں۔" راوی (یعنی حضرت ابوہریرہؓ) کہتے ہیں کہ "اس کے بعد وہ انصاری (ان حضرات کو لے کر اپنے باغ میں گئے، جہاں ان کے لئے ایک بچھونا بچھا کر ان کو اس پر بٹھایا، اور خود کھجوروں کے درختوں کے پاس) گئے اور ان (مہمانوں) کے لئے کھجوروں کا ایک خوشہ لے کر آئے، جس میں نیم پختہ، پختہ اور تروتازہ (ہر طرح کی) کھجوریں تھیں، پھر انہوں نے کہا کہ "آپ لوگ اس میں سے کھایئے" اس کے بعد انہوں نے چھری لی (اور ایک بکری کو ذبح کرنا چاہا) رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "دودھ والی بکری ذبح کرنے سے اجتناب کرنا" آخر کار انہوں نے آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کے لئے ایک بکری ذبح کی (اور جب اس کا گوشت پک گیا تو) سب نے اس بکری کا گوشت کھایا، اس خوشہ میں سے کھجوریں کھائیں، اور پانی پیا، اس طرح جب کھانے پینے سے پیٹ بھر گیا تو رسول کریم ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے، قیامت کے دن تم سے ان نعمتوں کی بابت پوچھا جائے گا، بھوک نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا تھا، لیکن تم اپنے گھروں کو واپس (بھی) نہ ہوئے تھے کہ (خدا کی طرف سے) تمہیں یہ نعمتیں مرحمت ہو گئیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے کئی مسئلے ثابت ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس میزبان پر اعتماد ہو اس کے ہاں دوسرے آدمیوں کو اپنے ہمرہ لے جانا درست ہے، دوسرے یہ کہ اپنے احباب سے رنج والم اور تکلیف وپریشانی کا اظہار کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ اظہار شکوہ وشکایت، عدم رضا اور بے صبری وجزع فزع کے طور پر نہ ہو، خاص طور پر جب کو گھر میں کھانے پینے کو کچھ میسر نہ ہو، اور بھوک کی شدت نہ صرف یہ کہ جسمانی طور پر اذیت پہنچائے بلکہ عبادت کے کیف ونشاط میں رکاوٹ ڈالے، طاعات کے ذریعہ حاصل ہونے والی روحانی لذت سے پوری طرح محظوظ نہ ہونے دے اور قلب کو (یاد خدا اور حضوری عبادات سے پھیر کر) ادھر ادھر مشغول کر دے، تو ایسی صورت میں گھر سے نکل کر مباح اسباب ووسائل کے ذریعہ اس (بھوک) کو مٹانے کا علاج کرنا اور اس سلسلہ میں سعی وکوشش کی راہ اختیار کرنا محض جائز ہی نہیں بلکہ لازم ہو جاتا ہے۔ نیز ایسے وقت میں اپنے احباب کے پاس جانا اور اس یقین کے ہوتے ہوئے کہ وہ انکار نہیں کریں گے ان سے بے تکلف کھانے پینے کی چیز مانگنا مباح ہی نہیں ہے بلکہ آپس کی محبت ومروت میں زیادتی کا باعث بھی ہوتا ہے۔

منقول ہے کہ جب نادار صحابہؓ کو کھانا پینا میسر نہ آتا اور ان کو بھوک کی شدت پریشان کرتی، تو وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے اور جب روئے انور ﷺ کی زیارت کرتے اور جمال با کمال پر نظر پڑتی تو ان کی بھوک وغیرہ کی ساری کلفت جاتی رہتی اور

جلوۂ حق کی نورانیت انہیں کھانے پینے سے بے نیاز کر دیتی تیسرے یہ کہ ضرورت کی بنا پر اجنبی عورت سے بات کرنا اور اس کی بات کو سننا جائز ہے، اسی طرح عورت کے لئے یہ جائز ہے کہ اگر اس کا شوہر گھر میں موجود نہ ہو تو وہ اپنے ہاں آنے والے مہمان کو گھر میں آنے کی اجازت دے سکتی ہے۔ بشرطیکہ اول تو اس مہمان کے گھر میں آنے سے کسی بات کا کوئی خطرہ و خدشہ نہ ہو اور دوسرے یہ کہ اپنے شوہر کی رضامندی کا یقین ہو، یعنی اس بات کا کوئی شبہ نہ ہو کہ شوہر اس مہمان کے گھر میں آنے سے کسی ناگواری یا ناراضگی کا اظہار کرے گا۔

چوتھے یہ کہ ان انصاریؓ کا اپنے گھر میں ان معزز بزرگ ترین مہمانوں کو دیکھ کر اپنے حق میں ایک عظیم نعمت تصور کرنا اور اس پر ان کا "الحمد للہ" کہنا اس بات کی علامت ہے کہ کسی نعمت کے ظاہر ہونے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا مستحب ہے، نیز یہ بھی مستحب ہے کہ جب مہمان آئے تو اس کے سامنے خوشی کا اظہار کیا جائے۔

اور پانچویں یہ کہ جب کوئی مہمان اپنے ہاں آئے تو کھانے سے پہلے اس کے سامنے میوہ و پھل لانا یا گھر میں جو بھی چیز (مثلاً مٹھائی وغیرہ) موجود ہو اس کے سامنے جلد پیش کر دینا مستحب ہے۔

"جب کھانے پینے سے پیٹ بھر گیا" اس کے بارے میں نوویؒ کہتے ہیں کہ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ پیٹ بھر کر کھانا آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بھی کھایا جاتا تھا، اور یہ (یعنی پیٹ بھر کر کھانا) جائز ہے، جہاں تک ان اقوال کا تعلق ہے جو پیٹ بھر کر کھانے کی کراہت کے سلسلے میں منقول ہیں تو وہ عادت و مداومت پر محمول ہیں کہ عادت و مداومت کے طور پر پیٹ بھر کر کھانا گویا محتاج اور غرباء کے حال سے فراموشی اور ان کے تئیں سنگدلی اختیار کرنے کا مظہر ہے۔

"قیامت کے دن تم سے ان نعمتوں کی بابت پوچھا جائے گا" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس دنیا میں جو نعمتیں عطا فرماتا ہے ان کے بارے میں وہ قیامت کے دن سوال کرے گا اور یہ سوال بعض کے حق میں تو توبیخ و سرزنش کے طور پر ہوگا، اور بعضوں سے احسان جتانے اور اظہار نعمت و کرامت کے طور پر ہوگا، گویا ہر صورت میں اللہ تعالیٰ اپنی ہر نعمت پر بندوں سے سوال و پرسش کرے گا کہ ہم نے تمہیں دنیا میں یہ جو فلاں فلاں نعمت عطا کی تھی تم نے اس پر ادائیگی شکر کا حق ادا کیا یا نہیں؟

وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَبِيْ مَسْعُوْدٍ كَانَ رَجُلٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ فِيْ بَابِ الْوَلِيْمَةِ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ کی یہ روایت کَانَ رَجُلٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ (کتاب النکاح کے) باب الولیمہ میں ذکر کی جا چکی ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

مہمان نوازی کی اہمیت

⑤ وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَيُّمَا مُسْلِمٍ ضَافَ قَوْمًا فَاَصْبَحَ الضَّيْفُ مَحْرُوْمًا كَانَ حَقًّا عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ نَصْرُهٗ حَتّٰى يَاْخُذَ لَهٗ بِقِرَاهُ مِنْ مَالِهٖ وَزَرْعِهٖ رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهٗ وَاَيُّمَا رَجُلٍ ضَافَ قَوْمًا فَلَمْ يَقْرُوْهُ كَانَ لَهٗ اَنْ يُّعْقِبَهُمْ بِمِثْلِ قِرَاهُ۔

"حضرت مقدام ابن معدیکربؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص کسی قوم میں (کسی کے یہاں) مہمان ہوا اور اس نے محرومی کی حالت میں صبح کی (یعنی اس کے میزبان نے رات میں اس کی مہمان داری نہیں کی، تو اس کا ہر مسلمان پر یہ حق ہوگا کہ وہ اس کی مدد کرے، یہاں تک کہ وہ (جس شخص کے یہاں مہمان ہوا ہے) اس کے مال اور اس کی کھیتی باڑی سے مہمانداری کے بقدر (یعنی ایک مہمان کے کھانے پینے کے بقدر) وصول کرے۔" (دارمیؒ ابوداؤد) اور ابوداؤدؒ کی ایک اور روایت میں یوں ہے، کہ جو شخص کسی قوم میں مہمان ہوا، اور ان لوگوں نے اس کی مہمان داری نہیں کی تو اس کو یہ حق حاصل ہوگا، کہ وہ ان لوگوں کا پیچھا پکڑ لے اور ان

کے مال و اسباب سے اپنی مہمان داری) کے بقدر وصول کرلے۔"

تشریح: اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے بھی مطلق ضیافت (مہمان داری) کرنے کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اس حدیث کی بھی وہی تاویل و توجیہ کی جائے گی، جو پیچھے حضرت عقبہ ابن عامرؓ کی روایت میں کی گئی ہے۔

برائی کا بدلہ برائی نہیں ہے

⑥ وَعَنْ اَبِي الْاَحْوَصِ الْجُشَمِيِّ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَأَيْتَ اِنْ مَرَرْتُ بِرَجُلٍ فَلَمْ يَقْرِنِيْ وَلَمْ يُضِفْنِي ثُمَّ مَرَّبِي بَعْدَ ذٰلِكَ اَقْرِيْهِ اَمْ اَجْزِيْهِ قَالَ بَلْ اَقْرِهِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوالاحوص جشمیؒ اپنے والد حضرت مالک ابن فضلہؓ صحابی) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا، میں نے (ایک دن) عرض کیا کہ "یارسول اللہ (ﷺ)! اگر میں کسی شخص کے ہاں سے گزروں یعنی اس کے یہاں مہمان ہوں اور وہ میری مہمانداری نہ کرے اور نہ میری مہمان داری کا حق ادا کرے اور پھر اس کے بعد اس کا گزر میرے یہاں ہو یعنی وہ میرے یہاں آکر مہمان ہو، تو کیا میں اس کی مہمان داری کروں یا اس سے بدلہ لوں یعنی میں بھی اس کے ساتھ وہی سلوک کروں جو وہ میرے ساتھ کرچکا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "(نہیں اس سے بدلہ نہ لو) بلکہ اس کی مہمان داری کرو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ برائی کا بدلہ یہ نہیں ہے کہ تم بھی برائی کرو، بلکہ جس شخص نے تمہارے ساتھ برا سلوک کیا ہے اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہی سب سے اچھا بدلہ ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے۔

بدی را بدی سہل باشد جزا　　　اگر مردے احسن الیٰ من اساء

کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لئے طلب اجازت کا جواب نہ ملے تو واپس چلے آؤ

⑦ وَعَنْ اَنَسٍ اَوْغَيْرِهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَاْذَنَ عَلٰى سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ فَقَالَ سَعْدٌ وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَلَمْ يُسْمِعِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى سَلَّمَ ثَلَاثًا وَرَدَّ عَلَيْهِ سَعْدٌ ثَلَاثًا وَلَمْ يُسْمِعْهُ فَرَجَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاتَّبَعَهٗ سَعْدٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ بِاَبِيْ اَنْتَ وَاُمِّيْ مَا سَلَّمْتَ تَسْلِيْمَةً اِلَّا وَهِيَ بِاُذُنِيْ وَلَقَدْ رَدَدْتُ عَلَيْكَ وَلَمْ اُسْمِعْكَ اَحْبَبْتُ اَنْ اَسْتَكْثِرَ مِنْ سَلَامِكَ وَمِنَ الْبَرَكَةِ ثُمَّ دَخَلُوا الْبَيْتَ فَقَرَّبَ لَهٗ زَبِيْبًا فَاَكَلَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا فَرَغَ قَالَ اَكَلَ طَعَامَكُمُ الْاَبْرَارُ وَصَلَّتْ عَلَيْكُمُ الْمَلٰئِكَةُ وَاَفْطَرَ عِنْدَكُمُ الصَّائِمُوْنَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت انسؓ یا ان کے علاوہ کسی اور (صحابیؓ) سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے حضرت سعد ابن عبادہؓ کے (ہاں پہنچ کر ان سے) گھر میں آنے کی اجازت طلب کی، چنانچہ آپ ﷺ نے (دروازہ پر کھڑے ہو کر) فرمایا کہ " السلام علیکم ورحمۃ اللہ تم پر اللہ کی سلامتی اور اس کی رحمت نازل ہو (کیا میں اندر آسکتا ہوں؟)" سعدؓ نے (گھر میں سے) جواب دیا کہ " وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ اور آپ ﷺ پر بھی اللہ کی سلامتی اور اس کی رحمت نازل ہو۔" لیکن انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ جواب نہیں سنایا یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ نے تین مرتبہ سلام کیا اور سعدؓ نے بھی آپ ﷺ کو تین مرتبہ جواب دیا، لیکن آپ ﷺ کو سنایا نہیں، یعنی حضرت سعدؓ نے آپ ﷺ کے سلام کا جواب تینوں مرتبہ قصداً بہت آہستہ آواز میں دیا تاکہ آپ ﷺ سن نہ سکیں، چنانچہ نبی کریم ﷺ (ان کا جواب نہ سن کر) واپس لوٹ پڑے اور حضرت سعدؓ) نے جب یہ دیکھا کہ جس چیز کو میں نے حصول سعادت میں زیادتی کا ذریعہ بنانا چاہا تھا وہ میرے لئے بالکل ہی محرومی کا باعث بنی جارہی ہے اور ایک طرح سے سوء ادبی کی صورت بھی پیدا ہوگئی ہے تو وہ لپک

کر گھر سے نکلے، اور آنحضرت ﷺ کے پیچھے پیچھے آئے اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! آپ ﷺ پر میرے ماں باپ قربان، آپ ﷺ نے جتنی بار بھی سلام کیا میرے دونوں کانوں نے سنا اور حقیقت یہ ہے کہ میں (ہر بار) جواب بھی دیتا تھا البتہ میں اس جواب کو آپ ﷺ کے کانوں تک نہیں پہنچنے دیتا تھا، کیوں کہ میں آپ ﷺ کے زیادہ سے زیادہ سلام وبرکت کا خواہش مند تھا (یعنی میرا مقصد یہ تھا کہ میرا جواب آپ ﷺ کے کانوں تک نہ پہنچے، تاکہ آپ جتنا زیادہ سلام کریں گے میرے حق میں اتنا ہی زیادہ حصول برکت وسعادت کا ذریعہ ہوگا) چنانچہ (حضرت سعدؓ کی طرف سے اس اظہار حقیقت اور عذر خواہی کے بعد) آنحضرت ﷺ اور حضرت سعدؓ مکان میں داخل ہوئے، اور حضرت سعدؓ نے آپ ﷺ کے لئے خشک انگور پیش کئے جن کو نبی کریم ﷺ نے کھایا، جب آپ ﷺ کھانے سے فارغ ہوئے تو (حضرت سعدؓ کے حق میں دعا کرتے ہوئے) فرمایا کہ "اللہ کے نیک بندے تمہارا کھانا کھائیں، فرشتے تمہارے لئے استغفار کریں، اور روزے دار تمہارے ہاں افطار کریں۔" (شرح السنۃ)

پرہیزگار لوگوں کی ضیافت کرنا زیادہ بہتر ہے

⑧ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَثَلُ الْمُؤْمِنِ وَمَثَلُ الْاِ یْمَانِ کَمَثَلِ الْفَرَسِ فِیْ اٰخِیَّتِہٖ یَجُوْلُ ثُمَّ یَرْجِعُ اِلٰی اٰخِیَّتِہٖ وَاِنَّ الْمُؤْمِنَ یَسْھُوْ ثُمَّ یَرْجِعُ اِلَی الْاِ یْمَانِ فَاَطْعِمُوْا طَعَامَکُمُ الْاَتْقِیَاءَ وَاَوْلُوْا مَعْرُوْفَکُمُ الْمُؤْمِنِیْنَ رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ وَاَبُوْنُعَیْمٍ فِی الْحِلْیَۃِ۔

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "مؤمن اور ایمان کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو اپنی رسی میں بندھا ہوا ہوتا ہے اور ادھر ادھر چکر لگانے کے بعد پھر اپنی رسی کے پاس آجاتا ہے، اور (اسی طرح مؤمن غفلت و کوتاہی کرتا ہے لیکن پھر ایمان کی طرف لوٹ آتا ہے، لہٰذا تم اپنا کھانا متقی و پرہیزگار لوگوں کو کھلاؤ، اور اپنے عطایا سے سب مسلمانوں کو نوازو۔" اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں اور ابونعیم نے حلیہ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: اٰخیۃ اصل میں اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کے دونوں سروں کو کنڈے کی طرح دیوار میں مضبوطی سے گاڑ دیتے ہیں اور پھر اس لکڑی میں رسی سے گھوڑے وغیرہ کو باندھ دیتے ہیں اور اس کے پاس گھاس وغیرہ ڈال دیتے ہیں، لہٰذا فرمایا گیا کہ جس طرح کوئی گھوڑا اپنے اخیہ یعنی کنڈے سے بندھا ہوا ادھر ادھر چکر لگاتا ہے اور پھر اپنے اخیہ کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے نیز یہ تو ہوتا ہے کہ وہ اپنے کنڈے سے کبھی نزدیک ہو جاتا ہے کبھی دور، مگر اس سے بالکل جدا نہیں ہو سکتا ٹھیک یہی حال ایمان اور مؤمن کے درمیان تعلق کا ہوتا ہے کہ کبھی تو اعمال صالحہ کے ذریعہ اس کو قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے اور کبھی گناہوں کی وجہ سے بعد ہو جاتا ہے مگر اصل ایمان سے جدا نہیں ہوتا، چنانچہ اگر وہ گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے تو آخر کار اس گناہ پر نادم ہو کر استغفار کرتا ہے اور اپنی فوت شدہ عبادات کا تدارک کر کے کمال ایمان کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

"لہٰذا تم اپنا کھانا پرہیزگار لوگوں کو کھلاؤ" یہ جملہ اصل میں جزا ہے شرط محذوف کی، اس اعتبار سے پورا مفہوم یوں ہوگا کہ اس مثال کے مطابق جب "ایمان" کی وہی حیثیت ہوئی جو اخیہ یعنی کنڈے کی ہے تو ان چیزوں کو مضبوط و قوی کرنے کے طریقے اختیار کرو جو تمہارے اور ایمان کے درمیان وسائل کا درجہ رکھتے ہیں اور اس کا ایک بہترین و سہل طریقہ ضیافت کرنا (کھانا کھلانا) ہے۔ رہی یہ بات کہ کھانا کھلانے کے سلسلے میں "پرہیزگاری" کی تخصیص کیوں ہے، تو اس کا سبب یہ ظاہر کرنا ہے کہ اگرچہ ہر بھوکے کو کھانا کھلانا جائز اور ایک نیک عمل ہے خواہ وہ پرہیزگار ہو یا غیر پرہیزگار، لیکن اول تو اولیٰ یہ ہے کہ اگر کسی بھوکے کو کھانا کھلانا جائز منظور ہے تو ایسے بھوکے کو کھلاؤ جو پرہیزگار اور خدا ترس ہو دوسرے یہ کہ جب تم پرہیزگاروں کو کھانا کھلاؤ گے تو نہ صرف یہ کہ تمہیں اس نیک عمل پر ثواب ملے گا بلکہ وہ تمہارا کھانا کھا کر جو عبادت کریں گے اس کا ثواب تمہیں بھی ملے گا اور وہ تمہارے حق میں جو دعا کریں گے وہ بھی قبول ہوگی لہٰذا پرہیز

گاروں کی تخصیص مذکورہ سبب سے ہے ورنہ جہاں تک مطلق احسان واعانت کا تعلق ہے وہ سب مسلمانوں کے ساتھ کرنی چاہئے، جیسا کہ فرمایا گیا "اور اپنے عطایا سے سب مسلمانوں کو نوازو۔"

کھانا کھاتے وقت زانو کے بل بیٹھنا تواضع وانکساری کی علامت ہے

⑨ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ بُسْرٍ قَالَ كَانَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَصْعَةٌ يَحْمِلُهَا اَرْبَعَةُ رِجَالٍ يُقَالُ لَهَا الْغَرَّاءُ فَلَمَّا اَضْحُوْا وَسَجَدُوا الضُّحٰى اُتِيَ بِتِلْكَ الْقَصْعَةِ وَقَدْ ثُرِدَ فِيْهَا فَالْتَفُّوْا عَلَيْهَا فَلَمَّا كَثُرُوْا جَثٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَعْرَابِيٌّ مَاهٰذِهِ الْجِلْسَةُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ جَعَلَنِيْ عَبْدًا كَرِيْمًا وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا عَنِيْدًا ثُمَّ قَالَ كُلُوْا مِنْ جَوَانِبِهَا وَدَعُوْا ذُرْوَتَهَا يُبَارَكْ فِيْهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن بسرؓ کہتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ کے ہاں ایک کٹھرا (چوبی ناند) تھا جس کو چار آدمی اٹھاتے تھے (یعنی جب اس میں کھانا رکھا جاتا تو وہ اتنا بھاری ہو جاتا تھا کہ اس کو چار آدمی اٹھاتے تھے یا وہ خالی ہی اتنا بڑا یا بھاری تھا کہ چار آدمیوں کے بغیر نہیں اٹھتا تھا) اس (کٹھرے) کو "غرا" کہا جاتا تھا، چنانچہ جب چاشت کا وقت ہو جاتا اور لوگ چاشت کی نماز پڑھ لیتے تو وہ کٹھرا لایا جاتا اور اس میں ثرید تیار کیا جاتا، پھر لوگ جمع ہو کر اس کے گرد بیٹھ جاتے، یہاں تک کہ جب لوگوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی تھی (اور بیٹھنے کی جگہ تنگ ہو جاتی) تو رسول کریم ﷺ گھٹنوں پر بیٹھتے (ایک دن آپ ﷺ کو اس طرح بیٹھے دیکھ کر) ایک دیہاتی نے کہا کہ "یہ نشست کیسی ہے؟ یعنی اس طرح بیٹھنا آپ ﷺ کے شایان شان نہیں ہے۔" (یہ سن کر) نبی کریم ﷺ نے فرمایا "حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو تواضع وانکسار کرنے والا بنایا ہے سرکش وضدی نہیں بنایا ہے (اور اس طرح بیٹھنا تواضع وانکسار اختیار کرنے کا قریبی راستہ ہے)۔" پھر آپ ﷺ نے (سب کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ "اس کے کناروں (یعنی اپنے سامنے) سے کھاؤ اس کی بلندی کو چھوڑ دو یعنی درمیانی حصے کے کھانے پر پہلے ہاتھ نہ ڈالو تمہارے لئے اس میں برکت عطا کی جائے گی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: غرا کے لغوی معنی ہیں روشن وچمکدار۔ اس بڑے برتن (کٹھرا یا ناند) کو غرا اس مناسبت سے کہا جاتا تھا کہ وہ بڑا ہونے کی وجہ سے کھلا ہوا اور کشادہ تھا۔

"اس میں برکت عطا کی جائے گی" کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم اس طرح کھاؤ گے تو یہ اس کٹھرے کے کھانے میں برکت کا باعث ہوگا اس کے برخلاف جب درمیان کے حصہ سے کھایا جاتا ہے تو نیچے کے حصے سے برکت منقطع ہو جاتی ہے۔

جمع ہو کر کھانا کھانے سے برکت نازل ہوتی ہے

⑩ وَعَنْ وَحْشِيِّ بْنِ حَرْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نَاْكُلُ وَلَا نَشْبَعُ قَالَ فَلَعَلَّكُمْ تَفْتَرِقُوْنَ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ فَاجْتَمِعُوْا عَلٰى طَعَامِكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ يُبَارَكْ لَكُمْ فِيْهِ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت وحشی ابن حربؓ اپنے والد سے اور وہ (اپنے والد اور) وحشیؓ کے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے (کچھ) صحابہؓ نے (ایک دن) عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! ہم (اگرچہ خاصی تعداد میں کھانا) کھاتے ہیں لیکن ہمارا پیٹ نہیں بھرتا (جب کہ ہم چاہتے ہیں کہ یا تو ہمارا پیٹ بھر جایا کرے کہ ہم عبادت وطاعت کی طاقت حاصل کر سکیں، یا پھر ہمیں قناعت کی دولت میسر ہو جائے)" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "(خاصی مقدار میں کھانا کھانے کے باوجود پیٹ نہ بھرنے کی ظاہری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ) تم لوگ شاید الگ الگ کھانا کھاتے ہو؟" انہوں نے عرض کیا کہ "جی ہاں" آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تو پھر تم لوگ اپنے کھانے پر اکٹھے بیٹھا کرو اور اس پر (یعنی کھاتے وقت) اللہ کا نام لیا کرو تمہارے لئے اس (کھانے) میں برکت عطا کی جائے گی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کے راوی وحشی ابن حرب، کے دادا کا نام بھی وحشی ابن حرب ہی تھا یہ (وحشیؓ ابن حرب جو حدیث کے راوی وحشی کے دادا ہیں) وہی وحشی ہیں جنہوں نے غزوہ احد کے دن آنحضرت ﷺ کے چچا، سید الشہداء حضرت حمزہؓ ابن عبد المطلب کو قتل کیا تھا اس وقت وحشی کافر تھے اور کفار مکہ کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما تھے! لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت بخشی اور وہ مشرف باسلام ہو گئے، اسلام لانے کے بعد ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ کہ انہوں نے مشہور مدعی نبوت، مسیلمہ کذاب کو قتل کر کے جہنم رسید کیا تھا! اس حدیث سے معلوم ہوا کہ الگ الگ کھانا، کھانا بے برکتی کا باعث ہے جب کہ اکٹھے ہو کر کھانے پر بیٹھنا اس کھانے میں برکت کا ذریعہ ہے، نیز کھانے پر اکٹھے ہو کر بیٹھنا اور کھاتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینا یعنی بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرنا ان دونوں میں سے ہر ایک برکت کا باعث ہے اور اگر دونوں جمع ہوں کہ کھانے پر اکٹھے بیٹھا بھی جائے اور کھاتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام بھی لیا جائے تو یہ برکت میں زیادتی کا باعث بھی ہوگا اور ذکر اللہ کی کثرت کا ذریعہ بھی، رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جو یہ فرمایا ہے کہ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا (یعنی اس بارے میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم الگ الگ کھانا کھاؤ یا اکٹھے ہو کر) تو اصل میں یہ آیت یا تو رخصت (آسانی) پر محمول ہے یا اس کا تعلق ان لوگوں کو تنگی سے بچانے سے ہے جو اکیلے ہی رہتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

روٹی، کپڑا اور مکان انسان کی بنیادی ضرورت بھی ہے اور اس کا پیدائشی حق بھی

(۱۱) عَنْ اَبِىْ عَسِيْبٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلًا فَمَرَّبِيْ فَدَعَانِيْ فَخَرَجْتُ اِلَيْهِ ثُمَّ مَرَّبِاَبِيْ بَكْرٍ فَدَعَاهُ فَخَرَجَ اِلَيْهِ ثُمَّ مَرَّبِعُمَرَ فَدَعَاهُ فَخَرَجَ اِلَيْهِ فَانْطَلَقَ حَتّٰى دَخَلَ حَائِطًا لِبَعْضِ الْاَنْصَارِ فَقَالَ لِصَاحِبِ الْحَائِطِ اَطْعِمْنَا بُسْرًا فَجَاءَ بِعِذْقٍ فَوَضَعَهُ فَاَكَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابُهُ ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ بَارِدٍ فَشَرِبَ فَقَالَ لَتُسْاَلُنَّ عَنْ هٰذَا النَّعِيْمِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ قَالَ فَاَخَذَ عُمَرُ الْعِذْقَ فَضَرَبَ بِهِ الْاَرْضَ حَتّٰى تَنَاثَرَ الْبُسْرُ قِبَلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا لَمَسْئُوْلُوْنَ عَنْ هٰذَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَالَ نَعَمْ اِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ خِرْقَةٍ لَفَّ بِهَا الرَّجُلُ عَوْرَتَهُ اَوْ كِسْرَةٍ سَدَّ بِهَا جَوْعَتَهُ اَوْ حُجْرٍ يَتَدَخَّلُ فِيْهِ مِنَ الْحَرِّ وَالْقَرِّ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"حضرت ابو عسیبؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ) رات کے وقت رسول کریم ﷺ گھر سے باہر نکلے اور میرے ہاں تشریف لائے اور مجھے بلایا میں (اپنے گھر سے) نکل کر آپ ﷺ کے ساتھ ہو لیا، پھر آپ ﷺ حضرت ابو بکرؓ کے ہاں تشریف لے گئے اور ان کو بلایا وہ بھی (اپنے گھر سے) نکل کر آپ ﷺ کے ساتھ ہو لئے، اس کے بعد آپ ﷺ حضرت عمرؓ کے ہاں تشریف لے گئے اور ان کو بلایا وہ بھی (اپنے گھر سے) نکل کر آپ ﷺ کے ساتھ ہو لئے، پھر آپ ﷺ (ہم سب کو لے کر) روانہ ہوئے یہاں تک کہ ایک باغ میں پہنچے جو ایک انصاری (صحابیؓ) کا تھا آپ ﷺ نے باغ کے مالک سے فرمایا کہ "ہمیں کھجوریں کھلاؤ۔" باغ کے مالک نے کھجوروں کا ایک خوشہ لا کر (ہمارے سامنے) رکھ دیا اس میں سے رسول کریم ﷺ نے (بھی) کھایا اور آپ ﷺ کے صحابہ (یعنی ہم لوگوں) نے (بھی) کھایا، پھر آپ ﷺ نے ٹھنڈا پانی منگوایا جس کو (آپ ﷺ نے اور ہم نے) پیا اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ "یقیناً قیامت کے دن تم سے اس نعمت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔" راوی کہتے ہیں کہ (یہ سن کر) حضرت عمرؓ نے کھجوروں کا خوشہ لیا اور اس کو زمین پر دے مارا یہاں تک کہ اس کی کچی کھجوریں رسول کریم ﷺ کے سامنے بکھر گئیں، پھر انہوں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا قیامت کے دن ہم سے اس کے بارے میں بھی سوال کیا جائے گا؟" آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں! (ہر نعمت کے بارے میں سوال کیا جائے گا خواہ وہ کم ہو یا زیادہ البتہ تین چیزوں کے بارے میں سوال نہیں ہوگا ایک تو کپڑا کہ جس سے آدمی اپنا ستر ڈھانکے اور دوسری روٹی کا ٹکڑا کہ جس

کے ذریعہ اپنی بھوک کو دور کرے، اور تیسرے بل کہ جس میں گرمی اور سردی سے (بچنے کے لئے) گھس جائے۔" (احمد ' بیہقی)

تشریح: "ایک انصاری" کے بارے میں احتمال ہے کہ وہی ابوالہیثمؓ ہوں جن کے باغ میں جانے کا ذکر پہلی فصل کی ایک حدیث میں بھی گزر چکا ہے، اور یہ واقعہ (جو یہاں حدیث میں بیان کیا گیا ہے" دوسری مرتبہ کا ہے گویا ایک واقعہ تو وہ ہے جس کا ذکر پہلی فصل کی حدیث (نمبر۳) میں گزرا اور دوسرا واقعہ ہے جو یہاں حدیث میں بیان کیا گیا ہے، اور یہ احتمال بھی ہے کہ "ایک انصاری" سے مراد ابوالہیثمؓ نہ ہوں بلکہ کوئی دوسرے انصاری صحابیؓ مراد ہوں۔

اور اس کو زمین پر دے مارا" حضرت عمرؓ کا یہ عمل گویا ان کی حالت جذب کا مظہر تھا جو قیامت کے دن ہر چھوٹی بڑی چیز اور ہر طرح کے جزئی و کلی امور کے سوال و پرسش کے سلسلہ میں خوف خدا اور مواخذہ آخرت کی ہیبت کی وجہ سے ان پر طاری ہو گئی تھی۔

"حجر" کا لفظ حاء کے پیش اور جیم کے سکون کے ساتھ بھی صحیح ہے، جس کے معنی حجرہ (کمرہ) کے ہیں، لیکن مشکوۃ کے ایک صحیح نسخہ میں یہ لفظ "جحر" یعنی جیم کے پیش اور حاء کے سکون کے ساتھ منقول ہے جس کے معنی سوراخ اور بل کے آتے ہیں، اس صورت میں یہ مراد ہوگا کہ ایک ایسا چھوٹا سا مکان جس کو اس کے انتہائی، چھوٹا اور حقیر ہونے کی وجہ سے "چوہے کے بل" سے تعبیر کیا جاسکتا ہو اور جس میں سردی و گرمی سے بچاؤ کے لئے مشکل اور تنگی کے ساتھ رہا جاسکتا ہو۔

اجتماعی طور پر کھانا کھانے کی صورت میں سب کے ساتھ ہی کھانے سے ہاتھ کھینچو

(۱۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا وُضِعَتِ الْمَائِدَۃُ فَلَا یَقُوْمُ رَجُلٌ حَتّٰی تُرْفَعَ الْمَائِدَۃُ وَلَا یَرْفَعُ یَدَہٗ وَاِنْ شَبِعَ حَتّٰی یَفْرُغَ الْقَوْمُ وَلْیُعْذِرْ فَاِنَّ ذٰلِکَ یُخْجِلُ جَلِیْسَہٗ فَیَقْبِضُ یَدَہٗ وَعَسٰی اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ فِی الطَّعَامِ حَاجَۃٌ۔ رَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ۔ وَالْبَیْہَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "جب دسترخوان بچھا دیا جائے (اور لوگ اس پر کھانے کے لئے بیٹھیں) تو کوئی شخص اس وقت تک نہ اٹھے جب تک کہ دسترخوان نہ اٹھا دیا جائے، اور (کھانے سے) اس وقت تک اپنا ہاتھ نہ کھینچے جب تک کہ سب لوگ کھانے سے فارغ نہ ہو جائیں اگرچہ اس کا پیٹ بھر گیا اور اگر کسی عذر کی بنا پر دسترخوان سے پہلے اٹھنا ضروری ہو، یا دوسرے لوگوں کے کھانے سے فارغ ہونے سے پہلے اپنا ہاتھ کھینچنا ہو تو) چاہئے کہ اس عذر کو بیان کر دے (یعنی معذرت طلب کر کے دسترخوان پر سے اٹھے یا اپنا ہاتھ کھینچے) کیوں کہ یہ (یعنی اس صورت میں کھانے سے اپنا ہاتھ کھینچ لینا جب کہ دوسرے لوگ ابھی کھانے میں مشغول ہوں) اپنے ہم نشین کو شرمندہ کر دینا ہے، چنانچہ (جب ایک شخص یہ دیکھے گا کہ اس کے ساتھی نے کھانا چھوڑ دیا ہے تو شرما حضوری میں) وہ (بھی) اپنا ہاتھ کھینچ لے گا جب کہ بہت ممکن ہے کہ ابھی اور کھانے کی خواہش رکھتا ہو (یعنی اس کا پیٹ نہ بھرا ہو۔" (ابن ماجہ، بیہقی)

تشریح: اس حدیث سے علماء نے مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اگر دسترخوان پر ایک سے زائد آدمی ہوں تو ان میں سے کسی شخص کو دوسرے ساتھیوں سے پہلے اپنا ہاتھ کھانے سے نہ کھینچنا چاہئے، بشرطیکہ اس کے ہاتھ کھینچنے کے بعد وہ (ساتھی) بھی شرما شرمی میں کھانا چھوڑ دیں۔ اور اگر کوئی شخص کم خوراک ہو (کہ کم خور ہونے کی وجہ سے دسترخوان کے دوسرے ساتھیوں کا آخر تک ساتھ دینا اس کے لئے مشکل ہو) تو اس صورت میں اس کے لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ آہستہ اور تھوڑا تھوڑا کھائے تاکہ آخر تک دوسرے لوگوں کا ساتھ دے سکے۔

(۱۳) وَعَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَکَلَ مَعَ قَوْمٍ کَانَ اٰخِرَھُمْ اَکْلًا رَوَاہُ الْبَیْہَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت امام جعفر صادقؒ ابن محمدؒ اپنے والد یعنی امام محمد باقرؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا "رسول کریم ﷺ لوگوں کے ساتھ کھانا کھاتے تو آپ ﷺ سب سے آخر تک کھانے والے شخص ہوتے تھے۔" اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں بطریق

ارسال نقل کیا ہے۔"

تشریح: حضرت امام محمد باقرؒ اصل میں تابعی ہیں، اور ان کو اپنے والد بزرگوار حضرت امام زین العابدینؒ اور حضرت جابر ابن عبداللہؓ سے سماعت حدیث کا شرف حاصل ہے اس اعتبار سے یہ حدیث مرسل ہے! حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ دسترخوان پر موجود دوسرے لوگوں سے پہلے اپنا ہاتھ کھانے سے نہیں کھینچتے تھے بلکہ آخر تک کھاتے رہتے تھے، اور یا تو یہ کہ آپ ﷺ ابتداء میں نہیں کھاتے تھے یا بہت آہستہ آہستہ اور کم کم کھاتے تھے اور اس طرح کھانے کے آخر تک سب کا ساتھ دیتے تھے تاکہ دوسرے لوگ بھی شرم ولحاظ میں کھانا نہ چھوڑ دیں۔

بھوک ہونے کے باوجود کھانے سے تکلفاً انکار کرنا جھوٹ بولنے کے مترادف ہے

⑭ وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ اُتِىَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِطَعَامٍ فَعُرِضَ عَلَيْنَا فَقُلْنَا لَا تَشْتَهِيْهِ قَالَ لَا تَجْتَمِعْنَ جُوْعًا وَكِذْبًا۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت اسماء بنت یزید کہتی ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کے پاس کھانا لایا گیا اور پھر وہ کھانا ہمارے سامنے رکھا گیا (ہم اگرچہ بھوکے تھے اور کھانے کی خواہش رکھتے تھے مگر جیسا کہ عادت ہوتی ہے محض تکلفاً) ہم نے کہا کہ ہم کو کھانے کی خواہش نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "بھوک اور جھوٹ کو جمع نہ کرو۔" (ابن ماجہ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک اور کھانے کی خواہش کے باوجود بطور تکلف کھانے سے انکار کرے اور یہ کہے کہ مجھے کھانے کی خواہش نہیں ہے جو حقیقت میں جھوٹ بولنا ہے تو اس سے بڑا نادان کون ہوگا کہ دو نقصان برداشت کرنے پر تیار ہو جائے، ایک تو دنیا کا نقصان کہ بھوک کی کلفت اٹھائے اور دوسرا دین کا نقصان کہ جھوٹ بولے۔

مل کر کھانا کھانا برکت کا باعث ہے

⑮ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُوْا جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا فَاِنَّ الْبَرَكَةَ مَعَ الْجَمَاعَةِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت عمر ابن خطابؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "(کھانا) مل کر کھاؤ، الگ الگ مت کھاؤ، کیوں کہ برکت، جماعت کے ساتھ ہوتی ہے۔" (ابن ماجہ)

مہمان کے استقبال و وداع کے لئے گھر کے دروازے تک جانا مسنون ہے

⑯ وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ السُّنَّةِ اَنْ يَّخْرُجَ الرَّجُلُ مَعَ ضَيْفِهٖ اِلٰى بَابِ الدَّارِ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ الْبَيْهَقِىُّ فِىْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنْهُ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَقَالَ فِىْ اِسْنَادِهٖ ضُعْفٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" یہ سنت ہے کہ آدمی اپنے مہمان (کا استقبال کرنے یا اس کو رخصت کرنے) کے لئے گھر کے دروازے تک نکل کر آئے۔" (ابن ماجہ) بیہقیؒ نے شعب الایمان میں اس روایت کو حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے، نیز بیہقیؒ نے کہا ہے کہ اس کے سلسلہ سند میں ضعف ہے۔"

تشریح: یہ بھی مہمان کی خاطرداری اور اس کا اکرام ہے کہ جب وہ آئے تو گھر کے دروازے پر اس کا استقبال کیا جائے اور جب وہ جانے لگے تو دروازے تک نکل کر اس کو رخصت کیا جائے، اس میں ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے دوسرے لوگ گھر میں ایک اجنبی کے آنے سے کسی وہم و وسوسہ کا شکار نہیں ہوں گے۔

"یہ سُنّت ہے" کا مطلب یا تو یہ ہے کہ یہ عمل (یعنی مہمان کے استقبال و وداع کے لئے گھر کے دروازے تک جانا) ایک قدیم عادت ہے جس کو ہمیشہ سے تہذیب و شائستگی کا مظہر بھی سمجھا گیا ہے اور انسان کی فطرت سلیم کا غماز بھی یا یہ مطلب ہے کہ یہ عمل میری سُنّت اور میرے طریقے کے مطابق ہے۔

"اس سلسلۂ سند میں ضعف ہے" اس سے نفس حدیث کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیوں کہ یہ روایت متعدد اسناد سے منقول ہے اور اگر کوئی روایت متعدد اسناد سے منقول ہو اور اس میں سے کسی سلسلۂ میں ضعف بھی ہو تو تعدد اسناد کی وجہ سے اس کو تقویت حاصل ہو جاتی ہے، ویسے بھی یہ بات ملحوظ رہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف روایت بھی قابل قبول ہوتی ہے۔

کھانا کھلانے کی فضیلت

⑰ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْخَيْرُ اَسْرَعُ اِلَى الْبَيْتِ الَّذِيْ يُؤْكَلُ فِيْهِ مِنَ الشَّفْرَةِ اِلٰى سَنَامِ الْبَعِيْرِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس گھر میں (مہمانوں کو) کھانا کھلایا جاتا ہے، وہاں خیر یعنی رزق، برکت اور بھلائی اتنی تیزی سے پہنچتی ہے جتنی تیزی سے چھری بھی اونٹ کے کوہان کی طرف نہیں پہنچتی۔" (ابن ماجہ)

تشریح: جب اونٹ کا گوشت کاٹا جاتا ہے تو اس کے سب اعضاء سے پہلے اس کے کوہان کو کاٹتے ہیں اور چونکہ کوہان کا گوشت زیادہ لذیذ ہوتا ہے اس لئے وہ شوق کے ساتھ کھایا بھی جاتا ہے، پس فرمایا کہ جس طرح کوہان پر چھری جلد پہنچتی ہے اس سے بھی زیادہ جلد اس گھر میں خیر و بھلائی پہنچتی ہے جس میں مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔

باب

گزشتہ باب کے متعلّقات کا بیان

یہاں باب کو کسی عنوان کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پچھلے باب میں جو موضوع چل رہا تھا اس باب میں بھی اسی سے متعلق احادیث نقل ہوں گی، تاہم مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں یہاں یہ عنوان قائم کیا گیا ہے باب فی اکل المضطر یعنی مضطر کے کھانے کا بیان۔

وَهٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الاوّلِ

اور اس باب میں پہلی فصل نہیں ہے

یعنی اس باب میں صاحب مصابیح نے بخاریؒ و مسلمؒ کی کوئی راویت نقل نہیں کی ہے اس کئے انہوں نے اس باب کو فصل اول سے خالی رکھا ہے! واضح رہے کہ بعض نسخوں میں لفظ الاول کے بعد الثالث کا لفظ بھی ہے کیوں کہ اس باب میں تیسری فصل بھی نہیں ہے لیکن زیادہ صحیح بات یہی ہے الثالث کا لفظ نہ ہونا چاہئے، کیوں کہ مصنف مشکوٰۃ کا اصل مقصد صاحب مصابیح کے بارے میں بیان کرنا ہے کہ انہوں نے اس باب کو پہلی فصل سے خالی رکھا ہے جب کہ تیسری فصل کو شامل کرنے یا شامل نہ کرنے کا تعلق خود مصنف مشکوٰۃ کی ذات سے ہے اگر وہ کسی باب کو تیسری فصل سے خالی رکھیں تو اس کو بیان کرنا غیر ضروری سی بات ہوگی اور یہ بات ہے بھی کہ مصنف مشکوٰۃ نے اس کو بیان کرنے کا معمول نہیں رکھا ہے، جیسا کہ آگے آنے والے ایک باب "باب تغطیۃ الاوانی" سے واضح ہوگا کہ اس باب میں مصنف مشکوٰۃ نے تیسری فصل کو شامل نہیں کیا ہے اور یہ بیان نہیں کیا کہ اس باب میں تیسری فصل نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

حالت اضطرار کا مسئلہ

① عَنِ الْفُجَیْعِ الْعَامِرِیِّ اَنَّہٗ اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَایَحِلُّ لَنَامِنَ الْمَیْتَۃِ قَالَ مَاطَعَامُکُمْ قُلْنَا نَغْتَبِقُ وَنَصْطَبِحُ قَالَ اَبُوْنُعَیْمٍ فَسَرَّہٗ لِیْ عُقْبَۃُ قَدْحٌ غُدْوَۃً وَقَدْحٌ عَشِیَّۃً قَالَ ذَاکَ وَاَبِی الْجُوْعُ فَاَحَلَّ لَھُمُ الْمَیْتَۃَ عَلٰی ھٰذِہِ الْحَالِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت فجیع عامریؓ سے روایت ہے کہ وہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ "(حضرت! یہ بتائیں کہ) ہمارے لئے مردار میں سے کیا حلال ہے؟" آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "(پہلے یہ بتاؤ کہ) تم لوگوں کو کھانا کس مقدار میں ملتا ہے؟" ہم نے عرض کیا کہ "ہم کو ایک پیالہ دودھ کا شام کو اور ایک پیالہ دودھ کا صبح کو ملتا ہے۔" (حدیث کے روای ابونعیمؒ کہتے ہیں کہ (میرے استاد وشیخ حضرت عقبہؒ نے نغتبق اور نصطبح کی) یہی وضاحت کی ہے کہ "ایک پیالہ دودھ کا صبح کو اور ایک پیالہ دودھ کا شام کو۔" (بہرحال رسول کریم ﷺ نے (فجیعؓ کا جواب سن کر) فرمایا کہ "کھانے کی یہ مقدار، اپنے باپ کی قسم، بھوک کو واجب کرتی ہے یعنی صبح وشام محض ایک ایک پیالہ دودھ کا ملنا بھوک کو ختم کر کے انسانی زندگی کی بقا کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس صورت میں ان کے لئے مردار کو حلال قرار دیا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: غذا، انسان کی زندگی کو باقی رکھنے کے لئے ایک ضروری چیز ہے انسان کو غذا کا نہ ملنا یا اتنی کم مقدار میں ملنا جس سے نہ صرف یہ کہ بھوک کو ختم نہ کیا جا سکتا ہو بلکہ زندگی کا وجود بھی خطرہ میں پڑ جائے ایک ایسی صورت حال پیدا کر دیتا ہے جس کو شریعت کی اصطلاح میں "حالت اضطرار" سے تعبیر کیا جاتا ہے، حالت اضطرار میں شریعت یہ اجازت دیتی ہے کہ انسان اگر کسی حرام چیز کو کھا کر اپنی زندگی بچا سکتا ہے تو وہ کھا لینی چاہئے، چنانچہ سائل نے یہ سوال کر کے کہ ہمارے لئے مردار میں سے کیا حلال ہے؟" اصل میں یہی معلوم کرنا چاہا تھا کہ وہ کون سی صورت حال ہے جس پر "حالت اضطرار" کا اطلاق کیا جائے کہ اس صورت میں مردار یا کسی بھی حرام چیز کو کھایا جا سکتا ہے، یعنی اضطرار کی حد کیا ہے اور بھوک کی نوعیت کس درجہ کی ہو کہ جس کی وجہ سے حرام چیز کا کھانا مباح ہو سکتا ہے؟ اگرچہ سائل نے سوال کے لئے جو اسلوب والفاظ اختیار کئے ہیں ان کے ظاہری مفہوم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے گویا مردار کے کھانے کے بارے میں دریافت کیا تھا کہ مردار چیزوں میں سے کونسی چیز یا یہ کہ اس کی کونسی مقدار ایسی ہے جس کو کھانا ہمارے لئے حلال ہے، لیکن حقیقت میں نہ تو سائل کا مقصد یہ تھا اور نہ جواب اس کا دیا گیا ہے بلکہ مقصود یہی ہے جو اوپر ذکر کیا گیا یعنی حالت اضطرار کے بارے میں سوال کرنا چنانچہ آنحضرت ﷺ نے جواب بھی اسی کے بارے میں دیا۔ علاوہ ازیں یہ عبارت مَایَحِلُّ لَنَا الْمَیْتَۃَ کہ جس سے مردار کے بارے میں سوال کرنا معلوم ہوتا ہے، ابوداؤدؒ کی ہے، لیکن طبرانی وغیرہ نے اس روایت کو جس طرح نقل کیا ہے اس میں یہ عبارت (یحل میں یاء کے پیش کے ساتھ) یوں ہے مَایُحِلُّ لَنَا الْمَیْتَۃَ یعنی وہ کون سی حالت ہو جو ہمارے لئے مردار کے کھانے کو حلال قرار دیتی ہے! یہ عبارت سائل کے اصل مقصود کو زیادہ صاف اسلوب میں واضح کرتی ہے۔

"تم لوگوں کو کھانا کس مقدار میں ملتا ہے؟" اس سوال کا مقصد یہ تھا کہ دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ تمہیں غذا کے نام پر کوئی چیز بھی کسی بھی مقدار میں میسر نہ ہو، اس صورت میں کوئی الجھاؤ ہی نہیں ہے، جب پیٹ میں ڈالنے کے لئے کوئی بھی چیز کسی بھی مقدار میں میسر نہ ہو تو "حالت اضطرار" بالکل واضح طور پر متحقق ہو جاتی ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ غذا کے نام پر کوئی نہ کوئی چیز اور کسی نہ کسی مقدار میں تمہیں میسر ہو اس صورت میں دیکھنا ہوگا کہ اس مقدار کی نوعیت کیا ہے کہ اس کے مطابق حالت اضطرار کے بارے میں فیصلہ ہو گا لہٰذا تم بتاؤ کہ اگر تمہیں کھانے کی قسم سے کوئی چیز دستیاب ہوتی ہے اس کی مقدار کیا ہے، تا کہ اس مقدار کو معلوم کر کے یہ اندازہ لیا

جاسکے کہ اس کے ذریعہ تمہارے پیٹ کو کتنا سہارا مل سکتا ہے اور تمہاری بھوک، اضطرار کی حد کو پہنچی ہے یا نہیں؟ آنحضرت ﷺ نے یہ سوال کرتے وقت "مخاطب کے لئے جمع" کا صیغہ استعمال کر کے گویا جماعت کو مخاطب کیا جب کہ سوال کرنے والے وہی ایک شخص (یعنی فجیع عامری ؓ) تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ جو حکم بیان کرنا چاہتے تھے وہ اگرچہ ایک شخص کے سوال کے پیش نظر تھا مگر حقیقت میں اس کا تعلق سب ہی لوگوں سے تھا اس لئے آپ ﷺ نے اس طرح اس حکم کی عمومی حیثیت کو واضح فرمایا یہی وجہ ہے کہ فجیع ؓ بھی اپنے جواب میں جمع کا صیغہ لائے یعنی یوں کہا کہ "ہم نے عرض کیا.... الخ"

"نصطبح" کا مادہ اشتقاق "صبوح" ہے صبح کے معنی صبح کے کھانے پینے" کے ہیں اسی طرح "نغتبق" کا مادۂ اشتقاق "غبوق" ہے جس کے معنی شام کے کھانے پینے" کے ہیں یہاں روایت میں ان دونوں الفاظ سے مراد صبح و شام ایک ایک پیالہ دودھ پینا لیا گیا ہے جیسا کہ حدیث کے ایک راوی ابو نعیم ؒ نے حضرت عقبہ ؒ سے یہ وضاحت نقل کی ہے، اور ہو سکتا ہے کہ ابو نعیم ؒ کی نقل کردہ وضاحت حضرت عقبہ ؒ ہی سے سماعت پر مبنی ہو یا دوسری روایتوں میں بھی یہ وضاحت منقول ہو، بہر صورت راوی کی یہ وضاحت مستند بھی ہے اور لائق اعتبار بھی۔

آنحضرت ﷺ کا "اپنے باپ کی قسم کھانا" بظاہر ایک تعجب خیز امر ہے جس کی تاویل یہ کی جائے گی کہ آپ ﷺ کا یہ قسم کھانا اصل میں اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ غیر اللہ کی قسم کھانے کی ممانعت نازل نہیں ہوئی تھی، یا یہ کہ پہلے اہل عرب عام طور پر چوں کہ اسی قسم کی قسمیں کھایا کرتے تھے اور ایسی قسموں کے الفاظ ان کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے اس لئے اس عادت کے مطابق آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے بھی یہ قسم اضطرارًا (یعنی بلا قصد و ارادہ) نکل گئی۔

"آپ ﷺ نے اس صورت میں ان کے لئے مردار کو حلال قرار دیا۔" میں "اس صورت" سے مراد صبح و شام ایک ایک پیالہ دودھ پینے کی صورت ہے یعنی گویا آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ غذا کی اتنی تھوڑی سی مقدار تم لوگوں کو یقیناً کافی نہیں ہوگی اور تم سب بھوکے رہے ہوگئے اس لئے یہ صورت حالت اضطرار کی ہے جس میں مردار کھانا حلال ہے لہٰذا تم مجبورًا مردار بھی کھا کر اپنی جان بچا سکتے ہو۔

(۲) وَعَنْ اَبِیْ وَاقِدِ اللَّیْثِیِّ اَنَّ رَجُلًا قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نَکُوْنُ بِاَرْضٍ فَتُصِیْبُنَا بِهَا الْمَخْمَصَةُ فَمَتٰی یَحِلُّ لَنَا الْمَیْتَةُ قَالَ مَالَمْ تَصْطَبِحُوْا اَوْ تَغْتَبِقُوْا اَوْ تَحْتَفِؤُا بِهَا بَقْلًا فَشَاْنُکُمْ بِهَا مَعْنَاهُ اِذَا لَمْ تَجِدُوْا صَبُوْحًا اَوْ غَبُوْقًا وَلَمْ تَجِدُوْا بَقْلَةً تَاْکُلُوْنَهَا حَلَّتْ لَکُمُ الْمَیْتَةُ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت ابو واقد لیثی ؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا "یا رسول اللہ (ﷺ)! ہم (کبھی) ایسی زمین میں (یعنی ایسی جگہ پہنچ جاتے) ہیں کہ (یہاں ہمیں کھانا کو کچھ نہیں ملتا جس کی وجہ سے) ہم وہاں مخمصہ (بھوک) کی حالت میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس صورت میں مردار کھانا ہمارے لئے کب حلال ہو جاتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا جب کہ تم صبح تک یا شام تک (کھانے پینے کی کوئی چیز) نہ پاؤ یا اس زمین (یعنی اس جگہ کہ جہاں تم ہو) تو تمہاری حالت مردار سے متعلق ہوگی یعنی ایسی صورت پیش آنے پر مردار کھانا تمہارے لئے حلال ہوگا (اب اس کے بعد راوی حدیث کا ماحصل بیان کرتے ہیں کہ) اس ارشاد گرامی ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم دن بھر میں اور رات بھر میں کھانے پینے کی کوئی چیز نہ پاؤ اسی طرح تمہیں ترکاری کی قسم سے بھی کوئی چیز (یہاں تک کہ گھاس اور درخت کے پتے بھی) میسر نہ ہوں جس کو تم کھا سکو (اور اپنی جان بچا سکو) تو اس صورت میں تمہارے لئے مردار حلال ہوگا۔" (دارمی)

تشریح: دونوں حدیثوں میں بظاہر تعارض محسوس ہوتا ہے کیوں کہ پہلی حدیث میں تو صبح و شام کو دودھ ملنے کی صورت کو بھی بھوک اور مخمصہ یعنی اضطرار کی حالت پر محمول کیا اور مردار کھانے کو مباح قرار دیا جب کہ اس دوسری حدیث میں حالت اضطرار کے پائے جانے کو اس امر کے ساتھ مشروط کیا کہ صبح یا شام تک کھانے پینے کی کوئی بھی چیز میسر نہ ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ اس دائرے کو اتنا تنگ کیا کہ اگر ترکاری و سبزی اور اس کی مانند چیزیں جیسے گھاس اور درخت کے پتے وغیرہ ہی مہیا ہو جائیں اور ان کو پیٹ میں ڈالا جا سکے تو اس صورت

میں حالت اضطرار متحقق نہیں ہوگی اور مردار کھانا مباح نہیں ہوگا۔ ان احادیث کے باہمی تعارض واختلاف ہی کی بنا پر علماء کے مسلک واقوال میں بھی اختلاف پیدا ہوا ہے، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک تو یہ ہے کہ سدرمق یعنی جان بچانے کی خاطر از قسم مردار کوئی چیز کھانا اس صورت میں حلال ہوگا جب کہ بھوک کی وجہ سے جان کی ہلاکت کا خوف پیدا ہو جائے، اور اسی قدر کھانا حلال ہوگا جس سے بس جان بچ جائے۔ حضرت امام شافعیؒ کا ایک قول بھی یہی ہے، یہ مسلک وقول بظاہر "سختی وتنگی" پر محمول ہے، لیکن حقیقت میں احتیاط وتقویٰ اسی میں ہے۔

اس کے برخلاف حضرت امام مالکؒ، حضرت امام احمدؒ اور ایک قول کے مطابق حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اتنی مقدار میں کھانا نہ پائے جس سے وہ سیر ہو جائے اور اس کی طبعی خواہش حاجت مند ومتقاضی ہو تو اس کے لئے مردار کھانا حلال ہوگا، تاآنکہ وہ اپنی حاجت طبع پوری کرے، یعنی وہ سیر ہو جائے، اور اس مسلک میں زیادہ نرمی وآسانی ہے۔ حاصل یہ کہ حالت، اضطرار میں از قسم مردار کوئی چیز کھانے کے سلسلے میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو سدرمق کا اعتبار ہے، کہ مضطر بس اتنا مردار کھا سکتا ہے جس سے جان بچی رہے، جب کہ دوسرے آئمہ کے نزدیک حصول قوت یعنی شکم سیر ہو کر کھانے کا اعتبار ہے ان ائمہؒ کی دلیل پہلی حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس حالت میں مردار کھانے کو حلال قرار دیا، جب کہ سائل کو ایک پیالہ دودھ دن میں، اور ایک پیالہ دودھ رات میں میسر ہوتا تھا اور دن ورات میں ملنے والا ایک ایک پیالہ دودھ بلاشک وشبہ سدرمق یعنی جان بچانے کی حد تک کافی ہو سکتا ہے، اگرچہ اس کے ذریعہ شکم سیری نہ ہو سکتی ہو، لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ اضطرار کی حد کی وجہ سے مردار کھانا مباح ہو جاتا ہے اصل میں شکم سیری کا حاصل نہ ہونا ہے اور بقدر حصول قوت مردار کھانا حلال ہے۔

ان ائمہؒ کے برخلاف حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اپنے مسلک کو دوسری حدیث سے ثابت کرتے ہیں جس کی وضاحت اوپر بیان کی گئی ہے۔ ان (حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ) کے نزدیک جہاں تک پہلی حدیث کا تعلق ہے کہ جس سے دوسرے آئمہ استدلال کرتے ہیں اس کے بارے میں ان کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس حدیث میں صبح وشام ایک ایک پیالہ دودھ پوری قوم کو ملتا تھا، نہ کہ ایک ایک شخص ایک ایک پیالہ دودھ پاتا تھا، چنانچہ لفظ طَعَامُکُمْ میں جمع کا صیغہ اس بات کی واضح دلیل ہے۔

اسی طرح حضرت فجیع عامری کا سوال کرنا محض اپنی ذات کی طرف سے نہیں تھا، بلکہ درحقیقت انہوں نے اپنی پوری قوم کی طرف سے سوال کیا تھا اسی لئے انہوں نے یہ الفاظ کہے مایحل لنا (ہمارے لئے مردار میں سے کیا حلال ہے) انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ میرے لئے مردار میں سے کیا حلال ہے؟ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک کثیر جماعت کے لئے محض ایک پیالہ دودھ سدرمق یعنی جان بچانے کے لئے بھی ہرگز کافی نہیں ہو سکتا، اور نہ وہ کسی ایک کی بھی بھوک کو ذرا برابر بھی ختم کرنے میں مددگار بن سکتا ہے، ہاں اگر ہر ایک کو ایک ایک پیالہ دودھ ملے تو وہ بے شک جان بچانے کے بقدر غذا بن سکتا ہے۔

بَابُ الْاَشْرِبَةِ

پینے کی چیزوں کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

پانی کو تین سانس میں پینے کی خاصیت

① عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَنَفَّسُ فِي الشَّرَابِ ثَلَاثًا۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَزَادَ مُسْلِمٌ فِي

رِوَايَةٍ وَيَقُوْلُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهٗ اَرْوٰى وَاَبْرَأُ وَاَمْرَأُ۔

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ پانی پینے کے درمیان تین مرتبہ سانس لیتے تھے (بخاریؒ و مسلمؒ) اور مسلمؒ نے ایک روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ "..... اور آپ ﷺ فرماتے کہ اس طرح (کئی سانس میں پانی پینا اچھی طرح سیراب کرتا ہے اور پیاس کو بجھاتا ہے، بدن کو صحت بخشتا ہے اور خوب ہضم ہوتا ہے، اور معدہ میں بڑی آسانی کے ساتھ جاتا ہے۔"

تشریح: "تین مرتبہ سانس لیتے تھے" یعنی آپ ﷺ پانی تین سانس میں پیتے تھے، حضرت انسؓ نے یہ بات اکثر کے اعتبار سے بیان کی ہے کہ آپ ﷺ اکثر و بیشتر اسی طرح پانی پیتے تھے، اور بعض روایتوں میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں دو سانس میں بھی پینے کا ذکر آیا ہے۔ بہر حال تین یا دو سانس میں پینے کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ﷺ ہر مرتبہ برتن کو منہ سے جدا کر لیتے تھے۔

مشک کے منہ سے پانی پینے کی ممانعت

② وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الشُّرْبِ مِنْ فِيِّ السِّقَاءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مشک کے دہانے سے پانی پینے سے منع فرمایا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مشک یا اس جیسی دوسری چیزوں (جیسے ہینڈ پمپ یا گھڑے وغیرہ) کے دہانہ (منہ) سے پانی پینے کی ممانعت اس بنا پر ہے کہ اس طریقہ سے اول تو پانی ضرورت سے زائد صرف ہوتا ہے، دوسرے وہ پانی کپڑوں وغیرہ پر گر کر ان کو خراب کرتا ہے تیسرے یہ کہ اس طرح پانی پینا کہ زیادہ مقدار میں دفعتاً پیٹ میں جائے معدہ کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے اور چوتھے یہ کہ پانی پینے کا جو مسنون طریقہ ہے اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

③ وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اِخْتِنَاثِ الْاَسْقِيَةِ وَزَادَ فِيْ رِوَايَةٍ وَاخْتِنَاثُهَا اَنْ يُّقْلَبَ رَاْسُهَا ثُمَّ يُشْرَبَ مِنْهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مشک کا منہ موڑنے یعنی اس کا منہ موڑ کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔ اور راوی نے ایک روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ مشک کا منہ موڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اس مشک کا سرا (یعنی منہ) الٹ دیا جائے، اور پھر اس سے پانی پیا جائے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس ممانعت کی وجہ بھی وہی ہے جو اوپر ذکر کی گئی، مشک کا منہ موڑ کر پانی پینے کی صورت میں ایک خدشہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس مشک میں کوئی کیڑا پتنگا ہو، یا کوئی زہریلا جانور اندر بیٹھا ہو اور وہ یکبارگی منہ کے اندر چلا جائے، اور کوئی ضرر پہنچائے۔ ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مشک کے منہ سے پانی پیا ہے، یہ روایت دوسری فصل میں آئے گی اس سے مشک کے منہ سے پانی پینے کا جواز ثابت ہوتا ہے، چنانچہ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ جن روایتوں سے ممانعت ثابت ہوتی ہے ان کا تعلق بڑی مشک سے ہے جن کا منہ زیادہ فراخ ہوتا ہے، اور جہاں تک آنحضرت ﷺ کے عمل کا تعلق ہے تو وہ چھوٹی مشک پر محمول ہے، کہ آپ ﷺ نے کسی ایسی مشک کے منہ سے پانی پیا ہو گا جو چھوٹی ہو گی اور اس کا دہانہ تنگ ہو گا۔ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ ممانعت کا تعلق دوام اور عادت سے ہے یعنی مشک کے منہ سے پانی پینے کی عادت نہ ڈالنی چاہئے، کیوں کہ اس کی وجہ سے مشک کے منہ میں رفتہ رفتہ بدبو پیدا ہونے لگے گی اور اگر گاہ بگاہ مشک کے منہ سے پانی پی لیا جائے تو یہ ممنوع نہیں ہو گا، یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اباحت کا تعلق ضرورت و احتیاج سے ہے کہ اگر فرض کیجئے، پانی پینے کی ضرورت ہو اور اس وقت کوئی ایسا برتن موجود نہ ہو جس میں پانی انڈیل کر پیا جا سکتا ہو تو پھر اس صورت میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہو گا کہ مشک یا گھڑے کے منہ سے پانی پی لیا جائے، ہاں بغیر ضرورت و احتیاج کے اس طرح پانی پینا ممنوع ہو گا، کیونکہ

اس طریقہ سے پانی پینے میں مذکورہ بالا مضرات کا خدشہ ہو سکتا ہے، خاص طور پر اس مشک کے اندر کسی زہریلے جانور کی موجودگی کے خطرہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص نے (مشک کے) دہانہ سے پانی پیا، تو اس کے اندر سے ایک سانپ نکل آیا۔ اور آخر میں ایک بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ اس طرح پانی پینا پہلے مباح تھا مگر بعد میں اس ممانعت کے ذریعہ اس اباحت کو منسوخ قرار دے دیا گیا۔

کھڑے ہو کر پانی مت پیو

④ وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ نَهٰى اَنْ يَّشْرَبَ الرَّجُلُ قَائِمًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ، نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص کھڑے ہو کر پیے۔" (مسلمؒ)

⑤ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَشْرَبَنَّ اَحَدٌ مِّنْكُمْ قَائِمًا فَمَنْ نَسِيَ مِنْكُمْ فَلْيَسْتَقِئْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص کھڑا ہو کر نہ پیے، اگر کسی شخص نے بھول سے کھڑے ہو کر پی لیا تو اس کو چاہیے کہ وہ قے کر ڈالے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حدیث میں قے کر ڈالنے کا جو امر (حکم) بیان کیا گیا ہے، وہ وجوب کے طور پر نہیں ہے، بلکہ بطریق استحباب ہے، چنانچہ اس حدیث کی صراحت کے مطابق اگر کسی شخص نے بھول سے کھڑے ہو کر پانی پیا ہے تو اس کے لئے یہ مستحب ہے، وہ قے کر ڈالے۔

قاضیؒ نے کہا ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینے کی یہ ممانعت اصل میں اولی و بہتر طریقہ (یعنی بیٹھ کر پانی پینے) کی تلقین اور اس کی خلاف پر تادیب و تنبیہ کے طور پر ہے نہ کہ یہ ممانعت، نہی تحریمی کے طور پر ہے، حاصل یہ کہ اس ارشاد سے یہ نہ سمجھا جائے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا حرام ہے، اس اعتبار سے یہ حدیث اس روایت کے منافی نہیں ہوگی جس میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک یا دو مرتبہ اس کے برخلاف عمل کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پیا

⑥ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِدَلْوٍ مِّنْ مَّاءِ زَمْزَمَ فَشَرِبَ وَهُوَ قَائِمٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں زمزم کے پانی کا ایک ڈول لے کر آیا تو آپ ﷺ نے اس کو اس حالت میں پیا کہ آپ ﷺ کھڑے ہوئے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آپ ﷺ کا زم زم کے پانی کو کھڑے ہو کر پینا یا تو تبرک کی بنا پر تھا، یا اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کے اژدہام کی وجہ سے آپ ﷺ کے لئے وہاں بیٹھنا ممکن نہیں تھا، اور یا جہاں (زم زم کے کنویں کے پاس) آپ ﷺ کھڑے تھے وہاں آس پاس پانی گرنے کی وجہ سے کیچڑ ہو گیا تھا، اور اس کیچڑ میں کس طرح بیٹھ سکتے تھے، اور یا یہ کہ آپ ﷺ کے کھڑے ہو کر پانی پینے کا مقصد محض بیان جواز تھا۔

وضو کا پانی اور آب زم زم کھڑے ہو کر پینا مستحب ہے

⑦ وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّهٗ صَلَّى الظُّهْرَ ثُمَّ قَعَدَ فِيْ حَوَائِجِ النَّاسِ فِيْ رَحْبَةِ الْكُوْفَةِ حَتّٰى حَضَرَتْ صَلٰوةُ الْعَصْرِ ثُمَّ اُتِيَ بِمَاءٍ فَشَرِبَ وَغَسَلَ وَجْهَهٗ وَيَدَيْهِ وَذَكَرَ رَاْسَهٗ وَرِجْلَيْهِ ثُمَّ قَامَ فَشَرِبَ فَضْلَهٗ وَهُوَ قَائِمٌ ثُمَّ قَالَ اِنَّ اُنَاسًا يَكْرَهُوْنَ الشُّرْبَ قَائِمًا وَاِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَنَعَ مِثْلَ مَا صَنَعْتُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی اور پھر لوگوں کے معاملات و مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے کوفہ کی ایک بلند و کشادہ جگہ پر اپنی مجلس قائم کی (اور وہاں لوگوں کے جھگڑوں اور معاملوں کو سن سن کر فیصلہ کرتے رہے) یہاں تک کہ عصر کا وقت آگیا، جب (وضو کے لئے) پانی لایا گیا تو انہوں نے (اپنی پیاس بجھانے کے لئے وضو سے پہلے اس پانی میں سے) پیا اور پھر انہوں نے (وضو کے لئے) اپنا منہ اور اپنے ہاتھ دھوئے، اور راوی نے یہ ذکر کیا کہ (انہوں نے) اپنا سر کا مسح اور اپنے پاؤں (دھوئے) اس کے بعد حضرت علیؓ کھڑے ہوئے اور وضو کا بچا ہوا پانی اس حالت میں پیا کہ وہ کھڑے ہوئے تھے اور پھر فرمایا کہ بعض لوگ کھڑے ہو کر پینے کو کراہت پر محمول کرتے ہیں یعنی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کھڑے ہو کر پانی پینا مکروہ ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسا ہی کیا ہے جیسا کہ (ابھی) میں نے کیا۔" (بخاریؒ)

تشریح: "اور راوی نے یہ ذکر کیا الخ" کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اوپر کے (یعنی پہلے) راوی نے جہاں ہاتھ اور منہ دھونے کا ذکر کیا تھا وہیں سر اور پیروں کے بارے میں بھی ذکر کیا تھا، لیکن جب نیچے کے (یعنی بعد کے) راوی نے حدیث نقل کی تو وہ پہلے راوی کے قول کی تفصیل بھول گیا اور اسے یہ یاد نہیں رہا کہ پہلے راوی نے یہ کہا تھا (کہ حضرت علیؓ نے اپنے سر کا مسح کیا اور اپنے پیروں کو دھویا، جیسا کہ بظاہر یہی واضح ہوتا ہے، یا یہ کہ پہلے راوی نے یہ بیان کیا تھا کہ انہوں نے اپنے سر کا بھی مسح کیا، اور پیروں کا بھی مسح کیا، جیسا کہ اسی واقعہ کے بارے میں حضرت علیؓ سے منقول ایک اور روایت میں ہی ذکر کیا گیا ہے، اس صورت میں کہا جائے گا کہ پیروں کے مسح سے مراد پیروں کو ہلکے طور پر دھونا ہے، اور یا یہ کہ حضرت علیؓ نے اس وقت موزے پہن رکھے ہوں گے، اس لئے انہوں نے پیروں پر مسح کیا۔

"اس حالت میں پیا کہ وہ کھڑے ہوئے تھے" یہ جملہ دراصل تاکید کے طور پر ہے تاکہ یہ گمان نہ ہو کہ کھڑے ہونے کے بعد پھر بیٹھ کر انہوں نے پانی پیا ہوگا، چنانچہ اس بات کو مکرر واضح کیا گیا کہ انہوں نے اسی طرح کھڑے کھڑے وضو کا بچا ہوا پانی پیا۔

واضح رہے کہ احادیث میں کھڑے ہو کر پانی پینے کی ممانعت بیان کی گئی ہے، جب کہ آنحضرت ﷺ اور اکابر صحابہؓ کا عمل اس کے برخلاف بھی ثابت ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں پہلے گزر ہی چکا ہے اور مواہب لدنیہ میں حضرت جبیر بن مطعمؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو دیکھا کہ وہ کھڑے ہو کر پانی پی رہے تھے، اسی طرح حضرت امام مالکؒ نے بیان کیا ہے کہ مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ نے کھڑے ہو کو پانی پیا ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ میں جو اس طرح کا تضاد و تعارض واقع ہوا ہے، اس کو دور کرنے کے لئے علماء نے یہ کہا ہے کہ اس بارے میں جو ممانعت منقول ہے وہ اصل میں نہی تنزیہہ کے طور پر ہے، یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ممانعت کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ لوگ کھڑے ہو کر پانی پینے کو ایک عادت و معمول بنالیں (ویسے گاہ بگاہ یا کسی عذر کی بنا پر کھڑے ہو کر پانی پی لینے میں کوئی مضائقہ نہیں) اسی لئے آنحضرت ﷺ نے جو کھڑے ہو کر پانی پیا اس کا مقصد محض اس جواز کو بیان کرنا تھا، علاوہ ازیں آب زمزم اور وضو کا بچا ہوا پانی اس ممانعت سے مستثنیٰ ہے، بلکہ ان کو تو کھڑے ہی ہو کر پینا مستحب ہے، چنانچہ بعض فقہی روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ آب زمزم اور وضو کا بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پیا جائے البتہ اور پانی کھڑے ہو کر نہ پیا جائے۔

جانوروں کی طرح منہ ڈال کر پانی پینا مکروہ ہے

⑧ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ وَمَعَهٗ صَاحِبٌ لَّهٗ فَسَلَّمَ فَرَدَّ الرَّجُلُ وَهُوَ يُحَوِّلُ الْمَآءَ فِيْ حَائِطٍ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ كَانَ عِنْدَكَ مَآءٌ بَاتَ فِيْ شَنَّةٍ وَاِلَّا كَرَعْنَا فَقَالَ عِنْدِيْ مَآءٌ بَاتَ فِيْ شَنٍّ فَانْطَلَقَ اِلَى الْعَرِيْشِ فَسَكَبَ فِيْ قَدَحٍ مَآءً ثُمَّ حَلَبَ عَلَيْهِ مِنْ دَاجِنٍ فَشَرِبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ اَعَادَ فَشَرِبَ الرَّجُلُ الَّذِيْ جَآءَ مَعَهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ ایک انصاری (یعنی ابوالہیثم جن کا ذکر پہلے بھی گزرا ہے) کے باغ میں تشریف لے گئے آپ ﷺ کے ہمراہ آپ ﷺ کے ایک صحابی (یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ) بھی تھے، آنحضرت ﷺ نے (باغ میں پہنچ کر) سلام علیک کی، ان انصاریؓ نے جو اس وقت باغ میں پانی دے رہے تھے آپکے سلام کا جواب دیا، نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا "اگر تمہارے پاس پرانی مشک میں باسی پانی ہو (تو لاؤ تاکہ ہم پئیں) اور اگر تمہارے پاس ایسا پانی نہ ہو تو پھر ہم ندی یا نہر سے منہ لگا کر پانی پی لیں گے۔" انہوں نے عرض کیا کہ "(جی ہاں!) میرے پاس پرانی مشک میں باسی پانی موجود ہے۔" چنانچہ وہ جھونپڑی میں گئے جو (انہوں نے اس باغ میں ڈال رکھی تھی) اور ایک پیالہ میں پانی لے کر پھر اس پر (یعنی اس پیالہ میں) گھر کی پلی ہوئی بکری کا دودھ دوہا (اور اس پیالہ کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا) جس کو نبی کریم ﷺ نے نوش فرمایا اس کے بعد وہ انصاری پہلے پیالہ کی طرح ایک اور پیالہ لے کر آئے۔ جس کو ان صاحب نے پیا جو آنحضرت ﷺ کے ہمراہ آئے تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: کرعنا کے معنی ہیں "ہم کرع میں سے پانی پی لیں گے" اور "کرع" اس جگہ کو کہتے ہیں، جہاں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے، اسی طرح چھوٹی سی نہر اور تالاب کو بھی کرع کہتے ہیں اس اعتبار سے کرعنا کا مفہوم یہ ہوا کہ ہم بغیر کسی برتن کے اور بغیر ہاتھ لگائے نہر یا تالاب وغیرہ سے منہ لگا کر پانی پی لیں گے۔ اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ کرع اس کو کہتے ہیں کہ بغیر برتن اور ہاتھ کے منہ ڈال کر پانی پیا جائے جس طرح چوپائے تالاب وغیرہ میں اپنے پاؤں ڈال کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور پھر منہ لگا کر پانی پیتے ہیں۔

سیوطیؒ کہتے ہیں کہ (اس حدیث سے مفہوم ہوتا ہے کہ کرع یعنی منہ ڈال کر پانی پینا جائز ہے جب کہ) ابن ماجہ کی ایک روایت میں کرع کی ممانعت منقول ہے اس صورت میں کہا جائے گا کہ ابن ماجہ کی روایت کا تعلق نہی تنزیہی سے ہے اور یہاں جو بیان کیا گیا ہے وہ جواز کو ظاہر کرنے کے لئے تھا (مطلب یہ ہے کہ عام حالات میں تو اس طرح جانوروں کے طریقہ پر پانی پینا مکروہ ہے لیکن مخصوص حالات میں اس طرح پانی پینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔)

سونے چاندی کے برتن میں کھانا پینا حرام ہے

⑨ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الَّذِيْ يَشْرَبُ فِيْ اٰنِيَةِ الْفِضَّةِ اِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِيْ بَطْنِهٖ نَارَ جَهَنَّمَ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ۔ اِنَّ الَّذِيْ يَاْكُلُ وَيَشْرَبُ فِيْ اٰنِيَةِ الْفِضَّةِ وَالذَّهَبِ۔

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص چاندی کے برتن میں پینے کی کوئی چیز پیتا ہے تو اس کا یہ پینا اس کے علاوہ اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرے گا کہ اس کے پیٹ میں دوزخ کی آگ کو غٹ غٹ اتارے گا (بخاریؒ و مسلمؒ) اور مسلمؒ کی ایک روایت میں ہے کہ جو شخص چاندی اور سونے کے برتن میں کھاتا اور پیتا ہے (اس کا حشر بھی یہی ہوگا۔"

تشریح: تمام علماء اور ائمہ کا اس مسئلہ پر اتفاق ہے کہ مرد اور عورت دونوں کے لئے چاندی اور سونے کے برتن میں کھانا پینا حرام ہے، اسی طرح ان کے برتنوں میں پانی بھر کر وضو کرنے، یا ان میں عطر رکھ کر ان سے عطر لگانے، اور یا ان میں حقہ رکھ کر حقہ پینے وغیرہ جیسے کاموں میں استعمال کرنا بھی حرام ہے، اگر کسی چاندی یا سونے کے برتن میں کھانے پینے کی کوئی چیز رکھی ہو تو اس کو پہلے اس میں سے نکال کر کسی دوسرے برتن میں رکھ لیا جائے اور پھر اس کو کھایا جائے، اسی طرح تیل یا عطر وغیرہ ہو تو پہلے اس تیل یا عطر کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر نکال لیا جائے اور پھر اس کو دائیں ہاتھ سے لگایا جائے، اور اگر یہ صورت اختیار کی گئی کہ اس تیل یا عطر وغیرہ کو اس چاندی یا سونے کے برتن میں سے کسی ہاتھ کی ہتھیلی پر نکالا گیا اور پھر اسی ہتھیلی سے لگایا گیا تو یہ جائز نہیں ہوگا۔

ہدایہ میں لکھا ہے کہ مفضض برتن میں پانی پینا جائز ہے بشرطیکہ منہ لگانے کی جگہ چاندی نہ ہو، اسی طرح سونے یا چاندی کے مضبب پیالہ میں بھی پانی پینا جائز ہے کیوں کہ پیالہ پر ضباب کا ہونا (یعنی اس پر سونے یا چاندی کا پتر چڑھا ہوا ہونا) اس پیالہ کی مضبوطی کے

لئے ہونا ہے نہ کہ زینت و آرائش کے مقصد سے۔

⑩ وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تَلْبَسُوا الْحَرِيْرَ وَلَا الدِّيْبَاجَ وَلَا تَشْرَبُوْا فِي اٰنِيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَلَا تَاْكُلُوْا فِي صِحَافِهَا فَاِنَّهَا لَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَهِيَ لَكُمْ فِي الْاٰخِرَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "ریشمی کپڑا نہ پہنو، اور نہ دیباج پہنو۔ (جو ایک طرح کا ریشمی ہی کپڑا ہوتا ہے) اسی طرح نہ سونے اور چاندی کے برتن میں پینے کی کوئی چیز پیو، اور نہ سونے چاندی کی رکابیوں اور پیالوں میں کھاؤ، کیوں کہ یہ ساری چیزیں دنیا میں کافروں کے لئے ہیں اور تمہارے لئے آخرت میں ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "ریشمی کپڑا نہ پہنو" اس حکم سے چار انگشت کے بقدر ریشمی کپڑا مستثنیٰ ہے جو دوسرے کپڑے کے کنارے پر لگایا جائے، مثلاً الحالق (یعنی روئی کی عبا یا انگرکھے) وغیرہ کی سنجاف یعنی گوٹ یا جھالر ریشمی کپڑے کی لگانا جائز ہے، بشرطیکہ وہ چار انگشت سے زائد چوڑی نہ ہو۔ اسی طرح وہ کپڑا پہننا جائز ہے جس کے تانے میں ریشم ہو اور بانے میں سوت، اور اگر سوت تانے میں ہو اور ریشم بانے میں ہو تو اس کا پہننا جائز نہیں ہوگا، لیکن لڑائی کے موقع پر اس کا پہننا بھی جائز ہوگا، اسی طرح اگر کسی کو خارش کا مرض لاحق ہو، یا جوؤں کی کثرت ہوگئی تو اس صورت میں ریشمی کپڑا پہننا جائز ہوگا۔

دائیں طرف سے دینا شروع کرو

⑪ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ حُلِبَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَاةٌ دَاجِنٌ وَشِيْبَ لَبَنُهَا بِمَآءٍ مِنَ الْبِئْرِ الَّتِيْ فِيْ دَارِ اَنَسٍ فَاُعْطِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقَدَحَ فَشَرِبَ وَعَلٰى يَسَارِهٖ اَبُوْبَكْرٍ وَعَنْ يَمِيْنِهٖ اَعْرَابِيٌّ فَقَالَ عُمَرُ اَعْطِ اَبَابَكْرٍ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاَعْطَى الْاَعْرَابِيَّ الَّذِيْ عَنْ يَمِيْنِهٖ ثُمَّ قَالَ الْاَيْمَنُ فَالْاَيْمَنُ وَفِيْ رِوَايَةٍ الْاَيْمَنُوْنَ الْاَيْمَنُوْنَ اَلَا فَيَمِّنُوْا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ (جب ہمارے گھر تشریف لائے تو آپ ﷺ) کے لئے گھر کی پلی ہوئی ایک بکری کا دودھ دوہا گیا اور اس دودھ کو اس کنویں کے پانی میں ملایا گیا جو انسؓ کے گھر میں تھا، پھر یہ دودھ کا پیالہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا جس میں سے آپ ﷺ نے کچھ دودھ پیا۔ (اس وقت) آنحضرت ﷺ کے بائیں طرف حضرت ابوبکر صدیقؓ بیٹھے تھے، اور دائیں طرف ایک دیہاتی بیٹھا تھا حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! یہ بچا ہوا دودھ حضرت ابوبکرؓ کو دیجئے" لیکن آپ ﷺ نے اس دیہاتی کو عنایت فرمایا جو آپ ﷺ کی دائیں طرف بیٹھا تھا، پھر فرمایا کہ "دایاں مقدم ہے اور پھر دایاں۔" اور ایک روایت میں یہ ہے کہ (آپ ﷺ نے اس موقع پر یہ فرمایا کہ) "یاد رکھو! دائیں طرف کے زیادہ حق دار ہیں دائیں طرف کے زیادہ حقدار ہیں، لہٰذا دائیں طرف والوں کو دیا کرو (یعنی جب یہ معلوم ہوگیا کہ دائیں طرف والے زیادہ حق دار ہیں تو تم بھی دائیں طرف والوں کی رعایت ملحوظ رکھا کرو کہ دینے میں انہی سے ابتداء کرو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جو انسؓ کے گھر میں تھا" ظاہری اسلوب کا تقاضا تو یہ تھا کہ حضرت انسؓ یہاں یہ کہتے کہ "جو ہمارے گھر میں تھا" کیوں کہ حضرت انسؓ نے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے وہ انہی کے گھر کا ہے، جس بکری کا دودھ دوہا گیا تھا وہ بھی حضرت انسؓ کے گھر میں تھی اور وہ کنواں بھی ان ہی کے گھر میں تھا اور خود حضرت انسؓ ہی اس واقعہ کو بیان کرنے والے ہیں، لیکن انہوں نے ظاہری اسلوب کے تقاضے کے برخلاف یہ کہہ کر کہ "جو انسؓ کے گھر میں تھا" گویا تفنن عبارت کے اسلوب کو اختیار کیا جس کو علم عربیت میں "وضع مظہر، موضع مضمر" کہتے ہیں۔

دونوں لفظ ایمن نون کے پیش کے ساتھ ہیں جن کا ترجمہ یہی ہے کہ "دایاں مقدم ہے اور پھر دایاں" یعنی سب سے پہلے اس شخص

کو دیا جائے جو داہنی طرف ہو اور پھر اس شخص کو دیا جائے جو پہلے شخص کے برابر میں اسی طرف ہو، اسی ترتیب سے دیتا چلا جائے، یہاں تک کہ سب سے آخر میں اس شخص کا نمبر آئے جو بائیں طرف ہے۔ ایک روایت میں یہ دونوں لفظ ایمن نون کے زبر کے ساتھ ہیں اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ میں دائیں طرف والے کو دوں گا پھر دائیں طرف والے کو، لیکن نون کے پیش والی روایت کی تائید مذکورہ بالا دوسری روایت الایمنون الایمنون سے بھی ہوتی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے دینے میں اپنی داہنی طرف کی رعایت ملحوظ رکھنا مستحب ہے یعنی اگرچہ داہنی طرف کا شخص بائیں طرف کے شخص کی بہ نسبت کم رتبہ بھی ہو تو تب بھی پہلے اسی کو دیا جائے، کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے اس دیہاتی کو حضرت ابوبکر صدیقؓ پر اسی لئے مقدم رکھا کہ وہ دائیں طرف تھا۔ نیز یہ حدیث آنحضرت ﷺ کے کمال عدل و انصاف اور آپ ﷺ کے وصف حق شناسی پر بھی دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کے افضل اور مقرب ترین ہونے اور حضرت عمرؓ کی سفارش کے باوجود دیہاتی کے حق کو نظر انداز نہیں کیا، جہاں تک حضرت عمرؓ کے عرض کرنے کا تعلق ہے تو انہوں نے محض یاد دہانی کے لئے عرض کیا تھا کہ شاید آنحضرت ﷺ کو وہاں حضرت ابوبکرؓ کی موجودگی یاد نہ رہی ہو۔

(۱۲) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ أُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَدَحٍ فَشَرِبَ مِنْهُ وَعَنْ يَمِيْنِهٖ غُلَامٌ أَصْغَرُ الْقَوْمِ وَالْأَشْيَاخُ عَنْ يَسَارِهٖ فَقَالَ يَا غُلَامُ أَتَأْذَنُ أَنْ أُعْطِيَهُ الْأَشْيَاخَ فَقَالَ مَا كُنْتُ لِأُوْثِرَ بِفَضْلٍ مِنْكَ أَحَدًا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَأَعْطَاهُ إِيَّاهُ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَحَدِيْثُ أَبِيْ قَتَادَةَ سَنَذْكُرُ فِيْ بَابِ الْمُعْجِزَاتِ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔

"اور حضرت سہل ابن سعدؓ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں (دودھ یا پانی) کا ایک پیالہ لایا گیا، جس میں سے آپ ﷺ نے پیا، اس وقت آپ ﷺ کے دائیں طرف ایک نو عمر تھا جو (حاضرین مجلس میں) سب سے چھوٹا تھا (یعنی حضرت ابن عباسؓ) اور جو بڑے بوڑھے لوگ تھے وہ بائیں طرف تھے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اے لڑکے، کیا تم اجازت دیتے ہو کہ میں اس (باقی ماندہ دودھ یا پانی) کو ان بوڑھوں کو دے دوں؟" اس نو عمر نے کہا کہ "(نہیں) یارسول اللہ! میں آپ ﷺ کے بچے ہوئے (دودھ یا پانی) کو دینے کے سلسلے میں اپنے پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔" چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس بچے ہوئے (دودھ یا پانی) کو اسی نو عمر کو دے دیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اور حضرت ابوقتادہؓ کی روایت (جس کو صاحب مصابیح نے یہاں نقل کیا تھا) ہم انشاء اللہ باب المعجزات میں نقل کریں گے۔

تشریح: اس حدیث سے بھی یہ معلوم ہوا کہ اگر مجلس میں ایک سے زائد لوگ موجود ہوں اور ان کو کوئی چیز دینی ہو تو دائیں طرف کا شخص اس بات کا اولی اور زیادہ حق دار ہے کہ دینے کی ابتداء اسی سے کی جائے ہاں اگر کسی مصلحت کا یہ تقاضا ہو کہ پہلے اس شخص کو دیا جائے جو بائیں طرف ہے تو دائیں طرف والے سے اس کی اجازت لینی چاہئے، اگر وہ اجازت دے دے تب بائیں طرف والے کو دیا جائے۔ رہی یہ بات کہ اس موقعے پر تو آنحضرت ﷺ نے ابن عباسؓ سے اجازت مانگی لیکن پچھلی حدیث میں جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے اس موقع پر آپ ﷺ نے دیہاتی سے اجازت نہیں مانگی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس موقع پر آنحضرت ﷺ کے دائیں طرف جو بڑی عمر والے لوگ بیٹھے تھے ان کا تعلق قریش سے تھا اور ابن عباسؓ آپ ﷺ کے قرابتدار تھے، لہٰذا آپ ﷺ نے سوچا کہ اگر ابن عباسؓ سے اجازت لے کر ان لوگوں کو دے دیا جائے تو ابن عباسؓ کو کوئی ناگواری بھی نہ ہوگی اور ان بڑی عمر والے لوگوں کی تالیف قلوب بھی ہو جائے گی. جب کہ اس موقعہ پر آنحضرت ﷺ کے بائیں طرف حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے جن کا آنحضرت ﷺ سے پختہ تعلق تھا، اور محبت واخلاص راسخ تھا ان کی تالیف قلب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، دوسری طرف اس دیہاتی کے بارے میں بھی یہ خیال تھا کہ اگر اس سے اجازت لے کر ابوبکرؓ کو دیا گیا، تو شاید وہ اس بات کو اپنی حق تلفی سمجھتے ہوئے کسی وحشت و بیگانگی کا شکار ہو جائے، کیونکہ وہ نیا نیا حلقہ بگوش اسلام ہوا تھا گویا آپ ﷺ نے اس کی تالیف قلب اسی میں دیکھی کہ اس سے اجازت نہ لی جائے۔

فقہاءؒ اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ طاعات (یعنی دینی امور اور عبادات) میں ایثار جائز نہیں ہے۔ یہ تو فقہاءؒ کا قول ہے، لیکن اس مسئلہ کا زیادہ واضح پہلو یہ ہے کہ اگر ایثار، واجبات میں ہو تو حرام ہے، اور اگر فضائل و مستحبات میں ہو تو مکروہ ہے، اس کو اور واضح طور پر یوں سمجھا جاسکتا ہے، مثلاً ایک شخص کے پاس صرف اتنا پانی ہے جس سے وہ خود وضو کرسکے لیکن اس نے وہ پانی کسی دوسرے شخص کو دے دیا، اور خود تیمم کر کے نماز پڑھی یا اس کے پاس محض اتنا کپڑا تھا جو اس کی ستر پوشی کے بقدر تھا لیکن اس نے وہ کپڑا کسی دوسرے شخص کو دے دیا اور خود ننگے بدن نماز پڑھی، اسی طرح کا ایثار جائز نہیں ہے بلکہ حرام ہے، یہ تو واجبات میں ایثار کی صورت تھی، فضائل و مستحبات میں ایثار کی صورت یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص باجماعت نماز پڑھنے کے لئے پہلی صف میں امام کے قریب بیٹھا تھا، لیکن اس نے وہ جگہ کسی دوسرے شخص کو دے دی اور خود پچھلی صف میں آکر نماز پڑھی اس طرح ایثار اچھا نہیں ہے بلکہ مکروہ ہے، طاعات کے برعکس دنیاوی امور میں ایثار ایک محمود و مستحسن عمل ہے، جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بعض صوفیاؒ کے بارے میں یہ منقول ہے کہ انہوں نے بعض مواقع پر طاعات میں ایثار کی صورتیں اختیار کیں تو غالباً انہوں نے ایسا غلبۂ حال کے سبب کیا ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

چلتے پھرتے کھانا اور کھڑے ہو کر پینا اصل کے اعتبار سے جائز ہے

⑬ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا نَاكُلُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَمْشِيْ وَنَشْرَبُ وَنَحْنُ قِيَامٌ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ۔

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں (ایسا بھی ہوتا تھا کہ) ہم چلتے پھرتے کھاتے تھے اور کھڑے ہونے کی حالت میں (پانی وغیرہ) پی لیا کرتے تھے (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ) اور ترمذیؒ نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔"

تشریح: علماء نے کہا ہے چلتے پھرتے کھانا اور کھڑے ہو کر پینا اصل میں تو جائز ہے، لیکن زیادہ بہتر اور پسندیدہ بات یہ ہے کہ چلتے پھرتے ہوئے کھانے سے اجتناب کیا جائے، کیوں کہ یہ خلاف ادب ہے یہی بات کھڑے ہو کر پانی پینے کی بھی ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

⑭ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَشْرَبُ قَائِمًا وَقَاعِدًا۔ (رواه الترمذی)

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا "میں نے رسول کریم ﷺ کو کھڑے ہو کر بھی پیتے دیکھا ہے اور بیٹھے ہوئے بھی۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کھڑے ہو کر پیتے ہوئے تو ایک بار یا دو بار دیکھا ہے اور وہ بھی یا تو بیان جواز کی خاطر تھا، یا کسی ضرورت و عذر کی بنا پر تھا، اس ایک یا دو بار کے علاوہ اور تمام مواقع پر بیٹھ کر ہی پیتے دیکھا ہے۔

پیتے وقت برتن میں سانس نہ لو

⑮ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّتَنَفَّسَ فِى الْاِنَآءِ اَوْ يُنْفَخَ فِيْهِ (رواه ابوداؤد وابن ماجہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ (پانی وغیرہ پیتے وقت) برتن میں یا پیالہ وغیرہ میں سانس لیا جائے، یا پھونک ماری جائے۔" (ابوداؤدؒ و ابن ماجہؒ)

تشریح: پیتے وقت برتن میں سانس لینے یا پھونک مارنے سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے تاکہ پئے جانے والے پانی وغیرہ میں تھوک نہ گر

جائے اور دوسرے شخص کو اس سے کراہت محسوس نہ ہو، نیز بسا اوقات منہ میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور اس صورت میں اگر برتن میں سانس لیا جائے گا یا پھونک ماری جائے گی تو ہو سکتا ہے کہ اس پی جانے والی چیز میں بھی بدبو پہنچ جائے، علاوہ ازیں پانی میں سانس لینا اصل میں چوپایوں کا طریقہ ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ اگر اس پی جانے والی چیز کو ٹھنڈا کرنے کیلئے بھی پھونک مارنے کی ضرورت ہو تو اس صورت میں بھی پھوک نہ ماری جائے بلکہ اس وقت تک پینے میں صبر کیا جائے جب تک کہ وہ ٹھنڈی نہ ہو جائے نیز اگر پانی میں کوئی تنکا وغیرہ پڑ جائے، تو اس کو کسی تنکے وغیرہ سے نکالا جائے، انگلی سے یا پھونک مار کر نہ نکالا جائے کیونکہ اس سے طبیعت نفرت و کراہت محسوس کرتی ہے۔

ایک سانس میں پانی مت پیو

(۱۶) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَشْرَبُوْا وَاحِدًا كَشُرْبِ الْبَعِيْرِ وَلٰكِنِ اشْرَبُوْا مَثْنٰى وَثُلَاثَ وَسَمُّوْا اِذَا اَنْتُمْ شَرِبْتُمْ وَاحْمَدُوْا اِذَا اَنْتُمْ رَفَعْتُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ تم ایک سانس میں پانی مت پیو جس طرح اونٹ پیتا ہے بلکہ دو سانس میں پیو، اور جب تم پانی پینے لگو تو بسم اللہ کہو اور جب (پینے کے بعد) برتن کو اپنے منہ سے ہٹاؤ تو حمد کرو، (یعنی ہر بار میں یا آخری بار میں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: ادنی درجہ یہ ہے کہ پانی دو سانس میں پیا جائے تاکہ اونٹ کی مشابہت لازم نہ آئے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تین سانس میں پینا بہتر اور زیادہ پسندیدہ ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اور اکثر اوقات میں آنحضرت ﷺ کا معمول یہی تھا۔

"تو حمد کرو" کے سلسلہ میں احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ پہلے سانس کے بعد الحمد للہ کہے، دوسری سانس کے بعد رب العلمین کا اضافہ کرے، اور تیسرے سانس کے بعد الرحمٰن الرحیم۔ نیز پانی پینے کے بعد پڑھی جانے والی یہ دعا بھی منقول ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَهُ عَذْبًا فُرَاتًا بِرَحْمَتِهٖ وَلَمْ يَجْعَلْهُ مِلْحًا اُجَاجًا بِذُنُوْبِنَا۔

تنکا وغیرہ نکالنے کے لئے بھی پانی میں پھونک نہ مارو

(۱۷) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ النَّفْخِ فِي الشَّرَابِ فَقَالَ رَجُلُ الْقَذَاةَ اَرَاهَا فِي الْاِنَاءِ قَالَ اَهْرِقْهَا قَالَ فَاِنِّيْ لَا اَرْوٰى مِنْ نَفَسٍ وَاحِدٍ قَالَ فَاَبِنِ الْقَدَحَ فِيْكَ ثُمَّ تَنَفَّسْ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے پانی میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ایک شخص نے (یہ ممانعت سن کر) عرض کیا کہ اگر میں پانی میں تنکے و نکے پڑے ہوئے دیکھوں (تو کیا کروں؟ کیونکہ اگر پھونک نہیں ماروں گا تو وہ تنکے کیسے نکلیں گے) آپ ﷺ نے فرمایا "تم اس کو پھینک دو، یعنی اوپر سے تھوڑا سا پانی پھینک دو تاکہ وہ تنکے وغیرہ نکل جائیں (اور چونکہ وہ شخص پھونک مارنے کی ممانعت سے یہ بھی سمجھا ہوگا کہ اس سے یہ بات بھی ضروری ہوئی کہ پانی پیتے وقت درمیان میں سانس نہ لیا جائے بلکہ ایک ہی سانس میں پانی پیا جائے اس لئے) اس نے عرض کیا کہ "میں ایک دم یعنی ایک سانس میں پینے سے سیراب نہیں ہوتا؟" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "(اس طرح پانی پیو کہ پہلے تھوڑا سا پی کر) پیالہ کو منہ سے ہٹاؤ اور (برتن سے باہر) سانس لو (اور پھر ایسے ہی دوسرے اور تیسرے سانس میں باقی پانی پی لو۔" (ترمذیؒ، دارمیؒ)

پینے کا برتن اگر کسی جگہ سے ٹوٹا ہوا ہو تو وہاں منہ لگا کر نہ پیو

(۱۸) وَعَنْهُ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الشُّرْبِ مِنْ ثُلْمَةِ الْقَدَحِ وَاَنْ يَنْفُخَ فِي الشَّرَابِ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے پیالہ کے سوراخ سے پانی پینے سے منع فرمایا، نیز آپ ﷺ نے پانی میں پھونک مارنے سے بھی منع فرمایا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "سوراخ" سے مراد برتن کی ٹوٹی ہوئی جگہ ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر پینے کا برتن کسی جگہ سے ٹوٹا ہوا ہو تو اس جگہ سے منہ لگا کر پانی نہ پیو، کیوں کہ اس جگہ ہونٹوں کی گرفت اچھی طرح نہیں ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہاں سے پانی نکل کر بدن اور کپڑوں پر گرے گا، دوسرے یہ کہ برتن کی دھلائی کے وقت اس کی ٹوٹی ہوئی جگہ اچھی طرح صاف نہیں ہو پاتی وہاں مٹی وغیرہ لگی رہ جاتی ہے اس صورت میں پاکیزگی وصفائی کا تقاضا بھی یہی ہے اس جگہ منہ نہ لگایا جائے۔

حدیث کے مفہوم اور مذکورہ بالا وضاحت سے معلوم ہوا کہ "سوراخ" سے ٹوٹا ہوا برتن مراد نہیں ہے بلکہ اس کی ٹوٹی ہوئی جگہ مراد ہے یعنی اس ممانعت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ٹوٹے ہوئے برتن میں پانی نہ پیا جائے بلکہ یہ مراد ہے کہ برتن کی ٹوٹی ہوئی جگہ پر منہ لگا کر پانی نہ پیا جائے۔

کبھی کبھار مشک وغیرہ کے منہ سے پانی پینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے

(۱۹) وَعَنْ كَبْشَةَ قَالَ دَخَلَ عَلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَشَرِبَ مِنْ فِي قِرْبَةٍ مُعَلَّقَةٍ قَائِمًا فَقُمْتُ اِلٰى فِيْهَا فَقَطَعْتُهٗ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت کبشہؓ (صحابیہ) کہتی ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ میرے یہاں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے کھڑے کھڑے لٹکی ہوئی مشک کے منہ سے پانی پیا، چنانچہ میں مشک کے منہ کے پاس جا کر کھڑی ہوئی اور اس کو کاٹ لیا۔ (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مشک کے منہ کے جتنے حصے پر آپ ﷺ کا دہن مبارک لگا تھا میں نے اتنے حصے کا چمڑہ کاٹ کر رکھ لیا اور یہ میں نے تبرک یعنی حصول برکت کی غرض سے کیا یا اس احساس ادب کی بنا پر کیا تا کہ اس حصے پر کسی اور کا منہ نہ لگے جیسا کہ اسی طرح کے ایک واقعہ کے سلسلے میں حضرت اُمّ سلمہؓ نے جو روایت بیان کی ہے اس میں انہوں نے صراحت کے ساتھ یہ کہا ہے کہ میں نے مشک کا منہ کاٹ دیا تا کہ آنحضرت ﷺ کے پینے کے بعد کوئی دوسرا شخص اس جگہ منہ لگا کر نہ پئے۔

آنحضرت ﷺ کو میٹھا اور ٹھنڈا مشروب بہت پسند تھا

(۲۰) وَعَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ اَحَبُّ الشَّرَابِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْحُلْوَ الْبَارِدُ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ وَالصَّحِيْحُ مَارُوِيَ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت زہریؒ، حضرت عروہؒ سے اور وہ حضرت عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے یعنی حضرت عائشہؓ نے کہا کہ رسول کریم ﷺ کے نزدیک پینے کی چیزوں میں ٹھنڈی میٹھی چیز بہت زیادہ پسندیدہ تھی۔ اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ روایت صحیح ہے جو بحوالہ زہریؒ آنحضرت ﷺ سے بطریق ارسال نقل کی گئی ہے۔"

تشریح: "میٹھی چیز" سے عموم مراد ہے کہ آپ ﷺ کو ہر میٹھا مشروب بہت زیادہ پسند تھا، خواہ وہ میٹھا پانی ہوتا تھا یا میٹھا دودھ، اور خواہ شہد وغیرہ کا شربت! اس وضاحت سے اس حدیث اور ان دونوں حدیثوں کے درمیان مطابقت ویکسانیت پیدا ہو جاتی ہے، جن میں سے ایک میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو پینے کی چیزوں میں دودھ سب سے زیادہ پسند تھا اور دوسری روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو پینے کی چیزوں میں شہد سب سے زیادہ پسند تھا۔

"وہ روایت صحیح ہے الخ" کا مطلب یہ ہے کہ زہریؒ نے اس روایت کو دو طریق سے نقل کیا ہے ایک تو مسند یعنی سند کے ساتھ جس طرح اوپر نقل کی گئی ہے کہ عن الزهري عن عروة عن عائشة.....الخ اور دوسرے مرسل یعنی بغیر سند کے ذکر کیا ہے اس طرح کہ اس میں انہوں نے عائشہؓ کا ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ عبارت کے ظاہری مفہوم سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ عروہ کا ذکر بھی نہیں کیا ہے، کیونکہ زہریؒ خود بھی تابعی ہیں اگرچہ صغیر تابعی ہیں۔ لہٰذا ترمذیؒ کہتے ہیں، کہ زہریؒ کی روایت جو بطریق ارسال ہم تک پہنچی ہے اس کے سلسلہ سند میں جن راویوں کا ذکر ہے وہ حدیث کی اصطلاح میں قوی تر اور ضابطہ تر ہیں، بخلاف اس روایت کے سلسلہ سند کے کہ جو متصل ہے اس کے بعض راوی ضعیف ہیں۔

کھانے پینے میں دودھ سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے

(۲۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ طَعَامًا فَلْيَقُلِ اللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَأَطْعِمْنَا خَيْرًا مِنْهُ وَإِذَا سُقِيَ لَبَنًا فَلْيَقُلِ اللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَزِدْنَا مِنْهُ فَإِنَّهُ لَيْسَ شَيْءٌ يُجْزِئُ مِنَ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ إِلَّا اللَّبَنُ۔ (رواه الترمذي وابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے تو یوں کہے یعنی یہ دعا پڑھے اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَأَطْعِمْنَا خَيْرًا مِنْهُ (اے اللہ ہمیں، ہمارے اس کھانے میں برکت عطا فرما اور ہم کو اس سے بھی اچھا کھانے کو دے) اور جب تم میں سے کسی شخص کو دودھ پینے کو ملے تو وہ یوں کہے، یعنی یہ دعا پڑھے۔ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَزِدْنَا مِنْهُ (اے اللہ ہمیں ہمارے اس دودھ میں برکت عطا فرما، اور ہم کو اس سے زیادہ پینے کو دے اور (دودھ پینے کی اس دعا "اس سے بھی اچھا پینے کو دے" کے الفاظ نہ کہے، کیوں کہ دودھ سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے، جو خدا سے مانگی جا سکے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ) ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو کھانے اور پینے کا بدل بن سکے علاوہ دودھ کے (کہ وہ شکم سیر کرنے کی بھی خاصیت رکھتا ہے، اور سیراب کرنے کی بھی)۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

آنحضرت ﷺ کے لئے میٹھے پانی کا خاص اہتمام

(۲۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسْتَعْذَبُ لَهُ الْمَاءُ مِنَ السُّقْيَا قِيْلَ هِيَ عَيْنٌ بَيْنَهَا وَبَيْنَ الْمَدِيْنَةِ يَوْمَانِ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی ﷺ کے لئے میٹھا پانی سقیا سے لایا جاتا تھا، بعض حضرات نے بیان کیا کہ سقیا ایک چشمہ کا نام ہے، جو مدینہ سے دو منزل کے فاصلہ پر واقع تھا۔" (ابوداؤدؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

سونے چاندی کے برتن میں نہ پیو

(۲۳) عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ شَرِبَ فِيْ إِنَاءِ ذَهَبٍ أَوْ فِضَّةٍ أَوْ إِنَاءٍ فِيْهِ شَيْءٌ مِنْ ذٰلِكَ فَإِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِيْ بَطْنِهِ نَارَ جَهَنَّمَ۔ (رواه الدارقطني)

"حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص سونے یا چاندی کے برتن میں پئے گا یا کسی ایسے برتن میں پئے گا (جو اگرچہ کلیۃً سونے چاندی کا نہ ہو مگر) اس میں سونے یا چاندی کا کچھ حصہ ہو تو اس کا یہ پینا اس کے علاوہ اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرے گا کہ اس کے پیٹ میں دوزخ کی آگ کو غٹ غٹ اتارے گا۔" (دار قطنیؒ)

تشریح: "اس میں سونے یا چاندی کا کچھ حصّہ ہو۔" کا مطلب یہ ہے کہ اس میں سونے یا چاندی کی کیلیں وغیرہ لگی ہوئی ہوں۔ اور طیبیؒ نے نوویؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ اگر وہ کیلیں وغیرہ چھوٹی چھوٹی ہوں اور اتنی ہی مقدار و تعداد میں استعمال کی گئی ہوں جو ضرورت و حاجت کے بقدر ہوں تو وہ حرام و مکروہ کے حکم میں داخل نہیں ہوں گی، لیکن اگر زیادہ مقدار و تعداد میں بھی ہوں اور بڑی بڑی یا چوڑی ہوں تو پھر وہ حرام کے حکم میں ہوں گی۔ لیکن جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ اس سلسلے میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ جس برتن میں سونے یا چاندی کی کیلیں وغیرہ لگی ہوئی ہوں اس میں پانی وغیرہ پینا جائز ہے بشرطیکہ جس جگہ منہ لگا کر پیا جائے وہاں سونا یا چاندی نہ ہو۔

بَابُ النَّقِيعِ وَالْاَنْبِذَةِ

نقیع اور نبیذوں کا بیان

آنحضرت ﷺ جو چیزیں پیا کرتے تھے ان میں ایک نقیع اور نبیذ بھی ہے۔ یہ دونوں چیزیں شربت کی قسم سے ہوتی ہیں ان میں سے نقیع کو بنانے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ انگور یا کھجوروں کو پانی میں محض بھگو دیا جاتا ہے اس کو جوش نہیں دیا جاتا، اس طرح انگور یا کھجوروں کی مٹھاس اس پانی میں آجاتی ہے اور ایک عمدہ قسم کا شربت بن جاتا ہے اور یہ شربت بہت مزیدار بھی ہوتا ہے اور بدن کو فائدہ بھی پہنچاتا ہے، چنانچہ خرما کا نقیع معدہ کے نظام کو درست کرتا ہے اور کھانے کو جلد ہضم کرتا ہے جب کہ انگور کا نقیع جسم کی زائد حرارت کو دفع کرنے کی خاصیت رکھتا ہے۔

نبیذ بھی اسی طرح بنتا ہے فرق محض یہ ہوتا ہے کہ نبیذ کی صورت میں انگور یا کھجوروں کو پانی میں بھگو کر کچھ عرصہ تک کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ اس میں کچھ ہلکی سی تیزی اور تغیر پیدا ہو جائے، لیکن اتنی تیزی یا اتنا زیادہ تغیر نہیں جو نشہ آور ہو جانے کی حد تک پہنچ جائے، کیونکہ جس نبیذ میں نشہ پیدا ہو جاتا ہے اس کا پینا قطعاً حرام ہے اسی لئے رسول کریم ﷺ اس نبیذ کو ہرگز نہیں پیتے تھے جس پر تین دن سے زائد کا عرصہ گزر جاتا تھا، جیسا کہ آگے آئے گا، نقیع کی طرح نبیذ بھی ایک فائدہ مند مشروب ہے یہ جسم کی طاقت و قوت میں اضافہ کرتا ہے اور عام صحت کی محافظت کرتا ہے۔

واضح رہے کہ نبیذ انگور اور کھجور کے علاوہ دوسری چیزوں سے بھی بنتی ہے، چنانچہ نہایہ میں لکھا ہے کہ نبیذ کھجور سے بھی بنتی ہے اور انگور سے بھی، شہد سے بھی بنتی ہے اور گیہوں اور جو وغیرہ سے بھی، مصنف مشکوۃ نے اوپر عنوان میں انبذہ جمع کا صیغہ اس لئے استعمال کیا ہے تاکہ اس کی متعدد اقسام و انواع کی طرف اشارہ ہو جائے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حضرت انسؓ کا پیالہ

(۱) عَنْ اَنَسٍ قَالَ لَقَدْ سَقَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَدَحِيْ هٰذَا الشَّرَابَ كُلَّهُ الْعَسَلَ وَالنَّبِيْذَ وَالْمَآءَ وَاللَّبَنَ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا۔ "میں نے رسول کریم ﷺ کو اپنے اس پیالہ میں پینے کی ساری چیزیں پلائی ہیں، جیسے شہد، نبیذ، پانی اور دودھ۔" (مسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ جس پیالہ میں پینے کی چیزیں پیا کرتے تھے وہ حضرت انسؓ کے پاس تھا، منقول ہے کہ نصر ابن انسؓ نے اس پیالہ کو حضرت انسؓ کی میراث میں سے آٹھ لاکھ درہم کے عوض خرید اتھا، حضرت امام بخاریؒ نے اس پیالہ کو بصرہ میں دیکھا تھا اور ان

کی خوش بختی کے کیا کہنے کہ ان کو اس مبارک پیالے میں پانی پینے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

آنحضرت ﷺ کے لئے نبیذ بنانے کا ذکر

② وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنَّا نَنْبِذُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سِقَاءٍ يُوْكَأُ اَعْلَاهُ وَلَهٗ عَزْلَاهُ نَنْبِذُهٗ غُدْوَةً فَيَشْرَبُهٗ عِشَاءً وَنَنْبِذُهٗ عِشَاءً فَيَشْرَبُهٗ غُدْوَةً۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ہم رسول کریم ﷺ کے لئے ایک مشک میں نبیذ بنایا کرتے تھے جس کو اوپر سے (باندھ کر) بند کر دیا جاتا تھا اور اس کے نیچے کے حصے میں بھی اس کا دہانہ تھا ہم اس مشک میں کھجور وغیرہ صبح کے وقت ڈال دیتے تھے تو آپ ﷺ رات کے وقت اس کو پیتے اور اگر اس میں کھجور وغیرہ رات میں ڈالتے تھے تو آپ ﷺ اس کو صبح کے وقت پیتے تھے۔" (مسلم)

تشریح: "عزلاء" اصل میں توشہ دان کے دہانہ کو کہتے ہیں، لیکن یہاں مشک کا دہانہ مراد ہے جو اس کے نیچے کی طرف ہو، حاصل یہ کہ اس مشک کے اوپر کی جانب تو منہ تھا ہی، لیکن اس کے نیچے کے حصے میں بھی ایک دہانہ تھا اس کے اوپر کے منہ کو تو باندھ دیا جاتا تھا اور اس کے نیچے کے منہ سے نکال کر پیا جاتا تھا، نبیذ بنانے کے لئے کھجوروں کو ایک دن اور ایک رات سے زائد تک، حتی کہ تین دن و تین رات تک بھگوئے رکھنے کا ذکر ہے، ان کا تعلق جاڑے کے موسم سے ہوگا۔

③ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُنْبَذُ لَهٗ اَوَّلَ اللَّيْلِ فَيَشْرَبُهٗ اِذَا اَصْبَحَ يَوْمَهٗ ذٰلِكَ اللَّيْلَةَ الَّتِيْ تَجِيْءُ وَالْغَدَوَ اللَّيْلَةَ الْاُخْرٰى وَالْغَدَ اِلَى الْعَصْرِ فَاِنْ بَقِيَ شَيْءٌ سَقَاهُ الْخَادِمَ اَوْ اَمَرَ بِهٖ فَصُبَّ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے لئے جو نبیذ رات کے ابتدائی حصے میں ڈالی جاتی تھی اس کو آپ ﷺ آنے والے دن کی صبح کو پیتے، پھر آنے والی رات میں پیتے، پھر دوسرے دن اور دوسری رات میں پیتے، اور پھر اس کے بعد آنے والے (یعنی تیسرے) دن، عصر کے وقت تک پیتے اور اگر اس کے بعد بھی اس میں سے کچھ باقی رہ جاتی تو خادم کو پلا دیتے یا پھینک دینے کا حکم دے دیتے چنانچہ وہ پھینک دی جاتی تھی۔" (مسلم)

تشریح: سقاہ الخادم او امر بہ میں حرف او (یا) اظہار شک کے لئے نہیں ہے بلکہ تنویع کے لئے ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تیسرے دن عصر کے وقت تک پینے کے بعد جو نبیذ بچ جاتی وہ چونکہ تلچھٹ رہ جاتی تھی اس لئے آپ ﷺ اس کو خود نہیں پیتے تھے بلکہ خادم کو پینے کے لئے دے دیتے تھے۔

اور اگر اس میں نشہ کا اثر آجاتا تو پھر خادم کو بھی پینے کے لئے نہیں دیتے تھے بلکہ پھینکوا دیتے تھے۔

مظہرؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ مالک و آقا کے لئے جائز ہے کہ وہ خود اوپر کا کھانا کھائے، اور نیچے کا کھانا غلام و خادم کو کھلائے۔

④ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ يُنْبَذُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سِقَاءٍ فَاِذَا لَمْ يَجِدُوْا سِقَاءً يُنْبَذُ لَهٗ فِيْ تَوْرٍ مِنْ حِجَارَةٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے لئے مشک میں نبیذ بنائی جاتی تھی اور اگر کسی وقت مشک نہ ملتی تو پھر آپ ﷺ کے لئے پتھر کے برتن میں نبیذ بنائی جاتی تھی۔" (مسلم)

نبیذ کن برتنوں میں نہ بنائی جائے

⑤ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الدُّبَّاءِ وَالْحَنْتَمِ وَالْمُزَفَّتِ وَالنَّقِيْرِ وَاَمَرَ اَنْ يُّنْبَذَ فِيْ

اَسْقِيَةِ الْاَدَمِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے کدو کے تو بنے، سبز لاکھی گھڑے، رال ملے ہوئے برتن اور لکڑی کے برتن میں نبیذ بنانے سے منع فرمایا اور یہ حکم دیا، کہ چمڑے کے مشک میں نبیذ بنائی جائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے اسلام کے ابتدائی دور میں ان برتنوں میں نبیذ بنانے کی ممانعت فرمائی تھی اور اس ممانعت کی بنیاد یہ خوف تھا، کہ کہیں ان برتنوں میں بنائی جانے والی نبیذ میں جلد نشہ پیدا نہ ہو جائے اور اس کے بارے میں معلوم بھی نہ ہو سکے، لیکن جب نشہ کی حرمت نازل ہونے پر اچھی خاصی مدت گزر گئی اور لوگوں کے ذہن میں بھی یہ حرمت اچھی طرح راسخ اور مشہور ہو گئی تو پھر ہر طرح کے برتن میں نبیذ کا بنانا مباح کر دیا گیا جیسا کہ آگے آنے والی حدیث سے معلوم ہو گا اور اس مسئلہ کی مفصل تحقیق کتاب الایمان میں بھی گزر چکی ہے۔

اس حکم کی منسوخی جس کے ذریعہ بعض برتنوں میں نبیذ کا بنانا ممنوع قرار دیا گیا تھا

(۶) وَعَنْ بُرَيْدَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَهَيْتُكُمْ عَنِ الظُّرُوْفِ فَاِنَّ ظَرْفًا لَا يُحِلُّ شَيْئًا وَّلَا يُحَرِّمُهٗ وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ نَهَيْتُكُمْ عَنِ الْاَشْرِبَةِ اِلَّا فِيْ ظُرُوْفِ الْاَدَمِ فَاشْرَبُوْا فِيْ كُلِّ وِعَاءٍ غَيْرَ اَنْ لَا تَشْرَبُوْا مُسْكِرًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میں نے تمہیں (مذکورہ بالا) بعض برتنوں میں نبیذ بنانے سے منع کیا تھا اور تم نے یہ گمان کر لیا تھا کہ حلت و حرمت کا حکم برتنوں سے تعلق رکھتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو چیز حرام ہے اس کو کوئی حلال نہیں کر دیتا اور جو چیز حلال ہے اس کو کوئی برتن حرام نہیں کر دیتا۔ اصل حکم تو یہ ہے کہ جو چیز نشہ پیدا کرے وہ حرام ہے (خواہ وہ کسی بھی برتن میں پی جائے، جو چیز نشہ پیدا نہ کرے وہ حلال ہے خواہ وہ کسی بھی برتن میں ہو)۔" اور ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "میں نے (مذکورہ بالا بعض برتنوں میں" تمہیں (نبیذ بنانے اور) پینے سے منع کیا تھا علاوہ چمڑے کے برتنوں کے (لیکن اب میں اس حکم کو منسوخ قرار دے کر ہر طرح کے برتن میں نبیذ بنانے اور پینے کو مباح قرار دیتا ہوں) لہٰذا تم ہر طرح کے برتن میں پی سکتے ہو، لیکن جو چیز نشہ پیدا کرنے والی ہو اس کو (ہرگز) مت پیو۔" (مسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

ہر نشہ آور مشروب حرام ہے خواہ اس کو شراب کہا جائے یا کچھ اور

(۷) عَنْ اَبِيْ مَالِكٍ الْاَشْعَرِيِّ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَيَشْرَبَنَّ نَاسٌ مِنْ اُمَّتِي الْخَمْرَ يُسَمُّوْنَهَا بِغَيْرِ اسْمِهَا۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"حضرت ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "(ایسا زمانہ آنے والا ہے جب) میری امت کے بعض لوگ شراب پئیں گے اور اس کا نام شراب کے بجائے کچھ اور رکھیں گے" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے ذہن میں کجی اور فساد ہو گا، وہ شراب پینے کے سلسلے میں مختلف حیلے بہانے کریں گے، خاص طور پر نام کو بڑا پردہ بنائیں گے، مثلاً نبیذ یا مباح شربت جیسے ماء العسل وغیرہ کو نشہ آور بنا کر پئیں گے اور یہ گمان کریں گے کہ یہ حرام نہیں ہے کیونکہ نہ اس کو انگور کے ذریعہ بنایا گیا ہے اور نہ کھجور کے ذریعہ، حالاں کہ ان کا اس طرح گمان کرنا ان کے حق میں ان مشروبات

کے مباح و حلال ہونے کے لئے کارگر نہیں ہوتا، بلکہ حقیقت میں وہ شراب پینے والے شمار ہوں گے، اور اس کی ان کو سزا ملے گی کیوں کہ اصل حکم یہ ہے کہ ہر نشہ آور شراب حرام ہے خواہ وہ کسی بھی چیز سے بنا ہو۔

ایک صورت یہ بھی ہوگی کہ وہ شراب ہی پئیں گے، لیکن اپنی طرف سے اس کا کوئی دوسرا نام رکھ لیں گے اس کو شراب نہیں کہیں گے تاکہ لوگ شراب پینے کا الزام عائد نہ کریں، لیکن حقیقت میں نام کی یہ تبدیلی ان کے حق میں قطعا کارگر نہیں ہوگی اصل میں اعتبار تو مسمی کا ہے نہ کہ اسم کا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

⑧ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِی اَوْفٰی قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ نَبِيْذِ الْجَرِّ الْاَخْضَرِ قُلْتُ اَنَشْرَبُ فِی الْاَبْيَضِ قَالَ لَا۔ (رواہ البخاری)

"حضرت عبداللہ بن اوفیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے سبز ٹھلیا میں بنی ہوئی نبیذ پینے سے منع فرمایا تو میں نے عرض کیا کہ "کیا ہم سفید ٹھلیا میں بنی ہوئی نبیذ پی سکتے ہیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "نہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: "سبز ٹھلیا" سے مراد "حنتم" یعنی سبز لاکھی (روغنی) گھڑا ہے! چونکہ عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سبز کی قید سے یہ سمجھے کہ جو ٹھلیا سبز نہ ہو اس میں بنی ہوئی نبیذ کا پینا مباح ہوگا اس لئے انہوں نے پوچھا کہ کیا ہم سفید ٹھلیا کی پی سکتے ہیں؟ لیکن آنحضرت ﷺ نے سفید ٹھلیا کی نبیذ پینے سے بھی منع فرما کر گویا اس طرف اشارہ کیا، کہ "سبز" کی قید محض اتفاقی ہے اور اس کا ایک سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں جن ٹھلیوں میں نبیذ بنائی جاتی تھی عام طور پر سبز ہی ہوتی تھی، اس لئے سبز ہی کا ذکر کر دیا، ورنہ سبز سفید کا حکم ایک ہی ہے، کہ جو بھی لاکھی یعنی روغنی ٹھلیا ہو خواہ وہ سبز رنگ کی ہو یا کسی اور رنگ کی ہو اس میں بنی ہوئی نبیذ پینے سے اجتناب کرو! لیکن واضح رہے کہ اس حدیث کا حکم بھی منسوخ ہے، جیسا کہ پیچھے ذکر کیا گیا۔

بَابُ تَغْطِيَةِ الْاَوَانِی وَغَيْرِهَا
برتنوں وغیرہ کو ڈھانکنے کا بیان

اس باب میں وہ احادیث مذکور ہوں گی جو رات کو سوتے وقت برتنوں کو ڈھانکنے، دروازوں کو بند کر دینے اور چراغ کو بجھا دینے جیسے امور کے سلسلے میں منقول ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

رات آنے پر کن چیزوں کا خیال رکھا جائے

① عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ جُنْحُ اللَّيْلِ اَوْ اَمْسَيْتُمْ فَكُفُّوْا صِبْيَانَكُمْ فَاِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْتَشِرُ حِيْنَئِذٍ فَاِذَا ذَهَبَ سَاعَةٌ مِنَ اللَّيْلِ فَخَلُّوْهُمْ وَاَغْلِقُوا الْاَبْوَابَ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فَاِنَّ الشَّيْطٰنَ لَا يَفْتَحُ بَابًا مُغْلَقًا وَاَوْكُوْا قِرَبَكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ وَخَمِّرُوْا اٰنِيَتَكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ وَلَوْ اَنْ تَعْرُضُوْا عَلَيْهِ شَيْئًا وَاَطْفِئُوْا مَصَابِيْحَكُمْ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِیْ رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِیِّ قَالَ خَمِّرُوا الْاٰنِيَةَ وَاَوْكُوا الْاَسْقِيَةَ وَاَجِيْفُوا الْاَبْوَابَ وَاكْفِتُوْا صِبْيَانَكُمْ عِنْدَ الْمَسَاءِ فَاِنَّ لِلْجِنِّ اِنْتِشَارًا وَخَطْفَةً وَاَطْفِئُوا الْمَصَابِيْحَ عِنْدَ الرُّقَادِ فَاِنَّ الْفُوَيْسِقَةَ رُبَّمَا اجْتَرَّتِ

الْفَتِيْلَةَ فَاحْرَقَتْ اَهْلَ الْبَيْتِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ غَطُّوا الْاِ نَاءَ وَاَوْكُوا السِّقَاءَ وَاَغْلِقُوا الْاَبْوَابَ وَاَطْفِئُوْا السِّرَاجَ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَحِلُّ سِقَاءً وَلَا يَفْتَحُ بَابًا وَلَا يَكْشِفُ اِنَاءً فَاِنْ لَمْ يَجِدْ اَحَدُكُمْ اِلَّا اَنْ يَّعْرِضَ عَلٰى اِنَائِهٖ عُوْدًا وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فَلْيَفْعَلْ فَاِنَّ الْفُوَيْسِقَةَ تُضْرِمُ عَلٰى اَهْلِ الْبَيْتِ بَيْتَهُمْ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهٗ قَالَ لَا تُرْسِلُوْا فَوَاشِيَكُمْ وَصِبْيَانَكُمْ اِذَا غَابَتِ الشَّمْسُ حَتّٰى تَذْهَبَ فَحْمَةُ الْعِشَاءِ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ يُبْعَثُ اِذَا غَابَتِ الشَّمْسُ حَتّٰى تَذْهَبَ فَحْمَةُ الْعِشَاءِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهٗ قَالَ غَطُّوا الْاِنَاءَ وَاَوْكُوا السِّقَاءَ فَاِنَّ فِي السَّنَةِ لَيْلَةً يَنْزِلُ فِيْهَا وَبَاءٌ لَا يَمُرُّ بِاِنَاءٍ لَيْسَ عَلَيْهِ غِطَاءٌ اَوْسِقَاءٍ لَيْسَ عَلَيْهِ وِكَاءٌ اِلَّا نَزَلَ فِيْهِ مِنْ ذٰلِكَ الْوَبَاءِ۔

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب رات کی تاریکی پھیل جائے، یا یہ فرمایا کہ جب شام ہو جائے تو تم اپنے بچوں کو (گھر سے نکلنے اور گلی کوچوں میں پھرنے سے) روک دو کیونکہ اس وقت شیطان یعنی جنات چاروں طرف پھیل جاتے ہیں۔ پھر جب رات کی ایک گھڑی گزر جائے تو بچوں کو (کہیں آنے جانے کے لئے) چھوڑ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، نیز اللہ کا نام لے کر (یعنی بسم اللہ پڑھ کر) دروازوں کو بند کر دو، کیونکہ (بسم اللہ پڑھ کر) بند (کئے گئے) دروازوں کو شیطان نہیں کھولتا (باوجودیکہ شیاطین اور جنات کو اس پر قدرت حاصل ہے کہ وہ دروازوں اور دیواروں میں بیٹھ جائیں، لیکن اللہ کے ذکر کے سبب وہ بیٹھنے کی مجال نہیں رکھتے) اور اللہ کا نام لے کر (ان) مشکیزوں کے منہ باندھ دو (جن میں پانی موجود ہو تا کہ ان میں کیڑا وپتنگا وغیرہ نہ گھس جائے) اور اللہ کا نام لے کر اپنے برتنوں کو ڈھانک دو اور خواہ برتن پر عرضا ہی کوئی چیز رکھ دو (یعنی اگر برتن پر ڈھکنے کے لئے کوئی ایسی چیز موجود نہ ہو جس سے اس برتن کا پورا منہ چھپ سکے تو اس پر عرضا کوئی لکڑی وغیرہ رکھ دو اگرچہ اس صورت میں برتن پوری طرح نہیں ڈھکے گا لیکن اس طرح کم سے کم کراہت تو ختم ہو ہی جائے گی اور اس حکم کی برکت سے برتن میں موجود کھانے پینے کی چیز اس ضرر ونقصان سے بچ جائے گی جو برتن کے بالکل کھلے ہوئے ہونے کی صورت میں یقینی ہوتا جیسے شیطان کا تصرف) اور (سوتے وقت) اپنے چراغوں کو بجھا دو۔" (بخاریؒ ومسلمؒ) اور مذکورہ بالا روایت تو یکساں الفاظ میں بخاری ومسلم میں منقول ہے ہی لیکن یہ مضمون مختلف الفاظ کے ساتھ بخاری ومسلم نے الگ الگ بھی نقل کیا ہے چنانچہ) بخاری کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "برتنوں کو ڈھانک دیا کرو، مشکیزوں کے منہ باندھ دیا کرو، دروازوں کو بند کر دیا کرو اور اپنے بچوں کو اپنے پاس بٹھائے رکھو (ان کو ادھر ادھر نہ جانے دو) جب کہ شام ہو جائے کیونکہ (اس وقت) جنات چاروں طرف پھیل جاتے ہیں اور اچک لیتے ہیں، اور سوتے سوتے چراغوں کو بجھا دیا کرو کیوں کہ (اکثر یا بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ) چوہا بتی کو کھینچ لے جاتا ہے اور گھر والوں کو جلا دیتا ہے۔"

اور مسلم کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت نے فرمایا۔ "برتنوں کو ڈھانک دیا کرو" مشکیزوں کے منہ باندھ دیا کرو دروازوں کو بند کر دیا کرو، اور چراغوں کو بجھا دیا کرو، کیوں کہ (اللہ کا نام لینے کی وجہ سے) شیطان (بندھے ہوئے، مشکیزوں کو نہیں کھولتا، اور نہ (بند) دروازوں کو کھولتا ہے اور نہ ڈھانکے ہوئے) برتنوں کو کھولتا ہے۔ اگر تم میں سے کسی کو (ڈھانکنے کے لئے کوئی چیز) نہ ملے الا یہ کہ وہ اللہ کا نام لے کر برتن کے منہ پر عرضا کوئی لکڑی ہی رکھ سکتا ہو تو وہ ایسا ہی کر لے (یعنی بسم اللہ پڑھ کر برتن کے منہ پر کوئی لکڑی ہی رکھ دے) اور (سوتے وقت چراغ کو اس لئے بجھا دیا کرو) کہ (چوہا چراغ کی بتی کو کھینچ کر) گھر والوں پر ان کے گھر کو بھڑکا دیتا ہے (یعنی چوہا جلی ہوئی بتی کو لے جا کر کسی ایسی جگہ ڈال دیتا ہے، جہاں کسی چیز میں آگ لگ جاتی ہے اور پھر سارا گھر جل جاتا ہے۔

اور مسلم کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "برتن کو ڈھانک دیا کرو، اور مشکیزہ (کے منہ) کو باندھ دیا کرو، کیونکہ سال بھر میں ایک ایسی رات آتی ہے جس میں وبا نازل ہوتی ہے اور جو برتن کھولا ہوا ہوتا ہے یا جس مشکیزہ کا منہ بند نہیں ہوتا اس وبا کا کچھ حصہ اس میں بھی داخل ہو جاتا ہے۔"

تشریح: متفق علیہ روایت کے بعد بخاری کی جو روایت نقل کی گئی ہے اور اس میں عند المساء (جب کہ شام ہو جائے) کا جو لفظ مذکور ہوا

ہے۔ اس کے بارے میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس کا تعلق ساری مذکورہ چیزوں سے ہو (یعنی جب رات شروع ہو جائے تو برتنوں کو ڈھانک دیا جائے، مشکیزوں کے منہ بھی باندھ دیئے جائیں، دروازے بھی بند کر دیئے جائیں اور بچوں کو باہر نکلنے سے روک دیا جائے، اس صورت میں "شام" سے مراد وہ وقت ہوگا جو ابتداء شام سے عشاء تک رہتا ہے کہ دروازوں کو بند رکھنے اور برتنوں کو ڈھانکنے کا یہی وقت ہے اور اگر یہ مراد لیا جائے کہ عند المساء کا تعلق صرف واکفتو اصبیانکم (اپنے بچوں کو اپنے پاس بٹھائے رکھو) سے ہے جیسا کہ حدیث کا سیاق ابھی اسی پر دلالت کرتا ہے تو مراد انسب ہوگی اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ رات میں ان سب چیزوں کا اس طرح خیال رکھو کہ رات کے ابتدائی حصے میں یعنی سورج ڈوبنے کے فوراً بعد بچوں کو باہر نکلنے اور ادھر ادھر ہونے سے روک دو، کیونکہ یہ وقت جنات کے پھیلنے کا ہے اور جب رات کی ایک گھڑی (یعنی ایک گھنٹہ) گزر جائے تو یہ سب کام کرو، یعنی برتن کو ڈھانک دو اور دروازے بند کر دو نیز اس وقت بچوں کو باہر جانے دینے میں کوئی حرج نہیں اس توجیہ سے اس روایت کی متفق علیہ روایت کے ساتھ بھی مطابقت ہو جائے گی۔

"اور اچک لیتے ہیں" شیاطین کا بچوں کو اچک لینا ایک حقیقت ہے جس کی تصدیق بعض واقعات سے بھی ہوئی ہے اگرچہ یہ قلیل الوقوع ہے، یا پھر اچک لینے سے مراد بچوں کے ہوش وحواس کو زائل کر دینا یا ان کو کھیل کود میں لگا دینا ہے۔

"جنات وشیاطین" اصل میں یہ دونوں ایک ہی ہیں" جنات میں سے جو سرکش وفاسق ہیں ان کو شیطان کہتے ہیں! فحمه شروع رات میں یعنی مغرب وعشاء کے درمیان جو تاریکی چھا جاتی ہے اس کو فحمه کہتے ہیں اور عشاء کی نماز سے صبح ہونے تک جو تاریکی رہتی ہے اس کو عَسْعَسَةٌ کہتے ہیں، چنانچہ قرآن کریم کی آیت وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ الخ سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے

واضح رہے کہ اس حدیث میں جو احکام دیئے گئے ہیں وہ بطریق وجوب نہیں ہیں، بلکہ ان کا مقصد محض ان امور کی ہدایت کرنا ہے جو ہماری روزمرہ زندگی میں بھلائی و مصلحت اندیشی کے متقاضی ہوتے ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان احکام کا تعلق استحباب سے ہے یعنی حدیث میں مذکورہ ہدایت پر عمل کرنا مستحب ہے۔

نوویؒ کہتے ہیں کہ (اگر بنظر عمیق اس حدیث کے مضمون پر غور کیا جائے اور ان ہدایات پر عمل کیا جائے تو واضح ہوگا کہ) اس ارشاد میں مختلف قسم کی بھلائیاں اور کتنے ہی جامع آداب اور تہذیب کے رموز پنہاں ہیں خاص طور سے ان میں سے جو سب سے بہتر تعلیم ہے وہ یہ ہے کہ ہر حرکت وسکون کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینا یعنی بسم اللہ پڑھنا ایک ایسا سہل ذریعہ ہے جو دنیا و آخرت کی آفات وبلاؤں سے سلامتی وحفاظت کا ضامن قرار دیا جاسکتا ہے۔

جس برتن میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہو اس کو ڈھانک کر لاؤ لے جاؤ

(۲) وَعَنْهُ قَالَ جَآءَ اَبُوْ حُمَيْدٍ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ مِنَ النَّقِيْعِ بِاِنَآءٍ مِنْ لَبَنٍ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَّا خَمَّرْتَهُ وَلَوْ اَنْ تَعْرِضَ عَلَيْهِ عُوْدًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ابوحمید جو ایک انصاری شخص تھے، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مقام نقیع سے دودھ سے بھرا ہوا ایک برتن لے کر آئے آنحضرت ﷺ نے (جب اس برتن کو کھلا ہوا دیکھا تو) فرمایا کہ "تم نے اس برتن کو ڈھانکا کیوں نہیں، اگرچہ ڈھانکنے کی یہ صورت کیوں نہ ہوتی کہ تم اس برتن پر عرضاً کوئی لکڑی رکھ دیتے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

سوتے وقت آگ بجھا دو

(۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَتْرُكُوا النَّارَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ حِيْنَ تَنَامُوْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرؓ، نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "جب تم سونے لگو تو گھروں میں آگ نہ چھوڑو۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "آگ" سے مراد وہ آگ ہے جس سے کسی چیز کے جل جانے کا خوف ہو، خواہ وہ چراغ ہو یا چولھے وغیرہ کی آگ، لہٰذا روشنی کی جو چیزیں قندیل وغیرہ کی صورت میں لٹکی ہوئی ہوں اور ان سے آگ لگنے کا کوئی خطرہ نہ ہو تو اس کو چھوڑے رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لہٰذا ایسی چیزیں اس ممانعت کے حکم میں داخل نہیں ہوں گی، کیونکہ اس ممانعت کی جو اصل علت ہے (یعنی آگ لگنے کا خطرہ) جب وہی نہیں پائی جائے گی تو اس حکم پر عمل بھی ضروری نہیں ہوگا، بلکہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ اگر آگ کو بھی گھر میں اس طرح رکھ چھوڑا جائے کہ اس سے کسی چیز کے جلنے کا خوف نہ ہو، جیسے جاڑے کے موسم میں شب بیداری کی غرض سے، یا کسی دوسری مصلحت وضرورت کے تحت چولھے وغیرہ میں آگ دبا دیتے ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا وضاحت پر قیاس کرتے ہوئے یہ بھی ممنوع نہیں ہوگا۔

(۴) وَعَنْ اَبِىْ مُوْسٰى قَالَ احْتَرَقَ بَيْتٌ بِالْمَدِيْنَةِ عَلٰى اَهْلِهٖ مِنَ اللَّيْلِ فَحُدِّثَ بِشَاْنِهِ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ هٰذِهِ النَّارَ اِنَّمَا هِىَ عَدُوٌّ لَّكُمْ فَاِذَا نِمْتُمْ فَاَطْفِئُوْهَا عَنْكُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ رات میں ایسا ہوا کہ مدینہ میں ایک شخص کا گھر جل گیا اور گھر والوں پر گر پڑا، چنانچہ اس کے بارے میں نبی کریم ﷺ کے سامنے ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ۔ "یہ آگ، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ یہ تمہارے حق میں ایک دشمن ہے (جو جان ومال کو جلا دیتی ہے) لہٰذا جب تم سونے لگو تو اس کو بجھا دو اور اس کے ضرر ونقصان سے اپنے کو محفوظ رکھو۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِىْ

کتے اور گدھے کی آواز سنو تو خدا کی پناہ چاہو

(۵) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا سَمِعْتُمْ نُبَاحَ الْكِلَابِ وَنَهِيْقَ الْحَمِيْرِ مِنَ اللَّيْلِ فَتَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ فَاِنَّهُنَّ يَرَيْنَ مَالَا تَرَوْنَ وَاَقِلُّوا الْخُرُوْجَ اِذَا هَدَاَتِ الْاَرْجُلُ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَبُثُّ مِنْ خَلْقِهٖ فِىْ لَيْلَةٍ مَا يَشَاءُ وَاَجِيْفُوا الْاَبْوَابَ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَفْتَحُ بَابًا اِذَا اُجِيْفَ وَذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَغَطُّوا الْجِرَارَ وَاكْفِئُوا الْاٰنِيَةَ وَاَوْكُوا الْقِرَبَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم رات میں کتوں کے بھونکنے اور گدھوں کے رینگنے کی آواز سنو تو شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہو کیونکہ وہ (کتے اور گدھے) جس چیز کو دیکھتے ہیں (یعنی شیطان اور اس کی ذریات کو) اس کو تم نہیں دیکھتے اور جب لوگوں کا چلنا پھرنا بند ہو جائے تو اس وقت تم بھی (گھر سے) کم نکلو، کیوں کہ (اس وقت) رات میں اللہ عزوجل اپنی مخلوقات میں سے جن کو چاہتا ہے (یعنی جنات وشیاطین اور موذی جانور وغیرہ) ان کو چاروں طرف پھیل جانے دیتا ہے، اور اپنے دروازوں کو اللہ کا نام لے کر یعنی بسم اللہ پڑھ کر بند کیا کرو، کیونکہ جس دروازے کو اللہ کا نام لے کر بند کیا جاتا ہے اس کو شیطان کھولنے پر قادر نہیں ہوتا، اور (ان) برتنوں کو ڈھانک دیا کرو (جن میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہو) اور (جن) برتنوں (میں کچھ نہ ہو یعنی وہ خالی ہوں ان) کو الٹ دیا کرو، اور مشکیزوں کے منہ باندھ دیا کرو۔" (شرح السنۃ)

چوہے کی شرارت سے بچنے کے لئے سوتے وقت چراغ کو بجھا دو

(۶) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَاءَتْ فَارَةٌ تَجُرُّ الْفَتِيْلَةَ فَاَلْقَتْهَا بَيْنَ يَدَىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْخُمْرَةِ الَّتِىْ كَانَ قَاعِدًا عَلَيْهَا فَاَحْرَقَتْ مِنْهَا مِثْلَ مَوْضِعِ الدِّرْهَمِ فَقَالَ اِذَا نِمْتُمْ فَاَطْفِئُوْا سُرُجَكُمْ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ يَدُلُّ مِثْلَ هٰذِهٖ عَلٰى هٰذِهٖ فَيُحْرِقُكُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن کا واقعہ ہے کہ) ایک چوہا چراغ کی (جلتی ہوئی بتی کھینچ لایا اور اس کو رسول کریم ﷺ کے سامنے اس چٹائی پر ڈال دیا جس پر آپ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے چنانچہ (اس طرح) اس نے ایک درہم کے بقدر چٹائی کو جلا دیا آنحضرت ﷺ نے (یہ دیکھ کر) فرمایا کہ "جب تم سونے لگو، تو چراغ کو گل کر دو کیونکہ شیطان اس چوہے جیسے موذی کو ایسی حرکت پر آمادہ کرتا ہے اور (اس صورت میں گویا) وہ شیطان تمہیں جلا دیتا ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: مصنف مشکوۃ نے اس باب میں تیسری فصل شامل نہیں کی ہے اور نہ یہ کہا ہے کہ "یہ باب تیسری فصل سے خالی ہے۔" چنانچہ یہ نہ کہنے کی وجہ پیچھے (کتاب الاشربہ سے پہلے باب میں بیان کی جا چکی ہے۔

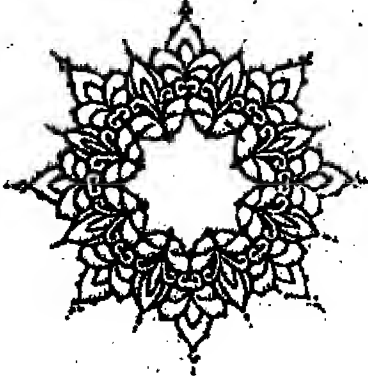

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب اللباس

لباس کا بیان

"لباس" اصل میں تو مصدر ہے، لیکن استعمال "ملبوس" کے معنی میں ہوتا ہے، جیسا کہ "کتاب" کا لفظ مصدر ہونے کے باوجود "مکتوب" کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، "لباس" کے ماضی اور مضارع کے صیغے باب علم یعلم سے آتے ہیں، ویسے اس کا مصدر لُبس (لام کے پیش کے ساتھ) بھی آتا ہے! اور لبس جو لام کے زبر کے ساتھ آتا ہے اس کے معنی التباس وخلط کے ہیں جس کا باب ضرب یضرب ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حبرہ آنحضرت ﷺ کا پسندیدہ کپڑا تھا

(۱) عَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ اَحَبُّ الثِّیَابِ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یَّلْبَسَھَا الْحِبَرَۃَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو سب کپڑوں میں پہننے کے لئے (نہ کہ کسی دوسری ضرورت جیسے بستر پر بچھانے یا کسی کو دینے وغیرہ کے لئے) حبرہ (چادر) سب سے زیادہ پسند تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حبرہ (با کے زبر کے ساتھ بروزن زِغَبَةٌ) ایک خاص قسم کی یمنی چادر کو کہتے ہیں جو اس زمانہ میں بننے والی چادروں میں سب سے عمدہ ہوتی تھی اس چادر میں اکثر سرخ دھاریاں ہوتی تھیں، بعض ایسی بھی ہوتی تھیں جن میں سبز دھاریاں ہوتی تھیں اس کی بناوٹ میں خالص سوت ہوتا تھا۔ علماء لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اس چادر کو اسی وجہ سے پسند فرماتے تھے، جب کہ بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ اس پسندیدگی کا سبب اس کا سبز رنگ ہوتا تھا کیوں کہ سبز کپڑا اہل جنّت کے ملبوسات میں سے ہے، اور یہ بھی منقول ہے کہ آپ ﷺ کو سبز رنگ بہت زیادہ پسند تھا جیسا کہ طبرانیؒ نے اوسط میں اور ابن سنی اور ابو نعیم نے محب میں یہ روایت نقل کی ہے کہ۔

اِنَّہٗ کَانَ اَحَبُّ الْاَلْوَانِ اِلَیْہِ الْخُضْرَۃُ۔

"آنحضرت ﷺ کو تمام رنگوں میں سبز رنگ سب سے زیادہ پسند تھا۔"

اور بعض حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ اس چادر کو اس لئے پسند فرماتے تھے کہ اس کی دھاریاں سرخ ہوتی تھیں اور سرخ رنگ میل خورا ہوتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی نقشی چادر

﴿۲﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ غَدَاةٍ وَعَلَيْهِ مِرْطٌ مُرَجَّلٌ مِنْ شَعْرٍ اَسْوَدَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ (ایک دن) صبح کے وقت سیاہ بالوں کی نقشی چادر اوڑھے ہوئے باہر تشریف لے گئے۔" (مسلمؒ)

تشریح: بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ لفظ "مرجل" کے بجائے "مرحل" زیادہ صحیح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس چادر پر اونٹ کے پالان جیسے نقش و نگار تھے۔

آنحضرت ﷺ نے تنگ آستینوں کا جبہ پہنا ہے

﴿۳﴾ وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَبِسَ جُبَّةً رُوْمِيَّةً ضَيِّقَةَ الْكُمَّيْنِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک رومی جبہ پہنا جس کی آستین تنگ تھی۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: یہ ایک سفر کے دوران کا واقعہ ہے جب کہ آپ ﷺ نے تنگ آستینوں والا جبہ پہنا، چنانچہ ایک اور روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کی آستینیں اتنی تنگ تھیں کہ جب آپ ﷺ وضو فرمانے لگے تو وہ آستینیں اوپر نہ چڑھ سکیں۔ اس لئے آپ ﷺ کو اپنے ہاتھوں کو دھونے کے لئے ان آستینوں کے نیچے سے نکالنا پڑا۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ اپنے کرتے وجبہ وغیرہ کی آستینیں تنگ بنوانا سفر کے دوران تو مستحب ہے، سفر کے علاوہ (حضر میں) مستحب نہیں ہے کیوں کہ صحابہ کرامؓ فراخ آستینیں بنوایا کرتے تھے جب کہ ابن حجرؒ نے یہ کہا ہے کہ اس بارے میں آئمہؒ کا قول یہ ہے کہ آستینوں کو فراخ رکھنا ایک قسم کی مذموم بدعت ہے، انہوں نے صحابہؓ کی آستینوں کے فراخ ہونے کے دوسرے معنی لکھے ہیں، جس کی تفصیل ان کی شرح میں دیکھی جا سکتی ہے، لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ آئمہ کا قول مفرط یعنی حد سے زیادہ فراخی پر محمول ہے اور صحابہؓ کی آستینوں کے فراخ ہونے کے بارے میں جو کچھ منقول ہے غیر مفرط (یعنی حد کے اندر) پر محمول ہے۔ اسی لئے منتقی میں، جو ائمہ کی کتابوں میں سے ایک کتاب ہے، یہ لکھا ہے کہ آستینوں کو ایک بالشت کے بقدر فراخ رکھنا مستحب ہے۔

وہ کپڑے جن میں سرکار دو عالم ﷺ نے سفر آخرت اختیار فرمایا

﴿۴﴾ وَعَنْ اَبِيْ بُرْدَةَ قَالَ اَخْرَجَتْ اِلَيْنَا عَائِشَةُ كِسَاءً مُلَبَّدًا وَاِزَارًا غَلِيْظًا فَقَالَتْ قُبِضَ رُوْحُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ هٰذَيْنِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت عائشہؓ نے ہمیں دکھانے کے لئے ایک پیوند لگی چادر اور ایک موٹا تہبند نکالا اور فرمایا کہ جب رسول کریم ﷺ کی روح مبارک قبض کی گئی تو آپ ﷺ ...ان ہی دو کپڑوں میں تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے اپنے حق میں یہ دعا کی تھی کہ اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَاَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا یعنی یا اللہ مجھے مسکین (غریب) رکھ کر جلا اور مسکین رکھ کر موت دے۔ تو یہ اس کا اثر تھا کہ جب آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو آپ ﷺ کے جسم مبارک پر یہ دو انتہائی معمولی کپڑے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دنیا اور دنیا کے زرق برق سے بے رغبتی و بے اعتنائی ایک پاکیزہ زندگی کا بہترین سرمایہ ہوتا ہے، لہٰذا

اُمت کو لازم ہے کہ ہر خصلت و عادت میں آنحضرت ﷺ کی پیروی کو اختیار کیا جائے۔

آنحضرت ﷺ کا بچھونا

⑤ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَ كَانَ فِرَاشُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِيْ يَنَامُ عَلَيْهِ اَدَمَ حَشْوُهُ لِيْفٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ کا بچھونا جس پر آپ ﷺ سوتے تھے چمڑے کا تھا اور اس میں (روئی کی جگہ) کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: شمائل ترمذی میں حضرت حفصہؓ سے جو روایت منقول ہے اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کا بچھونا ٹاٹ کا تھا، لہٰذا ان دونوں روایتوں میں کوئی تضاد و تناقض نہیں، کیوں کہ آپ ﷺ کے پاس کسی زمانے میں چمڑے کا بچھونا رہا ہوگا، اور کسی زمانے میں ٹاٹ کا یا یہ کہ سونے کا بچھونا تو چمڑے کا ہوگا اور بیٹھنے کا بچھونا ٹاٹ کا ہوگا۔

آنحضرت ﷺ کا تکیہ

⑥ وَعَنْها قَالَتْ كَانَ وِسَادُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِيْ يَتَّكِئُ عَلَيْهِ مِنْ اَدَمٍ حَشْوُهُ لِيْفٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ کا تکیہ، کہ جس پر آپ ﷺ تکیہ فرماتے تھے چمڑے کا تھا اور اس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔" (مسلمؒ)

تشریح: "تکیہ کرتے تھے" یعنی اس پر ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے یا سوتے وقت اس کو سر کے نیچے رکھتے تھے۔ ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ سونے کے لئے اور آرام کی خاطر، بچھونا اور تکیہ بنانا مستحب ہے، بشرطیکہ عیش و عشرت اور آسودگی نفس میں انہماک اور اسراف کے طور پر نہ ہو۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ تکیہ کو پسند کرتے تھے اور سوتے وقت اس کو سر کے نیچے رکھتے تھے اور اس پر ٹیک لگا کر بیٹھتے بھی تھے، نیز آپ ﷺ فرماتے کہ اگر کوئی شخص تکیہ اور خوشبو دے تو اس کو قبول کرنے سے انکار نہ کرنا چاہئے۔

یہ اور ان جیسی دوسری روایتوں سے واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ ﷺ دنیا کی زندگی میں زہد و استغناء اختیار کئے ہوئے تھے اور دنیا کی متاع اور لذتوں سے اعراض کرتے تھے اس لئے آپ ﷺ کا لباس بھی موٹے جھوٹے اور پھٹے پرانے کپڑوں پر مشتمل ہوتا تھا، منقول ہے آپ ﷺ کو جیسا بھی لباس میسر آجاتا اس کو پہن لیتے اس میں کسی تکلف و اہتمام کے روادار نہیں ہوتے تھے، البتہ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ ﷺ کے پاس کوئی نفیس و عمدہ کپڑا آگیا، تو بیان جواز کے لئے اس کو بھی زیب تن فرمالیا لیکن پھر فوراً ہی وہ کپڑا کسی دوسرے شخص کو عنایت فرمادیا، لہٰذا عمدہ و نفیس ہی کپڑا پہننے کی قید اپنے اوپر عائد کر لینا، یا عمدہ و نفیس کپڑا پہننے کی عادت اختیار کر لینا اور اس سلسلے میں بیجا تکلف و اہتمام کرنا سُنت کے خلاف ہے اگرچہ اصل کے اعتبار سے مباح ہے، لیکن یہ بھی واضح رہے کہ اگر کوئی اچھے کپڑے پہننے کی استطاعت و حیثیت کے باوجود محض بخل اور خست کی بنا پر موٹے جھوٹے اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے، یا لوگوں پر اپنے زہد و تقویٰ کا سکہ جمانے کے لئے اور یا حرص و طمع کے تحت لوگوں سے مانگنے کے لئے ریاکاری کے طور پر معمولی قسم کے خستہ و بوسیدہ کپڑے پہنے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی، بلکہ بعض ارباب خیر و مشیخت کے بارے میں یہ منقول ہے کہ انہوں نے اپنی پرہیزگاری اور اپنے بلند مقام روحانیت کو چشم اغیار سے چھپانے کے لئے، یا تحدیث نعمت کے طور پر اپنی خوش حالی کو ظاہر کرنے کے لئے عمدہ اور نفیس کپڑے پہنے۔ حاصل یہ کہ اگر خدا نے کسی کو خوشحالی کی نعمت عطا کی ہے، اور وہ مالی طور پر اچھی حیثیت و استطاعت رکھتا ہے تو اس کو اعلیٰ و نفیس کپڑے پہننے میں کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ وہ اسراف و تکبر کی حد کو نہ پہنچے کیونکہ میانہ روی ہر جگہ اور ہر عمل میں محمود و مطلوب ہے۔

جب آنحضرت ﷺ ہجرت کا حکم سنانے کے لئے ابوبکرؓ کے گھر تشریف لائے

⑦ وَعَنْهَا قَالَتْ بَيْنَ نَحْنُ جُلُوْسٌ فِيْ بَيْتِنَا فِيْ حَرِّ الظَّهِيْرَةِ قَالَ قَائِلٌ لِاَبِيْ بَكْرٍ هٰذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُقْبِلًا مُتَقَنِّعًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ہجرت) سے قبل ایک دن) جب کہ ہم دوپہر کی گرمی میں اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کسی کہنے والے نے (حضرت ابوبکرؓ سے) کہا کہ (دیکھو) وہ رسول کریم ﷺ چادر کے کونے سے اپنا سر مبارک چھپائے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا اپنے سر مبارک کو چادر کے کونے سے ڈھانکنا یا تو دھوپ کی تمازت و تپش سے بچنے کے لئے تھا، یا آپ ﷺ نے اپنا سر اس لئے ڈھانک رکھا تھا کہ چہرہ چھپا رہے اور لوگ (دشمنان دین) پہچان نہ سکیں۔

یہ حدیث اصل میں اس حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جس میں ہجرت نبوی ﷺ کے واقعہ کو بیان کیا گیا ہے کہ (مکہ میں) بیعت العقبہ کے بعد آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے، ہجرت کے حکم کے منتظر تھے ادھر حضرت ابوبکر صدیقؓ اس بات کے درخواست گزار تھے کہ اس سفر میں ان کو رفاقت کا شرف حاصل ہو، چنانچہ آنحضرت ﷺ ان سے فرماتے تھے کہ اگر ہجرت کا حکم نازل ہوا تو ایسا ہی ہوگا (کہ اس سفر میں تم ہی رفیق بنو گے) چنانچہ ایک دن اچانک ہجرت کا حکم نازل ہوا تو آپ ﷺ دوپہر میں حضرت ابوبکرؓ کے گھر تشریف لائے اور ان کو بتایا کہ ہجرت کا حکم نازل ہوگیا ہے اور یہ ہدایت ملی ہے کہ میں ہجرت کے لئے مکہ سے نکل جاؤں اور تم میرے رفیق بنو، پھر آنحضرت ﷺ رات میں حضرت ابوبکرؓ کو لے کر ان کے مکان کی اس کھڑکی سے نکلے جو مکہ کے نشیبی علاقہ میں واقع ثور پہاڑ کی سمت میں تھی اور غار ثور میں جا کر چھپ گئے.... الخ

گھر میں تین سے زائد بچھونے نہ رکھو

⑧ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهٗ فِرَاشٌ لِلرَّجُلِ وَفِرَاشٌ لِاِمْرَأَتِهٖ وَالثَّالِثُ لِلضَّيْفِ وَالرَّابِعُ لِلشَّيْطَانِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا "ایک بچھونا مرد کے لئے، دوسرا بچھونا اس کی بیوی کے لئے، تیسرا بچھونا مہمان کے لئے اور چوتھا بچھونا شیطان کے لئے ہوتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کسی گھر میں محض میاں بیوی ہوں اور وہ استطاعت رکھتے ہوں تو ان کو اپنے یہاں تین بستر رکھنے چاہئیں، ایک تو میاں کے لئے، دوسرا بیوی کے لئے کہ شاید کسی وقت بیماری وغیرہ کی وجہ سے وہ تنہا سونا چاہے ورنہ میاں بیوی کو ایک بستر پر سونا اولیٰ ہے اور سنت کے مطابق ہے کیوں کہ آنحضرت ﷺ، ازواج مطہراتؓ کے ساتھ سویا کرتے تھے، اور تیسرا بستر اس مقصد کے لئے ہو کہ اگر کوئی مہمان آجائے تو وہ رات میں اس پر سوئے، بس یہ تین بستر کافی ہیں ان سے زیادہ جو بھی بستر ہوگا وہ اسراف کی حد میں آئے گا، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا، کہ اگر چوتھا بستر ہوگا تو وہ شیطان کے لئے ہوگا شیطان کی طرف نسبت اسی لئے گئی ہے کہ وہ (چوتھا بستر) یقیناً ضرورت و حاجت سے زائد ہوگا اور ضرورت سے زائد چیز کا ہونا "فخر و مباحات" کے دائرے میں آنے کی وجہ سے مذموم ہے اور ہر مذموم چیز کی نسبت شیطان ہی کی طرف ہوتی ہے، یا اس نسبت کا سبب یہ ہے کہ وہ چوتھا بستر چونکہ ضرورت سے زائد ہوتا ہے اس لئے شیطان اس پر رات گزارتا ہے۔ تاہم یہ واضح رہے کہ جو شخص سخی اور فراخدل ہو اور کرم نواز طبیعت کا مالک ہو اور اس وجہ سے اس کے یہاں مہمانوں کی آمد کثرت سے ہوتی ہو تو اس کے یہاں بستر اور دوسرے اسباب کی زیادتی بظاہر مذموم نہیں ہوگی، مذموم تو وہ زیادتی و کثرت ہوگی جو محض اپنی بڑائی کے اظہار اور مفاخرت کے تحت ہو۔

ازراہ تکبر ٹخنوں سے نیچے پائجامہ وغیرہ لٹکانا حرام ہے

⑨ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَنْظُرُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِلٰى مَنْ جَرَّ اِزَارَهٗ بَطَرًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کی طرف (رحمت کی نظر سے) نہیں دیکھے گا، جو غرور و تکبر سے اپنی ازار (یعنی پائجامہ و تہبند) کو (ٹخنوں سے نیچے) لٹکائے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "غرور و تکبر" کی قید سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص غرور و تکبر کے بغیر اپنے پائجامے یا تہبند کو ٹخنوں سے لٹکائے تو یہ حرام نہیں، تاہم مکروہ تنزیہی یہ بھی ہے۔ اور کسی عذر کے سبب جیسے سردی یا بیماری وغیرہ کی وجہ سے پائجامہ و تہبند کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانا مکروہ تنزیہی بھی نہیں ہے۔

تکبر کے طور پر کپڑے کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے چلنا ممنوع ہے

⑩ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ جَرَّ ثَوْبَهٗ خُیَلَاءَ لَمْ یَنْظُرِ اللّٰهُ اِلَیْهِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص غرور و تکبر کے طور پر اپنے (بدن کے) کپڑے کو زمین پر گھسیٹتا ہوا چلے گا، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف (رحمت و عنایت کی نظر سے) نہیں دیکھے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "کپڑے" میں عمومیت ہے کہ خواہ تہبند ہو یا پائجامہ ہو، خواہ کرتا ہو یا انگرکھا ہو اور خواہ فرغل ہو یا دوپٹہ ہو ان سب کا یہی حکم ہے۔

⑪ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَیْنَمَا رَجُلٌ یَجُرُّ اِزَارَهٗ مِنَ الْخُیَلَاءِ خُسِفَ بِهٖ فَهُوَ یَتَجَلْجَلُ فِی الْاَرْضِ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس وقت ایک شخص غرور تکبر کے طور پر اپنی ازار (یعنی تہبند یا پاجامہ) کو زمین پر گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا تو اس کو زمین میں دھنسا دیا گیا اب وہ قیامت تک (اسی طرح) زمین میں دھنستا چلا جائے گا۔" (بخاریؒ)

تشریح: جس شخص کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ اسی اُمت کا کوئی فرد ہو گا اور آنحضرت ﷺ نے یہ بات بطور پیشین گوئی کے فرمائی، کہ کسی آنے والے زمانہ میں ایسا ہو گا اور بوجہ اس واقعہ کا وقوع پذیر ہونا ایک یقینی امر تھا اس لئے آپ نے اس بات کی خبر دینے کے لئے ماضی کا پیرایہ بیان اختیار فرمایا۔ یا کسی ایسے شخص کا واقعہ ہے جو پچھلی کسی اُمت میں رہا ہو گا اس اعتبار سے حدیث کا ظاہری مفہوم اپنی جگہ برقرار رہے گا کہ آپ ﷺ نے ایک گزرے ہوئے واقعہ کی خبر دی بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس شخص سے مراد قارون ہے (لیکن حدیث کے ظاہری مفہوم اور اس شخص کا نام لئے بغیر ذکر کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ شخص قارون کے علاوہ کوئی اور ہو گا۔)

لباس میں ضرورت سے زائد کپڑا صرف کرنا ممنوع ہے

⑫ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا اَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَیْنِ مِنَ الْاِزَارِ فِی النَّارِ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "از قسم ازار (یعنی پائجامہ وغیرہ) کا جو حصہ ٹخنوں سے نیچے ہو گا، وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ٹخنوں سے نیچے پیر کے جتنے حصہ پر تہبند وغیرہ لٹکا ہوا ہو گا وہ پورا حصہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ بعض حضرات

نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ یہ عمل یعنی ٹخنے سے نیچے تہبند وغیرہ لٹکانا) ایک مذموم عمل ہے اور دوزخیوں کا کام ہے۔ ٹخنے سے نیچے ازار وغیرہ لٹکانے کے مسئلہ میں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اس سلسلے میں جو احادیث منقول ہیں ان میں زیادہ تر ازار کے لٹکانے کا ذکر ہے اور ازار لٹکانے والے کے حق میں بہت سخت وعیدیں بھی بیان کی گئی ہے، یہاں تک کہ ایک روایت کے مطابق، نبی کریم ﷺ نے ایک دن ایک شخص کو اس حال میں نماز پڑھتے دیکھا کہ اس کے پائنچے ٹخنوں سے نیچے تھے، تو آپ ﷺ نے اس کو دوبارہ وضو کرنے اور نماز لوٹانے کا حکم دیا، اسی طرح ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ۔ "شعبان کی پندرھویں شب میں سب (مسلمانوں) کی بخشش کی جاتی ہے، علاوہ عاق، مدمن خمر، اور مسبل ازار کے کہ ان لوگوں کی بخشش نہیں ہوتی۔" لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ساری عیدوں اور ممانعت کا تعلق محض ازار ہی سے نہیں ہے بلکہ سب کپڑوں سے ہے، یعنی بدن پر جو بھی کپڑا ضرورت سے زائد اور سُنّت کے دائرے سے باہر ہوگا اس پر مذکورہ ممانعت کا حکم عائد ہوگا، جہاں تک ازار کی تخصیص کا تعلق ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اس زمانہ میں چادر اور ازار عام طور پر لباس ہوتا تھا اس لئے اس کے استعمال کی کثرت کی بنا پر اس کا ذکر کیا گیا، ویسے بعض روایتوں میں ازار کے ساتھ دوسرے کپڑوں جیسے قمیص اور پگڑی کا بھی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ آگے دوسری فصل میں حضرت ابن عمرؓ کی یہ روایت نقل ہوگی کہ الاسبال فی الازار و القمیص و العمامة من جر منها شیئا خیلاء الخ اسی طرح اسی فصل میں ابھی اوپر حضرت ابن عمرؓ ہی کی جو روایت گزری ہے اس میں مطلق کپڑے کا ذکر ہے، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ لباس میں ضرورت سے زائد کپڑا رکھنے کی ممانعت کا تعلق ہر کپڑے سے ہے۔

بہر حال عزیمت یعنی اولیٰ درجہ یہ ہے کہ ازار یعنی تہبند و پائجامہ کو نصف پنڈلی تک رکھا جائے، چنانچہ آنحضرت ﷺ اپنا تہبند نصف پنڈلی ہی تک رکھتے تھے البتہ رخصت یعنی اجازت و آسانی کا درجہ ٹخنوں تک ہے کہ تہبند و پائجامے کو زیادہ سے زیادہ ٹخنوں تک رکھا جا سکتا ہے، کرتے، وقمیص اور عبا و شیروانی وغیرہ کے دامن کا بھی یہی حکم ہے، اسی طرح قمیص و کرتے وغیرہ کی آستینوں کی مسنون لمبائی یہ ہے کہ وہ بند دست یعنی ہاتھ کے جوڑ تک ہوں عمامہ کا شملہ زیادہ سے زیادہ اتنا چھوڑا جانا چاہئے جو نصف پشت تک رہے، جو شملہ لمبائی یا چوڑائی میں اس سے زائد ہوگا وہ بدعت اور اس زائد لٹکانے میں شمار ہوگا جو ممنوع ہے، چنانچہ بعض علاقوں اور شہروں کے لوگ اپنے لباس میں جو زائد از ضرورت کپڑا استعمال کرتے ہیں، جیسے ضرورت سے زائد لمبی لمبی آستینوں اور وسیع و عریض دامنوں والے کرتے، کئی کئی گز کے پاجامے اور شلواروں اور بڑے بڑے عمامے اور پگڑ کا رواج بعض جگہ پایا جاتا ہے وہ خلاف سُنّت ہے بلکہ یہ زائد از ضرورت کپڑے صرف کرنا اگر تکبر و غرور کی نیت سے ہوگا تو اس کو حرام کہیں گے اور اگر لوگوں کی دیکھا دیکھی یا کسی رواج کے تحت ہوگا تو اس کو مکروہ کہا جائے گا۔ کپڑوں میں ضرورت سے زائد لمبائی چوڑائی رکھنا عورتوں کے لئے بھی ممنوع ہے لیکن مردوں کی بہ نسبت ایک بالشت یا دو بالشت کے بقدر زائد ہونا جائز ہے، بلکہ اتنی زائد مقدار تو مستحب ہے جو پردہ پوشی کے بقدر ہو، جیسا کہ حضرت اُمّ سلمہؓ کی روایت سے معلوم ہوگا جو دوسری فصل میں نقل ہوگی۔

کپڑے پہننے کے بعض ممنوع طریقے

(۱۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَاْكُلَ الرَّجُلُ بِشِمَالِهٖ اَوْ يَمْشِىَ فِىْ نَعْلٍ وَاحِدَةٍ وَاَنْ يَشْتَمِلَ الصَّمَّاءَ اَوْ يَحْتَبِىَ فِىْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ كَاشِفًا عَنْ فَرْجِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص بائیں ہاتھ سے کھائے یا ایک (پیر میں) جوتا پہن کر چلے، اور یہ کہ کپڑے کو بدن پر اس طرح لپیٹ لے کہ دونوں ہاتھ کپڑے کے اندر آجائیں، یا بدن پر کوئی ایک کپڑا لپیٹ کر اس طرح گوٹ مار کر بیٹھے کہ اس کا ستر کھلا ہوا ہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: بائیں ہاتھ سے کھانے کی ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے اور بعض حضرات کے نزدیک نہی تحریمی کے طور پر ہے۔ ایک پیر میں جوتا پہن کر چلنا ایک طرح کی بدہیئتی ہے اور وقار کے خلاف ہے، دوسرے اگر وہ جوتا اونچی اڑی کا ہو گا تو اس صورت میں قدم کے ڈگمگانے اور زمین پر گر پڑنے کا باعث ہو گا لہٰذا اس سے منع فرمایا گیا۔

"کپڑے کو بدن پر اس طرح لپیٹ لے... الخ۔" اس کو عربی میں اشتمال الصماء کہتے ہیں اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی ایک کپڑے جیسے چادر وغیرہ کو اس طرح اوڑھے یا بدن پر لپیٹ لے کہ پورا جسم ڈھک جائے کسی طرف سے کھلا نہ رہے، دونوں ہاتھ بھی بند ہو جائیں اور کسی طرف سے کپڑے کے اٹھنے کی گنجائش نہ رہے کہ اس سے ہاتھ نکالا جائے۔ اس طرح کوئی کپڑا اوڑھنے یا لپیٹنے سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ اس صورت میں آدمی ایسا ہو جاتا ہے، جیسے اس کو طوق پہنا دیا گیا ہو، چنانچہ اس کو "صماء" اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اعضاء جسم کی نقل و حرکت اور منافذ کو بند کر دیتا ہے جیسے "صخرہِ صمار" اس سخت و سپاٹ پتھر کو کہتے ہیں جس میں کوئی سوراخ یا شگاف وغیرہ نہیں ہوتا۔ ابن ہمامؒ نے ہدایہ کی شرح میں لکھا ہے کہ نماز میں "اشتمال صماء" مکروہ ہے جس کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص ایک کپڑے میں اپنا سر اور اپنا پورا بدن اس طرح لپیٹ لے کہ ہاتھ نکلنے کی بھی کوئی جگہ نہ چھوڑے۔ لیکن امام محمدؒ نے اس کراہت کے لئے اس کو شرط قرار دیا ہے کہ اس نے ازار (تہبند) بھی نہ پہن رکھا ہو جب کہ دوسروں کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے۔ اور نوویؒ نے شرح مسلم میں یہ لکھا ہے کہ فقہاءؒ کے نزدیک اشتمال صماء کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی ایک کپڑے کو اپنے پورے بدن پر لپیٹ لے اور کوئی دوسرا کپڑا (جیسے تہبند و پاجامہ وغیرہ) اس کے جسم پر نہ ہو اور پھر اس لپیٹے ہوئے کپڑے کا کوئی کنارہ اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لے۔ یہ صورت حرام ہے کیوں کہ اس میں ستر کا کچھ حصہ کھل جاتا ہے۔ حاصل یہ کہ اگر ستر کا کھل جانا یقینی ہو اشتمال صماء حرام ہو گا اور اگر ستر کا کھلنا محض احتمال کا درجہ رکھتا ہو تو مکروہ ہو گا۔

"گوٹ مار کر بیٹھنا" اس ہیئت میں بیٹھنے کو کہتے ہیں کہ دونوں کولہوں کو زمین پر ٹیک کر پنڈلیوں کو کھڑا کرے اور دونوں ہاتھ ان کے گرد باندھ لے، یا اس طرح بیٹھ کر کوئی کپڑا پیٹھ اور پنڈلیوں پر لپیٹ لے (جب کہ اس کپڑے کے علاوہ اور کوئی کپڑا پہنے ہوئے نہ ہو) چنانچہ اس طرح بیٹھنا اس صورت میں ممنوع ہے جب کہ اس کے پاس صرف چادر ہو کہ اگر اس کو اس طرح لپیٹے گا تو ستر کھل جائے گا اور اگر چادر کے علاوہ اس نے کوئی اور کپڑا پہن رکھا ہو تو اس طرح بیٹھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ نماز کے علاوہ دوسری حالتوں میں اس طرح بیٹھنا مستحب بھی ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ ﷺ خانہ کعبہ کے سامنے ایک چادر میں اور ہاتھوں کے ذریعہ بھی گوٹ مار کر بیٹھے تھے، اور اگر چادر اتنی بڑی اور چوڑی ہو کہ اس کو لپیٹنے سے ستر کھلنے کا احتمال نہ ہو تو صرف ایک چادر میں بھی اس طرح بیٹھنا جائز ہے۔

ریشمی کپڑا پہننے والے مرد کے بارے میں وعید

⑭ وَعَنْ عُمَرَ وَاَنَسٍ وَابْنِ الزُّبَيْرِ وَاَبِي اُمَامَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ لَبِسَ الْحَرِيْرَ فِي الدُّنْيَا لَمْ يَلْبَسْهُ فِي الْاٰخِرَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرؓ، حضرت انسؓ، حضرت ابن زبیرؓ اور حضرت ابوامامہؓ (یہ چاروں صحابہ کرامؓ) نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جس شخص نے دنیا میں (غیر مشروع ریشم پہنا وہ آخرت میں ریشم نہیں پہنے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کا تعلق اس شخص سے ہے جو مردوں کے لئے ریشم کے حلال ہونے کا عقیدہ رکھتے ہوئے ریشمی کپڑا پہنے، یا یہ زجر و تہدید پر محمول ہے، اور یا اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ ایسا شخص ایک خاص مدت تک جنت میں داخل ہونے سے پہلے ریشمی کپڑا پہننے سے محروم رہے گا کیوں کہ جنت میں جنتیوں کا لباس ریشمی ہو گا۔ اور حافظ سیوطیؒ کے قول کے مطابق اکثر علماء نے اس حدیث کی یہ تاویل

بیان کی ہے کہ جو شخص دنیا میں ریشمی کپڑا پہنے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ جنّت میں داخل نہیں ہوگا جو ابتداء ہی میں جائز المرام قرار پا کر جنت میں جائیں گے چنانچہ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو امام احمدؒ نے حضرت جویریہؓ سے نقل کی ہے کہ من لبس الحریر فی الدنیا البسه اللّٰہ یوم القیمة ثوبا من نار، یعنی جس شخص نے دنیا میں ریشمی کپڑا پہنا اس کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن آگ کا لباس پہنائے گا۔

⑮ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا يَلْبَسُ الْحَرِيْرَ فِي الدُّنْيَا مَنْ لَا خَلَاقَ لَهُ فِي الْاٰخِرَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا میں وہی شخص ریشم پہنتا ہے جس کے لئے آخرت میں حصہ نہیں ہوتا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ریشم پہننے والا شخص آخرت کے عقیدہ کا حصہ دار نہیں ہوتا، یا یہ کہ دنیا میں ریشم پہننے والے کو آخرت (جنت) میں ریشم پہننا نصیب نہیں ہوگا۔ جیسا کہ اوپر کی حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ لم یلبسه فی الاخرة یعنی وہ آخرت میں ریشم نہیں پہنے گا اس اعتبار سے اس ارشاد گرامی کا مقصد کنایۃً یہ بیان کرنا ہے کہ ایسا شخص جنّت میں داخل نہیں ہوگا، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ لٰہذا کافر کے حق میں تو یہ بات بالکل ظاہر ہے البتہ مسلمانوں کے حق میں یہ بات بطریق تغلیظ کے ہوگی کہ اس بات کے ذریعہ اس حقیقت کو شدت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ جو مسلمان دنیا میں ریشم پہنے گا وہ شروع میں جنّت میں داخل نہیں ہوگا، یا یہ کہ وہ اس وقت تک جنّت میں داخل نہیں ہوگا جب تک کہ دوسرے بدکاروں کے ساتھ وہ بھی دوزخ کی آگ کے لباس کا عذاب نہ بھگت لے گا۔

سونے چاندی کے برتن میں کھانا پینا اور ریشمی کپڑے پہننا مردوں کے لئے ناجائز ہے

⑯ وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ نَهَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَشْرَبَ فِيْ اٰنِيَةِ الْفِضَّةِ وَالذَّهَبِ وَاَنْ نَّاْكُلَ فِيْهَا وَعَنْ لُبْسِ الْحَرِيْرِ وَالدِّيْبَاجِ وَاَنْ نَجْلِسَ عَلَيْهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں اس سے منع فرمایا کہ ہم سونے چاندی کے برتنوں میں پئیں اور ان میں کھائیں نیز آپ ﷺ نے حریر و دیبا (ایک قسم کا ریشمی کپڑا) پہننے اور اس پر بیٹھنے سے منع فرمایا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: سونے چاندی کے برتنوں وغیرہ میں کھانے پینے اور ریشمی کپڑے پہننے کے بارے میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ فتاویٰ قاضی خان میں لکھا ہے کہ ریشمی کپڑے کا استعمال جس طرح مردوں کے لئے حرام ہے اسی طرح اس کو بچوں کو بھی پہنانا حرام ہے اور پہنانے والوں کو گناہ ہوتا ہے۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ ریشمی کپڑے کو بچھونے میں استعمال کرنا اور اس پر سونا کوئی مضائقہ نہیں رکھتا اسی طرح اگر تکیہ کے غلاف اور پردے ریشمی کپڑے کے ہوں تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ جب کہ حضرت امام ابویوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ نے ان سب کو مکروہ کہا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ (حدیث میں مردوں کے لئے ریشمی کپڑے پہننے اور ریشمی کپڑے پر بیٹھنے کی جو ممانعت منقول ہے اس میں پہننے کی ممانعت تو متفقہ طور پر سب کے نزدیک تحریم پر محمول ہے لیکن ریشمی کپڑے پر بیٹھنے کی) ممانعت صاحبینؒ کے نزدیک تو تحریم ہی پر محمول ہے جب کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک تنزیہہ پر محمول ہے کیونکہ ابھی اوپر ان کے بارے میں یہ بتایا گیا کہ وہ ریشمی کپڑے کو بچھونے وغیرہ میں استعمال کرنے کے مسئلہ میں یہ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جس کا مطلب یہ کہ ان چیزوں میں ریشمی کپڑے کا استعمال بہرحال احتیاط و تقویٰ کے خلاف ہے، کیوں کہ کسی عمل کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کے کرنے میں "کوئی مضائقہ نہیں ہے" اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس میں کوئی مضائقہ ہونے کے شک سے بچنے کے لئے اس عمل

کو نہ کرنا ہی بہتر ہے اس خوف کے سبب کہ شاید اس میں کوئی مضائقہ ہو اور یہی معنی اس مشہور حدیث کے بھی ہیں! دع مالا یریبک الی مالا یریبک یعنی اس کام کو چھوڑ دو جسے میں شک ہو اور اس کام کو اختیار کرو جس میں شک نہ ہو۔ بہر حال حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کو چونکہ ایسی کوئی دلیل قطعی حاصل نہیں ہوئی جس کی بنیاد پر ریشمی کپڑے پر بیٹھنے یا سونے کو حرام قرار دیا جاسکے اور کپڑے پہننے کی ممانعت میں جو صریح نصوص (یعنی اس کی حرمت کے واضح احکام) منقول ہیں ان کے دائرہ حکم میں ریشمی کپڑے پر بیٹھنے کا مسئلہ نہیں آتا کیوں کہ پہننا اور بیٹھنا دو الگ الگ چیزیں ہیں کہ پہنے کا اطلاق بیٹھنے پر نہیں ہو سکتا اس لئے انہوں نے اس حدیث میں (ریشمی کپڑے پر بیٹھنے کی ممانعت کو نہی تنزیہہ پر محمول کیا ہے۔

(۱۷) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ اُهْدِيَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُلَّةٌ سِيَرَاءُ فَبَعَثَ بِهَا اِلَيَّ فَلَبِسْتُهَا فَعَرَفْتُ الْغَضَبَ فِيْ وَجْهِهٖ فَقَالَ اِنِّيْ لَمْ اَبْعَثْ بِهَا اِلَيْكَ لِتَلْبِسَهَا اِنَّمَا بَعَثْتُ بِهَا اِلَيْكَ لِتُشَقِّقَهَا خُمُرًا بَيْنَ النِّسَاءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک دھاری دار ریشمی جوڑا (جو تہبند اور چادر پر مشتمل تھا بطور ہدیہ پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے اس کو میرے پاس بھیج دیا اور میں نے اس کو پہن لیا، لیکن میں نے دیکھا کہ (اس جوڑے کو میرے بدن پر دیکھ کر) آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر غصہ کے آثار پیدا ہو گئے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "میں نے اس جوڑے کو تمہارے پاس اس لئے نہیں بھیجا تھا کہ تم اس کو پہن لو، بلکہ میں نے تو اس جوڑے کو تمہارے پاس اس لئے بھیجا تھا کہ تم اس کو پھاڑ کر اوڑھنیاں بنالو اور ان اوڑھنیوں کو عورتوں میں تقسیم کردو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے جب اس جوڑے کو حضرت علیؓ کے پاس بھیجا تو وہ یہ سمجھے کہ آپ ﷺ نے اس جوڑے کو میرے پہننے کے لئے بھیجا ہے، کیوں کہ اگر اس کا پہننا جائز نہ ہوتا تو آپ ﷺ میرے پاس کیوں بھیجتے چنانچہ انہوں نے پہن لیا اور جہاں تک آنحضرت ﷺ کا تعلق ہے تو آپ ﷺ کے غصہ کا سبب یہ تھا کہ اس کپڑے میں اکثر حصہ یا سب کا سب ریشم تھا اس صورت میں حضرت علیؓ نے اس کو پہن کر ایک شرعی حکم کی خلاف ورزی کی، یا یہ کہ اگر اس میں ریشم کم مقدار میں تھا اور اس وجہ سے اگرچہ اس کا پہننا جائز تھا لیکن بہرحال حضرت علیؓ کی شان یہ نہیں تھی کہ وہ اس کو پہنتے اس لئے آپ ﷺ خفا ہوئے کہ انہوں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ یہ کپڑا متقی و پرہیز گار لوگوں کا لباس نہیں ہو سکتا۔

(۱۸) وَعَنْ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ لُبْسِ الْحَرِيْرِ اِلَّا هٰكَذَا وَرَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِصْبَعَيْهِ الْوُسْطٰى وَالسَّبَّابَةَ وَضَمَّهُمَا۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ اَنَّهٗ خَطَبَ بِالْجَابِيَةِ فَقَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ لُبْسِ الْحَرِيْرِ اِلَّا مَوْضِعَ اِصْبَعَيْنِ اَوْ ثَلَاثٍ اَوْ اَرْبَعٍ۔

"اور حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ریشم (کے کپڑے) پہننے سے منع فرمایا علاوہ اتنی (یعنی دو انگشت) مقدار کے اور آنحضرت ﷺ نے (یہ ممانعت بیان فرماتے ہوئے مذکورہ مقدار کو ظاہر کرنے کے لئے اپنی درمیانی انگلی اور شہادت کی انگلی کو اٹھایا اور دونوں کو ملایا یعنی آپ ﷺ نے ان دونوں انگلیوں کو ملا کر دکھایا اور بتایا کہ اس قدر یعنی دو انگشت کے بقدر ریشمی کپڑا لباس میں ہو تو مباح ہے) (بخاریؒ و مسلمؒ)

اور مسلمؒ کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے (ملک شام کے ایک شہر) جابیہ میں اپنے خطبہ کے دوران یہ فرمایا کہ رسول کریم ﷺ نے ریشمی کپڑا پہننے سے منع فرمایا ہے علاوہ بقدر دو یا تین اور یا چار انگل کے۔

تشریح: پہلی روایت سے مردوں کے لئے ریشمی کپڑے کی مباح مقدار دو انگشت معلوم ہوئی، اور دوسری روایت سے معلوم ہوا کہ چار انگشت تک کی مقدار مباح ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ اگر چار انگشت تک کے بقدر ریشمی کپڑا مردوں کے لباس میں استعمال ہو تو جائز ہے چنانچہ

اکثر علماء کا یہی قول ہے۔

آنحضرت ﷺ کا طیلسانی جبہ

(۱۹) وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِي بَكْرٍ اَنَّهَا اَخْرَجَتْ جُبَّةَ طَيَالِسَةٍ كِسْرَوَانِيَّةٍ لَهَا لِبْنَةُ دِيْبَاجٍ وَفُرْجَيْهَا مَكْفُوْفَيْنِ بِالدِّيْبَاجِ وَقَالَتْ هٰذِهٖ جُبَّةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ عِنْدَ عَائِشَةَ فَلَمَّا قُبِضَتْ قَبَضْتُهَا وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلْبَسُهَا وَنَحْنُ نَغْسِلُهَا لِلْمَرْضٰى نَسْتَشْفِيْ بِهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت اسماءؓ بنت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے طیلسان کا کسروانی جبہ نکالا، اس کے گریبان پر (سنجاف یعنی گوٹ کے طور پر) ریشمی کپڑے کا ٹکڑا سلا ہوا تھا اور اس کی دونوں کشادگیوں پر بھی ریشمی بیل ٹکی ہوئی تھی پھر انہوں نے فرمایا کہ یہ رسول کریم ﷺ کا جبہ ہے جو حضرت عائشہؓ کے پاس تھا اور جب ان کی وفات ہوئی تو (حضرت عائشہؓ کی میراث سے جو میری بہن تھیں) میرے قبضے میں آگیا رسول کریم ﷺ اس جبہ کو (کبھی کبھی) پہن لیا کرتے تھے، ہم اس کو بیماروں کے لئے دھوتے ہیں (یعنی اس کے دھوئے ہوئے پانی کو بیماروں کو پلاتے ہیں) اور اس کے ذریعہ شفا حاصل کرتے ہیں۔" (مسلم)

تشریح: "طیالس" اصل میں "طَیْلَسَان" کی جمع ہے اور طیلسان، ایک دوسری زبان کے لفظ "تالسان" کا معرب ہے جو ایک خاص قسم کی چادر کو کہتے ہیں، یہ چادر سیاہ رنگ کی ہوتی ہے اور صوف (اون) سے بنتی ہے پہلے زمانہ میں اس چادر کو عام طور پر یہودی لوگ اوڑھا کرتے تھے، یہاں حدیث میں جس جبہ (چغہ) کا ذکر کیا گیا ہے وہ اسی چادر کا بنایا گیا تھا، اور سیاہ رنگ کا مدور تھا چونکہ اس طرح کا جبہ فارس (ایران) کے بادشاہ خسرو کی طرف منسوب ہوتا تھا اور خسرو کا عربی لفظ کسریٰ یا بعض کے مطابق کِسریٰ ہے اس لئے اس جبہ کو کسروانی کہا گیا ہے۔

"دونوں کشادگیوں" سے مراد جبہ کے وہ دونوں کنارے ہیں جہاں سے جبہ کھلا ہوتا ہے اور جو ایک آگے اور ایک پیچھے ہوتا ہے جیسا کہ عام طور پر بعض جبوں کے آگے اور پیچھے دامن میں چاک کھلے ہوتے ہیں انہی دونوں چاکوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان پر جو سنجاف (گوٹ یا بیل) ٹکی ہوئی تھی وہ ریشم کی تھی۔

حضرت اسماءؓ نے اس جبہ کو اس لے نکالا تھا کہ لوگوں کو اس نعمت و برکت کا ان (اسماءؓ) کے پاس ہونا معلوم ہوا اور یہ ظاہر کرنا بھی مقصد تھا کہ اگر جبہ پر اس طرح کی ریشمی سنجاف ٹکی ہوئی ہو تو اس کو پہننا جائز ہے۔

واضح رہے کہ اس حدیث سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ریشمی سنجاف لگے ہوئے جبہ کو پہنا ہے، جب کہ اسی باب کی دوسری فصل میں حضرت عمران ابن حصین سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ "میں ایسا کرتا نہیں پہنتا جس پر ریشمی سنجاف ٹکا ہو۔" لہٰذا ان دونوں روایتوں میں بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے اس کو اس توجیہ کے ذریعہ دور کیا جائے گا کہ حضرت عمرانؓ کی روایت اس صورت پر محمول ہے جب کہ وہ ریشمی سنجاف چار انگشت سے زائد ہو اور یہاں جو روایت نقل کی گئی ہے یہ چار انگشت یا اس سے کم ریشمی سنجاف کے ٹکے ہوئے ہونے پر محمول ہے یا یہ کہ حضرت عمرانؓ کی روایت کا منشاء احتیاط و تقویٰ کی صورت کو بیان کرنا ہے اور حضرت اسماءؓ کی اس حدیث کا مقصد اصل جواز کو ظاہر کرنا ہے۔ اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ بعض اعتبار سے کرتے میں جبہ کی بہ نسبت زیادہ ٹھاٹ باٹ اور آسودگی کا اظہار ہوتا ہے (اس لئے آنحضرت ﷺ نے ریشمی سنجاف کے ٹکے ہوئے کرتے کو پہننا پسند نہیں فرمایا اور ریشمی سنجاف ٹکا ہوا جبہ پہنا۔

"اور اس کے ذریعہ شفا حاصل کرتے ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ یا تو اس کے دھوئے ہوئے پانی کو بیماروں کو پلاتے ہیں، جس سے ان کو شفا ملتی ہے یا اس شفایابی کے مقصد سے اس جبہ کو مریض کے سر پر اور آنکھوں پر رکھتے لگاتے ہیں اور یا اس جبہ کو ہاتھ سے چھو کر یا اس

کو بوسہ دے کر اس کی برکت سے شفا حاصل کرتے ہیں۔

کسی عذر کی بنا پر ریشمی کپڑا پہننا جائز ہے

(۲۰) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ رَخَّصَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِلزُّبَیْرِ وَعَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ فِیْ لُبْسِ الْحَرِیْرِ لِحِکَّۃٍ بِھِمَا مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ اِنَّھُمَا شَکَوَا الْقُمَّلَ فَرَخَّصَ لَھُمَا فِیْ قُمُصِ الْحَرِیْرِ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت زبیرؓ اور حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کو ریشمی کپڑا پہننے کی اجازت دے دی کیوں کہ ان کے خارش ہو گئی تھی (اور یہ خارش جوئیں پڑ جانے کی وجہ سے تھی جیسا کہ آگے کی روایت سے معلوم ہوگا) (بخاریؒ و مسلمؒ)

اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت انسؓ نے بیان کیا کہ ان دونوں (حضرت زبیرؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ) نے جوئیں پڑ جانے کی شکایت کی تو آنحضرت ﷺ نے ان کو ریشمی کپڑا پہننے کی اجازت دے دی۔"

تشریح: موجز میں لکھا ہے کہ ریشم اپنی اصل کے اعتبار سے گرم اور مفرح ہوتا ہے اور ریشمی کپڑا پہننے سے جوئیں ختم ہو جاتی ہیں۔

کسم کا رنگا ہوا کپڑا نہ پہنو

(۲۱) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرِو ابْنِ الْعَاصِ قَالَ رَاٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَیَّ ثَوْبَیْنِ مُعَصْفَرَیْنِ فَقَالَ اِنَّ ھٰذِہٖ مِنْ ثِیَابِ الْکُفَّارِ فَلَا تَلْبَسْھُمَا وَفِیْ رِوَایَۃٍ قُلْتُ اَغْسِلُھُمَا قَالَ بَلْ اَحْرِقْھُمَا رَوَاہُ مُسْلِمٌ وَسَنَذْکُرُ حَدِیْثَ عَائِشَۃَ خَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاتَ غَدَاۃٍ فِیْ بَابِ مَنَاقِبِ اَھْلِ بَیْتِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

"اور حضرت عبداللہؓ ابن عمروؓ ابن عاص کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ کو کسم کے رنگے ہوئے دو کپڑوں میں دیکھا تو فرمایا کہ۔ "یہ کافروں کا لباس ہے (کہ نہ وہ حلال و حرام میں تمیز کرتے ہیں اور نہ مرد و عورت کے لباس میں فرق کرتے ہیں) لہٰذا تم ان کو نہ پہنو۔" اور ایک روایت میں یوں ہے کہ میں نے عرض کیا کہ "کیا ان کو دھو ڈالوں؟" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "(نہیں) بلکہ ان کو جلا ڈالو۔" (مسلمؒ) اور حضرت عائشہؓ کی یہ روایت خرج النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذات غداۃ الخ انشاء اللہ ہم مناقب اہل بیت نبوی ﷺ کے باب میں نقل کریں گے۔"

تشریح: شارحینؒ نے لکھا ہے کہ جلا ڈالنے سے آنحضرت ﷺ کی مراد اس بات کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا تھا کہ ان کپڑوں کو کسی بھی صورت سے اپنی ملکیت اور اپنے قبضے سے نکال دو، خواہ اس کو کسی دوسرے کے ہاتھ بیچ دو، یا کسی کو ہبہ کر دو، غرضکہ جس طرح بھی ہو ان کو اپنے پاس سے جدا کر دو۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آپ ﷺ نے ان کپڑوں کو دھو ڈالنے کا حکم کیوں نہیں دیا تو اس کا سبب یہ تھا کہ کسم کا رنگا ہوا کپڑا اگرچہ مردوں کے لئے حرام و مکروہ ہے لیکن عورتوں کے لئے مکروہ نہیں ہے لہٰذا اس کو دھو ڈالنے کی صورت میں گویا اپنے مال کو ناقص کر دینا یا ضائع کر ڈالنا تھا اس لئے آپ ﷺ نے مذکورہ حکم کے ذریعہ اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ ان کپڑوں کو چاہے اپنی عورتوں کو دے دو، چاہے بیچ ڈالو، اور چاہے دوسروں کی عورتوں کو ہبہ کر دو کہ وہ ان کپڑوں سے فائدہ اٹھائیں۔

ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کو بہ نظر ظاہر یہ حکم دیا گیا اور انہوں نے ان کپڑوں کو جلا دیا۔ اور پھر جب اگلے دن وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس کے بارے میں عرض کیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے وہ کپڑے اپنی عورتوں کو کیوں نہیں پہنا دیئے کیونکہ ایسے کپڑوں کا پہننا عورتوں کے لئے درست ہے۔" اس روایت کی بنا پر شارحینؒ نے "جلا ڈالنے" کو اس کے ظاہری حکم کے خلاف پر محمول کیا ہے۔ اور بعض حضرات نے جو یہ کہا ہے کہ جلا ڈالنے کا حکم اصل میں اس بات کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا ہے کہ ان کپڑوں سے کسم کے رنگ کو ختم کر دیا جائے تو یہ قول روایت کے مفہوم سے بھی مطابقت نہیں رکھتا اور

روایت کے بھی خلاف ہے۔
واضح رہے کہ مردوں کو کسم کے رنگے ہوئے کپڑے پہننے کے بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، بعض علماء اس کو مطلق حرام کہتے ہیں، اور بعض حضرات مباح کہتے ہیں اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اگر کپڑے کو بننے کے بعد کسم میں رنگا گیا ہو تو اس کا پہننا حرام ہوگا اور اگر سوت کو رنگنے کے بعد اس کا کپڑا بنا گیا ہو تو اس کا پہننا مباح ہوگا، بعض یہ کہتے ہیں کہ اگر اس (کسم) کی بو زائل ہو گئی ہو تو مباح ہوگا ورنہ حرام، اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ کسم کے رنگے ہوئے کپڑوں کو مجلسوں وغیرہ میں پہننا تو مکروہ ہے، البتہ اگر گھر میں پہنا جائے تو درست ہے جہاں تک حنفیہ کا تعلق ہے تو ان کے مسلک میں مختار قول یہ ہے کہ کسم کا رنگا ہوا کپڑا پہننا مکروہ تحریمی ہے اور اس میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ کسم کے علاوہ دوسرے سرخ رنگ کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں، شیخ قاسم حنفیؒ نے جو مصر کے متاخرین علماء حنفیہ میں بہت بڑی حیثیت کے مالک گزرے ہیں، اور قسطلانیؒ کے استاد ہیں، فتویٰ دیا ہے کہ اصل حرمت رنگ کے سبب سے ہے، لہٰذا ہر سرخ رنگ مردوں کے لئے حرام و مکروہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

کُرتے کی فضیلت

(۲۲) عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ کَانَ اَحَبُّ الثِّيَابِ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقَمِيْصَ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ کو تمام کپڑوں میں کُرتا سب سے زیادہ پسند تھا۔" (ترمذیؒ ابوداؤدؒ)

تشریح: کُرتے کی پسندیدگی کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو اس کے پہننے سے جسم کے اعضاء اچھی طرح ڈھک جاتے ہیں اور دوسرے وہ بہت ہلکا اور جسم کے لئے آرام دہ ہوتا ہے، اور تیسرے یہ کہ کرتا پہننے سے آدمی متواضع و منکسر معلوم ہوتا ہے اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جو چیز آنحضرت ﷺ کو پسندیدہ و مرغوب رہی ہوگی اس میں یقیناً وہ اسرار و انوار ہوں گے جو اس کے علاوہ کسی چیز میں نہیں ہوں گے جیسا کہ تمام مستحبات کا حکم ہے۔

آنحضرت ﷺ کے کرتے اور اس کی آستینوں کی لمبائی

(۲۳) وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ کَانَ کُمُّ قَمِيْصِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَی الرُّصْغِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت اسماء بنت یزیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے کرتے کی آستینیں پہنچوں تک (بھی تھیں۔" ترمذیؒ، ابوداؤدؒ) ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: بعض روایتوں میں آنحضرت ﷺ کے کرتے کی آستینوں کا ہاتھ کی انگلیوں کے سر تک کی ہونا بھی منقول ہے، اسی طرح بعض روایتوں میں یہ بھی منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ کا کرتا لمبائی میں ٹخنوں سے اونچا تھا۔

کپڑے کو دائیں طرف سے پہننا شروع کیا جائے

(۲۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا لَبِسَ قَمِيْصًا بَدَأَ بِمَيَامِنِهٖ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب کرتا پہنتے تو دائیں طرف سے پہننا شروع کرتے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: میامن میمنہ کی جمع ہے جس کے معنی "دائیں جانب" کے ہیں، حدیث میں یہ لفظ جمع کے صیغہ کے ساتھ اس لئے لایا گیا ہے کہ

کرتے کی دائیں جانب کا تعلق آستین اور کرتے کے نیچے تک کی بھی دوسری چیزوں جیسے گلے وغیرہ سے ہے۔

تہبند و پائجامہ کا نصف ساق تک ہونا اولیٰ ہے

(۲۵) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِزْرَۃُ الْمُؤْمِنِ اِلٰی اَنْصَافِ سَاقَیْہِ لَا جُنَاحَ عَلَیْہِ فِیْمَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الْکَعْبَیْنِ وَمَا اَسْفَلَ مِنْ ذٰلِکَ فَفِی النَّارِ قَالَ ذٰلِکَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَلَا یَنْظُرُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِلٰی مَنْ جَرَّ اِزَارَہٗ بَطَرًا۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوسعید خدری ؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "ایک مؤمن کے تہبند و پائجامہ کی سب سے بہتر صورت تو یہ ہے کہ وہ آدھی پنڈلیوں تک ہو اور آدھی پنڈلیوں سے ٹخنوں تک (کے درمیان) ہونے میں (بھی) کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن اس (ٹخنے) سے نیچے جو حصہ (لٹکا ہوا) ہوگا وہ دوزخ کی آگ میں لے جائے گا۔ حضرت ابوسعید خدری ؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ الفاظ تین بار فرمائے۔ اور (پھر فرمایا کہ) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کو (رحمت و عنایت کی نظر سے) نہیں دیکھے گا جو غرور و تکبر سے اپنے تہبند و پائجامہ کو (ٹخنوں سے) نیچے لٹکائے گا۔" (ابوداؤد ؒ ترمذی ؒ)

اسبال ہر کپڑے میں ممنوع ہے

(۲۶) وَعَنْ سَالِمٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الْاِسْبَالُ فِی الْاِزَارِ وَالْقَمِیْصِ وَالْعِمَامَۃِ مَنْ جَرَّ مِنْہَا شَیْئًا خُیَلَاءَ لَمْ یَنْظُرِ اللّٰہُ اِلَیْہِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت سالم اپنے والد (یعنی حضرت عبداللہ ابن عمر ؓ سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اسبال یعنی لٹکانا، ازار، کُرتے اور عمامے میں ہے، جو شخص ان (کپڑوں) سے کچھ لٹکا کر غرور و تکبر سے کھینچے گا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف (بنظر کرم) نہیں دیکھے گا")۔ (ابوداؤد ؒ نسائی ؒ ابن ماجہ ؒ)

تشریح: اسبال یعنی کپڑے کو شرعی مقدار سے زائد لٹکانے کی جو حرمت و کراہت منقول ہے اس کا تعلق محض ازار یعنی تہبند و پائجامہ ہی سے نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں بلکہ کُرتے اور پگڑی میں کپڑے کا اسراف کرنا اور ان کو شرعی مقدار سے زائد لٹکانا حرام و مکروہ ہے، چنانچہ اس مسئلہ کی تفصیلی بحث پہلی فصل میں حضرت ابوہریرہ ؓ عنہ کی روایت کے تحت گزر چکی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے صحابہ ؓ کی ٹوپیاں

(۲۷) وَعَنْ اَبِیْ کَبْشَۃَ قَالَ کَانَ کِمَامُ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بُطْحًا رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ مُنْکَرٌ۔

"اور حضرت ابوکبشہ ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے صحابہ ؓ کی ٹوپیاں اس طرح کی ہوتی تھیں کی وہ سروں سے چپکی رہتی تھیں۔" ترمذی ؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔"

تشریح: اکثر شارحین ؒ نے کہا ہے کہ کمام اصل میں کمہ کی جمع ہے جیسے قبہ کی جمع قباب اور کمہ مدور یعنی گول ٹوپی کو کہتے ہیں۔ اور بطح بطحا کی جمع ہے جس کے معنی ہموار پتھریلی زمین کے ہیں، اس صورت میں حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ صحابہ کرام ؓ جو ٹوپیاں استعمال کرتے تھے وہ گول اور پھیلی ہوئی ہوتی تھیں کہ وہ سروں سے چپکی رہتی تھیں نہ کہ ہوا میں اوپر اٹھی ہوئی بلند و دراز، جیسے اس زمانہ میں ترکی اور ایرانی ٹوپیاں ہوتی ہیں۔

اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ "کمام" کمه کی جمع نہیں بلکہ "کم" کی جمع ہے جس کے معنی "آستین کے ہیں جیسے "قف" کی جمع "قفاف" (قف کے معنی بلند زمین کے ہیں) اس صورت میں "بطحا" کے معنی "فراخ و کشادہ" کے ہوں گے، کیونکہ بطحا یعنی ہموار پتھریلی زمین، کشادہ بھی ہوتی ہے، اس طرح حدیث کا مطلب یہ ہو جائے گا کہ "آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ اپنے کرتوں میں تنگ آستین نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے کرتوں کی آستینیں ایک بالشت کے بقدر چوڑی ہوتی تھیں۔

عورتیں اپنے لباس میں مردوں سے زائد کپڑا رکھ سکتی ہیں

(۲۸) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ ذَكَرَ الْإِزَارَ فَالْمَرْأَةُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ تُرْخِيْ شِبْرًا فَقَالَتْ إِذًا تَنْكَشِفُ عَنْهَا قَالَ فَذِرَاعًا لَا تَزِيْدُ عَلَيْهِ رَوَاهُ مَالِكٌ وَأَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَفِيْ رِوَايَةِ التِّرْمِذِيِّ وَالنَّسَائِيِّ عَنِ ابْنِ عُمَرَ فَقَالَتْ إِذًا تَنْكَشِفُ أَقْدَامُهُنَّ قَالَ فَيُرْخِيْنَ ذِرَاعًا لَا يَزِدْنَ عَلَيْهِ۔

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ سے روایت ہے کہ جس وقت رسول کریم ﷺ ازار بند (تہبند و پائجامہ) کا حکم بیان فرما رہے تھے (کہ اس کا لٹکانا ممنوع ہے) تو انہوں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! اور عورت (کے بارے میں کیا حکم ہے؟ یعنی اگر وہ اپنے ازار کو نیچا نہ رکھے تو اس کا ستر پوری طرح نہیں چھپے گا) آپ ﷺ نے فرمایا عورت اپنا تہبند یا پائجامہ (اپنی آدھی پنڈلیوں یا بعض کے قول کے مطابق اپنے ٹخنوں سے) ایک بالشت نیچا لٹکا سکتی ہے۔" حضرت اُمّ سلمہؓ نے عرض کیا کہ "اس صورت میں بھی کھلا رہے گا یعنی مثلاً اس کی پنڈلیاں زیادہ لمبی ہوں اور وہ اپنی آدھی پنڈلیوں سے ایک بالشت اور نیچے تک اپنا پائجامہ لٹکا لے تب بھی اس کا ستر کھلنے کا احتمال رہے گا۔" آپ ﷺ نے فرمایا" (اگر اس صورت میں بھی اس کا ستر کھلا رہے تو) وہ ایک گز اور نیچے لٹکا لے (گز سے شرعی گز یعنی ایک ہاتھ مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں وہ اپنے پائجامہ وغیرہ کو اتنا نیچے لٹکا سکتی ہے کہ وہ زمین تک پہنچ جائے تاکہ اس کے پیر چھپے رہیں اور وہ ایک بالشت کے بقدر زائد ہو یا ایک گز کے بقدر، اس کے بعد آپ ﷺ نے حد سے زیادہ لٹکانے کی ممانعت کو تاکیداً بیان کرنے کے لئے یہ فرمایا کہ) کوئی عورت اس ایک گز سے زیادہ نیچے نہ لٹکائے۔" (مالکؒ، ابوداؤدؒ، نسائی، ابن ماجہؒ) اور ترمذیؒ نسائی کی ایک روایت میں جو حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہے، یوں ہے کہ حضرت اُمّ سلمہؓ نے یہ کہا کہ اس صورت میں ان کے پیر کھلے رہیں گے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ "وہ ہاتھ بھر اور نیچے لٹکا لیں لیکن اس سے زائد نہ لٹکائیں۔"

آنحضرت ﷺ کے کُرتے میں گریبان کس جگہ تھا

(۲۹) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ قُرَّةَ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ رَهْطٍ مِنْ مُزَيْنَةَ فَبَايَعُوْهُ وَإِنَّهُ لَمُطْلَقُ الْإِزَارِ فَأَدْخَلْتُ يَدِيْ فِيْ جَيْبِ قَمِيْصِهِ فَمَسِسْتُ الْخَاتَمَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت معاویہ بن قرہؒ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ (ایک دن) میں مزینہ قوم کی ایک جماعت کے ساتھ (جو اسلام قبول کرنے آئی تھی) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا چنانچہ اس جماعت کے لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے (اسلام پر بیعت کی، اس وقت آنحضرت ﷺ (اپنے کرتے کی) گھنڈیاں کھولے ہوئے بیٹھے تھے، میں نے (موقع غنیمت جانا اور حصول برکت وسعادت کے لئے) اپنا ہاتھ آپ ﷺ کے کرتے کے گریبان میں ڈال کر مہر نبوت پر ہاتھ پھیر لیا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے کرتے کا گریبان سینہ مبارک پر تھا، چنانچہ اس پر بہت حدیثیں دلالت کرتی ہیں، اسی لئے شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ بعض لوگ جو علم سُنّت سے بے بہرہ ہیں یہ خیال رکھتے ہیں کرتے کا گریبان سینہ پر رکھنا بدعت ہے یہ قول قطعاً بے بنیاد اور بالکل باطل ہے۔

سفید کپڑے کی فضیلت

(۳۰) وَعَنْ سَمُرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِلْبَسُوا الثِّيَابَ الْبِيْضَ فَاِنَّهَا اَطْهَرُ وَاَطْيَبُ وَكَفِّنُوْا فِيْهَا مَوْتَاكُمْ۔ (رواہ احمد والترمذی والنسائی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت سمرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا سفید کپڑے پہنا کرو کیوں کہ سفید کپڑے بہت پاک اور زیادہ پاکیزہ و خوش تر ہوتے ہیں اسی طرح اپنے مردوں کو کفن بھی سفید کپڑوں کا دو۔" (ترمذیؒ ،نسائیؒ ،ابن ماجہؒ)

تشریح : سفید کپڑے کو بہت پاک تو اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ سفید کپڑا چونکہ جلد میلا ہو جاتا ہے اس لئے وہ بار بار اور بہت زیادہ دھویا جاتا ہے، اس کے برخلاف رنگین کپڑا چونکہ میل خور ہوتا ہے اس لئے وہ کافی عرصہ کے بعد ہی دھویا جاتا ہے! اور "زیادہ پاکیزہ" اس اعتبار سے ہوتا ہے کہ وہ دوسرے رنگوں میں مخلوط نہیں ہوتا، اسی طرح سفید کپڑے کو خوشتر اس سبب سے کہا گیا ہے کہ سلیم الطبع لوگ سفید ہی کپڑنے کی طرف زیادہ راغب ہوتے ہیں۔ البتہ ضرورت کی صورت اس سے خارج ہے۔ جیسے بعض صوفیاء نیلا اور یا کسی اور رنگ کے کپڑے کو اس ضرورت کی بناء پر اختیار کرتے ہیں کہ وہ سفید کپڑے کو بار بار دھوئے رہنے پر قادر نہیں ہوتے۔

جہاں تک کفن کا تعلق ہے تو واضح رہے کہ کفن میں سفید ہی کپڑا دینا افضل ہے کیوں کہ اس وقت مردہ گویا فرشتوں کی مجلس میں حاضر ہوتا ہے جیسے کہ سفید کپڑا پہننا اس شخص کے لئے افضل ہے جو مجلسوں اور محفلوں میں جانا چاہے، مثلاً جمعہ یا جماعت کے لئے مسجد میں، اور علماء و اولیاء اللہ کی ملاقات کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہو لیکن بعض حضرات نے کہا ہے کہ عید میں وہ کپڑا پہننا افضل ہے جو زیادہ قیمتی ہو تا کہ خدا کی عطا کی ہوئی نعمت کا زیادہ سے زیادہ اظہار ہو سکے چنانچہ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ عیدین اور جمعہ میں سرخ دھاریوں والی چادر اوڑھتے تھے۔

پگڑی کے شملہ کا مسئلہ

(۳۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اعْتَمَّ سَدَلَ عِمَامَتَهٗ بَيْنَ كَتِفَيْهِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب عمامہ باندھتے تو اس کا شملہ دونوں مونڈھوں کے درمیان ڈالتے۔ ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

(۳۲) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ عَمَّمَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَدَلَهَا بَيْنَ يَدَيَّ وَمِنْ خَلْفِيْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبدالرحمن ابن عوفؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے مجھ کو عمامہ بندھوایا تو اس کا شملہ میرے آگے اور میرے پیچھے (دونوں طرف) لٹکایا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح : یعنی آپ ﷺ پگڑی کے دونوں سروں کا شملہ چھوڑ کر ایک کو سینہ پر اور دوسرے کو پیٹھ پر لٹکایا۔

واضح رہے کہ عمامہ باندھنا سنت ہے اور اس کی فضیلت میں بہت زیادہ حدیثیں منقول ہیں، بلکہ ایک روایت میں جو اگرچہ ضعیف ہے یہاں تک منقول ہے کہ عمامہ باندھ کر پڑھی جانے والی دو رکعتیں بغیر عمامہ کے پڑھی جانے والی ستر رکعتوں سے افضل ہیں۔

نیز یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ عمامہ میں شملہ چھوڑنا افضل ہے لیکن دائمی طور پر نہیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ ﷺ کبھی تو شملہ چھوڑتے تھے اور کبھی نہیں چھوڑتے تھے، اسی طرح بعض دفعہ آپ ﷺ کے عمامہ کا شملہ آپ ﷺ کی

گردن سے نیچے تک لٹکا ہوتا تھا اور بعض دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ عمامہ کا ایک سرا عمامہ ہی میں اڑس دیتے تھے اور دوسرا چھوڑ دیتے تھے نیز آپ ﷺ کے عمامہ کا شملہ اکثر اوقات میں پیٹھ پر پڑا ہوتا تھا اور کبھی کبھی دائیں طرف بھی لٹکا لیتے تھے اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ عمامہ کے دونوں سروں کا شملہ چھوڑ کر دونوں کو دونوں مونڈھوں کے درمیان یعنی ایک کو سینہ پر اور دوسرے کو پیٹھ پر لٹکا لیتے تھے لیکن بائیں طرف لٹکانا چونکہ ثابت نہیں ہے اس لئے یہ بدعت ہے اور کنز میں لکھا ہے کہ شملہ کو مونڈھوں کے درمیان چھوڑنا مستحب ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے شملہ کی لمبائی کم سے کم ایک بالشت اور زیادہ سے زیادہ ہاتھ بھر ہونی چاہئے اس سے زائد لمبا شملہ چھوڑنا بدعت ہے اور اس حکم کی خلاف ورزی ہے جس کے ذریعہ اسبال و اسرف سے منع کیا گیا ہے چنانچہ مقررہ حد سے زائد لمبائی اگر غرور و تکبر کے طور پر ہوگی تو وہ حرام شمار ہوگی ورنہ مکروہ اور خلاف سنت! نیز محدثین نے یہ لکھا ہے کہ شملہ چھوڑنے کو صرف نماز کے وقت کے ساتھ مختص کرنا بھی سُنّت کے خلاف ہے۔

یہ ملحوظ رہے کہ شملہ چھوڑنا فقہی اعتبار سے مستحب ہے جس کا تعلق سنت زائدہ سے ہے سنت ہدی سے نہیں اس لئے اس (شملہ چھوڑنے) کے ترک میں کوئی گناہ یا برائی نہیں ہے اگرچہ اس کو اختیار کرنے میں ثواب و فضیلت ہے، جن حضرات نے شملہ چھوڑنے کو سنتِ مؤکدہ کہا ہے ان کا یہ قول تحقیق و روایت کے خلاف ہے۔

ٹوپی پر عمامہ باندھنا مسلمانوں کی امتیازی علامت ہے

(۳۳) وَعَنْ رُكَانَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَرْقُ مَابَيْنَنَا وَبَيْنَ الْمُشْرِكِيْنَ الْعَمَائِمُ عَلَى الْقَلَانِسِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَاِسْنَادُهُ لَيْسَ بِالْقَائِمِ۔

"اور حضرت رکانہؓ، نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "ہمارے اور مشرکوں کے درمیان (ایک) فرق یہ (بھی) ہے کہ ہم ٹوپیوں پر عمامہ باندھتے ہیں۔" "ترمذیؒ" نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی اسناد درست نہیں۔

تشریح: اس حدیث کو ابوداؤدؒ نے بھی روایت کیا ہے لیکن انہوں نے سکوت کیا ہے یعنی انہوں نے یہ نہیں کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد درست نہیں، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اس حدیث کی اسناد اصل کے اعتبار سے درست ہو یا دونوں (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ) کے نقل کرنے کی وجہ سے اس کو "درستی" حاصل ہو گئی ہو۔

بہر حال حدیث کی عبارت کے دو معنی محتمل ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ "ہم (مسلمان) تو ٹوپیوں پر عمامہ باندھتے ہیں جب کہ مشرک لوگ بغیر ٹوپیوں کے (یعنی ننگے سر پر) عمامہ باندھتے ہیں۔" اور دوسرے یہ کہ۔ "ہم ٹوپیوں پر عمامہ باندھتے ہیں جب کہ مشرک لوگ عمامہ باندھتے ہی نہیں صرف ٹوپی پہنتے ہیں۔" شارحین نے لکھا ہے کہ ان دونوں معنوں میں سے پہلے ہی معنی مراد ہیں کیونکہ اس زمانہ کے مشرکین کا عمامہ باندھنا تو تحقیق کے ساتھ معلوم ہے لیکن ان کا صرف ٹوپی پہننا ثابت نہیں ہے (اگرچہ ملا علی قاریؒ نے خدریؒ سے نقل کیا ہے کہ دوسرے معنی بھی مراد لئے جا سکتے ہیں نیز انہوں نے کہا ہے کہ بعض علماء کے قول کے مطابق سُنّت یہ ہے کہ ٹوپی اور عمامہ استعمال کیا جائے صرف ٹوپی پہننا مشرکین کی علامت ہے۔)

سونا اور ریشم عورتوں کے لئے حلال اور مردوں کے لئے حرام ہے

(۳۴) وَعَنْ اَبِيْ مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اُحِلَّ الذَّهَبُ وَالْحَرِيْرُ لِلْاِنَاثِ مِنْ اُمَّتِيْ وَحُرِّمَ عَلٰى ذُكُوْرِهَا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت ابوموسی اشعریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ میری اُمت کی عورتوں کے لئے سونا اور ریشم حلال کیا گیا ہے اور اُمت کے مردوں پر حرام کیا گیا ہے (ترمذیؒ، نسائیؒ) اور ترمذیؒ نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: "مرد" کے لفظ میں بچے (لڑکے) بھی داخل ہیں لیکن بچے چونکہ مکلف نہیں ہیں اس لئے ان کے حق میں ان چیزوں کی حرمت کا تعلق پہنانے والوں سے ہوگا کہ اگر کوئی بچہ ریشم یا سونے، کا زیور پہنے گا تو اس کا گناہ اس کے پہنانے والے پر ہوگا۔ نیز "سونے سے مراد سونے کے زیورات" ہیں ورنہ سونے چاندی کے برتن کا استعمال جس طرح مردوں کے لئے حرام ہے اسی طرح عورتوں کے لئے بھی حرام ہے، اسی طرح چاندی کے زیورات کا حلال ہونا بھی صرف عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے علاوہ اس مقدار کے جو مردوں کے لئے بھی حلال ہے جیسے انگوٹھی وغیرہ۔

نیا کپڑا پہنتے وقت کی دعا

(۳۵) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اسْتَجَدَّ ثَوْبًا سَمَّاہُ بِاسْمِہٖ عِمَامَۃً اَوْقَمِیْصًا اَوْرِدَآءً ثُمَّ یَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا کَسَوْتَنِیْہِ اَسْاَلُکَ خَیْرَہٗ وَخَیْرَ مَاصُنِعَ لَہٗ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّہٖ وَشَرِّ مَاصُنِعَ لَہٗ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کوئی نیا کپڑا پہنتے تو اس کا جو نام ہوتا یعنی پگڑی یا کرتا اور یا چادر، وہ نام لیتے اور پھر فرماتے۔ "اے اللہ تیرے ہی لئے تعریف ہے کہ تو نے مجھ کو یہ کپڑا پہنایا، اے اللہ میں تجھ سے اس کپڑے کی بھلائی کا طلب گر ہوں (کہ یہ کپڑا میرے بدن پر عافیت سے رہے اس کو کوئی نقصان نہ پہنچے) اور تجھ سے اس چیز کی بھلائی چاہتا ہوں جس کے لئے یہ کپڑا بنایا گیا ہے (یعنی یہ کہ میں یہ کپڑا پہن کر تیری اطاعت کروں) اور میں اس کپڑے کی برائی اور اس چیز کی برائی کی جس کے لئے یہ کپڑا بنایا گیا ہے تیری پناہ چاہتا ہوں (یعنی یہ کہ میں کپڑا پہن کر کوئی گناہ نہ کروں)۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "نیا کپڑا پہننے" کے بارے میں ابن حبانؒ خطیبؒ اور بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ جب کوئی نیا کپڑا پہننے کا ارادہ کرتے تو اس کو جمعہ کے دن زیب تن فرماتے۔

"اس کا جو نام ہوتا الخ" یعنی آپ ﷺ اس کپڑے کا نام لیتے خواہ کپڑا عمامہ ہوتا یا کرتا یا چادر اور یا کوئی اور لباس، چنانچہ مذکورہ جملہ میں لفظ "ثوب" سے عمومیت مراد ہے اور خاص طور پر جن کپڑوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ محض تمثیل کے طور پر ہیں۔

"وہ نام لیتے" یعنی اگر مثلاً آپ ﷺ کرتا پہنتے تو اس طرح فرماتے کہ رزقنی اللہ۔ یا۔ اعطانی اللہ۔ یا۔ کسانی اللہ ھذا القمیص اور پھر اس کے بعد مذکورہ دعا پڑھتے۔

(۳۶) وَعَنْ مُعَاذِبْنِ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَکَلَ طَعَامًا ثُمَّ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ ھٰذَا الطَّعَامَ وَرَزَقَنِیْہِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّۃٍ غُفِرَلَہٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَزَادَ اَبُوْدَاوُدَ وَمَنْ لَبِسَ ثَوْبًا فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَسَانِیْ ھٰذَا وَرَزَقَنِیْہِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّۃٍ غُفِرَلَہٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ وَمَاتَاَخَّرَ۔

"اور حضرت معاذ ابن انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص کھانا کھائے اور پھر یہ کہے یعنی یہ دعا پڑھے۔" تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھ کو یہ کھانا کھلایا اور کھانا بغیر میرے کسی حیلہ اور بغیر میری کسی قوت (کے اثر کے) مجھ تک پہنچایا" تو اس کے تمام پہلے (صغیرہ) گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔" (ترمذیؒ) اور ابوداؤدؒ نے اپنی روایت میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ جو شخص کپڑا پہنے اور پھر یہ کہے۔ "تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھ کو یہ کپڑا پہنایا اور یہ کپڑا بغیر میرے کسی حیلہ اور بغیر میری کسی قوت (کے اثر کے) مجھ تک پہنچایا۔" تو اس کے تمام اگلے پچھلے (صغیرہ) گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔"

پرانے کپڑے کو ضائع مت کرو

(۳۷) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا عَائِشَةُ اِنْ اَرَدْتِ اللُّحُوْقَ بِیْ فَلْیَکْفِكِ مِنَ الدُّنْیَا کَزَادِ الرَّاکِبِ وَاِیَّاكِ وَمُجَالَسَةَ الْاَغْنِیَاءِ وَلَا تَسْتَخْلِقِیْ ثَوْبًا حَتّٰی تُرَقِّعِیْهِ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ لَا نَعْرِفُهُ اِلَّا مِنْ حَدِیْثِ صَالِحِ بْنِ حَسَّانٍ وَقَالَ مُحَمَّدُ بْنُ اِسْمَاعِیْلَ صَالِحُ بْنُ حَسَّانٍ مُنْکَرُ الْحَدِیْثِ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا۔ "عائشہؓ! اگر تم (دنیا و آخرت دونوں جگہ مجھ سے (کامل) اتصال و وابستگی چاہتی ہو تو دنیا کی صرف اتنی ہی چیزوں پر اکتفا کرو جو سوار کے زاد راہ کے برابر ہو، اور دولت مندوں کی ہم نشینی اختیار کرنے سے اجتناب کرو، نیز کپڑے کو اس وقت تک پرانا سمجھ کر نہ پھینکو جب تک کہ تم اس کو پیوند (لگا کر پہننے) کے قابل سمجھو۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور یہ حدیث ہم تک صالح ابن حسان کی روایت کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے نہیں پہنچی ہے جب کہ محمد بن اسماعیل (یعنی امام بخاریؒ) نے کہا ہے صالح ابن حسان منکر الحدیث ہیں (یعنی ان کی روایت منکر ہے)۔"

تشریح: "جو سوار کے زاد راہ کے برابر ہو۔" اس ارشاد گرامی ﷺ کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے اس بات کی ترغیب دی ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ دنیا کی صرف اتنی ہی چیزوں پر قناعت کرے جو اس کی زندگی اور مقصد حیات کے لئے ضروری ہوں۔ اس جملہ میں "سوار" کی تخصیص شاید اس لئے ہے کہ وہ اپنا راستہ تیز گامی سے طے کرتا ہے اور منزل پر جلد پہنچتا ہے جس کی وجہ سے اس کو تھوڑا سا بھی زاد راہ کافی ہو جاتا ہے اس کے برخلاف پیادہ کو چونکہ سفر میں دیر لگتی ہے اس لئے اس کو زاد راہ بھی زیادہ لینا پڑتا ہے

دولت مندوں کی ہمنشینی سے بچنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ دنیا دار دولت مندوں کی صحبت و مجالست دنیا اور دنیا کی لذات کے تئیں محبت و خواہشات میں زیادتی اور لہو و لعب میں مشغولیت کا باعث بنتی ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ الآیہ ایک روایت میں منقول ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "مردوں کی ہمنشینی سے اجتناب کرو۔" عرض کیا گیا کہ "یا رسول اللہ ﷺ! وہ کون لوگ ہیں (جن کو مردہ فرمایا جا رہا ہے، اور جن کی ہمنشینی سے بچنے کی تلقین فرمائی جا رہی ہے۔)" آپ ﷺ نے فرمایا۔ "(دنیا دار) دولت مند۔"

"جب تک کہ تم اس کو پیوند کے قابل سمجھو۔" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کپڑا پرانا و بوسیدہ ہو جائے یا وہ پھٹ جائے تو اس سے بے اعتنائی نہ برتو اور اس کو ضائع نہ کرو بلکہ اس کو ٹھیک ٹھاک کر کے اور اس میں پیوند لگا کر کم سے کم ایک بار اور استعمال کر لو۔ اس ارشاد کے ذریعہ گویا اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ اگر اپنے پاس پھٹے پرانے کپڑے ہوں تو (زہد و قناعت کا تقاضا یہ ہے کہ سر پوشی کے لئے انہی پر اکتفا کیا جائے، چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنی خلافت کے زمانہ میں (جب کہ ان کو دنیا کے ایک عظیم ترین حکمران کی حیثیت حاصل تھی) ایک دن اسی حالت میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ انہوں نے جو تہبند باندھ رکھا تھا اس میں بارہ پیوند لگے ہوئے تھے۔

(۳۸) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اِیَاسِ بْنِ ثَعْلَبَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا تَسْمَعُوْنَ اَلَا تَسْمَعُوْنَ اَنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الْاِیْمَانِ اَنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الْاِیْمَانِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوامامہؓ ابن ایاس ابن ثعلبہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "کیا تم سن نہیں رہے ہو، کیا تم سن نہیں رہے (یعنی اے لوگو! کان لگا کر سنو!) کپڑے کی بوسیدگی و کہنگی (یعنی لباس کی سادگی) کو اختیار کرنا اور دنیا کی زیب و زینت کو ترک کرنا، حسن ایمان کی علامت ہے، کپڑے کی بوسیدگی و کہنگی کو اختیار کرنا اور دنیا کی زیب و زینت کو ترک کرنا حسن ایمان کی علامت ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ لباس کے معاملہ میں زیادہ تکلف و اہتمام سے کام لینا، عورتوں کی طرح اپنے آپ کو سنوارنا، اور ہر وقت زیب

وزینت کا خیال رکھنا مسلمان مرد کے شایان شان نہیں ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے اچھے کپڑے پہننے کی استطاعت عطا کی ہے تو بیشک اپنے لباس میں شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے عمدگی و نفاست کا لحاظ رکھنا اور جائز طریقے سے اچھے کپڑے پہننا کوئی معیوب نہیں ہے، لیکن کبھی کبھی پرانا کپڑا بھی پیوند لگا کر پہن لینا بہتر ہے۔ حاصل یہ کہ لباس میں تواضع وانکسار اختیار کرنا اور دنیاوی زیب وزینت سے بچنا اہل ایمان کی اچھی عادتوں میں سے ہے اور حسن ایمان کی علامت ہے کیونکہ آخرت اور آخرت کی زینتوں پر ایمان لانا ہی اس زہد وقناعت کا باعث ہوتا ہے۔

اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے اعلی لباس پہننا اخروی ذلت کا باعث ہے

(۳۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ فِي الدُّنْيَا اَلْبَسَهُ اللّٰهُ ثَوْبَ مَذَلَّةٍ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (رواہ احمد و ابوداؤد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ "جو شخص دنیا میں شہرت کا کپڑا پہنے گا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو ذلت کا کپڑا پہنائے گا۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی عزت طلبی اور اپنی بڑائی کے اظہار کی غرض سے اعلی ونفیس لباس پہنے یعنی اس کا مقصد یہ ہو کہ لوگ میرے جسم پر اعلی لباس دیکھ کر میری عزت کریں اور مجھے شہرت وبڑائی ملے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ذلیل وحقیر کپڑا پہنائے گا، یعنی اس کو اس کپڑے کے ذریعہ ذلیل وبے عزت کرے گا اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے دنیا میں ایسا لباس پہنے گا جس سے تواضع اور بے نفسی ظاہر ہوتی ہو (یعنی جس کو دنیادار لوگ ذلیل وحقیر لباس سمجھتے ہوں اس کو اللہ تعالیٰ عقبی میں عزت وعظمت کا لباس پہنائے گا۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ شہرت کے کپڑے سے مراد وہ حرام کپڑے ہیں کہ جن کا پہننا مباح نہیں ہے بعض نے یہ کہا ہے کہ وہ کپڑا مراد ہے جو فقراء ومساکین کو ذلیل وخوار رکھنے اور ان کی دل شکستگی کی غرض سے ازراہ غرور وتکبر پہنے، بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ کپڑا مراد ہے جو ازراہ تمسخر ومذاق یعنی لوگوں کو ہنسانے کے لئے پہنے، یا وہ کپڑا مراد ہے جو اپنے زہد وپارسائی کے اظہار کے لئے پہنے اسی طرح بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ حدیث میں دراصل "اعمال" کو کپڑے سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی مراد یہ ہے کہ جو شخص ازراہ ریا یعنی محض دکھانے سنانے کے لئے اچھے اعمال کرے تاکہ ان کی وجہ سے دنیا والوں کی نظر میں اس کو شہرت وعزت حاصل ہو تو قیامت کے دن اس کے حشر یہ ہوگا! بہر حال حدیث کے سیاق کو دیکھتے ہوئے یہ بات بلاشک کہی جاسکتی ہے کہ وہی مراد و مطلب زیادہ صحیح ہے جس کو پہلے بیان کیا گیا ہے۔

تشبہ بقوم کا ذکر

(۴۰) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا اس کا شمار اسی قوم میں ہوگا۔"

(احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص جس قوم وجماعت کی مشابہت اختیار کرے گا اس کو اسی قوم وجماعت جیسی خیر ومعصیت ملے گی مثلاً اگر کوئی شخص اپنے لباس واطوار وغیرہ کے ذریعہ کسی غیر مسلم قوم یا فساق وفجار کی مشابہت اختیار کرے گا تو اس کے نامہ اعمال میں وہی گناہ لکھے جائیں گے جو اس غیر مسلم قوم کے لوگوں یا فساق وفجار کو ملتا ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے آپ کو علماء ومشائخ اور اولیا اللہ کے

نمونے پر ڈھالے گا کہ انہی جیسا لباس پہنے گا، انہی جیسے اطوار اختیار کرے گا اور انہی جیسے اعمال کرے گا تو وہ بھلائی وسعادت کے اعتبار سے انہی کے زمرہ میں شمار ہوگا۔ اس ارشاد گرامی کے الفاظ بہت جامع وہمہ گیر ہیں جن کے دائرے میں بہت سی باتیں اور بہت سی چیزیں آجاتی ہیں یعنی مشابہت کا مفہوم عمومیت کا حامل ہے کہ مشابہت خواہ اخلاق واطوار میں ہو، یا افعال وکردار میں ہو، اور خواہ لباس وطرز رہائش میں ہو اور یا کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، رہنے سہنے اور بولنے چالنے میں ہو سب کا یہی حکم ہے۔

ترک زیب وزینت آخرت میں بڑائی ملنے کا ذریعہ ہے

(۴۱) وَعَنْ سُوَيْدِ بْنِ وَهْبٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ اَبْنَاءِ اَصْحٰبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَكَ لُبْسَ ثَوْبِ جَمَالٍ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ تَوَاضُعًا كَسَاهُ اللّٰهُ حُلَّةَ الْكَرَامَةِ وَمَنْ تَزَوَّجَ لِلّٰهِ تَوَّجَهُ اللّٰهُ تَاجَ الْمُلْكِ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ مِنْهُ عَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسٍ حَدِيْثَ اللِّبَاسِ۔

"اور حضرت سوید ابن وہب، نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی کے بیٹے سے، اور وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص زیب وزینت کے لباس کو پہننا چھوڑ دے باوجودیکہ وہ اس کے پہننے کی استطاعت وحیثیت رکھتا ہو۔ اور ایک روایت میں تواضعا کا لفظ بھی آیا ہے یعنی جو شخص زہد تواضع اور کسر نفسی کے سبب زیب وزینت کا لباس پہننا چھوڑ دے اس کو اللہ تعالیٰ عزت وعظمت کا جوڑا پہنائے گا یعنی اللہ تعالیٰ اس کو جنت کا لباس عطا کرے گا جو اس کی رفعت وعظمت کا باعث ہوگا، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو دنیا وآخرت دونوں جگہ عزت وعظمت عطا کرے گا جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص فروتنی اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو بلند مرتبہ بناتا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے نکاح کرے اس کو اللہ تعالیٰ بادشاہت کا تاج عطا فرمائے۔ (ابوداؤدؒ) اور ترمذیؒ نے اس روایت کا صرف وہ حصہ جس میں لباس کا ذکر ہے حضرت معاذ ابن انسؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: حدیث کے پہلے جز کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اعلیٰ ونفیس کپڑے اور زینت وآرائش کا لباس پہننے کی حیثیت رکھتا ہو لیکن اس کے باوجود یا تو اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے، یا آخرت میں بلند مرتبہ پانے کی تمنا میں اور یا دنیا کی زینت وآرائش کے بے وقعت وحقیر جان کر اعلیٰ لباس پہننا چھوڑ دے تو اس کو اللہ تعالیٰ دنیا وآخرت میں عزت وعظمت کی دولت سے نوازے گا۔

"اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے نکاح کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی ایسی عورت سے نکاح کرے جو نہ تو کفو اور عزت میں اس کے برابر اور نہ دولت وثروت میں اس کی برابری رکھتی ہو اور اس شخص نے اس عورت سے محض اس لئے نکاح کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا خوشنودی چاہتا تھا یا وہ اپنے نفس کو بدکاریوں کے، فتنہ سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا، اور اس کا مقصد دین کی محافظت اور طلب وبقا نسل تھا۔

"اس کو اللہ تعالیٰ بادشاہت کا تاج عطا فرمائے گا" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اس عمل پر اس کو جنت میں بادشاہی عزت وعظمت کا تاج پہنائے گا یا یہ جملہ "عزت وتوقیر" سے کنایہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس کو دنیا وآخرت میں عزت وتوقیر عطا فرمائے گا۔

روایت کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو معاذ ابن انسؓ سے نقل کیا ہو اور صرف وہ حصہ نقل کیا ہے جس میں لباس کا ذکر ہے، حدیث کا دوسرا جز کہ جس میں نکاح کا ذکر ہے انہوں نے نقل نہیں کیا۔

حق تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کا اظہار ایک مطلوب عمل ہے

(۴۲) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يُّرٰى اَثَرَ نِعْمَتِهٖ عَلٰى عَبْدِهٖ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ اس کی نعمت کا اثر اس کے بندے پر دیکھا جائے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو مادی نعمت عطا کرے تو چاہئے کہ وہ اس کو ظاہر کرے مثلاً وہ اپنی حیثیت کے مطابق اور مبالغہ و اسراف کی حد تک جائے بغیر اچھے کپڑے پہنے، لیکن اس کو خوش پوشاکی کسی غرور و تکبر اور اتراہٹ کے جذبہ سے نہیں ہونی چاہئے بلکہ شکر گزاری کی نیت سے ہونی چاہئے تاکہ فقراء محتاج، زکوۃ صدقات لینے کے لئے اس کی طرف رجوع کریں، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت کو چھپانا اچھا نہیں ہے بلکہ کفران نعمت کا موجب ہے اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کسی بندے کو روحانی نعمت جیسے علم و فضل کی دولت اور بزرگی و شخصیت عطا فرمائے تو اس کو چاہئے کہ وہ لوگوں کے سامنے اس نعمت کا اظہار کرے تاکہ لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ اوپر کی حدیث میں تو ترک زینت کی طرف راغب کیا گیا ہے۔ اور اس حدیث میں خوش پوشاکی کے ذریعہ گویا زیب و زینت اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے اس صورت میں ان دونوں حدیثوں کے درمیان جو ظاہری تضاد محسوس ہوتا ہے، اس کے دفعیہ کے لئے کیا توجیہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ اوپر کی حدیث کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ خوش پوشاکی کی حیثیت و استطاعت نہ ہو، چنانچہ اس صورت میں "ترک زینت کی طرف راغب کیا گیا ہے تاکہ اگر کسی شخص کو کسی موقع پر خوش پوشاکی کی ضرورت بھی لاحق ہو اور وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اس مقصد کی تکمیل کے لئے غیر موزوں تکلیف و اہتمام کرکے اور ناروا زحمت برداشت کرکے اچھے کپڑے حاصل کرنے کی سعی نہ کرے، بلکہ صبر و استقامت کی راہ اختیار کرکے ترک زینت" ہی پر عامل رہے اس کے برخلاف جو شخص عمدہ پوشاک پہننے اور لباس کی نفاست و لطافت کو اختیار کرنے کی استطاعت رکھتا ہو اور وہ اس کے باوجود "ترک زینت" ہی کو اپنا معمول بنا کر پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کپڑے پر قناعت کئے رہے تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کیوں کہ اس کی یہ عادت اصل میں بخل و خست پر محمول ہوگی۔

جسم و لباس کی درستگی اور صفائی ستھرائی پسندیدہ چیز ہے

(۴۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَتَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَائِدًا فَرَاٰى رَجُلًا شَعِثًا قَدْ تَفَرَّقَ شَعْرُهُ فَقَالَ مَا كَانَ يَجِدُ هٰذَا مَا يُسَكِّنُ بِهٖ رَاْسَهٗ وَرَاٰى رَجُلًا عَلَيْهِ ثِيَابٌ وَسِخَةٌ فَقَالَ مَا كَانَ يَجِدُ هٰذَا مَا يَغْسِلُ بِهٖ ثَوْبَهٗ۔ (رواہ احمد والنسائی)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ ملاقات کی غرض سے ہمارے پاس تشریف لائے تو وہاں آپ ﷺ نے ایک پراگندہ بال شخص کو دیکھا جس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا اس شخص کو وہ چیز یعنی کنگھی وغیرہ میسر نہیں ہے جس کے ذریعہ یہ اپنے بالوں کو درست کر سکے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے بدن پر میلے کچیلے کپڑے تھے تو فرمایا کہ کیا اس شخص کو وہ چیز یعنی صابون یا پانی میسر نہیں ہے جس سے یہ اپنے کپڑوں کو دھو ڈالے!۔" (احمدؒ، نسائیؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جسم کی درستی و نفاست اور لباس کی صفائی و ستھرائی آنحضرت ﷺ کے نزدیک پسندیدہ تھی اور اس کا برعکس ناپسندیدہ و مکروہ کیونکہ یہ چیزیں تہذیب و شائستگی کی علامت بھی ہیں اور اسلام کی روح پاکیزگی کے عین مطابق بھی۔ لہٰذا اس ارشاد گرامی البذاذة من الایمان (یعنی لباس کی سادگی اور ترک زینت حسن ایمان کی علامت ہے) کی مراد چونکہ موٹے چھوٹے کپڑے پر قناعت کرنا ہے اس لئے یہ بات نہ تو مذکورہ بالا روایت کے منافی ہے اور نہ اس نظافت و پاکیزگی کے خلاف ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اِنَّهَا مِنَ الدِّيْنِ (یعنی وہ نظافت و پاکیزگی) دین کا ایک جزء ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ نے مال و دولت عطا کی ہے تو اس کو اپنی پوشاک سے ظاہر کرو

(۴۴) وَعَنْ اَبِی الْاَحْوَصِ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ اَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَیَّ ثَوْبٌ دُوْنٌ فَقَالَ لِیْ اَلَكَ مَالٌ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ مِنْ اَیِّ الْمَالِ قُلْتُ مِنْ كُلِّ الْمَالِ قَدْ اَعْطَانِیَ اللّٰهُ مِنَ الْاِبِلِ وَالْبَقَرِ وَالْغَنَمِ وَالْخَیْلِ وَالرَّقِیْقِ قَالَ فَاِذَا

اَتَاكَ اللّٰهُ مَالاً فَلْيُرَ اَثَرُ نِعْمَةِ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَكَرَامَتِهٖ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالنَّسَائِیُّ وَفِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ بِلَفْظِ الْمَصَابِيْحِ۔

"اور حضرت ابوالاحوص اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں ایک دن رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایسی حالت میں حاضر ہوا کہ میرے بدن پر خراب وخستہ کپڑے تھے آپ ﷺ نے یہ دیکھ کر مجھ سے فرمایا کہ کیا تمہارے پاس مال ہے؟ میں نے عرض کیا ہر قسم کا مال ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے اونٹ گائیں اور بکریاں بھی عطا کی ہیں اور گھوڑا اور غلام بھی دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اتنا زیادہ مال دیا ہے تو اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمت کا اثر ظاہر ہو اور تمہیں اللہ نے جس عزت و عظمت سے نوازا ہے وہ عیاں ہو۔ (نسائی) اور شرح السنۃ نے اس روایت کو مصابیح کی روایت سے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے عبادت تو دونوں کی مختلف ہے لیکن دونوں کا مضمون ایک ہی ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اتنا کچھ دیا ہے اور تم اچھا لباس پہن سکتے ہو تو پھر تم اچھے کپڑے زیب تن کرو تا کہ لوگ جانیں کہ تم مال دار ہو اللہ کی نعمت کا اظہار کرنے کے لئے خوش پوشاکی اچھے، صاف ستھرے اور نئے کپڑے پہننے سے حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ وہ کپڑے اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق ہوں اور یہ کہ وہ تو اتنے باریک اور مہین ہوں جس کی ممانعت منقول ہے اور نہ اتنے زیادہ نفیس و عمدہ ہوں جس سے بیجا شان و شوکت کا اظہار ہو اسی طرح وہ کپڑے اوپر تلے یعنی ایک لباس کے اوپر دوسرا لباس نہ پہنا گیا ہو۔ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ لباس کے تئیں دونوں شہرتوں سے منع فرماتے تھے یعنی باریک کپڑے سے بھی اور موٹے کپڑے سے بھی اور سخت کپڑے سے بھی اور لمبے کپڑے سے بھی اور چھوٹے کپڑے سے بھی، الّا یہ کہ وہ کپڑا درمیانی درجہ کا ہو۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ کپڑے کی کہنگی یعنی کپڑے کا پرانا ہونا اور اس میں پیوند لگا ہوا ہونا ایک پسندیدہ محمود چیز ہے اور افعال ایمان میں سے ہے بشرطیکہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے دنیا میں زہد و فقر اور تواضع و انکسار اختیار کرنے کے مخلصانہ جذبہ سے ہو، اور اگر حیثیت و استطاعت کے باوجود یہ (یعنی کپڑے کا پرانا وخستہ و پیوند لگا ہوا ہونا) بخل وخست کی بنا پر ہو گا تو اس کو قبیح و مذموم کہیں گے۔

مردوں کے لئے سرخ کپڑا پہننا حرام ہے

(۲۵) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ مَرَّ رَجُلٌ وَعَلَيْهِ ثَوْبَانِ اَحْمَرَانِ فَسَلَّمَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن ایک شخص دو سرخ کپڑے پہنے ہوئے گزرا اور نبی کریم ﷺ کو سلام کیا آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: یہ حدیث صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مرد کو سرخ کپڑا پہننا حرام ہے نیز یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ جو شخص کسی ممنوع چیز کا مرتکب ہو اور وہ سلام کرے تو وہ سلام کا جواب دیئے جانے اور تکریم و توقیر کئے جانے کا مستحق نہیں ہے! جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے ریشمی کپڑے پر بیٹھنا بھی صاحبینؒ اور تینوں اماموں کے نزدیک مکروہ ہے لیکن حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک جائز ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک مکروہ ہے۔

خوشبو کا مسئلہ

(۲۶) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا اَرْكَبُ الْاُرْجُوَانَ وَلَا اَلْبَسُ الْمُعَصْفَرَ وَلَا اَلْبَسُ الْقَمِيْصَ الْمُكَفَّفَ بِالْحَرِيْرِ وَقَالَ اَلَا وَطِيْبُ الرِّجَالِ رِيْحٌ لَا لَوْنَ لَهٗ وَطِيْبُ النِّسَاءِ لَوْنٌ لَا رِيْحَ لَهٗ۔ (ابوداؤد)

"اور حضرت عمران ابن حصین سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ میں ارغوانی یعنی سرخ رنگ کے ازین پوش پر سوار نہیں ہوتا نہ میں کسم کا رنگا ہوا کپڑا پہنتا ہوں اور نہ میں ایسا پیرہن (کرتا وغیرہ) پہنتا ہوں جس پر ریشمی سنجاف (یعنی ریشمی گوٹ وبیل وغیرہ) لگی ہوئی ہو۔ اور پھر فرمایا یاد رکھو! مرد جو خوشبو لگائیں وہ ایسی ہونی چاہئے جس میں مہک تو ہو رنگ نہ ہو جیسے گلاب اور عطر وغیرہ تاکہ رنگ دار خوشبو لگانے سے کپڑے رنگین نہ ہو جائیں، اور عورتیں جو خوشبو لگائیں وہ ایسی ہونی چاہئے جس میں رنگ تو ہو مہک نہ ہو جیسے زعفران و مہندی وغیرہ تاکہ ان کی مہک باہر نکل کر مردوں کے لئے فتنہ و ابتلاء کا سبب نہ بن جائے۔" (ابوداؤد)

تشریح: "اُرْجُوَانْ" (الف وجیم کے پیش اور راء کے سکون کے ساتھ) کے معنی ہیں سرخ رنگ کی ریشمی زین پوش مطلب یہ ہے کہ میں سواری کے کسی ایسے جانور پر نہیں بیٹھتا جس کی زین (پالان) کے اوپر سرخ ریشمی کپڑا پڑا ہو اور نہایہ میں یہ لکھا ہے کہ ارجوان اصل میں ارغوان کا معرب ہے اور ارغوان اس درخت کو کہتے ہیں جس کا پھول سرخ رنگ کا ہوتا ہے اور جو رنگ اس پھول کے رنگ کے مشابہ ہوتا ہے جیسے نارنجی اس کو بھی ارجوان کہتے ہیں۔ اور قاموس میں یہ لکھا ہے کہ ارجوان سرخ رنگ کو کہتے ہیں، بہر حال ملا علی قاری کے مطابق حدیث میں ارجوان سے مراد سرخ رنگ کا کپڑا ہے خواہ وہ ریشمی اور ہو یا غیر ریشمی اور گویا یہ ارشاد گرامی اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس حکم کو زیادہ سے زیادہ تاکید کے ساتھ واضح کر رہا ہے کہ مردوں کو سرخ رنگ کا لباس پہننے سے اجتناب کرنا چاہئے، کیونکہ اگرچہ سوار ہونے پر پہننے کا اطلاق نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود آنحضرت ﷺ جب سرخ رنگ کے زین پوش پر سوار ہونے سے اجتناب کرتے تھے تو سرخ رنگ کا کپڑا پہننے سے تو آپ ﷺ بطریق اولیٰ اجتناب کرتے ہوں گے۔

اور نہ میں ایسا پیرہن پہنتا ہوں........ کا مطلب یہ ہے کہ میں ایسا کرتا یا جبہ وغیرہ نہیں پہنتا جس میں ریشمی سنجاف چار انگشت سے زیادہ ہو یا یہ کہ یہ ارشاد گرامی تقویٰ اور احتیاط پر محمول ہے۔

"جس میں رنگ تو ہو مہک نہ ہو۔" کا مطب یہ ہے کہ عورت کو اپنے گھر سے باہر نکلتے وقت ایسی کوئی چیز استعمال کرنی درست نہیں ہے جس میں مہک اور خوشبو ہو ہاں...... گھر کے اندر رہتے ہوئے اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ حدیث میں خوشبو کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا ظاہری اسلوب بیان "خبر" کا ہے لیکن معنی میں امر یعنی حکم کے ہے جس کا مطلب یہ ہے جیسا کہ ترجمہ میں بھی واضح کیا گیا ہے کہ مرد جو خوشبو استعمال کریں اس میں رنگ کی آمیزش نہ ہونی چاہئے، اس کے برخلاف عورت جو خوشبو استعمال کرے اس میں مہک نہ ہونی چاہئے، اسی طرح شمائل ترمذی کی ایک روایت میں یوں ہے کہ مردوں کی خوشبو ایسی چیز ہونی چاہئے جس سے مہک تو نکلتی ہو لیکن اس کا رنگ ظاہر نہ ہو اور عورتوں کی خوشبو ایسی چیز ہونی چاہئے جس کا رنگ تو ظاہر ہو لیکن اس سے مہک نہ نکلتی ہو۔ اس روایت کا مطلب بھی وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے کہ عورت گھر سے باہر نکلتے وقت کوئی ایسی چیز استعمال نہ کرے جس کی مہک پھیلتی ہو کیونکہ اگر یہ مطلب نہیں لیا جائے تو عبارت کا مفہوم اس لئے غیر واضح ہو جائے گا کہ کوئی بھی "خوشبو" بغیر مہک کے نہیں ہو سکتی اس صورت میں اس کی طرف "مہک" کی نسبت غیر ضروری اور بے فائدہ ہو گی اور اگر یہ کہا جائے کہ کچھ خوشبوئیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں بالکل مہک نہیں ہوتی اور عورتوں کے لئے ایسی ہی خوشبوؤں کا استعمال جائز کیا گیا ہے تو یہ بات بالکل غیر حقیقی اور غیر صحیح ہو گی۔

دس باتوں کی ممانعت

(۴۷) وَعَنْ اَبِیْ رَیْحَانَةَ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْ عَشْرٍ عَنِ الْوَشْرِ وَالْوَشْمِ وَالنَّتْفِ وَعَنْ مُکَامَعَةِ الرَّجُلِ الرَّجُلَ بِغَیْرِ شِعَارٍ وَمُکَامَعَةِ الْمَرْاَةِ الْمَرْاَةَ بِغَیْرِ شِعَارٍ وَاَنْ یَجْعَلَ الرَّجُلُ فِیْ اَسْفَلِ ثِیَابِهٖ حَرِیْرًا مِثْلَ الْاَعَاجِمِ اَوْ یَجْعَلَ عَلٰی مَنْکِبَیْهِ حَرِیْرًا مِثْلَ الْاَعَاجِمِ وَعَنِ النُّهْبٰی وَعَنْ رُکُوْبِ النُّمُوْرِ وَلُبُوْسِ الْخَاتَمِ اِلَّا لِذِیْ سُلْطَانٍ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابوریحانہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے دس باتوں سے منع فرمایا ہے دانتوں کو تیز کرنے سے، جسم کے کسی حصہ کو گودنے سے، بال اکھاڑنے سے، مرد کو مرد کے ساتھ سونے سے اگر درمیان میں کپڑا حائل نہ ہو، اور آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ مرد اپنے کپڑے کے نیچے ریشم (کا استر) لگائے جیسا کہ عجمی لوگ لگاتے ہیں یا عجمی لوگوں کی طرح مونڈھوں پر ریشمی کپڑا لگائے اور آپ ﷺ نے کسی کا مال لوٹنے سے اور چیتے کی زین پر سونے سے منع فرمایا نیز آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص مہر والی انگوٹھی پہنے الا یہ کہ وہ صاحب حکومت ہو۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: عرب میں یہ دستور تھا کہ بوڑھی عورتیں، جوان عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے اپنے دانت کے کناروں کو تیز اور باریک کیا کرتی تھیں لہٰذا آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ اسی طرح ایک رواج یہ بھی تھا کہ عورتیں اپنے جسم کے بعض حصوں کو سوئی سے گود کر اس میں نیل یا سرمہ بھر دیتی تھیں (جیسا کہ ہمارے یہاں بھی بعض غیر مسلم میں یہ دستور ہے کہ جسم کے کسی حصہ خاص طور سے ہاتھ پر نام وغیرہ گودتے ہیں) آپ ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا۔ بال اکھاڑنے سے منع فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ آرائش وزینت کی خاطر داڑھی اور سر کے سفید بال چننا ممنوع ہے یا یہ کہ عورتوں کا اپنے چہرہ یعنی پیشانی کے بال چننا ممنوع ہے۔ ان چیزوں کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اول تو ان سے اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تغیر کرنا لازم آتا ہے دوسرے یہ چیزیں آرائش وزینت کے لئے بے جا اور برے قسم کے تکلفات کا مرتکب ہونے کا باعث ہیں اگرچہ زیب وزینت اختیار کرنا عورتوں کے لئے جائز ہے مگر اس طرح کے مذموم تکلفات ان کے لئے بھی ممنوع ہیں۔ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں "بال اکھاڑنے" سے مراد یہ ہے کہ کسی حادثہ و مصیبت کے وقت شدت جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے سر اور داڑھی کے بال نوچنا ممنوع ہے۔

"مرد کا مرد کے ساتھ سونے ...... الخ" کا مطلب حدیث کے ظاہری مفہوم کے مطابق تو یہی ہے کہ دو مرد ایک کپڑے (یعنی ایک چادر ولحاف وغیرہ میں) اس طرح سوئیں کہ دونوں بالکل ننگے ہوں، یا ان کے صرف ستر ڈھکے ہوئے ہوں تو یہ بالکل ممنوع ہے یا یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس ممانعت کا تعلق صرف اس صورت سے ہو جب کہ دونوں کے ستر بھی ڈھکے ہوئے نہ ہوں، یہی دونوں احتمال عورتوں کے بارے میں بھی ہیں! اگر وہ عورتوں کا باہم اس طرح سونا کسی فتنہ وشر انگیزی کا خوف رکھتا ہو تو اس صورت میں بالکل صاف بات یہ ہے کہ یہ قطعا ممنوع ہوگا اور اگر کسی فتنہ وشر انگیزی کا خوف نہ ہو تب بھی یہ صورت تہذیب وشائستگی اور ادب واخلاق کے منافی اور بے حیائی وبے شرمی کی غماز تو بہر حال ہو ہی گی۔

مرد اپنے کپڑے کے نیچے ریشم کا استر لگائے کا مطلب یہ ہے کہ ریشم کا کپڑا پہننا مرد کے لئے قطعا حرام ہے خواہ وہ کپڑا ایسے لباس کی صورت میں کیوں نہ ہو کہ اس کے اوپر کا حصہ سوتی اور اس کا استر ریشمی ہو یا اس کے اوپر کا حصہ تو ریشمی ہو اور اس کا استر سوتی ہو چنانچہ صحیح قول یہی ہے۔

"مونڈھوں پر ریشمی کپڑا لگانے" کا مطلب یہ ہے کہ کرتے یا جبہ وغیرہ کے مونڈھوں پر بطور سنجاف (بیل) ریشمی کپڑا لگانا یا ریشم کا کام کرنا ایسی صورت میں جائز ہے جب کہ اس کی مقدار چار انگشت تک ہو، چار انگشت سے زائد کی صورت میں ممنوع ہوگا، نیز ہو سکتا ہے کہ اس جملہ سے یہ مراد ہو کہ کاندھوں پر دوپٹے کی طرح ازراہ تکبر واتراہٹ ریشمی کپڑا ڈالنا ممنوع ہے۔

چیتے کی کھال کی زین پر سوار ہونے سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ اس میں متکبرین کی مشابہت ہے۔ بعض مشائخ نے کہا ہے کہ چوپایوں اور درندوں کی کھال پر بیٹھنے سے ان چوپایوں و درندوں کی خاصیتیں جیسے وحشت و درندگی وغیرہ سرایت کر جاتی ہیں۔

"الا یہ کہ وہ صاحب حکومت ہو۔" یعنی جیسے بادشاہ، قاضی اور حاکم وغیرہ۔ حاصل یہ کہ مہر والی انگوٹھی کو بلا ضرورت کے محض زینت کی خاطر پہننا مکروہ تنزیہی ہے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہ حکم منسوخ ہے بایں دلیل کہ حضرت عمرؓ اور دوسرے خلفاء کے زمانہ میں صحابہؓ مہر والی انگوٹھی پہنا کرتے تھے اور کوئی اس کو خلاف نہیں کہتا تھا۔

مردوں کے لئے سونے کی انگوٹھی اور ریشمی کپڑا حرام ہے

(۴۸) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ نَهَانِي رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ خَاتَمِ الذَّهَبِ وَعَنْ لُبْسِ الْقَسِّيِّ وَالْمَيَاثِرِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَفِي رِوَايَةٍ لِاَبِيْ دَاوُدَ قَالَ نَهٰى عَنْ مَيَاثِرِ الْاُرْجُوَانِ۔

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ کو سونے کی انگوٹھی اور قسی کے پہننے سے اور میاثر استعمال کرنے سے منع فرمایا۔ (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ) اور ابوداؤد کی ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت علیؓ نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے ارغوانی یعنی سرخ میاثر استعمال کرنے سے منع فرمایا۔"

تشریح: مردوں کو سونے کی انگوٹھی پہننا چاروں اماموں کے نزدیک حرام ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بعض صحابہؓ جیسے حضرت طلحہؓ حضرت سعدؓ اور حضرت صہیبؓ کے بارے میں یہ منقول ہے کہ انہوں نے سونے کی انگوٹھی پہنی تھی تو اس کا تعلق اس زمانہ سے ہے جب کہ یہ حرمت نافذ نہیں ہوئی تھی۔

"قسی" اصل میں اس کپڑے کو کہا جاتا تھا جو مصر کے ایک شہر "قس" میں تیار ہوتا تھا۔ اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "قسی" ایک خاص قسم کے کپڑے کو کہا جاتا تھا جس میں ریشمی دھاریاں ہوتی تھیں، اس صورت میں اس ممانعت کا تعلق احتیاط و تقویٰ کی بناء پر نہی تنزیہی سے ہوگا۔ اور حضرت ابن مالکؒ نے کہا ہے کہ مذکورہ ممانعت کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ وہ کپڑا یا تو پوری طرح کا ریشم کا ہو یا اس کے بانے میں ریشم ہو اس صورت میں یہ ممانعت نہی تحریمی کے طور پر ہوگی اور طیبیؒ نے یہ کہا ہے کہ "قسی" جس کپڑے کو کہتے تھے وہ کتان کا ہوتا تھا جس میں ریشم بھی مخلوط ہوتا تھا۔

"میاثر" مثیر کی جمع ہے جو "سرخ رنگ کے زین پوش" کو کہتے ہیں اور وہ عام طور پر ریشمی ہوتا تھا چنانچہ اس ممانعت کا تعلق بھی اس صورت سے ہوگا جب کہ وہ ریشمی ہو، تاہم یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس ممانعت کا تعلق اس کے سوتی ہونے کی صورت سے بھی ہو اس صورت میں یہ ممانعت اسکے بیجا قسم کی شان و شوکت اور اتراہٹ و تکبر میں مبتلا لوگوں کی مشابہت کے مظہر ہونے کی وجہ سے نہی تنزیہی کے طور پر ہوگی۔

خز اور چیتے کی کھال کے زین پوش پر سوار ہونے کی ممانعت

(۴۹) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَرْكَبُوا الْخَزَّ وَلَا النِّمَارَ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ تم لوگ خز اور چیتے کی کھال کے زین پوش پر سوار نہ ہوا کرو۔"

(ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: "خز" پچھلے زمانہ میں اس کپڑے کو کہتے تھے جو اون اور ریشم ملا کر بنا جاتا تھا اور ایک طرح کے خالص ریشمی کپڑے کو بھی خز کہتے ہیں، چنانچہ اگر "خز" سے وہ کپڑا مراد ہو جس میں اون اور ریشم دونوں ہوتے تھے تو ان عجمیوں کی مشابہت کی بنیاد پر جو ازراہ تکبر خز کو زین پر ڈالتے تھے یہ ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہوگی کیونکہ اس خز کا پہننا مباح ہے، چنانچہ صحابہؓ اور تابعینؒ اس کو پہنا کرتے تھے۔ اور اگر خز سے مراد خالص ریشمی کپڑا ہو تب یہ ممانعت نہی تحریمی یعنی حرمت کے طور پر ہوگی۔ واضح رہے کہ ایک دوسری روایت میں جو آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی منقول ہے کہ آخر زمانہ میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے جو خز اور حریر (ریشمی لباس) کو حلال جانیں گے تو اس میں "خز" سے وہی خالص ریشمی کپڑا مراد ہے۔ چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ زمانہ نبوت میں اس کپڑے (یعنی وہ خز جو خالص ریشم کا ہوتا ہے) کا وجود نہیں تھا اس صورت میں یہ ارشاد گرامی آپ ﷺ کے معجزہ پر محمول ہوگا کہ آپ ﷺ نے ایک ایسے کپڑے کے بارے میں آگاہ کیا جو بہت بعد

کے زمانہ میں وجود پزیر ہونے والا تھا۔

سرخ زین پوش کی ممانعت

(۵۰) وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی عَنِ الْمِیْثَرَۃِ الْحَمْرَاءِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"حضرت براء ابن عازب ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سرخ زین پوش سے منع فرمایا ہے۔" (شرح السنۃ)

آنحضرت ﷺ کے بالوں کی سفیدی

(۵۱) وَعَنْ اَبِیْ رِمْثَۃَ التَّیْمِیِّ قَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَعَلَیْہِ ثَوْبَانِ اَخْضَرَانِ وَلَہٗ شَعْرٌ قَدْ عَلَاہُ الشَّیْبُ وَشَیْبُہٗ اَحْمَرُ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ، وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِاَبِیْ دَاوٗدَ وَھُوَ ذُوْ وَفْرَۃٍ وَبِھَا رَدْعٌ مِنْ حِنَّاءٍ۔

"اور حضرت ابو رمثہ تیمی ؓ کہتے ہیں کہ جب میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ ﷺ کے بدن پر دو سبز کپڑے تھے یعنی آپ ﷺ نے جو دو کپڑے پہن رکھے تھے وہ یا تو خالص سبز رنگ کے تھے یا ان میں سبز رنگ کی دھاریاں تھیں اور آنحضرت ﷺ کے سر اور داڑھی کے تھوڑے ہی بالوں پر بڑھاپے (یعنی سفیدی) کا غلبہ تھا، نیز آپ کا بڑھاپا سرخ تھا۔ (ترمذی ؒ) اور ابوداؤد ؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ وفرہ والے تھے اور ان (بالوں) میں مہندی کا رنگ تھا۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ کے سفید بالوں کی مقدار کے بارے میں مختلف روایتیں منقول ہیں، چنانچہ ایک روایت میں حضرت انس ؓ کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کے سر اور داڑھی کے سفید بالوں کو گنا تو وہ چودہ سے زیادہ نہیں تھے۔ حضرت ابن عمر ؓ کی روایت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ پر بڑھاپے کا اثر تقریباً بیس سفید بالوں سے زیادہ نہیں تھا، اس طرح ایک روایت میں سترہ کی تعداد آئی ہے۔

"وفرہ" اصل میں سر کے ان بالوں کو کہتے ہیں جو کانوں کی لو تک ہوں لہٰذا آنحضرت ﷺ وفرہ والے تھے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے سر کے بال کان کی لو تک تھے۔

آپ ﷺ کا بڑھاپا سرخ تھا کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے جو چند بال ان پر آپ ﷺ مہدی کا خضاب کئے ہوئے تھے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ سرخ بڑھاپے سے مراد یہ ہے کہ وہ چند بال بھی بالکل سفید نہیں تھے بلکہ مائل بہ سرخی تھے جیسا کہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جب بال سفید ہونے لگتے ہیں تو وہ پہلے بھورے ہوتے ہیں اور پھر سفید ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک آنحضرت ﷺ کے خضاب کرنے کا تعلق ہے تو اس بارے میں محدثین اور فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خضاب کیا ہے یا نہیں؟ چنانچہ اکثر محدثین یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے خضاب نہیں کیا ہے اور نہ آپ ؐ کا بڑھاپا سفید بالوں کی اس حد تک پہنچا تھا کہ آپ ﷺ کو خضاب کرنے کی کوئی ضرورت محسوس ہوتی جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے پھر آپ ﷺ کے جو چند بال سفید تھے ان کی بھی صورت یہ تھی کہ اگر آپ ﷺ سر کو تیل لگاتے تو ان بالوں کی سفیدی ظاہر نہیں ہوتی تھی اور جب سر بغیر تیل کے ہوتا تو وہ سفید بال ظاہر رہتے! اس کے برخلاف فقہاء اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپ ﷺ خضاب لگاتے تھے اس کی تفصیل فقہی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ محدثین اس حدیث کے بارے میں جو اوپر نقل ہوئی ہے یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے زیادہ سے زیادہ یہی مفہوم ہوتا ہے کہ جو چند بال سفید تھے آپ ﷺ صرف انہی پر خضاب کرتے تھے، لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ آپ ﷺ ان بالوں پر بھی قصداً خضاب نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ آنحضرت ﷺ اپنے بالوں کو دھونے اور ان کو صاف کرنے کے لئے کبھی کبھی سر میں مہندی ڈال لیا کرتے تھے اسی کی وجہ سے وہ سفید بال رنگین ہو جاتے تھے۔ ایک روایت میں جو یہ منقول ہے کہ حضرت انس ؓ کے پاس آنحضرت ﷺ کا جو موئے مبارک تھا وہ (دیکھنے والوں کو) ایسا نظر آتا تھا جیسے اس پر مہدی

کا خضاب کیا گیا ہو تو اس کے بارے میں محدثین یہ کہتے ہیں کہ بیشک اس بال پر خضاب کا اثر تھا لیکن وہ خضاب آنحضرت ﷺ نے نہیں کیا تھا بلکہ اس کی حقیقت یہ تھی کہ حضرت انسؓ چونکہ ادب و تعظیم و تبرک کے طور پر اس بال کو خوشبوؤں میں ڈال کر رکھتے تھے اس لئے وہ ان خوشبوؤں کے رنگ کے اثر سے خضاب کے مشابہ نظر آتا تھا یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود حضرت انسؓ نے اس بال کی حفاظت و مضبوطی کے لئے اس پر خضاب کر دیا ہو۔ اسی طرح بعض روایت میں جو یہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ کبھی سرخ خضاب کرتے تھے اور کبھی زرد، تو اس کی حقیقت بھی یہ ہے کہ آپ ﷺ اپنی ریش مبارک کو صفائی و ستھرائی کے لئے مہدی کے ساتھ دھوتے تھے اور کبھی زعفران کے ساتھ چنانچہ ریش مبارک کے بال جو بذات خود سیاہ تھے اس طرح دھوئے جانے کی وجہ سے رنگین ہو جاتے تھے۔

قطری چادر کا ذکر

(۵۲) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَاكِيًا فَخَرَجَ يَتَوَكَّأُ عَلٰى اُسَامَةَ وَعَلَيْهِ ثَوْبُ قِطْرٍ قَدْ تَوَشَّحَ بِهٖ فَصَلّٰى بِهِمْ۔ (رواه فی شرح السنة)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی بیماری کے زمانہ میں اس حالت میں باہر (مسجد میں) تشریف لائے کہ اسامہؓ پر سہارا دیئے ہوئے تھے اور بدن مبارک پر قطر کا کپڑا تھا جس کو آپ ﷺ نے بدھی کی طرح لپیٹ رکھا تھا اور پھر آپ ﷺ نے صحابہؓ کو نماز پڑھائی۔" (شرح السنة)

تشریح: "قطر" ایک قسم کی چادر کو کہتے ہیں جس میں سرخ رنگ کی دھاریاں ہوتی ہیں اور اس کا کپڑا کچھ کھرا کھرا ہوتا ہے بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ جس کپڑے کا ذکر کیا گیا ہے وہ "قطر" کا تھا جو بحرین کے علاقہ میں ایک بستی کا نام ہے اسی مناسبت سے اس کپڑے کو "قطری" کہا گیا ہے۔ حضرت انسؓ نے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے یہ اس وقت کا ہے جب آپ ﷺ مرض الموت میں مبتلا تھے چنانچہ حضرت ﷺ کی آخری نماز تھی جو آپ ﷺ نے صحابہؓ کے ساتھ مسجد نبوی میں ادا کی روایت میں منقول ہے کہ اس وقت حضرت ابوبکرؓ صحابہؓ کو نماز پڑھانا شروع کر چکے تھے کہ آنحضرت ﷺ مرض اور نقاہت کی وجہ سے حضرت اسامہؓ کا سہارا لئے ہوئے حجرہ مبارک سے نکل کر مسجد میں تشریف لائے اور حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں بیٹھ گئے اور نماز پڑھائی، چنانچہ اس واقعہ کی پوری تفصیل کتاب الصلوۃ کے باب الامامت میں گزر چکی ہے۔

ایک یہودی کی شقاوت کا ذکر

(۵۳) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَوْبَانِ قِطْرِيَّانِ غَلِيْظَانِ وَكَانَ اِذَا قَعَدَ فَعَرِقَ ثَقُلَا عَلَيْهِ فَقَدِمَ بَزٌّ مِنَ الشَّامِ لِفُلَانٍ الْيَهُوْدِيِّ فَقُلْتُ لَوْ بَعَثْتَ اِلَيْهِ فَاشْتَرَيْتَ مِنْهُ ثَوْبَيْنِ اِلَى الْمَيْسَرَةِ فَاَرْسَلَ اِلَيْهِ فَقَالَ قَدْ عَلِمْتُ مَا تُرِيْدُ اِنَّمَا تُرِيْدُ اَنْ تَذْهَبَ بِمَالِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَذَبَ قَدْ عَلِمَ اَنِّيْ مِنْ اَتْقَاهُمْ وَآدَاهُمْ لِلْاَمَانَةِ۔ (رواه الترمذی والنسائی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک زمانہ میں نبی کریم ﷺ کے جسم مبارک پر جو "دو کپڑے تھے وہ قطر کے تھے" اور بہت زیادہ موٹے تھے چنانچہ جب آپ ﷺ زیادہ دیر تک بیٹھتے اور پسینہ آتا تو وہ کپڑے آپ ﷺ کے بدن پر بھاری ہو جاتے جس کی وجہ سے آپ ﷺ کو تکلیف اٹھانی پڑتی آخر کار ایک دن جب کہ فلاں یہودی کے ہاں جس کا نام یہاں ذکر نہیں کیا گیا ہے شام سے کپڑا آیا ہوا تھا تو میں نے عرض کیا کہ اگر آپ ﷺ کسی شخص کو اس یہودی کے پاس بھیج دیتے جو اس سے بوعدہ فراغت یعنی اس وعدہ پر کہ جب کہیں سے کچھ آجائے گا تو قیمت ادا کر دی جائے گی دو کپڑے خرید لیتا تو اچھا ہوتا تاکہ آپ ﷺ اس تکلیف سے بچ جائیں جو ان کپڑوں کی وجہ سے

اٹھانا پڑ رہی ہے آنحضرت ﷺ نے میرے اس مشورہ کو قبول فرمالیا اور کسی شخص کو مذکورہ وعدہ پر کپڑا خریدنے کے لئے اس یہودی کے پاس بھیج دیا اس شخص نے یہودی کے پاس پہنچ کر جب کپڑا مانگا تو اس نے کہا کہ تمہارا جو ارادہ ہے اس کو میں جانتا ہوں تم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتے کہ اس وقت تو وعدہ پر میرا کپڑا لے جاؤ اور پھر بعد میں قیمت ادا کرنے سے انکار کر دو بظاہر ان الفاظ کا مخاطب وہ شخص تھا، لیکن حقیقت میں اس کا خطاب آنحضرت ﷺ سے تھا، پھر اس شخص نے واپس آکر جب آنحضرت ﷺ سے یہودی کا قول نقل کیا تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس یہودی نے جھوٹ بولا ہے، اور وہ خود بھی جانتا ہے کہ اس نے بالکل جھوٹ بات اپنی زبان سے نکالی ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ (تورات کے ذریعہ) یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں تمام لوگوں سے زیادہ متقی و پرہیز گار ہوں اور ان سے زیادہ اچھی طرح امانت ادا کرنے والا ہوں۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے موٹا کپڑا پہنا لیکن جب اس کپڑے کی وجہ سے آپ ﷺ کو تکلیف ہوئی تو آپ ﷺ نے اپنی راحت اور آسودگی کی خاطر دوسرے کپڑے قرض خریدنے کا ارادہ فرمایا اسی طرح اس حدیث سے اس یہودی کی شقاوت بھی ظاہر ہوئی کہ وہ آنحضرت ﷺ کے تئیں کس قدر بغض و نفرت کا شکار تھا۔

مرد کو کسم کا رنگا ہوا کپڑا پہننا ممنوع ہے

(۵۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ رَاٰنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَیَّ ثَوْبٌ مَصْبُوْغٌ بِعُصْفُرٍ مُوَرَّدًا فَقَالَ مَاهٰذَا فَعَرَفْتُ مَاكَرِهَ فَانْطَلَقْتُ فَاَحْرَقْتُهٗ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَاصَنَعْتَ بِثَوْبِكَ قُلْتُ اَحْرَقْتُهٗ قَالَ اَفَلَا كَسَوْتَهٗ بَعْضَ اَهْلِكَ فَاِنَّهٗ لَا بَاْسَ بِهٖ لِلنِّسَاءِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ بن عمرو ابن عاصؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے مجھ کو کسم کا رنگا ہوا گلابی رنگ کا کپڑا پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ میں اس ارشاد گرامی سے سمجھ گیا کہ آپ ﷺ نے میرے اس کپڑے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے چنانچہ میں فوراً گیا اور اپنے اس کپڑے کو جلا ڈالا، پھر جب میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو) آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ تم نے اپنے اس کپڑے کا کیا کیا؟ میں نے عرض کیا کہ میں نے اس کو جلا ڈالا، آپ ﷺ نے فرمایا تم نے اس کپڑے کو اپنی کسی عورت کو کیوں نہیں پہنا دیا کیونکہ عورتوں کے لئے اس قسم کے کپڑے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" (ابوداؤدؒ)

سرخ دھاری دار چادر کا ذکر

(۵۵) وَعَنْ هِلَالِ بْنِ عَامِرٍ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ رَاَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِمِنًی یَخْطُبُ عَلٰی بَغْلَةٍ وَعَلَیْهِ بُرْدٌ اَحْمَرُ وَعَلِیٌّ اَمَامَهٗ یُعَبِّرُ عَنْهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت بلال ابن عامر اپنے والد سے نقل کرتے ہیں، کہ انہوں نے کہا، میں نے رسول کریم ﷺ کو منیٰ میں خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے دیکھا اس وقت آپ ﷺ خچر پر سوار تھے اور جسم مبارک پر سرخ (ادھاریوں کی) چادر تھی، نیز حضرت علیؓ آپ ﷺ کے سامنے کھڑے تھے جو آپ ﷺ کے الفاظ لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: چونکہ اس موقع پر لوگوں کا بہت زیادہ ہجوم تھا اور آنحضرت ﷺ کی آواز مبارک مجمع میں دور والوں تک نہیں پہنچ رہی تھی اس لئے حضرت علیؓ آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کے الفاظ بلند آواز میں دوہرا کر لوگوں کو سمجھاتے جاتے تھے۔

سیاہ چادر کا ذکر

(۵۶) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ صُنِعَتْ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بُرْدَةٌ سَوْدَاءُ فَلَبِسَهَا فَلَمَّا عَرِقَ فِیْهَا وَجَدَ رِیْحَ

الصُّوْفِ فَقَذَفَهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے لئے سیاہ چادر تیار کی گئی جس کو آپ ﷺ نے استعمال فرمایا لیکن جب اس کی وجہ سے پسینہ آیا اور اس میں سے اون کی بو نکلنے لگی تو آپ ﷺ نے الطافت طبع کی ناگواری کی بنا پر اس چادر کو پھینک دیا!۔" (ابوداؤدؒ)

آنحضرت ﷺ کے گوٹ مار کر بیٹھنے کا ذکر

(۵۷) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ مُحْتَبٍ بِشَمْلَۃٍ قَدْ وَقَعَ ھُدْبُھَا عَلٰی قَدَمَیْہِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ ﷺ ایک چادر کے ذریعہ گوٹ مارے ہوئے بیٹھے تھے اور اس چادر کے کنارے آپ ﷺ کے قدموں پر پڑے ہوئے تھے!۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: گوٹ مار کر بیٹھنا اس نشست کو کہتے ہیں جس میں کولھے زمین پر ٹیک کو دونوں گھٹنے کھڑے کر لیتے ہیں اور سہارے کے لئے دونوں ہاتھ یا کوئی کپڑا گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر لیتے ہیں۔

عورتیں باریک کپڑا کس طرح پہنیں

(۵۸) وَعَنْ دِحْیَۃَ بْنِ خَلِیْفَۃَ قَالَ اُتِیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِقَبَاطِیَّ فَاَعْطَانِیْ مِنْھَا قُبْطِیَّۃً فَقَالَ اُصْدَعْھَا صَدْعَیْنِ فَاَقْطَعْ اَحَدَھُمَا قَمِیْصًا وَاَعْطِ الْاٰخَرَ اِمْرَاَتَکَ تَخْتَمِرُبِہٖ فَلَمَّا اَدْبَرَ قَالَ وَاْمُرِ امْرَاَتَکَ اَنْ تَجْعَلَ تَحْتَہٗ ثَوْبًا لَا یَصِفُھَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت دحیہ ابن خلیفہؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ کے پاس قبطی کپڑے آئے تو آپ ﷺ نے اس میں سے ایک قبطی کپڑا مجھ کو عطا کیا اور فرمایا کہ اس کو پھاڑ کو دو ٹکڑے کر لینا، ان میں سے ایک کا کرتہ بنا لینا اور دوسرا اپنی عورت کو دے دینا وہ اس کا دوپٹہ بنا لے گی۔ پھر جب دحیہؓ یعنی میں واپس ہونے لگا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اور اپنی عورت کو ہدایت کر دینا کہ اس قبطی کپڑے کے نیچے ایک اور کپڑا لگا لے تاکہ اس کپڑے کے باریک ہونے کی وجہ سے اس کے بال اور جسم نظر نہ آئے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "قباطی" اصل میں "قبطیہ" کی جمع ہے، قبطیہ ایک خاص قسم کے کپڑے کو کہتے ہیں جو سفید اور مہین ہوتا تھا اور مصر میں بنا کرتا تھا، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر عورت کوئی ایسا کپڑا پہننا چاہے جس کے نیچے بدن جھلکتا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ خالی وہی کپڑا نہ پہنے بلکہ کپڑے کے نیچے کوئی اور کپڑا لگا لے تاکہ اس کا بدن نہ جھلکے۔

دوپٹہ کا سر پر ایک ہی پیچ ڈالنا کافی ہے

(۵۹) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلَیْھَا وَھِیَ تَخْتَمِرُ فَقَالَ لَیَّۃً لَا لَیَّتَیْنِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت اُمّ سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے تو وہ اس وقت دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ دوپٹہ کا ایک ہی پیچ سر پر ڈال لیتیں دوسرے پیچ کی ضرورت نہیں تھی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ تھا کہ دوپٹہ کا سر پر اور گلے کے نیچے ایک ہی پھیر ڈالا کرو دو پھیر نہ دو تاکہ اسراف لازم نہ آئے اور مردوں کے عمامہ کی مشابہت بھی نہ ہو اور یہ بھی محتمل ہے بلکہ یہی زیادہ صحیح ہے کہ یہاں پیچ سے مراد سر پر کپڑا لپیٹنا ہو، جیسا کہ پچھلے زمانہ کی عرب عورتوں کا دستور تھا کہ وہ اپنے سر کو عصابہ (عورتوں کے سر پر باندھنے کا ایک خاص قسم کا رومال) کی طرح کپڑے لپیٹے رہا کرتی تھیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے واضح فرمایا کہ دوپٹہ کا بس ایک پیچ کافی ہے، دوپٹہ کو سر پر زیادہ نہ لپیٹو تاکہ اسراف کی صورت بھی پیدا نہ ہو اور

مردوں کی پگڑی کی مشابہت بھی لازم نہ آئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ وہ مردوں جیسا لباس پہنیں اور ان کی مشابہت اختیار کریں جس طرح کہ مردوں کیلئے عورتوں جیسا لباس پہننا اور عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا درست نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ازار کا نصف ساق تک ہونا پسندیدہ ہے

(۶۰) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مَرَرْتُ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَفِیْ اِزَارِیْ اُسْتِرْخَاءٌ فَقَالَ یَا عَبْدَاللّٰہِ اُرْفَعْ اِزَارَکَ فَرَفَعْتُہٗ ثُمَّ قَالَ زِدْ فَزِدْتُ فَمَازِلْتُ اَتَحَرَّاھَا بَعْدُ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ اِلٰی اَیْنَ قَالَ اِلٰی اَنْصَافِ السَّاقَیْنِ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ کے قریب سے گزرا، اس وقت میرا تہبند لٹکا ہوا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ عبداللہ! اپنا تہبند اونچا کرو۔ میں نے تھوڑا سا اونچا کر لیا، آپ ﷺ نے فرمایا اور اونچا کرو۔ میں نے اور اونچا کر لیا پھر حضرت ابن عمرؓ نے کہا کہ آنحضرت ﷺ اس حکم کے بعد میں برابر عمل (یعنی تہبند کو اونچا کرتے رہنے) کی طرف متوجہ رہتا ہوں، بعض لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ ﷺ اپنے تہبند کو کتنا اونچا رکھتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ "آدھی پنڈلیوں تک۔" (مسلمؒ)

تشریح: "اتحراھا" کی ضمیر اصل میں فعلہ جو محذوف ہے کی طرف راجع ہے چنانچہ ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے لیکن بظاہر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ضمیر رفعہ اخیرہ کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا کہ میں ہمیشہ اس بات کی طرف متوجہ رہتا ہوں کہ میرا تہبند آنحضرت ﷺ کی منشاء کے مطابق اونچا ہے۔ بہرحال مطلب دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔

ٹخنوں سے نیچے ازار کے لٹکنے کی حرمت کی اصل تکبر و غرور ہے

(۶۱) وَعَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ جَرَّ ثَوْبَہٗ خُیَلَاءَ لَمْ یَنْظُرِ اللّٰہُ اِلَیْہِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِزَارِیْ یَسْتَرْخِیْ اِلَّا اَنْ اَتَعَاھَدَہٗ فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّکَ لَسْتَ مِمَّنْ یَّفْعَلُہٗ خُیَلَاءَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص از راہ تکبر اپنا تہبند یا پانجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹکائے گا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف رحمت کی نظر نہیں اٹھائے گا یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا، کہ یا رسول اللہ کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے کہ میرے قصد و ارادہ کے بغیر میرا تہبند لٹک جاتا ہے اور ٹخنوں تک یا ٹخنوں سے نیچے پہنچ جاتا ہے الایہ کہ میں ہمہ وقت اس کا دھیان رکھوں یعنی اگر میں ہر وقت اس طرف متوجہ رہوں تو یقیناً کسی بھی وقت میرا تہبند نیچے نہیں لٹک سکتا لیکن بعض شرعی یا طبعی رکاوٹوں کی وجہ سے اس کی طرف ہر وقت دھیان رکھنا ممکن نہیں ہے تو ایسی صورت میں میرے لئے کیا حکم ہے؟ رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم ان لوگوں میں سے نہیں جو از راہ تکبر اپنا تہبند یا پاجامہ لٹکاتے ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تہبند یا پاجامہ کا بغیر قصد و ارادہ کے لٹکنا شرعی طور پر نقصان دہ نہیں ہے خاص طور سے اس شخص کے حق میں جو غرور و تکبر سے دور رہتا ہے لیکن افضل یہی ہے کہ بہر صورت متابعت ہی کو اختیار کیا جائے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تہبند و پاجامہ کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانے کی حرمت کی اصل تکبر ہے۔

اگر تہبند آگے سے لٹکا ہوا ہو لیکن پیچھے سے اٹھا ہوا ہو تو کوئی مضائقہ نہیں

(۶۲) وَعَنْ عِکْرِمَۃَ قَالَ رَاَیْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ یَاْتَزِرُ فَیَضَعُ حَاشِیَۃَ اِزَارِہٖ مِنْ مُقَدَّمِہٖ عَلٰی ظَھْرِ قَدَمِہٖ وَیَرْفَعُ مِنْ مُؤَخَّرِہٖ

قُلْتُ لِمَ تَأْتَزِرُ هٰذِهِ الْاِزْرَةَ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْتَزِرُهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عکرمہؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ کو اس طرح تہبند باندھے ہوئے دیکھا کہ وہ اس تہبند کے آگے کا کنارہ تو اپنے پیروں کے اوپر تک رکھتے اور اس کے پیچھے کا کنارہ ٹخنوں سے اونچا رکھتے تھے، میں نے یہ دیکھ کر حضرت ابن عباسؓ سے کہا کہ آپ کبھی کبھی اس طرح تہبند کیوں باندھتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ ﷺ بھی کبھی کبھی اس طرح تہبند باندھا کرتے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ تہبند و پاجامہ آگے کی طرف تو لٹکا رہے لیکن پیچھے کی طرف سے ٹخنوں سے اوپر اٹھا رہے تو عدم اسبال یعنی ٹخنوں سے نیچے نہ لٹکانے کے حکم کی تعمیل کے لئے کافی ہے۔

عمامہ باندھنے کا حکم

(۶۳) وَعَنْ عُبَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْكُمْ بِالْعَمَائِمِ فَاِنَّهَا سِيْمَاءُ الْمَلَائِكَةِ وَارْخُوْهَا خَلْفَ ظُهُوْرِكُمْ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت عبادہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم عمامہ پگڑی باندھنا ضروری سمجھو کیونکہ عمامے فرشتوں کی علامت ہیں (بایں طور کہ بدر کی جنگ کے موقعہ پر جو فرشتے مسلمانوں کی مدد کے لئے نازل ہوئے تھے وہ عمامہ باندھے ہوئے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ) اور عمامہ کے شملہ کو اپنی پشت پر چھوڑ دو کیونکہ ملائکہ بھی اسی ہیئت سے آئے تھے۔" (بیہقی فی شعب الایمان)

بدن کا باریک کپڑے کے نیچے جھلکنا بدن کے برہنہ ہونے کے برابر ہے

(۶۴) وَعَنْ عَائِشَةَ عَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ اَبِيْ بَكْرٍ دَخَلَتْ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَيْهَا ثِيَابٌ رِقَاقٌ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَقَالَ يَا اَسْمَاءُ اِنَّ الْمَرْاَةَ اِذَا بَلَغَتِ الْمَحِيْضَ لَنْ يَصْلُحَ اَنْ يُرٰى مِنْهَا اِلَّا هٰذَا وَهٰذَا وَاَشَارَ اِلٰى وَجْهِهٖ وَكَفَّيْهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن اسماء بنت ابوبکرؓ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں اس حالت میں آئیں کہ ان کے بدن پر باریک کپڑے تھے، آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھ کر اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور فرمایا کہ اسماءؓ! عورت جب ایام حیض کو پہنچ جائے یعنی (جب وہ بالغ ہو جائے) تو یہ ہرگز درست نہیں ہے کہ اس کے جسم کا کوئی عضو دیکھا جائے علاوہ اس کے اور اس کے یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنے چہرے اور ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ عورت کے لئے شرعی پردہ کی حد یہی ہے کہ وہ اپنے چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ باقی اعضاء کو ڈھانکے لیکن شرم و حجاب کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس حالت میں بھی گھر سے باہر نکل کر مردوں کے سامنے نہ آئے کہ اس کا پورا بدن علاوہ چہرے اور ہاتھوں کے چھپا ہوا ہو بلکہ اگر باہر نکلنا ضروری ہو تو چہرے اور ہاتھوں کو بھی چھپائے رکھے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر عورت نے کوئی ایسا باریک کپڑا پہن رکھا ہو جس کے نیچے اس کا بدن جھلک رہا ہو تو وہ برہنہ کے حکم میں ہوگی۔

نیا کپڑا پہنو تو خدا کی حمد و ثنا کرو

(۶۵) وَعَنْ اَبِيْ مَطَرٍ قَالَ اِنَّ عَلِيًّا اشْتَرٰى ثَوْبًا بِثَلَاثَةِ دَرَاهِمَ فَلَمَّا لَبِسَهٗ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ رَزَقَنِيْ مِنَ الرِّيَاشِ مَا

اَتَجَمَّلُ بِهٖ فِي النَّاسِ وَاُدَوَارِيْ بِهٖ عَوْرَتِيْ ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابو مطرؒ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت علیؓ نے ایک کپڑا تین درہم کے عوض خریدا اور جب اس کو پہنا تو کہا تمام تعریفیں خدا کے لئے ہیں جس نے مجھ کو زینت والے اسباب میں سے وہ چیز عطا کی جس کے ذریعہ ہم لوگوں کے سامنے اپنی آرائش بھی کرتے ہیں اور ستر بھی چھپاتے ہیں پھر حضرت علیؓ نے کہا کہ اسی طرح میں نے رسول کریم ﷺ کو بھی کپڑے پہننے کے بعد یہ حمد وثنا کرتے ہوئے سنا ہے۔"

(احمدؒ)

(۶۶) وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ قَالَ لَبِسَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ ثَوْبًا جَدِيْدًا فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَسَانِيْ مَا اُوَارِيْ بِهٖ عَوْرَتِيْ وَ اَتَجَمَّلُ بِهٖ فِيْ حَيَاتِيْ ثُمَّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ لَبِسَ ثَوْبًا جَدِيْدًا فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَسَانِيْ مَا اُوَارِيْ بِهٖ عَوْرَتِيْ وَاَتَجَمَّلُ بِهٖ فِيْ حَيَاتِيْ ثُمَّ عَمَدَ اِلَى الثَّوْبِ الَّذِيْ اَخْلَقَ فَتَصَدَّقَ بِهٖ كَانَ فِيْ كَنَفِ اللّٰهِ وَفِيْ حِفْظِ اللّٰهِ وَفِيْ سَتْرِ اللّٰهِ حَيًّا وَمَيِّتًا رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر ابن خطابؓ نے نیا کپڑا پہنا تو یہ کہا۔ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے وہ کپڑا پہننے کو دیا جس کے ذریعہ میں اپنا ستر بھی چھپاتا ہوں اور اپنی زندگی میں لوگوں کے سامنے اپنی آرائش بھی کرتا ہوں۔ پھر انہوں نے کہا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص نیا کپڑا پہننے کے بعد یوں کہے، تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے وہ کپڑا پہننے کو دیا جس کے ذریعہ میں اپنا ستر بھی چھپاتا ہوں اور اپنی زندگی میں لوگوں کے سامنے اپنی آرائش بھی کرتا ہوں۔ اور پھر اس کپڑے کو جو پرانا ہو گیا ہے یعنی جو (کپڑا اس نے اپنے جسم سے اتارا ہے) کسی کو اللہ واسطے دے دے تو وہ اپنے جیتے جی اور مرنے کے بعد (یعنی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی) اللہ کی پناہ میں رہے گا اللہ کی محافظت میں رہے گا اور اللہ کے عفو ومغفرت کے پردے میں رہے گا!۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔)

عورتوں کے لئے باریک کپڑے کی ممانعت

(۶۷) وَعَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ اَبِيْ عَلْقَمَةَ عَنْ اُمِّهٖ قَالَتْ دَخَلَتْ حَفْصَةُ بِنْتُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَلٰى عَائِشَةَ وَعَلَيْهَا خِمَارٌ رَقِيْقٌ فَشَقَّتْهُ عَائِشَةُ وَكَسَتْهَا خِمَارًا كَثِيْفًا۔ (رواہ مالکؒ)

"اور حضرت علقمہ ابن ابو علقمہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن حضرت عبدالرحمٰن ابن ابوبکرؓ کی صاحبزادی حفصہ، حضرت عائشہ کے پاس اس حالت میں آئیں، کہ انہوں نے باریک اوڑھنی اوڑھ رکھی تھی۔ حضرت عائشہ نے وہ باریک اوڑھنی پھاڑ ڈالی اور ان کو ایک موٹی اوڑھنی اڑھا دی۔" (مالکؒ)

تشریح: حفصہ، حضرت عائشہؓ کی بھتیجی تھیں حضرت عائشہؓ نے جب ان کو باریک دوپٹہ اوڑھے ہوئے دیکھا تو خفا ہوئیں اور ان کو سبق دینے کے لئے ان کے اس باریک دوپٹے کے دو ٹکڑے کر ڈالے اور پھر اس کے بدلے ان کے سر پر ایک موٹا دوپٹہ ڈال دیا۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں حضرت عائشہؓ کا فقر وزہد

(۶۸) وَعَنْ عَبْدِ الْوَاحِدِ بْنِ اَيْمَنَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى عَائِشَةَ وَعَلَيْهَا دِرْعٌ قِطْرِيٌّ ثَمَنُ خَمْسَةِ دَرَاهِمَ فَقَالَتْ اِرْفَعْ بَصَرَكَ اِلٰى جَارِيَتِيْ اُنْظُرْ اِلَيْهَا فَاِنَّهَا تُزْهٰى اَنْ تَلْبَسَهٗ فِي الْبَيْتِ وَقَدْ كَانَ لِيْ مِنْهَا دِرْعٌ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَا كَانَتِ امْرَاَةٌ تُقَيَّنُ بِالْمَدِيْنَةِ اِلَّا اَرْسَلَتْ اِلَيَّ تَسْتَعِيْرُهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عبدالواحد ابن ایمن اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ایک دن میں حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو

اس وقت ان کے جسم پر (مصر کے بنے ہوئے) قطری کپڑے کا کرتا تھا جس کی قیمت پانچ درہم تھی، حضرت عائشہؓ نے دوران گفتگو، مجھ سے فرمایا کہ ذرا میری اس لونڈی کو تو دیکھو یہ کس قدر غرور کرتی ہے یہ گھر میں بھی اس کپڑے کو پہننے پر تیار نہیں ہوتی (چہ جائیکہ اس کو پہن کر باہر نکلے) حالانکہ رسول کریم ﷺ کے زمانے میں میرے پاس اس طرح کے (یعنی قطری کپڑے) کا ایک کرتا تھا اور مدینہ میں جو بھی عورت (اپنی شادی میں یا کسی اور کی شادی کے وقت) اپنی آرائش کرنا چاہتی وہ کسی کو میرے پاس بھیج کر وہی کرتا عاریتاً منگواتی۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث میں حضرت عائشہؓ نے یہاں یہ واضح کیا ہے کہ اس تھوڑے سے عرصہ میں ذہنوں میں کیسی تبدیلی پیدا ہوگئی ہے کہ جس کپڑے کے کرتے کو کل تک عورتیں اپنی آرائش کے لئے ضروری سمجھتی تھیں وہی کرتا اب وہ اپنے گھر میں بھی پہننا پسند نہیں کرتی ہیں وہیں انہوں نے گویا آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں اپنے فقر و تنگی اور زہد کو بھی بیان کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ اور ریشمی قبا

(۶۹) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ لَبِسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا قَبَاءَ دِيْبَاجٍ اُهْدِيَ لَهٗ ثُمَّ اَوْشَكَ اَنْ نَزَعَهٗ فَاَرْسَلَ بِهٖ اِلٰى عُمَرَ فَقِيْلَ قَدْ اَوْشَكَ مَا انْتَزَعْتَهٗ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ نَهَانِيْ عَنْهُ جِبْرِيْلُ فَجَآءَ عُمَرُ يَبْكِيْ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ كَرِهْتَ اَمْرًا وَاَعْطَيْتَنِيْهِ فَمَالِيْ فَقَالَ اِنِّيْ لَمْ اُعْطِكَهٗ تَلْبَسُهٗ اِنَّمَا اَعْطَيْتُكَهٗ تَبِيْعُهٗ فَبَاعَهٗ بِاَلْفَيْ دِرْهَمٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے ایک ریشمی قبا پہنی جو آپ ﷺ کو ہدیہ کے طور پر دی گئی تھی۔ لیکن فوراً ہی اس قبا کو جسم مبارک سے اتار کر حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دیا صحابیؓ نے (یہ دیکھ کر) عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ نے اس قباء کو اتنی جلد کیوں اتار ڈالا؟ آپ ﷺ نے فرمایا "مجھ کو جبرئیل علیہ السلام نے اس کے پہننے سے منع کر دیا تھا (اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے وہ قبا ریشمی کپڑے کی حرمت نازل ہونے سے پہلے پہنی تھی) پھر جب حضرت عمرؓ کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو وہ روتے ہوئے حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! جس چیز کو آپ ﷺ نے ناپسند فرمایا ہے (یعنی اس ریشمی قبا کے پہننے کو) اس کو مجھے مرحمت فرمادیا ہے (تاکہ میں اس کو پہن لوں) اس صورت میں میرا کیا حال ہوگا؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا میں نے وہ قبا تمہیں اس لئے نہیں دی ہے کہ تم اس کو پہنو، بلکہ اس لئے دی ہے کہ تم اس کو بیچ ڈالو، چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس قبا کو دو ہزار درہم کے عوض بیچ دیا۔" (مسلمؒ)

جس کپڑے کے تانے میں ریشم ہو وہ مردوں کے لئے حلال ہے

(۷۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّمَا نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الثَّوْبِ الْمُصْمَتِ مِنَ الْحَرِيْرِ فَاَمَّا الْعَلَمُ وَسَدَى الثَّوْبِ فَلَا بَاْسَ بِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس کپڑے کو پہننے سے منع فرمایا ہے جو خالص ریشم کا ہو، البتہ ریشم کی گوٹ یا بیل (جو چار انگشت سے زائد نہ ہو) اور وہ کپڑا جس کے تانے میں ریشم ہو اس کو استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: جس کپڑے میں تانا اور بانا دونوں ریشم کا ہو اس کا مردوں کو پہننا حرام ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک جنگ میں اس کو پہننا مباح ہے اور جس کپڑے کا تانا ریشم کا ہو اور بانا، سوت وغیرہ کا ہو تو اس کا پہننا بالاتفاق جائز ہے اور اس کا برعکس ناجائز ہے مگر جنگ میں جائز ہے۔ گویا صاحبینؒ کے نزدیک تو جنگ میں وہ کپڑا بھی پہننا مباح ہے جو خالص ریشم کا ہو، اور وہ کپڑا بھی جس کے بانے میں ریشم ہو۔ لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک جنگ میں صرف وہ کپڑا پہننا مباح ہے جس کا بانا ریشم کا ہو اور تانا سوت وغیرہ کا اور جس کپڑے کا تانا ریشم کا ہو اور بانا کسی اور چیز کا وہ ہر حالت میں مباح ہے۔

اللہ کی دی ہوئی ہر نعمت کو ظاہر کرنا پسندیدہ ہے

(۷۱) وَعَنْ اَبِیْ رَجَاءٍ قَالَ خَرَجَ عَلَیْنَا عِمْرَانُ بْنُ حُصَیْنٍ وَ عَلَیْهِ مُطَرَّفٌ مِنْ خَزٍّ وَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ نِعْمَةً فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ اَنْ یُّرٰی اَثَرُ نِعْمَتِهٖ عَلٰی عَبْدِهٖ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابورجاءؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمران ابن حصینؓ (گھر سے) نکل کر ہمارے پاس آئے تو اس وقت ان کے بدن پر خز کا مطرف (شال) تھا۔ انہوں نے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنی نعمت سے سرفراز فرمائے تو اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کے بندے پر اس کی نعمت کا اثر دیکھا جائے۔" (احمدؒ)

تشریح: "مطرف" ایک خاص طرح کا چادر نما کپڑا ہوتا تھا، جس کے دونوں طرف کنارے بنے ہوتے تھے اور قاموس میں لکھا ہے کہ مطرف، جو مکرم کے وزن پر ہے خز کی دھاری دار چادر شال کو کہتے ہیں اس صورت میں "مطرف من خز" اس کپڑے کو کہتے تھے جو ریشم اور اون دونوں سے بنا جاتا تھا۔ اس کا پہننا مباح ہے۔ چنانچہ یہاں "خز" سے یہی مراد ہے۔

مباحات میں سے جو چاہو کھاؤ پہنو لیکن اسراف اور تکبر سے دامن بچاؤ

(۷۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ کُلْ مَاشِئْتَ وَالْبَسْ مَاشِئْتَ مَا اَخْطَاَتْكَ اثْنَتَانِ سَرَفٌ وَ مَخِیْلَةٌ۔ (رواہ البخاری فی ترجمۃ باب)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا جائز و مباح چیزوں میں سے جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پہنو تاوقتیکہ دو چیزیں یعنی اسراف اور تکبر تم میں سرایت نہ کریں۔" (بخاری فی ترجمۃ باب)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کھانے کی ہر مباح چیز کو کھانا اور پہننے کی ہر مباح چیز کو پہننا درست ہے، لیکن کھانے اور پہننے میں وہ توسع مکروہ ہے جو اسراف اور تکبر کے طور پر ہو جس توسع میں اسراف اور تکبر نہ ہو وہ مباح ہے۔

(۷۳) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَتَصَدَّقُوْا وَالْبَسُوْا مَالَمْ یُخَالِطْ اِسْرَافٌ وَلَا مَخِیْلَةٌ۔ (رواہ احمد والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا رسول کریم ﷺ نے فرمایا (اپنی حاجت و ضرورت کے بقدر) کھاؤ اور پیو اور جو چیز تمہاری حاجت اور ضرورت سے زائد ہو اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو (نیز پہننے کی مباح چیزوں میں سے جو چاہو) پہنو جب تک کہ اس میں اسراف اور تکبر نہ ہو۔" (احمدؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ)

سفید کپڑے کی فضیلت

(۷۴) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحْسَنَ مَازُرْتُمُ اللّٰهَ فِیْ قُبُوْرِکُمْ وَ مَسَاجِدِکُمُ الْبَیَاضُ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "وہ بہترین کپڑا کہ جس کو پہن کر تم اپنی قبروں اور اپنی مسجدوں میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرو، سفید کپڑا ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: مسجد، اللہ کا گھر ہے۔ جو شخص عبادت کے لئے مسجد میں گیا وہ گویا اللہ سے ملاقات کے لئے گیا لہٰذا وہاں سفید کپڑا پہن کر جانا بہتر ہے۔ اسی طرح بندہ مرنے کے بعد گویا اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرتا ہے۔ لہٰذا مردہ کو سفید کفن دینا بہتر ہے۔

بَابُ الْخَاتَمِ
انگوٹھی پہننے کا بیان
اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ
مردوں کو سونے کی انگوٹھی پہننا حرام اور چاندی کی انگوٹھی پہننا جائز ہے

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اتَّخَذَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاتَمًا مِنْ ذَهَبٍ، وَفِيْ رِوَايَةٍ وَجَعَلَهُ فِيْ يَدِهِ الْيُمْنٰى ثُمَّ اَلْقَاهُ ثُمَّ اتَّخَذَ خَاتَمًا مِنْ وَرَقٍ نُقِشَ فِيْهِ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَقَالَ لَا يَنْقُشَنَّ اَحَدٌ عَلٰى نَقْشِ خَاتَمِيْ هٰذَا وَكَانَ اِذَا لَبِسَهُ جَعَلَ فَصَّهُ مِمَّا يَلِيْ بَطْنَ كَفِّهِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سونے کی انگوٹھی بنوائی۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ انگوٹھی کو اپنے داہنے ہاتھ میں پہنا۔ اور پھر اس کو پھینک دیا، پھر آپ ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس میں "محمد رسول اللہ" کے الفاظ کندہ کرائے اور فرمایا کہ کوئی شخص میری اس مہر کی مانند الفاظ (اپنی انگوٹھی میں) کندہ نہ کرائے نیز آنحضرت ﷺ جب انگوٹھی پہنتے تو اس کا نگینہ ہتھیلی کی جانب رکھتے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے سونے کی انگوٹھی اس وقت بنوائی تھی جب کہ مردوں کے لئے سونا حرام نہیں ہوا تھا چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ مردوں کے لئے سونا پہننا حرام قرار دے دیا تو آپ ﷺ نے وہ انگوٹھی پھینک دی۔

امام محمدؒ نے اپنی کتاب مؤطا میں کہا ہے کہ مردوں کے لئے جس طرح سونے کی انگوٹھی پہننا جائز نہیں ہے اسی طرح ان کے لئے لوہے اور کانسی وغیرہ کی انگوٹھی بھی جائز نہیں ہے لہٰذا مرد کو چاندی کے علاوہ اور کسی چیز کی انگوٹھی نہیں چاہئے۔ عورتوں کے لئے سونے کی انگوٹھی اور دوسرے زیورات پہننا جائز ہے بلکہ علماء نے یہ لکھا ہے کہ عورتوں کو چاندی کی انگوٹھی پہننا مکروہ ہے، کیونکہ چاندی کی انگوٹھی مرد پہنتے ہیں اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت اختیار کرنا مکروہ ہے، لہٰذا اگر کوئی عورت چاندی کی انگوٹھی پہننا ہی چاہے تو وہ اس کے رنگ کو کسی ملمع وغیرہ کے ذریعہ تبدیل کر دے۔ نیز ہدایہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس بارے میں انگوٹھی کے حلقہ کا اعتبار ہے نہ کہ اس کے نگینہ کا۔

"کوئی شخص میری مہر کے مانند الفاظ کندہ نہ کرائے" اصل بات یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ یہ دیکھا کرتے تھے کہ مسلمان میری اتباع کے کس قدر حریص اور شیدائی ہیں وہ میرے ہر عمل کی پیروی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے کوئی بعید نہیں کہ لوگ میری اس مہر کے الفاظ اپنی انگوٹھیوں میں بھی کندہ کرنے لگیں، لہٰذا آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا، نیز اس ممانعت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آنحضرت ﷺ کی اس مہر اور اس میں کندہ الفاظ کی ایک قانونی حیثیت بھی تھی کہ آپ ﷺ جو خطوط وغیرہ دنیا کے بادشاہوں اور سربراہان مملکت کے نام بھیجا کرتے تھے ان پر یہی مہر ثبت فرماتے تھے اس صورت میں اگر دوسرے لوگ بھی اپنی انگوٹھیوں میں اسی طرح کی مہر کندہ کراتے تو نہ صرف یہ کہ مہر رسالت کی مخصوص حیثیت ان بادشاہوں کی نظر میں مشتبہ ہو جاتی بلکہ ایک عجیب طرح کی خرابی بھی واقع ہو جاتی۔

قاضی خاںؒ نے کہا ہے کہ چاندی کی انگوٹھی پہننا اس شخص کے حق میں مباح ہے جس کے لئے مہر رکھنا ایک ضرورت کے درجہ کی چیز ہو جیسے قاضی وغیرہ اور جو شخص مہر رکھنے کا ضرورت مند نہ ہو اس کے حق میں افضل یہی ہے کہ چاندی کی انگوٹھی کا بھی استعمال نہ کرے، نیز جو شخص انگوٹھی پہنے اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ انگوٹھی کو بائیں ہاتھ کی انگلی میں پہنے اور اس کا نگینہ ہتھیلی کی طرف رکھے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انگوٹھی کس ہاتھ میں پہنی جائے تو سیوطیؒ کہتے ہیں کہ احادیث تو دائیں ہاتھ میں پہننے کے بارے میں بھی منقول ہیں اور بائیں ہاتھ میں پہننے کے بارے میں بھی، لیکن عمل ان ہی احادیث پر ہے جن میں بائیں ہاتھ میں پہننے کا ذکر ہے اور جو احادیث دائیں ہاتھ کے متعلق ہیں ان کو منسوخ قرار دیا گیا ہے چنانچہ عدیؒ وغیرہ نے حضرت ابن عمرؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ پہلے تو دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے لیکن پھر بائیں ہاتھ میں پہننے لگے۔ سفر السعادہ کے مصنف نے یہ لکھا ہے کہ اس بارے میں مختلف احادیث منقول ہیں، بعض روایتوں میں تو نقل کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے اور بعض روایتوں میں بائیں ہاتھ میں پہننا نقل کیا گیا ہے یہ سب روایتیں صحیح ہیں، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کبھی تو آپ ﷺ دائیں ہاتھ میں پہنتے ہوں گے اور کبھی بائیں ہاتھ میں۔ امام نوویؒ یہ لکھتے ہیں کہ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انگوٹھی کا دائیں ہاتھ میں بھی پہننا جائز ہے اور بائیں ہاتھ میں بھی لیکن شوافع کے نزدیک دائیں ہاتھ میں پہننا بہتر ہے کیونکہ دایاں ہاتھ بائیں کی بہ نسبت شرف وفضیلت رکھتا ہے اس لئے وہی ہاتھ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کی زینت وآرائش اور توقیر ہو۔

(۲) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ لُبْسِ الْقَسِيِّ وَالْمُعَصْفَرِ وَعَنْ تَخَتُّمِ الذَّهَبِ وَعَنْ قِرَاءَةِ الْقُرْاٰنِ فِي الرُّكُوْعِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (مردوں کو) قسی کپڑے کسم کے رنگے ہوئے کپڑے اور سونے کی انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا، نیز آپ ﷺ نے رکوع میں قرآن پڑھنے سے منع فرمایا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "قسی" ایک خاص قسم کے ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں جو مصر کے ایک شہر قس میں تیار ہوتا تھا۔

"رکوع میں قرآن پڑھنے کی ممانعت" کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ رکوع میں یا سجدے میں تسبیح کے بجائے قرآن پڑھا جائے، دوسرے یہ کہ آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی شخص قیام کی حالت میں اضطراب وبے اطمینانی کا رویہ اختیار کرے اور قراءت کو پورا کئے بغیر اس طرح رکوع میں چلا جائے کہ اس قرآت کا کچھ حصہ رکوع میں واقع ہو۔

سونے کی انگوٹھی پہننے والے مرد کے بارے میں وعید

(۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى خَاتَمًا مِنْ ذَهَبٍ فِيْ يَدِ رَجُلٍ فَنَزَعَهٗ فَطَرَحَهٗ فَقَالَ يَعْمِدُ اَحَدُكُمْ اِلٰى جَمْرَةٍ مِنْ نَارٍ فَيَجْعَلُهَا فِيْ يَدِهٖ فَقِيْلَ لِلرَّجُلِ بَعْدَ مَاذَهَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُذْ خَاتَمَكَ انْتَفِعْ بِهٖ قَالَ لَا وَاللّٰهِ لَا اٰخُذُهٗ اَبَدًا وَقَدْ طَرَحَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے ایک شخص کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی تو آپ ﷺ نے اس کے ہاتھ سے اس انگوٹھی کو اتار کو پھینک دیا اور پھر فرمایا کہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ تم میں سے کوئی شخص دوزخ کی آگ کے انگارے کو حاصل کرے اور اس کو اپنے ہاتھ میں پہن لے، یعنی جو شخص اپنے ہاتھوں میں سونے کی کوئی چیز پہنے گا اس کا ہاتھ دوزخ کی آگ میں جلایا جائے گا اس صورت میں کسی مرد کا سونے کی انگوٹھی پہننا گویا اپنے ہاتھ میں دوزخ کی آگ کا انگارہ پہننا ہے، پھر جب رسول کریم ﷺ وہاں سے تشریف لے گئے تو اس شخص سے کہا گیا کہ تم اپنی اس انگوٹھی کو اٹھالو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ، یعنی چاہے تو اس کو فروخت کر ڈالو اور چاہے کسی عورت کو دے دو لیکن اس شخص نے کہا کہ نہیں خدا کی قسم میں اس کو کبھی نہیں اٹھاؤں گا جب کہ اس کو رسول کریم ﷺ نے پھینک دیا ہے!۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص قدرت رکھتا ہو وہ اگر کسی خلاف شرع چیز کو دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے بگاڑ دے اور مٹا دے، جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے اِذَا رَاٰى اَحَدٌ مِّنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ یعنی جب تم میں سے کوئی شخص کسی خلاف شرع چیز

کو دیکھے تو وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بگاڑ ڈالے۔

مہر نبوی ﷺ

④ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرَادَ اَنْ يَّكْتُبَ اِلٰى كِسْرٰى وَ قَيْصَرَ وَالنَّجَاشِيِّ فَقِيْلَ اِنَّهُمْ لَا يَقْبَلُوْنَ كِتَابًا اِلَّا بِخَاتَمٍ فَصَاغَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاتَمًا حَلْقَةَ فِضَّةٍ نُقِشَ فِيْهِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ كَانَ نَقْشُ الْخَاتَمِ ثَلَاثَةَ اَسْطُرٍ مُحَمَّدٌ سَطْرٌ وَرَسُوْلُ سَطْرٌ وَاللّٰهِ سَطْرٌ۔

"اور حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ واپس آکر، کسری (فارس کے بادشاہ) قیصر (روم کے بادشاہ) اور نجاشی (حبشہ کے بادشاہ) کو (اسلام کی دعوت دینے کے لئے) خطوط بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو عرض کیا گیا کہ (مروج قاعدہ کے مطابق) یہ (بادشاہ) اسی خط کو قبول کرتے ہیں یعنی مستند سمجھتے ہیں جس پر مہر لگی ہوئی ہو، چنانچہ رسول کریم ﷺ نے چاندی کے حلقہ والی انگوٹھی بنوائی جس میں محمد رسول اللہ کندہ کر دیا گیا۔ (مسلم) اور بخاری کی ایک روایت میں یوں منقول ہے کہ اس انگوٹھی میں جو الفاظ کندہ کرائے گے تھے وہ تین سطروں میں تھے اس طرح کہ ایک سطر میں (جو سب سے نیچی تھی) محمد کا لفظ تھا ایک سطر میں (جو بیچ میں تھی) رسول کا لفظ تھا اور ایک سطر میں (جو سب سے اوپر تھی) اللہ (کا لفظ) تھا۔

تشریح: یہاں انگوٹھی کے ضمن میں صرف اس کے حلقہ کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے اس کے نگینہ کے بارے میں ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ انگلی میں خلقہ ہی پہنا جاتا ہے اور وہی محل استبعاد بھی ہے اس لئے بیان جواز کی خاطر اس کا ذکر کیا گیا تاہم دوسری احادیث میں نگینہ کا بھی ذکر ہے چنانچہ بعض روایتوں میں یہ ہے کہ آپ ﷺ کی انگوٹھی کا نگینہ بھی چاندی ہی کا تھا اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اس کا نگینہ حبشی یعنی عقیق کا تھا، چنانچہ اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

مہر نبوی ﷺ میں جو الفاظ کندہ تھے ان کی ہیئت امام نووی ؒ نے وہی بیان کی ہے جو اوپر ذکر کی گئی، یعنی اوپر کی سطر میں "اللہ"، بیچ کی سطر میں "رسول" اور نیچے کی سطر میں "محمد" کا لفظ تھا، گویا اس مہر کی یہ صورت تھی محمد رسول اللہ ﷺ اور بعض حضرات نے اس مہر کی یہ صورت بیان کی ہے محمد رسول اللہ واللہ اعلم۔

آنحضرت ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی انگوٹھی حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے ہاتھ میں رہا کرتی تھی ان کے بعد حضرت عمر فاروق ؓ کے ہاتھ میں اور ان کے بعد حضرت عثمان ؓ کے ہاتھ میں آئی، لیکن حضرت عثمان ؓ کے خلافت کے آخری دور میں وہ انگوٹھی ایک دن معیقیب کے ہاتھ سے جو حضرت عثمان ؓ کے خادم تھے اریس کنویں میں گر پڑی اور پھر اس کو بہت زیادہ تلاش کیا گیا مگر نہیں ملی!

علماء لکھتے ہیں کہ وہ فتنہ و فساد اور اختلاف و انتشار جو حضرت عثمان ؓ کے آخری دور خلافت میں اور پھر ان کے بعد اسلامی مملکت میں پیدا ہوا اس کا باعث اس مبارک انگوٹھی کا گم ہونا تھا کیونکہ اس انگوٹھی میں حق تعالیٰ نے ایسی برکت عطا فرمائی تھی جو حکومت و مملکت کے انتظام و انصرام کا ایک مؤثر ذریعہ تھی جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی مہر والی انگوٹھی کی خاصیت تھی۔

آنحضرت ﷺ کی انگوٹھی کا نگینہ

⑤ وَعَنْهُ اَنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ خَاتَمُهٗ مِنْ فِضَّةٍ وَكَانَ فَصُّهٗ مِنْهُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی چاندی کی تھی اور اس کا نگینہ بھی چاندی ہی کا تھا۔" (بخاریؒ)

⑥ وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَبِسَ خَاتَمَ فِضَّةٍ فِيْ يَمِيْنِهٖ فِيْهِ فَصٌّ حَبَشِيٌّ كَانَ يَجْعَلُ فَصَّهٗ مِمَّا يَلِيْ

كَفِّهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ ہی سے (یہ بھی) روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی اپنے دائیں ہاتھ میں پہنی جس کا نگینہ حبشی تھا۔ نیز آنحضرت ﷺ انگوٹھی نگینہ کا ہتھیلی کی جانب رکھتے یعنی آپ ﷺ اپنی انگوٹھی کو اس طرح پہنتے تھے کہ اس کا نگینہ والا حلقہ ہتھیلی کی طرف رہتا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "حبشی" سے مراد "عقیق" ہے اور عقیق کو حبشہ کی طرف منسوب کر کے حبشی اس لئے کہا گیا ہے کہ عقیق کی کان حبشہ اور یمن میں تھی، یا وہ نگینہ عقیق کی بجائے کسی اور قسم کا ہو گا اور وہ قسم حبشہ ہی میں پائی جاتی تھی اس لئے اس کو حبشی کہا گیا، یا وہ نگینہ سیاہ رنگ کا تھا جیسا کہ حبشیوں کا رنگ ہوتا ہے اس مناسبت سے اس کو حبشی کہا گیا، اور یا یہ کہ اس نگینہ کو کسی حبشی شخص نے بنایا ہو گا اس لئے اس کو "حبشی" سے تعبیر کیا گیا، اس صورت میں یہ روایت اس روایت کے منافی نہیں ہوگی جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی انگوٹھی کا نگینہ بھی چاندی کا تھا البتہ اگر پہلے معنی مراد لئے جائیں یعنی یہ کہ وہ نگینہ عقیق کا تھا اور چونکہ عقیق کی کان حبشہ میں تھی اس لئے اس کو "حبشی" کہا گیا ہے تو اس صورت میں دونوں روایتیں تعدد پر محمول ہوں گی یعنی یہ کہا جائے گا کہ آپ ﷺ کی ایک انگوٹھی کا نگینہ چاندی ہی کا تھا اور دوسری انگوٹھی کا نگینہ حبشی یعنی عقیق کا تھا۔

⑦ وَعَنْهُ قَالَ كَانَ خَاتَمُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ هٰذِهٖ وَاَشَارَ اِلَى الْخِنْصَرِ مِنْ يَدِهِ الْيُسْرٰى۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی (اس انگلی) میں تھی! حضرت انسؓ نے یہ کہہ کر بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کی طرف اشارہ کیا۔" (مسلمؒ)

انگوٹھی کس انگلی میں پہنی جائے

⑧ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ نَهَانِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اَتَخَتَّمَ فِيْ اِصْبَعِيْ هٰذِهٖ اَوْ هٰذِهٖ قَالَ فَاَوْمَاَ اِلَى الْوُسْطٰى وَالَّتِيْ تَلِيْهَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھے اس سے منع فرمایا کہ میں اپنی اس انگلی میں یا اس انگلی میں انگوٹھی پہنوں۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے (یہ کہہ کر) درمیانی انگلی اور اس کے قریب والی انگلی یعنی شہادت کی انگلی کی طرف اشارہ کیا۔" (مسلمؒ)

تشریح: درمیانی اور شہادت کی انگلی کے بارے میں تو اس حدیث سے واضح ہوا اور انگوٹھے نیز چھوٹی انگلی کے قریب والی انگلی میں انگوٹھی پہننا نہ تو آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے اور نہ صحابہؓ و تابعینؒ ہی سے منقول ہے اس سے معلوم ہوا کہ انگوٹھی کو چھوٹی انگلی ہی میں پہننا مستحب ہے۔ چنانچہ شوافع اور حنفیہ کا رجحان اسی طرف ہے تاہم یہ بات مردوں کے حق میں ہے، جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے تو ان کے لئے سب انگلیوں میں پہننا جائز ہے۔ امام نوویؒ نے کہا ہے کہ مردوں کو درمیانی اور شہادت کی انگلی میں انگوٹھی پہننا مکروہ تنزیہی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

آنحضرت ﷺ انگوٹھی دائیں اور بائیں دونوں ہاتھوں میں پہنتے تھے

⑨ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَتَّمُ فِيْ يَمِيْنِهٖ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَرَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ

وَالنَّسَائِی عَنْ عَلِیٍّ۔

"حضرت عبداللہ ابن جعفرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ انگوٹھی کو اپنے دائیں ہاتھ میں پہنا کرتے تھے۔(ابن ماجہؒ) ابوداؤد اور نسائیؒ نے اس روایت کو حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے۔"

⑩ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَتَخَتَّمُ فِیْ یَسَارِہٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ انگوٹھی کو اپنے بائیں ہاتھ میں پہنا کرتے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

ریشمی کپڑا اور سونا مردوں کے لئے حرام ہے

⑪ وَعَنْ عَلِیٍّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَخَذَ حَرِیْرًا فَجَعَلَہٗ فِیْ یَمِیْنِہٖ وَاَخَذَ ذَھَبًا فَجَعَلَہٗ فِیْ شِمَالِہٖ ثُمَّ قَالَ اِنَّ ھٰذَیْنِ حَرَامٌ عَلٰی ذُکُوْرِ اُمَّتِیْ۔ (رواہ احمد وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے ریشمی کپڑا لیا اور اس کو اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑا اسی طرح سونا لیا اور اس کو اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑا اور پھر فرمایا کہ میری اُمت کے مردوں کے لئے یہ دونوں چیزیں حرام ہیں۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

⑫ وَعَنْ مُعَاوِیَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی عَنْ رُکُوْبِ النُّمُوْرِ وَعَنْ لُبْسِ الذَّھَبِ اِلَّا مُقَطَّعًا۔

(رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے چیتے کی کھال کی زین پر سوار ہونے سے منع فرمایا اسی طرح آپ ﷺ نے (مردوں کو) سونا پہننے سے منع فرمایا الایہ کہ وہ بہت قلیل مقدار میں ہو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ سے قلیل مقدار میں سونے کی جو اباحت ثابت ہوتی ہے وہ بھی منسوخ قرار پاچکی ہے ویسے بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان الفاظ سے بظاہر جو جواز ثابت ہوتا ہے وہ حنفیہؒ کے نزدیک اس پر محمول ہے کہ مثلاً کسی چیز پر سونے کا ملمع کیا جائے یا نگینہ وغیرہ میں سونے کی کیل لگائی جائے اور یا کپڑے پر دھاریوں اور بیل کے طور پر سنہرا کام کیا جائے تو یہ حنفیہؒ کے نزدیک مردوں کے لئے بھی جائز ہیں۔

پیتل اور لوہے کی انگوٹھی پہننے کی ممانعت

⑬ وَعَنْ بُرَیْدَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لِرَجُلٍ عَلَیْہِ خَاتَمٌ مِنْ شَبَہٍ مَالِیْ اَجِدُ مِنْکَ رِیْحَ الْاَصْنَامِ فَطَرَحَہٗ ثُمَّ جَآءَ وَعَلَیْہِ خَاتَمٌ مِنْ حَدِیْدٍ فَقَالَ مَالِیْ اَرٰی عَلَیْکَ حِلْیَۃَ اَھْلِ النَّارِ فَطَرَحَہٗ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مِنْ اَیِّ شَیْءٍ اَتَّخِذُہٗ قَالَ مِنْ وَرِقٍ وَلَا تُتِمَّہٗ مِثْقَالًا رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاؤدَ وَالنَّسَائِیُّ وَقَالَ مُحْیِ السُّنَّۃِ وَقَدْ صَحَّ عَنْ سَھْلِ بْنِ سَعْدٍ فِی الصَّدَاقِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لِرَجُلٍ۔ اِلْتَمِسْ وَلَوْ خَاتَمًا مِنْ حَدِیْدٍ۔

"اور حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے ایک شخص سے جو پیتل کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھا فرمایا کہ مجھے کیا ہوا ہے کہ میں تم میں بتوں کی بو پاتا ہوں یعنی آپ ﷺ نے اس شخص کے سامنے یہ بات بطور تعریض فرمائی۔ کیونکہ عام طور پر پیتل ہی کے بت بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ اس شخص نے آنحضرت ﷺ کی یہ ناگواری دیکھ کر اس انگوٹھی کو اتار کر پھینک دیا، پھر (جب دوبارہ) وہ شخص آیا تو لوہے کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھا، آنحضرت ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) فرمایا کہ مجھے کیا ہوا ہے کہ میں تم پر دوزخیوں کا زیور دیکھ رہا ہوں یعنی آپ ﷺ نے یہ بات بھی بطور تعریض اس بناء پر فرمائی کہ کفار میں سے کچھ لوگ دنیا میں لوہے کی چیز پہنتے ہیں یا اس ارشاد میں اس طرف اشارہ تھا کہ کافروں کو دوزخ میں جو طوق و سلاسل پہنائے جائیں گے وہ لوہے کے ہوں گے، اس لئے لوہے کی انگوٹھی پہننا دوزخیوں کی

مشابہت اختیار کرنا ہے چنانچہ اس شخص نے اس انگوٹھی کو (بھی) اتار کر پھینک دیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! پھر میں کس چیز کی انگوٹھی بناؤں؟ آپ ﷺ نے فرمایا چاندی کی اور وہ چاندی بھی پوری مثقال نہ ہو۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

محی السنۃؒ فرماتے ہیں کہ عورت کے مہر کے بارے میں حضرت سہل ابن سعدؓ کی صحیح روایت منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص سے فرمایا جو نکاح کرنے کا متمنی تھا کہ بیوی کے مہر کے لئے از قسم مال کوئی چیز تلاش کرو اگرچہ وہ لوہے کی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔

تشریح: "پوری ایک مثقال نہ ہو" یہ ممانعت اصل میں احتیاط و تقویٰ اور اولویت کیلئے ہے، یعنی اولیٰ یہ ہے کہ انگوٹھی ایک مثقال (۴ ۱/۲ ماشہ) سے کم چاندی کی ہو ورنہ جہاں تک جواز کا تعلق ہے تو پورے ایک مثقال کی بھی جائز ہے) اور یہ الویت بھی اس بنا پر ہے کہ سونا اور چاندی اصل کے اعتبار سے "غیر پسندیدہ" ہیں لہٰذا ان کا استعمال بس اسی قدر ہونا چاہئے جو ضرورت کے مطابق ہو اس لئے دو یا اس سے زائد انگوٹھیاں پہننا مکروہ ہے تاہم متعدد انگوٹھیاں بنانا مکروہ نہیں ہے، بشرطیکہ ان کو ایک ساتھ نہ پہنا جائے بلکہ نوبت بنوبت پہنا جائے۔

فتاویٰ قاضی خاں میں لکھا ہے کہ لوہے اور پیتل کی انگوٹھی وغیرہ پہننا مکروہ ہے اور مردوں کے لئے سونے کی انگوٹھی پہننا حرام ہے۔

محی السنۃؒ نے عورت کے مہر کے بارے میں حضرت سہلؓ کی جو روایت نقل کی ہے اس سے ان کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس شخص سے جو یہ فرمایا کہ بیوی کو مہر میں دینے کے لئے مال مہیا کرو اگرچہ وہ لوہے کی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو تو اس سے معلوم ہوا کہ اوپر روایت میں لوہے کی انگوٹھی پہننے کی جو ممانعت ثابت ہوتی ہے وہ تحریم کے لئے نہیں ہے کیونکہ اگر حقیقت میں لوہے کی انگوٹھی پہننا حرام ہوتا تو آپ ﷺ نکاح کے متمنی شخص کو لوہے کی انگوٹھی مہیا کرنے کے لئے کیوں فرماتے۔

مہر کے مال کے بارے میں مذکورہ ارشاد گرامی ﷺ کے متعلق علماء نے لکھا ہے کہ اس کا مقصد دراصل عورت کے مہر میں مال خرچ کرنے کی اہمیت و ضرورت کو زیادہ سے زیادہ تاکید کے ساتھ بیان کرنا ہے کہ مہر کے طور پر کوئی نہ کوئی مال ضرور مقرر کیا جائے خواہ وہ ادنیٰ ترین چیز ہی کیوں نہ ہو۔ اس ارشاد سے یہ بھی واضح ہوا کہ لوہے کی انگوٹھی پہننے کو اگرچہ ممنوع قرار دیا گیا ہے لیکن وہ انگوٹھی مال متقوم مالیت کے دائرے سے باہر نہیں ہے تاہم یہ بھی احتمال ہے کہ لوہے کی انگوٹھی پہننے کی اس ممانعت کے نفاذ و بیان کا زمانہ حضرت سہلؓ کی مذکورہ روایت کے بعد کا ہو، کیوں کہ یہ ثابت ہے کہ حضرت سہلؓ کی روایت استقراء سنن اور استحکام شرائع سے پہلے کی ہے اور حضرت بریدہؓ کی یہ روایت اس کے بعد کی ہے لہٰذا حضرت سہلؓ کی روایت منسوخ قرار پائے گی، نیز حضرت سہلؓ کی روایت باب المہر کی پہلی فصل میں گزر چکی ہے۔

وہ دس چیزیں جن کو آنحضرت برا سمجھتے تھے

⑮ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكْرَهُ عَشْرَ خِلَالٍ الصُّفْرَةَ يَعْنِي الْخَلُوْقَ وَتَغْيِيْرَ الشَّيْبِ وَجَرَّ الْاِزَارِ وَالتَّخَتُّمَ بِالذَّهَبِ وَالتَّبَرُّجَ بِالزِّيْنَةِ لِغَيْرِ مَحِلِّهَا وَالضَّرْبَ بِالْكِعَابِ وَالرُّقٰى اِلَّا بِالْمُعَوِّذَاتِ وَعَقْدَ التَّمَائِمِ وَعَزْلَ الْمَاءِ لِغَيْرِ مَحِلِّهٖ وَفَسَادَ الصَّبِيِّ غَيْرَ مُحَرِّمِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد و النسائی)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ دس چیزوں کو برا سمجھتے تھے ایک تو زردی یعنی خلوق کے استعمال کو، دوسرے بڑھاپا تبدیل کرنے کو، تیسرے (ٹخنوں سے نیچے) تہبند (یا پاجامہ کو لٹکا کر) کھینچتے ہوئے چلنے کو، چوتھے (مردوں کے لئے) سونے کی انگوٹھی پہننے کو، پانچویں عورت کا بے محل زینت ظاہر کرنے کو، چھویں نرد (چوسر) کھیلنے کو، ساتویں بجز معوذات کے جھاڑ پھونک کرنے کو، آٹھویں کوڑیوں اور منکوں کے باندھنے کو نویں بے موقع عزل یعنی عورت کی شرم گاہ سے باہر منی گرانے کو اور دسویں بچے کے خراب کرنے کو، اگرچہ آپ ﷺ اس کو حرام نہیں فرماتے تھے۔" (ابوداؤد، نسائیؒ)

تشریح: "خلوق" ایک قسم کی خوشبو کے کہتے ہیں جو زعفران وغیرہ سے بنائی جاتی ہے، خلوق استعمال کرنے کی یہ ممانعت صرف مردوں

کے لئے ہے عورتوں کو اس کا لگانا درست ہے اگرچہ ایسی احادیث بھی منقول ہیں جن سے مردوں کے لئے بھی خلوق کے استعمال کی اباحت ثابت ہوتی ہے لیکن ایسی احادیث زیادہ منقول ہیں جن سے ممانعت ثابت ہوتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اباحت کی حدیثیں منسوخ ہیں۔ مردوں کے لئے خلوق کا استعمال اس لئے ممنوع ہے کہ وہ خاص طور پر عورتوں کی خوشبو ہے۔

بڑھاپے کو تبدیل کرنا خواہ سفید بالوں کو چننے کی صورت میں ہو یا سیاہ خضاب لگانے کے ذریعہ ہو، یہ بہر صورت ممنوع ہے البتہ مہندی کا خضاب مستثنیٰ ہے کیوں کہ اس کے جواز میں احادیث کے منقول ہونے کی بناپر وہ بالاتفاق درست ہے، سفید بالوں کو اکھاڑنے اور چننے کے بارے میں حنفیہ کا مختار قول حرمت و کراہت کا ہے۔

والتبرج بالزینۃ لغیر محلھا میں لفظ محل حاء کے زیر کے ساتھ ہے جو "موضع حل" کے معنی میں ہے یعنی وہ جگہ جہاں عورت کو اپنا بناؤ سنگار ظاہر کرنا حلال ہے اور وہ جگہ اس کا شوہر اور اس کے محارم جیسے باپ اور بھائی وغیرہ ہیں، گویا مطلب یہ ہے کہ عورت کو اپنے خاوند اور اپنے محارم کے علاوہ دوسرے مردوں کے سامنے اپنا بناؤ سنگار ظاہر کرنا درست نہیں ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ الایۃ۔ بعض حضرات نے "محلھا" میں لفظ "محل" حاء کے زیر کے ساتھ بھی کہا ہے جو "حلول" سے ہے۔

"کعاب" کعب کی جمع ہے اور چوسر کی گوٹوں اور مہروں (پانسوں) کے معنی میں ہے جن کو قرعہ کی مانند پھینک پھینک کر چوسر کھیلا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ کھیل ممنوع ہے، چنانچہ اہل علم صحابہؓ کی اکثریت کے نزدیک یہ کھیل حرام تھا، حنفیہ شطرنج کھیلنے کو بھی مکروہ تحریمی کہتے ہیں۔

"رقی" رقیہ کی جمع ہے جس کے معنی منتر پڑھ کر پھونکنے کے ہیں اور "معوذات" سے مراد قرآن کی وہ آیتیں ہیں جو استعاذہ کے معنی پر مشتمل ہیں، خواہ وہ یہ دونوں سورتیں ہوں یا ان کے علاوہ دوسری آیات۔ حاصل یہ کہ قرآن کریم کی آیات، احادیث میں منقول دعاؤں اور اسماء الٰہی کے ذریعہ جھاڑ پھونک جائز ہے ان کے علاوہ کے ذریعہ حرام ہے، خاص طور پر ایسے الفاظ کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنا جن کے معنی معلوم نہ ہوں نہ صرف حرام ہے، بلکہ کفر کی حد میں داخل ہو جانے کے خوف کا بھی محتمل ہے۔

"تمائم" تمیمہ کی جمع ہے اس کے معنی ان منکوں (دانوں) اور ہڈیوں کے ہیں جن کو جوڑ کر عرب نظر نہ لگنے کے لئے بچوں کے گلے میں لٹکاتے تھے یہ زمانہ جاہلیت کے لوگوں کا خاص طریقہ تھا لیکن اسلام نے اس کی ممانعت فرما دی۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "تمائم" سے مراد وہ گنڈے اور منتر ہیں جن کی نوعیت مشرکانہ ہوتی ہے اور جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھے، لیکن وہ تعویذات وغیرہ جن میں آیات قرآنی، منقول دعائیں اور اسماء الٰہی لکھے ہوتے ہیں گلے میں لٹکانا جائز ہیں جیسا کہ حصن حصین میں منقول حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے۔

"بے موقع عزل" کا مطلب یہ ہے کہ حمل ٹھہر جانے کے خوف سے عزل کرنا اس صورت میں جائز ہے جب کہ عورت (بیوی) کی رضامندی حاصل ہو اگر اس کی رضامندی کے بغیر عزل کیا جائے گا تو وہ ایسا عزل ہوگا جو بے موقع کہلائے گا۔ جس کی ممانعت اس حدیث میں مذکور ہے، البتہ اگر عورت آزاد نہ ہو بلکہ لونڈی ہو تو وہ (لونڈی) چونکہ محل عزل ہے اس لئے اس کی رضامندی کے بغیر عزل کرنا جائز ہے۔

"بچے کو خراب کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ اس عورت کے ساتھ صحبت کی جائے جس کی گود میں دودھ پینے والا بچہ ہو، اور اس صحبت کے نتیجے میں وہ حاملہ ہو جائے، چونکہ اس حمل کی وجہ سے اس کا دودھ خراب ہو جاتا ہے اور وہ دودھ بچے کو نقصان پہنچاتا ہے کہ اس کو ضعف وغیرہ لاحق ہو جاتا ہے اس لئے دودھ پلانے والی عورت کے ساتھ صحبت کرنا گویا بچے کو نقصان پہنچانا ہے۔ دودھ والی عورت کے ساتھ صحبت کرنے کو "غیل" کہتے ہیں اور اس کا ذکر باب المباشرت میں گزر چکا ہے۔

"اگرچہ آپ ﷺ اس کو حرام نہیں فرماتے تھے" کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ آپ ﷺ دودھ پلانے کے زمانہ میں عورت کے ساتھ صحبت کرنے اور بچے کو نقصان پہنچانے کو ناپسند فرماتے تھے لیکن اس کو حرام قرار نہیں دیتے تھے کیونکہ منکوحہ عورت کے ساتھ جماع کرنا حلال ہے اور محض حمل کے احتمال سے کہ جس سے بچے کو مذکورہ نقصان پہنچنے کا تعلق ہے وہ عورت حرام نہیں ہوتی۔

عورت کو بجنے والا زیور پہننا ممنوع ہے

⑮ وَعَنِ ابْنِ الزُّبَيْرِ اَنَّ مَوْلَاةً لَهُمْ ذَهَبَتْ بِابْنَةِ الزُّبَيْرِ اِلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ وَفِي رِجْلِهَا اَجْرَاسٌ فَقَطَعَهَا عُمَرُ وَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَعَ كُلِّ جَرَسٍ شَيْطَانٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن زبیرؓ سے روایت ہے کہ ان کی آزاد کی ہوئی لونڈی حضرت زبیرؓ کی بچی کے پیروں میں گھنگرو تھے، حضرت عمرؓ نے ان گھنگروں کو کاٹ ڈالا اور فرمایا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر (جرس بجنے والی چیز) کے ساتھ شیطان ہوتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ شیطان کا مزمار (باجہ) ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے اَلجرس مذامیر الشیطان لہٰذا ہر جرس کے ساتھ شیطان ہوتا ہے کا مطلب یہ ہے کہ شیطان ہر بجنے والی چیز کی طرف لوگوں کو مائل کرتا ہے اور ان کی نظر میں اس کی آواز کو زیادہ سے زیادہ دلکش بناتا ہے۔

⑯ وَعَنْ بُنَانَةَ مَوْلَاةِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ حَيَّانَ الْاَنْصَارِيِّ كَانَتْ عِنْدَ عَائِشَةَ اِذْ دُخِلَتْ عَلَيْهَا بِجَارِيَةٍ وَعَلَيْهَا جَلَاجِلُ يُصَوِّتْنَ فَقَالَتْ لَا تُدْخِلْنَهَا عَلَيَّ اِلَّا اَنْ تُقَطِّعْنَ جَلَاجِلَهَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تَدْخُلُ الْمَلٰٓئِكَةُ بَيْتًا فِيْهِ جَرَسٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن حیان انصاریؓ کی آزاد کی ہوئی لونڈی بنانہؓ سے روایت ہے کہ وہ (ایک دن) حضرت عائشہؓ کے ہاں تھیں کہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں ایک چھوٹی لڑکی لائی گئی جو گھنگرو پہنے ہوئے تھی اور وہ بج رہے تھے، حضرت عائشہؓ نے (اس لڑکی کو لانے والی عورت سے) فرمایا کہ اس لڑکی کو میرے پاس اس وقت تک نہ لایا جائے جب تک کہ ان گھنگروں کا کاٹ کر پھینک نہ دیا جائے، کیوں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس گھر میں (رحمت کے) فرشتے داخل نہیں ہوتے جس میں باجے کی قسم کی کوئی چیز ہوتی ہے۔" (ابوداؤدؒ)

کسی مجبوری کے تحت سونے کے استعمال کی اجازت

⑰ وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ طَرَفَةَ اَنَّ جَدَّهٗ عَرْفَجَةَ بْنَ اَسْعَدَ قُطِعَ اَنْفُهٗ يَوْمَ الْكُلَابِ فَاتَّخَذَ اَنْفًا مِنْ وَرِقٍ فَاَنْتَنَ عَلَيْهِ فَاَمَرَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَتَّخِذَ اَنْفًا مِنْ ذَهَبٍ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن طرفہ سے روایت ہے کہ ان کے دادا حضرت عرفجہ ابن سعدؓ کی ناک کلاب کی لڑائی میں کاٹ ڈالی گئی تھی، انہوں نے چاندی کی ناک بنوائی لیکن اس میں بدبو پیدا ہو گئی، چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ان کو سونے کی ناک بنوانے کا حکم دیا۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: "کلاب" ایک جگہ کا نام ہے وہاں لڑائی ہوئی جس میں حضرت عرفجہؓ بھی شریک تھے اسی لڑائی کے دوران ان کی ناک کٹ گئی تھی جس کی وجہ سے ان کو چاندی کی ناک بنوا کر چہرے پر لگانی پڑی، لیکن اس میں بدبو پیدا ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے اس کو سونے کی ناک بنوانے کی اجازت عطا فرمائی۔ اس حدیث کی بناء پر علماء نے سونے کی ناک بنوانے کو اور اسی طرح دانتوں میں چاندی کا تارا باندھنے کو

مباح قرار دیا ہے، لیکن حضرت امام محمدؒ نے دانتوں میں سونے کا تار باندھنے کو بھی جائز کہا ہے۔

سونے کے زیوارت پہننے والی عورت کے بارے میں وعید

(۱۸) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّحَلِّقَ حَبِیْبَهٗ حَلْقَةً مِنْ نَارٍ فَلْیُحَلِّقْهُ حَلْقَةً مِنْ ذَهَبٍ وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّطَوِّقَ حَبِیْبَهٗ طَوْقًا مِنْ نَارٍ فَلْیُطَوِّقْهُ طَوْقًا مِنْ ذَهَبٍ وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّسَوِّرَ حَبِیْبَهٗ سِوَارًا مِنْ نَارٍ فَلْیُسَوِّرْهُ سِوَارًا مِنْ ذَهَبٍ وَلٰکِنْ عَلَیْکُمْ بِالْفِضَّةِ فَالْعَبُوْا بِهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے عزیز یعنی بیوی یا اولاد وغیرہ کو (ان کے کان یا ناک میں) آگ کا حلقہ پہنانا پسند کرتا ہو تو وہ اس کو سونے کا حلقہ ضرور پہنائے (یعنی سونے کا بالا وغیرہ پہنانے کی سزا یہ ہے کہ اس کو آگ کا بالا وغیرہ پہنایا جائے گا) جو شخص اپنے عزیز کی گردن میں آگ کا طوق ڈالنا پسند کرتا ہو تو وہ اس کو سونے کا گلوبند ضرور پہنائے اور جو شخص اپنے عزیز کو آگ کا کنگن پہنانا پسند کرتا ہو وہ اس کو سونے کا کنگن ضرور پہنائے، لیکن چاندی کے استعمال کی تمہیں اجازت ہے کہ تم اس کو اپنے استعمال و تصرف میں لاسکتے ہو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ "فَالْعَبُوْا بِهَا" کا اصل ترجمہ تو یہ ہے کہ تم چاندی سے کھیلو، یعنی چاندی کے زیورات بنوا کر اپنی عورتوں کو پہناؤ، اس کی انگوٹھی بنوا کر خود پہنو، اور اگر اپنے ہتھیار جیسے تلوار وغیرہ کی زینت و آرائش چاہو تو اس مقصد کے لئے بھی چاندی استعمال کر سکتے ہو، لیکن حدیث کے ان الفاظ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ دنیا کی زیب و زینت اور دنیا کے زیورات لہو و لعب میں داخل ہیں اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے مباح ہوں، یا اس طرف اشارہ ہے کہ زیور دار عورت کے ساتھ تفریح و دل چسپی لینا گویا اس کے زیور کے ساتھ کھیلنا ہے۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ کسی چیز کے ساتھ کھیلنا اس میں خواہش و مرضی کے مطابق تصرف کرنے کے مرادف ہے، لہٰذا ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی عورتوں کے زیور کے اقسام میں سے جس قسم کا زیور چاہو اس میں چاندی کا استعمال کرو، لیکن مردوں کو صرف انگوٹھی، تلواروں اور جنگ کے دوسرے ہتھیاروں کی زینت و آرائش کے لئے چاندی کا استعمال کرنا جائز ہے۔

(۱۹) وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ یَزِیْدَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَیُّمَا امْرَاَةٍ تَقَلَّدَتْ قِلَادَةً مِنْ ذَهَبٍ قُلِّدَتْ فِیْ عُنُقِهَا مِثْلُهَا مِنَ النَّارِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَاَیُّمَا امْرَاَةٍ جَعَلَتْ فِیْ اُذُنِهَا خُرْصًا مِنْ ذَهَبٍ جَعَلَ اللّٰهُ فِیْ اُذُنِهَا مِثْلَهٗ مِنَ النَّارِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت اسماء بنت یزیدؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو عورت سونے کا ہار پہنے قیامت کے دن اس کی گردن میں اسی طرح کا آگ کا ہار پہنایا جائے گا، اور جو عورت اپنے کان میں سونے کا بالا یا بالی پہنے گی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے کان میں اسی طرح کا آگ کا بالا یا بالی ڈالے گا۔" (ابوداؤدؒ)

(۲۰) وَعَنْ اُخْتٍ لِحُذَیْفَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ اَمَا لَکُنَّ فِی الْفِضَّةِ مَا تُحَلِّیْنَ بِهٖ اَمَا اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْکُنَّ امْرَاَةٌ تَحَلّٰی ذَهَبًا تُظْهِرُهٗ اِلَّا عُذِّبَتْ بِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت حذیفہؓ کی بہن سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اے عورتوں کی جماعت! کیا تمہارے لئے چاندی میں وہ بات نہیں ہے کہ تم اس کا زیور بناؤ (یعنی تمہارے لئے چاندی کا زیور بنوانا کافی ہے) یاد رکھو تم میں سے جو بھی عورت سونے کا زیور بنوائے گی اور پھر اس زیور کی (بے جا اور بے موقع) نمائش کرتی پھرے گی تو اس کو اس کے اس عمل کی بنا پر عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔"

(ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: اوپر جو حدیثیں نقل کی گئی ہیں ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عورتوں کو بھی خالص سونا پہننا منع ہے اور جو عورت سونے کے زیورات پہنے گی وہ حدیث میں مذکورہ وعید کا مورد ہوگی نیز یہ کہ عورتوں کو محض چاندی کا زیور پہننا مباح ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کے لئے دونوں مباح ہیں وہ سونے کے زیورات بھی پہن سکتی ہیں اور چاندی کے بھی۔ لہٰذا علماء نے ان احادیث کی مختلف تاویلیں بیان کی ہیں، بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ پہلے تو یہی حکم تھا کہ سونا پہننا عورتوں کے لئے بھی مباح نہیں لیکن بعد میں اس روایت کے ذریعہ اس حکم کو منسوخ قرار دیا گیا جس کو حضرت علیؓ نے نقل کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا حریر یعنی خالص ریشم اور سونا میری اُمت کے مردوں کے لئے حرام ہے پس اس ارشاد سے ثابت ہوا کہ عورتوں کو سونا اور خالص ریشم پہننا مباح ہے۔ بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ مذکورہ احادیث میں جو وعید بیان کی گئی ہے اس کا تعلق اس عورت سے ہے جو زکوٰۃ ادا کئے بغیر سونے کے زیورات پہنے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ وعید اس عورت کے حق میں ہے جو زیورات پہن کر اجنبی مردوں کو دکھلائے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اگر جنّت میں زیور اور ریشم پہننا چاہتے ہو تو دنیا میں ان چیزوں سے اجتناب کرو

(۲۱) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَمْنَعُ اَهْلَ الْحِلْيَةِ وَالْحَرِيْرِ وَيَقُوْلُ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ حِلْيَةَ الْجَنَّةِ وَحَرِيْرَهَا فَلَا تَلْبَسُوْهَا فِي الدُّنْيَا۔ (رواہ النسائی)

"حضرت عقبہ ابن عامرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ زیور والوں اور ریشم والوں کو منع فرماتے تھے (یعنی ان چیزوں کے پہننے کی ممانعت بیان کرتے تھے) اور فرماتے تھے کہ اگر تم جنّت کے زیور اور جنت کے ریشم کی خواہش رکھتے ہو کہ جنت میں تمہیں یہ چیزیں ملیں تو دنیا میں ان چیزوں کو نہ پہنو۔" (نسائیؒ)

آنحضرت ﷺ کی سونے کی انگوٹھی

(۲۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اتَّخَذَ خَاتَمًا فَلَبِسَهٗ قَالَ شَغَلَنِيْ هٰذَا عَنْكُمْ مُنْذُ الْيَوْمِ اِلَيْهِ نَظْرَةٌ وَاِلَيْكُمْ نَظْرَةٌ ثُمَّ اَلْقَاهُ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ایک انگوٹھی بنوائی اور اس کو پہنا پھر آپ ﷺ نے (حاضرین کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ آج کے دن اس انگوٹھی نے مجھ کو تمہاری طرف سے مشغول رکھا (یعنی میں تمہاری طرف متوجہ نہ رہ سکا) کیونکہ کبھی تو اس انگوٹھی کی طرف دیکھتا ہوں اور کبھی تمہاری طرف دیکھتا ہوں۔ اور (یہ کہہ کر) آپ ﷺ نے اس انگوٹھی کو اتار پھینکا۔" (نسائیؒ)

تشریح: بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث میں جس انگوٹھی کا ذکر کیا گیا ہے وہ سونے کی تھی۔

بچوں کو بھی سونا پہنانا منع ہے

(۲۳) وَعَنْ مَالِكٍ قَالَ اَنَا اَكْرَهُ اَنْ يَلْبَسَ الْغِلْمَانُ شَيْئًا مِنَ الذَّهَبِ لِاَنَّهٗ بَلَغَنِيْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ التَّخَتُّمِ بِالذَّهَبِ فَاَنَا اَكْرَهُهٗ لِلرِّجَالِ الْكَبِيْرِ مِنْهُمْ وَالصَّغِيْرِ۔ (رواہ فی المؤطا)

"اور حضرت امام مالکؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا میں اس کو برا سمجھتا ہوں کہ لڑکوں کو سونے کی کوئی چیز پہنائی جائے کیونکہ مجھ تک روایت پہنچی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے سونے کی انگوٹھی بھی استعمال کرنے سے منع فرمایا (اور جب انگوٹھی جیسی چیز بھی ممنوع ہے تو اور چیزیں بطریق اولیٰ ممنوع ہوں گی) لہٰذا میں مردوں کے لئے (سونا پہننا) برا سمجھتا ہوں خواہ وہ بڑے ہوں یا بچے ہوں!" (مؤطا)

تشریح: پس جس طرح مردوں کو سونے کی کوئی چیز خود پہننا یا لڑکوں کو پہنانا ممنوع ہے اسی طرح چاندی کی چیزیں بھی ممنوع ہیں علاوہ انگوٹھی کے نیز ریشم کا کپڑا بھی سونے چاندی کے حکم میں ہے۔

بَابُ النِّعَالِ
پاپوش کا بیان

"نعال"، نعل کی جمع ہے اور "نعل" اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ پیروں کو زمین سے بچایا جائے، جس چیز کے ذریعہ پیروں کی حفاظت کی جاتی ہے یعنی پاپوش اس کی ہیئت وقسم ہر دور میں اور ہر قوم وفرقہ کے لوگوں میں مختلف رہی ہے، خواہ وہ جوتے کی صورت میں ہو یا چپل وکھڑاؤں وغیرہ کی شکل میں ہو۔ اس بات کی اصل مراد آنحضرت ﷺ کے پاپوشوں کی ہیئت وصفات بیان کرنا ہے جو اس دور میں اہل عرب کے درمیان رائج تھیں، چونکہ اس زمانہ میں رائج پاپوش بھی مختلف اقسام کے ہوتے تھے اس لئے باب کے عنوان میں جمع کا صیغہ، نعال، استعمال کیا گیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آنحضرت ﷺ کی پاپوش مبارک

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلْبَسُ النِّعَالَ الَّتِىْ لَيْسَ فِيْهَا شَعْرٌ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو جو پاپوش مبارک پہنے ہوئے دیکھا ہے اس میں بال نہیں تھے!۔" (بخاریؒ)

(۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اِنَّ نَعْلَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ لَهَا قِبَالَانِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی پاپوش مبارک میں دو تسمے تھے۔" (البخاریؒ)

تشریح: "قبال" پاپوش کے تسمے کو کہتے ہیں جو انگلیوں کے بیچ میں ہوتا ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کی پاپوش مبارک میں دو تسمے تھے ایک انگوٹھے اور اس کے برابر والی انگلی کے درمیان رہتا تھا اور دوسرا تسمہ بیچ کی انگلی اور اس کے برابر والی انگلی جس کو عربی میں بنصر کہتے ہیں کے درمیان ہوتا تھا۔ اس پاپوش کو اس زمانے میں اہل عرب چپل کے طور پر استعمال کرتے تھے جس کو ہمارے یہاں عام طور پر گھر میں یا مسجد وغیرہ تک جانے کے لئے پہن لیا جاتا ہے۔

جوتے کی اہمیت

(۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ غَزْوَةٍ غَزَاهَا يَقُوْلُ اسْتَكْثِرُوْا مِنَ النِّعَالِ فَاِنَّ الرَّجُلَ لَا يَزَالُ رَاكِبًا مَا انْتَعَلَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایک غزوے کے موقع پر کہ جس میں جنگ ہوئی (یعنی کسی جہاد کے لئے روانگی کے وقت) نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بہت سی جوتیاں لے لو، کیونکہ آدمی جب تک جوتیاں پہنے ہوئے ہوتا ہے سوار کی مانند رہتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: جو شخص جوتا پہنے ہوئے ہوتا ہے وہ یقیناً ننگے پیر چلنے والوں کی بہ نسبت زیادہ تیز چلتا ہے اور اس کے پیر بھی تکلیف اور نقصانات سے محفوظ رہتے ہیں اسی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے جوتا پہننے والے شخص کو سوار کی مانند کہا گیا ہے، اس ارشاد گرامی میں گویا اس بات

کی طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے کہ اسباب سفر میں سے وہ چیزیں دوران سفر ضرور ساتھ رکھنی چاہئیں جن کی ضرورت پڑتی ہو۔

پہلے دایاں پیر جوتے میں ڈالو اور پہلے بائیں پیر کا جوتا اتارو

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا انْتَعَلَ اَحَدُكُمْ فَلْیَبْدَأْ بِالْیُمْنٰى وَاِذَا نَزَعَ فَلْیَبْدَأْ بِالشِّمَالِ لِتَكُنِ الْیُمْنٰى اَوَّلَهُمَا تُنْعَلُ وَاٰخِرَهُمَا تُنْزَعُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص جوتا پہنے تو اس کو چاہئے کہ دائیں پیر سے ابتدا کرے یعنی پہلے دایاں پیر جوتے میں ڈالے اور جب جوتا اتارے تو چاہئے کہ بائیں پیر سے ابتداء کرے یعنی پہلے بایاں پیر جوتے سے نکالے، حاصل یہ کہ دائیں پیر کو پہنتے وقت تو مقدم رکھنا چاہئے اور اتارتے وقت مؤخر رکھنا چاہئے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: مذکورہ مسئلہ میں اصل ضابطہ یہ ہے کہ جو عمل فضیلت و شان رکھتا ہو اس میں دائیں سے ابتداء کرنا مستحب ہے اور جو عمل ایسا نہ ہو اس میں بائیں سے ابتداء ہونی چاہئے، چنانچہ جوتا پہننا چونکہ مسجد میں جانے اور دوسرے اعمال خیر کا ذریعہ اور وسیلہ ہے اس لئے جوتا پہنتے وقت دائیں پیر سے ابتداء کرنا مستحب ہے اس ضابطہ کی روشنی میں یہ بھی مستحب ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے دائیں پیر رکھنا چاہئے اور مسجد سے نکلتے وقت پہلے بایاں پیر نکالنا چاہئے اس کے برخلاف بیت الخلاء جاتے وقت پہلے بایاں پیر اندر رکھنا چاہئے اور وہاں سے نکلتے وقت پہلے دایاں پیر نکالنا چاہئے۔ یہ تو ضابطہ کی بات تھی اس کے علاوہ اس حقیقت پر بھی نظر رہنی چاہئے کہ بائیں پیر کے مقابلہ میں دائیں پیر کو فضیلت اور برتری کا درجہ حاصل ہے لہٰذا اس کی تکریم کو ملحوظ رکھنا چاہئے اور اس کی تکریم یہی ہے کہ جب جوتا پہنا جائے تو پہلے دایاں پیر جوتے میں ڈالا جائے اور جب جوتا اتارا جائے تو پہلے بائیں پیر کا جوتا نکالا جائے تاکہ دایاں پیر بائیں پیر کی بہ نسبت جوتے میں زیادہ دیر تک رہے یہ گویا دائیں پیر کے اعزاز و احترام کا ذریعہ ہے اسی پر مسجد وغیرہ میں داخل ہونے اور وہاں سے نکلنے کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

ایک پیر میں جوتا اور ایک پیر ننگا نہ ہونا چاہئے

⑤ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَمْشِیْ اَحَدُكُمْ فِیْ نَعْلٍ وَاحِدَةٍ لِیُحْفِهِمَا جَمِیْعًا اَوْ لِیُنْعِلْهُمَا جَمِیْعًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص ایک پیر میں جوتا پہن کر نہ چلے، یہ ضروری ہے کہ یا تو دونوں پیر ننگے ہوں یا دونوں پیروں میں جوتے ہوں۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جوتا پہنے تو دونوں پیروں میں پہنے اور اگر نہ پہنے تو دونوں پیروں میں نہ پہنے ایک پاؤں میں جوتا پہننا اور دوسرے پاؤں کو ننگا رکھنا مکروہ تنزیہی ہے کیونکہ اول تو یہ طریقہ تہذیب و شائستگی کے خلاف ہے، دوسرے پیروں کے اونچے نیچے پڑنے اور گر جانے کا سبب بن سکتا ہے خاص طور پر اس صورت میں جب کہ جوتا اونچا اور زمین غیر ہموار ہو۔ علماء نے اس کے ساتھ ایک ہاتھ آستین سے باہر رکھنے کو بھی شامل کیا ہے یعنی اگر کوئی شخص کرتے وغیرہ کی ایک آستین میں تو ہاتھ ڈال لے لیکن دوسری آستین کو خالی چھوڑ کر کندھے پر ڈال لے تو اس کا بھی یہی حکم ہے اسی طرح ایک پاؤں میں جوتا پہننا اور دوسرے پاؤں میں محض موزہ پہن لینا بھی یہی حکم رکھتا ہے۔

⑥ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا انْقَطَعَ شِسْعُ نَعْلِهٖ فَلَا یَمْشِیْ فِیْ نَعْلٍ وَاحِدَةٍ حَتّٰى یُصْلِحَ شِسْعَهٗ وَلَا یَمْشِیْ فِیْ خُفٍّ وَاحِدٍ وَلَا یَاْكُلْ بِشِمَالِهٖ وَلَا یَحْتَبِیْ بِالثَّوْبِ الْوَاحِدِ وَلَا یَلْتَحِفِ الصَّمَّآءَ۔

(رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب کسی شخص کی جوتی یعنی چپل وغیرہ کا تسمہ ٹوٹ جائے تو ایک ہی جوتے میں نہ چلے بلکہ اس جوتی کا تسمہ درست کرلے اسی طرح ایک کپڑے میں گوٹ مارے (جب کہ اس کپڑے کا کوئی حصہ اس کے ستر کو چھپائے ہوئے نہ ہو) اور نہ کسی کپڑے کو بدن پر اس طرح لپیٹ لے کہ ہاتھ بھی اندر رہیں (اور ہاتھ نکالتے وقت ستر کھل جائے)۔" (مسلم)

اَلْفَصْلُ الثَّانِي

آنحضرت ﷺ کی پاپوش مبارک کے تسمے

⑦ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ لِنَعْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قِبَالَانِ مُثَنًّى شِرَاكُهُمَا۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی پاپوش مبارک میں دو تسمے تھے جن میں پیروں کی انگلیاں رہتی تھیں اور ان دونوں میں ہر تسمہ دوہرا تھا تاکہ تسمے کی مضبوطی بھی قائم رہے اور پاؤں میں دھنستے بھی نہیں۔" (ترمذیؒ)

کھڑے ہو کر جوتا پہننے کی ممانعت

⑧ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّنْتَعِلَ الرَّجُلُ قَائِمًا رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَرَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے کھڑے ہو کر جوتا پہننے سے منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ وابن ماجہؒ) نے اس روایت کو ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: یہ ممانعت اس صورت میں ہے جب کہ کھڑے ہو کر جوتا پہننے میں مشقت اٹھانا پڑتی ہو، یعنی ایسا جوتا ہو جس کو پہننے اور اس کا تسمہ باندھنے میں ہاتھ لگانا پڑتا ہو، ویسے مطلق جوتے کے بارے میں یہ ممانعت نہیں ہے۔

کیا آنحضرت ﷺ ایک پاؤں میں جوتا پہن کر چلتے پھرتے تھے

⑨ وَعَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ رُبَّمَا مَشَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ نَعْلٍ وَاحِدَةٍ وَفِيْ رِوَايَةٍ اِنَّمَا مَشَتْ بِنَعْلٍ وَاحِدَةٍ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا اَصَحُّ۔

"اور حضرت قاسم ابن محمدؒ، حضرت عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا نبی کریم ﷺ بعض وقت ایک پاپوش پہن کر چلتے تھے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت عائشہؓ ایک پاپوش پہن کر چلیں۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے یہ روایت اسناد کے اعتبار سے یا مفہوم ومعنی کے اعتبار سے نہایت صحیح ہے۔"

تشریح: جن احادیث میں ایک پاؤں میں جوتا پہن کر چلنے کی ممانعت منقول ہے یہ حدیث ان کے بالکل متضاد ہے، چنانچہ علماء نے اس حدیث کے صحیح ہونے میں شک و شبہ کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر اس حدیث کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس صورت میں آنحضرت ﷺ کا یہ عمل نادر کے درجہ میں ہوگا۔ اور یہ کہ اس کا تعلق گھر کے اندر سے ہوگا نہ کہ باہر سے یعنی آپ ﷺ گھر کے اندر کسی موقع پر ایک جوتا پہن کر چلے ہوں گے اور وہ بھی کسی ضرورت و مجبوری کی بنا پر، یا بیان جواز کی خاطر تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ایک پیر میں جوتا پہن کر چلنا بالکل حرام نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز اُمت کے حق میں مکروہ تنزیہی ہے اس کا شارع علیہ السلام کے عمل میں آنا اس چیز کے اصل جواز کو ظاہر کرنے کے لئے ہوتا ہے، اس اعتبار سے وہ چیز گویا شارع کے حق میں مکروہ ہوتی ہی نہیں بلکہ کسی چیز کے جواز کو بیان کرنا شارع پر واجب ہے اس نکتہ کو صاحب مواہب لدنیہ نے آنحضرت ﷺ کے کھڑے ہو کر پانی پینے کے ضمن میں بیان کیا ہے۔

جوتے اتار کر بیٹھو

⑩ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مِنَ السُّنَّةِ اِذَا جَلَسَ الرَّجُلُ اَنْ يَخْلَعَ نَعْلَيْهِ فَيَضَعَهُمَا بِجَنْبِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ یہ بات سُنّت سے ثابت ہے کہ جب کوئی شخص بیٹھے تو اپنے جوتے اتارے اور ان کو اپنے پہلو میں رکھ لے!۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جوتے سمیت نہ بیٹھے بلکہ ان کو اتار کر بیٹھے کہ یہ آداب مجلس کا تقاضہ بھی ہے اور تہذیب وشائستگی کی علامت بھی، نیز جوتوں کو اپنے بائیں پہلو کی طرف رکھے تاکہ دائیں پہلو کی تکریم برقرار رہے، سامنے کی طرف بھی نہ رکھے، تاکہ اگر مسجد وغیرہ میں بیٹھا ہوا ہے تو قبلہ کی تعظیم کے خلاف نہ ہو، اور چوری ہو جانے کے خوف سے پیچھے کی طرف بھی نہ رکھے۔

آنحضرت ﷺ کے لئے نجاشی کی طرف سے پائتابوں کا ہدیہ

⑪ وَعَنِ ابْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ النَّجَاشِيَّ اَهْدٰى اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُفَّيْنِ اَسْوَدَيْنِ سَاذَجَيْنِ فَلَبِسَهُمَا رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَزَادَ التِّرْمِذِيُّ عَنِ ابْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ ثُمَّ تَوَضَّأَ وَمَسَحَ عَلَيْهِمَا۔

"اور حضرت ابن بریدہؓ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ نجاشی (حبش کے بادشاہ) نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں دو سیاہ موزے (یعنی کالے چمڑے کے پائتابے) بطور ہدیہ بھیجے جو سادہ یعنی غیر منقش تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کو بحالت طہارت پہنا۔ (ابن ماجہؒ) اور ترمذیؒ نے اس روایت کو ابوہریرہؓ اور انھوں نے اپنے والد سے نقل کیا ہے یعنی ترمذی کی روایت میں عن ابن بریدۃ کے بجائے عن ابی بریرۃ ہے اور ان کی روایت میں ان الفاظ کا اضافہ بھی ہے کہ پھر آنحضرت ﷺ نے وضو کیا اور ان موزوں پر مسح کیا۔"

تشریح: وہ موزے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے تو آپ ﷺ نے یہ تحقیق وتفتیش نہیں کی کہ یہ موزے جس چمڑے کے ہیں آیا وہ دباغت دیا گیا تھا یا نہیں اور یہ کہ چمڑہ مردار کا ہے یا ذبح کئے ہوئے جانور کا، ان باتوں کو پوچھے بغیر آپ ﷺ نے وہ موزے پہن لئے، گویا آپ ﷺ نے ان موزوں کی ظاہری صورت حال کا اعتبار کیا کہ ظاہر میں ان پر کسی نجاست وغیرہ کے آثار نہیں تھے اس لئے ان کو پاک سمجھا اس سے کورے کپڑوں، بوریوں، چٹائیوں، قالین، دریوں اور شطرنجی اور دوسرے فرش وفروش کا یہ حکم معلوم ہوا کہ اگر ان پر ظاہر میں کوئی نجاست وغیرہ محسوس نہ ہو تو وہ پاک سمجھے جائیں گے۔

بَابُ التَّرَجُّلِ

کنگھی کرنے کا بیان

"ترجل" عربی زبان میں کنگھی کرنے کو کہتے ہیں، خواہ اس کا تعلق سر میں کنگھی کرنے کا ہو یا داڑھی میں لیکن عام طور پر "ترجل" کا استعمال سر میں کنگھی کرنے کے معنی میں ہوتا ہے اور داڑھی میں کنگھی کرنے کو "تسریح" کے لفظ سے بیان کرتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حائضہ کا بدن ناپاک نہیں ہوتا

① عَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ كُنْتُ اُرَجِّلُ رَأْسَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا حَائِضٌ۔ (متفق علیہ)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں اپنے ایام حیض میں بھی رسول کریم ﷺ کے سر مبارک میں کنگھی کیا کرتی تھی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حائضہ کا بدن ناپاک نہیں ہوتا، اور یہ کہ اس (حائضہ) کے ساتھ اختلاط جائز ہے۔

وہ چیزیں جو "فطرت" ہیں

② وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْفِطْرَةُ اَخْمَسُ اَلْخِتَانُ وَالْاِسْتِحْدَادُ وَقَصُّ الشَّارِبِ وَتَقْلِیْمُ الْاَظْفَارِ وَنَتْفُ الْاِبْطِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا پانچ چیزیں فطرت میں (داخل) ہیں ایک تو ختنہ کرانا دوسرے (زیر ناف بالوں کو صاف کرنے کے لئے لوہے) یعنی استرے وغیرہ کا استعمال کرنا، تیسرے لبوں کے بال ترشوانا چوتھے ناخون کٹوانا اور پانچویں بغل کے بال صاف کرانا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "فطرت" کا مطلب یہ ہے کہ یہ پانچ چیزیں تمام انبیاء کرام صلوات اللہ علیہم اجمعین کی شریعت میں مسنون رہی ہیں۔ واضح رہے کہ فطرت سے متعلق حدیث کتاب کے ابتدائی حصے میں باب السواک میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں دس چیزوں کو فطرت میں شمار کرایا گیا تھا اور یہاں پانچ چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہ تو وہاں حصر مقصود تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ جو چیزیں تمام انبیاء کرام کی سُنّت ہونے کی وجہ سے فطرت کا درجہ رکھتی ہیں ان میں سے دس چیزیں یہ ہیں (جن کو باب السواک میں بیان کیا گیا ہے) اور پھر ان دس چیزوں میں سے پانچ چیزیں علیحدہ کر کے یہاں بیان کی گئی ہیں۔

اپنے کو اہل شرک سے ممتاز رکھو

③ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَالِفُوا الْمُشْرِكِیْنَ اَوْفِرُوا اللُّحٰی وَاَحْفُوا الشَّوَارِبَ وَفِیْ رِوَایَةٍ اَنْهِكُوا الشَّوَارِبَ وَاَعْفُوا اللُّحٰی۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل شرک کے خلاف کرو یعنی وہ چونکہ داڑھیاں پست کراتے ہیں اور مونچھیں بڑھاتے ہیں اس لئے تم بایں طور ان سے اپنے آپ کو ممتاز رکھو کہ تم داڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں ہلکی کراؤ اور ایک روایت میں یوں ہے کہ تم مونچھیں نہایت ہلکی کراؤ اور داڑھیاں چھوڑ دو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

زائد بالوں کو صاف کرنے کی مدت

④ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ وُقِّتَ لَنَا فِیْ قَصِّ الشَّارِبِ وَتَقْلِیْمِ الْاَظْفَارِ وَنَتْفِ الْاِبْطِ وَحَلْقِ الْعَانَةِ اَنْ لَا نَتْرُكَ اَكْثَرَ مِنْ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مونچھیں ترشوانے، ناخون کٹوانے، بغل کے بال صاف کرانے اور زیر ناف بال مونڈنے کے بارے میں ہمارے لئے جو مدت متعیّن کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم ان کو چالیس دن سے زیادہ نہ چھوڑیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابو عمرؓ سے منقول ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ناخون اور لبوں کے بال، ہر جمعہ کو ترشواتے تھے، زیر ناف بال بیس دن میں صاف کرتے تھے، اور بغل کے بال چالیس دن میں صاف کراتے تھے۔ قنیہ میں لکھا ہے کہ افضل یہ ہے کہ ہفتہ میں ایک بار ناخون ترشوا کر، لبوں کے بال ہلکے کرا کر اور جسم کے زائد بال صاف کر کے غسل کے ذریعہ اپنے بدن کو صاف ستھرا کیا جائے اگر ہر ہفتہ یہ ممکن نہ ہو تو ہر پندرھویں دن اس پر عمل کیا جائے، یہاں تک کہ چالیس دن سے زائد کا عرصہ گزر

جائے تو یہ "بلاعذر ترک" کہلائے گا گویا ان چیزوں کے لئے ایک ہفتہ تو افضل مدت ہے پندرہ روزہ مدت اوسط درجہ پر مشتمل ہے اور آخری مدت چالیس دن ہے چالیس دن سے زیادہ گذارنے والا بلاعذر ترک کرنے والا شمار ہوگا، جس پر حنفیہ کے نزدیک وہ وعید کا مستحق ہوگا۔

مظہرؒ کہتے ہیں کہ ابوعمر اور عبداللہ الاغر سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ ہر جمعہ کے دن جمعہ کی نماز کو جانے سے پہلے لبوں کے بال اور ناخون کترتے تھے، اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ بغل کے بال اور ناف کے نیچے کے بال چالیس دن میں اور بعض حضرات کی روایت کے مطابق ایک مہینہ میں صاف کرتے تھے، ایک مہینہ والی روایت ایک معتدل قول ہے۔

خضاب کرنے کا مسئلہ

⑤ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْیَهُوْدَ وَالنَّصَارٰی لَایَصْبِغُوْنَ فَخَالِفُوْهُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "یہودی اور عیسائی خضاب نہیں لگاتے لہٰذا تم ان کے خلاف کرو۔"
(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تم لوگ خضاب لگا کر یہودیوں اور عیسائیوں کی مخالفت کو ظاہر کرو۔ واضح رہے کہ "خضاب" سے مراد وہ خضاب ہے جو سیاہ نہ ہو کیونکہ سیاہ خضاب لگانا ممنوع ہے، اس کی تفصیلی بحث آگے آئے گی، جہاں تک صحابہؓ وغیرہ کا تعلق ہے تو وہ مہندی کا سرخ خضاب کرتے تھے اور کبھی کبھی زرد خضاب بھی کر لیا کرتے تھے چنانچہ مہندی کا خضاب لگانے کے بارے میں متعدد احادیث منقول ہیں اور علماء نے لکھا ہے کہ مہندی کا خضاب مؤمن ہونے کی ایک علامت ہے، تمام علماء کے نزدیک مہندی کا خضاب لگانا جائز ہے، بلکہ بعض فقہاء نے مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے اس کو مستحب بھی کہا ہے اور اس کے فضائل میں وہ احادیث بھی نقل کرتے ہیں اگرچہ ان احادیث کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

مجمع البحار میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں خضاب کرنے کا حکم ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جن کے بال کھچڑی یعنی کچھ سیاہ اور کچھ سفید ہوں، بلکہ ان لوگوں کے لئے ہے جن کے بال بالکل سفید ہو گئے ہوں اور سیاہ بالوں کا نام و نشان بھی باقی نہ رہ گیا ہو، جیسا کہ حضرت ابوقحافہؓ کے بال تھے جن کے متعلق اگلی حدیث میں ذکر آ رہا ہے۔ اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ خضاب کے مسئلہ میں علماء کے اقوال مختلف ہیں اور اس اختلاف کی بنیاد احوال کے مختلف ہونے پر ہے۔ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس حکم کا تعلق اس مسلم شہر و علاقہ کے لوگوں سے ہے جہاں خضاب لگانے کا عام دستور ہو کہ اگر کوئی شخص اپنے شہر کے لوگوں کے تعامل و عادت سے اپنے آپ کو الگ رکھے گا تو غیر مناسب شہرت کا حامل ہوگا جو مکروہ ہے اور بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے بالوں کی سفیدی اس کے باوقار و پاکیزہ بڑھاپے کی علامت اس کے چہرے مہرے کی نورانیت اور خوشنمائی کا سبب ہو بلکہ، خضاب کرنے سے اس کی شخصیت کا وقار بھیکا پڑ جاتا ہو تو اس کے حق میں خضاب نہ کرنا ہی زیادہ بہتر اور زیادہ مناسب ہے اس کے برخلاف جس شخص کے بالوں کی سفیدی اس کے بدنما اور بے وقت بڑھاپے کی غماز ہو جس کی وجہ سے اس کی شخصیت کی دل کشی مجروح ہوتی ہو تو اس کو اپنا یہ عیب چھپانا اور خضاب لگانا زیادہ بہتر و مناسب ہے۔

⑥ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اُتِیَ بِاَبِیْ قُحَافَةَ یَوْمَ فَتْحِ مَکَّةَ وَرَاْسُهٗ وَلِحْیَتُهٗ کَالثَّغَامَةِ بَیَاضًا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ غَیِّرُوْا هٰذَا بِشَیْءٍ وَاجْتَنِبُوا السَّوَادَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (حضرت ابوبکر صدیق کے والد) ابوقحافہؓ کو فتح مکہ کے دن لایا گیا اور اسی دن انہوں نے اسلام قبول کیا ان کے سر اور داڑھی کے بال گویا ثغامہ تھے یعنی بالکل سفید تھے نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ان بالوں کی سفیدی کو کسی چیز کے ذریعہ بدل

ڈالو لیکن سیاہ رنگ سے اجتناب کرنا، یعنی سیاہ خضاب استعمال نہ کرنا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "ثغامہ" ایک قسم کی گھاس کو کہتے ہیں جس کے شگوفے اور پھل سفید ہوتے ہیں اس گھاس کو فارسی میں ورمغہ کہا جاتا ہے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سیاہ خضاب مکروہ حرام ہے اور مطالب المؤمنین میں علماء کا یہ قول لکھا ہے کہ اگر کوئی غازی و مجاہد دشمنان دین کی نظر میں اپنی ہیبت قائم کرنے کے لئے سیاہ خضاب کرے تو جائز ہے اور جو شخص اپنے نفس کو خوش کرنے کے لئے زینت و آرائش کی خاطر اور عورت کی نظر میں دل کش بننے کے لئے سیاہ خضاب کرے تو یہ اکثر علماء کے نزدیک ناجائز ہے۔ اس سلسلے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں جو کچھ منقول ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ مہندی اور وسمہ (نیل کے پتے) کا خضاب کرتے تھے اور اسی خضاب کی وجہ سے ان کے بالوں کا رنگ سیاہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ سرخ مائل بہ سیاہی ہوتا تھا، اسی طرح اس سلسلے میں بعض دوسرے صحابہؓ کے متعلق جو روایات نقل کی جاتی ہیں وہ بھی اسی پر محمول ہیں۔

حاصل یہ کہ مہندی کا خضاب بالاتفاق جائز ہے اور سیاہ خضاب میں حرمت و کراہت ہے بلکہ اس کے بارے میں بڑی سخت وعید بیان کی گئی ہے، جیسا کہ دوسری فصل میں بیان ہو گا۔

سر کے بالوں میں فرق وسدل دونوں جائز ہیں

(۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّ مُوَافَقَةَ اَهْلِ الْكِتَابِ فِيْمَا لَمْ يُؤْمَرْ فِيْهِ وَكَانَ اَهْلُ الْكِتَابِ يَسْدُلُوْنَ اَشْعَارَهُمْ وَكَانَ الْمُشْرِكُوْنَ يَفْرُقُوْنَ رُءُ سَهُمْ فَسَدَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَاصِيَتَهٗ ثُمَّ فَرَقَ بَعْدُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو جس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم نہیں ملتا تھا اس میں آپ ﷺ اہل کتاب کی موافقت کو پسند فرماتے تھے، چنانچہ اہل کتاب اپنے (سر کے) بالوں کو یوں ہی چھوڑے رکھتے تھے (یعنی وہ مانگ نہیں نکالتے تھے بلکہ اپنے بالوں کو یونہی پڑے رہنے دیتے تھے) جب کہ مشرکین اپنے سروں میں مانگ نکالتے اس لئے نبی کریم ﷺ (اہل کتاب کے طریقے کے مطابق) اپنی پیشانی کے بال یوں ہی چھوڑے رکھتے تھے لیکن بعد میں مانگ نکالنے لگے تھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "سدل" کے معنی ہیں سر کے بالوں کو چاروں طرف یونہی چھوڑے اور لٹکائے رکھنا اور مانگ نکالنے کے لئے دونوں طرف کے بالوں کو اکٹھا نہ کرنا اور فرق کا مطلب ہے سر کے آدھے بالوں کو ایک طرف اور آدھے بالوں کو دوسری طرف اکٹھا کر لینا۔ نیز قاموس میں لکھا ہے کہ "فرق" بالوں کے درمیان پیدا کی جانے والی راہ یعنی مانگ کو کہتے ہیں۔

جیسا کہ بیان کیا گیا، نبی کریم ﷺ جب مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو ابتداء میں اہل کتاب کی موافقت میں پیشانی کے بالوں کو سدل کرتے تھے، یعنی یوں ہی بے ترتیب چھوڑے رکھتے، کیونکہ اہل کتاب کا طریقہ سدل ہی کا تھا۔ واضح رہے کہ "سدل" کا مطلب اگرچہ بالوں کے سر کے چاروں طرف یونہی رکھنا ہے اور اس میں پیشانی کے بالوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے، لیکن سدل اور فرق کے درمیان امتیاز چونکہ پیشانی کے اوپر کے بالوں ہی سے ظاہر ہوتا ہے اس سبب سے خاص طور سے پیشانی کے بالوں کو ذکر کیا گیا ہے اگرچہ طیبیؒ نے کہا ہے کہ یہاں "سدل" سے مراد محض پیشانی کے بالوں کو چھوڑے رکھنا ہے۔

حدیث سے معلوم ہوا کہ شروع میں تو آنحضرت ﷺ کا معمول سدل ہی کا تھا لیکن بعد میں فرق یعنی مانگ نکالنا آخری عمل پایا، لہٰذا اس بنا پر بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ سدل یعنی بالوں کو یوں ہی چھوڑے رکھنا منسوخ ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ کو چھوڑ کر فرق کو اختیار کرنا حکم الٰہی (وحی) کے سبب تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو یہ اجازت تھی کہ جس معاملہ میں ابھی کوئی شرعی حکم نازل نہیں ہوا ہے اس میں اہل کتاب کے دستور کے مطابق عمل کیا جا سکتا ہے، چنانچہ جب بالوں کے بارے میں آپ ﷺ کو بذریعہ وحی

فرق یعنی مانگ نکالنے کا حکم دیا گیا تو یہ اس بات کی علامت قرار پایا کہ بالوں کے سلسلے میں عارضی طور پر اہل کتاب کے دستور کے مطابق عمل کرنے کی جو اجازت تھی وہ منسوخ ہوئی اس سے خود بخود یہ واضح ہو گیا کہ فرق کا حکم آخری و حتمی ہے اس لئے اس بارے میں اہل کتاب کی مخالفت یعنی سدل کو ترک کرنا بھی حتمی ہی طور پر ہونا چاہئے۔

اس حدیث سے بعض حضرات نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی شریعت ہمارے لئے قابل اتباع ہے جب تک کہ ہمیں اس کے برخلاف عمل کرنے کا حکم نہ دیا جائے، لیکن یہ اتباع انہیں چیزوں میں ہوگا جن کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ جوں کے توں وہی احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ نے پچھلی شریعت میں نازل کئے تھے۔

روایت کے ان الفاظ "یحب موافقتھم" (آپ ﷺ اہل کتاب کی موافقت کو پسند فرماتے تھے) سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان معاملات میں بھی اہل کتاب کی موافقت کرنے کو آنحضرت ﷺ کے محض اختیار پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ اگر آپ ﷺ پسند کریں تو اہل کتاب کے مطابق عمل کریں اور اگر پسند نہ کریں تو عمل نہ کریں اگر یہ (یعنی موافقت کرنے کا حکم) اسی درجہ کا ہوتا، جس درجہ کا کوئی شرعی حکم ہوتا ہے تو اس میں آنحضرت ﷺ کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا، بلکہ ایک واجب اور لازم امر ہوتا۔

بعض احادیث میں یہ بھی منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ معمول تھا کہ اگر آپ ﷺ کے بال بے ترتیب اور بکھرے ہوئے ہوتے تو ان کو اکٹھا کر کے مانگ نکال لیتے تھے ورنہ ان کی حالت پر چھوڑے رکھتے تھے۔ گویا عام حالات میں (جب کہ بال بکھرے ہوئے نہ ہوتے) آپ ﷺ سدل یا دونوں میں سے کسی کا بھی اہتمام و تکلف نہیں فرماتے تھے بلکہ ان بالوں کو ان کی حالت پر رہنے دیتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ سدل اور فرق دونوں جائز ہیں لیکن فرق افضل ہے۔

"قزع" کی ممانعت

⑧ وَعَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهٰى عَنِ الْقَزَعِ قِيْلَ لِنَافِعٍ مَا الْقَزَعُ قَالَ يُحْلَقُ بَعْضُ رَاسِ الصَّبِيِّ وَيُتْرَكُ الْبَعْضُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَالْحَقَ بَعْضُهُمُ التَّفْسِيْرَ بِالْحَدِيْثِ۔

"اور حضرت نافع، حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں نے نبی کریم ﷺ کو "قزع" سے منع فرماتے ہوئے سنا، حضرت نافعؒ سے پوچھا گیا کہ قزع کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا (قزع اس کو کہتے ہیں کہ) لڑکے کے سر کے بعض حصہ کو مونڈا جائے، اور بعض حصے کو چھوڑ دیا جائے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور بعض راویوں نے وضاحت کو حدیث کے ساتھ جوڑا ہے، یعنی ان راوی کے مطابق، قزع کے یہ معنی آنحضرت ﷺ ہی نے بیان فرمائے۔"

تشریح: نوویؒ کہتے ہیں کہ قزع کے معنی مطلق (کسی کے بھی) سر کے کچھ حصے کو مونڈنا (اور کچھ حصے کو بغیر مونڈے چھوڑ دینا ہیں)۔ اور یہی معنی زیادہ صحیح ہیں، کیوں کہ حدیث کے راوی نے بھی یہی معنی بیان کئے ہیں اور یہ حدیث کے ظاہری مفہوم کے مخالف بھی نہیں ہیں، لہٰذا اسی معنی پر اعتماد کرنا واجب ہے! جہاں تک "لڑکے" کی تخصیص کا ذکر ہے تو یہ محض عام رواج و عادت کی بنا پر ہے ورنہ قزع جس طرح لڑکے کے حق میں مکروہ ہے، اس طرح بڑوں کے حق میں بھی مکروہ ہے، اسی لئے فقہی روایات میں یہ مسئلہ کسی قید و استثناء کے بغیر بیان کیا جاتا ہے، اور قزع میں کراہت اہل کفر کی مشابہت اور بدہیئتی سے بچانے کے لئے ہے۔

راوی نے "قزع" کا جو مطلب بیان کیا ہے اور جس کو نوویؒ نے زیادہ صحیح کہا ہے اس میں چوٹی (جیسا کہ غیر مسلم اپنے سر چھوڑتے ہیں) (زلف اور بالوں کی) وہ تراش خراش شامل ہے جو مسنون طرز کے خلاف ہو۔

⑨ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى صَبِيًّا قَدْ حُلِقَ بَعْضُ رَاسِهٖ وَتُرِكَ بَعْضُهٗ فَنَهَاهُمْ عَنْ ذٰلِكَ وَقَالَ احْلِقُوْ كُلَّهٗ اَوِ اتْرُكُوْا كُلَّهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے ایک ایسے لڑکے کو دیکھا جس کے سر کا کچھ حصہ مونڈا گیا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے لڑکے کی پرورش کرنے والوں کو اس سے منع فرمایا اور فرمایا کہ پورے سر کو مونڈ دیا پورے سر کو چھوڑ دو!" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ حج و عمرہ کے علاوہ بھی سر منڈانا جائز ہے۔ ویسے مسئلہ یہ ہے کہ مرد کو اختیار ہے کہ وہ چاہے سر منڈائے اور چاہے سر پر بال رکھے لیکن افضل یہ کہ سوائے حج اور عمرہ کے سر نہ منڈائے، جیسا کہ آنحضرت ﷺ اور حضرت علیؓ کے علاوہ دوسرے صحابہ کرامؓ کا معمول تھا اور کتاب کے ابتدائی حصہ میں باب الجنایت کے دوران اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

مخنث پر آنحضرت ﷺ کی لعنت

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَعَنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُخَنَّثِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالْمُتَرَجِّلَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَقَالَ اَخْرِجُوْهُمْ مِنْ بُيُوْتِكُمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مخنث مردوں پر لعنت فرمائی ہے، اور ان عورتوں پر بھی لعنت فرمائی جو مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مخنثوں کو اپنے گھروں سے نکال باہر کرو۔" (بخاریؒ)

تشریح: مُخَنَّث یا مُخَنِّث (زیادہ صحیح مُخَنَّث ہی ہے) کی اصل "خنث" ہے جس کے لغوی معنی نرمی اور شکستگی کے ہیں۔ مخنث اس مرد کو کہتے ہیں جو عورتوں کا سا لباس پہنے، عورتوں کی طرح ہاتھ پیروں کو مہندی کے ذریعہ رنگین کرے، بات چیت میں عورتوں کا لب و لہجہ اختیار کرے، اور اسی طرح جملہ حرکات و سکنات میں عورتوں کا انداز اپنائے، ایسے مرد کو ہماری بول چال میں ہجڑہ یا زنانہ بھی کہا جاتا ہے۔ مخنث دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو خلقی کہ ان کے اعضاء جسم اور انداز میں خلقی اور جبلی طور پر عورتوں کی سی نرمی و لچک ہوتی ہے، گویا ان میں قدرتی طور پر عورتوں کے اوصاف و عادات ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بعض مرد اگرچہ اپنے اعضاء جسم اور خلقت و جبلت کے اعتبار سے مکمل مرد ہوتے ہیں مگر جان بوجھ کر اپنے کو عورت بنانا چاہتے ہیں چنانچہ وہ بات چیت کے انداز اور رہن سہن کے طور طریقوں میں عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں، یہاں تک کہ اپنے فوطے اور عضو تناسل کٹوا کر، نامرد بھی بن جاتے ہیں، مخنثوں کی اسی قسم کے حق میں لعنت و مذمت فرمائی گئی ہے، اس کے برخلاف پہلی قسم اس لعنت سے مستثنیٰ ہے کیونکہ وہ تو معذوری کی شکل ہے اس میں اپنے قصد و اختیار کا کوئی دخل نہیں ہے۔

اسی طرح ان عورتوں پر بھی لعنت فرمائی گئی ہے جو اپنے آپ کو وضع قطع، رہن سہن اور لباس وغیرہ میں مردوں کے مشابہ بناتی ہیں۔

شرعۃ الاسلام کی شرح میں لکھا ہے کہ مہندی لگانا عورتوں کے لئے تو مسنون ہے اور مردوں کے لئے بلاعذر لگانا مکروہ ہے، کیونکہ اس میں عورتوں کی مشابہت لازم آتی ہے۔ اس قول سے یہ مسئلہ بھی واضح ہوتا ہے کہ عورتوں کے لئے مہندی سے بالکل عاری رہنا مکروہ ہے کیونکہ اس صورت میں اس کی مردوں کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے۔

(۱۱) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ اللّٰهُ الْمُتَشَبِّهِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَآءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَآءِ بِالرِّجَالِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو مرد عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں اور جو عورتیں مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے۔" (بخاریؒ)

انسانی بال سے نفع اٹھانا حرام ہے

(۱۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاصِلَةَ وَالْمُسْتَوْصِلَةَ وَالْوَاشِمَةَ وَالْمُسْتَوْشِمَةَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو عورت اپنے بالوں میں کسی دوسری عورت کے بالوں کا جوڑ لگائے (خواہ خود لگائے اور خواہ کسی دوسرے سے لگوائے) اور جو عورت کسی دوسری عورت کے بالوں میں اپنے بالوں کا جوڑ لگائے اور جو عورت گودے اور جو عورت گدوائے ان سب پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "بالوں کا جوڑ لگائے یا لگوائے" سے مراد یہ ہے کہ بالوں کے حسن و درازی کے لئے کوئی عورت کسی دوسری عورت کے بالوں کا چوٹا لے کر اپنی چوٹی میں شامل کرے، یا اپنے بالوں کا چوٹا لے کر کسی دوسری عورت کی چوٹی میں شامل کر دے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ "احادیث سے یہ بات صراحت کے ساتھ ثابت ہوتی ہے کہ بلا کسی استثناء وقید کے بالوں کا جوڑ لگانا حرام ہے،" چنانچہ ظاہر و مختار مسئلہ بھی یہی ہے، لیکن ہمارے (شافعی) علماء نے اس مسئلہ میں یہ تفصیل بیان کی ہے کہ انسان کے بالوں کا جوڑ لگانا تو بلا اختلاف حرام ہے کیوں کہ انسان کو جو بزرگی و شرف حاصل ہے، اس کی بناء پر اس کے بالوں اور اس کے دیگر اجزاء جسم سے فائدہ اٹھانا حرام ہے، اور اگر انسان کے علاوہ کسی جانور کے پاک بال ہوں تو ان کی چوٹی میں شامل کرنے کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اگر عورت کا خاوند یا مالک نہ ہو (یعنی جو عورت آزاد ہو اور مطلقہ یا بیوہ یا کنواری ہو) تو اس کے لئے اپنی چوٹی میں ان بالوں کو شامل کرنا بھی حرام ہے اور اگر عورت خاوند یا مالک والی ہو تو اس کے حق میں تین صورتیں ہیں جن میں سب سے زیادہ صحیح صورت یہ ہے کہ وہ خاوند یا مالک کی اجازت کے بعد ان بالوں کو اپنی چوٹی میں شامل کرے تو جائز ہے۔

مالکؒ، طبریؒ اور اکثر علماء یہ کہتے ہیں کہ عورت کے لئے اپنی چوٹی میں کوئی بھی چیز شامل کرنا ممنوع ہے خواہ وہ بال ہوں، خواہ کالے صوف (اون) ہوں، خواہ دھجیاں ہوں اور خواہ ان کے علاوہ کوئی اور شے ہو، ان حضرات نے اس مسئلہ میں احادیث سے استدلال کیا ہے، جب کہ فقیہ لیثؒ کا قول یہ ہے کہ مذکورہ ممانعت کا تعلق صرف بالوں سے ہے، لہٰذا چوٹی میں بالوں کے علاوہ دوسری چیزیں جیسے صوف وغیرہ شامل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ نیز بالوں کو ایسی ڈوری وغیرہ سے باندھنا کہ جو بالوں کی مشابہت نہ رکھے بلا کراہت جائز ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں یہ لکھا ہے کہ سر کے بالوں میں (یعنی چوٹی میں) انسان کے بال شامل کرنا حرام ہے لیکن صوف یعنی اون کو شامل کرنا جائز ہے۔

"گودنے" کا مطلب یہ ہے کہ جسم کے کسی حصہ کی جلد پر سوئیاں یا اسی طرح کی کوئی چیز چبھوئی جائے یہاں تک کہ خون بہنے لگے پھر اس میں سرمہ یا نیل بھر دیا جائے۔ یہ زمانہ جاہلیت کی ایک رسم ہے اور آج کل بعض غیر مسلم قوموں میں اس کا رواج ہے، شریعت اسلامی نے اس کو ممنوع قرار دیا ہے، نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ چیز گودنے والے اور گدوانے والے دونوں کے لئے حرام ہے، اور جسم کے جس حصہ پر گودا جاتا ہے وہ حصہ بھی نجس ہو جاتا ہے، لہٰذا اگر کسی مسلمان نے ناسمجھی سے گدوالیا ہے اور کسی علاج و معالجہ کے ذریعہ اس کا ازالہ ممکن ہو تو اس کا نشان مٹوا دینا واجب ہے اور اگر کسی حرج و تنگی کے بغیر اس کا ازالہ ممکن نہ ہو، نیز اس بات کا خوف ہو کہ اس کو زائل کرنے کی صورت میں جسم کا وہ حصہ تلف یا بیکار ہو جائے گا یا پوری طرح کام نہیں کرے گا یا اس ظاہری عضو میں بہت بڑا عیب پیدا ہو جائے گا تو اس صورت میں اس کا ازالہ واجب نہیں، تاہم خدا سے معافی مانگنا اور توبہ و استغفار کرنا چاہئے تاکہ اس پر سے گناہ کا بار ہٹ جائے، اور اگر مذکورہ چیزوں میں سے کسی چیز کا خوف نہ ہو تو پھر اس کا ازالہ ہی لازم ہوگا اور اس میں تاخیر کرنے سے گنہ گار ہوگا۔

اللہ کی تخلیق میں تغیر کرنے والا اللہ کی لعنت کا مورد ہے

(۱۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ وَالْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ فَجَاءَتْهُ امْرَاَةٌ فَقَالَتْ اِنَّهُ بَلَغَنِيْ اَنَّكَ لَعَنْتَ كَيْتَ وَكَيْتَ فَقَالَ مَالِيْ لَا اَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ هُوَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ فَقَالَتْ لَقَدْ قَرَأْتُ مَابَيْنَ اللَّوْحَيْنِ فَمَا وَجَدْتُ فِيْهِ مَاتَقُوْلُ قَالَ لَئِنْ كُنْتِ قَرَأْتِيْهِ لَقَدْ وَجَدْتِيْهِ اَمَا قَرَأْتِ مَآ اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا قَالَتْ بَلٰى قَالَ فَاِنَّهٗ قَدْ نَهٰى عَنْهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ گودنے والی اور گدوانے والی عورتیں، منہ پر سے بال نچوانے والی عورتیں، افزائش حسن کے لئے دانتوں کو سوہان (ریتی) سے رتوانے والی عورتیں ان سب پر کہ جو اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں میں تغیر کرتی ہیں اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے۔ (جب ابن مسعودؓ کی یہ روایت عورتوں تک پہنچی) تو ایک عورت حضرت ابن مسعودؓ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ آپ اس طرح (کی عورتوں پر) لعنت بھیجتے ہیں؟ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ میرے لئے کیا رکاوٹ ہے کہ میں اس پر لعنت نہ بھیجوں جس پر رسول کریم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے، اور جس کو کتاب اللہ میں ملعون قرار دیا گیا ہے عورت نے کہا کہ میں نے بھی اس چیز کو پڑھا ہے جو دو دفتیوں کے درمیان ہے (یعنی میں نے بھی پورا قرآن کریم پڑھا ہے) لیکن اس میں مجھے یہ بات جو آپ کہتے ہیں، (صریح الفاظ میں) کہیں نہیں ملی ہے؟ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا۔ "اگر تم قرآن کریم کو غور و فکر کے ساتھ اور سمجھ کر پڑھتیں تو اس میں تمہیں یقیناً اس کا حکم ملتا، کیا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی ہے ماأتاکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا (یعنی رسول کریم (ﷺ) تمہیں جو کچھ دیں اس کو قبول کرو اور اس پر عمل کرو، اور جس چیز سے تمہیں منع کریں اس سے باز رہو) اس عورت نے کہا کہ ہاں یہ آیت تو میں نے پڑھی ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ "پس یہ وہ چیز ہے جس سے آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: عورتوں کو اپنے چہرے کے بال چنوانا مکروہ ہے، لیکن اگر کسی عورت کو چہرے پر داڑھی یا مونچھ نکل آئے تو اس کو صاف کرنا جائز بلکہ مستحب ہے۔ حدیث میں صرف چنوانے والی کا ذکر ہے۔ چننے والی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ جس کو نامصہ کہتے ہیں جب کہ اس مسئلہ سے متعلق جو روایت دوسری فصل میں آئے گی اس میں نامصہ کا ذکر ہے۔

اہل عرب کے نزدیک عورتوں کے دانتوں میں ایک دوسرے دانت کے درمیان کشادگی وفرق کا ہونا پسندیدہ سمجھا جاتا تھا اور عام طور پر چھوٹی عمر کی عورتوں کے دانت اسی طرح کے ہوتے ہیں، چنانچہ عرب میں یہ دستور تھا کہ عورتیں جب بوڑھی ہو جاتی تھیں اور ان کے دانت بڑھ جاتے تھے جس کی وجہ سے ان کے دانتوں کے درمیان یہ کشادگی باقی نہیں رہتی تھی، تو وہ باقاعدہ اپنے دانتوں پر سوہان اور ریتی وغیرہ چلا کر کے دانتوں کے درمیان کشادگی پیدا کرتی تھیں اور اس کی بنیاد ان کا یہ جذبہ ہوتا تھا کہ جوان و کمسن نظر آئیں اور حسن و دلکشی ظاہر ہو، چنانچہ اسلامی شریعت نے اس طریقہ کو بھی ممنوع قرار دیا۔

لفظ المغیرات تمام مذکورہ عورتوں کی صفت ہے جس کو ترجمہ میں ظاہر کیا گیا ہے، یعنی جن عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ سب اس طرح کی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیز جیسی بنادی ہے، اس میں وہ اپنی خواہش کے مطابق ترمیم کرتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مصلحت و مرضی کے خلاف ہے۔ اسی طرح لفظ "خلق اللّٰہ" مغیرات کا مفعول ہے اور یہ پورا جملہ تعلیل کے درجہ میں ہے جو وجوب لعنت کی علت و وجہ کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مثلہ اور داڑھی منڈانا وغیرہ میں جو حرمت (ممانعت) ہے اس کی علت و وجہ بھی یہی چیز یعنی اللہ کی تخلیق میں تغیر کرنا ہے۔ لیکن اس سے یہ ضروری قرار نہیں پاتا کہ ہر تغیر حرام ہو کیونکہ یہ علت کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتی، بلکہ حرمت کی اصل علت تو شرع کی طرف سے منع کیا جانا ہے اور اس ممانعت میں جو حکمت پوشیدہ ہے وہ یہ چیز ہے جس کو ظاہری علت کا درجہ دیا جاتا ہے، لہٰذا حاصل یہ نکلا کہ شارع (علیہ السلام) نے جن تغیرات کو مباح قرار دیا ہے ان میں اباحت رہے گی اور جن تغیرات کو حرام قرار دیا ہے ان میں حرمت جاری ہوگی۔

مذکورہ عورت نے حضرت ابن مسعودؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ ان

عورتوں کو اپنی طرف سے ملعون قرار دیتے ہیں یا اس بات کی اطلاع دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں ان عورتوں کو ملعون قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں ان عورتوں پر لعنت کا کوئی صریح ذکر نہیں ہے اور یہ مسئلہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے ملعون قرار نہیں دیا ہے اس پر لعنت بھیجنا جائز نہیں ہے؟ چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ نے اس عورت کو بڑے اچھے انداز میں بات سمجھائی اور قرآن وحدیث کے حوالوں سے مسئلہ کو ثابت کیا تو اس کو اطمینان ہو گیا کیونکہ اس کو حدیث کے بارے میں کوئی شبہ تھا ہی نہیں محض اس حکم کے قرآن میں بالفاظ صریح نہ ہونے کی وجہ سے اس کے ذہن میں اشکال پیدا ہوا تھا اور وہ بھی رفع ہو گیا۔

روایت کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جب بندوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جن امور کی ممانعت بیان فرمائیں ان سے باز رہا جائے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں بھی اور دوسری احادیث کے ذریعہ بھی مذکورہ بالا چیزوں سے منع فرمایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان چیزوں کی ممانعت گویا قرآن میں مذکور ہے۔ طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ مذکورہ عورتوں پر آنحضرت ﷺ کا لعنت فرمانا ایسا ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کو ملعون قرار دیا ہو لہٰذا اس پر عمل کیا جانا واجب ہے۔

نظر بد ایک حقیقت ہے

⑭ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعَيْنُ حَقٌّ وَنَهٰى عَنِ الْوَشْمِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "نظر لگنا برحق ہے" نیز آپ ﷺ نے گودنے سے منع فرمایا۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ نظر بد ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اثر ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ سحر کی طرح یہ (نظر بد) بھی انسان وغیرہ پر اثر انداز ہوتی ہے۔

سر کے بالوں کو گوند وغیرہ سے جمانے کا ذکر

⑮ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ لَقَدْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُلَبِّدًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو ملبد دیکھا ہے!۔" (بخاریؒ)

تشریح: "مُلَبِّد" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے سر کے بالوں کو گوند سے جما دیا تھا کہ جوئیں نہ پڑیں اور گرد وغبار سے حفاظت رہے۔ ایسا عام طور پر مذکورہ مقصد کے لئے احرام کی حالت میں کیا جاتا ہے، چنانچہ حضرت ابن عمرؓ نے آنحضرت ﷺ کو اس طرح یا تو احرام کی حالت میں دیکھا ہو گا یا کسی دوسرے سفر کے دوران دیکھا ہو گا۔

مردانہ کپڑے اور جسم کو زعفران سے رنگنے کی ممانعت

⑯ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ نَهَى النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّتَزَعْفَرَ الرَّجُلُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ کوئی مرد اپنے بدن یا کپڑوں پر زعفران ملے!۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: یہ ممانعت اسلئے ہے کہ کپڑے یا بدن پر زعفران ملنا عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ رہی یہ بات کہ بعض صحابہؓ کے بارے میں جو یہ منقول ہے کہ انہوں نے خلوق کا استعمال کیا جو زعفران سے بنائی جانے والی ایک خوشبو ہے تو وہ اس ممانعت سے پہلے کا واقعہ ہے۔

رنگ دار خوشبو کا مسئلہ

⑰ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اُطَيِّبُ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاَطْيَبِ مَا نَجِدُ حَتّٰى اَجِدُ وَبِيْصَ الطِّيْبِ فِیْ رَاْسِهٖ وَلِحْيَتِهٖ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ مجھے جو بہترین خوشبو میسر آتی وہ میں نبی کریم ﷺ کو لگاتی، یہاں تک کہ اس خوشبو کی چمک مجھ کو آپ ﷺ کے سر اور داڑھی میں نظر آتی!۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کے بارے میں اس حدیث کے پیش نظر اشکال واقع ہوتا ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مرد کے لئے اس خوشبو (عطر وغیرہ) کا استعمال جائز ہے جس کا رنگ ظاہر نہ ہوتا ہو جب کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو جو خوشبو لگائی جاتی تھی اس کا رنگ ظاہر ہوتا تھا کیونکہ اگر اس کی خوشبو کا رنگ ظاہر نہ ہوتا تو اس کی چمک آنحضرت ﷺ کے سر اور داڑھی میں کیسے نظر آتی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس حدیث میں مرد کو رنگ دار خوشبو استعمال کرنے سے منع کیا گیا ہے اس سے مراد وہ رنگ ہے جس کے ظاہر ہونے سے زینت وزیبائش کا انداز نمایاں ہوتا ہو، جیسے سرخ اور زرد رنگ اور جو رنگ ایسا نہ ہو جیسے مشک و عنبر وغیرہ کا رنگ تو وہ جائز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صندل اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا بھی رنگ جائز ہے۔

خوشبو کی دھونی لینے کا ذکر

(۱۸) وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ كَانَ ابْنُ عُمَرَ اِذَا اسْتَجْمَرَ بِالْاَلُوَّةِ غَيْرَ مُطَرَّاةٍ وَبِكَافُوْرٍ يَطْرَحُهُ مَعَ الْاَلُوَّةِ ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا كَانَ يَسْتَجْمِرُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت نافعؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ جب خوشبو کی دھونی لیتے تو (کبھی تو صرف) اگر کی دھونی لیتے جس میں مشک وغیرہ مخلوط نہ ہوتا اور (کبھی) کافور کی دھونی لیتے کہ اس کو اگر کے ساتھ یعنی دونوں کو ملا کر آگ میں ڈالتے، نیز حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ رسول کریمؐ بھی اسی طرح دھونی لیتے تھے کہ کبھی تو صرف اگر کی دھونی لیتے اور کبھی کافور اور اگر دونوں مخلوط کر کے اس کی دھونی لیتے۔" (مسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

لبیں ترشوانی قدیم سُنّت ہے

(۱۹) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُصُّ اَوْ يَاْخُذُ مِنْ شَارِبِهٖ وَكَانَ اِبْرَاهِيْمُ خَلِيْلُ الرَّحْمٰنِ (صَلٰوتُ الرَّحْمٰنِ عَلَيْهِ) يَفْعَلُهُ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنی لبوں کو کترتے۔ یا لیتے تھے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جو خدا کے دوست تھے وہ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے، یعنی وہ بھی اپنی لبیں ترشواتے تھے!۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مونچھیں بالکل ہلکی کرانا ایک ایسی قدیم سُنّت ہے جو حضرت ابراہیم کا بھی معمول تھا اور دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کا بھی، چنانچہ پیچھے لفظ "فطرۃ" کی وضاحت میں اس کا ذکر گزر چکا ہے، رہی یہ بات کہ جب یہ (یعنی مونچھیں ہلکی کرانا) دوسرے انبیاء کرام کی بھی سنت ہے تو اس موقعہ پر صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیوں کیا گیا؟ تو اس تخصیص کی وجہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مخصوص عظمت وجلالت کا اظہار ہے، یا یہ کہ اس سُنّت کی ابتداء حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے ہوئی ہے، جیسا کہ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے جو تیسری فصل میں نقل ہوگی۔

مونچھیں ہلکی نہ کرانے والے کے بارے میں وعید

(۲۰) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ لَّمْ يَاْخُذْ مِنْ شَارِبِهٖ فَلَيْسَ مِنَّا۔

(رواہ احمد والترمذی والنسائی)

"اور حضرت زید ابن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص لبوں کو نہ کترواۓ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: "وہ ہم میں سے نہیں ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہماری سُنّت اور ہمارے طریقے پر عمل پیرا نہیں ہے۔ اور ملا علی قاریؒ کے مطابق اس جملہ کے زیادہ صحیح معنی یہ ہیں کہ ایسا شخص ہماری سُنّت اور ہمارے طریق کو ماننے والوں میں کامل ترین نہیں ہے، یا اس جملہ کے ذریعہ اس سُنّت کو ترک کرنے والے کی تہدید مقصود ہے، یا ایسے شخص کو اس بات سے ڈرایا گیا ہے کہ اس سُنّت کا تارک ہوتے ہوئے مرنا گویا امت مسلمہ کے خلاف طریقے پر مرنا ہے۔

داڑھی کو برابر کرنے کا ذکر

(۲۱) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَاْخُذُ مِنْ لِحْيَتِهٖ مِنْ عَرْضِهَا وَطُوْلِهَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عمرو ابن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنی ریش مبارک کو عرض وطول میں یعنی نیچے سے بھی اور دائیں بائیں جانب سے بھی کترتے تھے۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی داڑھی کو ادھر ادھر سے بڑھے ہوئے بال کترواکر برابر درست کرتے تھے۔ اور آپ ﷺ کا یہ عمل داڑھی کو "چھوڑنے اور بڑھانے" کے منافی نہیں ہے جس کا حکم دوسری احادیث میں منقول ہے کیونکہ اصل ممانعت کا تعلق منڈانے یا اتنی چھوٹی کرانے سے ہے جو غیر مسلم لوگوں کا شعار ہے ورنہ تو داڑھی کو برابر اور درست رکھنے کے لئے ادھر ادھر سے بڑھے ہوئے بالوں کو کترنا ممنوع نہیں ہے، جیسا کہ خود آنحضرت ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ ﷺ داڑھی کے طول و عرض میں سے ان بالوں کو تراشتے تھے جو ادھر ادھر بڑھے ہوتے تھے اسی لئے ابن ملکؒ نے کہا ہے کہ داڑھی کے بالوں کو برابر کرنا سُنّت ہے۔ اور احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ زیادہ بڑھانے کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، چنانچہ کچھ حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی داڑھی کو مٹھی میں پکڑ کر داڑھی کے اس حصے کو کترواۓ جو مٹھی سے نیچے ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، یہ قول حضرت ابن عمرؓ اور تابعینؒ کی ایک جماعت کا ہے، اور شعبیؒ اور ابن سیرینؒ نے اس کو اچھا سمجھا ہے، جب کہ حسنؒ قتادہ اور ان کے متبعین نے اس چیز کو (یعنی داڑھی کے اس حصے کو کترنے کو جو مٹھی سے نکلی ہوئی ہو) اچھا نہیں سمجھا ہے ان حضرات نے آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد اعفو اللحی (داڑھیوں کی چھوڑ دو) کے پیش نظر اسی چیز کو بہتر جانا ہے کہ مٹھی سے بڑھی ہوئی داڑھی کو بھی چھوڑے رکھا جاۓ۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

مرد کو خلوق کے استعمال کی ممانعت

(۲۲) وَعَنْ يَعْلَى بْنِ مُرَّةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى عَلَيْهِ خَلُوْقًا فَقَالَ اَلَكَ امْرَاَةٌ قَالَ لَا قَالَ فَاغْسِلْهُ ثُمَّ اغْسِلْهُ ثُمَّ اغْسِلْهُ ثُمَّ لَا تَعُدْ۔ (رواہ الترمذی و النسائی)

"اور حضرت یعلی ابن مرہ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے ان (یعلیؓ) کے کپڑوں پر (زعفران سے مرکب خوشبو) خلوق لگی ہوئی دیکھی تو فرمایا کہ کیا تم بیوی والے ہو؟ انہوں نے کہا کہ نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا تو پھر اس کو دھوڈالو، پھر دھوؤ اور پھر دھوؤ اور پھر آئندہ کبھی اس کو استعمال نہ کرنا۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: "کیا تم بیوی والے ہو" آپ ﷺ کے اس سوال کا مقصد یہ بیان کرنا تھا کہ اگر بیوی ہے اور اس نے خلوق استعمال کی ہے اور

پھر اس کے بدن یا کپڑے سے اس کا اثر تمہارے بدن یا کپڑے پر پہنچا ہے تو اس صورت میں تم معذور ہو، اور اگر خود تم نے خلوق کا استعمال کیا ہے تو پھر معذور نہیں سمجھے جاؤ گے کیونکہ مرد کو خلوق کا استعمال جائز نہیں ہے، اس صورت میں تمہارے لئے یہ ضروری ہے کہ تم اپنے بدن یا کپڑے کو دھو کر اس کا اثر زائل کرو۔ اس سے واضح ہوا کہ اس سوال کا مقصد یہ ظاہر کرنا نہیں تھا کہ اگر تمہاری بیوی ہے اور تم نے بیوی کی خاطر استعمال کیا ہے تو تم "معذور" کے حکم میں ہو، جیسا کہ حدیث کے ظاہر مفہوم سے گمان ہوتا ہے۔

"اس کو دھو ڈالو" اس جملہ کے ذریعہ آپ ﷺ نے تین بار دھونے کا حکم دیا، اور تین بار دھونے کا حکم دینا مبالغہ و تاکید کے طور پر تھا، لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے تین بار دھونے کا حکم اس لئے فرمایا کہ اس کا رنگ کم از کم تین مرتبہ دھوئے بغیر نہیں چھوٹتا۔

(۲۳) وَعَنْ اَبِيْ مُوْسٰى قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةَ رَجُلٍ فِيْ جَسَدِهٖ شَيْءٌ مِنْ خَلُوْقٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اس شخص کی نماز قبول نہیں کرتا، جس کے بدن پر تھوڑی سی بھی خلوق لگی ہوئی ہو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: سیدؒ کہتے ہیں کہ "نماز قبول نہ کرنے" سے مراد عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے کی وجہ سے اس ثواب کا نہ ملنا ہے جو نماز کامل پر ملتا ہے۔ اور ابن ملکؒ نے کہا ہے کہ یہ ارشاد گرامی خلوق استعمال کرنے کے خلاف زجر و تہدید کے طور پر ہے۔

(۲۴) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ قَالَ قَدِمْتُ عَلٰى اَهْلِيْ مِنْ سَفَرٍ وَقَدْ تَشَقَّقَتْ يَدَايَ فَخَلَّقُوْنِيْ بِزَعْفَرَانٍ فَغَدَوْتُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيَّ وَقَالَ اذْهَبْ فَاغْسِلْ هٰذَا عَنْكَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمار ابن یاسرؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں سفر سے واپسی میں اپنے گھر والوں کے پاس اس حال میں پہنچا کہ میرے دونوں ہاتھ پھٹے ہوئے تھے، چنانچہ میرے گھر والوں نے (علاج کے طور پر) میرے ہاتھوں پر اس خوشبو کا لیپ کیا جس میں زعفران مخلوط تھی، پھر جب میں صبح کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور آپ ﷺ کو سلام کیا تو آپ ﷺ نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا بلکہ فرمایا کہ جاؤ اور اس خوشبو کو اپنے بدن پر سے دھو ڈالو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے علم میں وہ عذر نہیں آیا ہو گا جس کی بناء پر حضرت عمارؓ نے اس خوشبو کا استعمال کیا تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے ان کے سلام کا جواب نہ دے کر اپنی خفگی کا اظہار فرمایا، یا یہ کہ آنحضرت ﷺ کو عمارؓ کا اپنے ہاتھوں پر خوشبو لگائے ہوئے باہر نکلنا پسند نہیں آیا۔

(۲۵) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ طِيْبُ الرِّجَالِ مَا ظَهَرَ رِيْحُهٗ وَخَفِيَ لَوْنُهٗ وَطِيْبُ النِّسَاءِ مَا ظَهَرَ لَوْنُهٗ وَخَفِيَ رِيْحُهٗ۔ (رواہ الترمذی و النسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مردانہ خوشبو وہ ہے جس کی بو تو ظاہر ہو لیکن اس کا رنگ ظاہر نہ ہو (جیسے مشک و عنبر اور عطر وغیرہ) اور زنانہ خوشبو وہ ہے جس کا رنگ تو ظاہر ہو لیکن اس کی بو نہ پھیلے جیسے مہندی اور زعفران وغیرہ۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا "رنگ" سے مراد وہ رنگ ہے جو زینت و رعنائی کا غماز ہو۔ جیسے سرخ و زرد رنگ علماء نے لکھا ہے کہ "زنانہ خوشبو" کی جو وضاحت کی گئی ہے وہ اس عورت کے حق میں ہے جو گھر سے باہر نکلے، جو عورت گھر کے اندر رہو، یا اپنے خاوند کے پاس ہو تو اس کے لئے ہر طرح کی خوشبو استعمال کرنا جائز ہے۔

آنحضرت ﷺ کے استعمال کی خوشبو

(۲۶) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُكَّةٌ يَتَطَيَّبُ مِنْهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سکہ تھی (ایک مرکب خوشبو کا نام) آپ ﷺ اس میں سے خوشبو لگاتے تھے۔" (ابوداؤدؒ)

آنحضرت ﷺ کثرت سے سر میں تیل لگاتے تھے

(۲۷) وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكْثِرُ دَهْنَ رَاسِهٖ وَتَسْرِيْحَ لِحْيَتِهٖ وَيُكْثِرُ الْقِنَاعَ كَاَنَّ ثَوْبَهٗ ثَوْبُ زَيَّاتٍ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اپنے سر مبارک پر کثرت سے تیل استعمال کرتے تھے، کثرت سے داڑھی میں کنگھی کرتے تھے اور اکثر سر مبارک پر ایک کپڑا رکھتے تھے جو ایسا نظر آتا جیسے تیلی کا کپڑا ہو۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "کثرت سے کنگھی کرتے تھے" یہ بات اس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے روزانہ کنگھی سے منع فرمایا ہے، کیوں کہ اول تو یہ ممانعت، نہی تحریمی کے طور پر نہیں ہے بلکہ نہی تنزیہی کے طور پر ہے، دوسرے "کثرت سے کنگھی کرنے" سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ ﷺ روزانہ کنگھی کرتے تھے کیوں کہ "کثرت" کا اطلاق اس چیز پر بھی ہوتا ہے کہ کسی کام کو اس ضرورت کے وقت انجام دیا جائے، گویا جس عمل کی جس وقت ضرورت ہو اس وقت اس کو کرنا بھی "کثرت" کے حکم میں شامل ہوتا ہے، جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے تو داڑھی میں کنگھی کرنا سُنّت ہے لیکن جو لوگ ہر وضو کے بعد کنگھی کرتے ہیں اس کی سُنّت صحیحہ میں کوئی بنیاد نہیں ہے۔

"قناع" سے مراد وہ کپڑا ہے جو آپ بالوں کو تیل لگانے کے بعد سر پر اس مقصد سے ڈال لیا کرتے تھے کہ عمامہ میلا اور چکنا نہ ہو، چنانچہ وہ کپڑا تیل لگنے کی وجہ سے چونکہ بہت تیل آلود ہو جاتا تھا اس لئے اس کو تیلی کے کپڑے سے تشبیہ دی گئی ہے ورنہ یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ وہ کپڑا بہت گندا رہتا تھا یا آپ کے سارے کپڑے تیلی کے کپڑوں کی طرح رہتے تھے، کیونکہ یہ مراد اس نظافت و پاکیزگی اور صفائی و ستھرائی سے بہت بعید ہے جو آنحضرت ﷺ کے مزاج کا جز تھی، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سفید کپڑے کو بہت پسند فرماتے تھے۔

آنحضرت ﷺ کے گیسوئے مبارک

(۲۸) وَعَنْ اُمِّ هَانِئٍ قَالَتْ قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْنَا بِمَكَّةَ قَدْمَةً وَلَهٗ اَرْبَعُ غَدَائِرَ۔

(رواہ احمد والبوداؤد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت اُمّ ہانیؓ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ (فتح مکہ کے دن) رسول کریم ﷺ ہمارے ہاں تشریف لائے تو اس وقت آنحضرت ﷺ کے چار گیسو گندھے ہوئے تھے (یعنی دو دائیں طرف تھے اور دو بائیں طرف۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجۃؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے پورے سر کے بالوں کو چار حصوں میں بٹ لیا تھا۔ گویا "گیسو" سے بالوں کی وہ مخصوص وضع مراد نہیں ہے جس کو ہماری زبان میں "زلف" کہا جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی مانگ کا ذکر

(۲۹) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِذَا فَرَقْتُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاْسَهٗ صَدَعْتُ فَرْقَهٗ عَنْ يَافُوْخِهٖ وَاَرْسَلْتُ

نَاصِيَتَهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں جب رسول کریم ﷺ کے سر مبارک کے بالوں میں مانگ نکالتی تو تالو پر سے بالوں کے دو حصے کر کے مانگ چیرتی اور آپ ﷺ کی پیشانی کے بل دونوں آنکھوں کے درمیان چھوڑتی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "یافوخ" سر کے درمیانی حصے کو کہتے ہیں جہاں تالو ہوتا ہے، یہ دماغ کے عین اوپر کی سطح ہوتی ہے اور بچپن میں اس جگہ پھڑکن رہتی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے گویا آنحضرت ﷺ کی مانگ کی صورت بیان کی ہے کہ اس کا ایک سرا تو تالو کے نزدیک ہوتا ہے، اور دوسرا سرا دونوں آنکھوں کے درمیان کی جگہ کے بالمقابل پیشانی کے نزدیک ہوتا تھا۔

روایت کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ میں مانگ کا رخ پیشانی کے اس کنارے پر رکھتی جو دونوں آنکھوں کی عین درمیانی سمت میں ہے اس طرح کہ پیشانی کے آدھے بال مانگ کی دائیں طرف ہوتے اور آدھے بال مانگ کی بائیں طرف۔ طیبیؒ نے حدیث کے یہی معنی بیان کئے ہیں۔

روزانہ کنگھی کرنے کی ممانعت

(۳۰) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ التَّرَجُّلِ اِلَّا غِبًّا۔

(رواہ الترمذی والبوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عبداللہ ابن مغفلؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کنگھی کرنے سے منع فرمایا الا یہ کہ ایک روز ناغہ دے کر کنگھی کی جائے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: قاضیؒ کہتے ہیں کہ "غب" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کام ایک دن کیا جائے اور ایک دن ترک کیا جائے، لہٰذا حدیث کا یہ مطلب ہوا کہ کنگھی ہر روز نہ کی جائے بلکہ ایک دن کا ناغہ کر کے کی جائے، لیکن یہ ممانعت محض نہی تنزیہی کے طور پر ہے اور اس سے ضرورت و بے ضرورت ہر روز کنگھی کرنے کا اہتمام کرنے اور اس کو بطور عادت اختیار کر لینے کی ممانعت مراد ہے کیونکہ یہ زینت و آرائش میں مبالغہ اور بے جا تکلف و اہتمام کرنے کی صورت ہے۔

واضح رہے کہ لفظ "غب" جب ملاقات کے سیاق میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے زُرْغِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ہفتہ میں ایک مرتبہ ملاقات کی جائے اور جب یہ لفظ بخار کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس سے ایک دن کا ناغہ دے کر یعنی تیسرے دن کا بخار مفہوم ہوتا ہے، اسی طرح مریض کی عیادت کرنے اور گوشت کھانے کے سیاق میں بھی اس سے مراد ایک دن کا ناغہ ہوتا ہے۔

ہر روز کنگھی کرنے کی ممانعت میں سر کے بالوں اور داڑھی دونوں میں کنگھی کرنا شامل ہے، لہٰذا جو لوگ ہر وضو کے بعد کنگھی کرتے ہیں اس کا سنّت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اسی طرح احیاء العلوم میں جو یہ لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ ہر روز دو مرتبہ داڑھی میں کنگھی کرتے تھے تو اس حدیث کا بھی کوئی ثبوت نہیں پایا گیا ہے اور احیاء العلوم میں امام غزالیؒ کے علاوہ اور کسی نے بھی اس حدیث کو نقل نہیں کیا ہے، بلکہ شیخ ولی الدین العراقیؒ کے قول کے مطابق امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اس حدیث کے علاوہ بھی بعض ایسی احادیث نقل کی ہیں جن کی کوئی اصل ثابت نہیں ہے۔

رہی یہ بات کہ روزانہ کنگھی کرنے کی ممانعت صرف مرد کے لئے ہے یا مرد عورت دونوں کے لئے؟ تو بظاہر یہ بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ یہ ممانعت صرف مردوں کے حق میں ہے کیونکہ عورتوں کے لئے زینت و آرائش کرنا مکروہ نہیں ہے، تاہم بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس ممانعت کا تعلق مرد و عورت دونوں سے ہے لیکن وہ حضرات بھی یہ کہتے ہیں کہ عورتوں کے حق میں یہ ممانعت ہلکے درجے کی ہے کیونکہ ان کے لئے زینت و آرائش کا دائرہ مردوں کی بہ نسبت بہت وسیع ہے۔

زیادہ عیش و آرام کی زندگی اختیار کرنا میانہ روی کے خلاف ہے

(۳۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ لِفُضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ مَالِيْ اَرَاكَ شَعِثًا قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَنْهَانَا عَنْ كَثِيْرٍ مِنَ الْاِرْفَاهِ قَالَ مَالِيْ لَا اَرٰى عَلَيْكَ حِذَاءً قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ يَاْمُرُنَا اَنْ نَحْتَفِيَ اَحْيَانًا۔

(رواہ ابوداؤد)

"حضرت عبداللہ ابن بریدہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت فضالہ ابن عبیدہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ میں آپ کو پراگندہ بال (یعنی آپ کے بال بغیر کنگھی کئے ہوئے) دیکھ رہا ہوں؟ انہوں نے فرمایا کہ رسول کریم ﷺ عیش و آرام کی زیادہ چیزیں اختیار کرنے سے ہمیں منع فرمایا کرتے تھے (اور کنگھی و تیل کا زیادہ استعمال بھی اسی میں شامل ہے) اس شخص نے پھر یہ پوچھا کہ کیا بات ہے کہ میں آپ کے پیروں میں جوتیاں نہیں دیکھ رہا ہوں! انہوں نے جواب دیا کہ رسول کریم ﷺ ہمیں یہ حکم دیتے تھے کہ ہم کبھی کبھی ننگے پیر بھی پھرا کریں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: عیش و آرام کی زیادہ چیزیں اختیار کرنے سے اجتناب کرنے اور کبھی کبھی ننگے پیر پھرنے کا حکم دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح سے ایک تو مزاج و طبیعت میں تواضع و انکسار پیدا ہوتا ہے دوسری طرف اس ریاضت و مشقت کے ذریعہ نفس پر قابو حاصل ہوتا ہے اور اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ حالات و معیشت کی سختی و تنگی کے وقت وہ ریاضت و مشقت کام آتی ہے اور سختی و تنگی کو انگیز کرنے کی ہمت و توانائی عطا کرتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ آنحضرت ﷺ بالوں میں تیل بھی لگاتے تھے اور کنگھی بھی کرتے تھے بلکہ اس کو اچھا سمجھتے تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی حکم و ترغیب کے ذریعہ اس پر عمل کراتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی آپ ﷺ بعض حاملین زہد و ریاضت کو اس کے خلاف بھی رکھتے تھے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص آپ ﷺ کے سامنے ان چیزوں کو ترک کرتا تو آپ ﷺ اس کو ٹوکتے نہیں تھے بلکہ ان چیزوں کو ترک کرنے کا حکم بھی فرماتے تھے! اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس سلسلے میں اصل کراہت جس بات میں ہے وہ یہ ہے کہ عیش و راحت اور خوشحالی و آسودگی میں حد اعتدال سے تجاوز کیا جائے، یہاں تک کہ نفس تن آسانی کا خوگر ہو جائے اور تیل لگانے و کنگھی کرنے اور زینت و آرائش میں ایسا انہماک ظاہر کرے جو دین بیزار اور عیش و عشرت کے دلدادگان کا شیوہ ہے لہٰذا جب یہ حکم دیا جاتا ہے کہ زیب و زینت کے ذرائع اختیار نہ کرو اور اپنے رہن سہن میں سادگی و انکساری اور بے تکلفی بلکہ زہد و ریاضت کو اختیار کرو تو اس سے یہ مراد مطلق نہیں ہوتی کہ میلے کچیلے رہ کر پاکیزگی و نظافت کو ترک کر دو، اور اپنے کو اول جلول بنا کر تہذیب و شائستگی اور خوش ہیئتی کا مذاق اڑاؤ۔ بلکہ اس حکم کی مراد یہ ہوتی ہے کہ بہر صورت اعتدال اور میانہ روی کو ملحوظ رکھو! کسی بھی شرعی حکم کا یہ منشا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ رہن سہن کا ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو تہذیب و شائستگی کے خلاف اور نفاست و پاکیزگی کے منافی ہو کیونکہ انسان کو مہذب و شائستہ بنانا اسلام کا ایک مقصد اور تہذیب و پاکیزگی، دین کا ایک جزو ہے جیسا آگے آنے والی حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

بالوں کو اچھی طرح رکھنے کا حکم

(۳۲) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَانَ لَهٗ شَعْرٌ فَلْيُكْرِمْهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص سر پر بال رکھے ہوئے ہو اس کو چاہئے کہ اپنے بالوں کو اچھی طرح رکھے یعنی اس کو دھویا کرے ان میں تیل لگایا کرے، کنگھا کیا کرے اور اول جلول شخص کی طرح ان کو بکھرا ہوا نہ رہنے دے، کیونکہ نفاست و صفائی اور خوش ہیئتی ایک پسندیدہ محبوب چیز ہے۔" (ابوداؤدؒ)

(۳۳) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحْسَنَ مَاغُیِّرَبِہِ الشَّیْبُ الْحِنَّاءُ وَالْکَتَمُ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جن چیزوں کے ذریعہ بڑھاپے یعنی بالوں کی سفیدی کو تبدیل کیا جاسکتا ہے ان میں سب سے بہتر چیز مہندی اور وسمہ ہے۔" (ترمذیؒ ،ابوداؤدؒ ،نسائیؒ)

تشریح: "کتم" اور بعض حضرات کے قول کے مطابق کُتَّمْ ایک گھاس کا نام ہے جو وسمہ کے ساتھ ملا کر بالوں پر خضاب کرنے کے کام میں لائی جاتی ہے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ کتم اصل میں وسمہ ہی کو کہتے ہیں۔

بہر حال حدیث کے مفہوم کے بارے میں یہ سوال ہوتا ہے کہ آیا یہ مراد ہے کہ مہندی اور وسمہ دونوں کو ملا کر خضاب کیا جائے، یا مراد ہے کہ صرف مہندی یا صرف وسمہ کا خضاب کیا جائے؟ چنانچہ نہایہ کے قول کے مطابق بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں صرف کتم، یا صرف مہندی کا خضاب کرنا مراد ہے کیونکہ اگر کتم کو مہندی کے ساتھ ملایا جائے تو اس سے خضاب، سیاہ ہو جاتا ہے اور صحیح روایات میں سیاہ خضاب کی ممانعت مذکور ہے اس صورت میں کہا جائے گا کہ یہ جملہ اصل میں۔ "بالحناء او الکتم" ہے (یعنی حرف واؤ کے بجائے او ہے) جس کا مطلب یہ ہے کہ خضاب کرنے والے کو اختیار ہے کہ چاہے مہندی کا خضاب کرے اور چاہے کتم کا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت متعدد طرق و اسانید سے منقول ہے اور سب نے بالحناء والکتم ہی نقل کیا ہے اگرچہ اس سے مذکورہ مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ حرف "و" مفہوم کے اعتبار سے حرف او کے معنی میں ہو سکتا ہے۔ بعض حواشی میں یہ لکھا ہے کہ صرف مہندی کا خضاب سرخ رنگ کا ہوتا ہے اور صرف کتم کا خضاب سبز رنگ کا ہوتا ہے۔

بعض حضرات کے قول سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ خالص کتم کا خضاب سیاہ رنگ کا ہوتا ہے اور اگر کتم کو مہندی کے ساتھ ملا کر خضاب کیا جائے تو سرخ مائل بہ سیاہی رنگت پیدا ہو جاتی ہے، اس صورت میں اگر یہ کہا جائے کہ حدیث میں کتم اور مہندی دونوں کا مرکب خضاب مراد ہے تو کوئی اشکال پیدا نہیں ہوگا، چنانچہ آگے حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت آرہی ہے (نمبر ۳۶) اس سے یہ بات بصراحت معلوم ہوتی ہے۔

ملا علی قاریؒ نے یہ لکھا ہے کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ کتم اور مہندی کے مرکب خضاب کی مختلف نوعیت ہوتی ہے اگر کتم کا جزء غالب ہو یا کتم اور مہندی دونوں برابر ہوں تو خضاب سیاہ ہوتا ہے اور اگر مہندی کا حصہ غالب ہو تو خضاب سرخ ہوتا ہے۔

سیاہ خضاب کرنے والے کے بارے میں وعید

(۳۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَکُوْنُ قَوْمٌ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ یَخْضِبُوْنَ بِھٰذَا السَّوَادِ کَحَوَاصِلِ الْحَمَامِ لَا یَجِدُوْنَ رَائِحَۃَ الْجَنَّۃِ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ آخر زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو کبوتر کے پوٹے کی مانند اس سیاہی کے ذریعہ خضاب کریں گے، یعنی جو خضاب استعمال کریں گے وہ ایسا ہی سیاہ ہوگا جیسے بعض کبوتروں کے پوٹے سیاہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ جنت کی بو بھی نہیں پائیں گے۔" (ابوداؤدؒ ،نسائیؒ)

تشریح: "اس سیاہی" سے مراد خالص سیاہی ہے اس صورت میں وہ سیاہی مستثنیٰ ہوگی جو مائل بہ سرخی ہو، جیسے کتم اور مہندی کے خضاب کا رنگ ہوتا ہے۔ جنت کی بو نہیں پائیں گے۔" یہ دراصل سیاہ خضاب کرنے والے کے حق میں زجر و تہدید کو زیادہ شدت کے ساتھ بیان کرنا ہے، یا یہ ارشاد گرامی ﷺ اس شخص پر محمول ہے جو سیاہ خضاب کا نہ صرف استعمال کرے بلکہ اس کو جائز بھی سمجھے! بعض حواشی میں یہ لکھا ہے کہ ایسے لوگ اگرچہ جنت میں داخل ہوں گے لیکن اس کی بو یعنی اس کے کیف و سرور سے محظوظ و بہرہ مند نہیں ہوں گے،

اور بعض حضرات کے قول کے مطابق اس سے یہ مراد ہے کہ موقف میں جنت سے جو فرحت بخش مہک آئے گی اور جس سے مسلمان محفوظ و مسرور ہوں گے اس سے مذکورہ لوگ محروم رہیں گے۔ بہر حال حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ سیاہ خضاب حرام ہے۔"

زرد خضاب کرنا جائز ہے

۳۵ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَلْبَسُ النِّعَالَ السِّبْتِیَّةَ وَیُصَفِّرُ لِحْیَتَهٗ بِالْوَرْسِ وَالزَّعْفَرَانِ وَکَانَ ابْنُ عُمَرَ یَفْعَلُ ذٰلِكَ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ دباغت دیئے ہوئے اور بغیر بال کے چمڑے کی پاپوش پہنتے تھے اور اپنی ریش مبارک پر ورس (ایک گھاس جو یمن کے علاقہ میں ہوتی تھی اور زعفران کے ذریعہ زرد رنگ چڑھاتے تھے نیز حضرت ابن عمرؓ بھی ایسا ہی کرتے تھے (یعنی مذکورہ پاپوش پہنتے اور مذکورہ خضاب استعمال کرتے)۔" (نسائیؒ)

تشریح: اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنی ریش مبارک پر خضاب کرتے تھے جب کہ کتاب اللباس میں حضرت انسؓ کی جو روایت گزری ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی خضاب کا استعمال کیا چنانچہ ان دونوں روایتوں کے درمیان مطابقت کی جو صورت ہے وہ اسی جگہ (حضرت انسؓ کی روایت کے ضمن میں) بیان کی جا چکی ہے۔

۳۶ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ قَدْ خَضَبَ بِالْحِنَّاءِ فَقَالَ مَا اَحْسَنَ هٰذَا قَالَ فَمَرَّ اٰخَرُ وَقَدْ خَضَبَ بِالْحِنَّاءِ وَالْکَتَمِ فَقَالَ هٰذَا اَحْسَنُ مِنْ هٰذَا ثُمَّ مَرَّ اٰخَرُ قَدْ خَضَبَ بِالصُّفْرَةِ فَقَالَ هٰذَا اَحْسَنُ مِنْ هٰذَا کُلِّهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کے سامنے سے ایک شخص گزرا جس نے مہندی کا خضاب لگا رکھا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا "یہ اس کا خضاب، کتنا اچھا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر ایک شخص گزرا جس نے مہندی اور وسمہ کا خضاب لگا رکھا تھا جو خالص سیاہ نہیں تھا آپ ﷺ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ خضاب پہلے سے بھی بہت اچھا ہے اس کے بعد ایک اور شخص گزرا جس نے زرد خضاب لگایا تھا آپ ﷺ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ ان سب سے زیادہ اچھا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

خضاب کرنے کا حکم

۳۷ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ غَیِّرُوا الشَّیْبَ وَلَا تَشَبَّهُوْا بِالْیَهُوْدِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَرَوَاهُ النَّسَائِیُّ عَنِ ابْنِ عُمَرَ وَالزُّبَیْرِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، بڑھاپے (یعنی بالوں کی سفیدی) کو خضاب کے ذریعہ بدل ڈالو اور یہودیوں کی مشابہت اختیار نہ کرو جو خضاب نہیں کرتے (ترمذیؒ) اور نسائی نے اس روایت کو ابن عمرؓ اور زبیرؓ (بعض نسخوں میں ابن زبیرؓ ہے) سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: احتمال ہے کہ حدیث میں مذکورہ حکم خاص طور پر ان لوگوں کے لئے ہو جو برسر جہاد ہوں تا کہ اس کے ذریعہ دشمنوں پر مسلمانوں کی طاقت کا اظہار ہو اور وہ (دشمن) خوف میں مبتلا ہوں۔

بالوں کی سفیدی نورانیت کی غماز ہوتی ہے

۳۸ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَنْتِفُوا الشَّیْبَ فَاِنَّهٗ نُوْرٌ

الْمُسْلِمِ مَنْ شَابَ شَيْبَةً فِي الْإِسْلَامِ كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ بِهَا حَسَنَةً وَكَفَّرَ عَنْهُ بِهَا خَطِيْئَةً وَرَفَعَهُ بِهَا دَرَجَةً۔ (ابوداؤد)

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سفید بالوں کو نہ چنو کیونکہ بڑھاپا (یعنی بالوں کا سفید ہونا) مسلمانوں کے لئے نورانیت کا سبب ہے، جو شخص حالت اسلام میں بڑھاپے کی طرف قدم بڑھاتا ہے یعنی جب کسی مسلمان کا ایک بال سفید ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک نیکی لکھ دیتا ہے اور اس کی ایک خطا کو محو کر دیتا ہے اور اس کا ایک درجہ بلند کر دیتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: بڑھاپے کی نورانیت کا سبب اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ بڑھاپا اصل میں وقار کا مظہر ہے، جیسا کہ تیسری فصل میں آنے والی ایک روایت سے واضح ہوگا کہ بنی آدم میں سب سے پہلے جس شخص پر سفید بالوں کی صورت بڑھاپا آیا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے چنانچہ جب انہوں نے پہلے پہل اپنی داڑھی میں سفید بال کی صورت میں بڑھاپا دیکھا تو بارگاہ کبریائی میں عرض کیا کہ میرے پروردگارا یہ کیا ہے؟ جواب آیا کہ یہ وقار ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ خداوندا! میرے وقار کو زیادہ کر۔"

وقار، دراصل ایک ایسا وصف ہے جو انسان کو گناہ فسق اور بے حیائی کی باتوں سے روکتا ہے اور توبہ وطاعات کی طرف مائل کرتا ہے، اس اعتبار سے یہ وصف انسان میں اس نور کو پیدا کرتا ہے جو میدان حشر میں ظلمت وتاریکیوں کو چیرتا ہوا آگے آگے چلے گا، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے۔ "يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ" لہٰذا اس توجیہ کی روشنی میں بڑھاپے کے نور سے قیامت کے دن کا نور مراد ہے چنانچہ ایک روایت میں اس کی تفریح بھی ہے، اور اگر نورانیت سے شکل وصورت کی خوشنمائی ودل کشی اور باطن کی صفائی ونیک سیرتی مراد ہو جو اس دنیا میں بوڑھوں کو حاصل ہوتی ہے تو یہ بھی بعید از حقیقت نہیں ہوگا،

اس حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ سفید بالوں کو چننا مکروہ ہے۔

۳۹ وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مُرَّةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ شَابَ شَيْبَةً فِي الْإِسْلَامِ كَانَتْ لَهُ نُوْرًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواہ الترمذی والنسائی)

"اور حضرت کعب ابن مرۃؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص اسلام کی حالت میں بوڑھا ہوتا ہے اس کا بڑھاپا قیامت کے دن نور کی صورت میں ظاہر ہوگا۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: اس موقعہ پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب بڑھاپا (یعنی بالوں کا سفید ہونا) دنیا وآخرت دونوں جگہ نورانیت کا سبب ہے تو خضاب کے ذریعہ اس کو ظاہر نہ ہونے دینا اور اس کو تبدیل کرنا شریعت نے جائز کیوں قرار دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خضاب کی مشروعیت بھی دراصل ایک دینی مصلحت کے سبب سے ہے اور وہ یہ کہ اس کے ذریعہ دشمنوں کے سامنے قوت وہیبت کا اظہار ہوتا ہے تاکہ وہ مسلمانوں کو ضعیف وناتواں جان کر دلیر نہ ہوں۔ اس صورت میں پھر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مذکورہ مصلحت کی خاطر خضاب کرنا مشروع ہے تو اسی مصلحت کے لئے بالوں کو جڑ سے اکھاڑنا پڑتا ہے جو اول تو تکلیف کا باعث ہے، دوسرے بدہیئتی اور بدنمائی کا سبب بھی بنتا ہے جب کہ خضاب کا لگانا خوش ہیئتی میں اضافہ کرتا ہے، لہٰذا خضاب کرنے اور بالوں کو چننے میں بڑا فرق ہے۔

آنحضرت ﷺ کے سر مبارک کے بال

۴۰ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اَغْتَسِلُ اَنَا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اِنَاءٍ وَاحِدٍ كَانَ لَهُ شَعْرٌ فَوْقَ الْجُمَّةِ وَدُوْنَ الْوَفْرَةِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں اور رسول کریم ﷺ ایک ہی برتن سے نہایا کرتے تھے، یعنی پانی سے بھرا ہوا ایک ہی برتن ہم دونوں کے درمیان رکھا رہتا تھا اور آنحضرت ﷺ کے سر کے بال جمہ کے اوپر اور وفرہ کے نیچے ہوتے تھے۔" (نسائیؒ)

تشریح: سر کے بالوں کو عربی میں تین ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے ایک تو جُمَّه، دوسرے وَفرۃ اور تیسرے لِمَّۃ۔ چنانچہ اگر کسی شخص کے سر پر اتنے لمبے بال ہوں جو کانوں تک پہنچ جائیں تو ان بالوں کو جمہ کہتے ہیں اور اگر کان کے لوؤں تک بال ہوں تو ان کو وفرہ کہتے ہیں اور جو بال کان کی لو اور کاندھے کے بین بین ہوتے ہیں یعنی کان کی لو سے تو نیچے ہوں لیکن کاندھوں سے اوپر ہوں تو ان کو لمہ کہتے ہیں، لہٰذا حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ اس وقت آنحضرت ﷺ کے بال کاندھوں سے اوپر اور کان کی لو سے نیچے تھے جن کو لمہ کہتے ہیں۔ ویسے بعض مواقع پر جمہ مطلق بالوں کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ شمائل ترمذی میں یہ منقول ہے کہ وَكَانَتْ جمة تضرب شحمة اذنيه۔

مردوں کے بالوں کی زیادہ لمبائی ناپسندیدہ

(۴۱) وَعَنِ ابْنِ الْحَنْظَلِيَّةِ رَجُلٌ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نِعْمَ الرَّجُلُ خُرَيْمٌ الْاَسَدِيُّ لَوْلَا طُوْلُ جُمَّتِهٖ وَاِسْبَالُ اِزَارِهٖ فَبَلَغَ ذٰلِكَ خُرَيْمًا فَاَخَذَ شَفْرَةً فَقَطَعَ مَاجُمَّتَهٗ اِلٰى اُذُنَيْهِ وَرَفَعَ اِزَارَهٗ اِلٰى اَنْصَافِ سَاقَيْهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن حنظلہؓ جو نبی کریم ﷺ کے اصحاب میں سے ایک شخص ہیں، روایت کرتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "خریم اسدی اچھا آدمی ہے اگر اس کے بال لمبے نہ ہوں اور اس کا تہ بند لٹکتا ہوا نہ ہو۔" جب خریمؓ کو آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا علم ہوا تو انہوں نے ایک استرا لے کر اپنے بالوں کو کانوں کی لوؤں تک کاٹ ڈالا اور اپنے تہبند کو آدھی پنڈلیوں تک کر لیا!۔" (ابوداؤدؒ)

(۴۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَتْ لِيْ ذُؤَابَةٌ فَقَالَتْ لِيْ اُمِّيْ لَا اَجُزُّهَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمُدُّهَا وَيَاْخُذُهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت انسؓ فرماتے ہیں میرے سر پر لمبے بال تھے میری والدہ کاٹنے سے منع کرتی تھیں کیونکہ آپ ﷺ ان بالوں کو پکڑتے تھے (لہٰذا میں برکت حاصل کرنے کے لئے ان بالوں کو یونہی چھوڑوں گی۔" (ابوداؤدؒ)

اگر بالوں کی صفائی ستھرائی میں کوئی امر مانع ہو تو سر کو منڈا دینا چاہئے

(۴۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمْهَلَ اٰلَ جَعْفَرٍ ثَلَاثًا ثُمَّ اَتَاهُمْ فَقَالَ لَا تَبْكُوْا عَلٰى اَخِيْ بَعْدَ الْيَوْمِ ثُمَّ قَالَ ادْعُوْا لِيْ بَنِيْ اَخِيْ فَجِيْئَ بِنَا كَاَنَّا اَفْرَاخٌ فَقَالَ ادْعُوْا لِيَ الْحَلَّاقَ فَاَمَرَهٗ فَحَلَقَ رُؤُسَنَا۔

(رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عبداللہ ابن جعفرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت جعفر کی اولاد کو تین دن کی مہلت دی یعنی جب حضرت جعفر طیارؓ کی شہادت کی خبر آئی تو آپ ﷺ نے ان کے گھر والوں کو تین دن تک رونے دھونے اور سوگ کرنے کی اجازت دی اور اس عرصہ میں آپ ﷺ ان کے ہاں تشریف نہیں لائے، پھر آپ ﷺ (ان لوگوں کو تسلی و دلاسہ دینے کے لئے) ان کے ہاں تشریف لائے اور فرمایا کہ "بس، آج کے بعد میرے بھائی (جعفرؓ) پر مت رونا۔" پھر فرمایا کہ میرے بھتیجوں (یعنی عبداللہؓ، عونؓ اور محمدؓ) کو (جو جعفرؓ کے لڑکے ہیں) میرے پاس لے کر آؤ۔" چنانچہ ہم سب آپ ﷺ کی خدمت میں لائے گئے اور اس وقت ہم چوزوں کی طرح یعنی بہت کمسن تھے اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ نائی کو بلا کر میرے پاس لاؤ"۔ (جب نائی آگیا تو) آپ ﷺ نے اس کو (ہمارے بال) مونڈنے کا حکم دیا اور اس نے ہمارے سروں کو مونڈا!۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت جعفرؓ، ابوطالب کے بیٹے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کے حقیقی بھائی تھے۔ اس اعتبار سے وہ آنحضرت ﷺ کے

چچازاد بھائی ہوئے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ نوحہ اور جزع فزع کے بغیر میت پر رونا، غمگین و افسردہ ہونا اور رنج والم کا اظہار کرنا تین دن تک جائز ہے، تین دن کے بعد نہ تو رونا دھونا اور سوگ کرنا جائز ہے اور نہ تعزیت کرنا روا ہے۔

حج و عمرہ سے فراغت کے بعد تو سر کو منڈانا افضل ہے لیکن اس کے علاوہ بال رکھنا ہی افضل ہے لیکن اس کے باوجود آنحضرت ﷺ نے حضرت جعفرؓ کے لڑکوں کے سر مونڈنے کا حکم اس لئے دیا کہ ان کی ماں یعنی اسماء بنت عمیسؓ شوہر کی دائمی جدائی کے سخت ترین صدمہ سے دوچار تھیں، ان کو اپنی اس مصیبت سے اتنی فرصت کہاں ملتی کہ وہ بچوں کے سر کے بالوں کی صفائی ستھرائی اور تیل کنگھے کا خیال رکھتیں اس صورت میں ان کے سروں میں جوئیں وغیرہ پڑ جانے کا خدشہ تھا، لہٰذا آپ ﷺ نے ان کے بالوں کو منڈوا دینا ہی بہتر سمجھا۔

عورت کی ختنہ کا ذکر

(۴۴) وَعَنْ اُمِّ عَطِيَّةَ الْاَنْصَارِيَّةِ اَنَّ امْرَاَةً كَانَتْ تَخْتِنُ بِالْمَدِيْنَةِ فَقَالَ لَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُنْهِكِيْ فَاِنَّ ذٰلِكَ اَحْظٰى لِلْمَرْاَةِ وَاَحَبُّ اِلَى الْبَعْلِ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ هٰذَا الْحَدِيْثُ ضَعِيْفٌ وَرَاوِيْهِ مَجْهُوْلٌ۔

"اور حضرت اُمّ عطیہ انصاریؓ کہتی ہیں کہ مدینہ میں ایک عورت تھی جو (عورتوں کی) ختنہ کیا کرتی تھی (جیسا کہ اس زمانہ میں عورتوں کی ختنہ کا بھی رواج تھا) نبی کریم ﷺ نے (ایک دن) اس عورت سے فرمایا کہ "ختنہ کو" زیادہ مت کاٹا کرو (بلکہ تھوڑا سا اوپر سے کاٹ دیا کرو) کیونکہ یہ (یعنی زیادہ نہ کاٹنا) عورت کے لئے بھی بہت لذت بخش ہوتا ہے اور مرد کو بھی بہت پسندیدہ ہوتا ہے (یعنی اگر اس کو زیادہ کاٹ دیا جائے تو جماع میں نہ عورت کو لذت ملتی ہے اور نہ مرد کو) ابوداؤدؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور اس کے راوی مجہول ہیں۔"

تشریح: وراویہ مجھول (اور اس کے راوی مجہول ہیں) میں جس طرح یہ احتمال ہے کہ یہاں جنس راوی مراد ہے یعنی اس حدیث کے سب راوی مجہول ہیں، اسی طرح یہ بھی احتمال ہے کہ اس جملہ سے اصل میں یہ مراد ہے کہ کوئی ایک راوی مجہول ہے جیسا کہ ایک دوسرے صحیح نسخے میں منقول ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے وفی روایۃ مجھول بہرحال اس روایت کو طبرانیؒ نے صحیح سند کے ساتھ اور حاکم نے اپنی مستدرک میں ضحاک ابن قیسؓ سے نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں احفضنی ولا تنھکی فانہ انضر للزوجۃ واحظی عند الزوج۔

عورتوں کا سر کے بالوں پر مہندی کا خضاب کرنا ناپسندیدہ

(۴۵) وَعَنْ كَرِيْمَةَ بِنْتِ هَمَّامٍ اَنَّ امْرَاَةً سَاَلَتْ عَائِشَةَ عَنْ خِضَابِ الْحِنَّاءِ فَقَالَتْ لَا بَاْسَ وَلٰكِنِّيْ اَكْرَهُهُ كَانَ حَبِيْبِيْ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) يَكْرَهُ رِيْحَهُ۔ (رواه ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت کریمہ بنت ہمام سے روایت ہے کہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے (سر کے بالوں پر) مہندی کا خضاب کرنے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا اگرچہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن میں اس کو اچھا نہیں سمجھتی کیونکہ میرے محبوب (یعنی آنحضرت ﷺ) اس کی بو کو پسند نہیں فرماتے تھے!۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ عورتوں کے سر کے بالوں پر مہندی کا خضاب کرنے کو ناپسند فرماتے تھے کیوں کہ اگر آپ کے نزدیک عورتوں کے لئے مطلق مہندی کا استعمال ناپسندیدہ ہوتا تو آپ ﷺ ہندہؓ کو محض اس لئے بیعت کرنے سے انکار کیوں فرماتے کہ ان کے ہاتھ مہندی سے عاری تھے جیسا کہ آگے آنے والی حدیث سے واضح ہوگا۔

عورتوں کو ہاتھوں پر مہندی لگانا مستحب ہے

(۴۶) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ هِنْداً بِنْتَ عُتْبَةَ قَالَتْ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ بَايِعْنِيْ فَقَالَ لَا اُبَايِعُكِ حَتّٰى تُغَيِّرِيْ كَفَّيْكِ فَكَاَنَّهُمَا كَفَّا سَبُعٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ عتبہ کی بیٹی ہندہؓ نے (جب) یہ کہا اے اللہ کے نبی (ﷺ)! مجھ کو بیعت کر لیجئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جب تک کہ تم اپنے دونوں ہاتھوں کو (مہندی لگا کر ان کی رنگت کو) متغیر نہ کر لوگی میں تم سے (زبانی) بیعت نہیں لوں گا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: ہندہؓ عتبہ کی بیٹی، ابوسفیانؓ کی بیوی اور معاویہؓ کی ماں تھیں، انہوں نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا تھا، اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث بالا میں جس بیعت کا ذکر کیا گیا ہے وہ فتح مکہ کے دن کے علاوہ کسی اور دن کا واقعہ ہے۔ حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ عورتوں کو اپنے ہاتھوں پر مہندی لگانا مستحب ہے اور اس کو ترک کرنا مکروہ ہے اور یہ کراہت مردوں کی مشابہت اختیار کرنے کی وجہ سے ہے۔

(۴۷) وَعَنْهَا قَالَتْ اَوْمَتِ امْرَاَةٌ مِنْ وَرَاءِ سِتْرٍ بِيَدِهَا كِتَابٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَبَضَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَهُ فَقَالَ مَا اَدْرِيْ اَيَدُ رَجُلٍ اَمْ يَدُ امْرَاَةٍ قَالَتْ بَلْ يَدُ امْرَاَةٍ قَالَ لَوْ كُنْتِ امْرَاَةً لَغَيَّرْتِ اَظْفَارَكِ يَعْنِيْ بِالْحِنَّاءِ۔ (رواہ ابوداؤد و النسائی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک دن ایک عورت نے پردہ کے پیچھے سے اپنے ہاتھ کے ذریعہ اشارہ کیا جس میں ایک پرچہ تھا جو کسی شخص نے رسول کریم ﷺ کو بھیجا تھا (یعنی اس عورت نے پردہ کے پیچھے سے اپنا ہاتھ نکال کر وہ پرچہ آنحضرت ﷺ کو دینا چاہا) لیکن نبی کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا (یعنی وہ پرچہ نہیں لیا) اور فرمایا کہ مجھے نہیں معلوم کہ یہ ہاتھ مرد کا ہے یا عورت کا؟ اس عورت نے عرض کیا کہ "یہ ہاتھ عورت کا ہے" آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم عورت ہوتیں (یعنی تمہیں عورتوں کا طور طریقہ ملحوظ رکھنا آتا) تو اپنے ناخن کی رنگت کو مہندی کے ذریعہ ضرور تبدیل کرتیں۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: یہ حدیث عورتوں کے ہاتھوں پر مہندی لگانے کے استحباب کو اور رہن سہن کے طور طریقوں نیز آداب معاشرت کی تلقین کو پُر زور انداز میں واضح کرتی ہے۔

کسی مرض وعذر کی وجہ سے گودنا اور گدوانا جائز ہے

(۴۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لُعِنَتِ الْوَاصِلَةُ وَالْمُسْتَوْصِلَةُ وَالنَّامِصَةُ وَالْمُتَنَمِّصَةُ وَالْوَاشِمَةُ وَالْمُسْتَوْشِمَةُ مِنْ غَيْرِ دَاءٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ "ملانے والی یعنی اپنے بالوں میں انسانی بالوں کا جوڑا لگانے اور لگوانے والی اور بالوں کو چننے والی اور چنوانے والی، نیز بغیر کسی مرض کے گودنے اور گدوانے والی، یہ سب عورتیں ملعون قرار دی گئی ہیں!۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث میں مذکورہ الفاظ کی وضاحت پہلی فصل میں گزر چکی ہے۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اگر گودنے کی کوئی ضرورت اور حاجت ہو تو اس صورت میں گودنا اور گدوانا جائز ہے اگرچہ اس کے نشان باقی رہیں۔

مردانہ لباس پہننے والی عورت اور زنانہ لباس پہننے والے مرد پر آنحضرت ﷺ کی لعنت

(۴۹) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّجُلَ يَلْبَسُ لِبْسَةَ الْمَرْاَةِ وَالْمَرْاَةَ تَلْبَسُ لِبْسَةَ الرَّجُلِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس مرد پر لعنت فرمائی ہے جو زنانہ لباس پہنے، اسی طرح اس عورت پر بھی لعنت فرمائی ہے جو مردانہ لباس پہنے۔" (ابوداؤدؒ)

۵۰ وَعَنْ اَبِیْ مُلَیْکَةَ قَالَ قِیْلَ لِعَائِشَةَ اِنَّ امْرَاَةً تَلْبَسُ النَّعْلَ قَالَتْ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الرَّجُلَةَ مِنَ النِّسَآءِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوملیکہؒ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کو بتایا گیا کہ ایک عورت مردانہ جوتے پہنتی ہے تو انہوں نے فرمایا کہ رسول کریم ﷺ نے اس عورت پر لعنت فرمائی ہے جو مردوں کی مشابہت اختیار کرے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: وہ مشابہت مذموم ہے جو لباس، وضع قطع، بول چال اور رہن سہن میں اختیار کی جائے، اور جو عورت علم وعقل، اور حکمت ودانائی میں مردوں کی مشابہت اختیار کرے تو وہ مذموم نہیں ہے جیسا کہ حضرت عائشہؓ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ کانت عائشة رجلة الرای (یعنی عائشہ کی عقل مردوں کی عقل کی طرح تھی)۔

اپنے اہل بیت کا راحت و آرام کی زندگی اختیار کرنا آنحضرت ﷺ کے نزدیک ناپسندیدہ

۵۱ وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَافَرَ كَانَ اٰخِرُ عَهْدِهٖ بِاِنْسَانٍ مِنْ اَهْلِهٖ فَاطِمَةَ وَاَوَّلُ مَنْ يَّدْخُلُ عَلَيْهَا فَاطِمَةَ فَقَدِمَ مِنْ غَزَاةٍ وَقَدْ عَلَّقَتْ مِسْحًا اَوْ سِتْرًا عَلٰى بَابِهَا وَحَلَّتِ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ قُلْبَيْنِ مِنْ فِضَّةٍ فَقَدِمَ فَلَمْ يَدْخُلْ فَظَنَّتْ اَنَّ مَا مَنَعَهٗ اَنْ يَّدْخُلَ مَا رَاٰى فَهَتَكَتِ السِّتْرَ وَفَكَّتِ الْقُلْبَيْنِ عَنِ الصَّبِيَّيْنِ وَقَطَعَتْهُ مِنْهُمَا فَانْطَلَقَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ يَبْكِيَانِ فَاَخَذَهٗ مِنْهُمَا فَقَالَ يَا ثَوْبَانُ اذْهَبْ بِهٰذَا اِلٰى اٰلِ فُلَانٍ اَنَّ هٰؤُلَاءِ اَهْلِيْ اَكْرَهُ اَنْ يَّاْكُلُوْا طَيِّبَاتِهِمْ فِيْ حَيَاتِهِمُ الدُّنْيَا يَا ثَوْبَانُ اشْتَرِ لِفَاطِمَةَ قِلَادَةً مِنْ عَصَبٍ وَسِوَارَيْنِ مِنْ عَاجٍ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب سفر پر روانہ ہوتے تو اپنے اہل وعیال کے لوگوں میں سب سے آخری وقت حضرت فاطمہؓ کو عطا کرتے اور جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کے ہاں جاتے یعنی سفر کے لئے روانگی کے وقت آپ ﷺ پہلے دیگر اہل بیت سے الوداعی ملاقات فرماتے پھر ان سب سے فارغ ہو کر اور سب کو رخصت کر کے آخر میں حضرت فاطمہؓ کے پاس تشریف لے جاتے ان سے جو کچھ کہنا سننا ہوتا کہتے سنتے اور جو کوئی وصیت ونصیحت کرنی ہوتی وہ کرتے اور ان کو خدا حافظ کہہ کے روانہ ہو جائے، اور پھر جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کے ہاں تشریف لے جاتے اور سب سے پہلے ان سے ملاقات کرتے چنانچہ (ایک مرتبہ) آنحضرت ﷺ ایک جہاد کے سفر سے واپس آئے تو اس وقت حضرت فاطمہؓ نے اپنے مکان کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ لٹکا رکھا تھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے وہ پردہ آرائش کی خاطر لٹکایا تھا) کیونکہ اگر پردہ کی ضرورت کی خاطر لٹکایا ہوا ہوتا تو آنحضرت ﷺ کو کوئی ناگواری نہیں ہوتی) نیز انہوں نے (اپنے دونوں صاحبزادوں) حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو چاندی کے دو کڑے پہنا رکھے تھے (یعنی ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک کڑا یا دو دو کڑے پہنا رکھے تھے) جب آنحضرت ﷺ اپنے معمول کا مطابق سفر سے واپسی میں سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کی ملاقات کے لئے ان کے گھر، تشریف لائے اور یہ چیزیں دیکھیں تو آپ ﷺ ان کے گھر میں داخل نہیں ہوئے، حضرت فاطمہؓ سمجھ گئیں کہ جس چیز نے آنحضرت ﷺ کو میرے گھر میں داخل ہونے سے روکا وہ یہ ہے جو آپ ﷺ نے دیکھا ہے (یعنی دروازہ پر پردہ لٹکنا اور حسنؓ وحسینؓ کے ہاتھوں میں کڑے کا ہونا چنانچہ حضرت فاطمہؓ نے (فوراً) پردہ کو پھاڑ ڈالا اور دونوں صاحبزادوں کے ہاتھ سے دونوں کڑوں کو اتار لیا اور ان کو توڑ ڈالا پھر دونوں صاحبزادے ان ٹوٹے ہوئے کڑوں کو لے کر) روتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں گئے، آپ ﷺ نے اپنے رشتہ داروں میں

سے کسی شخص کا نام لے کر فرمایا کہ اس کے گھر والوں کو دے آؤ کیونکہ وہ محتاج وضرورت مند تھے، چونکہ یہ دونوں بچے میرے اہل بیت میں سے ہیں اس لئے میں اس کو اچھا نہیں سمجھتا کہ یہ دنیاوی زندگی میں بہترین غذا کھائیں (یعنی میرے نزدیک یہ پسندیدہ) نہیں ہے کہ میرے یہ بچے بہترین غذاؤں اور نفیس پوشاک واسباب سے لذت وفائدہ اٹھائیں یا آپ ﷺ نے "بہترین غذا" سے عیش وآرام کی زندگی اختیار کرنا اور دنیا کی لذتیں حاصل کرنا مراد لیا۔ نیز آپ ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ گویا یہ واضح فرمایا کہ میں اپنے اہل بیت کے بارے میں اس چیز کو اختیار کرتا ہوں کہ وہ اس دنیا میں فقروزہد اور سختی ومشقت کی زندگی اپنائیں تاکہ آخرت میں ان کے درجات بلند ہوں اور ان کا شمار ان لوگوں میں نہ ہو جن کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيٰوتِكُمُ الدُّنْيَا لیکن اس کے ساتھ ہی آنحضرت ﷺ چشم تصور سے اپنی لخت جگر فاطمہؓ کی شکستہ دلی کو بھی دیکھ رہے تھے اس لئے ان کے تئیں شفقت ومحبت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ ثوبانؓ! فاطمہؓ کے لئے عصب کا ایک ہار اور دونوں بچوں کے لئے ہاتھی دانت کے دو کڑے خرید لینا تاکہ فاطمہؓ کی بھی دلجوئی ہو جائے اور بچوں کی اشک شوئی ہو جائے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

سرمہ لگانے کا حکم

۵۲ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اكْتَحِلُوْا بِالْاِثْمِدِ فَاِنَّهٗ يَجْلُو الْبَصَرَ وَيُنْبِتُ الشَّعْرَ وَزَعَمَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ لَهٗ مُكْحُلَةٌ يَكْتَحِلُ بِهَا كُلَّ لَيْلَةٍ ثَلَاثَةً فِيْ هٰذِهٖ وَثَلَاثَةً فِيْ هٰذِهٖ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اصفہانی سرمہ (برابر) لگایا کرو، کیونکہ وہ سرمہ بینائی کو روشن کرتا ہے اور بالوں یعنی پلکوں کو اگاتا ہے جو آنکھوں کی زیبائی وحفاظت کی ضامن ہوتی ہیں) حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک لمبی سرمہ دانی تھی، جس سے آپ ﷺ روزانہ رات میں تین بار اس آنکھ میں اور تین بار اس آنکھ میں سرمہ لگاتے تھے (یعنی مسلسل تین سلائی دائیں آنکھ میں اور تین سلائی بائیں آنکھ میں لگاتے تھے)۔" (ترمذیؒ)

تشریح: بعض حضرات یہ کہتے ہیں "اثمد" مطلق سرمہ کو کہا جاتا ہے، لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ "اثمد" ایک مخصوص قسم کے سرمہ کو کہا جاتا ہے، اور بعض حضرات کے قول کے مطابق وہ مخصوص قسم اصفہانی سرمہ ہے جو آنکھ سے بہنے والے پانی کو روکتا ہے، آنکھ کے اندر اگر زخم پیدا ہو جاتے ہیں یا سوزش ہوتی ہے تو اس کو دفع کرتا ہے اور آنکھ کی رگوں کو جو روشنی کا ذریعہ ہیں طاقت دیتا ہے خاص طور پر بڑی عمر والوں اور بچوں کے حق میں زیادہ فائدہ مند رہتا ہے۔

ایک روایت میں بالاثمد کے بجائے بالاثمد المروح کے الفاظ ہیں یعنی وہ سرمہ جس میں خالص مشک مخلوط ہو۔

"روزانہ رات میں" سے ہر روز رات میں سونے سے پہلے "مراد" ہے جیسا کہ ایک روایت میں وعند النوم کے الفاظ منقول بھی ہیں۔ رات میں سونے سے پہلے سرمہ لگانے میں حکمت ومصلحت یہ ہے کہ سرمہ کے اجزاء آنکھوں میں زیادہ عرصہ تک رہتے ہیں اور اس کے اثرات آنکھ کے اندرونی پردوں اور جھلیوں تک اچھی طرح سرایت کرتے ہیں۔

بہترین دوائیں کون سی ہیں

۵۳ وَعَنْهُ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكْتَحِلُ قَبْلَ اَنْ يَّنَامَ بِالْاِثْمِدِ ثَلَاثًا فِيْ كُلِّ عَيْنٍ قَالَ وَقَالَ اِنَّ خَيْرَ مَا تَدَاوَيْتُمْ بِهِ اللَّدُوْدُ وَالسَّعُوْطُ وَالْحِجَامَةُ وَالْمَشِيُّ وَخَيْرَ مَا اكْتَحَلْتُمْ بِهِ الْاِثْمِدُ فَاِنَّهٗ يَجْلُو الْبَصَرَ وَيُنْبِتُ الشَّعْرَ وَاِنَّ خَيْرَ مَا تَحْتَجِمُوْنَ فِيْهِ يَوْمُ سَبْعَ عَشْرَةَ وَيَوْمُ تِسْعَ عَشْرَةَ وَيَوْمُ اِحْدٰى وَعِشْرِيْنَ وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَيْثُ عُرِجَ بِهٖ مَا مَرَّ عَلٰى مَلَاٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِلَّا قَالُوْا عَلَيْكَ بِالْحِجَامَةِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ (رات میں) سونے سے پہلے ہر آنکھ میں اصفہانی سرمہ کی تین تین سلائیاں لگایا کرتے تھے! نیز حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم علاج کے لئے جن چیزوں کو اختیار کرتے ہو ان میں بہترین چیزیں چار ہیں ایک تو لدود، دوسرے سعوط، تیسرے حجامۃ اور چوتھے مشی! آنکھوں کے لگانے کی چیزوں میں بہترین چیز اصفہانی سرمہ ہے جو بینائی کو روشن کرتا ہے اور پلکوں کے بالوں کو جماتا ہے، نیز بھری ہوئی سینگی کھنچوانے کے لئے (چاند کی) سترھویں، انیسویں اور اکیسویں (تاریخ) بہترین دن ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے یہ بھی بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ جب معراج میں تشریف لے گئے تو فرشتوں کی کوئی بھی ایسی جماعت نہیں تھی جس کے پاس سے آپ ﷺ گزرے ہوں اور اس نے یہ نہ کہا ہو کہ بھری ہوئی سینگی کھنچوانا آپ ﷺ کے لئے ضروری ہے۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "لدود" اس کو کہتے ہیں جو مریض کے منہ میں باچھ کی طرف سے ٹپکائی جائے! سعوط اس دوا کو کہتے ہیں جو ناک میں ٹپکائی جائے! حجامہ بھری ہوئی سینگی کھنچوانے کو کہتے ہیں! اور مشی اسہال کی دواء کو کہتے ہیں، یہ لفظ مشی بمعنی چلنے سے مشتق ہے، چونکہ دست آور دوا کے استعمال سے بیت الخلاء جانے کے لئے بار بار چلنا پڑتا ہے اس مناسبت سے اس دوا کو مشی کہا جاتا ہے۔

چوں کو مہینہ کی ابتداء سے وسط مہینہ تک خون، بلکہ تمام رطوبات میں بڑھوتری، غلبہ اور جوش رہتا ہے، ادھر مہینہ کی آخری تاریخوں میں ان چیزوں کا عمل سست کمزور اور سرد ہو جاتا ہے اس اعتبار سے گویا مہینہ کے وسط ایام اور خاص طور پر مذکورہ تاریخیں انسانی جسم کے لئے معتدل ہوتی ہیں، لہٰذا ان دنوں میں سینگی کھنچوانا زیادہ سود مند ہوتا ہے حجامۃ کے بارے میں تفصیلی باتیں انشاء اللہ کتاب الطب والرقی میں نقل کی جائیں گی۔

حمام میں جانے کا ذکر

(۵۴) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى الرِّجَالَ وَالنِّسَاءَ عَنْ دُخُولِ الْحَمَّامَاتِ ثُمَّ رَخَّصَ لِلرِّجَالِ اَنْ يَّدْخُلُوْا بِالْمَيَازِرِ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مردوں اور عورتوں کو حمام میں جانے سے منع فرمادیا تھا، پھر بعد میں آپ ﷺ نے مردوں کو اس صورت میں جانے کی اجازت دے دی تھی جب کہ ان کے جسم پر تہبند ہوا۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "حمام" سے مراد وہ غسل خانے ہیں جو عوامی ضرورت کے لئے بازاروں میں بنائے جاتے ہیں اور جہاں ہر کس و ناکس نہانے کی غرض سے آتا جاتا ہے، بلکہ پہلے زمانوں میں تو اس قسم کے حمام ہوتے تھے، جہاں علیحدہ علیحدہ نہانے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تھا بلکہ کئی کئی آدمی ایک ہی جگہ ساتھ ساتھ غسل کرتے تھے ظاہر ہے کہ اس صورت میں ستر پوشی ممکن نہیں ہو سکتی تھی اس لئے آپ ﷺ نے مسلمانوں کو حمام میں جانے سے منع کر دیا البتہ بعد میں مردوں کو اس شرط کے ساتھ جانے کی اجازت دی کہ وہ بغیر تہبند کے جو گھٹنوں تک ہونا ضروری ہے وہاں غسل نہ کریں۔

مظہرؒ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے (تہبند کی شرط کے ساتھ بھی) عورتوں کو حمام میں جانے کی اجازت اس لئے نہیں دی کہ ان کے اعضاء ستر کے حکم میں داخل ہیں کہ ان کے لئے جسم کا کوئی حصہ بھی کھولنا جائز نہیں ہے تاہم واقعی ضرورت و مجبوری کی صورت میں عورتوں کے لئے بھی اجازت ہے مثلاً شدید سردی کے موسم میں حیض و نفاس سے فراغت کے بعد، یا ناپاک ہونے کی صورت میں نہانے کی ضرورت ہو یا کسی علاج کے سلسلے میں گرم پانی سے نہانا ضروری ہو اور گرم پانی کا حمام کے علاوہ اور کہیں انتظام نہ ہو نیز ٹھنڈے پانی سے نہانا ضرر و نقصان کا باعث ہو تو اس صورت میں عورت کو بھی حمام جانے کی مخصوص اجازت ہوگی۔

یہاں یہ خلجان پیدا ہو سکتا ہے کہ اس وضاحت سے وہ وجہ ظاہر نہیں ہوئی جس سے یہ واضح ہوتا کہ اس ممانعت میں مردوں اور

عورتوں کے درمیان فرق کیوں کیا گیا ہے کیونکہ عورت کی موجودگی میں عورت کے لئے بلا فرق وہی حکم ہے جو مرد کی موجودگی میں مرد کے لئے ہے کہ جس طرح مرد کو کسی مرد کے سامنے اپنے جسم کو کھولنا جائز ہے۔ علاوہ اس حصہ جسم کے جو شرعی طور پر عورت کے لئے ستر کے حکم میں ہے اس اعتبار سے قیاس کا تقاضا تو یہی ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی یہ اجازت ہونی چاہئے کہ وہ زنانہ حمام میں جا سکتی ہیں بشرطیکہ وہ اپنے جسم کے اس حصے کو ضرور چھپائے رہیں جن کو عورت کے سامنے بھی کھولنا جائز نہیں ہے؟ اس خلجان کو اس توجیہ کے ذریعہ رفع کیا جاسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عورتوں کو مذکورہ شرط کے ساتھ حمام میں جانے کی اجازت اس لئے نہیں دی ہوگی کہ عام طور پر عورتیں اپنی ہم جنسوں کے سامنے اپنی ستر پوشی کا کوئی خاص لحاظ نہیں رکھتیں۔ بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو عورتوں کے سامنے حتی کہ اجنبی عورتوں تک کے سامنے اپنے ستر کی عریانیت کو معیوب نہیں سمجھتیں، چہ جائیکہ اپنی اقارب جیسے ماں یا بیٹی یا بہن وغیرہ کے سامنے ستر کھولنے کو کوئی برائی سمجھیں یہاں تک کہ گھر میں بھی غسل وغیرہ کے مواقع پر عورتیں ایک دوسرے کے سامنے اپنے ستر کو چھپانے کا خیال نہیں رکھتیں چہ جائیکہ حمام میں کہ جہاں ویسے بھی ایک دوسرے کے سامنے ستر پوشی بڑی مشکل سے قائم رکھنی پڑتی ہے بلکہ اکثر عورتیں تو کوئی کپڑا وغیرہ لپیٹنے تک روادار نہیں ہوتیں، لہٰذا آنحضرت ﷺ نے نور نبوت کے ذریعہ عورتوں کی اس حالت کا ادراک کر لیا اور ان کے لئے اس راستہ ہی کو بند کر دیا۔

۵۵ وَعَنْ اَبِی الْمَلِیْحِ قَالَ قَدِمَ عَلٰی عَائِشَةَ نِسْوَةٌ مِنْ اَھْلِ حِمْصَ فَقَالَتْ مِنْ اَیْنَ اَنْتُنَّ قُلْنَ مِنَ الشَّامِ قَالَتْ فَلَعَلَّکُنَّ مِنَ الْکُوْرَةِ الَّتِیْ تَدْخُلُ نِسَآئُھَا الْحَمَّامَاتِ قُلْنَ بَلٰی قَالَتْ فَاِنِّی سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا تَخْلَعُ امْرَاَةٌ ثِیَابَھَا فِیْ غَیْرِ بَیْتِ زَوْجِھَا اِلَّا ھَتَکَتِ السِّتْرَ بَیْنَھَا وَبَیْنَ رَبِّھَا، وَفِیْ رِوَایَةٍ فِیْ غَیْرِ بَیْتِھَا اِلَّا ھَتَکَتْ سِتْرَھَا فِیْمَا بَیْنَھَا وَبَیْنَ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابوملیح کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں (ملک شام کے شہر) حمص کی کچھ عورتیں آئیں، حضرت عائشہؓ نے ان سے پوچھا تم کہاں کی رہنے والی ہو؟ انہوں نے کہا کہ ملک شام کی، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ شاید تم اس علاقہ کی رہنے والی ہو جہاں کی عورتیں حمام میں جاتی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! تب حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو بھی عورت اپنے خاوند کے گھر کے علاوہ کہیں اور کپڑے اتارتی ہے تو (گویا) وہ اس پردہ کو چاک کر دیتی ہے جو اس کے اور اللہ عزوجل کے درمیان ہے۔ یعنی اس روایت میں فِیْ بیت غیر زوجھا کی بجائے فِیْ بیتھا کے الفاظ ہیں۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت عائشہؓ نے گویا مذکورہ حدیث عورتوں کے حمام میں جانے کے خلاف دلیل کے طور پر پیش کی، جس کا مطلب یہ ہے کہ عورت کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ پردہ میں رہے اور اس بات سے اپنے آپ کو بچائے کہ کوئی اجنبی اس کو دیکھے، یہاں تک کہ اس کے لئے یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے خاوند کی موجودگی کے علاوہ خلوت (تنہائی) میں بھی اپنا ستر کھولے، لہٰذا جب وہ بلا ضرورت شرعی حمام میں گئی اور وہاں اس نے اجنبی نظروں کا لحاظ کئے بغیر اپنے اعضاء و جسم کو عریاں کر دیا تو اس نے گویا اس پردہ کو چاک کر دیا جس میں اپنے جسم کو چھپانے کا حکم اس کو اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ مذکورہ ارشاد گرامی ﷺ کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لباس کو اس لئے نازل کیا ہے کہ اس کے ذریعہ اپنے ستر کو چھپایا جائے گو وہ لباس اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کا ذریعہ ہے، لہٰذا جس عورت نے اللہ تعالیٰ کے اس منشاء و حکم کو پورا نہیں کیا اور اپنے ستر کو عریاں کیا تو گویا اس نے اس پردہ کو پھاڑ ڈالا جو اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے۔

۵۶ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ ابْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ سَتُفْتَحُ لَکُمْ اَرْضُ الْعَجَمِ وَسَتَجِدُوْنَ فِیْھَا بُیُوْتًا یُقَالُ لَھَا الْحَمَّامَاتُ فَلَا یَدْخُلَنَّھَا الرِّجَالُ اِلَّا بِالْاُزُرِ وَامْنَعُوْھَا النِّسَاءَ اِلَّا مَرِیْضَةً اَوْ نُفَسَاءَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ عنقریب تمہیں عجم کی سرزمین پر فتح حاصل ہوگی جہاں تمہیں

ایسے گھر ملیں گے جن کو حمام کہا جائے گا، لہٰذا (خبردار) ان میں داخل ہونے سے بالکل منع کر دینا الا یہ کہ کوئی عورت بیمار ہو یا نفاس کی حالت میں ہو۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مردوں کو تو حمام میں جانے کی اس شرط کے ساتھ اجازت بھی ہے کہ وہ تہبند باندھے رکھیں، لیکن عورتوں کو مطلقاً اجازت نہیں ہے خواہ وہ تہبند باندھے ہوئے ہوں یا بغیر تہبند کے ہوں، کیونکہ عورت کا پورا جسم سر سے پاؤں تک ستر ہے جب کہ مرد کا پورا جسم ستر نہیں ہے بلکہ صرف ناف سے زانوں تک کا حصہ چھپانا اس کے لئے ضروری ہے اس لئے تہبند باندھنے سے ان کی ستر پوشی ہو جاتی ہے تاہم اگر کوئی عورت بیمار ہو اور کسی علاج کے سلسلے میں اس کے لئے گرم پانی سے نہانا ضروری ہو، یا کوئی عورت ولادت سے فارغ ہوئی تو غسل کے لئے یا اسی طرح کے کسی اور شرعی عذر کی بنا پر اس کے لئے زنانہ حمام میں داخل ہونا جائز ہو گا خواہ وہ وہاں تہبند جیسی کوئی چیز لپیٹ کر غسل کرے یا بالکل عریاں حالت میں، بغیر عذر حمام میں داخل ہونا عورتوں کے لئے جائز نہیں ہے۔

(۵۷) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا یَدْخُلِ الْحَمَّامَ بِغَیْرِ اِزَارٍ وَمَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا یُدْخِلْ حَلِیْلَتَہُ الْحَمَّامَ وَمَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا یَجْلِسْ عَلٰی مَائِدَۃٍ تُدَارُ عَلَیْہَا الْخَمْرُ۔ (رواہ الترمذی والنسائی)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنی عورت کو حمام میں داخل نہ ہونے دے" اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اس دسترخوان پر نہ بیٹھے جس پر شراب کا دور چلتا ہو۔" (ترمذیؒ، نسائیؒ)

تشریح: "اپنی عورت کو حمام میں داخل نہ ہونے دے" کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بیوی کو حمام میں جانے کی اجازت نہ دے، اس حکم میں ماں، بیٹی اور بہن وغیرہ ایسی عورتیں بھی شامل ہیں جو اس (مرد) کے قابو واختیار میں ہوں، نیز مرد کے لئے یہ مکروہ ہے کہ وہ حمام میں جانے کی اجرت دینے کے لئے اپنی بیوی وغیرہ کو روپیہ پیسہ دے کیونکہ اس صورت میں وہ ایک مکروہ عمل کا مددگار بنے گا۔

فقہ کی بعض کتابوں میں آنحضرت ﷺ کا حمام میں جانا نقل کیا گیا ہے لیکن محدثین کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے اور اس بارے میں حدیث منقول ہے اس کو موضوع یعنی من گھڑت قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہ بات درجہ صحت پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ آنحضرت ﷺ کبھی بھی حمام میں نہیں گئے ہیں بلکہ آپ ﷺ نے حمام کی صورت بھی کبھی نہیں دیکھی! رہی اس حمام کی بات جو مکہ معظمہ میں حمام النبی ﷺ کے نام سے مشہور ہے تو ہو سکتا ہے کہ جس جگہ آنحضرت ﷺ نے کبھی غسل کیا ہو گا اس کو حمام کی صورت دے دی گئی ہو اور پھر اس کو حمام النبی ﷺ کہا جانے لگا ہو، نیز ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ جگہ "حمام النبی ﷺ" اس مناسبت سے زبان زد خاص وعام ہو گئی ہو کہ آنحضرت ﷺ کی پیدائش مبارک کی جگہ اسی مقام کے اطراف وجوانب میں واقع ہے تاہم احادیث میں "حمام" کا ذکر ضرور موجود ہے جیسا کہ مذکورہ روایات سے ظاہر ہوا۔

"اس دسترخوان پر نہ بیٹھے" کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ ہرگز نہ جائے جہاں شراب کا دور چلتا ہو اور شرابی لوگ وہاں مے نوشی کرتے ہوں۔ لہٰذا وہاں جانے والا مسلمان اگر شراب نوشی میں شامل نہ بھی ہو تو اس صورت میں اس پر یہ تو واجب ہو ہی گا کہ وہ وہاں شراب پینے والوں کو اس برے فعل سے روکے لیکن وہاں پہنچ جانے کے باوجود اگر اس نے نہ تو ان لوگوں کو شراب پینے سے روکا، نہ ان سے بے اعتنائی کا برتاؤ کیا اور نہ ان کے خلاف اپنی نفرت وغصہ کا اظہار کیا تو یقیناً اس کا شمار کامل مؤمنین میں نہیں ہو گا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

آنحضرت ﷺ نے سر مبارک پر کبھی خضاب نہیں کیا

۵۸ عَنْ ثَابِتٍ قَالَ سُئِلَ اَنَسٌ عَنْ خِضَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْشِئْتُ اَنْ اَعُدَّ شَمَطَاتٍ کُنَّ فِیْ رَاْسِہٖ فَعَلْتُ قَالَ وَلَمْ یَخْتَضِبْ وَزَادَ فِیْ رِوَایَۃٍ وَقَدِ اخْتَضَبَ اَبُوْبَکْرٍ بِالْحِنَّاءِ وَالْکَتَمِ وَاخْتَضَبَ عُمَرُ بِالْحِنَّاءِ بَحْتًا۔

(متفق علیہ)

"حضرت ثابتؒ سے روایت ہے کہ حضرت انس ابن مالکؓ سے نبی کریم ﷺ کے خضاب کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ اگر میں آنحضرت ﷺ کے سر مبارک میں سفید بالوں کی تعداد شمار کرنا چاہتا تو (یقیناً) شمار کر لیتا (یعنی آپ ﷺ کے سر مبارک میں چند ہی بال سفید تھے) اس صورت میں آپ ﷺ کو خضاب کرنے کی کیا ضرورت تھی چنانچہ آپ ﷺ نے کبھی خضاب نہیں کیا۔ ایک روایت میں حضرت انسؓ نے یا حضرت انسؓ سے ثابتؒ نے یہ عبارت مزید نقل کی کہ حضرت ابوبکرؓ نے مہندی اور وسمہ کا خضاب استعمال کیا اور حضرت عمرؓ نے صرف مہندی کا خضاب استعمال کیا۔" (بخاریؒ، ومسلمؒ)

تشریح: آپ ﷺ نے کبھی خضاب نہیں کیا۔ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے سر مبارک میں کبھی بھی خضاب کا استعمال نہیں کیا اس صورت میں یہ روایت پیچھے نقل کی گئی اس روایت کے منافی نہیں ہوگی جس میں ریش مبارک پر خضاب کرنے کا ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ آگے بھی حضرت ابن عمرؓ کی روایت آ رہی ہے۔ نیز مہندی اور وسمہ دونوں کے مخلوط اور صرف مہندی کے خضاب کے سلسلے میں جو بحث کی جاتی ہے وہ بھی پیچھے گزر چکی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے خضاب کرنے کا ذکر

۵۹ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّہٗ کَانَ یُصَفِّرُ لِحْیَتَہٗ بِالصُّفْرَۃِ حَتّٰی یَمْتَلِیَٔ ثِیَابُہٗ مِنَ الصُّفْرَۃِ فَقِیْلَ لَہٗ لِمَ تَصْبَغُ بِالصُّفْرَۃِ قَالَ اِنِّیْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَصْبَغُ بِھَا وَلَمْ یَکُنْ شَیْءٌ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْھَا وَقَدْ کَانَ یَصْبَغُ بِھَا ثِیَابَہٗ کُلَّھَا حَتّٰی عِمَامَتَہٗ۔

(رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ اپنی داڑھی پر زرد خضاب کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے کپڑے بھی زرد آلود ہو جاتے تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ ﷺ زرد خضاب کیوں کرتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ کو (اپنی ریش مبارک پر) زرد خضاب کرتے ہوئے دیکھا ہے، اور آپ ﷺ کے نزدیک داڑھی پر خضاب کرنے کے لئے زرد رنگ سے زیادہ پسندیدہ کوئی چیز نہیں تھی، نیز آنحضرت ﷺ اپنے تمام کپڑے یہاں تک کہ عمامہ کو بھی رنگ دیتے تھے۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: "زرد خضاب" سے مراد ورس کے ذریعہ خضاب کرنا ہے جو ایک گھاس ہوتی ہے اور زعفران کے مشابہ ہوتی ہے۔ بسا اوقات ورس کے ساتھ زعفران کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یصبغ بھا سے ابن عمرؓ کی مراد یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی ریش مبارک پر زرد خضاب کرتے تھے جیسا کہ ترجمہ کے دوران قوسین میں اس کو واضح کیا گیا ہے، بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ بالوں کو رنگنا مراد ہے، اور بعض حضرات کے قول کے مطابق کپڑوں کو رنگنا مراد ہے، نیز سیوطیؒ نے کہا ہے کہ یہی قول اشبہ یعنی صحیح ہے کہ آنحضرت ﷺ کا بالوں کا رنگنا منقول نہیں ہے لیکن ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ جب یہ بات درجہ صحت کو پہنچ چکی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسم کے رنگے ہوئے اور زعفرانی

کپڑے پہننے سے منع کیا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ مذکورہ جملہ کو کپڑوں کے زرد رنگنے پر محمول کیا جائے لہٰذا زیادہ صحیح بات وہی ہے جو صاحب نہایہ نے نقل کی ہے کہ مختار قول یہ ہے کہ کبھی تو آپ ﷺ نے بالوں کو رنگا اور اکثر نہیں رنگا لہٰذا راویوں میں سے ہر ایک نے اسی چیز کو بیان کیا جس کو اس نے دیکھا ہے اس اعتبار سے ہر راوی اپنے بیان میں سچا ہے۔

"تمام کپڑے یہاں تک کہ عمامہ کو زرد رنگ دیتے تھے" اس سے یہ قطعا مراد نہیں ہے کہ آپ ﷺ خاص طور کپڑوں کو زرد رنگتے تھے اور پھر اس کو پہنتے تھے، کیونکہ زرد رنگ کے کپڑے پہننے کی ممانعت منقول ہے بلکہ عبارت کا مقصد، محض یہ واضح کرنا ہے کہ آنحضرت ﷺ جو زرد خضاب لگاتے تھے اس کے اثر سے آپ ﷺ کے کپڑے بھی زرد ہو جاتے تھے۔

(۶۰) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَوْهَبٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰی اُمِّ سَلَمَةَ فَاَخْرَجَتْ اِلَيْنَا شَعْرًا مِنْ شَعْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَخْضُوْبًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عثمان ابن عبداللہ ابن موہب کہتے ہیں کہ ایک دن میں اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے ہمیں نبی کریم ﷺ کا ایک موئے مبارک نکال کر دکھایا جو رنگین تھا!" (بخاریؒ)

تشریح: میرکؒ کہتے ہیں کہ ابن ماجہؒ اور احمدؒ نے اپنی روایت میں "رنگین" کے ساتھ مہندی اور وسمہ کے الفاظ بھی نقل کئے ہیں یعنی وہ موئے مبارک مہندی اور وسمہ کے مخلوط رنگ سے رنگین تھا۔ بخاریؒ کی جو روایت نقل کی گئی ہے اسی طرح کی ایک روایت ترمذیؒ نے بھی شمائل میں حضرت انسؓ سے نقل کی ہے کہ انہوں نے (یعنی انسؓ نے) بیان کیا کہ میں نے آنحضرت ﷺ کا ایسا موئے مبارک دیکھا جو رنگین تھا، لیکن حضرت انسؓ ہی کی یہ روایت بھی گزر چکی ہے کہ آنحضرت ﷺ خضاب نہیں کرتے تھے، تو ہو سکتا ہے کہ جس روایت میں انہوں نے آنحضرت ﷺ کے خضاب کرنے کی نفی کی ہے اس سے ان کی مراد یہ ہو کہ آپ ﷺ اکثر خضاب نہیں کرتے تھے اور جس روایت سے خضاب کا اثبات ہوتا ہے وہ اقل احوال پر محمول ہو یعنی کبھی کبھار آپ ﷺ نے خضاب کیا ہو گا نیز یہ کہنا بھی صحیح ہو سکتا ہے کہ ان دونوں میں سے ایک روایت تو حقیقت پر مبنی ہے اور دوسری مجاز پر محمول ہے یعنی حقیقت تو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی خضاب نہیں کیا، لیکن کسی موقع پر آپ ﷺ نے درد سر کے دفعیہ کے لئے اپنے سر مبارک پر مہندی لگائی ہو گی اس کے رنگ کا اثر آپ ﷺ کے بالوں پر بھی آگیا ہو گا یا یہ کہ وہ موئے مبارک جو حضرت انسؓ نے دیکھا تھا خوشبوؤں میں بسا کر رکھا جاتا ہو گا اور ان خوشبوؤں کے اثر سے وہ ایسا نظر آیا ہو گا جیسے خضاب کیا ہو، اس اعتبار سے حضرت انسؓ نے اس موئے مبارک کو رنگین کہا۔ ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ خضاب کی نفی کو اس پر محمول کیا جائے کہ آنحضرت ﷺ نے سفید بالوں کو چھپانے کے لئے اپنے سر مبارک پر کبھی خضاب نہیں کیا اور جس روایت سے خضاب کا اثبات ہوتا ہے اس کو اس پر محمول کیا جائے کہ آپ ﷺ نے اپنی ریش مبارک کے ان چند بالوں پر خضاب کیا تھا جو سفید ہو گئے تھے، اور بخاریؒ کی جس روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت اُم سلمہؓ کے پاس آنحضرت ﷺ کی ریش مبارک کا ایک بال تھا جس پر مہندی اور وسمہ کے خضاب کا اثر تھا تو اس پر شمائل میں منقول حضرت ابوہریرہؓ کی اس مطلق روایت کو محمول کیا جائے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ آنحضرت ﷺ خضاب کرتے تھے تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں۔

آنحضرت ﷺ کے حکم سے ایک مخنث کو شہر بدر کرنے کا ذکر

(۶۱) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ اُتِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمُخَنَّثٍ قَدْ خَضَبَ يَدَيْهِ وَ رِجْلَيْهِ بِالْحِنَّاءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَابَالُ هٰذَا قَالُوْا يَتَشَبَّهُ بِالنِّسَاءِ فَاَمَرَ بِهٖ فَنُفِيَ اِلَى النَّقِيْعِ فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلَا نَقْتُلُهٗ فَقَالَ اِنِّيْ نُهِيْتُ عَنْ قَتْلِ الْمُصَلِّيْنَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک مخنث کو لایا گیا جس نے (عورتوں کی طرح) اپنے ہاتھ پر مہندی لگا رکھی تھی رسول کریم ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) فرمایا کہ اس کو کیا ہوا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یہ شخص (اپنے رہن سہن، بول چال اور طور طریقوں میں) عورتوں کی مشابہت کرتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کو (شہر سے) باہر نکال دینے کا حکم دیا اور اس کو (مدینہ کے ایک جگہ) نقیع میں بھیج دیا گیا، پھر صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ!" کیا ہم اس کو موت کے گھاٹ نہ اتار دیں، یعنی چونکہ یہ فسق و فساد اور برائی کی گند پھیلا رہا ہے اس لئے اگر آپ ﷺ حکم دیں تو اس کو قتل کر دیا جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "مجھ کو نماز پڑھنے والوں کے قتل سے منع کیا گیا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے "نماز" کے ذریعہ بطور کنایہ اس کے اسلام کو ذکر کیا گویا آپ ﷺ نے واضح کیا کہ چونکہ وہ شخص بہرحال مسلمان ہے اس لئے اس کے قتل کا حکم کیسے دیا جا سکتا ہے! نماز بول کر اسلام مراد لینے کی بنیاد یہ بھی ہے کہ حقیقت میں نماز ایک ایسا عمل ہے جو اسلام کے اظہار کا ذریعہ ہے اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو گویا وہ ظاہر کرتا ہے کہ میرا اسلام سے تعلق نہیں ہے اسی لئے اس قول "اگر کوئی مسلمان نماز نہ پڑھے تو اس کو قتل کر دیا جائے" کو بعض علماء نے اس کے ظاہری مفہوم ہی پر محمول کیا ہے۔

مرد کے لئے رنگدار خوشبو کا استعمال ممنوع ہے

(۶۲) وَعَنِ الْوَلِيْدِ بْنِ عُقْبَةَ قَالَ لَمَّا فَتَحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَكَّةَ جَعَلَ اَهْلُ مَكَّةَ يَاْتُوْنَهُ بِصِبْيَانِهِمْ فَيَدْعُوْا لَهُمْ بِالْبَرَكَةِ وَيَمْسَحُ رُؤُوْسَهُمْ فَجِئَ بِيْ اِلَيْهِ وَاَنَا مُخَلَّقٌ فَلَمْ يَمَسَّنِيْ مِنْ اَجْلِ الْخَلُوْقِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ولید ابن عقبہؓ کہتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ کو مکہ پر فتح حاصل ہوئی (اور آپ ﷺ مکہ شہر میں رونق افروز ہوئے) تو مکہ والوں نے اپنے بچوں کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لانا شروع کیا، چنانچہ آنحضرت ﷺ ان بچوں کے لئے برکت کی دعا کرتے اور (پیار و شفقت سے) ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے اس موقع پر مجھے بھی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لایا گیا لیکن چونکہ میرے بدن پر (زعفران وغیرہ کی بنی ہوئی خوشبو) خلوق لگی ہوئی تھی اس لئے آپ ﷺ نے مجھ کو خلوق آلودہ ہونے کی وجہ سے ہاتھ نہیں لگایا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: خلوق چونکہ عورتوں کی مخصوص خوشبو ہے اس لئے اگر کوئی مرد اس خوشبو کو لگائے تو عورتوں کی مشابہت لازم آتی ہے لہٰذا مرد کے لئے خلوق کا استعمال ممنوع ہے۔

بالوں کی دیکھ بھال کرنے کا ذکر

(۶۳) وَعَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ اَنَّهُ قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِيْ جُمَّةً اَفَاُرَجِّلُهَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ وَاَكْرِمْهَا قَالَ فَكَانَ اَبُوْ قَتَادَةَ رُبَّمَا دَهَنَهَا فِي الْيَوْمِ مَرَّتَيْنِ مِنْ اَجْلِ قَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ وَاَكْرِمْهَا۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ سے عرض کیا کہ میرے (سر کے بال) مونڈھوں تک ہیں، کیا ان میں کنگھا کیا کروں؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہاں! اور ان کی تکریم بھی کیا کرو یعنی ان میں تیل وغیرہ لگا کر ان کی دیکھ بھال کرو۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے اس ارشاد "ہاں اور ان کی تکریم کیا کرو" کی تعمیل میں حضرت ابوقتادہؓ اکثر دن بھر میں دو مرتبہ اپنے بالوں میں تیل لگایا کرتے تھے۔" (مالکؒ)

تشریح: بالوں میں تیل لگانے اور کنگھی کرنے کو کثرت کے ساتھ اختیار کرنا، اس صورت میں غیر پسندیدہ اور نا محمود ہے جب کہ اس کا

مقصد محض زینت وآرائش ہو اور اس میں بے جا انہماک و اہتمام سے کام لیا جائے، لیکن حضرت ابوقتادہؓ کے بارے میں جو نقل کیا گیا ہے اس کی نوعیت بالکل جداگانہ تھی کہ ان کا یہ عمل یعنی بالوں میں اکثر تیل لگانا اور کنگھی کرنا محض آنحضرت ﷺ کے حکم کی بجا آوری اور منشاء نبوی ﷺ کی تعمیل کی خاطر تھا جو یقیناً پسندیدہ و محمود کہلائے گا جیسا کہ حضرت انسؓ کی والدہ کے بارے میں بیان کیا جاچکا ہے کہ انہوں نے انسؓ کے گیسو محض اس لئے نہیں کاٹے کہ ان کو آنحضرت ﷺ کھینچا اور پکڑا کرتے تھے۔

غیر مسلم قوموں کی وضع قطع کے بال رکھنے ممنوع ہیں

(۶۴) وَعَنِ الْحَجَّاجِ بْنِ حَسَّانٍ قَالَ دَخَلْنَا عَلٰى اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ فَحَدَّثَتْنِي اُخْتِي الْمُغِيْرَةُ قَالَتْ وَاَنْتَ يَوْمَئِذٍ غُلَامٌ وَلَكَ قَرْنَانِ اَوْ قُصَّتَانِ فَمَسَحَ رَاْسَكَ وَبَرَّكَ عَلَيْكَ وَقَالَ احْلِقُوْا هٰذَيْنِ اَوْ قُصُّوْهُمَا فَاِنَّ هٰذَا زِيُّ الْيَهُوْدِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت حجاج ابن حسان کہتے ہیں کہ ایک دن ہم لوگ یعنی میں اور میرے گھر کے کچھ افراد) حضرت انسؓ ابن مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے اس دن کے واقعہ کو مجھ سے میری بہن نے بیان کیا جن کا نام مغیرہ ہے، یعنی اس وقت میں بچہ تھا اور مجھے اس دن حضرت انسؓ کی خدمت میں حاضر ہونا تو یاد ہے لیکن اس حاضری کی کیفیت اور وہاں جو احوال پیش آئے ان کی تفصیل مجھے یاد نہیں ہے چنانچہ میری بہن نے (مجھے بتایا کہ) تم ان دنوں میں بچے تھے اور تمہارے سر پر دو گندھے ہوئے گیسو۔ یا دو گچھے تھے۔ حضرت انسؓ نے تمہارے سر پر ہاتھ پھیرا اور تمہارے حق میں برکت کی دعا کی نیز فرمایا کہ ان دونوں کو منڈوا ڈالو یا کاٹ ڈالو کیونکہ یہ یہودیوں کی وضع ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: "یا دو گچھے تھے" یہاں راوی نے اپنے شک کا اظہار کیا ہے کہ حضرت حجاجؒ نے اس موقع پر لفظ "قرنان" کہا تھا یا "قصتان"۔ قصتان اصل میں قصہ کا تثنیہ ہے جس کے معنی سر کے بالوں کے ہیں جو آگے کی جانب (پیشانی) پر پڑے رہتے ہیں۔

عورت کو اپنا سر منڈانا حرام ہے

(۶۵) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تَحْلِقَ الْمَرْاَةُ رَاْسَهَا۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی عورت اپنا سر منڈائے۔" (نسائی)

تشریح: عورت کے حق میں سر کے بالوں کی وہی اہمیت ہے جو مرد کے حق میں داڑھی کی ہے لہٰذا جس طرح مرد کو داڑھی منڈانا حرام ہے اسی طرح عورت کو سر منڈانا حرام ہے۔

سر اور داڑھی کے بالوں کا بکھرا ہوا ہونا غیر مہذب ہونے کی علامت ہے

(۶۶) وَعَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ فَدَخَلَ رَجُلٌ ثَائِرُ الرَّاْسِ وَاللِّحْيَةِ فَاَشَارَ اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهٖ كَاَنَّهٗ يَاْمُرُهٗ بِاِصْلَاحِ شَعْرِهٖ وَلِحْيَتِهٖ فَفَعَلَ ثُمَّ رَجَعَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَيْسَ هٰذَا خَيْرًا مِنْ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدُكُمْ وَهُوَ ثَائِرُ الرَّاْسِ كَاَنَّهٗ شَيْطَانٌ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت عطاء ابن یسارؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ مسجد نبوی ﷺ میں تشریف فرما تھے کہ ایک ایسا شخص آیا جس کے سر کے اور داڑھی کے بال پراگندہ (یعنی بکھرے اور الجھے ہوئے) تھے رسول اللہ ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) اس (کے سر اور داڑھی) کی طرف (اپنے دست مبارک سے اس انداز میں) اشارہ کیا جیسے آپ ﷺ اس کو یہ حکم دے رہے ہوں کہ وہ اپنے سر کے بالوں اور داڑھی کو سنوارے، چنانچہ اس شخص نے اپنے سر اور داڑھی کے بالوں کو سنوارا اور پھر واپس آیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا یہ اس سے بہتر نہیں ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس حالت میں آئے کہ اس کے سر کے بال پراگندہ ہوں اور وہ ایسا دکھائی دے جیسے کوئی شیطان (جن) ہو

(یعنی اس نے اپنی شکل و صورت ایسی بنا رکھی ہو جیسے کوئی جن اپنے بال بکھیرے ہوئے اور بدہیئت شکل و صورت میں ہوتا ہے)۔" (مالکؒ)

گھر کے صحن کو صاف ستھرا رکھو

(۶۷) وَعَنِ ابْنِ الْمُسَيَّبِ سَمِعَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ يُحِبُّ الطَّيِّبَ نَظِيْفٌ يُحِبُّ النَّظَافَةَ كَرِيْمٌ يُحِبُّ الْكَرَمَ جَوَادٌ يُحِبُّ الْجُوْدَ فَنَظِّفُوْا اُرَاهُ قَالَ اَفْنِيَتَكُمْ وَلَا تَشَبَّهُوْا بِالْيَهُوْدِ قَالَ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِمُهَاجِرِبْنِ مِسْمَارٍ فَقَالَ حَدَّثَنِيْهِ عَامِرُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَهُ اِلَّا اَنَّهُ قَالَ نَظِّفُوْا اَفْنِيَتَكُمْ۔ (رواه الترمذی)

"اور حضرت ابن مسیب (تابعیؒ) سے روایت ہے کہ ان کو یہ فرماتے ہوئے سنا گیا کہ اللہ تعالیٰ پاک ہے پاکی پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ نہایت ستھرا ہے ستھرائی کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ کرم کرنے والا ہے کرم کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نہایت سخی اور عطا کرنے والا ہے، سخاوت و عطا کو پسند کرتا ہے، لہٰذا تم صاف ستھرا رکھو۔ (حضرت ابن مسیب سے روایت کرنے والے) راوی کہتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ ابن مسیب نے یہ بھی کہا تھا کہ اپنے صحنوں کو (یعنی انھوں نے فنظفوا کے بعد افنیتکم کا لفظ بھی کہا تھا گویا اس جگہ پورا جملہ یہ ہے کہ تم اپنے صحنوں کو صاف ستھرا رکھو) اور یہودیوں کی مشابہت اختیار نہ کرو (جو اپنے گھروں کے صحن و آنگن کو کوڑے کرکٹ سے ناپاک و گندہ رکھتے ہیں)۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن مسیبؒ کا یہ قول حضرت مہاجر ابن مسمار تابعی کے سامنے ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ مجھ سے حضرت عامر ابن سعد (تابعیؒ) نے اور انھوں نے اپنے والد حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ (صحابیؓ) سے اور انھوں نے نبی کریم ﷺ سے اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔ لیکن مہاجرؒ نے جو حدیث نقل کی اس میں انھوں نے یہ نقل کیا کہ تم اپنے گھروں کے صحن کو صاف ستھرا رکھو۔ یعنی ان کی روایت میں افنیتکم کا لفظ صریحاً مذکور ہے جب کہ ابن مسیب کی روایت میں یہ لفظ گمان کے درجہ میں نقل کیا گیا ہے۔"

تشریح: "اللہ تعالیٰ پاک ہے" یعنی وہ ہر عیب، ہر نقصان، ہر برائی اور ہر اس چیز سے پاک و منزہ ہے جو شان الوہیت اور شان ربوبیت کے منافی ہو۔ "یحب الطیب" میں لفظ طیب طاء کے زیر کے ساتھ ہے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک خوش کرداری وخوش کلامی محبوب و پسندیدہ ہے، یا اللہ تعالیٰ کے نزدیک خوشبو ایک پسندیدہ چیز ہے اور چونکہ اس ساری چیزوں کی بنیاد پاکی و پاکیزگی ہے لہٰذا جو بندہ ان چیزوں کو اختیار و استعمال کر کے اپنے اندر پاکی و پاکیزگی پیدا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو پسند کرتا ہے اور اس کے عمل سے خوش ہوتا ہے، ایک نسخہ میں یہ لفظ طاء کے زبر اور یاء مشددہ کے زیر کے ساتھ یعنی طَيِّبٌ لکھا ہوا ہے اس صورت میں اس سے مراد وہ شخص ہوگا جو طیبات یعنی عقائد و خیالات کی اچھائی، اقوال اور زبان و بیان کی پاکیزگی، اور اعمال و اخلاق کی بلندی و نیک خوئی کے اوصاف کا حامل ہو۔ نظافۃ جس کا ترجمہ "ستھرائی" کیا گیا ہے، کے معنی ظاہر و باطن کی صفائی و پاکی کے ہیں۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ "گھروں کے صحن کو صاف ستھرا رکھنے" کا حکم اصل میں کرم اور جود اختیار کرنے کا کنایہ ہے، یعنی اس حکم سے اصل مقصد یہ تلقین کرنا ہے کہ اپنے اندر عطاء و بخشش اور سخاوت و مہمان نوازی کے اوصاف پیدا کرو، اور ظاہر ہے کہ گھر کی صفائی ستھرائی اس وصف کی تکمیل کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے کیونکہ جس گھر کا صحن و آنگن صاف ستھرا رہتا ہے اور مکان کے در و دیوار سے صفائی و سلیقہ شعاری ہویدا ہوتی ہے اس گھر میں لوگوں کو اور مہمانوں کے آنے اور ٹھہرنے کی ترغیب ملتی ہے۔

مونچھیں ترشوانے کی سنّت حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جاری ہوئی

(۶۸) وَعَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ اَنَّهُ سَمِعَ سَعِيْدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ يَقُوْلُ كَانَ اِبْرَاهِيْمُ خَلِيْلُ الرَّحْمٰنِ اَوَّلَ النَّاسِ ضَيَّفَ الضَّيْفَ وَاَوَّلَ النَّاسِ اخْتَتَنَ وَاَوَّلَ النَّاسِ قَصَّ شَارِبَهُ وَاَوَّلَ النَّاسِ رَاَى الشَّيْبَ فَقَالَ يَارَبِّ مَا هٰذَا قَالَ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى وَقَارٌ يَا اِبْرَاهِيْمُ قَالَ رَبِّ زِدْنِيْ وَقَارًا۔ (رواه مالک)

"اور یحییٰ ابن سعیدؒ سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت سعید ابن مسیبؒ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو رحمٰن (اللہ) کے دوست تھے سب سے پہلے انسان ہیں جنھوں نے مہمان کی مہمانداری کی یعنی مہمان کی پذیرائی و مہمانداری کی ابتداء انھوں ہی نے کی وہ سب سے پہلے انسان ہیں جنھوں نے ختنہ کیا، وہ سب سے پہلے انسان ہیں جنھوں نے اپنی مونچھیں کتریں، اور وہ سب سے پہلے انسان ہیں جنھوںؒ نے بڑھاپا یعنی سفید بال دیکھا، چنانچہ انھوں نے (جب سب سے پہلے اپنے بالوں میں سفیدی کو دیکھا تو) عرض کیا کہ "میرے پرودگار"! یہ کیا ہے؟ پرودگار کا جواب آیا کہ "ابراہیم (علیہ السلام)" یہ وقار ہے یعنی یہ اس بڑھاپے کی علامت ہے جو علم و دانش میں اضافہ کا باعث اور عزو وقار کا ذریعہ ہے اور اس کی وجہ سے انسان لہو ولعب کی مشغولیت اور گناہوں کے ارتکاب سے باز رہتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ پرودگار! یہ تو تیری بہت بڑی نعمت ہے لہٰذا "میرے وقار میں اضافہ فرما۔" (مالکؒ)

تشریح: سیوطیؒ نے موطا کے حاشیہ میں ایسی اور چیزوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کی ابتداء حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی ہے، جو یہ ہیں، ناخن کاٹنا، مانگ نکالنی، استرا استعمال کرنا، پائجامہ پہننا، مہندی اور وسمہ کا خضاب لگانا، منبر پر خطبہ پڑھنا، خدا کی راہ میں جہاد کرنا، میدان جنگ میں لشکر کو میمنہ، میسرہ، مقدمہ اور قلب کی ترتیب کے ساتھ صف آراء کرنا، لوگوں کے ساتھ معانقہ کرنا اور ثرید تیار کرنا۔

بَابُ التَّصَاوِيْرِ

تصاویر کا بیان

"تصاویر" تصویر کی جمع ہے، جس کے معنی صورت بنانے کے ہیں، یہاں تصاویر سے مراد جاندار کی تصویریں ہیں جو پردوں وغیرہ پر کڑھی یا بنی ہوئی ہوں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

تصویر بنانے اور رکھنے کا مسئلہ

(۱) عَنْ اَبِیْ طَلْحَةَ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَدْخُلُ الْمَلٰٓئِکَةُ بَیْتًا فِیْہِ کَلْبٌ وَلَا تَصَاوِیْرُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوطلحہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر ہو اور نہ اس گھر میں داخل ہوتے ہیں جس میں کتا ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ یہاں وہ تصویر اور کتا مراد ہے جن کا گھر میں رکھنا حرام نہیں ہے، جیسے وہ کتا جو شکار یا کھیت کھلیان اور مویشیوں وغیرہ کی حفاظت کے لئے پالا گیا ہو یا ایسی تصویریں جو بچھونوں وغیرہ پر ہوں اور ان کی تحقیر و پامالی کی جاتی ہو، چنانچہ گھر میں ایسے کتے یا ایسی تصویروں کی موجودگی فرشتوں کے داخل ہونے میں رکاوٹ نہیں بنتی، لیکن یہ مسئلہ محض ان تصویروں کے رکھنے یا استعمال کا ہے کیونکہ تصویر بنانا تو ہر صورت میں حرام ہے خواہ بچھونے پر ہو خواہ درہم سکوں اور نوٹوں پر ہوں۔ اور خواہ کسی اور چیز پر بنائی جائے، جاندار کی تصویر و مورت بنانے والا ایک سخت حرام عمل کا ارتکاب کرتا ہے اور گناہ کبیرہ میں مبتلا ہوتا ہے البتہ غیر جاندار چیزوں جیسے درخت، پہاڑ اور عمارت وغیرہ کی تصویر بنانا حرام نہیں ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ حکم عمومی نوعیت کا ہے یعنی کسی گھر میں مطلق تصویر اور کتے کی موجودگی ملائکہ کے داخل ہونے میں رکاوٹ بنتی ہے، اگرچہ کتا اور تصویریں اسی نوعیت کی کیوں نہ ہوں جن کا گھر میں رکھنا حرام نہیں ہے۔

"فرشتوں" سے مراد وہ فرشتے ہیں جو بندوں کے اعمال لکھنے اور ان کی حفاظت پر مامور نہیں ہوتے کیونکہ جو فرشتے اعمال لکھنے اور حفاظت کرنے پر معمور ہوتے ہیں وہ کسی بھی حال میں انسان سے جدا نہیں ہوتے۔

غیر ضروری کتوں کو مار ڈالا جائے

② وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ مَيْمُوْنَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصْبَحَ يَوْمًا وَاجِمًا وَ قَالَ اِنَّ جِبْرَئِيْلَ كَانَ وَعَدَنِيْ اَنْ يَلْقَانِي اللَّيْلَةَ فَلَمْ يَلْقَنِيْ اَمَا وَاللّٰهِ مَا اَخْلَفَنِيْ ثُمَّ وَقَعَ فِيْ نَفْسِهٖ جِرْوُ كَلْبٍ تَحْتَ فُسْطَاطٍ لَهٗ فَاَمَرَ بِهٖ فَاُخْرِجَ ثُمَّ اَخَذَ بِيَدِهٖ مَاءً فَنَضَحَ مَكَانَهٗ فَلَمَّا اَمْسٰى لَقِيَهٗ جِبْرَئِيْلُ فَقَالَ لَقَدْ كُنْتَ وَعَدْتَنِيْ اَنْ تَلْقَانِي الْبَارِحَةَ قَالَ اَجَلْ وَ لٰكِنَّا لَا نَدْخُلُ بَيْتًا فِيْهِ كَلْبٌ وَلَا صُوْرَةٌ فَاَصْبَحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَئِذٍ فَاَمَرَ بِقَتْلِ الْكِلَابِ حَتّٰى اِنَّهٗ يَاْمُرُ بِقَتْلِ كَلْبِ الْحَائِطِ الصَّغِيْرِ وَيَتْرُكُ كَلْبَ الْحَائِطِ الْكَبِيْرِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ اُمّ المؤمنین حضرت میمونہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن صبح کے وقت رسول کریم ﷺ بہت اداس و غمگین نظر آئے اور اس اداسی غمگینی کا سبب بیان کرتے ہوئے میمونہؓ سے یا کسی اور زوجہ مطہرہؓ سے یا اپنے دل میں اور یا اظہار تعجب و حیرت کے طور پر خود اپنے سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ "حضرت جبرئیل نے آج کی رات میرے پاس آنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن وہ میرے پاس نہیں آئے۔ خدا کی قسم! (اس سے پہلے) ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ انہوں نے وعدہ خلافی کی ہو"۔ پھر (اچانک) آپ ﷺ کے ذہن میں کتے کے اس پلہ کا خیال آیا جو آپ ﷺ کے خیمے (یعنی کسی تخت یا ٹاٹ وغیرہ) کے نیچے پڑا تھا، چنانچہ آپ ﷺ سمجھ گئے کہ حضرت جبرئیل اسی پلہ کی وجہ سے میرے پاس نہیں آئے اور آپ ﷺ نے اس پلے کو نکال دینے کا حکم دیا، جب وہ پلہ وہاں سے نکال دیا گیا تو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں میں پانی لے کر اس جگہ چھڑکا جہاں وہ پلہ بیٹھا ہوا تھا، پھر جب شام ہوئی تو حضرت جبرئیل آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ "آپ (علیہ السلام) نے تو گذشتہ شب میں مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا؟" حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں! لیکن ہم اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا تصویر ہو۔ اس کے بعد دوسرے دن صبح کو رسول کریم ﷺ نے کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دیا۔ یہاں تک کہ چھوٹے باغات کے کتوں کو بھی مار ڈالنے کا حکم دے دیا اور بڑے بڑے باغات کے کتوں کو چھوڑنے کا حکم دیا۔ (کیونکہ ان باغات کی حفاظت کے لئے کتوں کا رکھنا ضروری تھا)۔" (مسلم)

آنحضرت ﷺ تصویر دار چیزوں کو ضائع کر دیتے تھے

③ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَكُنْ يَتْرُكُ فِيْ بَيْتِهٖ شَيْئًا فِيْهِ تَصَالِيْبُ اِلَّا نَقَضَهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنے گھر میں ایسی کوئی چیز نہ چھوڑتے تھے جس پر تصویر ہو اور آپ ﷺ اس کو توڑ ڈالتے ہوں!۔" (بخاریؒ)

تشریح: "تصالیب" اصل میں تو تصلیب کی جمع ہے جس کے معنی صلیب (سولی) کی تصویر بنانا ہیں اور جن کو عیسائی برکت کے لئے اپنے پاس رکھتے ہیں اور اس کی پرستش تک کرتے ہیں ان کے خیال میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں نے سولی پر چڑھا دیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کر کے اٹھا لیا، چنانچہ اس سولی کی تصویر ان کے نزدیک ایک مقدس مذہبی علامت ہوتی ہے۔ لیکن یہاں حدیث میں "تصالیب" سے مطلق جاندار کی تصاویر مراد ہیں۔

تصویر بنانے والوں کو آخرت میں عذاب بھگتنا پڑے گا

④ وَعَنْهَا اَنَّهَا اشْتَرَتْ نُمْرُقَةً فِيْهَا تَصَاوِيْرُ فَلَمَّا رَاٰهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ عَلَى الْبَابِ فَلَمْ يَدْخُلْ

فَعَرَفْتُ فِيْ وَجْهِهِ الْكَرَاهِيَةَ قَالَتْ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) أَتُوْبُ إِلَى اللّٰهِ وَإِلٰى رَسُوْلِهِ مَاذَا أَذْنَبْتُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَا بَالُ هٰذِهِ النُّمْرُقَةِ قَالَتْ قُلْتُ اِشْتَرَيْتُهَا لَكَ لِتَقْعُدَ عَلَيْهَا وَتَوَسَّدَهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ أَصْحَابَ هٰذِهِ الصُّوَرِ يُعَذَّبُوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيُقَالُ لَهُمْ أَحْيُوْا مَا خَلَقْتُمْ وَقَالَ إِنَّ الْبَيْتَ الَّذِيْ فِيْهِ الصُّوْرَةُ لَا تَدْخُلُهُ الْمَلَائِكَةُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ ایسا تکیہ خرید لیا جس پر تصویریں تھیں، چنانچہ رسول کریم ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں داخل ہوتے وقت جب اس تکیہ کو دیکھا تو دروازے پر رک گئے اور حجرہ میں داخل نہیں ہوئے. حضرت عائشہؓ اس تصویر دار تکیہ کی وجہ سے آپ ﷺ کے چہرہ مبارک پر ناگواری کے اثرات کو بھانپ گئیں! حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) میں نافرمانی چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا کے طرف متوجہ ہوتی ہوں، میں نے ایسا کونسا گناہ کیا ہے کہ آپ میرے حجرے میں داخل نہیں ہو رہے ہیں؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا یہ تکیہ کیسا ہے اور تم اس کو کہاں سے لائی ہو؟ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے جواب دیا۔ میں نے اس تکیہ کو آپ (ﷺ) کے لئے خریدا ہے کہ آپ (ﷺ) جس وقت چاہیں اس کا سہارا لے کر بیٹھیں اور جس وقت چاہیں اس کو سوتے وقت سر کے نیچے رکھیں۔ رسول کریم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ یاد رکھو تصویر بنانے والوں کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ جو تصویریں تم نے بنائی ہیں ان میں جان ڈالو اور ان کو زندہ کرو۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس گھر میں تصویر ہوتی ہے اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے اسی طرح انبیاء علیہم السلام و اولیاءؒ کے لئے بھی یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ تصویر والے گھر میں داخل ہوں؟۔" (بخاریؒ، ومسلمؒ)

آرائشی پردے لٹکانا ناپسندیدہ

⑤ وَعَنْهَا أَنَّهَا كَانَتْ قَدِ اتَّخَذَتْ عَلٰى سَهْوَةٍ لَهَا سِتْرًا فِيْهِ تَمَاثِيْلُ فَهَتَكَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاتَّخَذَتْ مِنْهُ نُمْرُقَتَيْنِ فَكَانَتَا فِي الْبَيْتِ يَجْلِسُ عَلَيْهِمَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے شہ نشین پر ایک ایسا پردہ ڈال دیا جس پر تصویریں تھیں، رسول کریم ﷺ نے اس پردہ کو دیکھا تو اس کو پھاڑ دیا، حضرت عائشہؓ نے (اس پھٹے ہوئے پردہ کا یہ مصرف نکالا کہ) اس کے دو تکئے بنا دیئے چنانچہ وہ دونوں تکئے گھر میں رکھے رہتے تھے اور ان پر تکیہ لگا کر بیٹھتے تھے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: بظاہر یہ حدیث اس حدیث کے منافی ہے جو اس سے پہلے گزری ہے کیونکہ پہلی حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تکیہ پر بنی ہوئی تصویریں گھر میں ملائکہ کو داخل ہونے سے روکتی ہیں، اگرچہ ایسی تصویروں کا گھر میں رہنے دینا حرام نہ ہو، اس صورت میں وہ دونوں تکیے جن پر تصویریں تھیں حضرت عائشہؓ کے گھر میں کیسے رکھے ہوئے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان تکیوں پر جو تصویریں تھیں وہ کسی جاندار کی نہیں تھیں جن کا بنانا اور رکھنا حرام ہے اور آپ ﷺ نے جو اس پردہ کو پھاڑ ڈالا تھا تو اس کی وجہ بھی اس پردے پر تصویروں کی موجودگی نہیں تھی بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ درو دیوار پر بلا ضرورت پردے لٹکانا منشاء خداوندی کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ پتھر اور مٹی کو کپڑے پہنائے جائیں جیسا کہ آگے آنے والی حدیث سے معلوم ہوگا اور اگر بالفرض وہ تصویریں کسی جاندار ہی کی تھیں تو اس صورت میں کہا جائے گا کہ جب تکیہ بنانے کے لئے اس پردہ کی کانٹ چھانٹ ہوئی تو اس پر جو تصویریں تھیں ان کے سر کٹ گئے تھے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "ھتک" (کہ جس کا ترجمہ پھاڑ ڈالنا کیا گیا ہے) کے معنی ان تصویروں کو کاٹنا اور مٹا دینا ہیں جو اس پردہ پر تھیں۔

⑥ وَعَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ غَزَاةً فَأَخَذْتُ نَمَطًا فَسَتَرْتُهُ عَلَى الْبَابِ فَلَمَّا قَدِمَ فَرَأَى النَّمَطَ

فَجَذَبَهُ حَتّٰى هَتَكَهُ ثُمَّ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَاْمُرْنَا اَنْ نَكْسُوَ الْحِجَارَةَ وَالطِّيْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ جہاد کے لئے سفر میں تشریف لے گئے تو میں نے آپ ﷺ کے جانے کے بعد ایک کپڑا حاصل کیا اور اس کا پردہ دروازہ پر لٹکایا جب آنحضرت ﷺ سفر جہاد سے واپس تشریف لائے اور وہ پردہ پڑا ہوا دیکھا تو اس کو کھینچ کر پھاڑ ڈالا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم نہیں دیا ہے کہ ہم مٹی اور پتھر کو کپڑے پہنائیں۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "نمط" ایک عمدہ قسم کے فرش یا بچھونے کو کہتے ہیں جس کے کنارے باریک اور ملائم تانے کے ہوتے ہیں اس کو ہودج پر بھی ڈالتے ہیں اور اس کا پردہ بھی بناتے ہیں، احتمال ہے کہ یہ لفظ نمط، نمد کا معرب ہے۔ حضرت عائشہؓ نے غالبا اس کپڑے کو دروازے پر آرائش کی خاطر لٹکایا ہوگا ورنہ اگر پردے کے مقصد سے دروازے پر ڈالتیں تو اس پر عتاب ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اور بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ اس کپڑے پر گھوڑے کی تصویریں تھیں اس لئے آپ ﷺ نے اس کو ضائع کر دیا، اور گویا ان تصویروں کو مٹا ڈالا، لیکن یہ قول حدیث کے سیاق کے خلاف معلوم ہوتا ہے کیونکہ حدیث کا ربط مضمون یہ واضح کرتا ہے کہ آپ ﷺ کا اس کپڑے کو پھاڑنا اور گویا اس کو دروازے پر لٹکانے سے منع کرنا تصویر کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ در و دیوار کو کپڑے سے ڈھانپنے کی کراہت کی بنا پر تھا جیسا کہ آپ ﷺ کے ارشاد سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

یحییٰؒ کہتے ہیں کہ در و دیوار کو کپڑے سے ڈھانپنے کی ممانعت نہی تنزیہی طور پر ہے کیونکہ اس چیز کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہ ہونا ممانعت پر دلالت نہیں کرتا، رہی یہ بات کہ پھر آنحضرت ﷺ نے اس پردے پر اس قدر ناگواری کا اظہار کیوں کیا کہ اس کو پھاڑ بھی ڈالا تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ یہ چیز آپ ﷺ کے نزدیک اہل بیت کی شان اور ان کے ورع و تقویٰ کے خلاف تھی، تاہم یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ گھر کی دیواروں وغیرہ کو کپڑے سے ڈھانپنے سے منع کیا جائے نیز یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اگر کوئی بری چیز دیکھی جائے تو اس کو اپنے ہاتھ سے خراب و برباد کر دیا جائے اور اس کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا جائے۔

تصویر بنانے والے کے بارے میں وعید

⑦ وَعَنْهَا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ الَّذِيْنَ يُضَاهِئُوْنَ بِخَلْقِ اللّٰهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب لوگوں سے زیادہ سخت عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی مشابہت اختیار کرتے ہیں؟۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "مشابہت اختیار کرتے ہیں" یعنی صورت بنانا اللہ کا کام ہے لہٰذا جو شخص تصویر بناتا ہے وہ گویا اپنے فعل کو اللہ تعالیٰ کے فعل کے ساتھ مشابہ کرتا ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ تصویر بنانے والا گویا اس چیز (تصویر) کو بناتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے مشابہ ہوتی ہے۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ اگر مصور کا فعل تصویر سازی اسی نظریے (عقیدے) کے تحت ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فعل صورت گری کی مماثلت کرنے والا ہے تو وہ کافر ہو جاتا ہے اور اس صورت میں اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کو اس کے اس قبیح کفر کی بنا پر دوسرے کافروں کی بہ نسبت زیادہ سخت عذاب بھگتنا ہوگا اور اگر وہ ایسا عقیدہ نہ رکھتا ہو تو پھر اس کے حق میں یہ حدیث تہدید پر محمول ہوگی۔

⑧ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذَهَبَ يَخْلُقُ كَخَلْقِيْ فَلْيَخْلُقُوْا ذَرَّةً اَوْلِيَخْلُقُوْا حَبَّةً اَوْ شَعِيْرَةً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو میرے پیدا کرنے کی طرح پیدا کرے یعنی جس طرح میں صورت بناتا ہوں اسی طرح وہ بھی صورت بناتا ہے اگرچہ حقیقت میں وہ اس

مادہ سے صورت نہیں بناتا جس مادہ سے خدا کی بنائی ہوئی صورتیں ہیں تاہم وہ کوئی صورت بناتا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ یہ صورت میری بنائی ہوئی ہے اگر تصویر و مورت بنانے والے واقعہ تخلیق کا دعوی کرتے ہیں تو ذرا وہ ایک چیونٹی تو بنائیں یا ایک دانہ تو پیدا کریں یا ایک جو تو پیدا کر کے دکھائیں؟۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

(۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا عِنْدَاللّٰهِ الْمُصَوِّرُوْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "خدا کے ہاں سخت ترین عذاب کا مستوجب، مصور ہے!۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو سخت ترین عذاب میں مبتلا کرے گا ان میں مصور بھی ہوگا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہ وعید اس شخص کے حق میں ہے جو بتوں کی مورتیاں اس لئے بناتا ہے کہ ان کی پوجا کی جائے اور چونکہ ایسا شخص یقیناً کافر ہوگا اس لئے اگر اس کو سخت ترین عذاب میں مبتلا کیا جائے تو کچھ بعید نہیں۔ اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی مشابہت کی نیت سے تصویر بنائے وہ بھی کافر ہے اور سخت ترین کا مستوجب۔ اور جو شخص اس نیت کے بغیر تصویر سازی کرے وہ کافر نہیں ہوگا بلکہ فاسق کہلائے گا اور اس کا وہی حکم ہوگا جو مرتکب معاصی کا ہے اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ حدیث میں جس مصور کے بارے میں وعید بیان کی گئی ہے اس سے جاندار کی تصور بنانے والا مرد ہے نہ کہ درختوں اور عمارات وغیرہ کی تصویر بنانے والا اسی لئے عام طور پر مصور کا اطلاق جاندار کی تصویر بنانے والے پر ہوتا ہے اور جماوات و نباتات وغیرہ کی تصویر بنانے والے کو نقاش کہتے ہیں! مجاہدؒ نے پھل دار درختوں کی تصویر بنانے کو بھی مکروہ کہا ہے دوسرے محققین کے نزدیک غیر جاندار کی تصویر بنانا کراہت سے خالی نہیں اور لہو ولعب نیز بے مقصد و لایعنی چیزوں میں داخل ہے۔

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ كُلُّ مُصَوِّرٍ فِي النَّارِ يُجْعَلُ لَهٗ بِكُلِّ صُوْرَةٍ صَوَّرَهَا نَفْسٌ فَيُعَذِّبُهٗ فِيْ جَهَنَّمَ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَاِنْ كُنْتَ لَا بُدَّ فَاعِلًا فَاصْنَعِ الشَّجَرَ وَمَالَا رُوْحَ فِيْهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "ہر مصور دوزخ میں ڈالا جائے گیا اور اس کی بنائی ہوئی ہر تصویر کے بدلے ایک شخص پیدا کیا جائے گا جو تصویر بنانے والے کو دوزخ میں عذاب دیتا رہے گا" حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اگر تمہیں تصویر بنانے کی ضرورت ہی ہو تو درختوں یا کسی غیر ذی روح کی تصویر بنالو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یوں تو ہر طرح کی تصویر اور مورت بنانا ناجائز ہے تاہم اکثر علماء نے لڑکیوں کے لئے گڑیوں کو مستثنیٰ رکھا ہے یعنی ان کے نزدیک لڑکیوں کے حق میں گڑیاں بنانا مباح ہے لیکن امام مالکؒ نے مردوں کو ان کا خریدنا مکروہ قرار دیا ہے اور بعض علماء نے مذکورہ اباحت کو منسوخ قرار دیا ہے۔

(۱۱) وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ تَحَلَّمَ بِحُلْمٍ لَمْ يَرَهٗ كُلِّفَ اَنْ يَعْقِدَ بَيْنَ شَعِيْرَتَيْنِ وَلَنْ يَفْعَلَ وَمَنِ اسْتَمَعَ اِلٰى حَدِيْثِ قَوْمٍ وَهُمْ لَهٗ كَارِهُوْنَ اَوْيَفِرُّوْنَ مِنْهُ صُبَّ فِيْ اُذُنَيْهِ الْاٰنُكُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمَنْ صَوَّرَ صُوْرَةً عُذِّبَ وَكُلِّفَ اَنْ يَنْفُخَ فِيْهَا وَلَيْسَ بِنَافِخٍ۔ (رواہ البخاریؒ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص ایسا خواب دیکھنے کا دعوی کرے جو کہ اس نے نہیں دیکھا ہے یعنی جھوٹا خواب بیان کرے تو اس کو قیامت کے دن دو جو میں گرہ لگانے پر مجبور کیا جائے گا، جس کو وہ ہرگز نہیں کر سکے گا، اور جو شخص کچھ لوگوں کی بات چیت کی طرف اپنا کان لگائے جب کہ وہ لوگ اس شخص کے سننے کو پسند نہ کریں اور اس سے فرار اختیار

کریں تو قیامت کے دن اس شخص کے کان میں سیسہ ڈالا جائے گا اور جو شخص تصویر بنائے گا اس کو آخرت میں عذاب دیا جائے گا اور اس کو اس بات پر مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس تصویر میں روح پھونکے حالانکہ وہ ہرگز روح نہیں پھونک سکے گا۔" (بخاریؒ)

تشریح: "جس کو وہ ہرگز نہیں کر سکے گا" کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو عذاب میں مبتلا کیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ وہ جو کے دو دانوں کو آپس میں جوڑ کر ایک کر دے اور جب وہ ایسا نہیں سکے گا تو اس کو پھر عذاب میں مبتلا کیا جائے گا اور اسی طرح اس کو عذاب دیا جاتا رہے گا۔ جھوٹا خواب بیان کرنے اور جو کے دو دانوں کو آپس میں جوڑنے کے درمیان مناسبت یہ ہے کہ جس طرح اس شخص نے خواب کی بے بنیاد اور جھوٹی باتوں کو جوڑا اسی طرح اس سے کہا جائے گا کہ اب ذرا جو کے دو دانوں کو جوڑ کر دکھلا۔؟ واضح رہے کہ جھوٹا خواب بیان کرنا بھی اگرچہ جھوٹ کی ایک قسم ہے لیکن اس جھوٹا خواب بیان کرنے پر مطلق جھوٹ بولنے کی بہ نسبت زیادہ سخت عذاب اس لئے دیا جائے گا کہ اصل میں خواب کا تعلق عالم غیب سے ہے اور سچا خواب اجزاء نبوت میں سے ایک جزو ہے اور ایک طرح سے وحی کے درجہ کا حکم رکھتا ہے لہٰذا جس شخص نے جھوٹا خواب بیان کیا اس نے گویا حق تعالیٰ پر جھوٹ باندھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنا جھوٹ کی سب سے سخت قسم ہے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ حدیث میں مذکورہ وعید اس شخص کے حق میں ہے جو جھوٹے خواب کے ذریعہ نبوت یا ولایت کا دعوے کرے، مثلاً وہ یوں کہے کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو نبی بنایا ہے یا ولی بنایا ہے اور مجھ کو خبر دی ہے کہ فلاں شخص کی مغفرت ہوگئی ہے یا فلاں شخص ملعون ہے وغیرہ وغیرہ، یا یوں بیان کرے کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ کو خواب میں فلاں حکم دیا ہے حالاں کہ حقیقت میں اس نے خواب کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔

"اس شخص کے کان میں سیسہ ڈالا جائے گا" یہ وعید اس شخص کے حق میں ہے جو ان لوگوں کی باتیں چغل خوری اور فتنہ و فساد پھیلانے کی غرض سے سنے، اس کے برخلاف اگر وہ ان لوگوں کی باتیں اس غرض سے سنے کہ اگر وہ لوگ اس بات چیت کے ذریعہ کسی فتنہ و فساد پھیلانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں تو ان کو اس سے روکے یا ان کی شر انگیزیوں سے اپنے آپ کو یا دوسرے کو محفوظ رکھے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

نرد شیر کھیلنے کی مذمت

⑫ وَعَنْ بُرَيْدَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ لَعِبَ بِالنَّرْدَشِيْرِ فَكَاَنَّمَا صَبَغَ يَدَهٗ فِيْ لَحْمِ خِنْزِيْرٍ وَدَمِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ جس شخص نے نرد شیر کے ذریعہ کھیلا اس نے گویا سور کے گوشت اور خون میں اپنا ہاتھ ڈبویا۔" (رواہ مسلمؒ)

تشریح: "نرد شیر" چوسر کی قسم سے ایک کھیل ہے جس کو فارس (ایران) کے ایک بادشاہ شاپور ابن اردشیر ابن بابک نے ایجاد کیا تھا چونکہ سور کا گوشت اور لہو نہ صرف یہ کہ نجس ہوتا ہے بلکہ اس سے بہت زیادہ نفرت بھی ہوتی ہے اس لئے خاص طور پر اس کا ذکر کیا گیا تاکہ لوگ اس کھیل سے نہایت بیزاری برتیں۔ واضح رہے کہ مطلق نرد کے ذریعہ کھیلنا تمام علماء کے نزدیک حرام ہے خواہ وہ چوسر کی صورت میں ہو تختہ نرد کی صورت میں اور یا کسی اور طرح کا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

بچھونے پر تصویروں کا ہونا مکروہ نہیں

⑬ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَانِيْ جِبْرَئِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ اَتَيْتُكَ الْبَارِحَةَ فَلَمْ

يَمْنَعُنِيْ اَنْ اَكُوْنَ دَخَلْتُ اِلَّا اَنَّهُ كَانَ عَلَى الْبَابِ تَمَاثِيْلُ وَكَانَ فِي الْبَيْتِ قِرَامُ سِتْرٍ فِيْهِ تَمَاثِيْلُ وَكَانَ فِي الْبَيْتِ كَلْبٌ فَمُرْ بِرَاْسِ التِّمْثَالِ الَّذِيْ عَلٰى بَابِ الْبَيْتِ فَيُقْطَعَ فَيَصِيْرُ كَهَيْئَةِ الشَّجَرَةِ وَمُرْ بِالسِّتْرِ فَلْيُقْطَعْ فَلْيُجْعَلْ وِسَادَتَيْنِ مَنْبُوْذَتَيْنِ تُوْطَآنِ وَمُرْ بِالْكَلْبِ فَلْيُخْرَجْ فَفَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے فرمایا میرے پاس حضرت جبرئیل آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ میں گذشتہ شب آپ (ﷺ) کے پاس آیا تھا لیکن مجھ کو گھر میں آنے سے جس چیز نے روکا وہ یہ تھی کہ دروازے کے پردے پر تصویریں تھیں بایں طور کہ گھر میں جو رنگین منقش کپڑا تھا اس کا پردہ بنایا گیا تھا اور اس پر وہ تصویریں بنی ہوئی تھیں نیز گھر میں کتا بھی موجود تھا لہٰذا آپ (ﷺ) ان تصویروں کے سر کاٹے جانے کا حکم دیجئے، جو دروازے (کے پردے) پر ہیں اور ان تصویروں کے سر اس طرح کاٹ دیئے جائیں کہ ان کی ہیئت و شکل بدل جائے اور وہ درخت کی شکل کے ہو جائیں اور پھر اس پردہ کو کاٹ کر ان کے دو تکئے بنانے کا حکم دیجئے جو سہارا لے کر بیٹھنے اور تکیہ لگا کر سونے کے کام میں آنے کے لئے گھر میں فرش پر پڑے رہیں اور روندے جاتے رہیں۔ نیز کتے کو بھی گھر سے نکال باہر کرنے کا حکم دیجئے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ایسا ہی کیا (جیسا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے بتایا تھا)۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: فتاویٰ قاضی خاں میں لکھا ہے کہ اس حالت میں نماز پڑھنا مکروہ ہے کہ مصلے کے آگے یا سر کے اوپر یا دائیں طرف یا بائیں طرف کوئی تصویر موجود ہو یا نمازی کے کپڑے پر تصویر بنی ہو، البتہ بچھونے پر تصویر کے ہونے کے بارے میں دو قول ہیں ان میں سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ بچھونے یا فرش پر تصویر کا ہونا مکروہ نہیں ہے بشرطیکہ اگر اس بچھونے یا فرش پر نماز پڑھی جائے تو اس جگہ سجدہ نہ کیا جائے جہاں کوئی تصویر ہو۔ واضح رہے کہ یہ مسئلہ اس صورت کا ہے جب کہ تصویریں بڑی ہوں اور دیکھنے والوں کو بغیر کسی تکلّف کے نظر آئیں اور اگر تصویریں چھوٹی ہوں یا ان کے سر کٹے اور مٹے ہوئے ہوں تو ان میں کوئی مضائقہ نہیں۔

قیامت کے دن مصور وغیرہ پر مسلّط کیا جانے والا خاص عذاب

⑭ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْرُجُ عُنُقٌ مِنَ النَّارِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَهَا عَيْنَانِ تُبْصِرَانِ وَاُذُنَانِ تَسْمَعَانِ وَلِسَانٌ يَنْطِقُ يَقُوْلُ اِنِّيْ وُكِّلْتُ بِثَلٰثَةٍ بِكُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ وَكُلِّ مَنْ دَعَا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَبِالْمُصَوِّرِيْنَ۔

(رواہ الترمذی)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن دوزخ میں سے ایک گردن نکلے گی یعنی آگ کا ایک شرارہ لمبی گردن کی صورت میں نکلے گا اس گردن میں دیکھنے والی دو آنکھیں ہوں گی، سننے والے دو کان ہوں گے اور بولنے والی زبان ہوگی۔ وہ گردن کہے گی کہ میں تین طرح کے لوگوں پر مسلّط کی گئی ہوں یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بات پر متعین کیا ہے کہ میں ان تین طرح کے لوگوں کو دوزخ میں کھینچ کر لے جاؤں اور لوگوں کے سامنے ان کو ذلیل و رسوا کر کے عذاب میں مبتلا کروں ان میں سے ایک طرح کے تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے حق کے ساتھ تکبر و عناد کا برتاؤ کیا (یعنی دنیا میں ان پر حق ظاہر ہوا مگر انہوں نے حق کو قبول نہیں کیا) دوسری طرح کے لوگوں میں ہر وہ شخص شامل ہے جس نے اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارا ہے، اور تیسری طرح کے وہ لوگ ہیں جنہوں نے تصویر سازی کی ہے۔" (ترمذیؒ)

شراب، جوا اور کوبہ حرام ہے

⑮ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى حَرَّمَ الْخَمْرَ وَالْمَيْسِرَ وَالْكُوْبَةَ وَقَالَ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ قِيْلَ الْكُوْبَةُ الطَّبْلُ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت ابن عباسؓ، رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے شراب، جوا اور کوبہ بجانے کو لسان نبوت کے ذریعہ حرام قرار دیا ہے نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ "کوبہ" طبل کو کہتے ہیں۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "کوبہ" کے معنی میں علماء کے تین قول ہیں ایک تو نرد، دوسرے بربط اور تیسرے طبل جیسا کہ مصنف نے حدیث کے کسی راوی سے نقل کیا ہے، ڈھولکی اور ڈھولک وغیرہ کی طرح طبل بھی ایک خاص قسم کا دور خا باجا ہوتا ہے، حدیث میں وہ طبل مراد ہے جو محض لہو ولعب کے لئے ہو نہ کہ غازیان اسلام کا طبل۔

⑯ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَالْكُوْبَةِ وَ الْغُبَيْرَاءِ وَالْغُبَيْرَاءُ شَرَابٌ تَعمَلُهُ الْحَبَشَةُ مِنَ الذُّرَةِ وَيُقَالُ لَهَا السُّكُرْكَةُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شراب، جوئے، کوبہ اور غبیراء سے منع کیا ہے اور غبیرا ایک قسم کی شراب ہوتی ہے جس کو حبشہ کے لوگ جوار سے بناتے ہیں اور اس کو سکرک کہتے ہیں!۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "غبیراء" کی جو تعریف بیان کی گئی ہے وہ یا تو حضرت ابن عمرؓ ہی سے منقول ہے یا کسی دوسرے راوی کی بیان کی ہوئی ہے۔

نرد سے کھیلنا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرنا ہے

⑰ وَعَنْ اَبِيْ مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ لَعِبَ بِالنَّرْدِ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ۔ (رواہ احمد والبوداؤد)

"اور حضرت ابوموسیٰ شعریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے نرد سے کھیلا درحقیقت اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: نرد سے کھیلنا اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی کے مرادف اس لئے ہے کہ یہ کھیل اگر بازی لگا کر کھیلا جائے، تو حقیقۃً جوا ہے اور اگر بغیر بازی لگائے کھیلا جائے تب بھی صورۃً جوا ہی ہوگا اور یہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ مطلق نرد سے کھیلنا حرام ہے۔

کبوتر بازی حرام ہے

⑱ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى رَجُلًا يَتْبَعُ حَمَامَةً فَقَالَ شَيْطَانٌ يَتْبَعُ شَيْطَانَةً۔ (رواہ احمد والبوداؤد وابن ماجۃ والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو کبوتروں کے پیچھے پڑا ہوا تھا یعنی ان کے ساتھ لہو ولعب کرنے اور ان کو اڑانے میں مشغول تھا آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ شیطان ہے اور شیطان کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، بیہقیؒ)

تشریح: اس شخص کو شیطان اس لئے فرمایا کہ وہ حق سے بعد اختیار کئے ہوئے تھا اور لایعنی و بے مقصد کام میں مشغول تھا اور ان کبوتروں کو اس بنا پر شیطان فرمایا کہ انہوں نے اس شخص کو بازی اور لہو ولعب میں مشغول کر کے ذکر الٰہی اور دین و دنیا کے دوسرے کاموں سے باز رکھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کبوتر بازی حرام ہے اور نوویؒ نے لکھا ہے کہ انڈے بچے حاصل کرنے کے لئے دل کو بہلانے کی خاطر اور نامہ بری کے مقصد سے کبوتروں کو پالنا بلا کراہت جائز ہے، لیکن ان کو اڑانا مکروہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

تصویر کشی کا پیشہ ناجائز ہے

(۱۹) عَنْ سَعِيْدِ بْنِ اَبِی الْحَسَنِ قَالَ كُنْتُ عِنْدَ ابْنِ عَبَّاسٍ اِذْ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ يَا ابْنَ عَبَّاسٍ اِنِّی رَجُلٌ اِنَّمَا مَعِيْشَتِیْ مِنْ صَنْعَةِ يَدِیْ وَاِنِّیْ اَصْنَعُ هٰذِهِ التَّصَاوِيْرَ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَا اُحَدِّثُكَ اِلَّا مَا سَمِعْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ مَنْ صَوَّرَ صُوْرَةً فَاِنَّ اللّٰهَ مُعَذِّبُهُ حَتّٰی يَنْفُخَ فِيْهِ الرُّوْحَ وَلَيْسَ بِنَافِخٍ فِيْهَا اَبَدًا فَرَبَا الرَّجُلُ رَبْوَةً شَدِيْدَةً وَاصْفَرَّ وَجْهُهُ فَقَالَ وَيْحَكَ اِنْ اَبَيْتَ اِلَّا اَنْ تَصْنَعَ فَعَلَيْكَ بِهٰذَا الشَّجَرِ وَكُلِّ شَیْءٍ لَيْسَ فِيْهِ رُوْحٌ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت سعید ابن ابوالحسن تابعیؒ کہتے ہیں کہ ایک دن میں ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ناگہاں ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہنے لگا ابن عباسؓ میری معاشی زندگی کا انحصار میرے ہاتھوں کی محنت مزدوری پر ہے جن کے ذریعہ میں یہ تصویریں بناتا ہوں (اب سوال یہ ہے کہ میں کیا کروں کیونکہ شریعت نے اس پیشہ کو حرام قرار دیا ہے اور کوئی دوسرا پیشہ مجھے آتا نہیں کہ جس کے ذریعہ اپنی روزی کا انتظام کروں تو کیا اس مجبوری کے تحت میرے لئے یہ پیشہ جائز ہے یا نہیں؟) حضرت ابن عباسؓ نے جب یہ دیکھا کہ تصویر کشی کے کام سے اس شخص کا تعلق سخت نوعیت کا ہے اور شاید میرے منع کرنے سے باز نہ آئے تو انہوں نے اس کے سامنے آنحضرت ﷺ کی حدیث بیان کی، چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ میں تمہارے سامنے اس بات کے علاوہ اور کوئی بات بیان نہیں کروں گا جس کو میں نے رسول کریم ﷺ سے سنا ہے (تو تم توجہ سے سنو کہ) میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص تصویر سازی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو عذاب میں مبتلا رکھے گا یہاں تک کہ وہ اس تصویر میں روح پھونک دے درآنحالیکہ وہ اس تصویر میں ہرگز روح نہیں پھونک سکے گا۔ اس شخص نے (یہ وعید سن کر) بڑا گہرا سانس لیا اور اس کا چہرہ خوف کی وجہ سے پیلا پڑ گیا، حضرت ابن عباسؓ نے (اس کی یہ حالت دیکھی تو) فرمایا کہ تم پر افسوس ہے اگر تم اس تصویر کشی کے پیشہ کے علاوہ دوسرے پیشوں (کو قبول کرنے سے) انکار کرتے ہو (کیونکہ تم کوئی اور پیشہ جانتے ہی نہیں) تو ایسا کرو کہ ان درختوں کی اور ان چیزوں کی تصویریں بنانے لگو جو بے جان ہیں۔" (بخاریؒ)

کنیسہ کا ذکر

(۲۰) وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ لَمَّا اشْتَكَى النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَكَرَ بَعْضُ نِسَائِهِ كَنِيْسَةً يُقَالُ لَهَا مَارِيَةُ وَكَانَتْ اُمُّ سَلَمَةَ وَاُمُّ حَبِيْبَةَ اَتَتْ اَرْضَ الْحَبَشَةِ فَذَكَرَتَا مِنْ حُسْنِهَا وَتَصَاوِيْرَ فِيْهَا فَرَفَعَ رَاْسَهُ فَقَالَ اُولٰئِكَ اِذَا مَاتَ فِيْهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهِ مَسْجِدًا ثُمَّ صَوَّرُوْا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوَرَ اُولٰئِكَ شِرَارُ خَلْقِ اللّٰهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ بیمار ہوئے تو آپ ﷺ کی ازواجؓ میں سے بعض نے ایک کنیسہ کا ذکر کیا جس کو ماریہ کہا جاتا تھا (کنیسہ یہود ونصاری کی عبادت گاہ کو کہتے ہیں، جو کنشیت کا معرب ہے اسی کے بارے میں حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی بیماری میں آپ ﷺ کے پاس بیٹھی ہوئی ازواج مطہراتؓ آپ ﷺ کی دلبستگی کے لئے باتوں میں مشغول تھیں کہ بعض ازواج مطہراتؓ یعنی اُمّ سلمہؓ اور اُمّ حبیبہؓ نے کنیسہ کا ذکر کیا جس کو انہوں نے ملک حبشہ میں دیکھا تھا اور آپ ﷺ کی وہ ازواج مطہراتؓ یعنی اُمّ سلمہؓ اور اُمّ حبیبہؓ حبشہ جا چکی تھیں جہاں کے لوگ عیسائیت کے پیروکار تھے) چنانچہ ان دونوں نے کنیسہ کی خوبصورتی اور اس میں بنی ہوئی تصویروں کا ذکر کیا، آنحضرت ﷺ نے یہ تذکرہ سن کر اپنا سر مبارک اٹھایا اور فرمایا کہ وہ لوگ (یعنی حبشہ والے یا نصاریٰ ایسا کرتے ہیں کہ) جب ان میں سے کوئی نیک وصالح آدمی مرجاتا ہے تو وہ اس کی قبر پر عبادت گاہ بنا لیتے ہیں (جس کو کنیسہ کہا جاتا ہے) اور اس کنیسہ میں (اپنے نیک وصالح لوگوں کی) یہ تصاویر بناتے ہیں وہ لوگ (حقیقت میں) خدا کی بدترین مخلوق ہیں۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ قبروں پر عبادت گاہ بنانے اور ان قبروں کی طرف منہ کر کے عبادت کرنے کی وجہ سے وہ خدا کی بدترین مخلوق میں شمار کئے جاتے ہیں۔

سب سے سخت عذاب کن لوگوں پر ہوگا

(۲۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَنْ قَتَلَ نَبِيًّا اَوْ قَتَلَهُ نَبِيٌّ اَوْ قَتَلَ اَحَدَ وَالِدَيْهِ وَالْمُصَوِّرُوْنَ وَعَالِمٌ لَمْ يَنْتَفِعْ بِعِلْمِهِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن سخت ترین عذاب اس شخص پر ہوگا جو نبی کو قتل کرے" یا جہاد میں اس کو نبی قتل کرے یا جو والدین میں سے کسی ایک کو قتل کرے اور جو شخص تصویر بنائے، یا جو عالم اپنے علم سے فائدہ نہ اٹھائے یعنی اپنے علم کے مطابق عمل نہ کرے ان پر بھی سخت ترین عذاب ہوگا۔"

تشریح: جس شخص کو میدان جہاد میں کسی نبی نے قتل کیا ہوگا اس کا سخت ترین عذاب میں مبتلا ہونا ایک اور روایت سے بھی ثابت ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اشتد غضب اللّٰہ علی رجل تقتلہ رسول اللّٰہ فی سبیل اللّٰہ یعنی اللہ کا سخت ترین غضب (عذاب) اس شخص پر ہوگا جس کو اللہ کے رسول نے خدا کی راہ یعنی جہاد میں قتل کیا ہوگا! کیونکہ اللہ کے رسول کا مقتول اصل میں وہی شخص ہوگا جو اللہ کے رسول کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوگا۔ جہاد کی قید کے ذریعہ گویا اس قتل کو مستثنیٰ رکھا گیا ہے جو حد اور قصاص کے طور پر ہو۔

شطرنج کی مذمت

(۲۲) وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ الشِّطْرَنْجُ هُوَ مَيْسِرُ الْاَعَاجِمِ۔

"اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے۔ "شطرنج عجمی لوگوں یعنی غیر مسلم قوموں کا جوا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ غیر مسلم قوموں کے لوگ شطرنج کے ذریعہ حقیقۃً جوا کھیلتے ہیں یا شطرنج کھیلنا صورۃً ان کے جوئے کی مشابہت رکھتا ہے اور ان کی ہر طرح کی مشابہت اختیار کرنا ممنوع ہے۔

(۲۳) وَعَنِ ابْنِ شِهَابٍ اَنَّ اَبَا مُوْسَى الْاَشْعَرِيَّ قَالَ لَا يَلْعَبُ بِالشِّطْرَنْجِ اِلَّا خَاطِئٌ۔

"اور حضرت ابن شہابؒ سے روایت ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے فرمایا۔ شطرنج صرف وہ شخص کھیلتا ہے جو خطا کار ہو۔"

(۲۴) وَعَنْهُ اَنَّهُ سُئِلَ عَنْ لَعِبِ الشِّطْرَنْجِ فَقَالَ هِيَ مِنَ الْبَاطِلِ وَلَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْبَاطِلَ رَوَى الْبَيْهَقِيُّ الْاَحَادِيْثَ الْاَرْبَعَةَ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن شہابؓ سے روایت ہے کہ ان سے شطرنج کھیلنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ کھیل ایک باطل شئے ہے اور اللہ تعالیٰ باطل کو پسند نہیں کرتا۔ مذکورہ بالا چاروں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: ہدایہ میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی "جس شخص نے شطرنج یا نردشیر کھیلا اس نے گویا سور کے خون میں اپنا ہاتھ ڈبویا"۔ کی بنیاد پر نردشیر اور شطرنج کھیلنا مکروہ تحریمی ہے۔ جامع صغیر میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ شطرنج کھیلنے والا ملعون ہے اور جس شخص نے دلچسپی و رغبت کے ساتھ شطرنج کی طرف دیکھا گویا اس نے سور کا گوشت کھایا۔ اور بعض کتابوں میں جو یہ نقل کیا گیا ہے کہ امام شافعیؒ نے شطرنج کے کھیل کو کچھ شرائط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے تو نصاب الاحتساب میں امام اغزالیؒ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک بھی یہ کھیل مکروہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ شافعیؒ پہلے اس کے جواز کے قائل رہے ہوں گے لیکن پھر انہوں نے اس قول سے رجوع کر لیا، در مختار وغیرہ کتابوں میں لکھا ہے کہ اس طرح کے سب کھیل مکروہ ہیں۔

کتے اور بلی کا فرق

(۲۵) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْتِیْ دَارَ قَوْمٍ مِنَ الْاَنْصَارِ وَدُوْنَهُمْ دَارٌ فَشَقَّ ذٰلِكَ عَلَيْهِمْ فَقَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ تَاْتِیْ دَارَ فُلَانٍ وَلَا تَاْتِیْ دَارَنَا قَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَنَّ فِیْ دَارِكُمْ كَلْبًا قَالُوْا اِنَّ فِیْ دَارِهِمْ سِنَّوْرًا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السِّنَّوْرُ سَبُعٌ۔ (رواہ الدار قطنی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ انصار میں سے بعض لوگوں کے گھر تشریف لے جایا کرتے تھے، حالانکہ ان کے پڑوس میں اور لوگوں کے بھی گھر تھے (لیکن آپ ﷺ ان کے یہاں نہیں جاتے تھے) ان لوگوں پر یہ بات بڑی گراں گزرتی تھی (کہ ہمارے پڑوس میں دوسرے لوگوں کے گھر تشریف لاتے ہیں لیکن ہمارے یہاں نہیں آتے چنانچہ ان لوگوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ (ﷺ) فلاں کے گھر تو تشریف لاتے ہیں لیکن ہمارے گھر تشریف نہیں لاتے (ہم نے کیا قصور کیا ہے، کہ ہمارا گھر آپ (ﷺ) کی تشریف آوری کی سعادت سے محروم ہے) نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تمہارے گھر اس لئے نہیں آتا تمہارے گھروں میں کتے پلے ہوئے ہیں انہوں نے عرض کیا کہ ان کے گھروں میں بلی پلی ہوئی ہے (اور جس طرح کتا درندہ ہے اسی طرح بلی بھی درندہ ہے پھر دونوں کے درمیان یہ فرق کیسا ہے؟) نبی کریم ﷺ نے فرمایا بلی درندہ ہے۔" (دار قطنیؒ)

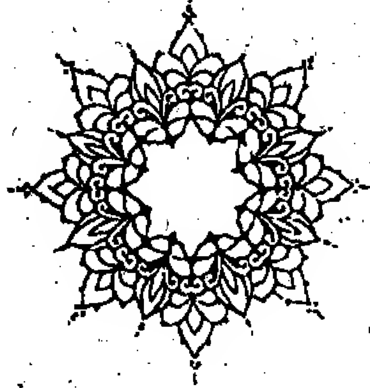

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

كِتَابُ الطِّبِّ وَالرُّقٰى

طب اور جھاڑ پھونک کا بیان

"طب" عام طور پر طاء کے زیر کے ساتھ مستعمل ہے، لیکن سیوطیؒ کہتے ہیں کہ یہ لفظ طاء کے زبر، زیر اور پیش تینوں کے ساتھ منقول ہے، اس کے معنی ہیں "علاج کرنا، دوا کرنا"، بعض مواقع پر اس لفظ کو طاء کے زیر کے ساتھ "سحر" کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے؛ اسی اعتبار سے "مطبوب" اس شخص کو کہتے ہیں جس پر سحر (جادو) کیا گیا ہو۔

طب کا تعلق جسم (ظاہر) سے بھی ہوتا ہے اور نفس (باطن) سے بھی، چنانچہ حفظان صحت اور دفع مرض کے ذریعہ بدن کے علاج معالجہ کو جسمانی طب کہتے ہیں، اور باطنی ہلاکت و تباہی تک پہنچانے والے افکار و اعمال اور بری عادات و اطوار کے ترک و ازالہ کے ذریعہ نفس کا علاج کرنے کو طب نفسانی کہتے ہیں۔ جس طرح طب کی دو قسمیں ہیں، اسی طرح دوا کی بھی دو قسمیں ہیں ایک تو جسمانی اور طبعی، خواہ وہ مفردات کی شکل میں ہو یا مرکبات کی شکل میں (جیسا کہ ظاہری دوائیں ہوتی ہیں) اور دوسری قسم روحانی و لسانی ہے۔ جو قرآن کریم اور قرآن کریم کے حکم میں شامل دوسری چیزوں کی صورت میں ہے۔ نبی کریم ﷺ اپنی اُمت کے لوگوں کے علاج و اصلاح کے لئے ظاہری و طبعی دواؤں کو بھی اختیار فرماتے تھے۔ اور باطنی و روحانی معالجہ کو بھی۔

"رقی" اصل میں "رقیہ" کی جمع ہے جس کے معنی افسون کے ہیں ہماری زبان میں اس کو منتر اور روزمرہ کی بول چال میں جھاڑ پھونک بھی کہا جاتا ہے، علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآنی آیات، منقول دعاؤں اور اسماء الٰہی کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنا جائز ہے، ان کے علاوہ ایسے منتروں کے ذریعہ بھی جائز ہے جن کے الفاظ و کلمات کے معنی معلوم ہوں۔ اور وہ دین و شریعت کے مخالف نہ ہوں، جن منتروں کے الفاظ و کلمات ایسے ہوں کہ ان کے معنی معلوم نہ ہوں یا ان کے الفاظ و کلمات دین و شریعت کی تعلیمات و احکام کے برخلاف ہوں ان کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، اسی طرح وہ اہل عزائم و تکثیر جو علم نجوم و رمل کی مدد لے کر عملیات کرتے ہیں اور حفظ ساعات و تعین اوقات جیسی چیزوں کو اختیار کرتے ہیں ان کا یہ طریقہ بھی اہل دیانت و تقویٰ کے نزدیک مکروہ و حرام ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کا علاج پیدا کیا ہے

(1) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی دَاءً اِلَّا اَنْزَلَ لَهٗ شِفَاءً (رواہ البخاری)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی بیماری نہیں اتاری ہے اور پیدا نہیں کی ہے جس کے لئے

شفا نازل نہ کی ہو، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر مرض کے ساتھ اس کا علاج بھی پیدا کیا ہے، تاکہ اگر وہ مرض لاحق ہو تو اس علاج کے ذریعہ شفا بخشے۔" (بخاریؒ)

دوا صرف ایک ظاہری ذریعہ ہے حقیقی شفا دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے

(۲) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ فَإِذَا أُصِيْبَ دَوَاءُ الدَّوَاءِ بَرَءَ بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہر بیماری کی دوا ہے، لہٰذا جب وہ بیماری کے موافق ہو جاتی ہے تو بیمار خدا کے حکم یعنی اس کی مشیت وارادہ سے اچھا ہو جاتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "خدا کے حکم" کی قید اس لئے لگائی گئی ہے تاکہ یہ گمان نہ کیا جائے کہ مرض سے شفایابی کا اصل تعلق دوا سے ہے اور مریض کو صحت بخشنے میں علاج و معالجہ، حقیقی اور مستقل بالذات مؤثر ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل میں شفایابی تو محض اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادہ پر موقوف ہے، دوا اور علاج و معالجہ محض ایک ظاہری ذریعہ اور وسیلہ ہے، کسی بھی مرض پر کوئی دوا اسی وقت اثر انداز ہوتی ہے، جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے، چنانچہ روایت حمیدی میں اس کی تفصیل یوں منقول ہے کہ ایسا کوئی بھی مرض نہیں ہے جس کا علاج نہ ہو، چنانچہ جب کوئی شخص بیمار ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتا ہے جس کے ساتھ ایک پردہ ہوتا ہے وہ فرشتہ اس پردہ کو بیمار کے مرض اور دوا کے درمیان حائل کر دیتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیمار جو بھی دوا استعمال کرتا ہے وہ مرض کو نہیں لگتی اور شفا حاصل نہیں ہوتی یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت ہوتی ہے کہ بیمار اچھا ہو جائے تو وہ فرشتہ کو حکم دیتا ہے کہ مرض اور دوا کے درمیان سے پردہ اٹھا دیا جائے اس کے بعد بیمار جب دوا پیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس دوا کے ذریعہ اس کو شفا دیدیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب کوئی مرض لاحق ہو جائے تو اس کا علاج کرنا اور دوا مستحب ہے، چنانچہ صحابہ کرامؓ اور اکثر علماء کا یہی مسلک ہے۔ نیز اس سے ان حضرات کے نظریہ کی بھی تردید ہوتی ہے جو علاج معالجہ اور دوا کی افادیت وضرورت سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر چیز کی طرح مرض بھی قضا وقدر کے زیر اثر ہے اس لئے کسی بیمار کا علاج کرنا لاحاصل ہے۔ جمہور علماء جو علاج و معالجہ کے قائل ہیں کی دلیل مذکورہ احادیث ہیں اور انکا اعتقاد یہ ہے کہ بیشک امراض کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، لیکن امراض کے ازالہ کے ذرائع پیدا کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے اور جس طرح مرض و بیماری قضا وقدر کے تابع ہے اسی طرح علاج معالجہ کرنا بھی تقدیر الٰہی ہی سے ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسا کہ ہر انسان کی موت کا وقت بالکل اٹل ہے جس کی موت جس صورت میں لکھی جا چکی ہے۔ اسی صورت میں آکر رہے گی۔ لیکن اس کے باوجود اپنی حفاظت وسلامتی کے ذرائع اختیار کرنا اور اپنی جان کو کسی حادثہ یا دشمن کے حملہ سے محفوظ رہنے کی دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یا میدان جنگ میں دشمنان دین کو قتل کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ حاصل یہ کہ جان و صحت کی حفاظت وسلامتی کے لئے دوا وغیرہ جیسے اسباب ذرائع اختیار کرنا نہ تو حکم خداوندی کے خلاف ہے اور نہ توکل کے منافی ہے جیسا کہ کھانے کے ذریعہ بھوک کو دفع کرنا توکل کے منافی نہیں ہے چنانچہ رسول کریم ﷺ سے بڑھ کر توکل کرنے والا کون انسان ہو سکتا ہے کہ آپ سید المتوکلین تھے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ علاج بھی کرتے تھے اور بیماری کو دور کرنے کے ذرائع اختیار فرماتے تھے۔

تین چیزوں میں شفا ہے

(۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الشِّفَاءُ فِيْ ثَلٰثٍ فِيْ شَرْطَةِ مِحْجَمٍ اَوْ شَرْبَةِ عَسَلٍ اَوْ كَيَّةٍ بِنَارٍ وَاَنَا اَنْهٰى اُمَّتِىْ عَنِ الْكَيِّ۔ (رواہ البخاریؒ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا شفا تین چیزوں میں ہے پچھنے والی سینگی لگانے میں، یا شہد پینے میں خواہ خالص شہد پیا جائے یا پانی وغیرہ میں ملا کر پیا جائے اور آگ سے داغنے میں۔ لیکن میں اپنی اُمت کو داغنے سے منع کرتا ہوں۔" (بخاریؒ)

تشریح: مِحْجَمْ۔ میم کے زیر اور جیم کے زبر کے ساتھ۔ سینگی کو کہتے ہیں، لیکن یہاں اس لفظ سے مراد نشتر یا استرا ہے جس سے پچھنے دیئے جاتے ہیں۔ شَرْطَةٌ شین کے زبر کے ساتھ، پچھنے لگاؤ کے لئے کوچھنے کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ رگ سے خون نکالا جاتا ہے لہٰذا فِی شَرْطَةمعجم کا ترجمہ یہ ہوگا کہ نشتر یا استرے کے ذریعہ پچھنے لگانے میں (شفا ہے)۔

سفر السعادۃ کے مصنف کے مطابق علماء کہتے ہیں کہ اس حدیث میں تمام ہی مادی (جسمانی) امراض کے علاج معالجہ کی طرف راہنمائی و اشارہ ہے کیونکہ مادی امراض یا تو دموی ہوتے ہیں یا صفراوی، یا بلغمی ہوتے ہیں، یا سوداوی، چنانچہ اگر کوئی مرض دموی یعنی فساد خون کی بنا پر ہوتا ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ اس کو جسم سے باہر نکال دیا جائے۔ جس کی صورت پچھنے لگوانا ہے اور باقی تینوں صورتوں میں مرض کا بہترین علاج اسہال ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے شہد کے ذریعہ مسہلات کی طرف متوجہ کیا کہ اسہال کے لئے شہد ایک بہترین اور معتدل دوا کا کام دیتا ہے نیز آگ سے داغنے کے ذریعہ اس طرف اشارہ کیا کہ اگر مرض کی نوعیت ایسی ہو کہ طبیب و معالج اس کے علاج سے عاجز ہو جائیں تو پھر آگ سے داغا جائے کیونکہ یہ جب کوئی مغلظ باغی ہو جاتی ہے اور اس کا مادہ منقطع نہیں ہوتا تو اس کے انقطاع کا واحد ذریعہ اس کو داغ دینا ہوتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ اخر الدوا الکی یعنی آخری دوا داغنا ہے۔

رہی یہ بات کہ داغنا جب ایک علاج ہے تو آپ ﷺ نے اس کی ممانعت کیوں فرمائی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب داغنے کو اتنی زیادہ اہمیت دیتے تھے اور ان کا یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ مادہ مرض کا باعث ہے اس کے دفیعہ کے لئے داغنا یقینی ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں یہ مشہور تھا کہ اخز الدوا الکی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اسلامی عقیدے کے سراسر خلاف ہے کیونکہ کوئی بھی علاج خواہ وہ کتنا ہی مجرب کیوں نہ ہو یقین کا درجہ نہیں رکھ سکتا، صرف ظاہری سبب اور ذریعہ ہی سمجھا جا سکتا ہے یقینی شفا تو صرف حق تعالیٰ کے حکم پر موقوف ہے لہٰذا آپ ﷺ نے اس فاسد عقیدے کی تردید اور لوگوں کو شرک خفی میں مبتلا ہونے سے بچانے کے لئے اس کی ممانعت فرمائی اور یہ ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے ورنہ اگر کوئی شخص داغنے کو مرض کے دفیعہ کا ایک ظاہری سبب و ذریعہ سمجھتے ہوئے اس کو بطور علاج اختیار کرنے اور اللہ تعالیٰ سے شفا کی امید رکھے جائز ہے۔ بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ داغنے کی ممانعت کا تعلق خطرہ اور تردد کی صورت سے ہے یعنی اگر ایسی صورت ہو کہ داغنے سے فائدے کے جزم کی بجائے نقصان اور ہلاکت جان کا خوف اور خطرہ ہو تو پھر داغنا نہ چاہئے۔ اس مسئلہ میں بعض شارحین حدیث نے یہ تفصیل بیان کی ہے کہ داغنے کے سلسلہ میں مختلف احادیث منقول ہیں بعض احادیث تو اس کے جواز پر دلالت کرتی ہیں اور بعض نہی کو ثابت کرتی ہیں، جیسے مذکورہ بالا احادیث اور دوسری احادیث اسی طرح بعض احادیث میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ میں داغنے کو پسند نہیں کرتا۔ اور بعض احادیث میں داغنے کو اختیار نہ کرنے پر مدح و تعریف کی گئی ہے اس طرح ان احادیث کے باہمی تعارض و تضاد کو دور کرنے اور ان میں مطابقت پیدا کرنے کے لئے علماء نے یہ لکھا ہے کہ جن احادیث میں آپ ﷺ کا یہ فعل منقول ہے کہ آپ ﷺ نے داغا تو یہ اصولی طور پر داغنے کے جواز پر دلالت کرتا ہے اور جن احادیث میں آپ ﷺ کا یہ فعل منقول ہے کہ آپ ﷺ نے داغا تو یہ اصولی طور پر داغنے کے جواز پر دلالت کرتا ہے اور جن احادیث سے آپ ﷺ کی عدم پسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے وہ اس جواز کے منافی نہیں ہے، کیونکہ عدم پسندیدگی عدم جواز پر دلالت نہیں کرتا، چنانچہ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن کو آپ ﷺ تو پسند نہیں فرماتے تھے، لیکن دوسروں کے لئے اس کی ممانعت بھی نہیں فرماتے تھے، اسی طرح جن احادیث میں داغنے کو اختیار نہ کرنے پر مدح و تعریف منقول ہے وہ بھی عدم جواز پر دلالت نہیں کرتیں کیونکہ مدح و تعریف کا مقصد صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ داغنے کو اختیار نہ کرنا محض اولی اور افضل ہے نہ کہ ضروری ہے البتہ جن احادیث میں داغنے کی ممانعت صراحت کے ساتھ منقول ہے تو وہ ممانعت دراصل اس صورت پر محمول ہے جب کہ داغنے کو اختیار کرنا یا تو سبب مرض کے بغیر ہو یا مرض کے دفیعہ

کے لئے اس کی واقعی حاجت نہ ہو، بلکہ وہ مرض دوسرے علاج معالجہ سے دفع ہو سکتا ہے، نیز جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا یہ ممانعت اس بات پر بھی محمول ہے کہ یہ ممانعت داغنے کے بارے میں مذکورہ بالا فاسد عقیدے اور شرک خفی میں مبتلا ہونے سے بچانے کے لئے ہے اور اگر اس طرح کا فاسد عقیدہ نہ رکھا جائے تو یہ ممانعت نہیں ہوگی، بعض حضرات کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا بعض صحابہؓ کے بارے میں داغنے کا حکم دینا (جیسا کہ آگے آرہا ہے) اس بنا پر تھا کہ ان صحابہؓ کے زخم بہت خراب ہو گئے تھے اور بعض عضو کے کٹ جانے کی وجہ سے اخراج خون میں کمی نہیں ہو رہی تھی، نیز آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ داغنے کے صحت یقینی ہے حاصل یہ کہ کسی عضو کو داغنا یا جلانا مکروہ ہے ہاں اگر کوئی واقعی ضرورت پیش آجائے اور طبیب حاذق یہ کہے کہ اس مرض کا آخری علاج داغنا ہی ہے تو پھر داغنا جائز ہوگا۔

داغنے کا ذکر

④ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ رُمِيَ أُبَيٌّ يَوْمَ الْأَحْزَابِ عَلَى أَكْحَلِهِ فَكَوَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ غزوہ احزاب (کہ جس کو غزوہ خندق بھی کہتے ہیں) کے دن حضرت ابی کی رگ ہفت اندام پر تیر آکر لگا (جس سے خون جاری ہو گیا) تو رسول کریم ﷺ نے ان کو داغ دیا، یعنی آپ ﷺ نے زخم کے منہ کو داغنے کا حکم فرمایا یا خود اپنے دست مبارک سے داغا تاکہ خون بند ہو جائے۔" (مسلمؒ)

⑤ وَعَنْهُ قَالَ رُمِيَ سَعْدُ بْنُ مَعَاذٍ فِيْ أَكْحَلِهِ فَحَسَمَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهِ بِمِشْقَصٍ ثُمَّ وَرِمَتْ فَحَسَمَهُ الثَّانِيَةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ حضرت سعد ابن معاذؓ کی رگ ہفت اندام پر تیر آکر لگا (جس سے خون جاری ہو گیا) چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے تیر کے پیکان کے ذریعہ (زخم کو) داغ دیا، پھر جب ان کے ہاتھ پر ورم آگیا تو آپ ﷺ نے دوبارہ داغا۔" (مسلمؒ)

⑥ وَعَنْهُ قَالَ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ طَبِيْبًا فَقَطَعَ مِنْهُ عِرْقًا ثُمَّ كَوَاهُ عَلَيْهِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ابی ابن کعبؓ کے پاس ایک طبیب بھیجا طبیب نے ان کی ایک رگ کو کاٹ ڈالا اور اس (زخم) پر داغ دیا۔" (مسلمؒ)

کلونجی کی خاصیت

⑦ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِي الْحَبَّةِ السَّوْدَاءِ شِفَاءٌ مِنْ كُلِّ دَاءٍ إِلَّا السَّامَ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ السَّامُ الْمَوْتُ وَالْحَبَّةُ السَّوْدَاءُ الشُّوْنِيْزُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ سیاہ دانہ سام کے وقت کے علاوہ ہر بیماری کے لئے شفا ہے۔ ابن شہابؒ نے بیان کیا کہ سام سے موت مراد ہے اور سیاہ دانہ سے کلونجی مراد ہے۔" (بخاریؒ، ومسلمؒ)

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں کہ اگرچہ حدیث کے مفہوم میں عمومیت ہے کہ کلونجی کو ہر بیماری کی دوا فرمایا گیا ہے لیکن یہ کلونج خاص طور پر انہی امراض میں فائدہ مند ہے۔ جو رطوبت اور بلغم میں پیدا ہوتے ہیں کیونکہ کلونجی ماء یابس وخشک وگرم ہوتی ہے اس لئے یہ ان امراض کو دفع کرتی ہے جو اس کی ضد ہیں۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ حدیث کا مفہوم عمومیت پر ہی معمول ہے یعنی کلونجی ہر بیماری میں فائدہ مند ہے بایں طور کہ اگر اس کو کسی بھی دوا میں خاص مقدار وترکیب کے ساتھ شامل کیا جائے تو اس کے صحت بخش اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ کرمانیؒ نے کہا ہے کہ حدیث کا مفہوم عام ہے کیونکہ حدیث میں استثناء صرف موت کا کیا گیا ہے۔

سفر السعادۃ کے مصنف نے لکھا ہے کہ اکابر و مشائخ کی ایک جماعت کا معمول تھا کہ وہ اپنے تمام امراض میں کلونجی کو بطور دوا استعمال کرتے تھے، اور ان کے حسن اعتقاد کی برکت سے ان کے امراض دور ہو جایا کرتے تھے۔

شہد کی شفا بخش تاثیر

⑧ وَعَنْ اَبِی سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ اَخِیْ اسْتَطْلَقَ بَطْنُہٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِسْقِہٖ عَسَلًا فَسَقَاہُ ثُمَّ جَآءَ فَقَالَ سَقَیْتُہٗ فَلَمْ یَزِدْہُ اِلَّا اسْتِطْلَاقًا فَقَالَ لَہٗ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ جَآءَ الرَّابِعَۃَ فَقَالَ اِسْقِہٖ عَسَلًا فَقَالَ لَقَدْ سَقَیْتُہٗ فَلَمْ یَزِدْہُ اِلَّا اسْتِطْلَاقًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَدَقَ اللّٰہُ وَکَذَبَ بَطْنُ اَخِیْكَ فَسَقَاہُ فَبَرَأَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میرے بھائی کا پیٹ چل رہا ہے یعنی اس کو دست پر دست آرہے ہیں رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس کو شہد پلادو، اس شخص نے (جاکر) اپنے بھائی کو شہد پلایا (کچھ دیر کے بعد) پھر آیا اور کہنے لگا کہ میں نے شہد پلادیا تھا، لیکن شہد نے اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا کہ اس کے پیٹ چلنے میں اور زیادتی کردی ہے (یعنی شہد پلانے کے بعد سے دستوں میں پہلے سے بھی زیادتی ہوگئی ہے) آنحضرت ﷺ نے اس شخص کو تین مرتبہ یہی حکم دیا (یعنی آپ ﷺ ہر بار یہی فرماتے کہ اس کو شہد پلادو، اور وہ شخص شہد پلاتا رہا، پھر آکر کہتا کہ میں نے شہد پلادیا مگر دستوں میں پہلے سے بھی زیادتی ہوگئی ہے) یہاں تک کہ وہ جب چوتھی مرتبہ آیا (اور کہنے لگا کہ اس کے دستوں میں زیادتی ہوگئی ہے) تو آنحضرت ﷺ نے پھر یہی فرمایا کہ اس کو شہد پلادو، اس نے عرض کیا کہ میں نے شہد پلادیا ہے، مگر شہد نے اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا ہے کہ اس کے پیٹ چلنے میں اور زیادتی کردی ہے، تب آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے تو سچ فرمایا ہے مگر تمہارے بھائی کا پیٹ ہی جھوٹا ہے۔" آخر کار اس شخص نے اپنے بھائی کو پھر شہد (خالص یا پانی میں ملا کر پلایا) تو وہ اچھا ہوگیا۔" (بخاریؒ، ومسلمؒ)

تشریح: کسی بیماری کی صورت میں شہد استعمال کرنے کا ایک خاص طریقہ حضرت علیؓ سے یوں منقول ہے کہ جب کوئی شخص بیمار ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنی بیوی سے کہے کہ وہ اپنے مہر میں سے کچھ مال دے اور پھر اس مال کے ذریعہ شہد خریدے اور شہد کو بارش کے پانی میں ملا کر پی لے انشاء اللہ بابرکت شفا پائے گا۔

"اللہ تعالیٰ نے تو سچ فرمایا ہے" ان الفاظ کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے اس آیت کریمہ فِیْہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ شہد میں لوگوں کے لئے شفا ہے، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو وحی کے ذریعہ بتادیا تھا کہ اگر وہ مریض شہد پیئے گا تو اس کے پیٹ کو آرام ہو جائے گا اور دست بند ہو جائیں گے اسی بات کو آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ بیان کیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ بتادیا ہے کہ شہد پینے سے اس کو فائدہ ہوگا اور اللہ کی بتائی ہوئی بات غیر صحیح نہیں ہو سکتی لہٰذا مریض کو شہد پلائے جاؤ اس کو یقیناً فائدہ ہوگا۔

پھر آپ نے "تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے" کے ذریعہ گویا صحت یابی میں تاخیر ہونے کی علت بیان فرمائی کہ تمہارے بھائی کے پیٹ میں کوئی سخت مادہ جمع ہو رہا ہے اس کی وجہ سے شہد کی دی ہوئی مقدار کارگر نہیں ہو رہی ہے جب تک وہ مادہ باہر نہیں آجائے گا تب تک اسے آرام نہیں آئے گا یا یہ کہ پیٹ خطا کر رہا ہے، یعنی ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہا ہے اور ابھی شفا کو قبول نہیں کر رہا ہے جب وہ ٹھیک کام کرنے لگے گا اور شفا قبول کرے گا تو دست بند ہو جائیں ہے۔ واضح رہے کہ اہل عرب اپنے کلام میں اکثر لفظ کذب یعنی جھوٹ کو خطا کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ جیسا کہ جب انہیں کہنا ہوتا ہے کہ فلاں شخص کے کان نے خطاء کی یعنی اس نے جو بات سنی ہے اس کی حقیقت کو نہیں پہنچا ہے تو وہ یوں کہتے ہیں۔ کذب سمعہ یعنی اس کے کان نے جھوٹ کہا۔

طب نبوی ﷺ اور مروج طب میں فرق اور اس کی وجہ

اس موقع پر یہ بات واضح کردینی ضروری ہے کہ اگرچہ علماء نے حتیٰ الامکان طب نبوی ﷺ اور مروجہ طب میں مطابقت و موافقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں فرق ضرور موجود ہے اسی لئے صاحب سفر السعادۃ نے لکھا ہے کہ طب نبوی (ظاہری طور پر) طباء کے قواعد و اصول کے ساتھ کوئی نسبت نہیں رکھتی کیونکہ طب نبوی ﷺ کا مصدر وحی الٰہی، قلب نبوت اور کمال عقل ہے، ظاہر ہے کہ جو طب وحی الٰہی کے ذریعہ حاصل ہوئی ہو یا جو علاج معالجہ قلب نبوت اور کمال عقل کا بتایا ہوا اس کا کامیاب ہونا اور اس کے ذریعے شفا پانا درجہ یقین کا حامل ہے اس کے برخلاف اطباء و حکماء کی جو طب ہے اور ان کے اصول و قواعد کے مطابق جو علاج معالجہ ہوتا ہے اس کا کلیۃً کامیاب اور افادیت بخش ہونا یقینی درجہ کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس میں غلطی و خطا ہونے کا بھی گمان ہے کیونکہ اس طب کی بنیاد انسانی ذہن و تجربہ پر ہے اس اعتبار سے یہ طب اس طب نبوی ﷺ کے برابر ہو ہی نہیں سکتی جس کی بنیاد وحی الٰہی، قلب نبوت اور کمال عقل ہے۔

طب نبوی اور مروجہ طب کے درمیان یہی فرق ہے جو بعض مواقع پر کچھ لوگوں کو شک شبہ اور الجھن میں ڈال دیتا ہے چنانچہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے کسی مرض کا ایسا علاج تجویز فرمایا ہے جو فن طب کے اصول و قواعد کے خلاف ہے تو وہ مختلف قسم کے اعتراض کرتے ہیں حالانکہ انہیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہئے کہ وہ جس طب کے اصول و قواعد کی بات کرتے ہیں وہ چونکہ انسان کے اپنے ذہن اور اپنی عقل و تدبیر کی پیداوار ہے اس لئے اس میں غلطی و خطا کا ہونا اور حقیقت حال تک نہ پہنچنا عین ممکن ہے جب کہ طب نبوی کا مصدر وحی الٰہی اور قلب نبوت ہے جس میں کسی خطا کا امکان ہی نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ نے کسی مرض کا جو بھی علاج تجویز فرمایا ہے اس کے بارے میں تو ہو سکتا ہے کہ ہمارا ناقص علم اور ذہن اس کی حقیقت تک نہ پہنچ سکے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ علاج مرض کے مطابق نہ ہو مثال کے طور پر یہاں حدیث میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے اس کے متعلق بعض اطباء سخت حیرانی اور الجھن میں مبتلا ہوئے ہیں کیونکہ شہد اپنے خواص کے اعتبار سے سہل اور پیٹ جاری کرنے والا ہے، لہٰذا دستوں کے روکنے کے لئے شہد پلانے کا حکم نبوی ﷺ بظاہر اطباء کے اصول و قواعد کے بالکل خلاف ہے بناء بریں وہ اطباء کہتے ہیں کہ ہر مرتبہ شہد پلانے کے بعد دستوں میں زیادتی کا ہونا اسی وجہ سے تھا کہ شہد اسہال پیدا کرتا ہے؟ اس بارے میں ایک بات تو یہی کہی جاسکتی ہے کہ یہ ایک بالکل مخصوص نوعیت کا معاملہ تھا جس میں دوا کی تاثیر سے زیادہ آنحضرت ﷺ کی دعا کی برکت اور آپ ﷺ کے اعجاز سے وہی شہد اس کے حق میں شفایابی کا ذریعہ بن گیا اور وہ اچھا ہو گیا، یہ بات اگرچہ حسن اعتقاد کے نقطہ نظر سے ایک اچھی تعبیر و ترجمانی ہے جو اہل ایمان کو مطمئن کر سکتی ہے اور پھر وہ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ محض اس واقعہ پر قیاس کر کے طب نبوی ﷺ کو مروج طب کے اصول و قواعد کے متضاد قرار نہیں دیا جاسکتا، لیکن اس کے علاوہ اگر فنی نقطہ نظر سے بھی آنحضرت ﷺ کے تجویز کردہ اس علاج پر پوری تحقیق اور گہری نظر کے ساتھ غور کیا جائے تو واضح ہوگا کہ آنحضرت ﷺ کا مریض کو شہد پلانے کا حکم دینا اطباء کے اصول و قواعد کے خلاف نہیں تھا۔ کیونکہ دستوں کا آنا جس طرح بدہضمی کی وجہ سے ہوتا ہے اسی طرح وہ فاسد مادہ بھی دست جاری ہونے کا سبب بنتا ہے جو جمع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جو دست معدے میں جمع ہونے والے فاسد مادہ کی وجہ سے آتے ہیں ان کو بند کرنا اور اس مادے کو باہر نکالنا ضروری ہوتا ہے اور اس کا بہترین علاج شہد ہے۔ خصوصاً شہد کو گرم پانی میں ملا کر پلانا بہت مفید ہے کہ وہ مادہ کو دفع بھی کرتا ہے اور خارج بھی کر دیتا ہے پس وہ شخص جو بدہضمی کا شکار تھا اور اس کے معدے میں فاسد مادہ بھی جمع ہو گیا تھا اس کے لئے بہترین علاج یہی تھا کہ شہد پلا کر اس کے معدے میں جمع ہو جانے والا فاسد مادہ نکالا جائے چنانچہ آپ ﷺ اس کو شہد پلانے کا حکم دیتے رہے یہاں تک کہ جب اس کا معدہ فاسد مادے سے بالکل صاف ہو گیا تو وہ اچھا ہو گیا، اس سلسلے میں یہ بات بطور خاص ذہن میں رکھنے کی ہے کہ علاج معالجہ میں حسن اعتقاد اور معالج کی تشخیص و تجویز پر مکمل اعتبار و بھروسہ بنیادی چیز ہے، چنانچہ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی

شخص اپنے معالج کے بارے میں کسی بھی قسم کے شک و شبہ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس سے حسن اعتقاد نہیں ہوتا تو اس کا مزاج معالج کے اس علاج کو قبول نہیں کرتا اور شفایابی سے محروم رہتا ہے خواہ وہ معالج کتنے ہی اونچے درجے کا کیوں نہ ہو اس کے برخلاف اگر وہ شخص پورے یقین و اعتقاد کے ساتھ کوئی انتہائی معمولی درجہ کا بھی علاج کرتا ہے تو وہ علاج اس کے لئے فائدہ مند ہو جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص طب نبوی ﷺ کے ذریعہ اپنا علاج کرے جس کی کامیابی یقینی ہے اور اس کو اس علاج سے فائدہ نہ ہو تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ اس کے ایمان میں کھوٹ ہے اور اس کو یقین و اعتقاد کی نعمت حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنے کسی مرض کا علاج طب نبوی ﷺ کے ذریعہ کرنے کا خواہش مند ہو تو اس کو اپنا یقین کامل اور اپنا اعتقاد مضبوط کرنا چاہئے اور پھر صدق نیت و اخلاص عمل کے ساتھ اس علاج کو اختیار کرنا چاہئے۔ اگر اس نے طب نبوی ﷺ کی اس بنیادی ضرورت کو پورا کر لیا تو اس کو یقیناً فائدہ ہوگا، اس حقیقت کو بالکل اسی طرح سمجھنا چاہئے۔ جیسا کہ قرآن کریم، امراض باطنی و روحانی اور فساد قلب و ذہن کے لئے شفاء کامل کا درجہ رکھتا ہے۔ لہٰذا جو شخص قرآن کریم کو اخلاص و خلوص کے جذبہ سے سیکھتا ہے اور پڑھتا ہے اس کی تعلیمات پر یقین و اعتقاد کے ساتھ عمل کرتا ہے۔ اس کے قلب و روح کو یقیناً جلاو شفا حاصل ہوتی ہے، اس کے برخلاف جو شخص عدم اخلاص و قبول اور بے یقینی و بے اعتمادی کے ساتھ قرآن کریم کو سیکھتا پڑھتا ہے تو اس کے باطن میں اور زیادتی برائی اور اس کے قلوب میں اور زیادہ فساد پیدا ہوتا ہے۔ اسی بناء پر بعض حضرات نے حدیث کے الفاظ کذب بطن اخیک (تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے) کو مریض کے عدم صدق نیت اور عدم خلوص اعتقاد پر بھی محمول کیا ہے یعنی ان حضرات کے نزدیک، آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد گرامی کے ذریعہ گویا یہ واضح کیا کہ تمہارے بھائی نے چونکہ شہد کو یقین و اعتقاد اور اخلاص و قبول کے ساتھ نہیں پیا ہے، اسلئے فائدہ ہونے کے بجائے اس مرض میں زیادتی ہو گئی ہے۔

قسط کے فوائد

⑨ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَمْثَلَ مَاتَدَاوَیْتُمْ بِہِ الْحِجَامَۃُ وَالْقُسْطُ الْبَحْرِیُّ۔
(متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جن چیزوں کو تم دوا علاج کے طور پر اختیار کرتے ہو ان میں بہترین چیز سینگی کھچوانا اور بحری قسط کا استعمال کرنا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "قسط" ایک جڑ کا نام ہے جس کو "کوٹ" بھی کہتے ہیں اور دوا کے کام میں آتی ہے اطباء نے اس کے بہت فوائد لکھے ہیں مثلاً نفاس والی عورتیں اس کی دھونی لیں تو رکا ہوا فاسد خون جیسے حیض اور پیشاب جاری ہو جاتا ہے۔ یہ مسموم جراثیم کو دور کرتی ہے۔ دماغ کو قوت بخشتی ہے اعضاء رئیسہ باہ اور جگر کو طاقت و ربتاتی ہے اور قوت مردمی میں تحریک پیدا کر دیتی ہے۔ ریاح کو تحلیل کرتی ہے، دماغی بیماریوں جیسے فالج، لقوہ، اور رعشہ کے لئے مفید ہے۔ پیٹ کر کیڑے باہر نکالتی ہے۔ چوتھے دن کے بخار کے لئے بھی فائدہ مند ہے اس کا لیپ کرنے سے چھائیاں اور چھیپ جاتی رہتی ہے، زکام کی حالت میں اس کی دھونی لینا ایک بہترین علاج ہے اس کی دھونی سے سحر و وبا کے اثرات بھی جاتے رہتے ہیں غرضکہ طب کی کتابوں میں اس کے بہت زیادہ فوائد لکھے ہیں اسی لئے اس کو "سب سے بہتر دوا" فرمایا گیا ہے۔ واضح رہے کہ "قسط" دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو قسط بحری جس کا رنگ سفید ہوتا ہے اور دوسری کو قسط ہندی کہا جاتا ہے جس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ دونوں کی خاصیت گرم و خشک ہے لیکن بحری قسط ہندی قسط سے بہتر ہوتی ہے کیونکہ اس میں گرمی کم ہوتی ہے۔

بچوں کے حلق کی مخصوص بیماری "عذرہ" کا علاج

⑩ وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاتُعَذِّبُوْا صِبْیَانَکُمْ بِالْغَمْطِ مِنَ الْعُذْرَۃِ وَعَلَیْکُمْ بِالْقُسْطِ۔
(متفق علیہ)

"اور حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم اپنے بچوں کے حلق کی بیماری کو ہاتھ یا کپڑے سے ان کو اذیت نہ پہنچاؤ بلکہ تمہیں قسط کا استعمال کرنا چاہئے۔" (بخاری، ومسلم)

تشریح: "عذرہ" ایک بیماری ہے جو شیر خوار بچے کو ہو جایا کرتی ہے اس کا سبب خون کا ہیجان ہوتا ہے عام طور پر مائیں یا دائیاں اس کو دفع کرنے کے لئے بچے کے حلق میں انگلی ڈال کر اس کو دباتی ہیں جن میں سے سیاہ خون نکلتا ہے اور بچے کو بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس طریقہ علاج سے منع فرمایا اور دفعیہ مرض کے لئے قسط کو بطور دوا تجویز فرمایا اس مرض میں قسط کو استعمال کرنے کی صورت یہ ہے کہ اس کو پانی میں حل کر کے ناک میں ٹپکایا جائے جس کو "سعوط" کہتے ہیں یہ محلول ناک کے ذریعہ عذرہ پر پہنچ کر اس کو دور کر دے گا۔ واضح رہے کہ عذرہ کے علاج کے لئے قسط کی تجویز بعض اطباء کے نزدیک حیرانی کا باعث ہے کیونکہ ان کے کہنے کے مطابق قسط چونکہ گرم ہے اور عذرہ بھی گرمی کی وجہ سے ہوتا ہے خاص طور پر حجاز میں کہ جہاں کی آب و ہوا گرم ہے اس لئے اس بیماری کو قسط سے کیونکر فائدہ ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عذرہ کا مادہ اصل میں وہ خون ہوتا ہے جس پر بلغم کا غلبہ ہوتا ہے گویا عذرہ خون اور بلغم دونوں سے مل کر بنتا ہے لیکن بلغم زیادہ ہوتا ہے اور خون کم لہٰذا بلغم کی رطوبت کو قسط کی گرمی جذب کر لیتی ہے! بسا اوقات دوا کا فائدہ بالخاصیت بھی ہوتا ہے اس اعتبار سے عذرہ میں قسط کا استعمال باعث حیرت نہیں ہونا چاہئے، علاوہ ازیں ایک جواب یہ بھی ہے کہ عذرہ کا علاج قسط کے ذریعہ کرنا اعجاز نبوی ﷺ کا ایک کرشمہ ہے جس میں عقل کی کوئی دخل نہیں ہے۔

ذات الجنب کا علاج

(۱۱) وَعَنْ اُمِّ قَیْسٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی مَا تَدْغَرْنَ اَوْلَادَکُنَّ بِھٰذَا الْعِلَاقِ عَلَیْکُنَّ بِھٰذَا الْعُوْدِ الْھِنْدِیِّ فَاِنَّ فِیْہِ سَبْعَۃَ اَشْفِیَۃٍ مِنْھَا ذَاتُ الْجَنْبِ یُسْعَطُ مِنَ الْعُذْرَۃِ وَیُلَدُّ مِنْ ذَاتِ الْجَنْبِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ام قیس کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم اپنے بچوں کے حلق کا علاج اس طرح دبا کر کیوں کرتی ہو بلکہ تمہیں ان کا علاج عود ہندی یعنی کوٹ کے ذریعہ کرنا چاہئے کیونکہ عود ہندی میں سات بیماریوں کی شفا ہے جن میں ایک ذات الجنب ہے۔ عذرہ کی صورت میں توسط کیا جائے (یعنی عذرہ بیماری کو دور کرنے کے لئے عود ہندی کو پانی میں گھول کر ناک میں ٹپکایا جائے) اور ذات الجنب کی صورت میں لدود کیا جائے یعنی ذات الجنب کی بیماری کو دور کرنے کے لئے عود ہندی کو پانی میں گھول کر باچھ کی طرف سے منہ میں ٹپکایا جائے۔" (بخاری، مسلم)

تشریح: "تَدْغَرْنَ" وغر کا مطلب ہے عذرہ بیماری میں حلق کو انگلی کے ذریعہ دبانا، جیسا کہ جب بچوں کو حلق کی بیماری ہوتی ہے تو عورتیں ان کے حلق میں انگلی ڈال کر ورم کو دباتی ہیں اور کوے کو اوپر اٹھا دیتی ہیں، چنانچہ اس بارے میں اس سے پہلے کی حدیث میں بھی گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ نے اس تکلیف دہ طریقہ علاج سے منع فرمایا ہے، اور یہاں بھی آپ ﷺ نے بطریق انکار فرمایا کہ تم اپنے بچوں کے حلق کو انگلی سے کیوں دباتی ہو، یعنی اس طریقہ علاج سے اجتناب کرو۔ اعلق کے معنی بھی وہی ہیں جو وغر کا مطلب بیان کیا گیا ہے۔ بعض روایت میں علاق کے بجائے اعلاق مذکور ہے، لیکن علماء نے لکھا ہے کہ یہی روایت اولی اور اصوب ہے، ویسے اعلاق کے بھی وہی معنی ہیں جو علق کے ہیں، حاصل یہ کہ عورتوں کو آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ عذرہ کی بیماری میں انگلی کے ذریعہ حلق کو دبانے کا طریقہ علاج اختیار کیا جائے۔ بلکہ عود ہندی کے ذریعہ اس کا علاج کیا جائے جس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو پانی میں گھول کر بچے کی ناک میں ٹپکایا جائے۔

حدیث میں "عود ہندی" کا ذکر اس بات کو واضح کرتا ہے کہ پچھلی حدیث میں قسط بحری سے مراد یہی عود ہندی ہے تاہم یہ بھی احتمال ہے کہ "قسط" ہندی کو عود ہندی فرمایا گیا ہو۔ جیسا کہ بعض حضرات نے اس کی وضاحت "عود ہندی" کی ہے اور یہ بات پہلے بتائی جا چکی

ہے کہ فائدہ مند تو دونوں ہیں لیکن "قسط بحری" زیادہ فائدہ مند ہے۔

"ذات الجنب" ایک بیماری ہے اس کی صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ سینے میں ورم ہو جاتا ہے اور یہ اگرچہ عضلات میں پیدا ہوتا ہے مگر پھر باطن سے ظاہر میں آجاتا ہے اور یہ صورت خطرناک ہے اور اس کا شمار مہلک امراض میں ہوتا ہے......... ذات الجنب کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ ریاح غلیظہ کے رک جانے کی وجہ سے پہلو میں ایک درد ہوتا ہے یہاں حدیث میں جس ذات الجنب کا ذکر ہے اس سے مراد یہی دوسری صورت ہے کیونکہ "عود ہندی" ریاحی امراض کی دوا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد گرامی میں سات بیماریوں کا ذکر فرمایا لیکن نام صرف دو بیماریوں کا لیا، باقی پانچ کے بارے میں سکوت فرمایا، کیونکہ اس موقع پر ان پانچوں کی وضاحت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پانچ بیماریاں ایسی ہوں گی جو عرب میں مشہور رہی ہوں گی اور ان کے بارے میں لوگ خود جانتے ہوں گے اور چونکہ ان دونوں بیماریوں کے بارے میں لوگوں کا علم محدود ہوگا اس لئے آپ ﷺ نے صرف دو بیماریوں کا نام لیا، لیکن حدیث میں "سات بیماریوں" کے ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ قسط بس انہی سات بیماریوں کے کام میں آنے والی دوا ہے سات سے زیادہ کسی اور بیماری کے لئے فائدہ مند نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس دوا کا فائدہ بہت وسیع ہے اور بہت سی بیماریوں میں استعمال کی جاتی ہے جن میں سے کچھ بیماریاں وہ ہیں جن کو پہلے بیان کیا جا چکا ہے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ سات بیماریوں کے لئے یہ بہت فائدہ مند ہوگی اس لئے اس کو یہاں ذکر کیا گیا، علاوہ ازیں بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ "سات" سے مراد مخصوص عدد نہیں ہے بلکہ کثرت مراد ہے چنانچہ اہل عرب کے کلام میں بسا اوقات سات کا اطلاق کثرت پر ہوتا ہے۔

بخار کا علاج اور پانی

(۱۲) وَعَنْ عَآئِشَةَ وَرَافِعِ ابْنِ خَدِيْجٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْحُمّٰى مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ فَابْرِدُوْهَا بِالْمَآءِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن خدیجؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا بخار جہنم کی بھاپ ہے لہٰذا تم اس کو پانی سے ٹھنڈا کرو۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: بعض حضرات نے کہا ہے کہ ارشاد گرامی کا مقصد بخار کی حرارت کو دوزخ کی آگ سے مشابہت دینا ہے یعنی بخار دوزخ کی آگ کی تپش کا نمونہ ہے، اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ حقیقی معنی پر محمول ہیں جیسا کہ باب مواقیت میں یہ روایت گزری ہے کہ موسم گرما کی تپش و حرارت اصل میں دوزخ کی بھاپ کا اثر ہے، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ بخار کی حرارت و جلن بھی دوزخ کی بھاپ کا اثر ہو۔ اس حدیث کے اصل مخاطب اہل حجاز ہیں کیونکہ مکہ اور مدینہ کے رہنے والے کو عام طور پر سورج کی شدید تمازت، گرم آب و ہوا اور دھوپ میں ان کی محنت مشقت کرنے اور ان کے مزاج کی تیزی و گرمی کی وجہ سے بخار ہو جایا کرتا تھا، چنانچہ جو بخار آفتاب کی حرارت و تمازت، کوئی گرم دوا وغیرہ کھانے دھوپ و تپش میں زیادہ چلنے پھرنے اور حرکت کرنے اور آب و ہوا کے دباؤ کی وجہ سے ہو اس کا بہترین علاج پانی ہے کہ ٹھنڈے پانی میں غوطہ لگایا جائے یا ٹھنڈا پانی اپنے بدن پر بہایا جائے، یا بخار کو پانی سے ٹھنڈا کیا جائے کی مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس طرح کے بخار میں ٹھنڈی دوائیں پانی میں مخلوط کر کے استعمال کی جائیں اور بعض حضرات کے مطابق اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ جس شخص کو بخار ہو وہ پیاسوں کو اللہ واسطے ٹھنڈا پانی پلائے، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کے بخار کو دور کر دے گا۔

جھاڑ پھونک کے ذریعہ علاج کرنے کی اجازت

(۱۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ رَخَّصَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِى الرُّقْيَةِ مِنَ الْعَيْنِ وَالْحُمَةِ وَالنَّمْلَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جھاڑ پھونک کے ذریعہ نظر بد، ڈنک اور نملہ کا علاج کرنے کی اجازت دی ہے۔" (مسلم)

تشریح: "افسوں" سے مراد وہ جھاڑ پھونک ہے، جس میں حصول شفا کے لئے منقول دعائیں اور قرآنی آیات پڑھی جاتی ہیں "نظر بد" ایک حقیقت ہے جس کو بعض حضرات نے "زہر" سے تعبیر کیا ہے ان حضرات کا کہنا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بچھو کے ڈنک اور سانپ کے منہ میں زہر رکھا ہے اسی طرح بعض آدمیوں کی آنکھوں میں بھی زہر رکھا ہے کہ ان کی نظر جس چیز کو بھی لگ جاتی ہے خواہ وہ انسان ہو یا مال و اسباب، زمین جائیداد ہو یا کھیتی و باغات اور جانور ہو، اس کو کھا جاتی ہے۔ چنانچہ نظر بد کے دفیعہ کے لئے دعا و تعویز اور جھاڑ پھونک نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ آنحضرت ﷺ نے اس مقصد کے لئے مختلف دعائیں بھی تعلیم فرمائی ہیں جو دعاؤں کے باب میں گزر چکی ہیں۔

"ڈنک" سے مراد زہریلہ ڈنک ہے جیسے بچھو کا ڈنک، سانپ کا ڈسنا بھی اسی کے حکم میں ہے اگر کسی شخص کو بچھو ڈنک مار دے یا سانپ ڈس لے تو اس کا زہر اتارنے کا بہترین ذریعہ جھاڑ پھونک ہے۔

"نملہ" اصل میں چیونٹی کو کہتے ہیں لیکن یہاں وہ پھوڑا مراد ہے جو آدمی کے پہلو میں ہو جایا کرتا ہے، کبھی یہ پھوڑا چھوٹی چھوٹی پھنسیوں کی صورت میں بھی ہوتا ہے جو پسلی کے اوپر نکل آتی ہیں، نملہ پھوڑے میں آدمی کو ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے چیونٹیاں رینگ رہی ہوں اور غالبا اسی مناسبت سے اس پھوڑے کو نملہ کہا گیا ہے اور اگر نملہ چھوٹی چھوٹی پھنسیوں کی صورت میں ہو تو اس میں وجہ مشابہت یہ ہوگی کہ وہ پھنسیاں چیونٹیوں کی طرح پھیلی اور بکھری ہوتی ہیں۔

واضح رہے کہ جھاڑ پھونک کے ذریعہ ہر مرض کا علاج کرنا جائز ہے، اس صورت میں خاص طور پر ان تین چیزوں کا ذکر محض اس لئے کیا گیا ہے کہ دوسرے امراض کی بہ نسبت ان تینوں میں جھاڑ پھونک کا اثر زیادہ اچھا ہوتا ہے اسی طرح جس روایت میں بطور حصریہ فرمایا گیا ہے کہ جھاڑ پھونک صرف ان تین چیزوں میں جائز ہے۔ اس کی تاویل بھی یہی ہوگی، علاوہ ازیں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب جن الفاظ و کلمات کے ذریعہ جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے ان سے اجتناب کی خاطر آنحضرت ﷺ نے ابتداء اسلام میں مسلمانوں کو جھاڑ پھونک کرنے سے منع فرما دیا تھا پھر جب ان تینوں چیزوں میں جھاڑ پھونک کی اہمیت اور لوگوں کو اس سے حاصل ہونے والے فائدے کی بنا پر آپ ﷺ نے ان تین چیزوں میں منتر پڑھ کر پھونکنے کی اجازت دیدی بشرطیکہ اس منتر میں مشرکانہ الفاظ و کلمات استعمال نہ ہوں یہاں تک کہ بعد میں اس اجازت کو عام کر دیا گیا کہ کسی بھی مرض میں منقول دعاؤں اور قرآنی آیات کے ذریعہ جھاڑ پھونک کی جا سکتی ہے۔

(۱۴) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اَمَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَسْتَرْقِيَ مِنَ الْعَيْنِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ ہم نظر بد کا اثر دور کرنے کے لئے جھاڑ پھونک کرائیں۔" (بخاری و مسلم)

(۱۵) وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى فِيْ بَيْتِهَا جَارِيَةً فِيْ وَجْهِهَا سَفْعَةٌ تَعْنِي صُفْرَةً فَقَالَ اسْتَرْقُوْا لَهَا فَاِنَّ بِهَا النَّظْرَةَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اُم سلمہ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے ان کے گھر میں ایک لڑکی کو دیکھا جس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس پر منتر پڑھواؤ۔ یعنی اس کی جھاڑ پھونک کراؤ۔ کیونکہ اس کو نظر لگی ہے۔" (بخاری، مسلم)

تشریح: حدیث کے ظاہری مفہوم سے تو عمومیت ظاہر ہوتی ہے کہ اس لڑکی کو نظر لگ گئی تھی خواہ کسی انسان کی نظر لگی ہو یا کسی جن کی لیکن شارحین نے وضاحت کی ہے کہ اس لڑکی پر کسی جن کی نظر بد کا اثر تھا۔ جنات کی نظر برچھے کی نوک سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے۔

(۱۶) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الرُّقٰى فَجَآءَ اٰلُ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّهٗ

كَانَتْ عِنْدَنَا رُقْيَةٌ نَرْقِي بِهَا مِنَ الْعَقْرَبِ وَاَنْتَ نَهَيْتَ عَنِ الرُّقٰى فَعَرَضُوْهَا عَلَيْهِ فَقَالَ مَا اَرٰى بِهَا بَاْسًا مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ اَنْ يَنْفَعَ اَخَاهُ فَلْيَنْفَعْهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے منتر پڑھنے اور پھونکنے سے منع فرمادیا تو عمرو ابن حزم کے خاندان کے لوگ (جو منتروں کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرتے تھے) حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہمارے پاس ایک منتر ہے جس کو ہم بچھو کے کاٹے پر پڑھا کرتے تھے اب آپ نے منتروں سے منع فرمادیا ہے اس کے بعد انہوں نے منتر کو پڑھ کر آنحضرت ﷺ کو سنایا (تاکہ آپ ﷺ اس منتر کو درست یا غلط ہونے کا فیصلہ فرمائیں) آنحضرت ﷺ نے (منتر کو سن کر) فرمایا کہ میں اس منتر میں کوئی حرج نہیں دیکھتا تم میں سے جو شخص اپنے بھائی کو نفع پہنچا سکے تو وہ ضرور نفع پہنچائے خواہ جھاڑ پھونک کے ذریعہ اور خواہ کسی اور طرح سے بشرطیکہ اس میں کوئی خلاف شرع بات نہ ہو۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

⑰ وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكِ نِ الْاَشْجَعِي قَالَ كُنَّا نَرْقِيْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ تَرٰى فِيْ ذٰلِكَ فَقَالَ اعْرِضُوْا عَلَيَّ رُقَاكُمْ لَا بَاْسَ بِالرُّقٰى مَالَمْ يَكُنْ فِيْهِ شِرْكٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عوف ابن مالک اشجعیؓ کہتے ہیں کہ ہم زمانہ جاہلیت میں جھاڑ پھونک کے ذریعہ منتر پڑھا کرتے تھے پھر (جب اسلام کا زمانہ آیا تو) ہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ (ﷺ) ان منتروں کے بارے میں کیا حکم فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا تم ان منتروں کو پڑھ کر مجھ کو سناؤ، جب تک ان میں شرک نہ ہو، میں کوئی حرج نہیں دیکھتا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "جب تک ان میں شرک نہ ہو" کا مطلب یہ ہے کہ جس منتر و افسوں میں جن و شیاطین کے اسماء اور ان سے استعانت نہ ہو اور ان کے مفہوم و معنی ایسے نہ ہوں جن سے کفر لازم آتا ہو تو ان کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی لئے علماء نے کہا ہے کہ ایسے الفاظ و کلمات پر مشتمل منتر و افسوں کے ذریعہ جھاڑ پھونک جائز نہیں ہے۔ جن کے مفہوم و معانی معلوم نہ ہوں البتہ بعض ایسے منتر جن کے الفاظ و کلمات صحیح روایت میں شارع سے منقول ہیں اور ان کے مفہوم و معانی معلوم نہیں ہیں ان کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنا جائز ہے۔

واضح رہے کہ جس طرح شیطان ازل ہی سے انسانی عداوت میں مبتلا ہے اسی طرح جنات بھی بالطبع انسان کے ساتھ عداوت رکھتے ہیں اور اس اعتبار سے جنات و شیاطین آپس میں ایک دوسرے کے دوست و رفیق ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی انسان پر جنات کا سایہ و اثر ہوتا ہے اور اس سایہ و اثر کو دور کرنے کے لئے ایسے منتر و افسوں پڑھے جاتے ہیں جن میں شیاطین کے نام اور ان سے استعانت ہوتی ہے تو جنات اس منتر و افسوں کو قبول کر کے اس انسان کا پیچھا چھوڑ دیتے ہیں اسی طرح بعض اوقات مار گزیدہ (سانپ کا ڈسا ہوا) شخص اصل میں جنات کے زیر اثر ہوتا ہے، بایں طور پر کہ کوئی شریر جن سانپ کی صورت اختیار کر کے کسی انسان کو ڈس لیتا ہے لیکن لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اس کو درحقیقت سانپ نے کاٹ کھایا ہے۔ جب ایسے شخص پر منتر پڑھے جاتے ہیں جن میں شیاطین کے نام ہوتے ہیں تو وہ زہر جو حقیقت میں جن کا اثر ہوتا ہے اس شخص کے بدن سے زائل ہو جاتا ہے اس طرح گویا جنات و شیاطین دونوں انسان کی گمراہی کا ذریعہ بنتے ہیں، چنانچہ علماء اُمت کا اس بات پر اجماع و اتفاق ہے کہ کتاب اللہ اور اسماء و صفات الٰہی کے بغیر افسوں و منتر پڑھنا اور جھاڑ پھونک کرنا جائز نہیں ہے، سب سے زیادہ مہتم بالشان "خود قرآن مجید" ہے کہ اس کا ہر ہر فقرہ اور ہر ہر لفظ کائنات انسانی کے لئے تاثیر و شفا اور خیر و برکت کا خزانہ ہے اور جن کا فائدہ یقینی ہے اور پھر اس میں بھی بعض سورتیں اور آیتیں جھاڑ پھونک کے لئے زیادہ فضیلت رکھتی ہیں جیسے سورہ فاتحہ، معوذتین آیت الکرسی اور وہ آیات کریمہ جو اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنے کے مفہوم پر مشتمل ہیں، اسی طرح وہ دعائیں اور عملیات بھی افضل ہیں جو احادیث صحیحہ میں آنحضرت ﷺ سے منقول و ثابت ہیں۔

سفر السعادۃ کے مصنف نے لکھا ہے کہ حدیث شریف میں منقول ہے کہ جب کوئی شخص اپنے کسی ایسے مال و اسباب وغیرہ یا بچے پر

نظر ڈالے جو اس کو اچھا لگتا ہو تو چاہئے کہ مَاشَآءَ اللّٰہُ لَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کہے (تاکہ اس مال یا بچے کو نظر نہ لگے) اسی طرح حضرت عثمان غنیؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک بہت ہی خوبصورت بچے کو دیکھا تو فرمایا کہ اس کی تھوڑی کے گڑھے میں ذرا سی سیاہی لگا دو، تاکہ اس کو نظر نہ لگے۔

آیات شفا

حضرت شیخ ابوالقاسم قشیریؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا، ایک مرتبہ میرا بچہ سخت بیمار ہوا یہاں تک کہ ہم سب اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے اسی دوران میں نے رسول کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا اور آپ ﷺ سے اپنے بچے کی بیماری کے بارے میں عرض کیا اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم آیات شفا سے بے خبر کیوں ہو؟ پھر جب میں بیدار ہوا اور قرآن کریم سے آیات شفا کی تلاش شروع کی یہاں تک کہ میں نے قرآن میں چھ جگہوں پر آیات شفا پائیں جو یہ ہیں۔

1. وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ۔
2. وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ۔
3. يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ۔
4. وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔
5. وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ۔
6. قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ۔

چنانچہ میں نے ان آیات کو لکھا اور پانی میں دھو کر بچے کو پلا دیا جس سے وہ اتنی جلدی اچھا ہو گیا کہ جیسے ان کے پیروں کا بند کھول دیا گیا ہے۔ قاضی بیضاویؒ نے بھی اپنی تفسیر میں ان آیات شفا کی طرف اشارہ کیا ہے، اسی طرح سعد حلبیؒ نے تفسیر بیضاوی کے حاشیہ میں ان آیات شفا کا تعین کرتے ہوئے ابوالقاسم قشیریؒ کی مذکورہ بالا حکایات کو نقل کیا ہے۔ لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھنے، ان آیات کو پڑھ کر مریض پر دم کرنے اور ان کو چینی کے برتن پر لکھ کر اور اس کو دھو کر مریض کو پلانے کا ذکر کیا ہے۔

نیز حضرت شیخ تاج الدین سبکیؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے بہت سے مشائخ کو دیکھا کہ وہ بیماریوں سے شفا حاصل کرنے کے لئے ان آیات کو لکھا کرتے تھے۔ رہی یہ بات کہ حصول شفا کے لئے ان آیات کے صرف مذکورہ بالا اجزاء کو لکھا جائے یا پوری آیتیں لکھی جائیں تو اس سلسلہ میں نقل کرنے والوں نے اکابر و مشائخ کا جو عمل دیکھا ہے وہ صرف ان ہی مذکورہ اجزاء کو لکھا جانا ہے۔

نظر بد کا لگنا ایک حقیقت ہے

⑱ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْعَيْنُ حَقٌّ فَلَوْ كَانَ شَيْءٌ سَابَقَ الْقَدَرَ سَبَقَتْهُ الْعَيْنُ وَاِذَا اسْتُغْسِلْتُمْ فَاغْسِلُوْا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا نظر بد حق ہے یعنی نظر لگنا ایک حقیقت ہے اگر تقدیر پر سبقت لے جانے والی کوئی چیز ہوتی تو وہ نظر ہی ہوتی اور جب تم سے دھونے کا مطالبہ کیا جائے تو تم دھو دو۔" (مسلم)

تشریح: "نظر حق ہے" کا مطلب یہ ہے کہ دیکھنے والے کی نظر میں کسی چیز کا کھب جانا اور اچھا لگنا خواہ وہ چیز جاندار یعنی انسان و حیوان ہو، یا غیر جاندار جیسے مال و اسباب ہو اور پھر اس چیز پر دیکھنے والے کی نظر کا اثر انداز ہو جانا ایک ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے جو تقدیر الٰہی سے متعلق ہے، چنانچہ حق تعالیٰ نے سحر و جادو کی طرح بعضوں کی نظر میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ جس چیز کو لگ جاتی ہے اس کی ہلاکت و تباہی اور

نقصان کا ذریعہ بن جاتی ہے۔
اگر تقدیر الٰہی پر سبقت لے جانے والی کوئی چیز ہوتی کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز کا مرکز اور مصدر و منبع، تقدیر الٰہی ہے کہ بڑی سے بڑی طاقت کا اثر و نفوذ بھی تقدیر الٰہی سے پابستہ ہے اور چھوٹے سے چھوٹے تک کی حرکت و سکون بھی تقدیر الٰہی کے بغیر ممکن نہیں، گویا کوئی چیز بھی تقدیر کے دائرہ سے باہر نکلنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ اگر بالفرض کوئی چیز ایسی طاقت رکھ سکتی کہ وہ تقدیر کے دائرہ کو توڑ کر نکل جائے تو وہ نظر بد ہوتی کہ وہ تقدیر کو بھی پلٹ دیتی اور اس پر غالب آجاتی۔ گویا یہ بات اشیاء میں تاثیر نظر کی شدت اور اس کے سرعت نفوذ کو زیادہ سے زیادہ کے ساتھ بیان کرنے کے لئے فرمائی گئی ہے۔
اور جب تم سے دھونے کا مطالبہ کیا جائے۔ "اس وقت عرب میں یہ دستور تھا کہ جس شخص کی نظر لگتی تھی اس کے ہاتھ پاؤں اور زیر ناف حصے کو دھو کر وہ پانی اس شخص پر ڈالتے تھے جس کو نظر لگتی تھی اور اس چیز کو شفا کا ذریعہ سمجھتے تھے اس کا سب سے ادنیٰ فائدہ یہ ہوتا تھا کہ اس ذریعہ سے مریض کا وہم دور ہو جاتا تھا۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے اس کی اجازت دی اور فرمایا کہ اگر تمہاری نظر کسی کو لگ جائے اور تم سے تمہارے اعضاء دھو کر مریض پر ڈالنے کا مطالبہ کیا جائے تو اس کو منظور کرلو اعضاء جسم کو اس مقصد کے لئے دھونے کا طریقہ دوسری فصل کے اخیر میں ذکر ہوگا"۔
واضح رہے کہ جمہور علماء اہل حق کا مسلک تو یہی ہے کہ جاندار خواہ وہ انسان ہو یا حیوان اور اموال میں جائیداد وغیرہ میں نظر کی تاثیر یعنی نظر لگنے سے نقصان پہنچنا ثابت ہے جب کہ بعض لوگ جیسے معتزلہ وغیرہ اس کے منکر ہیں جیسا کہ وہ اموال وغیرہ میں دوا اور صدقہ و خیرات کی تاثیر کے قائل نہیں ہیں ان لوگوں کا کہنا ہے کہ جس چیز کا وقوع پذیر ہونا مقدر میں لکھ دیا گیا ہو اس میں کسی اور چیز کا دخل نہیں ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ تقدیر کے لکھے کو کوئی چیز متغیر نہیں کرسکتی۔ لیکن وہ لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ تقدیر عالم اسباب کے ساتھ کوئی تضاد و منافات نہیں رکھتی، چنانچہ نظر کی تاثیر اور سببیت اس بناء پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں اس طرح کی خاصیت رکھ دی ہے کہ وہ ہلاکت و نقصان کا سبب بن جائے علاوہ ازیں علماء اہل حق کے مسلک کی دلیل یہ ارشاد گرامی ﷺ "العین الحق" ہے کہ جب شارع علیہ السلام نے اس حقیقت کو واضح کردیا ہے کہ نظر کی تاثیر برحق ہے تو اس کا اعتقاد رکھنا واجب اور ضروری ہے۔ رہی بات یہ کہ نظر لگنے کی کیفیت وصورت کیا ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے نظر زدہ کو نقصان و ضرر کیسے پہنچتا ہے تو اس سلسلے میں علماء نے مفصل بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ اس سلسلے میں بعض ایسے لوگوں نے جن کی نظر عام طور پر کسی نہ کسی کو لگتی رہتی ہے بیان کیا کہ جب ہمیں کوئی چیز اچھی لگتی ہے اور ہم اس پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری آنکھوں سے حرارت نکل رہی ہو۔ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ نظر لگانے والے کی آنکھ سے ایک خاص قسم کی حرارت سمیہ نکلتی ہے جو ہوا میں مخلوط ہو جاتی ہے اور وہ ہوا پھر نظر زدہ تک پہنچتی ہے تو اس کے نقصان و ہلاکت کا باعث بن جاتی ہے جیسا کہ بعض قدیم محققین کے مطابق اس سانپ کی زہر کی کیفیت ہوتی ہے جو محض اپنی نظر کے ذریعہ زہر کو منتقل کرتا ہے کہ اس کی نظر جس پر بھی پڑ جاتی ہے اس تک اس کا اثر پہنچ جاتا ہے اور وہ ہلاک ہو جاتا ہے حاصل یہ کہ دکھائی نہ دینے والی کوئی شئے نظر لگانے والے کی نظر سے تیر کی طرح روانہ ہوتی ہے اور اگر کوئی ایسی چیز درمیان میں نہ ہو جو اس شے کو روک دے تو وہ نظر زدہ تک پہنچتی ہے اور اس کو نقصان و ہلاکت میں ڈال دیتی ہے اور اگر روکنے والی کوئی چیز درمیان میں ہوتی ہے جیسے حرز و تعویذ اور دوا وغیرہ تو وہ شئے نظر زدہ تک نہیں پہنچتی اور اس میں اثر و نفوذ نہیں کرتی بلکہ اگر وہ حرز و تعویذ قوی و مضبوط قسم کا ہوتا ہے تو وہ شئے نظر لگانے والے ہی کی طرف پلٹ آتی ہے جیسا کہ اگر مقابل کے پاس سخت و مضبوط سپر ہوتا ہے تو تیر مارنے والے کا تیر سپر سے ٹکرا کر الٹا مارنے والے کو آکر لگتا ہے، چنانچہ حق تعالیٰ نے جس طرح بعض لوگوں کی نظر میں مذکورہ خاصیت و تاثیر پیدا کی ہے اسی طرح نفوس کاملہ یعنی اہل اللہ اور کاملین کو بھی اس نظر بد کے دفعیہ کی قوت اور اس میں تصرف کی طاقت عطا فرما دی ہے تاکہ وہ عوام کو دعا و تعویذ کے ذریعہ نظر بد کے اثرات سے محفوظ رکھنے میں مدد دیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

حق تعالیٰ نے ہر مرض کا علاج پیدا کیا ہے

(۱۹) عَنْ اُسَامَةَ بْنِ شَرِيْكٍ قَالَ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) اَفَنَتَدَاوٰى قَالَ نَعَمْ يَا عِبَادَ اللّٰهِ تَدَاوَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَضَعْ دَاءً اِلَّا وَضَعَ لَهٗ شِفَاءً غَيْرَ دَاءٍ وَاحِدٍ الْهَرَمُ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد)

"حضرت اسامہؓ ابن شریک کہتے ہیں کہ بعض صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا ہم بیماری میں دوا وعلاج کریں؟ آپ نے فرمایا ہاں اے اللہ کے بندو دوا وعلاج کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی بیماری پیدا نہیں کی ہے جس کی شفا نہ رکھی ہو، علاوہ ایک بیماری کے اور وہ بڑھاپا ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: اے اللہ کے بندو آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان الفاظ کے مخاطب کر کے گویا اس طرف اشارہ کیا ہے کہ علاج معالجہ کرنا اور بیماری کو دور کرنے کے ذرائع اختیار کرنا عبودیت وتوکل کے منافی نہیں ہے بشرطیکہ محض علاج پر ہی اعتماد بھروسہ نہ کیا جائے بلکہ دوا علاج کو شفا کا صرف ایک ضروری سبب وذریعہ سمجھو اور شافی حقیقی اللہ تعالیٰ ہی کو جانا جائے۔

مریض کو زبردستی نہ کھلاؤ پلاؤ

(۲۰) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُكْرِهُوْا مَرْضٰكُمْ عَلَى الطَّعَامِ فَاِنَّ اللّٰهَ يُطْعِمُهُمْ وَيَسْقِيْهِمْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اپنے مریضوں کو زبردستی نہ کھلاؤ کیونکہ ان کو اللہ تعالیٰ کھلاتا پلاتا ہے۔" ترمذی، ابن ماجہ اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر مریض کسی چیز کے کھانے پینے پر راضی نہ ہو تو اس کو وہ چیز زبردستی نہ کھلاؤ پلاؤ اور وہ چیز خواہ از قسم طعام ہو یا از قسم دوا۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی ہی ذات ہے جو جسم انسان کو طاقت بخشتی ہے اور اصل میں اس کی مدد کھانے پینے جیسی چیزوں کے فائدے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے گویا کسی بھی جاندار کا زندہ رہنا اور اس کو قوت وطاقت کا حاصل ہونا کھانے پینے پر منحصر نہیں ہے بلکہ قدرت الٰہی پر موقوف ہے۔ لہٰذا نفس کے کسی چیز میں مبتلا ومشغول ہونے کی وجہ سے اگر طبیعت کھانے پینے پر آمادہ نہ ہو تو کھانے پینے کے معاملہ میں زبردستی نہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ طبیعت وخواہش کے علی الرغم کھانا پینا فائدہ مند ہونے کی بجائے نقصان دہ ہو جاتا ہے اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جسم وجان کی بقا کے لئے نظام قدرت وعادت انسانی کے تحت کوئی نہ کوئی ظاہری سبب ذریعہ ہونا چاہئے تو اس مقصد کے لئے وہ رطوبت بدن کافی ہوتی ہے جس کو فقدان غذا کی صورت میں حرارت عزیزی تحلیل کر کے بقاء جسم وجان کا ذریعہ بنا دیتی ہے۔

سرخ بادہ کا علاج

(۲۱) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَوٰى اَسْعَدَ بْنَ زُرَارَةَ مِنَ الشَّوْكَةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سعدؓ ابن زرارہ کے جسم پر سرخ بادہ (کی بیماری کے علاج) کے لئے داغ دیا۔ اور اس

روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "داغ دیا" یعنی آپ ﷺ نے خود اپنے دست مبارک سے داغا یا کسی کو داغنے کا حکم دیا۔ یہ بات واضح نہیں ہو سکی ہے کہ مذکورہ بیماری کے علاج کے لئے حضرت سعدؓ کے جسم کے کس حصے پر داغ دیا گیا تھا۔

ذات الجنب کا علاج

(۲۲) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ قَالَ أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ نَتَدَاوٰى مِنْ ذَاتِ الْجَنْبِ بِالْقُسْطِ الْبَحْرِيِّ وَالزَّيْتِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت زید ابن ارقمؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں ہدایت فرمائی کہ ہم ذات الجنب کی بیماری میں قسط بحری اور زیتون کے تیل کے ذریعہ علاج کریں۔" (ترمذیؒ)

(۲۳) وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْعَتُ الزَّيْتَ وَالْوَرْسَ مِنْ ذَاتِ الْجَنْبِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت زید ابن ارقمؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ ذات الجنب کے علاج کے لئے زیتون کے تیل اور ورس کی تعریف کیا کرتے تھے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "ورس" ایک قسم کی گھاس کو کہتے ہیں جس کا رنگ زرد مائل بہ سرخ، ہوتا ہے اور اس کے ریشے زعفران کی مانند ہوتے ہیں۔ اور زعفران ہی کی طرح یہ گھاس بھی رنگنے کے کام میں آتی ہے ویسے اطباء نے مختلف بیماریوں کے لئے اس کے بہت فوائد بیان کئے ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذات الجنب کے علاج کے لئے ان دونوں چیزوں کا استعمال بطریق لدود یعنی منہ میں ٹپکانے کے ذریعہ ہو گا۔"

ثناء بہترین دوا ہے

(۲۴) وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَأَلَهَا بِمَا تَسْتَمْشِيْنَ قَالَتْ بِالشُّبْرُمِ قَالَ حَارٌّ حَارٌّ قَالَتْ ثُمَّ اسْتَمْشَيْتُ بِالسَّنَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ أَنَّ شَيْئًا كَانَ فِيْهِ الشِّفَاءُ مِنَ الْمَوْتِ لَكَانَ فِي السَّنَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت اسماء بنت عمیسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم کس چیز سے جلاب (مسہل) لیتی ہو، انہوں نے کہا شبرم سے آپ ﷺ نے فرمایا۔ شبرم تو گرم ہے گرم۔ اسماء کہتی ہیں کہ پھر میں نے ثناء سے جلاب لیا اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر کسی چیز میں موت سے شفا ہوتی، یعنی موت کا علاج کسی دوا میں ہوتا تو وہ ثناء ہوتی۔ (ترمذی، ابن ماجہ) اور ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: "شبرم" ایک گھاس ہے جو دست آور ہے، بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ "شبرم" سے اس گھاس کے دانے مراد ہیں جو مسور کے برابر ہوتے ہیں اور اسہال کے لئے ان دانوں کو پانی میں جوش دے کر اس کو پیا جاتا ہے دونوں لفظ "حار" حار کے زبر اور راہ کی تشدید کے ساتھ ہیں، جیسا کہ مشکوۃ کے اکثر صحیح نسخوں اور اصل کتاب یعنی ترمذی وابن ماجہؒ میں نقل کیا گیا ہے، لیکن بعض حضرات نے دوسرے لفظ کو جیم کے ساتھ یعنی (جار) کو پہلے لفظ (حار) کا "تابع" "مہمل" قرار دیا ہے، جیسا کہ جب کسی لفظ کو زیادہ اہمیت وتاکید کے ساتھ بیان کرنا ہوتا ہے تو اس اصل لفظ کے بعد اس کے مناسب وہم وزن کوئی دوسرا مہمل لفظ بول دیتے ہیں۔ جیسے پادر وادر اور پانی وانی وغیرہ، بہرصورت آنحضرت ﷺ نے اس جملہ کے ذریعہ گویا یہ واضح فرمایا کہ شبرم نہایت گرم ہے اور دست لانے کے لئے اس کو استعمال کرنا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ اطباء لکھتے ہیں کہ شبرم حار درجہ چار ہے اور چونکہ اس کا استعمال بہت زیادہ دست لاتا ہے اس لئے

اس میں احتیاط شرط ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ کے ذریعہ سناء کی فضیلت و تعریف کو بطور مبالغہ بیان فرمایا گیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ سناء اور خاص طور پر سناء مکی (جو زیادہ بہتر ہے) بڑی عجیب و غریب دوا ہے جس کے فوائد مشہور ہیں اور اطباء اس کو اکثر امراض میں شفا کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس میں کسی ضرر و نقصان کا خوف نہیں ہوتا یہ باعتدال ہے اور حار درجہ ایک ہے، صفرا، سودا اور بلغم کے اسہال و تنقیہ کے لئے بہترین چیز ہے اور جرم قلب کو بہت زیادہ طاقت و قوت بخشتی ہے، نیز اس کی جملہ خاصیتوں میں سے ایک بڑی خاصیت یہ بھی ہے کہ وا سواس سوداوی کے لئے فائدہ مند ہے۔

حرام چیزوں کے ذریعہ علاج معالجہ نہ کرو

(۲۵) وَعَنْ اَبِی دَرْدَآءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ الدَّآءَ وَالدَّوَآءَ وَجَعَلَ لِکُلِّ دَاءٍ دَوَاءً فَتَدَاوَوْا وَلَا تَدَاوَوْا بِحَرَامٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابو درداؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے بیماری بھی اتاری ہے اور دوا بھی، اور ہر بیماری کے لئے دوا بھی، اور ہر بیماری کے لئے دوا مقرر کی ہے لہٰذا تم دوا سے بیماری کا علاج کرو، لیکن حرام چیز سے دوا علاج نہ کرو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "حرام چیز سے مراد وہ شراب، خنزیر اور ان جیسی وہ چیزیں ہیں جن کو حرام قرار دیا گیا ہے۔" علاج معالجہ کے طور پر مطلق کسی بھی حرام چیز اور خاص طور پر شراب کو اختیار کرنے کی حرمت و کراہت کے سلسلے میں متعدد احادیث منقول ہیں۔ جن سے حرام چیزوں کے ذریعہ علاج معالجہ کرنے کی ممانعت ہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ایسی چیزوں کا استعمال قطعاً لا حاصل رہے گا۔ کیونکہ ان کے ذریعہ حصول شفا ممکن نہیں۔ چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری شفا ان چیزوں میں نہیں رکھی جن کو تمہارے لئے حرام قرار دیا گیا ہے، اسی طرح منقول ہے کہ ایک صحابیؓ حضرت طارق جعفیؓ نے نبی کریم ﷺ سے شراب بنانے کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور جب انہوں نے کہا کہ میں دوا کے طور پر شراب استعمال کرنے کے لئے بناتا ہوں تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا، شراب دوا نہیں ہے بلکہ وہ درد و مرض ہے نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ من تداوی بالخمر فلا شفا اللہ ۔ یعنی جو شخص شراب کے ذریعہ علاج معالجہ کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو شفا نہیں دے گا۔ تاہم بعض فقہی روایت میں یہ اجازت دی گئی ہے کہ اگر کسی مرض کے بارے میں قابل اعتماد اور حاذق اطباء معالجین کا اس پر اتفاق ہو کہ اس کا علاج شراب کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے تو اس مرض میں شراب کے بطور دوا استعمال کرنا جائز ہے، لیکن یہ بات بجائے خود تقریباً ناممکن ہوگی کیونکہ اول تو قابل اعتماد اور حاذق اطباء کا پایا جانا اور دوسرے ان اطباء کا اس بات پر اتفاق کر لینا کہ اس مرض کا علاج صرف شراب پر منحصر ہے کچھ آسان نہیں ہے۔

جس دوا کو طبیعت قبول نہ کرے وہ زیادہ کارگر نہیں ہوتی

(۲۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الدَّوَآءِ الْخَبِیْثِ۔

(رواہ احمد و ابوداؤد و الترمذی و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے خبیث دوا سے منع فرمایا۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ایسی دوا استعمال کرنے سے منع فرمایا جو نجس و ناپاک یا حرام ہو یا "خبیث" سے وہ دوا مراد ہے جو بدمزہ اور بدبودار ہو کہ جس کے استعمال سے طبیعت نفرت کرتی ہے، چنانچہ ایسی دوا بھی بہتر نہیں سمجھی جاتی کیونکہ جس دوا کو طبیعت قبول نہیں کرتی اس کی افادیت کم ہو جاتی ہے اس اعتبار سے حدیث میں مذکورہ نفرت کا تعلق نہی تنزیہی سے ہوگا۔

سر اور پاؤں کے درد کا علاج

(۲۷) وَعَنْ سَلْمٰی خَادِمَةِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ مَاکَانَ اَحَدٌ یَشْتَکِیْ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَجَعًا فِیْ رَاْسِهٖ اِلَّا قَالَ احْتَجِمْ وَلَا وَجَعًا فِیْ رِجْلَیْهِ اِلَّا قَالَ اخْتَضِبْهُمَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سلمیٰؓ جو نبی کریم ﷺ کی خادمہ تھیں کہتی ہیں کہ جب ہم میں سے کوئی شخص نبی کریم ﷺ سے سر کی (ایسی) بیماری کی شکایت کرتا (جس کا تعلق خون کی زیادتی و دباؤ سے ہوتا) تو آپ ﷺ فرماتے کھچری ہوئی سینگی کھچواؤ، اور جو شخص پاؤں کے درد کی شکایت کرتا یعنی ایسا درد جو گرمی حرارت کی بنا پر ہوتا تو آپ ﷺ فرماتے کہ پیروں پر مہندی لگالو!۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: ویسے تو یہ حدیث مطلق ہے کہ اس کے حکم میں مرد عورت، دونوں شامل ہیں، لیکن بہتر یہ ہے کہ مرد صرف تلووں پر مہندی لگا لینے پر اکتفا کرے۔ اور ناخونوں پر لگانے سے اجتناب کرے تاکہ عورتوں کی مشابہت سے حتی الامکان احتراز ہونا چاہئے۔"

زخم کا علاج

(۲۸) وَعَنْهَا قَالَتْ مَاکَانَ یَکُوْنُ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَرْحَةٌ وَلَا نَکْبَةٌ اِلَّا اَمَرَنِیْ اَنْ اَضَعَ عَلَیْهَا الْحِنَاءَ۔ (رواہ ترمذی)

"اور حضرت سلمیٰؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے جسم کے کسی حصہ پر) جب بھی کوئی زخم آجاتا (خواہ وہ تلوار، چھری، یا اور کسی ایسی چیز کے کٹ جانے کی صورت میں ہوتا) یا پتھر اور کانٹے سے آپ ﷺ زخمی ہو جاتے تو مجھ کو حکم دیتے کہ میں اس زخم پر مہندی (کی چھٹس) رکھ دوں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مہندی کی تاثیر چونکہ سرد ہے اور جلدی امراض کو نافع ہے اس لئے اس کی برودت زخم کی گرمی اور سوزش کو ختم کر دیتی ہے۔

سینگی کھنچوانے کا ذکر

(۲۹) وَعَنْ اَبِیْ کَبْشَةَ الْاَنْمَارِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَحْتَجِمُ عَلٰی هَامَتِهٖ وَبَیْنَ کَتِفَیْهِ وَهُوَ یَقُوْلُ مَنْ اَهْرَاقَ مِنْ هٰذِهِ الدِّمَاءِ فَلَا یَضُرُّهٗ اَنْ لَّا یَتَدَاوٰی بِشَیْءٍ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت کبشہ انصاریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اپنے سر مبارک پر اور اپنے دونوں مونڈھوں کے درمیان بھری ہوئی سینگیاں کھنچواتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص ان خونوں میں سے کچھ نکال دیا کرے اور پھر وہ کسی بیماری کا علاج نہ کرے تو اس کو کوئی نقصان وضرر نہیں پہنچے گا۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: احتمال ہے آپ ﷺ کبھی تو سر مبارک پر سینگی کھنچواتے ہوں گے اور کبھی دونوں مونڈھوں کے درمیان۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ ایک ساتھ دونوں جگہ سینگی کھنچواتے ہوں۔

ان خونوں میں سے کچھ نکال دیا کرے۔ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "خون" سے مراد مذکورہ دونوں عضو کا خون ہے لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ مطلق فاسد خون مراد ہو، یعنی جسم کے جس حصہ میں بھی فاسد خون جمع ہو گیا ہو اس کو نکلوا دینا چاہئے۔

(۳۰) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ احْتَجَمَ عَلٰی وَرِکِهٖ مِنْ وَثْءٍ کَانَ بِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے کولہے پر بھری ہوئی سینگی کھنچوائی کیونکہ آپ ﷺ کے پائے مبارک پر موچ آئی تھی!۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "وَثَاء" واؤ کے زبر اور ثاء کے جزم کے ساتھ، اس درد اور چوٹ کو کہتے ہیں جو کسی عضو کو اس ہڈی ٹوٹے بغیر پہنچے جس کو ہماری زبان میں "موچ" کہا جاتا ہے۔

(۳۱) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ حَدَّثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ لَيْلَةٍ اُسْرِيَ بِهٖ اَنَّهٗ لَمْ يَمُرَّ عَلٰى مَلَاءٍ مِنَ الْمَلٰئِكَةِ اِلَّا اَمَرُوْهُ مُرْ اُمَّتَكَ بِالْحِجَامَةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے شب معراج کے واقعات بتاتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ آپ ﷺ ملائکہ کی جس جماعت کے پاس سے گزرے اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا کہ آپ اپنی امت کو پچھنے لگوانے کا حکم دیں۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: پچھنے کی یہ اہمیت و فضیلت اس بنا پر ہے کہ فساد خون کی وجہ سے بہت زیادہ امراض پیدا ہوتے ہیں جن کو امراض دموی کہتے ہیں، امراض دموی کا سب سے بڑا علاج خون نکلوانا ہے، نیز خون نکلوانے کے دوسرے طریقوں کی بہ نسبت پچھنے کو زیادہ پسند اس لئے بھی کیا گیا ہے کہ وہ خون کو نواحی جلد سے خارج کرتا ہے چنانچہ تمام اطباء اس کے قائل ہیں کہ گرم آب و ہوا میں رہنے والوں کو فصد کے مقابلہ پر پچھنے لگوانا زیادہ مفید رہتا ہے کیونکہ ان لوگوں کا خون رقیق اور پختہ ہوتا ہے جو سطح بدن پر آجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس خون کو پچھنے ہی کے ذریعہ سے نکالا جاسکتا ہے۔ نہ کہ فصد کے ذریعہ۔

"امت" سے مراد اہل عرب ہیں جو آنحضرت کے زمانہ میں موجود تھے یا "امت" سے آنحضرت ﷺ کی قوم و وطن کے لوگ مراد ہو سکتے ہیں، نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ "یہاں" "امت" کا عام مفہوم مراد ہے یعنی آنحضرت ﷺ کی پوری امت میں سے ہر وہ شخص مراد ہے جس کو خون نکلوانے کی ضرورت لاحق ہو۔

مینڈک کی دوا بنانے کی ممانعت

(۳۲) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عُثْمَانَ اَنَّ طَبِيْبًا سَاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ضِفْدَعٍ يَجْعَلُهَا فِيْ دَوَاءٍ فَنَهَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عثمانؓ سے روایت ہے کہ ایک طبیب نے نبی کریم ﷺ سے مینڈک کو دوا میں شامل کرنے کے بارے میں پوچھا کہ یہ درست ہے یا نہیں؟ تو نبی کریم ﷺ نے اس کو مینڈک کے مارنے سے منع فرمایا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "مینڈک کے مارنے سے منع فرمایا" کا مطلب یہ ہے کہ مینڈک کو مار ڈالنے اور پھر اس کو دوا میں شامل کرنے سے منع فرمایا اس وضاحت سے سوال و جواب کے درمیان مطابقت ہو جاتی ہے اس بات کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو جامع میں منقول ہے کہ نهى عن القتل الصفدع للدواء یعنی آنحضرت ﷺ نے دوا بنانے کے لئے مینڈک مارنے سے منع فرمایا۔"

قاضیؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا مینڈک کے مارنے سے منع کرنا شاید اس بنا پر تھا کہ آپ ﷺ نے مینڈک کی دوا بنانے کو مناسب نہیں سمجھا اور یہ مناسب نہ سمجھنا یا تو مینڈک کے "نجس و حرام ہونے کی وجہ سے تھا کہ نجس و حرام چیزوں کے ذریعہ علاج کرنا جائز نہیں ہے یا اس لئے مناسب نہیں سمجھا کہ مینڈک سے طبیعت کراہت و تنفر محسوس کرتی ہے اور جس چیز سے طبیعت نفرت کرے اس کو دوا کے طور پر استعمال کرنا لاحاصل ہے اور یہ کہ طبیب نے مینڈک میں جو فوائد سمجھے ہوں گے اس کے مقابلہ پر آنحضرت ﷺ نے اس کی مضرت زیادہ دیکھی ہوگی اس لئے آپ نے اس کی دوا بنانے کو مناسب نہیں سمجھا۔

آنحضرت ﷺ کے پچھنے لگوانے کا ذکر

(۳۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْتَجِمُ فِي الْاَخْدَعَيْنِ وَالْكَاهِلِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَزَادَ

التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ وَکَانَ یَحْتَجِمُ لِسَبْعَ عَشْرَۃَ وَتِسْعَ عَشْرَۃَ وَاِحْدٰی وَعِشْرِیْنَ۔

"اور حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ گردن کی دونوں رگوں میں مونڈھوں کے درمیان بھری ہوئی سینگی کھنچواتے تھے (ابوداؤدؒ) ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے یہ عبارت بھی نقل کی ہے کہ اور آنحضرت ﷺ سترھویں انیسوی، اور اکیسویں تاریخ کو سینگی کھنچواتے تھے۔"

پچھنے لگوانے کے دن

(۳۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَسْتَحِبُ الحِجَامَۃَ لِسَبْعِ عَشْرَۃَ وَتِسْعَ عَشْرَۃَ وَاِحْدٰی وَعِشْرِیْنَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سترھویں، انیسویں اور اکیسویں تاریخ کو سینگی کھنچوانا ناپسند فرماتے تھے۔" (شرح السنۃ)

(۳۵) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ احْتَجَمَ لِسَبْعَ عَشْرَۃَ وَتِسْعَ عَشْرَۃَ وَاِحْدٰی وَعِشْرِیْنَ کَانَ شِفَآءً مِنْ کُلِّ دَآءٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص سترھویں، انیسویں، اور اکیسویں تاریخ کو سینگی کھنچوائے گا اس کو ہر بیماری سے شفا ہوتی ہے؟۔" (ابوداؤدؒ)

(۳۶) وَعَنْ کَبْشَۃَ بِنْتِ اَبِیْ بَکْرَۃَ اَنَّ اَبَاھَا کَانَ یَنْھٰی اَھْلَہٗ عَنِ الْحِجَامَۃِ یَوْمَ الثُّلٰثَاءِ وَیَزْعَمُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ یَوْمَ الثُّلٰثَاءِ یَوْمُ الدَّمِ وَفِیْہِ سَاعَۃٌ لَا یَرْقَأُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت کبشہؓ بنت ابی بکرہ سے روایت ہے کہ ان کے باپ اپنے گھروالوں کو منگل کے دن سینگی لگوانے سے منع کرتے تھے اور رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے تھے کہ منگل کا دن خون کے غلبہ کا دن ہے اور اس دن ایسی گھڑی آتی ہے خون بند نہیں ہوتا (لہٰذا اس دن خون نکلوانے کی صورت میں یہ ہوسکتا ہے کہ وہی گھڑی پڑجائے اور خون رکنے کا نام نہ لے جس سے ہلاکت بھی واقع ہوسکتی ہے)۔" (ابوداؤدؒ)

(۳۷) وَعَنِ الزُّھْرِیِّ مُرْسَلًا عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنِ احْتَجَمَ یَوْمَ الْاَرْبِعَاءِ اَوْیَوْمَ السَّبْتِ فَاَصَابَہٗ وَضح فَلَا یَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَہٗ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ وَقَدْ اُسْنِدَ وَلَا یَصِحُّ۔

"اور حضرت زہری تابعیؒ نبی کریم ﷺ سے بطریق ارسال نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا، جو شخص ہفتہ کے دن یا بدھ کے دن سینگی کھنچوائے اور پھر اس کو کوڑھ کی بیماری لگ جائے تو وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے (ابوداؤدؒ، احمدؒ) اور ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ حدیث (ایک روایت میں) مسند بیان کی گئی ہے، (یعنی وہ روایت راویوں کے اعتبار سے متصل ہے اور وہ اسناد صحیح نہیں ہے)۔"

تشریح: اگرچہ اس دوسری روایت مسند کو صحیح نہیں کہا گیا ہے لیکن اس کے ذریعہ اس مرسل حدیث کو تقویت و تائید حاصل ہوتی ہے اور ویسے بھی مرسل حدیث حنفیہ اور دیگر اصحاب جرح تعدیل کے نزدیک حجت (یعنی قابل عمل) ہوتی ہے۔

(۳۸) وَعَنْہُ مُرْسَلًا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنِ احْتَجَمَ اَوِاطَّلٰی یَوْمَ السَّبْتِ اَوِالْاَرْبِعَاءِ فَلَا یَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَہٗ فِی الْوَضَحِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت زہریؒ بطریق ارسال کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص ہفتہ یا بدھ کے دن بھری ہوئی سینگی کھنچوائے یا (اپنے بدن کے کسی عضو پر) لیپ کرے تو وہ کوڑھ مبتلا ہوجانے کی صورت میں اپنے آپ کو ملامت کرے۔" (شرح السنۃ)

ٹوٹکہ کی ممانعت

(۳۹) وَعَنْ زَیْنَبَ امْرَاءَۃِ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰہِ رَاٰی فِیْ عُنُقِیْ خَیْطًا فَقَالَ مَاھٰذَا فَقُلْتُ خَیْطٌ رُقِیَ لِیْ فِیْہِ قَالَتْ

فَاَخَذَهٗ فَقَطَعَهٗ ثُمَّ قَالَ اَنْتُمْ اٰلَ عَبْدِ اللّٰهِ لَاَغْنِيَاءُ عَنِ الشِّرْكِ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ الرُّقٰى وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَةَ شِرْكٌ فَقُلْتُ لِمَ تَقُوْلُ هٰكَذَا لَقَدْ كَانَتْ عَيْنِيْ تَقْذِفُ وَكُنْتُ اَخْتَلِفُ اِلٰى فُلَانٍ الْيَهُوْدِيِّ فَاِذَا رَقَاهَا سَكَنَتْ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ اِنَّمَا ذٰلِكَ عَمَلُ الشَّيْطَانِ كَانَ يَنْخَسُهَا بِيَدِهٖ فَاِذَا رُقِيَ كَفَّ عَنْهَا اِنَّمَا كَانَ يَكْفِيْكِ اَنْ تَقُوْلِيْ كَمَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَذْهِبِ الْبَاسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِيْ لَاشِفَاءَ اِلَّا شِفَاءُكَ شِفَاءً لَّا يُغَادِرُ سَقَمًا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی بیوی زینبؓ کہتی ہیں کہ ایک دن حضرت عبداللہ نے میری گردن میں تاگا پڑا ہوا دیکھا تو پوچھا یہ کیا ہے؟ میں نے کہا یہ تاگا ہے جس پر میرے لئے منتر پڑھا گیا ہے (یعنی جو کچھ منتروں کے ذریعہ اس تاگے کا گنڈہ بنوا کر میں نے اپنے گلے میں ڈال لیا ہے)۔ زینب کہتی ہیں کہ حضرت عبداللہ نے (یہ سن کر) اس تاگے کو (میری گردن سے) نکال لیا اور اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور پھر کہا کہ اے عبداللہؓ کے گھر والو، تم شرک سے بے پرواہو، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بلاشبہ منتر منکے، اور ٹوٹکے شرک ہیں۔ میں نے کہا آپ یہ بات کس طرح کہہ رہے ہیں (یعنی آپ گویا منتر سے اجتناب کرنے اور توکل کو اختیار کرنے کی تلقین کر رہے ہیں جب کہ مجھ کو منتر سے بہت فائدہ ہوا ہے)۔ چنانچہ میری آنکھ (درد کے سبب) نکلی پڑی تھی اور میں فلاں یہودی کے ہاں آیا جایا کرتی تھی اس یہودی نے جب منتر پڑھ کر آنکھ کو دم کیا تو آنکھ کو آرام مل گیا۔ حضرت عبداللہ نے کہا کہ (یہ تمہاری نادانی و غفلت ہے) اور وہ درد اس کا اچھا ہو جانا منتر کے سبب سے نہیں تھا بلکہ (حقیقت میں) وہ شیطان کا کام تھا، شیطان تمہاری آنکھ کو کونچتا تھا (جس سے تمہیں درد محسوس ہوتا تھا) پھر جب منتر پڑھا گیا تو (چونکہ وہ ایک شیطان کا کام تھا اس لئے) شیطان نے کونچنا چھوڑ دیا۔ تمہارے لئے وہ دعا بالکل کافی تھی جو رسول کریم ﷺ پڑھا کرتے تھے کہ۔ اَذْهِبِ الْبَاسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِيْ لَاشِفَاءَ اِلَّا شِفَاءُكَ شِفَاءً لَّا يُغَادِرُ سَقَمًا (یعنی اے لوگوں کے پروردگار! تو ہماری بیماری کو کھو دے اور شفا عطا فرما (کیونکہ) تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری شفا کے علاوہ شفا نہیں ہے، ایسی شفا جو بیماری کو باقی نہ چھوڑے!۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "تم شرک سے بے پرواہ ہو" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان و اسلام کی دولت دے کر کفر شرک سے دور کر دیا ہے، لہٰذا تمہیں اس چیز کی حاجت نہیں ہے کہ تم اپنی بیماریوں اور مضرتوں کو ختم کرنے کے لئے ایسے افعال و ذرائع اختیار کرو جو شرک میں مبتلا کر دیتے ہیں اور شرک کو متضمن ہیں۔ حضرت عبداللہ نے یہ بات اس بناء پر فرمائی کہ اس زمانہ میں جھاڑ پھونک اور تعویز گنڈے کے لئے جو منتر و افسوں کئے جاتے تھے وہ مشرکانہ مضامین پر مشتمل ہوتے تھے۔ ملا علی قاریؒ نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ یہاں شرک سے مراد یہ اعتقاد رکھنا ہے کہ یہ عمل یعنی جھاڑ پھونک وغیرہ بیماری و مضرت کو دفع کرنے کا ایک قوی سبب ہے اور خود اس میں تاثیری طاقت ہے اس صورت میں یہ شرک خفی ہوگا اور یہ اعتقاد ہو کہ یہ چیز بذات خود مؤثر حقیقی ہے تو یہ شرک جلی کہلائے گا۔

جس منتر کو شرک کہا گیا ہے اس سے وہ منتر اور جھاڑ پھونک مراد ہے جس میں بتوں، دیویوں، اور شیاطین کے نام لئے گئے ہوں جو کفریہ کلمات اور ایسی چیزوں پر مشتمل ہو جس کو شریعت نے جائز قرار نہ دیا ہو، نیز اس حکم میں ایسے منتر و افسوں بھی داخل ہیں جن کے معنی معلوم نہ ہوں۔

"تمائم" تمیمہ کی جمع ہے، اور تمیمہ ان تعویذ کو کہتے ہیں جو گلے میں لٹکایا جاتا ہے۔ یہاں وہ تعویز مراد ہے جس میں اسماء الٰہی، قرآنی آیات اور منقول دعائیں نہ ہوں! اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ تمیمہ منکے کو کہتے ہیں یعنی عرب میں عورتیں چتکبرے مہروں کو جوڑ کر بچوں کے گلے میں ڈال دیتی تھیں اور یہ عقیدہ رکھتی تھیں اس کی وجہ سے بچوں کو نظر نہیں لگتی، اسی کو تمیمہ کہتے ہیں۔

"تِوَلَۃٌ" ایک قسم کے ٹوٹکے کو کہتے ہیں جو مرد و عورت کے درمیان محبت قائم کرنے کے لئے دھاگے یا کاغذ تعویذ کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔

"بلاشبہ منتر منکے" اور ٹوٹکے شرک ہیں۔ کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب عملیات اور کام وہ ہیں جو اہل شرک کرتے ہیں اور یہ چیزیں

شرک خفی یا شرک جلی کے ضمن میں آتی ہیں جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا۔

"بلکہ شیطان کا کام تھا"۔ یعنی تمہاری آنکھ میں جو درد تھا۔ وہ حقیقۃً درد نہیں تھا۔ بلکہ شیطان کی ان ایذا رسانیوں میں سے ایک ایذا رسانی تھی جس میں وہ انسان کو مبتلا کرتا رہتا ہے۔

"نشرہ" شیطان کا کام ہے

(۴۰) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ النُّشْرَةِ فَقَالَ هُوَ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے نشرہ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ وہ شیطانی کام ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "نَشْرَہ" ایک قسم کا سفلی عمل ہے جو آسیب کے دفعیہ کے لئے کیا جاتا ہے۔ اور قاموس میں ہے کہ نشرہ ایک رقیہ یعنی منتر ہے جس کے ذریعہ مجنون و مریض کا علاج کیا جاتا ہے۔ حاصل یہ کہ نشرہ کے لفظی معنی منتر یا تعویز کے ہیں، لہٰذا جس نشرہ کو شیطان کا کام فرمایا گیا ہے اس سے مراد وہ منتر ہوگا جو اسماء الٰہی، قرآن اور منقول دعاؤں پر مشتمل نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ وہ زمانہ جاہلیت کے ان عملیات میں سے ایک عمل تھا جو بتوں اور شیاطین کے اسماء اور ان سے اعانت پر مشتمل ہوتے تھے، یا اس منتر کے الفاظ عبرانی زبان کے ہوں گے کہ جن کے معنی معلوم نہ ہوں گے۔

لاپرواہ لوگوں کے کام

(۴۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا اُبَالِيْ مَا اَتَيْتُ اِنْ اَنَا شَرِبْتُ تِرْيَاقًا او تَعَلَّقْتُ تَمِيْمَةً اَوْ قُلْتُ الشِّعْرَ من قِبَلِ نَفْسِيْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میں ہر عمل سے لاپرواہ ہوں اگر میں تریاق پیوں یا گلے میں منکا ڈالوں اور یا میں اپنے دل سے اور اپنے قصد و ارادہ سے شعر لکھوں (یعنی اشعار بناؤں)۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر ان چیزوں میں سے کوئی بھی چیز مجھ سے سرزد ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میرا شمار ان لوگوں میں سے ہو جو ہر عمل سے لاپرواہ ہوتے ہیں یعنی وہ کسی بھی کام کو کرتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ آیا ان کو یہ کام کرنا چاہئے یا نہیں، نتیجۃً وہ نامشروع افعال و حرکات سے پرہیز نہیں کرتے۔ گویا اس ارشاد گرامی سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ان چیزوں کو اختیار کرنا اسی شخص کا کام ہو سکتا ہے۔ جو نامناسب چیزوں اور غیر مشروع اعمال کو اختیار کرنے کے غیر پابند اور لاپرواہ ہوتے ہیں۔

مذکورہ چیزوں کے استعمال کو آنحضرت ﷺ نے اس لئے مذموم سمجھا کہ تریاق میں تو سانپ کا گوشت اور شراب پڑتی تھی اور یہ چیزیں حرام ہیں اس سے معلوم ہوا کہ جس تریاق کے اجزاء ترکیبی حرام چیزوں پر مشتمل نہ ہوں اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اگرچہ بعض حضرات نے حدیث کے مطلق مفہوم پر عمل کرنے کے پیش نظر اس کے ترک کو بھی اولیٰ قرار دیا ہے، اسی طرح تمیمہ یعنی منکے اور گنڈے سے وہ چیزیں مراد ہیں جن کو زمانہ جاہلیت کے لوگ جھاڑ پھونک اور عملیات کے ضمن میں استعمال کرتے تھے، لہٰذا ایسے تعویز اور گنڈے وغیرہ جو اسماء الٰہی اور آیات قرآنی وغیرہ پر مشتمل ہوں وہ حکم سے خارج ہیں۔ بلکہ ان کا مستحب ہونا ثابت ہے اور ان کی برکت سے حصول مقصد کی ایک امید کی جا سکتی ہے جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے تو آپ ﷺ کے نزدیک اس کا مذموم ہونا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِيْ لَهٗ کی بناء پر تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ خود کوئی شعر نہیں کہتے تھے بلکہ حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کو شعر گوئی سے پاک و منزہ رکھا تھا، اسی لئے آپ ﷺ شعر کہنے پر قادر ہی نہیں تھے۔ اور یہ بات ہے کہ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے بے ساختہ اور بلاقصد و ارادہ جو موزوں و مقفیٰ جملے ادا ہوتے تھے اور آپ ﷺ کا کلام جس فصاحت و بلاغت سے بھرپور ہوتا تھا وہ بذات

خود وصف شعر گوئی سے کہیں اعلیٰ معیار کی چیز ہوتی تھی، مگر ظاہر ہے کہ یہ چیز نہ تو شعر کہنے کے زمرے میں آتی ہے اور نہ یہ مذموم ہے اور ویسے بھی اہل فن و اصطلاح اس پر بے ساختہ اپنے کلام میں دوسروں کے اشعار استعمال کرنے کے باوصف آپ ﷺ کا خود شعر کہنے پر قادر نہ ہونا آپ ﷺ کے علاوہ دوسرے لوگوں کے حق میں اشعار اور شعر گوئی کی حیثیت دوسرے اصناف سخن و کلام کی طرح ہے کہ اچھے مضامین کو اشعار کا جامہ پہنانا اور صالح و پاکیزہ خیالات کو شعر گوئی کے ذریعہ ظاہر کرنا اچھا ہے اور برے مضامین اور گندے خیالات پر مشتمل شعر گوئی کرنا برا ہے تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ اس صورت میں بھی اپنے باطن کو شعر گوئی ہی کی طرف متوجہ کر لینا، اسی میں عمر کو ضائع کرنا اور اس میں اتنا زیادہ انہماک و تفکر اختیار کرنا کہ ان دینی امور میں رکاوٹ اور نقصان پیدا ہو جو ضروری اور واجب ہیں یقیناً مذموم ہوگا۔

ابن ملکؒ نے اس حدیث کی وضاحت میں کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ شعر کہنا، تریاق پینا اور گلے میں تعویذ و گنڈے لٹکانا میرے لئے حرام ہے البتہ اُمت کے حق میں نہ تو شعر گوئی حرام ہے اور نہ گلے میں تعویذ و گنڈے لٹکانا حرام ہے، بشرطیکہ اس شعر گوئی کے ذریعہ کسی مسلمان کی ہجو نہ کی گئی اور نہ وہ اشعار جھوٹ اور بری باتوں پر مشتمل ہوں اور نہ ہی وہ تعویذ و گنڈے غیر مشروع عملیات سے متعلق ہوں اسی طرح اُمت کے حق میں وہ تریاق بھی حرام نہیں ہے جس میں کوئی حرام چیز جیسے سانپ کا گوشت وغیرہ شامل نہ ہو۔

جھاڑ پھونک وغیرہ توکل کے منافی

(۴۲) وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اكْتَوٰى اَوِ اسْتَرْقٰى فَقَدْ بَرِئَ مِنَ التَّوَكُّلِ۔

(رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے داغ دلوایا، یا منتر پڑھوایا تو وہ توکل سے بری ہوا۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی مرض کے لئے جسم کے کسی حصہ پر داغ لینا یا کسی ضرورت و حاجت کی صورت میں جھاڑ پھونک اور تعویز گنڈے کرانا، اگرچہ مباح ہے لیکن توکل اور اعتماد علی اللہ کا جو مرتبہ و مقام ہے وہ اس سے بلند و بالا ہے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنِيْنَ لہٰذا اسباب و ذرائع کے اختیار کرنے میں زیادہ انہماک و رغبت گویا رب الارباب سے غافل ہو جانے کی دلیل ہے اسی لئے امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص کہیں جانے کے لئے اپنے مکان کے دروازوں کو دو تالوں سے مقفل کرے یا ایک تالا ڈالے اور پھر اپنے پڑوسی سے بھی مکان کی حفاظت و نگرانی کے لئے کہے تو وہ توکل کے دائرے سے نکل گیا۔

(۴۳) وَعَنْ عِيْسَى ابْنِ حَمْزَةَ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُلَيْمٍ وَبِهٖ حُمْرَةٌ فَقُلْتُ اَلَا تُعَلِّقُ تَمِيْمَةً فَقَالَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَعَلَّقَ شَيْئًا وُكِلَ اِلَيْهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عیسیٰ ابن حمزہؒ کہتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت عبداللہ بن عکیم کے پاس گیا تو دیکھا کہ ان کا بدن سرخی کی بیماری میں مبتلا تھا میں نے کہا کہ آپ تعویز کیوں نہیں باندھ لیتے؟ انہوں نے کہا کہ میں اس کام سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں۔ کیونکہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے جو شخص کوئی چیز لٹکاتا ہے یا (باندھتا ہے) تو اسی چیز کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: طیبیؒ کے قول کے مطابق بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ نے تعویذ باندھنے سے خدا کی پناہ چاہی تھی کیونکہ وہ مقام توکل و رضا پر فائز تھے اور انہوں نے تعویز باندھنے کو مرتبہ توکل کے منافی سمجھا۔ اگرچہ دوسروں کے لئے یہ جائز ہے۔

آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص تعویز باندھتا ہے یا گنڈا ڈالتا ہے اور جھاڑ پھونک وغیرہ جیسے عملیات کا سہارا

لیتا ہے اور یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ یہ چیزیں فائدہ مند ہیں اور ضرر کو دفع کرتی ہیں تو اس کو اس حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور انہی چیزوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے یعنی اس کو حق تعالیٰ کی مدد اعانت سے محروم کر دیا جاتا ہے اور وہ شفا نہیں پاتا کیونکہ ذات حق تعالیٰ کے علاوہ نہ کوئی چیز فائدہ دیتی ہے اور نہ نقصان پہنچاتی ہے۔ گویا اس ارشاد گرامی ﷺ کا مقصد تفویض و توکل کی طرف راغب کرنا ہے۔

جھاڑ پھونک کے اثر کا ذکر

(۴۴) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَارُقْيَةَ اِلَّا مِنْ عَيْنٍ اَوْحَمَةٍ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ بُرَيْدَةَ۔

"اور حضرت عمران ابن حصین ؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ منتر یعنی جھاڑ پھونک کا اثر تو بس نظر یا زہر دار جانور (جیسے بچھو وغیرہ کے) ڈنگ ہی پر ہوتا ہے۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد) اور ابن ماجہ ؒ نے اس روایت کو حضرت بریدہ ؓ سے نقل کیا ہے۔"

(۴۵) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَارُقْيَةَ اِلَّامِنْ عَيْنٍ اَوْحُمَةٍ اَوْدَمٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انس ؓ کہتے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا منتر تو بس نظر یا زہریلے ڈنک اور خون پر اثر کرتا ہے۔" (ابوداؤد ؒ)

تشریح: اس سے پہلی حدیث میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس حدیث میں تین چیزوں کا ذکر ہے گویا اس حدیث میں "خون" کا لفظ مزید نقل کیا گیا ہے۔ علماء نے خون سے نکسیر کا خون مراد لیا ہے اور اگر لفظ خون کو اس کے عمومی مفہوم پر محمول کیا جائے یعنی یوں کہا جائے کہ خون سے وہ تمام امراض مراد ہیں جو خون کے سبب سے لاحق ہوتے ہیں کہ خواہ ان کا تعلق، خون کی روانی، دباؤ اور غلبہ سے ہو، اور خواہ فساد خون سے تو یہ بھی صحیح ہوگا۔

"ابوداؤد" کی ایک روایت میں۔ اِلَّافِي عَيْنٍ کے بجائے اِلَّافِي نَفْسٍ کے الفاظ منقول ہیں، لیکن علماء نے کہا ہے کہ "نفس سے مراد" عین یعنی نظر ہی ہے اسی طرح اَوْدَمٍ کے بجائے اَوْلَدْغَةٍ کے الفاظ منقول ہیں۔ جن کے معنی دانتوں سے کاٹنے کے ہیں، جیسا کہ سانپ اور اس طرح کے دوسرے جانور دانتوں کے ذریعہ ڈستے ہیں اور کاٹتے ہیں۔

واضح رہے کہ جھاڑ پھونک اور عملیات کے ذریعہ علاج معالجہ کرنا درد سر دانتوں کے درد جیسی تقریباً ہر بیماری کے لئے فائدہ مند ہے جس کا ثبوت احادیث سے ملتا ہے، نیز بخاری ؒ و مسلم ؒ کی روایت میں منقول ہے کہ جب آنحضرت ﷺ بیمار تھے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ دَآءٍ يُؤْذِيْكَ۔ لہٰذا مذکورہ بالا حدیثوں میں جھاڑ پھونک کے اثر کو محض تین چیزوں میں منحصر کرنا دراصل مبالغہ کے طور پر ہے اور مراد یہ ہے کہ دوسری چیزوں کی بہ نسبت ان تین چیزوں میں جھاڑ پھونک زیادہ فائدہ مند اور بہتر ہے۔ جیسا کہ عام طور پر لوگ انہی چیزوں میں عملیات کا سہارا زیادہ لیتے ہیں۔

تیز نظر کا ذکر

(۴۶) وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ قَالَتْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ وُلْدَ جَعْفَرٍ تَسْرِعُ اِلَيْهِمُ الْعَيْنُ اَفَاَسْتَرْقِيْ لَهُمْ قَالَ نَعَمْ فَاِنَّهُ لَوْكَانَ شَيْءٌ سَابِقَ الْقَدَرَ لَسَبَقَتْهُ الْعَيْنُ۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت اسماء بنت عمیس سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ! جعفر طیار ؓ کی اولاد (چونکہ خوبصورت و خوب سیرت ہے اس لئے ان) کو نظر بہت جلدی لگتی ہے تو کیا ان کے لئے منتر پڑھوائیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہاں کیونکہ اگر کوئی چیز تقدیر پر سبقت لے جاسکتی تو وہ نظر ہوتی (یعنی نظر کا اثر یقیناً ایک سخت ترین چیز ہے۔ لہٰذا اس کے دفعیہ کے لئے جھاڑ پھونک کرانا جائز ہے۔"

(احمد ؒ، ترمذی ؒ، ابن ماجہ ؒ)

تشریح: عطاءؒ نے لکھا ہے کہ جس طرح بعض نظر بسبب حسد اور خبث طبع کے نقصان و ضرر پہنچاتی ہے اسی طرح اس کے مقابلہ میں عارفین اور اہل اللہ کی نظر اکسیر کی مانند فائدہ مند ہوتی ہے کہ ان کی ایک نگاہ ہدایت کافر کو مؤمن فاسق کو صالح اور جاہل کو عالم بنا دیتی ہے۔

نملہ کا منتر

(۴۷) وَعَنِ الشِّفَاءِ بِنْتِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَتْ دَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا عِنْدَ حَفْصَةَ فَقَالَ اَلَا تُعَلِّمِيْنَ هٰذِهٖ رُقْيَةَ النَّمْلَةِ كَمَا عَلَّمْتِيْهَا الْكِتَابَةَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت شفاء بنت عبداللہؓ کہتی ہیں (ایک دن) میں اُمّ المؤمنین حضرت حفصہؓ کے پاس بیٹھی تھی کہ رسول کریم ﷺ اندر تشریف لائے اور مجھ کو (دیکھ کر) فرمایا کہ کیا تم ان کو (یعنی حفصہؓ کو) نملہ کا منتر نہیں سکھا دیتیں جس طرح کہ تم نے ان کو لکھنا سکھایا ہے۔" (ابوداؤد)

تشریح: شفاء۔ عبداللہ ابن شمس کی بیٹی اور قریشی عدوی ہیں ان کا اصلی نام لیلی تھا اور شفاء لقب تھا جو اتنا مشہور ہوا کہ اصل نام پر غالب آگیا، انہوں نے ہجرت سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا اونچے درجہ کی عاقلہ فاضلہ عورتوں میں سے تھیں، نبی کریم ﷺ دوپہر کو قیلولہ کے لئے ان کے یہاں تشریف لے جاتے اور وہاں آرام فرماتے، انہوں نے آنحضرت ﷺ کے لئے بستر اور لنگی کا انتظام کر رکھا تھا تاکہ آرام کے وقت یہ دونوں چیزیں آپ ﷺ کی خدمت میں آئیں۔

"نملہ" کے بارے میں پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ ان پھنسیوں کو نملہ کہتے ہیں جو پسلیوں پر نکلتی ہیں اور بہت تکلیف پہنچاتی ہیں، جو شخص ان پھنسیوں میں مبتلا ہوتا ہے، اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے ان پھنسیوں کی جگہ چیونٹیاں رینگ رہی ہوں اور غالباً اسی مناسبت سے ان پھنسیوں کو نملہ چیونٹی کہا جاتا ہے۔ حضرت شفاءؓ مکہ میں اس نملہ کے دفعیہ کے لئے ایک منتر پڑھ کر جھاڑ پھونک کرتی تھیں، جب انہوں نے اسلام قبول کیا اور آنحضرت ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے آئے اور یہ بھی وہاں پہنچیں تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) میں اپنے زمانہ جاہلیت میں نملہ کے دفعیہ کے لئے ایک منتر پڑھا کرتی تھیں، اب چاہتی ہوں کہ وہ منتر پڑھ کر آپ ﷺ کو سناؤں تاکہ آپ ﷺ اس کے بارے میں حکم دیں کہ اس منتر کا پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس منتر کو سن کر اس کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنے کی اجازت دیدی اور پھر فرمایا کہ یہ منتر حفصہؓ کو بھی سکھا دو۔

"رقیہ نملہ" سے مراد وہ چند کلمات ہیں جو عرب کی عورتوں میں مشہور تھے، جن کو وہ رقیہ نملہ کہتی تھیں ورنہ نملہ کا جو حقیقی منتر تھا وہ تو دراصل خرافات کا مجموعہ تھا جس کو پڑھنے سے آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا تھا ظاہر ہے کہ آپ ﷺ اس منتر کے سکھانے کا حکم کیوں فرماتے، وہ مشہور کلمات جن کو عرب کی عورتیں رقیہ نملہ کہتی تھیں یہ ہیں۔ العروس تنتعل و تختضب و تکعل و کل شیء تفتعل غیر انہا و لا نقصی الرجل یعنی دلہن کو چاہئے کہ مانگ چوٹی اور زیب وزینت کرے، ہاتھ پاؤں رنگے، سرمہ لگائے ہر بات کرے مگر مرد کی نافرمانی نہ کرے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا شفاءؓ سے یہ فرمانا کہ حفصہؓ کو نملہ کا منتر سکھا دو حقیقت میں تعریض کے طور پر تھا اور اس کا ایک خاص پس منظر تھا اور وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی زوجہ مطہرہ حضرت حفصہؓ کو ایک راز کی بات سنائی تھی، لیکن حفصہؓ نے اس کو فاش کر دیا اس کا ذکر قرآن کریم کی سورۃ تحریم میں بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے شفاء سے مذکورہ ارشاد فرما کر گویا حضرت حفصہؓ کو نصیحت کی اور ان کو متنبہ کیا کہ تم نے میرے بتائے ہوئے راز کو ظاہر کر کے شوہر کی نافرمانی کی ہے جو نہ صرف تمہارے مقام و مرتبہ کے منافی بات ہے بلکہ وفا شعار عورت کی اس خصوصیت کے بھی منافی ہے۔ کہ وہ شوہر کی نافرمانی کرنا گوارا نہیں ہوتی۔

ایک حدیث میں عورتوں کو لکھنا سکھانے کی ممانعت منقول ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ لا تعلم الکتابۃ اس کے برخلاف،

اس حدیث میں اس کا جواز ثابت ہوتا ہے لہذا ہو سکتا ہے کہ اس حدیث کا تعلق اس وقت سے ہو جب کہ آنحضرت ﷺ نے یہ ممانعت ارشاد نہیں فرمائی تھی گویا ممانعت والی حدیث بعد کی ہے اور یہاں جو حدیث نقل کی گئی ہے وہ پہلے کی ہے۔ بعض حضرات اس بارے میں کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہراتؓ کی ایک خاص حیثیت تھی اس بنا پر بعض احکام وفضائل میں بھی ان کو مخصوص رکھا گیا ہے لہذا ممانعت کا تعلق اور تمام عورتوں سے ہے کہ ان کا اس فتنہ و برائی میں مبتلا ہو جانا عین ممکن ہے۔ جو مذکورہ ممانعت کی بنیاد ہے۔ جب کہ ازواج مطہرات کے بارے میں اس طرح کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے ان کو لکھنا سیکھنے کی اجازت تھی۔

خطابیؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورتوں کو لکھنا سکھانا مکروہ ہے اور ملا علی قاریؒ نے کہا ہے کہ یہ احتمال ہے کہ اس وقت یعنی زمانہ رسالت میں عورتوں کو لکھنا سکھانا جائز ہو، لیکن فتنہ و فساد میں مبتلا ہو جانے کے خوف کے سبب سے بعد کی عورتوں کے لئے جائز نہ ہو بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ لکھنا سکھانے کا مذکورہ حکم صرف حضرت حفصہؓ کے لئے تھا، دوسری عورتوں کے لئے نہیں۔

نظر لگنے کا ایک واقعہ

(۴۸) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ قَالَ رَاٰى عَامِرُ بْنُ رَبِيْعَةَ سَهْلَ بْنَ حُنَيْفٍ يَغْتَسِلُ فَقَالَ وَاللّٰهِ مَا رَاَيْتُ كَالْيَوْمِ وَلَا جِلْدَ مُخَبَّأَةٍ قَالَ فَلُبِطَ سَهْلٌ فَاُتِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيْلَ لَهٗ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ لَّكَ فِيْ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ وَاللّٰهِ مَا يَرْفَعُ رَاسَهٗ فَقَالَ هَلْ تَتَّهِمُوْنَ لَهٗ اَحَدًا فَقَالُوْا نَتَّهِمُ عَامِرَ بْنَ رَبِيْعَةَ قَالَ فَدَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامِرًا فَتَغَلَّظَ عَلَيْهِ وَقَالَ عَلَامَ يَقْتُلُ اَحَدُكُمْ اَخَاهُ اَلَّا بَرَّكْتَ اِغْتَسِلْ لَهٗ فَغَسَلَ لَهٗ عَامِرٌ وَجْهَهٗ وَيَدَيْهِ وَمِرْفَقَيْهِ وَرُكْبَتَيْهِ وَاَطْرَافَ رِجْلَيْهِ وَدَاخِلَةَ اِزَارِهٖ فِيْ قَدَحٍ ثُمَّ صُبَّ عَلَيْهِ فَرَاحَ مَعَ النَّاسِ لَيْسَ لَهٗ بَاْسٌ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَرَوَاهُ مَالِكٌ وَفِيْ رِوَايَتِهٖ قَالَ اِنَّ الْعَيْنَ حَقٌّ تَوَضَّأْ لَهٗ فَتَوَضَّأَ لَهٗ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ ابن سہل ابن حنیف کہتے ہیں کہ (ایک دن) عامر ابن ربیعہؓ نے (میرے والد) سہل ابن حنیفؓ کو نہاتے ہوئے دیکھا۔ تو کہنے لگا کہ خدا کی قسم (سہل کے جسم اور ان کے رنگ و روپ کے کیا کہنے) میں نے تو آج کے دن کی طرح (کوئی خوبصورت بدن کبھی) نہیں دیکھا۔ اور پردہ نشین (خوبصورت عورت) کی بھی کھال (سہلؓ کی کھال جیسی نازک و خوش رنگ) نہیں دیکھی۔ ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ (عامرؓ کا) یہ کہنا تھا کہ ایسا محسوس ہوا (جیسے) سہلؓ کو گرا دیا گیا (یعنی ان کو عامرؓ کی ایسی نظر لگی کہ وہ فوراً غش کھا کر گر پڑے) چنانچہ ان کو اٹھا کر رسول کریم ﷺ کی خدمت میں لایا گیا اور عرض کیا گیا کہ "یا رسول اللہ! آپ (ﷺ) سہلؓ کے علاج کے لئے کیا تجویز کرتے ہیں! خدا کی قسم، یہ تو اپنا سر بھی اٹھانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ آنحضرت ﷺ نے سہلؓ کی حالت دیکھ کر فرمایا کہ کیا کسی شخص کے بارے میں تمہارا خیال ہے کہ اس نے ان کو نظر لگائی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ (جی ہاں) عامر ابن ربیعہؓ کے بارے میں ہمارا گمان ہے کہ انہوں نے نظر لگائی ہے راویؒ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (یہ سنکر) عامر کو بلایا اور ان کو سخت سست کہا اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کیوں مار ڈالنے کے درپے ہوتا ہے، تم نے سہلؓ کو برکت کی دعا کیوں نہیں دی (یعنی اگر تمہاری نظر میں سہل کا بدن اور رنگ و روپ بھا گیا تھا تو تم نے یہ الفاظ کیوں نہ کہے۔ بَارَكَ اللّٰهُ عَلَيْكَ تاکہ ان پر تمہاری نظر کا اثر نہ ہوتا)، پھر آپ ﷺ نے عامرؓ کو حکم دیا کہ (تم سہل کے لئے اپنے اعضاء کو) دھوؤ اور اس پانی کو اس پر ڈال دو۔ چنانچہ عامرؓ نے ایک برتن میں اپنا منہ، ہاتھ، کہنیاں، گھٹنے، دونوں پاؤں کی انگلیوں کے پورے اور زیر ناف جسم (یعنی ستر اور کولھوں) کو دھویا اور پھر وہ پانی جس سے عامرؓ نے یہ تمام اعضاء دھوئے تھے سہلؓ پر ڈالا گیا اس کا اثر یہ ہوا کہ سہل فوراً اچھے ہو گئے اور اٹھ کر لوگوں کے ساتھ اس طرح چل پڑے۔ جیسے ان کو کچھ ہوا ہی نہیں تھا! (شرح السنۃ، مؤطا امام مالکؒ) اور امام مالکؒ کی ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ٹوکنے والے سے فرمایا کہ "نظر بد حق" ہے تم

نظر زدہ کے لئے وضو کرو چنانچہ اس نے نظر زدہ کے لئے وضو کیا۔"

تشریح: نووی کہتے ہیں کہ علماء کے نزدیک نظر زدہ کے لئے نظر لگانے والے کے وضو کی صورت یہ ہے کہ جس شخص کے بارے میں یہ تحقیق ہو کہ اس نے نظر لگائی ہے کہ اس کے سامنے کسی برتن یعنی پیالہ وغیرہ میں پانی لایا جائے اس برتن کو زمین پر نہ رکھا جائے۔ پھر نظر لگانے والا اس برتن میں سے ایک چلو پانی لے کر کلی کرے اور اس کلی کو اسی برتن میں ڈالے پھر اس میں سے پانی لے کر اپنا منہ دھوئے پھر بائیں ہاتھ میں پانی لے کو دائیں کہنی اور دائیں ہاتھ میں پانی لے کر بائیں کہنی دھوئے اور ہتھیلی و کہنی کے درمیان جو جگہ ہے اس کو نہ دھوئے، پھر داہنا پیر اور پھر اس کے بعد بایاں پیر دھوئے پھر اسی طرح پہلے داہنا گھٹنا اور بعد میں بایاں گھٹنا دھوئے اور پھر آخر میں تہبند کے اندر زیر ناف جسم کو دھوئے اور ان سب اعضاء کو اسی برتن میں دھویا جائے ان سب کو دھونے کے بعد اس پانی کو نظر زدہ کے اوپر اس کی پشت کی طرف سے سر پر ڈال کر بہا دے۔ واضح رہے کہ اس طرح کا علاج اسرار و حکم سے تعلق رکھتا ہے۔ جو عقل و سمجھ کی رسائی سے باہر کی چیز ہے۔ لہٰذا اس بارے میں عقلی بحث کرنا لاحاصل ہے۔

مارزی نے کہا ہے کہ مذکورہ اعضاء جسم کو دھونے کا حکم وجوب کے طور پر ہے، لہٰذا نظر لگانے والے کو اس بات پر طاقت کے ذریعہ مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ نظر زدہ کے لئے مذکورہ وضو کرے، نیز انہوں نے کہا ہے کہ اس حکم کی خلاف ورزی کرنا انسانیت سے بعید ہے خاص طور سے اس صورت میں جب کہ نظر زدہ کے ہلاک ہو جانے کا خوف ہو۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ جو شخص نظر لگانے کے بارے میں مشہور و معروف ہو جائے تو اس سے اجتناب کرنا اور اس کے سامنے آنے میں احتیاط کرنا لازم ہے اور امام سربراہ حکومت کے لئے مناسب ہے کہ وہ ایسے شخص کو لوگوں میں آنے جانے اور بیٹھنے اٹھنے سے روک دے اور اس پر یہ پابندی عائد کر دے کہ وہ اپنے گھر میں ہی رہا کرے، گھر سے باہر نہ نکلا کرے اور اگر وہ شخص محتاج و فقیر ہو کہ اپنی گزر و بسر کرنے کے لئے لوگوں کے پاس آنے جانے پر مجبور ہو تو بیت المال سرکاری خزانے سے اس کے لئے بقدر کفایت وظیفہ مقرر کر دے تاکہ وہ گزر اوقات کر سکے۔ حاصل یہ کہ ایسے شخص کا ضرر جذامی کے ضرر سے بھی سخت و شدید ہے لہٰذا اس بارے میں احتیاط لازم ہے امام نووی نے اس قول کی تائید کی ہے اور کہا ہے کہ یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے بالکل صحیح اور ناقابل تردید ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق علماء میں سے کسی کا بھی کوئی اختلافی قول ہمارے علم میں نہیں ہے۔

پناہ مانگنے کا ذکر

(۴۹) وَعَنْ اَبِي سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَعَوَّذُ مِنَ الْجَآنِّ وَعَيْنِ الْاِنْسَانِ حَتّٰى نَزَلَتِ الْمُعَوِّذَتَانِ فَلَمَّا نَزَلَتْ اَخَذَ بِهِمَا وَتَرَكَ مَاسِوَاهُمَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جنات سے اور انسان کا نظر بد سے پناہ مانگا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ معوذات یعنی سورہ قل اعوذ برب الناس اور سورہ قل اعوذ برب الفلق نازل ہوئیں جب یہ سورتیں نازل ہوئیں تو آپ ان سورتوں کے ذریعہ دعا مانگنے لگے۔ اور ان کے علاوہ دوسری چیزوں سے پناہ مانگنی چھوڑ دی۔ (ترمذی، ابن ماجہ) اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

(۵۰) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ رُءِيَ فِيْكُمُ الْمُغَرِّبُوْنَ قُلْتُ وَمَا الْمُغَرِّبُوْنَ قَالَ الَّذِيْنَ يَشْتَرِكُوْنَ فِيْهِمُ الْجِنُّ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَذُكِرَ حَدِيْثُ بْنُ عَبَّاسٍ خَيْرُ مَاتَدَاوَيْتُمْ فِي بَابِ التَّرَجُّلِ۔

"اور حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ کیا تمہارے اندر (یعنی انسانوں میں) مغربون دکھائی دیتے

ہیں؟ میں نے عرض کیا مغربون کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا...... "مغربون وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ جنات یعنی شیاطین شریک ہوتے ہیں؟ (ابوداؤدؒ) اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت خیر ماتد اویتم الخ باب الترجل میں نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: حدیث میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے جماع کرتے وقت خدا کا ذکر نہ کرے یعنی یہ دعا نہ پڑھے۔ بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّیْطَانَ مَارَزَقْتَنَا تو اس پر شیطان اثر انداز ہوتا ہے۔ بایں طور کہ شیطان اس کے جسم سے اپنا جسم اور اس کے ستر سے اپنا ستر ملا لیتا ہے اور اسکے ساتھ عورت سے جماع کرتا ہے اس طرح شیطان اس شخص کے نطفہ اور اس کے ہونے والی اولاد میں شریک ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں بھی فرمایا گیا ہے کہ وَشَارِکْھُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ اس سے معلوم ہوا کہ "مغربون" کے معنی ہیں وہ لوگ جو جماع کے وقت ذکر خداوندی سے روگردانی کرتے ہیں اور اپنے نفس کو ذکر حق سے دور کر دیتے ہیں۔ یا وہ جماع کے وقت ذکر خداوندی سے غفلت اختیار کر کے اور گویا وظیفہ زوجیت میں شیطان کو اپنا شریک بنا کر اپنی پیدا ہونے والی اولاد کو اپنی جنس سے دور کر دیتے ہیں اور اپنی نسل اور اپنے نسب میں گویا اجنبی خون کو شامل کرتے ہیں لہٰذا جماع کا وقت چونکہ سرشاری و غفلت کا وقت ہوتا ہے اس لئے اس موقع پر احتیاط و ہوشیاری اختیار کر کے ذکر خداوندی یعنی مذکورہ دعا پڑھنے سے چوکنا نہ چاہئے تاکہ اس بلاء و فتنہ سے محفوظ رہے۔ واضح رہے کہ آج کل کے ابناء روزگار (افراد انسانی میں) جو عام بے راہ روی، فتنہ و فساد اور مختلف قسم کی برائیاں پائی جاتی ہیں ان کا سبب اس حدیث کی روشنی میں بالکل ظاہر ہے کہ لوگوں نے عام طور پر مذکورہ ہدایت کو فراموش کر کے ذکر خداوندی کو ترک کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ پیدا ہونے والی نسل پوری طرح شیطانی اثرات لئے ہوئے دنیا میں آتی ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں، شیطان کی شرکت کا مطلب یہ ہے کہ شیطان ان لوگوں کو زنا کی طرف راغب کرتا ہے اور ان کی نظر میں بدکاری کو اچھے سے اچھے روپ میں پیش کرتا ہے جس کی بنا پر وہ اس برائی میں مبتلا ہو کر نالائق اور غیر صالح اولاد کی پیدائش کا ذریعہ بنتے ہیں یا یہ شیطان ان لوگوں کی عورتوں و بیویوں کو زنا کی طرف مائل کرتا ہے اور ان کو غیر مردوں کے ساتھ ملوث کراتا ہے اور اس کے نتیجہ میں نالائق اولاد پیدا ہوتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

معدے کی مثال

(۵۱) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْمَعِدَۃُ حَوْضُ الْبَدَنِ وَالْعُرُوْقُ اِلَیْھَا وَارِدَۃٌ فَاِذَا صَحَّتِ الْمِعْدَۃُ صَدَرَ الْعُرُوْقُ بِالصِّحَّۃِ وَاِذَا فَسَدَتِ الْمِعْدَۃُ صَدَرَتِ الْعُرُوْقُ بِالسَّقَمِ۔

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (آدمی کا) معدہ بدن کا حوض ہے اور پیٹ کی رگیں (جو اعضاء جسم سے پیوستہ ہیں) معدہ کی طرف (پانی پینے والے کی طرح) آتی ہیں جب معدہ درست ہوتا ہے تو یہ رگیں معدہ سے صحت بخش رطوبات کے ساتھ اعضاء جسم کی طرف جاتی ہیں (جس سے بدن کو صحت و طاقت حاصل ہوتی ہے) اور جب معدہ خراب ہوتا ہے تو یہ رگیں فاسد رطوبات کے ساتھ اعضاء کی طرف جاتی ہیں (جس سے بدن کو بیماری اور ضعف لاحق ہو جاتا ہے)۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ انسان کے بدن اور اس کے معدہ کے درمیان وہی نسبت ہے جو پانی کے تالاب وغیرہ اور درخت کے درمیان ہے کہ جس طرح کسی تالاب کے کنارے یا پانی میں کھڑا ہوا درخت اپنے رگ و ریشہ کے ذریعہ پانی سے حیات بخش رطوبات حاصل کرتا ہے اسی طرح جسم انسانی مختلف رگوں کے ذریعہ اپنے معدہ سے صحت و طاقت کی رطوبات حاصل کرتا ہے چنانچہ اگر پانی صاف و شیریں ہوتا ہے تو وہ درخت کی تازگی اور نشوونما کا سبب بنتا ہے اور اگر پانی گدلا اور کھارا ہوتا ہے تو وہ درخت کی پژمردگی و خشکی کا باعث بن جاتا ہے۔

زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حدیث کو طب نبوی پر محمول کیا جائے اس صورت میں مذکورہ بالا ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہوگا کہ انسان کے اقوال وافعال، کردار وعادات اور اخلاق واطوار اس کی غذا وخوراک کے مطابق ہوتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے پیٹ میں حرام غذا داخل ہوتی ہے تو اس کے اعضاء جسم سے حرام افعال واقوال صادر ہوتے ہیں اسی طرح اگر کسی شخص کے پیٹ میں کھانے پینے کی فضول وغیر مناسب چیزیں جاتی ہیں تو اس کے جسم کے ہر چھوٹے بڑے عضو سے فضول وغیر مناسب افعال وغیرہ صادر ہوتے ہیں اس کے بر خلاف جس شخص کے پیٹ میں حلال وپاک غذائیں جاتی ہیں اس کے اعضاء وجسم سے صالح وپاکیزہ افعال وغیرہ صادر ہوتے ہیں گویا انسان کی غذا اس کے افعال کا تخم ہے اور افعال بمنزلہ روئیدگی کے ہیں اور اس کے پیٹ میں جس طرح کی غذا جائے گی اس کے اعضاء سے اسی طرح کے افعال ظاہر ہوں گے جیسا کہ کہا گیا ہے۔ اناء یترشح بمافیه یعنی ہر برتن سے وہی چیز ٹپکتی اور نکلتی ہے جو اس کے اندر ہوتی ہے۔ اسی لئے حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ من نبت لحمه من سحت فالنار اولی به۔

بعض محدثین نے اس حدیث کے بارے میں کلام کیا ہے اور بعض حضرات نے تو اس کو موضوع من گھڑت قرار دیا ہے، اور کہا ہے کہ "لا اصل له" (یعنی اس حدیث کو کوئی اصل نہیں ہے) لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث کے بارے میں یہ کہنا کہ باطل ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے غیر صحیح بات ہے کیونکہ تعدد طرق کے سبب اور طبرانیؒ وبیہقیؒ کی روایت کی بنا پر اس کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اور اس بناء پر اس حدیث کو بلاشک وشبہ حسن یا ضعیف کہا جا سکتا ہے۔

بچھو کے کاٹے کا علاج

(۵۲) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ بَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ يُصَلِّيْ فَوَضَعَ يَدَهٗ عَلَى الْاَرْضِ فَلَدَغَتْهُ عَقْرَبٌ فَنَاوَلَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِنَعْلِهٖ فَقَتَلَهَا فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ لَعَنَ اللّٰهُ الْعَقْرَبَ مَا تَدَعُ مُصَلِّيًا وَلَا غَيْرَهٗ اَوْنَبِيًّا وَغَيْرَهٗ ثُمَّ دَعَا بِمِلْحٍ وَمَآءٍ فَجَعَلَهٗ فِيْ اِنَاءٍ ثُمَّ جَعَلَ يَصُبُّهٗ عَلٰى اِصْبَعِهٖ حَيْثُ لَدَغَتْهُ وَيَمْسَحُهَا وَيُعَوِّذُهَا بِالْمُعَوِّذَتَيْنِ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ ایک روز رات میں رسول کریم ﷺ نے نماز پڑھتے ہوئے اپنا ہاتھ زمین پر رکھا تھا کہ اس (ہاتھ) کی انگلی میں بچھو نے کاٹ لیا، آپ ﷺ نے اپنی پاپوش مبارک کے ذریعہ اس بچھو کو مار ڈالا اور جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ بچھو پر خدا کی لعنت ہو، نہ نمازی کو چھوڑتا ہے نہ غیر نمازی کو یا یہ فرمایا کہ، نبی کو چھوڑتا ہے نہ غیر نبی کو اس کے بعد آپ ﷺ نے نمک اور پانی منگوایا اور دونوں کو ایک برتن میں گھول دیا اور پھر آپ ﷺ اس چیز کو (جو برتن میں تھی یعنی پانی اور نمک) کو انگلی کے اس حصے پر ڈالتے جاتے تھے جہاں بچھو نے کاٹا تھا اور انگلی کو ملتے جاتے تھے۔ نیز قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھتے جاتے تھے۔ ان دونوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

آنحضرت ﷺ کے موئے مبارک کی برکت

(۵۳) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَوْهَبٍ قَالَ اَرْسَلَنِيْ اَهْلِيْ اِلٰى اُمِّ سَلَمَةَ بِقَدَحٍ مِنْ مَاءٍ وَكَانَ اِذَا اَصَابَ الْاِنْسَانَ عَيْنٌ اَوْشَيْءٌ بَعَثَ اِلَيْهَا مِخْضَبَةً فَاَخْرَجَتْ مِنْ شَعْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَتْ تُمْسِكُهٗ فِيْ جُلْجُلٍ مِنْ فِضَّةٍ فَخَضْخَضَتْهُ لَهٗ فَشَرِبَ مِنْهُ قَالَ فَاطَّلَعْتُ فِي الْجُلْجُلِ فَرَاَيْتُ شَعَرَاتٍ حُمْرًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عثمان ابن عبداللہ ابن موہب کہتے ہیں کہ ایک دن میرے گھر والوں نے مجھ کو پانی کا ایک پیالہ دے کر ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کے پاس بھیجا۔ معمول یہ تھا کہ جب کسی کو نظر لگتی یا اور کوئی بیماری ہوتی تو ام سلمہؓ کے پاس ایک پیالہ بھیجا جاتا اور ام سلمہؓ

رسول پاک ﷺ کا موئے مبارک نکالتیں جس کو وہ چاندی کی ایک نلکی میں رکھتی تھیں اور اس موئے مبارک کو پانی میں ڈال کر ہلاتیں اور پھر مریض اس پانی کو پی لیتا جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کو شفا عطا فرمادیتا راوی کہتے ہیں کہ میں نے چاندی کی اس نلکی میں جھانک کر دیکھا تو مجھ کو آنحضرت ﷺ کے کئی سرخ بال نظر آئے!۔" (بخاری)

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس موقع پر چاندی کا استعمال موئے مبارک کی تعظیم و توقیر کے پیش نظر تھا، جیسا کہ کعبہ مکرمہ پر ریشمی کپڑے کا پردہ ڈالا جاتا ہے۔ جہاں تک ان بالوں کی سرخی کا تعلق ہے تو ہو سکتا ہے کہ موئے مبارک خلقی طور پر سرخ ہی تھے۔ یا تھے تو بھورے مگر دیکھنے میں سرخ معلوم ہوتے تھے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان پر مہندی کا خضاب ہو گا جس کی وجہ سے وہ سرخ تھے۔ یا چونکہ ان کو خوشبوؤں میں رکھا جاتا تھا اس لئے ان خوشبوؤں کی وجہ سے ان کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ اور وہ سرخ نظر آنے لگتے تھے۔

کھنبی کے خواص

۵۴ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ نَاسًا مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْكَمْأَةُ جُدَرِيُّ الْاَرْضِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَمَآءُ هَا شِفَآءٌ لِلْعَيْنِ وَالْعَجْوَةُ مِنَ الْجَنَّةِ وَهِيَ شِفَآءٌ مِّنَ السَّمِّ قَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ فَاَخَذْتُ ثَلٰثَةَ اَكْمُؤٍ اَوْخَمْسًا اَوْسَبْعًا فَعَصَرْتُهُنَّ فَجَعَلْتُ مَاءَهُنَّ فِیْ قَارُوْرَةٍ وَكَحَلْتُ بِهٖ جَارِيَةً لِّیْ عَمْشَاءَ فَبَرَأَتْ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ کے صحابہؓ میں سے کئی حضرات نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کھنبی زمین کی چیچک ہے؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (نہیں) بلکہ کھنبی من کی قسم سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے اور عجوہ (جو کھجور کی سب سے نفیس اور عمدہ قسم ہے) جنت کی کھجور ہے اور اس میں زہر سے شفا کی خاصیت ہے حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد سنکر) میں نے تین یا پانچ یا سات کھنبیاں لیں اور ان کو نچوڑ لیا (یعنی کوٹ کر ان کا عرق نکال لیا)، اور اس پانی (عرق) کو ایک شیشی میں بھر کر رکھ لیا پھر میں نے اس پانی کو اپنی ایک چندھی لونڈی کی آنکھوں میں ڈالنے لگا تو وہ اچھی ہو گئی۔ اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔"

تشریح: "کھنبی زمین کی چیچک ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح چیچک کے دانے دراصل جسم میں پیدا ہو جانے والے ناقص، فضلات ہوتے ہیں جو جلد میں سے باہر نکل آتے ہیں، اسی طرح یہ کھنبی بھی زمین کا فضلہ ہے۔ جو زمین سے باہر نکل آتی ہے۔ صحابہؓ نے یہ بات گویا کھنبی کی مذمت کے طور پر کہی، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کے خیال کو رد کرنے کے لئے کھنبی کی فضیلت و تعریف اور اس کی منفعت بیان فرمائی کہ کھنبی من کی قسم سے ہے یعنی یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جو اس نے اپنے بندوں کو بطور احسان عطا فرمائی ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے نہ زمین کو کھودنے بونے کی مشقت کرنا پڑتی ہے اور نہ پانی دینے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے بلکہ یہ خود بخود زمین کے اندر سے پیدا ہوتی ہے اور بہت سے لوگوں کے کھانے اور پیٹ بھرنے کی ضرورت پوری کرتی ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آپ نے اس جملہ کے ذریعہ کھنبی کو اس من کے ساتھ مشابہت دی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر اتری تھی، اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر ان کی محنت و مشقت کے بغیر من اترتی تھی اسی طرح یہ کھنبی بھی تخم ریزی کی محنت و مشقت کے بغیر زمین سے نکلتی ہے یہ قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ ایک روایت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ الکمأة من المن والمن من الجنة یعنی کھنبی من کی قسم سے ہے اور من جنت کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

"اور اس کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے" کے بارے میں نوویؒ لکھتے ہیں کہ بعض علماء کے نزدیک محض کھنبی کا پانی آنکھ کو شفا بخشتا ہے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس کا پانی اس صورت میں شفا دیتا ہے جب کہ اس میں آنکھ کے امراض کے مطابق دوسری دوائیں بھی ملائی

جائیں، نیز بعضوں کے نزدیک یہ تفصیل ہے کہ اگر آنکھ کو گرمی سے ٹھنڈک پہنچانا مقصود ہو (یعنی آنکھ گرمی کی وجہ سے دکھتی ہو) تو صرف اس کا پانی ہی مفید ہے ورنہ دوسری صورتوں میں اس کے پانی کو دوسری دواؤں میں ملا کر آنکھ میں ڈالنا مفید ہوگا۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ہر صورت میں کہ آنکھ خواہ گرمی کی وجہ سے دکھتی ہو یا کسی اور وجہ سے، محض اس کا پانی شفا بخش ہے، چنانچہ بعض مشائخ" کے بارے میں منقول ہے کہ اس کی بنیائی بالکل جاتی رہی تھی اور انہوں نے آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی ﷺ پر مکمل اعتقاد رکھتے ہوئے اور اس کو متبرک جانتے ہوئے اپنی آنکھوں میں محض کھنبی کا پانی ڈالنا شروع کیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حسن اعتقاد اور آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کی برکت کی بناء پر ان کی آنکھوں کو شفائے کامل عطا فرمائی۔

شہد کی فضیلت

(۵۵) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَعِقَ الْعَسَلَ ثَلٰثَ غَدَوَاتٍ فِيْ كُلِّ شَهْرٍ لَمْ يُصِبْهُ عَظِيْمٌ مِنَ الْبَلَاءِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص ہر مہینے میں تین دن صبح کے وقت شہد چاٹ لیا کرے تو وہ کسی بڑی مصیبت میں مبتلا نہیں ہوتا۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ شہد کی برکت و خاصیت سے بڑی مصیبت و بلا تک دفع ہو جاتی ہے خواہ وہ کسی سخت بیماری کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں چہ جائیکہ کوئی چھوٹی مصیبت و بلا ہو۔

سفر السعادۃ کے مصنف نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ روزانہ ایک پیالہ میں شہد کو پانی میں ملا کر گھونٹ گھونٹ نوش فرماتے تھے۔ علماء نے لکھا ہے کہ شہد کو پانی میں ملا کر پینے سے حفظان صحت وہ نعمت حاصل ہوتی ہے جس کی معرفت کی راہ عارفین ہی جان سکتے ہیں چنانچہ شہد کے جو بیشمار فوائد و خواص ہیں ان کی بناء پر ارباب طب و تحقیق کا یہ فیصلہ ہے کہ شہد بلاشبہ ایک ایسی نعمت الٰہی ہے جس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا، جالینوس کا کہنا ہے کہ خالص طور پر بیماریوں کے لئے شہد سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ اطباء لکھتے ہیں کہ نہار منہ شہد کو پینا یا چاٹنا بلغم کو چھانٹتا ہے۔ معدے کو صاف کرتا ہے لزوجت اور فضلات کو دور کرتا ہے، معدے کو اعتدال کے ساتھ گرمی پہنچاتا ہے اور سدوں کو کھولتا ہے، علاوہ ازیں یہ جلندر، استرخاء اور ہر قسم کے ریاح کو زائل کرتا ہے، پیشاب، حیض، اور دودھ کو جاری کرتا ہے مثانہ و گردہ کی پتھری کو توڑتا ہے اور ہر طوبت ردیہ کو دفع کرتا ہے۔

(۵۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْكُمْ بِالشِّفَائَيْنِ الْعَسَلَ وَالْقُرْاٰنَ رَوَاهُمَا ابْنُ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَقَالَ الصَّحِيْحُ اَنَّ الْاَخِيْرَ مَوْقُوْفٌ عَلَى ابْنِ مَسْعُوْدٍ۔

"اور حضرت عبد اللہ ابنؓ مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ شفا دینے والی دونوں چیزوں کو اپنے اوپر لازم کر لو، ایک تو شہد دوسرے قرآن۔ ان دونوں روایتوں کو ابن ماجہ" اور بیہقی" نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے، نیز بیہقی" نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ دوسری حدیث (یعنی علیکم بالشفائین) مرفوع (آنحضرت ﷺ کا ارشاد) نہیں ہے بلکہ ابن مسعودؓ پر موقوف ہے یعنی ان کا اپنا قول ہے۔"

تشریح: شہد کی یہ فضیلت اس لئے ہے کہ اس میں شفا کا ہونا قرآن کریم سے ثابت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ۔ یعنی اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے اور خود قرآن مجید بھی کائنات انسانی کے لئے شفاء و رحمت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا هُدًى وَّشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ (یعنی یہ قرآن دلوں کی بیماریوں کے لئے ہدایت اور شفا ہے۔) لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ شہد تو محض ظاہری جسمانی بیماریوں کے لئے شفا ہے جب کہ قرآن کریم ظاہر و باطن یعنی جسم و روح دونوں کی بیماریوں کے لئے شفا ہے اسی لئے قرآن کریم کے حق میں هُدًى وَّشِفَآءٌ فرمایا گیا ہے۔

بلا ضرورت سر پر پچھنے لگوانا قوت حافظہ کے لئے نقصان دہ ہے

(۵۷) وَعَنْ اَبِی کَبْشَۃَ الْاَنْمَارِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَحْتَجَمَ عَلٰی ھَامَتِہٖ مِنَ الشَّاۃِ الْمَسْمُوْمَۃِ قَالَ مَعْمَرٌ فَاحْتَجَمْتُ اَنَا مِنْ غَیْرِ سَمٍّ کَذٰلِکَ فِیْ یَا خُوْفِیْ فَذَھَبَ حُسْنُ الْحِفْظِ عَنِّیْ حَتّٰی کُنْتُ اَلْقَنُ فَاتِحَۃَ الْکِتَابِ فِی الصَّلٰوۃِ۔ (رواہ رزین)

"اور حضرت ابوکبشہ انماریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس بیماری کے سبب کہ جو بکری کا زہر آلود گوشت کھا لینے کی وجہ سے لاحق ہوگئی تھی اپنے پر سینگی کھنچوائی۔ (حدیث کے ایک راوی) معمرؒ کا بیان ہے کہ میں نے کوئی زہر آلود چیز کھائے بغیر اسی طرح اپنے سر پر سینگی کھنچوائی، تو میں اپنے حافظہ کی خوبی سے محروم ہوگیا۔ یہاں تک کہ مجھ کو نماز میں الحمد سیکھنے کی ضرورت پیش آتی تھی!۔" (رزینؒ)

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ کسی علت و سبب کے بغیر کہ جو سر میں سے خون نکلوانے کو ضروری قرار دے، سر پر سینگی کھنچوانا اور خون نکلوانا قوت حافظہ کو نقصان پہنچانے کا باعث ہے۔

سینگی کھنچوانے کے دن

(۵۸) وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ قَالَ ابْنُ عُمَرَ یَا نَافِعُ یَنْبَغُ بِیَ الدَّمُ فَأْتِنِیْ بِحَجَّامٍ وَاجْعَلْہُ شَابًّا وَّلَا تَجْعَلْہُ شَیْخًا وَلَا صَبِیًّا قَالَ وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ الْحِجَامَۃُ عَلَی الرِّیْقِ اَمْثَلُ وَھِیَ تَزِیْدُ فِی الْعَقْلِ وَ تَزِیْدُ فِی الْحِفْظِ وَ تَزِیْدُ الْحَافِظَ حِفْظًا فَمَنْ کَانَ مُحْتَجِمًا فَیَوْمَ الْخَمِیْسِ عَلَی اسْمِ اللّٰہِ وَاجْتَنِبُوا الْحِجَامَۃَ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ وَیَوْمَ السَّبْتِ وَیَوْمَ الْاَحَدِ فَاحْتَجِمُوْا یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَیَوْمَ الثُّلٰثَاءِ وَاجْتَنِبُوا الْحِجَامَۃَ یَوْمَ الْاَرْبِعَاءِ فَاِنَّہٗ یَوْمَ الَّذِیْ اُصِیْبَ بِہٖ اَیُّوْبُ فِی الْبَلَاءِ وَمَا یَبْدُوْ اجْذَامٌ وَّلَا بَرَصٌ اِلَّا فِیْ یَوْمِ الْاَرْبِعَاءِ اَوْلَیْلَۃِ الْاَرْبِعَاءِ۔ (رواہ ابن ماجہ)

"اور حضرت نافعؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ نافع میرے جسم میں خون جوش کھا رہا ہے۔ ذرا تم سینگی کھینچنے والے کو بلالاؤ، لیکن جوان آدمی کو لانا، کسی بوڑھے یا بچے کو مت پکڑلانا (کیونکہ طاقت ور آدمی زیادہ اچھی طرح سینگی کھینچے گا)۔ نافعؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ بھری ہوئی سینگی نہار منہ کھنچوانا زیادہ بہتر ہے اس سے عقل میں زیادتی ہوتی ہے (جس شخص کے حافظہ نہیں ہوتا) اس کا حافظہ تیز ہوتا ہے اور جس شخص کے حافظہ تیز ہوتا ہے اس کے حافظہ میں زیادتی ہوتی ہے، لہٰذا جو شخص سینگیاں کھنچوانا چاہے وہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جمعرات کے دن سینگی کھنچوائے اور جمعہ، ہفتہ اور اتوار کو سینگی کھنچوانے سے اجتناب کرو، پھر پیر اور منگل کے دن کھنچوائے اور بدھ کے دن سینگی کھنچوانے سے اجتناب کرو، کیونکہ بدھ کا دن وہ دن ہے جس میں حضرت ایوب علیہ السلام مبتلائے بلاء ہوئے اور جذام یا کوڑھ کی بیماریاں بدھ کے دن یا بدھ کی رات میں ظاہر ہوتی ہیں۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: "جس میں حضرت ایوب علیہ السلام مبتلائے بلا ہوئے" سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کا بلاء میں مبتلا رہنا اسی سبب سے تھا کہ انہوں نے بدھ کے دن سینگی کھنچوائی تھی اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مفسرین نے اس کے مبتلائے بلاء ہونے کے اور بھی اسباب بیان کئے ہیں۔ تو ہوسکتا ہے کہ ان اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہوگا۔

علماء نے لکھا ہے کہ دوسری فصل میں حضرت کبشہؓ بنت ابی بکرہ کی جو روایت گزری ہے تو اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ منگل کے دن سینگی کھنچوانا مناسب نہیں ہے جب کہ یہاں اس کے برخلاف بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان دونوں روایتوں کے درمیان اس تضاد کو اس قول کے ذریعہ دور کیا جاسکتا ہے کہ اگر حضرت کبشہؓ کی روایت کو صحیح مان لیا جائے تو یہاں نقل کی گئی روایت میں "منگل" سے مراد وہ منگل ہوگا۔ جو چاند کی سترہویں تاریخ کو واقع ہوتا ہو جیسا کہ آگے آنے والی روایت سے واضح ہوتا ہے۔

روایت کے آخری الفاظ کے ذریعہ جو حصر بیان کیا گیا ہے کہ جذام اور کوڑھ کی بیماریاں صرف بدھ کے دن یا بدھ کی رات میں پیدا ہوتی ہیں تو یہ حصر اکثر کے اعتبار سے اور ازراہ مبالغہ ہے۔

(۵۹) وَعَنْ مَعْقَلِ ابْنِ يَسَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْحِجَامَةُ يَوْمَ الثُّلٰثَآءِ لِسَبْعِ عَشْرَةَ مِنَ الشَّهْرِ دَوَاءٌ لِدَآءِ السَّنَةِ رَوَاهُ حَرْبُ ابْنُ اِسْمَاعِيْلَ الْكِرْمَانِيُّ صَاحِبُ اَحْمَدَ وَلَيْسَ اِسْنَادُهُ بِذَالِكَ هٰكَذَا فِي الْمُنْتَقٰى وَرَوٰى رَزِيْنٌ نَحْوَهُ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ۔

"اور حضرت معقل ابن یسارؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ منگل کے دن سترھویں تاریخ کو سینگی کھنچوانا سال بھر کی بیماریوں کا علاج ہے اس روایت کو حرب ابن اسماعیل کرمانیؒ نے نقل کیا ہے جو امام احمد بن حنبلؒ کے مصاحب ہیں اور روایت کی اسناد ایسی قوی نہیں ہے کہ اس پر اعتماد کیا جاسکے (ابن جارودؒ کی کتاب) منتقی میں بھی اسی طرح منقول ہے، نیز اسی طرح کی روایت رزینؒ نے بھی حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کی ہے۔"

تشریح: منگل کے دن سینگی کھنچوانے کے سلسلے میں چوں کہ مختلف روایتیں منقول ہیں اس لئے زیادہ بہتر اور مناسب یہی ہے کہ منگل کے دن سینگی کھنچوانے سے اجتناب کیا جائے۔ تاوقتیکہ کوئی شدید ضرورت پیش آئے۔

سحر کے احکام

اس باب میں منتر وافسوں اور جھاڑ پھونک وغیرہ کے متعلق احکام و مسائل بیان ہوئے ہیں اب جب کہ باب ختم ہو رہا ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مناسبت سے سحر وجادو کے احکام و اقسام کے سلسلے میں کچھ تفصیل بیان کر دی جائے اس مقصد کے لئے خاص طور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے منقولات کو منتخب کیا گیا ہے جو انہوں نے آیت کریمہ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِيْنُ کے تحت سحر کے اقسام و احکام کی وضاحت میں بیان کئے ہیں ان معقولات و فرمودات کا ترجمہ و خلاصہ اور اس کی روشنی میں چند دوسری باتیں نقل کی جاتی ہیں۔

جاننا چاہئے کہ سحر کے حکم کی مختلف صورتیں ہیں اگر سحر کرنے والے نے کوئی ایسا قول و فعل اختیار کیا جو کفر کا موجب ہو جیسے بتوں، دیوی، دیوتاؤں اور ارواح خبیثہ کا نام ایسی تعظیم وصفت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہو جو صرف رب العزت ہی کے شایان شان ہے مثلاً ان بتوں وغیرہ کے لئے عموم علم، قدرت و تصرف اور غیب دانی و مشکل کشائی وغیرہ ثابت کی گئی ہو، یا غیر اللہ کے لئے ذبح کیا گیا ہو، یا غیر اللہ کے لئے سجدہ کیا گیا ہو وغیرہ وغیرہ تو ایسا سحر بلاشبہ کفر ہو گا اور اس سحر کو کرنے والا مرتد قرار پائے گا اسی طرح جس شخص نے اپنے کسی مطلب کے حصول کے لئے اس طرح کا سحر دیدہ دانستہ کرایا ہو گا تو وہ بھی کافر ہو جائے گا اور اس پر ارتداد کے احکام نافذ ہوں گے، اگر وہ مرد ہے تو پہلے اس کو تین دن کی مہلت دینی چاہئے اگر تین دن کے بعد اس نے صحیح توبہ نہ کی تو اس کو مار ڈالا جائے اور اس کی لاش کو پھینک دیا جائے نہ مسلمان میت کی طرح اس کی تجہیز و تکفین کی جائے نہ اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے اور نہ فاتحہ و درود و صدقات کے ذریعہ ایصال ثواب کیا جائے، اور اگر وہ عورت ہے تو حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق اس کو بھی مردوں کی طرح تین دن کی مہلت کے بعد قتل کر دیا جائے، اور، جب کہ حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک عورت کو ہمیشہ کے لئے قید میں ڈال دیا جائے جب تک کہ وہ توبۂ نصوح نہ کرے۔

اور اگر سحر میں کوئی ایسا قول و فعل نہ ہو جو ارتداد و کفر کا موجب ہوتا ہے، لیکن سحر کرنے والا اس بات کا دعویٰ کرے کہ میں اپنے اس جادو کے زور سے وہ کام کر سکتا ہوں جو خدا کرتا ہے۔ مثلاً میں انسان کو جانور کی صورت میں تبدیل کر سکتا ہوں یا لکڑی کو پتھر اور پتھر کو لکڑی بنا سکتا ہوں یا ایسے کام کر سکتا ہوں جو پیغمبر کر سکتے ہیں اور ان معجزات کی طرح میں بھی معجزہ دکھا سکتا ہوں مثلاً میں ہوا میں اڑ سکتا

ہوں یا ایک مہینے کی مسافت ایک لمحے میں طے کر سکتا ہوں تو اس کو بھی اس دعوے کی وجہ سے مرتد کافر قرار دیا جا سکتا ہے نہ کہ نفس سحر کے سبب۔ اگر وہ یوں کہے کہ میرے عملیات میں ایک خاصیت ہے اور وہ یہ کہ میں اپنے عمل جادو کے ذریعہ کسی جاندار کو جان سے مار سکتا ہوں، یا کسی تندرست کو بیمار اور بیمار کو تندرست کر سکتا ہوں یا میں لوگوں کے خیالات تک کو اچھا یا برا بنا سکتا ہوں تو اس کا یہ سحر جھوٹ بولنے اور فسق اختیار کرنے کے حکم میں ہوگا اور وہ (سحر کرنے والا) فاسق وکاذب قرار پائے گا اور اگر وہ اپنے اس عمل (سحر) کے ذریعہ کسی بے گناہ کو ہلاک کر ڈالے تو اس کو قزاق اور قاتل کی طرح سزائے موت دے کر مار ڈالا جائے کیونکہ وہ اپنے اس عمل کے ذریعہ فتنہ وفساد پھیلانے اور بے گناہوں کو ہلاکت میں ڈالنے کا مجرم قرار پائے گا۔ اس بارے میں ساحر اور ساحرہ کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔

ایک روایت میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ سے یہ منقول ہے کہ جس شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ سحر کرتا ہے اور اقرار و تنبیہ کے ذریعہ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جائے تو اس کو مار ڈالنا چاہئے۔ اس سے توبہ کا مطالبہ کرنے یا مہلت دینے کی ضرورت نہیں ہے اگر وہ کہے کہ میں سحر کو ترک کرتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں تو اس کی بات کو قبول نہ کرنا چاہئے۔ ہاں اگر وہ یوں کہے کہ میں پہلے تو بیشک سحر کرتا تھا مگر ایک مدت سے اپنے اس فعل سے باز آگیا ہوں تو اس کے اس قول کو قبول کر لیا جائے اور اس کو معاف کر دیا جائے۔

حضرت امام شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے سحر کیا اور اس کے سحر کی وجہ سے سحر زدہ مر گیا تو ساحر سے جواب طلب کرنا چاہئے اگر وہ اقرار کرے کہ میں نے اس شخص پر سحر کیا تھا اور میرا سحر اکثر اوقات جان لے لیتا ہے تو اس پر قصاص واجب ہوگا اور اگر یہ کہے کہ میں نے اس شخص پر سحر کیا تھا اور میرا سحر کبھی جان لے لیتا ہے اور کبھی جان نہیں لیتا تو یہ قتل شبہ عمد کے حکم میں ہوگا اور اس پر شبہ عمد کے احکام نافذ ہوں گے اور اگر وہ یوں کہے کہ سحر تو میں نے کسی دوسرے شخص کے لئے کیا تھا لیکن اتفاق سے اس شخص کا نام وہی تھا جو اس شخص کا تھا یا اس کا گزر اس جگہ پر ہو گیا جہاں اس دوسرے شخص کے لئے سحر کیا گیا تھا اور اس وجہ سے اس کا اثر اس شخص پر ہو گیا اور یہ ہلاک ہو گیا تو یہ قتل خطاء کے حکم میں ہوگا اور اس (ساحر) پر قتل خطاء کے احکام نافذ ہوں گے۔

اس موقع پر ایک اشکال واقع ہوتا ہے، جو اکثر ذہنوں میں خلجان پیدا کر سکتا ہے اور وہ یہ کہ خرق عادت افعال کہ جو محض قدرت الٰہی سے صادر ہوتے ہیں اکثر اولیاء اللہ کے ذریعہ ظہور میں آتے ہیں جیسے تقلیب اعیان یا تبدیلی صورت یا اسی طرح کے وہ افعال جو پیغمبروں کے معجزات کے مشابہ ہوتے ہیں جیسے مردہ کو زندہ کر دینا یا دور دراز کے سفر کو ایک لمحہ میں طے کر لینا، علاوہ ازیں اولیاء اللہ سے اسی طرح کی اور بہت سی چیزوں کا صادر ہونا ثابت ہے جن کو ان اولیاء اللہ کے مستند سوانح نگاروں نے ان کے مناقب وکرامات کے ضمن میں لکھا ہے۔ لہٰذا اگر افعال الٰہی کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرنا کفر ہے تو ان اولیاء اللہ سے صادر ہونے والے خرق عادت افعال کی صورت میں بھی کفر لازم آنا چاہئے اور اگر یہ کہا جائے کہ اولیاء اللہ سے جو خرق عادت فعل صادر ہوتا ہے وہ حقیقت میں ان کا فعل نہیں ہوتا بلکہ حق تعالیٰ ہی کی قدرت اور اس کے حکم سے صادر ہوتا ہے اور اولیاء اللہ اس فعل کے صادر ہونے کا ایک ظاہری سبب و ذریعہ بنتے ہیں اس لئے ان پر کفر کا اطلاق نہیں ہوتا تو پھر ساحروں کے حق میں کفر کا حکم کیوں کیا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی ان افعال کے صادر ہونے کا ظاہری سبب و ذریعہ ہی تو ہوتے ہیں نہ کہ حقیقی فاعل بلکہ علاوہ ازیں دعا تعویذ کرنے والے اور عاملین کہ جو اپنے عملیات اور دعاؤں کے ذریعہ ساحروں کی طرح کتنے ہی محیر العقول کارنامہ انجام دیتے ہیں اور اس طرح وہ بھی گویا پوری طرح ساحروں کے مشابہ ہوتے ہیں تو ان کے افعال پر بھی کفر کا طلاق کیوں نہیں ہوتا اور ان کے اور ساحروں کے درمیان فرق کیوں کیا جاتا ہے۔؟ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ خرق عادت افعال خواہ وہ معجزات کے مشابہ ہوتے ہیں اور خواہ کسی اور طرح کے ہوں سب اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اسی کے ارادہ و حکم سے اور اسی کے پیدا کرنے سے صادر و ظاہر ہوتے ہیں اس اعتبار سے اولیاء اللہ سے جو چیزیں (کرامت کی صورت میں) صادر ہوتی ہیں وہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کے حکم وارادہ سے ظہور میں آتی ہیں اور جو چیزیں ساحروں سے صادر ہوتی ہیں وہ بھی

اللہ تعالیٰ کے حکم وارادہ ہی سے پیدا ہوتی ہیں، لیکن ان دونوں صورتوں میں جو فرق ہے اور جس فرق کی وجہ سے کفر اور عدم کفر کا حکم لگتا ہے وہ یہ ہے کہ اولیاء اللہ یا دعا تعویذ کرنے والے اور عاملین ان افعال کی نسبت غیر اللہ کی طرف نہیں کرتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت یا اس کے اسماء پاک کے خواص کی طرف کرتے ہیں اسی لئے ان پر کفر و شرک کا اطلاق نہیں ہوتا، جب کہ ساحران افعال کو غیر اللہ، یعنی ارواح خبیثہ، دیوی دیوتاؤں، بتوں کے نام اور منتروں کے خواص کی طرف کرتے ہیں اسی لئے وہ ان افعال کو اپنے قبضہ وقابو اور اپنے زیر حکم جانتے ہیں اور ان افعال کے عوض اجرت لیتے ہیں، بھینٹ چاہتے ہیں، ان دیوی دیوتاؤں اور بتوں کے نام پر نذر کرنے اور قربانی دینے کا مطالبہ کرتے ہیں اور ظاہر ہے یہ چیزیں شرک و کفر کو لازم کرتی ہیں، اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی کو بچہ عطا ہونا، رزق میں وسعت و فراخی ملنا اور مریض کا شفایاب ہونا وغیرہ امور اللہ تعالیٰ کے افعال ہیں اور اسی کے حکم وارادہ کے تحت ہیں لیکن گمراہ لوگ ان کی نسبت ارواح خبیثہ، دیوی، دیوتاؤں اور پیروں فقیروں وغیرہ کی طرف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں دیوی دیوتا سے بچہ مانگا تھا تو اس نے ہمیں بچہ دیا ہم نے فلاں کی روح کے نام پر بھینٹ چڑھائی تھی تو اس نے ہمیں رزق میں وسعت دی اور ہم نے فلاں بزرگ و فقیر سے درخواست کی تھی اور اس مقصد کے لئے ان کے مزار پر نذرانے چڑھائے تھے تو انہوں نے ہمیں شفا دی۔ گویا ان کے نزدیک ان چیزوں کا دینے والا اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ غیر اللہ ہوتا ہے، لہٰذا ایسے لوگ کافر ہو جاتے ہیں اس کے برخلاف خدا کو ماننے والے اور اس کے احکام پر عمل کرنے والے لوگ اگر ان چیزوں کے لئے جائز ذرائع و اسباب، جیسے دعا، تعویذ، جھاڑ پھونک یا علاج معالجہ کا سہارا لیتے ہیں اور ان کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوتی ہے تو ان امور کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہمیں جو چیز ملی ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ملی ہے البتہ اس کے حصول میں اسماء الٰہی دعاؤں اور تعویز گنڈے کی تاثیر یا دوا کے خواص ایک ظاہری سبب و ذریعہ کا درجہ رکھتے ہیں اس بناء پر ان کے ایمان میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔

سحر کی تعریف و حقیقت

اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ سحر کی تعریف و حقیقت کیا ہے اور یہ کہ سحر کی کونسی قسم موجب کفر ہے کونسی موجب فسق ہے اور کونسی قسم مباح ہے یعنی شریعت میں جائز ہے؟ اس کی تفصیل اگرچہ بہت طویل ہے لیکن اجمالی طور پر اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ سحر کی حقیقت و تعریف یہ ہے دعاؤں اور اسماء الٰہی، کے عملیات وغیرہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے مدد طاقت حاصل کرنے کے بجائے خفیہ اسباب کی مزاولت (یعنی مخفی طاقتوں کی پرستش و جبیہ سائی اور ان کی تسخیر) کے ذریعہ خوارق عادات اور افعال عجیبیہ پر قدرت حاصل کرنا اور ان خوارق عادات اور افعال عجیبیہ کی نسبت قادر مطلق پروردگار عالم کی طرف کرنے کے بجائے غیر اللہ یعنی ان مخفی طاقتوں یا اپنی ذات کی طرف کرنا۔ اور چونکہ عالم میں اسباب خفیہ کئی طرح کے ہیں اس لئے سحر کی قسمیں بھی متعدد ہیں جن کو منضبط طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ خفیہ سبب یا تو روحانیت کی تاثیر ہے، یا جسمانیت کی تاثیر پھر روحانیت یا تو کلیہ مطلق ہیں جیسے کواکب و افلاک یا عناصر کی روحانیت، یا وہ روحانیات جزیہ خاصہ ہیں جیسے امراض اور جن و شیاطین کی روحانیات اور وہ ارواح جو جسم انسانی سے نکل کر جاتی ہیں اور جن کو مسخر کر کے اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جہاں تک جسمانیات کا تعلق ہے تو وہ جسمانیات یا تو ترکیب اور اجتماع کیفیات کے سبب سے تاثیر کرتے ہیں جس سے عجیب و غریب باتیں ظہور میں آتی ہیں یا خواص کے سبب سے تاثیر کرتے ہیں یعنی ان کی صورت نوعیہ کسی ترکیب اور اجتماع کیفیات کے توسط کے بغیر خود بخود تاثیر کرتی ہے جس طرح کہ مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے۔

رہی یہ بات کہ ان روحانیات یعنی ان پوشیدہ و مخفی طاقتوں سے مناسبت کیونکر حاصل ہوتی ہے اور ان کی تاثیر کو کس طرح مائل کیا جاتا ہے تو اس کے مختلف طریقے ہیں، بعض لوگ چند مخصوص شرائط کے ساتھ ان روحانیت کا نام جپتے ہیں، اور حصول مقصد کے لئے ان سے ملتجی ہوتے ہیں بعض لوگ ان کی تصویر بنا کر اس کے سامنے نذر بھینٹ چڑھاتے ہیں اور وہ کام کرتے ہیں جو ان کو مرغوب ہو سکتے ہیں، یا مخصوص طریقہ اور مخصوص شرائط کے ساتھ کچھ حروف و الفاظ بلا لحاظ ترکیب پڑھتے ہیں جن کے ذریعہ وہ ارواح میں سے کسی روح

کی بڑائی کی طرف یا ایسے عجیب وغریب فعل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جو اس سے کبھی سرزد ہوا تھا اور جس کی وجہ سے عام وخاص اس کی مدح وثناء میں رطب اللسان ہوئے تھے۔ غرضیکہ سحر کرنے کے مختلف عملیات اور مختلف صورتیں ہیں اور ان عملیات اور صورتوں کے نتیجہ میں سحر کی متعدد اور کثیر قسمیں سامنے آتی ہیں، لیکن جو قسمیں زیادہ مشہور ہیں وہ چند ہیں اور ان میں کی پہلی قسم جو سب سے بڑی قسم سمجھی جاتی ہے کلدانیوں اور بابل کا سحر ہے اور اسی کو باطل کرنے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے اس سحر کے علم کی اصل ہاروت وماروت سے چلی ہے کہا جاتا ہے کہ بابل کے لوگ ہاروت وماروت سے اس سحر کا علم اور طریقہ سیکھتے تھے اور پھر اس کے ذریعہ اپنے مقصد حاصل کیا کرتے تھے، نیز انہوں نے اس میں مختلف تحقیق و تجربے کئے تھے اور اس کے علم کو بہت زیادہ وسیع وہمہ گیر بنایا، اسی طرح کلدانیین، جو بابل میں سکونت رکھتے تھے اس علم کے حصول کے لئے مختلف محنت وجستجو میں لگے رہتے تھے اور اس کے ذریعہ نت نئی چیزیں پیدا کرتے تھے۔

تاریخ کی معتبر کتابوں میں لکھا ہے کہ بابل کے حکماء اور اس فن کے ماہرین نے نمرود کے زمانہ میں اپنے شہر بابل میں کہ جو نمرود کا دارالسلطنت تھا اس سحر کے ذریعہ ایسے چھ ہوشربا اور محیر العقول طلسمات بنا رکھے تھے۔ جن کی حقیقت وکیفیت جاننے سے انسان کی عقل و ذہانت عاجز رہتی تھی۔

اول یہ کہ انہوں نے تانبے کی ایک بطخ بنا رکھی تھی جو شہر میں ناپسندیدہ اور مضر افراد کے داخل ہونے کی خبر دیتی تھی، چنانچہ اگر کسی دوسرے ملک سے کوئی جاسوس یا دشمن یا کوئی چور وغیرہ شہر میں داخل ہوتا تو اس بطخ میں سے مخصوص آواز نکلنے لگتی تھی، شہر کے تمام لوگ اس آواز کو سن کر اس کا مقصد جان لیتے تھے۔ اور اس طرح وہ اس جاسوس اور چور کو پکڑ لیتے تھے۔

دوسرے یہ کہ انہوں نے ایک نقارہ بنا رکھا تھا جس کا مصرف یہ تھا کہ شہر میں جس شخص کو کوئی چیز گم ہو جاتی تو وہ اس نقارہ پر چوٹ مارتا، جس کے نتیجے میں اس میں سے یہ آواز نکلتی کہ تمہاری فلاں چیز فلاں جگہ ہے، چنانچہ تلاش کرنے کے بعد وہ اسی جگہ سے ملتی۔

تیسرے یہ کہ انہوں نے گم شدہ لوگوں کو دریافت کرنے کے لئے ایک آئینہ بنا رکھا تھا۔ جب شہر میں کسی کے گھر کا کوئی فرد غائب ہو جاتا تو وہ اس آئینے کے پاس آتا اور اس میں اپنے گمشدہ فرد کا حال دیکھ لیتا وہ گمشدہ خواہ کسی شہر میں ہوتا، خواہ جنگل میں اور خواہ کسی کشتی وغیرہ پر سفر کرتے ہوئے ہو یا کسی پہاڑ پر، اسی طرح خواہ وہ بیمار ہوتا یا تندرست، خواہ مفلس وقلاش ہوتا یا مال دار اور خواہ زخمی ہوتا یا مقتول، غرضکہ وہ جس جگہ اور جس حالت میں ہوتا اسی جگہ اور اسی حالت کے ساتھ اس آئینہ میں نمودار ہو جاتا۔

چوتھا طلسم یہ تھا کہ انہوں نے ایک حوض بنایا تھا جس کے کنارے وہ سال بھر میں ایک دن جشن مناتے تھے، چنانچہ شہر کے تمام سردار اور معززین اپنی پسند کے مشروب لے کر اس حوض کے کنارے جمع ہوتے اور جو شخص اپنے ساتھ جو مشروب لاتا اس کو اس حوض میں ڈال دیتا، پھر جب ساقی کا فرض انجام دینے والے لوگ اس کے کنارے کھڑے ہو کر لوگوں کو پلانا شروع کرتے اور اس حوض میں سے نکال نکال کر دیتے تو ہر شخص اس کو وہی پسندیدہ مشروب ملتا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔

پانچواں طلسم یہ تھا کہ انہوں نے لوگوں کے لڑائی جھگڑوں کو نمٹانے کے لئے ایک تالاب بنایا تھا اگر دو آدمیوں کا آپس میں کوئی تنازعہ ہوتا اور یہ ثابت ہونا ہوتا کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق پر۔ تو دونوں فریق اس تالاب کے کنارے آتے اور پھر اس میں اتر جاتے، چنانچہ جو شخص حق پر ہوتا اس تالاب کا پانی اس کے ناف کے نیچے رہتا اور وہ غرق نہ ہوتا اور جو شخص حق پر نہ ہوتا پانی اس کے سر سے اوپر چلا جاتا اور اس کو ڈبو دیتا ہاں اگر وہ فریق مخالف کے حق کو مان لیتا اور اپنے جھوٹے دعوے کو ترک کر دیتا تو پھر غرقابی سے نجات پاتا۔

اور چھٹا طلسم یہ تھا کہ انہوں نے نمرود کے محل کے میدان میں ایک درخت لگا رکھا تھا۔ جس کے سایہ میں درباری بیٹھتے تھے لوگوں کی تعداد جس قدر بڑھتی رہتی اسی قدر اس کا سایہ بھی بڑھتا رہتا تھا یہاں تک کہ اگر تعداد ایک لاکھ تک پہنچ جاتی تو سایہ بھی اسی اعتبار سے زیادہ ہو جاتا تھا مگر جب اس عدد سے ایک آدمی بھی زیادہ ہو جاتا تو پھر سایہ بالکل ختم ہو جاتا تھا اور تمام لوگ دھوپ میں بیٹھے رہ جاتے

تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس بارے میں بابل کے لوگ ہی شغف و دلچسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا بادشاہ نمرود بھی بہت زیادہ غلو رکھتا تھا اور اس علم کی پوری طرح سرپرستی کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سحر کی یہ قسم سب سے زیادہ سخت اور مشکل ہے لیکن اگر کوئی شخص سخت ترین ریاض و محنت اور مسلسل جدوجہد کے بعد اس کی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے اور اس فن کو جان لیتا ہے تو پھر اس کی اتنی زبردست طاقت و قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ کہ وہ انسانی عادت کے مخالف امور کو ظاہر کرنے اور انسانی عادات کے موافق امور کو روک دینے پر قادر ہو جاتا ہے۔

جیسے وہ ان امراض کا علاج بھی کر سکتا ہے جس کے معالجہ سے دنیا بھر کے طبیب عاجز ہو گئے ہوں مثلاً برص اور جذام وغیرہ کیونکہ ایسا شخص روحانیات یعنی طاقتوں (جیسے جن و شیاطین) کے ذریعہ تدبیر و عمل کرتا ہے، جب کہ طبیب جسمانیت (دواؤں) کے ذریعہ تدبیر کرتا ہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اجسام و ارواح کے ساری حقیقتیں منکشف کر دیں اور انہوں نے ہر جسم اور ہر روح کو قادر مطلق کے دست قدرت کے تحت مجبور و بیکس دیکھا تو سب سے منہ پھیر کر ذات واحد حقیقی کی طرف متوجہ ہو گئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی سورۃ انعام میں فرمایا۔ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ تا وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ یعنی ہم نے ایسے ہی طور پر ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات دکھلائیں تاکہ وہ عارف ہو جائیں اور کامل یقین کرنے والوں سے ہو جائیں، پھر جب رات کی تاریکی ان پر چھا گئی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا اور کہا کہ یہی میرا رب ہے سو جب وہ غروب ہو گیا تو انہوں نے کہا کہ میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا، پھر جب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہا کہ یہی میرا رب ہے سو جب وہ غروب ہو گیا تو انہوں نے کہا کہ اگر مجھ کو میرا رب ہدایت نہ کرتا رہے تو میں گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں۔ جب سورج کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہا کہ یہی میرا رب ہے یہ تو سب سے بڑا ہے سو جب وہ غروب ہو گیا تو انہوں نے کہا کہ اے قوم! بے شک میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ میں اپنا رخ اس ذات کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں سے نہیں ہوں۔

واضح رہے کہ اوپر سحر کی جو قسم ذکر کی گئی ہے وہ خالص کفر اور شرک محض ہے کیونکہ اس سحر کے علم کا حصول جن، پندرہ شرائط کی پابندی پر موقوف ہے ان میں سب سے پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ ارواح کو عالم الغیب اور احوال قلب پر مطلع مانا جائے۔ اور ان کے تئیں عجز و جہل کا گمان ہرگز نہ کیا جائے ورنہ وہ ارواح اس کا کہنا بالکل نہیں مانیں گی اور اس کے مقصد تک نہیں پہنچائیں گی۔

کواکب و سیارات کی روحانیات یعنی ان کی قوتوں سے استمداد کرنے اور ان کی تاثیر کو متوجہ کرنے کے لئے جو طریقہ بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے روحانیات قمر کی تاثیر کو ان الفاظ کے ورد کے ذریعہ متوجہ کرتے ہیں۔ ایها الملک الکریم و السید الرحیم مرسل الرحمة و منزل النعمة اور عطارد کی تاثیر کو متوجہ اور اپنے زیر اثر کے لئے ان الفاظ کا ورد کیا جاتا ہے۔ کل ماحصل لی من السحر فهو منک و کل ماندفع من الشر منی فهو منک دیگر کواکب و سیارات سے استمداد کرنے اور ان کی تاثیر کو متوجہ کرنے کے لئے جن الفاظ کا سہارا لیا جاتا ہو گا ان کو بھی انہی پر قیاس کیا جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ اس طرح کا عقیدہ رکھنا جو ان الفاظ سے آشکار ہوتے ہیں اور اس طرح کے الفاظ زبان سے نکالنا عقیدہ توحید، تعلیمات اسلامی اور ملت حنفی کے سراسر منافی ہے۔

سحر کی دوسری قسم وہ ہے جس میں جنات و شیاطین کو مسخر کیا جاتا ہے اور ان سے امداد و اعانت طلب کر کے مقصد حاصل کیا جاتا ہے یہ قسم سہل الحصول بھی ہے اور کثیر ارواج بھی ہے، جنات و شیاطین کی اس تسخیر میں جن چیزوں کا اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے ان میں بعض مخصوص الفاظ و اعمال کے ذریعہ ان سے تعلق پیدا کرنے کے علاوہ ان کی جبہہ سائی کرنا ان کے نام پر نذریں چڑھانا، بھینٹ دینا، ان کی پسندیدہ خوشبو وغیرہ ان کے آنے کی جگہوں پر رکھنا اور بسانا، جس جگہ ان کے آنے کا تصور ہو وہاں ہاتھ جوڑ کر بیٹھنا اور ان کو اپنے سامنے

موجود جانتے ہوئے رونا گڑگڑانا، منت خوشامد کرنا اور ان سے حاجت براری کی التجا کرنا وغیرہ وغیرہ خاص عمل ہیں اور ان سب چیزوں سے صریح کفر لازم آتا ہے۔

سحر کی تیسری قسم وہ ہے جس میں ان انسانی ارواح کو مسخر کیا جاتا ہے جو جسم چھوڑ چکی ہوتی ہیں، اس قسم کو اختیار کرنے کے لئے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ کسی ایسے مرے ہوئے انسان کا پتہ لگایا جائے جو قوی الجثہ اور قوی القلب رہا ہو، پھر بعض مخصوص عملیات اور مخصوص الفاظ کے ورد کے ذریعہ کہ جو بڑے بڑے جنات و شیاطین کے ذکر اور ان کی بہت زیادہ تعظیم و توقیر کے مضامین پر مشتمل ہوتے ہیں ان ارواح کو اپنی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان الفاظ و عملیات کے زور سے اور نذرانے و بھینٹ چڑھانے کے ذریعہ اس روح کو اس طرح اپنے قابو و اختیار میں کرلیا جاتا ہے کہ غلام و نوکر کی طرح اس کو جو کام کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اس کو وہ انجام دیتی ہے یہ عمل بھی کفر کو لازم کرتا ہے یا کفر کے قریب پہنچا دیتا ہے۔ نیز اغلب یہ ہے کہ اس طرح کی ارواح کہ جو ان سفلی و شہوانی عملیات کے ذریعہ متوجہ ہوتی ہیں۔ دراصل ان انسانوں کی ارواح ہوتی ہیں۔ جو کفر و شرک و فسق و خبث کی حالت میں مرجاتے ہیں لہٰذا اس عمل سحر میں خباثت کی مخالفت بھی لازم آتی ہے۔

سحر کی چوتھی قسم وہ ہے جس میں بعض جنات کی ارواح کے ذریعہ کسی شخص کے خیالات و تصورات میں خلل ڈالتے اور اس کے ذہن کو فاسد کردیتے ہیں کہ اس کو حقیقت کے خلاف کچھ کا کچھ نظر آنے لگتا ہے یا وہ اپنی ہی صورت ہائلہ متخلیہ سے ڈرنے لگتا ہے اور یا غیر واقعی چیزوں کو واقعی سمجھنے لگتا ہے، سحر کی اس قسم کو نظر بندی یا خیال بندی کہتے ہیں اور بعض مفسرین نے آیت کریمہ یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی کے تحت کہا ہے کہ فرعون کے ساحروں کا سحر اسی قسم کا تھا جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو واسطہ پڑا تھا، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں وہ سب لکڑیاں اور رسیاں سانپ بن کر نظر آنے لگی تھیں جو فرعون کے جادوگروں نے ان کو ڈرانے کے لئے ان کے سامنے ڈال دی تھیں، اس طرح کا سحر اگر نبی ﷺ کے لئے اس کے مقابلہ پر ہوگا کہ اس کی نبوت کی دلیل و شہادت کو ختم کردیا جائے یا کسی ولی یا بزرگ کی حیثیت کو مجروح کرنے کے لئے اس کے مقابلہ پر پیش کیا جائے، تو حرام اور گناہ کبیرہ کے حکم میں ہوگا اور اگر اس کی نظر بندی کا مقصد کسی شخص کو دھوکا و فریب میں مبتلا کرنا یا کسی شخص کی عزت و آبرو یا اس کے مال میں خیانت کرنا ہو تو گناہ کبیرہ کے حکم میں ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ سحر کی یہ قسم اگرچہ بنفسہ کفر نہیں ہے لیکن کسی شخص کے خیالات و تصورات پر اثر انداز ہونے کے لئے یا یوں کہا جائے کہ اس نظر بندی یا شعبدہ بازی کو کامیاب کرنے کے لئے چونکہ جنات کی ارواح سے استمداد کرنا یا جنات کے ارواح کو جپنا ضروری ہوتا ہے اس لئے کفر لازم آتا ہے، بشرطیکہ اس استمداد اور اسماء کو جپنے میں ان جنات کی اتنی زیادہ تعظیم و توقیر کا اظہار کیا جائے جو عقیدہ توحید کے منافی ہو۔

سحر کی پانچویں قسم وہ ہے جس میں انسان خود اپنے دھیان اور حواس خمسہ کی قوتوں کو دماغ میں مجتمع کرتے ہوئے کمال یکسوئی پیدا کر کے ایک ایسی قوت و قدرت حاصل کرلیتا ہے اس کے ذریعہ وہ اس خیال کو جو اس کی قوت متخلیہ میں ہوتا ہے (اور جس کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے) متشکل کر کے سامنے لے آتا ہے، جسمانی طول، عرض عمق کی حدود و قیود سے آزادی حاصل کرتے ہوئے مسمریزم کی طاقت سے شعبدے دکھلاتا ہے اور نظر یک سے دو متصل چیزوں کو منفصل کر دکھاتا ہے۔ اور دو علیحدہ علیحدہ چیزوں کو ملا کر دکھلا دیتا ہے۔ سحر کی اس قسم کا اب نام و نشان بھی موجود نہیں ہے، لیکن پچھلے زمانہ میں ہندوستان کی بعض قدیم اقوام میں یہ قسم بہت رائج تھی اس قسم کے حصول کے لئے جہاں اور بھی بہت شرائط ہیں، انہیں میں دو سب سے زیادہ اہم اور ضروری شرط کھانے پینے میں بالکل کمی اور لوگوں سے گوشہ نشینی اختیار کرلینا ہے اس کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر اس کے ذریعہ کسی مباح چیز کا حصول مقصود ہو، جیسے دو زناکاروں کے درمیان جدائی ڈالنا یا کسی ظالم کو مار ڈالنا تو سحر کی یہ قسم جائز ہوگی اور اگر کسی ممنوع چیز کا حصول مقصود ہو جیسے میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالنا یا کسی معصوم انسان کو ہلاک کردینا تو پھر یہ قسم بھی حرام ہوگی۔

سحر کی چھٹی قسم وہ ہے جس میں دواؤں یا اشیاء کے مخفی خواص معلوم کر کے ان کے ذریعہ عجیب وغریب کرشمے دکھائے جاتے ہیں اور چونکہ عام لوگ اس مخفی خواص سے قطعالاعلم ہوتے ہیں اس لئے اکثر دنیا اور پیر وفقیر اور جوگی اپنی حیلہ سازیوں سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیتے ہیں، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں لوگوں پر اپنی "کرامت" ظاہر کرنے کے لئے اپنی انگلیوں کو روشن کردوں تو اس کا طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے کہ تھوڑا سا نوره کابلی سرکہ میں بھگو کر اس میں تھوڑا سا کف دریا ملا دیا جائے اور پھر انگلی پر اس کا لیپ کیا جائے اور جس جگہ لیپ کیا جائے وہاں رال ٹپکا دی جائے اب لوگوں کی کسی ایسی مجلس میں کہ جہاں شمع یا چراغ جلتا ہو اس انگلی کو چراغ کے سامنے کر دیا وہ انگلی روشن ہو جائے گی اور جلے گی نہیں۔

سحر کی ساتویں قسم وہ ہے جس میں ایجاد کئے گئے عجیب وغریب آلات کی مدد سے بعض چیزوں کو ترکیب دے کر حیرت انگیز امور انجام دیئے جائیں! ان آلات کو ایجاد کرنا عام طور پر مختلف علوم وفنون میں تعمق اور تحقیق و جستجو پر منحصر ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ فرعون کے ساحروں کی جادوگری نظر بندی اور شعبدہ بازی کے ساتھ اس طرح کی جنی مہارت کا بھی پرتو تھی، آج کل کی سائنسی ایجادات کو بھی اس قسم میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

سحر کی آٹھویں قسم وہ ہے جس میں ہاتھ کی صفائی کے ذریعہ مختلف شعبدے دکھلا کر لوگوں کو متحیر کیا جاتا ہے سحر کی اس قسم میں ہاتھ کا سرعت کے ساتھ چند مخصوص پوشیدہ حرکات اور تبدیل امثال کر دینا ہے "خفیہ سبب" ہوتا ہے۔

سحر کی یہ تینوں آخری قسمیں نہ تو کفر ہیں اور نہ حرام، ہاں اگر ان کو کسی حرام چیز کے حصول یا کسی حرام کام کے اظہار کا ذریعہ بنایا جائے تو اس بنا پر ان پر حرمت کا حکم ثابت ہو جائے گا۔

واضح رہے کہ سحر کی جو آٹھ قسمیں بیان کی گئی ہیں یہ صرف لفظی اعتبار سے ہیں، کیونکہ عربی زبان میں سحر یعنی جادو ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو محیر العقول ہو اور جس کا سبب و ذریعہ نظروں سے پوشیدہ ہو اگر سحر یا جادو کے اصطلاحی و حرفی مفہوم اور اس کی مشہور تعریف و حقیقت کا اعتبار کیا جائے تو اصولی طور پر سحر کی تین ہی قسمیں ہونی چاہئیں ایک تو وہ سحر جس میں کواکب و سیارات کی قوتوں سے استمداد کر کے ہوشربا کرشمے اور محیر العقول طلسمات ظاہر کئے جائیں۔ دوسرا وہ سحر جس میں جنات و شیاطین اور مردہ انسانوں کی ارواح کو مسخر کر کے حاجت روائی کی جائے۔ اور تیسرا وہ سحر جس میں اپنے دھیان اور خواس خمسہ کی قوتوں کو دماغ میں مجتمع کرتے ہوئے نظر بندی اور شعبدہ بازی کا کمال حاصل کیا جائے۔

سحر کا بدل کیا ہے؟

اس بات کو بھی جاننا ضروری ہے کہ اس اُمت کے اذکیاء وعارفین نے سحر کی مذکورہ بالا قسموں میں سے اکثر کی اصطلاح کر کے اور اس کی بنیاد سے کفر و شرک کی غلاظتوں کو دور کر کے ان کو عملیات کی صورت میں پیش کیا ہے جس سے مختلف قسم کے روحانی اور جسمانی فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں، چنانچہ سحر کی پہلی قسم کی اصلاح دعوت علوی ہے یہ وہ عمل ہے جس میں ملائکہ علویہ کو اسماء الٰہی اور آیات قرآنی کی استعانت سے مسخر کیا جاتا ہے، دوسری قسم کی اصلاح عزائم اور دعوت سفلی ہے، اس عمل میں زمین کے موکلات اور جنات کو مسخر کیا جاتا ہے لیکن اس تسخیر میں بھی نہ کفر و شرک کی آمیزش ہوتی ہے اور غیر اللہ کی تعظیم و توقیر، بلکہ ان جنات و شیاطین کو حکم و استیلاء کے ذریعہ مسخر کیا جاتا ہے، تیسری قسم کی اصلاح وہ عملیات ہیں جن کے ذریعہ صلحاء اور اولیاء اللہ کی ارواح طیبہ سے ربط و تعلق پیدا کیا جاتا ہے اور عام طور اویسی مشرب بزرگ ان عملیات کو اختیار کر کے اپنے اور مخلوق خدا کے مقاصد و حوائج میں فائدہ حاصل کرتے ہیں ان عملیات کی بنیاد، طہارت و پاکیزگی، تلاوت قرآن اوراد و وظائف اور ان ارواح کو صدقات و خیرات کا ثواب پہنچانے پر ہوتی ہے پانچویں قسم کی اصلاح عقد ہمت ہے جو اونچے درجے کے مشائخ اور صوفیاء کرام حل مشکلات کے لئے اختیار کرتے ہیں جس میں دنیاوی امور سے کامل بے خبری پیدا کر کے اور اپنے دھیان و اپنے خیالات کو یکسو کر کے اسماء الٰہی میں سے کسی اسم پاک کے غور فکر میں استغراق کا درجہ حاصل کیا

جاتا ہے اور چھٹی قسم کی اصلاح وہ عملیات ہیں جن میں آیات قرآنی اور اسماء الٰہی کے خواص میں تعمق و جستجو کر کے ان کو مخصوص ترکیب و شرائط کے ساتھ یا ان کے اعداد کی صورت میں نقش و تعویذات لکھے جاتے ہیں، یا دعاؤں کے ذریعہ جھاڑ پھونک کی جاتی ہے جیسا کہ نقش و تعویذات اوراد و عملیات کی کتابوں میں اس کی تفصیل لکھی ہوتی ہے۔

حاصل یہ کہ سحر میں جو برائی ہے وہ محض اس وجہ سے کہ اس کی بنیاد کفر و شرک، نیز کواکب و سیارات، جنات و شیاطین اور ارواح خبیثہ کی تاثیر کے اعتقاد پر ہوتی ہے اور اس سے فائدہ حاصل کرنا اس پر موقوف ہوتا ہے کہ غیر اللہ سے رد و اعانت کی التجا کی جائے، ان کو حاجت روا مانا جائے اور اسباب و ذرائع پر اس طرح اعتماد کیا جائے کہ سبب یعنی حق تعالیٰ کی قدرت سے بالکل صرف نظر کر لیا جائے اور جب برائی کی یہ وجہ بالکل دور ہو جائے تو پھر اصل حرمت و حلت کا مدار غرض و مقاصد پر ہوگا کہ اگر کوئی نیک و مباح مقصد پیش نظر ہے تو سحر و عملیات کی طاقت سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا، اور اگر غرض و مقصد کسی بری چیز اور ناجائز امور سے متعلق ہو تو اس صورت میں بھی "سحر" کی طاقت سے فائدہ اٹھانا ناجائز ہوگا۔

جو علم نفع پہنچانے والا نہ ہو اس سے احتراز کرنا ہی دانشمندی ہے

مولانا شاہ عبدالعزیز" آیت کریمہ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ الاية کے اس ٹکڑے وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہودی ان دونوں طرح کے سحر سیکھنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے۔ جو انتہائی مذموم و قبیح ہیں بلکہ وہ اپنے اوقات اور اپنی صلاحیتوں کو دوسرے ایسے علوم کے حصول میں بھی صرف کرتے تھے جو علم شریعت اور وحی الٰہی سے دور کر دینے کا ذریعہ اور موجب بنتے ہیں، چنانچہ وہ اس طرح کے علوم سیکھتے تھے جو ان کے لئے نقصان دہ ہوتے تھے گو دوسروں کو نقصان نہ پہنچاتے ہوں اور ان سے خود ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تھا۔ گو اوروں کو فائدہ پہنچتا ہو، لہٰذا عقلمندی، سمجھداری کا تقاضہ یہی ہے کہ انسان ہر اس علم و فن سے احتراز کرے جو نفع بخش ہونے کی بجائے کسی طرح کا نقصان پہنچانے والا ہو۔ مگر واضح رہے کہ کسی شخص کے حق میں کسی علم کا مذموم و معیوب ہونا ان تینوں جہتوں میں سے کسی ایک جہت کے سبب سے ہوتا ہے ایک تو یہ کہ اس علم سے خود اپنے کو یا دوسروں کو نقصان پہنچنے کا خوف ہو، جیسے سحر و طلسمات کا علم نجوم کا علم بھی اسی میں شامل ہے کیونکہ اس کے ذریعہ اکثر لوگ عقیدہ کی گمراہی میں مبتلا ہو کر اپنا اخروی نقصان کرتے ہیں، چنانچہ جب وہ زمین اور کواکب سیارات کا باہم ربط دیکھتے ہیں اور علم نجوم ان کو بتاتا ہے کہ کرہ ارضی پر رونما ہونے والے تغیرات و واقعات اجرام فلکی کی حرکت و سکون اور سیارگان کی چال کے زیر اثر ہوتے ہیں تو ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ عالم میں جو بھی حادثہ و تغیر وقوع پذیر ہوا ہو وہ فلاں ستارے فلاں برج اور فلاں درجے کی تاثیر کے سبب سے ہے۔ اس طرح وہ اپنے مقاصد کے حصول کی امید یا مقاصد کے فوت ہو جانے کے خوف کو ستاروں اور ان کے بروج و منازل سے وابستہ کرتے ہیں۔ یعنی وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اگر فلاں ستارہ فلاں برج اور فلاں منزل میں ہوگا تو ہمارا فلاں مطلب حاصل ہوگا اور اگر فلاں ستارہ فلاں برج و منتری میں داخل ہوگا تو ہمارا فلاں مطلب حاصل نہیں ہوگا گویا ان کی توجہ ذات حق جل مجدہ کی طرف سے ہٹ جاتی ہے۔ جو نفع و نقصان کا حقیقی مالک ہے اور ان کے دل پر ایسا پردہ پڑ جاتا ہے جو ان کو نظر الی اللہ سے روک دیتا ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ علم اگرچہ بذات خود نقصان پہنچانے والا نہ ہو، لیکن اس کو حاصل کرنے کا دعویدار اس کے حقائق و نکات اور اس کے باریک و مخفی گوشوں تک اپنی عدم صلاحیت اور عدم استعداد کی وجہ سے نہ پہنچ سکتا ہو، ظاہر ہے کہ ایسا شخص جو علم کے حقائق و دقائق تک رسائی ہی نہ حاصل کر سکا ہو اس علم کا فاضل و ماہر تو ہونے سے رہا، البتہ جہل مرکب میں ضرور مبتلا ہو جائے گا، اسی لئے بے صلاحیت لوگوں کا اسرار و رموز الٰہیہ احکام شرعیہ کے بارے میں بحث و تمحیص کرنا، اکثر و بیشتر فلسفیانہ علوم میں جان کھپانا، قضا و قدر اور صبر و اختیار کے مسئلے میں تحقیق و جستجو کرنا مسئلہ توحید وجودی و شہودی کی راہ پر لگنا، اور بعض صحابہؓ کے درمیان آپسی نزاعات و خصومات کی جو صورتیں پیدا ہو گئی تھیں ان کو علم و تحقیق کے نام پر اچھالنا یا ان کی کھوج کرید کرنا وغیرہ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کو مذکورہ بالا علم کے زمرہ میں

شمار کیا جاتا ہے، اسی طرح شعرو شاعری کے فن کو بھی کچھ اچھا علم نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ شعرو شاعری کی بنیاد زیادہ تر حسن و عشق کے مضامین اور غیر پاکیزہ خیالات و تصورات پر ہوئی ہے اور یہ چیز عوام کے حق میں کہ جن کے دل و دماغ نفسانی خواہشات اور جنسی جذبات سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں زہر جیسی تاثیر رکھتی ہے اور تمام امور میں تخیل پردازی و مبالغہ آرائی کا ملکہ پیدا کرتی ہے۔

اور تیسرے یہ کہ شریعت سے متعلق علوم محمودہ میں بے جا فکر اور تعمق کیا جائے اور اس میں افراط و تفریط سے کام لیا جائے، جیسے عقائد و توحید کے علوم میں فلسفیانہ موشگافیاں اور دیگر شرعی علوم و قواعد میں عقل و منطق کی غیر موزوں اور غیر ضروری نکتہ آفرینیاں کی جائیں، اور فقہی احکام و مسائل میں کھوج کرید کر کے بے اصل حیلوں اور نادر روایات و اقوال کو بیان کیا جائے اسی طرح سلوک و ریاضت کے علم میں ایسے اصول و قواعد اور اعمال و اشغال داخل کرنا جو جوگیوں وغیرہ کا طریقہ ہے۔ یا دعوت اسماء الٰہی اور دوسرے عملیات دعا تعویذ اور جھاڑ پھونک میں سحر و طلسمات کے اصول و قواعد کو شامل کرنا، یا انبیاء علیہم السلام کے قصص و حالات میں یہود و روافض جیسے معاندین حق کے بیان کردہ جھوٹے قصے اور روایات کو سننا ان کو بیان کرنا کہ جن سے عقائد وغیرہ بھی اسی حکم میں شامل ہیں۔

غرضیکہ علم کی یہ جو قسمیں بیان کی گئی ہیں ان کے متوقع فوائد لوگوں کو نہیں پہنچتے، بلکہ ان کے حق میں نقصان دہ ہوتے ہیں، یہودی عام طور پر انہی جیسے لاحاصل، بے مقصد اور غیر نفع بخش علوم میں مشغول و مصروف رہتے تھے اور اصل علوم محمودہ سے اعراض کرتے تھے۔

بَابُ الفَالِ وَالطِّيَرَةِ

فال اور طیرہ کا بیان

"فال" اصل میں تو مطلق شگون کو کہتے ہیں، لیکن عام طور پر اس لفظ کا استعمال نیک شگون یا اچھی خال کے معنی میں ہوتا ہے۔ نیک شگون یا اچھی خال کا مطلب ہے کسی اچھی بات کو سننا یا کسی اچھی چیز کو دیکھنا جس سے اپنی مراد حاصل ہونے کی توقع پیدا ہو، مثلاً کوئی شخص بیمار ہو اور اس بات کے تردد اندیشہ میں ہو کہ صحت پاؤں گا یا نہیں اور اس حالت میں وہ سنے کہ کوئی کہہ رہا ہے۔ یَاسَالِمُ یا کوئی شخص میدان جنگ رہا تھا کہ ایک شخص سے ملاقات ہوگئی۔ جس کا نام ظفر خاں یا فتح علی تھا، اور یا مثلاً کوئی شخص کسی چیز کا طالب ہو یا اس کی کوئی چیز گم ہوگئی ہو اور وہ اس کو تلاش کر رہا ہو اور اسی اثناء میں اس کے کان میں یا واجد کی آواز آئے! بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ کبھی لفظ "فال" برائی کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز کا واقع ہونا بری فال ہے۔ یا زبان سے بری بات نکالنا بد فالی ہے۔

"طیرۃ" تطیر (یعنی بد فالی لینا) کا مصدر ہے جیسا کہ "خیرہ" تخیر کا مصدر ہے ان دونوں لفظوں کے سوا پر مطلق فال یعنی شگون کے معنی میں بھی ہوتا ہے جو وہ فال اچھی ہو یا بری۔

تطیر کی اصل اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب عام طور پر اس طرح شگون لیتے تھے کہ جب وہ کوئی کام کرتے یا کسی سفر پر جانے کا ارادہ کرتے تو کسی پرندے یا ہرن کو چھچکار دیتے اگر وہ داہنی سمت میں اڑ جاتا یا دائیں طرف کو بھاگتا تو اس کو مبارک جانتے اور نیک فال لیتے اور پھر اس کام کو شروع کرتے یا سفر پر روانہ ہوتے، اور اگر وہ پرندہ یا ہرن بائیں سمت میں اڑتا یا بائیں طرف کو بھاگتا تو اس کو نجس جانتے اور اس کام سے باز رہتے۔

واضح رہے کہ شکار کے اس جانور کو سنوح یا سانح کہتے ہیں جو سامنے سے نمودار ہو کر بائیں طرف سے دائیں طرف کو جا رہا ہو، اور شکار کا جو جانور دائیں طرف سے بائیں طرف کو جا رہا ہو اس کو بروح یا بارح کہتے ہیں عرب کے لوگ سنوح کو مبارک اور بروح کو منحوس سمجھتے تھے چنانچہ بعض مواقع پر "سوانح" اور "بوارح" اور ان کے ذریعہ شگون لینے کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کے یہی معنی ہیں۔

یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ نیک فال لینا محمود و مستحسن بلکہ مستحب ہے جب کہ تطیر یعنی بری فال لینا مذموم و ممنوع ہے چنانچہ نبی

کریم ﷺ کثرت کے ساتھ اور خاص طور پر لوگوں کے ناموں اور جگہوں کے ذریعہ اچھی فال لیتے تھے ان دونوں میں فرق و امتیاز اس بنا پر ہے کہ نیک فال میں اول اول تو اطمینان اور خوشی حاصل ہوتی ہے دوسرے اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے اچھائی و بھلائی کی امید آوری ہوتی ہے، نیز دل میں اچھائی اور بھلائی ہی کا خیال آتا ہے اور یہ امید آوری اور یہ خیال ہر حالت میں بندے کے لئے بہتر ہے گو اس کی مراد پوری نہ ہو، اور بدفالی اس لئے ممنوع و مذموم ہے کہ اس میں خواہ مخواہ رنج اور تردد پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے قطع امید ہوتی ہے اور ناامیدی و نامرادی کا احساس اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا کر دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ چیزیں شرعاً مذموم و ممنوع بھی ہیں اور عقل و دانش کے منافی بھی ہیں جب کہ بہر صورت ہوگا وہی جو اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے۔

بہر حال اس باب میں وہ احادیث نقل کی جائیں گی جو فال وطیرہ سے متعلق اور جن کی تحقیق اوپر بیان کی گئی نیز مؤلف مشکوۃ نے اس باب میں وہ احادیث نقل کی ہیں، جن میں عدویٰ، ہامہ، اور ان جیسی دوسری اور چیزوں کا ذکر ہے اور یہ سب بھی تطیر یعنی بدفالی کے مفہوم کی حامل اور اسی کے حکم میں داخل ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

بدشگونی لینا منع ہے

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَاطِيَرَةَ خَيْرُهَا الْفَالُ قَالُوْا وَمَا الْفَالُ قَالَ الْكَلِمَةُ الصَّالِحَةُ يَسْمَعُهَا اَحَدُكُمْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ۔ "بدشگونی بے حقیقت ہے اس سے بہتر تو اچھی فال ہے۔" صحابہؓ نے عرض کیا کہ اور فال کیا چیز ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ اچھا کلمہ جس کو تم میں سے کوئی شخص سنے اور اس سے اپنی مراد پانے کی توقع پیدا کرے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "بدشگونی بے حقیقت ہے" کا مطلب یہ ہے کہ حصول منفعت یا دفع مضرت میں بدفالی لینے کا کوئی عمل دخل نہیں ہے اور نہ شریعت نے اس کو سبب اعتبار قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس کا کوئی اعتقاد و اعتبار نہ کرنا چاہئے۔ چونکہ ہوگا وہی جو قادر مطلق (اللہ تعالیٰ) کی مرضی ہوگی اس لئے بدفالی لے کر اپنے آپ کو خواہ مخواہ خوف و اندیشہ اور ناامیدی میں کیوں مبتلا کیا جائے۔ طیرہ یعنی بدفالی کی نفی کرنے اور اس کی ممانعت کو ظاہر کرنے کے بعد آپ ﷺ نے فال کی تعریف کی اور یہ فرمایا کہ طیرہ کی بہترین صورت اچھی فال ہے۔ گویا حدیث میں "طیرہ" مطلق فال لینے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے لیکن اس موقع پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ حدیث کی عبارت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اچھی فال لینا بہتر ہے۔ اور بدفالی لینا بھی کسی نہ کسی درجہ میں اچھی چیز ہے حالانکہ حقیقت میں بدفالی اچھی چیز نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس عبارت میں لفظ خیر اصل میں بہ کے مفہوم میں ہے نہ کہ بہتر کے معنی میں جیسا کہ یہ جملہ ہے۔ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰی۔ وَاَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَيْرٌ ایک جواب یہ بھی ہے کہ یہ ارشاد گرامی ﷺ دراصل اہل عرب کے گمان و اعتقاد پر مبنی ہے کہ وہ بدفالی کو بھی پسندیدہ چیز سمجھتے تھے یا یہ کہ اس عبارت کی بنیاد یہ ہے کہ اگر طیرہ کا اچھا ہونا بالفرض ممکن بھی ہوتا تو فال اس سے بہتر چیز ہوتی۔

"وہ اچھا کلمہ......" کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو کوئی ایسا جملہ سنائی دے جس سے اس کے دل میں اپنے مطلوب و مقصود کے حاصل ہو جانے کی امید پیدا ہو جائے اور وہ اس لفظ یا جملے کو اپنے حق میں گویا اچھی پیشگوئی سمجھے جیسے کوئی شخص اپنی کسی گمشدہ چیز کو تلاش کر رہا ہو کہ وہ یہ آواز سنے یا واجد یا کوئی شخص راستہ بھول گیا ہو اور اس کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہا ہو کہ اس کے کان میں کسی طرف سے یہ آواز آئے۔ یا راشد۔

چند بے اصل باتیں اور ان کا بطلان

④ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاعَدْوٰى وَلَاطِيَرَةَ وَلَاهَامَةَ وَلَاصَفَرَ وَفِرَّمِنَ الْمَجْزُوْمِ كَمَاتَفِرُّمِنَ الْاَسَدِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ بیماری کا ایک سے دوسرے کو لگنا بدشگونی ہامہ، اور صفر یہ سب چیزیں بے حقیقت ہیں (البتہ) تم جذامی سے اس طرح بھاگو جس طرح شیر سے بھاگتے ہو۔" (بخاریؒ)

تشریح: یہ خیال کہ ایک شخص کی بیماری دوسرے کو لگ جاتی ہے، زمانہ جاہلیت کی یادگار ہے، چنانچہ اہل عرب کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص بیمار کے پہلو میں بیٹھ جائے یا اس کے ساتھ کھائے پئے تو وہ بیماری اس میں بھی سرایت کر جائے گی۔ علماء لکھتے ہیں کہ عام طور پر اطباء کے نزدیک سات بیماریاں ایسی ہیں جو ایک سے دوسرے کو لگتی ہیں ① جذام ② خارش ③ چیچک ④ آبلے جو بدن پر پڑ جاتے ہیں ⑤ گندہ دہنی ⑥ رمد ⑦ وبائی امراض۔

لہٰذا شارع علیہ السلام نے اس اعتقاد خیال کو رد کرتے ہوئے واضح کیا کہ مرض کا ایک سے دوسرے میں سرایت کرنا اور اڑ کر لگنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا بلکہ اس کا تعلق نظام قدرت اور قادر مطلق کی مشیت سے ہے کہ جس طرح پہلا شخص بیمار ہوا ہے اسی طرح دوسرا شخص بھی اس بیماری میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ جب تمام امراض کے ہی بارے میں چھوت کے اعتقاد و نظریہ کی تردید کی گئی ہے تو پھر جذامی سے بھاگنے کا حکم کیوں دیا گیا اور اس طرح خود اس حدیث کے مفہوم میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے تو اس کا جواب انشاء اللہ فصل کے آخر میں نقل کیا جائے گا۔

بدشگونی کے بارے میں تو اوپر بیان کیا جا چکا ہے! "ھَامًا" کے اصل معنی سر کے ہیں، لیکن یہاں اس لفظ سے ایک خاص جانور مراد ہے جو عربوں کے گمان کے مطابق میت کے استخوان سے پیدا ہو کر اڑتا ہے، زمانہ جاہلیت میں اہل عرب یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اگر کسی شخص کو قتل کر دیا جاتا ہے تو اس مقتول کے سر سے ایک جانور جس کو "ہامہ" کہتے ہیں باہر نکلتا ہے اور ہر وقت یہ فریاد کرتا رہتا ہے کہ مجھے پانی دو، پانی دو، یا وہ قاتل سے انتقام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جب قاتل (خود اپنی موت سے یا کسی کے قتل کر دینے سے) مر جاتا ہے تو وہ جانور اڑ کر غائب ہو جاتا ہے۔

بعض لوگ یہ کہا کرتے تھے خود مقتول کی روح اس جانور کا روپ اختیار کر لیتی ہے اور فریاد کرتی ہے تاکہ قاتل سے بدلہ لے سکے جب اس کو قاتل سے بدلہ مل جاتا ہے تو اڑ کر غائب ہو جاتا ہے۔ شارع علیہ السلام نے اس اعتقاد کو بھی باطل قرار دیا اور فرمایا کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ "ہامہ" سے مراد الو ہے کہ جب وہ کسی گھر پر بیٹھ جاتا ہے تو وہ گھر ویران ہو جاتا ہے۔ یا اس گھر کا کوئی فرد مر جاتا ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد گرامی کے ذریعہ اس عقیدہ کو بالکل مہمل قرار دیا اور واضح رہے فرمایا کہ تطیر یعنی پرندہ کے ذریعہ بدفالی لینے کے حکم میں ہے جو ایک ممنوع چیز ہے۔

"صفر" کی وضاحت میں متعدد اقوال بیان کئے جاتے ہیں۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس سے تیرہ تیزی کا مہینہ مراد ہے جو محرم کے بعد آتا ہے اور جس کو صفر کہتے ہیں، چوں کہ کمزور عقیدہ لوگ اس مہینہ کو منحوس سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس مہینے میں آفات وبلاء اور حوادث و مصائب کا نزول ہوتا ہے اس لئے اس ارشاد کے ذریعہ اس عقیدے کو باطل و بے اصل قرار دیا گیا۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اہل عرب یہ کہا کرتے تھے کہ ہر انسان کے پیٹ میں ایک سانپ ہوتا ہے۔ جس کو "صفر" کہا جاتا ہے ان کے گمان کے مطابق جب پیٹ خالی ہوتا ہے اور بھوک لگتی ہے تو وہ سانپ کاٹتا ہے اور تکلیف پہنچاتا ہے ان کا کہنا تھا کہ بھوک کے

وقت پیٹ میں جو ایک قسم کی تکلیف محسوس ہوتی ہے وہ اسی سانپ کے سبب سے ہوتی ہے اور اس کے اثرات ایک دوسرے میں سرایت کرتے ہیں۔ نوویؒ نے شرح مسلم میں یہ لکھا ہے کہ بعض لوگوں کے گمان کے مطابق "صفر" ان کیڑوں کو کہتے ہیں جو پیٹ میں ہوتے ہیں اور بھوک کے وقت کاٹتے ہیں۔ بسا اوقات ان کے سبب سے آدمی زرد رنگ کا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہلاک بھی ہو جاتا ہے۔ یہ سب بے اصل باتیں ہیں جن کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں ہے۔

کسی بیماری کا متعدی ہونا بے حقیقت بات ہے

(۳) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاعَدْوٰى وَلَا هَامَةَ وَلَا صَفَرَ فَقَالَ اَعْرَابِيٌّ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَمَابَالُ الْاِبِلِ تَكُوْنُ فِي الرَّمْلِ لَكَاَنَّهَا الظِّبَاءُ فَيُخَالِطُهَا الْبَعِيْرُ الْاَجْرَبُ فَيُجْرِبُهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَنْ اَعْدَى الْاَوَّلَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کسی بیماری کا ایک سے دوسرے کو اڑ کر لگنا، ہامہ، اور صفر، ان سب کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ (ایک دیہاتی نے کہ جو اپنے ناقص مشاہدے و تجربہ کی بنا پر خارش کو متعدی بیماری سمجھتا تھا) آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد سن کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! تو پھر ان اونٹوں کے بارے میں کہا جائے گا (جو اپنی تندرستی اور اپنی جلد کھال کی صفائی ستھرائی کے اعتبار سے) ہرن کی مانند ریگستان میں دوڑے پھرتے ہیں، لیکن جب کوئی خارشی اونٹ ان میں مل جاتا ہے تو وہ دوسروں کو بھی خارش زدہ بنا دیتا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا (اچھا تو یہ بتاؤ) پہلے اونٹ کو کس نے خارش زدہ بنایا؟ یعنی خارش پیدا ہونے کے لئے یہی ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی سے اڑ کر لگے لہٰذا جس طرح ان تندرست اونٹوں میں آملنے والے خارش زدہ اونٹ میں خارش کا پیدا ہونا بتقدیر الٰہی ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے اونٹوں کا خارش زدہ ہو جانا بھی حکم الٰہی کے تحت اور نظام قدرت کے مطابق ہوتا ہے۔" (مسلمؒ)۔

(۴) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاعَدْوٰى وَلَا هَامَةَ وَلَا نَوْءَ وَلَا صَفَرَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ایک دوسرے کو بیماری لگنا۔ ہامہ، نوء اور صفر کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "نوء" کا مطلب ہے کہ ایک ستارہ کا غروب ہونا اور دوسرے کا طلوع ہونا۔ اہل عرب کے خیال میں بارش کا ہونا یا نہ ہونا ستاروں کے اسی طلوع و غروب کے زیر اثر ہے جیسا کہ علم نجوم پر اعتقاد رکھنے والے لوگ کہا کرتے ہیں کہ بارش کا تعلق نچھتروں سے ہے کہ فلاں فلاں نچھتر اگر فلاں فلاں تاریخ میں پڑ جائیں اور ان تاریخوں میں بارش ہو جائے تو آگے چل کر برسات کے مہینوں میں فلاں فلاں تاریخوں میں بارش ہوگی۔

نہایہ میں لکھا ہے کہ "نوء" کی جمع انواء ہے جس کے معنی قمر کے ہیں منازل یعنی نچھتروں کے ہیں اور وہ منازل اٹھائیس ہیں قرآن کریم کی آیت کریمہ "وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ" میں ان ہی منازل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، چنانچہ اہل عرب نزول باراں کو انہی منازل کی طرف منسوب کرتے تھے ان کا کہنا تھا کہ جب چاند ان سے فلاں فلاں منازل میں آتا ہے تو بارش یقیناً ہوتی ہے گویا ان کے نزدیک چاند کا ان منازل میں آنا بارش ہونے کے لئے علت اور مؤثر حقیقی کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ شارع علیہ السلام نے اس عقیدے کو باطل قرار دیا اور واضح کیا کہ بارش کا ہونا محض حکم الٰہی پر منحصر ہے نہ کہ کسی سبب اور علت سے متعلق ہے لیکن واضح رہے کہ اس نفی و ابطال کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ تاثیر علت کا اعتقاد ہو ہاں اگر منازل میں چاند کے آنے کو نزول باراں کا ایک ظاہری سبب سمجھا جائے۔ یعنی یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس وقت بارش برساتا ہے جب کہ چاند اپنی اپنی فلاں منزل میں آتا ہے اور وہ وقت علت کا درجہ نہیں رکھتا بلکہ محض ایک ظاہری سبب کا درجہ رکھتا ہے کہ حق تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ اس وقت سے پہلے یا اس کے بعد بھی بارش برسائے اور اگر چاہے تو اس

وقت بھی نہ برسائے تو یہ عقیدہ نہ کفر کے دائرے میں آئے گا اور نہ اس کو باطل کہا جائے گا۔ اگرچہ امام نوویؒ کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ بھی کفر کا سبب ہے کیونکہ نزول باراں کو چاند اور اس کے منازل سے کسی بھی طرح متعلق کرنا اول تو اہل کفر کا شعار ہے، دوسرے مذکورہ صورت (اگرچہ علیت کے عقیدہ کو ظاہر نہیں کرتی مگر موہم علیت تو یقیناً ہے، اس بارے میں زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ حدیث مذکورہ ممانعت مطلق (بلا استثناء) ہے کہ اس کا تعلق علیت کے عقیدے سے بھی ہے اور اس صورت سے بھی ہے جس میں چاند اور اس کی منازل کو محض ایک ظاہری سبب سمجھا جائے، کیونکہ اول تو اس ارشاد کا مقصود عقیدے کی گمراہی و فساد کا سدباب ہے دوسری ایسی کوئی حدیث منقول نہیں ہے جس سے اس کا جواز کسی بھی صورت میں ثابت ہو۔ حاصل یہ کہ جب بارش ہو، اس طرح نہیں کہنا چاہئے کہ فلاں نچھتر سے بارش ہوئی ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بارش ہوئی ہے۔

غول کا ذکر

⑤ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَاعَدْوٰى وَلَا صَفَرَ وَلَا غُوْلَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ۔ "ایک سے دوسرے کو بیماری کا لگنا، صفر اور غول کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "غول" جس کی جمع غیلان ہے جنات و شیاطین کی ایک قسم و جنس ہے، اہل عرب کا خیال تھا کہ جنگلات میں غول مختلف صورتوں اور شکلوں میں لوگوں کو دکھائی دیتے ہیں اور ان کو راستہ بھلا دیتے ہیں اور ہلاک کر ڈالتے ہیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس خیال کو باطل قرار دیا اور فرمایا کہ غول کوئی چیز نہیں ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ارشاد گرامی ﷺ میں غول کے وجود کی نفی مراد نہیں ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان (غول) کا مختلف صورتوں میں ظاہر ہونا اور لوگوں کو گمراہ و ہلاک کر دینا ایک بے حقیقت بات ہے یعنی ان کو اتنی قدرت و طاقت حاصل ہی نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر مسافروں کو راستہ بھلا دیں اور ان کو ہلاک کر ڈالیں۔

جذامی کا ذکر

⑥ وَعَنْ عَمْرِوبْنِ الشَّرِيْدِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كَانَ فِيْ وَفْدِ ثَقِيْفٍ رَجُلٌ مَجْذُوْمٌ فَاَرْسَلَ اِلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّاقَدْ بَايَعْنَاكَ فَارْجِعْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمرو ابن شرید اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ قبیلہ ثقیف کے لوگوں کا جو وفد (دربار رسالت میں) آیا تھا اس میں ایک جذامی تھا (جب اس جذامی نے بیعت کے لئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا) تو نبی کریم ﷺ نے اس کے پاس ایک آدمی کو بھیج کر کہلا دیا کہ ہم نے (تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے بغیر) تم سے (زبانی) بیعت لے لی ہے، لہٰذا تم لوٹ جاؤ (گویا آپ ﷺ نے اس کو سامنے نہیں بلایا تاکہ حاضرین مجلس کو کراہت محسوس نہ ہو)۔" (مسلمؒ)

تشریح: جذامی سے ملنے جلنے میں اجتناب و احتراز کے بارے میں ایک تو یہ حدیث ہے، دوسری حدیث وہ ہے جو پیچھے گزری ہے اور جس میں فرمایا گیا کہ جذامی سے اس طرح بھاگو جس طرح شیر سے بھاگتے ہو ان دونوں حدیثوں سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ جذامی کی صحبت و مجالست سے اجتناب و پرہیز کرنا چاہئے، جب کہ وہ احادیث ان کے برعکس ہیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ کسی بیماری کا ایک سے دوسرے کو لگنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا، ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں بالکل متضاد ہیں، اس تضاد کو دور کرنے کے لئے اور ان احادیث کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے علماء کے متعدد اقوال منقول ہیں، حضرت شیخ ابن حجر عسقلانیؒ نے شرح نخبہ میں لکھا ہے کہ احادیث کے اس باہمی

تضاد کو دور کرنے کے لئے سب سے بہتر قول یہ ہے کہ جن احادیث میں عدوی یعنی چھوت کی نفی کی گئی ہے ان کا حکم اپنے عموم و اطلاق کے ساتھ قائم و باقی ہے اور ان لوگوں کی مخالطت و مجالست جو جذام جیسے امراض میں مبتلا ہوں ان کی بیماری لگنے کا سبب ہرگز نہیں ہوتا اور جہاں تک احادیث کا تعلق ہے جو جذامی سے اجتناب و پرہیز کو ظاہر کرتی ہیں تو ان کا مقصد محض اوہام و وساوس کا سدباب ہے کہ کوئی شخص شرک کے گرداب میں نہ پھنس جائے۔ اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر کسی شخص نے جذامی کے ساتھ مخالطت و مجالست اختیار کی، یعنی ان کے بیٹھا اٹھا اور اس کے ساتھ ملنا جلنا جاری رکھا، اور پھر اسی دوران اللہ کا یہ حکم ہوا کہ وہ شخص بھی جذام میں مبتلا ہو گیا تو بعید نہیں کہ وہ اس وہم و اعتقاد میں مبتلا ہو جائے کہ میں اسی جذامی کی مخالطت و مجالست ہی کی وجہ سے اس مرض میں گرفتار ہوا ہوں لہٰذا آپ ﷺ نے لوگوں کو اس وہم و اعتقاد سے بچانے کے لئے کہ جو کفر و شرک کی حد تک پہنچاتا ہے، جذامی سے اجتناب و پرہیز کرنے کا حکم دیا، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خود اپنی ذات کو حکم سے مستثنیٰ رکھا کیونکہ آپ توکل و اعتقاد علی اللہ کے مرتبہ اعلیٰ پر فائز تھے اس کی بنا پر مذکورہ وہم و گمان میں آپ ﷺ کے مبتلا ہونے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ ایک دن آپ ﷺ ایک جذامی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لائے اور پھر اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا، حاصل یہ ہے کہ جذامی سے اجتناب و پرہیز کرنے کا حکم اس شخص کے لئے ہے جو اپنے اندر صدق و یقین کی طاقت نہ رکھے اور اس بات کا خوف ہو کہ اگر وہ کسی جذامی کی مخالطت و مجالست کے دوران خود اس مرض میں مبتلا ہو گیا تو اس وہم و اعتقاد کا شکار ہو کر شرک خفی کے گرداب میں پھنس جائے گا۔

کرمانیؒ نے کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو یہ فرمایا ہے کہ بیماری کے چھوت کی کوئی حقیقت نہیں ہے تو جذام کی بیماری اس سے مستثنیٰ ہے۔ نوویؒ کہتے ہیں کہ جذام میں ایک خاص قسم کی بدبو ہوتی ہے اگر کوئی شخص کسی جذامی کے ساتھ مخالطت و مجالست اور ہم خوری و ہم بستری میں زیادتی اختیار کرے تو وہ بو اس کو متاثر کرتی ہے اور بیمار کر دیتی ہے۔ جیسا کہ اگر کوئی شخص ایسا کھانا کھالے یا ایسی بو میں پھنس جائے جو اس کے مزاج و طبیعت کے موافق نہ ہو یا اس کا مضر ہونا ظاہر ہو تو اس شخص سے متاثر ہوتا ہے اور مختلف قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اگرچہ یہ چیزیں محض ایک ظاہری ذریعہ و سبب بنتی ہے حقیقت میں وہ بیماری اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے لاحق ہوتی ہے اس اعتبار سے جذامی سے پرہیز طبی نقطہ نظر اور حصول حفظان صحت کی رو سے ہو گا نہ کہ اس کو چھوت سمجھنے کی وجہ سے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

آنحضرت ﷺ نیک فال لیتے تھے

⑦ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَفَاءَلُ وَلَا يَتَطَيَّرُ وَكَانَ يُحِبُّ الْاِسْمَ الْحَسَنَ۔

(رواہ فی شرح السنۃ)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ (اچھی فال لیتے تھے اور شگون بد نہیں لیتے تھے، نیز آپ ﷺ اچھے ناموں کے ذریعہ فال لینے کو) پسند فرماتے تھے۔" (شرح السنۃ)

شگون بد لینا شیطانی کام ہے

⑧ وَعَنْ قَطَنِ بْنِ قَبِيْصَةَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْعِيَافَةُ وَالطَّرْقُ وَالطِّيَرَةُ مِنَ الْجِبْتِ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت قطن ابن قبیصہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں۔ کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ عیافہ، طرق، اور شگون بد لینا یہ سب چیزیں جبت میں سے ہیں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "عِیَافَۃ" تطیر یعنی پرندوں کے ذریعہ فال لینے کی ایک صورت ہے جس میں پرندے کو خاص طور پر اڑا کر یا اس کے خود بخود اڑنے، اور اس کی آواز کے ذریعہ نیک فالی یا بدفالی لی جاتی ہے پہلے زمانہ کے عربوں میں اس کا بہت زیادہ رواج تھا اور عیافت دانی ایک باقاعدہ فن سمجھا جاتا تھا اس میں عام طور پر پرندوں کے نام کا اعتبار کیا جاتا ہے، مثلاً عقاب کے ذریعہ عقوبت، غراب کوے کے ذریعہ غربت اور ہدہد کے ذریعہ ہدایت کی فال لی جاتی تھی۔ طیرہ اور عیافہ میں فرق یہ ہے کہ طیرہ کے مفہوم میں عمومیت ہے کہ خواہ کسی پرندے کے ذریعہ شگون بدلیا جائے یا کسی اور جانور کے ذریعے، جبکہ عیافہ کا استعمال خاص طور پر کسی پرندے کی آواز کے ذریعہ نیک یا بدفالی لینے کے مفہوم میں ہوتا ہے۔ نہایہ میں لکھا ہے کہ "عیافہ" کے معنی ہیں ڈلے مار کر یا ہشکا کر کسی پرندے کو اڑانا اور اس کے نام، اس کی آواز اور اس کے اڑنے وگزرنے کے ذریعہ فال لینا۔

"طرق" (کنکریاں) مارنے کو کہتے ہیں، فال لینے کی یہ بھی ایک صورت تھی، چنانچہ پہلے زمانہ میں خاص طور پر عرب عورتیں فال لیتے وقت کنکریاں مارتی تھیں۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ریت پر خطوط اور لکیریں کھینچنے کو طرق کہتے ہیں جیسا کہ رمل جاننے والے ریت پر مختلف طرح کے ہندسے اور خطوط وغیرہ کھینچتے ہیں۔ اور ان کے ذریعہ غیب کی باتیں دریافت کرنے کا دعوی کرتے ہیں۔

"جبت" سحر وکہانت کے معنی میں ہے، بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ جبت کے معنی ہیں ہر وہ چیز جس میں بھلائی نہ ہو۔ یا وہ چیز جو اللہ کے سوا پوجی جائے، یعنی شرک، اور بعض حضرات کے نزدیک "جبت" شیطان کے کام کو کہتے ہیں۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب چیزیں یعنی شگون بدلینا، پرندوں کی آواز کے گزرنے کے ذریعہ اور کنکریاں مار کر فال لینا، یا رمل وزائچہ وغیرہ کھینچ کر آئندہ کے حالات بتلانا، سحر وکہانت کے حکم میں داخل ہیں، یہ سب شرک کے کام ہیں اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ سب چیزیں شیطان کے کام ہیں۔

بدشگونی شرک ہے

⑨ وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الطِّیَرَۃُ شِرْکٌ قَالَہٗ ثَلٰثًا وَمَامِنَّا اِلاَّ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یُذْھِبُہٗ بِالتَّوَکُّلِ۔ رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ سَمِعْتُ مُحَمَّدَ بْنَ اِسْمٰعِیْلَ یَقُوْلُ کَانَ سُلَیْمَانُ بْنُ حَرْبٍ یَقُوْلُ فِیْ ھٰذَا الْحَدِیْثِ وَمَامِنَّا اِلاَّ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یُذْھِبُہٗ بِالتَّوَکُّلِ ھٰذَا عِنْدِیْ قَوْلُ ابْنِ مَسْعُوْدٍ۔ (ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "شگون بدلینا شرک ہے آپ ﷺ نے (زیادہ سے زیادہ) اہمیت ظاہر کرنے کے لئے) یہ بات تین مرتبہ فرمائی تاکہ لوگ اس سے اجتناب کریں اور ہم میں سے جو بھی شخص ایسا ہوتا ہے (کہ جس کے دل میں کبھی بدشگونی کے ذریعہ تردد وخلجان پیدا ہوجاتا ہے) تو اللہ تعالیٰ اس کو اس پر بھروسہ واعتماد کرنے سے روک دیتا ہے یعنی یہ ایمان کا تقاضہ ہے کہ کسی کام وسفر کے قصد وارادہ کے وقت کوئی ایسی چیز ظاہر ہوجائے جس سے بتقاضائے بشریت دل ودماغ میں کوئی وہم اور تردد پیدا ہو تو اس وہم وتردد پر قطعا بھروسہ واعتماد نہ کیا جائے بلکہ اللہ تعالیٰ پر توکل ویقین رکھتے ہوئے اس کام کو کیا جائے یا اس سفر پر چلا جائے۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

اور ترمذیؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام بخاریؒ سے سنا وہ فرماتے تھے کہ میرے استاد وشیخ حضرت سلمان ابن حربؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے تھے کہ حدیث کی یہ عبارت وَمَامِنَّا اِلاَّ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یُذْھِبُہٗ بِالتَّوَکُّلِ میرے نزدیک حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے (نہ کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے)۔

تشریح: "شگون بدلینا شرک ہے"۔ کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیز مشرکین کے طور طریقوں اور ان کی عادات میں سے ہے اور شرک خفی کی موجب ہے۔ ہاں اگر جزمایہ اعتقاد رکھا جائے کہ یونہی ہوگا تو وہ شگون بلاشک وشبہ کفر کے حکم میں ہوگا۔

آنحضرت ﷺ نے جذامی کے ساتھ کھانا کھایا

⑩ وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَخَذَ بِیَدِ مَجْذُوْمٍ فَوَضَعَھَا مَعَہٗ فِی الْقَصْعَۃِ وَقَالَ کُلْ ثِقَۃً بِاللّٰہِ وَتَوَکُّلاً عَلَیْہِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے ایک جذامی کا ہاتھ پکڑ کر اس کو کھانے کے پیالہ میں اپنے ساتھ شریک کیا اور فرمایا کہ کھاؤ، میرا اللہ پر اعتماد و بھروسہ ہے اور میں اسی کی ذات پر توکل کرتا ہوں۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ توکل و یقین کا مرتبہ حاصل ہو جانے کے بعد جذامی سے بھاگنا اور اس کو اپنے سے الگ رکھنا ضروری نہیں ہے۔

بدشگونی کوئی چیز نہیں ہے

⑪ وَعَنْ سَعْدِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا ھَامَۃَ وَلَا عَدْوٰی وَلَا طِیَرَۃَ وَاِنْ تَکُنِ الطِّیَرَۃُ فِیْ شَیْءٍ فَفِی الدَّارِ وَالْفَرَسِ وَالْمَرْاَۃِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سعد ابن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا نہ ہامہ کوئی چیز ہے نہ ایک سے دوسرے کو بیماری کا لگنا کوئی حقیقت رکھتا ہے اور نہ شگون بد میں کوئی حقیقت ہے، اگر کسی چیز میں شگون بد ہوتا تو گھر میں، گھوڑے اور عورت میں ہوتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: طیرہ یعنی بدشگونی اور نحوست کے سلسلے میں مختلف احادیث منقول ہیں، جن احادیث سے طیرہ کے اثرات کی نفی اور اس کا اعتبار کرنے یا اس پر اعتقاد رکھنے کی نہی و ممانعت ثابت ہوتی ہے وہ زیادہ ہیں، بعض احادیث سے عورت، گھوڑے اور گھر میں طیرہ کا ثبوت یقینی الفاظ کے ذریعہ مفہوم ہوتا ہے جیسا کہ بخاریؒ و مسلمؒ کی روایت ہے۔ اِنَّمَا الشُّؤْمُ فِیْ ثَلٰثٍ الْفَرَسِ وَالْمَرْاَۃِ وَالدَّارِ یعنی اس میں کوئی شک نہیں کہ تین چیزوں میں نحوست ہے، گھر، گھوڑے اور عورت میں ایک روایت میں وہ تین چیزیں زمین، خادم اور گھوڑا بیان کی گئی ہیں۔ بعض احادیث سے ان تین چیزوں میں طیرہ کا ثبوت الفاظ شرط کے ساتھ مفہوم ہوتا ہے جیسا کہ اوپر نقل کی گئی حدیث یا اسی طرح کی دوسری حدیث کے الفاظ ہیں کہ اگر بدشگونی اور نحوست کوئی چیز ہوتی تو ان چیزوں میں پائی جاتی، بعض احادیث سے دوسری تمام چیزوں کی طرح ان تین چیزوں میں بھی نحوست کے پائے جانے کا انکار مفہوم ہوتا ہے، جیسا کہ ابن ابی ملیکہ کی روایت ہے جس کو انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے اور بعض احادیث میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ان چیزوں میں نحوست کے پائے جانے کا اعتقاد زمانہ جاہلیت کے بے سروپا اعتقادات و خیالات سے ہے۔ غرضکہ اس بارے میں مختلف مفہوم کی روایتیں منقول ہیں لہٰذا ان سب کے درمیان وجہ مطابقت اور ان سب کا حاصل مقصد یہ ہے کہ تطیر یعنی شگون بد لینا اور کسی چیز کو منحوس سمجھنا بالکل بے اصل بات ہے اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ کچھ چیزوں میں نحوست ہوتی ہے تو جو چیزیں ایسی ہیں جو اپنی بعض حیثیتوں اور مآل کار کے اعتبار سے اس قابل ہیں کہ ان میں نحوست کا ہونا گمان کیا جا سکتا ہے اور ان کو نحوست کا موقع و محل قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ بات ایسی ہی ہے جیسا کہ اس روایت میں فرمایا گیا ہے۔ لو کان شی سابق القدر لسبقۃ العین یعنی اگر کوئی چیز تقدیر پر سبقت لا جانے والی ہو تو وہ نظر بد ہوتی۔

قاضیؒ نے بھی اسی طرح کی بات کہی ہے وہ کہتے ہیں کہ حدیث میں پہلے تو طیرہ کا انکار کرنا اور اس کے بعد یہ شرطیہ جملہ (کہ اگر کسی چیز میں شگون بد ہوتا تو گھر میں گھوڑے میں ایک عورت میں ہوتا) لانا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ تطیر یعنی بدشگونی کی نحوست کا انکار اس مفہوم میں ہے کہ اگر نحوست کا کوئی وجود و ثبوت ہوتا تو ان تین چیزوں میں ہوتا کیونکہ یہی تین چیزیں نحوست کا موقع و محل ہو سکتی ہیں، لیکن جب ان چیزوں میں بھی نحوست کا کوئی وجود نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نحوست سرے سے کوئی وجود نہیں رکھتی۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اگر ان چیزوں میں "نحوست" کا کوئی وجود مفہوم ہوتا ہے تو اس معنی میں کہ اگر عورت زبان دراز، بے

حیا اور بدکار ہو یا اس کی کوکھ سے بچہ جنم نہ لیتا ہو یا اپنے شوہر کی نافرمانی کرتی ہو اور یا مکروہ صورت و بدشکل ہو تو اس اعتبار سے اس کو منحوس کہا جاتا ہے گھر میں نحوست کا ہونا اس معنی میں ہے کہ وہ گھر تنگ و تاریک ہو اس کا پڑوس برے ہمسایوں پر مشتمل ہو اور اس کی آب و ہوا ناموافق ہو، اسی طرح گھوڑے میں نحوست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ گھوڑا سرکش و شریر ہو، کھانے میں تو تیز ہو لیکن چلنے میں مٹھا ہو، خصوصیات کے اعتبار سے کم تر ہو لیکن قیمت کے اعتبار سے گراں ہو اور مالک کی ضرورت و مصالح کو پورا نہ کرتا ہو، گھوڑے ہی پر خادم کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ نحوست سے شرعی و طبعی کراہت و ناپسندیدگی مراد ہے اس اعتبار سے شوم و تطیر کی نفی تو عموم و حقیقت پر محمول ہوگی یعنی حقیقت تو یہی ہے کہ کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے۔ جس میں نحوست کا کوئی وجود ہو لیکن جن احادیث سے بعض چیزوں میں نحوست کا ہونا مفہوم ہوتا ہے ان میں نحوست سے مراد ان چیزوں کا طبعی طور پر یا کسی شرعی قباحت کی بنا پر ناپسندیدہ ہونا ہے۔

آنحضرت ﷺ نیک فال لینے کے لئے اچھے ناموں کا سننا پسند فرماتے تھے

(۱۲) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یُعْجِبُہٗ اِذَا خَرَجَ لِحَاجَۃٍ اَنْ یَّسْمَعَ یَارَاشِدُ یَا نَجِیْحُ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کسی کام کے لئے باہر نکلتے تو آپ ﷺ کو یہ اچھا معلوم ہوتا کہ کسی کی زبان سے یہ سنیں اے راشد اے نجیح یعنی کسی کام کے لئے جاتے وقت اس طرح کے نام والفاظ سننا نیک فال ہے۔" (ترمذی)

(۱۳) وَعَنْ بُرَیْدَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ لَا یَتَطَیَّرُ مِنْ شَیْءٍ فَاِذَا بَعَثَ عَامِلًا سَاَلَ عَنْ اِسْمِہٖ فَاِذَا اَعْجَبَہٗ اسْمُہٗ فَرِحَ بِہٖ وَرُؤِیَ بِشْرُ ذٰلِکَ فِیْ وَجْہِہٖ وَاِنْ کَرِہَ اِسْمَہٗ رُؤِیَ کَرَاھِیَۃُ ذٰلِکَ فِیْ وَجْہِہٖ وَاِذَا دَخَلَ قَرْیَۃً سَأَلَ عَنْ اِسْمِھَا فَاِذَا اَعْجَبَہٗ اِسْمُھَا فَرِحَ بِہٖ وَرُؤِیَ بِشْرُ ذٰلِکَ فِیْ وَجْہِہٖ وَاِنْ کَرِہَ اسْمَھَا رُؤِیَ کَرَاھِیَۃُ ذٰلِکَ فِیْ وَجْہِہٖ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی چیز سے شگون بد نہ لیتے تھے اور جب آپ ﷺ کسی عامل (کارکن کو کہیں) روانہ کرنے لگتے تو اس کا نام دریافت فرماتے، اگر اس کا نام اچھا معلوم ہوتا تو آپ ﷺ اس سے خوش ہوتے اور آپ ﷺ کی خوشی آپ ﷺ کے چہرہ مبارک سے ظاہر ہوتی اور اگر اس کا نام برا معلوم ہوتا تو اس سے آپ ﷺ کی ناگواری آپ ﷺ کے چہرہ مبارک سے ظاہر ہوتی (یہاں تک کہ آپ ﷺ اس کے نام کو کسی اچھے نام سے بدل دیتے) اسی طرح جب آپ ﷺ کسی بستی میں داخل ہوتے تو اس بستی کا نام پوچھتے اگر آپ ﷺ کو اس کا نام اچھا معلوم ہوتا تو اس سے خوش ہوتے اور آپ ﷺ کی خوشی آپ ﷺ کے چہرہ مبارک سے ظاہر ہوتی اور اگر اس کا نام برا معلوم ہوتا تو آپ ﷺ کی ناگواری آپ ﷺ کے چہرہ مبارک سے ظاہر ہوتی!۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: کسی برے نام کو سن کر ناگواری ہونا تطیر (یعنی شگون بد لینا) نہیں ہے تطیر تو اس صورت میں ہوتا جب آپ ﷺ برے نام کو سن کر اپنے کام یا اپنے سفر کو ترک کر دیتے جیسا کہ شگون بد لینے کی صورت میں ہوتا ہے تاہم کسی شخص یا آبادی کا برا اور بھدا نام سن کر آپ ﷺ کے چہرہ مبارک سے ناگواری کے اثرات نمایاں ہوتے تھے کیونکہ طبیعت کا اچھائی و برائی سے متاثر ہونا اور اس کے نتیجے میں خوشی یا ناخوشی کا ظاہر ہونا تفاؤل و تطیر سے قطع نظر ایک فطری بات ہے۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنی اولاد یا اپنے خادم کے لئے اچھے نام کو اختیار کرنا سنت ہے۔ کیونکہ بسا اوقات برے نام تقدیر کے موافق ہو جاتے ہیں اور اس کے نتائج دوررس اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنے بیٹے کا نام خسار رکھے تو ہو سکتا ہے کہ کسی موقع پر خود وہ شخص یا اس کا وہ بیٹا تقدیر الٰہی کے تحت خسارہ میں مبتلا ہو جائے اور اس کے نتیجہ میں لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ اس کا خسارہ مبتلا ہونا نام کی وجہ سے ہے اور بات یہاں تک پہنچے کہ

لوگ اس کو منحوس جاننے لگیں اور اس کی صحبت وہم نشینی تک سے احتراز کرنے لگیں۔

مکان میں بے برکتی کا ذکر

⑭ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ رَجُلٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّا کُنَّا فِیْ دَارٍ کَثُرَ فِیْہَا عَدَدُنَا وَاَمْوَالُنَا فَتَحَوَّلْنَا اِلٰی دَارٍ قَلَّ فِیْہَا عَدَدُنَا وَاَمْوٰلُنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَرُوْہَا ذَمِیْمَۃً۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن بارگاہ رسالت میں ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول کریم (ﷺ) پہلے ہم ایک مکان میں رہا کرتے تھے جس میں ہمارے افراد کی تعداد بھی زیادہ تھی اور ہمارے پاس مال بھی بہت تھا، پھر ہم ایک دوسرے مکان میں منتقل ہوگئے تو اس میں ہمارے آدمیوں کی تعداد بھی کم ہوگئی اور ہمارا مال بھی تھوڑا رہ گیا۔ رسول کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ اس مکان کو چھوڑ دو جو برا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا اس مکان کو چھوڑ دینے کا حکم اس مکان کو منحوس سمجھنے کی بنا پر نہیں تھا۔ بلکہ اس مکان کی آب و ہوا اور اس کی سکونت چونکہ مکینوں کو راس نہیں آئی اس لیے آپ ﷺ نے بہتر یہی سمجھا کہ وہ اس مکان کو چھوڑ دیں۔

خطابیؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کو مکان چھوڑ دینے کا حکم اس مصلحت کے پیش نظر دیا کہ ان کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ سارے نقصان اور ساری جڑ مکان ہے اگر ہم اس مکان میں نہ رہتے تو نہ ہمارے آدمیوں میں کمی آتی اور نہ ہمارے مال و اسباب کا نقصان ہوتا، لہٰذا آپ ﷺ نے ان کو مکان چھوڑ دینے کا حکم دینا ہی بہتر سمجھا۔ تاکہ ان کے اس غلط خیال اور واہمہ کی جڑ ہی کٹ جائے اور یہ شرک خفی کے گرداب میں نہ پھنسیں۔

خراب آب و ہوا کو چھوڑ دینے کا حکم

⑮ وَعَنْ یَحْیَی بْنِ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ بُحَیْرٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ مَنْ سَمِعَ فَرْوَۃَ بْنَ مُسَیْکٍ یَقُوْلُ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ عِنْدَنَا اَرْضٌ یُقَالُ لَہَا اَبْیَنُ وَھِیَ اَرْضُ رِیْفِنَا وَمِیْرَتِنَا وَاِنَّ وَبَآءَ ھَا شَدِیْدٌ فَقَالَ دَعْہَا عَنْکَ فَاِنَّ مِنَ الْقَرَفِ التَّلَفَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت یحییٰ ابن عبداللہ ابن بجیر کہتے ہیں کہ مجھ سے اس شخص نے بیان کیا کہ جس نے حضرت فروہؓ ابن میسک سے یہ روایت سنی کہ انہوں نے یعنی فروہ نے کہا کہ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! ہمارے پاس ایک زمین ہے جس کو ابین کہا جاتا ہے اور وہ ہماری زراعت اور غلے کی زمین ہے یعنی وہ غلہ منڈی ہے، جہاں تجارت کے لئے دوسری جگہوں سے غلہ لا کر جمع کیا جاتا ہے اور دوسرے شہروں میں بھیجا جاتا ہے لیکن اس زمین کی وبا سخت ہے یعنی وہاں وبائی امراض زیادہ رہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے یہ سنکر فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو (یعنی وہاں رہنا اور آنا جانا ترک کردو کیونکہ وہ طاعون زدہ آبادی کے حکم میں ہے) اور وبا (بیماری) کا قرب ہلاکت اور اتلاف کا باعث ہوتا ہے۔"

(ابوداؤدؒ)

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس زمین کو چھوڑنے کا حکم عدوی یعنی چھوت کے نقطہ نظر سے نہیں تھا بلکہ اصول طب اور حفظان صحت کے پیش نظر تھا کیونکہ وہاں کی آب و ہوا غیر موافق تھی اور یہ ظاہر ہے کہ آب و ہوا کا اچھا و صاف اور موافق ہونا حفظان صحت کی بنیاد اور جسم و بدن کی تندرستی و سلامتی کے لئے ضروری اسباب میں سے ہے اس کے برعکس آب و ہوا کا خراب و ناموافق ہونا صحت و تندرستی کے لئے انتہائی مضر اور بیماری و ہلاکت کا سبب ہوتا ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ وبا کی جگہ سے بھاگ جانا چاہئے وہ شاید اسی حدیث کے مضمون سے استدلال کرتے ہیں، ان حضرات کے مطابق اس شخص نے آنحضرت ﷺ سے وبا کی شکایت کی کہ اس زمین میں وبائیں پھیلتی ہیں لہٰذا

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس زمین کو چھوڑ دو اور وہاں سے نکل جاؤ۔ کیونکہ وبائی امراض کی قربت و مخالطت ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ حالانکہ حقیقت میں اس حدیث سے مذکورہ استدلال قطعاً غیر موزوں ہے کیونکہ یہ حدیث اس صورت سے متعلق نہیں ہے کہ وہاں وبا پھیلی ہوئی تھی اور آپ ﷺ نے وہاں سے بھاگ جانے کو جائز رکھا بلکہ اس شخص کی شکایت کا تعلق دراصل اس بات سے تھا کہ وہ زمین ایسی ہے۔ جہاں وبائیں پھیلتی رہتی ہیں۔ گویا اس شخص نے اس زمین کو منحوس و مکروہ جانا، چنانچہ اس کے باطنی احوال کی کمزوری کی بنا پر اس کو یہ اجازت دینا ہی بہتر سمجھا گیا کہ وہ اس زمین کو چھوڑ دے اور وہاں آنا جانا ترک کر دے تاکہ وہ ان وباؤں کو اس زمین کی نحوست سمجھ کر بے بنیاد عقیدے کا شکار نہ ہو جائے اور شرک خفی کے گرداب میں نہ پھنس جائے۔

ویسے وبا کی جگہ کے مسئلہ میں علماء کے مختلف اقوال و مباحث ہیں مگر جس صورت کو علماء نے زیادہ بہتر قرار دیا ہے اور جس پر عمل کیا جانا چاہئے وہ یہ ہے کہ پیش از وقوع تو احتراز و اجتناب کیا جائے اور بعد از وقوع صبر و رضا کی راہ اختیار کرنی چاہئے۔ اگر کسی شہر و آبادی میں کوئی وبائی مرض پھیل جائے تو وہاں پہلے سے موجود لوگوں کو اس شہر و آبادی سے بھاگنا ناروا ہے بلکہ وہاں رہتے ہوئے توبہ استغفار کیا جائے اور اس وبا کے دفعیہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا و تضرع کیا جائے جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے، چنانچہ بخاری و مسلم وغیرہما میں وہ احادیث موجود ہیں جن میں وبازدہ آبادی سے نکلنے اور وبا سے ڈر کر بھاگنے کی ممانعت نیز ایسے مواقع پر صبر و اثبات کی راہ اختیار کرنے کی ترغیب و تعریف منقول ہے۔

واضح رہے کہ وبا سے بھاگنے کو جائز قرار دینے والے حضرات کا اس حدیث سے استدلال کرنا یوں بھی غیر مناسب ہے کہ اس حدیث کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے جب کہ جو احادیث بھاگنے کی ممانعت کو ثابت کرتی ہیں ان کو بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا لہٰذا یہ حدیث بخاری و مسلم کی احادیث کے معارض نہیں ہو سکتی علاوہ ازیں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ علماء و محققین کے مطابق فروہؓ ابن مسیک کوئی کثیر الروایت صحابی نہیں ہیں بلکہ ان سے ایک دو ہی حدیثیں نقل کی گئی ہیں اور وہ بھی ایک ایسے راوی نے روایت کی ہیں جو بالکل مجہول غیر معروف ہیں یہاں تک کہ ان کا نام تک معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ بلکہ خود یحییٰ ابن عبداللہ ابن بحیر کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ آیا یہ کوئی ثقہ راوی ہیں بھی یا نہیں؟

حاصل یہ کہ وبا سے ڈر کر بھاگنا بلاشک و شبہ ممنوع اور معصیت ہے اور اگر کوئی اس اعتقاد کے ساتھ بھاگے کہ یہاں موجود رہا اور صبر و اثبات کی راہ اختیار کی تو یقیناً وبا کا شکار ہو کر مر جاؤں گا اور اگر یہاں سے نکل بھاگا تو بچ جاؤں گا تو ایسا شخص نہ صرف بھاگنے کی معصیت ہی کا مرتکب ہوگا بلکہ اس فاسد اعتقاد کی بنا پر کافر ہو جائے گا اس اعتقاد کے بغیر بھاگنے والا عاصی ہوگا۔ وبا سے ڈر کر بھاگنے کو، زلزلہ آجانے یا آگ لگ جانے کی صورت میں گھر سے نکل بھاگنے پر قیاس کرنا بھی ایک مہمل بات ہے کیونکہ اول تو یہ قیاس نص کے خلاف ہے، دوسرے زلزلہ آجانے، گھر کے گر پڑنے اور مکان میں آگ لگ جانے کی صورت میں گھر میں موجود رہنا یقینی طور پر ہلاکت و تباہی کا موجب ہے۔ جیسا کہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے اس کے برخلاف وباء سے نہ بھاگنے کی صورت میں مرجانا یقینی نہیں ہوتا بلکہ مشکوک و موہوم ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

بدشگونی کو سد راہ نہ بناؤ

(١٦) عَنْ عُرْوَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ ذُكِرَتِ الطِّيَرَةُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَحْسَنُهَا الْفَالُ وَلَا تَرُدُّ مُسْلِمًا فَاِذَا رَاٰى اَحَدُكُمْ مَا يَكْرَهُ فَلْيَقُلِ اللّٰهُمَّ لَا يَاْتِىْ بِالْحَسَنَاتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَاتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ مُرْسَلًا۔

"حضرت عروہ بن عامرؒ تابعی کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ کے سامنے بد شگونی کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی بہترین صورت اچھی فال ہے اور یاد رکھو کسی مسلمان کو شگون بد (اس کے مقصد و ارادہ سے) باز نہ رکھے (یعنی مسلمان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرے اور پھر کسی چیز کو بد شگونی سمجھ کر اس کام سے باز رہے) اور جب تم میں سے کوئی شخص ایسی چیز کو دیکھے جس کو وہ ناپسند کرتا ہے یعنی ایسی چیز جس کے ذریعہ شگون بد لیا جاتا ہے اور جو دل و دماغ میں وہم و خلجان پیدا کرتی ہے تو چاہئے کہ یہ دعا پڑھے اَللّٰھُمَّ لَایَاتِیْ بِالْحَسَنَاتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَایَدْفَعُ السَّیِّئَاتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ اے اللہ! اچھائیوں اور برائیوں کا لانے والا صرف تو ہے اور صرف تو ہی برائیوں اور خرابیوں کو دور کرنے والا ہے اور برائی سے منہ موڑنے اور نیکی کی طرف آنے کی توفیق و طاقت اللہ ہی کی طرف سے ہے۔" اس روایت کو ابوداؤد نے بطریق روایت نقل کیا ہے۔

بَابُ الْکِھَانَۃِ

کہانت کا بیان

صراح میں لکھا ہے کہ "کہانت" فال گوئی کو کہتے ہیں اور اس (فال گوئی) کے پیشہ و ہنر کو "کہانت" کہا جاتا ہے اسی طرح فال گو "کاہن" کہتے ہیں، طیبیؒ کہتے ہیں کہ کاہن اس شخص کو کہتے ہیں جو آئندہ پیش آنے والے واقعات و حوادث کی خبر دے اور علم غیب و معرفت اسرار کا دعوی کرے۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب میں کہانت کا بڑا رواج تھا، اہل عرب کاہنوں کی بتائی ہوئی باتوں پر اعتماد و بھروسہ کرتے تھے ان میں سے بعض کاہن یہ دعوی کرتے تھے کہ جو جنات آسمان پر جاتے ہیں وہ وہاں کی باتیں ہم سے بتا دیتے ہیں یہ بات روایت سے بھی ثابت ہے کہ بعثت نبوی ﷺ سے پہلے شیاطین چوری چھپے آسمان پر جاتے وہاں دنیا میں آئندہ پیش آنے والے واقعات جن کا تذکرہ فرشتوں میں ہوتا یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو جو احکام دیئے جاتے وہ شیاطین ان کو ادھر ادھر چھپ کر سن لیتے تھے اور پھر زمین پر آکر ان میں اپنی من پسند باتوں کا اضافہ کرکے اور جھوٹ ملا کر اپنے متبعین کو بتا دیتے وہ لوگ ان سب باتوں کو صحیح مان کر تسلیم کرتے اور ان کے ذریعہ اہل عرب پر اپنی غیب دانی کا سکہ جماتے، لیکن آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد جب شیاطین کو آسمان پر جانے سے روک دیا گیا اور یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ تو کہانت کا کام بھی تمام ہو گیا۔

کہانت ہی کی طرح کی ایک چیز عرافت بھی تھی کچھ لوگ بعض مخصوص چیزوں اور کچھ علامات و مقدمات کے ذریعہ پوشیدہ چیزوں کی خبر دیتے تھے، جیسے رمل جاننے والوں کی طرح وہ بھی یہ بتا دیتے تھے کہ چوری کا مال کہاں موجود ہے۔ یا گمشدہ شخص کس جگہ ہے وغیرہ وغیرہ ایسے لوگوں کو عراف کہا جاتا تھا، بعض مواقع پر کاہن کا اطلاق عراف اور منجم پر بھی ہوتا ہے علماء لکھتے ہیں کہ کہانت، عرافت اور رمل و نجوم کا علم حرام ہے کہ ان کا سیکھنا اور ان پر عمل کرنا شریعت نے قطعاً روا نہیں رکھا ہے اسی لئے ان علوم کے ذریعہ کمایا ہوا مال بھی حرام ہوتا ہے، لینے والا اور دینے والا دونوں گنہ گار ہوتے ہیں جو لوگ دنیاوی طور پر یا دینی طور پر مخلوق خدا کی دیکھ بھال اور ان کی ہدایت و راہنمائی پر مامور ہیں ان پر لازم ہے کہ وہ لوگوں کو ان چیزوں میں پڑنے سے روکیں اور جو لوگ ان میں مبتلا ہیں ان کو تادیب و تنبیہ کریں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

کہانت و رمل ناجائز ہے

① عَنْ مُعَاوِیَۃَ بْنِ الْحَکَمِ قَالَ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُمُوْرًا کُنَّا نَصْنَعُھَا فِی الْجَاھِلِیَّۃِ کُنَّا نَاْتِی الْکُھَّانَ قَالَ فَلَا تَاْتُوا الْکُھَّانَ قَالَ قُلْتُ کُنَّا نَتَطَیَّرُ قَالَ ذٰلِکَ شَیْءٌ یَجِدُہٗ اَحَدُکُمْ فِیْ نَفْسِہٖ فَلَا یَصُدَّکُمْ قَالَ قُلْتُ وَمِنَّا

رِجَالٌ يَخُطُّوْنَ خَطًّا قَالَ كَانَ نَبِيٌّ مِنَ الْاَنْبِيَآءِ يَخُطُّ فَمَنْ وَافَقَ خَطَّهٗ فَذَالِكَ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت معاویہ ابن حکمؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا "یارسول اللہ! ایسی کتنی ہی چیزیں ہیں جن کو ہم زمانہ جاہلیت میں کیا کرتے تھے، ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ہم کاہنوں کے پاس جاتے تھے (اور ان سے غیب کی باتیں پوچھا کرتے تھے) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب تم کاہنوں کے پاس نہ جایا کرو۔ حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا ایک چیز یہ بھی ہے کہ ہم شگون بد لیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو تم میں سے کوئی اپنے دل میں محسوس کر سکتا ہے لیکن یہ (یعنی دل میں اس طرح کا خیال آنا) تم کو کسی کام سے نہ روکے (یعنی اگر تم میں سے کوئی شخص بتقاضائے بشریت شگون بد کا خیال بھی لائے تو اس سے متاثر ہو کر اپنے قصد وارادہ سے باز نہ رہے کیونکہ بدشگونی وہم محض سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی) حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا۔ ایک چیز یہ بھی ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ لکیریں اور خطوط کھینچتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ انبیاء میں سے ایک نبی گزرے ہیں جو (اللہ تعالیٰ کے حکم سے یا اپنے علم لدنی کے ذریعہ) لکیریں اور خطوط کھینچا کرتے تھے لہٰذا جس شخص کا خط ان کے موافق ہو وہ مباح ہوگا (ورنہ ناجائز)۔" (مسلم)

تشریح: حدیث میں جن نبی کا ذکر کیا گیا ہے ان سے حضرت دانیال علیہ السلام یا بعض حضرات کے قول کے مطابق حضرت ادریس علیہ السلام مراد ہیں۔ حدیث کے آخری جزو کا مطلب یہ ہے کہ لکیریں اور خطوط کھینچنے کا علم کہ جس کو رمل کہا جاتا ہے اصل میں ان نبی سے چلا تھا جو اب اپنے حقیقی اصول و قواعد کے اعتبار سے معدوم ہو چکا ہے، اگر اب بھی کوئی شخص اس علم کو انہی خصوصیات و شرائط کے ساتھ جانتا ہو جو ان نبی علیہ السلام نے وضع فرمائے تھے اور اس کا لکیریں اور خطوط کھینچنا بالکل اسی طرح ہو جس طرح وہ نبی کھینچتے تھے تو اس صورت میں اس علم سے فائدہ اٹھانا مباح ہوگا، لیکن یہ بات چونکہ متحقق ہے کہ یہ علم اپنے اصل کے اعتبار سے دنیا سے اٹھ گیا ہے اور کوئی شخص یہ جاننے پر قادر نہیں ہے کہ وہ نبی کس طرح لکیریں اور خطوط کھینچا کرتے تھے اس لئے اب اس علم کو سیکھنا اور اس پر عمل کرنا حرام و ممنوع ہوا اس کی وضاحت باب مالا یجوز من العمل فی الصلوۃ میں بھی گزر چکی ہے۔

کہانت کوئی حقیقت نہیں ہے

(۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَأَلَ أُنَاسٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْكُهَّانِ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهُمْ لَيْسُوْا بِشَيْءٍ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَاِنَّهُمْ يُحَدِّثُوْنَ اَحْيَانًا بِالشَّيْءِ يَكُوْنُ حَقًّا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تِلْكَ الْكَلِمَةُ مِنَ الْحَقِّ يَخْطَفُهَا الْجِنِّيُّ فَيَقُرُّهَا فِيْ اُذُنِ وَلِيِّهٖ قَرَّ الدَّجَاجَةِ فَيَخْلِطُوْنَ فِيْهَا اَكْثَرَ مِنْ مِائَةِ كَذِبَةٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے کاہنوں کے بارے میں پوچھا (کہ ان کی بتائی ہوئی باتوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟) تو رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ وہ کچھ نہیں ہیں یعنی وہ جن باتوں کا دعوی کرتے ہیں وہ بے بنیاد ہوتی ہیں اس لئے ان کی بتائی ہوئی باتوں پر اعتماد بھروسہ مت کرو۔" لوگوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! بعض دفعہ وہ ایسی بات بتاتے ہیں یا ایسی خبر دیتے ہیں۔ جو سچ ہوتی ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا وہ بات حق ہوتی ہے جس کو جن (یعنی شیطان) اچک لیتا ہے اور اپنے دوست (کاہن) کے کان میں اس طرح ڈال دیتا ہے۔ جس طرح مرغ کوئی دوسرے مرغ کو دانہ لینے کے لئے بلاتا ہے پھر وہ کاہن اس بات میں سو سے زیادہ جھوٹی باتیں ملا دیتے ہیں۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "وہ بات حق ہوتی ہے جس کو جن اچک لیتا ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ کاہنوں کی جو بعض باتیں یا بعض چیزیں صحیح ثابت ہوتی ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب ذات حق جل مجدہ سے کوئی حکم بذریعہ وحی فرشتوں تک آتا ہے یا لوح محفوظ کی کوئی بات فرشتوں پر منکشف ہوتی ہے تو کسی طرح سے جنات و شیاطین ان فرشتوں سے اس بات یا حکم کو سن لیتے ہیں اور اس کو ان لوگوں کے کان میں پھونک دیتے ہیں

جو ان جنات اور شیاطین کے پیروکار ہوتے ہیں (یعنی وہ کاہن) اور پھر وہ کاہن اس ایک بات میں سینکڑوں جھوٹی باتیں ملا کر لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں۔

بعض حضرات نے لفظ "یقرھا فی اذن ولیہ قر الدجاجة"۔ کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ جس طرح مرغ اپنی مرغی سے جفتی کے وقت اس طرح منی ڈالتا ہے کہ کسی آدمی کو معلوم نہیں ہوتا اسی طرح وہ جن اس آسمانی بات کو اپنے پیروکار کے کان میں اس طور سے ڈالتا ہے کہ اس کے علاوہ دوسرے لوگوں کو اس کا علم نہیں ہوتا۔

(۳) وَعَنْهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ الْمَلٰٓئِكَةَ تَنْزِلُ فِي الْعَنَانِ وَهُوَ السَّحَابُ فَتَذْكُرُ الْاَمْرَ قُضِيَ فِي السَّمَآءِ فَتَسْتَرِقُ الشَّيَاطِيْنُ السَّمْعَ فَتَسْمَعُهُ فَتُوْحِيْهِ اِلَى الْكُهَّانِ فَيَكْذِبُوْنَ مَعَهَا مِائَةَ كَذْبَةٍ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "فرشتوں کی کوئی جماعت جب عنان یعنی ابر میں اترتی ہے اور (آپس میں) ان باتوں اور ان امور کا تذکرہ کرتی ہے جو آسمان میں خدا کے ہاں مقدر ہوئے ہیں اور دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے ہیں جب وہ کوئی بات سن لیتے ہیں تو اس کو کاہنوں کے پاس پہنچا دیتے ہیں اور وہ کاہن شیاطین سے سنی ہوئی اس بات میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا لیتے ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کاہن جو باتیں بیان کرتے ہیں ان میں وہ بات بھی ہوتی ہے جو ان کو شیاطین کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے اور وہ شیاطین اس بات کو فرشتوں سے چوری چھپے سن لیتے ہیں اور چونکہ وہ بات بہرصورت وقوع پذیر ہوتی ہے اس طرح کاہنوں کی بعض باتیں حقیقت و واقعہ کے مطابق ہو جاتی ہیں لیکن یہ چیز بہرحال ملحوظ رکھنے کی ہے کہ وہ کاہن چونکہ اس بات میں اپنی طرف سے سینکڑوں جھوٹی باتیں بھی ملا دیتے ہیں اور ان کی بتائی ہوئی باتوں اور چیزوں پر جھوٹ غالب رہتا ہے اس لئے شریعت نے ان کاہنوں سے استفادہ کرنے اور ان کی باتوں پر دھیان دینے سے سرے سے روک دیا اور فرمایا ان کی باتیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔

نجومیوں اور کاہنوں کے پاس جانے والے کے بارے میں وعید

(۴) وَعَنْ حَفْصَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَتٰى عَرَّافًا فَسَاَلَهُ عَنْ شَيْءٍ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلٰوةُ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت حفصہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص کاہن یا نجومی کے پاس جائے اور اس سے کچھ پوچھے یعنی غیب کی باتیں دریافت کرے) تو اس کی چالیس دن رات کی نمازیں قبول نہیں کی جاتی۔" (مسلمؒ)

تشریح: یہ چیز گویا ایسے شخص کے حق میں سخت نقصان دہ اور انتہائی بدبختی کی علامت ہے کہ اس کی نماز جو عبادات میں سب سے افضل اور بزرگ ترین عمل ہے، نامقبول ہو جائے یا یہ مراد ہے کہ اس شخص کی جب نماز ہی قبول نہیں ہوتی تو دوسرے اعمال بطریق اولی قبول نہیں ہوں گے، نیز نماز قبول نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کو ان نمازوں کا ثواب نہیں ملتا اگرچہ اس کے ذمہ سے فرض ادا ہو جاتا ہے اور اس پر ان نمازوں کی قضا واجب نہیں ہوتی۔

حدیث میں اگرچہ اربعین لیلة کے الفاظ ہیں یعنی صرف رات کا ذکر کیا گیا ہے مگر حقیقت میں رات اور دن دونوں مراد ہیں کیونکہ اہل عرب کے کلام کا یہ بھی اسلوب ہے کہ الفاظ میں تو ذکر صرف دن یا صرف رات کا ہوتا ہے۔ مگر مراد رات اور دن دونوں ہوتے ہیں۔

ستاروں کو بارش ہونے کا سبب قرار دینا کفر ہے

(۵) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدِنِ الْجُهَنِيِّ قَالَ صَلّٰى لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةَ الصُّبْحِ بِالْحُدَيْبِيَةِ عَلٰى اِثْرِ

سَمَآءٍ کَانَتْ مِنَ اللَّیْلِ فَلَمَّا انْصَرَفَ اَقْبَلَ عَلَی النَّاسِ فَقَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَاذَا قَالَ رَبُّکُمْ قَالُوْا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ قَالَ اَصْبَحَ مِنْ عِبَادِیْ مُؤْمِنٌ بِیْ وَکَافِرٌ فَاَمَّا مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهٖ فَذٰلِكَ مُؤْمِنٌ بِیْ وَکَافِرٌ بِالْکَوْکَبِ وَاَمَّا مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِنَوْءِ کَذَا وَکَذَا فَذٰلِكَ کَافِرٌ بِیْ مُؤْمِنٌ بِالْکَوْکَبِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت زید ابن خالد جہنیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مقام حدیبیہ میں ہمیں صبح کی نماز پڑھائی جب کہ رات میں بارش ہو چکی تھی، جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تم جانتے ہو تمہارے پروردگار نے اس وقت کیا فرمایا ہے (یعنی آپ ﷺ نے ارشاد کیا کہ ابھی مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے) صحابہؓ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میرے بندوں نے آج اس حال میں صبح کی کہ بعض تو مجھ پر ایمان لائے اور بعض نے کفر کیا، چنانچہ جس شخص نے یہ کہا کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے بارش ہوئی ہے تو وہ مجھ پر ایمان لایا اور ستاروں کے ساتھ کفر کیا (یعنی ستاروں کے اثر کا منکر ہیں) اور جس شخص نے کہا کہ فلاں ستارے کے طلوع ہونے اور فلاں ستارے کے غروب ہونے کی وجہ سے ہم پر بارش ہوئی ہے تو اس نے میرے ساتھ کفر کیا اور ستاروں پر ایمان لایا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ بارش ہونے میں ستاروں کی تاثیر کا دخل ہوتا ہے یعنی ستارے ہی بارش برساتے ہیں یا ستارے ہی ایسے اثرات مرتب کرتے ہیں جن سے پانی برستا ہے جیسا کہ زمانہ جاہلیت کے لوگوں کا عقیدہ ہوتا ہے تو ایسا شخص کافر ہو جائے گا۔ ہاں اگر اعتقاد کی نوعیت یہ ہو کہ بارش اصل میں اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے اور اس کے فضل و کرم سے ہوتی ہے۔ اور ستاروں کا طلوع و غروب اور پچھتر وغیرہ بارش کی ایک علامت ہے۔ اور ان چیزوں کی بنیاد پر بارش ہونے کا گمان کیا جاسکتا ہے تو یہ کفر نہیں، لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس طرح کا خیال و عقیدہ رکھنا بھی مکروہ تنزیہی ہے۔

⑥ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ بَرَکَةٍ اِلَّا اَصْبَحَ فَرِیْقٌ مِنَ النَّاسِ بِهَا کَافِرِیْنَ یُنْزِلُ اللّٰهُ الْغَیْثَ فَیَقُوْلُوْنَ بِکَوْکَبِ کَذَا وَکَذَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب بھی اللہ تعالیٰ آسمان سے کوئی برکت نازل کرتا ہے تو انسانوں کی کوئی نہ کوئی جماعت اس کے ذریعہ کفر میں مبتلا ہو جاتی ہے یعنی کچھ نہ کچھ لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو اس برکت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کی بجائے دوسرے ذرائع و اسباب کی طرف منسوب کر دیتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ بارش برساتا ہے تو بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ فلاں ستارے کے اثر سے بارش ہوئی ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اگرچہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ "برکت" سے مراد بارش ہے اور یہ عبارت وینزل الغیث (اللہ تعالیٰ بارش برساتا ہے الخ) ماقبل عبارت اور لفظ برکت کی توضیح ہے لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ "برکت" سے عام یعنی ہر طرح کی برکت مراد ہو اور وینزل الغیث الخ کے ذریعہ نزول برکت کی ایک مثال اور اس کی ایک خاص صورت کو بیان کرنا مقصود ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

علم نجوم حاصل کرنا گویا سحر کا علم حاصل کرنا ہے

⑦ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اقْتَبَسَ عِلْمًا مِنَ النُّجُوْمِ اقْتَبَسَ شُعْبَةً مِنَ السِّحْرِ زَادَ مَا زَادَ۔ (رواہ احمد وابوداود وابن ماجۃ)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص علم نجوم کا ایک حصہ سیکھتا ہے تو گویا، وہ علم سحر کا ایک حصہ سیکھتا ہے

اس طرح وہ اتنا ہی زیادہ سحر کا علم سیکھتا ہے جتنا زیادہ نجوم کا علم سیکھتا ہے۔" (ابوداؤدؒ، احمدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: علم نجوم کو سحر سے تشبیہ دی گئی ہے کہ نجوم کا علم سیکھنا ایسا ہی ہے جیسا کسی نے جادو ٹونکے کا علم سیکھ لیا اور اس مشابہت کی وجہ سے علم نجوم کی برائی کو ظاہر کرنا ہے اس اعتبار سے علم نجوم پر عمل کرنے والا گویا جادوگروں اور کاہنوں میں کا ایک فرد ہے جو خلاف شریعت امور کو اختیار کرتے ہیں اور غیب کی باتیں بتانے کا دعوی کرتے ہیں۔

کاہنوں کی بتائی ہوئی باتوں کو سچ جاننے والے کے بارے میں وعید

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَتٰی كَاهِنًا وَصَدَّقَهٗ بِمَا يَقُوْلُ اَوْاَتٰى امْرَاَتَهٗ حَائِضًا اَوْاَتٰى امْرَاَتَهٗ فِیْ دُبُرِهَا فَقَدْبَرِیَٔ مِمَّا اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ۔ (رواہ احمد والبوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص کاہن کے پاس جائے اور اس کی بتائی ہوئی باتوں کو سچا جانے، یا جو شخص کاہن کے پاس جائے اور اس کی بتائی ہوئی باتوں کو سچا جانے، یا جو شخص حیض کی حالت میں اپنی بیوی سے ہم بستر ہو، یا جو شخص اپنی بیوی کے پیچھے کی طرف بد فعلی کرے تو وہ اس چیز (یعنی قرآن وسُنّت وشریعت) سے بیزار ہوا جو، محمد (ﷺ) پر نازل ہوئی ہے۔" (احمدؒ والبوداؤدؒ)

تشریح: "بیزار ہوا" کا مطلب یہ ہے کہ وہ کافر ہو گیا، لیکن یہ اس صورت پر محمول ہے جب کہ وہ اس کو حلال جانے، حلال نہ جاننے کی صورت میں یہ ارشاد گرامی ﷺ ان چیزوں کی سخت ترین برائی کو زیادہ سے زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کرنے اور ان سخت برائیوں کے اختیار کرنے والے کو شدت کے ساتھ متنبہ کرنے اور ڈرانے پر محمول ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

نجومی اور کاہن غیب کی باتیں کس طرح بتاتے ہیں؟

⑨ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَاقَضَى اللّٰهُ الْاَمْرَ فِی السَّمَآءِ ضَرَبَتِ الْمَلَائِكَةُ بِاَجْنِحَتِهَا خِضْعَانًا لِقَوْلِهٖ كَاَنَّهٗ سِلْسِلَةٌ عَلٰى صَفْوَانٍ فَاِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوْا لِلَّذِیْ قَالَ الْحَقَّ وَهُوَالْعَلِیُّ الْكَبِيْرُ فَسَمِعَهَا مُسْتَرِقُوا السَّمْعِ وَمُسْتَرِقُوا السَّمْعِ هٰكَذَا بَعْضُهٗ فَوْقَ بَعْضٍ وَوَصَفَ سُفْيَانُ بِكَفِّهٖ فَحَرَّفَهَا وَبَدَّدَ بَيْنَ اَصَابِعِهٖ فَيَسْمَعُ الْكَلِمَةَ فَيُلْقِيْهَا اِلٰى مَنْ تَحْتَهٗ ثُمَّ يُلْقِيْهَا الْاٰخَرُ اِلٰى مَنْ تَحْتَهٗ حَتّٰى يُلْقِيْهَا عَلٰى لِسَانِ السَّاحِرِ اَوِالْكَاهِنِ فَرُبَّمَا اَدْرَكَ الشِّهَابُ قَبْلَ اَنْ يُلْقِيَهَا وَرُبَّمَا اَلْقَاهَا قَبْلَ اَنْ يُّدْرِكَهٗ فَيَكْذِبُ مَعَهَا مِائَةَ كَذْبَةٍ فَيُقَالُ اَلَيْسَ قَدْ قَالَ لَنَا يَوْمَ كَذَا وَكَذَا كَذَا وَكَذَا فَيُصَدَّقُ بِتِلْكَ الْكَلِمَةِ الَّتِیْ سُمِعَتْ مِنَ السَّمَاءِ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس وقت اللہ تعالیٰ آسمان میں کسی چیز کا حکم جاری کرتا ہے۔ تو فرشتے اللہ کے فرمان سن کر خوف وعاجزی سے اپنے بازو کو پھڑپھڑانے لگتے ہیں (یعنی فرشتے حکم الٰہی کی ہیبت وعظمت سے مارے ڈر کے پرندوں کی طرح اپنے پنکھ پھیلا دیتے ہیں اور لرزنے کانپنے لگتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ کے فرمان یعنی اس کے کلام کی آواز (گویا) اس زنجیر کی آواز کی مانند ہوتی ہے جس کو صاف، پتھر پر کھینچا جائے پھر جب فرشتوں کے دلوں سے خوف دور ہو جاتا ہے تو وہ (نیچے رہنے والے) تمام فرشتے مقرب فرشتوں سے دریافت کرتے ہیں کہ تمہارے پروردگار نے کیا حکم جاری فرمایا ہے، مقرب فرشتے وہ حکم بتاتے ہیں جو پروردگار نے جاری کیا ہے (یا مقرب فرشتے دریافت کرنے والے فرشتوں سے کہتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے پروردگار نے فرمایا ہے) حق ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات بلند قدر اور بلند مرتبہ ہے۔ چنانچہ ان باتوں کو (جو فرشتوں کے درمیان ہوتی ہیں) چوری چھپے سننے والے (یعنی جنات وشیاطین) سن لیتے ہیں اور وہ چوری چھپے سننے والوں کی ہیئت کو اپنے ہاتھ (کی انگلیوں) کے ذریعہ بیان کیا چنانچہ انہوں نے ہاتھ کو ٹیڑھا کر کے انگلیوں کے درمیان فرق کیا (یعنی

حضرت سفیان نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے اوپر تلے ہونے کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ وہ جنات و شیاطین آسمان سے زمین تک اس طرح سلسلہ وار اور اوپر تلے کھڑے رہتے ہیں) اور اوپر والا جن فرشتوں کی بات کو چوری چھپے سن کر اپنے نیچے والے جن کو پہنچا دیتا ہے اور وہ اپنے نیچے والے جن کو پہنچاتا ہے یہاں تک کہ آخری جن (جو سب سے نیچے ہوتا ہے) اس بات کو ساحر یا کاہن کی زبان تک پہنچاتا ہے ادھر (ان جنات و شیاطین کو مارنے اور بھگانے کے لئے آسمان سے شعلے پھینکے جاتے ہیں تو) کبھی تو یہ شعلے ساحر یا کاہن تک وہ بات پہنچانے سے پہلے ہی چوری چھپے سننے والے (جن کو) آپکڑتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ جن اس شعلے کے پہنچنے سے پہلے ساحر یا کاہن تک وہ بات پہنچا دیتا ہے اور جب اس ساحر یا کاہن تک وہ بات پہنچا دیتا ہے اور جب اس ساحر یا کاہن تک وہ بات پہنچ جاتی ہیں تو وہ اس میں سو جھوٹی باتیں شامل کر لیتا ہے (اور لوگوں کے سامنے ان جھوٹی باتوں کے درمیان وہ بات بھی بیان کرتا ہے جو اس تک جنات و شیاطین کے ذریعہ پہنچتی ہے)۔ چنانچہ جب کوئی شخص اس کاہن کو (اس کی بتائی ہوئی باتوں میں سے جھوٹی باتوں کے ذریعہ) جھٹلاتا ہے (یعنی یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے جو فلاں فلاں بات کہی تھی وہ جھوٹی ثابت ہوئی) تو (ان گمراہ لوگوں کی طرف سے جو کاہن کی باتوں کو سچا جانتے ہیں جھٹلانے والے کے سامنے) یہ کہا جاتا ہے کہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے اور کیا تم نہیں جانتے کہ اس کاہن نے فلاں فلاں دن ہم سے فلاں بات کہی تھی اور اس طرح اس کاہن کی سچائی کی تصدیق اس بات سے کی جاتی ہے جو اس تک (جنات کے ذریعہ) آسمان سے پہنچتی تھی۔" (بخاری)

تشریح: حدیث میں وہ صورت بیان کی گئی ہے جو کاہنوں تک غیب کی باتیں پہنچنے کا سبب بنتی ہے اس کے ساتھ حدیث کے آخر میں اس گمراہی کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب کاہن کی بتائی ہوئی اکثر باتیں جھوٹ ثابت ہوتی ہیں اور لوگ اس کو جھٹلاتے ہیں تو وہ لوگ جو کاہن کی سچائی کا اعتقاد رکھتے ہیں اور باطن کی گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں اس کاہن کی ساری جھوٹی باتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور صرف اس بات کا حوالہ دے کر اس کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو جنات و شیاطین فرشتوں سے چوری چھپے سن کر کاہن تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور جو واقعہ کے مطابق ہوتی ہے یہی صورت نجومیوں کے بارے میں بھی ہوتی ہے کہ جب سینکڑوں باتیں بتاتے ہیں اور اس میں کوئی بات اتفاق سے صحیح ثابت ہو جاتی ہے تو وہ دنیادار لوگ جن کے باطن میں گمراہی و کجی ہوتی ہے اس ایک بات کی بنیاد پر ان نجومیوں کے معتقد ہو جاتے ہیں۔

آگے حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت آرہی ہے جس میں صراحت کے ساتھ کاہن کو ساحر فرمایا گیا ہے اس اعتبار سے اس حدیث کے ان الفاظ علی لسان الساحر او الکاھن۔ میں ساحر سے مراد کاہن ہے اس صورت میں حرف او راوی کے شک کے اظہار کے لئے ہوگا (یعنی یہ کہا جائے گا کہ راوی نے اپنے شک کا اظہار کیا ہے کہ یہاں ساحر کا لفظ فرمایا گیا ہے یا کاہن کا) اور اگر یہ بات پیش نظر ہو کہ ساحر چونکہ غیب کی باتیں نہیں بتایا کرتا اور اس اعتبار سے یہاں ساحر کا لفظ اپنے حقیقی معنی پر محمول نہیں ہو سکتا تو یہ کہا جائے گا کہ "ساحر" سے مراد نجومی ہے جیسا کہ ایک روایت میں فرمایا گیا ہے المنجم ساحر یعنی نجومی ساحر ہے اس صورت میں الساحر والکاھن میں حرف او تنویع کے لئے ہوگا۔

رہی یہ بات کہ چوری چھپے آسمان میں داخل ہونے اور فرشتوں کی باتیں سننے والے جن و شیطان کو بھگانے کے لئے جب شعلے پھینکے جاتے ہیں اور وہ شعلے اس جن یا شیطان کو پکڑتے ہیں تو اس کا حشر کیا ہوتا ہے؟ چنانچہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ وہ جن یا شیطان ان شعلوں کی زد میں آکر جل بھن جاتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں جب کہ بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ وہ جل بھن کر ختم نہیں ہوتے بلکہ شعلوں سے تکلیف و ایذا پا کر زندہ واپس آجاتے ہیں۔

شہاب ثاقب کی حقیقت

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَخْبَرَنِی رَجُلٌ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنَ الْاَنْصَارِ اَنَّھُمْ بَیْنَاھُمْ جُلُوْسٌ

لَيْلَةً مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رُمِيَ بِنَجْمٍ وَاسْتَنَارَ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاكُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ اِذَا رُمِيَ بِمِثْلِ هٰذَا قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَعْلَمُ كُنَّا نَقُوْلُ وُلِدَ اللَّيْلَةَ رَجُلٌ عَظِيْمٌ وَمَاتَ رَجُلٌ عَظِيْمٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِنَّهَا لَا يُرْمٰى بِهَا لِمَوْتِ اَحَدٍ وَلَا لِحَيٰوتِهٖ وَلٰكِنْ رَبُّنَا تَبَارَكَ اسْمُهٗ اِذَا قَضٰى اَمْرًا سَبَّحَ حَمَلَةُ الْعَرْشِ ثُمَّ سَبَّحَ اَهْلُ السَّمَآءِ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ التَّسْبِيْحُ اَهْلَ هٰذِهِ السَّمَآءِ الدُّنْيَا ثُمَّ قَالَ الَّذِيْنَ يَلُوْنَ حَمَلَةَ الْعَرْشِ لِحَمَلَةِ الْعَرْشِ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ فَيُخْبِرُوْنَهُمْ مَاقَالَ فَيَسْتَخْبِرُ بَعْضُ اَهْلِ السَّمٰوٰتِ بَعْضًا حَتّٰى يَبْلُغَ هٰذِهِ السَّمَآءِ الدُّنْيَا فَيَخْطَفُ الْجِنُّ السَّمْعَ فَيَقْذِفُوْنَ اِلٰى اَوْلِيَآءِهِمْ وَيَرْمُوْنَ فَمَا جَآءُوْا بِهٖ عَلٰى وَجْهِهٖ فَهُوَ حَقٌّ وَلٰكِنَّهُمْ يَقْرِفُوْنَ فِيْهِ وَيَزِيْدُوْنَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے انصاری صحابہؓ میں سے ایک صحابیؓ نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک دن رات کے وقت کچھ صحابہؓ رسول کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک ستارہ ٹوٹا اور اس کی تیز روشنی پھیل گئی یہ دیکھ کر رسول کریم ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم زمانہ جاہلیت میں اس طرح ستارہ ٹوٹنے کو کیا کہتے تھے؟ صحابہؓ نے عرض کیا۔ حقیقت حال کو اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں ہم تو یہ کہا کرتے تھے کہ آج کی رات کوئی بڑا آدمی پیدا کیا گیا ہے (اور کبھی یہ کہتے کہ) آج کی رات کوئی بڑا آدمی مرگیا ہے (یعنی ہم اس طرح ستارہ ٹوٹنے کو کسی بڑے اور اہم واقعے کی علامت سمجھا کرتے تھے) رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ستارہ نہ تو کسی کی موت سے ٹوٹتا ہے اور نہ کسی کے پیدا ہونے سے بلکہ، حقیقت حال یہ ہے کہ ہمارا رب جس کا نام بابرکت ہے جب کوئی حکم جاری فرماتا ہے تو عرش الٰہی کو اٹھانے والے فرشتے تسبیح (یعنی سبحان اللہ، سبحان اللہ کا ورد کرنے لگتے ہیں) پھر ان کی تسبیح کی آواز سن کر آسمان کے فرشتے تسبیح کرنے لگتے ہیں، جو عرش اٹھانے والے فرشتوں کے قریب ہے یہاں تک کہ اس تسبیح کی آواز ایک دوسرے آسمان سے ہوتی ہوئی آسمان دنیا پر رہنے والے فرشتوں تک پہنچ جاتی ہے، پھر وہ فرشتے جو عرش الٰہی کو اٹھانے والے فرشتوں سے قریب رہتے ہیں، عرش کو اٹھانے والے فرشتوں سے پوچھتے ہیں تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا ہے؟ وہ فرشتے ان کو وہ بات بتاتے ہیں جو پروردگار نے فرمائی ہے، پھر اس بات کو ان سے دوسرے فرشتے دریافت کرتے اور ان سے اور فرشتے، یہاں تک کہ یہ سلسلہ آسمان دنیا پر رہنے والوں تک پہنچ جاتا ہے، پھر اس سنی ہوئی بات کو جنات اچک لیتے ہیں یعنی وہ کان لگائے ایسی باتوں کے منتظر رہتے ہیں اور جب وہ چوری چھپے کوئی بات سن لیتے ہیں تو اس کو وہاں سے لے اڑتے ہیں۔ اور اپنے دوستوں یعنی کاہنوں تک پہنچا دیتے ہیں، چنانچہ ان جنات کو مارنے کے لئے ستارے پھینکے جاتے ہیں (لہٰذا ان ستاروں کے پھینکے جانے کا سبب یہ ہے نہ کہ وہ جس کا تم اعتقاد رکھتے ہو، یعنی کسی کی موت یا پیدائش وغیرہ) اس طرح کاہن اگر اس بات کو جو آسمان سے سنی گئی ہے۔ اور جنات کے ذریعہ اس تک پہنچی ہے جوں کی توں (یعنی اس میں کوئی تصرف اور کمی بیشی کے بغیر) بیان کریں تو وہ یقیناً صحیح ثابت ہوگی، (لیکن وہ کاہن ایسا نہیں کرتے بلکہ) اس میں جھوٹی باتیں شامل کر دیتے ہیں اور ایک بات کی بہت سی باتیں بنا لیتے ہیں۔" (مسلمؒ)

ستارے کس لئے پیدا کئے گئے؟

(۱۱) وَعَنْ قَتَادَةَ قَالَ خَلَقَ اللّٰهُ تَعَالٰى هٰذِهِ النُّجُوْمَ لِثَلٰثٍ جَعَلَهَا زِيْنَةً لِلسَّمَآءِ وَرُجُوْمًا لِلشَّيٰطِيْنِ وَعَلَامَاتٍ يُهْتَدٰى بِهَا فَمَنْ تَاَوَّلَ فِيْهَا بِغَيْرِ ذٰلِكَ اَخْطَاءَ وَاَضَاعَ نَصِيْبَهٗ وَتَكَلَّفَ مَالَا يَعْلَمُ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ تَعْلِيْقًا وَفِيْ رِوَايَةِ رَزِيْنٍ وَتَكَلَّفَ مَالَا يَعْنِيْهِ وَمَالَا عِلْمَ لَهٗ بِهٖ وَمَا عَجَزَ عَنْ عِلْمِهِ الْاَنْبِيَآءُ وَالْمَلٰئِكَةُ وَعَنِ الرَّبِيْعِ مِثْلَهٗ وَزَادَ وَاللّٰهِ مَاجَعَلَ اللّٰهُ فِيْ نَجْمٍ حَيٰوةَ اَحَدٍ وَلَا رِزْقَهٗ وَلَا مَوْتَهٗ وَاِنَّمَا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَيَتَعَلَّلُوْنَ بِالنُّجُوْمِ۔

"اور حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو تین باتوں کے لئے پیدا کیا ہے ایک تو یہ کہ ان کو آسمانوں کی زینت بنایا ہے اور

دوسرے شیاطین وجنات کو مارنے کے لئے اور تیسرے علامات کے لئے کہ لوگ ان کے ذریعہ جنگل ودریا میں اپنا راستہ پاسکیں، لہٰذا جس شخص نے ان ستاروں میں ان تین باتوں کے سوا اور کوئی غرض بیان کی تو اس نے خطا کی، اپنا حصہ ضائع کیا اور پھر اس چیز میں تکلف کیا جس کو وہ نہیں جانتا (یعنی آسمان کی چیزوں کے بارے میں جو حقوق ہیں ان کا علم قرآن وسُنّت کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے حاصل ہونا ممکن نہیں اور جب قرآن وسُنّت میں ستاروں کی غرض ان تین باتوں کے علاوہ اور کوئی بیان نہیں کی گئی ہے تو مذکورہ باتوں کے علاوہ کوئی اور غرض بیان کرنا ایسی بات کا بیان کرنا ہے جس کا معلوم ہونا متصور ہی نہیں ہے! ۔ اس روایت کو بخاریؒ نے بغیر سند کے نقل کیا ہے اور رزین کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اس نے اس چیز کا تکلف کیا جو اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی اور اس چیز میں تکلف کیا (یعنی اس چیز کو جاننے کا دعویٰ کیا) جس کا اس کو علم نہیں ہے اور اس چیز میں تکلف کیا جس کے علم سے انبیاء اور فرشتے عاجز رہے ہیں۔ ربیع نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ قسم ہے خدا کی! اللہ تعالیٰ نے ستارے میں نہ تو کسی کی زندگی (یعنی پیدائش) مقرر کی ہے نہ کسی کا رزق یعنی مال وجاہ وغیرہ اور نہ کسی کی موت! اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کاہن اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھوٹی افتراء پردازی کرتے ہیں اور ستاروں کے طلوع وغروب ہونے کو کسی واقعہ وحادثہ کی علت قرار دیتے ہیں!۔"

تشریح: "اپنا حصہ ضائع کیا" کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اس طرح لایعنی باتوں اور بیکار امور میں مبتلا کیا کہ جن کا کوئی فائدہ نہ دنیا میں حاصل ہوتا ہے اور نہ آخرت میں حاصل ہونے والا ہے۔ اس طرح اس نے گویا اپنی عمر عزیز کا قیمتی حصہ گنوایا۔

نجومی، ساحر ہے

⑫ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اقْتَبَسَ بَابًا مِنْ عِلْمِ النُّجُوْمِ لِغَيْرِ مَاذَكَرَ اللّٰهُ فَقَدِ اقْتَبَسَ شُعْبَةً مِنَ السِّحْرِ اَلْمُنَجِّمُ كَاهِنٌ وَالْكَاهِنُ سَاحِرٌ وَالسَّاحِرُ كَافِرٌ۔ (رواہ رزین)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جس شخص نے علم نجوم کا کوئی حصہ سیکھا اور سیکھنے کی غرض ان تین چیزوں کے علاوہ کسی اور چیز سے متعلق ہو کہ جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ذکر فرمائی ہیں۔ (اور جن کا بیان حدیث میں گزرا) تو اس نے بلاشبہ علم سحر کا ایک حصہ سیکھا (جب کہ علم سحر ایک برا علم ہے کیونکہ اس کی بعض قسم فسق میں داخل ہے۔ اور بعض قسم موجب کفر ہے) اور (یاد رکھو) منجم (علم نجوم کا جاننے والا) کاہن کے حکم میں ہوتا ہے (کیونکہ کاہن کی طرح منجم بھی بعض علامات کے ذریعہ غیب کی خبر دیتا ہے) اور کاہن، ساحر کے حکم میں ہے (کیوں کہ کاہن بھی بری باتوں کا ارتکاب کرتا اور لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہے) اور جو شخص ساحر کرے اور اس کے جائز ہونے کا اعتقاد رکھے وہ کافر ہو جاتا ہے (اسی طرح منجم اور کاہن بھی اپنی بداعتقادی کی بنا پر کافر ہو جاتے ہیں)۔" (رزینؒ)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ نجوم کہانت اور سحر، یہ سب چیزیں ایک ہی جنس سے ہیں کہ ان سب کا ایک ہی حکم ہے اور یہ سب کافروں اور بے دین لوگوں کے کام ہیں۔

منازل قمر کو نزول باراں میں مؤثر حقیقی جاننا کفر ہے

⑬ وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْاَمْسَكَ اللّٰهُ الْقَطْرَ عَنْ عِبَادِهٖ خَمْسَ سِنِيْنَ ثُمَّ اَرْسَلَهٗ لَاَصْبَحَتْ طَائِفَةٌ مِنَ النَّاسِ كَافِرِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سُقِيْنَا بِنَوْءِ الْمِجْدَحِ۔ (رواہ النسائی)

"اور حضرت ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اگر اللہ تعالیٰ مثلاً پانچ برس تک اپنے بندوں کو بارش سے محروم رکھے اور پھر بارش برسائے تو لوگوں کی ایک جماعت جو نجوم پر اعتقاد رکھتی ہے اس صورت میں بھی کفر کرتی ہوئی یہ کہے گی کہ مجدح یعنی قمر کی منزل سبب ہم پر بارش ہوئی ہے۔" (نسائیؒ)

تشریح: "مجدح" میم کے زیر جیم کے جزم اور دال کے زبر کے ساتھ اہل عرب کے نزدیک منازل قمر میں سے ایک منزل کا نام ہے زمانہ جاہلیت میں اہل عرب اس منزل کو بارش برسنے کا سبب قرار دیتے تھے۔ یہ بات پہلے بھی بتائی جا چکی ہے، کہ ستاروں کے طلوع و غروب اور منازل قمر کو بارش برسنے کا حقیقی سبب سمجھنا کفر ہے۔

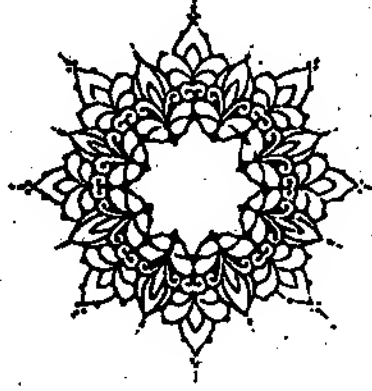

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الرؤیا
خواب کا بیان

"خواب" کے معنی ہیں وہ بات جو انسان نیند میں دیکھے "محققین" کہتے ہیں کہ خواب تین طرح کے ہوتے ہیں ایک تو محض خیال کہ دن بھر انسان کے دماغ اور ذہن پر جو باتیں چھائی رہتی ہیں، وہ خواب میں مشکل ہو کر نمودار ہو جاتی ہیں، دوسری طرح کا خواب وہ ہے جو شیطانی اثرات کا عکاس ہوتا ہے جیسا کہ عام طور پر ڈراؤنے خواب نظر آیا کرتے ہیں، اور تیسری طرح کا خواب وہ ہے جو منجانب اللہ بشارت اور بہتری کو ظاہر کرتا ہے، خواب کی یہی تیسری قسم "رویاء صالحہ" کہلاتی ہے اور اس کی حقیقت علماء اہل سُنّت کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سونے والے کے دل میں علوم معرفت اور ادراکات و احسان کا نور پیدا کر دیتا ہے، جیسا کہ وہ جاگنے والے کے دل کو علوم و معرفت اور دراکات و احساسات کی روشنی سے منور کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بلاشک و شبہ اس پر قادر ہے۔ کیوں کہ نہ تو بیداری قلب انسانی میں نور بصیرت کے پیدا ہونے کا ذریعہ ہے اور نہ نیند اس سے مانع۔

واضح رہے کہ سونے والا اپنے خواب میں جن باتوں کا ادراک و احساس کرتا ہے اور جن چیزوں کو اس کا نور بصیرت دیکھتا ہے وہ دراصل وقوع پذیر ہونے والی چیزوں کی علامت و اشارہ ہوتا ہے اور یہی علامت و اشارہ تعبیر کی بنیاد بنتا ہے۔ کبھی یہ علامت و اشارہ اتنا غیر واضح ہوتا ہے کہ اس کو صرف عارفین و معبرین ہی سمجھ پاتے ہیں اور کبھی اتنا واضح ہوتا ہے کہ عام انسانی ذہن بھی اس کی مراد پالیتا ہے۔ جیسا کہ بادل کو دیکھ کر بارش کے وجود کی طرف ذہن خود بخود چلا جاتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

مسلمان کا اچھا خواب حق ہے

① عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَمْ یَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ قَالُوْا وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ قَالَ الرُّؤْیَا الصَّالِحَةُ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ وَزَادَ مَالِكٌ بِرِوَایَةِ عَطَاءِ بْنِ یَسَارٍ یَرَاهَا الرَّجُلُ الْمُسْلِمُ اَوْ تُرٰی لَهٗ۔

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا نبوت کے آثار میں سے اب کچھ باقی نہیں رہا ہے علاوہ مبشرات کے صحابہؓ نے یہ سن کر عرض کیا کہ مبشرات سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اچھے خواب۔" (بخاریؒ)

"اور امام مالکؒ نے اس روایت میں جس کو انہوں نے حضرت عطاء ابن یسارؒ سے نقل کیا ہے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں (وہ اچھے خواب) جن کو مسلمان آدمی (اپنے لئے) دیکھتا ہے یا اس کے بارے میں کوئی اور شخص دیکھے۔"

تشریح: "مبشرات" (میم کے پیش اور باء کے زبر کے ساتھ) بشارت سے مشتق ہے جس کے معنی خوش خبری کے ہیں اعرابی میں لفظ

"بشارت" کا استعمال عام طور پر خیر کے سیاق میں ہوتا ہے لیکن کبھی شر کے ساتھ بھی اس کو استعمال کر لیا جاتا ہے اسی طرح رویا کا اطلاق عام طور پر اچھے خواب پر ہوتا ہے اور برے خواب کو حلم کہتے ہیں لیکن یہ فرق و تخصیص شرعی نقطہ نظر سے ہے ویسے لغت کے اعتبار سے رؤیا مطلق خواب کو کہتے ہیں۔ چنانچہ یہاں حدیث میں بھی لفظ رویاء مطلق خواب کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ رویاء سے اچھا خواب مراد ہے تو اس صورت میں کہا جائے گا کہ لفظ "صالحہ" کا ذکر محض لفظ رؤیا کی وضاحت و تشریح کے لئے ہے یا یہ کہ "صالحہ" اصل میں صادقہ کے معنی میں ہے کہ رؤیا صالحہ سے مراد وہ اچھا خواب ہے جو سچا یعنی واقع کے مطابق ہو۔ پہلے معنی میں یعنی لفظ صالحہ کو رؤیا کی وضاحت و تشریح قرار دینا زیادہ صحیح اور مبشرات کے معنی کے موافق ہے کیونکہ اچھے خواب کا مطلب اچھی خبر ہے اور بشارت بھی کلیۃً یا عام طور پر دل و دماغ کو خوش کرنے والی ہی ہوتی ہے اگرچہ طیبی کے قول کے مطابق بشارت میں صدق کا بھی اعتبار ہوتا ہے لیکن حدیث کا سیاق اس کا متقاضی ہے کہ دوسرے معنی صالحہ (بمعنی صادقہ) مراد لیا جائے کیونکہ حدیث میں خواب کو نبوت کا ایک جز کہا گیا ہے اور نبوت میں سچی خیر کا اعتبار ہے خواہ وہ خوش کرنے والی ہو یا ڈرانے والی ہو۔ اس صورت میں کہا جائے گا کہ لفظ مبشرات کا استعمال ازراہ تغلیب ہے یا یہ کہ "مبشرات" اپنے مطلق معنی یعنی "مخبرات" پر محمول ہے۔

اچھے خواب کی فضیلت

(۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَاَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ۔

"اور حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اچھا خواب نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: ظاہر یہ ہے کہ یہاں رویاء صالحہ سے مراد صادقہ ہے یعنی وہ اچھا خواب جو سچا بھی ہو! اس موقع پر ایک اشکال واقع ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کسی چیز کا کوئی جزو حصہ اس چیز سے جدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ہوتا ہے اس اعتبار سے کہا جائے گا کہ جب نبوت باقی نہیں رہی ہے تو نبوت کا جزو حصہ یعنی رویاء صالحہ کیوں کر باقی رہے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس ارشاد گرامی ﷺ کے معنی یہ ہیں کہ رویاء صالحہ علم نبوت کے اجزاء اور حصوں میں سے ایک جز، وحصہ ہے اور ظاہر ہے کہ علم نبوت باقی ہے اگرچہ نبوت باقی نہیں ہے گویا حدیث میں مذکورہ الفاظ کے ذریعہ رویاء صالحہ کی فضیلت و منقبت بیان فرمائی گئی ہے کہ اچھا خواب حقیقت میں نبوت کا پرتو ہے اگرچہ اس کو دیکھنے والا غیر نبی ہو، جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے نیک راہ دروش، حلم گرانباری، اور میانہ روی نبوت میں سے ہے۔ چھیالیس کے عدد کی تخصیص کے بارے میں اگرچہ علماء نے مختلف باتیں لکھی ہیں لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ نہ صرف اس کا بلکہ دوسری متعدد چیزوں جیسے نماز کی رکعات اور تسبیحات وغیرہ کے بارے میں اعداد مشروع و مذکور ہیں ان کی علت و حقیقت کا علم شارع علیہ السلام کو ہی ہے۔ ایک اور روایت میں چھیالیس کے بجائے چھبیس ایک روایت میں چھہتر اور ایک روایت میں چوبیس کا عدد مذکور ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کسی بھی روایت میں کسی خاص عدد سے تحدید مراد نہیں ہے بلکہ محض تکثیر مراد ہے۔

آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھنے کا ذکر

(۳) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ رَاٰنِيْ فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَاٰنِيْ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ فِيْ صُوْرَتِيْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس شخص نے مجھ کو خواب میں دیکھا اس نے درحقیقت مجھ کو ہی دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت نہیں بن سکتا۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے مجھ کو خواب میں دیکھا اس نے گویا عالم بیداری میں میرا دیدار کیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہو گا

کہ اس شخص پر وہ احکام عائد ہوں جو واقعۃً آنحضرت ﷺ کے دیدار و صحبت کی صورت میں ہوتے ہیں۔ یعنی نہ تو ایسے شخص کو صحابی کہا جائے گا اور نہ اس چیز پر عمل کرنا اس کے لئے ضروری ہوگا جس کو اس نے اپنے خواب میں آنحضرت ﷺ سے سنا ہوگا۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یہ حدیث اپنے زمانہ کے لوگوں کے لئے فرمائی میرے زمانہ میں جو شخص مجھ کو خواب میں دیکھے گا اس کو اللہ تعالیٰ ہجرت کی توفیق عطا فرمائے گا۔ تاکہ وہ مجھ سے آکر ملے۔ یا یہ مراد ہے کہ وہ آخرت میں میرا دیدار کرے گا۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہ ارشاد گرامی ﷺ بمعنی اخبار کے ہے، مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے مجھ کو خواب میں دیکھا اس کو خبر دیدو کہ اس کا خواب حقیقی اور سچا ہے اضغاث احلام میں سے نہیں ہے کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ یعنی اس کی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ کسی کے خواب میں آئے اور اس کے خیال میں یہ بات ڈالے کہ میں آنحضرت ﷺ ہوں اور اس طرح وہ آنحضرت پر یہ جھوٹ لگائے۔

بعض محققین نے لکھا ہے کہ شیطان حق تعالیٰ کی ذات کے بارے میں جھوٹ دکھا سکتا ہے، یعنی دیکھنے والے کو اس خیال و وسوسہ میں مبتلا کر سکتا ہے کہ یہ حق تعالیٰ کی صورت ہے لیکن آنحضرت ﷺ کی صورت ہرگز نہیں بن سکتا۔ اور نہ آپ ﷺ کی ذات پر جھوٹ لگا سکتا ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ ہدایت و راستی کے مظہر ہیں۔ جب کہ شیطان لعین ضلالت و گمراہی کا مظہر ہے اور ہدایت و ضلالت کے درمیان پانی اور آگ کی نسبت ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، اس کے برخلاف حق تعالیٰ کی ذات الٰہی صفات ہدایت و اضلال اور صفات متضادہ کی جامع ہے، علاوہ ازیں صفت الوہیت ایسی صفت ہے۔ جس کا مخلوقات میں سے کسی کا دعوی کرنا صریح البطلان ہے اور محل اشتباہ نہیں ہے، جب کہ وصف نبوت اس درجہ کی صفت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص الوہیت کا دعوی کرے تو اس سے خرق عادات صادر ہو سکتا ہے، جب کہ اگر کوئی شخص نبوت کا دعوی کرے تو اس سے معجزہ کا ظاہر ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

(۴) وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ رَاٰنِی فَقَدْ رَاَی الْحَقَّ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس نے اپنے خواب میں مجھ کو دیکھا اس نے حق دیکھا یعنی اس کا خواب سچا ہے کہ اس نے مجھ کو ہی دیکھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: واضح رہے کہ اس مضمون کی احادیث، جو متعدد طرق و اسانید سے اور مختلف الفاظ میں منقول ہیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جس شخص نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا اس نے حقیقت میں آنحضرت ﷺ ہی کو دیکھا اس بارے میں دروغ خیال اور شیطانی اثرات کا قطعاً دخل نہیں ہوتا، چنانچہ علماء نے اس چیز کو آنحضرت ﷺ کے خصائص میں شمار کیا ہے اور اس کو اعجاز نبوی ﷺ قرار دیا ہے البتہ علماء کے ہاں اس بات میں اختلاف ہے کہ ان احادیث کا تعلق آنحضرت ﷺ کو کس صورت و حلیہ میں دیکھنے سے ہے چنانچہ بعض حضرات تو کہتے ہیں کہ ان احادیث کا تعلق اس شخص سے ہے جو اپنے خواب میں آنحضرت ﷺ کو اس مخصوص صورت و حلیہ میں دیکھے جس سے آپ ﷺ متصف تھے، پھر بعض حضرات نے اس بارے میں توسع کیا ہے اور کہا ہے کہ آپ ﷺ کی اس صورت و شکل میں دیکھے جو پوری عمر آپ ﷺ سے متعلق رہی ہے۔ یعنی خواہ جوانی کی صورت و شکل میں دیکھے خواہ کہولت اور خواہ آخری عمر کی صورت میں دیکھے۔ اور بعض حضرات نے اس دائرے کو محدود کیا اور کہا ہے کہ آپ ﷺ کو اس شکل و صورت میں دیکھنے کا اعتبار ہے جو آپ ﷺ کی عمر کے آخری حصہ میں تھی اور جس پر آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے یہاں تک کہ ان حضرات نے ان سفید بالوں کو بھی دیکھنے کا اعتبار کیا ہے جو آپ ﷺ کے سر مبارک اور لحیہ مبارک میں تھے اور جو تعداد میں بیس تک بھی نہیں پہنچے تھے۔

منقول ہے کہ حضرت محمدؒ ابن سیرین جو تعبیر خواب کے فن میں امام تھے کے پاس جب کوئی شخص آکر بیان کرتا کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا ہے تو وہ کہتے تھے کہ بتاؤ تم نے آنحضرت ﷺ کو کس شکل و صورت اور کس حلیہ میں دیکھا ہے اگر وہ شخص آنحضرت ﷺ کا حلیہ بیان نہ کرتا جو آپ ﷺ کے ساتھ مخصوص تھا تو ابن سیرینؒ اس سے کہتے کہ بھاگ جاؤ تم نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں نہیں دیکھا ہے۔

اس بارے میں حضرت امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا اس نے بہر صورت آپ ﷺ کو دیکھا خواہ اس نے اس مخصوص صورت و حلیہ میں دیکھا ہو جو آپ ﷺ کے بارے میں منقول ہے یا کسی اور شکل و شباہت میں دیکھا ہو کیونکہ شکل و شباہت کا مختلف ہونا ذات کے مختلف ہونے کو ضروری قرار نہیں دیتا، علاوہ ازیں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ شکل و شباہت میں اختلاف و تفاوت کا تعلق خواب دیکھنے والے کے ایمان کے کمال و نقصان سے بھی ہوسکتا ہے یعنی جس شخص نے خواب میں آنحضرت ﷺ کو اچھی صورت و شکل میں دیکھا یہ اس کے ایمان کامل اور عقیدے کے صالح ہونے کی علامت قرار پائے گا اور جس شخص نے اس کے برخلاف دیکھا یہ اس کے ایمان کی کمزوری اور عقیدے کے فساد کی علامت قرار پائے گا، اسی طرح ایک شخص نے آپ ﷺ کو بوڑھا دیکھا، ایک شخص نے جوان دیکھا، ایک شخص نے رضامند دیکھا، ایک شخص نے خفگی کے عالم میں دیکھا، ایک شخص نے روتے ہوئے دیکھا، ایک شخص نے شاد و خوش دیکھا اور ایک شخص نے ناخوش دیکھا تو یہ ساری حالتیں خواب دیکھنے والے کے ایمانی احوال کے فرق و تفاوت پر مبنی ہوں گی، کہ جو شخص جس درجہ کے ایمان کا حامل ہوگا وہ آپ ﷺ کی اسی درجہ کی مثالی صورت میں دیکھے گا۔ اس اعتبار سے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھنا گویا اپنے احوال ایمانی کو پہچاننے کا ایک معیار ہے لہٰذا یہ چیز سالکین طریقت کے لئے ایک مفید ضابطہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ وہ اس کے ذریعے اپنے باطن کی حالت کو پہچان کر اس کی اصلاح کریں، اسی پر قیاس کرتے ہوئے بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ جو شخص خواب میں آنحضرت ﷺ سے کوئی ارشاد سنے تو اس کا حدیث و سُنّت سے تقابل کرے اگر وہ ارشاد حدیث و سُنّت کے موافق ہو تو وہ یقیناً حق ہے اور اگر موافق نہ ہو، جانے کہ یہ میرے ذہن اور میرے سامعہ کا خلل ہے لہٰذا خواب میں آنحضرت ﷺ کی ذات کریمہ کو اور آپ ﷺ کے ارشاد کو دیکھنا اور سننا حق ہے، اگر صورت مبارک اور ارشادات مقدسہ میں کوئی تفاوت و مخالفت نظر آئے تو سمجھنا چاہئے کہ یہ خواب دیکھنے والے کے نقص و کوتاہی کے اعتبار سے ہے۔

حضرت شیخ علی متقیؒ سے منقول ہے کہ ایک فقیر نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت ﷺ اس کو شراب پینے کے لئے فرمارہے ہیں، اس خواب کی وجہ سے اس کے ذہن میں سخت خلجان پیدا ہوا اس نے اس خلجان کو دور کرنے کے لئے علماء سے رجوع کیا اور ان سے پوچھا کہ اس خواب کی حقیقت کیا ہے ہر عالم نے اس کی مختلف تعبیر و تاویل بیان کی اسی دوران یہ مسئلہ حدیث کے ایک عالم حضرت شیخ محمد ابن عراقؒ کے سامنے آیا جو عالم باعمل اور نہایت متبع سُنّت تھے انہوں نے فرمایا کہ اصل بات یوں نہیں ہے جس طرح اس نے سنی ہے بلکہ اس کا ذہن و سامعہ، خلل اور انتشار کا شکار ہوا ہے۔ حقیقت میں آنحضرت ﷺ نے یوں فرمایا تھا کہ لا تشرب الخمر شراب ہرگز نہ پینا مگر اس نے اس جملہ کو یوں سنا اشرب الخمر (شراب پیو)۔

⑤ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ رَاٰنِیْ فِی الْمَنَامِ فَسَيَرَانِیْ فِی الْيَقْظَةِ وَلَا يَتَمَثَّلُ الشَّيْطَانُ بِیْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے مجھ کو خواب میں دیکھا وہ جلد ہی مجھ کو بیداری کے عالم میں دیکھے گا اور شیطان میری صورت نہیں بن سکتا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کا تعلق آپ ﷺ کے زمانہ سے ہے کہ جو شخص خواب میں آپ کو دیکھتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ یہ توفیق عطا فرمادیتا ہے کہ وہ عالم بیداری میں آپ ﷺ کے دیدار سے مشرف ہوتا یعنی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ اور اسلام قبول کرتا۔ یا اس ارشاد گرامی کی مراد یہ ہے کہ مجھ کو خواب میں دیکھنے والا شخص آخرت میں عالم بیداری میں مجھ کو دیکھے گا۔

اچھا خواب اور برا خواب

⑥ وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ مِنَ اللّٰهِ وَالْحُلْمُ مِنَ الشَّيْطَانِ

فَاِذَارَاٰی اَحَدُکُمْ مَایُحِبُّ فَلَا یُحَدِّثْ بِهٖ اِلَّا مَنْ یُحِبُّ وَاِذَارَاٰی مَایَکْرَهُ فَلْیَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّهَا وَمِنْ شَرِّ الشَّیْطَانِ وَلْیَتْفُلْ ثَلَاثًا وَلَا یُحَدِّثْ بِهَا اَحَدًا فَاِنَّهَا لَنْ تَضُرَّهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے ہے لہٰذا جب تم میں سے کوئی شخص ایسا خواب دیکھے جس سے وہ خوش ہو تو چاہئے کہ اس خواب کو صرف اس شخص کے سامنے بیان کرے جس کو وہ دوست وہمدرد سمجھتا ہے (جیسے علماء و صلحاء اور اقرباء، نیز وہ اس خواب پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اسکی حمد و تعریف کرے، جیسا کہ بخاری و مسلم کی ایک اور ایک روایت میں منقول ہے) اور جب ایسا خواب دیکھے جس کو وہ پسند نہیں کرتا تو چاہئے کہ اس خواب کی برائی اور شیطان کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے اور شیطان کو دور کرنے کے قصد سے تین مرتبہ تھتکار دے نیز اس خواب کو کسی کے سامنے بیان نہ کرے (خواہ دوست ہو یا دشمن) اس لئے وہ خواب اس کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "برا خواب شیطان کی طرف سے ہے" کا مطلب یہ ہے اگرچہ اچھے اور برے دونوں طرح کے خواب کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے اور دیکھنے والا اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے دیکھتا ہے لیکن برا خواب شیطان اثرات کا عکاس ہوتا ہے اور چونکہ اس خواب سے انسان کو پریشانی ہوتی ہے اس لئے اس پر شیطان کو بہت خوشی ہوتی ہے، حاصل یہ کہ اچھا خواب تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کو بشارت ہوتی ہے تاکہ وہ بندہ خوش ہو اور اس کا وہ خواب اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے حسن سلوک اور امید آوری کا باعث اور شکر خداوندی کے اضافہ کا موجب بنے جب کہ غمگین اور پریشان کرنے والا جھوٹا خواب شیطانی اثرات کے تحت ہوتا ہے جس سے شیطان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمان کو غمگین و پریشان کر کے ایسی راہ پر ڈال دے جس سے وہ بدگمانی اور ناامیدی اور تقرب الٰہی و تلاش حق کی راہ میں سست روی کا شکار ہو جائے۔

"وہ خواب اس کو نقصان نہیں پہنچائے گا"۔ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے صدقہ و خیرات کو مال کی حفاظت و برکت اور دفع بلیات کا سبب بنایا ہے اسی طرح اس نے مذکورہ چیزوں یعنی اللہ کی پناہ مانگنے، تین دفع تھتکارنے اور کسی کے سامنے بیان نہ کرنے کو برے خواب کے مضر اثرات سے سلامتی کا سبب قرار دیا ہے۔

برا خواب دیکھے تو کیا کرے

⑦ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَارَاٰی اَحَدُکُمُ الرُّؤْيَا يَكْرَهُهَا فَلْيَبْصُقْ عَنْ يَسَارِهٖ ثَلٰثًا وَيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ ثَلٰثًا وَلْيَتَحَوَّلْ عَنْ جَنْبِهِ الَّذِيْ كَانَ عَلَيْهِ۔ (رواہ مسلم)

اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص ایسا خواب دیکھے جس کو وہ ناپسند کرتا ہو تو اس کو چاہئے کہ بائیں طرف تین بار تھتکار دے اور تین بار شیطان سے اللہ کی پناہ مانگے اور اپنی کروٹ کو تبدیل کر دے جس پر وہ خواب دیکھنے کے وقت سویا ہوا تھا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "یہاں" "تھتکارنے" کے لئے لفظ "بصق" استعمال کیا گیا ہے۔ جب کہ پچھلی حدیث میں لفظ "تفل" مذکور ہے، مفہوم و مطلب کے اعتبار سے تو دونوں لفظ بظاہر یکساں ہیں لیکن دونوں میں ایک ہلکا سا فرق یہ ہے کہ "تفل" کے معنی ہیں منہ سے تھوک نکالنا جب کہ "بصق" کا مفہوم ہے منہ کے اندر سے (تھوک) نکالنا اس طرح کہ کچھ حلق سے بھی نکلے، منہ سے نکلے ہوئے تھوک کو "بصاق" کہتے ہیں اور "بزاق" بھی کہا جاتا ہے اس سے واضح ہوا کہ تھتکارنے کے سلسلے میں پہلا درجہ "بصق" ہے اس کے بعد "تفل" ہے، "تفل" کے بعد "نفث" ہے جس کے معنی ہیں لبوں کے تھوک کے ساتھ پھونکنا اور اس کے بعد "نفخ" ہے جو محض پھونک مارنے کو کہتے ہیں۔ مسلم کی ایک روایت میں فلیبصق کے بجائے فلینفث کا لفظ منقول ہے نیز اس حدیث میں بائیں طرف تھتکارنے کا حکم دیا

گیا ہے جب کہ پچھلی حدیث میں مطلق تھتکارنے کا حکم ہے اسی طرح اسی حدیث میں کروٹ تبدیل کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے، چنانچہ علماء لکھتے ہیں کہ خواب کے اثرات و کیفیات میں تغیر و تبدیلی کے لئے یہ چیزیں یعنی کروٹ پھیر لینا بہت تاثیر رکھتی ہے۔

چند خوابوں کی تعبیر

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اقْتَرَبَ الزَّمَانُ لَمْ یَكَدْ یَكْذِبُ رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَاَرْبَعِیْنَ جُزْءً مِنَ النُّبُوَّةِ فَمَا كَانَ مِنَ النُّبُوَّةِ فَاِنَّهٗ لَا یَكْذِبُ قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ سِیْرِیْنَ وَاَنَا اَقُوْلُ الرُّؤْیَا ثَلَاثٌ حَدِیْثُ النَّفْسِ وَتَخْوِیْفُ الشَّیْطَانِ وَبُشْرٰی مِنَ اللّٰهِ فَمَنْ رَاٰی شَیْئًا یَكْرَهُهٗ فَلَا یَقُصَّهٗ عَلٰی اَحَدٍ وَلْیَقُمْ فَلْیُصَلِّ قَالَ وَكَانَ یَكْرَهُ الْغُلَّ فِی النَّوْمِ وَیُعْجِبُهُمُ الْقَیْدُ وَیُقَالُ الْقَیْدُ ثُبَاتٌ فِی الدِّیْنِ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ قَالَ الْبُخَارِیُّ رَوَاهُ قَتَادَةُ وَیُوْنُسُ وَهُشَیْمٌ وَاَبُوْ هِلَالٍ عَنِ ابْنِ سِیْرِیْنَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ وَقَالَ یُوْنُسُ لَا اَحْسِبُهٗ اِلَّا عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِی الْقَیْدِ وَقَالَ مُسْلِمٌ لَا اَدْرِیْ هُوَ فِی الْحَدِیْثِ اَمْ قَالَهُ ابْنُ سِیْرِیْنَ وَفِیْ رِوَایَةٍ نَحْوَهٗ وَاَدْرَجَ فِی الْحَدِیْثِ قَوْلَهٗ وَاَكْرَهُ الْغُلَّ اِلٰی تَمَامِ الْكَلَامِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس وقت کہ زمانہ قریب ہوگا تو مؤمن کا خواب جھوٹا نہیں ہوگا اور مؤمن کا خواب نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزو ہے اور جو چیز نبوت کے اجزاء میں سے ہو وہ جھوٹی نہیں ہوا کرتی۔" حضرت محمد ابن سیرینؒ جو (ایک جلیل القدر تابعی اور فن تعبیر خواب کے امام ہیں) فرماتے ہیں کہ اور میں (آنحضرت ﷺ سے منقول احادیث کی روشنی میں یہ کہتا ہوں کہ خواب تین طرح کے ہوتے ہیں ایک تو نفس کا خیال، دوسرے شیطان کا ڈرانا اور تیسرے خدا کی طرف سے بشارت پس جو شخص کوئی برا خواب" (ڈراونا) دیکھے تو اس کو کسی کے سامنے بیان نہ کرے اور (یہ کرے کہ خواب دیکھنے کے بعد) اٹھے اور (نفل) نماز پڑھ لے تاکہ نماز کی برکت و نورانیت کے سبب اس کے دل کو اطمینان نصیب ہو اور خواب کی برائی کا جو وہم و وسوسہ دل میں پیدا ہو گیا ہے وہ جاتا رہے گا) نیز ابن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ خواب میں طوق کو دیکھنا اچھا نہیں سمجھتے تھے اور قید کو دیکھنا پسند فرماتے تھے چنانچہ کہا جاتا ہے (یعنی تعبیر خواب کے ماہر علماء کہتے ہیں) کہ قید کا مطلب دین پر ثابت قدم رہنا ہے یہ پوری روایت (جو آنحضرت ﷺ کے ارشاد اور ابن سیرینؒ کے قول پر مشتمل ہے) بخاریؒ و مسلمؒ نے نقل کی ہے لیکن روایت کے آخری جزو کے بارے میں دونوں کو تردد ہے چنانچہ امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کو یعنی پوری روایت کو یا صرف اسی جزو کو کہ جس میں قید کا ذکر ہے قتادہ، یونسؒ، ہشیمؒ، اور ابوہلالؒ نے محمد ابن سیرین سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے (ابتدائی جزو بطریق مرفوع اور آخری جزو بطریق موقوف) نقل کیا ہے اور یونس نے کہا ہے کہ میرا گمان ہے کہ حدیث کا وہ جزو جس میں ابن سیرین نے قید کا ذکر کیا ہے یعنی یہ الفاظ یعجبهم القید و القید ثبات فی الدین) حضرت ابوہریرہؓ کا قول نہیں ہے بلکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے (گویا بخاری کے اس قول کا مطلب یہ ہوا کہ ابن سرینؒ نے نقل کرنے والے ایک راوی یونسؒ کے مطابق روایت کا وہ جزو کہ جس میں طوق کا ذکر ہے، حضرت ابوہریرہؓ یا ابن سیرینؒ کا اپنا قول ہے، البتہ وہ جزو کہ جس میں قید کا ذکر ہے حضرت ابوہریرہؓ یا ابن سیرینؒ کا اپنا قول نہیں ہے بلکہ حدیث مرفوع یعنی آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے جس کو آنحضرت ﷺ سے ابوہریرہؓ نے اور ابوہریرہؓ سے محمد ابن سیرینؒ نے نقل کیا ہے) اور امام مسلمؒ نے جو (ابن سیرینؒ سے روایت نقل کرکے) یہ کہا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ (جزء کہ جس میں قید کے الفاظ ہیں)، آنحضرت ﷺ کی حدیث کے الفاظ ہیں یا ابن سیرینؒ کا اپنا قول ہے۔ مسلمؒ کی ایک اور روایت میں اسی طرح کے الفاظ ہیں نیز مسلمؒ نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ یا محمد ابن سیرینؒ نے حدیث میں ادراج کیا ہے۔ بایں طور کہ انہوں نے کہا میں طوق کو دیکھنا اچھا سمجھتا ہوں........الخ (گویا مسلم کے قول کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کا پورا آخری جزو، جو طوق اور قید کے ذکر پر مشتمل ہے آنحضرت ﷺ کا ارشاد نہیں ہے۔ بلکہ حضرت ابوہریرہؓ یا محمد ابن سیرینؒ کا اپنا قول ہے نیز

بخاریؒ و مسلم کے ان اقوال کی روشنی میں قال و کان یکرہ کی ضمیروں کی حقیقت حال بھی منکشف ہو جاتی ہے کہ ان ضمیروں کو کس کی طرف راجع ہونا چاہئے!۔"

تشریح: "جس وقت کہ زمانہ قریب ہوگا" کے تین معنی بیان کئے جاتے ہیں ایک تو یہ کہ زمانہ قریب ہونے سے مراد قرب قیامت کا آخری زمانہ ہے جیسا کہ ایک اور حدیث میں صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ آخر زمانہ میں قیامت کے قریب مؤمن کا خواب جھوٹا نہیں ہوگا۔ دوسرے یہ کہ زمانہ قریب ہونے سے مراد موت کے زمانہ سے قریب ہونا ہے یعنی جس مؤمن کی موت کا زمانہ قریب ہوتا ہے اس کا خواب جھوٹا نہیں ہوتا یہ معنی حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنے بعض مشائخ سے نقل کئے ہیں، تیسرے یہ کہ اس سے مراد وہ ایام ہیں جن میں دن رات برابر ہوتے ہیں، چنانچہ جس زمانہ میں دن رات برابر ہوتے ہیں ان میں انسانی مزاج اعتدال پر ہوتا ہے اور ذہن و فکر کی صلاحتیں صحت و سلامت روی کے ساتھ کام کرتی ہیں ایسے دنوں میں دیکھا جانے والا خواب ذہنی و جسمانی خلل و انتشار سے محفوظ اور زیادہ سچا ہوتا ہے، چوتھے یہ کہ زمانہ قریب ہونے سے مراد وہ زمانہ ہے جب سال مہینہ کی طرح، مہینہ ہفتہ کی طرح، ہفتہ دن کی طرح اور دن ساعت کی طرح گزرنے لگے۔ علماء نے لکھا ہے کہ ایسا زمانہ حضرت امام مہدیؓ کے دور میں آئے گا کیونکہ اس وقت حضرت امام مہدیؓ کے عدل و انصاف اور رعایا پروری کی وجہ سے سب ہی لوگ آسودگی و مسرت اور بے فکری کے دن گزاریں گے اور ظاہر ہے کہ آسودگی و بے فکری کے دن بڑی سرعت کے ساتھ گزرتے معلوم ہوتے ہیں خواہ وہ کتنا ہی طویل زمانہ کیوں نہ ہو اس کے برعکس عسرت و تنگی اور محنت مشقت کے دن اتنے بھاری معلوم ہوتے ہیں کہ خواہ وہ کتنا ہی مختصر عرصہ کیوں نہ ہو ایک ایک دن پہاڑ کی طرح گزرتا ہے۔ لہٰذا حضرت مہدیؓ کے زمانہ میں بھی خواب صحیح و درست ہوں گے کیوں کہ وہ راستی کا زمانہ ہوگا۔ ایک حدیث میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ وہ شخص جتنا زیادہ راست باز ہوگا اس کا خواب اتنا ہی سچا ہوگا۔

آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی سے چونکہ مطلق خواب سچا ہونا اور اس کی توصیف و فضیلت واضح ہوتی تھی تو اس لئے خواب کی قسمیں بیان کرنے کے لئے حضرت محمد ابن سیرینؒ کا ایک قول نقل کیا گیا جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ خواب کی ہر قسم نہ تو سچی ہوتی ہے اور نہ قابل تعبیر و لائق اعتبار، بلکہ خواب کی صرف وہی قسم قابل تعبیر و لائق اعتبار ہوتی ہے جس کو حق تعالیٰ کی طرف سے بشارت اور آئندہ پیش آنے والے واقعات و حادثات کی خبر و علامت قرار دیا جاتا ہے۔

ابن سیرینؒ نے خواب کی جو تین قسمیں بیان کی ہیں ان میں پہلی قسم نفس کا خیال ہے، یعنی انسان دن بھر جن امور میں مشغول رہتا ہے اور اس کے دل دماغ پر جو باتیں چھائی رہتی ہیں وہی رات میں بصورت خواب متشکل ہو کر نظر آتی ہیں مثلاً ایک شخص اپنے پیشہ و روزگار میں مصروف رہتا ہے اور اس کا ذہن و خیال انہیں باتوں کی فکر اور ادھیڑبن میں لگا رہتا ہے جو اس کے پیشہ و روزگار سے متعلق ہیں تو خواب میں اس کو وہی چیزیں نظر آتی ہیں، یا ایک شخص اپنے محبوب کے خیال میں مگن رہتا ہے اور اس کے ذہن پر ہر وقت اسی محبوب کا سایہ رہتا ہے تو اس کے خواب کی دنیا پر بھی وہی محبوب چھایا رہتا ہے غرضکہ عالم بیداری میں جس شخص کے ذہن و خیال پر جو چیز زیادہ چھائی رہتی ہے وہی اس کو خواب میں نظر آئے گی لہٰذا اس طرح کے خواب کا کوئی اعتبار نہیں۔

دوسری قسم ڈراؤنا خواب ہے، یہ خواب اصل میں شیطانی اثرات کا پرتو ہوتا ہے، شیطان چونکہ ازل سے بنی آدم کا دشمن ہے اور جس طرح وہ عالم بیداری میں انسان کو گمراہ کرنے اور پریشان کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح نیند کی حالت میں بھی وہ انسان کو چین نہیں لینے دیتا، چنانچہ وہ انسان کو خواب میں پریشان کرنے اور ڈرانے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کرتا ہے کبھی تو وہ کسی ڈراونی شکل و صورت میں نظر آتا ہے جیسے وہ دیکھتا ہے کہ میرا سر قلم ہو گیا وغیرہ وغیرہ اسی طرح خواب میں احتلام کا ہونا کہ موجب غسل ہوتا ہے اور بسا اوقات اس کی وجہ سے نماز فوت یا قضا ہو جاتی ہے اسی شیطانی اثرات کا کرشمہ ہوتا ہے، پہلی قسم کی طرح یہ قسم بھی بے اعتبار اور ناقابل تعبیر ہوتی ہے۔

خواب کی تیسری قسم وہ ہے جس کو منجانب اللہ بشارت کہا گیا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کے خواب میں بشارت دیتا ہے اور اس کے قلب کے آئینہ میں بطور اشارات وعلامات ان چیزوں کو مشکل کر کے دکھاتا ہے۔ جو آئندہ وقوع پذیر ہونے والی ہوتی ہے۔ یا جن کا تعلق مؤمن کی روحانی و قلبی بالیدگی وطمانیت سے ہوتا ہے وہ بندہ خوش ہو اور طلب حق میں تروتازگی محسوس کرے، نیز حق تعالیٰ سے حسن اعتقاد اور امید آوری رکھے۔ خواب کی یہی وہ قسم ہے۔ جو لائق اعتبار اور قابل تعبیر ہے اور جس کی فضیلت و تعریف احادیث میں بیان کی گئی ہے۔

"تو اس کو کسی کے سامنے بیان نہ کرے" کا مطلب یہ ہے کہ جب اس طرح کا خواب بے اعتبار ہے اور اس کو کوئی تعبیر نہیں تو اس کو کسی کے سامنے بیان کرنا عبث ولا حاصل ہے علاوہ ازیں ایک بات یہ بھی ہے کہ جب اس قسم کے خواب کو کسی کے سامنے بیان کرے گا اور سننے والا خواب کی ظاہری حالت کے پیش نظر اس کی خراب تعبیر دے گا۔ تو اس کی وجہ سے فاسد وہم میں مبتلا ہونا اور بد شگونی لینا لازم آئے گا، نیز دل ودماغ مختلف قسم کے اندیشوں اور وسوسوں سے پریشان ہو جائیں گے، مزید برآں خواب کے وقوع پذیر ہونے میں خواب کو ایک خاص تاثیر حاصل ہے کہ خواب کو سننے والا جو تعبیر دیتا ہے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ویسا ہی وقوع پذیر ہو جاتا ہے۔

"قال و کان یکرہ الغل الخ" میں لفظ قال اور کان کی ضمیروں کے بارے میں شارحین حدیث نے کئی احتمال لکھے ہیں۔ ایک تو یہ کہ قال کی ضمیر محمد ابن سیرینؒ کی طرف سے راجع ہو جیسا کہ ماقبل کی عبارت قال محمد بن سیرین سے بظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے اور اس بنا پر کان یکرہ کی ضمیریں آنحضرت ﷺ کی طرف راجع ہوں، اس صورت میں مذکورہ جملہ کے معنی وہی ہونگے جو ترجمہ میں بیان کئے گئے یعنی حضرت محمد ابن سیرینؒ نے کہا کہ آنحضرت ﷺ اس بات کو اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ اس کے گلے میں طوق ڈالا گیا ہے کیونکہ گلے میں طوق کا ڈالا جانا دوزخیوں کی صفت ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔ اذالاغلال فی اعناقھم دوسرا احتمال یہ ہے کہ "قال" کی ضمیر تو ابن سیرینؒ کی طرف راجع ہو اور کان یکرہ کی ضمیریں حضرت ابوہریرہؓ کی طرف راجع ہوں اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ ابن سیرینؒ نے کہا ہے، حضرت ابوہریرہؓ اس بات کو اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ اس کے گلے میں طوق ڈالا گیا ہے اور حضرت ابوہریرہؓ کا اس بات کو اچھا نہ سمجھنا یا تو اس پر تھا کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اسی طرح سنا ہو گا یا اپنے ان کے اجتہاد کی بنا پر تھا۔ اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ قال کی ضمیر تو اس راوی کی طرف راجع ہو جس نے اس حدیث کو حضرت ابن سیرینؒ سے نقل کیا ہے اور کان یکرہ کی ضمیریں حضرت ابن سیرینؒ کی طرف راجع ہوں اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ راوی نے کہا کہ حضرت ابن سیرینؒ خواب میں طوق کو دیکھنا اچھا نہیں سمجھتے تھے! بظاہر یہ تیسرا احتمال ایک طرح کی ترجیح رکھتا ہے کیوں کہ حضرت ابن سیرینؒ تعبیر خواب کے فن کے امام سمجھے جاتے ہیں اور ان سے اس طرح کے بہت سے اقوال منقول ہیں۔

اور قید کو دیکھنا پسند فرماتے تھے یعنی کوئی شخص خواب میں دیکھتا کہ اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر اس کو قیدی بنا لیا گیا ہے تو اس خواب کو اچھا سمجھتے تھے، بخاریؒ نے اس جملہ میں جمع کا صیغہ یعنی لفظ یعجبھم نقل کیا ہے، لہٰذا ضمیروں کے سلسلے میں اوپر نقل کئے گئے احتمالات میں سے پہلے احتمال کی بنا پر یعجبھم کی ضمیر آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ کی طرف راجع ہو گی دوسرے احتمال کی بنا پر حضرت ابوہریرہؓ اور ان کے تابعین کی طرف اور تیسرے احتمال کی بنا پر حضرت ابن سیرینؒ اور ان کے زمانہ کے تعبیر دینے والے علماء کی طرف راجع ہو گی۔ خواب میں اپنے کو قیدی دیکھنا اس لئے اچھا ہے کہ دراصل برے امور، گناہوں اور کمزوری و گمراہی سے باز رہنے اور دینی احکامات وطاعت پر ثابت قدم رہنے کی علامت ہے جیسا کہ روایت میں فرمایا گیا ہے ویقال القید ثبات فی الدین (کہا جاتا ہے کہ قید کا مطلب دین پر ثابت قدم رہنا ہے) لیکن واضح رہے کہ یہ تعبیر اہل دین وطاعت کی نسبت سے ہے یعنی جو شخص دینی زندگی کا حامل اور عبادات وطاعات پر عامل ہو گا اور وہ خواب میں اپنے کو قیدی دیکھے گا تو اس کے لئے مذکورہ تعبیر ہو گی اسی لئے تعبیر خواب کے ماہرین نے لکھا ہے کہ اگر کوئی بیمار یا قیدی، یا مسافر اور یا کوئی مصیبت زدہ شخص خواب میں دیکھے کہ میرے پیروں میں قید کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں تو

اس کے حق میں خواب کی یہ تعبیر ہوگی کہ وہ اپنے حال پر قائم رہے گا اسی طرح ایک ہی خواب کو دو مختلف حالت کے آدمی دیکھیں تو اس کی تعبیر ان کے حق میں ان کی حالت کے مطابق الگ الگ ہوگی، مثلاً اگر کوئی تاجر یہ خواب دیکھے کہ وہ اپنا سامان لے کر کشتی پر بیٹھا ہوا ہے اور ہوا کشتی کے موافق چل رہی ہے تو اس کے حق میں خواب نقصان و ضرر سے سلامتی اور تجارت میں نفع کی علامت قرار پائے گا اور اگر یہی خواب کوئی سالک طریقت دیکھے تو اس کے حق میں یہ خواب شریعت کی اتباع اور مرتبہ حقیقت کو پہنچنے کی علامت قرار پائے گا۔

ڈراؤنا خواب شیطانی اثر ہے اس کو کسی کے سامنے بیان نہ کرو

⑨ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَاَيْتُ فِي الْمَنَامِ كَاَنَّ رَاْسِيْ قُطِعَ فَقَالَ فَضَحِكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ اِذَا لَعِبَ الشَّيْطَانُ بِاَحَدِكُمْ فِيْ مَنَامِهٖ فَلَا يُحَدِّثْ بِهِ النَّاسَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک دیہاتی آیا اور عرض کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گویا میرا سر کاٹ ڈالا گیا ہے۔ جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یہ خواب سن کر ہنس دیئے اور فرمایا کہ جب تم میں سے کسی شخص کے خواب میں اس کے ساتھ شیطان تماشہ کرے تو وہ اس خواب کو لوگوں کے سامنے بیان نہ کرے۔" (مسلمؒ)

تشریح: گویا آنحضرت ﷺ نے دیہاتی سے فرمایا کہ تمہارا یہ خواب اضغاث احلام میں سے ہے اور اس قسم سے ہے جس میں انسان کے ساتھ شیطان تماشہ کرتا ہے تاکہ اس کو پریشان و رنجور کرے ایسے خواب کو چھپانا چاہئے۔ نہ کہ لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے۔

یحییٰ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو بذریعہ وحی یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ خواب اضغاث احلام میں سے ہے اور شیطانی اثرات کا عکاس ہے ورنہ اہل تعبیر کے نزدیک اس خواب کی تعبیر زوال نعمت، قوم برادری سے مفارقت اور اس جیسی دوسری چیزوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کا ایک خواب

⑩ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاَيْتُ ذَاتَ لَيْلَةٍ فِيْمَا يَرَى النَّائِمُ كَاَنَّا فِيْ دَارِ عُقْبَةَ بْنِ رَافِعٍ فَاُتِيْنَا بِرُطَبٍ مِنْ رُطَبِ ابْنِ طَابٍ فَاَوَّلْتُ اَنَّ الرِّفْعَةَ لَنَا فِي الدُّنْيَا وَالْعَاقِبَةَ فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ دِيْنَنَا قَدْ طَابَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں نے ایک رات کو ان چیزوں میں کہ جن میں سونے والا دیکھتا ہے (یعنی خواب میں) دیکھا کہ گویا میں اور میرے صحابہؓ عقبہ ابن رافعؓ کے گھر بیٹھے ہوئے ہیں اور میرے سامنے تازہ کھجوریں لائی گئیں جن کو رطب ابن طاب کہا جاتا ہے، چنانچہ میں نے اس خواب کی یہ تعبیر لی کہ ہمارے لئے دنیا رفعت و سربلندی ہے۔ اور آخرت میں نیک عاقبت یعنی اچھی جزا کا انعام ہے اور یہ ہمارا دین اچھا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مذکورہ تعبیر میں آپ ﷺ نے گویا ناموں کے الفاظ کو بنیاد بنایا باں طور کہ رفعت کی تعبیر تو آپ ﷺ نے رافع سے لی....... عاقبت کی تعبیر عقبہ سے لی اور "طاب یعنی اچھا ہے" رطب ابن طاب سے لیا، چنانچہ یہ عادت شریفہ تھی کہ آپ ﷺ ناموں کے الفاظ کے ذریعہ بطریق تفاؤل و تاویل حصول مقصد کا مفہوم حاصل کرتے تھے۔ اور یہ بات محض تعبیر خواب کے ساتھ مخصوص نہیں تھی بلکہ عالم بیداری اور روزمرہ کی زندگی میں بھی ان کے ذریعہ نیک فال لیتے تھے۔ جیسا کہ منقول ہے کہ جب آپ ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ روانہ ہوئے تو راستہ میں ایک شخص بریدہ اسلمی کو چند سواروں کے ساتھ دیکھا جس کو قریش مکہ نے آپ ﷺ کو پکڑ کر مکہ واپس لانے پر معمور کیا تھا اور اس کے بطور انعام سو اونٹ مقرر کئے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس کو دیکھ کر پوچھا کہ تم کون ہو اور تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا کہ بریدہ، آنحضرت ﷺ نے یہ سنا (تو لفظ بریدہ سے نیک فال لیتے ہوئے) حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا کہ قد برد امرنا یعنی ہمارا معاملہ ٹھنڈا ہو گیا کہ (دشمن کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا)

ہجرت سے متعلق آنحضرت ﷺ کا خواب

⑪ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ رَاَیْتُ فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اُھَاجِرُ مِنْ مَکَّۃَ اِلٰی اَرْضٍ بِھَا نَخْلٌ فَذَھَبَ وَھْلِیْ اِلٰی اَنَّھَا الْیَمَامَۃُ اَوْھَجَرٌ فَاِذَا ھِیَ الْمَدِیْنَۃُ یَثْرِبُ وَرَاَیْتُ فِیْ رُؤْیَایَ ھٰذِہٖ اَنِّیْ ھَزَزْتُ سَیْفًا فَانْقَطَعَ صَدْرُہٗ فَاِذَا ھُوَمَا اُصِیْبَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ اُحُدٍ ثُمَّ ھَزَزْتُہٗ اُخْرٰی فَعَادَ اَحْسَنَ مَاکَانَ فَاِذَا ھُوَ مَاجَاءَ اللّٰہُ بِہٖ مِنَ الْفَتْحِ وَاجْتِمَاعِ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہجرت سے پہلے مکہ میں ایک دن میں نے یہ خواب دیکھا کہ میں مکہ سے ہجرت کر کے ایک ایسی زمین کی طرف جارہا ہوں جس میں کھجوروں کے درخت ہیں، چنانچہ اس خواب کی تعبیر میں میرا یہ خیال ہوا کہ وہ شہر جہاں میں ہجرت کر کے جاؤں گا یمامہ ہوگا یا ہجر، لیکن حقیقت میں وہ مدینہ نکلا جس کا قدیم نام یثرب ہے، میں نے اپنے اس خواب میں یہ بھی دیکھا تھا کہ میں نے اپنی تلوار کو ہلایا اور وہ اوپر سے ٹوٹ گئی، چنانچہ تلوار ٹوٹنے کی تعبیر جنگ احد کے ان پریشانیوں اور مصائب کی صورت میں ظاہر ہوئی جس سے مسلمانوں کو دوچار ہونا پڑا کہ ابتداء میں مسلمانوں کو بظاہر شکست سے دوچار ہونا پڑا، آنحضرت ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوئے، کتنے ہی مسلمان شہید ہوئے اور کتنے زخمی ہوگئے پھر میں نے خواب ہی میں تلوار کو دوسری مرتبہ ہلایا تو وہ تلوار نہ صرف درست ہوگئی بلکہ پہلے سے بھی بہتر ہوگئی چنانچہ تلوار درست ہونے کی تعبیر جنگ احد ہی کے موقع پر یا فتح مکہ اور یا صلح حدیبیہ کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جانے والی فتح اور مسلمانوں کی اجتماعیت کی صورت میں ظاہر ہوئی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جزیرہ نمائے عرب (نجد و حجاز) کا وہ علاقہ ہے جو جبل طویق کے جنوب مشرق میں پھیلا ہوا ہے اور اب نجد کے علاقے میں شامل ہے یمامہ کہا جاتا ہے یہ بڑا سرسبز و شاداب علاقہ تھا اور اس میں کھجور کی بڑی پیداوار تھی موجود زمانہ میں "یمامہ" ایک چھوٹی سی بستی کی صورت میں سعودی عرب کے دارالسلطنت ریاض اور الالم کے درمیان پایا جاتا ہے ہجر بھی یمامہ سے متصل مشرق میں ایک بستی تھی یہاں بھی کھجور بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔

زمانہ جاہلیت میں "مدینہ" کا نام یثرب تھا، جب آنحضرت ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر یہاں تشریف لائے تو اس کا نام مدینہ، طابہ، اور طیبہ رکھا گیا، لیکن زیادہ مشہور مدینہ ہی ہوا! آنحضرت ﷺ نے اس شہر مقدس کو یثرب کہنے سے منع فرمادیا تھا، کیونکہ یثرب اصل میں ثرب بالتحریک سے مشتق ہے جس کے معنی فتنہ و فساد کے ہیں جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے اس حدیث میں یا بعض دوسری احادیث میں اس شہر کے لئے اس کا قدیم نام یثرب کیوں استعمال فرمایا تو اس کی وجہ تو یہ ہے کہ یہ احادیث مذکورہ ممانعت سے پہلے کی ہیں یا یہ ممانعت چونکہ نہی تنزیہی کے طور پر ہے اس لئے آپ ﷺ بیان جواز کی خاطر کبھی کبھی قدیم نام کو بھی استعمال فرمالیتے تھے اور یا یہ کہ ابتداء ہجرت میں چونکہ عام طور پر لوگ اس نئے نام سے واقف نہیں ہوتے تھے اس لئے آپ ﷺ نے اس کو اس سے واقف کرانے کے لئے اس کے شرعی نام مدینہ کے ساتھ قدیم نام یثرب کا بھی ذکر فرمادیا اور یہی آخری احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے، نیز قرآن کریم میں جو فرمایا گیا ہے کہ یا یا اھل یثرب لا مقام لکم الخ یہ تو یہ منافقین کی زبانی فرمایا گیا ہے اس لئے اس کے بارے میں کوئی اشکال نہیں ہونا چاہئے۔

ایک خواب کی تعبیر

⑫ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَیْنَ اَنَانَائِمٌ اُتِیْتُ بِخَزَائِنِ الْاَرْضِ فَوُضِعَ فِیْ کَفِّیْ سِوَارَانِ مِنْ ذَھَبٍ فَکَبُرَا عَلَیَّ فَاُوْحِیَ اِلَیَّ اَنْ نُفُخْھُمَا فَنَفَخْتُھُمَا فَذَھَبَا فَاَوَّلْتُھُمَا الْکَذَّابَیْنِ الَّذِیْنَ اَنَا بَیْنَھُمَا صَاحِبُ صَنْعَاءَ وَصَاحِبُ الْیَمَامَۃِ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ یُقَالُ اَحَدُ ھُمَا مُسَیْلَمَۃُ صَاحِبُ الْیَمَامَۃِ وَالْعَنْسِیُّ

صَاحِبُ صَنْعَآءَ لَمْ اَجِدْ هٰذِهِ الرِّوَايَةَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ وَذَكَرَهَا صَاحِبُ الْجَامِعِ عَنِ التِّرْمِذِيِّ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (ایک دن) میں سورہا تھا کہ (خواب) میں زمین کے خزانے میرے سامنے لائے گئے، پھر میرے ہاتھ پر سونے کے دو کڑے رکھے گئے جو مجھ پر گراں گزرے (یعنی مردوں کے لئے سونا حرام ہونے کی وجہ سے ان کڑوں کا میرے ہاتھوں میں ہونا مجھ کو ناگوار ہوا)، اس کے بعد مجھ پر وحی آئی (یعنی خواب ہی میں بطور الہام میرے دل میں اللہ نے یہ بات ڈالی) کہ ان کڑوں پر پھونک مارو چنانچہ میں نے پھونک ماری تو وہ کڑے اڑ گئے میں نے ان دونوں کڑوں سے ان دونوں جھوٹوں کے بارے میں تعبیر لی (باعتبار مسکن علاقہ کے) جن کے درمیان میں ہوں، یعنی ایک تو یمامہ والا، اور دوسرا صنعاء والا۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور ایک روایت میں جس کو (ترمذیؒ نے نقل کیا ہے) یوں ہے کہ (آپ ﷺ نے ان دونوں جھوٹوں کی وضاحت اس طرح فرمائی) کہ ان میں سے ایک کو تو مسیلمہ کہا جاتا ہے جو یمامہ کا رہنے والا ہے اور دوسرا عنسی ہے جو صنعاء کا رہنے والا ہے مصنف مشکوٰۃ کہتے ہیں کہ مجھے یہ روایت بخاریؒ و مسلم میں نہیں ملی ہے اور اس کو صاحب جامع الاصول نے ترمذیؒ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "زمین کے خزانے" یعنی زمین کے خزانے کی کنجیاں میرے سامنے لائی گئیں۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے سامنے حقیقت میں خزانے ہی لائے گئے تھے خزانوں کے ذریعہ گویا یہ بشارت دی گئی کہ آپ ﷺ کی اُمت کے لوگ اس روئے زمین پر اپنا تسلط قائم کریں گے اور دنیا کے خزانوں کے مالک قرار پائیں گے۔ نیز آپ ﷺ کی اُمت اور آپ ﷺ کی شریعت چار دانگ عالم میں پھیل جائے گی۔

"صنعاء" یمن کے ایک مشہور شہر کا نام ہے اس کے سردار کا نام اسود عنسی تھا جس نے آنحضرت ﷺ کے زمانہ حیات میں نبوت کا دعوی کیا تھا جب آپ ﷺ مرض وفات میں صاحب فراش تھے تو حضرت فیروز دیلمیؓ نے اسود عنسی کو قتل کیا، آنحضرت ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا فاز فیروز یعنی فیروز فائز المرام ہوئے، اسود عنسی کی طرح یمامہ کے رہنے والے مسیلمہ کذاب نے بھی نبوت کا دعوی کیا تھا اس کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ خلافت میں حضرت وحشیؓ نے قتل کیا تھا یہ وہی وحشیؓ ہیں جنہوں نے اسلام قبول کرنے سے قبل غزوہ احد میں امیر حمزہ کو شہید کیا تھا۔

کڑوں سے دونوں جھوٹوں کے بارے میں تعبیر لینے کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ کڑے اصل میں ہتھکڑی کی مشابہت رکھتے ہیں جس کو ہاتھوں میں ڈال کر قیدی بنایا جاتا ہے۔ اور ہتھکڑی ہاتھوں کو اس طرح باندھ دیتی ہے کہ وہ ہاتھ نہ کسی چیز کو پکڑ سکتے ہیں نہ کوئی کام کر سکتے ہیں اور نہ حرکت و تصرف کی قدرت رکھتے ہیں، چنانچہ وہ دونوں کذاب کہ جو نبوت کا دعوی کر کے آنحضرت ﷺ کے مقابلہ پر آئے تھے قیدیوں کے مشابہ ہوئے جن کے ہاتھ کی کڑی کڑوں کی صورت میں آپ ﷺ کے دست مبارک میں تھی کہ آپ ﷺ نے ان دنوں ہاتھوں کو ہتھکڑی میں ڈال کر پکڑ رکھا ہے اور چھوڑتے نہیں تاکہ وہ اپنی حرکت و عمل سے باز رہیں اور کوئی کام نہ کر سکیں۔ رہی یہ بات کہ اس تعبیر کے پیش نظر سونے ہی کے کڑے کیوں دکھائے گئے لوہے کے کڑے کیوں نہ دکھائے گئے جو ان کے زیادہ مناسب حال تھے تو اس میں بھی دراصل ایک نکتہ ہے اور وہ یہ کہ سونے کے کڑے دکھا کر اشارہ کیا گیا کہ دونوں جھوٹے دنیاوی عزت و جاہ کے لالچ اور زیب و زینت کے انہماک میں کس قدر مبتلا ہیں اور یہ کہ ان کا مردود و مجرم ہونا کس قدر واضح اور ان کی نوعیت کتنی سنگین ہے۔

(۱۳) وَعَنْ اُمِّ الْعَلَاءِ الْاَنْصَارِيَّةِ قَالَتْ رَاَيْتُ لِعُثْمَانَ بْنِ مَظْعُوْنٍ فِي النَّوْمِ عَيْنًا تَجْرِيْ فَقَصَصْتُهَا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ذٰلِكَ عَمَلُهٗ يُجْرٰى لَهٗ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت اُمّ العلاء انصاریہؓ کہتی ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ عثمان ابن مظعونؓ کے لئے پانی کا ایک چشمہ جاری ہے جب میں نے یہ خواب نبی کریم ﷺ کے سامنے بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ ان کے عمل کا ثواب ہے جو ان کے لئے جاری رکھا گیا ہے۔"

(بخاریؒ)

تشریح : حضرت عثمان ابن مظعونؓ ایک جلیل القدر اور قدیم الاسلام صحابی ہیں، مہاجرین میں بڑی فضیلت کے حامل تھے، میدان کارزار میں جان باز مجاہد کی حیثیت رکھتے تھے ان کی ایک بڑی فضیلت یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو مرابط یعنی میدان کارزار میں اسلامی لشکر و سرحد کا پاسبان مقرر کیا تھا۔ شریعت میں مرابط کے بہت زیادہ فضائل منقول ہیں ان میں سے ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ مرابط جب انتقال کر جاتا ہے تو اس کا عمل صالح قیامت تک بڑھتا رہتا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے مذکورہ خواب کی یہ تعبیر بیان فرمائی کہ وہ چشمہ دراصل ان کا عمل صالح ہے اور جس طرح وہ چشمہ جاری ہے اسی طرح ان کے عمل صالح کا ثواب برابر جاری ہے جو قیامت تک ان کی طرف پہنچتا رہے گا۔

عالم برزخ کی سیر سے متعلق آنحضرت ﷺ کا ایک خواب

(۱۴) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلَّى اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَقَالَ مَنْ رَاٰى مِنْكُمُ اللَّيْلَةَ رُؤْيَا قَالَ فَاِنْ رَاٰى اَحَدٌ قَصَّهَا فَيَقُوْلُ مَاشَاءَ اللّٰهُ فَسَالَنَا يَوْمًا فَقَالَ هَلْ رَاٰى مِنْكُمْ اَحَدٌ رُؤْيَا قُلْنَا لَا قَالَ لٰكِنِّي رَاَيْتُ اللَّيْلَةَ رَجُلَيْنِ اَتَيَانِي فَاَخَذَا بِيَدَيَّ فَاَخْرَجَانِيْ اِلٰى اَرْضٍ مُقَدَّسَةٍ فَاِذَا رَجُلٌ جَالِسٌ وَرَجُلٌ قَائِمٌ بِيَدِهٖ كَلُّوْبٌ مِنْ حَدِيْدٍ يُدْخِلُهٗ فِيْ شِدْقِهٖ فَيَشُقُّهٗ حَتّٰى يَبْلُغَ قَفَاهُ ثُمَّ يَفْعَلُ بِشِدْقِهِ الْاٰخَرِ مِثْلَ ذٰلِكَ وَيَلْتَئِمُ شِدْقُهٗ هٰذَا فَيَعُوْدُ فَيَصْنَعُ مِثْلَهٗ قُلْتُ مَاهٰذَا قَالَ انْطَلِقْ فَانْطَلَقْنَا حَتّٰى اَتَيْنَا عَلٰى رَجُلٍ مُضْطَجِعٍ عَلٰى قَفَاهُ وَرَجُلٌ قَائِمٌ عَلٰى رَاْسِهٖ بِفِهْرٍ اَوْصَخْرَةٍ يَشْدَخُ بِهَا رَاْسَهٗ فَاِذَا ضَرَبَهٗ تَدَهْدَهَ الْحَجَرُ فَانْطَلَقَ اِلَيْهِ لِيَاْخُذَهٗ فَلَا يَرْجِعُ اِلٰى هٰذَا حَتّٰى يَلْتَئِمَ رَاْسُهٗ وَعَادَ رَاْسُهٗ كَمَا كَانَ فَعَادَ اِلَيْهِ فَضَرَبَهٗ فَقُلْتُ مَاهٰذَا قَالَا انْطَلِقْ فَانْطَلَقْنَا حَتّٰى اَتَيْنَا اِلٰى ثَقْبٍ مِثْلِ التَّنُّوْرِ اَعْلَاهُ ضَيِّقٌ وَاَسْفَلُهٗ وَاسِعٌ تَتَوَقَّدُ تَحْتَهٗ نَارٌ فَاِذَا ارْتَفَعَتْ ارْتَفَعُوْا حَتّٰى كَادَاَنْ يَخْرُجُوْا مِنْهَا وَاِذَا خَمَدَتْ رَجَعُوْا فِيْهَا وَفِيْهَا رِجَالٌ وَنِسَاءٌ عُرَاةٌ فَقُلْتُ مَاهٰذَا قَالَ انْطَلِقْ فَانْطَلَقْنَا حَتّٰى اَتَيْنَا عَلٰى نَهْرٍ مِنْ دَمٍ فِيْهِ رَجُلٌ قَائِمٌ عَلٰى وَسْطِ النَّهْرِ وَعَلٰى شَطِّ النَّهْرِ رَجُلٌ بَيْنَ يَدَيْهِ حِجَارَةٌ فَاَقْبَلَ الرَّجُلُ الَّذِيْ فِي النَّهْرِ فَاِذَا اَرَادَ اَنْ يَخْرُجَ رَمَى الرَّجُلُ بِحَجَرٍ فِيْ فِيْهِ فَرَدَّهٗ حَيْثُ كَانَ فَجَعَلَ كُلَّمَا جَاءَ لِيَخْرُجَ رَمٰى فِيْ فِيْهِ بِحَجَرٍ فَيَرْجِعُ كَمَا كَانَ فَقُلْتُ مَاهٰذَا قَالَا انْطَلِقْ فَانْطَلَقْنَا حَتّٰى انْتَهَيْنَا اِلٰى رَوْضَةٍ خَضْرَاءَ فِيْهَا شَجَرَةٌ عَظِيْمَةٌ وَفِيْ اَصْلِهَا شَيْخٌ وَصِبْيَانٌ وَاِذَا رَجُلٌ قَرِيْبٌ مِنَ الشَّجَرَةِ بَيْنَ يَدَيْهِ نَارٌ يُوْقِدُهَا فَصَعِدَا بِيَ الشَّجَرَةَ فَاَدْخَلَانِيْ دَارًا وَسْطَ الشَّجَرَةِ لَمْ اَرَقَطُّ اَحْسَنَ مِنْهَا فِيْهَا رِجَالٌ شُيُوْخٌ وَشَبَابٌ وَنِسَاءٌ وَصِبْيَانٌ ثُمَّ اَخْرَجَانِيْ مِنْهَا فَصَعِدَا بِيَ الشَّجَرَةَ فَاَدْخَلَانِيْ دَارًا هِيَ اَحْسَنُ وَاَفْضَلُ مِنْهَا فِيْهَا شُيُوْخٌ وَشَبَابٌ فَقُلْتُ لَهُمَا اِنَّكُمَا قَدْ طَوَّفْتُمَانِي اللَّيْلَةَ فَاَخْبِرَانِيْ عَمَّا رَاَيْتُ قَالَا نَعَمْ اَمَّا الرَّجُلُ الَّذِيْ رَاَيْتَهٗ يُشَقُّ شِدْقُهٗ فَكَذَّابٌ يُحَدِّثُ بِالْكِذْبَةِ فَتُحْمَلُ عَنْهُ حَتّٰى تَبْلُغَ الْاٰفَاقَ فَيُصْنَعُ بِهٖ مَاتَرٰى اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَالَّذِيْ رَاَيْتَهٗ يُشْدَخُ رَاْسُهٗ فَرَجُلٌ عَلَّمَهُ اللّٰهُ الْقُرْاٰنَ فَنَامَ عَنْهُ بِاللَّيْلِ وَلَمْ يَعْمَلْ بِمَافِيْهِ بِالنَّهَارِ يُفْعَلُ بِهٖ مَارَاَيْتَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَالَّذِيْ رَاَيْتَهٗ فِي الثَّقْبِ فَهُمُ الزُّنَاةُ وَالَّذِيْ رَاَيْتَهٗ فِي النَّهْرِ اٰكِلُ الرِّبٰوا وَالشَّيْخُ الَّذِيْ رَاَيْتَهٗ فِيْ اَصْلِ الشَّجَرَةِ اِبْرٰهِيْمُ وَالصِّبْيَانُ حَوْلَهٗ فَاَوْلَادُ النَّاسِ وَالَّذِيْ يُوْقِدُ النَّارَ مَالِكٌ خَازِنُ النَّارِ وَالدَّارُ الْاُوْلٰى الَّتِيْ دَخَلْتَ دَارُ عَامَّةِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَمَّا هٰذِهِ الدَّارُ فَدَارُ الشُّهَدَاءِ وَاَنَا جِبْرَئِيْلُ وَهٰذَا مِيْكَائِيْلُ فَارْفَعْ رَاْسَكَ فَرَفَعْتُ رَاْسِيْ فَاِذَا فَوْقِيْ مِثْلُ السَّحَابِ وَفِيْ رِوَايَةٍ مِثْلُ الرَّبَابَةِ الْبَيْضَاءِ قَالَ ذَاكَ مَنْزِلُكَ قُلْتُ دَعَانِيْ اَدْخُلْ مَنْزِلِيْ قَالَ اِنَّهٗ بَقِيَ لَكَ عُمُرٌ لَمْ تَسْتَكْمِلْهُ فَلَوِ اسْتَكْمَلْتَهٗ اَتَيْتَ مَنْزِلَكَ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَذُكِرَ حَدِيْثُ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فِيْ رُؤْيَا النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَدِيْنَةِ فِيْ بَابِ حَرَمِ الْمَدِيْنَةِ۔

"اور حضرت سمرہ ابن جندبؓ کہتے ہیں، رسول کریم ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جب آپ ﷺ (صبح کی) نماز سے فارغ ہوتے تو اپنا چہرہ اقدس ہماری طرف متوجہ کرتے اور پوچھتے کہ آج کی رات تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے؟ حضرت سمرہؓ کہتے ہیں کہ اگر ہم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہوتا تو وہ اس کو بیان کرتا اور آپ اس کی وہ تعبیر فرمادیتے جو اللہ تعالیٰ الہام فرماتا۔ چنانچہ اپنے اپنے معمول کے مطابق ایک دن آنحضرت ﷺ نے ہم سے وہی سوال کیا اور فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی شخص نے خواب دیکھا ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ نہیں آپ ﷺ نے فرمایا۔ لیکن میں نے آج کی رات خواب دیکھا ہے (اور وہ یہ) کہ دو شخص میرے پاس آئے اور میرے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر مجھے مقدس سرزمین، ملک شام کی طرف لے چلے، پس ایک جگہ پہنچ کر میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص بیٹھا ہوا ہے اور ایک شخص اپنے ہاتھ میں لوہے کا آنکڑا لئے کھڑا ہے، اور وہ پھر اس آنکڑے کو بیٹھے ہوئے شخص کے کلے میں ڈالتا ہے اور اس کو چیرتا ہے، یہاں تک کہ اس کی گدی تک چیرتا چلا جاتا ہے، پھر وہ دوسرے کلے کے ساتھ اس طرح کرتا ہے (یعنی اس کو بھی گدی تک چیر دیتا ہے) جب وہ کلہ اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے تو پھر پہلے کی طرح وہی عمل کرتا ہے (یعنی وہ کلے کو چیرتا ہے اور جب وہ کلہ درست ہو جاتا ہے تو پھر چیرتا ہے غرضیکہ بار بار یہی عمل کرتا ہے اور یہ عمل جاری رہتا ہے) آنحضرت ﷺ یہ فرماتے ہیں کہ میں نے (یہ دیکھ کر) ان دونوں آدمیوں سے پوچھا (جو مجھے اپنے ساتھ لائے تھے) یہ کیا ہو رہا ہے؟ ان دونوں نے کہا کہ چلتے رہئے (یعنی یہ مت پوچھئے کہ کیا ہو رہا ہے بلکہ آگے چلئے ابھی بہت عجائبات دیکھنے ہیں اس کی تعبیر معلوم ہو جائے گی) چنانچہ ہم آگے چلے یہاں تک کہ ایک ایسی جگہ آئے جہاں ایک شخص چت پڑا ہوا تھا اور ایک شخص اس کے سر کے پاس اتنا بڑا پتھر لئے کھڑا تھا جس سے ہاتھ بھر جائے اور اس سے چت پڑے شخص کے سر کو کچلتا تھا، چنانچہ جب وہ پتھر کو (کھینچ کر) اس کے سر پر مارتا تو پتھر سر کو کچل کر لڑھکتا ہوا دور چلا جاتا (پھر وہ دوبارہ مارنے کی غرض سے) اس پتھر کو اٹھانے کے لئے جاتا اور جب لوٹ کر آتا تو اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس شخص کا سر درست ہو جاتا اور پھر وہ اس پر پتھر مارتا اور اسی طرح یہ سلسلہ جاری تھا کہ اس کا سر درست ہوتا رہتا اور وہ اس پر پتھر مارتا رہتا میں نے (یہ دیکھ کر) پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ ان دونوں نے جواب دیا کہ چلے چلئے۔ چنانچہ ہم آگے چلے یہاں تک کہ ایک ایسے گڑھے پر پہنچے جو تنور کی مانند تھا کہ اس کے اوپر کا حصہ تنگ تھا اور نیچے کا حصہ کشادہ تھا اور اس کے اندر آگ بھڑک رہی تھی جب آگ اوپر کی طرف بھڑکتی تو کچھ لوگ جو آگ کے اندر تھے (شعلوں کے ساتھ) اوپر آجاتے یہاں تک کہ اس گڑھے سے نکلنے کے قریب ہو جاتے اور جب شعلہ کا زور گھٹ جاتا تو وہ سب پھر اندر چلے جاتے میں نے دیکھا کہ اس آگ میں کئی مرد تھے اور کئی عورتیں تھیں اور سب ننگے تھے میں نے (یہ دیکھ کر) پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے تو ان دونوں نے کہا کہ چلے چلئے چنانچہ ہم آگے چلے یہاں تک کہ ایک ایسی نہر پر پہنچے جو (پانی کے بجائے) خون سے بھری ہوئی تھی۔ نہر کے بیچ میں ایک شخص کھڑا ہوا تھا اور ایک شخص اس کے کنارے پر تھا جس کے آگے پتھر رکھے ہوئے تھے جب وہ شخص جو نہر کے بیچ میں تھا (آگے کنارے پر) آیا اور چاہا کہ باہر نکل آئے تو اس شخص نے جو کنارے پر تھا اس کے منہ پر پتھر پھینک کر مارا جس سے وہ اپنی جگہ لوٹ گیا اور پھر اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہا کہ نہر کے اندر کا آدمی جب باہر نکلنے کا ارادہ کرتا تھا تو کنارے والا آدمی اس کے منہ پر پتھر مارتا اور اس کو اسی جگہ واپس کر دیتا میں نے (یہ دیکھ کر) پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ تو ان دونوں نے کہا کہ چلے چلئے۔ چنانچہ ہم آگے چلے یہاں تک ایک سرسبز شاداب باغ کے پاس پہنچے، اس باغ میں ایک بڑا درخت تھا اور اس کی جڑ پر ایک بوڑھا اور کچھ لڑکے (بیٹھے) تھے پھر کیا دیکھتا ہوں کہ اس درخت کے پاس ایک اور شخص بھی ہے جس کے آگے آگ جل رہی ہے وہ اس کو جلا بھڑکا رہا تھا، پھر وہ دونوں آدمی مجھ کو لے کر درخت پر چڑھے اور مجھ کو ایک ایسے گھر میں داخل کیا جو درخت کے بالکل درمیان تھا (اور یہ گھر اتنا اچھا تھا کہ) میں نے کبھی بھی اس سے اچھا کوئی گھر نہیں دیکھا اس گھر میں کتنے ہی جوان بوڑھے، مرد تھے، کتنی ہی عورتیں اور کتنے ہی بچے تھے، اس کے بعد وہ دونوں مجھ کو اس گھر سے نکال کر درخت کے اور اوپر لے گئے اور مجھ کو ایک ایسے گھر میں داخل کیا جو پہلے گھر سے بھی بہت اچھا اور افضل تھا اس میں بھی بوڑھے اور جوان آدمی موجود تھے اب میں نے ان دونوں آدمیوں سے کہا کہ آج کی رات تم نے مجھ کو خوب گھمایا پھرایا لیکن میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کی حقیقت سے تو مجھ کو آگاہ کرو؟ ان دونوں نے کہا کہ اچھا کہ ہم آپ ﷺ کو بتاتے ہیں (پھر

انہوں نے بیان کرنا شروع کیا کہ) جس شخص کو آپ (ﷺ) نے دیکھا کہ اس کے کلے چیرے جا رہے تھے وہ ایسا شخص ہے جو جھوٹا ہے، جھوٹ بولتا ہے اور اس کی جھوٹی باتیں نقل و بیان کی جاتی ہیں، جو دنیا میں چاروں طرف پھیلتی ہیں، جن سے لوگ گمراہ ہوتے ہیں چنانچہ اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جا رہا ہے جو آپ (ﷺ) نے دیکھا اور اس کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور جس شخص کو آپ (ﷺ) نے دیکھا کہ اس کا سر کچلا جا رہا تھا وہ ایسا شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن سکھایا تھا یعنی اس کو قرآنی علوم سیکھنے کی توفیق عطا فرمائی تھی لیکن وہ شخص اس (قرآن سے) بے نیاز ہو کر رات میں سوتا رہا اور دن میں قرآن کے مطابق عمل نہیں کیا، چنانچہ اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جا رہا ہے جو آپ (ﷺ) نے دیکھا اور اس کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور جن لوگوں کو آپ (ﷺ) نے تنور میں دیکھا ہے وہ زنا کار ہیں اور جس شخص کو آپ (ﷺ) نے نہر میں دیکھا وہ سود خور ہے (ان سب کو بھی اپنے کئے کی سزا مل رہی ہے اور قیامت تک یوں ہی ملتی رہے گی) اور جس بوڑھے شخص کو آپ (ﷺ) نے درخت کی جڑ کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کے پاس جو بچے ہیں وہ آدمیوں کی اولاد ہیں اور جو شخص درخت سے کچھ فاصلہ پر آگ جلا رہا ہے وہ دوزخ کا داروغہ ہے اور درخت کے اوپر پہلا گھر جس میں آپ (ﷺ) داخل ہوئے تھے وہ (جنت میں عام) مؤمنوں کا مکان ہے اور یہ گھر (جو پہلے گھر سے اوپر واقع ہے) شہداء کا مکان ہے میں جبرئیل (علیہ السلام) ہوں اور یہ جو میرے ساتھ ہیں میکائیل (علیہ السلام) ہیں اور ذرا آپ (ﷺ) اوپر سر اٹھائیے (آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ) میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے اوپر (نہایت بلندی میں) ابر کی مانند کوئی چیز ہے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ تہ در تہ سفید ابر کی مانند کوئی چیز ہے ان دونوں نے کہا کہ یہ ابر کی مانند جو چیز آپ (ﷺ) دیکھ رہے ہیں دراصل جنت میں آپ (ﷺ) کا مکان ہے۔ میں نے کہا کہ تو پھر تم لوگ مجھے چھوڑ دو تاکہ میں اپنے مکان میں چلا جاؤں ان دونوں نے کہا کہ ابھی تو آپ کی عمر باقی ہے جس کو آپ (ﷺ) نے پورا نہیں کیا ہے جب آپ (ﷺ) اپنی عمر کو پورا کر لیں گے تو اپنے مکان میں چلے جائیں گے۔" (بخاریؒ)

اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی وہ روایت جو مدینہ میں نبی کریم ﷺ کے خواب دیکھنے سے متعلق ہے وہ حرم مدینہ کے باب میں نقل کی جا چکی ہے۔

تشریح: "رات میں سوتا رہا" یعنی اس شخص نے نہ تو، رات میں قرآن کریم کی تلاوت کی اور نہ دن میں اس پر عمل کیا! یا تو قرآن پر عمل کرنے کا تعلق دن اور رات دونوں سے ہے اور رات میں اس کی تلاوت بھی اس پر عمل ہی کرنا ہے، لیکن چونکہ عبادت گزار بندے عام طور پر قرآن کریم کی تلاوت رات ہی کو کرتے ہیں اس لئے اس کو رات کے ساتھ مخصوص کیا گیا۔ اور چوں کہ زندگی کی زیادہ تر حرکت و عمل کا تعلق دن سے ہوتا ہے اور اس اعتبار سے قرآنی احکام یعنی اس کے امر و نواہی پر عمل کرنے کا تعلق زیادہ تر دن ہی سے ہوتا ہے اس لئے قرآن پر عمل کرنے کو ان کے ساتھ مخصوص کیا گیا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم نعمت عطا فرمائی کہ اس کو قرآن کا علم دیا لیکن اس نے اس نعمت کی قدر نہ کی بایں طور کہ رات کے وقت اس کی تلاوت سے غافل ہو کر سو رہا اور یہ چیز بسا اوقات قرآن کو بھول جانے کا سبب بنتی ہے۔ نیز اس نے قرآن کے اوامر و نواہی پر عمل بھی نہیں کیا باوجودیکہ قرآن نازل ہونے کا اصل مقصد یہی ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ جو شخص قرآن پر عمل کرتا ہے وہ گویا ہمیشہ قرآن کی تلاوت کرتا ہے اگرچہ وہ حقیقت میں تلاوت نہ کرے اور جو ہمیشہ تلاوت کرتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتا تو اس نے گویا قرآن کی کبھی تلاوت نہیں کی۔

یحییٰؒ کہتے ہیں کہ "سوتا رہا" کا مطلب یہ ہے کہ اس نے قرآن کریم سے اعراض کیا اور بے نیازی اختیار کی لہٰذا جو شخص تلاوت کے بغیر اس طرح سوئے کہ اس میں اس کے اعراض کرنے اور بے نیازی برتنے کو قطعاً دخل نہ ہو بلکہ محض غفلت و کوتاہی یا کسی مجبوری کا دخل ہو تو ایسا شخص مذکورہ وعید سے مستثنیٰ ہوگا۔

"اور یہ گھر شہداء کا مکان ہے" کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ "شہداء" سے مراد مؤمنین خاص ہیں جیسے انبیاء علیہم السلام،

اولیاءؒ، اور علماءؒ کیوں کہ منقول ہے کہ علماء کی سیاہی شہداء کے خونوں پر غالب ہوگی۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس ارشاد گرامی ﷺ سے یہ ہدایت واضح ہوتی ہے کہ امام کے لئے یہ مستحب ہے کہ نماز فجر میں سلام پھیرنے کے بعد مقیدیوں سے متوجہ ہو یہ بھی مستحب ہے کہ وہ امام مقتدیوں سے خواب دریافت کرے اور یہ بھی مستحب ہے کہ تعبیر بیان کرنے والا خواب کی تعبیر دن کے ابتدائی حصے میں بیان کردے تاکہ معاش روزگار میں مشغولیت کی وجہ سے ذہن منتشر نہ ہو اور دل جمی کے ساتھ تعبیر دے سکے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

اپنا برا خواب کسی مرد دانا یا دوست کے علاوہ اور کسی کے سامنے بیان نہ کرو

⑮ عَنْ اَبِی رَزِیْنٍ الْعُقَیْلِی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّۃٍ وَاَرْبَعِیْنَ جُزْءً مِنَ النُّبُوَّۃِ وَھِیَ عَلٰی رِجْلِ طَائِرٍ مَالَمْ یُحَدِّثْ بِھَا فَاِذَا حَدَّثَ بِھَا وَقَعَتْ وَاَحْسِبُہٗ قَالَ لَا تُحَدِّثْ اِلَّا حَبِیْبًا اَوْ لَبِیْبًا۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَفِی رِوَایَۃِ اَبِی دَاوٗدَ قَالَ الرُّؤْیَا عَلٰی رِجْلِ طَائِرٍ مَالَمْ تُعَبَّرْ فَاِذَا عُبِّرَتْ وَقَعَتْ وَاَحْسِبُہٗ قَالَ وَلَا تُقُصَّھَا اِلَّا عَلٰی وَادٍّ اَوْ ذِیْ رَأْیٍ۔

"حضرت ابورزین عقیلیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مؤمن کا خواب نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے اور خواب کو جب تک بیان نہ کیا جائے وہ پرندہ کے پاؤں پر ہوتا ہے اور جب اس کو کسی کے سامنے بیان کر دیا جاتا ہے تو وہ واقع ہو جاتا ہے راوی کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا دانا اور دوست کے علاوہ کسی اور کے سامنے خواب کو بیان نہ کرو۔ (ترمذیؒ) اور ابوداؤدؒ کی روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا خواب کی تعبیر جب تک بیان نہیں کی جاتی وہ پرندہ کے پاؤں پر ہوتا ہے اور جب اس کی تعبیر بیان کی دی جاتی ہے تو وہ تعبیر واقع ہو جاتی ہے اور میرا خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا اور دوست و عقلمند کے علاوہ کسی اور کے سامنے خواب کو بیان نہ کرو۔"

تشریح: علی رجل طائر (وہ پرندہ کے پاؤں پر ہے) دراصل عربی کا ایک محاورہ ہے جو اہل عرب کسی ایسے معاملہ اور کسی ایسی چیز کے بارے میں استعمال کرتے ہیں جن کو قرار وثبات نہ ہو، مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس طرح پرندہ عام طور پر کسی ایک جگہ ٹھہرا نہیں رہتا، بلکہ اڑتا اور حرکت کرتا رہتا ہے اور جو چیز اس کے پیروں پر ہوتی ہے وہ بھی کسی ایک جگہ قرار نہیں پاتی بلکہ ادنیٰ سی حرکت سے گر پڑتی ہے اسی طرح یہ معاملہ اور یہ چیز بھی کسی ایک جگہ پر قائم و ثابت نہیں رہتی لہٰذا فرمایا گیا کہ خواب کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ جب تک اس کو کسی کے سامنے بیان نہیں کیا جاتا اور اس کو اپنے دل میں پوشیدہ رکھا جاتا ہے اس وقت تک وہ کوئی اعتبار نہیں رکھتا اور واقع نہیں ہوتا، لیکن جب اس کو کسی کے سامنے بیان کر دیا جاتا ہے اور جوں ہی اس کی تعبیر دی جاتی ہے وہ اسی تعبیر کے مطابق واقع ہو جاتا ہے، لہٰذا کسی کے سامنے اپنا خواب بیان نہ کرنا چاہئے لیکن واضح رہے کہ یہ حکم برے خواب کے بارے میں ہے کہ جس کے واقع ہونے سے انسان ڈرتا ہے اور نقصان و ضرر کا واہمہ رکھتا ہے جیسا کہ دوسری احادیث میں اس کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔

مرد دانا اور دوست کے سامنے خواب بیان کرنے کو اس لئے فرمایا گیا ہے کہ عقلمند و دانا اپنی عقل و حکمت کی بنا پر خواب کی اچھی ہی تعبیر دے گا اسی طرح جو شخص دوست و ہمدرد ہو گا وہ بھی خواب کو بھلائی پر ہی محمول کرے گا اور اچھی تعبیر دے گا جب کہ بے وقوف تو اپنی نادانی کی بنا پر اور دشمن اپنے بغض و عناد کے تحت خراب تعبیر دے گا۔

اس موقع پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب تمام ہی چیزوں کا وقوع پذیر ہونا قضا و قدر سے متعلق ہے تو خواب کا شرمندہ تعبیر نہ ہونا اس خواب کو ظاہر نہ کرنے پر کس طرح موقوف ہو سکتا ہے اور خواب کے وقوع پذیر ہونے میں تعبیر کا مؤثر ہونا کیونکر ہے؟ اس کا مختصر

ساجواب یہ ہے کہ یہ چیز بھی قضاو قدر کے مطابق ہے جیسا کہ دعا اور صدقہ و خیرات اور دوسرے اسباب و ذرائع کا مسئلہ ہے۔

ورقہ ابن نوفل کے متعلق آنحضرت ﷺ کا خواب

(۱۶) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَرَقَةَ قَالَتْ لَهُ خَدِيْجَةُ اِنَّهُ كَانَ قَدْ صَدَّقَكَ وَلٰكِنْ مَاتَ قَبْلَ اَنْ تَظْهَرَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُرِيْتُهُ فِي الْمَنَامِ وَعَلَيْهِ ثِيَابٌ بِيْضٌ وَلَوْ كَانَ مِنْ اَهْلِ النَّارِ لَكَانَ عَلَيْهِ لِبَاسٌ غَيْرُ ذٰلِكَ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ سے ورقہ ابن نوفل کے بارے میں پوچھا گیا (کہ وہ مؤمن تھے یا نہیں؟) اور حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کے سامنے بیان کیا کہ وہ ورقہ بن نوفل آپ ﷺ کی تصدیق کرتے تھے لیکن آپ ﷺ کی نبوت ظاہر ہونے سے پہلے مرگئے تھے۔ تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو خواب میں ورقہ بن نوفل کو اس حالت میں دکھلایا گیا ہے کہ اس پر سفید کپڑے تھے اور وہ دوزخی ہوتے تو ان کے جسم پر اور طرح کے کپڑے ہوتے۔" (الترمذیؒ)

تشریح: ورقہ ابن نوفل ابن اسد ابن عبد العزی۔ اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کے چچازاد بھائی تھے انہوں نے زمانہ جاہلیت میں عیسائی مذہب کی تعلیم حاصل کر کے اس میں کافی درک پیدا کیا تھا اور انجیل کو عربی زبان میں منتقل کیا تھا ان کے بارے میں ثابت ہے کہ بت پرستی سے سخت بیزار تھے اور اپنے طریقے پر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہا کرتے تھے، کافی معمر تھے اور عمر کے آخری حصے میں بینائی سے بالکل محروم ہوگئے تھے، جب آنحضرت ﷺ کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا۔ اور پہلے پہل آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ کو لے کر ان کے پاس گئیں انہوں نے آنحضرت ﷺ کی نبوت کی تصدیق کی اور آپ ﷺ کو بشارت دی کہ آپ ﷺ وہی نبی آخر الزمان ﷺ ہیں جن کا تذکرہ آسمانی کتب میں کیا گیا ہے یہ واقعہ بہت مشہور ہے اور سیرت و تاریخ کی ہر کتاب میں موجود ہے۔

مشہور کتاب اسد الغابہ کے مصنف نے ورقہ ابن نوفل کا تذکرہ صحابہؓ کے زمرے میں کیا ہے اور ان کے اسلام کے بارے میں علماء کے جو اختلافی اقوال ہیں ان کو ذکر کرتے ہوئے مذکورہ بالا حدیث کو بعینہٖ نقل کیا ہے! حضرت خدیجہؓ کی حیات میں حضرت عائشہؓ چونکہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں نہیں تھیں اس لئے انہوں نے اس روایت کو صحابہؓ سے بطریق سماع نقل کیا ہوگا۔

"اور حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کے سامنے بیان کیا الخ" یعنی جب آنحضرت ﷺ سے ورقہ ابن نوفل کے بارے میں سوال کیا گیا تو حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت ﷺ کے جواب دینے سے پہلے اپنے چچازاد بھائی کی حالت کو بیان کیا لیکن اسلوب کلام ایسا اختیار کیا کہ ورقہ ابن نوفل کی حقیقت بھی واضح ہوجائے اور مرتبہ نبوت کا ادب بھی ملحوظ رہے، چنانچہ انہوں نے یہ کہا کہ وہ آپ ﷺ کی تصدیق کرتے تھے یعنی انہوں نے آپ ﷺ کی تصدیق کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس فرشتہ کو آپ ﷺ نے دیکھا ہے وہ اللہ کی طرف سے انبیاء کے پاس وحی لانے والا ہی فرشتہ ہے جو آپ سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی نازل ہوتا تھا اور آپ ﷺ خدا کے پیغمبر ہیں اور اگر میں آپ ﷺ کے ظہور و غلبہ کے وقت زندہ رہا تو آپ ﷺ کی مدد کروں گا اور آپ ﷺ کو طاقت پہنچاؤں گا۔ گویا ایک طرف تو اس بات سے حضرت خدیجہؓ نے ان کے ایمان کو ثابت کرنا چاہا اور دوسری طرف انہوں نے یہ بھی کہا کہ لیکن وہ آپ ﷺ کی نبوت ظاہر ہونے سے پہلے مرگئے تھے اس سے انہوں نے ان کے ایمان کے بارے میں شک کو بھی ظاہر کر دیا اور پھر اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے مذکورہ ارشاد گرامی ﷺ کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ وہ مؤمن تھے لہٰذا یہ حدیث ورقہ ابن نوفل کے ایمان پر دلالت کرتی ہے اور ظاہر بھی ہے کہ جب انہوں نے آنحضرت ﷺ کے مبعوث ہونے کے بعد آپ ﷺ کی تصدیق کی تو پھر ان کے ایمان کے سلسلہ میں اختلاف کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر ان کا تصدیق کرنا نبوت سے پہلے ہوتا تو بے شک اختلاف کی

گنجائش تھی۔

آنحضرت ﷺ کی پیشانی پر سجدہ کرنے سے متعلق ایک خواب

⑰ وَعَنِ ابْنِ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ عَنْ عَمِّهِ اَبِي خُزَيْمَةَ اَنَّهُ رَاٰى فِيْمَا يَرَى النَّائِمُ اَنَّهُ سَجَدَ عَلٰى جَبْهَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَهُ فَاضْطَجَعَ لَهُ وَقَالَ صَدِّقْ رُؤْيَاكَ فَسَجَدَ عَلٰى جَبْهَتِهِ۔ رواه في شرح السنة وسنذكر حديث ابي بكرة كان ميزانا نزل في السماء في باب مناقب ابي بكر و عمر رضي الله عنهما۔

"اور حضرت خزیمہ ابن ثابت اپنے چچا حضرت ابو خزیمہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے اس حالت میں جس میں سونے والا دیکھتا ہے یعنی خواب میں دیکھا کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی پیشانی پر سجدہ کیا ہے، پھر انہوں نے یہ خواب آنحضرت ﷺ کے سامنے بیان کیا تو آپ ﷺ (وہ خواب سن کر) ابو خزیمہؓ کی خاطر لیٹ گئے (تاکہ وہ پیشانی اقدس پر سجدہ کر لیں) اور فرمایا کہ اپنے خواب کو سچا کرو یعنی اپنے خواب کے مطابق عمل کرو، چنانچہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی پیشانی پر سجدہ کر لیا۔ (شرح السنۃ) اور حضرت ابوبکرؓ کی یہ روایت کَانَ مِيْزَانًا نَزَلَ مِنَ السَّمَآءِ کو مناقب ابوبکرؓ و عمرؓ کے باب نقل کیا جائے گا۔"

تشریح: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اگر خواب کا تعلق طاعات و عبادات کی قسم سے ہو تو عالم بیداری میں اس خواب پر عمل کرنا مستحب ہے، مثلاً اگر کسی شخص نے یہ خواب دیکھا کہ روزہ رکھا ہے، یا نماز پڑھی ہے، یا صدقہ یا خیرات کیا ہے اور کسی بزرگ کی زیارت کی ہے وغیرہ وغیرہ تو اس خواب کے مطابق عالم بیداری میں نماز پڑھنا یا روزہ رکھنا یا صدقہ خیرات کرنا، یا اس بزرگ کی زیارت کر لینا مستحب ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

عالم برزخ کے متعلق آنحضرت ﷺ کے خواب کے کچھ اور حصے

⑱ عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّا يُكْثِرُ اَنْ يَقُوْلَ لِاَصْحَابِهِ هَلْ رَاٰى اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِنْ رُؤْيَا فَيَقُصُّ عَلَيْهِ مَنْ شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَقُصَّ وَ اِنَّهُ قَالَ لَنَا ذَاتَ غَدَاةٍ اِنَّهُ اَتَانِي اللَّيْلَةَ اٰتِيَانِ وَاِنَّهُمَا ابْتَعَثَانِيْ وَاِنَّهُمَا قَالَ لِيَ انْطَلِقْ وَاِنِّيْ اِنْطَلَقْتُ مَعَهُمَا۔ وَذَكَرَ مِثْلَ الْحَدِيْثِ الْمَذْكُوْرِ فِي الْفَصْلِ الْاَوَّلِ بِطُوْلِهِ وَفِيْهِ زِيَادَةٌ لَيْسَتْ فِي الْحَدِيْثِ الْمَذْكُوْرِ وَهِيَ قَوْلُهُ فَاَتَيْنَا عَلٰى رَوْضَةٍ مُعْتَمَّةٍ فِيْهَا مِنْ كُلِّ نَوْرِ الرَّبِيْعِ وَاِذَا بَيْنَ ظَهْرَيِ الرَّوْضَةِ رَجُلٌ طَوِيْلٌ لَا اَكَادُ اَرٰى رَاْسَهُ طُوْلًا فِي السَّمَاءِ فَاِذَا حَوْلَ الرَّجُلِ مِنْ اَكْثَرِ وِلْدَانٍ رَاَيْتُهُمْ قَطُّ قُلْتُ لَهُمَا مَا هٰذَا مَا هٰؤُلَاءِ قَالَ قَالَا لِي انْطَلِقْ فَانْطَلَقْنَا فَانْتَهَيْنَا اِلٰى رَوْضَةٍ عَظِيْمَةٍ لَمْ اَرَ رَوْضَةً قَطُّ اَعْظَمَ مِنْهَا وَلَا اَحْسَنَ قَالَ قَالَا لِي ارْقَ فِيْهَا قَالَ فَارْتَقَيْنَا فِيْهَا فَانْتَهَيْنَا اِلٰى مَدِيْنَةٍ مَبْنِيَّةٍ بِلَبِنِ ذَهَبٍ وَلَبِنِ فِضَّةٍ فَاَتَيْنَا بَابَ الْمَدِيْنَةِ فَاسْتَفْتَحْنَا فَفُتِحَ لَنَا فَدَخَلْنَاهَا فَتَلَقَّانَا فِيْهَا رِجَالٌ شَطْرٌ مِّنْ خَلْقِهِمْ كَاَحْسَنِ مَا اَنْتَ رَاءٍ وَشَطْرٌ مِنْهُمْ كَاَقْبَحِ مَا اَنْتَ رَاءٍ قَالَ قَالَا لَهُمْ اِذْهَبُوْا فَقَعُوْا فِي ذٰلِكَ النَّهَرِ قَالَ فَاِذَا نَهَرٌ مُعْتَرِضٌ يَجْرِيْ كَاَنَّ مَاءَهُ الْمَحْضُ فِي الْبَيَاضِ فَذَهَبُوْا فَوَقَعُوْا فِيْهِ ثُمَّ رَجَعُوْا اِلَيْنَا قَدْ ذَهَبَ ذٰلِكَ السُّوْءُ عَنْهُمْ فَسَارُوْا فِي اَحْسَنِ صُوْرَةٍ وَذَكَرَ فِي تَفْسِيْرِ هٰذِهِ الزِّيَادَةِ وَاَمَّا الرَّجُلُ الطَّوِيْلُ الَّذِيْ فِي الرَّوْضَةِ فَاِنَّهُ اِبْرَاهِيْمُ وَاَمَّا الْوِلْدَانُ الَّذِيْنَ حَوْلَهُ فَكُلُّ مَوْلُوْدٍ مَاتَ عَلَى الْفِطْرَةِ قَالَ فَقَالَ بَعْضُ الْمُسْلِمِيْنَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَاَوْلَادُ الْمُشْرِكِيْنَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَوْلَادُ الْمُشْرِكِيْنَ وَاَمَّا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَانُوْا شَطْرٌ مِنْهُمْ حَسَنٌ وَشَطْرٌ مِنْهُمْ قَبِيْحٌ فَاِنَّهُمْ قَوْمٌ قَدْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَاٰخَرَ سَيِّئًا تَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهُمْ۔ (رواه البخاری)

"حضرت سمرہ ابن جندبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اپنے صحابہؓ سے اکثر یہ پوچھا کرتے تھے کہ کیا تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ جس کو خواب دکھانا چاہتا اور وہ خواب دیکھتا تو وہ اپنا خواب آنحضرت ﷺ کے سامنے بیان کر دیتا۔ ایک دن آنحضرت ﷺ نے ہمارے سامنے بیان کیا کہ آج رات (میں نے خواب دیکھا کہ) دو شخص میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ کو اٹھا کر کہا ہمارے ساتھ چلئے، چنانچہ میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ اس کے بعد حدیث کے راوی سمرہؓ نے وہی طویل حدیث بیان کی جو (اس خواب سے متعلق) پہلی فصل میں گزر چکی ہے لیکن اس حدیث میں پہلی فصل والی حدیث سے کچھ زیادہ باتیں ہیں اور وہ یہ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا، پس ہم ایک ایسے باغ میں پہنچے جہاں (درختوں کی کثرت اور ان میں سرسبزی و شادابی کی بہتات کی وجہ سے) اندھیرا پھیلا ہوا تھا باغ میں ہر طرف بہار ہی بہار تھی اور ہمہ اقسام کے شگوفے کھلے ہوئے تھے، پھر اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ باغ کے بیچوں بیچ ایک شخص کھڑے ہوئے ہیں وہ بہت لمبے تھے کہ ان کا سر بھی مجھے نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ ان کی لمبائی آسمان سے باتیں کر رہی تھی پھر مجھے یہ بھی نظر آیا کہ ان کے گرد بہت سے لڑکے تھے جن کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا میں نے ان دونوں سے پوچھا کہ یہ لمبا شخص کون ہے اور یہ لڑکے کون ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ان دونوں نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے مجھ سے کہا کہ چلے چلئے چنانچہ ہم آگے چلے اور ایک بہت بڑے باغ کے پاس پہنچے جس سے بڑا اور جس سے اچھا کوئی اور باغ میں نے کبھی نہیں دیکھا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ وہاں پہنچ کر ان دونوں نے مجھ سے کہا کہ باغ کے اندر چلئے یا اس کے درختوں پر چڑھئے چنانچہ ہم چڑھے اور ایک ایسے شہر کے قریب پہنچے جو سونے اور چاندی کی اینٹوں سے تعمیر کیا گیا ہے پھر ہم اس شہر کے دروازے پر آئے اور اس کو کھلوایا اور جب وہ دروازہ ہمارے لئے کھول دیا گیا تو ہم اندر داخل ہوئے اور اس شہر میں ہم ایسے کتنے ہی لوگوں سے ملے جن میں سے ہر ایک کے بدن کا آدھا حصہ اس سے بھی بہتر تھا جس کو تم دیکھتے ہو اور آدھا حصہ اس سے بھی بدتر تھا اور آدھا حصہ انتہائی حسین و تندرست تھا اور آدھا حصہ انتہائی بھدا و خراب تھا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ان دونوں نے (جو مجھ کو اپنے ساتھ لے گئے تھے) ان سب نے کہا کہ جاؤ اس نہر میں غوطہ لگاؤ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں (کہ جب ان دونوں نے یہ بات کہی تو) میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں عرضاً ایک نہر بہ رہی ہے جس کا پانی خالص دودھ کی طرح سفید ہے، چنانچہ وہ لوگ نہر کے پاس گئے اور اس میں کود گئے، پھر جب وہ (غوطہ لگا کر) ہمارے پاس واپس آئے تو ان کے جسم کی خرابی و برائی دور ہو چکی تھی۔ اور ان کا پورا جسم بہترین شکل و صورت میں تبدیل ہو گیا تھا اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے حدیث کے ان زیادہ الفاظ کی وضاحت میں فرمایا کہ وہ لمبے شخص جو باغ میں تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کے گرد جو لڑکے تھے۔ وہ ایسے بچے تھے جو فطرت پر مر جاتے ہیں یعنی جو بچے چھوٹی عمر میں نابالغ مر جاتے ہیں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس رہتے ہیں راویؒ یہ کہتے ہیں کہ بعض صحابہؓ نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! اور مشرکوں کے لڑکے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا مشرکوں کے نابالغ لڑکے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے پاس رہتے ہیں اور وہ لوگ جن کا آدھا جسم اچھا اور آدھا جسم برا تھا وہ ایسے لوگ تھے جن کے اعمال ملے جلے تھے کہ انہوں نے کچھ اچھے عمل کئے اور کچھ برے عمل، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا۔" (بخاریؒ)

جھوٹا خواب نہ بناؤ

(۱۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مِنْ اَفْرَى الْفِرٰى اَنْ يُّرِىَ الرَّجُلُ عَيْنَيْهِ مَالَمْ تَرَيَا۔

(رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا بڑے بہتانوں میں سے ایک بڑا بہتان یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اپنی آنکھوں سے وہ چیز دکھلائے جو حقیقت میں آنکھوں نے نہیں دیکھی ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آنکھوں پر یہ جھوٹ باندھا جائے کہ انہوں نے دیکھا ہے حالانکہ حقیقت میں انہوں نے کچھ نہیں دیکھا، گویا

مقصود جھوٹا خواب بنانے کی مذمت ظاہر کرنا ہے اور اس کو بڑا بہتان اس لئے فرمایا گیا ہے کہ خواب ایک طرح سے وحی کے قائم مقام ہے اور اس کا تعلق حق تعالیٰ سے ہے پس جھوٹا خواب بنانا گویا حق تعالیٰ پر بہتان باندھنا ہے۔ ایک حدیث میں منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ خواب دکھانے کے لئے فرشتے کو بھیجتا ہے۔

کس وقت کا خواب زیادہ سچا ہوتا ہے؟

(۲۰) وَعَنْ اَبِی سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَصْدَقُ الرُّؤْیَا بِالْاَسْحَارِ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

"اور حضرت ابو سعید خدریؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا پچھلے پہر کا خواب زیادہ سچا ہوتا ہے۔"

(ترمذیؒ، دارمیؒ)

تشریح: پچھلا پہر عام طور پر دل و دماغ کے سکون کا وقت ہوتا ہے اس وقت نہ صرف یہ کہ خاطر جمعی حاصل رہتی ہے بلکہ وہ نزول ملائکہ، سعادت اور قبولیت دعا کا بھی وقت ہے۔ اس لئے اس وقت جو خواب دیکھا جاتا ہے وہ زیادہ سچا ہوتا ہے۔

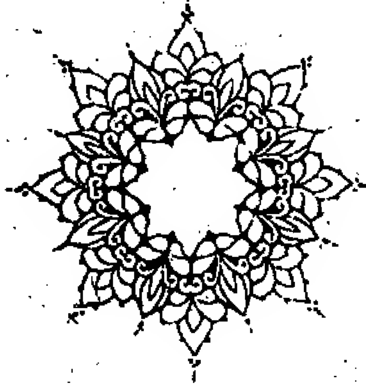

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الآداب

آداب کا بیان

"ادب" کے معنی ہیں وہ قول و فعل جس کو اچھا اور قابل تعریف کہا جائے! یا ادب کا مطلب یہ ہے کہ ہر بات کو درستی و اچھائی کے ساتھ اچھے موقع پر کہا جائے اور ہر کام کو احتیاط اور دور اندیشی کے ساتھ انجام دیا جائے۔

بعض حضرات کے نزدیک مکارم اخلاق (عمدہ اخلاق) یعنی یقین، قناعت، صبر، شکر، علم، حسن خلق، سخاوت، غیرت، شجاعت اور مروت جیسے اوصاف کو اختیار کرنا اور ان پر عمل کرنے کو ادب کہتے ہیں۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ادب کا مطلب یہ ہے کہ نیکی، بھلائی کی راہ کو اختیار کیا جائے اور گناہ و برائی کے راستہ سے اجتناب کیا جائے۔

بعض حضرات کے نزدیک ادب کے معنی یہ ہیں کہ اپنے بڑے بزرگ کی عزت و توقیر کی جائے اور اپنے سے چھوٹے کے ساتھ شفقت و محبت اور نرمی کا برتاؤ کیا جائے۔

"ادب" اپنے وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے چونکہ انسانی زندگی اور تہذیب و معاشرت کے مختلف پہلوؤں سے متعلق احادیث نقل کی جائے گی۔

بَابُ السَّلَامِ

سلام کا بیان

"سلام" کے معنی ہیں، نقائص و عیوب سے برات و نجات پانا۔ "سلام" اللہ تعالیٰ کا ایک اسم پاک ہے جس کے معنی ہیں وہ ذات جو ہر عیب و آفت اور تغیر و فنا سے پاک اور محفوظ ہے۔

"سلام" اسلامی تہذیب و معاشرت کا ایک خاص رکن ہے، اس کے لئے جو الفاظ مقرر کئے گئے ہیں وہ السلام علیک ہے اس کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تیرے حال سے واقف ہے۔ لہٰذا غفلت اختیار نہ کر، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اسم پاک کا تجھ پر سایہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی حفاظت و نگہبانی میں ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ اللہ معک ۔ یعنی اللہ تیرے ساتھ ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ تجھ پر سلامتی ہو یعنی تو مجھ سے سلامتی میں ہے اور مجھ کو بھی اپنے سے سلامتی میں رکھ، اس صورت میں سلام سلم سے مشتق ہو گا جس کے معنی مصالحت کے ہیں اور اس کلمہ کا مطلب یہ ہو گا کہ تو مجھ سے حفظ و امان میں رہ اور مجھ کو بھی حفظ و امان میں رکھ۔

منقول ہے کہ سلام کرنے کا طریقہ اسلام کے بالکل ابتدائی زمانہ میں مشروع ہوا تھا اور اس کا مقصد ایک ایسی علامت کو رائج کرنا تھا جس کے ذریعہ مسلمان اور کافر کے درمیان امتیاز کیا جا سکے تاکہ ایک مسلمان، دوسرے مسلمان سے تعرض نہ کرے گویا اس کلمہ کو اپنی زبان سے ادا کرنے والا اس بات کا اعلان کرتا تھا۔ کہ میں مسلمان ہوں اور پھر یہ طریقہ مستقل طور پر مشروع قرار پایا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کا سلام

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ طُوْلُهٗ سِتُّوْنَ ذِرَاعًا فَلَمَّا خَلَقَهٗ قَالَ اذْهَبْ فَسَلِّمْ عَلٰی اُولٰئِكَ النَّفَرِ وَهُمْ نَفَرٌ مِّنَ الْمَلٰئِكَةِ جُلُوْسٌ فَاسْتَمِعْ مَا یُحَیُّوْنَكَ فَاِنَّهَا تَحِیَّتُكَ وَتَحِیَّةُ ذُرِّیَّتِكَ فَذَهَبَ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمْ فَقَالُوْا اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ قَالَ فَزَادُوْهُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ قَالَ فَكُلُّ مَنْ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَلٰی صُوْرَةِ اٰدَمَ وَطُوْلُهٗ سِتُّوْنَ ذِرَاعًا فَلَمْ یَزَلِ الْخَلْقُ یَنْقُصُ بَعْدَهٗ حَتَّی الْاٰنَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر بنایا، ان کی لمبائی ساٹھ گز کی تھی، جب خدا نے ان کو بنایا تو ان سے فرمایا "جاؤ اور اس جماعت کو سلام کرو اور وہ جماعت فرشتوں کی تھی جو وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر سنو کہ وہ تمہیں کیا جواب دیتی ہے وہ جو جواب دے گا وہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا جواب ہے۔" چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام (اس حکم خداوندی کی تعمیل میں) فرشتوں کی اس جماعت کے پاس گئے اور کہا۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمْ فرشتوں نے جواب دیا۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ (یعنی تم پر اللہ کی رحمت نازل ہو) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ (گویا) آدم علیہ السلام کے سلام کے جواب میں ورحمۃ اللہ کا لفظ فرشتوں نے زیادہ کیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ پس جو شخص جنت میں داخل ہوگا وہ آدم علیہ السلام کی صورت پر ہوگا بایں طور پر کہ اس کی لمبائی ساٹھ گز کی ہوگی۔ (یعنی جنت میں جانے والے حضرت آدم علیہ السلام کے قد کی مذکورہ بلندی اور ان کے حسن و جمال کے ساتھ وہاں داخل ہوں گے) پھر حضرت آدم علیہ السلام کے بعد لوگوں کی ساخت برابر کم ہوتی رہی یہاں تک کہ موجودہ مقدار کو پہنچی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر بنایا"۔ اس ارشاد گرامی کے معنی میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، بعض حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ یہ ارشاد گرامی احادیث صفات میں سے ہے جس کے حقیقی مفہوم و مطلب تک رسائی ممکن نہیں ہے اس لئے اس بارے میں کوئی تاویل و توجیہہ کرنے کے بجائے سکوت ہی بہتر ہے جیسا کہ اس قسم کے ان اقوال و ارشادات کے بارے میں سکوت اختیار کیا جاتا ہے جو متشابہات کہلاتے ہیں علماء سلف اسی قول کی طرف مائل ہیں جب کہ بعض دوسرے حضرات اس ارشاد گرامی کی مختلف تاویلیں کرتے ہیں جن سے مشہور تاویل یہ ہے کہ فلاں معاملہ کی صورت مسئلہ یہ ہے یا صورت حال یوں ہے ظاہر ہے کہ جس طرح کسی مسئلہ یا حال کی کوئی ظاہری صورت نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ صورت کا لفظ استعمال کر کے حقیقت میں اس مسئلہ یا حال کی صفت و کیفیت مراد ہوتی ہے اس طرح یہاں اللہ کی صورت کا لفظ سے مراد اللہ کی صفت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صفت پر بنایا اور ان کو ان صفات کے ساتھ موصوف کیا جو صفات کریمہ باری تعالیٰ کا پرتو ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حی، عالم، قادر، مرید، متکلم، سمیع اور بصیر بنایا۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "صورتہ" کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف، شرف و عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ جیسا کہ روح اللہ اور بیت اللہ میں روح اور بیت کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اس صورت میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اس لطیف و جمیل صورت پر پیدا کیا جو اسرار و لطائف پر مشتمل ہے اور جس کو اس نے اپنی قدرت کاملہ کے ذریعہ اپنے پاس سے عطا کیا۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "صورتہ" کی ضمیر حضرت آدم علیہ السلام کی طرف راجع ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو انہی کی صورت پر بنایا، مطلب یہ ہے کہ وہ ابتداء آفرینش سے ہی شکل پر تھے، دوسرے انسانوں کی طرح ان کی تخلیق اس تدریجی طور پر نہیں ہوئی تھی کہ پہلے وہ نطفہ تھے، پھر مضغہ ہوئے پھر جنین، پھر طفل، پھر صبی اور پورے مرد ہوئے بلکہ وہ ابتداء ہی میں تمام اعضاء و جوارح، کامل شکل و صورت اور ساٹھ گز کے قد کے پورے انسان بنائے گئے تھے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر بنایا سے مراد آدم علیہ السلام کی تخلیق و پیدائش کی حقیقت کو واضح کرنا ہے اور چونکہ دیگر صفات کے برخلاف قد کی لمبائی ایک غیر معروف چیز تھی اس لئے اس کو خاص طور پر ذکر کیا اسی طرح چونکہ لمبائی پر چوڑائی بھی قیاس کی جا سکتی ہے اور اجمالی طور پر اس کا تصور ذہن میں آسکتا ہے لہٰذا چوڑائی کو ذکر نہیں کیا۔

"ورحمۃ اللہ کا لفظ فرشتوں نے زیادہ کیا" اس کے ذریعہ سلام کے جواب کے سلسلے میں ایک تہذیب و شائستگی اور ادب و فضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا، چنانچہ افضل طریقہ یہی ہے کہ اگر کوئی شخص السلام علیک کہے تو اس کے جواب میں وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا جائے اسی طرح اگر کوئی السلام علیک ورحمۃ اللہ کہے تو اس کے جواب میں وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، کہا جائے، ایک روایت میں ورحمۃ اللہ کے بعد ومغفرۃ کا لفظ بھی منقول ہے حدیث سے معلوم ہوا کہ سلام کے جواب میں وعلیک السلام کے بجائے السلام علیک کہنا بھی درست ہے کیونکہ معنی کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، لیکن جمہور علماء کے نزدیک افضل یہی ہے کہ جواب میں وعلیک السلام یا وعلیکم السلام ہی کہا جائے رہی یہ بات کہ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے سلام کے جواب میں وعلیک السلام کے بجائے السلام علیک کیوں کہا تو ہو سکتا ہے کہ ملائکہ نے بھی یہ چاہا ہو گا کہ سلام کرنے میں وہ خود ابتداء کریں، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ جب دو آدمی ملتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک سلام میں ابتداء کرنا چاہتا ہے تو دونوں ہی ایک دوسرے سے السلام علیک یا السلام علیکم کہتے ہیں، لیکن یہ بات واضح رہے کہ جواب کے درست و صحیح ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جواب سلام کے بعد واقع ہو نہ کہ دونوں ایک ساتھ واقع ہوں جیسا کہ، فاستمع مایحیونک (پھر سنو کہ وہ تمہیں کیا جواب دیتے ہیں) سے واضح ہوتا ہے چنانچہ فاستمع میں حرف فا تعقیب کے لئے ہے، جو مذکورہ وضاحت کی دلیل ہے، عام طور پر لوگ اس مسئلہ سے بہت غافل ہیں اس لئے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اگر دو شخص ملیں اور دونوں ایک ہی ساتھ السلام علیکم کہیں تو دونوں میں سے ہر ایک پر جواب دینا واجب ہو گا۔

حدیث کا آخری جملہ "تقدیم و تاخیر" پر دلالت کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا قد ساٹھ گز تھا ان کے بعد لوگوں کے قد بتدریج کوتاہ ہوتے گئے اور پھر جب جنت میں داخل ہوں گے تو سب کے قد دراز ہو جائیں گے جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا قد تھا۔

افضل اعمال

(۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَجُلاً سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّ الْاِسْلَامِ خَیْرٌ قَالَ تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَتُقْرِئُ السَّلَامَ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ اہل اسلام کی کونسی خصلت بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کھانا کھلانا اور ہر شناسا و ناشناسا کو سلام کرنا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اور دو اوصاف کی تخصیص، سائل کے حال کے مناسبت سے ہے، لہٰذا مختلف اوقات میں مختلف اعمال کو افضل فرمانا کہ کسی موقع پر کسی عمل کو افضل فرمایا اور کسی موقع پر کسی کو، سائل کے احوال کے اختلاف و تفاوت پر مبنی ہوتا تھا دریافت کرنے والا جس مزاج

واحوال کا آدمی ہوتا تھا اور اس کا رجحان جس نیک خصلت کی ضد کی طرف ہوتا اس کے سامنے اسی نیک خصلت کو افضل قرار دیا جاتا تھا، مثلاً کسی شخص نے پوچھا کہ کونسا عمل افضل ہے؟ اور آپ ﷺ جانتے تھے کہ اس شخص کے مزاج میں بخل ہے تو اس سے فرماتے کہ کھانا کھلانا، سب سے بہتر عمل ہے، لہٰذا یہاں جس شخص نے سوال کیا تھا آپ ﷺ نے اس کے احوال کی مناسبت سے اس سے فرمایا کہ کھانا کھلانا اور ہر آشنا و ناآشنا کو سلام کرنا بہتر عمل ہے۔

لفظ "تقرئ" (تا کے پیش کے ساتھ) اقراء سے مشتق ہے اور اس کے معنی پڑھوانے کے ہیں یہ لفظ تاء کے زبر کے ساتھ منقول ہے جو "قراءت" سے مشتق ہے اور جس کے معنی پڑھنے کے ہیں اگرچہ مؤخر الذکر صورت میں مفہوم زیادہ بہتر طور پر واضح نہیں ہوتا لہٰذا اس کی توجیہہ یہ کی جائے گی کہ سلام کرنے والا چونکہ مسلم علیہ (جس کو سلام کیا گیا ہے) کے جواب دینے کا باعث ہوتا ہے اس لئے گویا وہ اس کی زبان سے وہ کلمہ پڑھواتا ہے جس کا تعلق سلام اور اس کے جواب سے ہے۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوئی کہ سلام کا تعلق، شناسائی کے حقوق سے نہیں ہے بلکہ یہ ان حقوق میں سے ہے جو اسلام نے ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کے تئیں عائد کئے ہیں، اسی طرح مریض کی عیادت اور اس جیسے دوسرے امور بھی اسلامی حقوق و واجبات سے تعلق رکھتے ہیں جیسا کہ آگے آنے والی حدیث سے واضح ہوگا۔

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کے کیا حقوق ہیں؟

(۳) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِلْمُؤْمِنِ عَلَی الْمُؤْمِنِ سِتُّ خِصَالٍ یَعُوْدُہٗ اِذَا مَرِضَ وَیَشْھَدُہٗ اِذَا مَاتَ وَیُجِیْبُہٗ اِذَا دَعَاہُ وَیُسَلِّمُ عَلَیْہِ اِذَا لَقِیَہٗ وَیُشَمِّتُہٗ اِذَا عَطَسَ وَیَنْصَحُ لَہٗ اِذَا غَابَ اَوْ شَھِدَ لَمْ اَجِدْہُ فِی الصَّحِیْحَیْنِ وَلَا فِیْ کِتَابِ الْحُمَیْدِیِّ وَلٰکِنْ ذَکَرَہٗ صَاحِبُ الْجَامِعِ بِرِوَایَۃِ النَّسَائِیِّ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، مسلمان پر مسلمان کے چھ حق ہیں (ایک تو یہ ہے کہ) جب (کوئی) مسلمان بیمار ہو تو دوسرا مسلمان اس کی عیادت کرے (دوسرے یہ کہ) جب کوئی مسلمان مر جائے تو (دوسرا مسلمان) اس کی نماز جنازہ میں شریک ہو (تیسرے یہ کہ) جب (کوئی مسلمان) کھانے پر بلائے تو (بلایا جانے والا مسلمان) اس کی دعوت کو قبول کرے (بشرطیکہ کوئی شرعی عذر مانع نہ ہو جیسے اس دعوت میں باجا گاجا وغیرہ ہو یا اس دعوت کا تعلق اظہار فخر و ریاکاری سے ہو) (چوتھے یہ کہ) جب (کوئی مسلمان) ملے تو اس کو سلام کرے (پانچویں یہ کہ) جب (کوئی مسلمان) چھینکے اور الحمد للہ کہے تو اس کا جواب دے (یعنی یرحمک اللہ کہے اور اگر چھینکنے والا الحمد للہ نہ کہے تو وہ جواب کا مستحق نہیں ہوگا) اور چھٹے یہ کہ (ایک مسلمان کی ہر حالت میں) خیر خواہی کرے خواہ وہ حاضر ہو یا غائب اور مشکوٰۃ کے مؤلف کہتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کو نہ تو صحیحین (بخاریؒ و مسلمؒ) میں پایا ہے اور نہ حمیدی کی کتاب میں، البتہ اس کو صاحب جامع الاصول نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "خیر خواہی کرے" کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ وہ ہر حالت میں ایک دوسرے کے خیر خواہ و ہمدرد رہیں، جو مسلمان سامنے ہے اس کے ساتھ بھی خیر خواہی کی جائے اور جو نظروں سے دور ہے اس کے ساتھ بھی خیر خواہی کریں، یہ طرز عمل اختیار نہ کرنا چاہئے کہ جب کسی مسلمان کے سامنے آئیں تو اس کے ساتھ تملق یعنی خوشامد چاپلوسی کا رویہ اپنائیں اور جب وہ سامنے نہ ہو تو غیبت کریں یہ خالص منافقانہ رویہ ہے اور منافقوں کی خاصیت ہے۔

تعلق دوستی قائم کرنے کا بہترین ذریعہ سلام ہے

(۴) وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ حَتّٰی تُوْمِنُوْا وَلَا تُوْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا اَوَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی شَیْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْہُ تَحَابَبْتُمْ اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَکُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم جب تک کہ ایمان نہ لاؤ جنت میں داخل نہیں ہو سکو گے اور تمہارا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم اللہ کی رضاء خوشنودی کے لئے آپس میں تعلق ودوستی قائم نہ کرو۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا اور... کیا میں تمہیں ایک ایسا ذریعہ نہ بتادوں جس کو تم اختیار کرو تو آپس میں دوستی کا تعلق قائم ہو جائے اور وہ ذریعہ یہ ہے کہ تم آپس میں سلام کا چلن عام کرو یعنی آشنا و نا آشنا سب کو سلام کرو۔" (مسلم)

تشریح: مشکوٰۃ کے ان صحیح و معتمد نسخوں میں کہ جو اونچے درجہ کے مشائخ کے سامنے پڑھے گئے ہیں لفظ و لا تؤمنوا نون کے حذف کے ساتھ ہے اور یہ حذف نون حتی تؤمنوا کے مجانست و مقارنت کی وجہ سے ہے تاہم بعض نسخوں میں یہ لفظ نون کے ساتھ یعنی و لا تؤمنون منقول ہے اور یہ نحوی قاعدہ کے مطابق ہے۔

کون کس کو سلام کرے؟

⑤ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَلِّمُ الرَّاكِبُ عَلَى الْمَاشِيْ وَالْمَاشِيْ عَلَى الْقَاعِدِ وَالْقَلِيْلُ عَلَى الْكَثِيْرِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص سواری پر ہو وہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے، پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور تھوڑے آدمی زیادہ تعداد والے آدمیوں کو سلام کریں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جو شخص سواری پر ہو.....الخ" یہ حکم اصل میں تواضع و انکساری کی طرف راغب کرنے کے لئے ہے کیونکہ جو شخص سواری پر ہے اس کو گویا اللہ تعالیٰ نے پیدل چلنے والے پر برتری و فوقیت عطا فرمائی ہے، لہٰذا اس کو فروتنی ہی اختیار کرنی چاہئے، اسی طرح جو لوگ کم تعداد میں ہوں اور وہ ایسے لوگوں سے ملیں جو تعداد میں ان سے زیادہ ہوں تو ان کو بھی چاہئے کہ تواضع و انکساری کی بنا پر اور اکثریت کے احترام کے پیش نظر سلام کرنے میں ابتداء کریں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کچھ لوگوں سے ملے اور یہ چاہے کہ ان سب کو سلام کرنے کی بجائے ان میں سے چند کو سلام کرے تو یہ مکروہ ہے کیونکہ سلام کا اصل مقصد آپس میں موانست و الفت کو فروغ دینا ہے جب کہ بعض دوسرے مخصوص لوگوں کو سلام کرنا گویا باقی لوگوں کو وحشت و اجنبیت میں مبتلا کرنا ہے اور یہ چیز اکثر اوقات نفرت و عداوت کا بھی سبب بن جاتی ہے۔ لیکن بازار اور شارع عام کا حکم اس سے الگ ہے کہ اگر بازار میں یا شارع عام پر بہت سے لوگ آرہے ہوں تو وہاں بعض لوگوں کو سلام کرلینا کافی ہوگا۔ کیونکہ اگر کوئی شخص بازار میں شارع عام پر ملنے والے ہر شخص کو سلام کرنے لگے گا تو وہ اسی کام کا ہو کر رہ جائے گا اور اپنے امور کی انجام دہی سے باز رہے گا۔

⑥ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَلِّمُ الصَّغِيْرُ عَلَى الْكَبِيْرِ وَالْمَارُّ عَلَى الْقَاعِدِ وَالْقَلِيْلُ عَلَى الْكَثِيْرِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا چھوٹا، بڑے کو گزرنے والا بیٹھنے ہوئے کو، اور کم تعداد والے زیادہ تعداد والوں کو سلام کریں۔" (بخاریؒ)

تشریح: علماء نے یہ لکھا ہے کہ مذکورہ بالا حکم سر راہ ملاقات کے وقت کا ہے، مثلاً ایک شخص ادھر سے آرہا ہے دوسرا ادھر سے جارہا ہو اور دونوں آپس میں ملیں تو اس صورت کے لئے یہ حکم ہے کہ ان دونوں میں جو شخص چھوٹا ہو وہ بڑے کو سلام کرے لیکن وارد ہونے یعنی کسی کے پاس یا مجلس میں جانے کی صورت میں سلام کی ابتداء وارد کو کرنی چاہئے، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اور خواہ کم تعداد والے لوگ ہوں یا

زیادہ تعداد والے لوگ۔

آنحضرت ﷺ کی انکساری وشفقت

(۷) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰی غِلْمَانٍ فَسَلَّمَ عَلَیْہِمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ کچھ لڑکوں کے پاس گزرے تو آپ ﷺ نے ان کو سلام کیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا یہ عمل مبارک کہ آپ ﷺ نے بچوں کو سلام کیا درحقیقت آپ ﷺ کے وصف تواضع، وانکساری اور دنیا والوں کے تئیں کمال شفقت ومحبت کا مظہر ہے۔

غیر مسلم کو سلام کرنے کا مسئلہ

(۸) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاتَبْدَؤُا الْیَھُوْدَ وَلَا النَّصَارٰی بِالسَّلَامِ وَاِذَا لَقِیْتُمْ اَحَدَھُمْ فِیْ طَرِیْقٍ فَاضْطَرُّوْہُ اِلٰی اَضْیَقِہٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا یہودیوں اور عیسائیوں کو سلام کرنے میں ابتداء نہ کرو اور جب تم راستے میں ان میں سے کسی سے ملو تو ان کو تنگ ترین راستے پر چلے جانے پر مجبور کرو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: سلام کرنے میں ابتداء نہ کرو۔ کا مطلب یہ ہے کہ پہلے تم ان کو السلام علیکم نہ کہو۔ کیونکہ سلام میں پہل کرنا درحقیقت اسلامی تہذیب کا بخشا ہوا ایک اعزاز ہے جس کے مستحق وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اسلامی تہذیب کے پیرو ہوں اور مسلمان ہیں، اس اعزاز کا استحقاق ان لوگوں کو حاصل نہیں ہو سکتا جو دین کے دشمن اور خدا کے باغی ہیں اسی طرح ان باغیوں اور دشمنوں کے ساتھ سلام اور اس جیسی دوسری چیزوں کے ذریعہ الفت ومحبت کے مراسم کو قائم کرنا بھی جائز نہیں ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

لَاتَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ۔

"آپ (ﷺ) ایسی کوئی قوم نہ پائیں گے جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اور ان لوگوں سے بھی دوستی رکھتے ہوں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں۔"

ہاں اگر وہ لوگ سلام میں خود پہل کریں اور السلام علیک یا السلام علیکم کہیں تو اس کے جواب میں صرف علیک یا علیکم کہہ دیا جائے، اور علماء نے لکھا ہے کہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ غیر مسلم کے جواب میں ھداک اللّٰہ کہا جائے نیز بعض علماء نے لکھا ہے کہ کسی ضرورت و مجبوری کی بناء پر یہود ونصاری کے ساتھ سلام میں پہل کرنی جائز ہے اور یہی حکم ان مسلمانوں کا بھی ہے جو بدعت اور فسق میں مبتلا ہوں۔

اسلامی سلطنت میں رہنے والے کسی مسلمان نے کسی اجنبی کو سلام کیا اور پھر معلوم ہوا کہ وہ ذمی ہے تو اس صورت میں مستحب یہ ہے کہ اپنے سلام کو واپس کرنے کا مطالبہ کرے یعنی یوں کہے کہ اسر جعت سلامی مین اپنے سلام کو واپس کرنے کا مطالبہ کرتا ہوں۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ یہود ونصاری جو دین کے دشمن ہیں اور اپنے مکروفریب کی طاقتوں کے ذریعہ خدا کے جھنڈے کو سرنگوں کرنا چاہتے ہیں اس سلوک کے مستحق ہیں کہ جب وہ راستہ میں ملیں تو ان پر اتنا دباؤ ڈالا جائے کہ وہ یکسو ہو کر گزرنے پر مجبور ہو جائیں اور ان پر راستہ تنگ ہو جائے تاکہ اسلام کی عظمت وشوکت اور مسلمانوں کا دبدبہ ظاہر ہو۔ مشکوٰۃ کے بعض حواشی میں یہ مطلب لکھا ہے کہ ان کو یہ حکم دو کہ وہ ایک طرف ہو جائیں اور کنارے پر چلیں تاکہ راستے کا درمیانی حصہ مسلمانوں کی آمد ورفت کے لئے مخصوص رہے۔

یہودیوں کی شرارت

⑨ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا سَلَّمَ عَلَيْكُمُ الْيَهُوْدُ فَإِنَّمَا يَقُوْلُ اَحَدُهُمُ السَّامُ عَلَيْكَ فَقُلْ وَعَلَيْكَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب یہودی تمہیں سلام کرتے ہیں تو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ لوگ یوں کہتے ہیں، السام علیک (یعنی تمہیں موت آئے) لہٰذا تم ان کے جواب میں یہ کہو وعلیک (یعنی تمہیں موت آئے)" (بخاریؒ ومسلمؒ)

⑩ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا سَلَّمَ عَلَيْكُمْ اَهْلُ الْكِتَابِ فَقُوْلُوْا وَعَلَيْكُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب اہل کتاب یعنی یہود ونصاری تمہیں سلام کریں تو تم ان کے جواب میں کہو وعلیکم۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: پہلی روایت میں لفظ "فقل" اور "وعلیک" بصیغہ مفرد ہے اور اس روایت میں "فقولوا" اور "وعلیکم" بصیغہ جمع ہے اسی طرح اور روایتوں میں "وعلیک" اور "وعلیکم" واؤ کے ساتھ اور بغیر واؤ کے دونوں طرح منقول ہے مشکوۃ کے مؤلف نے یہاں جو روایت نقل کی ہے اس میں ان دونوں کو واؤ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ موطا کی روایت میں "علیک" بغیر واؤ کے مؤلف نے یہاں جو روایت نقل کی ہے اس میں ان دونوں کو واؤ کے ساتھ نقل کیا ہے موطا کی روایت میں "علیک" بغیر واؤ کے اور دار قطنی کی روایت میں "علیکم" بغیر واؤ کے منقول ہے اور علماء نے لکھا ہے کہ زیادہ صحیح اور مختار قول یہ ہے کہ مذکورہ لوگوں کے سلام کے جواب میں یہ لفظ بغیر واؤ کے یعنی "علیک" یا "علیکم" ہی کہا جائے تاکہ اس چیز میں مشارکت لازم نہ آئے جو ان کی زبان سے ادا ہوتی ہے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس لفظ کو واؤ کے ساتھ کہنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ جس چیز میں مشارکت لازم آئے گی وہ موت ہے اور موت سب کو آنے والی ہے اس صورت میں اس لفظ کا مطلب یہ ہوگا کہ (جس موت کو تم برا سمجھ کر گویا ہمیں اس کی بددعا دے رہے ہو) اس میں ہم اور تم برابر ہیں کہ ہم سب ہی کو موت یعنی مرنا ہے۔ بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ حرف واؤ یہاں مشارکت کے لئے نہیں ہے بلکہ استیناف کے لئے ہے، اس صورت میں یہ لفظ مفہوم کے اعتبار سے اس جملہ کا قائم مقام ہوگا کہ وعلیکم ماتستحقونہ من الذم (اور تجھ پر وہ برائی پڑے جس کا تو مستحق ہے) تاہم یہ بات واضح رہے کہ یہ لفظ احادیث میں چونکہ دونوں طرح منقول ہے کہ بعض روایتوں میں واؤ کے ساتھ ہے اور بعض روایتوں میں بغیر واؤ کے، اس لئے اس سلسلے میں درست بات یہ ہے کہ دونوں طرح کہنا جائز ہے۔

نوویؒ کہتے ہیں کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اہل کتاب کے سلام کا جواب دیا جائے لیکن وعلیکم السلام نہ کہا جائے یعنی جواب دینے والا نہ تو "علیکم السلام" کہے اور نہ "علیک السلام" بلکہ صرف "وعلیکم" یا "علیک" کہے بلکہ "وعلیکم" بھی اس صورت میں کہے جب وہ ایک سے زائد ہوں اگر ایک ہی ہو تو "علیکم" نہ کہے، کیوں کہ اسطرح اس کی تعظیم وتوقیر لازم آئے گی۔

آنحضرت ﷺ کا حلم

⑪ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اسْتَاذَنَ رَهْطٌ مِنَ الْيَهُوْدِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوا السَّامُ عَلَيْكُمْ فَقُلْتُ بَلْ عَلَيْكُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَةُ فَقَالَ يَاعَائِشَةُ اِنَّ اللّٰهَ رَفِيْقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الْاَمْرِ كُلِّهِ قُلْتُ اَوَلَمْ تَسْمَعْ مَاقَالُوْا قَالَ قَدْ قُلْتُ وَعَلَيْكُمْ وَفِي رِوَايَةٍ عَلَيْكُمْ وَلَمْ يَذْكُرِ الْوَاوَ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ اِنَّ الْيَهُوْدَ اَتَوُا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوا السَّامُ عَلَيْكَ قَالَ وَعَلَيْكُمْ فَقَالَتْ عَائِشَةُ السَّامُ عَلَيْكُمْ وَلَعَنَكُمُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْكُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَهْلًا يَا عَائِشَةُ عَلَيْكِ بِالرِّفْقِ وَاِيَّاكِ وَالْعُنْفَ وَالْفُحْشَ قَالَتْ اَوَلَمْ تَسْمَعْ مَاقَالُوْا اَوَلَمْ

تَسْمَعِیْ مَاقُلْتُ رَدَدْتُ عَلَیْهِمْ فَیُسْتَجَابُ لِی فِیْهِمْ وَلَا یُسْتَجَابُ لَهُمْ فِیَّ وَفِیْ رِوَایَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ لَا تَکُوْنِی فَاحِشَةً فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفُحْشَ وَالتَّفَحُّشَ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک دن یہودیوں کی ایک جماعت نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت مانگی، چنانچہ ان کو اجازت دے دی گئی اور جب وہ آپ ﷺ کے پاس آئے تو کہا کہ بلکہ تمہیں موت آئے اور تم پر لعنت ہو آنحضرت ﷺ نے فرمایا عائشہؓ! اللہ تعالیٰ محبت و نرمی کرنے والا ہے اور ہر کام میں محبت و نرمی کو پسند کرتا ہے میں نے عرض کیا کیا آپ (ﷺ) نے سنا نہیں انہوں نے (سلام کے) بجائے کیا لفظ کہا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا (بیشک میں نے سنا ہے) اور میں نے (ان کے جواب میں) کہا ہے کہ وَعَلَیْکُمْ اور ایک روایت میں یہ لفظ عَلَیْکُمْ ہے یعنی واؤ کا ذکر نہیں ہے (بخاریؒ و مسلمؒ)........اور بخاریؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا (ایک دن) کچھ یہودی نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور انہوں نے السلام علیکم کہنے کے بجائے یہ کہا کہ السام علیکم، آنحضرت ﷺ نے (ان کے جواب میں) فرمایا کہ وعلیکم۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہودیوں کی یہ بد تمیزی مجھ سے برداشت نہیں ہوئی اور میں نے ان کے جواب میں کہا کہ تمہیں موت آئے، اور تم پر اللہ کی لعنت ہو، اور تم پر اللہ کا غضب ٹوٹے۔ آنحضرت ﷺ نے (جب میری زبان سے ایسے الفاظ سنے تو) فرمایا کہ عائشہؓ رک جاؤ! تمہیں نرمی اختیار کرنی چاہئے نیز سخت گوئی اور لچر باتوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ کیا آپ نے نہیں سنا کہ انہوں نے کیا لفظ کہا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اور کیا تم نے نہیں سنا کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے میں نے اس پر کیا جواب دیا ہے (تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ) ان کے حق میں میری دعا (یا بددعا) تو قبول ہوتی ہے لیکن میرے حق میں ان کی دعا (یا بددعا) قبول نہیں ہوتی اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا عائشہؓ تم لچر باتیں کرنے والی مت بنو، کیونکہ اللہ تعالیٰ لچر باتوں کو اور بہ تکلف لچر باتیں بنانے کو پسند نہیں کرتا۔"

مسلم اور غیر مسلم کی مخلوط مجلس میں سلام کرنے کا طریقہ

⑫ وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَیْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِمَجْلِسٍ فِیْهِ اَخْلَاطٌ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُشْرِکِیْنَ عَبَدَةِ الْاَوْثَانِ وَالْیَهُوْدِ فَسَلَّمَ عَلَیْهِمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اسامہ ابن زید کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ ایک ایسی مجلس کے پاس سے گزرے جس میں مسلمان اور مشرکین باہم بیٹھے ہوئے تھے اور مشرکین میں بت پرست بھی تھے، اور یہودی بھی، چنانچہ آپ ﷺ نے (مسلمانوں کا ارادہ کر کے) مجلس والوں کو سلام کیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: نوویؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان کسی ایسی جماعت کے پاس سے گزرے یا کسی ایسی مجلس میں پہنچے جس میں مسلمان بھی ہوں اور غیر مسلم بھی، اور مسلمان خواہ ایک ہی ہو یا کئی ہوں تو مسنون یہ ہے کہ مسلمانوں، یا مسلمان کا قصد کر کے پوری جماعت کو سلام کرے، نیز علماء نے لکھا ہے کہ اس صورت میں چاہے تو السلام علیکم کہے اور نیت یہ رکھے کہ اس سلام کے اصل مخاطب مسلمان ہیں اور چاہے یوں کہے۔ السلام علی من اتبع الھدی نیز علماء یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگر کسی مشرک و غیر مسلم کو خط لکھا جائے تو مسنون یہ ہے کہ مکتوب الیہ کو السلام علیکم، لکھنے کی بجائے وہی الفاظ لکھے جو آنحضرت ﷺ نے ہرقل روم کے بادشاہ کو لکھے تھے، سلام علی من اتبع الھدی۔

راستہ کے حقوق

⑬ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِیَّاکُمْ وَالْجُلُوْسَ بِالطُّرُقَاتِ فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ

مَالَنَامِنْ مَّجَالِسِنَا بُدٌّ نَتَحَدَّثُ فِيْهَا قَالَ فَاِذَا اَبَيْتُمْ اِلَّا الْمَجْلِسَ فَاَعْطُوا الطَّرِيْقَ حَقَّهٗ قَالُوْا وَمَا حَقُّ الطَّرِيْقِ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ غَضُّ الْبَصَرِ وَكَفُّ الْاَذٰى وَرَدُّ السَّلَامِ وَالْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْىُ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدری نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا تم راستوں میں بیٹھنے سے اجتناب کرو۔ یہ سن کر بعض صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! ہمارے لئے راستوں میں بیٹھنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے، جہاں ہم باتیں کرتے ہیں (یعنی راستوں میں بیٹھنے سے اجتناب کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے، ہمارے پاس چوں کہ کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں ہم اپنی مجلس رکھا کریں اس لئے جب ہم چند لوگ کہیں مل جاتے ہیں تو وہیں راستہ میں بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے دینی و دنیاوی امور کے بارے میں باہمی رائے مشورہ اور مذاکرات کرتے ہیں، ایک دوسرے کی حالت دریافت کرتے ہیں اگر کوئی بیمار ہوتا ہے تو اس کے لئے علاج معالجہ تجویز کرتے ہیں، اگر آپس میں کوئی رنجش و عناد ہوتا ہے تو صلح وصفائی کرتے ہیں اور اپنے معاملات کو طے کرنے کی تدبیر پر غور کرتے ہیں) آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب (تم مجبوری کی بنا) پر بیٹھنے کے علاوہ دوسری صورت سے انکار کرتے ہو تو پھر راستہ کو اس کا حق ادا کرو (یعنی اگر ایسی صورت ہو کہ راستے میں بیٹھنے سے اجتناب کرنا تمہارے لئے ممکن نہ ہو اور تمہیں ایسی جگہ بیٹھنا پڑے جو راستہ پر واقع ہو تو راستے کا حق ادا کرو) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! راستہ کا کیا حق ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ آنکھوں کا بند کرنا یعنی حرام چیزوں پر نظر ڈالنا، ایذاء رسانی سے باز رہنا یعنی تنگ راستہ کردینے یا کسی اور طرح گزرنے والوں کو ایذاء نہ پہنچانا، سلام کا جواب دینا اور لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم کرنا اور بری باتوں سے روکنا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: سلام کا جواب دینا یہاں سلام کرنے کا حکم دینے کے بجائے سلام کا جواب دینے کی ہدایت کرنا اس مسنون امر کے پیش نظر ہے کہ چلنے اور گزرنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

⑭ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِیْ هٰذِهِ الْقِصَّةِ قَالَ وَاِرْشَادُ السَّبِيْلِ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ عَقِيْبَ حَدِيْثِ الْخُدْرِيِّ هٰكَذَا۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے اس مضمون کے سلسلے میں (کہ جو اوپر کی حدیث میں ذکر کیا گیا) نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے (یہ بھی) فرمایا کہ (جو شخص راستہ بھول جائے، یا جو شخص راستہ نہ جانتا ہو) اس کو راستہ بتانا (بھی ایک حق ہے) اس روایت کو ابوداؤدؒ نے حضرت ابوسعید خدری کی روایت کے بعد اسی طرح نقل کیا ہے جیسا کہ صاحب مصابیح نے اور ان کی اتباع میں صاحب مشکوٰۃ نے یہاں نقل کیا ہے۔"

⑮ وَعَنْ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِیْ هٰذِهِ الْقِصَّةِ قَالَ وَتُغِيْثُوا الْمَلْهُوْفَ وَتَهْدُوا الضَّالَّ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ عَقِيْبَ حَدِيْثِ اَبِیْ هُرَيْرَةَ هٰكَذَا وَلَمْ اَجِدْهُمَا فِی الصَّحِيْحَيْنِ۔

"اور حضرت عمرؓ نبی کریم ﷺ سے اس مضمون کے سلسلے میں نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے بھی یہ فرمایا کہ ایک حق یہ بھی ہے کہ مظلوم کی فریادرسی کی جائے اور گم کردہ راہ کو راستہ بتایا جائے۔ اس روایت کو حضرت ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے بعد اسی طرح نقل کیا ہے اور میں نے ان دونوں حدیثوں کو صحیحین یعنی بخاری و مسلم میں نہیں پایا۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

اسلامی معاشرہ کے چھ باہمی حقوق

⑯ عَنْ عَلِیٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ بِالْمَعْرُوْفِ يُسَلِّمُ عَلَيْهِ اِذَا لَقِيَهٗ

وَيُجِيْبُهُ اِذَا دَعَاهُ وَيُشَمِّتُهُ اِذَا عَطَسَ وَيَعُوْدُهُ اِذَا مَرِضَ وَيَتْبَعُ جَنَازَتَهُ اِذَا مَاتَ وَيُحِبُّ لَهُ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ۔
(رواہ الترمذی والدارمی)

"حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا مسلمان پر مسلمان کے چھ حقوق ہیں جو حسن سلوک (اور خدا کی خوشنودی) سے متعلق ہیں، جب کوئی مسلمان ملے تو اس کو سلام کرنا، جب کوئی مسلمان کھانے (کے لئے یا کسی اور غرض سے بلائے) تو اس کو قبول کرنا جب کوئی مسلمان چھینکے تو اس پر یرحمک اللہ کہنا، جب کوئی مسلمان بیمار ہو تو اس کی عیادت کرنا، جب کسی مسلمان کا انتقال ہو جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ جانا اور مسلمان کے لئے اس چیز کو پسند کرنا جس کو خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔" (ترمذیؒ، دارمیؒ)

سلام کے ثواب میں اضافہ، باعث بننے والے الفاظ

(۱۷) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ رَجُلًا جَآءَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ فَرَدَّ عَلَيْهِ ثُمَّ جَلَسَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرٌ ثُمَّ جَآءَ اٰخَرُ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ فَرَدَّ عَلَيْهِ فَجَلَسَ فَقَالَ عِشْرُوْنَ ثُمَّ جَآءَ اٰخَرُ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ فَرَدَّ عَلَيْهِ فَجَلَسَ فَقَالَ ثَلٰثُوْنَ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کی مجلس میں ایک شخص آیا اور کہا السلام علیکم آنحضرت ﷺ نے اس کے سلام کے جواب دیا، پھر وہ شخص بیٹھ گیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اس شخص کے لئے دس نیکیاں لکھی گئی ہیں۔ پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے سلام کا بھی جواب دیا اور جب وہ بیٹھ گیا تو فرمایا کہ اس کے لئے بیس نیکیاں لکھی گئی ہیں۔ اس کے بعد ایک اور شخص آیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آنحضرت نے اس کے سلام کا بھی جواب دیا اور جب وہ بیٹھ گیا تو فرمایا کہ اس کے لئے تیس نیکیاں لکھی گئی ہیں۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: مذکورہ بالا ارشاد گرامی ﷺ کا تعلق سلام کرنے والے کے ساتھ ہے! اگر سلام کرنے والا السلام علیکم کہے اور جس کو سلام کیا گیا ہے وہ اس کے جواب میں ورحمۃ اللہ کے لفظ کا اضافہ کرے یعنی وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ کہے یا سلام کرنے والا السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہے اور جواب دینے والا وبرکاتہ کے لفظ کا اضافہ کرے یعنی یوں کہے کہ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ تو اضافہ ثواب کے سلسلے میں اس کا حکم بھی یہی ہوگا اور یہی حکم مغفرتہ کے اضافہ کا بھی ہے جیسا کہ آگے آنے والی حدیث میں مذکور ہے۔

(۱۸) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَعْنَاهُ وَزَادَ ثُمَّ اَتٰى اٰخَرُ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ وَمَغْفِرَتُهُ فَقَالَ اَرْبَعُوْنَ وَقَالَ هٰكَذَا تَكُوْنُ الْفَضَائِلُ۔ (رواہ البوداؤد)

"اور حضرت معاذ ابن انسؓ نے بھی نبی کریم ﷺ سے اوپر کی حدیث کے ہم معنی روایت نقل کی ہے جس میں معاذؓ نے یہ الفاظ مزید نقل کئے ہیں۔ پھر ایک اور شخص یعنی چوتھا شخص آیا اور کہا کہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ۔ آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ اس کے لئے چالیس نیکیاں لکھی گئی ہیں۔ نیز یہ فرمایا کہ اسی طرح سے ثواب میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یعنی سلام کرنے والا جس قدر الفاظ بڑھاتا جائے گا اسی قدر اس کے ثواب میں اضافہ ہوتا جائے گا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ سلام کرنے کے سلسلے میں افضل یہ ہے کہ سلام کرنے والا یوں کہے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، یعنی جمع کی ضمیر علیکم استعمال کی جائے اگرچہ جس کو سلام کیا جا رہا ہے وہ ایک ہی شخص کیوں نہ ہو، اسی طرح جس شخص کو سلام کیا گیا ہے وہ جواب میں یوں کہے۔ وعلیکم السلام، یعنی وہ بھی جمع کی ضمیر استعمال کرے اور واؤ لگائے۔

واضح رہے کہ سلام کا ادنی درجہ السلام علیکم کہنا ہے اور اگر السلام علیک کہا جائے تو بھی کافی ہوگا اور جواب میں ادنی

درجہ و علیک السلام اور و علیکم السلام ہے اور اگر واؤ نہ لگایا جائے تو بھی کافی ہوگا۔ علماء کا اس بات پر تو اتفاق ہے کہ اگر جواب میں صرف علیکم کہا جائے تو جواب پورا نہیں ہوگا اور اگر جواب میں و علیکم کہا جائے یعنی واؤ لگایا جائے تو اس صورت میں دونوں قول ہیں۔

سلام میں پہل کرنے کی فضیلت

(۱۹) وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاللّٰهِ مَنْ بَدَأَ بِالسَّلَامِ۔

(رواہ احمد والترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا لوگوں مین سے اللہ کے نزدیک تر وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔"

(احمدؒ و ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: اس فضیلت کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو راستہ میں ایک دوسرے سے ملیں کیوں کہ اس صورت میں سلام کرنے کے حق کے سلسلے میں وہ برابر کی حیثیت رکھیں گے لہٰذا ان میں سے جو شخص پہلے سے سلام کرے گا وہ مذکورہ فضیلت کا مستحق ہوگا اس کے برخلاف اگر یہ صورت ہو کہ ایک شخص تو کہیں بیٹھا ہوا ہو اور دوسرا شخص اس کے پاس آئے تو سلام کرنے کا حق اس دوسرے شخص پر ہوگا جو آیا ہے لہٰذا اگر وہ آنے والا سلام کرنے میں پہل کرے تو وہ فضیلت کا مخاطب نہیں ہوگا کیوں کہ اس نے سلام کرنے میں پہل کرکے درحقیقت اس حق کو ادا کیا ہے جو اس کے ذمہ تھا، ہاں اگر سلام کرنے میں وہ شخص پہل کرے جو بیٹھا ہوا تھا تو اس فضیلت کا وہ مستحق ہوگا۔

حضرت عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کو اختیار کرنے سے مسلمانوں کے باہمی تعلقات میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے تئیں اخلاص و محبت کے جذبات کو فروغ دیتا ہے ایک تو ملاقات کے وقت سلام کرنے میں پہل کرنا دوسرے کسی مسلمان کو اس کے نام کے ذریعہ مخاطب کرنا اور پکارنا جس کو وہ پسند کرتا ہے تیسرے یہ کہ جب وہ مجلس میں آئے تو اس کو عزت و احترام کے ساتھ جگہ دینا۔

اجنبی عورت کو سلام کرنا جائز نہیں

(۲۰) وَعَنْ جَرِيْرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلَى نِسْوَةٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِنَّ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت جریرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ عورتوں کے پاس سے گزرے تو آپ ﷺ نے ان کو سلام کیا۔" (احمدؒ)

تشریح: یہ بات آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی ﷺ کے ساتھ مخصوص تھی کیونکہ کسی فتنہ و شر میں آنحضرت ﷺ کے مبتلا ہونے کا کوئی خوف و خطر نہ تھا اس لئے آپ ﷺ کے لئے عورتوں کو بھی سلام کرنا روا تھا، لیکن آپ ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے مسلمان کے لئے یہ مکروہ ہے کہ وہ اجنبی عورت کو سلام کرے، ہاں اگر کوئی عورت اتنی عمر رسیدہ ہو کہ اس کے تئیں کسی فتنہ و شر میں مبتلا ہونے کا کوئی خوف نہ ہو اور نہ اس کو سلام کرنا دوسروں کی نظروں میں کسی بدگمانی کا سبب بن سکتا ہو تو اس کو سلام کرنا جائز ہوگا۔

جماعت میں سے کسی ایک کا سلام کرنا پوری جماعت کی طرف سے کافی ہے

(۲۱) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ قَالَ يُجْزِئُ عَنِ الْجَمَاعَةِ اِذَا مَرُّوْا اَنْ يُسَلِّمَ اَحَدُهُمْ وَيُجْزِئُ عَنِ الْجُلُوْسِ اَنْ يَرُدَّ اَحَدُهُمْ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ مَرْفُوْعًا وَرَوَى اَبُوْدَاوٗدَ وَقَالَ رَفَعَهُ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ وَهُوَ شَيْخُ اَبِيْ دَاوٗدَ۔

"اور حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا جب کچھ لوگ گزر رہے ہوں تو ان میں سے کسی ایک کا

سلام لینا ان سب کی طرف سے کافی ہوگا اسی طرح جو لوگ بیٹھے ہوئے ہوں ان میں سے کسی ایک کا جواب دینا ان سب کی طرف سے کافی ہوگا۔ اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں بطریق مرفوع نقل کیا ہے (یعنی بیہقیؒ کی روایت کے مطابق یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ﷺ ہے نہ کہ حضرت علیؓ کا قول ہے) اور ابوداؤد نے اس روایت کو (بطریق موقوف) نقل کیا ہے نیز انہوں نے (اپنی سند بیان کرنے کے بعد) کہا ہے کہ اس روایت کو حسن ابن علیؓ نے مرفوع بیان کیا ہے اور یہ حسن ابن علی (امام حسن ابن علی ابن ابی طالب نہیں ہیں بلکہ) وہ حسن ہیں جو ابوداؤد کے استاد و شیخ ہیں (حاصل یہ کہ اس روایت کو بیہقیؒ نے تو مرفوع نقل کیا ہے اور ابوداؤدؒ نے بھی حسن ابن علی کی سند سے مرفوع ہی نقل کیا ہے، لیکن دوسری سند سے موقوف نقل کیا ہے)۔"

تشریح: "گزر رہے ہوں" اس حکم میں وہ صورت بھی داخل ہے جب کہ وہ (کچھ لوگ) کسی ایسی جگہ جائیں یا کسی ایسی جگہ رکیں جہاں پہلے سے کچھ لوگ بیٹھے ہوں، یا ایک ہی شخص ہو۔ حدیث کا حاصل یہ ہے کہ سلام کرنے میں پہل کرنا سُنت کفایہ ہے اور سلام کا جواب دینا فرض کفایہ ہے جن لوگوں کو سلام میں پہل کرنی چاہئے، یا جن لوگوں کو سلام کا جواب دینا ہے اگر ان میں سے کوئی ایک شخص سلام کرے یا کوئی ایک شخص سلام کا جواب دیدے تو وہ سلام یا جواب میں ان سب لوگوں کی طرف سے کافی ہوگا اور سب بری الذمہ ہو جائیں گے اگرچہ ان میں سے ہر ایک کا سلام کرنا یا ہر ایک کا جواب دینا افضل ہوگا۔

اشاروں کے ذریعہ سلام کرنا

(۲۲) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا لَا تَشَبَّهُوْا بِالْيَهُوْدِ وَلَا بِالنَّصَارٰى فَاِنَّ تَسْلِيْمَ الْيَهُوْدِ الْاِشَارَةُ بِالْاَصَابِعِ وَتَسْلِيْمَ النَّصَارٰى الْاِشَارَةُ بِالْاَكُفِّ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ اِسْنَادُهٗ ضَعِيْفٌ۔

"اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد حضرت شعیب سے اور وہ اپنے دادا (حضرت عبداللہ ابن عمروؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص ہمارے غیروں کے ساتھ مشابہت کرے گا یعنی ہماری امت کے لوگوں کے برعکس دوسرے مذاہب کے لوگوں کے طریقہ پر عمل کرے گا اور وہ ہم میں سے نہیں ہے، تم نہ یہودیوں کے ساتھ مشابہت کرو اور نہ عیسائیوں کے ساتھ، یہودیوں کا سلام کرنا انگلیوں کے ذریعہ اشارہ کرنے اور عیسائیوں کا سلام کرنا ہتھیلیوں کے ذریعہ اشارہ کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی اسناد ضعیف ہے۔"

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے کسی بھی فعل و طریقہ اور خاص طور پر سلام کرنے کے ان دونوں طریقوں کی مشابہت اختیار نہ کرنی چاہئے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہودی اور عیسائی سلام کرنے یا سلام کرنے کا جواب دینے کے لئے اور یا دونوں کے لئے محض مذکورہ اشاروں ہی پر اکتفا کر لیتے تھے، سلام کا لفظ نہیں کہتے تھے۔ جو حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت میں سے انبیاء و اولیاء کی سُنت و طریقہ ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ کو گویا مکاشفہ ہوا کہ میری اُمت کے کچھ لوگ بے راہ روی کا شکار ہو کر سلام کرنے کا وہ طریقہ اختیار کریں گے جو یہودیوں، عیسائیوں، اور دوسری غیر اقوام کا ہے جیسے انگلیوں یا ہتھیلیوں کے ذریعہ اشارہ کرنا ہاتھ جوڑ لینا، کمر یا سر کو جھکانا، اور صرف سلام کرنے پر اکتفا کر لینا وغیرہ وغیرہ لہٰذا آپ ﷺ نے پوری اُمت کو مخاطب کرتے ہوئے اس بارے میں تنبیہ بیان فرمائی اور یہ وعید بیان کی کہ جو شخص سلام کے ان رسوم و رواج کو اپنائے گا، جو اسلامی شریعت اور ہماری سُنت کے خلاف ہیں تو اس کو سمجھ لینا چاہئے، کہ اس کا شمار ہماری اُمت کے لوگوں میں نہیں ہوگا۔

واضح رہے کہ اس حدیث کی اسناد کو ترمذیؒ نے ضعیف کہا ہے لیکن یہ حدیث ایک دوسری سند سے بھی منقول ہے اور وہ ضعیف نہیں

ہے جس کو جامع صغیر میں نقل کیا گیا ہے۔

ہر ملاقات پر سلام کرو

(۲۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا لَقِيَ اَحَدُكُمْ اَخَاهُ فَلْيُسَلِّمْ عَلَيْهِ فَاِنْ حَالَتْ بَيْنَهُمَا شَجَرَةٌ اَوْ جِدَارٌ اَوْ حَجَرٌ ثُمَّ لَقِيَهُ فَلْيُسَلِّمْ عَلَيْهِ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص جب اپنے مسلمان بھائی سے ملاقات کرے تو چاہئے کہ پہلے اس کو سلام کرے اور اس کے بعد اگر دونوں کے درمیان کوئی درخت یا دیوار یا بڑا پتھر حائل ہوا اور پھر اس سے ملاقات ہو تو اس کو دوبارہ سلام کرے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اتنے معمولی وقفہ کی جدائی و مفارقت کے بعد بھی سلام کرنا مستحب ہے چہ جائیکہ زیادہ عرصہ کے بعد ملاقات ہو۔ گویا یہ حدیث سلام کے استحباب اور ہر موقع پر اس ادب کے ملحوظ رکھنے کو مبالغہ کے طور پر بیان کرتی ہے، واضح رہے کہ سلام کی اہمیت کے باوجود بعض صورتیں ایسی ہیں جو سلام کرنے سے مستثنیٰ ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص پیشاب کر رہا ہے یا پاخانہ میں ہو، یا جماع میں مصروف ہو یا اسی طرح کی کوئی حالت اور ہو تو اس وقت اس شخص کو سلام کرنا مکروہ ہے اور جواب دینا اس پر واجب نہیں ہوگا اسی طرح اگر کوئی شخص سو رہا ہو یا اونگھ رہا ہو، یا نماز پڑھ رہا ہو، یا اذان دے رہا ہو یا حمام میں ہو یا کھانا کھا رہا ہو اور نوالہ اس کے منہ میں ہو اور ان صورتوں میں اس کو کوئی سلام کرے تو وہ جواب کا مستحق نہیں ہوگا نیز خطبہ کے وقت نہ تو سلام کرنا چاہئے اور نہ سلام کا جواب دینا چاہئے، جو شخص قرآن کی تلاوت کر رہا ہو اس کو بھی سلام نہ کیا جائے اگر کوئی سلام کرے تو تلاوت کرنے والے کو چاہئے کہ تلاوت روک کر سلام کا جواب دے اور پھر اعوذ پڑھ کر تلاوت شروع کر دے۔

اپنے گھر والوں کو بھی سلام کرو

(۲۴) وَعَنْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلْتُمْ بَيْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰى اَهْلِهٖ وَاِذَا خَرَجْتُمْ فَاَوْدِعُوْا اَهْلَهٗ بِسَلَامٍ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت قتادہؒ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب تم گھر میں گھسو تو اپنے گھر والوں کو سلام کرو، اور جب گھر سے باہر نکلو تو اپنے گھر والوں کو سلام کے ذریعہ رخصت کرو۔ اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

تشریح: اگر گھر میں کوئی فرد نہ ہو تو مستحب یہ ہے کہ اس طرح کہے السلام علینا و عباد اللہ الصالحین تاکہ وہاں جو فرشتے ہوں ان کو سلام پہنچے۔

حدیث کے الفاظ فاودعوا اهله بسلام میں ایداع اصل میں تودیع کے معنی میں ہے جو وداع سے ہے جس کا مطلب یہ ہے گھر سے باہر جاتے وقت اپنے اہل و عیال کو سلام کے ذریعہ وداع کہو۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس رخصتی سلام کا جواب واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے کیوں کہ یہ سلام اصل میں دعا اور وداع ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ یہ فرماتے ہیں کہ لفظ اودعوا ایداع سے ہے بایں معنی کہ اپنے اہل و عیال کے پاس سلام کو ودیعت امانت رکھو۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب تم نے رخصت ہوتے وقت اپنے اہل و عیال کو سلام کیا تو گویا تم نے سلام کی خیر و برکت کو اپنے اہل و عیال کے پاس امانت رکھا جس کو تم...... آخرت میں واپس لوگے، جیسا کہ کوئی شخص اپنی کوئی چیز کسی کے پاس امانت رکھتا ہے اور پھر اس کو واپس لے لیتا ہے۔ یحییٰ کے مطابق مطلب یہ ہے کہ تم سلام کو اپنے گھر والوں کی ودیعت امانت و سپردگی میں دے دو تاکہ لوٹ کر

ان کے پاس آؤ تو اپنی ودیعت امانت کو واپس لو جیسا کہ امانتیں واپس لی جاتی ہیں! یہ بات گویا اس امر کی نیک فال لینے کے مرادف ہے کہ گھر سے رخصت ہونے والا سلامتی کے ساتھ لوٹ کر آئیگا اور اسے دوبارہ سلام کرنے کا موقع نصیب ہوگا۔

(۲۵) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَابُنَیَّ اِذَا دَخَلْتَ عَلٰی اَھْلِكَ فَسَلِّمْ یَکُوْنُ بَرَکَةً عَلَیْكَ وَعَلٰی اَھْلِ بَیْتِكَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ میرے بیٹے! جب تم اپنے گھر والوں سے ملو تو سلام کرو، وہ سلام تم پر اور تمہارے گھر والوں پر خیر و برکت کے نزول کا باعث ہوگا۔" (ترمذیؒ)

پہلے سلام پھر کلام

(۲۶) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلسَّلَامُ قَبْلَ الْکَلَامِ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ مُّنْکَرٌ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا سلام کلام سے پہلے ہے یعنی ملاقات کے وقت پہلے سلام کرنا چاہئے، اور اس کے بعد بات چیت کرنی چاہئے، سلام کرنے سے پہلے بات چیت شروع کر دینا اچھا نہیں۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔"

زمانۂ جاہلیت کا سلام

(۲۷) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ قَالَ کُنَّا فِی الْجَاھِلِیَّةِ نَقُوْلُ اَنْعَمَ اللّٰہُ بِكَ عَیْنًا وَاَنْعِمْ صَبَاحًا فَلَمَّا کَانَ الْاِسْلَامُ نُھِیْنَا عَنْ ذٰلِكَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں ملاقات کے وقت یہ کہا کرتے تھے انعم اللّٰہ بک علینا وانعم صباحا یعنی خدا تمہاری وجہ سے آنکھوں کو ٹھنڈا رکھے اور تم ہر صبح نعمتوں میں داخل ہو۔ پھر جب اسلام کا زمانہ آیا تو ہمیں یہ کہنے سے منع کر دیا گیا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: پہلا لفظ "انعم" نعومة سے ماضی کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں نرمی، تازگی، اور شادمانی اس عبارت انعم اللّٰہ بک علینا کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ "بک" میں حرف با سبب کے معنی میں ہے اور یہ جملہ اس مفہوم کا حامل ہے کہ خدا تمہاری وجہ سے تمہارے دوستوں اور عزیزوں کی آنکھوں کو تروتازہ اور روشن رکھے یہ گویا مخاطب کی خوش حالی سے کنایہ ہے کہ وہ خوش حال و شادمان رہے تاکہ اس کے دوست اس کی خوش حالی و شادمانی دیکھ کر خوش ہوں۔ دوسرے یہ کہ حرف با زائد ہے اور اس سے تاکید تعدیہ مراد ہے اس صورت میں یہ جملہ اس مفہوم کا حامل ہوگا۔ کہ خدا تمہیں اس چیز کو دیکھنے کا موقع دے کر خوش و خرم رکھے جس کو تم پسند کرتے ہو اور اس کی طلب رکھتے ہو۔

دوسرا لفظ "انعم" امر کا صیغہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری صبحیں تمہارے لئے تروتازگی و خوشحالی و مسرت کا باعث بنیں، یا یہ کہ صبح کے وقت تم تروتازہ اور خوش و خرم رہو۔ یہ بھی خوشی و فراغت کے ساتھ وقت گزارنے سے کنایہ ہے۔ اور صبح کے وقت کی تخصیص اس سبب سے ہے کہ دن کی ابتداء صبح سے ہوتی ہے اگر صبح کا وقت کسی حادثہ (مصیبت) کو اپنے ساتھ لاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب پورا دن بے چینی و بے اطمینانی اور سخت روی کے ساتھ گزرے گا خاص طور پر اس زمانہ میں غارت گری اور لوٹ مار کا جو معمول بنا ہوا تھا اس کی ابتداء عام طور سے صبح ہی کے وقت ہوتی تھی۔ لہٰذا اس دور میں جس شخص کی صبح خیر و عافیت اور امن کے ساتھ گزر جاتی تھی

اس کا پورا وقت اطمینان و چین کے ساتھ گزرتا تھا۔

غائبانہ سلام اور اس کا جواب

(۲۸) وَعَنْ غَالِبٍ قَالَ اِنَّا لَجُلُوْسٌ بِبَابِ الْحَسَنِ الْبَصْرِيِّ اِذْجَآءَ رَجُلٌ فَقَالَ حَدَّثَنِيْ اَبِيْ عَنْ جَدِّيْ قَالَ بَعَثَنِيْ اَبِيْ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِئْتِهٖ فَاَقْرِئْهُ السَّلَامَ قَالَ فَاَتَيْتُهٗ فَقُلْتُ اَبِيْ يُقْرِئُكَ السَّلَامَ فَقَالَ عَلَيْكَ وَعَلٰى اَبِيْكَ السَّلَامُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت غالبؒ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم حضرت حسن بصریؒ کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص آیا اور بیان کیا کہ مجھ سے میرے باپ نے اور ان سے ان کے باپ (یعنی میرے دادا) نے بیان کیا کہ مجھ کو میرے باپ نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجتے ہوئے کہا کہ تم آنحضرت ﷺ کے پاس جاؤ اور آپ ﷺ کو سلام عرض کرو میرے دادا نے بیان کیا کہ (اپنے باپ کے حکم پر) میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میرے باپ نے آپ ﷺ کو سلام عرض کیا ہے آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ تم پر اور تمہارے باپ پر سلامتی ہو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی کی طرف سے سلام پہنچائے تو مسنون یہ ہے کہ سلام پہنچانے والے پر بھی سلام بھیجا جائے اور جس کی طرف سے جس نے سلام پہنچایا ہے اس پر بھی یعنی جب کوئی شخص کسی کی طرف سے سلام پہنچائے تو جواب میں یوں کہا جائے علیک و علی فلان السلام یا و علیک و علیہ السلام چنانچہ نسائی کی روایت میں یہ الفاظ بعینہٖ منقول ہیں۔

خطوط میں سلام لکھنے کا طریقہ

(۲۹) وَعَنْ اَبِي الْعَلَاءِ الْحَضْرَمِيِّ اَنَّ الْعَلَاءَ الْحَضْرَمِيَّ كَانَ عَامِلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ اِذَا كَتَبَ اِلَيْهِ بَدَاَ بِنَفْسِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوالعلاء حضرمیؒ کہتے ہیں کہ علاء حضرمیؓ رسول کریم ﷺ کی طرف سے عامل مقرر تھے، جب وہ آنحضرت ﷺ کو خط لکھتے تو اپنی طرف سے شروع کرتے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: ابوالعلاءؓ کا اصل نام یزید ابن عبد ہے۔ مشکوۃ کے بعض نسخوں میں اس روایت کے راوی کا نام ابوالعلاء ہی لکھا ہے یعنی یوں ہے عن ابی العلاء الحضرمی ان العلاء الحضرمی اور بعض نسخوں میں مصابیح کے بعض نسخوں کے مطابق ابن علاء لکھا ہے یعنی یوں ہے۔ عن ابن العلاء الحضرمی ان العلاء الحضرمی حضرمی اصل میں مشہور شہر حضرموت کی طرف نسبت ہے کیونکہ حضرت علاءؓ حضرموت کے رہنے والے تھے اور مشکوۃ کے اکثر نسخوں میں آگے کی عبارت اَنَّ الْعَلَاءَ الْحَضْرَمِيَّ ہے لیکن ایک نسخہ میں ان العلاء ابن الحضرمی لکھا ہوا ہے۔

"تقریب میں" لکھا ہے کہ حضرت علاءؓ بنو امیہ کے حلیف تھے یہ ایک جلیل القدر اور بزرگ صحابیؓ ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے ان کو بحرین کا عامل مقرر کیا تھا آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے بھی اپنے دور خلافت میں ان کو وہاں کا عامل باقی رکھا اور اسی عہدے پر ان کا انتقال ہوا۔

"اپنی طرف سے شروع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خط کی ابتداء ان الفاظ سے کرتے من العلاء الحضرمی الی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السلام علیکم و رحمۃ اللہ (یعنی علاء حضرمی کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں السلام علیکم ورحمۃ اللہ) اس عبارت کے بعد خط کا مضمون ہوتا اور حضرت علاء حضرمیؓ خط لکھنے کا یہ طریقہ آنحضرت ﷺ کی اتباع میں اختیار کرتے تھے۔ کیوں کہ

آنحضرت ﷺ کے مکتوبات گرامی کی ابتداء اسی طرح ہوتی تھی۔ من محمد رسول اللہ الی فلاں اس عبارت کے بعد سلام کے الفاظ ہوتے تھے اگر مکتوب الیہ مسلمان ہوتا تو اس کا مخاطب خاص طور پر اسی کو بنایا جاتا یعنی سلام علیک جیسے الفاظ ہوتے اور اگر مکتوب الیہ مسلمان نہ ہوتا تو پھر علی العموم سلام کے الفاظ ہوتے یعنی یوں لکھتے سلام علی من اتبع الھدی (جو شخص راہ راست کی پیروی کرے اس پر سلامتی ہو) سلام کے بعد اصل مضمون ہوتا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ہرقل کو جو مکتوب ارسال کیا تھا وہ اسی ترتیب کے ساتھ لکھا گیا، نیز آنحضرت ﷺ نے معاذؓ کو ان کے بیٹے کی تعزیت میں جو خط بھیجا تھا اس کے ابتدائی الفاظ یوں تھے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، من محمد رسول اللہ الی معاذ بن جبل سلام علیک فانی احمد الیک اللہ الذی لا الٰہ الا ھو، اما بعد......الخ

یہ حدیث جو یہاں نقل کی گئی ہے بظاہر باب کے موضوع سے تعلق نہیں رکھتی، لیکن یہ حدیث چونکہ سلام کے مقدم کی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ بیان کیا گیا اس لئے یہ اس باب میں نقل کی گئی ہے اسی طرح آگے جو تین حدیثیں آرہی ہیں اور جن میں خط سے متعلق کچھ باتیں بیان کی گئی ہیں چونکہ ان کا تعلق بھی باایں، اعتبار سلام سے ہے کہ سلام جس طرح زبانی پیش کیا جاتا ہے اسی طرح وہ خط میں بھی لکھا جاتا ہے لہٰذا ان حدیثوں کو بھی اس باب میں نقل کیا گیا اور مشکوٰۃ کے مؤلف کا یہ محمول بھی ہے کہ وہ فصل کے آخر میں ان احادیث کو بھی نقل کرتے ہیں جو اگرچہ براہ راست باب سے تعلق نہیں رکھتیں، لیکن باب اور اس کے موضوع کے مناسب اور بالواسطہ طور پر تعلق رکھنے والی ضرور ہوتی ہے۔

خط لکھ کر اس پر مٹی چھڑکنے کی خاصیت

(۳۰) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا کَتَبَ اَحَدُکُمْ کِتَابًا فَلْیُتَرِّبْہُ فَاِنَّہٗ اَنْجَحُ لِلْحَاجَةِ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ حَدِیْثٌ مُنْکَرٌ۔

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی شخص کسی کو خط لکھے تو چاہئے کہ وہ خط لکھنے کے بعد اس پر مٹی ڈال دے یا مٹی چھڑک کر جھاڑ دے کیونکہ یہ چیز حاجت براری کے لئے بہت کار آمد ہے۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔"

تشریح: کاغذ وغیرہ پر لکھنے کے بعد مٹی چھڑکنا بڑا قدیم طریقہ ہے اور عام طور پر اس کا مقصد روشنائی کو خشک کرنا سمجھا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ طریقہ حاجت براری کے لئے ایک مخصوص تاثیر رکھتا ہے اور یہ تاثیر بالخاصیت ہے کہ اس کا سبب شارع کے علاوہ اور کسی کو معلوم نہیں ہے تاہم بعض عارفین نے پہلے معنی یعنی (مٹی ڈال دے) کی وضاحت میں لکھا ہے کہ ایسا کرنا دراصل اپنے لکھے ہوئے پر خاک ڈالنے کے مفہوم کے مترادف ہے بایں طور کہ اس فعل سے ظاہر کیا جاتا ہے کہ اپنے مقصد و حاجت کے لئے نہ تو اپنے اس مکتوب پر اعتبار ہے اور نہ مکتوب الیہ کو حقیقی حاجت روا کا درجہ دینا مقصود ہے، بلکہ حقیقی اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہے کہ وہی مقصد کو پورا کرنے اور حاجت برلانے والا ہے لہٰذا یہ مکتوب محض اظہار حال کا ایک ظاہری ذریعہ ہے، حقیقی درخواست تو صرف اللہ تعالیٰ سے ہے۔

"یا مٹی چھڑک کر جھاڑ دے" یہ "فلیتربہ" کا دوسرا ترجمہ ہے اور یہ ترجمہ اس اعتبار سے ہے کہ "مٹی ڈالنے" کی صورت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مٹی کسی دوسرے کی ملکیت سے متعلق ہو اور اس طرح مالک کی اجازت کے بغیر اس کی چیز کو صرف کرنا لازم آئے جب کہ مٹی چھڑک کر جھاڑ دینے میں اس طرح کی کوئی بات لازم نہیں آتی، چنانچہ اس دوسرے ترجمہ کی تائید اور اس قصے سے بھی ہوتی ہے جس کو امام غزالیؒ نے منہاج العابدین میں نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے جو کسی کرایہ کے مکان میں رہائش پذیر تھا ایک پرچہ لکھا، پھر جب اس نے یہ چاہا کہ مکان کی دیوار سے تھوڑی سی مٹی لے کر پرچہ پر ڈالے تو اس کو خیال ہوا کہ یہ مکان کرایہ کا ہے اور اس کی دیوار سے مٹی لے کر صرف کرنا غیر مناسب ہے، لیکن معاً دل میں دوسرا خیال یہ بھی آیا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے چنانچہ اس نے مٹی لے کر پرچہ پر

ڈال دی اس کے بعد اس نے یہ غیبی ندا سنی کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ اس مٹی کو حلال جاننے والا جلد ہی اس چیز کو جان لے گا جو کل کے دن یعنی روز حشر طویل حساب کے سبب اس کو پیش آنے والی ہے۔

یہ حدیث راویوں کے اعتبار سے منکر ہے اس کے مضمون میں کوئی کلام نہیں ہے، چنانچہ طبرانیؒ نے اوسط میں بطریق مرفوع حضرت ابوداؤدؒ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اذا کتب احدکم الی انسان فلیبد ابنفسہ واذا کتب فلیترب کتابہ فھو انجح یعنی جب تم میں سے کوئی شخص کسی آدمی کو خط لکھے تو چاہئے کہ اس کو اپنی طرف سے شروع کرے اور جب اس خط کو لکھ لے تو اس پر مٹی چھڑک دے کیوں کہ یہ چیز حاجت براری کے لئے بہت کار آمد ہے۔

لکھتے وقت قلم کو کان پر رکھنے کی خاصیت

(۳۱) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبَيْنَ يَدَيْهِ كَاتِبٌ فَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ ضَعِ الْقَلَمَ عَلٰى اُذُنِكَ فَاِنَّهُ اَذْكَرُ لِلْمَالِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَفِيْ اِسْنَادِهٖ ضُعْفٌ۔

"اور حضرت زید ابن ثابتؓ کہتے ہیں کہ میں (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ ﷺ کے سامنے ایک خط لکھنے والا بیٹھا ہوا تھا میں نے آپ ﷺ کو (لکھنے والے سے) یہ فرماتے ہوئے سنا کہ قلم کو اپنے کان پر رکھ لو کیوں کہ یہ چیز مطلب کو بہت یاد دلاتی ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند میں ضعف ہے۔"

تشریح: "یہ چیز مطلب کو بہت یاد دلاتی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کرنے سے ذہن کے دریچے کھل جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے مقصد اور مفہوم کو بیان کرنے کے لئے عبارت و الفاظ کی آمد ہونے لگتی ہے اور لکھنے والا جو کچھ لکھنا چاہتا ہے اس میں پوری طرح کامیاب رہتا ہے یہ چیز بھی بالخاصیت ہے یعنی ایسا کس طرح ہوتا ہے؟ اس کا علم شارع ہی کو ہے تاہم بعض علماء نے اس کی تاویل و توجیہ بیان کی ہے! یحییٰؒ نے لکھا ہے، کہ قلم ایک طرح سے زبان کا حکم رکھتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے القلم احد اللسانین اور زبان، قلب و ذہن کی ترجمان ہوتی ہے لہٰذا قلم کو کان پر رکھنا گویا زبان کو کان پر جو کہ سننے کی جگہ ہے رکھنے کے مرادف ہے، تاکہ زبان، قلم قلب و ذہن کے قریب ہو جائے اور قلب و ذہن جو کچھ کہنے کا ارادہ کریں اور وہ مفہوم کو جس اعلیٰ عبارت و پیرایہ بیان اور جس عمدہ الفاظ و اسلوب میں ادا کرنے کا تقاضہ کریں ان کو کلام و بیان کی اسی مناسبت و موزونیت کے ساتھ بصورت تحریر بیان کرے۔

یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند ضعیف ہے کا مطلب یہ ہے کہ روایت متن یا سند کے اعتبار سے غریب ہے اور اپنے بعض راویوں کے ضعف کے سبب "ضعیف" ہے تاہم یہ بات اس روایت کے صحیح ہونے کے منافی نہیں ہے نیز اس کی تائید ابن عساکرؒ کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو انہوں نے حضرت انسؓ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے کہ اذا کتبت فضع قلمک علی اذنک فانہ اذکر لک اسی طرح جامع صغیر میں حضرت زید ابن ثابتؓ سے بطریق مرفوع ترمذیؒ کی یہ روایت منقول ہے کہ ضع القلم علی اذنک فانہ اذکر للملی۔

ضرورت کے تحت غیر مسلم قوموں کی زبان سیکھنا جائز ہے

(۳۲) وَعَنْهُ قَالَ اَمَرَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اَتَعَلَّمَ السُّرْيَانِيَّةَ وَفِيْ رِوَايَةٍ اَنَّهُ اَمَرَنِيْ اَنْ اَتَعَلَّمَ كِتَابَ يَهُوْدَ وَقَالَ اِنِّيْ مَا اٰمَنُ يَهُوْدَ عَلٰى كِتَابٍ قَالَ فَمَا مَرَّبِيْ نِصْفُ شَهْرٍ حَتّٰى تَعَلَّمْتُ فَكَانَ اِذَا كَتَبَ اِلٰى يَهُوْدَ كَتَبْتُ وَاِذَا كَتَبُوْا اِلَيْهِ قَرَاْتُ لَهٗ كِتَابَهُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت زید ابن ثابتؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ کو یہ حکم دیا کہ میں سریانی زبان کو سیکھوں اور ایک روایت میں یوں ہے

کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو حکم دیا کہ میں یہودیوں سے خط و کتابت کرنا سیکھ لوں، نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ خط و کتابت کے معاملہ میں مجھے یہودیوں پر اطمینان نہیں ہوتا۔ زید ابن ثابتؓ کہتے ہیں (کہ آنحضرت ﷺ کے اس حکم کے بعد) آدھا مہینہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ میں نے یہودیوں کی زبان اور ان سے خط و کتابت کرنا سیکھ لیا، چنانچہ جب آنحضرت ﷺ یہودیوں کو کوئی مکتوب بھیجنا چاہتے تو اس کو میں ہی لکھتا، اور جب یہودی آپ ﷺ کے پاس کوئی مکتوب بھیجتے تو اس کو آپ ﷺ کی خدمت میں میں ہی پڑھتا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "سریانی" دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک زبان ہے جس میں توریت نازل ہوئی تھی لیکن اکثر محققین کا قول یہ ہے کہ تورایت عبرانی زبان میں نازل ہوئی تھی اور سریانی و عبرانی دونوں ملتی جلتی زبانیں ہیں۔

مجھے یہودیوں پر اطمینان نہیں ہوتا" کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کوئی مسلمان نہیں ہے جو یہودیوں کی زبان جانتا ہو اس لئے یہودیوں کے ساتھ خط و کتابت کے لئے مجھے کسی یہودی ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے اور اس صورت میں مجھے اس بات کا خطرہ ہے کہ اگر یہودیوں کے نام اپنا کوئی خط کسی یہودی سے لکھواؤں تو وہ اس میں اپنی طرف سے کچھ کمی بیشی نہ کر دے، اسی طرح اگر یہودیوں کی طرف سے میرے پاس کوئی خط آئے اور میں اس کو کسی یہودی سے پڑھواؤں تو وہ اس میں اپنی طرف سے کم یا زیادہ کر کے نہ پڑھ دے اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے تحت غیر مسلم اقوام کی زبان سیکھنا جائز ہے بلا ضرورت سیکھنا جائز نہیں ہے کیوں کہ اس صورت میں غیر مسلم کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا لازم آتا ہے اور یہ چیز ممنوع ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا من تشبہ بقوم فھو منھم جو شخص جس قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ اسی قوم میں شمار ہو گا بلکہ یحیٰی نے بلا ضرورت سیکھنے کو حرام لکھا ہے۔

ملاقات کے وقت بھی سلام کرو اور رخصت ہوتے وقت بھی

(۳۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا انْتَهٰی اَحَدُکُمْ اِلٰی مَجْلِسٍ فَلْیُسَلِّمْ فَاِنْ بَدَا لَهٗ اَنْ یَّجْلِسَ فَلْیَجْلِسْ ثُمَّ فَاِذَا قَامَ فَلْیُسَلِّمْ فَلَیْسَتِ الْاُوْلٰی بِاَحَقَّ مِنَ الْاٰخِرَةِ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص کسی مجلس میں پہنچے تو پہلے سلام کرے اور پھر اگر بیٹھنا چاہے تو بیٹھ جائے، نیز جب (مجلس سے چلنے کے لئے) کھڑا ہو تو اس وقت بھی سلام کرے کیونکہ پہلا سلام کرنا دوسرا سلام کرنے سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔" (ترمذیؒ وابوداؤدؒ)

تشریح: جب کھڑا ہو کا مطلب یہ ہے کہ مجلس میں بیٹھنے کے بعد جب وہاں سے واپس ہونے کے لئے کھڑا ہو اور زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہاں سے چلنے کا ارادہ کرے خواہ مجلس میں بیٹھا ہو یا نہ بیٹھا ہو! بہر حال حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رخصت ہوتے وقت بھی سلام کرنا سنّت ہے جیسا کہ ملاقات کے وقت کا سلام سنّت ہے اسی طرح ان دونوں ہی سلام کا جواب دینا واجب ہے لیکن بعض محققین نے لکھا ہے کہ رخصت ہوتے وقت کا سلام اور اس کا جواب مستحب ہے۔

راستہ پر بیٹھنے کا حق

(۳۴) وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا خَیْرَ فِیْ جُلُوْسٍ فِی الطُّرُقَاتِ اِلَّا لِمَنْ هَدَی السَّبِیْلَ وَرَدَّ التَّحِیَّةَ وَغَضَّ الْبَصَرَ وَاَعَانَ عَلَی الْحَمُوْلَةِ رَوَاهُ فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَذُکِرَ حَدِیْثُ اَبِیْ جُرَیٍّ فِیْ بَابِ فَضْلِ الصَّدَقَةِ۔ (شرح السنۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ سے فرمایا۔ راستوں پر بیٹھنا کوئی اچھا کام نہیں ہے، ہاں جو (شخص راستہ بھولے ہوئے یا اندھے کو) راستہ بتلائے، سلام کا جواب دے، حرام چیزوں کو دیکھنے سے آنکھوں کو بند رکھے اور اس شخص کی مدد کرے جو بوجھ

لادے ہوئے ہو تو ایسے شخص کا راستہ پر بیٹھنا گوارا ہے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "حمولہ" حاء کے پیش کے ساتھ ہے لیکن مشکوٰۃ کے ایک نسخہ میں یہ لفظ حاء کے زبر کے ساتھ منقول ہے شارحین نے لکھا ہے کہ حَمُوْلَۃٌ حاء کے زبر کے ساتھ اس جانور کو کہتے ہیں جس پر بوجھ لادا جاتا ہے اس شخص کی مدد کرے جو بوجھ لادے ہوئے ہو کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے باربرداری کے جانور کی پیٹھ پر لادنے کے لئے یا خود اپنے سر پر یا اپنی پیٹھ پر رکھنے کے لئے کوئی بوجھ اٹھانا چاہتا ہو۔ تو اس بوجھ کے اٹھانے سے اس کی مدد کرے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

سلام کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے

(۳۵) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰہُ اٰدَمَ وَنَفَخَ فِیْہِ الرُّوْحَ عَطَسَ فَقَالَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ فَحَمِدَ اللّٰہَ بِاِذْنِہٖ فَقَالَ لَہٗ رَبُّہٗ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ یَا اٰدَمُ اِذْھَبْ اِلٰی اُولٰئِکَ الْمَلَائِکَۃِ اِلٰی مَلَاءٍ مِنْھُمْ جُلُوْسٍ فَقُلْ السَّلَامُ عَلَیْکُمْ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَیْکُمْ قَالُوْا عَلَیْکَ السَّلَامُ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ ثُمَّ رَجَعَ اِلٰی رَبِّہٖ فَقَالَ اِنَّ ھٰذِہٖ تَحِیَّتُکَ وَتَحِیَّۃُ بَنِیْکَ بَیْنَھُمْ فَقَالَ لَہُ اللّٰہُ وَیَدَاہُ مَقْبُوْضَتَانِ اخْتَرْ اَیَّتَھُمَا شِئْتَ فَقَالَ اخْتَرْتُ یَمِیْنَ رَبِّیْ وَکِلْتَا یَدَیْ رَبِّیْ یَمِیْنٌ مُبَارَکَۃٌ ثُمَّ بَسَطَھَا فَاِذَا فِیْھَا اٰدَمُ وَذُرِّیَّتُہٗ فَقَالَ اَیْ رَبِّ مَا ھٰؤُلَاءِ قَالَ ذُرِّیَّتُکَ فَاِذَا کُلُّ اِنْسَانٍ مَکْتُوْبٌ عُمْرُہٗ بَیْنَ عَیْنَیْہِ فَاِذَا فِیْھِمْ رَجُلٌ اَضْوَءُھُمْ اَوْمِنْ اَضْوَئِھِمْ قَالَ یَا رَبِّ مَنْ ھٰذَا قَالَ ھٰذَا ابْنُکَ دَاوٗدُ وَقَدْ کَتَبْتُ لَہٗ عُمْرَہٗ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً قَالَ یَا رَبِّ زِدْہُ فِیْ عُمْرِہٖ قَالَ ذٰلِکَ الَّذِیْ کَتَبْتُ لَہٗ قَالَ اَیْ رَبِّ فَاِنِّیْ قَدْ جَعَلْتُ لَہٗ مِنْ عُمْرِیْ سِتِّیْنَ سَنَۃً قَالَ اَنْتَ وَذَاکَ قَالَ ثُمَّ سَکَنَ الْجَنَّۃَ مَاشَاءَ اللّٰہُ ثُمَّ اُھْبِطَ مِنْھَا وَکَانَ اٰدَمُ یَعُدُّ لِنَفْسِہٖ فَاَتَاہُ مَلَکُ الْمَوْتِ قَالَ لَہٗ اٰدَمُ قَدْ عَجِلْتَ قَدْ کُتِبَ لِیْ اَلْفُ سَنَۃٍ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنَّکَ جَعَلْتَ لِابْنِکَ دَاوٗدَ سِتِّیْنَ سَنَۃً فَجَحَدَ فَجَحَدَتْ ذُرِّیَّتُہٗ وَنَسِیَ فَنَسِیَتْ ذُرِّیَّتُہٗ قَالَ فَمِنْ یَوْمَئِذٍ اُمِرَ بِالْکِتَابِ وَالشُّھُوْدِ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا اور ان کے جسم میں روح پھونکی تو ان کو چھینک آئی انہوں نے الحمد للہ کہا اس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق و اجازت سے خدا کی حمد کی، اللہ تعالیٰ نے ان کی حمد کے جواب میں فرمایا یرحمک اللہ، یعنی تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہو۔ اور پھر فرمایا، آدم (علیہ السلام) فرشتوں کی اس جماعت کے پاس جاؤ جو وہاں بیٹھی ہوئی ہے اور کہو کہ السلام علیکم۔ (چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام ان فرشتوں کے پاس گئے اور ان کو سلام کیا) فرشتوں نے (جواب میں) کہا کہ علیک السلام ورحمۃ اللہ۔ اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام اپنے پروردگار کے پاس آئے (یعنی اس جگہ لوٹ کر آئے جہاں پروردگار نے ان سے کلام کیا تھا) اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا یہ (یعنی السلام علیکم ورحمۃ اللہ) تمہاری اور تمہاری اولاد کی دعا ہے جو آپس میں ایک دوسرے کو دیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا، درآنحالیکہ اس کے دونوں ہاتھ بند تھے کہ ان دونوں ہاتھوں میں سے جس کو چاہو پسند کر لو۔ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ میں نے اپنے پروردگار کے داہنے ہاتھ کو پسند کر لیا۔ اور میرے پروردگار کے دونوں ہاتھ داہنے بابرکت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس ہاتھ کو کھولا تو حضرت آدم علیہ السلام نے کیا دیکھا کہ اس میں آدم علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کی اولاد کی صورتیں دیکھیں انہوں نے پوچھا کہ پروردگار! یہ کون ہیں؟ پروردگار نے فرمایا۔ یہ تمہاری اولاد ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے یہ بھی دیکھا کہ ہر مسلمان کی عمر اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لکھی ہوئی ہے، پھر ان کی نظر ایک ایسے انسان پر پڑی جو سب سے زیادہ روشن تھا یا ان میں کے روشن ترین لوگوں میں سے ایک تھا حضرت آدم علیہ السلام نے اس انسان کو دیکھ کر پوچھا کہ میرے پروردگار! یہ کون ہے؟ پروردگار نے فرمایا یہ تمہارا بیٹا داؤد (علیہ السلام) ہے اور میں نے اس کی عمر چالیس سال لکھی ہے حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ پروردگار! اس

کی عمر کچھ اور بڑھادے پروردگار نے فرمایا یہ وہ چیز ہے جس کو میں اس کے حق میں لکھ چکا ہوں حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ پروردگار (اگر اس کی عمر لکھی جا چکی ہے) تو میں اپنی عمر سے ساٹھ سال اس کو دیتا ہوں، پروردگار نے فرمایا تم جانو۔ اور تمہارا کام جانے یعنی اس معاملہ میں تم مختار ہو۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام جنت میں رہے جب تک کہ اللہ نے چاہا اور پھر ان کو (جنت سے) زمین پر اتار دیا گیا اور حضرت آدم علیہ السلام برابر اپنی عمر کے سالوں کو گنتے رہے (یہاں تک کہ ان کی عمر نو سو چالیس سال ہوئی تو) موت کا فرشتہ روح قبض کرنے کے لئے ان کے پاس آیا حضرت آدم علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تم نے جلدی کی میری عمر تو ایک ہزار سال کی مقرر کی گئی ہے، فرشتے نے کہا کہ یہ (صحیح ہے) لیکن آپ نے اپنی عمر کے ساٹھ سال اپنے بیٹے داؤد کو دیدیئے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے انکار کیا اور ان کی اولاد بھی انکار کرتی ہے نیز حضرت آدم علیہ السلام اس ممانعت کو بھول گئے تھے جو حق تعالیٰ کی طرف سے مشہور درخت کا پھل کھانے سے متعلق تھی اور ان کی اولاد بھی بھولی تھی آنحضرت ﷺ نے فرمایا اس دن سے لکھنے اور گواہ بنانے کا حکم دیا گیا۔" (ترمذی)

تشریح: درآنحالیکہ اس کے دونوں ہاتھ بند تھے ان الفاظ سے اس ہیئت کذائی کو بیان کرنا مقصود ہے کہ جس طرح کوئی شخص اپنے ہاتھوں میں کوئی چیز بند کر کے اس کو چھپالیتا ہے۔

"اور میرے پروردگار کے دونوں ہاتھ داہنے بابرکت ہیں" یہ جملہ یا تو حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا تھا جس کو آنحضرت ﷺ نے نقل کیا یا آنحضرت ﷺ کا اپنا کلام ہے، بہر صورت حق تعالیٰ کی طرف ہاتھ اور داہنے ہاتھ کی نسبت کرنا متشابہات میں سے ہے۔ البتہ علماء نے ان الفاظ کے کئی معنی اور تاویلات بیان کی ہیں ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے "ید" ہاتھ کی صفت تو ثابت ہے لیکن ظاہری و جسمانی ہاتھ ثابت نہیں ہے، لہٰذا مذکورہ عبارت جسمانی ہاتھ کی نفی کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ کے لئے جسمانی ہاتھ ثابت نہیں ہے، لہٰذا مذکورہ عبارت جسمانی ہاتھ کی نفی کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ کے لئے جسمانی ہاتھ ثابت ہوتے تو یمین وشمال دایاں اور بایاں بھی ہوتا اور دونوں ہاتھ داہنے بابرکت ہیں سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ یہاں خیر و برکت کا وجود مراد ہے جو ید یمین داہنے ہاتھ اور لفظ یمین کے مادہ اشتقاق یمن معنی برکت کا تقاضہ ہے۔

دوسرے یہ کہ جس طرح قوت اور گرفت میں مخلوقات کا بایاں ہاتھ کمزور اور ناقص ہوتا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں کوئی کمزوری نہیں ہے بلکہ اس کے دونوں ہاتھ یکساں زور وقوت رکھتے ہیں، اس اعتبار سے اس کے دونوں ہاتھ داہنے ہوئے، یہ بات اس طرح گویا سمجھانے کے لئے بیان کی گئی ہے ورنہ اس عبارت کی اصل مراد یہ بیان کرنا ہے کہ حق تعالیٰ کی کسی صفت میں کسی طرح کی کوئی کمزوری اور نقص نہیں ہے اور اس کی تمام صفات کامل ہیں۔

اور تیسرے یہ کہ ان الفاظ کا مقصد حق تعالیٰ کے جود و کرم اور احسان و انعام کی صفت کو زیادہ سے زیادہ ظاہر کرنا ہے، چنانچہ اہل عرب جب کسی ایسے شخص کی توصیف کرنا چاہتے تو بہت زیادہ نفع پہنچانے والا ہوتا تو اس کے حق میں یہ کہتے کہ، کلتا یدیہ یمین یعنی اس شخص کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں۔

"جو سب سے زیادہ روشن تھا" اس عبارت سے ذہن میں ایک خلجان پیدا ہوتا ہے اور یہ کہ اس سے تمام انبیاء پر حضرت داؤد علیہ السلام کی فضیلت لازم آتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس موقع پر حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے حضرت داؤد علیہ السلام کو ایک طرح کی امتیازی شکل و صورت میں ظاہر کیا تاکہ اس کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام ان کے بارے میں سوال کریں؛ اور اس سوال پر وہ صورت حال مرتب ہو جو آگے پیش آئی، یعنی حضرت آدم علیہ السلام کا حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی عمر میں سے ساٹھ سال دینا اور پھر ملک الموت کے آنے پر اس سے انکار کرنا اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے روشن ترین ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ تمام صفات کمالیہ میں سب سے ترجیح رکھتے تھے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ مذکورہ بالا مصلحت کے پیش نظر اس عالم میں حق

تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی شکل و صورت میں ایک طرح کی خاص نورانیت ودیعت فرمائی ہو اور بلکہ وہ اس عالم میں بھی اس نورانیت سے متصف رہے ہوں، چنانچہ پیغمبروں میں سے ہر ایک نبی علیہ السلام کسی نہ کسی خاص صفت سے موصوف رہا ہے اور اس صفت میں ان کو امتیازی حیثیت و خصوصیت حاصل رہی ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ محض اس خاص صفت کی بنا پر اس نبی علیہ السلام کو دیگر تمام انبیاء پر فضیلت و فوقیت کا درجہ حاصل ہو۔

"میری عمر تو ایک ہزار سال مقرر کی گئی ہے۔" ظاہر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے یہ بات بالکل صحیح کہی تھی کیونکہ واقعۃً حق تعالیٰ نے ان کی عمر ایک ہزار سال مقرر کی تھی البتہ اس بات کے ضمن میں ان کا مذکورہ انکار پوشیدہ تھا انہوں نے صریحاً یہ بات نہیں کہی کہ میں نے اپنی عمر سے داؤد علیہ السلام کو کچھ نہیں دیا ہے اور صریحاً انکار ممکن بھی نہیں تھا کیوں کہ انبیاء علیہم السلام کی زبان سے کوئی جھوٹ قصدا اور صریحا صادر نہیں ہوتا، لہٰذا کہا جائے گا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا یہ انکار بطور تعریض تھا جیسا کہ اس طرح کی بعض صورتیں دیگر انبیاء سے بھی صادر ہوتی ہیں یا یہ کہا جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا مذکورہ انکار بطریق نسیان تھا یعنی انہیں یہ یاد نہیں رہا تھا کہ وہ اپنی عمر میں سے ساٹھ سال داؤد علیہ السلام کو دے چکے ہیں اس لئے انہوں نے ملک الموت کے سامنے اس کا انکار کر دیا۔

عورتوں کو سلام کرنا آنحضرت ﷺ کے لئے مخصوص طور پر جائز تھا

(۳۶) وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ مَرَّ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي نِسْوَةٍ فَسَلَّمَ عَلَيْنَا۔

(رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت اسماء بنت یزید کہتی ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ ہم عورتوں کے پاس سے گزرے جب کہ ہم کچھ عورتوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں تو آپ ﷺ نے ہمیں یعنی وہاں موجود تمام عورتوں کو سلام کیا۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: عورتوں کو سلام کرنے کی اجازت آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص تھی، کسی دوسرے مسلمان کے لئے جائز نہ تھی اور نہیں ہے کہ وہ اجنبی عورتوں کو سلام کرے جیسا کہ دوسری فصل کی حدیث کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے۔

سلام کی فضیلت

(۳۷) وَعَنِ الطُّفَيْلِ بْنِ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ اَنَّهُ كَانَ يَاتِي ابْنَ عُمَرَ فَيَغْدُوْا مَعَهُ اِلَى السُّوْقِ قَالَ فَاِذَا غَدَوْنَا اِلَى السُّوْقِ لَمْ يَمُرَّ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ عَلَى سَقَّاطٍ وَلَا عَلَى صَاحِبِ بَيْعَةٍ وَلَا مِسْكِيْنٍ وَلَا عَلَى اَحَدٍ اِلَّا سَلَّمَ عَلَيْهِ قَالَ الطُّفَيْلُ فَجِئْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ يَوْمًا فَاسْتَتْبَعَنِيْ اِلَى السُّوْقِ فَقُلْتُ لَهُ وَمَا تَصْنَعُ فِي السُّوْقِ وَاَنْتَ لَا تَقِفُ عَلَى الْبَيْعِ وَلَا تَسْاَلُ عَنِ السِّلَعِ وَلَا تَسُوْمُ بِهَا وَلَا تَجْلِسُ فِيْ مَجَالِسِ السُّوْقِ فَاجْلِسْ بِنَا هٰهُنَا نَتَحَدَّثُ قَالَ فَقَالَ لِي عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ يَا اَبَابَطْنٍ قَالَ وَكَانَ الطُّفَيْلُ ذَا بَطْنٍ اِنَّمَا نَغْدُوْ مِنْ اَجْلِ السَّلَامِ نُسَلِّمُ عَلٰى مَنْ لَقِيْنَاهُ۔ (رواہ مالک والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت طفیل ابن ابی ابن کعب سے روایت ہے کہ وہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور پھر صبح کے وقت ان کے ساتھ بازار جایا کرتے تھے۔ حضرت طفیل کہتے ہیں کہ جب ہم صبح کے وقت بازار میں جاتے تو حضرت عبداللہ ابن عمرؓ جس بساطی، جس بیچنے والے، جس مسکین اور جس کسی شخص کے پاس سے بھی گزرتے اس کو سلام کرتے۔ حضرت طفیل کہتے ہے کہ ایک دن (معمول کے مطابق) میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے پاس آیا اور وہ مجھ کو اپنے ہمراہ بازار لے جانے لگے تو میں نے ان سے کہا کہ آپ بازار جا کر کیا کریں گے آپ نہ تو کسی خرید و فروخت کی جگہ ٹھہرتے ہیں اور نہ کسی بیچی جانے والی چیز کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ نہ تو مول تول اور کوئی سودا کرتے ہیں اور نہ بازار کی کسی مجلس میں شریک ہوتے ہیں (لہٰذا بازار جانے سے اچھا تو یہی ہے کہ) آپ ہمارے ساتھ یہیں

بیٹھتے تاکہ کچھ باتیں ہی کریں۔ حضرت طفیل ؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ؓ نے یہ سنکر مجھ سے کہا کہ اے بڑے پیٹ والے راوی کا بیان ہے کہ طفیل ؒ کا پیٹ بڑا تھا کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم خرید و فروخت کرنے یا کسی اور غرض سے بازار جایا کرتے ہیں، نہیں بلکہ ہم صرف سلام کرنے کی غرض سے جاتے ہیں اور ہر اس شخص کو سلام کرتے ہیں جو ہم کو ملتا ہے اور اس طرح ہم بازار جاکر ثواب حاصل کرتے ہیں۔" (مالک، بیہقی)

سلام نہ کرنا بخل ہے

(۳۸) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَتٰی رَجُلُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لِفُلَانٍ فِیْ حَائِطِیْ عَذْقٌ وَاِنَّہٗ قَدْ اٰذَانِیْ مَکَانُ عَذْقِہٖ فَاَرْسَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ بِعْنِیْ عَذْقَکَ قَالَ لَا قَالَ فَھَبْ لِیْ قَالَ لَا قَالَ فَبِعْنِیْہِ بِعَذْقٍ فِی الْجَنَّۃِ فَقَالَ لَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَارَاَیْتُ الَّذِیْ ھُوَ اَبْخَلُ مِنْکَ اِلَّا الَّذِیْ یَبْخَلُ بِالسَّلَامِ۔

(رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت جابر ؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے باغ میں فلاں شخص کا کھجور کا درخت ہے اور صورت حال یہ ہے کہ وہاں اس درخت کے ہونے سے مجھے تکلیف پہنچتی ہے کیونکہ وہ شخص اپنے اس درخت کی وجہ سے وقت بے وقت میرے باغ میں آتا جاتا ہے چنانچہ نبی کریم ﷺ نے کسی کو اس شخص کے پاس بھیجا تاکہ اس کو بلائے جب وہ آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنا کھجور کا درخت میرے ہاتھ فروخت کر دو، اس نے کہا کہ میں فروخت نہیں کرتا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس درخت کو بیچنے میں تمہیں کوئی عار محسوس ہوتا ہے تو اس کو میرے نام ہبہ کر دو، اس نے کہا میں ہبہ بھی نہیں کرتا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اچھا اس درخت کو تم میرے ہاتھ کھجور کے ایسے درخت کے عوض فروخت کو دو جو تمہیں جنت میں ملے۔ اس نے کہا کہ میں اس طرح بھی فروخت کرتا نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا۔ میں نے تم سے بڑا بخیل کسی شخص کو نہیں دیکھا علاوہ اس شخص کے جو سلام کرنے میں بخل کرتا ہے یعنی سلام کے معاملہ میں کوتاہی کرنے والا شخص تم سے بھی بڑا بخیل ہے کہ وہ اتنا ذرا سا کام کر کے بھی زیادہ ثواب حاصل نہیں کرنا چاہتا۔" (احمد ؒ، بیہقی ؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس شخص سے جو کچھ فرمایا وہ بطریق شفارش تھا، حکم کے طور پر نہیں تھا، اگر آپ ﷺ حکم کے طور پر فرماتے تو وہ انکار کرنے کی ہرگز جرأت نہ کرتا کیونکہ وہ بہرحال مسلمان تھا اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ آنحضرت ﷺ کے کسی حکم سے برملا انکار کسی صورت میں نہیں کر سکتا تھا، ہاں اگر وہ مسلمان نہ ہوتا تو حکم نبوی ﷺ سے اس کا انکار کرنا کوئی تعجب خیز امر نہ ہوتا، لیکن آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا کہ تم اس درخت کو جنت کے کھجور کے درخت کے بدلے میرے ہاتھ فروخت کر دو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ یقیناً مسلمان تھا تاہم بخل طمع سے خالی نہیں تھا۔

سلام کرنے میں پہل کی فضیلت

(۳۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الْبَادِیُٔ بِالسَّلَامِ بَرِیْءٌ مِنَ الْکِبْرِ رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔ (رواہ البیہقی)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعود ؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا سلام میں پہل کرنے والا تکبر سے پاک ہے۔" (بیہقی ؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب کہیں آتے جاتے وہ شخص آپس میں ملیں اور دونوں کی حیثیت یکساں نوعیت کی ہو، جیسے دونوں پیدل ہوں، یا دونوں سواری پر ہوں تو ان میں سے جو شخص پہلے سلام کرے گا وہ گویا یہ ظاہر کرے گا کہ خدا نے اس کو تکبر و غرور سے پاک رکھا

ہے۔

یہ بات بھی پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ سلام کرنا سُنّت ہے اور سلام کا جواب دینا فرض ہے اگر کوئی شخص مجلس میں آئے اور وہاں سلام کرے تو مجلس والوں پر اس کے سلام کا جواب دینا فرض ہوگا۔

اور اگر وہ شخص اسی مجلس میں دوبارہ آئے اور پھر سلام کرے تو اب اس کے سلام کا جواب دینا ان پر فرض نہیں ہوگا البتہ مستحب ہوگا۔

سلام اور اس کا جواب، دونوں کے الفاظ بصیغہ جمع ہونے چاہئیں، اگرچہ مخاطب فرد واحد ہو، تاکہ ملائکہ جو ہر شخص کے ساتھ ہوتے ہیں، سلام میں مخاطب کے ساتھ وہ بھی شریک ہوں۔

ایک حدیث میں منقول ہے کہ ایک شخص سرخ کپڑے پہنے ہوئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام کیا آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو شخص سلام کرتے وقت کسی نامشروع امر کا مرتکب ہو وہ سلام کے جواب کا مستحق نہیں ہوگا۔

بَابُ الْاِسْتِیْذَانِ
اجازت حاصل کرنے کا بیان

ادب و تہذیب کا تقاضہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہو، چنانچہ شریعت نے اس بات کو مستحب قرار دیا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کے گھر جائے تو پہلے دروازے پر کھڑے ہو کر گھر میں آنے کی اجازت طلب کرے، اگر صاحب خانہ گھر میں بلائے تو دروازے کے اندر قدم رکھے ورنہ وہیں سے واپس ہو جائے، اس حکم کی بنیاد قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَھْلِھَا۔ (الآیۃ)

"اے ایمان والو! اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہو، جب تک کہ گھر والوں سے اجازت حاصل نہ کر لو اور ان کو سلام نہ کر لو۔"

اس بارے میں مسنون طریقہ یہ ہے کہ دروازے پر کھڑے ہو کر اہل خانہ کو مخاطب کر کے یوں کہا جائے کہ "السلام علیکم" کیا میں اندر آسکتا ہوں؟

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

دروازے پر کھڑے ہو کر تین مرتبہ سلام کرنے کے بعد بھی گھر میں سے جواب نہ ملے تو واپس ہو جاؤ

① عَنْ اَبِی سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ اَتَانَا اَبُوْ مُوْسٰی قَالَ اِنَّ عُمَرَ اَرْسَلَ اِلَیَّ اَنْ اٰتِیَهٗ فَاَتَیْتُ بَابَهٗ فَسَلَّمْتُ ثَلَاثًا فَلَمْ یَرُدَّ عَلَیَّ فَرَجَعْتُ فَقَالَ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَاْتِیَنَا فَقُلْتُ اِنِّیْ اَتَیْتُ فَسَلَّمْتُ عَلٰی بَابِكَ ثَلَاثًا فَلَمْ تَرُدُّوْا عَلَیَّ فَرَجَعْتُ وَقَدْ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اسْتَاْذَنَ اَحَدُكُمْ ثَلٰثًا فَلَمْ یُؤْذَنْ لَهٗ فَلْیَرْجِعْ فَقَالَ عُمَرُ اَقِمْ عَلَیْهِ الْبَیِّنَةَ قَالَ اَبُوْ سَعِیْدٍ فَقُمْتُ مَعَهٗ فَذَهَبْتُ اِلٰی عُمَرَ فَشَهِدْتُّ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت ابوموسیٰ اشعری ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے کہ حضرت عمرؓ نے میرے پاس ایک شخص کو بھیج کر مجھے بلا بھیجا تھا جب میں حسب طلب ان کے دروازے پر پہنچا اور اندر آنے کی اجازت طلب کرنے کے لئے تین مرتبہ سلام کیا تو مجھ کو سلام کا جواب نہیں ملا، چنانچہ میں واپس چلا آیا پھر بعد میں ملاقات ہوئی تو حضرت عمرؓ نے مجھ سے پوچھا کہ میرے پاس آنے سے تمہیں کس چیز نے روکا تھا؟ میں نے کہا کہ میں (آپؓ کے پاس) آیا تھا اور آپؓ کے (دروازے پر کھڑے ہو کر) تین مرتبہ سلام کیا، لیکن آپ نے اس کا جواب نہیں دیا (اور نہ آپ کے کسی خادم ہی نے جواب دیا) لہٰذا میں واپس آگیا کیوں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ جب تم میں سے کوئی شخص (کسی کے گھر جائے اور دروازے پر کھڑے ہو کر) تین مرتبہ اجازت طلب کرے اور اس کو اجازت نہ ملے تو چاہئے کہ واپس چلا آئے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ اس حدیث کے گواہ لاؤ (یعنی اس حدیث کے صحیح ہونے پر) گواہ پیش کرو کہ یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوموسیٰ کے ساتھ چلنے کے لئے کھڑا ہوا اور حضرت عمرؓ کے پاس جا کر گواہی دی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت ابوموسیٰؓ نے حضرت ابوسعید خدری کے سامنے مذکورہ واقعہ بیان کیا اور کہا کہ یہ حدیث چونکہ آپ نے بھی آنحضرت ﷺ سے سنی ہے اس لئے میرے ساتھ حضرت عمرؓ کے پاس چلئے اور ان کے سامنے گواہی دیجئے، چنانچہ حضرت ابوسعید خدریؓ ان کے ساتھ حضرت عمرؓ کے پاس گئے اور یہ گواہی دی کہ حضرت ابوموسیٰؓ نے جو حدیث بیان کی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

حضرت عمرؓ کا گواہ طلب کرنا محض احتیاط کے طور پر تھا کہ دوسرے لوگوں کو حدیث بیان کرنے کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے اور خاص طور پر وہ جھوٹے لوگ جو من گھڑت حدیثیں آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کر کے بیان کرنا چاہیں ان کو اس بات کی جرأت نہ ہو سکے ورنہ متفقہ طور پر یہ بات ہے کہ خبر واحد مقبول ہے خاص طور پر اس صورت میں جب کہ راوی حضرت ابوموسیٰ اشعری جیسا صحابی ہو جو کبار صحابہ میں سے ہیں۔

دروازے پر کھڑے ہو کر تین بار سلام اس لئے کرنا چاہئے کہ ایک سلام تو تعرف کے لئے ہوگا، دوسرا سلام تأمل کے لئے اور تیسرا سلام اجازت کے لئے ہوگا، یعنی اہل خانہ پہلا سلام سن کر اس شخص کو پہچانیں گے کہ یہ کون شخص ہے اور دوسرا سلام سن کر وہ یہ سوچیں گے کہ آیا اس شخص کو اندر آنے کی اجازت دی جائے یا نہیں اور تیسرا سلام سننے کے بعد اندر آنے کی اجازت دیں گے۔

خاص اجازت

(۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ لِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْنُكَ عَلَيَّ اَنْ تَرْفَعَ الْحِجَابَ وَاَنْ تَسْتَمِعَ سِوَادِيْ حَتّٰى اَنْهَاكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ میری طرف سے تمہیں یہ اجازت ہے کہ تم پردہ اٹھاؤ اور میری باتیں سنو تا آنکہ میں تمہیں منع نہ کر دوں۔" (مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے آستانۂ اقدس کے دروازے پر جو پردے پڑے ہوئے تھے۔ وہ بوریئے کے تھے۔

حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو آنحضرت ﷺ کے گھر کے اندر آنے کی مخصوص اجازت حاصل تھی اور وہ دروازے پر کھڑے ہو کر اجازت حاصل کرنے کے پابند نہیں تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے ان سے فرما دیا تھا کہ میرے پاس تمہارے آنے کی اجازت کی علامت بس یہی ہے کہ تم پردہ، اٹھا کر دیکھو اگر میں سامنے موجود ہوں یا تمہیں یہ معلوم ہو کہ میں ہوں تو اندر چلے آؤ، خواہ میں مخصوص لوگوں سے خفیہ بات چیت ہی کیوں نہ کر رہا ہوں تمہیں اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ہاں البتہ اگر کسی وقت میں تمہارا اندر آنا مناسب نہیں سمجھوں گا اس وقت تمہیں اندر آنے سے منع کر دوں گا اس سے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے مرتبہ کا اندازہ

ہوتا ہے کہ انہیں نگاہ نبوت میں کس قدر محبوبیت حاصل تھی اور ان پر آنحضرت ﷺ کی کتنی زیادہ عنایت تھی آپ ﷺ نے ان کو اپنا اتنا مقرب قرار دیا تھا کہ وہ گویا گھر ہی کے ایک فرد ہو گئے تھے اور جب چاہتے گھر میں چلے آتے۔

لیکن واضح رہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی یہ مخصوص اجازت اس صورت سے متعلق تھی جب کہ حجرہ مبارکہ میں عورتوں کے آنے کا وقت نہیں رہتا تھا یا گھر میں عورتیں موجود نہیں ہوتی تھیں، خاص طور سے پردہ کی آیت نازل ہونے کے بعد تو یہ قید ضرور عائد ہوئی ہوگی۔

کسی دروازے پر پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع کرو تو نام بتاؤ

(۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ دَيْنٍ كَانَ عَلٰى اَبِيْ فَدَقَقْتُ الْبَابَ فَقَالَ مَنْ ذَا فَقُلْتُ اَنَا فَقَالَ اَنَا اَنَا كَاَنَّهٗ كَرِهَهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں ایک قرض کے معاملہ میں جو میرے باپ پر تھا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لئے دروازے کو کھٹکھٹایا، آپ ﷺ نے اندر سے پوچھا کون ہے؟ میں نے کہا کہ میں ہوں آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ میں ہوں، میں ہوں، گویا آپ ﷺ نے میرے اس طرح جواب دینے کو برا سمجھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: قرض کا وہ معاملہ جس سلسلے میں حضرت جابرؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، یہ تھا کہ ان کے والد حضرت عبداللہ انصاریؓ غزوہ احد میں شہید ہو گئے تھے اور اپنے ذمہ کچھ قرض چھوڑ گئے تھے، جب قرض خواہوں نے حضرت جابرؓ سے اس قرض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا اور ان کو تنگ کرنا شروع کر دیا تو وہ مدد چاہنے کے لئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ اس قرض کی ادائیگی کا کوئی انتظام ہو اور قرض خواہوں سے نجات مل جائے اس وقت حضرت جابرؓ کی ملکیت میں تھوڑی سی کھجوروں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا، لیکن اس موقع پر آنحضرت ﷺ کا معجزہ ظاہر ہوا کہ ان کھجوروں میں برکت ہوئی اور اتنی برکت ہوئی کہ حضرت جابرؓ نے ان کھجوروں سے پورا قرض ادا کر دیا اور اس کے بعد بھی وہ جوں کی توں باقی رہیں، ان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

"میں ہوں" کہنے کو آنحضرت ﷺ نے اس لئے برا سمجھا کہ اس جملہ کے ذریعہ ابہام کا ازالہ نہیں ہوتا اور صاحب خانہ پر یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ کون شخص ہے، گویا یہ کہنے سے اس صورت میں صاحب خانہ کا یہ سوال کہ کون ہے جوں کا توں باقی رہتا ہے، لہٰذا حضرت جابرؓ کو چاہئے تھا کہ وہ نام لقب، یا کنیت بتاتے تاکہ یہ معلوم ہو جاتا کہ باہر دروازے پر کون شخص ہے اگرچہ بعض اوقات محض آواز پہچان لینے سے بھی شخصیت کی وضاحت ہو جاتی ہے، خاص خاص طور سے اس صورت میں جب کہ "میں ہوں" کہنے والا ایسا شخص ہو جس کے ساتھ ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا یا اس سے راہ ورسم ہو، چنانچہ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے "میں ہوں" کی آواز سے حضرت جابرؓ کی آواز کو پہچان لیا ہو گا مگر اس کے باوجود آپ ﷺ نے اپنی ناگواری کا اظہار حضرت جابرؓ کو اس ادب کی تعلیم کے طور پر کیا کہ کسی کے دروازے پر پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع دو صاف طرح سے اپنا نام بتاؤ محض یہ کہنے پر اکتفا نہ کرو کہ "میں ہوں"۔

یہ احتمال بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت جابرؓ کے اس طرح کہنے کو اس لئے برا سمجھا کہ انہوں نے سلام کرنے کے ذریعہ اجازت حاصل کرنے کے طریقہ کو ترک کیا جو مسنون ہے۔

آنحضرت ﷺ کا "میں ہوں، میں ہوں" دوبار کہنا حضرت جابرؓ کے اس جواب کو قبول کرنے سے انکار کے طور پر تھا اور اس کا مفہوم گویا یوں تھا کہ میں ہوں میں ہوں کیا کہتے ہو، اپنا نام کیوں نہیں بتاتے؟

بلانے والے کے دروازے پر بھی رک کر اندر آنے کی اجازت مانگنی چاہئے

(۴) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ دَخَلْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَجَدَ لَبَنًا فِيْ قَدَحٍ فَقَالَ اَبَا هِرٍّ الْحَقْ بِاَهْلِ

الصُّفَّةِ فَادْعُهُمْ اِلَیَّ فَاَتَیْتُهُمْ فَدَعَوْتُهُمْ فَاَقْبَلُوا فَاسْتَاْذَنُوا فَاُذِنَ لَهُمْ فَدَخَلُوْا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے رسول کریم ﷺ کے ساتھ (آپ ﷺ کے گھر میں) داخل ہوا تو آپ ﷺ نے گھر میں دودھ کا ایک پیالہ رکھا ہوا پایا آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ ابوہریرہؓ! اہل صفہ کے پاس جاؤ اور ان کو میرے پاس بلالاؤ! چنانچہ میں ان کے پاس جا کر ان کو بلالایا جب وہ لوگ آئے تو دروازے پر رک کر اندر آنے کی اجازت چاہی آپ ﷺ نے ان کو اجازت دی تو وہ اندر آگئے!۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: ایک دوسری حدیث میں یہ بھی منقول ہے کہ اہل صفہ اندر آئے تو آنحضرت ﷺ نے ان کے سامنے دودھ کا وہ پیالہ پیش کیا اور آپ ﷺ کے معجزہ کے سبب سے ان سب نے اس پیالہ کے دودھ کو خوب سیر ہو کر پیا۔

واضح رہے کہ اہل صفہ ان صحابہؓ کی جماعت کو کہا جاتا تھا جو مدینہ میں نہ تو گھربار رکھتی تھی اور نہ کوئی سلسلہ معاش، بلکہ اپنے فقرو افلاس کے ساتھ مسجد نبوی ﷺ کے باہر ایک چبوترہ پر جمع رہتی تھی اور ہمہ وقت آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر رہ کر اکتساب فیض کرتی تھی ان صحابہؓ کا تعلق انصارؓ سے بھی تھا اور مہاجرینؓ سے بھی یوں تو مدینہ کے عام مسلمان اپنی حیثیت واستطاعت کے مطابق ان کے کھانے پینے کا انتظام کرتے رہتے تھے لیکن آنحضرت ﷺ بذات خود اکثر و بیشتر ان سب کو اپنے پاس سے کھلاتے پلاتے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی کو بلانا، اجازت حاصل کرنے کو ساقط نہیں کرتا یعنی اگر کوئی شخص کسی کے بلانے پر اس کے گھر جائے تو اس کو بھی چاہئے کہ وہ دروازہ پر آکر پہلے اجازت طلب کرے اور پھر گھر اندر جائے الا یہ کہ بلانے اور آنے میں زیادہ وقت کا فرق نہ ہو آگے...... حدیث آرہی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی شخص کو بلایا جائے اور وہ شخص اس کے ہمراہ آجائے جو بلانے گیا تھا تو اس کے ساتھ آنا ہی اس کے لئے اجازت ہے یعنی اس کو اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، چونکہ بظاہر یہ حدیث مذکورہ بالا حدیث سے مطابقت نہیں رکھتی اس لئے ان دونوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے علماء نے لکھا ہے کہ اصل مسئلہ یہی ہے کہ بلا کر لانے والے کے ساتھ آنے کی صورت میں اجازت ہے یعنی اس کو اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، چونکہ بظاہر یہ حدیث مذکورہ بالا حدیث سے مطابقت نہیں رکھتی اس لئے اس دونوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے علماء نے لکھا ہے کہ اصل مسئلہ یہی ہے کہ بلا کر لانے والے کے ساتھ آنے کی صورت میں اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ اہل صفہ نے اسی لئے اجازت چاہی تھی کہ وہ لوگ حضرت ابوہریرہؓ کے ساتھ ہی چلے آتے تو ان کو اجازت حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی یا یہ کہ وہ لوگ حضرت ابوہریرہؓ کے ہی ساتھ آئے تھے اس صورت میں ان کو اجازت حاصل کرنے کی ضرورت یا حاجت نہیں تھی لیکن چونکہ ان لوگوں پر ادب وحیا کا انتہائی غلبہ تھا اس لئے ان لوگوں نے اجازت حاصل کرنا ہی بہتر سمجھا یا ان لوگوں کو وہاں کوئی ایسی چیز محسوس ہوئی ہوگی جو اجازت حاصل کرنے کی مقتضی تھی یا یہ کہ ان لوگوں کو یہ حدیث ہی نہیں پہنچی ہوگی، اس لئے انہوں نے اجازت حاصل کی۔ واللہ اعلم

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

اجازت طلب کئے بغیر کسی کے گھر میں نہ جاؤ

⑤ عَنْ كَلَدَةَ بْنِ حَنْبَلٍ اَنَّ صَفْوَانَ ابْنَ اُمَيَّةَ بَعَثَ بِلَبَنٍ اَوْجَدَايَةٍ وَضُغَابِيْسَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاَعْلَى الْوَادِيْ قَالَ فَدَخَلْتُ عَلَيْهِ وَلَمْ اُسَلِّمْ وَلَمْ اَسْتَاْذِنْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِرْجِعْ فَقُلِ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَاَدْخُلُ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"حضرت کلدۃ ابن حنبلؓ کہتے ہیں کہ صفوان ابن امیہؓ نے میرے ہاتھ رسول کریم ﷺ کے لئے دودھ، ہرن کا بچہ اور ککڑی بھیجی اور اس وقت رسول کریم ﷺ مکہ کے بالائی کنارہ پر (جس کو معلی کہتے ہیں) قیام پذیر تھے، کلدہؓ کہتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کی خدمت میں یونہی چلا گیا تو میں نے (آپ ﷺ کی قیامگاہ میں داخل ہونے سے پہلے) سلام کیا اور نہ اندر آنے کی اجازت مانگی، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے مجھ فرمایا کہ واپس جاؤ (یعنی یہاں سے نکل کر دروازہ پر جاؤ) اور (وہاں کھڑے ہو کر) کہو کہ السلام علیکم، کیا میں اندر آسکتا ہوں۔"

(ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

بلا کر لانے والے کے ساتھ آنیکی صورت میں اجازت کی ضرورت نہیں

⑥ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا دُعِیَ اَحَدُكُمْ فَجَآءَ مَعَ الرَّسُوْلِ فَاِنَّ ذٰلِكَ لَهٗ اِذْنٌ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَفِیْ رِوَایَةٍ لَهٗ قَالَ رَسُوْلُ الرَّجُلِ اِلَى الرَّجُلِ اِذْنُهٗ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی شخص کو بلایا جائے اور وہ اسی کے ساتھ چلا آئے جو اس کو بلانے گیا ہے تو اس کے ساتھ آنا ہی اس کے لئے اجازت ہے۔ (ابوداؤد) اور ابوداؤد ہی کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ نے فرمایا۔ کسی شخص کا کسی شخص کو بلانے کے لئے اس کے پاس آدمی بھیجنا ہی اس کی طرف سے اجازت ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنا آدمی بھیج کر کسی کو اپنے گھر بلائے اور وہ بلا کر لانے والے ہی کے ساتھ چلا آئے تو اس صورت میں اس کو اس بات کی ضرورت نہیں ہوگی کہ وہ دروازے پر کھڑے ہو کر پہلے اجازت مانگے اور پھر گھر میں داخل ہو۔

آنحضرت ﷺ کسی کے گھر جاتے تو اجازت مانگنے کے لئے دروازے پر کس طرح کھڑے ہوتے

⑦ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتٰى بَابَ قَوْمٍ لَمْ یَسْتَقْبِلِ الْبَابَ مِنْ تِلْقَاءِ وَجْهِهٖ وَلٰكِنْ مِنْ رُكْنِهِ الْاَیْمَنِ اَوِ الْاَیْسَرِ فَیَقُوْلُ السَّلَامُ عَلَیْكُمْ وَذٰلِكَ اِنَّ الدُّوْرَ لَمْ یَكُنْ یَوْمَئِذٍ عَلَیْهَا سُتُوْرٌ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَذُكِرَ حَدِیْثُ اَنَسٍ قَالَ عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ السَّلَامُ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ فِیْ بَابِ الضِّیَافَةِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن بسرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب کسی گھر جانے کے لئے اس کے دروازہ پر پہنچتے تو دروازہ کی طرف منہ کر کے کھڑے نہ ہوتے (تاکہ گھر والوں پر نظر نہ پڑ جائے) بلکہ دائیں یا بائیں جانب کھڑے ہوتے اور پھر اجازت مانگنے کے لئے، فرماتے، السلام علیکم، السلام علیکم، اور دروازے کے سامنے کھڑے نہ ہونے کی وجہ یہ ہوا کرتی تھی کہ اس زمانہ میں دروازوں پر پردے نہ پڑے ہوئے تھے۔ (ابوداؤدؒ) اور انسؓ کی یہ روایت قال علیہ الصلوۃ والسلام السلام علیکم و رحمۃ اللہ باب الضیافۃ میں نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: ایک سے زائد بار سلام کرنے کی وجہ یہ تھی تاکہ صاحب خانہ اچھی طرح سن لے اور اجازت دے سکے واضح رہے کہ یہاں السلام علیکم جو دوبار ذکر کیا گیا ہے تو اس سے تعدد مراد ہے دوبار پر اقتصار مراد نہیں ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کسی کے دروازے پر کھڑے ہو کر تین بار سلام فرماتے تھے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

روایت کے آخری الفاظ، دروازے کے سامنے کھڑے نہ ہونے کی وجہ سے یہ سمجھا گیا ہے اگر دروازے پر کواڑ ہوں یا اس پر پردے پڑے ہوئے ہوں تو اس صورت میں دروازے کے سامنے کھڑے ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن اصل سنّت کی رعایت کے پیش نظر اولیٰ یہی ہے کہ اس صورت میں بھی دروازے کے سامنے سے ہٹ کر دائیں یا بائیں طرف کھڑا ہو، اور اس لئے بھی کہ بعض اوقات کواڑ یا پردہ کھولتے ہوئے دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے شخص کی نظر اندر چلی جاتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

اپنی ماں وغیرہ کے گھر میں بھی اجازت لے کر جاؤ

⑧ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ اَنَّ رَجُلاً سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَسْتَاذِنُ عَلٰى اُمِّي فَقَالَ نَعَمْ فَقَالَ رَجُلٌ اِنِّي مَعَهَا فِي الْبَيْتِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْتَاذِنْ عَلَيْهَا فَقَالَ الرَّجُلُ اِنِّي خَادِمُهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْتَاذِنْ عَلَيْهَا اَتُحِبُّ اَنْ تَرَاهَا عُرْيَانَةً قَالَ لاَ قَالَ فَاسْتَاذِنْ عَلَيْهَا۔ رَوَاهُ مَالِكٌ مُرْسَلاً۔

"حضرت عطاء ابن یسارؒ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا میں اپنی ماں کے پاس جانے میں بھی اجازت طلب کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں" (کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت اس کے جسم کے اعضاء کھلے ہوئے ہوں جو بیٹے کو بھی دیکھنا جائز نہیں ہیں) اس شخص نے کہا کہ میں اس کے ساتھ ہی رہتا ہوں (یعنی میں اور میری ماں دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں، اس صورت میں مجھے اجازت طلب کرنے کی کیا ضرورت ہے، گویا اس شخص نے گمان کیا کہ اجازت حاصل کرنا اسی شخص کے لئے مشروع ہے جو بیگانہ ہو اور کبھی کبھار آتا جاتا ہو) رسول کریم ﷺ نے فرمایا (جب تم گھر میں داخل ہونا چاہو یا ایک ہی گھر میں وہ کسی علیحدہ جگہ کسی کمرے وغیرہ میں ہو اور) تم اس کے پاس جانا چاہو تو اجازت حاصل کر کے جاؤ اس نے کہا کہ میں اپنی ماں کا خادم ہوں (یعنی میں اپنی ماں کی دیکھ بھال اور خدمت کرنے کے لئے اس کے پاس بار بار آتا جاتا ہوں تو کیا شرعی قواعد کے مطابق دفع حرج کے لئے ہر بار اجازت طلب کرنے کی پابندی مجھ سے ہٹ سکتی ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا بہر صورت اجازت حاصل کر کے اس کے پاس جاؤ (اگرچہ اجازت کا حاصل کرنا، کھنکارنے پاؤں کی آہٹ اور بلند آواز سے بولنے کی ہی صورت میں کیوں نہ ہو) کیا تم یہ پسند کرو گے کہ اپنی ماں کو برہنہ دیکھو؟ یعنی تم اگر بغیر اجازت حاصل کئے اچانک اس کے پاس چلے جاؤ تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس وقت وہ کسی وجہ سے برہنہ بیٹھی ہو اور تمہاری نظر اس پر پڑ جائے۔ اس شخص نے کہا کہ (ہرگز نہیں) آپ ﷺ نے فرمایا تو پھر اجازت حاصل کر کے اس کے پاس جایا کرو اس روایت کو امام مالکؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

تشریح: اس سلسلے میں ماں ہی کے حکم میں دیگر محارم بھی ہیں خواہ ان سے نسبی تعلق ہو یا دودھ کا اور خواہ سسرالی، حاصل یہ کہ جن عورتوں سے پردہ کرنا شرعی طور پر ضروری نہیں ہے اور جن کو محارم کہا جاتا ہے اگر ان کے پاس بھی جائے تو اجازت حاصل کئے بغیر نہ جانا چاہئے البتہ بیوی اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔

اجازت کا ایک طریقہ

⑨ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كَانَ لِي مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَدْخَلٌ بِاللَّيْلِ وَمَدْخَلٌ بِالنَّهَارِ فَكُنْتُ اِذَا دَخَلْتُ بِاللَّيْلِ تَنَحْنَحَ لِي۔ (رواه النسائی)

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ میں رسول کریم ﷺ کے پاس رات کو بھی اور دن کو بھی آیا جایا کرتا تھا، چنانچہ جب میں رات کے وقت حاضر ہوتا تو آپ ﷺ مجھے اجازت دینے کے لئے کنکھار دیتے تھے۔" (نسائی)

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ رات کے وقت اجازت دینے کی علامت کھنکارنا تھا، رہی یہ بات کہ دن کے وقت حاضری کی صورت میں کون سی علامت مقرر تھی تو احتمال ہے کہ اس صورت کے لئے امر بالعکس مراد ہو، یعنی حضرت علیؓ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ رات کے وقت تو آنحضرت ﷺ کھنکارتے تھے جو میرے لئے اجازت کے مرادف ہوتا اور جب میں دن کے وقت حاضر ہوتا تو خود کھنکار کر اندر جاتا تھا۔

اس حدیث سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا کھنکارنا اجازت کی علامت تھا، لیکن ایک دوسری روایت میں حضرت علیؓ یہ فرماتے ہیں کہ جب میں رات کے وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ ﷺ کھنکار دیتے تو میں واپس ہو جاتا، اس لئے یہ واضح ہوتا ہے کہ کھنکارنا عدم اجازت کی علامت ہوتا ہے، لہٰذا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھنکارنا صرف اجازت ہی کی علامت نہیں ہوتا تھا بلکہ کوئی ایسا قرینہ ہوگا جس کے ذریعہ بعض اوقات تو کنکھارنا اجازت کی علامت سمجھا جاتا تھا اور بعض اوقات اس کو عدم اجازت کی علامت سمجھتے ہوں گے، لہٰذا وہ قرینہ جس صورت اجازت یا عدم اجازت کو ظاہر کرتا، حضرت علیؓ اسی پر عمل کرتے۔

سلام نہ کرنے والے کو اپنے پاس آنے کی اجازت نہ دو

(۱۰) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَاذَنُوْا لِمَنْ لَمْ یَبْدَأْ بِالسَّلَامِ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص سلام سے پہل نہ کرے اس کو اپنے پاس آنے کی اجازت نہ دو۔" (بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے پاس آنا چاہے لیکن وہ سلام کے ذریعہ اندر آنے کی اجازت طلب نہ کرے یا تمہارے پاس پہنچ کر تمہیں سلام نہ کرے تو اس کو اپنے پاس آنے یا اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت نہ دو بلکہ اس سے کہو کہ وہ دروازے پر واپس جا کر پہلے سلام کرے اور پھر اجازت پانے پر اندر آئے۔

بَابُ الْمُصَافَحَةِ وَالْمُعَانَقَةِ

مصافحہ اور معانقہ کا بیان

"مصافحہ" کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ دست یکدیگر را گرفتن۔ دو آدمیوں کا باہم ایک دوسرے سے ہاتھ ملانا۔ معانقہ کے بارے میں یہ کہا گیا ہے دست در گردن یکدیگر در آوردن۔ یعنی دو آدمیوں کا باہم ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالنا یا دو آمیوں کا باہم ایک دوسرے کو سینے سے لگانا۔

مصافحہ اور معانقہ کے احکام

باہمی ملاقات کے وقت مصافحہ کرنا سُنّت ہے، نیز دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا چاہئے، محض ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا غیر مسنون ہے کسی خاص موقعہ یا کسی خاص تقریب کے وقت مصافحہ ضروری سمجھنا غیر شرعی بات ہے چنانچہ بعض مقامات پر جو یہ رواج ہے کہ کچھ لوگ عصر کی نماز یا جمعہ کے بعد ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہیں اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور ہمارے علماء نے تصریح کی ہے کہ تخصیص وقت کے سبب اس طرح کا مصافحہ مکروہ ہے اور بدعت مذمومہ ہے ہاں اگر کوئی شخص مسجد میں آئے اور لوگ نماز میں مشغول ہوں یا نماز شروع کرنے والے ہوں اور وہ شخص نماز ہو جانے کے بعد ان لوگوں سے مصافحہ کرے تو یہ مصافحہ بلاشبہ مسنون مصافحہ ہے بشرطیکہ اس نے مصافحہ سے پہلے سلام بھی کیا ہو، تاہم یہ واضح رہے کہ اگرچہ کسی متعین اور مکروہ وقت میں مصافحہ کرنا مکروہ ہے لیکن اگر کوئی شخص اس وقت مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائے تو اس کی طرف سے ہاتھ کھینچ لینا اور اس طرح بے اعتنائی برتنا مناسب نہیں ہوگا کیوں کہ اس کی وجہ سے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھانے والے شخص کو دکھ پہنچے گا اور کسی مسلمان کو دکھ نہ پہنچانا آداب کی رعایت سے زیادہ اہم ہے۔

جوان عورت سے مصافحہ کرنا حرام ہے اور اس بوڑھی عورت سے مصافحہ کرنے سے کوئی مضائقہ نہیں ہے جس کی طرف جنسی جذبات مائل نہ ہوسکتے ہوں چنانچہ منقول ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے دور خلافت میں ان بوڑھیوں سے مصافحہ کرتے تھے جن کا

دودھ انہوں نے پیا تھا، اسی طرح وہ بڈھا مرد جو جنسی جذبات کی فتنہ خیزیوں سے بے خوف ہو چکا ہو اس کو جوان عورت سے مصافحہ کرنا جائز ہے، عورت کی طرح خوش شکل امرد سے بھی مصافحہ کرنا جائز نہیں ہے۔ واضح رہے کہ جس کو دیکھنا حرام ہے اس کو چھونا بھی حرام ہے، بلکہ چھونے کی حرمت، دیکھنے کی حرمت سے زیادہ سخت ہے جیسا کہ مطالب المؤمنین میں مذکور ہے۔

صلوٰۃ مسعودی میں لکھا ہے کہ جب کوئی شخص سلام کرے تو اپنا ہاتھ بھی دے یعنی مصافحہ کے لئے ہاتھ دینا سُنّت ہے لیکن مصافحہ کا یہ طریقہ ملحوظ رہے کہ ہتھیلی کو ہتھیلی پر رکھے محض انگلیوں کے سروں کو پکڑنے پر اکتفانہ کرے کیوں کہ محض انگلیوں کے سروں کو پکڑنا مصافحہ کا ایسا طریقہ ہے جس کو بدعت کہا گیا ہے۔

معانقہ یعنی ایک دوسرے کو سینے سے لگانا مشروع ہے خاص طور سے اس وقت جب کہ کوئی شخص سفر سے آیا ہو جیسا کہ حضرت جعفر ابن ابی طالب کی حدیث منقول ہے، لیکن اس کی اجازت اسی صورت میں ہے جب کہ اس کی وجہ سے کسی برائی میں مبتلا ہو جانے یا کسی شک وشبہ کے پیدا ہو جانے کا خوف نہ ہو۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے بارے میں منقول ہے کہ یہ دونوں حضرات معانقہ اور تقبیل یعنی ہاتھ کو منہ اور آنکھوں کے ذریعہ چومنے کی کراہت کے قائل ہیں ان کا یہ کہنا ہے کہ معانقہ کے بارے میں نہی (ممانعت) منقول ہے چنانچہ فصل اول میں حضرت انسؓ کی روایت سے یہ نہی ثابت ہوتی ہے یہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ جن روایتوں سے معانقہ کی اجازت ثابت ہوتی ہے ان کا تعلق اس زمانہ سے ہے جب کہ معانقہ کو ممنوع نہیں قرار دیا گیا تھا۔ بہر حال اس سلسلے میں جو احادیث منقول ہیں اور جن کے درمیان بظاہر اختلاف نظر آتا ہے کہ بعض سے ممانعت کی اجازت ثابت ہوتی ہے۔ اور بعض معانقہ کا تعلق محبت واکرام کے جذبہ سے ہو وہ بلاشک و شبہ جائز ہے بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ معانقہ کے بارے میں فقہا کے درمیان جو اختلاف ہے وہ اس صورت میں ہے جب کہ جسم پر کپڑے نہ ہوں بدن پر قمیص وجبہ وغیرہ ہونے کی صورت میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ بالا اتفاق جائز ہے۔

تقبیل یعنی ہاتھ یا پیشانی وغیرہ چومنا بھی جائز ہے بلکہ بزرگان دین اور متبعین سُنّت علماء کے ہاتھ پر بوسہ دینے کو بعض حضرات نے مستحب کہا ہے۔ لیکن مصافحہ کے بعد خود اپنا ہاتھ چومنا کچھ اصل نہیں رکھتا بلکہ یہ جاہلوں کا طریقہ ہے اور مکروہ ہے۔

امرائے سلطنت اور علماء مشائخ کے سامنے زمین بوسی کرنا حرام ہے، زمین بوسی کرنے والا اور اس زمین بوسی پر راضی ہونے والا دونوں ہی گنہ گار ہوتے ہیں۔ فقیہ ابو جعفرؒ کہتے ہیں کہ سلطان وحاکم کے سامنے زمین بوسی اور سجدہ کرنے والا کافر ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس کی زمین بوسی وسجدہ عبادت کی نیت سے ہو اور اگر تحیہ سلام کے طور پر ہو تو کافر نہیں ہوتا لیکن آثم اور کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور بعض علماء کے قول کے مطابق کسی بھی طرح کی نیت نہ ہونے کی صورت میں بھی کافر ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اکثر علماء کے نزیک زمین بوسی کرنا، زمین پر ماتھا ٹیکنے یا رخسارہ رکھنے سے ہلکا فعل ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ کسی عالم یا سلطان وحاکم کے ہاتھ کو چومنا ان کے علم و انصاف کی بنا پر اور دین کے اعزاز واکرام کے جذبہ سے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اور اگر ان کے ہاتھ چومنے کا تعلق کسی دنیاوی غرض و منفعت سے ہو تو سخت مکروہ ہو گا۔ اگر کوئی شخص کسی عالم یا کسی بزرگ سے اس کا پیر چومنے کی درخواست کرے تو اس کو ہرگز نہیں ماننا چاہئے بچوں کو بوسہ سے پیار کرنے کی اجازت ہے اگرچہ غیر کا بچہ ہو بلکہ وہاں طفل پر بوسہ دینا مسنون ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ جو بوسہ شرعی طور پر جائز ہے اس کی پانچ صورتیں ہیں ایک تو مودت و محبت کا بوسہ جیسے والدین کا اپنے بچے کے رخسار کو چومنا، دوسرے احترام و اکرام اور رحمت کا بوسہ، جیسے اولاد کا اپنے والدین کے سر پر بوسہ دینا، تیسرے جنسی جذبات کے تحت بوسہ دینا، جیسے شوہر کا بیوی کے چہرہ کا بوسہ لینا، چوتھے تحیہ سلام کا بوسہ جیسے مسلمانوں کا ایک دوسرے کے ہاتھ کو چومنا، اور پانچویں وہ بوسہ جو بہن اپنے بھائی کی پیشانی کا لیتی ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک آپس میں ایک دوسرے کے ہاتھ اور چہرہ کا بوسہ دینا مکروہ ہے،

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ چھوٹے بچے کا بوسہ لینا واجب ہے۔
امام نوویؒ نے یہ لکھا ہے کہ شوہر بیوی کے علاوہ کسی اور کا جنسی جذبات کے تحت بوسہ لینا بالاتفاق حرام ہے خواہ وہ باپ ہو یا کوئی دوسرا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

مصافحہ مشروع ہے

① عَنْ قَتَادَةَ قَالَ قُلْتُ لِاَنَسٍ اَكَانَتِ الْمُصَافَحَةُ فِي اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَعَمْ۔ (رواه البخاری)

"حضرت قتادہ تابعیؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انسؓ سے دریافت کیا کہ کیا رسول کریم ﷺ کے صحابہؓ (باہمی ملاقات کے وقت سلام کے بعد) مصافحہ کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا ہاں!۔" (بخاریؒ)

بچے کو چومنا مستحب ہے

② وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَبَّلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْحَسَنَ ابْنَ عَلِيٍّ وَعِنْدَهُ الْاَقْرَعُ بْنُ حَابِسٍ فَقَالَ الْاَقْرَعُ اِنَّ لِيْ عَشْرَةً مِنَ الْوَلَدِ مَا قَبَّلْتُ مِنْهُمْ اَحَدًا فَنَظَرَ اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ مَنْ لَّا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وسنذكر حَدِيْثَ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَثَمَّ لُكَعُ فِيْ بَابِ مُنَاقِبِ اَهْلِ بَيْتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَيْهِمْ اَجْمَعِيْنَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَذُكِرَ حَدِيْثُ اُمِّ هَانِئٍ فِيْ بَابِ الْاَمَانِ۔ (بخاری ومسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے حسن ابن علیؓ کا بوسہ لیا تو ایک صحابی اقرع ابن حابسؓ نے جو اس وقت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہا کہ میرے دس بچے ہیں اور میں نے ان میں سے کسی کا کبھی بوسہ نہیں لیا۔ رسول کریم ﷺ نے یہ سن کر ان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا یعنی جو شخص اپنی اولاد یا مخلوق خدا پر لطف و شفقت نہیں کرتا اس پر اللہ کی رحمت و شفقت نہیں ہوتی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت اَثَمَّ لُكَعُ کو ہم انشاء اللہ مناقب اہل بیت نبی ﷺ وعلیہم اجمعین کے باب میں نقل کریں گے اور حضرت اُمّ ہانیؓ کی روایت باب الامان میں نقل کی جا چکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

مصافحہ کی فضیلت و برکت

③ عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمَيْنِ يَلْتَقِيَانِ فَيَتَصَافَحَانِ اِلَّا غُفِرَ لَهُمَا قَبْلَ اَنْ يَتَفَرَّقَا رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَفِيْ رِوَايَةِ اَبِيْ دَاوُدَ قَالَ اِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ فَتَصَافَحَا وَحَمِدَا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَاهُ غُفِرَ لَهُمَا۔

"حضرت براء ابن عازبؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب دو مسلمان ملتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے جدا ہونے سے پہلے خدا ان کو بخش دیتا ہے۔ (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور ابوداؤدؒ کی روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب دو مسلمان ملیں، ایک دوسرے سے مصافحہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کی حمد کریں اور بخشش چاہیں تو ان دونوں کو

بخشدیا جاتا ہے۔"

تشریح: حکیم ترمذیؒ اور ابوالشیخؒ نے حضرت عمرؓ سے بطریق مرفوع یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب دو مسلمان ملتے ہیں اور ان میں کا ایک اپنے دوسرے ساتھی کو سلام کرتا ہے تو ان میں سے وہ مسلمان اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہوتا ہے جو کشادہ پیشانی اور بشاشت کے ساتھ اپنے دوسرے ساتھی سے ملتا ہے اور پھر جب دونوں مصافحہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر سو رحمتیں نازل کرتا ہے نوے رحمتیں تو اس پر جس نے پہل کی اور دس رحمتیں اس پر جس سے مصافحہ کیا ہے۔

سلام کے وقت جھکنا ممنوع ہے

④ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ الرَّجُلُ مِنَّا یَلْقٰی اَخَاہُ اَوْ صَدِیْقَہٗ اَیَنْحَنِیْ لَہٗ قَالَ لَا قَالَ اَفَیَلْتَزِمُہٗ وَیُقَبِّلُہٗ قَالَ لَا قَالَ اَفَیَاْخُذُ بِیَدِہٖ وَیُصَافِحُہٗ قَالَ نَعَمْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) ہم مین سے کوئی جب اپنے مسلمان بھائی یا اپنے دوست سے ملاقات کرے تو کیا وہ جھک جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں اس شخص نے کہا کہ کیا اس سے گلے ملے اور اس کو بوسہ دے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں اس نے کہا تو کیا اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے مصافحہ کرے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں"!۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سلام کے وقت جھکنا، جیسا کہ کچھ لوگوں کا معمول ہے اور بعض جگہوں پر اس کا رواج ہے، خلاف سُنّت ہے اور آنحضرت ﷺ نے اس کو اس بنا پر پسند نہیں فرمایا کہ یہ چیز رکوع کے حکم میں ہے اور رکوع اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔

یحییٰ نے محی السنۃ سے نقل کیا ہے کہ سلام کے وقت پیٹھ جھکانا مکروہ ہے کیوں کہ اس کی ممانعت میں صحیح حدیث منقول ہے اور اگرچہ بعض اہل علم وصلاح نے اس کو اختیار کیا ہے لیکن ان کا فعل ہرگز قابل اعتبار واعتماد نہیں ہے

مطالب المؤمنین میں حضرت شیخ ابو منصور ماتریدیؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے سامنے زمین بوسی کرے یا اس کے آگے پیٹھ کو جھکائے تو اس کی وجہ سے وہ کافر نہیں ہوگا البتہ گنہ گار ہوگا کیونکہ کسی کے آگے زمین بوسی کرنا یا جھکنا تعظیم کی خاطر ہوتا ہے نہ کہ عبادت کی نیت سے (اور اگر کوئی شخص عبادت کی نیت سے اس طرح کا فعل کرے گا تو وہ یقیناً کافر ہو جائے گا)۔

بعض مشائخ نے اس فعل جھکنے کی ممانعت کو بڑی شدت اور سختی کے ساتھ بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ کاد الانحناء ان یکون کفرا یعنی جھکنا، کفر کے نزدیک پہنچا دیتا ہے۔

جو حضرات معانقہ و تقبیل یعنی گلے لگانا اور ہاتھ وغیرہ چومنے کو مکروہ کہتے ہیں جیسا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام محمد سے منقول ہے، وہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں، تاہم جو حضرات ان چیزوں کی کراہت کے قائل نہیں ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ معانقہ و تقبیل مکروہ ہے، جو تملق یعنی بیجا خوشامد اور تعظیم کے طور پر ہو، یا جس معانقہ و تقبیل سے کسی برائی میں مبتلا ہو جانے یا شک وشبہ کے پیدا ہو جانے کا خوف ہو ورنہ اس صورت میں گلے لگنا اور ہاتھ وغیرہ چومنا جائز ہے جب کسی کو رخصت کیا جائے یا کوئی سفر سے آئے یا کسی سے بہت دنوں کے بعد ملاقات نصیب ہوئی ہو اور یا بوجہ اللہ کسی کی محبّت کا غلبہ اس کا متقاضی ہو۔

سلام، مصافحہ سے پورا ہوتا ہے

⑤ وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ تَمَامُ عِیَادَۃِ الْمَرِیْضِ اَنْ یَّضَعَ اَحَدُکُمْ یَدَہٗ عَلٰی جَبْھَتِہٖ اَوْ عَلٰی یَدِہٖ فَیَسْاَلُہٗ کَیْفَ ھُوَ وَتَمَامُ تَحِیَّاتِکُمْ بَیْنَکُمُ الْمُصَافَحَۃُ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَضَعَّفَہٗ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا مریض کی پوری عیادت یہ ہے کہ تم میں سے کوئی اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر یا اس کے ہاتھ پر رکھے اور پھر پوچھے کہ اس کا کیا حال ہے اور تمہارا پورا سلام کہ جو تم آپس میں کرتے ہو مصافحہ ہے یعنی جب تم سلام کرو تو مصافحہ بھی کرو تاکہ سلام پورا اور کامل ہو اس روایت کو احمدؒ و ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور اس کو ضعیف کہا ہے۔"

سفر سے آنے والے کے ساتھ معانقہ و تقبیل بلا کراہت جائز ہے

⑥ وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ قَدِمَ زَيْدُ بْنُ حَارِثَةَ الْمَدِيْنَةَ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بَيْتِيْ فَاَتَاهُ فَقَرَعَ الْبَابَ فَقَامَ اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُرْيَانًا يَجُرُّ ثَوْبَهُ وَاللّٰهِ مَا رَاَيْتُهُ عُرْيَانًا قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ فَاعْتَنَقَهُ وَقَبَّلَهُ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ زید ابن حارثہؓ جو مشہور صحابیؓ ہیں اور جن کو آنحضرت ﷺ نے بیٹا بنایا تھا، کسی غزوہ یا سفر سے لوٹ کر مدینہ پہنچے تو اس وقت رسول کریم ﷺ میرے گھر میں تشریف فرما تھے، زیدؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے میرے گھر آئے اور دروازہ کھٹکھٹایا، رسول کریم ﷺ برہنہ بدن اپنے کپڑے یعنی چادر کو کھینچتے ہوئے زیدؓ سے ملنے کے لئے باہر تشریف لے گئے (یعنی اس وقت آنحضرت ﷺ کے جسم مبارک پر تہبند کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہیں تھا اور آپ ﷺ اسی حالت میں دروازہ پر تشریف لے گئے) قسم ہے خدا کی میں نے اس سے پہلے اور اس کے بعد کبھی آپ ﷺ کو برہنہ نہیں دیکھا یعنی ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ ﷺ نے کسی کے استقبال کے وقت اس طرح اظہار شوق و تمنا کیا ہو اور اس سے ملنے کے لئے برہنہ بدن باہر تشریف لے گئے ہوں، بہرحال آپ ﷺ نے حضرت زیدؓ کو گلے لگایا اور بوسہ دیا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یہ حدیث اور اسی طرح حضرت جعفر ابن ابوطالبؓ کی حدیث جو آگے آئے گی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ معانقہ و تقبیل یعنی گلے لگانا اور ہاتھ و پیشانی چومنا جائز ہے اور فقہاء نے اسی قول کو اختیار کیا ہے کہ سفر سے آنے والے کے ساتھ معانقہ و تقبیل بلا کراہت جائز ہے۔

معانقہ کا جواز

⑦ وَعَنْ اَيُّوْبَ بْنِ بُشَيْرٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ عَنَزَةَ اَنَّهُ قَالَ قُلْتُ لِاَبِيْ ذَرٍّ هَلْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَافِحُكُمْ اِذَا لَقِيْتُمُوْهُ قَالَ مَا لَقِيْتُهُ قَطُّ اِلَّا صَافَحَنِيْ وَبَعَثَ اِلَيَّ ذَاتَ يَوْمٍ وَلَمْ اَكُنْ فِيْ اَهْلِيْ فَلَمَّا جِئْتُ اُخْبِرْتُ فَاَتَيْتُهُ وَهُوَ عَلٰى سَرِيْرٍ فَالْتَزَمَنِيْ فَكَانَتْ تِلْكَ اَجْوَدَ وَاَجْوَدَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ایوب ابن بشیر بنو عنزہ کے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے بیان کیا کہ میں نے حضرت ابوذرؓ سے پوچھا جب آپ لوگ رسول کریم ﷺ سے ملاقات کیا کرتے تھے تو کیا آنحضرت ﷺ آپ لوگوں سے مصافحہ بھی کیا کرتے تھے؟ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ میں نے جب آنحضرت ﷺ سے ملاقات کی تو آنحضرت ﷺ نے مجھ سے مصافحہ کیا اور ایک دن کا واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مجھے بلانے کے لئے میرے پاس ایک شخص کو بھیجا اس وقت میں اپنے گھر میں موجود نہیں تھا جب میں گھر آیا تو مجھے اس کی اطلاع دی گئی، چنانچہ میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ ﷺ اس وقت ایک تخت پر تشریف فرما تھے آپ ﷺ نے مجھ کو گلے لگایا اور یہ گلے لگانا (حصول لطف و سرور اور برکت کے اعتبار سے مصافحہ کی بہ نسبت) بہتر تھا کہیں زیادہ بہتر۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ سفر سے آنے کے علاوہ دوسری حالتوں میں بھی اظہار محبت و عنایت کے پیش نظر معانقہ کرنا ثابت ہے۔

بارگاہ نبوت ﷺ میں عکرمہؓ ابن ابوجہل کی حاضری کا راز

⑧ وَعَنْ عِكْرَمَةَ بْنِ اَبِىْ جَهْلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ جِئْتُهُ مَرْحَبًا بِالرَّاكِبِ الْمُهَاجِرِ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت عکرمہؓ ابن ابوجہل کہتے ہیں کہ (فتح مکہ کے بعد) اس دن جب کہ میں (اسلام قبول کرنے کے لئے) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے (مجھے دیکھ کر) فرمایا (اللہ اور رسول ﷺ کی طرف یا دار الحرب سے دار السلام کی طرف) ہجرت کرنے والے سوار کو خوش آمدید۔" (ترمذیؒ)

تشریح: سیوطیؒ نے جمع الجوامع میں حضرت مصعب ابن عبداللہ سے نقل کیا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے عکرمہؓ ابن ابوجہل کو اپنے پاس آتے ہوئے دیکھا تو کھڑے ہوگئے اور چل کر ان کے پاس پہنچے اور پھر ان کو گلے سے لگایا اور فرمایا کہ مرحبا بالراکب المہاجر۔

حضرت عکرمہ اسلام قبول کرنے سے پہلے اپنے باپ ابوجہل کی طرح آنحضرت ﷺ سے سخت عداوت رکھتے تھے اور اسلام کے خلاف ہر معرکہ آرائی میں پیش پیش رہتے تھے ان کا خاص وصف شہ سواری تھا جس میں بڑے مشہور تھے اور بڑے جیالے سوار مانے جاتے تھے فتح مکہ کے دن جب اسلام دشمن عناصر کی طاقت آخری طور پر ٹوٹ کر چور چور ہوگئی اور اس خطہ مقدس پر خدا کے نام لیواؤں کا مکمل تسلط و غلبہ ہوگیا تو یہ عکرمہؓ بھی مکہ سے فرار ہو کر یمن پہنچ گئے، پھر ان کی بیوی اُمِ حکیم بنت حارث ان کے پاس یمن گئیں اور ان کو اپنے پاس نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لائیں اور انہوں نے آپ ﷺ کے سامنے اپنی گزشتہ تقصیرات پر ندامت کا اظہار کیا اور معافی و بخشش کے طلبگار ہوئے، آنحضرت ﷺ کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا اور پھر حسن اسلام کی ایسی دولت نصیب ہوئی کہ قابل رشک بن گئے یہاں تک کہ خدا کے دین کا جھنڈا سربلند رکھنے کے لئے اپنی جان تک قربان کردی اور جنگ یرموک میں شہادت کے مرتبہ پر فائز ہوئے۔

واضح رہے کہ اس حدیث میں سفر سے آنے والے کو خوش آمدید کہنے کا ذکر ہے اور خوش آمدید کہنا مصافحہ سے ایک طرح کی مناسبت رکھتا ہے اس اعتبار سے اس حدیث کو یہاں مصافحہ کے باب میں نقل کیا گیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو بوسہ دینے کا ذکر

⑨ وَعَنْ اُسَيْدِ بْنِ حُضَيْرٍ رَجُلٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ قَالَ بَيْنَمَا هُوَ يُحَدِّثُ الْقَوْمَ وَكَانَ فِيْهِ مِزَاحٌ بَيْنَا يُضْحِكُهُمْ فَطَعَنَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِىْ خَاصِرَتِهِ بِعُوْدٍ فَقَالَ اَصْبِرْنِىْ قَالَ اصْطَبِرْ قَالَ اِنَّ عَلَيْكَ قَمِيْصًا وَلَيْسَ عَلَىَّ قَمِيْصٌ فَرَفَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَمِيْصَهُ فَاحْتَضَنَهُ وَجَعَلَ يُقَبِّلُ كَشْحَهُ قَالَ اِنَّمَا اَرَدْتُ هٰذَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت اسید ابن حضیرؓ جو انصار میں سے تھے کے بارے میں راوی کہتے ہیں کہ ایک دن اس وقت جب کہ اسیدؓ لوگوں سے باتیں کررہے تھے اور ان کے مزاج میں جو خوش طبعی و ظرافت تھی اس کے تحت لوگوں کو ہنسا رہے تھے تو نبی کریم ﷺ نے ازراہ مذاق ان کے پہلو میں ایک لکڑی سے ٹھوکا دیا، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ مجھے اس ٹھوکا دینے کا بدلہ دیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ لو! مجھ سے بدلہ لے لو، انہوں نے کہا کہ آپ ﷺ کے جسم پر کپڑا ہے اور میرے جسم پر کپڑا نہیں تھا (اگر میں کپڑے کے اوپر سے ٹھوکا دوں گا تو بدلہ پورا نہیں ہوگا) نبی کریم ﷺ نے یہ سن کر اپنا کرتہ اٹھادیا اسیدؓ آپ ﷺ کے پہلو سے لپٹ گئے اور پہلو پر بوسہ دینا شروع کردیا اور کہنے لگے کہ یارسول اللہ! میں صرف یہی چاہتا تھا یعنی بدن مبارک پر بوسہ دینا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: لفظ "رَجُلٍ" مصابیح میں جس طرح مذکورہ ہے یعنی لام کے زیر کے ساتھ وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ جس شخص کے مزاج میں خوش طبعی و ظرافت تھی اور جس نے آنحضرت ﷺ سے بدلہ کا مطالبہ کیا وہ خود اسید ؓ ہیں جیسا کہ ترجمہ سے واضح ہوا، لیکن جامع الاصول میں یہ لفظ "رَجُلٌ" نہیں بلکہ رجلا منقول ہے، چنانچہ روایت کے الفاظ یوں ہیں عن اسید بن حضیر قال ان رجلا من الانصار کان فیہ مزاح فبینما ھو یحدث القوم یضحکھم اذ طعنہ النبی (یعنی حضرت اسید ؓ سے روایت ہے کہ انصار میں سے ایک شخص تھے جن کے مزاج میں خوش طبعی و ظرافت تھی چنانچہ ایک موقع پر جب لوگوں سے باتیں کر رہے تھے اور ان کو ہنسا رہے تھے تو نبی کریم ﷺ نے ان کے پہلو میں لکڑی سے ٹھوکا دیا، اس سے یہ واضح ہوا کہ خوش طبعی و ظرافت سے ہنسانے والے اور آنحضرت ﷺ سے بدلہ لینے کا مطالبہ کرنے والے کوئی دوسرے صاحب تھے، خود حضرت اسید ؓ نہیں تھے حضرت اسید ؓ تو ان کے واقع کو نقل کرنے والے ہیں۔

چنانچہ طیبیؒ نے جامع الاصول ہی کی روایت کے پیش نظر متن حدیث کی روایت میں توجیہہ و تاویل کر کے اس بات کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ صاحب واقعہ خود اسید ؓ نہیں ہیں بلکہ وہ محض اس واقعہ کے راوی ہیں اور انہوں نے کوشش اس بنا پر کی ہے کہ حضرت اسید ؓ ایک جلیل القدر صحابی تھے ان کا تعلق اونچے درجہ کے صحابہ ؓ کے زمرہ سے تھا لہٰذا ان کی جلالت شان سے یہ مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق خود ان کی ذات سے ہو، واللہ اعلم۔

آنحضرت ﷺ نے ان کو پہلو میں ایک لکڑی سے ٹھوکا دیا ان الفاظ کا محمول یہ ہے کہ وہ صاحب (خواہ اسید ؓ ہوں یا کوئی دوسرے صحابی ؓ) مزاح و ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوڑ رہے تھے اور اپنی باتوں سے لوگوں کو ہنسا رہے تھے اس لئے آنحضرت ﷺ نے بھی اس موقع پر خوش طبع فرمائی اور بطور مزاح ان کے پہلو میں لکڑی سے ٹھوکا دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خوش طبعی و ظرافت کی باتیں کرنا اور ان باتوں کو سننا مباح ہے بشرطیکہ ان کی وجہ سے کسی غیر شرعی اور ممنوع بات کا صدور نہ ہو۔

معانقہ اور بوسہ کا ذکر

(۱۰) وَعَنِ الشَّعْبِيِّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَلَقّٰى جَعْفَرَ بْنَ اَبِي طَالِبٍ فَالْتَزَمَهٗ وَقَبَّلَ مَابَيْنَ عَيْنَيْهِ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْاِيْمَانِ مُرْسَلًا وَفِي بَعْضِ نُسَخِ الْمَصَابِيْحِ وَفِي شَرْحِ السُّنَّةِ عَنِ الْبَيَاضِيِّ مُتَّصِلًا۔

"اور حضرت شعبیؒ تابعی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ حضرت جعفر بن ابی طالب ؓ سے ملے تو ان کو گلے سے لگا لیا اور ان کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اس روایت کو ابوداؤد اور شعب الایمان میں بیہقیؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے جب کہ مصابیح کے بعض نسخوں اور شرح السنۃ میں یہ روایت بیاضی سے بطریق اتصال نقل کی گئی ہے۔"

تشریح: یہ حضرت جعفر ؓ کے حبشہ سے واپس آنے کے اسی واقعہ سے متعلق ہے جس کا ذکر آگے کی حدیث میں بھی آرہا ہے۔

"بیاضی" بیاضہ ابن عامر کی طرف منسوب ہے اور جامع الاصول میں لکھا ہے کہ جہاں مطلق بیاضی بغیر نام کے منقول ہوتا ہے وہاں حضرت عبداللہ ابن جابر انصاری صحابی مراد ہوتے ہیں۔

(۱۱) وَعَنْ جَعْفَرِ بْنِ اَبِي طَالِبٍ فِي قِصَّةِ رُجُوْعِهٖ مِنْ اَرْضِ الْحَبَشَةِ قَالَ فَخَرَجْنَا حَتّٰى اَتَيْنَا الْمَدِيْنَةَ فَتَلَقَّانِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاعْتَنَقَنِيْ ثُمَّ قَالَ مَا اَدْرِيْ اَنَا بِفَتْحِ خَيْبَرَ اَفْرَحُ اَمْ بِقُدُوْمِ جَعْفَرٍ وَوَافَقَ ذٰلِكَ فَتْحَ خَيْبَرَ۔

(رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت جعفر ابن ابی طالب ؓ سرزمین حبشہ سے واپسی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم حبشہ سے روانہ ہوئے اور مدینہ پہنچ کر رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے ملاقات کی آپ ﷺ نے مجھ کو گلے لگایا اور فرمایا میں نہیں کہہ سکتا کہ میں خیبر کے فتح ہو جانے کی وجہ سے زیادہ خوش ہوں، یا جعفر کے واپس آنے کی وجہ سے اور اتفاق سے حضرت جعفر ؓ اسی دن آئے تھے جس

دن خیبر فتح ہوا تھا۔" (شرح السنۃ)

تشریح: حضرت امام شافعیؒ کے شیخ و استاد حضرت سفیان ابن عیینہؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ایک دن حضرت امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت امام مالکؒ نے ان سے مصافحہ کیا اور فرمایا کہ اگر معانقہ بدعت نہ ہوتا تو میں آپ سے معانقہ بھی کرتا۔ حضرت سفیانؒ نے کہا کہ معانقہ تو ان لوگوں نے کیا ہے جو مجھ سے اور آپ سے کہیں بہتر تھے، حبشہ سے حضرت جعفر کی واپسی کے وقت آنحضرت ﷺ ان سے گلے ملے ہیں اور ان کو بوسہ دیا ہے حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ صحیح ہے لیکن وہ حضرت جعفر کے ساتھ مخصوص تھا۔ حضرت سفیانؒ نے جواب دیا کہ جی نہیں وہ معانقہ حضرت جعفرؓ کے ساتھ مخصوص نہیں تھا بلکہ ایک عام مسئلہ کے طور پر تھا اور اگر ہمارا تعلق صلحاء کے زمرہ سے ہو تو ہم اور جعفرؓ (اس مسئلہ میں) ایک جیسی حیثیت رکھتے ہیں، نیز اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی مجلس میں یہ حدیث بیان کروں۔ حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ ہاں! میں اجازت دیتا ہوں چنانچہ حضرت سفیانؒ نے حدیث کو اپنی سند کے ساتھ بیان کیا اور امام مالکؒ نے سکوت اختیار کی۔

پاؤں کو بوسہ دینا جائز نہیں ہے

⑫ وَعَنْ زَارِعٍ وَكَانَ فِيْ وَفْدِ عَبْدِ الْقَيْسِ قَالَ لَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِيْنَةَ فَجَعَلْنَا نَتَبَادَرُ مِنْ رَوَاحِلِنَا فَنُقَبِّلُ يَدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرِجْلَهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت زارعؓ جو عبدالقیس کے وفد میں شامل تھے، کہتے ہیں کہ جب ہم مدینہ پہنچے تو اپنی سواریوں سے جلدی جلدی اترنے لگے اور بارگاہ نبوت ﷺ میں حاضر ہوئے چنانچہ ہم نے رسول کریم ﷺ کے ہاتھوں اور پاؤں کو بوسہ دیا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے معلوم ہوتا ہے پیروں کو چومنا جائز ہے، لیکن فقہاء اس کو ممنوع قرار دیتے ہیں، چنانچہ وہ اس حدیث کی تاویل کرتے ہیں کہ یا تو یہ آنحضرت ﷺ کے خصائص میں سے تھا کہ صرف آپ ﷺ کے پاؤں کو بوسہ دینا جائز تھا۔ یا ابتداءً یہ جائز تھا مگر پھر ممنوع قرار دیدیا گیا، یا وہ لوگ اس مسئلہ سے ناواقف تھے اور اس ناواقفی کی بنا پر سے انہوں نے آپ ﷺ کے پاؤں کے بوسہ دیا اور یا یہ کہ شوق ملاقات میں اضطراری طور پر ان سے یہ فعل صادر ہو گیا تھا۔

اولاد کو بوسہ دینا اظہار محبت کا ذریعہ ہے

⑬ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَارَأَيْتُ اَحَدًا كَانَ اَشْبَهَ سَمْتًا وَهَدْيًا وَدَلًّا وَفِيْ رِوَايَةٍ حَدِيْثًا وَكَلَامًا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ فَاطِمَةَ كَانَتْ اِذَا دَخَلَتْ عَلَيْهِ قَامَ اِلَيْهَا فَاَخَذَ بِيَدِهَا فَقَبَّلَهَا وَاَجْلَسَهَا فِيْ مَجْلِسِهِ وَكَانَ اِذَا دَخَلَ عَلَيْهَا قَامَتْ اِلَيْهِ فَاَخَذَتْ بِيَدِهِ فَقَبَّلَتْهُ وَاَجْلَسَتْهُ فِيْ مَجْلِسِهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے طور طریقہ، عادات وروش اور نیک خصلتی اور ایک روایت میں ہے کہ۔ بات چیت اور کلام میں رسول کریم ﷺ کی مشابہت فاطمہؓ سے زیادہ کسی اور شخص میں نہیں دیکھی (یعنی حضرت فاطمہؓ ان امور میں آنحضرت ﷺ سے بہت مشابہ تھیں۔ حضرت عائشہؓ حضرت فاطمہؓ کے بارے میں یہ بیان کرنے کے بعد اس محبت و تعلق خاطر کو بیان کر رہی ہیں جو حضرت فاطمہؓ اور آنحضرت ﷺ کا ایک دوسرے سے تھا اور جس وجہ سے دونوں کے درمیان کمال مشابہت ظاہر ہوتی ہے چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں) کہ فاطمہؓ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتیں تو آنحضرت ﷺ کھڑے ہو جاتے ان کی طرف متوجہ ہو جاتے پھر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے، ان کو بوسہ دیتے (یعنی ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان پیشانی کو چومتے) اور پھر ان کو اپنے بیٹھنے کی جگہ پر بٹھاتے (یعنی جگہ ان کے بیٹھنے کے لئے چھوڑ دیتے تھے اسی طرح آنحضرت ﷺ جب فاطمہؓ کے ہاں تشریف لے جاتے تو وہ آپ کو دیکھ کر

کھڑی ہو جاتیں آپ ﷺ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتیں، پھر آپ ﷺ کو بوسہ دیتیں (یعنی آپ ﷺ کے دست مبارک کو چومتیں، یا کسی اور جگہ بوسہ دیتیں) اور اپنی جگہ پر بٹھاتیں!۔" (ابوداؤدؒ)

⑭ وَعَنِ الْبَرَآءِ قَالَ دَخَلْتُ مَعَ اَبِیْ بَکْرٍ اَوَّلَ مَاقَدِمَ الْمَدِیْنَةَ فَاِذَا عَائِشَةُ ابْنَتُهٗ مُضْطَجِعَةٌ قَدْ اَصَابَهَا حُمّٰی فَاَتَاهَا اَبُوْبَکْرٍ فَقَالَ کَیْفَ اَنْتِ یَابُنَیَّةُ وَقَبَّلَ خَدَّهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ میں (ایک مرتبہ) کسی غزوہ سے حضرت ابوبکرؓ کے مدینہ آتے ہی ان کے ساتھ (ان کے گھر گیا تو دیکھتا ہوں کہ ان کی صاحبزادی حضرت عائشہ صدیقہؓ لیٹی ہوئی ہیں اور بخار میں مبتلا ہیں، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ان کے پاس آئے اور پوچھا کہ میری بیٹی تمہاری طبیعت کیسی ہے اور انہوں نے (ازراہ شفقت و محبت یا بر عایت سنت) ان کے رخسار پر بوسہ دیا۔" (ابوداؤدؒ)

اولاد کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا

⑮ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اُتِیَ بِصَبِیٍّ فَقَبَّلَهٗ فَقَالَ اَمَا اِنَّهُمْ مَبْخَلَةٌ مَجْبَنَةٌ وَاِنَّهُمْ لَمِنْ رَیْحَانِ اللّٰهِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک بچہ لایا گیا آپ ﷺ نے اس کا بوسہ لیا اور فرمایا کہ جان لو یہ اولاد بخل کا باعث اور بزدلی کا سبب ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اولاد خدا کی عطا کردہ نعمت اور رزق بھی ہے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: اولاد کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے جو کچھ فرمایا ہے اس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اولاد ہی ہے جو انسان سے سب کچھ کراتی ہے ایک باپ اپنے بچوں کے لئے نہ صرف مختلف ذرائع و وسائل اختیار کر کے روپیہ پیسہ کماتا ہے اور مال و اسباب فراہم کرتا ہے بلکہ بچوں کا مستقبل اس کو اس بات پر بھی مجبور کرتا ہے کہ اس نے جو کچھ کمایا ہے اس کو پیسہ پیسہ جوڑ کر رکھے، یہاں تک کہ اولاد کی فکر اس کو بخیل بنا دیتی ہے کہ وہ اپنے روپے پیسے اور مال و اسباب کو نہ خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے نہ بھلائی و انسانی ہمدردی کے کام میں مدد دیتا ہے۔ اور پھر یہ کہ آل و اولاد کی محبت ہی ہوتی ہے جو انسان کو اس حد تک بزدل و نامرد بنا دیتی ہے کہ وہ اعلاء کلمۃ الحق اور دین و حق کی سربلندی کے اپنے فرض کو بھی فراموش کر دیتا ہے چنانچہ جہاد کرنے سے کتراتا ہے اور لڑائی میں جانے سے دل چراتا ہے" اس کو یہ خوف، شجاعت و بہادری دکھانے سے باز رکھتا ہے کہ اگر میں میدان جنگ میں مارا گیا یا مجھے پکڑ لیا گیا تو میرے بچے کا کیا حال ہوگا، ان کی دیکھ بھال اور پرورش کیسے ہوگی اور میرے بچے باپ کے سایہ سے محروم ہو کر کس کس طرح تکلیف و مشقت برداشت کریں گے۔

پہلے تو آنحضرت ﷺ نے گویا اولاد کے بارے میں اس طرح کی برائی بیان کی اور پھر بعد میں اولاد کی ایک خوبی اور اس کی تعریف بھی بیان فرمائی، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ یہ بچے ریحان ہیں! ریحان کے معنی روزی اور نعمت کے بھی ہیں اور ریحان ہر اس پودے اور گھاس کو بھی کہتے ہیں جو خوشبودار ہو، دونوں ہی صورتوں میں اولاد کی مدح (تعریف) ظاہر ہوتی ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے کہ بچے ماں باپ کے حق رزق کا درجہ رکھتے ہیں کہ اگر والدین کی گود اولاد سے خالی ہو تو ان کی ممتا اور ان کے جذبات اسی طرح مضطرب و پریشان رہتے ہیں جس طرح کوئی بھوکا روزی نہ ملنے کی صورت میں مضطرب رہتا ہے، اسی طرح بچے دراصل خدا کی طرف سے ماں باپ کو ایک عظیم نعمت کے طور پر عطا ہوتے ہیں، ایسی نعمت جو ان کی زندگی کا سہارا بھی ہوتی ہے اور ان کے گھر کا چراغ بھی۔

اور اگر "ریحان" سے خوشبودار پودا مراد لیا جائے تو بلاشک و شبہ بچے اپنے ماں باپ اور اہل خاندان کی نظر میں پھول کا درجہ رکھتے ہیں کہ جس طرح کوئی شخص خوشبودار پھول کو دیکھ کر سرور حاصل کرتا ہے اور سونگھ کر مشام جان کو معطر کرتا ہے اسی طرح بچوں کو دیکھ کر خوشی محسوس ہوتی ہے ان کو پیار کر کے، ان کو چوم کر اور ان کے ساتھ خوش طبعی کر کے سرور حاصل کیا جاتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

انسان اور اس کی اولاد

(۱۶) عَنْ يَعْلٰي قَالَ اِنَّ حَسَنًا وَ حُسَيْنًا اِسْتَبَقَا اِلٰي رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم فَضَمَّهُمَا اِلَيْه وَقَالَ اِنَّ الْوَلَد مَبْخَلَةٌ مَجْبَنَةٌ۔ (رواہ احمد)

"حضرت یعلیٰؓ کہتے ہیں کہ ایک دن حسنؓ اور حسینؓ نہیں سے دوڑتے ہوئے رسول کریم ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے ان دونوں کو گلے لگالیا اور فرمایا کہ بچے بخل کا سبب ہیں اور بزدلی کا باعث ہیں۔" (احمدؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ یہاں مذکورہ الفاظ سے بچوں کے تئیں شفقت و محبت اور تعریف کا اظہار مقصود ہے جب کہ پچھلی حدیث میں ان الفاظ کے ذریعہ بچوں کی برائی اور کراہت کو ظاہر کیا گیا ہے۔

ہدیہ و مصافحہ کی فضیلت

(۱۷) وَعَنْ عَطَاءِ نِ الْخُرَاسَانِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَصَافَحُوا يَذْهَبِ الْغُلُّ وَتَهَادُوْا تَحَابُّوْا وَتَذْهَبِ الشَّحْنَاءُ رَوَاهُ مَالِكٌ مُرْسَلاً۔

"اور حضرت عطاء خراسانیؒ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ آپس میں ایک دوسرے سے مصافحہ کیا کرو کہ اس سے بغض و کینہ جاتا رہے گا اور آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ و تحفہ بھیجتے رہا کرو کہ اس سے محبت بڑھتی ہے اور دشمنی جاتی رہتی ہے امام مالکؒ نے اس روایت کو بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

(۱۸) وَعَنِ الْبَرَآءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى اَرْبَعًا قَبْلَ الْهَاجِرَةِ فَكَاَنَّمَا صَلاَّهُنَّ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ وَالْمُسْلِمَانِ اِذَا تَصَافَحَا لَمْ يَبْقَ بَيْنَهُمَا ذَنْبٌ اِلاَّ سَقَطَ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت براء ابن عازبؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے دوپہرے سے پہلے چار رکعت نماز پڑھی اس نے گویا ان چار رکعتوں کو شب قدر میں پڑھا اور دو مسلمان جب آپس میں مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے درمیان کوئی گناہ باقی نہیں رہتا بلکہ جھڑ جاتا ہے، اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ گناہوں سے مراد عام گناہ ہیں، لیکن طیبیؒ نے کہا ہے کہ گناہ سے مراد بغض و کینہ اور دشمنی ہے، جیسا کہ اس سے پہلے حدیث میں بیان کیا گیا۔

بَابُ الْقِيَامِ

کھڑے ہونے کا بیان

"کھڑے ہونے" سے مراد ہے کسی کے لئے تعظیما کھڑے ہونا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ مجلس میں یا اپنے پاس آنے والے شخص کی تعظیم و توقیر کے لئے کھڑے ہوجانا مسنون ہے۔ ان حضرات نے آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی ﷺ سے استدلال کیا ہے کہ قوموا الی سیدکم جیسا کہ آگے حدیث میں آرہا ہے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ مکروہ و بدعت ہے اور اس کی ممانعت ثابت ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس طرح عجمی کھڑے ہوجاتے ہیں اس طرح تم نہ اٹھو اور فرمایا کہ یہ عجمیوں کا دستور ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اہل فضل کی تعظیم کے لئے کھڑے ہونا جائز ہے

① عَنْ اَبِی سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ بَنُوْقُرَیْظَۃَ عَلٰی حُکْمِ سَعْدٍ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَیْہِ وَکَانَ قَرِیْبًا مِنْہُ فَجَآءَ عَلٰی حِمَارٍ فَلَمَّا دَنَامِنَ الْمَسْجِدِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِلْاَنْصَارِ قُوْمُوْا اِلٰی سَیِّدِکُمْ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ وَمَضَی الْحَدِیْثُ بِطُوْلِہٖ فِیْ بَابِ حُکْمِ الْاُسَرَآءِ۔

"حضرت ابوسعید خدری ؓ کہتے ہیں کہ جب بنو قریظہ حضرت سعد ؓ کے حکم وثالث بنانے پر اتر آئے تو رسول کریم ﷺ نے کسی شخص کو حضرت سعد ؓ کے پاس بھیجا (تاکہ وہ ان کو بلا لائے اور وہ آکر بنو قریظہ کا مطالبہ طے کریں) اس وقت حضرت ابوسعد ؓ آنحضرت ﷺ (کی قیام گاہ) کے قریب ہی فروکش تھے، چنانچہ وہ خر پر بیٹھ کر آئے اور جب مسجد کے قریب پہنچے تو رسول کریم ﷺ نے ان کو دیکھ کر فرمایا اے انصار تم اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔" (بخاری ؒ و مسلم ؒ) اور یہ حدیث پوری تفصیل کے ساتھ قیدیوں کے باب میں گزر چکی ہے۔

تشریح: "بنو قریظہ" مدینہ کے یہودیوں کے ایک قبیلہ کا نام ہے، سن ۵ ھ میں غزوہ خندق کے دوران ان یہودیوں نے جو منافقانہ کردار کیا اور باوجودیکہ سابقہ معاہدہ کے تحت مدینہ کے اس دفاعی مورچہ پر ان یہودیوں کو بھی مسلمانوں کے شانہ بشانہ کفار عرب کی جارحیت کا مقابلہ کرنا چاہئے تھا لیکن انہوں نے اپنی روایتی بدعہدی اور شرارت کا مظاہرہ کیا اور مختلف قسم کی سازشوں کے ذریعہ اس دفاعی مورچہ کو توڑنے کے لئے کفار عرب کے آلہ کار بن گئے انکی اس بدعہدی اور سازشی کاروائیوں کی بناء پر آنحضرت ﷺ نے غزوہ خندق کی فتح سے فارغ ہوتے ہی ان بنو قریظہ کے ساتھ اعلان جنگ کر دیا اور ان سب یہودیوں کو ان کے قلعہ میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا، مسلمانوں کی طرف سے بنو قریظہ کے قلعہ کا محاصرہ ۲۵ دن تک جاری رہا آخر کار انہوں نے یہ تجویز رکھی کہ ہمارا معاملہ حضرت سعد ابن معاذ کے سپرد کر دیا جائے جو قبیلہ اوس کے سردار تھے اور قبیلہ اوس بنو قریظہ کا حلیف تھا، ان یہودیوں نے کہا کہ حضرت سعد ابن معاذ ؓ کو پنچ اور حکم تسلیم کرتے ہیں، وہ ہمارے بارے میں جو بھی فیصلہ کریں گے ہم اس کو بے چون وچرا مان لیں گے، یہودیوں کا خیال تھا کہ حضرت سعد ؓ چونکہ ہمارے حلیف قبیلے کے سردار ہیں اور ان کے اور ہمارے درمیان تعلقات کی ایک خاص نوعیت ہے اس لئے حضرت سعد ؓ یقیناً ہمارے ہی حق میں فیصلہ دیں گے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت سعد ؓ کو بلا بھیجا کہ وہ آکر اس معاملہ میں اپنا فیصلہ دیں، حضرت سعد ؓ اگرچہ اس وقت آنحضرت ﷺ کی قیامگاہ کے قریب ہی فروکش تھے لیکن چونکہ غزوہ خندق میں وہ بہت سخت مجروح ہو گئے تھے اور خاص طور پر رگ ہفت اندام پر ایک زخم پہنچا تھا۔ جس سے خون برابر جاری تھا اس لئے خچر پر بیٹھ کر بارگاہ نبوت ﷺ میں حاضر ہوئے اس وقت تک ان کے زخم سے خون جاری تھا لیکن یہ آنحضرت ﷺ کا اعجاز تھا کہ جب آپ نے ان کو بلوا بھیجا تو خون رک گیا، بہر حال حضرت معاذ ؓ آئے اور انہوں نے پورے معاملہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے اور ان کے جرم بدعہدی و غداری کی بنا پر انہی کی شریعت کے مطابق جو فیصلہ دیا اس کا اصل یہ تھا کہ ان کے لڑسکنے والے مرد قتل کر دیئے جائیں، عورتیں اور بچے غلام بنا لئے جائیں اور ان کے مال و اسباب کو تقسیم کر دیا جائے۔ اس فیصلہ پر کسی حد تک عمل بھی ہوا۔

یہاں حدیث میں اسی وقت کے واقعہ کا ذکر ہے کہ جب حضرت سعد ؓ آئے تو آنحضرت ﷺ نے انصار سے کہا کہ دیکھو تمہارے سردار آرہے ہیں کھڑے ہو جاؤ۔ چنانچہ اکثر علماء اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر کوئی صاحب فضل وقابل تکریم شخص آئے تو اس کے اعزاز و احترام کے لئے کھڑے ہو جانا چاہئے، اس کے برخلاف بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ قوموا الی سیدکم سے آنحضرت ﷺ کی یہ مراد نہیں تھی کہ سعد ؓ کی تعظیم وتکریم کے لئے کھڑے ہو جاؤ جیسا کہ کسی بڑے آدمی کے آجانے پر کھڑے ہونے کا رواج ہے اور جس کی ممانعت ثابت ہے اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ چیز عجمیوں کے رائج کردہ تکلفات میں سے ہے، نیز یہ عمل

آنحضرت ﷺ کے نزدیک آخر زمانہ حیات تک ناپسندیدہ رہا، یحییٰ کہتے ہیں کہ اگر اس ارشاد سے آنحضرت ﷺ کی مراد تعظیم و تکریم کے لئے کھڑے ہو جانے کا حکم دینا ہوتا تو آپ ﷺ اس موقع پر قوموا الی سیدکم نہ فرماتے بلکہ یہ فرماتے کہ قوموا السیدکم لہٰذا ان علماء کے مطابق اس حکم سے آنحضرت ﷺ کی مراد یہ تھی کہ دیکھو تمہارے سردار سعدؓ آرہے ہیں، ان کی حالت اچھی نہیں ہے، جلدی سے اٹھ کر ان کے پاس جاؤ اور سواری سے اترنے میں ان کی مدد کرو تاکہ اترتے وقت ان کو تکلیف نہ ہو اور زیادہ حرکت کی بنا پر زخم سے خون نہ بہنے لگے۔ ان علماء کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ جو روایت ہے کہ حضرت عکرمہؓ ابن ابی جہل جب بارگاہ نبوت ﷺ میں حاضر ہوئے تو آپ ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے تھے۔ یا حضرت عدیؓ ابن حاتم کی جو یہ روایت نقل کی جاتی ہے کہ انہوں نے کہا میں جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا آپ ﷺ میرے لئے یا تو کھڑے ہو جاتے یا اپنی جگہ سے ہل جایا کرتے تھے تو ان روایتوں سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ محدثین نے ان روایتوں کو ضعیف قرار دیا ہے۔

جو حضرات اہل فضل و کمال کے آنے پر کھڑے ہونے کو جائز قرار دیتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر حضرت عکرمہؓ اور حضرت عدیؓ کے بارے میں مذکورہ بالا روایتیں ضعیف ہیں اور ان سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے تو پھر اس روایت کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو حضرت فاطمہؓ کے بارے میں منقول ہے کہ جب آنحضرت ﷺ حضرت فاطمہؓ کے پاس تشریف لاتے تو حضرت فاطمہؓ آپ ﷺ کے لئے کھڑی ہو جاتی تھیں اور جب حضرت فاطمہؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتیں تو آنحضرت ﷺ ان کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ اگر اس روایت کی یہ تاویل کی جائے کہ ان کا کھڑا ہونا اظہار محبت و استقبال کے طور پر ہوتا نہ کہ تعظیم و اجلال کے طور پر، تو یہ تاویل بعید از حقیقت سمجھے جانے سے خالی نہیں ہوگی علاوہ ازیں خود طیبیؒ نے محی السنۃ سے نقل کیا ہے کہ جمہور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس حدیث کے پیش نظر اہل فضل و کمال جیسے علماء و صلحاء اور بزرگان دین کا اعزاز و اکرام کرنا جائز ہے، علاوہ ازیں محی الدین نوویؒ نے یہ لکھا ہے کہ یہ کھڑا ہونا اہل فضل کے آنے کے وقت مستحب ہے اور نہ صرف یہ کہ اس سلسلے میں احادیث بھی منقول ہیں، بلکہ اس کی صریح ممانعت کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

مطالب المؤمنین میں قنیہ کے حوالہ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ آنے والے کی تعظیم کے طور پر بیٹھے ہوئے لوگوں کا قیام یعنی کھڑے ہو جانا مکروہ نہیں ہے اور یہ کہ قیام بنفسہ مکروہ نہیں ہے بلکہ قیام کی طلب و پسندیدگی مکروہ ہے چنانچہ وہ قیام ہرگز مکروہ نہیں ہوگا جو کسی ایسے شخص کے لئے کیا جائے جو نہ تو اپنے لئے قیام کی طلب رکھتا ہو اور نہ اس کو پسند کرتا ہو۔

قاضی عیاض مالکیؒ نے یہ لکھا ہے کہ کھڑے ہونے کی ممانعت کا تعلق اس شخص کے حق میں ہے جو بیٹھا ہوا ہو اور بیٹھے رہنے تک لوگ اس کے سامنے کھڑے رہیں جیسا کہ ایک حدیث میں منقول ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص نظر آئے جو علم و فضل اور بزرگی کا حامل ہو تو اس کی تعظیم و توقیر کے طور پر کھڑے ہو جانا جائز ہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ ایسے شخص کے آنے پر کھڑے ہونا جو نہ صرف یہ کہ اس اعزاز کا مستحق نہ ہو بلکہ اپنے آنے پر لوگوں کے کھڑے ہو جانے کی طلب و خواہش بھی رکھتا ہو، مکروہ ہے اور اسی طرح بیجا خوشامد و چاپلوسی کے طور پر کھڑے ہونا بھی مکروہ ہے، نیز دنیاداروں کے لئے کھڑے ہونا اور ان کی تعظیم کرنا بھی نہایت مکروہ ہے اور اس بارے میں سخت وعید منقول ہے۔

کسی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر وہاں بیٹھنا سخت برا ہے

(۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يُقِيْمُ الرَّجُلُ الرَّجُلَ مِنْ مَجْلِسِهٖ ثُمَّ يَجْلِسُ فِيْهِ وَلٰكِنْ تَفَسَّحُوْا وَتَوَسَّعُوْا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ایسا نہ ہونا چاہئے کہ جو آدمی جس جگہ بیٹھ گیا ہو کوئی شخص

اس کو وہاں سے اٹھا کر خود اس جگہ بیٹھ جائے، البتہ بیٹھنے کی جگہ کو کشادہ رکھو اور آنے والے کو جگہ دو تاکہ اٹھانے کی حاجت نہ پڑے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ ولکن کے بعد لیقل کا لفظ مقدر ہے یعنی مفہوم کے اعتبار سے اصل عبارت یوں ہے کہ ولکن لیقل تفسحوا او توسعوا، اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ (کوئی شخص کسی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر وہاں نہ بیٹھے) بلکہ اس سے یہ کہنا چاہئے کہ کشادگی کے ساتھ بیٹھو اور آنے والے کو جگہ دو

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں مذکورہ ممانعت نہی تحریمی کے طور پر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی جگہ پہلے پہنچ کر بیٹھ جائے جو کسی کے لئے مخصوص نہیں ہے مثلاً جمعہ وغیرہ کے دن مسجد وغیرہ میں پہلے پہنچ جائے اور آگے کی صف میں بیٹھ جائے، یا اس کے علاوہ کسی اور مجلس وغیرہ میں پہلے پہنچ کر کسی عام جگہ پر بیٹھ جائے تو اس جگہ بیٹھنے کا سب سے بڑا حقدار وہی ہوگا، دوسرے کسی شخص کے لئے یہ حرام ہوگا کہ وہ اس (پہلے) شخص کو اس جگہ سے اٹھا کر وہاں خود بیٹھ جائے۔

اپنی جگہ سے کچھ دیر کے لئے اٹھ کر جانے والا اس جگہ پر اپنا حق برقرار رکھتا ہے

(۳) وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَامَ مِنْ مَجْلِسِهٖ ثُمَّ رَجَعَ اِلَیْهِ فَهُوَ اَحَقُّ بِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنی جگہ سے اٹھ کر جائے اور پھر وہاں واپس آئے تو اس جگہ کا زیادہ حق دار وہی ہوگا۔" (مسلمؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ وہ شخص اپنی جگہ سے اس ارادہ نیت کے ساتھ اٹھ کر گیا ہو کہ پھر جلدی اس جگہ واپس آئے گا مثلاً وہ وضو کے لئے اٹھ کر گیا ہو یا اس کو کوئی ایسی ضرورت پیش آگئی ہو جس کی بنا پر اس کو تھوڑی دیر کے لئے وہاں سے اٹھ کر جانا ضروری ہو گیا، وہ وضو کر کے یا اس کام کو پورا کر کے جلد ہی واپس آگیا ہو تو اس جگہ کا زیادہ مستحق وہی شخص ہوگا، چنانچہ اس صورت میں اگر کوئی دوسرا شخص آکر اس جگہ بیٹھ گیا ہو تو اس کو اٹھانا درست ہوگا کیوں کہ وہ (پہلا) شخص اس جگہ بیٹھنے کے اپنے حق سے محروم نہیں ہوا ہے بایں طور کہ عارضی طور پر کسی ضرورت سے اٹھ کر جانے اور پھر جلد ہی اپنی جگہ پر واپس آجانے کی وجہ سے اس جگہ پر اس کا حق قرار رہے گا اس کی تائید آگے آنے والی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی جگہ تشریف رکھتے اور پھر وہاں سے اٹھ کر کہیں جانے کی ضرورت پیش آتی اور واپس آنے کا ارادہ ہوتا تو آپ ﷺ اپنی جگہ پر اپنی جوتیاں چھوڑ جاتے۔ تاہم یہ واضح رہے کہ اگر کوئی شخص اپنی جگہ چھوڑ کر مجلس سے اٹھا اور کسی ضرورت سے کہیں دور دراز یا طویل وقفہ کے لئے چلا گیا اور پھر واپس آیا تو اس صورت میں وہ اپنی سابقہ جگہ کا مستحق نہیں رہے گا اگرچہ اس جگہ پر وہ اپنی کوئی چیز ہی چھوڑ کر کیوں نہ گیا ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

آنحضرت ﷺ اپنے لئے کھڑے ہونے کو پسند نہیں فرماتے تھے

(۴) عَنْ اَنَسٍ قَالَ لَمْ یَکُنْ شَخْصٌ اَحَبَّ اِلَیْهِمْ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَکَانُوْا اِذَا رَاَوْهُ لَمْ یَقُوْمُوْا لِمَا یَعْلَمُوْنَ مِنْ کَرَاهِیَتِهٖ لِذٰلِكَ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ۔

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ صحابہؓ کے نزدیک رسول کریم ﷺ سے زیادہ محبوب و عزیز کوئی اور شخص نہیں تھا، لیکن (اس محبت و تعلق کے باوجود) صحابہؓ جب آنحضرت ﷺ کو دیکھتے تو کھڑے نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت ﷺ اس (کھڑے ہونے) کو پسند

نہیں فرماتے اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ اپنی انکساری کے اظہار اور اہل تکبر کے طور طریقوں کی مخالفت کی بنا پر اس بات کو پسند نہیں فرماتے تھے کہ جب آپ ﷺ مجلس میں تشریف لائیں تو صحابہؓ آپ ﷺ کو دیکھ کر تعظیما کھڑے ہو جائیں بلکہ آپ ﷺ کھڑے ہونے، بیٹھنے، کھانے پینے، چلنے پھرنے اور دیگر افعال و اخلاق میں ترک تکلّفات پر قائم و عامل تھے جو اہل عرب کی عادت تھی اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا۔

انا واتقياء امتي برآء من التكلف۔

"میں اور میری اُمّت کے متقی لوگ، تکلّف سے بیزار ہیں۔"

اور طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس چیز کو ناپسند کرنا کمال محبت، صفائی باطن، اور اتحاد قلوب کی بنا پر تھا کہ قلبی اتحاد اور تعلق کا کمال اس طرح کے تکلّفات کا متقاضی نہیں ہوتا۔

حاصل یہ کہ تعظیما کھڑے ہونا اور کھڑے نہ ہونا دونوں صورتوں کا تعلق وقت و حالات اور اشخاص و تعلّقات کے تفاوت پر مبنی ہوتا ہے کہ بعض وقت اور بعض حالات میں آنے والے کے لئے احتراما کھڑے ہو جانا مناسب ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں کھڑے نہ ہونا ہی مناسب ہوتا ہے خاص طور پر اس صورت میں جب کہ یہ معلوم ہو کہ آنے والا کھڑے ہونے کو پسند نہیں کرتا یا آپس کے تعلّقات تکلّفات کے محتاج نہیں ہیں، نیز کسی ایسے شخص کے لئے کھڑے ہونا جائز نہیں ہے جو کسی بھی طرح کی دینی فضیلت نہیں رکھتا بلکہ کوئی دنیاوی حیثیت رکھتا ہے۔

لوگوں کو اپنے سامنے کھڑا رکھنے والے کے بارے میں وعید

⑤ وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهُ اَنْ يَتَمَثَّلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّءْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔ (رواه الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص اس بات کو پسند کرتا ہو کہ لوگ اس کے سامنے سیدھے کھڑے رہیں تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے بیٹھنے کی جگہ دوزخ میں تیار کرے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: تیار کرے یہ امر (حکم) خبر کے معنی میں ہے یعنی اس اسلوب بیان کے ذریعہ آپ ﷺ نے گویا یہ خبر دی ہے کہ جو شخص اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ لوگ اس کے سامنے باادب کھڑے رہیں تو اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس نے اپنے آپ کو دوزخ میں داخل ہونے کا مستوجب بنا لیا ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہ وعید اس شخص کے حق میں ہے جو بطریق تکبر اور اپنی تعظیم کرانے کے لئے اپنے سامنے لوگوں کے کھڑے رہنے کو پسند کرتا ہو، ہاں اگر کوئی شخص اس طرح کی طلب و خواہش نہ رکھتا ہو بلکہ لوگ خود اپنی خوشی سے اس کی خدمت کے لئے یا طلب ثواب کی خاطر اور یا بطور تواضع و انکساری اس کے سامنے کھڑے رہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ حاصل یہ کہ مکروہ و ممنوع یہ چیز ہے کہ اپنی تعظیم و احترام کرانے کے اور اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے اپنے سامنے لوگوں کے کھڑے رہنے کو پسند کیا جائے اور اگر یہ صورت نہ ہو تو پھر مکروہ و ممنوع نہیں ہوگا۔

بیہقیؒ نے شعب الایمان میں خطابیؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ (اس وعید کا تعلق اس شخص کی ذات سے ہے) جو بطریق تکبر و نخوت لوگوں کو یہ حکم دے کہ وہ اس کے سامنے کھڑے رہیں یا وہ لوگوں کے لئے ضروری قرار دیدے کہ وہ جب بھی اس کے سامنے آئیں کھڑے رہیں۔ نیز کہا ہے کہ حضرت سعدؓ کے بارے میں جو حدیث گزری ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ سردار و امیر، فاضل و

والی، اور عادل و منصف کے سامنے کسی شخص کا باادب کھڑے رہنا جیسا کہ کوئی شاگرد اپنے استاد کے سامنے کھڑا رہتا ہے، مستحب ہے نہ کہ مکروہ اور بیہقیؒ نے اس قول کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ مذکورہ لوگوں کے کھڑے رہنا دراصل بھلائی حاصل کرنے اور تکریم و توقیر کے طور پر کھڑے ہو جانے کے مرادف ہے جیسا کہ (آنحضرت کے حکم پر) انصار حضرت سعدؓ کے لئے کھڑے ہوئے تھے یا حضرت طلحہ حضرت کعب ابن مالکؓ کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے، تاہم یہ ملحوظ رہے کہ جو شخص اس طرح کی حیثیت و فضیلت رکھتا اس کے سامنے احتراماً کھڑے ہو جانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اس کے لئے بھی قطعاً مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے سامنے لوگوں کے کھڑے ہو جانے کی طلب رکھے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کھڑا نہ ہو تو وہ اس سے کینہ رکھے، یا اس کا شکوہ کرے اور یا اس سے ناراض ہو جائے۔

احتراماً کھڑے ہونے کی ممانعت

(۶) وَعَنْ اَبِی اُمَامَةَ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مُتَّکِئًا عَلٰى عَصًا فَقُمْنَا لَهٗ فَقَالَ لَا تَقُوْمُوْا کَمَا یَقُوْمُ الْاَعَاجِمُ یُعَظِّمُ بَعْضُهَا بَعْضًا۔ (رواہ ابوداؤد)

”اور حضرت امامہ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ عصاء مبارک پر سہارا دیئے ہوئے باہر تشریف لائے تو ہم آپ ﷺ کے احترام میں کھڑے ہو گئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ اس طرح کھڑے نہ ہو جس طرح عجمی لوگ کھڑے ہوتے ہیں کہ ان میں بعض بعض کی تعظیم کرتے ہیں۔“ (ابوداؤد)

تشریح: آنحضرت ﷺ کی یہ مراد تھی کہ یہ عجمی لوگوں کا دستور ہے کہ جب ان کا کوئی سردار یا بڑا آدمی ان کی مجلس میں آتا ہے تو محض اس کو دیکھتے ہی بڑبڑا کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور پھر اس کے سامنے باادب دست بستہ کھڑے رہتے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے اس ارشاد ”یعظم بعضها بعضا“ کے ذریعہ اسی طرف اشارہ فرمایا کہ ان میں کے چھوٹے اور کمتر لوگ اپنے بڑے اور اونچی حیثیت کے لوگوں کو محض دیکھ کر اس طرح کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اگر وہ کھڑے نہ ہوئے تو وہ بڑے لوگ ان سے ناراض ہو جائیں گے اور پھر تعظیماً ان کے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔ اس توجیہ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہاں حدیث میں اصل قیام کا ممنوع ہونا ثابت نہیں ہوتا جس کا جواز دیگر احادیث سے ثابت ہے بلکہ وہ قیام ممنوع ہے جو شان و شکوہ کے اظہار اور تکبر و نخوت کے طور پر ہو، زیادہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تواضع و انکساری کی بنا پر صحابہؓ کو کھڑے ہونے سے منع فرمایا، جیسا کہ پہلے ایک حدیث میں گزر چکا ہے۔

دوسرے کی جگہ پر بیٹھنے کی ممانعت

(۷) وَعَنْ سَعِیْدِ بْنِ اَبِی الْحَسَنِ قَالَ جَآءَنَا اَبُوْبَکْرَةَ فِیْ شَهَادَةٍ فَقَامَ لَهٗ رَجُلٌ مِّنْ مَجْلِسِهٖ فَاَبٰى اَنْ یَّجْلِسَ فِیْهِ وَقَالَ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ ذَا وَنَهَى النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْ یَّمْسَحَ الرَّجُلُ یَدَهٗ بِثَوْبِ مَنْ لَّمْ یَکْسُهٗ (رواہ ابوداؤد)

”اور حضرت سعید ابن ابوالحسنؒ جو ایک جلیل القدر اور ثقہ تابعی اور حضرت حسن بصری کے بھائی ہیں کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت ابوبکرہؓ صحابی، ہمارے پاس (ایک ایسے مقدمہ میں) گواہی دینے کے لئے تشریف لائے (جس میں وہ گواہ تھے) ایک شخص اس کے احترام میں اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا (تاکہ وہ اس جگہ بیٹھ جائیں لیکن انہوں نے اس جگہ پر بیٹھنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے (یعنی آپ ﷺ نے اس جگہ پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے جہاں کوئی شخص پہلے سے بیٹھا ہوا ہو اور عارضی طور پر اس جگہ سے اٹھ گیا ہو) نیز آنحضرت ﷺ نے اس بات سے بھی منع فرمایا ہے کہ کوئی آدمی کسی ایسے شخص کے کپڑے سے اپنے ہاتھ پونچھے جس کو اس نے کپڑا نہیں پہنایا ہے۔“ (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث میں مذکور دوسری ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کھانے وغیرہ میں ہاتھ بھر گئے ہوں تو ان ہاتھوں کو کسی اجنبی کے کپڑے سے نہ پونچھے بلکہ ایسے شخص کے کپڑے سے ہاتھ پونچھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جس کو اس نے کپڑے پہنائے اور دیئے ہوں، جیسے اپنی اولاد، یا غلام اور یا خادم وغیرہ اور زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس اجنبی کے کپڑے سے پونچھنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے جو اس بات پر راضی ہو۔ اس پر حدیث کے پہلے جزو کے مسئلہ کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اگر یہ معلوم ہو کہ کوئی شخص اس کے لئے اپنی جگہ سے بطیب خاطر اٹھا ہے تو اس کی جگہ بیٹھنے میں کوئی مضائقہ نہیں جیسا کہ اس آیت تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ سے مفہوم ہوتا ہے اور جیسا کہ اس پر حدیث بھی دلالت کرتی ہے۔ صدر الدابة احق بصاحبها الا اذا اذن۔ نیز اس طرح اور بہت سے منقولات ہیں جن سے یہ وضاحت مفہوم ہوتی ہے۔ رہی یہ بات کہ جب وہ شخص حضرت ابوبکرؓ کے لئے اپنی مرضی سے جگہ چھوڑ کر اٹھا تھا تو حضرت ابوبکرؓ نے بیٹھنے سے کیوں انکار کر دیا؟ تو ان کے انکار کا سبب یہ تھا کہ ان کو اس شخص کی رضامندی کے بارے میں شک ہوا ہوگا اور انہوں نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ یہ شخص از خود بطیب خاطر اپنی جگہ سے نہیں اٹھا ہے بلکہ کسی اور شخص کے کہنے سے اٹھا ہے یا شرم حضوری میں اٹھا ہے اور یا یہ کہ اس شخص کی رضامندی جاننے کے باوجود حضرت ابوبکرؓ نے احتیاط و تقویٰ اسی میں دیکھا ہوگا کہ وہ اس کی جگہ پر نہ بیٹھیں یا انہوں نے ممانعت کی حدیث کو اطلاق پر محمول کیا ہوگا اور رضامندی کو بھی عدم ممانعت کا سبب نہیں سمجھتے ہوں گے۔

اپنی جگہ سے اٹھ کر جانے لگو تو وہاں کوئی چیز رکھ دو

⑧ وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا جَلَسَ وَجَلَسْنَا حَوْلَهُ فَقَامَ فَاَرَادَ الرُّجُوْعَ نَزَعَ نَعْلَهُ اَوْبَعْضَ مَا يَكُوْنُ عَلَيْهِ فَيَعْرِفُ ذٰلِكَ اَصْحَابُهُ فَيَثْبُتُوْنَ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب تشریف رکھتے اور ہم آپ ﷺ کے گرد بیٹھتے اور پھر آپ ﷺ واپس آنے کے ارادہ سے گھر میں جانے کے لئے اٹھتے تو اپنی جگہ پر جوتیاں اتار کر رکھ جاتے اور ننگے پیر چلتے جاتے یا اپنے بدن پر کوئی چیز جیسے چادر وغیرہ اس جگہ چھوڑ جاتے اس سے آپ ﷺ کے صحابہؓ جان لیتے کہ آپ ﷺ مجلس میں پھر آئیں گے، چنانچہ وہ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہتے۔"

(ابوداؤدؒ)

تشریح: "آپ ﷺ کے گرد" سے مراد آپ ﷺ کے دائیں طرف، بائیں طرف اور سامنے بیٹھنا ہے، یعنی کچھ صحابہؓ آپ ﷺ کے داہنے ہاتھ کی طرف بیٹھتے کچھ بائیں ہاتھ کی طرف اور کچھ سامنے بیٹھ جاتے! یہ معنی اس لئے بیان کئے گئے ہیں کہ اگر گرد سے مراد چاروں اطراف لی جائیں تو یہ صحیح نہیں ہوگا کیونکہ حلقہ کے درمیان بیٹھنے کی ممانعت منقول ہے۔

دو آدمیوں کے درمیان گھس کر بیٹھنے کی ممانعت

⑨ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَحِلُّ لِرَجُلٍ اَنْ يُفَرِّقَ بَيْنَ اثْنَيْنِ اِلَّا بِاِذْنِهِمَا۔ (رواه الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کسی شخص کے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ دو بیٹھے ہوئے آدمیوں کے درمیان ان کی اجازت کے بغیر جدائی ڈالے۔" (ترمذی، وابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر دو آدمی ایک ساتھ بیٹھے ہوئے ہوں تو کسی تیسرے شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان گھس کر بیٹھ جائے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں آدمی آپس میں محبت و تعلق رکھتے ہوں، اور رازدارانہ طور پر ایک دوسرے سے کوئی بات چیت کرنا چاہتے ہوں، اگر کوئی تیسرا آدمی ان کے درمیان حائل ہو کر بیٹھے گا تو اس کا وہاں بیٹھنا ان پر شاق گزرے گا۔ علماء

نے یہ وضاحت کی ہے کہ اگر یہ معلوم ہو کہ یہ دونوں بیٹھے ہوئے آدمی آپس میں محبت و تعلق رکھتے ہیں تو ان کے درمیان نہ بیٹھے اور اگر یہ معلوم ہو کہ ان دونوں کے درمیان اتحاد و محبت کا علاقہ نہیں ہے تو اس صورت میں ان کے درمیان بیٹھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا اور اگر ان دونوں کے درمیان تعلق مبہم ہو یعنی یقینی طور پر یہ معلوم نہ ہو کہ ان کے درمیان محبت کا علاقہ ہے یا نہیں، یا سرے سے یہ معلوم ہی نہ ہو تو اس صورت میں احتیاط کا تقاضہ یہ ہوگا کہ ان کے درمیان نہ بیٹھے۔

(۱۰) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَجْلِسْ بَيْنَ رَجُلَيْنِ اِلَّا بِاِذْنِهِمَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمرو ابن شعیبؒ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا پہلے سے بیٹھے ہوئے، دو آدمیوں کے درمیان نہ بیٹھو الا یہ کہ ان کی اجازت حاصل ہو۔" (ابوداؤد)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

آنحضرت ﷺ جب مجلس سے اٹھتے تھے تو صحابہؓ کھڑے ہو جاتے تھے

(۱۱) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْلِسُ مَعَنَا فِي الْمَسْجِدِ يُحَدِّثُنَا فَاِذَا قَامَ قُمْنَا قِيَامًا حَتّٰى نَرَاهُ قَدْ دَخَلَ بَعْضَ بُيُوْتِ اَزْوَاجِهٖ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ مسجد میں ہمارے ساتھ بیٹھتے اور باتیں کیا کرتے تھے، پھر جب آپ مجلس سے اٹھتے تو ہم بھی کھڑے ہو جاتے تھے اور دیر تک کھڑے رہتے تھے یہاں تک کہ ہم دیکھتے کہ آپ ﷺ اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی ایک کے گھر میں تشریف لے گئے ہیں۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ جب مجلس سے اٹھتے تو اس وقت صحابہؓ کا کھڑا ہونا احتراماً کھڑے ہو جانا کے طور پر نہیں ہوتا تھا بلکہ مجلس کے برخاست ہو جانے کی وجہ سے ہوتا تھا اور ظاہر بھی ہے کہ جب صحابہؓ آپ ﷺ کی تشریف آوری کے وقت نہیں کھڑے ہوتے تھے تو جانے کے وقت کیوں کھڑے ہوتے تھے رہی یہ بات کہ اس وقت صحابہؓ دیر تک کیوں کھڑے رہتے تھے تو اس کی وجہ شاید یہ ہوگی کہ آنحضرت ﷺ جب مجلس سے اٹھ کر جانے لگتے تو صحابہؓ اس انتظار میں رک جاتے تھے کہ شاید آپ ﷺ کسی کام کے لئے فرمائیں گے یا یہ امید ہوتی تھی کہ آپ ﷺ دوبارہ تشریف لائیں گے اور مجلس برقرار رہے گی، لیکن جب یہ امید ختم ہو جاتی تو صحابہؓ اپنی اپنی راہ پکڑتے۔

مجلس میں آنے والے شخص کے لئے جگہ نکالنا تہذیب کا تقاضہ ہے

(۱۲) وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ دَخَلَ رَجُلٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ قَاعِدٌ فَتَزَحْزَحَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ الرَّجُلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ فِي الْمَكَانِ سَعَةً فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلْمُسْلِمِ لَحَقًّا اِذَا رَاٰهُ اَخُوْهُ اَنْ يَتَزَحْزَحَ لَهٗ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت واثلہ ابن خطابؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا جب کہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے رسول کریم ﷺ نے اس شخص کو جگہ دینے کے لئے اپنی جگہ سے حرکت کی اور ایک طرف کھسک گئے، اس شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! مکان میں بیٹھنے کی جگہ کافی فراخ و کشادہ ہے (میں کہیں بھی بیٹھ جاؤں گا آپ ﷺ نے میرے لئے اپنی جگہ سے حرکت کرنے اور کھسکنے کی زحمت گوارا کیوں فرمائی؟) نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ مسلمان کا حق ہے کہ جب اس کو اس کا مسلمان بھائی

مجلس میں یا اپنے پاس آتا دیکھے تو جگہ کی فراخی وتنگی سے قطع نظر کرتے ہوئے اس کے لئے اپنی جگہ چھوڑ دے اور ایک طرف کو کھسک جائے یعنی آنے والے کے لئے اپنی جگہ سے حرکت کرنا اور کھسک جانا دراصل اس کا اکرام و اعزاز ہے اور ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی پر اس اکرام و اعزاز کا بجاطور پر حق رکھتا ہے ان دونوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

بَابُ الْجُلُوسِ وَالنَّوْمِ وَالْمَشْيِ
بیٹھنے، لیٹنے، سونے اور چلنے کا بیان
اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ
گوٹ مار کر بیٹھنا جائز ہے

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بِفِنَاءِ الْكَعْبَةِ مُحْتَبِيًا بِيَدَيْهِ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو خانہ کعبہ کے صحن میں اپنے ہاتھوں کے ذریعہ گوٹ مار کر بیٹھے ہوئے دیکھا" (بخاریؒ)

تشریح: گوٹ مار کر بیٹھنا نشست کا ایک خاص طریقہ ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دونوں زانوں کھڑے کر لئے جاتے ہیں تلوے زمین پر رہتے ہیں اور دونوں ہاتھوں سے پنڈلیوں پر حلقہ باندھ لیتے ہیں اور کولھے خواہ زمین پر ٹکے رہتے ہیں۔ خواہ اوپر اٹھے رہتے ہیں، بسا اوقات پنڈلیوں پر ہاتھوں کے ذریعہ حلقہ باندھنے کی بجائے ان پر کوئی کپڑا لپیٹ کر بیٹھنا بھی منقول ہے۔

بہرحال بیٹھنے کا یہ طریقہ اہل عرب میں بہت رائج تھا اور اکثر و بیشتر وہ لوگ اسی طرح بیٹھا کرتے تھے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس طرح بیٹھنا جائز بلکہ مستحب ہے۔

پیر پر پیر رکھ کر لیٹنے کا مسئلہ

② وَعَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِيْمٍ عَنْ عَمِّهٖ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ مُسْتَلْقِيًا وَاضِعًا اِحْدٰى قَدَمَيْهِ عَلَى الْاُخْرٰى۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبادہ ابن تمیم تابعیؒ اپنے چچا حضرت عبداللہ ابن زید انصاری صحابیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں نے ایک دن رسول کریم ﷺ کو مسجد میں اس طرح چت لیٹے ہوئے دیکھا کہ آپ کا ایک قدم، دوسرے قدم پر رکھا ہوا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: قدم کو قدم پر رکھ کر لیٹنے سے ستر نہیں کھلتا جب کہ اس طرح لیٹنا کہ پاؤں پر پاؤں رکھا ہوا ہو بسا اوقات ستر کھل جانے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس مطلب کے ذریعہ اس حدیث اور ان احادیث کے درمیان مطابقت پیدا ہو جاتی ہے جو آگے آرہی ہے اور جن سے واضح ہوتا ہے کہ پاؤں کو پاؤں پر رکھ کر لیٹنا ممنوع ہے اس مسئلہ کی مزید تفصیل آگے بیان ہوگی۔

واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ کا اس طرح لیٹنا کبھی کبھی ہوتا تھا اور وہ بھی یا تو بیان جواز کی خاطر، یا کچھ دیر آرام کر کے تکان کو دور کرنے کے لئے، ورنہ جہاں تک آنحضرت ﷺ کے معمول کا تعلق ہے، آپ کسی بھی ایسی جگہ کہ جہاں کچھ لوگ موجود ہوں، چار زانو، باوقار اور تواضع وانکسار کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے۔

③ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّرْفَعَ الرَّجُلُ اِحْدٰى رِجْلَيْهِ عَلَى الْاُخْرٰى وَهُوَ مُسْتَلْقٍ

عَلٰی ظَھْرِہٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص ایک پاؤں کھڑا کر کے دوسرا پاؤں اس پر رکھ لے درآنحالیکہ وہ چت ہوا ہو۔" (مسلمؒ)

④ وَعَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَسْتَلْقِیَنَّ اَحَدُکُمْ ثُمَّ یَضَعُ اِحْدٰی رِجْلَیْہِ عَلَی الْاُخْرٰی۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس طرح چت نہ لیٹے کہ ایک پاؤں کھڑا کر کے اس پر دوسرا پاؤں رکھ لے۔" (مسلمؒ)

تشریح: حضرت جابرؓ کی مذکورہ بالا دونوں حدیثیں، بظاہر عباد ابن تمیم کی روایت کے منافی، معلوم ہوتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان میں کوئی منافات وتضاد نہیں ہے کیوں کہ پاؤں پر پاؤں رکھ کر چت لیٹنا دو طرح سے ہوتا ہے ایک تو یہ کہ دونوں ٹانگیں پھیلی ہوئی ہوں اور ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھی ہوئی ہو اس طریقہ پر لیٹنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کیوں کہ اس صورت میں ستر کھل جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لہٰذا عباد ابن تمیمؒ کی روایت میں جو یہ منقول ہے کہ آپ ایک قدم کو دوسرے قدم پر رکھ کر چت لیٹے ہوئے تھے تو اس سے یہی صورت مراد ہے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ چت لیٹ کر ایک ٹانگ کے گھٹنے کو کھڑا کر لیا جائے اور دوسری ٹانگ کے پیر کو اس کھڑے ہوئے گھٹنے پر رکھ لیا جائے یہ طریقہ ممنوع ہے، لیکن یہ ممانعت بھی اس صورت میں ہے جب کہ ستر کھل جانے کا اندیشہ ہو، مثلاً کسی شخص نے پاجامہ نہ پہن رکھا ہو بلکہ تہ بند باندھ رکھا ہو اور وہ تہ بند یا کرتے کا دامن اتنا چھوٹا ہو کہ اس طریقہ سے لیٹنے کی وجہ سے ستر کھل سکتا ہو! اگر ستر کھلنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو پھر اس طریقہ سے لیٹنا بھی جائز ہوگا حاصل یہ نکلا کہ ممانعت اور جواز کا اصل مدار ستر کے کھلنے یا ستر کے نہ کھلنے پر ہے، چنانچہ علماء نے بھی یہی بیان کیا ہے۔

تکبر کی چال کا انجام

⑤ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَیْنَمَا رَجُلٌ یَتَبَخْتَرُ فِیْ بُرْدَیْنِ وَقَدْ اَعْجَبَتْہُ نَفْسُہٗ خُسِفَ بِہِ الْاَرْضُ فَھُوَ یَتَجَلْجَلُ فِیْھَا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ایک شخص دو دھاری دار کپڑوں میں ملبوس اتراہٹ اور اکڑ کے ساتھ چل رہا تھا، نیز (وہ ان کپڑوں کو اتنا نفیس اور برتر سمجھ رہا تھا کہ اس کے نفس نے اس کو غرور وخود بینی میں مبتلا کر دیا تھا اس کا انجام یہ ہوا کہ زمین نے اس شخص کو نگل لیا چنانچہ وہ قیامت کے دن تک زمین میں دھنستا چلا جائے گا۔"

تشریح: بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ حدیث میں جس شخص کا ذکر کیا گیا ہے وہ قارون تھا، جب کہ نوویؒ نے یہ لکھا ہے کہ یہ احتمال بھی ہے کہ وہ شخص کسی اُمت کا کوئی فرد ہوگا یا کسی پچھلی اُمت میں کا کوئی شخص ہوگا۔ بہرحال حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ تکبر وگھمنڈ اور اتراہٹ و اکڑ کے ساتھ چلنا برا ہے اور اس کا انجام نہایت برا۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

سب سے بہتر چال

واضح رہے کہ انسان کی چال اس کے مزاج و احوال اور عادات واطوار کی بڑی حد تک غماز ہوتی ہے، اسی طرح اس بات پر خاص زور دیا جاتا ہے کہ انسان کو اپنے چلنے کا انداز، ایسا نہ رکھنا چاہئے جس سے اس کی شخصیت میں کسی نقص وبے راہ روی اور اس کے طبعی احوال و کیفیات میں کسی کجی کا اظہار ہو۔ عام طور پر چال کی دس قسمیں بیان کی جاتی ہیں اور ان میں سے ہر قسم کو عربی میں ایک مستقل لفظ کے ساتھ موسوم کیا گیا ہے جن کا تفصیلی ذکر دوسری کتابوں میں موجود ہے جو قسم سب سے اچھی اور افضل سمجھی گئی ہے اس کو "ھون" کا نام دیا گیا ہے،

لغت کے اعتبار سے ہون کے معنی ہیں سکون وقرار، چنانچہ عربی کا یہ مشہور محاورہ ہے اِمْشِ عَلٰی هَوْنِكَ یعنی اپنی پرورش پر چلو۔ جس چال کو ہون کہا جاتا ہے وہ ایسی چال ہے جس میں حرکت تو پوری ہو لیکن قدم آہستہ آہستہ، قدرے سرعت کے ساتھ اٹھیں نہ تو خشک لکڑی کی مانند ایسی مری ہوئی چال جیسے مردہ دل اور افسرلوگ چلتے ہیں اور نہ تیزی اور بھاگ دوڑ کی چال جو جلد باز اور گھبراہٹ میں مبتلا لوگوں کے چلنے کا طریقہ ہے، چال کی یہ دنوں صورتیں ہی بری ہیں اور چلنے والے کی مردہ دلی یا بے عقلی کو ظاہر کرتی ہیں۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے ہون کی تعریف کی ہے اور اس چال کو اپنے خاص بندوں کی صفت قرار دیا۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا۔

"اور رحمٰن (اللہ) کے خاص بندے وہ لوگ ہیں جو زمین پر نرمی آہستگی اور سکون ووقار کے ساتھ چلتے ہیں۔"

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

تکیہ لگا کر بیٹھنا مستحب ہے

(٦) عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ رَاَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مُتَّکِئًا عَلٰی وِسَادَةٍ عَلٰی یَسَارِهٖ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت جابرؓ ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو اس طرح تکیہ لگائے بیٹھے ہوئے دیکھا کہ وہ تکیہ آپ ﷺ کے بائیں جانب رکھا ہوا تھا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تکیہ لگا کر بیٹھنا مستحب ہے اور یہ نقل کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ تکیہ کو پسند فرماتے تھے، نیز آپ ﷺ نے خوشبو کی طرح تکیہ کے بارے میں بھی یہ فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص تکیہ پیش کرے تو اس کو قبول کرنے سے انکار نہ کیا جائے۔

گوٹ مار کر بیٹھنے کا ذکر

(٧) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا جَلَسَ فِی الْمَسْجِدِ اِحْتَبٰی بِیَدَیْهِ۔ (رواہ رزین)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب مسجد میں بیٹھتے تو دونوں ران کھڑے کر لیتے اور پنڈلیوں پر دونوں ہاتھوں سے حلقہ باندھ لیتے۔" (رزینؒ)

آنحضرت ﷺ کی ایک منکسرانہ نشست

(٨) وَعَنْ قَیْلَةَ بِنْتِ مَخْرَمَةَ اَنَّهَا رَاَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِی الْمَسْجِدِ وَهُوَ قَاعِدٌ الْقُرْفُصَاءَ قَالَتْ فَلَمَّا رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْمُتَخَشِّعَ اُرْعِدْتُ مِنَ الْفَرَقِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت قیلہ بنت مخرمہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو مسجد میں بہ ہیئت قرفصا بیٹھے ہوئے دیکھا۔ قیلہؓ کہتی ہیں کہ جب میں نے رسول کریم ﷺ کو اس طرح انتہائی فروتنی و انکساری، خشوع و خضوع اور استغراق و حضوری کے عالم میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو میں مارے ہیبت کے کانپ گئی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: قرفصاء قاف کے پیش، راء کے جزم اور فاء کے پیش اور زبر کے ساتھ کے معنی ہیں اکڑوں بیٹھنا اور ہاتھوں کو ٹانگوں کے گرد

باندھنا۔ چنانچہ اس نشست یعنی قرفصاء کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دونوں تانوؤں کو کھڑا کر کے سرینوں (کولھوں) پر بیٹھ جاتے ہیں، زانوؤں کو پیٹ سے لگا لیتے ہیں اور دونوں ہاتھوں کو پنڈلیوں پر باندھ لیتے ہیں۔ قرفصاء کی ایک دوسری صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ دونوں زانوؤں کو زمین پر ٹیک کر رانوں کو پیٹ سے لگا لیتے ہیں اور ہاتھوں کی ہتھیلیاں دونوں بغلوں میں داب لی جاتی ہیں اس طرح کہ دائیں ہتھیلی بائیں بغل میں اور بائیں ہتھیلی دائیں بغل میں رہتی ہے۔ بیٹھنے کا یہ خاص طریقہ عام طور پر عرب کے ان غیر متمدن لوگوں میں رائج تھا جو جنگلات میں بود و باش رکھتے تھے۔ نیز وہ مسکین و غریب لوگ بھی اسی طرح بیٹھتے ہیں جو تفکرات و خیالات اور غم و آلام میں مبتلا ہوتے ہیں، چونکہ یہ نشست انتہائی عجز و بے چارگی اور کمال انکسار و فروتنی کو ظاہر کرتی ہے اس لئے آنحضرت ﷺ اس ہیئت کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔

نماز فجر کے بعد آنحضرت ﷺ کی نشست

(۹) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلَّى الْفَجْرَ تَرَبَّعَ فِيْ مَجْلِسِهٖ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ حَسْنَاءَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابر ابن سمرۃؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب فجر کی نماز پڑھ چکتے تو چار زانو بیٹھ جاتے اور سورج اچھی طرح روشن ہو جانے تک اسی طرح بیٹھے رہتے۔" (ابوداؤد)

آنحضرت کے لیٹنے کا طریقہ

(۱۰) وَعَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا عَرَّسَ بِلَيْلٍ اضْطَجَعَ عَلٰى شِقِّهِ الْاَيْمَنِ وَاِذَا عَرَّسَ قُبَيْلَ الصُّبْحِ نَصَبَ ذِرَاعَهٗ وَوَضَعَ رَاْسَهٗ عَلٰى كَفِّهٖ۔ (شرح السنۃ)

"اور حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ جب سفر کے دوران آرام کرنے اور سونے کے لئے کسی جگہ رات میں اترتے تو دائیں کروٹ لیٹتے تھے اور جب صبح کے قریب اترتے تو اس طرح لیٹتے کہ اپنا ایک ہاتھ کھڑا کر کے اس کی ہتھیلی پر سر مبارک رکھ لیتے۔"

(شرح السنۃ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا معمول مبارک یہ تھا کہ جب آپ ﷺ سفر میں ہوتے اور رات کا وقت کسی جگہ پڑاؤ ڈالتے اور رات کا کچھ حصہ باقی رہتا تو داہنی کروٹ پر لیٹ کر آرام فرماتے جیسا کہ سفر میں داہنی کروٹ پر لیٹنے کی آپ ﷺ کی عادت تھی اور اگر ایسے وقت پڑاؤ ڈالتے کہ رات کا تقریباً پورا حصہ گزر چکا ہوتا اور صبح ہونے والی ہوتی تو اس صورت میں آپ ﷺ پوری طرح لیٹنے کی بجائے دست مبارک کو کھڑا کر لیتے اور اس کی ہتھیلی پر سر رکھ کر آرام فرمالیتے۔ ایسا اس وجہ سے کیا کرتے تھے تاکہ غفلت کی نیند نہ آجائے اور فجر کی نماز قضا نہ ہو جائے، اگرچہ داہنی کروٹ پر سونے کی صورت میں بھی غفلت کی نیند طاری نہیں ہوتی کیونکہ داہنی کروٹ پر لیٹنے سے لٹکا رہتا ہے اور اس کو قرار کم ملتا ہے، جب کہ بائیں کروٹ پر لیٹنے سے دل اپنے ٹھکانے پر ہوتا ہے اور آرام بھی پاتا ہے جس کی وجہ سے نیند بھی اطمینان و سکون کی آتی ہے یہی وجہ ہے کہ اطباء نہ صرف خود بلکہ دوسروں کو بھی بائیں کروٹ سونے کا مشورہ دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ بائیں کروٹ پر سونے سے دل چونکہ اپنی جگہ پر رہتا ہے اس لئے دل کے مطمئن و پر سکون ہونے کی وجہ سے نہ صرف آرام ملتا ہے اور چین کی نیند طاری ہوتی ہے بلکہ کھانا بھی خوب اچھی طرح ہضم ہوتا ہے کیوں کہ اس صورت میں جسم کے باہر کی حرارت بدن کے اندر رک جاتی ہے جو نظام ہضم کو بہتر اور معتدل بنانے کا سبب ہے، بعض روایتوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ سفر کے دوران جب رات کے آخری حصے میں کہیں اترتے تو سر مبارک کے نیچے کوئی اینٹ رکھ لیتے اور جب صبح کے وقت کے قریب اترتے تو ہاتھ کھڑا کر کے اس کی ہتھیلی پر سر مبارک رکھ کر (کچھ دیر کے لئے) لیٹ رہتے۔

آنحضرت ﷺ جب لیٹتے تو سر مبارک کو مسجد کی طرف رکھتے

⑪ وَعَنْ بَعْضِ اٰلِ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَ كَانَ فِرَاشُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَحْوًا مِمَّا يُوْضَعُ فِيْ قَبْرِهٖ وَكَانَ الْمَسْجِدُ عِنْدَ رَاْسِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور اُمّ سلمہؓ کے ایک لڑکے کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کا بچھونا (جس پر آپ ﷺ آرام فرماتے تھے) اس کپڑے کی مانند تھا جو آپ ﷺ کی قبر شریف میں رکھا گیا تھا اور مسجد آپ ﷺ کے سر مبارک کے قریب رہا کرتی تھی۔" (ابوداؤد)

تشریح: حدیث کے پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ جس بچھونے پر استراحت فرماتے تھے اس کی لمبائی چوڑائی اس کپڑے کے تقریباً برابر تھی جو آپ ﷺ کی قبر شریف میں رکھا گیا تھا اور اس کپڑے کو کچھ لوگوں نے دیکھ رکھا تھا کہ وہ ایک مختصر سا کپڑا تھا جو زیادہ لمبا چوڑا نہ تھا۔ بعض حضرات نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا بچھونا اس کپڑے کی قسم سے تھا جو آپ ﷺ کی قبر مبارک میں رکھا گیا تھا اور جو کپڑا قبر مبارک میں رکھا گیا تھا وہ دراصل ایک سرخ چادر تھی جو بیماری کے دوران آنحضرت ﷺ کے نیچے رہتی تھی، آپ ﷺ کا وصال ہوا تو شقرانؓ نے (آنحضرت ﷺ کے غلام تھے) صحابہؓ کی رائے کے بغیر اس چادر کو قبر شریف میں آنحضرت ﷺ کے جسد مبارک کے نیچے رکھ دیا تھا ان کا کہنا تھا کہ میں نہیں چاہتا کہ آنحضرت ﷺ کا کپڑا آپ ﷺ کے بعد کوئی دوسرا شخص پہنے یا استعمال کرے، تاہم صحیح قول یہ ہے کہ صحابہؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے قبر تشریف بند کئے جانے سے پہلے اس چادر کو نکال لیا تھا۔ واضح رہے کہ حدیث میں اس جگہ لفظ یوضع، (مضارع کے صیغہ) کے بجائے "وضع" (ماضی کا صیغہ) ہونا چاہئے تھا لیکن راوی کا مقصد چونکہ حکایت بزمانۂ حال تھا اس لئے ماضی کے صیغہ کے بجائے مضارع کا صیغہ استعمال کیا گیا۔

حدیث کے دوسرے جز۔ اور مسجد آپ ﷺ کے سر مبارک کے قریب رہا کرتی تھی کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ استراحت فرماتے تو اس زاویہ سے لیٹتے کہ سر مبارک مسجد کی طرف رہتا، کیونکہ آپ ﷺ کا حجرہ شریف، مسجد کے بائیں جانب تھا اور چونکہ آپ ﷺ روبقبلہ لیٹا کرتے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ اگر اس حجرہ شریف میں روبقبلہ لیٹا جائے تو مسجد سرہانے کی طرف رہے گی۔

مشکوۃ کے ایک نسخہ میں لفظ مسجد جیم کے زبر کے ساتھ ہے جس کے معنی مصلی کے ہیں اس صورت میں مطلب یہ ہوگا استراحت کے وقت آپ ﷺ کے سرہانے رکھا رہتا تھا، تاکہ جب نماز پڑھنی ہو تو اس کو فوراً بچھا لیا جائے۔

پیٹ کے بل لیٹنا ناپسندیدہ ہے

⑫ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ رَاٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا مُضْطَجِعًا عَلٰى بَطْنِهٖ فَقَالَ اِنَّ هٰذِهٖ ضِجْعَةٌ لَا يُحِبُّهَا اللّٰهُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے ایک شخص کو اوندھا یعنی پیٹ کے بل لیٹے ہوئے دیکھا تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ اس طرح سے لیٹنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ لیٹنے کی چار صورتیں ہیں، ایک تو چت لیٹنا، لیٹنے کا طریقہ اہل عبرت کا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سازیوں اور عجائبات قدرت کو دیکھ کر ایمان باللہ کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں وہ چت لیٹتے ہیں تاکہ وہ آسمان اور ستاروں کی طرف بنظر استشہاد دیکھتے رہیں اور خدا کی قدرت و حکمت کردگاری کی دلیل حاصل کریں دوسری صورت دائیں کروٹ پر لیٹنا ہے یہ اہل کبار رو کے لیٹنے کا طریقہ ہے جو لوگ خدا کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں اور شب بیداری کرنا چاہتے ہیں وہ دائیں کروٹ پر لیٹ کر سوتے ہیں تاکہ غفلت کی نیند طاری نہ ہو اور وقت پر اٹھ کر نماز و وظائف اور اپنے مولی کے ذکر میں مشغول ہو سکیں۔ تیسری صورت بائیں کروٹ پر لیٹنا ہے یہ

آرام وراحت کے طلبگاروں کے لیٹنے کا طریقہ ہے کہ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کھانا اچھی طرح ہضم ہو جائے، چین و سکون کی نیند سو سکیں اور جسم کو پوری طرح آرام و راحت ملے وہ بائیں کروٹ پر لیٹ کر سوتے ہیں اور چوتھی صورت اوندھا یعنی پیٹ کے بل لیٹنا ہے، یہ اہل غفلت اور نادان لوگوں کے لیٹنے کا طریقہ ہے کیونکہ اس طرح لیٹنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سینہ اور منہ جو برتر اعضاء ہیں اور اجزائے جسم میں سے سب سے افضل جزء ہیں ان کو بلا قصد و طاعت و سجدہ، خاک و ذلت پر اوندھا ڈال دیا جائے جو ان اعضاء کے عزو شرف کے منافی ہے، نیز چونکہ اغلام کرانے والوں کی عادت ہے اس لئے اوندھا لیٹنا اتنی ذلیل ترین برائی کی مشابہت اختیار کرنا ہے جو خود انتہائی بری بات ہے۔

⑬ وَعَنْ يَعِيْشَ بْنِ طِخْفَةَ بْنِ قَيْسِ الْغِفَارِيِّ عَنْ اَبِيْهِ وَكَانَ مِنْ اَصْحَابِ الصُّفَّةِ قَالَ بَيْنَمَا اَنَا مُضْطَجِعٌ مِنَ السَّحَرِ عَلٰى بَطْنِيْ اِذَا رَجُلٌ يُحَرِّكُنِيْ بِرِجْلِهٖ فَقَالَ اِنَّ هٰذِهٖ ضِجْعَةٌ يُبْغِضُهَا اللّٰهُ فَنَظَرْتُ فَاِذَا هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت یعیش ابن طخفہ ابن قیس، غفاری اپنے والد ماجد (حضرت طخفہؓ) سے جو اصحاب ؓ صفہ میں سے تھے، نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے یعنی (حضرت طخفہؓ نے) بیان کیا کہ (ایک دن) میں سینہ کی درد کی وجہ سے پیٹ کے بل اوندھا لیٹا ہوا تھا کہ اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص مجھے اپنے پاؤں سے ہلا رہا ہے اور پھر میں نے سنا کہ وہ شخص کہہ رہا ہے لیٹنے کے اس طریقہ کو اللہ تعالیٰ سخت ناپسند کرتا ہے۔ اور پھر میں نے پلٹ کر نظر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ شخص رسول کریم ﷺ ہیں۔" (ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے علم میں حضرت طخفہؓ کا وہ عذر نہیں ہوگا جس کی وجہ سے وہ پیٹ کے بل لیٹے ہوئے تھے اس لئے آپ نے مذکورہ الفاظ ارشاد فرمائے اور اگر یہ کہا جائے کہ ان کا عذر آپ ﷺ کے علم میں تھے تو پھر یہ تاویل لی جائے گی کہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد احتیاط و تقویٰ کی بنا پر تھا اور یہ ظاہر کرنے کے لئے تھا کہ عام حالات میں بلا کسی عذر کے پیٹ کے بل لیٹنا سخت برا ہے اور اس طرف بھی اشارہ کرنا مقصود تھا کہ اگر سینہ کے درد کا دفاع ہی مقصود تھا تو اس صورت میں یہ بھی ممکن تھا کہ وہ پیروں کو پھیلائے بغیر ٹانگوں کی طرف جھک کر سینے کے دونوں رانوں کو دبا لیتے۔

بغیر دیوار کی چھت پر سونا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے

⑭ وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ شَيْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ بَاتَ عَلٰى ظَهْرِ بَيْتٍ لَيْسَ عَلَيْهِ حِجَابٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ حِجَارٌ فَقَدْ بَرِءَتْ مِنْهُ الذِّمَّةُ۔ رَوَاهُ اَبُوْ دَاوُدَ وَفِيْ مَعَالِمِ السُّنَنِ لِلْخَطَّابِيِّ حِجًى۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت علیؓ ابن شیبان کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص رات میں گھر کی ایسی چھت پر سوئے جس پر پردہ نہ ہو اور روایت میں یوں ہے کہ جس کے گرد رکاوٹ والی کوئی چیز نہ ہو تو اس سے ذمہ جاتا رہا۔" (ابوداؤدؒ)

اور خطابی کی کتاب معالم السنن میں لفظ حجاب کے بجائے حجی کا لفظ ہے۔

تشریح: ایک ہی مضمون کی تین روایتوں میں تین الگ الگ لفظ ہیں ایک روایت میں "حجاب" کا لفظ ہے جس کے معنی پردہ کے ہیں اور اس سے مراد وہ دیوار ہے جو چھت کو بے پردگی سے محفوظ بھی رکھتی ہے اور اس کی وجہ سے اس چھت پر سے کسی کے گر پڑنے کا خدشہ بھی نہیں رہتا، دوسری روایت میں حجار کا لفظ ہے جو "حجر" (حاء کے زیر کے ساتھ) کی جمع ہے اور اس کے معنی اس چیز کے ہیں جو چھت کو اس طرح گھیر دے کہ کوئی گرنے نہ پائے خواہ وہ دیوار ہو یا جنگلہ وغیرہ اور تیسری روایت میں حجی کا لفظ ہے یہ لفظ حاء کے زیر کے ساتھ بھی ہے اور حاء کے زبر کے ساتھ بھی، دونوں ہی صورتوں میں یہ لفظ پردہ کے مفہوم میں ہے ویسے لغت کے اعتبار سے حجی حاء کے زیر کے ساتھ کے معنی ہیں عقل و زیرکی، لہٰذا کہا جائے گا کہ پردہ کو عقل کے ساتھ اس لئے مشابہت دی گئی ہے کہ جس طرح عقل انسان کو ناشائستہ اور

نقصان دہ امور سے روکتی ہے اسی طرح پردہ بھی انسان کو چھت پر سے گزرنے سے روکتا ہے اسی طرح (حجی حاء کے زبر کے ساتھ) کے معنی کنارہ اور گوشہ کے ہیں اور ظاہر ہے کہ چھت کا پردہ چھت کے کناروں پر کھڑی گئی دیوار وغیرہ ہی کی صورت میں ہوتا ہے اس اعتبار سے اس کو حجی کہا گیا۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی نگہبانی و حفاظت کا ذمہ و عہد لیا ہے اور اس مقصد کے لئے اس نے محض اپنے فضل و کرم سے ملائکہ مقرر کئے ہیں اور ایسے اسباب و ذرائع پیدا فرمائے ہیں جن کو اختیار کر کے انسان اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص ایسی چھت پر سوتا ہے جس کے گرد کوئی پردہ اور رکاوٹ نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی جگہ سو رہا ہے جو عام طور پر ہلاکت و ضرر کا سبب بن سکتی ہے اور جب اس شخص نے خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہے تو اب قدرت کو کیا ضرورت ہے کہ اس کی حفاظت کرے لہٰذا اس کی محافظت کا خدائی ذمہ و عہد ساقط ہو گیا۔

⑮ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّنَامَ الرَّجُلُ عَلٰى سَطْحٍ لَيْسَ بِمَحْجُوْرٍ عَلَيْهِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے اس کوٹھے پر سونے سے منع فرمایا ہے جس پر پردہ کی دیوار نہ ہو۔" (ترمذی)

حلقہ کے درمیان بیٹھنے والے پر لعنت

⑯ وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ مَلْعُوْنٌ عَلٰى لِسَانِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَعَدَ وَسْطَ الْحَلْقَةِ۔ (رواہ الترمذی و ابوداود)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ کی زبان مبارک کے ذریعہ اس شخص کو ملعون قرار دیا گیا ہے جو حلقہ کے درمیان بیٹھے۔" (ترمذیؒ و ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث کے محمول کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں ایک تو یہ کہ مثلاً کسی جگہ لوگ حلقہ بنائے بیٹھے تھے کہ ایک شخص آیا اور بجائے اس کے کہ وہ جہاں جگہ دیکھتا وہیں بیٹھ جاتا لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا درمیان میں جا کر بیٹھ گیا چنانچہ ایسے شخص کو ملعون کہا گیا ہے، دوسرے یہ کہ کوئی شخص کچھ لوگوں کے حلقہ کے درمیان اس طرح بیٹھ گیا کہ ان میں سے بعضوں کے چہرے ایک دوسرے سے چھپ گئے اور انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کے چہرے نہ دیکھ سکنے سے اور اپنے درمیان خلل پڑ جانے کی وجہ سے اس شخص کو تکلیف و ضرر کا باعث محسوس کیا لہٰذا ایسا شخص مذکورہ حدیث کا محمول ہے اور تیسرے یہ کہ اس حدیث کا تعلق اس شخص سے ہے جو مسخرا پن کرنے کے لئے حلقہ کے بیچ میں جا کر بیٹھ جائے تا کہ لوگوں کو ہنسائے۔

مجلس ایسی جگہ منعقد کرنی چاہئے جو فراخ و کشادہ ہو

⑰ وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ الْمَجَالِسِ اَوْسَعُهَا۔ (رواہ ابوداود)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا بہترین مجلس وہ ہے جو کشادہ و فراخ جگہ میں منعقد کی جائے" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مجلس وعظ و نصیحت منعقد کرنی ہو، یا کسی بھی مباح تقریب کے موقع پر کسی جگہ لوگوں کو جمع کرنا ہو تو اس مقصد کے لئے ایسی جگہ اختیار کرنی چاہئے جو کشادہ و فراخ ہو تا کہ لوگوں کو بیٹھنے میں تنگی نہ ہو اور وہ تکلیف میں مبتلا نہ ہوں۔

مجلس میں الگ الگ نہ بیٹھو

⑱ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ جَآءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابُهٗ جُلُوْسٌ فَقَالَ مَالِيْ اَرٰكُمْ عِزِيْنَ۔ (رواہ ابوداود)

"اور حضرت جابرؓ ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ گھر سے باہر نکل کر تشریف لائے جب کہ مسجد نبوی ﷺ میں آپ ﷺ کے صحابہؓ ادھر ادھر بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کو اس طرح بیٹھے ہوئے دیکھ کر فرمایا کہ کیا بات ہے کہ میں تم لوگوں کو متفرق و منتشر بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہوں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "عزین" اصل میں عزۃ کی جمع ہے جس کے معنی لوگوں کے جماعت کے ہیں۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ نے جب یہ دیکھا کہ صحابہؓ کی ایک جماعت اس طرف بیٹھی ہوئی ہے تو دوسری جماعت اس طرف کچھ لوگ اس کونے میں بیٹھے ہوئے ہیں تو کچھ لوگ اس کونے میں، تو چوں کہ الگ الگ گروہوں میں بیٹھنا اور علیحدہ علیحدہ مجلسیں قائم کرنا آپس میں وحشت و بیگانگی کو فروغ دینے اور ایک دوسرے سے علیحدگی و جدائی اختیار کرنے کا موجب ہوتا ہے اس لئے آپ ﷺ نے مذکورہ ارشاد گرامی ﷺ کے ذریعہ اس طرح متفرق و منتشر طور بیٹھنے کو ناپسند فرمایا اور متحد و مجتمع ہو کر بیٹھنے کی طرف راغب کیا کیونکہ ایک جگہ جمع ہو کر بیٹھنا در اصل باہمی یگانگت و اتحاد اور ایک دوسرے سے تعلق و موانست کی علامت ہے۔

حاصل یہ کہ اگر کسی جگہ مسلمان جمع ہوں تو ان کو چاہئے کہ وہ علیحدہ علیحدہ جماعتیں بنا کر نہ بیٹھیں بلکہ سب لوگ ایک جگہ حلقہ بنا کر یا صف بندی کے ساتھ بیٹھیں۔

اس طرح نہ لیٹو کہ جسم کا کچھ حصہ دھوپ میں رہے اور کچھ سایہ میں

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا کَانَ اَحَدُکُمْ فِی الْفَیْءِ فَقَلَصَ عَنْهُ الظِّلُّ فَصَارَ بَعْضُهٗ فِی الشَّمْسِ وَ بَعْضُهٗ فِی الظِّلِّ فَلْیَقُمْ۔ رَوَاهُ اَبُوْ دَاؤدَ وَفِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ عَنْهُ قَالَ اِذَا کَانَ اَحَدُکُمْ فِی الْفَیْءِ فَقَلَصَ عَنْهُ فَلْیَقُمْ فَاِنَّهٗ مَجْلِسُ الشَّیْطٰنِ هٰکَذَا رَوَاهُ مَعْمَرٌ مَوْقُوْفًا

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص سایہ میں بیٹھا ہو اور پھر وہ سایہ ختم ہو رہا ہو بایں طور کہ اس سایہ کی جگہ دھوپ آجانے کی وجہ سے اس کے جسم کا کچھ حصہ دھوپ میں اور کچھ حصہ سایہ میں ہو تو اس کو چاہئے کہ وہاں سے اٹھ جائے اور ایسی جگہ جا کر بیٹھ جائے جو پوری طرح سایہ میں ہو یا پوری طرح دھوپ میں کیونکہ جب کوئی شخص ایسی جگہ بیٹھا یا لیٹا رہتا ہے کہ کچھ دھوپ میں ہو اور کچھ سایہ میں، تو اس کے جسم پر ایک ہی وقت میں دو متضاد چیزوں کے اثر انداز ہونے کی وجہ سے اس کا مزاج بھی فساد و اختلال کا شکار ہو جاتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

اور شرح السنۃ میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے (یعنی حضرت ابوہریرہؓ نے) فرمایا تم میں سے جو شخص سایہ میں بیٹھا ہو اور پھر وہ سایہ ختم ہو رہا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ وہاں سے اٹھ جائے کیوں کہ ایسی جگہ کہ کچھ سایہ میں ہو اور کچھ دھوپ میں، شیطان کے بیٹھنے کی جگہ ہے اسی طرح جیسا کہ شرح السنۃ میں ہے معمرؒ نے بھی اس روایت کو حضرت ابوہریرہؓ سے بطریق موقوف نقل کیا ہے۔

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ یہ حضرت ابوہریرہؓ کا قول ہے آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ﷺ نہیں ہے لیکن واضح رہے کہ یہ موقوف حکم کے اعتبار سے مرفوع حدیث کے ہی درجہ میں ہے کیونکہ دین کی جو بات اجتہاد قیاس کے ذریعہ ثابت ہونے والی نہیں ہوتی اور اس کو کوئی صحابیؓ اپنے قول کے طور پر نقل کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس صحابیؓ نے وہ بات آنحضرت ﷺ سے ضرور سنی ہے ورنہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی صحابیؓ دین کی کوئی ایسی بات نقل کرے جو اجتہاد و قیاس سے باہر ہو اور اس بات کو اس نے آنحضرت ﷺ سے نہ سنا ہو۔

شیطان کے بیٹھنے کی جگہ ہے کے بارے میں بعض حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ یہ عبارت اپنے ظاہری معنی پر محمول ہے، یعنی واقعۃً ایسا ہوتا ہے کہ شیطان اس جگہ بیٹھتا ہے جس کا کچھ حصہ دھوپ میں اور کچھ حصہ سایہ میں ہوتا ہے اس اعتبار سے، یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ کچھ سایہ اور کچھ دھوپ میں بیٹھنا شیطان کا کام ہے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ایسی جگہ کی نسبت شیطان کی طرف اس اعتبار سے کی گئی ہے

کہ شیطان جس شخص کو پریشان کرنا چاہتا ہے اس کو ایسی جگہ پر بیٹھنے یا لیٹنے کی طرف راغب کرتا ہے اور گویا اس جگہ پر کسی شخص کے بیٹھنے یا لیٹنے کا سبب شیطان بنتا ہے اور اس سے شیطان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص تکلیف و دکھ میں مبتلا ہو، لہٰذا معلوم ہوا کہ شیطان جس طرح انسان کے دین کا دشمن ہے اسی طرح اس کے بدن کا بھی بدخواہ ہے۔

یہ بات ملحوظ رہے کہ کسی ایسی جگہ بھی بیٹھنا یا لیٹنا ممنوع و مکروہ ہے جو پوری طرح دھوپ میں ہو اگرچہ اس صورت میں ممانعت و کراہت کا سبب یہ نہیں ہوگا کہ ایسی جگہ شیطان کی نشست گاہ ہوتی ہے بلکہ یہ اس لئے ممنوع و مکروہ ہوگا کہ پوری طرح دھوپ میں بیٹھنا گویا اپنے آپ کو تعب و مشقت اور تکلیف میں ڈالنا ہے ہاں اگر جاڑے کا موسم ہو تو پھر دھوپ میں بیٹھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔

عورتوں کو راستے کے کنارے پر چلنے کا حکم

(۲۰) وَعَنْ اَبِی اُسَیْدِنِ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّہٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ وَھُوَ خَارِجٌ مِّنَ الْمَسْجِدِ فَاخْتَلَطَ الرِّجَالُ مَعَ النِّسَاءِ فِی الطَّرِیْقِ فَقَالَ لِلنِّسَاءِ اِسْتَاخِرْنَ فَاِنَّہٗ لَیْسَ لَکُنَّ اَنْ تَحْقُقْنَ الطَّرِیْقَ عَلَیْکُنَّ بِحَافَّاتِ الطَّرِیْقِ فَکَانَتِ الْمَرْءَۃُ تَلْصَقُ بِالْجِدَارِ حَتّٰی اَنَّ ثَوْبَھَا لَیَتَعَلَّقُ بِالْجِدَارِ۔ (رواہ ابوداؤد و البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت ابواسید انصاری ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک دن، رسول کریم ﷺ کو اس وقت جب کہ آپ ﷺ مسجد سے نکل رہے تھے (لوگوں سے دینی ہدایات و احکام شرعی مسائل) بیان کرتے ہوئے سنا پھر راستہ میں مرد عورتوں سے مل گئے یعنی مرد اور عورتیں مخلوط ہو کر راستہ میں چلنے لگے، آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھ کر عورتوں سے فرمایا کہ تم مردوں کے پیچھے چلو اور ان سے الگ رہو کیوں کہ تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم راستہ کے کنارے پر چلا کرو۔ چنانچہ عورتوں نے آنحضرت ﷺ کے اس حکم پر اس طرح عمل کیا کہ وہ راستہ چلتیں تو دیواروں سے لگ کر چلا کرتیں یہاں تک کہ بعض اوقات ان کا کپڑا دیوار سے اٹک جاتا تھا۔" (ابوداؤد، بیہقی)

عورتوں کے درمیان نہ چلو

(۲۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی اَنْ یَمْشِیَ یَعْنِی الرَّجُلُ بَیْنَ الْمَرْاَتَیْنِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دو عورتوں کے درمیان چلنے سے منع فرمایا، یعنی مرد کو۔" (ابوداؤد)

تشریح: لفظ "یعنی" روای کا اپنا قول ہے جس سے الفاظ حدیث کی وضاحت مقصود ہے گویا راوی نے یہ بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے "یمشی" کا فاعل الرَّجُلُ مراد لیا ہے حاصل یہ کہ لفظ الرَّجُلُ حدیث کے اصل متن کا جزء نہیں ہے بلکہ اس کو کسی راوی نے بطور وضاحت نقل کیا ہے اس طرح روایت کے درمیان یہ عبارت یعنی الرَّجُلُ گویا جملہ معترضہ ہے۔

آنحضرت ﷺ نے مرد کو عورتوں کے درمیان چلنے سے اس لئے منع فرمایا کہ مرد و عورت کا اختلاط نہ صرف یہ کہ مختلف قسم کی برائیوں کے فتنہ میں مبتلا کر دیتا ہے بلکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو شرم و حیا اور سنجیدگی و متانت کے تقاضوں کے خلاف سمجھا گیا ہے۔

واضح رہے کہ جس طرح عورتوں کے درمیان چلنا منع ہے اسی طرح راستہ میں کسی عورت کے ساتھ بھی چلنا منع ہے بشرطیکہ اس کی وجہ سے کسی فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا خوف ہو۔

مجلس میں جہاں جگہ دیکھو وہاں بیٹھ جاؤ

(۲۲) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَۃَ قَالَ کُنَّا اِذَا اَتَیْنَا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَلَسَ اَحَدُنَا حَیْثُ یَنْتَھِیْ۔ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَذُکِرَ حَدِیْثَا عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو فِیْ بَابِ الْقِیَامِ وَسَنَذْکُرُ حَدِیْثَیْ عَلِیٍّ وَاَبِیْ ھُرَیْرَۃَ فِیْ بَابِ اَسْمَآءِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَصِفَاتِہٖ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ کی مجلس میں ہم حاضر ہوتے تو ہم میں سے جو شخص جہاں جگہ دیکھتا اور آخر میں جو جگہ خالی ہوتی وہاں بیٹھ جاتا۔ (ابوداؤد) اور عبداللہ ابن عمروؓ کی دونوں حدیثیں یعنی ایک تو لایحل للرجل اور دوسری جو اس کے بعد ہے ولا یجلس بین رجلین باب القیام میں نقل کی جا چکی ہے اور حضرت علیؓ و حضرت ابوہریرہؓ کی دونوں روایتوں کو ہم انشاء اللہ باب اسماء النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ و صفاتہ میں نقل کریں گے جن میں سے ایک تو كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا مشى تكفا اور دوسری مَا رَأَيْتُ شَيْئًا احسن من رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مجلس نبوی ﷺ میں ہر شخص مجلس نبوی ﷺ کے آداب وقار کو ملحوظ رکھتا تھا اور اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ اس کو دوسروں کی بہ نسبت نمایاں اور برتر مقام ملے، جہاں جگہ دیکھتا وہیں بیٹھ جاتا کیونکہ مجلس میں نمایاں اور برتر جگہ پر بیٹھنے کی خواہش اور اس کے لئے کوشش کرنا دراصل اس نفس کا تقاضہ ہوتا ہے جو ہر موقع پر اپنے آپ کو بلاضرورت نمایاں کرنے اور برتر ثابت کرنے کا متلاشی رہتا ہے اور یہ ان لوگوں کی شان ہے جو جاہ پسند اور دنیاوی عزت اور بڑائی کے حریص ہوتے ہیں جب کہ صحابہؓ اس طرح کے جذبات سے بالکل عاری تھے نہ ان کو اس چیز کے حصول کی خواہش ہوتی تھی اور نہ کسی بھی موقع پر نشست برخاست کے سلسلہ میں خواہ مخواہ کے تکلفات و اہتمام کے عادی تھے ان کے مزاج میں جو سادگی و خاکساری اور بے تکلفی اور رواداری تھی اس کی بناء پر بھی اور آنحضرت ﷺ کا ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے بھی وہ مجلس نبوی ﷺ میں جہاں جگہ دیکھتے بیٹھ جاتے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

بیٹھنے کا ایک ممنوع طریقہ

(۲۳) عَنْ عَمْرِو بْنِ الشَّرِيْدِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ مَرَّ بِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا جَالِسٌ هٰكَذَا وَقَدْ وَضَعْتُ يَدِيَ الْيُسْرٰى خَلْفَ ظَهْرِيْ وَاَتَّكَأْتُ عَلٰى اَلْيَةِ يَدِيْ فَقَالَ اَتَقْعُدُ قِعْدَةَ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت عمرو ابن شریدؒ تابعی اپنے والد ماجد (حضرت شرید ثقفی صحابیؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ایک دن رسول کریم ﷺ میرے پاس سے گزرے جب کہ میں اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ میرا بایاں ہاتھ تو میری پیٹھ کے پیچھے تھا اور انگوٹھے کی جڑ کے گوشت پر میں سہارا دیئے ہوئے تھا آپ ﷺ نے مجھ کو اس طرح بیٹھا ہوا دیکھ کر فرمایا کہ کیا تم اس ہیئت پر بیٹھے ہوئے ہو جس ہیئت پر وہ لوگ بیٹھتے ہیں جن پر خدا کا غضب نازل ہوا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "جن پر خدا کا غضب نازل ہوا ہے" سے مراد یہودی ہیں، یہاں یہودیوں کا صراحت کے ساتھ ذکر کرنے کے بجائے مغضوب علیہم کے ذریعہ ان کی طرف اشارہ کرنے کی ایک وجہ تو، اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ اس ہیئت پر بیٹھنا ان چیزوں میں سے ہے جن کو حق تعالیٰ دشمن رکھتا ہے اور دوسرے یہ کہ مسلمان چونکہ ایک ایسی اُمت کا فرد ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و نعمت فرمائی ہے اس لئے اس کو چاہئے کہ وہ ان لوگوں کی مشابہت اختیار نہ کرے جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا غضب نازل کیا ہے اور ان کو ملعون قرار دیا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم کی سورۃ فاتحہ میں مغضوب علیہم کے ذریعہ جن لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان سے بھی یہی یہود مراد ہیں۔

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ حدیث میں مغضوب علیہم کا لفظ اپنے وسیع و عام مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے، یعنی اس سے تمام کافر اور وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے بیٹھنے چلنے اور دیگر افعال میں غرور و تکبر کا اظہار کرتے ہیں۔

پیٹ کے بل لیٹنا دوزخیوں کا طریقہ ہے۔

(۲۴) وَعَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ مَرَّ بِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا مُضْطَجِعٌ عَلٰى بَطْنِيْ فَرَكَضَنِيْ بِرِجْلِهٖ وَقَالَ يَا جُنْدُبُ

اِنَّمَاھِیَ ضِجْعَۃُ اَھْلِ النَّارِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ میرے پاس سے گزرے جب کہ میں اپنے پیٹ کے بل یعنی اوندھا لیٹا ہوا تھا، آپ ﷺ نے یہ دیکھ کر اپنے پاؤں سے مجھے ٹھوکا دیا اور فرمایا جندبؓ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس طرح لیٹنا دوزخیوں کا طریقہ ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: جندب حضرت ابوذرؓ کا اصل نام ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس موقع پر ان کو کنیت کے بجائے اصل نام سے مخاطب فرمایا۔
"اس طرح لیٹنا دوزخیوں کا طریقہ" کے بارے میں دو احتمال ہیں، ایک تو یہ کہ اس ارشاد گرامی سے آپ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ اس دنیا میں کفار و فجار اسی طرح لیٹنے کی عادت رکھتے ہیں، دوسرے یہ کہ آپ ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ اس طرف اشارہ فرمایا کہ کفار فجار دوزخ میں جس ہیئت پر پٹائے جائیں گے وہ یہی ہیئت ہوگی یعنی پیٹ کے بل.......

بَابُ الْعُطَاسِ وَالتَّثَاؤُبِ
چھینکنے اور جمائی لینے کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

جمائی کا آنا شیطانی اثر ہے

① عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْعُطَاسَ وَیَکْرَہُ التَّثَاؤُبَ فَاِذَا عَطَسَ اَحَدُکُمْ وَحَمِدَ اللّٰہَ کَانَ حَقًّا عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ سَمِعَہٗ اَنْ یَقُوْلَ لَہٗ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ فَاَمَّا التَّثَاؤُبُ فَاِنَّمَا ھُوَ مِنَ الشَّیْطَانِ فَاِذَا تَثَاءَبَ اَحَدُکُمْ فَلْیَرُدَّہٗ مَا اسْتَطَاعَ فَاِنَّ اَحَدَکُمْ اِذَا تَثَاءَبَ ضَحِکَ مِنْہُ الشَّیْطَانُ۔ رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِمُسْلِمٍ فَاِنَّ اَحَدَکُمْ اِذَا قَالَ ھَا ضَحِکَ الشَّیْطَانُ مِنْہُ۔

"حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ چھینکنے کو تو پسند کرتا ہے لیکن جمائی کو ناپسند کرتا ہے لہٰذا تم میں سے جب کوئی شخص چھینکے اور اللہ کی تعریف کرے تو اس چھینک اور الحمد للہ کو سننے والے ہر مسلمان پر حق ہے کہ وہ چھینکنے والے کے جواب میں یرحمک اللہ کہے رہی جمائی کی بات تو جمائی کا آنا شیطانی اثر ہے لہٰذا تم میں سے جب کسی کو جمائی آئے تو چاہئے کہ وہ حتی الامکان اس جمائی کو روکے واضح رہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص جمائی لیتا ہے (یعنی منہ پھاڑتا ہے) تو اس پر شیطان ہنستا ہے۔ (بخاریؒ) اور مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ تو (چاہئے کہ حتی الامکان اس جمائی کو روکے) کیوں کہ جب تم میں سے کوئی شخص ہاء کہتا ہے یعنی جمائی لیتا ہے تو اس پر شیطان ہنستا ہے۔"

تشریح: "اللہ تعالیٰ چھینکنے کو پسند کرتا ہے" مطلب یہ ہے کہ چھینکنے کی وجہ سے چونکہ دماغ پر سے بوجھ ہٹ جاتا ہے اور فہم و ادراک کی قوت کا تزکیہ ہو جاتا ہے اور یہ چیز طاعت و حضوری قلب کا باعث و مددگار بنتی ہے اس لئے چھینکنا پسندیدہ ہے، اس کے برخلاف جمائی کا آنا طبیعت کے امتلاء نفس کے بھاری پن اور حواس کی کدورت کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہ چیز غفلت و سستی اور بدفہمی نیز طاعت و عبادت میں عدم نشاط کا باعث بنتی ہے اس لئے جمائی کا آنا شیطان کی خوشی کا ذریعہ ہے اور اسی وجہ سے جمائی کے آنے کو شیطانی اثر قرار دیا گیا ہے اور اس کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کا چھینکنے کو پسند کرنا اور جمائی کو ناپسند کرنا ان کے نتیجہ و ثمرہ کے

اعتبار سے ہے کہ چھینکنے کا نتیجہ عبادت و طاعت میں نشاط و تازگی کا پیدا ہونا ہے اور جمائی کا نتیجہ کسل و سستی کا پیدا ہو جانا ہے۔

"اللہ کی تعریف کرے" یعنی جب چھینک آئے تو الحمد للہ کہے، اور اگر رب العالمین بھی بڑھا دے یعنی الحمد للہ رب العالمین کہے تو بہتر ہے جب کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ کہنا بہت ہی بہتر ہے نیز کتاب مصنف میں ابن ابی شیبہؒ نے حضرت علیؓ سے بطریق موقوف یہ نقل کیا ہے کہ جس شخص کو چھینک آئے اور وہ یوں کہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ عَلٰى كُلِّ حَالٍ تو وہ داڑھ اور کان کے درد میں کبھی مبتلا نہیں ہوگا۔ واضح رہے کہ علماء نے چھینک آنے پر الحمد للہ کہنے کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ چھینک دراصل دماغ کی صحت و صفائی اور مزاج طبیعت میں نشاط و توانائی کی علامت ہوتی ہے اور یہ چیز جسمانی صحت و تندرستی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور ظاہر ہے کہ حصول نعمت پر اللہ کی تعریف کرنا نہایت موزوں و مناسب چیز ہے۔

یرحمک اللہ کہنا فرض یا واجب؟

حدیث کی یہ عبارت، ہر مسلمان پر حق ہے کہ وہ چھینکنے والے کے جواب میں یرحمک اللہ کہے۔ بظاہر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ چھینکنے والا الحمد للہ کہے تو اس کو سننے والے ہر مسلمان پر یہ فرض ہے کہ وہ جواب میں یرحمک اللہ کہے لیکن اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں، حنفی مسلک کے اعتبار سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ جواب میں یرحمک اللہ کہنا واجب علی الکفایہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر چھینکنے والے کی حمد کو سننے والے ایک سے زائد لوگ ہوں تو وہاں موجود سب میں سے کسی ایک شخص کا یرحمک اللہ کہہ دینا سب کے ذمہ سے جواب کا وجوب ساقط کر دے گا۔ جب کہ ایک قول میں اس جواب کو مستحب کہا گیا ہے اس کے برخلاف سفر السعادۃ کے مصنف نے یہ لکھا ہے کہ اس بارے میں منقول صحیح احادیث کا ظاہری مفہوم یہ واضح کرتا ہے کہ چھینکنے والے کے جواب میں یرحمک اللہ کہنا سننے والے ہر مسلمان پر فرض ہے اور وہاں موجود لوگوں میں سے کسی ایک کا جواب دے دینا اس فرض کو سب کے ذمہ سے ساقط نہیں کرتا، چنانچہ اکابر علماء کی ایک جماعت کا مسلک اسی قول کے مطابق ہے اشوافع کا مسلک یہ ہے کہ چھینکنے والے کا جواب دینا سُنّت علی الکفایہ ہے لیکن افضل یہی ہے کہ حاضرین میں سے ہر شخص جواب میں یرحمک اللہ کہے حضرت امام مالکؒ کے مسلک میں اختلافی اقوال ہیں کہ چھینکنے والے کے جواب میں یرحمک اللہ کہنا آیا واجب ہے یا سنت؟ لیکن اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب کہ چھینکنے والا الحمد للہ کہے اور اس کو حاضرین سنیں، لہٰذا اگر چھینکنے والے نے الحمد للہ نہیں کہا تو وہ جواب کا مستحق نہیں ہوگا اسی طرح اس نے الحمد للہ تو کہا لیکن اتنی آہستہ آواز سے کہا کہ کسی ایک نے بھی نہیں سنا تو اس صورت میں بھی جواب دینا یعنی یرحمک اللہ کہنا لازم نہیں ہوگا چنانچہ لفظ سَمِعَهٗ جو اس حدیث میں منقول ہے اس بات پر دلالت کرتا ہے اور یہی حکم سلام اور تمام فرض کفایہ امور جیسے عیادت مریض و تجہیز میت اور نماز جنازہ وغیرہ کا بھی ہے۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ چھینکنے والے کو چاہئے کہ وہ الحمد للہ، بلند آواز سے کہے تاکہ اہل مجلس سن لیں اور وہ جواب کا مستحق ہو۔

یرحمک اللہ کہنے والے کے جواب میں کیا کہا جائے

(۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا عَطَسَ اَحَدُكُمْ فَلْيَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلْيَقُلْ لَهٗ اَخُوْهُ اَوْصَاحِبُهٗ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ وَاِذَا قَالَ لَهٗ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ فَلْيَقُلْ يَهْدِيْكُمُ اللّٰهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی شخص کو چھینک آئے تو چاہئے کہ وہ الحمد للہ کہے اور اس کے مسلمان بھائی۔ یا یہ فرمایا کہ اس کے دوست کو چاہئے کہ وہ اس چھینکنے والے کے الحمد للہ کہنے کے جواب میں یرحمک اللہ کہے اور جب اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہے تو چھینکنے والے کو چاہئے کہ یوں کہے يَهْدِيْكُمُ اللّٰهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری ہدایت کرے اور تمہارے دل و تمہارے احوال درست کرے۔" (بخاری)

تشریح: "یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ" میں مخاطب کے لئے جمع کا صیغہ یا تو باعتبار غالب کے ہے کہ عام طور پر چھینکنے والے کے پاس کئی آدمی ہوتے ہیں لہٰذا مذکورہ دعا میں ان سب کو شریک کرنا چاہئے، یا مخاطب کے لئے جمع کا صیغہ بطور تعظیم و تکریم کے ہے اور یا یہ کہ اس دعا میں مخاطب کے واسطے سے پوری امت مرحومہ کو شامل کرنا مراد ہوتا ہے۔

جو چھینکنے والا الحمدللہ نہ کہے وہ جواب کا مستحق نہیں ہوتا

③ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ عَطَسَ رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَشَمَّتَ اَحَدُھُمَا وَلَمْ یُشَمِّتِ الْاٰخَرَ فَقَالَ الرَّجُلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ شَمَّتَّ ھٰذَا وَلَمْ تُشَمِّتْنِیْ قَالَ اِنَّ ھٰذَا حَمِدَ اللّٰہَ وَلَمْ تَحْمِدِ اللّٰہَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے دو آدمیوں کو چھینک آئی آنحضرت ﷺ نے ان میں سے ایک آدمی کی چھینک کا جواب نہیں دیا جس آدمی کی چھینک کا جواب آپ نے نہیں دیا تھا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! (کیا وجہ ہے کہ) آپ نے اس آدمی کو تو جواب دیا لیکن مجھ کو جواب نہیں دیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس آدمی نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی تھی جب کہ تم نے اللہ تعالیٰ کی حمد نہیں کی (لہٰذا تم جواب کے مستحق نہیں ہوئے)۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص چھینکنے کے بعد الحمدللہ نہ کہے وہ اس بات کا مستحق نہیں ہوتا کہ اس کی چھینک کے جواب میں یرحمک اللہ کہا جائے۔

حضرت مکحولؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت ابن عمرؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ کسی شخص نے مسجد کے کسی کونے میں چھینکا، حضرت ابن عمرؓ نے (اس چھینک کی آواز سنی تو) فرمایا کہ یرحمک اللہ ان کنت حمدت اللہ یعنی اگر تو نے اللہ کی حمد کی ہے تو تجھ پر اللہ اپنی رحمت نازل کرے۔

شعبیؒ کہتے ہیں کہ اگر تمہارے کان میں دیوار کے پیچھے سے کسی چھینکنے اور الحمدللہ کہنے کی آواز آئے تو اس کو بھی جواب دو یعنی یرحمک اللہ کہو۔

④ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِذَا عَطَسَ اَحَدُکُمْ فَحَمِدَ اللّٰہَ فَشَمِّتُوْہُ وَاِنْ لَّمْ یَحْمَدِ اللّٰہَ فَلَا تُشَمِّتُوْہُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم میں سے کوئی شخص چھینکے اور اللہ کی حمد کرے یعنی چھینک آنے پر الحمدللہ کہے تو اس کو جواب یعنی یرحمک اللہ کہو اور اگر وہ اللہ کی حمد نہ کرے تو اس کو جواب نہ دو۔" (مسلمؒ)

جس شخص کو لگاتار چھینک آتی رہے اس کے جواب کا مسئلہ

⑤ وَعَنْ سَلْمَۃَ بْنِ الْاَکْوَعِ اَنَّہٗ سَمِعَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَعَطَسَ رَجُلٌ عِنْدَہٗ فَقَالَ لَہٗ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ ثُمَّ عَطَسَ اُخْرٰی فَقَالَ الرَّجُلُ مَزْکُوْمٌ۔ رَوَاہُ مُسْلِمٌ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِلتِّرْمِذِیِّ اَنَّہٗ قَالَ لَہٗ فِی الثَّالِثَۃِ اَنَّہٗ مَزْکُوْمٌ۔

"اور حضرت سلمہؓ ابن اکوعؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک دن رسول کریم ﷺ کو اس شخص کی چھینک کا جواب دیتے سنا جو اس وقت آپ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا یرحمک اللہ۔ پھر جب اس کو دوسری بار چھینک آئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص کو زکام ہو گیا ہے (مسلمؒ)۔ اور ترمذیؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے اس شخص کو تیسری مرتبہ چھینکنے پر یہ فرمایا کہ اس شخص کو زکام ہو گیا ہے۔"

تشریح: آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ اس شخص کو چوں کہ زکام ہو گیا ہے اس لئے یہ بار بار چھینکے گا اور

الحمد للہ کہے گا لہٰذا اس کے جواب میں بار بار یرحمک اللہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ واضح رہے کہ ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ کی ایک اور روایت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جس شخص کو لگاتار چھینک آتی رہے اور وہ الحمد للہ کہتا رہے تو تین چھینکوں تک جواب دیا جائے، تیسری مرتبہ کے بعد اختیار ہوگا کہ چاہے جواب دے چاہے نہ دے۔

پس حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ اگر کسی شخص کو لگاتار چھینک آتی رہے تو اس کے جواب میں تین چھینکوں تک یرحمک اللہ تو واجب یا سُنّت مؤکدہ ہوگا، تیسری مرتبہ کے بعد سکوت اور جواب کے درمیان اختیار ہوگا کہ چاہے تو تین مرتبہ کے بعد جواب نہ دے جو رخصت یعنی شریعت کی طرف سے آسانی ہے اور چاہے تین مرتبہ کے بعد بھی جواب دیتا رہے جو مستحب ہے گویا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ تین مرتبہ کے بعد جواب دینا کوئی ناجائز بات نہیں ہے لیکن واجب و سُنّت مؤکدہ بھی نہیں ہے۔

جب جمائی آئے تو منہ پر ہاتھ رکھ لو

⑥ وَعَنْ اَبِی سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا تَثَاءَبَ اَحَدُکُمْ فَلْیُمْسِكْ بِیَدِهٖ عَلٰی فَمِهٖ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ یَدْخُلُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی شخص کو جمائی آئے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنا ہاتھ منہ پر رکھ لے، کیونکہ شیطان اگر منہ کو کھلا ہوا پاتا ہے تو اس میں گھس جاتا ہے۔" (مسلم)

تشریح: منہ میں شیطان کے گھسنے سے مراد یا تو حقیقۃً گھسنا ہے یا یہ مراد ہے کہ جو شخص جمائی کے وقت اپنے منہ کو بند نہیں رکھتا، شیطان اس پر اثر انداز ہونے اور اس کو وساوس و اوہام میں مبتلا کرنے پر قادر ہو جاتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

چھینکتے وقت چہرہ پر ہاتھ رکھ لینا چاہئے

⑦ وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا عَطَسَ غَطّٰی وَجْهَهٗ بِیَدِهٖ اَوْ ثَوْبِهٖ وَغَضَّ بِهَا صَوْتَهٗ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوُدَ قَالَ التِّرْمِذِیُّ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ۔

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب چھینکتے تو اپنے چہرہ مبارک کو اپنے ہاتھوں یا اپنے کسی کپڑے سے ڈھانک لیتے تھے اور اپنی چھینک کی آواز کو پست کر لیتے۔ اس روایت کو ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے، نیز ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: چھینکتے وقت چہرے کو ڈھانک لینا اور بلند آواز سے نہ چھینکنا، یہ دونوں چیزیں تہذیب و شائستگی کی علامت بھی ہیں اور آداب شریعت کا تقاضہ بھی کیوں کہ ایک تو چھینک کے ذریعہ عام طور پر دماغ کا فضلہ و بلغم وغیرہ ناک یا منہ سے نکل پڑتا ہے دوسرے چھینکتے وقت چہرہ کی ہیئت بگڑ جاتی ہے اس لئے چہرے کو ڈھانک لینا چاہئے اسی طرح زیادہ زوردار آواز کے ساتھ چھینکنے کی صورت میں بسا اوقات لوگ چونک اٹھتے ہیں اور ویسے بھی زیادہ بلند آواز اور بے ساختہ آواز کے ساتھ چھینکنا طبیعت کی سلامتی اور شخصی وقار کے خلاف سمجھا جاتا ہے لہٰذا ہلکی آواز کے ساتھ چھینکنا حسن ادب سمجھا گیا ہے، علماء نے لکھا ہے کہ چھینکنے والے کے لئے مستحب ہے کہ اپنی چھینک کو پست آواز میں رکھے۔ اور الحمد للہ بلند آواز میں کہے تاکہ لوگ سن کر جواب دیں۔

یرحمک اللہ کہنے والے کے حق میں دعا

⑧ وَعَنْ اَبِی اَیُّوْبَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا عَطَسَ اَحَدُکُمْ فَلْیَقُلِ الْحَمْدُلِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ وَلْیَقُلِ الَّذِیْ یَرُدُّ عَلَیْہِ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ وَلْیَقُلْ ھُوَ یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

"اور حضرت ابوایوبؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب تم میں سے کسی شخص کو چھینک آئے تو چاہئے کہ وہ یوں کہے۔ اَلْحَمْدُلِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ یعنی ہر حال میں خدا کی تعریف ہے، اور جو شخص اس کا جواب دے اس کو یوں چاہئے۔ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ اور پھر اس کے جواب میں چھینکنے والے کو یوں کہنا چاہئے یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت بخشے اور تمہارے دل یا تمہارے احوال کو درست فرمائے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

یہودیوں کی چھینک اور آنحضرت ﷺ کا جواب

⑨ وَعَنْ اَبِی مُوْسٰی قَالَ کَانَ الْیَھُوْدُ یَتَعَاطَسُوْنَ عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَیَرْجُوْنَ اَنْ یَّقُوْلَ لَھُمْ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ فَیَقُوْلُ یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ یہودی جب نبی کریم ﷺ کے پاس ہوتے تو جان بوجھ کر چھینکتے اس امید میں کہ آپ ﷺ ان کے جواب میں یَرْحَمُکَ اللّٰہ کہیں گے، لیکن آپ ﷺ ان کی چھینک کے جواب میں محض یہ فرماتے یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت بخشے اور تمہارے قلوب یا تمہارے احوال کی اصلاح فرمائے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ ان کی چھینک کے جواب میں یرحمک نہ کہتے کیوں کہ اللہ کی رحمت صرف مؤمن کے لئے مخصوص ہے البتہ آپ ﷺ ان کے حسب حال ان کی ہدایت و اصلاح کی دعا فرماتے۔

چھینک کے وقت سلام

⑩ وَعَنْ ھِلَالِ بْنِ یَسَافٍ قَالَ کُنَّا مَعَ سَالِمِ بْنِ عُبَیْدٍ فَعَطَسَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَیْکُمْ فَقَالَ لَہٗ سَالِمٌ وَعَلَیْکَ وَعَلٰی اُمِّکَ فَکَاَنَّ الرَّجُلَ وَجَدَ فِیْ نَفْسِہٖ فَقَالَ اَمَا اِنِّیْ لَمْ اَقُلْ اِلَّا مَا قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَیْکَ وَعَلٰی اُمِّکَ اِذَا عَطَسَ اَحَدُکُمْ فَلْیَقُلِ الْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَلْیَقُلْ لَہٗ مَنْ یَّرُدُّ عَلَیْہِ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ وَلْیَقُلْ یَغْفِرُ اللّٰہُ لِیْ وَلَکُمْ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ہلال ابن یسافؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ ایک دن ہم لوگ حضرت سالم ابن عبیدؓ کے ساتھ تھے کہ جماعت میں سے ایک شخص کو چھینک آئی اور اس نے الحمدللہ کے بجائے السلام علیکم کہا اس گمان کہ چھینک کے بعد الحمدللہ کی بجائے السلام علیکم کہنا بھی جائز ہے حضرت سالمؓ نے اس شخص کے جواب میں کہا کہ تم پر اور تمہاری ماں پر بھی سلام اس شخص نے گویا اپنے دل میں ان الفاظ (اور تمہاری ماں پر بھی سلام) کا برا مانا، حضرت سالمؓ نے (اس ناگواری کو محسوس کرتے ہوئے) کہا کہ (اس ناگواری کی کیا بات ہے) تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے وہی الفاظ کہے ہیں جو نبی کریم ﷺ نے اس وقت ارشاد فرمائے تھے جب کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کے سامنے چھینکا تھا اور اس نے الحمد للہ کہنے کی بجائے السلام علیکم کہا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا کہ تم پر اور تمہاری ماں پر سلام۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی شخص کو چھینک آئے تو اس کو چاہئے کہ (الحمد للہ رب العالمین) کہے اور جواب دینے والے کو چاہئے کہ یرحمک اللہ کہے اور پھر چھینکنے والے کو (بطریق استحباب) چاہئے کہ یوں کہے یغفر اللہ لی ولکم یعنی اللہ تعالیٰ میری اور تمہاری مغفرت فرمائے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ چھینک آنے پر الحمدللہ یا الحمدللہ رب العالمین کے الفاظ کہنے چاہئیں اس موقع پر حاضرین کو سلام کرنا نہ کوئی معنی رکھتا ہے اور نہ اس کی کوئی اصل ہے۔

بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ یرحمک اللہ کہنے والے کے جواب میں چھینکنے والے کو یغفر اللہ لی ولکم کے ساتھ یھدیکم اللہ ویصلح بالکم بھی کہنا اولیٰ و افضل ہے۔

حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر چھینکنے والا الحمدللہ کے بجائے کوئی اور لفظ کہے تو وہ چھینک کے جواب کا مستحق نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس شخص کی چھینک کے جواب میں یرحمک اللہ نہیں فرمایا البتہ اس شخص نے چونکہ آپ ﷺ کو سلام کیا آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا، رہی یہ بات کہ آپ ﷺ نے سلام کے جواب میں وعلی امک اور تمہاری ماں پر بھی سلام کے الفاظ کیوں فرمائے تو دراصل آپ ﷺ نے اس لفظ کے ذریعہ دو باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ایک تو یہ کہ اس موقع پر سلام کرنا بے محل و بے موقع ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص سلام تو تمہیں کرنا چاہئے مگر کہے یوں کہ تم پر اور تمہاری ماں پر سلام۔ دوسری بات یہ کہ کسی بھی لفظ و کلام کا بے محل و بے موقع استعمال کرنا چاہئے اپنے آپ کو علم و تربیت اور مجلس کے آداب سے بے بہرہ ثابت کرنا ہے اور اس بات کا اظہار کرنا ہے کہ میں اس شخص کی طرح ہوں جو کسی مردانا کی تربیت سے محروم اور محض ماں کی غیر موزوں تربیت کا حامل ہو اور جس کے دل و دماغ پر زنانہ ماحول اور زنانہ طور طریقوں کا اثر ہو۔ نیز علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان الفاظ کے ذریعہ گویا اس شخص کی نادانی کو ظاہر کیا گیا ہے جو اس میں ماں کے اوصاف کے سرایت کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی اسی اعتبار سے وہ اپنی ماں کے حق میں آنحضرت ﷺ کی دعا کا محتاج تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے ساتھ تمہاری ماں پر بھی سلامتی ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو عقل کی دولت سے نوازے اور نادانی کے فتنہ سے محفوظ رکھے۔

لگاتار تین بار سے زائد چھینکنے والے کو جواب دینا ضروری نہیں ہے

(۱۱) وَعَنْ عُبَيْدِبْنِ رِفَاعَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ شَمِّتِ الْعَاطِسَ ثَلَاثًا فَمَازَادَ فَاِنْ شِئْتَ فَشَمِّتْهُ وَاِنْ شِئْتَ فَلَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عبید ابن رفاعہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا چھینکنے والے کی لگاتار تین چھینک تک جواب دیا جائے اور اگر کوئی شخص تین بار سے زائد چھینکے تو اس صورت میں اختیار ہے کہ چاہے اس کو جواب دیا جائے اور چاہے جواب نہ دیا جائے۔ اس روایت کو ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

(۱۲) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ شَمِّتْ اَخَاكَ ثَلٰثًا فَاِنْ زَادَ فَهُوَ زُكَامٌ رَوَاهُ اَبُوْ دَاوُدَ وَقَالَ لَا اَعْلَمُهٗ اِلَّا اَنَّهٗ رَفَعَ الْحَدِيْثَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ تم اپنے مسلمان بھائی کی چھینک کا تین بار تک جواب دو اگر وہ اس سے زائد بار چھینکے تو سمجھو کہ اس کو زکام ہو گیا ہے۔ اس روایت کو ابوداؤدؒ اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ حضرت ابوہریرہؓ نے اس حدیث کو نبی کریم ﷺ تک پہنچایا ہے۔"

تشریح: امام ابوداؤدؒ کی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ کا اپنا قول نہیں ہے بلکہ یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جس کو ابوہریرہؓ نے نقل کیا ہے اور اگر اس روایت کو حدیث موقوف یعنی حضرت ابوہریرہؓ ہی کا قول کہا جائے تو بھی یہ روایت حدیث مرفوع یعنی آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کے حکم میں ہوگی کیوں کہ حضرت ابوہریرہؓ تین کے عدد کا تعین شارع علیہ السلام سے سنے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

چھینک آنے پر الحمد کے ساتھ صلوٰۃ و سلام کے الفاظ ملانا غیر مستحب ہے

⑬ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ رَجُلاً عَطَسَ اِلٰی جَنْبِ ابْنِ عُمَرَ فَقَالَ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ابْنُ عُمَرَ وَاَنَا اَقُوْلُ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ وَلَيْسَ هٰكَذَا عَلَّمَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَقُوْلَ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ عَلٰی كُلِّ حَالٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت نافعؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ ایک دن کا واقعہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کے برابر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے چھینکا اور پھر کہا الحمدللّٰہ والسلام علی رسول اللّٰہ۔ حضرت ابن عمرؓ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ میں بھی کہتا ہوں الحمدللّٰہ والسلام علی رسول اللّٰہ، لیکن یوں ہے نہیں (یعنی اس کا نہ تو حکم دیا گیا ہے اور نہ یہ مستحب اور آداب میں سے ہے کہ چھینک آنے پر الحمدللّٰہ کے ساتھ سلام کے الفاظ ملائیں جائیں۔ بلکہ اصل ادب اور حکم نبوی ﷺ کے اتباع کا تقاضہ یہی ہے کہ چھینک آنے پر ہم بلا کسی کمی و زیادتی کے وہی کہیں) جو رسول کریم ﷺ نے ہمیں سکھایا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم یوں کہیں الحمد للہ علی کل حال یعنی ہر حال میں خدا کی تعریف ہے۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

بَابُ الضِّحْكِ

ہنسنے کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آنحضرت ﷺ کی ہنسی

① عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَارَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُسْتَجْمِعًا ضَاحِكًا حَتّٰی اَرٰی مِنْهُ لَهَوَاتِهٖ اِنَّمَا كَانَ يَتَبَسَّمُ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو اتنا زیادہ ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ ﷺ کا منہ کھل گیا ہو اور مجھے آپ ﷺ کے تالو یا حلق کا کوا یا مسوڑھا نظر آیا ہو بلکہ اکثر و بیشتر آپ ﷺ کا ہنسا مسکرانے کی حد تک رہتا تھا۔" (بخاریؒ)

② وَعَنْ جَرِيْرٍ قَالَ مَاحَجَبَنِيَ النَّبِيُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُنْذُ اَسْلَمْتُ وَلَا رَاٰنِيْ اِلَّا تَبَسَّمَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جریرؓ کہتے ہیں کہ جب سے میں مسلمان ہوا ہوں نبی کریم ﷺ نے کبھی مجھ کو منع نہیں کیا اور جب بھی آپ ﷺ مجھ کو دیکھتے مسکرا دیتے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "مجھ کو منع نہیں کیا" سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی بھی مجھ کو اپنے پاس آنے سے روکا نہیں میں جس وقت چاہتا آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا، چاہے کوئی خصوصی مجلس ہی کیوں نہ ہوتی بشرطیکہ مردانہ مجلس ہوتی! یا یہ مراد ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے آپ ﷺ سے کوئی چیز مانگی ہو اور آپ ﷺ نے اس کے دینے سے انکار کیا ہو میں نے آنحضرت ﷺ سے جب بھی مانگا اور جو کچھ بھی مانگا وہ مجھ عطا ہوا۔

صحابہؓ کی زبان سے زمانہ جاہلیت کی باتیں سن کر آنحضرت ﷺ کا مسکرانا

③ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقُوْمُ مِنْ مُصَلَّاهُ الَّذِيْ يُصَلِّيْ فِيْهِ الصُّبْحَ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَإِذَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ قَامَ وَكَانُوْا يَتَحَدَّثُوْنَ فَيَأْخُذُوْنَ فِيْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ فَيَضْحَكُوْنَ وَيَتَبَسَّمُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلتِّرْمِذِيِّ يَتَنَاشَدُوْنَ الشِّعْرَ۔

"اور حضرت جابرؓ ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کا معمول تھا کہ آپ ﷺ جس مصلے پر فجر کی نماز پڑھتے وہاں سے اس وقت تک نہیں اٹھتے تھے جب تک سورج اچھی طرح نہ نکل آتا جب سورج نکل آتا اور خاصا بلند ہو جاتا تو آپ ﷺ اشراق کی نماز پڑھنے یا گھر میں تشریف لے جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے، اس دوران صحابہؓ بطریق استہزاء مذمت زمانہ جاہلیت کی باتیں کرتے رہتے اور ہنسا کرتے ان کے ساتھ آنحضرت ﷺ بھی مسکراتے رہتے (مسلمؒ) اور ترمذیؒ کی روایات میں یوں ہے کہ اس دوران صحابہؓ اشعار پڑھنے سننے میں لگے رہتے۔"

تشریح: "اشعار" سے مراد وہ اشعار ہیں جو بیان توحید، منقبت رسالت اور ترغیب و ترہیب کے مضامین پر مشتمل ہوتے۔
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زمانہ جاہلیت کی باتیں کرنا اور ان پر ہنسنا جائز ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

آنحضرت ﷺ بہت مسکراتے تھے

④ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ الْحَارِثِ بْنِ جَزْءٍ قَالَ مَا رَأَيْتُ أَحَدًا أَكْثَرَ تَبَسُّمًا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت عبد اللہ ابن حارث ابن جزءؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے زیادہ کسی اور شخص کو مسکراتے نہیں دیکھا" (ترمذیؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

صحابہؓ کے ہنسنے کا ذکر

⑤ وَعَنْ قَتَادَةَ قَالَ سُئِلَ ابْنَ عُمَرَ هَلْ كَانَ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَضْحَكُوْنَ قَالَ نَعَمْ وَالْإِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِهِمْ أَعْظَمُ مِنَ الْجَبَلِ وَقَالَ بِلَالُ بْنُ سَعْدٍ أَدْرَكْتُهُمْ يَشْتَدُّوْنَ بَيْنَ الْأَغْرَاضِ وَيَضْحَكُ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ فَإِذَا كَانَ اللَّيْلُ كَانُوْا رُهْبَانًا۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"حضرت ابو قتادہؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا رسول کریم ﷺ کے صحابہؓ ہنسا کرتے تھے، حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ ہاں! حالانکہ ان کے دلوں میں پہاڑ سے بھی بڑا ایمان تھا۔ اور حضرت بلال ابن سعد تابعیؒ کہتے ہیں کہ میں نے صحابہؓ کو اس حال میں پایا ہے کہ وہ دن میں تیر اندازی کی مشق کے وقت تیر کے نشانوں کے درمیان دوڑا کرتے تھے اور ایک دوسرے کی باتوں پر ہنسا کرتے تھے مگر جب رات آتی تو وہ اللہ سے بہت زیادہ ڈرنے والے ہو جاتے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "حالانکہ ان کے دلوں میں پہاڑ سے بھی بڑا ایمان تھا" کے ذریعہ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب ہنسنے مسکرانے کا موقع ہوتا تو وہ ہنسا کرتے تھے لیکن اس طرح نہیں ہنستے تھے جیسے اہل غفلت اور دنیادار لوگ ہنستے ہیں کیوں کہ ایسی ہنسی جو حد سے بڑھی ہوئی ہو دل کو

غافل کر دیتی ہے اور نور ایمان میں خلل ڈالتی ہے چنانچہ صحابہ ہنسنے کی حالت میں بھی شرعی آداب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے اور اپنے ایمان کو کامل درجہ پر باقی رکھتے تھے۔

تو وہ اللہ سے بہت زیادہ ڈرنے والے ہو جاتے کا مطلب یہ ہے کہ جب رات آتی تو صحابہ دنیا کے سارے کام کاج اور آرام و راحت چھوڑ کر خدا کی عبادت میں مشغول ہو جاتے اور خوف الٰہی کے غلبہ سے روتے گڑگڑاتے اور مناجات و التجا میں مصروف رہتے۔

بَابُ الْاَسَامِیْ

اسماء کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اس باب میں وہ احادیث نقل کی جائیں گی جن سے ناموں کے احکام واضح ہوں گے اور یہ معلوم ہوگا کہ کس طرح کے نام رکھنے چاہئیں، کون سے نام اچھے ہیں اور کون سے نام برے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی کنیت پر اپنی کنیت مقرر نہ کرو

① عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي السُّوْقِ فَقَالَ رَجُلٌ يَا اَبَا الْقَاسِمِ فَالْتَفَتَ اِلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّمَا دَعَوْتُ هٰذَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمُّوْا بِاسْمِيْ وَلَا تَكْتَنُوْا بِكُنْيَتِيْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ بازار میں تھے ایک شخص نے کسی کو ابوالقاسم کہہ کر پکارا، آپ ﷺ نے پلٹ کر اس شخص کی طرف دیکھا اس نے عرض کیا کہ میں نے آپ ﷺ کو نہیں پکارا، تھا بلکہ اس شخص کو آواز دی تھی اور یہ کہہ کر ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو وہاں موجود تھا نبی کریم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ تم میرے نام پر نام رکھ لو لیکن میری کنیت پر کنیت مقرر نہ کرو۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

② وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَمُّوْا بِاِسْمِي وَلَا تَكْتَنُوْا بِكُنْيَتِي فَاِنِّي اِنَّمَا جُعِلْتُ قَاسِمًا اَقْسِمُ بَيْنَكُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم میرے نام پر نام رکھا کرو لیکن میری کنیت پر کنیت مقرر نہ کرو کیونکہ مجھ کو قاسم قرار دیا گیا ہے۔ اور میں تمہارے درمیان تقسیم کرتا ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "کنیت اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی ذات کی نسبت باپ یا بیٹے کی طرف کر کے اپنے کو مشہور و متعارف کرائے جیسے ابن فلاں یا ابوفلاں یعنی فلاں کا بیٹا فلاں کا باپ وغیرہ، یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کنیت اس نام کو کہتے ہیں جو باپ، بیٹا یا بیٹی، ماں کے تعلق سے بولا جائے۔

اور میں تمہارے درمیان تقسیم کرتا ہوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو جو علم اور حکمت دینی احکام و مسائل اور دنیاوی دولت جیسے مال غنیمت وغیرہ عطا کرتا ہے اس کو میں مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرتا ہوں۔ بعض حضرات کے نزدیک "یہ تقسیم کرتا ہوں" سے مراد یہ ہے کہ میں خدا کے نیک بندوں کو جنت اور دوسری نعمتوں کی بشارت و خوش خبری دیتا ہوں۔ اور بدکار لوگوں کو دوزخ وغیرہ سے ڈراتا ہوں، لہٰذا یہ صفت چونکہ تمہارے اندر موجود نہیں ہے اور تم اس مقام پر فائز نہیں ہو اس لئے تم میری کنیت کو اختیار کرنے کے مجاز نہیں البتہ اپنا نام یا اپنی اولاد کا نام لفظ اور صورۃً میرے نام پر رکھ سکتے ہو۔ حاصل یہ کہ میں محض اس سب سے ابوالقاسم نہیں ہوں کہ میرے بیٹے

کا نام قاسمؒ ہے بلکہ مجھ میں قاسمیت کے معنی کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے بایں اعتبار کہ مجھ کو دینی و دنیاوی امور و دولت کا تقسیم کنندہ قرار دیا گیا ہے لہٰذا جب میں نہ تو ذات کے اعتبار سے اور نہ صفات کے اعتبار سے تم میں سے کسی بھی شخص کی مانند ہوں تو تم کو میری کنیت پر اپنی کنیت مقرر نہ کرنی چاہئے۔ واضح رہے کہ اس صورت میں ابو کے معنی باپ کے نہیں ہوں گے بلکہ اس وصف کے مالک ہوں گے جیسا کہ کسی شخص کو ابوالفضل کہا جائے درآنحالیکہ اس کے بیٹے کا نام فضل نہ ہو۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی کنیت پر مقرر کرنے کی ممانعت کا تعلق خاص طور پر آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے تھا تاکہ تخاطب کے وقت ذات نبوی ﷺ اور دوسرے لوگوں کے درمیان اشتباہ کی صورت پیدا نہ ہو جیسا کہ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے یہی قول صحیح ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں حدیثوں سے واضح ہوتا ہے کہ محمد نام رکھنا تو جائز ہے لیکن۔ ابوالقاسم کنیت مقرر کرنا درست نہیں ہے خواہ یہ صورت ہو کہ جس شخص کا نام محمد ہو وہ ابوالقاسم کو اپنی کنیت قرار دینا چاہے اور خواہ یہ صورت ہو کہ نام کچھ اور ہو اور محض کنیت ابوالقاسم مقرر کرنا چاہے۔ حاصل یہ کہ کسی بھی شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ابوالقاسم کو اپنی کنیت قرار دے خواہ اس کا نام محمد ہو یا کچھ اور ہو، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ اور اصحاب ظواہر کا یہی قول ہے اور وہ انہیں حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں دوسرا قول! محمد شیبانیؒ کا ہے اور وہ یہ ہے کہ نام اور کنیت کو ایک ساتھ جمع کرنا درست نہیں ہے یعنی جس کا نام محمد ہو وہ اپنی کنیت ابوالقاسم نہ رکھے البتہ جس کا نام محمد نہ ہو اس کو صرف ابوالقاسم کہنا کہلانا جائز ہے ان کے نزدیک ان دونوں حدیثوں کا مطلب یہی ہے کہ کوئی شخص اپنی ذات کے لئے اس نام و کنیت کو ایک ساتھ اختیار نہ کرے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ دونوں کو جمع کرنا بھی جائز ہے یعنی جس شخص کا نام محمد ہو وہ بھی اپنی کنیت ابوالقاسم رکھ سکتا ہے اس قول کی نسبت حضرت امام مالکؒ کی طرف کی جاتی ہے ان کا کہنا ہے کہ جن احادیث میں اس کی ممانعت منقول ہے وہ منسوخ ہیں، چنانچہ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ اس ممانعت کا تعلق آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک سے تھا آپ ﷺ کے بعد یہ جائز ہے اس جماعت کی دلیل حضرت علیؓ کی یہ حدیث ہے کہ جب انہوں نے آنحضرت ﷺ سے یہ عرض کیا کہ اگر آپ ﷺ کے بعد میرے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوا تو میں اس کا نام اور کنیت آپ ﷺ کے نام و کنیت کی طرح رکھوں گا؟ تو آپ ﷺ نے ان کو اس کی اجازت عطا فرمائی، چنانچہ حضرت محمد بن الحنفیہؒ جو آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد پیدا ہوئے تھے، حضرت علیؓ نے ان کی کنیت ابوالقاسم رکھی۔ ایک اور جماعت کہ جس کا قول ناقابل اعتماد ہے یہ کہتی ہے کہ کسی شخص کو آنحضرت ﷺ کا نام رکھنا بھی جائز نہیں ہے۔

مذکورہ بالا تمام اقوال کی روشنی میں جو قول سب سے صحیح اور حنفی مسلک کے مطابق ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا نام رکھنا تو جائز بلکہ مستحب ہے لیکن آنحضرت ﷺ کی کنیت پر اپنی کنیت رکھنا اگرچہ اس کا تعلق آنحضرت ﷺ کے بعد سے ہو۔ ممنوع ہے اس اعتبار سے آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں یہ ممنوع تر تھا اسی طرح نام اور کنیت دونوں کو جمع کرنا بطریق اولی ممنوع ہوگا، جہاں تک حضرت علیؓ کے بارے میں مذکورہ بالا روایت کا تعلق ہے تو وہ ان کے ساتھ ایک مخصوص معاملہ تھا جیسا کہ حدیث کے سیاق سے واضح ہوتا ہے لہٰذا ان کے علاوہ کسی اور کو یہ جائز نہیں ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی کنیت پر اپنی کنیت رکھے اس کی تائید ابن عساکرؒ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو جمع الجوامع میں حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ ایک دن اسی مسئلہ پر حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی تو حضرت طلحہؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ آپ نے اپنے لڑکے کا آنحضرت ﷺ کے نام پر محمد رکھا ہے اور اس کی کنیت بھی آنحضرت ﷺ کی کنیت پر ابوالقاسم رکھی ہے حالانکہ آنحضرت ﷺ نے کسی ایک شخص کے لئے ان دونوں کو جمع کرنے سے منع فرمایا ہے حضرت علیؓ نے قریشی صحابہؓ کو بلوایا ان سب نے حاضر ہو کر گواہی دی کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو مخصوص طور پر اس بات کی اجازت دیدی تھی کہ وہ آنحضرت ﷺ کے بعد اپنے ہونے والے بچے کا نام و کنیت آپ ﷺ کے نام و کنیت پر رکھ لیں۔

عبداللہ اور عبدالرحمٰن سب سے بہتر نام ہیں

③ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَبَّ اَسْمَآءِ کُمْ اِلَی اللّٰہِ عَبْدُ اللّٰہِ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ عزوجل کے نزدیک تمہارے ناموں میں سب سے زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس ارشاد گرامی ﷺ سے مراد ہے کہ یہ دونوں نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن انبیاء کے ناموں کے بعد سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں اس اعتبار سے کہا جائیگا کہ یہ دونوں نام اسم محمد سے زیادہ پسندیدہ نہیں ہیں بلکہ پسندیدگی میں ان دونوں کا درجہ یا تو اسم محمد کے درجہ سے کم ہے یا برابر ہے۔

چند ممنوع نام

④ وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَسْتَمِّیَنَّ غُلَامَكَ یَسَارًا وَّلَا رَبَاحًا وَلَا نَجِیْحًا وَلَا اَفْلَحَ فَاِنَّكَ تَقُوْلُ اَثَمَّ ھُوَ فَلَا یَکُوْنُ فَیَقُوْلُ لَا رَوَاہُ مُسْلِمٌ وَفِیْ رِوَایَةٍ لَهٗ قَالَ لَا تُسَمِّ غُلَامَكَ رَبَاحًا وَلَا یَسَارًا وَلَا اَفْلَحَ وَلَا نَافِعًا۔

"اور حضرت سمرہ ابن جندبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اپنے غلام کا نام یسار، رباح، نجیح، اور افلح نہ رکھو کیوں کہ اگر کسی وقت تم نے کسی شخص سے پوچھا کہ کیا وہ (مثلاً) یسار یا رباح یہاں ہے اور (فرض کرو) وہ وہاں نہ ہوا تو جواب دینے والا کہے گا کہ وہ (یعنی یسار یا رباح) یہاں نہیں ہے۔" (مسلمؒ)

اور مسلمؒ ہی کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اپنے غلام کا نام، رباح، یسار افلح، اور نافع نہ رکھو۔

تشریح: یسار، یسر سے ہے جس کے معنی فراخی اور تونگری کے ہیں۔ رباح، ربح سے ہے جس کے معنی فائدہ اور نفع کے ہیں، نجیح نجح سے ہے جس کے معنی فتحمندی یا مطلب یابی کے ہیں، اَفْلَحْ، فَلَاحْ سے ہے جس کے معنی کامیابی و نجات کے ہیں اور نافع نفع سے ہے جس کے معنی فائدہ کے ہیں۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے نام رکھنے ممنوع ہیں کیونکہ مثال کے طور پر اگر کسی شخص نے یسار نام رکھا اور کسی وقت گھر والوں سے پوچھا کہ یہاں یسار ہے؟ گھر والوں نے جواب دیا کہ گھر میں یسار نہیں ہے تو اگرچہ اس صورت میں متعین ذات مراد ہوگی مگر لفظ یسار کے حقیقی معنی کے اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا کہ گھر میں فراخی و تونگری نہیں ہے اور اس طرح کہنا برائی کی بات ہے اس پر دوسرے مذکورہ بالا الفاظ کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔

مسلمؒ کی دوسری روایت میں "نجیح" کے بجائے "نافع" کا ذکر ہے اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ ممانعت کا تعلق محض انہی ناموں سے نہیں ہے بلکہ اور دوسرے نام بھی جو ان الفاظ کے معنی میں ہوں، یہی حکم رکھتے ہیں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اس طرح کے نام رکھنے مکروہ تنزیہی ہیں نہ کہ مکروہ تحریمی۔

⑤ وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَرَادَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یَّنْھٰی اَنْ یُّسَمّٰی بِیَعْلٰی وَبِبَرَکَةَ وَبِاَفْلَحَ وَبِیَسَارٍ وَبِنَافِعٍ وَبِنَحْوِ ذٰلِكَ ثُمَّ رَاَیْتُہٗ سَکَتَ بَعْدُ عَنْھَا ثُمَّ قُبِضَ وَلَمْ یَنْهَ عَنْ ذٰلِكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے یہ ارادہ فرمایا تھا کہ یعلی، برکت، افلح، یسار، نافع اور اس طرح کے دوسرے نام رکھنے سے

لوگوں کو منع فرمادیں لیکن پھر میں نے دیکھا کہ اس ارادہ کے بعد آپ ﷺ نے سکوت فرمایا، یہاں تک کہ آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے اور ان ناموں کے رکھنے کو منع نہیں فرمایا۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے بظاہر معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا طرح کے نام رکھنے کی ممانعت نافذ نہیں ہوئی ہے جب کہ پچھلی حدیث ممانعت کے نفاذ پر واضح طور سے دلالت کرتی ہے اس تضاد کو دور کرنے کے لئے یحیٰی کہتے ہیں کہ گویا حضرت جابرؓ نے ممانعت کی علامتوں کو دیکھا اور وہ چیز سنی جو ممانعت کی طرف اشارہ کرتی ہے چونکہ انہوں نے ممانعت کا حکم صریح طور سے نہیں سنا تھا اس لئے اس مسئلہ کو انہوں نے مذکورہ اسلوب میں بیان کیا لیکن یہ ممانعت چونکہ حدیث صحیح سے ثابت ہوئی ہے اس لئے یہی کہا جائے گا کہ ممانعت ثابت ہے۔ علاوہ ازیں ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک اس تضاد کو دور کرنے کے لئے ایک اور تاویل ہے وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ کے ارادہ کا تعلق دراصل اس ممانعت کو نہی تحریمی کے طور پر نافذ کرنے سے تھا لیکن اس کے بعد آپ ﷺ نے امت کے حق میں آسانی و نرمی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے سکوت فرمایا کیوں کہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ ناموں کا مسئلہ ایسا ہے جس کی طرف لوگ زیادہ توجہ نہیں دیں گے اور اچھے و برے ناموں میں فرق و امتیاز کرنے کے پابند نہیں ہوں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی وجہ سے امت کے لوگ دینی نقصان میں مبتلا ہوں گے! لہٰذا کہا جائے گا کہ جس روایت سے ممانعت کا عدم نفاذ ثابت ہوتا ہے اس کا تعلق نہی تحریمی سے ہے اور حقیقت میں مسئلہ بھی یہی ہے کہ مذکورہ طرح کے نام رکھنا مکروہ تنزیہی ہے مکروہ تحریمی نہیں ہے۔

شہنشاہ کا نام ولقب اختیار نہ کرو

(۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَخْنَى الْاَسْمَآءِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ اللّٰهِ رَجُلٌ يُسَمّٰى مَلِكَ الْاَمْلَاكِ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ وَفِیْ رِوَايَةِ مُسْلِمٍ قَالَ اَغْيَظُ رَجُلٍ عَلَى اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاَخْبَثُ رَجُلٌ كَانَ يُسَمّٰى مَلِكَ الْاَمْلَاكِ لَا مَلِكَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (بخاریؒ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین نام والا وہ شخص ہوگا جس کو شہنشاہ کا نام دیا جائے۔" (بخاریؒ)

اور مسلمؒ کی روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین اور سب سے بدتر وہ شخص ہوگا جس کو شہنشاہ کا نام دیا جائے یاد رکھو خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہیں ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی بادشاہ نہیں ہے، چہ جائیکہ کسی کو شہنشاہ یعنی بادشاہوں کا بادشاہ کہا جائے اور صفِ شہنشاہیت ایک ایسا وصف ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ خاص ہے کہ اس وصف میں کسی مخلوق کے شریک ہونے کا وہم وگمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ایسا نام نہ رکھو جس سے نفس کی تعریف ظاہر ہو

(۷) وَعَنْ زَيْنَبَ بِنْتِ اَبِیْ سَلَمَةَ قَالَتْ سُمِّيْتُ بَرَّةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمُ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَهْلِ الْبِرِّ مِنْكُمْ سَمُّوْهَا زَيْنَبَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت زینب بنت ابی سلمہؓ کہتی ہیں کہ میرا نام برہ یعنی نیکوکار رکھا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے نفس کی تعریف نہ کرو تم میں جو شخص نیکوکار ہے اس کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اس بچی کا نام زینب رکھو۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایسا نام نہ رکھنا چاہئے جس کے لفظی مفہوم سے نفس کی تعریف ظاہر ہو کیونکہ اس کی وجہ سے نفس

میں بڑائی پیدا ہو جاتی ہے۔

⑧ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَتْ جُوَيْرِيَةُ اِسْمُهَا بَرَّةَ فَحَوَّلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِسْمَهَا جُوَيْرِيَةَ وَكَانَ يَكْرَهُ اَنْ يُقَالَ خَرَجَ مِنْ عِنْدِ بَرَّةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی ایک زوجہ مطہرہ، حضرت جویریہؓ کا نام برہ تھا لیکن رسول کریم ﷺ نے ان کا یہ نام بدل کر جویرہؓ رکھ دیا کیونکہ آنحضرت ﷺ کو یہ پسند نہیں تھا کہ کوئی شخص یوں کہے کہ آپ ﷺ برہ کے پاس سے نکلے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "برہ کے معنی نیکوکار کے ہیں" لہٰذا آپ ﷺ نے اس لفظ کے اصل معنی کے اعتبار سے اس کو پسند نہیں کیا کہ جب برہ کے گھر سے نکلیں یوں کہا جائے کہ آپ ﷺ برہ یعنی نیکوہ کار کے پاس سے نکلے کیونکہ نیکوکار کے پاس سے نکلنا کوئی اچھی بات نہیں سمجھی جاتی۔ وَكَانَ يَكْرَهُ کے بارے میں بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اپنی مذکورہ ناپسندیدگی کے بارے میں خود آنحضرت ﷺ نے اپنے متعلق سے ان الفاظ کے ذریعہ خبر دی ہوگی۔

واضح رہے کہ اس حدیث میں برہ یا اس طرح کا کوئی اور نام رکھنے کی ممانعت کا سبب مذکورہ ناپسندیدگی کو قرار دیا گیا ہے جب کہ حضرت زینبؓ کے بارے میں اس ممانعت کا سبب تزکیہ نفس کی تعریف کو قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ اسباب کے درمیان کوئی مزاحمت نہیں ہوا کرتی ایک چیز کے دو مختلف سبب ہو سکتے ہیں، چنانچہ جن دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ دونوں مذکورہ ممانعت کا سبب بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں، علاوہ ازیں ہو سکتا ہے کہ زینب کے خاندان وقبیلہ کے لوگوں سے معلوم کرنے کے بعد یہ واضح ہوا ہوگا کہ انہوں نے زینبؓ کا نام برہ واقعۃً ان کے نفس کی تعریف اور مدح وثنا کے قصد سے رکھا تھا جب کہ حضرت جویریہؓ کے حق میں اس ممانعت کا سبب۔ آنحضرت ﷺ برہ کے پاس سے نکلے کہے جانے کی ناپسندیدگی کو قرار دیا اور یہ بات تھی بھی کہ ازواج مطہرات کے پاس آنحضرت ﷺ کے جانے آنے کے بارے میں عام طور پر اسی طرح کہا جاتا تھا کہ آنحضرت ﷺ فلاں زوجہ مطہرہ کے پاس تشریف لے گئے ہیں یا آنحضرت ﷺ فلاں زوجہ مطہرہ کے ہاں سے نکلے ہیں۔ نیز اس احتمال کو بھی ملحوظ رکھا جا سکتا ہے کہ جس طرح یسار اور نجیح وغیرہ جیسے ناموں کی ممانعت کے سلسلے میں بدفالی کا اعتبار کیا گیا ہے اسی طرح برہ کے سلسلے میں بھی اس کا اعتبار ہو، اور جس طرح برہ کے سلسلے میں تزکیہ وکراہت کا اعتبار کیا گیا ہے، اسی طرح یسار اور نجیح وغیرہ کے سلسلہ میں بھی اس کا اعتبار ہو۔

برے نام کو بدل دینا مستحب ہے

⑨ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ بِنْتًا كَانَتْ لِعُمَرَ يُقَالُ لَهَا عَاصِيَةُ فَسَمَّاهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَمِيْلَةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے ایک بیٹی تھی جس کو عاصیہ بمعنی گنہ گار کہا جاتا تھا چنانچہ رسول کریم ﷺ نے اس کا نام جمیلہ رکھا۔" (مسلمؒ)

تشریح: زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کا دستور تھا کہ وہ اپنے بچوں کا نام عاصی یا عاصیہ رکھتے تھے اس کے لفظی معنی نافرمان سرکش، متکبر اور خدا اور اس کے دین کا مخالف ہیں چنانچہ زمانہ اسلام کے ظہور کے بعد آنحضرت ﷺ نے اس طرح کے نام رکھنے کو ناپسند فرمایا اور جس کسی کا نام عاصی یا عاصیہ تھا اس کو بدل کر دوسرا نام رکھ دیا اس سے معلوم ہوا کہ برے ناموں کو بدل دینا مستحب ہے۔

⑩ وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ اُتِيَ بِالْمُنْذِرِ بْنِ اَبِيْ اُسَيْدٍ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ وُلِدَ فَوَضَعَهُ عَلٰى فَخِذِهٖ فَقَالَ مَا اسْمُهُ قَالَ فُلَانٌ قَالَ لَا وَلٰكِنْ اِسْمُهُ الْمُنْذِرُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سہل ابن سعدؓ کہتے ہیں کہ منذر ابن ابی اسید جب پیدا ہوئے تو ان کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لایا گیا، آپ ﷺ نے ان کو اپنی ران مبارک پر رکھا اور پوچھا کہ اس کا کیا نام ہے؟ لانے والے نے بتایا کہ فلاں نام ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ (یہ نام اچھا

نہیں ہے) بلکہ اس کا نام منذر ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "فلاں نام ہے" یعنی ماں باپ یا خاندان والوں نے جو لکھا تھا لانے والے نے اس کو بیان کیا چونکہ راوی کو وہ نام معلوم نہیں تھا اس لئے انہوں نے اس طرح نقل کیا۔

"منذر" اصل میں انذار سے مشتق ہے جس کے معنی تبلیغ احکام اور عذاب خداوندی سے ڈرانے والے کے ہیں۔

اپنے غلام اور باندی کو میرا بندہ یا میری بندی نہ کہو

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَقُوْلَنَّ اَحَدُکُمْ عَبْدِیْ وَاَمَتِیْ کُلُّکُمْ عَبِیْدُ اللّٰهِ وَکُلُّ نِسَآءِ کُمْ اِمَاءُ اللّٰهِ وَلٰکِنْ لِیَقُلْ غُلَامِیْ وَجَارِیَتِیْ وَفَتَایَ وَفَتَاتِیْ وَلَا یَقُلِ الْعَبْدُ رَبِّیْ وَلٰکِنْ لِیَقُلْ سَیِّدِیْ وَفِیْ رِوَایَةٍ لِیَقُلْ سَیِّدِیْ وَمَوْلَایَ وَفِیْ رِوَایَةٍ لَا یَقُلِ الْعَبْدُ لِسَیِّدِہٖ مَوْلَایَ فَاِنَّ مَوْلٰکُمُ اللّٰهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام اور باندی کو "عبدی" میرا بندہ اور "امتی" میری لونڈی نہ کہے، تمہارے سب مرد اللہ کے بندے اور تمہاری سب عورتیں اللہ کی لونڈیاں ہیں، بلکہ یوں کہے کہ میرا غلام یعنی میرا لڑکا اور میری جاریہ یعنی میری لڑکی، یا میرا خادم اور میری خادمہ اسی طرح کوئی غلام اپنے مالک کو میرا رب نہ کہے بلکہ میرا سردار کہنا چاہئے۔ اور ایک روایت میں یوں ہے کہ کوئی غلام اپنے مالک کو "میرا مولی" نہ کہے، کیونکہ تمہارا مولی تو صرف اللہ ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: جب غلام اور باندی رکھنے کا رواج تھا تو لوگ ان کو ایسے الفاظ کے ذریعہ یاد اور مخاطب کیا کرتے تھے جو اپنے معنی کے اعتبار سے بالکل غیر موزوں ہوتے تھے۔ مثلاً زمانہ جاہلیت میں اہل عرب جب اپنے غلام یا اپنی باندی کو مخاطب کرتے تو اس طرح کہتے، یاعبدی اے میرے بندے۔ اور۔ یا امتی، یعنی اے میری لونڈی ظاہر ہے کہ لفظ "عبد" ایک مخصوص مفہوم کا حامل ہے اور اسلامی عقیدے کے مطابق انسان اللہ تعالیٰ ہی کا عبد بندہ ہے اور ہو سکتا ہے۔ ایک دوسرے انسان کا بندہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ عبد یا بندہ عبادت کرنے والے کو کہتے ہیں اور عبادت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہو سکتی ہے، کسی مخلوق کی نہیں! اس اعتبار سے اگر کوئی انسان، کسی دوسرے انسان کو اپنا عبد یعنی بندہ کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر وہ یا تو حقیقت عبدیت میں شرک کا مرتکب ہو رہا ہے یا شرک کا مرتکب نہ سہی ارتکاب شرک کے گمان کا سبب بن رہا ہے لہٰذا آپ ﷺ نے اس لفظ کو استعمال کرنے سے منع فرمایا اسی طرح قاموس کے مطابق لفظ "امۃ" کے معنی مملوکہ کے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی بھی انسان کی حقیقی ملکیت صرف اللہ تعالیٰ کو حال ہے یہ ممکن نہیں ہے ایک انسان دوسرے انسان کی ملکیت کا دعویٰ کرے لہٰذا آپ ﷺ نے اس لفظ کو بھی استعمال کرنے سے منع فرمایا۔

جن الفاظ کے ذریعہ غلام و باندی کو یاد اور مخاطب کرنے کی اجازت دی گئی ہے ان میں سے غلام کے معنی لڑکے کے ہیں، جاریہ کے معنی لڑکی کے ہیں، فتی کے معنی جوان مرد اور فتاۃ کے معنی جوان عورت کے ہیں ظاہر ہے کہ ان الفاظ کے استعمال میں نہ صرف یہ کہ مفہوم کے اعتبار سے کوئی غیر موزونیت نہیں ہے بلکہ ان الفاظ کے ذریعہ ایک طرح سے غلام و باندی کے تئیں شفقت و محبت اور یگانگت و رواداری کے جذبات کا بھی اظہار ہوتا ہے، رہی یہ بات کہ جب فتی اور فتاۃ جوان مرد اور جوان عورت کو کہتے ہیں تو ان الفاظ کا اطلاق ان غلام اور باندی پر کیسے ہو گا جو عمر رسیدہ اور بوڑھے ہوں تو اس بارے میں یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ غلام اور باندی، خواہ وہ کتنے ہی بوڑھے ہوں، عام طور پر ان کے آقا اور مالک ان کے ساتھ چھوٹوں اور جوانوں ہی کا سا معاملہ رکھتے تھے، اور ان کو بڑھاپے کا وہ لحاظ احترام نہیں کرتے تھے جو ان کی عمر کے دوسرے لوگوں یعنی آزاد بوڑھیوں کا ہوتا تھا، علاوہ ازیں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خدمت گاری اور کام کاج کے سلسلے میں چوں کہ بوڑھے غلام و باندی بھی جوانوں جیسی مستعدی اور چستی رکھتے تھے اس لئے ان کو بھی فتی اور فتاۃ کہا جاتا تھا۔ حاصل یہ کہ اس ارشاد گرامی ﷺ کا مطلب یہ واضح کرنا ہے کہ اگر اپنے غلام اور باندی کو ایسے الفاظ کے ذریعہ مخاطب کرنا ہی ہو جوان کی حیثیت و رتبہ کو

واضح کر سکیں تو اس مقصد کے لئے عبد اور امتہ سے بہتر مذکورہ الفاظ ہیں، تاہم علماء نے یہ لکھا ہے کہ عبد اور امتہ کے الفاظ کے استعمال کی اس ممانعت کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ اپنے غرور و تکبر کے اظہار اور باندی کو حقیر و ذلیل جاننے کے طور پر ہو، ورنہ غلام و باندی پر لفظ عبد اور امتہ کا اطلاق خود قرآن و حدیث میں منقول ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَالصَّالِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ اور ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ اس طرح بہت سی احادیث میں بھی غلام اور باندی کو، لفظ عبد اور امتہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جس طرح مالکوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے غلام و باندی کو ناشائستہ اور غیر موزوں الفاظ کے ذریعہ مخاطب نہ کریں، چنانچہ فرمایا گیا کہ کوئی غلام و باندی اپنے آقا کو ربی میرا رب نہ کہے کیوں کہ اگرچہ رب کے معنی تربیت و پرورش کرنے والے کے ہیں، اور ظاہری مفہوم کے اعتبار سے ایک آقا کو اپنے غلام و باندی کا تربیت و پرورش کرنے والا کہا جاسکتا ہے، لیکن ربوبیت علی الاطلاق ایک ایسی خاص صفت ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق ہے، لہٰذا کسی انسان کو "رب" کہنا شرک کے گمان کا باعث ہے، لیکن واضح رہے کہ اس ممانعت کا تعلق بھی اس صورت سے ہے جب کہ اس لفظ کے استعمال کا مقصد اپنے مالک کی تعظیم ہو، ورنہ مالک پر لفظ رب کا اطلاق بھی قرآن کریم سے ثابت ہے جیسا کہ فرمایا گیا..... اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ غلام و باندی کو اپنے مالک کے تئیں جس لفظ کو استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

وہ "سید" ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مالک کو اپنے غلام باندی پر سیادت و فضیلت اور امارت و ریاست حاصل ہوتی ہے اس اعتبار سے غلام و باندی کا اپنے مالک کو، یاسیدی یعنی اے میرے سردار یا اے میرے آقا کہہ کر مخاطب کرنا موزوں و مناسب ہے۔

واضح رہے کہ ایک روایت میں تو غلام و باندی کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مالک کو مولی کہیں لیکن دوسری روایت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ کوئی غلام و باندی اپنے مالک کو مولی نہ کہے ان دونوں روایتوں کے درمیان پائے جانے والے ظاہری تضاد کو اس تاویل کے ذریعہ دور کیا جاتا ہے کہ مولی کے کئی معنی آتے ہیں، جیسے متصرف و منتظم، ناصر اور معین وغیرہ چنانچہ غلام و باندی کو اپنے مالک کے تئیں "مولی" کا لفظ استعمال کرنے کی اجازت و جواز کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ وہ اس کے معنی مراد نہ لیں جو حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہیں "ہاں" جس معنی کا اطلاق بندوں کی ذات پر بھی ہو سکتا ہے جیسے متصرف و منتظم تو ان معنی کو مراد لیتے ہوئے مالک کے لئے لفظ مولی کا استعمال کیا جاسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ مولی کا اطلاق معتق اور معتق پر کیا جاتا ہے، جیسا کہ بخاریؒ کی روایت میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے مولی القوم من انفسھم یا طبری کی روایت میں ہے مولی الرَّجُلُ اخوہ اور مالک کو "مولی" کہنے کی ممانعت و عدم جواز کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ اس کے وہ معنی مراد لئے جائیں جو حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں جیسے ناصر اور معین وغیرہ کیونکہ ان کے معنی کے اعتبار سے مولی کے حقیقی معنی صرف حق تعالیٰ ہے جیسا کہ یہ فرمایا گیا، نعم المولی و نعم النصیر اس تاکی روشنی میں دونوں روایتوں کے درمیان کوئی تضاد باقی نہیں رہا حاصل یہ کہ اس مسئلے میں وہی ضابطہ پیش نظر رہے گا جو پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ اگر لفظ "مولی" کا استعمال غایت تعظیم کے طور پر ہو تو ممانعت کا حکم نافذ ہوگا ورنہ بصورت دیگر اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔

انگور کو "کرم" کہنے کی ممانعت

(۱۲) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَقُوْلُوا الْكَرْمُ فَإِنَّ الْكَرْمَ قَلْبُ الْمُؤْمِنِ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَّهُ عَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ قَالَ لَا تَقُوْلُوا الْكَرْمَ وَلٰكِنْ قُوْلُوا الْعِنَبُ وَالْحَبَلَةُ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا (انگور کے درخت کو) کرم نہ کہو کیونکہ کرم مؤمن کا دل ہے (مسلم) اور مسلمؒ ہی کی ایک حدیث میں حضرت وائل ابن حجرؓ سے یوں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا انگور کے درخت کو کرم نہ کہو بلکہ عنب اور حبلہ کہو۔"

تشریح: حبلہ۔ حاء اور باء کے زبر کے ساتھ، یا باء کے زبر اور باء کے جزم کے ساتھ، اصل میں انگور کے درخت یا ایک قول کے مطابق انگور کی جڑ یا شاخ کو کہتے ہیں، بعض مواقع پر مجازاً انگور کو بھی حبلہ کہا گیا ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ انگور کو عنب یا حبلہ کہو یا اس کے اور جو نام ہیں وہ لیا کرو۔ لیکن اس کو "کرم" نہ کہا جائے اس ممانعت کا ایک پس منظر ہے اور وہ یہ کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب انگور کو کرم کہا کرتے تھے کیونکہ انگور سے شراب بنتی ہے اور ان کا کہنا تھا کہ اس شراب کے پینے سے آدمی میں سخاوت و ہمت اور جود و کرم کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں چنانچہ جب شریعت نے شراب کو حرام کر دیا اور وہ ایک نجس و ناپاک چیز قرار پائی تو آنحضرت ﷺ نے انگور کو کرم کہنے سے منع فرمایا کیونکہ ایک ایسی چیز کو نذ کورہ نام کے ذریعہ کرم و خیر کے ساتھ متصف کرنا جو شراب جیسی ناپاک چیز کی جڑ ہے مناسب نہیں سمجھا گیا جب کہ انگور کو اتنے عمدہ نام سے یاد کرنے کا مطلب ایک حرام چیز کی تعریف و توصیف کا راستہ اختیار کرنا اور اس کی طرف سے دل و دماغ کو رغبت دلانا بھی ہو سکتا ہے، نیز آپ ﷺ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ "کرم" ایک ایسا اعلیٰ لفظ ہے جو اپنے وسیع مفہوم کے اعتبار سے تمام بھلائیوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس اعتبار سے اس لفظ کا مصداق مؤمن اور اس کا قلب ہی ہو سکتا ہے نہ جو علم و تقویٰ کے نور کا مخزن اور اسرار معارف کا منبع ہے۔

زمانہ کو برا نہ کہو

(۱۳) وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَاتُسَمُّوا الْعِنَبَ الْكَرْمَ وَلَاتَقُوْلُوْا یَا خَیْبَةَ الدَّهْرِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ انگور کو کرم نہ کہو اور نہ یہ کہو کہ اے ناامیدی زمانہ کی کیونکہ بلاشبہ اللہ ہی کے اختیار میں زمانہ ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: زمانہ جاہلیت میں عام طور پر لوگوں کی عادت تھی کہ جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی یا وہ کسی آفت و مصیبت میں مبتلا ہوتے تو یوں کہتے۔ یا خیبۃ الدھر اور اس لفظ کے ذریعہ گویا وہ زمانہ کو برا کہتے تھے جیسا کہ اب بھی جاہلوں کی عادت ہے کہ وہ بات بات پر زمانہ کو برا کہتے ہیں چنانچہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو اس سے منع فرمایا کیونکہ زمانہ بذات خود کوئی چیز نہیں ہے، حالات میں الٹ پھیر اور زمانہ کے انقلابات مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں کہ جس بھلائی و برائی اور مصیبت و راحت کی نسبت زمانہ کی طرف کی جاتی ہے حقیقت میں وہ خدا کی طرف سے ہوتی ہے اور وہی فاعل حقیقی ہے، پس زمانہ کو برا کہنا دراصل اللہ تعالیٰ کو برا کہنا ہے۔

(۱۴) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَایَسُبُّ اَحَدُكُمُ الدَّهْرَ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم میں کوئی شخص زمانہ کو برا نہ کہے کیونکہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی زمانہ کو الٹ پھیر کرنے والا ہے۔" (مسلمؒ)

امتلاء نفس کو "خباثت نفس" سے تعبیر نہ کرو

(۱۵) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَایَقُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ خَبُثَتْ نَفْسِی وَلٰكِنْ لِیَقُلْ لَقِسَتْ نَفْسِی مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ وَذُكِرَ حَدِیْثُ اَبِی هُرَیْرَةَ یُؤْذِیْنِی ابْنُ اٰدَمَ فِی بَابِ الْاِیْمَانِ۔

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص (امتلاء کے وقت) یوں نہ کہے کہ میرا جی برا ہوا بلکہ لَقِسَتْ نَفْسِی کہے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت یُؤْذِیْنِی ابن ادم باب الایمان میں نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: خَبُثَتْ نفسی اور لقست نفسی یہ دونوں لفظ اگرچہ معنی کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں رکھتے بلکہ عربی میں ان دونوں کے معنی

ایک ہی ہیں یعنی جی متلانا اور طبیعت کا فاسد ہونا، لیکن آنحضرت ﷺ نے خبثت نفسی کہنے کو ناپسند فرمایا کیوں کہ لفظ "خبث" کی وجہ سے نہ صرف یہ جملہ قبیح ہو جاتا ہے بلکہ مؤمن کا لفظ خبث کو اپنے نفس کی طرف منسوب کرنا بھی لازم آتا ہے جو ایک مناسب بات نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

ابوالحکم، کنیت کی ناپسندیدگی

(۱۶) عَنْ شُرَیْحِ بْنِ هَانِیءٍ عَنْ اَبِیْهِ اَنَّهٗ لَمَّا وَفَدَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَعَ قَوْمِهٖ سَمِعَهُمْ یُکْنُوْنَهٗ بِاَبِی الْحَکَمِ فَدَعَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَکَمُ وَاِلَیْهِ الْحُکْمُ فَلِمَ تُکْنٰی اَبَا الْحَکَمِ قَالَ اِنَّ قَوْمِیْ اِذَا اخْتَلَفُوْا فِیْ شَیْءٍ اَتَوْنِیْ فَحَکَمْتُ بَیْنَهُمْ فَرَضِیَ کِلَا الْفَرِیْقَیْنِ بِحُکْمِیْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا اَحْسَنَ هٰذَا فَمَالَكَ مِنَ الْوَلَدِ قَالَ لِیْ شُرَیْحٌ وَمُسْلِمٌ وَعَبْدُاللّٰهِ قَالَ فَمَنْ اَکْبَرُهُمْ قَالَ قُلْتُ شُرَیْحٌ قَالَ فَاَنْتَ اَبُوْ شُرَیْحٍ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"حضرت شریح ابن ہانیؒ اپنے والد حضرت ہانیؓ سے نقل کرتے ہیں کہ جب وہ (حضرت ہانیؓ) اپنی قوم کے ساتھ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے سنا کہ ان کی قوم ان کو ابوالحکم کی کنیت کے ذریعہ یاد و مخاطب کرتی ہے، چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ان کو بلایا اور فرمایا کہ حکم تو صرف اللہ تعالیٰ ہے اور حکم اسی کی طرف سے ہے پھر تم نے اپنی کنیت ابوالحکم کیوں مقرر کی ہے؟ حضرت ہانیؓ نے عرض کیا کہ میری قوم مجھ کو ابوالحکم کی کنیت کے ذریعہ اس لئے پکارتی ہے کہ جب میری قوم کے لوگ کسی معاملہ میں اختلافات کا شکار ہوتے ہیں تو میرے پاس آتے ہیں اور میں ان کے معاملہ میں جو حکم فیصلہ کرتا ہوں دونوں فریق میرے اس فیصلہ کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ یہ یعنی لوگوں کے تنازعات کو نمٹانا اور ان کے درمیان فیصلہ و حکم کرنا بہت اچھی بات ہے لیکن یہ بتاؤ تمہارے کتنے بچے ہیں اور ان کے نام کیا ہیں انہوں نے کہا میرے تین بچے ہیں جن کے نام شریح مسلم اور عبداللہ ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ ان تینوں میں بڑا کون ہے؟ حضرت ہانیؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا شریح! آنحضرت ﷺ نے فرمایا تو پھر آج سے تم ابوشریح ہو۔" (نسائیؒ)

تشریح: کنیت کبھی تو کسی وصف و صفت کی طرف نسبت کر کے مقرر کی جاتی ہے جیسے کوئی شخص اپنی کنیت ابوالفضل یا ابوالحکم اور ابوالخیر وغیرہ مقرر کرے، کبھی اولاد کی طرف نسبت کر کے مقرر کی جاتی ہے جیسے ابوسلمہ یا ابوشریح وغیرہ کبھی کنیت کا تعلق کسی ایسی خاص چیز کی طرف نسبت کرنے سے ہوتا ہے جس کے ساتھ انتہائی اختلاط اور ربط ہو، جیسے ابوہریرہؓ چنانچہ مشہور صحابی حضرت ابوہریرہؓ کا اصل نام عبداللہ تھا کہتے ہیں کہ ایک بلی ان کے پاس رہا کرتی تھی ایک دن وہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس بلی کو اپنی آستین میں لئے ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ بلی، آپ ﷺ نے فرمایا یَا اَبَاهُرَیْرَۃَ بس اس دن سے ان کی کنیت ابوہریرہؓ مشہور ہو گئی اور کبھی کنیت محض علمیت کے لئے یعنی اصل نام کے طور پر ہوتی ہے، جیسے ابوبکرؓ اور ابوعمرؓ وغیرہ۔

"اور حکم اسی کی طرف سے ہے" سے آنحضرت ﷺ کی مراد یہ تھی کہ حقیقی حکم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور ہر حکم و فیصلہ کی ابتداء و انتہا اسی کے قبضہ و اختیار میں ہے کہ نہ صرف اس کے حکم و فیصلہ کو کوئی رد نہیں کر سکتا بلکہ اس کا حکم و فیصلہ حکمت و دانائی سے خالی نہیں ہوتا اس اعتبار سے یہ وصف چوں کہ حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے اور وہی اس صفت کا سزاوار ہے اس لئے کسی دوسرے کو مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ابوالحکم یعنی حکم و فیصلہ کا مالک کہے یا کہلائے کیوں کہ اس صورت میں اللہ کے اس وصف خاص میں غیر اللہ کے شریک ہونے کا گمان پیدا ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ ابوت و ابنیت کے وہم کی وجہ سے اس کی ذات پر ابوالحکم کا اطلاق نہیں ہوتا۔

"اجدع" شیطانی نام ہے

⑰ وَعَنْ مَسْرُوْقٍ قَالَ لَقِيْتُ عُمَرَ فَقَالَ مَنْ اَنْتَ قُلْتُ مَسْرُوْقُ بْنُ الْاَجْدَعِ قَالَ عُمَرُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْاَجْدَعُ شَيْطَانٌ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"حضرت مسروقؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ جب میں حضرت عمرؓ سے ملا تو انہوں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ میں نے عرض کیا کہ میں اجدع کا بیٹا مسروق ہوں۔ حضرت عمرؓ نے (میرے باپ کا نام اجدع سن کر) فرمایا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اجدع ایک شیطان کا نام ہے۔" (ابوداؤدؒ وابن ماجہؒ)

تشریح: "اجدع" اصل میں اس کو کہتے ہیں جس کے کان، ناک، ہونٹ، اور ہاتھ کٹے ہوئے ہوں اور کنایۃً اس نام کا اطلاق اس شخص پر کیا جاتا ہے جس کی کسی بات میں کوئی وزن اور دلیل نہ ہو اسی مناسبت سے ایک شیطان کو اجدع کہا جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا حضرت مسروقؒ کے بارے میں پوچھنا اور پھر آنحضرت ﷺ کا مذکورہ ارشاد نقل کرنا گویا تفنن طبع کے طور پر تھا اور اس کے ذریعہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود تھا کہ اگر تمہارے والد حیات ہوں تو ان کا یہ نام بدل دو۔

اچھے نام رکھو

⑱ وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِاَسْمَائِكُمْ وَاَسْمَاءِ اٰبَائِكُمْ فَاَحْسِنُوْا اَسْمَائَكُمْ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن تم کو تمہارے اور تمہارے باپ کے ناموں سے پکارا جائے گا۔ لہٰذا تم اپنے اچھے نام رکھو۔" (احمدؒ وابوداؤدؒ)

تشریح: "تم اچھے نام رکھو" اس ارشاد کے ذریعہ تمام بنی آدم کو خطاب کیا گیا ہے لہٰذا اس میں باپ بھی داخل ہیں اور ان کے لئے ہدایت ہے کہ وہ اپنے بچوں کا اچھا نام رکھیں۔

ایک روایت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو ان کی ماؤں کے نام کے ساتھ پکارا جائے گا اور علماء نے لکھا ہے کہ ماؤں کے نام کے ساتھ پکارنے کی حکمت وعلت ایک تو یہ ہے کہ جو لوگ زنا کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہوں گے وہ اس صورت میں شرمندگی اور رسوائی سے بچ جائیں گے دوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم علیہ السلام کی رعایت حال مقصود ہوگی جو بے پدر تھے اور تیسرے حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے اس فضل وشرف کا اظہار مقصود ہوگا جو ان کو حضرت فاطمہؓ کے بیٹے ہونے کی حیثیت سے آنحضرت ﷺ کی طرف نسبت کے ذریعہ حاصل ہے۔ اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کیا جائے تو کہا جائے گا کہ "تم کو تمہارے باپ کے ناموں سے پکارا جائے گا" میں باپ کو تغلیب پر حمل کیا جائے جیسا کہ ماں اور باپ دونوں کو ابوین کہا جاتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی موقع پر تو باپ کے نام کے ساتھ پکارا جائے گا اور کسی موقع پر ماں کے نام کے ساتھ، یا بعض لوگوں کی نسبت ان کے باپ کی طرف کی جائے گی اور بعض لوگوں کی نسبت ان کی ماں کی طرف کی جائے گی اور یا یہ کہ بعض مقامات میں باپ کے نام کے ساتھ اور بعض مقامات میں ماں کے نام کے ساتھ پکارا جائے گا۔

آنحضرت ﷺ کے نام اور کنیت دونوں کو ایک ساتھ اختیار کرنے کی ممانعت

⑲ وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى اَنْ يَجْمَعَ اَحَدٌ بَيْنَ اِسْمِهٖ وَكُنْيَتِهٖ وَيُسَمّٰى مُحَمَّدٌ اَبَا

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی شخص آپ ﷺ کے نام اور کنیت کو ایک ساتھ اختیار کرے اور جس شخص کا نام محمد ہو اس کو ابوالقاسم (بھی) کہا جائے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مذکورہ ترجمہ اس صورت میں ہوگا جب کہ لفظ "محمد" مرفوع اور یسمی بصیغہ مجہول ہو جیسا کہ ترمذی اور شرح السنۃ اور مصابیح کے اکثر نسخوں میں نقل کیا گیا ہے لیکن جامع الاصول اور مصابیح کے بعض نسخوں میں محمد کو نصب کے ساتھ نقل کیا گیا ہے اس صورت میں یسمی صیغہ معروف کے ساتھ ہوگا اور ترجمہ یوں کیا جائے گا کہ کوئی شخص اس آدمی کو ابوالقاسم کہے جس کا نام محمد ہو۔ حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کا نام محمد ہو تو نہ خود اس کے لئے روا ہے کہ وہ اپنی کنیت ابوالقاسم مقرر کرے اور نہ کسی دوسرے شخص کے لئے مناسب ہے کہ وہ محمد نامی کو ابوالقاسم کہے اس مسئلہ کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔

(۲۰) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا سَمَّیْتُمْ بِاسْمِیْ فَلَا تَکْتَنُوْا بِکُنْیَتِیْ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ وَفِیْ رِوَایَۃِ اَبِیْ دَاؤُدَ قَالَ مَنْ تَسَمّٰی بِاسْمِیْ فَلَا یَکْتَنِ بِکُنْیَتِیْ وَمَنْ تَکَنّٰی بِکُنْیَتِیْ فَلَا یَتَسَمَّ بِاسْمِیْ۔

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر تم میرے نام پر اپنا نام محمد رکھو تو میری کنیت پر کنیت (ابوالقاسم) مقرر نہ کرو۔ (ترمذی، ابن ماجہ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ نیز ابوداؤد کی روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص میرے نام پر نام رکھے تو وہ میری کنیت پر کنیت نہ مقرر کرے اور جو شخص میری کنیت پر کنیت مقرر کرے تو میرے نام پر نام نہ رکھے۔"

تشریح: یہ حدیث بھی آنحضرت ﷺ کے نام اور کنیت کو ایک ساتھ اختیار کرنے کی صریح ممانعت کو ظاہر کرتی ہے تاہم ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا یعنی صرف نام پر نام رکھنا یا صرف کنیت پر کنیت مقرر کرنا ممنوع نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ کا نام اور کنیت ایک ساتھ اختیار کرنیکی ممانعت بطور تحریم نہیں ہے

(۲۱) وَعَنْ عَائِشَۃَ اَنَّ امْرَاءَۃً قَالَتْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّیْ وَلَدْتُ غُلَامًا فَسَمَّیْتُہٗ مُحَمَّدًا وَکُنْیَتُہٗ اَبَا الْقَاسِمِ فَذُکِرَ لِیْ اَنَّکَ تَکْرَہُ ذٰلِکَ فَقَالَ مَا الَّذِیْ اَحَلَّ اِسْمِیْ وَحَرَّمَ کُنْیَتِیْ اَوْمَا الَّذِیْ حَرَّمَ کُنْیَتِیْ وَاَحَلَّ بِاسْمِیْ۔ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤُدَ وَقَالَ مُحْیِ السُّنَّۃِ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک عورت نے بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! میرے ایک لڑکا ہوا ہے اور میں نے اس کا نام محمد اور کنیت ابوالقاسم رکھی ہے لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ (ﷺ) اس کو پسند نہیں فرماتے یعنی بتانے والے نے مجھ کو یہ بتایا ہے کہ آپ (ﷺ) نے اپنا نام اور کنیت ایک ساتھ اختیار کئے جانے کو احرام قرار دیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ایسی کیا چیز ہے جس نے میرے نام پر نام رکھنے کو تو حلال و جائز رکھا ہے اور میری کنیت پر کنیت مقرر کرنے کو حرام کیا ہے۔ یا یہ فرمایا کہ۔ ایسی کیا چیز ہے جس نے میری کنیت پر کنیت رکھنے کو تو حرام کیا ہے اور میرے نام پر نام رکھنے کو حلال رکھا ہے؟ (ابوداؤدؒ) اور محی السنۃ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کے سلسلے میں راوی نے (یہ فرمایا کہ) کے ذریعہ اپنے شک کو ظاہر کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یا تو پہلے نام کی حلت اور بعد میں کنیت کی حرمت کو ذکر کیا یا پہلے کنیت کی حرمت کو اور بعد میں نام کی حلت کو ذکر فرمایا۔ تاہم دونوں صورتوں میں معنی و مطلب ایک ہی ہیں، مفہوم و مقصد کے درمیان کوئی فرق و تفاوت نہیں ہے! اصل بات یہ ہے کہ محدث جب کوئی حدیث بیان کرتا ہے

تو اس بات کی پوری احتیاط رکھتا ہے کہ اس نے حدیث کے الفاظ آنحضرت ﷺ سے جس طرح سنے ہیں یا جس طرح اس تک پہنچے ہیں اسی طرح بجنسہ ان کو نقل کرے چوں کہ اس موقع پر راوی کو الفاظ حدیث کے سلسلے میں شک ہوا اس لئے اس نے مذکورہ طرح سے بیان کیا۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے نام اور کنیت کو ایک ساتھ اختیار کرنے کی ممانعت بطریق تحریم یعنی حرام ہونے کے طور پر نہیں ہے بلکہ مکروہ تنزیہی کے طور پر ہے۔

(۲۲) وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَنَفِيَّةِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَأَيْتَ اِنْ وُلِدَلِي بَعْدَكَ وَلَدٌ اُسَمِّيْهِ بِاِسْمِكَ وَاُكَنِّيْهِ بِكُنْيَتِكَ قَالَ نَعَمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت محمد ابن حنفیہؒ اپنے والد ماجد حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! مجھے بتایئے کہ اگر میں آپ (ﷺ) کے (وصال کے) بعد میرے یہاں (حضرت فاطمہؓ سے یا کسی اور بیوی سے) کوئی بچہ پیدا ہو تو کیا میں اس کا نام آپ (ﷺ) کے نام پر اور اس کی کنیت آپ (ﷺ) کی کنیت پر رکھ سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں!۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: یہ حدیث بھی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے نام اور کنیت کو ایک ساتھ اختیار کرنے کی ممانعت کا تعلق آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے تھا اس کے بعد یہ جائز ہے اس مسئلہ پر علماء کے جو اختلافی اقوال ہیں پیچھے نقل کئے جا چکے ہیں۔

حضرت انسؓ کی کنیت

(۲۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَنَّانِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبَقْلَةٍ كُنْتُ اَجْتَنِيْهَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ لَانَعْرِفُهُ اِلَّا مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ وَفِي الْمَصَابِيْحِ صَحَّحَهُ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے میری کنیت اس ساگ کے نام پر مقرر کی تھی جس کو میں اکھاڑ تا تھا (یعنی آپ ﷺ نے ایک دن مجھ کو ایک ساگ کہ جس کو عربی میں حمزہ کہتے ہیں اکھاڑتے ہوئے دیکھا تو اس کی مناسبت سے میری کنیت ابو حمزہ رکھ دی) اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ ہمارا علم یہ ہے کہ یہ حدیث اس سند کے علاوہ جو جامع الترمذیؒ میں نقل کی گئی ہے اور کسی سند کے ساتھ مذکور نہیں ہے (گویا یہ حدیث غریب ہے کہ ایک طریق اور ایک سند کے علاوہ اور کسی طریق و سند سے منقول نہیں ہے) لیکن صاحب مشکوۃ کہتے ہیں کہ مصابیح میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔"

جو نام اچھا نہ ہو اس کو بدل دو

(۲۴) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُغَيِّرُ الْاِسْمَ الْقَبِيْحَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ برے نام کو بدل دیا کرتے تھے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مثلاً ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص کا نام اسود یعنی کالا تھا آنحضرت ﷺ نے اس کے نام کو بدل دیا اور فرمایا کہ آج سے اس کا نام بیض (یعنی گورا) ہے۔

ایسے نام رکھنے کی ممانعت جو اسماء الٰہی میں سے ہیں

(۲۵) وَعَنْ بَشِيْرِ بْنِ مَيْمُوْنٍ عَنْ عَمِّهٖ اُسَامَةَ بْنِ اَخْدَرِيٍّ رَجُلًا يُقَالُ لَهٗ اَصْرَمُ كَانَ فِي النَّفَرِ الَّذِيْنَ اَتَوْرَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اسْمُكَ قَالَ اَصْرَمُ قَالَ بَلْ اَنْتَ زُرْعَةُ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ

وَقَالَ وَغَيَّرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسم الْعَاصِ وَعَزِيْزٍ وَعَتَلَةَ وَشَيْطَانٍ وَالْحَكَمِ وَغُرَابٍ وَ حُبَابٍ وَ شِهَابٍ وَقَالَ تَرَكْتُ اَسَانِيْدَهَا لِلْاِخْتِصَارِ۔

"اور حضرت بشیر ابن میمونؒ (تابعی) اپنے چچا حضرت اسامہؓ ابن اخدری سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک جماعت حاضر ہوئی تو اس میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس کو "اصرم" کہا جاتا تھا رسول کریم ﷺ نے اس سے دریافت فرمایا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا کہ مجھ کو اصرم کہتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ (نہیں) بلکہ (آج سے) تمہارا نام زرعہ ہے۔ اس روایت کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے نیز انہوں نے بطریق تحلیق یہ بھی نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عاص، عزیز، عتلہ، شیطان، حکم، غراب، حباب اور شہاب ناموں کو بدل دیا تھا۔ ابوداؤدؒ کہتے ہیں کہ میں نے اختصار کے پیش نظر ان روایتوں کو کہ جس میں مذکورہ ناموں کو بدلنے کا ذکر ہے بغیر اسناد کے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "اصرم" صرم سے مشتق ہے جس کے معنی قطع و برید کرنا، ترک سلام و کلام کرنا اور درخت کاٹنا ہیں ان معنی کی مناسبت سے آپ ﷺ نے اصرم نام کو ناپسند فرمایا اور اس کے بجائے مذکورہ نام رکھ دیا یہ لفظ زراعت سے ما[illegible] اور اپنے معنی کے اعتبار سے جود و سخاوت اور خیر و برکت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

آخر میں ابوداؤدؒ نے آنحضرت ﷺ کی طرف سے جن ناموں کے بدلے جانے کا ذکر کیا ہے ان میں [illegible]ص، عاصی کا مخفف ہے یہ نام لفظی مفہوم کے اعتبار سے عصیان و سرکشی، عدم اطاعت اور نافرمانی پر دلالت کرتا ہے جب کہ مؤمن کی خصوصیت اطاعت و فرمانبرداری ہے اس لئے کسی مؤمن کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ عاص یا عاصیہ نام رکھے۔

عزیز چونکہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم پاک ہے اس لئے عبدالعزیز نام رکھنا تو مناسب ہے لیکن صرف "عزیز" نام غیر موزوں ہے، علاوہ ازیں یہ لفظ غلبہ و قوت عزت اور زور آوری پر دلالت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان ہے جب کہ بندے کی شان ذلت و انکساری، خضوع اور فروتنی ہے اسی طرح حمید نام رکھنا بھی غیر مناسب ہے کیونکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی صفات میں سے ایک اسم ہے اور بطریق مبالغہ اس کی ایک صفت ہے اس اعتبار سے کسی شخص کا نام عبدالحمید موزوں ہے کریم وغیرہ کو بھی اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

"عتلہ" نام کو بھی آپ ﷺ نے اس لئے ناپسند فرمایا کہ اس میں غلظت و شدت اور سختی کے معنی نکلتے ہیں جب کہ مؤمن کو نرم و ملائمت کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے۔

شیطان نام رکھنا نہ صرف اس ذات کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا ہے جو تمام برائیوں کی جڑ ہے بلکہ اس کے لفظی مفہوم کے اعتبار سے بھی نہایت غیر موزوں ہے کیونکہ لفظ شیطان یا تو "شیط" سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں جل جانا ہلاک ہو جانا یا "شطن" سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں خدا کی رحمت سے دور ہونا۔

"حکم" حاکم کا مبالغہ ہے اور حقیقی حاکم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کہ بس اسی کا حکم قابل نفاذ بھی ہے اور لائق اطاعت بھی اس اعتبار سے حکم نام بھی غیر موزوں ہے اور جب آنحضرت ﷺ نے ابوالحکم کی کنیت کو پسند نہیں فرمایا جیسا کہ پیچھے روایت گزری ہے تو حکم نام کا تغیر بطریق اولیٰ مناسب ہے۔

غراب نام کی ناپسندیدگی کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ غراب کوے کو کہتے ہیں جو جانوروں میں پلید جانور ہے وہ مردار اور نجاست کھاتا ہے دوسرے یہ کہ اس کے معنی دوری کے ہیں۔

"حباب" نام اس اعتبار سے نہایت غیر موزوں ہے کہ یہ شیطان کا نام ہے اور سانپ کو بھی حباب کہتے ہیں۔

"شہاب" آگ کے اس شعلہ کو کہتے ہیں جو فرشتے شیطانوں پر مارتے ہیں اس مناسبت کے شہاب نام رکھنا بھی غیر پسندیدہ ہے البتہ اگر شہاب کی اضافت دین کی طرف کی جائے یعنی شہاب الدین نام رکھا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔

لفظ "زعموا" کی برائی

(۲۶) وَعَنْ اَبِي مَسْعُوْدِنِ الْاَنْصَارِيِّ قَالَ لِاَبِي عَبْدِاللّٰهِ اَوْقَالَ اَبُوْعَبْدِاللّٰهِ لِاَبِي مَسْعُوْدٍ مَا سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِيْ زَعَمُوْا قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ بِئْسَ مُطِيَّةُ الرَّجُلِ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَقَالَ اِنَّ اَبَاعَبْدِاللّٰهِ حُذَيْفَةُ۔

"اور حضرت ابوسعید انصاریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہؓ سے یا حضرت ابوعبداللہؓ نے حضرت ابومسعودؓ انصاری سے دریافت کیا کہ آپ نے رسول کریم ﷺ کو لفظ زعموا کے بارے میں کچھ فرماتے ہوئے سنا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ (یہ لفظ) مرد کی بری سواری ہے۔ ابوداؤدؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ ابوعبداللہ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کی کنیت ہے جو اونچے درجہ کے صحابہؓ میں سے ہیں۔"

تشریح: "زعموا ازاءل" میں زعم سے مشتق، ہے "زُعم" یا "زَعم" زاء کے پیش اور زبر کے ساتھ کے معنی تقریباً وہی ہیں جو ظن وگمان کے ہوتے ہیں جیسا کہ نہایہ میں لکھا ہے، صراح میں یہ لکھا ہے کہ زعم کے معنی ہیں کہنا اور عام طور پر زعم کا اطلاق اس بات پر ہوتا ہے جو غیر صحیح اور قابل اعتماد ہو۔ اور قاموس میں لکھا ہے۔ "زَعْمٌ" یا "زِعْمٌ" کے معنی قول کے ہیں اور اس کا اطلاق اکثر بے بنیاد اور جھوٹی بات پر ہوتا ہے۔

لفظ زعموا کے بارے میں علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ لوگوں کا جو یہ محمول ہے کہ جب انہیں کسی بے بنیاد بات کو بیان کرتا ہوتا ہے تو وہ یوں کہتے یا لکھتے ہیں کہ لوگ یہ کہتے ہیں فلاں شخص کے متعلق یہ سنا گیا ہے۔ اور یا لوگ اس طرح کہہ رہے ہیں وغیرہ وغیرہ اور جھٹلائے جانے کے خوف سے کسی شخص کا نام لے کر تو کہا نہیں جاتا کہ یہ بات فلاں نے کہی ہے یا فلاں شخص نے بیان کیا ہے بلکہ "لوگ کہتے ہیں یا بیان کیا جاتا ہے" کے پردہ میں بے تحاشہ جھوٹ بولا جاتا ہے اور بلا تحقیق و بے بنیاد باتوں کو پھیلایا جاتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا دونوں صحابہؓ میں سے ایک صحابیؓ نے دوسرے صحابیؓ سے پوچھا کہ کچھ آدمی جو لفظ زعموا یعنی لوگ یہ کہتے ہیں کے ذریعہ بے بنیاد اور غیر تحقیقی باتیں نقل کرتے ہیں تو کیا آپ نے رسول کریم ﷺ سے اس لفظ کے بارے میں سنا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس لفظ تحقیق میں اس لفظ کے استعمال اور اس کے مفہوم کے بارے میں کیا فرماتے تھے؟ دوسرے صحابیؓ نے جواب دیا کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ لفظ بری سواری ہے۔ یعنی آپ ﷺ نے اس لفظ کو سواری کے ساتھ تشبیہ دی ہے کہ جس طرح کوئی شخص سواری پر بیٹھ کر اپنی منزل مقصود تک پہنچتا ہے اسی طرح جو آدمی یہ چاہتا ہے کہ کسی بے بنیاد اور غیر تحقیقی بات کو دوسروں کے سامنے نقل کرے اور پھیلائے تو وہ اپنی گفتگو اور اپنے قول کے شروع میں لفظ زعموا استعمال کرتا ہے اور اس لفظ کے ذریعہ اپنی غرض حاصل کرنا چاہتا ہے نیز آپ ﷺ نے بری سواری کے ذریعہ اس امر کی طرف اشارہ فرمادیا کہ لفظ زعموا کوئی اچھا آغاز کلام نہیں ہے کیونکہ اس لفظ کو بنیاد بنا کر جو بات کہی یا نقل کی جاتی ہے جو کوئی سند اور ثبوت نہ رکھے بلکہ ایک حکایت کے درجہ میں ہو اور بر سبیل ظن وگمان زبان پر آئے۔ لہٰذا اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ نقل و بیان اور روایات و حکایات کے سلسلے میں پوری احتیاط ملحوظ رہنی چاہئے کیونکہ وہ باتیں جن کا تعلق محض ظن وگمان سے ہوتا ہے عام طور پر غلط نہی اور جھوٹ پر مبنی ہوتی ہیں اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ وزعموا مطية الكذب لفظ زعموا جھوٹ کی سواری ہے۔

یا آنحضرت ﷺ کے مذکورہ ارشاد کا مقصد یہ ہدایت دینا ہے کہ کوئی شخص بلا تحقیق و یقین کسی کی طرف زعم وگمان یعنی دروغ گوئی کی نسبت نہ کرے ہاں اگر اس کو اس بات کا یقین ہو کہ فلاں شخص نے واقعۃ دروغ گوئی کی ہے۔ اور یہ کہ اس شخص کی دروغ گوئی کے نقصان و اثرات سے دوسروں کا بچانا ضروری ہے تاکہ کوئی دھوکا نہ کھاجائے تو اس مصلحت کے پیش نظر کسی کی طرف زعم وگمان کی نسبت

کرنا جائز ہوگا جیسا کہ محدثین وغیرہ کرتے ہیں۔

مشیت میں اللہ اور غیر اللہ کو برابر قرار نہ دو

(۲۷) وَعَنْ حُذَيْفَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَاتَقُوْلُوْا مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشَاءَ فُلَانٌ وَلٰكِنْ قُوْلُوْا مَاشَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ شَآءَ فُلَانٌ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاوُدَ وَفِيْ رِوَايَةٍ مُنْقَطِعًا قَالَ لَاتَقُوْلُوْا مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشَاءَ مُحَمَّدٌ وَقُوْلُوا مَاشَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت حذیفہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا (لوگو) اس طرح نہ کہو کہ (وہی ہوگا) جو اللہ چاہئے اور فلاں شخص چاہے (کیونکہ) اس طرح کے کہنے کا مطلب، ارادہ و مشیت میں اللہ اور بندے کو برابر کا درجہ دینا ہے جب کہ کسی کام کا ہونا یا نہ ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی مشیت و مرضی پر منحصر ہوتا ہے البتہ ظاہری اسباب و وسائل کے پیش نظر انسان کی طرف ارادہ و مشیت کی نسبت کرنا ہی منظور ہو تو پھر یوں کہو کہ وہی ہوگا جو اللہ چاہے اور پھر فلاں چاہے یعنی اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کا مقدم ہونا اور بندے کی مشیت کا اس کے تابع ہونا مفہوم ہوگا جو صحیح ہے۔)" (احمدؒ و ابوداؤدؒ)

اور ایک روایت میں جس کا سلسلہ سند متصل نہیں ہے بطریق انقطاع یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا یوں نہ کہو کہ وہی ہوگا جو اللہ چاہے اور محمد چاہیں، بلکہ اس طرح کہو کہ وہی ہوگا جو تنہا اللہ چاہے خواہ کوئی دوسرا چاہے یا نہ چاہے اس اعتبار سے اوپر کی روایت کہ جس میں ماشاء اللّٰہ ثم شاء فلاں کہنے کا جواز ثابت ہوتا ہے اور اس روایت کے درمیان تضاد واقع نہیں ہوگا اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنۃ میں نقل کیا ہے۔

کسی منافق کو سید نہ کہو

(۲۸) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَاتَقُوْلُوْا لِلْمُنَافِقِ سَيِّدٌ فَاِنَّهٗ اِنْ يَّكُ سَيِّدًا فَقَدْ اَسْخَطْتُمْ رَبَّكُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت حذیفہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کسی منافق کے سید نہ کہو یعنی سردار آقا نہ کہو کیوں کہ اگر وہ سید ہو اور تم نے اس کو سید کہا تو تم نے اپنے پروردگار کو ناراض کیا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: عربی میں "سید" کے معنی ہیں سردار آقا۔ ظاہر ہے کہ کسی منافق کو یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا کہ اس کو کوئی مسلمان سردار آقا کہے بلکہ اگر کوئی منافق واقعۃً سردار ہو بایں طور کہ وہ اپنی قوم کا سربراہ ہو یا کچھ لوگوں کا حاکم ہو اور غلام و باندی اور دوسرے اسباب کا مالک ہو تو اس کے باوجود وہ اس قابل نہیں سمجھا جائے گا۔ کہ کوئی مسلمان اس کو سردار و آقا کہہ کر مخاطب کرے یا اس کو سید کہے اور اگر کوئی مسلمان اس کو سید و سردار و آقا کہے گا تو وہ خدا کے غضب کا مستوجب ہوگا کیوں کہ یہ لفظ سید (یا سردار و آقا) تعظیم و احترام پر دلالت کرتا ہے اور وہ منافق، مسلمان کی طرف سے کسی بھی تعظیم و احترام کا مستحق نہیں ہے اور اگر صورت یہ ہو کہ وہ واقعۃً کسی بھی طرح کی سیادت و سرداری رکھتا ہی نہ ہو تو اس کو سید کہنا اور بھی برا ہوگا کیوں کہ اس کے باوجود اس کو سید کہنے والا نہ صرف مذکورہ حکم کی خلاف ورزی بلکہ جھوٹ اور نفاق کا بھی مرتکب ہوگا۔

ظاہر تو یہ ہے کہ اس بارے میں کافر، گم کردہ راہ ہدایت اور علی الاعلان گناہ کا ارتکاب کرنے والے مسلمان بھی منافق کے حکم میں داخل ہوں، لیکن حدیث میں خاص طور پر صرف منافق ہی کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ منافق چونکہ بہرحال ظاہری طور پر مسلمان ہوتا ہے اس لئے عام مسلمانوں کا اس کی تعریف و خوشامد میں مبتلا ہونا زیادہ قریبی احتمال رکھتا ہے لہٰذا صرف منافق کا ذکر کر کے اس بات کی ممانعت

فرمائی گئی کہ اس کو سید نہ کہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

برے نام کا برا اثر

(۲۹) عَنْ عَبْدِالْحَمِیْدِ بْنِ جُبَیْرِ بْنِ شَیْبَۃَ قَالَ جَلَسْتُ اِلٰی سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیِّبِ فَحَدَّثَنِیْ اَنَّ جَدَّہٗ حَزْنًا قَدِمَ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا اسْمُکَ قَالَ اِسْمِیْ حَزْنٌ قَالَ بَلْ اَنْتَ سَھْلٌ قَالَ مَا اَنَا بِمُغَیِّرٍ اِسْمًا سَمَّانِیْہِ اَبِیْ قَالَ ابْنُ الْمُسَیِّبِ فَمَا زَالَتْ فِیْنَا الْحُزُوْنَۃُ بَعْدُ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت عبدالحمید ابن جبیر ابن شیبہ" کہتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت سعد ابن مسیب" کی خدمت میں حاضر تھا کہ انہوں نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی کہ میرے دادا جن کا نام حزن تھا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے انہوں نے کہا میرا نام حزن ؓ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ حزن کوئی اچھا نام نہیں ہے بلکہ میں تمہارا نام سہل رکھتا ہوں میرے دادا نے کہا کہ میرے باپ نے میرا جو نام رکھا ہے اب میں اس کو بدل نہیں سکتا۔ حضرت سعید" نے فرمایا کہ اس کے بعد سے اب تک ہمارے خاندان میں ہمیشہ سختی رہی۔" (بخاری" ومسلم")

تشریح: "حزن" سخت اور دشوار گزار زمین کو کہتے ہیں "سہل" حزن کی ضد ہے یعنی ملائم اور ہموار زمین جہاں آدمی کو آرام ملے۔

حضرت سعید" کے دادا نے چوں کہ آنحضرت ﷺ کے رکھے ہوئے نام کو اختیار نہیں کیا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس انکار کی نحوست سے ان کے خاندان پر حزن ؓ کو مسلط کر دیا کہ ان کے گھر والے ہمیشہ سختی حالات کا شکار رہنے لگے اور برابر ایک نہ ایک مصیبت میں مبتلا ہوتے رہے۔

رہی یہ بات کہ حزن ؓ کو آنحضرت ﷺ کی بات کا انکار کرنے کی جرات کیوں کر ہوئی تو اول اس کو شیطان کا وسوسہ کہا جاسکتا ہے جس میں وہ مبتلا ہو گئے دوسرے یہ کہ مذکورہ واقعہ ابتداء ہجرت کا ہے جب کہ وہ نئے نئے ہجرت کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور اس وقت تک تعلیم و تربیت کے فقدان کی وجہ سے وہ صدق ایمان سلامتی طبع اور تہذیب و اخلاق سے مشرف نہ ہوئے تھے لہذا اس پر شیطان کا داؤ کارگر ہو گیا اور وہ آنحضرت ﷺ کے تجویز کردہ نام کو اختیار نہ کر سکے۔

اچھے نام

(۳۰) وَعَنْ اَبِیْ وَھْبِ الْجُشَمِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَسَمَّوْا بِاَسْمَآءِ الْاَنْبِیَاءِ وَاَحَبُّ الْاَسْمَآءِ اِلَی اللّٰہِ عَبْدُاللّٰہِ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ وَاَصْدَقُھَا حَارِثٌ وَھَمَّامٌ وَاَقْبَحُھَا حَرْبٌ وَمُرَّۃُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابووہب جشمی ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ انبیاء کے ناموں پر اپنے نام رکھو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن (اور اسی طرح عبدالرحیم و عبدالکریم وغیرہ)، ہیں نیز زیادہ سچے نام، حارث اور ہمام ہیں اور سب سے برے نام حرب اور مرہ ہیں۔" (ابوداؤد)

تشریح: "انبیاء کے ناموں پر......" سے واضح ہوتا ہے کہ ملائکہ کے ناموں پر نام نہ رکھنے چاہئیں اسی طرح وہ نام بھی نہ رکھنے چاہئیں جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھے جیسے کلب، حمار، عبدشمس اور اسی طرح کے دوسرے نام۔

"حارث" کے معنی ہیں کسب و کمائی اور قصد و ارادہ کرنے والا۔ اسی طرح "ہمام، ہَمَّ" سے نکلا ہے جس کے معنی قصد و ارادہ کے ہیں رہے کہ کوئی بھی شخص کسب و کمائی اور قصد و ارادہ کرنے سے خالی نہیں ہوتا اس لئے معنی و مفہوم اور واقعہ کے اعتبار سے ان ناموں کو

زیادہ سچا فرمایا گیا ہے۔
حرب اور مرہ کو سب سے برے نام اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ "حرب" لڑائی اور جنگ کو کہتے ہیں اور جنگ بڑی خراب چیز ہے جس میں کشت و خون اور خسارہ و بربادی ہے، اسی طرح مرہ تلخی کو کہتے ہیں جو طبیعت کو ناپسند ہوتی ہے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ابلیس کی کنیت ابو مرہ ہے اور اس وجہ سے مرہ قبیح نام ہے۔

بَابُ الْبَيَانِ وَالشِّعْرِ

بیان اور شعر کا بیان

"بیان" کے اصل معنی کھولنے، اچھی طرح ظاہر کرنے اور خوب واضح کرنے کے ہیں، یا یوں کہنا چاہئے کہ بیان اس فصیح گفتگو و تقریر وغیرہ کو کہتے ہیں جو مافی الضمیر کو نہایت وضاحت اور حسن و خوبی کے ساتھ ظاہر کرے۔ چنانچہ صراح میں بھی یہ لکھا ہے کہ بات کو کھول کر اور وضاحت کے ساتھ کہنے اور فصاحت کا نام "بیان" ہے اسی لئے کہا جاتا ہے فلان ابین من فلان (فلاں شخص، فلاں شخص سے زیادہ بیان کرنے والا ہے یعنی وہ اپنی بات کو فلاں شخص سے زیادہ فصاحت اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنے والا ہے)۔
"شعر" کے معنی دانائی اور زیرکی کے ہیں اور شاعر کے معنی ہیں دانا و زیرک، لیکن عام اصلاح میں شعر موزوں اور مقفٰی (منظوم) کلام کو کہتے ہیں، جو بقصد و ارادہ موزوں و مقفٰی کیا گیا ہو، اس اعتبار سے قرآن و حدیث میں جو مقفٰی عبارتیں ہیں ان پر شعر کا اطلاق نہیں ہوسکتا کیوں کہ ان عبارتوں کا مقفٰی ہونا نہ تو قصد و ارادہ کے تحت ہے اور نہ مقصود بالذات ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

بعض بیان سحر کی تاثیر رکھتے ہیں

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَدِمَ رَجُلَانِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَخَطَبَا فَعَجِبَ النَّاسُ لِبَيَانِهِمَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن مشرقی علاقے سے دو آدمی آئے اور آپس میں خوب فصاحت و بلاغت کے ساتھ گفتگو کرنے لگے لوگوں نے جب ان کی باتیں سنیں تو ان کی فصیح و بلیغ گفتگو پر بڑی حیرت اور تعجب کا اظہار کیا، رسول کریم ﷺ نے فرمایا بلاشبہ بعض بیان سحر (کا اثر رکھتے) ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب مشرقی علاقے سے بنو تمیم کی ایک جماعت بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئی اس جماعت میں دو ایسے شخص بھی تھے جو فصاحت و بلاغت طرز تخاطب اور انداز گفتگو میں بڑی قابلیت اور مہارت رکھتے تھے اس میں سے ایک کا نام حصین ابن بدی اور لقب زبرقان تھا دوسرے کا نام عمرو ابن ہتم تھا ان دونوں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے آپس میں گفتگو کی۔ زبرقان نے اپنے فضائل و اوصاف بیان کرنا شروع کئے اور اپنے فخریہ کارناموں کا بڑے زوردار الفاظ اور بڑی فصیح و بلیغ عبارت میں تعارف کرانے لگا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! میں نے فلاں فلاں کارنامے انجام دیئے ہیں اور میں ایسا ہوں اور ایسا ہوں، یہاں تک کہ عمرو بھی اس بات کو جانتا ہے! عمرو نے یہ سنا تو اس نے بھی اتنے ہی پر شکوہ انداز اور اتنی ہی فصاحت و بلاغت کے ساتھ اس کی باتوں کا جواب دیا اور اپنے بیان میں اس کی طرح برائیاں ظاہر کیں کہ گویا زبرقان کے بیان کردہ سارے اوصاف و فضائل کو اچھی طرح جانتا ہے اور جو کچھ کہہ رہا ہے اس کے اندر کی آواز نہیں ہے حقیقت میں اس کو میرے کمالات کا اعتراف ہے مگر حسد نے اس کو میرے خلاف بیان کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس

موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بعض بیان سحر کی تاثیر رکھتے ہیں کہ جس طرح سحر انسان کی حالت وکیفیت میں تغیر پیدا کر دیتا ہے اس طرح بعض بیان بھی اسی نوعیت کا ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے انسان کے ذہن ودماغ میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی تاثیر دل کو پھیر دیتی ہے۔

اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے مذکورہ ارشاد گرامی ﷺ بیان کی تعریف میں فرمایا یا اس کی مذمت میں؟ ان اقوال کو سامنے رکھتے ہوئے زیادہ صحیح بات یہ نکلتی ہے کہ اس ارشاد گرامی ﷺ سے بیان کی تعریف ومذمت دونوں ظاہر ہوتی ہیں اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بعض بیان دلوں کو مائل ومنحرف کرنے اور اپنا جواب پیش کرنے سے معذور رکھتے ہیں سحر کی مانند تاثیر رکھتا ہے اور یہ محمود ومستحسن ہے بشرطیکہ اس بیان کا تعلق سچائی کو ظاہر کرنے اور سچائی کو ثابت کرنے سے ہو اور اگر اس کا تعلق باطل وفاسد امور سے ہو تو پھر وہی بیان مذموم ہوگا جیسا کہ ایک حدیث میں شعر کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ کہ الشعر ھو کلام فحسنه حسن وقبیحه قبیح یعنی شعر کلام ہی تو ہے (چنانچہ اچھے اور برے کلام کی طرح) اچھا شعر اچھا کہلائے گا اور برا شعر برا۔

بعض اشعار حکمت ودانائی کے حامل ہوتے ہیں

(۲) وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِكْمَةً۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابی ابن کعبؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ بعض شعر حکمت (کا حامل) ہوتا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ سارے ہی اشعار برے نہیں ہوتے بلکہ ان میں سے بعض اچھے اور فائدہ مند ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعہ حکمت ودانائی کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

کلام میں مبالغہ آرائی کی ممانعت

(۳) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ قَالَهَا ثَلٰثًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ کلام میں مبالغہ کرنے والے ہلاکت میں پڑ گئے، آپ ﷺ نے یہ الفاظ تین بار فرمائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تحریر اور گفتگو وکلام میں بے جا تکلفات واہتمام کرنا، عبارت آرائی اور مبالغہ آمیزی کی پابندی اختیار کرنا اور لاحاصل وبے فائدہ باتوں کی آمیزش کرنا نہایت برا ہے جب کہ اس کا مقصد اظہار عظمت اور ریا، تصنع وبناوٹ، کسی کی بے جا خوشامد وچاپلوسی اور اس کو اپنی طرف مائل وراغب کرنا ہو۔

ایک مبنی بر حقیقت شعر

(۴) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصْدَقُ كَلِمَةٍ قَالَهَا الشَّاعِرُ كَلِمَةُ لَبِيْدٍ اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا سب سے سچی بات جو کسی شاعر نے کہی ہے لبیدؓ کا یہ کلام ہے کہ مت بھولو، اللہ کے سوا ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: لبیدؓ عرب کے بہت مشہور شاعر تھے، عربی ادب میں ان کے کلام اور ان کی شاعری کو سند کا درجہ حاصل ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی ہدایت بھی بخشی اور ان کو قبولیت اسلام کے بعد صحابیت کا شرف حاصل ہوا، جس طرح زمانہ جاہلیت میں اپنے فن کی وجہ سے

قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اسی طرح زمانہ اسلام میں بہت معزز و مکرم رہے، بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے بڑی طویل حیات پائی اور تقریبا ایک سو ستاون سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

آنحضرت ﷺ نے جس کلام کی تعریف و توصیف فرمائی وہ پورا شعر یوں ہے۔

الا کل شئی ماخلا اللّٰہ باطل وکل نعیم لامحالۃ زائل

"(مت بھولو) اللہ کے سوا ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے اور دنیا کی ہر لذت و راحت کو آخر کار فنا ہونا ہے۔"

یہ مشہور شعر بھی لبیدؓ کا ہی ہے۔

ولقد سئامت من الحیوۃ وطولھا وسوال ھذا لناس کیف لبید

"میں زندگی اور اس کی درازی سے بیزار ہو گیا ہوں اور لوگوں کے بار بار پوچھنے سے کہ لبید کیسا ہے۔"

علم و حکمت کے حامل اشعار سننا مسنون ہے

⑤ وَعَنْ عَمْرِوبْنِ الشَّرِيْدِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ رَدِفْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ هَلْ مَعَكَ مِنْ شِعْرِ اُمَيَّةَ بْنِ اَبِى الصَّلْتِ شَىْءٌ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ هِيْهِ فَاَنْشَدْتُهٗ بَيْتًا فَقَالَ هِيْهِ ثُمَّ اَنْشَدْتُهٗ بَيْتًا فَقَالَ هِيْهِ حَتّٰى اَنْشَدْتُهٗ مِائَةَ بَيْتٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عمرو ابن شریدؒ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ایک دن سفر کے دوران میں رسول کریم ﷺ کے پیچھے آپ ﷺ کی سواری پر بیٹھا ہوا تھا کہ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کیا تمہیں امیہ ابن ابی الصلت کے کچھ اشعار یاد ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا اچھا تو سناؤ آپ ﷺ کو میں نے ایک شعر سنایا آپ ﷺ نے فرمایا اور سناؤ! میں نے پھر ایک شعر سنایا آپ ﷺ اسی طرح مزید سنانے کی فرمائش کرتے رہے اور میں سناتا رہا یہاں تک کہ میں نے سو اشعار سنائے!" (مسلم)

تشریح: امیہ ابن ابی الصلت بھی عرب کا ایک مشہور اور باکمال شاعر تھا اس کا تعلق قبیلہ ثقیف سے تھا بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے عہد جاہلیت میں اہل کتاب سے دین سیکھا تھا اور دینداری کی باتیں کرتا تھا، حشر و نشر اور قیامت کے دن پر بھی عقیدہ رکھتا تھا اور اس کے اشعار علم و حکمت اور پند و نصائح سے پر ہوتے تھے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا تھا امن شعرہ و کفر قلبہ (یعنی اس کے اشعار سے ایمان جھلکتا ہے اگرچہ اس کا دل کفر میں مبتلا رہا) اس کا ایک خاص مشغلہ یہ تھا کہ آسمانی کتب کا علم رکھنے والوں کے پاس آنا جانا رکھتا اور ان سے ان بشارتوں اور پیشگوئیوں کے بارے میں دریافت کرتا رہتا جو آسمانی کتابوں پر نبی آخر الزمان ﷺ کی بعثت سے متعلق مذکورہ تھیں، اس کا گمان تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں میں جن نبی ﷺ آخر الزمان ﷺ کی بعثت کی خبر دی ہے وہ میں ہوں، اور ایک نہ ایک دن مجھے نبوت کے خلعت فاخرہ سے نوازا جائے گا لیکن جب آسمانی کتب کے عالموں نے اس کو بتایا کہ وہ بنی قریش میں سے ہوں گے اور اس کو آنحضرت ﷺ کی صفات تفصیل سے معلوم ہوئیں تو وہ اپنے عقائد و نظریات سے ایک دم پھر گیا اور حسد و عناد کی راہ پر چل کر کہنے لگا کہ مجھے اس نبی ﷺ پر ہرگز ایمان نہ لانا چاہئے جس کا تعلق قبیلہ ثقیف سے نہ ہو۔

ابن جوزیؒ نے کتاب وفا میں یہ لکھا ہے کہ امیہ ابن ابی الصلت ابتداء میں تو نبی آخر الزمان ﷺ کی بعثت کا انتظار بڑی شدت سے کرتا تھا اور آنحضرت ﷺ کی نبوت کی جو علامتیں اور اوصاف سنتا تھا ان کی بنا پر یہ آرزو رکھتا تھا کہ کاش میں ان کا زمانہ پاؤں اور ان کی خدمت و مدد کروں مگر آنحضرت ﷺ کا جب نور نبوت آشکارا تو اپنی باتوں سے پھر گیا اور بغض و عناد اور سخاوت و سختی کی راہ اختیار کرلی۔

بہر حال مذکورہ بالا حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ جو اشعار علم و حکمت اور پند و نصائح کی باتوں پر مشتمل ہوں ان کو سننا مسنون ہے اگرچہ

ان اشعار کو کہنے والا کوئی کافر و فاسق ہی کیوں نہ ہو۔

آنحضرت ﷺ کا ایک شعر

⑥ وَعَنْ جُنْدُبٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ فِیْ بَعْضِ الْمَشَاهِدِ وَقَدْ دَمِیَتْ اِصْبَعُهٗ فَقَالَ هَلْ اَنْتِ اِلَّا اَصْبَعٌ دَمِیْتِ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَالَقِیْتِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جندبؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک جنگ (غزوہ احد) میں شریک تھے کہ معرکہ آرائی کے دوران آپ ﷺ کی انگلی زخمی ہوگئی اور اس کی وجہ سے وہ خون آلود ہوگئی آپ ﷺ نے بطور استعارہ یا در حقیقت انگلی کو تسلی دینے کے لئے اس کو مخاطب کر کے یہ شعر فرمایا۔" (بخاریؒ)

هَلْ اَنْتِ اِلَّا اَصْبَعٌ دَمِیْتِ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَالَقِیْتِ

"یعنی تو کیا ہے ایک انگلی ہے خون آلود ہوگئی اور پھر تجھ کو یہ جو کچھ ہوا ہے خدا کی راہ میں ہوا ہے۔"

تشریح: زخمی اور خون آلود انگلی کو مخاطب کر کے آپ ﷺ نے جو اشعار ارشاد فرمایا اس کا مطلب یہ تھا تو جسم کا کوئی بڑا حصہ نہیں ہے بدن کا کوئی سب سے اہم عضو نہیں ہے، ایک معمولی سی انگلی ہے، پھر تجھے جو تکلیف ہوئی ہے وہ سخت اور شدید ترین نہیں ہے کہ نہ تو کٹ کر گر پڑی ہے اور نہ ہلاکت میں مبتلا ہوئی ہے تجھ کو صرف زخم پہنچا ہے اور خون آلود ہوگئی ہے اگر تو نے اتنی سی تکلیف اٹھائی ہے اس کی وجہ سے بے تابی اور بے قراری کی کوئی وجہ نہیں ہے جب کہ یہ تھوڑی سی تکلیف بھی ضائع جانے والی نہیں ہے بلکہ اللہ کی راہ میں اور اس کی رضاء میں چوں کہ تو نے تکلیف اٹھائی ہے اس لئے تجھ کو اس پر اجر ملے گا اس اعتبار سے یہ تکلیف بھی تیرے لئے خوشی و راحت کا ذریعہ ہونا چاہئے اس ارشاد کے ذریعہ گویا آپ ﷺ نے امت کے لوگوں کو تلقین فرمائی کہ اگر کسی مسلمان کو اللہ کی راہ میں کوئی تکلیف وضرر پہنچے تو اس پر صبر کرنا چاہئے، بلکہ حقیقت میں اس کو شکر کا مقام سمجھنا چاہئے کہ اللہ کا عطا کیا ہوا جسم وبدن اسی کی راہ میں قربان کرنے اور تکلیف اٹھانے کی توفیق نصیب ہوئی جو ایک بہت بڑی سعادت ہے۔

اس حدیث کے سلسلے میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا مذکورہ ارشاد گرامی ﷺ ایک شعر ہے جب کہ آپ ﷺ کی ذات اقدس شعر و شاعری کے وصف سے پاک ہے اور آپ ﷺ کی ذات سے کسی شعر کا صادر ہونا غیر ممکن ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے بارے میں فرمایا ہے وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ (یعنی) اور ہم نے آپ (ﷺ) کو شعر کہنا سکھایا ہی نہیں، اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ شعر میں شاعر کا قصد وارادہ بھی شرط ہے یعنی یہ ضروری ہے کہ جس شخص نے کوئی کلام موزوں کیا ہے اس نے موزونیت کا قصد وارادہ بھی کیا ہو جیسا کہ باب کے شروع میں بیان کیا جا چکا ہے جب کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ﷺ بلاشبہ موزوں کلام ہے لیکن اس کی موزونیت آپ ﷺ کے کسی قصد وارادہ کے تحت نہیں ہوئی، بلکہ بلا قصد وارادہ اور بے ساختہ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے صادر ہونے والا یہ کلام، شعر میں ڈھل گیا۔

بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا مذکورہ کلام اصل رجز کی قسم سے ہے اور رجز پر شعر کا اطلاق نہیں ہوتا! علاوہ ازیں یحییٰ نے یہ کہا ہے کہ جو شخص بطریق ندرت یعنی اتفاقاً کبھی کوئی شعر کہہ دے تو اس کو شاعر نہیں کہا جاتا اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ۔ سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ شاعر نہیں ہیں۔

مشہور شاعر حسان کی فضیلت

⑦ وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَوْمَ قُرَیْظَةَ لِحَسَّانِ بْنِ ثَابِتٍ اُهْجُ الْمُشْرِکِیْنَ فَاِنَّ جِبْرِیْلَ

مَعَكَ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لِحَسَّانٍ اَجِبْ عَنِّيْ اَللّٰهُمَّ اَيِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے قریظہ کے دن حضرت حسان ابن ثابتؓ سے فرمایا کہ تم مشرکین کی ہجو کرو، حضرت جبرئیل تمہارے ساتھ ہیں۔ (یعنی مضامین کے القاء والہام کے سلسلے میں وہ تمہاری مدد کرتے ہیں!) اور رسول کریم ﷺ جب کفار و مشرکین کی ہجو سنتے کہ وہ آپ ﷺ کی شان میں نازیبا باتیں کرتے ہیں اور آپ ﷺ کو برے الفاظ سے یاد کرتے ہیں تو حضرت حسانؓ سے فرمادیتے کہ تم میری طرف سے کفار کو جواب دو اور پھر یہ فرماتے اے اللہ جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ حسانؓ کی مدد کر اور ان کی زبان و بیان میں طاقت و قوت دے!۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہودیوں کے ایک قبیلہ کا نام بنو قریظہ تھا جو مدینہ شہر کے ایک کنارے پر آباد تھا، جب ان یہودیوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف سازشیں کر کے اور کفار عرب کے مددگار بن کر آنحضرت ﷺ اور تمام مسلمانوں کو سخت اذیت پہنچائی تو آنحضرت ﷺ نے غزوہ خندق کے بعد مسلمانوں کی معیت میں اس قبیلہ کا محاصرہ کر لیا جس کے نتیجہ میں ان کو اپنے کیفر کردار تک پہنچنا پڑا، چنانچہ اس موقع کو قریظہ کے دن سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حضرت حسانؓ ابن ثابت ابن منذر مدینہ کے رہنے والے تھے اور جلیل القدر انصاری صحابیؓ ہیں، بڑے اونچے درجہ کے شاعر تھے شعراء اسلام میں ان کا شمار ہوتا ہے اور شاعر رسول کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں ان کی عمر ایک سو بیس سال ہوئی ہے۔ ساٹھ سال کی عمر تک کفر کی حالت میں رہے اور ساٹھ سال اسلام کی حالت میں گزارے۔

شعراء اسلام کو کفار قریش کی ہجو کرنے کا حکم

⑧ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اهْجُوْا قُرَيْشًا فَاِنَّهٗ اَشَدُّ عَلَيْهِمْ مِنْ رَشْقِ النَّبَلِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے اپنے شعراء سے فرمادیا تھا کہ کفار قریش کی ہجو کیا کرو کیوں کہ یہ ہجو ان پر تیر مارنے سے زیادہ سخت ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "ہجو" کے معنی ہیں اشعار کے ذریعہ برائی بیان کرنا! اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کفار اور دشمنان دین کی ہجو کرنا جائز ہے لیکن اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ اگر کفار مسلمانوں کی ہجو کریں، تب ان کی ہجو کی جائے اس سے پہلے ان کی ہجو کرنا روا نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں وہ مسلمانوں کی ہجو کریں گے اور اس طرح سے مسلمانوں کے خلاف ان کی ہجو کا سبب خود مسلمان بنیں گے اس مسئلہ کی بنیاد یہ آیت کریمہ ہے کہ۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔

"اے مسلمانو! ان لوگوں کو گالی نہ دو جو غیر اللہ کو پکارتے ہیں یعنی کفار و مشرکین، نہیں وہ آگے بڑھ کر اللہ کو گالیاں دینے لگیں گے بغیر علم کے۔"

⑨ وَعَنْهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لِحَسَّانٍ اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ لَا يَزَالُ يُؤَيِّدُكَ مَا نَافَحْتَ عَنِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَقَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ هَجَاهُمْ حَسَّانٌ فَشَفٰى وَاشْتَفٰى۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو حضرت حسان سے یہ فرماتے ہوا سنا کہ جب تک تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف کفار و مشرکین کی ہجو کا مقابلہ کرتے رہتے ہو حضرت جبرئیل برابر تمہاری مدد اعانت کرتے رہتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ

کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا کہ حسانؓ نے کفار کی ہجو کی تو اس ہجو سے مسلمانوں کو شفا دی اور خود بھی شفا پائی، یعنی انہوں نے کفار کی ہجو کا جواب ہجو سے دے کر مسلمانوں کے لئے بھی تسلی و تشفی کا سامان بہم پہنچایا اور خود بھی سکون و طمانیت حاصل کی۔" (مسلمؒ)

غزوہ خندق میں عبداللہ بن رواحہؓ کا رجزیہ کلام آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک پر

(۱۰) وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْقُلُ التُّرَابَ يَوْمَ الْخَنْدَقِ حَتّٰى اغْبَرَّ بَطْنُهُ يَقُوْلُ:

وَاللّٰهِ لَوْلَا اللّٰهُ مَا اهْتَدَيْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا

فَاَنْزِلَنْ سَكِيْنَةً عَلَيْنَا وَثَبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَاقَيْنَا ٠

اِنَّ الْاُوْلٰى قَدْ بَغَوْا عَلَيْنَا اِذَا اَرَادُوْا فِتْنَةً اَبَيْنَا

يَرْفَعُ صَوْتَهُ بِهَا اَبَيْنَا اَبَيْنَا مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔

"اور حضرت براءؓ کہتے کہ رسول کریم ﷺ خندق کھودے جانے کے دن خود بنفس نفیس مٹی اٹھا اٹھا کر پھینکتے تھے یعنی غزوہ احزاب کے موقع پر جب خندق کھودی جا رہی تھی تو سرکار دو عالم ﷺ بنفس نفیس سارے کام میں شریک تھے، صحابہؓ کے ساتھ آپ ﷺ بھی بڑے بڑے پتھر اٹھاتے اور مٹی اٹھا اٹھا کر پھینکتے جاتے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ کا شکم مبارک غبار آلود ہو گیا تھا اور اس موقع حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ کا یہ رجزیہ کلام پڑھتے جاتے تھے۔

وَاللّٰهِ لَوْ لَا اللّٰهُ مَا اهْتَدَيْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا

"خدا کی قسم! اگر اللہ کی ہدایت نہ ہوتی تو ہم راہ راست نہیں پا سکتے تھے، نہ ہم صدقہ دے سکتے اور نہ نماز پڑھ سکتے تھے۔"

فَاَنْزِلَنْ سَكِيْنَةً عَلَيْنَا وَثَبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَاقَيْنَا

"پس اے اللہ! ہم پر وقار اور اطمینان نازل فرما اور جب دشمنان دین سے ہماری مڈبھیڑ ہو تو ہمیں ثابت قدم رکھ۔"

اِنَّ الْاُوْلٰى قَدْ بَغَوْا عَلَيْنَا اِذَا اَرَادُوْا فِتْنَةً اَبَيْنَا

"بلاشبہ ان کفار مکہ نے ہم پر اس لئے زیادتی کی ہے کہ جب وہ ہمیں فتنہ میں مبتلا کرنے یعنی کفر کی طرف واپس لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو ہم انکار کر دیتے ہیں۔"

آنحضرت ﷺ ان اشعار کو بلند آواز سے پڑھتے تھے خصوصاً ابینا ابینا پر آواز زیادہ بلند ہو جاتی تھی؟ (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یرفع بہا صوتہ میں بہا کی ضمیر لفظ "ابینا" کی طرف راجع ہے اور ابینا ابینا سے پہلے لفظ قائلا مقدر ہے، مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ ان اشعار کو پڑھتے تو آخر میں لفظ ابینا کو بار بار دہراتے اور اس وقت آواز کو زیادہ بلند کرتے اور اس سے مقصد اس لفظ کے مفہوم کو مؤکد کرنا، تلذذ و حظ حاصل کرنا اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں اور کافروں کے کانوں تک پہنچانا تھا۔

طیبیؒ نے یہ لکھا ہے کہ بہا کی ضمیر ان اشعار کی طرف راجع ہے اور ابینا ابینا اس جملہ میں حال واقع ہو رہا ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ تمام اشعار کو با آواز بلند پڑھتے تھے اور لفظ ابینا پر پہنچ کر آواز خصوصیت سے بلند کر دیتے تھے۔

غزوہ خندق کے موقع پر رجز پڑھنے والے صحابہؓ کے حق میں آنحضرت ﷺ کی دعا

(۱۱) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ جَعَلَ الْمُهَاجِرُوْنَ وَالْاَنْصَارُ يَحْفِرُوْنَ الْخَنْدَقَ وَيَنْقُلُوْنَ التُّرَابَ وَهُمْ يَقُوْلُوْنَ۔ نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا

مُحَمَّدًا عَلَى الجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا يَقُوْلُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يُجِيْبُهُمْ اَللّٰهُمَّ لَاعَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْاٰخِرَةِ فَاغْفِرِ الْاَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ جب غزوہ احزاب کے موقع پر مہاجرینؓ اور انصارؓ نے خندق کھودنا اور مٹی کو اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کیا تو وہ اس دوران یہ رجز پڑھتے جاتے تھے۔

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَابَقِيْنَا اَبَدًا

ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک جہاد کرتے رہنے کے لئے محمد ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔

اور رسول کریم ﷺ ان کے اس رجز کے جواب میں یہ دعا فرماتے جاتے تھے کہ اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے تو انصارؓ و مہاجرینؓ کو بخشدے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ گویا ان دعائیہ الفاظ کے ذریعہ صحابہؓ کو تسلی دیتے تھے کہ تمہیں اس موقع پر جو محنت و مشقت برداشت کرنا پڑ رہی ہے اور تم جن سخت حالات سے دوچار ہو ان پر صبر کرو اللہ تعالیٰ کا انعام تمہارے لئے مقدر ہے اور اس دنیا میں تمہیں راحت و سکون ملے یا نہ ملے لیکن آخرت کی زندگی میں تمہیں اپنی اس محنت و مشقت کے عوض بے شمار انعامات ملیں گے نیز اصل انعامات آخرت ہی کے ہیں یا یں طور کہ زندگی بس آخرت ہی کی زندگی ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے جب کہ اس دنیا کی کیا راحت و کیا مصیبت سب کو آخر کار معدوم ہو جانا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔

ہر وقت شعر و شاعری میں مستغرق رہنے اور برے شعر کی مذمت

⑫ وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاَنْ يَمْتَلِئَ جَوْفُ رَجُلٍ قَيْحًا يَرِيْهِ خَيْرٌ مِنْ اَنْ يَمْتَلِئَ شِعْرًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا یاد رکھو! کسی شخص کا پیٹ کو پیپ سے بھرنا جو اس کے پیٹ کو خراب کر دے اس سے بہتر ہے کہ پیٹ کو مذموم اشعار سے بھرا جائے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کے ذریعہ ایسی شاعری کی مذمت کی گئی ہے جو انسان کو ہر طرف سے غافل کر دے، چنانچہ جو شاعر ہر وقت مضامین بندی اور تخلیق شعر میں مستغرق رہ کر فرائض و عبادت و تلاوت قرآن و ذکر خداوندی اور علوم شرعیہ سے غافل ہو جاتے ہیں ان کے اشعار برائی اور قابل نفرین ہونے کے اعتبار سے اس پیپ سے بھی بدتر ہیں جو زخم میں پڑ جاتی ہے خواہ وہ اشعار کسی بھی طرح کے ہوں، اور کیسے ہی اچھے مضامین پر مشتمل کیوں نہ ہوں۔

یا اس ارشاد گرامی ﷺ میں محض ان اشعار کی مذمت مراد ہے جو فحش و بے حیائی، کفر و فسق اور ناشائستہ و غیر صالح مضامین پر مشتمل ہونے کی وجہ سے برے اشعار کہے جاتے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِىْ

شعری جہاد کی فضیلت

⑬ عَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّهُ قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدْ اَنْزَلَ فِى الشِّعْرِ مَا اَنْزَلَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ يُجَاهِدُ بِسَيْفِهٖ وَلِسَانِهٖ وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ لَكَاَنَّمَا تَرْمُوْنَهُمْ بِهٖ نَضْحَ النَّبْلِ۔ رَوَاهُ

فِیْ شَرْحِ السُّنَّۃِ وَفِی الْاِسْتِیْعَابِ لِابْنِ عَبْدِالْبَرِّ اَنَّہٗ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَاذَا تَرٰی فِی الشِّعْرِ فَقَالَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ یُجَاھِدُ بِسَیْفِہٖ وَلِسَانِہٖ۔

"حضرت کعب ابن مالک سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک دن نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے شعرو شاعری کے حق میں جو حکم دیا ہے وہ آیت سے ظاہر ہے جو اس نے نازل فرمائی ہے؟ نبی کریم ﷺ نے ان کی اس بات کے جواب میں فرمایا حقیقت یہ ہے کہ مؤمن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور اپنی زبان سے بھی قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم کافروں کو اشعار کے ذریعہ اسی طرح زخم پہنچاتے ہو جس طرح تیروں کے ذریعہ۔" (شرح السنۃ)

اور ابن عبدالبرؒ کی کتاب استیعاب میں یوں ہے کہ حضرت کعبؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! شعرو شاعری کے متعلق آپ (ﷺ) کیا حکم فرماتے ہیں یہ کوئی اچھی چیز ہے یا بری؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا مؤمن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور اپنی زبان سے بھی۔

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ تین حضرات شعراءؓ اسلام میں ممتاز اور برتر حیثیت رکھتے تھے ان میں ایک تو حضرت حسان ابن ثابتؓ تھے دوسرے حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ اور تیسرے حضرت کعبؓ ابن مالک! علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ تینوں حضرات اپنا الگ الگ شعری انداز ورخ رکھتے ہیں حضرت کعبؓ کے اشعار خصوصیت سے ایسے مضامین پر مشتمل ہوتے تھے جو کفار ومشرکین کو جنگ وجہاد کے خوف میں مبتلا کرتے تھے اور ان کے دلوں پر رعب وہیبت کے اثرات مرتب کرتے تھے، حضرت حسانؓ اپنے اشعار کے ذریعہ دشمنان دین، اور دشمنان رسول کے حسب ونسب پر طعن وتشنیع کے تیر چلاتے تھے اور حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ کے اشعار کا رخ کفار مشرکین کی توبیخ وسرزنش کی طرف رہتا تھا۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی یہ آیت وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُھُمُ الْغَاوٗنَ نازل فرمائی اور اس کے ذریعہ شعرو شاعری کی برائی اور اپنے احوال یعنی اپنے شاعر ہونے پر تاسف کے اظہار کے طور پر آنحضرت ﷺ کے سامنے مذکورہ جملہ ادا کیا لیکن آنحضرت ﷺ نے اپنے جواب کے ذریعہ ان پر ظاہر فرمایا کہ شعرو شاعری بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے بلکہ اس میں برائی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کو غیر شرعی باتوں اور نامناسب مضامین کے اظہار کا ذریعہ بنایا جائے اور چونکہ عام طور پر شعراء فکروخیال کی گمراہی اور زبان کلام کی بے اعتدالیوں کا شکار ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت میں مذکورہ آیت نازل فرمائی ورنہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کوئی شخص اپنے اشعار کو حق وصداقت کے اظہار وباطل وناحق کی تردید کا ذریعہ بنائے تو اس کی شعرو شاعری اس آیت کا محمول نہیں ہوگی بلکہ جو شعراء اپنے اشعار کے ذریعہ خدا اور خدا کے رسول ﷺ کی خاطر کفار کا شعری مقابلہ کرتے ہیں اور ان کی ہجو کا جواب ہجو سے دے کر گویا دین اسلام کی تائید کرتے ہیں وہ دراصل جہاد کرنے والوں میں شمار ہوتے ہیں لہٰذا تمہیں اطمینان رکھنا چاہئے کہ نہ تمہارے اشعار اس آیت کی روشنی میں قابل مذمت ہیں اور نہ تم ان شعراء میں داخل ہو جن کی برائی ظاہر کرنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی گئی ہے کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ نے تم جیسے شعراء کو اپنے اس قول کے ذریعہ مذکورہ آیت کے حکم سے باہر رکھا ہے کہ۔

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا۔ (الآیۃ)

کم گوئی ایمان کی نشانی ہے

⑭ وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الْحَیَاءُ وَالْعِیُّ شُعْبَتَانِ مِنَ الْاِیْمَانِ وَالْبَذَاءُ وَالْبَیَانُ شُعْبَتَانِ مِنَ النِّفَاقِ۔ (ترمذیؒ)

"اور حضرت ابوامامہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ شرم وحیا اور زبان کو قابو میں رکھنا ایمان کی دو شاخیں ہیں جب کہ فحش گوئی اور لاحاصل بکواس نفاق کی دو شاخیں ہیں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: شرم وحیا کا ایمان کی شاخ ہونا ایک ظاہر ومعروف بات ہے اور اس کا تفصیلی ذکر باب الایمان میں گزر چکا ہے۔

زبان کو قابو میں رکھنے کا ایمان کی شاخ ہونا اور فحش گوئی ولاحاصل بکواس کا نفاق کی شاخ ہونا اس اعتبار سے ہے کہ مؤمن اپنی حقیقت کے اعتبار سے شرم وحیاء انکساری ومسکینی اور سلامتی طبع کے جن اوصاف سے مزین ہوتا ہے وہ اپنے خدا کی عبادت، اپنے خدا کی مخلوق کی خدمت اور اپنے باطن کی اصلاح میں جس طرح مشغول ومنہمک رہتا ہے اس کی بناء پر اس کو بے فائدہ تقریر بیان پر قدرت ہی حاصل نہیں ہوتی وہ اس بات پر قادر ہی نہیں ہوتا ہے کہ اپنے مفہوم ومدعا کو مبالغہ آرائی اور زبان کی تیزی وطراری کے ذریعہ ثابت وظاہر کر سکے بلکہ وہ اس خوف سے کم گوئی کو اختیار کرتا ہے اور اپنی زبان کو قابو میں رکھتا ہے کہ مبادا زبان سے کوئی بڑی بات نکل جائے اور وہ فحش گوئی اور بدزبانی کا مرتکب قرار پاجائے اس کے برخلاف منافق کی شان ہی ہوتی ہے کہ وہ چرب زبانی یاوہ گوئی اور مبالغہ آمیزی کی راہ اختیار کرتا ہے اور نتیجہ کے طور پر وہ بے فائدہ تقریر وبیان، زبان درازی اور فحش گوئی پر قادر ودلیر ہو جاتا ہے۔

بے فائدہ بیان آرائی مکروہ ہے

⑮ وَعَنْ اَبِیْ ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَحَبَّکُمْ اِلَیَّ وَاَقْرَبَکُمْ مِنِّیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اَحَاسِنُکُمْ اَخْلَاقًا وَاِنَّ اَبْغَضَکُمْ اِلَیَّ وَاَبْعَدَکُمْ مِنِّیْ مَسَاوِیْکُمْ اَخْلَاقًا الثَّرْثَارُوْنَ الْمُتَشَدِّقُوْنَ الْمُتَفَیْهِقُوْنَ۔ رَوَاہُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ وَرَوَی التِّرْمِذِیُّ نَحْوَہٗ عَنْ جَابِرٍ وَفِیْ رِوَایَةٍ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَدْ عَلِمْنَا الثَّرْثَارُوْنَ وَالْمُتَشَدِّقُوْنَ فَمَا الْمُتَفَیْهِقُوْنَ قَالَ الْمُتَکَبِّرُوْنَ۔

"اور حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن مجھ کو سب سے زیادہ عزیز ومحبوب اور میرے زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جو تم میں سے زیادہ خوش اخلاق ہیں اور میرے نزدیک تم میں سے سب سے برے اور مجھ سے سب سے زیادہ دور وہ لوگ ہوں گے جو تم میں بد اخلاق ہیں اور بد اخلاق سے مراد وہ لوگ ہیں جو بہت (بنا بنا کر) باتیں کرتے ہیں بغیر احتیاط کے بک بک لگاتے ہیں اور متفیهقین، اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے بھی حضرت جابرؓ سے اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔ نیز ترمذیؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ صحابہؓ نے یہ ارشاد سن کر عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! ثرثارون اور متشدقون کے معنی تو ہمیں معلوم ہیں متفیهقون سے کیا مراد ہے یعنی متفیهق کس کو کہتے ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تکبر کرنے والے۔"

تشریح: "فیهق" ضرورت سے زیادہ باتیں کرنا اور منہ پھیر کر کوئی بات کہنے کو کہتے ہیں جیسا کہ تکبر وغرور میں مبتلا لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جو وہ کسی سے بات چیت کرتے ہیں تو ان کے رویہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اپنے مخاطب کو بہت حقیر وذلیل سمجھ رہے ہوں اور یہ بھی گوارا نہیں ہو رہا ہے کہ اس کی طرف منہ اٹھا کر ہی بات کریں۔ بلکہ اس کی طرف سے چہرہ پھیر پھیر کر بات کرتے ہیں چنانچہ اسی معنوی لزوم کی وجہ سے "متفیهقین" کی وضاحت "متکبرین" کے ذریعہ کی گئی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بک بک لگانا، بے فائدہ ولاحاصل گفتگو کرنا، بنا بنا کر باتیں کرنا اور بیان آرائی ومبالغہ آمیزی کے ساتھ تقریریں کرنا مکروہ ومذموم ہے، لیکن حق کے تئیں لوگوں کے ذہن وفکر کو متاثر کرنے قلوب کو نرمانے اور عبادات وطاعات کی طرف متوجہ وراغب کرنے کے لئے وعظ وخطابت میں جو بیان آرائی وسیر کلامی اور طول بیانی کی جاتی ہے وہ مذموم ومکروہ نہیں ہے۔ لیکن اس صورت میں یہ بھی ضروری ہے کہ انداز بیان اور طرز کلام ایسا اختیار کیا جائے جو آسانی کے ساتھ لوگوں کو مقصد تک پہنچادے اس کے برخلاف پیچیدہ ورقیق انداز مشکل لغات والفاظ اور ایسی نکتہ سنجی وحکمت آفرینی اختیار کرنا جو عام ذہن وفہم سے بالاتر ہو اور جس کی وجہ سے ان پڑھ لوگ اس کے وعظ وتقریر سے کماحقہ فائدہ نہ اٹھا سکیں، مناسب وموزوں نہیں ہے۔

ایک پیش گوئی

(۱۶) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِی وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاتَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی یَخْرُجَ قَوْمٌ یَاْکُلُوْنَ بِاَلْسِنَتِہِمْ کَمَا تَاْکُلُ الْبَقَرَۃُ بِاَلْسِنَتِہَا۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ ایک ایسی جماعت پیدا نہیں ہو جائے گی جو اپنی زبانوں کے ذریعہ اس طرح کھائے گی جس طرح گائیں اپنی زبانوں سے کھاتی ہیں۔" (احمدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ قرب قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو اپنی زبانوں کو کھانے پینے کا وسیلہ وذریعہ بنائیں گے بایں طور کہ وہ خوشامد چاپلوسی کی خاطر لوگوں کی جھوٹی تعریفیں بیان کریں گے یا بغض و حسد کی بنا پر ان کی جھوٹی مذمت کریں گے اور اپنی تقریر و تحریر میں زبان دانی اور فصاحت وبلاغت کا جھوٹا مظاہرہ کریں گے تاکہ لوگوں کو اپنے دام فریب میں مبتلا کریں اور ان سے دنیا کا مال وزر حاصل کریں اور اپنی خواہشات کی تکمیل کرائیں۔

"جس طرح گائیں اپنی زبان کے ذریعہ کھاتی ہیں" کے ذریعہ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس طرح گائیں اپنی زبان سے کھاتی ہیں اور چارہ چرتے وقت یہ تمیز نہیں کرتیں کہ وہ چارہ خشک ہے یا تر، شیریں ہے یا تلخ اور جائز ہے یا ناجائز، اسی طرح وہ لوگ بھی کہ جو اپنی زبانوں کو اپنے ناجائز مقاصد اور ناروا خواہشات کی تکمیل کا وسیلہ وذریعہ بنائیں گے، حق وباطل اور سچ وجھوٹ کے درمیان قطعاً کوئی تمیز نہیں کریں گے۔ اور نہ حلال وحرام کے درمیان کوئی فرق کریں گے۔

زبان دراز اور چکنی چپڑی باتیں کرنے والا خدا کا ناپسندیدہ ہے

(۱۷) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ یُبْغِضُ الْبَلِیْغَ مِنَ الرِّجَالِ الَّذِیْ یَتَخَلَّلُ بِلِسَانِہٖ کَمَا یَتَخَلَّلُ الْبَاقِرَۃُ بِلِسَانِہَا۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ شخص سخت ناپسندیدہ ہے جو کلام و بیان میں حد سے زیادہ فصاحت وبلاغت کا مظاہرہ کرنے بایں طور کہ وہ اپنی زبان کو اس طرح لپیٹ لپیٹ کر باتین کرے جس طرح گائیں اپنے چارے کو لپیٹ لپیٹ کر جلدی جلدی اپنی زبان کے ذریعہ کھاتی ہیں۔ اس روایت کو ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے نیز ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ زبان درازی اور طاقت لسانی کوئی اچھی چیز نہیں ہے اپنی زبان اور اپنے کلام میں خواہ مخواہ کے لئے حد سے زیادہ فصاحت وبلاغت کا مظاہرہ کرنا، حاشیہ آرائی اور مبالغہ آمیزی کے ساتھ اپنی بات کو پیش کرنا اور الفاظ کو چبا چبا کر اور زبان کو لپیٹ لپیٹ کر چکنی چپٹی باتیں کرنا احمق لوگوں کے نزدیک تو ایک وصف سمجھا جاتا ہے، لیکن جو دانشمند اور عاقل لوگ اس "وصف" کے پیچھے چھپی ہوئی برائی کو دیکھتے ہیں کہ عام طور پر اس طرح باتیں بنانے والے لوگ جھوٹے اور حیلہ باز ہوتے ہیں ان کے نزدیک اس وصف کا کوئی اعتبار نہیں اور اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایسا شخص خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہے لہٰذا اچھا کلام وہی ہے جو ضرورت کے بقدر اور سیدھا سادا ہو نیز جس سے یہ واضح ہو کہ متکلم کے ظاہری الفاظ، اس کی باطنی کیفیات کے ہم آہنگ ہیں جو شریعت کا تقاضا بھی ہے۔

بے عمل واعظ وخطیب کے بارے میں وعید

(۱۸) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَرَرْتُ لَیْلَۃَ اُسْرِیَ بِیْ بِقَوْمٍ تُقْرَضُ شِفَاھُھُمْ بِمَقَارِیْضَ مِنَ النَّارِ فَقُلْتُ یَا جِبْرَئِیْلُ مَنْ ھٰؤُلَاءِ قَالَ ھٰؤُلَاءِ خُطَبَاءُ اُمَّتِکَ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ مَالَا یَفْعَلُوْنَ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا

حَدِيثٌ غَرِيبٌ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا معراج کی رات میں میرا گزر کچھ ایسے لوگوں پر ہوا جن کی زبانیں آگ کی قینچیوں سے کاٹی جارہی تھیں، میں نے یہ دیکھ کر پوچھا کہ جبرئیل (علیہ السلام) یہ کون لوگ ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ یہ آپ (ﷺ) کی امت کے واعظ و خطیب ہیں جو ایسی باتیں کہتے ہیں جن پر خود عمل نہیں کرتے۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث میں ان واعظوں اور خطیبوں کے لئے سخت تنبیہ و وعید ہے جو دوسروں کو تو نیک کام کرنے کو کہتے ہیں لیکن خود نیک کام نہیں کرتے، تاہم واضح رہے کہ یہ حدیث ان واعظوں اور خطیبوں کی بے عملی کی مذمت کو ظاہر کرتی ہے نہ کہ اس ارشاد کا مقصد اس بات کی برائی کو بیان کرنا ہے کہ وہ نیک کام کے لئے کیوں کہتے ہیں اگرچہ وہ خود نیک کام نہیں کرتے اسی بنیاد پر علماء لکھتے ہیں کہ امر بالمعروف میں فعل شرط نہیں ہے یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ نیک کام کے لئے وہی شخص کہہ سکتا ہے جو خود بھی اس پر عمل کرے البتہ یہ بہتر ہے کہ امر بالمعروف کرنے والا اپنے کہے پر خود بھی عمل کرے۔ کیوں کہ جس امر بالمعروف کی بنیاد محض قول پر ہوتی ہے عمل پر نہیں ہوتی ہے اس کا اثر نہیں ہوتا۔

چرب زبانی کے بارے میں وعید

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَعَلَّمَ صَرْفَ الْكَلَامِ لِيَسْبِیَ بِهٖ قُلُوْبَ الرِّجَالِ اَوِ النَّاسِ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ صَرْفًا وَّلَا عَدْلًا۔ (رواہ ابوداؤدؒ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص اس مقصد کے لئے گھما پھرا کر بات کرنے کا سلیقہ سیکھے کہ وہ اس کے مردوں کے دلوں یا لوگوں کے دلوں پر قابو حاصل کرلے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ اس کی نفل عبادت قبول کرے گا اور نہ فرض۔"

(ابوداؤدؒ)

تشریح: مذکورہ وعید کا تعلق اس شخص سے ہے جو چرب زبانی کرے، ضرورت سے زیادہ باتیں بنائے، اپنے مقصد کو اس طرح گھما پھرا کر بیان کرے کہ حقیقت ظاہر نہ ہوسکے اور یا اپنے کلام کو ضرورت سے زیادہ فصاحت و بلاغت نیز مبالغہ آرائی کے ساتھ آراستہ و مزین کرے اور ان چیزوں کا مقصد محض یہ ہو کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی باتوں سے اثر قبول کر کے اس کے مقصد کو پورا کریں۔

مختصر تقریر بہتر ہوتی ہے

(۲۰) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّهٗ قَالَ يَوْمًا وَقَامَ رَجُلٌ فَاَكْثَرَ الْقَوْلَ فَقَالَ عَمْرٌو لَوْ قَصَدَ فِیْ قَوْلِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَقَدْ رَاَيْتُ اَوْ اُمِرْتُ اَنْ اَتَجَوَّزَ فِی الْقَوْلِ فَاِنَّ الْجَوَازَ هُوَ خَيْرٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عمرو ابن العاصؓ سے روایت ہے کہ ایک دن انہوں نے اس وقت فرمایا جب کہ ایک شخص (وعظ کہنے یا خطبہ دینے کے لئے کھڑا ہوا اور اپنی فصاحت و بلاغت کے اظہار کی خاطر) بہت لمبی تقریر کی یہاں تک کہ سننے والے اکتا گئے چنانچہ اس وقت حضرت عمروؓ نے اس شخص سے فرمایا کہ اگر تم اپنی تقریر میں اعتدال و میانہ روی سے کام لیتے (یعنی مختصر تقریر کرتے) تو بے شک وہ (تقریر) سننے والوں کے حق میں بہت بہتر ہوتی، میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے سمجھ لیا ہے۔ یا یہ فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تقریر میں و گفتگو میں اختصار سے کام لوں، حقیقت یہ ہے کہ مختصر تقریر بہتر ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: روایت میں فَقَالَ عَمْرٌو کے الفاظ طول کلام کے سبب مکرر نقل کئے گئے ہیں کیونکہ ولو قصد..... الخ مقولہ ہے قَالَ یَوْمًا کا اور قَامَ رَجُلٌ حال ہے اور ظاہر ہے کہ حال کی وجہ سے قول ومقولہ کے درمیان خاصا فرق ہوگیا اس لئے فَقَالَ عمرو دوبارہ کہہ کر گویا قول کا اعادہ کیا۔

بعض، علم جہالت ہوتے ہیں

(۲۱) وَعَنْ صَخْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا وَاِنَّ مِنَ الْعِلْمِ جَهْلًا وَاِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حُكْمًا وَاِنَّ مِنَ الْقَوْلِ عِيَالًا۔ (رواہ ابوداؤدؒ)

"اور حضرت صخر ابن عبداللہ ابن بریدہؓ اپنے والد (حضرت عبداللہ) سے اور وہ صخرؒ کے دادا حضرت بریدہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بعض بیان جادو کی مانند ہوتے ہیں بعض علم جہالت ہوتے ہیں، بعض اشعار فائدہ مند یعنی حکمت ودانائی سے پر ہوتے ہیں اور بعض قول وکلام وبال جان ہوتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "بعض علم جہالت ہوتے ہیں" کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ کسی شخص نے ایسا علم حاصل کیا جو بذات خود نہ تو فائدہ مند ہو اور نہ اس کی طرف احتیاج وضرورت ہو، جیسے علم جعفر ورمل یا علم نجوم وفلاسفہ وغیرہ، اور اس بے فائدہ علم میں مشغولیت کی وجہ سے وہ ضروری علوم حاصل کرنے سے محروم رہا جن سے لوگوں کی احتیاج وضرورت وابستہ ہوتی ہے، جیسے قرآن وحدیث اور دین کے علوم، تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہی کہا جائے گا کہ اس شخص نے جو بے فائدہ علم حاصل کیا اس علم نے دوسرے ضروری علوم سے اس کو محرومی وجاہل رکھا ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ بعض علوم در حقیقت جہل کو لازم کرتے ہیں اور اسی اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ بعض علم جہالت ہوتے ہیں۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ علم حاصل کرنے والا اپنے علم پر عمل پیرا نہ ہوا، اس اعتبار سے وہ شخص عالم ہونے کے باوجود جاہل قرار پائے گا کیوں کہ جو شخص علم رکھے اور عمل نہ کرے تو وہ گویا جاہل ہے۔

علاوہ ازیں اس ارشاد گرامی سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو شخص علم کا دعوی کرتا ہے اور اپنے گمان کے مطابق خود کو عالم سمجھا ہے مگر حقیقت میں وہ عالم نہیں ہے تو اس کا یہ علم جس کا اس نے دعوی کیا ہے علم نہیں ہے بلکہ سراسر جہالت ونادانی ہے۔

"بعض قول وکلام وبال جان ہوتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص نے کوئی ایسی بات کہی جس کی وجہ سے وہ خود کسی آفت میں مبتلا ہوگیا یا جس شخص نے اس بات کو سنا وہ کسی ملال ودل برداشتگی میں مبتلا ہوگیا، بایں طور کہ اگر وہ سننے والا جاہل تھا تو وہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور اگر عالم تھا تو اس کے لئے لاحاصل تھی یا وہ کوئی ایسی بات ہے جس کو سننے والا پسند نہیں کرتا اور اس بت کی وجہ سے اس کو رنج وملال ہوتا ہے تو ان صورتوں میں یہی کہا جائے گا کہ کہنے والے کا وہ قول وکلام وبال وملال کا ذریعہ بن گیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضرت حسانؓ کی فضیلت

(۲۲) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَضَعُ لِحَسَّانٍ مِنْبَرًا فِي الْمَسْجِدِ يَقُوْمُ عَلَيْهِ قَائِمًا يُفَاخِرُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْيُنَافِحُ وَيَقُوْلُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يُؤَيِّدُ حَسَّانَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ مَانَافَحَ اَوْفَاخَرَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ البخاریؒ)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ مسجد نبوی ﷺ میں مشہور شاعر اسلام حضرت حسانؓ کے لئے منبر رکھوا دیتے تھے جس پر

وہ کھڑے ہو کر اپنے اشعار سناتے اور ان اشعار میں رسول کریم ﷺ کی طرف سے اظہار فخر کرتے تھے۔ یا۔ یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے کفار کے دین مخالف اشعار اور ہجو کا مقابلہ کرتے تھے اور رسول کریم ﷺ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ حسان کی تائید کرتا ہے جب تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مقابلہ کرتے ہیں۔ یا یہ الفاظ ہیں کہ جب تک وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اظہار فخر کرتے ہیں۔" (بخاریؒ)

حدی کا جواز

(۲۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَادٍ يُقَالُ لَهُ اَنْجَشَةُ وَكَانَ حَسَنَ الصَّوْتِ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رُوَيْدَكَ يَا اَنْجَشَةُ لَا تَكْسِرِ الْقَوَارِيْرَ قَالَ قَتَادَةُ يَعْنِي ضَعْفَةَ النِّسَآءِ۔ (متفق علیہ)

"اور انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے ایک حدی خواں تھے جن کا نام انجشہ تھا، وہ بہت خوش آواز تھے ایک سفر کے دوران نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ انجشہ اونٹوں کو آہستہ آہستہ ہانکو اور شیشوں کو نہ توڑو۔ حضرت قتادہؓ حدیث کے ایک راوی کہتے ہیں کہ شیشوں سے آنحضرت ﷺ کی مراد عورتیں تھیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "حدی" صراح کے مطابق اس بلند آواز گانے کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ اونٹوں کو ہانکا جاتا ہے، لغت کی بعض دوسری کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ حدی، عرب شتربانوں کے نغمہ کو کہتے ہیں، چنانچہ عرب میں دستور ہے کہ شتربان اونٹ ہانکنے والا جب یہ دیکھتا ہے کہ اس کا اونٹ تھک گیا ہے یا اس کی چال سست ہوگئی ہے تو وہ بلند آواز اور خوش گوئی کے ساتھ گانے لگتا ہے اس گانے کی آواز گویا اونٹ میں چستی و گرمی پیدا کر دیتی ہے جس سے وہ تیز رفتاری کے ساتھ چلنے لگتا ہے کتابوں میں لکھا ہے کہ حدی، جو گانے ہی کی ایک قسم ہے مباح ہے اور اس کے بارے میں علماء میں سے کسی کا کوئی اختلافی قول نہیں ہے۔

"قواریر" قارورہ کی جمع ہے جس کے معنی شیشہ کے ہیں! اس ارشاد گرامی وَلَا تَكْسِرِ الْقَوَارِيْرَ اور شیشوں کو نہ توڑو کے دو مطلب ہیں ایک تو یہ کہ عورتوں کے بدن میں جو فطری نزاکت و کمزوری ہوتی ہے اس کی بنا پر اونٹوں کا تیز چلنا اور ہچکولے لگنا ان کے سخت تعب و تکلیف کا موجب بن جاتا ہے لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اپنے شتربان انجشہؓ کو حکم دیا کہ اونٹ کو اتنی تیزی کے ساتھ نہ بھگاؤ کہ اس پر سوار عورتیں ہچکولے کھانے لگیں اور اس کی وجہ سے ان کو تکلیف و پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس ارشاد گرامی ﷺ کے ذریعہ عورتوں کے دل کی کمزوری و نرمی کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا یعنی آنحضرت ﷺ نے انجشہؓ کو ہدایت کی اس طرح حدی خوانی نہ کرو جس سے عورتوں کے دل کمزور، متاثر ہو جائیں اور تمہارے گانے کی وجہ سے ان کے ذہن و دماغ اور جذبات میں ہلچل پیدا ہو جائے اور وہ کسی برے خیال میں مبتلا ہو جائیں کیونکہ گانے کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ طبیعت کو بھڑکاتا ہے اور جذبات میں ہلچل مچا دیتا ہے! اگرچہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جس موقع پر یہ ارشاد فرمایا اس وقت اونٹ پر ازواج مطہراتؓ میں سے کوئی زوجہ مطہرہ سوار ہوں گی اور اس صورت میں مطلب غیر موزوں معلوم ہوتا ہے کیونکہ مذکورہ احتمال یعنی گانے کی آواز سن کر جذبات میں ہلچل پیدا ہو جانا، ازواج مطہراتؓ کے حق میں نہایت کمزور ضعیف ہے لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ کسی برے خیال کا پیدا ہو جانا اور طبیعت و دل کا کسی وسوسے میں مبتلا ہو جانا ایک طبعی چیز ہے جو کسی انسان کے اختیار کی پابند نہیں ہے لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اس کو مناسب سمجھا کہ احتیاط کی راہ ظاہر فرما دیں کہ بہر صورت احتیاط کی راہ اختیار کرنا ہی بہتر اور اولیٰ ہے۔

یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا تعلق در حقیقت امت کے لوگوں کو تعلیم و تلقین سے ہے یعنی آپ ﷺ نے اس موقع پر مذکورہ ارشاد کے ذریعہ پوری امت کو ہدایت فرمائی کہ جب اونٹ پر عورتیں سوار ہوں تو ان کی موجودگی کو

ملحوظ رکھا جائے اور حدی خوانی میں احتیاط و مصلحت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

اوپر جو دو مطلب بیان کئے گئے ہیں ان میں سے دوسرے مطلب کو اکثر شارحین نے ترجیح دی ہے لیکن روایت کے الفاظ کا تقاضا یہ ہے کہ پہلا مطلب صحیح مانا جائے۔

شعر کی خوبی و برائی کا تعلق اس کے مضمون سے ہے

(۲۴) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ ذُكِرَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الشِّعْرُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ كَلَامٌ فَحَسَنُهُ حَسَنٌ وَقَبِيْحُهُ قَبِيْحٌ رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَرَوَى الشَّافِعِيُّ عَنْ عُرْوَةَ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ کے سامنے شعر کا ذکر کیا گیا یعنی یہ دریافت کیا گیا شعر و شاعری کوئی اچھی چیز ہے یا بری؟ تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ شعر بھی ایک کلام ہے چنانچہ اچھا شعر اچھا کلام ہے اور برا شعر برا کلام ہے۔"

شعر و شاعری کے بارے میں پہلے بھی بتایا جا چکا ہے اور حدیث بھی اسی بات کو واضح کرتی ہے کہ شعر کہنا یا پڑھنا سننا بذات خود کوئی برائی نہیں رکھتا بلکہ اس کی اچھائی اور برائی کا دار و مدار شعر کے مضمون پر ہوتا ہے اگر شعر کا مضمون ایسا ہے جو شریعت کے حکم و منشاء اور دینی تقاضوں کے خلاف نہیں ہے تو اس شعر میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ ایسے مضمون کا حامل شعر کہنا، اور سنا جائے جس سے دین کی بات پھیلتی اور ثابت ہوتی ہو یا جس سے خدا کی وحدانیت رسول ﷺ کی محبت و منقبت اور دین و خادمان دین کی عظمت ظاہر ہوتی ہو تو یقیناً ایسا شعر مستحسن و محمود بھی ہوگا اس کے برخلاف جس شعر کا مضمون شریعت کے حکم و منشاء کے خلاف ہو تو اس کو برا کہا جائے گا۔

شعر کی برائی

(۲۵) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ بَیْنَا نَحْنُ نَسِیْرُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْعَرْجِ اِذَا عَرَضَ شَاعِرٌ یُنْشِدُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُذُوا الشَّيْطَانَ اَوْ اَمْسِكُوا الشَّيْطَانَ لَاَنْ يَمْتَلِئَ جَوْفُ رَجُلٍ قَيْحًا خَيْرٌ لَهٗ مِنْ اَنْ يَمْتَلِئَ شِعْرًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول کریم ﷺ کے ہمراہ سفر کے دوران عرج میں تھے کہ اچانک ایک شاعر سامنے سے نمودار ہوا جو اشعار پڑھنے میں مشغول تھا، رسول کریم ﷺ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ اس شیطان کو پکڑ لو یا یہ فرمایا کہ اس شیطان کو جانے دو یعنی اس کو شعر پڑھنے سے روک دو، یاد رکھو! انسان کا اپنے پیٹ کو پیپ سے بھرنا اس میں اشعار بھرنے سے بہتر ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "عرج" مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے درمیان راستہ میں پڑنے والی ایک گھاٹی کا نام ہے جہاں ایک چھوٹی سی بستی بھی ہے اس راستے پر چلنے والے قافلے یہاں منزل کرتے تھے، آنحضرت ﷺ بھی سفر ہجرت اور حجۃ الوداع میں اس جگہ سے گزرے تھے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ حجۃ الوداع کے سفر کے دوران کا ہے۔

بہرحال جب آنحضرت ﷺ نے اس شخص کو دیکھا کہ وہ شعر پڑھنے میں بری طرح مشغول ہے یہاں تک کہ اس کو وہاں موجود مسلمانوں کی طرف بھی کوئی التفات نہیں ہے بلکہ ایک طرح سے آنحضرت ﷺ اور تمام مسلمانوں سے صرف نظر کئے ہوئے بے محابا چلا جا رہا ہے اور اس کو شوق شعر و شاعری نے اس درجہ بے باک بنا دیا ہے کہ وہ انسانی اور اخلاقی تقاضوں اور آداب زندگی تک کو فراموش کر بیٹھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے رگ و پے میں صرف شعر و شاعری ہی سرایت کئے ہوئے ہے اور وہ پرلے درجے کا بے حیا و بے ادب بن گیا ہے تو آپ ﷺ نے اس کو شیطان فرمایا جس سے آپ ﷺ کی مراد یہ تھی کہ یہ شخص رحمت الٰہی اور قرب خداوندی سے بعد اختیار کئے ہوئے ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے صورت حال کا صدور محض اس لئے ہوا کہ وہ اپنی شعر و شاعری کے غرور و نخوت میں مبتلا

تھا اس لئے آپ ﷺ نے شعر کی مذمت کی۔

راگ لگانا، نفاق کو پیدا کرتا ہے

(۲۶) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْغِنَآءُ يُنْبِتُ النِّفَاقَ فِى الْقَلْبِ كَمَا يُنْبِتُ الْمَاءُ الزَّرْعَ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ راگ و گانا دل میں نفاق کو اس طرح اگاتا ہے جس طرح پانی کھیتی کو اگاتا ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ راگ و گانا انسانی قلب و روح کے لئے ایک آزار ہے کہ جس کا ثمرہ نفاق ہے یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ راگ و گانا انسان میں نفاق و فساد باطن کے پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے۔

دیلمیؒ کی روایت میں حضرت انسؓ سے آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی یوں نقل کیا گیا ہے کہ۔

ان الغنا واللهو ينبتان النفاق كما ينبت الماء العشب والذى نفس محمد بيده ان القران والذكر ينبتان الايمان، فى القلب كما ينبت الماء العشب۔

"حقیقت یہ ہے کہ راگ و گانا اور کھیل کود یہ دونوں نفاق کو اس طرح اگاتے ہیں جس طرح پانی سبزی کا اگاتا ہے اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے قرآن اور ذکر الٰہی یہ دونوں قلب میں ایمان کو اس طرح اگاتے ہیں جس طرح پانی سبزی کو اگاتا ہے۔"

حاصل یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ راگ و گانے اور کھیل کود جیسی لاحاصل چیزوں سے اجتناب کرے بلکہ اپنے اوقات کو تلاوت قرآن اور ذکر الٰہی سے معمور رکھے کیوں کہ یہ چیزیں قلب و روح کو جلا بخشتی ہیں اور ایمان و اخلاق کو مضبوط تر بناتی ہیں۔

نوویؒ نے کتاب روضہ میں لکھا ہے کہ محض آواز کے ساتھ گانا مکروہ ہے اور اس کا سننا بھی مکروہ ہے نیز اجنبی عورت سے سننا سخت مکروہ ہے اور ساز جیسے عود و طنبور اور دیگر باجوں کے ساتھ گانا کہ شراب نوشوں کا خاص مشغلہ ہوتا ہے حرام ہے اور اس کا سننا بھی حرام ہے۔

باجے گاجے کی آواز آئے تو کانوں میں انگلیاں ڈال لو

(۲۷) وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ كُنْتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ فِيْ طَرِيْقٍ فَسَمِعَ مِزْمَارًا فَوَضَعَ اِصْبَعَيْهِ فِيْ اُذُنَيْهِ وَنَاءَ عَنِ الطَّرِيْقِ اِلَى الْجَانِبِ الْاٰخِرِ ثُمَّ قَالَ لِيْ بَعْدَ اَنْ بَعُدَ يَا نَافِعُ هَلْ تَسْمَعُ شَيْئًا قُلْتُ لَا فَرَفَعَ اِصْبَعَيْهِ مِنْ اُذُنَيْهِ قَالَ كُنْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمِعَ صَوْتَ يَرَاعٍ فَصَنَعَ مِثْلَ مَا صَنَعْتُ قَالَ نَافِعٌ وَكُنْتُ اِذْ ذَاكَ صَغِيْرًا۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت نافعؓ تابعی کہتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ راستہ میں تھا یعنی ہم دونوں کہیں جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک جگہ حضرت ابن عمرؓ نے "نے" کی آواز سنی اور فوراً اپنی دونوں انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیں نیز راستہ سے ہٹ کر دوسری طرف ہو لئے تاکہ اس آواز سے اپنے آپ کو بچا سکیں پھر اس راستہ سے ہٹنے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ نافع کیا تم بھی کچھ سن رہے ہو یعنی "نے" کی جو آواز آرہی تھی وہ اب بھی جاری ہے یا بند ہو گئی ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں اب وہ آواز بند ہو گئی ہے انہوں نے اپنی دونوں انگلیاں کانوں سے نکال لیں اور پھر بیان کیا کہ ایک دن میں رسول کریم ﷺ کے ساتھ تھا کہ آپ ﷺ نے "نے" کی آواز سنی اور پھر آپ ﷺ نے بھی یہی کیا جو اس وقت میں نے کیا ہے! حضرت نافعؓ کہتے ہیں کہ اس وقت میں ایک چھوٹی عمر کا لڑکا تھا۔" (احمدؒ وابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت نافعؒ نے اس روایت کے آخر میں جو یہ واضح کیا کہ میں نے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے وہ اس وقت کا ہے جب میں بہت چھوٹا تھا اس سے ان کا مقصد اس بات کو واضح کرنا تھا کہ اس وقت چونکہ میں چھوٹی عمر کا تھا اور شرعی طور پر مکلف نہیں تھا اس لئے

حضرت ابن عمرؓ نے اس آواز کو سننے سے مجھ کو منع نہیں کیا اگر میں شرعی طور پر مکلف ہوتا تو وہ یقیناً مجھ کو یہ ہدایت کرتے کہ ان کی طرح میں بھی اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لوں لہٰذا کسی کو یہ وہم نہ ہونا چاہئے کہ اس آواز میں کراہت تنزیہی تھی اس لئے انہوں نے مجھے اس آواز سے سننے سے منع نہیں کیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس آواز کو سننا مکروہ تحریمی تھا اور مجھے منع نہ کرنے کا تعلق میرے غیر مکلف ہونے سے تھا۔

رہی یہ بات کہ جب حضرت ابن عمرؓ نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں تھیں تو راستہ چھوڑ دینے کی کیا ضرورت تھی تو اس کا تعلق کمال تقویٰ اور ورع سے تھا یعنی حضرت ابن عمرؓ نے احتیاط و تقویٰ کا تقاضہ یہی سمجھا کہ اس راستہ سے ہی ہٹ جائیں ورنہ اگر اس راستے کو چھوڑ دینا بھی شرعی طور پر ضروری ہوتا تو حضرت ابن عمرؓ یقیناً حضرت نافعؒ کو بھی وہ راستہ چھوڑ دینے کا حکم دیتے۔

واضح رہے کہ گانے بجانے کا مسئلہ بہت تفصیل طلب ہے خلاصہ کے طور پر اتنا جان لینا کافی ہے کہ محدثین کی تحقیق کے مطابق ایسی کوئی حدیث منقول نہیں ہے جس سے گانے کا حرام ہونا ثابت ہوتا ہو، مشائخ کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں اظہار ممانعت کے طور پر جو کچھ منقول ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ گانا ممنوع ہے جس کے ساز اور باجا بھی شامل ہو البتہ فقہاء نے اس مسئلہ میں بڑی شدت اختیار کی ہے جس کی تفصیل فقہی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے فتاویٰ قاضی خاں میں لکھا ہے کہ لہو و لعب کی چیزوں یعنی ساز اور باجوں کو سننا حرام اور سخت گناہ ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے۔

استماع الملاهی معصية والجلوس عليها فسق والتلذذ بها من الکفر

"باجوں کا سننا گناہ ہے اس پر بیٹھنا فسق ہے اور اس سے لذت و حظ حاصل کرنا کفریات میں سے ہے۔"

ہاں اگر کسی شخص کے کان میں باجے کی آواز ناگہانی طور پر آجائے تو اس صورت میں کوئی گناہ نہیں، لیکن اس پر واجب ہوگا کہ وہ اس بات کی پوری کوشش کرے کہ وہ اس آواز کو سن نہ سکے کیونکہ آنحضرت ﷺ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے باجے کی آواز سے بچنے کے لئے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لی تھیں۔

بَابُ حِفْظِ اللِّسَانِ وَالْغِيْبَةِ وَالشَّتْمِ

زبان کی حفاظت، غیبت اور برا کہنے کا بیان

"غیبت" کے معنی ہیں پیٹھ پیچھے بدگوئی کرنا۔ یعنی کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کے متعلق ایسی باتیں کرنا کہ جس کو اگر وہ سنے تو ناپسند کرے۔

"شتم" کے معنی ہیں گالی دینا یعنی کسی کو کوئی فحش بات کہنا بدزبانی کرنا برا بھلا کہنا اور کسی کو ایسے الفاظ کے ذریعہ یاد و مخاطب کرنا جو شریعت و اخلاق اور تہذیب و شائستگی کے خلاف ہوں۔

بہرحال اس باب میں وہ احادیث نقل کی جائیں گی جن سے یہ واضح ہوگا کہ زبان کو ایسے الفاظ و کلام سے بچانا چاہئے جن کو زبان پر لانا شرعی، اخلاقی اور معاشرتی طور پر ناروا ہے خصوصاً غیبت، گالم گلوچ اور بدزبانی و بدکلامی! نیز ان احادیث سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ ان چیزوں میں شرعی طور پر کیا برائی ہے اور ان کا ارتکاب کرنے والا شریعت و اخلاق کی نظر میں کس کی نظم میں کس قدر ناپسندیدہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

زبان اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے کو آنحضرت ﷺ کی طرف سے جنت کی بشارت

① عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَّضْمَنْ لِيْ مَابَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ اَضْمَنْ

لَهُ الْجَنَّةَ۔ (رواه البخاري)

"حضرت سہل ابن سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص مجھے اس بات کی ضمانت دے کہ وہ اپنی اس چیز کی حفاظت کریگا جو اس کے دونوں کلوں کے درمیان ہے یعنی زبان اور دانت اور جو اس کے دونوں پاؤں کے درمیان ہے یعنی شرمگاہ تو میں اس کی جنّت کی ضمانت لیتا ہوں۔" (بخاریؒ)

تشریح: زبان کی حفاظت کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ اپنی زبان پر قابو حاصل کرے بایں طور کہ اس کو بے فائدہ الفاظ وکلام اور فحش گوئی و سخت کلامی سے محفوظ رکھے اور دانت کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ اس کو حرام چیزوں کے کھانے پینے میں ملوث نہ کرے اس طرح شرمگاہ کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ زنا جیسی برائی سے اجتناب کرے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص مجھ سے اس بات کا عہد کرے اور عمل کے ذریعہ اس عہد کو پورا کرے گا کہ وہ اپنی زبان کو فحش گوئی و بدکلامی سے محفوظ رکھے گا۔ اپنے منہ کو حرام و ناجائز کھانے پینے سے بچانے اور اپنی شرمگا کو حرام کاری سے محفوظ رکھنے پر پوری طرح عامل و کاربند رہے گا تو اس کے تئیں اس بات کا ضامن بنتا ہوں کہ وہ شروع ہی میں نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ جنّت میں داخل کر دیا جائیگا اور وہاں کے درجات عالیہ کا مستحق قرار پائے گا۔

واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ کی در اصل حق تعالیٰ کی طرف سے ضمانت ہے کہ جس طرح وہ محض اپنے فضل سے بندوں کے رزق کا ضامن ہوا ہے اسی طرح اس نے پاکیزہ زندگی اختیار کرنے اور اعمال صالحہ پر جزاء دینے اور اپنے انعامات سے نوازنے کا بھی قوی وعدہ کیا ہے اور چونکہ آنحضرت ﷺ اس کے نائب ہیں اس کی طرف سے مذکورہ ضمانت لی ہے۔

زبان پر قابو رکھو

(۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ رِضْوَانِ اللّٰهِ لَا يُلْقِیْ لَهَا بَالًا يَرْفَعُ اللّٰهُ بِمَا دَرَجَاتٍ وَاِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللّٰهِ لَا يُلْقِیْ لَهَا بَالًا يَهْوِیْ بِهَا فِیْ جَهَنَّمَ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ وَفِیْ رِوَايَةٍ لَهُمَا يَهْوِیْ بِهَا فِی النَّارِ اَبْعَدَ مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا حقیقت یہ ہے کہ جب بندہ اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نکالتا ہے جس میں حق تعالیٰ کی خوشنودی ہوتی ہے تو اگرچہ وہ بندہ اس بات کی اہمیت کو نہیں جانتا لیکن اللہ تعالیٰ اس کے سبب سے اس کے درجات بلند کر دیتا ہے یعنی اگرچہ وہ بندہ اپنی اس بات کی قدر و اہمیت سے واقف نہیں ہوتا اور اس کو ایک نہایت سہل اور معمولی درجہ کی بات سمجھتا ہے مگر حق تعالیٰ کے نزدیک وہ بات بہت بلند پایہ اور بڑے مرتبہ کی ہوتی ہے اسی طرح جب بندہ کوئی ایسی بات زبان سے نکالتا ہے جو حق تعالیٰ کی ناخوشی کا ذریعہ بن جاتی ہے تو اگرچہ وہ بندہ اس بات کی اہمیت کو نہیں جانتا یعنی وہ اس بات کو بہت معمولی سمجھتا ہے اور اس کو زبان سے نکالنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا لیکن حقیقت میں وہ بات نتیجے کے اعتبار سے اتنی ہیبتناک ہوتی ہے کہ وہ بندہ اس کے سبب سے دوزخ میں گر پڑتا ہے۔ (بخاریؒ) اور بخاری و مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ وہ اس کے سبب سے دوزخ میں اتنی دور سے گرتا ہے جو مشرق و مغرب کے درمیانی فاصلہ سے بھی زیادہ ہے یعنی وہ جہاں سے دوزخ میں گرے گا وہ دوزخ جس جگہ جا کر گرے گا، ان دونوں کے درمیان اتنا طویل فاصلہ ہے جتنا مشرق و مغرب کے درمیان بھی نہیں ہے۔"

تشریح: اس ارشاد گرامی ﷺ کا حاصل اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ زبان پر ہر وقت قابو رکھو اور اس کے معاملہ کو کم اہم نہ سمجھو نیز اس حقیقت کو کسی بھی لحہ نظر انداز نہ کرو کہ اگر زبان پر احتیاط کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور یہ چھوٹی سی چیز تمہارے قابو سے باہر ہو گئی تو پھر تمہاری خیر نہیں! چنانچہ اس حقیقت کو فرمایا گیا کہ بسا اوقات بندہ اپنی زبان سے کوئی بات نکالتا ہے اور اس کو اپنے نزدیک بہت معمولی درجہ کی

بات سمجھتا ہے مگر در حقیقت و نتیجہ کے اعتبار سے اس بات کی کیا اہمیت ہوتی ہے؟ اس کو یوں سمجھ کہ اگر وہ بات حق ہوتی ہے اور خدا کی خوشنودی کا ذریعہ بنتی تو وہی ذرا سی بات جنّت میں اس کی بلندی کا سبب بن جاتی ہے اور اگر وہ بات کہیں ایسی ہوئی جو بری ہونے کی وجہ سے خدا کی ناراضگی کا سبب بن گئی ہو تو بندے کے نزدیک وہی معمولی بات اس کو دوزخ میں گرا دینے کا ذریعہ بن جائیگی۔

کسی مسلمان کے حق میں بدزبانی و سخت گوئی فسق ہے

۳ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ۔
(متفق علیہ)

"اور حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کسی مسلمان کو برا کہنا فسق ہے اور کسی مسلمان کا مار ڈالنا کفر ہے۔"
(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: کسی مسلمان کے قتل کرنے کو کفر کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی مسلمان اگر کسی مسلمان کو قتل کر دے تو وہ کافر ہو جاتا ہے بلکہ ارشاد کا مقصد اس بات کو نہایت سختی و شدت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ کہ مسلمان کا ناحق خون بہانا انتہائی سنگین جرم ہے اور جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو قتل کرتا ہے وہ اپنے اسلام کے کامل ہونے کی نفی کرتا ہے گویا یہاں "کفر" سے مراد کمال اسلام کی نفی ہے جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے المسلم من سلم المسلمون یعنی کامل مسلمان وہی ہے جس سے مسلمان محفوظ و مامون رہیں اور اگر کفر سے اس کے حقیقی معنی مراد ہوں تو اس صورت میں کہا جائے گا کہ وہ مسلمان یقیناً کافر ہو جائے گا جو کسی مسلمان کو اس لئے قتل کر دے کہ وہ مسلمان ہو اور اس کے اسلام کے سبب سے اس قتل کرنے کو حلال و مباح جانے کیوں کہ کسی مسلمان کو محض اس کے اسلام کی وجہ سے قتل کرنا اور اس قتل کو حلال و مباح جاننا بلاشبہ کفر ہے۔

کسی مسلمان کو برا نہ کہو

۴ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا رَجُلٍ قَالَ لِاَخِيْهِ كَافِرٌ فَقَدْ بَاءَ بِهَا اَحَدُهُمَا۔
(متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جس شخص نے اپنے مسلمان بھائی کو کافر کہا تو ان دونوں میں سے ایک پر کفر لوٹ گیا یعنی یا تو کہنے والا خود کافر ہو گیا یا وہ شخص کہ جس کو اس نے کافر کہا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ایک شخص نے جو خود مسلمان ہے کسی دوسرے مسلمان کو کافر کہا تو اس کی دو ہی صورتیں ہوں گی ایک تو یہ کہ کہنے والے نے سچ کہا ہو، ظاہر ہے کہ اس صورت میں کلمہ کفر کا مستحق وہی شخص ہو گا جس کو کافر کہا گیا ہے اور جو حقیقۃً کافر ہے، دوسرے یہ کہ کہنے والے نے جھوٹ کہا ہو یعنی اس نے جس شخص کو کافر کہا ہے وہ حقیقت میں مسلمان ہے اور اس طرف کفر کی نسبت سراسر جھوٹ ہے اس صورت میں کہا جائے گا کہ کہنے والا خود کافر ہو گیا۔ تو اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے ایمان کو کفر سمجھا اور دین اسلام کو باطل جانا۔

اس حدیث کے سلسلے میں امام نوویؒ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ مذکورہ حدیث کو بعض علماء نے مشکلات میں شمار کیا ہے کیونکہ اس ارشاد گرامی ﷺ کا جو بظاہر مفہوم ہے۔ اس کو حقیقی مراد قرار نہیں دیا جا سکتا بایں وجہ کہ اہل حق کا مسلک یہ ہے کہ کوئی مسلمان خواہ کتنا ہی بڑا گناہ کیوں نہ کرے جیسے قتل اور زنا وغیرہ اور خواہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کو کافر کہنے کا ہی مرتکب کیوں نہ ہو بشرطیکہ وہ دین اسلام کے باطل ہونے کا عقیدہ نہ رکھے تو اس کی طرف کفر کی نسبت نہ کی جائے (جب کہ مذکورہ حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ثابت

کرتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو کافر کہے اور حقیقت میں کافر نہ ہو تو کہنے والا خود کافر ہو جائے گا)۔ چنانچہ اسی وجہ سے اس ارشاد گرامی ﷺ کی مختلف تاویلیں کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا محمول وہ شخص ہے جو نہ صرف یہ کہ کسی مسلمان کو کافر کہے۔ بلکہ کسی مسلمان کی طرف کفر کی نسبت کرنے کو حلال و جائز بھی سمجھے اس صورت میں "باء بہا" کے معنی یہ ہونگے کہ کفر خود اس شخص کی طرف تکفیر کی معصیت لوٹتی ہے یعنی جو شخص کسی مسلمان کو کافر کہے گا تو اس کا یہ کہنا اس مسلمان کو تو کوئی نقصان پہنچائے گا نہیں البتہ مسلمان کو کافر کہنے کے گناہ میں خود مبتلا ہو گا اور تیسرے یہ کہ اس ارشاد گرامی ﷺ کا محمول خوارج ہیں جو مؤمنوں کو کافر کہتے ہیں لیکن یہ تیسری تاویل بہت ضعیف ہے کیونکہ اس تاویل کا مطلب یہ ہو گا کہ خوارج کو کافر قرار دیا جائے جب کہ اکثر علماء امت کے نزدیک زیادہ صحیح اور قابل قبول قول یہ ہے کہ خوارج فرقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ گمراہ بیشک ہیں جیسا کہ اہل بدعت، مگر ان کو کافر نہیں کہنا چاہئے۔ اگرچہ ملا علیؒ قاری نے وضاحت کی ہے کہ اس تاویل کو ان کے حق میں ضعیف نہیں کہا جائے گا۔ جو نہ صرف اہل سنت والجماعت بلکہ اکثر اونچے درجہ کے صحابہ کرامؓ تک کے بارے میں نعوذ باللہ کفر کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

کسی مسلمان کی طرف فسق کی نسبت نہ کرو

۵ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَرْمِیْ رَجُلٌ رَجُلًا بِالْفُسُوْقِ وَلَا یَرْمِیْہِ بِالْکُفْرِ اِلَّا ارْتَدَّتْ عَلَیْہِ اِنْ لَّمْ یَکُنْ صَاحِبُہٗ کَذٰلِکَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ کوئی شخص کسی آدمی کو فاسق نہ کہے اور نہ اس پر کفر کی تہمت لگائے کیونکہ اگر وہ آدمی فسق یا کفر کا حامل نہیں ہے تو اس کا کہا ہوا اسی طرف لوٹ جائے گا۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کو نہ تو فاسق کہو اور نہ اس کی طرف کفر کی نسبت کرو۔ کیونکہ اگر کسی شخص نے کسی ایسے مسلمان کو فاسق کہا جو حقیقت میں فاسق نہیں تو وہ کہنے والا خود فاسق ہو گا اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی ایسے شخص کو کافر کہا جو حقیقت میں کافر نہیں ہے بلکہ مؤمن ہے تو وہ کہنے والا خود کافر ہو جائے گا جیسا کہ پچھلی حدیث کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔

کسی شخص کو دشمن خدا نہ کہو

۶ وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ دَعَا رَجُلًا بِالْکُفْرِ اَوْ قَالَ عَدُوَّ اللّٰہِ وَلَیْسَ کَذٰلِکَ اِلَّا حَارَ عَلَیْہِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی کو کافر کہہ کر پکارے یا کسی کو خدا کا دشمن کہے اور وہ واقعۃً ایسا نہ ہو تو اس کا کہا ہوا خود اس پر لوٹ پڑتا ہے یعنی کہنے والا خود کافر یا خدا کا دشمن ہو جاتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

آپس کی گالم گلوچ کا سارا گناہ ابتداء کرنے والے پر ہوتا ہے

۷ وَعَنْ اَنَسٍ وَاَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُسْتَبَّانِ مَا قَالَا فَعَلَی الْبَادِیْ مَالَمْ یَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اگر دو شخص آپس میں گالم گلوچ کریں تو ان کی ساری گالم گلوچ کا گناہ اس شخص پر ہو گا جس نے پہل کی ہے جب تک کہ مظلوم تجاوز نہ کرے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر دو شخص آپس میں گالم گلوچ کرنے لگیں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگیں اور ایک دوسرے کے حق میں

بد کلامی و سخت گوئی کریں تو اس ساری گالم گلوچ اور برا بھلا کہنے کا گناہ ان دونوں میں سے اس شخص پر ہوگا جس نے گالم گلوچ کی ابتداء کی ہوگی یعنی اس کو اپنی گالم گلوچ کا گناہ تو ہوگا ہی دوسرے شخص کی گالم گلوچ کا گناہ بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا کیونکہ اس نے گالم گلوچ کی ابتداء کر کے گویا دوسرے شخص پر ظلم کیا ہے اور اس اعتبار سے وہ ظالم کہلائے گا اور دوسرا شخص مظلوم لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ وہ دوسرا شخص یعنی مظلوم جواب دینے میں زیادتی نہ کرے، اگر مظلوم حد سے تجاوز کر گیا بایں طور کہ اس کی گالم گلوچ ابتدا کرنے والے کی گالم گلوچ سے بڑھ گئی یا ابتداء کرنے والے نے جو ایذاء پہنچائی تھی اس کے جواب میں دوسرے شخص نے اس سے بھی زیادہ ایذا پہنچادی تو اس صورت میں ابتداء کرنے والے کی بہ نسبت اس پر زیادہ گناہ ہوگا بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ دوسرا شخص بھی اس تعدی اور زیادتی کی وجہ سے گنہ گار ہوگا۔

کسی پر لعن طعن کرنا نامناسب بات ہے

⑧ وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَایَنْبَغِیْ لِصِدِّیْقٍ یَکُوْنَ لَعَّانًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ صدیق کے لئے یہ جائز مناسب نہیں ہے کہ بہت زیادہ لعنت کرنے والا ہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: "صدیق" مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ سچا۔ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ صدیق اس شخص کو کہتے ہیں جس کے قول و فعل کے درمیان کوئی تضاد نہ ہو بلکہ پوری یکسانیت و مطابقت ہو۔ صوفیاء کے ہاں صدیقیت ایک مقام ہے جس کا درجہ مقام نبوت کے بعد سب سے اعلی ہے جیسا کہ قرآن کریم کی آیت کریمہ فاولٓئک الذین انعم اللّٰہ علیھم من النبین والصدیقین والشھدآء والصلحین سے مفہوم ہوتا ہے۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص صدق و راستی کے وصف سے مزین ہو اور ایسے اونچے مقام پر پہنچ چکا ہو جو مقام نبوت کے بعد سب سے اعلی ہے اور اس اعتبار سے اس کے مرتبہ کو مرتبہ نبوت سے سب سے قریبی نسبت حاصل ہے تو اس کی شان یہ نہیں ہونی چاہئے۔ کہ وہ دوسروں پر لعنت کرتا رہے اور نہ مقام صدیقیت کا مقتضاء ہو سکتا ہے کیونکہ کسی کو لعنت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو رحمت خداوندی اور بارگاہ الوہیت سے محروم اور بعید قرار دیدیا جائے جب کہ تمام انبیاء کا مقصد ہی یہ رہا ہے کہ وہ مخلوق خدا کو رحمت خداوندی سے بہرہ یاب کریں۔ اور جو بارگاہ الوہیت سے دور ہو چکے ہیں ان کو قریب تر لائیں۔ اسی وجہ اہل سُنت والجماعت کا پسندیدہ شیوہ یہ ہے کہ لعن طعن کو ترک کیا جائے اور کسی بھی شخص کو لعنت نہ کی جائے اگرچہ وہ اس لعنت کا مستحق ہی کیوں نہ ہو کیونکہ جو شخص اپنے قول و فعل کے ذریعہ خدا کے نزدیک خود ملعون قرار دیا جا چکا ہے اس پر لعنت کرنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے لہٰذا کسی ایسے شخص پر لعنت کرنا اپنی زبان کو خواہ مخواہ آلودہ کرنا اس کی لعنت میں اپنا وقت صرف کرنا اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے اور یہ کہ اس پر لعن طعن کر کے گویا اپنی جماعت حقہ کے شیوہ و معمول کے برخلاف عمل کرنا ہے البتہ اس کافر پر لعنت کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے جس کے بارے میں مخبر صادق کی خبر یا اپنا علم و یقین یہ ہو کہ وہ کفر ہی کی حالت میں مرا ہے۔

واضح رہے کہ لعنت کی دو قسمیں ہیں کہ ایک تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ شخص کو بھلائی سے بالکل محروم اور رحمت خداوندی سے کلیۃً دور قرار دینا نیز اس کو اللہ تعالیٰ کے فضل لامتناہی سے مطلق ناامید کر دینا، ایسی لعنت صرف کافروں کے لئے مخصوص ہے دوسری قسم کی لعنت کا مطلوب یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کو رضائے حق اور قرب خداوندی کے مقام سے دور محروم قرار دیا جائے جو ترک اولی و احوط کا مرتکب ہو چنانچہ بعض اعمال و اوراد کو ترک کے سلسلے میں جو لعنت ملامت منقول ہے اور جو بعض صحابہؓ وغیرہ سے بھی نقل کی گئی ہے اس کا تعلق اسی دوسری قسم سے ہے۔

لفظ "لعان" مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ لعنت کرنے والا احدیث میں یہ لفظ صیغہ مبالغہ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ عام طور پر یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی اونچے سے اونچے درجہ کا مؤمن بھی تھوڑی بہت لعنت کرنے سے اجتناب کرتا ہو، چنانچہ ابن ملکؒ نے لکھا ہے کہ اس ارشاد گرامی ﷺ میں اس لفظ کا بصیغہ مبالغہ ذکر ہونا اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے لعنت کرنے کی جو برائی اس حدیث سے واضح ہوتی ہے کہ وہ اس شخص کے حق میں نہیں ہے جس سے کبھی کبھار یعنی ایک مرتبہ یا دو مرتبہ لعنت کا صدور ہو جائے۔

⑨ وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللَّعَّانِيْنَ لَا يَكُوْنُوْنَ شُهَدَاءَ وَلَا شُفَعَاءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو لوگ بہت زیادہ لعنت کیا کرتے ہیں وہ قیامت کے دن نہ گواہ بنائے جائیں گے اور نہ شفاعت کر سکیں گے۔" (مسلمؒ)

تشریح: قیامت کے دن امت محمدیہ کے لوگ پچھلی امتوں پر گواہ کی حیثیت سے پیش کئے جائیں گے چنانچہ وہ یہ گواہی دیں گے کہ ان کے رسولوں اور پیغمبروں نے اللہ تعالیٰ کے احکام ان تک پہنچائے تھے اور ان کو خدا کی طرف بلایا تھا مگر انہوں نے اپنے رسولوں اور پیغمبروں کی بات نہیں مانی اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔

"اور اسی طرح ہم نے تمہیں برگزیدہ امت بنایا تاکہ تم اور لوگوں پر گواہ ہو۔"

اسی گواہی کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن ایسے گواہ بننے کا اعزاز نہیں بخشا جائے گا جو دوسروں پر اتنی زیادہ لعنت کیا کرتے ہیں کہ لعنت کرنا گویا ان کی عادت بن جاتی ہے اسی طرح بہت زیادہ لعنت کرنے والے لوگ قیامت کے دن درجہ شفاعت سے بھی محروم کر دیئے جائیں گے یعنی اگر وہ چاہیں گے کہ دوسرے لوگوں کی شفاعت کریں تو وہ بھی نہیں کر سکیں گے۔

کسی کی طرف اخروی ہلاکت کی نسبت نہ کرو

⑩ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَالَ الرَّجُلُ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ اَهْلَكُهُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ لوگ ہلاک ہوئے یعنی جہنم کی آگ کے مستوجب ہو گئے تو اس طرح کہنے والا سب سے زیادہ ہلاک ہونے والا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اگر کوئی شخص کچھ لوگوں، کو ایسے عقائد و اعمال میں مبتلا دیکھے جو دین و شریعت کے خلاف ہوں تو ان کی اس حالت پر حسرت و افسوس کا ہونا اور غم خواری کے جذبات کا پیدا ہونا ایک فطری امر بھی ہے اور اخوت اسلامی کا تقاضا بھی اب اگر وہ شخص اسی حسرت و افسوس اور غم خواری کے جذبات کے تحت ان لوگوں کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ وہ لوگ تو ہلاک ہو گئے یعنی ان لوگوں نے ایسے عقائد و اعمال کو اختیار کر لیا ہے جو ان کو دوزخ کی آگ میں دھکیل کر رہیں گے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اس شخص کا یہ کہنا در اصل ان لوگوں کے تئیں ہمدردی و غم خواری کا مظہر ہو گا اور اس کا مطلب یہی سمجھا جائے گا کہ وہ شخص ان لوگوں کے برے احوال سے دل شکستہ ہے اور اس کا قلبی جذبہ یہ ہے کہ کاش وہ لوگ اس حالت میں مبتلا ہو کر اخروی ہلاکت و تباہی کے راستہ کو اختیار نہ کرتے اور جب وہ اس راہ پر پڑ گئے ہیں تو اے کاش اب بھی ان کو ہدایت نصیب ہو جائے اور وہ ابدی ہلاکت و تباہی کے خوف سے راہ راست پر لگ جائیں۔

لیکن اگر کوئی شخص ان جذبات ہمدردی و غم خواری کے برعکس محض عیب جوئی حقارت اور ان لوگوں کو رحمت خداوندی سے مایوس کرنے کے لئے اس طرح کے الفاظ زبان سے نکالے تو یہ سخت برا ہو گا اور اس طرح کہنے والا شخص خود سب سے زیادہ ہلاکت و تباہی میں

پڑے گا کیوں کہ اس کے ان الفاظ سے یہ سمجھا جائے گا کہ وہ اپنے نفس کی برائی اور اپنے اعمال کے غرور و تکبر میں مبتلا ہو گیا ہے دوسرے لوگوں کو چشم حقارت سے دیکھتا ہے اور ان کو حق تعالیٰ کی رحمت سے ناامید کرتا ہے یہ مطلب اس صورت میں ہو گا جب کہ لفظ اھلکم کاف کے پیش کے ساتھ یعنی بصیغہ تفضیل ہو اور اگر یہ لفظ کاف کے زبر کے ساتھ یعنی بصیغہ ماضی ہو جیسا کہ بعض روایتوں میں نقل کیا گیا ہے تو اس صورت میں ترجمہ یہ ہو گا کہ اس طرح کہنے والا ان کو ہلاک و برباد کر دیتا ہے اور مطلب یہ ہو گا کہ جب کوئی شخص اپنے مشاہدہ کے مطابق بدعملیوں میں مبتلا لوگوں کے بارے میں اپنی زبان سے یہ الفاظ نکالتا ہے کہ وہ لوگ تو ہلاک و برباد ہو گئے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ رحمت خداوندی سے مایوس ہو کر ترک طاعت و عبادت اور ارتکاب معصیت و گناہ میں اور زیادہ مشغول و منہمک ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح کے الفاظ ان گنہ گاروں کو شکستہ دل، ناامید اور بے شوق بنا دیتے ہیں جو اپنی بدعملیوں کی وجہ سے گویا دنیا ہی میں خدا کے قہر و جلال میں گرفتار ہوئے ہیں اسی لئے شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ جو لوگ بدعملیوں کی راہ اختیار کئے ہوئے ہوں اور معصیت کے اندھیروں نے جن کو گھیر رکھا ہو انہیں نہایت نرمی و ملائمت اور شفقت و محبت کے ساتھ تذکیر و نصیحت کی جانی چاہئے اور ان پر سختی و تشدد کرنا ان کے حق میں سخت گوئی و ترش روئی سے پیش آنا ان کے بارے میں دل شکستگی اور مایوسی کے الفاظ اپنی زبان سے نکالنا اور ان پر سختی و تشدد کرنا ان کے حق میں سخت برا بن جاتا ہے اور وہ ضد و ہٹ دھرمی میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے راہ راست پر آنے کے بجائے اور زیادہ گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں لہٰذا جو شخص ان کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کرتا ہے اور انہیں ہلاکت و بربادی کی خبر دیتا ہے وہ گویا انہیں ہلاکت و بربادی میں ڈالنے کا خود موجب بنتا ہے اس اعتبار سے کہا جائے گا کہ آنحضرت ﷺ کا مذکورہ ارشاد گرامی ﷺ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ گنہ گار لوگوں کو بھی مغفرت کی بشارت دینا چاہئے۔ ان کے قلب و ذہن کو دین و ایمان پر پختہ کرنا چاہئے۔ اور انہیں رحمت خداوندی کا امیدوار طلبگار بنانا چاہئے۔

منہ دیکھی بات کرنے والوں کی مذمت

(۱۱) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَجِدُوْنَ شَرَّ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ذَالْوَجْهَيْنِ الَّذِيْ يَاْتِيْ هٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ وَهٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ قیامت کے دن سب سے بدتر شخص وہ ہو گا جو فتنہ انگیزی کی خاطر دو منہ رکھتا ہے یعنی منافق کی خاصیت و صفت رکھتا ہے کہ وہ ایک جماعت کے پاس آتا ہے تو کچھ کہتا ہے اور دوسری جماعت کے پاس آتا ہے تو کچھ کہتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی ﷺ میں ان لوگوں کے لئے سخت وعید و تنبیہ ہے جو منافقوں کی طرح دورویہ یعنی دو منہ والے ہوتے ہیں کہ ہر فریق کو خوش رکھنے کی خاطر کبھی صحیح اور حق بات نہیں کہتے بلکہ منہ دیکھی بات کرتے ہیں وہ جس جماعت اور جس فریق کے پاس اس کی مرضی اور خواہش کے مطابق اپنی زبان کھولتے ہیں زید کے پاس جاتے ہیں تو اس کی سی کہتے ہیں اور بکر کے پاس جاتے ہیں تو اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔

چغل خور کے بارے میں وعید

(۱۲) وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةِ مُسْلِمٍ نَمَّامٌ۔

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ۔ چغل خور جنت میں داخل نہیں ہو گا (یعنی وہ نجات

پائے ہوئے لوگوں کے ساتھ ابتداء میں جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور مسلمؒ کی ایک روایت میں (قتات کے بجائے) نمام کا لفظ ہے۔"

تشریح: قتات اور نمام کے ایک ہی معنی ہیں یعنی چغل خور اس شخص کو کہتے ہیں جو لگائی بجھائی کرتا ہے اور ادھر کی بات ادھر اور ادھر کی بات ادھر کرکے لوگوں کے درمیان فتنہ و فساد کے بیج بوتا ہے۔

سچ بولنے اور جھوٹ سے بچنے کی تاکید

(۱۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَاِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِىْ اِلَى الْبِرِّ وَاِنَّ الْبِرَّ يَهْدِىْ اِلَى الْجَنَّةِ وَمَايَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا وَاِيَّاكُمْ وَالْكِذْبَ فَاِنَّ الْكِذْبَ يَهْدِىْ اِلَى الْفُجُوْرِ وَاِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِىْ اِلَى النَّارِ وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكِذْبَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِىْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ اِنَّ الصِّدْقَ بِرٌّ وَاِنَّ الْبِرَّ يَهْدِىْ اِلَى الْجَنَّةِ وَاِنَّ الْكِذْبَ فُجُوْرٌ وَاِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِىْ اِلَى النَّارِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا سچ بولنے کو اپنے اوپر لازم کرلو کیونکہ ہمیشہ اور پابندی کے ساتھ سچ بولنا، نیکو کاری کی طرف لیجاتا ہے یعنی سچ بولنے کی خاصیت یہ ہے کہ نیکی کرنے کی توفیق ہوتی ہے اور نیکو کاری نیکو کار کو جنت کے اعلیٰ درجات تک پہنچاتی ہے اور یاد رکھو! جو شخص ہمیشہ سچ بولتا ہے اور ہمیشہ سچ بولنے کی سعی کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیق، لکھا جاتا ہے! نیز تم اپنے آپ کو جھوٹ بولنے سے باز رکھو کیونکہ جھوٹ بولنا فسق و فجور کی طرف لے جاتا ہے یعنی جھوٹ بولنے کی خاصیت یہ ہے کہ برائیوں اور بدعملیوں کے ارتکاب کی طرف رغبت ہوتی ہے اور فسق و فجور فاسق و فاجر کو دوزخ کی آگ میں دھکیلتا ہے اور یاد رکھو! جو شخص بہت جھوٹ بولتا ہے اور زیادہ سے زیادہ جھوٹ بولنے کی سعی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں کذاب یعنی بڑا جھوٹا لکھا جاتا ہے۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ سچ بولنا نیکی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور جھوٹ بولنا فسق و فجور ہے اور فسق و فجور، دوزخ کی آگ میں دھکیلتا ہے۔"

تشریح: "وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیق لکھا جاتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اس کو وصف صدیقیت کا حامل اور مقام صدیقیت پر فائز قرار دیا جاتا ہے اور اس اونچے درجے کے وصف و مقام کے اجر و ثواب کا مستحق گردانا جاتا ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ملاء اعلیٰ کے پاس جس کتاب میں تمام بندوں کے اعمال لکھے ہوئے ہیں اس میں مذکورہ شخص کا نام صدیق لکھا جاتا ہے۔ اور یا یہ کہ دنیا میں لوگ ایسے شخص کو اپنی کتابوں اور قلم پاروں میں صدیق کے نام سے لکھتے اور یاد کرتے ہیں۔ اس صورت میں اس ارشاد کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں میں انتہائی معزز و مکرم ظاہر کیا جاتا ہے لوگوں کے دلوں پر اس شخص کا لقب صدیق القا کیا جاتا ہے اور ان کی زبانوں پر اس کے اس لقب و صفت کو جاری کردیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کو سچا و صادق سمجھتے ہیں اور اس کی سچائی و صداقت میں رطب اللسان رہتے ہیں، اس مفہوم کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا "جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور نیک اعمال کئے اللہ تعالیٰ ان کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈالے گا"۔

"اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نزدیک کذاب لکھا جاتا ہے" کا مطلب بھی یا تو یہ ہے کہ جھوٹ بولنے والے شخص کے بارے میں یہ فیصلہ دیا جاتا ہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور اس کے لئے وہ سزا مقرر کردی جاتی ہے جو جھوٹوں کے لئے مخصوص ہے یا یہ کہ اس شخص کے بارے میں لوگوں کی نظروں اور دلوں میں یہ بات ظاہر و راسخ کردی جاتی ہے کہ یہ شخص انتہائی ناقابل اعتبار ہے اس طرح گویا اس کو جھوٹا مشہور

کر دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص لوگوں کی نظروں سے گر جاتا ہے اور ہر شخص اس سے بغض و نفرت کرنے لگتا ہے۔

دروغ مصلحت آمیز جھوٹ کے زمرہ میں نہیں آتا

(۱۴) وَعَنْ اُمِّ کَلْثُوْمٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْسَ الْکَذَّابُ الَّذِیْ یُصْلِحُ بَیْنَ النَّاسِ وَیَقُوْلُ خَیْرًا اَوْیَنْمِیْ خَیْرًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ام کلثوم کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا وہ شخص جھوٹا نہیں ہے، جو لوگوں کے درمیان صلح و صفائی کراتا ہے بھلائی کی بات کہتا ہے اور (ایک دوسرے سے) اچھی باتیں پہنچاتا ہے (اگرچہ وہ صلح و صفائی کرانے اور اس بات کے کہنے اور پہنچانے میں جھوٹ سے کام لے)۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے باہمی نزاع اور فتنہ و فساد کو ختم کرانے کے لئے اگر کوئی شخص ایسی بات کہے جو واقعہ کے اعتبار سے صحیح نہ ہو بلکہ جھوٹ ہو تو اس شخص کو جھوٹا نہیں کہیں گے اور اس پر جھوٹ کا گناہ نہیں ہوگا لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ بات ایسی ہو جو خیر و بھلائی ہی پر مشتمل ہو نہ کہ کسی برائی جیسے شرک و فسق وغیرہ کی حامل ہو مثلاً دو مسلمان زید اور بکر اگر آپس میں کوئی مخاصمت رکھتے ہوں یا ان دونوں کے درمیان کوئی فتنہ و فساد راہ پا گیا ہو، تو اس صورت میں اگر کوئی تیسرا شخص یہ چاہے کہ ان دونوں کی باہمی مخاصمت ختم ہو جائے اور ان کے درمیان صلح و صفائی ہو جائے اور اس مقصد کے لئے وہ دونوں میں سے ہر ایک کے پاس جا کر یوں کہے کہ اس دوسرے نے تمہیں سلام کہا ہے وہ تمہاری تعریف کر رہا تھا اور تمہارے بارے میں کہہ رہا تھا کہ میں اس کو اپنا دوست سمجھتا ہوں اور حقیقت میں نہ تو اس نے سلام کہا ہو نہ اس کی تعریف کی ہو اور نہ یہ کہا کہ میں اس کو دوست رکھتا ہوں۔

جھوٹی اور مبالغہ آمیز تعریف کرنے والے کی مذمت

(۱۵) وَعَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْاَسْوَدِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَارَاَیْتُمُ الْمَدَّاحِیْنَ فَاحْثُوْافِیْ وُجُوْھِھِمُ التُّرَابَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت مقداد ابن اسود کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جب تم تعریف کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے منہ میں خاک ڈال دو۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے منہ پر تمہاری تعریف کرے اور وہ تعریف خواہ زبانی ہو یا قصیدہ و نثر کی صورت میں ہو نیز اس تعریف کرنے سے اس کا مقصد تم سے کچھ مالی منفعت حاصل کرنا یا اپنا کوئی مطلب نکالنا ہو تو تم اس کے منہ پر مٹی ڈال دو یعنی اس کو محروم رکھو کہ نہ اس کو کچھ دو اور نہ اس کا مطلب پورا کر دو یا "منہ میں خاک ڈالنے" سے یہ مراد ہے کہ اس کو کچھ معمولی طور پر دے دو کہ کسی کو بہت تھوڑا سا اور حقارت کے ساتھ دینا اس کے منہ میں خاک ڈالنے کے مشابہ ہے اور یہ معمولی طور پر دینا بھی اس مصلحت کے پیش نظر ہو کہ مبادا کچھ بھی نہ ملنے کی صورت میں وہ ہجو کرنے لگے۔

بعض علماء نے اس ارشاد گرامی کو اس کے ظاہری مفہوم پر محمول کیا ہے چنانچہ اس حدیث کے راوی حضرت مقداد ہی کے بارے میں منقول ہے کہ ایک شخص امیرالمؤمنین حضرت عثمان کے سامنے ان کی تعریف کرنے لگا تو انہوں نے ایک مٹھی خاک لے کر اس کے منہ پر ڈال دی علماء نے لکھا ہے کہ تعریف کرنے والوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرنے کا حکم دینا دراصل ان تعریف کرنے والوں کو سختی کے ساتھ متنبہ کرنا ہے کیوں کہ کسی کے منہ پر اس کی تعریف کرنے والا اپنے ممدوح کو مغرور متکبر بنا دیتا ہے۔

خطابی نے یہ لکھا کہ مداحین یعنی تعریف کرنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے خوشامد و چاپلوسی اور بیجا تعریف و مدح کرنے کو

اپنی عادت بنالی ہو، چنانچہ ایسے لوگ تعریف و مدح کرنے میں نہ حق و باطل کی تمیز کرتے ہیں اور نہ مستحق و غیر مستحق کا لحاظ رکھتے ہیں نیز انہوں نے اس چیز کو حصول منفعت اور معاش کا ذریعہ بنا رکھا ہے کہ جس شخص سے انہیں کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے یا جس شخص سے مطلب براری کی امید ہوتی ہے وہ اس کے منہ پر نہایت مبالغہ آمیزی کے ساتھ اس کی تعریف و مدح کرتے ہیں لہٰذا جو شخص کسی دنیاوی غرض و لالچ کے بغیر کسی قابل تعریف آدمی کی واقعی مدح و توصیف کرے یا کسی شخص کے کسی اچھے فعل اور پسندیدہ کام پر اس نقطہ نظر سے تعریف کریں کہ اس شخص کو مزید اچھے افعال اور بھلائی کے کام کرنے کا شوق پیدا ہو نیز دوسرے لوگوں کو بھی اس کی اتباع میں نیک اعمال اور بھلائی کے کام کرنے کی رغبت ہو تو ایسے شخص پر حدیث میں مذکورہ لفظ "مداح" کا اطلاق نہیں ہوگا یعنی اس کو قابل مذمت تعریف کرنے والا نہیں کہا جائے گا۔

(۱۶) وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ اَثْنٰی رَجُلٌ عَلٰی رَجُلٍ عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ وَیْلَکَ قَطَعْتَ عُنُقَ اَخِیْکَ ثَلَاثًا مَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَادِحًا لَا مُحَالَۃَ فَلْیَقُلْ اَحْسَبُ فُلَانًا وَاللّٰہُ حَسِیْبُہٗ اِنْ کَانَ یُرٰی اَنَّہٗ کَذٰلِکَ وَلَا یُزَکِّیْ عَلَی اللّٰہِ اَحَدًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کے سامنے ایک شخص نے ایک آدمی کی (مبالغہ آمیزی کے ساتھ) تعریف کرنی شروع کی (اور وہ شخص بھی کہ جس کی وہ تعریف کر رہا تھا وہاں موجود تھا) چنانچہ آنحضرت ﷺ نے تعریف کرنے والے سے فرمایا کہ افسوس ہے تم پر تم نے تو اپنے بھائی کی گردن کاٹ دی آپ نے یہ الفاظ تین بار دہرائے اور پھر یہ فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی شخص کسی کی تعریف کرنا ضروری سمجھے تو اس کو چاہئے کہ مثلاً یوں کہے کہ فلاں شخص کے بارے یہ گمان رکھتا ہوں کہ وہ ایک نیک آدمی ہے جب کہ اس شخص کی حقیقی حالت سے اللہ تعالیٰ خوب واقف ہے اور وہی ان کے اعمال کا حساب لینے والا ہے نیز اگر تعریف کرنے والا یہ گمان رکھتا ہے کہ اس نے جس شخص کی تعریف کی ہے وہ واقعۃً ایسا ہی ہے تو اس صورت میں بھی وہ خدا کی طرف سے کسی شخص پر جزم و یقین کے ساتھ حکم نہ لگائے۔"

(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: کسی کی گردن کاٹنا، اگرچہ اس کو ذبح کرنے اور اس کی جسمانی ہلاکت کے ہم معنی ہے لیکن یہاں "گردن کاٹنے" سے مراد روحانی ہلاکت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی کی تعریف کرتا ہے تو وہ (ممدوح اپنی تعریف سنکر غرور و تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے لہٰذا جس طرح کسی کی گردن کاٹ ڈالنا اس کو دنیاوی طور پر ہلاک کر دینے کے مرادف اسی طرح منہ پر کسی کی تعریف کرنا گویا اس کو دینی اور اخروی طور پر ہلاکت میں ڈال دینا ہے جب کہ یہ تعریف بسا اوقات دنیاوی طور پر بھی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے جیسے کوئی شخص اپنی تعریف سن کر اتنا زیادہ مغرور ہو جائے کہ کسی کا ناحق خون کر ڈالے اور پھر عدالت کی طرف سے سزائے موت کا مستوجب ہو کر خود اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

"اگر تم میں کوئی شخص کسی کی تعریف کرنا ضروری سمجھے"۔ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کسی شخص کے اندر کوئی ایسا وصف دیکھو کہ جس کی وجہ سے وہ قابل تعریف ہو، مثلاً کوئی شخص بہت زیادہ نیک و صالح ہو یا کوئی شخص بہت زیادہ خلیق ہو اور تم اس کی تعریف کرنا ہی چاہتے ہو تو اس صورت میں بھی یہ ضروری ہے کہ تم بس اپنے گمان کی حد تک اس کی تعریف کرو اس کے بارے میں جزم و یقین کے ساتھ فیصلہ نہ کرو بلکہ یوں کہو کہ میں فلاں شخص کو ایسا سمجھتا ہوں یا فلاں شخص کے بارے میں میرا یہ گمان ہے اس جملہ کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی شخص کا حقیقی حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، جس شخص کو بظاہر نیک و اچھا سمجھا جا رہا ہے ہو سکتا ہے کہ اس کے باطنی احوال اس درجہ کے نہ ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھا ہو، لہٰذا جو شخص قابل تعریف ہو اس کی تعریف میں احتیاط کی راہ اختیار کرنی چاہئے اس کے بارے بالکل آخری فیصلہ نہ کرنا چاہئے۔ کہ یہ شخص یقیناً اچھا و نیک اور خدا کے نزدیک پسندیدہ ہے ہاں ان لوگوں کا معاملہ دوسرا ہے جن کو احادیث میں صراحت کے ساتھ قابل تعریف قرار دیا گیا ہے اور جن کے بارے میں ثابت ہو چکا ہے کہ وہ خدا کے نزدیک یقیناً پسندیدہ ہیں جیسے عشرہ

مبشرہ وغیرہ ان لوگوں کے علاوہ اور کسی شخص کے بارے میں اس جزم و یقین کا اظہار نہ کیا جائے کہ فلاں شخص خدا کے نزدیک اچھا ہے۔

تعریف کی قسمیں

علماء نے کسی شخص کی تعریف کرنے کی تین قسمیں بیان کی ہیں ایک تو یہ کہ کسی کے منہ پر اس کی تعریف کی جائے یہ قسم وہ ہے جس کی ممانعت منقول ہے دوسرے یہ کہ کسی کی غائبانہ تعریف کی جائے لیکن خواہش یہ ہو کہ اس کو اس تعریف کی خبر ہو جائے یہ قسم بھی ایسی ہے جس سے منع کیا گیا ہے اور تیسرے یہ کہ کسی کی غائبانہ تعریف کی جائے اور اس کی مطلق پرواہ ہو کہ اس کو تعریف کی خبر پہنچے گی یا نہیں، نیز تعریف بھی ایسی کی جائے جس کا وہ واقعۃً مستحق ہے یہ قسم ایسی ہے جس کی اجازت دی گئی ہے اور کسی شخص کی اس طرح کی تعریف میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

غیبت کے معنی اور اس کی تفصیل

⑰ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا الْغِیْبَةُ قَالُوْا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ ذِكْرُكَ اَخَاكَ بِمَا یَكْرَهُ قِیْلَ اَفَرَاَیْتَ اِنْ كَانَ فِیْ اَخِیْ مَا اَقُوْلُ قَالَ اِنْ كَانَ فِیْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهٗ وَاِنْ لَمْ یَكُنْ فِیْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدْ بَهَتَّهٗ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِیْ رِوَایَةٍ اِذَا قُلْتَ لِاَخِیْكَ مَا فِیْهِ فَقَدِ اغْتَبْتَهٗ وَاِذَا قُلْتَ مَا لَیْسَ فِیْهِ فَقَدْ بَهَتَّهٗ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے (صحابہؓ سے) فرمایا۔ کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) زیادہ جانتے ہیں۔ آنحضرت نے فرمایا۔ غیبت یہ ہے کہ تم اپنے مسلمان بھائی کا ذکر اس طرح کرو کہ جس کو وہ (اگر سنے تو) ناپسند کرے۔ بعض صحابہؓ نے (یہ سن) کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! یہ بتائیے کہ اگر میرے اس بھائی میں کہ (جس کا میں نے برائی کے ساتھ ذکر کیا ہے) وہ عیب ہو جو میں نے بیان کیا ہے تو کیا جب بھی غیبت ہوگی یعنی میں نے ایک شخص کے بارے میں اس کے پیٹھ پیچھے یہ ذکر کیا کہ اس میں فلاں برائی ہے جب کہ اس میں واقعۃً وہ برائی ہے اور میں نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل سچ ہے اور ظاہر ہے کہ اگر وہ شخص اپنے بارے میں میرے اس طرح ذکر کرنے کو سنے تو یقیناً ناخوش ہوگا تو کیا میرا اس کی طرف کسی برائی کو منسوب کرنا جو درحقیقت اس میں ہے، غیبت کہلائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا تم نے اس کی جس برائی کا ذکر کیا ہے اگر وہ واقعی اس میں موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر اس میں وہ برائی موجود نہیں ہے جس کو تم نے ذکر کیا ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا یعنی یہی تو غیبت ہے کہ تم کسی کا کوئی عیب اس کے پیٹھ پیچھے بالکل سچ بیان کرو اور اگر تم اس کے عیب کو بیان کرنے میں سچے نہیں ہو کہ تم نے اس کی طرف جس عیب کی نسبت کی ہے وہ اس میں موجود نہیں ہے تو یہ افتراء اور بہتان ہے جو بذات خود ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ (مسلمؒ) اور مسلمؒ ہی کی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم اپنے کسی (مسلمان) بھائی کی وہ برائی بیان کی جو واقعی اس میں موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر تم نے اس کی طرف ایسی برائی کی نسبت کی جو اس میں موجود نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا!"

تشریح: غیبت یعنی پیٹھ پیچھے کسی کا کوئی عیب بیان کرنا نہ صرف ایک گناہ لوگوں میں زیادہ پھیلا ہوا ہے، ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جو اس برائی سے بچے ہوئے ہیں ورنہ عام طور پر ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں غیبت کرتا نظر آتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس بات میں کچھ تفصیل بیان کر دی جائے۔

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے، غیبت اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص کسی ایسے شخص کے بارے میں جو موجود نہ ہو اس طرح کا ذکر کرے جس سے اس کا کوئی عیب ظاہر ہو اور وہ اس عیب کے ذکر کئے جانے کو ناپسند کرے اور اس عیب کا تعلق خواہ اس کے بدن سے ہو یا عقل سے خواہ اس کے دین سے ہو یا دنیا سے، خواہ اس کے اخلاق و افعال سے ہو یا نفس سے خواہ اس کے مال و اسباب سے، ہو یا اولاد سے خواہ اس کے ماں باپ سے، ہو یا بیوی خادم وغیرہ سے خواہ اس کے لباس وغیرہ سے ہو یا رفتار و گفتار سے، خواہ اس کی ہیئت کذائی سے یا

نشست و برخاست سے، خواہ اس کے حرکات و سکنات سے ہو یا عادات و اطوار سے، خواہ اس کی کشادہ روئی سے ہو یا ترش روئی سے اور خواہ اس کی تند خوئی و سخت گوئی سے ہو یا نرم خوئی اور خاموشی سے اور یا ان چیزوں کے علاوہ کسی بھی ایسی چیز سے ہو جو اس سے متعلق ہو سکتی ہے نیز اس عیب کے ساتھ اس کا ذکر کرنا خواہ الفاظ کے ذریعہ ہو یا اشارہ و کنایہ اور رمز کے ذریعہ اور اشارہ و کنایہ بھی خواہ لفظ و بیان کے ذریعہ ہو یا ہاتھ، آنکھ، ابرو اور سر وغیرہ کے ذریعہ۔

اس سلسلہ میں یہ قاعدہ کلیہ بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ اگر کسی شخص کا کوئی عیب اس کی عدم موجودگی میں بیان کیا جائے جو دوسروں کی نظروں میں اپنے ایک مسلمان بھائی کی حیثیت و شخصیت کو گھٹاتا ہے تو یہ سخت غیبت ہے اور حرام ہے اور اگر کسی کے منہ پر اس کے کسی عیب کو اس طرح بیان کیا جائے جس سے اس کو ناگواری اور دل شکنی ہو تو یہ ایک طرح کی بے حیائی، سنگدلی اور ایذاء رسانی ہے کہ یہ اور بھی سخت گناہ ہے۔

غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ جس شخص کی غیبت کی گئی ہے غیبت کرنے والا اس سے معافی طلب کرے بشرطیکہ اس غیبت کی خبر اس تک پہنچی ہو اور اس سے معافی کی طلب کے وقت تفصیل بیان کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اجمالی طور پر اتنا کہنا کافی ہے کہ میں نے تمہاری غیبت کی ہے مجھے معاف کر دو اور اگر وہ غیبت اس تک نہ پہنچی ہو بایں طور کہ وہ مر گیا ہو یا کسی دور دراز جگہ پر ہو تو اس صورت میں استغفار کافی ہے یعنی اپنے اس گناہ پر خدا سے مغفرت و بخشش طلب کرے نیز احادیث میں یہ بھی منقول ہے کہ جس شخص کی غیبت کی گئی ہے اس کے حق میں استغفار کرنا غیبت کے کفارہ میں داخل ہے۔

غیبت کس صورت میں جائز ہے: علماء نے لکھا ہے کہ کسی کا عیب اس کے پیٹھ پیچھے بیان کرنا بعض صورتوں میں جائز ہے مثلاً کوئی شرعی صورت لاحق ہو، جیسے ظالم کا ظلم بیان کرنا، حدیث کے راویوں کا حال ظاہر کرنا، نکاح کے مشورہ کے وقت کسی کا نسب یا حال رویہ بیان کرنا، یا کوئی مسلمان کسی سے امانت و شرکت وغیرہ کا کوئی معاملہ کرنا چاہتا ہے تو اس مسلمان کو نقصان سے محفوظ رکھنے کے لئے اس شخص کا رویہ بیان کر دینا وغیرہ وغیرہ اسی طرح کوئی شخص ظاہری طور پر دیندارانہ زندگی کا حامل ہے یعنی نماز بھی پڑھتا ہے اور روزہ بھی رکھتا ہے۔ اور دیگر فرائض بھی پورے کرتا ہے مگر اس میں یہ عیب ہے کہ لوگوں کو اپنی زبان اور اپنے ہاتھ سے تکلیف و نقصان پہنچاتا ہے۔ تو لوگوں کے سامنے اس کے اس عیب کا ذکر کرنا غیبت نہیں کہلائے گا اور اگر اس شخص کے بارے میں ذمہ داران حکومت کو اطلاع دیدی جائے تاکہ وہ اس کو متنبہ کریں اور اس کی ایذاء رسانی سے لوگ محفوظ رہیں تو اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں! علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ بطریق اصلاح و اہتمام کسی شخص کے عیب کو ذکر کرنا کوئی مضائقہ نہیں رکھتا، ممانعت اس صورت میں ہے جب کہ اس کے عیب کو ذکر کرنے کا مقصد اس شخص کی برائی بیان کرنا اور اس کو نقصان و تکلیف پہنچانا ہو اسی طرح کسی شخص کی کسی شہر والوں یا کسی بستی کے لوگوں کی غیبت نہیں کہیں گے جب تک کہ وہ متعین طور پر کسی جماعت کا نام لیکر اس کی غیب نہ کرے۔

فحش گو بدترین شخص ہے

⑱ وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَجُلاً اِسْتَاْذَنَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ائْذَنُوْا لَهُ فَبِئْسَ اَخُو الْعَشِيْرَةِ فَلَمَّا جَلَسَ تَطَلَّقَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ وَجْهِهٖ وَانْبَسَطَ اِلَيْهِ فَلَمَّا انْطَلَقَ الرَّجُلُ قَالَتْ عَائِشَةُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قُلْتَ لَهُ كَذَا وَكَذَا ثُمَّ تَطَلَّقْتَ فِيْ وَجْهِهٖ وَانْبَسَطْتَ اِلَيْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَتٰى عَاهَدْتِنِيْ فَحَّاشًا اِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَنْ تَرَكَهُ النَّاسُ اِتِّقَاءَ شَرِّهٖ وَفِيْ رِوَايَةٍ اِتِّقَاءَ فُحْشِهٖ۔ (متفق علیہ)

"**اور** حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو آنے دو۔ وہ اپنی قوم کا برا آدمی ہے پھر وہ شخص جب آ کر بیٹھا تو آپ ﷺ نے اس سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کی

اور مسکرا مسکرا کر اس سے باتیں کرتے رہے جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) آپ (ﷺ) نے تو اس شخص کے بارے میں ایسا ایسا کہا تھا (یعنی یہ فرمایا تھا کہ وہ شخص اپنی قوم کا برا آدمی ہے) مگر آپ (ﷺ) نے اس سے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات فرمائی اور مسکرا مسکرا کر اس سے باتیں کرتے رہے آپ ﷺ نے فرمایا تم نے مجھ کو فحش گو (لچر باتیں کرنے والا) کب پایا۔ (یاد رکھو) قیامت کے دن خدا کے نزدیک درجہ کے اعتبار سے لوگوں میں سب سے بدترشخص وہ ہوگا جس کو لوگ اس کی برائی کے ڈر سے چھوڑدیں اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جس کی فحش گوئی سے (ڈر کر لوگ اس سے اجتناب کریں)۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: حدیث میں جس شخص کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے اس کا نام عیینہ ابن حصین تھا، یہ شخص اپنی سنگدلی بدخلقی اور سخت مزاجی کے اعتبار سے بہت ہی مشہور تھا اور اپنی قوم کا سردار بھی تھا اس کا شمار مولفۃ القلوب میں ہوتا تھا تاکہ اس کو اسلام پر قائم و ثابت قدم رکھا جاسکے اگرچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ ہی میں اس کے دین و بیان میں نقصان و اضمحلال کا اظہار ہونے لگا تھا مگر آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد دین و ایمان سے پوری طرح منحرف ہو کر مرتد ہو گیا اور حضرت ابوبکرؓ نے اس کو گرفتار کر لیا پھر اس نے دوبارہ ایمان قبول کیا اور اسلام کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوا بہرحال حضرت عائشہؓ نے اسی شخص کے بارے میں ذکر کیا کہ اس نے اپنے ابتدائی زمانہ اسلام میں جب ایک دن ہمارے دروازے پر پہنچ کر بارگاہ نبوت ﷺ میں حاضری کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے اس کو آنے کی اجازت دیدی اور حاضرین مجلس سے فرمایا کہ یہ شخص اپنی قوم کا ایک برا شخص ہے اس نے اسی موقع پر آنحضرت ﷺ کے سامنے اپنے اسلام کا اظہار کیا اگرچہ اس کا اسلام کامل اور اس کا ایمان راسخ نہیں تھا۔ اس سے واضح ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے اس کے بارے میں جو کچھ فرمایا وہ علامات نبوت میں سے ایک علامت اور آپ کا ایک معجزہ تھا کہ آپ ﷺ نے مذکورہ ارشاد کے ذریعہ اس کے بارے میں آئندہ پیش آنے والے واقعات اور اس کے باطن کے حقیقی احوال سے لوگوں کو پہلے ہی مطلع کر دیا اور آخرکار اس کی برائی و بدی بصورت ارتداد وغیرہ آشکارا ہوئی اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ آپ ﷺ نے اس کے حق میں مذمت کے جو الفاظ فرمائے یا یوں کہیے کہ اس کے جس عیب کو ظاہر فرمایا اس کا مقصد اس کے احوال کو منکشف کرنا تھا تاکہ لوگ اس کو جان لیں اور اس کی حقیقت حال سے باخبر رہ کر اس کے فریب اور اس کی وجہ سے کسی فتنہ و فساد میں مبتلا نہ ہو سکیں۔ لہٰذا اس کو غیبت نہیں کہا جائے گا۔

امام نوویؒ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے آنحضرت ﷺ سے کشادہ روئی اور خندہ پیشانی سے ملنا اور مسکرا مسکرا کر اس سے باتیں کرنا اس کی تالیف قلب کی خاطر تھا، اس سے معلوم ہوا کہ اس شخص کی مدارت کرنا جائز ہے جس کی فحش گوئی بدخلقی اور اس کے ضرر کا خوف ہو نیز اس سے یہ بھی ہوا کہ کسی فاسق کے عیب کو ظاہر کرنا یعنی اس کی غیبت کرنا جائز ہے اس موقع پر مدارات اور مداہنت کے درمیان فرق کو بھی سمجھ لینا چاہئے مدارات تو اس کو کہتے ہیں کہ کسی شخص کی دنیا یا دین اور یا دونوں کی اصلاح کے لئے اس پر دنیا کی چیز کو خرچ کیا جائے اور یہ مباح ہے بلکہ بسا اوقات اس کی حیثیت ایک اچھی چیز کی ہو جاتی ہے اس کے برخلاف مداہنت اس کو کہتے ہیں کہ کسی کی اصلاح و مدد کے لئے اس پر دین قربان کیا جائے، مداراب مدارات اور مداہنت کے درمیان اس فرق کو یاد رکھنا چاہئے کیوں کہ اکثر لوگ اس سے غافل ہیں اور اس فرق کو نہ جاننے کی وجہ سے گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

"تم نے مجھ کو فحش کب پایا" آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد دراصل حضرت عائشہؓ کے خیال کو صحیح کرنے کے لیے تھا جنہوں نے اپنے قول کے ذریعہ گویا اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ آپ ﷺ نے اس شخص کے بارے میں مختلف رویہ اختیار فرمایا جب وہ آپ ﷺ کے سامنے نہیں تھا تو آپ ﷺ نے اس کی مذمت فرمائی اور جب وہ آپ کے سامنے آیا تو اس کے ساتھ ملاطفت و یگانگت کا برتاؤ کیا جب آپ ﷺ نے اس کی عدم موجودگی میں اس کو برا کہا تو اس کی موجودگی میں بھی اس کو برا کہتے اور اس کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے جو کسی برے آدمی کے ساتھ کیا جاتا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ کی بات کے جواب پر واضح فرمایا اگر میں اس کے سامنے بھی وہی بات کہتا جو اس کی عدم موجودگی میں کہی تھی اور ایک نازیبا اور لچر بات ہوتی جب کہ تم نے مجھے کبھی بھی لچر باتیں کرتے ہوئے نہیں

دیکھا ہوگا۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے جو ارشاد فرمایا اس کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ واضح فرمایا کہ میں نے اس شخص کے منہ پر اس کو اس لئے برا نہیں کہا کہ میں سخت گو قرار نہ پاسکوں اور میرا شمار ان لوگوں میں نہ ہونے لگے جن کی سخت اور کڑوی باتوں کی وجہ سے لوگ ان سے ملنا جلنا چھوڑ دینے کو کہتے ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے الفاظ کے ذریعہ گویا ظاہر فرمایا کہ وہ شخص چونکہ بہت شریر اور بدباطن تھا لہٰذا میں نے اس کی بدباطنی کی وجہ سے اس سے اجتناب کیا اور اس کے منہ پر اس کو برا نہیں کہا اور حقیقت میں برا شخص وہی ہے جس کی برائی سے بچنے کے لئے لوگ اس سے اجتناب کریں اور اس کے عیوب سے بھی آگاہ نہ کریں۔

اپنے عیب کو ظاہر نہ کرو

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ اُمَّتِیْ مُعَافًا اِلاَّ الْمُجَاهِرُوْنَ وَاِنَّ مِنَ الْمَجَانَةِ اَنْ یَّعْمَلَ الرَّجُلُ بِاللَّیْلِ عَمَلاً ثُمَّ یُصْبِحَ وَقَدْ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَیَقُوْلُ یَافُلاَنُ عَمِلْتُ الْبَارِحَةَ كَذَا وَكَذَا وَقَدْ بَاتَ یَسْتُرُهٗ رَبُّهٗ وَیُصْبِحُ یَكْشِفُ سِتْرَ اللّٰهِ عَنْهُ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ وَذُكِرَ حَدِیْثُ اَبِیْ هُرَیْرَةَ مَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ فِیْ بَابِ ضِیَافَةِ۔

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا میری امت پوری عافیت میں ہے علاوہ ان لوگوں کے جو اپنے عیوب اور گناہ کو ظاہر کرتے ہیں یعنی میری امتؐ کے وہ سارے گناہگار جو ایمان کی حالت میں مریں اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب میں مبتلا نہیں ہونگے البتہ وہ لوگ یقیناً سخت ترین عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے جو نہ صرف گناہ کرتے ہیں۔ بلکہ اپنے گناہ کو دنیا والوں پر ظاہر بھی کرتے پھرتے ہیں، بلاشبہ یہ بات بڑی بے پروائی (بے حسی اور بے شرمی) کی ہے کہ کوئی شخص رات میں کوئی برا کام کرے اور پھر صبح ہونے پر جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس برے کام کو) چھپالیا تھا (یا اس کی بدعملی پر اسی رات میں اس کو عذاب میں مبتلا نہیں کیا یہاں تک کہ وہ دن ہونے تک ٹھیک ٹھاک رہا)۔ تو وہ لوگوں سے یہ کہتا پھرے کہ اے فلاں شخص میں نے آج رات میں ایسا ایسا (یعنی فلاں برا کام) کیا ہے حالانکہ اس کے پروردگار نے تورات میں اس کے گناہ کی پردہ پوشی کی تھی اور اس نے صبح ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کے پردہ کو چاک کردیا۔ (بخاریؒ و مسلمؒ) اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت من کان یؤمن باللہ باب الضیافۃ میں نقل کی جاچکی ہے۔"

تشریح: حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب میں لفظ "معافًا" کے معنی "سلامت و محفوظ رہنا" لکھے ہیں گویا ان کے نزدیک كُلُّ اُمَّتِیْ مُعَافًا اِلاَّ الْمَجَاهِرُوْنَ کا ترجمہ یوں ہوگا کہ میری امت کے تمام لوگ غیبت سے محفوظ و مامون ہیں یعنی شریعت خداوندی میں کسی مسلمان کی غیبت کرنے کو روا نہیں رکھا گیا ہے علاوہ ان لوگوں کے جو گناہ و معصیت کے کھلم کھلا ارتکاب کرتے ہیں ایک دوسرے شارح حدیث طیبیؒ نے بھی یہی معنی لکھے ہیں لیکن ملا علی قاریؒ نے یہ لکھا ہے کہ حدیث کا سیاق و سباق اور اس کا حقیقی مفہوم اس معنی پر دلالت نہیں کرتا چنانچہ ان کے نزدیک زیادہ مبنی بر حقیقت کے معنی وہی ہیں جو ترجمہ میں نقل کئے گئے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ نے حدیث کی وضاحت میں لکھا ہے کہ شریعت نے جس غیبت کو حرام قرار دیا ہے وہ اس شخص کی غیبت ہے جو پوشیدہ طور پر کوئی گناہ کرتا ہے اور اپنے عیب کو چھپاتا ہے لیکن جو لوگ کھلم کھلا اور ڈھٹائی کے ساتھ گناہ کرتے رہتے ہیں اور اپنے عیب کو خود ظاہر کرتے پھرتے ہیں کہ نہ تو خدا سے شرماتے ہیں اور نہ بندوں سے تو ان کی غیبت کرنا درست ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ فاسق معلن یعنی کھلم کھلا فسق و فجور کرنے والے کی غیبت کرنا جائز ہے نیز ظلم کرنے والے حاکم و سلطان اور مبتدع داعی کی اور داد خواہی و اظہار ظلم کے لئے غیبت کرنا بھی درست ہے اسی طرح اصلاح عیوب کی خاطر اور بقصد نصیحت کسی کی برائی کو بیان کرنا کسی کے گواہ و شاہد کے حالات کی چھان بین اور اس کے بارے میں صحیح اطلاعات بہم پہنچانے کی خاطر اس کے عیوب کو بیان کرنا اور اخبار و احادیث کے راویان کی حیثیت و شخصیت کو واضح کرنے کے لئے ان کے عیوب کو ظاہر کرنا غیبت میں داخل نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

جھوٹ اور مخاصمت کو ترک کرنے والے اور اخلاق واطوار کو اچھا بنانے والے کا ذکر

(۲۰) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَکَ الْکَذِبَ وَھُوَ بَاطِلٌ بُنِیَ لَہٗ فِیْ رَبَضِ الْجَنَّۃِ وَمَنْ تَرَکَ الْمِرَآءَ وَھُوَ مُحِقٌّ بُنِیَ لَہٗ فِیْ وَسَطِ الْجَنَّۃِ وَمَنْ حَسَّنَ خُلُقَہٗ بُنِیَ لَہٗ فِیْ اَعْلَاھَا۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ وَکَذَا فِیْ شَرْحِ السُّنَّۃِ وَفِی الْمَصَابِیْحِ قَالَ غَرِیْبٌ۔

"حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص جھوٹ بولنا چھوڑ دے اور وہ جھوٹ ناحق و ناروا ہو تو اس کے لئے جنت کے کنارے پر محل بنایا جاتا ہے اور جو شخص جھگڑے اور بحث و تکرار چھوڑ دے باوجودیکہ وہ حق پر ہو تو اس کے لئے جنت کی بلند جگہ پر محل بنایا جاتا ہے اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے اسی طرح کی روایت شرح السنۃ اور مصابیح میں منقول ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حدیث میں ان تین طرح کے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کو جنت میں نمایاں مقامات پر رکھا جائے گا ایک طرح کے لوگ وہ ہیں جو جھوٹ بولنا بالکل ترک کر دیتے ہیں اس موقع پر "ناحق" کی قید لگائی گئی ہے یعنی ایسا جھوٹ جو بالکل ناروا اور ناجائز ہوتا ہے اس قید کی وجہ یہ ہے کہ بعض صورتوں میں جھوٹ بولنا جائز ہو جاتا ہے۔ جیسے جنگ کی حالت میں بشرطیکہ اس جھوٹ کی وجہ سے کسی طرح کی عہد شکنی نہ ہوئی ہو، یا لوگوں کے درمیان صلح و صفائی کی خاطر اور کسی مسلمان کا ایسا مال بچانے کے لئے جو ناروا طور پر اپنے مالک کے ہاتھ سے جا رہا ہو اور یا دو بیویاں رکھنے کی صورت میں یعنی اگر کسی شخص کے ہاں دو بیویاں ہوں تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی ہر ایک بیوی کا دل خوش رکھنے کے لئے ہر ایک سے یوں کہے کہ میں تمہیں زیادہ چاہتا ہوں اور بعض حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک ہی بیوی ہونے کی صورت میں بھی اس وقت جھوٹ بولنا جائز ہوتا ہے جب وہ بیوی کا دل خوش کرنے کے لئے اس سے یوں کہے کہ میں تمہیں یہ دوں گا وہ دوں گا یہ بنا دوں گا وہ لا دوں گا۔

دوسری طرح کے وہ لوگ ہیں جو حق پر ہونے کے باوجود تواضع کسر نفسی اور شرافت نفس کی بنا پر مخاصمت و نزاع اور بحث و تکرار سے اپنا دامن بچاتے ہیں لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ اس مخاصمت و نزاع کا تعلق کسی دنیاوی معاملہ سے ہو اس میں سکوت و اجتناب کرنے سے دین میں کوئی خلل نہ پڑے، ہاں اگر کسی مخاصمت و نزاع کا تعلق کسی دینی معاملہ سے ہو تو اس سے اس وقت تک کنارہ کشی اختیار کرنا مناسب نہیں ہوگا جب تک وہ معاملہ نپٹ نہ جائے اور حق ظاہر نہ ہو جائے! حضرت امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کسی دینی معاملہ میں کوئی بحث و مناظرہ اس مقصد کے علاوہ اور کسی وجہ سے نہیں کیا کہ میں چاہتا تھا میں سچائی کو ثابت کرنے کی ذمہ داری سے عہدہ برا ہوں او، حق میرے مقابل کے ہاتھ پر ظاہر ہو۔

مذکورہ بالا سلسلے میں حضرت امام حجۃ الاسلامؒ نے لکھا ہے کہ مِرَاء یعنی جھگڑے اور بحث و تکرار کو اختیار کرنے کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے کلام اور اس کی بات پر اعتراض وارد کرے، بایں طور کہ یا تو اس کے الفاظ میں خلل و نقصان کو ظاہر کرے یا اس کے مضمون و معنی میں غلطی نکالنے اور یا متکلم کے مقصد و مراد کو نادرست قرار دے۔ اس کے برخلاف ترک مراد یعنی جھگڑے اور بحث و تکرار سے اجتناب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی دوسرے کے کلام و قول پر کوئی اعتراض وارد نہ کرے لہٰذا انسان کو چاہئے کہ جب وہ کوئی کلام و بات سنے تو اگر وہ حق ہو تو اس کی تصدیق کرے اور اگر وہ باطل و بے بنیاد اور اس کا تعلق کسی دینی معاملہ سے نہ ہو تو اس سے سکوت اختیار کرلے۔

تیسری طرح کے وہ لوگ ہیں جو اپنے اخلاق اچھا بناتے ہیں! واضح رہے کہ حسن اخلاق یوں تو تمام ہی اچھے اوصاف و کمالات کو اختیار

کرنے کا نام ہے لیکن معاشرہ میں عام طور پر حسن اخلاق کا اطلاق، خندہ پیشانی، کشادہ روئی، نرم گوئی اور حسن معاشرت پر ہوتا ہے۔

جنت اور دوزخ لے جانے والی چیزیں

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَتَدْرُوْنَ مَا اَكْثَرُ مَایُدْخِلُ النَّاسَ الْجَنَّةَ تَقْوَی اللّٰهِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ اَتَدْرُوْنَ مَا اَكْثَرُ مَایُدْخِلُ النَّاسَ النَّارَ الْاَجْوَفَانِ الفَمُ وَالْفَرْجُ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جانتے ہو، لوگوں کو عام طور پر کونسی چیز جنت میں داخل کرتی ہے؟ (یعنی کیا تمہیں معلوم ہے کہ جو چیزیں فائزین کے ساتھ لوگوں کے جنت میں داخل ہونے کا سبب ہیں ان میں سے کونسی چیز سب سے زیادہ سبب بنتی ہے؟) وہ تقویٰ یعنی اللہ سے ڈرنا اور حسن خلق ہے اور جانتے ہو، لوگوں کو عام طور پر کونسی چیز دوزخ میں لے جاتی ہے؟ وہ دو کھوکھلی چیزیں ہیں یعنی منہ اور شرمگاہ۔" (ترمذیؒ ابن ماجہ)

تشریح: تقویٰ کا سب سے ادنی درجہ یہ ہے کہ شرک سے اجتناب کیا جائے اور سب سے اعلی درجہ یہ ہے کہ دل میں اللہ کے علاوہ اور کسی بات کا خیال بھی نہ آنے دیا جائے۔

"حسن خلق" سے مراد مخلوق خدا کے ساتھ خوش خلقی اختیار کرنا ہے جس کا سب سے ادنی درجہ یہ ہے کہ کسی مخلوق کو کوئی تکلیف وایذاء نہ پہنچائی جائے اور سب سے اعلی درجہ یہ ہے کہ انسان اس شخص کے ساتھ بھی بھلائی کرے جس نے اس کے ساتھ برا سلوک کیا ہے۔ اس اعتبار سے حدیث کے پہلے جزء کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص میں تقویٰ اور حسن خلق یہ دونوں اوصاف پیدا ہو جائیں تو سمجھو کہ اس کی نجات کا دروازہ کھل گیا کیوں کہ تقویٰ یعنی پرہیزگاری سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور خوش خلقی سے مخلوق خدا کی خوشی ملتی ہے اور ظاہر ہے کہ جس انسان سے خدا بھی خوش ہو اور مخلوق خدا بھی تو اس کا بیڑا پار ہونے میں کیا شبہ رہ جائے گا۔

حضرت شیخ عبدالحقؒ نے لکھا ہے کہ خوش خلقی بھی تقویٰ میں داخل ہے لہٰذا حدیث میں تقویٰ کے بعد پھر خوش خلقی کا ذکر کرنا تخصیص بعد تعمیم کے طور پر ہے مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تقویٰ سے تو ظاہری اعمال کا حسن مراد ہے اور حسن خلق سے باطنی احوال کا حسن۔

طیبیؒ یہ کہتے ہیں کہ "تقویٰ" کے ذریعہ تو اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ خالق (اللہ تعالیٰ) کے ساتھ حسن معاملہ کرے بایں طور کہ ہر اس چیز سے اجتناب کرے جس سے اس نے منع کیا ہے اور ہر اس چیز پر عمل کرے جس کا حکم دیا ہے اور حسن خلق کے ذریعہ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مخلوق خدا کے ساتھ حسن معاملہ کرے یعنی خوش خلقی اختیار کرے۔

حدیث کے دوسرے جز میں اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ منہ اور شرمگاہ گناہ کے دو بڑے سرچشمے ہیں جن سے پیدا ہونے والی برائیوں میں پڑ کر انسان دوزخ میں جا گرتا ہے چنانچہ منہ کہ اس میں زبان بھی داخل ہے گمراہی اور بدعملیوں کا بڑا ذریعہ ہے انسان جو بھی حرام چیز کھاتا اور پیتا ہے اسی منہ کے ذریعہ نگلتا اور وہ جو بھی ممنوع و ناجائز بے ہودہ و فحش اور لاطائل کلام و گفتگو کرتا ہے زبان ہی اس کا ذریعہ بنتی ہے اسی طرح شرمگاہ، خواہ عورت کی ہو یا مرد کی شیطان کا سب سے دل فریب جال ہے جس میں وہ لوگوں کو پھنسا کر دوزخ میں گرا دیتا ہے چنانچہ انسان اسی شرمگاہ کے سبب جنسی جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے اور نفسانی شہوت میں مبتلا ہو کر اپنے خالق کی نافرمانی کرتا ہے۔

کلمہ خیر اور کلمہ شر کی اہمیت

(۲۲) وَعَنْ بِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الرَّجُلَ لَیَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنَ الْخَیْرِ مَایَعْلَمُ مَبْلَغَهَا یَكْتُبُ اللّٰهُ لَهٗ بِهَا رِضْوَانَهٗ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَاهُ وَاِنَّ الرَّجُلَ لَیَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنَ الشَّرِّ مَایَعْلَمُ مَبْلَغَهَا یَكْتُبُ اللّٰهُ بِهَا عَلَیْهِ سَخَطَهٗ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَاهُ۔ رَوَاهُ فِی شَرْحِ السُّنَّةِ وَرَوٰی مَالِكٌ وَالتِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ نَحْوَهٗ۔

"اور حضرت بلال ابن حارث کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ انسان کوئی کلمہ خیر (بھلائی کی کوئی بات) اپنی زبان سے نکالتا ہے درآنحالیکہ وہ اس کی قدر و منزلت سے آگاہ نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ اسی کلمہ خیر کے سبب سے اس کے حق میں اس دن تک کے لئے اپنی خوشنودی کو ثابت کر دیتا ہے جب کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے، اسی طرح کوئی انسان کلمہ شر (یعنی کوئی بری بات) اپنی زبان سے نکالتا ہے درآنحالیکہ وہ اس کی اہمیت سے واقف نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ اس کلمہ شر کے سبب سے اس کے حق میں اس دن تک کے لئے اپنی خفگی ثابت کر دیتا ہے جب کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے۔ (شرح السنۃ) اور امام مالکؒ، ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔"

تشریح: "اپنی خوشنودی کو ثابت کر دیتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ایسی باتوں کی توفیق دیتا ہے جو رضاء الٰہی کا موجب ہیں اس کو برزخ میں قبر کے عذاب سے محفوظ رکھتا ہے اس کی قبر کو کشادہ کر دیا جاتا ہے اور اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اس طرح سو رہو جیسے نوشہ سوتا ہے پھر وہ قیامت کے دن نیک بختی و سعادت کے ساتھ اٹھے گا کہ اس پر حق تعالیٰ کی رحمت کا سایہ ہوگا جنت میں داخل کیا جائے گا اور وہاں کی نعمتیں اس کا نصیب بنیں گی! اسی طرح جس شخص کے حق میں اللہ تعالیٰ اپنی خفگی قائم کر دے گا اس کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوگا، لہٰذا حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ اس دن تک کے لئے جب کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے تو اس توقیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا یا اس کی خفگی بس اسی دن تک محدود رہے گی۔ اس کے بعد منقطع ہو جائے گی! اس کی تائید قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے حق میں نازل فرمائی ہے کہ وَاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ظاہر ہے آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ابلیس لعین، اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مورد صرف قیامت کے دن تک ہی ہے بلکہ ہمیشہ ہمیشہ تک اللہ تعالیٰ کے لعنت میں گرفتار رہے گا اسی طرح حدیث میں مذکورہ لوگوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی یا خفگی کا تعلق موت کے دن کے بعد بھی ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔

سفیان ابن عیینہؒ کہتے ہیں کہ "کلمہ خیر" سے مراد ظالم سلطان و حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے۔ اس پر قیاس کر کے کہا جا سکتا ہے کہ "کلمہ شر" سے مراد کسی حاکم و سلطان کے سامنے کلمہ باطل یعنی بری بات کہنا ہے جو دین کو نقصان پہنچائے لیکن حدیث کا ظاہری مفہوم عمومیت پر دلالت کرتا ہے۔

جھوٹے لطیفوں کے ذریعہ لوگوں کو ہنسانے والے کے بارے میں وعید

(۲۳) وَعَنْ بَهْزِبْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيْلٌ لِمَنْ يُحَدِّثُ فَيَكْذِبُ لِيُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ وَيْلٌ لَّهٗ وَيْلٌ لَّهٗ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد و الدارمی)

"بہز ابن حکیمؒ اپنے والد (حکیم ابن معاویہ) سے اور وہ بہز کے دادا (حضرت معاویہ ابن عبدہؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "افسوس اس شخص پر جو بات کرے تو جھوٹ بولے تاکہ اس کے ذریعہ لوگوں کو ہنسائے، افسوس اس شخص پر افسوس اس شخص پر۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، دارمیؒ)

تشریح: "ویل" کے معنی ہیں عظیم ہلاکت اور ویل دوزخ کی ایک گہری وادی کا نام بھی ہے جس میں اگر پہاڑ ڈال دے جائیں تو گرمی سے گل جائیں اہل عرب کے کلام میں یہ لفظ اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو کسی برائی اور ناپسندیدہ امر کا ارتکاب کرتا ہے اور اس کے تئیں اظہار تاسف اور اس کو متنبہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا اپنے ارشاد کے آخر میں مذکورہ لفظ کو پھر استعمال کرنا اور مکرر استعمال کرنا گویا ایسے شخص کے حق میں زجر و وعید کو زیادہ شدت کے ساتھ بیان کرنا مقصود تھا جو بے بنیاد باتوں اور جھوٹے لطائف و قصص کے ذریعہ لوگوں کو ہنسائے۔

ویل لمن یحدث فیکذب میں لفظ یکذب (جھوٹ بولنے کی قید سے یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے ہم جلیسوں اور یار دوستوں کو خوش کرنے اور ان کو ہنسانے کے لئے ایسی بات کرے یا ایسے لطیفے اور قصے سنائے جو سچے ہوں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اگرچہ یہ ضروری ہے کہ اس کو اپنی عادت نہ بنائے اور نہ لطیفہ گوئی کو بطور پیشہ اختیار کرے کیونکہ خوش طبعی وبذلہ سنجی جو جھوٹ پر مبنی نہ ہو، باوجویکہ مشروع و مسنون ہے لیکن اس کو بھی کبھار ہی اختیار کیا جائے نہ کہ ہمیشگی کے ساتھ اس طرح ہر وقت لوگوں کو ہنسانے اور مسخرا پن کرنے ہی میں نہ لگا رہے اور نہ اس پر زیادہ توجہ دے کیونکہ اس کا مآل کار نقصان و خسران کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا جیسا کہ اگلی حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

مسخرے پن اور زبان کی لغزش سے بچو

(۲۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ لَیَقُوْلُ الْكَلِمَةَ لَا یَقُوْلُهَا اِلَّا لِیُضْحِكَ بِهِ النَّاسَ یَهْوِیْ بِهَا اَبْعَدَ مِمَّا بَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَاَنَّهٗ لَیَزِلُّ عَنْ لِسَانِهٖ اَشَدَّ مِمَّا یَزِلُّ عَنْ قَدَمِهٖ۔ رَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" حقیقت یہ ہے کہ جب بندہ ایک بات کہتا اور صرف اس لئے کہتا ہے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو ہنسائے تو وہ اس بات کی وجہ سے (دوزخ میں) جا گرتا ہے اور اتنی دوری سے گرتا ہے جو زمین و آسمان کے درمیانی فاصلہ سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بندہ اپنے قدموں کے ذریعہ پھسلنے سے زیادہ اپنی زبان کے ذریعہ پھسلتا ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جزء کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے پاؤں کے پھسلنے سے منہ کے بل گر پڑے اور ضرر اٹھائے تو یہ اتنا سخت نہیں جتنا سخت وہ ضرر ہے جو زبان کے پھسلنے یعنی اس سے جھوٹ وغیرہ کے صادر ہونے کی وجہ سے اٹھانا پڑتا ہے کیونکہ پاؤں کی لغزش بدن کو ضرر پہنچاتی ہے اور زبان کی لغزش دین و آخرت کے نقصان میں مبتلا کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ جسمانی نقصان و ضرر دینی نقصان و ضرر سے ہلکا ہوتا ہے۔

ایک چپ لاکھ بلا ٹالتی ہے

(۲۵) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَمَتَ نَجَا۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالدَّارِمِیُّ وَالْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص خاموش رہا اس نے نجات پائی۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ، دارمیؒ، بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ چپ رہ کر اور زبان کو بری باتوں سے محفوظ رکھ کر دنیا کی بھی بہت سی آفتوں سے نجات مل جاتی ہے اور دینی واخروی طور پر بھی بہت سی بلاؤں اور نقصان و خسران سے نجات حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ انسان عام طور پر جن بلاؤں اور آفتوں میں مبتلا ہوتا ہے ان میں سے اکثر زبان ہی کے ذریعہ سے پہنچتی ہیں۔

کلام کی قسمیں: امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ انسان اپنی زبان سے جو بات نکالتا ہے اور جو کلام کرتا ہے اس کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو محض نقصان، دوسرے محض نفع، تیسرے وہ بات اور کلام جس میں نہ نفع ہوتا ہو اور نہ نقصان ہوتا ہو اور چوتھے وہ بات و کلام جس میں نفع بھی ہو اور نقصان بھی اس سے بھی خاموشی ہی اختیار کرنا چاہئے کیونکہ نقصان سے بچنا فائدہ حاصل کرنے سے زیادہ اہم ہوتا ہے اور وہ کلام کہ جس میں نہ نفع ہو نہ نقصان تو ظاہر ہے کہ اس میں زبان کو مشغول کرنا محض وقت ضائع کرنا ہے اور یہ چیز بھی خالص ٹوٹا ہی ہے دوسری

قسم یعنی وہ کلام کہ جس میں نفع ہی نفع ہو تو اگرچہ ایسی بات وکلام میں زبان کو مشغول کرنا برائی کی بات نہیں ہے لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ کہ اس میں بھی ابتلائے آفت کا خطرہ ضرور ہوتا ہے بایں طور کہ ایسے کلام میں بسا اوقات ریاء وتصنع، خوشنودی نفس اور فضول باتوں کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ اور اس صورت میں یہ تمیز کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ کہاں لغزش ہو گئی ہے! حاصل یہ کہ ہر حالت اور ہر صورت میں خاموشی اختیار کرنا بہتر اور نجات کا ذریعہ ہے کیونکہ زبان کی آفتیں ان گنت ہیں اور ان سے بچنا سخت مشکل الایہ کہ زبان کو بند ہی رکھا جائے کسی نے خوب کہا ہے۔

اللسان جسمه صغير وجرمه كبير وكثير۔

"زبان کا جثہ تو چھوٹا ہے، مگر اس کے پاپ بڑے اور بہت ہیں۔"

دنیا و آخرت نجات کے ذریعے

(۳۶) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ لَقِيتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ مَا النَّجَاةُ فَقَالَ اَمْلِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ وَابْكِ عَلٰى خَطِيْئَتِكَ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے ملاقات کی اور عرض کیا کہ (مجھے بتائیے کہ دنیا اور آخرت میں) نجات کا ذریعہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اپنی زبان کو قابو میں رکھو تمہارا گھر تمہاری کفایت کرے اور اپنے گناہوں پر روؤ۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: لفظ "املک" الف کے زبر اور لام کے زیر کے ساتھ ہے لیکن حضرت شیخ عبد الحقؒ نے الف کے زیر کو ترجیح دی ہے اس جملہ کے معنی ایک شارح نے یہ لکھے ہیں کہ اپنی زبان کو ایسی چیزوں اور باتوں سے صاف رکھو جن میں خیر و بھلائی نہیں ہے۔ لیکن اس جملہ کے زیادہ صحیح معنی یہ ہیں کہ اپنی زبان کو بند رکھو کہ گویا تم اپنے تئیں اپنے امور کی نگہداشت رکھتے ہو۔ یعنی اپنے دین کے معاملہ میں محتاط و پرہیزگار ہو اور اپنے حالات (کوائف پر متوجہ ہونا ظاہر ہے کہ جب تم اپنے معاملات میں محتاط پرہیزگار رہو گے اور اپنے احوال و کوائف پر متوجہ رہ کر اپنی برائیوں اور بھلائیوں پر نظر رکھو گے تو راہ نجات تمہارے سامنے ہوگی۔

"تمہارا گھر تمہیں کفایت کرے" کا مطلب یہ ہے کہ بری مجلسوں اور برے لوگوں کی صحبت سے بچنے کی خاطر یکسوئی اختیار کرو اپنے گھر سے اسی وقت باہر نکلو جب نکلنے کی ضرورت پیش آئے اور اس یکسوئی وگوشہ نشینی کی وجہ سے دل برداشتہ نہ ہو بلکہ اس کو غنیمت جانو کیونکہ یہ چیز بہت سے فتنہ وفساد اور برائیوں سے نجات پانے کا ذریعہ ہے اسی لئے کہا گیا ہے ھذا زمان السکوت وملازمة البیوت والقناعة بالقوة الی ان تموت طیبیؒ کہتے ہیں کہ ویسعک بیتک میں حکم کا ظاہر مورد تو گھر ہے لیکن حقیقت میں اس حکم کا مورد مخاطب ہے، گویا اس ارشاد کے ذریعہ مخاطب کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے گھر میں یکسوئی اور گوشہ نشینی اختیار کر کے مولی کی عبادت میں مشغول رہو۔

"اپنے گناہوں پر روؤ۔" کا مطلب یہ ہے کہ اپنی خطاؤں اور اپنی تقصیرات پر نادم و شرمسار ہو کر طلب مغفرت کے لیے خدا کے حضور روؤ گڑگڑاؤ اور خشوع و خضوع اختیار کرو اور اگر رونا نہ آئے کم سے کم رونے کی صورت بنالو۔

تمام اعضاء جسم، زبان سے عاجزی کرتے ہیں

(۳۷) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ رَفَعَهٗ قَالَ اِذَا اَصْبَحَ ابْنُ اٰدَمَ فَاِنَّ الْاَعْضَاءَ كُلَّهَا تُكَفِّرُ اللِّسَانَ فَتَقُوْلُ اتَّقِ اللّٰهَ فِیْنَا فَاِنَّا نَحْنُ بِكَ فَاِنِ اسْتَقَمْتَ اسْتَقَمْنَا وَاِنِ اعْوَجَجْتَ اعْوَجَجْنَا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ آنحضرت ﷺ سے بطریق مرفوع نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب ابن آدم صبح کرتا ہے تو سارے اعضاء چشم زبان کے سامنے عاجزی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے حق میں اللہ سے ڈر کیوں کہ ہمارا تعلق تجھ ہی سے ہے۔ اگر تو سیدھی رہے گی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے اور اگر تو ٹیڑھی ہوگی تو ہم بھی ٹیڑھے ہو جائیں گے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یوں تو سارے جسمانی نظام کا ظاہری و روحانی دار و مدار دل پر ہے کہ اگر دل درست و صالح ہے تو تمام اعضاء جسم بھی درست و صالح رہتے ہیں اور اگر دل فاسد و ناکارہ ہو جائے تو سارے اعضاء بھی فاسد و ناکارہ ہو جاتے ہیں جب کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

ان فی الجسد مضغة ان صلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت فسد الجسد کله۔

"جسم میں گوشت کا لوتھڑا ہے (جس کو دل کہا جاتا ہے) اگر وہ درست ہو تو سارا جسم درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو سارا جسم بگڑ گیا۔"

اس حقیقت کے باوجود اس حدیث میں یہ ظاہر کرنا کہ گویا زبان ہی سارے اعضاء جسم کی سردار ہے اس اعتبار سے ہے کہ حقیقت میں "دل" ہی جسم کا بادشاہ ہے مگر دل کا ترجمان اور خلیفہ زبان ہی ہے۔ کہ دل جو کچھ سوچتا ہے زبان اس کو بیان کرتی ہے اور دیگر اعضاء جسم اس پر عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا جو حکم دل کا ہے وہی زبان کا ہے کہ جس طرح دل کے صالح و فاسد ہونے کا اثر سارے اعضاء جسم پر پڑتا ہے اس طرح زبان کا بناؤ بگاڑ بھی تمام اعضائے جسم کو بناتا اور بگاڑتا ہے۔

حسن اسلام کیا ہے

(۲۸) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَالَا يَعْنِيْهِ۔ رَوَاهُ مَالِكٌ وَاَحْمَدُ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنْهُمَا۔

"اور حضرت علیؓ ابن حسینؓ یعنی حضرت امام زین العابدینؒ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس چیز کو چھوڑ دے جو بے فائدہ ہے۔" مالکؒ، احمدؒ نیز اس روایت کو ابن ماجہؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے اور ترمذیؒ اور شعب الایمان میں بیہقیؒ نے دونوں یعنی حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت علی ابن الحسینؓ سے نقل کیا ہے)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے اسلام کے حسن و خوبی اور ایمان کے کامل ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ اس چیز سے اجتناب و پرہیز کرے جس کا اہتمام نہیں کیا جاتا جس کے ساتھ کوئی غرض متعلق نہیں ہوتی اور جس کی یہ شان نہیں ہوتی کہ کوئی شخص اس کا اہتمام کرے اور اس کے حصول میں مشغولیت اختیار کرے حاصل یہ کہ وہ چیز کوئی امر ضروری نہ ہو، چنانچہ جس چیز کا امر لایعنی کہا جاتا ہے اس کی تعریف و وضاحت یہی ہے اس کے برخلاف جو چیز امر ضروری کہلاتی ہے۔ اور کوئی شخص جس کا اہتمام کرتا ہے وہ ایسی چیز ہوتی ہے جس کے ساتھ دنیا میں ضروریات زندگی اور آخرت میں سلامتی و نجات وابستہ ہوتی ہے، مثلاً دنیا کی ضروریات زندگی میں سے ایک تو غذا ہے جو بھوک مٹاتی ہے، دوسرے پانی ہے جو پیاس کو رفع کرتا ہے، تیسرے کپڑا ہے جو ستر کو چھپاتا ہے، چوتھے بیوی ہے جو عفت و پاکدامنی پر قائم رکھتی ہے اور اسی طرح کی وہ چیزیں جو زندگی کی دوسری ضروریات کو پورا کریں نہ کہ وہ چیزیں جن سے محض نفس کی لذت حرص و ہوس کی بہرہ مندی اور دنیا کی محبت کا تعلق ہوتا ہے نیز ایسے افعال و اقوال، اور تمام حرکات و سکنات بھی نہیں جو فضول و بے فائدہ ہوں، اسی طرح وہ چیز کہ جس سے آخرت کی سلامتی و نجات متعلق ہوتی ہے ایمان و اسلام اور احسان کہ جس کی وضاحت ابتداء کتاب میں حدیث جبرئیل میں ذکر ہو چکی ہے۔ حاصل یہ کہ جو چیزیں دنیا و آخرت میں ضروری ہیں اور جن پر دینی و دنیوی زندگی کا انحصار و مدار ہوتا ہے اور جو مولیٰ کی رضا و خوشنودی کا سبب و ذریعہ بنتی ہے وہ تو لایعنی نہیں ہیں ان کے علاوہ باقی تمام چیزیں لایعنی ہیں خواہ ان چیزوں کا تعلق عمل سے ہو یا قول سے۔

حضرت امام غزالیؒ نے کہا ہے کہ لایعنی (بے فائدہ بات) کا آخری درجہ یہ ہے کہ تم کوئی ایسی بات اپنی زبان سے نکالو کہ جس کو اپنی زبان سے نہ نکالتے تو گنہ گار نہ ہوتے اور اس کی وجہ سے نہ تو تمہیں فوری طور پر کوئی نقصان پہنچتا اور نہ مآل کے اعتبار سے اس کی مثال یہ ہے کہ فرض کرو۔ تم کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہو، اب تم نے ان کے سامنے اپنے کسی سفر کے احوال بیان کئے اس بیان احوال کے دوران تم نے ہر اس چیز کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جو تم نے اپنے سفر کے دوران دیکھی تھی مثلاً پہاڑ عمارت وغیرہ یا جو کچھ واقعات و حادثات پیش آئے تھے ان کے بارے میں بتایا، پھر تم نے ان اچھے کھانوں، عمدہ لباس و پوشاک اور دوسری چیزوں کا بھی ذکر کیا جو تمہیں ملی تھیں یا جن کو تم نے دیکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ تم نے جو یہ ساری تفصیل بیان کی اور جن امور کا ذکر کیا وہ یقیناً ایسی چیزیں ہیں کہ اگر تم ان کو بیان نہ کرتے تو نہ گنہگار ہوتے اور نہ تمہیں کوئی نقصان و ضرر برداشت کرنا پڑتا جب کہ اس لمبی چوڑی تفصیل بیان کرنے کی صورت میں بہت ممکن ہے کہ کسی موقع پر تمہاری زبان نے لغزش کھائی ہو اور اس سے کوئی ایسی بات نکل گئی ہو جس سے تم گنہگار بن گئے ہو۔

کسی کی آخرت کے بارے میں یقین کے ساتھ کوئی حکم نہ لگاؤ

(۲۹) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ تُوُفِّیَ رَجُلٌ مِنَ الصَّحَابَةِ فَقَالَ رَجُلٌ اَبْشِرْ بِالْجَنَّةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَوَلَا تَدْرِیْ فَلَعَلَّهُ تَکَلَّمَ فِیْمَا لَا یَعْنِیْهِ اَوْبَخِلَ بِمَا لَا یَنْقُصُهُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) صحابہؓ میں سے ایک شخص کا انتقال ہوا تو ایک دوسرے شخص نے (مرحوم کی میت کو مخاطب کر کے) کہا کہ (آنحضرت ﷺ کی صحبت کی برکت سے) تمہیں جنت کی بشارت ہو۔ رسول کریم ﷺ نے (یہ بات سن کر اس شخص سے) فرمایا کہ تم یہ بات کس طرح کہہ رہے ہو جب کہ حقیقت حال کا تمہیں علم نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے کسی ایسے معاملہ میں اپنی زبان سے الفاظ نکالے ہوں جو اس کے لئے ضرر رساں نہ ہو یا کسی ایسی چیز میں بخل کیا ہو جس میں کمی نہ آئے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "کسی ایسے معاملہ میں اپنی زبان سے الفاظ نکالے ہوں۔" کا مطلب یہ ہے کہ اس نے بے فائدہ باتوں میں اپنا وقت ضائع کیا ہو اور ایسے امور میں خواہ مخواہ کے لئے اپنی زبان سے الفاظ نکالے ہوں جو اس کے لئے کسی طرح کا ضرر و نقصان پہنچانے کا سبب نہ ہوں۔

"کسی ایسی چیز میں بخل کیا ہو۔" کا مطلب یہ ہے کہ اس نے کسی ایسی چیز کو دینے میں بخل سے کام لیا ہو جو دیئے جانے کے باوجود کم نہیں ہوتی جیسے علم کی تعلیم یا مال زکوٰۃ کی ادائیگی کہ علم کو تقسیم کرنے یا زکوٰۃ ادا کرنے سے علم اور مال میں کوئی کمی نہیں ہوتی بلکہ ان میں زیادتی ہی ہوتی ہے۔

آنحضرت کے ارشاد کا ماحصل یہ تھا کہ تم نے اس شخص کے جنت میں جانے کے بارے میں اس طرح کا جزم و یقین کیوں ظاہر کیا ہے؟ جب کہ تمہیں اس کی زندگی کے سارے ظاہری باطنی گوشوں سے واقفیت اور اس کے احوال کی حقیقت کا علم نہیں ہے، بیشک اس شخص کی ظاہری زندگی بڑی پاکیزہ تھی اور اس کو صحابیت کی سعادت بھی حاصل ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنی زبان سے کوئی لایعنی بات نکالی ہو یا بخل کیا ہو اور اس مواخذہ و حساب میں گرفتار ہو کر جنت میں داخل ہونے سے روک دیا گیا ہو۔

زبان کے فتنہ سے بچو

(۳۰) وَعَنْ سُفْیَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الثَّقَفِیِّ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا أَخْوَفُ مَا تَخَافُ عَلَیَّ قَالَ فَاَخَذَ بِلِسَانِ نَفْسِهٖ وَقَالَ هٰذَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَصَحَّحَهٗ۔

"اور حضرت سفیان ابن عبد اللہ ثقفیؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ میرے بارے میں جن چیزوں سے ڈرتے ہیں ان میں سب سے زیادہ خوفناک چیز کونسی ہے؟ حضرت سفیانؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) اپنی زبان

مبارک کو پکڑا اور فرمایا کہ یہ چیز یعنی تمہارے بارے میں مجھے سب سے زیادہ ڈر اس زبان سے لگتا ہے کہ گناہ کی اکثر باتیں اس سے سرزد ہوتی ہیں، لہٰذا تم اس زبان کے فتنہ سے بچو۔" "ترمذیؒ" نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔"

جھوٹ بولنا حفاظت کرنے والے فرشتوں کو اپنے سے دور کر دیتا ہے

(۳۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا کَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْہُ الْمَلَکُ مِیْلًا مِنْ نَتْنِ مَاجَآءَ بِہٖ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب کوئی بندہ جھوٹ بولتا ہے تو اس کی پیدا کی ہوئی چیز یعنی جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے (حفاظت کرنے والے) فرشتے اس سے کوس بھر دور چلے جاتے ہیں۔" (ترمذیؒ)

کسی کو اپنے جھوٹ کے دھوکے میں مبتلا کرنا بہت بڑی خیانت ہے

(۳۲) وَعَنْ سُفْیَانَ بْنِ اَسَدِ نِ الْحَضْرَمِیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ کَبُرَتْ خِیَانَۃً اَنْ تُحَدِّثَ اَخَاکَ حَدِیْثًا ھُوَلَکَ بِہٖ مُصَدِّقٌ وَاَنْتَ بِہٖ کَاذِبٌ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت سفیان ابن اسد حضرمیؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ یہ بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے (مسلمان) بھائی سے کوئی بات کہو اور وہ تم کو اس بات میں سچا جانے جب کہ حقیقت میں تم نے اس سے جھوٹ بولا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ یوں تو ہر حالت اور ہر موقع پر جھوٹ بولنا بہت برا ہے مگر اس صورت میں تو بہت ہی برا ہے کہ تم اپنے کسی مسلمان بھائی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاؤ باایں طور کہ وہ تو تمہیں سچ بولنے والا سمجھے مگر تم اس سے جھوٹ بولو۔

دورویہ کے بارے میں وعید

(۳۳) وَعَنْ عَمَّارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ کَانَ ذَا وَجْھَیْنِ فِی الدُّنْیَا کَانَ لَہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ لِسَانَانِ مِنْ نَارٍ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت عمارؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص دنیا میں دورویہ ہوگا قیامت کے دن اس کے (منہ میں) آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔" (دارمیؒ)

تشریح: دورویہ اصل میں منافق صفت آدمی کو کہتے ہیں یعنی وہ شخص جو کسی کے حق مخلص نہ ہو، زبان سے کچھ کہے اور دل میں کچھ رکھے جب کسی کے سامنے بات کرے تو اس طرح کرے کہ مخاطب یہ سمجھے کہ یہ میرا بڑا دوست وہمدرد ہے مگر جب اس کے پیٹھ پیچھے بات کرے تو زبان سے ایسے الفاظ نکالے جو اس کے لئے تکلیف کا باعث ہوں۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ دورویہ اس شخص کو کہتے ہیں جو آپس میں مخاصمت رکھنے والے دو آدمیوں میں سے ہر ایک کی منہ دیکھی بات کرے ایک کے پاس جائے تو اس کی پسند کی باتیں کرے اور وہ یہ سمجھے کہ یہ میرا دوست ہے اسی طرح دوسرے کہ پاس جائے تو اس کی سی کہے اور وہ سمجھے کہ یہ میرا دوست ہے غرضیکہ دونوں میں سے ہر ایک کے پاس اس کی محبت ظاہر کرے اور دوسرے کی برائی کرے اسی طرح دونوں ہی اس کے بارے میں غلط فہمی کا شکار رہیں۔ اور ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا دوست وہمدرد اور مددگار ہے اور میرے مخالف کا دشمن وبدخواہ۔

کمال ایمان کے منافی چیزیں

(۳۴) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا بِاللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا

الْبَذِيِّ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيْمَانِ وَفِي أُخْرَى لَهُ وَلَا الْفَاحِشِ الْبَذِيِّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ (کامل) مؤمن نہ تو طعن کرنے والا ہوتا ہے نہ لعن کرنے والا نہ فحش گوئی کرنے والا ہوتا ہے، نہ زبان درازی کرنے والا (ترمذیؒ، بیہقیؒ) اور بیہقی کی روایت میں نہ فحش گوئی کرنے والا زبان دراز" کے الفاظ ہیں (یعنی اس روایت میں "بذی" کو "فاحش" کی صفت قرار دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص کامل مؤمن نہیں ہو سکتا جو حد سے زیادہ فحش گوئی کرنے والا ہو نیز ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

۳۵ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ لَعَّانًا وَفِي رِوَايَةٍ لَا يَنْبَغِي لِلْمُؤْمِنِ أَنْ يَكُوْنَ لَعَّانًا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "وہ شخص (کامل) مؤمن نہیں ہو سکتا جو بہت زیادہ لعنت کرنے والا اور لعنت کرنے کا عادی ہو۔" ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ۔ "اور کسی مؤمن کے لئے یہ موزوں نہیں ہے کہ وہ بہت زیادہ لعنت کرنے والا ہو۔" (ترمذیؒ)

بددعا کرنے کی ممانعت

۳۶ وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَلَاعَنُوْا بِلَعْنَةِ اللّٰهِ وَلَا بِغَضَبِ اللّٰهِ وَلَا بِجَهَنَّمَ وَفِي رِوَايَةٍ وَلَا بِالنَّارِ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت سمرہ ابن جندبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "آپس میں ایک دوسرے کے لیے نہ تو خدا کی لعنت کی بددعا کرو نہ خدا کے غضب کی اور نہ جہنم میں جانے کی بددعا کرو۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ یوں تو کسی صورت میں بھی کسی مسلمان کو اپنے کسی مسلمان بھائی کے حق میں بددعا نہ کرنی چاہئے کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے لیکن خدا کی لعنت وغیرہ جیسی چیزوں کی بددعا کرنا تو سخت برا اور گناہ کی بات ہے چنانچہ کسی کے حق میں اس طرح بددعا نہ کرنی چاہئے کہ تجھ پر خدا کی لعنت ہو یا تجھ پر خدا کا غضب ٹوٹے یا خدا کرے تو جہنم میں جائے اور یا خدا کرے تو دوزخ کی گھاٹی میں جلے وغیرہ وغیرہ۔

جو شخص لعنت کے قابل نہ ہو اس پر لعنت کرنا خود اپنے آپ کو مبتلائے لعنت کرنا ہے

۳۷ وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا لَعَنَ شَيْئًا صَعِدَتِ اللَّعْنَةُ إِلَى السَّمَاءِ فَتُغْلَقُ أَبْوَابُ السَّمَاءِ دُوْنَهَا ثُمَّ يُهْبَطُ إِلَى الْأَرْضِ فَتُغْلَقُ أَبْوَابُهَا دُوْنَهَا ثُمَّ تَأْخُذُ يَمِيْنًا وَّ شِمَالًا فَإِذَا لَمْ تَجِدْ مَسَاغًا رَجَعَتْ إِلَى الَّذِي لُعِنَ فَإِنْ كَانَ لِذَالِكَ أَهْلًا وَإِلَّا رَجَعَتْ إِلَى قَائِلِهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ۔ "جب کوئی بندہ کسی چیز یعنی کسی انسان یا غیر انسان پر لعنت کرتا ہے تو وہ لعنت آسمان کی طرف جاتی ہے اور آسمان کے دروازے اس لعنت پر بند کر دئے جاتے ہیں پھر وہ لعنت دائیں بائیں طرف جانا چاہتی ہے (مگر ادھر سے بھی دھتکار دی جاتی ہے) چنانچہ جب وہ کسی طرف بھی راستہ نہیں پاتی تو اس چیز کی طرف متوجہ ہوتی ہے جس پر لعنت کی گئی ہے یہاں تک کہ اگر وہ چیز اس لعنت کی اہل و سزاوار ہوتی ہے تو اس پر واقع ہو جاتی ہے ورنہ اپنے کہنے والے کی طرف لوٹ جاتی ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث کے ذریعہ لعنت کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ کہ جس چیز کو لوگ بہت معمولی چیز سمجھتے ہیں۔ اور ہر کس و ناکس پر لعنت کرتے رہتے ہیں انجام کار خود ہی اس لعنت کا شکار ہو جاتے ہیں چنانچہ جب کوئی شخص کسی پر لعنت کرتا ہے تو وہ لعنت ابتداء ہی سے اس پر متوجہ نہیں ہوتی۔ اور یہ چاہتی ہے کہ ادھر ادھر سے ہو کر باہر نکل جائے مگر جب کسی طرف کو راستہ نہیں پاتی تو آخر کار اس پر متوجہ ہوتی ہے بشرطیکہ وہ اس لعنت کا سزاوار ہو اور اگر حقیقت کے اعتبار سے وہ اس لعنت کا سزاوار نہیں ہوتا تو پھر انجام یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ لوٹ کر اس شخص پر واقع ہو جاتی ہے جس نے وہ لعنت کی ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جب تک یقینی طور پر یہ معلوم نہ ہو کہ فلاں شخص لعنت کا واقعی مستوجب ہے اس پر لعنت نہ کی جائے اور ظاہر ہے کہ کسی شخص کا قابل لعنت ہونا شارع علیہ السلام کی طرف سے بتائے بغیر متعین نہیں ہو سکتا۔

(۳۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَجُلًا نَازَعَتْهُ الرِّيحُ رِدَاءَهُ فَلَعَنَهَا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَلْعَنْهَا فَاِنَّهَا مَامُوْرَةٌ وَاِنَّهُ مَنْ لَعَنَ شَيْئًا لَيْسَ لَهُ بِاَهْلٍ رَجَعَتِ اللَّعْنَةُ عَلَيْهِ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن کا واقعہ ہے کہ) ایک شخص کی چادر ہوا میں اڑ گئی تو اس نے ہوا پر لعنت کی چنانچہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "ہوا پر لعنت نہ کرو کیونکہ وہ تو حکم کے تابع ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جو شخص کسی ایسی چیز پر لعنت کرے جو اس لعنت کے قابل نہ ہو تو وہ لعنت اسی پر لوٹ آتی ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: "وہ تو حکم کے تابع ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ ہوا بذات خود کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور نہ کسی طرح کا تصرف کرنے کے قابل ہے وہ تو چلنے پر منجانب اللہ مامور کی گئی ہے اور حق تعالیٰ نے اپنی حکمتوں اور مصالح کے تحت اس کو پیدا کیا اور چلایا ہے بس اس کا کام چلنا ہے اور وہ چلتی ہے اس صورت میں اگر اس کی وجہ سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس ہوا سے دل برداشتہ ہونا اور اس کو برا بھلا کہنا نہ صرف نہایت ناموزوں بات ہے بلکہ تقاضائے عبودیت اور استقامت کے منافی بھی ہے زمانہ کے حوادث و تغیرات اور انسان کے اپنے تابع ارادوں اور افعال کے بارے میں یہی حکم ہے کہ رنج و حادثہ کے وقت اپنے ظاہر و باطن دونوں میں قلب و زبان کو راضی و ساکت رکھے اور اگر کسی تکلیف و حادثہ کے وقت بتقاضائے بشریت اپنے اندر کوئی تغیر اور دل کو متاثر پائے تو لازم ہے کہ زبان کو قابو میں رکھے کہ اس سے شکوہ و شکایت اور اظہار رنج کا کوئی ایسا لفظ نہ نکل جائے جو مرتبہ عبودیت اور اسلامی تعلیمات و آداب کے خلاف ہو۔

اپنے بڑوں کے سامنے ایک دوسرے کی برائی نہ کرو۔

(۳۹) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُبَلِّغُنِىْ اَحَدٌ مِنْ اَصْحَابِىْ عَنْ اَحَدٍ شَيْئًا فَاِنِّىْ اُحِبُّ اَنْ اَخْرُجَ اِلَيْكُمْ وَاَنَا سَلِيْمُ الصَّدْرِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میرے صحابہؓ میں سے کوئی شخص کسی کے بارے میں مجھ تک کوئی (ایسی) بات نہ پہنچائے (جس سے اس کی برائی ظاہر ہوتی ہو یعنی میرے پاس آکر کسی کے بارے میں یہ نہ کہے کہ فلاں آدمی نے یہ برا کام کیا ہے۔ یا یہ بری بات کہی ہے اور یا وہ اس بری عادت میں مبتلا ہے۔) کیونکہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ جب میں (گھر سے) نکل کر تمہارے پاس آؤں تو میرا سینہ صاف ہو (کہ میرے دل میں تم میں سے کسی کی طرف سے کوئی ناراضگی غصہ اور بغض نہ ہو۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس ارشاد گرامی میں امت کے لئے یہ تعلیم ہے کہ کوئی آدمی اپنے کسی بڑے مثلاً حاکم و سردار اور بزرگ و شیخ کے سامنے کسی شخص کی برائی بیان نہ کرے تاکہ بغض عداوت اور ناراضگی و خفگی کی صورت پیدا نہ ہو۔

حدیث کے آخری جز کے مطلب یہ لکھا ہے کہ اس ارشاد کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے گویا اپنی اس خواہش و آرزو کا اظہار فرمایا کہ آپ ﷺ اپنے صحابہؓ سے خوش و راضی رہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوں۔

(۴۰) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَسْبُكَ مِنْ صَفِيَّةَ كَذَا وَكَذَا تَعْنِي قَصِيْرَةً فَقَالَ لَقَدْ قُلْتِ كَلِمَةً لَوْ مُزِجَ بِهَا الْبَحْرُ لَمَزَجَتْهُ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں (ایک دن مجھے کیا سوجھی کہ) میں نبی کریم ﷺ سے یہ کہہ بیٹھی کہ صفیہؓ کے تئیں بس آپ ﷺ کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ ایسی ایسی ہیں اس بات سے حضرت عائشہؓ کی مراد حضرت صفیہؓ کے قد کی کوتاہی کو ذکر کرنا تھا رسول کریم ﷺ نے (میری یہ بات سن کر ناگواری کے ساتھ فرمایا۔ کہ "تم نے اپنی زبان سے ایک ایسی بات نکالی ہے کہ اگر اس کو دریا میں ملایا جائے تو بلاشبہ یہ بات دریا پر غالب آجائے۔" (احمدؒ ، ترمذیؒ ، ابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت صفیہؓ بنت حُیَیّ بھی آنحضرت ﷺ کی ایک زوجہ مطہرہ تھیں ان کا قد کچھ چھوٹا تھا چنانچہ ایک دن حضرت عائشہؓ نے چاہا کہ آنحضرت کے سامنے حضرت صفیہ کے اس عیب کا ذکر کریں اور اس طرح انہوں نے مذکورہ الفاظ اپنی زبان سے ادا کئے ظاہر ہے کہ یہ غیبت تھی جس میں حضرت عائشہؓ مبتلا ہوئیں۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کی اس بات پر ناگواری کا اظہار فرمایا اور مذکورہ ارشاد گرمی کے ذریعہ گویا ان پر یہ واضح کیا کہ تم نے جو بات کہی ہے وہ کوئی معمولی درجہ کی نہیں ہے بلکہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے اس قدر ہیبتناک ہے کہ اگر بالفرض اس کو کسی دریا میں ملا دیا جائے تو دریا اس کے سامنے ہیچ ہو جائے اور یہ چند الفاظ اس دریا کی وسعت و عظمت کے باوجود اس پر غالب آجائیں اور اس کو متغیر کر دیں اور جب ان الفاظ کے مقابلہ پر دریا کا یہ حال ہے تو سوچو کہ تمہارے اعمال کا کیا حشر ہو سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہو کہ کسی کے اس درجہ کے عیب کو بھی بقصد حقارت بیان کرنا کہ فلاں شخص کوتاہ قد ہے غیبت ہے۔

جیسا کہ ترجمہ میں ظاہر کیا گیا لفظ کذا کذا کے ذریعہ حضرت صفیہؓ کے بعض عیوب یعنی ان کے قد کی کوتاہی کو کنایۃً بیان کرنا مقصود تھا، جب کہ ایک شارح نے کہا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے ان الفاظ کذا کذا کے ذریعہ دراصل اپنی بالشت کی طرف اشارہ کیا کہ حضرت صفیہؓ تو گویا بالشت بھر کی ہیں۔ نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ لفظ کذا کو مکرر لانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا مقصد حضرت صفیہؓ کے اس عیب کو زبان اور اشارہ دونوں ذریعوں سے بیان کرنا تھا۔ چنانچہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے پہلے تو اپنی زبان سے کہا ہوگا کہ صفیہ ٹھگنی ہیں اور پھر اپنی بالشت کا اشارہ کر کے اپنی بات کو مؤکد کیا کہ وہ بہت ہی ٹھگنی ہیں ملا علی قاریؒ نے اس طرح کی بات کی ہے۔

بدگوئی عیب دار بناتی ہے اور نرم گوئی، زینت بخشتی ہے

(۴۱) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا كَانَ الْفُحْشُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا شَانَهُ وَمَا كَانَ الْحَيَاءُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا زَانَهُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس چیز میں بدگوئی اور سخت کلامی ہو اس کو عیب دار بنا دیتی ہے اور جس چیز میں حیا و نرمی ہو اس کو زیب و زینت عطا کرتی ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس ارشاد گرامی میں فحش یعنی بدگوئی و سخت کلامی اور اس کے مقابلہ پر حیاء یعنی نرم گوئی کی تاثیر و شان کو مبالغہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ اگر بالفرض فحش یا حیا کسی پتھر یا لکڑی میں پیدا ہو جائے تو اس کو عیب دار یا بازینت بنا دے اس سے معلوم ہوا کہ بدگوئی و سخت کلامی شخصیت میں نقص و عیب پیدا کرنے کا ذریعہ ہے جب کہ نرم گوئی و خوش کلامی شخصیت میں وقار کو ظاہر کرتی ہے۔

عار دلانے والے کے بارے میں وعید

(۴۲) وَعَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ عَنْ مُعَاذٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ عَيَّرَ اَخَاهُ بِذَنْبٍ لَمْ يَمُتْ حَتّٰى يَعْمَلَهُ يَعْنِيْ مِنْ ذَنْبٍ قَدْ تَابَ مِنْهُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَلَيْسَ اِسْنَادُهُ بِمُتَّصِلٍ لِاَنَّ خَالِدًا لَمْ

يُدْرِكُ مُعَاذَبْنَ جَبَلٍ۔

"اور حضرت خالدؒ ابن معدان حضرت معاذؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا، رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ: "جو شخص اپنے (مسلمان) بھائی کو کسی گناہ پر عار دلاتا ہے (یعنی اگر کسی مسلمان سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے اور کوئی شخص اس کو شرم و غیرت دلاتا ہے اور سرزنش و ملامت کرتا ہے تو وہ عار دلانے والا مرنے سے پہلے خود بھی اس گناہ میں (کسی نہ کسی طرح ضرور) مبتلا ہوتا ہے آنحضرت ﷺ کی مراد اس گناہ سے تھی جس سے اس نے توبہ کرلی ہو۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند متصل نہیں ہے کیونکہ خالدؒ نے حضرت معاذؓ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔"

تشریح: کسی مسلمان کا بتقاضائے بشریت کسی گناہ میں مبتلا ہو جانا اور پھر شرم و نادم ہو کر اس گناہ سے توبہ کر لینا اس کی سلامتی طبع اور حسن ایمان کی علامت ہے اس صورت میں کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ مسلمان اس کے اس گناہ پر شرم و غیرت دلائے اور اس کو سرزنش و ملامت کرے ہاں اگر اس نے اس گناہ سے توبہ نہیں کی ہے اور اس گناہ میں مبتلا ہے تو پھر اس کو شرم و غیرت بھی دلائی جا سکتی ہے اور سرزنش و ملامت بھی کی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس کو شرم و غیرت دلانا اور سرزنش و ملامت کرنا بطریق تکبر و بقصد تحقیر نہ ہو بلکہ تنبیہ و نصیحت کے طور پر اور اس کو اس گناہ سے باز رکھنے کے قصد سے ہو۔

آنحضرت ﷺ کے مذکورہ ارشاد کی یہ وضاحت "آنحضرت کی مراد اس گناہ سے تھی الخ۔" حضرت امام احمد حنبلؒ سے منقول ہے اور یہ الفاظ اس روایت کے آخر میں نقل کئے جاتے ہیں۔

امام ترمذیؒ نے اس روایت کو اگرچہ غریب کہا ہے اور اس میں کلام کیا ہے لیکن عراقیؒ کہتے ہیں کہ اس روایت کو احمدؒ اور طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔

کسی کو مصیبت میں دیکھ کر خوشی کا اظہار نہ کرو

(۴۳) وَعَنْ وَاثِلَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُظْهِرِ الشَّمَاتَةَ لِاَخِيْكَ فَيَرْحَمَهُ اللّٰهُ وَيَبْتَلِيْكَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت واثلہؒ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اپنے مسلمان بھائی کی تکلیف پر اپنی خوشی مت ظاہر کرو۔ (یعنی اگر کسی ایسے مسلمان کو کسی دنیوی یا دینی مصیبت و آفت میں مبتلا دیکھو کہ جس سے تم عداوت رکھتے ہو تو اس کی تکلیف پر خوشی کا اظہار نہ کرو) کیوں کہ (ہو سکتا ہے کہ تمہاری بے جا خوشی سے ناراض ہو کر) اللہ تعالیٰ اس پر اپنی رحمت نازل کر دے (یعنی اس مصیبت و آفت سے نجات دیدے) اور تمہیں اس آفت و مصیبت میں مبتلا کر دے اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

کسی کی نقل اتارنا حرام ہے

(۴۴) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اُحِبُّ اَنِّيْ حَكَيْتُ اَحَدًا وَاَنَّ لِيْ كَذَا وَكَذَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ میں کسی شخص کی نقل اتاروں اگرچہ میرے لئے ایسا اور ایسا ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی اگر کوئی مجھے بے حساب مال و زر اور کتنا ہی زیادہ روپیہ پیسہ بھی دے تو بھی میں کسی کی نقل اتارنا گوارا نہ کروں۔" ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔"

تشریح: کسی کی نقل اتارنا خواہ قولی ہو یا فعلی، حرام اور غیبت محرمہ میں داخل ہے۔

خدا کی رحمت کو کسی کے لئے مخصوص و محدود نہ کرو

(۴۵) وَعَنْ جُنْدُبٍ قَالَ جَآءَ اَعْرَابِیٌّ فَاَنَاخَ رَاحِلَتَهٗ ثُمَّ عَقَلَهَا ثُمَّ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَصَلّٰی خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا سَلَّمَ اَتٰی رَاحِلَتَهٗ فَاَطْلَقَهَا ثُمَّ رَکِبَ ثُمَّ نَادَی اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِیْ وَمُحَمَّدًا وَلَا تُشْرِكْ فِیْ رَحْمَتِنَا اَحَدًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَتَقُوْلُوْنَ هُوَ اَضَلُّ اَمْ بَعِیْرُهٗ اَلَمْ تَسْمَعُوْا اِلٰی مَا قَالَ قَالُوْا بَلٰی۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَذُکِرَ حَدِیْثُ اَبِیْ هُرَیْرَةَ کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا فِیْ بَابِ الْاِعْتِصَامِ فِی الْفَصْلِ الْاَوَّلِ۔

"اور حضرت جندب ؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ایک دیہاتی شخص (اپنے اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ) آیا اور (مسجد نبی کے قریب پہنچ کر) اس نے اپنے اونٹ کو بٹھایا اور اس کے پاؤں کو باندھ کر مسجد میں داخل ہوا پھر اس نے رسول کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور سلام پھیرنے کے بعد (یعنی نماز سے فارغ ہو کر) اپنے اونٹ کے پاس آیا (اور اس کو کھول کر) اس پر سوار ہوا، اور پھر اس نے باآواز بلند اس طرح کہا کہ اے اللہ مجھ پر اور محمد ﷺ پر اپنی رحمت نازل فرما اور ہماری رحمت میں کسی اور کو شریک نہ کر رسول کریم ﷺ نے (اس کو اس طرح دعا مانگتے سنا تو صحابہ ؓ سے) فرمایا کہ۔ تم بتا سکتے ہو کہ یہ دیہاتی زیادہ جاہل ہے یا اس کا اونٹ کیا تم نے سنا نہیں اس نے کیا کہا ہے؟" صحابہ ؓ نے عرض کیا کہ جی ہاں! ہم نے سنا ہے (ابوداؤد) اور حضرت ابوہریرہ کی روایت کفی بالمرء کذبا الخ باب الاعتصام میں نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: اس دیہاتی نے چونکہ اپنی دعا میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کو مخصوص و محدود کیا تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے اپنے مذکورہ الفاظ کے ذریعہ گویا اس پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ دعا میں اپنے مطلوب کو محدود و مخصوص نہ کرنا چاہئے۔ یعنی یہ دعا نہ مانگنی چاہئے کہ فلاں بات بس ہمارے ہی لئے ہو دوسرے کے لئے نہ ہو بلکہ اس میں تمام مؤمنین و مؤمنات کو داخل کرنا چاہئے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

فاسق کی تعریف و توصیف نہ کرو

(۴۶) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا مُدِحَ الْفَاسِقُ غَضِبَ الرَّبُّ تَعَالٰی وَاهْتَزَّلَهُ الْعَرْشُ رَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب فاسق کی مدح و تعریف کی جاتی ہے (یعنی کوئی شخص اس کے حق میں تعظیم و توقیر کے الفاظ استعمال کرتا ہے) تو اللہ تعالیٰ (مدح و تعریف کرنے والے پر) غصہ ہوتا ہے اور اس کی مدح و تعریف کی وجہ سے عرش کانپ اٹھتا ہے۔" (بیہقی ؒ)

تشریح: "عرش کا کانپ اٹھنا" یا تو اپنے ظاہری مفہوم پر محمول ہے کہ جب کسی فاسق و فاجر کی تعریف کی جاتی ہے تو عرش الٰہی واقعۃ کانپنے لگتا ہے اور یا ان الفاظ کے ذریعہ اس بات کو بطور کنایہ بیان کرنا مقصود ہے کہ فاسق کی تعریف و توصیف ایک بہت ہی ہیبتناک بات اور انتہائی سنگین برائی ہے اور اس ہیبتناکی کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص کسی فاسق کی تعریف میں رطب اللسان ہوتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے تعریف کرنے والا گویا ان اومر وافعال سے راضی اور خوش ہے جو اس فاسق کی زندگی میں پائے جاتے ہیں، بلکہ عجب نہیں کہ تعریف کرنے والا کفر کی حد میں داخل ہو جائے کیونکہ فاسق کی تعریف اس کو اس مقام تک لے جا سکتی ہے۔ جہاں وہ حرام کو حلال جاننے لگے اس سے معلوم ہوا کہ بے عمل اور دنیادار علماء گمراہ شعراء، اور ریاکار و پیشہ ور قراء کی مدح و تعریف کرنا بھی اس حکم میں داخل ہے نیز اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جب فاسق کی مدح و تعریف کرنے کا یہ حال ہے تو ظالم اور کافر کی تعریف و توصیف میں

رطب اللسان ہونا کسی درجہ ہیبتناک برائی ہوگی، لہٰذا اس بارے میں احتیاط لازم ہے اور اس بلاء عظیم سے بچنا اشد ضروری ہے، نیز اس سے بچنا اس صورت میں ممکن ہے جب کہ ان لوگوں کی صحبت و ہم نشینی سے اجتناب کیا جائے۔

خیانت و جھوٹ، ایمان کی ضد میں

(۴۷) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُطْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلَى الْخِلَالِ كُلِّهَا اِلَّا الْخِيَانَةَ وَالْكَذِبَ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِیْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "مسلمان، جھوٹ اور خیانت کے سوا ہر طرح کی خصلت پر پیدا کیا جاتا ہے۔ (احمدؒ) بیہقیؒ نے شعب الایمان میں اس روایت کو حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: اس ارشاد گرامی کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ کامل مؤمن میں یہ دو خصلتیں نہیں ہوسکتیں بلکہ اس کے اجزاء ترکیبی میں صدق وامانت کے اوصاف ہوتے ہیں جو تصدیق وایمان کا تقاضا ہیں یا اس ارشاد گرامی کی مراد مؤمن کی ذات میں ان دونوں خصلتوں کی نفی کرنا ہے یعنی یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ مؤمن، جو ایمان کے بار امانت کا حامل ہے ان دو خصلتوں میں مبتلا نہیں ہوسکتا اور زیادہ واضح بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ دراصل ان دو خصلتوں کو اختیار کرنے سے منع فرمایا کہ کسی مسلمان کو یہ نہ چاہئے کہ ان دو، (خیانت اور جھوٹ) کو اپنے اندر راہ پانے دے کیونکہ یہ دونوں برائیاں درحقیقت ایمان و اسلام کی ضد میں۔

(۴۸) وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ اَنَّهُ قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ جَبَانًا قَالَ نَعَمْ فَقِيْلَ لَهُ اَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ بَخِيْلًا قَالَ نَعَمْ فَقِيْلَ لَهُ اَيَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ كَذَّابًا قَالَ لَا۔ رَوَاهُ مَالِكٌ وَالْبَيْهَقِيُّ فِیْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت صفوان ابن سلیمؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے پوچھا گیا۔ کہ کیا مؤمن بزدل ہوسکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "ہوسکتا ہے۔" پھر آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا مومن بخیل ہوسکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہوسکتا ہے پھر جب آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا مؤمن بہت جھوٹا ہوسکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ نہیں اس روایت کو مالکؒ اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کوئی مؤمن کسی موقع پر بزدلی دکھا سکتا ہے اور کسی صورت میں بخیل بھی ہوسکتا ہے لیکن وہ جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ایمان کی صداقت و حقانیت کذب کے منافی ہے جو اپنی اصلی اور نفس الامر کے اعتبار سے باطل (ناحق) ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہ حدیث بھی اوپر کی حدیث کی تشریح میں ذکر کردہ تاویلات پر محمول ہے۔

حدیث میں کذاب مبالغہ کے صیغہ کے ساتھ ذکر کرنا، اس امر کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اگر تقاضائے بشریت کسی موقع پر مؤمن سے جھوٹ سرزد ہو جائے جیسا کہ بعض صورتوں میں دنیا کی کسی ناجائز غرض کے تحت نہیں بلکہ مصالح اور حکمت عملی کے پیش نظر جھوٹ بولنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ تو ایسی صورت مستثنیٰ ہے اس کو ایمان کے منافی نہیں کہا جاسکتا۔

حضرت صفوانؒ کا کچھ ذکر خیر: اس موقع پر اس حدیث کے راوی حضرت صفوانؒ کا کچھ ذکر خیر کردینا موزوں ہوگا یہ عظیم ہستی جن کا پورا نام صفوان ابن سلیم زہری ہے حضرت حمید ابن عبدالرحمٰن ابن عوف کے آزاد کردہ غلام ان کا شمار مدینہ کے مشہور وثقہ اور جلیل القدر تابعین میں ہوتا ہے حضرت انس ابن مالکؓ وغیرہ سے روایت حدیث کرتے ہیں اللہ کے صالح اور برگزیدہ بندوں میں سے تھے بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے چالیس سال تک اپنے پہلو کو زمین سے نہیں لگایا یہاں تک کہ وقت مرگ بھی بیٹھے ہی رہے اور اسی حالت میں جان جاں آفریں کے سپرد کی لوگ کہتے تھے کہ عبادت الٰہی اور سجدہ کی کثرت کی وجہ سے ان کی پیشانی میں سوراخ ہوگیا تھا۔ قناعت اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ باوجود احتیاج کے شاہی عطیات کے قبول نہیں کرتے تھے ان کے فضائل و مناقب بہت زیادہ ہیں۔ ۱۳۲ھ میں انتقال ہوا۔

شیطان کی فتنہ خیزی

(۴۹) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اِنَّ الشَّيْطَانَ لَيَتَمَثَّلُ فِيْ صُوْرَةِ الرَّجُلِ فَيَاتِي الْقَوْمَ فَيُحَدِّثُهُمْ بِالْحَدِيْثِ مِنَ الْكِذْبِ فَيَتَفَرَّقُوْنَ فَيَقُوْلُ الرَّجُلُ مِنْهُمْ سَمِعْتُ رَجُلاً اَعْرِفُ وَجْهَهٗ وَلاَ اَدْرِيْ مَا اسْمُهٗ يُحَدِّثُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ (کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ) شیطان کسی آدمی کی صورت اختیار کر کے کسی جماعت کے پاس آتا ہے اور ان تک کوئی جھوٹی خبر پہنچا دیتا ہے پھر جب اس جماعت کے لوگ ادھر ادھر منتشر ہوتے ہیں تو ان میں سے کوئی شخص کہتا ہے کہ میں نے ایک شخص سے سنا ہے جس کی صورت تو میں پہنچانتا ہوں (کہ اگر اس کو دیکھوں تو بتا سکتا ہوں کہ یہ وہی شخص ہے) مگر اس کا نام نہیں جانتا، وہ یہ بات بیان کرتا تھا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "خبر" سے مراد یا تو آنحضرت ﷺ کی حدیث ہے یا مطلق کوئی بھی جھوٹی خبر و اطلاع! حضرت ابن مسعودؓ کے قول کا مقصد یہ تنبیہ کرنا ہے کہ حدیث کی سماعت کے وقت پوری احتیاط اور چھان بین کر لینی چاہئے کہ جو حدیث سنائی یا نقل کی جارہی ہے صحیح ہے یا نہیں؟ اسی طرح اگر کوئی بھی خبر یا کوئی بھی بات کسی سے سنے تو اس وقت تک دوسروں کے سامنے نقل نہ کرے جب تک کہ یہ تحقیق نہ کر لے کہ اس خبر اور بات بیان کرنے والا قابل اعتماد اور سچا ہے یا نہیں اور یہ کہ وہ خبر واقعہ کے مطابق اور صحیح ہے یا نہیں؟

مذکورہ بالا روایت اگرچہ بطریق مرفوع یعنی آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے طور پر نقل نہیں کی گئی ہے بلکہ بطریق موقوف ہے یعنی حضرت ابن مسعودؓ ایسی کوئی بات آنحضرت ﷺ سے سنے بغیر اس کو بیان نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے یہ روایت مرفوع حدیث ہی کے حکم میں ہے۔

برائی سکھانے سے چپ رہنا بہتر ہے

(۵۰) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حِطَّانَ قَالَ اَتَيْتُ اَبَاذَرٍّ فَوَجَدْتُهٗ فِي الْمَسْجِدِ مُحْتَبِيًا بِكِسَاءٍ اَسْوَدَ وَحْدَهٗ فَقُلْتُ يَا اَبَاذَرٍّ مَا هٰذِهِ الْوَحْدَةُ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْوَحْدَةُ خَيْرٌ مِّنْ جَلِيْسِ السَّوْءِ وَالْجَلِيْسُ الصَّالِحُ خَيْرٌ مِّنَ الْوَحْدَةِ وَاِمْلاَءُ الْخَيْرِ خَيْرٌ مِّنَ السُّكُوْتِ وَالسُّكُوْتُ خَيْرٌ مِّنْ اِمْلاَءِ الشَّرِّ۔

"اور حضرت عمران ابن حطان (تابعی) کہتے ہیں۔ (ایک دن) میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کو مسجد میں پایا، اس وقت وہ ایک کالی کملی لپیٹے ہوئے تنہا بیٹھے تھے میں نے عرض کیا کہ ابوذر! یہ تنہائی کیوں اختیار کر رکھی ہے؟ (یعنی صحابہؓ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر افادہ استفادہ کرنے کے بجائے اس طرح تنہا کیوں بیٹھے ہیں؟) حضرت ابوذرؓ نے جواب دیا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا بُرے ہم نشینوں کے ساتھ بیٹھنے سے تنہا بیٹھنا بہتر ہے اور تنہا بیٹھنے سے نیک ہم نشینوں کے ساتھ بیٹھنا بہتر ہے نیز چپ رہنے سے بھلائی کا سکھانا بہتر ہے اور برائی سکھانے سے چپ رہنا بہتر ہے (اور ظاہر ہے کہ جو چیز چپ رہنے میں مددگار بن سکتی ہے وہ گوشہ نشینی اور تنہائی ہے۔)"

تشریح: حضرت ابوذرؓ کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت چونکہ وہ خاص رفقا اور ہمنشین یہاں موجود نہیں ہیں جن کی نیکیوں، سلامتی طبع اور پاکیزہ صحبت کا جویا ہونا چاہئے۔ اور جن پر مجھے اعتماد بھروسہ ہو سکتا ہے اس لئے میں نے یہی بہتر سمجھا ہے کہ یہاں چپ چاپ اور تنہا بیٹھا رہوں، ہاں جب ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ بیٹھتا ہی ہوں۔

خاموشی اختیار کرنا، ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے

(۵۱) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَقَامُ الرَّجُلِ بِالصَّمْتِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ

سِتِّيْنَ سَنَةً۔

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا چپ رہنے کی وجہ سے آدمی کو جو درجہ حاصل ہوتا ہے وہ ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے۔"

تشریح: لفظ "مقام" میم کے زبر کے ساتھ ہے اور میم کے پیش کے ساتھ بھی منقول ہے مطلب یہ ہے کہ آدمی کا بری باتوں سے خاموشی اختیار کرنا اور اسی خاموشی پر مداومت و ہمیشگی کے ساتھ عمل پیرا اور ثابت قدم رہنا اس شخص کی ساٹھ سال کی عبادت سے بھی بہتر و افضل ہے جو کثرت کلام اور زبان کی بے احتیاطی میں مبتلا ہو اور اس کی وہ عبادت استقامت دین کی روح سے خالی ہو۔ طیبیؒ نے مقام کے معنی اللہ کے نزدیک اس کا مرتبہ لکھے ہیں۔ اور افضل ہونے کی یہ دلیل بیان کی ہے کہ عبادات میں بہت سی آفات بھی پیش آتی ہیں اور جو شخص خاموشی اختیار کر لیتا ہے وہ ان آفات سے محفوظ و سلامت رہتا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ من کان صمت نجا یعنی جو شخص چپ رہا اس نے نجات پائی۔

حضرت شیخ عبدالحقؒ نے اس حدیث کی تشریح میں یہ لکھا ہے کہ چپ رہنے کی وجہ سے جو درجہ حاصل ہوتا ہے کبھی وہ خدا کے نزدیک ساٹھ سال کی عبادت سے بھی افضل اور فزوں تر قرار پاتا ہے کیونکہ وہ خاموشی کہ جس کے دوران اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اس کی قدرتوں اور کائنات و مخلوقات کے تئیں اس کی حکمت آفرینی و کارسازی میں غور فکر کو راہ ملے یا لطیفہ قلب کو ذکر خفی میں استغراق و انہماک دولت نصیب ہو اور روح و باطن کو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے نور سے روشنی حاصل کرنے کا موقع ملے تو یہ فکر و استغراق اگرچہ ایک ہی لمحہ و ساعت کے بقدر کیوں نہ ہو لیکن اعضاء و جوارح کی اس عبادت و طاعت سے کہیں زیادہ بہتر و افضل ہے جو ذہن و فکر کے انتشار، بے حضوری قلب اور یاد الٰہی کے ساتھ غیر خاطر جمعی کے ساتھ عمل میں آئے اگرچہ وہ عبادت و طاعت سالہا سال کے بقدر رہی کیوں نہ ہو۔

حضرت ابوذرؓ کو آنحضرت ﷺ کی چند نصائح

(۵۲) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ الْحَدِيْثَ بِطُوْلِهٖ اِلٰی اَنْ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوْصِنِیْ قَالَ اُوْصِيْكَ بِتَقْوَی اللّٰهِ فَاِنَّهٗ اَزْيَنُ لِاَمْرِكَ كُلِّهٖ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ عَلَيْكَ بِتِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ وَ ذِكْرِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَاِنَّهٗ ذِكْرٌ لَكَ فِی السَّمَاءِ وَنُوْرٌ لَكَ فِی الْاَرْضِ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ عَلَيْكَ بِطُوْلِ الصَّمْتِ فَاِنَّهٗ مَطْرَدَةٌ لِلشَّيْطَانِ وَعَوْنٌ لَكَ عَلٰی اَمْرِ دِيْنِكَ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ اِيَّاكَ وَكَثْرَةَ الضِّحْكِ فَاِنَّهٗ يُمِيْتُ الْقَلْبَ وَيَذْهَبُ بِنُوْرِ الْوَجْهِ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ قُلِ الْحَقَّ وَاِنْ كَانَ مُرًّا قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ لَا تَخَفْ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ قُلْتُ زِدْنِیْ قَالَ لِيَحْجُزْكَ عَنِ النَّاسِ مَا تَعْلَمُ مِنْ نَّفْسِكَ۔

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس کے بعد (خود ابوذرؓ نے یا ابوذر سے نقل کرنے والے راوی نے) طویل حدیث بیان کی (جو یہاں نقل نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کے یہ آخری جملے نقل کئے گئے ہیں کہ) پھر ابوذرؓ نے بیان کیا کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھ کو کوئی نصیحت فرمائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں تم کو تقویٰ اللہ یعنی اللہ سے ڈرنے کی نصیحت کرتا ہوں کیونکہ تقویٰ تمہارے تمام (دینی و دنیاوی) امور و اعمال کو بہت زیادہ زینت و آراستگی بخشنے والا ہے میں نے عرض کیا کہ میرے سے کچھ اور (نصیحت) فرمائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تلاوت قرآن اور ذکر اللہ کو اپنے لئے ضروری سمجھو، کیونکہ (تلاوت قرآن اور ذکر اللہ) تمہارے لئے آسمان میں ذکر کا موجب ہوگا اور زمین پر نور کا سبب ہوگا (یعنی جب تم تلاوت قرآن اور ذکر اللہ میں مشغولیت اختیار کرو گے تو اس کے سبب سے آسمانوں میں ملائکہ تمہارا ذکر خیر کریں گے بلکہ حق تعالیٰ بھی تمہیں یاد کریگا اور اس دنیا میں تمہارے معرفت و یقین اور

راہ ہدایت کا نور ظاہر ہو گا) میں نے عرض کیا کہ میرے لئے کچھ اور (نصیحت) فرمایئے! آپ ﷺ نے فرمایا طویل خاموشی کو اپنے اوپر لازم کر لو کیونکہ خاموشی شیطان کو دور بھگاتی ہے اور دینی امور میں تمہاری مددگار ہوتی ہے (یعنی خاموشی پر مداومت و ہمیشگی اختیار کرنے کی وجہ سے تمہیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور و فکر کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع نصیب علاوہ ازیں خاموشی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ تم اپنے آپ کو شیطان کی فتنہ خیزیوں سے محفوظ رکھ سکو گے جو زبان کے راستہ سے عملی زندگی میں سرایت کرتا ہے اور دنیا و آخرت کے زبردست نقصان و خسران میں مبتلا کر لیتا ہے دوسرے یہ کہ خاموشی تمہاری دینی و اخروی بھلائی و سعادت کا ضامن بھی بنے گی کیوں کہ جب وہ تمہیں زبان کی آفتوں سے محفوظ و سلامت رکھ کر تمہارے دل کو خدا کی طرف متوجہ رکھے گی تو یہ چیز ذکر خفی کے سبب سے تمہارے حق میں علوم و معارف اور نورانیت قلب کے حصول کا موجب ہو گی۔) میں نے عرض کیا کہ میرے لئے کچھ اور (نصیحت) فرمایئے آپ ﷺ نے فرمایا بہت زیادہ ہنسنے سے پرہیز کرو کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے اور چہرے کی موزونیت کو کھو دیتا ہے (یعنی بہت زیادہ ہنسنے ہنسانے کی وجہ سے چونکہ قلب پر غفلت و بے حسی کی تاریکی چھا جاتی ہے اور علم و معرفت کا وہ نور بجھ جاتا ہے جس پر دل کی حیات کا دارومدار ہے اس لئے بہت زیادہ ہنسنے والے کا دل گویا مردہ ہو جاتا ہے نیز جب دل غافل ہو جاتا ہے۔ اور قوائے باطن پر غفلت و بے حسی طاری ہو جاتی ہے تو طاعت و عبادت میں بھی کمی آجاتی ہے جس کی وجہ سے وہ نور رخصت ہو جاتا ہے جو عبادت کی علامت کے طور پر مؤمن کے چہرے پر ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ویسے بھی یہ بات یقینی ہے کہ دل کی مردنی چہرے کو بے نور بنا دیتی ہے کیونکہ بدن کی تروتازگی اور نورانیت دراصل حسی اور معنوی حیات پر منحصر ہے) میں نے عرض کیا کہ میرے لئے کچھ اور (نصیحت) فرمایئے آپ ﷺ نے فرمایا سچی بات کہو اگرچہ وہ کڑوی ہو (یعنی حق کے اظہار میں کبھی نہ چوکو جو بات سچی ہو اس کو ضرور کہو۔ اگر اس کی وجہ سے لوگوں کو یا خود تمہارے نفس کو ناگوار محسوس ہو) میں نے عرض کیا کہ میرے لئے کچھ اور (نصیحت) فرمایئے آپ ﷺ نے فرمایا خدا کے دین اور خدا کو ظاہر کرنے اور اس کی تائید و تقویت میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرو میں نے عرض کیا کہ میرے لئے کچھ اور (نصیحت) فرمایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا چاہئے کہ وہ چیز تمہیں لوگوں کے عیوب ظاہر کرنے سے روکے جس کو تم اپنے نفس کے بارے میں جانتے ہو یعنی جب تمہیں کسی کی عیب گوئی کا خیال آئے تو فوراً اپنے عیوب کی طرف دیکھو اور سوچو کہ خود میری ذات میں اتنے عیب ہیں تو میں دوسرے کی عیب گیری کیا کروں گو اتم خود اپنے عیوب و نقائص کی طرف متوجہ رہو اور دوسروں کی عیب گوئی سے اجتناب کرو۔"

تشریح: ہر ایک کام اور ہر بھلی بات، جو محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور اس کا تقرب حاصل کرنے کی نیت سے صادر و سرزد ہو ذکر اللہ میں داخل ہے اگر اس جملہ وَعَلَيْكَ بِتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ وَذِكْرِ اللّٰهِ یعنی سب ذکروں میں افضل لا الہ الا اللہ ہے تو کہا جائے گا کہ مذکورہ جملہ اس اسلوب بیان کا مظہر ہے کہ جس میں کوئی بات پہلے عمومی طور پر ذکر کی جاتی ہے اور پھر کسی ایسے جز کو خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے جو تمام اجزاء سے زیادہ شرف و فضیلت رکھتا ہو۔

"کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرو" کے ذریعہ گویا یہ تلقین فرمائی گئی کہ خدا کے دین کو سربلند کرنے کا جو فریضہ تم پر عائد ہوتا ہے۔ اگر اس کی انجام دہی میں تمہیں دنیا والوں سے پوری طرح منہ موڑنا پڑے تو اس میں بھی کوئی ہچکچاہٹ نہ دکھاؤ۔ اور اس بات کو ضروری سمجھو کہ تمہیں دنیا والوں کی مذمت اور تعریف سے بالکل بے پرواہ ہو کر ہر حالت میں حق و صداقت پر اور خدا کی اطاعت پر ثابت قدم رہنا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا یعنی اور دنیا والوں سے منہ موڑ کر صرف اللہ کی رضا و خوشنودی کی طرف رجوع کرو۔

"جس کو تم اپنے نفس کے بارے میں جانتے ہو۔" کا مطلب یہ ہے کہ جب تم جانتے ہو کہ خود تمہارے اندر کیا عیوب ہیں اور تمہارا نفس کن برائیوں میں مبتلا ہے تو پھر تمہارے لئے یہ قطعاً مناسب نہیں ہو گا کہ تم دوسرے کے عیوب پر نظر رکھو اور دوسروں کی برائیوں پر

انگلی اٹھاؤ! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری کو پورا کرنے کے نقطہ نظر سے تو بیشک کسی کو اس کی برائی پر ٹوک سکتے ہو اور اس کو راہ راست اختیار کرنے کی تلقین کر سکتے ہو بلکہ تم پر یہ ضروری بھی ہے کہ اگر تم کسی کو برائی میں مبتلا دیکھو تو اس کو اس برائی سے ہٹانے کی کوشش کرو۔ لیکن محض عیب جوئی اور تحقیر و تذلیل کے خیال سے کسی کی برائی پر انگلی نہ اٹھاؤ اور اس کی غیبت نہ کرو بلکہ اپنی برائیوں اور اپنے عیوب پر نظر رکھتے ہوئے خود اپنے کو سب سے زیادہ ناقص اور کمتر سمجھو کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

غافل اند ایں خلق از خود بے خبر لاجرم گویند عیب یکدگر

دیلمیؒ نے حضرت انسؓ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ:

طوبیٰ لمن شغله عليه عن عيوب الناس

"قابل مبارک باد ہے وہ شخص جس کو اس کا عیب لوگوں کی عیب گیری سے باز رکھے۔"

خاموشی اور خوش خلقی کی فضیلت

(۵۳) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا اَبَاذَرٍّ عَلٰى اَدُلُّكَ عَلٰى خَصْلَتَيْنِ هُمَا اَخَفُّ عَلَى الظَّهْرِ وَاَثْقَلُ فِي الْمِيْزَانِ قَالَ قُلْتُ بَلٰى قَالَ طُوْلُ الصَّمْتِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا عَمِلَ الْخَلَائِقُ بِمِثْلِهِمَا۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ابوذرؓ کیا میں تمہیں وہ دو خصلتیں نہ بتادوں جو مکلف انسان کی پشت پر یعنی اس کی زبان کے اوپر بہت ہلکی ہیں اعمال کے ترازو میں بہت بھاری ہیں۔ حضرت ابوذرؓ نے بیان کیا کہ میں نے سن کر عرض کیا کہ ہاں ضرور بتائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا معرفت الہیہ اور نظام قدرت میں غور و فکر کے لئے طویل خاموشی اور خوش خلقی قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، مخلوق کے لئے ان دونوں خصلتوں سے بہتر کوئی کام نہیں ہے۔"

تشریح: چپ رہنا اور خوش خلقی اختیار کرنا یہ دونوں خصلتیں اس اعتبار سے بہت آسان اور ہلکی ہیں کہ خاموش رہنے میں کوئی محنت و مشقت برداشت کرنا نہیں پڑتی بلکہ ایک طرح سے راحت ہی ملتی ہے کیونکہ زبان ہلانے اور الفاظ کو ترتیب دے کر جملے ادا کرنے میں ظاہر و باطن کی مشقت اٹھانا پڑتی ہے اسی پر خوش خلقی کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نرم خوئی اور خوش مزاجی اور خندہ روئی میں راحت و سکون اور آسانی و نرمی حاصل ہوتی ہے بخلاف سخت خوئی، تند مزاجی اور جدال و نزاع کے کہ ان میں سراسر محنت و مشقت ہے۔

لعنت کرنے کی برائی

(۵۴) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاَبِيْ بَكْرٍ وَهُوَ يَلْعَنُ بَعْضَ رَقِيْقِهٖ فَالْتَفَتَ اِلَيْهِ فَقَالَ لَعَّانِيْنَ وَصِدِّيْقِيْنَ كَلَّا وَرَبِّ الْكَعْبَةِ فَاَعْتَقَ اَبُوْبَكْرٍ يَوْمَئِذٍ بَعْضَ رَقِيْقِهٖ ثُمَّ جَاءَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَا اَعُوْدُ۔ رَوَى الْبَيْهَقِيُّ الْاَحَادِيْثَ الْخَمْسَةَ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس سے ...... گزر رہے تھے تو دیکھا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ اپنے کسی غلام پر لعنت کر رہے ہیں۔ آنحضرت ﷺ ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اور فرمایا کہ بھلا تم نے لعنت کرنے والے اور صدیقین کو بھی دیکھا ہے؟ (یعنی کیا تم نے کبھی بھی کوئی ایسا شخص دیکھا کہ جس میں بیک وقت یہ دو صفتیں یعنی لعانیت اور صدیقیت پائی جاتی ہوں حاصل یہ کہ جو شخص صدیقیت کے مقام پر فائز ہو وہ لعنت کرنے والا نہیں ہو سکتا جیسا کہ یہ حدیث گزر چکی ہے کہ لا ینبغی لصدیق ان یکون لعانا یعنی صدیق کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ لعنت کرنے والا ہو) نہیں رب کعبہ کی قسم یہ دونوں باتیں کسی ایک شخص میں ہرگز جمع نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے یہ ارشاد سن کر اپنی اس تقصیر کے کفارہ کے طور پر اس دن اپنے بعض غلاموں کو آزاد کیا اور پھر معذرت خواہی کے لئے نبی

کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں آئندہ کبھی ایسا کام نہیں کروں گا (یعنی کسی کو لعنت نہیں کروں گا) حضرت عمران بن حطان کی روایت سے لے کر اس حدیث تک کی ان پانچوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

زبان کی ہلاکت خیزی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کا خوف

۵۵ وَعَنْ اَسْلَمَ قَالَ اِنَّ عُمَرَ دَخَلَ يَوْمًا عَلٰى اَبِىْ بَكْرِنِ الصِّدِّيْقِ وَهُوَ يَجْبِذُ لِسَانَهٗ فَقَالَ عُمَرُ مَهْ غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ فَقَالَ لَهٗ اَبُوْبَكْرٍ اِنَّ هٰذَا اَوْرَدَنِى الْمَوَارِدَ۔ (رواه مالک)

"اور حضرت اسلمؒ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر فاروقؓ امیرالمؤمنین حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو (دیکھا کہ) حضرت ابوبکرؓ اپنی زبان کو کھینچ رہے ہیں (یعنی اپنی زبان کے تئیں اس قدر غیظ و غضب کا اظہار کر رہے تھے کہ اس کو انگلیوں سے پکڑ پکڑ کر کھینچ رہے تھے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کو نکال باہر پھینک دیں گے حضرت عمرؓ نے یہ دیکھ کر کہا کہ ٹھہریئے، ایسا نہ کیجئے! اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ (یہ زبان اسی سزا کی مستوجب ہے کیونکہ) اس نے مجھے ہلاکت کی جگہوں میں ڈالا ہے" (مالک)

وہ چھ امور جو جنّت کے ضامن ہیں

۵۶ وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ اَنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اضْمَنُوْا لِىْ سِتًّا مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَضْمَنْ لَكُمُ الْجَنَّةَ اُصْدُقُوْا اِذَا حَدَّثْتُمْ وَاَوْفُوْا اِذَا وَعَدْتُّمْ وَاَدُّوْا اِذَا اؤْتُمِنْتُمْ وَاحْفَظُوْا فُرُوْجَكُمْ وَغُضُّوْا اَبْصَارَكُمْ وَكُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ۔

"اور حضرت عبادہ ابن صامت روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم لوگ اپنے بارے میں مجھے چھ چیزوں کی ضمانت دو یعنی چھ باتوں پر عمل کرنے کا عہد کر لو تو میں نجات پائے ہوئے اور صالحین کے ساتھ تمہارے جنّت میں جانے کا ضامن بنتا ہوں ① جب بھی بولو سچ بولو ② وعدہ کرو تو پورا کرو۔ ③ تمہارے پاس امانت رکھی جائے تو امانت کو ادا کرو۔ ④ اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرو یعنی حرام کاری سے بچو۔ ⑤ اپنی نگاہ کو محفوظ رکھو یعنی اس چیز کی طرف نظر اٹھانے سے پرہیز کرو جس کو دیکھنا جائز نہیں۔ ⑥ اپنے ہاتھوں پر قابو رکھو یعنی اپنے ہاتھوں کو ناحق مارنے اور حرام و مکروہ چیزوں کو پکڑنے سے باز رکھو۔ یا یہ کہ اپنے آپ کو ظلم و تعدی کرنے سے باز رکھو۔"

اچھے اور برے بندے کون ہیں؟

۵۷ وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ غَنْمٍ وَاَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ اَنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خِيَارُ عِبَادِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ اِذَا رُاُوْا ذُكِرَ اللّٰهُ وَشِرَارُ عِبَادِ اللّٰهِ الْمَشَّاءُوْنَ بِالنَّمِيْمَةِ الْمُفَرِّقُوْنَ بَيْنَ الْاَحِبَّةِ الْبَاغُوْنَ الْبُرَاءَ الْعَنَتَ۔ رَوَاهُمَا اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِىُّ فِىْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن غنمؓ اور اسماءؓ بنت یزید، راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ اللہ کے بہترین بندے وہ ہیں جن کو دیکھ کر خدا یاد آ جائے اور اللہ کے بدترین بندے وہ ہیں جو لوگوں میں چغلی کھاتے پھرتے ہیں (جس سے ان کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا) کہ وہ دوستوں کے درمیان نفاق و جدائی ڈال دیں اور پاکیزہ لوگوں کے دامن پر فساد اور خرابی اور زنا کاری کے چھینٹے ڈالیں یعنی خدا کے جو نیک بندے فتنہ و فساد، گناہ و معصیت اور کسی عیب سے پاک و منزہ ہوتے ہیں۔ ان پر فتنہ و فساد اور گناہ و معصیت جیسے زنا کاری وغیرہ کا بہتان لگاتے ہیں اور اس طرح ان کو ہلاکت و مشقت اور دشواریوں میں مبتلا کرتے ہیں۔" (احمدؒ و بیہقیؒ)

تشریح: اس حدیث میں بہترین لوگوں کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ خدا کے وہ نیک و صالح اور عبادت گزار بندے جو اللہ رب العزت کے ساتھ اپنے کمال تعلق و اختصاص کی بنا پر ایسے درجے پر فائز ہو جاتے ہیں کہ ان کے احوال و کردار، عادات و اطوار اور حرکات و سکنات پر انوار و آثار الٰہی ہویدا ہو جاتے ہیں اور ان کے چہرے پر عبادت گزاری اور اتباع دین و شریعت کی وہ علامتیں ظاہر ہوتی ہیں کہ جب ان کے

جمال پر نظر پڑتی ہے تو بے ساختہ خدا یاد آجاتا ہے اور دل پکار اٹھتا ہے کہ یہی وہ نیک بندے جو کامل عبودیت کے حامل اور کائنات انسانی کا خلاصہ اور انوار الٰہی کے مظہر ہیں۔

بعض حضرات نے خدا یاد آجانے کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ خدا کے ایسے نیک و صالح بندوں کو دیکھنا گویا ذکر الٰہی میں مشغول ہونا ہے جیسا کہ علماء نے لکھا ہے کہ عالم دین کے چہرے پر نظر ڈالنا، عبادت اور عین سعادت ہے اور اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ بسا اوقات کسی مرد صالح اور شیخ کامل کے چہرے پر نظر پڑتے ہی باطن میں ایسی نورانیت محسوس ہوتی ہے جس سے دل روشن ہو جاتا ہے! یہ بات حدیث سے بھی ثابت ہے چنانچہ حضرت علیؓ کے بارے میں فرمایا گیا کہ النظر علی وجہ علی عبادۃ یعنی علیؓ کے چہرہ پر نظر کرنا عبادت ہے۔ نیز منقول ہے کہ جب حضرت علیؓ گھر سے نکلتے تھے اور لوگوں کی نظر ان کے چہرہ پر نور پر پڑتی تھی تو یہ الفاظ ان کی زبان پر آجاتے لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ مَا اَشْرَفَ ھٰذَا الْفَتٰی، لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ مَا اَکْرَمَ ھٰذَا الْفَتٰی، لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ مَا اَعْلَمَ ھٰذَا الْفَتٰی، لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ مَا اَشْجَعَ ھٰذَا الْفَتٰی گویا حضرت علی کو دیکھنا کلمہ توحید کے ورد کا باعث بنتا تھا۔

غیبت مفسد روزہ ہے

(۵۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَجُلَیْنِ صَلَّیَا صَلٰوۃَ الظُّھْرِ اَوِ الْعَصْرِ وَکَانَ صَائِمَیْنِ فَلَمَّا قَضَی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الصَّلٰوۃَ قَالَ اَعِیْدُوْا وَضُوْءَ کُمَا وَصَلٰوتَکُمَا وَامْضِیَا فِیْ صَوْمِکُمَا وَاقْضِیَاہُ یَوْمًا اٰخَرَ قَالَ لِمَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اَغْتَبْتُمْ فُلَانًا۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) دو آدمیوں نے جو روزہ دار تھے (نبی کریم ﷺ کے پیچھے) ظہر یا عصر کی نماز پڑھی جب نبی کریم ﷺ نماز پڑھ چکے تو ان دونوں سے فرمایا کہ تم دونوں دوبارہ وضو کرو اپنی اس نماز کو لوٹاؤ اور اپنے اس روزے کو پورا کرو اور اس کے بدلے میں احتیاطاً دوسرے دن روزہ رکھ لو۔ ان دونوں نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! ایسا کیوں؟ یعنی وضو، نماز اور روزے کو لوٹانا کس سبب سے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس لئے کہ تم نے فلاں شخص کی غیبت کی ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیبت وضو اور روزے کو توڑ دیتی ہے لیکن علماء نے لکھا ہے کہ یہ حدیث دراصل غیبت کی شدید مذمت اور غیبت کرنے والے کے حق میں سخت ترین زجر و تنبیہ کے طور پر ارشاد ہوئی ہے ورنہ حقیقت میں غیبت سے روزہ اور وضو ٹوٹتا نہیں تاہم غیبت کی وجہ سے وضو اور روزہ کا کمال و ثواب ضرور کھویا جاتا ہے لیکن حضرت سفیان ثوریؒ کے نزدیک غیبت، مفسد روزہ ہے۔ بہر حال حدیث سے یہ بات یقیناً واضح ہوتی ہے کہ غیبت کی قباحت و برائی بہت زیادہ ہے اور احتیاط و تقویٰ کا تقاضا یہی ہے کہ اگر غیبت صادر ہو جائے تو وضو کی تجدید کرنی چاہئے بلکہ علماء نے بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص بہت زیادہ ہنسے یا کسی نے بہت زیادہ لغو باتیں کیں تو اس کے لئے مستحب ہوگا کہ وہ وضو کرلے تاکہ وہ ظلمت زائل ہو جائے جو بہت زیادہ ہنسنے یا بہت زیادہ لایعنی باتیں کرنے سے اس کے باطن پر طاری ہو گئی ہے نیز روزہ دار کو چاہئے کہ غیبت سے پوری طرح اجتناب کرے۔

غیبت زنا سے بدتر ہے

(۵۹) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَجَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْغِیْبَۃُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَکَیْفَ الْغِیْبَۃُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ لَیَزْنِیْ فَیَتُوْبُ فَیَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ فَیَتُوْبُ فَیَغْفِرُ اللّٰہُ لَہٗ وَاِنَّ صَاحِبَ الْغِیْبَۃِ لَا یُغْفَرُ لَہٗ حَتّٰی یَغْفِرَ ھَالَہٗ صَاحِبُہٗ وَفِیْ رِوَایَۃِ اَنَسٍ قَالَ صَاحِبُ الزِّنَا یَتُوْبُ وَصَاحِبُ الْغِیْبَۃِ لَیْسَ لَہٗ تَوْبَۃٌ۔ رَوَی الْبَیْھَقِیُّ الْاَحَادِیْثَ الثَّلٰثَۃَ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابوسعیدؓ اور حضرت جابرؓ دونوں بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے بیان فرمایا غیبت کرنا زنا کرنے سے زیادہ سخت

برائی ہے۔ صحابہؓ نے یہ سن کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! غیبت زنا سے زیادہ سخت برائی کس طرح سے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس طرح کہ جب آدمی زنا کرتا ہے تو توبہ کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیتا ہے اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ، توبہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو بخش دیتا ہے لیکن غیبت کرنے والے کو اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا جب تک کہ اس کو وہ شخص معاف نہ کردے جس کی اس نے غیبت کی ہے یعنی زنا کاری چونکہ اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی ہے اس لئے وہ ان کی توبہ قبول کرلیتا ہے اور اس کو بخشدیتا ہے جبکہ غیبت کرنا حق العباد سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ غیبت کرنے والے کو اس وقت تک نہیں بخشتا جب تک وہ شخص اس کو معاف نہ کردے جس کی اس نے غیبت کی ہے اور حضرت انسؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا زنا کرنے والا توبہ کرتا ہے اور غیبت کرنے والے کے لئے توبہ نہیں ہے (ان تینوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔")

تشریح: "اور غیبت کرنے والے کے لئے توبہ نہیں ہے" غالباً اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ جو شخص زنا میں مبتلا ہو جاتا ہے اس کے دل پر خدا کا خوف طاری ہو جاتا ہے اور اس تصور سے لرزنے لگتا ہے۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مواخذہ کرلیا تو نجات کا راستہ نہیں ملے گا اس لئے وہ اپنے اس فعل شنیع پر نادم و شرمسار ہو کر توبہ کرتا ہے جب کہ غیبت اگرچہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑے گناہ کی چیز ہے مگر غیبت کرنے والا اس کو ایک ہلکی چیز سمجھتا ہے کیونکہ جب کوئی برائی عام ہو جاتی ہے تو اس کی قباحت دل سے نکل جاتی ہے اور لوگ اس میں مبتلا ہو جانے کی برائی کو محسوس نہیں کرتے یا یہ بات بھی بعید از امکان نہیں ہو سکتی ہے کہ غیبت کرنے والا غیبت کو سرے سے کوئی برا فعل ہی نہ سمجھے بلکہ اس کو جائز و حلال جانے اور اس طرح وہ کفر کے بھنور میں پھنس جائے۔ اوریا اس جملہ کے یہ معنی ہیں کہ غیبت کرنے والا توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ بذات خود کارگر نہیں ہوتی بلکہ اس توبہ کا صحیح و مقبول ہونا اس شخص کی رضامندی اور اس کی طرف سے معاف کردیئے جانے پر موقوف ہوتا ہے جس کی اس نے غیبت کی ہے چنانچہ اوپر کی حدیث سے یہی واضح ہوتا ہے۔

غیبت کا کفارہ

(۶۰) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ كَفَّارَةِ الْغِيْبَةِ اَنْ تَسْتَغْفِرَ لِمَنِ اغْتَبْتَهٗ تَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا وَلَهٗ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي الدَّعْوَاتِ الْكَبِيْرِ وَقَالَ فِيْ هٰذَا الْاِسْنَادِ ضُعْفٌ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ تم اس شخص کی مغفرت و بخشش کی دعا مانگو جس کی تم نے غیبت کی ہے اور اس طرح دعا مانگو کہ اے اللہ ہم کو اور اس شخص کو کہ جس کی میں نے غیبت کی ہے بخش دے! اس روایت کو بیہقیؒ نے اپنی کتاب دعوات کبیر میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند میں ضعف ہے۔"

تشریح: دعاو مغفرت کے الفاظ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ غیبت کرنے والا پہلے خواہ اپنے حق میں مغفرت کی دعا کرے اس میں نکتہ یہ ہے کہ استغفار کرنے والے کے بارے میں حق تعالیٰ کا وعدہ یہ ہے کہ اس کی دعاو مغفرت کو قبول کیا جائے گا لہٰذا غیبت کرنے والا جب پہلے خود اپنے حق میں استغفار کرے گا اور اس کے نتیجہ میں وہ اس معصیت سے پاک ہو جائے گا تو دوسرے کے حق میں بھی اس کی دعاء مغفرت قبول ہوگی۔

"اغفر لنا" میں جمع متکلم کا صیغہ اس صورت کے اعتبار سے ہے جب کہ غیبت کا صدور بھی لوگوں سے ہوا ہو یعنی اگر غیبت کرنے والے کئی لوگ ہوں تو سب اس طرح دعا مانگیں اور اگر غیبت کرنے والا ایک شخص ہو تو پھر "اغفرلی" کے الفاظ استعمال ہونگے یا یہ مراد ہے کہ استغفار کرنے والا اپنی دعاء مغفرت میں تمام مسلمانوں کو شامل کرے اس صورت میں اس دعا کے معنی یہ ہونگے کہ اے اللہ ہم سب مسلمانوں کو اور خاص طور پر اس شخص کو کہ جس کی میں نے غیبت کی ہے بخش دے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغفرت کی دعا کرنا اس صورت سے متعلق ہے جبکہ اس کی غیبت کی خبر اس شخص کو نہ پہنچی ہو جس کی غیبت

کی گئی ہے اور اگر یہ صورت ہو کہ جس شخص کی غیبت کی گئی ہے اس کو معلوم ہو گیا کہ فلاں شخص نے میری یہ غیبت کی ہے تو غیبت کرنے والے کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس شخص سے اپنے آپ کو معاف کرائے بایں طور کہ پہلے اس کو یہ بتائے کہ میں نے تمہاری غیبت میں اس طرح کہا ہے اور پھر اس سے اپنے آپ کو معاف کرائے اور اگر غیبت کرنے والا کسی مجبوری اور عذر کی بنا پر ایسا نہ کر سکے تو پھر یہ ارادہ رکھے کہ جب بھی ہو سکے گا۔ اس سے اپنے آپ کو معاف کراؤں گا۔ چنانچہ اس کے بعد جب بھی وہ اپنے آپ کو اس سے معاف کرا لے گا اس ذمہ داری سے بری ہو جائے گا۔ اور اس غیبت کے سلسلہ میں اس پر کوئی حق و مواخذہ باقی نہیں رہ جائے گا، ہاں اگر وہ اپنے آپ کو معاف کرانے سے بالکل عاجز رہا۔ بایں سبب کہ جس شخص کی اس نے غیبت کی ہے۔ وہ مثلاً مر گیا ہے یا اتنی دور رہائش پذیر ہے کہ، اس سے ملاقات کا کوئی امکان نہیں ہے تو اس صورت میں اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت و بخشش کا طلب گار ہو اور اس کے فضل و کرم سے یہ امید رکھے کہ وہ اس شخص کو اس کے تئیں راضی کر دے گا۔

فقیہ ابواللیثؒ نے کہا ہے کہ علماء نے غیبت کرنے والے کی توبہ کے بارے میں کلام کیا ہے کہ آیا اس کے لئے یہ جائز ہے یا نہیں؟ کہ اس نے جس شخص کی غیبت کی ہے اس سے معاف کرائے بغیر توبہ کرے چنانچہ بعض علماء نے اس کو جائز کہا ہے جب کہ ہمارے نزدیک اس کی صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ اگر اس کی غیبت کی خبر اس شخص کو پہنچ گئی ہے کہ جس کی اس نے غیبت کی ہے تو اس کی توبہ بس یہی ہے کہ وہ اس سے معاف کرائے اور دوسرے یہ کہ اگر اس شخص کو اس غیبت کی خبر پہنچی ہے تو اس صورت میں وہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت و بخشش کی دعا مانگے اور دل میں یہ عہد کرلے کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔

بیہقیؒ نے اس روایت کو گویا ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن اس کا ضعیف ہونا حدیث کے اصل مفہوم پر اثر انداز نہیں ہوتا کیونکہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث سے بھی استدلال کرنا کافی ہو جاتا ہے علاوہ ازیں جامع صغیر میں بھی اس طرح کی ایک حدیث حضرت انسؓ سے منقول ہے جو اس روایت کو تقویت پہنچاتی ہے اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ کفارة من الغيبة ان تستغفر له یعنی غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ اس شخص کے حق میں مغفرت کی دعا کی جائے جس کی غیبت کی گئی ہے۔

باب الوعد

وعدہ کا بیان

"وَعْدٌ" کے معنی ہیں قول و قرار کرنا، وعدہ کرنا یعنی کسی سے مثلاً یہ کہنا کہ تمہارا فلاں کام کر دوں گا یا تمہارے پاس آؤں گا اور یا تمہارے ساتھ کھانا کھاؤں گا وغیرہ وغیرہ...... واضح رہے کہ لفظ وعد خیر اور شر دونوں سے متعلق جملوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس جملہ میں خیر اور شر کا لفظ مذکور ہو جیسے کہا جاتا ہے وعدته خيرا او وعدته شرا اور اگر خیر یا شر کا لفظ مذکور نہ ہو تو خیر میں وعد کا لفظ استعمال کیا جائے گا اور شر میں وعید اور ایعاد کا لفظ۔

ایفاء عہد اور وعدے کو پورا کرنا انسانیت کا مظہر اور اسلامی اخلاق و آداب کا ایک بنیادی تقاضا ہے اس کے برخلاف بدعہدی اور وعدہ خلافی ایک بہت بڑا عیب ہے جو شخص اپنا عہد پورا نہ کرے اور اپنا وعدہ وفا نہ کرے وہ اسلام اور معاشرہ دونوں کی نظر میں سخت ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے چنانچہ اس باب میں اسی موضوع سے متعلق احادیث نقل ہوں گی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

جو شخص اپنا وعدہ پورا کرنے سے پہلے مر جائے تو اس کا جانشین اس کا وعدہ پورا کرے

① عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَمَّا مَاتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَاءَ اَبَابَكْرٍ مَالٌ مِنْ قِبَلِ الْعَلَاءِ بْنِ الْحَضْرَمِيِّ فَقَالَ

اَبُوْبَکْرٍ مَنْ کَانَ لَہٗ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دَیْنٌ اَوْ کَانَتْ لَہٗ قِبَلَہٗ عِدَۃٌ فَلْیَأْتِنَا قَالَ جَابِرٌ فَقُلْتُ وَعَدَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یُّعْطِیَنِیْ ھٰکَذَا وَھٰکَذَا وَھٰکَذَا فَبَسَطَ یَدَیْہِ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ قَالَ جَابِرٌ فَحَثٰی لِیْ حَثْیَۃً فَعَدَدْتُھَا فَاِذَا ھِیَ خَمْسُ مِائَۃٍ وَقَالَ خُذْ مِثْلَیْھَا۔ (متفق علیہ)

"حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ جب رسول کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے اور خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس علاء بن حضرمیؓ کے ہاں سے مال آیا جن کو آنحضرت ﷺ نے بحرین کا عامل مقرر کیا تھا تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ جس شخص کا آنحضرت ﷺ پر قرض ہو یا جس شخص سے آنحضرت ﷺ نے کچھ دینے کا وعدہ کیا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ ہمارے پاس آئے۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ یہ سن کر میں نے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے اتنا اور اتنا دینے کا مجھ سے وعدہ فرمایا تھا (یہ کہہ کر) حضرت جابرؓ نے اپنے دونوں ہاتھ تین مرتبہ کھولے یعنی حضرت جابرؓ نے اپنے ہاتھوں کو تین مرتبہ کھول کھول کر دکھایا اور واضح کیا کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ مال آنے پر میں تمہیں دونوں ہاتھ بھر بھر کر دوں گا۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ پس حضرت ابوبکرؓ نے ایک بار اپنے دونوں (دونوں ہاتھ) بھر کر مجھ کو زر نقد عطا فرمایا میں نے اس کو شمار کیا تھا تو وہ تعداد میں پانچ سو تھے پھر انہوں نے فرمایا کہ اسی طرح دو مرتبہ اور لے لو یعنی ایک ہزار گن کر اور لے لو تاکہ کم و بیش نہ ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

آنحضرت ﷺ کے وعدہ کا حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے ایفاء

(۲) وَعَنْ اَبِیْ جُحَیْفَۃَ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَبْیَضَ قَدْ شَابَ وَکَانَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِیٍّ یُشْبِھُہٗ وَاَمَرَلَنَا بِثَلٰثَۃَ عَشَرَ قَلُوْصًا فَذَھَبْنَا نَقْبِضُھَا فَاَتَانَا مَوْتُہٗ فَلَمْ یُعْطُوْنَا شَیْئًا فَلَمَّا قَامَ اَبُوْبَکْرٍ قَالَ مَنْ کَانَتْ لَہٗ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عِدَۃٌ فَلْیَجِئْ فَقُمْتُ اِلَیْہِ فَاَخْبَرْتُہٗ فَاَمَرَلَنَا بِھَا۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوجحیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ آپ ﷺ کا رنگ سرخی مائل سفید تھا اور آپ ﷺ پر بڑھاپا ظاہر ہو چکا تھا اگرچہ آپ ﷺ کے سر اور داڑھی کے بال سفید نہیں تھے اور حضرت حسن ابن علیؓ جسم کے اوپر کے حصہ کے اعتبار سے آنحضرت ﷺ سے بہت مشابہ تھے آنحضرت ﷺ نے ہماری جماعت کو تیرہ جوان اونٹنیاں دیئے جانے کا حکم فرمایا تھا چنانچہ ہم ان اونٹنیوں کو لینے گئے تو اسی دوران ہمیں آنحضرت ﷺ کی وفات کی خبر ملی اور ہمیں کچھ بھی نہیں دیا گیا پھر جب حضرت ابوبکر صدیقؓ (خلیفہ اول قرار پائے اور خطبہ دینے کے لئے آ کھڑے ہوئے تو) فرمایا کہ جس شخص سے رسول کریم ﷺ نے کچھ دینے کا وعدہ فرمایا ہو اس کو چاہئے کہ وہ ہمارے پاس آئے۔ میں (حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ ارشاد سن کے ان کے سامنے جا کھڑا ہوا اور ان کو اس بارے میں بتایا کہ آنحضرت ﷺ نے ہمیں تیرہ اونٹنیاں دینے کا وعدہ فرمایا تھا چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ہمیں تیرہ اونٹنیاں دینے کا حکم فرمایا۔" (ترمذیؒ)

ایفاء عہد کی عملی تعلیم

(۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ اَبِی الْحَمْسَاءِ قَالَ بَایَعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَبْلَ اَنْ یُّبْعَثَ وَبَقِیَتْ لَہٗ بَقِیَّۃٌ فَوَعَدْتُّہٗ اَنْ اٰتِیَہٗ بِھَا فِیْ مَکَانِہٖ فَنَسِیْتُ فَذَکَرْتُ بَعْدَ ثَلٰثٍ فَاِذَا ھُوَ فِیْ مَکَانِہٖ فَقَالَ لَقَدْ شَقَقْتَ عَلَیَّ اَنَا ھٰھُنَا مُنْذُ ثَلٰثٍ اَنْتَظِرُکَ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن ابوحمساءؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے نبی ہونے سے پہلے ایک مرتبہ میں نے آپ سے کسی چیز کو خریدا اور اس کے کچھ حصہ کی ادائیگی مجھ پر باقی رہ گئی اور میں نے وعدہ کیا کہ میں بقیہ قیمت لے کر اسی جگہ (جہاں آپ تشریف فرما تھے یا جہاں میں نے وہ چیز

خریدی تھی) آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گا لیکن میں اس وعدہ کو بھول گیا اور پھر تیسرے دن یہ بات یاد آئی کہ میں نے آپ ﷺ سے کوئی وعدہ کیا تھا جبھی میں وہ بقیہ قیمت لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ ﷺ اسی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں اور مجھے دیکھ کر فرمایا کو تم نے تو مجھ کو بڑی زحمت میں مبتلا کر دیا میں تین دن سے اسی جگہ بیٹھا ہوا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: علماء نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا اتنے طویل انتظار کی اس مشقت و زحمت کو برداشت کرنا اپنی چیز کی بقیہ قیمت وصول کرنے کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ اس احساس کے تحت تھا کہ جب عبداللہؓ نے بقیہ قیمت لے کر یہاں آنے کا وعدہ کیا تھا اور ان کے وعدے کے جواب میں گویا میری طرف سے بھی یہ وعدہ تھا کہ میں یہاں ہوں گا تو جب تک وہ یہاں نہ آئیں ایفاء وعدہ کی خاطر مجھے یہاں بیٹھ کر انتظار کرنا چاہئے اس اعتبار سے آپ ﷺ نے اپنے اس عمل کے ذریعہ اُمت کو یہ تعلیم دی کہ وعدہ کو بہرصورت پورا کرنا چاہئے خواہ اس کے لئے کتنی ہی زحمت کیوں نہ برداشت کرنا پڑے واضح رہے کہ دین اسلام سے پہلے بھی تمام ادیان میں وعدے کو پورا کرنے کا حکم تھا اور سارے رسول پیغمبر ایفاء وعدہ کی محافظت کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مدح و تعریف میں یوں فرمایا ہے۔ وَاِبْرَاهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى۔

ایفاء وعدہ کی نیت ہو اور وہ وعدہ پورا نہ ہو سکے تو گناہ نہیں ہو گا

(۴) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا وَعَدَ الرَّجُلُ اَخَاهُ وَمِنْ نِيَّتِهٖ اَنْ يَفِيَ لَهٗ فَلَمْ يَفِ وَلَمْ يَجِئْ لِلْمِيْعَادِ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت زید ابن ارقمؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب کوئی آدمی اپنے کسی بھائی سے کوئی وعدہ کرے اور اس کے تئیں اس وعدہ کو پورا کرنے کا قصد رکھتا ہو مگر کسی عذر کے سبب اس وعدہ کو پورا نہ کر سکے اور وقت موعود پر نہ آئے تو گنہ گار نہیں ہو گا۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص وعدہ کو پورا کرنے کی نیت رکھنے کے باوجود اس وعدہ کو پورا نہ کر سکے تو وہ گنہ گار نہیں ہوتا اس سے یہ بات بھی سمجھی جاتی ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی وعدہ کیا اور نیت یہ رکھی کہ اس وعدہ کو پورا نہیں کروں گا تو وہ گنہ گار ہو گا خواہ اس وعدے کو پورا کرے یا پورا نہ کرے کیونکہ زبان سے وعدہ کرنا اور دل میں اس کے خلاف کرنے کا ارادہ رکھنا منافقین کی خصلت ہے۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ بغیر کسی اور بلا کسی امر مانع کے وعدہ خلافی کرنا حرام ہے اور مذکورہ بالا ارشاد گرامی کی مراد بھی یہی ہے مجمع البحار میں لکھا ہے کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ممنوع کام کا وعدہ کرے تو اس وعدہ کو پورا نہیں کرنا چاہئے۔

ایفاء وعدہ واجب ہے یا مستحب؟: آئمہ فقہ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ وعدہ کو پورا کرنا واجب ہے یا مستحب؟ چنانچہ جمہور علماء بشمول حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور حضرت امام شافعی کا قول یہ ہے کہ وعدہ کو پورا کرنا مستحب ہے اور پورا نہ کرنا سخت مکروہ ہے۔ البتہ گناہ نہیں اس کے برخلاف ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ وعدہ کو پورا کرنا واجب ہے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ بھی اسی جماعت میں شامل ہیں۔

منقول ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا معمول تھا کہ جب کوئی وعدہ کرتے تو انشاء اللہ کہہ لیتے تھے اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں بھی منقول ہے کہ آپ ﷺ لفظ عسی فرماتے تھے۔

بچے سے بھی وعدہ کرو تو اس کو پورا کرو

(۵) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَامِرٍ قَالَ دَعَتْنِيْ اُمِّيْ يَوْمًا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاعِدٌ فِيْ بَيْتِنَا فَقَالَتْهَا تَعَالَ

أُعْطِيْكَ فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَرَدْتِ اَنْ تُعْطِيْهِ قَالَ اَرَدْتُ اَنْ اُعْطِيَهُ تَمْرًا فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَا اِنَّكِ لَوْ لَمْ تُعْطِيْهِ شَيْئًا كُتِبَتْ عَلَيْكِ كَذِبَةٌ۔ (رواہ ابوداؤد والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت عبداللہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میری والدہ نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا کہ لو آؤ! میں تمہیں (ایک چیز) دوں گی اس وقت رسول کریم ﷺ ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے (جب میری والدہ نے مجھ سے کہا تو) رسول کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم نے اس کو کیا چیز دینے کا ارادہ کیا تھا؟ انہوں نے کہا کہ میں اس کو ایک کھجور دینا چاہتی تھی رسول کریم ﷺ نے (یہ سن کر) ان سے فرمایا کہ یاد رکھو اگر تم اس کو کچھ نہ دیتیں تو تمہارے نامہ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا۔" (ابوداؤدؒ، بیہقیؒ)

تشریح: یہ واقعہ حضرت عبداللہ ابن عامرؓ کے بچپن کا ہے چنانچہ ان کی والدہ نے ان کو بلایا اور کوئی چیز دینے کا وعدہ کیا تو آنحضرت ﷺ یہ سمجھے کہ اپنے بچے کو محض بہلانے کے لئے ادھر ادھر کی باتیں کی جاتی ہیں اس کو اس کی مطلوبہ چیز یا کچھ اور دینے کا جھوٹ موٹ وعدہ کیا جاتا ہے یا اس کو ڈرانے دھمکانے کے لئے خوفناک چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے اور موقع پر ان باتوں کا حقیقی مفہوم مراد نہیں ہوتا لہٰذا آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہؓ کی والدہ کو اس بارے میں آگاہ کرنے کے لئے مذکورہ سوال کیا۔

کسی شرعی اور حقیقی عذر کی بناء پر وعدہ خلافی کرنا نامناسب نہیں

⑥ عَنْ زَيْدِ ابْنِ اَرْقَمَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ وَعَدَ رَجُلًا فَلَمْ يَاْتِ اَحَدُهُمَا اِلَى وَقْتِ الصَّلٰوةِ ذَهَبَ الَّذِيْ جَآءَ لِيُصَلِّيَ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ۔ (رواہ رزین)

"حضرت زید ابن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی آدمی سے کہیں ملنے کا وعدہ کرے اور ان دونوں میں سے کوئی ایک نماز کے وقت تک وہاں نہ پہنچے اور وہ شخص نماز پڑھنے کے لئے چلا جائے جو وہاں آ گیا تھا تو وہ گناہگار نہیں ہوگا۔"

(رزینؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کی صورت وضاحت یہ ہے کہ مثلاً دو آدمیوں نے اپنے آپس میں ایک دوسرے سے یہ وعدہ کیا کہ ہم دونوں فلاں جگہ پہنچ کر ایک دوسرے سے ملیں گے اس وعدہ کے مطابق ان دونوں میں سے کوئی ایک مقررہ جگہ پر پہنچ کر دوسرے آدمی کی انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اب مزید انتظار نہ کرے اور نماز کے لئے چلا جائے تو وہ وعدہ خلاف نہیں کہلائے گا اور اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا کیونکہ نماز کے لئے جانا ضرورت دین میں سے ہے ہاں اگر وہ نماز کا وقت آنے سے پہلے ہی وہاں سے اٹھ کر چلا جائے تو بیشک اس کو وعدہ خلاف کہا جائے گا اور وعدہ خلافی کی برائی اس کے ذمہ ہوگی اسی طرح اگر کوئی ضروری امر مانع پیش آئے جیسے کھانے پینے کا وقت ہو گیا ہو یا پیشاب و پاخانہ کی حاجت لاحق ہو گئی ہو یا اسی طرح کا کوئی اور حقیقی عذر پیش آ گیا ہو تو اس صورت میں بھی مزید انتظار کئے بغیر پہلے جانا جائز ہوگا۔

بَابُ الْمِزَاحِ
خوش طبعی کا بیان

مِزَاحٌ میم کے زیر کے ساتھ مصدر ہے جس کے معنی ہیں خوش طبعی کرنا، ہنسی مذاق کرنا اور میم کے پیش کے ساتھ یعنی مُزَاحٌ اسم مصدر ہے جس کے معنی مطایبہ یعنی خوش طبعی و ظرافت کے ہیں۔

عربی میں لفظ مزاح کا اطلاق اس خوش طبعی اور ہنسی مذاق پر ہوتا ہے جس میں کسی کی دل شکنی اور ایذاء رسانی کا پہلو نہ ہو اس کے برخلاف جس خوش طبعی اور ہنسی مذاق کا تعلق دل شکنی اور ایذاء رسانی سے ہو اس کو سخریہ کہتے ہیں۔

ایک حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ لا تمار اخاک و لا تمازحہ یعنی اپنے مسلمان بھائی سے جھگڑا فساد نہ کرو، اور نہ اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرو تو علماء لکھتے ہیں کہ وہ مزاح و ظرافت ممنوع ہے جس میں حد سے تجاوز کیا جائے اور اس کو عادت بنالیا جائے کیونکہ ہر وقت مزاح و ظرافت میں مبتلا رہنا اور اس میں حد سے تجاوز کرنا بہت زیادہ ہنسنے اور قہقہہ لگانے کا باعث ہوتا ہے، قلب و ذہن کو قساوت اور بے حسی میں مبتلا کر دیتا ہے ذکر الٰہی سے غافل کر دیتا ہے مہمات دین میں غور و فکر اور پیش قدمی سے باز رکھتا ہے اور اکثر اوقات اس کا انجام ایذار سانی اور آپس میں بغض و عناد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی حقیقت ہے کہ جو شخص ہر وقت ہنسی مذاق کرتا رہتا ہے اس کی شخصیت بری طرح متاثر اور مجروح ہو جاتی ہے کہ نہ اس کا کوئی دبدبہ قائم رہتا ہے اور نہ اس کو عظمت اور اس کا وقار باقی رہتا ہے۔ اس کے برعکس جو مزاح و ظرافت، حد کے اندر اور کبھی کبھار ہو وہ نہ صرف مباح ہے بلکہ صحت مزاج اور وفور نشاط اور سلامت طبع کی علامت بھی ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ بھی مزاح و ظرافت کو اختیار فرماتے تھے جس سے آپ ﷺ کا مقصد مخاطب کی دل بستگی و خوش وقتی اور آپس میں محبت و موانست کے جذبات کو مستحکم کرنا ہوتا تھا اور یہ چیز سنت مستحبہ ہے اور اگر اس موقع پر یہ اشکال واقع ہو کہ یہ بات کہ وہی مزاح و ظرافت مباح ہے جو کبھی کبھار ہو۔ اس روایت کے مخالف ہے جس میں حضرت عبداللہ ابن حارث ؓ نے بیان کیا ہے کہ ما رایت احدا اکثر مزاحا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی میں نے رسول کریم ﷺ سے زیادہ مزاح کرنے والا کوئی شخص نہیں دیکھا تو اس کا جواب مختصر طور پر یہ ہوگا کہ زیادہ مزاح و ظرافت کرنے کی ممانعت اس وجہ سے ہے کہ اس سے نفس پر قابو نہیں رہتا اور ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کے برابر کوئی اور شخص اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ سکتا لہٰذا یہ چیز (زیادہ مزاح کرنا) ان امور میں سے ہے جو صرف آنحضرت ﷺ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں اور دوسروں کے لئے ان سے اجتناب ہی اولیٰ ہے اس کی تائید ترمذیؒ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو آگے آئے گی کہ صحابہ ؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ (ﷺ) ہمارے ساتھ مزاح فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا میں مزاح میں سچ کہتا ہوں۔ حاصل یہ کہ زیادہ مزاح کرنے کی ممانعت کا تعلق آنحضرت ﷺ کے سوا دوسرے لوگوں سے ہے ہاں اگر کوئی شخص حد پر قائم رہے نفس پر قابو رکھے اور راہ اعتدال سے منحرف نہ ہونے پر قادر ہو وہ بھی اس ممانعت سے مستثنیٰ ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

آنحضرت ﷺ کی خوش طبعی

① عَنْ اَنَسٍ قَالَ اِنْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيُخَالِطُنَا حَتّٰى يَقُوْلَ لِاَخٍ لِّيْ صَغِيْرٍ يَا اَبَا عُمَيْرٍ مَافَعَلَ النُّغَيْرُ وَكَانَ لَهٗ نُغَيْرٌ يَلْعَبُ بِهٖ فَمَاتَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہم سے اختلاط و خوش طبعی فرمایا کرتے تھے یہاں تک کہ میرے چھوٹے بھائی سے از راہ مذاق فرماتے ابو عمیر! نغیر کہاں گیا؟ حضرت انس ؓ کہتے ہیں میرے اس چھوٹے بھائی کے پاس ایک نغیر تھا جس سے وہ کھیلا کرتا تھا اور جو مر گیا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضرت انس ؓ نے اپنے چھوٹے بھائی کا ذکر کیا ہے ان کا نام کبشہ تھا اور وہ ان کے اخیافی یعنی ماں شریک بھائی تھے ان کے باپ کا نام ابو طلحہ زید ابن سہیل ؓ انصاری تھا۔

"نُغَیْرٌ" تصغیر ہے نَغْرٌ کی جو ایک چھوٹے پرندے کا نام ہے اور چھوٹی چڑیا کی طرح ہوتا ہے اور اس کی چونچ سرخ ہوتی ہے بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ وہ پرندہ چڑیا کی طرح سرخ سر والا ہوتا ہے نیز بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ اہل مدینہ اس پرندے کو بلبل کہتے تھے ہو سکتا ہے کہ یہ وہی پرندہ ہو جس کو ہمارے ہاں لال کہتے ہیں۔

حضرت انسؓ کے چھوٹے بھائی کبشہ اس پرندے کو لیکر آنحضرت ﷺ کے پاس آتے تھے جیسا کہ چھوٹے بچوں کو جب کوئی چڑیا وغیرہ مل جاتی ہے تو اس کے ساتھ کھیلا کرتے ہیں۔ اور اس کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں پھر ایک دن اچانک وہ پرندہ مرگیا اس کے بعد جب وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ ﷺ ان کو از راہ مذاق چھیڑتے اور پوچھتے کہ ارے ابو عمیر تمہارا نغیر کیا ہوا؟ گویا ان کو مخاطب کرتے وقت ظرافت کے ساتھ تفنن کلام کا اسلوب بھی اختیار فرماتے یعنی نغیر کی مناسبت سے اور اس لفظ کے قافیہ کے طور پر ان کو ابو عمیر کی کنیت کے ذریعہ مخاطب فرماتے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بچوں کو چڑیا وغیرہ سے دل بہلانا اور ان کے ساتھ کھیل کود کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس کو تکلیف وایذاء نہ پہنچائیں نیز اس سے معلوم ہوا کہ کسی چھوٹے اور کمسن بچے کی کنیت مقرر کرنا جائز ہے اور یہ جھوٹ میں داخل نہیں ہے نیک فالی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

آنحضرت ﷺ کا ہنسی مذاق بھی جھوٹ پر مبنی نہیں ہوتا تھا

(۲) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّكَ تُدَاعِبُنَا قَالَ اِنِّیْ لَا اَقُوْلُ اِلَّا حَقًّا۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ ہم سے خوش طبعی فرماتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ ہاں لیکن اس خوش طبعی میں بھی میں سچی بات کہتا ہوں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کو زیادہ ہنسی مذاق کرنے سے منع فرمایا تو اس کے بعد انہوں نے مذکورہ سوال کیا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان کو جواب دیا کہ ہنسی مذاق کی ممانعت اس بنا پر ہے کہ اس میں عام طور پر جھوٹی باتوں اور غیر شرعی امور کا ارتکاب ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ تم میں سے کوئی بھی شخص اس پر قادر نہیں ہے کہ اس کا ہنسی مذاق جھوٹ اور لایعنی باتوں سے کلیۃً پاک ہو، کیونکہ تم کو معصوم نہیں بنایا گیا ہے لیکن حق تعالیٰ نے مجھ کو معصوم بنایا ہے اور مجھے اس بات پر قادر کیا ہے کہ میرے کسی بھی ہنسی مذاق کی بات میں جھوٹ کی آمیزش ہو وہ ناجائز ہے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کبھی بھی ایسا مزاح نہیں فرماتے تھے جس میں جھوٹ اور لچریات کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو اور اگر ہنسی مذاق کی کوئی بات حقیقت کے اعتبار سے جھوٹ پر مبنی نہ ہو تو وہ جائز ہے لیکن اس کے باوجود ہنسی مذاق اور ظرافت کو عادت نہ بنالینا چاہئے کیوں کہ اس کی وجہ سے دبدبہ اور وقار ختم ہو جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی ظرافت کا ایک واقعہ

(۳) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلًا اسْتَحْمَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّیْ حَامِلُكَ عَلٰى وَلَدِ نَاقَةٍ فَقَالَ مَا اَصْنَعُ بِوَلَدِ النَّاقَةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهَلْ تَلِدُ الْاِبِلَ اِلَّا النُّوْقُ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دن ایک شخص نے رسول کریم ﷺ سے سواری کا ایک جانور مانگا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہاری سواری کے لئے اونٹنی کا بچہ دوں گا اس شخص نے (حیرت کے ساتھ) کہا یا رسول اللہ (ﷺ)! میں اونٹنی کے بچہ کا کیا کروں گا؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اونٹ کو اونٹنی ہی تو جنتی ہے؟۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: اس شخص نے یہ سمجھا تھا کہ اونٹنی کے بچہ سے مراد وہ چھوٹا بچہ ہے جو سواری کے قابل نہیں ہوتا لیکن آنحضرت ﷺ کی مراد یہ تھی کہ سواری کے قابل جو اونٹ ہوتا ہے وہ بچہ تو اونٹنی ہی کا ہوتا ہے لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اس شخص کی طلب پر مذکورہ ارشاد بطور خوش طبعی فرمایا اور پھر اس کی حیرت پر جو جواب دیا اس کے ذریعہ نہ صرف حقیقت مفہوم کو ادا کیا بلکہ اس کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ اگر

تم تھوڑی سی عقل سے کام لیتے اور میری بات کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرتے تو اس حیرت میں نہ پڑتے اور حقیقی مفہوم کو خود سمجھ لیتے لہٰذا اس ارشاد میں نری ظرافت ہی نہیں ہے بلکہ اس امر کی طرف متوجہ کرنا بھی مقصود ہے کہ سننے والے کو چاہئے کہ وہ اس بات میں غور و تأمل کرے جو اس سے کہی گئی ہے اور بغیر سوچے سمجھے سوال و جواب نہ کرے بلکہ پہلے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرے اور غور و فکر کے بعد آگے بڑھے۔

تعریف پر مشتمل خوش طبعی

④ وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهٗ يَاذَا الْاُذُنَيْنِ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا اے دو کانوں والے۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے حضرت انسؓ کو دو کانوں والے کے ذریعہ جو مخاطب فرمایا تو اس میں خوش طبعی و ظرافت بھی تھی اور ان کے تئیں اس تعریف و توصیف کا اظہار بھی مقصود تھا کہ تم نہایت فہیم و ذکی ہو اور تم سے جو بات کہی جاتی ہے اس کو تم خوب اچھی طرح سنتے ہو۔

ایک بڑھیا کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی خوش طبعی

⑤ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِامْرَاَةٍ عَجُوْزٍ اِنَّهٗ لَا تَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَجُوْزٌ فَقَالَتْ وَمَا لَهُنَّ وَكَانَتْ تَقْرَاُ الْقُرْاٰنَ فَقَالَ لَهَا اَمَا تَقْرَئِيْنَ الْقُرْاٰنَ اِنَّا اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَاءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا۔ رَوَاهُ رَزِيْنٌ وَفِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ بِلَفْظِ الْمَصَابِيْحِ۔

"اور انسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن ایک بوڑھی عورت نے جب آپ ﷺ سے یہ درخواست کی کہ میرے جنت میں جانے کی دعا فرمائیں تو اس سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ بڑھیا جنت میں داخل نہیں ہوگی وہ عورت قرآن پڑھی ہوئی تھی آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تم نے قرآن میں یہ نہیں پڑھا ہے کہ اِنَّا اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ط یعنی ہم جنت کی عورتوں کو پیدا کریں گے جیسا کہ پیدا کیا جاتا ہے پس ہم ان کو کنواری بنادیں گے اس اعتبار سے یہ خوش طبعی مبنی بر حقیقت تھی اور آپ کا یہ فرمانا درست ہوا کہ یہ بوڑھی عورت جنت میں نہیں جائے گی کیونکہ واقعۃً کوئی عورت اپنے بڑھاپے کے ساتھ جنت میں نہیں جائے گی اس روایت کو رزین نے مذکورہ الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے اور بغوی نے اپنی دوسری کتاب شرح السنۃ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے جو مصابیح میں مذکور ہیں۔"

تشریح: مصابیح میں اس روایت کو جن الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے وہ یوں ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس عورت سے فرمایا کہ بوڑھی عورتیں جنت میں داخل نہیں ہوں گی یہ سن کر وہ عورت واپس ہوئی اور روتی ہوئی چلی گئی آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس عورت کو جا کر بتادو عورتیں اپنے بڑھاپے کے ساتھ جنت میں داخل نہیں ہونگی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اِنَّا اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا۔

خوش طبعی کا ایک واقعہ

⑥ وَعَنْهُ اَنَّ رَجُلًا مِنْ اَهْلِ الْبَادِيَةِ كَانَ اسْمُهٗ زَاهِرَ بْنَ حَرَامٍ وَكَانَ يُهْدِيْ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْبَادِيَةِ فَيُجَهِّزُهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَخْرُجَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ زَاهِرًا بَادِيَتُنَا وَنَحْنُ حَاضِرُوْهُ وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّهٗ وَكَانَ رَجُلًا دَمِيْمًا فَاَتَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا وَهُوَ يَبِيْعُ مَتَاعَهٗ فَاحْتَضَنَهٗ مِنْ خَلْفِهٖ وَهُوَ لَا يُبْصِرُهٗ فَقَالَ اَرْسِلْنِيْ مَنْ هٰذَا فَالْتَفَتَ فَعَرَفَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

فَجَعَلَ لَا يَأْلُوْا مَا أَلْزَقَ ظَهْرَهُ بِصَدْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ عَرَفَهُ وَجَعَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ يَشْتَرِي الْعَبْدَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِذًا وَاللّٰهِ تَجِدُنِيْ كَاسِدًا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لٰكِنْ عِنْدَ اللّٰهِ لَسْتَ بِكَاسِدٍ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ شہر سے باہر کا رہنے والا ایک شخص جس کا نام زاہر بن حرامؓ تھا۔ نبی کریم ﷺ کے لئے بطور ہدیہ شہر کے باہر سے کچھ لایا کرتا تھا (یعنی ایسی چیزیں جو شہر سے باہر جنگل میں پیدا ہوتی ہیں، جیسے ساگ، سبزی، لکڑی اور پھول پھل وغیرہ) اور جب وہ مدینہ سے باہر (اپنی جائے سکونت کو) جانے لگتا تو رسول کریم ﷺ اس کے ساتھ شہر کا کچھ سامان کر دیا کرتے تھے نبی کریم ﷺ (اس کے بارے میں فرماتے) کہ زاہرؓ ہمارا باہر کا گماشتہ ہے کہ وہ ہمارے لئے باہر کی چیزیں لاتا ہے اور ہم اس کے شہر کے گماشتہ ہیں کہ ہم اس کو شہر کی چیزیں دیتے ہیں نیز نبی کریم ﷺ زاہرؓ سے بہت محبت و تعلق رکھتے تھے ویسے وہ ایک بد صورت شخص تھا ایک دن نبی کریم ﷺ (بازار میں) تشریف لے گئے تو (دیکھا کہ) وہ اپنا سودا سلف بیچ رہا ہے آپ ﷺ نے پیچھے سے اس کی اس طرح کولی بھرلی کہ وہ آپ ﷺ کو دیکھ نہیں سکتا تھا (یعنی آپ ﷺ نے اس کی بے خبری میں اس کے پیچھے بیٹھ گئے اور اپنے ہاتھ اس کی دونوں بغلوں کے نیچے سے نکال کر اس کی آنکھیں چھپالیں تاکہ وہ پہچان نہ سکے) زاہرؓ نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو یہ شخص کون ہے؟ پھر (اس نے کوشش کر کے) کن آنکھیوں سے دیکھا اور نبی کریم ﷺ کو پہچان گیا پھر تو وہ آپ ﷺ کو پہچاننے کے بعد اپنی پیٹھ کو نبی کریم ﷺ کے سینہ مبارک سے چمٹانے کی پوری کوشش کرنے لگا تاکہ زیادہ سے زیادہ برکت حاصل کرے اور حضور نبی کریم ﷺ نے یہ آواز لگانی شروع کر دی کہ کون شخص ہے جو اس غلام کا خریدار ہے؟ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! خدا کی قسم آپ ﷺ مجھ کو ناکارہ پائیں گے (یعنی بالکل سستا اور بے کار مال) نبی کریم ﷺ نے فرمایا لیکن تم خدا کے نزدیک ناکارہ نہیں ہو۔" (شرح السنۃ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے زاہر کو ازراہ مذاق غلام سے تعبیر کیا اور حقیقت کے اعتبار سے یہ کوئی جھوٹ بات نہیں تھی کیوں کہ وہ اللہ کا غلام بہر حال تھے ہی۔

کسی چیز کو بطور فروخت کرنے کے لئے بطور استفہام یہ کہنا کہ کون شخص ہے جو اس کو خریدتا ہے مفہوم کے اعتبار سے کبھی تو اس چیز کی پیش قیمت حیثیت کو ظاہر کرنے کے لئے مقابلہ آرائی پر اطلاق کیا جاتا ہے اور کبھی اس کا اطلاق استبدال پر آتا ہے، لہٰذا آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد "کون شخص ہے جو اس غلام کا خریدار ہے" کا مطلب یہ تھا کہ اس بازار میں ایسا کوئی شخص ہے جو اس غلام کی قدر و قیمت اور اس کی حیثیت کا مقابلہ کرے؟ یعنی یہاں کوئی چیز اس کی حیثیت کا مقابلہ نہیں کر سکتی، یا یہ کہ ایسا کوئی شخص ہے جو اس غلام کی قیمت لگا دے اور ایسی کوئی چیز مجھے دے سکے جس کے بدلے میں اس کو یہ غلام دے سکوں یعنی یہاں کا کوئی مال اس کا بدل نہیں ہو سکتا اور کوئی چیز اس کی قیمت نہیں بن سکتی! نیز یہ بھی ممکن ہے آپ ﷺ کا یہ ارشاد تجرید کے قبیل سے ہو جس سے گویا آپ ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ کون شخص ہے جو اس غلام کو حاصل کرے یعنی ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو اس غلام کو حاصل کرنے اور اس کو اپنے پاس رکھنے کا اہل ہو۔

آنحضرت ﷺ کی صحابہؓ سے بے تکلفی

(۷) وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ الْأَشْجَعِيِّ قَالَ أَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ وَهُوَ فِيْ قُبَّةٍ مِنْ أَدَمٍ فَسَلَّمْتُ فَرَدَّ عَلَيَّ فَقَالَ ادْخُلْ فَقُلْتُ أَكُلِّيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ كُلُّكَ فَدَخَلْتُ قَالَ عُثْمَانُ بْنُ أَبِي الْعَاتِكَةِ إِنَّمَا قَالَ أَدْخُلُ كُلِّيْ مِنْ صِغَرِ الْقُبَّةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عوف ابن مالک اشجعیؓ کہتے ہیں کہ غزوہ تبوک کے دوران ایک دن میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ ﷺ چمڑے کے خیمہ میں تشریف فرما تھے میں نے آپ ﷺ کو سلام کیا آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ اندر آجاؤ میں

نے مزاح کے طور پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! میں سب کا سب اندر آجاؤں یعنی سارے جسم کو اندر لے آؤں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں سب بدن کو اندر لے آؤ چنانچہ میں خیمہ کے اندر داخل ہو گیا حضرت عثمانؓ ابن ابو عاتکہ (جو اس حدیث کے ایک راوی ہیں) کہتے ہیں کہ حضرت عوفؓ نے یہ بات کہ کیا میں سب کا سب اندر آجاؤں اس مناسبت سے کہی تھی کہ خیمہ چھوٹا تھا۔" (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ اپنے صحابہؓ کے ساتھ اس طرح محبت و شفقت کا تعلق رکھتے تھے کہ صحابہؓ آپ ﷺ کے ساتھ بے تکلف ہو جاتے تھے اور اس بے تکلفی کے موقع پر آپ ﷺ سے ظریفانہ بات بھی کر لیتے تھے۔

⑧ وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ اسْتَأْذَنَ اَبُوْبَكْرٍ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمِعَ صَوْتَ عَائِشَةَ عَالِيًا فَلَمَّا دَخَلَ تَنَاوَلَهَا لِيَلْطِمَهَا وَقَالَ لَا اَرَاكِ تَرْفَعِيْنَ صَوْتَكِ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْجُزُهٗ وَ خَرَجَ اَبُوْبَكْرٍ مُغْضَبًا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ خَرَجَ اَبُوْبَكْرٍ وَ كَيْفَ رَاَيْتِنِيْ اَنْقَذْتُكِ مِنَ الرَّجُلِ قَالَتْ فَمَكَثَ اَبُوْبَكْرٍ اَيَّامًا ثُمَّ اسْتَأْذَنَ فَوَجَدَهُمَا قَدِ اصْطَلَحَا فَقَالَ لَهُمَا اَدْخِلَانِيْ فِيْ سِلْمِكُمَا كَمَا اَدْخَلْتُمَانِيْ فِيْ حَرْبِكُمَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ فَعَلْنَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت نعمان ابن بشیرؓ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے دروازے پر کھڑے ہو کر آپ ﷺ سے گھر آنے کی جازت طلب کی جبھی انہوں نے حضرت عائشہؓ کی آواز کو سنا جو ذرا زور سے بول رہی تھیں پھر جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو انہوں نے حضرت عائشہؓ کا ہاتھ پکڑا اور طمانچہ مارنے کا ارادہ کیا اور کہا کہ خبردار آئندہ میں تمہیں رسول کریم ﷺ کی آواز سے اونچی آواز میں بولتے ہوئے نہ دیکھوں ادھر نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو (حضرت عائشہؓ کو مارنے سے) روکنا شروع کیا اور پھر حضرت ابوبکرؓ غصہ کی حالت میں نکل کر چلے گئے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کے چلے جانے کے بعد (حضرت عائشہؓ سے) فرمایا کہ تم نے دیکھا میں نے تمہیں اس آدمی یعنی ابوبکرؓ کے ہاتھ سے کس طرح بچا لیا؟ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (اس کے بعد) حضرت ابوبکرؓ (مجھ سے خفگی کی بنا پر یا آنحضرت ﷺ سے شرمندگی کی وجہ سے) کئی دن تک آنحضرت ﷺ کی خدمت میں نہیں آئے پھر ایک دن انہوں نے دروازے پر حاضر ہو کر اندر آنے کی اجازت مانگی اور اندر آئے تو دیکھا کہ دونوں (آنحضرت ﷺ اور عائشہؓ) صلح کی حالت میں ہیں انہوں نے دونوں کو مخاطب کر کے کہا کہ تم دونوں مجھ کو اپنی صلح میں شریک کر لو جس طرح تم نے مجھ کو اپنی لڑائی میں شریک کیا تھا، آنحضرت ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا بے شک ہم نے ایسا ہی کیا بے شک ہم نے ایسا ہی کیا یعنی تمہیں اپنی صلح میں شریک کر لیا (گویا آپ ﷺ نے اپنی بات مؤکد کرنے کے لئے یہ جملہ دو مرتبہ فرمایا)۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کا وہ جملہ بطور مزاح تھا جو آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا تھا کہ دیکھا میں نے تمہیں اس شخص کے ہاتھ سے کس طرح نجات دلائی گویا آپ ﷺ نے "تمہارے باپ" کہنے کی بجائے "اس شخص" کہہ کر بقصد مزاح حضرت ابوبکرؓ کو حضرت عائشہؓ کے حق میں اجنبی قرار دیا۔

ایسا مذاق نہ کرو جس سے ایذاء پہنچے

⑨ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُمَارِ اَخَاكَ وَلَا تُمَازِحْهُ وَلَا تَعِدْهُ مَوْعِدًا فَتُخْلِفَهٗ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا تم اپنے مسلمان بھائی سے جھگڑا نہ کرو، نہ اس سے ایسا مذاق کرو (جس سے اس کو تکلیف پہنچے) اور نہ ایسا وعدہ کرو۔ جس کو پورا نہ کر سکو۔ (حضرت شیخ عبدالحقؒ نے لا تعدہ موعدا فتخلفه کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ تم وعدہ نہ کرو جیسا کہ وعدہ کیا جاتا ہے تا کہ تم وعدہ خلافی نہ کرو یعنی اگر وعدہ کرو تو اس کو پورا کر دیا پھر سرے

سے وعدہ ہی نہ کرو اور وعدہ کا راستہ ہی بند کر دو تا کہ وعدہ خلافی کے وبال میں پڑنے کا تمہیں خوف ہی نہ رہے۔ اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

بَابُ الْمُفَاخِرَةِ وَالْعَصَبِيَّةِ

مفاخرت اور عصبیت کا بیان

فَخْرٌ یا فَخَارَةٌ کے معنی ہیں اترانا یعنی اپنے حسب ونسب یا اپنے خاندان وقبیلہ یا اپنی قوم وجماعت یا اپنے علم و اخلاق اور یا اپنی مالداری وثروت وغیرہ پر نازاں ہونا اور فخر کرنا۔ تفاخر کے معنی ہیں کہ ایک دوسرے پر فخر کرنا مفاخرت کے معنی ہیں فخر میں ایک دوسرے کی برابری کرنا اور افتخار وتفخر کے معنی ایک کو دوسرے کے مقابلہ پر بڑھانا۔

مفاخرت یعنی اظہار فخر کرنا اور نازاں ہونا اگر حق کے معاملہ میں ہو، حق کی خاطر ہو کسی دینی مصلحت کے پیش نظر ہو اور دشمنان اسلام پر اپنی برتری، اپنی شان وشوکت اور اپنی قوت کے اظہار کے طور پر ہو تو جائز ہے چنانچہ اس طرح کی مفاخرت صحابہؓ اور سلف سے منقول ہے ور اگر مفاخرت کا تعلق ناحق معاملہ سے ہو اور نفسانیت کے تحت تکبر و غرور اور گھمنڈ کے طور پر ہو تو مذموم ہے اور عرف عام میں مفاخرت کا استعمال اکثر اسی معنی میں ہوتا ہے۔

عصبیت کے معنی ہیں عصبی یا متعصب ہونا یعنی اپنے مذہب یا اپنے خیال کی پچ کرنا اور اپنی قوم کی قوت وسختی کے اظہار کے لئے جدل وخصومت کرنا، چنانچہ عصبہ اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی بات یا اپنی قوم کی حمایت کرے اور یا اپنی قوم وجماعت کی پچ کے لئے غصہ ہو تعصب بھی اگر حق کے معاملہ میں ہو اور ظلم وتعدی کے ساتھ نہ ہو تو مستحسن ہے اور اگر تعصب کا تعلق حق بات کو نہ ماننے، ظلم وتعدی اختیار کرنے اور اپنی قوت وشان وشوکت کے بیجا اظہار کی خاطر ہو تو مذموم ہے عام طور پر تعصب کا اطلاق اپنی بات وخیال اور اپنے مذہب قوم کے حق میں ناروا سختی اختیار کرنے اور دوسروں کے تئیں ظلم وتعدی کرنے پر ہوتا ہے جیسا کہ اس باب میں نقل کی جانے والی احادیث سے معلوم ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

خاندانی وذاتی شرافت کا حسن، علم دین سے ہے

① عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَیُّ النَّاسِ اَكْرَمُ فَقَالَ اَكْرَمُهُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقَاهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَنْ هٰذَا نَسْئَلُكَ قَالَ فَاَكْرَمُ النَّاسِ يُوْسُفُ نَبِیُّ اللّٰهِ بْنُ نَبِیِّ اللّٰهِ بْنِ نَبِیِّ اللّٰهِ ابْنِ خَلِيْلِ اللّٰهِ قَالُوْا لَيْسَ عَنْ هٰذَا نَسْئَلُكَ قَالَ فَعَنْ مَعَادِنِ الْعَرَبِ تَسْاَلُوْنِیْ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ فَخِيَارُكُمْ فِی الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِی الْاِسْلَامِ اِذَا فَقِهُوْا۔

(متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون شخص زیادہ معزز و مکرم ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک لوگوں میں سب سے زیادہ معزز و مکرم وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار و متقی ہے۔ یعنی اگر تمہارے سوال کا مطلب یہ ہے کہ خاندانی عظمت باپ دادا کی بڑائی اور اپنے فضائل و اچھی عادات سے قطع نظر ذاتی بزرگی و کرامت کیا چیز ہے تو جان لو کہ وہ تقویٰ ہے لہٰذا جو شخص لوگوں میں سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار ہے وہی سب سے زیادہ معزز و مکرم ہے خواہ وہ اپنے حسب ونسب، خاندانی عظمت و وجاہت اور اپنے اوصاف و خصائل کے اعتبار سے کم تر ہو یا برتر صحابہؓ نے عرض کیا آپ ﷺ سے ہمارے سوال کا مطلب یہ نہیں ہے

آنحضرت ﷺ نے فرمایا (اگر تم ذاتی بزرگی و کرامت کے بارے میں نہیں پوچھ رہے ہو بلکہ حسب و نسب کی بزرگی اور شرافت کے بارے میں پوچھ رہے ہو تو اس اعتبار سے) انسانوں میں سب سے زیادہ شریف و بزرگ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں جو خدا کے نبی (حضرت یعقوب علیہ السلام) کے بیٹے، خدا کے نبی (حضرت اسحٰق علیہ السلام) کے پوتے اور خدا کے دوست (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کے پڑپوتے ہیں (یعنی حضرت یوسف علیہ السلام میں کئی طرح کی شرافت و بزرگیاں جمع ہیں کہ خود بھی نبی ہیں اور ان تین پشتوں میں نبوت رہی ہے ان کے پرداد اکو خلیل اللہ کا لقب ملا ہے کہ اللہ نے ان کو خالص دوست قرار دیا ہے پھر وہ علم و دانائی، حسن و جمال، عفو و کرم اخلاق و احسان، عدل و انصاف اور دینی و دنیاوی سرداری و حکمرانی کے اوصاف سے بھی متصف تھے لہٰذا اس اعتبار سے وہ انسانوں میں سب سے بزرگ و شریف انسان تھے) صحابہؓ نے عرض کیا کہ آپ ﷺ سے ہمارے سوال کا یہ مطلب بھی نہیں ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا تو کیا تم عربوں کی خاندانی شرافت اور ذات و حسب کی اعلیٰ خصوصیات کے اعتبار سے پوچھ رہے ہو؟ کہ اہل عرب جو اپنے اور باپ دادا کے کارناموں ذاتی بزرگی و عزت اور اس طرح کے اور دوسرے اوصاف کے ذریعہ ایک دوسرے کے سامنے اظہار فخر کرتے ہیں اور اپنی بزرگی و بڑائی کا دعویٰ کرتے ہیں نیز وہ اپنے میں ایک دوسرے کی عزت و شرافت کا معیار تقویٰ اور نسب کے بجائے مذکورہ اوصاف و خصوصیات کو قرار دیتے ہیں تو ان میں واقعۃً سب سے زیادہ معزز و مکرم کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہاں ہمارے سوال کا مطلب یہی ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا (تو سنو) تم میں سے جو لوگ زمانہ جاہلیت میں سب سے بہتر تھے وہی اسلام میں سب سے بہتر ہیں جبکہ وہ فقیہ ہوں (یعنی تم میں سے جو لوگ زمانہ جاہلیت میں اپنی خاندانی شرافت، شریف النفسی، بہادری و سرداری اور عمدہ اخلاق و عادات کے اعتبار سے سب سے پسندیدہ اور سب سے بہتر شمار کئے جاتے تھے اسلام کے زمانہ میں بھی وہی لوگ سب سے زیادہ پسندیدہ اور سب سے بہتر ہیں بشرطیکہ وہ اسلامی احکام و شرائع کے سمجھنے والے اور دین کا علم حاصل کرنے والے ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کے آخری جواب کا مطلب یہ تھا کہ زمانہ جاہلیت میں جن لوگوں کی ذات اور شخصیت کی وجہ سے ان کو سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا وہ لوگ اپنی انہی خصوصیات کی بنا پر زمانہ اسلام میں بھی معزز و مکرم قرار دیئے جائیں گے بشرطیکہ انہوں نے ایمان و اسلام قبول کر کے دین کا علم اور شریعت کے احکام و مسائل حاصل کئے ہوں فرق یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ان پر کفر کا سایہ معصیت کی تاریکی اور جہل کا غبار چھایا ہوا تھا اور خواہش نفس کے دام فریب میں مبتلا تھے اور اس اعتبار سے ان کی ذاتی شرافت و صفات کی کوئی حیثیت نہیں تھی مگر اب ایمان و اسلام کی پاکیزگی اور عبادات و علم دین کے نور نے ان کی ذات و شخصیت کو نکھار دیا ہے ان کی زندگی کو روشن کر دیا ہے اور ان کو حق کا تابعدار بنا دیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ "معادن" سے مراد لوگوں کی اپنی ذات و شخصیات ہیں جو عمدہ صفات و اعلیٰ خصوصیات سے متصف ہوں جیسا کہ کتاب العلم میں یہ روایت نقل کی جا چکی ہے کہ الناس معادن کمعادن الذھب و الفضۃ الخ یعنی لوگوں کی بھی کانیں ہوتی ہیں جیسے سونے اور چاندی کی کانیں پس جو خاندان و افراد اپنی اعلیٰ خصوصیات کے اعتبار سے زمانہ جاہلیت میں سب سے بہتر شمار کئے جاتے تھے اسلام کے زمانہ میں بھی وہی سب سے بہتر ہیں بشرطیکہ وہ دین کا علم حاصل کریں۔

سب سے زیادہ مکرم کون ہے

(۴) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْکَرِیْمُ بْنُ الْکَرِیْمِ بْنِ الْکَرِیْمِ بْنِ الْکَرِیْمِ یُوْسُفُ بْنُ یَعْقُوْبَ بْنِ اِسْحٰقَ ابْنِ اِبْرَاھِیْمَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کریم ابن کریم ابن کریم ابن کریم اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ حضرت یوسف ابن یعقوب ابن اسحاق علیہ السلام ابن ابراہیم علیہ السلام ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ خاندانی شرافت و عظمت اور نسبی برتری کی جو خصوصیات حضرت یوسف علیہ السلام کو حاصل ہے وہ کسی اور کو

نہیں سب سے بڑا شرف ان کے علاوہ اور کسی انسان کو حاصل نہیں ہوا کہ وہ خود نبی علیہ السلام تھے ان کے باپ نبی علیہ السلام تھے ان کے دادا نبی تھے اور ان کے پڑدادا نبی علیہ السلام تھے اس خصوصیت کے علاوہ ان کو حسن و جمال، عدل و انصاف، علم و دانائی اور ریاست و حکومت کے جو اوصاف حاصل تھے ان کے اعتبار سے ان کی ذاتی مکرمت کو شرافت کو سب سے برتر مقام حاصل ہے۔

کفار کے مقابلہ پر آنحضرت ﷺ کا اظہار فخر

③ وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ فِي يَوْمِ حُنَيْنٍ كَانَ اَبُوْسُفْيَانَ بْنِ الْحَارِثِ اٰخِذًا بِعِنَانِ بَغْلَتِهٖ يَعْنِيْ بَغْلَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا غَشِيَهُ الْمُشْرِكُوْنَ نَزَلَ فَجَعَلَ يَقُوْلُ اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ اَنَا ابْنُ عَبْدِالْمُطَّلِبِ قَالَ فَمَا رُوِيَ مِنَ النَّاسِ يَوْمَئِذٍ اَشَدُّ مِنْهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت براء ابن عازبؓ کہتے تھے کہ غزوہ حنین کے دن ان کے خچر یعنی رسول کریم ﷺ کے خچر کی باگ سفیان ابن حارثؓ نے پکڑ رکھی تھی جو حارث ابن عبدالمطلب کے لڑکے ہونے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کے چچازاد بھائی تھے اور عرب کے دلیر، جیالے جوانوں میں ایک بہادر مرد تھے چنانچہ جنگ کے دوران جب آنحضرت ﷺ کو مشرکوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا تو آپ ﷺ (اپنے خچر پر سے) اتر پڑے اور یہ رجز فرمانا شروع کیا میں نبی ﷺ ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں اور میں عبدالمطلب کا سپوت ہوں۔ راوی کا بیان ہے کہ پس اس دن آنحضرت ﷺ سے زیادہ بہادر دلیر اور کسی کو نہیں دیکھا گیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہ حدیث آنحضرت ﷺ کی بے مثال شجاعت و جوانمردی پر دلالت کرتی ہے کہ ایک ایسے معرکہ میں جہاں ہوازن و غطفان کے قبائل سمیت عرب کے دوسرے بہت سے جنگجو قبائل برسرپیکار تھے اور انہوں نے اپنی بے پناہ خرابی قوت اور انفرادی طاقت کے ذریعہ اسلامی لشکر پر اتنا زبردست دھاوا بول دیا تھا کہ شکست کی صورت ظاہر ہونے لگی تھی تو آپ ﷺ بھی خچر پر سوار ہو کر مجاہدین اسلام کے شانہ بشانہ لڑ رہے تھے اور اپنے خچر کو ایڑ لگا لگا کر کفار کے لشکر پر حملہ کر رہے تھے۔ اور پھر جب ان دشمنان دین نے آپ ﷺ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور خچر کو آگے بڑھنے کا راستہ نہ مل سکا تو آپ ﷺ اس پر سے اتر پڑے اور پاپیادہ ہو کر بڑی دلیری اور جوان مردی کے ساتھ دشمن کے لشکر پر ضرب لگائی آخر اللہ تعالیٰ نے ان کو شکست سے درچار کیا اور آنحضرت ﷺ کو فتح نصیب فرمائی۔

اگرچہ آنحضرت ﷺ نے حسب و نسب اور خاندانی وجاہت پر اظہار فخر کرنے اور نازاں ہونے سے منع فرمایا ہے لیکن آپ ﷺ کا بطور رجزیہ فرمانا کہ میں عبدالمطلب کا سپوت ہوں اس طرح کا اظہار فخر نہیں ہے جو ممنوع ہے کیونکہ وہ فخر ممنوع ہے جو نہ زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق، بیجا اظہار نام و نمود، تعصب و ہٹ دھرمی اور نفس کے گھمنڈ کے طور پر ہو جبکہ آنحضرت ﷺ کا مذکورہ فخر دین کی طاقت اور شان و شوکت بڑھانے اور کفار کے مقابلہ پر اپنا رعب اور دبدبہ ظاہر کرنے کے لئے تھا اور اس طرح کا فخر جائز ہے علاوہ ازیں ایک بات یہ تھی کہ زمانہ جاہلیت میں بعض اہل عرب جیسے کاہن اور اہل کتاب آنحضرت ﷺ کی نبوت ظاہر ہونے سے پہلے بعثت نبوی ﷺ کی خبر دیا کرتے تھے اور نبی آخر الزمان ﷺ کی جو نشانیاں اور علامتیں بتایا کرتے تھے ان میں سے ایک نشانی یہ بھی تھی۔ کہ وہ پیغمبر، عبدالمطلب کی اولاد میں سے ہونگے۔

خیر البریہ کا مصداق

④ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا خَيْرَ الْبَرِيَّةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاكَ اِبْرَاهِيْمُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دن ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کو یوں مخاطب کیا اے وہ شخص جو ساری مخلوق میں بہتر ہے آپ ﷺ نے فرمایا وہ شخص جو ساری مخلوق میں بہتر ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس موقع پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب صحیح احادیث سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ تمام انبیاء کے سردار اور ساری مخلوق سے افضل و برتر ہیں تو خیر البریہ یعنی ساری مخلوق میں سب سے بہتر کا مصداق حضرت ابراہیم علیہ السلام کیونکر ہوئے اس کے تین جواب ہیں ایک تو یہ کہ حقیقت کے اعتبار سے تو ساری مخلوق میں سب سے بہتر آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی ﷺ ہے۔ لیکن آپ ﷺ نے ازراہ تواضع و انکسار اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس حیثیت کا لحاظ کرتے ہوئے کہ وہ خلیل اللہ کے دوست اور آپ ﷺ کے جد اعلیٰ ہیں ان کو خیر البریہ کا مصداق قرار دیا جیسا کہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ کوئی شریف النفس اور خلیق انسان تعظیم و تکریم کا خود سب سے زیادہ اہل و مستحق ہونے کے باوجود بسا اوقات کسی دوسرے شخص کو اپنے اوپر ترجیح دیتا ہے اور اس کی تعظیم کرتا ہے دوسرے یہ کہ مذکورہ روایت میں لسان نبوت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خیر البریہ کا مصداق قرار دیا جانا اس زمانہ کا واقعہ ہے جبکہ اس وقت تک یہ وحی نازل نہیں ہوئی تھی کہ آپ ﷺ تمام اولاد آدم علیہ السلام سے افضل اور ساری مخلوق میں سب سے بہتر ہیں اور تیسرے یہ کہ مذکورہ ارشاد گرامی کی مراد یہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے زمانہ میں ساری مخلوق سے بہتر و برتر تھے اور آپ ﷺ نے اس بات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کرنے کی خاطر مطلق الفاظ ارشاد فرماتے۔

آپ ﷺ کی منقبت و تعریف ایسے الفاظ کے ذریعہ نہ کرو جو مقام نبوت سے بالا ہوں

⑤ وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰى ابْنَ مَرْيَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُهٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم لوگ میری مدح و تعریف میں حد سے زیادہ تجاوز نہ کرو جس طرح کہ نصاریٰ نے ابن مریم علیہا السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف میں حد سے تجاوز کیا ہے (کہ ان کو بشریت سے چڑھا کر خدا کا بیٹا کہنے لگے ہیں) میں تو خدا کا بندہ ہوں لہٰذا تم مجھ کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: عبودیت اور بندگی کا جو سب سے اعلیٰ درجہ ہے وہ آنحضرت ﷺ کی مخصوص صفت ہے کہ بندہ حقیقی آپ ﷺ کی ذات گرامی ﷺ ہے اور صفت عبودیت میں آپ ﷺ سب سے کامل و برتر ہیں لہٰذا آپ ﷺ کی مدح و تعریف کا کمال اور آپ ﷺ کی علو مرتبت کا بیان اسی صفت کو ظاہر کرنے میں ہے نہ کہ آپ ﷺ کی ذات گرامی ﷺ کی منقبت و تعریف ایسے الفاظ و پیرایۂ بیان اور ان صفات کے ذریعہ کی جائے جس سے آپ ﷺ کا مقام عبودیت پیچھے رہ جائے اور وہ حد آجائے جہاں سے معبود کی صفات شروع ہو جاتی ہیں۔

اظہار فخر کی ممانعت

⑥ وَعَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ الْمُجَاشِعِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اَوْحٰى اِلَيَّ اَنْ تَوَاضَعُوْا حَتّٰى لَا يَفْخَرَ اَحَدٌ عَلٰى اَحَدٍ وَلَا يَبْغِيْ اَحَدٌ عَلٰى اَحَدٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عیاضؓ ابن حمار مجاشعی سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مجھے حکم دیا ہے کہ عاجزی اور فروتنی اختیار کرو، یہاں تک کہ کوئی شخص کسی پر فخر نہ کرے اور نہ کوئی شخص کسی پر ظلم و زیادتی کرے۔" (مسلمؒ)

تشریح: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ایسا فخر جو غرور و تکبر اور گھمنڈ کے طور پر ہو حرام ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

باپ دادا کے متعلق شیخی بگھارنا اور خاندانی فخر کوئی چیز نہیں ہے

⑦ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَیَنْتَهِیَنَّ اَقْوَامٌ یَفْتَخِرُوْنَ بِاٰبَائِهِمُ الَّذِیْنَ مَاتُوْا اِنَّمَاهُمْ فَحْمٌ مِنْ جَهَنَّمَ اَوْلَیَکُوْنُنَّ اَهْوَنَ عَلَی اللّٰهِ مِنَ الْجُعَلِ الَّذِیْ یُدَهْدِهُ الْخِرَاءَ بِاَنْفِهٖ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْکُمْ عُبِّیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ وَفَخْرَهَا بِالْاٰبَاءِ اِنَّمَا هُوَ مُؤْمِنٌ تَقِیٌّ اَوْ فَاجِرٌ شَقِیٌّ النَّاسُ کُلُّهُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"حضرت ابوہریرۃؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا لوگ اپنے ان باپ دادا پر فخر کرنا چھوڑ دیں جو مرچکے ہیں اور جن کی حقیقت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ دوزخ کا کوئلہ بن گئے ہیں، ورنہ اگر فخر کرنے سے باز نہ آئے تو وہ خدا کے نزدیک گوہ (غلاظت) کے کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل وخوار ہوں گے جو گوہ (غلاظت) کو اپنی ناک سے ہٹاتا ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے جاہلیت کی نخوت کو اور باپ دادا پر فخر کرنے کی عادت کو دور کردیا ہے (یاد رکھو) آدمی (اب) یا تو مؤمن متقی ہے یا فاجر بدکار (یعنی اگر کوئی شخص ایمان و تقویٰ اور اعمال صالحہ کی دولت سے مالامال ہے تو وہ خود قابل تکریم اور معزز ہے اس صورت میں اس کو کیا ضرورت ہے کہ اپنے باپ دادا پر فخر کا اظہار کرکے اپنی حیثیت کو بڑھانے کی کوشش کرے اور اگر کوئی شخص فاجر وبدکار ہے تو وہ خدا کے نزدیک ذلیل وخوار ہے اس صورت میں اس کا کیا حق ہے کہ تکبر و گھمنڈ کرے) تمام انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے (اور مٹی چونکہ ایک بہت کم تر اور بے حیثیت چیز ہے لہٰذا مٹی سے بنائے گئے انسان کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنی عظمت وبڑائی کا دعوی کرے اور غرور و تکبر میں مبتلا ہو۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: وہ دوزخ کا کوئلہ بن گئے کا مطلب یہ ہے کہ اگر باپ دادا مشرک و کافر تھے تو وہ بالیقین دوزخ میں جائیں گے اور اگر وہ کافر و مشرک نہیں تھے تو ان کے بارے میں بھی یہ احتمال تو ہو ہی سکتا ہے کہ کسی وجہ سے ان کا خاتمہ بخیر نہ ہوا ہو اور وہ اس دنیا سے ایمان کے بغیر ہی رخصت ہوگئے ہوں اور وہ دوزخ میں ڈالے جائیں لہٰذا اس صورت میں ظاہر ہے کہ جو لوگ دوزخ کی آگ میں جل کر کوئلہ کی مانند سوختہ وسیاہ ہوجانے والے ہیں ان کے متعلق شیخیاں بگھارنا اور ان پر اظہار فخر کرنا بڑی نادانی کی بات ہے۔

حاصل یہ کہ جو لوگ زمانہ جاہلیت میں فوت شدہ اپنے باپ دادا کے متعلق شیخیاں بگھاتے ہیں اور اپنے خاندان کی دنیاوی بڑائی پر فخر و گھمنڈ کا اظہار کرتے ہیں ان کو آنحضرت ﷺ نے غلاظت کے کیڑے سے تشبیہ دی ہے اور ان کے فوت شدہ باپ دادا کو غلاظت کے ساتھ تشبیہ دی ہے اپنے باپ دادا پر ان کے فخر کرنے کو ایسا فعل قرار دیا ہے جیسا کہ غلاظت کا کیڑا اپنے جسم سے غلاظت کو خارج کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ محض اپنی بڑائی کو ظاہر کرنے اور لوگوں پر اپنی ناروا اہمیت کو جتانے کے لئے اپنے باپ دادا اور خاندان پر گھمنڈ کرنا اور اظہار فخر کرنا سخت معیوب اور انتہائی قابل نفرین فعل ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

دوش دیدم کہ ابلہے می گفت — پدر من وزیر خاں بودست
باوجودیکہ نیست معلومم — خود گرفتم کہ آنچناں بودست
ہیچ کس دیدہ کہ گربہ خوردست — کین بعہد قدیم نان بودست

آنحضرت ﷺ کا اپنے تئیں سردار کہلانے سے انکار

⑧ وَعَنْ مُطَرِّفِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الشِّخِّیْرِ قَالَ انْطَلَقْتُ فِیْ وَفْدِ بَنِیْ عَامِرٍ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْنَا اَنْتَ سَیِّدُنَا فَقَالَ السَّیِّدُ اللّٰهُ فَقُلْنَا وَاَفْضَلُنَا فَضْلاً وَّاَعْظَمُنَا طَوْلاً فَقَالَ قُوْلُوْا قَوْلَکُمْ اَوْ بَعْضَ قَوْلِکُمْ وَلَا

یَسْتَجْرِیَنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مطرف ابن عبداللہ ابن شخیر کہتے ہیں کہ (میرے والد حضرت عبداللہؓ صحابی نے بیان کیا کہ) بنو عامر کا جو وفد رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اس میں میں بھی شریک تھا، چنانچہ (جب ہم آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو) ہم نے عرض کیا کہ آپ (ﷺ) ہمارے سردار ہیں آپ ﷺ نے فرمایا سردار تو خدا ہے ہم نے عرض کیا آپ (ﷺ) بھلائی و بہتری کے اعتبار سے ہم میں سب سے بہتر ہیں اور بخشش کے اعتبار سے ہم میں سب سے بزرگ و برتر ہیں آپ ﷺ نے فرمایا ہاں اس طرح کہو، بلکہ اس سے بھی کم درجہ کے الفاظ استعمال کرو یعنی میری تعریف و مدح میں مبالغہ آرائی سے کام نہ لو اور ان صفات کو میری طرف منسوب نہ کرو جو صرف حق تعالیٰ کی ذات سے مخصوص ہیں تم نے آخر میں جو بات کہی ہے زیادہ سے زیادہ اسی حد تک میری تعریف کر سکتے ہو بلکہ میرے تئیں اس سے بھی ہلکے درجہ کی تعریف کرو تو زیادہ بہتر ہے اور دیکھو شیطان تم کو اپنا وکیل نہ بنائے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: لفظ "جَرِیٌ" کے معنی وکیل کے ہیں جو اپنے موکل کا جاری مجری یعنی قائم مقام ہوتا ہے لہٰذا لایستجرینکم الشیطن کا مطلب یہ ہے کہ تم میری تعریف ایسے الفاظ کے ذریعہ اور ایسے انداز میں نہ کرو جس سے یہ معلوم ہو کہ شیطان لعین نے تمہیں اپنا وکیل و قائم مقام بنا لیا ہے اور تم اس کی وکالت کے طور پر بلا تامل جو چاہتے ہو کہتے چلے جا رہے ہو چنانچہ وہ لوگ سخت گمراہی میں مبتلا ہیں۔ جو ذات رسالت ﷺ کی منقبت و تعریف میں حد سے تجاوز کرتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ گویا بندے کو خدا کا درجہ دیدیتے ہیں جیسے مروج مولود کے قصائد نقلیہ میں ایسے الفاظ و بیان اختیار کئے جاتے ہیں جن سے پروردگار کی شان میں بڑی بے ادبی ہوتی ہے۔

بعض روایت میں اس "یستجرینکم" میں یاء کی بجائے ہمزہ ہے اس صورت میں یہ لفظ جری کے بجائے جرأت سے ہوگا اور معنے یہ ہوں گے کہ شیطان تم کو میری تعریف میں اس طرح اور بیباک نہ بنادے کہ غلط سلط اور خلاف حقیقت جو کچھ کہنا چاہو بے جھجک کہنے لگو۔

"سردار تو بس خدا ہے" سے آپ ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ وہ ذات کہ جو مخلوق کے تمام امور کی حقیقی مالک ہے اور وہ ذات کہ ہر ایک پر فرمانبروائی و حکمرانی کی سزاوار ہے اور جس کے دست قدرت میں تمام تر نظم و تصرف ہے صرف حق تعالیٰ کی ذات ہے نہ کہ کوئی اور شخص۔

علماء نے لکھا ہے آنحضرت ﷺ کا اس جماعت کی طرف سے اپنے آپ ﷺ کو سردار کہے جانے کی ممانعت کرنا اس سبب سے نہیں تھا کہ ان لوگوں نے آنحضرت ﷺ کے تئیں سرداری و سیادت کو ثابت کیا تھا کیونکہ آنحضرت ﷺ بلاشبہ تمام اولاد آدم علیہ السلام کے سردار ہیں، بلکہ آپ ﷺ کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے آنحضرت ﷺ کو لفظ سید سردار کے ذریعہ اس انداز سے مخاطب کیا تھا جس طرح کسی قوم قبیلہ کے سردار رئیس کو مخاطب کیا جاتا ہے حالانکہ ان لوگوں کو چاہئے تھا کہ وہ آپ ﷺ کو لفظ نبی ﷺ یا رسول ﷺ کے ذریعہ مخاطب کرتے جو بشریت کا سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے۔

اصل فضیلت، تقویٰ ہے

⑨ وَعَنِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْحَسَبُ الْمَالُ وَالْكَرَمُ التَّقْوٰى۔

(رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت حسنؒ، حضرت سمرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا حسب مال داری ہے اور کرم پرہیزگاری کا نام ہے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "حَسَبٌ" ان فضائل و خصائل کو کہتے ہیں کہ جو کسی انسان میں ہوتے ہیں چنانچہ صاحب حسب انسان اپنے اور اپنے باپ دادا

کے خصائل وفضائل کو شمار کرتا ہے اور ان کے ذریعہ اپنی حیثیت کو بڑھاتا ہے کرم صفات خیر کا نام ہے جس کا اطلاق تمام وجوہ خیر بھلائی اور شرف پر ہوتا ہے آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے نزدیک اصل حسب وفضیلت مالداری ہے کہ جو شخص مالدار اور صاحب ثروت ہو تو وہی حسب والا اور فضیلت کا مالک سمجھا جاتا ہے اور اس کی عزت کی جاتی ہے اگر کسی کے پاس مال وثروت نہ ہو تو وہ سب کی نظروں میں کم تر و بے وقعت رہتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصل فضیلت تقویٰ پر ہیزگاری میں ہے کہ بغیر تقویٰ کے کوئی بھی فضیلت اعتبار نہیں رکھتی خدا کی نظر میں کریم یعنی بزرگ و شریف وہی شخص ہے جو پرہیزگار ہو جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔ ان اکرمکم عنداللہ اتقکم بیشک زیادہ عزت والا تم میں سے اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

اپنے باپ دادا پر فخر کرنے والے کے بارے میں وعید

⑩ وَعَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ تَعَزّٰی بِعَزَاءِ الْجَاھِلِیَّۃِ فَاَعِضُّوْہُ بِھَنِ اَبِیْہِ وَلَا تَکْنُوْا۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابی بن کعبؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص زمانہ جاہلیت کی نسبت کے ساتھ اپنے کو منسوب کرلے تو اس کے باپ کے ہن کو کٹواؤ اور اس میں اشارہ کنایہ سے کام نہ لو۔" (شرح السنۃ)

تشریح: ھَنٌ یا ھَنٌّ ہر اس قبیح اور بری چیز کو کہتے ہیں جو صاف صاف نام لے کر بیان نہیں کی جاتی اسی لئے اس لفظ کا اطلاق شرمگاہ پر بھی ہوتا ہے یعنی اگر کسی موقع پر شرمگاہ کا نام لینا ہو تو اس مقصد کے لئے ہن کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ دادا پر فخر کرے جو زمانہ جاہلیت میں گزرے ہیں تو اس کو صاف صاف باپ کی گالی دو اور اس کے باپ کی شرمگاہ کا ذکر کرتے ہوئے اشارہ کنایہ سے کام نہ لو بلکہ اس کا صریح نام لو یعنی اس سے مہذب گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں سیدھا صاف کہہ دو کہ ابے جا اپنے باپ کی شرمگاہ ...... اور اس ارشاد کا مطلب گویا باپ دادا اور خاندانی ثروت و وجاہت پر فخر کرنے والوں کے تئیں شاید نفرت کا اظہار اور ان کو سخت تنبیہ کرنا مقصود ہے تاکہ کوئی شخص اپنے باپ دادا کے تئیں فخر و مباہات میں مبتلا نہ ہو۔

بعض حضرات نے من تعزی بعزاء الجاھلیۃ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جو شخص زمانہ جاہلیت کی رسموں اور عادتوں کو اختیار کرے جیسے نوحہ اور بال نوچنے کپڑے پھاڑنے وغیرہ کے ذریعہ غمی منائے تو اس کو صاف صاف باپ کی گالی دو یا جو شخص زمانہ جاہلیت کی طرح لوگوں کو برا بلا کہے، ان کو عار دلائے اور ان کے ساتھ گالم گلوچ کرے تو اس کے سامنے اس کے باپ کی برائیاں اشارہ کنایوں میں نہیں بلکہ صریح الفاظ میں بیان کرو یعنی یوں کہو کہ تمہارا باپ بتوں کو پوجتا تھا۔ فسق و فجور کی زندگی اختیار کئے ہوئے تھا اور زناکاری و شراب نوشی جیسی قبیح برائیوں میں مبتلا تھا اگر اس کے سامنے اس طرح کی بات کرو گے تو آئندہ کسی شخص کو برا بھلا کہنے، گالم گلوچ کرنے اور کسی کی آبروریزی کرنے کی وہ کبھی جرات نہیں کریگا۔

اپنے زمانہ جاہلیت کے کسی تعلق پر فخر نہ کرو

⑪ وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ عُقْبَۃَ عَنْ اَبِیْ عُقْبَۃَ وَکَانَ مَوْلًی مِنْ اَھْلِ فَارِسٍ قَالَ شَھِدْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُحُدًا فَضَرَبْتُ رَجُلًا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ فَقُلْتُ خُذْھَا مِنِّیْ وَاَنَا الْغُلَامُ الْفَارِسِیُّ فَالْتَفَتَ اِلَیَّ فَقَالَ ھَلَّا قُلْتَ خُذْھَا مِنِّیْ وَاَنَا الْغُلَامُ الْاَنْصَارِیُّ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن ابوعقبہؓ حضرت ابوعقبہؓ سے نقل کرتے ہیں جو (کسی انصاری) کے ایک فارس نژاد مولیٰ تھے انہوں نے بیان کیا کہ رسول کریم ﷺ کے ہمراہ میں بھی غزوہ اُحد میں شریک تھا چنانچہ معرکہ آرائی کے دوران میں نے مشرکین میں سے ایک شخص کو

(تلوار یا نیزہ کھینچ کر) مارا اور کہا کہ ایک وار میری طرف سے بھی کھا میں ایک فارسی غلام یعنی فارس نژاد ہوں (جو دلیر اور بہت مار دینے والا ہے) رسول کریم ﷺ نے (میرا یہ جملہ سنا تو) تو میری طرف متوجہ ہو گئے اور فرمایا کہ تم نے اس طرح کیوں نہیں کہا کہ لے میری طرف سے بھی ایک وار کھا میں ایک انصاری غلام ہوں۔" (ابوداؤد)

تشریح: آنحضرت ﷺ کی تنبیہ کا مطلب یہ تھا کہ اس موقع پر اگر تم اپنی نسبت فارس کی طرف جو مذہبًا مجوسی اور آتش پرست قوم ہے کرنے کی بجائے انصاری کی طرف کرتے جو بہت بہادر اور خدا کے دین اور رسول ﷺ کے حامی و مددگار ہیں تو زیادہ اچھا ہوتا اور اس وجہ سے بھی موزوں تھا کہ مولی القوم منھم (کسی قوم کے مولی کا شمار اسی قوم میں ہوتا ہے) کے بموجب تمہارا تعلق ہی سے ہے۔

"مولی" کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک تو مولی عتاقہ یعنی وہ غلام جس کو اس کے مالک نے آزاد کر دیا ہو اور دوسرے یہ کہ وہ لوگ جن کا وطنی تعلق غیر عرب علاقوں اور ملکوں سے ہوتا تھا اور اسلام قبول کر لیتے تھے اور ہجرت کر کے مدینہ منورہ آجاتے تھے وہ اپنے آپ کو مہاجرین" وانصار" کے اختیار میں رہتی تھی کہ ان کے سیاہ و سفید وہی مالک و متصرف ہوتے تھے ایسے لوگوں کو مولی موالات کہا جاتا تھا حضرت ابوعقبہ صحابیؓ جن کا اصل نام رشد تھا اسی طرح کے مولی تھے کہ وہ اصلا فارس کے رہنے والے تھے اور جب انہوں نے اسلام قبول کیا اور اپنے ملک فارس سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آگئے تو کسی انصاریؓ کے زیر تربیت رہے اس حدیث کے راوی حضرت عبدالرحمٰن انہی ابوعقبہؓ کے صاحبزادے ہیں اور ان کا شمار ثقہ تابعین میں ہوتا ہے۔

اپنی قوم کی بیجا حمایت کرنے والے کی مذمت

(۱۲) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ نَصَرَ قَوْمَهٗ عَلٰى غَيْرِ الْحَقِّ فَهُوَ كَالْبَعِيْرِ الَّذِيْ رَدٰى فَهُوَ يُنْزَعُ بِذَنَبِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن مسعودؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنی قوم کی ناحق حمایت و مدد کرے وہ اس اونٹ کی مانند ہے جو کنویں میں گر پڑے اور پھر اس کی دم پکڑ کر اس کو کھینچا جائے۔" (ابوداؤد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئی اونٹ کنویں میں گر کر ہلاک ہو جاتا ہے اسی طرح وہ شخص کنویں میں گر کر روحانی طور پر تباہ و برباد ہو جاتا ہے اور اس میں سے نکالے جانے کی کوئی سبیل نہیں پاتا جو کسی ناحق معاملہ میں یا کسی ایسے معاملہ میں کہ اس کا حق ہونا مشتبہ ہو اپنی قوم و جماعت کی حمایت و مدد کے ذریعہ اپنے آپ کو اونچا اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد گرامی کے ذریعہ قوم و جماعت کو تو ہلاک ہو جانے والے اونٹ کے مشابہ قرار دیا ہے کیونکہ جو طبقہ و گروہ حق کو چھوڑ کر باطل کو اختیار کرتا ہے وہ گویا ہلاک ہو جانے والا شمار ہوتا ہے اور جو شخص اس قوم و جماعت کی حمایت کرتا ہے اس کو اس اونٹ کی دم کے ساتھ تشبیہ دی ہے چنانچہ جو اونٹ کنویں میں گر جائے اس کو اس کی دم پکڑ کر کھینچنا اس کو ہلاک ہونے سے نہیں بچا سکتا اسی طرح جو قوم و جماعت باطل ہونے کی وجہ سے ہلاکت کی کھائی میں گر پڑی ہے اس کو وہ حمایتی اور مددگار ہلاکت کی کھائی سے نجات نہیں دلا سکتا۔

عصبیت کس کو کہتے ہیں

(۱۳) وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْعَصَبِيَّةُ قَالَ اَنْ تُعِيْنَ قَوْمَكَ عَلَى الظُّلْمِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت واثلہ ابن اسقعؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! عصبیت یعنی جاہلیت کیا چیز ہے؟ آپ (ﷺ) نے فرمایا عصبیت

یہ ہے کہ تم ظلم پر اپنی قوم وجماعت کی حمایت کرو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ حق کے معاملہ میں اپنی قوم وجماعت کی حمایت ورعایت کی جائے تو یہ اچھی چیز ہے جیسا کہ آنے والی حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

اپنی قوم وجماعت کے ظلم کے ختم کرنے کی کوشش کرو

(۱۴) وَعَنْ سُرَاقَةَ بْنِ مَالِكِ بْنِ جُعْشَمٍ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ خَيْرُكُمُ الْمُدَافِعُ عَنْ عَشِيْرَتِهٖ مَالَمْ يَاثَمْ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت سراقہ ابن مالک ابن جعشمؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے ہمارے سامنے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنی قوم جماعت کے لوگوں کے ظلم وزیادتی کا دفعیہ کرے جب تک کہ اس دفعیہ کی وجہ سے ظلم کے گناہ کا خود مرتکب نہ ہو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اگر یہ سوال پیدا ہو کہ جو شخص ظلم وزیادتی کا دفعیہ کر رہا ہے وہ خود ظلم کا مرتکب کس طرح ہو سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ فرض کیجئے ایک شخص کو اس کے ظلم سے زبانی ہدایت وتنبیہ اور افہام وتفہیم کے ذریعہ روکا جا سکتا ہے لیکن کوئی شخص اس ظلم کے دفعیہ کے لئے اپنی زبان کو ذریعہ بنانے کی بجائے اپنے ہاتھوں کو ذریعہ بنانے لگے کہ ظلم کرنے والے کو مارنے لگے تو ظاہر ہے کہ یہ روا نہیں ہوگا یا اس ظلم کو روکنے کے لئے تھوڑا بہت مارنا کافی ہو سکتا ہو مگر کوئی شخص اس کو بہت زیادہ مارنے لگے یا جان ہی سے مار ڈالے تو اس کی اس کارروئی کو سراسر ناواجب کہا جائے گا۔ حاصل یہ کہ کسی ظالمانہ کارروائی کو روکنے کے لئے ایسا اقدام کرنا جو ضرورت سے زائد اور واجبی حد متجاوز ہو تو ظلم کی وہ مدافعت خود ظلم وتعدی بن جائے گی۔

عصبیت کی مذمت

(۱۵) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا اِلٰى عَصَبِيَّةٍ وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَصَبِيَّةً وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ مَاتَ عَلٰى عَصَبِيَّةٍ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت جبیر ابن مطعمؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے (یعنی ہمارے اہل ملت یا ہمارے اہل طریقہ میں سے نہیں ہے) جو لوگوں کو عصبیت کی دعوت دے (یعنی لوگوں کو کسی ناحق معاملہ میں حمایت کرنے پر آمادہ کرے نہ وہ شخص ہم میں سے ہے جو عصبیت کے سبب جنگ کرے اسی طرح وہ شخص بھی ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی حالت میں مر جائے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ عصبیت میں مبتلا ہونا یعنی اس شخص وقوم کی حمایت کرنا جو باطل پر ہو ہر حالت میں مذموم وممنوع ہے بشرطیکہ اس عصبیت کا تعلق کسی دینی مصلحت سے نہ ہو بلکہ محض ظلم وتعدی کے طور پر ہو۔

محبّت اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے

(۱۶) وَعَنْ اَبِى الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِيْ وَيُصِمُّ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت ابوداؤدؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کسی چیز سے تمہارا محبت کرنا تم کو اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کے ذریعہ اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ محبّت کا جنون انسان کو اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے کہ وہ غلبہ محبّت کی وجہ

سے اپنی محبوب چیز کے عیب کو نہ دیکھنے کی صلاحیت باقی رکھتا ہے اور نہ سننے کی اگر محبوب میں کوئی برائی دیکھتا بھی تو اس کو اچھی چیز سمجھتا ہے اور اگر اس سے کوئی بری بات سنتا بھی ہے تو اس کو اچھا جانتا ہے یا یہ مراد ہے کہ محبت انسان کو محبوب کے علاوہ ہر چیز سے اندھا اور بہرا کر دیتی ہے کہ وہ جمال یار کے سوا نہ کسی چیز پر نظر ڈالتا ہے اور نہ محبوب کے سوا بات سننا پسند ہے۔

اس باب میں اس حدیث کو نقل کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ارشاد گرامی اس شخص کے حق میں فرمایا گیا ہے جو کسی کی محبت سے مغلوب ہو باطل و ناروا امور میں اسی کی حمایت و مدد کرتا ہے کہ وہ حق کو نہ دیکھتا ہے اور نہ سنتا ہے بلکہ محض محبت کی وجہ سے ناحق و باطل کا حامی و مددگار بن جاتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

عصبیت کے معنی

⑰ عَنْ عُبَادَةَ بْنِ كَثِيْرٍ الشَّامِيِّ مِنْ أَهْلِ فِلَسْطِيْنَ عَنِ امْرَأَةٍ مِنْهُمْ يُقَالُ لَهَا فَسِيْلَةُ أَنَّهَا قَالَتْ سَمِعْتُ أَبِيْ يَقُوْلُ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَمِنَ الْعَصَبِيَّةِ أَنْ يُحِبَّ الرَّجُلُ قَوْمَهُ قَالَ لَا وَلٰكِنْ مِنَ الْعَصَبِيَّةِ أَنْ يَنْصُرَ الرَّجُلُ قَوْمَهُ عَلَى الظُّلْمِ۔ (رواہ احمد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت عبادۃ ابن کثیر شامیؒ جن کا تعلق فلسطین سے تھا اپنے ہی لوگوں میں کی ایک خاتون سے جن کا نام فسیلہ تھا۔ نقل کرتے ہیں کہ وہ خاتون بیان کرتی تھیں، میں نے اپنے والد کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے سوال کرتے ہوئے عرض کیا، یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا عصبیت اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی قوم و جماعت کو عزیز رکھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں، بلکہ عصبیت اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص ظلم کے معاملہ میں اپنی قوم و جماعت کی حمایت و مدد کرے۔" (احمدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی "عصبیت" کے مفہوم پر بڑے سادہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے اور اس بات کو واضح کر دیا گیا ہے۔ کہ اپنی جماعت اور اپنی قوم کی جائز حمایت کرنا اور اس کے فطری و قانونی حقوق و مفادات کے حصول و تحفظ کے لئے اس طرح جدوجہد کرنا کہ دوسروں کے حقوق و مفادات پر کوئی زد نہ پڑے عصبیت کے معنی میں داخل نہیں ہے ہاں اگر اپنی جماعت و قوم کی اس طرح حمایت کی جائے جس سے دوسروں کے تئیں ظلم و تعدی کے جذبات ظاہر ہوتے ہوں۔ یا اپنی جماعت و قوم کی جدوجہد میں معاونت کرنا جو سراسر زیادتی اور انتہاپسندی پر مبنی ہو نیز اس جدوجہد کا کوئی قانونی جواز موجود نہ ہو تو اس کو عصبیت کہا جائے گا۔ اور شریعت کی نظر میں اس حمایت و معاونت کی کوئی حقیقت نہیں ہوگی۔

اپنے نسب پر گھمنڈ نہ کرو

⑱ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْسَابُكُمْ هٰذِهٖ لَيْسَتْ بِمَسَبَّةٍ عَلٰى أَحَدٍ كُلُّكُمْ بَنُوْا اٰدَمَ طَفُّ الصَّاعِ بِالصَّاعِ لَمْ تَمْلَؤُهُ لَيْسَ لِأَحَدٍ عَلٰى أَحَدٍ فَضْلٌ اِلَّا بِدِيْنٍ وَتَقْوٰى كَفٰى بِالرَّجُلِ أَنْ يَكُوْنَ بَذِيًّا فَاحِشًا بَخِيْلًا۔ رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْإِيْمَانِ۔

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا نسب کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے سبب تم کسی کو برا کہو اور عار دلاؤ تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو جس طرح ایک صاع دوسرے صاع کے برابر ہوتا ہے کہ جس کو تم نے بھرا نہ ہو کسی کو کسی پر کوئی فضیلت و ترجیح نہیں ہے علاوہ دین اور تقویٰ کے آدمی کی برائی کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ وہ زبان دراز، فحش گوئی اور لچر باتیں کرنے والا بخیل ہو۔ اس روایت کو احمد اور شعب الایمان میں بیہقیؒ نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "صاع" سے مراد مپانہ یا پیمانہ ہے ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح ایک صاع یعنی مپانہ اپنے ہی جیسے دوسرے مپانہ کے بالکل برابر ہوتا ہے یا ان دونوں مپانوں میں جو چیزیں بھری ہوتی ہیں وہ یکساں اور برابر مقدار وزن کی حامل ہوتی ہیں کہ ان کو ایک دوسرے پر کوئی ترجیح حاصل نہیں ہوتی اسی طرح تمام انسان ایک باپ آدم علیہ السلام کی اولاد ہونے کی حیثیت میں برابری کا درجہ رکھتے ہیں اور کسی انسان کو دوسرے انسان پر محض نسب کے اعتبار سے کوئی فوقیت و برتری حاصل نہیں ہوتی۔

"تقویٰ" سے مراد شرک جلی و خفی سے بچنا اور صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے اجتناب و احتراز کرنا ہے اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ انسان، انسان ہونے کی حیثیت سے ایک دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں رکھتا بلکہ انسانی جبلت اور نفسانی تقاضوں کے اختیار سے تمام انسان، نقصان و خسران کے مقام پر ہوتے ہیں البتہ جو انسان ایمان و اسلام کی دولت رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی کمال تقویٰ و دین داری کے حامل ہوتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ آخرت کے نقصان سے محفوظ ہوتے ہیں بلکہ انسانیت کا اعلیٰ مظہر ہونے کی وجہ سے دوسرے لوگوں پر فضیلت و برتری بھی رکھتے ہیں چنانچہ اسی حقیقت کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔

"قسم ہے زمانہ کی، انسان بڑے خسارہ میں ہے علاوہ ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے۔"

حضرت شیخ عبدالحق ؒ نے طیبیؒ کے حوالہ سے حدیث کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ "طف صاع" کے معنی ہیں وہ مپانہ جو پورا بھرا ہوا ہو۔ لہٰذا انسان کو طف صاع کے ساتھ تشبیہ دے کر گویا اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ تم تمام انسانوں کے باپ چونکہ آدم علیہ السلام ہیں اور آدم علیہ السلام کو خاک سے پیدا کیا گیا ہے اس لئے تم سب اپنے اصل نسب کے اعتبار سے نقصان اور درجہ کمال تک نہ پہنچنے میں ایک دوسرے کے بالکل قریب اور برابر ہو کہ ہر انسان اپنی طبعی جبلت کی وجہ سے نقصان اور ٹوٹے میں مبتلا ہے ہاں وہ انسان اس نقصان اور ٹوٹے سے محفوظ ہیں جو ایمان و اسلام کے حامل اور تقویٰ و کمال دینداری کے مرتبہ پر فائز ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ صرف تقویٰ اور کامل دین داری ایک ایسا وصف ہے جو کسی انسان کو معزز و مکرم اور افضل و برتر قرار دے سکتا ہے جو شخص مؤمن اور متقی و پرہیزگار ہے اور دینداری کے اعلیٰ مقام پر فائز ہے بس وہی انسان فضیلت کا حامل ہو سکتا ہے اور اس وصف کے علاوہ نہ نسب کی وجہ سے کوئی انسان برتر قرار پا سکتا ہے اور نہ محض خاندانی وجاہت و شوکت اور نسلی و قبائلی شرف و امتیاز کسی انسان کو دوسرے انسانوں پر فوقیت و برتری کا درجہ دے سکتا ہے۔

بَابُ الْبِرِّ وَالصِّلَةِ

بر و صلہ کا بیان

"برّ" باء کے زیر کے ساتھ کے معنی نیکی و احسان کے ہیں اور عام طور پر اس لفظ کا اطلاق اس نیکی و بھلائی پر ہوتا ہے جس کا تعلق ماں باپ کی اطاعت و فرمانبرداری اور ان کے ساتھ اچھے برتاؤ سے ہوتا ہے اسی لئے لغت کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ بر کے معنی ہیں ماں باپ کی فرنبرداری واطاعت کرنا۔ مذکورہ بالا عنوان میں بھی اس لفظ کے یہی معنی مراد ہیں۔ واضح رہے کہ اس لفظ کی ضد "عقوق" ہے جس کے معنی ہیں ماں باپ کی نافرمانی کرنا اور ان کے ساتھ سرکشی و ایذاء رسانی کا برتاؤ کرنا۔

"صلہ" کے لغوی معنی ملانا اور پیوند لگانے کے ہیں لیکن عام اصطلاح میں اس کے معنی ہیں اپنے اعزاء و اقارب کے ساتھ احسان اور اچھے سلوک کا معاملہ کرنا اور ان کو عطاء و بخشش اور اپنی مالی و اخلاقی مدد و اعانت کے ذریعہ فائدہ و راحت پہنچانا، چنانچہ عنوان میں اس لفظ کے یہی معنے مراد ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اولاد پر ماں کے حقوق

① عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مَنْ اَحَقُّ بِحُسْنِ صَحَابَتِیْ قَالَ اُمُّکَ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ اُمُّکَ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ اُمُّکَ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ اَبُوْکَ وَفِیْ رِوَایَۃٍ قَالَ اُمُّکَ ثُمَّ اُمُّکَ ثُمَّ اُمُّکَ ثُمَّ اَبَاکَ ثُمَّ اَدْنَاکَ اَدْنَاکَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! میری اچھی رفاقت یعنی میری طرف سے حسن سلوک و احسان اور خدمت گزاری کا سب سے زیادہ مستحق کون شخص ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تمہاری ماں اس نے عرض کیا کہ پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا تمہاری ماں اس نے عرض کیا کہ پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا تمہاری ماں اس نے عرض کیا کہ پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا باپ، ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے اس شخص کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ تمہاری ماں پھر تمہاری ماں پھر تمہاری ماں پھر تمہارا باپ پھر تمہارا وہ عزیز جو نزدیک کی قرابت رکھتا ہو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس دنیا کے معاشرہ کی اصلاح و فلاح دراصل باہمی حقوق کی نگہداشت تعلق و قرابت کی پاسداری ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک اور احسان و بھلائی کے برتاؤ اور اس حسن سلوک میں فرق مراتب کے احساس پر منحصر ہے۔ شریعت اسلامی کا تقاضا ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ جس تعلق و قربت کا رشتہ رکھتا ہے اور اس تعلق و قرابت میں جو فرق مراتب سے ادائیگی حقوق اور حسن سلوک کے باہمی معاملات میں اس کا لحاظ ضروری ہے ظاہر ہے کہ قرابت کے اعتبار سے ماں کا رشتہ سب سے زیادہ گہرا اور اس کا تعلق سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے لہٰذا کسی شخص کے احسان و حسن سلوک اور خدمت گزاری کی سب سے زیادہ مستحق جو ذات ہو سکتی ہے وہ ماں ہے ماں کے بعد باپ ہے اور پھر دوسرے قرابتی اور رشتہ دار، لیکن ان قرابتی اور رشتہ داروں میں بھی تعلق و قرابت کے درجات و مراتب کی رعایت کی جائے گی کہ جو رشتہ دار، اپنے رشتہ کے اعتبار سے جتنا زیادہ نزدیک اور قریب ہو گا وہ اتنا ہی زیادہ مقدم رکھا جائے گا مذکورہ بالا حدیث میں اسی ضابطہ کو بیان فرمایا گیا ہے۔

بعض حضرات نے اس حدیث کے الفاظ سے ایک مسئلہ یہ اخذ کیا ہے کہ کسی شخص پر والدین کے ساتھ حسن سلوک اور بھلائی کرنے کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں ماں کا حصہ باپ سے تین گنا بڑھا ہوا ہے کیوں کہ وہ حمل کا بوجھ اٹھاتی ہے ولادت کی تکلیف و مشقت اور دودھ پلانے کی محنت برداشت کرتی ہے۔

فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اولاد پر ماں کا حق باپ کے حق سے بڑا ہے اور اس کے ساتھ حسن سلوک و بھلائی اور اس کی خدمت و دیکھ بھال کرنا زیادہ واجب اور زیادہ ضروری ہے اور اگر ایسی صورت پیش آجائے جس میں بیک وقت دونوں کے حقوق کی ادائیگی دشوار ہو جائے مثلاً ماں باپ کے درمیان کسی وجہ سے ان بن ہو اور لڑکا اگر ماں کے حقوق کی رعایت کرتا ہے تو باپ ناراض ہوتا ہے اور اگر باپ کے حقوق کا لحاظ کرتا ہے تو ماں آزردہ ہوتی ہے تو ایسی صورت میں یہ درمیانی راہ نکالی جائے کہ تعظیم و احترام میں تو باپ کے حقوق کو فوقیت دے اور خدمت گزاری نیز مالی امداد و عطا میں ماں کے حق کو فوقیت دے۔

ماں باپ کے حقوق کی فہرست بہت طویل ہے بلکہ ان کے مرتبہ و درجہ کو دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ اولاد اگر اپنی پوری زندگی بھی ان کے حقوق کی ادائیگی میں صرف کر دے تب بھی ان کے تئیں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی تاہم شریعت نے کچھ چیزیں ایسی بیان کر دی ہیں۔ جو زیادہ اہمیت کی ہیں اور جن کا لحاظ بہر صورت ہونا چاہئے۔ مثلاً سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ ان کی جائز خواہشات کی تکمیل اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری کو لازم جانا جائے اور ان کی رضا و خوشنودی کو اپنے حق میں ایک بڑی سعادت سمجھی جائے، اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق ان کی ضروریات اور ان کے آرام و راحت میں اپنا مال و اسباب خرچ کیا جائے اور ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا

جائے جو ان کی شان کے مطابق ہو اولاد ان کے سامنے تواضع و انکساری اختیار کرے ان کے سامنے ملائمت و نرمی اور خوشامد و عاجزی کا رویہ اپنائے اور جہاں تک ہو سکے ان کی خدمت کرے تا آنکہ وہ راضی اور خوش ہوں، ان کی اطاعت و فرمانبرداری میں کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن اطاعت و فرمانبرداری ان ہی امور میں کی جانی چاہئے جو مباح ہوں ان کے ساتھ کوئی ایسا رویہ نہیں اپنانا چاہئے جس سے ان کی شان میں بے ادبی و گستاخی ظاہر ہوتی ہو اور نہ ان کے ساتھ تکبر و انانیت کے ساتھ پیش آنا چاہئے خواہ وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں بات چیت کے وقت اپنی آواز کو ان کی آواز سے اونچی نہ کرنا چاہئے۔ اور نہ ان کا نام لے کر ان کو یاد و مخاطب کرنا چاہئے کسی کام میں ان سے پہل نہ کرنا چاہئے اور نہ ان کے مقابلہ پر خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اسی طرح اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ کہ اگر والدین غیر شرعی امور کے مرتکب ہوں تو ان کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کے وقت بھی ادب و احترام اور نرمی و ملائمت کی راہ اختیار کی جائے اور ایک دفعہ کہنے پر وہ باز نہ آئیں تو پھر سکوت اختیار کر لیا جائے اور ان کے حق میں دعا و استغفار کرتے رہنا چاہئے۔ یہ بات قرآن کریم کی اس آیت سے اخذ کی گئی ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے اپنے باپ کے سامنے نصیحت و موعظت کا ذکر ہے۔

بوڑھے والدین کی خدمت نہ کرنے والے کے حق میں آنحضرت ﷺ کی بددعا

(۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَغِمَ اَنْفُهٗ رَغِمَ اَنْفُهٗ رَغِمَ اَنْفُهٗ قِيْلَ مَنْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ مَنْ اَدْرَكَ وَالِدَيْهِ عِنْدَ الْكِبَرِ اَحَدُهُمَا اَوْكِلَاهُمَا ثُمَّ لَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خاک آلود ہو ناک اس شخص کی خاک آلود ہو ناک اس شخص کی یعنی آپ ﷺ نے تین مرتبہ گویا یہ بددعا فرمائی کہ وہ شخص ذلیل و خوار ہو پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) وہ کون شخص ہے جس کے حق میں بددعا فرمائی جا رہی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ شخص جو اپنے والدین میں سے کسی ایک یا دونوں کو بڑھاپے کی حالت میں پائے اور پھر جنت میں داخل نہ ہو یعنی جس شخص کے ماں باپ یا دونوں میں سے کوئی ایک بڑھاپے کی حالت میں ہو اور وہ شخص ان کی خدمت کر کے ان کو راضی نہ کرے تو وہ انتہائی بدقسمت ہے کیونکہ خصوصیت سے بوڑھے ماں باپ کی خدمت کرنا بڑے اجر کی بات ہے اور جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے۔" (مسلمؒ)

مشرک ماں باپ کے ساتھ بھی حسن سلوک کرنا چاہئے

(۳) وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِیْ بَكْرٍ قَالَتْ قَدِمَتْ عَلَیَّ اُمِّیْ وَهِیَ مُشْرِكَةٌ فِیْ عَهْدِ قُرَيْشٍ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اُمِّیْ قَدِمَتْ عَلَیَّ وَهِیَ رَاغِبَةٌ اَفَاَصِلُهَا قَالَ نَعَمْ صِلِيْهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ کہتی ہیں کہ میری والدہ شرک کی حالت میں مکہ سے مدینہ آئیں جبکہ قریش کے ساتھ صلح کا زمانہ تھا یعنی مدینہ میں میری والدہ کے آنے کا یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جبکہ صلح حدیبیہ کی صورت میں آنحضرت ﷺ اور قریش مکہ کے درمیان جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہو چکا تھا اور میری والدہ اس وقت تک مشرف بہ اسلام نہیں ہوئی تھیں چنانچہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! میری والدہ میرے پاس آئی ہیں اور وہ اسلام سے بیزار ہیں کیا میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

صلہ رحم کی اہمیت

(۴) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اٰلَ اَبِیْ فُلَانٍ لَيْسُوْا لِیْ بِاَوْلِيَاءَ

اِنَّمَا وَلِیِّیَ اللّٰہُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَلٰکِنْ لَّھُمْ رَحِمٌ اُبُلُّھَا بِبَلَالِھَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ ابوفلاں کی اولاد میرے دوست نہیں ہیں میرا دوست یا تو خدا ہے یا نیک بخت مؤمنین البتہ ان لوگوں سے میری قرابت داری ہے جس کو میں تر چیزوں سے تر کرتا رہتا ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "ابوفلاں کی اولاد" کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشاد میں صریح نام لیا تھا لیکن راوی نے اس ارشاد گرامی کو بیان کرتے وقت اس نام کو صریح ذکر نہیں کیا بلکہ لفظ "ابوفلاں" کے ذریعہ اشارۃً بیان کیا اور صریح ذکر نہ کرنے کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ راوی نے جس موقع پر اس ارشاد گرامی کو بیان کیا اس وقت اس نام کو صراحۃً ذکر کرنے سے کسی فتنہ کے اٹھ کھڑے ہونے کا خوف ہوگا بخاریؒ و مسلمؒ کے اصل نسخوں میں بھی لفظ ابی کے بعد جگہ کو خالی چھوڑ دیا گیا ہے کسی نام کو صراحۃ نہیں کیا گیا ہے اور اس کی علت بھی وہی ہے رہی یہ بات کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشاد میں جس نام کو صراحۃً ذکر فرمایا تھا وہ کیا ہے؟ تو محققین نے کہا ہے کہ وہ ابولہب ہے اور بعض حضرات نے ابوسفیان یا حکم بن العاص بیان کیا ہے لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا جو مفہوم ہے اس کا تعلق کسی خاص فرد کی اولاد سے نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ کی مراد عمومی طور پر اپنے قبیلہ و خاندان کے افراد ہیں جیسے اہل قریش یا بنوہاشم اور یا آنحضرت ﷺ کے چچاؤں کی اولاد۔

"میرے دوست نہیں ہیں الخ" سے آنحضرت ﷺ کی مراد اس بات کو واضح کرنا تھا کہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ میری مالی امداد و معاونت اور ان کو دینا دلانا اس سبب سے نہیں ہے کہ میں ان کو زیادہ محبوب رکھتا ہوں اور مجھ کو ان سے کچھ زیادہ روحانی و باطنی تعلق ہے بلکہ چونکہ وہ میرے قرابتی ہیں اس لئے میں قرابت کا حق ادا کرنے کے لئے ان کی مالی امداد کرتا رہتا ہوں۔ ورنہ جہاں تک باطنی و روحانی تعلق اور محبت کا سوال ہے تو مجھ کو زیادہ تعلق اور زیادہ محبت اس شخص سے ہے جو مؤمن صالح ہے خواہ وہ میرا قرابتی ہو یا غیر قرابتی چنانچہ میرا دوست خدا ہے یا نیک بخت مؤمنین میں نیک بخت سے جنس صلحاء یعنی تمام نیک بخت و صالح مسلمان مراد ہیں اگرچہ بعض حضرات نے حضرت ابوبکرؓ کو اور بعض حضرات نے حضرت علیؓ کو مراد قرار دیا ہے۔

"جس کو میں تر چیزوں سے تر کرتا رہتا ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ چونکہ میرے قرابتدار ہیں اس لئے میں ان کے ساتھ مدد تعاون کا سلوک کرتا ہوں اور ان کو مال وغیرہ دیتا رہتا ہوں تاکہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں دراصل تری اور نرمی چونکہ متفرق اجزاء اور اشیاء کو آپس میں جوڑنے اور ملانے کا ایک ذریعہ بنتی ہے اور اس کے برخلاف خشکی اور سختی چونکہ اشیاء کے باہمی افتراق و انتظار کا سبب بنتی ہے اس لئے اہل عرب اپنے کلام میں بطور استعارہ لفظ "بل" یعنی تری اور نرمی کو صلہ رحم، ناتا جوڑنے کے معنی میں اور "یبس" یعنی خشکی کو ناتا توڑنے اور ترک تعلق کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

والدین کو تکلیف پہنچانا حرام ہے

⑤ وَعَنِ الْمُغِیْرَۃِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَیْکُمْ عُقُوْقَ الْاُمَّھَاتِ وَوَأْدَ الْبَنَاتِ وَمَنْعَ وَھَاتِ وَکَرِہَ لَکُمْ قِیْلَ وَقَالَ وَکَثْرَۃَ السُّؤَالِ وَاِضَاعَۃَ الْمَالِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت مغیرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تم پر اس امر کو حرام قرار دیا ہے کہ ماں کی نافرمانی کر کے اس کا دل دکھایا جائے، لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جائے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ فقر و محتاجگی اور عار کے خوف سے لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے) اور بخیلی و گدائی اختیار کی جائے نیز قیل و قال سوال کی زیادتی اور مال ضائع کرنے کو تمہارے لئے مکروہ قرار دیا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: خاص طور پر "ماں" کا ذکر کرنا اس سبب سے ہے کہ اولاد پر ماں کے حقوق باپ سے زیادہ ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ ماں کا حق

باپ سے تین گنا ہے یا اس تخصیص کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ ماں طبعی طور پر باپ سے زیادہ حساس اور کمزور دل ہوتی ہے باپ تو اولاد کی بڑی سے بڑی اذیت رسانی کو برداشت کر لیتا ہے لیکن ماں اپنی اولاد کی طرف سے ذرا سی بات میں رنجیدہ ہو جاتی ہے اگر اولاد اس کے حقوق کی ادائیگی اور اطاعت و فرمانبرداری کرنے میں معمولی سی بھی غفلت و کوتاہی کرتی ہے تو اس کا دل فوراً متاثر ہو جاتا ہے اور وہ سخت تکلیف محسوس کرتی ہے یہ اور بات ہے کہ اولاد کی تقصیر و کوتاہی سے جس قدر ماں درگزر کرتی ہے اتنا اور گزر باپ نہیں کرتا اور اس کا سبب بھی ماں کا کمزور دل ہونا ہے۔

"مَنَعَ" یا "مَنْعَ" کے معنی روکنے اور محروم کرنے کے ہیں اور اس سے مراد بخل اور کنجوسی ہے۔

"هَاتِ" دراصل لفظ اٰتِ کے معنی میں ہے جو ایتاء کا صیغہ امر ہے اور جس کے معنی ہیں لاؤ دو! یہاں اس لفظ کو مانگنے اور سوال کرنے یعنی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے علماء نے لکھا ہے کہ منع و ھات سے مراد یہ ہے کہ اپنے مال پر دوسرے لوگوں کا جو حق واجب ہو تو اس کو ادا نہ کرے اور دوسروں کے مال میں سے وہ چیز لے جو اس کے لئے حلال نہیں ہے! بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ نہ صرف مال میں منع وہات کو حرام قرار دیا گیا ہے بلکہ ہر طرح کے حقوق واجبہ کو ادا نہ کرنا حرام ہے ان کا تعلق خواہ مال و زر سے ہو یا افعال و احوال سے اور خواہ اقوال و گفتار سے ہو یا اخلاق و کردار سے اسی طرح کسی ایسی چیز کا مطالبہ کرنا اور مانگنا جو دوسروں پر کسی بھی طرح کے حق کے طور پر واجب نہ ہو اور دوسروں کو کسی ایسی چیز کی ادائیگی و انجام دہی کی محنت و کلفت میں مبتلا کرنا جو ان پر واجب نہیں ہے حرام ہے۔

قِيْلَ وَقَالَ یہ ایک محاورہ ہے جو ہماری زبان میں بھی اسی طرح مستعمل ہے اس کا اطلاق عام طور پر بے فائدہ بحث و مباحثہ، ردوکد اور حجت و تکرار پر ہوتا ہے یہاں حدیث میں بھی قیل وقال کو مکروہ قرار دینے کا مطلب بے فائدہ باتیں کرنے اور بک بک لگانے سے منع کرنا ہے جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ جب بے فکر لوگ کہیں آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ تو ادھر ادھر کی لایعنی باتوں میں لگ جاتے ہیں نہ کسی گفتگو کا کوئی با مقصد موضوع ہوتا ہے اور نہ کسی بات کا کوئی دینی و دنیاوی فائدہ ان کی بات چیت کا زیادہ تر موضوع غلط سلط واقعات کو نقل کرنا اور جھوٹے سچے اقوال کو بیان کرنا ہوتا ہے چنانچہ کوئی کہتا ہے کہ فلاں شخص نے ایسا ایسا کہا ہے فلاں آدمی نے اس طرح کہا تو فلاں شخص نے یوں جواب دیا غرضیکہ اسی طرح کے بے سروپا اور لغو باتیں کر کے اور غپ شپ میں مشغول رہ کر وقت جیسی قابل قدر شے کو ضائع کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ قیل وقال کی ممانعت اس صورت میں ہے جب کہ اس بحث و مباحثہ اور باہمی بات چیت کا مقصد کسی مسئلہ معاملہ کی تحقیق اور حصول معلومات نہ ہو ہاں اگر کسی معاملہ کی تحقیق حصول معلومات اور دوسرے نیک مقصد کے لئے باتوں میں مشغول رہا جائے اور لوگوں کے اقوال بیان کئے جائیں تو اس پر مذکورہ ممانعت کا اطلاق نہیں ہوگا بعض حضرات نے قیل وقال کی مراد بہت زیادہ باتیں کرنا لکھا ہے اور واضح کیا ہے کہ بہت زیادہ باتیں کرنا دل پر غفلت و مردنی طاری کرتا ہے بے حسی اور لاپرواہی میں مبتلا کرتا ہے اور وقت کو ضائع کرتا ہے۔

"کثرۃ السوال" یعنی سوال کی زیادتی کے کئی معنی بیان کئے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دوسرے لوگوں کے احوال و معاملات کی بہت زیادہ پوچھا پاچھی اور تجسس معلومات کرنا دوسرے یہ کہ اپنے علم کی برتری کو ظاہر کرنے یا کسی کو امتحان و آزمائش میں مبتلا کرنے یا لاحاصل بحث و مناظرہ کی خاطر بہت زیادہ علمی سوالات کرنا اور کسی بات کو بہت زیادہ گھما پھرا کر پوچھنا اور تیسرے یہ کہ اس ممانعت کے مخاطب خاص طور پر صحابہؓ تھے جنہیں اس بات کی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ دینی احکام و مسائل میں آنحضرت ﷺ سے زیادہ سوالات نہ کیا کریں اور نہ ادھر ادھر کے معاملات میں آپ ﷺ سے پوچھ پاچھ کیا کریں کیونکہ سوالات کی زیادتی و کثرت اور غیر ضروری پوچھا پاچھی کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ آنحضرت ﷺ کی طبیعت کو ناگواری ہوتی ہے بلکہ زیادہ پوچھنا احکام و مسائل میں شدت و سختی اور مزید پابندیوں کا سبب بھی بن سکتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ۔

"اِضَاعَةُ الْمَال" یعنی مال کو ضائع کرنے سے مراد یہ ہے کہ اپنے مال اور اپنے روپے پیسے کو اسراف یعنی فضول خرچی میں بہایا جائے یا اس کو ایسی جگہ خرچ کیا جائے جس کا حق تعالیٰ کی طاعت وخوشنودی سے کوئی تعلق نہ ہو جیسے کوئی شخص اپنا سارا مال اور روپیہ پیسہ یا اس کا کچھ حصہ کسی دوسرے شخص کو دیدے مگر اس کے وہ عزیز و اقارب اور متعلقین محروم رہیں جو نہ صرف اپنے تعلق کی وجہ سے بلکہ اپنے احتیاج وضرورت کی بنا پر بھی اس کے مال اور روپیہ پیسہ پر اپنا حق رکھتے ہوں یا کوئی شخص اپنے مال و اسباب اور دولت کو پانی میں ڈال دے یا نذر آتش کر دے اور یا کسی ایسے فاسق کو دیدے جو اس کو گناہ و معصیت کے کاموں میں خرچ کرے۔

اضاعت مال کے مذکورہ بالا مسئلہ کو زیادہ تفصیل کے ساتھ یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اپنے مال و دولت اور روپیہ پیسہ کو جہاں خرچ کرنا حرام یا مکروہ ہے وہاں اپنے مال اور روپیہ پیسہ کو صرف کرنا بلاشبہ اسراف اور ضائع کرنا کہلائے گا یہ دونوں صورتیں بالکل واضح ہیں اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں! اشتباہ اس جگہ ہے جہاں خرچ کرنا بظاہر تو مباح معلوم ہوتا ہو لیکن اگر اچھی طرح غور فکر کیا جائے تو اس خرچ کے نتیجہ سے برائیاں اور ظاہری باطنی خرابیاں نکلیں مثلاً بلاضرورت دور دراز کے علاقوں میں مکانات بنانا، مکانات میں بے ضرورت تعمیر و ترمیم کر کے ان کو وسیع و عریض بنانا ان کی ناروا آرائش و زیبائش کی خاطر مال خرچ کرنا جہاں جس قدر خرچ کرنے کی ضرورت ہو اس سے زائد خرچ کرنا، محض نفس و طبیعت کے حظ اور مزہ و لذت حاصل کرنے کے لئے حد اعتدال سے زیادہ اور اچھے اچھے کھانے کھانا بڑائی جتانے اور اپنے کو برتر ثابت کرنے کی خاطر اعلیٰ پوشاک پہننا اور اپنی شان و شوکت کو ظاہر کرنے کے لئے اونچے درجہ کی طرز معاشرت اختیار کرنا اور ان سب صورتوں میں فقراء و مساکین اور مفلس و قلاش لوگوں کی ضرورت و احتیاج سے صرف نظر کرنا اور ان کی خستہ حالی و محتاجگی کی قطعاً کوئی رعایت نہ کرنا جیسا کہ خالص دنیادار اور فضول خرچ کرنے والوں کا شیوہ ہے یہ ایسی چیزیں ہیں جن پر اپنا مال اور روپیہ پیسہ خرچ کرنا اگرچہ شریعت کے ظاہری حکم کی روشنی میں حرام قرار نہ پائے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس طرح کے اخراجات قلب و طبیعت پر تنگی و سختی اور بے مروتی طاری ہونے کا سبب بنتے ہیں اس صورت حال سے سماج و معاشرہ میں غیر فطری عدم توازن و ناہمواری کی فضا بھی پیدا ہو جاتی ہے جس سے مختلف قسم کی برائیاں ظہور میں آتی ہیں۔

اسی طرح برتن باسنوں ہتھیاروں اور استعمال میں آنے والی دوسری چیزوں کو سونے جواہرات اور دیگر قیمتی اشیاء سے مزین کرنا، خرید و فروخت کے معاملات میں اس طرح لاپرواہی برتنا کہ نہ تو مال کے ڈوبنے کا خوف ہو جیسے ادھار لین دین کی مدت کو ضرورت سے زائد بڑھانے اور نہ اپنے روپے پیسے کی حفاظت کا لحاظ ہو جیسے ایسی تجارت یا معاملہ میں اپنا روپیہ لگانا جس میں نقصان کا یقین ہو یا کسی چیز کو خواہ مخواہ بلاضرورت گراں قیمت پر خریدنا اس طرح کی چیزیں بھی اسراف یعنی فضول خرچی اور اپنے مال کو ضائع کرنے کے حکم میں داخل ہیں۔

دوسروں کے ماں باپ کو برا کہہ کر اپنے ماں باپ کو برا نہ کہلواؤ

(٦) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْكَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَيْهِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَهَلْ يَشْتِمُ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ قَالَ نَعَمْ يَسُبُّ اَبَا الرَّجُلِ فَيَسُبُّ اَبَاهُ وَيَسُبُّ اُمَّهُ فَيَسُبُّ اُمَّهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اپنے ماں باپ کو گالی دینا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ صحابہؓ نے یہ سن کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا کوئی شخص اپنے ماں باپ کو بھی گالی دیتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں کیوں نہیں (کبھی کبھار تو حقیقت میں بھی کوئی جاہل شخص اپنے ماں باپ کو گالی بک دیتا ہے اور یہ تو اکثر ہوتا ہے کہ لوگ اپنے ماں باپ کو اگرچہ حقیقۃً خود گالی نہیں دیتے۔ مگر ان کو گالی دلوانے کا سبب ضرور بنتے ہیں اور وہ اس طرح کہ) اگر کوئی شخص کسی کے باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے اور اگر کوئی شخص کسی کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔" (بخاری)

تشریح: اس حدیث سے یہ بات واضح ہوئی کہ اپنے ماں باپ کو گالی دینا اور ان کو برا کہنا تو گناہ کبیرہ ہے ہی لیکن جو شخص کسی کے ماں باپ کو گالی دے کر اپنے ماں باپ کو گالی دلوانے اور ان کو برا کہلوانے کا سبب بنے وہ بھی گناہ کبیرہ کا مرتکب قرار دیا جائے گا کیونکہ اگر وہ اس شخص کے ماں باپ کو گالی نہ دیتا تو وہ شخص بھی اس کے ماں باپ کو گالی نہ دیتا لہٰذا جب وہ اپنے ماں باپ کو گالی دینے کا باعث بنا تو گویا اس نے خود گالی دی اور ماں کو گالی دینا عقوق یعنی والدین کی نافرمانی اور تمرد و سرکشی میں داخل ہے جو حرام ہے۔

گر مادر خویش دوست داری دشنام مدہ بمادر من

مذکورہ بالا حدیث سے یہ مسئلہ بھی نکلا کہ اگر کوئی شخص کسی فسق و معصیت کا سبب و ذریعہ بنے گا تو اس کا شمار بھی اس فسق و معصیت کے مرتکب کی حیثیت سے ہوگا اور درجہ کا گنہ گار بھی ہوگا۔

باپ کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک و احسان کی اہمیت

(۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَبَرِّ الْبِرِّ صِلَةَ الرَّجُلِ اَهْلَ وُدِّ اَبِيْهِ بَعْدَ اَنْ يُّوَلِّيَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا سب سے اعلیٰ نیکیوں میں سے ایک اعلیٰ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے باپ کے مرنے کے بعد یا اس کی غیر موجودگی میں اس کے دوستوں کے ساتھ احسان و سلوک کرے۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کا باپ مر گیا ہو یا سفر پر گیا تو اس کے دوستوں کے ساتھ احسان و مروت کا معاملہ کرنا اور حسن سلوک کا برتاؤ کرنا گویا اپنے باپ کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کرنا اور اس کا یہ معاملہ چونکہ اپنے باپ کی غیر موجودگی میں ہوگا اس لئے وہ بہترین اور اعلیٰ نیکی کرنے والا شمار ہوگا۔

حدیث شریف میں صرف باپ کے دوستوں کا ذکر کرنا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ ماں کی سکھی سہیلیوں کے ساتھ احسان و حسن سلوک بدرجہ اولیٰ ایک بہترین نیکی ہوگا۔

رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک فراخی رزق اور درازی عمر کا ذریعہ ہے

(۸) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّبْسَطَ لَهٗ فِيْ رِزْقِهٖ وَيُنْسَاَ لَهٗ فِيْ اَثَرِهٖ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں وسعت و فراخی اور اس کی موت میں تاخیر کی جائے یعنی اس کی عمر دراز ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کرے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "اَثَر" اصل میں پیروں کے اس نشان کو کہتے ہیں جو چلتے وقت زمین پر پڑتا ہے اور وہ نشان گویا زندگی کی علامت ہوتا ہے کہ جو شخص مر گیا اس کا نشان قدم زمین پر نہیں پڑا اس اعتبار سے عرب میں مدت عمر کو "اثر" کہا جانے لگا۔

حدیث کے اس جملہ اس کے رزق میں وسعت و فراخی اور اس کی موت میں تاخیر کی جانے کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی عقیدے رزق کا تعلق تقدیر سے ہے کہ جس شخص کے مقدر میں جس قدر رزق لکھ دیا گیا ہے اس کو اسی قدر ملے گا اس میں نہ کمی ہو سکتی ہے اور نہ زیادتی اسی طرح موت کا وقت بھی متعین ہے کہ جس کی موت کا جو وقت کاتب تقدیر نے لکھ دیا ہے اس وقت سے نہ ایک لمحہ پہلے موت آسکتی ہے اور نہ ایک لمحہ بعد جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۔

"پھر جب وہ معیاد ختم ہوگی یعنی عمر پوری ہو جائے گی اس وقت نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹیں گے اور نہ آگے بڑھیں گے۔"

لہٰذا اس واضح عقیدے کی روشنی میں حدیث کے مذکورہ بالا جملے کے معنی کیا ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رزق میں وسعت و فراخی اور درازی عمر سے مراد رزق میں برکت کا محسوس ہونا، شب و روز کا خوشی و مسرت اور اطمینان و سکون کے ساتھ گزرنا عمر کے بیشتر لمحات کو طاعات و عبادات کی زیادہ سے زیادہ توفیق کا حاصل ہونا اور قلب کو نورانیت اور باطن کی صفائی و پاکیزگی کا نصیب ہونا ہے یا درازی عمر سے مراد دنیا جہان میں نام کو نیک بقا حاصل رہنا ہے اور یا یہ کہ درازی عمر سے اولاد صالح مراد ہے جو اپنے ماں باپ کے مرنے کے بعد اس کے حق میں دعا و مغفرت اور ایصال ثواب کرتی ہے اور اس کے نیک نام کو باقی رکھتی ہے اس لئے کہا گیا کہ بقائے اولاد مردہ کے لئے پیدائش ثانی ہے یعنی صاحب اولاد شخص مرنے کے بعد بھی اس اولاد کی صورت میں ایک طرح سے اپنا وجود باقی رکھتا ہے۔

اور اگر زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ رزق و عمر کے بارے میں مذکورہ بالا عقیدے اور حدیث کے مفہوم کے درمیان کوئی ایسا تضاد نہیں ہے جس کو دور کرنے کے لئے دقیق تاویلات اختیار کی جائیں کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کرنے کو فراخی رزق اور درازی عمر کا سبب قرار دیا ہے جیسا کہ اس نے ہر چیز کے لئے کوئی نہ کوئی سبب ضرور پیدا کیا ہے چنانچہ وہ جس کے رزق میں وسعت، فراخی اور عمر میں درازی کرنا چاہتا ہے اس کو رشتہ داروں کے تئیں ادائے حقوق کی توفیق بخش دیتا ہے اور یہ بات ایسی نہیں ہے جس کو تقدیر الٰہی میں ترمیم و تغیر کا نام دیا جائے زیادہ سے زیادہ اس بات کو خلق کی نسبت سے محو سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جیسے لوح محفوظ میں لکھ دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص کی عمر ساٹھ سال کی ہے لیکن اگر یہ شخص اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرے تو اس کی عمر میں چالیس سال کا اضافہ ہو جائے۔

اس مسئلہ میں بحث کی خاطر علمی اور تحقیقی طور پر بہت سی باتیں کہی جاسکتی ہیں لیکن اصل بات صرف یہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے جو بیان کر دیا ہے اور جس طرح فرمایا ہے بس اسی پر ایمان اور اعتقاد رکھا جائے نہ کہ بحث و مباحثہ کے ذریعہ شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں۔ چنانچہ سعادت کی نشانی میں ہے کہ اس طرح کی چیزوں کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے جتنا فرما دیا ہے اسی کو اختیار کیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے اور دور دراز کی بحثوں اور تحقیقی موشگافیوں میں الجھ کر اپنے ذہن و فکر کو بوجھل نہ بنایا جائے۔

صلۂ رحم کی اہمیت

(۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَلَمَّا فَرَغَ مِنْهُ قَامَتِ الرَّحِمُ فَاَخَذَتْ بِحَقْوَیِ الرَّحْمٰنِ فَقَالَ مَهْ قَالَتْ هٰذَا مَقَامُ الْعَآئِذِ بِكَ مِنَ الْقَطِیْعَةِ قَالَ اَلَا تَرْضَیْنَ اَنْ اَصِلَ مَنْ وَصَلَكِ وَ اَقْطَعَ مَنْ قَطَعَكِ قَالَتْ بَلٰی یَارَبِّ قَالَ فَذَاكِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا کیا یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو ان کی پیدائش سے پہلے ہی ان صورتوں کے ساتھ اپنے علم ازلی میں مقدر کر دیا جن پر وہ پیدا ہوں گی جب اس سے فارغ ہوا تو رحم یعنی رشتہ ناتا کھڑا ہوا اور پروردگار کی کمر تھام لی، پروردگار نے فرمایا کہہ کیا چاہتا ہے؟ رحم نے عرض کیا کہ یہ کاٹے جانے کے خوف سے تیری پناہ کے طلبگار کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے (یعنی کہ میں تیرے روبرو کھڑا ہوں اور تیرے دامن عزت و عظمت کی طرف دست سوال دراز کئے ہوں تجھ سے اس امر کی پناہ چاہتا ہوں کہ کوئی شخص مجھ کو کاٹ دے اور میرے دامن عزت و عظمت کی طرف دست سوال دراز کئے ہوں تجھ سے اس امر کی پناہ چاہتا ہوں۔ کہ کوئی شخص مجھ کو کاٹ دے اور میرے دامن کو جوڑنے کی بجائے اس کو تار تار کر دے) پروردگار نے فرمایا کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ جو شخص (رشتہ داروں اور عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک کے ذریعہ) تجھ کو قائم و برقرار رکھے اور اس کو میں بھی اپنے احسان و انعام اور اجر و بخشش کے ذریعہ قائم و برقرار رکھوں اور جو شخص رشتہ داری اور تعلق کے حقوق کی پامالی کے ذریعہ تجھ کو منقطع

کردے میں بھی (اپنے احسان و انعام کا تعلق) اس سے منقطع کرلوں؟ رحم نے عرض کیا کہ پروردگار! بیشک میں اس پر راضی ہوں پروردگار نے فرمایا اچھا تو یہ وعدہ تیرے لئے ثابت و برقرار ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جب اس سے فارغ ہوا" کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ مخلوقات کو پیدا کرچکا! اگرچہ ظاہری طور پر ان دونوں جملوں میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن اس میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ لغوی طور پر فراغت کا حقیقی مفہوم اپنے تحقق کے لئے پہلے اشتغال کا متقاضی ہوتا ہے یعنی فراغت کا مفہوم اس صورت پر صادق آتا ہے جب کسی کام میں مشغولیت رہی ہو اور اس کام کے علاوہ دیگر امور سے باز رکھتی ہے اس لئے کہا جائے گا کہ "جب اس سے فارغ ہوا" میں فراغت اپنے اس حقیقی مفہوم میں استعمال نہیں ہوا ہے کیونکہ حق تعالیٰ اس سے پاک و منزہ ہے کہ اس کو ایک کام دوسرے کام سے باز رکھے جیسا کہ ایک دعائے ماثورہ میں یوں آیا ہے سبحان من لا یشغلہ شان عن شان۔

"حَقْوٌ" دراصل اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں ازار باندھتے ہیں۔ اور چونکہ ازار کو باندھنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس کے دونوں کناروں کو ملا کر باندھا جاتا ہے اس اعتبار سے یہاں اس لفظ کا تثنیہ استعمال کرتے ہوئے بحقوی الرحمٰن فرمایا گیا یعنی وہ جگہ جہاں ازار کے دونوں کنارے باندھے جاتے ہیں، ویسے لفظ "حَقْوٌ" کا اطلاق خود ازار باندھنے کی جگہ اور کمر جیسی چیزوں سے پاک و منزہ ہے اس لئے یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے۔ کہ یہ جملہ اپنے حقیقی معنی پر محمول نہیں ہے بلکہ اہل عرب کے ایک مخصوص اور اپنے بیان کا مظہر ہے اور یہاں جس بات کو بیان کرنا مقصود تھا ان کو انہی کے طرز کلام کی مثالی صورت میں واضح کیا گیا ہے چنانچہ اہل عرب کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے کی پناہ میں آنا چاہتا یا اس کی مدد کا خواہاں ہوتا جو اس کو سخت اضطراب و پریشانی میں ڈالنے والی ہوتی اور وہ پناہ یا مدد چاہنے کی اپنی ضروریات کو زیادہ اہمیت اور تاکید کے ساتھ ظاہر کرنا چاہتا تو جس کی پناہ یا مدد درکار ہوتی اس کے حقو ازار پر دونوں ہاتھ مارتا تاکہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوجائے اور یہ پوچھنے پر مجبور ہو کہ تیرا مقصد کیا ہے اور مجھ سے کیا چاہتا ہے چنانچہ رشتہ ناتے کا اپنے کاٹے جانے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کے مفہوم کو بطور استعارہ مذکورہ عبارت کے ذریعہ بیان کیا گیا ورنہ لغوی طور پر یہاں نہ تو حقو کے حقیقی معنی مفہوم ہیں اور نہ اس کو پکڑنے کا وہی مفہوم ہے جو کسی انسان کو پکڑنے کا ہوتا ہے یہ ایسا ہی ہے جیسا اہل عرب کے ہاں جب کسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یداہ مبنسو طتان یعنی اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں تو اس سے مراد اس کی نہایت سخاوت و فیاضی کو ظاہر کرنا ہوتا ہے خواہ وہ واقعۃً ہاتھوں والا ہو یا خلقی طور پر سرے سے اس کے ہاتھ ہی نہ ہوں اور خواہ وہ ایسی ذات ہو جس کے لئے ہاتھوں کا وجود ہی محال ہو جیسے حق تعالیٰ کی ذات حاصل یہ کہ اس طرح کے طرز کلام اہل عرب میں محاورہ کے طور پر بہت مستعمل ہیں جن کے الفاظ اپنے حقیقی مفہوم کو ادا کرنے کے بجائے دوسرے مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور چونکہ قرآن کریم کا نزول اور احادیث نبوی ﷺ کا صدور اہل عرب ہی کے طرز کلام پر اور اسلوب بیان کے مطابق ہوا ہے اس لئے قرآن و حدیث کے ایسے مقام کہ جہاں اس طرح کے جملے آتے ہیں اور جن پر متشابہات کا اطلاق ہوتا ہے ان کی تاویل و وضاحت کے لئے یہ بات ایک بڑی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے ویسے اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ کہ رحم یعنی رشتہ و ناتا کوئی ذات و جسم تو ہے نہیں کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو اور حق تعالیٰ سے پناہ کا طلبگار ہو، بلکہ حقیقت میں وہ ایک معنی ہے لہٰذا اس کے لئے۔ کھڑے ہونے اور پناہ چاہنے کے الفاظ استعمال کرنا بطور تشبیہ و تمثیل ہی ہوسکتا ہے جس سے اس بات کو واضح کرنا مراد ہے کہ رحم گویا ایک ہستی یا ایک ایسے شخص کی طرح ہے جو کھڑا ہو اور حق تعالیٰ کی عزت و عظمت اور اس کی کبریائی کا دامن پکڑ کر پناہ کا طلبگار ہو۔

اسی طرح کی بات نووی نے بھی بیان کی ہے انہوں نے کہا ہے کہ رحم جس کو جوڑا جاتا ہے یا کاٹا جاتا ہے کوئی ذات یا جسم نہیں ہے بلکہ معانی میں سے ایک معنی ہے جو (کسی ذات جسم کی طرح) نہ کھڑا ہوسکتا ہے اور نہ اس سے کلام و گفتگو کا صدور ہوتا ہے لہٰذا اس کے بارے میں مذکورہ ارشاد کی مراد دراصل رحم یعنی ناتے کی اہمیت کو ظاہر کرنا، ناتے کو جوڑنے والے کی فضیلت کو بیان کرنا اور ناتے کی مذمت کرنا ہے کیونکہ ناتے کو جوڑنا فی الجملہ واجب ہے اور اس کو توڑنا گناہ کبیرہ ہے اگرچہ صلہ رحم کے درجات متعین کردیئے گئے ہیں جن میں سے

بعض کو زیادہ اہمیت اور برتری حاصل ہے اور سب سے ادنی درجہ ترک مہاجرت یعنی میل ملاقات کو اختیار کرنا ہے کیونکہ صلہ رحم کا ایک ذریعہ کلام وملاقات بھی ہے اگرچہ وہ محض سلام کی حد تک ہو۔

واضح رہے کہ صلہ رحم کے ان درجات کے درمیان تفاوت و اختلاف کی بنیاد مواقع و حالات اور ضرورت وقدرت کے مختلف ہونے پر ہے چنانچہ بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں رشتہ داری کے تعلق کی رعایت اور رشتہ داروں سے نیک سلوک کی زیادہ اہمیت و ضرورت ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں اس کی اہمیت و ضرورت زیادہ نہیں رہتی علاوہ ازیں بعض مواقع پر رشتہ کا لحاظ اور نیک سلوک کرنے کی قدرت و استطاعت حاصل ہوتی ہے اور بعض مواقع پر قدرت و استطاعت کا فقدان ہوتا ہے اسی اعتبار سے صلہ رحم کا حکم بھی عائد ہوتا ہے کہ بعض صورتوں میں زیادہ اہم ہے اور بعض میں مستحب لہٰذا اگر کسی شخص نے ناتا جوڑنے کے حق کو جزوی طور پر ادا کیا اور اس کو پورے طور پر ادا نہیں کر سکا تو اس کو ناتا توڑنے والا نہیں کہیں گے۔ لیکن اگر کسی شخص نے رشتہ داری کے حقوق میں سے کسی ایسے حق کو پورا کرنے میں کوتاہی کی جس کو پورا کرنے پر وہ قادر تھا نیز اس حق کو پورا کرنا اس کے لئے مناسب بھی تھا تو اس شخص کو ناتا جوڑنے والا کہا جائے گا۔

ناتا توڑنے والا اور رحمت خداوندی

(۱۰) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّحِمُ شُجْنَةٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ فَقَالَ اللّٰهُ مَنْ وَصَلَكِ وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَكِ قَطَعْتُهُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ رحم (کا لفظ) رحمٰن (کے لفظ) سے نکلا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (رحم یعنی رشتہ ناتے سے) فرمایا کہ جو شخص تجھ کو جوڑے گا یعنی تیرے حق کو ملحوظ رکھے گا میں بھی اس کو اپنی رحمت کے ساتھ جوڑوں گا اور جو شخص تجھ کو توڑے گا یعنی تیرے حق کا لحاظ نہیں کرے گا میں بھی اس کو توڑ دوں گا یعنی ایسے شخص کو اپنی رحمت سے محروم کروں گا۔" (بخاریؒ)

تشریح: لفظ "رحم رحمٰن سے نکلا ہے" کی وضاحت ایک دوسری حدیث میں یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے رحم یعنی ناتے کو پیدا کیا اور اس کے نام کا لفظ یعنی رحم اپنے نام یعنی رحمٰن کے لفظ سے نکالا اور یہ احتمال بھی ہے کہ حدیث میں ان دونوں لفظ یعنی رحم اور رحمٰن کے معنی مراد ہوں اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ رحم کی قرابت یعنی ذو الارحام جیسے ماں باپ اور بہن بھائی وغیرہ کہ جس کے حق کا لحاظ کرنا واجب ہے رحمٰن (یعنی اللہ تعالیٰ) کی رحمت کی ایک شاخ ہے۔

اور بعض شارحین نے لغت کی کتابوں کے حوالہ سے لکھا کہ "شُجْنَة" اصل میں درخت کے ان ریشوں اور ٹہنیوں کو کہتے ہیں جو اپنی جڑ کے ساتھ پیوستہ ہوں لہٰذا حدیث میں اس لفظ کے ذریعہ یہ بتانا مقصود ہے کہ رحم رحمٰن سے نکلا ہے یا یوں کہا جائے کہ رحم کا لفظ رحمت سے مشتق ہے کہ جس طرح درخت کے ریشے اپنی جڑوں کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح گویا رحم، رحمٰن کے ساتھ ملا ہوا ہے۔

اور بعض حضرات نے لفظ شُجْنَة کے بارے میں یہ کہا ہے کہ اس لفظ کے ذریعہ اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ لفظ رحم میں جو حروف ہیں وہ حق تعالیٰ کے اسم رحمٰن میں بھی موجود ہیں۔ اور چونکہ رحم اور رحمٰن کی اصل مادۂ اشتقاق ایک ہی ہے یعنی رحمۃ اس لئے رحم اور رحمٰن کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ کسی درخت کی ٹہنیوں کو اس کی جڑ سے الگ نہیں کیا جا سکتا اس طور پر حدیث کے معنی یہ ہونگے کہ رحم یعنی ناتا در اصل اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آثار میں سے ایک اثر ہے اور اس کے ساتھ مربوط ہے لہٰذا صلہ رحم کے حقوق یعنی ناتا داروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی ذمہ داری کو اپنے سے منقطع کرنے والا اپنے آپ کو رحمت خداوندی سے منقطع کرنے والا ہے اور ناتے کو جوڑنے والا یعنی ناتے داروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ اپنے کو جوڑنے والا ہے جیسا

کہ خود حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

⑪ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّحِمُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَقُوْلُ مَنْ وَصَلَنِىْ وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَنِىْ قَطَعَهُ اللّٰهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا رحم یعنی ناتا عرش سے لٹکا ہوا ہے اور (بطریق دعا یا خبر دینے کے طور پر) کہتا ہے کہ جو شخص مجھ کو جوڑے گا اس کو اللہ تعالیٰ (اپنی رحمت کے ساتھ) جوڑے گا اور جو شخص مجھ کو توڑے گا اللہ تعالیٰ اس کو (اپنی رحمت سے) جدا کرے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "عرش سے لٹکا ہوا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ عرشِ رحمٰن کا پایہ پکڑے ہوئے اپنے توڑے جانے سے بارگاہ کبریا کی پناہ کا طلبگار ہے اور اس نے اپنے حق میں اللہ تعالیٰ سے جو کچھ سنا ہے اس کے مطابق کو خبردار کر رہا ہے کہ اگر مجھ کو جوڑو گے یعنی ناتے داری کے میرے حقوق کو ادا کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی رحمت کے ساتھ منسلک کریگا اور اگر تم مجھ کو توڑو گے یعنی میرے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی رحمت سے دور کر دے گا۔ یا تقول کا مطلب یہ ہے کہ ناتا یہ جو کچھ کہتا ہے وہ دعا کے طور پر ہے یعنی وہ عرش الٰہی کا پایہ تھامے ہوئے دعا کر رہا ہے کہ الٰہی جو شخص مجھ کو جوڑے اس کو تو اپنی رحمت کے ساتھ جوڑ دے اور جو شخص مجھ کو منقطع کرے اس کو تو اپنی رحمت سے منقطع کر دے۔

قطع رحم کرنے والا جنّت میں داخل نہیں ہوگا

⑫ وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جبیر ابن مطعمؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ قطع رحم کرنے والا جنّت میں داخل نہیں ہوگا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: نوویؒ نے ارشاد گرامی کی یہ مراد بیان کی ہے کہ جو شخص یہ جاننے کے باوجود کہ قطع رحم کرنا یعنی ناتے داری کا حق ادا نہ کرنا حرام ہے نہ صرف یہ کہ بغیر کسی سبب وعذر کے قطع رحم کرے اور بغیر کسی شبہ و وجہ کے قطع رحم کرنے کو حلال بھی جانے تو وہ جنت میں داخل نہیں کیا جائے گا یا یہ مراد ہے کہ قطع رحم کرنے والا نجات یافتہ اور اولین لوگوں کے ساتھ جنّت میں داخل نہیں ہوگا۔

اقرباء کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا کامل ترین جذبہ

⑬ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِئِ وَلٰكِنَّ الْوَاصِلَ الَّذِىْ إِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَهَا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کامل صلہ رحم کرنے والا وہ شخص نہیں ہے جو بدلہ چکائے بلکہ کامل صلہ رحم کرنے والا وہ ہے کہ جب اس کی قرابت کو منقطع کیا جائے تو وہ اس قرابت کو قائم رکھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے اس قرابت دار کے ساتھ بدلہ کے طور پر احسان اور نیک سلوک کرنا چاہے جس نے اس کے ساتھ احسان اور نیک سلوک کیا ہے تو اس کو حقیقی معنی میں صلہ رحمی نہیں کہیں گے بلکہ احسان چکانا کہیں گے ہاں اگر اس نے ایسے قرابتدار کے ساتھ احسان اور نیک سلوک کیا جس نے خود اس کی قرابت کا کوئی لحاظ روا نہیں رکھا ہے اور کبھی اس کے ساتھ کوئی احسان اور نیک سلوک کیا تو اس کا احسان و نیک سلوک بے شک کامل صلہ رحم کہلائے گا اس سے معلوم ہوا کہ صلہ رحمی کا کامل ترین جذبہ وہ ہے جس کی بنیاد بدلہ چکانے پر نہ ہو بلکہ محض حق شناسی اور حق کی ادائیگی کے احساس پر ہو خواہ خود اس کا حق کسی نے ادا کیا ہو یا ادا نہ کیا ہو چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ جوان مرد وہی شخص ہے جو اپنا حق کسی سے طلب نہ کرے اور خود دوسروں کا حق ادا کرے۔

⑭ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلاً قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ لِیْ قَرَابَةً اَصِلُهُمْ وَیَقْطَعُوْنِیْ وَاُحْسِنُ اِلَیْهِمْ وَیُسِیْئُوْنَ اِلَیَّ وَاَحْلُمُ عَنْهُمْ وَیَجْهَلُوْنَ عَلَیَّ فَقَالَ لَئِنْ کُنْتَ کَمَا قُلْتَ فَکَاَنَّمَا تُسِفُّهُمُ الْمَلَّ وَلَا یَزَالُ مَعَكَ مِنَ اللّٰهِ ظَهِیْرٌ عَلَیْهِمْ مَادُمْتَ عَلٰی ذَالِكَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! میرے کچھ قرابت دار ایسے ہیں کہ میں تو ان کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہوں لیکن وہ میرے ساتھ نیک سلوک نہیں کرتے ہیں، ان کے ساتھ احسان کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ برائی کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ حلم و بردباری اور درگزر کا رویہ اختیار کرتا ہوں اور وہ مجھ سے جہالت کے ساتھ پیش آتے ہیں (یعنی مجھے برا بھلا کہتے ہیں اور مجھ پر غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہیں اس کی یہ باتیں سن کر) حضور ﷺ نے فرمایا اگر تم ایسے ہی ہو جیسا کہ تم نے بیان کیا ہے تو گویا تم ان کو گرم راکھ پھکاتے ہو اور تمہارے ساتھ اللہ کی طرف سے ہمیشہ مدد و نصرت ہے جو ان کی ایذاء اور ان کے شر سے تمہاری محافظ ہے جب تک کہ تم اسی صفت پر قائم ہو۔" (مسلمؒ)

تشریح: "راکھ پھکانے" سے مراد یہ ہے کہ تمہارے وہ قرابت دار چونکہ تمہارے نیک سلوک کے قدرداں نہیں ہیں اور تمہاری نیکی کا شکریہ ادا نہیں کرتے اس لئے تم ان کو جو کچھ دیتے ہو وہ ان کے حق میں حرام مال کا حکم رکھتا ہے اور تمہاری دی ہوئی چیزیں ان کے پیٹ میں آگ کی طرح ہیں! گویا آپ ﷺ نے ان قرابت داروں کے اس گناہ کو گرم راکھ کے ساتھ تشبیہ دی جو ان چیزوں کو کھانے کی وجہ سے ان کو لاحق ہوتا ہے۔

بعض حضرات نے یہ مراد بیان کی ہے کہ تم ان کے برتاؤ کے علی الرغم، ان کے ساتھ احسان اور نیک سلوک کر کے ان کو خود ان کے نفس کے سامنے ذلیل و رسوا کرتے ہو جیسا کہ کوئی شخص اگر گرم گرم راکھ منہ میں ڈالے اور اس کو پیٹ میں اتارے تو اس کا نفس اس کو لعنت ملامت کرتا ہے، بعض شارحین نے یہ بیان کیا ہے کہ ان کے ساتھ تمہارا احسان گویا ان کے حق میں گرم راکھ ہے جو ان کو جلاتا اور ہلاک کرتا ہے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ تمہارا احسان ان کا منہ کالا کرتا ہے جیسا کہ گرم راکھ کسی کے چہرے کو جلا کر سیاہ کر دے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

والدین اور اقرباء کے ساتھ حسن سلوک درازی عمر کا سبب ہے

⑮ عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَرُدُّ الْقَدَرَ اِلَّا الدُّعَاءُ وَلَا یَزِیْدُ فِی الْعُمُرِ اِلَّا الْبِرُّ وَاِنَّ الرَّجُلَ لَیُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ یُصِیْبُهٗ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تقدیر الٰہی کو دعا کے علاوہ کوئی چیز نہیں بدلتی اور عمر کو دراز کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے علاوہ والدین اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک، اور (یاد رکھو) انسان کو جس سبب سے روزی سے محروم کیا جاتا ہے وہ صرف گناہ ہے جس کا وہ مرتکب ہوتا ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: "تقدیر" سے مراد تقدیر معلق ہے نہ کہ قضائے مبرم جو اٹل اور ناقابل ترمیم و تبدیل ہوتی ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے دعا کو جس تقدیر کے بدل دینے کا سبب گردانا ہے وہ تقدیر معلق ہے اور یہ بات بذات خود تقدیر الٰہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ مقدر کیا ہے کہ اگر بندہ دعا کرے گا تو اس کی یہ مصیبت دور ہو جائے گی۔ چنانچہ عالم کے تمام اسباب و وسائل قضا و قدر الٰہی کے باوجود یہی حکم رکھتے ہیں جیسا کہ حصول شفا کے لئے علاج معالجہ اور دوائیں یا جنت و دوزخ میں جانے کے لئے بندوں کے اعمال وغیرہ وغیرہ۔

بعض حضرات نے یہ تاویل کی ہے کہ بندہ کا دعا و تدبیر میں برابر مشغول رہنا، تقدیر کے فیصلہ کو قبول کرنا آسان بنا دیتا ہے اور قسمت کے لکھے پر اس کا دل مطمئن و راضی ہو جاتا ہے یعنی جب بندہ اپنی کسی مشکل میں پھنس کر یا کسی تکلیف سے دوچار ہو کر دعا کرنے میں مشغول رہتا ہے اور پھر آخر کار دیکھتا ہے کہ اب کوئی دعا اور تدبیر کام نہیں کرے گی اور تقدیر کا لکھا اٹل ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ ہو کر رہے گا تو وہ قسمت کے آگے سپر ڈال دیتا ہے اور اپنی تقدیر پر راضی ہو جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تقدیر کا وہ فیصلہ اس کے لئے آسان و سبک ہو جاتا ہے اور اس کے دل پر سے بوجھ ہٹ جاتا ہے اس کے برخلاف اگر اس کی تقدیر کا فیصلہ اس کے سامنے یکایک آنے اور ہونے والی بات ناگہاں اس پر نازل ہو جائے کہ نہ تو اس کو دعا میں مشغول ہونے کا موقع مل سکے اور نہ کسی تدبیر پر عمل کرنے کی مہلت مل سکے تو تقدیر کا وہی فیصلہ بڑا سخت اور مشکل ترین ہو جاتا ہے اس اعتبار سے فرمایا گیا کہ دعا تقدیر کو بدل دیتی ہے۔

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ یہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اس ارشاد کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ دراصل دعا کی تاثیر کو اور دعا کی اہمیت و فضیلت کو بطور مبالغہ بیان فرمایا ہے اور مراد یہ ہے کہ قضا و قدر کوئی چیز نہیں بدل سکتی، ہاں اگر کوئی چیز اس درجہ کی ہوتی کہ وہ تقدیر کو بدل دے تو وہ دعا ہوتی اس اعتبار سے کہا جائے گا کہ یہ ارشاد گرامی اس حدیث کے مثل ہے جس میں فرمایا گیا کہ اگر کوئی چیز تقدیر پر سبقت لے جانے والی ہوتی تو وہ نظر بد ہوتی۔

"درازی عمر" سے مراد عمر میں خیر و برکت کا ہونا اور زندگی کا اچھے کاموں فلاحی امور اور حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے راستہ پر گزرنا ہے جیسا پہلی فصل میں اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے۔

حدیث کے آخری جزء سے ایک اشکال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ دنیا میں ایسے لوگوں کی کثرت ہے جو اپنے فسق و فجور، خدائی احکام سے سرکشی و تمرد اور یہاں تک کہ اپنے کفر و شرک کے باوجود خدا کے نیک بندوں اور کامل مؤمنین کے مقابلہ پر زیادہ اچھا کھاتے ہیں اور زیادہ رزق کے مالک ہیں تو پھر اس بات کے معنی کیا ہوں گے کہ انسان اپنے گناہوں کی وجہ سے رزق سے محروم کیا جاتا ہے چنانچہ اس کو دور کرنے کے لئے بعض حضرات نے یہ تاویل بیان کی ہے کہ حدیث میں رزق سے مراد آخرت کا رزق ہے یعنی ثواب اور اس میں کوئی شک نہیں کہ گناہ و معصیت کا ارتکاب اس رزق (آخرت کے اجر و ثواب) میں نقصان اور اس سے محرومی کا مطلب ان چیزوں سے محروم ہونا ہے جن کے بغیر مال و دولت کی فراوانی اور رزق کی وسعت کے باوجود انسان کو اندرونی طمانیت و خوشی اور قلبی و روحانی عظمت و بڑائی عطا نہیں ہوتی جیسے رضاء الٰہی کا حصول زندگی کا بے فکری اور سکون کے ساتھ گزرنا، قلب کا فراغ و اطمینان وقت کا یاد الٰہی اور اچھے کاموں میں صرف ہونا رزق کا طیب و پاکیزہ ہونا اور روح و باطن کا ہر قسم کی کدورت و ظلمت سے پاک و صاف ہونا، یہ وہ اوصاف ہیں جو انسانی زندگی کو حیوۃ طیبہ کا درجہ عطاء کرنے کی وجہ سے عطا ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔

"جس نے نیک کام کیا مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان رکھتا ہے تو ہم اسے ضرور اچھی زندگی بسر کرائیں گے۔"

اس کے برخلاف اہل فسق و فجور، کہ جن کی زندگی شب و روز دنیا کی حرص و ہوس کی کدورتوں اور گناہ و معصیت کی ظلمت سے بھرے ہوتے ہیں ان کے وقت کا اکثر و بیشتر حصہ مال و دولت پیدا کرنے کی تعب و مشقت کی نذر ہوتا ہے ان کا قلب مال و زر کے نقصان و بربادی کے خوف سے ہر لمحہ متفکر و پریشان رہتا ہے اور مختلف قسم کے خطرات اور اندیشے ان کی زندگی کو سکون و طمانیت سے محروم کر دیتے ہیں مزید برآں خدا کی عبادت و طاعت کی نورانیت اور اس کی رحمت سے محرومی ان کو ایسے اندھیروں میں ڈال دیتی ہے کہ وہ بظاہر بڑے خوشحال اور اسباب راحت و آسائش کے مالک ہونے کے باوجود ایک سخت اور مشکل زندگی گزارتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔

"جس نے میرے ذکر سے منہ موڑا اس کے لئے زندگی تنگ کر دی جائیگی۔"

اسی پر گنہ گار مؤمن کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ چاہے وہ ظاہری طور پر مال و دولت اور حشمت و تمول رکھتا ہو مگر روحانی و باطنی طور پر اس کی زندگی بھی کچھ کم سخت اور دشوار گزار نہیں ہوتی کم سے کم اتنا تو ہوتا ہی ہے کہ اگر اس کے اندر ایمان کی روشنی پوری طرح موجود ہے تو ارتکاب گناہ و معصیت کا خوف اس کے قلب پر بہر حال چھایا رہتا ہے اور اس گناہ کی بد انجامی اور آخرت میں مبتلائے عذاب کا کھٹکا یقیناً اس کو وحشت زدہ رکھتا ہے اور خواہ اپنی دنیاوی زندگی میں کتنا ہی مطمئن نظر آئے مگر اس کو اپنے اندر اطمینان و سکون اور روحانی طمانیت و (بے فکری کی محرومی اور ضمیر کی لعنت ملامت سے دوچار رہنا پڑتا ہے حاصل یہ کہ رزق کا مطلب محض پیٹ بھرنے کے ساتھ انسان کے قلبی اطمینان و سکون، روحانی طمانیت و بشاشت اور اوقات زندگی کے بامقصد و کارآمد گزرنے سے بھی اور یہ چیزیں صرف انہی بندگانِ خدا کو نصیب ہوتی ہیں جو صالح عقائد اور پاکیزہ اعمال و کردار کے حامل ہوتے ہیں۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ ارشاد گرامی کا تعلق صرف ان بعض مؤمنین سے ہے جو نفس کے فریب میں آکر گناہ و معصیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اپنے جن گناہگار بندوں پر حق تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ان کو گناہ و معصیت کے داغ دھبوں سے پاک و صاف کر کے اس دنیا سے اٹھائے تو ان کو فقر و فاقہ میں مبتلا کر دیتا ہے اور ان کا وہ فقر و فاقہ گویا دنیا ہی میں ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے یا ان کو کسی ایسی مصیبت و پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے جس سے ان کو تنبیہ حاصل ہو جاتی ہے اور وہ توفیق الٰہی کی بنا پر اپنے گناہوں سے صدق دلی کے ساتھ توبہ کر لیتے ہیں اس کا حاصل یہ نکلا کہ جس مؤمن نے گناہ و معصیت کا ارتکاب کیا اور حق تعالیٰ کی طرف سے لطف خفی اس کے شامل حال رہا تو وہ فقر و فاقہ یا کسی مرض و تکلیف کے ذریعہ اس گناہ سے پاک و صاف کر دیا جاتا ہے اور اگر خدانخواستہ اس کو اس بات کا بھی مستحق نہیں سمجھا جاتا کہ حق تعالیٰ کا لطف و کرم، فقر و فاقہ یا کسی آفت و مصیبت ہی کے ذریعہ اس کے گناہوں کو دھو دے تو پھر وہ اپنے حال پر آخر تک گناہوں میں گرفتار رہتا ہے اور اسی حالت میں دنیا سے چلا جاتا ہے اور آخر کار اس کو آخرت میں سزا بھگتنی پڑے گی۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

والدین کی خدمت کرنے کی فضیلت

(۱۶) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ فَسَمِعْتُ فِيْهَا قِرَاءَةً فَقُلْتُ مَنْ هٰذَا قَالُوْا حَارِثَةُ ابْنُ النُّعْمَانِ كَذٰلِكُمُ الْبِرُّ كَذٰلِكُمُ الْبِرُّ وَكَانَ اَبَرَّ النَّاسِ بِاُمِّهٖ۔ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ نِمْتُ فَرَاَيْتُنِيْ فِي الْجَنَّةِ بَدَلَ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا میں جنت میں گیا تو میں نے وہاں قرآن پڑھنے کی آواز سنی میں نے (فرشتوں سے) پوچھا کہ یہ کون شخص ہے (جو قرآن کی تلاوت میں مشغول ہے) تو فرشتوں نے بتایا کہ یہ حارثہ بن نعمان ہیں۔ (صحابہؓ نے یہ بات سنی تو گویا ان کے دل میں یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوئی کہ حارثہؓ نے اپنے کس عمل کے سبب یہ فضیلت حاصل کی کہ آنحضرت ﷺ نے جنت میں ان کے قرآن پڑھنے کی آواز سنی چنانچہ آپ ﷺ نے حارثہؓ کی اس فضیلت کا سبب ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ) یہی وہ فضیلت و ثواب ہے جو والدین کے ساتھ نیکی کرنے پر حاصل ہوتا ہے یہی وہ فضیلت و ثواب ہے جو والدین کے ساتھ نیکی کرنے پر حاصل ہوتا ہے اور حارثہؓ ابن نعمان اپنی ماں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرنے والا تھا اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنۃ میں اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور بیہقیؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے (میں جنت میں گیا کے بجائے یہ) فرمایا کہ میں گیا تھا تو اسی حالت میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں جنت میں ہوں۔"

خدا کی خوشنودی کے طلبگار ہو تو والدین کو خوش رکھو

(۱۷) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رِضَى الرَّبِّ فِيْ رِضَى الْوَالِدِ وَسَخَطُ الرَّبِّ

فِیْ سَخَطِ الْوَالِدِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرو کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا پروردگار کی رضامندی وخوشنودی ماں باپ کی رضامندی وخوشنودی میں ہے اور پروردگار کی ناخوشی وناراضگی باپ کی ناخوشی وناراضگی میں ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یہی حکم ماں کا بھی ہے بلکہ ماں اس بات کی زیادہ مستحق ہے حاصل یہ کہ اگر تم اپنی خدمت و اطاعت اور اچھے سلوک کے ذریعہ ماں باپ کو خوش رکھو گے تو تمہارا پروردگار بھی تم سے خوش رہے گا اور اگر تم نافرمانی و سرکشی اور ایذاء رسانی کے ذریعہ ماں باپ کو ناخوش و ناراض رکھو گے تو تمہارا پروردگار بھی تم سے ناخوش وناراض رہے گا۔

ماں باپ کی خوشنودی کو بیوی کی محبت پر ترجیح دینی چاہئے

(۱۸) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ اَنَّ رَجُلاً اَتَاہُ فَقَالَ اِنَّ لِیْ اِمْرَاَۃً وَاُمِّیْ تَأْمُرُنِیْ بِطَلَاقِھَا فَقَالَ لَہٗ اَبُو الدَّرْدَاءِ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ الْوَالِدُ اَوْسَطُ اَبْوَابِ الْجَنَّۃِ فَاِنْ شِئْتَ فَحَافِظْ عَلَی الْبَابِ اَوْضَیِّعْ۔

(رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں ایک بیوی والا ہوں اور میری والدہ چاہتی ہیں کہ میں اس بیوی کو طلاق دے دوں حضرت ابودرداء نے اس سے کہا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ والد جنت کے بہترین دروازوں میں سے ہے (یعنی والد کی رضامندی وخوشنودی کو ہر حالت میں ملحوظ رکھنا جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے اس لئے جو شخص چاہتا ہے کہ جنت میں داخل ہونے کے لئے وہ دروازہ اختیار کرے جو بہترین دروازں میں سے ہے تو اس کو چاہئے کہ والد کی رضامندی وخوشنودی کو ہر حالت میں ملحوظ رکھے) پس تم کو اختیار ہے کہ چاہے اس دروازے کی محافظت کرو اور چاہے اس کو ضائع کردو۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: حضرت ابودرداء نے حدیث بیان کرنے کے بعد اپنے قول "پس تم کو اختیار ہے" کے ذریعہ اس شخص پر واضح کردیا کہ اگر تم اپنی والدہ کی خواہش کے مطابق اپنی بیوی کو طلاق دیدو گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے اس کی رضامندی وخوشنودی حاصل کر کے جنت میں داخل ہونے کے لئے بہترین دروازہ اختیار کرلیا ہے ورنہ بصورت دیگر تم اس دروازے کو چھوڑ دینے والے سمجھے جاؤ گے۔

آنحضرت ﷺ کے ارشاد میں اگرچہ والد کا ذکر ہے مگر ابودرداءؓ نے اس سے یہ مسئلہ اخذ کیا کہ جب باپ کے حق میں اس طرح فرمایا گیا ہے تو ماں بدرجہ اولی اس ارشاد کا محمول قرار پائے گی یا یہ کہ لفظ "والد" سے صرف باپ مراد نہیں لیا گیا ہے بلکہ جنس یعنی پیدا کرنے والا مراد ہے اور یہ بات زیادہ موزوں ومناسب ہے کیونکہ پیدا کرنے والے کے مفہوم میں باپ اور ماں دونوں داخل ہیں۔

ماں اولاد کے نیک سلوک کی زیادہ مستحق ہے

(۱۹) وَعَنْ بَھْزِ بْنِ حَکِیْمٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ قَالَ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مَنْ اَبَرُّ قَالَ اُمَّکَ قُلْتُ ثُمَّ مَنْ قَالَ اُمَّکَ قُلْتُ ثُمَّ مَنْ قَالَ اُمَّکَ قُلْتُ ثُمَّ مَنْ قَالَ اَبَاکَ ثُمَّ الْاَقْرَبَ فَالْاَقْرَبَ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت بہز بن حکیمؒ اپنے والد سے اور وہ بہزؒ کے دادا (حضرت معاویہؓ ابن صدہ) سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا، میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! میں کس کے ساتھ بھلائی اور نیک سلوک کروں؟ حضور ﷺ نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ میں نے عرض کیا کہ پھر کس کے ساتھ؟ حضور ﷺ نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ میں نے عرض کیا پھر کس کے ساتھ؟ آپ ﷺ نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ، میں نے عرض کیا کہ پھر کس کے ساتھ؟ آپ ﷺ نے فرمایا اپنے باپ کے ساتھ اور پھر اس کے ساتھ جو (ماں باپ کے بعد) تمہارا

قریب تر عزیز ہے (جیسے بھائی اور بہن) اور پھر اس کے ساتھ جو ان (بھائی بہن) کے بعد اوروں میں زیادہ قریبی عزیز ہے (جیسے چچا اور ماموں اور اسی ترتیب کے مطابق چچا اور ماموں کی اولاد وغیرہ)" (ترمذی، ابوداؤد)

ناتے داروں کے ساتھ بھلائی کرنے کی اہمیت

(۲۰) وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى اَنَا اللّٰهُ وَاَنَا الرَّحْمٰنُ خَلَقْتُ الرَّحِمَ وَشَقَقْتُ لَهَا مِنِ اسْمِيْ فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَهَا بَتَّتُّهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ بزرگ و برتر ارشاد فرماتا ہے کہ میں اللہ ہوں میں رحمٰن ہوں (یعنی صفت رحمت کے ساتھ متصف ہوں) میں نے رحم یعنی رشتے ناتے کو پیدا کیا ہے اور میں نے اس کے نام کا لفظ اپنے نام یعنی رحمٰن کے لفظ سے نکالا ہے لہٰذا جو شخص رحم کو جوڑے گا یعنی رشتہ ناتے کے حقوق ادا کرے گا تو میں بھی اس کو (اپنی رحمت کے ساتھ) جوڑوں گا اور جو شخص رحم کو توڑے گا یعنی رشتہ ناتے کے حقوق ادا نہیں کرے گا میں بھی اس کو (اپنی رحمت خاص سے) جدا کر دوں گا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "میں اللہ ہوں" یعنی میں واجب الوجود ہوں کہ میری ذات پاک اپنے وجود اور اپنے حکم و فیصلہ کے نفاذ میں کسی کی محتاج نہیں ہے یہ جملہ دراصل آگے ارشاد ہونے والے کلام کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے بطور تمہید ہے اور اس تمہید میں پہلے اسم خاص کا ذکر کیا اور پھر اپنی صفت رحمٰن کو ذکر کیا جس کا لفظی مادہ اشتقاق وہی ہے جو رحم کا ہے۔

ناتا توڑنے والے خدا کی رحمت سے محروم رہتے ہیں

(۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِيْ اَوْفٰى قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تَنْزِلُ الرَّحْمَةُ عَلٰى قَوْمٍ فِيْهِمْ قَاطِعُ رَحِمٍ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت عبداللہ ابن ابی اوفیٰؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اس قوم پر رحمت نازل نہیں ہوتی جس میں ناتا توڑنے والا ہو۔" (بیہقیؒ)

تشریح: "قوم" سے مراد پوری قوم نہیں ہے بلکہ محض وہ لوگ مراد ہیں جو ناتا توڑنے والے کی مدد و حمایت کریں یا اس کو اپنے ناتے داروں کے ساتھ بدسلوکی کے ذریعہ ناتا توڑنے سے منع نہ کریں۔

یہ بھی احتمال ہے کہ رحمت سے باران رحمت مراد ہو یعنی جس قوم یا جس آبادی کے اندر ناتا توڑنے والا کوئی شخص ہوتا ہے تو ناتا توڑے جانے کی نحوست سے اس قوم یا آبادی کو بارش سے محروم رکھا جاتا ہے۔

بغاوت اور قطع رحم وہ گناہ ہیں جن کی وجہ سے دنیا میں عذاب ہوتا ہے

(۲۲) وَعَنْ اَبِيْ بَكْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ ذَنْبٍ اَحْرٰى اَنْ يُّعَجِّلَ اللّٰهُ لِصَاحِبِهِ الْعُقُوْبَةَ فِي الدُّنْيَا مَعَ مَا يُدَّخَرُ لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْبَغْيِ وَقَطِيْعَةِ الرَّحِمِ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کوئی گناہ اس بات کے زیادہ لائق نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا ارتکاب کرنے والے کو دنیا میں بھی اس کی سزا دیدے اور (مرتکب) کو آخرت میں بھی دینے کے لئے (اس سزا) کو اٹھا رکھے ہاں دو گناہ بیشک اس بات کے لائق ہیں ایک تو امام وقت کے خلاف بغاوت کرنا اور دوسرے ناتا توڑنا۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ اپنے ملک کے سربراہ اور قانونی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا اور ناتا توڑنا یعنی اپنے اعزاو اقرباء کے ساتھ بدسلوکی اور ان کے حقوق کی ادائیگی سے اعراض کرنا بڑا سخت گناہ اور نہایت غمگین بات ہے چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ ان دونوں گناہوں کے مرتکب کو محض آخرت ہی میں عذاب نہیں دیا جائے گا بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو سزا دینے میں جلدی کرے گا بایں طور کہ ان کو دنیا میں بھی اپنے ان گناہوں کی سزا بھگتنی پڑے گی گویا ایسے لوگ نہ دنیا میں چین پاسکتے ہیں اور نہ آخرت میں یہاں بھی سزا پائیں گے خواہ اس کی صورت کچھ ہی ہو اور وہاں بھی عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے کیونکہ یہ دونوں گناہ اس طرح کے ہیں ان کے اثرات صرف دینی زندگی کو نقصان نہیں پہنچاتے بلکہ دنیا میں بھی برے نتائج مرتب کرتے ہیں چنانچہ حکومت کے خلاف بغاوت برپا کرنے سے سارے ملک کا نظم و نسق درہم برہم ہو جاتا ہے پوری قوم سخت افراتفری اور مختلف مصائب و آلام میں مبتلا ہو جاتی ہے اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ قومی اور ملی توانائی ناگہانی انتشار و اضمحلال کا شکار ہو جاتی ہے جس سے دشمن کو غالب آجانے کا موقع ملتا ہے اسی طرح ناتا توڑنے سے آپس میں نفرت و عداوت پیدا ہوتی ہے اور دلوں میں کدورت کو راہ مل جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اعزاء اور اقرباء جو باہم محبت و موانست کے ذریعہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو کر ایک پر سکون اور راست بخش ماحول پیدا کر سکتے ہیں اور آپس کے میل جوں کے سبب بڑی سے بڑی مصیبت اور سخت سے سخت حالات کو انگیز کرنے کی طاقت فراہم کر سکتے ہیں وہ باہمی لڑائی جھگڑے اور افتراق وانتشار کی وجہ سے سخت جسمانی و روحانی اذیت ناکیوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں لہٰذا ان گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کو دنیا میں زیادہ ڈھیل نہیں دی جاتی بلکہ خدا کی طرف سے ان کی سزا کا فیصلہ جلد صادر ہو جاتا ہے تاکہ وہ پہلے تو دنیا میں اپنے کئے کی سزا بھگت کر دوسروں کے لئے سامان عبرت بنیں اور پھر آخرت میں بھی عذاب میں مبتلا ہوں۔

یہ بات واضح ہے کہ دنیا میں بھی سزا پانا اور آخرت میں بھی عذاب کا مستوجب ہونا محض ان دو گناہوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ کچھ اور گناہ بھی انہی طرح کے ہوں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دونوں گناہ ان میں بدتر اور زیادہ ہیبت ناک ہیں۔

فائزین کے ساتھ جنّت میں داخل ہونے سے کون لوگ محروم رہیں گے

(۲۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنَّانٌ وَلَا عَاقٌّ وَلَا مُدْمِنُ خَمْرٍ۔ (رواہ النسائی والدارمی)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جنّت میں نہ تو وہ شخص داخل ہو گا جو کسی کے ساتھ بھلائی کر کے اس پر احسان رکھے نہ وہ شخص جو ماں باپ کی نافرمانی کرے اور نہ وہ شخص جو شراب نوشی کرے اور بغیر توبہ کے مرجائے۔" (نسائی، داریؒ)

تشریح: "مَنَّان" اصل میں مِنَّةٌ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی کو کچھ دیا جائے یا اس کے ساتھ کوئی نیکی کی جائے اور پھر اس پر اپنا احسان جتایا جائے یہ خصلت یعنی احسان کر کے اس کو جتانا نہایت بری بات ہے قرآن کریم میں ہے۔

لَاتُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى۔

"احسان رکھ کر اور ایذاء دے کر اپنی خیرات کو ضائع نہ کرو۔"

اور بعض حضرات نے لفظ "مَنَّان" کے بارے میں یہ کہا ہے کہ یہ من سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کاٹنا، لہٰذا منان کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ شخص جو ناتے کو کاٹے۔

"عاق" سے مراد وہ شخص ہے جو ماں باپ اور دوسرے اقرباء کو کسی شرعی وجہ کے بغیر ایذاء پہنچائے! یا عاق کا اطلاق خاص طور سے اس شخص پر ہوتا ہے جو ماں باپ کو یا ان دونوں میں سے کسی ایک کو ستائے۔

جنّت میں داخل نہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ ایسے لوگ خدا کے ان نیک اور صالح بندوں کے ساتھ جنّت میں داخل نہیں ہونگے جو

آخرت میں حساب کتاب کے دن فائز المرام اور نجات یافتہ قرار دیئے جائیں اور بلا کسی روک ٹوک کے شروع ہی میں جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے یا یہ مراد ہے کہ یہ لوگ عذاب کے بغیر جنت میں داخل نہیں ہونگے یعنی پہلے ان کو اپنے گناہ کی سزا بھگتنی ہوگی اس کے بعد جنت میں پہنچائے جائیں گے تاہم اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو ان کے بغیر عذاب کے بھی جنت میں داخل کر دے گا کیونکہ اس کا وعدہ ہے کہ:

وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔

"اور اس کے علاوہ بھی جس کو وہ چاہے گا بخشدے گا۔"

اقرباء کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی برکت

(۲۴) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعَلَّمُوْا مِنْ اَنْسَابِكُمْ مَاتَصِلُوْنَ بِهٖ اَرْحَامَكُمْ فَاِنَّ صِلَةَ الرَّحِمِ مَحَبَّةٌ فِي الْاَهْلِ مَثْرَاةٌ فِي الْمَالِ مَنْسَأَةٌ فِي الْاَثَرِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تم اپنے نسبوں میں اس قدر سیکھو کہ جس کے ذریعہ تم اپنے ناتے داروں کے ساتھ حسن سلوک کو سکو کیونکہ ناتاداروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا اقربا میں باہمی محبت و موانست کا سبب مال میں کثرت و برکت کا ذریعہ اور درازی عمر کا باعث بنتا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تم اپنے باپ، دادا، ماؤں، دادیوں، نانیوں، ان کی اولاد اور دیگر اعزاء و اقرباء کی پہچان رکھو ان کے ناموں سے باخبر ہو اور ان کے حالات سے واقفیت حاصل کرو تاکہ تم ذوی الارحام کو جان لو، جن کے ساتھ حسن سلوک کرنا تمہاری ذمہ داری ہے اور یہ جاننا تمہارے لئے ضروری اور فائدہ مند ہے۔

خالہ ماں کا درجہ رکھتی ہے

(۲۵) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلاً اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ اَصَبْتُ ذَنْبًا عَظِيْمًا فَهَلْ لِيْ مِنْ تَوْبَةٍ قَالَ هَلْ لَكَ مِنْ اُمٍّ قَالَ لَا قَالَ وَهَلْ لَكَ مِنْ خَالَةٍ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَبَرَّهَا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کہنے لگا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! مجھ سے ایک بڑا گناہ صادر ہو گیا ہے میری توبہ کے لئے کیا چیز ہے؟ یعنی کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جس کو اختیار کر کے میں خدا کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرا سکوں اور اپنا وہ گناہ معاف کرا سکوں! حضور ﷺ نے فرمایا کیا تمہاری ماں ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں! حضور ﷺ نے فرمایا تو کیا تمہاری خالہ ہے؟ اس نے کہا کہ وہاں! حضور ﷺ نے فرمایا تم اس کے ساتھ نیک سلوک کرو یعنی اس کی خدمت و اطاعت کرو اور اس کی دیکھ بھال رکھو نیز اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق اس کی مالی امداد و اعانت کرتے رہو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ ناتے داروں کے ساتھ حسن سلوک، گناہوں کے کفارہ کا ذریعہ ہے اگرچہ وہ گناہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو تاہم یہ بھی ہو سکتا کہ آنحضرت ﷺ کو وحی کے ذریعہ بتایا گیا ہوگا کہ حسن سلوک کا کبیرہ گناہ کے کفارہ کا سبب بننا اس شخص کے ساتھ مخصوص ہے لہٰذا حضور ﷺ نے اس سے فرمادیا کہ تم اپنی خالہ سے حسن سلوک کرو، تمہارا وہ گناہ بخشدیا جائے گا اور یا یہ کہ اس شخص سے جو گناہ صادر ہوا تھا وہ کبیرہ نہیں تھا بلکہ حقیقت میں صغیرہ گناہ تھا البتہ اس شخص نے اپنے مضبوط جذبہ ایمانی اور احتیاط و تقویٰ کی بنا پر اس گناہ کو ایک بڑا گناہ سمجھا! اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خالہ، ماں کا درجہ رکھتی ہے۔

والدین کی وفات کے بعد بھی ان کے ساتھ حسن سلوک کی صورتیں

(۲۶) وَعَنْ اَبِیْ اُسَیْدِ نِ السَّاعِدِیِّ قَالَ بَیْنَ نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذْجَاءَہٗ رَجُلٌ مِنْ بَنِیْ سَلِمَۃَ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ ھَلْ بَقِیَ مِنْ بِرِّ اَبَوَیَّ شَیْءٌ اَبَرُّھُمَا بِہٖ بَعْدَ مَوْتِھِمَا قَالَ نَعَمْ اَلصَّلٰوۃُ عَلَیْھِمَا وَالْاِسْتِغْفَارُ لَھُمَا وَاِنْفَاذُ عَھْدِھِمَا مِنْ بَعْدِھِمَا وَصِلَۃُ الرَّحِمِ الَّتِیْ لَا تُوْصَلُ اِلَّا بِھِمَا وَاِکْرَامُ صَدِیْقِھِمَا۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابواسید ساعدی کہتے ہیں کہ ایک دن ہم لوگ رسول کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جو قبائل انصار میں سے ایک قبیلہ بنو سلمہ سے تعلق رکھتا تھا اس شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! میرے ماں باپ کے حسن سلوک کا کچھ حصہ ابھی باقی ہے جس کو میں ان کی وفات کے بعد پورا کروں یعنی میں اپنے ماں باپ کی زندگی میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا تھا وہ مر چکے ہیں تو کیا ان کی وفات کے بعد بھی ان کے حق میں حسن سلوک کرنے کی کوئی صورت ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ہاں ان کے حق میں دعا کرنا (جس میں نماز جنازہ بھی شامل ہے) ان کے لئے استغفار کرنا ان کی موت کے بعد ان کی وصیت کو پورا کرنا ان کے ان ناتے داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا جن کے ساتھ حسن سلوک کرنا محض ان (ماں باپ) کے سبب سے ہے (یعنی ماں باپ کے وہ عزیز و اقارب کہ جن کے ساتھ محض اس وجہ سے حسن سلوک کیا جاتا ہے تاکہ ماں باپ کی خوشنودی حاصل ہو نہ کہ کسی اور غرض سے) اور ماں باپ کے دوستوں کی عزت و تعظیم کرنا (یہ وہ صورتیں ہیں جن کو اختیار کر کے ماں باپ کی وفات کے بعد بھی ان کے ساتھ حسن سلوک کا سلسلہ جاری رکھا جا سکتا ہے)۔" (ابوداؤد، ابن ماجہ)

دایہ حلیمہ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا حسن سلوک

(۲۷) وَعَنْ اَبِی الطُّفَیْلِ قَالَ رَاَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقْسِمُ لَحْمًا بِالْجِعِرَّانَۃِ اِذْ اَقْبَلَتِ امْرَاَۃٌ حَتّٰی دَنَتْ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَبَسَطَ لَھَا رِدَاءَہٗ فَجَلَسَتْ عَلَیْہِ فَقُلْتُ مَنْ ھِیَ فَقَالُوْا ھِیَ اُمُّہُ الَّتِیْ اَرْضَعَتْہُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوطفیلؓ کہتے ہیں کہ جعرانہ میں، میں نے دیکھا کہ رسول کریم ﷺ گوشت تقسیم فرما رہے تھے کہ اچانک ایک خاتون آئیں جب وہ نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچیں تو آپ ﷺ نے ان کے لئے اپنی چادر مبارک بچھادی اور وہ اس پر بیٹھ گئیں میں نے ان کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا یہ حسن سلوک دیکھا تو لوگوں سے پوچھا کہ یہ خاتون کون ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ یہ آنحضرت ﷺ کی وہ ماں ہیں جنہوں نے آنحضرت ﷺ کو دودھ پلایا تھا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث میں جن محترم خاتون کا ذکر کیا گیا ہے وہ دایہ حلیمہ ہیں جن کو آنحضرت ﷺ کی رضاعی ماں ہونے کا شرف حاصل ہے آنحضرت ﷺ کو دایہ حلیمہ کے علاوہ ایک اور خاتون نے بھی ابتداء میں کچھ دنوں تک دودھ پلایا تھا جن کا نام ثوبیہ ہے اور جو ابولہب کی باندی تھیں ان دونوں کے اسلام کے بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں۔

کسی مصیبت کے وقت اپنے نیک اعمال کے وسیلہ سے دعا مانگنا مستحب ہے

(۲۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ بَیْنَمَا ثَلٰثَۃُ نَفَرٍ یَتَمَاشَوْنَ اَخَذَھُمُ الْمَطَرُ فَمَالُوْا اِلٰی غَارٍ فِی الْجَبَلِ فَانْحَطَّتْ عَلٰی فَمِ غَارِھِمْ صَخْرَۃٌ مِنَ الْجَبَلِ فَاَطْبَقَتْ عَلَیْھِمْ فَقَالَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ اُنْظُرُوْا اَعْمَالًا عَمِلْتُمُوْھَا لِلّٰہِ صَالِحَۃً فَادْعُوا اللّٰہَ بِھَا لَعَلَّہٗ یُفَرِّجُھَا فَقَالَ اَحَدُھُمْ اَللّٰھُمَّ اِنَّہٗ کَانَ لِیْ وَالِدَانِ شَیْخَانِ کَبِیْرَانِ وَلِیْ صِبْیَۃٌ صِغَارٌ اَرْعٰی عَلَیْھِمْ فَاِذَا رُحْتُ عَلَیْھِمْ فَحَلَبْتُ بَدَاْتُ بِوَالِدَیَّ اَسْقِیْھِمَا قَبْلَ وَلَدِیْ وَاِنَّہٗ قَدْنَاءَ بِیَ الشَّجَرُ فَمَا اَتَیْتُ حَتّٰی اَمْسَیْتُ فَوَجَدْتُھُمَا قَدْ نَامَا فَحَلَبْتُ کَمَا کُنْتُ اَحْلُبُ فَجِئْتُ بِالْحِلَابِ فَقُمْتُ عِنْدَ رُؤُسِھِمَا اَکْرَہُ اَنْ

اَوْقِظَهُمَا وَاَكْرَهُ اَنْ اَبْدَأَ بِالصِّبْيَةِ قَبْلَهُمَا وَالصِّبْيَةُ يَتَضَاغَوْنَ عِنْدَ قَدَمَيَّ فَلَمْ يَزَلْ ذٰلِكَ دَأْبِيْ وَدَأْبُهُمْ حَتّٰى طَلَعَ الْفَجْرُ فَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنِّيْ فَعَلْتُ ذَالِكَ ابْتِغَآءَ وَجْهِكَ فَافْرُجْ لَنَا فُرْجَةً نَرٰى مِنْهَا السَّمَآءَ فَفَرَجَ اللّٰهُ لَهُمْ حَتّٰى يَرَوْنَ السَّمَآءَ قَالَ الثَّانِيْ اَللّٰهُمَّ اِنَّهٗ كَانَتْ لِيْ بِنْتُ عَمٍّ اُحِبُّهَا كَاَشَدِّ مَا يُحِبُّ الرِّجَالُ النِّسَاءَ فَطَلَبْتُ اِلَيْهَا نَفْسَهَا فَاَبَتْ حَتّٰى اٰتِيَهَا بِمِائَةِ دِيْنَارٍ فَسَعَيْتُ حَتّٰى جَمَعْتُ مِائَةَ دِيْنَارٍ فَلَقِيْتُهَا بِهَا فَلَمَّا قَعَدْتُ بَيْنَ رِجْلَيْهَا قَالَتْ يَا عَبْدَ اللّٰهِ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تَفْتَحِ الْخَاتَمَ فَقُمْتُ عَنْهَا اَللّٰهُمَّ فَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنِّيْ فَعَلْتُ ذَالِكَ ابْتِغَآءَ وَجْهِكَ فَافْرُجْ لَنَا مِنْهَا فَفَرَجَ لَهُمْ فُرْجَةً وَقَالَ الْاٰخَرُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ كُنْتُ اسْتَاْجَرْتُ اَجِيْرًا بِفَرَقِ اَرُزٍّ فَلَمَّا قَضٰى عَمَلَهٗ قَالَ اَعْطِنِيْ حَقِّيْ فَعَرَضْتُ عَلَيْهِ حَقَّهٗ فَتَرَكَهٗ وَرَغِبَ عَنْهُ فَلَمْ اَزَلْ اَزْرَعُهٗ حَتّٰى جَمَعْتُ مِنْهُ بَقَرًا وَرَاعِيَهَا فَجَاءَنِيْ فَقَالَ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تَظْلِمْنِيْ وَاَعْطِنِيْ حَقِّيْ فَقُلْتُ اذْهَبْ اِلٰى ذَالِكَ الْبَقَرِ وَرَاعِيْهَا فَقَالَ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تَهْزَاْبِيْ فَقُلْتُ اِنِّيْ لَا اَهْزَاُبِكَ فَخُذْ ذٰلِكَ الْبَقَرَ وَرَاعِيَهَا فَاَخَذَهٗ فَانْطَلَقَ بِهَا فَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنِّيْ فَعَلْتُ ذَالِكَ ابْتِغَآءَ وَجْهِكَ فَافْرُجْ لَنَا مَا بَقِيَ فَفَرَجَ اللّٰهُ عَنْهُمْ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کسی قوم کا یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ تین آدمی ایک ساتھ کہیں چلے جارہے تھے کہ (راستہ میں) سخت بارش نے ان کو آلیا وہ (اس بارش سے بچنے کے لئے) پہاڑ کے ایک غار میں گھس گئے اتنے میں پہاڑ سے ایک بڑا پتھر گر کر اس غار کے منہ پر آپڑا اور ان تینوں پر باہر نکلنے کا راستہ بند کر دیا وہ تینوں (اس صورت حال سے سخت پریشان ہوئے اور اس غار میں سے نکلنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آئی تو) آپس میں کہنے لگے کہ اب تم اپنے ان اعمال پر نظر ڈالو جو تم نے (کسی دنیاوی فائدہ کی تمنا اور جذبہ نام و نمود کے بغیر) محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے کئے ہوں اور ان اعمال کے وسیلہ سے خدا سے دعا مانگو شاید اللہ تعالیٰ ہماری نجات کے راستہ کو کھول دے چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا اے اللہ (تو خوب جانتا ہے کہ) میرے ماں باپ بہت بوڑھے تھے اور میرے کئی چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے اور میں بکریاں چرایا کرتا تھا تاکہ (ان کے دودھ کے ذریعہ) ان سب (ماں باپ اور بچوں کے پیٹ بھرنے) کا انتظام کر سکوں، چنانچہ جب میں شام کو اپنے گھر والوں کے پاس لوٹتا اور بکریوں کا دودھ نکالتا تو اپنے ماں باپ سے ابتدا کرتا اور ان کو اپنی اولاد سے پہلے دودھ پلاتا۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ (چراگاہ کے) درخت مجھ کو دور لے گئے یعنی میں بکریوں کو چراتا چراتا بہت دور نکل گیا یہاں تک کہ شام ہوگئی اور میں گھر واپس نہ آسکا اور (جب رات گئے گھر پہنچا تو) اپنے ماں باپ کو سوتے ہوئے پایا پھر میں نے اپنے معمول کے مطابق دودھ دوہا اور دودھ سے بھرا ہوا برتن لے کر ماں باپ کے پاس پہنچا اور ان کے سرہانے کھڑا ہو گیا کیوں کہ میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ ان کو جگاؤں اور نہ ہی یہ گوارا ہوا کہ ان سے پہلے اپنے بچوں کو دودھ پلاؤں جب کہ وہ بچے میرے پیروں کے پاس پڑے ہوئے مارے بھوک کے رو بلک رہے تھے میں اور وہ سب اپنے حال پر قائم رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی (یعنی پوری رات اسی حالت میں میں دودھ کا برتن لئے ماں باپ کے سرہانے کھڑا رہا وہ دونوں پڑے سوتے رہے اور میرے بچے بھوک سے بیتاب ہو کر روتے اور چیختے چلاتے رہے پس اے خدا! اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ کام محض تیری رضا اور خوشنودی کی طلب میں کیا ہے تو (میں اپنے اس عمل کا واسطہ دیتے ہوئے تجھ سے التجا کرتا ہوں) کہ تو ہمارے لئے اس پتھر کو اتنا کھول دے کہ اس کشادگی کے ذریعہ ہم آسمان کو دیکھ سکیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول فرمائی اور اس پتھر کو اتنا سرکا دیا کہ ان کو آسمان نظر آنے لگا۔ دوسرے شخص نے اس طرح کہا کہ اے اللہ میرے چچا کی ایک بیٹی تھی میں اس کو اتنا ہی زیادہ چاہتا تھا جتنا زیادہ کوئی مرد کسی عورت کو چاہ سکتا ہے جب میں نے اس سے اپنے آپ کو میرے سپرد کر دینے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے یہ کہہ کر میری خواہش کو ماننے سے انکار کر دیا کہ جب تک میں سو ۱۰۰ دینار اس کو پیش نہیں کر دیتا میری جنسی خواہش پوری نہیں ہوگی پھر (میں نے محنت مشقت کر کے سو ۱۰۰ دینار فراہم کئے اور) ان دیناروں کو لے کر اس کے پاس پہنچا (وہ اپنی شرط پوری ہو جانے پر میری خواہش کے لئے راضی ہوگئی) جب میں جنسی فعل کے لئے اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیٹھا تو وہ کہنے لگی کہ بندۂ خدا! اللہ سے ڈر اور میری مہر امانت کو توڑنے سے باز رہ (یعنی اس نے مجھے خدا کا خوف دلاتے ہوئے التجا کی کہ میری آبرو کو نہ لوٹو اور حرام

طور پر ازالہ بکارت کر کے میرے پردہ ناموس کو جو کسی کی امانت ہے یوں تار تار نہ کرو)، میں یہ سنتے ہی خوف خدا سے کانپنے لگا اور اپنے نفس کی گمراہی پر شرمسار ہو کر اس کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا پس اے خدا! اگر تو جانتا ہے کہ میرا یہ عمل (یعنی قابو حاصل ہونے کے باوجود اس کو چھوڑ کر ہٹ جانا اور اپنے نفس کو کچل دینا) محض تیری رضا اور خوشنودی کی طلب میں تھا تو میں (اپنے اس عمل کے واسطہ سے) تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو اس پتھر کو ہٹا کر ہمارے لئے راستہ کھول دے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (اس شخص کی بھی دعا قبول فرمائی) اور اس پتھر کو تھوڑا سا اور سرکا دیا پھر تیسرے شخص نے اس طرح کہنا شروع کیا۔ اے اللہ! میں نے ایک مزدور کو ایک فرق چاول کے عوض مزدوری پر لگایا جب اس نے اپنا کام پورا کر لیا تو مطالبہ کیا لاؤ میری اجرت دو میں۔ نے اس کی اجرت اس کو پیش کر دی مگر وہ بے نیازی کے ساتھ اس کو چھوڑ کر چلا گیا پھر میں نے ان چاولوں کو اپنی زراعت میں لگا دیا اور کاشت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ انہی چاولوں کے ذریعہ میں نے (خاصی پونجی بنالی اور اس کے ساتھ میں) بیل اور ان بیلوں کے چرواہے جمع کر لئے پھر (ایک بڑے عرصہ کے بعد) وہ مزدور میرے پاس آیا اور کہنے لگا خدا سے ڈرو مجھ پر ظلم نہ کرو اور میرا حق (جو میں نے تمہارے پاس چھوڑ دیا تھا) مجھ کو واپس کر دو، میں نے کہا کہ (بیشک تمہارا حق مجھ پر واجب ہے) ان بیلوں اور ان کے چرواہوں کے پاس جاؤ (اور ان کو اپنے قبضہ میں کر لو، وہ سب تمہارا ہی حق ہے) اس نے (میری بات سن کر بڑی حیرت سے میری طرف دیکھا اور) کہا کہ خدا سے ڈرو اور میرے ساتھ ٹھٹھول نہ کرو! میں نے کہا کہ (میری بات کو جھوٹ نہ سمجھو) میں تم سے مذاق نہیں کر رہا ہوں جا کر ان بیلوں اور ان کے چرواہوں کو لے لو اس کے بعد اس نے ان سب کو اپنے قبضہ میں کیا اور لے کر چلا گیا۔ پس اے خدا! اگر تو جانتا ہے کہ میرا وہ عمل محض تیری رضا اور خوشنودی کی طلب میں تھا تو میں (اپنے اس عمل کا واسطہ دے کر تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ) تو یہ پتھر جتنا باقی رہ گیا ہے اس کو بھی سرکا دے۔" چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (اس شخص کی دعا بھی قبول فرمائی اور) غار کے منہ کا باقی حصہ بھی کھول دیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "جب کہ وہ بچے میرے پیروں کے پاس پڑے ہوئے ...... الخ" سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ جس قوم کے افراد سے متعلق ہے اس کی شریعت میں ماں باپ کا حق اولاد کے نفقہ و حق پر مقدم تھا جبھی تو اس شخص نے ماں باپ کو دودھ پلانے سے پہلے اپنے بچوں کو دودھ پلانا گوارا نہیں کیا حالانکہ بھوک کی شدت سے رات بھر روتے تڑپتے رہے لیکن بعض حضرات کے قول کے مطابق ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے اپنے بچوں کو بقدر سد رمق تو دودھ پلا دیا تھا مگر وہ اتنی مقدار پر مطمئن نہیں ہوئے تھے اور مزید دودھ پینے کے لئے رو، چلا رہے تھے۔

"فرق" مدینہ میں رائج ایک پیمانہ کا نام تھا اس میں سولہ رطل یعنی تقریباً آٹھ سیر غلہ آتا تھا یہ پیمانہ عام طور پر غلہ وغیرہ کے لین دین میں ماپ تول کے کام آتا تھا۔

"بیلوں کے چرواہے" سے مراد وہ غلام ہیں جو کھیتی باڑی کے کام، چوپایوں کے دیکھ بھال اور ان کو چرانے پر مامور ہوتے تھے حدیث میں ان چاولوں کی کاشت سے حاصل ہونے والے مال کے طور پر صرف بیلوں اور چرواہوں کا ذکر اکثر و اغلب کے اعتبار سے ہے کہ اس شخص نے ان چاولوں کو اپنی زراعت میں لگا کر بہت کچھ حاصل کیا یہاں تک کہ میرے پاس بہت زیادہ مال و اسباب جمع ہو گیا جیسے بیل اونٹ، گوسفند اور غلام وغیرہ۔

اس حدیث سے مختلف مسائل اخذ کئے جاتے ہیں چنانچہ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ کسی سخت آفت و مصیبت کے وقت اپنے نیک اعمال کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا مستحب ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ان تینوں کی دعا قبول فرمانا اور آنحضرت ﷺ کا اس واقعہ کو مدح و تعریف اور ذکر فضیلت کے طور پر صحابہؓ کے سامنے بیان کرنا اس امر کی دلیل ہے اور اگر یہ مستحب نہ بھی ہو تو اس کے جائز ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا ان کو اپنے بال بچوں پر ترجیح دینا ان کو کسی تکلیف و مشقت میں

مبتلا کرنے سے اجتناب اور بہر صورت ان کے آرام و سکون کو مد نظر رکھنا بڑی فضیلت کی بات ہے۔

تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جو شخص سو رہا ہو اور خاص طور پر وہ شخص جو قابل احترام و لائق تعظیم ہو تو اس کو نیند سے اٹھانا مکروہ ہے علاوہ اس صورت کے جب کہ اس نے نماز نہ پڑھی ہو اور فرض نماز کا وقت ختم ہو رہا ہو۔

چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ نیند کی راحت کھانا کھانے سے زیادہ لذت آمیز ہے کہ نیند کا مزہ بھوک کی حالت میں بھی غالب رہتا ہے۔

پانچویں بات یہ معلوم ہوئی کہ عفت و پارسائی اور انسانی نفس کو حرام امور سے باز رکھنا خصوصا اس صورت میں جبکہ کسی طرح کی کوئی رکاوٹ بھی سامنے نہ ہو بڑی فضیلت کی بات ہے اور انسانی کردار کی پختگی و عظمت کی دلیل ہے چنانچہ نفس کی خواہش اور خاص طور جنسی خواہش کہ جو دوسری تمام خواہشات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ غالب اور سرکش ہوتی ہے انسان کو سخت ترین حالات سے دوچار کر دیتی ہے۔ کہ اگر کوئی شخص اس کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے تو عقل اور حرام و حلال کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت تک ختم ہو جاتی ہے لہٰذا جنسی خواہش کے اس قدر شدید غلبہ کی صورت میں جب کہ اس خواہش کی تکمیل کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو کسی مرد کا عین موقع پر نفس کو کچل ڈالنا اور حرام کاری سے باز رہنا ایک مثالی عظمت کردار کا مظہر ہے۔

چھٹی بات یہ معلوم ہوئی کہ غیر کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا جائز ہوتا ہے بشرطیکہ بعد اس کی اجازت حاصل ہو جائے جیسا کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے کہ فضولی کا تصرف جائز ہو جاتا ہے اور یہ جواز مالک کی اجازت پر موقوف رہتا ہے کہ اگر مالک اجازت دیدیتا ہے تو وہ تصرف نافذ العمل قرار پا جاتا ہے۔

ساتویں بات یہ معلوم ہوئی کہ نیک عہد و اقرار، ادائیگی امانت اور خوش معاملگی نہ صرف بہتر چیز ہے بلکہ انسان کو قرب خداوندی سے ہمکنار کرنے اور آفات و مصائب سے نجات دلانے کا باعث ہے۔

آٹھویں بات یہ معلوم ہوئی کہ بندہ کا کسی آفت و بلا میں گرفتار ہو جانے پر دعا کرنا بہتر ہے کیونکہ وہ دعا قبول ہوتی ہے اور بندہ کو اس آفت و بلا سے نجات دلانے کا سبب بنتی ہے۔

اور نویں بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ کے نیک صالح بندوں کے ذریعہ ایسی چیزوں کا ظاہر ہونا جو عام انسانی عادت کے خلاف ہوں اور جن کو کرامات کہا جاتا ہے برحق ہے اور کرامات کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں کرنا چاہئے جیسا کہ اہلسنّت والجماعت کا مسلک ہے۔

جنّت ماں کے قدموں میں ہے

(۲۹) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ جَاهِمَةَ اَنَّ جَاهِمَةَ جَاءَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَدْتُّ اَنْ اَغْزُوَ وَقَدْ جِئْتُ اَسْتَشِيْرُكَ فَقَالَ هَلْ لَكَ مِنْ اُمٍّ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَالْزَمْهَا فَاِنَّ الْجَنَّةَ عِنْدَ رِجْلِهَا۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔ (احمدؒ، نسائی، بیہقیؒ)

"اور حضرت معاویہ ابن جاہمہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت جاہمہؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! میں جہاد میں جانا چاہتا ہوں اور اس وقت اسی سلسلے میں آپ ﷺ سے مشورہ کرنے حاضر ہوا ہوں حضور نے فرمایا کیا تمہاری ماں زندہ ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! حضور ﷺ نے فرمایا پھر تم انہی کی خدمت کو ضروری سمجھو کیونکہ جنّت ماں کے قدموں میں ہے۔" (احمدؒ، نسائی، بیہقیؒ)

تشریح: "جنّت ماں کے قدموں میں ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ تم جہاد میں جانے کے بجائے ماں کے قدموں میں پڑے رہ کر اس کی اطاعت و خدمت کرنا زیادہ ضروری سمجھو کیونکہ ماں کی اطاعت و خدمت جنت میں جانے کا ذریعہ ہے گویا اس جملہ کے ذریعہ بطور کنایہ اس تواضع و انکساری اور عاجزی و خاکساری کو بیان کرنا مقصود ہے جس کا حکم اولاد کو دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

وَخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ۔

"اور ان (والدین) کے سامنے شفقت سے عاجزی کے ساتھ جھکے رہو۔"

باپ کی خواہش کا احترام کرو

(۳۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَتْ تَحْتِي امْرَأَةٌ أُحِبُّهَا وَكَانَ عُمَرُ يَكْرَهُهَا فَقَالَ لِيْ طَلِّقْهَا فَأَبَيْتُ فَأَتَى عُمَرُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهُ فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَلِّقْهَا۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میرے نکاح میں ایک عورت تھی جس سے میں بہت محبت کرتا تھا لیکن میرے والد محترم حضرت عمرؓ اس کو ناپسند کرتے تھے چنانچہ انہوں نے ایک دن مجھ سے کہا کہ تم اس عورت کو طلاق دیدو، میں نے انکار کر دیا پھر جب وہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضور ﷺ سے اس بات کا ذکر کیا تو حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ اس عورت کو طلاق دے دو!۔"

(ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ کا ابن عمرؓ سے یہ فرمانا کہ اس عورت کو اطلاق دیدویا تو استحباب کے طور پر تھا یا اگر اس عورت کو طلاق دلوانے کا کوئی اور شرعی سبب بھی پایا جاتا تھا کہ اس بناء پر ابن عمرؓ کا اس صورت سے علیحدگی اختیار کرنا ہی ضروری ہو گیا تھا تو پھر کہا جائے گا کہ آنحضرت ﷺ کا مذکورہ ارشاد وجوب کے طور پر ہے۔

والدین کی اہمیت

(۳۱) وَعَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا حَقُّ الْوَالِدَيْنِ عَلٰى وَلَدِهِمَا قَالَ هُمَا جَنَّتُكَ وَنَارُكَ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! اولاد پر ماں باپ کا کیا حق ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا تمہارے ماں باپ تمہارے لئے جنت بھی اور...... دوزخ بھی۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: اس ارشاد کے ذریعہ بڑے بلیغ انداز میں ماں باپ کی اہمیت اور ان کی عظمت شان کو ظاہر فرمایا گیا ہے کہ وہ تمہارے لئے جنت کی راہ بھی آسان کر سکتے ہیں اور تمہیں دوزخ کا مستوجب بھی بنا سکتے ہیں چنانچہ فرمایا گیا کہ اولاد پر ماں باپ کا حق یہ ہے کہ ان کی رضامندی اور خوشنودی کو بہر صورت ملحوظ رکھا جائے جو جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اور ان کی نافرمانی سے اجتناب کیا جائے جو دوزخ میں جانے کا باعث۔ حاصل یہ کہ اگر اطاعت و خدمت کے ذریعہ ماں باپ کو راضی و خوش رکھو گے تو جنت میں جاؤ گے اور اگر نافرمانی ولاپرواہی کے ذریعہ ماں باپ کو ناخوش و ناراض رکھو گے تو دوزخ میں ڈالے جاؤ گے۔

ماں باپ کے حق میں استغفار و ایصال ثواب کے ذریعہ ان کی ناراضگی کے وبال کو ٹالا جا سکتا ہے

(۳۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ لَيَمُوْتُ وَالِدَاهُ اَوْ اَحَدُهُمَا وَاِنَّهُ لَهُمَا لَعَاقٌّ فَلَا يَزَالُ يَدْعُوْلَهُمَا وَيَسْتَغْفِرُ لَهُمَا حَتّٰى يَكْتُبَهُ اللّٰهُ بَارًّا۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کسی ایسے بندے کے ماں باپ مر جاتے ہیں یا ان دونوں میں سے کوئی ایک مرتا ہے جو ان کی نافرمانی کیا کرتا تھا اور پھر ان کی موت کے بعد وہ ان کے لئے برابر دعا و استغفار کرتا رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیکوکار لکھ دیتا ہے۔"

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ والدین کے مرنے کے بعد اولاد کا ان کے حق میں برابر دعاء و استغفار اور ایصال ثواب کرتے رہنا

اس درجہ سودمند ہے کہ اگر وہ والدین اس اولاد سے ناراضگی وناخوشی کی حالت میں بھی اس دنیا سے رخصت ہوئے ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کی ناراضگی وناخوشی کو ختم کر دے گا اور اس اولاد کا نام ان لوگوں میں شمار کرے گا جو اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرتے ہیں اور ان کی رضا و خوشنودی کے جویا رہتے ہیں۔

والدین کی اطاعت اور نافرمانی حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طاعت و معصیت ہے

(۳۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَصْبَحَ مُطِيْعًا لِلّٰهِ فِيْ وَالِدَيْهِ اَصْبَحَ لَهٗ بَابَانِ مَفْتُوْحَانِ مِنَ الْجَنَّةِ وَاِنْ كَانَ وَاحِدًا فَوَاحِدًا وَمَنْ اَصْبَحَ عَاصِيًا لِلّٰهِ فِيْ وَالِدَيْهِ اَصْبَحَ لَهٗ بَابَانِ مَفْتُوْحَانِ مِنَ النَّارِ وَاِنْ كَانَ وَاحِدًا فَوَاحِدًا قَالَ رَجُلٌ وَاِنْ ظَلَمَاهُ قَالَ وَاِنْ ظَلَمَاهُ وَاِنْ ظَلَمَاهُ وَاِنْ ظَلَمَاهُ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جس شخص نے اس حالت میں صبح کی کہ وہ ماں باپ کے حق میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والا ہے یعنی اس نے ماں باپ کے حقوق ادا کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کی ہے تو وہ اس حال میں صبح کرتا ہے کہ اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھلے ہوتے ہیں اور اگر اس کے ماں باپ میں سے کوئی ایک زندہ ہو کہ جس کی اس نے اطاعت و فرمانبرداری کی ہے تو ایک دروازہ کھولا جاتا ہے اور جس شخص نے اس حالت میں صبح کی کہ وہ ماں باپ کے حق میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرنے والا ہے (یعنی اس نے ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی و تقصیر کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی ہے) تو وہ اس حال میں صبح کرتا ہے کہ اس کے لئے دوزخ کے دو دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ اور اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک زندہ ہو کہ جس کی اس نے نافرمانی کی ہے تو ایک دروازہ کھولا جاتا ہے۔ یہ ارشاد سن کر ایک شخص نے عرض کیا کہ اگرچہ ماں باپ اس پر ظلم کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! اگرچہ ماں باپ اس پر ظلم ہی کیوں نہ کریں، اگرچہ ماں باپ اس پر ظلم ہی کیوں نہ کریں، اگرچہ ماں باپ اس پر ظلم ہی کیوں نہ کریں۔"

تشریح: حدیث سے معلوم ہوا کہ ماں باپ کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا اور ان کی نافرمانی کرنے سے اجتناب کرنا چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس لئے ان کی اطاعت و فرمانبرداری یا ان کی نافرمانی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری یا اس کی نافرمانی کرنا ہے۔

"اگرچہ ماں باپ اس پر ظلم ہی کیوں نہ کریں۔" حضور ﷺ کا اس جملہ کو تین بار فرمانا ماں باپ کی اطاعت و فرمانبرداری کی اہمیت کو ظاہر کرنے اور ان کے حقوق کو ادا کرنے کی تاکید کو زیادہ سے زیادہ شدت کے ساتھ بیان کرنے کی بنا پر تھا تاہم واضح رہے کہ ظلم سے مراد وہ ظلم ہے جس کا تعلق دنیاوی معاملات سے ہو نہ کہ دینی امور سے کیونکہ ماں باپ کی ایسی اطاعت و فرمانبرداری جائز نہیں ہے جس سے دین کی مخالفت اور شرعی احکام و مسائل کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔

ماں باپ کو محبت و احترام کی نظر سے دیکھنے کی فضیلت

(۳۴) وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ وَلَدٍ بَارٍّ يَنْظُرُ اِلٰى وَالِدَيْهِ نَظْرَةَ رَحْمَةٍ اِلَّا كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ بِكُلِّ نَظْرَةٍ حَجَّةً مَبْرُوْرَةً قَالُوْا وَاِنْ نَظَرَ كُلَّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ قَالَ نَعَمْ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَاَطْيَبُ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے والا جو بھی لڑکا اپنے باپ یا ماں کو محبت و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی ہر نظر کے بدلے ایک مقبول نفلی حج کا ثواب لکھتا ہے، صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! اگرچہ وہ دن بھر میں سو مرتبہ دیکھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں! اللہ تعالیٰ بہت بڑا اور بہت پاکیزہ ہے یعنی تمہارے گمان میں جو یہ بات ہے کہ ہر نظر کے بدلے ایک مقبول نفلی حج کا ثواب کیونکر لکھا جا سکتا ہے تو یہ اجر و انعام اللہ تعالیٰ کی شان اور اس کی وسعت رحمت کی نسبت سے کچھ بھی بعید نہ ہے وہ اگر چاہے تو اس سے بھی بڑا اجر عطا کر سکتا ہے۔"

والدین کی نافرمانی کرنے والے کے بارے میں وعید

(۳۵) وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُلُّ الذُّنُوْبِ یَغْفِرُ اللّٰہُ مِنْھَا مَاشَآءَ اِلَّا عُقُوْقَ الْوَالِدَیْنِ فَاِنَّہٗ یُعَجِّلُ لِصَاحِبِہٖ فِی الْحَیٰوۃِ قَبْلَ الْمَمَاتِ۔

"اور حضرت ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا شرک کے علاوہ تمام گناہ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے جس قدر چاہتا ہے بخش دیتا ہے مگر نافرمانی کے گناہ کو نہیں بخشتا بلکہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی نافرمانی کرنے والے کو موت سے پہلے اس کی زندگی میں جلد ہی سزا دے دیتا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص ماں باپ کی نافرمانی کے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اسے اپنے اس گناہ کی سزا اپنی موت سے پہلے اسی دنیا میں بھگتنی پڑتی ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس دنیا کی زندگی کا تعلق ماں باپ سے ہو یعنی جو والدین اپنی اولاد کی طرف سے نافرمانی کا دکھ سہتے ہیں وہ اپنی زندگی ہی میں اس اولاد کو اپنے گناہ کی نافرمانی کی سزا بھگتتے دیکھ لیتے ہیں تاہم دونوں ہی صورتوں میں آخرت کا عذاب بدستور باقی رہتا ہے کہ نافرمان اولاد محض اسی دنیا میں سزا نہیں پائے گی بلکہ آخرت میں بھی عذاب کی مستوجب ہوگی۔

اس حدیث کے سلسلہ میں ایک احتمال اور بھی ہے وہ یہ کہ والدین کے حقوق کے مذکورہ بالا حکم میں تمام حقوق العباد شامل ہوں یعنی جس طرح ماں باپ کے حقوق ادا نہ کرنے والی اولاد اس گناہ کی سزا دنیا میں پاتی ہے اسی طرح ہر وہ شخص بھی اسی دنیا میں سزایاب ہوتا ہے جو بندوں کے حقوق کو پامال کرتا ہے چنانچہ حکومت وقت کے خلاف بلا کسی شرعی وقانونی وجہ کے بغاوت کرنے والے اور ناحق ظلم کرنے والے کے بارے میں مذکورہ بالا طرح کی منقول وعید سے یہی ثابت ہوتا ہے حاصل یہ کہ مذکورہ بالا ارشاد گرامی کے ذریعہ والدین کے حقوق کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے اور ان کی نافرمانی کرنے کے گناہ کی شدت وسنگینی کو بڑے سخت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

بڑا بھائی باپ کی مانند ہے

(۳۶) وَعَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَقُّ کَبِیْرِ الْاِخْوَۃِ عَلٰی صَغِیْرِھِمْ کَحَقِّ الْوَالِدِ عَلٰی وَلَدِہٖ۔ رَوَی الْبَیْھَقِیُّ الْاَحَادِیْثَ الْخَمْسَۃَ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت سعید بن العاصؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ چھوٹے بھائی پر بڑے بھائی کا وہی حق ہے جو بیٹے پر اس کے باپ کا ہوتا ہے یہ پانچوں روایتیں بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کی ہیں۔"

بَابُ الشَّفْقَۃِ وَالرَّحْمَۃِ عَلَی الْخَلْقِ

مخلوق خداوندی پر شفقت ورحمت کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

جو شخص، لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اس پر اللہ کی رحمت نازل نہیں ہوتی

(۱) عَنْ جَرِیْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَرْحَمُ اللّٰہُ مَنْ لَّا یَرْحَمُ النَّاسَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت جریر ابن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم نہیں کرتا (یعنی اس کو اپنی خاص وکامل رحمت کا مستحق نہیں گردانتا) جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

بچوں کو پیار کرنے کی فضیلت

(۳) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَآءَ اَعْرَابِیٌّ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَتُقَبِّلُوْنَ الصِّبْیَانَ فَمَا نُقَبِّلُھُمْ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَوَ اَمْلِكُ لَكَ اَنْ نَزَعَ اللّٰہُ مِنْ قَلْبِكَ الرَّحْمَةَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک دیہاتی حاضر ہوا اور جب اس نے صحابہؓ کو دیکھا کہ وہ بچوں کو چومتے اور پیار کرتے ہیں تو کہنے لگا کہ کیا تم لوگ بچوں کو چومتے ہو؟ ہم تو بچوں کو نہیں چومتے، نبی کریم ﷺ نے اس کی یہ بات سن کر فرمایا۔ کیا میں اس بات پر قادر ہو سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل میں سے جس رحم و شفقت کو نکال لیا ہے اس کو روک دوں۔"
(بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل کو رحمت و شفقت اور پیار محبّت سے خالی کر دیا ہے تو یہ میرے بس کی بات نہیں ہے کہ تمہارے دل میں رحمت و شفقت اور محبّت کا جذبہ پیدا کروں۔ یہ معنی اس صورت میں ہیں جب کہ لفظ اَنْ الف کے ساتھ ہو جیسا کہ اکثر راویوں نے نقل کیا ہے اور اگر الف کے زیر کے ساتھ یعنی اِنْ ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ میں کیا کر سکتا ہوں اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل سے رحم کا جذبہ نکال دیا ہے تاہم دونوں صورتوں میں روایت کا مفہوم ایک ہی ہے تفاوت و فرق محض اعراب کی بنیاد پر ہے حدیث کا مقصد بے رحمی و بے مروّتی اور سخت دلی کے خلاف نفرت کا اظہار کرنا اور اس قسم کے لوگوں کو سختی کے ساتھ متنبہ کرنا ہے نیز اس ارشاد گرامی میں اس طرح بھی اشارہ ہے کہ دلوں میں رحم و شفقت کے جذبات کا ہونا اللہ تعالیٰ کا ایک بہترین عطیہ ہے اور اسی کا پیدا کیا ہوا ہے اور اگر وہ کسی شخص کے دل سے رحم و شفقت اور محبّت و مروّت کے جذبات کو نکال دے تو یہ پھر کسی کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ اس شخص کے دل کو ان جذبات کی دولت عطا کر دے۔

لڑکی، ماں باپ کے پیار و محبّت اور حسن سلوک کی زیادہ مستحق ہے

(۴) وَعَنْھَا قَالَتْ جَآءَ تْنِیْ اِمْرَأَةٌ وَمَعَھَا ابْنَتَانِ لَھَا تَسْأَلُنِیْ فَلَمْ تَجِدْ عِنْدِیْ غَیْرَ تَمْرَةٍ وَاحِدَةٍ فَاَعْطَیْتُھَا اِیَّاھَا فَقَسَمَتْھَا بَیْنَ ابْنَتَیْھَا وَلَمْ تَاْکُلْ مِنْھَا ثُمَّ قَامَتْ فَخَرَجَتْ فَدَخَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَحَدَّثْتُہٗ فَقَالَ مَنِ ابْتُلِیَ مِنْ ھٰذِہِ الْبَنَاتِ بِشَیْءٍ فَاَحْسَنَ اِلَیْھِنَّ کُنَّ لَہٗ سِتْرًا مِّنَ النَّارِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک دن میرے پاس ایک عورت آئی، اس کے ساتھ اس کی دو بچیاں بھی تھیں اس نے مجھ سے سوال کیا (یعنی مجھ سے کچھ مانگا) لیکن اس کو میرے پاس ایک کھجور کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں مل سکا (یعنی اس وقت میرے پاس صرف ایک کھجور کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا) چنانچہ میں نے اس کو وہی ایک کھجور دے دی اس نے اس کھجور کو آدھی آدھی اپنی دونوں بچیوں کو بانٹ دیا اور خود اس میں سے کچھ نہیں کھایا اور پھر وہ اٹھی اور باہر چلی گئی اتنے میں نبی کریم ﷺ گھر میں تشریف لائے میں نے آپ ﷺ سے اس عورت کا یہ واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص ان بچیوں میں سے کچھ یعنی ایک یا دو یا زیادہ لڑکیوں کی وجہ سے ابتلاء و آزمائش سے کیا جائے اور وہ ان بچیوں کے ساتھ احسان و سلوک کرے تو وہ بچیاں اور ان کے ساتھ کی گئی وہ نیکی اس کے لئے دوزخ کی آگ سے پردہ بنیں گی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یعنی وہ بچیاں اور ان کے ساتھ کی گئی نیکی اس شخص اور دوزخ کی آگ کے درمیان حائل ہونگی کہ وہ شخص اپنی ان بچیوں کی وجہ سے دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے گا اور بچیوں کے ساتھ حسن سلوک کی یہ فضیلت اس بنا پر ہے کہ لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیاں یا وہ اپنے ماں باپ کے پیار محبّت اور ان کے حسن سلوک و احسان کی مستحق ہوتی ہیں۔

اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ ابتلاؤ آزمائش کا محمول محض لڑکیوں کا پیدا ہونا ہے یا کسی ایسی حالت میں مبتلاء ہونا ہے جو لڑکیوں کی وجہ سے کسی محنت و تکلیف اور پریشانی و عسرت کے سامنے آنے اور اس پر صبرو تحمل کرنے کی صورت میں پیش آئے چنانچہ پہلی صورت یعنی ابتلاؤ آزمائش کا تعلق لڑکیوں کی پیدائش سے ہونا زیادہ صحیح ہے اس صورت میں کہا جائے گا کہ جو لوگ اپنے ہاں لڑکیاں پیدا ہونے پر دل گرفتگی اور ناگواری میں مبتلا ہوتے ہیں وہ اس حقیقت سے بالکل بے خبر ہیں کہ لڑکیاں اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی رحمت ہیں اور ان کی پرورش و دیکھ بھال اور ان کے ساتھ پیار و محبّت کا سلوک کرنا ایک بہت بڑی اخروی سعادت ہے اس بارے میں بھی علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ احسان و سلوک سے مراد وہ نان ونفقہ ہے جو باپ پر واجب ہوتا ہے یا اس واجب نان ونفقہ کے علاوہ مزید حسن سلوک کرنا مراد ہے۔ چنانچہ راجح قول یہ ہے کہ یہ دوسرے معنیٰ زیادہ صحیح ہیں نیز واضح رہے کہ مذکورہ احسان و سلوک کی شرط یہ ہے کہ وہ شریعت کے موافق ہو۔

علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ بچیوں کے ساتھ احسان و سلوک کرنے کا مذکورہ اجر اس صورت میں حاصل ہوتا ہے جبکہ اس احسان و سلوک کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ بچیاں اپنی شادی بیاہ کی وجہ سے یا کسی اور صورت میں باپ کی کفالت اور اس کے احسان و سلوک سے بے نیاز ہو جائیں۔

بچیوں کی پرورش کرنے کی فضیلت

④ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَآءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَنَا وَهُوَ هٰكَذَا وَضَمَّ اَصَابِعَهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص دو بیٹیوں کی پرورش اور دیکھ بھال کرے یہاں تک کہ وہ بلوغ کی حد تک پہنچ جائیں یا شادی بیاہ کے بعد اپنے خاوند کے پاس چلی جائیں تو وہ شخص قیامت کے روز اس طرح آئے گا کہ میں اور وہ اس طرح ایک دوسرے کے قریب ہوں گے یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو ملا کر دکھایا۔" (مسلمؒ)

تشریح: آپ ﷺ نے اپنے اور اس شخص کے درمیان کمال قرب اور اتصال کو ظاہر کرنے کے لئے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کو ملا کر دکھایا کہ جس طرح تم ان دونوں انگلیوں کو ایک دوسرے سے ملی ہوئی دیکھ رہے ہو اسی طرح قیامت کے دن میں اور وہ شخص ایک دوسرے کے قریب ہوں گے اور محشر میں ہم دونوں ایک جگہ اور ایک ساتھ ہوں گے یا وہ میرے ساتھ جنّت میں داخل ہوگا۔

بیوہ اور مسکین کی خدمت کا ثواب

⑤ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السَّاعِیْ عَلَى الْاَرْمِلَةِ وَ الْمِسْكِيْنِ كَالسَّاعِیْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اَحْسِبُهٗ قَالَ كَالْقَائِمِ لَا يَفْتُرُ وَ كَالصَّائِمِ لَا يُفْطِرُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ بیوہ عورت اور مسکین کی خبرگیری کرنے والا اس شخص کے مانند ہے جو خدا کی راہ میں سعی کرے یعنی جو شخص بیوہ عورت اور مسکین کی دیکھ بھال اور خبرگیری کرتا ہے اور ان کی ضروریات کو پورا کر کے ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے تو اس ثواب کے برابر ہے جو خدا کی راہ میں جہاد اور حج کرنے والے کو ملتا ہے اور میرا گمان ہے کہ انہوں نے یہ بھی بیان کیا کہ بیوہ عورت اور مسکین کی خبرگری کرنے والا اس شخص کے مانند ہے جو نماز و عبادت کے شب بیداری کرتا ہے اور اپنی شب بیداری میں نہ کوئی سستی کرتا ہے اور نہ کسی فتور اور نقصان کو گوارا کرتا ہے اور اس شخص کے مانند ہے جو (دن کو کبھی) افطار نہیں کرتا کہ جس کو صائم الدہر کہا جاتا ہے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: فقیر و محتاج بھی مسکین کے حکم میں داخل ہے بلکہ بعض حضرات کے نزدیک اس کو مسکین پر ترجیح حاصل ہے۔

"اور میرا گمان ہے کہ انہوں نے یہ بھی بیان "ان الفاظ کی نسبت حضرت عبداللہ ابن سلمہ قعنبیؒ کی طرف کی جاتی ہے جو بخاریؒ و مسلمؒ کے شیخ اور اس حدیث کے راوی ہیں جس کو انہوں نے حضرت امام مالکؒ سے روایت کیا ہے اس بات کی صراحت امام بخاریؒ نے کی ہے، بہر حال ان الفاظ کے ذریعہ حضرت عبداللہ ابن سلمہؒ کا مطلب یہ ہے کہ میرا گمان ہے کہ اس حدیث کے راوی حضرت امام مالکؒ نے یہ الفاظ کالقائم لا یفتر.... الخ نقل کئے تھے لیکن اگر بخاریؒ کی مذکورہ صراحت کے سامنے نہ ہو تو مصابیح اور مشکوٰۃ کے ظاہری الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ اور میرا گمان ہے کہ........ الخ حضرت ابوہریرہ کا ہے اور ابوہریرہؓ اس جملہ کے ذریعہ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ میرے گمان کے مطابق پر آنحضرت ﷺ نے کالقائم لا....... الخ کے الفاظ بھی ارشاد فرمائے تھے یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس موقع پر حضرت ابوہریرہ نے اپنے اس شک کو ظاہر کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یا تو کالساعی فِیْ سبیل اللّٰہ کے الفاظ ارشاد فرمائے تھے یا کالقائم لا یفتر کے الفاظ، چنانچہ اس کی تائید جامع صغیر کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو احمدؒ شیخینؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ اور ابن ماجہؒ سے نقل کیا گیا ہے اور جس کے الفاظ یوں ہیں کہ الساعی علی الارملۃ والمساکین کالمجاھد فی سبیل اللّٰہ او لقائم اللیل الصائم النھار۔

یتیم کی پرورش کرنے کی فضیلت

(٦) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيْمِ لَهٗ وَلِغَيْرِهٖ فِي الْجَنَّةِ هٰكَذَا وَاَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ وَالْوُسْطٰى وَفَرَّجَ بَيْنَهُمَا شَيْئًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت سہل ابن سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا کہ وہ یتیم خواہ اس کا ہو یا کسی اور کا جنت میں اس طرح ہوں گے یہ کہہ کر آپ ﷺ نے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کے ذریعہ اشارہ کیا اور دونوں کے درمیان تھوڑی سی کشادگی رکھی۔" (بخاریؒ)

تشریح: "وہ یتیم خواہ اس کا ہو یا کسی اور کا" کے ذریعہ اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ مطلق یتیم کی کفالت و پرورش کرنے کی فضیلت ہے وہ یتیم خواہ اس کا اپنا قرابتی ہو جیسے پوتا اور بھتیجا وغیرہ یا کوئی غیر قرابتی ہو۔ حضور ﷺ نے اپنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کے ذریعہ اشارہ کر کے واضح کیا کہ جنت میں میرے اور یتیم کی پرورش کرنے والے کے درمیان اتنا قریبی علاقہ ہوگا جتنا کہا کہ ان دونوں انگلیوں کے درمیان ہے نیز آپ ﷺ نے ان دونوں انگلیوں کی کشادگی کے ذریعہ اس طرح بھی اشارہ فرمایا کہ مرتبہ نبوت جو سب سے اعلیٰ درجہ ہے اس کے اور سخاوت و مروت کے مرتبہ کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔

تمام مسلمانوں کو ایک تن ہونا چاہئے

(٧) وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَكٰى عُضْوًا تَدَاعٰى لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت نعمان ابن بشیرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اے مخاطب تو مؤمنوں کو آپس میں ایک دوسرے سے رحم کا معاملہ کرنے ایک دوسرے سے محبت و تعلق رکھنے اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی و معاونت کا سلوک کرنے میں ایسا پائے گا جیسا کہ بدن کا حال ہے کہ جب بدن کا کوئی عضو دکھتا ہے تو بدن کے باقی اعضاء اس ایک عضو کی وجہ سے ایک دوسرے کو پکارتے ہیں اور بیداری و بخار کے تعب و درد میں سارا جسم شریک رہتا ہے۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد کے ذریعہ آنحضرت ﷺ نے مؤمن کی صفت اتحاد و یگانگت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اگر کوئی جذبہ و تعلق ایسا ہو سکتا ہے جو دنیا کے تمام انسانوں کو رنگ و نسل کے بھید بھاؤ زبان و کلچر کے اختلاف و تفاوت اور ذات و قبائل اور علاقہ کی تفرقہ بازی سے نجات دلا کر ایک انسانی برادری اور اتحاد و یگانگت کی ایک لڑی میں پرو سکتا ہے تو وہ صرف ایمان و اسلام کا تعلق ہے چنانچہ اہل ایمان جہاں بھی ہوں جس رنگ و نسل سے بھی تعلق رکھتے ہوں اور ان کی زبان و معاشرت میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن انسان اور مؤمن ہونے کی حیثیت سے وہ ایک ہیں اور ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے درمیان کوئی انسانی اونچ نیچ نہیں ہے، کوئی بھید بھاؤ نہیں ہے اور کسی برتری و کمتری کی نفرت و حقارت نہیں ہے وہ جس عقیدہ کے حامل اور جس نظریہ حیات کو ماننے والے ہیں اس کی روشنی میں اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ تمام انسان ایک باپ کی اولاد ہیں تمام مسلمان ایک زنجیر کی کڑیاں ہیں، اگر وہ کڑیاں الگ الگ ہو جائیں تو زنجیر ٹوٹ کر رہ جائے گی، اسی طرح اگر مسلمان تفرقہ بازی کا شکار ہو جائیں اور رنگ و نسل زبان و کلچر اور ذات پات کے دائروں میں سمٹ جائیں تو ان کے ملی وجود اور ان کی اجتماعی طاقت کو انتشار و اضمحلال کا گھن لگ جائے گا۔ اور جب ان کی اجتماعی حیثیت مجروح ہو کر غیر مؤثر ہوگی تو ان کا شخصی و انفرادی وجود بھی نہ صرف بے معنی ہو جائے گا۔ بلکہ ہر شخص مختلف آفات و مصائب کا شکار ہوگا۔ اور چونکہ ملی وجود اور اجتماعی طاقت کا سرچشمہ افراد کا آپس میں محبت و موانست اور اشخاص کا باہمی ربط و تعلق ہے اس لئے ہر مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی سے اس طرح ربط و تعلق رکھتا ہے جس طرح دو حقیقی بھائی ہوتے ہیں کہ آپس میں سلام و دعا کرتے ہیں باہمی میل جول اور ملاقات کرتے ہیں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہتے ہیں۔ باہمی معاملات و تعلقات کو محبت و مؤانست اور رحم دلی کی بنیاد پر استوار کرتے ہیں ہدایا و تحائف کا تبادلہ کرتے ہیں ایک دوسرے کی مدد و اعانت کرتے رہتے ہیں۔ اور ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے حالات کی رعایت اور اس کے طور طریقوں کی پاسداری کرتا ہے چنانچہ جب شخصی اور انفرادی سطح پر یہ ربط و تعلق ایک دوسرے کو جوڑنے کا ذریعہ بن جاتا ہے تو سارے مسلمان ایک مضبوط اجتماعی حیثیت اور عظیم طاقت بن جاتے ہیں۔

اس حقیقت کو اس ارشاد گرامی میں ظاہر کیا گیا ہے اور تمام مسلمانوں کو ایک بدن کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جب بدن کا کوئی ایک عضو دکھتا تو سارا بدن اس دکھ سے متاثر ہوتا ہے اور محض ایک عضو میں تکلیف ہونے سے پورا جسم تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے اسی طرح مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ ایک تن بن جائیں اور پوری ملت اسلامیہ ایک جسم کی مانند ہو جائے کہ اگر کسی ایک بھی مسلمان کو کوئی گزند پہنچے یا وہ کسی آفت و مصیبت میں گرفتار ہو تو سارے مسلمان اس کے دکھ و رنج میں شریک ہوں اور سب مل کر اس کی تکلیف و مصیبت کو دور کرنے کی تدبیر کریں اسی مفہوم کو شیخ سعدیؒ نے ان الفاظ میں نظم کیا ہے۔

بنی آدم اعضائے یکد یگرند   کہ در آفرینش زیک گوہراند
چو عضوے بدرد آورد روزگار   دگر عضو ہا رانماند قرار

⑧ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُؤْمِنُوْنَ كَرَجُلٍ وَاحِدٍ اِنِ اشْتَكٰى عَيْنُهٗ اشْتَكٰى كُلُّهٗ وَاِنِ اشْتَكٰى رَأْسُهٗ اشْتَكٰى كُلُّهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت نعمان ابن بشیرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (ایک خدا ایک رسول ﷺ اور ایک دین کو ماننے کی وجہ سے) سارے مسلمان ایک شخص (کے اعضاء و جسم کے) مانند ہیں کہ اگر اس کی آنکھ دکھتی ہے تو اس کا سارا جسم بے چین و مضطرب ہو جاتا ہے اور اس کا سر دکھتا ہے تو پورا بدن تکلیف محسوس کرتا ہے اسی طرح ایک مسلمان کی تکلیف کو سارے مسلمانوں کو محسوس کرنا چاہئے۔" (مسلمؒ)

سارے مسلمان ایک دوسرے کی مدد و اعانت کے ذریعہ ناقابل تسخیر طاقت بن سکتے ہیں

⑨ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰى عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضًا ثُمَّ شَبَّكَ بَيْنَ

اَصَابِعِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ مسلمان، مسلمان کے لئے ایک مکان کے مانند ہے یعنی سارے مسلمان مضبوطی وطاقت حاصل کرنے کے اعتبار سے اس مکان کی طرح ہیں جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط رکھتا ہے یہ کہہ کر آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کیا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: پہلے تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو اس مکان کے ساتھ تشبیہ دی جس کے سارے اجزاء اور تمام حصے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر پورے مکان کو مضبوط و پختہ بناتے ہیں اور پھر اس حقیقت کو آپ ﷺ نے مثالی صورت میں اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسا کر دکھلایا کہ اگر سارے مسلمان اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ مربوط و متحد رہیں اور باہمی محبّت و موانست اور امداد و تعاون کی زنجیر میں منسلک رہیں تو پوری ملت اسلامیہ مضبوط و توانا اور ایک ناقابل تسخیر طاقت بن جائے گی لیکن واضح رہے کہ مسلمانوں کا وہی اتحاد اور وہی یک جہتی مطلوب و مستحسن ہے جس کی بنیاد حق و حلال کے معاملات پر ہو حرام و مکروہ اور گناہ کے موجب معاملات میں اتحاد و اتفاق اور ایک دوسرے کے ساتھ مدد تعاون غیر مطلوب ہے۔

سفارش کرنا ایک مستحسن عمل ہے

⑩ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ كَانَ اِذَا اَتَاهُ السَّآئِلُ اَوْصَاحِبُ الْحَاجَةِ قَالَ اشْفَعُوْا فَلْتُؤْجَرُوْا وَيَقْضِي اللّٰهُ عَلٰى لِسَانِ رَسُوْلِهٖ مَاشَآءَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جب آپ ﷺ کے پاس کوئی سائل یا حاجتمند آتا تو صحابہؓ سے فرماتے کہ مجھ سے اس شخص کی سفارش کرو تاکہ تمہیں سفارش کا ثواب مل جائے اور اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کی زبان سے جو حکم چاہتا ہے جاری فرماتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: کسی کی سفارش کرنا گویا اس کے ساتھ ہمدردی کرنا اور اس کی مدد کرنا ہے اس لئے حضور ﷺ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ تم لوگوں کی سفارش کرتے رہا کرو۔ خواہ تمہاری سفارش قبول کی جائے یا نہ کی جائے کیوں کہ کسی کا کام ہونا یا نہ ہونا تقدیر الٰہی اور حکم خداوندی کے مطابق ہے لہٰذا تم اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ شاید میری سفارش قبول نہ ہو، سفارش کرنے سے اجتناب نہ کرو اور اس کا ثواب ہاتھ سے نہ جانے دو۔

واضح رہے کہ سفارش کا حکم ان امور و معاملات سے متعلّق ہے جو کسی ناجائز و حرام مقصد پر مبنی نہ ہوں، نیز اگر کوئی شخص کسی ایسے معاملہ میں ماخوذ ہو جو حد یعنی شریعت کی طرف سے متعیّن شدہ سزا کو لازم کرتا ہو تو اس صورت میں اس وقت سفارش کرنا جائز نہیں ہوگا جب کہ وہ معاملہ امام وقت تک پہنچ چکا ہو، اگر وہ معاملہ امام تک نہ پہنچا ہو تو پھر سفارش کی جاسکتی ہے ہاں تعزیری معاملات میں بہر صورت سفارش کرنا جائز ہے۔ نیز یہ ساری تفصیل اس صورت سے متعلّق ہے جبکہ وہ شخص موذی و شریر نہ ہو، جس کی سفارش کرنا مقصود ہے موذی اور شریر شخص کی سفارش کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔

ظالم کی مدد کس طرح کی جاسکتی ہے

⑪ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ انْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنْصُرُهٗ مَظْلُوْمًا فَكَيْفَ اَنْصُرُهٗ ظَالِمًا قَالَ تَمْنَعُهٗ مِنَ الظُّلْمِ فَذَالِكَ نَصْرُكَ اِيَّاهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ ایک صحابیؓ نے (یہ

ارشاد سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جو مسلمان مظلوم ہے اس کی مدد تو مجھے کرنی چاہئے۔ (اور میں جانتا ہوں کہ اس کی کس طرح مدد کی جاسکتی ہے)۔ لیکن میں اس مسلمان کی کس طرح مدد کرسکتا ہوں جو ظلم کر رہا ہو؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ تم اس کو ظلم سے روکو اور یہی یعنی اس کو ظلم سے روکنا اس کے حق میں تمہاری مدد ہے کیوں کہ اس کو ظلم سے روکنا گویا اس کو اپنے نفس اور شیطان پر قابو پانے میں مدد دینا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تمام مسلمان ایک دوسرے کے دینی بھائی ہیں

⑫ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُسْلِمُ اَخُ الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهٗ وَلَا يُسْلِمُهٗ وَمَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهٖ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا دینی بھائی ہے یعنی تمام مسلمان آپس میں دینی اخوت کا تعلق رکھتے ہیں۔ اور اس اعتبار سے شریعت کو وہی مقام حاصل ہے جو ماں کو حاصل ہوتا ہے اور شارع ﷺ تمام مسلمانوں کے دینی باپ ہیں لہٰذا اس دینی اخوت کا تقاضا ہے کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان پر ظلم نہ کرے اور اس کو کسی ہلاکت میں مبتلا نہ کرے اور نہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کو اس کے دشمن کے ہاتھوں میں چھوڑے بلکہ اس دشمن کے مقابلہ پر اس کی مدد و اعانت کرے اور (یاد رکھو) جو شخص کسی مسلمان بھائی کی حاجت روائی کی سعی و کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی کرتا ہے جو شخص کسی مسلمان بھائی کے کسی غم کو دور کرتا ہے (خواہ وہ غم اور تکلیف زیادہ ہو یا کم) تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن غموں میں سے ایک بڑے غم سے نجات دے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان بھائی کے بدن یا اس کے عیب کو ڈھانکتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیب ڈھانکے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان بھائی کی ستر پوشی کرنے والے یا اس کے عیوب کو چھپانے والے شخص نے دنیا میں جو عیوب و گناہ کئے ہوں گے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے ان گناہ و عیوب کی پردہ پوشی کرے گا بایں طور کہ اہل موقف کے سامنے ظاہر نہیں کرے گا اس پر مواخذہ و محاسبہ نہیں کرے گا اور نامہ اعمال کی پیشی کے وقت ان کا ذکر پوشیدہ طور پر ہوگا۔

علماء نے لکھا ہے کہ جن مسلمانوں کے عیوب کی پردہ پوشی مستحسن و مستحب ہے وہ اس درجہ کے مسلمان ہیں جن کو اہل عزت و حیا کہا جاتا ہے یعنی وہ مسلمان جن کی ظاہری زندگی پاکیزہ اور آبرومندانہ سمجھی جاتی ہے اور جن کے عیوب پوشیدہ رہتے ہیں کہ اگر بتقاضائے بشریت ان سے کوئی گناہ و عیب سرزد ہو جاتا ہے تو وہ اس کو پردہ حیا میں چھپاتے ہیں۔ رہے وہ مسلمان جو حیا کا پردہ اٹھا دیتے ہیں جن کی ایذاء رسانی اور فتنہ پردازی آشکارا ہوتی ہے اور جو علی الاعلان گناہ و معصیت کا ارتکاب کرنے میں کوئی شرم اور جھجک محسوس نہیں کرتے ان کا معاملہ جداگانہ ہے کہ نہ صرف ان کو ان گناہ و عیوب پر ٹوکنا واجب، اور ان کو ارتکاب معصیت سے منع کرنا اور تنبیہ کرنا لازم ہے بلکہ اگر وہ روکنے اور تنبیہ کرنے کے باوجود اپنی برائیوں اور گناہ و ایذاء رسانی سے باز نہ آئیں تو ان کے بارے میں حاکم کے یہاں اطلاع دینی چاہئے تاکہ وہ ان کو ان کی ایذاء رسانیوں اور فتنہ پردازی سے باز رکھے اسی طرح راویان حدیث اور مورخین پر جرح و نقد، ارباب حکومت اور گواہوں کی تحقیق اور اہل ظلم کے حالات کا اظہار بھی نہ صرف جائز بلکہ واجب و لازم ہے کیوں کہ ان صورتوں میں دین و علم کی نگہبانی اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت مقصود ہوتی ہے اس لئے مذکورہ بالا لوگوں کے حالات و عیوب کو بیان کرنا اس اظہار عیب میں داخل نہیں ہے جس کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

کسی مسلمان کو حقیر نہ سمجھو

⑬ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُسْلِمُ اَخُ الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهٗ وَلَا يَخْذُلُهٗ وَلَا يَحْقِرُهٗ

التَّقْوٰی هٰهُنَا وَيُشِيْرُ اِلٰى صَدْرِهٖ ثَلٰثَ مِرَارٍ بِحَسْبِ امْرِءٍ مِنَ الشَّرِّ اَنْ يَحْقِرَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ كُلُّ الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهٗ وَمَالُهٗ وَعِرْضُهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ہر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا دینی بھائی ہے (لہٰذا) مسلمان، مسلمان پر ظلم نہ کرے اس کی مدد و اعانت کو ترک نہ کرے اور اس کو ذلیل و حقیر نہ سمجھے، پھر آپ ﷺ نے اپنے سینے کی طرف تین دفعہ اشارہ کر کے فرمایا کہ پرہیزگاری اس جگہ ہے نیز فرمایا کہ مسلمان کے لئے اتنی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو ذلیل و حقیر کرے یعنی کسی مسلمان بھائی کو ذلیل و حقیر کرنا بجائے خود اتنی بڑی برائی ہے کہ وہ کوئی اور گناہ نہ بھی کرے تو اسی ایک برائی کی وجہ سے مستوجب مواخذہ ہوگا۔ (اور یاد رکھو) مسلمان پر مسلمان کی ساری چیزیں حرام ہیں جیسے اس کا خون، اس کا مال، اور اس کی عزت و آبرو۔" (مسلم)

تشریح: "اس کو ذلیل و حقیر نہ سمجھے" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان بھائی کے عیب کو اچھال کر اور اس کی برائیوں کو لوگوں کے سامنے بیان کر کے ان کو رسوا اور بدنام نہ کرے اس کے ساتھ بدزبانی اور سخت کلامی نہ کرے۔ اور کوئی مسلمان خواہ کتنا ہی غریب و محتاج ہو کتنا ہی ضعیف و ناتواں اور کتنا ہی نامراد و خستہ حال ہو اس کا مذاق نہ اڑائے کیوں کہ کسی کو کیا معلوم کہ جو مسلمان ظاہری طور پر نہایت خستہ حال اور ضعیف و محتاج ہے اللہ کے نزدیک اس کا مقام کیا ہے۔ اور انجام و مآل کے اعتبار سے وہ کس درجہ کا ہے۔ اس حقیقت کو کسی صورت میں فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ جو بھی شخص لا الہ الا اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔ اور خدا کے رسول ﷺ کا امتی ہے وہ عزت والا ہے اور قابل تکریم ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لہٰذا کسی مؤمن کی عزت ایمانی کو کسی حال میں مجروح نہ کرنا چاہئے اور خصوصا وہ مؤمن جن کے چہرے مہرے سے علم دین کی علامت اور عبادت خداوندی کا نور جھلکتا ہو ان کی تعظیم و توقیر کو بطریق اولیٰ ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے اکثر لوگ اور خصوصا وہ دنیادار جو نفس کی ظلمت و غفلت میں مبتلا ہوتے ہیں عام طور پر فقراء و مساکین اور غریب و بے کس مسلمانوں کے وبال میں گرفتار رہتے ہیں کیونکہ وہ ان کو ذلیل و کمتر سمجھتے ہیں اور ان بے چاروں کے ساتھ انتہائی ترشی اور حقارت کا معاملہ کرتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر مؤمن کو ذلیل و حقیر کرنے کا عذاب اپنا سر لیتے ہیں وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دنیا میں بھی عزت و اقبال مندی سے نوازتا ہے اور آخرت میں بھی نجات عطا کرے گا جو اس کے غریب و مسکین اور ضعیف و بے کس بندوں کے ساتھ محبت و احترام کا برتاؤ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ مسکین و غرباء کی محبت حاصل ہونے کی دعا مانگا کرتے تھے نیز آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا تھا کہ فقراء و مساکین کی ہم نشینی اختیار فرمائیں جیسا کہ سورہ کہف میں مذکور ہے۔

"پرہیزگاری اس جگہ ہے" کا مطلب یہ ہے کہ متقی یعنی وہ شخص جو شرک اور گناہوں سے اجتناب و پرہیز کرتا ہے اس کو کسی بھی صورت میں حقیر و کمتر سمجھنا جائز نہیں ہے یا یہ مراد ہے کہ تقویٰ کا مصدر و مخزن اصل میں سینہ یعنی دل ہے اور وہ ایک ایسی صفت ہے جو باطن کی ہدایت اور نورانیت سے پیدا ہوتی ہے اس صورت میں کہا جائے گا کہ ان الفاظ کا مقصد ماقبل جملہ کی تاکید و تقویت ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ جو چیز کسی انسان کو معزز و مکرم بناتی ہے وہ تقویٰ ہے اور جب تقویٰ کا تعلق باطن سے ہے اور اس کی جگہ دل ہے جو ایک پوشیدہ چیز ہے کہ جس کو انسان ظاہری نہیں دیکھ سکتا تو پھر کسی مسلمان کو کیونکر حقیر و ذلیل کہا جاسکتا ہے۔ درآنحالیکہ اس کی حقیقت معلوم نہیں ہے ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ تقویٰ کی جگہ دل کو قرار دیکر اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ جس کے دل میں تقویٰ ہو وہ کسی مسلمان کو حقیر و ذلیل نہ کرے کیونکہ کوئی بھی متقی کسی مسلمان کو ذلیل کرنے والا نہیں ہوسکتا یہ مراد اگرچہ بعض علماء نے لکھی ہے لیکن پہلے معنی زیادہ صحیح اور زیادہ موزون ہیں۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی مسلمان ایسا کوئی کام نہ کرے اور نہ اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نکالے جس سے کسی مسلمان بھائی کی خوں ریزی ہو یا اس کا مال تلف و ضائع ہو اور یا اس کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچے۔

یہ حدیث اپنے الفاظ کے اختصار لیکن مفہوم و معنیٰ کی وسعت کے اعتبار سے جوامع الکلم میں سے ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت ﷺ کو خصوصی عطیہ ہے۔

جنتی اور دوزخی لوگوں کی قسمیں

(۱۴) وَعَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَهْلُ الْجَنَّةِ ثَلٰثَةٌ ذُوْ سُلْطَانٍ مُقْسِطٌ مُتَصَدِّقٌ مُوَفَّقٌ وَرَجُلٌ رَحِيْمٌ رَقِيْقُ الْقَلْبِ لِكُلِّ ذِیْ قُرْبٰى وَمُسْلِمٍ وَعَفِيْفٌ مُتَعَفِّفٌ ذُوْ عِيَالٍ وَاَهْلُ النَّارِ خَمْسَةٌ الضَّعِيْفُ الَّذِیْ لَا زَبْرَ لَهُ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْكُمْ تَبَعٌ لَا يَبْغُوْنَ اَهْلًا وَلَا مَالًا وَالْخَائِنُ الَّذِیْ لَا يَخْفٰى لَهُ طَمَعٌ وَاِنْ دَقَّ اِلَّا خَانَهُ وَرَجُلٌ لَا يُصْبِحُ وَلَا يُمْسِیْ اِلَّا وَهُوَ يُخَادِعُكَ عَنْ اَهْلِكَ وَمَالِكَ وَذَكَرَ الْبُخْلَ وَالْكِذْبَ وَالشِّنْظِيْرُ الْفَحَّاشُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عیاض ابن حمارؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جنتی لوگوں کی تین قسمیں ہیں (یعنی جو اہل ایمان اس لائق ہیں کہ سابقین اور مقربین کے ساتھ جنت میں داخل ہوں وہ تین طرح کے ہیں) ایک تو وہ حاکم جو عدل و انصاف کرتا ہو اور لوگوں کے ساتھ احسان کرنے والا ہو اور جس کو نیکیوں اور بھلائیوں کی توفیق دی گئی، دوسرے وہ شخص (جو چھوٹوں اور بڑوں پر) مہربان، اور قرابتداروں اور مسلمانوں کے لئے رقیق القلب یعنی نرم دل ہو (یعنی وہ اپنے اور بیگانے ہر ایک کے ساتھ نرمی اور مروت اور مہربانی کا برتاؤ کرنے والا ہو)۔ اور تیسرے وہ شخص جو (غیر حلال چیزوں سے) بچنے والا (غیر اللہ کے آگے دست سوال دراز کرنے سے) پرہیز کرنے والا اور اہل وعیال کے بارے میں خدا پر توکل کرنے والا ہو (یعنی اہل وعیال کی محبت اور ان کے رزق کا خوف اس کو خدا پر توکل کرنے سے باز نہ رکھتا ہو، لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنے اور حرام و ناجائز مال حاصل کرنے پر مجبور نہ کرتا ہو اور نہ وہ اپنے ان اہل وعیال کی وجہ سے علم و عمل میں مشغول ہونے سے غافل رہتا ہو) اور دوزخی لوگوں کی پانچ قسمیں ہیں۔ (یعنی جو لوگ اپنے افعال بد کے وبال میں پڑ کر مستوجب عذاب ہوتے ہیں وہ پانچ طرح کے ہیں! گویا یہاں ان افعال بد اور بری خصلتوں کی برائی بیان کرنا اور ان کی سختی و شدت کو ظاہر کرنا مقصود ہے جو دوزخ کے عذاب کا باعث ہیں جیسا کہ پہلے ان چیزوں کی تعریف و مدح ذکر کی گئی۔ جو جنت میں لے جانے والی ہیں) ایک تو کمزور عقل والا کہ اس کی عقل کی کمزوری اس کو ناشائستہ امور سے باز نہ رکھے (یعنی وہ شخص کہ جو اپنی عقل پر نفسانی خواہشات اور خود غرضی کے جذبات کے غالب آجانے کی وجہ سے ثبات و استقامت ترک کر دیتا ہے اور گناہوں اور بری باتوں سے باز رہنے پر قادر نہیں رہتا) وہ لوگ کہ جو تمہارے تابع اور تمہارے خادم ہیں ان کو نہ بیوی کی خواہش ہوتی ہے اور نہ مال کی پرواہ (یعنی جو لوگ تمہارے مال داروں اور مقتدروں کے آگے پیچھے پھرتے نظر آتے ہیں اور ان کی خدمت و اطاعت کا دم بھرتے رہتے ہیں ان کے مدنظر نہ تو کسی کی بھلائی و دوستی ہوتی ہے اور نہ ان کو واقعۃً خدمت و اطاعت سے کوئی غرض ہوتی ہے بلکہ وہ تو محض اپنی نفسانی خواہشات اور خود غرضی کے تابع ہوتے ہیں ان کا اصل مقصد اچھے اچھے کھانوں سے اپنا پیٹ بھرنا اچھے درجہ کا لباس اور دوسری چیزیں حاصل کرنا ہوتا ہے نہ تو انہیں بیوی کی پرواہ ہوتی ہے کہ جس کے ذریعہ وہ اپنی جنسی خواہش جائز طور پر پوری کر سکیں اور نہ انہیں اس مال و زر کی طلب ہوتی ہے جو حلال ذرائع جائز وسائل اور محنت و مشقت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے بلکہ وہ بدکاریوں حرام خوریوں اجنبی عورتوں اور حرام و مشتبہ اسباب میں مگن اور خوش رہتے ہیں اور یہ چیز بھی انسانی عقل کی کمزوری اور ضمیر کی مردنی پر دلالت کرتی ہے کیونکہ حلال و پاک چیزوں سے اعراض کرنا اور حرام و مشتبہ چیزوں کو مطلوب و مقصد قرار دینا نہ تو عقل کا تقاضا ہو سکتا ہے اور نہ ضمیر کے مطابق) دوسرے وہ شخص جو خائن و بددیانت ہے کہ اس کی طمع کسی پوشیدہ چیز کو بھی اس کے ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تاکہ وہ اس میں بددیانتی کر سکے خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی اور کمتر چیز کیوں نہ ہو (یعنی اس کی طمع و حرص اس کو کسی حال میں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی یہاں تک کہ وہ چھپی ہوئی چیزوں کی بھی تلاش و جستجو میں لگا رہتا ہے اور جب وہ چیزیں اس کے ہاتھ لگ جاتی ہیں تو ان میں بھی بددیانتی کرتا ہے خواہ وہ چیزیں کتنی ہی بے وقعت اور کمتر کیوں نہ ہوں، نیز بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ خفا

چونکہ ظہور کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اس لئے لا یخفی لہ طمع کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ خائن کہ وہ اس چیز میں بھی خیانت کرتا ہے جو اس کے سامنے نہیں ہوتی اور نہ وہ اس قابل ہوتی ہے کہ وہ اس کی طمع و حرص کر سکے)۔ اور تیسرے وہ شخص جو صبح و شام تمہیں تمہارے اہل و عیال میں دھوکہ دینے کے چکر میں رہتا ہے (یعنی جس شخص کو تم اپنے گھر والوں کی حفاظت اور اپنے مال و اسباب کی نگرانی سپرد کرتے ہو یا جو شخص از خود تمہارے ساتھ لگا رہتا ہے اور اپنی عفت و پاکدامنی کو تم پر ظاہر کر کے یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ تمہارے گھربار اور اہل خانہ کی حفاظت و نگرانی میں مصروف ہے لیکن حقیقت میں وہ ہر لمحہ تمہارے اہل خانہ اور تمہارے مال و اسباب پر بری نظر رکھتا ہے) نیز آنحضرت ﷺ نے بخیل اور جھوٹے اور بد خلق فحش گو کا ذکر کیا۔" (مسلم)

تشریح: "رجل رحیم رقیق القلب" میں رحیم سے مراد صفت فعلیہ اور رقیق سے مراد صفت قلبیہ ہے صفت فعلیہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ صفت اپنا خارجی وجود بھی رکھے اور دوسروں پر اس کے اثرات ظاہر ہوں جبکہ صفت قلبیہ کا تعلق محض اس صفت کے باطنی وجود سے ہوتا ہے خواہ عملی اور خارجی طور پر اس کا اظہار ہو یا نہ ہو۔

لفظ بخل اور کذب مصدر قائم مقام فاعل ہیں۔ وذکر البخل والکذب......الخ کے ذریعہ راوی نے یہ بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دوزخیوں کی جو قسمیں بیان فرمائی تھیں ان میں بخیل اور کاذب کا بھی ذکر فرمایا اور پوری عبارت کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ نے دوزخیوں کی مذکورہ قسمیں بیان فرمانے کے بعد فرمایا کہ دوزخیوں کی اور قسمیں بخیل و کاذب ہیں! رہی یہ بات کہ راوی نے ذکر البخیل والکاذب کہنے کے بجائے ذکر البخل والکذب کیوں کہا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے جو ارشاد فرمایا تھا وہ بعینہ الفاظ میں راوی کو یاد نہیں رہا تھا البتہ صحیح طور پر یہ یاد تھا کہ آپ ﷺ نے باقی دو قسموں کے سلسلے میں جو الفاظ ارشاد فرمائے تھے ان میں بخل اور کذب کا ذکر ضرور تھا خواہ آپ ﷺ نے والبخیل والکاذب ہی کے الفاظ فرمائے ہوں یا کچھ اور الفاظ فرمائے ہوں۔ اکثر روایتوں میں البخل اور الکذب کے درمیان واؤ کے بجائے او ہے یعنی البخل او الکذب اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اس موقع پر راوی کو شک واقع ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یا تو "البخل" کا لفظ ارشاد فرمایا تھا یا الکذب کا یعنی راوی گویا یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے دوزخیوں کی تین قسمیں بیان کرنے کے بعد چوتھی قسم کے طور پر یا تو بخیل کو بیان کیا تھا یا کاذب کو اور زیادہ صحیح بات بھی یہی ہے کہ یہاں حرف او ہے جو راوی کے شک کو ظاہر کرتا ہے اور جن روایتوں میں واؤ ہے ان میں بھی واؤ حرف او کے معنی میں ہے نیز لفظ والشنظیر کو بھی مرفوع قرار دینا زیادہ صحیح ہوگا اور اس کا عطف رجل پر کیا جاتا ہے جبکہ بعض حضرات نے اس کو منصوب قرار دیا ہے۔

اپنے مسلمان بھائی کے لئے اسی چیز کو اچھا سمجھو جس کو اپنے لئے اچھا سمجھتے ہو

(۱۵) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ قسم ہے اس خدا کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کوئی بندہ اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی مسلمان کے لئے وہی چیز نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں سمجھا جائے گا جب تک کہ وہ اپنے بھائی مسلمان کے لئے اس چیز کو پسند نہ کرے جس کو خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

"چیز" سے مراد دنیا و آخرت کی بھلائی ہے، چنانچہ ایک روایت میں من الخیر کا لفظ صریح طور پر منقول ہے! رہی یہ بات کہ دنیا و آخرت کی بھلائی کا تعلق کن چیزوں سے ہے تو آخرت کی بھلائی یہ ہے کہ نیک اعمال اور اچھے احوال کی سعادت نصیب ہو، خاتمہ بخیر ہو قبر کی

سختیوں قیامت کے دن کی باز پرسی اور دوزخ کے عذاب سے نجات حاصل ہو اپنے اعمال صالحہ کے سبب سے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے جنت میں اعلیٰ درجات میں اور خدا اور خدا کے رسول کی خوشنودی حاصل ہو اسی طرح دنیا کی بھلائی یہ ہے کہ عزت و آبرو اور نیک نامی و خوش حالی کی زندگی نصیب ہو مال و دولت اور اسباب راحت حاصل ہوں اچھے احوال و کردار کے حامل اہل خانہ اور صالح و فرمانبردار اولاد کی نعمت ملے اور یہ سب چیزیں آخرت کا وسیلہ بنیں جو مسلمان دنیا و آخرت کی ان نعمتوں اور بھلائیوں کو اپنے لئے چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ انہیں دنیاوی و اخروی نعمتوں اور بھلائیوں کو سارے مسلمانوں کے لئے چاہے کیونکہ یہی کمال ایمان بھی ہے اور دینی اخوت کا تقاضا بھی۔

اگر یہ کہا جائے کہ جو مسلمان محض شیطان کے فریب، نفسانی حرص اور فساد باطن کی وجہ سے اپنے لئے دنیا کے مال و زر اور دنیا کی جاہ کے طلبگار و خواہشمند ہوتے ہیں اور اس مال و جاہ کا نتیجہ گناہ و معصیت فتنہ و فساد، ظلم و جور اور آخرت کے وبال و عذاب کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ تو وہ اس مال و جاہ کی خواہش کسی دوسرے کے لئے کیسے کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو مال و زر اور جو جاہ و حشمت دین کے نقصان اور آخرت کے عذاب کا باعث ہوا تو اس کو خیر و بھلائی کے زمرہ میں شمار ہی نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ اس طرح کے مال و زر اور جاہ و حشمت کو نہ تو اپنے لئے پسند کرے اور نہ کسی دوسرے مسلمان کے لئے تاہم اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ مال و دولت اور جاہ و حشمت بجائے خود برائی نہیں ہیں اور نہ یہ ہر حالت میں برائی تک پہنچانے کا سبب بنتے ہیں بلکہ ان کے تعلق سے برائی یا بھلائی کا دارومدار خود انسان کے ذہن و مزاج اور اس کی طبعی خاصیت پر ہوتا ہے ایک شخص ایسا ہوتا ہے کہ وہ محض مال و دولت اور جاہ و حشمت کی وجہ سے نیکی و بھلائی کے بڑے سے بڑے درجہ پر پہنچ جاتا ہے اور جاہ و حشمت کا حصول ثواب آخرت اور قرب مولیٰ کا سبب بنتا ہو جیسے مال و زر کے ذریعہ حج کرنا اور فقراء و مساکین کی خبر گیری کرنا اور جاہ و حشمت کے ذریعہ عدل و انصاف قائم کرنا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری کو پورا کرنا اس کے برخلاف اگر وہی مال و دولت اور جاہ و حشمت دوسرے شخص کے لئے دینی فائدے کے بجائے نقصان کا موجب بنتا ہو۔ جیسے اس مال و جاہ کے ذریعہ فسق و فجور کا ارتکاب فتنہ و فساد اور ظلم و جور کی گرم بازاری تو اول الذکر شخص کا اس مال و جاہ کو اپنے لئے پسند کرنا اور دوسرے شخص کے لئے پسند نہ کرنا درست ہوگا کیونکہ اس مال و جاہ کو اس کے حق میں خیر نہیں کہا جائے گا۔

ہمسایہ کو تکلیف نہ پہنچاؤ

(۱۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ قِيْلَ مَنْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الَّذِیْ لَا يَأْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ قسم ہے خدا کی اس شخص کا ایمان کامل نہیں ہے، قسم ہے خدا کی اس شخص کا ایمان کامل نہیں ہے (جب آپ ﷺ نے بار بار الفاظ ارشاد فرمائے اور اس شخص کی وضاحت نہیں کی تو) صحابہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! وہ شخص کون ہے جس کا ایمان کامل نہیں ہے اور جس کے بارے میں آپ (ﷺ) کا یہ ارشاد ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا وہ شخص جس کے پڑوسی اس کی برائیوں اور اس کے شر سے محفوظ و مامون نہ ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

(۱۷) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَّا يَأْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا وہ شخص نجات یافتہ اور سابقین کے ساتھ جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ جس کے پڑوسی اس کی برائیوں اور شر سے محفوظ و مامون نہ ہوں۔" (مسلمؒ)

ہمسایہ سے اچھا سلوک اختیار کرنے کی اہمیت

(۱۸) وَعَنْ عَائِشَةَ وَابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا زَالَ جِبْرَئِيْلُ يُوْصِيْنِيْ بِالْجَارِ حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّهٗ سَيُوَرِّثُهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا حضرت جبرئیل علیہ السلام ہمیشہ مجھ کو ہمسایہ کے حق کا لحاظ رکھنے کا حکم دیا کرتے تھے یہاں تک کہ مجھے خیال ہوا کہ حضرت جبرئیل حکم الٰہی کے مطابق بذریعہ وحی عنقریب ہی پڑوسیوں کو ایک دوسرے کا وارث قرار دیں گے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث سے ہمسایہ کے حقوق یعنی پڑوسیوں کے ساتھ احسان و نیک سلوک کرنے اس کے دکھ درد کو بانٹنے اور اس کو کسی قسم کی تکلیف و پریشانی میں مبتلا نہ کرنے کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے چنانچہ حضرت جبرئیل اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت ﷺ کو جس تو اتر اور پابندی کے ساتھ حکم دیتے تھے۔ اس سے آنحضرت ﷺ نے یہ خیال قائم کر لیا تھا کہ حضرت جبرئیل شاید کسی قریبی وقت میں یہ وحی لے کر نازل ہوں کہ پڑوسی آپس میں ایک دوسرے کے وارث قرار دیئے جاتے ہیں۔

تیسرے شخص کی موجودگی میں دو شخص آپس میں سرگوشی نہ کریں

(۱۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كُنْتُمْ ثَلٰثَةً فَلَا يَتَنَاجٰى اثْنَانِ دُوْنَ الْاٰخَرِ حَتّٰى تَخْتَلِطُوْا بِالنَّاسِ مِنْ اَجْلِ اَنْ يُحْزِنَهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اگر تم تین آدمی یکجا ہو تو دو آدمی اس طرح سرگوشی نہ کریں کہ وہ تیسرا شخص نہ سن سکے یہاں تک کہ وہ بہت سے آدمیوں میں مل جائیں اور یہ (ممانعت) اس وجہ سے ہے کہ ان دونوں کا یہ فعل (یعنی آپس میں سرگوشی کرنا) اس (تیسرے آدمی) کو رنجیدہ کرے گا (یعنی جب وہ اپنے سامنے ان لوگوں کو سرگوشی کرتے دیکھے گا تو خیال کرے گا کہ یہ دونوں شاید میری برائی کر رہے ہیں یا میرے خلاف کوئی مشورہ کر رہے ہیں۔)" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر تین آدمی ایک ساتھ مثلاً کہیں بیٹھے ہوئے ہیں تو ان میں سے کسی بھی دو آدمیوں کے لئے یہ روا نہیں ہے کہ وہ آپس میں اس طرح سرگوشی اور کانا پھوسی کرنے لگیں کہ ان میں کا تیسرا آدمی ان کی بات کو سننے نہ پائے، ہاں اگر کسی جگہ چار آدمی ایک ساتھ بیٹھے ہوئے ہوں اور ان میں سے دو آدمی آپس میں سرگوشی کرنے لگیں تو ان دونوں کی سرگوشی پر مذکورہ ممانعت کا اطلاق نہیں ہو گا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ تیسرے آدمی کی موجودگی میں دو آدمیوں کے آپس میں سرگوشی کرنے یا اسی طرح چوتھے آدمی کی موجودگی میں تین آدمیوں کے آپس میں سرگوشی کرنے کی مذکورہ بالا ممانعت نہی تحریمی کے طور پر ہے لہٰذا دو آدمی ہوں یا تین چار ہوں یا پورا مجمع ہو ان کے لئے یہ حرام ہے کہ وہ ایک آدمی کو چھوڑ کر باقی سب آپس میں سرگوشی اور کانا پھوسی کریں ہاں اگر اس ایک آدمی سے پوچھنے کے بعد اور اس کی اجازت کی صورت میں سرگوشی کریں تو کوئی مضائقہ نہیں، حضرت ابن عمرؓ حضرت امام مالکؒ، شوافع اور جمہور علماء کا یہی مسلک ہے اور اس حکم کا تعلق ہر موقع و ہر زمانہ سے ہے خواہ سفر ہو یا حضر ہو۔

خیر خواہی کی اہمیت و فضیلت

(۲۰) وَعَنْ تَمِيْمِ نِ الدَّارِيِّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ ثَلٰثًا قُلْنَا لِمَنْ قَالَ لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت تمیم داریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ دین نصیحت ہے (یعنی نصیحت اور خیر خواہی اعمال دین میں سے افضل

ترین عمل ہے یا نصیحت اور خیر خواہی دین کا ایک مہتم بالشان نصب العین ہے) حضور ﷺ نے یہ بات (کہ دین نصیحت ہے) تین بار فرمائی! ہم نے (یعنی صحابہؓ نے) پوچھا کہ یہ نصیحت اور خیر خواہی کس کے لئے ہے اور کس کے حق میں کرنی چاہئے؟ حضور ﷺ نے فرمایا خدا کے لئے، خدا کی کتاب کے لئے، مسلمانوں کے اماموں (یعنی اسلامی حکومت کے سربراہوں اور علماء) کے لئے اور تمام مسلمانوں کے لئے۔" (مسلمؒ)

تشریح: خدا کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ذات و صفات پر ایمان لائے اس کی واحدانیت و حاکمیت کا اعتقاد رکھے، اس کی صفات و کار سازی میں کسی غیر کو شریک کرنے سے اجتناب کرے اس کی عبادت اخلاص نیت کے ساتھ کرے اس کے اوامر و نواہی کی اطاعت و فرمانبرداری کرے اس کی نعمتوں کا اقرار و اعتراف کرے اور اس کا شکر ادا کرے اس کے نیک اور فرمانبردار بندوں سے محبت رکھے اور بدکار و سرکش بندوں سے نفرت کرے۔

خدا کی کتاب کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کا عقیدہ رکھے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اس میں جو کچھ لکھا ہے اس پر ہر حالت میں عمل کرے تجوید و ترتیل اور غور و فکر کے ساتھ اس کی تلاوت کرے اور اس کی تعظیم و احترام میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔

خدا کے رسول ﷺ کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کی سچے دل سے تصدیق کرلے کہ وہ رسول (ﷺ) اور اس کے پیغمبر ہیں ان کی نبوت پر ایمان لائے وہ اللہ کی طرف سے جو پیغام پہنچائیں اور جو احکام دین ان کو قبول کرے اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرے ان کو اپنی جان اپنی آل اولاد اپنے ماں باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ عزیز و محبوب رکھے ان کے اہل بیت اور ان کے صحابہؓ سے محبت رکھے اور ان کی سُنّت پر عمل کرے۔

مسلمانوں کے اماموں کے حق میں خیر خواہی یہ ہے کہ جو شخص اسلامی حکومت کی سربراہی کر رہا ہو اس کے ساتھ وفاداری کو قائم رکھے، احکام و قوانین کی بیجا طور پر خلاف ورزی کر کے ان کے نظم حکومت میں خلل و ابتری پیدا نہ کرے اچھی باتوں میں ان کی پیروی کرے اور بری باتوں میں ان کی اطاعت سے اجتناب کرے اگر وہ اسلام اور اپنے عوام کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت و کوتاہی کا شکار ہوں تو ان کو مناسب اور جائز طریقوں سے متنبّہ کرے اور ان کے خلاف بغاوت کا علم بلند نہ کرے اگرچہ وہ کوئی ظلم ہی کیوں نہ کریں! علماء کو جو مسلمانوں کے علمی و دینی رہنما ہوتے ہیں ان کی عزت و احترام کرے، شرعی احکام اور دینی مسائل میں وہ قرآن و سُنّت کے مطابق جو کچھ کہیں اس کو قبول کرے اور اس پر عمل کرے ان کی اچھی باتوں اور ان کے نیک اعمال کی پیروی کرے۔

اور تمام مسلمانوں کے حق میں خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ ان کی دینی و دنیاوی خیر و بھلائی کا طالب رہے ان کو دین کی تبلیغ کرے ان کو دنیا کے اس راستہ پر چلانے کی کوشش کرے اور ان کو کسی بھی طرح نقصان پہنچانے کی بجائے نفع پہنچانے کی سعی کرے۔

واضح رہے کہ یہ حدیث بھی "جوامع الکلم" میں سے ہے، اس کے مختصر الفاظ حقیقت میں دین و دنیا کی تمام بھلائیوں اور سعادتوں پر حاوی ہیں اور تمام علوم اولین و آخرین اس چھوٹی سی حدیث میں مندرج ہیں۔

(۲۱) وَعَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ بَايَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جریر ابن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے اس بات پر بیعت کی کہ پابندی کے ساتھ نماز پڑھوں گا زکوٰۃ ادا کروں گا اور ہر مسلمان کے حق میں خیر خواہی کروں گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اللہ تعالیٰ کی تمام تر عبادات و طاعت کا تعلق دو ہی چیزوں سے ہے ایک تو حقوق اللہ، دوسرے حقوق العباد، لہٰذا حضرت جریرؓ نے حقوق اللہ میں خاص طور پر ان عبادات کا ذکر کیا جو تمام بدنی اور مالی عبادتوں میں شہادت کے بعد سب سے اعلیٰ و افضل ہیں اور

ارکان اسلام میں سے اہم ترین رکن ہیں یعنی نماز اور زکوٰۃ جہاں تک روزہ اور حج کا تعلق ہے تو ہو سکتا ہے کہ جس وقت حضرت جریرؓ نے بیعت کی ہو اس وقت تک یہ دونوں روزہ اور حج مسلمانوں پر فرض نہ قرار دیئے گئے ہوں! اسی طرح حقوق العباد سے متعلق اس چیز کو ذکر کیا جس کے دائرے میں بندوں کے تمام حقوق آجاتے ہیں یعنی خیر خواہی۔

انہی حضرت جریرؓ کا ایک واقعہ اس موقع کے نہایت مطابق ہے اور جس سے ان کی مذکورہ بالا بیعت کا ایک عملی نمونہ سامنے آتا ہے منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جریرؓ نے ایک گھوڑا تین سو درہم کے عوض خرید کیا، انہوں نے بیچنے والے سے کہا کہ تمہارا یہ گھوڑا تو تین سو درہم سے زیادہ قیمت کا ہے کیا تم اس کی قیمت چار سو درہم لوگے؟ اس نے کہا ابن عبداللہ! یہ تمہاری مرضی پر موقوف ہے! انہوں نے کہا کہ یہ گھوڑا تو چار سو درہم سے بھی زائد کا معلوم ہوتا ہے کیا تم اس کی قیمت پانچ سو درہم لینا پسند کرو گے؟ وہ اسی طرح اس کی قیمت سو سو درہم بڑھاتے گئے اور آخر کار انہوں نے اس گھوڑے کی قیمت میں آٹھ سو درہم ادا کئے جب لوگوں نے ان سے گھوڑے کی قیمت بڑھانے کا سبب پوچھا تو انہوں نے فرمایا اصل بات یہ ہے کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے یہ بیعت کی تھی کہ ہر مسلمان سے خیر خواہی کروں گا (چنانچہ جب میں نے دیکھا کہ اس گھوڑے کا مالک وہ قیمت طلب نہیں کر رہا ہے جو حقیقت میں ہونی چاہئے تو میں نے اس کی خیر خواہی کے پیش نظر اس کو زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کی۔)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

بدبخت کا دل رحم وشفقت کے جذبہ سے خالی ہوتا ہے

(۲۲) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا الْقَاسِمِ الصَّادِقَ الْمَصْدُوْقَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا تُنْزَعُ الرَّحْمَةُ اِلَّا مِنْ شَقِیٍّ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں ابوالقاسم ﷺ کو جو صادق ومصدوق ہیں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ رحمت یعنی مخلوق خدا پر رحم وشفقت کرنے کے جذبہ کو کسی کے دل سے نہیں نکالا جاتا مگر بدبخت کے دل کو اس جذبہ سے خالی کر دیا جاتا ہے۔" (احمدؒ وترمذیؒ)

تشریح: "صادق" کے معنی ہیں وہ شخص اپنی باتوں میں سچا ہے اور مصدوق کے معنی ہیں وہ شخص جس کو لوگوں نے سچا تسلیم کر لیا ہے یا جس کے سچا ہونے کی خبر خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے یہ دونوں لقب آنحضرت ﷺ کی صفت ہیں چنانچہ آپ ﷺ نہ صرف یہ کہ سچے تھے۔ اور دنیا نے آپ ﷺ کو سچا تسلیم کیا بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سچا ہونے کی خبر دی کہ فرمایا وما ینطق عن الھوی۔

بدبخت سے مراد کافر ہے یا فاجر! اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ کافر اپنے کفر یا فاسق اپنے فسق وفجور کی وجہ سے اپنے دل کو اتنا سخت بنا لیتا ہے کہ اس کے اندر سے وہ انسانی جذبہ بھی ختم ہو جاتا ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان پر رحم وشفقت کرنے پر مائل کرتا ہے۔

تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا

(۲۳) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ مخلوق خدا پر رحم وشفقت کرنے والوں پر رحمٰن کی رحمت نازل ہوتی ہے لہٰذا تم زمین والوں پر رحم وشفقت کرو تاکہ تم پر وہ رحم کرے جو آسمان میں ہے۔" (ابوداؤدؒ وترمذیؒ)

تشریح: "زمین والوں میں" سارے جاندار داخل ہیں خواہ وہ حیوان ہوں یا انسان اور انسان بھی خواہ نیک ہوں یا بد البتہ بد لوگوں پر رحم وشفقت کرنے کی صورت یہ ہے کہ ان کو ان کی بدی اور برائی سے روکا جائے جیسا کہ اس حدیث کہ اپنے بھائی کی مدد کر خواہ وہ ظالم ہو یا

مظلوم کی تشریح میں بتایا گیا تھا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے باز رکھا جائے یا یہ کہ زمین والوں پر رحم و شفقت کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں پر رحم و شفقت کرو جو اس کے مستحق ہوں۔

جو آسمان میں ہے سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس کا کمال قدرت اور جس کی سلطنت آسمان میں ہے یا اس سے مراد ملائکہ ہیں، اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ تم زمین پر رہنے والوں پر رحم و شفقت کرو تا کہ آسمانوں میں رہنے والے یعنی ملائکہ کا رحم تم پر ہو اور تمہارے حق میں ان کا رحم یہ ہے کہ وہ تمہارے دشمنوں اور ایذاء پہنچانے والی مخلوق جیسے جنات و شیاطین اور شریر انسانوں سے تمہاری حفاظت کریں اور بارگاہ کبریائی میں تمہارے لئے دعا و استغفار اور طلب رحمت کریں۔

جو شخص اپنے چھوٹوں پر شفقت اور اپنے بڑوں کا احترام نہ کرے وہ متبعین رسول میں نہیں ہے

(۲۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا وَيَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ وہ شخص ہماری اتباع کرنے والوں میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹوں پر رحم و شفقت نہ کرے ہمارے بڑوں کا جو خواہ جوان ہوں یا بوڑھے احترام ملحوظ نہ رکھے، نیکی و بھلائی کا حکم نہ دے اور بدی و برائی سے منع نہ کرے اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

اپنی تعظیم کرانا چاہتے ہو تو اپنے بڑوں کی تعظیم کرو

(۲۵) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَكْرَمَ شَابٌّ شَيْخًا مِنْ اَجْلِ سِنِّهٖ اِلَّا قَيَّضَ اللّٰهُ لَهٗ عِنْدَ سِنِّهٖ مَنْ يُكْرِمُهٗ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو بھی جوان کسی بوڑھے شخص کی اس کے بڑھاپے کے سبب تعظیم و تکریم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بڑھاپے کے وقت کسی ایسے شخص کو متعین کو دیتا ہے جو اس کی تعظیم و خدمت کرتا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث کے ذریعہ گویا اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ جو شخص دوسروں کی تعظیم و خدمت کرتا ہے تو اس کی بھی تعظیم و خدمت کی جاتی ہے اور جو لوگ اپنے بزرگوں کی تعظیم و خدمت نہیں کرتے اور اپنے بڑے بوڑھوں کی تحقیر کرتے ہیں وہ اپنے بڑھاپے میں اپنے چھوٹوں کی طرف سے اسی تحقیر و تذلیل اور بے وقعتی سے دوچار ہوتے ہیں۔

اس ارشاد گرامی میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس جوان کی عمر دراز ہوتی ہے جو اپنے بڑے بوڑھوں کی تعظیم و خدمت کرتا ہے۔

منقول ہے کہ ایک بزرگ تھے جو مصر میں سکونت پزیر تھے اور ان کا ایک مرید تھا جو خراسان میں رہتا تھا ایک مرتبہ وہ مرید اپنے شیخ کے پاس کچھ دن رہنے کے لئے خراسان سے چل کر مصر پہنچا اور وہاں ایک طویل مدت تک شیخ کی خدمت میں رہا انہی دنوں کچھ دوسرے بزرگوں کی جماعت اس کے شیخ کی زیارت کے لئے آئی تو شیخ نے اس مرید سے اشارہ کیا کہ ان بزرگوں کی سواری کے جانور تھام لو وہ ان کے پاس سے چلا گیا اور ان جانوروں کی نگرانی کرنے لگا۔ مگر اس کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ میں جو اتنی دور دراز کا سفر طے کر کے شیخ کی خدمت میں آیا تھا یہ اس کا نتیجہ ہے! بہر حال جب وہ بزرگ ان شیخ کے پاس سے چلے گئے اور وہ مرید اپنے پیر کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے کہا کہ عزیز من! اس وقت میں نے تمہیں ان بزرگوں کی سواری کے جانوروں کی دیکھ بھال پر جو متعین کیا تھا۔ تو اس کی وجہ نہ معلوم تمہارے دل میں کیا وسوسہ پیدا ہو گا لیکن اتنی بات یاد رکھو کہ تمہیں اس خدمت کا بہت بڑا اجر ملے گا اور عنقریب اللہ تعالیٰ تمہیں اس درجہ پر پہنچائے گا کہ تمہاری خدمت میں بڑے بڑے بزرگ اور اکابر آئیں گے اور پھر خدا کی طرف سے تمہارے پاس ایسے لوگ

مقرر کئے جائیں گے جو ان آنے والوں کی خدمت کریں گے، چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان شیخ نے جو کہا تھا وہ صحیح ثابت ہوا اور اس شخص کی ملاقات کے لئے آنے والے بڑے بڑے بزرگوں کی کثرت کی وجہ سے ہمیشہ اس کے دروازے پر خچر اور گھوڑوں کا ایک ہجوم رہا کرتا تھا۔

خود اس حدیث کے راوی حضرت انسؓ رسول خدا کی خدمت کے سلسلے میں دین و دنیا کے بڑے بڑے اجر و انعام سے نوازے گئے چنانچہ جب وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تو اس وقت ان کی عمر صرف دس سال تھی اور جب تک آنحضرت ﷺ اس دنیا میں تشریف فرما رہے ان کی زندگی کا سارا وقت حضور ﷺ کی خدمت ہی میں صرف ہوتا رہا اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک بڑی نعمت تو یہ عطا کی کہ ان کی حیات بہت طویل ہوئی اور وہ تقریباً ایک سو تین سال تک نہایت پاکیزہ اور اچھے احوال اور اطمینان و سکون کے ساتھ اس دنیا میں رہے اللہ تعالیٰ نے ان کو مال و دولت کی فراوانی سے بھی نوازا اور کثیر اولاد کی نعمت سے بھی سرفراز کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ایک سو لڑکے تھے۔

عالم حافظ اور عادل بادشاہ کی تعظیم ہے

(۲۶) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اِجْلَالِ اللّٰہِ اِکْرَامُ ذِی الشَّیْبَۃِ الْمُسْلِمِ وَحَامِلِ الْقُرْاٰنِ غَیْرَ الْغَالِیْ فِیْہِ وَلَا الْجَافِیْ عَنْہُ وَاِکْرَامُ السُّلْطَانِ الْمُقْسِطِ۔ (رواہ ابوداؤد والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا بوڑھے مسلمان کی عزت و توقیر کرنا، حامل قرآن یعنی حافظ و مفسر اور قرآن خوان کا احترام و اکرام کرنا جبکہ وہ قرآن میں زیادتی کرنے والا اور اس سے ہٹ جانے والا نہ ہو اور عادل بادشاہ کی تعظیم کرنی منجملہ خداوندی تعظیم کے ہے۔" (ابوداؤدؒ و بیہقیؒ)

تشریح: اس حدیث کے ذریعہ مذکورہ لوگوں کی تعظیم و توقیر کی اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی شان میں بے ادبی گستاخی کرنا اور خدا کی تعظیم کے منافی عمل کرنا ہے۔

حامل قرآن — یعنی حافظ، مفسر اور قرآن خواں — کی تعظیم کو اس امر کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے کہ نہ تو غلو کرنے والا ہو اور نہ قرآن پڑھنے پڑھانے کو ترک کرنے والا ہو، بلکہ اعتدال و میانہ روی کو اختیار کرنے والا ہو جیسا کہ تمام عبادات میں آنحضرت ﷺ کی عادت شریفہ تھی چنانچہ غلو نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ریا کاروں کی طرح الفاظ کی تجوید اور حسن قرات و صوت میں حد سے تجاوز نہ کیا جائے تلاوت اس قدر تیز نہ کی جائے کہ نہ تو الفاظ صحیح طور پر ادا ہوں اور نہ معنی سمجھ میں آئیں قرآن کے الفاظ و حروف میں تحریف کے ذریعہ خیانت کا ارتکاب نہ کیا جائے اور نہ غلط سلط تاویلات اور فاسد عقائد و نظریات کے ذریعے اس کے معنی و مفہوم میں حذف و اضافہ اور ترمیم و تبدیلی کی جائے جیسا کہ اکثر اور فاسد ذہن و فکر کے حامل لوگوں کا شیوہ ہے اور نہ قرآن کے احکام و ہدایات کے بارے میں شکوک و شبہات اور وسوسے پیدا کئے جائیں اسی طرح قرآن سے نہ ہٹنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت کو ترک نہ کیا جائے تجوید و قرآت کے آداب و قواعد سے اعراض نہ کیا جائے اور قرآن نے جو احکام و ہدایات اور مسائل بیان کئے ہیں ان پر عمل کرنے سے گریز نہ کیا جائے۔

بعض حضرات نے غالی (قرآن میں غلو کرنے والا) اس شخص کو قرار دیا ہے جو تعلیم و تدریس، تبلیغ و اصلاح، ذکر و فکر اور عبادات سے بالکل بے پروا ہو کر صرف تلاوت قرآن میں مشغول و مصروف رہے اسی طرح جافی (قرآن سے ہٹنے والا) اس شخص کو قرار دیا ہے جو تلاوت قرآن سے بالکل بے پرواہ اور گریزاں اور دوسری چیزوں میں مشغول رہے۔

"عادل بادشاہ" سے مراد وہ حاکم و سربراہ ہے جو حقیقی معنی میں عدل کا پیکر ہو اور اپنے عوام پر ظلم و جور کو گوارا نہ کرتا ہو اور اس کا کوئی فیصلہ اور کوئی عمل عدل و انصاف کے منافی نہ ہو اور یہ اعلیٰ درجہ ہے اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس کا عدل اس کے ظلم پر غالب ہو، اس

کے ظلم پر غالب ہو اس کے برخلاف اگر اس کا ظلم اس کے عدل پر غالب ہو تو اس کو عادل نہیں کہیں گے اور ایسے بادشاہ حاکم سے دور رہنا ہی افضل ہو گا واضح رہے کہ اس دور کے اکثر حاکموں اور سربراہوں کے احوال ان کی حکومتی کاروائیاں اور ان کے نظم حکومت کے دیکھتے ہوئے ان کو ادنی درجہ کا عادل کہنا بھی بڑا مشکل ہے ان کی طرف سے اپنے عوام پر جو قوانین نافذ کئے جاتے ہیں اور جس طور پر ان کے کارندے عوام کے ساتھ سلوک کرتے ہیں ان کو اگر حقیقت کے آئینے میں دیکھا جائے تو عدل و انصاف سرنگوں اور ظلم وزیادتی کا غلبہ نظر آئے گا یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے یہاں تک کہدیا ہے کہ جو شخص موجودہ زمانہ میں کسی بادشاہ وحاکم کو "عادل" کہے گا وہ کفر کی حد میں داخل ہو جائے گا اگرچہ ہر بادشاہ حاکم کو کسی نہ کسی طرح کے عدل سے بالکل خالی نہیں کہا جاسکتا دراصل اس قول کی بنیاد ایک لطیف نکتہ پر ہے اور وہ یہ کہ کسی شخص کا عدل کرنا اور کسی شخص کا عادل ہونا ان دونوں کے درمیان فرق ہے اگر یہ کہا جائے کہ زید عدل کرتا ہے تو اس کے کہنے کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہوگا کہ زید عادل ہے کیونکہ عدل کرنے کا اطلاق اس شخص پر بھی ہو سکتا ہے جو اگرچہ گاہے بگاہے عدل کرتا ہو جب کہ "عادل" کا اطلاق صرف اسی شخص پر ہوتا ہے جو صفت عدل کے ساتھ دوامی طور پر موصوف ہو اس کو مثال کے طور یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر اس طرح کہا جائے کہ زید نمازی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زید پابندی کے ساتھ ایک ایک وقت کی نماز پڑھتا ہے اور کبھی بھی اس کی کوئی نماز ترک یا قضا نہیں ہوتی جب کہ اگر یوں کہا جائے کہ زید نماز پڑھتا ہے تو اس کا مفہوم بالکل دوسرا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ زید بھی نماز پڑھتا ہے اگرچہ پابندی کے ساتھ نہیں بلکہ کبھی کبھی پڑھتا ہو۔ لہٰذا لفظ "عادل" اپنے جس وسیع اور اہم مفہوم کو ادا کرتا ہے اس کی بنیاد پر اس لفظ کا اطلاق نہ تو اس دور کے کسی بادشاہ وحاکم پر ہو سکتا ہے اور نہ اس دور کے کسی بھی بادشاہ وحاکم کو عادل کہنے کی اجازت ہے۔

مذکورہ بالا حدیث میں تین طرح کے لوگوں کی توقیر و تعظیم کرنے کے حکم کا ذکر ہے اور شرح السنہ میں حضرت طاؤس سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ یہ مسنون ہے کہ تم چار آدمیوں کی تعظیم و توقیر کرو ایک تو عالم کی، دوسرے بوڑھے شخص کی تیسرے سلطان و بادشاہ کی اور چوتھے باپ کی۔ ملا علی قاری نے اس قول کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ باپ کے حکم میں ماں بھی داخل ہے اور عالم سے مراد عالم باعمل ہے جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث میں باپ کا ذکر نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اول تو باپ کا معاملہ بالکل ظاہر ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ باپ کی تعظیم کرنی چاہئے دوسرے یہ کہ مستحق تعظیم قرار دینے کی زیادہ ضرورت انہی لوگوں کے حق میں ہے جو اجنبی ہوں اور جن سے کوئی قرابتی تعلق نہ ہو کیوں کہ قرابت کا تعلق بجائے خود ایک انسان کو دوسرے انسان کی تعظیم و توقیر کرنے پر مائل کرتا ہے لہٰذا اگر شخص کا باپ بوڑھا بھی ہو حامل قرآن یعنی حافظ و عالم باعمل بھی ہو اور سلطان و حاکم بھی ہو اور اس کا سلطان و حاکم ہونا خواہ اپنے ظاہری منصب کے اعتبار سے ہو یا باطنی و روحانی طور پر تو اس صورت میں اس شخص کو اپنے باپ کی بہت زیادہ تعظیم و توقیر کرنی چاہئے کیونکہ اس کی ذات میں وہ کئی خصوصیات جمع ہیں جو تعظیم و توقیر کو واجب کرتی ہیں۔

اس حدیث میں مذکورہ لوگوں کی تعظیم کو منجملہ تعظیم خداوندی قرار دیا گیا ہے جب کہ ایک روایت کے مطابق اس تعظیم و توقیر کو آنحضرت ﷺ نے خود اپنی بھی تعظیم و توقیر کے مترادف قرار دیا ہے چنانچہ خطیب نے اپنی جامع میں حضرت انس سے نقل کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اِنَّ مِنْ اِجْلَالِیْ تَوْقِیْرُ الشَّیْخِ مِنْ اُمَّتِیْ یعنی اس بوڑھے شخص کی توقیر و تعظیم کرنا جو میری اُمّت میں سے ہو، منجملہ میری توقیر و تعظیم کے ہے۔

یتیم کے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت

(۲۷) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَیْرُ بَیْتٍ فِی الْمُسْلِمِیْنَ بَیْتٌ فِیْهِ یَتِیْمٌ یُحْسَنُ اِلَیْهِ وَ شَرُّ بَیْتٍ فِی الْمُسْلِمِیْنَ بَیْتٌ فِیْهِ یَتِیْمٌ یُسَآءُ اِلَیْهِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مسلمانوں کے گھروں میں بہترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور مسلمانوں کے گھروں میں بدترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ برا سلوک کیا جائے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: یتیم کے ساتھ برے سلوک کا مطلب یہ ہے کہ اس گھر کے افراد اس کی ضروریات زندگی کی کفالت میں غفلت و کوتاہی برتیں اس کے ایسا برتاؤ کریں کہ جس سے اس کو اپنی کمتری و بے چارگی کا احساس ہو اور اس کو ناحق مارا پیٹا جائے اور تکلیف پہنچائی جائے ہاں اس کو تعلیم و تربیت کے طور پر مارنا یا کوئی اور سزا دینا برے سلوک میں شمار نہیں ہوگا بلکہ اس کو احسان و حسن سلوک ہی میں شمار کیا جائے گا۔

(۲۸) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ مَسَحَ رَأْسَ یَتِیْمٍ لَمْ یَمْسَحْہُ اِلَّا لِلّٰہِ کَانَ لَہٗ بِکُلِّ شَعْرَةٍ تَمُرُّ عَلَیْہَا یَدُہٗ حَسَنَاتٌ وَمَنْ اَحْسَنَ اِلٰی یَتِیْمَةٍ اَوْیَتِیْمٍ عِنْدَہٗ کُنْتُ اَنَا وَھُوَفِی الْجَنَّةِ کَھَاتَیْنِ وَقَرَنَ بَیْنَ اِصْبَعَیْہِ۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی اور غرض و جذبہ کے تحت نہیں بلکہ) محض خدا کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کسی یتیم بچے (لڑکے یا لڑکی) کے سر پر (پیار و محبت اور شفقت کے ساتھ) ہاتھ پھیرے تو اس کے لئے یتیم کے سر پر اس بال کے عوض کہ جس پر اس کا ہاتھ لگا ہے، نیکیاں لکھی جاتی ہیں نیز جو شخص اس یتیم لڑکے یا یتیم لڑکی کے ساتھ جو اس کی پرورش و تربیت میں ہو اچھا سلوک کرے (اور وہ یتیم خواہ اپنا قرابتدار ہو یا بیگانہ) تو وہ شخص اور میں جنت میں اس طرح ہوں گے اور یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنی دونوں انگلیوں کو ملایا یعنی انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی کو ملا کر دکھایا کہ جس طرح یہ دونوں انگلیاں ایک دوسرے کے قریب ہیں اسی طرح میں اور وہ شخص جنت میں ایک دوسرے کے قریب ہوں گے۔" اس روایت کو احمدؒ و ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: لفظ "تمر" اگر تاء کے زبر اور میم کے پیش کے ساتھ یعنی مونث کا صیغہ ہو تو اس کا ترجمہ وہی ہوگا جو اوپر نقل کیا گیا اور اگر یہ لفظ یاء کے پیش اور میم کے زیر کے ساتھ یعنی "یمر" بصیغہ مذکر ہو تو اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ (ہر اس بال کے عوض کہ) جس پر وہ شخص اپنا ہاتھ پھیرتا ہے مطلب کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے حسنات کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ نیکیاں کمیت و کیفیت کے اعتبار سے مختلف درجہ کی ہوتی ہیں اور یہ فرق و اختلاف حسن نیت کے مدار پر مبنی ہوتا ہے۔

"اچھا سلوک کرے" کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ شفقت و مہربانی کا برتاؤ کرے اس کی تعلیم و تربیت پر توجہ دے جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو اس کا نکاح کرے۔ اور اگر اس کا مال وغیرہ اپنے پاس رکھا ہوا ہو تو اس کی محافظت کرے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے یَتِیْمَةٍ اَوْیَتِیْمٍ میں حرف اَوْ تنویع کے لئے ہے۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ حرف اَوْ شک کو ظاہر کرتا ہے یعنی اس موقع پر کسی راوی کو شک واقع ہوا ہے کہ یہاں آنحضرت ﷺ نے یَتِیْمَةٍ کا لفظ ارشاد فرمایا تھا یا یَتِیْمٍ کا۔

حدیث میں یتیم کی پرورش و تربیت کرنے اور اس کے ساتھ اچھا سلوک اختیار کرنے والے کے بارے میں جن الفاظ کے ذریعہ تحسین فرمائی گئی ہے ان میں اس شخص کے لئے حسن خاتمہ کی بشارت ہے۔

بہن بیٹی کی پرورش کرنے کی فضیلت

(۲۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اٰوٰی یَتِیْمًا اِلٰی طَعَامِہٖ وَشَرَابِہٖ اَوْجَبَ اللّٰہُ لَہُ الْجَنَّةَ اَلْبَتَّةَ اِلَّا اَنْ یَّعْمَلَ ذَنْبًا لَا یُغْفَرُ وَمَنْ عَالَ ثَلٰثَ بَنَاتٍ اَوْ مِثْلَھُنَّ مِنَ الْاَخَوَاتِ فَاَدَّبَھُنَّ وَرَحِمَھُنَّ حَتّٰی یُغْنِیَھُنَّ اللّٰہُ اَوْجَبَ اللّٰہُ لَہُ الْجَنَّةَ فَقَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَوِ اثْنَتَیْنِ قَالَ اَوِ اثْنَتَیْنِ حَتّٰی لَوْ قَالُوْا اَوْ وَاحِدَةً لَقَالَ وَاحِدَةً وَمَنْ

اَذْهَبَ اللّٰهُ بِكَرِيْمَتِهٖ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا كَرِيْمَتَاهُ قَالَ عَيْنَاهُ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے کھانے پینے میں کسی یتیم کو شریک کرے تو اللہ تعالیٰ (اپنے وعدے کے مطابق) اس شخص کو بلاشک وشبہ جنت کا مستحق گردانتا ہے الایہ کہ وہ کوئی ایسا گناہ کرے جو بخشے جانے کے قابل نہ ہو اور جو شخص تین بیٹیوں یا ان ہی کی طرح تین بہنوں کی پرورش کرے اور پھر ان کی تربیت کرے اور ان کے ساتھ پیار وشفقت کا برتاؤ کرے یہاں تک کہ اللہ ان کو بے پرواہ بنادے (یعنی وہ بڑی ہو جائیں اور بیاہ دی جائیں) تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کا مستحق گردانتا ہے" یہ سن کر ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ کیا دو بیٹیوں یا دو بہنوں کی پرورش کرنے پر بھی یہ اجر ملتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "ہاں دو پر بھی یہ اجر ملتا ہے" (راوی کہتے ہیں) اگر صحابہؓ ایک بیٹی یا ایک بہن کے بارے میں بھی سوال کرتے تو آپ ﷺ یہی جواب دیتے کہ ہاں ایک پر بھی یہی اجر ملتا ہے (پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ جس شخص کی دو پیاری چیزیں لے لے وہ بھی جنت کا مستحق گردانا جاتا ہے" پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) ! دو پیاری چیزوں سے کیا مراد ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی دونوں آنکھیں۔" (شرح السنۃ)

تشریح: جو گناہ بخشے جانے کے قابل نہ ہو اس سے مراد شرک اور حقوق العباد ہیں! گویا آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ شخص کسی ایسے گناہ کا مرتکب ہو جو توبہ واستغفار وغیرہ کے بغیر بخشا نہیں جاتا تو اس کو جنت کا مستحق نہیں گردانا جائے گا۔ اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے، کہ وہ تمام گناہ کہ جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے حق سے ہے بخشدیئے جاتے ہیں مگر شرک کے گناہ کو نہیں بخشا جاتا۔

"اگر صحابہؓ ایک بیٹی یا ایک بہن کے بارے میں سوال کرتے" یہ بات اس راجح ومختار مسلک کی روشنی میں تو بالکل واضح ہے جس میں اس امر کو تسلیم کیا گیا ہے کہ احکام شرعیہ کا نفاذ آنحضرت ﷺ کی صوابدید پر ہے کہ آپ ﷺ جس طرح چاہیں نافذ فرمائیں اور جس کو چاہیں مقید ومستثنیٰ قرار دیں، لیکن جو حضرات اس قول کو تسلیم نہیں کرتے وہ مذکورہ عبارت کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے صحابہؓ کے مذکورہ جواب میں جوبات فرمائی وہ وحی الٰہی کی بنیاد پر تھی کہ سائلین نے اپنے سوال کے ذریعہ گویا اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ جو ثواب تین بیٹیوں یا تین بہنوں کی پرورش وتربیت کرنے پر ملتی ہے کاش وہی ثواب دو بیٹیوں یا دو بہنوں کی پرورش وتربیت کی صورت میں بھی ملے، چنانچہ حق تعالیٰ نے ان کی اس خواہش کے مطابق وحی نازل فرمائی اور حضور ﷺ نے اس کو بیان فرمایا، جیسا کہ اور بہت سی حدیثوں میں بھی اسی طرح کی صورت حال منقول ہے۔

بچوں کی صحیح تربیت وتادیب کی اہمیت

(۳۰) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاَنْ يُؤَدِّبَ الرَّجُلُ وَلَدَهُ خَيْرٌ لَّهُ مِنْ اَنْ يَّتَصَدَّقَ بِصَاعٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَنَاصِحُ الرَّاوِيْ لَيْسَ عِنْدَ اَصْحَابِ الْحَدِيْثِ بِالْقَوِيِّ۔

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "بخدا انسان کا اپنے بیٹے کو ادب کی ایک بات سکھانا، ایک صاع غلہ خیرات کرنے سے بہتر ہے" ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کے راوی ناصحؒ محدثین کے نزدیک (حفظ وضبط کے اعتبار سے) قوی یعنی قابل اعتماد نہیں ہے۔"

تشریح: "ادب" سے شرعی تربیت وتادیب مراد ہے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شریعت کی نظر میں بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت کی بہت زیادہ اہمیت ہے لہٰذا یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کو صحیح تعلیم وتربیت سے بہرہ مند کریں اور صحیح تعلیم وتربیت وہی ہے جو دینی تعلیم، اسلامی اخلاق اور شرعی آداب وقواعد پر مشتمل ہو۔

ترمذیؒ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے لیکن واضح رہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر بھی عمل کرنا جائز ہے جیسا کہ محدثین کا متفقہ فیصلہ ہے۔

(۳۱) وَعَنْ اَيُّوْبَ بْنِ مُوْسٰى عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَانَحَلَ وَالِدٌ وَلَدَهٗ مِنْ نَحْلٍ اَفْضَلَ مِنْ اَدَبٍ حَسَنٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا عِنْدِيْ حَدِيْثٌ مُرْسَلٌ۔

"اور حضرت ایوبؒ ابن موسیٰ (اپنے والد حضرت موسیٰ) سے اور وہ ایوبؒ کے دادا (حضرت ابن سعیدؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کوئی باپ اپنے بیٹے کو نیک ادب اور صحیح تربیت سے بہتر کوئی چیز نہیں دیتا۔" (ترمذیؒ، بیہقیؒ) ترمذیؒ نے کہا ہے کہ میرے نزدیک یہ حدیث مرسل ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ایک باپ کی طرف سے اپنے بیٹے کے لئے جو چیز سب سے زیادہ قیمتی اور سب سے زیادہ مفید ہو سکتی ہے وہ صحیح تعلیم و تربیت اور نیک تادیب ہے۔

اپنی اولاد کی پرورش میں مشغول رہنے والی بیوہ عورت کی فضیلت

(۳۲) وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكِ الْاَشْجَعِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا وَامْرَأَةٌ سَفْعَاءُ الْخَدَّيْنِ كَهَاتَيْنِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاَوْمَأَ يَزِيْدُ بْنُ ذُرَيْعٍ اِلَى الْوُسْطٰى وَالسَّبَّابَةِ اِمْرَأَةٌ اٰمَتْ مِنْ زَوْجِهَا ذَاتُ مَنْصَبٍ وَجَمَالٍ حَبَسَتْ نَفْسَهَا عَلٰى يَتَامَاهَا حَتّٰى بَانُوْا اَوْ مَاتُوْا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عوف ابن مالک اشجعیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میں اور وہ عورت کہ جس کے رخسارے (اپنی اولاد کی پرورش و دیکھ بھال کی محنت و مشقت اور ترک زینت و آرائش کی وجہ سے) سیاہ پڑ گئے ہوں قیامت کے دن اس طرح ہوں گے اس حدیث کے راوی یزید ابن ذریعؒ نے یہ الفاظ بیان کرنے کے بعد انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا (کہ جس طرح یہ دونوں انگلیاں ایک دوسرے کے قریب ہیں اسی طرح قیامت کے دن آپ ﷺ اور وہ بیوہ عورت قریب قریب ہوں گے) اور (سیاہ رخساروں والی عورت کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ اس سے مراد) وہ عورت ہے جو اپنے شوہر کے مرجانے یا اس کے طلاق دیدینے کی وجہ سے بیوہ ہوگئی ہو اور وہ حسین و جمیل اور صاحب جاہ و عزت ہونے کے باوجود، محض، اپنے یتیم بچوں کی پرورش اور ان کی بھلائی کی خاطر (دوسرا نکاح کرنے سے) اپنے آپ کو باز رکھے یہاں تک کہ وہ بچے جدا ہو جائیں (یعنی بڑے اور بالغ ہو جانے کی وجہ سے اپنی ماں کے محتاج نہ رہیں یا موت ان کے درمیان جدائی ڈال دے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس عورت کا خاوند چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مرگیا ہو یا جس عورت کو اس کے خاوند نے طلاق دے دی ہو اور اس عورت نے محض اپنے یتیم بچوں کی خاطر کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کیا ہو بلکہ اپنے حسن و جمال اور جاہ عزت کے باوجود اپنے جذبات کو کچل کر ازادواجی زندگی کی خوشیوں و مسرتوں سے دور رہی اور اپنے ان بچوں کی پرورش و دیکھ بھال میں اس وقت تک اپنی جان کھپاتی رہی جب تک کہ وہ اس کے ساتھ رہے یہاں تک کہ اس نے ان کی پرورش میں مشغول رہ کر اپنی زندگی کے جوان ایام کو قربان اور اپنے حسن و جمال کو برباد کر دیا۔ تو حضور ﷺ نے ایسی حوصلہ مند عورت کے بارے میں فرمایا کہ وہ قیامت کے دن میرے اس قدر قریب ہوگی جس قدر یہ دونوں انگلیاں ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو عورتیں اپنے خاوند کی وفات یا طلاق کی وجہ سے بیوہ ہوگئی ہوں تو ان کو صبر و استقامت، عفت و پاکدامنی اور ترک زیب و زینت کو اختیار کرنا، اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کی خاطر دوسرا نکاح نہ کرنا اور ان بچوں کی صحیح پرورش و تربیت میں مشغولیت رہنا بڑی فضیلت کا حامل ہے۔

دینے دلانے میں بیٹے کو بیٹی پر ترجیح نہ دو

(۳۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَتْ لَهٗ اُنْثٰى فَلَمْ يَئِدْهَا وَلَمْ يُهِنْهَا وَلَمْ يُؤْثِرْ

وَلَدَهٗ عَلَيْهَا يَعْنِي الذُّكُوْرَ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص کے کوئی بیٹی یا بہن ہو اور وہ اس کو نہ تو زندہ درگور کرے (جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں رواج تھا کہ لوگ فقر کے خوف سے بچیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتے تھے) نہ اس کو ذلت و حقارت کے ساتھ رکھے اور نہ (دینے دلانے وغیرہ میں) اپنے ولد یعنی بیٹے کو اس پر ترجیح دے تو اللہ تعالیٰ اس کو (سابقین اور صلحاء کے ساتھ) جنت میں داخل کرے گا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: چونکہ "ولد" کا اطلاق بیٹے اور بیٹی دونوں پر ہوتا ہے اس لئے حضرت ابن عباسؓ نے ان الفاظ یعنی الذکور کے ذریعہ یہ وضاحت فرمائی کہ اس حدیث میں ولد سے آنحضرت ﷺ کی مراد بیٹا ہے۔

کسی شخص کو اپنے سامنے کسی مسلمان بھائی کی غیبت نہ کرنے دو

(۳۴) وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ اغْتِيْبَ عِنْدَهٗ اَخُوْهُ الْمُسْلِمُ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلٰى نَصْرِهٖ فَنَصَرَهٗ نَصَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَاِنْ لَّمْ يَنْصُرْهُ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلٰى نَصْرِهٖ اَدْرَكَهُ اللّٰهُ بِهٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ (رواه فی شرح السنة)

"اور حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "جس شخص کے سامنے اس کے مسلمان بھائی کی غیبت کی جائے اور وہ اس مسلمان بھائی کی مدد کرے بشرطیکہ وہ مدد کرنے پر قادر ہو تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی مدد کرے گا۔ اور اگر وہ مدد کرنے پر قادر ہونے کے باوجود اس کی مدد نہ کرے تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کا مواخذہ کرے گا۔" (شرح السنةؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے سامنے اس کے کسی مسلمان بھائی کی غیبت کی جا رہی ہو اور اس کے عیوب کو بیان کر کے اس کی حیثیت و عزت کو نقصان پہنچایا جا رہا ہو تو اس کو چاہئے کہ اگر وہ اس پر قادر ہو تو اپنے اس مسلمان بھائی کی ذات و حیثیت کو جو نقصان پہنچا ہے اس کو ختم کرنے کی کوشش کرے کیونکہ اس طرح نہ صرف اپنے ایک مسلمان بھائی کی مدد ہوتی ہے بلکہ اپنے آپ کو دنیا و آخرت میں خدا کی مدد و نصرت کا مستحق بنایا جاتا ہے اور اگر کوئی شخص اپنی اس ذمہ داری کو پورا کرنے سے گریز کرے تو اس کو جان لینا چاہئے کہ قدرت کا ہاتھ اس کا گریبان پکڑے گا اور اس کو دنیا و آخرت میں مواخذہ خداوندی سے دوچار ہونا ہو گا۔

(۳۵) وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ ذَبَّ عَنْ لَحْمِ اَخِيْهِ بِالْمَغِيْبَةِ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُّعْتِقَهٗ مِنَ النَّارِ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت اسماء بنت یزیدؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے پیٹھ پیچھے اس کا گوشت کھانے سے باز رکھے (یعنی اس کے سامنے اگر کوئی شخص کسی مسلمان بھائی کی برائی اور غیبت کر رہا ہو تو اس کو اس حرکت سے روکے) تو اس کا اللہ پر یہ حق ہے کہ وہ اس کو دوزخ کی آگ سے آزاد کرے گا۔" (بیہقیؒ)

تشریح: غیبت کرنے کو بطور کنایہ گوشت کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی جو شخص کسی کی غیبت کرتا ہے تو گویا وہ اس کا گوشت کھاتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں غیبت کی برائی ان الفاظ میں بیان فرمائی گئی ہے کہ۔

اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا۔

"کیا تم میں سے کوئی شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے۔"

غیبت کرنے کو گوشت کھانے کے ساتھ تشبیہ دینے کا سبب یہ ہے کہ غیبت کرنا در اصل اس کی آبرو ریزی کرنا ہے اور آبرو چونکہ جان سے بھی زیادہ پیاری ہوتی ہے لہٰذا جس شخص نے اپنے مسلمان بھائی کی غیبت کے ذریعہ آبرو ریزی کی اس نے گویا اس کو ہلاک کر دیا اور

اس کا گوشت کھالیا۔

بظاہر یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ لفظ بالمغیبۃ کا تعلق لفظ ذبّ سے ہے اور غیبت یعنی عدم موجودگی کے مفہوم میں ہے تاہم احتمال بھی ہے کہ بالمغیبۃ کا تعلق بلحم اخیہ سے ہو اور مفہوم کے اعتبار سے (غیبت یعنی عدم موجودگی کے بجائے) غیبت یعنی پیٹھ پیچھے برائی بیان کرنے کے معنی میں ہو اس صورت میں عبارت گویا یوں ہوگی مَنْ ذَبَّ عن اکل لحم اخیہ بالمغیبۃ یعنی جو شخص کسی اپنے مسلمان بھائی کی غیبت کے ذریعہ اس کا گوشت کھانے سے باز رکھے...... الخ لیکن حدیث کا حاصل دونوں صورتوں میں ایک ہی رہے گا وہ یہ کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے کی غیبت کرنے سے باز رکھنے والے کی فضیلت کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔

"دوزخ کی آگ سے آزاد کرے۔" کا مطلب یا تو یہ ہے کہ اس شخص کو شروع ہی میں دوزخ کی آگ سے نجات یافتہ قرار دیدیا جائے گا یا یہ کہ اگر وہ شخص اپنے گناہوں کے سبب دوزخ میں داخل کیا جائے گا تو اس کو وہاں سے عذاب پورا کئے بغیر نکال لیا جائے گا۔

(۳۶) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامِنْ مُسْلِمٍ يَرُدُّ مِنْ عِرْضِ اَخِيْهِ اِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يَرُدَّ عَنْهُ نَارَ جَهَنَّمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو مسلمان کسی کا اپنے بھائی مسلمان کی آبروریزی یعنی اس کی غیبت کرنے سے روکے اور اس کا دفعیہ کرے تو اللہ پر اس کا حق ہے کہ وہ اس کو قیامت کے دن دوزخ کی آگ سے بچائے یا اس سے دوزخ کی آگ کو دور کرے۔ پھر حضور ﷺ نے (اپنے قول کَانَ حقا کو ثابت کرنے کے لے) یہ آیت پڑھی و کان حقا علینا نصر المؤمنین یعنی (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ) مؤمنین کی مدد کرنا ہم پر واجب ہے۔" (شرح السنۃ)

(۳۷) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَامِنْ امْرِءٍ مُسْلِمٍ يَخْذُلُ امْرَءً مُسْلِمًا فِيْ مَوْضِعٍ يُنْتَهَكُ فِيْهِ حُرْمَتُهٗ وَيُنْتَقَصُ فِيْهِ مِنْ عِرْضِهٖ اِلَّا خَذَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ مَوْطِنٍ يُحِبُّ فِيْهِ نُصْرَتَهٗ وَمَامِنْ امْرِءٍ مُسْلِمٍ يَنْصُرُ مُسْلِمًا فِيْ مَوْضِعٍ يُنْتَقَصُ فِيْهِ مِنْ عِرْضِهٖ وَيُنْتَهَكُ فِيْهِ مِنْ حُرْمَتِهٖ اِلَّا نَصَرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ مَوْطِنٍ يُحِبُّ فِيْهِ نُصْرَتَهٗ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو مسلمان شخص اپنے مسلمان بھائی کی اس موقع پر مدد نہ کرے اور غیبت کرنے والے کو غیبت سے نہ روکے جہاں اس کی بے حرمتی کی جاتی ہو اور اس کی عزت وآبرو کو نقصان پہنچایا جاتا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی (دنیا و آخرت میں) اس موقع پر اس شخص کی مدد نہیں کریگا جہاں وہ خدا کی مدد کو پسند کرتا ہے اور جو مسلمان شخص اپنے مسلمان بھائی کی اس موقع پر مدد کرے جہاں اس کی بے حرمتی کی جاتی ہو۔ اور اس کی عزت وآبرو کو نقصان پہنچایا جاتا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس موقع پر اس شخص کی مدد کرے گا جہاں وہ خدا کی مدد کو پسند کرتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

کسی میں کوئی عیب دیکھو تو اس کو چھپاؤ

(۳۸) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ رَاٰى عَوْرَةً فَسَتَرَهَا كَانَ كَمَنْ اَحْيٰى مَوْءُوْدَةً۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهٗ۔

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی مسلمان میں کوئی عیب دیکھے یا اس کی برائی کو جانے اور پھر اس کو چھپالے تو اس کا درجہ اس شخص کے درجہ کے برابر ہوگا جو زندہ دفن کی ہوئی لڑکی کو بچالے۔" احمدؒ و ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔"

تشریح: کسی کا عیب چھپانے کو زندہ دفن کی ہوئی لڑکی کو بچانے کے ساتھ تشبیہ دینے کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ جس شخص کی کوئی معیوب بات ظاہر ہو جاتی ہے تو مارے شرم کے گویا مردہ کے ہو جاتا ہے۔ اور یہ تمنا کرتا ہے کہ کاش میں مرجاتا کہ میرا عیب ظاہر نہ ہوتا

اور مجھ کو اپنی یہ رسوائی دیکھنی نہ پڑتی لہٰذا اگر کوئی شخص کسی کے عیب کو چھپاتا ہے تو گویا اس کی اس شرمندگی اور خجالت کو دفع کرتا ہے جو اس کے لئے موت کے برابر ہے، اس اعتبار سے کسی کے عیب کو چھپانا اس کو زندگی بخشنے کے مرادف ہوا جیسا کہ کسی زندہ لڑکی کو دفن کر دیا جائے اور پھر کوئی شخص اس کو عین اس وقت قبر سے نکال لے جب کہ وہ آخری سانس لے رہی ہو اور پھر زندگی پا جائے۔

ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے حق میں آئینہ ہے۔

(۳۹) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَدَكُمْ مِرْاٰةُ اَخِيْهِ فَاِنْ رَاٰى بِهٖ اَذًى فَلْيُمِطْ عَنْهُ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَضَعَّفَهٗ وَفِیْ رِوَايَةٍ لَهٗ وَلِاَبِیْ دَاوٗدَ اَلْمُؤْمِنُ مِرْءَاةُ الْمُؤْمِنِ وَالْمُؤْمِنُ اَخُو الْمُؤْمِنِ يَكُفُّ عَنْهُ ضَيْعَتَهٗ وَيَحُوْطُهٗ مِنْ وَّرَائِهٖ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے ہر شخص اپنے مسلمان کے حق میں آئینہ کی طرح ہے لہٰذا اگر تم اس میں کوئی برائی دیکھو تو اس سے اس برائی کو دور کر دو (یعنی جس مسلمان میں کوئی معیوب بات اور برائی دیکھو یا اس کو غلط راہ پر پاؤ تو اسے راہِ راست پر لانے کی ہر ممکن کوشش کرو اور خواہ نرمی و شفقت کے ساتھ خواہ زجر و تنبیہ کے ذریعہ اور خواہ اس کو معتوب کر کے غرضیکہ اصلاح و نصیحت کے جو شرائط و قواعد ہیں، ان کے مطابق جس طرح بھی ہو سکے اس کو برائی سے باز رکھنے کی سعی کرو)" ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس کو ضعیف قرار دیا ہے (یعنی ان کے نزدیک اس حدیث کو مذکورہ الفاظ میں روایت کرنا ضعف سے خالی نہیں ہے) اور ترمذیؒ کی ایک دوسری روایت نیز ابوداؤد کی روایت میں یوں ہے کہ (حضور ﷺ نے فرمایا) ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا آئینہ ہے اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے جو اس سے اس چیز (برائی اور عیب) کو دور کرتا ہے جس میں اس کے لئے نقصان اور ہلاکت ہے اور اس کی عدم موجودگی میں بھی (اس کے حقوق و مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس طرح آئینہ دیکھنے والا اس آئینہ میں اپنے خد و خال کو دیکھتا ہے اور اس میں جو عیب و خرابی ہوتی ہے اس سے آگاہ ہو جاتا ہے خواہ وہ عیب کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، اسی طرح ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے حق میں اتنا حساس اور بہی خواہ ہونا چاہئے کہ اگر کوئی مسلمان اپنے بھائی مسلمان میں کوئی عیب دیکھے اور اس کو کسی برائی میں مبتلا پائے تو اس کو فوراً آگاہ کر دے اور اس عیب و برائی کی مضرت و ہلاکت کو واضح کر دے اور یہ آگاہ و واضح کرنا پوشیدہ طور پر ہو، تاکہ اس کے اس عیب سے دوسرے لوگ مطلع نہ ہوں، اور وہ دنیا کی نظر میں ذلیل و رسواء نہ ہوں جیسا کہ آئینہ اپنے دیکھنے والے کو اس کے عیب سے اس طرح آگاہ کرتا ہے کہ کسی دوسرے شخص کو معلوم نہیں ہوتا، نیز اس مسلمان کو بھی چاہئے کہ جب کوئی مسلمان اس کو اس کے کسی عیب سے آگاہ کرے تو وہ فوراً اس عیب پر مطلع ہو جائے۔ اور اپنی ذات کو اس کے داغ سے پاک و صاف کرے جیسا کہ کوئی شخص آئینہ میں اپنے چہرے پر کسی داغ و دھبہ کو دیکھ کر فوراً مطلع ہو جاتا ہے اور چہرے کی صفائی و زیبائش کی کوشش کرتا ہے! حاصل یہ نکلا کہ مسلمانوں کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جو قلبی و روحانی تعلق ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی مسلمان اپنے کسی بھائی مسلمان کو کسی برائی، کسی عیب اور کسی ناشائستہ حرکت میں مبتلا دیکھے تو اس احساس کے ساتھ کہ یہ میرا بھائی نقصان و تباہی کے راستہ پر لگ گیا ہے اور اس کا نقصان میرا نقصان ہے۔ اور اسی کی تباہی میری تباہی ہے اس کو اس عیب و برائی سے بچانے کی کوشش کرے کیونکہ یہ بہی خواہی اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی و تعاون ایمان و اسلام کا منشاء ہے اور اس ارشاد گرامی "ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے" کا تقاضا یہ ہے کہ ہمدردی ملت کی فلاح و بہبود اور دینی و دنیاوی کامرانیوں اور سعادتوں کا سرچشمہ ہے غالباً اسی بنا پر مولانا روم قدس اللہ سرہ نے فرمایا کہ صوفیا اس وقت تک خیر و بھلائی پر ہیں، جب تک وہ ایک دوسرے کے احوال کی اصلاح کی سعی و کوشش کرتے ہیں جب بھی وہ ایک دوسرے کی طرف سے بے پرواہ اور ایک دوسرے کا احوال سے اتفاق کر لیں گے ہلاکت میں پڑ جائیں گے۔

حدیث کے آخری الفاظ ویحوطہ من ورآئہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایمانی اخوت کا مظہر ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی عدم موجودگی میں بھی اس کی عزت وآبرو اور اس کی جان ومال کا تحفظ کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے، چنانچہ کوئی مسلمان نہ صرف یہ کہ خود کسی مسلمان کی غیبت اور عیب جوئی نہیں کرتا کیونکہ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی غیبت کرتا ہے تو وہ اس کو غیبت کرنے سے منع کرتا ہے اور اس کی طرف سے عیب جوئی پر خاموشی اختیار کرنے کے بجائے اس کی تردید و تنقیص کرتا ہے اور اس بات کا کوشاں رہتا ہے کہ اس کے سامنے کسی مسلمان بھائی کے جانی ومالی حقوق اور حیثیت عرفی کو نقصان نہ پہنچے۔

تم مسلمان کو عیب جو کے شر سے بچاؤ، اللہ تعالیٰ تمہیں دوزخ کی آگ سے بچائے گا۔

(۴۰) وَعَنْ مُعَاذِبْنِ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ حَمٰى مُؤْمِنًا مِّنْ مُنَافِقٍ بَعَثَ اللّٰہُ مَلَکًا یَحْمِیْ لَحْمَہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ مِنْ نَّارِ جَھَنَّمَ وَمَنْ رَمٰى مُسْلِمًا بِشَیْءٍ یُرِیْدُ بِہٖ شَیْنَہٗ حَبَسَہُ اللّٰہُ عَلٰى جِسْرِ جَھَنَّمَ حَتّٰى یَخْرُجَ مِمَّا قَالَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت معاذ ابن انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی مسلمان کی (عزت وآبرو) کو منافق کے شر سے بچائے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک فرشتہ بھیجے گا۔ جو اس کو قیامت کے دن دوزخ کی آگ سے بچائے گا اور جو شخص کسی مسلمان پر ایسی چیز (یعنی کسی عیب وبرائی) کی تہمت لگائے جس کے ذریعہ اس کا مقصد اس مسلمان کی ذات کو عیب دار کرنا (اور اس کی حیثیت عرفی کو نقصان پہنچانا) ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ کے پل پر قید کر دے گا یہاں تک کہ وہ اس تہمت لگانے کے وبال سے نکل جائے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: یہاں "منافق" سے مراد غیبت کرنے والا اور عیب جو شخص ہے اس کو "منافق" اس لئے فرمایا گیا ہے کہ غیبت کرنے والا کبھی بھی کسی شخص کے منہ پر اس کے منہ پر برائی نہیں کرتا بلکہ اگر وہ سامنے ہوتا ہے تو دل میں اس کی طرف سے برائی رکھنے کے باوجود اس کی خیر خواہی کا دم بھرتا ہے اور پیٹھ پیچھے اس پر عیب لگاتا ہے۔ غیبت کرنا اور عیب جوئی منافق کا کام ہے جس کا ظاہر کچھ ہوتا ہے اور باطن کچھ۔

حدیث کے آخری الفاظ حَتّٰى یَخْرُجَ مِمَّا قَالَ کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ شخص اپنی اتہام تراشی کا شکار بنانے والے شخص کو راضی نہ کر لے گا یا شفاعت کے ذریعہ اور یا گناہ کے بقدر عذاب بھگت لینے کے ذریعہ الزام تراشی کے گناہ سے صاف نہ ہو جائے گا اس وقت تک اس کی گلو خلاصی ممکن نہیں ہوگی۔

خیر خواہ دوست اور خیر خواہ پڑوسی کی فضیلت

(۴۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَیْرُ الْاَصْحَابِ عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرُھُمْ لِصَاحِبِہٖ وَخَیْرُ الْجِیْرَانِ عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرُھُمْ لِجَارِہٖ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَالدَّارِمِیُّ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "خدا کے نزدیک (ثواب وفضیلت کے اعتبار سے) دوستوں میں بہترین دوست وہ ہے جو اپنے دوستوں کا بہترین خیر خواہ ہو اور خدا کے نزدیک پڑوسیوں میں بہترین پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسیوں کا بہترین خیر خواہ ہو" (ترمذیؒ، دارمیؒ) ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے دوستوں اور اپنے ہمسائیوں کے ساتھ بہت زیادہ احسان اور حسن سلوک کرتا ہے، اور ہر حالت میں ان کا خیر خواہ رہتا ہے تو وہ نہ صرف بہترین، دوست اور بہترین پڑوسی قرار پاتا ہے بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے بہت زیادہ ثواب بھی ملتا ہے۔

زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو

(۴۲) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ لِيْ اَنْ اَعْلَمَ اِذَا اَحْسَنْتُ اَوْ اِذَا اَسَأْتُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعْتَ جِيْرَانَكَ يَقُوْلُوْنَ قَدْ اَحْسَنْتَ فَقَدْ اَحْسَنْتَ وَاِذَا سَمِعْتُمْ يَقُوْلُوْنَ قَدْ اَسَأْتَ فَقَدْ اَسَأْتَ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! میں اپنی نیکوکاری یا بدکاری کو کس طرح معلوم کر سکتا ہوں؟ یعنی اگر میں کوئی ایسا کام کروں جس کی شرعًا اچھائی برائی معلوم نہ ہو تو ایسا کونسا ذریعہ ہے جس سے میں یہ معلوم کر سکوں کہ وہ کام کر کے میں نیکوکار بنا ہوں یا بدکار؟ حضور ﷺ نے فرمایا "جب تم (اپنے کسی کام کے بارے میں) اپنے پڑوسیوں کو یہ کہتے سنو کہ تم نے اچھا کام کیا ہے تو تمہارا کام اچھا ہے اور جب تم پڑوسیوں کو یہ کہتے سنو کہ تم نے برا کیا ہے تو تمہارا وہ کام برا ہے۔ یعنی تمہارا نیکوکار یا بدکار ہونا تمہارے پڑوسیوں کی گواہی کے ذریعہ معلوم ہوگا۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: "جب تم اپنے پڑوسیوں کو یہ کہتے سنو" میں "پڑوسیوں" سے سارے پڑوسی مراد ہیں کیونکہ دو چار پڑوسی تو کسی غلط بات پر اتفاق کر سکتے ہیں لیکن عام طور پر سارے پڑوسیوں کا کسی ناروا فیصلے اور غلط بات پر متفق ہونا ممکن نہیں ہو سکتا۔ لیکن حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ نے صراحت بھی کی ہے کہ حدیث کا تعلق اس صورت سے ہے جب کہ اس کے پڑوسی اہل حق، صاحب انصاف اور کسی کام کی اچھائی کو سمجھنے والے ہوں نیز وہ اس شخص سے نہ بہت زیادہ محبت و تعلق رکھتے ہوں اور نہ بہت زیادہ دشمنی و عداوت۔

یہ حدیث حضرت علیؓ کے اس عارفانہ قول کی تائید کرتی ہے السنۃ الخلق اقلام الحلق یعنی مخلوق خدا کی زبان حق تعالیٰ کا قلم ہے یا اسی مفہوم کو ہمارے یہاں اس محاورہ "زبان خلق نقارۂ خدا" کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے، کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

برا کہے جسے عالم اسے برا سمجھو زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

مرتبہ کے مطابق سلوک کرو

(۴۳) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ہر ایک آدمی کو اس کے درجہ پر رکھو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شخص کی جو حیثیت عرفی اور جس کا جو متعین مرتبہ و درجہ ہے اس کے ساتھ اسی کے مطابق سلوک و تعظیم کرو۔ یہ نہیں کہ ہر ایک شخص کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کیا جائے کیوں کہ کوئی شخص شریف اور صاحب عزت ہوتا ہے اور کوئی شخص ذلیل و کمینہ، اگر دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا تو ظاہر ہے کہ غیر موزوں ہوگا اس لئے تعظیم و تکریم میں ہر ایک کے ساتھ ایسا سلوک کرو۔ جو نہ تو تکلیف پہنچائے اور شکایت پیدا ہونے کا باعث ہو اور نہ درجہ و مرتبہ کے غیر مناسب۔ اس سے معلوم ہوا کہ خادم و مخدوم کے ساتھ برابری کا سلوک نہ کرنا چاہئے بلکہ دونوں سے ہر ایک کو اس کے درجہ پر رکھنا چاہئے۔ اور یہ بات قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ۔

احیاء العلوم میں منقول ہے کہ ایک دن حضرت عائشہؓ بیٹھی ہوئی کھانا کھا رہی تھیں کہ ایک فقیر ان کے سامنے راستے سے گزرا، انہوں نے روٹی کا ایک ٹکڑا اس کو بھیج دیا۔ اس کے بعد ایک سوار ادھر سے گزرا تو انہوں نے اس کو کہلا بھیجا کہ کھانا حاضر ہے اگر خواہش ہو تو تشریف لا کر تناول فرمایئے! حاضرین میں سے ایک شخص نے ان کے اس مختلف برتاؤ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر آدمی کو اس کے درجہ پر رکھو چنانچہ وہ فقیر تو روٹی کے ایک ٹکڑے پر خوش ہو گیا، لیکن اگر

میں سوار کے ساتھ وہی برتاؤ کرتی جو فقیر کے ساتھ کیا تھا، تو وہ تکلیف محسوس کرتا اور اس کی حقارت لازم آتی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو علماء تفاضیل انبیاء اور تفصیل خلفاء وغیرہ کے قائل ہیں ان کا قول صحیح ہے اور یہ حدیث ان کے حق میں سرچشمۂ ہدایت ہے اگر کچھ لوگ امراء واغنیاء اور ارباب اقتدار کے تئیں اختیار کئے جانے والے اعزاز واکرام کو اس حدیث کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کریں تو ان کی یہ کوشش گمراہی کے مترادف ہوگی کیونکہ علماء تو اہل علم وفضل کو ان کے علم وفضل کے اعتبار سے ایک دوسرے پر فضیلت دیتے ہیں اور اس فضیلت دینے میں کسی کی حقارت وتوہین کا جذبہ ہرگز شامل نہیں ہوتا جب کہ دنیادار لوگ غریب و مسکین اور محتاج لوگوں کے ساتھ تو حقارت ونفرت کا برتاؤ کرتے ہیں چاہے کوئی غریب شخص علم وفضل کے بڑے سے بڑے درجہ کا حامل ہی کیوں نہ ہو اور امراء مقتدرین کی تعظیم وعزت کرتے ہیں۔ چاہے وہ کتنے ہی بڑے فاسق وفاجر کیوں نہ ہوں۔ اگر ایسے دنیادار لوگ اس حدیث سے استدلال کرنے لگیں تو اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ ایک طرف تو وہ علماء ہیں، جنہیں اس حدیث سے استدلال و استنباط میں اللہ تعالیٰ نے سرفراز کیا اور دوسری طرف وہ بدنصیب دنیادار ہیں جن کو گمراہ کیا کُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ فَهُمْ كُلُّ فَرِيْقٍ مَذْهَبُهُمْ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

سچ بولو، امانت ادا کرو، اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو

(۴۴) عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِىْ قُرَادٍ اَنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ يَوْمًا وَجَعَلَ اَصْحَابُهٗ يَتَمَسَّحُوْنَ بِوَضُوْئِهٖ فَقَالَ لَهُمُ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَايَحْمِلُكُمْ عَلٰى هٰذَا قَالُوْا حُبُّ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَقَالَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يُّحِبَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اَوْ يُحِبَّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ فَلْيَصْدُقْ حَدِيْثَهٗ اِذَا حَدَّثَ وَلْيُؤَدِّ اَمَانَتَهٗ اِذَا ائْتُمِنَ وَلْيُحْسِنْ جِوَارَ مَنْ جَاوَرَهٗ۔

"حضرت عبدالرحمٰن ابن ابی قرادؓ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے وضو کیا تو صحابہؓ نے حضور ﷺ کے وضو کے پانی کو اپنے جسم پر ملنا شروع کر دیا نبی کریم ﷺ نے (یہ دیکھ کر) فرمایا کہ "تم یہ جو کچھ کر رہے ہو اس کا سبب کیا ہے؟" انہوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی محبت اس کا باعث ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اللہ اور اللہ کا رسول اس سے محبت کریں تو اس کو چاہئے کہ جب بولے تو سچ بولے، جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس امانت کو ادا کرے اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھی ہمسائیگی کا ثبوت دے۔"

تشریح: "وضو کے پانی" سے مراد اکثر علماء کے نزدیک تو وہ پانی ہے جو وضو کرنے کے بعد برتن میں بچ گیا تھا، اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ پانی ہے جو وضو کے وقت حضور ﷺ کے اعضاء مبارک سے جدا ہو کر گر رہا تھا۔

او یحبه اللّٰه ورسوله میں حرف اَوْ تنویع کے لئے ہے! واضح رہے کہ ایک درجہ تو بندہ کا اللہ ورسول ﷺ سے محبت رکھنا ہے اور دوسرا درجہ اللہ ورسول ﷺ کا بندہ سے محبت رکھنا ہے ظاہر ہے کہ دوسرا درجہ پہلے درجہ سے کہیں بالا ہے لیکن حقیقت میں دونوں درجے ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ بایں طور کہ ہر کوئی اپنے دوستدار کو دوست رکھتا ہے۔ یا یہ کہ حرف اَوْ دراصل لفظ بَلْ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا کہ "جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھے بلکہ جو شخص پسند کرتا ہو کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ اس سے محبت کرے تو اس کو چاہئے کہ......الخ" یہ قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ایک احتمال یہ بھی ہے کہ حرف اَوْ راوی کے شک کو ظاہر کرتا ہے یعنی آنحضرت ﷺ نے یہاں یا تو یہ فرمایا تھا کہ جو شخص اللہ کے رسول ﷺ سے محبت رکھنا چاہتا ہو۔ یا یہ فرمایا تھا کہ جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اللہ اور اللہ کا رسول ﷺ اس سے محبت کرے۔

بہر حال حضور ﷺ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کا دعوی ایسی باتوں کے ذریعہ کرنا کہ جو نفس پر چنداں شاق نہیں، کوئی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس دعوے کے ثبوت کے لئے ضروری ہے۔ کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جن چیزوں کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے ان کو اختیار کیا جائے اور جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے اجتناب کیا جائے خصوصًا ان احکام پر زیادہ توجہ و مستعدی اور زیادہ پابندی کے ساتھ عمل کیا جائے جن کا تعلق لوگوں کے حقوق اور باہمی معاملات سے ہو اور حقوق و معاملات بھی وہ کہ جن سے اکثر و بیشتر واسطہ رہتا ہے، جیسے سچ بولنا، امانت کو ادا کرنا اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھے سلوک اور آداب ہمسائیگی کو لازم پکڑنا۔

احتمال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے شاید ان صحابہؓ کو مذکورہ بالا چیزوں کے تعلق سے ادائے حقوق کی کسی تقصیر و کوتاہی میں مبتلا پایا ہوگا اس لئے خاص طور پر آپ ﷺ نے ان ہی چیزوں کا ذکر فرمایا۔

بھوکے پڑوسی سے صرف نظر کمال ایمان کے منافی ہے۔

(۴۵) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالَّذِيْ يَشْبَعُ وَجَارُهٗ جَائِعٌ اِلٰى جَنْبِهٖ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "وہ شخص کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جو پیٹ بھر کر کھالے درآنحالیکہ اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا ہو" دونوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: ظاہر ہے کہ وہ مسلمان کمال ایمان کے درجہ کو کس طرح پہنچ سکتا ہے۔ جو خود تو پیٹ بھر کر کھانا کھائے اور اس کا پڑوسی بالکل بھوکا رہے کسی کامل مسلمان کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ یہ جاننے کے باوجود کہ اپنے پڑوسی میں فلاں شخص کو محتاجگی و افلاس اور شدت بھوک نے مضطرب و بے حال کردیا ہے وہ اس کی خبر نہ لے اور اس کو اپنے کھانے میں شریک نہ کرے! "اس کے پہلو میں۔" اس جملہ کے ذریعہ گو اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ جو شخص اپنے پڑوسی کے حالات سے بے خبر و لاپرواہ ہو اس سے بڑا غافل اور لاپرواہ کون ہوسکتا ہے۔

اپنی بدزبانی کے ذریعہ ہمسائیوں کو ایذاء پہچانے والی عورت کے بارے میں وعید

(۴۶) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ فُلَانَةً تُذْكَرُ مِنْ كَثْرَةِ صَلَاتِهَا وَصِيَامِهَا وَصَدَقَتِهَا غَيْرَ اَنَّهَا تُؤْذِيْ جِيْرَانَهَا بِلِسَانِهَا قَالَ هِيَ فِي النَّارِ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاِنَّ فُلَانَةً تُذْكَرُ قِلَّةُ صِيَامِهَا وَصَدَقَتِهَا اَوْ صَلَاتِهَا وَاِنَّهَا تَصَدَّقُ بِالْاَثْوَارِ مِنَ الْاَقِطِ وَلَا تُؤْذِيْ بِلِسَانِهَا جِيْرَانَهَا قَالَ هِيَ فِي الْجَنَّةِ۔ (رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن مجلس نبوی میں کسی شخص نے عرض کیا، کہ یارسول اللہ (ﷺ)! فلاں عورت کا زیادہ نماز، روزے اور کثرت صدقہ و خیرات کی وجہ سے بڑا چرچا ہے (یعنی لوگ کہتے ہیں کہ وہ عورت بہت زیادہ عبادت کرتی ہے اور کثرت سے صدقہ و خیرات کرتی رہتی ہے) لیکن وہ اپنی زبان کے ذریعہ اپنے پڑوسیوں کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ حضور ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ وہ دوزخ میں جائے گی۔ (یعنی وہ عورت چونکہ اپنی بدزبانی اور گالم گلوچ کے ذریعہ اپنے پڑوسیوں کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ اس لئے وہ دوزخ میں ڈالی جائے گی اور باوجودیکہ نماز روزہ اور صدقہ و خیرات افضل ترین عبادات ہیں لیکن اس کی یہ عبادتیں بھی اس کے گناہ کا کفارہ نہیں ہونگی اس شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! فلاں عورت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت کم روزے رکھتی ہے، بہت کم صدقہ و خیرات کرتی ہے اور بہت کم نماز پڑھتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا صدقہ و خیرات قروط کے چند ٹکڑوں سے آگے نہیں بڑھتا لیکن وہ اپنی

زبان کے ذریعہ اپنے ہمسائیوں کو تکلیف نہیں پہنچاتی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ عورت جنت جائے گی۔" (احمدؒ و بیہقیؒ)

تشریح: حضور ﷺ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ اصل میں دین کا مدار جس چیز پر ہے وہ اکتساب فرائض اور اجتناب معاصی ہے یعنی انسان کی اخروی فلاح و نجات محض اس بات پر منحصر ہے کہ وہ دینی فرائض و واجبات پر عمل کرے اور گناہ و معصیت سے پرہیز کرے اور گناہ و معصیت خواہ ترک فرائض و واجبات کی صورت میں ہوں یا بدعملیوں کی شکل میں! اس بات سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں کہ فضول یعنی نفلی عبادات و طاعات کو اختیار کیا جائے اور اصول یعنی واجبات کو ضائع کر دیا جائے۔ جیسا کہ اکثر علماء اور صلحاء اس کمزوری میں مبتلا ہیں چنانچہ علماء تو ان چیزوں کو ترک کرتے ہیں جن پر عمل کرنا واجب ہے اور صلحاء اس علم کو حاصل نہیں کرتے جس کو حاصل کرنا واجب ہے گویا دونوں طبقے ترک واجب کی معصیت کے مرتکب ہیں البتہ وہ مشائخ اور صوفیاء جو علم و عمل دونوں کے حامل ہوتے ہیں وہ واجبات پر عمل کرنے کو جو درجہ دیتے ہیں وہی درجہ ترک واجب کی معصیت سے اجتناب کو بھی دیتے ہیں بلکہ ایک طرح سے ان کے نزدیک اجتناب کی اہمیت مقدم ہے اور وہ حکمائے طب کے اس اصول کو اختیار کرتے ہیں کہ تحلیہ پر تخلیہ مقدم ہے لہٰذا جس طرح اطباء مریض کو پرہیز پہلے کراتے اور دواء بعد میں دیتے ہیں۔ اس طرح وہ مشائخ و صوفیاء بھی سالکین طریقیت کے لئے پہلی منزل توبہ قرار دیتے ہیں، اور حقیقت بھی ہے کہ جس طرح مریض مضر چیزوں سے پرہیز نہ کرے تو لاکھ دوائیں بھی اس کیلئے بے فائدہ ہیں اسی طرح کوئی مسلمان گناہ و معصیت سے اجتناب نہ کرے اور ترک واجبات سے دامن نہ بچائے تو لاکھ عبادات کرے اور نوافل و اوراد میں مشغول رہے اس کو خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ کلمۂ توحید میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ پہلے نفی ہے پھر اثبات اور یہ کہ صفات ثبوتیہ پر صفات سلبیہ مقدم ہیں کیونکہ صفات ثبوتیہ کا حصول تو لازم آتا ہے لیکن صفات ثبوتیہ سے صفات سلبیہ کا حصول لازم نہیں آتا۔

کون شخص بہتر ہے اور کون بدتر؟

(۴۷) وَعَنْهُ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَفَ عَلٰى نَاسٍ جُلُوْسٍ فَقَالَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِكُمْ مِنْ شَرِّكُمْ قَالَ فَسَكَتُوْا فَقَالَ ذٰلِكَ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ فَقَالَ رَجُلٌ بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَخْبِرْنَا بِخَيْرِنَا مِنْ شَرِّنَا فَقَالَ خَيْرُكُمْ مَنْ يُرْجٰى خَيْرُهٗ وَيُؤْمَنُ شَرُّهٗ وَشَرُّكُمْ مَنْ لَا يُرْجٰى خَيْرُهٗ وَلَا يُؤْمَنُ شَرُّهٗ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے بیٹھے ہوئے صحابہؓ کے سامنے کھڑے ہو کر فرمایا کیا میں تمہیں یہ بتاؤں کہ تم میں نیک ترین کون شخص ہے اور تمہارے بہترین آدمیوں کو تمہارے بدترین آدمیوں سے جدا کر کے دکھا دوں؟ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ صحابہؓ (یہ سن کر) خاموش رہے (کیونکہ انہیں خوف ہوا کہ اگر حضور ﷺ نے عام مفہوم اور عنوان کلی کے طور پر بتانے کے بجائے مشخص و متعین طور پر یعنی ایک ایک شخص کا نام لے کر بتا دیا کہ فلاں نیک ہے اور فلاں بد تو اس سے بڑی ذلت اور رسوائی ہوگی یہاں تک کہ) جب حضور ﷺ نے مذکورہ ارشاد تین مرتبہ فرمایا، تو ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ ہاں! یا رسول اللہ (ﷺ)! ہمیں بتا دیجئے اور ہمارے نیک آدمیوں کو ہمارے بد آدمیوں سے ممیز و ممتاز فرما دیجئے! حضور ﷺ نے فرمایا (تو سنو) تم میں بہترین شخص وہ ہے جس سے لوگ بھلائی کی توقع کریں اور اس کے شر سے محفوظ و مامون ہوں۔ اور تم میں سے بدترین وہ ہے جس سے لوگ بھلائی کی توقع نہ کریں اور اس کے شر سے محفوظ و مامون نہ ہوں۔ (ترمذیؒ و بیہقیؒ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: بہترین اور بدترین شخص کی پہچان تو یہ ہے کہ جس کو حدیث میں فرمایا گیا، رہا وہ شخص کہ جس سے لوگ بھلائی کی امید تو رکھتے ہوں، لیکن اس کے شر سے محفوظ و مامون نہ ہوں۔ یا وہ شخص کہ جس کے شر سے تو لوگ محفوظ و مامون ہوں مگر اس سے کسی بھلائی کی توقع نہ رکھتے ہوں تو ایسا شخص بین بین ہوگا کہ اس کو نہ بہترین کہیں گے نہ بدترین۔

کامل مؤمن و مسلمان کون ہے؟

(۴۸) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَسَمَ بَيْنَكُمْ اَخْلَاقَكُمْ كَمَا قَسَمَ بَيْنَكُمْ اَرْزَاقَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُعْطِى الدُّنْيَا مَنْ يُّحِبُّ وَمَنْ لَّا يُحِبُّ وَلَا يُعْطِى الدِّيْنَ اِلَّا مَنْ اَحَبَّ فَمَنْ اَعْطَاهُ اللّٰهُ الدِّيْنَ فَقَدْ اَحَبَّهٗ وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ لَا يُسْلِمُ عَبْدٌ حَتّٰى يُسْلِمَ قَلْبُهٗ وَلِسَانُهٗ وَلَا يُؤْمِنُ حَتّٰى يَاْمَنَ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان تمہارے اخلاق کو اسی طرح تقسیم فرمایا ہے جس طرح تمہارے رزق کو تمہارے درمیان تقسیم کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا تو اس شخص کو بھی دیتا ہے جس کو وہ دوست رکھتا ہے۔ (جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت عثمانؓ وغیرہ) اور اس شخص کو بھی دیتا ہے جس کو دوست نہیں رکھتا (جیسے فرعون وغیرہ) لیکن دین یعنی اچھے اخلاق کی دولت صرف اسی شخص کو عطا کرتا ہے جس کو وہ دوست رکھتا ہے (حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ دنیاوی مال و دولت اور اقتدار تو ہر شخص کو عطا فرما سکتا ہے خواہ وہ اس کا دوست ہو یا نہ ہو لیکن اچھے اخلاق و احوال کی نعمت کا مستحق صرف وہی شخص ہے جو محبوب خداوندی ہو) لہٰذا اللہ تعالیٰ کا کسی شخص کو دین عطا فرمانا اس بات کی علامت ہے کہ اس کو اس نے دوست رکھا ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کوئی بندہ اس وقت تک کامل مسلمان نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا دل اور زبان مسلمان نہ ہو اور کوئی بندہ اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ و مامون نہ ہو۔"

تشریح: دل کا اسلام تو یہ ہے کہ اس کو باطل عقائد و نظریات سے پاک رکھا جائے اور زبان کا اسلام یہ ہے کہ اس کو لایعنی باتوں سے محفوظ رکھا جائے لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ دل اور زبان کے مسلمان ہونے سے مراد وہ تصدیق و اقرار ہے جس پر ایمان کی بنیاد ہے اور اس کے ذریعہ گویا اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ ظاہر و باطن کا ایک ہونا کمال ایمان و اسلام کی دلیل ہے اور چونکہ دل اور زبان ہی ایمان و اسلام کا مدار ہیں اس لئے خاص طور پر ان دونوں کا ذکر کیا گیا۔

باہمی الفت و محبت، اتحاد و یکجہتی کا ذریعہ ہے

(۴۹) وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُؤْمِنُ مَاْلَفٌ وَلَا خَيْرَ فِيْمَنْ لَا يَاْلَفُ وَلَا يُؤْلَفُ۔ رَوَاهُمَا اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِىُّ فِىْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "مسلمان، الفت و محبت کا مقام و مخزن ہے اور اس شخص میں بھلائی نہیں ہے جو الفت نہیں کرتا اور نہ اس سے الفت کی جاتی ہے یعنی جو شخص ایسا ہو کہ نہ تو وہ مسلمانوں سے الفت و محبت کرے اور نہ مسلمان اس سے محبت و الفت کریں تو وہ کسی کام کا نہیں ہے۔" ان دونوں روایتوں کو احمدؒ نے اور شعب الایمان میں بیہقیؒ نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: لفظ مالف، مصدر میمی ہے اور فاعل و مفعول دونوں کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے گویا یہ لفظ مفہوم کے اعتبار سے یوں ہے یالف و یولف یعنی مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ الفت کرتا ہے اور دوسرے اس کے ساتھ الفت کرتے ہیں چنانچہ ایک روایت میں اسی طرح منقول ہے اور یہاں بھی حدیث کے آخری الفاظ اس بات کی تائید کرتے ہیں لیکن طیبیؒ یہ کہتے ہیں کہ احتمال ہے کہ یہ لفظ مالف مصدر بطریق مبالغہ ہو، جیسا کہ کہا جائے رجل عدل اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ مؤمن الفت کرنے والا ہے اور یا یہ کہ مالف اسم مکان ہے جیسا کہ ترجمہ میں ظاہر کیا گیا ہے اس صورت میں اس طرف اشارہ مقصود ہوگا کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت و موانست اور الفت و شفقت ہی کے ذریعہ اتحاد و یگانگت اور اتفاق و یکجہتی کی دولت حاصل کر سکتے ہیں اگر وہ باہمی الفت و محبت کی روح کو ختم کر دیں تو پھر ان میں تفرقہ پڑ جائے گا اور وہ انتشار کا شکار ہو جائیں گے، چنانچہ حق تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کُنْتُمْ اَعْدَآءً

فالف بین قلوبکم الایة کے ذریعہ باہمی الفت و موانست کو مسلمانوں کے حق میں ایک زبردست نعمت قرار دیا ہے اور قرآن میں اس مضمون کو کئی جگہ بیان کیا ہے۔

مسلمانوں کی حاجت روائی کی فضیلت

۵۰ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَضٰی لِاَحَدٍ مِنْ اُمَّتِیْ حَاجَۃً یُرِیْدُ اَنْ یَسُرَّہٗ بِھَا فَقَدْ سَرَّنِیْ وَمَنْ سَرَّنِیْ فَقَدْ سَرَّ اللّٰہَ وَمَنْ سَرَّ اللّٰہَ اَدْخَلَہُ اللّٰہُ الْجَنَّۃَ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو آدمی میری اُمت میں سے کسی شخص کی کسی (دینی و دنیاوی) حاجت و ضرورت کو پورا کرے اور اس سے اس کا مقصد اس کو خوش کرنا ہو تو اس نے مجھ کو خوش کیا (کیونکہ مسلمان کی خوشی ہوتی ہے) اور جس نے مجھ کو خوش کیا اس نے اللہ کو خوش کیا اور جس نے اللہ کو خوش کیا اس کو اللہ جنت میں داخل کرے گا۔"

تشریح: مسلمان کی حاجت روائی کی فضیلت کو جامع صغیر کی روایت میں جس کو خطیبؒ نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے یوں بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے اپنے بھائی مسلمان کی کسی حاجت و ضرورت کو پورا کیا تو اس کو حج و عمرہ کرنے والے شخص کے ثواب کی مانند ثواب ملتا ہے"۔

مسلمان کی فریادرسی کی فضیلت

۵۱ وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَغَاثَ مَلْھُوْفًا کَتَبَ اللّٰہُ لَہٗ ثَلٰثًا وَسَبْعِیْنَ مَغْفِرَۃً وَاحِدَۃً فِیْھَا صَلَاحُ اَمْرِہٖ کُلِّہٖ وَثِنْتَانِ وَسَبْعُوْنَ لَہٗ دَرَجَاتٌ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص مظلوم کی فریادرسی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے بہتر بخششیں لکھ دیتا ہے اور ان میں سے ایک بخشش تو وہ ہے جو اس کے تمام (دنیاوی و اخروی) امور کی اصلاح کی ضامن بن جاتی ہیں اور باقی بہتر بخششیں قیامت کے دن اس کے درجات کی بلندی کا سبب ہونگی۔"

تشریح: "عیال" کے معنی متعلقین کے ہیں اور کسی شخص کے متعلقین کا اطلاق ان افراد پر ہوتا ہے جن کی پرورش، جن کا کھانا پینا اور جن کی ضروریات زندگی کی تکمیل اس شخص کے ذمہ ہوتی ہے اور وہ ان کے اخراجات اپنے روپیہ پیسے سے پورا کرتا ہے لہٰذا اس معنی میں عیال کی نسبت غیر اللہ کی طرف تو مجازی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف حقیقی ہے کیونکہ رزاق مطلق حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے جیسا کہ خلاق مطلق اسی کی ذات ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا۔

"زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔"

حقوق ہمسائیگی کی اہمیت

۵۲ وَعَنْ عُقْبَۃَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَوَّلُ خَصْمَیْنِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ جَارَانِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت کے دن سب سے پہلے دو جھگڑنے والے دو ہمسایہ ہوں گے۔" (احمدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اہل دوزخ کے بعد حقوق کی عدم ادائیگی سے متعلق جو معاملہ سب سے پہلے پیش ہوگا وہ ان دو ہمسایوں کا ہوگا۔ جنہیں آپس میں ایک دوسرے سے ایذا رسانی یا حقوق واجب الادا میں تقصیر و کوتاہی وغیرہ سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔ واضح

رہے کہ ایک روایت میں یوں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جس محاسبہ کا سامنا کرنا پڑے گا وہ نماز سے متعلق ہوگا نیز ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ قیامت کے دن بندہ کے سب سے پہلے جس معاملہ کا فیصلہ کیا جائے گا وہ خون کا معاملہ ہوگا اور مذکورہ بالا روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جو معاملہ پیش ہوگا وہ ہمسائیوں کی مخاصمت کا معاملہ ہوگا۔ چونکہ ان روایتوں میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے۔ اس لئے علماء نے ان تمام روایتوں کے درمیان یہ تطبیق دی ہے۔ کہ حقوق اللہ کے سلسلہ میں سب سے پہلے خون کے معاملہ کا فیصلہ کیا جائے گا۔ کیونکہ کسی کا ناحق خون بہانا بہت بڑا گناہ ہے۔ رہی مذکورہ بالا حدیث تو لفظ خصمین کے ذریعہ یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حدیث دونوں فریق کے ایک دوسرے کے خلاف دعوی رکھنے کے ساتھ مقید ہے یعنی جو لوگ ایسے ہیں ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کے حقوق کی ادائیگی میں تقصیر و کوتاہی کی ہے اور اس کی وجہ سے ہر ایک گناہگار ہوا ہے تو ایسے لوگوں میں سے جو دو آدمی سب سے پہلے اپنا معاملہ لے کر پیش ہونگے اور ایک دوسرے کے خلاف دعوی کریں گے وہ دو ہمسایہ ہوں گے اور ان کا فیصلہ کیا جائے گا اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ادائیگی حقوق میں تقصیر و کوتاہی کا تعلق دونوں فریق سے نہ ہو بلکہ کسی ایک سے ہو تو اس صورت میں کہا جائے گا کہ دونوں فریق پر خصمین کا اطلاق بطریق تغلیب اور مشاکلت کے ہے جیسا کہ قرآن کے یہ الفاظ وَجَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا اس کی مثال ہے حاصل یہ کہ مذکورہ بالا روایتوں میں جن معاملات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ہر ایک میں اولیت اضافی ہے جس کی وجہ سے حقیقی طور پر کوئی باہمی تضاد لازم نہیں آتا۔

سنگدلی کا علاج

۵۴ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَجُلاً شَكٰى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَسْوَةَ قَلْبِهٖ قَالَ امْسَحْ رَاْسَ الْيَتِيْمِ وَاَطْعِمِ الْمِسْكِيْنَ۔ (رواه احمد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے (ایک دن) نبی کریم ﷺ سے ایک شخص نے اپنی سنگدلی کی شکایت کی اور (اس کا علاج پوچھا) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو اور مسکین کو کھانا کھلایا کرو۔" (احمدؒ)

بیوہ بیٹی کی کفالت کا اجر

۵۵ وَعَنْ سُرَاقَةَ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى اَفْضَلِ الصَّدَقَةِ اِبْنَتُكَ مَرْدُوْدَةً اِلَيْكَ لَيْسَ لَهَا كَاسِبٌ غَيْرُكَ۔ (رواه ابن ماجه)

"اور حضرت سراقہ ابن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "کیا میں تمہیں بہترین صدقہ کے بارے میں بتاؤں؟ اور وہ صدقہ اپنی اس بیٹی کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہے جو تمہارے پاس واپس بھیجدی گئی ہے اور جس کے لئے تمہارے علاوہ اور کوئی کمانے والا نہیں ہے یعنی اگر تمہاری بیٹی کو اس کے شوہر نے طلاق دیدی ہو اور نہ تو اس کے پاس کوئی ایسا ذریعہ اس کے لئے گزر بسر کا سامان فراہم کر سکے بلکہ صرف تم ہی اس کے لئے واحد سہارا بن سکتے ہو اور وہ اسی لئے ناچار ہو کر تمہارے گھر آن پڑی ہو تو تمہاری طرف سے اس کی کفالت اور اس کے ساتھ حسن سلوک ایک بہترین صدقہ ہے۔" (ابن ماجہؒ)

بَابُ الْحُبِّ فِي اللّٰهِ وَمِنَ اللّٰهِ

اللہ کے ساتھ اور اللہ کے لئے محبت کرنے کا بیان

"اللہ کے ساتھ محبت" کے معنی یہ ہیں کہ معبود کے ساتھ عبودیت کا جو تعلق قائم کیا جائے اور پروردگار کی ذات سے جو محبت کی جائے

اس میں ریاو نمائش اور خواہشات نفسانی کی آمیزش نہ ہو بلکہ وہ محبت و تعلق محض اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہو۔

اللہ کے لئے محبت۔ کا مطلب یہ ہے کہ کسی بندے کے ساتھ تعلق و محبت کا جو رشتہ قائم کیا جائے وہ محض اللہ ہی کی خاطر ہو اور اللہ کی راہ میں کسی دنیاوی غرض و لالچ کی وجہ سے نہ ہو، یعنی اگر کسی بندے سے دلی محبت و دوستی کی جائے تو صرف اس لئے کی جائے کہ اس بندہ کے ساتھ محبت و دوستی رکھنے سے اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

دنیا میں انسان کا باہمی اتحاد یا اختلاف روز ازل کے اتحاد، اختلاف کا مظہر ہے

(۱) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ وَرَوَاهُ مُسْلِمٌ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ۔

"حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "روحیں (جسموں میں داخل کئے جانے سے پہلے) لشکر کی طرح (ایک جگہ) مجتمع تھیں (اور پھر ان کو الگ الگ کر کے ایک ایک جسم میں داخل کیا گیا) چنانچہ (جسموں میں داخل ہونے سے پہلے) جو روحیں ایک دوسرے کی صفات سے مناسبت و مشارکت رکھنے کی وجہ سے" آپس میں مانوس و متعارف تھیں، وہ (جسموں میں پہنچنے کے بعد اس دنیا میں بھی) ایک دوسرے کے ساتھ محبت و الفت رکھتی ہیں۔ اور جو روحیں ایک دوسرے سے انجان و نامانوس تھیں وہ (اس دنیا میں بھی) اختلاف رکھتی ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ دنیا میں اب تک جتنے اجسام پیدا ہو چکے ہیں یا قیامت تک جتنے پیدا ہونگے ان سب کی روحیں اپنے جسمانی وجود سے بھی بہت پہلے پیدا کی جا چکی ہیں، جو عالم ارواح میں جمع ہیں اور دنیا میں جب کسی روح کا جسم پیدا ہوتا ہے تو وہ روح اس جسم میں بھیجدی جاتی ہے۔ چنانچہ ابتداء خلقت میں اور روز ازل اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا عہد و اقرار کرنے کے لئے جب پوری کائنات انسانی کی روحوں کو چیونٹیوں کی صورت میں جمع کیا تو اس وقت وہاں جو روحیں آپس میں ایک دوسرے سے مانوس و متعارف ہوئیں، اور جن روحوں کے درمیان صفات کی مناسبت اور موانست و محبت پیدا ہوئی یا جو روحیں آپس میں نامانوس انجان رہیں اور جن روحوں کے درمیان اختلاف و تفرقہ رہا وہ دنیا میں اپنے اجسام میں آنے کے بعد بھی اسی مناسبت و محبت یا اختلاف و اجنبیت پر قائم رہتی ہیں، دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے اس دنیا میں جو انسان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت و موانست اور ایک دوسرے کی صفات سے مناسبت و مشابہت رکھتے ہیں جیسے جو لوگ نیک اور اچھے ہوتے ہیں وہ نیک اور اچھے لوگوں سے محبت و تعلق رکھتے ہیں اور جو لوگ فاسق اور بدکار ہوتے ہیں، وہ فاسقوں اور بدکاروں سے محبت و تعلق رکھتے ہیں یا جو لوگ اس دنیا میں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف و عناد اور اجنبیت رکھتے ہیں جیسے نیک لوگ برے لوگوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ اور برے لوگ نیک لوگوں سے اختلاف و عناد رکھتے ہیں تو وہ دراصل اپنی روحوں کے ازلی اتحاد موانست یا اختلاف و اجنبیت کا مظہر ہیں کہ روز ازل جن روحوں میں محبت و موانست تھی ان کے درمیان اس دنیا میں بھی محبت و موانست رہتی ہے اور جن روحوں میں وہاں اختلاف و عناد رہا وہ یہاں بھی اختلاف و عناد رکھتے ہیں۔

جاننا چاہئے کہ روحوں کے درمیان روز ازل جو تعارف و تعلق پیدا ہو گیا تھا اس کا ظہور اس دنیا میں الہام خداوندی کے سبب ہوتا ہے بایں طور کہ جب وہ روحیں اس دنیا میں اپنے جسموں میں آتی ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی وہاں (روز ازل) کی محبت کے سبب یہاں (دنیا) بھی ان کے دلوں میں تعلق و محبت ڈال دیتا ہے۔

جس بندے کو اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے اس کو زمین و آسمان والے بھی دوست رکھتے ہیں۔

(۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِیْلَ فَقَالَ اِنِّیْ اُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّهٗ قَالَ فَیُحِبُّهٗ جِبْرَئِیْلُ ثُمَّ یُنَادِیْ فِی السَّمَآءِ فَیَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ فَیُحِبُّهٗ اَهْلُ السَّمَآءِ ثُمَّ یُوْضَعُ لَهُ الْقُبُوْلُ فِی الْاَرْضِ وَاِذَا اَبْغَضَ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِیْلَ فَیَقُوْلُ اِنِّیْ اُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضْهُ قَالَ فَیُبْغِضُهٗ جِبْرَئِیْلُ ثُمَّ یُنَادِیْ فِیْ اَهْلِ السَّمَآءِ اِنَّ اللّٰهَ یُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضُوْهُ قَالَ فَیُبْغِضُوْنَهٗ ثُمَّ یُوْضَعُ لَهُ الْبَغْضَآءُ فِی الْاَرْضِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت رکھتا ہے (یعنی جب وہ اپنے بندوں میں کسی بندے کے تئیں اپنی خوشنودی و محبت کو ظاہر کرنے کا ارادہ کرتا ہے) تو جبرئیل کو بلا کر فرماتا ہے کہ میں فلاں بندے سے محبت رکھتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو" آنحضرت نے فرمایا "جبرئیل علیہ السلام (یہ سن کر) اس بندے سے محبت رکھتے ہیں اور پھر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے آسمان میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ۔ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت رکھتا ہے لہٰذا تم سب بھی اس سے محبت کرو۔ چنانچہ آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور پھر اس بندے کے لئے زمین میں بھی قبولیت رکھی جاتی ہے (یعنی زمین والوں کے دلوں میں بھی اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے۔ اور تمام جن وانس اس سے محبت کرتے لگتے ہیں) اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے نفرت کرتا ہے تو جبرئیل علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے کہ میں فلاں شخص سے نفرت کرتا ہوں، تم بھی اس سے نفرت کرو۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "جبرئیل (یہ سن کر) اس شخص سے نفرت کرتے ہیں اور پھر وہ آسمان میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے نفرت کرتا ہے لہٰذا تم سب بھی اس سے نفرت کرو۔ چنانچہ آسمان والے بھی اس شخص سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ یہاں تک اس شخص کے لئے زمین میں بھی عداوت ونفرت رکھی جاتی ہے جس کی وجہ سے تمام جن وانس اس شخص سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: اللہ تعالیٰ کا کسی بندے کو دوست و محبوب رکھنے کا مطلب دراصل اس بندے پر حق تعالیٰ کی طرف سے خیر و بھلائی اور ہدایت و فلاح کی بارش ہونا اور اس پر رحمت خداوندی کا نازل ہونا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی شخص سے نفرت کرنا گویا اس شخص کو عذاب میں مبتلا کرنے کے ارادۂ خداوندی کو ظاہر کرنا، اس سے حق، ہدایت کی توفیق کسی بندے کے حق میں ان کی محبت کو دو صورتوں پر محمول کیا جاسکتا ہے، ایک تو یہ کہ وہ اس بندے کے حق میں استغفار کرتے ہیں۔ اس کی مدح و تعریف کرتے ہیں۔ اور اس کے لئے بارگاہ خداوندی میں دعا کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ "محبت" کے وہی ظاہری معنی مراد ہیں۔ جو عام طور پر مفہوم ہوتے ہیں یعنی ان کے دل اس بندے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اور اس سے ملاقات کا اشتیاق رکھتے ہیں۔

ملا علی قاری کہتے ہیں کہ دوسری صورت یعنی محبت کو اس کے اپنے ظاہری معنی پر محمول کرنا زیادہ صحیح ہے کیونکہ جب کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنی پر محمول کرنا صحیح ہو تو مجازی معنی مراد لینا غیر موزوں ہے، علاوہ ازیں محبت کو اس کے حقیقی معنی پر محمول کرنے کی صورت میں پہلے معنی (یعنی اس بندے کے حق میں جبرئیل اور فرشتوں کا دعا و استغفار اور مدح و تعریف کرنا ضمنی طور پر خود بخود متحقق ہو جاتے ہیں۔

خدا کی رضا و خوشنودی کی خاطر ایک دوسرے سے محبت رکھنے والوں کا قیامت کے دن اعزاز

(۳) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یَقُوْلُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَیْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِیَ الْیَوْمَ اُظِلُّهُمْ فِیْ ظِلِّیْ یَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلِّیْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن (سب لوگوں کے سامنے اپنے بعض بندوں کی عظمت و بزرگی کو ظاہر کرنے کے لئے) فرمائے گا "کہاں ہیں وہ لوگ جو میری بڑائی کے اظہار اور میری تعظیم کی خاطر آپس میں محبت و تعلق رکھتے تھے (یا کہاں ہیں وہ لوگ جو میری رضا و خوشنودی کی خاطر اور حصول ثواب کی غرض سے آپس میں محبت و تعلق رکھتے تھے) آج میں ان

لوگوں کو اپنے سایہ میں پناہ دوں گا اور آج کے دن میرے سایہ کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہے۔" (مسلم)

تشریح: اللہ تعالیٰ کے سایہ سے مراد یا تو عرش کا سایہ ہے، جیسا کہ بعض احادیث میں اس کا صراحۃً ذکر ہے اس صورت میں کہا جائے گا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سایہ کی وضاحت اس سایہ کی عظمت و تکریم کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ یا سایہ سے مراد حفاظت خداوندی اور رحمت الٰہی ہے جیسا کہ السلطان ظل اللہ فی الارض (بادشاہ) دنیا میں اللہ تعالیٰ کا سایہ ہے، فرمایا گیا ہے اور یا یہ کہ "سایہ" کے ذریعہ قیامت کے دن کی ان راحتوں اور نعمتوں کو تعبیر کیا گیا ہے جو ان لوگوں پر حق تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوں گی، چنانچہ عربی میں لفظ ظل یعنی سایہ، راحت و نعمت کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ خوشی و راحت کے ساتھ گزرنے والی زندگی کو عیش ظلیل کہا جاتا ہے۔

حب فی اللہ کی فضیلت

④ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ رَجُلاً زَارَ اَخًا لَهُ فِيْ قَرْيَةٍ اُخْرٰى فَاَرْصَدَ اللّٰهُ لَهُ عَلٰى مَدْرَجَتِهِ مَلَكًا قَالَ اَيْنَ تُرِيْدُ قَالَ اُرِيْدُ اَخًالِيْ فِيْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ قَالَ هَلْ لَكَ عَلَيْهِ مِنْ نِعْمَةٍ تَرُبُّهَا قَالَ لاَ غَيْرَ اَنِّيْ اَحْبَبْتُهُ فِي اللّٰهِ قَالَ فَاِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكَ بِاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَبَّكَ كَمَا اَحْبَبْتَهُ فِيْهِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص اپنے مسلمان بھائی کی ملاقات کے لئے روانہ ہوا جو کہ دوسری آبادی میں رہتا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کے راستہ پر اس کے انتظار میں ایک فرشتہ کو بٹھا دیا (جب وہ شخص اس جگہ پہنچا تو) فرشتہ نے (اس کو روک کر) پوچھا کہ کہاں جانے کا ارادہ ہے، اس شخص نے کہا کہ میں اپنے ایک مسلمان بھائی کی ملاقات کے لئے جا رہا ہوں، جو اس آبادی میں رہتا ہے فرشتہ نے پوچھا کہ کیا اس پر تمہارا کوئی حق نعمت ہے؟ جس کو حاصل کرنے کے لئے تم اس کے پاس جا رہے ہو (یعنی تم جس شخص کے پاس جا رہے ہو کیا وہ کوئی ایسا شخص ہے جس کو تم نے کوئی نعمت دی تھی اور اب اس کا بدلہ حاصل کرنے کے لئے اس کے یہاں جا رہے ہو؟) اس شخص نے کہا کہ نہیں! میں محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس سے محبت و تعلق رکھتا ہوں۔ فرشتہ نے کہا (تو پھر سنو!) مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ تاکہ میں تمہیں یہ بشارت دوں، کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرتا ہے جیسا کہ تم محض اللہ تعالیٰ کی خاطر اس شخص سے محبت و تعلق رکھتے ہو۔" (مسلم)

تشریح: اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کرنے کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے کہ یہ چیز (حب فی اللہ) محبت الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے نیز اس سے صالحین کی ملاقات کے لئے ان کے پاس جانے کی فضیلت بھی واضح ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی اپنے نیک و محبوب بندوں کے پاس فرشتوں کو بھیجتا ہے جو ان سے ہم کلام ہوتے ہیں، لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ چیز پچھلی امتوں کے ساتھ مخصوص تھی کیونکہ اب نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور انسانوں کے پاس فرشتوں کی آمد کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔

علماء اور اولیاء اللہ کے ساتھ محبت رکھنے والے آخرت میں ان ہی کے ساتھ ہونگے

⑤ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ تَقُوْلُ فِيْ رَجُلٍ اَحَبَّ قَوْمًا وَلَمْ يَلْحَقْ بِهِمْ فَقَالَ الْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! اس شخص کے بارے میں آپ (ﷺ) کیا فرماتے ہیں جو کسی جماعت یعنی علماء و صلحاء اور بزرگان دین سے محبت و عقیدت رکھتا ہو۔ لیکن ان کی محبت اس کو نہ ہوئی ہو یا وہ ان کے علم و عمل تک نہ پہنچا ہو؟ حضور ﷺ نے فرمایا ہے وہ شخص اسی کے ساتھ ہے جس کو وہ محبوب رکھتا

ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی عالم یا بزرگ کے ساتھ عقیدت و محبت رکھتا ہے وہ آخرت میں اسی عالم و بزرگ کے ساتھ ہوگا۔ اور اگرچہ کامل محبت کہ جس کا اعتبار کیا جاسکتا ہے وہی ہے جو اتباع و موافقت اور علمی و عملی یگانگت تک پہنچا دے لیکن محض مخلصانہ عقیدت و محبت بھی معیت (یکجائی کا ذریعہ بن جاتی ہے، اس میں گویا ان لوگوں کے لئے بشارت ہے جو علماء و صلحا اور بزرگان دین سے عقیدت و محبت اور دوستی رکھتے ہیں کہ وہ لوگ انشاء اللہ قیامت کے دن انہی علماء و صلحاء اور بزرگان دین کے ساتھ اٹھیں گے اور آخرت میں ان کی رفاقت و معیت کی دولت پائیں گے، ملا علی قاریؒ نے یہ لکھا ہے کہ حدیث کا ظاہری مفہوم عمومیت پر دلالت کرتا ہے یعنی اس ارشاد گرامی میں عمومی طور پر یہ نکتہ بیان فرمایا گیا ہے کہ جو شخص کسی سے محبت رکھتا ہے۔ اس کا حشر اسی کے ساتھ ہوگا۔ اور وہ شخص کہ جس کے ساتھ محبت ہے خواہ نیک و صالح ہو یا بدکار و فاسق، ملا علی قاریؒ کی اس بات کی تائید اس حدیث اَلْمَرْءُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِهٖ سے ہوتی ہے جو آگے آئے گی اس صورت میں کہا جائے گا کہ جو لوگ علماء و صلحاء اور بزرگان دین کے ساتھ عقیدت و محبت رکھتے ہیں ان کے لئے اس حدیث میں خاتمہ بخیر اور اخروی فلاح و سعادت کی بشارت ہے اور جو لوگ بدکار و فاسق اور خدا کے دشمنوں کے ساتھ عقیدت و محبت رکھتے ہیں ان کے لئے اس حدیث میں سخت وعید و تنبیہ ہے۔

⑥ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلًا قَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَتَی السَّاعَةُ قَالَ وَیْلَكَ وَمَا اَعْدَدْتَ لَهَا قَالَ مَا اَعْدَدْتُ لَهَا اِلَّا اَنِّیْ اُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ قَالَ اَنْتَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ قَالَ اَنَسٌ فَمَا رَاَیْتُ الْمُسْلِمِیْنَ فَرِحُوْا بِشَیْءٍ بَعْدَ الْاِسْلَامِ فَرَحَهُمْ بِهَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انس سے روایت ہے کہ (ایک دن) ایک شخص نے یہ سوال کیا کہ یا رسول اللہ! قیامت کب آئے گی تو حضور ﷺ نے فرمایا۔ "تم پر افسوس ہے! کیا تم نے قیامت کے لئے کوئی تیاری کر رکھی ہے؟" (بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا آنحضرت ﷺ کو اس کا یہ سوال اچھا نہیں لگا اور آپ ﷺ کو گمان ہوا کہ اس شخص نے اچھا اعتقاد رکھتے ہوئے ازراہ خودی یہ سوال نہیں کیا ہے بلکہ قیامت کے آنے کو ایک دور دراز کی بات سمجھتے ہوئے لاپرواہی کے طور پر یہ سوال کر رہا ہے چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو جواب بھی اسی انداز میں دیا کہ یہ کیا پوچھتے ہو؟ کہ قیامت کب آئے گی، تم اپنا عقیدہ و عمل درست رکھو اور اچھے کام کرو، جب قیامت کے دن کو آنا ہوگا آجائے گا۔ لیکن جب) اس شخص نے عرض کیا کہ میں نے تو کوئی تیاری نہیں کی ہے البتہ میرے پاس ایک دولت ضرور ہے اور وہ یہ کہ) میں خدا اور خدا کے رسول (ﷺ) سے محبت رکھتا ہوں (تو آنحضرت ﷺ نے جانا کہ اس شخص کا مذکورہ سوال ایک مخلص و کامل مؤمن کے اعتقاد کا مظہر اور ازراہ خوف ہے کسی لاپرواہی کا غماز نہیں ہے، چنانچہ) آپ ﷺ نے فرمایا "تم دنیا و آخرت میں اسی کے ساتھ ہو، جس سے محبت رکھتے ہو۔" حضرت انس کہتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں کو اسلام کے بعد کسی اور چیز سے اتنا زیادہ خوش نہیں دیکھا جتنا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے خوش ہوئے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس شخص نے "تیاری" کے زمرہ میں صرف خدا اور خدا کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت کو ذکر کیا اس کے علاوہ دوسری بدنی، قلبی اور مالی عبادتوں کا اس نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ جن سے اس کی زندگی یقیناً خالی نہیں تھی۔ اس کی وجہ ایک تو اظہار عجز و انکساری اور اپنے مرتبۂ عبودیت کا اخفاء تھا جو ایک مخلص مؤمن کی شان ہے، دوسری وجہ یہ تھی کہ خدا اور خدا کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت ہی اصل چیز ہے اور تمام عبادتیں اسی محبت کی شاخیں اور اس کا لازمی اثر ہوتی ہیں۔ جس شخص کا قلب خدا اور خدا کے رسول ﷺ کی محبت سے سرشار ہو جاتا ہے۔ عبادت و طاعت خود بخود اس کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔ علاوہ ازیں صرف محبت کو ذکر کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ محبت بذات خود سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ بھی محبت کرتا ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ اور ایک جگہ یوں فرمایا ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ظاہر ہے

کہ جس بندے کو محبت الٰہی کی دولت حاصل ہو جائے اس کی دنیاوی واخروی فلاح ونجات میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

"تم اسی کے ساتھ ہو جس سے تم محبت رکھتے ہو۔" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی ذات سے اس درجہ کا تعلق رکھتا ہے کہ اس کی محبت دوسری تمام چیزوں یہاں تک کہ اپنے مال، اپنے اہل وعیال اور اپنی جان تک کی محبت پر غالب آجاتی ہے۔ تو وہ اپنے محبوب کے ساتھ منسلک وملحق ہو جاتا ہے اور اس کا شمار محبوب کے اپنے لوگوں میں ہونے لگتا ہے اور محبت صادقہ یا عشق حقیقی کی علامت یہ ہے کہ وہی کام کرے جس کا محبوب حکم کرے یا جو محبوب کی رضاء وخوشنودی کا باعث ہو اور ہر اس کام سے اجتناب وپرہیز کرے جو محبوب کے حکم ومرضی کے خلاف ہو۔ اور اس کے غیر کی مرضی ومراد کو پورا کرنے والا ہو۔ لہٰذا تم اگر اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو اپنے عقیدہ وقول اور فعل وعمل سے اس دعوے کو ثابت کرتے رہو بایں طور کہ فرائض وواجبات کی بجا آوری کرو۔ حق تعالیٰ جن امور سے راضی وخوش ہوتا ہے ان کو ہمیشہ اختیار کرو۔ اور اس نے جن چیزوں سے منع کر دیا ہے ان کے قریب بھی مت جاؤ، اسی بات کو مشہور صوفی خاتون حضرت رابعہ بصریؒ نے ان الفاظ میں نظم کیا ہے۔

تَعْصِي الْاِلٰهَ وَاَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهٗ هٰذَا لَعَمْرِي فِي الْقِيَاسِ بَدِيْعٌ
لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَاَطَعْتَهٗ اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُحِبُّ مُطِيْعٌ

"تم خدا کی نافرمانی اختیار کئے ہوئے درآنحالیکہ تم اس کی محبت کا دم بھرتے ہو۔ اپنی جان کی قسم یہ چیز قیاس میں بھی نہیں آسکتی!..... اگر تمہاری محبت سچی ہوتی تو یقیناً تم اس کی اطاعت کرتے۔ (کیونکہ) محبت کرنے والا در حقیقت اپنے محبوب کا فرمانبردار ہوتا ہے......"

آنحضرت کا ارشاد سن کر مسلمانوں کا بہت زیادہ خوش ہونا اس بنا پر تھا کہ پہلے ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ جنت میں آنحضرت کی معیت محض آنحضرت کے ساتھ محبت اور آپ کی متابعت کی وجہ سے حاصل نہیں ہوگی بلکہ اس سعادت کو حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ عبادت میں مشغول رہنا اور کثرت کے ساتھ ریاضت ومجاہدہ اختیار کرنا ضروری ہے چنانچہ جب آنحضرت ﷺ نے مذکورہ بات ارشاد فرمائی تو صحابہؓ کو بہت زیادہ خوشی ہوئی اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔ جس کو علامہ عماد الدین ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک صحابیؓ حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ مجھ کو اپنی جان اپنے اہل خانہ اور اپنے بچوں سے بھی زیادہ عزیز ومحبوب ہیں، میں اپنے گھر میں ہوتا ہوں تو آپ کے تصور میں کھویا رہتا ہوں۔ جب آپ ﷺ کی یاد بہت ستاتی اور روئے انورؐ کی زیارت کے بغیر چین نہیں ملتا تو آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ اور آپ ﷺ کی زیارت سے تسکین حاصل کرتا ہوں جب مجھے اپنی موت کا خیال آجاتا ہے اور اس دنیا سے آپ ﷺ کے رخصت ہو جانے کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ آپ ﷺ جنت میں جائیں گے تو جنت کے سب سے اعلیٰ درجہ میں انبیاء کے ساتھ ہونگے اور اگر خدا نے مجھے بھی جنت میں داخل کیا تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ میں آپ ﷺ کی زیارت سے محروم رہوں گا۔ آنحضرت ﷺ نے ان صحابیؓ کی یہ بات سنی لیکن کوئی جواب نہیں دیا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ۔

"جس نے (ضروری احکام میں) اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری کی وہ (جنت میں) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا انعام نازل کیا ہے۔ یعنی انبیاء علیہم السلام، صدیق شہداء اور صالحین۔"

رہی یہ بات کہ یہاں "معیت" سے کیا مراد ہے تو جاننا چاہئے۔ کہ "معیت" سے یہ مراد نہیں ہے کہ محبت کرنے والا اور محبوب دونوں کے درمیان ہونے والی ملاقات کی جو کیفیت ایک حدیث میں بیان کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ اعلیٰ درجہ والے ان لوگوں کے پاس آئیں گے جو نیچے کے درجات میں ہونگے اور پھر سب جنت کے باغات میں یکجا ہونگے وہاں ایک دوسرے کی زیارت وملاقات

ہوگی۔ اور درجہ عالیہ والے ان چیزوں کا ذکر کریں گے جو ان کو اللہ کی طرف سے بطور انعام حاصل ہوئی ہوں گی۔ اور حق تعالیٰ کے انعامات واکرامات پر اس کی حمد وثناء کریں گے پھر درجات سافلہ والے ان کی خاطر و تواضع کریں گے اور دوڑ دوڑ کر ہر وہ چیز لائیں گے۔ اور ان کو دیں گے جن کی وہ خواہش وطلب کریں غرضیکہ اسی طرح وہ سب جنت کے باغات میں اس طرح کی تقریب سے لطف اندوز اور مسرور ہوا کریں گے۔

واضح رہے کہ متابعت اور ضروری احکام کے مدارج مختلف ہوتے ہیں، لہٰذا جس درجہ کے احکام ضروریہ میں اطاعت ہوگی اسی درجہ کی محبت بھی شمار ہوگی۔ اور جس درجہ کی محبت یا جس درجہ کا حسن معاملہ ہوگا اسی درجہ کی یہ معیت وملاقات بھی نصیب ہوگی۔

نیک اور بد ہمنشین کی مثال

(۷) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْجَلِیْسِ الصَّالِحِ وَالسَّوْءِ کَحَامِلِ الْمِسْکِ وَنَافِخِ الْکِیْرِ فَحَامِلُ الْمِسْکِ اِمَّا اَنْ یُّحْذِیَکَ وَاِمَّا اَنْ تَبْتَاعَ مِنْہُ وَاِمَّا اَنْ تَجِدَ مِنْہُ رِیْحًا طَیِّبَۃً وَنَافِخُ الْکِیْرِ اِمَّا اَنْ یُّحْرِقَ ثِیَابَکَ وَاِمَّا اَنْ تَجِدَ مِنْہُ رِیْحًا خَبِیْثَۃً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو موسیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "نیک اور بد ہمنشین کی مثال مشک رکھنے والے اور دھونکنی دھونکنے والے کی سی ہے مشک رکھنے والا یا تو تمہیں مشک مفت دیدے گا یا تم اس سے خرید لوگے اور یا (اگر کسی بھی صورت میں اس کا مشک تمہارے ہاتھ نہیں لگتا تو کم (از کم اس کی خوشبو تو ضرور تمہیں حاصل ہو جائیگی (اس طرح نیک اور صالح ہمنشین سے کوئی فیض یا کوئی خاص نعمت نہ بھی ملے تو یہی کیا کم ہے کہ کچھ ساعتوں کے لئے اس کی صحبت میں سکون وطمانیت کے ساتھ بیٹھنا نصیب ہو جائے) اور دھونکنی دھونکنے والا یا تو تمہارے کپڑوں کو جلا دیگا یا تمہیں اس سے دماغ پاش بو یعنی دھواں ملے گا۔ (اسی طرح بدکار ہمنشین اول تو دین ودنیا دونوں کا نقصان پہنچاتا ہے وقت کو ضائع کرتا ہے اور حصول سعادت کی صلاحیت واستعداد کو مضمحل اور بے کار کر دیتا ہے اور اگر یہ نہ بھی ہو تو اس کی صحبت میں کم از کم اتنا تو ضرور ہوتا ہے کہ زندگی کے وہ قیمتی لمحات، دل ودماغ کی کبیدگی اور لاحاصل صحبت کی ناخوشگواری میں صرف ہوتے ہی ہیں۔"

(بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: اچھے لوگوں کی محبت وہم نشینی اور برے لوگوں کی محبت وہم نشینی کے درمیان جو فرق ہے اس کو مذکورہ بالا نشین مثال کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے اور جیسا کہ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے اس ارشاد گرامی کی مراد اس بات کی تاکید وتنبیہ ہے کہ اچھے لوگوں سے محبت وتعلق پیدا کرو۔ ان کی صحبت وہم نشینی کو اختیار کرو اور برے لوگوں کی محبت وموافقت اور ان کی صحبت وہم نشینی سے اجتناب کرو، نیز اس میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اچھے لوگوں یعنی علماء وصلحاء کی صحبت وہم نشینی کے دنیا وآخرت میں فائدہ حاصل کرنے کا سبب ہے اور برے لوگوں یعنی بدکار وفساق کی صحبت وہمنشینی دنیا وآخرت میں نقصان اٹھانے کا ذریعہ ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

خدا کی رضاء وخوشنودی کی خاطر باہمی میل ملاپ اور محبت رکھنے والوں کی فضیلت

(۸) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَجَبَتْ مَحَبَّتِیْ لِلْمُتَحَابِّیْنَ فِیَّ وَالْمُتَجَالِسِیْنَ فِیَّ وَالْمُتَزَاوِرِیْنَ فِیَّ وَالْمُتَبَاذِلِیْنَ فِیَّ۔ رَوَاہُ مَالِکٌ وَفِیْ رِوَایَۃِ التِّرْمِذِیِّ قَالَ یَقُوْلُ اللّٰہُ تَعَالٰی اَلْمُتَحَابُّوْنَ فِیْ جَلَالِیْ لَھُمْ مَنَابِرُ مِنْ نُّوْرٍ یَغْبِطُھُمُ النَّبِیُّوْنَ وَالشُّھَدَآءِ۔

"حضرت معاذ ابن جبلؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ میرا

محبت کرنا ایک طے شدہ امر ہے جو محض میری رضامندی وخوشنودی کی خاطر آپس میں میل محبت رکھتے ہیں محض میری رضا وخوشنودی کی خاطر اور میری حمد وثناء کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں۔ محض میری رضا وخوشنودی کی خاطر ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں اور محض میری رضاء وخوشنودی کی خاطر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔" (مالکؒ) ترمذی کی روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ میری عظمت وجلال کے سبب آپس میں میل محبت رکھتے ہیں ان کے لئے (آخرت میں) نور کے منبر ہوں گے جن پر انبیاء وشہداء (بھی رشک کریں گے۔"

تشریح: "جن پر انبیاء وشہداء رشک کریں گے۔" اس جملہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات کس طرح درست ہو سکتی ہے کیونکہ انبیاء علی الاطلاق تمام لوگوں سے افضل وبرتر ہیں اور شہداء راہ میں اپنی جان ومال قربان کر دینے کے سبب عظیم فضیلت رکھتے ہیں لہٰذا ان دونوں کا ایسے لوگوں کے اجر وانعام پر رشک کرنا کس طرح موزوں ہو سکتا ہے جس کا مذکورہ عمل (یعنی خدا کے لئے آپس میں میل محبت رکھنا) نہایت آسان اور سہل ہے علاوہ ازیں اس بات سے انبیاء اور شہداء کے مقابلہ پر مذکورہ لوگوں کا زیادہ افضل ہونا لازم آتا ہے کیونکہ رشک اسی کو ہوتا ہے جو مفضول ہو اور جس پر رشک کیا جاتا ہے وہ فاضل ہوتا ہے؟ اس کا جواب علماء نے اجر وانعام پر خوشی ومسرت کا اظہار کرنا ہے نہ کہ رشک کا حقیقی مفہوم مراد ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث کا مذکورہ بالا جملہ دراصل فرض وتقدیر پر مبنی ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو جو رتبہ ومقام حاصل ہوگا اس کی اہمیت وفضیلت کو اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر بفرض محال انبیاء وشہداء کو کسی رتبہ ومقام پر رشک ہوتا تو ان لوگوں کے رتبہ ومقام پر ہوتا۔ اور تیسرا جواب جو اس طرح کے مواقع پر عام طور پر دیا جاتا ہے یہ ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مفضول میں کوئی ایسی خاص صفت وفضیلت ہوتی ہے جو فاضل میں نہیں ہوتی اور باوجودیکہ فاضل اپنے اندر جو فضائل اور خوبیاں رکھتا ہے۔ ان کے مقابلہ پر مفضول کی اس صفت وفضیلت کی اہمیت نہیں ہوتی لیکن فاضل کی تمنا وخواہش ہوتی ہے کہ اس کو وہ صفت وخوبی حاصل ہو جائے جو مفضول میں ہے۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ زید کے پاس ایک ہزار بہت خوب صورت غلام ہوں اور ان میں خوبصورتی کے علاوہ دوسری اور خوبیاں بھی اور اس کے مقابلہ پر بکر کے پاس صرف ایک غلام بچہ ہو جو بہت نیک اور ہونہار ہو، ظاہر ہے کہ زید اپنے غلاموں کی تعداد واہمیت کے اعتبار سے بکر کے مقابلہ پر کہیں زیادہ برتری وفضیلت رکھتا ہے اور اس کو اس بات کی بظاہر کوئی ضرورت ہی نہیں کہ وہ بکر کے غلام بچہ پر رشک کرے لیکن اس کے باوجود اس کی خواہش یہ ہو کہ بکر کے پاس جو غلام بچہ ہے اسی طرح کا ایک غلام بچہ مجھے بھی حاصل ہو جائے۔ اسی طرح انبیاء وشہداء بھی مذکورہ لوگوں کی فضیلت دیکھ کر یہ آرزو کریں گے کہ کاش دوسری فضیلتوں کے ساتھ یہ فضیلت بھی ان کو حاصل ہو جاتی۔

⑨ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ لَاُنَاسًا مَاهُمْ بِاَنْبِيَآءَ وَلَا شُهَدَآءَ يَغْبِطُهُمُ الْاَنْبِيَآءُ وَالشُّهَدَآءُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِمَكَانِهِمْ مِنَ اللّٰهِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ تُخْبِرُنَا مَنْ هُمْ قَالَ هُمْ قَوْمٌ تَحَابُّوْا بِرُوْحِ اللّٰهِ عَلٰى غَيْرِ اَرْحَامٍ بَيْنَهُمْ وَلَا اَمْوَالٍ يَتَعَاطَوْنَهَا فَوَاللّٰهِ اِنَّ وُجُوْهَهُمْ لَنُوْرٌ وَّاِنَّهُمْ لَعَلٰى نُوْرٍ لَا يَخَافُوْنَ اِذَا خَافَ النَّاسُ وَلَا يَحْزَنُوْنَ اِذَا حَزِنَ النَّاسُ وَقَرَأَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ اَلَا اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَرَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ عَنْ اَبِيْ مَالِكٍ بِلَفْظِ الْمَصَابِيْحِ مَعَ زَوَائِدَ وَكَذَا فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "خدا کے بندوں میں سے کتنے ہی لوگ (یعنی اولیاء اللہ) ایسے ہیں جو اگرچہ نبی اور شہید نہیں ہیں، لیکن قیامت کے دن خدا کے نزدیک ان کے مراتب ودرجات دیکھ کر انبیاء اور شہداء بھی ان پر رشک کریں گے۔" صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! ہمیں بتایئے وہ کون لوگ ہونگے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "وہ لوگ ہیں جو خدا کی روح یعنی قرآن کریم کے سبب آپس میں میل محبت رکھتے ہیں حالانکہ ان کے درمیان نہ کوئی رشتہ ناتا ہوتا ہے (جس کا تقاضا انہیں ایک دوسرے سے محبت کرنے پر مجبور

کرے) اور نہ مال و دوست کی لین دین کا معاملہ ہوتا ہے (حاصل یہ کہ ان کی باہمی محبت اور آپس کے اتحاد و میل ملاپ کی بنیاد کسی دنیاوی غرض و وسیلہ پر نہیں ہوتی۔ بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور تعلیمات قرآنی کی اتباع پر ہوتی ہے پس قسم ہے اللہ کی (قیامت کے دن) ان کے چہرے نورانی ہونگے یا وہ مجسم نور ہونگے اور وہ نور (کے منبروں) پر (یا نفس نور پر) متمکن و مستولی ہونگے وہ لوگ اس وقت بھی خوف زدہ نہیں ہونگے جب کہ دوسرے لوگ خوف میں مبتلا ہوں گے۔ اور وہ اس وقت بھی غمگین اور رنجیدہ نہیں ہوں گے۔ جب کہ دوسرے لوگ غمگین و رنجیدہ ہونگے پھر حضور ﷺ نے (ایسے لوگوں کو خدا کا دوست کرنے اور ان سے خوف و حزن کی نفی کرنے کے لئے بطور دلیل) یہ آیت تلاوت فرمائی اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ آگاہ ہو کہ خدا تعالیٰ کے دوستوں پر نہ تو خوف طاری ہو گا اور نہ وہ غمگین و رنجیدہ ہونگے۔ اس روایت کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے اور بغویؒ نے شرح السنۃ میں اس روایت کو بالفاظ مصابیح ابومالک سے روایت کیا ہے لیکن اس میں کچھ الفاظ کا اضافہ بھی ہے! اور اس طرح باضافہ الفاظ اس روایت کو بیہقیؒ نے بھی شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: "انبیاء اور شہداء بھی ان پر رشک کریں گے" کے بارے میں پچھلی حدیث کی تشریح کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اور ایک خاص بات یہ ذہن میں رہنی چاہئے۔ کہ "انبیاء" سے وہ نبی اور پیغمبر مراد ہیں جو اپنی زندگی میں کسی عذر یا کسی اور سبب سے باہمی ملاقات کا موقع نہ پا سکے ہونگے۔ ورنہ تو جہاں تک نفس محبت و ہمنشینی کا تعلق ہے ایسا کوئی نبی اور پیغمبر نہیں گزرا ہے جو اللہ کی خاطر اپنی اُمت کے لوگوں سے محبت و تعلق نہ رکھتا ہو اور ہم نشینی سے محروم رہے ہوں گے۔

"رُوح" (راکے پیش کے ساتھ) اصل میں تو اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ جسم زندہ رہتا ہے یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس جوہر کو کہتے ہیں۔ جس کے سبب زندگی کو بقا حاصل ہوتی ہے اور یہاں "روح" سے مراد قرآن ہے چنانچہ قرآن کریم میں "رُوح" کے معنی "قرآن" کے بھی آئے ہیں جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا! اور اس اعتبار سے بھی "قرآن" کو "روح" کہنا نہایت موزوں ہے کہ جس طرح جسم و بدن کی زندگی کا مدار روح پر ہے اسی طرح قلب انسان کی حیات کا مدار قرآن پر ہے۔

قرآن کو باہمی میل و محبت کا سبب قرار دینا یا تو اس اعتبار سے ہے کہ قرآن یعنی دین اسلام انسانوں کو جوڑنے، ان میں اتحاد اور باہمی میل و محبت پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے یا اس اعتبار سے ہے کہ قرآن کریم کو نظام زندگی کا اساس قانون ماننے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے باہمی محبت و موانست کی دولت حاصل ہوتی ہے کیوں کہ قرآن کریم کی تعلیمات، محبت و موانست کا ذریعہ اور مؤمنین کو باہمی میل ملاپ اور اتحاد و یکجہتی اختیار کرنے کی ہدایت دینے والی ہیں۔

بعض حضرات نے "رُوحُ اللّٰه" کی مراد قرآن کے بجائے خود محبت کو قرار دیا ہے اور ان کے نزدیک "محبت پر" "روح" کا اطلاق اس سبب سے موزوں ہے کہ محبت بھی قلب انسان کی حیات و نشاط اور تازگی کا سبب ہے اسی لئے محبوب کو "جان من" کہا جاتا ہے۔

مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں یہ لفظ راء کے زبر کے ساتھ یعنی "رَوحُ اللّٰه" منقول ہے جس کے معنی رحمت اور رزق کے ہیں، بہر حال مآل و ماحصل کے اعتبار سے معنی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مطلب سب کا ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ خدا کی رضا و خوشنودی کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنا۔

بالفاظ مصابیح یہ روایت جس طرح نقل کی ہے۔ وہ یوں ہے۔

عَنْ ابی المالک الاشعری اَنَّهٗ قَالَ کنت عند النبی صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اذ قال ان للّٰه عزوجل عبادا لیسوا بانبیاء وَلَا شهداء یغبطهم النبیون والشهداء بقربهم و مقعدهم من اللّٰه یوم القیامة فَقَالَ حدثنا من هم فقال هم عباد اللّٰه من بلد ان شتی وقبائل شتی لَمْ یکن بینهم ارحام یتواصلون وَلَا دنیا یتباذلون بها یتحابون بروح اللّٰه یجعل وجوههم نورا ویجعل لهم منابر من نور قدام عرش الرحمن۔

"حضرت ابومالک اشعریؓ کہتے ہیں (ایک دن) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا اللہ عزوجل کے بعض

بندے ایسے ہیں جو اگرچہ انبیاء اور شہداء نہیں ہیں لیکن قیامت کے دن خدا کے نزدیک ان کا مرتبہ و مقام اور ان کی رفعت شان دیکھ کر انبیاء اور شہداء بھی ان پر رشک کیا کریں گے۔" (یہ سن کر) ایک اعرابی نے عرض کیا کہ آپ ﷺ ہمیں بتائیں کہ وہ کون لوگ ہوں گے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "وہ اللہ کے بندے ہیں جن کا تعلق مختلف شہروں اور مختلف قبائل سے ہوتا ہے۔ ان کے درمیان کوئی رشتہ ناتا بھی نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے تعلق و محبت قائم کرنے پر مجبور ہوں اور نہ وہ ایک دوسرے پر اپنا مال اور روپیہ پیسہ خرچ کرتے ہیں (جس سے ان کے درمیان تعلقات قائم ہو مگر وہ محض خدا کی روح یعنی قرآن کریم کے سبب آپس میں میل محبت رکھتے ہیں (قیامت کے دن) ان کے چہرے نور کے ہوں گے۔ اور عرش الٰہی کے نیچے ان کیلئے نور کے منبر رکھے جائیں گے (جن پر وہ متمکن ہونگے)"

حب فی اللہ و بغض فی اللہ کی فضیلت

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَبِيْ ذَرٍّ يَا اَبَاذَرٍّ اَيُّ عُرَى الْاِيْمَانِ اَوْثَقُ قَالَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ الْمُوَالَاةُ فِي اللّٰهِ وَالْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا کہ "ابوذر! (جانتے ہو) ایمان کی کونسی شاخ زیادہ مضبوط ہے حضرت ابوذرؓ نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ زیادہ جاننے والے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا۔ "خدا کی رضا و خوشنودی کے لئے آپس میں ایک دوسرے سے میل محبت رکھنا اور خدا کی رضا و خوشنودی کے لئے کسی سے دوستی رکھنا اور خدا کی رضا و خوشنودی کے لئے کسی سے بغض و نفرت رکھنا۔" (بیہقیؒ)

مسلمان بھائی کی عیادت کرنے اور ملاقات کے لئے اس کے ہاں جانے کا ثواب

(۱۱) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا عَادَ الْمُسْلِمُ اَخَاهُ اَوْزَارَهٗ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى طِبْتَ وَطَابَ مَمْشَاكَ وَتَبَوَّاْتَ مِنَ الْجَنَّةِ مَنْزِلًا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جب کوئی مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کی عیادت کے لئے یا اس کی ملاقات کی خاطر اس کے ہاں جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ (بلاواسطہ یا فرشتوں کی زبانی، فرماتا ہے کہ۔ "(دنیا و آخرت میں) تیری زندگی خوش ہوئی، تیرا چلنا مبارک رہا (کہ تو چل کر یہاں تک آیا) ہر قدم پر تجھے ثواب ملا اور تجھ کو جنت میں ایک بڑی اور عالی مرتبہ جگہ حاصل ہوئی۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: دنیا میں زندگی کو خوشی و اطمینان ملنے کا تعلق جن چیزوں سے ہے وہ یہ ہیں کہ قناعت و توکل کی دولت نصیب ہو جائے رضائے الٰہی کی سعادت ملے، رزق میں برکت، قلب میں وسعت و حوصلہ، عادات و اطوار میں تہذیب و شائستگی اور علم و عمل کی توفیق حاصل ہو۔

واضح رہے کہ یہ تینوں لفظ طیب۔ طاب اور تبوات بطور خبر نقل ہوئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو حق تعالیٰ کی طرف سے مذکورہ چیزوں کے حاصل ہو جانے کی خوشخبری دی جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ یہ تینوں لفظ دعائیہ جملہ کے طور پر منقول ہوں، اس صورت میں ان الفاظ کے معنی یہ ہوں گے کہ تیری زندگی کو خوشی و راحت نصیب ہو، تیرا راہ چلنا مبارک ثابت ہو اور تجھے جنت میں اعلیٰ مقام حاصل ہو۔

جس شخص سے محبت و تعلق قائم کرو اس کو اپنی محبت اور تعلق سے باخبر رکھو

(۱۲) وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَحَبَّ الرَّجُلُ اَخَاهُ فَلْيُخْبِرْهُ اَنَّهٗ يُحِبُّهٗ۔

(رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت مقدام ابن معدیکرب ؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب کوئی شخص اپنے کسی مسلمان بھائی سے دوستی و محبت رکھے تو چاہئے" کہ وہ اس مسلمان کو بتادے کہ وہ اس کو دوست و محبوب رکھتا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ جب اس مسلمان کو یہ معلوم ہوگا کہ فلاں شخص مجھ سے دوستی اور محبت رکھتا ہے تو وہ بھی اس سے دوستی و محبت رکھے گا اور دوستی کے حقوق ادا کرے گا نیز اس کے حق میں دعا گو و خیر خواہ رہیگا۔

(۱۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ مَرَّ رَجُلٌ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعِنْدَهُ نَاسٌ فَقَالَ رَجُلٌ مِمَّنْ عِنْدَهُ اِنِّيْ لَاُحِبُّ هٰذَا لِلّٰهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْلَمْتَهُ قَالَ لَا قَالَ قُمْ اِلَيْهِ فَاَعْلِمْهُ فَقَامَ اِلَيْهِ فَاَعْلَمَهُ فَقَالَ اَحَبَّكَ الَّذِيْ اَحْبَبْتَنِيْ لَهُ قَالَ ثُمَّ رَجَعَ فَسَأَلَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَهُ بِمَا قَالَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْتَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلَكَ مَا احْتَسَبْتَ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَفِيْ رِوَايَةِ التِّرْمِذِيِّ الْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ وَلَهُ مَا اكْتَسَبَ۔

"اور حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ کے سامنے سے ایک شخص گزرا جب کہ آپ ﷺ کے پاس بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے ان لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ یہ آدمی جو ابھی سامنے سے گزرا ہے اس سے محض خدا کی رضا و خوشنودی کے لئے محبت کرتا ہوں نبی کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ کیا تم نے اس کو بتادیا ہے کہ تم ان سے محبت رکھتے ہو؟ اس شخص نے کہا کہ نہیں! حضور ﷺ نے فرمایا۔ "تو اٹھو! اور اس کے پاس جاکر اس کو بتادو۔" چنانچہ وہ شخص (مجلس نبوی سے) اٹھ کر اس کے پاس گیا اور اس کو بتایا کہ میں تم سے محبت رکھتا ہوں! اس شخص نے (جواب میں بطور دعا) کہا کہ وہ ذات (یعنی اللہ تعالیٰ) تم سے محبت کرے جس کی رضا و خوشنودی کی خاطر تم مجھ سے محبت کرتے ہو! حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ پھر وہ شخص لوٹ کر آیا، تو نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ اس شخص نے جواب میں کیا کہا ہے؟ اس نے آنحضرت ﷺ کو اس کا وہ جواب بتایا جو اس نے دیا تھا حضور ﷺ نے فرمایا۔ "(آخرت میں) اس شخص کے ساتھ ہوگے جس سے تم محبت رکھتے ہو اور تم (محبت رکھنے بلکہ ہر عمل میں) اس چیز پر اجر و جزاء پاؤ گے جس کی اللہ تعالیٰ کے لئے نیت کروگے۔" (بیہقیؒ) اور ترمذیؒ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (آدمی اس شخص کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہے اور اس کو اس چیز پر اجر ملے گا جس کو وہ بہ نیت ثواب اختیار کرے گا۔"

تشریح: "احتساب" کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھنا اور حسبہ اس لفظ کا اسم ہے اور اصل میں یہ لفظ "حساب" سے نکلا ہے جس کے معنی گننے، شمار کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی رضا و خوشنودی کی خاطر کسی سے محبت کرنا ایسا فعل ہے جو اگر ثواب کی نیت سے ہو تو وہ حساب میں آتا ہے یعنی اس پر اجر مرتب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ محبت کرنے والے کو اس کی نیت کے مطابق ثواب عطا کرتا ہے۔

دشمنان دین اور بدکاروں کے ساتھ محبت و ہمنشینی نہ رکھو

(۱۴) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ اَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تُصَاحِبْ اِلَّا مُؤْمِنًا وَلَا يَاْكُلْ طَعَامَكَ اِلَّا تَقِيٌّ۔

(رواہ الترمذی والبوداؤد والدارمی)

"اور حضرت ابوسعید ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "مسلمان کے علاوہ اور کسی (کافر و مشرک) کو اپنا ہم نشین اور دوست نہ بناؤ۔ (یا یہ مراد ہے کہ نیکوکار مسلمان کے علاوہ کسی فاسق و بدکار سے دوستی مت کرو! اس مراد کا قرینہ وہ جملہ ہے جو آگے فرمایا کہ) تمہارا کھانا پرہیزگار و نیکوکار کے علاوہ اور کوئی نہ کھائے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، دارمیؒ)

تشریح: ارشاد گرامی ﷺ کے آخری جملہ کا یہ مطلب بھی ہے کہ تمہیں چاہئے کہ تم اپنی روزی حلال و جائز وسائل و ذرائع سے حاصل کرو

تاکہ وہ نیک و پرہیزگار مسلمانوں کے کھانے کے قابل ہو اور یہ مطلب بھی ہے کہ تمہیں چاہئے کہ تم اپنا کھانا (دعوت کی صورت میں) صرف متقی و پرہیزگار مسلمانوں کو کھلاؤ تاکہ اس کھانے کے ذریعہ انہیں عبادت خداوندی اور نیک کام کرنے کی طاقت حاصل ہو۔ غیر متقی اور بدکار لوگوں کو اپنا کھانا نہ کھلاؤ کہ جس سے ان کو گناہ کرنے کی طاقت حاصل ہو۔

آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو دشمنان دین اور بدکار لوگوں کے ساتھ صحبت و ہم نشینی اور ہم پیالہ و ہم نوالہ ہونے سے اس لئے منع فرمایا ہے تاکہ ان سے الفت و محبت قائم ہونے کا سبب پیدا نہ ہو اور ان کی صحبت و ہم نشینی کی وجہ سے کفر و شرک اور بدکاری و برائیوں کے جراثیم سرایت نہ کریں۔

علماء نے لکھا ہے کہ صرف متقی اور پرہیزگاروں کو کھانا کھلانے کے حکم کا تعلق محض دعوت طعام اور تقاریب سے ہے۔ ضرورتمندی و احتیاج کی صورت اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ کسی بھوکے اور محتاج کو کھانا کھلانے کے لئے کسی قسم کا امتیاز روا نہیں ہے! یہ بات اس آیت کریمہ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا سے بھی ثابت ہے کیونکہ اس آیت میں دوسرے ضرورتمندوں کے ساتھ جن اسیروں کا ذکر کیا گیا ہے وہ کافر تھے لہٰذا معلوم ہوا کہ رفع حاجت یعنی بھوک سے بچانے کے لئے کافر کو کھلانا جائز ہے۔

دوست بناتے وقت یہ دیکھ لو کہ کس کو دوست بنا رہے ہو

⑮ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَرْءُ عَلٰى دِيْنِ خَلِيْلِهٖ فَلْيَنْظُرْ اَحَدُكُمْ مَنْ يُّخَالِلُ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَ قَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ وَقَالَ النَّوَوِيُّ اِسْنَادُهٗ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے (یعنی جو شخص کسی کو دلی دوست بناتا ہے تو عام طور پر اس کے عقائد و نظریات اور اس کے عادات و اطوار کو قبول و اختیار کرتا ہے) لہٰذا یہ ضروری ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی کو دوست بنائے تو دیکھ لے کہ کس کو دوست بنا رہا ہے (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، بیہقیؒ) ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور نوویؒ نے کہا ہے اس روایت کی اسناد صحیح ہے۔"

تشریح: حدیث میں جس دوستی کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد دلی اور سچی دوستی ہے نہ کہ ظاہرداری اور خوش اخلاقی، کیونکہ ظاہرداری اور خوش اخلاقی کے تعلقات ضرورت کی بنا پر ہر ایک کے ساتھ استوار کئے جا سکتے ہیں البتہ دلی اور سچی دوستی صرف انہی لوگوں کے ساتھ کرنی چاہئے جن کے عقائد و نظریات صالح ہوں اور جن کے اعمال اور عادات و اطوار پاکیزہ ہوں چنانچہ اس بارے میں قرآن کی ہدایت بھی یہی ہے کہ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ۔

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سچوں کے ساتھ رہو!"

حضرت امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ حریص کی ہم نشینی و مخالطت حرص کا ذریعہ بنتی ہے اور زاہد کی ہم نشینی و مخالطت دنیا سے بے رغبتی پیدا کرتی ہے کیونکہ صحبت و اختلاط کا اثر قبول کرنا اور اپنے ہمنشین و مصاحب کی مشابہت و پیروی اختیار کرنا انسانی طبیعت و جبلت کا خاصہ ہے۔

حدیث کے آخر میں مؤلف مشکوٰۃ جو طویل عبارت لائے ہیں اس کا مقصد ان لوگوں کے خیال کی تردید کرنا ہے جو اس حدیث کو موضوع کہتے ہیں۔

کسی سے بھائی چارہ قائم کرو تو اس کا اور اس کے ماں باپ و قبیلہ کا نام معلوم کرلو

⑯ وَعَنْ يَزِيْدِبْنِ نُعَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اٰخَى الرَّجُلُ الرَّجُلَ فَلْيَسْئَلْهُ عَنْ اِسْمِهٖ وَاسْمِ اَبِيْهِ وَمِمَّنْ هُوَ فَاِنَّهٗ اَوْصَلُ لِلْمُوَدَّةِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت یزید ابن نعامہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔"..... جب کوئی شخص کسی سے بھائی چارہ قائم کرے تو چاہئے کہ وہ اس سے اس کا اور اس کے باپ کا نام دریافت کرلے اور پوچھ لے کہ وہ کس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ یہ دریافت کرنا دوستی اور تعلق کو بہت زیادہ مضبوط بنانے کا ذریعہ ہوگا۔" (ترمذی)

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

خدا کے لئے کسی سے محبت یا نفرت کرنے کی فضیلت

⑰ عَنْ اَبِىْ ذَرٍّ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَتَدْرُوْنَ اَىُّ الْاَعْمَالِ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى قَالَ قَائِلٌ الصَّلٰوةُ وَالزَّكٰوةُ وَقَالَ قَائِلٌ اَلْجِهَادُ قَالَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَبَّ الْاَعْمَالِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى اَلْحُبُّ فِى اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِى اللّٰهِ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَرَوٰى اَبُوْدَاوُدَ اَلْفَصْلُ الْاَخِيْرَ۔

"حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ (اپنے حجرہ مبارک سے) نکل کر (مسجد نبوی میں) ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو، اللہ کے نزدیک بہت پیارا عمل کونسا ہے؟ کسی کہنے والے نے کہا کہ نماز یا زکوٰۃ اور ایک کہنے والے نے یہ کہا کہ جہاد! حضور ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت پیارا عمل خدا کی رضا و خوشنودی کی خاطر کسی سے محبت کرنا اور خدا کی رضا و خوشنودی کی خاطر کسی سے بغض و نفرت رکھنا ہے۔" (احمدؒ اور ابوداؤدؒ نے اپنی روایت میں حدیث کا صرف آخری جزو یعنی اِنَّ اَحَبَّ لْاَعْمَالِ الخ نقل کیا ہے۔"

تشریح: لفظ وَالزَّكٰوةُ میں حرف واؤ معنی کے اعتبار سے اَوْ کی جگہ استعمال ہوا ہے، یا مفہوم کے اعتبار سے الصلوۃ کے بعد کی عبارت گویا یوں ہے وَقَالَ قَائِلُ الزَّكٰوةَ (اور کسی کہنے والے نے کہا کہ زکوٰۃ) حدیث میں آنحضرت ﷺ کے سوال، صحابہؓ کے جواب اور پھر آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا جواب اور پھر آنحضرت کے ارشاد کا جو اسلوب نقل کیا گیا ہے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کا درجہ نماز، زکوٰۃ اور جہاد سے بھی بڑا ہے جبکہ حقیقت یہ نہیں ہے کیونکہ نماز و زکوٰۃ اور جہاد، وہ اعمال ہیں جو بلاشک وشبہ تمام اعمال سے افضل واعلیٰ ہیں، اس صورت میں یہاں جو اشکال واقع ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص حقیقی معنی میں کسی سے اللہ کی رضا و خوشنودی کی خاطر محبت و تعلق رکھے گا وہ یقیناً انبیاء و علماء اور اولیاء اللہ سے سچی محبت و عقیدت رکھے گا۔ تو ظاہر ہے کہ وہ یقیناً ان کی اتباع و پیروی بھی کریگا۔ بایں طور کہ نماز بھی پڑھے گا اور زکوٰۃ دیگا۔ اسی طرح جو شخص کسی سے اللہ کی رضا و خوشنودی کی خاطر بغض و نفرت رکھے گا تو وہ یقیناً دشمنان دین سے دشمنی اور عداوت رکھے گا۔ اور جب وہ ان سے دشمنی و عداوت رکھے گا تو ظاہر ہے کہ وہ ان کی بیخ کنی، جہاد فی سبیل اللہ اور دین کی سربلندی کی سعی و کوشش کرے گا۔ لہٰذا حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کے ضمن میں ساری طاعتیں آجائیں گی خواہ وہ نماز و زکوٰۃ ہو یا جہاد وغیرہ ان میں سے کوئی بھی چیز اس عمل سے باہر نہیں رہے گی اس اعتبار سے حضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ دین کی اصلی بنیاد اور اعمال و طاعات کا مدار حب فی اللہ اور بغض فی اللہ پر ہے جس شخص نے اس درجہ کو حاصل کرلیا اس کے لئے تمام عبادات و طاعات کو اختیار کرنا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔

یا اس ارشاد گرامی ﷺ سے مراد یہ ہے کہ قلبی اعمال میں سب سے افضل عمل حب فی اللہ اور بغض فی اللہ ہے اور بدنی اعمال میں سب سے افضل عمل نماز، روزہ، زکوٰۃ اور جہاد ہیں، اس صورت میں کوئی اشکال پیدا نہیں ہوگا۔ اور یا یہ مراد ہے کہ شریعت نے جن امور کو

اختیار کرنے کا حکم دیا ہے ان پر عمل کرنے کے بعد اور شریعت نے جن امور سے باز رکھا ہے ان سے اجتناب کرنے کے بعد (یعنی فرائض و واجبات کی تکمیل کے بعد) حب فی اللہ اور بغض فی اللہ سب سے افضل عبادت ہے اور سب سے کامل طاعت ہے اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ

اجب الاعمال الی اللہ بعد الفرائض ادخال السرور فی قلب المؤمن۔

"فرائض کے بعد جو عمل خدا کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ ہے وہ کسی مؤمن کے دل کو خوشی و مسرت سے بھرنا ہے۔"

(۱۸) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَحَبَّ عَبْدٌ عَبْدًا لِلّٰهِ اِلَّا اَكْرَمَ رَبَّهٗ عَزَّوَجَلَّ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس بندے نے کسی بندے سے محض اللہ کی رضا و خوشنودی کی خاطر محبت و دوستی رکھی تو اس نے درحقیقت اپنے پروردگار عزوجل کی تعظیم و تکریم کی۔" (احمدؒ)

بہتر لوگ کون ہیں؟

(۱۹) وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ يَزِيْدَ اَنَّهَا سَمِعَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِخِيَارِكُمْ قَالُوْا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ خِيَارُكُمُ الَّذِيْنَ اِذَا رُءُوْا ذُكِرَ اللّٰهُ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت اسماء بنت یزیدؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں بہترین لوگ کون ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہاں! ضرور بتائیے حضور ﷺ نے فرمایا۔ "تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جن کو دیکھ کر خدا یاد آجائے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: باب حفظ اللسان میں تیسری فصل میں یہ حدیث مع ترجمہ و شرح نقل کی جاچکی ہے۔

خدا کے لئے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت

(۲۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اَنَّ عَبْدَيْنِ تَحَابَّا فِی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَاحِدٌ فِی الْمَشْرِقِ وَاٰخَرُ فِی الْمَغْرِبِ لَجَمَعَ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَقُوْلُ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتَ تُحِبُّهٗ فِیَّ۔

"اور حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اگر دو بندے محض خدا کی رضا و خوشنودی کی خاطر آپس میں محبت رکھیں اور خواہ ان میں سے ایک مشرق میں ہو اور دوسرا مغرب میں تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے دن یکجا کر دیگا (تاکہ وہ ایک دوسرے کی شفاعت کریں یا جنت میں ایک دوسرے کے ساتھ رہیں۔) نیز اللہ تعالیٰ (فرشتے کی زبانی یا براہ راست خود ان میں سے ہر ایک سے فرمائے گا کہ یہ بندہ وہ ہے کہ جس سے تو میری خاطر محبت رکھتا تھا۔"

دنیا آخرت کی بھلائی حاصل کرنے کے ذرائع

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ رَزِيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰى مِلَاكِ هٰذَا الْاَمْرِ الَّذِیْ تُصِيْبُ بِهٖ خَيْرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ عَلَيْكَ بِمَجَالِسِ اَهْلِ الذِّكْرِ وَاِذَا خَلَوْتَ فَحَرِّكْ لِسَانَكَ مَا اسْتَطَعْتَ بِذِكْرِ اللّٰهِ وَاَحِبَّ فِی اللّٰهِ وَاَبْغِضْ فِی اللّٰهِ يَا اَبَا رَزِيْنٍ هَلْ شَعَرْتَ اَنَّ الرَّجُلَ اِذَا خَرَجَ مِنْ بَيْتِهٖ زَائِرًا اَخَاهُ شَيَّعَهٗ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ كُلُّهُمْ يُصَلُّوْنَ عَلَيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اِنَّهٗ وَصَلَ فِيْكَ فَصِلْهُ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تُعْمِلَ جَسَدَكَ فِیْ ذٰلِكَ فَافْعَلْ۔

"اور حضرت ابورزینؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ میں تمہیں اس امر یعنی دین کی جڑ نہ بتادوں جس کے ذریعہ تم دنیا وآخرت کی بھلائی حاصل کر سکو؟ (تو سنو) ان چیزوں کو تم اپنے پر لازم کر لو اہل ذکر کی مجالس میں بیٹھا کرو (تاکہ تمہیں بھی ذکر اللہ کی توفیق و سعادت نصیب ہو) جب تنہا ہو تو جس قدر ممکن ہو ذکر اللہ کے ذریعہ اپنی زبان کو حرکت میں رکھو یعنی لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر بھی ذکر اللہ کرو اور تنہائی میں بھی خدا کی یاد میں مشغول رہو (اگر تم کسی کو دوست رکھو تو) محض اللہ کی رضا و خوشنودی کے لئے دوست رکھو اور (جس کو دشمن رکھو تو) محض اللہ کی رضا و خوشنودی کے لئے اس سے بغض رکھو یعنی کسی سے تمہاری دوستی اور دشمنی کا معیار تمہاری اپنی ذات کی خواہشات یا کوئی دنیاوی نفع نقصان نہ ہونا چاہئے بلکہ اللہ کی رضا و خوشنودی کو معیار بناؤ جس کا مطلب یہ ہے کہ اسی شخص کو اپنا دلی دوست بناؤ جس کی دوستی سے خدا خوش ہوتا ہو اور اسی شخص سے دشمنی رکھو جس کی دشمنی سے خدا کی خوشنودی حاصل ہو۔ اور اے ابورزینؓ کیا تمہیں معلوم ہے؟ کہ جب کوئی شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کی زیارت وملاقات کے ارادہ سے گھر سے نکلتا ہے (اور اس مسلمان کے ہاں جاتا ہے۔) تو ستر ہزار فرشتے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں اور وہ (سب فرشتے) اس کے لئے دعا استغفار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پرودگار! اس شخص نے محض تیری رضا و خوشنودی کی خاطر (ایک مسلمان بھائی سے) ملاقات کی ہے تو اس کو اپنی رحمت و مغفرت کے ساتھ منسلک کر۔" پس (اے ابورزینؓ) اگر تمہارے لئے ان (مذکورہ) چیزوں میں اپنی جان کو لگانا (یعنی ان پر عمل کرنا) ممکن ہو تو ان چیزوں کو ضرور اختیار کرو۔"

خدا کے لئے محبت کرنے کا اجر

(۲۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كُنْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِی الْجَنَّةِ لَعُمُدًا مِنْ يَاقُوْتٍ عَلَيْهَا غُرَفٌ مِنْ زَبَرْجَدٍ لَهَا اَبْوَابٌ مُفَتَّحَةٌ تُضِیْءُ كَمَا تَضِیْءُ الْكَوْكَبُ الدُّرِّیُّ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ يَسْكُنُهَا قَالَ الْمُتَحَابُّوْنَ فِی اللّٰهِ وَالْمُتَجَالِسُوْنَ فِی اللّٰهِ وَالْمُتَلَاقُوْنَ فِی اللّٰهِ۔ رَوَى الْبَيْهَقِیُّ الْاَحَادِيْثَ الثَّلَاثَةَ فِیْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں رسول کریم ﷺ کے ساتھ تھا کہ آپ ﷺ فرمانے لگے "جنت میں یاقوت کے ستون ہیں جن پر زمرد کے بالاخانے بنے ہوئے ہیں ان کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور وہ بالاخانے اور ان کے دروازے اسی طرح روشن اور چمکتے ہیں جیسا کہ روشن ستارے چمکتے ہیں۔" صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ "یارسول اللہ (ﷺ)! ان میں لوگ رہیں گے"؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "وہ لوگ جو خدا کی رضا و خوشنودی کی خاطر آپس میں محبت رکھتے ہیں۔ خدا کی رضا و خوشنودی کی خاطر ایک دوسرے کی صحبت وہم نشینی اختیار کرتے ہیں۔ اور خدا کی رضا و خوشنودی کی خاطر آپس میں ملاقات کرتے ہیں۔" (ان تینوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

بَابُ مَا يُنْهٰی عَنْهُ مِنَ التَّهَاجُرِ وَالتَّقَاطُعِ وَاتِّبَاعِ الْعَوْرَاتِ

ممنوع چیزوں یعنی ترک ملاقات، انقطاع تعلق اور عیب جوئی کا بیان

"تہاجر" کے معنی ہیں ترک کرنا، کاٹنا اور "تقاطع" کے معنی بھی یہ ہیں، اس اعتبار سے لفظ "تقاطع" معنوی طور پر لفظ تہاجر کی وضاحت اور اس کے بیان کے لئے ہے۔ اور ان دونوں لفظوں سے مراد ہے ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ سلام وکلام اور ملنا جلنا چھوڑے رکھنا، صحبت وہمنشینی کے تعلق کو منقطع رکھنا اور اسلامی بھائی چارہ کو نظر انداز کرنا چونکہ ان امور کی ممانعت

علی الاطلاق نہیں ہے بلکہ بعض حالت میں اور بعض قیود کے ساتھ ان کو اختیار کرنا کوئی گناہ نہیں رکھتا اس لئے مذکورہ بالا عنوان میں یوں کہا گیا ماینھی عنہ من التھاجر و التقاطع۔

"عورات" عورت کی جمع ہے اور لغت میں عورت اس چیز کو کہتے ہیں جو شرم کی متقاضی ہو اور جس کے ظاہر ہونے کو کوئی شخص پسند نہ کرتا ہو بلکہ یہ چاہتا ہو کہ وہ چیز پوشیدہ رہے جیسا کہ کسی شخص میں کسی عیب اور نقصان کا ہونا۔ اس اعتبار سے اتباع عورت کا مطلب ہے کسی کی عیب جوئی کرنا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

تین دن سے زیادہ خفگی رکھنا جائز نہیں

(۱) وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَحِلُّ لِلرَّجُلِ اَنْ یَّھْجُرَ اَخَاہُ فَوْقَ ثَلٰثِ لَیَالٍ یَلْتَقِیَانِ فَیُعْرِضُ ھٰذَا وَیُعْرِضُ ھٰذَا وَخَیْرُھُمَا الَّذِیْ یَبْدَاُ بِالسَّلَامِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "یہ کسی شخص کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے مسلمان بھائی سے ملنا جلنا چھوڑے رکھے اور صورت یہ ہو کہ (جب وہ کہیں ایک دوسرے کے سامنے آئیں تو) یہ اپنا منہ ادھر کو پھیر لے اور وہ اپنا منہ دوسری طرف پھیر لے (یعنی دونوں ہی ایک دوسرے سے سلام و کلام اور ملاقات سے احتراز کریں) اور ان دونوں میں بہتر شخص وہ ہے جو (خفگی کو دور کرنے کے لئے اور بحالی تعلقات کی خاطر) سلام میں پہل کرے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "تین دن سے زیادہ" کی قید کی بناء پر یہ سمجھا گیا ہے کہ اگر کسی وجہ سے اظہار خفگی کی خاطر تین دن تک ملنا جلنا چھوڑے رکھا جائے تو یہ حرام نہیں ہے کیونکہ انسان کی طبیعت میں غیظ و غضب، غیرت و حمیت اور تندی و بے صبری کا جو مادہ ہے وہ بہرحال اپنا اثر ضرور ظاہر کرتا ہے اس لئے اس قدر مدت معاف کردی گئی ہے تاکہ انسان کے ان جذبات کی بھی کچھ تسکین ہو جایا کرے اور اس تین دن کے عرصہ میں خفگی و ناراضگی اور بغض و نفرت کے جذبات بھی ختم ہو جائیں یا کم سے کم ہلکے پڑ جائیں اور صلح و صفائی ہو جائے۔

بہرحال حدیث کی مراد یہ ہے کہ اجتماعی طور پر ایک جگہ رہنے سہنے اور روزمرہ کے باہمی معاملات کی وجہ سے آپس میں نزاع ہو جایا کرتا ہے۔ اور ایک دوسرے سے کوئی شکایت پیدا ہو جانے کی وجہ سے خفگی و ناراضگی کی صورت پیش آجاتی ہے مثلاً ایک شخص نے کسی کی غیبت کر دی۔ اس کو برا بھلا کہہ دیا اور یا اس کو اس شخص سے خیر خواہی کی امید تھی مگر اس نے خیر خواہی نہیں کی۔ تو اس طرح کی صورتوں میں اگر آپس میں ناراضگی و خفگی ہو جائے اور ترک ملاقات کی نوبت آجائے تو اس خفگی اور ترک ملاقات کو تین دن سے زیادہ نہیں رہنے دینا چاہئے۔ ہاں اگر ترک موالات کسی دینی معاملہ کی وجہ سے ہو جیسے کوئی شخص خواہشات نفسانی کا غلام بن گیا ہو یا کوئی شخص بدعتی ہو تو اس سے ترک ملاقات اس وقت تک جائز ہے۔ جب تک کہ وہ توبہ کر کے راہ راست اختیار نہ کرے۔ اور حق کی طرف رجوع نہ کرے۔

سیوطیؒ نے موطا کے حاشیہ میں ابن عبدالبرؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کسی شخص کو یہ خوف ہو کہ اگر میں فلاں آدمی سے سلام کروں اور اس سے ملنا جلنا رکھوں تو ان کی وجہ سے مجھے دینی یا دنیاوی نقصان برداشت کرنا پڑے گا اور میرا قیمتی وقت لایعنی امور میں ضائع ہوگا کہ وہ اس شخص سے کنارہ کشی اختیار کرے اور اس سے دور رہنے کی کوشش کرے لیکن یہ کنارہ کشی اور دوری اختیار کرنا اچھے انداز میں ہونا چاہئے۔ یہ نہیں کہ اس کی غیبت کی جائے۔ اس پر عیب لگائے جائیں اور اس کے تئیں کینہ و عداوت کو ظاہر کیا جائے۔

آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ کے زمانہ کے ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جن میں مسلمانوں کا دینی مصالح کے پیش نظر ایک دوسرے سے تین دن سے زیادہ بھی ترک ملاقات کئے رہنا ثابت ہے چنانچہ احیاء العلوم میں صحابہؓ وغیرہ کی ایک جماعت کے بارے میں منقول ہے

کہ ان میں سے بعض مرتے دم تک ترک ملاقات پر قائم رہے ان تین صحابہؓ کا واقعہ تو بہت مشہور ہے جو غزوۂ تبوک میں نہیں گئے تھے اور آنحضرت ﷺ نے ان میں نفاق کی راہ پا جانے کے خدشہ سے ان کو تمام مسلمانوں سے الگ تھلگ کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے تمام صحابہؓ، ان تینوں کی ازواج اور ان کے عزیز و اقارب کو ان سے ترک ملاقات اور ترک سلام و کلام کا حکم دیا تھا، یہ حکم اور اس پر عمل پچاس ۵۰ دنوں تک جاری رہا، خود آنحضرت ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مہینہ تک اپنی ازواج مطہراتؓ سے ملنا جلنا چھوڑے رکھا تھا، حضرت عائشہؓ نے ایک مدت تک حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ سے ترک ملاقات اختیار رکھی اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنے بیٹے حضرت بلالؒ سے ایک دینی معاملہ میں اس درجہ ناراض ہوئے کہ ان سے بات چیت کرنا چھوڑ دی تھی۔ غرضیکہ ایسے بہت سے واقعات منقول ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دینی معاملات میں خفگی و ناراضگی تین دن سے زیادہ بھی جاری رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ نیت صادق رکھی جائے اور اس میں کسی نفسانی خواہش اور دنیاوی غرض کا دخل نہ ہو۔

"جو سلام کے ذریعہ ابتداء کرے" کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں میں سے جو شخص خفگی و ناراضگی کو ختم کرنے کے لئے پہلے سلام کریگا۔ اس کا درجہ دوسرے کے مقابلہ پر بڑا ہوگا۔ نیز اس میں اسی طرف بھی اشارہ ہے کہ سلام میں پہل کرنا ترک ملاقات کے گناہ کو زائل کر دیتا ہے اور یہ کم سے کم ترک سلام کو تو ختم کر ہی دینا چاہئے۔ تاکہ اخوۃ اسلامی کا یہ بنیادی حق ضائع نہ ہونے پائے۔

ان باتوں سے ممانعت جن سے معاشرہ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی فاسد ہوتی ہے

(۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ وَلَا تَحَسَّسُوْا وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا تَنَاجَشُوا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَکُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا وَفِیْ رِوَایَةٍ وَلَا تَنَافَسُوْا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بدگمانی قائم کرنے سے اجتناب کرو۔ کیونکہ بدگمانی باتوں کا سب سے بدتر جھوٹ ہے (اپنے سے غیر متعلق امور اور بلا ضرورت دوسروں کے احوال کی) ٹوہ میں نہ رہو کسی کی جاسوسی نہ کرو کسی کے سودے نہ بگاڑو، آپس میں حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو اور سارے مسلمان خدا کے بندے اور ایک دوسرے کے بھائی بن کر رہو۔" اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپس میں حرص نہ کرو۔" (بخاری و مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان کا معاشرہ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بھاؤ سے براہ راست تعلق ہے ان باتوں سے اگر اجتناب کیا جائے تو معاشرہ میں پھیلنے والی بہت سی خرابیوں سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

بدگمانی کو باتوں کا سب سے بدتر جھوٹ فرمایا گیا ہے چنانچہ جب کوئی شخص کسی کے بارے میں بدگمانی کرتا ہے تو وہ یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ شخص ایسا ایسا ہے اور چونکہ وہ شخص حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا اس لئے اس فیصلہ کو جھوٹ ہی کہا جائے گا۔ واضح رہے کہ "باتوں" سے مراد وہ باتیں ہیں جو نفس پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں وہ شیطان کی طرف سے نفس میں ڈالی جاتی ہیں۔ اسی اعتبار سے بدگمانی کو "بدترین جھوٹ" کہا گیا ہے یا یہ کہ اس کو "بدترین جھوٹ" کا نام دینا گویا اس کی برائی کو زیادہ سے زیادہ کر کے بیان کرنا مقصود ہے! قرآن کریم میں یوں فرمایا گیا ہے۔ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ چنانچہ ان الفاظ میں جس ظن کو گناہ قرار دیا گیا ہے اس سے بدگمانی مراد ہے اور جیسا کہ علماء نے وضاحت کی ہے جس سے بدگمانی کے بارے میں ممانعت منقول ہے۔ اس سے وہ بدگمانی مراد ہے جو ذہن میں بیٹھ جائے اور اس پر یقین کر لیا وہ بدگمانی مراد نہیں ہے جو محض خیال کے طور پر دل میں گزر جائے اور بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ "بدگمانی" گناہ گار اس وقت کرتی ہے جب کہ اس کا ذکر کیا جائے اور اس کو زبان پر لایا جائے۔ نیز بہر صورت اس بدگمانی کے موجب گناہ ہونے کی شرط یہ بھی ہے کہ اس بدگمانی

کو قائم کرنے کے لئے کوئی معقول وجہ اور دلیل نہ ہو یا اگر بدگمانی کی بھی معقول وجہ اور دلیل ہو تو بدگمانی نہ کرنے کی بھی کوئی معقول وجہ اور دلیل ہو اور دونوں دلیلیں باہم متعارض ہوں، ہاں اگر اس بدگمانی کو درست ثابت کرنے کے لئے کوئی ایسا واضح قرینہ اور معقول دلیل ہو جس کو تسلیم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ ہو تو ایسی بدگمانی پر مواخذہ نہیں ہوگا۔ اور نہ اس کو حقیقی معنی میں "بدگمانی" کہیں گے۔

تحسس اور تجسس (یعنی ٹو اور جاسوسی) بظاہر ایک ہی مفہوم کے حامل دو الفاظ ہیں لیکن علماء نے کئی وجوہ سے ان دونوں کے درمیان فرق ظاہر کیا ہے اس سلسلے میں مختلف اقوال منقول ہیں چنانچہ صاحب قاموس نے جیم کی فصل میں لکھا ہے کہ "تجسس" کے معنی ہیں خبروں کی تلاش میں رہنا جیسا کہ تحسس کے معنی ہیں اور "جاجوس" "وجس" اسی سے مشتق ہیں جن کے معنی ہیں ایسی پوشیدہ خبریں رکھنے والا جو اچھی نہ ہوں۔ پھر انہوں نے حاء کی فصل میں لکھا ہے کہ "حاسوس" کے وہی معنی ہیں جو جاسوس کے ہیں یا یہ کہ "حاسوس" خاص طور پر ایسی پوشیدہ خبریں رکھنے والے کو کہتے ہیں جو اچھی ہوں۔ بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ "تجسس" کے معنی ہیں اچھی خبروں کو ہوشیاری اور نرمی کے ساتھ دریافت کرنا اور "تحسس" کے معنی ہیں ان خبروں کو قوت حاسہ کے ذریعہ دریافت کرنا جیسے کوئی شخص کسی بات کو چوری چھپے سنتا اور دیکھتا ہے۔ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ "تجسس" کے معنی ہیں کسی شخص کی برائیوں اور عیوب کی تفتیش کرنا اور "تحسس" کے معنی ہیں ان برائیوں اور عیوب کو سننا۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "تجسس" کے معنی ہیں دوسروں کے لئے خبر کی ٹوہ میں رہنا اور "تحسس" کے معنی ہیں اپنے لئے کسی خبر کی ٹوہ لگانا! اور طیبیؒ نے یہ کہا ہے کہ اس ارشاد گرامی میں "تجسس" مراد ہے خود اپنے طور پر یا کسی کی مدد سے دوسرے لوگوں کے عیوب اور ان کے پوشیدہ ذاتی احوال و معاملات کی ٹوہ لگانا اور "تحسس" کے معنی ہیں کسی کی مدد کے بغیر خود اپنے طور پر ٹوہ لگانا! بہر حال اگر حدیث کی مراد لوگوں کے ایسے احوال و معاملات کی لگانے اور ایسی خبروں کی تلاش میں رہنے سے منع کرنا ہے جن کا تعلق عیب و برائی اور کردار و احوال کی کمزوریوں سے ہو تو اس کی ممانعت بالکل ظاہر ہے اور اگر اچھی خبر کی تلاش میں رہنے اور اچھے احوال و معاملات کی ٹوہ میں رہنے سے بھی منع کرنا مراد ہے تو اس صورت میں اس ممانعت کی وجہ یہ بیان کی جائے گی کہ ہو سکتا ہے کہ کسی کے بارے میں کوئی اچھی خبر پانے کے بعد اپنے اندر حسد کا جذبہ پیدا ہو جائے یا طمع و حرص جاگ اٹھے جو کوئی اچھی چیز نہیں ہے لہٰذا احتیاط اسی میں ہے کہ کسی کی اچھی خبر کی ٹوہ میں بھی نہ رہا جائے۔

وَلَا تناجشوا اس میں اصل لفظ "نجش" ہے جس کے اصل معنی ہیں شکار کو برانگیختہ کرنا! بعض حضرات نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ دوسروں کے مقابلہ پر اپنی عظمت و وقعت اور بڑائی کی طلب و خواہش کرنا اور بعض حضرات نے یہ معنی بیان کئے ہیں۔ کہ کسی کو دھوکا دینے کے لئے بکنے والی چیز کی چڑھا چڑھا کر تعریف کرنا یا مصنوعی خریدار بن کر بکنے والی چیز کی قیمت بڑھانا کہ تاکہ دوسرا شخص اس کے دیکھا دیکھی اس چیز کو اسی قیمت میں خرید لے یا کسی بکتی ہوئی چیز کی برائی کرنا تاکہ خریدار اس کو چھوڑ کر دوسری طرف ہو جائے، عام طور پر علماء نے حدیث میں اس لفظ کو اسی معنی پر محمول کیا ہے یعنی مذکورہ بالا طریقوں میں سے کسی بھی طریقے سے سودے کو بگاڑنا! بعض حضرات نے اس لفظ کے اصل معنی زعایت سے حدیث میں وَلَا تناجشوا کے یہ معنی مراد لئے ہیں کہ کسی کو کسی کی برائی اور خصومت پر نہ اکساؤ۔

وَلَا تحاسدوا (آپس میں حسد نہ کرو) کا مطلب یہ ہے کہ کسی غیر ظالم کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر اس کے زوال کی آرزو نہ کرو یا یہ خواہش و آرزو نہ رکھو کہ وہ نعمت اس کے پاس سے ہٹ کر تمہارے پاس آجائے۔

وَلَا تباغضوا (ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو کا مطلب یہ ہے کہ ایسے اسباب کو پیدا کرنے سے احتراز کرو جو بغض و نفرت کو لازم کرتے ہیں! یہ وضاحت اس بناء پر ہے کہ جس طرح محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو خود بخود پیدا ہوتا ہے اسی طرح بغض و نفرت بھی پیدائشی ہیں کہ اس جذبہ کے پیدا ہونے یا نہ ہونے میں کسی شخص کا کوئی اختیار نہیں ہے البتہ انسان اپنے آپ کو ایسے اسباب سے محفوظ رکھنے پر یقیناً قادر ہو سکتا ہے جن سے باہمی بغض و نفرت پیدا ہو سکتی ہو بعض حضرات لا تباغضوا کے یہ معنی بیان کئے ہیں۔ کہ شرعی احکام و مسائل میں خواہشات نفسانی کی بناء پر آپس میں اختلاف و انتشار پیدا نہ کرو اور خود ساختہ افکار و نظریات کو دین میں شامل نہ کرو۔ کیونکہ دین میں

بدعت اختیار کرنا اور راہ مستقیم سے گمراہ ہو ناوہ اسباب ہیں جو مسلمانوں کے درمیان ایک دوسرے سے بغض و نفرت پیدا کرتے ہیں لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حدیث میں ایک دوسرے سے بغض رکھنے کی ممانعت کا اصل مقصد باہمی محبت والفت کے حکم کو موکد کرتا ہے اور محبت والفت کے اس حکم کا تعلق علی الاطلاق مسلمانوں کی پوری زندگی سے ہے البتہ جس محبت والفت سے دین میں خلل پڑتا ہو اس صورت میں محبت کو جائز قرار نہیں دیا جائے گا، بلکہ دین کو نقصان پہنچانے والے شخص سے بغض و نفرت ہی رکھنا جائز ہو گا حاصل یہ کہ آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد گرمی کے ذریعہ تمام مسلمانوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ وہ خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لئے محبت واتحاد کی زنجیر میں منسلک رہیں جو ارشاد خداوندی کا بھی تقاضا ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔

"اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کی رسی کو اس طور پر کہ باہم سب متفق رہیں اور باہم نااتفاقی مت کرو۔"

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محبت والفت، اتحاد کی بنیاد ہے۔ اور بغض نفرت، افتراق وانتشار کا ذریعہ ہے لہٰذا فرمایا گیا کہ تم ایک دوسرے سے بغض و نفرت نہ رکھو۔

بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ لا تباغضوا کے معنی یہ ہیں کہ تم مسلمانوں کے درمیان عداوت ودشمنی پیدا نہ کرو! اس صورت میں مذکورہ ممانعت کا تعلق گویا چغل خوری سے ہو گا۔ کیونکہ چغل خوری سے فساد کی بنیاد پڑتی ہے اور ایک دوسرے سے عداوت ودشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔

وَلَا تدابروا کا مطلب یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے برائی بیان کرو! اور طیبیؒ نے کہا ہے کہ تدابر سے مراد تقاطع (ترک ملاقات) ہے اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ ایک دوسرے سے ملنا جلنا چھوڑو! اس معنی کو مذکورہ جملہ سے لفظی مناسبت بایں طور ہے کہ ترک ملاقات کرنے والوں میں سے ہر ایک دوسرے سے پیٹھ پھیر لیتا ہے اور اسلام کے بتائے ہوئے باہمی حقوق کی ادائیگی سے گریز کرتا ہے۔

و کونوا عباد اللّٰہ اخوانا کا مطلب یہ ہے کہ تم سب اللہ کے ایک بندے ہو اور عبودیت میں سب برابر ہو نیز تم سب اخوۃ کی ایک زنجیر سے منسلک ہو، لہٰذا تمہاری اس حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسرے کے درمیان حسد، بغض اور غیبت جیسی برائیوں کو حائل کرنے کے اپنے دلوں میں افتراق اور اپنی صفوں میں انتشار پیدا نہ کرو۔ بلکہ اپنے مرتبہ عبودیت پر اتحاد و یکجہتی کے ساتھ قائم رہو اور آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔

وَلَا تنافسوا (آپس میں حرص نہ کرو) میں لفظ تنافس لغوی طور پر تحاسد (ایک دوسرے سے حسد کرنے) کے معنی کے قریب ہے لیکن احتمال یہ رہے کہ تنافس کے معنی دنیا کی طرف میلان ورغبت رکھنا ہوں، اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ مجھے خدشہ ہے کہ تم پر دنیا کے دروازے کھول دیئے جائیں اور تنافس کرنے لگو۔ یعنی تم دنیا کی طرف راغب ہو جاؤ۔ اسی اعتبار سے ترجمہ میں (تنافس) کے معنی "آپس میں حرص کرنا" نقل کئے گئے ہیں۔

عداوت کی برائی

(۳) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُفْتَحُ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَيَوْمَ الْخَمِيْسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا اِلَّا رَجُلًا كَانَتْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ انْظُرُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "پیر اور جمعرات کے دن جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور پھر ہر اس بندے کی بخشش کی جاتی ہے جو خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو البتہ وہ شخص اس بخشش سے محروم رہتا ہے جو اپنے اور کسی

مسلمان بھائی کے درمیان عداوت رکھتا ہو اور فرشتوں سے کہا جاتا ہے ان دونوں کو جو آپس میں عداوت ودشمنی رکھتے ہیں مہلت دو تا آنکہ وہ آپس میں صلح وصفائی کرلیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: "جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ جنت کے طبقات ودرجات یا اس کے بالاخانے ان دونوں میں کھول دیئے جاتے ہیں کیونکہ ان دونوں دنوں میں حق تعالیٰ کی رحمت کثرت سے نازل ہوتی ہے جو بندوں کی مغفرت کا باعث ہوتی ہے (ملا علی قاریؒ)

اور شیخ عبدالحقؒ نے یہ لکھا ہے کہ دروازوں کا کھلنا دراصل اس بات سے کنایہ ہے کہ ان دو دنوں میں بندوں کو بہت زیادہ مغفرت سے نوزا جاتا ہے ان کے گناہ وجرائم سے درگزر کیا جاتا ہے اور انہیں ثواب کی کثرت اور بلندی درجات کی سعادت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ کو ان کے ظاہری معنی پر محمول کیا جائے کیونکہ نصوص (یعنی قرآن وحدیث میں منقول احکام) کو ان کے ظاہری مفہوم پر عمل کرنا واجب ہے۔ تا وقتیکہ کوئی ایسی واضح دلیل موجود نہ ہو، جس سے اس ظاہری مفہوم کے بجائے کوئی دوسرا مطلب مراد لیا جا سکتا ہے۔

"تا آنکہ وہ آپس میں صلح وصفائی کرلیں" یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کی مغفرت باہمی صلح وصفائی اور عداوت کے ختم ہوجانے پر موقوف رہتی ہے۔ خواہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے عداوت رکھتے ہوں۔ یا ان میں سے ایک عداوت رکھتا ہو اور دوسرا اس عداوت سے صاف ہو۔

④ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْرَضُ اَعْمَالُ النَّاسِ فِيْ كُلِّ جُمُعَةٍ مَرَّتَيْنِ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَيَوْمَ الْخَمِيْسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّؤْمِنٍ اِلَّا عَبْدًا بَيْنَهُ وَبَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ اتْرُكُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَفِيْئَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہر ہفتہ میں دوبار پیر اور جمعرات کے دن پروردگار کے حضور لوگوں کے عمل پیش کئے جاتے ہیں چنانچہ ہر مؤمن بندہ کی مغفرت کی جاتی ہے علاوہ اس بندہ کے جو اپنے اور کسی مسلمان کے درمیان عداوت رکھتا ہو ان کے بارے میں کہہ دیا جاتا ہے کہ ان دونوں کو مہلت دو تاکہ وہ رجوع کرلیں اور عداوت سے باز آجائیں۔" (مسلمؒ)

دروغ مصلحت آمیز

⑤ وَعَنْ اُمِّ كُلْثُوْمٍ بِنْتِ عُقْبَةَ بْنِ مُعَيْطٍ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِيْ يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ وَيَقُوْلُ خَيْرًا وَيَنْمِيْ خَيْرًا۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَزَادَ مُسْلِمٌ قَالَتْ وَلَمْ اَسْمَعْهُ تَعْنِي النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُرَخِّصُ فِيْ شَيْءٍ مِّمَّا يَقُوْلُ النَّاسُ كَذِبٌ اِلَّا فِيْ ثَلٰثٍ الْحَرْبُ وَالْاِصْلَاحُ بَيْنَ النَّاسِ وَحَدِيْثُ الرَّجُلِ امْرَاَتَهُ وَحَدِيْثُ الْمَرْاَةِ زَوْجَهَا وَذُكِرَ حَدِيْثُ جَابِرٍ اِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ اَيِسَ فِيْ بَابِ الْوَسْوَسَةِ۔

"اور حضرت اُمّ کلثوم بنت عقبہ ابن ابو معیطؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا "وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو (اپنی جھوٹی باتوں کے ذریعہ) لوگوں کے درمیان اصلاح کرے یعنی باہمی عداوت رکھنے والوں کے درمیان صلح وصفائی کرائے (آپس میں دشمنی رکھنے والوں میں سے ہر ایک سے) بھلی بات کہے (جو صلح کا باعث بنے) اور (ہر ایک کی طرف سے دوسرے کو) بھلی بات پہنچائے۔" (بخاری ومسلمؒ) اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ مزید نقل کئے گئے کہ حضرت اُمّ کلثوم نے کہا میں نے اس ذاتِ گرامی یعنی نبی کریم ﷺ سے ایسی کوئی بات نہیں سنی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ آپ ﷺ نے ان میں سے کسی بات کی اجازت دی ہو جس کو لوگ جھوٹ کہتے ہیں (یعنی آپ ﷺ نے کسی معاملہ میں جھوٹ بولنے کی کبھی اجازت نہیں دی) علاوہ تین باتوں کے (کہ ان میں جھوٹ بولنے کی اجازت عطا فرمائی) ایک تو جنگ کی حالت میں، دوسرے لوگوں کے درمیان صلح وصفائی کرانے میں اور تیسرے اس وقت جبکہ شوہر اپنی بیوی سے باتیں کر رہا ہو

اور بیوی اپنے شوہر سے باتیں کر رہی ہو۔" اور حضرت جابرؓ کی یہ روایت اِنَّ الشَّیْطَانَ قَدْ اَیِسَ الخ باب الوسوسہ میں نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: "بھلی بات پہنچائے"۔ یعنی صلح کرانے والا شخص دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کی طرف سے دوسرے فریق کو وہ بات پہنچائے جو حقیقت میں اس فریق نے نہ کہی ہو اور وہ بات اس طرح کی ہو جس سے دونوں کے درمیان صلح و دوستی کے جذبات پیدا کرنے میں مدد ملتی ہو مثلاً وہ دونوں فریق میں سے کسی کے پاس جائے اور اس سے یوں کہے کہ تم اس (دوسرے فریق) سے خواہ مخواہ کی عداوت رکھتے ہو، حالانکہ وہ تمہارا بڑا خیر خواہ ہے اور تمہارے حق میں اچھی بات کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کہتا اس نے تمہیں سلام کہا ہے اور تمہارے تئیں دوستی و خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

جنگ کی حالت میں جس جھوٹ بولنے کی اجازت ہے اس کا تعلق ایسی باتیں کہنے سے ہے جن سے مسلمانوں کی طاقت و قوت کا اظہار ہوتا ہو اپنے لشکر کے لوگوں کا حوصلہ بڑھتا ہو اور ان کے دل قوی ہوتے ہوں اور دشمن کے لشکر کا فریب کھا جانا ممکن ہو، اگرچہ وہ باتیں حقیقت کے بالکل خلاف ہی کیونکہ نہ ہوں، مثلاً یوں کہا جائے کہ ہمارے لشکر کی تعداد اتنی زیادہ ہے۔ کہ دشمن کا لشکر کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا اور ہمارے لشکر کی مدد کے لئے مزید کافی کمک آرہی ہے، یا اپنے سامنے کھڑے ہوئے دشمن سے یوں کہا جائے۔ کہ دیکھ سنبھل فلاں شخص تجھے ختم کر دینے کے لئے تیرے پیچھے آپہنچا ہے اور پھر جب وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے اور اس کا دھیان سامنے سے ہٹ جائے تو موقع سے فائدہ اٹھا کر اس پر وار کر دیا جائے۔

میاں بیوی کی باتوں میں جھوٹ کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً میاں بیوی سے یا بیوی میاں سے اپنے اتنے زیادہ پیار و محبت کا اظہار کرے جو حقیقت کے خلاف ہو اور اس سے مقصد یہ ہو کہ آپس میں محبت و الفت زیادہ بڑھے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

تین موقعوں پر جھوٹ بولنا جائز ہے

(۶) عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَحِلُّ الْكَذِبُ اِلَّا فِيْ ثَلٰثٍ كَذِبُ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ لِيُرْضِيَهَا وَالْكَذِبُ فِي الْحَرْبِ وَالْكَذِبُ لِيُصْلِحَ بَيْنَ النَّاسِ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"حضرت اسماء بنت یزیدؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جھوٹ بولنا جائز نہیں ہے علاوہ تین موقعوں کے ایک تو شوہر کا اپنی بیوی سے جھوٹ بولنا جس سے وہ خوش ہو جائے دوسرے کفار سے جنگ کی حالت میں اور تیسرے اس مقصد کے جھوٹ بولنا تاکہ لوگوں کے درمیان صلح و صفائی ہو جائے۔" (احمدؒ و ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث میں صرف شوہر کے جھوٹ بولنے کی اجازت کا ذکر ہے بیوی کے جھوٹ بولنے کا ذکر نہیں ہے جب کہ پچھلی حدیث میں دونوں کا ذکر ہے اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ راوی نے یہاں اختصار کی خاطر صرف شوہر کے بارے میں نقل کیا اور بیوی کے ذکر کو حذف کر دیا یہ کہ خود آنحضرت ﷺ نے اکثر و اغلب کا اعتبار کرتے ہوئے صرف شوہر ہی کا ذکر فرمایا کیونکہ عام طور پر عورتیں اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے زیادہ شکی اور بدگمان ہوا کرتی ہیں۔ اس لئے ان کی تسلی اور ان کو خوش رکھنے کی شوہر کو زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔

تین دن سے زیادہ خفگی نہ رکھو

(۷) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَكُوْنُ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَّهْجُرَ مُسْلِمًا فَوْقَ ثَلٰثَةٍ فَاِذَا لَقِيَهٗ سَلَّمَ عَلَيْهِ ثَلٰثَ مِرَارٍ كُلَّ ذٰلِكَ لَا يَرُدُّ عَلَيْهِ فَقَدْ بَاءَ بِاِثْمِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "کسی مسلمان کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ تین دن سے زیادہ کسی

مسلمان بھائی سے ملنا جلنا چھوڑے رکھے جب وہ اس مسلمان سے کہیں ملے جو اس سے خفا ہے اور اسے تین مرتبہ سلام کرے اور وہ ایک مرتبہ بھی جواب نہ دے تو وہ (جواب نہ دینے والا) اس کے گناہ کا وبال لے کر وہاں سے لوٹے گا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر وہ سلام کرنے والے کے سلام کا جواب نہیں دیگا تو ترک ملاقات کا گناہ اس کے سر پڑے گا یا تو وہ صرف اپنے گناہ میں مبتلا ہوگا یا سلام کرنے والے کا گناہ بھی اس پر ہوگا۔ حاصل یہ کہ سلام کرنے والا تو ترک ملاقات کے گناہ سے نکل آئے گا لیکن سلام کا جواب نہ دینے والے کی گردن پر بدستور رہے گا بلکہ سلام کا جواب نہ دینے کی وجہ سے سلام کرنے والے کا گناہ بھی اس پر ہوگا۔

ترک تعلّق کی حالت میں مرجانے والے کے بارے میں وعید

⑧ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ یَّهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلٰثٍ فَمَنْ هَجَرَ فَوْقَ ثَلٰثٍ فَمَاتَ دَخَلَ النَّارَ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ ترک ملاقات کرے لہٰذا جو شخص تین دن سے خواہ ایک ساعت بھی زیادہ ملنا جلنا چھوڑے رکھے اور پھر وہ (اسی حالت میں توبہ کئے بغیر) مجائے تو آگ میں جائے گا۔" (احمدؒ، ابوداؤدؒ)

ایک برس تک کسی مسلمان سے ملنا جلنا چھوڑے رکھنا بہت بڑا گناہ ہے۔

⑨ وَعَنْ اَبِیْ خِرَاشٍ السَّلَمِیِّ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ هَجَرَ اَخَاهُ سَنَةً فَهُوَ كَسَفْكِ دَمِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوخراش سلمیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے (ناراضگی کے ساتھ) اپنے مسلمان بھائی سے ایک سال تک ملنا جلنا چھوڑے رکھا اس نے گویا اس کا خون کیا یعنی طویل ترک ملاقات کا گناہ اور ناحق قتل کرنے کا گناہ قریب قریب ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تین دن کے بعد ناراضگی ختم کردو

⑩ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَحِلُّ لِمُؤْمِنٍ اَنْ یَّهْجُرَ مُؤْمِنًا فَوْقَ ثَلٰثٍ فَاِنْ مَرَّتْ بِهٖ ثَلٰثٌ فَلْیَلْقَهٗ فَلْیُسَلِّمْ عَلَیْهِ فَاِنْ رَدَّ عَلَیْهِ السَّلَامَ فَقَدِ اشْتَرَكَا فِی الْاَجْرِ وَاِنْ لَّمْ یَرُدَّ عَلَیْهِ فَقَدْ بَآءَ بِالْاِثْمِ وَ خَرَجَ الْمُسْلِمُ مِنَ الْهِجْرَةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ کسی مؤمن کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ کسی مؤمن سے تین دن سے زیادہ ملنا جلنا چھوڑے رکھے لہٰذا جب (ناراضگی کو) تین دن گزر جائیں تو چاہئے کہ (جس سے ملنا جلنا چھوڑ رکھا ہے) اس سے ملے اور اس کو سلام کرے اگر اس نے سلام کا جواب دے دیا تو پھر وہ دونوں (ملنے والے) ثواب میں شریک ہوں گے (کیونکہ پہلے کو تو سلام میں پہل اور ترک خفگی کی ابتداء کرنے کی وجہ سے ثواب ملے گا اور دوسرا سلام کا جواب دینے اور بحالی تعلقات کی پیش کش کو قبول کرنے کی وجہ سے ثواب کا حق دار ہوگا) اور اگر اس نے سلام کا جواب نہ دیا تو اس صورت میں وہ (سلام کا جواب نہ دینے والا) گناہ کے ساتھ لوٹے گا (یعنی اس پر ترک ملاقات اور سلام کا جواب نہ دینے کا گناہ ہوگا) اور سلام کرنے والا ترک ملاقات کے گناہ سے بری ہو جائے گا۔" (ابوداؤدؒ)

صلح کرانے کی فضیلت

(۱۱) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِاَفْضَلَ مِنْ دَرَجَۃِ الصِّیَامِ وَالصَّدَقَۃِ وَالصَّلٰوۃِ قَالَ قُلْنَا بَلٰی قَالَ اِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَیْنِ وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَیْنِ ھِیَ الْحَالِقَۃُ۔ رَوَاہُ اَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ۔

"اور حضرت ابودرداء کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "کیا میں تمہیں ایک ایسا عمل نہ بتادوں جس کے ثواب کا درجہ، روزے، صدقے اور نماز کے ثواب سے زیادہ ہے۔" ابودرداء کہتے ہیں کہ ہم نے یہ سن کر عرض کیا کہ ہاں (ضرور بتایئے) آپ ﷺ نے فرمایا۔ " آپس میں دشمنی رکھنے والے) دو شخصوں کے درمیان صلح کرانا۔ (اس کے بعد فرمایا) کہ اور دو آدمیوں کے درمیان فساد و نفاق پیدا کرنا ایک ایسی خصلت ہے جو مونڈنے والی ہے، (یعنی اس خصلت کی وجہ سے مسلمانوں کے معاملات اور دین میں نقصان و خلل پیدا ہوتا ہے اس روایت کو ترمذیؒ ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے اور کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے و الصدقہ میں حرف واؤ جمع کے لئے ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ صلح صفائی کرانا ان سب عبادات سے افضل ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ حرف واؤ مفہوم کے اعتبار سے او کے معنی میں ہو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ صلح صفائی کرانا ان عبادتوں میں سے افضل ہے۔ حدیث کا جو مقصد ہے یعنی آپس میں دشمنی رکھنے والوں کے درمیان صلح کرانے کی ترغیب دلانا اس کے پیش نظر پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

ملا علی قاریؒ نے بعض حضرات کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ حدیث میں صلح کرانے کو جو روزہ، صدقہ اور نماز سے افضل کہا گیا ہے تو یہاں فرض روزہ یا فرض صدقہ یا فرض نماز مراد نہیں ہے بلکہ نوافل مراد ہیں۔" اس کے بعد ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ میرا کہنا یہ ہے کہ ویسے تو یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ حقیقی مراد کیا ہے، لیکن اگر دو فریقوں کے درمیان پائی جانے والی دشمنی و عداوت کی نوعیت یہ ہو کہ اس کے نتیجہ میں لوگوں کی خونریزی، مال و اسباب کی غارتگری اور عزت و ناموس کی بے حرمتی کا ہونا یقینی امر ہو تو قیاس کہتا ہے کہ ایسی عداوت و دشمنی کو ختم کرانا اور دونوں فریقوں کے درمیان صلح صفائی کرانا مذکورہ فرض عبادات سے بھی افضل ہو کیونکہ اول تو یہ عبادات ایسا عمل ہیں جو کسی وقت چھوٹ جائیں تو ان کی قضا ہو سکتی ہے جب کہ اس عداوت و دشمنی کے نتیجہ میں ہلاک ہونے والی جانیں، تباہ و برباد ہونے والے مال و اسباب اور بے حرمت ہونے والی عزت و ناموس کی مکافات ممکن نہیں دوسرے یہ کہ ان عبادات کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور مذکورہ ہلاکت و تباہی کا تعلق حقوق العباد سے ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ بعض اعتبار سے.... پروردگار کے نزدیک حقوق اللہ سے زیادہ حقوق العباد کی اہمیت ہے لہٰذا اس حقیقت کی بناء پر یہ کہنا زیادہ صحیح ہو سکتا ہے کہ یہ جنس عمل کو ان عبادات پر جزوی فضیلت بہرحال حاصل ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ کہا جاتا ہے البشر خیر من الملک والرجل خیر من المراۃ یعنی انسان فرشتہ سے بہتر ہے اور مرد عورت سے بہتر ہے۔

"ذات البین" کے معنی ہیں وہ احوال جن میں لوگ باہمی طور پر مبتلا ہوں، جیسے بغض، عداوت اور جنگ وجدل وغیرہ اور "اصلاح" کے معنی ہیں ان احوال کو درست کرنا! اس اعتبار سے "اصلاح ذات البین" کا یہ مطلب ہوگا کہ اگر کچھ لوگ آپس میں برے حالات کا شکار ہوں مثلاً وہ ایک دوسرے کے بغض و عناد میں مبتلا ہو کر اور آپس کے لڑائی جھگڑے میں پھنس کر اپنے آپ کو فتنہ و فساد میں ڈالے ہوئے ہوں، تو ان کے بغض و عناد کو باہمی محبت و الفت میں بدلا جائے۔ اور ان کو فتنہ و فساد سے نکال کر صلح و آشتی کی طرف لایا جائے اس کے برخلاف "فساد ذات البین" ہے (یعنی فساد و نفاق پیدا کرنا" جس کو لفظ "حالقہ" سے تعبیر کیا گیا ہے! "حالقہ" اصل میں "حلق" سے ہے جس کے معنی ہیں بال مونڈنا اور حالقہ بال مونڈنے والی کو کہتے ہیں۔ یہاں اس لفظ سے مراد تباہ برباد کرنا اور جڑ سے اکھاڑنا ہے مطلب

یہ ہے کہ فساد ذات البین" یعنی لوگوں کے درمیان افتراق و انتشار کے فتنہ کا بیج بونا ایک ایسی خصلت ہے جو دین کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ اور ثواب کے حصول کو بالکل ختم کر دیتی ہے۔ جیسا کہ استرا بالوں کو جڑ سے صاف کر دیتا ہے، بہرحال اس ارشاد گرامی کا مقصد لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانے اور فتنہ و فساد کو مٹانے کی ترغیب دلانا اور لوگوں میں افتراق و انتشار پیدا کرنے سے متنفر کرنا ہے۔

حسد اور بغض کی مذمت

⑫ وَعَنِ الزُّبَيْرِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَبَّ اِلَيْكُمْ دَاءُ الْاُمَمِ قَبْلَكُمُ الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَةُ لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰكِنْ تَحْلِقُ الدِّيْنَ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت زبیرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "تم سے پہلے کی امتوں کی بیماری تمہارے اندر سرایت کر گئی ہے اور وہ بیماری حسد اور بغض ہے جو مونڈنے والی ہے اس سے میری مراد بالوں کو مونڈنا نہیں ہے بلکہ دین کو مونڈنا ہے (یعنی بغض یا حسد اتنی بری خصلت ہے کہ اس کی وجہ سے انسان کا دین و اخلاق تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ خصلت دین و دنیا دونوں کے لئے بڑی نقصان دہ ہے۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ)

حسد نیکیوں کو کھا جاتا ہے

⑬ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ يَاْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَاْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "حسد سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح لکڑیوں کو آگ کھا جاتی ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ جس طرح آگ اور لکڑی کا معاملہ ہے کہ آگ لکڑی کو جلا کر اس کا وجود مٹا دیتی ہے۔ اسی طرح حسد وہ خصلت ہے جو انسان کو اپنی گرفت میں لے کر اس کی نیکیوں کو مٹا دیتا ہے۔

"معتزلہ" اس حدیث کو اپنے اس مسلک کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ کہ ارتکاب معصیت، عمل صالح کو باطل کر دیتا ہے اور برائیاں نیکیوں کو مٹا دیتی ہیں ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی گناہ کا مرتکب ہو جائے تو اس کے اچھے اعمال محض اس گناہ کے ارتکاب سے ملیامیٹ ہو جاتے ہیں۔ اور برائی کا خاصہ یہ ہے کہ وہ پچھلی نیکیوں کو ختم کر ڈالتی ہے۔ لیکن ہم سُنّت والجماعت اس بات کو غلط قرار دیتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ برائیوں سے نیکیاں ختم نہیں ہوتیں البتہ نیکیوں کا خاصہ یہ ضرور ہے کہ وہ برائیوں کو مٹا دیتی ہیں جیسا کہ فرمایا گیا ہے اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں) جہاں تک اس حدیث سے معتزلہ کے استدلال کا سوال ہے تو اہل سُنّت والجماعت کی طرف سے کہا جاتا ہے اس ارشاد گرامی میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ حسد، نیکیوں کو کھا جاتا ہے تو اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ حسد نیکیوں کے حسن و کمال کو زائل کر دیتا ہے جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ الحسد یفسد الایمان کما یفسد الصبر العسل یعنی حسد ایمان میں فتور پیدا کر دیتا ہے جس طرح ایلوا شہد کو بدمزہ کر دیتا ہے بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ حسد کا نیکیوں کو کھا جانے سے مراد یہ ہے کہ حسد، حاسد کو محسود کا مال تلف کرنے اس کی زندگی تباہ کرنے اور اس کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچانے پر اکساتا ہے اگر حاسد ان چیزوں کو عملاً پورا نہیں کرتا تو وہ ان باتوں کا ارادہ و رجحان ضرور رکھتا ہے اور کچھ نہیں تو غیبت وغیرہ کے ذریعہ اس کی عزت و آبرو کو نقصان یقیناً پہنچاتا ہے، لہٰذا حسد کی سزا یہ ملے گی کہ قیامت کے دن حاسد کی نیکیاں محسود کو دیدی جائیں گی اور یہ محسود کے ان حقوق کا بدلہ ہوگا جو حاسد اپنی گردن پر لے کر اس دنیا سے جائے گا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا

ہے۔ کہ میری اُمت میں حقیقی مفلس شخص وہ ہے جو قیامت کے دن (اپنے نامۂ اعمال میں) نماز، روزہ، زکوٰۃ اور شب بیداری (کا ثواب) لئے ہوئے آئے گا لیکن اس کی حالت یہ ہوگی کہ اس نے (دنیا میں) کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر زنا کا بہتان لگایا ہوگا کسی کا مال کھایا ہوگا کسی کا خون کیا ہوگا اور کسی کو مارا پیٹا ہوگا۔ لہٰذا اس کی تمام نیکیاں (جو نماز، روزہ، زکوٰۃ اور شب بیداری جیسی صورتوں میں ہوں گی) ان لوگوں کو دیدی جائیں گی جن پر اس نے (گالی اور بہتان وغیرہ کے ذریعہ) زیادتی کی ہوگی لہٰذا مذکورہ بالا حدیث میں نیکیوں کے مٹائے جانے سے یہی مراد ہے یعنی قیامت کے دن اپنی نیکیوں سے محروم ہو جانا نہ کہ ان نیکیوں کو دیوان اعمال میں سے مٹا دینا اور ختم کر دینا مراد ہے۔ یہ مراد یوں بھی صحیح نہیں ہوگی کہ اگر کسی کی نیکیوں کو یہیں مٹا دیا جائے اور ان کو دیوان اعمال میں سے محو کر دیا جائے تو پھر وہ وہاں (قیامت کے دن) کن اعمال کے ساتھ آئے گا۔ درآنحالیکہ حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ جس شخص نے دنیا میں جو اعمال کئے ہونگے۔ وہ قیامت کے دن انہی اعمال کے ساتھ میدان حشر میں حاضر ہوگا۔

ایک جواب یہ بھی دیا جاتا ہے کہ ہر بندہ اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق اپنی نیکیوں میں اضافہ کرتا ہے اور اس کے نامہ اعمال میں ثواب کی تعداد بڑھتی رہتی ہے، ظاہر ہے جو بندہ نیکیوں کی بجائے خطاؤں کا مرتکب ہوتا ہے وہ اپنے نامہ اعمال میں نیکیوں اور ثواب کے اضافہ سے محروم ہو جاتا ہے اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ حسد، حاسد کو اچھی بات سے مٹا کر گویا ان نیکیوں سے محروم رکھتا ہے۔ جو اس کو بری خصلت سے اجتناب کی صورت میں حاصل ہوتیں۔

دو آدمیوں کے درمیان برائی ڈالنے کی مذمت

(۱۴) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِيَّاكُمْ وَسُوْءَ ذَاتِ الْبَيْنِ فَاِنَّهَا الْحَالِقَةُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تم اپنے آپ کو دو آدمیوں کے درمیان برائی ڈالنے کی خصلت سے بچاؤ کیونکہ یہ خصلت مونڈنے والی یعنی دین کو تباہ کرنے والی ہے۔" (ترمذیؒ)

(۱۵) وَعَنْ اَبِيْ صِرْمَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ ضَارَّ ضَارَّا اللّٰهُ بِهِ وَمَنْ شَاقَّ شَاقَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ۔ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوصرمہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی (مسلمان کو بلاوجہ شرعی) کوئی ضرر و نقصان پہنچائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرر و نقصان پہنچائے گا یعنی اس کو برے عمل کی سزا دیگا اور جو شخص (کسی مسلمان کو) مشقت و تکلیف میں ڈالے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو مشقت و تکلیف میں مبتلا کریگا۔" (ابن ماجہؒ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: لفظ "شاق" کے ایک معنی یہ بھی بیان کئے گئے ہیں کہ جو شخص کسی مسلمان سے عداوت و مخالفت رکھے گا اللہ تعالیٰ اس سے عداوت و مخالفت رکھے گا۔ یعنی اس کو عذاب میں مبتلا کریگا۔

کسی مسلمان کو ضرر پہنچانے والے کے بارے میں وعید

(۱۶) وَعَنْ اَبِيْ بَكْرِ نِ الصِّدِّيْقِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَلْعُوْنٌ مَنْ ضَارَّ مُؤْمِنًا اَوْ مَكَرَ بِهٖ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "وہ شخص ملعون ہے جو کسی مسلمان کو ضرر پہنچائے یا اس کے ساتھ مکرو فریب کرے" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کو خواہ ظاہری طور پر ضرر و نقصان پہنچائے اور خواہ پوشیدہ طور پر، اس کو بارگاہ رب العزت

کے قرب اور رحمت الٰہی سے دور قرار دیا گیا ہے۔

کسی مسلمان کو اذیت پہنچانے، عار دلانے اور اس کی عیب جوئی کرنے کی ممانعت

(۱۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ صَعِدَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْمِنْبَرَ فَنَادٰی بِصَوْتٍ رَفِیْعٍ فَقَالَ یَا مَعْشَرَ مَنْ اَسْلَمَ بِلِسَانِہٖ وَلَمْ یُفْضِ الْاِیْمَانُ اِلٰی قَلْبِہٖ لَا تُؤْذُوا الْمُسْلِمِیْنَ وَلَا تُعَیِّرُوْھُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِھِمْ فَاِنَّہٗ مَنْ یَتَّبِعْ عَوْرَۃَ اَخِیْہِ الْمُسْلِمِ یَتَّبِعِ اللّٰہُ عَوْرَتَہٗ وَمَنْ یَتَّبِعِ اللّٰہُ عَوْرَتَہٗ یَفْضَحْہُ وَلَوْ فِیْ جَوْفِ رَحْلِہٖ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے اور لوگوں کو آواز بلند اس طرح مخاطب فرمایا۔" اے وہ لوگو! جو زبان سے تو اسلام لائے ہیں اور ان کے دل تک ایمان نہیں پہنچا ہے (تمہیں آگاہ کیا جاتا ہے) کہ تم (ان) مسلمانوں کو اذیت نہ دو (جو کامل مسلمان ہیں بایں طور کہ انہوں نے زبان سے بھی اسلام قبول کیا ہے اور ان کا دل بھی ایمان کے نور سے منور ہے) ان کو عار نہ دلاؤ اور ان کے عیب نہ ڈھونڈو۔ یاد رکھو! جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے عیب تلاش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کا عیب ڈھونڈھے گا۔ اور جس کا عیب اللہ تعالیٰ ڈھونڈے اس کا رسوا کیا جانا یقینی ہے اگرچہ وہ (لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر اپنے گھر میں) چھپا ہوا کیوں نہ ہو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "جو زبان سے اسلام لائے ہیں" اس خطاب میں مؤمن اور منافق دونوں شامل ہیں اور اس کے آگے جو یہ فرمایا کہ۔ "جن کے دل تک ایمان نہیں پہنچا ہے یعنی ان کا دل اصل ایمان یا کمال ایمان کے نور سے منور نہیں ہوا ہے۔" تو اس کے ذریعہ خطاب میں فاسق کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ بات اس لئے بھی زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ارشاد گرامی میں آگے یہ فرمایا گیا ہے۔ "جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے عیب تلاش کرتا ہے۔" تو اس سے واضح ہوتا ہے۔ کہ حضور ﷺ کا خطاب تمام مسلمانوں سے تھا خواہ وہ کامل... مسلمان ہوں یا منافق اور یا فاسق! اگر خطاب صرف منافقین سے ہوتا تو چوں کہ مسلمان اور منافق کے درمیان اخوہ یعنی بھائی چارہ نہیں ہے اس لئے اس ارشاد گرامی میں "اپنے مسلمان بھائی" کا لفظ استعمال نہ کیا جاتا! لہٰذا طیبیؒ کا اس قول کا اختیار کرنا کہ اس ارشاد گرامی کے مخاطب صرف منافقین ہیں اور صرف انہیں پر اس حدیث کا اطلاق ہوتا ہے ظاہر مفہوم کے خلاف ہے۔

"عار نہ دلاؤ۔" کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کو اس کے اس گناہ پر طعن و تشنیع اور تنبیہ نہ کرو جو کبھی پہلے اس سے صادر ہوا ہو، خواہ اس گناہ سے اس کا توبہ کرنا تمہیں معلوم ہو یا معلوم نہ ہو، البتہ اگر کوئی شخص کسی گناہ کے ارتکاب کی حالت میں ہو یا وہ کوئی گناہ کر چکا ہو اور وہ گناہ اس کے توبہ کرنے سے پہلے علم میں آگیا ہو تو اس صورت میں اس کو اس گناہ پر طعن و تشنیع اور تنبیہ کرنا اس شخص پر واجب ہو گا جو اس پر قادر ہو اور اگر وہ گناہ قابل حد و تعزیر ہو تو اس پر حد اور تعزیر بھی جاری کرنا (قاضی و حاکم پر) واجب ہو گا، گویا اس صورت کا تعلق "عار دلانے" سے نہیں ہو گا بلکہ اس کا شمار امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے زمرہ میں ہو گا۔

"نہ ان کے عیب ڈھونڈھو" یعنی تم کسی مسلمان کے جن عیوب کو نہیں جانتے ہو اس کی ٹوہ مت لگاؤ اور اس کے جو عیوب تمہارے علم میں آگئے ہیں ان کو دوسروں کے سامنے ظاہر نہ کرو۔ اس سے ثابت ہوا کہ کسی مسلمان (جو فاسق نہ ہو) کے عیوب کی ٹوہ میں رہنے یا اس کے جو عیوب اپنے علم میں ہوں ان کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنے سے اجتناب کرنا واجب ہے۔ اور جو شخص ایسا کرے (یعنی کسی مسلمان کی عیب جوئی کرے یا کسی مسلمان کے عیوب کو دوسروں کے سامنے بیان کرتا پھرے) اس سے خود بھی کنارہ کشی اختیار کرنا اور دوسروں کو بھی اس سے دور رکھنا واجب ہے۔

"اللہ تعالیٰ اس کے عیب ڈھونڈھے گا الخ۔" کا مقصد اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ جو شخص اس دنیا میں کسی مسلمان کی عیب جوئی کرتا ہے یا کسی مسلمان کے عیوب کو دوسروں کے سامنے بیان کر کے اس کی رسوائی کراتا ہے اس کو جان لینا چاہئے۔ کہ آخرت میں اس کے ساتھ بھی ایسا معاملہ ہو گا۔ بایں طور کہ اللہ تعالیٰ وہاں اس کے عیوب سے درگزر کرنے کے بجائے اس کی ایک ایک برائی پر نظر رکھے

گا۔ اور اس کے تمام عیوب کو مخلوق کے سامنے ظاہر کرے گا۔ تا کہ جس طرح اس نے اپنے ایک مسلمان بھائی کو دنیا میں رسواء کیا تھا اسی طرح آخرت میں وہ خود رسوا ہو اور ظاہر ہے کہ آخرت کی رسوائی دنیا کی رسوائی سے کہیں زیادہ ہوگی عطا نے لکھا ہے، کہ کسی کے عیوب کی ٹوہ لگانا خود سب سے بڑا عیب ہے۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ عیب جوئی وہ خصلت ہے۔ جو دراصل بدگمانی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے جو شخص کسی مسلمان کے بارے میں بدگمانی قائم کر لیتا ہے وہ اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکتا، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ٹوہ میں لگا رہے چنانچہ وہ ٹوہ میں رہتا ہے اور جب اس کے علم میں کوئی عیب آجاتا ہے تو پھر وہ اس کی پردہ دری کرتا ہے (لہٰذا چاہئے کہ اس بڑی خصلت کی جو جڑ ہے یعنی بدگمانی کرنا، اس سے اپنے آپ کو بچایا جائے تا کہ کسی مسلمان کی عیب جوئی اور اس کی پردہ دری کا وبال گردن پر نہ ہو۔) حقیقت یہ ہے کہ شریعت نے ایک مسلمان کے کردار اس کی سماجی حیثیت اس کے شخصی وقار اور اس کی نجی زندگی کو معاشرہ میں ذلت ورسوائی سے بچانے پر بڑا زور دیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس بات کا تاکید کے ساتھ حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم کسی مسلمان کے کسی عیب کو جانو تو اس کو چھپاؤ نہ کہ اس کو اچھالتے پھرو، نیز کسی شخص کو یہ اجازت نہیں ہے کہ کسی مسلمان کے نجی حالات کی جستجو کرے اس کی کمزوری کو کھوج کھوج کر دوسروں کے سامنے لائے اور اس کے کردار کے ان گوشوں میں جھانکنے کی کوشش کرے جن کو وہ دنیا کی نظروں سے چھپانا چاہتا ہو، اس کی اہمیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ شریعت نے کسی مسلمان کے عیوب کی پردہ پوشی کا جو حکم دیا ہے اس کی حد یہ ہے کہ اگر کسی کے پڑوس میں ایسا مکان ہو جہاں شغل مے نوشی ہوتا ہو اور راگ رنگ کی مجلسیں جمتی ہوں، تو اس شخص کو چاہئے کہ وہ خود اپنے مکان کا دروازہ بند کرے تا کہ اس کی نظر اس مکان میں ہونے والے غیر شرعی امور تک نہ جاسکے اس کے گھر کے لوگوں کی بدکاریاں اس کے علم میں نہ آسکیں نیز اس شخص کے مکان اور مذکورہ مکان کے درمیان جو دیوار حائل ہو اس سے کان لگا کر چوری چھپے اس آواز کو سننے کی کوشش نہ کرنی چاہئے جو اس مکان میں گانے بجانے اور راگ رنگ وغیرہ کے ذریعہ پیدا ہو رہی ہو۔ اور نہ یہ جائز ہے کہ اس برائی کو دیکھنے کے لئے اس شخص کے گھر میں گھسا جائے ہاں اگر اس مکان کے مکین اپنے افعال بد کو خود ظاہر کر رہے ہوں جیسے وہ اتنی بلند آواز میں گانا بجانا کر رہے ہوں کہ باہر تک آواز آرہی ہو یا شرابی لوگ آپس میں شرابیوں جیسا شور وشغب کر رہے ہوں اور ان کی آواز ان کے شغل مے نوشی بھی ان تک ظاہر کر رہی ہو تو یہ دوسری بات ہے اسی طرح اگر وہ شخص ان کی ٹوہ لینے کے مقصد کے بغیر یونہی اس گھر میں چلا جائے اور وہ لوگ شغل مے نوشی یا گانا بجانا موقوف کر کے شراب کے برتن اور گانے بجانے کی چیزیں اپنے دامن وغیرہ کے نیچے چھپالیں تو اس شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ ان کے دامن وغیرہ ہٹوا کر ان چیزوں کو دیکھنے کی کوشش کرے، اس طرح شراب کی بو کی ٹوہ میں منہ وغیرہ سونگھنا بھی جائز نہیں ہوگا۔ اور نہ یہ جائز ہوگا اپنے پڑوسیوں سے دریافت کرتا پھرے کہ اس کے مکان میں کیا کیا ہوتا ہے۔

آخر میں ایک بات یہ جان لینی چاہئے کہ حدیث کے الفاظ ولم یفض الایمان الی قلبه (اور ان کے دل تک ایمان نہیں پہنچا ہے) میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب تک ایمان کا نور دل کو روشن نہیں کر دیتا اس وقت تک نہ اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور نہ اس کے حقوق ادا ہوتے ہیں اور یہ کہ قلب کے تمام روحانی امراض کا علاج اللہ کی معرفت اور اس کے حقوق کو ادا کرنے پر موقوف ہے چنانچہ جو شخص اللہ کی معرفت حاصل کر لیتا ہے اور اس کے حقوق کو ادا کرتا ہے تو نہ وہ کسی کو تکلیف پہنچاتا ہے اور نہ کسی کو نقصان وضرر میں مبتلا کرتا ہے نہ کسی کو عار دلاتا ہے۔ اور نہ کسی کے احوال وکردار کی کمزوریوں اور اس کے عیوب کی تلاش وجستجو میں رہتا ہے۔

کسی مسلمان کی عزت وآبرو کو نقصان پہنچانے کی مذمت

⑱ وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ مِنْ اَرْبَى الرِّبٰو الْاِسْتِطَالَةَ فِيْ عِرْضِ الْمُسْلِمِ بِغَيْرِ حَقٍّ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت سعید ابن زیدؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "سب سے بڑھ کر سود یہ ہے کہ کسی مسلمان کی عزت و آبرو کو ناحق بگاڑنے کے لئے زبان درازی کی جائے۔" (ابوداؤد، بیہقی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی شرعی مصلحت کے بغیر اور ناروا طور پر کسی مسلمان کے بارے میں اپنی زبان سے برے الفاظ نکالنا، اس کی غیبت کرنا، اس کے ساتھ تکبر کرنا اور اپنی بڑائی جتانے کے لئے اس کی حقارت و توہین کرنا اور اس طرح اس کی عزت و آبرو کے درپے ہونا ایک ایسی خصلت ہے جو حرام ہونے اور گناہ لازم کرنے کے اعتبار سے بہ نسبت اور سودوں کے سخت ترین سود ہے۔ واضح رہے کہ لغت میں "ربو" کے معنی ہیں زیادہ ہونا، بڑھنا، اور اصطلاح شریعت میں اس کا مفہوم ہے خرید و فروخت اور قرض میں واجب حق اور اصل رقم سے زیادہ لینا۔ لہٰذا کسی مسلمان کے بارے میں ایسا رویہ اختیار کرنا یا ایسے الفاظ اپنی زبان سے نکالنا جس کا اس مسلمان کے بارے میں اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا اور نہ اس کا تعلق کسی ایسے معاملہ سے ہو جس میں اس طرح کا رویہ اختیار کرنا یا اس طرح کے الفاظ کے استعمال کی شرعی طور پر اجازت ہو گویا اس چیز کی طرح ہے جو اپنے حق سے زیادہ اور نہایت ظلم کے ساتھ لی گئی ہو، اس اعتبار سے کسی کی آبروریزی کے لئے زبان درازی کو ربو کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور پھر اس کو اربیٰ یعنی سب سے بڑا سود کہا گیا ہے کیونکہ کسی مسلمان کے نزدیک اس کی عزت و آبرو اس کے مال و زر سے زیادہ حیثیت و قیمت رکھتی ہے اور مال و زر کی بہ نسبت عزت و آبرو کا نقصان زیادہ تکلیف دہ اور زیادہ سخت ہوتا ہے۔

شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ "ناحق" کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ بعض صورتوں میں ایسا رویہ اختیار کرنا اور ایسی بات کہنا کہ جس سے عزت و آبرو مجروح ہوتی ہو، مباح قرار پاتا ہے۔ مثلاً کسی شخص پر کسی شخص کا کوئی حق (جیسے قرض وغیرہ) ہو اور وہ اس حق کو ادا نہ کر رہا ہو تو صاحب حق کو اجازت ہے کہ وہ اس شخص کو "ظالم" جیسے سخت الفاظ کہہ سکتا ہے یا اس کو بدنام و بے عزت کر سکتا ہے یا کوئی شخص کسی کے حق میں گواہی دے رہا ہو تو اس پر جرح کرنا اور اس گواہ کے عیوب بیان کرنا درست ہے اسی قسم سے راویان حدیث پر جرح کرنا بھی ہے۔ یعنی محدثین کا حدیث کے راویوں کے عیوب ظاہر کرنا بھی درست ہے کیونکہ اس کا مقصد حدیث کی صحت کو محفوظ رکھنا اور دین کی حفاظت کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح لوگوں کو نقصان و فساد سے بچانے کے لئے نکاح کا پیغام دینے والے کے صحیح احوال (یعنی اس کی برائیوں) کو ظاہر کرنا اور بدعتی و فاسق کی مذمت و بے عزتی کرنا بھی درست ہے۔

کسی کی ناحق آبروریزی کرنا اس کا گوشت کھانے کے مرادف ہے

⑲ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا عُرِجَ بِيْ رَبِّيْ مَرَرْتُ بِقَوْمٍ لَهُمْ اَظْفَارٌ مِّنْ نُّحَاسٍ يَخْمِشُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ صُدُوْرَهُمْ فَقُلْتُ مَنْ هٰؤُلَاءِ يَا جِبْرَئِيْلُ قَالَ هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ لُحُوْمَ النَّاسِ وَيَقَعُوْنَ فِيْ اَعْرَاضِهِمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب اللہ تعالیٰ مجھے (معراج کی رات میں) اوپر لے گیا تو (عالم بالا میں) میرا گزر کچھ ایسے لوگوں پر ہوا جن کے ناخون تانبے کے تھے اور وہ ان ناخونوں سے اپنے چہروں کو کھرچ رہے تھے (ان کی اس کی حالت کو دیکھ کر) میں نے پوچھا کہ جبرئیل علیہ السلام یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے (یعنی لوگوں کی غیبت کرتے ہیں) اور ان کی عزت و آبرو کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔" (ابوداؤد)

تشریح: حضرت جبرئیل علیہ السلام کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کی غیبت کرتے ہیں۔ ان کے حق میں نازیبا (اور ناشائستہ) الفاظ اپنی زبان سے نکالتے ہیں۔ اور اس طرح ان لوگوں کی عزت و آبرو کو پامال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا اپنے چہروں اور سینوں کو کھرونچنا، اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے بھائیوں کی آبروریزی کر کے اور اس آبروریزی پر خوش ہو کر ان بھائیوں کے

سینوں (یعنی دلوں) اور چہروں کو مجروح و مغموم کیا لہٰذا ان کی سزا یہی ہے کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے سینوں اور چہروں کو بھی زخمی کریں۔

کسی شخص کی بے آبروئی کرنے والے کے بارے میں وعید

(۲۰) وَعَنِ الْمُسْتَوْرِدِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَكَلَ بِرَجُلٍ مُسْلِمٍ اُكْلَةً فَاِنَّ اللّٰهَ يُطْعِمُهُ مِثْلَهَا مِنْ جَهَنَّمَ وَمَنْ كَسٰى ثَوْبًا بِرَجُلٍ مُسْلِمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَكْسُوْهُ مِثْلَهُ مِنْ جَهَنَّمَ وَمَنْ قَامَ بِرَجُلٍ مَقَامَ سُمْعَةٍ وَرِيَاءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَقُوْمُ لَهُ مَقَامَ سُمْعَةٍ وَرِيَاءٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مستوردؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص کسی مسلمان کی غیبت (برائی کرنے یا اس پر زنا وغیرہ کی تہمت لگانے کے ذریعہ اس کی آبروریزی کر کے ایک لقمہ کھائے، تو اللہ تعالیٰ اس کو اس لقمہ کی مانند دوزخ کی آگ کھلائے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کی تحقیر و اہانت کے بدلہ میں کسی کو کپڑا پہنائے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کپڑے کی مانند دوزخ کی آگ کا کپڑا پہنائے گا اور جو شخص کسی کو سنانے اور دکھانے کے لئے کھڑا کرے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے سنانے اور دکھانے کے لئے خود کھڑا ہو گا۔"

(ابوداؤدؒ)

تشریح: لفظ "اکلۃ" کے معنی ایک لقمہ کے ہیں اور ایک نسخہ میں یہ لفظ اکلۃ (الف کے زبر کے ساتھ) منقول ہے جس کے معنی ہیں ایک بار سیر ہو کر کھانا۔ کسی مسلمان کی آبروریزی کر کے ایک لقمہ یا ایک بار کھانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کی خوشنودی مزاج کے لئے اس کے سامنے کسی مسلمان کی برائی کرنا اور اس کے عوض کچھ کھانے پینے کا سامان پیدا کر لینا! مثلاً فرض کیجئے ایک شخص زید ہے جو کسی مسلمان سے عداوت رکھتا ہے۔ اور اس مسلمان کی برائی سن کر بہت خوش ہوتا ہے چنانچہ ایک اور شخص بکر اس کے اس مزاج کو جان کر اس کے پاس جاتا ہے اور ازراہ خوشامد و چاپلوسی اس کے سامنے اس مسلمان کو برا بھلا کہتا ہے یا اس کے عیوب کو بیان کرتا ہے اور زید اس کی اس حرکت سے خوش ہو کر اس کو روپیہ پیسہ یا کچھ کھانے پینے کے لئے دیدیتا ہے تو ایسے شخص کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ کہ جو شخص کسی مسلمان کی آبروریزی کو اپنی کمائی اور روزی کا ذریعہ بناتا ہے تو آخرت میں اس کو اپنی اس روزی اور کمائی کے مثل دوزخ کی آگ کھانی پڑے گی۔

لفظ "کسی" بصیغہ معروف ہے اور اوپر ترجمہ میں اسی کا اعتبار کیا گیا ہے۔ لیکن ایک نسخہ میں یہ لفظ بصیغہ مفعول ہے اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا کہ جو شخص کسی مسلمان کی تحقیر و اہانت کرنے کے بدلے میں کپڑا پہنایا جائے۔ یہ معنی قبل کی عبارت کی زیادہ مطابق ہیں۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس لفظ کے بصیغہ معروف ہونے کی صورت میں قبل کی عبارت من اکل برجل مسلم اکلہ دیکھتے ہوئے ترجمہ یوں ہوگا "اور جو شخص کسی مسلمان کی تحقیر و اہانت کرنے کے بدلہ میں اپنے آپ کو کپڑے پہنائے..... الخ"۔

و من قام برجل مقام سمعۃ و ریاء کے لفظ "برجل" میں حرف باء تعدیہ کے لئے اور "رجل" سے مراد خود وہی شخص ہو سکتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص بھی! مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نمود و نمائش کی خاطر خود اپنی زبان سے اپنی بڑائیاں بیان کرے۔ اور اپنی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہو یا کسی دوسرے شخص کو اس بات پر مامور کرے کہ وہ لوگوں کی بڑائی جتانے کے لئے اور لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے اس کی تعریف و توصیف کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی برائیاں ظاہر کر کے لوگوں کے درمیان اس کی رسوائی و فضیحت کا سامان پیدا کرے گا۔

بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ "برجل" میں حرف باء تعدیہ کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور سببیت کے لئے بھی! پس اگر تعدیہ کے لئے ہو تو یہ مطلب ہوگا کہ جو شخص کسی کو سمعہ و ریاء (نمود و نمائش کے طور پر اس کی پرہیزگاری و دینداری کا ڈنکا پیٹتا پھرے اور اس کے

زہد و عبادات اور اس کی بزرگی کو جھوٹ شہرت دے اور اس سے مقصد یہ ہو کہ لوگ اس کے معتقد ہوں اور اس کے حلقہ ارادت میں شامل ہو کر اپنے جان و دل کے ذریعہ اس کی خدمت کیا کریں۔ اور اس کی آڑ میں اپنا جاہ و مال کا فائدہ ہو، جیسا کہ بعض بزرگان کے خدام کا شیوہ ہے کہ وہ ان کی شہرت کی آڑ میں اپنے لئے مختلف فوائد حاصل کرتے ہیں اور بقول شخصے "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" تو ایسے شخص کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کو رسوائی و فضیحت کی جگہ کھڑا کرے گا یعنی فرشتوں کو حکم دے گا کہ اس شخص کے بارے میں اعلان کرو کہ یہ جھوٹا ہے اس نے محض اپنے فائدہ اور ذاتی اغراض کے لئے ایک شخص کو ناروا طور پر شہرت دی اس کے بعد اس کو اس عذاب میں مبتلا کیا جائے گا جو جھوٹوں کے لئے ہوگا۔

اور اگر حرف باء سببیت کے لئے ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص کسی کی توجہ حاصل کرنے کے لئے خود اپنے آپ کو سمعہ وریاء کے مقام پر کھڑا کرے یعنی اپنے آپ کو بڑا زاہد و متقی اور نہایت صالح و پاکباز ظاہر کرے تاکہ کوئی صاحب جاہ اور مالدار شخص اس کا معتقد ہو اور وہ اس کے ذریعہ جاہ و مال کی اپنی خواہش و طلب کو پورا کرے تو ایسے شخص کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو ایسی جگہ کھڑا کرے گا جہاں لوگ اس کی رسوائی و فضیحت کو دیکھیں گے یعنی فرشتوں کو حکم دیا جائے گا۔ کہ یہ اعلان کرو کہ یہ شخص نہایت ریاکار تھا اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے اور اس کے ذریعہ جاہ و مال حاصل کرنے کے لئے خود کو زاہد و متقی ظاہر کرتا تھا اور پھر اس کے بعد اس عذاب میں مبتلا کیا جائے گا جو ریاکاروں کے لئے ہوگا۔

خدا کے ساتھ حسن ظن کی فضیلت

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ حُسْنِ الْعِبَادَةِ۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اچھا گمان رکھنا، منجملہ بہترین عبادات کے ہے۔" (احمدؒ وابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ کہ جن اعمال کو عبادت حسنہ کہا جاتا ہے ان میں سے ایک بہترین چیز اور بہترین عبادت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھا گمان رکھا جائے لہٰذا ضروری ہے کہ عبادتوں کو ترک نہ کیا جائے۔ واضح رہے کہ جاہل عوام یہ گمان کرتے ہیں۔ کہ خدا کے ساتھ حسن ظن کا مطلب یہ ہے کہ اگر عبادتیں ترک ہوتی ہیں تو ہونے دو! البتہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد ہونا چاہئے کہ وہ کریم اور غفور الرحیم ہے جو تارک عبادت کو بھی یقیناً بخشدے گا۔ یہ گمان نہایت گمراہی کا سبب ہے اور شیطان کے فریب میں پھنس جانے کا نتیجہ ہے علماء نے لکھا ہے کہ جو شخص عبادتوں کو تو ترک کرے اور معبود کے ساتھ حسن ظن کا دعوی کرے وہ یقیناً مغرور و مردود ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ حدیث میں "اچھے گمان" کا تعلق خدا کے بجائے مسلمانوں کے بارے میں خیر و صلاح کا اعتقاد رکھنا منجملہ عبادات حسنہ کے ہے یا یہ (مسلمانوں کے بارے میں اچھا گمان رکھنا) ایک ایسی صفت ہے جو عبادتوں میں حسن و کمال پیدا کرتی ہے اور ثواب کا درجہ بڑھاتی ہے اس کا حاصل یہ نکلا کہ جو شخص عبادت گزار و نیکوکار ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے بارے میں ہمیشہ اچھا گمان اور نیک خیال رکھتا ہے اور بدگمانی رکھنے والا بدکار کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا ؎

بد گماں باشد ہمیشہ زشت کار نامہ خود خواند اندر حق یار

ایک زوجہ مطہرہ کی بدگوئی اور حضور ﷺ کی ناراضگی

(۲۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتِ اعْتَلَّ بَعِیْرٌ لِصَفِیَّةَ وَعِنْدَ زَیْنَبَ فَضْلُ ظَهْرٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِزَیْنَبَ اَعْطِیْهَا بَعِیْرًا فَقَالَتْ اَنَا اُعْطِیْ تِلْكَ الْیَهُوْدِیَّةَ فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَهَجَرَ هٰذَا الْحِجَّةِ وَالْمُحَرَّمَ وَبَعْضَ صَفَرٍ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَذُكِرَ حَدِیْثُ مُعَاذِ بْنِ اَنَسٍ مَنْ حَمٰی مُؤْمِنًا فِیْ بَابِ الشَّفْقَةِ وَالرَّحْمَةِ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک مرتبہ) صفیہؓ کا اونٹ بیمار ہوگیا اس وقت زینبؓ کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ سواری تھی (یعنی ان کے پاس ایک اونٹ ضرورت سے زائد تھا) لہٰذا رسول کریم ﷺ نے زینبؓ سے فرمایا کہ تم اپنا وہ اونٹ (تمہاری ضرورت سے زیادہ ہے) صفیہؓ کو دے دو! زینبؓ نے جواب دیا کہ بھلا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دوں گی (یعنی انہوں نے صفیہ کو اپنا اونٹ دینے سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ ان کے بارے میں نازیبا الفاظ بھی زبان سے نکالے) چنانچہ رسول کریم ﷺ ان سے سخت ناراض ہوگئے یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ذی الحجہ اور محرم (کے پورے مہینے) اور ماہ صفر کے کچھ دنوں تک ان سے ملنا جلنا اور ان کے پاس جانا چھوڑے رکھا۔"

(ابوداؤدؒ) اور حضرت معاذ ابن انسؓ کی روایت من حمی مؤمنا الخ باب الشفقة والرحمة میں نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: حضرت صفیہؓ ایک یہودی حیی ابن اخطب کا سلسلہ نسب چوں کہ اوپر جاکر حضرت ہارون علیہ السلام سے مل جاتا تھا اس لئے ان کو ایک پیغمبر یعنی حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے ہونے کا نسبی شرف بھی حاصل تھا، حضرت صفیہؓ کی پہلی شادی ایک یہودی ابوالحقیق سے ہوئی تھی! جب جنگ خیبر میں ابوالحقیق مارا گیا اور صفیہ قیدی بناکر بارگاہ رسالت میں لائی گئیں تو حضور ﷺ نے ان کو رہا کر دیا اور پھر ان سے عقد کرلیا آنحضرت ﷺ کی بعض ازواج مطہراتؓ ان کو پسند نہیں کرتی تھیں اور خود حضرت عائشہؓ بھی انہیں میں سے تھیں لیکن آنحضرت ﷺ کو دوسری ازواجؓ کی طرح ان سے بھی برابر کا تعلق تھا اور ان کی حمایت ورعایت کرتے تھے۔ ایک دن حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کسی بات پر حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یہودیہ کہہ دیا۔ اور کچھ سخت سُست بھی کہا انہوں نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی، حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم عائشہؓ سے کہو کہ تم ابوبکر کی بیٹی ہو، اور میں پیغمبر زادی ہوں۔

حضرت زینبؓ بھی آنحضرت ﷺ کی زوجہ مطہرہ تھیں پہلے ان کا نام برہ تھا اور پہلی شادی عبداللہ ابن زمعہ سے ہوئی تھی جب یہ حضور ﷺ کے عقد میں آئیں تو آپ ﷺ نے ان کا نام زینبؓ رکھا۔

اس حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ کسی شخص کو اس کی گزشتہ زندگی کے تعلق سے طعنہ دینا یا اس کی حقارت کرنا نہایت نازیبا بات ہے، دوسری بات یہ کہ آنحضرت ﷺ حضرت زینبؓ کی بدگوئی پر ان سے سخت ناراض ہونا اور ایک طویل عرصہ تک ان سے ترک ملاقات اختیار کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ کسی شرعی مصلحت کے پیش نظر کسی مسلمان سے تین دن سے زائد بھی ترک ملاقات کی جاسکتی ہے، مثلاً اگر کوئی شخص کسی قبیح فعل کا مرتکب ہو تو اس کی تادیب وتنبیہ کی خاطر، نہ کہ کسی بغض وعداوت کے تحت اس سے تین دن سے زیادہ بھی ملنا جلنا چھوڑے رکھنا جائز ہے جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

قسم کا بہرحال اعتبار کرو

(۲۳) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَاٰی عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ رَجُلًا یَسْرِقُ فَقَالَ لَهٗ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ سَرَقْتَ قَالَ كَلَّا وَالَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَقَالَ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَكَذَّبْتُ نَفْسِیْ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (ایک مرتبہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم علیہ السلام نے ایک شخص کو چوری کرتے ہوئے دیکھ لیا! حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم علیہما السلام نے اس شخص سے کہا کہ تم نے چوری کی ہے؟ اس شخص نے کہا کہ ہرگز نہیں، اس ذات پاک کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے (میں نے چوری نہیں کی ہے) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے (اس کو اس طرح قسم کھاتے ہوئے سنا تو) کہا کہ میں خدا پر ایمان لایا اور اپنے نفس کو جھوٹا قرار دیا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "میں خدا پر ایمان لایا" یعنی تم نے اپنی قسم میں خدا کی واحدانیت کا جو ذکر کیا ہے میں اس پر اپنے ایمان واعتقاد کا اقرار کرتا ہوں!

یہ جملہ مفہوم کے اعتبار سے یوں ہے کہ تم نے اللہ کی جو قسم کھائی ہے میں اس کا اعتبار کرتا ہوں اور اپنے نفس کو اس بات کے کہنے میں جھوٹا قرار دیتا ہوں کہ تم نے چوری کی ہے اگرچہ میرا یہ کہنا ظاہری حالات میں غمازی کی بنا پر تھا۔ یہ وضاحت اس احتمال کے پیش نظر ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس شخص نے کہیں سے کوئی چیز اس کے مالک سے پوشیدہ طور پر اٹھائی ہوگی اس بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سمجھا کہ اس شخص نے چوری کی ہے لیکن اس نے اول تو خدا کی قسم کھا کر چوری سے انکار کیا دوسرے اس موقع پر ایسی کوئی شرط نہیں پائی گئی ہوگی جس کا چوری کے ثبوت کے لئے اور چوری کی سزا یعنی حد جاری کرنے کے لئے پایا جانا شرعی طور پر ضروری ہوتا ہے اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس شخص کی قسم کو تسلیم کر لیا اور اپنی بات کو غلط قرار دیا۔

حضرت شیخ عبدالحق نے یہ مطلب لکھا ہے کہ میں تمہیں تمہاری قسم میں سچا مانتا ہوں اپنے اس گمان سے رجوع کرتا ہوں جو میں نے تمہارے بارے میں قائم کیا تھا اور مذکورہ بات کے کہنے میں اپنے نفس کو جھوٹا قرار دیتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی بات پر خدا کی قسم کھائے تو اگرچہ اس کی وہ بات حقیقت کے کتنی ہی خلاف معلوم ہوتی ہو لیکن چاہئے یہی کہ اپنے گمان اور اپنی معلومات کو غلط قرار دیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے نام کی تعظیم کے پیش نظر اس کی قسم کا اعتبار کیا جائے۔

حسد اور افلاس کی برائی

(۲۴) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا وَ کَادَ الْحَسَدُ اَنْ یَّغْلِبَ الْقَدَرَ۔

"اور حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "فقر و افلاس قریب ہے کہ کفر کی حد تک پہنچا دے اور حسد، قریب ہے کہ تقدیر پر غالب آجائے۔"

تشریح: حدیث کے پہلے جز کا مطلب یہ ہے کہ فقر و افلاس اور تنگدستی ایسی بری چیز ہے کہ بسا اوقات انسان اس سے مجبور ہو کر کفر کی حد تک پہنچ جاتا ہے، چنانچہ جو فقیر و مفلس، صبر و استقامت اور عزم و حوصلہ کی طاقت کھو کر قلبی افلاس بھی مبتلا ہو جاتا ہے وہ خدا کی ذات پر اعتماد و بھروسہ کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے وہ نہایت مایوسی کے عالم میں خدا کے نظام قدرت تک پر اعتراض کرنے لگتا ہے۔ یا تقدیر الٰہی کا شکوہ و گلا کر کے خدا کے حکم و فیصلہ پر ہر حالت میں راضی رہنے کے تقاضا کو پس پشت ڈال دیتا ہے یا خدا کے آگے ہاتھ پھیلانے کی بجائے غیر اللہ کے سامنے دست سوال دراز کرنے لگتا ہے اور ماسواء اللہ کو اپنا حاجت روا ماننے لگتا ہے۔ اور یا جب وہ دیکھتا ہے کہ اکثر کافر مالدار ہیں اور عیش و راحت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کے برخلاف اکثر مسلمان افلاس و تنگدستی کی آزمائش میں مبتلا ہیں۔ تو وہ کفر کی طرف مائل ہونے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور ظاہر ہے کہ یہ چیزیں انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہیں۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ فقر و افلاس دراصل مسلمانوں کے لئے ایک آزمائش اور امتحان کا درجہ رکھتا ہے چنانچہ جو لوگ اس حقیقت کو جانتے ہیں اور مال و دولت اور دنیاوی زندگی کے اعتبار سے مفلس و قلاش ہونے کے باوجود اپنے دل کو غنی رکھتے ہیں اور تقدیر الٰہی پر صابر و شاکر رہ کر اس امتحان و آزمائش میں پورے اترتے ہیں۔ ان کے حق میں وہی فقر و افلاس ایمان کی پختگی اور ترقی درجات کا ضامن بن جاتا ہے لہٰذا جو مسلمان مال و دولت سے تہی دست اور فقر و افلاس میں مبتلا ہوں اور تمام تر انسانی تدابیر اور محنت و مشقت کے باوجود تنگی حالات سے نجات نہ پاتے ہوں ان کو چاہئے کہ وہ اپنی اس حالت کو خدا کی طرف سے امتحان و آزمائش سمجھیں اور یہ یقین کریں کہ یہ دنیا اور دنیا کی ساری کلفتیں اور پریشانیاں مرد مؤمن کے لئے ایک ایسا وقفہ حیات ہے۔ جس میں اگر صبر و استغناء اور اللہ کی ذات پر توکل و اعتماد کی دولت نصیب ہو گئی تو کبھی نہ کبھی دنیا میں بھی حالات تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اور آخرت کی فلاح و کامیابی تو یقیناً نصیب ہوگی اور یہاں کی ساری کلفتیں اور پریشانیاں وہاں کی بے پایاں نعمتوں اور لازوال آسائشوں میں تبدیل ہو جائیں گی! حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔

اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّۃُ الْکَافِرِ۔

"یہ دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے جنت ہے۔"

اور جو مسلمان اس قید خانہ کی تکلیف و مصائب کو خندہ پیشانی کے ساتھ انگیز کرے ان کے لئے خدا نے آخرت کے بے پایاں انعامات کا وعدہ کیا ہے، قرآن کریم میں ایک موقع پر اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ۝ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ۝۔

"(اے مؤمن) تجھ کو ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا مغالطہ میں نہ ڈال دے۔ (کیونکہ یہ) چند روزہ بہار ہے پھر ان کا ٹھکانہ (ہمیشہ کے لئے) دوزخ ہوگا اور وہ برا ہی آرام گاہ ہے۔ لیکن جو لوگ (ان میں سے) خدا سے ڈریں (اور مسلمان و مطیع ہو جاویں) ان کے لئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے۔ یہ (ان کی) مہمانی ہوگی، اللہ کی طرف سے، اور جو چیزیں خدا کے پاس ہیں یہ نیک بندوں کے لئے بدرجہا بہتر ہیں۔"

منقول ہے کہ بعض صحابہؓ جب کفار و مشرکین کی تجارتی سرگرمیوں ان کے یہاں مال و دولت کی ریل پیل اور ان کو دنیا کی راحت و آسائش میں دیکھتے تو ان کی زبان پر یہ الفاظ آجاتے تھے کہ یہ لوگ جو خدا کے دشمن ہیں ان کا حال تو ہم بڑا اچھا دیکھتے ہیں لیکن ہم محنت و مشقت کی سختیوں اور افلاس و بھوک کی جانکاہیوں سے دم توڑتے نظر آرہے ہیں۔ اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو بتایا گیا کہ دنیا کا یہ آرام و چین اور یہاں کی ساری آسائش و راحت چند روزہ ہے ان کو جلد ہی فنا ہونا ہے لیکن تمہیں آخرت کا جو آرام و چین اور وہاں کی جو آسائشیں اور راحت نصیب ہونے والی ہیں وہ لازوال ہیں جن کو کبھی فنا نہیں آئے گی، لہٰذا تم لوگ فنا ہونے والے چین و آرام اور چند روزہ راحت و آسائش کی تمنا نہ کرو۔ بلکہ ان نعمتوں کے امیدوار رہو جو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں۔

جس طرح فقر و افلاس بسا اوقات کفر کی حد تک پہنچا دیتا ہے اسی طرح بسا اوقات مال و دولت کی زیادتی بھی گمراہ کر دیتی ہے۔ دولتمندی کا نشہ انسان کو تمرد و سرکشی میں مبتلا کر دیتا ہے اور حد سے زیادہ راحت و آسائش کا فتنہ گناہ معصیت کے اندھیروں میں پھینک دیتا ہے اسی لئے کہا جاتا ہے خواہ مالداری ہو یا افلاس ان دونوں کا معتدل طور پر رہنا انسانی زندگی کو گمراہی و ضلالت سے بچا سکتا ہے چنانچہ وہ فقر و افلاس جس کو انگیز کیا جا سکتا ہو مایوسی اور کفر کی حد تک پہنچنے سے روکے رکھتا ہے اور بقدر ضرورت مال و دولت کا ملنا سرمایہ داری کے نشہ سے محفوظ رکھتا ہے جس کی وجہ سے تمرد و سرکشی اور گناہ و معصیت کا خدشہ نہیں رہتا لہٰذا خیر الامور اوسطھا کا اصول ان دونوں پر بھی صادق آتا ہے۔

حدیث کے دوسرے جزو "اور حسد، قریب ہے کہ تقدیر الٰہی پر غالب آجائے" کا مطلب یہ ہے کہ بفرض محال کوئی چیز ایسی ہوتی جو تقدیر پر غالب آجانے اور اس کو بدل دینے کی طاقت رکھتی تو وہ حسد ہوتا اور بعض حضرات نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ حسد، حاسد کو اس گمراہ کن گمان تک لے جاتا ہے کہ وہ تقدیر الٰہی کو بھی بدل سکتا ہے۔

عذر خواہی کو قبول کرو

(۲۵) وَعَنْ جَابِرٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ اعْتَذَرَ اِلٰى اَخِيْهِ فَلَمْ يَعْذِرْهُ اَوْلَمْ يَقْبَلْ عُذْرَهُ كَانَ عَلَيْهِ مِثْلُ خَطِيْئَةِ صَاحِبِ مَكْسٍ۔ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَقَالَ الْمُكَّاسُ الْعَشَّارُ۔

"اور حضرت جابرؓ رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی سے (اپنے کسی قصور پر) عذر خواہی کرے اور وہ مسلمان شخص اس کو معذور نہ قرار دے (یعنی اس کے عذر کو ناقابل تسلیم قرار دیدے اور کہے کہ تمہیں کوئی عذر لاحق نہیں ہے بلکہ عذر خواہی کے نام پر جھوٹ بول رہے ہو) یا اس کے عذر کو قبول نہ کرے (یعنی یوں کہے کہ تم عذر تو رکھتے ہو مگر میں تمہارے

عذر کو قبول نہیں کرتا) تو وہ اسی درجہ کا گنہ گار ہوگا جس درجہ کا صاحب مکس گنہ گار ہوتا ہے ان دونوں حدیثوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ مکاس عشر لینے والے کو کہتے ہیں۔"

تشریح: "مکس" کے معنی ہیں محصول لینا، اسی اعتبار سے عشر لینے والے کو مکاس کہا جاتا ہے۔ اور عام طور پر صاحب مکس کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے۔ جو از راہ ظلم و تعدی ناحق محصولات وصول کرے ناحق اور خلاف شرع محصولات لگانے اور وصول کرنے کا گناہ بہت سخت ہے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ صاحب مکس جنت میں نہیں جائے گا۔ عذر خواہی کو قبول نہ کرنے والے اور صاحب مکس کے درمیان مشابہت کی وجہ شاید یہ ہے کہ مذکورہ شخص کی طرح مکس بھی محصول دہندہ کے کسی عذر اور دلیل کو قبول نہیں کرتا، کوئی تاجر لاکھ کہے کہ مجھ پر اس قدر محصول عائد نہیں ہوتا یا میرے پاس مال تجارت کا نہیں ہے بلکہ امانت کا ہے اور یا یہ کہ میں قرضدار ہوں، یہ محصول ادا نہیں کر سکتا وغیرہ وغیرہ مگر وہ اس کی کسی بات کو تسلیم نہیں کرتا اور اس سے زبردستی محصول وصول کر لیتا ہے۔

عذر خواہی کو قبول نہ کرنے کی مذمت اور اس کے گناہ کے بارے میں اور احادیث بھی منقول ہیں، چنانچہ طبرانیؒ نے اوسط میں حضرت عائشہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

مَنِ اعْتَذَرَ اِلٰی اَخِیْہِ المسلم فلم یقبل عذرہ لَم یرد علی الحوض۔

"اگر کسی شخص نے اپنے کسی مسلمان بھائی سے عذر خواہی کی اور اس نے اس کے عذر کو قبول نہیں کیا تو اس کو حوض کوثر پر آنا نصیب نہیں ہوگا۔"

طبرانیؒ اور دوسرے محدثین نے حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ "کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں برا شخص کون ہے؟ صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ ہاں! اگر آپ ﷺ بہتر سمجھیں تو ضرور بتائیں حضور ﷺ نے فرمایا۔ "تم میں برا شخص وہ ہے جو تنہا کسی منزل پر اترے اپنے غلام کو کوڑے مارے اور (محتاج و ضرورتمند وں کو) اپنی عطاو بخشش سے محروم رکھے۔" پھر فرمایا "کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اس سے بھی برا شخص کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہاں! اگر آپ (ﷺ) بہتر سمجھیں تو ضرور بتائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "وہ شخص کہ جو قصور (کرنے والے کے عذر) کو تسلیم نہ کرے، معذرت کو قبول نہ کرنے اور خطا کو معاف نہ کرے۔" پھر فرمایا۔ "کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اس سے بھی برا شخص کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہاں! اگر آپ (ﷺ) بہتر سمجھیں تو ضرور بتائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "وہ شخص کہ جس سے خیر و بھلائی کی توقع نہ ہو اور نہ اس کی فتنہ انگیزیوں سے امن ملتا ہو۔"

حاکمؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "لوگوں کو عورتوں کے تئیں پاکدامن رکھو (یعنی تم دوسروں کی عورتوں پر بری نظر نہ رکھو تمہاری عورتیں دوسرے لوگوں سے اپنے دامن عفت کو محفوظ رکھیں گی) تم اپنے باپ سے اچھا سلوک کرو۔ تمہارے بیٹے تم سے اچھا سلوک کریں گے اور جس شخص کے پاس اس کا کوئی مسلمان بھائی (اپنے کسی قصور پر) عذر خواہ بن کر آئے تو چاہئے کہ اس کی عذر خواہی کو قبول کیا جائے خواہ اس کی عذر خواہی صحیح ہو یا غلط، اگر اس نے اپنے اس مسلمان بھائی کی عذر خواہی کو قبول نہیں کیا تو (وہ یاد رکھے کہ) اس کو حوض کوثر پر آنا نصیب نہیں ہوگا۔" (حاکمؒ نے اس روایت کو صحیح الاسناد قرار دیا ہے۔

بَابُ الْحَذْرِ وَالتَّاَنِّی فِی الْاُمُوْرِ
معاملات میں احتراز اور توقف کرنے کا بیان

حذر حا اور ذال کے زبر اور راء کے جزم کے ساتھ) کے معنی ہیں بچنا، پرہیز کرنا، چوکنا رہنا۔ اور حذر حا کے زبر اور ذال کے زیر کے ساتھ) بیدار و مستعد مرد کو کہتے ہیں۔

تانی کے معنی ہیں کسی کام و معاملہ میں جلد بازی اختیار کرنے کے بجائے توقف و تاخیر کرنا اور اچھی طرح غور و فکر کر لینا" عنوان بالا کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ لوگوں کے شر زمانہ کی آفات اور ماحول و معاشرہ کے فتنہ و فساد سے اپنے آپ کو بچائے ان آفات و فتنہ و فساد کا تعلق خواہ دنیاوی نقصانات و مضرات سے ہو یا دینی و اخروی نقصان و تباہی سے اسی طرح چاہئے کہ وہ اپنے کام اور معاملات میں ہمیشہ ہوشیار اور چوکنا رہے، عجلت پسندی اور جلد بازی سے احتراز کرے حلم و وقار اختیار کرے اپنے ہر ارادہ و عمل پر اچھی طرح غور فکر کیا کرے اور ہر کام کے انجام و مآل پر بہر صورت نظر رکھے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

ایک حکیمانہ اصول

① عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَایُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَاحِدٍ مَرَّتَیْنِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "مؤمن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: لدغ کے معنی ہیں ڈسنا، سانپ اور بچھو کا کاٹنا۔ جحر (پہلے جیم اور پر حاء) سوراخ اور بل کو کہتے ہیں جو سانپ اور بچھو وغیرہ کا مسکن ہوتا ہے۔

حدیث کا مقصد اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ مؤمن دانا، جو حق و انصاف کا علمبردار اور دین کا حامی و محافظ ہوتا ہے اس کی شان یہ ہے کہ وہ کسی عہد شکن اور سرکش سے، جو دین کا دشمن ہے درگزر نہ کرے خدا کی راہ میں اور خدا کی خاطر اس کو اپنے غضب و انتقام کا نشانہ بنانے سے نہ چوکے، بار بار حلم و بردباری اور چشم پوشی کا رویہ اختیار نہ کرے اور اس کے دھوکہ و فریب میں نہ آئے واضح رہے کہ کسی دنیاوی معاملہ میں فریب کھا جانا زیادہ اہمیت نہیں رکھتا مگر دین کے معاملہ میں ہرگز فریب نہ کھانا چاہئے۔

علماء نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مذکورہ ارشاد گرامی میں سے جس حکیمانہ اصول کی طرف اشارہ کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک عظیم الشان تعلیم ہے جس کی بنیاد دین کی رعایت و حمایت اور دشمنان دین کے شر و فساد کی بیخ کنی پر ہے۔

مذکورہ بالا ارشاد گرامی کا پس منظر یہ بیان کیا گیا ہے کہ زمانہ رسالت میں عرب کا ایک بڑا مشہور شاعر ابوغرہ تھا، اور اس کا تعلق کفار کے اس طبقہ سے تھا جو اسلام، ذات رسالت پناہ اور مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت اور سب و شتم کے پہاڑ تراشنے پر مامور تھا، چنانچہ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ مسلمانوں کی ہجو کیا کرتا تھا اور اپنی قوم کے شریر لوگوں کو مسلمانوں کی ایذاء و اہانت پر اکسایا کرتا تھا جب بدر کے میدان میں حق و باطل کے درمیان پہلی معرکہ آرائی ہوئی اور خدا نے اپنے مٹھی بھر بندوں کو دشمنان دین پر فتح عطا فرمائی اور مکہ کے بہت سارے کفار جس میں ان کے زعماء و اساطین بھی تھے۔ قیدی بنا کر مدینہ منورہ لئے گئے تو ان میں وہ بدبخت شاعر ابوغرہ بھی تھا اس نے بارگاہ رسالت میں اپنے پچھلے سیاہ کارناموں پر اظہار ندامت کیا اور عفو خواہی کے ساتھ یہ عہد و اقرار کیا کہ اب میں کبھی بھی ایسے افعال بد کے پاس نہیں پھٹکوں گا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کو اس بدبخت پر رحم و کرم کرنے کا موقع مل گیا اور آپ ﷺ نے اس کے عہد و پیمان کی بنیاد پر اس کو رہا کر دیا۔ لیکن اس کی ازلی شقاوت و بدبختی نے اس کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا اور وہ اپنی قوم میں پہنچ کر پہلی روش پر چلنے لگا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دوبارہ، جنگ احد کے موقع پر، قیدی کی حیثیت سے بارگاہ رسالت میں پہنچا دیا۔ اس نے اس مرتبہ بھی وہی حربہ استعمال کیا اور اظہار ندامت و عفو خواہی کے ساتھ امان چاہنے لگا اور آئندہ اپنی ان حرکتوں سے باز رہنے کا عہد و پیمان کیا لیکن آنحضرت ﷺ نے اس کو معاف نہیں کیا اور اس کو جہنم رسید کر دینے کا حکم فرما دیا، چنانچہ اسے قتل کر دیا گیا۔ اس وقت جب بعض لوگوں نے اس کی سفارش کی اور حضور ﷺ سے درخواست کی کہ اس کو ایک مرتبہ اور معاف فرما دیا جائے تو حضور ﷺ نے فرمایا۔ "مؤمن ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا۔"

حلم وبردباری اور توقف وآہستگی کی فضیلت

(۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِاَشَجِّ عَبْدِالْقَيْسِ اِنَّ فِيْكَ لَخَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللّٰهُ الْعِلْمُ وَالْاَنَاةُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قبیلہ عبدالقیس کے سردار اشج سے فرمایا کہ تمہارے اندر جو دو خوبیاں ہیں ان کو اللہ تعالیٰ بہت پسند کرتا ہے (خواہ وہ کسی شخص میں ہوں حلم وبردباری اور دوسرے توقف وآہستگی۔" (مسلم)

تشریح: عبدالقیس، ایک قبیلہ کا نام ہے۔ جب اس قبیلہ کے لوگ آنحضرت ﷺ کی زیارت وملاقات کے لئے مدینہ آئے اور مسجد نبوی کے سامنے پہنچے تو آنحضرت ﷺ کو دیکھ کر فرط شوق سے اپنے اونٹوں سے کود پڑے بے تابانہ اور دیوانہ وار دوڑتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور آنحضرت ﷺ کے تئیں محبت وعقیدت اور شوق ملاقات کی بیقراری کا اظہار نہایت جذباتی طور پر کیا آنحضرت ﷺ نے ان کی اس بیقرار ومضطرب حالت کو دیکھا تو سکوت فرمایا اور ان سے کچھ نہیں کہا لیکن یہ لوگ جس عظیم المرتبت شخصیت اور اپنے سردار یعنی اشج کی زیر قیادت بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تھے۔ اور جن کا اصل نام منذرؓ تھا ان کی کیفیت بالکل دوسری تھی وہ پہلے اپنی قیامگاہ پر اترے وہاں انہوں نے اپنے تمام رفقاء کا سامان جمع کیا اور ساری چیزوں کو باندھ کر اطمینان کے ساتھ نہائے دھوئے، نہایت نفیس وپاکیزہ کپڑے زیب تن کئے اور پھر انتہائی وقار وتمکنت کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مسجد نبوی میں آئے وہاں دو رکعت نماز ادا کی دعا مانگی اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو ان کی یہ وضع اور روش بہت پسند آئی، اور ان سے مذکورہ بالا الفاظ ارشاد فرمائے۔

ایک روایت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے ان کے سامنے ان میں ان دونوں خوبیوں کا ہونا بیان فرمایا، تو انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرے اندر جو یہ دو خوبیاں ہیں ان کو میں نے ازراہ تکلف اختیار کیا ہے اور میری خود ساختہ ہیں یا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں خوبیوں کو میری فطرت میں پیدا کیا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "ان دونوں خوبیوں کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے مزاج وفطرت میں ودیعت فرمایا ہے۔" (یہ سن کر) انہوں نے کہا کہ۔ "خدا کا لاکھ لاکھ شکر واحسان کہ اس نے مجھ کو ان دو خوبیوں کے ساتھ استوار کیا جن کو خدا اور اس کا رسول ﷺ پسند کرتا ہے یعنی اگر یہ دونوں خوبیاں میری خود ساختہ اور ازراہ تکلف اختیار کی ہوئی ہوتیں تو ان کے زائل ہو جانے یا ان میں نقصان پیدا ہو جانے کا خدشہ ہوتا مگر چونکہ فطری ہیں اور خدا کی عطا کی ہوئی ہیں اس لئے میں بجا طور پر امید رکھتا ہوں کہ یہ دونوں میرے اندر ہمیشہ رہیں گی اور باقی رہیں گی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

آہستگی وبردباری کی فضیلت اور جلد بازی کی مذمت

(۳) عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدِ السَّاعِدِيِّ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْاَنَاةُ مِنَ اللّٰهِ وَالْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَقَدْ تَكَلَّمَ بَعْضُ اَهْلِ الْحَدِيْثِ فِيْ عَبْدِالْمُهَيْمِنِ بْنِ عَبَّاسٍ الرَّاوِيْ مِنْ قِبَلِ حِفْظِهٖ۔

"حضرت سہل ابن ساعد ساعدیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "کسی کام میں آہستگی وبردباری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے (یعنی یہ خوبی الہام خداوندی کے ذریعہ کسی انسان کو حاصل ہوتی ہے) اور جلد بازی شیطان کی خصلت ہے۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے، نیز بعض محدثین نے (اس حدیث کے راوی) عبدالمہیمن ابن عباسؓ کی یادداشت کے بارے میں

کلام کیا ہے (یعنی انہوں نے کہا ہے کہ عبدالمہیمن کا حافظہ زیادہ اچھا نہیں تھا اگرچہ ان کے عدل و ثقہ میں کوئی شبہ نہیں۔"

تشریح: اس حدیث کو بیہقیؒ نے بھی شعب الایمان میں بطریق مرفوع نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ کہ اَلتَّانِیُ مِنَ اللّٰہِ وَالْعَجَلَۃُ مِنَ الشَّیْطَانِ۔

اور جلد بازی شیطان کی خصلت ہے" کا مطلب یہ ہے کہ کسی دنیاوی کام میں غور و فکر نہ کرنا، اس کے انجام پر نظر رکھے بغیر اس کو شروع کر دینا اور جلد بازی کی روش اختیار کرنا ایک ایسی خصلت ہے جس کو شیطان وسوسوں اور واہمات کے ذریعہ انسان میں پیدا کرتا ہے جس سے اس کا مقصد اس کے کام کو خراب کرنا اور خود اس کو پریشانیوں میں مبتلا کرنا ہوتا ہے۔ بعض حضرات نے یہ وضاحت کی ہے کہ اس سے وہ امور مستثنیٰ ہیں جن کی خیر و برکت میں کوئی شبہ یعنی اچھی چیزوں میں عجلت کرنا شیطان کی خصلت نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ۔

ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ (جہاں تک عبادات و طاعات کا تعلق ہے تو جاننا چاہئے کہ) ایک تو کسی عبادت و طاعت کی طرف سرعت و جلد روی کو اختیار کرنا ہے۔ اور دوسرے اس عبادت و طاعت کو کرتے وقت جلد بازی کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کے درمیان فرق ہے، چنانچہ اول الذکر ایک مطلوب و مستحسن چیز ہے اور ثانی الذکر ایک مذموم خصلت ہے اس بات کو مثال کے طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک تو نماز کے لئے جلدی کرنا ہے اور ایک نماز میں جلدی کرنا ہے، نماز کے لے جلدی کرنا تو یہ ہے کہ جب نماز کا وقت ہو جائے تو اس کو ادا کرنے میں تاخیر نہ کرے جلدی جلدی تیاری کرے اور نماز پڑھنے لگے۔ یہ چیز نہ صرف یہ کہ اس "جلدی بازی" میں شامل نہیں ہے جس کی برائی بیان کی گئی ہے۔ بلکہ یہ ایک مستحسن و مطلوب فعل ہے۔ اور (نماز میں جلدی کرنا) یہ ہے کہ جب نماز پڑھنے لگے تو اس نماز سے جلد از جلد فارغ ہو جانے کی خاطر اس کے ارکان و افعال کی ادائیگی میں عجلت کرنے لگے یہ چیز یعنی کسی نیک کام کو جلد بازی سے پورا کرنا مذموم ہے۔ لہٰذا ملا علی قاریؒ کے مذکورہ بالا الفاظ کا حاصل یہ نکلا کہ فرط شوق سے کسی اچھے کام کی طرف لپکنا اور اس کی انجام دہی کے لئے جلد سے جلد تیار ہونا ایک اچھی چیز ہے۔ اور اس اچھے کام کو جلد بازی کے ساتھ کرنا ایک بری چیز ہے۔

تجربہ سب سے بڑی دانائی ہے

④ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا حَلِیْمَ اِلَّا ذُوْ عَثْرَۃٍ وَلَا حَکِیْمَ اِلَّا ذُوْ تَجْرِبَۃٍ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کوئی شخص کامل بردبار نہیں ہوتا جب تک اس کو لغزش نہ ہوئی ہو اور کوئی شخص کامل حکیم نہیں ہوتا جب تک کہ اس کو تجربہ حاصل نہ ہو" اس روایت کو احمدؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حدیث کے پہلے جملے کا مطلب یہ ہے کہ حلم و بردباری اور لحاظ و مروت کا جوہر اسی شخص میں ہوتا ہے جس نے دھوکا کھایا ہو لغزشوں اور خطاؤں سے دوچار ہوا ہو گناہ و معصیت کا مرتکب ہو چکا ہو اور اپنے معاملات میں خلل و نقصان برداشت کر چکا ہو، اور ہوشیار ہونے کے بعد ندامت و خجالت کا بار گراں کاندھوں پر اٹھائے پھرا ہو! ظاہر ہے کہ ایسا شخص چونکہ اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہے کہ کسی کے دکھ درد اور نفع و نقصان کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ کسی کے عیوب کو چھپانے اور کسی کی خطاؤں سے درگزر کرنے کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ دوسروں کے تئیں حلیم و بردبار اور خیر خواہ ہوتا ہے لوگوں کے عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے اور اگر کسی سے کوئی خطا و لغزش ہو جاتی ہے تو اس سے درگزر کرتا ہے۔

حکیم اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جو دانا و عقلمند، راست باز اور استوار کار ہو، کیونکہ حکمت کے معنی ہیں ہر چیز کی حقیقت و

اصلیت کو جاننا! اور "تجربہ" کا مطلب ہے کاموں کی واقفیت حاصل ہونا اور کسی کام کو کرنے کا طریقہ جاننا لہٰذا فرمایا گیا کہ جس شخص کو اشیاء کی حقیقت و پہچان حاصل ہوئی ہر چیز کے نفع نقصان سے آگاہ ہوا، حالات کے اتار چڑھاؤ اور معاملات و افراد کی بھلائی برائی سے واقف ہوا اس کو "حکمت کی دولت مل گئی اور وہ "کامل حکیم" ہوا۔

اور اگر "حکیم" سے طبیب و معالج مراد لیا جائے تو بھی مطلب بالکل صاف ہے کہ کوئی شخص محض علم طب پڑھنے سے کامل طبیب و معالج نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کے لئے تجربہ اور معالجہ کی مشق و مزاولت ضروری ہے۔

وہی کام کرو، جس کا انجام اچھا نظر آئے

⑤ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْصِنِيْ فَقَالَ خُذِالْاَ مْرَبِالتَّدْبِيْرِ فَاِنْ رَأَيْتَ فِيْ عَاقِبَتِهٖ خَيْرًا فَاَمْضِهٖ وَاِنْ خِفْتَ غَيًّا فَاَمْسِكْ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ حضرت (ﷺ) مجھ کو (کوئی ایسی) وصیت فرما دیجے (جس پر میں اپنے کاموں اور معاملات میں عمل کروں اور جس کی وجہ سے میرا کوئی کام و عمل بگڑنے نہ پائے) حضور ﷺ نے فرمایا "تم جب بھی کسی کام کو (کرنے کا ارادہ) کرو تو تدبر اختیار کرو! (یعنی انجام) پر نظر ڈال لو اور اس کے تمام مصلح و مفاسد پر اچھی طرح غور و فکر کر لو) اور پھر اگر تمہیں اس کام کے انجام میں (دینی و دنیوی) خیر و بھلائی نظر آئے تو اس کو کرو اور اگر تمہیں اس کے انجام میں (کسی دینی یا دنیوی) گمراہی واخروی خوف محسوس ہو تو اس کو چھوڑ دو۔" (شرح السنۃ)

توقف و تاخیر نہ کرو

⑥ وَعَنْ مُصْعَبِ بْنِ سَعْدٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ الْاَعْمَشُ لَا اَعْلَمُهٗ اِلَّا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ التُّؤَدَةُ فِيْ كُلِّ شَيْءٍ خَيْرٌ اِلَّا فِيْ عَمَلِ الْاٰخِرَةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مصعب ابن سعدؒ نے اپنے والد (حضرت سعدؓ) سے ایک روایت نقل کی ہے جس کے بارے میں (حدیث کے راوی) حضرت اعمش کہتے ہیں۔ کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس حدیث کو حضرت سعدؓ نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے (اور وہ یوں ہے کہ) آنحضرت ﷺ نے فرمایا "توقف و تاخیر ہر عمل میں بہتر ہے مگر آخرت کے عمل میں نہیں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں توقف و تاخیر نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان کو فورًا کر لینا چاہئے۔ کیونکہ نیک کام میں تاخیر کا مطلب بہت سی آفات اور کوتاہیوں کا خطرہ مول لینا ہے علاوہ ازیں دنیاوی امور کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کسی دنیاوی کام کو کیا جائے تو ابتداء میں عام طور پر اس کے انجام کا حال معلوم نہیں ہوتا کہ آیا اس کام کا انجام یقینی طور پر اچھا ہوگا۔ جس کی وجہ سے اس کو فورًا کر لینا ضروری ہو یا اچھا نہیں ہوگا۔ کہ اس کے کرنے میں تاخیر کی جائے لہٰذا تعلیم دی گئی ہے کہ اپنے دنیاوی معاملات میں توقف و تاخیر اختیار کرو اور کوئی بھی کام شروع کرنے سے پہلے اچھی طرح غور و فکر کر لو، اس کے برخلاف دینی کاموں کا انجام چونکہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا علم نہ ہو اس لئے ان میں تاخیر کی گنجائش نہیں ہوتی علاوہ ازیں قرآن کریم میں یہ حکم بھی دیا گیا ہے۔

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔

"نیکی و بھلائی کے کاموں میں سبقت و عجلت کرو اور مغفرت و بخشش کی طرف لپکو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے۔"

تشریح: امام غزالیؒ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ مؤمن کے لئے مناسب یہ ہے کہ جونہی اس کے دل میں خدا کے نام پر اپنا مال خرچ کرنے کا داعیہ پیدا ہو تو وہ اس نیک کام میں قطعاً توقف و تاخیر نہ کرے، کیونکہ جب کوئی شخص اللہ

کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا چاہتا ہے تو شیطان اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالنے لگتا ہے کہ اگر اپنا مال خرچ کیا تو کنگال ہو جاؤ گے اسی طرح وہ اس کو فقر و افلاس سے ڈراتا ہے اور صدقہ و خیرات کرنے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے لہٰذا توقف و تاخیر کرنے کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ کہ وقت گزرنے کے ساتھ شیطان کا داؤ چل جائے اور اس نیکی سے ہاتھ دھونا پڑے۔

ایک بزرگ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ایک دن بیت الخلاء میں تھے کہ انہوں نے وہیں سے اپنے شاگرد کو آواز دی اور کہا کہ میرے بدن کی قمیص اتار کر فلاں شخص کو دیدو، شاگرد نے یہ سن کر کہا کہ یہ بات آپ بیت الخلاء سے نکلنے کے بعد بھی کہہ سکتے تھے اس قدر بے صبری کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ جیسے ہی میرے دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ میں یہ قمیص فلاں ضرور تمند کو دیدوں تو میں نے ارادہ کر لیا کہ فوراً یہ نیک کام کر لوں۔ کیوں کہ میں اپنے نفس پر بھروسہ نہیں کر سکتا نہ معلوم اس کا ارادہ کب بدل جائے اور میں اس نیکی سے محروم رہ جاؤں۔

نبوت سے تعلّق رکھنے والی صفات کا ذکر

(۷) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَرْجِس اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ السَّمْتُ الْحَسَنُ وَالتُّؤَدَةُ وَالْاِقْتِصَادُ جُزْءٌ مِنْ اَرْبَعٍ وَعِشْرِيْنَ جُزْءً مِّنَ النُّبُوَّةِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عبداللہ ابن سرجسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "نیک راہ روش، کسی کام میں آہستگی اور غور و فکر کے لئے تاخیر کرنا، اور میانہ روی وہ خوبیاں ہیں جو نبوت کے چوبیس اجزاء میں سے ایک جزء ہیں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "میانہ روی" کے معنی ہیں ہر کام اور ہر حالت میں درمیانی راہ اختیار کرنا اور افراط و تفریط (یعنی زیادتی اور کمی) سے اجتناب کرنا جیسے خرچ کرنے میں نہ تو اسراف کرنا اور نہ بخل کرنا بلکہ درمیانی طریقہ یعنی جود و سخاوت اختیار کرنا۔ یا ہمت و حوصلہ کے اظہار کے موقع پر نہ تو تہور دکھانا اور نہ بزدل بن جانا بلکہ درمیانی راہ شجاعت کو اختیار کرنا یا اعتقادی اور نظریاتی معاملات میں بھی میانہ روی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ اسی عقیدہ پر اعتماد کیا جائے۔ اور وہی نظریہ اپنایا جائے جو دین و دیانت اور عقل و دانش کے اعتبار سے معتدل سمجھا جاتا ہے مثلاً ایک عقیدہ جبر کا ہے اور ایک قدر کا ہے یہ دونوں عقیدے افراط کے حامل ہیں۔ ان دونوں کے برخلاف درمیانی عقیدہ وہ ہے جو اہل سُنّت والجماعت کا ہے اسی طرح میانہ روی اختیار کرنے کے حکم کا تعلّق معیشت سے بھی ہے۔ اور اس کی درمیانی راہ یہ ہے کہ ضروریات زندگی پر نہ تو اتنا خرچ کیا جائے جو اسراف اور عیش و عشرت کی حد تک ہو اور نہ اس قدر کم خرچ کیا جائے جو تنگی و تکلیف میں مبتلا کر دے بلکہ ان دونوں کے درمیان اعتدال پیدا کیا جائے جیسا کہ خود ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

الاقتصاد فی النفقة نصف المعیشة۔

"خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرنا معیشت کا آدھا سرمایہ ہے۔"

غرضیکہ انسانی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر فعل و عمل میں میانہ روی اختیار کرنے کا حکم ہے اور یہی چیز (یعنی ہر ایک امر میں اعتدال و میانہ روی اختیار کرنا) وہ کمال ہے جو انسان کو اس کی مراد اور اس کے مقاصد تک پہنچاتا ہے کیونکہ بہت دوڑ کر چلنے والا گر پڑتا ہے اور سُست رفتاری سے چلنے والا بچھڑ جاتا ہے، صرف اعتدال کی چال چل کر ہی منزل پر پہنچا جا سکتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے متعدد مواقع پر راہِ اعتدال اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور بعض چیزوں کا نام لے کر ذکر فرمایا ہے جیسے ایک جگہ ارشاد ہے کہ واقصد فِی مشیک (یعنی اپنی چال میں میانہ روی اپناؤ) اور ایک جگہ یوں فرمایا ہے کہ کُلُوْا وَاشْرِبُوْا وَلَاتُسْرِفُوْا (یعنی کھاؤ اور پیو اور اسراف سے اجتناب کرو۔

بعض عارفینؒ نے کہا ہے کہ علم و عمل میں بھی میانہ روی کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی وجہ سے مختلف علمی و عملی آفات سے بچا جا سکتا ہے چنانچہ حصول علم میں اتنی ہی مشغولیت بہتر ہے جو عمل سے باز نہ رکھے، اور عمل میں اسی قدر انہماک روا ہے، جو حصول علم سے باز نہ

رکھے۔

"نبوت کے چوبیس اجزاء میں سے ایک جزء ہیں" کے بارے میں شارحین نے لکھا ہے کہ یا تو یہ سب چیزیں مل کر ایک جزء کا درجہ رکھتی ہیں۔ یا ان میں سے ہر ایک چیز ایک جزء ہے اور اس جزء کا مطلب یہ ہے کہ یہ خوبیاں اور صفات ان خوبیوں اور صفات میں سے ایک ہیں جن سے انبیاء کرام علیہم السلام متصف و مزین ہوتے ہیں۔ رہی یہ بات کی اجزاء نبوت کے عدد کے تعین سے کیا مراد ہے؟ تو حقیقت یہ ہے کہ اس کی مراد صرف شارع ﷺ ہی بیان فرما سکتے تھے۔ جس کو بیان نہیں فرمایا گیا یوں بیان کرنے کو مختلف باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ مگر اس کی حقیقت تک چونکہ نور نبوت کے علاوہ کوئی بھی انسانی فہم و ادراک نہیں پہنچ سکتا اس لئے اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں کہنا چاہئے۔ اور اس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی کے سپرد کر دینا چاہئے۔

⑧ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْهَدْیَ الصَّالِحَ وَالسَّمْتَ الصَّالِحَ وَالْاِقْتِصَادَ جُزْءٌ مِنْ خَمْسٍ وَّعِشْرِيْنَ جُزْءًا مِّنَ النُّبُوَّةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "نیک سیرت، نیک راہ روش اور میانہ روی وہ خوبیاں ہیں جو نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جزو ہیں۔" (ابوداؤدؒ)

"ہدی صالح" اور "سمت صالح" کے درمیان فرق یہ ہے کہ "ہدی" کا تعلق انسان کے باطنی احوال سے ہے اسی لئے اس کا ترجمہ نیک سیرت کیا گیا ہے۔ جس کو نیک خوئی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اور "سمت کا تعلق انسان کے ظاہری احوال و کردار سے ہے اس لئے اس کا ترجمہ "نیک راہ و روش" کیا گیا ہے اس کو نیک چلنی بھی کہا جا سکتا ہے۔ راہ سلوک و طریقت میں ان دونوں کا وہی درجہ ہے جو شریعت میں ایمان و اسلام کا ہے اس اعتبار سے نیک خوئی اور نیک چلنی یہ دونوں خوبیاں ایک ساتھ جس مؤمن میں ہوں تو نور علی نور اور اس کے مرتبہ حقیقت کے کامل ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

اس حدیث میں ان خوبیوں کو نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جزو کہا گیا ہے جب کہ پچھلی حدیث میں چوبیس کا عدد منقول ہوا ہے، لہٰذا دونوں روایتوں میں یہ تفاوت و فرق یا تو کسی راوی کے وہم و خطا میں مبتلا ہو جانے کی بنا پر ہے یا اس میں بھی کوئی بھید ہے کہ حضور ﷺ نے کسی موقع پر تو چوبیس کا عدد ذکر فرمایا اور کسی موقع پر پچیس کا۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پہلے تو حضور ﷺ نے یہی فرمایا کہ یہ خوبیاں نبوت کے چوبیس اجزاء میں سے ایک جزء ہیں اور پھر آپ ﷺ نے از راہ عنایت ان خوبیوں کا ایک درجہ اور بڑھا دیا اور یہ فرمایا کہ یہ خوبیاں نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جزء! یا یہ کہ پچھلی حدیث میں جن تین خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ مل کر چوبیس اجزاء میں سے ایک جزء کا درجہ پاتی ہیں اور اس حدیث میں جن تین خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ مل کر پچیس اجزاء میں سے ایک جزء کا درجہ پاتی ہیں، اس صورت میں یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ یہ راوی کے وہم و خطا میں مبتلا ہو جانے کا نتیجہ ہے کہ اس سے ایک روایت میں چوبیس کا عدد نقل ہو اور ایک روایت میں پچیس کا۔

کسی کا راز امانت کی طرح ہے

⑨ وَعَنْ جَابِرِ ابْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ الْحَدِيْثَ ثُمَّ الْتَفَتَ فَهِیَ اَمَانَةٌ۔

(رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت جابرؓ ابن عبداللہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جب کوئی شخص (کوئی) ایسی بات کہے (جس کا وہ اخفا چاہتا ہے) اور پھر وہ چلا جائے تو اس کی وہ بات امانت ہے"۔" (ترمذیؒ وابوداؤدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اس کی وہ بات، سننے والوں کے لئے ایک امانت کا حکم رکھتی ہے لہٰذا ان کو چاہئے۔ کہ وہ اس امانت میں خیانت

نہ کریں یعنی اس کو ظاہر نہ کریں۔

مشورہ چاہنے والے کو وہی مشورہ دو، جس میں اس کی بھلائی ہو

(۱۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِاَبِی الْهَيْثَمِ بْنِ التَّيِّهَانِ هَلْ لَكَ خَادِمٌ قَالَ لَا فَقَالَ فَاِذَا اَتَانَا سَبْیٌ فَاْتِنَا فَاُتِیَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِرَاْسَيْنِ فَاَتَاهُ اَبُو الْهَيْثَمِ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اخْتَرْ مِنْهُمَا فَقَالَ يَا نَبِیَّ اللّٰهِ اخْتَرْ لِیْ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمُسْتَشَارَ مُؤْتَمَنٌ خُذْ هٰذَا فَاِنِّیْ رَاَيْتُهٗ يُصَلِّیْ وَاسْتَوْصِ بِهٖ مَعْرُوْفًا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے (ایک صحابیؓ) حضرت ابوالہیثم ابن تیہانؓ سے پوچھا کہ تمہارے پاس کوئی خادم ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا! "جب ہمارے پاس کہیں سے غلام آئیں تو تم آجانا (میں تمہیں ایک غلام دیدونگا) چنانچہ (کچھ عرصہ کے بعد) جب نبی کریم ﷺ کے پاس دو غلام لائے گئے تو ابوالہیثمؓ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ یہ دو غلام ہیں ان دونوں میں سے کسی ایک کو اپنے لئے پسند کر لو! ابوالہیثمؓ نے عرض کیا کہ یا نبی اللہ (ﷺ)! آپ ہی میرے لئے کوئی غلام پسند فرما دیجئے! حضور ﷺ نے فرمایا "جس شخص سے مشورہ لیا جائے اس کو امین ہونا چاہئے۔ (یعنی مشیر کو چاہئے کہ مشورہ چاہنے والے کی بھلائی و بہبودی کو بہر صورت ملحوظ رکھے اور وہی مشورہ دے جو اس کے حق میں بہتر ہو! گویا حضور ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ ابوالہیثمؓ پر واضح کیا کہ جب تم نے حق انتخاب میرے سپرد کر دیا ہے اور مجھ سے مشورہ چاہتے ہو تو میں تمہیں وہی غلام دوں گا جو تمہارے لئے بہتر و مناسب ہو اس کے بعد حضور ﷺ نے ان دونوں غلاموں میں سے ایک غلام کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ) اس غلام کو لے جاؤ کیونکہ میں نے اس کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے (یعنی یہ غلام چونکہ نمازی اور دین دار ہے اس لئے تمہارے حق میں بہت اچھا رہے گا) اور اس کے ساتھ اچھا سلوک اور بھلائی اختیار کرنے کی میری وصیت پر ہمیشہ عمل کرنا"۔ (ترمذی)

تشریح: ایک روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ جب حضرت ابوالہیثمؓ اس غلام کو لے کر اپنے گھر آئے اور اہلیہ محترمہؓ سے فرمایا کہ سرکار ﷺ نے مجھ کو یہ غلام عطا کیا ہے اور اس کے ساتھ اچھا سلوک اور بھلائی کرنے کی وصیت فرمائی ہے تو ان کی بیوی نے کہا کہ اس وصیت پر عمل پیرا ہونے کا حق شاید پوری طرح ادا نہ ہو سکے اس لئے اس کے ساتھ حسن سلوک یہی ہے کہ اس کو آزاد کر دو۔

وہ تین باتیں جو کسی کا راز بھی ہوں تو ان کو ظاہر کر دو

(۱۱) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ اِلَّا ثَلٰثَةَ مَجَالِسَ سَفْكُ دَمٍ حَرَامٍ اَوْ فَرْجٌ حَرَامٌ اَوِ اقْتِطَاعُ مَالٍ بِغَيْرِ حَقٍّ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَبِیْ سَعِيْدٍ اِنَّ اَعْظَمَ الْاَمَانَةِ فِیْ بَابِ الْمُبَاشَرَةِ فِی الْفَصْلِ الْاَوَّلِ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "مجلسیں، امانت کے ساتھ وابستہ ہیں (یعنی اگر کسی مجلس میں کوئی ایسی بات سنی جائے جس کا افشاء کیا جانا مناسب نہ ہو تو امانت کی طرح اس بات کی حفاظت کرو یعنی نہ اس کو کہیں نقل کرو اور نہ کسی سے اس کی چغل خوری کرو) البتہ تین مجلسیں یعنی تین چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں کہیں کوئی بات کی جائے تو دوسرے تک ان کو پہنچا دینا ضروری ہے (خواہ کہنے والا ان باتوں کو کتنا ہی اہم راز کیوں نہ سمجھے، اور وہ تینوں یہ ہیں (۱) جس خون کو ناحق بہانا حرام ہے اس کو بہانے (یعنی کسی کو ناحق قتل کرنے کے مشورہ وارادہ کی بات)۔ (۲) حرام کاری یعنی زنا کرنے کے مشورہ وارادہ کی بات (۳) کسی کا مال ناحق چھیننے کے مشورہ وارادہ کی بات۔" (ابوداؤدؒ) اور حضرت ابوسعیدؓ کی روایت اِنَّ اَعْظَمَ الْاَمَانَةِ الخ باب المباشرۃ کی پہلی فصل میں ذکر کی جا چکی ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سے یہ بات سنے کہ میں فلاں آدمی کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں یا فلاں عورت کے ساتھ بدکاری کروں گا یا فلاں شخص کا مال زور وزبردستی ہتھیاؤنگا تو اس طرح کی اس بات سننے والے کو چاہئے کہ وہ اس کو ایسا راز نہ سمجھے جس کو پوشیدہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بلکہ اس کو فوراً ظاہر کردے یعنی اس بات سے متعلقہ لوگوں کو آگاہ کردے تاکہ وہ ہوشیار ہو جائیں اور اپنے آپ کو بچائیں اسی طرح اس مجلس کی باتوں کا افشاء کرنا بھی جائز ہے جن میں دین وملت اور قوم کو نقصان پہنچانے پر گفتگو و تجویز ہوئی ہو! یہ مطلب حضرت شیخ عبدالحق ؒ نے لکھا ہے۔

اور ملا علی قاری ؒ نے اس حدیث کی تشریح میں جو کچھ لکھا ہے اس کی روشنی میں مطلب یہ ہے کہ ایک مؤمن کے لئے مناسب یہ ہے کہ اگر وہ کسی مجلس میں لوگوں کو کوئی برا کام کرتے دیکھے تو وہ ان کی اس بدعملی کا چرچا کرتا نہ پھرے البتہ تین مجلسیں ایسی ہیں کہ ان میں کی جانے والی برائیوں کا چرچا کیا جاسکتا ہے۔ جن میں سے ایک مجلس وہ ہے جس میں کسی کو ناحق قتل کیا جارہا ہو، دوسری مجلس وہ ہے جس میں کسی عورت کی عصمت لوٹی جارہی ہو اور تیسری مجلس وہ ہے جس میں کسی شخص کا مال ناحق ہتھیایا جارہا ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

عقل کی تعریف واہمیت

⑫ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْعَقْلَ قَالَ لَهٗ قُمْ فَقَامَ ثُمَّ قَالَ لَهٗ اَدْبِرْ فَاَدْبَرَ ثُمَّ قَالَ اَقْبِلْ فَاَقْبَلَ ثُمَّ قَالَ لَهٗ اقْعُدْ فَقَعَدَ ثُمَّ قَالَ لَهٗ مَا خَلَقْتُ خَلْقًا هُوَ خَیْرٌ مِّنْكَ وَلَا اَفْضَلُ مِنْكَ وَلَا اَحْسَنُ مِنْكَ بِكَ اٰخُذُ وَبِكَ اُعْطِیْ وَبِكَ اُعْرَفُ وَبِكَ اُعَاتِبُ وَبِكَ الثَّوَابُ وَعَلَیْكَ الْعِقَابُ وَقَدْ تَكَلَّمَ فِیْهِ بَعْضُ الْعُلَمَآءِ۔

"حضرت ابوہریرہ ؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا تو اس سے فرمایا کہ کھڑی ہو جا! وہ کھڑی ہوگئی پھر اس سے فرمایا کہ پشت پھیر اس نے پشت پھیرلی، پھر اس سے فرمایا کہ میری طرف منہ کر، اس نے خدا کی طرف منہ کرلیا پھر اس سے فرمایا کہ بیٹھ جا! وہ بیٹھ گی اور پھر اس سے فرمایا کہ "میں نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کی جو تجھ سے بہتر ہو، فضل و کمال میں تجھ سے بڑھی ہوئی ہو اور خوبیوں میں تجھ سے اچھی ہو میں تیرے ہی سبب سے (بندوں سے عبادت) لیتا ہوں (یعنی تیری رہنمائی کے ذریعہ بندے میری عبادت کرتے ہیں یا یہ کہ تیرے ہی سبب بندوں سے نعمتیں واپس لے لیتا ہوں، بایں طور کہ جو بندے تیرے بارے میں کوتاہی کرتے ہیں اور میری نافرمانی کرنے لگتے ہیں۔ تو وہ میرے غضب میں مبتلا ہو کر میرے انعامات سے محروم ہو جاتے ہیں) میں تیرے ہی سبب سے (بندوں کو ثواب ودرجات) دیتا ہوں (یا یہ کہ میں جس بندے کو نعمت دیتا ہوں تیرے ہی واسطے دیتا ہوں کہ جس نے تیرے لئے محنت ومشقت اختیار کی اس کو اجر وانعام کا مستحق گردانتا ہوں) میں تیرے ہی سبب سے پہچانا جاتا ہوں میں تیرے ہی سبب غضبناک ہوتا ہوں میں تیرے ہی سبب سے ثواب دیتا ہوں اور تیرے ہی سبب سے عذاب دیتا ہوں (حاصل یہ کہ دنیا وآخرت میں انسان کا احکام خداوندی کا مکلف ومخاطب بننا، خدا کی رضا وخوشنودی اور اس کے غیظ وغضب کا مورد بننا اور ثواب وعذاب کا مستحق ومستوجب گردانا جانا، ان سب کا مدار عقل پر ہے) بعض علماء نے اس حدیث کے صحیح ہونے میں کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔"

تشریح: حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقل کو جسم کے ساتھ پیدا کیا تھا، جیسا کہ قیامت میں حساب کتاب کے بعد موت کو دنبہ کی صورت میں لایا جائے گا اور پھر اس کو جنت ودوزخ کے درمیان ذبح کردیا جائے گا۔

قیامت کے دن عقل کے مطابق جزاء ملے گی

⑬ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الرَّجُلَ لَیَكُوْنُ مِنْ اَهْلِ الصَّلٰوةِ وَالصَّوْمِ وَالزَّكٰوةِ

وَالْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ حَتّٰى ذَكَرَ سِهَامَ الْخَيْرِ كُلَّهَا وَمَا يُجْزٰى يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِلاَّ بِقَدْرِ عَقْلِهِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ایک شخص جو نماز پڑھنے والوں میں سے ہو، روزہ رکھنے والوں میں سے ہو، زکوٰۃ دینے والوں میں سے ہو، حج اور عمرہ کرنے والوں میں سے ہو۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اسی طرح نیکی اور بھلائی سے متعلق ساری بڑی بڑی چیزوں کا ذکر کیا اور فرمایا کہ لیکن وہ قیامت کے دن اپنی عقل کے مطابق جزاء پائے گا"۔

تشریح: ان حدیثوں میں "عقل" سے مراد وہ اعلیٰ جوہر ہے جس کے ذریعہ انسان اشیاء واسباب کی حقیقت کا ادراک کرتا ہے، دنیا و آخرت کی بھلائیوں اور برائیوں کو معلوم کرتا ہے نیکی اور بدی کے درمیان فرق وامتیاز کرتا ہے، نفس کی آفات اور گمراہیوں سے اجتناب کرتا ہے، نیک راہ وروش اختیار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب واتصال حاصل کرتا ہے۔ بعض عارفین کے کلام میں جس "عقل معاد" کا ذکر آتا ہے اس سے یہی عقل مراد ہے یہ اعلیٰ جوہر جس شخص میں جس نوعیت ومقدار کا ہوتا ہے اس کے اندر مذکورہ بالا اوصاف بھی اسی کے تناسب سے ہوتے ہیں اسی لئے فرمایا گیا ہے جس شخص میں جتنی عقل ہوگی اس کو قیامت کے دن اسی کے مطابق جزاء دی جائے گی کیونکہ خدا کی طرف سے جزاو انعام کا مدار محض عبادت وطاعت یا عبادات وطاعات کی مقدار پر نہیں ہوگا بلکہ عبادت کے حسن وکمال پر ہوگا اور ظاہر ہے کہ عبادات وطاعات میں حسن وکمال کیفیت وکیت اسی عقل سے متعلق ہے۔

اسی موقع پر علماء اس بارے میں بحث واختلاف کرتے ہیں کہ آیا علم افضل ہے یا عقل چنانچہ بعض حضرات علم کو افضل قرار دیتے ہیں اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ علم کی بہ نسبت عقل افضل ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ علم کا معنوی اطلاق بھی قوت تمیز ومعرفت پر ہوتا ہے۔ جو عقل سے روشنی پاتی ہے تو اس صورت میں بحث اختلاف کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اس اعتبار سے یہ بات البتہ کہی جاسکتی ہے کہ علم وعقل کو عمل وعبادت پر فضیلت حاصل ہے۔ چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ صاحب عقل عالم کی ایک رکعت نماز دوسرے لوگوں کی ایک ہزار رکعتوں سے افضل قرار پائے گی۔

تدبر کی فضیلت

⑭ وَعَنْ اَبِىْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ لِىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَبَاذَرٍّ لَا عَقْلَ كَالتَّدْبِيْرِ وَلَا وَرَعَ كَالْكَفِّ وَلَا حَسَبَ كَحُسْنِ الْخُلُقِ۔

"اور حضرت ابوذرؓ یہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ابوذر (جان لو) عمل تدبیر کے برابر نہیں، ورع یعنی پرہیزگاری اجتناب واحتیاط کے برابر نہیں اور حسب وفضیلت خوش خلقی کے برابر نہیں ہے۔"

تشریح: "تدبیر" کے معنی ہیں ہر کام کے انجام پر نظر رکھ کر اس کے لئے سامان کرنا۔ لہٰذا "عقل تدبیر کے مانند نہیں" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی عقل، عقل تدبیر (وہ عقل کہ جس کے ساتھ تدبیر ہو) کے برابر نہیں ہوسکتی! گویا مذکورہ جملہ میں "عقل" سے مراد مطلق علم وادراک ہے "تدبیر" سے مراد ہے عقل تدبیر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی کام کیا جائے پہلے اس کے انجام پر نظر رکھی جائے اور اس میں جو بھلائیاں وبرائیاں ہوں ان کو پہچانا جائے۔

ورع کے معنی پرہیزگاری کے ہیں جس کو تقویٰ بھی کہا جاتا ہے اگرچہ بعض حضرات کے نزدیک ورع اور تقویٰ کے درمیان بھی فرق ہے وہ کہتے ہیں کہ ورع کا درجہ تقویٰ کے درجہ سے بڑھا ہوا ہے بایں طور پر کہ تقویٰ کا مطلب ہے حرام چیزوں سے پرہیز کرنا اور تورع کا مطلب ہے ان چیزوں سے بھی پرہیز کرنا جو مکروہ یا مشتبہ ہوں لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ تقویٰ اور تورع دونوں کے ایک ہی معنی ہیں اور عام طور پر سب لوگ ان دونوں کو ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ حدیث میں جو دو لفظ ورع اور کف نقل کئے گئے اور ان میں سے ورع کا ترجمہ پرہیزگاری اور کف کا ترجمہ اجتناب واحتیاط کیا گیا ہے۔ تو کیا ان دونوں کے درمیان کچھ فرق

ہے؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیونکہ ورع کے معنی ہیں باز رہنا اور "کف" کے معنی بھی باز رہنے کے ہیں اس صورت میں حدیث کے اس جملہ لا ورع کالکف پر اشکال واقع ہوتا ہے کیونکہ اس کا لفظی ترجمہ یوں ہوگا "باز رہنا، یا رہنے کے برابر نہیں۔" اور ظاہر ہے کہ اس طرح اس جملہ کے کوئی معنی ہی نہیں ہوں گے چنانچہ طیبیؒ نے اس حدیث کی شرح میں اس اشکال کو ظاہر کیا ہے اور پھر اس کا جواب دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں کف کے معنی مسلمانوں کو ایذاء پہنچانے یا زبان کو لایعنی باتوں میں مشغول کرنے سے پرہیز کرنا ہے اور چونکہ دینی طور پر بھی اور سماجی و معاشرتی طور پر بھی ان دونوں چیزوں میں سے ہر ایک مفاسد اور اس کی برائیاں بہت زیادہ ہیں اس لئے ان کے مفاسد کو ازراہ مبالغہ بیان کرنے کے لئے گویا یہ فرمایا کہ ورع یعنی حرام چیزوں سے باز رہنا اگرچہ ایک اعلیٰ وصف ہے علاوہ ازیں ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ ورع و تقویٰ کے لغوی معنی اگرچہ باز رہنا اور پرہیز کرنا ہیں لیکن شرعی طور پر ان کے مفہوم میں امتثال اور اجتناب دونوں ایک ساتھ داخل ہیں اور اگر ان کا مفہوم صرف اجتناب یعنی پرہیزگاری ہی ہو تو احکام کی فرماں برداری ترک کرنے سے پرہیز کرنا بھی ان کے مفہوم میں داخل ہوتا لہٰذا بات وہی رہی کہ ورع اور تقویٰ کے مفہوم میں امتثال اور اجتناب دونوں داخل ہیں اور اس صورت میں بھی حاصل یہی نکلے گا کہ ورع اور تقویٰ کا اصل مفہوم یہ ہے کہ جو احکام دیئے گئے ہیں ان پر چلا جائے اور ان احکام پر خواہ امتثال کے طور پر ہو یا اجتناب کے طور پر۔ اس طرح جب یہ بات واضح ہوگئی کہ ورع کا تعلق دو چیزوں سے ہے یعنی جن امور کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کو اختیار کرنا اور جن امور سے منع کیا گیا ہے ان سے باز رہنا اور "کف" کا تعلق صرف ایک چیز یعنی ممنوعات سے باز رہنے سے ہے تو مذکورہ اشکال رفع ہوگیا۔ اس کے بعد یہ مسئلہ جان لینا چاہئے۔ جس سے حدیث کے مذکورہ جملہ کا مفہوم اور زیادہ صاف ہو جائے گا۔ کہ جانب اجتناب کی رعایت، جانب امتثال کی رعایت کی بہ نسبت زیادہ مقدم اور زیادہ ضروری ہے، یعنی شریعت نے جن چیزوں سے باز رہنے کا حکم دیا ہے ان سے باز رہنا زیادہ مقدم اور زیادہ ضروری ہے بہ نسبت اس بات کے کہ جن چیزوں کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے ان کو اختیار کیا جائے اسی بنا پر علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص جانب امتثال میں فرض و واجبات اور سنن موکدہ پر اکتفا کرے اور نوافل و مستحبات کو ترک کرے لیکن جانب اجتناب میں خوب اہتمام کرے یعنی تمام حرام مکروہ اور مشتبہ چیزوں سے پرہیز کرے تو وہ شخص منزل مقصود پالے گا یعنی معرفت و حقیقت اور قرب خداوندی کا درجہ حاصل کرے گا اس کے برخلاف اگر کوئی شخص جانب امتثال میں خوب اہتمام کرے یعنی فرائض و واجبات اور سنن موکدہ پر بھی عمل کرے۔ اور تمام نوافل و مستحبات کو بھی ادا کرے لیکن جانب اجتناب کی رعایت نہ کرے یعنی ممنوعات کا ارتکاب کرتا رہے۔ تو وہ شخص منزل مقصود کو نہیں پہنچے گا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص بیمار ہو اور وہ پرہیز تو پوری طرح کرے لیکن دوا نہ کھائے تو وہ اچھا ہو جائے گا خواہ کتنی ہی دیر میں اچھا ہو، اس کے برخلاف اگر وہ دوائیں کھاتا رہے لیکن پرہیز بالکل نہ کرے تو وہ ہرگز شفا نہیں پائے گا۔ بلکہ روز بروز بیمار ہوتا چلا جائے گا۔

"حسب و فضیلت خوش خلقی کے برابر نہیں ہے" حسب اصل میں کہتے ہیں اپنے اور اپنے باپ دادا کے فضائل و مناقب کو گنوانا اور اپنے خاندانی فخریہ کارناموں کو بیان کرنا۔ لہٰذا اس جملہ میں اس حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ انسان کی ذاتی فضیلت و بزرگی اور انسانیت کا اصل تقاضا یہ ہے کہ اس میں خوش خلقی ہو اگر کوئی شخص خوش خلقی کی صفت سے محروم ہے تو وہ لاکھ اپنے مناقب گنوائے اور لاکھ اپنے فخریہ کارناموں کا اظہار کرے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوگی۔ واضح رہے کہ اگر خوش خلقی میں "خلق" سے مراد تمام باطنی اوصاف ہوں تو ظاہر ہے کہ حسن اخلاق کو سب سے بہتر اور اصل فضیلت کہا جائے گا، اور اگر "خلق" سے مراد نرم خوئی و مہربانی اور مروت کے اوصاف ہوں جیسا کہ عام طور پر خوش خلقی انہی اوصاف کو کہا جاتا ہے تو اس صورت میں یہ فرمانا کہ حسب و فضیلت خوش خلقی کے برابر نہیں ہے خوش خلقی کی فضیلت کو ازراہ مبالغہ بیان کرنے کے لئے ہوگا۔

اہل تصوف کے نزدیک خوش خلقی کی فضیلت ان الفاظ میں بیان کی جاتی ہے کہ خندہ پیشانی کے ساتھ رہنا، لوگوں کو اپنی عطا و بخشش

سے بہرہ مند کرنا۔ اور خدا کی مخلوق کو ایذاء پہنچانے سے باز رہنا یہ وہ اوصاف ہیں جن پر حسن خلق کا اطلاق ہوتا ہے، یہ حضرت حسن بصریؒ کا قول ہے اور ایک بڑے بزرگ یہ کہتے ہیں۔ کہ حسن خلق یہ ہے کہ خدا کی مخلوق کے ساتھ عداوت کو ترک کیا جائے اور راحت و تنگی، دونوں حالت میں لوگوں کو خوش رکھا جائے اور حضرت سہل تستریؒ کے قول کے مطابق حسن خلق کا سب سے کم تر درجہ یہ ہے کہ مخلوق کی طرف سے جو زیادتی و سختی پیش آئے اس کو برداشت کرے اور کسی سے انتقام نہ لے، ظالم کے حق میں بھی شفیق و مہربان رہے اور اس کی مغفرت کا خواہاں رہے۔

خرچ میں میانہ روی زندگی کا آدھا سرمایہ ہے

⑮ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاِقْتِصَادُ فِي النَّفَقَةِ نِصْفُ الْمَعِيْشَةِ وَ التَّوَدُّدُ اِلَى النَّاسِ نِصْفُ الْعَقْلِ وَحُسْنُ السُّوَالِ نِصْفُ الْعِلْمِ۔ رَوَى الْبَيْهَقِيُّ الْاَحَادِيْثَ الْاَرْبَعَةَ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" اخراجات میں میانہ روی اختیار کرنا نصف معیشت ہے انسانوں سے دوستی نصف عقل ہے اور خوبی کے ساتھ سوال کرنا آدھا علم ہے۔" ان چاروں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: حدیث کے پہلے جز کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اور اپنے متعلقین کی ضروریات زندگی خرچ کرنے میں نہ تو اسراف کرنا اور نہ تنگی و سختی کرنا بلکہ اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنا زندگی کا آدھا سرمایہ ہے بایں طور کہ انسان کی معاشی زندگی کا دار و مدار دو چیزوں پر ہے ایک تو آمدنی دوسرے خرچ اور ان دونوں کے درمیان توازن، خوشحالی کی علامت بھی ہے اور معیشت کے مستحکم ہونے کا ذریعہ بھی لہٰذا جس طرح آمدنی کے توازن کا بگڑنا، خوشحالی کے منافی اور معیشت کے عدم استحکام کا سبب ہے۔ اسی طرح اگر اخراجات کا توازن بگڑ جائے تو نہ صرف خوش حالی مفقود ہوگی۔ بلکہ معیشت کا سارا ڈھانچہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ لہٰذا مصارف میں اعتدال اور خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرنا معیشت کا نصف حصّہ ہوا۔

حدیث کے دوسرے جزء کا مطلب یہ ہے کہ اچھے لوگوں کے ساتھ محبت ظاہر کرنا اور ان کی محبت کو اپنے معاملات و احوال میں خیر و برکت کا سرچشمہ جاننا اس عقل کا نصف حصّہ ہے جو حسن معاشرت کی ضامن ہے۔ گویا پوری عقل مندی یہ ہے کہ انسان کوئی کسب و پیشہ اور سعی و محنت کر کے جائز روزی حاصل کرے اور اس کے ساتھ آپس میں محبت و مروت کے جذبات بھی کار فرما رکھے۔

حدیث کے تیسرے جزء کا مطلب یہ ہے کہ کسی علمی مسلہ میں خوب سوچ سمجھ کر اور اچھی طرح سوال کرنا آدھا علم ہے کیونکہ جو شخص سوال کرنے میں دانا اور سمجھدار ہوتا ہے اسی چیز کے بارے میں سوال کرتا ہے جو بہت زیادہ ضروری اور بہت کار آمد ہوتی ہے۔ اور چونکہ وہ اپنے علم میں اضافہ کا متمنی ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ پوچھی جانے والی چیزوں کے درمیان تمیز کرنا جانتا ہے کہ کیا پوچھنا چاہئے۔ اور کس سے پوچھنا چاہئے اس لئے جب وہ اپنے سوال کا جواب پالیتا ہے تو حل طلب مسلہ میں اس کا علم پورا ہو جاتا ہے اس اعتبار سے گویا علم کی دو قسمیں ہوئیں۔ ایک تو سوال اور دوسرے جواب۔

رہی یہ بات کہ اچھی طرح سوال کرنے کا مطلب ہے تو جاننا چاہئے۔ کہ "اچھے سوال" کا اطلاق اس سوال پر ہوتا ہے جس کے تمام پہلوؤں کی تحقیق و تنقیح کرلی گئی ہو۔ اور اس میں جتنے احتمالات پیدا ہو سکتے ہوں ان سب کی واقفیت ہو تاکہ شافی و کافی جواب پائے اور جواب میں کوئی پہلو تشنہ نہ رہنے پائے اس طرح کا سوال بذات خود علم کی ایک شق ہوگا اور اس پر یہ اشکال وارد نہیں ہوگا کہ جب سوال کرنا، جہل (ناواقفیت) اور تردد پر دلالت کرتا ہے تو سوال کرنے کو نصف علم کس طرح کہا گیا ہے تاہم مذکورہ اشکال کے پیش نظر ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ جو شخص خوب سوچ سمجھ کر اور صحیح انداز میں سوال کرتا ہے اس کے بارے میں یہی سمجھا جاتا ہے۔ کہ یہ ایک ایسا شخص ہے جو علمی ذوق کا حامل ہے اور علم میں اپنا کچھ حصّہ ضرور رکھتا ہے اور اس بات کا خواہش مند ہے کہ اپنے ناقص علم کو پورا کرے لہٰذا اس

کے سوال کو نصف علم کہنا موزوں ہوگا۔ اس کے برخلاف جو شخص بغیر سوچے سمجھے اور خراب انداز میں سوال کرتا ہے وہ اپنے اس سوال کے ذریعہ اپنے نقصان عقل وکمال اور جہالت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی مثال میں اس واقعہ کو پیش کیا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امام ابویوسف ؒ نے اپنی علمی مجلس میں اپنے ایک شاگرد کو مسلسل خاموش بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس سے فرمایا کہ یہاں بیان کی جانے والی باتوں میں سے کوئی بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے یا کوئی مسئلہ تمہیں مشکل معلوم ہو رہا ہو تو اس کے بارے میں پوچھ لینا شرمانا نہیں، کیونکہ کسی حل طلب بات میں سوال کرنے سے شرمانا علم سے باز رکھتا ہے اس وقت حضرت امام یوسف ؒ روزہ کی تعریف میں گفتگو فرما رہے تھے چنانچہ جب انہوں نے فرمایا کہ روزہ صبح سے شروع ہوتا ہے اور غروب آفتاب تک رہتا ہے تو اسی شاگرد نے سوال کیا کہ حضرت! اگر آفتاب غروب ہی نہ ہو تو پھر روزہ کب تک رہیگا؟ حضرت امام ابویوسف ؒ نے (اس کا جاہلانہ سوال سنکر) فرمایا کہ چپ رہو! تمہارا چپ رہنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ تم بولو۔

حاصل یہ کہ سوال کی نوعیت اور سوال کرنے کا انداز سوال کرنے والے کی شخصیت وحالت پر بذات خود دلالت کرتا ہے اور اس کے سوال کی روشنی میں یہ اندازہ نکالنا مشکل نہیں ہوتا کہ یہ شخص بالکل ہی جاہل ہے یا علم سے کچھ سروکار رکھتا ہے جس شخص میں علم وعقل کی روشنی ہوگی اس کا سوال بھی عالمانہ اور عاقلانہ ہوگا اور جو شخص نرا جاہل ہوگا اس کی اور باتوں کی طرح اس کا سوال بھی جاہلانہ اور عامیانہ ہوگا جیسا کہ کسی نے کہا ہے جب جاہل بات کرتا ہے تو گدھے کی طرح معلوم ہوتا ہے اور جب چپ رہتا ہے تو دیوار کی طرح معلوم ہوتا ہے۔

بَابُ الرِّفْقِ وَالْحَيَآءِ وَحُسْنِ الْخُلُقِ
نرمی، مہربانی، حیاء اور حسن خلق کا بیان

"رفق" عنف کی ضد ہے اور اس کے معنی ہیں نرمی وملائمت اور فروتنی کا رویہ اختیار کرنا، اپنے ساتھیوں کے حق میں مہربان ونرم خو ہونا اور ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آنا اور ہر کام اطمینان وخوش اسلوبی کے ساتھ کرنا۔

"حیاء" سے مراد ہے شرمندہ اور محجوب ہونا اور حیاء دراصل اس کیفیت کا نام ہے جو کسی انسان پر عیب وبرائی کے خوف وندامت کی وجہ سے طاری ہوتی ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ بہترین حیا وہی ہے جو نفس کو اس چیز میں مبتلا ہونے سے روکے جس کو شریعت نے بری قرار دیا ہے۔ حضرت جنید ؒ کا قول یہ ہے کہ حیاء اس کیفیت وحالت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے حاصل ہونے اور ان نعمتوں کا شکر ادا نہ کرنے کی وجہ سے وحشت وگھبراہٹ کے ساتھ دل میں پائی جائے اور حضرت رقاق ؒ کا قول یہ ہے کہ حیاء اس کیفیت کا نام ہے جو آقا کے سامنے درخواست وطلب سے باز رکھتی ہے۔

"حسن خلق" یعنی خوش خلق یا اچھے اخلاق کا سب سے واضح مطلب یہ ہے کہ اس چیز کی اتباع وپیروی کی جائے جس کو خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ نے خدا کی طرف سے دنیا والوں کے سامنے پیش کیا ہے یعنی شریعت، آداب طریقت اور احوال حقیقت ومعرفت۔ چنانچہ جب حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو آنحضرت ﷺ کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِيْمٍ (اور بلاشبہ آپ ﷺ خلق عظیم کے مرتبہ پر فائز ہیں) تو آپ ﷺ کے وہ اخلاق کیا تھے؟ جن کو "خلق عظیم" سے تعبیر کیا گیا ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جواب دیا کہ آپ ﷺ کا خلق قرآن کریم ہے۔ یعنی قرآن مجید میں اچھی خصلتیں اور اعلی اوصاف بیان کئے گئے ہیں (خواہ ان کا تعلق اللہ تعالیٰ کی نافرمانی وغیرہ سے ہو یا مخلوق خدا کے ساتھ بد معاملگی وغیرہ سے) آپ ﷺ ان سب سے اجتناب فرماتے تھے۔ (اور یہی چیز انسانی اخلاق وکردار کا سب سے اعلی درجہ ہے) رہی اتباع کے درجات کی بات تو ظاہر ہے کہ

"اتباع بقدر محبت وتوفیق متابعت کے حاصل ہوتی ہے یعنی جو شخص آنحضرت ﷺ کی محبت سے جتنا زیادہ سرشار ہوتا ہے اور اس کو اتباع کرنے کی جس قدر توفیق نصیب ہوتی ہے وہ اتنا ہی زیادہ اور اسی قدر اتباع بھی کرتا ہے اور جس شخص کو آنحضرت ﷺ کی محبت کا جتنا کم حصہ حاصل ہوتا ہے اور اتباع کرنے کی جس قدر کم توفیق نصیب ہوتی ہے۔ وہ اتباع میں بھی اسی قدر پیچھے رہتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الاول

نرمی ومہربانی کی فضیلت

① عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ رَفِیْقٌ یُحِبُّ الرِّفْقَ وَیُعْطِیْ عَلَی الرِّفْقِ مَالَا یُعْطِیْ عَلَی الْعُنْفِ وَمَالَا یُعْطِیْ عَلٰی مَاسِوَاہُ۔ رَوَاہُ مُسْلِمٌ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لَہٗ قَالَ لِعَآئِشَۃَ عَلَیْکِ بِالرِّفْقِ وَاِیَّاکِ وَالْعُنْفَ وَالْفُحْشَ اِنَّ الرِّفْقَ لَا یَکُوْنُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا زَانَہٗ وَلَا یُنْزَعُ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا شَانَہٗ۔

"حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "بلاشبہ اللہ تعالیٰ نرم ومہربان ہے اور نرمی ومہربانی کو پسند کرتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر خود بھی نرم ومہربان ہے اور ان کو ایسے امور کا مکلف قرار نہیں دیتا جو ان کی قوت برداشت سے باہر ہوں اور جن کی وجہ سے وہ دشواریوں اور سختیوں میں مبتلا ہوں اور وہ بندوں کے تئیں بھی اس بات کو پسند کرتا ہے اور اس سے راضی وخوش ہوتا ہے کہ وہ آپس میں نرمی ومہربانی کریں اور ایک دوسرے کو سختیوں اور دشواریوں میں مبتلا نہ کریں) اس لئے وہ نرمی ومہربانی پر وہ چیز عطا فرماتا ہے جو درشتی وسختی پر عطا نہیں فرماتا اور نرمی ومہربانی پر جو چیز عطا کرتا ہے وہ نرمی ومہربانی کے علاوہ کسی بھی دوسری چیز پر عطا نہیں فرماتا (مسلمؒ) اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا۔ "نرمی ومہربانی کو لازمی طور پر اختیار کرو اور سختی ودرشتی اور بے حیائی سے اپنے آپ کو بچاؤ! کیونکہ جس چیز میں نرمی ہوتی ہے اس کو زینت بخشتی ہے اور جس چیز میں سے نکال لی جاتی ہے، وہ عیب دار ہو جاتی ہے۔

تشریح: "اللہ تعالیٰ نرم ومہربان ہے اور نرمی ومہربانی کو پسند کرتا ہے" کے ذریعہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نرمی ومہربانی کو پسند کرنا، خود بندوں کے اس مفاد ومصالح کے پیش نظر ہے کہ آپس میں نرمی ومہربانی اور شفقت ومروت کے جذبات کو فروغ دینا ایک ایسی خوبی ہے جس کے ذریعہ معاشرہ کو مطمئن وپرسکون اور انسانی زندگی کو مختلف پریشانیوں اور بے چینیوں سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے چنانچہ جس معاشرہ کے افراد اپنے تمام امور میں ایک دوسرے سے نرم خوئی اور مہربانی ومروت کا برتاؤ کرتے ہیں ایک دوسرے کو سختیوں اور پریشانیوں میں مبتلا کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ اور باہمی معاملت کو سہولت وآسانی کی بنیاد پر استوار کرتے ہیں اور ان امور ومعاملات کا تعلق خواہ حصول معاش (جیسے تجارت، ملازمت اور محنت مزدوری وغیرہ) سے ہو یا اس کے علاوہ معاشرتی زندگی کے کسی بھی پہلو سے ہو، تو اس معاشرہ کا ہر فرد اپنے آپ کو فلاح یاب وبامراد محسوس کرتا ہے اور پورے معاشرہ پر حق تعالیٰ کی طرف سے خیر وبرکت اور اس کی نعمتوں کا نزول ہوتا ہے چنانچہ ویعطی علی الرفق الخ (وہ نرمی ومہربانی پر وہ چیز عطا فرماتا ہے الخ) کے ذریعہ نہ صرف یہ ترغیب دلائی گئی کہ اپنے امور معاملات میں باہمی طور پر نرمی ومہربانی اختیار کرو تاکہ حصول مقصد کو پہنچ سکو بشارت بھی دی گئی ہے کہ جو لوگ سختی ودرشتی کے بجائے نرمی ومہربانی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں ان کو حق تعالیٰ اجر وثواب عطا فرماتا ہے اور مقاصد میں کامیاب وکامران کرتا ہے۔

"اور نرمی ومہربانی پر جو چیز عطا کرتا ہے... الخ۔" یہ جملہ ماقبل عبارت کے مفہوم کو ایک دوسرے انداز میں کر رہا ہے یعنی پہلے تو نرمی ومہربانی کو سختی ودرشتی پر ترجیح دی گئی اور یہ فرمایا گیا۔ کہ اللہ کی طرف سے اجر وثواب اور حصول مقاصد کی جو نعمت نرمی ومہربانی اختیار کرنے پر ہوتی ہے وہ سختی ودرشتی اختیار کرنے کی صورت میں عطا نہیں ہوتی اور پھر آگے اس جملہ کے ذریعہ اس طرف اشارہ فرمایا کہ نرمی

و مہربانی اپنی ضد یعنی سختی و درشتی ہی پر نہیں بلکہ حصول مقصد کے اور دوسرے اسباب و وسائل پر بھی ترجیح و فضیلت رکھتی ہے البتہ اس موقع پر یہ اشکال پیدا ہو کہ اگر وہ اسباب و وسائل از قسم نرمی ہوں تو ترجیح و فضیلت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور اگر از قسم سختی و درشتی ہوں تو نرمی و مہربانی کا سختی و درشتی پر فضیلت و ترجیح رکھنا ماقبل عبارت سے واضح ہو ہی چکا تھا اس کے بعد اسی مفہوم کو دوبارہ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ دونوں جملوں کی عبارت میں ظاہری طور پر تفاوت ہے مگر حقیقت میں یہ دوسرا جملہ ماقبل عبارت کو موکد کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اور دونوں جملوں کا مقصد اس بات کو زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کرنا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ اپنے مقاصد جیسے حصول معاش وغیرہ کی طلب اور سعی، جدوجہد میں ایسا رویہ و انداز اختیار کرے جو نرم خوئی، مہربانی اور ایک دوسرے کے ساتھ لحاظ و مروت کا ہو کیوں کہ انسان کو اس کی مطلوب چیز دینے والا حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہے۔ اور چونکہ نرمی و مہربانی اس کے نزدیک محبوب و پسندیدہ ہے اس لئے وہ نرمی و مہربانی کا رویہ اختیار کرنے والے کو زیادہ عطا کرے گا بہ نسبت اس شخص کے جو اپنے مقاصد کے حصول میں سختی و درشتی اور عامیانہ انداز و رویہ اختیار کرتا ہے۔

جس شخص میں نرمی و مہربانی نہ ہو وہ نیکی سے محروم رہتا ہے

(۲) وَعَنْ جَرِيْرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ يُحْرَمُ الرِّفْقُ يُحْرَمُ الْخَيْرَ۔ (رواہ مسلم)۔

"اور حضرت جریرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جس شخص کو نرمی و مہربانی سے محروم کیا جاتا ہے وہ گویا نیکی سے محروم کیا جاتا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: جامع صغیر کی روایت میں خیر کے ساتھ کلہ کا لفظ بھی ہے لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص نرمی و مہربانی کی خوبیوں سے عاری ہوتا ہے وہ تمام بھلائیوں سے محروم قرار پاتا ہے۔ گویا اس ارشاد گرامی کا مقصد نرمی و مہربانی کے وصف کی فضیلت بیان کرنا اس عظیم وصف کو حاصل کرنے کی ترغیب دلانا، سختی و درشتی کی مذمت کرنا اور یہ بات واضح کرنا ہے کہ نرمی و مہربانی تمام بھلائیوں کے حاصل ہونے کا سبب و ذریعہ ہے۔

حیا کی فضیلت

(۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ وَهُوَ يَعِظُ اَخَاهُ فِى الْحَيَاءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعْهُ فَاِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْاِيْمَانِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ ایک انصاری صحابیؓ کے پاس سے گزرے جو اپنے بھائی کو حیا کے بارے میں نصیحت کر رہا تھا تو رسول کریم ﷺ نے اس سے فرمایا "کہ اس کو کچھ مت کہو، کیوں کہ حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: وہ صحابیؓ اپنے بھائی کو زیادہ حیا کرنے سے منع کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ جو شخص زیادہ حیا کرنے لگتا ہے وہ رزق اور علم حاصل کرنے سے باز رہتا ہے چنانچہ جب آنحضرت ﷺ نے ان کو اس طرح کہتے سنا تو ان کو منع کیا اور فرمایا تم اپنے اس بھائی کو حیا کرنے سے نہ روکو کیونکہ حیا بذات خود ایک بہت اعلیٰ وصف ہے اور ایمان کی ایک شاخ ہے۔

طیبیؒ نے کہا ہے کہ لفظ یعظ سے مراد "ینذر" ہے یعنی وہ صحابیؓ اپنے بھائی کو ڈرا دھمکا رہے تھے! امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ "وعظ" کے معنی ہیں کسی کو اس طرح تنبیہ کرنا کہ اس میں کچھ ڈرانا دھمکانا بھی ہو۔ خلیلؒ نے یہ بیان کیا ہے "وعظ" کہتے ہیں خیر و بھلائی کی اس طرح نصیحت کرنا کہ اس سے دل نرم ہو جائے۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہاں حدیث میں "وعظ" عتاب کے معنی میں ہے

جیسا کہ ایک روایت میں (یعظ کے بجائے) یعاتب ہی کا لفظ منقول ہے۔

④ وَعَنْ عمران بن حصین قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْحَیَآءُ لَا یَأْتِیْ اِلَّا بِخَیْرٍ وَفِیْ رِوَایَۃٍ اَلْحَیَاءُ خَیْرٌ کُلُّہٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمران ابن حصینؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "حیا نیکی اور بھلائی کے سوا کوئی بات پیدا نہیں کرتی" ایک اور روایت میں یہ ہے کہ "حیاء کی تمام صورتیں بہتر ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: یہاں ایک اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ بسا اوقات حیا بعض حقوق کی ادائیگی جیسے امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں مخل ہوتی ہے تو اس اعتبار سے حیا کی تمام صورتوں کو بہتر قرار دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جو حیاء اظہار حقیقت اور حق کی ادائیگی سے باز رکھے اس کو حیا کہا ہی نہیں جا سکتا بلکہ اس کو عجز اور بزدلی کہیں گے جو ایک طرح کی خرابی اور نقصان ہے اور اگر اس کو حیا کہا بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ مجازاً کہا جا سکتا ہے کیونکہ شریعت کی نظر میں حقیقی حیا وہی ہے جو برائی کو ترک کرنے کا باعث بنے علاوہ ازیں یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ حیا کے زیادہ صحیح معنی ہیں نفس کا برائی سے رک جانا خواہ وہ برائی طبعی ہو یا شرعی۔ اور شریعت میں جس حیا کو بہتر اور قابل تعریف قرار دیا گیا ہے اس کی صحیح پہچان یہ ہے کہ نفس اس چیز کو اختیار کرنے سے باز رہے جس کو شریعت نے برائی قرار دیا ہے اور خواہ وہ حرام ہو یا مکروہ اور یا ترکِ اولیٰ ہو لہٰذا مذکورہ بالا اشکال کا زیادہ واضح جواب یہ ہے کہ یہ کلیہ الحیاء خیر کلہ حیا کی ان صورتوں کے ساتھ مخصوص ہے جو حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے مطابق ہوں۔

ایک بہت پرانی بات جو پچھلے انبیاء سے منقول چلی آرہی ہے

⑤ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِمَّا اَدْرَکَ النَّاسُ مِنْ کَلَامِ النُّبُوَّۃِ الْاُوْلٰی اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَاشِئْتَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "لوگوں نے پہلے انبیاء پر اترنے والے کلام میں سے جو بات پائی ہے وہ یہ کہ جب تو بے شرم ہو جائے تو جو جی چاہے کر۔" (بخاریؒ)

تشریح: ان مما ادرک الناس الخ کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بات پہلے انبیاء علیہم السلام پر اترنے والے کلام سے ماخوذ ہے اور جس کا حکم ابھی تک باقی ہے نہ اس کو منسوخ قرار دیا گیا ہے۔ اور نہ اس میں کوئی تغیر و تبدل ہوا ہے۔

واضح رہے کہ مذکورہ جملہ میں امر کا جو یہ صیغہ استعمال کیا گیا ہے کہ فاصنع الخ (یعنی جو جی چاہے کر) تو اس سے حکم دینا یا طلب مراد نہیں ہے بلکہ یہ امر بطور خبر کے ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ جو چیز بری باتوں سے باز رکھتی ہے۔ وہ حیا ہے اور جب کسی نے شرم و حیا کو اٹھا کر طاق پر رکھ دیا اور بے حیائی کو شیوہ بنا لیا تو پھر وہ جو چاہے گا کرے گا اور اسے کسی گناہ اور کسی برائی کو اختیار کرنے میں کوئی باک نہیں ہوگا۔ یا یہ کہ امر کا صیغہ تہدید و توبیخ کے طور پر ہے اور اس سے مقصد یہ آگاہی دینا ہے۔ کہ جب تم نے بے حیائی پر کمر باندھ ہی لی ہے تو جی چاہے کرتے پھرو! لیکن یاد رکھو کہ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے۔ کہ جب تمہیں اپنے سارے کرتوتوں کی سزا بھگتنی پڑے! گویا یہ جملہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اِعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ۔

نیکی اور گناہ کیا ہے؟

⑥ وَعَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ قَالَ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْبِرِّ وَالْاِثْمِ فَقَالَ الْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ وَالْاِثْمُ مَاحَاکَ فِیْ صَدْرِکَ وَکَرِھْتَ اَنْ یَّطَّلِعَ عَلَیْہِ النَّاسُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت نواس ابن سمعانؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے نیکی اور گناہ کے بارے میں پوچھا (کہ نیکی کیا ہے اور گناہ کیا ہے؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "نیکی خوش خلقی کا نام ہے (یعنی نیکی کی عمدہ صورت خوش خلقی ہے) اور گناہ وہ (کام) ہے جو تمہارے دل میں تردد پیدا کردے اور تم اس بات کو پسند نہ کرو کہ لوگ تمہارے اس کام سے واقف ہو جائیں۔" (مسلمؒ)

تشریح: "تردد پیدا کردے" کا مطلب یہ کہ جب تم کوئی ایسا کام کرو جس پر تمہارے دل کو اطمینان نہ ہو بلکہ اس کی وجہ سے دل ودماغ میں ایک خلش پیدا ہو جائے تو سمجھو کہ تمہارا وہ کام بہتر نہیں ہے بلکہ گناہ کا باعث ہے لیکن واضح رہے کہ اس بات کا تعلق اس شخص سے ہے جس کے سینے کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دولت کے لئے کھول دیا ہو اور اس کا دل نور تقویٰ سے روشن وآراستہ ہو علاوہ ازیں "کام" سے مراد وہ اعمال و افعال نہیں ہیں جن کی برائی کو شریعت نے وضاحت کے ساتھ بیان کردیا ہے اور جس کا گناہ ہونا کسی شک و شبہ سے بالاتر ہو بلکہ اس سے مراد کوئی ایسا فعل و عمل ہے جس کا ممنوع ہونا شارع علیہ السلام سے واضح طور پر منقول نہ ہو اور اس کے متعلق علماء کے اختلافی اقوال ہوں اور تم اس بات کو پسند نہ کرو" یہ گویا گناہ کی دوسری پہچان بیان فرمائی گئی ہے لیکن اس کا تعلق بھی انہی لوگوں سے ہے جو اچھے احوال کے ہوں۔

اچھے اخلاق کی فضیلت

⑦ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَحَبِّكُمْ اِلَيَّ اَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ تم میں سے وہ شخص مجھ کو بہت پیارا ہے، جو اچھے اخلاق کا حامل ہو۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تم میں سے وہ شخص میرے نزدیک بہت عزیز و محبوب ہے جو اچھے اطوار وعادات رکھتا ہو اور بہترین خصلتوں کا حامل ہو بایں طور کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ادا کرتا ہو اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں بھی تقصیر و کوتاہی نہ کرتا ہو۔

⑧ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ اَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

نرمی کی فضیلت واہمیت

⑨ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اُعْطِيَ حَظَّهٗ مِنَ الرِّفْقِ اُعْطِيَ حَظَّهٗ مِنْ خَيْرِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَنْ حُرِمَ حَظَّهٗ مِنَ الرِّفْقِ حُرِمَ حَظَّهٗ مِنْ خَيْرِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جس شخص کو نرمی میں سے حصہ دیا گیا اس کو گویا دنیا و آخرت کی بھلائیوں میں سے حصہ عطا ہوا اور جو شخص نرمی میں سے اپنے حصے سے محروم رہا وہ گویا دنیا و آخرت کی بھلائیوں میں سے اپنے حصہ سے محروم کیا گیا۔" (شرح السنۃؒ)

حیا ایمان کا جزء ہے

⑩ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْحَيَآءُ مِنَ الْاِيْمَانِ وَالْاِيْمَانُ فِي الْجَنَّةِ وَالْبَذَاءُ مِنَ

اَلْجَفَاءِ وَالْجَفَاءُ فِی النَّارِ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "حیاء (یعنی برے کاموں سے حجاب رکھنا ایمان کا جز ہے اور ایمان یعنی مؤمن جنت میں جائے گا اور بے حیائی (کہ جس کی وجہ سے فحش باتوں اور بری باتوں کا ارتکاب ہوتا ہے) بدی کا جز ہے۔ اور بد، دوزخ کی آگ میں جائے گا۔" (احمدؒ، ترمذیؒ)

خوش خلقی بہترین عطیہ خداوندی ہے

(۱۱) وَعَنْ رَجُلٍ مِنْ مُزَیْنَةَ قَالَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا خَیْرُ مَا اُعْطِیَ الْاِنْسَانُ قَالَ الْخُلُقُ الْحَسَنُ۔ رَوَاہُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ وَفِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ عَنْ اُسَامَةَ بْنِ شَرِیْكٍ۔

"اور قبیلہ مزینہ کے ایک شخص نے بیان کیا کہ صحابہؓ نے عرض کیا! یا رسول اللہ (ﷺ)! جو چیزیں انسان کو عطا کی گئی ہیں ان میں سے بہترین چیز کیا ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا "خوش خلقی" اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور شرح السنۃ میں یہ روایت اسامہ ابن شریکؒ سے منقول ہے۔"

بد خلقی اور سخت کلامی کی مذمت

(۱۲) وَعَنْ حَارِثَةَ بْنِ وَهْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ الْجَوَّاظُ وَلَا الْجَعْظَرِیُّ قَالَ وَالْجَوَّاظُ الْغَلِیْظُ الْفَظُّ۔ رَوَاہُ اَبُوْ دَاوٗدَ فِیْ سُنَنِہٖ وَالْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ وَصَاحِبُ جَامِعِ الْاُصُوْلِ فِیْهِ عَنْ حَارِثَةَ وَکَذَا فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ عَنْهُ وَلَفْظُهٗ قَالَ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ الْجَوَّاظُ الْجَعْظَرِیُّ یُقَالُ الْجَعْظَرِیُّ الْفَظُّ الْغَلِیْظُ وَفِیْ نُسَخِ الْمَصَابِیْحِ عَنْ عِکْرَمَةَ بْنِ وَهْبٍ وَلَفْظُهٗ قَالَ وَالْجَوَّاظُ الَّذِیْ جَمَعَ وَمَنَعَ وَالْجَعْظَرِیُّ الْغَلِیْظُ الْفَظُّ۔

"اور حضرت حارثہ ابن وہبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جنت میں نہ تو سخت کلام داخل ہوگا اور نہ بد خلق اور راوی کہتے ہیں کہ جواظ کے معنی ہیں سخت کلام اور بد خلق۔ اس روایت کو ابوداودؒ نے اپنی سنن میں اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے نیز صاحب جامع الاصول نے بھی جامع الاصول میں اس روایت کو حارثہؓ ہی سے نقل کیا ہے اور اسی طرح یہ روایت شرح السنۃ میں حضرت حارثہؓ ہی سے ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے کہ "جنت میں جواظ جعظری داخل نہیں ہوگا۔" گویا ان الفاظ میں جعظری کو جواظ کی صفت قرار دیا گیا ہے) اور کہا گیا ہے۔ کہ جعظری کے معنی ہیں بد خلق اور سخت کلام (یعنی اس روایت کے مطابق جواظ اور جعظری کے ایک ہی معنی ہیں) اور مصابیح کے (بعض) نسخوں میں یہ روایت حضرت عکرمہ ابن وہبؓ سے منقول ہے) ان میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ راویؒ نے کہا ہے جواظ اس شخص کو کہتے ہیں جو مال و دولت جمع کرے لیکن سائل کو کچھ نہ دے اور جعظری اس شخص کو کہتے ہیں جو سخت کلام اور بد خلق ہو۔"

تشریح: جیسا کہ اوپر کی عبارتوں سے واضح ہوا، بعض روایتوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جواظ اور جعظری دونوں کے ایک معنی ہیں اور بعض روایتوں سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جواظ کے معنی متکبر کے ہیں اور جعظری کے معنی ہیں بد خلق لیکن ان سب روایتوں کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ معنی و مفہوم میں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اور دونوں کے درمیان زیادہ فرق و تفاوت نہیں ہے۔

اور ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ جواظ اور جعظری سے مراد وہ شخص ہے جو سخت دل اور بد خلق ہو (یعنی وہ شخص کہ جس کے باطنی احوال کی گمراہیوں اور عادات و اطوار کی خرابیوں نے اس کو شقی القلب بنا دیا ہو کہ نہ اس پر کسی وعظ و نصیحت کا اثر ہوتا ہو اور نہ اس کو خدا کا خوف برائیوں سے روکتا ہو۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا کہ وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا) اس کا قرینہ وہ روایت ہے جس کو خطیبؒ نے حضرت عائشہؓ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے کہ (حضور نے فرمایا) ہر چیز کے لئے توبہ ہے مگر بد خلق

(یعنی بد چلن اور بد اطوار شخص) کے حق میں توبہ کارگر نہیں کیونکہ وہ ایک گناہ سے توبہ کرتا ہے تو اس سے بڑے دوسرے گناہ میں مبتلا ہوجاتا ہے (اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی بد چلنی اور بد اطواری اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔)

لا یدخل الجنة الجواظ و لا الجعظری میں لفظ جعظری سے پہلے لا زائد لانا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو شخص ان دونوں بری خصلتوں میں سے کسی بھی ایک خصلت میں مبتلا ہوگا اس کو جنت میں داخل نہیں کیا جائے گا۔ اگر وہ شخص منافقین میں سے ہوگا تو اس کا جنت میں داخل نہ کیا جانا مطلق معنی پر محمول ہوگا اور اگر اس شخص کا تعلق مؤمنین سے ہو تو پھر کہا جائے گا۔ کہ اس کے حق میں ان الفاظ کہ "وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا" کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ ابتداء جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

خوش خلقی کی فضیلت اور فحش گوئی کی مذمت

⑬ وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَثْقَلَ شَیْءٍ یُوْضَعُ فِیْ مِیْزَانِ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ خُلُقٌ حَسَنٌ وَاِنَّ اللّٰهَ یُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِیَّ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ وَرَوٰی اَبُوْدَاوُدَ الْفَصْلَ الْاَوَّلَ۔

"اور حضرت ابودرداءؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن مؤمن کی میزان اعمال میں رکھی جانے والی چیزوں میں بہت وزنی چیز حسن خلق ہے اور اللہ تعالیٰ فحش بکنے والے بے ہودہ گو سے سخت نفرت اور دشمنی رکھتا ہے۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے نیز ابوداؤدؒ نے بھی اس روایت کا حصہ یعنی "خلق حسن" نقل کیا ہے۔"

تشریح: حضرت شیخ عبدالحقؒ نے لفظ "بذی کا ترجمہ" "بے ہودہ گو" کیا لیکن ملا علی قاریؒ نے کسی شارح سے اس لفظ کے معنی "بد خلق" نقل کئے ہیں اور لکھا ہے کہ یہی معنی موقع کے مناسب ہیں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ حدیث میں پہلے جملے کے مقابلہ پر جو دوسرا جملہ لایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن میزان اعمال میں بد خلقی بہت بے وزن چیز ہوگی۔

خوش خلقی اختیار کرنے والے کا مرتبہ

⑭ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَیُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهٖ دَرَجَةَ قَائِمِ اللَّیْلِ وَصَائِمِ النَّهَارِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ۔ "مؤمن (یعنی کامل مؤمن کہ جو عالم باعمل ہوتا ہے) خوش خلقی کے سبب وہ درجہ و مرتبہ حاصل کرتا ہے جو (عبادت و ذکر الٰہی کے لئے) شب بیداری کرنے والے اور ہمیشہ دن میں روزہ رکھنے والے کو ملتا ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حضرت سہیلؒ فرماتے ہیں کہ خوش خلقی کا سب سے کم تر درجہ یہ ہے کہ لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف کو برداشت کیا جائے انتقام لینے سے گریز کیا جائے اور یہ کہ نہ صرف ظالم کے ظلم سے درگزر کیا جائے بلکہ اس کے حق میں مغفرت و بخشش کی دعا کی جائے اور اس کے تئیں رحم و شفقت کو اختیار کیا جائے۔

لوگوں سے جو بھی معاملہ کرو، خوش خلقی کے ساتھ کرو

⑮ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِتَّقِ اللّٰهَ حَیْثُ مَاکُنْتَ وَاَتْبِعِ السَّیِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ۔ (رواہ احمد والترمذی والدارمی)

"اور حضرت ابودرداء کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا "اللہ سے ڈرو، تم جہاں کہیں بھی ہو اگر تم سے کوئی برائی سرزد ہو جائے تو اس کے بعد نیک کام ضرور کرو تاکہ وہ نیکی اس برائی کو مٹا دے اور لوگوں سے خوش خلقی کے ساتھ معاملہ کرو۔"

(احمدؒ، ترمذیؒ، دارمیؒ)

تشریح: "اللہ سے ڈرو" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن امور کو تم پر واجب کیا ہے ان سب کی بجا آوری و فرمانبرداری کرو اور جن چیزوں سے منع کیا ہے یعنی تمام طرح کی برائیاں ان سے اجتناب و پرہیز کرو۔ کہ اسی کو "تقویٰ" کہا گیا ہے اور تقویٰ، دین کی بنیاد ہے جس کے ذریعہ ایقان و معرفت کے مراتب و درجات حاصل ہوتے ہیں، تقویٰ کا سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ شرک سے بیزاری و پاکی اختیار کی جائے اور اس کا سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے۔ کہ ماسوای اللہ سے اعراض کیا جائے ان دونوں درجوں کے درمیان تقویٰ کے دوسرے مراتب ہیں جن میں سے بعض کو بعض پر برتری حاصل ہے جیسے ممنوعات کو ترک کرنا ایک مرتبہ ہے اس سے برتر مرتبہ یہ ہے کہ مکروہات کو بھی ترک کیا جائے۔ اور اس سے بھی برتر مرتبہ یہ ہے کہ جو چیزیں مباح ہیں۔ ان میں سے بھی ان چیزوں کو ترک کیا جائے جو غیر ضروری اور بے فائدہ ہوں۔

"تم جہاں کہیں ہو" کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا خدا سے ڈرنا یعنی احکام خداوندی پر عمل کرنا کسی خاص وقت، کسی خاص جگہ اور کسی خاص حالت پر موقوف نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ تم خواہ سفر میں ہو یا حضر میں، خواہ نعمتوں سے بہرہ مندی کی حالت میں ہو یا آفات بلاؤں میں مبتلا ہو اور خواہ جلوت میں ہو یا خلوت میں، غرضیکہ تم کسی جگہ پر ہو اور کسی حالت میں ہو، اور اس وقت اس جگہ اور اس حالت سے متعلق جو بھی احکام خداوندی ہوں ان پر عمل پیرا ہوں کیونکہ خدا کے نزدیک تمہاری کوئی حالت پوشیدہ نہیں ہے اور وہ کسی بھی وقت تمہاری طرف سے غافل نہیں رہتا وہ جس طرح تمہاری ظاہری باتوں کو جانتا ہے اسی طرح تمہاری پوشیدہ باتیں بھی خوب جانتا ہے لہٰذا تمہارے لئے ضروری ہے کہ اس کے احکام کی بجا آوری اور اس کی معصیت سے اجتناب کے جو تقاضے اور جو آداب ہیں ان کو بہر صورت نگاہ میں رکھو! منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت داؤدؒ طائی کسی قبر کے پاس سے گزر رہے تھے کہ خدا نے ان پر اس قبر کے اندر کے حالات منکشف کئے بایں طور کہ انہوں نے سنا قبر کے اندر سے ایک آواز باہر آرہی ہے جس میں مردہ کہہ رہا ہے کہ پروردگار! کیا میں نے تیری نمازیں ادا نہیں کی ہیں۔ کیا میں نے تیری زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے اور کیا میں نے یہ نہیں کیا ہے اور وہ نہیں کیا ہے؟ یعنی اس نے دنیا میں جب بھی نیک کام کئے تھے ان سب کو گنواتا رہا۔ (اس کی یہ بات سنکر) فرشتوں نے جواب دیا، ہاں اے دشمن خدا! بے شک تو نے یہ سب کام کئے ہیں لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جب تو خلوت میں ہوتا تھا اور اس وقت خدا کے خوف پر گناہوں کو ترجیح دیتا تھا اور تجھے اس بات کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا تھا کہ اس حالت میں بھی تو خدا کی نگاہ میں ہے۔

"اگر تم سے برائی سرزد ہو جائے الخ" کا مطلب یہ ہے کہ انسان بہر حال انسان ہے یہ ضروری ہے کہ اس سے کبھی کوئی گناہ سرزد نہ ہو اور لغزشیں اس کے پائے استقامت پر اثر انداز نہ ہوں، لہٰذا اگر بتقاضائے بشریت تم سے کوئی گناہ صادر ہو جائے تو اس کے بعد فوراً نیک کام کر لو! تاکہ وہ نیکی اس گناہ و برائی کے اثرات کو مٹا دے! رہی یہ بات کہ نیک کام سے کیا مراد ہے؟ تو اس سے توبہ اور مطلق کوئی بھی مراد ہے یا یہ کہ وہ نیکی مراد ہے جو اس گناہ و برائی کو ضد ہو، چنانچہ طیبیؒ نے کہا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ نیک کام کرنے کے ذریعہ برائیوں کے اثرات مٹانے سے کسی بھی لمحہ غافل نہ رہے اس سے جو بھی برائی صادر ہو اس کے بدلہ میں اسی کی جنس سے کوئی نیک کام ضرور کر لے، اگر شراب نوشی کا گناہ سرزد ہو جائے تو اس کے بدلے میں حلال چیزیں خدا واسطے لوگوں کو پلائے اگر کسی وقت تکبر میں مبتلا ہو جائے تو تواضع اختیار کرے، اگر کسی جگہ گانا بجانا سننے کا اتفاق ہو جائے تو ان لوگوں کی ہم نشینی میں کچھ وقت گزارنا پڑا ہو جو گانے بجانے کی لغویت میں مبتلا ہوں تو اس کے بدلے میں قرآن پاک کی تلاوت سنے اور ذکر و نصیحت کی مجلس میں بیٹھے اور اسی طرح بخل کا تدارک، خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ کرے۔

جو یہ فرمایا گیا ہے کہ " تاکہ وہ نیکی اس برائی کو مٹادے" تو مٹانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نیکی کے ذریعہ یا تو اس بندے کے دل پر سے برائی کے اثرات مٹادیتا ہے یا اعمال لکھنے والے فرشتوں کے رجسٹر میں سے اس برائی کو محو کر دیتا ہے اور یہ مٹانا بھی اس صورت میں ہوتا ہے جب کہ اس برائی کا تعلق کسی حقوق العباد سے ہوتا ہے بایں طور کہ کوئی شخص کسی کے حق کو تلف کرتا ہے یا کسی پر ظلم وزیادتی کرتا ہے تو اس حق تلفی یا ظلم کا تدارک اس طرح کیا جاتا ہے کہ حق تلفی کرنے والے یا ظلم کرنے والے کے نامہ اعمال میں جو نیکیاں ہوتی ہیں ان میں سے اس کے بقدر نیکیاں صاحب حق کو دیدی جاتی ہیں، یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے دوسرے اجرو انعامات کے ذریعہ صاحب حق کو خوش کردے اور وہ اس شخص کو معاف کرنے پر راضی ہو جائے۔

منقول ہے کہ ایک بزرگ کا انتقال ہو گیا کچھ عرصہ بعد ایک دوسرے بزرگ نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنے احسان وانعام سے نوازا اور میری بخشش فرمادی لیکن حساب کتاب ضرور ہوا یہاں تک کہ اس دن کے بارے میں بھی مجھ سے مواخذہ ہوا جب کہ میں روزے سے تھا اور ایک دوست کی دوکان پر بیٹھا ہوا تھا جب افطار کا وقت ہوا تو میں نے گیہوں کی ایک بوری میں سے گیہوں کا ایک دانہ اٹھالایا اور اس کو توڑ کر کھانا ہی چاہتا تھا کہ ایک دم مجھے احساس ہوا کہ یہ گیہوں میرا نہیں ہے چنانچہ میں نے وہ گیہوں فوراً اسی جگہ ڈال دیا جہاں سے اٹھایا تھا اور اب سے اس کا بھی حساب لیا گیا۔ یہاں تک کہ اس گیہوں کے توڑے جانے کے نقصان کے بقدر میری نیکیاں مجھ سے لی گئیں۔

بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ نیکیاں صغیرہ گناہوں کا بھی کفارہ ہوتی ہیں اور کبائر میں بھی ان گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہیں جو پوشیدہ ہوں کیونکہ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد لَنُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ بھی عموم پر دلالت کرتا ہے اور مذکورہ بالا حدیث بھی مطلق اور عام ہے البتہ جو کبیرہ گناہ ظاہر ہو گئے اور حاکم وقاضی کے نزدیک ثابت ہو جائیں ان پر حد، یعنی شرعی سزا کا نفاذ ساقط نہیں ہوگا۔ اور نہ وہ توبہ سے معاف ہوں گے۔

نرم مزاج ونرم خو شخص کی فضیلت

⑯ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلاَ اُخْبِرُكُمْ بِمَنْ يَحْرُمُ عَلَى النَّارِ وَبِمَنْ تَحْرِمُ النَّارُ عَلَيْهِ عَلٰى كُلِّ هَيِّنٍ لَيِّنٍ قَرِيْبٍ سَهْلٍ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کیا میں بتاؤں کہ وہ شخص کون ہے جو آگ پر حرام ہوگا اور جس پر آگ حرام ہوگی؟ (تو سنو) دوزخ کی آگ ہر اس شخص پر حرام ہوگی جو نرم مزاج، نرم طبیعت، لوگوں سے نزدیک اور نرم خو ہو۔" اس روایت کو احمدؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: سوال۔ کیا میں بتاؤں الخ میں ازراہ مبالغہ وتاکید دونوں صورتیں یعنی اس شخص کا آگ پر حرام ہونا اور آگ کا اس شخص پر حرام ہونا ذکر فرمائیں۔ اور چونکہ دونوں عبارتوں کا حاصل ایک ہی ہے یعنی اس شخص کا دوزخ کی آگ سے محفوظ رہنا اس لئے جواب میں دوسری ہی صورت کے بیان پر اکتفاء فرمایا۔ اور ویسے بھی یہ بات عام بول چال کے زیادہ قریب ہے کیونکہ عام طور پر اس طرح کہا جاتا ہے کہ دوزخ کی آگ فلاں شخص پر حرام ہے۔

نیکوکار مؤمن کی تعریف

⑰ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُؤْمِنُ غِرٌّ كَرِيْمٌ وَالْفَاجِرُ خَبٌّ لَئِيْمٌ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "نیکوکار مؤمن بڑا بھولا اور شریف ہوتا ہے جب کے

بد کار بڑا مکار و بخیل اور کمینہ ہوتا ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: غِرٌّ کے معنی ہیں دھوکہ کھانے والا شخص اسی طرح صراح وغیرہ میں غر کے معنی نا آزمودہ یا نا تجربہ کار نوجوان کے لکھے ہیں خب کے معنی ہیں وہ شخص جو دھوکہ دینے والا اور چالاک ہو۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نیکو کار شخص چونکہ طبعاً مطیع و فرمانبردار ہونے کی وجہ سے نرم مزاج، شریف النفس اور سادہ لوح ہوتا ہے اس لئے وہ ہر فریب کار شخص سے دھوکہ کھا جاتا ہے وہ نہ تو لوگوں کے مکر و فریب سے آگاہ ہوتا ہے اور نہ مکر و فریب کی باتوں اور چالوں کی چھان بین اور دھوکہ بازوں کے احوال کی تحقیق و جستجو کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ جاہل و نادان ہوتا ہے بلکہ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کے مزاج کی نرمی و مروت حلم و کرم، عفو، درگزر کرنے کی عادت اور خوش خلقی ہوتا ہے۔

بعض حضرات نے حدیث کا مطلب اس اسلوب میں بیان کیا ہے کہ نیکو کار شخص چونکہ سلیم القلب اور سادہ لوح ہوتا ہے۔ اس لئے وہ لوگوں کے بارے میں ہمیشہ نیک گمان رکھتا ہے کسی کے اندر کیا بھرا ہوا ہے۔ اس کو وہ نہیں دیکھتا جس کے سینے میں کینہ ہوتا ہے اس کو پہچانتا نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو شخص اس کے سامنے جو کچھ کہہ دیتا ہے اس کو مان لیتا ہے اور دھوکہ کھا جاتا ہے ایک بات یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کے سامنے آخرت کے معاملات اور نفس کی اصلاح کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے اور دنیا کے معاملات اس کی نظر میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتے لہٰذا وہ اپنے نفس کی اصلاح اور آخرت کے کاموں میں مشغول رہتا ہے اور دنیا کے کاموں پر زیادہ توجہ نہیں دیتا اس لئے اگرچہ وہ دنیاوی معاملات میں دھوکہ کھا جاتا ہے مگر آخرت کے معاملات میں ہوشیار اور عقل معاد میں کامل ہوتا ہے نیکو کار مؤمن کی اس حالت کو اگرچہ تعریف کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے مگر اس کے باوجود حضور ﷺ نے اپنے اس ارشاد لا یلدغ المؤمن من جحر واحد مرتین کے ذریعہ آگاہ بھی فرمایا ہے کہ مؤمن کے لئے مناسب نہیں ہے کہ ہمیشہ غفلت اختیار کرے مسلسل دھوکہ کھاتا رہے، اور ہوشیاری کے طریقہ کو بالکل ترک کر دے اور بات پہلے بھی بتائی جا چکی ہے کہ "لا یلدغ المؤمن الخ کے ذریعہ مؤمن کو جس ہوشیاری و بیدار مغزی کی تلقین کی گئی ہے اس کا تعلق دنیا و آخرت دونوں معاملات سے ہے اگرچہ بعض حضرات نے اس کو صرف اخروی معاملات کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔

نیکو کار کے برخلاف فاجر یعنی منافق وغیرہ کی خصلت یہ بیان فرمائی گئی ہے۔ چونکہ دھوکہ دہی اور مکاری اس کی فطرت ہی میں داخل ہوتی ہے، فتنہ و فساد پھیلانا ہی اس کا شیوہ ہوتا ہے اور اس کے نزدیک چشم پوشی ایک بے معنی چیز ہوتی ہے اس لئے وہ جلد دھوکا نہیں کھاتا الا یہ کہ کوئی شخص اس سے بھی بڑا مکار و عیار ہو اور وہ اس کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو جائے تاہم اگر وہ نادانستہ دھوکا کھا بھی جاتا ہے تو اس کو برداشت نہیں کرتا بلکہ انتقام لینے کی سعی کرتا ہے۔

(۱۸) وَعَنْ مَكْحُوْلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُؤْمِنُوْنَ هَيِّنُوْنَ لَيِّنُوْنَ كَالْجَمَلِ الْاَنِفِ اِنْ قِيْدَ انْقَادَوَ اِنْ اُنِيْخَ عَلٰى صَخْرَةٍ اسْتَنَاخَ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت مکحولؒ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ایمان رکھنے والے لوگ بردبار، نرم خو اور فرمانبردار ہوتے ہیں اس اونٹ کی مانند جس کی ناک میں نکیل پڑی ہو کہ اگر اس کو کھینچا جائے تو کھنچا چلا آئے اور اگر پتھر پر بیٹھایا جائے تو پتھر پر بیٹھ جائے" اس حدیث کو ترمذیؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ مؤمن طبعاً فرماں بردار ہوتا ہے وہ شریعت کا اتباع بلا چون و چرا کرتا ہے، خدا اور خدا کے رسول کے احکامات جس طرح ہوتے ہیں۔ انکو اسی طرح بجالاتا ہے ان میں اپنی طرف سے کوئی دخل اندازی نہیں کرتا اور ان احکام کی بجا آوری اور شریعت کی اتباع میں جو مشقت پیش آتی ہے اس کو برضا و رغبت برداشت کرتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس حدیث میں مسلمانوں کی اس خصوصیت کو بیان کرنا مقصود ہو جو وہ آپس میں ایک دوسرے کی اتباع

وفرمانبرداری اور ایک دوسرے کے ساتھ تواضع وانکساری اختیار کرنے اور غرور وتکبر سے اجتناب کرنے کی صورت میں رکھتے ہیں اور حقیقت میں یہ خصوصیت بھی احکام خداوندی کی اطاعت میں شامل ہے۔

لوگوں کے ساتھ رابطہ واختلاط عزلت وگوشہ نشینی سے افضل ہے

(۱۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْمُسْلِمُ الَّذِيْ يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلٰى اَذَاهُمْ اَفْضَلُ مِنَ الَّذِيْ لَا يُخَالِطُهُمْ وَلَا يَصْبِرُ عَلٰى اَذَاهُمْ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔"جو مسلمان لوگوں کے ساتھ ربط واختلاط رکھے اور ان کی اذیتوں پر صبر کرے وہ (اجر وثواب کے اعتبار سے) افضل ہے اس شخص سے جو لوگوں سے ربط واختلاط نہ رکھے اور ان کی اذیتوں پر صبر نہ کرے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ لوگوں کے ساتھ ربط واختلاط اور میل جول رکھنا، عزلت وتنہائی اور گوشہ نشینی اختیار کرنے سے افضل ہے چنانچہ اکثر تابعینؒ اس پر عامل تھے اور یہ چیز امر بالمعروف ونہی عن المنکر، خیر وبھلائی کے پھیلانے، باہمی امداد وتعاون اور دین واسلام کی استعانت کے اعتبار سے بھی زیادہ کامل اور زیادہ افضل ہے۔ رہی یہ بات کہ عزلت وگوشہ نشینی کے بارے میں بھی احادیث منقول ہیں جس سے عزلت وگوشہ نشینی کا افضل وبہتر ہونا ثابت ہوتا ہے تو اس سلسلے میں اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس اختلاف کا تعلق زمان ومکان اور لوگوں کے احوال کے اختلاف سے ہے یعنی بعض موقعہ ومقام اور بعض لوگوں کے حالات کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ ربط واختلاط رکھا جائے۔ چنانچہ ایسی صورت میں لوگوں سے ملنا جلنا عزلت وگوشہ نشینی اور لوگوں سے الگ تھلگ رہنا ہی افضل وبہتر ہوتا ہے۔ تاہم اس بارے میں جس درمیانی راہ کو اختیار کرنے کی ہدایت ہے وہ یہ ہے کہ ذہنی طور پر ضروری اور ناگزیر حالات کے علاوہ باقی اوقات میں عوام الناس سے الگ تھلگ رہا جائے اور جمعہ وان کے ساتھ اکٹھا ہونے پر اکتفا کیا جائے البتہ خواص یعنی صالحین وغیرہ کے ساتھ برابر ربط واختلاط رکھا جائے اور ان سے عزلت وگوشہ نشینی اختیار نہ کی جائے۔ لیکن عوام الناس سے عزلت وگوشہ نشینی اختیار کرنا اس صورت میں سود مند ہوگا جب کہ باعث عمل علم حاصل کیا جا چکا ہو اور زہد وتوکل کا وہ درجہ نصیب ہو گیا ہو جہاں پہنچ کر انسان مخلوق سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے اور کسی طرح کی طمع وخواہش نہیں رکھتا اسی لئے بعض عارفین نے کہا کہ عزلت وگوشہ نشینی بغیر علم کے ذلت ورسوائی ہے اور بغیر زہد وقناعت کے علّت وخرابی ہے! چنانچہ کامل صوفیاء جیسے نقشبندیہ، شاذلیہ اس طریقہ پر عامل تھے کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ بھی رہتے تھے اور پھر ان سے ربط واختلاط بھی رکھتے تھے۔

غصہ پر قابو پانے کی فضیلت

(۲۰) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ مُعَاذٍ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَّهُوَ يَقْدِرُ عَلٰى اَنْ يُّنْفِذَهٗ دَعَاهُ اللّٰهُ عَلٰى رُؤُسِ الْخَلَائِقِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُخَيِّرَهٗ فِيْ اَىِّ الْحُوْرِ شَآءَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِّاَبِيْ دَاوُدَ عَنْ سُوَيْدِ بْنِ وَهْبٍ عَنْ رَجُلٍ مِّنْ اَبْنَآءِ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ مَلَا اللّٰهُ قَلْبَهٗ اَمْنًا وَّاِيْمَانًا وَّذُكِرَ حَدِيْثُ سُوَيْدٍ مَّنْ تَرَكَ لُبْسَ ثَوْبِ جَمَالٍ فِيْ كِتَابِ اللِّبَاسِ۔

"اور حضرت سہل بن معاذ، اپنے والد (حضرت معاذؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے غصہ کو پی جائے باوجودیکہ وہ اس غصہ پر عمل کرنے کی قدرت رکھتا ہو تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو مخلوق کے روبرو بلائے گا اور اس کو یہ اختیار دے گا کہ وہ جس حور کو چاہے پسند کر لے۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ اور ابوداؤد کی ایک اور روایت میں کہ جو انہوں نے سوید بن

وہب سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کے کسی صحابیؓ کے ایک صاحبزادے سے نقل کی ہے یہ الفاظ ہیں کہ حضور ﷺ نے (تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو مخلوق کے روبرو بلائے گا الخ) کے بجائے اس طرح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کے دل کو امن وامان سے معمور کرے (جو اپنے غصہ کو پی جائے) اور حضرت سویدؓ کی یہ روایت من ترک لبس ثوب جمال الخ کتاب اللباس میں نقل کی جا چکی ہے۔

تشریح: "اللہ تعالیٰ اس کو مخلوق کے روبرو بلائے گا" کا مطلب یہ کہ حق تعالیٰ قیامت کے دن ساری مخلوق کے درمیان اس شخص کو نیک شہرت دے گا، اس کی تعریف وتوصیف کرے گا اور اس پر فخر کا اظہار کرے گا، نیز اس کے بارے میں اعلان کیا جائے گا کہ یہ وہ شخص ہے جس کے اندر اتنی بڑی خوبی تھی۔

غصہ پر قابو پانے کی صفت کو اتنا اونچا مقام دینے کی وجہ یہ ہے کہ غصہ دراصل نفس امارہ کی ہیجانی کیفیت کا نام ہے اور جس نے اپنا غصہ پی لیا اس نے گویا اپنے نفس امارہ کو کچل ڈالا، اسی لئے غصہ پر قابو پانے والوں کی تعریف حق تعالیٰ نے بھی ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ اور جو شخص اپنے نفس کو اس کی خواہش سے باز رکھتا ہے اس کا آخری ٹھکانہ جنت اور اس کا انعام حور عین ہے۔ واضح رہے کہ جب اتنا عظیم اجر محض غصہ کو پی جانے پر حاصل ہوگا تو اس شخص کے مقام ومرتبہ کی بلندی کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے جو محض غصہ کو پی جانے پر اکتفانہ کرے بلکہ اس کے ساتھ عفو واحسان کا برتاؤ بھی کرے، چنانچہ امام ثوریؒ فرماتے ہیں کہ اصل احسان یہی ہے کہ تم اس شخص پر احسان کرو جو تمہارے ساتھ برائی کرے کیونکہ جس شخص نے تم پر احسان کیا ہے اگر تم اس پر احسان کرتے ہو تو وہ تمہارا احسان نہیں بلکہ بدلہ چکانا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حیا کی تعریف وفضیلت

(۲۱) عَنْ زَيْدِ بْنِ طَلْحَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِكُلِّ دِيْنٍ خُلُقًا وَخُلُقُ الْاِسْلَامِ الْحَيَاءُ۔ رَوَاهُ مَالِكٌ مُرْسَلًا وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنْ اَنَسٍ وَابْنِ عَبَّاسٍ۔

"اور حضرت زید بن طلحہؒ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہر دین اور مذہب میں ایک خلق ہے (یعنی ہر مذہب والوں میں ایک ایسی صفت وخصلت ہوتی ہے جو ان کی تمام صفتوں پر غالب اور ان کی ساری خصلتوں سے اعلی ہوتی ہے) اور اسلام کا وہ خلق حیا ہے۔" اس روایت کو مالکؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے (کیونکہ زید صحابی نہیں ہیں بلکہ تابعیؒ ہیں نیز ابن ماجہؒ اور شعب الایمان میں بیہقیؒ نے اس روایت کو حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔

تشریح: یہاں "حیاء" سے اس چیز میں شرم وحیا کرنا مراد ہے جس میں حیا کرنا مشروع ہے، چنانچہ جن چیزوں میں شرم وحیاء کرنے کی اجازت نہیں ہے جیسے تعلیم وتدریس، امر بالمعروف ونہی عن المنکر ادائیگی حق کا حکم دینا، خود حق کو ادا کرنا اور گواہی دینا وغیرہ وغیرہ، ان میں شرم وحیاء کرنے کی کوئی فضیلت نہیں ہے۔

حدیث کا زیادہ مفہوم بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر دین کے لوگوں پر کوئی نہ کوئی وصف وخصلت غالب رہتی ہے چنانچہ اہل اسلام پر جس طبعی وصف وخصلت کو غالب قرار دیا گیا ہے وہ حیاء ہے اور باوجودیکہ حیا بھی ان اوصاف وخصائل میں سے ہے جو تمام ادیان ومذاہب کے لوگوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں لیکن اسی وصف وحیاء کو خاص طور پر اہل اسلام پر غالب کیا گیا ہے اور دوسرے مذہب کے لوگوں میں اس جوہر کو بہت کم رکھا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حیاء نہ صرف یہ کہ طبعی خاصیتوں اور خصلتوں میں سب سے اعلی درجہ رکھتی ہے بلکہ یہ وہ جوہر ہے جس سے انسانی اخلاق وکردار کی تکمیل بھی ہوتی ہے اور چونکہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ بعثت لاتمم

مکارم الاخلاق (میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے دنیا میں بھیجا گیا ہوں) اس لئے اس جوہر کے ذریعہ ملت اسلامیہ کے اخلاق واوصاف کو کمال کے درجہ پر پہنچایا گیا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ صرف حیا ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ ہم سے پہلے کی امتوں میں تمام ہی اخلاق وخصائل ناقص تھے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ دنیا میں تشریف لائے اور آپ ﷺ کی برکت سے ملت اسلامیہ میں تمام اخلاق وخصائل کو کامل ومکمل کیا گیا اسی لئے ملت اسلامیہ کی اس خاصیت کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ الایۃ (تم کو دنیا والوں کے لئے سب سے بہتر اُمت بنا کر پیدا کیا گیا ہے الخ۔

ابن ماجہؒ اور بیہقیؒ نے مذکورہ بالا روایت کو حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بطریق موقوفہ نقل نہیں کیا ہے جیسا کہ عبارت سے ظاہری اسلوب سے یہ گمان ہوسکتا ہے بلکہ بطریق مرفوع آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کے طور پر نقل کیا ہے۔ نیز مذکورہ عبارت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں یعنی ابن ماجہؒ اور بیہقی میں سے ہر ایک نے ان دونوں صحابیؓ سے اس روایت کو نقل کیا ہے اور یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ مذکورہ عبارت میں ان دونوں کا ذکر علی الترتیب ہو یعنی ابن ماجہؒ نے اس روایت کو حضرت انسؓ سے اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے، لیکن جامع صغیر میں اس حدیث کو ابن ماجہؒ کے سلسلہ کے ساتھ بروایت حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباسؓ نقل کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح بیہقی نے بھی اس روایت کو ان دونوں صحابیؓ سے نقل کیا ہے۔

ایمان اور حیاء لازم ملزوم ہیں

(۲۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْحَیَآءَ وَالْاِیْمَانَ قُرَنَاءُ جَمِیْعًا فَاِذَا رُفِعَ اَحَدُھُمَا رُفِعَ الْاٰخَرُ وَفِیْ رِوَایَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ فَاِذَا سُلِبَ اَحَدُھُمَا تَبِعَهُ الْاٰخَرُ۔ رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "حیا اور ایمان کو ایک دوسرے کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے لہٰذا جب کسی کو ان دونوں میں سے کسی ایک سے محروم کیا جاتا ہے تو وہ دوسرے سے بھی محروم رکھا جاتا ہے یعنی جو شخص ایمان سے محروم رہتا ہے وہ حیاء سے محروم رکھا جاتا ہے اور جس میں حیا نہیں ہوتی اس میں ایمان بھی نہیں ہوتا اور ایک دوسری روایت جو حضرت ابن عباس سے منقول ہے یوں ہے کہ ان دونوں میں سے جب ایک کو دور کیا جاتا ہے تو دوسرا بھی جاتا رہتا ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: لفظ قُرَنَاءُ اصل میں قرین کی جمع ہے۔ اس اعتبار سے یہ لفظ ان لوگوں کی دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اقل جمع کا اطلاق دو پر بھی ہوتا ہے ویسے بعض نسخوں میں یہ لفظ ماضی مجہول کے صیغہ تثنیہ کے ساتھ منقول ہے۔

خوش خلقی کی اہمیت

(۲۳) وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ کَانَ اٰخِرُ مَا وَصَّانِیْ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حِیْنَ وَضَعْتُ رِجْلِیْ فِی الْغَرْزِ اَنْ قَالَ یَا مُعَاذُ اَحْسِنْ خُلُقَكَ لِلنَّاسِ۔ (رواہ مالک)

"اور حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھے جن باتوں کی نصیحت ووصیت فرمائی ان میں سب سے آخری وصیت جو آپ ﷺ نے اس وقت فرمائی جب کہ میں نے (گھوڑے پر سوار ہونے کے لئے اپنا پاؤں رکاب میں رکھا تھا یہ تھی کہ "معاذؓ لوگوں کی تربیت وتعلیم کے لئے خوش خلقی اختیار کرنا۔" (مالکؒ)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانہ حیات میں حضرت معاذؓ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تھا۔ چنانچہ جب حضرت معاذؓ اپنا منصب سنبھالنے کے لئے یمن روانہ ہونے لگے تو حضور نے ان کو بہت سی نصیحتیں فرمائیں گھوڑے پر سوار کرایا اور رخصت کرنے کے لئے خود پا پیادہ کچھ دور تک ان کے ساتھ گئے اس وقت آنحضرت ﷺ نے ان سے یہ الفاظ بھی فرمائے تھے کہ معاذ! شاید تم پھر مجھے نہ دیکھ پاؤ

چنانچہ معاذؓ کو اس کے بعد سرکار رسالت پناہ کی زیارت نصیب نہیں ہوئی، وہ یمن ہی میں تھے کہ آنحضرت ﷺ نے اس دنیا سے پردہ فرمالیا۔ بہرحال حضرت معاذؓ نے مذکورہ بالا روایت میں آنحضرت ﷺ کی جس وصیت کا ذکر کیا ہے وہ اسی موقع پر ان کے لئے آنحضرت ﷺ کی آخری نصیحت تھی۔

سیوطیؒ کہتے ہیں کہ یہاں "لوگوں" سے مراد وہ لوگ ہیں جو خوش خلقی اور نرمی و مہربانی کے مستحق ہوں ورنہ جہاں تک اہل کفر و فسق اور ظالموں کا تعلق ہے وہ اس دائرہ سے خارج ہیں اور ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنے کا حکم ہے بلکہ سرکش لوگوں کے ساتھ اختیار کی جانے والی سختی و درشتی کو ظاہر کرنا ہی حسن خلق میں داخل ہے۔ کیونکہ نہ صرف ان کی تربیت و تہذیب اسی سختی و درشتی پر منحصر ہوتی ہے بلکہ ان کے ساتھ اختیار کئے جانے والے اس رویہ کے ساتھ دوسرے لوگوں کے حالات کی بہتری و سلامتی بھی وابستہ ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیوطیؒ کے نزدیک گویا حدیث میں حسن خوش خلقی سے مراد نرمی و مہربانی اور عفو و درگزر کا رویہ اختیار کرنا ہے۔

(۲۴) وَعَنْ مَالِكٍ بَلَغَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ۔ رَوَاهُ فِي الْمُوَطَّا وَرَوَاهُ اَحْمَدُ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ۔

"اور حضرت مالکؒ سے منقول ہے کہ ان تک یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں یعنی اس دنیا میں میری بعثت کا ایک عظیم مقصد یہ ہے کہ انسانی اخلاق و اوصاف کو بیان کروں اور ان کو درجہ کمال تک پہنچادوں۔" (مؤطا امام مالک اور احمدؒ نے اس روایت کو حضرت ابوہریرہ سے نقل کیا ہے۔

اپنی بہترین صورت و سیرت پر آنحضرت ﷺ اللہ کا شکر ادا کرتے تھے

(۲۵) وَعَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا نَظَرَ فِي الْمِرْاٰةِ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ حَسَّنَ خَلْقِيْ وَخُلُقِيْ وَزَانَ مِنِّيْ مَاشَانَ مِنْ غَيْرِيْ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت جعفر بن محمدؒ اپنے والد بزرگوار حضرت امام باقرؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا۔ "رسول کریم ﷺ جب آئینہ دیکھتے تو فرماتے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کیلئے ہیں وہ اللہ کہ جس نے مجھ کو بہترین تخلیق سے نوازا میرے اخلاق و کردار کو اچھا بنایا اور مجھ میں ان چیزوں کو آراستہ کیا جو میرے عیب و نقصان کا باعث ہیں، اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں بطریق ارسال نقل کیا ہے"

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح بعض آدمیوں کی جسمانی تخلیق میں کوئی عیب و نقصان ہوتا ہے کہ مثلاً کوئی شخص ایک ہاتھ سے یا ایک آنکھ وغیرہ سے محروم ہوتا ہے یا کسی شخص کی کوئی ٹانگ "ٹیڑھی ہوتی ہے یا کوئی اور عضو ناقص ہوتا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھ میں کوئی جسمانی عیب و نقصان نہیں رکھا بلکہ مجھ کو تمام نقصان و عیوب سے محفوظ اور صحیح و سلامت رکھا! ملا علی قاری کی وضاحت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نقصان و عیب عام ہے کہ اس کا تعلق خواہ جسمانی تخلیق و پیدائش سے ہو یا اخلاق و کردار سے۔ بہرحال یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کسی بھی انسان کے مقابلہ میں آنحضرت ﷺ کی سیرت و صورت بہت اعلیٰ اور بہت خوب تھی اور جیسا کہ طیبیؒ نے کہا ہے مذکورہ بالا حدیث گویا آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد بعثت لاتمم حسن الاخلاق (میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں) کی وضاحت بھی ہے۔ آنحضرت ﷺ کا اپنے حسن صورت و حسن سیرت پر اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کا شکر ادا کرنا، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس حمد و شکر کی طرح ہے جس کو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ..... (یعنی اور بلاشبہ ہم نے داؤدؑ و سلیمانؑ کو علم سے مالا مال کیا اور ان دونوں نے کہا کہ تمام تعریفیں اس اللہ کیلئے ہیں جس نے ہمیں اپنے مؤمن بندوں میں سے اکثر پر فضیلت عطا فرمائی۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آئینہ دیکھنا مستحب ہے اور اپنے حسن صورت و حسن سیرت پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرنا بھی مستحب

ہے کیونکہ یہ دونوں نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا ہوتی ہیں لہٰذا ان پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے! رہی یہ بات کہ ظاہری حسن و خوبصورتی ایک ایسی چیز ہے جس کو آئینہ میں دیکھا جاسکتا ہے لہٰذا آئینہ دیکھ کر اس پر شکر ادا کرنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن اس کے ساتھ حسن سیرت یا حسن خلق کا ذکر سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ وہ ایک پوشیدہ چیز ہے جس کا آئینہ میں دیکھا جانا ممکن ہی نہیں ہے؟ اس کے جواب میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بے شک حسن سیرت کوئی نظر آنے والی چیز نہیں ہے لیکن انسان کا ظاہر بہرحال اس کے باطن کی غمازی کرتا ہے اور کسی دوسرے کے بارے میں بات چاہے صحیح نہ ہو لیکن رسول خدا پر یہ بات ضرور صادق آتی ہے کہ حسن صورت حسن سیرت کا ایک ایسا جلی عنوان ہوتا ہے جس کو دیکھ کر باطن کے احوال کا ادارک کیا جاسکتا ہے لہٰذا اس مناسبت سے حضور ﷺ نے حسن سیرت کے ساتھ حسن صورت کو بھی ذکر فرمایا اور اگر یہ سوال پیدا ہو کہ کیا آنحضرت ﷺ کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی اتباع مین آئینہ دیکھ کر مذکورہ طرح سے حمد و ثنا کریں یا اس طرح حمد و ثنا کرنا صرف آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص تھا اور دوسرے لوگ وہ دعا پڑھنے پر اکتفا کریں جو آگے آنے والی حدیث میں نقل ہوگی اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں حمد و ثناء اور شکر کے جو الفاظ مذکور ہیں ان کو ہر مؤمن پڑھ سکتا ہے کیونکہ انسان اس اعتبار سے کہ وہ اچھی صورت کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اور وہ صاحب ایمان ہے بلا شک و شبہ خدا کی مخلوق کامل اور دین و اخلاق کے اوصاف سے مزین ہوتا ہے تاہم بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حمد و ثنا اور شکر کے مذکورہ الفاظ اپنی ذات کے تعلق سے فرمائے تھے اور ظاہر ہے کہ حسن صورت اور حسن سیرت کا وصف جو کمال و نہایت کے ساتھ حضور ﷺ کی ذات میں تھا وہ کسی دوسرے میں نہیں ہو سکتا اس لئے کسی دوسرے کے لئے ان الفاظ کو استعمال کرنا موزوں نہیں ہوگا چاہے اُمت کے بعض افراد کے اعتبار سے اس طرح کے الفاظ کے استعمال کو جائز نہ کہا جائے لیکن اُمت کے لئے بہتر یہی ہے کہ اسی دعا کو اختیار کیا جائے جو اگلی حدیث میں منقول ہے۔

حسن خلق کی دعا

(۲۶) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ حَسَّنْتَ خَلْقِيْ فَاَحْسِنْ خُلُقِيْ (رواہ احمد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ (یہ دعا) فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ! تو نے میری جسمانی تخلیق کو اچھا کیا ہے لہٰذا میرے اخلاق کو بھی اچھا بنا۔" (احمدؒ)

تشریح: یہ دعا یا تو آپ ﷺ مطلق کسی بھی وقت فرماتے تھے یا آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر فرماتے تھے جیسا کہ جزریؒ نے حصن حصین میں صراحت بھی کی ہے اور پہلی حدیث کے مطابق یہی زیادہ موزوں ہے! نیز آنحضرت ﷺ کی یہ دعا تو اُمت کی تعلیم و تلقین کے لئے تھی تاکہ امت کے لوگ اپنے حق میں اسی طرح دعا مانگا کریں اور یا اس دعا کا تعلق خود آپ ﷺ کی ذات سے تھا اس صورت میں آپ ﷺ کی مراد گویا یہ طلب و درخواست تھی کہ خدایا! اپنے دین کو کامل اور اپنی نعمتوں کو پورا کردے اس مراد کا قرینہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے خلق کو اچھا اور مہذب کرنے کا ذریعہ قرآن کریم تھا جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا کہ آنحضرت ﷺ کا خلق قرآن تھا۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ کا اپنے اخلاق کا اچھا ہونے کی دعا کرنا درحقیقت قرآن کو نازل کرنے اور اس کے نزول کو پورا کرنے کی طلب و درخواست تھی۔

بہترین لوگ کون ہیں؟

(۲۷) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِخِيَارِكُمْ قَالُوْا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ خِيَارُكُمْ اَطْوَلُكُمْ اَعْمَارًا وَّاَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے (صحابہؓ سے) فرمایا کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں بہترین لوگ کون ہیں! صحابہؓ نے

عرض کیا کہ ہاں ضرور بتائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو لمبی عمر والے ہیں اور جن کے اخلاق بہت اچھے ہیں۔"

(احمدؒ)

تشریح: ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے اخلاق و اطوار پاکیزہ اور اچھے ہوں گے اور ان کی عمر زیادہ ہوگی تو وہ نیکیاں اور بہتریں بہت کریں گے جس کے نتیجے میں ان کو فضائل و کمالات بھی زیادہ حاصل ہوں گے اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کی عمر کا دراز ہونا اس کے حق میں بہت مبارک ہے اور حقیقت میں دراز عمر شخص وہی ہے جو نیک کاموں میں مشغول رہے۔

(۲۸) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا۔ (رواہ ابوداؤد والدارمی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "ایمان میں کامل ترین لوگ وہی ہیں جن کے اخلاق بہتر ہیں۔"

(ابوداؤد، دارمیؒ)

تین خاص باتیں

(۲۹) وَعَنْهُ اَنَّ رَجُلاً شَتَمَ اَبَا بَكْرٍ وَّالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسٌ يَّتَعَجَّبُ وَيَتَبَسَّمُ فَلَمَّا اَكْثَرَ رَدَّ عَلَيْهِ بَعْضَ قَوْلِهٖ فَغَضِبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَامَ فَلَحِقَهٗ اَبُوْبَكْرٍ وَّقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ كَانَ يَشْتِمُنِيْ وَاَنْتَ جَالِسٌ فَلَمَّا رَدَدْتُّ عَلَيْهِ بَعْضَ قَوْلِهٖ غَضِبْتَ وَقُمْتَ قَالَ كَانَ مَعَكَ مَلَكٌ يَّرُدُّ عَلَيْهِ فَلَمَّا رَدَدْتَّ عَلَيْهِ وَقَعَ الشَّيْطَانُ ثُمَّ قَالَ يَا اَبَا بَكْرٍ ثَلٰثٌ كُلُّهُنَّ حَقٌّ مَامِنْ عَبْدٍ ظُلِمَ بِمَظْلِمَةٍ فَيُغْضِيْ عَنْهَا لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ اِلَّا اَعَزَّ اللّٰهُ بِهَا نَصْرَهٗ وَمَا فَتَحَ رَجُلٌ بَابَ عَطِيَّةٍ يُّرِيْدُ بِهَا صِلَةً اِلَّا زَادَ اللّٰهُ بِهَا كَثْرَةً وَّمَا فَتَحَ رَجُلٌ بَابَ مَسْئَلَةٍ يُّرِيْدُ بِهَا كَثْرَةً اِلَّا زَادَ اللّٰهُ بِهَا قِلَّةً۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ (صحابہؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے حضرت ابوبکرؓ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا، آنحضرت ﷺ (اس کی سخت سست باتوں کو سن کر) حیرت کرتے اور مسکراتے تھے، یہاں تک کہ جب وہ شخص برا بھلا کہنے میں حد سے گزر گیا تو حضرت ابوبکرؓ نے بھی اس کی بعض باتوں کا جواب دیا (یعنی انہوں نے بھی اس شخص کو جواب میں کچھ برا بھلا کہا) اس پر نبی کریم ﷺ ناراض ہو گئے اور وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے حضور ﷺ کے پیچھے پیچھے حضرت ابوبکرؓ بھی آگئے اور خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یارسول اللہ! جب وہ شخص مجھ کو برا بھلا کہہ رہا تھا تو آپ ﷺ وہاں بیٹھے رہے لیکن میں نے جب اس کی بعض باتوں کا جواب دیا (اور اسی کے الفاظ میں دوسرے انداز میں اس کو برا بھلا کہا تو آپ ﷺ ناراض ہو گئے اور وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے (اس میں آپ ﷺ کے نزدیک کیا حکمت تھی؟) حضور ﷺ نے فرمایا "(اصل بات یہ ہے کہ جب تک تم خاموش رہے تو) تمہارے ساتھ فرشتہ تھا جو (تمہاری طرف سے) اس کو جواب دے رہا تھا مگر جب تم نے خود جواب دیا (اور اس طرح نفس کی خواہش کا عمل دخل ہو گیا) تو شیطان درمیان میں کود پڑا پھر فرمایا "ابوبکرؓ! تین باتیں ہیں اور وہ سب حق ہیں ایک تو یہ کہ جو بندہ کسی کے ظلم کا شکار ہوتا ہے اور محض اللہ (کی رضا اور اس کے ثواب کی طلب) کے لئے (نہ کہ اپنے عجز کی وجہ سے یا دکھانے منانے کے لیے) اس ظالم سے چشم پوشی کرتا ہے (یعنی اس سے درگزر کرتا ہے) تو اللہ تعالیٰ اس (ظلم کے سبب یا اس کے وصف چشم پوشی کی) بناء پر (دنیا و آخرت) میں اپنی مدد کے ذریعہ اس بندہ کو مضبوط و قوی بناتا ہے دوسرے یہ کہ جو بھی بندہ اپنی عطاء و بخشش کا دروازہ کھولتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ اپنے قرابت داروں اور مسکینوں کے ساتھ احسان اور نیک سلوک کرے (یعنی ان کی مالی امداد و اعانت کرے) تو اللہ تعالیٰ اس کے عطا و بخشش کے سبب اس کے مال دولت میں (ظاہری باطنی خیر و برکت کی صورت میں) اضافہ کرتا ہے اور تیسرے یہ کہ جو شخص سوال و گدائی کا دروازہ کھولتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ اپنی دولت کو بڑھائے (یعنی اس کا لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنا حاجت و ضرورت کی بنا پر نہیں ہوتا محض اپنے مال و دولت میں اضافہ کی خاطر ہوتا ہے) تو اللہ اس کو گدائی کے سبب اس کے مال و دولت کو اور کم کر دیتا ہے (یعنی خواہ ظاہری طور پر اس کے مال و دولت کو

نقصان و بربادی سے دوچار کرتا ہے یا اس کی خیر و برکت سے اس طرح محروم کر دیتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے مال میں کمی و نقصان کو محسوس کرتا رہتا ہے۔" (احمد)

تشریح: "حیرت کرتے اور مسکراتے تھے۔ میں حیرت کا تعلق یا تو اس شخص کی بدزبانی اور اس میں شرم و حجاب کی کمی سے تھا یا حضرت ابوبکرؓ کے صبر و تحمل اور ان کے باوقار و بردبار رویہ سے تھا اور مسکرانے کا تعلق اس فرق سے تھا جو آپ ﷺ ان دونوں کے درمیان دیکھ رہے تھے علاوہ ازیں آپ ﷺ کی نظر ان دونوں کے حق میں مرتب ہونے والے نتیجہ پر بھی تھی کہ وہ شخص تو اپنی بدکلامی کے سبب عذاب کا مستوجب ہو رہا تھا اور حضرت ابوبکرؓ پر ان کے صبر و تحمل اور بردباری و چشم پوشی کے سبب رحمت الٰہی نازل ہو رہی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ نے بھی اس کی بعض باتوں کا جواب دیا گویا انہوں نے اس موقع پر (جواب دے کر) رخصت و اجازت پر عمل کیا جو ایک عام آدمی کیلئے موزوں ہے اور اس عزیمت کو ترک کیا جو خواص کے مرتبہ و شان کے عین مطابق ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (برائی کا بدلہ اس برائی کے مطابق لیا جا سکتا ہے لیکن جو شخص درگزر کرے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ پر ہے) چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اگرچہ اس شخص کی بعض باتوں کا بدلہ لے کر اور بعض باتوں پر صبر اختیار کر کے گویا دونوں پہلوؤں کی رعایت کی مگر نگاہ نبوت میں چونکہ ان کے لئے وہ مرتبہ کمال مطلوب تھا جو ان کی شان صدیقیت کے مطابق ہے اس لئے ان کا اس شخص کی بعض باتوں کا جواب دے کر جزوی بدلہ لینا بھی حضور ﷺ کو پسند نہیں آیا اور آپ ﷺ پر وہ کیفیت طاری ہو گئی جو ناراض ہو جانے والے شخص پر ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ اس مجلس سے اٹھ کر چلے گئے تاکہ ایک طرف تو حضرت ابوبکرؓ کے رویہ پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی ہو جائے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر عمل بھی ہو جائے کہ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ (یعنی جب وہ کوئی لغویات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں۔

"شیطان درمیان میں کود پڑا" یعنی حضور ﷺ نے گویا یہ واضح فرمایا کہ جب تم خود جواب دینے لگے تو پھر شیطان کو دخل دینے کو موقع مل گیا اور وہ فرشتہ جو تمہاری طرف سے جواب دے رہا تھا آسمان پر چلا گیا، اور تم یہ جانتے ہی ہو کہ جب کسی معاملہ میں شیطان کود پڑے تو کیا کچھ نہیں ہو جاتا وہ بے حیائی اور برائی پر اکسانے کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہے چنانچہ مجھے خوف ہوا کہ کہیں شیطان کا داؤ تم پر نہ چل جائے اور تم اپنے مخالف سے بدلہ لینے میں حد سے زیادہ بڑھ جاؤ اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ تم جو مظلوم تھے ظالم کی جگہ پر آ جاؤ جب کہ چاہئے یہ کہ تم اللہ کے مظلوم بندے بنو ظالم بندے نہ ہو۔

نرمی و مہربانی کرنے کا اثر

(۳۰) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُرِيْدُ اللّٰهُ بِاَهْلِ بَيْتٍ رِفْقًا اِلَّا نَفَعَهُمْ وَلَا نَحْرِمُهُمْ اِيَّاهُ اِلَّا ضَرَّهُمْ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ جن گھر والوں کے لئے نرمی و مہربانی پسند کرتا ہے اس کے ذریعہ ان کو نفع پہنچاتا ہے اور جن گھر والوں کو نرمی و مہربانی سے محروم رکھتا ہے اس کے ذریعہ ان کو نقصان پہنچاتا ہے۔" (بیہقی)

بَابُ الْغَضَبِ وَالْكِبْرِ
غصہ اور تکبر کا بیان

"غضب" کے معنی ہیں غصہ ہونا! اور حقیقت میں غضب یا غصہ اس طبعی کیفیت و حالت کو کہتے ہیں جو طبیعت و مزاج کے خلاف

پیش آنے والی بات پر نفس کو برانگیختہ کرتی ہے، انتقام لینے پر اکساتی ہے اور ناپسندیدہ چیز میں مغضوب علیہ کی طرف میلان کرتی ہے تاکہ اس سے انتقام لے سکے اور طبیعت کیخلاف پیش آنے والی صورت حال کو دور کر سکے، اسی وجہ سے غصہ کی حالت میں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور رگیں پھول جاتی ہیں اس طرح خوشی کی حالت میں بھی روح باہر کی طرف میلان کرتی ہے تاکہ اس چیز کے سامنے آجائے جو خوشی کا باعث بنی ہے۔ چنانچہ غصہ یا خوشی کی زیادتی کے وقت ہلاکت کا خوف اسی لئے ہوتا ہے کہ ایسے موقع پر روح پوری طرح بالکل نکل آنا چاہتی ہے۔ اس کے برخلاف غم یا خوف کی حالت میں روح اندر کی طرف چلی جاتی ہے جس کی وجہ سے چہرہ پر زردی چھا جاتی ہے اور جسم کو کمزوری لاحق ہو جاتی ہے، اس حالت میں بھی ہلاکت کا خوف ہوتا ہے کیونکہ روح پوری طرح اندر کی طرف چلی جاتی ہے اور مطلق سرد ہو جاتی ہے! اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف غضب و غصہ کی نسبت کرنا جیسا کہ ایک موقع پر فرمایا گیا ہے من لم یسأل اللہ یغضب علیہ (جو شخص اللہ کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتا تو اللہ اس پر غصہ ہوتا ہے) مجاز ہے اور اللہ تعالیٰ کے غصہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس بندے سے ناراض ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہ معاملہ کرتا ہے جو کوئی بادشاہ غصہ کے وقت اپنی رعایا کے ساتھ کرتا ہے یعنی سزا دیتا ہے اور عذاب نازل کرتا ہے۔ غضب کی ضد حلم ہے اور حلم دراصل نفس و طبیعت کے اس سکون و استقلال کا نام ہے جو محبوب ترین چیز کے قریب پہنچ جانے اور مقصود و مراد کے بالکل سامنے ہونے کے وقت بھی انسان کو بے قرار نہیں ہونے دیتا جیسا کہ وفد عبدالقیس کے سردار حضرت منذرؓ کے بارے میں یہ روایت منقول ہے کہ جب وہ اپنا وفد لے کر مدینہ پہنچے تو انہوں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھ کر اس اضطراب و بے قراری کا اظہار نہیں کیا جو انکی قوم کے دوسرے لوگوں نے ظاہر کیا تھا اور اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ان کو حلم و وقار کی خوبیوں سے موصوف قرار دیا ہے۔

واضح رہے کہ غضب غصہ کوئی ایسی خصلت نہیں ہے جس کو بذات خود برا کہا جائے بلکہ اس میں برائی اس وقت آتی ہے جب اس کی وجہ سے راہ حق چھوٹ جائے اور احکام شریعت کی پابندی ترک ہو جائے چنانچہ جو غضب و غصہ حق کی خاطر ہو اور حق کی راہ میں ہو اس کو محمود و مستحسن کہا جائے گا یہی وجہ ہے کہ راہ طریقت و سلوک میں ریاضت و مجاہدہ کا مقصد مطلق غضب و غصہ کو ختم کر دینا نہیں ہوتا بلکہ اس کو قابو میں رکھنا اور حق کے تابع کرنا ہوتا ہے اور ویسے بھی قدرت نے غضب کو ایک ایسی قوت بنایا ہے جو جسمانی نظام کو برقرار رکھنے کا ذریعہ اور بقاء حیات کا سبب ہے کیونکہ یہ قوت غضبیہ ایسی ہوتی ہے جو مضرات و موذیات سے بچاتی ہے چنانچہ نباتات و جمادات کو نیست و نابود کرنے پر ہر کوئی اسی لئے قادر ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان دونوں کو قوت غضبیہ سے محروم رکھا ہے اس کے برخلاف حکمت کاملہ خداوندی نے حیوانات میں نہ صرف یہ کہ قوت غضبیہ پیدا کی ہے بلکہ ان کے بعض جسمانی حصوں کو گویا ایسے آلات و ہتھیار کے طور پر بنایا جن سے وہ نقصان و ایذاء پہنچانے والوں سے اپنا دفاع کر سکیں، جیسے سینگ اور دانت وغیرہ اور انسان میں اگرچہ اس طرح کی چیزیں پیدا نہیں کی ہیں لیکن اس کو وہ عقل و تدبیر دکھا دی ہے جس کے ذریعہ وہ ضرورت و حالت کے مطابق ایسے آلات و ہتھیار بنا سکتا ہے جو اس کو نقصان و ایذا پہنچانے والے سے محفوظ رکھ سکتے ہوں۔

"کِبر" کے اصل معنی تو بڑائی کے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد وہ کبر ہے جو عجب یعنی خود بینی و خود ستائی کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے چنانچہ اپنے آپ کو اس طور پر بڑا سمجھنا اور بڑا ظاہر کرنا کہ جس کے سبب لوگوں پر اپنی فوقیت برتری جتانا مقصود ہو حق کو قبول کرنے اور حق کی فرمانبرداری سے انکار ہوتا ہو اور تمرد و سرکشی ظاہر ہوتی ہو تکبر اور استکبار کہلائے گا! واضح رہے کہ کبر اور تکبر اس صورت میں مذموم ہے جب کہ وہ واقع کے خلاف ہو، یعنی اگر کوئی شخص اپنی ذات میں ایسے اوصاف و فضائل اور کمالات کا دعوی کرے جن سے حقیقت میں وہ خالی ہو اور مصنوعی طور پر اپنے آپ کو ان فضائل و کمالات سے متصف ظاہر کرتا ہو تو ایسا کرنا مذموم ہوگا! اور اگر اس شخص کی ذات میں واقعۃً ایسے فضائل و کمالات ہوں جن کی بنا پر وہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر و بلند اور بڑا سمجھتا اور ظاہر کرتا ہو تو یہ مذموم نہیں ہوگا۔ نیز یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ تکبر کے مقابلہ پر تواضع ہے جو کبر اور صغر کے درمیان توسط اور راہ استدلال ہے، چنانچہ کبر تو یہ ہے کہ

کوئی شخص ان اوصاف وفضائل سے بھی زیادہ کا دعوی کرے جو وہ اپنے اندر رکھتا ہے، اور صغریہ ہے کہ اپنے اصل مقام سے بھی نیچے گر جائے اور وہ جس چیز کے دعوی کا حق رکھتا ہے اس کو بھی ترک کردے ان دونوں کے درمیان تواضع ہے جو توسط اور اعتدال کا مقام ہے یعنی اپنے آپ کو نہ تو حد سے زیادہ بڑھایا جائے اور نہ حد سے نیچے گرایا جائے بلکہ بین بین رکھا جائے، کیونکہ ہر چیز اور ہر حالت کی طرح اس معاملہ میں بھی اصل کمال توسط اور اعتدال ہی ہے اگرچہ مشائخ اور صوفیاء قدس اللہ ارواحہم کا معمول یہ رہا ہے کہ جب وہ اپنے نفس میں تکبر کا غلبہ دیکھتے تھے تو اس کو زائل کرنے میں اتنا مبالغہ کرتے تھے کہ تواضع کے بجائے صغر کا مقام اختیار کرنیکی کوشش کرتے تاکہ نفس آخر الامر تواضع کے مقام پر رک جائے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

غصہ سے اجتناب کی تاکید

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَوْصِنِیْ قَالَ لَا تَغْضَبْ فَرَدَّدَ ذٰلِكَ مِرَارًا قَالَ لَا تَغْضَبْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے کوئی نصیحت فرمادیجئے (تاکہ میں اس پر عمل کر کے دین و دنیا کی بھلائی حاصل کروں) آپ ﷺ نے فرمایا "غصہ مت کرو" اس شخص نے یہ بات (کہ آپ ﷺ مجھے کوئی نصیحت فرمادیجئے) کئی مرتبہ کہی اور آپ ﷺ نے ہر مرتبہ یہی فرمایا کہ غصہ مت کرو۔" (بخاری)

تشریح: چونکہ اس شخص میں غصہ کا مادہ زیادہ تھا اس لئے اس نے جتنی مرتبہ بھی یہ درخواست کی کہ مجھ کو کوئی نصیحت فرمادیجئے، آپ ﷺ نے یہی جواب دیا کہ غصہ مت کرو چنانچہ آنحضرت ﷺ کا معمول یہی تھا کہ سوال کرنے والا جس حالت و کیفیت کا حامل ہوتا اس کو جواب اسی حالت و کیفیت کے مطابق ارشاد فرماتے، اور ہر ایک کے مرض کا علاج اس کے احوال کی مناسبت سے تجویز فرماتے، اسی لئے آپ ﷺ نے اس شخص کے حق میں، اجتناب کے حکم کو بار بار ظاہر کرنا ہی مناسب جانا۔

بعض محققین کہتے ہیں کہ غضب و غصہ کی کیفیت دراصل شیطانی وسوسوں سے پیدا ہوتی ہے جس کے سبب انسان ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی، اعتدال کی راہ سے گزر جاتا ہے اور شیطان کے جال میں پھنس جاتا ہے چنانچہ اس حالت میں وہ نہ صرف اس طرح اول فول بکنے لگتا ہے اور ایسے افعال و حرکات کا ارتکاب کرتا ہے جو شرعی طور پر بھی اور اخلاقی طور پر بھی نہایت برے اور نازیبا ہوتے ہیں، بلکہ دل میں کینہ اور بغض بھی رکھتا ہے، اس کے علاوہ ایسی اور بہت سی چیزیں اس سے صادر ہوتی ہیں جو بدخلقی و بدخوئی کی نشانیاں ہیں، اور بسا اوقات تو غصہ کرنے والا اس درجہ مغلوب الغضب ہوجاتا ہے کہ اس سے کفر تک سرزد ہوجاتا ہے۔ اس حقیقت سے بھی یہ بات واضح ہوئی کہ غضب و غصہ چونکہ انسان کو دین و دنیا کے سخت ترین نقصان میں مبتلا کردیتا ہے اس لئے آپ ﷺ نے مذکورہ شخص کے بار بار عرض گزار ہونے کے باوجود بس ایک ہی نصیحت کی کہ غصہ مت کرو! اور ہر مرتبہ اسی کی تاکید فرماتے رہے، گویا آپ ﷺ نے اس کو یہ تعلیم ارشاد فرمائی کہ غصہ کا تعلق بدخلقی سے ہے اور بدخلقی محض ایک ہی برائی نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ سے نہ معلوم کتنی برائیاں پیدا ہوجاتی ہیں اور کتنے نقصانات کرنا پڑتے ہیں۔ لہٰذا غصہ سے اجتناب و پرہیز کر کے خوش خلقی اختیار کرو جو دین و دنیا کی بھلائیوں اور دارین کی سعادتوں کی ضامن ہے۔

ایک بات یہ بھی جان لینی چاہئے کہ شریعت نے غصہ کا علاج بھی تجویز کیا ہے جو علم و عمل یا ظاہر و باطن کا مرکب ہے، چنانچہ اگر کوئی ایسی صورتحال پیش آجائے جو غصہ کا سبب ہو تو اس صورت میں علمی یا باطنی و قلبی علاج یہ ہے کہ دل میں یہ تصور کرے اور اس پر یقین رکھے کہ کوئی کام اللہ تعالیٰ کے ارادہ و تقدیر کے بغیر نہیں ہوتا، جو کچھ بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے، نفع و نقصان سب اسی

ے اختیار میں ہے، انسان تو ظاہر میں ایک آلہ ہے، لہٰذا جس شخص کی طرف سے کوئی نقصان یا تکلیف پہنچے اس پر غصہ ہونا ایسا ہے جیسے کوئی شخص چھری یا چاقو پر غصہ ہو کہ اس نے کیوں کاٹا علاوہ ازیں اپنے نفس کو سمجھائے کہ دیکھ اللہ تعالیٰ کس قدر قادر ہے اور اس کا غضب کتنا شدید ہے مگر اس کے باوجود وہ درگزر کرتا ہے بندے اس کی کس طرح مخالفت کرتے ہیں اور اس کے احکام سے کس طرح سرکشی اختیار کرتے ہیں لیکن وہ ان پر اپنا غضب نازل نہیں کرتا، پھر تو اتنا بڑا کہاں کا آیا کہ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا دوسرا علاج جو عملی یا ظاہری ہے وہ یہ ہے کہ فوراً وضو کر ڈالے اور اعوذ پڑھنے لگے تاکہ پانی کی ٹھنڈک، غصہ کی حرارت کو فرو کر دے اور نفس دوسری طرف مشغول ہو جائے۔

طاقتور شخص

(۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرْعَةِ اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِيْ يَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "طاقتور اور پہلوان وہ شخص نہیں ہے جو لوگوں کو پچھاڑ ے بلکہ طاقتور اور پہلوان وہ شخص ہے جو غصہ کے وقت (اپنے نفس کو پچھاڑ دے اور) اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اصل میں اگر کوئی چیز انسان کی سب سے بڑی دشمن اور اس کے مقابلہ میں سب سے زیادہ طاقتور ہے تو وہ خود اس کا نفس! اگر کوئی شخص بڑے بڑے پہلوانوں کو پچھاڑتا رہا اور اپنے طاقتور ترین دشمن کو بھی زیر کرتا رہا، مگر خود اپنے نفس پر غالب نہیں آسکا تو یہ کوئی کمال نہیں ہے، اصل کمال تو یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو زیر کرے جو اس کا اصل دشمن ہے جیسا کہ فرمایا ہے۔

اعدی عدوک نفسک التی جنبیک۔

"تمہارے دشمنوں میں سب سے بڑا دشمن وہ ہے جو تمہارے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔"

واضح رہے کہ بدن کی قوت ظاہری اور جسمانی ہے جو زوال پذیر اور فناہ ہو جانے والی ہے اس کے برخلاف جو قوت نفس کو زیر کرتی ہے وہ دینی اور روحانی ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی ہے اور ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ لہٰذا نفس کو مارنا، وصف اور کمال کی بات ہے جب کہ آدمی کو پچھاڑنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا ؎

مردے نہ بقوت بازو ست وزور کتف　　بانفس اگر برآئی دانم کہ شاطرے

جنتی اور دوزخی لوگ

(۳) وَعَنْ حَارِثَةَ بْنِ وَهْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَهْلِ الْجَنَّةِ كُلُّ ضَعِيْفٍ مُتَضَعَّفٍ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَهْلِ النَّارِ كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ كُلُّ جَوَّاظٍ زَنِيْمٍ مُتَكَبِّرٍ۔

"اور حضرت حارث بن وہبؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "کیا میں تمہیں جنتیوں کو بتلادوں؟ (یعنی کیا میں یہ کہوں کہ کون لوگ جنتی ہیں! تو سنو) ہر وہ ضعیف شخص (جنتی ہے) جس کو لوگ ضعیف و حقیر سمجھیں (اور اس کی کمزوری و شکستہ حالی کی وجہ سے اس کے ساتھ جبر و تکبر کا معاملہ کریں حالانکہ (حقیقت کے اعتبار سے وہ ضعیف و کمزور اللہ کے نزدیک اس قدر اونچا مرتبہ رکھتا ہے کہ) اگر وہ اللہ کے بھروسہ پر کسی بات پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو سچا کر دے۔ اور کیا میں تمہیں وہ لوگ بتلادوں جو دوزخی ہیں؟ (تو سنو) ہر وہ شخص

(دوزخی ہے) جو جھوٹی اور لغو باتوں پر سخت گوئی کرنے والا جھگڑالو ہو مال جمع کرنے والا بخیل ہو اور تکبر کرنے والا ہو (بخاریؒ اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ہر وہ شخص دوزخی ہے) جو مال کو جمع کرنے والا حرام زادہ اور تکبر کرنے والا ہو۔"

تشریح: حدیث میں ضعیف سے مراد وہ شخص ہے جو نہ تو گھمنڈی اور متکبر ہو اور نہ لوگوں پر جبر و زیادتی کرنے والا ہو۔ لفظ "متضعف" میں مشہور تو عین پر زبر ہی ہے اور ترجمہ میں اسی کو ملحوظ رکھا گیا ہے، لیکن بعض حضرات نے عین کو زیر کے ساتھ پڑھا ہے، اس صورت میں اس لفظ کے معنی، متواضع، کمتر اور گمنام کے ہوں گے۔

"ہر ضعیف جنتی ہے۔" سے مراد یہ ہے کہ جنت میں جن لوگوں کی اکثریت ہوگی وہ یہی لوگ ہوں، اسی طرح دوسری قسم کے لوگ (یعنی جن کو دوزخی قرار دیا گیا ہے، سے بھی یہی مراد ہے کہ دوزخیوں کی اکثریت ان ہی لوگوں پر مشتمل ہوگی۔

علماء نے لَوْاَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ کے معنی بیان کئے ہیں، ایک تو یہ کہ اگر وہ شخص اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم پر اعتماد کر کے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر قسم کھالے تو اللہ تعالیٰ اس کو سچا کرتا ہے اور اس کے اعتماد کو پورا کرتا ہے یعنی اس کی قسم ٹوٹتی نہیں بلکہ پوری ہوتی ہے۔

ترجمہ میں اس معنی کو ملحوظ رکھا گیا ہے! دوسرے یہ کہ اگر وہ شخص اپنے پروردگار سے کسی چیز کا طلب گار ہوتا ہے اور اس کو قسم دے کر اپنی مراد پوری ہونے کی دعا کرتا ہے تو پروردگار اس کی قسم کی لاج رکھتا ہے اور اس کی مراد پوری کرتا ہے اور تیسرے یہ کہ اگر وہ شخص کسی کام کے بارے میں قسم کھا کر یہ کہتا ہے کہ حق تعالیٰ اس کام کو کرے گا یا اس کام کو نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو سچا کرتا ہے یعنی اس طرح کرتا ہے جو اسکی قسم کے مطابق ہوتا ہے۔

زَنِیم کے معنی کمینہ کے ہیں اور اس کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو اپنے آپ کو کسی ایسی قوم یا ایسے طبقہ کی طرف منسوب کرلے جس سے حقیقت میں وہ کوئی تعلق نہیں رکھتا اسی لئے "زنیم" کا ترجمہ "حرام زادہ" کیا جاتا ہے۔ چنانچہ عتل اور زنیم کے الفاظ قرآن کریم میں بھی آئے ہیں اور مذکورہ بالا معنی ہی میں ان الفاظ کا مصداق ولید بن مغیرہ کو قرار دیا گیا ہے جو کفار مکہ میں سے نہایت بدطن اور اسلام و پیغمبر اسلام کا سخت ترین دشمن تھا۔

متکبر جنت میں داخل نہیں ہوگا

④ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَدْخُلُ النَّارَ اَحَدٌ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالَ حَبَّۃٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ اِیْمَانٍ وَّلَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ اَحَدٌ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالَ حَبَّۃٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ کِبْرٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "وہ شخص (ہمیشہ کے لیے) دوزخ میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانہ برابر بھی ایمان ہوگا، اور وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانہ برابر بھی تکبر ہوگا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "ایمان" سے مراد اصل ایمان نہیں ہے بلکہ ایمان کے ثمرات مراد ہیں جن کو فضائل و اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے خواہ ان کا تعلق ظاہر سے ہو یا باطن سے اور جو نور ایمان اور ظہور ایقان سے صادر ہوتے ہیں۔ جہاں تک اصلی ایمان کا تعلق ہے وہ چونکہ تصدیق قلبی کا نام ہے اسلئے اس میں نہ تو زیادتی ہو سکتی ہے اور نہ کمی، اس اعتبار سے اس کو اجزاء میں منقسم بھی نہیں کیا جاسکتا، البتہ اس کے شعبے اور شاخیں بہت ہیں جو اصل ایمان کی حقیقت و ماہیت سے خارج ہیں جیسے نماز روزہ اور زکوۃ اور اسی طرح اسلام کے دوسرے تمام ظاہری احکام یا جیسے تواضع اور ترحم اور اسی طرح وہ تمام چیزیں جو باطنی اوصاف و خصائل کا درجہ رکھتی ہیں، چنانچہ اس حدیث میں فرمایا گیا ہے الایمان بضع وسبعون شعبۃ (ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں) ظاہر ہے کہ شاخوں اور اس کی اصل کے درمیان اتنا گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کا درجہ رکھتی ہیں لیکن اس کے باوجود حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے کوئی بھی شاخ اپنی اصل کا مترادف نہیں ہوسکتی اس طرح اصل ایمان ایک الگ چیز ہے اور اسلام کے تمام ظاہری احکام و باطنی اخلاق و خصائل جداگانہ

حیثیت رکھتے ہیں جن کو اصل ایمان کی حقیقت و ماہیت میں شامل نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ آنحضرت کا یہ ارشاد الحیاء شعبۃ من الایمان (حیاء ایمان کی ایک شاخ ہے) مذکورہ بالا قول کی دلیل ہے کیونکہ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حیاء ایمان کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔

حدیث کے دوسرے جزء کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک جنّت میں داخل نہیں ہوگا جب تک کہ اس کے نامہ اعمال میں تکبر کا گناہ موجود رہے گاہاں جب وہ تکبر اور دوسری بری خصلتوں کی آلائش سے پاک وصاف ہو جائے گا تو اس وقت جنّت میں داخل کیا جائے گا، اور یہ پاکی وصفائی یا تو اس صورت میں حاصل ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اس کو عذاب میں مبتلا کرے گا اور وہ عذاب اس آلائش کو دھودے گا یا اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کو معاف کردے گا اور معافی اس آلائش کو زائل کردے گی۔ خطابیؒ نے لکھا ہے کہ حدیث کے اس جزء کی دو تاویلیں ہیں، ایک تو یہ کہ (کبر) سے کفر و شرک مراد ہے اور ظاہر ہے کہ کفر و شرک کے مرتکب پر جنّت کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ بند رہیں گے دوسری تاویل یہ ہے کہ "کبر" سے مراد تو اس کے اپنے معنی ہی ہیں یعنی اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے برتر و بلند سمجھنا اور غرور گھمنڈ میں مبتلا ہونا البتہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ متکبر شخص اس وقت تک جنّت میں داخل نہیں ہوگا جب تک کہ حق تعالیٰ کی رحمت اس پر متوجہ نہ ہو چنانچہ جب حق تعالیٰ اس کو جنّت میں داخل کرنا چاہے گا تو اس کے دل میں سے کبر کو نکال باہر کرے گا اور پھر اس کی کدورتوں سے پاک وصاف کر کے جنّت میں داخل کردیگا۔

تکبر کی حقیقت

⑤ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ فَقَالَ رَجُلٌ اِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ اَنْ يَّكُوْنَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَّ نَعْلُهُ حَسَنًا قَالَ اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُّحِبُّ الْجَمَالَ اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "وہ شخص جنّت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا (یہ سن کر) ایک شخص نے عرض کیا کہ کوئی آدمی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کا لباس عمدہ ہو اور اس کے جوتے اچھے ہوں (اور وہ اپنی اس پسند و خواہش کے تحت اچھا لباس پہنتا ہے اور اچھے جوتے استعمال کرتا ہے تو کیا اس کو بھی تکبر کہیں گے؟) آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ جمیل یعنی اچھا اور آراستہ ہے اور جمال یعنی اچھائی و آراستگی کو پسند کرتا ہے، اور تکبر یہ ہے کہ حق بات کو ہٹ دھرمی کے ساتھ نہ مانا جائے اور لوگوں کو حقیر و ذلیل سمجھا جائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "ذرہ" سے یا تو چیونٹی مراد ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس جیسی سو چیونٹیاں مل کر ایک جو کے وزن کے برابر ہوتی ہیں یا وہ ریزہ و غبار مراد ہے جو ہوا میں باریک باریک نظر آتا ہے اور روشنی کے وقت چمکتا ہے۔

"ایک شخص نے عرض کیا......" کے بارے میں مختلف اقوال ہیں کہ "ایک شخص" سے کون صحابیؓ مراد ہیں، چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس وقت جن صحابیؓ نے مذکورہ بات عرض کی تھی وہ معاذ بن جبلؓ تھے۔ بعض حضرات نے عبداللہ بن عمروؓ بن العاص اور بعض حضرات نے ربیعہ بن عامرؓ کا نام ذکر کیا ہے۔

کوئی آدمی یہ پسند کرتا ہے الخ" ان صحابیؓ نے جو یہ سوال کیا تو اس کا ایک پس منظر تھا، وہ یہ دیکھا کرتے تھے کہ جو لوگ غرور و تکبر کرتے ہیں اور اپنے علاوہ ہر ایک کو ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں، ان کے جسم پر اعلیٰ اور نفیس لباس ہوتا ہے، ان کے پیروں میں نہایت اعلیٰ جوتیاں ہوتی ہیں اور ان کے کپڑے وغیرہ اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں چنانچہ جب انہوں نے آنحضرت ﷺ کا مذکورہ ارشاد سنا تو ان کو گمان ہوا کہ کہیں یہ چیزیں تو تکبر کی نشانیاں نہیں ہیں اور اعلیٰ و نفیس لباس وغیرہ ہی سے تو تکبر پیدا نہیں ہوتا، لہٰذا انہوں نے پوچھا کہ اگر کوئی

شخص محض اپنی ذاتی خواہش وپسند اور استطاعت کی بنا پر اچھے اچھے کپڑے پہنے اور عمدہ جوتے وغیرہ استعمال کرے اور اس کے خیال میں بھی یہ بات نہ ہو کہ وہ اپنے کپڑوں وغیرہ کے ذریعہ دوسروں پر اپنی امارت وبڑائی کا رعب ڈالے گا۔ لوگوں کو ذلیل وحقیر سمجھے گا اور اتراہٹ وگھمنڈ کرے گا اور اس شخص کی اس نیت کی علامت یہ ہو کہ وہ جس طرح لوگوں کے سامنے اچھے کپڑے وغیرہ استعمال کرنا پسند کرتا ہو اسی طرح تنہائی میں بھی ان چیزوں کو پسند کرتا ہو تو کیا ایسے شخص پر بھی تکبر کا اطلاق ہوگا؟ حضور ﷺ نے اپنے مذکورہ جواب کے ذریعہ واضح فرمایا کہ ایسے شخص پر تکبر کا اطلاق نہیں ہوگا بلکہ اس کا لباس عمدہ زیب تن کرنا اور اچھے جوتے پہننا اس کی تہذیب وشائستگی اور اس کی خوش ذوقی کی علامت ہوگا جس سے شریعت نے منع نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے کبر کی حقیقت بیان فرمائی کہ جس کبر کو مذموم قرار دیا گیا ہے وہ دراصل اس کیفیت وحالت کا نام ہے جو انسان کو حق کے راستہ سے ہٹادے یعنی توحید وعبادت خداوندی سے بے پرواہ بنادے حق وصداقت سے سرکشی کرنے پر مائل کرے حقیقت تک پہنچنے سے روکے اور سچائی کو قبول کرنے سے باز رکھے اور مخلوق خدا کو ذلیل وحقیر سمجھنے پر مجبور کرے! بعض حضرات نے بطر الحق کے معنی "جمال حق کو باطل کرنا" لکھے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ جمیل ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات وصفات میں اور اپنے افعال وقدرت میں اوصاف کاملہ سے موصوف ہے، اور تمام ظاہری وباطنی حسن وجمال اسی کے جمال کا عکس ہیں اور جمال وجلال بس اسی کی ذات پاک کا خاصہ ہے بعض حضرات نے "جمیل" کے معنی "آراستہ کرنے والے اور جمال بخشنے والے" بیان کئے ہیں، بعضوں نے یہ کہا ہے کہ "جمیل" دراصل "جلیل" کے معنی میں ہے اس صورت میں "اللہ جمیل ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام تر نور وبہجت اور حسن وجمال کا مالک ہے۔ نیز بعض حضرات نے یہ معنی بھی بیان کئے ہیں کہ وہ اپنے بندوں کا اچھا کارساز ہے۔

وہ تین لوگ جو قیامت کے دن خدا کی توجہ سے محروم رہیں گے

(۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ لَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ وَفِیْ رِوَایَةٍ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ شَیْخٌ زَانٍ وَّمَلِكٌ كَذَّابٌ وَعَآئِلٌ مُّسْتَكْبِرٌ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ تین شخص ہیں جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کلام نہیں کرے گا (یعنی یا تو رضا وخوشنودی کا کلام نہیں کرے گا یا مطلق کوئی کلام نہیں کرے گا) اور نہ ان کی تعریف وستائش کرے گا اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اور نہ ان کی طرف (رحمت وعنایت کی نظر سے) دیکھے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا! ایک تو زنا کار بڈھا، دوسرا جھوٹا بادشاہ اور تیسرا تکبر کرنے والا مفلس۔" (مسلم)

تشریح: "قیامت کے دن" سے میدان حشر کا وقت مراد ہے جب اللہ کے فضل وعدل، غضب وناراضگی اور رضا کا ظہور ہوگا اور جنتیوں و دوزخیوں کے بارے میں فیصلے صادر کیے جائیں گے۔

وَلَا یُزَكِّیْهِمْ کے ایک معنی تو وہی ہیں جو ترجمہ میں بیان کیے گئے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ میدان حشر میں اپنی تمام مخلوق کے سامنے اپنے مؤمن اور نیکوکار بندوں کی تعریف وستائش کرے گا تو اس وقت ان تین طرح کے آدمیوں کو اس تعریف وستائش سے خارج کر دیا جائے گا اور ایک معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان تینوں طرح کے آدمیوں کو اپنے عفو ودرگزر کے ذریعہ گناہوں کی نجاست سے پاک وصاف نہیں کرے گا۔ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ کے بارے میں دو احتمال ہیں، یا تو یہ جملہ دوسری روایت کا تتمہ ہے یا اس کا تعلق اصل حدیث سے ہے، اور یہ دوسرا احتمال زیادہ قوی اور قابل اعتماد ہے۔ حاصل یہ کہ مذکورہ باتیں دراصل اللہ تعالیٰ کے غضب وکبر اور اس کی ناراضگی سے کنایہ ہیں، چنانچہ جو کوئی کسی شخص سے ناراض وخفا ہوتا ہے تو وہ نہ اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہے نہ اس سے کلام کرتا ہے اور نہ اس کی تعریف وستائش کرتا ہے بلکہ اس کو سزا وتنگی میں مبتلا کرتا ہے۔

حدیث میں جن تین برائیوں کے مرتکبین کے بارے میں وعید بیان فرمائی گئی ہے وہ ہر حال میں مذموم اور مستوجب عذاب ہیں، خواہ ان برائیوں کا مرتکب کسی درجہ کا، کسی حیثیت کا اور کسی عمر کا آدمی ہو، لیکن یہاں ان برائیوں کے تعلق سے جن تین لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے اعتبار سے ان برائیوں کی سنگینی کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے، مثلاً زنا ایک بہت برا فعل ہے اور جب یہ فعل جوان کے حق میں بھی بہت بڑا گناہ ہے جو طبعی طور پر معذور بھی ہوتا ہے تو ایک بڈھے کے حق میں یہ فعل کہیں زیادہ برا ہوگا کیونکہ نہ تو وہ طبعی طور پر اس کی احتیاج رکھتا ہے اور نہ اس کی طبیعت پر جنسی خواہش اور قوت مردمی کا وہ غلبہ ہوتا ہے جو بسا اوقات عقل و شعور سے بیگانہ اور خوف خداوندی سے غافل کر دیتا ہے۔ لہٰذا جو بڈھا، زنا کا مرتکب ہوتا ہے وہ گویا اپنی نہایت بے حیائی اور خبث طبیعت پر دلالت کرتا ہے، اسی طرح جھوٹ بولنا ہر شخص کے حق میں برا ہے لیکن بادشاہ کے حق میں بہت ہی برا ہے کیونکہ اس پر ملک کے انتظام، رعایا کے مصالح و مفاد کی رعایت اور مخلوق خدا کے معاملات کی نگہداشت کی ذمہ داری ہوتی ہے اس کا ایک ادنی سا حکم پورے ملک کے نظم و نسق پر اثر انداز ہوتا ہے، اگر وہ جھوٹ کا مرتکب ہو تو اس کی اس برائی کی وجہ سے پورا ملک اور ملک کے تمام لوگ مختلف قسم کی برائیوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں، علاوہ ازیں جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں وہ عام طور پر اس برائی کا ارتکاب اپنے کسی فائدہ کے حصول یا کسی نقصان کے دفعیہ کے لئے کرتے ہیں، جب کہ ایک بادشاہ و حاکم یہ مقصد بغیر جھوٹ بولے بھی حاصل کرنے پر قادر ہوتا ہے، لہٰذا اس کا جھوٹ بولنا نہ صرف بالکل بے فائدہ بلکہ نہایت مذموم ہوگا۔ اسی پر تکبر کو بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ جو چیزیں عام طور پر انسان کو غرور و تکبر میں مبتلا کر دیتی ہیں جیسے مال و دولت اور جاہ و اقتدار وغیرہ وہ اگر کسی شخص میں پائی جائیں اور وہ ان چیزوں کی وجہ سے تکبر کرے تو اگرچہ اس شخص کو بھی برا کہیں گے مگر اس کا تکبر کرنا ایک طرح سے سمجھ میں آنے والی بات ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر کوئی فقیر و مفلس تکبر کرے کہ جو نہ تو مال و دولت رکھتا ہے اور نہ جاہ و اقتدار وغیرہ کا مالک ہے تو اس کا یہ فعل نہایت ہی برا ہوگا اور اس کے بارے میں اس کے علاوہ اور کیا کہا جائے گا کہ وہ خبث باطن اور طبیعت کی کمینگی میں مبتلا ہے۔

بعض حضرات نے عَآئِلٌ مُّسْتَكْبِرٌ میں لفظ عائل سے (مفلس کے بجائے) عیال دار مراد لیا ہے یعنی جو لوگ بال بچے دار ہوں اور اپنی خستہ حالی کی وجہ سے اپنے متعلقین کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے پر قادر نہ ہوں لیکن اس کے باوجود ازراہ تکبر صدقہ و زکوٰۃ کا مال قبول کرنے پر تیار نہ ہوتے ہوں، لوگوں کی تواضع و امداد کو ٹھکراتے ہوں اور اس طرح وہ اپنے اہل و عیال کی ضرورت کو پورا کرنے سے بے پرواہ ہو کر گویا ان کو تکلیف و ہلاکت میں مبتلا کرتے ہوں تو ایسے لوگ حدیث میں مذکورہ وعید کا مورد ہیں واضح رہے کہ خدا کی ذات پر توکل و اعتماد اور غیرت و خود داری کے تحت اپنی حالت کو چھپانا اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے شرم و حیاء کرنا تو ایک الگ چیز ہے لیکن سخت احتیاج و اضطرار کے باوجود کبر و نخوت اختیار کرنا اور ازراہ تکبر لوگوں کا احسان قبول نہ کرنا ایک ایسا فعل ہے جس کو نہایت مذموم ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

شَيْخٌ زَانٍ کے بارے میں بھی بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہاں "شیخ" سے مراد، محض شادی شدہ شخص بھی ہو سکتا ہے خواہ وہ بوڑھا ہو یا جوان جیسا کہ اس منسوخ التلاوت آیت اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ میں شیخ سے مراد شادی شدہ مرد ہے، چنانچہ ایسے شخص کے حق میں زنا کا زیادہ برا ہونا شرعاً بھی اور عرفاً بھی بالکل ظاہر بات ہے اسی لئے ایسے شخص کو سنگسار کرنا واجب ہے اسی طرح مَلِكٌ كَذَّابٌ کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں ملک (بادشاہ) سے مراد غنی و مالدار شخص بھی ہو سکتا ہے! چنانچہ کسی مفلس یا قلاش شخص کا جھوٹ بولنا تو ایک درجہ میں سمجھ میں آنے والی بات ہو سکتی ہے کیونکہ وہ اپنی تنگ دستی و خستہ حالی کی وجہ سے بسا اوقات اپنی کسی سخت غرض اور شدید دنیاوی ضرورت کی وجہ سے جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے، جب کہ غنی و مالدار شخص اپنے مال و زر کی وجہ سے ایسی کوئی احتیاج نہیں رکھتا اور وہ جھوٹ بولے بغیر بھی اپنی غرض پوری کر سکتا ہے لہٰذا جھوٹ بولنا اس کے حق میں زیادہ برا ہے "عائل مستکبر" کے بارے میں بھی ایک قول یہ ہے کہ یہاں "عائل" یعنی مفلس سے مراد وہ شخص ہے جو فقراء

ومساکین کے ساتھ تکبر کرے چنانچہ فقراء ومسکین کے ساتھ تکبر کرنا سخت برا ہے جب کہ مغرور مالداروں کے ساتھ تکبر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے! اس جملہ کے بارے میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہاں "مفلس" سے مراد وہ شخص ہے جو کسب وکمائی اور محنت ومشقت کر کے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے پر قادر ہو مگر اس کے باوجود وہ ازراہ رعونت ونخوت کوئی کسب وکمائی اور محنت مزدوری کرنے کو کسر شان سمجھتا ہو جیسا کہ آجکل عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اچھے خاصے اور ہٹے کٹے لوگ کوئی کام کاج کرنے اور محنت مزدوری اختیار کرنے میں اپنی ذلت سمجھتے ہیں خواہ ان کو اور ان کے متعلقین کو فاقوں کی اذیت ہی کیوں نہ برداشت کرنا پڑتی ہو یا ناروا طور پر دوسرے لوگوں کے کاندھوں کا بار ہی کیوں نہ بننا پڑتا ہو، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسے لوگوں کا یہ طریقہ یقیناً تکبر کے ہم معنی ہے اور یہ تکبر مالداروں کے تکبر سے کہیں زیادہ برا ہے کیونکہ اس کی بنیاد رعونت ونخوت، بیجا شان دکھانے خواہ مخواہ کے لئے اپنے اور اپنے متعلقین کو تکلیف وہلاکت میں مبتلا کرنے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور ناجائز طور سے مال حاصل کرنے پر ہے خصوصا ایسی صورت میں اس تکبر کی برائی اور کہیں بڑھ جاتی ہے جبکہ ایسا کوئی شخص اپنے دست وبازو کے ذریعہ اپنا اور اپنے متعلقین کا رزق حاصل کرنے کے بجائے دین کا لبادہ اوڑھ لے اور اپنی وضع قطع دینداروں اور بزرگوں کی سی بنا کر اپاہج کی طرح بیٹھ جائے اور سادہ لوح مسلمانوں پر اپنی مصنوعی بزرگی کا سکہ جما کر ان کے کاندھوں کا بار بنا رہے۔

تکبر کرنا گویا شرک میں مبتلا ہونا ہے

(۷) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اَلْكِبْرِيَآءُ رِدَآئِىْ وَالْعَظْمَةُ اِزَارِىْ فَمَنْ نَازَعَنِىْ وَاحِدًا مِّنْهُمَا اَدْخَلْتُهُ النَّارَ۔ وَفِىْ رِوَايَةٍ قَذَفْتُهٗ فِى النَّارِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ذاتی بزرگی (گویا تمہارے اعتبار سے) میری چادر ہے اور صفاتی عظمت (گویا تمہارے اعتبار سے) میرا تہبند ہے پس جو ان دونوں میں سے کسی ایک میں میرے ساتھ جھگڑا کرے گا (یعنی جو تکبر کرے گا اور اس طرح وہ گویا میری ذات وصفات میں شرک کا ارتکاب کرے) تو میں اس کو (عذاب دینے والی) آگ میں داخل کروں گا اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "تو میں اس کو آگ میں پھینک دوں گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: میری چادر اور میرا تہبند جیسے الفاظ حق تعالیٰ نے مثال کے طور پر فرمائے ہیں اور اس مثال کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ یہ دونوں صفتیں یعنی کبریائی اور عظمت صرف میری ذات سے تعلق رکھتی ہیں جن میں کوئی بھی میرا ساجھی اور شریک نہیں ہو سکتا جیسے کسی کے لباس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا، چنانچہ حق تعالیٰ کی کچھ صفات تو ایسی ہیں جن میں کا کچھ حصہ بندوں کو بھی دیا گیا ہے اور بندے بطریق مجاز خود کو ان صفات کے ساتھ موصوف کر سکتے ہیں جیسے جود وکرم اور مہربانی وغیرہ لیکن کچھ صفات ایسی ہیں جو صرف حق تعالیٰ کی ذات کے لئے مخصوص ہیں اور جن کے ساتھ کوئی بندہ اپنے آپ کو بطریق مجاز بھی موصوف نہیں کر سکتا اسی حقیقت کو مثال کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے کہ جس طرح کوئی شخص ان کپڑوں کو نہیں پہن سکتا جو کسی دوسرے شخص کے جسم پر ہوں اسی طرح کبریائی اور حقیقی عظمت وبڑائی کا بھی کوئی بندہ دعویٰ نہیں کر سکتا کیونکہ یہ دونوں صفتیں صرف میری ذات کے لئے موزوں اور مخصوص ہیں۔

"کبریاء" اور "عظمۃ" یہ دونوں لفظ لغت میں ایک ہی معنی کے حامل ہیں یعنی بزرگی اور بڑا ہونا، لیکن حدیث کے ظاہری اسلوب سے ان دونوں کے درمیان فرق معلوم ہوتا ہے کہ ایک کو چادر کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور دوسرے کو تہبند کے ساتھ! لہٰذا اس فرق کو سامنے رکھتے ہوئے بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ کبریا تو صفت ذاتی ہے یعنی اللہ کی ذات کبیر ومتکبر ہے خواہ دوسرا اس حقیقت کو جانے یا نہ جانے، اور "عظمت" کا لفظ حق تعالیٰ کی اس بڑائی کو بیان کرتا ہے جس کا ظہور اس کے غیر پر بھی ہوتا ہے کہ ساری مخلوق جانتی ہے کہ وہ ایسا بڑا ہے، پس یہ (عظمت) حق تعالیٰ کی صفت اضافی ہوئی اور ذاتی صفت کا اضافی صفت سے اعلیٰ ہونا ضروری ہوتا ہے، لہٰذا کبریائی کو

چادر کے ساتھ تشبیہ دی گئی کیونکہ چادر تہبند سے اعلی ہوتی ہے اور عظمت کو تہبند کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

تکبر نفس کا دھوکہ ہے

⑧ عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَذْهَبُ بِنَفْسِهٖ حَتّٰى يُكْتَبَ فِي الْجَبَّارِيْنَ فَيُصِيْبُهٗ مَآ اَصَابَهُمْ۔ (رواه الترمذی)

"حضرت سلمہ بن اکوع کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "کوئی شخص اپنے نفس کو برابر کھینچتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کا نام) سرکشوں (یعنی ظالم اور متکبر لوگوں کی فہرست) میں لکھ دیا جاتا ہے اور پھر جو چیز دنیا و آخرت کی آفت وبلا) ان سرکشوں کو پہنچتی ہے وہی اس شخص کو بھی پہنچتی ہے۔" (ترمذی)

تشریح: لفظ "بنفسه" میں حرف باء اگر تعدیہ کے لئے ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ اپنے نفس کو اوپر اٹھاتا ہے، خود کو بلند مرتبہ سمجھ کر لوگوں سے دور رکھتا ہے اور اپنے آپ کو ہر ایک کے مقابلہ پر بزرگ و برتر جانتا ہے اور اگر حرف باء مصاحبت کے لئے ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ وہ اپنے نفس کے دھوکے میں مبتلا ہو کر اس کے ساتھ کبر و غرور کی طرف بڑھتا ہے، اس کو عزت دیتا ہے اور اس کی تعظیم و توقیر کرتا ہے۔ جیسا کہ دوست، دوست کی تعظیم و توقیر کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ متکبر و مغرور ہو جاتا ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے نفس کے دھوکے میں پڑ کر خود بینی و خود ستائی کا شکار ہو جاتا ہے تو اپنے آپ کو اپنے اصل مرتبہ و مقام سے اوپر اٹھا کر بڑے مرتبہ و مقام تک پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا ہے، نفس اس کو جس طرح مصنوعی بڑائی کی طرف بہکاتا ہے وہ بہکتا رہتا ہے۔ جدھر لے جاتا ہے ادھر جاتا ہے اور نفس پر قابو پانے کے بجائے خود اس کے قابو میں ہو جاتا ہے، یہاں تک تکبر اور سرکشی میں پوری طرح مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کے لئے دنیا و آخرت کا وہ عذاب مقدر ہو جاتا ہے جو سرکشوں کے لئے مخصوص ہے۔

تکبر کرنے والوں کا انجام

⑨ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُحْشَرُ الْمُتَكَبِّرُوْنَ اَمْثَالَ الذَّرِّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْ صُوَرِ الرِّجَالِ يَغْشَاهُمُ الذُّلُّ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ يُسَاقُوْنَ اِلٰى سِجْنٍ فِيْ جَهَنَّمَ يُسَمّٰى بُوْلَسَ تَعْلُوْهُمْ نَارُ الْاَنْيَارِ يُسْقَوْنَ مِنْ عُصَارَةِ اَهْلِ النَّارِ طِيْنَةِ الْخَبَالِ۔ (رواه الترمذی)

"حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے اور وہ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن تکبر کرنے والوں کو چھوٹی چیونٹیوں کی طرح مردوں کی صورت میں ایک جگہ جمع کیا جائے گا (یعنی ان کی شکل وصورت تو مردوں کی سی ہوگی لیکن جسم و جثہ چیونٹیوں کی مانند ہوگا) اور ہر طرف سے ذلت و خواری ان کو پوری طرح گھیرے گی، پھر ان کو جہنم کے ایک قید خانہ کی طرف کہ جس کا نام بولس ہے، ہانکا جائے گا، وہاں آگوں کی آگ ان پر چھا جائیگی (جیسے کسی ڈوبنے والے کے اوپر تک پانی چھا جاتا ہے) اور دوزخیوں کا نچوڑ (یعنی دوزخیوں کے بدن سے بہنے والا خون، پیپ اور کچ لہو ان کو پلایا جائیگا جس کا نام طینت الخبال ہے" (ترمذی)

تشریح: "چھوٹی چیونٹیوں کی طرح" کے اصل مفہوم کے بارے میں علما کے اختلافی اقوال ہیں۔ چنانچہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ چیونٹیوں کی تشبیہ دراصل اس بات سے کنایہ ہے کہ تکبر کرنے والے لوگ قیامت کے دن میدان حشر میں نہایت ذلت و خواری کی حالت میں ہوں گے اور گویا وہ لوگوں کے پاؤں کے نیچے اس طرح پامال ہونگے جس طرح چیونٹیوں کو روندا جاتا ہے! ان حضرات کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ قیامت کے دن مخلوق کا اٹھنا اور ان کے اجسام کا دوبارہ بننا انہی اجزاء اصل کے ساتھ ہوگا جو وہ دنیا میں رکھتے تھے جیسا

کہ یہ ثابت ہے کہ ہر شخص میدان حشر میں اپنے ہی اجزاء واعضاء کے ساتھ اٹھ کر آئے گا جن پر دنیا میں اس کا جسم مشتمل تھا، اور ظاہر ہے کہ چیونٹی کی صورت اور اس کا جثہ اس جسم وبدن کے اجزاء اصلی کے حامل نہیں ہو سکتا، اسی لئے حدیث فی الصور الرجال مردوں کی صورت میں) کے الفاظ بھی اس قول پر دلالت کرتا ہے بلکہ یغشاھم الذل کے الفاظ بھی اسی کا قرینہ ہیں کہ "چیونٹیوں کی طرح" سے مراد ذلت وخواری ہی ہے نہ کہ یہ مراد ہے کہ ان کے جسم چیونٹیوں کی طرح ہوں گے۔ لیکن جیسا کہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے، زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حدیث اپنے ظاہری مفہوم پر محمول ہے، یعنی تکبر کرنے والے در حقیقت چیونٹیوں کے جسم کے ساتھ اٹھیں گے البتہ ان کی شکل وصورت مردوں جیسی ہوگی، اور یہ چیز قطعا بعید از قیاس نہیں ہے کیونکہ حق تعالیٰ کو اس امر پر پوری قدرت حاصل ہے کہ وہ قیامت میں کسی کے ان اجزاء اصل کو جن کے ساتھ وہ اٹھے گا، ایک چیونٹی کے جثہ میں جمع کر دے اور اس کو چیونٹی کا جسم دے کر پوری مخلوق کے سامنے ذلیل وخوار کرے۔

حضرت ملا علی قاریؒ نے بھی اس بارے میں کئی اقوال نقل کیے ہیں اور پھر تورپشتیؒ کی طرف منسوب کر کے یہ بیان کیا ہے کہ ہم اس حدیث کے ظاہری معنی اس لئے مراد نہیں لیتے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب لوگ قیامت کے دن دوبارہ اٹھ کر میدان حشر میں آئیں تو ان کے جسم وبدن ان ہی اجزاء پر مشتمل ہوں گے جن پر دنیا میں ان کے جسم مشتمل تھے یہاں تک کہ ان کے عضو تناسل کی کھال کا وہ حصہ بھی لگا دیا جائے گا جو ختنہ کے وقت کاٹا جاتا ہے گویا سارے لوگ غیر مختون اٹھیں گے، لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک انسان کے جسم کے سارے اجزاء یہاں تک کہ ناخن اور بال وغیرہ بھی ایک چیونٹی کے جثہ میں جمع ہو جائیں۔

آخر میں ملا علی قاریؒ نے تورپشتی کے مذکورہ قول کے مخالفین کے جواب بھی نقل کئے ہیں اور ان پر شک کا اظہار کرتے ہوئے اپنی تحقیق یہ لکھی ہے کہ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ جب لوگ اپنی قبروں سے اٹھ کر میدان حشر میں آئیں گے تو اس وقت اللہ تعالیٰ دوسرے لوگوں کی طرح تکبر کرنے والوں کے جسم کو بھی دوبارہ بنائے گا اور وہ بھی اپنے تمام اجزاء معدومہ کے ساتھ اپنے پورے جسم میں اٹھ کر آئیں گے تاکہ ہر ایک کی دوبارہ جسمانی تخلیق کی قدرت پوری طرح ثابت ہو جائے لیکن پھر ان لوگوں کو میدان حشر میں مذکورہ جسم وصورت میں تبدیل کر دے گا یعنی ان کے جسم چیونٹیوں کی طرح ہو جائیں گے اور ان کی صورت مردوں کی سی رہے گی، اور یہ تبدیلی جسم اس لئے ہوگی تاکہ ان کی ذلت واہانت پوری مخلوق کے سامنے ظاہر ہو جائے یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب مذکورہ لوگ حساب کتاب کی جگہ آئیں گے اور ان کے سامنے عذاب الٰہی کی نشانیاں ظاہر ہوں گی تو اس وقت وہ ہیبت ودہشت کے سبب اس قدر گھٹ جائیں گے کہ ان کے جسم چیونٹیوں کی طرح معلوم ہوں گے، اور اہل دوزخ کا اپنی اپنی حالتوں اور گناہوں کے اعتبار سے مختلف صورتوں جیسے کتے، سور، اور گدھے وغیرہ کی شکلوں میں تبدیل ہو جانا مختلف منقولات سے ثابت بھی ہے۔

لفظ "بولس" با کے زبر، واؤ کے جزم اور لام کے زبر کے ساتھ ہے، اور قاموس میں لکھا ہے کہ یہ لفظ با کے پیش اور لام کے زیر کے ساتھ ہے جو بلس سے مشتق ہے، اور جس کے معنی تحیر اور ناامیدی کے ہیں شیطان کا نام ابلیس بھی اسی سے مشتق ہے۔

"آگوں کی آگ میں" کی طرف آگ کی نسبت ایسی ہی ہے۔ جیسے آگ کی نسبت کسی ایسی چیز کی طرف کی جائے جس کو آگ جلا دیتی ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ آگ اس طرح کی ہوگی کہ وہ خود آگ کو لکڑی کی طرح جلائے گی۔

طینۃ الخبال میں لفظ خبال خاء کے زبر کے ساتھ ہے اور اس کے لغوی معنی فساد اور خرابی کے ہیں اور جیسا کہ حدیث سے واضح ہوتا ہے "طینۃ الخبال" ان دوزخ کے عصارہ کا نام ہے اور عصارہ (بمعنی شیرہ یا تلچھٹ) اس پیپ، خون اور کچ لہو کو کہتے ہیں جو دوزخیوں کے زخموں سے بہے گا۔

ناحق غصہ، شیطانی اثر ہے

(۱۰) وَعَنْ عَطِيَّةَ بْنِ عُرْوَةَ السَّعْدِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْغَضَبَ مِنَ الشَّيْطٰنِ وَاِنَّ الشَّيْطٰنَ

خُلِقَ مِنَ النَّارِ وَاِنَّمَا يُطْفَأُ النَّارُ بِالْمَاءِ فَاِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَتَوَضَّا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عطیہ ابن عروہ سعدیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (ناحق) غصہ شیطانی اثر ہے (یعنی ناحق غصہ کرنا، شیاطین کے مشتعل کرنے اور اس کے فریب میں آجانے کا نتیجہ ہوتا ہے) اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ کو پانی سے بجھایا جاتا ہے اس لئے جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اس کو چاہئے کہ وضو کر لے۔" (ابوداؤد)

تشریح: ٹھنڈا پانی استعمال کرنے کی خاصیت یہ ہے کہ وہ غصہ کو ٹھنڈا کرتا ہے جیسا کہ عام تجربہ سے ثابت ہے، اور ٹھنڈے پانی کے استعمال کی بہترین صورت تو وضو کر لینا ہے لیکن ٹھنڈا پانی پینے کی بھی یہ خاصیت ہے اس حدیث میں تو صرف وضو کرنے کا ذکر ہے لیکن چاہئے یہ کہ جب غصہ آئے تو پہلے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھے (چنانچہ ایک حدیث میں یہ منقول ہے کہ اعوذ پڑھنے سے غصہ جاتا رہتا ہے) پھر جب دیکھے کہ غصہ ختم نہیں ہوا ہے تو اٹھ کر وضو کرے اور اللہ تعالیٰ کے لئے دو رکعت نماز پڑھے۔

غصہ کا ایک نفسیاتی علاج

⑪ وَعَنْ اَبِىْ ذَرٍّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ وَهُوَ قَائِمٌ فَلْيَجْلِسْ فَاِنْ ذَهَبَ عَنْهُ الْغَضَبُ وَاِلَّا فَلْيَضْطَجِعْ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے اور اس وقت کھڑا ہو تو (فورا) بیٹھ جائے، اگر غصہ جاتا رہے تو خیر ورنہ پھر پہلو پر لیٹ جائے۔" (احمد، ترمذی)

تشریح: شرح السنہ میں لکھا ہے کہ غصہ کی حالت میں کھڑا رہنے کے بجائے بیٹھ جانے میں حکمت یہ ہے کہ عام طور غصہ کے وقت انسان بے قابو ہو جاتا ہے اور اگر وہ غصہ کے وقت کھڑا ہوا ہو تو اس بات کا زیادہ خوف رہتا ہے کہ وہ کوئی ایسی حرکت کر گزرے جس سے بعد میں پریشانی اور پشیمانی اٹھانی پڑے اور ظاہر ہے کہ بیٹھے ہوئے ہونے کی صورت میں کسی حرکت کا صادر ہونا اتنی سرعت اور آسانی کے ساتھ نہیں ہوتا جس قدر کہ کھڑے ہونے کی صورت میں ہوتا ہے اور لیٹے ہوئے ہونے کی صورت میں اتنی سرعت اور آسانی کے ساتھ نہیں ہوتا جس قدر بیٹھے ہوئے ہونے کی صورت میں ہوتا ہے لیکن اس بارے میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ غصہ کے وقت اپنی حالت میں اس طرح تبدیلی کر لینا کہ جس سے جسم وذہن کو سکون وآرام ملے جیسے کھڑا ہو تو فوراً بیٹھ جائے یا بیٹھا ہوا ہو تو لیٹ جائے، غصہ اور اشتعال کے دفعیہ کے لئے بہترین تاثیر رکھتا ہے۔

برے بندے کون ہیں؟

⑫ وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ تَخَيَّلَ وَاخْتَالَ وَنَسِيَ الْكَبِيْرَ الْمُتَعَالَ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ تَجَبَّرَ وَاعْتَدٰى وَنَسِيَ الْجَبَّارَ الْاَعْلٰى بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ سَهٰى وَلَهٰى وَنَسِيَ الْمَقَابِرَ وَالْبِلٰى بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ عَتَا وَطَغٰى وَنَسِيَ الْمُبْتَدَاَ وَالْمُنْتَهٰى بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ يَخْتِلُ الدُّنْيَا بِالدِّيْنِ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ يَخْتِلُ الدِّيْنَ بِالشُّبُهَاتِ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ طَمَعٌ يَقُوْدُهٗ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ هَوًى يُضِلُّهٗ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ رَغَبٌ يُذِلُّهٗ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَقَالَا لَيْسَ اِسْنَادُهٗ بِالْقَوِيِّ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ اَيْضًا هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت اسماء بنت عمیس کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "برا بندہ ہے وہ بندہ جس نے اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر جانا اور تکبر کیا اور خداوند بزرگ و برتر کو وہ بھول گیا (یعنی اس نے یہ فراموش کر دیا کہ بزرگی اور بلندی و برتری صرف اللہ

تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے) یا یہ بھول گیا کہ اس نے دنیا میں احتیاط و تقویٰ کی راہ چھوڑ کر جس برے راستہ کو اختیار کیا ہے اس کی جواب دہی اس کو آخرت میں کرنی ہوگی اور وہاں خدا کا عذاب بھگتنا ہوگا) برا بندہ ہے وہ بندہ جس نے لوگوں پر جبر و جور کیا اور ظلم و فساد ریزی میں حد سے بڑھ گیا اور خداوند جبار و قہار کو بھول گیا جس کی قدرت و عزت سب سے بلند ہے! برا بندہ وہ بندہ ہے جو دین کے کاموں کو بھول گیا اور دنیا داری میں مشغول رہا اور اس نے مقبروں کو اور خاک میں مل جانے والے جسم کی کہنگی و بوسیدگی کو فراموش کر دیا! (یعنی اس نے بات سے کوئی عبرت نہیں پکڑی کہ اس دنیا کے کیسے کیسے لوگ ہزاروں مٹی کے نیچے دفن کر دیے گئے اور ان کے جسم کیڑوں مکوڑوں کی خوراک بن گئے) یا مقبروں کو بھولنا موت کو بھولنے سے کنایہ ہے یعنی اس نے یہ فراموش کر دیا کہ ایک دن موت کا پنجہ آدبوچے گا اور اس وقت سے پہلے ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی کے لئے کچھ تیاری کر لینی ہے) برا بندہ ہے وہ بندہ جس نے فتنہ و فساد برپا کیا اور حد سے متجاوز ہو گیا اور اپنی ابتدا و انتہاء کو بھول گیا (یعنی نہ تو اس کو یاد رہا کہ وہ کتنی حقیر چیز سے پیدا کیا گیا ہے اور ابتداء میں وہ کس قدر عاجز و ناتواں تھا اور نہ اس کو اپنا انجام یاد رہا کہ ابھی اس کو کیا کیا دیکھنا ہے اور آخر کار پیوند زمین ہو جانا ہے اور فتنہ و فساد برپا کرنے اور جور و جفا کی زندگی اختیار کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت اور مخلوق خدا کی خدمت و بھلائی میں مشغول رکھے)! برا بندہ ہے وہ بندہ جو دین کے ذریعہ دنیا حاصل کرے (یعنی دنیا کو حاصل کرنے کے لئے دین کو وسیلہ بنائے یا یہ معنی ہیں کہ صلحاء اور بزرگوں کی سی شکل و صورت اختیار کرکے اور دین کا لبادہ اوڑھ کر اہل دنیا کو فریب دے تاکہ وہ اس کے معتقد و مداح ہوں اور ان سے مال و جاہ حاصل کرے)! برا بندہ ہے وہ بندہ جس نے مخلوق سے طمع و امید قائم کی اور حرص و طمع اس کو دنیاداروں کے دروازہ پر کھینچے کھینچے پھرتی ہے اور جدھر چاہتی ہے لے جاتی ہے، اور برا بندہ ہے وہ بندہ جس کو دنیا کی طرف اس کی رغبت و خواہش حصول دنیا کی حرص اور کثرت مال و جاہ کی ہوس ذلیل و خوار کرتی ہے اور اس کے دین کی آبرو ریزی کرتی ہے" اس روایت کو ترمذی نے اور شعب الایمان میں بیہقیؒ نے نقل کیا ہے اور دونوں نے کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد قوی نہیں ہے نیز ترمذیؒ نے بھی کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: یہ حدیث محض ترمذی و بیہقی کی مذکورہ اسناد ہی سے منقول نہیں ہے، بلکہ اس کو طبرانیؒ نے بھی نقل کیا ہے اور ایک دوسرے موقع پر بیہقیؒ نے نعیم ابن ہماز سے نقل کیا ہے نیز اس کو حاکم نے بھی اپنی مستدرک میں نقل کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کثرت طرق ضعیف حدیث کو قوی کر دیتی ہے اور اس کو حسن لغیرہ کے درجہ پر پہنچا دیتی ہے جس سے روایت کا مقصود پورا ہو جاتا ہے جہاں تک ترمذیؒ کے اس قول کا تعلق ہے کہ یہ حدیث غریب ہے، تو واضح رہے کہ اول تو غرابت صحت اور حسن کے منافی نہیں، دوسرے یہ کہ تمام محدثین کے نزدیک فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر بھی عمل کیا جاتا ہے، لہٰذا واعظ و نصیحت کے موقع پر اس حدیث کو ذکر کرنا اور لوگوں کو اس سے سبق حاصل کرنے کی تلقین کرنا بطریق اولیٰ مناسب ہوگا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

غصہ کو ضبط کرو

(۱۳) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا تَجَرَّعَ عَبْدٌ اَفْضَلَ عِنْدَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ مِنْ جُرْعَةِ غَيْظٍ يَكْظِمُهَا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ تَعَالٰى۔ (رواہ احمد)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بندہ (کسی چیز کا ایسا کوئی گھونٹ نہیں پیتا جو خدا کے نزدیک غصہ کا گھونٹ پینے سے بہتر ہو جس کو وہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے پی جاتا ہے۔" (احمدؒ)

(۱۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ قَالَ الصَّبْرُ عِنْدَ الْغَضَبِ وَالْعَفْوُ عِنْدَ الْاِسَآءَةِ فَاِذَا فَعَلُوْا عَصَمَهُمُ اللّٰهُ وَخَضَعَ لَهُمْ عَدُوُّهُمْ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ قَرِيْبٌ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ تَعْلِيْقًا۔

"اور حضرت ابن عباسؓ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (تم برائی بھلائی کے ذریعہ دفع کرنے کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ غصہ کے وقت صبر کرنا اور برائی کے وقت عفو و درگزر کرنا، اس ارشاد خداوندی کی مراد ہے! لہٰذا جب لوگ صبر و عفو کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو نفس اور مخلوقات کی آفتوں سے محفوظ رکھتا ہے اور ان کے دشمن اس طرح پست ہو جاتے ہیں جیسے وہ (دشمن نہ ہوں بلکہ) بہت قریبی دوست ہوں! اس روایت کو بخاری نے بطریق تعلیق نقل کیا ہے۔"

تشریح: روایت میں آیت کا جو ٹکڑا نقل کیا گیا ہے وہ اپنے سیاق و سباق کے ساتھ اس طرح ہے۔ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ

گویا آیت کی تعلیم یہ ہے کہ برائی کا بدلہ برائی نہیں ہے بلکہ برائی کا بدلہ نیکی ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص تمہارے ساتھ برائی سے پیش آئے تم اس کے ساتھ بھلائی سے پیش آؤ اس کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "برائی بھلائی کے ذریعہ دفع کرنے" سے مراد یہ ہے کہ جب غصہ آئے تو صبر و تحمل اختیار کرو اور اگر کسی سے کوئی برائی اور تکلیف پہنچے تو اس سے عفو و درگزر کا برتاؤ کرو۔

لفظ "قریب" دراصل لفظ حمیم کی تفسیر ہے جس سے قرابتی مراد ہے اور یہ جملہ مذکورہ آیت کے اس آخری جزو کی تفسیر ہے فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ یعنی پھر اچانک (تم دیکھو گے کہ) تم میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی قریبی دوست ہوتا ہے۔

غصہ ایمان کو خراب کر دیتا ہے

⑮ وَعَنْ بَهْزِبْنِ حَكِیْمٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْغَضَبَ لَیُفْسِدُ الْاِیْمَانَ كَمَا یُفْسِدُ الصَّبِرُ الْعَسَلَ۔

"اور حضرت بہز بن حکیم اپنے والد سے اور وہ بہزؒ کے دادا (حضرت معاویہ ابن حیدة القشیریؒ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "غصہ ایمان کو خراب کر دیتا ہے جس طرح ایلواء شہد کو خراب کر دیتا ہے۔"

تشریح: "ایمان" سے یا تو کمال ایمان مراد ہے یا نور ایمان! اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ بسا اوقات غصہ کی شدت اصل ایمان کو بھی ختم کر دیتی ہے، نعوذ باللّٰہ من ذٰلك۔

تواضع اختیار کرو

⑯ وَعَنْ عُمَرَ قَالَ وَهُوَ عَلَی الْمِنْبَرِ یَا اَیُّهَا النَّاسُ تَوَاضَعُوْا فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ فَهُوَ فِیْ نَفْسِهٖ صَغِیْرٌ وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ عَظِیْمٌ وَمَنْ تَكَبَّرَ وَضَعَهُ اللّٰهُ فَهُوَ فِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ صَغِیْرٌ وَّفِیْ نَفْسِهٖ كَبِیْرٌ حَتّٰی لَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِمْ مِنْ كَلْبٍ اَوْ خِنْزِیْرٍ۔

"اور حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) انہوں نے منبر پر کھڑے ہو کر (خطبہ دیتے ہوئے فرمایا لوگو! تواضع اور فروتنی اختیار کرو کیونکہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جو شخص اللہ تعالیٰ (کی رضا مندی و خوشنودی حاصل کرنے) کے لئے لوگوں کے ساتھ تواضع اور فروتنی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے مرتبہ کو بلند کر دیتا ہے، چنانچہ وہ اپنی نظر میں تو حقیر ہوتا ہے (کیونکہ وہ اپنے نفس کو ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے) لیکن لوگوں کی نظر میں بلند مرتبہ ہوتا ہے (کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کی تواضع و فروتنی کے سبب اس کو لوگوں کی نظر میں بلند مرتبہ کر دیتا ہے) اور جو شخص لوگوں کے ساتھ تکبر و غرور کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے مرتبہ کو گرا دیتا ہے چنانچہ وہ لوگوں کی نظر میں تو حقیر ہوتا ہے، لیکن اپنی نظر میں خود کو بلند مرتبہ سمجھتا ہے یہاں تک کہ وہ لوگوں کے نزدیک کتے یا سور سے بھی بدتر ہو جاتا

ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ متکبر و مغرور شخص اگرچہ خود کو بڑا اور عزت دار سمجھتا ہے اور دوسروں کو بھی اپنی مصنوعی بڑائی اور عزت دکھاتا ہے لیکن وہ خدا کے نزدیک بھی ذلیل و حقیر ہوتا ہے اور لوگوں کی نظروں میں بھی نہایت کمتر و بے وقعت رہتا ہے، اس کے برخلاف جو شخص تواضع و فروتنی اختیار کرتا ہے وہ اگرچہ اپنی نظر میں خود کو حقیر سمجھتا ہے اور لوگوں کے سامنے بھی اپنے آپ کو کمتر و بے وقعت ظاہر کرتا ہے مگر خدا کے نزدیک اس کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے اور لوگوں کی نظروں میں بھی اس کی بڑی عزت و وقعت ہوتی ہے۔

انتقام لینے پر قادر ہونے کے باوجود عفو و درگزر کرنے کی فضیلت

⑰ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مُوْسَى بْنُ عِمْرَانَ عَلَیْهِ السَّلَامُ یَارَبِّ مَنْ اَعَزُّ عِبَادِكَ عِنْدَكَ قَالَ مَنْ اِذَا قَدَرَ غَفَرَ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "حضرت موسیٰ ابن عمران علیہ السلام نے عرض کیا، میرے پروردگار! تیرے بندوں میں سے کون بندہ تیرے نزدیک زیادہ عزیز ہے؟ پروردگار نے فرمایا۔ "وہ بندہ جو قادر ہونے کے باوجود عفو و درگزر کرے۔"

تشریح: یعنی اگر اس پر کسی شخص نے کوئی ظلم کیا اور اس کو رنج و تکلیف میں مبتلا کیا تو وہ اس سے انتقام لینے کی طاقت و قدرت رکھنے کے باوجود اس کو معاف کر دے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طبیعت پر چونکہ جلالی کیفیت غالب تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس جواب کے ذریعہ گویا ان کو تلقین کی کہ وہ عفو و درگزر کا رویہ اختیار کیا کریں۔

جامع صغیر کی ایک روایت میں منقول ہے کہ جو شخص انتقام لینے کی طاقت و قدرت کے باوجود عفو و درگزر کرے تو اللہ تعالیٰ یوم عسرت یعنی قیامت کے دن اس کے ساتھ عفو و درگزر فرمائے گا۔

غصہ کو ضبط کرنے کا اجر

⑱ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ خَزَنَ لِسَانَهٗ سَتَرَ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ وَمَنْ كَفَّ غَضَبَهٗ كَفَّ اللّٰهُ عَنْهُ عَذَابَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَمَنِ اعْتَذَرَ اِلَى اللّٰهِ قَبِلَ اللّٰهُ عُذْرَهٗ۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص اپنی زبان کو بلند رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کو ڈھانک لیتا ہے (یعنی جو شخص لوگوں کے ان عیوب اور برائیوں کو چھپانے اور بیان کرنے سے باز رہتا ہے جو اس کے علم میں ہوتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کے عیوب و معاصی کو لوگوں کی نگاہوں سے یا اعمال لکھنے والے فرشتوں سے اور یا دونوں سے چھپاتا ہے) جو شخص اپنے غصہ کو ضبط کرتا ہے (اور انتقام لینے سے باز رہتا ہے) تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن اپنے عذاب سے بچائے گا، اور جو شخص (اپنے گناہ و تقصیر پر نادم ہو کر) اللہ تعالیٰ سے عفو خواہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی عفو خواہی کو قبول کرتا ہے۔"

وہ تین چیزیں جو نجات کا ذریعہ ہیں اور وہ تین چیزیں جو اخروی ہلاکت کا باعث ہیں

⑲ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلٰثٌ مُنْجِیَاتٌ وَّثَلٰثٌ مُهْلِكَاتٌ فَاَمَّا الْمُنْجِیَاتُ فَتَقْوَى اللّٰهِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَةِ وَالْقَوْلُ بِالْحَقِّ فِی الرِّضٰى وَالسَّخَطِ وَالْقَصْدُ فِی الْغِنَا وَالْفَقْرِ وَاَمَّا الْمُهْلِكَاتُ فَهَوًى مُتَّبَعٌ وَّشُحٌّ مُّطَاعٌ وَاِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ وَهِیَ اَشَدُّهُنَّ۔ رَوَى الْبَیْهَقِیُّ الْاَحَادِیْثَ الْخَمْسَةَ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "تین چیزیں نجات دینے والی ہیں اور تین چیزیں آخرت میں ہلاک

کرنے والی ہیں! جو چیزیں نجات دینے والی ہیں ان میں سے ایک تو ظاہر میں خدا سے ڈرنا ہے (یعنی جلوت وخلوت ہر حالت میں اور ہر حرکت وعمل کے وقت خدا کا خوف غالب ہو یا یہ کہ بندہ کا ظاہر بھی خوف خدا کے احساس کا مظہر ہو اور اس کا باطن بھی خوف خدا سے معمور ہو) دوسری چیز خوشی وناخوشی (ہر حالت) میں حق بات کہنا ہے، تیسری چیز دولت مندی وفقیری دونوں حالتوں کے درمیان میانہ روی اختیار کرنا ہے۔ اور جو تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں ان میں سے ایک تو خواہش نفس ہے جس کی پیروی کی جائے، دوسری چیز حرص وبخل ہے انسان جس کا غلام بن جائے، اور تیسری چیز مرد کا اپنے نفس پر گھمنڈ کرنا ہے (یعنی کسی شخص کا اپنے آپ کو نیک اور اچھا سمجھنا اور اپنے اوصاف کا خود مداح ہونا کہ جس سے کبر پیدا ہوتا ہے اور کبر سے غرور تکبر وجود میں آتا ہے، اور یہ تیسری چیز ان سب میں بدترین خصلت ہے۔" مذکورہ بالا پانچوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: خوشی وناخوشی میں حق بات کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت بیانی اور حق گوئی کو اپنی کسی مصلحت کسی مفاد اور اپنے کسی جذبۂ خوشی وناخوشی کا پابند نہیں بنانا چاہئے بلکہ اگر کسی سے راضی وخوش ہے تو اس کے سامنے بھی وہی بات کہے جو حق ہے اور اگر اس سے ناراض وناخوش ہو تو اس صورت میں بھی حق بات ہی کہے مثلاً اگر خود کو کسی ایسے شخص سے کوئی نفع وفائدہ پہنچتا ہے، دوسروں کے ساتھ جس کا ظلم اور جس کا فسق ظاہر وثابت ہو تو اس کی ناحق تعریف وستائش اور خلاف واقعہ بات محض اس لئے بیان نہ کرے کہ ذاتی فائدہ حاصل ہونے کی وجہ سے اس سے خوش ہے، اسی طرح اگر کسی صالح وبزرگ شخصیت سے کسی معاملہ میں کوئی اختلاف اور ناراضگی کی صورت پیدا ہوجائے تو محض اپنی ذاتی ناراضگی کی وجہ سے اس کی برائی اور مذمت نہ کرے، حاصل یہ کہ خواہ کسی سے خوش ہو یا ناراض، دونوں صورتوں میں راہ استقامت پر گامزن رہے اور حق گوئی کے فریضہ کو کسی بھی حالت میں پس پشت نہ ڈالے۔

میانہ روی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خرچ واخراجات میں نہ تو اس قدر وسعت وفراخ دستی کا طور اپنائے کہ اس پر اسراف کا اطلاق ہونے لگے اور نہ اس قدر تنگی وسختی اختیار کرے کہ فقر وافلاس ظاہر ہونے لگے یا یہ مراد ہے کہ فقر وغنا کے درمیان اعتدال قائم کرے اور درمیانی راستہ کو اختیار کرے جیسا کہ علماء نے کہا ہے کہ حصول معاش کی جدوجہد میں اس حد پر اکتفا کرنا کہ جس سے ضروریات زندگی کی تکمیل اور بقاء حیات کا سامان فراہم ہوجاتا ہو غنا اور فقر دونوں سے افضل ہے۔

"خواہش نفس کہ جس کی پیروی کی جائے" کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس طرح کا تابع کر دینا کہ اس کی ہر خواہش پوری کرنے لگے، وہ جو کچھ کہے اور جس طرف لے جائے ادھر چل پڑے ایک ایسی خصلت ہے جو ہلاکت وتباہی میں ڈال دیتی ہے، اس کے برخلاف ایمان کا کامل ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ اپنے نفس کو فرمان حق اور شریعت مصطفوی ﷺ کا تابع بنا دیا جائے۔

بخل وحرص کا غلام بن جانے کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بخل وحرص انسان کی طبیعت میں داخل ہے اور اس وجہ سے یہ ممکن نہیں ہے کہ انسان بخل وحرص کے مادہ سے بالکل خالی ہو، لیکن اپنے آپ کو بخل وحرص کا اس طرح غلام بنا دیا کہ کسی بھی صورت میں ان چیزوں سے خود کو محفوظ رکھنا ممکن نہ ہو ایک ایسی خصلت ہے جو انسان کو اخروی تباہی وہلاکت میں ڈال دیتی ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ ہلاکت میں ڈالنے والی جن تین چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں از روئے گناہ اور نقصان سب سے بدتر خصلت عجب یعنی خود بینی وخود ستائی ہے جس کی وجہ سے انسان تکبر وغرور میں مبتلا ہوجاتا ہے کیونکہ خواہش نفس کی اتباع اور بخل وحرص کی غلامی) یہ دونوں برائیاں اس طرح کی ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں گرفتار ہو تو ان کے پھندے سے اپنے آپ کو نکال لینا اور توبہ وانابت کی راہ اختیار کر لینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا مگر خود بینی وخود ستائی ایک ایسا مرض ہے جو اگر لاحق ہوجاتا ہے تو کم ہی پیچھا چھوڑتا ہے اور انسان کو کبر ونحوست میں اس طرح مبتلا کر دیتا ہے کہ وہ اپنے کسی برے فعل کی اچھائی وبرائی کے احساس تک سے خالی ہوجاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کسی برے فعل پر نادم نہیں ہوتا اور توبہ وانابت کی راہ اس سے دور ہوتی چلی جاتی ہے، جیسا کہ بدعتی، بدعت کے پھندے میں اس طرح پھنس جاتا ہے کہ اس سے نکلنا آسان نہیں ہوتا چنانچہ بدعتی سے کم ہی توبہ کی توفیق ہوتی ہے۔

بَابُ الظُّلْمِ
ظلم کا بیان

"ظُلْم" کے لغوی معنی ہیں "کسی چیز کو بے موقع اور بے محل رکھنا" یعنی جس چیز کی جو جگہ اور جو محل ہو اس کو وہاں کی بجائے دوسری جگہ اور دوسرے محل میں رکھنا! اور یہ مفہوم ہر اس چیز کو شامل ہے جو اپنی حد سے تجاوز کر جائے اور اس کو جس طرح واقع ہونا چاہئے اس کے بجائے زیادتی یا نقصان کے ساتھ بے جا اور بے وقت واقع ہو چنانچہ جس چیز کو عام اصطلاح میں جور و تعدی یا زور، زبردستی اور ستم کرنا کہتے ہیں اس کے بھی یہ معنی ہیں اور شریعت میں بھی ظلم وغیرہ کے یہ معنی مراد لئے جاتے ہیں، البتہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ موقع و محل سے شرعی موقع و محل مراد لیا جائے یعنی شرعی طور پر ظلم وغیرہ کا اطلاق اس چیز پر ہوگا جو اپنے شرعی محل سے بلاوجہ شرعی تجاوز کر جائے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

ظالم قیامت کے دن اندھیروں میں بھٹکتا پھرے گا۔

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ظلم کرنا قیامت کے دن تاریکیوں کا باعث ہوگا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ظالم کو قیامت کے دن میدان حشر میں تاریکیاں اس طرح گھیرے ہوئے ہوں گی کہ وہ اس نور سے محروم رہے گا جو مؤمن کو نصیب ہوگا اور جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یوں فرمایا يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (یعنی قیامت کے دن مؤمنین کا نور ان کے آگے آگے اور دائیں طرف دوڑتا ہوگا (جس کی روشنی میں وہ اپنی منزل پائیں گے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ظُلُمَاتٌ (تاریکیوں) سے آخرت کے وہ شدائد (تکالیف و مشکلات) اور عذاب مراد ہیں جن سے قیامت کے دن واسطہ پڑے گا اور جن میں اہل دوزخ مبتلا ہوں گے) چنانچہ قرآن کریم میں بھی بعض جگہ "ظلمات" کے معنی شدائد مراد لئے گئے ہیں جیسا کہ ایک آیت میں فرمایا گیا ہے قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (کہہ دیجئے کہ تمہیں جنگل اور دریا کی تکلیف و مشکلات سے کون نجات دیتا ہے۔

ظالم کی رسی دراز ہوتی ہے

(۲) وَعَنْ اَبِيْ مُوْسٰى قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَيُمْلِيْ الظَّالِمَ حَتّٰى اِذَا اَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْهُ ثُمَّ قَرَأَ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَا اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ الْاٰيَةَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابو موسیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بلاشبہ اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے (یعنی دنیا میں اس کی عمر دراز کرتا ہے تاکہ وہ اپنے ظلم کا پیمانہ لبریز کرے اور آخرت میں سخت عذاب میں گرفتار ہو) یہاں تک کہ جب اس کو پکڑے گا تو چھوڑے گا نہیں (اور وہ ظالم اس کے عذاب سے بچ کر نکل نہیں پائے گا) اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے (دلیل کے طور پر) یہ آیت پڑھی وَكَذٰلِكَ[1] اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ الاية (اور آیت کے آخری الفاظ یہ ہیں اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

---

[1] وکذلک تا الیمٌ شدیدٌ کا ترجمہ یہ ہے "اور تمہارا پروردگار جب ظالم بستی والوں کو پکڑتا ہے تو اس کی پکڑ اسی طرح کی ہوتی ہے بے شک اس کی پکڑ دکھ دینے والی اور سخت ہے۔"

تشریح: اس حدیث میں گویا مظلوم لوگوں کو تسلی دی گئی ہے کہ وہ اپنے اوپر کیے جانے والے ظلم وستم پر صبرواستقامت اختیار کریں اور اس دن کا انتظار کریں جب قانون قدرت کے مضبوط ہاتھ ظالم کی گردن پر ہوں گے اور اس کو اپنے ظلم کی سخت سزا بھگتنی پڑے گی، نیز اس ارشاد گرامی میں ظالموں کے لئے سخت وعید وتنبیہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے اس مہلت پر مغرور نہ ہو جائیں بلکہ یقین کہ آخر الامران کو خدا کے سخت مواخدہ سے دوچار ہونا ہے اور اپنے ظلم کی سزا یقیناً بھگتنی ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ الآية (یعنی اور تم اللہ تعالیٰ کو اس چیز سے غافل مت سمجھو جس کو ظالم اختیار کرتے ہیں۔

قوم ثمود کے علاقہ سے گزرتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی صحابہ کو تلقین

(۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا مَرَّ بِالْحِجْرِ قَالَ لَا تَدْخُلُوْا مَسَاكِنَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنُوْا بَاكِیْنَ اَنْ یُّصِیْبَكُمْ مَّآ اَصَابَهُمْ ثُمَّ قَنَّعَ رَاْسَهٗ وَاَسْرَعَ السَّیْرَ حَتّٰی اجْتَازَ الْوَادِیَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ جب مقام حجر سے گزرے تو (صحابہؓ سے) فرمایا کہ "تم ان لوگوں کے مکانات (کے کھنڈرات) میں نہ گھسنا جنہوں نے (کفر اختیار کر کے اور اپنی طرف بھیجے گئے اللہ کے پیغمبر علیہم السلام کو جھٹلا کر) خود اپنے آپ پر ظلم کیا ہے الا یہ کہ تم رونے والے ہو (یعنی اگر تم ان کھنڈرات کی صورت میں اس بدنصیب قوم کا المناک انجام دیکھ کر اور ان لوگوں کے سیاہ کارناموں کو یاد کر کے عبرت حاصل کرنا چاہو تو اس جگہ کو دیکھ سکتے ہو نیز تم اس جگہ سے غفلت ولاپرواہی کے ساتھ نہ گزرو) کہ مبادا تم پر بھی وہی مصیبت نازل ہو جائے جو ان پر نازل ہوئی تھی (کیونکہ ایسی جگہوں سے غفلت وبے پروائی کے ساتھ گزرنا اور عبرت نہ پکڑنا قساوت قلبی اور خوف خدا کے فقدان کی علامت ہے اور یہ چیز عذاب الٰہی کے ساتھ گزرنا اور عبرت نہ پکڑنا قساوت قلبی اور خوف خدا کے فقدان کی علامت ہے اور یہ چیز عذاب الٰہی کے نازل ہونے کا باعث بن سکتی ہے، یا یہ مراد ہے کہ تم یہاں خدا کا خوف کھاؤ اور عبرت پکڑو کہ مبادا تم سے بھی وہی اعمال صادر ہونے لگیں جو اس قوم کے لوگوں کا شیوہ تھے اور پھر تمہیں بھی سزا بھگتنی پڑے) اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے چادر سے اپنا سر ڈھانک لیا اور تیز تیز چل کر اس علاقہ سے گزر گئے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: حجر اس جگہ کا نام ہے جو مشہور پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ثمود کا مسکن تھی! اجاز کے شمالی علاقہ میں، جس کا نام مدین ہے) ایک تاریخی وادی ہے جس کا نام وادی القری ہے) اسی وادی میں تبوک سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر یہ جگہ واقع ہے) یہاں قوم ثمود کی بستیاں تھیں، اس قوم نے جب طغیانی وسرکشی میں حد سے تجاوز کیا اور اپنے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کے بنائے ہوئے راستہ پر چلنے کے بجائے ان کو جھٹلایا، ان کو سخت تکلیفیں پہنچائیں اور اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تو اس قوم پر عذاب الٰہی نازل ہوا، اور ان کی ساری بستیاں تباہ کر دی گئیں، ان بستیوں کے آثار وکھنڈرات اب بھی موجود ہیں اور زبان حال سے عبرت پذیر لوگوں کو قوموں کے عروج وزوال کی داستان سناتے ہیں! جب آنحضرت ﷺ غزوہ کے لئے تبوک جا رہے تھے یا غزوہ سے فارغ ہو کر وہاں سے واپس تشریف لا رہے تھے تو راستہ میں آپ ﷺ کا گزر اسی علاقہ سے ہوا، چنانچہ اس حدیث کا تعلق اسی وقت سے ہے۔

آنحضرت ﷺ کا اپنے سر پر چادر ڈال کر اس جگہ سے جلدی گزرنا جیسا کہ کسی جگہ سے کوئی خوفزدہ شخص جلد سے جلد گزر جاتا ہے، اس وجہ سے تھا تا کہ آپ کی نظر مبارک اس تباہ شدہ قوم کے مکانات کھنڈرات پر نہ پڑے۔ اور حقیقت میں آپ کا یہ عمل مسلمانوں کی تعلیم کے واسطے تھا تا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی پیروی کریں، چنانچہ آپ نے پہلے تو قول کے ذریعہ لوگوں کو اس امر کی طرف متوجہ کیا اور پھر ازراہ تاکید اپنے فعل کے ذریعہ بھی توجہ دلائی! یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ کا وہاں سے اس طرح گزرنا اس بناء پر تھا کہ خود آپ پر خوف خدا کا نہایت غلبہ رہتا تھا اور عذاب الٰہی کے آثار آپ ﷺ کو سب سے زیادہ لرزاں کر دیا کرتے تھے جیسا کہ ایک ارشاد میں فرمایا اَنَا اَعْلَمُكُمْ بِاللّٰهِ وَاَخْشَاكُمْ (میں تم سب سے زیادہ خدا کا علم رکھتا ہوں اور سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں۔

ایک روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس جگہ صحابہؓ کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ وہ اس جگہ نہ تو کچھ کھائیں اور نہ وہاں کا پانی پئیں۔

بہر حال حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ خدا کے سرکش بندوں اور ظالموں کے مکانات اور ان کی جگہوں میں نہ تو رہائش اختیار کی جائے اور نہ ان کے علاقوں کو اپنا وطن بنایا جائے۔

قیامت کے دن مظلوم کو ظلم سے کس طرح بدلہ ملے گا

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَتْ لَهٗ مَظْلِمَةٌ لِاَخِيْهِ مِنْ عِرْضِهٖ اَوْشَیْءٌ فَلْيَتَحَلَّلْهُ مِنْهُ الْيَوْمَ قَبْلَ اَنْ لَّا يَكُوْنَ دِيْنَارٌ وَّلَا دِرْهَمٌ اِنْ كَانَ لَهٗ عَمَلٌ صَالِحٌ اُخِذَ مِنْهُ بِقَدْرِ مَظْلِمَتِهٖ وَاِنْ لَّمْ تَكُنْ لَّهٗ حَسَنَاتٌ اُخِذَ مِنْ سَيِّئَاتِ صَاحِبِهٖ فَحُمِلَ عَلَيْهِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کا کوئی حق رکھتا ہو، اور وہ حق خواہ (غیبت وبرائی کرنے اور روحانی وجسمانی ایذارسانی وغیرہ کی صورت میں) آبروریزی کا ہو یا کسی اور چیز سے متعلق ہو (جیسے کوئی مالی مطالبہ یا ناحق خون وغیرہ) تو اس کو چاہئے کہ وہ اس حق کو آج ہی کے دن (یعنی اسی دنیا میں) معاف کرالے اس سے پہلے کہ وہ دن آئے یعنی قیامت کا دن کہ جس میں) وہ نہ تو درہم رکھتا ہو گا نہ دینار (کہ جو اس حق کے بدلہ کے طور پر دے سکے) اگر (اس نے اپنے حق کو معاف کر دیا تو بہتر ہے ورنہ پھر) ظالم کے اعمال نامہ میں جو کچھ نیکیاں ہوں گی تو ان میں سے اس کے ظلم کے برابر یا واجب حق کے بقدر نیکیاں لے لی جائیں گی (اور مظلوم یا حق دار کو دیدی جائیں گی) اور اگر وہ کچھ بھی نیکیاں نہیں رکھتا ہو گا تو اس صورت میں اس مظلوم یا حق دار کے گناہوں میں سے (اس کے حق کے بقدر) گناہ لے کر ظالم پر لاد دیئے جائیں گے" (بخاریؒ)

تشریح: آخرت میں ظالم سے اس کے ظلم کا بدلہ اس طرح لیا جائے گا کہ اگر اس کے اعمال نامہ میں کچھ نیکیاں ہوں گی تو وہ مظلوم کو دیدی جائیں گی اور اگر وہ اپنے اعمال نامہ میں نیکیاں نہیں رکھتا ہو گا تو اس صورت میں مظلوم کے وہ گناہ جو اس نے دنیا میں کیے ہونگے اس ظالم پر لاد دیئے جائیں گے چنانچہ وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگتے ہی گا مزید برآں مظلوم کے گناہوں کے عذاب میں بھی مبتلا ہو گا اور مظلوم کو اس عذاب سے نجات دے دی جائے گی جس کا وہ ان گناہوں کی وجہ سے مستوجب ہوتا۔

حدیث کے یہ الفاظ کہ "وہ نہ درہم رکھتا ہو گا نہ دینار" اس طرف اشارہ کرتے ہیں جس شخص نے کسی پر کوئی ظلم وزیادتی حق تلفی کی ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ ہر حالت میں مظلوم یا حق دار سے اس ظلم یا حق کو ضرور معاف کرالے خواہ اس معافی کے عوض روپیہ پیسہ خرچ کرنا پڑے اور اس دنیا ہی میں معافی تلافی کا ہو جانا اس سے کہیں زیادہ بہتر اور آسان ہے کہ عدم معافی کی صورت میں اس کی نیکیاں لے لی یا اپنے گناہوں کا بوجھ اس پر ڈال دے۔

"اس کے ظلم یا واجب حق کے بقدر" کے بارے میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے ان نیکیوں اور گناہوں کی مقدار کا تعین علم الٰہی کے سپرد ہے، یعنی وہی بہتر جانتا ہے کہ ان نیکیوں اور گناہوں کا لینا دینا کس طرح اور کس اعتبار سے ہو گا) تاہم ابن ملکؒ نے لکھا ہے کہ جن نیکیوں اور برائیوں کا لینا دینا ہو گا، ہو سکتا ہے کہ وہ اس موقع پر نفس اعمال ہوں گے جن کو جواہر کی مانند مجسم کر کے پیش کیا جائے گا) اور یہ احتمال بھی ہے کہ ایک دوسرے کو وہ نعمتیں یا عذاب ملیں جو ان نیکیوں یا برائیوں کی جزا وسزا کے طور پر حق تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں۔

حقیقی مفلس کون ہے

⑤ وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَاالْمُفْلِسُ قَالُوا الْمُفْلِسُ فِيْنَا مَنْ لَّا دِرْهَمَ لَهٗ وَلَا مَتَاعَ

فَقَالَ اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ اُمَّتِیْ مَنْ یَّاْتِیْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ بِصَلٰوةٍ وَّ صِیَامٍ وَّ زَکٰوةٍ قَدْ شَتَمَ هٰذَا وَقَذَفَ هٰذَا وَاَکَلَ مَالَ هٰذَا وَسَفَكَ دَمَ هٰذَا وَضَرَبَ هٰذَا فَیُعْطٰی هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ وَهٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ فَاِنْ فَنِیَتْ حَسَنَاتُهٗ قَبْلَ اَنْ یُّقْضٰی مَا عَلَیْهِ اُخِذَ مِنْ خَطَایَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَیْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِی النَّارِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے (صحابہؓ سے) فرمایا۔ "تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ بعض صحابہؓ نے جواب دیا کہ ہم میں مفلس وہ شخص ہے جس کے پاس نہ تو درہم و دینار (روپیہ پیسہ) ہو، اور نہ سامان واسباب (یعنی انہوں نے اپنے جواب میں مفلس اس شخص کو بتایا جو مال وزر اور روپیہ و پیسہ سے تہی دست ہو جیسا کہ عام طور پر دنیا والے سمجھتے ہیں صحابہؓ کا ذہن اس طرف نہیں گیا کہ حضور ﷺ کی مراد دنیاوی طور پر مفلس شخص کے بارے میں پوچھا نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ کے سوال کا تعلق اس شخص سے ہے جو آخرت کے اعتبار سے مفلس ہو) چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "میری اُمت مرحومہ میں مفلس شخص درحقیقت وہ ہے جو قیامت کے دن میدان حشر میں (دنیا سے) نماز، روزہ اور زکوٰۃ (اور دوسری مقبول عبادتیں لے کر آئے گا، مگر حال یہ ہوگا کہ اس نے کسی کو گالی دی تھی، کسی پر تہمت لگائی تھی کسی کو (ناحق) مارا پیٹا تھا (غرض کہ اس نے جہاں تمام مالی وبدنی عبادتیں کی تھیں وہیں ان برائیوں کا مرتکب بھی ہوا تھا چنانچہ اس کی نیکیوں میں سے (پہلے) کسی ایک مظلوم وصاحب حق کو (اس کے حق کے بقدر) نیکیاں دی جائیں گی (اس طرح اس نے دنیا میں جس کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کیا ہوگا اور جس جس کو ناحق ستایا ہوگا ان سب کو الگ الگ اپنے حق کے بقدر اس کی نیکیوں میں سے دیا جائے گا) یہاں تک کہ اگر اس کے ان گناہوں کا فیصلہ ہونے سے پہلے اس کی تمام نیکیاں ختم ہو جائیں گی (یعنی اگر اس کی تمام نیکیاں ان سب حق والوں کو دے دینے کے بعد بھی حقوق العباد کو تلف کرنے کی سزا پوری نہیں ہوگی) تو اس حقداروں اور مظلوموں کے گناہ (جو انہوں نے دنیا میں کیے ہوں گے) ان سے لے کر اس شخص پر ڈال دیے جائیں گے اور پھر اس کو دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ بندوں کے حقوق کی پامالی کرنے والے کو آخرت میں نہ تو معافی ملے گی اور نہ اس کے حق میں شفاعت کام آئے گی، ہاں اگر اللہ تعالیٰ کسی کے لئے چاہے گا تو وہ مدعی (صاحب حق) کو اس کے مطالبہ کے مطابق اپنی نعمتیں عطا فرما کر راضی کر دیگا۔ نوویؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ عام طور پر لوگ مفلس اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس مال ودولت اور روپیہ پیسہ نہیں ہوتا یا بہت کم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں مفلس وہی شخص ہے جس کے بارے میں ذکر کیا گیا، چنانچہ دنیاوی مال ودولت سے تہی دست شخص کو حقیقی مفلس نہیں کہا جا سکتا کیونکہ مال ودولت اور روپیہ پیسہ کا افلاس عارضی ہوتا ہے جو موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے بلکہ بسا اوقات زندگی ہی میں وہ افلاس، مال ودولت کی فراوانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف حدیث میں جس افلاس کا ذکر کیا گیا ہے اس کا تعلق ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی سے ہے اور اس افلاس میں مبتلا ہونے والا شخص پوری طرح ہلاک ہوگا۔

آخرت میں ہر حق تلفی کا بدلہ لیا جائے گا

(۶) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَتُؤَدُّنَّ الْحُقُوْقَ اِلٰی اَهْلِهَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ حَتّٰی یُقَادَ لِلشَّاةِ الْجَلْحَاءِ مِنَ الشَّاةِ الْقَرْنَاءِ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَذُكِرَ حَدِیْثُ جَابِرٍ اِتَّقُوا الظُّلْمَ فِیْ بَابِ الْاِنْفَاقِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن حق داروں کو ان کے حقوق ادا کیے جائیں گے، یہاں تک کہ بے سینگ بکری کا قصاص (بدلہ) سینگ دار بکری سے لیا جائے گا (مسلمؒ) اور حضرت جابرؓ کی روایت اتقو الظلم باب الانفاق میں ذکر کی جا چکی ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اس دن (میدان حشر میں) اللہ تعالیٰ کا عدل وانصاف اس حد تک کارفرما ہوگا کہ آدمیوں کے حقوق کا بدلہ تو لیا ہی جائے گا لیکن حیوانات کہ جن کو انسان کی طرح مکلف قرار نہیں دیا گیا ہے ان سے بھی حق تلفی کا بدلہ لیا جائے گا۔ بعض علماء نے لکھا ہے

کہ یہ قصاص یعنی بدلہ (جس کا ذکر مذکورہ بالا حدیث میں ہے) اس طرح کا قصاص نہیں ہے جو مکلّف سے لیا جاتا ہے بلکہ اس سے مقابلہ کا قصاص مراد ہے لیکن ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ اس کو مقابلہ کا قصاص قرار دینا محل نظر ہے اور یہ کوئی صحیح بات نہیں ہے اس صورت میں کہا جائے گا کہ اس قصاص سے بھی وہی قصاص مراد ہے، جو مکلف سے لیا جاتا ہے مگر اس پر یہ اشکال واقع ہوگا کہ حیوان مکلف نہیں ہوتا لہٰذا اس سے قصاص کس طرح لیا جائے گا؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اول تو اللہ تعالیٰ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ہے اس اعتبار سے وہ اپنی مرضی کا مالک اور اپنے ہر فعل پر قادر و مختار ہے لہٰذا وَلَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ یعنی وہ جو کچھ کرے گا اور جس طرح کرے گا اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا دوسرے یہ کہ یہاں بکری سے قصاص لئے جانے کا ذکر در حقیقت بندوں کو اس امر سے آگاہ کرنے کے لئے ہے کہ کسی کا کوئی حق ضائع نہیں ہوگا بلکہ جو بھی شخص جس شخص کا حق مارے گا اور اس کے ساتھ ظلم کرے گا اس سے اس حق تلفی اور ظلم کا بدلہ حق دار اور مظلوم کو ضرور دلایا جائے گا۔ یہ دوسری تاویل زیادہ اچھی اور زیادہ قابل فہم ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

برائی کا بدلہ برائی نہیں ہے

(۷) عَنْ حُذَیْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَكُوْنُوْا اِمَّعَةً تَقُوْلُوْنَ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَحْسَنَّا وَاِنْ ظَلَمُوْا ظَلَمْنَا وَلٰكِنْ وَطِّنُوْا اَنْفُسَكُمْ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَنْ تُحْسِنُوْا وَاِنْ اَسَآءُوْا فَلَا تَظْلِمُوْا۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "تم امعہ نہ ہو یعنی یہ نہ کہو کہ اگر لوگ ہمارے ساتھ ظلم کریں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ ظلم کریں گے بلکہ تم اپنے آپ کو اس امر پر قائم رکھو کہ اگر لوگ بھلائی کریں تو تم بھی بھلائی کرو، اور اگر لوگ برائی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا"

تشریح: اِمَّعَةٌ اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی کوئی رائے اور عقل نہ رکھتا ہو اور بے سمجھے بوجھے دوسروں کی رائے اور دوسروں کے کہنے پر چلتا ہو۔ یہاں حدیث میں اس لفظ سے وہ شخص مراد ہے جو یہ کہے کہ لوگ جیسا سلوک میرے ساتھ کریں گے ویسا ہی سلوک میں بھی ان کے ساتھ کروں گا، اگر وہ میرے ساتھ بھلائی کریں گے تو میں بھی ان کے ساتھ بھلائی کروں گا اور اگر وہ میرے ساتھ برائی کریں گے تو میں بھی ان کے ساتھ برائی کروں گا، چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم ایسے آدمی مت بنو، کیونکہ یہ دین و دانش کے خلاف بات ہے بھلائی کا بدلہ بھلائی تو ہے ہی لیکن برائی کا بدلہ بھی بھلائی ہی کو قرار دو! جو شخص تمہارے ساتھ برائی کرے تم اس کے ساتھ بھلائی کر کے گویا اس کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو کیونکہ انتقاماً بھی ظلم اور برائی کی راہ کو ترک کرنا احسان ہے! لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ "اگر لوگ برائی کریں تو تم ان کے ساتھ ظلم نہ کرو" سے یہ مراد ہو کہ اگر کوئی شخص تمہارے ساتھ برائی کرے تو تم اس کے مقابلہ میں حد سے تجاوز نہ کرو بلکہ اعتدال کی حد میں رہتے ہوئے اس سے بدلہ لو، جیسا کہ مشروع ہے! یا برائی کرنے والوں سے بدلہ لینے ہی پر اپنے آپ کو پابند نہ بناؤ بلکہ ان کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ بھی کرو! اور یا برائی کا بدلہ بھلائی کو قرار دے کہ برائی کرنے والے کے ساتھ احسان کرو۔ واضح رہے کہ ان تینوں صورتوں میں سے پہلی صورت وہ ہے جس کو عام مسلمانوں کے مطابق قرار دیا جا سکتا ہے دوسری صورت کا تعلق ان مسلمانوں سے ہے جن کا شمار خواص میں ہوتا ہے اور تیسری صورت جو سب سے اعلیٰ درجہ ہے، ان مسلمانوں سے متعلق ہے جن کو اخص الخواص کہا جاتا ہے۔

حضرت شیخ علی متقیؒ نے ایک رسالہ میں بڑی عارفانہ بات کہی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ دنیا اور آخرت کی محبت کو پہنچانے کا معیار یہ چار چیزیں ہیں:

(۱) جس شخص پر دنیا کی محبت غالب ہوتی ہے وہ لوگوں کو بلا وجہ ایذاء پہنچاتا ہے اور بغیر کسی پیش آمدہ معاملہ کے ان کے ساتھ برائی کرتا ہے۔

② جو شخص دنیا کی محبت میں اس درجہ مبتلا نہیں ہوتا وہ کسی کو ایذاء پہنچانے میں ابتداء نہیں کرتا، البتہ جب کوئی شخص اس کو ایذا پہنچاتا ہے تو وہ حد سے تجاوز کئے بغیر اس کو اسی قدر ایذاء پہنچاتا ہے جس کو شریعت نے بدلہ کے طور پر جائز رکھا ہے۔

③ جس کی آخرت کی محبت قوی ہوتی ہے اور دنیا کی محبت ضعیف تو وہ اس شخص کے ساتھ عفو و درگزر کرتا ہے جو اس پر ظلم کرتا ہے۔

④ جس شخص کی آخرت کی محبت بہت زیادہ قوی ہوتی ہے وہ ظلم کے مقابلہ پر احسان کرتا ہے۔ اور یہ وہ درجہ ہے جو صدیقین اور مقربین کو حاصل ہوتا ہے۔

لوگوں کو راضی وخوش رکھنا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی وخوشنودی حاصل کرو

⑧ وَعَنْ مُعَاوِيَةَ اَنَّهٗ كَتَبَ اِلٰى عَآئِشَةَ اَنِ اكْتُبِيْ اِلَيَّ كِتَابًا تُوْصِيْنِيْ فِيْهِ وَلَا تُكْثِرِيْ فَكَتَبَتْ سَلَامٌ عَلَيْكَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنِ الْتَمَسَ رِضَى اللّٰهِ بِسَخَطِ النَّاسِ كَفَاهُ اللّٰهُ مُؤْنَةَ النَّاسِ وَمَنِ الْتَمَسَ رِضَى النَّاسِ بِسَخَطِ اللّٰهِ وَكَلَهُ اللّٰهُ اِلَى النَّاسِ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت امیر معاویہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ کو لکھا کہ آپ مجھ کو ایک نصیحت نامہ لکھ کر بھیج دیجئے (جس پر میں عمل پیرا ہوسکوں اور آپ کی وہ نصیحت میرے دینی ودنیاوی امور میں میرے لئے فلاح وسعادت کی باعث ہو) اور وہ نصیحت نامہ طویل نہ ہو (بلکہ مختصر اور جامع ہو، چنانچہ حضرت عائشہؓ نے یہ کلمات لکھ کر بھیج دیئے۔ تم پر سلامتی ہو! بعد ازاں میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے کہ جو شخص لوگوں کی خفگی وناراضگی سے بے پرواہ ہو اور لوگوں کی ناراضگی وناخوشی کا سبب بنے تو اللہ تعالیٰ لوگوں کی محبت کی طرف سے اس کے لئے کافی ہوجاتا ہے (یعنی اگر کوئی شخص ایسا کام کرے جو اللہ تعالیٰ کی رضامندی وخوشنودی کا باعث ہو اور لوگوں کی ناراضگی وناخوشی کا سبب بنے تو اللہ تعالیٰ اس کام کی وجہ سے اس سے خوش ہوتا ہے اور آخر الامر مخلوق کو بھی اس سے راضی و خوش کر دیتا ہے اور لوگوں کے شر وفساد سے اس کو محفوظ رکھتا ہے) اور جو شخص لوگوں کی رضامندی وخوشنودی کی مدنظر رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خفگی وناراضگی سے بے پرواہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو لوگوں کے سپرد کر دیتا ہے۔" اور سلامتی ہو تم پر۔ (ترمذی)

تشریح: "اس کو لوگوں کے سپرد کر دیتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی خفگی وناراضگی سے بے پرواہ ہوکر لوگوں ہی کی رضامندی وخوشنودی کو ترجیح دیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی اس سے بے پرواہ ہوجاتا ہے اور اس کے امور کو لوگوں کے سپرد کر دیتا ہے یہی نہیں کہ اس کے ان امور میں اس کی مدد نہیں کرتا اور دوسروں کے شر وفتنہ سے اس کو محفوظ نہیں رکھتا بلکہ لوگوں کو اس پر مسلط کر دیتا ہے۔ جو اس کو ایذاء پہنچاتے ہیں اور اس پر ظلم وستم کرتے ہیں حاصل یہ کہ بندوں کے حق میں اصل چیز رضائے مولیٰ ہے، اگر خدا راضی و خوش ہے تو مخلوق خدا بھی راضی اور مطیع ہوجائے گی اور اگر رضائے مولیٰ پر نظر نہ ہو تو پھر نہ خدا راضی وخوش ہوتا ہے اور نہ مخلوق خدا راضی وخوش ہوتی ہے۔

اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ خط کے شروع میں بھی سلام لکھا جائے اور آخر میں بھی چنانچہ شروع کا سلام تو ملاقات کے سلام کا درجہ رکھتا ہے اور آخر کا سلام رخصت کے سلام کا قائم مقام ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ایک آیت کے لفظ "ظلم" کی تشریح

⑨ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ شَقَّ ذٰلِكَ عَلٰى اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيُّنَا لَمْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ ذَاكَ اِنَّمَا

هُوَا الشِّرْكُ اَلَمْ تَسْمَعُوْا قَوْلَ لُقْمَانَ لِابْنِهٖ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَيْسَ هُوَ كَمَا تَظُنُّوْنَ اِنَّمَا هُوَ كَمَا قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهٖ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ[1] ....الخ نازل ہوئی تو اس سے رسول کریم ﷺ کے صحابہؓ کو بڑا بوجھ محسوس ہوا (کیونکہ انہوں نے یہ گمان کیا کہ "ظلم" سے مراد مطلق گناہ ہیں) چنانچہ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم میں ایسا کون شخص ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم نہیں کیا ہے؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "یہ بات نہیں ہے (یعنی ظلم سے وہ مراد نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو یعنی مطلق گناہ) بلکہ "ظلم" سے "شرک" مراد ہے! کیا تم نے لقمان کی وہ نصیحت نہیں سنی جو انہوں نے اپنے (مؤمن) بیٹے کو کی تھی (اور وہ یہ کہ) اے میرے بیٹے! خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا (یعنی ایمان باللہ اور ان تمام چیزوں میں کہ جن پر ایمان لانا واجب ہے شرک کی آمیزش نہ کرنا) کیونکہ شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (آپ ﷺ نے فرمایا) ظلم سے وہ مراد نہیں ہے جس کا تم نے گمان کیا ہے بلکہ اس سے وہ مراد ہے جو لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جب مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ نے "ظلم" کو "گناہ" پر حمل کیا یعنی وہ سمجھے کہ اس آیت میں جن مؤمنین کو مامون اور ہدایت یافتہ قرار دیا گیا ہے ان سے وہی مؤمنین مراد ہیں جن کے اعمال، گناہ و معصیت کی آمیزش سے بالکل پاک و صاف ہوں، چنانچہ وہ اپنے گمان کے مطابق اس آیت کریمہ کے نزول سے بہت پریشان ہوئے اور حضور سے عرض کیا کہ اس آیت کی روشنی میں تو ہم میں سے شاید ہی کوئی مؤمن ہدایت یافتہ اور مومان قرار پائے کیونکہ ہم میں سے ایسا کون شخص ہے جس سے کبھی معصیت و گناہ صادر نہ ہوا ہو! تب رسول کریم ﷺ نے صحابہؓ کے سامنے واضح فرمایا کہ اس آیت میں "ظلم" سے مراد "گناہ" نہیں ہے جیسا کہ تم نے گمان کیا ہے بلکہ "شرک" مراد ہے۔

اگر اس موقع پر یہ اشکال واقع ہو کہ ایمان کے ساتھ شرک کا مخلوط ہونا کیونکر ممکن ہے کیونکہ ایمان شرک کی ضد ہے، البتہ ایمان کے ساتھ گناہ کا مخلوط ہونا سمجھ میں آنے والی بات ہے اور اسی وجہ سے صحابہؓ کا ذہن اس طرف گیا تھا کہ "ظلم" سے مراد گناہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ ایمان کے ساتھ شرک کا مخلوط ہونا واقع کے اعتبار سے صحیح ہے، اس کی مثال مشرکین مکہ تھے، جو اگرچہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی بت پرستی بھی کرتے۔ واضح رہے کہ "شرک" کی دو قسمیں ہیں ایک تو شرک فی الربوبیۃ یعنی عبادت و تعظیم، میں اور کو بھی خدا اقرار دینا، اس قسم کے مشرک دنیا میں کم ہیں، دوسرے شرک فی الالوھیۃ یعنی عبادت و تعظیم، اور اللہ کی صفات خاص جیسے خالقیت، رزاقیت اور حاجت براری وغیرہ میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرنا، اس قسم کے مشرک دنیا میں بہت سے نام کے مسلمان بھی اس شرک میں گرفتار ہیں)! چنانچہ حدیث میں جس شرک کو ظلم کا محمول قرار دیا گیا ہے اس سے وہ شرک مراد ہے جس کا تعلق دوسری قسم سے ہو! اس بات کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِکُوْنَ (اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں اور شرک بھی کرتے جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایمان کے ساتھ ظلم یعنی شرک کو ملانے سے یہ مراد ہو کہ زبان سے تو ایمان کا اقرار کیا جائے اور دل میں شرک کا اندھیرا ہو جیسے منافقین کا حال ہوتا ہے کہ وہ ظاہر ایمان کے ساتھ باطنی شرک کو مخلوط رکھتے ہیں بایں طور کہ وہ زبان سے تو ایمان کا اقرار کرتے ہیں اور ظاہر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں مگر وہ دل سے ایمان کو قبول نہیں کرتے بلکہ ان کے اندر شرک اور اسلام دشمنی کے جذبات بھرے ہوئے ہیں۔

---

[1] لفظ بِظُلْمٍ کے بعد آیت کے باقی الفاظ یہ ہیں اُولٰٓئِکَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ اور سب کا ترجمہ یہ ہے "وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان میں ظلم کو شامل نہیں کیا (تو) یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے امن ہے اور جو سیدھی راہ پانے والے ہیں۔"

ملا علی قاریؒ نے اس حدیث کی تشریح میں یہ لکھا ہے کہ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (کیونکہ شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے) استیناف تعلیل ہے، جس کی مراد اس بات کو واضح کرنا ہے کہ شرک ایسا گناہ ہے جو ایمان کو سرے سے ختم کر دیتا ہے، گویا ایمان اور شرک کسی بھی حال میں جمع نہیں ہوسکتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَنْ یَّکْفُرْ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ اس کے برخلاف اور تمام گناہ اس درجہ کے نہیں ہیں کہ وہ ایمان کے منافی ہوں، چنانچہ تمام اہل سُنّت والجماعت کا یہی مسلک ہے کہ کفر و شرک کے علاوہ اور کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو ایمان کو سرے سے ختم کردے جب کہ معتزلہ، خوارج، اور دیگر اہل بدعت ہر گناہ کبیرہ کو ایمان کے منافی سمجھتے ہیں لہٰذا جب مذکورہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ نے پہلے یہ ہی سمجھا تھا کہ اس آیت میں جن لوگوں کو مؤمن و ہدایت یافتہ قرار دیا گیا ہے ان سے وہی لوگ مراد ہیں جنہوں نے اپنے ایمان کو گناہ سے ملوث نہیں کیا ہے کیونکہ شرک کا ایمان کے ساتھ مخلوط ہونا سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان پر واضح فرمایا کہ بعض صورتوں میں ایمان کے ساتھ شرک کا ملنا ممکن ہے جیسے کوئی شخص اللہ پر ایمان لائے اور اس کی عبادت میں غیر اللہ کو شریک کرے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آیت میں ایمان باللہ کا مفہوم اسی وقت پورا ہوتا ہے اس سے اس کے لغوی معنی مراد ہیں نہ کہ شرعی معنی کیونکہ شرعی نقطہ نظر سے ایمان تمام صفات کمالیہ کو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کرنے اور اس کی ذات کو تمام نقصان و عیوب سے پاک قرار دینے پر مشتمل ہو، ورنہ (آیت میں لفظ ایمان کو اس کے لغوی معنی پر محمول قرار دینے کی صورت میں) یہ لازم آئے گا کہ حقیقت کے اعتبار سے تمام مشرکین و کفار ایمان رکھنے والے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ.... لیکن ظاہر ہے کہ شریعت میں اس طرح کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے اصل ایمان وہی ہے جو اللہ کی ذات کے اعتراف و اقرار کے ساتھ اس کی صفات خاص اور عبادت میں کسی کو شریک قرار نہ دینے پر مشتمل ہو) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کسی ایسے فعل و عمل کی بھی اجازت نہیں دی ہے جس سے ظاہراً اور صورۃً ہی شرک کا ارتکاب ہوتا ہو جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اَنَا اَغْنَی الشُّرَکَآءِ عَنِ الشِّرْكِ۔

آخرت کو دنیا پر قربان نہ کرو

(۱۰) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مِنْ شَرِّ النَّاسِ مَنْزِلَةً یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَبْدٌ اَذْهَبَ اٰخِرَتَهٗ بِدُنْیَا غَیْرِهٖ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت کے دن مرتبہ کے اعتبار سے بدترین آدمی وہ ہوگا دنیا کے سبب آخرت کو ضائع کردے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ یوں تو خود اپنی خاطر آخرت کے مفاد پر دنیا کے مفاد کو ترجیح دینا نہایت سنگین برائی ہے لیکن یہ برائی اس وقت کہیں زیادہ سخت اور بدتر ہو جاتی ہے جب کسی دوسرے کے لئے دنیا کو حاصل کرے اور اس کی وجہ سے لوگوں پر ظلم کر کے اپنی آخرت کو ضائع کردے جیسا کہ بعض ناعاقبت اندیش اور مفاد پرست لوگ ظالموں اور بدکاروں کی مدد اعانت کرتے ہیں۔

شرک اور ظلم کی بخشش ممکن نہیں

(۱۱) وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الدَّوَاوِیْنُ ثَلٰثَةٌ دِیْوَانٌ لَّا یَغْفِرُ اللّٰهُ الْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ یَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَدِیْوَانٌ لَّا یَتْرُكُهُ اللّٰهُ ظُلْمُ الْعِبَادِ فِیْمَا بَیْنَهُمْ حَتّٰی یَقْتَصَّ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ وَدِیْوَانٌ لَّا یَعْبَاُ اللّٰهُ بِهٖ ظُلْمُ الْعِبَادِ فِیْمَا بَیْنَهُمْ وَبَیْنَ اللّٰهِ فَذَاكَ اِلَی اللّٰهِ اِنْ شَآءَ عَذَّبَهٗ وَاِنْ شَآءَ تَجَاوَزَ عَنْهُ۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "دفتر (یعنی نامۂ اعمال تین طرح کے ہیں) ایک تو وہ نامۂ اعمال ہے جس کو اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا، اور وہ نامۂ اعمال وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کیا گیا ہو (یعنی کفر و شرک کا گناہ جس نامۂ اعمال میں ہوگا

اس کی بخشش ممکن نہیں ہوگی) چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خدا شرک کو نہیں بخشتا۔ دوسرا نامۂ اعمال وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ یوں ہی نہیں چھوڑ دے گا (بلکہ اس کے بارے میں ضرور حکم کرے گا) اور وہ نامہ اعمال وہ ہے جس میں بندوں کے آپس کے مظالم درج ہیں، چنانچہ وہ (اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق) ایک دوسرے سے بدلہ لیں گے (یعنی اللہ تعالیٰ مظلوم کو ظالم سے اس کے ظلم کا بدلہ دلوائے گا یا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ جس پر اپنا فضل کرنا چاہے گا اس کو صاحب حق کے مطالبہ سے بری کرادے گا بایں طور کہ وہ صاحب حق کو اپنے خزانہ رحمت سے اس کے حق کے بقدر یا اس سے زائد نعمتیں عطا فرما کر راضی کر دیگا اور کہے گا کہ اب تم اس شخص کو معاف کر دو جس نے تم پر ظلم کیا تھا یا تمہارا کوئی حق غصب کیا تھا، چنانچہ وہ راضی وخوش ہو کر اس شخص کو معاف کر دیگا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں گویا اس کے حق کا بدلہ اور دنیا کی دیت کا قائم مقام ہو جائیں گی) اور تیسرا اعمال نامہ وہ ہے جس کی اللہ تعالیٰ کو پرواہ نہیں ہوگی (یعنی اگر وہ چاہے تو اس اعمال نامہ کے مطابق سزا وعذاب کا فیصلہ صادر کرے اور اگر چاہے تو اس پر کوئی کاروائی نہ کرے) اور وہ اعمال نامہ وہ جس میں بندوں کا اللہ کے ساتھ ظلم کرنا یعنی ان کی طرف سے حقوق اللہ میں تقصیر وکوتاہی کا مرتکب ہونا درج ہے) چنانچہ یہ اعمال نامہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہوگا۔ چاہیں وہ بندے کو اس کے عمل کے مطابق سزا دے اور چاہے اس سے درگزر وعفو کا معاملہ کرے اور اس کو کوئی سزا نہ دے۔"

تشریح: اس حدیث سے یہ واضح ہوا کہ دنیا میں بندے جن برائیوں اور گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں ان میں سے جن کا تعلق حقوق العباد سے ہوگا جیسے کسی نے کسی پر ظلم کیا ہوگا، کسی کا حق مارا ہوگا، کسی کی عزت وآبرو کو نقصان پہنچایا ہوگا وغیرہ وغیرہ، تو آخرت میں ان گناہوں پر ہر حالت میں مواخذہ ہوگا اور اس مواخذہ سے کسی کو نجات نہیں ملے گی، اسی طرح جن برائیوں اور گناہوں کا تعلق حقوق اللہ سے ہوگا ان میں سے شرک کا گناہ بخشش ومعافی کے قابل نہیں ہوگا البتہ شرک کے علاوہ اور تمام گناہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف رہیں گے کہ چاہے وہ ان گناہوں پر عذاب دے اور چاہے اپنے فضل وکرم سے بخش دے۔

مظلوم کی بددعا سے بچو

⑫ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِيَّاكَ وَدَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّمَا يَسْأَلُ اللّٰهَ حَقَّهٗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَمْنَعُ ذَا حَقٍّ حَقَّهٗ۔

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اپنے آپ کو مظلوم کی بددعا سے بچاؤ (یعنی کسی پر ظلم نہ کرو کہ وہ تمہارے حق میں بددعا کرے) کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ سے صرف اپنا حق مانگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو اس کے حق سے باز نہیں رکھتا (یعنی ہر حق دار کو اس کا حق ضرور دیتا ہے۔"

ظالم کی مدد واعانت ایمان کے منافی ہے

⑬ وَعَنْ اَوْسِ بْنِ شُرَحْبِيْلَ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ مَشٰى مَعَ ظَالِمٍ لِيُقَوِّيَهٗ هُوَ يَعْلَمُ اَنَّهٗ ظَالِمٌ فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْاِسْلَامِ۔

"اور حضرت اوس ابن شرحبیلؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا جو شخص کسی ظالم کی تقویت وتائید کے لئے اس کے ساتھ چلے یعنی اس کی موافقت وحمایت کرے اور وہ یہ جانتا ہو کہ (جس شخص کی مدد تائید کر رہا ہے) وہ ایک ظالم انسان ہے تو وہ شخص اسلام سے خارج ہو جاتا ہے یعنی وہ کمال ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔"

ظلم کی نحوست

⑭ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّهٗ سَمِعَ رَجُلًا يَقُوْلُ اِنَّ الظَّالِمَ لَا يَضُرُّ اِلَّا نَفْسَهٗ فَقَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ بَلٰى وَاللّٰهِ حَتَّى الْحُبَارٰى

لَتَمُوْتُ فِيْ وَكْرِهَا هُزْلًا بِظُلْمِ الظَّالِمِ۔ رَوَى الْبَيْهَقِيُّ الْأَحَادِيْثَ الْأَرْبَعَةَ فِيْ شُعَبِ الْإِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ظالم حقیقت میں اپنے آپ ہی کو نقصان پہنچاتا ہے (دوسروں تک اس کے ظلم کے اثرات نہیں پہنچتے)" تو حضرت ابوہریرہؓ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ "بیشک (ظالم اپنی ظالمانہ حرکتوں سے اپنے آپ ہی کو نقصان پہنچاتا ہے، لیکن اس کی نحوست دوسروں کو بھی متاثر کرتی ہے) یہاں تک حباری اپنے گھونسلے میں ظالم کے ظلم کے سبب دبلا ہو کر مرجاتا ہے" چاروں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: حُبَارٰی ایک پرندہ کا نام ہے جس کو اردو میں "سرخاب" کہتے ہیں! بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پرندہ اپنے دانہ پانی کی تلاش میں بہت دور دور تک جاتا ہے، عام طور پر اس کا گھونسلہ ایسی جگہ ہوتا ہے جہاں سے پانی کی جگہ کئی کئی دن کی راہ کے فاصلہ پر ہوتی ہے، اور وہ اپنے گھونسلہ سے اتنے طویل فاصلہ پر جاتا ہے اور پانی پی کر اپنے گھونسلہ میں آتا ہے ایک محقق نے لکھا ہے کہ بعض مرتبہ دیکھا گیا کہ بصرہ میں سرخاب کے پیٹ میں سے حبہ الخضرار نامی جڑی برآمد ہوئی، جب کہ وہ جڑی صرف ایک علاقہ میں پائی جاتی ہے اور وہ علاقہ بصرہ سے کئی دن کی راہ کے فاصلہ پر واقع ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ ظالم کے اثرات دوسروں پر اس حد تک مرتب ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی نحوست سے بارش برسانا بند کر دیتا ہے اور پانی کی قلت سے کھانے پینے کی چیزیں نایاب ہو جاتی ہیں چنانچہ انسان و حیوان کھانا پانی نہ ملنے کی وجہ سے مرنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ سرخاب جیسا جانور بھی اپنے گھونسلے ہی میں سوکھ سوکھ کر مرجاتا ہے جو اپنے چارے و پانی کے حصول میں دور دراز کے علاقوں تک کی رسائی رکھتا ہے! اس سے معلوم ہوا کہ سرخاب کا اپنے گھونسلے میں سوکھ سوکھ کر مرجانا قحط اور خشک سالی کی علامت ہے اور اس کے ظلم کی نحوست کے اثرات کو بیان کرنے کے لئے خاص طور پر سرخاب کا ذکر کیا گیا ہے۔

جس شخص نے یہ کہا تھا کہ "ظالم حقیقت میں اپنے آپ ہی کو نقصان پہنچاتا ہے" اس کی مراد یہ تھی کہ ظالم اگرچہ ظاہر میں مظلوم کو نقصان پہنچاتا ہے مگر حقیقت میں اس نقصان کا وہ خود ہی شکار ہوتا ہے کیونکہ مظلوم کا نقصان تو ایسا نقصان ہے جس پر اس کو حق تعالیٰ کی طرف سے صبر کا پھل ملے گا اور ظالم سے اس ظلم کا بدلہ لے لیگا جب کہ ظالم کے حصہ میں آخر الامر خسران و تباہی کے علاوہ کچھ نہیں آئے گا چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ نے اس وقت پیش آنے والے کسی قرینہ کی بناء پر اس بات کو عمومیت کے ساتھ بیان کیا کہ ظالم اپنے ظلم کے نتیجہ میں خود تو نقصان و خسران میں مبتلا ہوتا ہے لیکن اس کے ظلم کی نحوست کسی نہ کسی صورت میں دوسروں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

اغلب یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے جو بات بیان فرمائی ہے وہ خود ان کا اپنا قول نہیں ہے بلکہ یہ مضمون کسی حدیث کا ہے جس کو حضرت ابوہریرہؓ نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہو گا یا یہ کہ ایک حدیث میں چونکہ یہ منقول ہے کہ بارش کا نہ ہونا ظلم کی نحوست کا اثر ہوتا ہے ظاہر ہے کہ بارش نہ ہونے سے حیوانات کو ضرور نقصان پہنچتا ہے اس لئے انہوں نے اس حدیث سے استنباط کرتے ہوئے مذکورہ بات فرمائی۔

بَابُ الْأَمْرِ بِالْمَعْرُوْفِ

امر بالمعروف کا بیان

"معروف" اصل میں "معرفت" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پہچاننا، حقیقت کو پالینا اور اس سے مراد یہ ہے کہ وہ چیزیں جن کو شریعت کے ذریعہ پہچانا گیا ہے اور جن کو اختیار کرنے کا حکم شریعت نے دیا ہے۔ معروف کے مقابلہ پر منکر ہے یعنی وہ چیزیں جن کا شریعت سے کوئی واسطہ نہ ہو اور ان کو اختیار کرنے سے شریعت نے باز رکھا ہو۔

واضح رہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، تعلیمات اسلامی کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں لوگوں کو بھلائیوں کا حکم دینا، اور برائیوں سے روکنا! چنانچہ اس باب میں اسی مضمون سے متعلق احادیث نقل ہوں گی۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

خلاف شرع امور کی سرکوبی کا حکم

① عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ رَّاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابو سعید خدریؓ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تم میں سے جو شخص کسی خلاف شرع امر کو دیکھے (یعنی جس چیز کو شریعت کے خلاف جانے) تو اس کو چاہئے کہ اس چیز کو اپنے ہاتھوں سے بدل ڈالے (یعنی طاقت کے ذریعہ اس چیز کو نیست و نابود کر دے مثلاً باجوں گاجوں اور آلات لہو و لعب کو توڑ پھوڑ دے نشہ آور مشروبات کو ضائع کر دے اور ہڑپ کی ہوئی چیز کو اس کے مالک کے سپرد کرا دے وغیرہ وغیرہ) اور اگر وہ (خلاف شرع امر کے مرتکب کے زیادہ قوی ہونے کی وجہ سے) ہاتھوں کے ذریعہ اس امر کو انجام دینے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان کے ذریعہ اس امر کو انجام دے (یعنی خلاف شرع امور کے بارے میں وعید کی آیتیں اور احادیث سنائے، خدا کے عذاب سے ڈرائے، پند و نصیحت کرے اور اگر کوئی سیدھی طرح نہ مانے تو سخت سُست کہے) اور اگر زبان کے ذریعہ بھی اس امر کو انجام دینے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر دل کے ذریعہ اس امر کو انجام دے (یعنی اس کو دل سے برا جانے قلبی کڑھن رکھے اور اس عزم و ارادہ پر قائم رہے کہ جب بھی ہاتھ یا زبان کے ذریعہ اس امر کو انجام دینے کی طاقت حاصل ہوگی تو اپنی ذمہ داری کو ضرور پورا کرے گا، نیز اس خلاف شرع امر کے مرتکب کو بھی برا جانے اور اس سے کنارہ کشی اختیار کرے) اور یہ (آخری درجہ) ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: برائیوں کے پھیلنے سے روکنے اور ان کا قلع قمع کرنے کی جو ذمہ داری اہل ایمان پر عائد ہوتی ہے اس سے عہدہ برآ، ہونے کے تین درجے بیان کیے گئے ہیں پہلا درجہ یہ ہے کہ ہر برائی کا سر طاقت کے ذریعہ کچل دیا جائے بشرطیکہ اس طرح کی طاقت میسر ہو اور اگر یہ طاقت حاصل نہ ہو تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس برائی کا فریضہ زبان کے ذریعہ ادا کیا جائے اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ اگر زبان کے ذریعہ بھی کسی برائی کی مذمت کرنے اور اس کو ختم کرنے کی ہمت نہ ہو تو پھر دل سے اس فریضہ کو انجام دیا جائے۔ یعنی کسی خلاف شرع امر کو دیکھ کر اسے دل سے برا جانے اور اس کے مرتکب کے خلاف قلب میں عداوت و نفرت کے جذبات رکھے جائیں، اس درجہ کو ایمان کا سب سے کمزور درجہ قرار دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب اہل ایمان اس درجہ کمزور ہو جائیں کہ وہ کسی برائی کو مٹانے کے لئے ہاتھ اور زبان کی طاقت سے محروم ہوں تو سمجھا جائے کہ یہ ایمان کے لئے سب سے کمزور زمانہ ہے کہ اگر اہل ایمان طاقتور ہوتے تو وہ کسی برائی کو اپنی قولی و فعلی طاقت کے ذریعہ مٹانے کے بجائے محض قلبی نفرت پر اکتفا نہ کرتے۔ یا وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی برائی کو محض قلبی طور پر برا جاننے پر اکتفا کرتا ہے بلکہ ہاتھ اور زبان کے ذریعہ اس برائی کو مٹانے کی جدوجہد کرتا ہے، اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ بہترین جہاد، ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَائِمٍ (اور ان کو کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں ہوتا۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ حدیث میں پہلے حکم (یعنی برائی کو ہاتھ کے ذریعہ مٹانے) کا تعلق ان اہل ایمان سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے طاقت و اقتدار سے نوازا ہے یعنی بادشاہ و حاکم وغیرہ! چنانچہ طاقت و اقتدار رکھنے والے مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے حلقہ اثر و اقتدار میں سختی و شدت کے ساتھ برائیوں کی سرکوبی کریں اور برائیوں کا ارتکاب کرنے والوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں

دوسرے حکم (یعنی برائی کو زبانی مذمت اور تلقین و نصیحت کے ذریعہ ختم کرنے) کا تعلق علماء کی ذات سے ہے۔ یعنی یہ اہل علم اور واعظین

کا فریضہ ہے کہ وہ جن برائیوں کو دیکھیں اپنے وعظ و نصیحت کے ذریعہ ان کی مذمت کریں اور عوام کو تلقین و نصیحت کے ذریعہ ان برائیوں سے روکیں اور تیسرے حکم (یعنی برائیوں اور ان کے مرتکبین کے خلاف دل میں نفرت کا جذبہ رکھنے) کا تعلق عام مسلمانوں سے ہے، چنانچہ عام مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ خلاف شرع امور کو دیکھ کر محض اعراض و بے اعتنائی کا رویہ اختیار نہ کریں بلکہ ان امور کو دل سے برا جانیں اور ان کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف قلبی نفرت رکھیں۔

بعض حضرات نے حدیث کے اس آخری جملہ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یہ چیز یعنی کسی برائی کو دیکھ کر محض دل میں اس کو برا سمجھنے پر اکتفا کر لینا ایمان کے مراتب میں سب سے کمزور مرتبہ ہے کیونکہ اگر کوئی مسلمان ایسی چیز کو دیکھے کہ جس کا دینی نقطہ نظر سے برا ہونا قطعی طور پر ثابت و ظاہر ہو اور وہ اس چیز کو برا بھی نہ سمجھے بلکہ اس پر اپنے اطمینان کا اظہار کرے اور اس کو اچھا جانے تو مسلمان نہیں رہے گا بلکہ کافر ہو جائے گا۔

اس موقع پر اس بات کو بھی جان لینا چاہیے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم بھلائیوں یا برائیوں کی حیثیت کے تابع ہوتا ہے۔ یعنی اگر کوئی چیز اس درجہ کی ہے کہ اس کو اختیار کرنا واجب ہے تو اس کو اختیار کرنے کا حکم دینا (یعنی امر بالمعروف) بھی واجب ہو گا اور اگر وہ چیز مستحب ہو گی تو امر بالمعروف بھی مستحب ہو گا، اسی طرح اگر کوئی خلاف شرع چیز حرام کا درجہ رکھتی ہو اس سے روکنا یعنی نہی عن المنکر واجب ہو گا اور اگر وہ چیز مکروہ ہو تو اس صورت میں نہی عن المنکر بھی مستحب ہو گا۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ ان کی وجہ سے کسی فتنہ و فساد کے پیدا ہو جانے کا خوف نہ ہو مثلاً اگر یہ ظاہر ہو کہ فلاں شخص کو کسی نیک کام کی تلقین کرنے کی وجہ سے فتنہ اٹھ کھڑا ہو گا یا جو شخص کسی برے کام کا مرتکب ہے اگر اس کو اس برائی سے روکا گیا تو اس کے نتائج اور زیادہ فتنہ و فساد کی صورت میں نکلیں گے تو اس صورت میں اس فریضہ کی ادائیگی قطعاً ضروری نہیں ہو گی۔ اسی طرح ایک شرط یہ بھی ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو قبول کیے جانے کا گمان بھی ہو، لہٰذا اگر یہ گمان ہو کہ جس شخص کو نیک کام کرنے کی تلقین کی جائے گی یا اس کو کسی برے کام سے روکا جائے گا تو وہ اس بات کو قبول نہیں کرے گا تو اس کو اس نیک کام کا حکم کرنا یا برے کام سے روکنا واجب نہیں ہو گا البتہ مستحسن ضرور رہے گا تاکہ شعار اسلام کا اظہار ہو جائے۔ امام نوویؒ نے اس کے خلاف نقل کیا ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

حدیث کے الفاظ مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا میں لفظ من کے ذریعہ مذکورہ حکم کا مخاطب جن لوگوں کو قرار دیا گیا ہے ان میں ملت کا ہر فرد شامل ہے، یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ہر مسلمان کو ادا کرنا چاہیے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور خواہ آزاد ہو یا غلام یہاں تک کہ فاسق بھی اس امر کا ذمہ دار ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ امر بالمعروف کے لئے شرط نہیں ہے کہ جو شخص کسی نیکی کا حکم کرنے والا ہو وہ پہلے خود بھی اس نیکی پر عامل ہو اور بغیر اپنے عمل کے امر بالمعروف کا فریضہ انجام دینا اس کے لئے درست نہ ہو کیونکہ جس طرح خود اپنے نفس کو کسی نیکی پر عمل کرنے کی تلقین کرنا ایک واجب چیز ہے اسی طرح ایک واجب امر یہ ہے کہ دوسروں کو نیکی کی تلقین کی جائے، لہٰذا اگر ان میں سے کوئی ایک واجب ترک ہوتا تو اس کی وجہ سے دوسرے واجب کو ترک کرنا قطعاً جائز نہیں ہو گا، یہ الگ بات ہے کہ جس واجب کا ترک ہو گا اس کا گناہ بہرصورت لازم آئے گا۔ لہٰذا قرآن کریم میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ (یعنی تم اس چیز کو کیوں کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے) تو اس آیت کریمہ کا محمول امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو تسلیم کرنے کی صورت میں یہ کہا جائے گا کہ اس آیت کی مراد ترک عمل سے روکنا اور اس پر زجر و تنبیہ ہے نہ کہ دوسروں کو بھلائی کی تلقین کرنے سے منع کرنا مراد ہے، اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں سمجھئے کہ جو شخص بھلائیوں کی تلقین کرتا ہے اور دوسروں سے نیک عمل اختیار کرنے کو

کہتا ہے لیکن وہ خود اس بھلائی اور نیک عمل کو اختیار نہیں کرتا تو یہ آیت کریمہ ایسے شخص کو متنبہ کرتی ہے کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ تم دوسروں کو بھلائی اور نیک عمل کرنے کی تلقین کرتے ہو لیکن یہ نہایت غیر موزوں بات ہے کہ تم خود اس بھلائی اور نیک عمل کو اختیار نہیں کرتے! لہٰذا آیت یہ بات قطعاً ثابت نہیں کرتی کہ جو شخص خود نیک عمل اختیار نہ کرے وہ دوسروں کو بھی نیک عمل اختیار کرنے کی تلقین نہیں کر سکتا، تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نیکی کی تلقین کرنے والا اگر خود بھی نیکی کو اختیار کرے تو اس سے اچھی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جو شخص خود عمل نہیں کرتا، اس کی تلقین و نصیحت دوسروں پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حدیث میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کی جو ترتیب ذکر کی گئی ہے وہ قرآن و سنت اور اجماع اُمت کے ذریعہ واجب ہے اس بارہ میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ کچھ روافض کا اس سے اختلاف ہے جن کا کوئی اعتبار نہیں ہے، لہٰذا جس شخص نے مذکورہ ترتیب کے مطابق اس فریضہ کو انجام دیا اور مخاطب نے اس کو قبول کر لیا تو سبحان اللہ، اور اگر قبول نہ کیا تو وہ شخص اپنی ذمہ داری سے بہر حال سبکدوش ہو جائے گا، اس کے بعد اب اس پر کوئی اور چیز واجب نہیں ہوگی! نیز علماء نے کہا ہے کہ اس امر (یعنی بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے) کی فرضیت بطریق کفایہ ہے اور جو شخص اس فریضہ کی ادائیگی کی طاقت و قوت رکھنے کے باوجود اس ذمہ داری کو بلا کسی عذر کے پورا نہ کرے تو وہ گناہ گار ہوتا ہے لیکن بعض صورتوں میں یہ امر فرض عین بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً کوئی برائی کسی ایسی جگہ رونما ہو رہی ہو کہ ایک شخص کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا یا اس کے ازالہ کی قدرت اس کے علاوہ کوئی اور نہیں رکھتا جیسے اپنی بیوی یا بیٹی کسی برائی کا ارتکاب کرے تو اس برائی کو ختم کرنے کی ذمہ داری خاص طور سے اسی شخص پر عائد ہوگی۔

امام نوویؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ عدم قبولیت کا گمان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وجوب کو ساقط نہیں کرتا، لہٰذا اگر کسی کو یہ گمان ہو کہ فلاں شخص کے سامنے بھلائی کی تلقین کرنا یا اس کو برے کام سے روکنا بے کار ہے کیونکہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو قبول نہیں کرے گا تو اس صورت میں بھی اس پر واجب ہوگا کہ وہ اس شخص کو نیک کام کرنے کا حکم دے اور برائی کے راستہ سے روکے، اور اس بات کی قطعاً پرواہ نہ کرے کہ اس کی بات مانی جائے گی یا نہیں کیونکہ موعظت و نصیحت اول تو بذات خود بڑے فائدے رکھتی ہے اور کسی نہ کسی صورت میں اور کبھی نہ کبھی ضرور اثر کرتی ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ دوسرے یہ کہ محض اس گمان کی بنا پر کہ مخاطب تلقین و نصیحت سے کوئی اثر نہیں لے گا اپنی ذمہ داری سے اعراض نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر بھلائیوں کو پھیلانے اور برائیوں کو مٹانے کی جدوجہد میں مصروف رہنا چاہئے کہ لوگوں نے تو رسولوں تک کو جھٹلایا ہے اور پیغمبروں تک کی موعظت و نصیحت کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے تو کیا ان رسولوں اور پیغمبروں نے حق بات پہنچانے کا فریضہ ترک کر دیا تھا! قرآن نے جو بات رسول و پیغمبر کے بارے میں فرمائی ہے وہ ہر اس شخص پر صادق آتی ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے یعنی وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ (یعنی رسول کا کام بس یہ ہے کہ (خدا کے احکام) صاف صاف پہنچا دے (ان احکام کا ماننا یا نہ ماننا دوسروں کا کام ہے۔

واضح رہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ صرف حاکم اور مقتدر مسلمانوں ہی پر عائد نہیں ہوتا اور نہ یہ ضروری ہے کہ اس امر کی انجام دہی کے لئے حاکم اپنی طرف سے احکام جاری کر دے، بلکہ اس کا حق عام لوگوں کو بھی پہنچتا ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام کو انجام دیں، بلکہ ایسے زمانہ میں جب کہ طاقت واقتدار رکھنے والے مسلمان اس فریضہ سے بالکل لاپرواہی برتتے ہیں۔ خصوصیت سے عام مسلمانوں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس کام کو انجام دیں اور تمام مسلمانوں میں بھی زیادہ ذمہ داری علماء و مشائخ پر عائد ہوتی ہے، اسی طرح اس فریضہ کی ادائیگی میں اپنا مخاطب صرف عام مسلمانوں ہی کو نہیں ماننا چاہئے بلکہ خواص جیسے حاکموں وغیرہ کو بھی مناسب انداز میں بھلائیوں کی تلقین کرنی چاہئے اور وہ جن برائیوں میں مبتلا ہوں ان سے ان کو روکنا چاہئے، چنانچہ پچھلے زمانوں کے بزرگ صرف

عوام الناس کو بھلائیوں کی تلقین نہیں کرتے تھے اور ان کو برائیوں سے روکنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ بادشاہوں حاکموں اور مقتدر مسلمانوں کے سامنے بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ تاہم یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسی شخص کو کرنا چاہئے جو یہ علم رکھتا ہو کہ وہ جس چیز کا حکم دے رہا ہے یا جس چیز سے روک رہا ہے شریعت کے اعتبار سے اس کی کیا حیثیت واہمیت ہے، چنانچہ جہاں تک ان چیزوں کا تعلق ہے جنکا فرض وواجب ہونا یا جن کا حرام ہونا اس طرح ظاہر ہے کہ تمام مسلمان ان کو جانتے ہیں، جیسے نماز اور روزہ وغیرہ یا زنا اور شراب وغیرہ، تو ان چیزوں کے بارے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عام مسلمان بھی شوق سے کر سکتے ہیں لیکن جو چیزیں کہ خواہ وہ قولی ہوں یا فعلی، ایسی ہیں کہ ان کے بارے میں عام مسلمانوں کو کوئی علم نہیں ہوتا جو اجتہاد سے تعلق رکھتی ہیں تو عوام کو ان طرح کی چیزوں میں سے صرف اسی چیز کو اختیار کرنے سے منع کرنا چاہئے جن کی ممانعت متفق علیہ ہو مختلف فیہ امور میں منع نہیں کرنا چاہیے خصوصا ان حضرات کے مسلک کے مطابق کہ جو یہ کہتے ہیں کہ ہر مجتہد مصیب ہوتا ہے۔

آخر میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ جو لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری انجام دیں ان کو چاہئے کہ وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں خوش خلقی، نرمی اور تہذیب ومتانت کا رویہ اختیار کریں اور وہ اس امر کو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کی خاطر انجام دیں نہ کہ کسی دنیاوی غرض ومقصد اور نفس کی خاطر، اس صورت میں مخاطب پر بات اثر بھی کرتی ہے، اور اللہ تعالیٰ ثواب بھی عطا فرماتا ہے اسی طرح جب کسی شخص کو کوئی نصیحت کرنی ہو تو لوگوں کی موجودگی میں نہ کی جائے بلکہ تنہائی میں اور پوشیدہ طور پر اس کو نصیحت کرنی چاہئے کیونکہ لوگوں کی موجودگی میں کسی کو نصیحت کرنا، نصیحت نہیں بلکہ فضیحت ہے۔

مداہنت کرنے والے کی مثال

(۲) وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْمُدَاهِنِ فِيْ حُدُوْدِ اللّٰهِ وَالْوَاقِعِ فِيْهَا مَثَلُ قَوْمٍ اسْتَهَمُوْا سَفِيْنَةً فَصَارَ بَعْضُهُمْ فِيْ اَسْفَلِهَا وَصَارَ بَعْضُهُمْ فِيْ اَعْلَاهَا فَكَانَ الَّذِيْ فِيْ اَسْفَلِهَا يَمُرُّ بِالْمَآءِ عَلَى الَّذِيْنَ فِيْ اَعْلَاهَا فَتَاَذَّوْا بِهٖ فَاَخَذَ فَاْسًا فَجَعَلَ يَنْقُرُ اَسْفَلَ السَّفِيْنَةِ فَاَتَوْهُ فَقَالُوْا مَالَكَ قَالَ تَاَذَّيْتُمْ بِيْ وَلَا بُدَّلِيْ مِنَ الْمَآءِ فَاِنْ اَخَذُوْا عَلٰى يَدَيْهِ اَنْجَوْهُ وَنَجَّوْا اَنْفُسَهُمْ وَاِنْ تَرَكُوْهُ اَهْلَكُوْهُ وَاَهْلَكُوْا اَنْفُسَهُمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "خدا کی مقرر کردہ حدود میں غفلت وسستی کرنے والے اور ان حدود میں گر پڑنے والے یعنی گناہ کا ارتکاب کرنے والے کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو قرعہ ڈال کر کشتی میں بیٹھے ہوں (جیسے کسی سواری میں ایک ساتھ سفر کرنے والوں کی عادت ہوتی ہے کہ قرعہ وغیرہ کی صورت میں ہر شخص کی جگہ متعین کر دی جاتی ہے اور جس شخص کی جو جگہ متعین ہوتی ہے وہ اسی جگہ پر بیٹھتا ہے) چنانچہ ان میں سے بعض لوگ کشتی کے نیچے کے حصے میں ہوں اور بعض لوگ اس کے اوپر کے حصے میں پھر جو لوگ کشتی کے نیچے کے حصے میں ہوں وہ جب پانی لینے کے لئے اوپر کے حصے میں آئیں تو اس حصے میں بیٹھے ہوئے لوگ اس شخص کے آنے جانے کی وجہ سے تکلیف محسوس کرنے لگیں (جو پانی لانے کے لئے اوپر جائے اور وہاں کے لوگوں کے درمیان سے گزرے) لہٰذا نیچے کے حصہ والوں میں سے ایک شخص (اوپر والوں کی تکلیف وناگواری کو دیکھ کر) یہ کرے کہ کلہاڑا لے کر کشتی کی سطح کو توڑنا شروع کر دے، اور پھر اوپر کے لوگ اس کے پاس آئیں اور کہیں کہ یہ تمہیں کیا ہوا ہے (یعنی تم یہ کیسا بے تکا کام کر رہے ہو کہ کشتی کی سطح کو توڑ رہے ہو اور تمام کشتی والوں کی زندگیوں کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو؟) اس پر وہ شخص یہ جواب دے کہ جب میں (پانی لینے کے لیے) اوپر جاتا ہوں اور تم لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوں تو تم تکلیف وناگواری محسوس کرتے ہو اور میں پانی حاصل کرنے پر مجبور ہوں (خواہ اس کے لئے مجھے کشتی کی سطح ہی کو کیوں نہ توڑ کر پانی کی جگہ نکالنی پڑے)! ایسی حالت میں (دو ہی صورتیں سامنے ہو سکتی ہیں) یا تو لوگ اس شخص کے ہاتھ کو روکیں (یعنی اس کو کشتی کی سطح نہ توڑنے دیں) تاکہ اس کو بھی اور خود اپنے آپ کو بھی (غرقابی اور ہلاکت سے) بچائیں یا اس کو اس کے حال پر

چھوڑ دیں (یعنی کشتی کی سطح توڑنے سے اس کو نہ روکیں) اور پھر اس کو بھی ہلاکت میں ڈالیں اور خود بھی ہلاک ہو جائیں۔" (بخاری)

تشریح: حدیث میں جو لفظ مُدْھِنْ ذکر کیا گیا ہے اس کے معنی ہیں مداہنت کرنے والا اور مداہنت کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص طاقت و قدرت رکھنے کے باوجود کسی خلاف شرع امر کو دیکھ کر اس کو مٹانے وختم کرنے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے سے باز رہے اور یہ باز رہنا خواہ شرم حضوری کی وجہ سے ہو یا دینی بے حمیتی کی بنا پر اور خواہ کسی کی جانب داری اور کسی غرض و لالچ کی وجہ سے ہو یا دین کی پرواہ نہ ہونے کی وجہ سے۔ واضح رہے کہ لغت میں، مداہنت اور مدارت کے ایک ہی معنی ہیں، لیکن شریعت میں مدارت کی اجازت ہے بلکہ بعض مواقع پر اس کو مستحسن قرار دیا گیا ہے جب کہ مداہنت کی صریح ممانعت ہے، چنانچہ شرعی نقطہ نظر سے مدارت اور مداہنت کے درمیان فرق یہ ہے کہ مدارت کی بنیاد، دین کی حفاظت مصالح وقت کی رعایت اور ظالموں کے ظلم کو دور کرنے پر ہوتی ہے اور مداہنت کی بنیاد اپنے نفس کے تحفظ اور اس کی خواہشات کی تکمیل، لوگوں سے منفعت و مفاد حاصل کرنے اور دین سے لاپرواہی پر ہوتی ہے۔

"خدا کی حدود میں غفلت و سستی کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گناہوں کی جو حد (سزائیں) مقرر کی ہیں (جیسے شرابی کو کوڑے مارنے وغیرہ) ان کو طاقت و قدرت کے باوجود قائم و جاری کرنے میں لاپرواہی و غفلت کرنا۔ یا اللہ تعالیٰ نے جن گناہوں کو موجب حد قرار دیا ہے (جیسے زنا اور شراب نوشی وغیرہ) ان کے مرتکبین کو ان گناہوں سے روکنے میں غفلت کرنا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو انجام دینے سے باز رہنا۔ پس حضور نے فرمایا کہ جس طرح کشتی میں سوار کوئی شخص کشتی کی سطح کو توڑنے لگے اور کشتی میں سوار دوسرے لوگ اس کو اس کی حرکت سے باز رکھیں تو کشتی ڈوبنے سے بچ جائے گی اور تمام مسافر محفوظ و سلامت رہیں گے اور اگر دوسرے مسافر اس شخص کو اس کے اس عمل سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ صرف وہی شخص بلکہ دوسرے تمام مسافر بھی اس شخص کی اس حرکت کی وجہ سے غرقاب و ہلاک ہو جائیں گے اسی طرح اگر لوگ کسی فاسق و بدکار کو اس کے فسق و بدکاری سے روکیں اور برائیوں کے راستہ سے باز رکھیں تو وہ اس فاسق و بدکار کی نجات و فلاح کا بھی باعث بنیں گے اور خود کو بھی عذاب خداوندی سے محفوظ رکھ پائیں گے اور اگر لوگ اس فاسق و بدکار کو اس حالت پر چھوڑ دیں کہ وہ اسی طرح فسق و بدکاری میں مبتلا رہے تو پھر نہ صرف وہ فاسق و بدکار ہی تباہ و برباد ہوگا بلکہ وہ لوگ اپنے آپ کو بھی ہلاکت و تباہی میں مبتلا کریں گے کیونکہ جب دنیا والوں کی بداعمالیوں اور بدکاریوں کی وجہ سے خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے تو اس کی تباہ کاریوں میں کسی نہ کسی حیثیت سے سب ہی لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً یعنی تم لوگ اپنے آپ کو اس فتنہ سے بچاؤ جو خاص طور پر ان ہی لوگوں کو مبتلا نہیں کرے گا جنہوں نے ظلم کیا ہے، بلکہ تمہاری مداہنت کی وجہ سے تمہیں بھی مبتلا کرے گا۔

"جو قرعہ ڈال کر کشتی میں بیٹھے ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے کشتی کو درجات میں تقسیم کر لیا ہو جن میں سے ایک درجہ تو کشتی کے اوپر کے حصہ میں واقع ہو اور دوسرا درجہ کشتی کے نیچے کے حصہ میں ہو اور ان دونوں درجات میں بیٹھنے کے لئے قرعہ اندازی کا طریقہ اختیار کیا گیا ہو کہ جس شخص کا نام قرعہ میں جس درجہ کے لئے نکلے وہ شخص اسی درجہ میں بیٹھے گا۔ واضح رہے کہ یہ قرعہ والی بات محض ایک قید اتفاقی کے طور پر ہے ورنہ عام طور سے کشتی میں بیٹھنے کا یہ طریقہ رائج نہیں ہے بلکہ نشست اور درجات کی تقسیم کشتی کے مالک و منتظم کی صوابدید پر منحصر ہوتی ہے کہ وہ کرایہ و ٹکٹ کی حیثیت اور ترتیب کے مطابق جس شخص کو جہاں چاہتا ہے جگہ دیتا ہے یا جس شخص کو جہاں جگہ مل جاتی ہے، وہاں بیٹھ جاتا ہے، ہاں اگر کشتی کسی ایک شخص کی ملکیت ہونے کے بجائے مشترکہ طور پر چند اشخاص کی یکساں طور پر ملکیت ہوتی ہے اور وہ اشخاص ایک ساتھ اس کشتی میں جائیں تو اس صورت میں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سب اپنی اپنی نشست کے لئے قرعہ ڈال لیں، اور جس شخص کا نام جس درجہ اور جس جگہ کے لئے نکلے وہ وہاں بیٹھ جائے۔

فَكَانَ الَّذِیْ فِیْ اَسْفَلِهَا الخ میں لفظ اَلَّذِیْ استعمال کرنا ماسبق میں ذکر کیے گئے لفظ بعض کی مناسبت سے ہے اور اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر اس حصے میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں میں سے صرف ایک شخص بھی ایسا کرے (یعنی کشتی کی سطح کو توڑنے لگے) تو اس،

کے بارے میں بھی یہ ہی حکم ہوتا ہے۔
"وہ جب پانی لینے کے لئے اوپر کے حصہ میں آئیں" میں لفظ "پانی" سے مراد اکثر شارحین کے نزدیک وہی عام پانی ہے جو پینے وغیرہ کے استعمال میں آتا ہے، اور بعض شارحین کہتے ہیں کہ یہاں "پانی" سے مراد پیشاب پاخانہ ہے جو نیچے کے حصے میں کوئی شخص کسی برتن وغیرہ میں کرے اور پھر اس کو دریا میں ڈالنے کے لئے اوپر کے حصے میں آئے اور وہاں کے لوگوں کے درمیان سے گزرے، اس صورت میں اس شخص کی وجہ سے اوپر کے حصہ والوں کا تکلیف و ناگواری محسوس کرنا زیادہ بدیہی بات ہوگی! بہر صورت حاصل یہی ہے کہ نیچے کے حصے والے پانی لانے کے لئے یا پیشاب پاخانہ پھینکنے کے لئے اوپر کے حصہ میں جائیں اور ان کی وجہ سے وہاں کے لوگ تکلیف و اذیت محسوس کرنے لگیں اور پھر نیچے والوں میں سے کوئی شخص ان کی تکلیف و ناگواری کو دیکھ کر کشتی کے نیچے کی سطح توڑنے لگے تاکہ اس جگہ سے پانی حاصل کرے یا غلاظت وغیرہ پھینک دیا کرے الخ۔
ایک شارحؒ نے حدیث کی تشریح میں یہ بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس ارشاد گرامی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی حدود میں غفلت و سستی کرنے والے کو اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو کشتی کے اوپر کے درجہ میں ہو اور حدود میں گر پڑنے والے یعنی گناہ و معصیت میں مبتلا ہونے والے کو اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی جو کشتی کے نیچے کے درجہ میں ہو اور اس کے انہماک یعنی ان حدود (گناہوں) میں مشغول و متفرق رہنے اور ان کو ترک نہ کرنے کو کشتی کے نیچے کی سطح کو توڑنے کے عمل کے ساتھ تشبیہ دی، اور گناہوں کے مرتکب کو ان گناہوں سے روکنے کو کشتی کی سطح توڑنے والے کا ہاتھ پکڑنے اور اس کو کشتی توڑنے سے منع کرنے سے تعبیر کیا، اور گناہوں سے روکنے و منع کرنے کے فائدہ کو ان سب لوگوں کی فلاح و نجات سے تعبیر کیا جو پانی لینے کے لئے اوپر آنے والوں کو منع کریں یا جو پانی کے لئے اوپر جائیں اور ان کو اوپر آنے سے روکا جائے اور گناہوں سے منع نہ کرنے والوں کو ان لوگوں سے تعبیر کیا جو کشتی توڑنے والے کو اس کے حال پر چھوڑ دیں یعنی اس کو کشتی توڑنے سے باز رکھیں اور مدافعت کرنے والوں یعنی لوگوں کو گناہوں سے نہ روکنے والوں کے گناہ اور گناہوں کا ارتکاب کرنے والے کے انجام کو اس امر سے تعبیر کیا کہ اگر کشتی کے اوپر والے کشتی کو توڑنے والے کو منع نہ کریں تو وہ اپنے آپ کو بھی اور کشتی توڑنے والے کو بھی ہلاکت و تباہی میں ڈال دیں گے! نیز اسلام کو گویا کشتی سے تعبیر فرمایا جو دونوں قسم کے لوگوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔
آخر میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ حدیث میں منع کرنے والوں کے طبقہ کو جمع کے صیغہ کے ساتھ ذکر فرمایا جس کے ذریعہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ تمام مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس شخص کی حسب قدرت پوری مدد کریں جو لوگوں کو گناہوں اور برائیوں سے باز رکھنے کا فریضہ انجام دے اور اسی طرح گناہ کرنے والے کا ذکر مفرد کے صیغہ کے ساتھ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ گناہ کے مرتکب اپنی حیثیت کے اعتبار سے ناقص ہیں خواہ وہ تعداد میں کتنے ہی ہوں۔

بے عمل واعظ و ناصح کا انجام

(۳) وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُجَآءُ بِالرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُلْقٰى فِى النَّارِ فَتَنْدَلِقُ اَقْتَابُهٗ فِى النَّارِ فَيَطْحَنُ فِيْهَا كَطَحْنِ الْحِمَارِ بِرَحَاهُ فَيَجْتَمِعُ اَهْلُ النَّارِ عَلَيْهِ فَيَقُوْلُوْنَ اَىْ فُلَانُ مَا شَانُكَ اَلَيْسَ كُنْتَ تَاْمُرُنَا بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَانَا عَنِ الْمُنْكَرِ قَالَ كُنْتُ اٰمُرُكُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَا اٰتِيْهِ وَاَنْهَاكُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاٰتِيْهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اسامہ بن زیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت کے دن (امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مقدمات کے فیصلہ کے وقت) ایک شخص کو لایا جائے گا جس کو مستوجب عذاب قرار دے کر آگ میں ڈال دیا جائے گا اور آگ میں پہنچتے ہی ان کی انتڑیاں فوراً باہر نکل پڑیں گی اور وہ انتڑیوں کو اس طرح پیسے گا جس طرح خراس کا گدھا اپنی چکی کے ذریعہ آٹے کو پیستا ہے (یعنی جس طرح چکی میں چلنے

والا گدھا اپنی چکی کے گرد چلتا رہتا ہے، اسی طرح وہ شخص اپنی ان انتڑیوں کے گرد چکر لگائے گا اور ان کو پیروں تلے روندتا رہے گا) چنانچہ (اس شخص کو اس حالت میں دیکھ کر) دوزخی (یعنی اس کے زمانہ کے فاسق وفاجر لوگ) اس کے گرد جمع ہو جائیں گے اور کہیں گے کہ اے فلاں شخص! تمہارا یہ کیا حال ہے؟ تم تو ہمیں نیک کام کی تلقین و نصیحت کیا کرتے تھے اور برے کام سے منع کرتے تھے وہ شخص جواب دے گا کہ بے شک میں تمہیں نیک کام کی تلقین کیا کرتا تھا مگر خود اس نیک کام کو نہیں کرتا تھا اور تمہیں برے کام سے منع کرتا تھا مگر خود اس برے کام سے باز نہیں رہتا تھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، اس شخص کو یہ سزا، عمل نہ کرنے کی وجہ سے ملے گی، نہ کہ اس وجہ سے ملے گی کہ وہ جب خود عمل نہیں کرتا تھا تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ کیوں انجام دیتا تھا، چنانچہ اگر وہ اس فریضہ کو بھی ترک کرتا تو وہ مذکورہ عذاب سے بھی سخت عذاب کا مستوجب ہوتا کیونکہ اس صورت میں اس پر دو واجب کے ترک کا گناہ ہوتا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ نہ انجام دینے پر عذاب خداوندی

④ عَنْ حُذَيْفَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْ لَيُوْشِكَنَّ اللّٰهُ اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ عِنْدِهٖ ثُمَّ لَتَدْعُنَّهٗ وَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت حذیفہؓ، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم یقیناً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دو گے یا عنقریب اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب نازل کرے گا پھر تم اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرو گے تو تمہاری دعا قبول نہیں کی جائے گی۔" اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: حضور کے ارشا کا مطلب یہ ہے کہ دونوں باتوں میں سے ایک بات ضرور ہوگی یا تو تم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے رہو گے اور یا اگر تم اس فریضہ کی انجام دہی سے غافل رہے تو اللہ تعالیٰ مختلف طرح کی سختیوں اور مصائب کی صورت میں تم پر اپنا عذاب نازل کرے گا اور اس وقت تم ان سختیوں اور مصائب کے دفعیہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو گے تو تمہاری دعا قبول نہیں کی جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوسرے عذاب اور مصائب دعا کی برکت سے ٹلنے کا احتمال رکھتے ہیں لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ترک پر خدا کی طرف سے جو آفات وبلائیں نازل ہوتی ہیں وہ دعا کے ذریعہ بھی ٹلنے کا احتمال نہیں رکھتیں کیونکہ ان کے دفعیہ کے لئے کی جانے والی دعا قبول نہیں ہوتی۔

بزارؒ نے اور طبرانیؒ نے کتاب اوسط میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ (حضور نے فرمایا۔ "دو باتوں میں سے ایک بات کا ہونا ضروری ہے یعنی یا تو) تم یقیناً امر بالمعروف بھی کرو گے اور یقیناً نہی عن المنکر کا فریضہ بھی انجام دو گے، یا ان دونوں فریضوں کی عدم ادائیگی کی صورت میں) یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر تمہارے برے لوگوں کو مسلّط کر دے گا اور پھر جو تمہارے نیک لوگ (ان برے لوگوں کے فتنہ وفساد اور ظلم وجور کے دفعیہ کے لیے) دعا کریں گے، مگر ان کی دعا، قبول نہیں کی جائے گی۔

گناہ کو گناہ سمجھو

⑤ وَعَنِ الْعُرْسِ ابْنِ عَمِيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا عُمِلَتِ الْخَطِيْئَةُ فِي الْاَرْضِ مَنْ شَهِدَهَا فَكَرِهَهَا كَانَ كَمَنْ غَابَ عَنْهَا وَمَنْ غَابَ عَنْهَا فَرَضِيَهَا كَانَ كَمَنْ شَهِدَهَا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عرس بن عمیرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جب زمین پر گناہ کیے جائیں تو جو شخص ان

گناہوں کو برا جانے، وہ اس شخص کی مانند ہے جو وہاں موجود نہ ہو (اور ان گناہوں کے وقوع کو نہ جانتا ہو) اور جو شخص وہاں موجود نہ ہو لیکن وہ ان گناہوں کے وقوع کو جانتا ہو) اور وہ ان گناہوں کو برا نہ جانے تو وہ اس شخص کی مانند ہو گا جو وہاں موجود ہو (اور ان گناہوں کو برا خیال نہ کرے۔" (ابوداؤد)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ گناہ کو ہر حال میں گناہ سمجھو، اور اس کو برا خیال کرو! اگر تمہاری آنکھوں کے سامنے کسی گناہ کا ارتکاب ہو رہا ہو تو اول اس کو ہاتھ اور زبان کے ذریعہ مٹانے اور ختم کرنے کی کوشش کرو اگر ان دونوں میں سے کسی کی بھی طاقت و قدرت نہیں رکھتے ہو تو پھر جو آخری درجہ ہے اس کو اختیار کرو یعنی اس گناہ کو برا خیال کرو اور دل میں اس کے خلاف نفرت کا جذبہ رکھو۔ اس صورت میں تمہارا شمار گویا ان لوگوں کے زمرہ میں ہو گا جو وہاں موجود ہی نہ ہوں، اور جن کی آنکھوں کے سامنے اس گناہ کا ارتکاب نہ ہو رہا ہو! اس سے واضح ہوا کہ حقیقی موجودگی و غیر موجودگی کا تعلق دل سے ہے نہ کہ جسم و بدن سے، چنانچہ جس شخص نے اپنی آنکھوں کے سامنے ہونے والے گناہ کو برا خیال کیا اور دل میں بھی اس کے خلاف نفرت رکھی تو گویا حقیقت میں وہ اس جگہ موجود نہیں جہاں وہ گناہ کیا جا رہا ہے، اگرچہ ظاہری طور پر وہاں موجود ہے اور اگر کسی شخص نے گناہ کو گناہ نہیں سمجھا یعنی اس گناہ کو اور اس گناہ کے مرتکب کو دل میں برا خیال نہیں کیا تو گویا وہ حقیقت میں اس جگہ موجود ہے یہاں وہ گناہ کیا جا رہا ہے اگرچہ ظاہری طور پر وہاں موجود نہیں ہے۔

برائیوں کو مٹانے کی جدوجہد نہ کرنا عذاب الٰہی کو دعوت دینا ہے

(۶) وَعَنْ اَبِیْ بَکْرِ نِ الصَّدِّیْقِ قَالَ یَاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّکُمْ تَقْرَءُوْنَ هٰذِهِ الْاٰیَةَ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَاَوْا مُنْکَرًا فَلَمْ یُغَیِّرُوْهُ یُوْشِكُ اَنْ یَّعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابِهٖ۔ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَصَحَّحَهُ وَفِیْ رِوَایَةِ اَبِیْ دَاؤُدَ اِذَا رَاَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ یَاْخُذُوْا عَلٰی یَدَیْهِ اَوْشَكَ اَنْ یَّعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابِهٖ وَفِیْ اُخْرٰی لَهٗ مَا مِنْ قَوْمٍ یُّعْمَلُ فِیْهِمْ بِالْمَعَاصِیْ ثُمَّ یَقْدِرُوْنَ عَلٰی اَنْ یُّغَیِّرُوْا ثُمَّ لَا یُغَیِّرُوْنَ اِلَّا یُوْشِكُ اَنْ یَّعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ وَفِیْ اُخْرٰی لَهٗ مَا مِنْ قَوْمٍ یُّعْمَلُ فِیْهِمْ بِالْمَعَاصِیْ هُمْ اَکْثَرُ مِمَّنْ یَّعْمَلُهٗ۔

"اور حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) انہوں نے فرمایا۔ "لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ "یعنی اے مؤمنو! تم اپنے نفسوں کو لازم پکڑ لو جو شخص گمراہ ہو گیا ہے وہ تم کو ضرر نہیں پہنچائے گا جب کہ تم ہدایت یافتہ ہو (لہٰذا حضرت ابوبکرؓ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ تم اس آیت کی تلاوت کرتے ہو اور اس کے معنی کو عموم و اطلاق پر محمول کرتے ہوئے یہ سمجھتے ہو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب نہیں ہے۔ حالانکہ تمہارا یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب لوگ کسی خلاف شرع امر کو دیکھیں اور اس کی اصلاح و سرکوبی کے لئے کوشش نہ کریں اور لوگوں کو اس سے باز نہ رکھیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے عذاب میں مبتلا کر دے۔" اس روایت کو ابن ماجہؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے! نیز ابوداؤدؒ کی روایت میں یوں ہے کہ (حضور ﷺ نے فرمایا) "جب لوگ کسی کو ظلم کرتے دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں (یعنی اس کو ظلم کرنے سے نہ روکیں) تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے عذاب کی گرفت میں لے لے۔" اور ابوداؤدؒ ہی کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (حضور ﷺ نے فرمایا)۔ "جس قوم میں گناہ و معاصی کا ارتکاب ہونے لگے اور اس قوم کے لوگ ہاتھ اور زبان کے ذریعہ) ان کی اصلاح و سرکوبی کی قدرت رکھتے ہوں، لیکن اس کے باوجود وہ اس کی اصلاح و سرکوبی کی کوشش نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو عذاب میں مبتلا کر دے۔" ابوداؤدؒ ہی کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (حضور ﷺ نے فرمایا) جس قوم میں گناہ و معاصی کا ارتکاب ہونے لگے اور اس قوم میں ان لوگوں کی تعداد زیادہ ہو جو گناہ و معاصی کا

ارتکاب نہیں کرتے (لیکن اس کے باوجود وہ اپنے میں کے گناہ گار لوگوں کو گناہوں سے باز نہ رکھیں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے عذاب میں گرفتار کریگا۔"

تشریح: آخری روایت کے الفاظ کا حاصل یہ ہے کہ جب برے لوگوں کے مقابلہ میں اچھے لوگوں کی تعداد زیادہ ہو اور وہ اچھے لوگ اپنی کثرت کے باوجود ان لوگوں پر قابو نہ پائیں اور ان کو گناہ و معاصی کے راستہ سے نہ روکیں تو وہ یقیناً عذاب اللہ کے مستوجب قرار پائیں گے کیونکہ ان کا اکثریت میں ہونا، برائیوں کو مٹانے پر قدرت رکھنے کے مترادف ہے۔ اور قدرت رکھنے کے باوجود برائیوں کی بیخ کنی کی جد وجہد اور سعی نہ کرنا ایک ایسی غفلت و تقصیر ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے۔

مذکورہ آیت کے بارے میں یہ وضاحت فرمائی گئی ہے کہ یہ آیت اپنے حکم کے اعتبار سے عام و مطلق نہیں ہے بلکہ اس امر کے ساتھ مخصوص و مقید ہے کہ جو لوگ وعظ و نصیحت اور تنبیہ و تہدید کے باوجود برائی کا راستہ ترک نہ کریں، ان پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کوئی اثر نہ ہو اور وہ اپنے اختیار کیے ہوئے راستہ پر مطمئن وخوش ہوں، جیسا کہ قرب قیامت میں لوگوں کا یہی حال ہوگا تو ایسے لوگوں کے بارے میں مذکورہ آیت کہتی ہے کہ ایسے لوگوں کی برائیوں کا وبال ان بندگان خدا کو کوئی نقصان وضرر نہیں پہنچاسکتا، جن کو خدا نے ہدایت یافتہ بنایا ہے اور جو برائیوں کے راستہ سے دور رہتے ہیں! اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ اس آیت کو لوگوں نے حضرت ابن مسعودؓ کے سامنے پڑھا (اور اس کا مطلب جاننا چاہا) تو انہوں نے فرمایا کہ تم جس زمانہ میں ہو وہ زمانہ اس آیت کا محمول نہیں ہے کیونکہ تمہارے زمانہ کے لوگ تو اچھی باتوں کو سنتے ہیں اور انکا اثر قبول کرتے ہیں، البتہ آخر میں ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جب بندگان خدا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں گے تو لوگ ان کی باتوں کو نہیں سنیں گے، چنانچہ یہ آیت اس آنے والے زمانہ کے بارے میں آگاہ کر رہی ہے اسی طرح حضرت ابو ثعلبہؓ کی روایت جو آگے آرہی ہے اس پر دلالت کرتی ہے۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت میں "ہدایت یافتہ" سے مراد وہ مؤمن ہیں جو برے کاموں کی تردید و تغلیظ کریں اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں۔ اس مناسبت سے مذکورہ بالا حدیث کو اس آیت کی تفسیر کہا جاسکتا ہے! "ضرر" سے مراد عام عذاب ہے، نیز "انفسکم" سے مراد مسلمان ہیں "تم اپنے نفسوں کو لازم پکڑلو" کا مطلب یہ ہوگا کہ تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کی اصلاح وہدایت کرنے کی ذمہ داری کو پوری طرح انجام دیتے رہو اگر تم اس طور پر عامل رہوگے اور ایک دوسرے کو برائیوں سے روک کر ہدایت کا راستہ پکڑے رہوگے تو تمہیں کوئی گمراہی بہکا نہیں سکتی اور کسی کے گناہ کا وبال نقصان نہیں پہنچاسکتا۔

ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! تم اپنے آپ کو گناہوں سے محفوظ رکھو، اگر تم نے گناہوں اور برائیوں سے خود کی حفاظت کرلی اور اس طرح ہدایت یافتہ بن گئے، نیز کسی وجہ سے تم امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے سے عاجز رہے تو پھر تمہیں ان لوگوں کی گمراہی کا وبال کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا جو خلاف شرع امور اور برائیوں کا ارتکاب کر کے گمراہ ہوگئے ہوں۔

(۷) وَعَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامِنْ رَجُلٍ يَكُوْنُ فِيْ قَوْمٍ يَعْمَلُ فِيْهِمْ بِالْمَعَاصِيْ يَقْدِرُوْنَ عَلٰى اَنْ يُغَيِّرُوْا عَلَيْهِ وَلَا يُغَيِّرُوْنَ اِلَّا اَصَابَهُمُ اللّٰهُ مِنْهُ بِعِقَابٍ قَبْلَ اَنْ يَمُوْتُوْا۔

(رواہ ابوداؤد وابن ماجہ)

"اور حضرت جریر بن عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ "جس قوم کا کوئی شخص گناہ و معاصی کا ارتکاب کرتا ہو اور اس قوم کے لوگ اس پر قدرت رکھتے ہوں کہ (ہاتھ یا زبان کے ذریعہ) اس گناہ کی اصلاح و سرکوبی کریں اور اس شخص پر قابو پائیں لیکن اس کے باوجود وہ اس کی اصلاح نہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر اپنی طرف سے عذاب نازل کرتا ہے قبل اس کے کہ وہ مریں۔"

(ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وہ عذاب اسی دنیا میں نازل ہوتا ہے۔ خواہ اس کی صورت کچھ ہی ہو! اس سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ترک کی وجہ سے دنیا میں بھی عذاب پہنچتا ہے اور آخرت کا عذاب باقی رہتا ہے جو وہاں پہنچے گا، اس کے برخلاف اور گناہوں کے مرتکبین پر اس دنیا میں عذاب ہونا ضروری نہیں ہے۔

آخر زمانہ میں دین پر عمل کرنے کی فضیلت واہمیت

⑧ وَعَنْ اَبِيْ ثَعْلَبَةَ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ فَقَالَ اَمَا وَاللّٰهِ لَقَدْ سَاَلْتُ عَنْهَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ بَلِ ائْتَمِرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنَاهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ حَتّٰى اِذَا رَاَيْتَ شُحًّا مُّطَاعًا وَّهَوًى مُّتَّبَعًا وَّدُنْيَا مُؤْثَرَةً وَّاِعْجَابَ كُلِّ ذِيْ رَاْيٍ بِرَاْيِهٖ وَرَاَيْتَ اَمْرًا لَّا بُدَّ لَكَ مِنْهُ فَعَلَيْكَ نَفْسَكَ وَدَعْ اَمْرَ الْعَوَامِّ فَاِنَّ وَرَآءَكُمْ اَيَّامَ الصَّبْرِ فَمَنْ صَبَرَ فِيْهِنَّ قَبَضَ عَلَى الْجَمْرِ لِلْعَامِلِ فِيْهِنَّ اَجْرُ خَمْسِيْنَ رَجُلًا يَّعْمَلُوْنَ مِثْلَ عَمَلِهٖ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَجْرُ خَمْسِيْنَ مِنْهُمْ قَالَ اَجْرُ خَمْسِيْنَ مِنْكُمْ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ)

"اور حضرت ابو ثعلبہؓ سے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم کی تفسیر میں منقول ہے کہ انہوں نے کہا جان لو خدا کی قسم میں نے رسول کریم ﷺ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا (کہ کیا میں اس آیت کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے سے باز رہوں؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ (ہرگز نہیں) تم اس فریضہ کی ادائیگی سے باز نہ رہو) بلکہ نیکیوں کا حکم دیتے رہو یہاں تک کہ جب تم بخل کو دیکھو کہ لوگ اس کی اتباع کرنے لگے ہیں، جب تم خواہشات نفس کو دیکھو کہ لوگ اس کے غلام بن گئے ہیں، جب دنیا کو دیکھو کہ لوگ اس کے غلام بن گئے ہیں، جب دنیا کو دیکھو کہ لوگ اس کو آخرت پر ترجیح دینے لگے ہیں، جب تم دیکھو کہ ہر عقل مند اور کسی مسلک کا پیروا اپنی ہی عقل اور اپنے ہی مسلک کو سب سے اچھا اور پسندیدہ سمجھنے لگا ہے (کہ نہ تو وہ کتاب وسنت اور اجماع اُمت اور قیاس کی طرف نظر کرتا ہے اور نہ علماء اور اہل حق کی طرف رجوع کرتا ہے بلکہ محض اپنے نفس ہی کو سب سے بڑا حاکم اور مفتی سمجھنے لگا ہے) اور جب تم کسی ایسی چیز کو دیکھو کہ جس کے علاوہ تمہارے لئے کوئی چارہ کار نہ ہو تو (ان سب صورتوں میں) اپنے آپکو لازم پکڑ لو (یعنی اپنی ذات کو گناہوں سے محفوظ رکھو) اور عوام کے معاملات سے کوئی تعلق نہ رکھو (بلکہ ان سے گوشہ نشینی اختیار کرو) کیونکہ تمہارے سامنے آخر زمانہ میں ایسے دن آنے والے ہیں جن میں صبر کرنا ضروری ہوگا (اور ان ایام کی ابتداء خلفاء راشدین کے بعد ہی ہوگئی ہے اور تاحال ان کا سلسلہ جاری ہے) لہٰذا جس شخص نے ان دنوں میں صبر کر لیا (یعنی اس سخت زمانہ میں دین پر عمل پیرا رہنے کی کلفت ومشقت کو برداشت کر لیا) اس کی حالت یہ ہوگی کہ گویا اس نے اپنے ہاتھ میں انگارا لے لیا ہے اور ان دنوں میں جو شخص دین وشریعت کے احکام پر عمل کرے گا اس کو ان پچاس لوگوں کے عمل کے برابر ثواب ملے گا جو اس شخص جیسے عمل کریں (اور ان کا تعلق نہ ان سخت ایام سے ہو اور نہ ان کو دین پر عمل کرنے کے سلسلے میں وہ تکالیف ومصائب برداشت کرنا پڑے جو اس شخص کو برداشت کرنا پڑیں گے)۔" صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ان پچاس لوگوں کے عمل کا اعتبار ہوگا جو تمہارے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا تم میں سے پچاس آدمیوں کا اجر وثواب۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: ورایت امرا لابدلك (اور جب تم ایسی چیز دیکھو جس کے علاوہ چارۂ کار نہ ہو) کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی ایسی برائی کا دور دورہ ہو کہ جس کی طرف خواہش نفس کا میلان ہوتا ہے اور لوگوں کے درمیان آنے اور ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے جبلت طبعی کی بناء پر بے اختیار اس برائی میں مبتلا ہو جانے کا خدشہ ہو تو اس صورت میں ان لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر لینا لازم ہے تاکہ اس برائی کا ارتکاب نہ ہو! اور بعض حواشی میں یہ مطلب لکھا ہے لابدلک سے مراد اپنے عجز کے سبب نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے سے معذور رہنا ہے!

یعنی اگر تم کسی ایسی برائی کو دیکھو جس سے لوگوں کو روکنے اور منع کی طاقت تم نہ رکھتے ہو اور اس وجہ سے تم نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے سے سکوت و اعراض کرتے ہو تو اس صورت میں تمہارے لئے یہ ضروری ہے کہ تم ایسے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر لو جو اس برائی میں مبتلا ہیں۔ یہ معنی کتاب کے ان نسخوں کی روایت کے مطابق ہیں جن میں لابدلک (جس کے علاوہ تمہارے لئے کوئی چارہ کار نہ ہو) کے بجائے لَایَدَلَکَ (بمعنی لاقدرۃ لکَ علیہ یعنی جس سے روکنے اور منع کرنے کی طاقت وقدرت تمہیں حاصل نہ ہو) کے الفاظ ہیں! یا مذکورہ جملہ کی مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اگر تمہیں کوئی ایسا امر درپیش ہو جو تمہارے لئے نہایت ضروری ہو اور سخت اہمیت کا حامل ہو اور اس کی وجہ سے تم نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہ دے سکتے ہو بایں طور کہ اگر تم اپنی توجہ اور اپنے وقت کو اس فریضہ کی انجام دہی میں لگاتے ہو تو تمہارا وہ ضروری امر فوت ہو جاتا، ہو تو اس صورت میں تم ان لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر لو، جو برائیوں میں مبتلا ہیں اور جن کو ان برائیوں سے روکنے سے تم معذور ہو۔

"اور عوام کے معاملات سے کوئی تعلق نہ رکھو" کا مطلب یہ ہے کہ جب تم کچھ لوگوں کو دیکھو کہ وہ گناہ کرتے ہیں اور برائیوں میں مبتلا ہیں مگر تم طاقت وقدرت نہ رکھنے کی وجہ سے ان لوگوں کو نیکی کی تلقین کرنے اور برائی سے روکنے سے سکوت و عراض کرنا ضروری سمجھتے ہو تو اس صورت میں تمہیں چاہئے کہ بس اپنی ذات کی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے کے بجائے خود اپنے آپ کو گناہوں اور برائیوں سے محفوظ رکھنے اور نیک کاموں کو اختیار کرنے میں مشغول رہو، نیز لوگوں کے معاملات وحالات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو، وہ اگر چاہے تو اپنے فضل و کرم سے خود ہی ان کو راہ راست پر لے آئے گا ورنہ ان کو سخت سزا دے گا۔ اس حکم کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو بس اسی قدر ذمہ دار قرار دیتا ہے، جتنی ذمہ داری اٹھانے کی وہ طاقت وقدرت رکھتا ہو۔

"گویا اس نے اپنے ہاتھ میں انگارہ لے لیا ہے" یہ جملہ دراصل مشقت و کلفت برداشت کرنے سے کنایہ ہے یعنی اس زمانہ میں دین پر چلنا اور دنیا سے بے رغبتی رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا بلکہ یہ کام اتنا سخت اور اس قدر مصائب اور کلفتوں سے بھرپور ہوگا کہ جیسے کوئی شخص اپنے ہاتھ پر دہکتا ہوا انگارہ رکھ لے اور پھر اس کی تکلیف واذیت کو برداشت کر لے۔

حدیث کے آخری جزء سے مذکورہ صفت (یعنی دین پر عمل پیرا ہونے کی کلفت و مشقت برداشت کرنے اور اس پر صابر و شاکر رہنے) میں صحابہؓ پر آخر زمانہ کے دیندار لوگوں کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جزوی فضیلت، کلی فضیلت کے منافی نہیں ہوسکتی، چنانچہ ابوعمرو بن عبدالبر نے، جو مشاہیر محدثین میں سے ہیں، اپنی کتاب استیعاب میں اس مسئلہ پر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ اس اُمت میں صحابہؓ کے بعد کوئی ایسا شخص پیدا ہو جو کسی صحابیؓ کے مرتبہ جیسی فضیلت رکھتا ہو بلکہ صحابیؓ سے زیادہ فضیلت کا حامل ہو! انہوں نے اپنے اس قول کی دلیل میں ان احادیث کو پیش کیا ہے جن سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے، لیکن علماء کا مختار قول اس کے خلاف ہے تاہم واضح رہے کہ یہ اختلاف اقوال بس ان صحابہؓ کی حد تک ہے جو آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر ایمان لائے اور واپس اپنے وطن چلے گئے، اس سے زیادہ محبت رسول ﷺ ان کو حاصل نہ رہی، ورنہ جہاں تک ان صحابہؓ کرام کی ذات کا تعلق ہے جنہیں آنحضرت ﷺ کی طویل صحبت ورفاقت کا شرف حاصل رہا ہے اور جو شب وروز آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر رہے اور انہوں نے آثار وانوار صحبت جمع کیے ان کی ذات اس اختلاف اقوال سے ماوراء ہے کہ ان کے بارے میں کسی بھی عالم کا یہ قول نہیں ہے کہ اس اُمت کا کوئی بھی فرد ان صحابہؓ میں سے کسی کے رتبہ کے بقدر یا اس سے زائد فضیلت رکھ سکتا ہے، بلکہ ہم تو جمہور علماء کے قول کے مطابق بلا استثناء تمام ہی صحابہؓ کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ شرف صحابیت کا مرتبہ ہر ایک صحابیؓ کو حاصل ہے خواہ وہ آنحضرت ﷺ کے دست مبارک پر ایمان لا کر اپنے وطن چلے گئے ہوں اور خواہ تمام عمر آنحضرت ﷺ کی خدمت ورفاقت میں رہے ہوں، اور یہ شرف بذات خود اس درجہ کا ہے کہ ان کے علاوہ کوئی بھی فرد اس مرتبہ میں ان کا شریک نہیں ہوسکتا، لہٰذا اس اُمت کا کوئی بڑے سے بڑا شخص

بھی بلا استثناء کسی بھی صحابیؓ کے مرتبہ جیسی فضیلت نہیں رکھ سکتا! قوت القلوب میں کیا خوب لکھا ہے کہ جمال مصطفی ﷺ پر پڑنے والی ایک ہی نظر سے وہ حقائق آشکارا ہو جاتے ہیں اور وہ مقام و مقصد حاصل ہو جاتا ہے جو دوسروں کو سالہا سال کے چلوں اور قرنہا قرن کی ریاضت و مجاہدہ سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

حضور کے ایک جامع خطبہ کا ذکر

(۹) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَامَ فِیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَطِیْبًا بَعْدَ الْعَصْرِ فَلَمْ یَدَعْ شَیْئًا یَکُوْنُ اِلٰی قِیَامِ السَّاعَۃِ اِلَّا ذَکَرَہٗ حَفِظَہٗ مَنْ حَفِظَہٗ وَنَسِیَہٗ مَنْ نَسِیَہٗ وَکَانَ فِیْمَا قَالَ اِنَّ الدُّنْیَا حُلْوَۃٌ خَضِرَۃٌ وَّاِنَّ اللّٰہَ مُسْتَخْلِفُکُمْ فِیْہَا فَنَاظِرٌ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ اَلَا فَاتَّقُوا الدُّنْیَا وَاتَّقُوا النِّسَآءَ وَذَکَرَ اَنَّ لِکُلِّ غَادِرٍ لِوَآءً یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ بِقَدْرِ غَدْرَتِہٖ فِی الدُّنْیَا وَلَا غَدْرَ اَکْبَرُ مِنْ غَدْرِ اَمِیْرِ الْعَآمَّۃِ یُغْرَزُ لِوَآءُہٗ عِنْدَ اِسْتِہٖ قَالَ وَلَا یَمْنَعَنَّ اَحَدًا مِّنْکُمْ ھَیْبَۃُ النَّاسِ اَنْ یَّقُوْلَ بِحَقٍّ اِذَا عَلِمَہٗ وَفِیْ رِوَایَۃٍ اِنْ رَاٰی مُنْکَرًا اَنْ یُّغَیِّرَہٗ فَبَکٰی اَبُوْ سَعِیْدٍ وَّ قَالَ قَدْ رَاَیْنَاہُ فَمَنَعَتْنَا ھَیْبَۃُ النَّاسِ اَنْ نَّتَکَلَّمَ فِیْہِ ثُمَّ قَالَ اَلَا اِنَّ بَنِیْ اٰدَمَ خُلِقُوْا عَلٰی طَبَقَاتٍ شَتّٰی فَمِنْھُمْ مَّنْ یُّوْلَدُ مُؤْمِنًا وَّیَحْیٰی مُؤْمِنًا وَّیَمُوْتُ مُؤْمِنًا وَّمِنْھُمْ مَنْ یُّوْلَدُ کَافِرًا وَّیَحْیٰی کَافِرًا وَّیَمُوْتُ کَافِرًا وَّمِنْھُمْ مَّنْ یُّوْلَدُ مُؤْمِنًا وَّیَحْیٰی مُؤْمِنًا وَّیَمُوْتُ کَافِرًا وَّمِنْھُمْ مَّنْ یُّوْلَدُ کَافِرًا وَّیَحْیٰی کَافِرًا وَّیَمُوْتُ مُؤْمِنًا قَالَ وَذَکَرَ الْغَضَبَ فَمِنْھُمْ مَّنْ یَّکُوْنُ سَرِیْعَ الْغَضَبِ سَرِیْعَ الْفَیْءِ فَاِحْدٰھُمَا بِالْاُخْرٰی وَمِنْھُمْ مَنْ یَّکُوْنُ بَطِیْءَ الْغَضَبِ بَطِیْءَ الْفَیْءِ فَاِحْدٰھُمَا بِالْاُخْرٰی وَخِیَارُکُمْ مَّنْ یَّکُوْنُ بَطِیْءَ الْغَضَبِ سَرِیْعَ الْفَیْءِ وَشِرَارُکُمْ مَنْ یَّکُوْنُ سَرِیْعَ الْغَضَبِ بَطِیْءَ الْفَیْءِ قَالَ اتَّقُوا الْغَضَبَ فَاِنَّہٗ جَمْرَۃٌ عَلٰی قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ اَلَا تَرَوْنَ اِلَی انْتِفَاخِ اَوْدَاجِہٖ وَحُمْرَۃِ عَیْنَیْہِ فَمَنْ اَحَسَّ بِشَیْءٍ مِّنْ ذٰلِکَ فَلْیَضْطَجِعْ وَلْیَتَلَبَّدْ بِالْاَرْضِ قَالَ وَذَکَرَ الدَّیْنَ فَقَالَ مِنْکُمْ مَنْ یَّکُوْنُ حَسَنَ الْقَضَآءِ وَاِذَا کَانَ لَہٗ اَفْحَشَ فِی الطَّلَبِ فَاِحْدٰھُمَا بِالْاُخْرٰی وَمِنْھُمْ مَّنْ یَّکُوْنُ سَیِّءَ الْقَضَآءِ وَاِنْ کَانَ لَہٗ اَجْمَلَ فِی الطَّلَبِ فَاِحْدٰھُمَا بِالْاُخْرٰی وَخِیَارُکُمْ مَّنْ اِذَا کَانَ عَلَیْہِ الدَّیْنُ اَحْسَنَ الْقَضَآءَ وَاِنْ کَانَ لَہٗ اَجْمَلَ فِی الطَّلَبِ وَشِرَارُکُمْ مَّنْ اِذَا کَانَ عَلَیْہِ الدَّیْنُ اَسَآءَ الْقَضَآءِ وَاِنْ کَانَ لَہٗ اَفْحَشَ فِی الطَّلَبِ حَتّٰی اِذَا کَانَتِ الشَّمْسُ عَلٰی رُؤُسِ النَّخْلِ وَاَطْرَافِ الْحِیْطَانِ فَقَالَ اَمَا اِنَّہٗ لَمْ یَبْقَ مِنَ الدُّنْیَا فِیْمَا مَضٰی مِنْھَا اِلَّا کَمَا بَقِیَ مِنْ یَّوْمِکُمْ ھٰذَا فِیْمَا مَضٰی مِنْہُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) عصر کے بعد رسول کریم ﷺ ہمارے سامنے کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا، اس خطبہ میں آپ ﷺ نے (متعلقات دین میں سے) ایسی کوئی ضروری بات نہیں چھوڑی جو قیامت تک پیش آ سکتی ہے، آپ ﷺ نے ان باتوں کو ذکر فرمایا، اور یاد رکھنے والے نے ان کو یاد رکھا اور بھولنے والا اس کو بھول گیا (یعنی وہ باتیں اتنی تفصیل اور ہمہ گیری کے ساتھ بیان ہوئیں کہ بعض لوگوں کو تو یاد رہیں اور بعض لوگوں کے حافظہ نے ان کو فراموش کر دیا) آپ ﷺ نے اس وقت جو کچھ فرمایا اس میں یہ بھی تھا کہ۔ "دنیا بڑی شیریں اور ہری بھری ہے اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس دنیا میں خلیفہ بنایا ہے۔ لہٰذا وہ دیکھتا ہے کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو! پس خبردار! تم دنیا سے بچنا اور عورتوں سے دور رہنا۔" آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ۔ "قیامت کے دن ہر عہد شکن کے لئے ایک نشان (علامتی جھنڈا) کھڑا کیا جائے گا جو دنیا میں اس کی عہد شکنی کے بقدر ہوگا (یعنی جس شخص نے دنیا میں) جتنی زیادہ عہد شکنی کی ہوگی اس کا وہ نشان اسی قدر بلند و نمایاں ہوگا تاکہ میدان حشر میں اس کو عام طور پر پہچان لیا جائے کہ یہ عہد شکنی کا مرتکب ہے اور اس نے کتنی زیادہ عہد شکنی کی ہے اور اس طرح کا علامتی نشان ہر باعث حق و باطل کے لئے ہوگا تاکہ ایک کو دوسرے سے امتیاز کر کے پہچانا جا سکے جیسے اس دنیا میں امراء اور مقتدرین اپنے ساتھ کوئی علامتی نشان رکھتے ہیں" اور کوئی عہد شکنی امیر عامہ کی عہد شکنی سے زیادہ بڑی نہیں، چنانچہ اس کا

نشان اس کی مقعد کے قریب کھڑا کیا جائے گا (تاکہ اس کی زیادہ فضیحت ورسوائی ہو۔" حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ۔ "تم میں سے کسی کو بھی کوئی خوف وہیبت حق بات کہنے سے باز نہ رکھے، جب کہ وہ حق بات سے واقف ہو (یعنی کوئی شخص کلمہ الحق کہنے میں کسی کا کوئی خوف ولحاظ نہ کرے بلکہ اس کو برملا کہے) ہاں اس کی وجہ سے جان جانے کا خوف ہو تو معذوری ہے اگرچہ اس صورت میں بھی اس سے باز رہنا اولی ہوگا) اور ایک اور روایت میں اس جگہ وَلَا یمنعن احدامنکم ھیبة النّاس ان یَقُوْلُ بحق کے بجائے) یہ ہے کہ "جب تم میں سے کوئی شخص کسی خلاف شرع امر کو دیکھے تو لوگوں کا کوئی خوف وہیبت اس کو خلاف شرع امر کی اصلاح وسرکوبی سے باز نہ رکھے۔" یہ بیان کر کے) حضرت ابوسعید خدری رو پڑے اور کہنے لگے کہ ہم نے خلاف شرع امر کو (اپنی آنکھ سے) دیکھا اور لوگوں کے خوف سے ہم اس کے بارے میں کچھ نہ کہہ سکے۔ (اس کے بعد حضرت ابوسعید نے بیان کیا کہ) حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا۔ "جان لو! آدم علیہ السلام کی اولاد کو مختلف جماعتوں اور متضاد اقسام ومراتب کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے چنانچہ ان میں سے بعض وہ ہیں جن کو مؤمن پیدا کیا جاتا ہے، جو (سن تمیز سے لے کر آخر عمر تک گویا ساری عمر) ایمان کی حالت میں زندہ رہتے ہیں اور ایمان ہی پر ان کا خاتمہ ہوتا ہے اور ان میں سے بعض وہ ہیں جن کو کافر پیدا کیا جاتا ہے، جو کفر ہی کی حالت میں (ساری عمر) زندہ رہتے ہیں اور کفر ہی پر ان کا خاتمہ ہوتا ہے! اور ان میں سے بعض وہ ہیں جن کو مؤمن پیدا کیا جاتا ہے وہ ایمان ہی کی حالت میں (ساری عمر) رہتے ہیں لیکن ان کا خاتمہ کفر پر ہوتا ہے! اور ان میں سے بعض وہ ہیں جن کو کافر پیدا کیا جاتا ہے، وہ کفر ہی کی حالت میں (ساری عمر) گزارتے ہیں لیکن ان کا خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے۔" حضرت ابوسعید کہتے ہیں کہ (اس موقع پر) حضور ﷺ نے غضب وغصہ کی قسموں کو بھی ذکر کیا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "بعض آدمی بہت جلد غضب ناک ہو جاتے ہیں لیکن ان کا غضب وغصہ جلد ہی ختم بھی ہو جاتا ہے (یعنی کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں ذرا سی بات پر جلد ہی غصہ آجاتا ہے لیکن ان کا غصہ جتنی تیزی کے ساتھ ہے اسی تیزی کے ساتھ فرو بھی ہو جاتا ہے) چنانچہ ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کا بدل بن جاتا ہے (یعنی جلد غصہ آنا بری خصلت ہے اور غصہ کا جلد جاتے رہنا اچھی خصلت ہے، لہذا جس شخص میں یہ دونوں خصلتیں ہوں تو ان میں سے جو خصلت اچھی ہے وہ بری خصلت کی مکافات کر دیتی ہے، اس طرح اس بارے میں وہ شخص نہ تو مدح وتحسین کا مستحق ہوتا ہے اور نہ برائی کا مستوجب، بلکہ دونوں خصلتوں کا حامل ہونے کی وجہ سے بین بین رہتا ہے، بایں اعتبار اس کے متعلق نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ لوگوں میں بہتر شخص ہے اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ لوگوں میں بدتر شخص ہے) اور بعض آدمی ایسا ہوتا ہے کہ اس کو غصہ دیر میں آتا ہے اور دیر سے جاتا ہے (ایسا شخص بھی ایک اچھی خصلت رکھتا ہے اور ایک بری خصلت کہ اگرچہ غصہ کا دیر میں آنا اچھا ہے لیکن اس کا دیر سے جانا برا ہے۔ چنانچہ ایسا شخص بھی بین بین ہوتا ہے کہ اس کو بہترین شخص کہا جاسکتا ہے اور نہ بدترین شخص، لہذا تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جن کو غصہ دیر سے آتا ہے اور جلد فرو ہو جاتا ہے جب کہ تم میں بدترین شخص وہ ہے جس کو جلد غصہ آئے اور دیر میں غصہ جائے۔" (اس کے بعد) حضور ﷺ نے فرمایا۔ "تم غصہ سے بچو (یعنی ایسا کام نہ کرو جس سے غصہ آئے یا یہ مطلب ہے کہ غصہ سے خدا کی پناہ مانگو اور اس کے درجہ اس خصلت سے بچو (کیونکہ وہ غصہ ابن آدم کے قلب پر ایک دہکتا ہوا انگارہ ہے (یعنی غصہ آگ کے انگارہ کی طرح حرارت غریزیہ اور حدت جبلیہ رکھتا ہے جو نفس کی انگیٹھی میں دبا ہوا ہے، اور جب خواہش نفس اس کو بھڑکاتی ہے تو اس کی حرارت اور تیزی قلب پر غالب آجاتی ہے اور عقل اپنا تصرف کرنے سے عاجز رہتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص اپنے غصہ کی آگ میں دوسروں کو تو جلاتا ہے لیکن خود کو بھی جلا ڈالتا ہے) کیا تم نہیں دیکھتے کہ (جب کوئی شخص غضب ناک ہوتا ہے تو) اس کی گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں اور آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں (یعنی یہ چیزیں دراصل اسی غصہ کی حرارت غریزیہ اور انجارات غلیظہ کے اٹھنے کا اثر ہوتی ہیں، اس اس طرح غضب ناک شخص کا ظاہر گویا اس کے باطن کا غماز ہوتا ہے) لہذا جب کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ اب غصہ آیا ہی چاہتا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ فوراً پہلو پر لیٹ جائے اور زمین سے چمٹ جائے۔" اور

حضور ﷺ نے قرض کا بھی ذکر کیا (یعنی قرض قرضدار اور قرض خواہ کے احوال و اقسام کو بھی بیان کیا) چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ۔ "تم میں سے بعض آدمی ایسا ہوتا ہے کہ وہ (قرض کی) ادائیگی میں تو اچھا رہتا ہے لیکن اپنا قرض وصول کرنے میں سختی کرتا ہے (یعنی اگر اس پر کسی کا قرض ہوتا ہے تو اس کو ادا کرنے میں صفائی معاملہ اور خوبی کا ثبوت دیتا ہے، لیکن جب اس کا قرض کسی پر ہوتا ہے تو اس کو قرض دار سے وصول کرنے میں سختی کرتا ہے بایں طور کہ مطالبہ و تقاضا کے وقت اس قرض دار کا کوئی ادب و لحاظ نہیں کرتا اور سختی و بد کلامی کے ذریعہ اس کو ایذاء پہنچاتا ہے اس طرح اس میں قرض کو خوبی کے ساتھ ادا کرنے کی بھی خصلت ہوتی ہے اور اصولی قرض میں برائی اختیار کرنے کی بھی خصلت چنانچہ اس کی دونوں خصلتوں میں سے ہر ایک دوسری کا بدل ہو جاتی ہے، لہٰذا تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو کسی کا قرض ادا کرنے میں بھی اچھے ہوں اور کسی سے اپنا قرض وصول کرنے میں بھی اچھے ہوں اور تم میں بدترین لوگ وہ ہیں جو کسی کا قرض ادا کرنے میں بھی برے ہوں اور کسی سے اپنا قرض وصول کرنے میں بھی برے ہوں۔" حضور ﷺ نے اپنے خطبہ میں یہ نصیحتیں فرمائیں) یہاں تک کہ جب سورج کا اثر صرف کھجوروں کی چوٹیوں اور دیواروں کے کناروں پر رہ گیا (یعنی جب دن آخر ہو گیا) تو آپ ﷺ نے یہ فرمایا۔ "یاد رکھو! اس دنیا کا جو زمانہ گزر چکا ہے اس کی بہ نسبت اب صرف اتنا زمانہ باقی رہ گیا ہے جتنا کہ آج کے دن کے گزرے ہوئے حصہ کی بہ نسبت یہ آخری وقت! (یعنی جس طرح آج کے دن کا قریب قریب پورا حصّہ گزر چکا ہے اب بہت قلیل عرصہ باقی رہ گیا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "یہ دنیا بڑی شیریں اور ہری بھری ہے" کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا اپنے متعلقات کے ساتھ بظاہر اس قدر لذت آمیز اور خوش نما ہے کہ محض ظاہری حالت پر ریجھنے والے لوگوں کو طبعی طور پر اس سے بہت مناسبت اور اس کی طرف میلان ہوتا ہے اور ان کی آنکھوں میں اس کی حقیقت نہایت دلکش اور سرسبز و شاداب معلوم ہوتی ہے! بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اہل عرب کے نزدیک جو چیز نرم و نازک ہوتی ہے اور اپنی ناپائیداری کی وجہ سے زیادہ مدت نہیں ٹھہرتی بلکہ جلد جاتی رہتی ہے اس کو وہ لوگ خضروات یعنی سبزیوں اور ترکاریوں سے مشابہت دیتے ہوئے "خضراء" کہتے ہیں۔ بہر حال حدیث کے اس جملہ میں دراصل اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ یہ دنیا مکرو تصنع اور ظاہری حسن و لذات سے بھری ہوئی ہے کہ لوگوں کو اپنے ظاہری ٹیپ ٹاپ رکھنے والے حسن و جمال پر فریفتہ کرتی ہے اور اپنی جھوٹی لذات و خواہشات کی طرف مائل کرتی ہے حالانکہ اس کی تمام تر دلکشی اور رنگینی اور خواہشات و لذات بہت جلد فناہ کے گھاٹ اتر جاتی ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس دنیا میں خلیفہ بنایا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں تمہیں جو مال و دولت حاصل ہے اس کے بارے میں تم اس حقیقت کو جان لو کہ اس مال و دولت کے تم حقیقی مالک نہیں ہو بلکہ حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اور تم صرف اس کے خرچ و تصرف میں خلیفہ اور وکیل کی حیثیت رکھتے ہو۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان لوگوں کا خلیفہ قرار دیا ہے جو تم سے پہلے اس دنیا میں تھے اور ان کے اموال و جائداد کو تمہاری سپردگی میں دے دیا ہے، لہٰذا وہ یہ دیکھتا ہے کہ تم اپنے اموال و املاک کے بارے میں کیا طرز عمل اختیار کرتے ہو اور اس میں کس طرح تصرف کرتے ہو یا کہ تم گزرے ہوئے لوگوں کے احوال و انجام سے کس طرح عبرت پکڑتے ہو اور ان کے چھوڑے ہوئے اموال و جائداد میں کس طرح تصرف کرتے ہو۔

"تم دنیا سے بچو" کا مطلب یہ ہے کہ جب تم نے دنیا کی حقیقت جان لی کہ وہ فناہ ہو جانے والی چیز ہے اور اس کی کسی بھی شے کو کوئی استحکام و دوام نہیں ہے تو پھر اس کے پیچھے پڑنا نہایت نازیبا اور غیر دانش مندی کی بات ہے، لہٰذا تم دنیا کو اس قدر حاصل کرنے کی خواہش و کوشش نہ کرو جو ضرورت و حاجت سے زیادہ ہو اور ضرورت و حاجت بھی وہ کہ جس سے آبرو مندانہ زندگی کی بقاء دین کی مدد اور آخرت میں نفع حاصل ہو۔ "اسی طرح عورتوں سے بچو" کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کے حسن و جمال اور ناز و ادا کے مکرو فریب اور ان کی ناروا

محبت و شیفتگی کے جال سے اپنے آپ کو بچاؤ کہ مبادا یہ چیز مال و دولت جمع کرنے کی حرص اور دنیا کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے استغراق میں مبتلا کر دے جس کی وجہ سے تم علم و عمل کی رہ سے دور ہو جاؤ۔

"امیر عامہ" سے مراد متغلبی ہے یعنی وہ شخص جو مسلمانوں کے معاملات اور ان کے ملک و شہر پر غالب و حکمران ہو گیا ہو اور عام لوگوں نے ارباب حل و عقد یعنی علماء اور دانشوران زمانہ کی رائے و مشورہ کے بغیر اس شخص کو امیر و حاکم تسلیم کر لیا ہو اور اس کے حامی و مددگار ہوں۔

اور حضرت ابوسعید کا رونا اس احساس کی بناء پر تھا کہ ہم نے کلمہ حق کہنے کے سلسلہ میں اس مرتبہ کو ترک کر دیا جو اولیٰ ہے، اور وہ یہ کہ ہر حال میں حق بات کہی جائے خواہ اس کی پاداش میں جان ہی کیوں نہ دینی پڑے! ظاہر ہے کہ ان کا یہ احساس محض اس کے کمال ایمان اور دین کے تئیں شدت احتیاط پر مبنی تھا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس مرتبہ کو ترک کرنا اسلامی تعلیمات کے قطعاً خلاف نہیں تھا بلکہ ان احادیث پر عمل کرنے کی بناء پر تھا جن سے واضح ہوتا ہے کہ اہل ایمان کے ضعف و اضمحلال کے زمانہ میں اور عجز و بے بسی کی صورت میں کلمہ حق کہنے سے سکوت اختیار کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اس کی وجہ سے جان و مال اور آبرو کی ہلاکت و نقصان کا خوف ہو! اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ جب اسلام کے ابتدائی زمانہ میں اکابر صحابہ کرام جیسے عظیم انسان کو جو دین کے بارے میں انتہائی سخت و مضبوط تھے اور جو یقین و معرفت کی دولت سے پوری طرح مالا مال تھے اگر وہ اس وصف و مرتبہ کے باوجود، اہل باطل جیسے یزید و حجاج سفاک وغیرہ کے خوف سے اظہار حق کی قدرت نہیں رکھتے تھے تو ہم جیسے مسلمانوں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے جو اہل ایمان کے انتہائی ضعف و اضمحلال کا زمانہ پائے ہوئے ہیں جن میں باعمل علماء اور ایمانی جرأت و ایثار رکھنے والے راہبر کم ہیں جو ریاکار مشائخ و صوفیاء کی کثرت رکھتے ہیں اور جن پر اکثر ظالم امراء و حکماء مسلط ہیں! لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ زمانہ صبر و تحمل، رضا بالقضاء اور سکوت و یکسوئی اختیار کرنے اور بقدر بقاء زندگی معاشی ضروریات کے حصول پر قناعت کرنے کا ہے۔

"بعض وہ ہیں جن کو مؤمن پیدا کیا جاتا ہے" یعنی ان کی پیدائش مؤمن ماں باپ کے یہاں یا مسلم آبادی یا شہر میں ہوتی ہے اور اس اعتبار سے ان کو مؤمن کہا جاتا ہے۔ یہ وضاحت اس لئے کی جاتی ہے کہ جب کوئی شخص پیدا ہوتا ہے تو سن تمیز کو پہنچنے سے قبل اس کی طرف ایمان کی نسبت نہیں کی جاتی، یہ اور بات ہے کہ علم الٰہی کے اعتبار سے یا اس سے آئندہ زمانہ کی حالت کے اعتبار سے اس کی طرف ایمان کی نسبت کر دی جائے۔ اسی طرح "بعض وہ ہیں جن کو کافر پیدا کیا جاتا ہے" سے مراد وہ لوگ ہیں جو کافر ماں باپ سے پیدا ہوتے ہیں یا جن کی پیدائش کافروں کی آبادی اور ان کے شہر میں ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے حدیث کا یہ جملہ اس حدیث کے منافی نہیں ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ کل مولود یولد علی الفطرۃ کیونکہ اس ارشاد گرامی (کل مولود الخ) کی مراد، یہ بتانا ہے کہ جو بھی شخص اس دنیا میں آتا ہے وہ فطری طور پر ہدایت و راستی قبول کرنے کی استعداد و صلاحیت رکھتا ہے بشرطیکہ کوئی ایسا مانع پیش نہ آئے جو اس کو گمراہی کے راستہ پر ڈال دے جیسا کہ خود اسی حدیث کے بعد کے الفاظ فابواہ یہودانہ الخ اس پر دلالت کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ مذکورہ بالا ارشاد گرامی میں لوگوں کی جو قسمیں بیان کی گئی ہیں وہ غالب و اکثریت کے اعتبار سے ہیں، ورنہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مؤمن پیدا ہوتے ہیں، کفر کی حالت پر زندگی گزرتے ہیں، لیکن ان کا خاتمہ ایمان ہی کی حالت پر ہوتا ہے، اسی طرح بعض وہ ہیں جو کافر پیدا ہوتے ہیں، ایمان کی حالت پر زندگی گزارتے ہیں، لیکن ان کا خاتمہ کفر کی حالت پر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں قسمیں اس لئے ذکر نہ فرمائی گئی ہوں کہ یہاں حقیقی مقصد اس بات کو واضح کرنا ہے کہ ہدایت و گمراہی میں اصل اعتبار خاتمہ کی حالت کے ہے، اور یہ بات مذکورہ قسمیں بیان کرنے سے بھی اجمالی طور پر سمجھ میں آجاتی ہے۔

"پہلو پر لیٹ جائے اور زمین سے چمٹ جائے" غصہ آنے کے وقت اس حالت کو اختیار کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ حالت نفسیاتی طور پر غصہ کو فرو کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، کیونکہ غصہ کے وقت زمین سے لگ کر پہلو پر لیٹ جانا فوری طور پر یہ احساس پیدا کرتا

ہے کہ جب میری حقیقت بس اتنی ہے کہ میں مٹی سے پیدا ہوا اور آخر کار مٹی ہی میں مل جاؤں گا تو مجھ کو تکبر نہ کرنا چاہیے بلکہ تحمل اور انکساری کی راہ اختیار کرنی چاہئے۔

گناہ کی زیادتی موجب ہلاکت ہے

(۱۰) وَعَنْ اَبِی الْبَخْتَرِیِّ عَنْ رَجُلٍ مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَنْ یَّھْلِكَ النَّاسُ حَتّٰی یُعْذِرُوْا مِنْ اَنْفُسِھِمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوالبختری، نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ سے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "لوگ اس وقت تک ہرگز ہلاک و برباد نہیں ہوں گے جب تک کہ ان سے بہت زیادہ گناہ اور برائیاں صادر ہونے لگیں۔"

(ابوداؤدؒ)

تشریح: لفظ "یُعْذِرُوْا" یاء کے پیش، عین کے جزم اور ذال کے زیر کے ساتھ) "اعذار" سے مشتق ہے اور صراح میں لکھا ہے کہ "اعذار" کے معنی ہیں بہت گناہ گار اور باعیب ہونا۔ اس طرح قاموس میں لکھا ہے کہ اعذر فلان ای کثرت ذنوبہ وعیوبہ (یعنی جب اہل عرب یہ کہتے ہیں کہ "اعذر فلان" یعنی فلاں شخص نے اعذار کیا تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس شخص سے بکثرت گناہ اور عیوب صادر ہوئے۔) مفہوم کے اعتبار سے حدیث کے اس جملہ میں اعذار کا لفظ گویا سلب عذر کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی جب کسی شخص کے گناہ اور عیوب بکثرت ہو جائیں تو پھر اس پر حق تعالیٰ کے عذاب کے نازل ہونے اور لوگوں کی طرف سے ان کو ان گناہ و عیوب سے روکنے اور منع کرنے میں کوئی عذر حائل نہیں رہ جاتا، لہٰذا اس شخص نے اپنے گناہوں اور عیوب کی کثرت کے سبب گویا اس عذر کو ختم کر دیا جو اس کو عذاب الٰہی سے محفوظ رکھتا۔

اعذار کا لفظ صاحب عذر یعنی عذر کرنے والے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور یہ معنی بھی حدیث کے مفہوم سے مطابقت رکھتے ہیں، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ لوگ اس وقت تک ہلاکت و بربادی میں مبتلا نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے اور اپنی برائیوں کے بارے میں دور دراز کی تاویلیں اور ناروا عذر و معذرت کرنے کا رویہ اختیار نہ کریں۔

بعض روایتوں میں یہ لفظ یعذروا (یاء کے زبر کے ساتھ) منقول ہے جس کا مادہ اشتقاق عذر (عین کے زبر کے ساتھ) ہے اور اس کے معنی ہیں معذور رکھنا! اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ لوگ اس وقت تک ہلاکت و تباہی میں مبتلا نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ لوگوں کو اس طرح معذور و مجبور نہ کر دیں کہ وہ ان کو کثرت گناہ اور برائیوں میں مبتلا دیکھ کر ان کو ان گناہوں اور برائیوں سے نہ روک سکیں اور نہ ان پر ملامت کر سکیں۔

بہرحال تینوں صورتوں میں حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دنیا کے مصائب و آفات اور ہلاکت و تباہی میں صرف اسی وقت مبتلا کرتا ہے جب کہ وہ گناہوں اور خلاف شرع امور کے ارتکاب میں منہمک ہو جاتے ہیں، احکام الٰہی کی نافرمانی کثرت سے کرنے لگتے ہیں، اور جب خدا کے نیک بندے ان کو گناہوں اور برائیوں سے روکتے ہیں تو ان کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے بلکہ نہایت بے حسی اور لاپرواہی کے ساتھ اپنی اختیار کی ہوئی راہ پر چلتے رہتے ہیں۔

عام عذاب کب نازل ہوتا ہے

(۱۱) وَعَنْ عَدِیِّ بْنِ عَدِیِّ الْکِنْدِیِّ قَالَ حَدَّثَنَا مَوْلًی لَّنَا اَنَّہٗ سَمِعَ جَدِّیْ یَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَا یُعَذِّبُ الْعَآمَّۃَ بِعَمَلِ الْخَاصَّۃِ حَتّٰی یَرَوُا الْمُنْکَرَ بَیْنَ ظَھْرَانَیْھِمْ وَھُمْ قَادِرُوْنَ عَلٰی اَنْ یُّنْکِرُوْہُ فَلَا یُنْکِرُوْا فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَذَّبَ اللّٰہُ الْعَآمَّۃَ وَالْخَآصَّۃَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت عدی بن عدی کندی کہتے ہیں کہ ہم سے ہمارے ایک آزاد کردہ غلام نے بیان کیا کہ اس نے میرے دادا (حضرت عمیرہؓ کندی) سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے بعض افراد کے اعمال بد کے سبب اس کے اکثر افراد کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا (یعنی اگر اس قوم کے کچھ افراد بدعملیوں اور احکام خداوندی کی نافرمانیوں میں مبتلا ہوں تو ان کی پاداش میں اور لوگوں کو عذاب میں مبتلا نہیں کیا جاتا) ہاں اگر اس قوم کے لوگ یہ دیکھیں کہ ان کے درمیان بعض افراد کی وجہ سے خلاف شرع امور کا ارتکاب ہو رہا ہے اور وہ ان خلاف شرع امور کی اصلاح و سرکوبی نہ کریں بشرطیکہ وہ اس اصلاح و سرکوبی کی قدرت رکھتے ہوں اور اس صورت حال (یعنی قدرت و طاقت رکھنے کے باوجود سکوت و مداہنت اختیار کرنے) میں قوم کے اکثر لوگ مبتلا ہو جائیں تو پھر اللہ تعالیٰ عام و خاص سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا حاصل یہ ہے کہ قوم کے ان بعض افراد کو تو ان کی بدعملیوں اور احکام خداوندی کی نافرمانیوں کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے اور باقی افراد کو اس لئے عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے کہ انہوں نے قدرت و طاقت کے باوجود ان بعض افراد کو بدعملیوں سے باز کیوں نہیں رکھا اور برائیوں کو مٹانے کا فریضہ انجام کیوں نہیں دیا۔

برائیوں کے مٹانے کی پوری جدوجہد کرو

(۱۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا وَقَعَتْ بَنُوْا اِسْرَآئِيْلَ فِي الْمَعَاصِيْ نَهَتْهُمْ عُلَمَآؤُهُمْ فَلَمْ يَنْتَهُوْا فَجَالَسُوْهُمْ فِيْ مَجَالِسِهِمْ وَاٰكَلُوْهُمْ وَشَارَبُوْهُمْ فَضَرَبَ اللّٰهُ قُلُوْبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ فَلَعَنَهُمْ عَلٰى لِسَانِ دَاؤُدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ قَالَ فَجَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ مُتَّكِئًا فَقَالَ لَا وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ حَتّٰى تَاطِرُوْهُمْ اَطْرًا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوُدَ وَفِيْ رِوَايَتِهٖ قَالَ كَلَّا وَاللّٰهِ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَاْخُذُنَّ عَلٰى يَدَيِ الظَّالِمِ وَلَتَاطِرُنَّهٗ عَلَى الْحَقِّ اَطْرًا وَلَتَقْصُرُنَّهٗ عَلَى الْحَقِّ قَصْرًا اَوْلَيَضْرِبَنَّ اللّٰهُ بِقُلُوْبِ بَعْضِكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ثُمَّ لَيَلْعَنَنَّكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ۔

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل جب (زنا، ہفتہ کے دن شکار کرنے اور ان کے علاوہ دوسرے گناہوں میں مبتلا ہوئے تو ان کے علماء نے ان کو روکا اور جب وہ باز نہ آئے (یعنی انہوں نے اپنے علماء کی بات نہیں مانی اور ممنوع چیزوں کو ترک نہیں کیا) تو ان کے وہ علماء بھی ان کی مجلسوں کے ہم نشین بن گئے اور ان کے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو گئے (یعنی ان کے علماء نے پہلے تو ان بدعملی اور گناہ گار لوگوں کو بدعملی اور گناہ کی راہ اختیار کرنے سے منع کیا لیکن جب وہ لوگ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے اور برائی کی راہ پر جمے رہے تو پھر وہ علماء بھی ان بدعمل اور گناہگار لوگوں کے ساتھ خلط ملط ہو گئے اور سکوت و مداہنت کی راہ پر لگ گئے) اللہ تعالیٰ نے ان سب کو خلط ملط کر دیا اور ان کے دلوں کو آپس میں ایک دوسرے کے دل کے ساتھ ملا دیا، پھر اللہ تعالیٰ ان (بنی اسرائیل کے گناہ گار لوگوں کے ساتھ مصاحب و مجالست رکھنے والوں اور ان کے تئیں مداہنت اختیار کرنے والوں) پر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی زبان کے ذریعہ لعنت فرمائی اور یہ لعنت اس کے لئے کی گئی تھی کہ ان لوگوں نے گناہ کیے اور حد سے تجاوز کیا تھا (یعنی انہوں نے محض گناہ کرنے اور مداہنت اختیار کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حد سے تجاوز کر کے کفر تک پہنچ گئے تھے بایں طور کہ خلاف شرع امور کو حلال و جائز جاننے لگے، گناہوں سے رضامندی ظاہر کرنے لگے اور گناہ گاروں کو اچھا سمجھنے لگے تھے) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول کریم ﷺ جو اس وقت (اپنے پہلو یا پشت سے) تکیہ لگائے بیٹھے تھے مذکورہ بالا باتیں ارشاد فرمانے کے بعد) سیدھے بیٹھ گئے (یعنی آپ ﷺ نے تکیہ چھوڑ دیا اور اس طرح بیٹھ گئے جیسے کوئی اہم بات فرمانے کا ارادہ ہو) چنانچہ فرمایا۔ "اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم اس وقت تک عذاب الٰہی سے نجات نہیں پاسکو گے جب تک کہ ظالموں کو ان کے ظلم سے اور فاسقوں

کو ان کے گناہوں سے نہیں روکو گے۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ) اور ابوداؤدؒ کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تمہارا یہ گمان ہے کہ سکوت و مداہنت کے باوجود تمہیں عذاب الٰہی سے نجات مل جائے گی تو) ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ خدا کی قسم! تمہارے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کو نیکی کی راہ اختیار کرنے کا حکم دو اور ان کو برائی کی راہ سے روکو، ظالم کا ہاتھ پکڑو، اس کو حق کی طرف مائل کرو اور اس کو حق و انصاف کی راہ پر قائم کرو! اگر تم ایسا نہیں کروگے تو پھر (جان لو کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے (گناہگاروں اور ان سے سکوت و مداہنت کرنے والوں کے (دلوں کو بھی آپس میں ایک دوسرے کے دل کے ساتھ خلط ملط کر دے گا اور پھر تم پر لعنت فرمائے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر (ان کے گناہوں کی وجہ سے) لعنت فرمائی تھی۔"

تشریح: اس جملہ ضَرَبَ اللّٰهُ الخ کے معنی ملا علی قاریؒ اور "شیخ عبدالحق" نے وہی لکھے ہیں جو اوپر ترجمہ میں بیان کیے گئے ہیں، البتہ ملا علی قاریؒ نے ابن مالکؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ لفظ ببعض میں حرف باء سببیّت کے لئے ہے، اس صورت میں مذکورہ جملہ کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے گناہگاروں کی نحوست کے سبب سے ان لوگوں کے دل بھی سیاہ کر دیئے جنہوں نے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا تھا لہٰذا وہ سب کے سب سخت دل ہو گئے حق و راستی کی راہ قبول و اختیار کرنے کی استعداد و صلاحیت ان سب میں سے ختم ہوگئی اور ان میں کا ہر ایک شخص خیر و رحمت سے دور ہو گیا، اور یہ اس لئے ہوا کہ ان میں سے جن لوگوں نے گناہ اور برائی کی راہ اختیار کی تھی ان کو تو اپنے گناہوں کی سزا ملی، اور جنہوں نے گناہ نہیں کیے تھے ان کو اس لئے مبتلا کیا گیا کہ گناہگاروں کے ساتھ خلط ملط رکھا اور ان کے بارے میں سکوت و مداہنت کا رویہ اختیار کیا۔

بے عمل عالم و واعظ کے بارے میں وعید

⑬ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ رَاَيْتُ لَيْلَةَ اُسْرِیَ بِیْ رِجَالًا تُقْرَضُ شِفَاهُهُمْ بِمَقَارِيْضَ مِنْ نَّارٍ قُلْتُ مَنْ هٰؤُلَاءِ يَا جِبْرَئِيْلُ قَالَ هٰؤُلَاءِ خُطَبَاءُ مِنْ اُمَّتِكَ يَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَيَنْسَوْنَ اَنْفُسَهُمْ۔ رَوَاهُ فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَالْبَيْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَفِیْ رِوَايَةٍ قَالَ خُطَبَاءُ مِنْ اُمَّتِكَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَيَقْرَءُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَلَا يَعْمَلُوْنَ۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میں نے معراج کی رات میں کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کترے جارہے ہیں میں نے پوچھا کہ جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں! انہوں نے کہا کہ یہ آپ (ﷺ) کی اُمّت کے وہ علماء و واعظ اور مشائخ ہیں جو لوگوں کو تو نیکی کی تلقین کرتے تھے مگر خود اپنی ذات کو فراموش کر دیتے تھے، یعنی خود تو عمل نہیں کرتے تھے لیکن اوروں کو عمل کی تلقین و نصیحت کرتے تھے۔" اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنۃ میں اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔ اور بیہقیؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت جبرئیل نے جواب دیا۔ "یہ لوگ آپ (ﷺ) کی امت کے وہ واعظ و خطیب ہیں جو اس چیز کو کہتے تھے جس کو خود نہیں کرتے تھے جو کتاب اللہ کو پڑھتے تھے لیکن اس پر عمل نہیں کرتے تھے۔"

تشریح: یہ سزا بے عمل علماء و واعظین اور مشائخ کو ان کی بے عملی کی وجہ سے ملے گی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ، الاية۔

"کیا تم لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہو اور خود کو بھی بھول جاتے ہو۔"

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

ویل للجاهل مرة وویل للعالم سبع مرات جاہل کے لئے ایک بار خرابی ہے اور (بے عمل) عالم کے لئے سات بار خرابی ہے اور

ایک حدیث مشہور میں یوں فرمایا گیا ہے۔

اشدا الناس عذابا یوم القیامۃ عالم لم ینفعہ اللہ بعلم۔

"قیامت کے دن لوگوں میں سب سے سخت عذاب کا مستوجب وہ عالم ہوگا جس کو اللہ نے علم سے فائدہ نہیں پہنچایا ہوگا۔"

نعمت خداوندی میں خیانت کی سزا

(۱۴) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ یَاسِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُنْزِلَتِ الْمَآئِدَۃُ مِنَ السَّمَآءِ خُبْزًا وَلَحْمًا وَّاُمِرُوْٓا اَنْ لَّا یَخُوْنُوْا وَلَا یَدَّخِرُوْا لِغَدٍ فَخَانُوْا وَادَّخَرُوْا وَرَفَعُوْا لِغَدٍ فَمُسِخُوْا قِرَدَۃً وَّخَنَازِیْرَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عمار بن یاسرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "(حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم پر) آسمان سے روٹی اور گوشت کا خوان اتارا گیا اور ان کو حکم دیا گیا کہ نہ تو وہ اس میں خیانت کریں اور نہ آنے والے دن کے لئے ذخیرہ کریں (یعنی اس نعمت الٰہی کے بارے میں ان کو خاص طور پر دو حکم دیئے گئے) ایک تو یہ کہ کوئی شخص خیانت کا ارتکاب نہ کرے یعنی ایسا نہ ہو کہ وہ خوان جس کے قبضہ میں آئے وہ خود تو اچھا اچھا کھالے یا دوسروں سے زیادہ کھالے اور دوسرے لوگوں کو خراب یا کم کھانے کو ملے اور دوسرا حکم یہ تھا کہ جو خوان اترے اس کو بچا کر دوسرے دن کے لئے نہ اٹھا رکھیں! لیکن انہوں نے خیانت کا ارتکاب بھی کیا اور ذخیرہ بھی کیا کہ آنے والے دن کے لئے اٹھا رکھا، چنانچہ ان کو بندر اور سور کی صورتوں میں تبدیل کر دیا گیا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے جو لوگ بوڑھے تھے ان کو تو بندروں کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا اور جو لوگ جوان تھے ان کی صورتوں کو سوروں جیسی بنا دیا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ظالم حکمرانوں کے زمانے میں نجات کی راہ

(۱۵) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّہٗ تُصِیْبُ اُمَّتِیْ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ مِنْ سُلْطَانِہِمْ شَدَآئِدُ لَا یَنْجُوْا مِنْہُ اِلَّا رَجُلٌ عَرَفَ دِیْنَ اللّٰہِ فَجَاھَدَ عَلَیْہِ بِلِسَانِہٖ وَیَدِہٖ وَقَلْبِہٖ فَذٰلِکَ الَّذِیْ سَبَقَتْ لَہُ السَّوَابِقُ وَرَجُلٌ عَرَفَ دِیْنَ اللّٰہِ فَصَدَّقَ بِہٖ وَرَجُلٌ عَرَفَ دِیْنَ اللّٰہِ فَسَکَتَ عَلَیْہِ فَاِنْ رَاٰی مَنْ یَّعْمَلُ الْخَیْرَ اَحَبَّہٗ عَلَیْہِ وَاِنْ رَاٰی مَنْ یَّعْمَلُ بِبَاطِلٍ اَبْغَضَہٗ عَلَیْہِ فَذٰلِکَ یَنْجُوْا عَلٰی اِبْطَانِہٖ کُلِّہٖ۔

"حضرت عمر ابن خطاب کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میری اُمت کو آخری زمانہ میں اپنے حکمرانوں کی طرف سے (دینی یا دنیاوی) سختیاں اور بلائیں جھیلنا پڑیں گی اور اس وقت ان بلاؤں اور سختیوں سے نجات کی راہ پانے والا ایک شخص تو وہ ہوگا جو خدا کے دین کو سمجھے گا (یعنی اپنے اندر علم و عمل کو یکجا کرے گا، معرفت و یقین کی دولت کے ذریعہ خود بھی کمال کے درجہ کو پہنچے گا اور دوسروں کو بھی کامل کرے گا، اور اس طرح پہلے تو وہ خدا کے دین سے بہ تفصیل اصول و جزئیات اچھی طرح واقف و آگاہ ہوگا اور پھر اس علم کے مطابق اپنے نفس کو عمل کے سانچے میں ڈھالے گا اور صرف مشروع چیزوں کو اختیار کریگا جس کی وجہ سے اس کے اندر ظلم و ناانصافی کے خلاف سعی اور جدوجہد کرنے کا عزم و حوصلہ پیدا ہوگا) چنانچہ وہ شخص خدا کے دین کو سربلند کرنے کے لئے اپنی زبان اپنے ہاتھ اور اپنے دل کے ذریعہ جہاد کرے گا (یعنی بطریق وعظ و نصیحت زبان کے ذریعہ بھی ظلم و برائی کے خلاف جدوجہد کرے گا اور اگر اس کو طاقت و قوت میسر نہیں ہوگی تو مجبوراً دل میں اس ظلم و برائی کے خلاف نفرت و عداوت رکھنے پر اکتفا کرلے گا) پس یہ وہ شخص ہوگا جو کمال ایمان، ثواب اور دنیا و آخرت کی

سعادتوں تک پہلے پہنچے گا اور ایک شخص وہ ہوگا جو خدا کے دین کو سمجھے گا (مگر پہلے شخص سے ایک درجہ کم) چنانچہ وہ شخص دین کی تصدیق کرے گا اور اس کو اچھا جانے گا (یعنی وہ شخص ظلم و برائی کے خلاف صرف دل اور زبان کے ذریعہ جہاد کرے گا، ہاتھ کی قوت سے کام نہیں لے گا! یہ مطلب اس قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کے بارہ میں تصدیق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ تصدیق کا تعلق دل سے ہوتا ہے جس کی ترجمانی زبان کرتی ہے) اور ایک شخص وہ ہوگا جو خدا کے دین کو (تھوڑا) بہت سمجھے گا چنانچہ وہ شخص سکوت اختیار کرے گا (اور صرف قلب کے ذریعہ جہاد کرے گا یعنی ظلم و برائی کو محض دل سے برا سمجھنے پر اکتفا کرے گا) چنانچہ اس شخص کی حالت یہ ہوگی کہ وہ جب کسی کو نیک کام کرتے دیکھے گا تو اس کو درست رکھے گا اور کسی کا غلط کام کرتے دیکھے گا تو اس سے نفرت کرے گا اور وہ شخص بھی پوشیدہ طور پر نیکی بھلائی کے تئیں محبت اور گناہ و برائی کے تئیں نفرت رکھنے کے سبب نجات پائے گا۔"

تشریح: اس ارشاد گرامی کے ذریعہ حضور ﷺ نے ایک طرف تو اس زمانہ کے بارے میں پیشگوئی فرمائی ہے جب اُمت مرحومہ پر ظالم اور بدکار حکمرانوں اور ان سخت حالات سے نجات کی راہ کو بھی واضح فرمادیا گیا ہے اور وہ راہ ہے خدا کے دین کا علم حاصل کرنا یقین و معرفت اور عزم و استقامت اختیار کرنا، بھلائی کو پھیلانا اور برائی کو ختم کرنے کی جدوجہد کرنا! چنانچہ اس راہ کو اختیار کرنے والے لوگوں کو تین قسموں میں بیان فرمایا گیا ہے، پہلی قسم تو گویا ان لوگوں کی ہوئی جو خدا کے دین کو پوری طرح جانیں گے اور سمجھیں گے اور دین کے بارے میں نہایت سختی اور پختگی کا رویہ اختیار کریں گے، ایسے لوگ نہ صرف برائی کو دل سے برا جانیں گے اور زبان کے ذریعہ تلقین و نصیحت کا فریضہ انجام دیں گے بلکہ طاقت و قوت میسر ہونے پر ہاتھ کے ذریعہ بھی جہاد کریں گے اور ظلم و برائی کو مٹانے کے لئے کما حقہ جدوجہد کریں گے، دوسری قسم کے لوگ وہ ہوں گے جو دین کو جاننے اور سمجھنے اور معرفت و یقین کے مرتبہ کے اعتبار سے پہلی قسم کے لوگوں سے کچھ کم تر ہوں گے ایسے لوگ بھلائی کو پھیلانے اور برائی کو ختم کرنے کے لئے محض زبان اور دل کو ذریعہ بنانے پر اکتفا کریں گے اور تیسری قسم کے لوگ وہ ہوں گے جو دین کا علم بہت معمولی سا رکھیں گے اور برائیوں کے خلاف زبان کو بھی خاموش رکھیں گے اور خلاف شرع امور کو صرف دل میں برا سمجھنے پر اکتفا کریں گے بلکہ وہ قلبی نفرت و عداوت کے معاملہ میں بھی اس قدر سخت اور حساس نہیں ہوں گے جتنا ان کے ایمان کا تقاضا ہوگا، اسی لئے ان لوگوں کو ایک دوسری حدیث کے الفاظ ذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ کے ذریعہ سب سے کمزور ایمان کا حامل بتایا گیا ہے۔ مذکورہ بالا تین قسمیں ان لوگوں کی ہیں جن کو عارف اور دیندار کہا جاسکتا ہے البتہ ان قسموں کے لوگ اپنے اپنے مرتبہ اور اپنی اپنی حیثیت کے اعتبار سے ایک دوسرے پر فضیلت و برتری رکھتے ہیں اور ان کے درجات میں تفاوت ہے، چنانچہ قرآن کریم کی ایک آیت کی روشنی میں ان کے درجات کو اس طرح متعین کیا گیا ہے کہ پہلی قسم سے تعلق رکھنے والے شخص کو "سابق" دوسری قسم سے تعلق رکھنے والے شخص کو "مقتصد" یعنی متوسط اور تیسری قسم سے تعلق رکھنے والے شخص کو "ظالم" سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ آیت یہ ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَّمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ۔

"پھر یہ کتاب ہم نے ان لوگوں کے ہاتھ میں پہنچائی جن کو ہم نے اپنے (تمام دنیا کے) بندوں میں سے پسند فرمایا پھر بعضے تو ان میں اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں سے نیکیوں کے ساتھ آگے نکل جانے والے ہیں۔"

واضح رہے کہ تیسری قسم سے تعلق رکھنے والے شخص کو "ظالم" اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ وہ دین کی زیادہ معرفت نہ رکھنے اور دین کے تئیں زیادہ محتاط و حساس نہ ہونے کی وجہ سے تقصیرات اور لغزشوں کا شکار ہو جاتا ہے اور اس طرح اپنی تقصیرات کے ذریعہ گویا اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے! نیز مذکورہ آیت کے ابتدائی الفاظ سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ان تینوں قسموں کے لوگ اگرچہ اپنے مراتب و درجات میں تفاوت رکھتے ہیں مگر ایک بات میں سب کے سب مشترک ہیں کہ ان سب کو بارگاہ رب العزت میں برگزیدہ بندہ قرار دیا گیا ہے۔

لفظ "سوابق" اصل میں سابقہ کی جمع ہے اور سابقہ اس خصلت کو کہتے ہیں جو اولیت اور امتیازی حیثیت رکھتی ہو، جیسا کہ کہا جاتا ہے

لہ سابقة فی هذا الامر یعنی اس کو اس معاملہ میں اولیت حاصل ہے، یا وہ شخص اس معاملہ میں لوگوں پر سبقت لے گیا ہے، لہٰذا حدیث کے اس جملہ و ذلک الذی سبقت لہ السوابق کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ شخص سابقین بالخیرات میں سے ہوگا بایں طور کہ وہ دین و دنیا کی سعادتوں، اجر و ثواب کی بشارتوں اور طاعات و عبادات کی توفیق کے حصول میں دوسرے لوگوں پر سبقت لے جائے گا۔ گویا اس جملہ میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد اَلسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ کی طرف اشارہ ہے کہ جس میں فرمایا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کمال و تکمیل کے مراتب، علم و عمل کے درجات اور تعلیم و تعلم کی خصوصیات کو اپنے اندر جمع کر لیا ہے اور اس اعتبار سے ان کے حق میں یہ بشارت ہے کہ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ یعنی یہ ہی لوگ بارگاہ خداوندی میں مقرب و مقبول ہیں۔

بروں کے ساتھ، اچھے بھی عذاب میں کیوں مبتلا کیے جاتے ہیں؟

(۱۶) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْحَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى جِبْرَئِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَكَذَا بِاَهْلِهَا فَقَالَ يَارَبِّ اِنَّ فِيْهِمْ عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ قَالَ فَقَالَ اقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ فَاِنَّ وَجْهَهٗ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں شہر کو جہاں کے حالات اس اس طرح کے ہیں، باشندوں سمیت الٹ دو! حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا "میرے پروردگار! اس شہر میں تیرا وہ فلاں بندہ بھی ہے جس نے ایک لحہ کے لئے بھی تیری نافرمانی نہیں کی ہے؟ آنحضرت فرماتے ہیں کہ (جب جبرئیل علیہ السلام نے یہ کہا تو) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اس شہر کو سارے باشندوں پر بھی اور اس شخص پر بھی الٹ دو کیونکہ میری خوشنودی اور میرے دین کی محبت میں اس شخص کے چہرہ کا رنگ (شہر والوں کے گناہوں کو دیکھ) ایک ساعت کے لئے بھی نہیں بدلا۔"

تشریح: اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا حاصل تھا کہ بے شک میرے اس بندے نے کبھی بھی میری نافرمانی نہیں کی اور وہ ایک لحہ بھی برائی کی راہ پر نہ چلا مگر اس کا یہ جرم ہی کیا کم ہے کہ لوگ اس کے سامنے گناہ کرتے رہے اور وہ اطمینان کے ساتھ ان کو دیکھتا رہا برائی پھیلتی رہی اور لوگ خدا کی نافرمانی کرتے رہے مگر ان برائیوں اور نافرمانی کرنے والوں کو دیکھ کر اس کے چہرہ پر کبھی بھی اس طرح کے آثار پیدا نہیں ہوئے جن سے یہ معلوم ہو کہ اس کے دل میں برائیوں اور برائیوں کے مرتکبین کے خلاف غیظ و غضب اور نفرت و عداوت کا کوئی جذبہ ہے، لہٰذا شہر کے اور باشندوں کے ساتھ وہ شخص بھی ہلاکت و بربادی کا مستوجب ہے۔ "ایک ساعت" کے الفاظ اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اگر وہ شخص اپنی پوری زندگی میں ایک مرتبہ بھی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے برائیوں اور برائیوں کا ارتقاب کرنے والوں کے خلاف غصہ و نفرت کا اظہار کر دیتا تو اس کی زندگی کے باقی حصے میں اس کی اس تقصیر سے درگزر کر دیا جاتا۔

تقصیر کی معذرت

(۱۷) وَعَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَسْاَلُ الْعَبْدَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَيَقُوْلُ مَالَكَ اِذَا رَاَيْتَ الْمُنْكَرَ فَلَمْ تُنْكِرْهُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيُلَقّٰى حُجَّتَهٗ فَيَقُوْلُ يَا رَبِّ خِفْتُ النَّاسَ وَرَجَوْتُكَ۔ رَوَى الْبَيْهَقِيُّ الْاَحَادِيْثَ الثَّلَاثَةَ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ بزرگ و برتر قیامت کے دن بندہ سے سوال کرتے ہوئے فرمائے گا کہ تجھ کو کیا ہوا تھا کہ جب تو نے کسی خلاف شرع کام کو دیکھا تو (زبان و ہاتھ کے ذریعہ) اس کی بیخ کنی کا فریضہ انجام نہیں دیا؟ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ (اگر اللہ تعالیٰ اس بندہ کو معاف کرنے کا ارادہ فرمائے گا تو سوال کے ساتھ ہی) اس کو وہ تاویل و دلیل

سکھائی جائے گی (جس کے ذریعہ وہ اس فریضہ کو ترک کرنے کی معذرت کر سکے) چنانچہ وہ عرض کرے گا کہ۔ "میرے پروردگار! میں لوگوں کے ظلم وزیادتی سے ڈرتا تھا اور تیری طرف سے عفو ودرگزر اور مغفرت وبخشش کی امید رکھتا تھا۔" تینوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: اس بندہ کی طرف سے مذکورہ جواب میں گویا اپنی تقصیر کا اقرار، اپنے عجز کا اظہار اور رب کریم کے فضل وکرم پر اپنے یقین واعتماد کا بیان ہوگا۔ اور جیسا کہ بیہقی نے کہا ہے، یہ احتمال بھی ہے کہ اس حدیث کا تعلق اس شخص سے ہو جو خلاف شرع امور کا ارتکاب کرنے والوں کے غلبہ ودبدبہ سے ڈرتا ہو اور ان کی طرف سے پہنچائے جانے والے کسی بھی طرح کے نقصان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی طاقت وقدرت نہ رکھتا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر لوگوں کے رعب داب کی وجہ سے کوئی شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہ دے سکے تو وہ مستوجب مواخذہ نہیں ہوگا اور حق تعالیٰ کی طرف سے اس کے حق میں عفو ودرگزر کی امید رکھی جاسکتی ہے، لیکن اس صورت میں یہ اشکال یقیناً پیدا ہوگا کہ ایسا شخص شریعت کی نظر میں معذور ہے، لہٰذا قیامت کے دن نہ تو اس سے مواخذہ ہوگا اور نہ اس کو معذرت کے لئے کسی تاویل ودلیل کے سکھانے کی ضرورت ہوگی؟ اس اشکال کو دور کرنے کے لئے یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ اس حدیث کا تعلق دراصل اس شخص سے ہے جس نے کسی عذر ومانع کے بغیر مذکورہ فریضہ کی انجام دہی میں کچھ تقصیر کی ہوگی اور اگر اللہ تعالیٰ اس کی اس جزوی تقصیر کو معاف کرنا چاہے گا تو اس کو مذکورہ تاویل ودلیل الہام کرے گا تاکہ وہ معذرت کر سکے۔

عمل خیر اور عمل بد قیامت کے دن متشکل ہو کر سامنے آئیں گے

(۱۸) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ اِنَّ الْمَعْرُوْفَ وَالْمُنْکَرَ خَلِیْقَتَانِ تُنْصَبَانِ لِلنَّاسِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ فَاَمَّا الْمَعْرُوْفُ فَیُبَشِّرُ اَصْحَابَہٗ وَیَوْعَدُھُمُ الْخَیْرَ وَاَمَّا الْمُنْکَرُ فَیَقُوْلُ اِلَیْکُمْ اِلَیْکُمْ وَمَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَہٗ اِلَّا لُزُوْمًا۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالْبَیْہَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے قیامت کے دن مشروع عمل اور غیر مشروع عمل کو (آدمیوں کی شکل وصورت میں) پیدا کیا جائے گا اور ان کو (ان) لوگوں کے سامنے کھڑا کیا جائے گا (جنہوں نے ان اعمال کو دنیا میں اختیار کیا ہوگا) چنانچہ مشروع عمل اپنے لوگوں کو خوشخبری سنائے گا اور انجام کی بھلائی کا وعدہ دے گا، جب کہ غیر مشروع عمل اپنے لوگوں سے) کہے گا کہ مجھ سے دور ہو جاؤ لیکن وہ لوگ اس سے جدا ہو جانیکی طاقت نہیں رکھیں گے بلکہ اس سے چمٹے رہیں گے۔" (احمد، بیہقی)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ انسان دنیا میں جو نیک اور اچھے اعمال کریگا وہ اس کے مرنے کے بعد قبر میں بھی اچھی وپاکیزہ اور عطر بیز صورتوں میں ظاہر ہوں گے اور قیامت کے دن بھی بہترین شکل وصورت اختیار کر کے اس شخص کے سامنے آئیں گے اور اس کو آخرت کی لازوال سعادتوں اور حسن انجام کی خوشخبری سنائیں گے، اس کے برخلاف اگر کوئی شخص برے اعمال اختیار کرے گا تو وہ اعمال قبر میں بھی خراب اور ڈراؤنی صورتوں میں آکر پریشان کریں گے اور قیامت کے دن بھی بری شکل وصورت کے ساتھ اس کے سامنے آئیں گے اور اس کو اس کے برے انجام سے ڈراتے ہوئے کہیں گے کہ ہمارے پاس سے دور ہٹ جا، مگر وہ شخص اس سے دور ہٹنے پر قادر نہیں ہوگا یعنی ان برے اعمال پر جو سزا ملنے والی ہوگی اس سے وہ شخص بھاگ نہیں پائے گا۔ لفظ "تنصبات" مجہول ہونے کی وجہ سے مونث کا صیغہ ہے لیکن مشکوٰۃ کے ایک نسخے میں یہ لفظ بہ صیغہ مذکر منقول ہے اور یہی زیادہ موزوں ہے کیونکہ لفظ "خلیقہ" میں حرف تاء تانیث کے لئے نہیں ہے بلکہ اظہار (مبالغہ کے لئے ہے اور اس لفظ کے معنی یہ ہیں کہ یہ دونوں یعنی عمل خیر اور عمل بد مخلوقات میں سے ایک نوع ہیں جو قیامت کے دن لوگوں کے سامنے شکل وصورت اختیار کر کے ظاہر ہوں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الرقاق

رقاق کا بیان

"رقاق" رقیق کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں نرم، پتلا۔ یہاں سے کتاب کے جو ابواب شروع ہو رہے ہیں ان کو کتاب الرقاق سے اس لئے موسوم کیا گیا ہے کہ ان ابواب میں وہ احادیث منقول ہیں جو دل کو نرم کرتی ہیں، طبیعت میں رقت پیدا کرتی ہیں اور قوائے فکر و عمل کو اس طرح متاثر کرتی ہیں کہ دنیا سے زہد و بے اعتنائی اور آخرت سے رغبت پیدا ہو جاتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

دو قابل قدر نعمتیں

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِنَ النَّاسِ الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "دو نعمتیں ہیں کہ ان کے معاملہ میں بہت سے لوگ فریب اور ٹوٹا کھائے ہوئے ہیں (اور وہ دونوں نعمتیں) "تندرستی" اور "فراغت ہیں۔" (بخاری)

تشریح: مذکورہ نعمتوں میں سے ایک نعمت تو تندرستی ہے یعنی جسم و بدن کا امراض سے محفوظ رہنا، اور دوسری نعمت ہے اوقات کا غم روز گار کے مشاغل در مصروفیات اور تفکرات و تشویشات سے فارغ و خالی ہونا! چنانچہ دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اپنی غفلت شعاری کی بنا پر ان دونوں نعمتوں کی قدر نہیں کر رہے اور ان کے معاملہ میں اپنے نفس سے فریب کھا کر ان کو مفت میں ہاتھ سے جانے دیتے ہیں جیسا کہ کوئی شخص خرید و فروخت کے معاملہ میں کسی کے فریب اور دھوکہ کا شکار ہو کر اپنے مال و متاع کو مفت میں گنوا دیتا ہے اور نقصان برداشت کرتا ہے۔

لہٰذا اس ارشاد گرامی میں ان لوگوں کے تئیں حسرت و افسوس کا اظہار ہے جو ان نعمتوں سے کماحقہ فائدہ نہیں اٹھاتے، بایں طور کہ نہ تو اپنی صحت و تندرستی کے زمانہ میں دین و دنیا کی بھلائی و فائدہ کے کام کرتے ہیں اور نہ فرصت کے اوقات کو غنیمت جان کر ان میں آخرت کے امور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ہاں جب ان کی صحت و تندرستی خراب ہو جاتی ہے دنیا بھر کے فکرات لاحق ہو جاتے ہیں اور غم روزگار کی گردش ان کے اوقات کو مختلف قسم کی مشغولیتوں اور تشویشوں میں جکڑ لیتی ہے اس وقت ان کو ان نعمتوں کی قدر ہوتی ہے اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے کیسے بیش قیمت مواقع گنوا دیئے اور اس قول اَلنِّعْمَةُ اِذَا فُقِدَتْ عُرِفَتْ (کہ نعمت کی قدر اس وقت ہوتی

ہے جب وہ جاتی رہتی ہے) کا مصداق بنتے ہیں
ملا علی قاریؒ نے حدیث کی تشریح میں یہ لکھا ہے کہ اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے لوگ ان نعمتوں کی حقیقی قدر نہیں کرتے، بایں طور کہ وہ ان نعمتوں کے حاصل ہونے کے زمانہ میں ایسے کام نہیں کرتے جن کے آخرت میں وہ محتاج ہوں گے اور پھر وہاں نادم ہوں گے کہ ہم نے دنیا میں اپنی عمر کے بیش قیمت اوقات کو کس طرح ضائع کر دیا اور تندرستی و فراغت وقت کی جو نعمتیں ہمیں میسر تھیں ان کے جاتے رہنے سے پہلے ان کی قدر نہیں کی، حالانکہ اس وقت ان کی یہ ندامت ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ اور حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ آخرت میں اہل جنت اگر کسی بات پر حسرت و افسوس کریں گے تو ان لمحات پر کریں گے جو انہوں نے دنیا میں اس طرح گزار دیئے ہوں گے کہ ان میں انہوں نے اللہ کو یاد نہیں کیا ہوگا۔

دنیا اور آخرت کی مثال

(۲) وَعَنِ الْمُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ وَاللّٰهِ مَا الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا مِثْلُ مَايَجْعَلُ اَحَدُكُمْ اِصْبَعَهٗ فِى الْيَمِّ فَلْيَنْظُرْ بِمَا يَرْجِعُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت مستورد ابن شداد کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "خدا کی قسم! آخرت (کے زمانہ اور وہاں کی نعمتوں) کے مقابلے میں دنیا (کے زمانہ اور اس کی نعمتوں) کی مثال ایسی ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی انگلی کو سمندر میں ڈبوئے اور پھر دیکھے کہ وہ انگلی کیا چیز لے کر واپس آئی ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی انگلی کو سمندر میں ڈبو کر باہر نکالے تو وہ دیکھے گا کہ اس کی انگلی سمندر میں سے محض تری یا صرف ایک آدھ قطرہ پانی کا لے کر واپس آئی ہے، پس سمجھنا چاہئے کہ آخرت کے زمانہ اور وہاں کی نعمتوں کے مقابلہ میں دنیا کا زمانہ اور دنیا کی تمام نعمتیں اسی قدر قلیل و کمتر ہیں جس قدر کہ سمندر کے مقابلہ میں اس کی انگلی کو لگا ہوا پانی، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تمثیل بھی محض لوگوں کو سمجھانے کے لئے ہے ورنہ متناہی کو غیر متناہی کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں ہو سکتی، پانی کا وہ ایک قطرہ جو دریا سے باہر آیا ہے اپنی کمتری و بے وقعتی کے باوجود سمندر سے کچھ نہ کچھ نسبت ضرور رکھتا ہے مگر دنیا، آخرت سے اس قدر بھی نسبت نہیں رکھتی۔
ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ نہ تو نہایت جلد فناہ ہو جانے والی دنیا کی نعمتوں اور آسائشوں پر مغرور ہو اور نہ اس کی سختیوں اور پریشانیوں پر روئے پیٹے اور نہ شکوہ و شکایت کرے بلکہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم کے مطابق یہی کہے کہ:

اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْاٰخِرَةِ۔

"اے اللہ! اصل زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے۔"

نیز اس حقیقت کو ہر لمحہ مد نظر رکھے کہ یہ دنیا، مزرعة الاخرة (آخرت کی کھیتی ہے) اور یہاں کی زندگانی بس ایک ساعت کی ہے لہٰذا اس ایک ساعت کو گنوانے کی بجائے طالب الٰہی میں مصروف رکھنا ہی سب سے بڑی دانشوری ہے۔

دنیا ایک بے حیثیت چیز ہے

(۳) وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِجَدْىٍ اَسَكَّ مَيِّتٍ قَالَ اَيُّكُمْ يُحِبُّ اَنَّ هٰذَا لَهٗ بِدِرْهَمٍ فَقَالُوْا مَا نُحِبُّ اَنَّهٗ لَنَا بِشَىْءٍ قَالَ فَوَاللّٰهِ لَلدُّنْيَا اَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ هٰذَا عَلَيْكُمْ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) رسول کریم ﷺ بکری کے ایک ایسے مردہ بچہ کے پاس سے گزرے جس کے کان بہت چھوٹے تھے یا کٹے ہوئے تھے اور یا اس کے کان تھے ہی نہیں، چنانچہ آپ نے (اس کو دیکھ کر صحابہؓ سے) فرمایا کہ تم میں ایسا کوئی شخص ہے جو

اس (مردہ بچہ) کو ایک درہم کے عوض لینا پسند کرے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم تو اس کو کسی بھی چیز کے عوض لینا پسند نہیں کر سکتے! آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "خدا کی قسم! یہ دنیا (اپنی تمام لذتوں اور آسائشوں کے ساتھ) خدا کے نزدیک اس سے کہیں زیادہ بے وقعت و کمتر ہے جیسا کہ تمہاری نظر میں یہ ہے۔" (مسلم)

تشریح: حضور ﷺ نے بکری کے اس مردہ بچہ کی مثال کے ذریعہ درحقیقت اس طرف متوجہ فرمایا کہ یہ دنیا ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ انسان اس کی محبت و طلب میں آخرت کے نفع نقصان کو فراموش کر دے، بلکہ اصل چیز آخرت کی محبت و طلب ہے جہاں کی زندگی بھی لافانی ہے اور جس کی نعمتیں بھی لازوال ہیں، لہٰذا مقصود زندگی آخرت کی محبت و طلب ہونا چاہئے نہ کہ دنیا کی محبت و طلب، کیونکہ فرمایا گیا ہے۔

حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ

"دنیا کی محبت وچاہت ہر گناہ کی جڑ ہے۔"

تَرْكُ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ عِبَادَةٍ

"دنیا سے بے اعتنائی، ہر عبادت کی بنیاد ہے۔"

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی محبت میں گرفتار رہنے والا اپنے اعمال میں مخلص و پاکیزہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا ہر کام کسی فاسد غرض و لالچ کی آمیزش رکھتا ہے خواہ وہ کوئی دینی اور مذہبی کام ہی کیوں نہ کرے، اس کے برخلاف جو شخص دنیا سے بااعتنائی اختیار کیے ہوئے ہوتا ہے اس کے ہر عمل میں اخلاص و پاکیزگی اور آخرت ہی کا مفاد ہوتا ہے، خواہ وہ کسی دنیاوی کام ہی میں کیوں نہ مشغول ہو! اسی لئے کسی عارف نے کہا ہے کہ جس نے دنیا کو اپنی پسندیدہ اور محبوب چیز بنا لیا ہے اس کو تمام مشائخ اور مرشدین مل کر بھی راہ راست پر نہیں لگا سکتے اور جس نے دنیا سے بے اعتنائی کو اپنا شیوہ بنا لیا اس کو دنیا بھر کے مفسد و بدکار لوگ بھی گمراہ نہیں کر سکتے۔

دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ ہے

④ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ۔ (رواه مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "دنیا، مؤمن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے جنت ہے۔" (مسلم)

تشریح: "قید خانہ" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئی شخص قید خانہ میں بند ہو تو وہاں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے، اور طرح طرح کی مشقتیں جھیلتا ہے۔ اسی طرح مؤمن کے لئے یہ دنیا بھی گویا ایک قید خانہ ہے جہاں اس کو محنت و مشقت اور مصائب و شدائد کا سامنا کرنا پڑتا ہے، منکرات اور منہیات (ممنوع اور خلاف شرع امور) سے اپنے آپ کو بچانا پڑتا ہے۔ نفس کی آزادی اور بے راہ روی کو ختم کرنا پڑتا ہے اور طاعات و عبادات کی مشقتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ یا یہ کہ مؤمن اس دنیا کو ایک ایسی جگہ محسوس کرتا ہے جہاں تنگی و گھٹن ہوتی ہے اور جہاں بود و باش اختیار کرنے کو وہ پسند نہیں کرتا، چنانچہ وہ ہر وقت یہی خواہش رکھتا ہے کہ وہ اس تنگ و تاریک جہاں سے نکل جائے اور عالم ملکوت کی وسعتوں کو اپنی جولانگاہ بنائے! اور "دنیا کافر کے لئے جنت ہے" کا مطلب یہ ہے کہ کافر چونکہ اپنا مقصد زندگی دنیا کا حصول سمجھتا ہے اس لئے وہ اپنی تمام تر سعی و کوشش اور اپنی تمام تر جدوجہد دنیا کی نعمتوں اور آسائشوں کو حاصل کرنے میں صرف کرتا ہے اور پھر وہ دنیا کی لذات و شہوات میں اس طرح مشغول و منہمک ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے یہ دنیا ایک عشرت کدہ بن جاتی ہے جہاں سے نکلنا اس کو گوارہ نہیں ہوتا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ حدیث کی مراد یہ ہے کہ مؤمن کو آخرت میں جو اجر و ثواب ملے گا اور اس کو وہاں کی جن نعمتوں اور

راحتوں سے نوازا جائے گا ان کی بہ نسبت یہ دنیا اس کے حق میں گویا قید خانہ ہے اور کافر کو آخرت میں جس دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا اس کے مقابلہ میں یہ دنیا اس کے حق میں گویا جنّت ہے! اس کا حاصل یہ ہے کہ مؤمن اس دنیا میں خواہ کتنے ہی ناز و نعم کے ساتھ رہے اور اس کو یہاں کی کتنی ہی آسائشیں اور راحتیں حاصل ہوں مگر وہ سب ہیچ ہیں کیوں کہ اس کو آخرت میں جو نعمتیں ملنے والی ہیں اور وہاں کی جو راحتیں اور آسائشیں اس کو حاصل ہوں گی وہ اس دنیا کی نعمتوں اور راحتوں و آسائشوں سے کہیں زیادہ بہتر اور کہیں زیادہ اعلیٰ ہوں گی، اسی طرح کافر اس دنیا میں خواہ کتنی ہی مصیبتیں اور آفتیں جھیلے اور کتنے ہی شدائد کا سامنا کرے۔ مگر آخرت میں اس کا حال اس دنیا کے حال سے بھی بدتر ہوگا۔ منقول ہے کہ ایک یہودی نے حضرت حسنؓ کو دیکھ کر ان سے کہا کہ آپ کے نانا جان (رسول کریم ﷺ) نے جو یہ فرمایا ہے کہ الدنیا سجن المؤمن و جنة الکافر تو ان کا یہ قول میرے اور آپ کے حال پر کس طرح صادق آتا ہے، کیونکہ تم تو گھوڑے پر سواری کرتے ہو، اور بڑی راحت و آسائش کے ساتھ زندگی گزارتے ہو، جب کہ میں بیماری میں مبتلا ہوں اور طرح طرح کی تکالیف اور فقر و فاقہ میں گرفتار رہتا ہوں؟ چنانچہ حضرت امامؓ نے اس کو جو جواب دیا وہ وہی تھا جو اوپر نقل کیا گیا۔

کافر کے اچھے کام کا اجر اس کو اسی دنیا میں دے دیا جاتا ہے

⑤ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مُؤْمِنًا حَسَنَۃً یُعْطٰی بِھَا فِی الدُّنْیَا وَیُجْزٰی بِھَا فِی الْاٰخِرَۃِ وَاَمَّا الْکَافِرُ فَیُطْعَمُ بِحَسَنَاتِ مَا عَمِلَ بِھَا لِلّٰہِ فِی الدُّنْیَا حَتّٰی اِذَا اَفْضٰی اِلَی الْاٰخِرَۃِ لَمْ تَکُنْ لَہٗ حَسَنَۃٌ یُجْزٰی بِھَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ مؤمن کی نیکی کا اجر ضائع نہیں کرتا، کہ اس کی اس نیکی کے سبب اس کو دنیا میں بھلائیاں دی جاتی ہیں اور آخرت میں بھی اس کا اجر و ثواب دیا جائے گا۔ اور کافر خدا کی خوشنودی کے لئے جو اچھے کام کرتا ہے اس کو اس کے بدلہ میں اس دنیا میں کھلا پلا دیا جاتا ہے (یعنی وہ ان اچھے کاموں کی وجہ سے جس بھلائی کا مستحق ہوتا ہے وہ اس کو نعمتوں اور راحتوں کی صورت میں اس دنیا میں دے دی جاتی ہے) یہاں تک کہ جب وہ آخرت میں پہنچے گا تو اس کے نامۂ اعمال میں ایسی کوئی نیکی نہیں ہوگی کہ جس کی وجہ سے اس کو وہاں اجر و ثواب دیا جائے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کے ذریعہ اس حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ آخرت کی بھلائی اور وہاں کے اجر و ثواب کا دارومدار دنیا میں محض اچھے کام کرنے پر نہیں ہے بلکہ ایمان و عقیدہ پر ہے چنانچہ وہ نیک کام جو خدا کی خوشنودی کے لئے کیے جاتے ہیں اور جن سے خدا یقیناً خوش ہوتا ہے، جب کوئی مؤمن کرتا ہے تو اس کو ان نیک کاموں کی وجہ سے دنیا میں بھی اچھا بدلہ ملتا ہے۔ بایں طور پر کہ اس کے کاروبار معیشت اور رزق میں وسعت و فراخی عطا کی جاتی ہے، اس کی زندگی کو چین و سکون اور خوش حالی و قلبی اطمینان کی دولت نصیب ہوتی ہے اور پھر اس کو ہر طرح کی آفات و بلیات اور ناپسندیدہ عناصر سے محفوظ و مامون رکھا جاتا ہے، اور پھر جب وہ اس دنیا کی زندگی کو پورا کر کے آخرت میں پہنچے گا تو اس کو وہاں بھی ان نیک کاموں کا پورا پورا اجر و ثواب ملے گا۔ اس کے برخلاف جب کافر اچھے اعمال کرتا ہے جس سے خدا خوش ہوتا ہو جیسے فقیر و محتاج کو کھانا کھلانا اور اس کی مدد کرنا، یتیم اور بیواؤں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کرنا، اور اس طرح کے دوسرے فلاحی و رفاہی کام تو اس کے ان اچھے کاموں کا پورا بدلہ اس کو دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے، جب کہ آخرت میں وہ ان اچھے کاموں کا کوئی اجر و ثواب پانے کے مستحق نہیں ہوگا۔

رہی یہ بات کہ جس طرح مؤمن کو دنیا میں اپنے اچھے کاموں کا بدلہ اچھا ملتا ہے اسی طرح کیا اس کو دنیا میں برے کاموں کی سزا بھی ملتی ہے؟ تو اس کا جواب اثبات میں ہوگا کہ حق تعالیٰ اپنے جس بندہ کو آخرت کے عذاب و شدائد سے بچانا چاہتا ہے اس کو اس کی برائیوں کی سزا اس دنیا میں دے دیتا ہے۔ چنانچہ ایک دوسری حدیث میں منقول ہے کہ مؤمن کو اس کے برے کاموں کا بدلہ دنیا میں مختلف قسم کے

مصائب و آلام اور تکالیف و پریشانیوں کی صورت میں دیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ جب آخرت میں پہنچے گا تو اس کے نامۂ اعمال میں ایسی کوئی برائی نہیں ہوگی جس پر وہ عذاب کا مستوجب قرار پائے۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کو احمد اور ابن حبان نے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت کریمہ من یعمل سوءً یجزبہ نازل ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! (اگر ایسا ہے کہ بندہ سے جو بھی برائی صادر ہوگی اس کی وجہ سے اس کو آخرت میں ضرور سزا دی جائے گی اور ظاہر ہے کہ دنیا میں ہر بندے سے چھوٹی یا بڑی کوئی نہ کوئی برائی ضرور صادر ہوتی ہے) تو پھر نجات پانے والا کون شخص ہوگا؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تمہیں بخشے، کیا تم غمگین نہیں ہوتے، کیا تم رنج و الم نہیں اٹھاتے، کیا تم بیمار نہیں ہوتے، اور کیا تمہیں کوئی آفت یا بلا نہیں پہنچتی؟" انہوں نے عرض کیا کہ ہاں یا رسول اللہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "تو یاد رکھو) یہ چیز (یعنی تمہارا کسی تکلیف و مصیبت اور رنج و الم میں مبتلا ہونا) دراصل تمہارے حق میں اس برائی کی سزا اور بدلہ ہے جو تم سے صادر ہو جاتی ہے۔"

جنّت اور دوزخ کے پردے

(۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهْوَاتِ وَحُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ اِلَّا عِنْدَ مُسْلِمٍ حُفَّتْ بَدَلَ حُجِبَتْ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "دوزخ کی آگ شہوتوں یعنی خواہشات ولذات سے ڈھانکی گئی ہے، اور جنّت سختیوں اور مشقتوں سے ڈھانکی گئی ہے" اس روایت کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے لیکن مسلم کی روایت میں "حجبت" (یعنی ڈھانکی گئی ہے کہ بجائے) "حفت" (یعنی گھیری گئی ہے) کا لفظ ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ وہ محنت و مشقت اور سختی و پریشانی پر جو طاعت و عبادت کی مداومت و پابندی اور نفسانی خواہشات ولذات سے اجتناب کی وجہ سے اٹھانا پڑتی ہے، گویا بہشت کا پردہ ہے، اور جو چیز پردے کے پیچھے ہوتی ہے اس تک پہنچنے کے لئے پہلے پردہ تک پہنچنا اور اس کو اٹھانا ضروری ہوتا ہے اس لئے اگر جنّت تک پہنچنا چاہتے ہو تو پہلے اس کے پردے کو اٹھاؤ یعنی احکام خداوندی کی اتباع اور نفس کی خواہشات سے اجتناب کی محنت اور سختی برداشت کرو، جب ان باتوں کو اختیار کرو گے تب کہیں جنّت تک رسائی ہوگی۔ اسی طرح نفس کی خواہشات ولذات گویا دوزخ کا پردہ ہیں۔ جو شخص اس پردہ کو ہٹائے گا یعنی نفس کی اتباع اور خواہش پرستی کا ارتکاب کرے گا وہ دوزخ تک پہنچ جائے گا۔

واضح رہے کہ حدیث میں "شہوات" کا جو لفظ استعمال فرمایا گیا ہے اس کا تعلق نفس کی ان خواہشات ولذات سے ہے جو حرام چیزوں جیسے شراب نوشی، زنا اور غیبت وغیرہ کا ارتکاب کراتی ہیں، ورنہ جہاں تک مباح خواہشات ولذات کا تعلق ہے وہ نہ تو دوزخ میں لے جانے کا باعث بنتی ہیں اور نہ جنّت میں داخل ہونے سے روکتی ہیں، اگرچہ نفس کی مباح خواہشات ولذات کا اتباع بھی بندہ کو قرب اور ولایت کے مقام سے دور کر دیتا ہے۔

حدیث کی مذکورہ بالا وضاحت سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ ایک روایت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ العلم حجاب اللہ (یعنی علم اللہ تعالیٰ کا پردہ ہے) تو اس کے کیا معنی ہیں، چنانچہ اس جملہ کا مطلب بھی یہی ہے کہ علم، گویا اللہ اور بندے کے درمیان پردہ ہے، جو شخص علم حاصل کرتا ہے وہ گویا اس پردہ کو اٹھا دیتا ہے اور جب وہ پردہ اٹھ جاتا ہے تو خدا کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔

مال و زر کا غلام بن جانے والے کی مذمت

(۷) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ وَعَبْدُ الْخَمِيْصَةِ اِنْ اُعْطِيَ رَضِيَ وَاِنْ لَمْ يُعْطَ سَخِطَ تَعِسَ وَانْتَكَسَ وَاِذَا شِيْكَ فَلَا انْتُقِشَ طُوْبٰى لِعَبْدٍ اٰخِذٍ بِعِنَانِ فَرَسِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَشْعَثَ

رَأْسُهُ مُغْبَرَّةٌ قَدَمَاهُ إِنْ كَانَ فِي الْحِرَاسَةِ كَانَ فِي الْحِرَاسَةِ وَإِنْ كَانَ فِي السَّاقَةِ كَانَ فِي السَّاقَةِ إِنِ اسْتَأْذَنَ لَمْ يُؤْذَنْ لَهُ وَإِنْ شَفَعَ لَمْ يُشَفَّعْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "ہلاک ہو وہ شخص جو دینار کا غلام ہو، درہم کا غلام ہو، اور چادر کا غلام ہو (یعنی اس شخص کے لئے آخرت میں ہلاکت وتباہی مقدر ہے جس نے مال ودولت کے حصول کو اپنا مقصد زندگی بنالیا ہو، دنیاوی عیش وتمول کو معبود جبار کی رضا وخوشنودی پر ترجیح دیتا ہو اور طلب مال وحصول زر کی راہ مین ناجائز وحرام وسائل وذرائع اختیار کرنے سے باز نہ رہتا ہو اور پھر جو کچھ کماتا ہو اس کو ازراہ بخل، جمع کردیتا ہو کہ نہ اس مال کے حقوق کو ادا کرتا ہو نہ خدا کی راہ میں اور خدا کی خوشنودی کے لئے اس کو خرچ کرتا ہو، اور اس کے ساتھ ہی اپنی شان وشوکت اور بڑائی جتانے کے لئے لباس فاخرہ زیب تن کرتا ہو اور ناروا طور پر زیب وزینت میں مبتلا ہو اور ایسے شخص کی علامت یہ ہے کہ) جب اس کو (مال ودولت اور لباس فاخرہ) ملے تو خوش اور راضی ہو، اور اگر نہ ملے تو ناراض وناخوش ہو (گویا اس کی طبیعت کا میلان ہمیشہ لوگوں کے مال وزر کی طرف رہتا ہو اور ہروقت اس حرص میں مبتلا رہتا ہے کہ فلاں شخص سے فلاں چیز حاصل ہو جائے، چنانچہ اگر لوگ اس کی حرص وتمنّا کو پورا کرتے ہیں تو وہ ان سے خوش رہتا ہے اور اگر ان کی طرف سے اس کی اس حرص وطمع کی تکمیل نہیں ہوتی تو ان سے ناخوش وناراض ہو جاتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس دینے یا نہ دینے کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہو، یعنی اگر اللہ تعالیٰ اس کی خواہش کے مطابق اس کو مال ودولت اور سامان تعیش عطا کرتا ہے تو وہ اس سے خوش ہو جاتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ اس کی خواہش وحرص کو پورا نہیں کرتا تو وہ اللہ تعالیٰ کے تئیں اپنی ناراضگی ظاہر کرتا ہے) ایسے شخص کی اس مذموم خصلت کی وجہ سے گویا حضور ﷺ نے مکرر بددعا فرمائی کہ ہلاک ہو ایسا شخص اور ذلیل وسرنگوں ہو! اور (دیکھو!) جب اس شخص کے پاؤں میں کانٹا لگ جائے تو کوئی اس کو نہ نکالے! (گویا تہدید وتنبیہ کے طور پر ایسے شخص کے حق میں مسلمانوں کو آگاہ فرمایا گیا کہ اگر ایسی مذموم خصلت رکھنے والا شخص کسی آفت وپریشانی میں مبتلا ہو جائے تو کوئی اس کی مدد واعانت نہ کرے۔ دنیاداروں اور حرص وطمع کے غلام لوگوں کی اس بدحالی کو ذکر کرنے کے بعد حضور ﷺ نے چاہا کہ ان کے مقابلہ پر ان طالبان دین اور زاہدان دنیا کا بھی ذکر فرمائیں جو آخرت کی فلاح حاصل کرنے اور دین کو سربلند کرنے کے لئے محنت ومشقت اور جہاد کے ذریعہ اللہ کی راہ میں مشغول رہتے ہیں، دنیا سے بے نیازی برتتے ہیں، ظاہری زینت وآرائش سے دور رہتے ہیں اور اہل دنیا کے طور طریقوں سے اپنے کو الگ رکھتے ہیں اور اس وجہ سے ظاہر پرستوں کی نظر میں نہایت کمتر وحقیر معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا) سعادت وخوش بختی ہے اس بندے کے لئے جو خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے کھڑا ہے، اس کے سر کے بال پراگندہ اور قدم غبار آلود ہیں، اگر اس کو لشکر کی (اگلی صفوں کے آگے) نگہبانی پر معمور کیا جاتا ہے تو پوری طرح نگہبانی کرتا ہے (کہ کسی بھی وقت اپنی ذمہ داری کی انجام دہی سے نہ غافل رہتا ہے اور نہ سوتا ہے بلکہ ہر وقت پوری ہوشیاری وچستی کے ساتھ نگہبانی کرتا ہے) اور اگر اس کو لشکر کے پیچھے رکھا جاتا ہے تو لشکر کے پیچھے ہی رہتا ہے (یعنی وہ امیر لشکر اور مسلمانوں کی پوری تابعداری کرتا ہے کہ اس کو جس جگہ مامور کیا جاتا ہے وہیں اپنا فرض انجام دیتا ہے، اور اس سے جو کچھ کہا جاتا ہے اس پر پوری طرح عمل کرتا ہے، تکبر اور ضد واصرار نہیں کرتا) اور (خدا کے نزدیک اپنے اس مرتبہ وسعادت کے باوجود اپنے معاشرہ میں اس قدر سادگی، جاہ ومال اور شان وشوکت سے اس قدر بے نیازی اور اس قدر تواضع انکساری کے ساتھ رہتا ہے کہ دنیادار اس کو کوئی وقعت واہمیت نہیں دیتے، یہاں تک کہ) اگر وہ لوگوں کی محفلوں میں شریک ہونا چاہتا ہے تو اس کو شرکت کی اجازت نہیں دیجاتی، اور اگر کسی کی سفارش کرتا ہے تو اس کی سفارش قبول نہیں کی جاتی۔"

تشریح: "دینار ودرہم کا غلام" اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ مال ودولت کے سلسلہ میں جو چیز مذموم ہے وہ اس مال ودولت کی محبّت اور دنیاداری میں مبتلا ہونا ہے، چنانچہ یہ خصلت (یعنی مال ودولت اور دنیا کی محبّت میں گرفتار ہونا) انسان کو مال کا بندہ بنادیتی ہے کہ اس کی ہر سعی اور جدوجہد کا محور، اس کی ہر تمنّا وخواہش کا مرکز اور اس کے ہر فعل وعمل کی بنیاد صرف مال وزر ہوتا ہے اس سے واضح ہوا کہ مال

داری اور دولت مندی بذات خود کوئی مذموم چیز نہیں ہے، کسی شخص کے پاس خواہ کتنا ہی مال وزر ہو اور وہ کتنا بڑا دولت مند ہو، اگر وہ دولت کی محبت میں گرفتار نہیں ہے تو اس کو برا نہیں کہیں گے۔

حدیث میں مال ودولت کے تعلق سے "دینار اور درہم" ہی کا ذکر اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ یہ دونوں چیزیں (جن کو سونا چاندی یا روپیہ پیسہ بھی کہا جاسکتا ہے) زر نقد ہیں کہ لین دین اور خرید وفروخت میں انہی کا اعتبار ہوتا ہے، اور ان کے ذریعہ ہی تمام جائز وناجائز مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے! اسی طرح اسباب معیشت میں صرف "چادر" کا ذکر اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ اصل میں "خمیصہ" اس خط دار چادر کو کہتے ہیں جو اس زمانہ میں لباس فاخرہ کا سب سے اعلیٰ مظہر سمجھی جاتی تھی اور اس کے استعمال سے عام طور پر تکبر ور عونت اور نمود ونمائش کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، نیز لوگ اس چادر کو اس قدر پسند کرتے تھے کہ اس کو اپنے سے جدا کرنا بھی ان کو گوارہ نہیں ہوتا تھا، لہٰذا اس زمانہ کے دنیادار اس چادر کی خواہش وطلب اور اس کی محبت میں اس قدر گرفتار ہوتے تھے کہ جیسے انہوں نے اس چادر کی غلامی اختیار کر لی ہو۔

نقش اور انتقاش کے معنی ہیں "پیر سے کانٹا نکالنا" لہٰذا واذاشیک فلا انتقش کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص مال ودولت اور روپیہ پیسہ کا غلام بن جائے کہ نہ تو وہ ناجائز اور حرام وسائل وذرائع سے کمانا اور دولت جوڑنا ترک کرتا ہو اور نہ اپنے روپیہ پیسہ کو حقداروں پر اور خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہو تو مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اس کے ساتھ تعاون اور اس کی پشت پناہی سے گریز کریں۔ اور جب وہ کسی آفت میں پھنسے تو اس کی کوئی مدد نہ کریں! اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ پیر سے کانٹا نکالنا چونکہ مدد کرنے کا سب سے ادنی درجہ ہے لہٰذا اس سب سے ادنی درجہ کی مدد سے بھی منع کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اگر اس کو کوئی اس سے بھی بڑا حادثہ پیش آجائے اور اس سے بھی زیادہ سخت حالات سے دوچار ہو تو اس کی مدد نہ کرنا بطریق اولیٰ جائز بلکہ مطلوب ہوگا۔

یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ حدیث کے لفظ "تعس" کا یہ ترجمہ کہ "ہلاک ہو وہ شخص الخ" اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ حضور ﷺ کے اس ارشاد کی مراد ایسے شخص کے حق میں بددعا کرنا ہے، چنانچہ مذکورہ ترجمہ اسی مراد کے پیش نظر اور شارحین کی اتباع کی بناء پر نقل کیا گیا ہے اور اگر یہ مراد لیا جائے تو حضور ﷺ نے اس لفظ کے ذریعہ اس شخص کے حق میں بددعا نہیں فرمائی بلکہ اس بدترین خصلت کی مذمت اور اس خصلت کو اختیار کرنے والوں کو دنیاوی اور اخروی ذلت وخواری اور ان کے برے انجام کو بطور خبر ظاہر فرمایا تو اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ "ہلاک ہوا وہ شخص..... الخ۔" اور یہ مراد بھی حدیث کے مغائر نہیں ہوگی۔

مالداری بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے

⑧ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّا مِمَّا اَخَافُ عَلَیْکُمْ مِنْ بَعْدِیْ مَایُفْتَحُ عَلَیْکُمْ مِنْ زَھْرَۃِ الدُّنْیَا وَزِیْنَتِھَا فَقَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَوَیَاْتِی الْخَیْرُ بِالشَّرِّ فَسَکَتَ حَتّٰی ظَنَنَّا اَنَّہٗ یُنْزَلُ عَلَیْہِ قَالَ فَمَسَحَ عَنْہُ الرُّحَضَاءَ وَقَالَ اَیْنَ السَّائِلُ وَکَاَنَّہٗ حَمِدَہٗ فَقَالَ اِنَّہٗ لَا یَاْتِی الْخَیْرُ بِالشَّرِّ وَاِنَّ مِمَّا یُنْبِتُ الرَّبِیْعُ مَایَقْتُلُ حَبَطًا اَوْیُلِمُّ اِلَّا اٰکِلَۃَ الْخَضِرِ اَکَلَتْ حَتّٰی اِمْتَدَّتْ خَاصِرَتَاھَا اسْتَقْبَلَتْ عَیْنَ الشَّمْسِ فَثَلَطَتْ وَبَالَتْ ثُمَّ عَادَتْ فَاَکَلَتْ وَاِنَّ ھٰذَا الْمَالَ خَضِرَۃٌ حُلْوَۃٌ فَمَنْ اَخَذَہٗ بِحَقِّہٖ وَوَضَعَہٗ فِیْ حَقِّہٖ فَنِعْمَ الْمَعُوْنَۃُ ھُوَ وَمَنْ اَخَذَہٗ بِغَیْرِ حَقِّہٖ کَانَ کَالَّذِیْ یَاْکُلُ وَلَا یَشْبَعُ وَیَکُوْنُ شَھِیْدًا عَلَیْہِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعید خدری ؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے (صحابہ ؓ اور ان کے ذریعہ عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے) فرمایا۔ "اپنی وفات کے بعد تمہارے بارہ میں مجھے جن چیزوں کا خوف ہے (کہ تم ان میں مبتلا ہو جاؤ گے) ان میں سے ایک چیز دنیا کی تروتازگی اور زینت بھی ہے (جو ملکی فتوحات واقتدار کی صورت میں) تم کو حاصل ہوگی۔" یہ سن کر ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا

بھلائی اپنے ساتھ برائی بھی لائے گی؟ (یعنی ملکی فتوحات واقتدار کی وجہ سے ہم مسلمانوں کو جو مال غنیمت اور ساز وسامان حاصل ہوگا وہ تو ہمارے حق میں خدا کی نعمت ہوگی اور ویسے بھی جائز وسائل وذرائع سے حاصل ہونے والی دولت اور رزق وغیرہ کی وسعت وفراخی ایک اچھی چیز ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا کی عطا کی ہوئی نعمت اور ایک اچھی چیز ہمارے لئے برائی وفتنہ اور ترک طاعات کا سبب وذریعہ بن جائے؟) حضور ﷺ (یہ سن کر) خاموش رہے (اور انتظار کرتے رہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئے تو جواب دیں) یہاں تک کہ ہم کو خاموش کیا آپ ﷺ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ (تھوڑی دیر کے بعد) حضور ﷺ نے اپنے چہرۂ مبارک سے پسینہ پونچھا (جو نزول وحی کے وقت آتا تھا) اور پھر فرمایا کہ وہ شخص کہاں ہے جس نے سوال کیا تھا؟ گویا آپ ﷺ نے سائل کے سوال کی تحسین فرمائی (کیونکہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ اس شخص نے جو سوال کیا ہے اور اب اس کا جو جواب دیا جائے گا اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا) اور اس کے بعد فرمایا۔ "حقیقت یہ ہے کہ بھلائی اپنے ساتھ برائی نہیں لاتی (یعنی جائز ذرائع سے مال ودولت کا حاصل ہونا اور رزق میں وسعت وفراخی اور خوشحالی کا نصیب ہونا بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہے اور اس کی وجہ سے کوئی برائی پیش نہیں آتی، بلکہ اصل میں برائی کا پیش آنا ان عوارض کی وجہ سے ہوتا ہے جو دولتمندی اور خوشحالی کے وقت لاحق ہو جاتے ہیں جیسے بخل و اسراف اور حد اعتدال سے تجاوز کرنا اور اس کی مثال موسم بہار ہے جو زمین کے پیٹ سے گھاس وغیرہ اگاتا ہے وہ اپنی ذات کے اعتبار سے تو اچھا اور فائدہ مند ہوتا ہے، البتہ اس سے ضرور نقصان اس وقت پہنچتا ہے جب کوئی چوپایہ اس کو ضرورت سے زائد کھائے اور بسیار خوری کے سبب ضرور ہلاکت میں مبتلا ہو جائے، چنانچہ خود حضور ﷺ نے اس مثال کو یوں بیان فرمایا کہ) موسم بہار جو سبزہ اگاتا ہے (وہ حقیقت میں تو بھلائی وفائدہ کی چیز ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ کوئی نقصان وبرائی لے کر زمین کے پیٹ سے نہیں اگتا مگر) وہ جانور کو اس کا پیٹ پھلا کر مار دیتا ہے یا (اگر وہ مرتا نہیں تو) مرنے کے قریب پہنچ جاتا ہے (یعنی جو جانور اس سبزہ کو کھانے میں حد سے تجاوز کر جاتا ہے وہ اس سبزہ کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے فعل یعنی زیادہ کھانے کی وجہ سے ضرور ہلاکت میں مبتلا ہو جاتا ہے) یہ کہ کھانے والے جانور نے اس سبزہ کو اس طرح کھایا کہ (جب بسیار خوری کی وجہ سے) اس کی دونوں کوکھیں پھول گئیں تو وہ سورج کے سامنے بیٹھ گیا (جیسا کہ جانور کی عادت ہوتی ہے کہ جب بدہضمی کی وجہ سے اس کا پیٹ پھول جاتا ہے تو وہ دھوپ میں بیٹھ جاتا ہے اور اس کا پیٹ گرمی پا کر نرم ہو جاتا ہے اور اس میں جو کچھ ہوتا ہے باہر نکل جاتا ہے، اور پھر (جب) پتلا گوبر اور پیشاب کر کے (اس نے اپنا پیٹ ہلکا کر لیا تو) چراگاہ کی طرف چلا گیا اور سبزہ چرنے لگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا یہ مال وزر بڑا سرسبز، تروتازہ اور نرم ودلکش ہے (کہ بظاہر آنکھوں کو بہت بھاتا ہے، طبیعت کو بہت اچھا لگتا ہے جس کی وجہ سے دل چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ حاصل ہو) لہٰذا جو شخص دنیا کے مال وزر کو حق کے ساتھ (یعنی بوقت ضرورت اور جائز وسائل وذرائع سے) حاصل کرے اور اس کو اس کے حق میں (یعنی اس کے اچھے مصارف میں کہ خواہ واجب ہو یا مستحب) خرچ کرے تو وہ مال وزر اس کے حق میں (دین کا) بہترین مددگار ثابت ہوتا ہے اور جو شخص اس مال وزر کو حق کے بغیر یعنی ناجائز طور پر حاصل کرے تو وہ اس شخص کی طرح ہوتا ہے جو کھاتا رہتا ہے اور شکم سیر نہیں ہوتا اور وہ مال و زر قیامت کے دن اس کے بارے میں (اس کے اسراف اور اس کی حرص وطمع کا) گواہ ہوگا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: حدیث کے ابتدائی جملوں کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے بارے میں مجھے خدشہ ہے کہ جب تم دنیا کے ملکوں اور شہروں کو فتح کر کے اپنے تسلط واقتدار کا جھنڈا لہراؤ گے اور اس کے نتیجہ میں تمہیں مال ودولت کی فراوانی اور خوشحالی نصیب ہوگی تو یہ چیز تمہیں عبادت وطاعت اور نیک اعمال سے باز رکھنے کی کوشش کرے گی، نفع پہنچانے والے علوم (یعنی دینی علوم وفنون) سے لاپرواہ بنا دے گی اور عجب وتکبر، گھمنڈ وغرور، شان وشوکت کا اظہار اور جاہ ومال سے محبت جیسی برائیاں تمہارے اندر پیدا ہو جائیں گی، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تم آخرت کی زندگی کی فکر کرنے اور موت کے لئے تیاری کرنے کے بجائے دنیاوی امور میں پھنس کر رہ جاؤ گے۔

پھر چراگاہ کی طرف چلا گیا اور سبزہ چرنے لگا" یعنی جب وہ جانور ضرورت سے زیادہ کھا لیتا ہے اور بدہضمی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اپنے

طریقہ سے بدہضمی کا علاج کرتا ہے اور اپنے پیٹ کو صاف کر کے دوبارہ سبزہ چرنے لگتا ہے! یہ مثال اس شخص کی ہے جو انسانی خمیر میں شامل حرص وخواہشات کے غلبہ کی وجہ سے بعض وقت اعتدال کی راہ سے بھٹک کر حد سے تجاوز کر جاتا ہے اور پھر ہلاکت کے قریب پہنچ جاتا ہے لیکن اپنے طرز عمل سے جلد ہی رجوع کر لیتا ہے اور مستقل طور سے بے اعتدالی وگناہ کی راہ پر قائم نہیں رہتا بلکہ آفتاب ہدایت کی روشنی اس کو راہ راست کی طرف متوجہ کر دیتی ہے اور ندامت وتوبہ کے ذریعہ اپنے نفس کو بے اعتدالی اور گناہ کی غلاظت سے پاک کر کے گویا اپنا علاج کر لیتا ہے۔ اس کے برخلاف پہلی قسم کی کہ جس کو "وہ جانور کو اس کا پیٹ پھلا کر مار دیتا ہے۔" کے ذریعہ بیان فرمایا، اس شخص کی حالت کی طرف اشارہ کرتی ہے جو نفس کی خواہشات کا غلام بن جاتا ہے، گناہ ومعصیت پر قائم رہتا ہے اور اسی حالت میں مرجاتا ہے، یہاں تک کہ اس کو توبہ وانابت اور رجوع واستغفار کی توفیق بھی نصیب نہیں ہو پاتی۔ ان دونوں قسموں پر غور کرنے سے ایک اور قسم سامنے آتی ہے جس کا تعلق اس شخص سے ہے جو سرے سے بے اعتدالی اور گناہ کی راہ اختیار نہیں کرتا اور نفس کی خواہشات اور ناروا تمناؤں کا اسیر نہیں ہوتا بلکہ دنیا سے بے پرواہ ہوتا ہے اور اپنی تمامتر توجہ آخرت کے مفاد کی طرف مبذول رکھتا ہے، لہٰذا پہلی قسم کے لوگ وہ ہیں جن کو اصطلاحی طور پر "ظالم" سے موسوم کیا جاتا ہے، دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کو "مقتصد" یعنی میانہ رو کہا جاتا ہے اور تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کو "سابق" یعنی بھلائیوں کو اختیار کرنے میں سبقت لے جانے والا کہا جاتا ہے۔ پس جو شخص "سابق" ہوتا ہے وہ سرے سے اپنے ہاتھوں کو گناہ سے آلودہ ہی نہیں کرتا، جو شخص "مقتصد" ہوتا ہے وہ اپنے ہاتھوں کو گناہ سے آلودہ تو کرتا ہے لیکن ان کو پھر دھوڈالتا ہے، اور جو شخص "ظالم" ہوتا ہے وہ ہاتھ آلودہ ہی اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔

مذکورہ مثال اور اس کی مطابقت کو بیان کرنے کے بعد حضور ﷺ نے "یہ مال وزر بڑا سرسبز تازہ اور نرم ودلکش ہے" سے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ دنیا کے مال وزر، اس کے تئیں محبت اور اس کے مصارف کے تعلق سے انسانوں کے حالات وخیالات مختلف ہوتے ہیں کہ کچھ لوگ تو وہ ہوتے ہیں جو محض ضرورت وحاجت کے بقدر ہی مال واسباب کے حصول پر اکتفا کرتے ہیں اور اس کے حصول کے لئے بھی جائز ودرست وسائل وذرائع اختیار کرتے ہیں، نیز ان کے پاس جو مال واسباب اور روپیہ پیسہ ہوتا ہے اس کو وہ اچھے مصارف میں خرچ کرتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مال ودولت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ان کی حرص وطمع کسی بھی حد پر قناعت نہیں کرتی، وہ نہ صرف یہ کہ ضرورت واحتیاج سے زائد مال وزر حاصل کرنے کی سعی وکوشش کرتے ہیں اور اس کو جوڑنے میں لگے رہتے ہیں بلکہ اس کے حصول میں جائز وناجائز کے درمیان کوئی تمیز نہیں کرتے، سخت سے سخت برائی کا ارتکاب کر کے اور حرام ذرائع کو اختیار کر کے دولت سمیٹتے رہتے ہیں، علاوہ ازیں ان کے پاس جو مال ودولت اور روپیہ پیسہ ہوتا ہے اس کو حقداروں پر اور ان مصارف میں خرچ نہیں کرتے جو خدا کی خوشنودی کا باعث ہوتے ہیں، اور مال ودولت کے تئیں ان کی یہ حرص وطمع ان کو اس شخص کی مانند بنادیتی ہے جو کھاتا رہتا ہے مگر غلبہ حرص کی وجہ سے کبھی شکم سیر نہیں ہوتا یا ان کی حالت اس شخص کی سی ہو جاتی ہے جو استسقاء کا مریض ہوتا ہے کہ کسی وقت بھی سیراب نہیں ہوتا اور جتنا پانی پیتا ہے اسی قدر پیاس بھڑکتی ہے اور پیٹ پھولتا جاتا ہے۔

ایک عارف کی نظر میں دنیا کی مثال: بڑے پایہ کے بزرگ اور عارف باللہ حضرت خواجہ عبید اللہ نقشبندی کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ "یہ دنیا سانپ کی مانند ہے، لہٰذا جو شخص اس کا منتر جانتا ہے ان کے لئے تو دنیا کو حاصل کرنا جائز ہے لیکن دوسروں کے لئے جائز نہیں" جب لوگوں نے یہ سنا تو عرض کیا کہ حضرت! اس کا منتر کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا "اس بات کا علم ہونا کہ اس (ادنی کے مال ودولت) کو کہاں سے، اور کس طرح حاصل کر رہا ہے، اور کہاں خرچ کر رہا ہے"

دنیا کی طرف راغب ہونا تباہی وبربادی کی طرف راغب ہونا ہے

(۹) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَاللّٰهِ لَا الْفَقْرَ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ وَلٰكِنْ اَخْشٰى

عَلَيْكُمْ اَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا كَمَا بُسِطَتْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ فَتَنَا فَسُوْهَا كَمَا تَنَافَسُوْهَا وَتُهْلِكَكُمْ كَمَا اَهْلَكَتْهُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمرو ابن عوفؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ خدا کی قسم مجھے تمہارے فقرو افلاس کا کوئی ڈر نہیں ہے (کیونکہ فقرو افلاس کی حالت میں دین کی سلامتی کا امکان غالب ہوتا ہے اور یہ چیز تمہارے حق میں زیادہ سود مند ہے) بلکہ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ دنیا تم پر کشادہ کی جائے گی (اور تم، مالداروں کا طور طریقہ اختیار کر کے مختلف قسم کی آفتوں اور بلاؤں کے ذریعہ ہلاکت و تباہی میں مبتلا ہو جاؤ گے) جیسا کہ ان لوگوں پر دنیا کشادہ کی گئی تھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں (اور وہ مال و دولت کی بے حد رغبت و محبت رکھنے کی وجہ سے فقراء اور مساکین پر رحم نہیں کھاتے تھے اور ان کی مدد و اعانت سے گریز کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو تباہ و برباد کر دیا گیا) چنانچہ تم دنیا کی طرف رغبت کرو گے (یعنی دنیا کو اختیار کرو گے اور اس کی طرف نہایت رغبت رکھو گے کہ ایک دوسرے سے مال و دولت اور جاہ و حکومت حاصل کرنے کے لئے لڑائی جھگڑا شروع کر دو گے) جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں نے اس کی طرف رغبت کی تھی، اور پھر یہ دنیا تم کو اسی طرح تباہ و برباد کر دے گی جس طرح ان کو تباہ و برباد کر چکی ہے" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: مال و دولت کی وہ فراخی و آسودگی جو دنیا کا گرویدہ بناتی ہے، حرص و طمع میں مبتلا کرتی ہے، جوڑنے سمیٹنے اور ذخیرہ اندوزی کا خوگر کرتی ہے چونکہ انسان کو اخلاقی و روحانی طور پر تباہ و برباد کر دیتی ہے اور اخروی ہلاکت کا مستوجب بنا دیتی ہے اس لئے حضور ﷺ نے مسلمانوں کی دنیاوی خوشحالی و آسودگی اور مالداری سے اپنے خوف کا اظہار فرمایا! یا آپ ﷺ نے اس دنیاوی ترفع و آسودگی اور خوشحالی کے تئیں خوف کا اظہار فرمایا جو باہمی مخالفت و نزاع، سماجی استحصال و لوٹ کھسوٹ اور محض دنیاوی اقتدار کے لئے جنگ و جدل اور قتل و قتال کے نتیجہ میں حاصل ہو۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ارشاد گرامی میں "فقر" سے مراد ان تمام چیزوں سے تہی دست ہونا ہے جن کی ایک انسانی زندگی کو احتیاج ہوتی ہے اور جن پر ضروریات دین کی تکمیل اور بنیادی اسباب معیشت کا انحصار ہوتا ہے۔ اسی طرح غنا یعنی دنیاوی فراخی و آسودگی سے مراد دنیا کی چیزوں کا اس قدر حاصل ہونا ہے جو مقدار کفایت و ضرورت سے زائد ہوں، جس کی وجہ سے انسان حق تعالیٰ کی عبادت و اطاعت سے غافل ہو جاتا ہے اور تمرد و سرکشی اختیار کر لیتا ہے۔

رزق کے بارے میں آنحضرت ﷺ کی دعا

(۱۰) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا وَفِيْ رِوَايَةٍ كَفَافًا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے یہ دعا فرمائی۔ "اے اللہ! تو آل محمد (ﷺ) کو بقدر قوت، رزق عطا فرما" اور ایک روایت میں (قوت کے بجائے) "کفاف" کا لفظ ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ملا علی قاری کے مطابق "آل" سے مراد آنحضرت ﷺ کی ذریت (اولاد) اور اہل بیت ہیں! یا اُمت کے وہ لوگ مراد ہیں جو آپ ﷺ کے سچے تابعدار اور محبوب ہوں۔ اور حضرت شیخ عبدالحقؒ نے یہ لکھا ہے کہ "آل" سے مراد آپ ﷺ کی اُمت کے تمام افراد اور متبعین مراد ہیں جیسا کہ لفظ "آل" کے اصل معنی یہی مراد لئے جاتے ہیں۔ اور اگر اہل و عیال ہی کو مراد لیا جائے تو بھی قیاس اور دلالت کو بنیاد بنا کر ان (اہل و عیال) کے علاوہ اُمت کے باقی افراد کو بھی اس دعا میں شامل قرار دیا جائے گا۔"

"قوت" کھانے پینے کی اس محدود مقدار کو کہتے ہیں جو زندگی کو باقی اور جسمانی توانائی کو برقرار رکھے! اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ کھانے پینے کی وہ محدود مقدار "قوت" کہلاتی ہے جو جان کو بچائے اور بطور رزق کافی ہو "کفاف" بنیادی ضروریات زندگی کی اس

مقدار کو کہتے ہیں جو کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے محفوظ و باز رکھے۔ نیز بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ "قوت" اور کفاف" کے ایک ہی معنی ہیں اور زیادہ صحیح بات بھی یہی ہے کہ دوسری روایت کا لفظ "کفاف" دراصل پہلی روایت کے لفظ "قوت" کی وضاحت ہے اور اس لفظ کے ذریعہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اسباب معیشت اور ضروریات زندگی کی کم سے کم مقدار پر اکتفا کرنا اولیٰ ہے!

واضح رہے کہ حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کی اس دعا کو اپنے ان بندوں کے حق میں قبول فرمایا جنہیں اس نے اپنا پیارا اور برگزیدہ بنانا چاہا۔

اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ "کفاف" یعنی خوراک کی بقدر کفایت مقدار، کوئی متعین اور آخری نہیں، بلکہ اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں اور اس فرق و اختلاف کا مدار اشخاص، زمانہ اور حالات کی عدم یکسانیت پر ہے، مثلاً ایک شخص ایسا ہوتا ہے جو قلیل کھانے کی عادت رکھتا ہے بایں طور کہ وہ دو تین دن یا اس سے زائد بھوکا رہ سکتا ہے، ایک شخص ایسا ہوتا ہے جو دن بھر میں دو تین بار کھانے کی عادت رکھتا ہے، کوئی شخص کم یا زیادہ اہل و عیال رکھتا ہے اور کوئی شخص سرے سے عیالدار ہی نہیں ہوتا، اسی طرح بعض حالات اور بعض اوقات ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں کھانے پینے کی تھوڑی سی مقدار بھی کافی ہو جاتی ہے جیسے قحط کا زمانہ، تنگدستی کی حالت اور ضعف و کمزوری یا مرض کا لاحق ہونا، اس کے برخلاف خوشحالی و آسودگی اور قوت و توانائی کی حالت میں کھانے پینے کی زیادہ خواہش ہوتی ہے غرضیکہ کفاف کی مقدار کو منضبط نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کا دار و مدار وقت و حالات و ضروریات پر ہوتا ہے کہ جو شخص جس حیثیت کا اور جس حالت میں ہوتا ہے اس کے حق میں کفاف کی مقدار اسی کے مطابق ہوتی ہے۔ البتہ مستحسن اور مطلوب یہ ہے کہ انسان کو اپنے کھانے پینے کی ضروریات کو بس اسی مقدار تک محدود رکھنا چاہئے جو زندگی کی بقاء کے لئے ناگزیر اور جسمانی قوت توانائی کی برقراری کے لئے ضروری ہو کہ جس سے عبادات و طاعات پر قدرت حاصل رہے اور معمولات زندگی فوت نہ ہوں۔

اس حدیث میں گویا مسلمانوں کو اس امر پر متنبہ کرنا مقصود ہے کہ وہ حصول معاش کی جدوجہد کی ضروریات زندگی کی اس مقدار تک محدود رکھیں جو "کفاف" کہلاتی ہے اور ضرورت سے زیادہ اسباب معیشت مہیا کرنے کی محنت و مشقت برداشت نہ کریں نیز حد اعتدال سے تجاوز کر کے اور حرص و ہوس میں مبتلا ہو کر اپنی روحانی و اخلاقی زندگی کو مضمحل نہ کریں۔

علماء نے لکھا ہے کہ "فقر اور غنا دونوں سے کفاف افضل ہے، اگرچہ بعض حالتوں میں غنا یعنی مال و دولت کی کثرت بھی ایک طرح کی فضیلت رکھتی ہے بشرطیکہ اس کثرت کی وجہ سے حاصل ہونے والی خوشحالی و آسودگی کسی بھی صورت میں دینی گمراہی، اخروی نقصان و خسران اور دنیا کی محبت و جاہ کا موجب نہ بنے بلکہ خیر و بھلائی اور عبادات و طاعات کی راہ زیادہ سے زیادہ اختیار کرنے میں مددگار ہو۔

فلاح و نجات پانے والا شخص

(۱۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَسْلَمَ وَ رُزِقَ كَفَافًا وَقَنَّعَهُ اللّٰهُ بِمَا آتَاهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "وہ شخص فلاح و نجات کو پہنچ گیا جس نے اسلام قبول کیا (یا "اسلم" سے مراد یہ ہے کہ اس نے قضا و قدر الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کیا) اس کو (حلال و جائز ذرائع سے) بقدر کفاف رزق دیا گیا (یعنی اس کو بس اتنا رزق ملا جو اس کی ضروریات زندگی کے لئے کافی ہو گیا اور وہ غیر اللہ کے آگے ہاتھ پھیلانے کا ضرورتمند نہیں رہا) اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اس چیز پر کہ جو اس کو دی گئی ہے قناعت بخشی (اور اس کو تقدیر پر راضی اور مطمئن کیا۔" (مسلمؒ)

مال و دولت میں انسان کا اصل حصہ

(۱۲) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْعَبْدُ مَالِيْ مَالِيْ وَاِنَّ مَالَهُ مِنْ مَالِهِ ثَلٰثٌ مَا اَكَلَ فَاَفْنٰى اَوْ لَبِسَ فَاَبْلٰى اَوْ اَعْطٰى فَاقْتَنٰى وَمَا سِوٰى ذٰلِكَ فَهُوَ ذَاهِبٌ وَتَارِكُهُ لِلنَّاسِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بندہ کہتا رہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال (یعنی جو شخص مالدار اور دولت مند ہوتا ہے وہ اپنے مال و دولت پر بہت فخر کرتا ہے اور دوسرے پر یہ جتانے کی کوشش کرتا ہے کہ میرے پاس مال و دولت ہے) اور حقیقت یہ ہے کہ اس کو اس مال و دولت میں سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ فی الجملہ تین چیزیں ہیں (اور ان تین چیزوں میں سے بھی صرف ایک چیز ایسی ہے جو اس کے لئے حقیقی نفع بخشش اور باقی رہنے والی ہے، جب کہ بقیہ دو چیزیں ایسی ہیں جن کا تعلق دنیا سے ہے اور جو فناہ ہو جانے والی ہے) ایک تو وہ چیز جس کو اس نے کھالیا اور ختم کر دیا، دوسری وہ چیز جس کو اس نے پہن لیا اور بوسیدہ کر دیا یعنی اتار کر پھینک دیا، اور تیسری وہ چیز جس کو اس نے خدا کی راہ میں دیا اور (آخرت کے لئے) ذخیرہ کر لیا، ان تینوں چیزوں کے سوا اور جو کچھ ہے (جیسے زمین، جائداد، مویشی، نوکر چاکر، روپیہ پیسہ اور دیگر قیمتی چیزیں وہ) سب ایسی ہیں جن کو وہ لوگوں کے لئے چھوڑ کر (اس دنیا سے) چلا جانے والا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی میں اس حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ انسان محنت و مشقت کر کے دنیا کماتا ہے، مال و دولت حاصل کرتا ہے اور زمین و جائداد بناتا ہے، پھر اس مال و دولت اور زمین و جائداد پر فخر کرتا ہے، اپنے کو ایک بڑا آدمی ظاہر کرتا ہے اور لوگوں پر اپنی امارت و ثروت کا سکہ جمانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اس بات کو محسوس نہیں کرتا کہ اول تو اس مال و دولت اور زمین جائداد کا وبال بہت سخت ہے اور اس کی جواب دہی نہایت مشکل ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے پاس جو کچھ مال و دولت اور زمین جائداد ہے اس سے خود اس کی ذات کو بہت معمولی فائدہ پہنچتا ہے اور یہ چیزیں بہت کم عرصہ تک اس کا ساتھ دینے والی ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے بڑے نفسیاتی طریقہ پر واضح فرمایا کہ مال و دولت میں انسان کا اصل حصہ اور اس کا فی الجملہ فائدہ بس اتنا ہوتا ہے کہ وہ کچھ چیزوں کو تو کھا پی کر ختم کر دیتا ہے۔ کچھ چیزوں کو پہن برت کر پرانا کر دیتا ہے اور اگر اسے توفیق ہوتی ہے تو کچھ چیزوں کو خدا کی راہ میں خرچ کر کے ان کو اپنے لئے ذخیرۂ آخرت بنا لیتا ہے، باقی تمام مال و اسباب، ساری زمین جائداد اور سب روپیہ پیسہ وغیرہ دوسروں کے لئے چھوڑ کر دنیا سے چلا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں سے آخری صورت (یعنی اپنے مال کو خدا کی راہ میں خرچ کرنا) بے شک ایسی چیز ہے جو انسان کو اس کے مال و دولت سے سب سے بیش قیمت اور ہمیشہ کے لئے باقی رہنے والا نفع پہنچاتی ہے، اور اگر اس اصل نفع کے لئے مال و دولت کو حاصل کیا جائے اور اس کو جمع کیا جائے تو یہ یقیناً سمجھ میں آنے والی بات ہوگی ورنہ محض چند روزہ دنیاوی اور جزوی منافع کے لئے مال و دولت جمع کرنا اور اس کی وجہ سے اپنی بڑائی کا اظہار کرنا بے حقیقت بات ہوگی، چنانچہ اس ارشاد گرامی کے ان الفاظ او اعطی فاقتنی کے ذریعہ اس امر کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ مال و دولت کو جمع کرنا حقیقت میں یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ جو مال و دولت عطا کرے وہ اس کو خدا کی خوشنودی کے لئے فقراء و غرباء اور حاجتمندوں پر خرچ کرے تاکہ اس کا ثواب جمع ہوتا رہے اور پھر حاجت کے دن (روز حشر) کام آئے۔

مرنے کے بعد نہ اہل و عیال ساتھی ہوں گے اور نہ جاہ و مال

(۱۳) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتْبَعُ الْمَيِّتَ ثَلٰثَةٌ فَيَرْجِعُ اِثْنَانِ وَ يَبْقٰى مَعَهٗ وَاحِدٌ يَتْبَعُهٗ اَهْلُهٗ وَمَالُهٗ وَعَمَلُهٗ فَيَرْجِعُ اَهْلُهٗ وَمَالُهٗ وَيَبْقٰى عَمَلُهٗ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں رسول کریم ﷺ نے فرمایا میت کے ساتھ (قبر تک) تین چیزیں جاتی ہیں، ان میں سے دو چیزیں تو (اس کو اکیلا چھوڑ کر) واپس آجاتی ہیں اور ایک چیز اس کے ساتھ رہ جاتی ہے، چنانچہ اس کے متعلقین (جیسے اولاد، عزیز و اقارب، دوست و احباب اور جان پہچان کے لوگ) اور اس کے اموال (جیسے نوکر چاکر، پلنگ، جانور، گاڑی وغیرہ اور اسی طرح کے اسباب) اور اس کے اعمال اس کے ساتھ جاتے ہیں۔ ان تینوں میں سے متعلقین اور مال تو (اس کو تنہا چھوڑ کر) واپس آجاتے ہیں اور اس کے اعمال اس کے ساتھ رہتے

ہیں۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اعمال" سے مراد وہ ثواب وعذاب ہے جو ہر اچھے برے عمل پر مرتب ہوتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ انسان جب اس دنیا سے رخصت ہو کر آخرت کی پہلی منزل (قبر) میں پہنچتا ہے تو وہاں سے وہ مرحلہ شروع ہو جاتا ہے جہاں سے عزیز و اقارب، دوست، احباب، مال و دولت اور جاہ و حشم سب ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور صرف وہ اعمال اس کے ساتھ رہ جاتے ہیں جو اس نے دنیا میں کیے تھے۔ شاید اسی لئے کہا گیا ہے کہ القبر صندوق العمل یعنی قبر اعمال کا صندوق ہے۔

اپنے مال کو ذخیرۂ آخرت بناؤ

(۱۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّكُمْ مَالُ وَارِثِهٖ اَحَبُّ اِلَيْهِ مِنْ مَالِهٖ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا مِنَّا اَحَدٌ اِلَّا مَالُهٗ اَحَبُّ اِلَيْهِ مِنْ مَالِ وَارِثِهٖ قَالَ فَاِنَّ مَالَهٗ مَا قَدَّمَ وَمَالُ وَارِثِهٖ مَا اَخَّرَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے (صحابہؓ کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ "تم میں وہ کون شخص ہے جو اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کے مال کو پسند کرتا ہو کہ اس کا مال اور روپیہ پیسہ خود اس کے لئے نہ ہو بلکہ اس کے وارثوں کے لئے ہو؟) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! ہم میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کے مال کو پسند کرتا ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ (تو سنو) حقیقت میں اس کا مال وہ ہے جس کو اس نے (صدقہ و خیرات وغیرہ کے ثواب کی صورت میں) آگے بھیج دیا ہے، اور اس کے وارث کا مال وہ ہے جس کو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر لوگ واقعۃً اس بات کو زیادہ پسند کرتے ہیں کہ ان کے پاس جو مال و دولت ہے اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ انہی کو پہنچے تو چاہئے تو یہ کہ وہ اس مال و دولت کو یہاں دنیا میں جمع کرنے اور یہیں چھوڑ جانے کے بجائے آخرت میں کام آنے کے لئے آگے بھیجیں، جس کی صورت یہ ہے کہ اس کو صدقہ و خیرات اور نیک کاموں میں خرچ کر کے زیادہ سے زیادہ ثواب کمائیں۔ لیکن عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ لوگ اپنے مال و دولت اور روپیہ پیسہ کو جوڑ جوڑ کر جمع کرتے ہیں، صدقہ و خیرات کرنے اور حقداروں کا حق دینے سے گریز کرتے اور بخل کرتے ہیں، اور اس طرح اس کو آگے بھیجنے کے بجائے ورثاء کے لئے یہیں دنیا میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مال و دولت کو اپنے لئے زیادہ پسند نہیں کرتے بلکہ اپنے ورثاء کے لئے زیادہ پسند کرتے ہیں تاہم واضح رہے کہ اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس شخص کے پاس جو کچھ مال و دولت اور اثاثہ ہو وہ ان سب کو خدا کی راہ میں خرچ کر دے اور اپنے ورثاء کے لئے کچھ بھی چھوڑ کر نہ جائے، بلکہ اصل مقصد اس بات کی طرف راغب کرنا ہے کہ مال دار لوگ بخل و امساک کا طور نہ اپنائیں اور فقراء مساکین کی امداد و اعانت سے گریز نہ کریں بلکہ اپنے مال و دولت اور اپنے روپیہ پیسہ کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں ضرور خرچ کریں، چنانچہ اپنے مال و دولت کے کچھ حصے کو صدقہ و خیرات کرنے اور فقراء و مساکین اور نیک کاموں کے لئے وصیت کرنے کے بعد کہ جس کی زیادہ سے زیادہ مقدار تہائی حصہ ہے، باقی کو ورثاء کے لئے چھوڑنا افضل ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اپنے ورثاء کو تونگر چھوڑ کر جانا اس سے بہتر ہے کہ (اپنا سارا مال و زر خدا کی راہ میں خرچ کر کے دنیا سے رخصت ہو جائے اور) اس کے ورثاء اپنی ضروریات کے لئے لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔

مالدار کے حق میں اس کا اصل مال وہی ہے جو اس کے کام آئے

(۱۵) وَعَنْ مُطَرِّفٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَقْرَءُ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ قَالَ يَقُوْلُ ابْنُ اٰدَمَ مَالِيْ مَالِيْ قَالَ وَهَلْ لَكَ يَا ابْنَ اٰدَمَ اِلَّا مَا اَكَلْتَ فَاَفْنَيْتَ اَوْ لَبِسْتَ فَاَبْلَيْتَ اَوْ تَصَدَّقْتَ فَاَمْضَيْتَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت مطرفؒ (تابعی) اپنے والد ماجد (حضرت عبداللہ ابن شخیر) سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ الھٰکم التکاثر پڑھ رہے تھے (جس کے معنی یہ ہیں کہ اے لوگو! تم آپس میں اپنی ثروت و امارت پر فخرو ناز کرنے کے سبب آخرت کے خوف سے بے پرواہ ہو گئے ہو) چنانچہ حضور ﷺ نے (تکاثر یعنی آپس میں ثروت و امارت پر فخر کرنے کی وضاحت میں) فرمایا ابن آدم میرا مال، میرا مال کہتا ہے (یعنی جس کے پاس زیادہ مال ہوتا ہے وہ لوگوں پر جتاتا رہتا ہے کہ میں اتنا بڑا مالدار ہوں، میرے پاس اتنی زیادہ دولت ہے) پھر آپ نے فرمایا کہ (لوگوں کا اپنے مال و متاع پر فخر کرنا بالکل بے حقیقت بات ہے، واقعہ یہ ہے کہ) اے ابن آدم! تجھے تیرے مال سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے اور تو جتنا فائدہ اٹھاتا ہے وہ بس اتنا ہے کہ تو کچھ چیزوں کو کھالیتا ہے اور اس کو ختم کر دیتا ہے، کچھ چیزوں کو پہنتا ہے اور ان کو بوسیدہ کر دیتا ہے اور کچھ چیزوں کو خدا کی راہ میں خرچ کر دیتا ہے اور اس کو آخرت کے لئے ذخیرہ بنالیتا ہے۔" (مسلمؒ)

حقیقی دولت، دل کا غناء ہے

(۱۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الْغِنٰى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلٰكِنَّ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اصل تونگری و دولت مندی یہ نہیں ہے کہ اپنے پاس بہت زیادہ مال و متاع ہو بلکہ حقیقی تونگری و دولتمندی جس چیز کا نام ہے وہ نفس یعنی دل کا تونگر و غنی ہونا ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: دل کا غنی ہونا یہ ہے کہ جو کچھ حاصل ہو اس پر قناعت کرے، مال و دولت اور مالداروں سے بے نیازی و بے پروائی برتے اور بلند حوصلگی اور عالی ہمتی کا مالک ہو کہ نہ تو حرص و طمع میں مبتلا ہو اور نہ کسی کے آگے دست سوال دراز کرے، چنانچہ جو شخص ایسا ہو کہ اس کا دل مال و دولت حاصل کرنے اور جوڑنے بٹورنے میں لگا رہے اور کثرت مال کی طلب و حرص میں مبتلا ہو تو وہ حقیقت میں فقیر و محتاج ہے، خواہ ظاہر میں کتنا ہی مالدار کیوں نہ ہو، اور جو شخص قوت و کفاف پر قانع و راضی ہو اور زیادہ طلبی و حرص سے دور رہے۔ وہ اصل میں تونگر و غنی ہے اگرچہ ظاہر میں اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ اسی حقیقت کو شیخ سعدیؒ نے یوں بیان کیا ہے ؎

تو نگری بدل است نہ بمال ۔ بزرگی بعقل است نہ بسال

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ غنی النفس (یعنی نفس کے غنی ہونے) سے مراد یہ ہے کہ وہ علمی کمالات حاصل ہوں جن کے بغیر انسان کی روحانی اخلاقی زندگی نہ تو محفوظ رہتی ہے اور نہ اس کو آسودگی و عظمت حاصل ہوتی ہے، گویا اصل خوش بختی و دولت اور تونگری کا مدار روحانی و عملی کمالات پر ہے نہ کہ مال و متاع کی کثرت پر، جیسا کہ کسی نے کہا ہے ؎

تو نگری نہ بمال است نزد اہل کمال ۔ کہ مال تالب گور است بعدازاں اعمال

اور بعض ارباب نے یوں کہا ہے ؎

رَضِيْنَا قِسْمَةَ الْجَبَّارِ فِيْنَا ۔ لَنَا عِلْمٌ وَلِلْاَعْدَاءِ مَالُ

حق تعالیٰ نے ہماری قسمت میں جو کچھ لکھدیا ہے ہم اس پر راضی و مطمئن ہیں ہمارے لئے علم کی دولت ہے اور دشمنوں کے لئے دنیاوی مال ہے ؎

فَاِنَّ الْمَالَ يَفْنٰى عَنْ قَرِيْبٍ ۔ وَاِنَّ الْعِلْمَ يَبْقٰى لَا يَزَالُ

پس اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیاوی مال بہت جلد فنا ہونے والا ہے۔ جب کہ علم کی دولت یقیناً ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ اور

یہ بات معلوم ہی ہے کہ دنیاوی مال و متاع ان لوگوں کی میراث ہے جو خدا کے نزدیک سخت مبغوض اور مردود ہیں، جیسے فرعون، قارون اور تمام کفار و فجار وغیرہ، جب کہ انبیاء، علماء اور اولیاء کی میراث علم و اخلاق کی دولت ہے، لہٰذا دنیادار شخص ظاہری مال و متاع حاصل کر کے راضی و مطمئن ہوتا ہے اور دیندار شخص علم کی دولت پاکر خوش اور مطمئن ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

پانچ بہترین باتوں کی نصیحت

(۱۷) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ یَاْخُذُ عَنِّیْ هٰؤُلَآءِ الْكَلِمَاتِ فَیَعْمَلُ بِهِنَّ اَوْیُعَلِّمُ مَنْ یَّعْمَلُ بِهِنَّ قُلْتُ اَنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاَخَذَ بِیَدِیْ فَعَدَّ خَمْسًا فَقَالَ اتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ اَعْبَدَ النَّاسِ وَ اَرْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُنْ اَغْنَی النَّاس وَاَحْسِنْ اِلٰی جَارِكَ تَكُنْ مُؤْمِنًا وَ اَحِبَّ لِلنَّاسِ مَاتُحِبُّ لِنَفْسِكَ تَكُنْ مُسْلِمًا وَلَا تُكْثِرِ الضِّحْكَ فَاِنَّ كَثْرَةَ الضِّحْكِ تُمِیْتُ الْقَلْبَ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ کون شخص ہے جو مجھ سے پانچ باتوں کو سیکھے اور پھر ان پر عمل کرے یا اس شخص کو سکھائے جو ان پر عمل کرنے والا ہو۔ (حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ یہ سن کر میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! وہ شخص میں ہوں۔ حضور ﷺ نے (یہ سن کر) میرا ہاتھ پکڑا اور وہ پانچ باتیں گنائیں، اور (اس طرح) بیان فرمایا کہ ① تم ان چیزوں سے بچو، جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے اگر تم ان سے بچو گے تو تم لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار بندہ ہو گے۔ ② تم اس چیز پر راضی و شاکر رہو جس کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری قسمت میں لکھ دیا ہے، اگر تم تقدیر الٰہی پر راضی و مطمئن رہو گے تو تمہارا شمار تونگر ترین لوگوں میں ہوگا، یعنی جب بندہ اپنے مقسوم پر راضی و مطمئن ہو جاتا ہے اور طمع و حرص سے پاک ہو کر زیادہ طلبی کی احتیاج میں رکھتا تو وہ مستغنی اور بے نیاز ہو جاتا ہے اور تونگری کا اصل مفہوم بھی یہی ہے ③ تم اپنے ہمسایہ سے اچھا سلوک کرو (اگرچہ تمہارے ساتھ برا سلوک کرے) اگر تم ایسا کرو گے تو تم کامل مؤمن سمجھے جاؤ گے ④ تم (دنیا و آخرت کی بھلائیوں سے متعلق) جس چیز کو اپنے لئے پسند کرتے ہو اس کو دوسرے سب لوگوں کے لئے پسند کرو، اگر تم ایسا کرو گے تو تم کامل مسلمان سمجھے جاؤ گے ⑤ اور تم زیادہ ہنسنے سے پرہیز کرو، کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ (اور خدا کی یاد سے غافل) بنا دیتا ہے (اگر تم زیادہ ہنسنے سے اجتناب کرو گے تو تمہارا دل روحانی بالیدگی و تروتازگی اور نور سے بھرا رہے گا اور ذکر اللہ کے ذریعہ اس کو زندگی و طمانیت نصیب ہوگی)" اس روایت کو احمدؒ نے نقل کیا ہے اور (ترمذی نے) کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حدیث کے ابتدائی جملوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علم، بذات خود افضل و اشرف ہے کہ کسی شخص کا محض علم کا حاصل ہونا اس کی فضیلت کی دلیل ہے، ہاں اگر اس علم پر عمل پیرا ہونے کی دولت بھی نصیب ہو جائے تو اس سے بڑی کوئی سعادت ہی نہیں کہ علم کا اصل مقصود حاصل ہو جاتا ہے، لیکن اگر کوئی عالم اپنے علم پر خود تو عمل نہ کرے البتہ تعلیم و تلقین کے ذریعہ اس علم کی روشنی دوسرے تک پہنچائے اور سیدھی راہ دکھانے کا فریضہ انجام دے تو اس کو اس صورت میں بھی ثواب ملتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بے عمل عالم کا لوگوں کو نیکی و بھلائی کی تلقین کرنا اور برائی سے روکنا درست ہے۔

"محارم" کے مفہوم میں ہر طرح کی ممنوع چیزوں کو اختیار کرنا اور جن چیزوں کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کو ترک کرنا شامل ہے! لہٰذا تم "محارم" یعنی ان چیزوں سے بچو جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف ممنوع اور حرام چیزوں سے اجتناب کرو بلکہ شریعت نے جن چیزوں کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے ان کو ترک کرنے سے بھی اجتناب کرو۔

محارم سے اجتناب کرنے والے کو سب سے زیادہ عبادت گزار بندہ اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ محارم سے اجتناب کرنا گویا ان

فرائض سے عہدہ برآ ہونا ہے جو حق تعالیٰ نے عائد کیے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ فرائض کو پورا کرنے سے افضل کوئی عبادت نہیں ہے، جب کہ عام لوگ فرائض کو ترک کرتے ہیں یا ان کی طرف کم توجہ دیتے ہیں اور کثرت نوافل میں مشغول رہتے ہیں۔ اور اس طرح وہ گویا اصول اور بنیاد کو توضائع کرتے ہیں اور فروعات و فضائل کو اختیار کرتے ہیں، مثلاً بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص پر روزوں کی قضا واجب ہوتی ہے مگر وہ اس قضا کو ادا کرنے کی طرف سے تو غافل رہتا ہے البتہ حصول علم اور فضل عبادات میں مشغول رہنے کو ترجیح دیتا ہے، یا ایک شخص پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے یا لوگوں کے مالی حقوق اس کے ذمہ ہوتے ہیں مگر وہ زکوٰۃ اور حقوق العباد کی ادائیگی کی طرف تو کوئی توجہ نہیں دیتا البتہ فقراء و مساکین پر خرچ کرنا اور مساجد و مدارس کی تعمیر و اعانت یا اسی طرح کے دوسرے نافلہ امور میں پورے ذوق و شوق کے ساتھ اپنا مال خرچ کرتا ہے۔

تقدیر الٰہی پر راضی و مطمئن ہونا اور اپنے مقسوم پر صابر و شاکر رہنا، بڑا اونچا مرتبہ ہے، جس شخص کو یہ مقام نصیب ہو جاتا ہے وہ حرص و طمع سے پاک رہتا ہے، زیادہ طلبی سے اپنا دامن بچاتا ہے اور قلبی استغنا و تونگری کی وجہ سے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا گوارہ نہیں کرتا۔ منقول ہے کہ ایک شخص نے مشہور بزرگ حضرت سید ابوالحسن شاذلی سے کیمیا کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ (کیمیا) دو باتوں میں پوشیدہ ہے۔ ایک تو یہ کہ تم مخلوق کو نظر سے گرا دو (یعنی غیر اللہ کو حاجت روا اور مشکل کشا بنانے کے قابل نہ سمجھو اور اللہ کے سوا کسی اور سے اپنی حاجت کو وابستہ نہ کرو) اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ سے بھی یہ امید وابستہ نہ کرو کہ وہ تمہیں اس چیز کے علاوہ کچھ اور بھی دے جو اس نے تمہاری قسمت میں لکھ دی ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا۔ "اے انسان، اس بات کو جان لے کہ جو چیز تیری قسمت میں لکھی جا چکی ہے وہ ہر حال میں تجھے ملے گی، خواہ تو طلب و سوال کی راہ اختیار کر یا اس راہ کو ترک کر دے، اور جو چیز تیری قسمت میں نہیں لکھی ہے وہ تجھ کو کسی حالت میں نہیں ملے گی۔ خواہ تو اس کے طلب کی کتنی ہی حرص رکھے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے کتنی ہی سعی و کوشش اور محنت و مشقت برداشت کرے، لہٰذا (تجھے جو کچھ مل جائے) اس پر شاکر و صابر رہ، ہر حالت میں جائز و حلال چیز کو حاصل کرنا ضروری سمجھ اور اپنے مقسوم پر راضی و مطمئن رہ تاکہ رب ذوالجلال تجھ سے راضی و خوش رہے۔

"تم جس چیز کو اپنے لئے پسند کرتے ہو" کا مطلب یہ ہے کہ دین و دنیا کی بہتری و بھلائی کی جس چیز کو تم خاص طور پر اپنے لئے پسند کرتے ہو اس چیز کو دوسروں کے لئے بھی پسند کرو، یہاں تک کہ کافر کے لئے ایمان کو اور فاجر کے لئے توبہ و انابت کو پسند کرو۔"

دنیاوی تفکرات اور غم روزگار کی پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ

(۱۸) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ ابْنَ آدَمَ تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِيْ اَمْلَأْ صَدْرَكَ غِنًى وَاَسُدَّ فَقْرَكَ وَاِنْ لَا تَفْعَلْ مَلَأْتُ يَدَكَ شُغْلًا وَلَمْ اَسُدَّ فَقْرَكَ۔ (رواہ احمد و ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ابن آدم! میری عبادت کے لئے تو اپنے دل کو اچھی طرح مطمئن و فارغ کر لے، میں تیرے سینے کو استغناء سے بھر دوں گا (یعنی تیرے دل کو علوم و معارف کی دولت سے مالا مال کر دوں گا، (جس کے سبب تو غیر اللہ سے بے نیاز و مستغنی ہو جائے گا) اور تیرے لئے فقر و افلاس کی راہ کو بند کر دوں گا۔ اگر تو نے ایسا نہ کیا (یعنی میں نے جو یہ حکم دیا ہے کہ دنیا سے بے پروائی اختیار کر کے اپنے رب کی عبادت کی طرف متوجہ رہ، کہ یہ چیز دنیا و آخرت دونوں جگہ فائدہ پہنچاتی ہے، اگر تو نے اس حکم سے اعراض کیا اور اپنے قوائے فکر و عمل کو میری عبادت میں مشغول رکھنے کے بجائے صرف دنیاوی امور اور اپنے نفس کی خواہشات کی تکمیل میں مشغول و منہمک رکھا) تو میں تیرے ہاتھوں (اور دیگر قوائے عمل کو) طرح طرح کے تفکرات اور مشاغل سے بھر دوں گا اور تیرے فقر و احتیاج کو دور نہیں کروں گا۔" (احمدؒ و ابن ماجہؒ)

تشریح : مطلب یہ ہے کہ فقر وافلاس اور تفکرات وآلام کے بادل محض اس طور سے نہیں چھٹتے کہ اپنے تمام اوقات کو طلب معاش اور حصول مال کی جدوجہد اور محنت ومشقت میں صرف کرے اور ہر لمحہ دنیاوی امور ومشاغل میں سرگرداں رہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس صورت میں تمام تر پریشانیاں اور سرگردانیاں اپنی جگہ باقی رہتی ہیں جب کہ عبادت خداوندی کے لئے اپنے قوائے فکر وعمل اور اوقات کو دنیاوی فکرات ومشاغل سے فارغ رکھنا کشائش حالات کا ضامن بھی ہے اور غیر اللہ سے استغناء وبے نیازی کے حصول کا باعث بھی، اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ خدا کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے ہر وقت غم روزگار کی الجھنوں کو اپنے اوپر مسلط رکھنے اور طلب زر کی راہ میں ناروا محنت ومشقت کی صعوبتوں اور تفکرات میں پھنس کر اپنے آپ کو تعب وغم میں مبتلا رکھنے کی وجہ سے اس مقدار سے زائد تو کچھ حاصل ہونے سے رہا، جو ازل سے قسمت میں لکھ دی گئی ہے البتہ الٹا اثر یہ ضرور ہوگا کہ عبادت خداوندی کو ترک کرنے کے سبب قلبی استغناء کی دولت سے بھی محروم ہو جائے گا۔

ورع کی اہمیت

(۱۹) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ ذُكِرَ رَجُلٌ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعِبَادَةٍ وَاجْتِهَادٍ وَذُكِرَ اٰخَرُ بِرِعَةٍ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَعْدِلُ بِالرِّعَةِ يَعْنِي الْوَرْعَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے سامنے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا گیا جو کثرت کے ساتھ عبادت وطاعت میں مشغول رہتا ہے اور اس میں بہت زیادہ سعی واہتمام کرتا ہے (اگرچہ وہ گناہوں سے بہت کم اجتناب کرتا ہے) اور ایک دوسرے شخص کے بارے میں ذکر کیا گیا جو پرہیزگاری کو اختیار کرتا ہے (چنانچہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ پہلا شخص افضل ہے یا دوسرا شخص؟) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ (پرہیزگاری کے بغیر) کثرت عبادت وطاعت اور اس میں سعی واہتمام کرنے کو پرہیزگاری کے برابر نہ ٹھہراؤ (اگرچہ اس پرہیزگاری کے ساتھ عبادت وطاعت کی اس قدر کثرت اور سعی اور اہتمام شامل نہ ہو۔" (ترمذیؒ)

تشریح : یعنی "الورع" کے الفاظ اصل حدیث کا جزو نہیں ہیں بلکہ کسی راوی کا اپنا قول ہے جس نے ان الفاظ کے ذریعہ رعة کی وضاحت کی ہے کہ اس لفظ سے مراد ورع ہے۔ واضح رہے کہ ورع سے مراد تقویٰ ہے یعنی حرام چیزوں سے بچنا، اور جس کے مفہوم میں عبادات واجبہ کو ادا کرنا بھی شامل ہو سکتا ہے۔ حدیث کا حاصل یہ ہے کہ "جو شخص عبادت وطاعات تو زیادہ کرے لیکن گناہوں سے اجتناب کے معاملہ میں کمزور ہو وہ اس شخص سے افضل نہیں ہو سکتا جو پرہیزگاری کو اختیار کیے ہوئے ہو، اگرچہ اس کے ہاں عبادت وطاعت کی کثرت اور اس میں زیادہ سعی واہتمام نہ ہو۔

پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو

(۲۰) وَعَنْ عَمْرِو ابْنِ مَيْمُوْنِ الْاَوْدِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِرَجُلٍ وَهُوَ يَعِظُهُ اغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقْمِكَ وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ وَحَيٰوتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ مُرْسَلًا۔

"اور حضرت عمرو ابن میمون اودی (تابعیؒ) کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔ "پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو! یعنی پانچ حالتیں ایسی ہیں کہ جب وہ موجود ہوں تو ان کو ان پانچ حالتوں سے غنیمت سمجھو جو زمانہ آئندہ میں پیش آنے والی ہیں ① بڑھاپے سے پہلے جوانی کو یعنی اپنے اس زمانہ کو غنیمت جانو اور اس سے پورا فائدہ اٹھاؤ جس میں تمہیں عبادت وطاعات کی انجام دہی اور خدا کے دین کو پھیلانے کی طاقت وہمت میسر ہو۔ قبل اس کے کہ تمہارے جسمانی زوال کا زمانہ آجائے اور تم عبادت

وطاعت وغیرہ کی انجام دہی میں ضعف وکمزوری محسوس کرنے لگو ② بیماری سے پہلے صحت کو! یعنی ایمان کے بعد جو چیز سب سے بڑی نعمت ہے وہ صحت وتندرستی ہے، لہٰذا اپنی صحت وتندرستی کے زمانہ میں اگرچہ وہ بڑھاپے کے دور ہی میں کیوں نہ ہو، یعنی دینی ودنیاوی بھلائی وبہتری کے لئے جو کچھ کر سکتے ہو کر گزرو! ③ فقر وافلاس سے پہلے تونگری وخوشحالی کو (یعنی تمہیں جو مال ودولت نصیب ہے قبل اس کے کہ وہ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے یا موت کا پنجہ تمہیں اس سے جدا کر دے تم اس کو عبادت مالیہ اور صدقات وخیرات میں خرچ کرو اور اس دولتمندی وخوشحالی کو ایک ایسا غنیمت موقع سمجھو جس میں تم اپنی اخروی فلاح وسعادت کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہو! ④ مشاغل وتفکرات میں مبتلا ہونے سے پہلے وقت کی فراغت واطمینان کو۔ ⑤ موت سے پہلے زندگی کو!" اس روایت کو ترمذیؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔"

تشریح: "اغتنم" کا لفظ "اغتنام" سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں غنیمت کا مال لینا! اور "غنیمت" اصل میں تو اس مال کو کہتے ہیں جو مسلمانوں نے لڑکر اور حملہ کر کے حربی کافروں سے حاصل کیا ہو، لیکن اس لفظ کا اطلاق اس چیز پر بھی ہوتا ہے جو کسی محنت ومشقت کے بغیر ہاتھ لگی ہو۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جوانی، صحت، دولت، فراغت وقت اور زندگی ایسی چیزیں ہیں جو ہمیشہ ساتھ نہیں دیتیں۔ جوانی کے بعد بڑھاپے، صحت کے بعد بیماری، دولت کے بعد محتاجگی، فراغت وقت کے بعد تفکرات ومشاغل اور زندگی کے بعد موت کا پیش آنا لازمی امر ہے، لہٰذا جب تک یہ چیزیں پیش نہ آئیں موقع غنیمت جانو اور اس میں اپنی دنیاوی واخروی بھلائی وبہتری کے لئے جو کچھ کر سکتے ہو اس سے غفلت اختیار نہ کرو۔

غنیمت کے موقعوں سے فائدہ نہ اٹھانا اپنے نقصان وخسران کا انتظار کرنا ہے

㉑ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا يَنْتَظِرُ اَحَدُكُمْ اِلَّا غِنًى مُطْغِيًا اَوْفَقْرًا مُنْسِيًا اَوْمَرَضًا مُفْسِدًا اَوْهَرَمًا مُفْنِدًا اَوْمَوْتًا مُجْهِزًا اَوِالدَّجَّالَ فَالدَّجَّالُ شَرٌّ غَائِبٌ يُنْتَظَرُ اَوِ السَّاعَةَ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ۔

(رواہ الترمذی والنسائی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تم میں کوئی شخص تونگری کا انتظار کرتا رہتا ہے جو گنہگار کرنے والی اور امر ونہی کی حدود سے متجاوز کرنے والی ہے یا فقر وافلاس کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ جو طاعت حق کو بھلا دینے والا ہے (یعنی فقر وافلاس میں مبتلا ہونے والا شخص بھوک وبرہنگی کے مصائب میں گرفتار ہو کر اور ضروریات زندگی کی فراہمی کے چکر میں پھنس کر خدا کی عبادت وطاعت سے غافل ہو جاتا ہے، بیماری کا انتظار کرتا رہتا ہے جو (اپنی سختی وشدت کی وجہ سے) بدن کو (یا کمزوری یا سستی کے سبب دینی زندگی کو) تباہ کر دینے والی ہے، یا سخت بڑھاپے کا انتظار کرتا رہتا ہے جو بے عقل وبد حواس اور بیہودہ گو بنا دیتا ہے، یا موت کا انتظار کرتا ہے جو ناگہاں کام تمام کر دیتی ہے (کہ بعض وقت توبہ کرنے کا موقع بھی نہیں دیتی) یا دجال کا انتظار کیا جاتا ہے اور وہ آخر زمانہ میں ظاہر ہوگا، یا وہ قیامت کا انتظار کرتا رہتا ہے جو حوادث، آفات میں سب سے زیادہ سخت وشدید ہے۔" (ترمذیؒ۔ نسائیؒ)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو فرصت وفراغت اور کچھ کر لینے کا موقع نصیب ہوتا ہے وہ اس کو غنیمت نہیں جانتا اور اس طرح گویا وہ اس وقت کا منتظر رہتا ہے جب وہ موقع ہاتھ سے نکل جائے اور ایسی صورت حال پیش آ جائے جو اس کو ان بھلائیوں اور سعادتوں سے محروم کر دے جن سے وہ بس اسی گزرے ہوئے زمانہ میں بہرہ مند ہو سکتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص فقر وافلاس میں مبتلا ہوتا ہے تو چاہئے تو یہ کہ وہ اس حالت کو اپنے لئے غنیمت جانے اور یہ سمجھے کہ مال ودولت کی وجہ سے جو خرابیاں اور برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں ان سے خدا نے بچا رکھا ہے اور اس وقت یہ موقع نصیب ہے کہ اپنی موجودہ حالت پر صبر واستقامت کی راہ اختیار کر کے خدا کا صابر بندہ

بن جاؤں، لیکن اس کے بجائے وہ اپنی حالت فقر کا شاکی ہو کر مال و متاع کا طلبگار ہوتا ہے اس کا نفس اس کو تونگری و مالداری کے پیچھے کھینچے کھینچے پھرتا ہے اور وہ گویا اس مال و دولت کی خواہش رکھتا ہے جس کا نشہ سرکشی میں مبتلا اور راہ راست سے دور کر دیتا ہے، اسی طرح جس شخص کو اللہ تعالیٰ مال و دولت سے نوازتا ہے وہ اپنی اس مالداری کی حالت میں ادائیگی شکر سے بے پرواہ ہوتا ہے اور اس مال و دولت کو بھلائیوں کے کاموں میں خرچ کرنے کے بجائے ادھر ادھر لٹا کر خدا کی اتنی بڑی نعمت کی بے قدری کرتا ہے اور اپنے اس طرز عمل سے گویا فقر و افلاس کی طرف جانا چاہتا ہے جو معاشی تفکرات و پریشانیوں میں مبتلا کر کے عبادات و طاعات سے غافل کر دیتا ہے۔ اسی پر حدیث کے دوسرے جملوں کے مطلب کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

واضح رہے کہ یہ الفاظ "انتظار کرتا رہتا ہے" دراصل ان لوگوں کے حق میں تنبیہ و سرزنش کے طور پر ہیں جو دین کے کاموں میں غفلت و سستی اور عبادات و طاعات میں تقصیر و کوتاہی کرتے ہیں، گویا ان کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ تم اپنے رب کی عبادت و طاعت اور اپنے دین کی خدمت کی راہ آخر کب اختیار کرو گے؟ اگر تم نے دین کی خدمت اور اپنے رب کی عبادت و طاعت اس وقت نہیں کی جب تمہیں قلت مشاغل و فراغت وقت اور جسمانی طاقت و توانائی کی صورت میں اس کا بہترین موقع نصیب ہے تو پھر اس وقت کس طرح کر پاؤ گے جب یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا؟ اور کثرت مشاغل اور ضعف بدن و خرابیٔ صحت کی وجہ سے تم اس پر پوری طرح قادر نہیں رہو گے؟ تو کیا تم فائدہ کا موقع چھوڑ کر ٹوٹے کے وقت کے منتظر ہو اور اپنے نقصان و خسران کی راہ دیکھ رہے ہو۔

دنیا کی مذمت

(۲۲) وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلَا اِنَّ الدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ مَلْعُوْنٌ مَّافِيْهَا اِلَّا ذِكْرُ اللّٰهِ وَمَا وَالَاهُ وَعَالِمٌ اَوْ مُتَعَلِّمٌ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "یاد رکھو، دنیا ملعون ہے (یعنی دنیا کو بارگاہ خداوندی سے دھتکار دیا گیا ہے کیونکہ یہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے دور رکھتی ہے) اور جو چیز دنیا کے اندر ہے وہ بھی ملعون ہے (یعنی دنیا کی جو چیزیں ذکر اللہ سے غافل رکھتی ہیں ان کو بھی راندۂ درگاہ قرار دے دیا گیا ہے) لہٰذا ذکر اللہ، خدا کی پسندیدہ چیزیں، عالم اور متعلم (وہ چیزیں ہیں جن کو بارگاہ رب العزت میں مقبول قرار دیا گیا ہے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس ارشاد گرامی کا مقصد، دنیا سے بے رغبت کرنا اور یہ تعلیم دینا ہے کہ دنیا کی جن چیزوں کو خدا نے ناپسند کیا ہے جیسے تمام حرام و ناجائز امور، ان سے اجتناب کرو کہ مبادا ان چیزوں کو اختیار کرنے کی وجہ سے تم بھی راندۂ درگاہ رب العزت قرار پا جاؤ گے، اور جو چیزیں خدا کے یہاں مقبول و پسندیدہ ہیں جیسے ذکر اللہ نیک کام اور تعلیم و تعلم وغیرہ ان کو اختیار کرو تاکہ تم بھی مقبول بارگاہ رب العزت قرار پاؤ خدا کی پسندیدہ چیزوں سے۔ "عبادات و طاعات اور تمام وہ چیزیں مراد ہیں جو خدا کی خوشنودی کا باعث اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہیں! یا ماوالاہُ (جس کا ترجمہ "خدا کی پسندیدہ چیزیں" کیا گیا ہے) کے معنی یہ ہیں کہ وہ چیز جو ذکر اللہ کے قریب اور اس کے مشابہ ہو، جیسے انبیاء و اولیاء اور صلحاء کے حالات و فضائل کا ذکر اور اعمال صالحہ۔ "یا یہ معنی ہیں کہ وہ چیز جو ذکر اللہ کے تابع اور اس کے لوازم و مقتضیات میں سے ہے جیسے احکام خداوندی (اوامر و نواہی) کی اتباع و فرمانبرداری۔ لہٰذا مَاوَالَاہُ کے پہلے معنی (جو ترجمہ میں نقل کیے گئے ہیں) مراد لینے کی صورت میں لفظ وَالَاہُ کا مادۂ اشتقاق وَلِی ہو گا جس کے معنی محبت اور دوستی کے ہیں، دوسرے معنی مراد لینے کی صورت میں یہ لفظ گویا "ولی" سے مشتق ہو گا جس کے معنی متابعت کے ہیں۔ لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ اس ساری وضاحت کا تعلق اس امر کو تسلیم کرنے سے ہے کہ "ذکر اللہ" سے مراد اللہ تعالیٰ کے نام کا ورد ہے جیسا کہ عام طور پر ذکر اللہ کا یہی مفہوم سمجھا جاتا ہے اور اگر "ذکر اللہ" سے مراد ہر وہ عمل خیر ہو جو اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی، اس کا تقرب حاصل کرنے اور اس کی عبادت کی نیت سے کیا جائے تو اس معنی کے اعتبار سے تمام ہی عبادتیں

اور طاعتیں "ذکر اللہ" کے مفہوم میں داخل ہوں گی، اور پھر لفظ مَاوَالَاہُ سے وہ چیز مراد ہوں گی جو ذکر اللہ کے اسباب و ذرائع ہونے کی وجہ سے اس کا باعث اور معین و مددگار ہوتی ہے یہاں تک کہ بقدر کفاف کھانا پینا اور ضروریات زندگی کی دیگر چیزوں کا شمار بھی انہی اسباب میں ہوگا! اس صورت میں کہا جائے گا کہ بعد میں عالم اور متعلّم کا ذکر تخصیص بعد تعمیم کے طور پر ہے۔

دنیا کے بے وقعت ہونے کی دلیل

(۲۳) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَاسَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةً۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت سہل ابن سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "یہ دنیا اگر خدا کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی وقعت رکھتی تو اللہ تعالیٰ اس میں سے کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ پلاتا۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس دنیا کی کچھ بھی وقعت ہوتی تو اس دنیا کی کوئی ادنی ترین چیز بھی کافر کو نصیب نہ ہوتی، کیونکہ کافر، دشمن خدا ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز کچھ بھی قدر و وقعت رکھتی ہے دینے والا وہ چیز اپنے کسی دشمن کو ہرگز نہیں دیتا، لہٰذا دنیا کے بے وقعت اور نہایت حقیر ہونے ہی کا سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ دنیا کافروں کو دیتا ہے لیکن اپنے پیارے بندوں کو نہیں دیتا، جیسا کہ ایک حدیث میں اس طرف یوں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

مَازُوِيَتِ الدُّنْيَا عَنْ اَحَدٍ اِلَّا كَانَتْ خَيْرَةً لَّهٗ۔

"دنیا (کے مال و جاہ) کا مستحق وہی شخص ہوتا ہے جس کے لئے دنیا ہی بہتر ہوتی ہے۔"

نیز کفار و فجار جو دنیا میں زیادہ خوشحال و متمول نظر آتے ہیں تو اس کا سبب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں یہ دنیا بڑی ذلیل چیز ہے جس کو وہ اپنے دوستوں (نیک بندوں) کے لئے اچھا نہیں سمجھتا، بلکہ اس کو کوڑے کرکٹ کی طرح ان لوگوں (کفار و فجار) کے سامنے ڈال دیتا ہے جس سے اس کو نفرت ہے، چنانچہ اس آیت کریمہ میں اسی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

لَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ۔

"اگر یہ بات (متوقع) نہ ہوتی کہ (قریب قریب) تمام لوگ ایک ہی طریقہ کے (یعنی کافر) ہو جائیں گے تو جو لوگ خدا کیساتھ کفر کرتے ہیں ہم ان کے لئے ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے۔"

نیز قرآن کریم کی ان آیات وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ۔ اور وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى۔ سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے۔

کمانے میں اتنا منہمک نہ رہو کہ خدا سے غافل ہو جاؤ

(۲۴) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَتَّخِذُوا الضَّيْعَةَ فَتَرْغَبُوْا فِى الدُّنْيَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ضیعة کو (اس طرح) اختیار نہ کرو کہ وہ دنیا کی طرف رغبت کا سبب بن جائے۔" (ترمذیؒ، بیہقیؒ)

تشریح: ضیعة سے مراد دنیاوی اسباب و سامان اور کمانے کے ذرائع ہیں جیسے صنعت و تجارت، زراعت، زمین جائداد، اور باغ و گاؤں وغیرہ! حدیث کا حاصل یہ ہے کہ حصول معاش اور کمانے کے جو ذرائع خواہ وہ مذکورہ چیزیں ہوں یا ان کے علاوہ کچھ اور ہوں، ان میں اس

طرح کی مشغولیت اور انہماک اختیار کرنا ممنوع ہے جس سے انسان عبادت الٰہی اور آخرت کی طرف اچھی طرح متوجہ نہیں رہتا بلکہ زیادہ طلبی کی حرص میں مبتلا ہوکر ہروقت دنیاوی دھندوں میں مشغول رہتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ حدیث میں مذکورہ حکم اس شخص کے حق میں ہے جو حصول معاش کے دنیاوی اسباب ووسائل میں گرفتار ہو اور مسبب حقیقی (اللہ تعالیٰ) کی طرف توجہ اور اس کی یاد سے بے پرواہ ہو اور حقوق اللہ و حقوق العباد کی ادائیگی سے باز رہے، اگر ایسا نہ ہو تو پھر حصول معاش کے جائز اسباب وذرائع کو اختیار کرنے اور حلال دنیاوی دھندوں میں مشغول ہونے کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کریم کی اس آیت رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ کے جس طرح یہ معنی مراد لئے جاسکتے ہیں کہ قرآن نے ان الفاظ کے ذریعہ ان لوگوں کی تعریف وتحسین فرمائی ہے جو تجارت وبیع کی مشغولیت کو محض اس لئے اختیار نہیں کرتے کہ امور آخرت کی طرف ان کے متوجہ رہنے میں انہیں کوئی مانع پیش نہ آئے اسی طرح یہ معنی بھی مراد لئے جاسکتے ہیں کہ اس آیت میں دراصل ان لوگوں کی تعریف وتحسین فرمائی گئی ہے جو اپنی تجارت وغیرہ میں مشغول رہنے کے باوجود امور آخرت سے غافل نہیں ہوتے بلکہ اپنی دنیا کے ساتھ اپنی آخرت کے صلاح وفلاح کی طرف بھی متوجہ رہتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ موخر الذکر معنی ہی زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں؟ جیسا کہ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ کے الفاظ کی مناسبت سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔

دنیا کی محبت، آخرت کے نقصان کا سبب ہے

(۲۵) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ دُنْيَاهُ اَضَرَّ بِاٰخِرَتِهٖ وَمَنْ اَحَبَّ اٰخِرَتَهٗ اَضَرَّ بِدُنْيَاهُ فَاٰثِرُوْا مَا يَبْقٰى عَلٰى مَا يَفْنٰى رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص اپنی دنیا کو دوست رکھتا ہے (اس قدر دوست رکھنا کہ خدا کی محبت پر غالب آجائے) تو وہ اپنی آخرت کو نقصان پہنچاتا ہے (یعنی آخرت میں اپنے درجہ کو گھٹاتا ہے کیونکہ جب اس پر دنیا کی محبت غالب آجاتی ہے تو اس کا ظاہر وباطن ہمہ وقت دنیاوی امور میں مشغول ومنہمک رہتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ امور آخرت اور طاعت الٰہی کے لئے فراغت و موقع سے محروم رہتا ہے) اور جو شخص اپنی آخرت کو درست رکھتا ہے وہ اپنی دنیا کو نقصان پہنچاتا ہے (کیونکہ وہ ہمہ وقت امور آخرت میں مشغول ومنہمک رہنے کی وجہ سے دنیاوی امور کی طرف متوجہ نہیں رہتا) پس (جب تم نے یہ جان لیا کہ دنیا اور آخرت کی دوستی ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی تو) تمہیں چاہئے کہ جو چیز فنا ہوجانے والی ہے یعنی دنیا، اس پر اس چیز کو ترجیح دو جو باقی رہنے والی ہے یعنی آخرت۔" (احمدؒ، بیہقیؒ)

مال وزر کا غلام بن جانے والے پر حضور ﷺ کی لعنت

(۲۶) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لُعِنَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَلُعِنَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ۔ (رواه الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص دینار کا غلام اور درہم کا غلام بن جائے، وہ ملعون ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ جو شخص دینار کا غلام اور درہم کا غلام بن جائے اس پر لعنت ہو۔" (ترمذی)

تشریح: "لعن" کے معنی ہیں ہانک دینا، بھلائی سے محروم کردینا اور اللہ کی رحمت سے دور کردینا! حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص مال وزر اور روپیہ پیسہ کی محبت میں اس طرح گرفتار ہوجائے کہ ان کی وجہ سے خدا کی عبادت وطاعت سے بعد اختیار کرلے تو وہ گویا مال وزر اور روپیہ پیسہ کا غلام ہے۔ اور ایسا شخص، تمام بھلائیوں سے محروم، رحمت خداوندی سے دور اور راندۂ درگاہ رب العزت قرار دیا جاتا

ہے۔

جاہ و مال کی حرص دین کے لئے نہایت نقصان دہ ہے

(۲۷) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاذِئْبَانِ جَائِعَانِ اُرْسِلاَفِيْ غَنَمٍ بِاَفْسَدَ لَهَامِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِيْنِهٖ۔ (رواہ الترمذی والداری)

"اور حضرت کعبؓ ابن مالک اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "دو بھوکے بھیڑیئے، جن کو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیا جائے، اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا کہ انسان کی حرص، جو مال و جاہ کے تئیں ہو، اس کے دین کو نقصان پہنچاتی ہے۔" (ترمذیؒ، داریؒ)

تشریح: دین کو گویا بکری کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے، اور حرص کا مشابہ بھیڑیئے کو قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ اگر دو بھوکے بھیڑیوں کو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیا جائے تو وہ بھی اس ریوڑ کو اس طرح تباہ نہیں کرتے جس طرح کہ ایک انسان کی حرص، اس کے دین کو خراب و تباہ کر دیتی ہے۔

حدیث کی سند مشکوٰۃ کے نسخوں میں اس طرح منقول ہے جیسا کہ اوپر نقل کی گی ہے یعنی عن کعب ابن مالک عن ابیہ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس روایت کو حضرت کعب ابن مالکؓ نے اپنے والد سے اور انہوں نے آنحضرت ﷺ سے نقل کیا ہے حالانکہ حقیقت میں یہ بات صحیح نہیں ہے اور بربناء سہو و خطا یہ سند اس طرح نقل ہوئی ہے کیونکہ حضرت کعب ابن مالکؓ کے والد کو اسلام کی سعادت نصیب ہی نہیں ہوئی تھی اور ظاہر ہے کہ ان کا آنحضرت ﷺ سے کسی حدیث کو نقل کرنا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا، لہٰذا یہ سند صحیح طور پر یوں ہے عن ابن کعب ابن مالک عن ابیہ یعنی ابن کعب اپنے والد حضرت کعب ابن مالک سے روایت کرتے ہیں۔ چنانچہ جامع ترمذی میں یہ سند اسی طرح نقل کی گئی ہے اور مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں بھی اس طرح منقول ہے پس اس حدیث کے اصل راوی حضرت کعب ابن مالکؓ ہیں جو مشہور صحابی ہیں اور ان یعنی صحابہؓ میں سے ایک ہیں جو غزوہ تبوک میں شریک ہونے سے باز رہے تھے اور جن کا قصہ بہت مشہور ہے۔

ضرورت سے زیادہ تعمیر پر روپیہ خرچ کرنا لاحاصل چیز ہے

(۲۸) وَعَنْ خَبَّابٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا اَنْفَقَ مُؤْمِنٌ مِنْ نَفَقَةٍ اِلَّا اُجِرَ فِيْهَا اِلَّا نَفَقَتَهٗ فِيْ هٰذَا التُّرَابِ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت خبابؓ، رسول کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "مسلمان (اپنی معیشت کے مصارف میں) جو کچھ خرچ اخراجات کرتا ہے اس کو اس کا ثواب دیا جاتا ہے علاوہ اس خرچ کے جو اس مٹی میں کرتا ہے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جزو کا مطلب یہ ہے کہ مکان وغیرہ کی تعمیر میں جو کچھ خرچ ہوتا ہے اس پر کوئی اجر و ثواب نہیں ملتا! لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ وہ تعمیر، وحاجت سے زائد ہو، ورنہ اپنی حاجت کے بقدر گھر بنانا، ضروریات زندگی میں شامل ہے اور اس کی تعمیر پر صرف کیا جانے والا روپیہ پیسہ ضائع نہیں ہو جاتا، اسی طرح ہی خیر و بھلائی کے مکانات جیسے مساجد و مدارس اور ان جیسی دوسری عمارتوں کا معاملہ بھی مذکورہ حکم سے مستثنیٰ ہے کہ ان کا بنانا مستحب و مستحسن ہے۔

(۲۹) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّفَقَةُ كُلُّهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِلَّا الْبِنَاءَ فَلَاخَيْرَ فِيْهِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" (ضروریات زندگی کے) تمام مصارف اللہ کی راہ میں (خرچ کرنے کے برابر) ہیں (یعنی انسان اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریات پر جو کچھ خرچ کرتا ہے اس کو اس کا ثواب ملتا ہے بشرطیکہ تقرب الٰہی کی نیت سے خرچ کرے) البتہ (ضرورت وحاجت سے زائد) تعمیر پر خرچ کرنا کوئی نیکی اور ثواب نہیں رکھتا۔" اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: ضرورت سے زائد تعمیر پر خرچ کرنا اسراف ہے اور اللہ تعالیٰ اسراف کو پسند نہیں کرتا، اس کے برخلاف دیگر ضرورت پر بہ نیت تقرب الٰہی جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے۔ اس میں اسراف کا شائبہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ خرچ لوگوں کو کھلانے اور عطاو بخشش کی قسم سے ہوتا ہے۔ خواہ وہ مستحق ہوں یا غیر مستحق، اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں چیزوں یعنی کھلانے اور عطاء بخشش سے خوش ہوتا ہے۔

بلا ضرورت عمارت بنانے پر وعید

(۳۰) وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يَوْمًا وَنَحْنُ مَعَهٗ فَرَاٰى قُبَّةً مُشْرِفَةً فَقَالَ مَاهٰذِهٖ قَالَ اَصْحَابُهٗ هٰذِهٖ لِفُلَانٍ رَجُلٌ مِنَ الْاَنْصَارِ فَسَكَتَ وَحَمَلَهَا فِيْ نَفْسِهٖ حَتّٰى لَمَّا جَآءَ صَاحِبُهَا فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فِي النَّاسِ فَاَعْرَضَ عَنْهُ صَنَعَ ذٰلِكَ مِرَارًا حَتّٰى عَرَفَ الرَّجُلُ الْغَضَبَ فِيْهِ وَالْاَعْرَاضَ عَنْهُ فَشَكٰى ذٰلِكَ اِلٰى اَصْحَابِهٖ وَقَالَ وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاُنْكِرُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا خَرَجَ فَرَاٰى قُبَّتَكَ فَرَجَعَ الرَّجُلُ اِلٰى قُبَّتِهٖ فَهَدَمَهَا حَتّٰى سَوَّاهَا بِالْاَرْضِ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ فَلَمْ يَرَهَا قَالَ مَافَعَلَتِ الْقُبَّةُ، قَالُوْا شَكٰى اِلَيْنَا صَاحِبُهَا اِعْرَاضَكَ فَاَخْبَرْنٰهُ فَهَدَمَهَا فَقَالَ اَمَا اِنَّ كُلَّ بِنَآءٍ وَبَالٌ عَلٰى صَاحِبِهٖ اِلَّا مَالَا اِلَّا مَالَا يَعْنِيْ اِلَّا مَالَا بُدَّ مِنْهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک روز رسول کریم ﷺ (کہیں جانے کے لئے) باہر نکلے۔ ہم صحابہؓ کی ایک جماعت بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھی، آپ ﷺ نے راستہ میں، ایک بلند قبہ کو دیکھا تو تحقیر و نفرت کے لہجہ میں فرمایا کہ یہ قبہ کیا ہے؟ (یعنی یہ ناپسندیدہ عمارت کس نے بنائی ہے؟) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یہ قبہ فلاں شخص نے بنایا ہے جو ایک انصاری ہے۔ آپ ﷺ (یہ سن کر) خاموش رہے اور (کچھ فرمایا تو نہیں لیکن) اس بات کو (ناگواری اور غصہ کے طور پر) اپنے دل میں رکھا یہاں تک کہ جب اس قبہ کا مالک آپ ﷺ کی خدمت میں آیا اور اس نے لوگوں کی موجودگی میں آپ ﷺ کو سلام کیا تو آپ ﷺ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا (یعنی یا تو آپ نے اس کے سلام کا جواب ہی نہیں دیا یا جواب تو دیا لیکن اس سے منہ پھیر لیا اور دوسرے لوگوں کو بھی تنبیہ ہو جائے) آنحضرت ﷺ نے ایسا کئی مرتبہ کیا (کہ وہ شخص آپ ﷺ کو سلام کرتا اور آپ ﷺ اس کا جواب نہ دیتے اور اس سے منہ پھیر لیتے تھے) آخر کار اس شخص نے آپ ﷺ کے چہرہ پر غصہ کے آثار محسوس کیے اور آپ ﷺ کے منہ پھیر لینے (سے آپ ﷺ کی نفرت) کو معلوم کر لیا چنانچہ اس شخص نے (ان) صحابہؓ سے (کہ جو حضور ﷺ کے خاص مصاحب اور ہم نشین تھے اس امر کا شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ بخدا، میں ایسا دیکھ رہا ہوں جیسے رسول کریم ﷺ مجھ سے ناآشنا ہوں (یعنی میں رسول کریم ﷺ کے چہرہ مبارک پر جس غضب و غصہ کے آثار دیکھ رہا ہوں وہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے اور مجھے اس کا سبب بھی معلوم نہیں کہ آپ ﷺ کیوں اتنا سخت ناراض ہیں؟) ان صحابہؓ نے اس کو بتایا کہ (ایک دن) حضور ﷺ ادھر (تمہاری طرف) تشریف لے گئے تھے اور (جب وہاں) تمہارے قبہ کو دیکھا (تو ناراض ہو گئے تھے)۔ اس شخص (نے یہ سنا تو فورا) اپنے قبہ کی طرف گیا اور اس کو ڈھا دیا یہاں تک کہ زمین کے برابر کر دیا! (اس واقعہ کے بعد) ایک دن رسول کریم ﷺ پھر ادھر تشریف لے گئے اور قبہ کو وہاں نہیں دیکھا تو دریافت فرمایا کہ وہ قبہ کیا ہوا؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ قبہ بنانے والے نے اپنے تئیں آپ ﷺ کی بے التفاتی اور ناراضگی کا ہم سے شکوہ کیا تھا (اور اس کا سبب دریافت کیا) تو ہم نے اس کو صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا (کہ حضور ﷺ تم سے اس لئے ناراض ہیں کہ تم نے اس قبہ کی صورت میں ایک ناپسندیدہ تعمیر کرائی ہے) چنانچہ اس شخص نے اس قبہ کو ڈھا دیا

ہے تب آپ ﷺ نے (اس عمارت کی ناپسندیدگی اور اپنی ناراضگی کا سبب بیان کرنے کے لئے) فرمایا کہ۔ "یاد رکھو! یہ عمارت اپنے بنانے والے کے لئے آخرت میں وبال یعنی عذاب کا سبب بنے گی اِلَّا مَالَا اِلَّا مَالَا یعنی علاوہ اس چیز کے، کہ جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔"

(ابوداؤدؒ)

تشریح: "وبال" کے اصل معنی بوجھ، سختی اور مکروہ کے ہیں! حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو عمارت بنائی جاتی ہے وہ آخرت میں اپنے مالک کے لئے عذاب کا سبب بنتی ہے، لیکن واضح رہے کہ یہ حکم اس عمارت کے حق میں ہے جو ضرورت و حاجت سے زائد ہو، اظہار شان و شوکت اور محض عیش و عشرت کے لئے بنائی گئی ہو، ورنہ تو وہ عمارت جو اپنے اور اپنے متعلقین کی رہائشی ضروریات کے بقدر رہو یا جو عمارت خیر و بھلائی کے امور کے لئے ہو جیسے مساجد و مدارس اور خانقاہیں وغیرہ، وہ مذکورہ وعید سے مستثنیٰ ہیں، اسی طرح ہر وہ چیز کہ جو انسان کی جسمانی توانائی کو باقی رکھنے اور لباس و رہائش کے طور پر ضروریات زندگی کا درجہ رکھتی ہو، آخرت میں کسی وبال کا باعث نہیں بنے گی۔

بیہقی نے بھی حضرت انسؓ سے بطریق مرفوع یہ روایت نقل کی ہے کہ مسجد (اور خیر و بھلائی کے کام میں آنے والی دیگر عمارتوں کے علاوہ، ہر عمارت اپنے مالک پر قیامت کے دن وبال ہوگی! (اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ایسی عمارت کہ جو رہائشی ضروریات سے زائد اور اظہار شان و شوکت کے لئے ہو) اسی طرح طبرانیؒ نے حضرت واثلہؓ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے کہ ہر عمارت وبال ہے علاوہ اس عمارت کے جو بس اس قدر ہو، اور یہ فرما کر اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کے ذریعہ اشارہ فرمایا (یعنی یہ اشارہ فرمایا کہ جو عمارت بہت مختصر اور محض رہائشی ضروریات کے بقدر رہو وہ وبال نہیں ہے) نیز ہر علم، قیامت کے دن وبال ہوگا، علاوہ اس علم کے جس پر عمل کیا جائے۔

کفایت و قناعت کی نصیحت

(۳۱) وَعَنْ اَبِیْ هَاشِمِ بْنِ عُتْبَةَ قَالَ عَهِدَ اِلَیَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا يَكْفِيْكَ مِنْ جَمِيْعِ الْمَالِ خَادِمٌ وَمَرْكَبٌ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَفِیْ بَعْضِ نُسَخِ الْمَصَابِيْحِ عَنْ اَبِیْ هَاشِمِ بْنِ عُتْبَدٍ بِالدَّالِ بَدَلَ التَّاءِ وَهُوَ تَصْحِيْفٌ۔

"اور حضرت ابوہاشم ابن عتبہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا۔ "دنیا کے تمام مال میں سے جو کچھ تمہارے لئے کافی ہے وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ تمہارے پاس ایک خادم ہو اور ایک سواری ہو جو خدا کی راہ میں کام (یعنی اگر تم دنیاوی چیزوں میں سے کچھ اپنے پاس رکھنا چاہتے ہو تو بس یہ دو چیزیں رکھو کہ سواری کے جانور کے ذریعہ جہاد، حج اور حصول علم کے لئے سفر کر سکو اور خادم اس سفر میں تمہاری خدمت کرے! دنیا کے اموال میں سے ان دو چیزوں سے زائد کچھ نہ رکھو بلکہ صرف کر ڈالو! حاصل یہ کہ اس ارشاد کا مقصود اس امر کی تلقین کرنا ہے کہ بقدر ضرورت مال و اسباب پر اکتفا و قناعت کی جائے اور ان میں سے بھی ان چیزوں کو اختیار کیا جائے جو راہ آخرت کا توشہ ہیں۔" (اس روایت کو احمدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔"

اور مصابیح کے بعض نسخوں میں حدیث کی سند عن ابی ہاشم ابن عتبد منقول ہے یعنی عتبۃ میں تاء کی بجائے دال ہے اور یہ غلط ہے جو کسی راوی کے سہو کا نتیجہ ہے (گویا صحیح ہاشم ابن عتبۃ ہی ہے)۔

ضرویارت زندگی کی مقدار کفایت اور اس پر انسان کا حق

(۳۲) وَعَنْ عُثْمَانَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيْسَ لِابْنِ اٰدَمَ حَقٌّ فِیْ سِوٰی هٰذِهِ الْخِصَالِ بَيْتٌ يَسْكُنُهٗ وَثَوْبٌ يُوَارِیْ بِهٖ عَوْرَتَهٗ وَجِلْفُ الْخُبْزِ وَالْمَاءُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "ابن آدم ان چیزوں کے علاوہ اور کسی چیز پر اپنا حق نہیں رکھتا، ایک تو گھر

کہ جس میں وہ رہائش اختیار کرے (یعنی ایسا گھر جو رہائشی ضروریات کے بقدر ہو کہ جو سردی گرمی سے محفوظ رکھ سکے) دوسرے کپڑا، کہ جس سے وہ اپنا ستر ڈھانکے، تیسرے بغیر سالن کے خشک روٹی (کہ جس سے وہ اپنی بھوک دفع کر سکے) اور چوتھے پانی کہ جس سے وہ اپنی پیاس بجھا سکے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "حق" سے مراد وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لئے واجب کی گئی ہے اور جس پر آخرت میں کوئی سوال و مواخذہ نہیں ہوگا، یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا کی جن چیزوں کو ضروریات زندگی کے طور پر بنایا ہے ان کو انسان اسی قدر حاصل کرنے اور اس سے بہرہ مند ہونے کا حقدار و مجاز ہے جس قدر کہ اس کی ضروریات کے لئے کافی ہو چنانچہ جو شخص ان چیزوں کو حلال وسائل ذرائع سے حاصل کرے گا اور بقدر ضرورت پر اکتفاء وقناعت کرے گا اس سے آخرت میں ان چیزوں کے بارے میں کوئی سوال و مواخذہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ بقدر ضرورت مذکورہ چیزیں ان لوازمات میں سے ہیں جن کے بغیر نفس انسانی کے لئے کوئی چارہ نہیں ہے، ہاں ان کے علاوہ دنیا کی اور جو چیزیں ہیں یا انہی چیزوں کی ضرورت سے زائد جو مقداریں ہیں وہ سب لوازمات زندگی میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ لذات نفس میں سے ہیں اور ان کے بارے میں آخرت میں یقیناً مواخذہ و مطالبہ کیا جائے گا۔

جِلْفُ (جیم کے زیر اور لام کے جزم کے ساتھ) سے مراد ہے بغیر سالن کے خشک موٹی روٹی! ایک روایت میں یہ لفظ جَلْف (جیم کے زبر کے ساتھ) بھی منقول ہے جو جِلْفَةً کی جمع ہے اور جس کے معنی ہیں خشک روٹی کا ٹکڑا، کہ جس کے ذریعہ بھوک کو دفع کیا جائے۔

خدا اور لوگوں کی نظر میں محبوب بننے کا طریقہ

(۳۳) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ دُلَّنِيْ عَلٰى عَمَلٍ إِذَا أَنَا عَمِلْتُهُ أَحَبَّنِيَ اللّٰهُ وَأَحَبَّنِيَ النَّاسُ قَالَ ازْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبَّكَ اللّٰهُ وَازْهَدْ فِيْمَا عِنْدَ النَّاسِ يُحِبَّكَ النَّاسُ۔ (رواه الترمذی وابن ماجۃ)

"اور سہل ابن سعدؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے (بارگاہ رسالت میں) حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول (ﷺ) مجھ کو کوئی ایسا عمل بتا دیجئے کہ میں جب اس کو اختیار کروں تو اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے محبت رکھے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "دنیا سے زہد اختیار کرو (یعنی دنیا کی محبت میں گرفتار نہ ہو، اس کی فضولیات سے اعراض کرو اور امور آخرت کی طرف متوجہ رہو) اگر تم ایسا کرو گے تو گویا تم اس چیز سے نفرت کرنے والے ہوں گے جس سے اللہ تعالیٰ نفرت کرتا ہے اور اس کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ تم سے محبت رکھے گا اور اس چیز کی طرف رغبت نہ کرو جو لوگوں کے پاس ہے (یعنی جاہ و دولت) لوگ تم سے محبت کریں گے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: کسی چیز کی طرف خواہش و میلان نہ رکھنے کو "زہد" کہتے ہیں، اور کامل و صادق زہد یہ ہے کہ دنیا کی لذات میسر ہونے کے باوجود ان سے بے رغبتی اختیار کی جائے! چنانچہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس شخص کے بارے میں "زہد" تصور ہی نہیں ہو سکتا جو نہ مال و دولت رکھتا ہو اور نہ جاہ و حشم کا مالک ہو، بلکہ حقیقت کے اعتبار سے "زاہد" وہی شخص ہے جو مال و دولت اور جاہ و حشم کا مالک ہونے کے باوجود ان کی لذات سے دور رہے! منقول ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت ابن مبارکؒ کو "یا زاہد" کہہ کر مخاطب کیا تو انہوں نے فرمایا کہ زاہد تو بس حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ تھے، جن کے دامن میں دنیا کھنچی آتی تھی مگر اس کے باوجود وہ دنیاوی لذات سے ترک تعلق رکھتے تھے اور ہمارے پاس کیا رکھا ہے کہ ہم زہد اختیار کریں گے! حاصل یہ کہ اصل میں "زہد" یہ ہے کہ لوازمات دنیا میں کھانے پینے اور پہننے کی فراوانی کے باوجود بقدر ضرورت پر قناعت کی جائے اور فضولیات کو ترک کیا جائے۔

دنیا کے عیش و آرام سے حضور ﷺ کی بے رغبتی

(۳۴) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَامَ عَلٰى حَصِيْرٍ فَقَامَ وَقَدْ أَثَّرَ فِيْ جَسَدِهٖ فَقَالَ ابْنُ

مَسْعُوْدٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ اَمَرْ تَنَا اَنْ نَبْسُطَ لَكَ وَنَعْمَلَ فَقَالَ مَالِیْ وَلِلدُّنْیَا وَمَا اَنَا وَالدُّنْیَا اِلَّا كَرَاكِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ بوریئے پر سوئے اور سو کر اٹھے تو آپ ﷺ کے جسم مبارک پر بوریئے کے نشان پڑے ہوئے تھے (یہ دیکھ کر) حضرت ابن مسعودؓ نے عرض کیا کہ یا رسول (ﷺ)، اگر آپ ہمیں اجازت دیں تو ہم آپ (ﷺ) کے لئے نرم بستر بچھا دیں اور اچھے کپڑوں کا انتظام کر دیں (تاکہ آپ ﷺ اس سخت بوریئے پر لیٹنے سے بے آرامی محسوس نہ کریں) حضور ﷺ نے فرمایا۔" (عزیز) مجھ کو اس دنیا (کے عیش و آرام) سے اور اس دنیا کو مجھ سے کیا سروکار؟ میری اور دنیا کی مثال تو بس ایسی ہے جیسے کوئی سوار کسی درخت کے نیچے سایہ کی تلاش میں آئے اور وہاں (کچھ دیر تک سایہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے) اپنی سواری ہی پر کھڑا رہے اور پھر اس درخت کو وہیں چھوڑ کر اپنی منزل کی طرف چل دے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: مالی وللدنیا میں حرف ما، نفی کے لئے ہے اور اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو مجھے اس دنیا کے ساتھ کچھ الفت ہے اور نہ اس دنیا کو میرے ساتھ کوئی محبت والفت ہے کہ میں اس دنیا کے تئیں کوئی رغبت و چاہت رکھوں، اس کا عیش و آرام چاہوں اور اس کی بے آرامی سے بچنے کے لئے اس کی آرام دہ چیزوں جیسے نرم و گدیلے بستر اور نفیس و اعلیٰ کپڑوں وغیرہ کا مالک بنوں۔ ویسے اس حرف ما کو استفہامیہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے (جیسا کہ ترجمہ میں اسی کو ملحوظ رکھا گیا ہے) اور اس صورت میں جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھ کو اس دنیا سے کون سی الفت، محبت ہے یا اس دنیا کی طرف میری رغبت و میلان سے یا میری طرف اس دنیا کی رغبت والفت سے مجھے کون سی نفع بخش چیز حاصل ہوگی؟ کیونکہ میں تو آخرت کا طلبگار ہوں اور دنیا اس آخرت کی سوکن اور ضد ہے۔

درخت کے سایہ سے فائدہ اٹھانے کے ضمن میں خاص طور پر سوار ہی کا ذکر کرنا اس درخت کے نیچے اس کے ٹھہرنے کی مدت کے قلیل ہونے اور جلد ہی وہاں سے رخصت ہو جانے کی بناء پر ہے، یعنی یہ بات سب جانتے ہیں کہ کسی درخت کے سایہ سے فائدہ اٹھانے والا اگر کوئی سوار مسافر ہو، اور وہ اپنی سواری سے اترے بغیر اس درخت کے نیچے کھڑا ہے تو وہ وہاں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا۔ بلکہ بہت قلیل عرصہ کے لئے اس سایہ میں کھڑا رہ کر آگے چل دیتا ہے۔ نیز سوار کی مثال بیان کرنے سے اس طرف بھی اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جس طرح کسی مسافر کی منزل مقصود جب دور ہوتی ہے تو وہ دوران سفر کسی راحت و آرام کی زیادہ پرواہ کیے بغیر زیادہ سے زیادہ راستہ طے کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہاں وہاں زیادہ ٹھہر کر اپنا وقت برباد نہیں کرتا اسی طرح ہم بھی اس دنیا میں ایک مسافر کی طرح ہیں کہ ہماری منزل مقصود یعنی آخرت بہت دور ہے اور اس کا راستہ کٹھنائیوں سے بھرا ہوا ہے لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی راہ آخرت کو زیادہ سے زیادہ طے کرنے کی سعی و اہتمام کریں اور کسی بھی ایسی چیز کی طرف ملتفت اور مائل نہ ہوں جو منزل مقصود کی طرف ہمارے سفر میں رکاوٹ بن سکے۔

قابل رشک زندگی

(۳۵) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَغْبَطُ اَوْلِیَائِیْ عِنْدِیْ لَمُؤْمِنٌ خَفِیْفُ الْحَاذِ ذُوْحَظٍّ مِنَ الصَّلٰوةِ اَحْسَنَ عِبَادَةِ رَبِّهٖ وَاَطَاعَهٗ فِی السِّرِّ وَكَانَ غَامِضًا فِی النَّاسِ لَا یُشَارُ اِلَیْهِ بِالْاَصَابِعِ وَكَانَ رِزْقُهٗ كَفَافًا فَصَبَرَ عَلٰی ذٰلِكَ ثُمَّ نَقَدَ بِیَدِهٖ فَقَالَ عُجِّلَتْ مَنِیَّتُهٗ قَلَّتْ بَوَاكِیْهِ قَلَّ تُرَاثُهٗ۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابو امامہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "میرے نزدیک (یعنی میرے دین و مذہب کے اعتبار سے) میرے دوستوں (تمام مؤمنین) میں نہایت قابل رشک (یعنی اموال کے اعتبار سے سب سے اچھا اور مال و دولت کے اعتبار سے سب سے افضل) وہ مؤمن جو سبکسار ہے، نماز سے بہت زیادہ بہرہ مند ہوتا ہے اور اپنے رب کی سب ہی عبادتیں خوبی کے ساتھ کرتا ہے (اور جس

طرح ظاہر میں عبادت کرتا ہے اسی طرح مخفی طور پر (خلوت میں بھی) طاعت الٰہی میں مشغول رہتا ہے، لوگوں میں گمنام ہے کہ اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ نہیں کیا جاتا (یعنی اپنے علم و عمل کے سبب لوگوں میں مشہور و معروف نہیں ہے بلکہ نہایت بے نفسی کے ساتھ گوشۂ گمنامی میں رہ کر علم و عمل کے ذریعہ دین و ملت کی خدمت کرتا ہے) نیز اس کی روزی (یعنی ضروریات زندگی کا خرچ) بقدر کفایت ہے اور اسی پر صابر وقانع ہے۔ یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کے ذریعہ چٹکی بجائی اور فرمایا۔ "اس کی موت بس یوں (چٹکی بجاتے) اپنا کام جلد پورا کر لیتی ہے اور اس کی موت پر رونے والی عورتیں بھی کم ہوتی ہیں اور اس کا ترکہ بھی بہت مختصر (یعنی نہ ہونے کے برابر) ہوتا ہے۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: "حاذ" کے معنی سواری کی پشت کے ہیں اور قاموس کے مطابق خفیف الحاذ کا مطلب قلیل المال و العیال خفیف الحاذ کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو زیادہ اہل و عیال کو بوجھ اور مال و دولت کی گرانباری نہ رکھتا ہو۔ صراح میں یہ لکھا ہے کہ "خفیف الحاذ" کے معنی ہلکی پیٹھ کے ہیں یعنی وہ شخص جو زیادہ اہل و عیال اور مال و دولت کے جھمیلوں سے فارغ ہو بہر حال دونوں ہی صورتوں میں ایسا شخص چونکہ دنیاوی تفکرات و مشغولیات سے عاری ہوتا ہے اور فراغ قلب و وقت رکھتا ہے اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت وطاعت اور دین و ملت کی خدمت میں اچھی طرح مشغول رہتا ہے اور از قسم علائق کوئی چیز اس کی راہ عبادت و خدمت میں رکاوٹ نہیں بنتی۔

"نماز سے بہت زیادہ بہرہ مند ہوتا ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ وہ حضور قلب اور مناجات مع اللہ کے ساتھ نماز بہت زیادہ پڑھتا ہے اور اپنا زیادہ تر وقت عبادت خداوندی میں صرف کرتا ہے کیونکہ اہل و عیال اور دنیاوی جھمیلوں سے بہت کم تعلق رکھنے اور قلت مشغولیت کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ نماز و عبادت ہی کی طرف متوجہ رہتا ہے، بلکہ نماز و عبادت میں اس کو حضور قلب بھی بہت زیادہ حاصل ہوتا ہوتا ہے چنانچہ حقیقی درویش اور خدا رسیدہ لوگ دنیاوی علائق و تعلقات سے کنارہ کشی اس لئے اختیار کرتے ہیں تاکہ نماز و عبادت خداوندی میں زیادہ سے زیادہ حضور قلب حاصل کر سکیں۔

"لوگوں میں گمنام ہے" میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ عبادت و ریاضت کے لئے لوگوں کے درمیان بود و باش ترک نہیں کرتا بلکہ ان کے درمیان رہ کر ہی عبادت و ریاضت اور دین و علم کی خدمت میں خاموشی کے ساتھ مشغول رہتا ہے اور اپنے آپ کو عام شہرت سے بچائے رکھتا ہے گویا اس جملہ سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ اپنے کو عام شہرت سے بچانے کے لئے لوگوں کے درمیان سے چلا جاتا ہے اور سب سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے کیونکہ عام لوگوں کے درمیان بود و باش ترک کر دینا اور کنارہ کشی اختیار کر لینا بجائے خود موجب شہرت ہے! نیز اس جملہ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ "لوگوں" سے مراد عوام الناس ہیں، چنانچہ خواص یعنی اولیاء و صلحاء کے درمیان اس کا متعارف ہونا کہ جن کا وہ ہمنشین رہتا ہے، اس کے مذکورہ مرتبہ کے منافی نہیں ہے۔ یہ بات بعد کے جملہ ولا یشاء الیہ الخ سے بھی مفہوم ہوتی ہے۔

لقد بیدہ، کے اصل معنی تو یہ ہیں کہ آپ نے اپنے انگوٹھے کے پورے کو اپنی بیچ کی انگلی کے پورے پر مارا جس سے نکلی ہوئی آواز کو سنا گیا۔ اور حاصل یہ کہ جس طرح عام طور پر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ کسی بات پر اظہار حیرت و تعجب کے لئے یا کسی کام کی مدت کو کم سے کم بیان کرنے کے لئے چٹکی بجا کر کہتے ہیں کہ فلاں کام بس یوں چٹکی بجاتے ہوگیا اسی طرح حضور نے بھی مذکورہ مؤمن کا حال بیان فرمایا کہ وہ دنیا میں اپنی مذکورہ حالت و کیفیت کے ساتھ زندہ رہتا ہے کہ موت اس کے رشتہ جسم و جان کو چند دن کے بعد ختم کر دیتی ہے اور وہ فتنہ و آشوب سے بھرے ہوئے اس عالم سے بہت جلد انتقال کر جاتا ہے اور یہاں کی آفات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات پا جاتا ہے۔ یا یہ مراد ہے ایسا مؤمن چونکہ اس دنیا سے بہت کم تعلق رکھتا ہے اور شوق آخرت اس پر غالب ہوتا ہے اس لئے وقت موعود آنے پر وہ نہایت آسانی اور سکون کے ساتھ بہت جلد اپنی جان، آفرین کے سپرد کر دیتا ہے۔

دنیا سے آنحضرت ﷺ کی بے رغبتی

(۳۶) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَرَضَ عَلَيَّ رَبِّيْ لِيَجْعَلَ لِيْ بَطْحَاءَ مَكَّةَ ذَهَبًا فَقُلْتُ لَا يَارَبِّ وَلٰكِنْ اَشْبَعُ يَوْمًا وَاَجُوْعُ يَوْمًا فَاِذَا جُعْتُ تَضَرَّعْتُ اِلَيْكَ وَذَكَرْتُكَ وَاِذَا شَبِعْتُ حَمِدْتُكَ وَشَكَرْتُكَ۔

(رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میرے رب نے میرے سامنے اس امر کو ظاہر کیا کہ وہ میرے لئے مکہ کے سنگریزوں کو سونا بنادے، لیکن میں نے عرض کیا کہ میرے پروردگار! مجھ کو اس چیز کی قطعا خواہش نہیں ہے میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز پیٹ بھر کر کھاؤں اور ایک روز بھوکا رہوں کہ جب میں بھوکا رہوں تو تیرے حضور گڑگڑاؤں، اپنی عاجزی بیان کروں اور تجھے یاد کروں اور جب میں شکم سیر ہوں تو تیری حمد و تعریف کروں اور تیرا شکر ادا کروں۔" (احمدؒ ترمذیؒ)

تشریح: آنحضور ﷺ کے لئے اللہ تعالیٰ کی مذکورہ پیش کش یا تو حسی و ظاہری طور پر تھی یا معنوی یعنی باطنی طور پر اور یہ دوسری مراد زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے اس صورت میں آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں مجھ سے مشورہ فرمایا اور مجھے اختیار دیا کہ چاہے آپ ﷺ اس دنیا میں وسعت و فراخی اور یہاں کے مال و زر کی فراوانی کو پسند کریں اور چاہے دنیا سے بے رغبتی اختیار کر کے توشۂ آخرت کی فکر میں لگے رہیے اور وہاں کے حساب و عذاب سے نجات کی راہ اختیار کر لیجئے! لہٰذا میں نے دنیا کو ٹھکرا دیا اور آخرت کو پسند کر لیا۔

"بطحاء" اور "ابطح" اس کشادہ نالہ کو کہتے ہیں جس سے پانی گزرتا ہے اور جس میں ریت اور سنگریزے جمع ہو جاتے ہیں۔ مکہ کے سنگریزوں کو سونا بنانے سے مراد یہ تھی کہ مکہ کے اطراف میں جو نالے اور پانی کے نکاس کے راستے ہیں ان سب کو سونے سے بھر دیا جائے یا یہ کہ ان نالوں میں جو سنگریزے ہیں ان کو سونے میں تبدیل کر دیا جائے۔ اور یہ دوسری مراد زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ ایک دوسری حدیث میں یوں فرمایا گیا ہے کہ (اگر آپ ﷺ چاہیں تو اللہ تعالیٰ) مکہ کے پہاڑوں کو سونے میں تبدیل کر دے۔ حدیث کے آخری جملوں کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے لئے دنیاوی وسعت و فراخی اور خوشحالی کی پیش کش کے باوجود میں نے دنیا کے مال و زر کو ٹھکرا دیا اور فقر کو اختیار کر لیا کہ اگر ایک روز شکم سیر ہوں تو دوسرے روز بھوکا رہوں اور اس طرح صبر اور شکر دونوں کی فضیلت پاؤں۔ اس ارشاد گرامی کے ذریعے حضور ﷺ نے گویا اُمت کو تعلیم و تلقین فرمائی کہ اگرچہ دولتمندی بھی خدا کی بہت بڑی نعمت ہے لیکن اس کی آفات بھی بہت ہیں اور انسان دولتمندی کی حالت میں زیادہ گمراہ ہوتا ہے لہٰذا فقر و قناعت کو اختیار کرنا زیادہ موزوں ہے اس لئے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ غنا یعنی دولتمندی کے مقابلہ میں فقر، افضل ہے۔

دنیا کی اصل نعمتیں

(۳۷) وَعَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ مِحْصَنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَصْبَحَ مِنْكُمْ اٰمِنًا فِيْ سِرْبِهٖ مُعَافًى فِيْ جَسَدِهٖ عِنْدَهٗ قُوْتُ يَوْمِهٖ فَكَاَنَّمَا حِيْزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَافِيْرِهَا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت عبید اللہ ابن محصنؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "تم میں سے جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ وہ اپنی جان کی طرف سے بے خوف ہو (ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی اس کا بدن درست و باعافیت ہو اور اس کے پاس (حلال ذریعہ سے حاصل کیا ہوا) ایک دن کی بقدر ضرورت خوراک کا سامان ہو تو گویا اس کے لئے تو کم دنیا (کی نعمتیں) جمع کر دی گئی ہیں۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "وہ اپنی جان کی طرف سے بے خوف ہو" کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنے کسی دشمن کی طرف سے کسی نقصان و ضرر کا خدشہ نہ ہو یا یہ کہ برے کاموں سے بچنے اور اپنی لغزشوں پر خدا سے توبہ کر لینے کی وجہ سے ان آفات سے بے خوف ہو، جو عذاب الٰہی کے طور پر نازل ہوتی ہیں۔ واضح رہے کہ لفظ "سرب" سین کے زیر اور راء کے جزم کے ساتھ (یعنی سرب) زیادہ مشہور ہے۔ جو نفس، راستہ، حال اور دل، ان سب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اگر یہاں حدیث میں اس لفظ سے ان سب چیزوں کو مراد لیا جائے تو یہ بھی منشاء حدیث کے مناسب ہوگا، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص اس حال میں صبح کو اٹھے کہ اس کو مذکورہ چیزوں کے بارے میں کسی نقصان و ضرر کا کوئی خوف و خدشہ نہ ہو الخ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ لفظ سین اور راء دونوں کے زبر کے ساتھ (یعنی سرب) ہے جس کے معنی خانہ زیر زمین کے ہیں یعنی وہ بل و سوراخ جو وحشی جانوروں، جیسے چوہے وغیرہ کا مسکن ہوتے ہیں، اگر اس قول کو صحیح مان لیا جائے، یہ معنی بھی منشاء حدیث کے منافی نہیں ہوتے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ جو شخص اس حال میں صبح کو اٹھے کہ اس کے گھر کے بلوں اور سوراخوں میں رہنے والے چوہوں اور لومڑیوں وغیرہ کی طرف سے کہ جو آفات زمانہ میں سے ہیں اس کو کسی نقصان و ضرر کا کوئی خوف و خدشہ نہ ہو.... الخ۔"

کھانا زیادہ سے زیادہ کتنا کھایا جائے

(۳۷) وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامَلَاَ اٰدَمِيٌّ وِعَاءً شَرًّا مِّنْ بَطْنٍ بِحَسْبِ ابْنِ اٰدَمَ اُكُلَاتٌ يُقِمْنَ صُلْبَهُ فَاِنْ كَانَ لَا مُحَالَةَ فَثُلُثٌ طَعَامٌ وَّثُلُثٌ شَرَابٌ وَّثُلُثٌ لِنَفَسِهٖ۔

(رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت مقدام ابن معدیکرب کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "انسان (اگر اپنے پیٹ کو حد سے زیادہ بھر لے تو اس) نے پیٹ سے بدتر کوئی برتن نہیں بھرا (کیونکہ پیٹ کو زیادہ بھرنے سے جو برائیاں اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا کوئی شمار نہیں، ابن آدم کے لئے بس چند لقمے کافی ہیں جو اس کی پشت کی ہڈی کو سیدھا اور کھڑا رکھیں (تاکہ وہ اطاعت الٰہی کی بجا آوری اور بقدر ضرورت اپنی معاشی جدوجہد کو جاری رکھنے پر قادر رہ سکے، ہاں اگر ضروری ہو (یعنی کوئی پیٹ بھرنا ہی چاہتا ہو اور کھانے کی کم سے کم مقدار کفایت پر قناعت نہ کر سکتا ہو) تو اس کو چاہئے کہ پیٹ کے تین حصے کرے ایک حصہ کھانے کے لئے ہو ایک حصہ پانی کے لئے ہو اور ایک حصہ سانس (کی آمد و رفت) کے لئے (خالی چھوڑ دے تاکہ دم گھٹنے کی وجہ سے ہلاکت میں مبتلا نہ ہو جائے۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: جیسا کہ طیبیؒ نے لکھا ہے، حدیث کا مطلب یہ ہے کہ واجب تو یہ ہے کہ کھانے کے معاملہ میں اس حد سے تجاوز نہ کیا جائے جو پیٹھ کو قائم رکھنے یعنی جسمانی توانائی کو برقرار رکھنے کے لئے کافی ہو اور یہ بھی اس لئے تاکہ خدا کے احکام بجالانے کی طاقت و قدرت حاصل رہے، ہاں اگر کوئی شخص اس حد کفایت پر قناعت نہ کر سکے اور وہ اس حد سے تجاوز کرے یعنی زیادہ مقدار میں کھانے کی خواہش رکھے تو وہ بھی بس اسی قدر زیادہ کھائے جو پیٹ کے تین حصوں میں سے ایک حصے کو بھر دے، باقی دو حصوں میں سے ایک حصہ پانی کے لئے اور ایک حصہ خالی رہنا چاہئے۔ اپنی خوراک کی مقدار میں اس آخری حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔

واضح رہے کہ اس حدیث میں پہلے تو پیٹ کو ان معمولی برتنوں کی طرح ایک برتن قرار دیا گیا ہے جو گھر کی ضروریات میں کام آتے ہیں اور اس طرح یہ اشارہ فرمایا گیا کہ پیٹ ایک بے حیثیت چیز ہے، پھر یہ واضح فرمایا کہ برتنوں میں بھی (یہ پیٹ) گویا سب سے برا برتن ہے کیونکہ عام طور پر تمام برتن انہی کاموں میں استعمال کیے جاتے ہیں جن کے لئے ان کو بنایا گیا ہے، اس طرح پیٹ کا اصل موضوع یہ ہے کہ اس میں خوراک کی بس اتنی مقدار ڈالی جائے جو جسمانی توانائی کو باقی رکھنے کے لئے ضروری ہو اور اگر اس کو ضرورت سے زیادہ بھرا جائے تو نہ صرف اس کے مقصد سے تجاوز ہوگا بلکہ اس کی وجہ سے ایسی برائیاں اور خرابیاں پیدا ہوں گی جو دین و دنیا دونوں کو نقصان

پہنچائیں گی، اس اعتبار سے پیٹ گویا سب سے برا برتن ہوا۔

بھوک کے دس فوائد: "بھوک" بظاہر بڑا بھیانک لفظ ہے اور آج کی دنیا کا نہایت سنگین مسئلہ ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ اگر بھوک کا تعلق "قوت لایموت" تک کے فقدان سے ہو اور کوئی انسان نان جویں کی اس مقدار سے بھی محروم رہے جس کا بقاء زندگی کے لئے پیٹ میں پہنچنا ضروری ہے تو واقعۃً وہ "بھوک" انسان کے لئے پیغام اجل سے کم نہیں، لیکن اگر "بھوک" سے مراد کم کھانا، یا وقتاً فوقتاً فاقہ ہو، تو وہ بھوک بھی ہماری اس دنیا کے نقطۂ نظر سے چاہے کتنا ہی سنگین مسئلہ ہو مگر حقیقت میں اس "بھوک" کے جو فوائد ہیں، طبی اور رُوحانی نقطہ نظر سے ہیں ان کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا! بعض حضرات نے ان فوائد کو بڑی جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے، چنانچہ ایک اونچے درجہ کے اسلامی محقق اور عارف باللہ حضرت شیخ ابو حامدؒ نے لکھا ہے کہ "بھوک" میں دس فوائد پوشیدہ ہیں، اول یہ کہ قلب اور بصارت کی صفائی حاصل ہوتی ہے کیونکہ پیٹ کا بھرا ہوا ہونا طبیعت کو سُست و کند، قلب کو بوجھل اور دماغ پر انجارات کا غلبہ کر دیتا ہے، دوسرے یہ کہ قلب میں رقت و نرمی اور پاکیزگی آتی ہے اور اس کی وجہ سے دل یاد الٰہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے، تیسرے یہ کہ طبیعت و مزاج میں انکسار پیدا ہوتا ہے اور اس تکبر و حرص اور عشرت پسندی کا خاتمہ ہوتا ہے جو طغیان و سرکشی کا مبداء ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان کا نفس، جس قدر انکسار پسند بھوک کی حالت میں ہوتا ہے کہ اس قدر انکسار اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوتا، چوتھے یہ کہ عذاب الٰہی آفات وبلاء قدرت اور اہل بلاء فراموش نہیں ہوتے۔ چنانچہ جو لوگ ہر وقت اپنا پیٹ بھرا رکھتے ہیں وہ نہ تو بھوک کی اذیت کو محسوس کر سکتے ہیں اور نہ بھوکوں کو یاد کر سکتے ہیں! پانچویں یہ کہ نیند کا غلبہ کم ہوتا ہے اور بیداری کی کیفیت طاری رہتی ہے، کیونکہ جو شخص پیٹ کو کھانے سے بھر لیتا ہے وہ پانی بھی بہت پیتا ہے، زیادہ پانی پینا، نیند کی زیادتی کا سبب ہوتا ہے اور نیند کی زیادتی نہ صرف یہ کہ عبادت و طاعت، جیسے تہجد وغیرہ کو فوت کرتی ہے، طبیعت کو مکدر اور دل کو سخت بناتی ہے بلکہ زیادہ سونا، گویا عمر کو ضائع کرنا ہے، اور ظاہر ہے کہ عمر، بہت اعلیٰ جوہر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے عطا نہیں کیا ہے کہ اس کو بیکار گنوایا جائے بلکہ اس کو انسان کے حق میں رأس المال بنایا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ اپنے دینی و دنیاوی معاملات کی اصلاح وفلاح کے امور انجام دے۔ علاوہ ازیں "نیند" ایک طرح کی موت ہے، لہٰذا اپنے اوپر نیند کو غالب رکھنا گویا عمر کو چھوٹی کرنا ہے! چھٹے یہ کہ عبادت و طاعت کی پابندی و ہمیشگی حاصل ہوتی ہے، کیونکہ جو شخص زیادہ کھاتا ہے اس کے اوقات کا زیادہ حصہ کھانے پینے کی مشغولیت میں صرف ہوتا ہے مثلاً اس کو کچھ وقت تو بازار سے سود سلف لانے اور اشیاء خوراک کی فراہمی میں لگانا پڑتا ہے، کچھ وقت کھانے کی تیاری میں صرف ہوتا ہے، کھانا کھاتے وقت بھی کافی وقت دینا پڑتا ہے اور پھر کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے اور کھانے کے بعد منہ کی صفائی اور خلال کرنے اور بار بار پانی کے لئے پانی کی جگہ آنے جانے جیسے کاموں میں بھی کافی وقت صرف ہوتا ہے، غرضیکہ بہت ہی وقت کا خرچ ہے اور اگر ان اوقات کو کھانے پینے کی مشغولیات سے بچا کر عبادت وطاعت اور ذکر و مناجات میں لگائے تو کہیں زیادہ فائدہ حاصل کرے! مشہور عالم اور بزرگ حضرت علامہ تستری کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے حضرت علی جرجانیؒ کو ستو پھانکتے دیکھا تو عرض کیا کہ حضرت ایسی کون سی وجہ پیش آگئی جو آپ ستو پھانک رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ بھئی کیا پوچھتے ہو، میں نے ایک دن حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ ایک چپاتی کھانے کے دوران اتنا وقت صرف ہوتا ہے جتنا کہ ستر تسبیحات پڑھنے میں (میں نے سوچا کہ اس طرح تو روٹیاں کھانے میں بہت وقت لگتا ہے اور اس وقت کو بچا کر دوسرے مفید کاموں میں صرف کیا جاسکتا ہے) لہٰذا میں نے روٹیاں کھانی چھوڑ دیں اور چالیس برس سے ایک چپاتی بھی نہیں کھائی ہے بلکہ بھوک کی شدت کم کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً ستو پھانک لیا کرتا ہوں۔ ساتویں یہ کہ کم کھانے کی وجہ سے بدن کی صحت و تندرستی بحال رہتی ہے اور امراض کا دفیعہ ہوتا ہے کیونکہ اکثر امراض کا سبب کھانے کی زیادتی اور کھانے پینے میں بے اعتدالی ہوتی ہے، پھر زیادہ کھانے کی وجہ سے امراض صرف پیدا نہیں ہوتے بلکہ وہ عبادت سے باز رکھتے ہیں اور تشویش و فکر میں مبتلا کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وقت کا بڑا حصہ، حکیم ڈاکٹر کے پاس آنے جانے، علاج معالجہ کرنے، اور دواء وغیرہ کی فراہمی میں صرف ہوتا ہے اور سب چیز جو محنت

مشقت اور پریشانی برداشت کرنا پڑتی ہے وہ اس کے علاوہ ہوتی ہے، لہٰذا انسان اگر کم کھائے اور وقتاً فوقتاً فاقہ کرتا رہے تو ان پریشانیوں سے نجات مل جائے! آٹھویں یہ کہ حصول معاش کی جدوجہد اور روزی کمانے کی محنت مشقت زیادہ نہیں کرنا پڑتی، کیونکہ جو شخص کم کھانے کی عادت ڈال لیتا ہے اس کے لئے تھوڑی سی محنت مشقت سے حاصل کیا ہوا تھوڑا سامال واسباب بھی کافی ہو جاتا ہے! نویں یہ کر ایثار و احسان اور صدقہ و خیرات کے داعیہ کو پورا کرنے پر آسانی سے قدرت حاصل ہوتی ہے، یعنی کم کھانے کی صورت میں جو کھانا اپنی خوراک سے بچ جاتا ہے اس کو غریب و مسکین اور فقیر و محتاج کو بطور صدقہ دینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا، اور ظاہر ہے کہ صدقہ و خیرات کرنے والا شخص قیامت کے دن اپنے اس صدقہ و خیرات کے سایہ میں رحمت خداوندی سے بہرہ مند ہو گا، نیز یہ حقیقت بھی سامنے آنی چاہئے کہ انسان جو کچھ خود کھاتا پیتا ہے اس کو تو وہ گویا بیت الخلاء میں جا کر جمع کر دیتا ہے اور جو کچھ فقیر و محتاج پر صدقہ و خیرات کرتا ہے اس کو اپنے لئے ذخیرۂ آخرت کر دیتا ہے کہ وہ وہاں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہتر جزاء پائے گا! اور دسواں یہ کہ جو بھوک کے مذکورہ بالا فائدوں میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ان خواہشات و جذبات کی بیخ کنی ہوتی ہے جو انسان کو ہر طرح کے گناہ پر ابھارتے ہیں، اور نفس امارہ پر غلبہ و قابو حاصل ہو جاتا ہے، کیونکہ کم کھانا ہر طرح کی نفسانی خواہش کو مارتا ہے اور شہوانی خواہشات کو مضمحل کر دیتا ہے اور یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ دین و دنیا کی تمام سعادتیں اور بھلائیاں اس امر میں پوشیدہ ہیں کہ انسان اپنے نفس کا مالک اور اس پر قابو یافتہ ہو اور ہر طرح کی شقاوت و بدبختی اس میں پوشیدہ ہے کہ انسان اپنے نفس کا غلام بن جائے اور خود پر اس کو قابو دے دے۔

لمبی ڈکار لینے کی ممانعت

(۳۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعَ رَجُلًا يَتَجَشَّأُ فَقَالَ اَقْصِرْ مِنْ جُشَاءِكَ فَاِنَّ اَطْوَلَ النَّاسِ جُوْعًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَطْوَلُهُمْ شِبَعًا فِي الدُّنْيَا۔ رَوَاهُ فِي شَرْحِ السُّنَّةِ وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ نَحْوَهُ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ایک شخص کو ڈکارتے سنا تو اس سے فرمایا کہ اپنی ڈکار کو روکو (یعنی اتنا زیادہ نہ کھایا کرو کہ لمبی لمبی ڈکاریں آنے لگیں) اس لئے کہ قیامت کے دن لوگوں میں سب سے بڑا بھوکا وہ ہو گا جو دنیا میں ان میں سب سے بڑے پیٹ والا ہو گا۔ یعنی جو شخص اس دنیا میں بہت زیادہ کھانے والا ہو گا اس کو قیامت کے دن بھی بہت زیادہ بھوک لگے گی۔ جس کی وجہ سے وہ نہایت پریشانی میں مبتلا ہو گا۔" بغویؒ نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔"

تشریح: حدیث میں صحابیؓ کے ڈکارنے کا ذکر ہے ان کا نام وہب ابن عبداللہ تھا اور ان کا شمار چھوٹی عمر والے ان صحابہؓ میں ہوتا ہے جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بالغ نہیں ہوئے تھے! خود ان کا بیان ہے کہ ایک دن میں نے گوشت کا ثرید کھایا، اور ڈکاریں لیتا ہوا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ اپنی ڈکاروں کو روکو۔ اور اس کے بعد وہی الفاظ ارشاد فرمائے جو اوپر نقل کیے گئے ہیں! مذکورہ ارشاد میں ڈکار لینے کی جو ممانعت فرمائی گئی ہے اس کا مقصد، جیسا کہ حدیث کے آخری جزو سے واضح ہوتا ہے، اتنا زیادہ کھانے سے منع کرنا ہے جس سے پیٹ ضرورت سے زیادہ بھر جائے۔ اور جو لمبی لمبی ڈکاریں لینے کا باعث بنتا ہے۔ منقول ہے کہ حضرت وہب ابن عبداللہ نے حضور ﷺ کی مذکورہ ممانعت کے بعد تا زندگی کبھی بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ اگر رات میں کھا لیتے تو دن میں نہیں کھاتے اور جب دن میں کھا لیتے تو رات میں نہیں کھاتے۔

مال و دولت ایک فتنہ ہے

(۴۰) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عِيَاضٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ لِكُلِّ اُمَّةٍ فِتْنَةً وَفِتْنَةُ اُمَّتِي الْمَالُ۔
(رواہ الترمذی)

"اور حضرت کعب ابن عیاضؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ (حق تعالیٰ کی طرف سے) ہر اُمت کے لئے (کوئی نہ کوئی) فتنہ وآزمائش ہے (جس میں اس اُمت کے لوگوں کو مبتلا کر کے ان کو آزمایا جاتا ہے) چنانچہ میری اُمت کے لئے جو چیز فتنہ آزمائش ہے وہ مال ودولت ہے یعنی اللہ تعالیٰ میری اُمت کے لوگوں کو مال ودولت دے کر یہ آزمانا چاہتا ہے کہ وہ راہ مستقیم اور حد اعتدال پر قائم رہتے ہیں یا نہیں۔" (ترمذیؒ)

جو مالدار صدقہ وخیرات کے ذریعہ آخرت کے لئے کچھ نہیں کرتے ان کے بارے میں وعید

(۴۱) وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُجَاءُ بِابْنِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كَاَنَّهٗ بَذَجٌ فَيُوْقَفُ بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ لَهٗ اَعْطَيْتُكَ وَخَوَّلْتُكَ وَاَنْعَمْتُ عَلَيْكَ فَمَا صَنَعْتَ فَيَقُوْلُ رَبِّ جَمَعْتُهٗ وَثَمَّرْتُهٗ وَتَرَكْتُهٗ اَكْثَرَ مَا كَانَ فَارْجِعْنِي اٰتِكَ بِهٖ كُلِّهٖ فَيَقُوْلُ لَهٗ اَرِنِيْ مَا قَدَّمْتَ فَيَقُوْلُ رَبِّ جَمَعْتُهٗ وَثَمَّرْتُهٗ وَتَرَكْتُهٗ اَكْثَرَ مَا كَانَ فَارْجِعْنِيْ اٰتِكَ بِهٖ كُلِّهٖ فَاِذَا عَبْدٌ لَمْ يُقَدِّمْ خَيْرًا فَيُمْضٰى بِهٖ اِلَى النَّارِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَضَعَّفَهٗ۔

"اور حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت کے دن ابن آدم کو اس طرح حقارت وذلت کے ساتھ) پیش کیا جائے گا گویا کہ وہ بکری کا بچہ ہے، پھر اس کو اللہ تعالیٰ کے روبرو کھڑا کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ (فرشتہ کی وساطت سے یا خود براہ راست زبان قال یا زبان حال سے) اس سے فرمائے گا کہ میں نے (دنیا میں) تجھ کو (زندگانی، عمل ودانش، صحت وتندرستی اور اَمن وعافیت جیسی نعمت عطاء کی تھی (مال ودولت، حشم وخدم اور جاہ وعزت جیسی چیزوں کا مالک) بنایا تھا اور (اس سے بڑی) نعمت (یہ) عطا کی تھی (کہ اپنی کتاب نازل کی، اپنا رسول ﷺ بھیجا اور ہدایت وراستی کا نور پھیلایا) پس تو نے کیا کام کیا؟ یعنی کیا تو نے ان چیزوں کے حقوق ادا کیے اور ان سب نعمتوں کا شکر گزار رہا؟" ابن آدم عرض کرے گا۔ "میرے پروردگار! میں نے (تو بس یہ کیا کہ تجارت اور کاروبار کے ذریعہ) مال ودولت جمع کرنے اور اس کو بڑھانے میں لگا رہا اور (مرتے وقت) اس کو دنیا میں اس سے زیادہ چھوڑ کر آیا جتنا کہ (میری زندگی کے دنوں میں پہلے میرے پاس) تھا، اور اب آپ مجھے دنیا میں دوبارہ بھیج دیجئے تاکہ میں اس تمام مال ودولت کو (آپ کی راہ میں خرچ کروں اور اس کا ثواب) لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔" اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ (یہ تو ممکن نہیں کہ تمہیں دنیا میں دوبارہ بھیجا جائے اور تم جو مال ودولت دنیا میں چھوڑ کر چلے آئے تھے وہ بھی اب تمہارے لئے کارگر نہیں ہے، ہاں اگر) تم نے (اس مال ودولت میں سے کچھ حصہ بھی صدقہ وخیرات کیا ہو اور ثواب کی صورت میں) اس کو آگے (یہاں آخرت میں) بھیجا ہو تو مجھے اس کو دکھلاؤ۔" (لیکن اس نے چونکہ اس مال ودولت سے کچھ بھی حصہ آخرت کے کاموں میں خرچ نہیں کیا ہوگا اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر نہایت شرمندہ وخجل ہوگا اور جیسا کہ مجرموں کی عادت ہے کے جب اپنے جرم میں پکڑے جاتے ہیں اور اپنی صفائی میں کوئی معقول عذر بیان نہیں کر سکتے تو بار بار ایک ہی بات کو جو پہلے کہہ چکے ہوتے ہیں، دہراتے رہتے ہیں، وہ ابن آدم بھی ایک تو اس وجہ سے اور دوسرے اپنی اس بات کا جواب نہ پانے کی وجہ سے دوبارہ وہ عرض کرے گا کہ "میں تو بس مال ودولت کو جمع کرنے اور اس کو بڑھانے میں لگا رہا اور اس کو دنیا میں اس سے زیادہ چھوڑ کر آیا جتنا کہ پہلے تھا اور اب آپ مجھے دنیا میں دبارہ بھیج دیجئے تاکہ میں اس تمام مال ودولت کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔"

اس طرح یہ ظاہر ہو جائے گا کہ (اس کو دنیا میں جو مذکورہ چیزیں دی گئی تھیں ان میں سے) اس نے کوئی بھی بھلائی آگے (آخرت میں) نہیں بھیجی ہے لہٰذا اس کو دوزخ میں پہنچائے جانے کا حکم دیا جائے گا۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور اس (کی اسناد) کو ضعیف قرار دیا ہے۔ (اگرچہ معنی کے لحاظ سے یہ بالکل صحیح ہے)

تشریح: طیبیؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث میں ابن آدم کی جس حالت کو ذکر کیا گیا ہے کہ جس بندہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مذکورہ چیزیں، اور

نعمتیں حاصل ہوں اور وہ ان کے ذریعہ آخرت کی بھلائی حاصل کرنے سے غافل رہے تو اس کی مثال اس غلام کی سی ہے جس کو اس کا آقا بہت سامال واسباب اس مقصد کے لئے دے کہ وہ اس کے ذریعہ تجارت کر کے زیادہ سے زیادہ نفع کمائے مگر وہ (غلام) اپنے آقا کی مرضی اور اس کے حکم سے سرتابی کر کے اس سارے مال واسباب کو لٹا کر تلف و ضائع کر دے یا ایسے کاروبار اور تجارت میں پھنسا دے جس کا حکم اس کو نہیں دیا گیا تھا تو ظاہر ہے کہ وہ غلام نہ صرف نااہل سمجھا جائے گا بلکہ مستوجب سرزنش بھی قرار پائے گا، ٹھیک اسی طرح وہ بندہ بھی نہایت ٹوٹے میں رہے گا اور مستوجب عذاب قرار دیا جائے گا۔

ابو حامدؒ نے کہا ہے کہ یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ اگرچہ ہر بھلائی، ہر لذت اور ہر سعادت یہاں تک کہ ہر مطلوب. کو "نعمت" کہا جاتا ہے لیکن حقیقی نعمت بس "اخروی سعادت" ہے اس کے علاوہ، کسی بھی چیز کو "سعادت" کہنا غلط ہے. بلکہ کسی دنیاوی چیز پر مجازاً بھی "سعادت" کا اطلاق کرنا یعنی اس کو "دینوی ساعدت" کہنا بھی صحیح نہیں ہے، ہاں جو دنیاوی چیزیں "اخروی سعادت" کے حصول کا سبب و ذریعہ ہوں اور اس کی راہ میں کسی ایک واسطہ یا کئی واسطوں کے ساتھ معاون و مددگار ہوں تو ان چیزوں کو "نعمت" کہنا صحیح ہو سکتا ہے اور یہ بھی اس وجہ سے کہ وہ چیز "حقیقی نعمت" تک پہنچا سکتی ہیں۔

ٹھنڈا پانی اور تندرستی، خدا کی بڑی نعمت ہے

(۴۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ مَا یُسْاَلُ الْعَبْدُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مِنَ النَّعِیْمِ اَنْ یُّقَالَ لَهٗ اَلَمْ نُصِحَّ جِسْمَكَ وَنُرَوِّكَ مِنَ الْمَآءِ الْبَارِدِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت کے دن سب سے پہلے بندے سے نعمتوں کے بارے میں جو سوال کیا جائے گا وہ یہ ہو گا کہ "کیا ہم نے تیرے بدن کو تندرستی نہیں عطا کی تھی اور تجھ کو ٹھنڈے پانی سے سیراب نہیں کیا تھا۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یوں تو ہر وہ چیز خدا کی نعمت ہے جس سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑی نعمت تندرستی اور پانی ہے، اسی لئے قیامت کے دن سب سے پہلے انہی دونوں نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

ایک بڑے بزرگ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے اپنے مرید سے فرمایا۔ "پانی ٹھنڈا کر کے پیا کرو کیونکہ ٹھنڈا پانی، خدا کا شکر، دل کی گہرائیوں سے ادا کراتا ہے۔ نیز حضرت شیخ عبدالحقؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اپنے والد ماجدؒ کے بارے میں خوب یاد ہے کہ وہ جب بھی ٹھنڈا پانی پیتے بیخود ہو جاتے، اور جب تھوڑی دیر تک اسی عالم بیخودی میں رہنے کے بعد اپنی حالت پر واپس آتے، تو فرماتے، سبحان اللہ! یہ ٹھنڈا پانی بھی کیا چیز ہے اور خدا نے اس کو کتنا بہترین جوہر بنایا ہے؟ اور اسی طرح کے عالم ذوق و توحید سے متعلق کلمات ارشاد فرماتے! حاصل یہ کہ پانی بذات خود تو بہت بڑی نعمت ہے ہی، لیکن ٹھنڈا پانی جو کیف و لذات اور جو فوائد اپنے اندر رکھتا ہے ان کی وجہ سے اس نعمت کا درجہ کہیں زیادہ بڑھ جاتا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ قدرت نے پانی کو چیز تو ایسی عزیز اور اہم بنایا کہ زندگی کا مدار ہی اس پر ہے لیکن عام اتنا کیا کہ اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اس موقع پر ایک بڑی دلچسپ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک بادشاہ کسی طرح بھٹک کر کہیں اور جنگل میں پہنچ گیا، وہاں اس کو پیاس لگی مگر آس پاس پانی کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا، پیاس کے ساتھ اس کا اضطراب بڑھتا رہا یہاں تک کہ مرنے کے بالکل قریب پہنچ گیا تو اچانک اس کے سامنے ایک عارف یا کوئی فرشتہ نمودار ہوا اور بولا کہ اگر میں تمہیں پانی پلا دوں تو تم مجھے کیا دو گے؟ بادشاہ نے فوراً جواب دیا کہ اپنا آدھا ملک! اس غیبی انسان نے اس کو پانی پلا دیا، اس کے بعد اس کا پیشاب رک گیا۔ اس نے لاکھ چاہا کہ کسی طرح پیشاب کرلے، مگر نامراد رہا۔ اور سخت پریشانی میں مبتلاء ہو گیا آخر کار پھر وہی غیبی انسان نمودار ہوا اور کہا کہ اگر میں تمہارے اس مرض کا علاج کر دوں اور تمہارا پیشاب کھل جائے تو مجھے کیا انعام دو گے؟ بادشاہ نے کہا کہ "باقی آدھا ملک بھی تمہیں ہی دے دوں گا۔ اس نے علاج کیا اور بادشاہ کا پیشاب کھل گیا۔ تب اسی غیبی انسان نے کہا کہ "بادشاہ

سلامت! آپ اپنا ملک خود سنبھالئے، مجھے اس کی حاجت نہیں ہے، لیکن اپنی سلطنت اور اپنے ملک کی حیثیت دیکھ لیجئے (کہ ذرا سے پانی اور پیشاب کے لئے آپ نے تمام ملک وسلطنت کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا، لہٰذا اتنی بے حیثیت چیز اور اس کی ظاہری چمک دمک پر کبھی گھمنڈ نہ کیجئے گا۔"

آخر میں ایک بات یہ ملحوظ رہے کہ مذکورہ بالا حدیث میں تندرستی اور پانی دونوں نعمتوں کو ایک ساتھ ذکر کرنے میں گویا اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، کہ یہ دونوں اتنی عظیم الشان اور اہم نعمتیں ہیں کہ تمام ملک وسلطنت ایک طرف اور یہ دونوں نعمتیں ایک طرف۔

وہ پانچ نعمتیں جن کے بارے میں قیامت کے دن جوبداہی کرنا پڑے گی

(۴۳) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حَتّٰى يُسْأَلُ عَنْ خَمْسٍ عَنْ عُمْرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَهٗ وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت کے دن انسان کے پاؤں سرکنے نہیں پائیں گے اور اس کو بارگاہ رب ذوالجلال میں اس وقت تک کھڑا رکھیں گے جب تک کہ اس سے پانچوں باتوں کا جواب نہیں لے لیا جائے گا، چنانچہ اس سے پوچھا جائے گا کہ اس نے اپنی عمر کس کام میں صرف کی، (بالخصوص یہ کہ) اس نے اپنی جوانی کو کس کام میں بوسیدہ کیا (یعنی جوانی گویا نیا لباس ہے جو رفتہ رفتہ پرانا ہوتا ہے) اس نے مال کیونکر کمایا (یعنی اس نے دنیا میں جو کچھ مال ودولت اور روپیہ پیسہ کمایا وہ حلال وسائل وذرائع سے حاصل کیا یا حرام ذرائع سے؟) اس نے مال کو کہاں خرچ کیا (یعنی اپنے مال اور روپیہ پیسہ کو اچھے کاموں میں صرف کیا یا برے کاموں میں گنوایا) اور یہ کہ اس نے جو علم حاصل کیا تھا اس کے موافق عمل کیا یا نہیں؟" ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حضرت ابو درداءؓ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک دن انہوں نے حضرت عُوَیمرؓ سے فرمایا کہ عویمر! (خیال کرو) قیامت کے دن تمہاری کیا کیفیت ہوگی جب تم سے سوال کیا جائے گا کہ آیا تم عالم تھے یا جاہل؟ اگر تم یہ جواب دو گے کہ میں عالم تھا تو پھر تم سے یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے جو کچھ علم حاصل کیا اس کے موافق کیا عمل کیا؟ اور اگر تم نے یہ جواب دیا کہ میں تو جاہل تھا، تو پوچھا جائے گا کہ تمہارے لئے جاہل رہنے کی کیا وجہ تھی اور تم نے علم کیوں حاصل نہیں کیا؟

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

برتری محض تقویٰ سے حاصل ہو سکتی ہے، رنگ ونسل سے نہیں

(۴۴) عَنْ اَبِيْ ذَرٍّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهٗ اِنَّكَ لَسْتَ بِخَيْرٍ مِنْ اَحْمَرَ وَلَا اَسْوَدَ اِلَّا اَنْ تَفْضُلَهٗ بِتَقْوٰى۔ (رواہ احمد)

"حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا۔ (ابوذر!) تم نہ تو سرخ رنگ والے سے بہتر ہو اور نہ سیاہ رنگ والے سے الا یہ کہ تم ان دونوں میں سے کسی سے تقویٰ کے اعتبار سے افضل ہو۔" (احمدؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ انسانی فضیلت وبرتری، ظاہری شکل وصورت اور رنگ ونسل پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس کا مدار دینی اخلاقی کردار کی عظمت اور تقویٰ پر ہے! واضح رہے کہ حدیث میں صرف دو رنگوں سرخ اور سیاہ کا ذکر اس بناء پر کیا گیا ہے کہ زیادہ تر لوگ انہی دو

رنگ کے ہوتے ہیں، اور زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان دونوں رنگوں والوں سے مراد آقا اور غلام ہیں چنانچہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ آقا گورے رنگ کا ہوتا ہے اور غلام کالے رنگ کا۔

طیبیؒ نے حدیث کی وضاحت میں کہا ہے کہ یہاں سرخ سے مراد اہل عجم اور سیاہ رنگ سے مراد اہل عرب ہیں۔ چنانچہ (اس زمانہ میں) اہل عرب، عجم والوں یعنی غیر عرب لوگوں کو، "احمر" (سرخ) کہا کرتے تھے، کیونکہ ان کے رنگ پر سرخی اور سفیدی غالب ہوتی تھی، اور اہل عرب کو "اسود" (سیاہ) کہا جاتا تھا کیونکہ ان کی رنگت پختہ ہوتی تھی اور اس پر سیاہی اور سبزی کا غلبہ ہوتا تھا۔

نیز حضرت شیخ عبدالحقؒ نے لکھا ہے کہ حدیث کے معنی یہ ہیں کہ حقیقی فضیلت و برتری کا تعلق تقویٰ اور عمل صالح سے ہے اور تقویٰ و عمل صالح کے بغیر کسی بھی وصف و خصوصیت کی طرف نسبت کوئی فضیلت نہیں رکھتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے) یہ بات ملحوظ رہے کہ "تقویٰ" اپنے مراتب و درجات کے اعتبار سے کئی اقسام پر مشتمل ہے، سب سے ادنیٰ قسم یا سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ہر حالت میں شرک جلی سے اجتناب کیا جائے۔ اوسط درجہ یہ ہے کہ ہر قسم کے گناہ ہر طرح کی برائی ہر طرح کے لہو و لعب اور شرک خفی سے اجتناب کیا جائے۔ اور سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ہر لحہ خدا کے ساتھ تعلق و حضور رکھا جائے اور دل میں ماسوی اللہ کا خیال بھی نہ آنے دیا جائے۔

دنیا سے زہد و بے رغبتی کی فضیلت

(۴۵) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَازَهِدَ عَبْدٌ فِي الدُّنْيَا اِلَّا اَنْبَتَ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فِيْ قَلْبِهٖ وَاَنْطَقَ بِهَا لِسَانَهٗ وَبَصَّرَهٗ عَيْبَ الدُّنْيَا وَدَاءَهَا وَدَوَاءَهَا وَاَخْرَجَهٗ مِنْهَا سَالِمًا اِلٰى دَارِالسَّلَامِ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس بندہ نے دنیا میں (زائد از ضرورت و حاجت، دنیاوی مال وجاہ سے) زہد یعنی بے رغبتی اختیار کی، اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں حکمت یعنی معرفت و یقین کی دولت پیدا کی، اس کی زبان کو، اس (حکمت) کے ساتھ گویا کیا اور اس کو دنیا کے عیوب (جیسے کثرت غم ورنج، قلت غناء خست شرکاء، سرعت فنا اور ذکر الٰہی سے دل کی غفلت وغیرہ کو یقین کی آنکھوں سے) دیکھنے والا کیا، نیز اس دنیا کی بیماری (یعنی دنیاوی محبت کی علت و سبب) اور (علم و عمل، صبر و قناعت اور دنیا سے اجتناب و بے رغبتی اختیار کرنے اور تقدیر الٰہی پر راضی رہنے کی توفیق بخش کر) اس بیماری کا علاج بھی اس کو دکھایا اور (اس کے دنیا سے اعراض کرنے اور عقبیٰ کی طرف متوجہ رہنے کے سبب) حق تعالیٰ نے اس کو دنیا (کی آفات و بلیات) سے سلامتی کے ساتھ دارالسلام میں پہنچا دیا۔" (بیہقی)

تشریح: "دارالسلام" سے مراد "جنت" ہے اور اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ بکمال تمام حقیقی سلامتی بس دار آخرت اور جنت ہی میں حاصل ہوگی۔ منقول ہے کہ ایک عارف درویش سے لوگوں نے پوچھا کہ کہئے، آپ کا کیا حال ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ خدا نے چاہا تو سلامتی ہے بشرطیکہ جنت میں پہنچ جاؤں۔"

صلاح و فلاح کا انحصار خلوص ایمان پر ہے

(۴۶) وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَخْلَصَ اللّٰهُ قَلْبَهٗ لِلْاِيْمَانِ وَجَعَلَ قَلْبَهٗ سَلِيْمًا وَلِسَانَهٗ صَادِقًا وَنَفْسَهٗ مُطْمَئِنَّةً وَخَلِيْقَتَهٗ مُسْتَقِيْمَةً وَجَعَلَ اُذُنَهٗ مُسْتَمِعَةً وَعَيْنَهٗ نَاظِرَةً فَاَمَّا الْاُذُنُ فَقَمْعٌ وَاَمَّا الْعَيْنُ فَمُقِرَّةٌ لِمَا يُوْعِي الْقَلْبُ وَقَدْ اَفْلَحَ مَنْ جُعِلَ قَلْبُهٗ وَاعِيًا۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "وہ شخص فلاح یاب ہوا جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے (نفاق کی آمیزش سے پاک کر کے) ایمان کے لئے خالص و مخصوص کر دیا، (یعنی اس کو ایمان خالص عطا کیا) اس کے دل کو (بغض وحسد اور تمام برے کاموں وبرے احوال، جیسے دنیا کی محبّت اور مولی اور عقبی سے بے پروائی وغیرہ سے) محفوظ وسالم رکھا! اس کی زبان کو راست گو بنایا، اس کے نفس کو (اللہ کے ذکر اور اس کی محبت کے ذریعہ مطمئن کیا (اور اس کو حق کا مطیع بنایا) اس کی خلقت وطبیعت کو (کجی و باطل کی طرف مائل اور افراط و تفریط میں مبتلا ہونے سے بچاکر) مستقیم اور سیدھا رکھا، اس کے کانوں کو (حق بات کا) سننے والا بنایا، اور اس کی آنکھوں کو (وحدانیت کے دلائل ومشاہدات اور پروردگار کے نظام قدرت وصنعت کا) دیکھنے والا بنایا، پس کان تو "قیف" ہیں اور آنکھ اس چیز کو قائم اور ثابت رکھنے والی ہے جس کو دل محفوظ کرتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شخص فلاح یاب ہوا جس کے دل کو خدا نے یا خود اس شخص نے اپنے دل کو (حق بات اور برحق چیزوں کا) محافظ بنایا۔" (احمدؒ، بیہقیؒ)

تشریح: "قمع" کے معنی قیف کے ہیں اور قیف ٹونٹی دار یا نلکی دار ظرف کی صورت میں اس آلہ کو کہتے ہیں جس کو بوتلوں وغیرہ کے منہ پر رکھ کر ان میں کوئی رقیق چیز جیسے تیل وغیرہ بھرتے ہیں۔ "پس کان تو قیف ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح قیف کے ذریعہ کوئی رقیق چیز بوتلوں وغیرہ میں ڈالی جاتی ہے اسی طرح کان وہ ذریعہ ہے جو حق بات کو انسان کے قلب ودماغ میں اتارتا ہے بایں طور کہ کان اس بات کو سنتا ہے اور قلب ودماغ اس کو قبول کرتے ہیں۔

"اور آنکھ اس چیز کو قائم اور ثابت رکھنے والی ہے.....الخ۔" اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کو آنکھیں دیکھتی ہیں، دل ان کا ظرف ہوتا ہے یا وہ چیزیں دل کو اپنا ظرف بناتی ہیں کہ وہ آنکھوں کے ذریعہ دل میں داخل ہوتی ہے! گویا جس طرح کان، حق بات کو دل تک پہنچاتا ہے اس طرح نظر آنے والے حقائق آنکھوں کی راہ سے دل میں داخل ہوتے ہیں اور اس کے اندر قائم وثابت رہتے ہیں! حدیث کے آخری جزء میں گویا ان دونوں چیزوں کا نتیجہ بیان فرمایا گیا ہے کہ جس شخص نے حق بات کو سن کر اور برحق چیزوں کو دیکھ کر انہیں اپنے دل میں اتار لیا اور ان کی محافظت کی یعنی بہر صورت حق پر عامل رہا تو وہ فلاح یاب قرار پائے گا۔

کفار و فجار کو دنیاوی مال و دولت کا ملنا گویا انہیں بتدریج عذاب تک پہنچانا ہے

(۴۷) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا رَأَيْتَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يُعْطِي الْعَبْدَ مِنَ الدُّنْيَا عَلٰى مَعَاصِيْهِ مَا يُحِبُّ فَاِنَّمَا هُوَ اِسْتِدْرَاجٌ ثُمَّ تَلَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى اِذَا فَرِحُوْا بِمَا اُوْتُوْا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ رواه احمد۔

"اور حضرت عقبہ ابن عامرؓ، نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "جب تم دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو اس کے گناہ ومعصیت میں مبتلا ہونے کے باوجود اس کی محبوب ترین چیزیں (یعنی دنیاوی مال ودولت اور جاہ وحشمت وغیرہ) دیتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ (یعنی اس کو اس کی محبوب ترین چیزیں دینا) استدراج ہے۔

اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے استشہاد کے طور پر) یہ آیت تلاوت فرمائی: فلمانسوا ماذکروا بہ فتحنا علیھم ابواب کل شیء حتی اذا فرحوا بما اوتوا اخذنھم بغتۃ فاذا ھم مبلسون

"جب کافر اس نصیحت کو بھول گئے جو انہیں کی گئی تھی (یعنی اللہ تعالیٰ کا عہد، یا یہ کہ جب انہوں نے حق تعالیٰ کی نافرمانی کی) تو ہم نے ان پر (دنیا کی نعمتوں کی) ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں پر خوش ہوئے جو انہیں دی گئی تھیں (یعنی جاہ ومال، صحت وخوشحالی اور درازیٔ عمر اور دیگر نعمتیں) تو ہم نے ان کو (اپنے عذاب میں) پکڑ لیا اور وہ نہایت حیران وششدر رہ گئے۔" (احمد)

تشریح: لغت میں "استدراج" کے معنی ہیں درجہ بدرجہ سے جانا! جیسے کسی کو اوپر پہنچانے کے لئے زینہ کی ایک پیڑی پر چڑھا جائے پھر

دوسری پیڑی پر چڑھا جائے اور پھر تیسری پیڑی پر، اسی طرح یکے بعد دیگرے ایک ایک پیڑی پر چڑھاتے ہوئے اس کو آخر تک لے جایا جائے! اور بندہ کے حق میں اللہ تعالیٰ کا استدراج یہ ہے کہ جب کوئی انسان گناہ و معصیت میں مبتلا ہو تو اس کو دنیا کی خوش کن نعمت عطا کرے یا اس کی کوئی بات یا خواہش پوری کردے، اور پھر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دے تاکہ وہ انسان یہ گمان کرے کہ یہ میرے حق میں پروردگار کی طرف سے لطف و کرم ہے، چنانچہ اپنی کھال میں مست رہے کہ نہ تو اپنی بدعملیوں سے توبہ کرنے کی طرف متوجہ ہو اور نہ اپنے گناہ پر استغفار کرے اور پھر ایک دم عذاب خداوندی میں پکڑا جائے، پس یہ گویا حق تعالیٰ کی طرف سے اس بندہ کو بتدریج عذاب کی طرف لے جانا ہے جیسا کہ کسی کو درجہ بدرجہ چڑھا کر اوپر لے جایا جائے اور پھر اچانک اس کو وہاں سے نیچے پھینک دیا جائے۔

حاصل یہ کہ جس گناہ گار یا کافر کو دنیا کی ترقی یا بھلائی حاصل ہو جائے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ حق تعالیٰ اس کو نواز رہے ہیں بلکہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اس کی تمام تر دنیاوی ترقی و کامیابی دراصل اس کو بتدریج اس مرحلہ تک پہنچانا ہے جہاں اچانک عذاب خداوندی اس کو تباہ و برباد کردے گا، خواہ وہ مرحلہ کتنے ہی طویل عرصہ کے بعد آئے۔

اہل زہد کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ قلیل مقدار میں بھی اپنے پاس دنیاوی مال رکھیں

(۲۸) وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اَنَّ رَجُلاً مِنْ اَهْلِ الصُّفَّةِ تُوُفِّیَ وَتَرَكَ دِیْنَارًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَیَّةٌ قَالَ ثُمَّ تُوُفِّیَ اٰخَرُ فَتَرَكَ دِیْنَارَیْنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَیَّتَانِ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ اصحاب صفہ میں سے ایک شخص نے وفات پائی اور ایک دینار کی صورت میں اپنا ترکہ چھوڑا رسول کریم ﷺ نے (جب اس دینار کو دیکھا تو) فرمایا کہ "یہ دینار (اس شخص کی پیشانی، پشت اور پہلو پر) ایک داغ ہے۔" حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ پھر (کچھ دنوں بعد) صفہ والوں میں سے ایک اور شخص نے وفات پائی اور اس نے اپنے ترکہ میں دو دینار چھوڑے، رسول کریم ﷺ نے (ان دیناروں کو دیکھ کر فرمایا۔ یہ دو دینار دو داغ ہیں۔" (احمدؒ، بیہقیؒ)

تشریح: "صفہ والے" ان غریب اور گھربار نہ رکھنے والے صحابہؓ کی جماعت کو کہتے ہیں جو مستقل طور پر صفہ مسجد میں رہا کرتی تھی اور صفہ مسجد دراصل مسجد نبوی ﷺ سے متصل ایک مسقف (چھت دار) جگہ تھی اور بالکل شروع میں، جب کہ مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس تھا یہی جگہ "مسجد" کے طور پر استعمال ہوتی تھی، لیکن جب کچھ عرصہ بعد کعبۃ اللہ کو قبلہ قرار دیا گیا تو اس جگہ کو اسی حالت میں چھوڑ دیا گیا اور اس کے برابر میں "مسجد نبوی ﷺ" بنائی گئی! صحابہؓ کی جو مقدس جماعت صفہ میں رہتی تھی وہ ستر اسی نفر پر مشتمل تھی۔ یہ تعداد مختلف اوقات میں کم و زیادہ بھی ہوتی رہتی تھی، ان صحابہؓ کا چونکہ نہ کوئی مکان تھا نہ ان کے پاس کچھ مال و اسباب تھا اور نہ کوئی کاروبار زندگی اور اہل و عیال رکھتے تھے اس لئے وہ کامل زہد اختیار کیے ہوئے تھے، اور خدا کی ذات پر توکل و اعتماد کے سہارے اس جگہ پڑے رہتے تھے اور ہمہ وقت ذکر و شغل، ریاضت و مجاہدہ اور تلاوت قرآن مجید میں مشغول اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث پاک کو یاد و محفوظ کرنے میں منہمک رہ کر ہمہ وقت انوار و برکات حاصل کرتے رہتے تھے، ان حضرت کو اضیاف اللہ (اللہ کے مہمان) کہا جاتا ہے! جو صحابہؓ استطاعت رکھتے تھے وہ ان کی خدمت کیا کرتے تھے، ان کی ضروریات زندگی کی فراہمی میں حتی الامکان سعی کرتے تھے، کچھ کو ان کی جگہ پر نہایت عزت و احترام کے ساتھ کھانے پینے کا سامان پہنچاتے، کچھ کو بطور مہمان اپنے گھر لے جاتے اور وہاں ان کی میزبانی کے فرائض انجام دیتے اور ان میں سے کتنے ہی حضرات ایسے تھے جو آنحضرت ﷺ کی خصوصی عنایات و توجہ سے بہرہ مند ہوتے تھے اور سرکار رسالت پناہ ﷺ کے آستانہ پاک سے کھانا کھاتے تھے اور اسی وجہ سے کبھی کبھی آنحضرت ﷺ کے ایسے معجزات کے صادر ہونے کا باعث بھی بنتے تھے جس سے تھوڑا سا سامان خور اک حیرت انگیز طور پر سب کے لئے کافی ہو جاتا تھا، مثال کے طور پر، کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ دودھ کا صرف ایک پیالہ، جو ایک شخص کی بھی غذائی ضرورت کے لئے کافی ہو جانے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اعجاز نبوی ﷺ کے طفیل

ان سب حضرات کو شکم سیر کر دیتا تھا! آنحضرت ﷺ کو حکم خداوندی تھا کہ آپ ﷺ ان حضرات کے درمیان تشریف رکھا کریں. چنانچہ آپ ﷺ ان حضرات کو وقتاً فوقتاً اپنے حضور شرف یابی سے نوازتے رہتے تھے اور کسی وقت بھی انہیں اپنی بیچارگی اور لاچاری کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ آپ ﷺ ان سے فرمایا کرتے تھے کہ (تم لوگ اپنے کو تنہا اور بے کس مت سمجھو) میں تم میں ہی سے ہوں۔ نیز ان کو یہ بشارت دیتے کہ آخرت میں تم میرے ساتھ رہو گے اور میرے ہمراہ جنت میں جاؤ گے! مشہور صحابی حضرت ابوہریرہؓ بھی انہی (صفہ والے) صحابہ میں سے تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

واضح رہے کہ صوفیاء کی جماعت کو (زہد و توکل اور دنیا سے ترک تعلق) اہل صفہ کے ساتھ مشابہت و مناسبت حاصل ہے اور اگرچہ لفظ "صوفیہ" کو "صفہ" سے مشتق قرار دینا اور یہ کہنا کہ مسلک زہد و توکل اختیار کرنے والے کو "صوفی" کہنا لفظ "صفہ" کی بنیاد پر ہے، ایک غیر حقیقی بات ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ معنوی طور پر صوفیاء کی نسبت اہل صفہ کی طرف کی جاسکتی ہے۔

اب اصل حدیث کی طرف آیئے! اہل صفہ میں سے وفات پانے والے حضرات کا اپنے پیچھے دینار چھوڑ جانا اور اس پر آنحضرت ﷺ کا وعید بیان فرمانا اس بنیاد پر تھا کہ اگرچہ حاجت و ضرورت کے تحت ایک دینار یا دو دینار جیسا معمولی سا دنیاوی مال بچا کر رکھنا اور جمع کرنا شرعی طور پر گناہ کا موجب نہیں ہے اور نہ یہ کوئی ایسی بات ہے جس کو غیر مناسب قرار دیا جاسکے بلکہ اگر کوئی شخص ادائے حقوق (مثلاً زکوٰۃ وغیرہ کی ادائیگی) کے بعد پورا خزانہ بھی جمع کر لے اور دنیا بھر کا مال و اسباب اپنے پاس رکھے تو اس کو خلاف شرع نہیں کہیں گے الا یہ کہ کوئی شخص اس طرح مال وزر کا انبار لگائے اور جمع کرے کہ نہ تو اس کی زکوٰۃ ادا کرے اور نہ دوسرے مالی حقوق کی ادائیگی کا لحاظ رکھے تو بے شک یہ ممنوع ہوگا، لیکن اس حقیقت کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اہل زہد اور تارکان دنیا جو سب کچھ چھوڑ کر، سب سے آنکھیں بند کر کے اور اہل فقر کی محبت کر کے باب توکل و فقر پر بیٹھتے ہیں ان کی شان جدا گانہ ہے، ان کے پاس ضرورت سے زائد دنیاوی مال و اسباب کی حقیر سے حقیر مقدار کا بھی ہونا غیر موزوں ہے۔ لہٰذا حضور ﷺ کا مذکورہ ارشاد گویا فقر و تجرد کے اس وعدے کے خلاف سخت تنبیہ و سرزنش کے طور پر ہے جو حقیقت حال سے مطابقت نہ رکھے۔ اور غالباً اسی وجہ سے راوی نے ان دونوں حضرات کے ذکر میں یہ نہیں کہا کہ "اصحاب میں سے ایک شخص نے وفات پائی۔" بلکہ یہ کہا کہ "اصحاب صفہ میں سے ایک شخص نے وفات پائی۔" گویا انہوں نے ان دونوں صحابیوں کی طرف "صفہ" کی نسبت خاص طور پر کی تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اگر کوئی دوسرا صحابیؓ اپنے ترکہ میں ایک یا دو دینار چھوڑ کر وفات پاتا تو یہ کوئی اہم بات نہیں تھی لیکن یہ ان اصحاب صفہ میں سے دو شخصوں کا ذکر ہے جن کی شخصیات کا امتیاز ہی زہد و فقر تھا، لہٰذا ان اصحابہ صفہ کی صحبت و معیت میں رہنا اور خود کو ان کی امتیازی خصوصیت (یعنی زہد و فقر اور توکل) کا حامل قرار دینا، مطلق درہم و دینار جمع کرنے کے منافی ہے۔

ملا علی قاریؒ نے اس حدیث کی وضاحت میں ایک دوسرے رخ سے بحث کی ہے، ان کے منقولات کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان دونوں صحابہؓ کے بارے میں جو یہ وعید بیان فرمائی وہ اس امر کے پیش نظر تھی کہ وہ دونوں صحابہؓ دراصل ان خستہ حال و مسکین لوگوں (یعنی اصحاب صفہ) میں سے تھے جن کے فقر و فاقہ کی وجہ سے ان پر دوسرے لوگ اپنا مال خیرات کرتے تھے اور اللہ واسطے ان کو کھلاتے پلاتے تھے، اس طرح وہ دونوں حضرات یا تو از روئے مال یا از روئے حال بمنزلہ سائلین کے تھے اور جیسا کہ معلوم ہے، کسی بھی شخص کے لئے یہ قطعاً حلال نہیں ہے کہ اگر اس کے پاس ایک دن کا بھی بقدر کفاف کھانے پینے کا سامان ہو تو وہ دست سوال دراز کرے، لہٰذا وہ دونوں حضرات اپنے پاس دینار ہونے کے باوجود ان چیزوں میں سے جو کچھ کھاتے پیتے تھے جو دوسرے لوگ صدقہ و خیرات کے طور پر ان کے پاس لاتے تھے، وہ گویا ان کے حق میں حرام تھا۔ اسی طرح یہ مسئلہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ جو شخص اپنے آپ کو فقراء و مساکین کی صورت میں ظاہر کرے، مثلاً پھٹے پرانے کپڑے پہنے اور خستہ حالی کے ساتھ رہے یا صوفیا یا مشائخ کی وضع قطع اختیار کرے اور اس کے پاس از قسم نقد یا مثل نقود (یعنی سونا، چاندی، درہم و دینار یا نوٹ اور روپیہ پیسہ وغیرہ) کچھ ہو اور اس کے

باوجود لوگوں کے ہاتھ میں سے وہ چیز لے لے اور قبول کرلے جو کسی کو صدقہ وخیرات کے طور پر دینے کے لئے ہو اور پھر وہ اس چیز کو کھائے پئے یا اپنے مصرف میں لائے تو وہ چیز اس کے حق میں حرام ہوگی۔ اسی طرح وہ شخص اپنے آپ کو عالم یا صالح اور یا شریف ظاہر کرے اور حقیقت کے اعتبار سے وہ ایسا نہ ہو اور لوگ اس کو اس کے علم یا شرافت کی وجہ سے کچھ دیں تو ان کی دی ہوئی وہ چیز اس کے حق میں حرام ہوگی۔

منقول ہے کہ مشہور بزرگ حضرت شیخ ابو اسحٰق "گاذرونی" نے ایک دن فقراء کو ایک ایسے کھانے پر دیکھا جو مستحقین کے لئے تیار کیا گیا تھا، تو انہوں نے ان فقرا سے فرمایا۔ "تم لوگ حرام کھا رہے ہو؟ ان سب فقراء نے (یہ سن کر) کھانے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، اس کے بعد حضرت شیخ ؒ نے فرمایا۔ "دیکھو یہ کھانا صرف ایسے لوگوں کے لئے ہے جن کے پاس از قسم دنیاوی مال کچھ بھی نہ ہو، لہٰذا تم سے جو شخص ایسا ہو وہ تو اس کھانے کو کھائے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہ کھائے" چنانچہ اس کھانے کو کچھ نے کھایا اور کچھ وہاں سے ہٹ گئے۔ (یہ دیکھ کر) حضرت شیخ ؒ نے فرمایا۔ "سبحان اللہ! کھانا تو ایک ہی لیکن کچھ لوگوں کے لئے حلال ہے اور کچھ لوگوں کے لئے حرام" اس سے واضح ہوا کہ وہ اوقاف کہ جو محض فقراء کے لئے ہیں ان کی آمدنی اور ان کے وسائل کو کسی بھی ایسے شخص کا اپنے مصرف میں لانا مطلقاً حلال نہیں ہے جو شرعی طور پر غنی ہو! چنانچہ ان مکانات اور کمروں میں جو فقراء ومساکین کے لئے وقف ہیں ایسے لوگوں کا مفت رہائش اختیار کرنا حرام ہے جو فقیر ومسکین نہ ہوں جیسا کہ علامہ ابن حمام ؒ نے صراحت کی ہے کہ غنی پر حرام ہے کہ وہ خانقاہوں کے وقف حجروں میں مفت رہائش اختیار کرے! لہٰذا اس قول کو قابل اعتبار نہیں سمجھنا چاہئے جس کا حاصل یہ ہے کہ حرمین شریفین کے اوقاف فقیر وغنی ہر ایک کے لئے ہیں کیونکہ اگر اس بات کو صحیح بھی مان لیا جائے (کہ واقعۃً وقف کرنے والوں نے ان اوقاف کو عام رکھا تھا) تو بھی ان اوقاف سے غنی کو فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک غنی کے حق میں کسی چیز کو وقف کرنا صحیح نہیں ہے جب کہ وہ غیر محصور ہو۔

دنیاوی مال واسباب جمع کرنے سے گریز کرو

(۴۹) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ اَنَّهُ دَخَلَ عَلٰى خَالِهِ اَبِيْ هَاشِمِ بْنِ عُتْبَةَ يَعُوْدُهُ فَبَكٰى اَبُوْ هَاشِمٍ فَقَالَ مَا يُبْكِيْكَ يَا خَالُ اَوَجَعٌ يُشْئِزُكَ اَمْ حِرْصٌ عَلَى الدُّنْيَا قَالَ كَلَّا وَلٰكِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَهِدَ اِلَيْنَا عَهْدًا لَمْ اٰخُذْ بِهٖ قَالَ وَمَا ذٰلِكَ قَالَ سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ اِنَّمَا يَكْفِيْكَ مِنْ جَمْعِ الْمَالِ خَادِمٌ وَمَرْكَبٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاِنِّيْ اُرَانِيْ قَدْ جَمَعْتُ۔

(رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ)

"اور حضرت معاویہ ابن سفیان ؓ سے روایت ہے کہ وہ (ایک دن) اپنے ماموں حضرت ابوہاشم ابن عتبہ ؓ کے پاس ان کی عیادت کو گئے تو حضرت ابوہاشم ؓ (ان کو دیکھ کر) رونے لگے، حضرت معاویہ ؓ نے پوچھا کہ ماموں جان! آپ کیوں روتے ہیں؟ کیا بیماری (کی شدت) نے آپ کو قلق واضطراب میں مبتلا کر دیا ہے یا دنیا کی حرص وتمنا نے؟" انہوں نے فرمایا (عزیز من! تم نے جو کچھ کہا ہے) ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ (قلق و اضطراب کا باعث یہ ہے کہ (رسول کریم ﷺ نے ہم (صحابہ ؓ) کو ایک وصیت کی تھی اور میں اس پر عمل کرنے سے قاصر رہا ہوں! معاویہ ؓ نے پوچھا کہ وہ وصیت کیا تھی؟ انہوں نے کہا، میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تمہارے لئے دنیا کے مال میں سے بس اسقدر جمع کرنا کافی ہے کہ تمہارے پاس ایک خادم ہو اور خدا کی راہ میں لڑنے کے لئے ایک سواری ہو۔" اور میرا خیال ہے کہ میں نے (ان دونوں چیزوں سے کہیں زیادہ) مال واسباب اپنے پاس رکھا ہے۔" (احمد ؒ، ترمذی ؒ، نسائی ؒ، ابن ماجہ ؒ)

تشریح: لفظ "اُرانی" مفہوم کے اعتبار سے اظن کے معنی میں ہے یعنی میں گمان کرتا ہوں۔" اور بعض نسخوں میں یہ لفظ ہمزہ کے زبر کے ساتھ (اَرانی) ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ میں دیکھتا ہوں۔ یا میں جانتا ہوں۔

آخرت کی دشوار گذار راہ سے آسانی کے ساتھ گزرنا چاہتے ہو تو مال و دولت جمع نہ کرو

(۵۰) وَعَنْ اُمِّ الدَّرْدَاءِ قَالَتْ قُلْتُ لِاَبِی الدَّرْدَآءِ مَالَكَ لَا تَطْلُبُ كَمَا يَطْلُبُ فُلَانٌ فَقَالَ اِنِّی سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اَمَامَكُمْ عَقَبَةً كَئُوْدًا لَا يَجُوْزُهَا الْمُثْقِلُوْنَ فَاُحِبُّ اَنْ اَتَخَفَّفَ لِتِلْكَ الْعَقَبَةِ۔

"اور حضرت اُمّ درداءؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) میں نے (اپنے شوہر) حضرت ابودرداءؓ سے کہا) آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ (حضور ﷺ سے یا صحابہؓ سے) مال و اسباب اور منصب نہیں مانگتے جیسا کہ فلاں فلاں لوگ مانگتے ہیں؟ حضرت ابودرداءؓ نے (یہ سن کر) کہا کہ (میں کسی سے مال و دولت کی خواہش کرنے اور اس کو جمع کرنے سے اس لئے گریز کرتا ہوں کہ) میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے (یاد رکھو) تمہارے سامنے ایک دشوار گذار گھاٹی ہے، اس سے وہ لوگ (آسانی اور سہولت کے ساتھ) نہیں گزر سکتے جو گرانبار ہیں۔"
چنانچہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ (مال و دولت طلب کرنے سے گریز کر کے اور کم سے کم دنیاوی مال و اسباب پر صبر و قناعت کر کے) ہلکا رہوں تاکہ اس گھاٹی سے (آسانی و سہولت کے ساتھ) گزر سکوں۔"

تشریح: "دشوار گذار گھاٹی" سے مراد موت، قبر، حشر اور ان کے سلسلہ میں پیش آنے والی ہولناکیاں اور شدائد ہیں۔ اور "گرانبار" سے مراد وہ لوگ ہیں جو مال و دولت، منصب و جاہ اور دنیاوی ترفع و خوشحالی کا بوجھ اپنے کاندھوں پر رکھتے ہیں، حضور ﷺ کے ارشاد گرامی کا حاصل یہ ہے کہ مؤمن کی دنیاوی زندگی اور اس کی ابدی قرار گاہ (جنت) کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ ایک دشوار گذار گھاٹی سے گزرنے کے بعد ہی طے ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ جس شخص کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دشوار گزار گھاٹی سے گزرنا ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ کوئی بوجھ نہیں رکھتا اور زیادہ سے زیادہ ہلکا رہ کر ہی آسانی کے ساتھ اس گھاٹی سے گزر سکتا ہے۔ لہٰذا اگر تم اپنی آخری منزل یعنی جنّت تک آسانی کے ساتھ پہنچنا چاہتے ہو تو خود کو دنیا کے مال و اسباب اور جاہ و حشم کی گرانباری سے ہلکا رکھو تاکہ تمہارے اور جنت کے درمیان جو دشوار گزار گھاٹی ہے اس کو طے کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے، اور اسی لئے کہا گیا ہے فَازَ الْمُخِفُّوْنَ وَهَلَكَ الْمُثْقِلُوْنَ یعنی سبک سر لوگ کامیاب ہوئے اور گرانبار لوگ ہلاکت میں پڑ گئے۔

دنیاداری سے اجتناب کرو

(۵۱) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ مِنْ اَحَدٍ يَمْشِیْ عَلَی الْمَآءِ اِلَّا ابْتَلَّتْ قَدَمَاهُ قَالُوْا لَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ كَذٰلِكَ صَاحِبُ الدُّنْيَا لَا يَسْلَمُ مِنَ الذُّنُوْبِ۔ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن، مجلس نبوی ﷺ میں موجود صحابہؓ سے) رسول کریم ﷺ نے پوچھا، کیا کوئی شخص پانی پر اس طرح چل سکتا ہے کہ اس کے پاؤں تر نہ ہوں؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! ایسا تو ممکن نہیں! حضور ﷺ نے فرمایا۔ "یہی حال دنیادار کا ہے کہ وہ گناہوں سے محفوظ و سلامت نہیں رہتا۔" (ان دونوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: جس شخص پر دنیا کی محبت غالب ہو، وہ تو کسی حالت میں بھی دنیاداری کے ساتھ گناہوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور جس شخص پر گو دنیا کی محبت غالب نہ ہو لیکن اس کا بھی مال و دولت اور دنیاوی امور میں مبتلا ہونا اس کے دامن کو عام طور پر گناہوں سے آلودہ ہونے سے محفوظ نہیں رکھتا۔

اس ارشاد گرامی کا حاصل دولتمندوں اور مالداروں کو سخت خوف دلانا اور زہد دنیا کی طرف راغب کرنا ہے نیز اس امر کو بھی واضح کرنا مقصود ہے کہ ہر حالت میں آخرت کے نفع و نقصان کو دنیا کے نفع و نقصان پر ترجیح دینا چاہئے دنیاوی مال و دولت کے حامل و طلب گار کے لئے یہی احساس کافی ہونا چاہئے کہ آخرت کا نقصان و خسران فقر کی بہ نسبت مالداری میں زیادہ پوشیدہ ہے اور فقر کی یہی فضیلت کیا کم ہے

کہ فقراء (جنہوں نے اپنے فقر و افلاس پر صبر و قناعت اختیار کیا ہوگا) جنت میں مالداروں سے پانچ سو سال پہلے داخل ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کو دنیوی امور سے اجتناب اور اخروی امور میں انہماک کا حکم

(۵۲) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرٍ مُرْسَلاً قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا أُوْحِيَ إِلَيَّ أَنْ أَجْمَعَ الْمَالَ وَأَكُوْنَ مِنَ التَّاجِرِيْنَ وَلٰكِنْ أُوْحِيَ إِلَيَّ أَنْ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ۔ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَأَبُوْ نُعَيْمٍ فِي الْحِلْيَةِ عَنْ أَبِيْ مُسْلِمٍ۔

"اور حضرت جبیر ابن نفیر (تابعیؒ) بطریق ارسال روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "مجھ پر یہ وحی نازل نہیں ہوئی ہے کہ میں مال و دولت جمع کروں اور تاجر بنوں بلکہ مجھ پر یہ وحی نازل ہوئی ہے کہ۔ "آپ ﷺ اپنے پروردگار کی حمد و تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان کیجئے، اور سجدہ کرنے والوں (یعنی نمازیوں) میں سے بنیں۔ نیز اپنے رب کی عبادت میں مشغول رہیے یہاں تک کہ آپ ﷺ (کی دنیاوی زندگی) کا آخری وقت آجائے۔" اس حدیث کو بغویؒ نے شرح السنہ میں اور ابو نعیم نے کتاب حلیہ میں ابو مسلمؒ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: اس ارشاد کے ذریعہ حضور ﷺ نے گویا یہ واضح فرمایا کہ مجھے تو اپنے رب کی طرف سے یہ حکم ہے کہ میں اپنے تمام اوقات کو تسبیح و تحمید اور عبادت، خصوصاً نماز میں صرف کروں اور آخر عمر تک اسی طرح کے اخروی امور میں مشغول رہوں، بھلا مجھے اتنی فرصت کہاں کہ میں تجارتی معاملات اور خرید و فروخت نیز دیگر دنیاوی امور کی طرف توجہ دوں اور ان میں مشغولیت اختیار کروں۔

امور خیر کی نیت سے دنیا حاصل کرنے کی فضیلت

(۵۳) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ طَلَبَ الدُّنْيَا حَلَالًا اِسْتِعْفَافًا عَنِ الْمَسْئَلَةِ وَسَعْيًا عَلٰى أَهْلِهِ وَتَعَطُّفًا عَلٰى جَارِهِ لَقِيَ اللّٰهَ تَعَالٰى يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَوَجْهُهُ مِثْلُ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ وَمَنْ طَلَبَ الدُّنْيَا حَلَالًا مُكَاثِرًا مُفَاخِرًا مُرَائِيًا لَقِيَ اللّٰهَ تَعَالٰى وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْإِيْمَانِ وَأَبُوْ نُعَيْمٍ فِي الْحِلْيَةِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ذلت سے بچنے، اپنے اہل و عیال کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے اور اپنے ہمسایہ کے ساتھ احسان کرنے کی خاطر جائز وسائل و ذرائع سے دنیا (کے مال و اسباب) کو حاصل کرے، وہ قیامت کے دن اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کا چہرہ (کمال نور اور نہایت مسرت و سرور کی وجہ سے) چودھویں رات کے چاند کی مانند (روشن و منور ہوگا! اور جو شخص مال و دولت میں اضافہ کرنے (اپنی امارت و دولت مندی کے ذریعہ غرباء و فقراء پر) فخر کرنے، اور (محض اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کے لئے صدقہ و خیرات اور داد و دہش کی صورت میں) نام و نمود کے لئے (حرام وسائل و ذرائع تو الگ رہے) جائز وسائل و ذرائع سے (بھی) دنیا (کے مال و اسباب) کو حاصل کرے تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غضب ناک ہوگا۔" اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں ابو نعیمؒ نے کتاب حلیہ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: سوچنے اور عبرت حاصل کرنے کی بات ہے کہ جب زیادہ مال و دولت جمع کرنے کی حرص، ایک دوسرے پر اظہار فخر اور نام و نمود کے لئے دنیا کمانے اور سامان دنیا حاصل کرنے میں حلال ذرائع اختیار کرنے والے کا یہ حشر ہوگا تو ان لوگوں کا کتنا برا انجام ہوگا جو مذکورہ بالا غیر شرعی مقاصد کے لئے حرام وسائل و ذرائع سے مال و دولت حاصل کرتے ہیں؟ چنانچہ حضور ﷺ نے حدیث میں حرام مال کمانے والوں کا ذکر شاید اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے نہیں فرمایا کہ یہ کام کسی مسلمان کا تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اول تو وہ مذکورہ مفاسد کی خاطر دنیا کمائے اور پھر وسائل و ذرائع بھی حرام و ناجائز اختیار کرے، یا ایسے لوگوں کا ذکر اس لئے نہیں فرمایا کہ ان کا انجام بد حدیث کے انداز بیان اور طرز مضمون سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔

خیر وشر کے خزانے اور ان کی کنجی

(۵۴) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ هٰذَا الْخَيْرَ خَزَآئِنُ لِتِلْكَ الْخَزَآئِنِ مَفَاتِيْحَ فَطُوْبٰى لِعَبْدٍ جَعَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى مِفْتَاحًا لِلْخَيْرِ مِغْلَاقًا لِلشَّرِّ وَوَيْلٌ لِعَبْدٍ جَعَلَهُ اللّٰهُ مِفْتَاحًا لِلشَّرِّ مِغْلَاقًا لِلْخَيْرِ۔

(رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت سہل ابن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" یہ خیر (یعنی مال و دولت کے انبار) خزانے ہیں اور ان خزانوں کے لئے کنجیاں ہیں (یعنی خدا اپنے جن نیک اور مخیر بندوں کو مال و دولت سے نوازتا ہے وہ گویا ان خدائی خزانوں کی کنجیاں ہوتے ہیں کہ ان کے مالی عطیات اور صدقہ و خیرات کے ذریعہ فقیر و مفلس اور ضرور تمند بند گان خدا فائدہ اٹھاتے ہیں) پس (دینوی کامیابی اور ترقی اور اخروی فلاح و سعادت کی) بشارت ہو اس بندہ کو کہ جس کو خدا نے خیر (یعنی نیکیوں و بھلائیوں اور مالی بخشش وعطاء) کے دروازے کھلنے اور برائی (یعنی بخل و خست اور ضرور تمندوں سے بے پروائی کے دروازے بند ہونے کا سبب و ذریعہ بنایا ہے اور (دین و دنیا کی) ہلاکت و تباہی ہے اس بندہ کے لئے جس کو خدا نے برائی کے دروازے کھلنے اور خیر کے دروازے بند ہونے کا سبب و ذریعہ بنایا ہے (یعنی جو مالدار اپنی دولت کو بڑھانے کے چکر میں رہتا ہے اور ضرور تمند بند گان خدا کی خبر گیری اور امور خیر میں خرچ کرنے کی اہمیت سے بے پرواہ کر گویا بخل و خست میں مبتلا ہوتا ہے اس کے لئے تباہی ہی تباہی ہے۔" (ابن ماجہؒ)

تشریح: مذکورہ بالا ترجمہ حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلوی کی "اسعۃ اللمعات" سے ماخوذ ہے، جہاں تک ملا علی قاریؒ کا تعلق ہے تو انہوں نے حدیث کی وضاحت اس طور پر کی ہے کہ هٰذَا الْخَيْرُ میں "خیر" جنس خیر (یعنی ہر طرح کی بھلائی) مراد ہے، خزائن سے مراد "خیر" کی انواع کثیرہ ہیں یعنی وہ بھلائیاں مختلف انواع رکھتی ہیں اور ان کو خدا کے بندوں کے درمیان اس طرح مخزون و مرکوز کیا گیا ہے جیسے خزانوں کو پوشیدہ رکھا جاتا ہے، لتلک الخزائن مفاتیح (ان خزانوں کے لئے کنجیاں ہیں) میں "کنجیوں" سے مراد خدا کے ان نیک بندوں کے ہاتھ (قوائے عمل ہیں) جو اس روئے زمین پر امور کائنات میں تصرف و تسلط کے لئے) خدا کے وکیل و نائب کی حیثیت رکھتے ہیں! مفتاحا للخیر (خیر کی کنجی) سے مراد، ان بندوں کا ان بھلائیوں اور نیکیوں کو اختیار کرنا اور پھیلانا ہے، خواہ وہ علم و عمل کو اختیار کرنے اور اپنے اور دوسروں کے اخلاق و احوال کو صالح بنانے کی صورت میں ہو یا اپنے مال و زر اور روپیہ پیسہ کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی شکل میں ہو! اور مفتاحا للشر (شر کی کنجی) سے مراد خیر و بھلائی کے راستہ کو مسدود کرنا اور بدی و برائی کے راستہ کو کھولنا ہے اور اس برائی کے راستہ کا کھلنا خواہ کفر و شرک، و تکبر و سرکشی اور بد عملی و فتنہ انگیزی کو اختیار کرنے کے ذریعہ ہو یا بخل و خست اور اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ بد سلوکی اختیار کرنے کی صورت میں ہو۔

امام راغبؒ کہتے ہیں کہ "خیر" اس چیز کو کہتے ہیں جس کی طرف ہر انسان رغبت رکھتا ہے جیسے علم و عقل اور احسان و مہربانی وغیرہ اور اسی طرح ہر وہ چیز جو نفع پہنچاتی ہے! اور جو چیز "خیر" کی ضد اور اس کے برعکس ہوتی ہے اس کو "شر" کہتے ہیں۔ نیز خیر و شر اگرچہ ایک دوسرے کی ضد اور مخالف ہیں مگر کبھی کبھی ان دونوں میں اتحاد ذاتی اور فرق اعتباری بھی ہوتا ہے یعنی ایک ہی چیز دو اعتبار سے خیر اور شر دونوں کی حامل بن سکتی ہے کہ ایک شخص کے حق تو وہ خیر و بھلائی کا ذریعہ ہو اور دوسرے شخص کے حق میں وہی چیز شر اور برائی کا سبب بن جائے جیسے مال ہی کی مثال لے لیجئے، وہ ایک شخص مثلاً عمر کے حق میں تو خیر کا ذریعہ ہوتا ہے جب کہ عمر نے اس کو جائز طور پر حاصل کیا ہو اور جائز مصارف میں اس کو خرچ کرے اور وہی مال ایک دوسرے شخص مثلاً زید کے حق میں شر کا سبب بن سکتا ہے جب کہ زید اس مال پر ناجائز طور سے قبضہ و تصرف کرے۔

اسی طرح "علم" کی مثال بھی ہے کہ ایک ہی علم ایک ہی وقت میں بعض لوگوں کی نسبت سے خدا اور بندہ کے درمیان حجاب بن جاتا

ہے، اور ان لوگوں پر عذاب خداوندی کا سبب ہوتا ہے جب کہ وہ لوگ اس علم سے ہدایت وراستی حاصل کرنے کی بجائے ضلالت و گمراہی میں پھنس جائیں اور وہی علم دوسرے لوگوں کے حق میں خدا کی معرفت و قربت اور ایمان و یقین کا ذریعہ بنتا ہے جب کہ وہ لوگ اس علم سے ہدایت وراستی حاصل کریں اور اس کے صحیح تقاضوں پر عمل کریں! اسی پر اور عبادات کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان میں سے بعض عبادتیں، عجب و غرور کی باعث ہوتی ہیں جب کہ ان کو اختیار کرنے والا ریاء و نمائش اور نام و نمود کا راستہ اختیار کرے اور بعض عبادتیں، ایمانی وروحانی کیف و سرور اور نورانیت اور ذوق عبودیت کا باعث بنتی ہیں جب کہ ان کو اختیار کرنے والا اخلاص وللّٰہیت کے جذبہ سے سرشار ہو! دنیاوی چیزوں مثلاً گھوڑے آلات حرب اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کے بارے میں بھی یہی بات ہے کہ کبھی تو یہ چیزیں دشمنان خدا کے ساتھ جہاد کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں اور اس طرح سے بندہ کو جنت میں لے جانے کا وسیلہ ہوتی ہے اور کبھی یہی چیزیں فتنہ وفساد پھیلانے یہاں تک کہ خدا کے نہایت نیک و برگزیدہ بندوں (جیسے انبیاء و اولیاء) کے قتل و خونریزی کا ذریعہ بن جاتی ہے اور ان کی وجہ سے انسان دوزخ کے اسفل ترین درجہ میں پہنچ جاتا ہے۔

ضرورت سے زیادہ عمارت بنانے کے بارے میں وعید

۵۵ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا لَمْ يُبَارَكْ لِلْعَبْدِ فِيْ مَالِهٖ جَعَلَهٗ فِي الْمَاءِ وَالطِّيْنِ۔

"اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔"جب کسی بندہ کے مال و دولت میں برکت عطا نہیں ہوتی (یعنی اس کو اپنا مال اور روپیہ پیسہ بھلائی کے امور اور عقبیٰ کو سنوارنے والی چیزوں میں خرچ کرنے کی توفیق نصیب نہیں ہوتی) تو وہ اس مال کو پانی اور مٹی میں ملا دیتا ہے یعنی اپنی دولت ضرورت سے زائد عمارتیں بنانے اور ان کی زینت و آرائش میں خرچ کرتا ہے۔"

۵۶ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اتَّقُوا الْحَرَامَ فِي الْبُنْيَانِ فَاِنَّهٗ اَسَاسُ الْخَرَابِ۔ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔"(لوگو!) تم عمارتوں میں حرام مال لگانے سے پرہیز کرو، کیونکہ عمارتوں میں حرام مال لگانا (دین یا اس عمارت کی خرابی کی بنیاد اور جڑ ہے۔"ان دونوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا۔"

تشریح: مذکورہ ارشاد گرامی سے یہ مفہوم اخذ کیا جاتا ہے کہ اگر عمارتوں میں حلال مال لگایا جائے تو اس سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی اور بعض حضرات نے "عمارتوں میں حرام مال لگانے سے پرہیز کرو" کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ ان حرام چیزوں کو اختیار کرنے سے اجتناب کرو جو عمارتیں بنانے کے سلسلہ میں پیش آتی ہیں! گویا اس اعتبار سے "چیز" وہی ضرورت سے زائد عمارت کا بنانا ہے۔

"فی البنیان" میں لفظ فی کے وہی معنی ہیں جو مثلاً اس جملہ کے ہیں کہ، اس زنجیر میں دو سیر لوہا ہے، ظاہر ہے کہ اس جملہ سے یہ مراد نہیں لیا جاتا کہ وہ زنجیر خالص دو سیر لوہا ہے۔

"خرابی" سے مراد دین کی خرابی اور آخرت کا نقصان ہے تاہم یہ احتمال بھی ہے کہ خود عمارت کی خرابی مراد ہو یعنی عمارت کا بنانا، گویا اس کی خرابی و تباہی کی بنیاد رکھنا ہے کہ بہرصورت جو عمارت بنے گی وہ انجام کار تباہ و برباد ہوگی جیسا کہ کہا جاتا ہے لدو للموت وابنوا للخراب یعنی پیدا کرو مرنے کے لئے اور عمارت بناؤ خراب ہونے کے لئے۔

بعض شارحین نے یہ کہا ہے کہ اس حدیث کا یہ مطلب بھی مراد لیا جاسکتا ہے کہ عمارتوں میں حرام امور اور گناہوں کے ارتکاب سے اجتناب کرو، یعنی عمارتیں اس لئے نہ بناؤ کہ ان میں فسق و فجور کے لئے اٹھنا بیٹھنا رکھو۔ اوباش لوگوں کے ساتھ مجلس بازی کرو اور ان کو ناجائز کاموں کا اڈہ بناؤ کیونکہ جس عمارت میں فسق و فجور کی گرم بازاری رہتی ہے اور اوباش لوگوں کی مجلسیں جمتی ہیں وہ آخر کار تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

ملا علی قاریؒ نے اس جملہ "کیونکہ عمارتوں میں حرام مال لگانا.... الخ" کے دونوں احتمال بیان کیے ہیں ایک تو یہ کہ یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ (ضرورت سے زائد) تعمیر میں حلال مال لگانا جائز ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ حدیث مذکور جواز پر دلالت نہیں کرتی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ دوسرا احتمال باب کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

مال و دولت جمع کرنا بے عقلی ہے

(۵۷) وَعَنْ عَائِشَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الدُّنْيَا دَارُ مَنْ لَا دَارَ لَهُ وَمَالُ مَنْ لَا مَالَ لَهُ وَلَهَا يَجْمَعُ مَنْ لَا عَقْلَ لَهُ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت عائشہؓ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "دنیا اس شخص کا گھر ہے جس کے لئے (آخرت میں) مال نہیں ہے، نیز مال و دولت وہی جمع کرتا ہے جس کو عقل نہیں ہوتی۔" (احمدؒ، بیہقیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا چونکہ فانی ہے اس لئے اس میں ٹھہرنا اور شادمانی کی زندگی اختیار کرنا ممکن نہیں ہے، لہٰذا جس شخص نے دنیا کو اپنا گھر سمجھا اور اس کے آرام و آسائش کو اصل شادمانی حیات جانا، وہ ایسا شخص ہے کہ گویا اس کے لئے کوئی اور گھر نہیں ہے! اسی طرح "اور مال اس شخص کا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو دنیا کا مال و اسباب حاصل ہو اور وہ اس کے مقصود اصلی یعنی بھلائیوں کے کام اور خدا کی رضا و خوشنودی کے امور میں خرچ نہ کرے، بلکہ دنیاوی لذات کے حصول اور نفسانی خواہشات کی تکمیل میں خرچ کرے۔ اس کا وہ مال گویا مالیت کے حکم سے خارج ہے کیونکہ اس نے اپنے مال کے اصلی مقصد سے انحراف کر کے اور اس کو غیر مقصود مصارف میں خرچ کر کے ضائع کر دیا۔ لہٰذا وہ اس شخص کی طرح ہوا جس کے پاس مال نہ ہو۔

مشکوٰۃ کے بعض حواشی میں یہ لکھا ہے کہ اس ارشاد گرامی کی مراد یہ ہے کہ دنیا کے گھر اور دنیا کے مال چونکہ بہت جلد فنا کے گھاٹ اتر جانے والی چیز ہے اور ان کی کوئی حیثیت و وقعت نہیں ہے اس لئے ان کو "گھر" اور "مال" کہنا ہی نہیں چاہئے! یہ مراد بھی حقیقت کے اعتبار سے پہلی وضاحت ہی سے ماخوذ ہے۔

حدیث کی ایک مراد یہ بھی بیان کی جا سکتی ہے کہ جس شخص نے دنیا کے گھر کو اپنا اصلی گھر قرار دیا اور اس پر مطمئن ہو گیا، یا جس نے اس گمان کے ساتھ دنیوی مال و دولت کو جمع کیا کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب باقی رہنے والا اور ہمیشہ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآئَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا اور ایک جگہ یوں فرمایا ہے، يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهُ اَخْلَدَهُ تو وہ شخص آخرت میں گھر پانے اور وہاں کے غنا (یعنی نعمتوں) سے نوازے جانے کا مستحق نہیں ہوگا۔

"مال و دولت وہی شخص جمع کرتا ہے..... الخ" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص محض اس لئے مال و دولت جمع کرتا ہے کہ اس کو دنیا عزیز ہوتی ہے یا وہ اس مال و دولت کو ہمیشہ باقی رکھنے کی نیت رکھتا ہے اور یا محض دنیاوی لذات اور دنیاوی فائدوں کا حصول اس کے پیش نظر ہوتا ہے تو اس شخص کو عقل و دانش کا حامل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ حدیث کا اجمالی مفہوم یہ ہے کہ "یہ دنیا اس قابل نہیں ہے کہ اس کو "گھر" سمجھا جائے، ہاں جو شخص آخرت میں ملنے والے اپنے گھر سے محروم رہنا چاہتا ہے وہی اس دنیا کو اس قابل سمجھ سکتا ہے اسی طرح اس دنیا کی دولت کو وہی شخص "دولت" سمجھ سکتا ہے جو آخرت کی دولت سے محروم رہنا چاہتا ہے، اور حاصل یہ کہ اس ارشاد گرامی کا مقصد گویا یہ احساس دلانا ہے کہ جن لوگوں کے لئے آخرت میں دار القرار (قرار گاہ) اور وہاں کی بے بہا دولت مقدر ہے ان کی نظر میں یہ دنیا اتنی حقیر اور اسقدر بے وقعت ہے کہ اس کے "گھر" اور اس کے "مال و دولت" کو "گھر" اور "دولت" کہا ہی نہیں جا سکتا۔

شراب تمام برائیوں کی جڑ ہے

(۵۸) وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِيْ خُطْبَتِهِ الْخَمْرُ جِمَاعُ الْاِثْمِ وَالنِّسَآءُ حَبَائِلُ الشَّيْطَانِ وَحُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ قَالَ وَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ اَخِّرُوا النِّسَآءَ حَيْثُ اَخَّرَهُنَّ اللّٰهُ۔ رَوَاهُ رَزِيْنٌ وروى الْبَيْهَقِيُّ مِنْهُ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلاً حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ۔

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو ایک خطبہ کے دوران یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "یاد رکھو! شراب پینا، گناہوں کو جمع کرنا ہے یعنی شراب چونکہ تمام برائیوں کی جڑ ہے اس لئے شراب پینے سے طرح طرح کے گناہ سرزد ہوتے ہیں) اور عورتیں شیطان کے جال ہیں اور دنیا کی محبت ہر گناہ کا سر ہے۔" حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "عورتوں کو موخر کرو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو موخر کیا ہے، یعنی قرآن مجید میں جہاں بھی عورتوں کا ذکر آیا ہے مردوں کے بعد آیا ہے، اسی طرح گواہی، جماعت اور فضیلت مرتبہ میں ان کو مردوں کے بعد رکھا گیا ہے، لہٰذا تم بھی ان چیزوں میں ان کو مقدم نہ کرو اور مردوں پر فضیلت نہ دو۔" رزین نے یہ پوری روایت نقل کی ہے اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں حضرت حسن بصریؒ سے بطریق ارسال روایت کا صرف یہ حصہ نقل کیا ہے کہ حب الدنیا رأس کل خطیئة۔"

تشریح: طبرانیؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے کہ الخمر الفواحش واکبر الکبائر من شربها وقع علی امه وخالته وعمته۔ "(حضور ﷺ نے فرمایا) شراب بیحیائیوں کی جڑ ہے اور بڑے گناہوں میں سے ایک بہت بڑا گناہ ہے، جس شخص نے شراب نوشی کی اس نے (گویا) اپنی ماں، اپنی خالہ اور اپنی پھوپھی کے ساتھ ہم بستری کی۔" کہتے ہیں کہ ایک شخص کو بت کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لئے کہا گیا تو اس نے انکار کر دیا، پھر اس سے ایک آدمی کو قتل کرنے کے لئے کہا گیا، تو اس نے اس کام سے بھی انکار کر دیا، پھر اس کو ایک عورت کے ساتھ زنا کرنے کے لئے کہا گیا تو اس نے اس سے بھی انکار کر دیا اور پھر جب اس سے شراب پینے کے لئے کہا گیا تو اس نے شراب پی لی پس اس شخص نے گویا شراب ہی نہیں پی، بلکہ اس نے ساری برائیوں کا ارتکاب کیا جن کی طرف اس کو بلایا گیا تھا، اور اس نے انکار کر دیا تھا۔

"دنیا کی محبت ہر گناہ کا سر ہے" کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا کی محبت ہی ہے جو انسان کو طرح طرح کی برائیوں میں مبتلا کرتی ہے اور وہ اس محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ممنوعات اور گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے! اس جملہ کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ ترک دنیا، ہر عبادت کا سر ہے، یعنی جو شخص دنیاوی لذات اور نفسانی خواہشات سے بے تعلق ہو جاتا ہے، وہ بس عبادت و اطاعت میں مشغول رہتا ہے اور ہر وقت خدا کی رضا و خوشنودی کو سامنے رکھتا ہے، چنانچہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ جس شخص نے دنیا کی محبت کو اختیار کر لیا اس کو تمام مرشدین و مصلحین بھی راہ راست پر نہیں لا سکتے اور جس شخص نے ترک دنیا کو پسند کر لیا اس کو تمام دنیا کے مفسد و گمراہ لوگ بھی راہ راست سے بھٹکا نہیں سکتے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ حدیث کے تینوں جملے نہایت جامع ہیں، یعنی ان کے دائرے میں اکثر گناہ آجاتے ہیں کیونکہ ان تینوں چیزوں (یعنی شراب، عورت اور دنیا کی محبت) میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ بہت سارے گناہوں کی جڑ ہے۔

دو خوفناک چیزوں کا ذکر

(۵۹) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَتَخَوَّفُ عَلٰى اُمَّتِيْ الْهَوٰى وَطُوْلُ الْاَمَلِ فَاَمَّا الْهَوٰى فَيَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ وَاَمَّا طُوْلُ الْاَمَلِ فَيُنْسِي الْاٰخِرَةَ وَهٰذِهِ الدُّنْيَا مُرْتَحِلَةٌ ذَاهِبَةٌ وَهٰذِهِ الْاٰخِرَةُ مُرْتَحِلَةٌ قَادِمَةٌ وَلِكُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا بَنُوْنَ فَاِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَّا تَكُوْنُوْا مِنْ بَنِي الدُّنْيَا فَافْعَلُوْا فَاِنَّكُمُ الْيَوْمَ فِيْ دَارِ الْعَمَلِ وَلَا حِسَابَ

وَاَنْتُمْ غَدًا فِیْ دَارِ الْاٰخِرَۃِ وَلَا عَمَلَ۔ رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اپنی اُمت کے بارے میں جن دو چیزوں سے بہت زیادہ ڈرتا ہوں، ان میں سے ایک تو خواہش نفس ہے، دوسرے (تاخیر عمل اور نیکیوں سے غفلت کے ذریعہ) درازی عمر کی آرزو ہے، پس نفس کی خواہش (جو حق کے مخالف اور باطل کے موافق ہوتی ہے) حق کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے سے روکتی ہے اور جہاں تک درازئ عمر کی آرزو کا تعلق ہے تو وہ آخرت کو بھلا دیتی ہے اور (یاد رکھو) یہ دنیا کوچ کر کے چلی جانے والی ہے اور آخرت کوچ کر کے آنے والی ہے (یعنی یہ دنیا لحہ بہ لحہ گزرتی چلی جارہی ہے اور آخرت لحہ بہ لحہ تمہاری طرف چلی آرہی ہے) نیز ان دونوں (یعنی دنیا اور آخرت) میں سے ہر ایک کے بیٹے ہیں (یعنی کچھ لوگ تو وہ ہیں جو دنیا کے تابع و محکوم اور اس کی دوستی و چاہت رکھنے والے ہیں گویا وہ دنیا کے بیٹے ہیں اور کچھ لوگ وہ ہیں جو آخرت کے تابع و محکوم اور اس کے دوست و طلب گار ہیں گویا وہ آخرت کے بیٹے ہیں) لہٰذا اگر تم سے یہ ہو سکے کہ تم دنیا کے بیٹے نہ بنو تو ایسا ضرور کرو کہ (یعنی ایسے کام کرو اور ایسے راستے پر چلو کہ دنیا کا داؤ تم پر نہ چل سکے اور تم اس کی اتباع و فرمانبرداری اور اس کی محبت و چاہت کے دائرے سے نکل کی آخرت کے تابع و محکوم اور اس کے طلبگار بن جاؤ) کیونکہ تم آج دنیا میں ہو جو دار العمل (کام کرنے کی جگہ ہے) جہاں عمل کا حساب نہیں لیا جاتا (پس اس موقع کو غنیمت جانو اور اجل آنے سے پہلے عمل کرلو) جب کہ تم کل آخرت کے گھر میں جاؤ گے تو وہاں عمل کرنے کا کوئی موقع نہیں ملے گا (بلکہ وہاں صرف محاسبہ ہوگا۔" (بیہقیؒ)

تشریح: "دنیا کوچ کر کے چلی جانے والی ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا اپنے تمام سرو سامان کے ساتھ اس طرح فنا کی طرف جارہی ہے کہ اس میں رہنے والوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا جس طرح کشتی کے اندر بیٹھا ہوا شخص کشتی کو چلتے ہوئے محسوس نہیں کرتا! حدیث کا یہ جملہ اور مابعد کا جملہ دراصل دنیا کے نہایت جلد گزرنے اور فناء ہو جانے کے مفہوم کو واضح کرتا ہے کیونکہ اگر آخرت اپنی جگہ قائم ہوتی اور صرف دنیا اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے اس کی طرف چلتی تو بھی یہ پوری گزر ہی جاتی اور اپنی عمر تمام کرلیتی اگرچہ اس کے سفر کو کچھ وقفہ اور مل جاتا مگر جب صورت حال یہ ہے کہ ادھر سے تو آخرت چلی آرہی ہے اور ادھر سے دنیا اس کی طرف کو چلی جارہی ہے تو گویا وہ نقطہ کہ جہاں دنیا کا اختتام اور آخرت کی ابتداء ہونے والی ہے درمیان راہ ہی واقع ہو جائے گا اور مسافت بہت جلد ختم ہو جائے گی۔

"جہاں عمل کا حساب نہیں لیا جاتا۔" یہ بات ظاہر کے اعتبار سے اور فاسق و فاجر کی نسبت سے فرمائی گئی ہے ورنہ تو ایک روایت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا۔ "اپنے نفسوں کا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تم سے حساب لیا جائے۔"

دنیا عمل کی جگہ ہے

(۶۰) وَعَنْ عَلِیٍّ قَالَ ارْتَحَلَتِ الدُّنْیَا مُدْبِرَۃً وَارْتَحَلَتِ الْاٰخِرَۃُ مُقْبِلَۃً وَلِکُلٍّ وَاحِدَۃٍ مِّنْھُمَا بَنُوْنَ فَکُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الْاٰخِرَۃِ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الدُّنْیَا فَاِنَّ الْیَوْمَ عَمَلٌ وَلَا حِسَابَ وَغَدًا حِسَابٌ وَلَا عَمَلَ۔ رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ فِیْ تَرْجَمَۃِ بَابٍ۔

"اور حضرت علیؓ سے (بطریق موقوف) روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ "یہ دنیا ادھر سے کوچ کر کے منہ پھیرے ہوئے چلی جارہی ہے، اور آخرت ادھر سے کوچ کر کے ہماری طرف منہ کیے آرہی ہے (یعنی دنیا کا ہماری طرف سے منہ پھیر کر اپنی فنا کی طرف بڑھنا اور آخرت کا اپنی بقا کے ساتھ ہماری طرف متوجہ ہونا ظاہر ہو رہا ہے) اور ان دونوں (دنیا و آخرت) میں سے ہر ایک کے بیٹے ہیں، پس تم (نیک عمل اختیار کر کے اور آخرت کی طرف متوجہ ہو کر) آخرت کے بیٹے بنو اور (آخرت سے بے پروا اور دنیا کی طرف راغب و متوجہ ہو کر) دنیا کے بیٹوں میں سے نہ ہو، یاد رکھو! آج کا دن عمل کرنے کا ہے، حساب کا دن نہیں ہے (یعنی یہ دنیا دار العمل ہے دار الحساب نہیں، یہاں بس زیادہ سے زیادہ نیک عمل کیے جاؤ) اور کل (قیامت) کا دن، حساب کا دن ہوگا، عمل کرنے کا نہیں" اس روایت کو امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں نقل

کیا ہے۔

تشریح: "ترجمۃ الباب" سے مراد جامع بخاری کے ایک باب کا عنوان ہے، یعنی امام بخاریؒ نے اس روایت کو اپنی کتاب کے ایک باب کے عنوان میں بغیر اسناد کے حضرت علیؓ سے بطریق موقوف نقل کیا ہے، لیکن اس سے پہلے حضرت جابرؓ کی جو روایت نقل کی گئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی اس روایت کی اصل مرفوع ہے، یعنی یہ حضور ﷺ ہی کا ارشاد ہے کیونکہ حضرت علیؓ نے جو مضمون نقل کیا ہے وہ وہی ہے جو حضرت جابرؓ کی روایت میں منقول ہے۔

دنیا غیر پائیدار متاع ہے

(۶۱) وَعَنْ عَمْرٍو اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَطَبَ یَوْمًا فَقَالَ فِیْ خُطْبَتِہٖ اَلَا اِنَّ الدُّنْیَا عَرَضٌ حَاضِرٌ یَاکُلُ مِنْہُ الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ اَلَا وَاِنَّ الْاٰخِرَۃَ اَجَلٌ صَادِقٌ وَیَقْضِیْ فِیْھَا مَلِکٌ قَادِرٌ اَلَا وَاِنَّ الْخَیْرَ کُلَّہٗ بِحَذَافِیْرِہٖ فِی الْجَنَّۃِ اَلَا وَاِنَّ الشَّرَّ کُلَّہٗ بِحَذَافِیْرِہٖ فِی النَّارِ اَلَا فَاعْمَلُوْا وَاَنْتُمْ مِنَ اللّٰہِ عَلٰی حَذَرٍ وَاعْلَمُوْا اَنَّکُمْ مَعْرُوْضُوْنَ عَلٰی اَعْمَالِکُمْ مَنْ یَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَرَہٗ وَمَنْ یَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَرَہٗ۔ (رواہ الشافعی)

"اور حضرت عمروؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور اس خطبہ میں فرمایا۔ "لوگو!" خبردار ہو! دنیا ایک ناپائدار متاع ہے، اس میں سے نیک بھی کھاتا ہے اور بد بھی (یعنی اللہ تعالیٰ اس دنیا میں ہر شخص کو رزق دیتا ہے خواہ وہ مؤمن ہو یا کافر اور خواہ مطیع ہو یا فاسق جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا خبردار ہو! آخرت واقعی مدت ہے جو سچی یعنی متحقق و ثابت ہے اور اس (آخرت) میں، ہر قسم کی قدرت رکھنے والا بادشاہ (یعنی اللہ تعالیٰ) فیصلہ صادر فرمائے گا یعنی وہ ثواب و عذاب کے ذریعہ نیک و بد اور مؤمن و کفر کے درمیان فرق ظاہر کر دے گا) خبردار ہو! تمام بھلائیاں اور خوبیاں اپنے انواع و اقسام کے ساتھ جنت میں ہیں، خبردار ہو! تمام برائیاں اور خرابیاں اپنے انواع و اقسام کے ساتھ دوزخ میں ہیں، خبردار ہو! پس تم (نیک) عمل کرو درآنحالیکہ تم پر خدا کے حساب و عذاب کا خوف طاری ہو (یا یہ یعنی کہ نیک عمل کرو اور سارے میں خدا سے ڈرتے رہو، کہ تمہارے وہ نیک عمل قبول ہوتے ہیں یا نہیں) اور اس بات کو یاد رکھو کہ اپنے اعمال کے ساتھ (خدا کے سامنے) پیش ہونا ہے، پاس جو شخص ذرہ برابر بھی نیک کام کرتا ہے وہ (آخرت میں یا دنیا میں) اس کی جزاء پائے گا اور جو شخص ذرہ برابر بھی برا کام کرتا ہے وہ اس کی سزا پائے گا۔" (شافعیؒ)

تشریح: اِنَّکُمْ مَعْرُوْضُوْنَ عَلٰی اَعْمَالِکُمْ کا ترجمہ اگر یہ کیا جائے کہ تم اپنے اعمال کے سامنے کیے جاؤ گے۔ تو اس عبارت کے الٹے معنی مراد ہوں گے کہ (قیامت کے دن) تمہارے اعمال تمہارے سامنے حاضر کئے جائیں گے۔ ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم بارگاہ رب العزت میں اپنے اعمال کے مطابق پیش کیے جاؤ گے۔ لیکن زیادہ صحیح اور زیادہ واضح معنی کہ جو اوپر ترجمہ میں نقل کے گئے ہیں، یہی ہیں کہ تم اپنے اعمال کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کئے جاؤ گے اور اپنے ان اعمال کے مطابق جزاء یا سزا پاؤ گے، جیسا کہ جب کوئی لشکر میدان جنگ سے واپس آتا ہے تو وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کی کاروائی کے ساتھ اپنے امیر کے سامنے پیش ہوتا ہے اور وہ امیر اس لشکر کے ہر فرد کے امور مفوضہ کی انجام دہی کو دیکھتا ہے اور اس کے مطابق ہر سپاہی کو انعام و سزا دیتا ہے۔

(۶۲) وَعَنْ شَدَّادٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ الدُّنْیَا عَرَضٌ حَاضِرٌ یَاکُلُ مِنْھَا الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ وَاِنَّ الْاٰخِرَۃَ وَعْدٌ صَادِقٌ یَحْکُمُ فِیْھَا مَلِکٌ عَادِلٌ قَادِرٌ یُحِقُّ فِیْھَا الْحَقَّ وَیُبْطِلُ الْبَاطِلَ کُوْنُوْا مِنْ اَبْنَآءِ الْاٰخِرَۃِ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الدُّنْیَا فَاِنَّ کُلَّ اُمٍّ یَتْبَعُھَا وَلَدُھَا۔

"اور حضرت شدادؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "لوگو! بلاشبہ یہ دنیا ایک ناپائدار متاع ہے جس میں نیک و بد (یعنی مؤمن و کافر) دونوں کھاتے ہیں اور بلاشبہ آخرت ایک سچا اور یقینی طور پر پورا ہونے والا وعدہ ہے اس (آخرت) میں ہر طرح کی

قدرت رکھنے والا اور عدل وانصاف کرنے والا بادشاہ (اپنے حکم وفیصلہ کے ذریعہ) حق کو ثابت رکھے گا اور باطل کو مٹا دے گا (یعنی ثواب و عذاب کے ذریعہ اہل حق اور اہل باطل کو ایک دوسرے سے متمیز اور جدا کردے گا) تم آخرت کے بیٹے بنو اور دنیا کے بیٹوں میں اپنا شمار نہ کراؤ، کیونکہ ہر ماں کا بیٹا اسی (ماں) کے تابع ہوتا ہے۔"

تشریح: حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم دنیا کے بیٹے بنو گے یعنی دنیا کی طلب گاری ومحبت میں منہمک ومستغرق رہو گے تو دوزخ میں جاؤ گے کیونکہ باطل دنیا کا ٹھکانا دوزخ ہے اور اگر تم آخرت کے بیٹے بنو گے یعنی طلب آخرت اور اخری امور کی انجام دہی میں منہمک ومستغرق رہو گے تو جنت میں جاؤ گے کیونکہ آخرت حقہ کی جگہ جنت ہے۔ یہ ملا علی قاریؒ کے منقولات کا مفہوم ہے، اور حضرت شیخ عبدالحقؒ نے حدیث کے اختتام پر یہ لکھا ہے کہ پس جو شخص آخرت کا بیٹا ہوگا وہ آخرت کی اتباع کرے گا اور اس کے مطابق عمل کرے گا اور جو شخص دنیا کا بیٹا ہوگا وہ دنیا کی پیروی کرے گا اور اسی کے لئے کام کرے گا۔

تھوڑا مال بہتر ہوتا ہے

(۶۳) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ اِلَّا وَبِجَنْبَتَیْهَا مَلَکَانِ یُنَادِیَانِ یُسْمِعَانِ الْخَلَائِقَ غَیْرَ الثَّقَلَیْنِ یٰاَیُّهَا النَّاسُ هَلُمُّوْا اِلٰی رَبِّکُمْ مَا قَلَّ وَکَفٰی خَیْرٌ مِمَّا کَثُرَ وَاَلْهٰی۔ رَوَاهُمَا اَبُوْنُعَیْمٍ فِی الْحِلْیَةِ۔

"اور حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب بھی آفتاب طلوع ہوتا ہے اس کے دونوں طرف دو فرشتے ہوتے ہیں جو منادی کرتے ہیں اور جن وانس کے علاوہ اور ساری مخلوق کو سناتے ہیں (یعنی ان کی منادی کو جنات اور انس نہیں سنتے، باقی ساری مخلوق سنتی ہے اور وہ منادی یہ ہوتی ہے) کہ لوگو! اپنے پروردگار کی طرف آؤ (یعنی اپنے پروردگار کے احکام کی اتباع کرو یا یہ معنی ہیں کہ ہر طرف سے بے تعلقی اختیار کرکے اپنے رب کی طرف رجوع کرو، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا اور اس بات کو جان لو کہ جو مال قلیل ہو اور (دینی معاملات کی تکمیل یا زاد عقبی کے طور پر) کفایت کرے وہ اس مال سے کہیں زیادہ بہتر ہے جو زیادہ ہو اور عبادت خداوندی سے باز اور اطمینان وسکون کی زندگی سے محروم رکھے۔" ان دونوں روایتوں کو ابونعیمؒ نے کتاب حلیہ میں نقل کیا ہے۔

تشریح: فرشتوں کی مذکورہ بالا منادی کا جنات وانسان کو نہ سنایا جانا شاید اس امر کی بناء پر ہے کہ وہ فریضہ کو غیب کی باتوں پر ایمان لانے اور عمل کرنے کے لئے جن وانس پر عائد کیا گیا ہے اس طرح سے بے اثر نہ ہو جائے، ہاں اس موقع پر یہ اشکال ضرور پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ منادی اور اس کا مضمون اصل میں تو انسان ہی کو متنبہ کرنے کے لئے ہے اور جب انسان اس کو سن ہی نہیں سکتا تو وہ متنبہ کیسے ہوگا؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اس آگاہی کا انحصار محض اپنے کان سے سننے ہی پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ وہ آگاہی سے باخبر اور مطلع ہو جائے، سو یہ بات مخبر صادق رسول کریم ﷺ کے خبر دے دینے اور اس آگاہی کے مضمون کو بیان کر دینے سے حاصل ہو جاتی ہے، لہٰذا مذکورہ بالا مضمون جب اس حدیث کے ذریعہ انسان تک پہنچ گیا تو وہ اس سے حقیقتاً باخبر اور مطلع ہو گیا! رہی یہ بات کہ اس تنبیہ میں صرف انسان ہی کو مخاطب کیوں بنایا گیا، جنات کو بھی خطاب کیوں نہیں کیا گیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں میں جو نوع، زیادہ مال ودولت کی نہایت حریص اور عقبی سے نہایت غافل ہے وہ نوع انسان ہی ہے، یہ صرف انسان ہے جو دنیا کے پیچھے اپنے خالق تک کو بھول جاتا ہے اور دنیا کا مال ومتاع اس کو ذکر رب اور عبادت الٰہی کی طرف متوجہ ہونے سے باز رکھتا ہے لہٰذا انسان کو خاص طور پر مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ عقبہ کے انجام کی طرف سے تمہاری یہ غفلت ولاپرواہی اور ذکر اللہ سے تمہارے اس اعراض کا سلسلہ کہاں تک جاری رہے گا؟ اپنی اخروی تباہی کے اس راستہ کو چھوڑ دو، اور آؤ، عبادت رب اور ذکر الٰہی کے ذریعہ اس راہ راست کو اپنا لو جو تمہیں آخرت کے حسن انجام تک لے جائے گی۔"

دنیاوی مال ومتاع کے تئیں انسان کی حرص

۶۴ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ یَبْلُغُ بِهٖ قَالَ اِذَا مَاتَ الْمَیِّتُ قَالَتِ الْمَلٰئِكَةُ مَا قَدَّمَ وَقَالُوْا بَنُوْا آدَمَ مَاخَلَّفَ۔ رَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت منقول ہے جس کو وہ رسول کریم ﷺ تک پہنچاتے (یعنی آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی نقل کرتے ہیں جس کو حدیث مرفوع کہتے ہیں) کہ انہوں نے کہا (حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ) "جب کوئی شخص مرتا ہے تو فرشتے تو یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے آخرت کے لئے (اعمال خیر کی صورت میں) کیا بھیجا ہے اور لوگ یعنی مرنے والے کے ورثاء اور دیگر متعلقین وغیرہ) یہ پوچھتے ہیں کہ اس نے (اپنے ترکہ میں) کیا چھوڑا ہے؟ (گویا فرشتوں کی نظر تو اعمال پر ہوتی ہے اور لوگوں کی نظر دنیاوی مال ومتاع پر لگی رہتی ہے)" اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

آخرت قریب ہے

۶۵ وَعَنْ مَالِكٍ اَنَّ لُقْمَانَ قَالَ لِابْنِهٖ یَا بُنَیَّ اِنَّ النَّاسَ قَدْ تَطَاوَلَ عَلَیْهِمْ مَا یُوْعَدُوْنَ وَهُمْ اِلَی الْاٰخِرَةِ سِرَاعًا یَذْهَبُوْنَ وَاِنَّكَ قَدِ اسْتَدْبَرْتَ الدُّنْیَا مُنْذُ كُنْتَ وَاسْتَقْبَلْتَ الْاٰخِرَةَ وَاِنَّ دَارًا تَسِیْرُ اِلَیْهَا اَقْرَبُ اِلَیْكَ مِنْ دَارٍ تَخْرُجُ مِنْهَا۔

"اور حضرت امام مالکؒ سے روایت ہے کہ (مشہور حکیم) لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا، میرے بیٹے! جس بات (یعنی مردوں کا دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جانا، حساب اور ثواب وعذاب وغیرہ) کا لوگوں سے وعدہ کیا گیا تھا، اس کی مدت (از آدم تا ایں دم) ان پر دراز ہوگئی حالانکہ لوگ آخرت کی طرف تیزی سے چلے جارہے ہیں۔ اور میرے بیٹے! جس وقت تم پیدا ہوئے تھے اسی وقت سے تمہاری پیٹھ دنیا کی طرف اور تمہارا رخ آخرت کی طرف ہے (یعنی تم اپنی پیدائش کے دن سے گویا دنیا کو پیچھے چھوڑتے چلے آرہے ہو اور آخرت کی طرف بڑھتے جارہے ہو) اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جس گھر اور مقام کی طرف تم جارہے ہو وہ تم سے اس گھر اور مقام کی بہ نسبت زیادہ قریب ہے جس کو تم چھوڑ کر جارہے ہو۔" (رزینؒ)

تشریح: "اس کی مدت ان پر دراز ہوگئی" کا مطلب یہ ہے کہ قیامت آنے، امور آخرت اور اس جہان کی زندگی کے بارے میں جو خبر دی گئی ہے اور اس کا جو وعدہ کیا گیا ہے اس پر چونکہ ایک طویل مدت گزر گئی ہے اس لئے لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وعدے کے پورے ہونے میں دیر ہوگئی ہے حالانکہ دیر کچھ نہیں ہوئی ہے بلکہ دنیا کا سفر جاری ہے اور لوگ ہر ساعت بلکہ ہر لحہ اس یوم موعود اور آخرت کی طرف بڑھ رہے ہیں جس کی خبر ان کو دی گئی ہے جیسا کہ کشتیوں کا کارواں اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور بھری ہوئی کشتیوں میں بیٹھے ہوئے اہل کارواں راستہ گزرنے کا احساس نہیں کرتے! اسی بات کو اس جملہ، "اور جس وقت تم پیدا ہوئے تھے.....الخ" کے ذریعہ بیان کیا گیا۔ اس جملہ میں اگرچہ خاص طور پر بیٹے سے خطاب کیا گیا ہے لیکن حقیقت میں اس سے مراد عام خطاب ہے کہ اس بات کا روئے سخن ہر انسان کی طرف ہے۔

روایت کے آخری جملہ سے اس بات کو ثابت کیا گیا ہے کہ جب کوئی شخص کسی جگہ کو چھوڑ کر نکلتا ہے تو اس کا ہر قدم اس جگہ سے دور ہوتا جاتا ہے اور جس جگہ کی طرف اس کا رخ ہوتا ہے اس سے قریب تر ہوتا رہتا، لہٰذا جو بھی انسان اس دنیا میں آتا ہے وہ اپنی پیدائش کے دن سے آخرت کی طرف اپنا سفر شروع کر دیتا ہے اور دنیا کو پیچھے چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح گویا وہ ہر دن اور ہر لحہ ایک ایسی مسافت کے درمیان ہے جس کو وہ قطع کرتا رہتا ہے اور اس کے قریب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک دن ایسا آئے گا جب وہ مسافت پوری ہو جائے گی اور وہ جس جانب رواہ دواں ہے وہ وہاں پہنچ جائے گا! واضح رہے کہ حکیم لقمان کی اس نصیحت کا مقصد اس غفلت کا پردہ چاک کرنا ہے جس نے امور آخرت کی طرف سے بے پرواہ بنا رکھا ہے۔

بہتر انسان کون ہے؟

(٦٦) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قِیْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّ النَّاسِ اَفْضَلُ قَالَ کُلُّ مَخْمُوْمِ الْقَلْبِ صَدُوْقِ اللِّسَانِ قَالُوْا صَدُوْقُ اللِّسَانِ نَعْرِفُہٗ فَمَا مَخْمُوْمُ الْقَلْبِ قَالَ ھُوَ النقی التَّقِیُّ لَا اِثْمَ عَلَیْہِ وَلَا بَغْیَ وَلَا غِلَّ وَلَا حَسَدَ رَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ وَالْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کون آدمی بہتر ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ "ہر وہ شخص جو مخموم دل اور زبان کا سچا ہو۔" (یہ سن کر) صحابہؓ نے عرض کیا کہ زبان کے سچے کو تم ہم جانتے ہیں (کہ زبان کا سچا اس شخص کو کہتے ہیں جو کبھی جھوٹ نہ بولے) لیکن "مخموم دل" سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "مخمول دل وہ شخص ہے جس کا دل پاک وصاف ہو، پرہیزگار ہو، اس میں کوئی گناہ نہ ہو، اس نے کوئی ظلم نہ کیا ہو، حد سے تجاوز نہ کیا ہو، اور اس میں کدورت و کینہ اور حسد کا مادہ نہ ہو۔" (ابن ماجہ، بیہقی)

تشریح: لفظ "مخموم" اصل میں "خم" سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں "جھاڑو دینا، کوڑے کرکٹ اور گندگی سے زمین و کنویں کو صاف کرنا۔" پس "مخموم دل سے" مراد وہ شخص ہے جس کا دل غیر اللہ کے غبار سے صاف ستھرا ہو اور برے اخلاق و احوال اور فاسد افکار و خیالات سے پاک ہو جس کو "سلیم القلب" کہا جاتا ہے، اور جس کی تعریف اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ! اسی مراد کو حضور ﷺ نے لفظ "نقی" اور "تقی" کے ذریعہ واضح فرمایا، چنانچہ "نقی" کے معنی ہیں وہ شخص جس کا دل اور باطن غیر اللہ کی محبت سے پاک وصاف ہو! اور "تقی" کے معنی ہیں فاسد و بیہودہ افکار و خیالات، لغو عقائد اور برے اعمال و خیال سے بچنے والا۔

صحابہؓ نے آنحضرت ﷺ سے جو "مخموم القلب" کے معنی دریافت کیے تو اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت دریافت کرنے والے صحابہؓ کے ذہن میں لفظ "مخموم" کے لغوی معنی محفوظ نہیں ہوں گے کیونکہ آنحضرت ﷺ کبھی کبھی ایسے نادر الفاظ ارشاد فرماتے تھے کہ صحابہؓ عربی زبان پر پوری دستگاہ رکھنے اور فصاحت بلاغت کے رموز سے آشنا ہونے کے باوجود ان کا فہم ان الفاظ کے معنی تک نہیں پہنچ پاتا تھا، چنانچہ وہ حضور ﷺ سے ایسے الفاظ کے بارے میں دریافت کرلیا کرتے تھے۔ یا یہ کہ صحابہؓ لفظ "مخموم" کے معنی تو جانتے تھے لیکن قلب کی طرف اس لفظ کی اضافت اور اس کی مراد و معنی کا تعین ان کے فہم سے باہر تھا، چنانچہ انہوں نے دریافت کیا اور حضور ﷺ نے اس کی وضاحت فرمادی۔ یہ احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

وہ چار باتیں جو دنیا کے نفع نقصان سے بے پرواہ بنا دیتی ہیں

(٦٧) وَعَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَرْبَعٌ اِذَا کُنَّ فِیْکَ فَلَا عَلَیْکَ مَافَاتَکَ الدُّنْیَا حِفْظُ اَمَانَۃٍ وَصِدْقُ حَدِیْثٍ وَحُسْنُ خَلِیْقَۃٍ وَعِفَّۃٌ فِیْ طُعْمَۃٍ۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "(لوگو!) چار چیزیں ایسی ہیں کہ اگر وہ تم میں پائی جائیں تو دنیا کے فوت ہونے نہ ہونے کا تمہیں کوئی غم نہیں ہونا چاہئے، ایک تو امانت کی حفاظت کرنا (یعنی حقوق کی حفاظت و ادائیگی کرنا اور ان حقوق کا تعلق خواہ پروردگار سے ہو یا بندوں سے اور یا اپنے نفس سے) دوسرے سچی بات کہنا، تیسرے اخلاق کا اچھا ہونا اور چوتھے کھانے میں احتیاط و پرہیزگاری اختیار کرنا (یعنی حرام و ناجائز کھانے سے پرہیز کرنا اور زیادہ کھانے سے اجتناب کر کے بقدر حاجت و ضرورت پر اکتفا کرنا۔" (احمد، بیہقی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شخص کی زندگی ان چار چیزوں سے معمور ہوگئی تو گویا اس نے اخروی نعمتوں کی جڑ پکڑلی، اس کے نفس نے

روحانی عروج و کمال کا درجہ پالیا، اس کا قلب و باطن منور ہو گیا اور ثواب آخرت اور بہشت کی لازوال نعمتوں کا ذریعہ اس کو حاصل ہو گیا، لہٰذا اس صورت میں اگر وہ دنیا بھر کی نعمتوں اور تمام مادی خواہشات ولذات سے محروم ہو جائے تو اس کو کوئی افسوس و غم نہیں ہونا چاہئے بلکہ ایک طرح سے اس کو اس محرومی پر مطمئن ہونا چاہئے کہ اگر دنیاوی نعمتیں اور لذتیں حاصل ہوتیں تو ان کی وجہ سے دینی معمولات اور عبادات وطاعات میں جمعیت خاطری اور حضور قلب، خلل و وحشت کا شکار ہوتے اور روحانی لطافت و نورانیت کا جمال مادی کثافت و ظلمت سے غبار آلود ہو جاتا۔

راست گفتاری و نیک کرداری کی اہمیت

(۶۸) وَعَنْ مَالِكٍ قَالَ بَلَغَنِي اَنَّهُ قِيْلَ لِلُقْمَانَ الْحَكِيْمِ مَابَلَغَ بِكَ مَانَرٰى يَعْنِي الْفَضْلَ قَالَ صِدْقُ الْحَدِيْثِ وَاَدَآءُ الْاَمَانَةِ وَتَرْكُ مَالَا يَعْنِيْنِيْ - رَوَاهُ فِي الْمُؤَطَّا۔

"اور حضرت امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ جب لقمان حکیم سے یہ پوچھا گیا کہ جس مرتبہ (یعنی فضیلت (کے جس مقام) پر ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں اس تک آپ کو کس چیز نے پہنچایا ہے؟ لقمان حکیم نے فرمایا۔ "سچ بولنے نے (کہ میں نے سچائی کا دامن، کبھی نہیں چھوڑا، خواہ میں نے خود کوئی بات کہی ہو یا کسی کی کوئی بات نقل کی ہو ہمیشہ سچ بولنے پر عامل رہا) ادائیگی امانت نے (یعنی خواہ کوئی مالی معاملہ رہا ہو یا فعلی، میں نے ہمیشہ دیانت داری کو ملحوظ رکھا ہے) اور جو چیزیں میرے لئے بے فائدہ اور غیر ضروری ہیں ان کو ترک کر دینے سے۔" (موطاؒ)

تشریح: اس روایت سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اصل حکمت و دانائی، راست گفتاری و نیک کرداری ہے۔ چنانچہ انسانی زندگی کے یہی وہ دو اعلی جوہر ہیں جن کو اختیار کر کے لقمان حکیم اپنے عظیم مرتبہ تک پہنچ گئے۔

لقمان حکیم کون تھے؟: لقمان حکیم، جن کی حکمت و دانائی آج بھی ضرب المثل ہے اور جن کا نام عقل و دانش کے اس پیکر کے طور پر لیا جاتا ہے جس سے دنیا کے بڑے بڑے حکماء، بڑے بڑے مقننین اور بڑے بڑے فلاسفر فیضان حاصل کرتے ہیں، دراصل مشہور پیغمبر حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے تھے اور بعض حضرات نے ان کو حضرت ایوب علیہ السلام کا خالہ زاد بھائی کہا ہے، علماء اسلام کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ خود پیغمبر تھے یا نہیں؟ تاہم یہ بات متفقہ طور پر مسلم ہے کہ وہ ایک عظیم حکیم و فلاسفر تھے اور ولایت کے درجہ پر فائز تھے، نیز منقول ہے کہ انہوں نے تقریباً ایک ہزار پیغمبروں کی خدمت میں حاضر باشی اختیار کی تھی اور ان سب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا، غالباً ان کی اس بے مثال حکمت و دانائی کا ایک بڑا راز یہ بھی ہے کہ ان کو اتنے زیادہ پیغمبروں سے فیضان حاصل کرنے کا موقع نصیب ہوا! حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت منقول ہے کہ لقمان، نہ تو پیغمبر تھے اور نہ کوئی بادشاہ بلکہ وہ ایک سیاہ فام غلام تھے اور بکریاں چرایا کرتے تھے، حق تعالیٰ نے ان کو مقبول بارگاہ رب العزت بنایا، انہیں حکمت و دانائی، جوانمردی اور عقل و دانش سے نوازا، اور اپنی کتاب "قرآن کریم" میں ان کا ذکر فرمایا۔"

قیامت کے دن بندوں کے حق میں نیک اعمال کی شفاعت؟

(۶۹) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَجِيْءُ الْاَعْمَالُ فَتَجِيْءُ الصَّلٰوةُ فَتَقُوْلُ يَارَبِّ اَنَا الصَّلٰوةُ فَيَقُوْلُ اِنَّكِ عَلٰى خَيْرٍ فَتَجِيْءُ الصَّدَقَةُ فَتَقُوْلُ يَارَبِّ اَنَا الصَّدَقَةُ فَيَقُوْلُ اِنَّكِ عَلٰى خَيْرٍ ثُمَّ يَجِيْءُ الصِّيَامُ فَيَقُوْلُ يَارَبِّ اَنَا الصِّيَامُ فَيَقُوْلُ اِنَّكَ عَلٰى خَيْرٍ ثُمَّ تَجِيْءُ الْاَعْمَالُ عَلٰى ذٰلِكَ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنَّكَ عَلٰى خَيْرٍ ثُمَّ يَجِيْءُ الْاِسْلَامُ فَيَقُوْلُ يَارَبِّ اَنْتَ السَّلَامُ وَاَنَا الْاِسْلَامُ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنَّكَ عَلٰى خَيْرٍ بِكَ الْيَوْمَ آخُذُ وَبِكَ اُعْطِيْ

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِیْ كِتَابِهٖ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ (قیامت کے دن) اعمال (خداوند برتر و بزرگ کے حضور) آئیں گے۔ پس (سب سے پہلے) نماز پیش ہوگی اور عرض کرے گی کہ اے پروردگار! میں نماز ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ "بے شک تو بھلائی ہے۔" پھر صدقہ یعنی زکوۃ پیش ہوگی اور عرض کرے گی کہ اے پروردگار! میں صدقہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ "بے شک تو بھلائی ہے۔" اور پھر روزہ پیش ہوگا اور عرض کرے گا کہ اے پروردگار! اسی طرح (یکے بعد دیگرے) دوسرے اعمال (جیسے حج، جہاد اور طالب علم وغیرہ) پیش ہوں گے (اور ہر ایک عمل مذکورہ بالا الفاظ میں اپنا تعارف پیش کرے گا) اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو خیر پر ہے (گویا ہر نیک عمل اپنے تعارف کے ذریعہ بندوں کے حق میں جو شفاعت کرے گا اس کی قبولیت کو حق تعالیٰ موقوف رکھے گا اور ہر ایک کی درخواست کو نہایت ملائمت و نرمی اور مہربانی کے ساتھ ملتوی رکھے گا) پھر (سب سے آخر میں) اسلام پیش ہوگا اور عرض کرے گا کہ، اے پروردگار! تیرا نام سلام ہے (کہ تیری ذات تمام عیوب و آفات اور ہر طرح کے نقص سے سالم و پاک ہے، اور تو تمام بندوں کو ہر طرح کے خوف اور تمام سختیوں اور مصیبتوں سے سلامتی بخشنے والا ہے) اور میں اسلام ہوں (کہ تیرے حضور عجز و نیاز کرنے والا اور تیرے احکام کا مطیع و فرمانبردار ہوں، نیز میرے بارے میں تو نے خود فرمایا ہے کہ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ "بے شک تو بھلائی پر ہے، آج کے دن میں تیرے ہی سبب مواخذہ کروں گا اور تیرے ہی وسیلہ سے عطا کروں گا (یعنی آج جزاو سزا کے دن میں تجھے ہی اصل اور طاعت و معصیت کے فیصلوں کا مدار قرار دیتا ہوں کہ جس نے تجھے اختیار نہیں کیا اور تیرے راستے پر نہیں چلا اس سے مواخذہ کروں گا اور اس کو عذاب میں مبتلا کروں گا اور جس نے تجھے اختیار کیا اور تیرے راستہ پر گامزن رہا اس کو جزاو ثواب دوں گا، لہٰذا تو جو کچھ چاہتا ہے ہمارے سامنے عرض کر، ہم تیری ہر سفارش و شفاعت قبول کریں گے) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ یعنی جو شخص اسلام کے سوا کسی دین کو اختیار کرے گا اس سے وہ دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں ٹوٹے میں رہنے والوں میں سے ہے۔"

تشریح: تَجِیْءُ الْاَعْمَالُ کا مطلب یہ کہ قیامت کے دن نیک اعمال بحضور رب ذوالجلال پیش ہوں گے اور دنیا میں جن لوگوں نے ان اعمال کو اختیار کیا ہوگا ان کے حق میں گواہی دیں گے اور ان کی شفاعت کریں گے، نیز جن لوگوں نے ان اعمال کو ترک کیا ہوگا ان کے خلاف احتجاج و شکایت کریں گے! رہی یہ بات کہ ان اعمال کے پیش ہونے کی کیا صورت ہوگی تو وہ ایک قوی احتمال یہ ہے کہ وہ اعمال اچھی صورتوں میں متشکل ہو کر پیش ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کو نہایت پاکیزہ اور خوشنما صورتیں عطا فرمائے گا جیسا کہ بعض احادیث و آثار سے مفہوم ہوتا ہے اور یا یہ کہ حق تعالیٰ کی یہ قدرت پوری طرح ثابت ہے کہ وہ اعراض کو بالذات پیش کر دے اور ان کو قوت گویائی عطا فرمائے۔

حضرت شیخ عبدالحقؒ نے حدیث کی وضاحت میں یہ لکھا ہے کہ نماز کا یہ تعارف پیش کرنا کہ "میں نماز ہوں" دراصل اس مفہوم کا حامل ہے کہ اے پروردگار! مجھ کو تیری بارگاہ میں جو عظمت و مرتبہ حاصل ہے کہ تو نے مجھے اپنے دین کا ستون فرمایا ہے اور اپنے نزدیک مقام عزت و قرب سے نوازا ہے اس پر اعتماد کرتے ہوئے اور بامید قبولیت تیری درگاہ لطف و کرم بندوں کے حق میں شفاعت کرنے حاضر ہوئی ہوں اور چونکہ تو نے یہ فرمایا ہے اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ اس لئے جس طرح میں دنیا میں لوگوں کو فسق و فجور سے دور رکھنے والی تھی اسی طرح آج کے دن امیدوار ہوں کہ لوگوں کو تیرے عذاب سے دور رکھوں اور تیرے غضب سے بچاؤں۔" چنانچہ اللہ تعالیٰ نماز سے فرمائے گا کہ۔ "بے شک تو بھلائی اور صلاح و فلاح کی حامل ہے۔" گویا اللہ تعالیٰ نماز کی شفاعت کو قبول نہیں فرمائے گا بلکہ اس کی درخواست شفاعت کو موقوف، ملتوی رکھے گا اور مذکورہ ارشاد کے ذریعہ اس توقف و التواء کو نہایت بلیغ و پاکیزہ انداز اور حسن کلام کے ذریعہ ظاہر کرے گا اور اس ارشاد کا مفہوم درحقیقت یہ ہوگا کہ اے نماز! اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے تجھ کو بہت بڑے مرتبہ کا حامل قرار دیا ہے اور تجھ میں جو فضل و شرف رکھا ہے وہ ایک حقیقت ہے اور بجائے خود ہے، لیکن جہاں تک شفاعت کا

تعلق ہے تو یہ ایک دوسرا مرتبہ ہے جو تجھے حاصل نہیں ہے بلکہ یہ صفت و مرتبہ اس کو دیا گیا ہے جو تیری اور تیری ہم مثل عبادتوں کی بنیاد و مبنیٰ ہے اور تمام اچھی صفات کا مجموعہ یعنی دین اسلام۔

اس موقع پر ایک لطیف نکتہ سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ مقام شفاعت پر کھڑا ہونا (یعنی قیامت کے دن بارگاہ رب العزت میں بندوں کے حق میں شفاعت کرنا) صرف اس ذات کو سزاوار ہے جو جامع کمالات ہے جیسا کہ محمد مصطفے ﷺ کی ذات پاک کہ آپ ﷺ تمام اسماء و صفات الٰہی کے مظہر ہیں، چنانچہ شفاعت کا حق صرف آپ ﷺ کی ذات کو حاصل ہوگا، آپ کے علاوہ کوئی اور پیغمبر شفاعت کا دروازہ کھلوانے پر قادر نہیں ہوگا اسی طرح اعمال میں بھی صرف وہی عمل شفاعت کرنے کا مجاز ہوگا جو تمام صفات و کمالات کا جامع ہے یعنی اسلام، جیسا کہ حدیث کے آخری جز سے واضح ہوتا ہے۔

صدقہ کا یہ تعارف پیش کرنا کہ "میں صدقہ ہوں" اس مفہوم کا حامل ہوگا کہ پروردگار! میں اپنی عزت و فضیلت کا سہارا لے کر تیری بارگاہ میں شفاعت کرنے حاضر ہوا ہوں جس سے تو نے اپنے لطف و کرم کے طفیل مجھے نوازا ہے اور میرے حق میں فرمایا ہے کہ الصدقة تطفی غضب الرب اسی طرح روزہ کے اس تعارف کا کہ "میں روزہ ہوں" یہ مفہوم ہوگا کہ پروردگار! میں وہ عبادت یعنی روزہ ہوں جو اس مخصوص صفت و حیثیت کا حامل ہے کہ تو نے اس کی وہ خاص جزا رکھی ہے جس کو تیرے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا اور جس شخص نے اس کو اختیار کیا اور اس کے پورے حقوق کی رعایت ملحوظ رکھی اس کو تو نے بخشنے اور جنت میں داخل کرنے کا وعدہ فرمایا ہے، لہٰذا میں اپنے اس فضیلت و خصوصیت کی بناء پر بامید قبولیت تیری بارگاہ میں درخواست شفاعت لے کر حاضر ہوا ہوں۔

"اسلام" اپنے تعارف کے سلسلے میں جو اسلوب و انداز اختیار کرے گا وہ مذکورہ بالا دیگر اعمال کے اسلوب تعارف سے مختلف ہوگا، چنانچہ اس کو چونکہ باب شفاعت وا کرانے میں بہت دخل ہوگا اس لئے وہ اپنے تعارف اور اپنی درخواست کی ابتداء حق تعالیٰ شانہ کی حمد و تعریف اور اس کے تئیں اظہار تعظیم سے کرے گا جیسا کہ حضرت محمد مصطفے ﷺ جب مقام شفاعت پر کھڑے ہوں گے تو پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و تعریف اور تعظیم و ثنا بیان کریں گے اس کے بعد درخواست شفاعت پیش کریں گے، لہٰذا اسلام حق تعالیٰ کے حضور پیش ہو کر اس کو اس کے اسم مبارک سلام کے ذریعہ صدا دے گا اور اپنے آپ کو ایک مطیع و فرمانبردار ذات ظاہر کرے گا اور اس کے بعد درخواست شفاعت پیش کرے گا۔

ایک یہ احتمال بھی ہے کہ حدیث میں "اسلام" سے مراد دین اسلام نہ ہو بلکہ صفت رضاء تسلیم اور ترک اختیار مراد ہو جو خدا کے برگزیدہ اور مقرب بندوں کے اعلیٰ مراتب میں سے ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں "اسلام" کا ذکر اسی مفہوم میں کیا گیا ہے کہ فرمایا اِذْقَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یعنی جب ابراہیم علیہ السلام سے اس کے رب نے فرمایا کہ تابعداری اختیار کرو تو انہوں نے کہا کہ میں رب العالمین کا تابعدار رہا)۔

دنیا کی طرف مائل کرنے والی چیزوں کو چھوڑ دو

(۷۰) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ لَنَا سِتْرٌ فِيْهِ تَمَاثِيْلُ طَيْرٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَائِشَةُ حَوِّلِيْهِ فَاِنِّيْ اِذَا رَاَيْتُهٗ ذَكَرْتُ الدُّنْيَا۔

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ہمارے ہاں (دروازے پر، یا بطور دیوار گیری) جو پردہ تھا اس پر پرندوں کی تصویریں بنی ہوتی تھیں چنانچہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "عائشہؓ! اس پردہ کو بدل ڈالو، کیونکہ جب میں اس کو دیکھتا ہوں تو دنیا یاد آجاتی ہے۔"

تشریح: حضور ﷺ نے اس پردے کو بدلنے کا حکم جس انداز سے دیا اور اس کی جو علت بیان فرمائی اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اس پردے پر جو تصویریں تھیں وہ نمایاں نہیں تھیں بلکہ ان کے خطوط و نقوش اس قدر چھوٹے اور غیر واضح تھے کہ ان پر حقیقی معنی میں "تصویر"

کا اطلاق نہیں ہوتا تھا، یا یہ کہ تصویر دار پردہ کا یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب کہ تصویر کی حرمت نازل و نافذ نہیں ہوئی تھی۔

اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان اسباب واشیاء کو دیکھنا کہ جس کے ذریعہ دولتمند لوگ عیش وعشرت کی زندگی اختیار کرتے ہیں۔ فقراء کے قلب کی حلاوت وطمانیت پر اثر انداز ہوتا ہے، لہٰذا عیش وعشرت کی چیزوں اور دنیا کی طرف مائل کرنے والی اشیاء کو نہ صرف یہ کہ اختیار نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان کی طرف نظر بھی نہیں اٹھانی چاہئے۔

چند انمول نصائح

(۷۱) وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عِظْنِیْ وَاَوْجِزْ فَقَالَ اِذَا قُمْتَ فِیْ صَلَاتِكَ فَصَلِّ صَلٰوةَ مُوَدِّعٍ وَلَا تَكَلَّمْ بِكَلَامٍ تَعْتَذِرُ مِنْهُ غَدًا وَاَجْمِعِ الْاِيَاسَ مِمَّا فِیْ اَيْدِی النَّاسِ۔

"اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر کیا کہ (یارسول اللہ!) مجھ کو کوئی ایسی نصیحت فرمایئے مختصر اور جامع ہو! حضور ﷺ نے فرمایا۔ "جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو اس شخص کی طرح نماز پڑھو جو (اللہ کے سوا ہر چیز یعنی مخلوق اور اپنے نفس کو) رخصت کرنے اور چھوڑنے والا ہے (حاصل یہ کہ جب نماز پڑھو تو دنیا بھر سے اپنی توجہ اور اپنا خیال پھیر کر کامل اخلاص اور پوری توجہ کے ساتھ رب العالمین کی طرف متوجہ رہو) نیز اپنی زبان سے ایسی کوئی بات نہ نکالو جس کے سبب تمہیں کل (قیامت کے دن، اللہ کے حضور) عذر خواہی کرنی پڑے (یا یہ کہ عذر خواہی کا مفہوم، عموم پر محمول ہے یعنی کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکال جس کے سبب تمہیں اپنے دوستوں، رفقاء ومتعلقین اور تمام مسلمانوں کے سامنے پشیمان ہونا پڑے اور معذرت کرنے کی ضرورت پیش آئے) اور اس چیز سے ناامید ہو جانے کا پختہ ارادہ کرلو جو لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، (یعنی خدا نے تمہاری قسمت میں جتنا لکھ دیا ہے اور تمہیں جو کچھ دے دیا ہے اسی پر قناعت وکفایت کرو، اور لوگوں کے مال ومتاع سے اپنی امید وابستہ نہ کرو۔"

تشریح: "رخصت کرنے" کے ایک معنی تو وہ ہیں جو اوپر ترجمہ میں بیان کیے گئے ہیں اور ممکن ہے کہ "رخصت کرنے" سے مراد حیات کو رخصت کرنا ہو، یعنی تم اس طرح نماز پڑھو کہ گویا وہ تمہاری آخری نماز ہے اور وہ وقت تمہاری زندگی کا آخری وقت ہے! چنانچہ مشائخ کی وصیتوں اور نصائح میں یہ زریں ہدایت منقول ہے کہ طالب کو چاہئے کہ وہ اپنی ہر نماز میں یہ تصور کرے کہ بس یہ آخری نماز ہے! جب وہ اس تصور کے ساتھ نماز پڑھے گا تو یقیناً اس نماز کو کامل اخلاص، پورے ذوق وشوق، حضور قلب اور تعدیل ارکان کے ساتھ ادا کرے گا۔

حدیث کے آخری الفاظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ دوسروں کے مال ومتاع اور دولت پر نظر رکھنا اور ان سے امیدیں وابستہ کرنا قلبی فقر وافلاس کی علامت ہے، چنانچہ قلب کا غنی ہونا اس پر منحصر ہے کہ لوگوں کے پاس جو کچھ مال ومتاع اور دولت ہے اس سے اپنی امید منقطع کرلی جائے۔

پرہیزگاری کی فضیلت

(۷۲) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ لَمَّا بَعَثَهٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَی الْيَمَنِ خَرَجَ مَعَهٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ يُوْصِيْهِ وَمُعَاذٌ رَاكِبٌ وَرَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ يَمْشِیْ تَحْتَ رَاحِلَتِهٖ فَلَمَّا فَرَغَ قَالَ يَا مُعَاذُ اِنَّكَ عَسٰی اَنْ لَّا تَلْقَانِیْ بَعْدَ عَامِیْ هٰذَا وَلَعَلَّكَ اَنْ تَمُرَّ بِمَسْجِدِیْ هٰذَا وَقَبْرِیْ فَبَكٰی مُعَاذٌ جَشَعًا لِفِرَاقِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثُمَّ الْتَفَتَ فَاَقْبَلَ بِوَجْهِهٖ نَحْوَ الْمَدِيْنَةِ فَقَالَ اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِیَ الْمُتَّقُوْنَ مَنْ كَانُوْا وَحَيْثُ كَانُوْا۔ رَوَی الْاَحَادِيْثَ الْاَرْبَعَةَ اَحْمَدُ۔

"اور حضرت معاذ ابن جبلؓ سے روایت ہے کہ جب رسول کریم ﷺ نے انہیں (قاضی یا عامل بنا کر) یمن روانہ فرمایا تو آپ ﷺ (الوداع کہنے کے لئے کچھ دور تک) ان کے ساتھ گئے اور اس دوران آپ ﷺ ان کو تلقین و نصیحت کرتے رہے، نیز اس وقت معاذؓ تو اپنی سواری پر سوار تھے اور رسول اللہ ﷺ ان کی سواری کے ساتھ ساتھ (پیدل) چل رہے تھے! جب آپ ﷺ نصائح وہدایت سے فارغ ہوئے تو فرمایا۔ "معاذؓ! میری عمر کے اس سال کے بعد شاید تم مجھ سے ملاقات نہیں کر سکو گے، اور ممکن ہے کہ تم (جب یمن سے واپس لوٹو گے تو مجھ سے ملاقات کرنے کے بجائے) میری اس مسجد اور میری قبر سے گزرو۔" معاذؓ (یہ سن کر) رسول اللہ ﷺ کی جدائی کے غم میں رونے لگے اور رسول کریم ﷺ نے معاذؓ کی طرف سے منہ پھیر کر مدینہ کی جانب اپنا رخ کر لیا، پھر فرمایا۔ "میرے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جو پرہیزگار ہیں خواہ وہ کوئی ہوں اور کہیں ہوں (یعنی خواہ وہ کسی رنگ و نسل، کسی ملک و قوم اور کسی طبقہ و مرتبہ کے ہوں)" ان چاروں روایتوں کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: لفظ "ماقبل" گویا لفظ "التفت" کی وضاحت ہے! نیز معاذؓ کی طرف سے، حضور ﷺ کے منہ پھیرنے کی وجہ شاید یہ تھی کہ آپ ﷺ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کو روتا ہوا دیکھیں، کیونکہ اس صورت میں آپ ﷺ کا دل بھی بھر آتا اور بعید نہیں تھا کہ آپ ﷺ بھی رونے لگتے جس سے آپ ﷺ کے قلب مبارک پر غم کا احساس شدید تر ہو جاتا! نیز اس طرح آپ ﷺ نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ میری اس بات سے تمہارا غمگین ہونا اور رونا بالکل بجا، لیکن میرا اس دنیا کو چھوڑنا اور آخرت کا سفر اختیار کرنا ایک یقینی بات ہے! چنانچہ ایک طرف تو آپ ﷺ نے اپنے مذکورہ فعل کے ذریعہ حضرت معاذؓ کو ڈھارس دی اور ان کو حادثہ فاجعہ کو قبول کرنے کے لئے تیار کیا اور دوسری طرف اپنے اشارہ کے ذریعہ ان کو آگاہ فرمایا کہ تم اس وقت مجھ سے اور مدینہ سے جدا ہو رہے ہو لیکن بعد میں تم مدینہ کو دیکھ لو گے البتہ مجھے دیکھنا تمہیں نصیب نہیں ہوگا۔ پھر آپ ﷺ نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ انبیاء اور اتقیا کے درمیان حقیقی رفاقت و قرب کا کیف بس اسی جہاں میں حاصل ہوگا جو دار البقاء ہے وہاں جو شخص جس کا رفیق و ساتھی بن جائے گا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے! لہٰذا جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کو میری ہمیشہ کی رفاقت کا شرف مل جائے اور آخرت کی دائمی زندگی میں اس کو وہ مرتبہ نصیب ہو کہ جس کی وجہ سے اس کو میری شفاعت و قرب حاصل ہو تو اس کو چاہئے کہ تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرے، کیونکہ یہی وہ راہ ہے جس پر چل کر کوئی شخص میری قربت حاصل کر سکتا ہے۔

"خواہ وہ کوئی ہوں اور کہیں ہوں" جیسا کہ اوپر ترجمہ میں بھی وضاحت کی گئی، اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص میرا پسندیدہ میرا نزدیک اور میرا عزیز بننا چاہتا ہے اس کو لازم ہے کہ وہ متقی بنے، قطع نظر اس بات کے کہ وہ کس قبیلہ و قوم کا ہے، کس رنگ و نسل کا ہے اور کس ملک میں سکونت پزیر ہے، ایک شخص مکہ اور مدینہ میں میرا ہم شہر اور میرے قبیلہ و خاندان کا ہونے کے باوجود میرے قریب نہیں ہو سکتا جب کہ وہ پرہیزگاری اختیار کیے ہوئے نہ ہو، اور ایک شخص مجھ سے بہت دور سکونت پذیر ہونے اور مجھ سے کوئی نسلی و قرابتی تعلق نہ رکھنے کے باوجود کہ وہ بصرہ میں ہو یا کوفہ میں، یمن میں ہو یا کسی اور دور دراز کے ملک میں، میرے، بہت قریب و نزدیک ہو سکتا ہے جب کہ وہ پرہیزگاری پر عامل ہو! اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک تو حضرت اویس قرنیؒ تھے کہ ان کو کبھی بھی حضور کی زیارت تک نصیب نہیں ہوئی اور یمن میں سکونت پذیر رہے مگر چونکہ وہ تقویٰ اور پرہیزگاری کے درجہ کمال پر پہنچے ہوئے تھے اس لئے انہوں نے کتنا عظیم مرتبہ پایا اور حضور ﷺ سے دور رہنے کے باوجود بارگاہ رسالت میں کس قدر قربت و نزدیکی کے حامل ہوئے، اس کے برخلاف ایک وہ لوگ تھے جن کا شمار مکہ اور مدینہ کے معزز ترین اور اشرف لوگوں میں ہوتا تھا حضور ﷺ ہی کے شہر میں رہتے تھے اور حضور ﷺ ہی کے قبیلہ و خاندان کے تھے مگر چونکہ ترک تقویٰ اختیار کیے ہوئے تھے اس لئے بارگاہ رسالت میں مقام قرب سے محروم رہے بلکہ حضور ﷺ کو تکالیف ایذا پہنچانے کے سبب نہایت شقی اور بدبخت قرار پائے۔ پس حضور ﷺ نے مذکورہ ارشاد کے ذریعہ گویا حضرت معاذؓ کو تسلی دی کہ ہماری ظاہری جدائی کا غم نہ کھاؤ بلکہ تقویٰ کو اختیار کیے رہے اگر تم متقی رہے تو گو ظاہری اعتبار سے تم ہم سے

جدا ہو گے مگر معنوی طور پر ہمارے ساتھ ہی رہو گے۔

طیبیؒ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کا مذکورہ ارشاد حضرت معاذؓ کو اپنی رحلت کی پیشگی اطلاع دینے کے بعد گویا ان کے حق میں تسلی کے طور پر تھا اور ان کو اس طرف متوجہ کرنا مقصود تھا کہ جب تم اپنے فرائض منصبی کو پورا کر کے یمن سے مدینہ واپس آؤ اور مجھے اس دنیا میں موجود نہ پاؤ تو اس وقت یہاں ان لوگوں کی اقتداء واتباع کرنا جو اپنے تقویٰ وطہارت اور کمال دینداری کے سبب مجھ سے سب سے زیادہ نزدیک اور قریب ہیں۔ پھر طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس ارشاد میں جن لوگوں کی اقتداء واتباع کرنے کا حکم دیا گیا ان سے گویا (بطور کنایہ) حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ذات گرامی مراد تھی جن کو آنحضرت ﷺ کے بعد خلیفہ اول قرار پانا تھا، اس بات کی تائید حضرت جبیر ابن مطعمؓ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کا تعلق اسی طرح کے ایک واقعہ سے ہے جس میں حضور ﷺ نے اپنے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی طرف اشارہ فرمایا تھا، چنانچہ اس روایت میں منقول ہے کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئی اور آپ ﷺ سے کسی مسئلہ میں گفتگو کی۔ حضور ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تم کسی اور وقت آنا (تو میں تفصیل کے ساتھ تمہیں سمجھادوں گا) اس عورت نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر میں کسی ایسی وقت آئی کہ (خدانخواستہ) آپ (ﷺ) (اس دنیا میں) موجود نہ ہوئے تو میں کیا کروں گی؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "اگر تم ایسے وقت آئیں کہ میں (اس دنیا میں) نہیں رہا تو پھر تم ابوبکرؓ کے پاس چلی جانا۔" گویا حضور ﷺ نے اس طرف صریحا اشارہ فرمایا کہ میرے بعد ابوبکرؓ خلیفہ ہوں گے اور اس وقت مسلمانوں کے مقتداء وہی ہوں گے۔

بہرحال اس حدیث کا مقصد اس طرف متوجہ کرنا ہے کہ اپنے تمام دینی ودنیاوی معاملات اور تمام ملکی وشرعی امر میں ہمہ وقت احتیاط وتقویٰ کو ملحوظ رکھنا چاہئے، نیز اس میں تمام اُمت کے لئے یہ تسلی بھی پوشیدہ ہے کہ جن لوگوں کو حضور ﷺ کا زمانہ اور آپ ﷺ کی خدمت وصحبت کا شرف حاصل نہیں ہوا ہے، خواہ وہ کتنے ہی زمانہ کے بعد پیدا ہوں گے اگر وہ تقویٰ اختیار کریں گے تو انہیں بارگاہ رسالت میں تقرب حاصل ہوگا، اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا ھٰذِہِ النِّعْمَۃَ۔

شرح صدر کی علامت

(۷۳) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ تَلاَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلاَمِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ النُّوْرَ اِذَا دَخَلَ الصَّدْرَ انْفَسَحَ فَقِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ھَلْ لِتِلْکَ مِنْ عَلَمٍ تُعْرَفُ بِہٖ قَالَ نَعَمْ التَّجَافِیْ مِنْ دَارِ الْغُرُوْرِ وَالْاِنَابَۃُ اِلٰی دَارِ الْخُلُوْدِ وَالْاِسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نُزُوْلِہٖ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے آیت پڑھی فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلاَمِ یعنی اللہ تعالیٰ جس شخص کو ہدایت بخشنا چاہتا ہے (یعنی خاص ہدایت کہ جو اس کو مرتبۂ اختصاص تک پہنچادے تو اس کا سینہ اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے (بایں طور کہ اس کو شرائع اسلام اخلاص کے ساتھ قبول کرنے کی توفیق عطا فرماتا ہے) پھر حضور ﷺ نے (گویا آیت کی تفسیر میں) فرمایا۔ (جب ہدایت کا) نور سینہ میں داخل ہوتا ہے تو سینہ فراخ اور کشادہ ہو جاتا ہے۔" صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا اس حالت وکیفیت کی کوئی علامت ہے جس سے اس کو پہچانا جا سکے؟ حضور نے فرمایا۔ "ہاں! اس کی نشانی ہے، دار الغرور (دنیا سے) دور رہنا، آخرت کی طرف کہ جو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا جہان ہے، رجوع کرنا اور پوری طرح متوجہ رہنا اور مرنے سے پہلے مرنے کے لئے تیاری کرنا۔"

تشریح: "شرح صدر" یعنی سینہ کا کھل جانا وہ نعمت ہے جو ہدایت وراستی اور تمام دینی ودنیاوی امور میں بہتری وبھلائی کا ذریعہ ہے! یہ کیسے معلوم ہو کہ فلاں شخص شرح صدر کی حالت کو پہنچ گیا ہے؟ اس کو پہچاننے کے لئے تین علامتیں بیان فرمائی گئی ہیں، ایک تو دار الغرور (دنیا) سے بعد یعنی زہد وقناعت اختیار کرنا کہ یہ جگہ مکر وفریب سے بھری ہوئی ہے اور شیطان اس کے ذریعہ لوگوں کو فریب دیتا ہے دوسرے دنیا کی طرف سے بے پرواہ ہو کر آخرت کی طرف ہمیشہ متوجہ رہنا اور ہر صورت میں اسی کی بہتری وبھلائی کو ملحوظ رکھنا اور تیسرے یہ کہ موت

آنے سے پہلے موت کے لئے تیاری کر لینا یعنی توبہ و انابت کے ذریعہ اپنی لغزشوں اور گناہوں سے اظہار بیزاری کرنا، عبادات اور اچھے کاموں میں سبقت کرنا اور اپنے اوقات کو طاعات الٰہی میں مشغول رکھنا! جس شخص میں یہ تینوں باتیں پائی جائیں تو جان لینا چاہئے کہ اس نے گویا تمام شرائع اسلام کو پورے یقین واخلاص کے ساتھ قبول کر لیا ہے اور وہ اس مقام تک پہنچ گیا ہے جہاں احکام خداوندی کی بجاآوری مزاج وطبیعت پر گراں گزرنے کے بجائے روحانی و جسمانی کیف وسرور اور لذت بہم پہنچاتی ہے۔ واضح رہے کہ شرح صدر یعنی سینہ کی کشادگی سے مراد قلب میں قبول حق کی استعداد و صلاحیت کا پیدا ہو جانا ہے اور قلب مؤمن جو نور ہدایت سے پر ہو، وہ بذات خود بڑے عظیم مرتبہ کا حامل ہے یہاں تک کہ اس کو "عرش رب" سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسعنی قلب عبدی المؤمن یعنی نہ تو میری زمین میری گنجائش رکھتی ہے اور نہ میرا آسمان لیکن میرے مؤمن بندے کا قلب میری گنجائش رکھتا ہے۔

دنیا کو دار الغرور یعنی دھوکے کا گھر، کہا گیا ہے کیونکہ بلاشبہ یہ دنیا مکر و فریب میں مبتلا کرنے اور دھوکا دینے والی ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی عہد شکن نہیں ہے! لوگ اس کی محبت میں مبتلا ہو کر کیا کچھ نہیں کرتے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے کیسے کیسے پاپڑ نہیں بیلتے، لیکن آخر کار یہ کسی کی نہیں ہوتی اور ہر ایک کو دغا دیتی ہے! چنانچہ قرآن کریم میں آگاہ فرمایا گیا ہے کہ وَلَا يَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا یعنی دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں مبتلا نہ کر دے۔ جہاں تک اس دنیا کی حقیقت و ماہیت کا تعلق ہے تو اس میں بھی کوئی شبہ کر سکتا ہے کہ یہ دنیا خرابی و فساد اور رنج و محن کا گھر ہے، اگرچہ اس کی ظاہری حالت ایک نعمت کی طرح معلوم ہوتی ہے اور اس کی مثال سراب کی سی ہے کہ دھوپ میں چمکنے والے ریگستانی ریت کو پانی سمجھ کر پیاسا اس کی طرف لپکتا ہے مگر جب قریب پہنچتا ہے تو اس کو حقیقت نظر آتی ہے اور سمجھتا ہے کہ میں دھوکہ میں مبتلا ہو گیا، بالکل اسی طرح بادشاہ و امراء دولتمند اور دنیا دار لوگ دنیا کی ظاہری چمک دمک کے دھوکے میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور جب حقیقت سامنے آتی ہے تو آنکھیں کھلتی ہیں مگر وقت گزر چکا ہوتا ہے اور حسرت و خسران کے سوا ان کے ہاتھ اور کچھ نہیں لگتا۔

"موت آنے سے پہلے" سے حیات مستعار کا وہ عرصہ مراد ہے جس میں انسان کچھ کر لینے کی صلاحیت و قوت رکھتا ہے یعنی صحت و تندرستی کا زمانہ اور آخر درجہ میں وہ زمانہ بھی مراد ہو سکتا ہے جب موت کے مقدمات ظاہر ہوں گے اور زندگی کے خاتمہ کے ظاہری اسباب پیدا ہو جائیں اور وہ مرض و بیماری کا زمانہ ہے لیکن عمر کا وہ حصہ کہ جو انسان کو بالکل بیکار و ناکارہ بنا کر رکھ دیتا ہے یعنی بہت بڑھاپا کہ اس زمانہ میں نہ علم و معرفت حاصل کرنے کی طاقت رہتی ہے اور نہ عمل کرنے پر قدرت ہوتی ہے، اس وقت بے فائدہ حسرت و ندامت کے سوا اور کچھ نہیں ملتا، لہٰذا دانائی اسی میں ہے کہ اس زمانہ سے پہلے سفر آخرت کے لئے زاد راہ تیار کر لیا جائے۔"

حکمت و دانائی کس کو عطا ہوتی ہے

(۷۴) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ وَاَبِيْ خَلاَّدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا رَاَيْتُمُ الْعَبْدَ يُعْطٰى زُهْدًا فِي الدُّنْيَا وَقِلَّةَ مَنْطَقٍ فَاقْتَرِبُوْا مِنْهُ فَاِنَّهٗ يُلَقَّى الْحِكْمَةَ۔ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوخلادؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب تم کسی بندے کو دیکھو کہ اس کو (دنیا سے) بے رغبتی اور (لغو و بیہودہ کلام سے اجتناب اور) کم گوئی عطا کی گئی ہے تو اس کی قربت و صحبت اختیار کرو کیونکہ اس کو حکمت و دانائی کی دولت دی گئی ہے۔" ان دونوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے (اور پہلی حدیث بہت سے طرق سے ثابت ہے۔"

تشریح: بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ زیادہ دانا مؤمن کون ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ مؤمن جو موت کو بہت یاد کرتا ہو اور موت کے بعد کی زندگی (یعنی آخرت) کے لئے بہت تیاری کرتا ہو۔

مذکورہ بالا حدیث میں لفظ "حکمت" نقل کیا گیا ہے اس سے مراد نیک کرداری اور راست گفتاری ہے۔ اور جس بندے کو اللہ تعالیٰ حکمت عطا فرماتا ہے اس کی بڑی فضیلت منقول ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے وَمَنْ يُؤْتَى الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا یعنی جس شخص کو حکمت عطا کی گئی، گویا اس کو بہت زیادہ خیر و بھلائی دی گئی۔

بہر حال، حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص دنیا سے بے اعتنائی اور بے رغبتی اختیار کیے ہوئے ہو اور کم گوئی کی صفت سے متصف ہو وہ ایک ایسا مخلص و کامل عالم ہے جس کو خدا نے نیک کرداری اور راست گفتاری کی دولت سے نواز دیا ہے اور وہ یقیناً مرشد و مقتدا بننے کا اہل ہے کہ وہ بندگان خدا کی تربیت و اصلاح اور رشد و ہدایت کی ذمہ داری کو پوری طرح انجام دے سکتا ہو، لہٰذا ہر ایک شخص پر واجب ہے کہ اس کی اطاعت و خدمت کرے، اسی کی صحبت و ہمنشینی اختیار کرے اور اس کے ساتھ ہمکلامی رکھے بعض عارفین نے بہت خوب کہا ہے کہ اللہ کی صحبت اختیار کرو۔ اگر تم اس پر قادر نہ ہو سکو تو اس شخص کی صحبت و ہم نشینی اختیار کرو جو خدا کے ساتھ صحبت رکھتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ شخص وہی ہو سکتا ہے جس میں کردار و احوال اور اقوال و افعال کے صحیح اور قابل اعتماد ہونے کی وہ علامت پائی جائے جو انشراح صدر کی علامت کے طور پر پچھلی حدیث میں بیان کی جا چکی ہے، اور اس کی وہ حیثیت و شخصیت اس طرح ظاہر و ثابت ہو جائے کہ اس کی صحبت تمام دینی و دنیاوی معاملات پر بھلائی و بہتری کی صورت میں اثر انداز ہوتی ہو۔ وہ اپنے رفقاء اور معتقدین کو دنیاوی لذات سے کنارہ کش، تحصیل مال و جاہ سے بے رغبت اور مقدار حاجت و ضرورت سے زیادہ کی طلب و خواہش سے بے پرواہ بنا کر زاد عقبی کی طرف پہنچاتا ہو۔ ایسا شخص نہ صرف عالم و عارف کہلاتا ہے بلکہ انبیاء کا حقیقی وارث و خلیفہ ہے! اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسے عارف باللہ کی زیارت و خدمت اور اس کی صحبت و ہم نشینی کی نعمت عظمی سے سرفراز فرمائے (آمین ثم آمین)

بَابُ فَضْلِ الْفُقَرَاءِ وَمَا كَانَ مِنْ عَيْشِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

فقراء کی فضیلت اور نبی کریم ﷺ کی معاشی زندگی کا بیان

"فقراء" فقیر کی جمع ہے جس کے معنی ہی مفلس، محتاج، غریب اور "فضیلت" سے مراد اجر و ثواب کی کثرت ہے! لہٰذا فقراء کی فضیلت کے بیان کا مطلب ان احادیث کو نقل کرنا ہے جن سے یہ واضح ہو گا کہ جو لوگ اپنی غربت و افلاس اور محتاجگی کی وجہ سے اپنی اور اپنے متعلقین کی معاشی زندگی کی سختیوں کو صبر و سکون کے ساتھ جھیلتے ہیں اور تمام مشکلات کا مقابلہ نہایت عزم و استقلال کے ساتھ کرتے ہوئے توکل و قناعت اختیار کرتے ہیں اور تقدیر الٰہی پر راضی و شاکر رہتے ہیں ان کو کتنا زیادہ اجر و ثواب ملتا ہے اور وہ آخرت میں کتنا بڑا درجہ پائیں گے۔

"حضور ﷺ کی معاشی زندگی" سے مراد آپ کے کھانے پینے، رہن سہن اور بسر اوقات کا وہ معیار اور طور طریقہ ہے جو غرباء اور فقراء کا ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ جس کو کفاف (بقدر ضرورت) کہا جا سکتا ہے! عنوان بالا میں "فقراء کی فضیلت" اور "حضور کی معاشی زندگی" کو ایک ساتھ ذکر کرنے اور دونوں سے متعلق احادیث و مضمون کو ایک باب میں نقل کرنے میں جو خاص حکمت ہے وہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اکثر انبیاء اولیاء کی طرح حضور ﷺ کا معیار زندگی اور بسر اوقات بھی غرباء و فقراء کی طرح تھا، یعنی سرکار دو عالم ﷺ خوشحال زندگی اختیار کرنے کی قدرت رکھنے کے باوجود اپنی زندگی اس طرح بسر کرتے تھے جس طرح کوئی غریب و مفلس شخص بسر کرتا ہے اور اپنے متعلقین کی کفالت اسی تنگی اور سخت کوشی و جانکاہی کے ساتھ کرتے تھے جو غریب و نادار لوگوں کا معمول ہے، چنانچہ غریب و نادار مؤمن کی فضیلت کو ثابت کرنے کے لئے یہی بات بہت کافی ہے۔

واضح رہے کہ اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ صبر و رضا اختیار کرنے والا غریب و مفلس زیادہ فضیلت رکھتا ہے یا شکر گذار

غنی وخوشحال شخص؟ چنانچہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ شکر گذار غنی زیادہ فضیلت رکھتا ہے کیونکہ اس کے ہاتھ سے اکثر وہ چیزیں عمل میں آتی ہیں جو صدقہ وخیرات اور مالی انفاق وایثار یعنی زکوٰۃ قربانی اور نیک کاموں میں خرچ کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی زیادہ سے زیادہ قرب ونزدیکی حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں نیز حدیث میں بھی اغنیاء کی تعریف میں یوں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (یعنی یہ مال ودولت اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے) اور اکثر حضرات یہ فرماتے ہیں کہ صبر کرنے والا غریب ومفلس زیادہ فضیلت رکھتا ہے جس کی ایک سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ خود حضور سرور کائنات ﷺ کا معیار زندگی اغنیاء کے مطابق نہیں تھا بلکہ غرباء اور مفلسوں کی طرح تھا نیز اس بات میں جو احادیث منقول ہوں گی وہ سب بھی ان حضرات کے قول کی دلیل ہیں! تاہم یہ بات ملحوظ رہے کہ اس اختلاف اقوال کا تعلق دراصل مطلق فقر اور غنا کی حقیقت وماہیت سے ہے اور اس کا اعتبار بھی وجوہ کے مختلف ہونے پر ہے۔

چنانچہ ایک شخص کے حق میں کبھی تو غنا یعنی دولتمندی، خیر وبھلائی کا باعث بن سکتی ہے اور کبھی اس کا فقیر ومفلس ہونا ہی اس کے حق میں بہتر ہوسکتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندہ پر مہربان ہوتا ہے تو اس کو وہی چیز دیتا ہے جو اس کے حق میں صلاح وفلاح کا ذریعہ ہوتی ہے۔ خواہ فقر ہو یا غنا، اور خواہ صحت ہو یا تندرستی! یہی حکم (کہ اختلاف وجوہ کی بناء پر ایک ہی چیز کبھی افضل ہوسکتی ہے اور کبھی مفضول) ان تمام صفات کا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

حضرت شیخ المشائخ سید محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کے بارے میں منقول ہے کہ کسی نے ان سے پوچھا کہ صبر کرنے والا مفلس بہتر ہے یا شکر گزار دولتمند؟ تو انہوں نے فرمایا کہ شکر گذار فقیر دونوں سے بہتر ہے۔ انہوں نے اس جواب کے ذریعہ گویا فقر و افلاس کی فضیلت کی طرف اشارہ فرمایا کہ فقر وافلاس درحقیقت ایک نعمت ہے کہ اس پر شکر گزار ہونا چاہئے، نہ کہ وہ کوئی مصیبت وبلا ہے جس پر صبر کیا جائے، شیخ عالم عارف ربانی اور ولی اللہ حضرت عبدالوہاب متقیؒ اپنے شیخ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے جب تک ہم سے فقر وافلاس کی فضیلت کا اقرار واعتراف نہیں کرا لیا اس وقت تک ہمیں بیعت نہیں کیا، چنانچہ فرمایا کہ اس طرح کہو الفقر افضل من الغناء (فقر وافلاس، غنا سے بہتر ہے) جب ہم نے اس بات کو دہرایا تب انہوں نے ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ہمیں مرید کیا۔

اس موقع پر اس بات کو بھی جان لینا چاہئے کہ اصلاح شریعت میں "فقیر" کا وہ مفہوم مراد نہیں ہوتا جو عام طور پر معروف ہے یعنی گداگر، بھکاری اور منگتا، بلکہ اس لفظ سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جس کو عرف عام میں "غریب ومفلس کہا جاتا ہے اور جو مال واسباب سے تہی دست ہوتا ہے! اسلام کی مذہبی کتابوں اور احکام ومسائل میں ایسے شخص کے لئے عام طور پر دو لفظ استعمال ہوتے ہیں ایک تو "فقیر" دوسرے "مسکین" چنانچہ بعض حضرات نے ان دونوں میں فرق کیا ہے اور کہا ہے کہ "فقیر" کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو نصاب (یعنی اس قدر مال واسباب) کا مالک نہ ہو جس کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ وفطرہ واجب ہوتا ہو، یا اس شخص کو "فقیر" کہا جاتا ہے جو بس ایک دن کی غذائی ضروریات کے بقدر مال واسباب رکھتا ہو اور اس سے زائد اس کے پاس اور کچھ نہ ہو جب کہ "مسکین" اس شخص کو کہتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ نصاب کا مالک نہ ہو بلکہ اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو یہاں تک وہ ایک دن کی غذائی ضروریات کے بقدر بھی مال واسباب نہ رکھتا ہو، اور بعض حضرات نے اس کے برعکس کہا ہے! بہرحال عنوان میں جو لفظ "فقراء" استعمال کیا گیا ہے اس سے فقیر اور مسکین دونوں مراد ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

افلاس اور خستہ حالی کی فضیلت

(۱) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رُبَّ اَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔"بہت سے لوگ ایسے ہیں جو (بظاہر تو) پراگندہ بال اور غبار آلود (یعنی نہایت خستہ حال اور پریشان صورت) نظر آتے ہیں جن کو (ہاتھ یا زبان کے ذریعہ) دروازوں سے دھکیلا جاتا ہے لیکن (وہ خدا کے نزدیک اتنا اونچا درجہ رکھتے ہیں کہ) اگر وہ اللہ کے بھروسہ پر قسم کھالیں تو اللہ ان کی قسم کو یقیناً پورا کرے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "جن کو دروازوں سے دھکیلا جاتا ہے" اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ واقعتاً دنیاداروں کے دروازوں پر جاتے ہیں اور ان کو وہاں سے دھکیلا جاتا ہے۔ کیونکہ جو لوگ خدا کے لئے دنیا کی ظاہری زینت وعزت کی چیزوں سے دور رہتے ہیں، ان کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ کوئی ایسا کام کریں گے جس سے ذلت اٹھانا پڑے، بلکہ اس جملہ سے مراد یہ ہے کہ اولیاء اللہ کی روحانی عظمتوں کا راز ان کی شکستہ حالی میں پوشیدہ ہوتا ہے اور ان کا ظاہر، ان کے باطن کا اس حد تک سرپوش ہوتا ہے کہ اگر بالفرض وہ کسی کے گھر جانا چاہیں تو لوگوں کی نظر میں ان کی کوئی قدر ومنزلت نہ ہونے کی وجہ سے ان کو دروازہ ہی پر روک دیا جائے مکان میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ اور ظاہر ہے کہ جب وہ دروازوں سے دھکیلے جاسکتے ہیں تو ان کو مجلسوں اور محفلوں میں آنے سے بطریق اولی روکا جاسکتا ہے! اور اس میں حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ ان کی حقیقت لوگوں پر ظاہر ہو اور وہ ایسی حالت میں رہیں جس سے لوگ ان کی طرف مائل وملتفت ہوں، تاکہ ان کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے کوئی انس ورغبت نہ ہو! پس حقیقت میں اللہ تعالیٰ ان پاک نفس بندوں کو دنیا داروں اور ظالموں کے دروازوں پر کھڑے رہنے اور ان کے حرام مال کے کھانے پینے سے محفوظ رکھتا ہے، جیسا کہ کوئی شخص اپنے مریض کو مضر آب وہوا اور نقصان دہ غذاؤں سے بچانے کی کوشش کرتا ہے! چنانچہ وہ لوگ اپنے مولی کے در کے علاوہ اور کسی دروازے پر حاضری نہیں دیتے اور اپنے کمال استغناء اور بے نیازی کی وجہ سے اپنے پروردگار کے علاوہ کسی دوسرے کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔

اور اگر وہ اللہ پر قسم کھائیں..... الخ کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اللہ پر اعتماد کر کے اور اس کی قسم کھا کر یہ کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں کام کرے گا یا فلاں کام نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو سچا کرتا ہے باپں طور کہ ان کے کہنے کے مطابق اس کام کو کرتا ہے یا نہیں کرتا، جیسا کہ باب الدیت میں اس کے متعلق ایک روایت گزر چکی ہے! حاصل یہ کہ وہ لوگ اگرچہ اپنی ظاہری حالت کی وجہ دنیاداروں کی نظر میں کوئی قدر ومنزلت نہیں رکھتے مگر حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا مرتبہ اتنا بلند اور اس کی بارگاہ میں ان کی عزت ومقبولیت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اگر وہ کسی بات پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ ان کو سچا کرتا ہے اور ان کی قسم پوری کرتا ہے یعنی وہ بات پوری ہو کر رہتی ہے۔

ملت کے حقیقی خیر خواہ وپشت پناہ، غریب وناتواں مسلمان ہیں

(۲) وَعَنْ مُصْعَبِ ابْنِ سَعْدٍ قَالَ رَاٰى سَعْدٌ اَنَّ لَهٗ فَضْلاً عَلٰى مَنْ دُوْنَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تُنْصَرُوْنَ وَتُرْزَقُوْنَ اِلَّا بِضُعَفَاءِ كُمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت مصعبؒ ابن سعد (تابعی) کہتے ہیں کہ (میرے والد) حضرت سعدؓ نے اپنے بارہ میں یہ گمان کیا کہ وہ اس شخص سے افضل ہیں جو ان سے کمتر ہے (یعنی ضعیف وناتواں شخص یا فقیر ومفلس) چنانچہ رسول کریم ﷺ نے (اس کا یہ گمان ختم کرنے اور دوسروں کو آگاہ کرنے کے لئے) فرمایا۔ "تمہیں (دشمنان دین کے مقابلہ پر) مدد وسہارا اور رزق کن لوگوں کی برکت سے ملتا ہے انہی کی برکت سے جو ضعیف و ناتواں اور غریب ونادار ہیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: حضرت سعدؓ بہت سے اوصاف اور خوبیوں کے مالک تھے، مثلاً شجاعت (دلاوری) جود وکرم، اور سخاوت، فیاضی جیسے اعلی اوصاف ان میں بدرجہ اتم تھے، چنانچہ ان کے ذہن میں یہ بات پیدا ہوئی کہ جو لوگ مجھ جیسی خصوصیات اور خوبیاں نہیں رکھتے ان کی بہ نسبت میں مسلمانوں کی زیادہ مدد واعانت کرتا ہوں، اور اس اعتبار سے اسلام کے لئے میرا وجود زیادہ فائدہ مند ہے! ذہن کی یہ بات زبان

پر بھی آگئی ہوگی، لہٰذا حضور ﷺ نے ان کے اس گمان سے ان کو باز رکھا اور واضح فرمایا کہ تمہارا اس انداز سے سوچنا غیر مناسب بات ہے، تمہیں چاہئے کہ جو لوگ طاقت وقوت اور مال ودولت کے اعتبار سے تم سے کمتر ہیں ان کی عزت کرو، انہیں کمتر وحقیر نہ سمجھو اور ان کے تئیں تکبر ونخوت کا رویہ اختیار نہ کرو کیونکہ وہ لوگ بڑے شکستہ دل اور مسکین ہوتے ہیں، ان میں خلوص وسچائی کا جوہر ہوتا ہے، ان پر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہوتی ہے، اور تم انہی کی دعاؤں کی برکتوں سے فائدہ اٹھاتے ہو، خدا انہی کے طفیل تمہیں دشمنوں پر غالب کرتا ہے اور تمہارے رزق میں برکت عطا فرماتا ہے۔

غریب ونادار مسلمانوں کو جنّت کی بشارت

(۳) وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُمْتُ عَلٰى بَابِ الْجَنَّةِ فَكَانَ عَامَّةُ مَنْ دَخَلَهَا الْمَسَاكِيْنَ وَاَصْحَابُ الْجَدِّ مَحْبُوْسُوْنَ غَيْرَ اَنَّ اَصْحَابَ النَّارِ قَدْ اُمِرَ بِهِمْ اِلَى النَّارِ وَقُمْتُ عَلٰى بَابِ النَّارِ فَاِذَا عَامَّةُ مَنْ دَخَلَهَا النِّسَاءُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اسامہ بن زیدؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ فرمانے لگے کہ میں (معراج کی رات، یا خواب میں، یا حالت کشف میں) جنّت کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا (میں نے دیکھا کہ جو لوگ جنت میں داخل ہوئے ہیں ان میں زیادہ تعداد غریبوں کی ہے، اور مالداروں کو قیامت کے میدان میں روک رکھا گیا ہے۔ البتہ اصحاب نار یعنی کافروں کو دوزخ میں لے جانے کا حکم دے دیا گیا ہے، اور جب میں دوزخ کے دروازے پر کھڑا ہوا تو دیکھا کہ جو لوگ دوزخ میں ڈالے گئے ہیں ان میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "محبوسون" کے معنی ہیں، وہ لوگ جن کو جنّت میں جانے سے روک دیا گیا ہے! حاصل یہ کہ مؤمنین میں سے جو لوگ اس فانی دنیا میں مالداری وتمول، اور جاہ ومنصب کی وجہ سے عیش عشرت کی زندگی اختیار کیے ہوئے ہیں ان کو جنّت میں جانے سے اس وقت تک کے لئے روکا رکھا جائے گا، جب تک ان سے اچھی طرح حساب نہیں لیا جائے گا، چنانچہ اس وقت وہ لوگ اس بات سے سخت رنج وغم محسوس کریں گے کہ انہیں دنیا میں مال وزر کی کثرت اور جاہ ومنصب کی وسعت کیوں حاصل ہوئی، اور وہ اپنی خواہشات نفس کے مطابق دنیاوی لذات وعشرت سے کیوں بہرہ مند ہوئے! کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر ان سے ان دنیاوی امور کا ارتکاب ہوا ہوگا جن کو حرام قرار دیا گیا ہے تو وہ عذاب کے مستوجب ہوں گے اور اگر انہوں نے محض ان چیزوں کو اختیار کیا ہوگا جن کو حلال قرار دیا گیا ہے تب بھی انہیں حساب وکتاب کے مرحلہ سے بہر حال گزرنا پڑے گا، جب کہ فقراء ومفلس لوگ اس سے بری ہونگے کہ نہ تو ان سے حساب لیا جائے گا اور نہ انہیں جنّت میں جانے سے روکا جائے گا بلکہ وہ مالداروں سے چالیس سال پہلے جنّت میں چلے جائیں گے اور ان کا مالداروں سے پہلے جنّت میں جانا گویا ان نعمتوں کے عوض میں ہوگا جن سے وہ دنیا سے محروم رہے ہوں گے۔

جنتیوں اور دوزخیوں کی اکثریت کن لوگوں پر مشتمل ہوگی

(۴) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِطَّلَعْتُ فِى الْجَنَّةِ فَرَاَيْتُ اَكْثَرَ اَهْلِهَا الْفُقَرَآءَ وَاطَّلَعْتُ فِى النَّارِ فَرَاَيْتُ اَكْثَرَ اَهْلِهَا النِّسَآءَ۔" (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میں نے جنت میں جھانک کر دیکھا تو اس میں اکثر تعداد غریبوں اور ناداروں کی نظر آئی اور دوزخ میں جھانک کر دیکھا تو اس میں اکثریت عورتوں کی نظر آئی۔" (بخاریؒ، مسلمؒ)

فقراء کی فضیلت

(۵) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فُقَرَآءَ الْمُهَاجِرِيْنَ يَسْبِقُوْنَ الْاَغْنِيَآءَ يَوْمَ

الْقِيٰمَةِ اِلَى الْجَنَّةِ بِاَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "فقراء، مہاجرین قیامت کے دن جنّت میں اغنیاء (مال داروں) سے چالیس سال پہلے داخل ہوں گے۔" (مسلم)

تشریح: "چالیس سال" سے مراد وہ عرصہ ہے جو ہماری اس دنیا کے شب و روز کے اعتبار سے چالیس سال کے بقدر ہونا! اور اس حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس حدیث کا تعلّق خاص طور پر انہی فقراء سے ہے جو مہاجرین میں سے تھے۔ اس طرح "اغنیاء" سے مراد بھی اغنیائے مہاجرین ہیں! رہی یہ بات کہ یہاں فقراء اور اغنیاء کیساتھ۔ مہاجرین کی قید کیوں لگائی گئی ہے تو اس کی حقیقت دوسری فصل کی پہلی حدیث سے معلوم ہوگی! نیز جنّت میں فقراء کے پہلے داخل ہونے کی وجہ ہوگی اغنیاء تو حساب کی طوالت کی وجہ سے میدان حشر میں رکے رہیں گے، جب کہ فقراء حساب کے بغیر جنّت میں داخل ہو کر وہاں کی سعادتوں اور نعمتوں سے بہرہ مند ہونے لگیں گے۔

(٦) وَعَنْ سَهْلِ ابْنِ سَعْدٍ قَالَ مَرَّ رَجُلٌ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لِرَجُلٍ عِنْدَهٗ جَالِسٌ مَارَأْيُكَ فِيْ هٰذَا فَقَالَ رَجُلٌ مِنْ اَشْرَافِ النَّاسِ هٰذَا وَاللّٰهِ حَرِيٌّ اِنْ خَطَبَ اَنْ يُّنْكَحَ وَاِنْ شَفَعَ اَنْ يُّشَفَّعَ قَالَ فَسَكَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ مَرَّ رَجُلٌ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَارَأْيُكَ فِيْ هٰذَا فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذَا رَجُلٌ مِنْ فُقَرَآءِ الْمُسْلِمِيْنَ هٰذَا حَرِيٌّ اَنْ خَطَبَ اَنْ لَا يُنْكَحَ وَاِنْ شَفَعَ اَنْ لَا يُشَفَّعَ وَاِنْ قَالَ اَنْ لَا يُسْمَعَ لِقَوْلِهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا خَيْرٌ مِّنْ مِّلَاءِ الْاَرْضِ مِثْلُ هٰذَا۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت سہل بن سعدؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ کے سامنے سے ایک شخص گزرا تو آپ ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ جو شخص گزرا ہے اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، یعنی یہ کوئی اچھا شخص ہے یا برا؟ اس شخص نے جواب دیا کہ یہ شخص نہایت معزز اور شریف ترین لوگوں میں سے ہے، بخدا، اس شخص کی حیثیت یہ ہے کہ اگر کسی عورت سے نکاح کا پیغام بھیجے تو اس عورت سے اس کا نکاح ہو جائے، اور اگر (کسی حاکم و سردار سے کسی شخص کے بارے میں) کوئی سفارش کرے تو اس کی سفارش مان لی جائے! راوی حضرت سہلؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ (یہ جواب سن کر) خاموش رہے، اتنے میں ایک دوسرا شخص سامنے سے گزرا تو آپ ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) اپنے پاس بیٹھے ہوئے اسی شخص سے پوچھا کہ اچھا، اس شخص کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ! یہ شخص نادار، قلاش مسلمانوں میں سے ہے، اس کی حیثیت تو یہ ہے کہ اگر نکاح کا پیغام دے تو اس سے کوئی نکاح نہ کرے، اگر کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول نہ ہو، اور اگر کوئی بات کہے تو اس کی وہ بات سننے پر کوئی تیار نہ ہو (یعنی یہ شخص اپنے فقر و افلاس کی وجہ سے اتنی قدر و منزلت بھی نہیں رکھتا کہ کوئی شخص اس کی بات سننے پر آمادہ ہو جائے اور اس کی طرف التفات و توجہ کرے) رسول کریم ﷺ نے (یہ سنا تو) فرمایا۔ "(نادان!) یہ شخص (کہ جس کو تم نے حقارت کی نظر سے دیکھا ہے اور ایک بے حیثیت انسان سمجھا ہے) اس شخص جیسے لوگوں سے بھری زمین سے بھی کہیں بہتر ہے (جس کی تم نے تعریف کی ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "اس شخص جیسے لوگوں سے بھری زمین..... الخ" کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمام روئے زمین اس شخص جیسے لوگوں سے بھر جائے جو پہلے یہاں سے گزرا تھا اور جس کی تعریف و توصیف میں تم رطب اللسان ہوئے تھے تو وہ ایک شخص کہ جو اپنے فقر و افلاس کی وجہ سے تمہاری نظر میں کوئی قدر و منزلت نہیں رکھتا ہے، مرتبہ و فضیلت کے اعتبار سے اس تمام روئے زمین سے کہیں بہتر قرار پائے گا۔"

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضور ﷺ کے پاس جو صاحب بیٹھے ہوئے تھے اور جن سے حضور ﷺ نے ان دونوں اشخاص کے بارے میں سوال کیا تھا وہ خود کوئی غنی اور مال دار شخص ہوں گے، لہٰذا ان کے ساتھ مذکورہ سوال و جواب گویا ان کے حق میں

یہ تنبیہ تھی کہ غریب و نادار مسلمانوں کو کبھی بنظر حقارت نہیں دیکھنا چاہئے کیونکہ خدا کے نزدیک ان کو جو فضیلت حاصل ہے وہ بڑے بڑے مالداروں کو بھی حاصل نہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حضور ﷺ نے مالدار مسلمانوں کے مقابلہ پر غریب و نادار مسلمان کی اس درجہ فضیلت کیوں بیان فرمائی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر غریب و نادار مسلمان کا دل بہت صاف ہوتا ہے اور اس کے سبب وہ حق کو جلد قبول کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی بہت زیادہ کرتا ہے، اس کے برخلاف غنی و مالدار لوگ عام طور پر بے حسی اور شقاوت میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اندر سرکشی و بے نیازی اور تکبر کا وہ مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو انہیں قبول حق اور احکام خداوندی کی پیروی سے باز رکھتا ہے۔ اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اور اس حقیقت کا اندازہ علماء کے شاگردوں اور صلحاء و مشائخ کے مریدوں کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے کہ ان میں سے جو لوگ غریب و نادار ہوتے ہیں وہ حق بات کو بہت جلد قبول کر لیتے ہیں اور جو لوگ صاحب ثروت و مالدار ہوتے ہیں وہ ہر بات میں حیل و حجت کرتے ہیں۔

حدیث کے ظاہری مفہوم سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ پہلے گزرنے والا شخص بھی مالدار مسلمانوں میں سے تھا نہ کہ کوئی کافر تھا کیونکہ مفاضلہ (یعنی آپس میں ایک دوسرے کی اخروی فضیلت کو ظاہر کرنے) کا تعلق کفار و مسلمین کے مابین ہو ہی نہیں سکتا (یعنی کسی مسلمان اور کسی کافر کو ایک دوسرے کے مقابلہ پر رکھ کر یہ کہا ہی نہیں جا سکتا کہ اخروی اجر و ثواب کے اعتبار سے ان میں سے کون شخص زیادہ افضل ہے) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار میں سے کسی بھی شخص کی طرف سرے سے خیر (یعنی اخروی سعادت و بھلائی) کی نسبت کی ہی نہیں جا سکتی (اور ظاہر ہے کہ جس شخص میں "خیر" کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو سکتا ہو اس کی طرف اخروی فضیلت کی نسبت بھی کسی طرح نہیں کی جا سکتی چنانچہ بعض علماء نے تو یہاں تک کہا ہے کہ جس مسلمان نے اپنی زبان سے یوں کہا کہ اَلنَّصْرَانِيُّ خَيْرٌ مِّنَ الْيَهُوْدِيِّ (یعنی عیسائی، یہودی سے افضل ہے) تو اس کے بارے میں خوف ہے کہ وہ دائرہ کفر میں داخل نہ ہو گیا ہو کیونکہ اس نے اس جملہ کے ذریعہ گویا ان لوگوں میں "خیر" کا وجود ثابت کیا جن میں سرے سے "خیر" کا وجود ہی نہیں ہو سکتا، تاہم اس پر کفر کا اطلاق، جزم کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ بعض موقعوں پر لفظ کے ذریعہ (اخروی سعادت و بھلائی کے بجائے) "حق کے زیادہ قریب" کا مفہوم بھی مراد لے لیا جاتا ہے (اور ہو سکتا ہے کہ مذکورہ جملہ ادا کرنے والے نے لفظ خیر کو اسی مفہوم میں استعمال کیا ہو)

اہل بیت نبوی ﷺ کے فقر کی مثال

⑦ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَاشَبِعَ اٰلُ مُحَمَّدٍ مِنْ خُبْزِ الشَّعِيْرِ يَوْمَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ حَتّٰى قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ محمد ﷺ کے اہل بیت (یعنی ازواج مطہرات اور متعلقین) نے دو روز مسلسل جو کی روٹی سے پیٹ بھرا ہو (چہ جائیکہ گیہوں کی روٹی سے) یہاں تک کہ رسول کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: دو روز مسلسل سے یہ واضح ہوا کہ حضور ﷺ اور آپ کے اہل بیت کا معمول یہی تھا کہ اگر ایک دن پیٹ بھر کر کھایا تو دوسرے دن بھوکے رہے، اور یہ اس وجہ سے تھا کہ حضور ﷺ نے خوشحالی و ترفہ کی زندگی پر فقر و افلاس کی زندگی کو ترجیح دی تھی، اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو دنیا بھر کے خزانوں کی پیش کش ہوئی اور حکم ہوا اگر آپ ﷺ کہیں تو مکہ کے پہاڑوں کو آپ ﷺ کے لئے سونے میں تبدیل کر دیا جائے تو حضور ﷺ نے دنیا بھر کے خزانوں اور سونے کے پہاڑوں کو تبدیل کرنے کے بجائے فقر اور تنگدستی ہی کو اختیار کیا اور فرمایا کہ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن پیٹ بھروں اور ایک دن بھوکا رہوں، تاکہ جس دن پیٹ بھروں اس دن خدا کا شکر ادا کروں اور جس دن بھوکا رہوں اس دن صبر کروں۔

مذکورہ بالا حدیث سے بعض لوگوں کے اس قول کی تردید ہو جاتی ہے کہ حضور ﷺ اپنی زندگی کے آخری حصہ میں غنی و مالدار ہو گئے تھے، کیونکہ اگر حضور ﷺ اپنی آخر عمر میں واقعتاً غنی ہو گئے تھے تو پھر حضرت عائشہؓ کے اس کہنے کے کیا معنی ہوں گے کہ حضور ﷺ کے اہل بیت کا حضور ﷺ کی وفات تک یہی معمول رہا کہ انہوں نے کبھی مسلسل دو دن تک جو کی روٹی سے پیٹ نہیں بھرا؟ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ جب آخری زمانۂ نبوی میں اسلام کو طاقت اور غلبہ ملا اور مجاہدین اسلام نے مختلف علاقوں کو فتح کیا تو اس صورت میں مال غنیمت کا مقررہ حصہ حضور ﷺ کو بھی ملا، اور تھوڑا بہت مال آپ ﷺ کے پاس آتا رہا، مگر روایات صحیحہ شاہد ہیں کہ حضور ﷺ نے اس مال کو بھی اپنے پاس کبھی نہیں رکھا، بلکہ جس طرح آتا اسی طرح اس کو اپنے پروردگار کی خوشنودی کی راہ میں خرچ کر دیتے اور خود ہمیشہ کی طرح خالی ہاتھ رہ جاتے، البتہ دل کا غنا اور بڑھ جاتا! حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی حالت یہ تھی کہ مسلسل کئی کئی راتیں بھوک میں گذار دیتے تھے، حضور ﷺ اور اہل بیت کو رات کا کھانا میسر نہیں ہوتا تھا اور (وقتاً فوقتاً) کھانا میسر ہونے کی صورت میں بھی) آپ ﷺ کے دسترخوان پر عام طور سے جس چیز کی روٹی ہوتی تھی وہ جو تھا۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوئی کہ ہمارے زمانہ کے غریب و نادار لوگوں اور فقراء میں سے کوئی بھی شخص اتنی سخت زندگی نہ تو گزارتا ہے اور نہ گذار سکتا ہے جتنی سخت زندگی حضور ﷺ گزراتے تھے، اور یہ شان اس ذات گرامی کی تھی جو نہ صرف افضل البشر بلکہ افضل الانبیاء ہے جس کے چشم و ابرو کے اشارے پر دنیا بھر کی نعمتیں اس کے قدموں میں آسکتی تھیں! پس حضور ﷺ کے اس طرز زندگی میں غریب و نادار مسلمانوں کے لئے بڑی تسلی و اطمینان کا سامان پوشیدہ ہے۔

واضح رہے کہ حضور ﷺ کا اس قدر فقر و افلاس کی زندگی گذارنا اور بھوک کی صعوبت کو برداشت کرنا کوئی اضطرار و مجبوری کے درجہ کی چیز نہیں تھی بلکہ یہ اپنے قصد و اختیار کا نتیجہ تھا کہ آپ ﷺ چونکہ دنیا کی لذات اور نعمتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے، قوت لایموت پر قناعت کرتے اور اپنی اور اپنے اہل بیت کی ضروریات پر فقراء و مساکین اور دیگر ضرورتمندوں کی ضروریات کو ترجیح دے کر ایثار نفس پر عمل پیرا تھے اس لئے آپ ﷺ اتنی سخت زندگی گذارا کرتے تھے۔

اتباع نبوی ﷺ کی اعلیٰ مثال

⑧ وَعَنْ سَعِيْدِ نِ الْمَقْبُرِيِّ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّهٗ مَرَّ بِقَوْمٍ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ شَاةٌ مُّصْلِيَّةٌ فَدَعَوْهُ فَاَبٰى اَنْ يَّاْكُلَ وَقَالَ خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الدُّنْيَا وَلَمْ يَشْبَعْ مِنْ خُبْزِ الشَّعِيْرِ۔ (رواه البخاری)

"اور حضرت سعید مقبری (تابعیؒ) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ (ایک دن) وہ (حضرت ابوہریرہؓ) کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے (جو ایک جگہ کھانے کے دسترخوان پر جمع تھے) اور ان کے سامنے بھنی ہوئی بھری بکری رکھی تھی، انہوں نے (کھانے کے لئے) حضرت ابوہریرہؓ کو بھی بلایا، لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور (اپنے نہ کھانے کے عذر میں) فرمایا کہ رسول کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے اور کبھی آپ ﷺ نے جو کی روٹی سے بھی اپنا پیٹ نہیں بھرا لہذا یہ کیسے گوارا ہو سکتا ہے کہ میں بھنی بکری جیسی لذیذ غذا سے اپنا پیٹ بھروں جب کہ حضور ﷺ کو پیٹ بھر جو کی روٹی بھی میسر نہ ہوتی تھی۔" (بخاریؒ)

حضور ﷺ کی معاشی زندگی پر قرض کا سایہ

⑨ عَنْ اَنَسٍ اَنَّهٗ مَشٰى اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِخُبْزِ شَعِيْرٍ وَاِهَالَةٍ سَنِخَةٍ وَلَقَدْ رَهَنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دِرْعًا لَهٗ بِالْمَدِيْنَةِ عِنْدَ يَهُوْدِيٍّ وَاَخَذَ مِنْهُ شَعِيْرًا لِاَهْلِهٖ وَلَقَدْ سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ مَا اَمْسٰى عِنْدَ اٰلِ مُحَمَّدٍ صَاعُ بُرٍّ وَّلَا صَاعُ حَبٍّ وَاِنَّ عِنْدَهٗ لَتِسْعَ نِسْوَةٍ۔ (رواه البخاری)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں جو کی روٹی اور ایسی چربی لے کر آئے جو زیادہ دن رکھی

رہنے کی وجہ سے بدبودار ہوگئی تھی۔ نیز (حضرت انسؓ ہی نے) بیان کیا کہ، نبی کریم ﷺ نے (ایک مرتبہ) اپنی زرہ مدینہ میں ایک یہودی کے پاس گروی رکھ کر اس سے اپنے اہل بیت کے لئے کچھ جو لئے۔" حضرت انسؓ سے روایت کرنے والے نے یہ بھی بیان کیا کہ میں نے حضرت انسؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ محمد ﷺ کے اہل بیت کی ایسی کوئی شام نہیں ہوتی تھی جس میں ان کے پاس ایک صاع گیہوں یا کوئی اور غلہ رہتا ہو جب کہ حضور ﷺ کے نو بیویاں تھیں۔" (بخاریؒ)

تشریح: روایت کے آخری الفاظ کے ذریعہ یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ حضور ﷺ نے اپنے اہل بیت کے لئے کسی رات میں آنے والے دن کے لئے کسی طرح کا غلہ رکھ چھوڑا ہو باوجودیکہ آپ کے نو بیویاں تھیں اور ان کی غذائی ضروریات کے لئے تھوڑا بہت غلہ ہر وقت آپ ﷺ کے یہاں رہنا چاہئے تھا۔

جہاں تک ایک یہودی سے حضور ﷺ کے قرض لینے کی بات ہے تو اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر آپ کسی مسلمان سے قرض لیتے تو مسلمان پر آپ ﷺ کا حال ظاہر ہوتا اور وہ آپ ﷺ کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرتے جب کہ آپ ﷺ اس بات کو ہرگز پسند نہیں فرماتے تھے کہ آپ ﷺ کی ضروریات زندگی کا بار مسلمانوں کے کاندھوں پر پڑے اور وہ خواہ خوشی یا کسی گرانی کے ساتھ اور شرم حضوری میں آپ ﷺ کو کچھ دیں! لیکن یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ حضور ﷺ کا کسی مسلمان کی بجائے ایک یہودی سے قرض لینا دراصل اس بات سے انتہائی تنزہ اور کامل احتیاط کے پیش نظر تھا کہ حضور اپنی اُمّت کے لوگوں سے کسی "اجر و معاوضہ" کے طلب گار ہوں خواہ وہ (اجر و معاوضہ کے اعتبار سے نہ ہو بلکہ محض صورۃً ہو (جیسا کہ مثلاً قرض کی صورت، کہ اگر آپ ﷺ کسی مسلمان سے قرض لیتے تو اس پر اجر و معاوضہ کا اطلاق نہ ہوتا، مگر ممکن تھا کہ کسی نہ کسی درجہ میں نفع اٹھانے کی وجہ سے اس پر بھی صورتاً اجر و معاوضہ کا اطلاق ہو جاتا، اس لئے آپ ﷺ احتیاطاً اس کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ کسی مسلمان سے قرض ہی کی صورت میں کوئی مالی فائدہ حاصل کریں) چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ۔

حضور ﷺ کے اس کمال احتیاط کی ایک نظیر ہمارے امام، امام اعظم ابوحنیفہؒ کی زندگی میں بھی ملتی ہے، چنانچہ ان کے بارے میں منقول ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کی دیوار کے سایہ سے بھی فائدہ نہیں اٹھاتے تھے جس پر ان کا کوئی قرض ہوتا تھا اور ان کی یہ احتیاط اس حدیث کے پیش نظر ہوتی تھی کل قرض جر منفعة فهو ربوا (یعنی جو بھی قرض کوئی منفعت کھینچ کر لائے وہ سود ہے۔

مذکورہ بالا حدیث کے ضمن میں ایک اشکال واضح ہوتا ہے اور وہ یہ کہ بعض صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کی بقدر کفایت لازمی ضروریات کی بعض چیزیں ایک سال کے لئے اکٹھا بھروا کر رکھ دی تھیں، جب کہ یہاں جو حدیث نقل کی گئی ہے اس سے اس کے برعکس ثابت ہوتا ہے؟ اس کا جواب علماء یہ بیان کرتے ہیں کہ حقیقت تو یہی ہے کہ شروع میں بہت کافی عرصہ تک، جب کہ آپ ﷺ کی معاشی زندگی پر فقر کا زیادہ غلبہ تھا آپ ﷺ اس معمول پر قائم تھے کہ کبھی کسی چیز کا ایک دن کے لئے بھی ذخیرہ نہیں کیا، جس دن جو کچھ میسر ہو گیا وہ اس دن کی غذائی ضروریات میں کام آ گیا، اگلے دن کے لئے قناعت و توکل کے علاوہ کچھ پاس نہیں رہا، ہاں بعد میں جب معاشی حالت کچھ بہتر ہوئی اور آمدنی میں کچھ وسعت ہوئی تو آپ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کے لئے ایک سال کی غذائی ضروریات کے بقدر غلہ کہ جو حد کفایت سے متجاوز نہیں تھا، اکٹھا بھروا دیا تھا! بعض حضرات نے ان دونوں طرح کی روایتوں میں اس طور پر مطابقت پیدا کی ہے کہ اٰلِ مُحَمَّدٍ میں لفظ آل زیادہ ہے جیسا کہ اہل عرب کے اسلوب کلام میں یہ بھی پایا جاتا ہے کہ وہ (آل فلاں) بول کر اس کے لفظی معنی "فلاں کے اہل بیت" کے بجائے صرف اس فلاں کی ذات کو مراد لیتے ہیں مثلاً اگر وہ یہ کہتے ہیں لہ آل زید (یعنی زید کے گھر والوں) کے پاس چند روپے بھی نہیں ہیں تو اس جملہ سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ خاص طور پر زید کے پاس چند روپے بھی نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ بات بعید از حقیقت نہیں ہو سکتی کہ کبھی کبھی دو دو روز مسلسل جو کی روٹی سے پیٹ نہ بھرنے یا اگلے دن کے لئے غلہ وغیرہ جمع نہ رکھنے کی بات خاص طور سے آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک سے تعلق رکھتی ہو یعنی ایسا کبھی نہیں ہوا کہ خود

آپ ﷺ نے مسلسل دو دن تک پیٹ بھر کر نہ کھایا ہو یا خاص اپنی ذات کے واسطے آنے والے ایک آدھ دن کے لئے رکھ چھوڑا ہو! ہاں اگر آپ ﷺ نے کبھی کبھار ایسا کیا ہو کہ اپنی ازواج مطہرات کے لئے کچھ دنوں یا ایک آدھ سال کی غذائی ضروریات کے بقدر غلہ وغیرہ بھروا کر رکھ دیا ہو تو یہ اس بات کے منافی نہیں ہے۔

دنیا کی طلب مؤمن کی شان نہیں

(۱۰) وَعَنْ عُمَرَ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِذَا هُوَ مُضْطَجِعٌ عَلٰى رِمَالِ حَصِيْرٍ لَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهٗ فِرَاشٌ وَقَدْ اَثَّرَ الرِّمَالُ بِجَنْبِهٖ مُتَّكِئًا عَلٰى وِسَادَةٍ مِنْ اَدَمٍ حَشْوُهَا لِيْفٌ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ادْعُ اللّٰهَ فَلْيُوَسِّعْ عَلٰى اُمَّتِكَ فَاِنَّ فَارِسَ وَالرُّوْمَ قَدْ وُسِّعَ عَلَيْهِمْ وَهُمْ لَا يَعْبُدُوْنَ اللّٰهَ فَقَالَ اَوَفِيْ هٰذَا اَنْتَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ اُولٰئِكَ قَوْمٌ عُجِّلَتْ لَهُمْ طَيِّبَاتُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِيْ رِوَايَةٍ اَمَا تَرْضٰى اَنْ تَكُوْنَ لَهُمُ الدُّنْيَا وَلَنَا الْاٰخِرَةُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ (ایک دن) میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضور ﷺ کھجور کے پات کی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے، آپ ﷺ کے بدن مبارک اور چٹائی کے درمیان کوئی بچھونا وغیرہ نہیں تھا جس کی وجہ سے حضور ﷺ کے پہلوئے مبارک پر چٹائی نے بدھیاں ڈال دی تھیں، نیز آپ ﷺ نے سر مبارک کے نیچے جو تکیہ رکھ رکھا تھا وہ چمڑے کا تھا اور اس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، میں نے (سرکار دو عالم کو اس حالت میں دیکھ کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے دعا کیوں نہیں فرماتے کہ وہ آپ ﷺ کی اُمت کو مالی وسعت و فراخی عطا فرمائے؟ فارس اور روم کے لوگوں کو کس قدر وسعت و فراخی عطا کی گئی ہے حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی نہیں کرتے! حضور ﷺ نے فرمایا۔ "ابن خطاب! یہ تم کیا کہہ رہے ہو، کیا تم ابھی تک اسی جگہ ہو (جہاں سے تم شروع میں چلے تھے اور اتنے عرصہ کے بعد بھی تمہارے انداز فکر اور سوچنے سمجھنے کا معیار اتنا آگے نہیں بڑھا جو تم حقیقت تک پہنچ سکو؟ یاد رکھو) یہ اہل فارس و روم اور تمام کفار) وہ لوگ ہیں جن کو تمام نعمتیں اور خوبیاں بس ان کی دنیاوی زندگی ہی میں دے دی گئی ہیں (جب کہ ہمیشہ کی زندگی یعنی آخرت میں ان کو فقر و افلاس، ذلت و خواری اور خسران و نقصان کے سوا کچھ نہیں ملے گا)" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "کیا تم اس پر راضی و مطمئن نہیں ہو کہ ان (اہل فارس و روم اور دیگر کفار) کو دنیا ملے (جو فناہ ہو جانے والی ہے) اور ہمیں آخرت ملے (جو اپنی تمام تر نعمتوں کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے" یعنی وہی چٹائی سرکار دو عالم ﷺ کا بستر تھا جس کو چارپائی پر ڈال کر اس پر آپ لیٹے ہوئے تھے یا وہ چٹائی زمین پر بچھی ہوئی تھی اور آپ اسی کھری چٹائی پر استراحت فرما رہے تھے! اور بعض عبارتوں سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی جو چارپائی تھی وہی کھجور کی رسیوں سے بنی ہوئی تھی جیسا کہ چارپائیوں کو بان سے بنا جاتا ہے۔

"رمال" (راء کے پیش اور زبر دونوں کے ساتھ) اصل میں رمل کی جمع ہے اور مرمول (یعنی بنے ہوئے کے) معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ مخلوق کے معنی میں خُلقٌ استعمال ہوتا ہے۔

"لیف" (لام کے زیر اور راء کے جزم کے ساتھ) کھجور کی چھال کو کہتے ہیں! حاصل یہ کہ حضور ﷺ کا جو تکیہ مبارک تھا وہ چمڑے کا تھا اور اس میں روئی وغیرہ کے بجائے کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، چنانچہ جو لوگ غریب و نادار ہوتے ہیں، روئی وغیرہ کا تکیہ بنانا ان کی استطاعت سے باہر ہوتا ہے وہ کھجور کی چھال کو کوٹ کر نرم کر لیتے ہیں اور اس کو تکیہ میں بھر لیتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے اُمت کے حق میں مالی وسعت اور رزق کی فراخی کی دعا کے لئے حضور ﷺ سے جو درخواست کی، اس کی وجہ یہ تھی کہ جب انہوں نے دیکھا کہ حضور ﷺ فقر کو اختیار کر کے اتنی سخت زندگی گذار رہے ہیں اور اپنے آپ کو اس حال میں رکھے ہوئے ہیں تو انہوں نے سوچا کہ اگر پوری اُمت بھی اسی فقر و افلاس میں مبتلا رہی اور اس کو معاشی زندگی کی غربت و دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تو

اس اُمت کے وہ لوگ جو مضبوط عقیدہ و مزاج کے نہیں ہوں گے، اتنی سخت زندگی کی تاب نہیں رکھ پائیں گے اور ناقابل برداشت دشواریوں میں مبتلا ہو جائیں گے لہٰذا انہوں نے ایسے لوگوں کے مناسب حال یہی جانا کہ انہیں مالی وسعت وفراخی عطا ہو جائے۔

لیکن طیبیؒ یہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا اصل مقصد خود حضور ﷺ کی ذات کے لئے مالی وسعت و فراخی کی خواہش کرنا تھا، مگر انہوں نے اس بات کو آنحضرت ﷺ کی شان عظمت کے مناسب نہیں سمجھا کہ براہ راست حضور ﷺ کے لئے اس ادنی اور ناپاک دنیا کی طلب کو ظاہر کریں، جیسا کہ ایک اور روایت میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ ﷺ ایک نہایت گرم اور تنگ و تاریک کوٹھری میں ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں انہوں نے کوٹھری کے کونوں میں نظر دوڑائی تو دیکھا کہ بس چمڑے کے دو چار ٹکڑے اور ایک دو باسن پڑے ہوئے ہیں، حضور ﷺ کی غربت و خستہ حالی کا یہ منظر دیکھ کر حضرت عمرؓ رونے لگے، حضور نے پوچھا کہ "ابن خطاب! کیوں رو رہے ہو؟" انہوں نے کہا یا رسول اللہ! حضور کی حالت دیکھ کر رو رہا ہوں کہ آپ ﷺ خدا کے رسول ہوتے ہوئے اس حالت میں پڑے ہوئے ہیں، اور قیصر و کسریٰ (جو خدا کے نافرمان و سرکش بندے ہیں) کس قدر ناز و نعم اور عیش و راحت کی زندگی گزار رہے ہیں۔"

اس کے بعد روایت کے وہی الفاظ ہیں جو اَوَفِیْ هٰذَا یَاابْنَ الْخَطَّابِ سے آخر تک، اوپر حدیث میں نقل ہوئے ہیں! طیبیؒ کی یہ وضاحت بھی اگرچہ حقیقت کے بہت زیادہ قریب ہے لیکن خود حضرت عمرؓ کے الفاظ فَاِنَّ فَارِسَ وَرُوْمَ قَدْ وُسِّعَ عَلَیْهِمْ کے پیش نظر پہلی توضیح زیادہ مناسب ہے۔

اصحاب صفہ کی ناداری

⑪ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ لَقَدْ رَأَیْتُ سَبْعِیْنَ مِنْ اَصْحَابِ الصُّفَّةِ مَامِنْهُمْ رَجُلٌ عَلَیْهِ رِدَاءٌ اِمَّا اِزَارٌ وَاِمَّا کِسَاءٌ قَدْ رَبَطُوْا فِیْ اَعْنَاقِهِمْ فَمِنْهَا مَایَبْلُغُ نِصْفَ السَّاقَیْنِ وَمِنْهَا مَایَبْلُغُ الْکَعْبَیْنِ فَیَجْمَعُهُ بِیَدِهٖ کَرَاهِیَةَ اَنْ تُرٰی عَوْرَتُهٗ۔ (رواه البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے اصحاب صفہ میں سے ستر افراد کو دیکھا جن میں سے کوئی شخص ایسا نہیں تھا کہ اس کے پاس کوئی چادر ہو (جس کو وہ دوسرے کپڑے کے اوپر اوڑھ لے یا کاندھوں پر ڈال لے، گویا ان کو صرف ایک کپڑے کے علاوہ اور کوئی کپڑا میسر نہیں تھا اور وہ کپڑا (بھی) یا تو تہبند تھا یا کملی تھی، جس کو وہ اپنی گردنوں میں باندھ لیتے تھے (اور اس کے ذریعہ اپنے جسم و ستر کو ڈھانکتے تھے) ان تہبند اور کملیوں میں سے بعض ایسے تھے جو صرف آدھی پنڈلیوں تک آتے تھے اور بعض ایسے تھے جو دونوں ٹخنوں تک پہنچ جاتے تھے، چنانچہ جب کوئی شخص سجدہ میں جاتا (یا گھٹنے اٹھا کر بیٹھتا) تو وہ اس خوف سے کہ کہیں اس کا ستر نہ کھل جائے اپنے اس تہبند یا کملی کو ہاتھ سے پکڑے رہتا تھا۔" (بخاریؒ)

اپنی اقتصادی حالت کا موازنہ اس شخص سے کرو جو تم سے بھی کمتر درجہ کا ہے

⑫ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا نَظَرَ اَحَدُکُمْ اِلٰی مَنْ فُضِّلَ عَلَیْهِ فِی الْمَالِ وَالْخَلْقِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی مَنْ هُوَ اَسْفَلَ مِنْهُ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ اُنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ هُوَ اَسْفَلَ مِنْکُمْ وَلَا تَنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ هُوَ فَوْقَکُمْ فَهُوَ اَجْدَرُ اَنْ لَّا تَزْدَرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "تم میں سے جو شخص کسی ایسے آدمی کو دیکھے جو اس سے زیادہ مالدار اور اس سے زیادہ اچھی شکل و صورت کا ہو (اور اس کو دیکھ کر اپنی حالت پر رنج و حسرت ہو، خدا کا شکر ادا کرنے میں سستی و کوتاہی واقع ہوتی ہو اور اس آدمی کے تئیں رشک و حسد کے جذبات پیدا ہوتے ہوں) تو اس کو چاہئے کہ وہ اس آدمی پر نظر ڈالے جو اس سے کمتر درجہ کا ہے (تاکہ

اس کو دیکھ کر اپنی حالت پر خدا کا شکر ادا کرے اور نعمت عطا کرنے والے پروردگار سے خوش ہو۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تم اس شخص کو دیکھو جو مرتبہ میں تم سے کمتر ہے اس شخص کی طرف نہ دیکھو جو مرتبہ میں تم سے بڑا ہے، پس ایسا کرنا تمہارے لئے نہایت مناسب ہے تاکہ تم اس نعمت کو، جو خدا نے تمہیں دی ہے، حقیر نہ جانو۔"

تشریح: معاشرہ کے افراد کو دنیاوی مال ومتاع اور جاہ وحشمت کے تئیں باہمی بغض وحسد، رشک وحسرت اور بددلی ومایوسی سے بچانے کے لئے حضور ﷺ نے بڑا نفسیاتی طریقہ تجویز فرمایا ہے! یہ انسان کی جبلت ہے کہ جب وہ کسی شخص کو اپنے سے زیادہ مالدار اور اپنے سے زیادہ اچھی حیثیت وحالت میں دیکھتا ہے تو یا اس کے اندر اس طرح کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جو اس کو بددل ومایوس، رنج خور وحسرت زدہ اور تقدیر الٰہی کا شاکی بنا دیتے ہیں یا پھر اس کے اندر حسد وجلن، اور نارو امسابقت کا مادہ پیدا کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ جائز وناجائز ہر طرح سے اپنے آپ کو اوپر لے جانے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح معاشرہ میں عجیب قسم کی "جنگ زرگری" اور نقصان دہ سماجی ومعاشی دوڑ شروع ہو جاتی ہے! چنانچہ حضور ﷺ نے اس صورت حال سے بچنے کے لئے مذکورہ بالا ہدایت فرمائی جس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی ایسے آدمی کو دیکھے کہ جو اس سے زیادہ مالدار ہو، اس سے زیادہ اچھی شکل وصورت کا ہو، اس سے زیادہ جاہ وحشمت رکھتا ہو اور اس سے زیادہ اچھے لباس اور زیادہ اچھے مکان میں رہتا ہو، نیز وہ اس حقیقت سے بے خبر ہو کہ اس آدمی کو حاصل شدہ یہ تمام دنیاوی خوبیاں دراصل آخرت کے اعتبار سے اس کے حق میں وبال کا درجہ رکھتی ہیں کہ وہ انہی چیزوں کی وجہ سے آخرت میں مواخذہ وعذاب کا مستوجب ہو گا تو اس شخص کو چاہئے کہ وہ اس آدمی کی طرف نظر کرے جو مال ومنال وشکل وصورت اور دنیاوی حیثیت وعزت کے اعتبار سے اس سے کمتر درجہ کا ہے، لیکن اپنے عقیدہ وخیال اور گفتار وکردار کے اعتبار سے آخرت میں درجہ عالی کا مستحق ہے۔ اس حدیث کے بین السطور سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ معاشرہ میں اکثریت ایسے افراد کی ہوئی ہے جو اقتصادی وسماجی طور پر اعتدال کی حالت میں ہوتے ہیں یعنی کہ نہ تو زیادہ اونچے درجہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ بہت نیچے درجہ سے تعلق رکھتے ہیں (معروف اصطلاح میں ایسے لوگوں کو "درمیانہ طبقہ" کہا جاتا ہے) یہ اور بات ہے کہ وہ حالت اعتدال یکساں نوعیت نہ رکھتی ہو، بلکہ ایسا ہو کہ کوئی شخص کسی کی بہ نسبت معتدل حالت رکھتا ہو اور کوئی شخص کسی کی بہ نسبت! لہٰذا جس شخص نے اپنے سے برتر کی طرف دیکھ کر اپنے سے کمتر کی طرف نظر ڈالی وہ یقیناً اچھی حالت کا حامل ہو گا۔

اس حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ بفرض محال کوئی شخص ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے اپنے معاشرہ کے تمام ہی لوگوں پر فضیلت وبرتری رکھتا ہو تو اس کے لئے یہ مناسب نہیں ہو گا کہ وہ ان لوگوں کی طرف دیکھے جو اس سے کمتر درجہ کے حامل ہیں، کیونکہ اس صورت میں بعید نہیں کہ اس کے اندر عجب وغرور اور اظہار فخر کا مادہ پیدا ہو جائے لہٰذا اس پر واجب یہ ہو گا کہ وہ جس خدا تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہے اور اپنی فضیلت وبرتری کو اپنے بلند کردار کے ذریعہ تواضع وانکساری اور خدمت خلق کا ذریعہ بنالے۔

نیز جو شخص ایسا ہو کہ کوئی دوسرا آدمی اس سے زیادہ مفلس وقلاش اور اس سے زیادہ غریب ونادار نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرے کہ اس نے مجھے دنیا کے وبال میں مبتلا نہیں کیا اور دنیا داری کے بکھیڑوں اور اس کے غم وفکر سے محفوظ رکھا! چنانچہ حضرت شبلیؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ جب کسی دنیا دار کو دیکھتے تو (اس کے وبال کے خوف سے) بیساختہ ان کی زبان سے نکلتا۔ "اے اللہ! میں تجھ سے دنیا وآخرت میں عفو وعافیت کا طلب گار ہوں۔"

غربت وافلاس کی تنگی وسختی اور فقر وفاقہ کی صعوبتیں حقیقت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے، اس کا اندازہ اس حکایت سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک دن ایک بہت بزرگ وولی اور عارف باللہ اپنی مجلس میں حاضرین کو وعظ ونصیحت سے مستفید فرما رہے تھے کہ ایک نہایت مفلس ونادار شخص کھڑا ہوا اور شکوہ کرنے لگا کہ حضرت! میں نے اتنے طویل عرصہ سے نہ تو کسی کے سامنے اور نہ کسی سے

چھپ کر کچھ کھایا پیا ہے اور نہایت اخلاص اور کمال استقامت کے ساتھ شدت بھوک کی صعوبتوں کو برداشت کر رہا ہوں۔" ان بزرگ نے فرمایا۔ "ارے دشمن خدا! تو کتنا بڑا جھوٹ بول رہا ہے؟" تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ شدت بھوک کی صعوبت میں اپنے انہی بندوں کو مبتلا کرتا ہے جو اس کے رسول، نبی اور ولی ہوتے ہیں، اگر تو ایسے ہی بندگان خدا میں سے ہوتا تو اس پوشیدہ راز کو ہرگز ظاہر نہ کرتا اور خدا کی اس نعمت کو لوگوں سے چھپاتا۔"

ان ساری باتوں کا ماحصل یہ ہے کہ مؤمن کو جب سلامتی طبع اور حسن استقلال کی دولت مل جاتی ہے اور اس کا دین ہر طرح کے نقصان و خلل سے محفوظ ہوتا ہے تو پھر وہ نہ مال و متاع کی پرواہ کرتا ہے اور نہ جاہ و حشمت سے محرومی اس کو ملول کرتی ہے نیز زمانہ حال یا مستقبل میں اس کو جن مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا ہوتا ہے وہ ان کو خدا کی طرف سے ایک ایسی نعمت سمجھ کر کہ جو اس کو آخرت کی سعادتوں اور کامیابیوں سے ہمکنار کرنے والی ہے، صبر و رضا اور شکر و اطمینان کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔ منقول ہے کہ امام غزالی کے ایک مرید کو کسی نے مارا پیٹا اور قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا تو اس نے امام غزالی سے شکایت کی، انہوں نے فرمایا، عزیز من! اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو بس اتنے ہی میں ٹل گئی ورنہ بلا تو کبھی اس سے زیادہ تکلیف دہ صورت میں نازل ہوتی ہے! کچھ دنوں کے بعد وہی مرید کچھ دوسرے لوگوں کے چکر میں پھنس گیا جنہوں نے اس کو ایک کنوئیں میں بند کر دیا، جب وہ کسی طرح سے نجات پاکر حضرت امام موصوف کی خدمت میں پہنچا اور ان سے اس حادثہ کی شکایت کی تو انہوں نے وہی جواب دیا جو پہلے دیا تھا، پھر اتفاق کی بات کہ کچھ عرصہ کے بعد ایک یہودی کے چنگل میں جا پھنسا، اس یہودی نے یہ سلوک کیا کہ اس کو ایک زنجیر میں باندھ کر اپنے پاس ڈال لیا اور ہر لمحہ کوئی نہ کوئی ایذاء اس کو پہنچاتا رہا! اس مرتبہ اس شخص کو نہایت تکلف واذیت کا سامنہ کرنا پڑا اور بہت دل گرفتہ ہوا کہ کیا دنیا بھر کی مصیبتیں میرے ہی لئے رہ گئی ہیں. آخر کار جب اس یہودی سے بھی نجات پاکر امام غزالی کی خدمت میں پہنچا، اور جن مصائب سے دوچار ہوا تھا ان کی شکایت کی، تو حضرت امام موصوف نے پہلے کی طرح پھر صبر و شکر کی تلقین کی! اب بات چونکہ اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تھی لہٰذا نہایت بیقراری کے عالم میں کہنے لگا کہ حضرت! اب تک جن اذیتوں اور تکلیفوں سے دوچار ہو چکا ہوں کیا ان سے بھی زیادہ سخت کوئی بلا باقی رہ گئی ہے؟ حضرت امام غزالی نے جواب دیا۔ "ہاں! اس سے بھی سخت بلا ہے اور وہ یہ کہ (خدانخواستہ) تمہاری گردن میں کفر کا طوق پڑ جائے۔" حاصل یہ کہ انسان کے لئے آفات اور بلاؤں کی کوئی حد نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص کسی آفت و بلا میں مبتلا ہو تو صرف یہ کہ اس کو اس آفت و بلا کا صبر و استقامت کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہئے بلکہ خدا کا شکر بھی ادا کرنا چاہئے کہ اس نے اس سے بھی سخت کسی آفت و مصیبت میں مبتلا نہیں کیا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

جنّت میں فقراء کا داخلہ اغنیاء سے پہلے ہوگا

(۱۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَدْخُلُ الْفُقَرَآءُ الْجَنَّةَ قَبْلَ الْاَغْنِیَاءِ بِخَمْسِ مِائَةِ عَامٍ نِصْفُ یَوْمٍ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "فقراء جنت میں اغنیاء سے پانچ سو سال پہلے داخل ہوں گے جو آدھے دن کے برابر ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "آدھے دن" سے مراد قیامت کا آدھا دن ہے! مطلب یہ ہے کہ وہ پانچ سو سال قیامت کے آدھے دن کے برابر ہوں گے۔ اور قیامت کے دن کی مدت طوالت، دنیاوی شب و روز کے اعتبار سے ایک ہزار سال کے برابر ہو گی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم ہی میں ایک اور جگہ یہ فرمایا ہے کہ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ

خَمۡسِيۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ اور جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا، تو جاننا چاہئے کہ پہلی آیت (کہ جس سے قیامت کے دن کا ایک ہزار سال کے برابر ہونا ثابت ہوتا ہے) عمومیت کی حامل ہے۔ جب کہ یہ دوسری آیت (کہ جس سے قیامت کے دن کا پچاس ہزار سال کے برابر ہونا ثابت ہوتا ہے) ایک خاص نوعیت کی طرف اشارہ کرتی ہے! یعنی اصل بات تو یہی ہے کہ دنیاوی حساب کے اعتبار سے قیامت کا دن ایک ہزار سال کے برابر ہوگا اور اسی کو پہلی آیت کے ذریعہ واضح فرمایا گیا ہے۔ لیکن وہ قیامت کا دن چونکہ سختیوں اور شدت کا دن ہوگا اور جو شخص دنیا میں دین وہدایت سے جتنا دور ہوگا اس کو اس دن کی سختیاں اسی قدر زیادہ محسوس ہوں گی اس لئے کفار کے حق میں اس دن کی سختیاں اس قدر زیادہ ہوں گی کہ اپنی درازی و سختی کے اعتبار سے وہ دن ان کو پچاس ہزار سال کے برابر معلوم ہوگا! یہ دوسری آیت یہی مفہوم بیان کرتی ہے کہ قیامت کا دن (اگرچہ ایک ہزار سال کے برابر ہوگا مگر سختیوں اور شدائد کی بنا پر) کفار کو وہ دن پچاس ہزار سال کے برابر معلوم ہوگا جیسا کہ مؤمنین اور نیک کاروں کے حق میں وہ دن گویا لپیٹ دیا جائے گا کہ ایک ہزار سال کے برابر اس دن کی طوالت ان کو ایک ساعت کے بقدر معلوم ہوگی! اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔ "فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوۡرِ ۝ فَذٰلِكَ يَوۡمَئِذٍ يَّوۡمٌ عَسِيۡرٌ ۝ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ غَيۡرُ يَسِيۡرٍ۔

اس حدیث کے ضمن میں ایک اشکال یہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ حدیث بظاہر اس حدیث کے معارض ہے جو جنت میں فقراء کے پہلے داخل ہونے کی مدت کو چالیس سال ظاہر کرتی ہے؟ لہٰذا شارحین نے ان دونوں حدیثوں میں مطابقت پیدا کرنے کے لئے یہ بیان کیا ہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ پچھلی حدیث میں "اغنیاء" سے مراد "اغنیاء مہاجرین" ہوں (جیسا کہ اس حدیث کی تشریح میں بھی اس طرف اشارہ کیا جا چکا ہے) اس صورت میں اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ فقراء ان اغنیاء سے کہ ان کا تعلق مہاجر صحابہ سے ہے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے، جب کہ یہاں اس حدیث میں "اغنیاء" سے مراد وہ اغنیاء ہیں جو مہاجرین میں سے ہوں گے! اس وضاحت سے دونوں حدیثوں کے درمیان کوئی تعارض و تضاد باقی نہیں رہتا! لیکن جیسا کہ بعض شارحین نے لکھا ہے کہ ان دونوں حدیثوں کے درمیان مذکورہ تعارض کو ختم کرنے کے لئے یہ وضاحت زیادہ مناسب وموزوں ہے کہ دونوں عدد، یعنی چالیس اور پانچ سو سے مراد تحدید نہیں ہے بلکہ مطلقاً اس زمانی فرق کو بیان کرنا مقصود ہے جو جنت میں داخل ہونے کے سلسلہ میں فقراء اور اغنیاء کے درمیان ہوگا، چنانچہ اس فرق کو ظاہر کرنے کے لئے کہ فقراء جنت میں اغنیاء سے پہلے جائیں گے، ازراہ تفنن، کسی موقع پر تو "چالیس سال" فرمایا گیا ہے۔ اور کسی موقع پر "پانچ سو سال" کے الفاظ ذکر فرمائے گئے ہیں جب کہ مقصود دونوں کا ایک ہی ہے! یا یہ کہ پہلے حضور ﷺ کو بذریعہ وحی یہی معلوم ہوا ہوگا کہ جنت میں فقراء کے اغنیاء سے پہلے جانے کی مدت چالیس سال ہوگی، چنانچہ حضور ﷺ نے اس وحی کے مطابق چالیس سال کا ذکر فرمایا، لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی برکت سے فقراء کے حال پر خصوصی فضل فرماتے ہوئے اور ان کی مزید تسلی کے لئے یہ خبر دی کہ فقراء کو جنت میں اغنیاء سے پانچ سو سال پہلے داخل کیا جائے گا، چنانچہ حضور ﷺ نے جب دوسری مرتبہ اس بات کا ذکر کیا تو اس میں پانچ سو سال کا ذکر فرمایا۔ یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں حدیثوں کے مفہوم میں جو اختلاف نظر آتا ہے اس کا تعلق دراصل خود فقراء کی ذات و شخصیت کی غیر یکسانیت سے ہے یعنی ظاہر ہے کہ ہر غریب ونادار اور ہر فقیر مسلمان ایک ہی حالت نہیں رکھتا، بعض فقراء تو ایسے ہوتے ہیں جو صبر ورضا اور شکر کے درجۂ کمال پر ہوتے ہیں، اور بعض فقراء وہ ہیں جن میں صبر ورضا اور شکر کا مادہ کم ہوتا ہے لہٰذا "پانچ سو سال" والی حدیث کا تعلق اول الذکر فقراء سے اور "چالیس سال" والی حدیث کا تعلق موخر الذکر فقراء سے! یہ تاویل زیادہ مناسب اور موزوں بھی ہے اور اس کی تائید جامع الاصول کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے جس میں ان دونوں حدیثوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ جس حدیث میں "چالیس سال" کا ذکر ہے اس کی مراد یہ ہے کہ دنیاوی لذتوں اور نعمتوں کی خواہش رکھنے والا فقیر، حریص غنی سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوگا اور جس حدیث میں "پانچ سو سال" ذکر ہے اس کی مراد یہ ہے کہ دنیاوی لذتوں و نعمتوں سے بالکل بے نیاز اور زاہد فقیر دنیا دار غنی سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہوگا۔

مفلس و مسکین کی فضیلت

(۱۴) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَاَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَاحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ فَقَالَتْ عَآئِشَةُ لِمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنَّهُمْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ قَبْلَ اَغْنِيَآءِهِمْ بِاَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا يَا عَآئِشَةُ لَا تَرُدِّي الْمِسْكِيْنَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ يَا عَآئِشَةُ اَحِبِّي الْمَسَاكِيْنَ وَقَرِّبِيْهِمْ فَاِنَّ اللّٰهَ يُقَرِّبُكِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ اِلٰى قَوْلِهٖ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ دعا فرمائی۔ "اے اللہ! مجھ کو مسکین بنا کر زندہ رکھ، مسکینی ہی کی حالت میں مجھے موت دے اور مسکینوں ہی کے زمرہ میں میرا حشر فرما۔" حضرت عائشہؓ نے حضور ﷺ کو یہ دعا فرماتے ہوئے سنا تو) کہنے لگیں کہ یا رسول اللہ! آپ ایسی دعا کیوں کرتے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "اس لئے کہ مساکین (اپنے دوسرے فضائل و خصوصیات اور حسن اخلاق و کردار کی وجہ سے آخرت کی سعادتوں اور نعمتوں سے تو بہرہ ور ہوں ہی گے لیکن اس سے قطع نظر ان کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ وہ) دولتمندوں سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے! دیکھو عائشہؓ! کسی مسکین کو اپنے دروازہ سے ناامید نہ جانے دینا (بلکہ ہر حالت میں اس کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کرنا) اگرچہ اس کو دینے کے لئے تمہارے پاس کھجور کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ عائشہؓ! (اپنے دل میں) مسکینوں کی محبّت رکھو اور ان کو اپنی (مجلسوں اور محفلوں کی) قربت سے نوازو (یعنی ان کو حقیر و کمتر جان کر اپنے یہاں آنے جانے سے مت روکو) اگر تم ایسا کرو گی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنی قربت سے نوازے گا (کیونکہ فقراء و مساکین کے ساتھ محبت ہمدردی کا برتاؤ کرنا اور ان کو اپنے قریب آنے دینا اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل ہونے کا ذریعہ ہے)۔ ترمذیؒ، بیہقیؒ اور ابن ماجہؒ نے اس روایت کو حضرت ابوسعیدؓ سے صرف زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْن تک نقل کیا ہے (یعنی ان کی روایت میں حضرت عائشہؓ کا سوال و جواب اور حدیث کے باقی جملے نہیں ہیں۔

تشریح: "مسکین" لفظ مسکنت سے نکلا ہے جس کے معنی تواضع کمزوری اور مفلسی کے ہیں! ویسے یہ لفظوں سکون اور سکینة سے بھی مشتق قرار دیا جاسکتا ہے، جس کے معنی وقار، اطمینان اور تقدیر الٰہی کے اقرار و قبول کے ہیں اور یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ شرعی اصطلاح میں مسکین اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس کچھ نہ ہو یا جس کے پاس اتنا نہ ہو جو اس کے اہل و عیال کی ضروریات زندگی کو پورا کر سکے۔

مذکورہ بالا ارشاد گرامی میں اُمّت کے لئے یہ تعلیم و تلقین ہے کہ فقراء و مساکین کی فضیلت کو پہچانا جائے، ان کے ساتھ محبّت و ہمدردی کا برتاؤ کیا جائے اور ان کے ساتھ ہم نشینی و قربت اختیار کی جائے تاکہ ان کی برکت مسلمانوں کو پہنچے! نیز اس حدیث میں فقراء و مساکین کے لئے یہ بڑی تسلی پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے حالات کی تنگی و سختی سے بددل و مایوس نہ ہوں بلکہ اپنے ان بلند درجات سے آگاہ ہو جائیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اس فانی دنیا کی زوال پذیر نعمتوں اور لذتوں سے محرومی کے عوض ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والے جہاں یعنی آخرت کی زندگی کے لئے عطا فرما دیئے ہیں۔

مذکورہ بالا ارشاد گرامی میں اُمّت کے لئے یہ تعلیم و تلقین ہے کہ فقراء و مساکین کی فضیلت کو پہچانا جائے، ان کے ساتھ محبّت و ہمدردی کا برتاؤ کیا جائے اور ان کے ساتھ ہم نشینی و قربت اختیار کی جائے تاکہ ان کی برکت مسلمانوں کو پہنچے! نیز اس حدیث میں فقراء و مساکین کے لئے یہ بڑی تسلی پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے حالات کی تنگی و سختی سے بددل و مایوس نہ ہوں بلکہ اپنے ان بلند درجات سے آگاہ ہو جائیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اس فانی دنیا کی زوال پذیر نعمتوں اور لذتوں سے محرومی کے عوض ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والے جہاں یعنی آخرت کی زندگی کے لئے عطا فرما دیئے ہیں۔

رہی یہ بات کہ حضور ﷺ کا اپنے حق میں "مسکین" بننے کی دعا کرنا کیا مفہوم رکھتا تھا، تو اس بارے میں یہ کہنا مناسب ہے کہ اس دعا سے حضور ﷺ کی مراد یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو بس اتنی روزی دے جو گزارہ کے بقدر ہو اور جس سے زندگی کا وجود باقی رہے، نیز

آپ کو دنیاوی مال و دولت اور اس کی نعمتوں ولذتوں میں مشغول نہ کرے، کیونکہ مال و دولت کی کثرت مقربین کے حق میں سخت وبال کا درجہ رکھتی ہے!" منقول ہے کہ ایک مسلمان بادشاہ کہیں جارہا تھا کہ راستہ میں اس کا گزر فقراء وصالحین کی ایک جماعت پر ہوا، ان لوگوں نے بادشاہ کے تئیں کسی التفات کا اظہار نہیں کیا اور نہ اس کی طرف متوجہ ہوئے، بادشاہ کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی، اس نے پوچھا کہ تم کون لوگ ہو؟ انہوں نے جواب میں جو بات کہی اس کو یہاں نقل کرنا مقصود ہے، انہوں نے کہا۔ "ہم وہ لوگ ہیں کہ جن کے ساتھ محبت، ترک دنیا کا سبب ہے اور جن کے ساتھ عداوت ترک عقبیٰ کا سبب ہے۔" بادشاہ نے یہ جواب سنا تو ان سے داروگیر کئے بغیر آگے بڑھ گیا اور کہنے لگا کہ ہم نہ تمہاری محبت حاصل کر سکتے ہیں اور نہ تمہارے ساتھ عداوت رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا اپنے حق میں مذکورہ دعا فرمانا اور پھر حضرت عائشہؓ کے پوچھنے پر اس دعا کی یہ توجیہہ فرمانا کہ میرا مقصد وہ فضل و شرف حاصل کرنا ہے جو قیامت کے دن فقراء کو حاصل ہوگا وہ دولتمندوں سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے، یہ وہم پیدا کرتا ہے کہ فقراء بلا استثناء تمام دولتمندوں سے پہلے جنت میں جائیں گے خواہ وہ (دولتمند) انبیاء ہی کیوں نہ ہوں! لیکن اس سلسلہ میں زیادہ قوی بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی مذکورہ دعا اور اس کی توجیہہ میں مذکورہ ارشاد کا اصل مقصد ایک تو محض، فقراء ومساکین کے فضل و شرف کو ظاہر کرنا ہے، اور دوسرے اپنی اس طلب وخواہش کو ظاہر کرنا ہے کہ مجھے تمام انبیاء سے پہلے جنت میں داخل ہونے کی سعادت حاصل ہو خواہ وہ انبیاء دولتمند ہوں یا فقراء! پس حضور ﷺ کا اپنے بارے میں فقروفاقہ کی زندگی کی دعا کرنا فقراء غیر انبیاء سے پیچھے رہ جانے کے خوف سے نہیں بلکہ ان انبیاء سے پیچھے رہ جانے کے خوف کی بناء پر تھا جن کی زندگی فقروفاقہ سے معمور تھی! اس وضاحت سے مذکورہ بالا وہم محل نظر ہو جاتا ہے۔

یاعائشة الا تردی المسکین الخ (عائشہؓ! کسی مسکین کو اپنے دروازہ سے ناامید نہ جانے دینا الخ) کے ذریعہ حضور ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو یہ نصیحت فرمائی کہ جو مسکین و فقیر تمہارے پاس اپنی حاجت لے کر آئے اس کو کمتر و حقیر نہ جانو اور اس کو بے مراد واپس نہ کرو، بلکہ اس کے ساتھ محبت ونرمی سے پیش آؤ، ان کی حالت پر رحم کھاؤ اور جو کچھ میسر ہو اس کے دامن مراد میں ڈال دو، خواہ وہ کتنی ہی کمتر چیز کیوں نہ ہو، اور اگر تمہارے پاس ایسی کوئی بھی چیز نہ ہو جس کے ذریعہ تم اس کا سوال پورا کر سکو تو اس صورت میں نہایت نرمی و بھلائی کے ساتھ معذرت کرو اور اس کو اچھے انداز میں واپس کرو۔

ابو الشیخؒ اور بیہقیؒ نے حضرت عطاء بن ابی رباح سے نقل کیا ہے انہوں نے مشہور صحابی حضرت ابوسعیدؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "لوگو" تمہاری تنگدستی وناداری تمہیں اس بات پر نہ اکسانے پائے کہ تم اپنی روزی ناجائز وسائل وذرائع سے حاصل کرنے کی طلب رکھنے لگو، (یعنی اگر خدا نے تمہیں تنگدستی وناداری میں مبتلا کیا ہے تو تم اپنی اس حالت پر صابر و شاکر رہ کر عزم و حوصلہ اور کردار کی پختگی کے ساتھ معاشی شدائد کا مقابلہ کرو، ایسا نہ ہو کہ روزی حاصل کرنے کے لئے ایسے ذرائع اختیار کرو جو شرعی احکام کے خلاف اور انسانی اخلاق و کردار کی عظمت کے منافی ہیں) کیونکہ میں نے رسول کریم ﷺ کو اپنے بارے میں یہ دعا فرماتے سنا ہے کہ "اے اللہ! تو مجھے فقرو ناداری کی حالت میں موت دے، دولتمندی کی حالت میں موت نہ دے، اور میرا حشر مسکینوں کے زمرہ میں فرما"، پس یقیناً سب سے بڑا بدبخت وہ شخص ہے جو دنیا کے فقرو افلاس کا بھی شکار ہو اور آخرت کے عذاب کا بھی مستوجب قرار پائے (یعنی جو شخص فقرو افلاس کی سختیوں سے گھبرا کر ناجائز طور پر اپنی روزی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اس سے بڑا بدنصیب اور کون ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے فقرو افلاس کی وجہ سے دنیا کی نعمتوں سے بھی محروم رہا اور حصول معاش کی راہ میں حرام وناجائز امور کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے آخرت کے عذاب کا بھی مستوجب قرار پایا۔

ملا علی قاریؒ نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ۔ "میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر اس ارشاد گرامی کے علاوہ کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتی تو یہی حدیث اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی تھی کہ صبر کرنے والا فقیر ومسکین، شکر گذار دولت مند سے افضل ہے!

نیز ملا علی قاریؒ نے اس موقع پر ان دو حدیثوں کا بھی ذکر کیا ہے جو فقر و ناداری کے سلسلہ میں عوام میں بہت مشہور ہیں، ان میں سے ایک حدیث اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ وَبِہٖ اَفْتَخِرُ ہے ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ حفاظ حدیث جیسے علامہ عسقلانیؒ وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ یہ حدیث بالکل بے اصل ہے اور اس کی کوئی سند نہیں ہے۔ دوسری حدیث کادا لفقران یکون کفرا ہے اس کے بارے میں محدثین نے وضاحت کی ہے کہ یہ حدیث اول تو یقینی طور پر ضعیف ہے دوسرے اگر اس کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اس کا محمول قلبی فقر و افلاس ہے جو جزع و فزع، شکوہ شکایت، قضا و قدر پر بے اطمینانی اور خدا کی بنائی ہوئی قسمت پر اعتراض کرنے کے باعث ہوتا ہے، ورنہ جہاں تک معاشی فقر و افلاس کا تعلق ہے تو وہ ایک ایسی چیز ہے جو اللہ کی طرف سے انہی بندوں کو نصیب ہوتی ہے جن کو وہ آخرت میں بلند درجات پر پہنچانا چاہتا ہے اس لئے ایک روایت میں فرمایا گیا ہے کہ الفقر شین عندالناس وزین عند اللہ یوم القیمۃ (دیلمی) یعنی فقر و افلاس لوگوں کی نظر میں تو ایک عیب و برائی ہے لیکن قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک زینت دینے والی چیز ہے۔

کمزور و نادار مسلمانوں کی برکت

⑮ وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ ابْغُوْنِیْ فِیْ ضُعَفَاءِ کُمْ فَاِنَّمَا تُرْزَقُوْنَ اَوْ تُنْصَرُوْنَ بِضُعَفَاءِ کُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابو درداءؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تم لوگ مجھے اپنے کمزور لوگوں میں تلاش کرو کیونکہ تمہیں رزق کا دیا جانا۔ یا یہ فرمایا کہ تمہیں اپنے دشمن کے مقابلہ پر مدد کا ملنا انہی لوگوں کی برکت سے ہے جو تم میں کمزور ہیں۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "کمزور لوگوں" سے مراد فقراء و مساکین اور نادار لوگ ہیں اور ان میں تلاش کرنے کا مطلب، ان لوگوں کی مدد و اعانت اور خبر گیری کے ذریعہ ان کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کرنا ہے! یا "کمزور لوگوں" سے مراد "مظلوم" ہیں کہ اگرچہ وہ دولتمند ہی کیوں نہ ہوں اور مطلب ظلم کے پنجہ سے نکلنے میں ان کی ہر طرح مدد کرنا ہے۔ حاصل یہ کہ اس ارشاد گرامی کے ذریعہ حضور ﷺ نے یہ واضح فرمایا ہے کہ اگر تم لوگ میری رضامندی و خوشنودی کے طلب گار ہو تو اپنی مدد و اعانت اور حسن سلوک کے ذریعہ ان لوگوں کی خوشنودی حاصل کرو جو تم میں کمزور نادار ہیں۔

او تنصرون میں لفظ او تنویع کے لئے ہے، اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں اَوْ کے بجائے حرف واؤ ہے، تاہم یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں حرف اَوْ کے ذریعہ راوی کے شک کو ظاہر کرنا مقصود ہے کہ حضور ﷺ نے یا تو لفظ ترزقون فرمایا تھا یا لفظ تنصرون چنانچہ اوپر ترجمہ میں اس احتمال کو مد نظر رکھا گیا ہے۔

"انہی لوگوں کی برکت سے ہے جو تم میں کمزور ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جو کمزور و نادار نظر آتے ہیں اور ہر طرح کی دنیاوی طاقت و حیثیت سے خالی معلوم ہوتے ہیں، ان کا وجود پوری کائنات کے لئے خیر و برکت کا باعث اور ان کے ساتھ احسان و حسن سلوک تمام لوگوں کی بھلائی و بہتری کا ضامن ہوتا ہے کیونکہ ان لوگوں میں وہ بڑے بڑے اقطاب و اوتاد بھی ہوتے ہیں جو اگرچہ دنیاداروں کی نظر میں اپنی اصل حیثیت کے ساتھ متعارف نہیں ہوتے مگر حقیقت میں سارے عالم کا نظم کائنات انہی کی وجہ سے استوار ہوتا ہے بلکہ بعض حالات میں مختلف علاقوں اور آبادیوں کا نظم و انصرام روحانی طور پر خدا کی طرف سے ان کے سپرد ہوتا ہے ان لوگوں کا در و بست ان کے ہاتھ میں رہتا ہے۔

ابن ملکؒ نے اس حدیث کی وضاحت میں لکھا ہے کہ حضور ﷺ کے مذکورہ ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ (اگر مجھ کو پانا چاہتے ہو تو) مجھے اپنے کمزور نادار لوگوں میں تلاش کرو، بایں طور کہ تمہارے اوپر ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں، ان کی محافظت کرو اور ان کی دل جوئی میں مشغول رہو کیونکہ میں ان کے ساتھ بعض اوقات تو جسمانی طور پر ہوتا ہوں دل و جان سے تمام اوقات میں ہوتا ہوں، لہٰذا جس

شخص نے ان کا احترام کیا اس نے گویا میرا اکرام واحترام کیا اور جس شخص نے ان کو (خواہ جسمانی خواہ روحانی طور پر) تکلیف (ایذاء پہنچائی اس نے گویا مجھ کو تکلیف وایذاء پہنچائی! اس کی تائید اس حدیث قدسی سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، من عادلی ولیافقد بارزنی بالحرب (یعنی) جس شخص نے میرے ولی کے ساتھ عداوت ودشمنی اختیار کی وہ گویا مجھ سے لڑنے کے لئے میدان میں آیا۔

(۱۶) وَعَنْ اُمَيَّةَ ابْنِ خَالِدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَسِيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ كَانَ يَسْتَفْتِحُ بِصَعَالِيْكِ الْمُهَاجِرِيْنَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت امیہ ابن خالد ابن عبداللہ ابن اسید نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ (اللہ تعالیٰ سے کفار کے مقابلہ پر) فتح حاصل ہونے کے لئے درخواست کرتے تو فقراء مہاجرین کی برکت کے ذریعہ دعا مانگتے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "صعالیک" صعلوک کی جمع ہے، جیسا کہ عُصفُور کی جمع عصافیر ہے، اور صعلوک کے معنی ہیں فقیر ومسکین اور کمزور ونادار۔

ملا علی قاریؒ نے اس حدیث کا مطلب یہ لکھا ہے کہ حضور ﷺ (کفار سے مقابلہ آرائی کے وقت) اللہ تعالیٰ سے فتح حاصل ہونے کی جو درخواست کرتے اس میں فقراء مہاجرین کا واسطہ اور ان کی دعاؤں کی برکت کا ذریع اختیار فرماتے۔" اس کے بعد انہوں نے ابن ملکؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ سے فقراء مہاجرین کا واسطہ اختیار کر کے فتح کی درخواست فرماتے بایں طور کہ آپ ﷺ اس طرح دعا فرمایا کرتے تھے، اَللّٰهُمَّ انْصُرْنَا عَلَى الْاَعْدَاءِ بِعِبَادِكَ الْفُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِيْنَ

حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ نے بھی یہی مطلب بیان کیا ہے اور پھر لکھا ہے کہ۔ "یہ حدیث فقراء ونادار مسلمانوں کی اس عظمت و فضیلت کو ظاہر کرتی ہے جو سرکار دوعالم ﷺ نے ان کے لئے ثابت فرمائی، چنانچہ آپ نے یہ شرف صرف فقراء ومساکین کو عطا فرمایا کہ ان کی برکت کو واسطہ اور وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے فتح ونصرت کی درخواست کرتے تھے ع

شاہان چہ عجب گر بہ نوازند گدارا

کافروں کی خوشحالی پر رشک نہ کرو

(۱۷) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَغْبِطَنَّ فَاجِرًا بِنِعْمَةٍ فَاِنَّكَ لَا تَدْرِيْ مَاهُوَ لَاقٍ بَعْدَ مَوْتِهٖ اِنَّ لَهٗ عِنْدَ اللّٰهِ قَاتِلًا لَا يَمُوْتُ يَعْنِي النَّارَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "کسی فاجر (یعنی کافر یا فاسق) کو دنیاوی نعمتوں "یعنی جاہ وحشمت اور دولت) سے مالا مال دیکھ کر اس پر رشک نہ کرو کیونکہ تم نہیں جانتے کہ مرنے کے بعد (قبر میں یا حشر میں) اس کو کیا کیا پیش آنے والا ہے (یعنی وہ یہاں تو بے شک دنیاوی نعمتوں سے مالا مال ہے لیکن اس کے برعکس آخرت میں طرح طرح کے عذاب اور سختیوں سے دوچار ہوگا) اور (یاد رکھو) فاجر کے لئے خدا کے یہاں ایک ایسا قاتل ہے جس کو موت اور فنا نہیں ہے۔" اور اس قاتل سے حضور ﷺ کی مراد "آگ" ہے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: "ایک ایسا قاتل ہے الخ" یعنی اللہ تعالیٰ نے کفار وفساق کے لئے ایک ایسی چیز تیار کر رکھی ہے جو ان کو سخت عذاب دے گی، ہلاک کرے گی اور طرح طرح کی اذیت ناکیوں میں مبتلا کرے گی، اور اس چیز کی شان یہ ہے کہ خود اس کو موت وفنا نہیں ہے۔ بلکہ ہمیشہ موجود رہے گی۔

"یعنی النار" کے الفاظ ان راوی کے ہیں جنہوں نے اس حدیث کو حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے اور ان کا نام نامی حضرت عبداللہ ابن ابی مریم ہے، گویا انہوں نے ان الفاظ کے ذریعہ یہ وضاحت کی ہے کہ حضور ﷺ نے لفظ "قاتل" کے ذریعہ جس چیز کی

طرف اشارہ فرمایا ہے وہ دوزخ کی آگ ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ ایسے کافر و فاسق کو دیکھ کر کہ جو زیادہ اولاد رکھتا ہے، یا زیادہ جاہ و حشمت کا مالک ہے یا مال و دولت کی فراوانی رکھتا ہے اور یا دوسری دنیاوی نعمتوں سے مالا مال ہے تو اس پر رشک نہ کیا جائے اور اس تمنا کو اپنے دل میں جگہ نہ دی جائے کہ کاش اسی طرح کی نعمتیں ہمیں بھی حاصل ہوں۔

دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ ہے

⑱ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَسَنَتُهٗ وَاِذَا فَارَقَ الدُّنْيَا فَارَقَ السِّجْنَ وَالسَّنَةَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" یہ دنیا! مؤمن کے لئے قید خانہ اور قحط ہے! جب وہ مؤمن دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو (گویا) قید خانہ اور قحط سے نجات پاتا ہے۔" (شرح السنۃ)

تشریح: قید خانہ اور قحط کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن یہاں ہمیشہ طرح طرح کی تنگی و سختی کا شکار رہتا ہے اور معاشی پریشان حالیوں میں بسر اوقات کرتا ہے اور اگر کسی مؤمن کو یہاں کی خوشحالی میسر بھی ہو تو ان نعمتوں کی بہ نسبت کہ جو اس کو آخرت میں حاصل ہونے والی ہیں، یہ دنیا پھر بھی اس کے لئے قید خانہ اور قحط زدہ جگہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی! یا یہ مراد ہے کہ مخلص و عبادت گذار مؤمن چونکہ اپنے آپ کو ہمیشہ طاعات و عبادات کی مشقتوں اور ریاضت و مجاہدہ کی سختیوں میں مشغول رکھتا ہے۔ عیش و راحت کو اپنی زندگی میں راہ نہیں پانے دیتا اور ہر لمحہ اس راہ شوق پر گامزن رہتا ہے کہ اس محنت و مشقت بھری دنیا سے نجات پاکر دار البقاء کی راہ پکڑے۔ اس اعتبار سے یہ دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ اور قحط زدہ جگہ سے کم صبر آزما نہیں ہوتی، ایک روایت میں یوں فرمایا گیا لا یخلو المؤمن من قلة او علة او ذلة وقد یجتمع للمؤمن الکامل جمیع ذلک یعنی ایسا کوئی مؤمن نہیں جو، یا تو مال کی کمی، یا بیماری اور یا ذلت و خواری سے خالی ہو، اور بعض اوقات مؤمن کامل میں یہ سب چیزیں جمع ہو جاتی ہیں۔

جن کو خدا اپنا محبوب بنانا چاہتا ہے ان کو دنیاوی مال و دولت سے بچاتا ہے

⑲ عَنْ قَتَادَةَ بْنِ النُّعْمَانِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا حَمَاهُ الدُّنْيَا كَمَا يَظَلُّ اَحَدُكُمْ يَحْمِىْ سَقِيْمَهُ الْمَآءَ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت قتادہ ابن نعمانؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو دوست رکھتا ہے تو اس کو دنیا سے بچاتا ہے، جس طرح کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے مریض کو پانی سے بچاتا ہے۔" (احمد)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس طرح تمہارا کوئی عزیز و متعلق جب کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو جائے جس میں پانی کا استعمال سخت نقصان پہنچاتا ہے جیسے استسقاء اور ضعف معدہ وغیرہ، اور تمہیں اس کی زندگی پیاری ہوتی ہے تو تم اس بات کی پوری کوشش کرتے ہو کہ وہ مریض، پانی کے استعمال سے دور رہے تاکہ صحتیابی سے جلد ہمکنار ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ جس بندے کو اپنا محبوب بنانا اور اس کو آخرت کے بلند درجات پر پہنچانا چاہتا ہے اس کو دنیاوی مال و دولت، جاہ و منصب اور اس ہر چیز سے دور رکھتا ہے جو اس کے دین کو نقصان پہنچانے اور عقبیٰ میں اس کے درجات کو کم کرنے کا سبب بنے۔

اشرفؒ نے بھی اسی طرح کی بات کہی ہے اور لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندے کو دنیاوی مال و جاہ اور یہاں کی کوئی ایسی چیز نہیں دیتا جو اس کی دینی و اخروی زندگی کی زینت و خوبی کو داغدار کر دے، تاکہ اس کا دل دنیا اور دنیا کی چیزوں کی محبت و خواہش کے مرض میں مبتلا نہ ہو۔

مال کی کمی، درحقیقت بڑی نعمت ہے

(۲۰) وَعَنْ مَحْمُوْدِبْنِ لَبِيْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اثْنَتَانِ يَكْرَهُهُمَا ابْنُ اٰدَمَ يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَالْمَوْتُ خَيْرٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ مِنَ الْفِتْنَةِ وَيَكْرَهُ قِلَّةَ الْمَالِ وَقِلَّةُ الْمَالِ اَقَلُّ لِلْحِسَابِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت محمود بن لبیدؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "دو چیزیں ایسی ہیں جن کو ابن آدم (انسان) ناپسند کرتا ہے (اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ دونوں چیزیں بہت اچھی ہیں چنانچہ انسان ایک تو موت کو ناپسند کرتا ہے حالانکہ مؤمن کے لئے موت فتنہ سے بہتر ہے، دوسرے مال و دولت کی کمی کو ناپسند کرتا ہے، حالانکہ مال کی کمی حساب کی کمی کا موجب ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: "فتنہ" سے مراد ہے کفر و شرک، اور گناہوں میں گرفتار ہونا، ظالم و جابر لوگوں کا ایسے کام کرنے پر مجبور کرنا جو اسلامی عقائد و تعلیمات کے خلاف ہوں، اور ایسے حالات سے دوچار ہونا جن سے دین و آخرت کی زندگی مجروح ہوتی ہو! حقیقت تو یہ ہے کہ زندگی اور زندہ رہنے کی تمنا تو اسی صورت میں خوب ہے جب کہ خدا اور خدا کے رسولؐ کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے طاعات و عبادات کی توفیق عمل حاصل رہے، راہ مستقیم پر ثابت قدم نصیب ہو، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس دنیا سے ایمان کی سلامتی کے ساتھ رخصت ہو! اگر یہ چیزیں حاصل نہ ہوں اور ایمان کی سلامتی نصیب نہ ہو تو پھر یہ زندگی کس کام کی؟ ظالم و جابر لوگوں کی طرف سے جبر و اکراہ کی صورت میں اگرچہ دل، ایمان، عقیدہ پر قائم رہے مگر زبان سے ایسی بات کا ادا ہونا کہ جو ایمان و عقیدہ کے مناسب و لائق نہیں ہے، یہ بھی ایک "فتنہ" ہی ہے! ہاں اگر فتنہ کا تعلق کسی اور طرح کے دنیاوی ابتلاء و مصائب، زندگی کی سختیوں اور نفس کی مشقت و شدائد سے ہو تو اسی صورت میں زندگی سے نفرت اور موت کی تمنا درست نہیں ہوگی کیونکہ ایسا فتنہ گناہوں کے کفارہ اور اخروی درجات کی بلندی و رفعت کا سبب ہوتا ہے۔

وَقِلَّةُ الْمَالِ اَقَلُّ لِلْحِسَابِ کا مطلب یہ ہے کہ دنیاوی مال و دولت کی کمی، عذاب سے بعید تر اور ہر مسلمان کے لئے بہتر ہے۔ لہٰذا جو مسلمان تنگدست و غریب ہو اس کو خوش ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مال و دولت کی فراوانی سے بچا کر گویا آخرت کے حساب و عذاب سے بچایا ہے! اور ظاہر ہے کہ اس دنیا میں غربت و ناداری کی وجہ سے جو سختیاں اور پریشانیاں برداشت کرنا پڑتی ہیں وہ ان سختیوں اور ہولناکیوں سے کہیں کم اور آسان تر ہیں جو مال و دولت کی فراوانی کے وبال کی وجہ سے آخرت میں پیش آئیں گی۔

حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ نے اس موقع پر بڑی حکمت آمیز بات کہی ہے، انہوں نے ہر طالب حق کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

"عزیز من! یہ سب ایمان کی شاخیں ہیں، جو شخص شارع علیہ السلام کے ارشادات کے مطابق ایمان کو صحیح درست رکھتا ہے وہ یقیناً جانتا ہے کہ شارع نے جو کچھ فرمایا ہے وہ برحق اور عین صداقت ہے، اور اگر وہ شخص عقل سلیم اور صحیح تجربہ رکھتا ہو تو وہ اسی دنیا میں بھی جان لیتا ہے کہ مال و دولت کی فراوانی، اور اس مال و دولت کو حاصل کرنے اور جمع کرنے، نیز اس کے ساتھ تعلق و محبت رکھنے کے سلسلے میں جن مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس قدر ذلت و خواری کا منہ دیکھنا پڑتا ہے، اور جتنی زیادہ محنت اور مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے وہ سب فقر و افلاس کی سختیوں اور پریشانیوں سے کسی طرح کم نہیں! پس (دنیاوی طور پر محنت و مشقت اور ہر طرح کی ذلت و خواری سے بچنے ہی کا نہیں بلکہ) نفس کی پاکیزگی و صفائی (اور اخروی حساب و عذاب سے بچنے نیز درجات کی بلندی و رفعت) کا انحصار اس بات پر ہے کہ مال و دولت کی کثرت سے اپنا دامن بچایا جائے، اس سے قطع کر کے اور قدر کفایت پر قناعت کر کے عزت نفس اور اخلاق و کردار کی بلندی و استقامت کو اختیار کیا جائے۔

ذات رسالت ﷺ سے محبت کا دعویٰ رکھتے ہو تو فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کرو

(۲۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّيْ اُحِبُّكَ فَقَالَ انْظُرْ مَا تَقُوْلُ

فَقَالَ وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاُحِبُّکَ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ قَالَ اِنْ کُنْتَ صَادِقًا فَاَعِدَّ لِلْفَقْرِ تِجْفَافًا لِلْفَقْرِ اَسْرَعُ اِلٰی مَنْ یُّحِبُّنِیْ مِنَ السَّیْلِ اِلٰی مُنْتَھَاہُ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں آپ ﷺ سے (بہت زیادہ) محبّت رکھتا ہوں! حضور ﷺ نے یہ (سن کر) فرمایا کہ دیکھ لو کیا کہہ رہے ہو؟ (یعنی اچھی طرح سوچ لو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، کیونکہ تم ایک بہت بڑی چیز کا دعوی کر رہے ہو، ایسا نہ ہو کہ بعد میں اپنی بات پر پورا نہ اتر سکو) اس شخص نے عرض کیا کہ خدا کی قسم، میں، آپ ﷺ سے محبّت رکھتا ہوں۔ اور تین بار اس جملہ کو ادا کیا! حضور ﷺ نے فرمایا اگر تم (میری محبت کے دعوے میں) سچے ہو تو پھر فقر کے لئے پاکھر تیار کر لو کیونکہ جو شخص مجھ سے محبت رکھتا ہے اس کو فقرو افلاس، اس پانی کے بہاؤ سے بھی زیادہ جلد پہنچتا ہے جو اپنے منتہا کی طرف جاتا ہے۔" اس حدیث کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: "تِجْفَاف" کے معنی ہیں "پاکھر" اور پاکھر اس آہنی جھول کو کہتے ہیں جو میدان جنگ میں ہاتھی گھوڑے پر ڈالی جاتی ہے تاکہ ان کا جسم زخمی ہونے سے بچا رہے جیسا کہ زرہ، سوار سپاہی کے جسم کو نیزہ و تلوار وغیرہ کے زخم سے محفوظ رکھتی ہیں۔ یہاں حدیث میں "پاکھر" کے ذریعہ "صبرو استقامت" کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جس طرح "پاکھر" ہاتھی گھوڑے کے جسم کو چھپاتا ہے۔ اس طرح صبرو استقامت اختیار کرنا، فقرو فاقہ کی زندگی کا سرپوش بنتا ہے! حاصل یہ کہ صبرو استقامت کی راہ پر بہر صورت گامزن رہو، خصوصا اس وقت جب کہ فقرو افلاس تمہاری زندگی کو گھیر لے تاکہ تمہیں مراتب و درجات کی بلندی و رفعت نصیب ہو۔

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص حضور ﷺ کی محبّت سے پوری طرح سرشار ہوتا ہے اس کو فقرو فاقہ کا جلد پہنچنا اور اس پر دنیاوی آفات وبلاؤں اور سختیوں کا کثرت سے نازل ہونا ایک یقینی امر ہے کیونکہ منقول ہے کہ دنیا میں جن لوگوں کو سب سے زیادہ آفات و شدائد کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ انبیاء ہیں ان کے بعد درجہ بدرجہ ان لوگوں کا نمبر آتا ہے جو عقیدہ و عمل کے اعتبار سے اعلی مرتبہ کے ہوتے ہیں۔ پس حضور ﷺ بھی انہی انبیاء میں سے تھے لہذا آپ ﷺ نے اس شخص پر واضح فرمایا کہ اگر واقعتا تم میری محبّت رکھو گے تو میرے تئیں تمہاری محبّت جس درجہ کی ہوگی اسی درجہ کی دنیاوی سختیوں اور پریشانیوں کا تمہیں سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ یہ اصول ہے کہ المرء مع من احب (یعنی جو شخص جس کو دوست رکھتا ہے اسی جیسی حالت میں رہتا ہے۔)

حضرت شیخ عبدالحقؒ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنے اس ارشاد "فقر کے لئے پاکھر تیار کر لو" کے ذریعہ بطور کنایہ اس امر کی تلقین فرمائی کہ فقرو فاقہ کے وقت "صبر" کی راہ پر چلنے کے لئے تیار رہو کیونکہ یہ صبر ہی ہے جو فقرو افلاس کی آفتوں اور صعوبتوں کو برداشت کرنے کی طاقت بہم پہنچاتا ہے، دینی و دنیاوی ہلاکت و تباہی سے محفوظ رکھتا ہے، جزع و فزع اور شکوہ شکایت کی راہ سے دور رکھتا ہے اور غضب خداوندی سے بچاتا ہے حضرت شیخ آگے فرماتے ہیں کہ "اس حدیث سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ فقرو فاقہ کی زندگی اختیار کئے بغیر اور حضور ﷺ کے طرز حیات پر عمل پیرا ہوئے بغیر آپ ﷺ کی محبّت کا دعوی بالکل ناروا اور جھوٹ ہے، کیونکہ حقیقت میں اسوۂ نبوی کی اتباع اور حضور ﷺ کی محبّت دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور محبوب کی اتباع و پیروی کے بغیر محبّت کا دعوی درست ہو ہی نہیں سکتا، ان المحب لمن یحب مطیع! تاہم واضح رہے کہ حب نبوی کا یہ سب سے اعلی مرتبہ ہے کہ کسی مسلمان کا حضور ﷺ کے اسوۂ حیات کی کامل اتباع کو اپنا شیوہ بنا لینا اس بات کی علامت ہے کہ وہ حضور ﷺ کے تئیں دعوئ محبت میں بالکل سچا اور درجۂ کمال کا حامل ہے! اگرچہ "محبت" کی حقیقت و ماہیت یہ ہے کہ انسان کا کسی کی طرف اندر سے کھنچنا، اور اس کے دل کا اس (محبوب) کی خوبیوں، اس کی ذات و صفات کی تحسین اور اس کی شکل و صورت اور عادات واطوار کی تعریف و توصیف سے معمور ہو جانا کہ وہ اپنے محبوب کو سب سے اچھا دیکھنے اور سب سے اچھا جاننے لگے! مگر جیسا کہ پہلے بتایا گیا تکمیل محبّت کا انحصار، محبوب کی کامل اتباع اور پیروی پر ہے، اگر باطنی تعلق و محبّت کے ساتھ عمل و اتباع کی دولت بھی نصیب ہو تو اصل اور کامل محبّت وہی کہلائے گی ورنہ

محض دل میں محبت کا ہونا اور زبان سے اس کا اعتراف اقرار بھی کرنا، مگر عمل و اتباع کی راہ میں غفلت و کوتاہی کا شکار ہونا، محبت کے ناقص ہونے کی دلیل ہے، جیسا کہ عمل کے بغیر ایمان، درجۂ تکمیل تک نہیں پہنچتا۔

دعوت اسلام کی راہ میں حضور ﷺ کو پیش آنے والے فقر و فاقہ اور آفات و آلام کا ذکر

(۲۲) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ اُخِفْتُ فِي اللّٰهِ وَمَا يُخَافُ اَحَدٌ وَلَقَدْ اُوْذِيْتُ فِي اللّٰهِ وَمَا يُؤْذٰى اَحَدٌ وَلَقَدْ اَتَتْ عَلَيَّ ثَلٰثُوْنَ مِنْ بَيْنِ لَيْلَةٍ وَيَوْمٍ وَمَالِيْ وَلِبِلَالٍ طَعَامٌ يَاْكُلُهٗ ذُوْكَبِدٍ اِلَّا شَيْءٌ يُوَارِيْهِ اِبْطُ بِلَالٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ مَعْنٰى هٰذَا الْحَدِيْثِ حِيْنَ خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَارِبًا مِنْ مَكَّةَ وَمَعَهٗ بِلَالٌ اِنَّمَا كَانَ مَعَ بِلَالٍ مِنَ الطَّعَامِ مَا يَحْمِلُ تَحْتَ اِبْطِهٖ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "خدا (کے دین کو ظاہر کرنے اور اس کی طرف لوگوں کو بلانے) کی راہ میں جس قدر مجھ کو خوف و دہشت میں مبتلا کیا گیا اس قدر کسی اور کو خوف و دہشت میں مبتلا نہیں کیا گیا، اور خدا (کے دین) کی راہ میں جتنی ایذاء رسانیوں سے میں دوچار ہوا ہوں اتنی ایذاء رسانیوں سے کوئی اور دوچار نہیں ہوا ہے (یعنی ابتداء میں جب میں نے اسلام کی دعوت پیش کی اور خدا کی وحدانیت اور اپنی رسالت کا اظہار و اعلان کیا تو اس وقت میں بالکل تنہا تھا، کوئی اور شخص میرے ساتھ نہیں تھا، چنانچہ اس راہ میں پیش آنے والے تمام تر مصائب و الام اور ہر طرح کی دہشت انگیزی کو برداشت کرنے والا واحد شخص میں تھا) بلاشبہ مجھ پر متواتر تیس دن اور تیس راتیں ایسی گزری ہیں جن میں میرے اور بلالؓ کے لئے کھانے پینے کا ایسا کوئی سامان نہیں تھا جس کو کوئی جگردار (یعنی حیوان) کھاتا ہے (یعنی ان دنوں میں ہم دونوں کے پاس کھانے کی ان چیزوں میں سے بھی کوئی چیز نہیں تھی جن کو جانور کھاتے ہیں، چہ جائیکہ آدمیوں کے کھانے پینے کی کوئی چیز ہوتی) علاوہ اس نہایت معمولی سی چیز کے جس کو بلالؓ اپنی بغل میں چھپائے رہتے تھے اور ظاہر ہے کہ جس چیز کو انسان اپنی بغل میں دبالے اس کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے خاص طور پر اس صورت میں جب کہ باہر سے یہ نظر بھی نہ آئے کہ بغل میں کیا چیز ہے۔" "ترمذیؒ" نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث میں حضور ﷺ نے جو صورت حال بیان فرمائی ہے اس کا تعلق اس وقت سے ہے جب حضور ﷺ مکہ سے نکلنے پر مجبور ہو گئے تھے اور اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ حضرت بلالؓ تھے، نیز حضرت بلالؓ کے پاس کھانے کی چیزوں میں سے صرف اتنا تھا جس کو وہ اپنی بغل میں دبائے رہتے تھے۔"

تشریح: حدیث کے ابتدائی جملوں کی وضاحت طیبیؒ نے وہی کی ہے جو ترجمہ میں (بین القوسین) نقل کی گئی ہے، لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ "اس قدر کسی اور خوف و دہشت میں مبتلا نہیں کیا گیا۔ اور اتنی زیادہ ایذاء رسانیوں سے کوئی اور دوچار نہیں ہوا" سے حضور ﷺ کی مراد یہ تھی کہ خدا کا دین پہنچانے کی راہ میں جس قدر خوف و دہشت میں مجھے مبتلا کیا گیا ہے اور جس قدر اذیتیں اور تکلیفیں میں نے برداشت کی ہیں اس قدر خوف و دہشت میں کسی اور نبی اور رسول کو مبتلا نہیں کیا اور نہ اس قدر اذیتیں اور تکلیفیں کسی اور نبی اور رسول نے برداشت کی ہیں! اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ مَا اُوْذِيَ نَبِيٌّ مِثْلَ مَا اُوْذِيْتُ (یعنی جتنی زیادہ ایذاء مجھے پہنچائی گئی ہے اتنی زیادہ کسی اور نبی کو نہیں پہنچائی گئی) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دراصل خدا کے دین کی راہ میں ایذاء اور تکلیف کا پہنچنا ہر شخص کی ہمت و حیثیت اور مرتبہ کے مطابق ہوتا ہے، چونکہ سرکار دوعالم ﷺ کی ہمت و حیثیت سب سے زیادہ بلند تھی، آپ ﷺ کا مرتبہ سب سے اونچا تھا آپ ﷺ کی صداقت و حقانیت سب سے زیادہ واضح تھی، اور ایمان کو پھیلانے اور لوگوں کو راہ راست پر لانے کی تمنا و خواہش اور اس کے تئیں سعی و تڑپ سب سے زیادہ آپ ﷺ میں تھی اس لئے اس راہ میں سب سے زیادہ ایذاء رسانی اور مصائب کا سامنا بھی آپ ہی کو کرنا پڑا۔ وَلَقَدْ اَتَتْ عَلَيَّ الخ سے حضور ﷺ نے اپنے فقر و فاقہ کے انتہائی شدید و سخت دنوں کا ذکر جس انداز میں فرمایا اس سے ایک تو ان سخت مصائب و آلام کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا جن سے آپ ﷺ کو دعوت

سلام کی راہ میں دوچار ہونا پڑا اور ظاہر ہے کہ فقر وفاقہ سے زیادہ سخت اور کوئی مشقت نہیں ہو سکتی، اور دوسرے اصل مقصد امت کے لوگوں کو تعلیم و تلقین تھا کہ خدا کے دین کی راہ میں اگر بڑی سے بڑی صعوبت بھی برداشت کرنا پڑے تو اس کو بطیب خاطر انگیز کیا جائے اور بہر صورت راہ استقامت پر گامزن رہا جائے۔

امام ترمذیؒ نے جو یہ کہا ہے کہ "اور اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ حضرت بلالؓ تھے۔" اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضور کی بیان فرمودہ صورت حال کا تعلق اس وقت سے نہیں جب کہ آپ ﷺ نے مکہ سے مدینہ کے لئے ہجرت فرمائی تھی کیونکہ اس وقت حضور ﷺ کے ساتھ حضرت بلالؓ نہیں تھے۔ بلکہ یہ واقعہ غالباً اس وقت کا ہے جب آپ ابتدائے اسلام میں مکہ سے طائف تشریف لے گئے تھے! چنانچہ نبوت کا دسواں سال تھا اور شوال کا مہینہ کہ آپ کے چچا ابوطالب کی وفات ہوگئی، اور پھر تین ہی دن بعد یا پانچ دن کے بعد ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں، یہ دونوں سانحے حضور ﷺ کے لئے نہایت سخت تھے اسی لئے آپ ﷺ نے اس سال کو عام الحزن یعنی "غم کا سال" فرمایا! قریش مکہ جو پہلے ہی آپ ﷺ کو طرح طرح کی اذیتوں کا نشانہ بنا رہے تھے، اب ان دونوں، ہستیوں خصوصاً ابوطالب کی وفات کے بعد ان کو اپنی جابرانہ کاروائیوں کا موقع مل گیا، چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ کے ایذا رسانی میں بڑی شدت پیدا کر دی، ادھر جب آپ ﷺ کو اہل مکہ کے قبول اسلام سے مایوسی کی صورت پیدا ہونے لگی تو اسی سال یعنی ۱۰ نبوی، آخر ماہ شوال میں آپ حضرت زید ابن حارثہؓ کو ساتھ لے کر پیادہ پا مکہ سے طائف تشریف لے گئے، اور اہل طائف کو کلمۂ حق کی طرف دعوت دی، اور متواتر ایک ماہ تک ان کی تبلیغ وہدایت میں مصروف رہے، مگر انہوں نے آپ کی ایک بات نہیں سنی اور کسی ایک شخص کو بھی قبول حق کی توفیق نہیں ہوئی، بلکہ ظالموں نے اپنے بچوں اور اوباش لوگوں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگا دیا کہ جس قدر ہو سکے آپ ﷺ کو ایذاء پہنچائیں، چنانچہ ان بدبختوں نے آپ پر پتھر برسانے شروع کئے جس سے سردار دوعالم ﷺ کے قدم شریف زخمی ہو جاتے تھے اور اتنا خون بہتا تھا کہ آپ کے نعلین مبارک اس سے بھر جاتے تھے، جب آپ ﷺ پتھر کے زخموں سے چور ہو کر پڑتے تھے تو وہ لوگ آپ ﷺ کے دونوں بازو پکڑ کر کھڑا کر دیتے تھے اور آپ ﷺ آگے چلتے تو پھر پتھراؤ شروع کر دیتے تھے، اور خوش ہو ہو کر تالیاں بجاتے اور قہقہے لگاتے تھے۔ حضرت زید ابن حارثہؓ جس طرف سے پتھر آتا ہوا دیکھتے اس طرف خود کھڑے ہو کر آنحضرت ﷺ کو بچاتے اور پتھر کو اپنے سر پر لیتے تھے یہاں تک کہ حضرت زیدؓ کا سر بھی پتھروں کے زخم سے چور چور ہو گیا۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ نے بادل کا ایک ٹکڑا بھیجا جو آپ ﷺ پر سایہ فگن ہو گیا اور پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ایک اور فرشتے کے ساتھ حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ کے پروردگار نے آپ (ﷺ) کی قوم کی ساری باتیں سنیں اور آپ (ﷺ) کے ساتھ جو کچھ سلوک کیا ہے اس کو دیکھا، میرے ساتھ یہ وہ فرشتہ ہے جس کے سپرد پہاڑوں کی خدمت ہے، اللہ پاک کا اس کو حکم ہے کہ اگر آپ (ﷺ) فرمائیں تو طائف کے گرد کی دونوں پہاڑیاں باہم ٹکرا دی جائیں۔ اور ان دونوں کے درمیان اہل طائف کو اس طرح دل دیا جائے جس طرح چکی کے دو پاٹوں میں دانہ دل جاتا ہے۔"

رحمت عالم ﷺ کسی انتقامی کاروائی کی اجازت دے دیتے، یہ کیسے ممکن تھا؟ چنانچہ آپ ﷺ نے اس امر کی اجازت نہیں دی اور بارگاہ رب العزت میں یوں گویا ہوئے، "ارحم الراحمین! تو نے مجھ کو سخت دل اور انتقام کا خوگر نہیں بنایا، میں لوگوں پر تیرے عذاب نازل کرانے نہیں آیا ہوں، مجھے اپنی قوم کے ہلاک و تباہ ہونے کا سبب نہ بنا، اگر یہ نیست و نابود ہو گئے تو اس سے مجھے کیا حاصل ہوگا، ہاں اگر یہ زندہ رہے تو امید ہے کہ شاید ان کی نسلوں میں سے وہ لوگ پیدا ہوں جو تیری وحدانیت کے ساتھ پرستش کریں، اور تیرے دین کا جھنڈا بلند کریں! پروردگارا! یہ میرے مرتبہ سے ناواقف ہیں، ان کی آنکھوں پر جہل و نادانی کی پٹی بندی ہوئی ہے، اگر تو ان کو وہ بینائی عطا فرمادے جس سے یہ میری شان پیغمبری دیکھ لیں تو امید ہے کہ ایمان سے مشرف ہو جائیں۔"

بالآخر رحمت عالم ﷺ ایک ماہ بعد طائف سے اس طرح واپس ہوئے کہ فقر وفاقہ کے تعب اور ایذار سانیوں کے زخم سے جسم نڈھال تھا اور آپ ﷺ کے ٹخنے شریف لہولہان تھے، مگر زبان پر حرف بددعا کے بجائے دعائے ہدایت کے الفاظ تھے۔

سفر طائف کا یہ پورا واقعہ تفصیل کے ساتھ تاریخ و سیر کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے، یہاں اس کا ذکر اجمالی طور پر کیا گیا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ روایت کے آخر میں اس طرف اشارہ ہے! رہی یہ بات کہ حدیث میں اس موقع پر آنحضرت ﷺ کے ساتھ حضرت بلالؓ کا ہونا مذکور ہے، جب کہ مذکورہ بالا واقع میں حضرت زید ابن حارثہؓ کا ذکر ہے تو ان دونوں میں کوئی تضاد اور منافات نہیں کیونکہ اغلب ہے کہ حضرت بلالؓ اور حضرت زید ابن حارثہؓ دونوں ہی آپ ﷺ کے ساتھ رہے ہوں گے، تاہم تاریخ و سیر کی کتابوں میں اس موقعہ پر حضرت زید ابن حارثہؓ کا ہی ہونا ذکر کیا جاتا ہے۔

حضور ﷺ اور صحابہؓ کے فقر و افلاس کا حال

(۲۳) وَعَنْ اَبِیْ طَلْحَةَ قَالَ شَكَوْنَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْجُوْعَ فَرَفَعْنَا عَنْ بُطُوْنِنَا عَنْ حَجَرٍ حَجَرٍ فَرَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَطْنِهٖ عَنْ حَجَرَيْنِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوطلحہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول کریم ﷺ سے بھوک کی شکایت کی اور اپنے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا دکھایا، (یعنی ہم میں سے ہر شخص نے بھوک کی شدت سے بیتاب ہو کہ اپنے پیٹ پر ایک ایک پتھر باندھ رکھا تھا جس کو ہم نے اپنا پیٹ کھول کر حضور کو دکھایا) تب حضور ﷺ نے اپنا پیٹ کھولکر دکھایا تو اس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔" ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: جب بھوک کی شدت ہوتی ہے اور پیٹ بالکل خالی ہوتا ہے تو اس صورت میں پیٹ پر پتھر باندھ لینا پیٹ و معدہ اور آنتوں کو اس حد تک تقویت پہنچا دیتا ہے کہ آدمی اپنا کام کاج کرنے، اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے پر تھوڑا بہت قادر ہو جاتا ہے، اور جب بھوک کی شدت اور زیادہ ہو جاتی ہے اور ایک پتھر سے بھی کام نہیں چلتا تو پھر دو پتھر باندھنے پڑتے ہیں، چنانچہ حضور ﷺ پر بھوک کی شدت زیادہ طاری تھی اور ویسے بھی آپ ﷺ زیادہ محنت و ریاضت کے عادی تھے اس لئے آپ نے اپنے شکم مبارک پر دو پتھر باندھ رکھے تھے۔

(۲۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّهٗ اَصَابَهُمْ جُوْعٌ فَاَعْطَاهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَمْرَةً تَمْرَةً۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب فقراء صحابہ کو بھوک کی شدت نے پریشان کیا تو رسول کریم ﷺ نے ان (میں سے ہر ایک) کو ایک کھجور عطا فرمائی۔" (ترمذیؒ)

تشریح: اس حدیث سے حضرت ابوہریرہؓ کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ان صحابہؓ پر فقر و افلاس اور کھانے پینے کی تنگی کا اتنا زیادہ غلبہ تھا کہ بسا اوقات انہیں ایک ایک کھجور پر اکتفا کرنا پڑتا تھا۔

صابر و شاکر کون ہے؟

(۲۵) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَصْلَتَانِ مَنْ كَانَتَا فِيْهِ كَتَبَهُ اللّٰهُ شَاكِرًا صَابِرًا مَنْ نَظَرَ فِيْ دِيْنِهٖ اِلٰى مَنْ هُوَ فَوْقَهٗ فَاقْتَدٰى بِهٖ وَنَظَرَ فِيْ دُنْيَاهُ اِلٰى مَنْ هُوَ دُوْنَهٗ فَحَمِدَ اللّٰهَ عَلٰى مَا فَضَّلَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ كَتَبَهُ اللّٰهُ شَاكِرًا صَابِرًا وَمَنْ نَظَرَ فِيْ دِيْنِهٖ اِلٰى مَنْ هُوَ دُوْنَهٗ وَنَظَرَ فِيْ دُنْيَاهُ اِلٰى مَنْ هُوَ فَوْقَهٗ فَاَسِفَ عَلٰى مَا فَاتَهٗ مِنْهُ لَمْ يَكْتُبْهُ اللّٰهُ شَاكِرًا وَّلَا صَابِرًا۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَبِیْ سَعِيْدٍ اَبْشِرُوْا يَا مَعْشَرَ صَعَالِيْكِ الْمُهَاجِرِيْنَ بِالنُّوْرِ التَّامِّ فِیْ بَابٍ بَعْدَ فَضَائِلِ الْقُرْاٰنِ۔

"اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "دو خصلتیں ایسی ہیں کہ وہ جس شخص میں پائی جاتی ہیں اس کو اللہ تعالیٰ شاکر و صابر قرار دیتا ہے، ایک یہ کہ جب وہ شخص دینی معاملہ (یعنی اچھے اعمال وغیرہ) میں ایسے

آدمی کو دیکھے جو (علم وعمل، طاعات و عبادات، قناعت و استقامت اور ریاضت و مجاہدہ کے اعتبار سے) اس سے برتر ہو تو اس کی اقتدا کرے (یعنی اس میں دینی برتری و فضیلت سے اس طرح فیضان حاصل کرے کہ خود بھی علم وعمل کی راہ پر چلے، طاعات و عبادات کی محنت و مشقت اور برائیوں سے اجتناب پر صبر و استقامت اختیار کرے اور جو دینی و باطنی کمالات پہلے فوت ہو چکے ہیں ان پر تأسف کرے) اور دوسرے یہ کہ جب اپنی دنیا کے معاملہ میں اس آدمی کو دیکھے جو (مال و دولت اور جاہ و منصب کے اعتبار سے) اس سے کم تر ہو، تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے اور اس کا شکر ادا کرے کہ اس نے اس آدمی پر اس کو فضیلت و برتری بخشی ہے پس اللہ تعالیٰ اس شخص کو "صابر و شاکر" قرار دیتا ہے (یعنی شاکر تو اس لئے کہ اس نے دنیاوی اعتبار سے اپنے سے کمتر کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور "صابر" اس لئے کہ اس نے دینی اعتبار سے اپنے سے برتر شخص کو دیکھ کر ان سے رہنمائی اور فیضان حاصل کیا) اور جو شخص ایسا ہو کہ جب وہ کسی ایسے شخص کو دیکھے جو اس کے دینی (یعنی اعمال صالحہ وغیرہ) کے اعتبار سے اس سے کمتر درجہ کا ہو (تو اس کے تئیں عجب و غرور اور تکبر میں مبتلا ہو جائے) اور جب کسی ایسے آدمی کو دیکھے جو اس کی دنیا (یعنی جاہ و مال) کے اعتبار سے اس سے برتر ہو تو (اس کے تئیں رشک و حسد اور حرص و خواہش میں مبتلا ہو جائے اور) اس چیز (یعنی جاہ و مال) پر رنج و غم کرے جس سے وہ محروم ہے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ نہ "شاکر" قرار دیتا ہے اور نہ "صابر" (ترمذی)

اور حضرت ابوسعیدؓ کی روایت ابشرو ایا معشر صعالیک، المہاجرین الخ اس باب میں نقل کی جا چکی ہے، جو فضائل قرآن کے باب کے بعد ہے۔

تشریح: موخر الذکر شخص کو نہ تو شاکر اور نہ صابر قرار دینے کا سبب یہ ہے کہ جن دو خصلتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے کسی ایک صفت کو بھی اس نے اختیار نہیں کیا، بلکہ اس کے برخلاف اس نے خدا کی ناشکری کی اور زبان اور دل دونوں سے جزع و فزع اور شکوہ شکایت کا مرتکب ہوا۔

حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ اس شخص کو صابر اور شاکر قرار دیتا ہے۔" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو کامل مؤمن بنا دیتا ہے۔ چنانچہ اس آیت اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ "صابر و شاکر" کا اطلاق اسی پر ہوتا ہے جو کامل مؤمن ہو، نیز ایک حدیث میں بھی فرمایا گیا ہے کہ ایمان کے دو نصف ہیں، اس کا ایک نصف "صبر" ہے اور ایک نصف "شکر" ہے گویا اپنے آپ کو برائیوں سے روکنا "صبر" سے تعبیر ہے اور اعضاء ظاہری کے ذریعہ طاعات کی بجا آوری "شکر" کے مفہوم میں ہے اور ظاہر ہے کہ جس بندے کی زندگی ان دونوں اجزاء تکمیل سے معمور ہو وہ "کامل مؤمن" ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

فقر پر صبر کرنے کی فضیلت

(۲۶) عَنْ اَبِیْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ الْحُبُلِیِّ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَمْرٍو وَسَأَلَهٗ رَجُلٌ قَالَ اَلَسْنَا مِنْ فُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِیْنَ فَقَالَ لَهٗ عَبْدُاللّٰهِ اَلَکَ امْرَأَةٌ تَاْوِیْ اِلَیْهَا قَالَ نَعَمْ قَالَ اَلَکَ مَسْکَنٌ تَسْکُنُهٗ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاَنْتَ مِنَ الْاَغْنِیَاءِ قَالَ فَاِنَّ لِیْ خَادِمًا قَالَ فَاَنْتَ مِنَ الْمُلُوْکِ قَالَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ وَجَآءَ ثَلٰثَةُ نَفَرٍ اِلٰی عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو وَاَنَا عِنْدَهٗ فَقَالُوْا یَا اَبَا مُحَمَّدٍ اِنَّا وَاللّٰهِ مَا نَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ لَا نَفَقَةٍ وَلَا دَابَّةٍ وَلَا مَتَاعٍ فَقَالَ لَهُمْ مَا شِئْتُمْ اِنْ شِئْتُمْ رَجَعْتُمْ اِلَیْنَا فَاَعْطَیْنٰکُمْ مَا یَسَّرَ اللّٰهُ لَکُمْ وَاِنْ شِئْتُمْ ذَکَرْنَا اَمْرَکُمْ لِلسُّلْطَانِ وَاِنْ شِئْتُمْ صَبَرْتُمْ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ فُقَرَآءَ الْمُهَاجِرِیْنَ یَسْبِقُوْنَ الْاَغْنِیَاءَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِلَی الْجَنَّةِ بِاَرْبَعِیْنَ خَرِیْفًا قَالُوْا فَاِنَّا نَصْبِرُ لَا نَسْاَلُ شَیْئًا۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوعبدالرحمٰن جبلیؒ (جن کا اصل نام عبداللہ بن زید مصری ہے اور جن کا شمار ثقہ تابعین میں ہوتا ہے) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاصؓ کو فرماتے ہوئے سنا، جب کہ ایک شخص نے ان سے سوال کیا اور کہا کہ کیا ہم ان فقراء مہاجرین میں سے نہیں

ہیں جن کے بارہ میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ وہ دولتمندوں سے پہلے جنّت میں داخل ہوں گے؟) حضرت عبداللہ نے (یہ سن کر) اس شخص سے پوچھا کہ کیا تم بیوی والے ہو کہ جس کے پاس تمہیں سکون و قرار ملتا ہو؟" اس شخص نے کہا کہ ہاں! پھر حضرت عبداللہ نے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس مکان ہے جس میں تم رہائش اختیار کرو؟ اس شخص نے کہا کہ ہاں مکان بھی ہے! حضرت عبداللہ نے فرمایا۔ تو پھر تم دولتمندوں میں سے ہو (یعنی تم ان مہاجرین کی حیثیت کے آدمی ہو جو فقر و افلاس میں مبتلا نہیں تھے، فقراء مہاجرین میں تمہارا شمار نہیں ہو سکتا کیونکہ ان فقراء کے پاس نہ بیوی تھی نہ گھربار تھا، یا اگر کسی کے پاس اس دونوں میں سے کوئی ایک چیز تھی تو دوسری چیز سے محروم تھا) اس شخص نے (جب یہ سنا کہ حضرت عبداللہ نے بیوی اور گھروالا ہونے کی وجہ سے اسے گویا دولتمند کہا ہے تو) کہا کہ میرے پاس ایک خادم بھی ہے (یعنی غلام یا لونڈی) حضرت عبداللہ نے فرمایا تب تو تم بادشاہوں میں سے ہو (یعنی اس صورت میں تو تمہارا شمار رئیسوں اور بادشاہوں میں ہونا چاہئے، تمہیں فقیر و مفلس کہنا کسی طرح درست نہ ہوگا۔"

حضرت ابوعبدالرحمٰن (راوی) نے یہ بھی بیان کیا کہ (ایک دن) حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کے پاس تین آدمی آئے، اس وقت میں بھی ان کی خدمت میں حاضر تھا، ان تینوں نے کہا۔ "ابو محمد! بخدا ہم کسی چیز کی استطاعت نہیں رکھتے، نہ تو خرچ کرنے کی (کہ حج کو جاسکیں) نہ کسی جانور کی (کہ جہاد میں شریک ہوسکیں) اور نہ کسی دوسرے سامان کی (کہ جس کو فروخت کر کے اپنے ضروری مصارف پورا کرسکیں) حضرت عبداللہ نے (ان کی بات سن کر) فرمایا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ اگر تمہاری (یہ) خواہش ہے کہ (میں تمہارے ساتھ معاونت کروں اور تمہیں اپنے پاس سے کچھ دوں) تو تم لوگ پھر کسی وقت آنا، میں تمہیں وہ چیز دوں گا جس کا خدا تمہارے لئے انتظام کردے گا (کیونکہ تمہیں دینے کے لئے اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے) اور اگر تم چاہو تو میں تمہاری حالت بادشاہ (امیر معاویہؓ) سے بیان کردوں (تمہیں اپنی عطاء سے فارغ البال کردیں گے) اور (سب سے بہتر بات یہ ہے کہ) اگر تم (اہل کمال کا رتبہ حاصل کرنا) چاہو تو صبر کرو (یعنی اپنی اسی حالت فقر و افلاس پر استقامت اختیار کرو) کیونکہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ فقراء مہاجرین قیامت کے دن جنّت میں دولتمندوں سے چالیس سال پہلے جائیں گے۔" ان تینوں نے (یہ حدیث سنی تو) کہا کہ "بے شک ہم صبر و استقامت ہی کی راہ اختیار (کرنے کا عہد) کرتے ہیں، اب (ہم آپ سے) کچھ نہیں مانگتے (یا یہ کہ اب آئندہ ہم کسی سے کچھ نہیں مانگیں گے۔" (مسلم)

فقراء مہاجرین کی فضیلت

(۲۷) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ بَيْنَا اَنَا قَاعِدٌ فِي الْمَسْجِدِ وَحَلْقَةٌ مِنْ فُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِيْنَ قُعُوْدٌ اِذْ دَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَعَدَ اِلَيْهِمْ فَقُمْتُ اِلَيْهِمْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُبَشَّرْ فُقَرَآءَ الْمُهَاجِرِيْنَ بِمَا يَسُرُّ وُجُوْهَهُمْ فَاِنَّهُمْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ قَبْلَ الْاَغْنِيَآءِ بِاَرْبَعِيْنَ عَامًا قَالَ فَلَقَدْ رَاَيْتُ اَلْوَانَهُمْ اَسْفَرَتْ قَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو حَتّٰى تَمَنَّيْتُ اَنْ اَكُوْنَ مَعَهُمْ اَوْ مِنْهُمْ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرو کہتے ہیں کہ ہم لوگ مسجد (نبوی ﷺ) میں بیٹھے ہوئے تھے اور فقراء مہاجرین کا حلقہ جما ہوا تھا کہ اچانک نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے اور فقراء کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور (حضور ﷺ کی اتباع میں) فقراء کے قریب پہنچ کر ان کی طرف متوجہ ہو گیا (تاکہ آنحضرت ﷺ ان سے جو کچھ فرمائیں، ان ملفوظات کو میں بھی سن سکوں) چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "فقراء مہاجرین کو وہ بشارت" پہنچا دینی ضروری ہے جو ان کو مسرور و شاداں بنادے، پس (وہ بشارت یہ ہے کہ) فقراء مہاجرین جنّت میں دولتمندوں سے چالیس سال پہلے داخل ہوں گے۔" حضرت عبداللہ کہتے ہیں کہ، بخدا میں نے دیکھا کہ (یہ بشارت سن کر) فقراء (کے چہروں) کا رنگ روشن و تاباں ہو گیا۔ پھر حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ یہ بشارت سن کر اور فقراء کے چہروں کی تابانی و شگفتگی دیکھ کر میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ (کاش) میں بھی ان ہی جیسا ہوتا (یعنی اس دنیا میں مجھ پر بھی فقر و افلاس طاری ہوتا اور میں اس جماعت

فقراء میں شمار ہوتا) یا یہ کہ ان میں سے ہوتا (یعنی آخرت میں اس جماعت کے ساتھ اٹھتا اور انہی کے ساتھ میرا حشر ہوتا۔" (دارمیؒ)

تشریح: بِمَا یَسرُّ وُجُوْهَهُمْ میں لفظ "وجوہ" سے مراد یا تو ذات ہے یا جیسا کہ ترجمہ میں اسی کو ملحوظ رکھا گیا ہے یا یہ لفظ اپنے اصل معنی "چہرے" کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ (فقراء مہاجرین کو بشارت پہنچادینی ضروری ہے) جو ان کے دلوں کو خوش کردے اور اس خوشی کا اثر ان کے چہروں پر ظاہر و نمایاں ہو۔

اکون معھم او منھم میں حرف اَوْ تنویع کے لئے ہے اور اسی کے مطابق کا مطلب بھی بین القوسین بیان کر دیا گیا ہے یا یہ کہ یہ صرف راوی کے شک کو ظاہر کرتا ہے کہ حضرت عبداللہ نے یا تو ان اکون معھم فرمایا یا یہ کہ ان اکون منھم یعنی میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش) میں بھی فقراء مہاجرین میں سے ایک ہوتا۔

وہ باتیں جو خزانہ الٰہی میں سے ہیں

(۲۸) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ اَمَرَنِیْ خَلِیْلِیْ بِسَبْعٍ اَمَرَنِیْ بِحُبِّ الْمَسَاكِیْنِ وَالدُّنُوِّ مِنْهُمْ وَاَمَرَنِیْ اَنْ اَنْظُرَ اِلٰی مَنْ هُوَ دُوْنِیْ وَلَا اَنْظُرَ اِلٰی مَنْ هُوَ فَوْقِیْ وَاَمَرَنِیْ اَنْ اَصِلَ الرَّحِمَ وَاِنْ اَدْبَرَتْ وَاَمَرَنِیْ اَنْ لَا اَسْئَلَ اَحَدًا شَیْئًا وَاَمَرَنِیْ اَنْ اَقُوْلَ بِالْحَقِّ وَاِنْ كَانَ مُرًّا وَاَمَرَنِیْ اَنْ لَا اَخَافَ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ وَاَمَرَنِیْ اَنْ اُكْثِرَ مِنْ قَوْلِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ فَاِنَّهُنَّ مِنْ كَنْزٍ تَحْتَ الْعَرْشِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میرے خلیل (نبی کریم ﷺ) نے مجھ کو سات باتوں کا حکم دیا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے ایک حکم تو یہ دیا کہ میں فقراء و مساکین سے محبت کروں اور ان سے قربت رکھوں۔ دوسرا حکم یہ کہ میں اس شخص کی طرف دیکھوں جو (دنیاوی اعتبار سے) مجھ سے کمتر درجہ کا ہے اور اس شخص کی طرف نہ دیکھوں جو (جاہ و مال اور منصب میں مجھ سے بالاتر ہے، تیسرا حکم یہ دیا کہ میں کسی قرابتداروں سے ناتے داری کو قائم رکھوں اگرچہ کوئی (قرابت دار) ناتے داری کو منقطع کرے، چوتھا حکم یہ دیا کہ میں کسی شخص سے کوئی چیز نہ مانگوں، پانچواں حکم یہ دیا کہ میں (ہر حالت میں) حق بات کہوں اگرچہ وہ (سننے والے کو) تلخ اور غیر خوش آئند معلوم ہو، چھٹا حکم یہ دیا کہ میں خدا کے دین کے معاملہ میں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں ملامت کرنے والے کی کسی ملامت سے نہ ڈروں اور ساتواں حکم یہ دیا کہ میں کثرت کے ساتھ لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا ورد رکھوں (پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ) پس یہ ساتوں باتیں اور عادتیں اس خزانہ میں کی ہیں جو عرش الٰہی کے نیچے ہے (اور جس سے فیوض و برکات نازل ہوتے ہیں۔" (احمدؒ)

تشریح: فَاِنَّهُنَّ کی ضمیر حضرت شیخ عبدالحقؒ نے تو مذکورہ ساتوں باتوں کی طرف راجع کی ہے جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہوا لیکن ملاعلی قاریؒ نے اس ضمیر کا مرجع صرف آخری بات یعنی لاحول ولا قوۃ الا باللہ کو قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ الفاظ (یعنی لاحول الخ) دراصل اس گنج معنوی کا ایک حصہ ہیں جو عرش الٰہی کے نیچے محفوظ رکھا گیا ہے اور گنج معنوی تک اس شخص کے علاوہ اور کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی جس کو خدا کی طرف سے حول و قوۃ یعنی قدرت و طاقت حاصل ہو۔ یا یہ معنی ہیں کہ یہ الفاظ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہیں۔ اس صورت میں "عرش الٰہی کے نیچے" کا مفہوم بھی بالکل واضح ہو گا کیونکہ عرش الٰہی، بالائے جنت ہے، نیز ملاعلی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ "جن شارحین نے اِنَّهُنَّ کی ضمیر مذکورہ ساتوں باتوں کی طرف راجع کرتے ہوئے) یہ کہا ہے کہ "یہ ساتوں باتیں اور عادتیں اس خزانہ میں کی ہیں جو عرش الٰہی کے نیچے ہے۔" ایک ایسا قول ہے جو حقیقت سے بعید ہے کیونکہ اس قول کو ثابت کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے جب کہ (انہن) کی ضمیر کو صرف آخری بات یعنی لاحول الخ کی طرف راجع کرنے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے) کہ صحاح ستہ اور دیگر مسند کتابوں میں کثیر طرق سے یہ روایت کیا گیا ہے کہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ رہی یہ بات کہ ان الفاظ کو جنت کا خزانہ کس اعتبار سے فرمایا گیا ہے تو اس سلسلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، چنانچہ بعض حضرات نے

یہ کہا ہے کہ ان الفاظ کو خزانہ اس لئے کہا گیا ہے کہ جس طرح خزانہ، عام لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے اسی طرح یہ الفاظ اپنی حقیقت ورفعت اور نفاست وپاکیزگی کے اعتبار سے لوگوں کی نظروں سے محفوظ ہیں۔ یا ان الفاظ کو اس لئے خزانہ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہ جنت کے ذخائر میں سے ایک ذخیرہ ہیں۔ اور یا یہ کہ جو شخص ان الفاظ کا ورد رکھتا ہے اس کے لئے نہایت اعلیٰ مرتبہ کا اجر وثواب جنت میں محفوظ کر دیا جاتا ہے، اس اعتبار سے یہ الفاظ گویا جنت کا ایک خزانہ ہیں۔ حضرت مسعودؓ ایک روایت میں بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں نے آنحضرت کے سامنے یہ کلمہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا تو حضور ﷺ نے پوچھا کہ کیا تم ان الفاظ کا حقیقی مفہوم بھی جانتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی بہتر جان سکتے ہیں، تب آپ ﷺ نے فرمایا (ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ) "اللہ کی نافرمانی اور گناہوں سے پھرنا اور بچنا صرف اللہ تعالیٰ کی مدد پر منحصر ہے اور اللہ کی طاعت وعبادات پر قادر ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جانے والی قدرت وطاقت پر منحصر ہے۔

مشائخ شاذلیہ قدس اللہ اسرارہم نے طالبان حق اور رہروان طریقت ومعرفت کو ان الفاظ "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" کے ورد کی بہت وصیت کی ہے اور فرمایا ہے کہ توفیق عمل کی راہ میں اس سے زیادہ معین ومددگار اور کوئی چیز نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ کی مرغوب دنیاوی چیزیں

(۲۹) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْجِبُهُ مِنَ الدُّنْيَا ثَلٰثَةٌ اَلطَّعَامُ وَالنِّسَاءُ وَالطِّيْبُ فَاَصَابَ اثْنَتَيْنِ وَلَمْ يُصِبْ وَاحِدًا اَصَابَ النِّسَاءَ وَالطِّيْبَ وَلَمْ يُصِبِ الطَّعَامَ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ دنیا کی چیزوں میں سے تین چیزیں رسول کریم ﷺ کی نظر میں نہایت پسندیدہ تھیں ایک تو کھانا (کہ جس کے ذریعہ جسم وبدن کو محفوظ وتوانا رکھ کر دینی خدمات پر قدرت وطاقت حاصل کی جاسکے) دوسرے عورتیں (کہ جن کے ذریعہ نفس کو برے خیالات سے محفوظ رکھا جاسکے)، اور تیسرے خوشبو (کہ جس کے ذریعہ دماغ کو نشاط وتقویت حاصل ہو، کیونکہ حکماء کے قول کے مطابق عقل وفراست کا مخزن دماغ ہی ہے) چنانچہ ان تینوں چیزوں میں سے دو چیزیں تو حضور ﷺ کو (کثرت کے ساتھ) حاصل ہوئیں اور ایک چیز (زیادہ) حاصل نہیں ہوئی یعنی ایک تو عورتیں آپ کو زیادہ ملیں (بایں طور کہ آپ نے نو شادیاں کیں) اور دوسرے (خارجی طور پر) خوشبو آپ کو بہت ملی (باوجودیکہ آپ ﷺ کا پسینہ مبارک ہی تمام طرح کی خوشبو سے زیادہ معطر اور خوشگوار تھا، لیکن تیسری چیز کھانا، آپ ﷺ کو (زیادہ) نہیں ملا۔" (احمدؒ)

تشریح: "کھانے" پر نفی کا اطلاق بطور مبالغہ ہے، کہ آپ ﷺ کی غذائی ضروریات جس تنگی وقلت کے ساتھ پوری ہوتی تھیں اور جتنا کم کھانا آپ ﷺ کو نصیب ہوتا تھا اس کی بناء پر اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ کھانا، نہ ملنے ہی کے برابر تھا، چنانچہ پہلے یہ روایت گزر چکی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ تا وفات ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ ﷺ نے مسلسل دو دن جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر کھائی ہو، اگرچہ کھانے کی یہ تنگی وقلت خود حضور ﷺ کی اختیار کردہ تھی کہ آپ ﷺ نے اپنے لئے تنگی معیشت اور فقر وغربت کی زندگی کو ترجیح دی تھی اور حق تعالیٰ نے اپنے حبیب کے لئے جو اس بات کو پسند کیا تو اس میں بے شمار حکمتیں پوشیدہ تھیں۔

(۳۰) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُبِّبَ اِلَيَّ الطِّيْبُ وَالنِّسَاءُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَزَادَ ابْنُ الْجَوْزِيْ بَعْدَ قَوْلِهٖ حُبِّبَ اِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "خوشبو اور عورتیں میرے لئے پسندیدہ بنائی گئی ہیں اور میرا قلبی سکون ونشاط، نماز میں رکھا گیا ہے۔" (احمدؒ، نسائیؒ) اور ابن جوزیؒ نے اس ارشاد میں حبب الی کے بعد من الدنیا کے الفاظ بھی نقل کئے ہیں۔"

تشریح: "میرا قلبی سکون ونشاط، نماز میں رکھا گیا ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ مجھ کو جو ذوق ولذت، استغراق وحضور اور راحت وسرور نماز

میں حاصل ہوتا ہے وہ کسی بھی وقت اور کسی بھی عبادت میں میسر نہیں ہوتا چنانچہ حضور ﷺ پر نماز کے تئیں اس لذت بیخودی اور اسی ذوق حضوری کے نشاط کا یہ اثر تھا کہ جونہی نماز کا وقت آتا، تو نہایت شوق کے عالم میں فرماتے ارحنا یابلال! جلدی اٹھو اور اذان کہو، تاکہ میں نماز پڑھنے لگوں، اور دوسرے امور کی مشغولیت و فکرات سے دامن چھڑا کر مناجات حق میں مشغول ہو جاؤں۔

لفظ قُرَّۃٌ یا تو قَرَّ سے مشتق ہے جس کے معنی قرار وثبات کے ہیں! اور چونکہ جب نگاہ کو محبوب کا دیدار نصیب ہو جاتا ہے تو نہ صرف نظر کو قرار مل جاتا ہے کہ نگاہیں پھر کسی دوسرے کو دیکھنے کی روادار نہیں ہوتیں، بلکہ دل ودماغ کو بھی راحت واطمینان کی دولت مل جاتی ہے، جس طرح کہ محبوب کا دیدار نہ ہونے کی صورت میں نظریں پریشان اور دل بے قرار رہتا ہے، لہٰذا نگاہ ودل کے اسی قرار وسکون کو حضور ﷺ نے "قرۃ عنی" سے تعبیر فرمایا۔ یا کہ یہ لفظ قُرَّۃَ اصل میں قر سے مشتق ہے، جس کے معنی اس ٹھنڈک اور خنکی ولذت کے ہیں جو کسی عزیز ترین چیز اور محبوب کے دیدار ومشاہدہ کے سرور سے آنکھوں کو حاصل ہوتی ہے! چنانچہ جس طرح کسی دشمن اور قابل نفرت چیز کو دیکھ کر آنکھوں میں چنگاریاں سلگتی معلوم ہوتی ہیں اسی طرح اپنی کسی عزیز ترین چیز اور محبوب کو دیکھ کر آنکھوں میں ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے، اسی لئے بیٹے کو "قرۃ العین" کہا جاتا ہے۔

روایت کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ ابن جوزی نے اس حدیث کو جس طرح نقل کیا ہے اس میں شروع کا جملہ اس طرح ہے حُبِّبَ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَا الطِّیْبَ الخ (یعنی دنیا کی جن چیزوں کو میرے لئے پسندیدہ بنایا گیا ہے، ان میں سے ایک تو خوشبو ہے اور دوسری عورت ہے) تاہم یہ بات واضح رہے کہ حدیث کے وہ الفاظ کہ جن کو امام احمدؒ اور امام ترمذیؒ نے متفقہ طور پر نقل کیا ہے، زیادہ صحیح وہی ہیں جو اوپر متن میں نقل کئے گئے ہیں، چنانچہ طبرانیؒ نے اپنے تینوں معاجم میں، خطیب نے تاریخ بغداد میں، اور ابن عدی نے کامل میں بھی اس روایت کو انہی الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے، نیز حاکمؒ نے بھی اپنی مستدرک میں اسی طرح نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے البتہ ان کی روایت میں جُعِلَتْ کا لفظ نہیں ہے! ویسے نسائیؒ کی ایک روایت میں بھی من الدنیا کا لفظ ایک دوسری وجہ سے منقول ہے! ایک اور بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض ناقلین حدیث کے ہاں اس روایت میں حُبِّبَ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَا کے بعد "ثلث" کا جو ایک اور لفظ نقل کیا جاتا ہے، تو جیسا کہ سخاویؒ نے لکھا ہے کہ تحقیق وتفتیش کے باوجود یہ لفظ حدیث کی کسی کتاب میں اس روایت کے دوران نہیں ملتا، البتہ کتاب احیاء العلوم اور کشاف کی تفسیر سورۂ آل عمران میں یہ لفظ ضرور ملتا ہے! شیخ ابن حجرؒ اور شیخ ولی الدین عراقیؒ نے بھی یہی لکھا ہے کہ حدیث کی جس کتاب میں بھی یہ روایت ہے ثلث کا لفظ کہیں منقول نہیں ہے، لہٰذا یہ حدیث یہاں جن الفاظ کے ساتھ نقل کی گئی ہے اس کے مفہوم میں کوئی اشکال واقع نہیں ہوتا، اسی طرح ان دونوں لفظوں یعنی "من الدنیا" اور "ثلث" میں سے کوئی بھی ایک لفظ شامل روایت ہو تب بھی مفہوم بالکل واضح رہتا ہے، ہاں! اگر یہ دونوں لفظ ایک ساتھ شامل روایت ہوں تو اس صورت میں اشکال پیدا ہوتا ہے کہ "نماز" پر "دنیاوی چیز" کا اطلاق کس طرح ہو سکتا ہے کیونکہ نماز دنیاوی امور میں سے نہیں ہے؟ لہٰذا جو ناقلین حدیث ان دونوں لفظوں کے ساتھ اس روایت کو بیان کرتے ہیں ان کی طرف سے اشکال کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ "دنیا" سے حضور ﷺ کی مراد اس عالم کی حیات ہے، یعنی آپ ﷺ نے گویا یہ فرمایا کہ اس عالم میں تین چیزیں میری پسندیدہ ہیں جن میں سے، دو چیزیں تو طبعی اور دنیاوی امور سے تعلق رکھتی ہیں یعنی خوشبو اور عورت، اور تیسری چیز یعنی نماز کا تعلق دینی امور سے ہے۔

آخر میں ایک بات اور، حدیث میں "صلوٰۃ" کا لفظ تقریباً تمام علماء کے نزدیک "نماز" ہی پر محمول ہے، لیکن بعض حضرات کا قول یہ بھی ہے کہ اس حدیث میں "صلوٰۃ" کے لفظ سے نبی کریم ﷺ پر (درود وسلام، مراد ہے۔

راحت طلبی اور تن آسانی بندگان خاص کی شان کے منافی ہے

(۳۱) وَعَنْ مَعَاذِ ابْنِ جَبَلٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا بَعَثَ بِهٖ اِلَى الْيَمَنِ قَالَ اِيَّاكَ وَالتَّنَعُّمَ فَاِنَّ عِبَادَ اللّٰهِ

لَیْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِیْنَ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت معاذ ابن جبلؓ سے روایت ہے کہ جب انہیں رسول کریم ﷺ نے (قاضی بنا کر) یمن بھیجا تو ان کو یہ نصیحت بھی فرمائی کہ "اپنے آپ کو راحت طلبی اور تن آسانی سے بچانا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بندگان خاص آرام و آسائش کی زندگی نہیں گذارتے۔" (احمدؒ)

تشریح: تنعم کا مفہوم ہے نفسانی خواہشات کی تکمیل میں زیادہ سے زیادہ اہتمام و انصرام کرنا، بہت زیادہ دنیاوی لذتوں اور نعمتوں کے درمیان رہنا اور کھانے پینے اور طبیعت و نفس کی مرغوبات کا حریص ہونا حاصل یہ کہ راحت طلبی و تن آسانی کی چیزوں میں پڑنا اور عیش و عشرت کی زندگی اختیار کرنا، کافر و فاجر، غافل و نادان اور جاہل لوگوں کا خاصہ ہے، بندگان خاص کو ایسی زندگی سے کیا سروکار! چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ۔

"آپ (ﷺ) ان (کافروں) کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے کہ وہ (خوب) کھالیں اور چین اڑالیں، اور خیالی منصوبے (دنیا بھر کی آرزوئیں اور تمنائیں ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں ان کو ابھی حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے۔"

اور فرمایا:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ۔

"اور جو لوگ کافر ہیں وہ عیش کر رہے ہیں اور اس طرح کھاتے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں اور جہنم ان لوگوں کا ٹھکانہ ہے۔ ایک جگہ یوں فرمایا گیا ہے وہ (کافر) لوگ اس سے قبل (دنیا میں) بڑی خوشحال اور چین کی زندگی بسر کرتے تھے۔"

قناعت کی فضیلت

(۳۲) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ رَضِيَ مِنَ اللّٰهِ بِالْيَسِيْرِ مِنَ الرِّزْقِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ بِالْقَلِيْلِ مِنَ الْعَمَلِ۔

"اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص تھوڑے سے رزق پر اللہ سے راضی ہوتا ہے، (یعنی اپنی معاشی ضروریات کی قلیل مقدار پر قناعت کرتا ہے) تو اللہ تعالیٰ اس سے (طاعات و عبادات کے) تھوڑے سے عمل پر راضی ہو جاتا ہے۔"

اپنی معاشی تنگی و محتاجگی کو لوگوں پر ظاہر نہ کرنے والے کے حق میں وعدۂ خداوندی

(۳۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ جَاعَ اَوِ احْتَاجَ فَكَتَمَهُ النَّاسَ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ اَنْ يَّرْزُقَهُ رِزْقَ سَنَةٍ مِنْ حَلَالٍ۔ رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جو شخص بھوکا ہو، یا (کسی چیز کا) محتاج ہو اور اپنی اس بھوک و محتاجگی کو لوگوں سے چھپائے (یعنی کھانے کی طلب میں کسی سے یہ نہ کہے کہ میں بھوکا ہوں اور نہ مدد چاہنے کے لئے کسی سے اپنی احتیاج و ضرورت کو بیان کرے) تو اللہ تعالیٰ کا یہ یقینی وعدہ ہے کہ وہ اس شخص کو حلال طریقہ پر ایک سال کا رزق پہنچائے گا۔" (ان دونوں روایتوں کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: "بھوک" سے مراد وہ بھوک ہے جس کو برداشت کرنا ممکن ہو، اور لوگوں سے اس کو چھپانا ناجائز نہ ہو، کیونکہ جو بھوک ناقابل برداشت حد تک پہنچائے اور اس کی وجہ سے ہلاکت کا خوف ہو تو ایسی بھوک کو چھپانا جائز نہیں ہے، اس لئے علماء نے تصریح کی ہے کہ

اگر کوئی شخص اس حالت میں بھوک کی وجہ سے مرا جائے کہ نہ تو اس نے کسی کے سامنے اپنی بھوک کا انحصار کر کے کھانے پینے کے لئے کچھ مانگا ہو اور نہ اس نے ایسی کوئی چیز ہی کھائی ہو جس سے زندگی بچائی جا سکتی تھی، اور بحالت مجبوری جس چیز کے کھانے کی اجازت شریعت نے دی ہے کہ خواہ وہ مردار ہی کیوں نہ ہو تو اس شخص کی موت گنہگار کی موت ہوگی۔

اللہ کے نزدیک کون مسلمان پسندیدہ ہے؟

(۳۴) وَعَنْ عِمْرَانَ ابْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ عَبْدَهُ الْمُؤْمِنَ الْفَقِيْرَ الْمُتَعَفِّفَ اَبَا الْعِيَالِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت عمران بن حصینؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ اس مسلمان کو محبوب رکھتا ہے جو مفلس، پارسا اور عیالدار ہو۔" (ابن ماجہ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان عیالدار، مفلس و نادار ہونے کے باوجود اپنی اور اپنے اہل و عیال کی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے حرام و ناجائز اسباب و ذرائع سے اجتناب کرتا ہو اور لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بھی پرہیز کرتا ہو وہ کامل مسلمان ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اس کو محبوب رکھتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا کمال تقویٰ

(۳۵) وَعَنْ زَيْدِ ابْنِ اَسْلَمَ قَالَ اسْتَسْقٰى يَوْمًا عُمَرُ فَجِيْءَ بِمَآءٍ قَدْ شِيْبَ بِعَسَلٍ فَقَالَ اِنَّهٗ لَطَيِّبٌ لٰكِنِّيْ اَسْمَعُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ نَعٰى عَلٰى قَوْمٍ شَهَوَاتِهِمْ فَقَالَ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَاَخَافُ اَنْ تَكُوْنَ حَسَنَاتُنَا عُجِّلَتْ لَنَا فَلَمْ يَشْرَبْهُ۔ (رواہ رزین)

"حضرت زید ابن اسلمؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ ایک دن امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے پینے کے لئے پانی مانگا تو ان کی خدمت میں جو پانی پیش کیا گیا اس میں شہد ملا ہوا تھا، حضرت عمرؓ نے (اس پانی کو دیکھ کر اور یہ جان کر کہ اس میں شہد ملا ہوا ہے) فرمایا۔ "یقیناً یہ پانی پاک و حلال اور نہایت خوشگوار ہے لیکن میں اس کو نہیں پیوں گا، کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں (قرآن سے) سنتا اور جانتا ہوں کہ اس نے ایک قوم کو خواہشات نفس کی اتباع کا ملزم گردانا اور (بطور سرزنش و تنبیہ) فرمایا۔ "کہ تم نے اس دنیاوی زندگی میں اپنی لذتوں اور نعمتوں کو پا لیا اور ان سے پورا پورا فائدہ حاصل کر لیا (اب آخرت میں تمہارے لئے کیا رہ گیا ہے۔" لہٰذا میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ہماری) نیکیاں بھی ایسی نہ ہوں جن کا اجر و ثواب (دنیاوی نعمتوں اور لذتوں کی صورت میں) جلد ہی اتنی دنیا میں) ہمیں دے دیا جائے (اور پھر آخرت میں محرومی کا منہ دیکھنا پڑے۔) چنانچہ حضرت عمرؓ نے شہد ملا ہوا وہ پانی نہیں پیا۔" (رزینؒ)

تشریح: حضرت عمرؓ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ شہد ملا ہوا یہ پانی نہایت لذت آمیز اور بہت بڑی دنیاوی نعمت ہے جو نفس کو بھی نہایت مطلوب ہے، اگر میں اس پانی کو پیتا ہوں تو گویا بہت بڑی نعمت سے فائدہ اٹھاتا ہوں اور لذت کام و دہن سے نفس کو خوش کرتا ہوں تو اس صورت میں مجھے خوف ہے کہیں یہ لذت و نعمت، ہمارے اعمال صالحہ کا وہ اجر و ثواب نہ قرار پائے جو ہمیں بس دنیا ہی میں چکا دیا جائے اور آخرت کے لئے کچھ نہ رہ جائے جیسا کہ کافروں کے بارے میں ہے کہ ان کے نیک عمل کا بدلہ، دنیاوی نعمتوں اور لذتوں کی صورت میں ان کو اس دنیا میں مل جاتا ہے اور آخرت میں ان کو کچھ نصیب نہیں ہوگا۔

واضح رہے کہ حضرت عمرؓ نے اللہ تعالیٰ کا جو ارشاد نقل فرمایا ہے یعنی اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے اس طرح ایک آیت یہ بھی ہے مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ (الآیۃ) یعنی جو شخص دنیا (کے نفع) کی

نیت رکھے گا، ہم ایسے شخص کو دنیا میں جتنا چاہیں گے، جس کے واسطے چاہیں گے جلدی (اسی دنیا میں) دے دیں گے۔ یہ دونوں آیتیں اگرچہ کفار کے حق میں ہیں لیکن اصل اعتبار تو الفاظ کی عمومیت کا ہے جس سے ہر شخص سبق حاصل کر سکتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا اعتبار ہونا چاہئے۔

ابتدائے اسلام میں صحابہؓ کا فقر و افلاس

(۳۶) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مَاشَبِعْنَامِنْ تَمرٍ حَتّٰی فَتَحْنَا خَيْبَرَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم (صحابہؓ) نے اپنے فقر و افلاس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کے ساتھ کھجوروں سے، کبھی پیٹ نہیں بھرا، یہاں تک کہ ہم نے خیبر کو فتح کر لیا (جہاں کھجوریں بہت ہوتی تھیں) تب ہمیں پیٹ بھر کھانے کو کھجوریں ملیں۔" (بخاریؒ)

بَابُ الْاَمَلِ وَالْحِرْصِ
آرزو اور حرص کا بیان

اَمَل کے معنی ہیں امید رکھنا اور حرص کے معنی ہیں لالچ کرنا یا آرزو و ارادے کو دراز و وسیع کرنا! "حرص" کا تعلق نیک آرزوؤں اور اچھے ارادوں سے بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے، اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی هُدٰهُمْ اور لفظ حرص کا اطلاق نفسانی خواہشات کی زیادتی اور دنیاوی چیزوں کے لالچ پر بھی ہوتا ہے جو ایک بری چیز ہے، چنانچہ قاموس میں لکھا ہے کہ بدترین حرص یہ ہے کہ تم اپنا حصہ بھی حاصل کر لو اور غیر کے حصے کی بھی طمع رکھو! حاصل یہ کہ نیک امور جیسے حصول علم، خدا کے دین کی سربلندی اور اچھے اعمال، اس میں حریص ہونا یعنی آرزوؤں اور ارادوں کو دراز و وسیع کرنا، متفقہ طور پر علماء کے نزدیک بہت اچھی بات ہے، اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا، طُوْبٰى لِمَنْ طَالَ عُمْرُهٗ وَحَسُنَ عَمَلُهٗ نیز آپ ﷺ نے اپنی عمر کے آخر میں اس آرزو اور ارادہ کا اظہار فرمایا تھا کہ اگر میں اگلے سال تک جیتا رہا تو (محرم کی) نویں تاریخ کو بھی روزہ ضرور رکھوں گا اس کے برخلاف جس آرزو و ارادے کی درازی کا تعلق دنیاوی خواہشات نفس جیسے مال و دولت جمع کرنے اور جاہ و منصب کی طلب سے ہو تو وہ بہت بری بات ہے۔

جہاں تک عنوان کے پہلے لفظ "امل" کا تعلق ہے تو اس سے مراد دنیاوی امور (یعنی خوش حال زندگی اور محض دنیاوی بہبودی و ترقی وغیرہ) کی امیدوں، تمناؤں اور خیالی منصوبوں کی درازی و وسعت میں اس حد تک مبتلا ہو جانا ہے کہ موت کے لئے مستعد رہنے اور توشہ آخرت تیار کرنے سے غافل ہو جائے۔ اور یہ شان صرف انہی لوگوں کی ہو سکتی ہے جو دین و آخرت سے غافل، خدا فراموش اور دنیاوی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھنے والے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ۔ یعنی آپ (ﷺ) ان کافروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے کہ (وہ خوب) کھالیں اور چین اڑالیں اور خیالی منصوبے (یعنی دنیا بھر کی آرزوئیں اور تمنائیں) ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

انسان، اس کی موت اور اسکی آرزوؤں کی صورت مثال

(۱) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ خَطَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا مُرَبَّعًا وَخَطَّ خَطًّا فِي الْوَسَطِ خَارِجًا مِنْهُ وَخَطَّ خُطُطًا صِغَارًا اِلٰى هٰذَا الَّذِيْ فِي الْوَسَطِ مِنْ جَانِبِهِ الَّذِيْ هو فِي الْوَسَطِ فَقَالَ هٰذَا الْاِنْسَانُ وَهٰذَا اَجَلُهٗ مُحِيْطٌ

بِهٖ وَهٰذَا الَّذِیْ هُوَ خَارِجٌ اَمَلُهٗ وَهٰذِهِ الْخُطَطُ الصِّغَارُ الْاَعْرَاضُ فَاِنْ اَخْطَاهُ هٰذَا نَهَسَهٗ هٰذَا وَاِنْ اَخْطَاهُ هٰذَا نَهَسَهٗ هٰذَا۔ رواہ البخاری۔

"حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے ہمارے سمجھانے کے لئے چار خط کھینچ کر ایک مربع بنایا، پھر اس مربع کے درمیان ایک اور خط کھینچا جو مربع سے باہر نکلا ہوا تھا، اس کے بعد آپ ﷺ نے اس درمیانی خط کے اس حصہ کی طرف جو (مربع کے) خطوں کے درمیان تھا، چھوٹے چھوٹے کئی خطوط کھینچے اور پھر فرمایا۔ "اس خاکہ کو اچھی طرح سمجھ لو! درمیانی خط کا یہ حصہ کہ مربع کے خطوں کے درمیان ہے، گویا انسان ہے، اور یہ خط (کہ جس نے چاروں طرف سے مربع بنا رکھا ہے) اس انسان کی موت ہے (یعنی مربع کے چاروں خطوط گویا اس کی موت کا وقت اور اس کی عمر کی آخری حد ہے جس نے چاروں طرف سے اس کو گھیر رکھا ہے) اور درمیانی خط کہ یہ حصہ کہ جو مربع سے باہر نکلا ہوا ہے، اس انسان کی (وہ) آرزو اور تمنا ہے (جس کے بارے میں وہ یہ خیال رکھتا ہے کہ میں موت آنے سے پہلے اس کو حاصل کر لوں گا) حالانکہ وہ ایک بے بنیاد خیال میں مبتلا ہے کیونکہ اس کی آرزوؤں اور خواہشوں کا سلسلہ دراز ہوتا رہتا ہے جس سے اس کا دل و دماغ کبھی خالی نہیں رہتا جب کہ اس کی موت سے اس کی آرزوؤں کی تکمیل سے زیادہ قریب ہے) اور درمیانی خط کے اندرونی حصے پر جو یہ چھوٹے چھوٹے خطوط ہیں وہ عوارض (یعنی آفات و حادثات جیسے بھوک پیاس اور افلاس و بیماری وغیرہ) ہیں (کہ جو انسان پر ہر طرف سے مسلط رہتے ہیں اور اگر وہ عوارض اپنا کام کر جاتے ہیں تو وہ ہلاک ہو جاتا ہے) پس اگر وہ (انسان) کسی ایک حادثہ و عارضہ سے بچ جاتا ہے تو دوسرا حادثہ و عارضہ گھیر لیتا ہے، اگر اس حادثہ و عارضہ سے بھی بچ نکلتا ہے تو پھر تیسرا حملہ کر دیتا ہے (غرضیکہ متعدد حوادث و عارضات اس کی تاک میں رہتے ہیں جن سے وہ یکے بعد دیگرے دوچار ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ موت آکر اس کا کام تمام کر دیتی ہے۔"
(بخاریؒ)

تشریح: حدیث کا حاصل یہ ہے کہ انسان دور دراز کی امیدیں اور آرزوئیں رکھتا ہے اور اس وہم میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس کی وہ امیدیں اور آرزوئیں کبھی نہ کبھی پوری ہوں گی۔ حالانکہ حقیقت میں وہ ان امیدوں اور آرزوؤں سے بہت دور اور اپنی موت سے بہت قریب ہوتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی امیدوں اور آرزوؤں کی منزل تکمیل تک پہنچنے سے پہلے موت کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے۔

② وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ خَطَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خُطُوْطًا فَقَالَ هٰذَا الْاَمَلُ وَهٰذَا اَجَلُهٗ فَبَیْنَمَا هُوَ كَذٰلِكَ اِذْ جَآءَهُ الْخَطُّ الْاَقْرَبُ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریمؐ نے کئی خطوط کھینچے (جیسا کہ پہلی حدیث میں گزرا کہ آپ نے چار خط کھینچ کر ایک مربع بنایا اور اس مربع کے درمیان ایک اور خط کھینچا جو مربع سے باہر نکلا ہوا تھا) پھر فرمایا کہ درمیانی خط کا یہ حصہ (جو مربع سے باہر نکلا ہوا ہے) انسان کی آرزو ہے، اور یہ خط (جس نے چاروں طرف سے ایک مربع بنا رکھا ہے) اس (انسان) کی موت ہے، پس انسان اسی حالت میں (یعنی امیدوں اور آرزوؤں کے پورا ہونے کی فکر میں) رہتا ہے کہ اچانک موت کا خط اس کو آدبوچتا ہے جو اس کے زیادہ قریب ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس انسان کی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ وہ اس خط تک پہنچ جائے جہاں اس کی دنیائے آرزو بستی ہے اور جو اس سے بہت دور واقع ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ ناگہاں موت اس کو آدبوچتی ہے اور وہ آرزو حاصل کئے بغیر اس جہاں سے چل کھڑا ہوتا ہے۔

بڑھاپے کی حرص

③ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَهْرَمُ ابْنُ اٰدَمَ وَیَشِبُّ مِنْهُ اثْنَانِ الْحِرْصُ عَلَی الْمَالِ وَالْحِرْصُ عَلَی الْعُمُرِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "انسان (خود تو بوڑھا ہو جاتا ہے مگر اس میں دو چیزیں جوان اور قوی ہو جاتی ہیں،

ایک تو مال (جمع کرنے) کی حرص اور اس کو خرچ نہ کرنے کی عادت اور دوسرے درازئ عمر کی آرزو۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: یہ حقیقت ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی بوڑھا ہو جائے، اس کے مزاج واطوار اور اس کی جبلت پر مذکورہ بالا دونوں خصلتوں کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوتی بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ ان دونوں چیزوں کا زور بھی بڑھتا رہتا ہے اور بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا نفس (اگر علم وعمل اور ریاضت ومجاہدہ کے ذریعہ محفوظ وپاکیزہ نہ ہو جائے تو وہ) اپنی خواہشات اور اپنے جذبات کی گرفت میں رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ خواہشات وجذبات کی تکمیل، مال اور عمر کے بغیر نہیں ہو سکتی، دوسرے یہ کہ انسان جب بڑھاپے کی منزل میں پہنچ جاتا ہے تو اس میں ان نفسانی خواہشات وجذبات کا وجود تو جوں کا توں قائم رہتا ہے لیکن وہ قوت عقلیہ کو جو (قوت شہوانیہ) کے محرکات کو دفع نہیں کر سکتی! اسی اعتبار سے ان دونوں چیزوں کو "جوان اور قوی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

④ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَزَالُ قَلْبُ الْکَبِیْرِ شَآبًّا فِیْ اِثْنَیْنِ فِیْ حُبِّ الدُّنْیَا وَطُوْلِ الْاَمَلِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "بوڑھے کا دل ہمیشہ دو باتوں میں جوان (قوی) رہتا ہے، ایک تو دنیا کی محبت میں، اور دوسرے آرزو کی درازی میں۔" (اور یہ دونوں ہی باتیں مضر ہیں کیونکہ دنیا کی محبت موت کو عزیز نہیں رکھنے دیتی اور آرزوئے درازئ عمر، تاخیر عمل اور کوتاہی عمل کی مقتضی ہوتی ہے۔" (بخاریؒ مسلمؒ)

بوڑھا اگر توبہ وانابت نہیں کرتا تو اس کو عذر کا کوئی موقع نہیں

⑤ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَعْذَرَ اللّٰهُ اِلَى امْرِیءٍ اَخَّرَ اَجَلَهٗ حَتّٰى بَلَّغَهٗ سِتِّیْنَ سَنَةً۔ (رواه البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کے لئے عذر کا کوئی موقع نہیں چھوڑا (یعنی اس کا عذر دور کر دیا) جس کی موت کو اتنا مؤخر کیا کہ اس کو ساٹھ سال کی عمر تک پہنچا دیا۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اتنی لمبی عمر عطا کی اور اتنے طویل زمانہ تک اس کو مہلت دی اور اس نے اس کے باوجود توبہ وانابت کی راہ اختیار نہیں کی اور گناہوں سے باز نہیں آیا تو اب اس کے لئے عذر خواہی کا وہ کون سا موقع رہ گیا ہے جس کے سہارے وہ قیامت میں عفو وبخشش کی امید رکھتا ہے! اگر کوئی جوان گناہ ومعصیت اور بے عملی کی راہ اختیار کئے ہوئے ہے تو وہ کہتا ہے کہ جب میں بڑھاپے کی منزل میں پہنچوں گا تو اپنی بد عملیوں اور اپنے گناہوں سے توبہ کر لوں گا اور اپنی زندگی کے اس حصہ کو خدا کی رضا جوئی اور اس کی عبادت میں صرف کروں گا، لیکن جو شخص بڑھاپے کی منزل میں پہنچ چکا ہے اور توبہ وانابت اور عمل کرنے کا آخری موقع بھی اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے تو وہ اپنی بے عملی اور گناہوں پر کیا کہے گا؟ ہائے! کتنے بد نصیب ہیں وہ لوگ جو عمر کی آخری منزل میں بھی پہنچ کر اپنی بے عملیوں اور اپنے گناہوں پر نادم وشرمسار نہیں ہیں اور اس آخری مرحلہ پر بھی جب کہ موت ان کو آدبوچنے کے لئے بالکل تیار کھڑی ہے، انہیں اپنے رحیم وکریم پروردگار کا دامن عفو ورحمت پکڑ لینے کی توفیق نہیں ہوتی۔

بعض حضرات کے قول کے مطابق اس ارشاد گرامی کے معنی یہ ہے کہ بوڑھے شخص پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ واجب ہے کہ وہ برابر پروردگار کی بارگاہ میں عذر خواہی اور توبہ واستغفار کرتا رہے اور اس میں قطعاً تقصیر وکوتاہی نہ کرے۔

انسان کی حرص وطمع کی درازی کا ذکر؟

⑥ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْ کَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِیَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغٰى ثَالِثًا وَلَا یَمْلَأُ

جَوْفَ ابْنِ اٰدَمَ اِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اگر (بالفرض والتقدیر) آدمی کے پاس مال و دولت سے بھرے ہوئے دو جنگل ہوں تب بھی وہ تیسرے جنگل کی تلاش میں رہے گا (یعنی اس کی حرص وطمع کی درازی کا یہ عالم ہے کہ کسی بھی حد پر پہنچ کر اس کو سیری حاصل نہیں ہوتی) اور آدمی کے پیٹ کو مٹی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی (یعنی جب تک وہ قبر میں جاکر نہیں لیٹ جاتا اس وقت تک اس کی حرص وطمع کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ تاہم یہ بات اکثر لوگوں کے اعتبار سے فرمائی ہے۔ ورنہ ایسے بندگان خدا بھی ہیں جن میں حرص وطمع کے ہونے کا تو کیا سوال اپنی ضرورت کے بقدر مال واسباب کی بھی انہیں پرواہ نہیں ہوتی) اور اللہ تعالیٰ بری حرص سے جس بندہ کی توبہ کو چاہتا ہے قبول کر لیتا ہے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ گناہوں سے توبہ کو قبول کرنا چونکہ پروردگار کی شان رحمت ہے اور ان گناہوں کا تعلق خواہ ظاہری بد عملیوں سے ہو یا باطنی برائیوں سے، اس لئے بڑی حرص میں مبتلا ہونے والا شخص اگر اخلاص و پختگی کے ساتھ اس برائی سے اپنے نفس کو باز رکھنے کا عہد کر لیتا ہے اور اپنے پروردگار سے توبہ و استغفار کرتا ہے تو اس کی توبہ قبول کی جاتی ہے! یا یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو اس برائی سے پاک کرنا چاہتا ہے اس پر اپنی رحمت کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے بایں طور کہ اس کو اس بری خصلت کے ازالہ کی توفیق اور نفس کو پاکیزہ و مہذب بنانے کی باطنی طاقت عطا فرماتا ہے۔

اس حدیث میں یہ تنبیہ بھی ہے کہ انسان کی جبلت میں بخل کا مادہ رکھا گیا ہے اور یہ بخل ہی ہے جو حرص وامل اور طمع ولالچ کا باعث بنتا ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو چاہئے کہ انفاق وایثار کے ذریعہ بخل کی سرکوبی کرتا رہے تاکہ حرص کو راہ پانے کا موقع نہ ملے۔

دنیا میں مسافر کی طرح رہو

⑦ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبَعْضِ جَسَدِيْ فَقَالَ كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ وَعُدَّ نَفْسَكَ مِنْ اَهْلِ الْقُبُوْرِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے میرے جسم کے ایک حصہ (یعنی دونوں مونڈھوں) کو پکڑ کر فرمایا۔ "تم دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم مسافر ہو یا راہ گیر ہو، اور تم اپنا شمار ان لوگوں میں کرو جو دنیا سے گزر گئے ہیں اور اپنی قبروں میں آسودہ خواب ہیں (یعنی تم مردوں کی مشابہت اختیار کرو کہ جس طرح وہ دنیا کی تمام چیزوں سے منہ موڑ کر ایک گوشہ میں پڑے ہوئے ہیں اسی طرح تم بھی دنیاداری کے علائق سے اپنا دامن بنا کر نہایت سادگی اور یکسوئی کے ساتھ زندگی گزارو۔" (بخاریؒ)

تشریح: میرکؒ کہتے ہیں کہ اس روایت کا بخاری کی طرف منسوب ہونا محل نظر ہے کیونکہ یہاں جو الفاظ نقل کئے گئے وہ بعینہٖ ترمذیؒ کے روایت کردہ ہیں اور بخاریؒ نے اس حدیث کو جن الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے وہ اس سے مختلف ہیں۔

اَوْ عابر سبیل میں حرف اَوْ یا تو تنویع کے لئے ہے جیسا کہ ترجمہ میں ظاہر کیا گیا ہے، اور یا یہ کہ یہاں یہ حرف بل کے معنی میں استعمال فرمایا گیا ہے جو ترقی کے لئے آتا ہے، اس صورت میں پورے جملہ کا ترجمہ یوں ہوگا۔ "تم دنیا میں اس طرح رہو گویا تم مسافر ہو، بلکہ راہگیر ہو۔" اس طرح بات میں زیادہ زور پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس ارشاد گرامی کا مقصد جس مفہوم کو بیان کرنا ہے وہ زیادہ پر تاثیر انداز میں واضح ہوتا ہے، کیونکہ مسافر تو پھر بھی کچھ دنوں کے لئے یا کچھ عرصہ کے لئے کہیں کہیں ٹھہر کر وہاں کی چیزوں میں کسی نہ کسی حد تک مشغول ہوتا ہے اور ان سے کچھ نہ کچھ تعلق اس کو ضرور رکھنا پڑتا ہے، لیکن جو شخص سر راہ گزر رہا ہوتا ہے وہ بس آگے کی طرف چلتا ہی رہتا ہے اس کو نہ تو اس راستے کی کسی چیز سے سروکار ہوتا ہے اور نہ ادھر ادھر کی مشغولیت میں اپنا وقت ضائع کر کے اپنے سفر میں رخنہ اندازی کو گوارا کرتا ہے۔

حدیث کے آخری جزء کی تشریح تھوڑی سی تفصیل کا تقاضہ کرتی ہے، لہٰذا اس سلسلہ میں پہلے تو یہ جان لینا چاہئے کہ موت کی حقیقت کیا ہے؟ بدن سے روح کے تصرف کا منقطع ہو جانا، روح و بدن کے باہمی رشتہ کا ٹوٹ جانا، اور بدن کا روح کے آلہ کار کی حیثیت سے باہر ہو جانا موت کا مفہوم ہے! بدن کی موت سے روح معدوم و نابود نہیں ہو جاتی صرف اس کی وہ حیثیت و حالت بدل جاتی ہے جو بدن کے ساتھ تعلق رکھنے کی صورت میں اس کو حاصل ہوتی ہے مثلاً یہ کہ بدن کی موت کے ساتھ اس کی بصارت اس کی سماعت، اس کی گویائی اور اسی طرح ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء جسم کی وہ طاقتیں اس سے سلب کر لی جاتی ہیں جن کے ذریعہ وہ (روح) بدن پر اپنا تصرف ظاہر کرتی ہے، ایسے ہی اس کے تمام اہل و عیال، اقربا و آشنا، اور دوست و عزیز اس سے جدا کر دیئے جاتے ہیں، نیز دنیا کی وہ تمام چیزیں اس سے الگ کر دی جاتی ہیں، جن سے وہ اپنے بدن کے ساتھ تعلق رکھتی تھی جیسے گھربار، اسباب و سامان، زمین و جائداد، فوج و حشم، لونڈی و غلام اور گھوڑے و دیگر چوپائے اور دیگر ضروری و غیر ضروری چیزیں، پس مردوں میں اپنا شمار کرنا اور ان کی مشابہت اختیار کرنا گویا اس مفہوم کا حامل ہے کہ انسان جسمانی علائق سے حتی الامکان قطع تعلق اختیار کر لے، جس کی صورت یہ ہے کہ اعضائے جسم پر سے روح کا وہ تصرف ختم کر دے جس کے نتیجہ میں حرام و مکروہ امور کا ارتکاب ہوتا ہے اور اس میں یقین رکھے کہ دنیا کی جو بھی چیزیں میرے تصرف و اختیار میں ہیں، ان سب کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے ان کی ملکیت سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور اس بات کو اس کی علامت سمجھے کہ اگر ان چیزوں میں سے کوئی چیز اس کے پاس سے جاتی رہے تو کوئی غم نہ ہو، اور کوئی چیز اپنے پاس آئے تو خوش نہ ہو۔ اسی طرح اپنے اہل و اولاد، عزیز و اقارب اور دوستوں وغیرہ سے تعلق محبت کے وہ جذبات منقطع کر لے جن کی وجہ سے حرام و مکروہ چیزوں کا ارتکاب ہوتا ہے! پس جس شخص نے اپنے آپ کو اس وصف سے متصف کر لیا وہ دنیا سے بے تعلقی میں گویا مردوں کے مشابہ ہوگا، اور اس کا شمار آسودگان خاک کے حکم میں ہوگا! اس کے بعد اس شخص کی شان کی مناسب یہ بات ہوگی کہ وہ ان آداب و شرائط کو ملحوظ رکھے جن کے سبب اس کا مردوں کے مشابہ ہونا صحیح قرار پا سکے، مثلاً ایک تو یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے ہر مطلوب سے دست کنارہ کش ہو جائے جیسا کہ موت کی صورت میں، دوسرے یہ کہ زہد کو اختیار کرے، یعنی دنیا، کی محبت اور دنیا کی لذات و خواہشات سے کنارہ کش ہو جائے جیسا کہ موت کی صورت میں، تیسرے یہ کہ توکل کی راہ پر گامزن رہے یعنی دنیاوی اسباب و وسائل کی ناروا قید سے آزاد ہو جائے جیسا کہ موت کی صورت میں، چوتھے یہ کہ قناعت پر عامل رہے یعنی نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کرے جیسا کہ موت کی صورت میں، پانچویں یہ کہ صرف اللہ کی طرف متوجہ رہے اور ماسوی اللہ کی طرف نظر نہ اٹھائے تاکہ اللہ عز وجل کے سوا کوئی مطلوب، کوئی محبوب اور کوئی مقصود نہ ہو جیسا کہ موت کی صورت میں، چھٹے یہ کہ صبر کی راہ اختیار کرے یعنی ریاضت و مجاہدہ کے ذریعہ نفس امارہ سے قطع تعلق کر لے جیسا کہ موت میں، ساتویں یہ کہ رضا کے راستہ پر چلے یعنی اپنے نفس کی خوشنودی کے جال سے نکل کر حق سبحانہٗ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے دائرے میں آجائے، احکام ازلیہ کو بلاچون وچرا تسلیم کرے اور اپنے تمام امور کو بغیر کسی اعتراض و منازعت کے حق تعالیٰ کی تدبیر و اختیار کے سپرد کر دے جیسا کہ موت کی صورت میں، آٹھویں یہ کہ ذکر سے غافل نہ رہے یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے ذکر میں اپنے دل اور اپنی زبان کو مشغول رکھے اور ماسوی اللہ کی یاد اور اس کے ذکر و خیال کی الجھن سے آزاد رہے جیسا کہ موت کی صورت میں، اور نویں یہ کہ مراقبہ کو اختیار کرے یعنی ہر طرح کی قوت و سطوت اور ہر مقتدر طاقت سے بے نیاز ہو کر اور اس کو چھوڑ کر بس احکم الحاکمین کی طاقت و قدرت کا دھیان رکھے اور اس کی طاقت اور قدرت کو اپنے تمام امور کا مالک و متصرف جانے جیسا کہ موت کی صورت میں، پس یہ صفات و کیفیات پیدا ہو جائیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ مردوں کی مشابہت حاصل ہو گئی اور اہل قبور میں شمار کرانے کا حکم پورا ہو گیا، اور آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد وعد نفسک من اهل القبور کا یہی مفہوم ہے اور یہی معنی اس حدیث کے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے موتوا قبل ان تموتوا (موت آنے سے پہلے موت کو اختیار کر لو) چنانچہ ایک موت تو وہ ہے جو اچانک روح و بدن کے باہمی رشتہ کو یکسر منقطع کر دیتی ہے اور ایک موت وہ ہے جس کو انسان مذکورہ بالا صفات کی صورت میں اختیار کر کے اپنے نفس امارہ کو کچل ڈالتا ہے، اور

یہی موت "اختیاری موت" کہلاتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

زیادہ توجہ، دنیاوی چیزوں کی اصلاح و درستی کے بجائے اپنی دینی و اخروی زندگی کی اصلاح کی طرف مبذول رکھو

(۸) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ مَرَّبِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا وَاُمِّیْ نُطَیِّنُ شَیْئًا فَقَالَ مَاھٰذَا یَا عَبْدَاللّٰهِ قُلْتُ شَیْءٌ نُصْلِحُهٗ قَالَ الْاَمْرُ اَسْرَعُ مِنْ ذٰلِكَ۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں (ایک دن) میں اور میری والدہ گارے سے کسی چیز کو (یعنی اپنے مکان کی دیواروں یا چھت کو) لیپ پوت رہے تھے کہ رسول کریم ﷺ کا گزر ہماری طرف ہو گیا، آپ ﷺ نے (ہمیں اس حالت میں دیکھ کر) فرمایا کہ عبداللہ یہ کیا ہے؟ (یعنی یہ لیپ پوت کس وجہ سے ہو رہی ہے؟) میں نے عرض کیا کہ اس چیز (یعنی دیواروں یا چھت) کی درستی و مرمت کر رہے ہیں (یا اس کو اس لئے لیپ پوت رہے ہیں تا کہ اس میں پختگی آجائے) حضور ﷺ نے فرمایا "امر، یعنی اجل اس سے بھی زیادہ جلد آنے والی ہے۔ (احمدؒ و ترمذیؒ)، اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ موت کا آنا اس مکان کی ٹوٹ پھوٹ اور خرابی سے کہیں پہلے متوقع ہے۔ تم لیپ پوت کے ذریعہ اس مکان کی مرمت و درستگی میں اس لئے مصروف ہو کہ کہیں اس کے در و دیوار اور چھت تمہاری زندگی ختم ہونے سے پہلے نہ گر پڑے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس مکان کے گر پڑنے اور اس کے خراب ہونے سے تم خود موت کی آغوش میں پہنچ سکتے ہو، پس تمہارے لئے اپنے عمل کی اصلاح کی طرف متوجہ رہنا، اس مکان کی مرمت و درستگی میں مشغول ہونے سے زیادہ بہتر ہے اور اس میں دل لگانا عبث ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ کا اپنے مکان کو گارا مٹی لگانا اشد ضرورت کے تحت نہیں ہو گا بلکہ وہ زیادہ مضبوطی اور آرائش کے لئے اس کو لیپ پوت رہے ہوں گے۔

موت سے کسی لمحہ غافل نہ ہونا چاہئے

(۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُهْرِيْقُ الْمَآءَ فَيَتَيَمَّمُ بِالتُّرَابِ فَاَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ الْمَآءَ مِنْكَ قَرِيْبٌ يَقُوْلُ مَا يُدْرِيْنِیْ لَعَلِّیْ لَا اَبْلُغُهٗ۔ رَوَاہُ فِیْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَابْنُ الْجَوْزِیِّ فِیْ كِتَابِ الْوَفَآءِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ (کبھی ایسا ہوتا کہ) رسول کریم ﷺ پیشاب کرنے کے بعد (اور وضو کرنے سے پہلے) مٹی سے تیمم کر لیتے، میں (یعنی ابن عباسؓ یہ دیکھ کر) عرض کرتا کہ یا رسول اللہ! پانی تو آپ (ﷺ) کے بہت قریب ہے؟ (یعنی جب پانی آپ (ﷺ) کی دسترس سے اتنا دور نہیں ہے کہ وضو کر سکتے ہیں تو پھر تیمم کیوں کرتے ہیں؟) حضور ﷺ (میری اس بات کے جواب میں) فرماتے۔ مجھے کیا معلوم کہ میں اس پانی تک پہنچ بھی سکوں گا یا نہیں؟" اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنۃ میں اور ابن جوزیؒ نے کتاب الوفاء میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: یعنی مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ میری عمر کتنی ہے، اور ہر لمحہ موت متوقع ہے، اس لئے میں ڈرتا ہوں کہ پیشاب کرنے کے بعد مجھے اتنی مہلت بھی نہ ملے کہ پانی تک پہنچ کر وضو کر سکوں، لہٰذا فوری طور پر تیمم کر لیتا ہوں تا کہ ایک طرح کی طہارت تو حاصل رہے۔

انسان کی موت اس کی آرزو سے زیادہ قریب ہے

(۱۰) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ ھٰذَا ابْنُ اٰدَمَ وَھٰذَا اَجَلُہٗ وَوَضَعَ یَدَہٗ عِنْدَ قَفَاہُ ثُمَّ بَسَطَ فَقَالَ وَثَمَّ اَمَلُہٗ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "یہ تو ابن آدم (انسان) ہے اور یہ اس کی موت ہے یہ فرما کر آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ پیچھے کی طرف رکھا (یعنی پہلے تو ایک جگہ اشارہ کر کے بتایا کہ یہ انسان ہے اور پھر اس جگہ سے ذرا پیچھے کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ اس کی موت ہے) اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کو پھیلایا (اور دور اشارہ کر کے) فرمایا کہ اس جگہ انسان کی آرزو ہے (یعنی انسان کی موت اس کے بہت قریب ہے جب کہ اس کی آرزو اس سے بہت دور ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "یہ ابن آدم ہے" میں گویا حضور ﷺ نے مخاطبین کو ایک ظاہری اشارہ کے ذریعہ تصوراتی وجود کی طرف متوجہ کیا اور یہی اسلوب "یہ اس کی موت ہے" بھی اختیار فرمایا گیا۔ اس بات کو وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ پہلے تو حضور ﷺ نے اپنے سامنے کی جانب زمین کے گوشہ پر یا ہوا میں اپنے ہاتھ کے ذریعہ اشارہ کر کے بتایا کہ اس جگہ کو یہ تصور کرو کہ یہاں انسان ہے، پھر اپنے ہاتھ کو پیچھے ہٹایا اور جس جگہ پہلے اشارہ فرمایا تھا اس کے بالکل قریب عقب میں ہاتھ کو رکھ کر بتایا کہ اس جگہ کو وہ مقام تصور کرو جہاں انسان کی موت ہے، اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کو بالشت اور انگلیوں کی کافی کشادگی کے ساتھ پھیلایا۔ یا بسط کے معنی یہ ہیں کہ، آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کو اس جگہ سے کہ جہاں آپ ﷺ نے پہلے اشارہ فرمایا تھا، بہت آگے تک دراز کیا اور وہاں اشارہ کر کے بتایا کہ اس جگہ کو وہ مقام تصور کرو جہاں گویا انسان کی آرزو ہے اور اس طرح آپ ﷺ نے اس اسلوب بیان اور اشارہ کے ذریعہ گویا لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور متنبہ فرمایا کہ انسان کی موت اس کے بہت قریب کھڑی ہے جب کہ اس کی وہ آرزوئیں اور امیدیں کہ جن کے پیچھے وہ مارا مارا پھرتا ہے اس سے بہت دور واقع ہیں۔

کسی شاعر نے، اللہ اس پر اپنی رحمتیں نازل کرے، کیا خوب کہا ہے۔

کل امری مصبح فی اھلہ ۔ والموت ادنی من شراک نعلہ

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ غَرَزَ عُوْدًا بَیْنَ یَدَیْہِ وَاٰخَرَ اِلٰی جَنْبِہٖ وَاٰخَرَ اَبْعَدَ..... فَقَالَ اَتَدْرُوْنَ مَاھٰذَا قَالُوْا اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ قَالَ ھٰذَا الْاِنْسَانُ وَھٰذَا الْاَجَلُ اُرَاہُ قَالَ وَھٰذَا الْاَمَلُ فَیَتَعَاطَی الْاَمَلَ فَلَحِقَہُ الْاَجَلُ دُوْنَ الْاَمَلِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے سامنے ایک لکڑی (زمین میں) گاڑی، پھر ایک اور لکڑی (دونوں لکڑیوں سے یا دوسری لکڑی سے) کافی فاصلہ پر نصب فرمائی اور پھر فرمایا۔ "تم لوگ جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یعنی ان لکڑیوں سے کیا مراد ہے اور یہ کس چیز کی مثالیں ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کی کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں! حضور ﷺ نے فرمایا۔ "(تو سنو) یہ (پہلی) لکڑی (گویا) انسان ہے، یہ (دوسری لکڑی (گویا) اس انسان کی موت ہے (جو انسان کے اتنے ہی قریب ہے جتنا کہ یہ دوسری لکڑی پہلی لکڑی کے قریب ہے) حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ اس کے بعد حضور ﷺ نے یہ فرمایا۔ "اور یہ (تیسری) لکڑی (کہ جس کو میں نے کافی فاصلہ پر گاڑا ہے گویا) اس (انسان) کی آرزو ہے (جو اس سے بہت دور ہے) پس انسان اپنی امید اور آرزو کی تکمیل کی جستجو میں رہتا ہے (اور اپنا وقت اس کوشش میں صرف کرتا رہتا ہے کہ اس آرزو کو حاصل کرلے مگر ہوتا یہ ہے) کہ اس کی موت، اس کی آرزو کے پورا ہونے سے پہلے ہی اس کو آدبوچتی ہے۔" (شرح السنۃ)

امت محمدی ﷺ کے لوگوں کی عمر

⑫ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ عُمْرُ اُمَّتِیْ مِنْ سِتِّيْنَ سَنَةً اِلٰی سَبْعِيْنَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "میری اُمت (کے لوگوں) کی عمر ساٹھ سال سے ستر سال تک ہے۔" اس روایت کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اُمت محمدیہ کے لوگوں کی عمر کا حصہ تناسب ساٹھ سال اور ستر سال کے درمیان رہے گا۔ ظاہر ہے کہ حضور ﷺ نے یہ بات اکثر لوگوں کے اعتبار سے فرمائی ہے ورنہ تو اس اُمت میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی عمر ساٹھ سال تک بھی نہیں پہنچ پاتی، اور ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی عمر ستر سال سے بھی متجاوز ہو جاتی ہے جیسا کہ آگے کی حدیث سے واضح ہوگا۔

⑬ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْمَارُ اُمَّتِیْ مَابَيْنَ السِّتِّيْنَ اِلَی السَّبْعِيْنَ وَاَقَلُّهُمْ مَنْ يَّجُوْزُ ذٰلِكَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَذُكِرَ حَدِيْثُ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ الشِّخِّيْرِ فِیْ بَابِ عِبَادَةِ الْمَرِيْضِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میری اُمت کے اکثر لوگوں کی عمر ساٹھ اور ستر سال کے درمیان رہے گی اور میری اُمت میں ایسے لوگوں کی تعداد کم ہی ہوگی جو اس (ستر سال) سے تجاوز کر جائیں (اور ان کی عمر سو یا سو سال سے بھی زائد ہو) (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور حضرت عبداللہ ابن شخیر کی روایت باب عیادۃ المریض میں نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: یوں تو ہر دور میں اُمت محمدی میں ایسے لوگوں کی بھی تھوڑی بہت تعداد رہی ہے جن کی عمر سو یا سو سال سے بھی زائد ہوتی ہے لیکن خود حضور ﷺ کے زمانے کے لوگوں یعنی صحابہ کرام میں بھی ایسے لوگوں کا وجود پایا جاتا ہے جنہوں نے کافی عمر پائی، مثلاً حضرت انسؓ ابن مالکؓ کی وفات ایک سو تین سال کی عمر میں ہوئی، اسماء بنت ابوبکرؓ نے سو سال کی عمر پائی، ان کی حالت تو یہ تھی کہ آخر عمر تک بھی ان کے دانت نہیں ٹوٹے تھے اور عقل وحواس ذرہ برابر مختل نہیں ہوئے تھے۔ ان دونوں سے زیادہ عمر حضرت حسان ابن ثابتؓ کی ہوئی، جنہوں نے ایک سو بیس سال کی عمر میں اس دنیا کو خیرباد کہا، ابتدائی ساٹھ سال تک تو کفر کی حالت میں رہے اور پھر ساٹھ سال تک ایمان واسلام کی حالت میں بسر کئے، ان سے بھی طویل عمر حضرت سلمان فارسیؓ کی ہوئی، کہا جاتا ہے کہ جب ان کی وفات ہوئی تو اس وقت ان کی عمر ڈھائی سو سال تھی، اگرچہ ایک روایت ساڑھے تین سو سال کی بھی ہے لیکن صحیح پہلا ہی قول ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

بخل اور آرزو کی مذمت

⑭ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَوَّلُ صَلَاحِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الْيَقِيْنُ وَالزُّهْدُ وَاَوَّلُ فَسَادِهَا الْبُخْلُ وَالْاَمَلُ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اس اُمت کی پہلی نیکی، یقین کرنا اور زہد اختیار کرنا ہے اور اس اُمت کا پہلا فساد، بخل اور دنیا میں باقی رہنے کی آرزو کو دراز کرنا ہے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: "یقین" سے مراد ہے اس بات پر کامل اعتقاد رکھنا کہ اللہ تعالیٰ رزاق ہے اور رزق پہنچانے کا متکفل وضامن ہے، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا یعنی روئے زمین پر ایسا کوئی چلنے والا (جاندار) نہیں۔ ہے جس کا رزق اللہ

کے ذمہ نہ ہو۔

"زہد اختیار کرنے" کا مطلب، دنیا کی محبت میں گرفتار ہونے سے بچنا اور دنیا کی نعمتوں ولذتوں سے بے اعتنائی ولاپرواہی برتنا ہے۔ حاصل یہ کہ دین وآخرت کی بھلائی وکامیابی کا مدار تقویٰ پر ہے جو زہد ویقین سے حاصل ہوتا ہے اور دین وآخرت کی خرابی کی جڑ، طمع ولالچ جیسے بخل اور درازیٔ عمر کی آرزو سے پیدا ہوتا ہے۔

چنانچہ جب حق تعالیٰ کی رزاقیت پر کامل اعتقاد ویقین ہوتا ہے تو بخل کا مادہ فساد نہیں پھیلاتا کیونکہ بخل کا سبب وہ بے یقینی ہوتی ہے جو رزق پہنچنے کے تئیں انسان اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے یعنی اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میرے پاس جو مال وزر ہے اگر میں نے اس کو انفاق وایثار کی صورت میں خرچ کر دیا تو پھر کل کہاں سے کھاؤں گا! اسی طرح جب زہد کی راہ اختیار کی جاتی ہے تو دنیا میں باقی رہنے کی تمنا اور آرزوؤں کی درازی ختم ہو جاتی ہے، اس لئے یہ فرمایا گیا ہے کہ اس اُمت کا پہلا فساد بخل اور آرزو ہے، کیونکہ یہ دونوں خصلتیں رزاقیت حق پر یقین اور زہد کی ضد ہیں۔

"یقین" کی تعریف: اس موقع پر یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ "یقین" کا اصل مفہوم کیا ہے؟ چنانچہ حضرت شیخ عبدالوہاب متقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ "حبل المتین فی تحصیل الیقین" میں لکھا ہے کہ "اعتقاد کا جزم کی حد تک پہنچ جانا اور دلیل وبرہان کے ذریعہ اتنا مضبوط ومستند ہو جانا کہ حق کو ثابت کر دے۔" حکماء ومتکلمین کی اصطلاح میں "یقین" کہلاتا ہے۔ لیکن صوفیہ کی اصطلاح میں اس مفہوم پر "یقین" کا اطلاق اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ تصدیق دل پر اس حد تک غالب نہ ہو جائے کہ دل پر اس کے تصرف وحکمرانی کا سکہ چلنے لگے۔ یا اس دل کو صرف انہی چیزوں کی طرف مائل کرنے لگے جو شریعت کے مطابق ہوں اور ان چیزوں سے باز رہے جو شرعی احکام کے خلاف ہوں، مثلاً موت کا اعتقاد ہر شخص رکھتا ہے اور وہ اعتقاد نہ صرف جزم کی حد تک ہوتا ہے بلکہ دلیل وبرہان کے ذریعہ اتنا مضبوط ومستند ہوتا ہے کہ وہ موت کو ایک اٹل حقیقت بھی ثابت کرتا ہے، تو حکماء متکلمین کے نزدیک اس اعتقاد پر "یقین" کا اطلاق کیا جا سکتا ہے لیکن صوفیاء کے نزدیک وہ اعتقاد حقیقی معنی میں "یقین" نہیں کہلا سکتا اور اس اعتقاد کا حامل "صاحب یقین" شمار نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس کے دل پر موت کی یاد غالب نہ ہو، اور موت کا احساس اس حد تک اس پر متصرف وحکمران نہ ہو کہ وہ طاعات کی مشغولیت اور گناہ کے ترک کے ذریعہ ہر وقت موت کے لئے تیار رہے۔

واضح رہے کہ چار امور ایسے ہیں جو "یقین" کا محل ہیں۔ یوں تو وہ تمام چیزیں یقین کی متقاضی ہیں جن کی خبر آنحضرت ﷺ نے دی ہے لیکن ان تمام چیزوں کی اصل اور بنیاد ہونے کی حیثیت سے وہ چار امور اس درجہ کے ہیں کہ ان پر ہر سالک کو یقین رکھنا بنیادی طور پر ضروری ہے، ایک تو توحید، یعنی یہ پختہ اعتقاد رکھنا کہ جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے حق تعالیٰ ہی کی قدرت سے واقع ہوتا ہے دوسرے توکل، یعنی اس بات پر کامل یقین رکھنا کہ اللہ تعالیٰ رزق پہنچانے کے متکفل وضامن ہے، تیسرے جزاء وسزا کا اعتقاد، یعنی یہ یقین رکھنا کہ ہر عمل کی جزا وسزا مقرر ہے تمام اعمال پر ثواب وعذاب کا مرتب ہونا لازمی امر ہے اور چوتھے یہ یقین رکھنا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام احوال وکیفیات اور تمام حرکات وسکنات سے پوری طرح باخبر اور مطلع ہے! پس توحید کے تئیں یقین کا فائدہ یہ ہوگا کہ مخلوقات کی طرف رغبت والتفات نہیں رکھے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق پہنچنے کے تئیں یقین رکھنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ یا تو حصول رزق کی طلب وکوشش میں میانہ روی اختیار کرے گا، یا اگر افلاس وناداری کی صورت میں غذائی ضروریات پوری نہ ہوں گی تو کسی تاسف اور بددلی میں مبتلا نہیں ہوگا، اعمال کے جزا وسزا کے تئیں یقین رکھنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ طاعات وعبادات کی مشغولیت اور خدا کی رضا وخوشنودی کے حصول میں زیادہ سے زیادہ سعی وکوشش کرے گا اور گناہ ومعصیت کی زندگی سے اجتناب کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے علیم وخبیر ہونے کے تئیں یقین رکھنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ اپنے ظاہر وباطن کی اصلاح کی طرح زیادہ سے زیادہ متوجہ رہے گا۔" یہ حضرت شیخ عبدالوہاب کے کلام کا خلاصہ تھا۔ اب آخر میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق اللہ تعالیٰ کی رزاقیت، رزق پہنچنے، اور اللہ تعالیٰ نے رزق دینے کا جو وعدہ کیا ہے اس پر کامل

توکل واعتماد رکھنا، تمام روحانی وباطنی اعلی مراتب میں سے ایک بہت بڑا مرتبہ ہے نیز سالک راہ حق کو یہ مرتبہ اختیار کئے بغیر کوئی چارہ نہیں، اور تمام عبادات وطاعات میں قلبی فروغ واطمینان کا انحصار اس مرتبہ پر ہے۔ امام زمانہ، قطب وقت، حضرت الشیخ ابوالحسن شاذلیؒ نے بڑی عارفانہ بات کہی ہے کہ دو ہی چیزیں ایسی ہیں جو عام طور پر بندہ اور خدا کے درمیان پردہ کی طرح حائل ہو جاتی ہیں (یعنی ان دونوں چیزوں کی وجہ سے بندہ معرفت حق حاصل کرنے سے محروم رہتا ہے) ایک تو رزق کا فکر، اور دوسرے مخلوق کا خوف، اور ان دونوں میں سے بھی زیادہ سخت پردہ رزق کا فکر ہے۔

امام اصمعیؒ سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دیہاتی کے سامنے سورۂ وَالذّٰرِیٰتِ کی تلاوت شروع کی اور جب اس آیت پر پہنچا فِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ وَمَاتُوْعَدُوْنَ تو اس دیہاتی نے (جو بڑے غور کے ساتھ میری تلاوت سن رہا تھا) ایک دم کہا کہ بس کیجئے! اور پھر وہ اپنی اونٹنی کی طرف متوجہ ہوا، اس نے اس اونٹنی کو نحر کیا اور اس کا گوشت کاٹ بنا کر ان تمام لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا جو اس کے آس پاس موجود تھے، اس کے بعد اس نے اپنی تلوار اور کمان اٹھائی اور ان کو بھی توڑ کر پھینک دیا، اور پھر بغیر کچھ کہے سنے وہاں سے اٹھ کر چلا گیا، کافی عرصہ کے بعد میں ایک دن بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا کہ اچانک اس دیہاتی سے ملاقات ہوگئی جو خود بھی طواف کر رہا تھا، میں اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا، اس کا بدن بالکل سوکھ گیا تھا اور رنگ زرد ہو گیا تھا، اس نے مجھ کو دیکھ کر سلام کیا اور کہنے لگا کہ وہی سورت پھر پڑھیے جو آپ نے اس دن پڑھی تھی، چنانچہ میں نے وہ سورت پڑھنی شروع کی اور جب اسی آیت یعنی وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ پر پہنچا تو اس نے ایک چیخ ماری اور کہا قَدْ وَجَدْنَامَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا اس کے بعد اس نے کہا کہ کچھ اور؟ (یعنی اب آگے کی آیت پڑھیے) میں نے آگے کی آیت پڑھی، فَوَرَبِّ السَّمَآءِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ اس نے آیت سن کر پھر ایک چیخ ماری اور کہنے لگا، یا اللہ، پاک ہے تیری ذات! وہ کون بدبخت ہے جس نے اللہ کو اتنا غصہ دلایا کہ اس کو قسم کھانی پڑی؟ اس شخص کی بدبختی کا کیا ٹھکانا ہے کہ پروردگار نے جو کچھ فرمایا اور جو وعدہ کیا اس پر اس نے یقین نہیں کیا یہاں تک کہ پروردگار کو قسم کھا کر اس بات کا یقین دلانا پڑا؟ اس دیہاتی نے تین مرتبہ یہی جملے ادا کئے اور اس کے ساتھ ہی اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

حقیقی زہد کیا ہے؟

⑮ وَعَنْ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ قَالَ لَيْسَ الزُّهْدُ فِي الدُّنْيَا بِلُبْسِ الْغَلِيظِ وَالْخَشِنِ وَاَكْلِ الْجَشِبِ اِنَّمَا الزُّهْدُ فِي الدُّنْيَا قِصَرُ الْاَمَلِ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت سفیان ثوریؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا "دنیا میں زہد اس کا نام نہیں ہے کہ موٹے چھوٹے اور سخت کپڑے پہن لئے جائیں اور روکھا سوکھا اور بدمزہ کھانا کھایا جائے بلکہ دنیا سے زہد اختیار کرنا حقیقت میں آرزوؤں اور امیدوں کی کمی کا نام ہے" (شرح السنۃ)

تشریح: "غلیظ" سے وہ کپڑا مراد ہوتا ہے جس کے سوت نہایت موٹے اور بھدے ہوں اور خشن سے مراد وہ کپڑا ہوتا ہے جو نہایت سخت اور کھردری بناوٹ کا ہو! جشب اس کھانے کو کہتے ہیں جو نہایت بدمزہ ہو، اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ بغیر سالن کی روٹی کو "جشب" کہتے ہیں! آرزوؤں اور امیدوں کی کمی کا مطلب ہے دنیاوی چیزوں کے حصول کی خواہشات اور درازئ عمر کی تمنا کو ختم کر کے بلا تاخیر توبہ وانابت اور علم وعمل کی راہ اختیار کر لینا اور ہمہ وقت موت کے لئے تیار رہنا۔

حضرت سفیان ثوریؒ کے مذکورہ بالا عارفانہ قول کا مطلب یہ ہے کہ زہد، دنیا سے بے رغبتی بے اعتنائی کی اس کیفیت کا نام ہے جو انسانی قلب پر اس طرح طاری ہو کہ وہ (قلب) دنیا سے بیزار، اور آخرت کی طرف راغب ومتوجہ رہے! گویا زہد کا مدار اس بات پر نہیں ہے کہ انسان کا قالب یعنی جسم وبدن دنیا کی جائز ومباح چیزوں سے فائدہ اٹھاتا ہے یا نہیں کیونکہ حقیقت کے اعتبار سے اس (زہد) کے معاملہ میں یہ دونوں برابر ہوں یعنی ایک شخص جسمانی طور پر خوش پوشاک وخوش خوراک ہونے کے باوجود قلبی طور پر ہمہ وقت آخرت کی طرف

متوجہ وراغب رہ سکتا ہے اور ایک شخص جسمانی طور پر خوش پوشاکی وخوش خوراکی سے بیزار رہتے ہوئے بھی قلبی طور پر آخرت کی طرف زیادہ متوجہ وراغب نہیں رہ سکتا، اگرچہ لباس کی بے حیثیتی وسادگی اور کھانے کی بدمزگی، سلوک وطریقت کی راہ میں بندے کی استقامت واستواری پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ حاصل یہ کہ جو سالک جسمانی طور پر تو دنیا سے اجتناب کرے لیکن اس کے دل میں دنیا کی محبت جاگزیں ہو تو یہ چیز اس کے لئے نہایت مہلک اور تباہ کن ہے، اس کے برخلاف اگر وہ جسمانی طور پر تو دنیا کی جائز ومباح نعمتوں اور لذتوں سے فائدہ اٹھائے، مگر اس کا دل دنیا کی محبت سے خالی اور آخرت کی طرف متوجہ ہو تو یہ اس کے حق میں بہت بہتر ہے۔

جاننا چاہئے کہ دل کی مثال کشتی کی سی ہے کہ اگر پانی کشتی کے اندر آجائے تو وہ نہ صرف کشتی بلکہ اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو بھی ڈبو دیتا ہے، لیکن وہی پانی جب اسی کشتی کے باہر اور اس کے گرد رہتا ہے تو اس (کشتی) کو رواں کرتا ہے اور منزل تک پہنچاتا ہے! اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا ہے نعم المال الصالح للرجل الصالح اور اسی وجہ سے صوفیاء کی ایک جماعت کے بارے میں منقول ہے کہ وہ حضرات اسی طرح کا لباس پہنا کرتے تھے جیسا کہ عام طور پر رائج تھا بلکہ بعض نے تو امیروں اور رئیسوں جیسا لباس بھی پہنا ہے تاکہ ان کے باطنی احوال کا انکشاف نہ ہو۔

(۱۶) وَعَنْ زَيْدِ ابْنِ الْحُسَيْنِ قَالَ سَمِعْتُ مَالِكًا وَّسُئِلَ اَیُّ شَیْءٍ اَلزُّهْدُ فِي الدُّنْيَا قَالَ طِيْبُ الْكَسْبِ وَقِصَرُ الْاَمَلِ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت زید ابن حصین (جو حضرت امام مالک کے رفقاء اور مصاحبین میں سے تھے) کہتے ہیں میں نے حضرت امام مالک کو یہ کہتے ہوئے سنا جب کہ ان سے پوچھا گیا کہ دنیا سے زہد اختیار کرنا کس چیز کا نام ہے؟ انہوں نے فرمایا۔ "حلال کمائی اور آرزوؤں کی کمی، کا نام زہد ہے۔" (بیہقی)

تشریح: "کسب" یہاں "مکسوب" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی کھانے پینے کی وہ چیزیں جو حلال وپاکیزہ ہوں! حاصل یہ کہ "زہد" اس چیز کا نام نہیں ہے کہ انسان ان چیزوں کو بھی کھانے پینے اور ان سے بقدر ضرورت فائدہ اٹھانے سے پرہیز کرے جو اس کے حق میں حلال وپاکیزہ ہیں، کیونکہ اگر ان چیزوں سے فائدہ اٹھانا "زہد" کے منافی اور غیر مستحسن ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں سے یہ نہ فرماتا کہ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اور نہ اہل ایمان کو یہ حکم دیا جاتا کہ يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ! بلکہ "زہد" یہ ہے کہ انسان کو جائز وسائل وذرائع سے جو حلال پاکیزہ چیزیں حاصل ہوں ان سے بقدر ضرورت فائدہ اٹھائے اور غیر حلال وغیر پاکیزہ چیزوں سے کلیۃً اجتناب کرے، اسی طرح ایک اور چیز، جس کا تعلق زہد سے ہے، یہ ہے کہ انسان آرزوؤں اور امیدوں کا اسیر بن کر کاہل وسست اور آخرت سے غافل نہ بن جائے بلکہ ہمہ وقت آخرت کی طرف متوجہ رہے اور زیادہ سے زیادہ اچھے عمل کرنے میں مشغول رہے تاکہ جس وقت بھی پیغام اجل آجائے، وہ اپنی جان، جاں آفریں کے سپرد کرنے پر اپنے کو بالکل تیار پائے، یہی وہ "زہد" جو شریعت کی نظر میں مطلوب ہے اور جو انسان کو عاقبت اندیش بناتا ہے اور آخرت کی طرف متوجہ رکھتا ہے۔

اگر اس موقع پر ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ "زہد" سے حلال کمائی کا کیا تعلق؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ حضرت امام مالک نے اپنے اس قول کے ذریعہ اسی خیال کی تو تردید کی ہے "زہد" محض اس چیز کا نام ہے کہ دنیا سے بالکل بے تعلقی اور کنارہ کشی اختیار کرلی جائے، موٹا جھوٹا کپڑا پہنا جائے، اور روکھی سوکھی روٹی کھانے پر عمل پیرا رہا جائے! چنانچہ حضرت امام مالک نے اس بات کو بجا طور پر واضح فرمایا حقیقی زہد وہ نہیں ہے جس کو تم نے اپنے گمان میں جگہ دے رکھی ہے بلکہ زہد کی حقیقت یہ ہے کہ خدا تمہیں جائز ذریعوں سے جو کچھ حلال وپاکیزہ چیزیں عطا کرے ان کو کھاؤ پیؤ، ان سے فائدہ اٹھاؤ اور قدر ضرورت پر قناعت کرو نیز ضرورت سے زیادہ چیزوں کی امید آرزو اور درازی عمر کی تمنا نہ رکھو، جیسا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے۔ "دنیا سے زہد اختیار کرنا اس چیز کا نام نہیں ہے کہ حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام قرار دے لو اور اپنے مال واسباب کو ضائع کر ڈالو، بلکہ زہد در اصل اس چیز کا نام ہے کہ جو چیز تمہارے ہاتھ میں ہے اس پر اس چیز سے زیادہ

اعتماد نہ کرو جو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

بَابُ اِسْتِحْبَابِ الْمَالِ وَالْعُمْرِ لِلطَّاعَةِ

خدا کی طاعت و عبادت کے لئے مال اور عمر سے محبّت رکھنے کا بیان

"استحباب" کے معنی ہیں، اچھا جاننا، پسند کرنا! "مال" کے معنی ہیں خواستہ، یعنی وہ چیز جس کی چاہ و خواہش رکھی جائے، اس کی جمع "اموال" ہے اور "مال" اصل میں "میل" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں مائل ہونا، راغب ہونا! چنانچہ دھن دولت، اسباب و سامان اور جائداد وغیرہ کو "مال" اسی لئے کہا جاتا ہے کہ انسان ان چیزوں کی طرف طبعی طور پر رغبت و میلان رکھتا ہے! "عمر" کے معنی ہیں زندگی، زندہ رہنے کی مدت۔

اس باب میں وہ احادیث نقل کی جائیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت و عبادت کی خاطر، دین کی خدمت کے لئے اور اخروی فلاح و بہبود کے امور انجام دینے کی غرض سے مال و دولت کی خواہش و طلب اور درازیٔ عمر کی آرزو رکھنا جائز ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

خدا کا پسندیدہ بندہ کون ہے؟

(۱) عَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِيَّ الْغَنِيَّ الْخَفِيَّ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَذُكِرَ حَدِيْثُ ابْنِ عُمَرَ لَا حَسَدَ اِلَّا فِي اثْنَيْنِ فِيْ بَابِ فَضَائِلِ الْقُرْاٰنِ۔

"حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، "یقیناً اللہ تعالیٰ اس بندے کو بہت پسند کرتا ہے جو متقی و غنی اور گوشہ نشین ہو۔" (مسلمؒ) اور حضرت ابن عمرؓ کی روایت لاحسد الافی اثنین فضائل قرآن کے باب میں نقل کی جا چکی ہے۔"

تشریح: "متقی" اس شخص کو کہتے ہیں جو ممنوع چیزوں سے اجتناب کرے یا یہاں "متقی" سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے مال و زر کو بڑے کاموں اور عیش و تفریح میں خرچ نہ کرے! بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ متقی سے مراد وہ شخص ہے جو حرام اور مشتبہ امور سے کلیۃً اجتناب کرے اور ان چیزوں سے بھی احتیاط و پرہیز کرے جن کا تعلق خواہشات نفس اور مباحات سے ہے! اور "غنی" سے مراد وہ شخص ہے جو مالدار و دولتمند ہو یا دل کا غنی ہو! لیکن اس حدیث کا یہاں اس باب میں نقل کرنا اس بات کو زیادہ ثابت کرتا ہے کہ "غنی" سے مراد وہی شخص ہے جو مال و دولت رکھتا ہو، اور یہ بات دل کے غنی ہونے کے منافی نہیں ہے کیونکہ "غنا" کے باب میں وہی شخص اصل اور کامل ترین ہے جو ظاہری مال و دولت کے ساتھ دل کا غنا بھی رکھتا ہو اور جس کے ذریعہ ہاتھ کے غنا کا وہ تقاضا بھی پورا ہوتا ہے جو دنیا و آخرت میں مراتب و درجات کی بلندی کا باعث بنتا ہے اس صورت میں یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ یہاں "غنی" سے مراد اصل میں شکر گذار مالدار ہے! چنانچہ بعض حضرات نے اس حدیث سے یہی استدلال کیا ہے کہ شکر گذار مالدار، صبر اختیار کرنے والے فقیر و مفلس سے افضل ہے۔ اگرچہ یہ قول (کہ شاکر غنی، صابر فقیر سے افضل ہوتا ہے) اس قول کے خلاف ہے جس کو زیادہ صحیح اور قابل اعتماد قرار دیا گیا ہے (اور وہ یہ کہ صابر فقیر، شاکر غنی سے افضل ہوتا ہے) چنانچہ اس بارے میں تفصیلی بحث پیچھے گزر چکی ہے۔

"خفی" سے مراد یا تو گوشہ نشین ہے، یعنی وہ شخص جو سب سے ترک تعلق کے ذریعہ یکسوئی اور تنہائی اختیار کر کے اپنے رب کی عبادت میں مشغول رہے، یا یہ کہ پوشیدہ طور پر خیر و بھلائی کرنے والا امراد ہے، یعنی وہ شخص کہ جو اللہ تعالیٰ کی رضامندی و خوشنودی کے لئے نیک کاموں اور اپنے مال کو خرچ کرنے میں اس طرح رازداری اختیار کرے کہ کسی کو اس کا علم نہ ہو، اس صورت میں "خفی" کا

اطلاق مفلس ونادار شخص پر بھی ہوسکتا ہے، اور یہ دوسری مراد زیادہ واضح ہے ویسے یہ لفظ حائے مہملہ کے ساتھ یعنی "حفی" بھی روایت کیا گیا ہے جس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو حق کے معاملہ میں نرمی ومہربانی اور احسان کرے، لیکن صحیح یہی ہے کہ یہ لفظ "خفی" ہے جس کی وضاحت پہلے کی گئی! واضح رہے کہ یہ حدیث ان لوگوں کی بھی دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا، ان کے ساتھ میل جول اور ان کے درمیان رہن سہن رکھنے سے افضل ہے، لیکن جو حضرات، لوگوں کے ساتھ میل جول اور ان کے درمیان رہن کو ترک تعلق اور کنارہ کشی سے افضل قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے یہ تاویل کی ہے کہ گوشہ نشینی کا افضل اور پسندیدہ ہونا اس صورت کے ساتھ خاص ہے جب کہ فتنوں کا زور ہو اور لوگوں کے ساتھ میل جول اور ان کے درمیان رہن سہن اختیار کرنے سے دین وآخرت کے معاملات پر برا اثر پڑتا ہو اور ایمان وعمل میں رخنہ اندازی ہوتی ہو۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

درازیٔ عمر کی فضیلت حسن عمل پر منحصر ہے

(۲) عَنْ اَبِیْ بَکْرَةَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ النَّاسِ خَیْرٌ قَالَ مَنْ طَالَ عُمُرُہٗ وَحَسُنَ عَمَلُہٗ قَالَ فَاَیُّ النَّاسِ شَرٌّ قَالَ مَنْ طَالَ عُمُرُہٗ وَسَآءَ عَمَلُہٗ۔ (رواہ احمد والترمذی والدارمی)

"حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے پوچھا، کہ یا رسول اللہ! کون سا آدمی بہتر ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "وہ شخص جس کی عمر زیادہ ہو اور عمل اچھے ہوں۔" پھر اس شخص نے پوچھا۔ "اور کون سا آدمی برا ہے؟" حضور ﷺ نے فرمایا۔ "وہ شخص جس کی عمر زیادہ ہو اور برے عمل ہوں۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، دارمیؒ)

تشریح: حدیث کے ظاہری اسلوب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ حکم اغلب کے اعتبار سے ہے یعنی اچھے یا برے عمل زیادہ ہوں گے تو وہ شخص یا برا قرار پائے گا اور اگر اچھے اور برے عمل دونوں برابر ہوں گے تو پھر وہ ایک وجہ سے تو اچھا کہلائے گا اور ایک وجہ سے برا، اگرچہ اس بات کا ثابت ہونا نادر ہے۔

اچھے اعمال کے ساتھ زیادتی عمر کی فضیلت

(۳) وَعَنْ عُبَیْدِ ابْنِ خَالِدٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ آخَی بَیْنَ رَجُلَیْنِ فَقُتِلَ اَحَدُھُمَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ مَاتَ الْاٰخَرُ بَعْدَہٗ بِجُمْعَةٍ اَوْنَحْوِھَا فَصَلُّوْا عَلَیْہِ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَاقُلْتُمْ قَالُوْا دَعَوْنَا اللّٰہَ اَنْ یَّغْفِرَ لَہٗ وَیَرْحَمَہٗ وَیُلْحِقَہٗ بِصَاحِبِہٖ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَیْنَ صَلٰوتُہٗ بَعْدَ صَلٰوتِہٖ وَعَمَلُہٗ بَعْدَ عَمَلِہٖ اَوْ قَالَ صِیَامُہٗ بَعْدَ صِیَامِہٖ لَمَا بَیْنَھُمَا اَبْعَدُ مِمَّا بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور حضرت عبید ابن خالدؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دو شخصوں کے درمیان بھائی چارہ کرا دیا تھا (یعنی ان دونوں کو جو صحابہؓ میں سے تھے، بھائی بھائی بنا دیا تھا) ان میں سے ایک شخص خدا کی راہ میں مارا گیا (یعنی جہاد میں شہید ہوگیا) اور اس کی شہادت کے ایک ہفتہ یا قریب ایک ہفتہ کے بعد دوسرا شخص بھی (صاحب فراش ہوکر) فوت ہوگیا۔ صحابہؓ نے اس شخص کی نمازہ جنازہ پڑھی اور (جب وہ نماز جنازہ سے فارغ ہوئے تو) نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم نے مرحوم کی جو نماز جنازہ پڑھی ہے اس میں تم نے کیا پڑھا ہے اور کیا کہا ہے (یعنی تم نے نماز جنازہ میں مرحوم کے لئے کیا دعا کی ہے؟) صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی ہے کہ اس کے گناہ بخش دے، اس پر رحمت نازل کرے اور اس کو اس کے (شہید ہوجانے والے) ساتھی کے پاس (جنت کے اعلیٰ درجہ میں) پہنچادے (جیسا کہ وہ دونوں اس دنیا میں اتفاق واتحاد کے ساتھ اور یکجا رہتے تھے) نبی کریم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا۔ "تو پھر اس کی وہ نماز کہاں گئی جو اس نے اپنے

ساتھی کی نماز کے بعد کے دنوں میں) پڑھی تھی، اور اس کے ان اعمال کا ثواب کہاں گیا جو اس نے اپنے ساتھی کے اعمال کے بعد (کے دنوں میں) کئے تھے۔ یا یہ فرمایا کہ "اس کے ان روزوں کا ثواب کہاں گیا جو اس نے اپنے اس ساتھی کے روزوں کے بعد (کے دنوں میں) رکھے تھے؟" (یعنی تم نے مرحوم کے حق میں جو یہ دعا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے اس بھائی و ساتھی کے پاس جنّت میں پہنچائے جو شہید ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے گمان میں اس شخص کا درجہ و مرتبہ اپنے اس شہید بھائی کے درجہ و مرتبہ سے کم ہے۔ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو پھر بتاؤ کہ اس مرحوم کی وہ نمازیں و روزے اور وہ دوسرے اچھے اعمال اور ان کا اجر و ثواب کہاں جائے گا جو اس نے اپنے بھائی کے انتقال کے بعد کے دنوں میں کئے ہیں، بلاشبہ جنّت کے اندر اور قرب الٰہی میں دو شخصوں کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ اس فاصلہ سے بھی زیادہ ہے جو زمین و آسمان کے درمیان ہے۔" (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: حضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ یہ شخص اپنے ساتھی کی شہادت کے بعد جتنے زائد دنوں تک زندہ رہا اور ان دنوں میں اس نے جو عبادات و اعمال صالحہ کئے ان کی وجہ سے اس کا مرتبہ اپنے شہید بھائی و ساتھی کے مرتبہ سے بھی بلند ہو گیا ہے! اس موقعہ پر بجا طور پر یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ بعد میں وفات پانے والا مذکورہ شخص محض ان عبادات و اعمال کی وجہ سے کہ جو اس نے ایک ہفتہ کے دوران کئے تھے، اس شخص پر فضیلت کیسے پا سکتا ہے جو اس سے پہلے میدان جنگ میں شہید ہو گیا تھا اور جب کہ اس نے خدا کی راہ میں اور دین حق کی سربلندی کی خاطر شہادت کا درجہ پایا اور جام شہادت بھی اس نے اس زمانہ میں نوش کیا جب کہ رسول کریم ﷺ اس دنیا میں تشریف فرما تھے، اسلام اپنے ابتدائی زمانہ کے نہایت پر آشوب حالات سے گزر رہا تھا، اور دین کے مددگاروں کی کمی تھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس دوسرے شخص کو پہلے شخص (شہید) کے مقابلہ میں زیادہ افضل قرار دینا محض اس کے ان اعمال کی وجہ سے نہیں ہے جو اس نے اس ایک ہفتہ کے دوران کئے تھے بلکہ اصل بات یہ تھی کہ وہ شخص بھی اسلامی لشکر ہی کا ایک فرد تھا اور خدا کی راہ میں مرابط کے فرائض انجام دیا کرتا تھا نیز میدان جنگ میں شہید ہونے کی صادق نیت رکھتا تھا، لہٰذا اس کی نیت کا یہ پھل اس کو ملا کہ اس کو گویا شہادت کا درجہ دیا گیا جس کی وجہ سے وہ اپنے ساتھی کا ہم مرتبہ ہو گیا اور پھر اس نے اس ساتھی کی شہادت کے بعد کے دنوں میں جو نیک اعمال کئے ان کی وجہ سے اس کا مرتبہ اور زیادہ بڑھ گیا۔

وہ چار آدمی جن کے حق میں دنیا بھلی یا بری ہے

(۴) وَعَنْ اَبِیْ کَبْشَةَ الْاَنْمَارِیِّ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ ثَلٰثٌ اُقْسِمُ عَلَيْهِنَّ وَاُحَدِّثُكُمْ حَدِيْثًا فَاحْفَظُوْهُ فَاَمَّا الَّذِیْ اُقْسِمُ عَلَيْهِنَّ فَاِنَّهٗ مَانَقَصَ مَالُ عَبْدٍ مِنْ صَدَقَةٍ وَلَا ظُلِمَ عَبْدٌ مَظْلِمَةً صَبَرَ عَلَيْهَا اِلَّا زَادَهُ اللّٰهُ بِهَا عِزًّا وَلَا فَتَحَ عَبْدٌ بَابَ مَسْئَلَةٍ اِلَّا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ بَابَ فَقْرٍ وَاَمَّا الَّذِیْ اُحَدِّثُكُمْ فَاحْفَظُوْهُ فَقَالَ اِنَّمَا الدُّنْيَا لِاَرْبَعَةِ نَفَرٍ عَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ مَالًا وَّعِلْمًا فَهُوَ يَتَّقِیْ فِيْهِ رَبَّهٗ وَيَصِلُ رَحِمَهٗ وَيَعْمَلُ لِلّٰهِ فِيْهِ بِحَقِّهٖ فَهٰذَا بِاَفْضَلِ الْمَنَازِلِ وَعَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ عِلْمًا وَّلَمْ يَرْزُقْهُ مَالًا فَهُوَ صَادِقُ النِّيَّةِ يَقُوْلُ لَوْ اَنَّ لِیْ مَالًا لَعَمِلْتُ بِعَمَلِ فُلَانٍ فَاَجْرُهُمَا سَوَآءٌ وَعَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ مَالًا وَّلَمْ يَرْزُقْهُ عِلْمًا فَهُوَ يَتَخَبَّطُ فِیْ مَالِهٖ بِغَيْرِ عِلْمٍ لَا يَتَّقِیْ فِيْهِ رَبَّهٗ وَلَا يَصِلُ فِيْهِ رَحِمَهٗ وَلَا يَعْمَلُ فِيْهِ بِحَقٍّ فَهٰذَا بِاَخْبَثِ الْمَنَازِلِ وَعَبْدٍ لَمْ يَرْزُقْهُ اللّٰهُ مَالًا وَّلَا عِلْمًا فَهُوَ يَقُوْلُ لَوْ اَنَّ لِیْ مَالًا لَعَمِلْتُ فِيْهِ بِعَمَلِ فُلَانٍ فَهُوَ نِيَّتُهٗ وَوِزْرُهُمَا سَوَآءٌ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ۔

"اور حضرت ابوکبشہ انماری" سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "تین باتیں ہیں جن کی حقانیت وصداقت پر میں قسم کھا سکتا ہوں، اور میں تم سے ایک بات کہتا ہوں (یعنی تمہارے سامنے اپنی ایک حدیث بیان کرتا ہوں) تم اس کو یاد رکھنا (اور اس پر عمل پیرا ہونا) پس وہ تین باتیں جن کی حقانیت وصداقت پر میں قسم کھا سکتا ہوں، یہ ہیں کہ بندہ کا مال خدا کی راہ میں خرچ کرنے

(صدقہ وخیرات) کی وجہ سے کم نہیں ہوتا (یعنی کسی بندہ کا اپنے مال کو خدا کی رضاو خوشنودی کے لئے خرچ کرنا بظاہر تو اپنے مال کو کم کرنا اور گھٹانا ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کو کوئی نقصان اور گھاٹا نہیں ہوتا کیونکہ اس کا صدقہ وخیرات کرنا دنیاوی طور پر بھی اس کے مال واسباب میں خیروبرکت کا موجب ہے اور آخرت میں بھی حصول ثواب کا ذریعہ ہے اور ظاہر ہے کہ یہ چیز کثرت وزیادتی کے حکم میں ہوگی نہ کہ نقصان کے حکم میں۔

جس بندہ پر ظلم کیا جائے اور اس کا مال ناحق لے لیا جائے اور وہ بندہ اس ظلم وزیادتی پر صبر کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت کو بڑھاتا ہے (یعنی اس کے ساتھ ظلم وزیادتی کا ہونا اگرچہ ظاہری طور پر اس کی ذلت کے مترادف ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس ظلم وزیادتی پر صبر کرنے کی وجہ سے اللہ کے نزدیک اس بندہ کی عزت ومرتبہ بڑھ جاتا ہے جیسا کہ جو شخص ظلم کرتا ہے اس کے ظلم کی وجہ سے اللہ کے نزدیک اس کی ذلت بڑھ جاتی ہے، یا یہ مطلب ہے کہ ظلم وزیادتی کا شکار ہونے والا بندہ اگرچہ وقتی طور پر ذلت وکمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے مگر انجام کار اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اس کی عزت ومرتبہ کو بڑھا دیتا ہے جیسا کہ ظالم اگرچہ وقتی طور پر سربلند ہو جاتا ہے مگر آخر کار اپنے ظلم کی وجہ سے نہایت ذلت ورسوائی سے دوچار ہوتا ہے اور دنیا والوں کی نظر میں بری طرح گر جاتا ہے اگرچہ وہ کتنی ہی طویل مدت کے بعد اس انجام بد کو کیوں نہ پہنچے، چنانچہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ قدرت کی کرشمہ سازی صورت حال کو اس طرح بدل دیتی ہے کہ ظالم ایک نہ ایک دن اپنی سربلندی کھو دیتا ہے اور کبھی زور آور ہونے کی وجہ سے جس شخص پر ظلم وزیادتی کیا کرتا تھا اپنے انجام کو پہنچ کر اسی مظلوم کا زیردست اور اس کے سامنے ذلیل وسرنگوں ہو جاتا ہے۔

اور جس بندہ نے اپنے نفس پر سوال کا دروازہ کھولا (یعنی ضرورت وحاجت کی وجہ سے نہیں بلکہ مال ودولت جمع کرنے اور خواہشات نفس کی تکمیل کے لئے لوگوں سے مانگنا شروع کر دے) اللہ تعالیٰ اس کے لئے فقروافلاس کا دروازہ کھول دیتا ہے (یعنی اس کو طرح طرح کے احتیاج وافلاس میں مبتلا کر دیتا ہے یا اس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے اس کو بھی ختم کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے وہ نہایت خرابی میں پڑ جاتا ہے) اور رہی اس حدیث کی بات جس کو میں نے تمہیں سنانے کے لئے کہا تھا تو اب میں اس کو بیان کرتا ہوں (دھیان سے سنو اور) اس کو یاد رکھو، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دنیا بس چار آدمیوں کے لئے ہے (یعنی یہ دنیا اپنے مال ودولت کے احوال اور اپنی بھلائی برائی کے اعتبار سے چار طرح کے آدمیوں میں منحصر ہے) ایک تو وہ بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال وزر بھی عطا کیا اور علم کی دولت سے بھی نوازا (ایسا علم کہ جس کے ذریعہ وہ اپنے مال کو مصارف خیر میں خرچ کرنے کا طریقہ جانتا ہے اور اس کے اثرات وکیفیات سے بھی باخبر ہے) پس وہ بندہ اپنے مال ودولت کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے (یعنی اس کو حرام وناجائز اور ناپسندیدہ حق امور میں خرچ نہیں کرتا) اس کے ذریعہ اپنے قرابت داروں اور عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک اور احسان کرتا ہے اور اس مال وزر میں سے اس کے حق کے مطابق اللہ تعالیٰ کے لئے خرچ کرتا ہے (یعنی مال ودولت کے تئیں اللہ تعالیٰ نے جو حقوق متعین کئے وہ ان کو احکام خداوندی کی تکمیل کے لئے ادا کرتا ہے، مثلاً زکوٰۃ نکالتا ہے، صدقہ وخیرات کرتا ہے، مالی کفارات ادا کرتا ہے اور ضیافت ایمانداری میں خرچ کرتا ہے چنانچہ اس بندہ کا بہت بڑا اور کامل ترین مرتبہ ہے (یعنی وہ بندہ دنیا میں اچھے خصائل واحوال سے متصف قرار دیا جاتا ہے یا آخرت میں اعلیٰ مراتب کا مستحق قرار پاتا ہے۔

دوسرا وہ بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم تو عطا کیا (کہ جس کے ذریعہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ مال کو کسی کام میں صرف کرنا خدا کی رضاو خوشنودی اور ہر طرح کے اجروثواب کا باعث ہے اور کس کام میں خرچ کرنا خدا کی ناراضگی اور ہر طرح کے خسران وعذاب کا سبب ہے) لیکن اس کو مال عنایت نہیں فرمایا پس وہ بندہ (اپنے علم کے سبب سچی نیت رکھتا ہے اور (حصول مال ودولت کی خواہش وآرزو رکھتے ہوئے) کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال اور روپیہ پیسہ ہوتا تو میں اس کے تئیں اچھے عمل کرتا جیسا کہ وہ فلاں شخص اپنے مال وزر کے بارے میں خدا سے ڈرتا ہے (یعنی جس طرح فلاں شخص کو خدا نے علم صادق کے ساتھ مال ودولت سے بھی سرفراز کیا ہے اور وہ اس مال کو خدا کی رضاو خوشنودی کی

خاطر اچھے کاموں میں خرچ کرکے، (یعنی ادائیگی زکوٰۃ، اقرباء کے ساتھ حسن سلوک اور صدقہ وخیرات کے ذریعہ دنیا وآخرت کی سرخروئی حاصل کر رہا ہے، اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس علم کے ساتھ مال ودولت بھی عطا فرماتا تو میں بھی اس شخص کی طرح اپنے مالک وزر کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی سعادت حاصل کرتا) چنانچہ دونوں شخصوں کا ثواب برابر ہے (یعنی اگر پہلا شخص مالدار ہونے کی وجہ سے خدا کی راہ میں واقعتا اپنا مال خرچ کرتا ہے اور یہ دوسرا شخص مالدار نہ ہونے کی وجہ سے خدا کی راہ میں کچھ خرچ نہیں کرتا لیکن سچی نیت رکھنے کے سبب وہی اجر وثواب پاتا ہے جو پہلے شخص کو ملتا ہے) تیسرا بندہ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا ہے لیکن علم نہیں دیا (ایسا علم کہ جس کے ذریعہ وہ خدا سے ڈرے اور اپنے مال کو حقوق کی ادائیگی میں خرچ کرے) پس وہ بندہ بے علم ہونے کی وجہ سے اپنے مال کے بارے میں بہک جاتا ہے (بایں طور کہ اول تو لالچ وحرص اور دنیا کی محبت کی وجہ سے بخل کرتا ہے کہ کسی بھی اچھے کام اور ادائیگی حقوق میں خرچ کرنے کا روادار نہیں ہوتا اور اگر کسی فلاحی، رفاہی کام یا کسی کی مدد واعانت میں کچھ خرچ بھی کرتا ہے تو مقصد محض نام ونمود اور اپنی بڑائی وثروت کا اظہار ہوتا ہے) وہ (اپنی بے عملی کے سبب) اس مال ودولت کے بارے میں اپنے رب سے نہیں ڈرتا ہے (یعنی آمدنی کے ایسے وسائل وذرائع سے اجتناب واحتیاط نہیں کرتا جو حرام وناجائز اور مشتبہ ہوتے ہیں اور نہ ایسے امور میں اپنا مال خرچ کرنے سے گریز کرتا ہے جو غیر شرعی اور ناپسندیدۂ حق ہیں) اور علم وتربیت کی کمی، نیز جذبۂ ترحم وہمدردی کے فقدان اور حرص وبخل کی کثرت کی وجہ سے) اپنے قرابت داروں اور عزیزوں کے ساتھ مالی احسان وسلوک نہیں کرتا ہے اور نہ ان حقوق کی تعمیل کرتا ہے جو اس کے مال ودولت سے متعلق ہیں (یعنی نہ تو زکوٰۃ اور دوسرے صدقات واجبہ کے ذریعہ خدا کا حق ادا کرتا ہے اور نہ بندوں کے حقوق مطالبات کے ادائیگی کی پرواہ کرتا ہے، چنانچہ یہ بندہ بدترین مرتبہ کا ہے۔

اور چوتھا بندہ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نہ تو مال عطا کیا ہے اور نہ علم دیا ہے (ایسا علم کہ جس کے ذریعہ وہ خیر وشر کے درمیان تمیز کر سکے اور یہ پہچان کر سکے کہ میرے حق میں کون سی چیز بہتر ہے اور کون سی چیز بری) پس وہ بندہ کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال اور روپیہ پیسہ ہوتا تو میں بھی اس کو فلاں شخص کی طرح (برے کاموں میں) خرچ کرتا، چنانچہ یہ بندہ اپنی نیت کے سبب مغضوب ہے (یا یہ ترجمہ بھی ہو سکتا ہے کہ پس یہ بندہ بری نیت رکھنے والا ہے) اور اس کا گناہ اس (تیسرے شخص) کے گناہ کے برابر ہے یعنی وہ تیسرا شخص اگرچہ اپنا مال برے کاموں میں خرچ کرنے کی وجہ سے گنہگار ہوتا ہے اور یہ (چوتھا) شخص مالدار نہ ہونے کی وجہ سے برے کاموں میں خرچ کرنے کا مرتکب نہیں ہوتا لیکن چونکہ برے کاموں میں خرچ کرنے کی نیت رکھتا ہے اس سبب سے اس کو بھی وہی گناہ ملتا ہے جو برے کاموں میں واقعتا خرچ کرنے والے کو ملتا ہے۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔"

تشریح: یہاں "نیت" کو "عزم" کے معنی پر محمول کرنا چاہئے، کیونکہ انسان گناہ کی محض خواہش ونیت پر نہیں بلکہ "عزم" پر ماخوذ ہوتا ہے اور اصطلاحی طور پر "عزم" اس کو کہتے ہیں کہ انسان کے دل میں کسی گناہ کے کرنے کا خیال وارادہ پیدا ہو اور وہ اس خیال وارادہ کو پورا کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑے لیکن خارجی طور پر کوئی ایسا مانع حائل ہو جس کی وجہ سے وہ اس گناہ کے کرنے اور اس تک پہنچنے پر قادر نہ ہو، کہ اگر وہ مانع باقی نہ رہے اور اس کو قدرت حاصل ہو جائے تو وہ بلا توقف اس گناہ کو کر ڈالے، مثلاً اگر کوئی شخص زنا کرنا چاہے اور وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل میں اس حد تک سعی وکوشش کرے گا کہ اگر کوئی خارجی چیز اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہ کرے تو وہ بے جھجک اور بلا توقف زنا میں مبتلا ہو جائے تو اس کی اس خواہش وارادہ کا اتنا پختہ (باعمل ہونا "عزم" کہلائے گا اور وہ اس عزم پر ماخوذ ہوگا اور اس کو خدا کی نظر میں گنہگار قرار دیا جائے گا کیونکہ "عزم" اگرچہ واقعۃً زنا نہیں ہے لیکن جس طرح زنا ایک گناہ ہے اسی طرح زنا کا عزم بھی ایک مستقل گناہ ہے! اس موقع پر زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس سلسلہ کی پوری بحث کو مختصر طور پر بیان کر دیا جائے، چنانچہ جاننا چاہئے کہ اول تو وسوسۂ شیطان ہے، یعنی بغیر کسی کسب وارادہ کے دل میں کسی گناہ کا خیال خود بخود آ جائے اور گزر جائے، جمے نہیں، اس کو "ہاجس" کہا جاتا ہے اور ہاجس پر کوئی مواخذہ نہیں! لیکن اگر وہ خیال دل میں بیٹھ جائے اور طبیعت کے اندر جولانی وگردش کرنے لگے تو اس کو

"خاطر" کہتے ہیں، خاطر بھی اس اُمت کے حق میں مرفوع اور قابل معافی قرار دیا گیا ہے۔ اس پر کوئی مواخذہ نہیں اور یہ اسی اُمت کے خصائص میں سے ہے! اس کے بعد "ہم" کا نمبر آتا ہے، "ہم" یہ ہے کہ گناہ کا وہ خیال دل میں اس طرح بیٹھ جائے کہ اس گناہ کے قصد وارادہ اور نیت کی صورت اختیار کر لے، حسنات (نیکیوں) میں تو "ہم" کا اعتبار کیا جاتا ہے کہ کسی نیکی کی محض نیت اور اس کا قصد وارادہ پوری نیکی کے مترادف قرار دیا جاتا ہے لیکن سیئات (گناہوں) کے معاملہ میں محض نیت اور ارادہ کا اعتبار نہیں ہوتا! اس کے بعد "عزم" ہے جس کی وضاحت پہلے کی جاچکی ہے اور جیسا کہ بیان کیا گیا ہے یہ عزم قابل مواخذہ ہے۔

حدیث کے اس جملہ ویعمل لله فیه بحقه میں فِیهِ کی ضمیر حضرت شیخ عبدالحق نے تو مال کی طرف لوٹائی ہے (جیسا کہ ترجمہ سے واضح ہے) لیکن ملا علی قاری نے فیہ کی ضمیر، مال کے بجائے، علم کی طرف لوٹائی ہے، اس صورت میں اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ "اور وہ شخص اس علم کے تعلق سے اور اس کے حق کے مطابق اللہ تعالیٰ کے لئے کام کرتا ہے بایں طور کہ اس علم پر عمل کر کے اور حقوق اللہ و حقوق العباد ادا کر کے اس علم کا حق ادا کرتا ہے! تاہم ملا علی قاری نے ابن مالک کی طرف منسوب کر کے یہ قول بھی لکھا ہے کہ فِیهِ کی ضمیر مال کی طرف راجع ہے! چنانچہ حضرت شیخ عبدالحق نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، نیز حضرت شیخ نے لفظ یتخبط کے یہ معنی لکھے ہیں کہ وہ شخص (کہ جس کو صرف مال عطا ہوتا ہے علم حاصل نہیں ہوتا) اپنی بے علمی اور بدعقلی کی وجہ سے اپنے مال و دولت کے معاملہ میں کوئی صحیح راہ اختیار نہیں کرپاتا، اور اچھے اور برے مصارف کے درمیان تمیز نہ کرپانے کی وجہ سے اس کو ادھر ادھر خرچ کرتا رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا مال زیادہ تر ان کاموں میں خرچ ہوتا ہے جو غیر شرعی اور ناپسندیدہ حق ہوتے ہیں! چنانچہ مابعد کے الفاظ لایتقی فیه ربه سے یہی بات واضح ہوتی ہے۔" لیکن ملا علی قاری نے اس جملہ کے یہ معنی لکھے ہیں کہ۔ "وہ شخص مال و دولت کے حصول میں سخت بے اعتدالی کا شکار ہو جاتا ہے کہ وہ ہر وقت بس پیسہ کمانے اور دولت جمع کرنے کے چکر میں رہتا ہے اس کا اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا اور ہر حرکت و سکون کا واحد محور حصول زر ہوتا ہے، علاوہ ازیں وہ اس مال و دولت کے تئیں طرح طرح کے احوال میں مبتلا ہوتا ہے کہ کبھی تو اس کو ادھر ادھر بے دریغ خرچ کرتا ہے اور کبھی اس طرح بخل و خست کرتا ہے کہ بنیادی ضروریات اور ادائیگی حقوق میں خرچ کرنے کا بھی روادار نہیں ہوتا۔"

نیکی کی توفیق اور حسن خاتمہ

⑤ وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی اِذَا اَرَادَ بِعَبْدٍ خَیْرًا اِسْتَعْمَلَهٗ فَقِیْلَ وَکَیْفَ یَسْتَعْمِلُهٗ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ یُوَفِّقُهٗ لِعَمَلٍ صَالِحٍ قَبْلَ الْمَوْتِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ جب بندہ کی بھلائی (یعنی اس کے حسن انجام) کا ارادہ فرماتا ہے تو اس سے بھلائی کے کام کراتا ہے۔" پوچھا گیا کہ، یا رسول اللہ، اس سے بھلائی کے کام اللہ تعالیٰ کس طرح کرتا ہے؟" فرمایا "موت سے پہلے اس کو نیک کام کی توفیق عطا فرما دیتا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس بندہ پر اللہ تعالیٰ کا کرم ہو جاتا ہے اس کو موت سے پہلے توبہ و انابت اور طاعت و عبادت کی توفیق خداوندی عطا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ حسن انجام اور خاتمہ بخیر کی سعادت پالیتا ہے۔

یہ حدیث گویا زندہ رہنے کی فضیلت و اہمیت کو ظاہر کرتی ہے کہ یہ زندگی ہی ہے جس میں انسان آخرت کی بھلائی و کامیابی کے لئے کچھ کما سکتا ہے۔

دانا شخص وہی ہے جو خواہشات نفس کو احکام الٰہی کے تابع کر دے

⑥ وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ

وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَ تَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت شداد بن اوسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "عقلمند و بہادر شخص وہ ہے جو اپنے نفس کو (اللہ تعالیٰ کے حکم و فیصلہ، تقدیر و قضا اور اس کی رضا خوشنودی کے تئیں) جھکادے اور (فرمان الٰہی کا) مطیع و فرمانبردار بنادے اور اس اجر و ثواب کے لئے (اچھے) عمل کرے جو موت کے بعد پائے گا۔ نیز احمق و نادان اور بزدل شخص وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشات کا تابع بنادے (یعنی نفس جن حرام و مشتبہ چیزوں اور دنیاوی لذات و مرغوبات کا خواہشمند ہو، ان کو اختیار کرکے گویا اپنے آپ کو خواہش نفس کا اسیر بنادے) اور (گناہوں میں مبتلا ہونے، فرمان حق کے خلاف چلنے، عمل خیر اور توبہ و استغفار کی راہ اختیار نہ کرنے کے باوجود) اللہ تعالیٰ سے (اس بات کا متمنی اور آرزو مند ہو (کہ وہ اس سے راضی ہو، اس کو بخش دے اور اس کو جنت میں داخل کرے۔" (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: نوویؒ نے لکھا ہے کہ امام ترمذیؒ اور دیگر علماء و محدثین نے وضاحت کی ہے من دان نفسه دراصل حاسبها کے مفہوم میں ہے یعنی عقلمند و بہادر وہ شخص ہے جو اپنی دنیاوی زندگی میں اپنے قول و فعل اور اپنی حالت کا خود احتساب کرے، پس اگر وہ دیکھے کہ اس کے اعمال و احوال اور کردار و گفتار پر نیکیوں کا غلبہ ہے تو خدا کا شکر ادا کرے اور اگر اس کو برائیوں کا غلبہ معلوم ہو تو توبہ و انابت کے ذریعہ اپنی حالت سدھارنے کی طرف متوجہ ہو، برائیوں کا ازالہ کرے اور پچھلی زندگی میں جو عبادات و اعمال صالحہ فوت ہوگئے ہیں ان کا تدارک کرے قبل اس کے کہ آخرت کے سخت عذاب و مواخذہ میں گرفتار کیا جائے۔ چنانچہ ایک روایت میں فرمایا گیا ہے حَاسِبُوْا اَنْفُسَكُمْ قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا یعنی اپنے نفس کا احساب کرو قبل اس کے کہ (آخرت میں) تمہارا محاسبہ کیا جائے! اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّاقَدَّمَتْ لِغَدٍ یعنی نفس کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نے کل (آخرت) کے لئے آگے کیا بھیجا ہے۔

حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ دانا مؤمن وہ ہے جو اپنے اندر اتنی طاقت و مضبوطی رکھے کہ اس کا نفس اپنی خواہشات کے فریب میں مبتلا نہ کرسکے، اور نادان مؤمن وہ ہے جو اس درجہ کمزور و ناتواں ہو کہ اس کا نفس اس کو اپنی خواہشات کا اسیر بنالے، دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ گناہ و معصیت کی راہ کو ترک نہ کرنا، توبہ و استغفار اور عمل خیر کے ذریعہ اپنی زندگی کو پاکیزہ نہ بنانا اور خدا اور سول کی مرضی کے خلاف چلنا اور پھر امید یہ (رکھنا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے دروزے کھول دے گا اور دین و دنیا کی فلاح و کامیابی سے نوازے گا نیز زبان سے یہ کہتے رہنا کہ میرا رب تو بڑا کریم و رحیم ہے، وہ مجھے بخش ہی دے گا اور جنت میں پہنچادے گا دراصل نفس کا ایک ایسا فریب ہے جس کے ذریعہ شیطان گمراہی سے نکلنے نہیں دینا چاہتا! اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے مَاغَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ اور فرمایا نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ایک موقع پر یوں واضح فرمایا کہ اِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ اور فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَةَ اللّٰهِ۔ ان آیتوں کا حاصل یہی ہے کہ عمل تو نہ کرنا، برائی کے راستہ کو تو نہ چھوڑنا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار ہونا لاحاصل ہے! امیدوار استہ بس یہی ہے کہ برائی کے راستہ کو چھوڑ دیا جائے، اعتقادی و عملی زندگی کو دینی و اخروی پاکیزگی و سلامتی کے سانچے میں ڈھال دیا جائے اور ہر عمل خیر کی راہ میں کوئی تقصیر و کوتاہی نہ کی جائے، اور پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار بھی رہے اور اس کے عذاب سے ڈرتا بھی رہے تو اس صورت میں رحمت خداوندی کا استحقاق نصیب ہوسکتا ہے۔

حضرت شیخ ابن عباد شاذلیؒ نے لکھا ہے کہ عارف باللہ علماء نے وضاحت کی ہے کہ خدا کی رحمت کے تئیں وہ جھوٹی امید کہ جس پر ناروا اعتماد کرکے انسان عمل و عبادت کی راہ ترک کردے اور وہ امید اس کو گناہ و معصیت کی زندگی کا بیباک راہرو بنادے، حقیقت میں امید نہیں ہے بلکہ نفس کا فریب آرزو اور شیطان کا دھوکا ہے۔

حضرت معروف کرخیؒ فرماتے ہیں۔ "عمل کے بغیر جنت کی طلب گناہوں میں سے ایک گناہ ہے (خداترسی و پاکیزگی عمل کا" ذریعہ و تعلق اختیار کئے بغیر شفاعت کی امید فریب کی ایک قسم ہے، اور اس ذات کی رحمت کا امیدوار ہونا کہ جس کی اطاعت و فرمانبرداری نہ

کرے بڑی جہالت و حماقت ہے۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا۔ "خدا کے بندو! ان باطل آرزوؤں اور جھوٹی امیدوں سے دور رہو جو حماقت کی وادی ہے اور جس میں لوگ گرے ہوئے ہیں، خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو محض اس کی آرزوؤں کے سہارے نہ دنیا میں کامیابی و کامرانی سے نوازا ہے اور نہ آخرت کی خیر و فلاح کا مستحق گردانا ہے۔

حضرت عمرو بن منصورؒ نے اپنے متعلقین میں سے ایک شخص کو لکھا تھا۔ "نادان! تم اپنی عمر کی درازی کے آرزومند ہو، اور اللہ تعالیٰ سے اس بات کے امیدوار ہو کہ وہ تمہاری بدعملیوں کے باوجود تمہیں اپنی رحمت سے نوازے؟ ہوش میں آؤ، یہ کیا ٹھنڈا لوہا کوٹنے کی سعی میں مصروف ہو؟۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

خدا ترس لوگوں کے لئے دولت بری چیز نہیں

⑦ عَنْ رَجُلٍ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُنَّا فِيْ مَجْلِسٍ فَطَلَعَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلٰى رَأْسِهٖ اَثَرُ مَاءٍ فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَرَاكَ طَيِّبَ النَّفْسِ قَالَ اَجَلْ قَالَ ثُمَّ خَاضَ الْقَوْمُ فِيْ ذِكْرِ الْغِنٰى فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا بَاسَ بِالْغِنٰى لِمَنِ اتَّقَى اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ وَالصِّحَّةُ لِمَنِ اتَّقٰى خَيْرٌ مِنَ الْغِنٰى وَطِيْبُ النَّفْسِ مِنَ النَّعِيْمِ۔ (رواہ احمد)

"نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے ایک شخص کہتے ہیں کہ ہم لوگ ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ رسول کریم ﷺ آکر ہمارے درمیان تشریف فرما ہوگئے، اس وقت آپ ﷺ کے سر مبارک پر (غسل کے) پانی کی تری تھی، ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اس وقت ہم آپ ﷺ کو بہت خوش دل و شادماں دیکھ رہے ہیں (جس کے آثار چہرہ اقدس پر نمایاں ہیں۔)" حضور ﷺ نے فرمایا۔ "ہاں!" راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد اہل مجلس دولتمندی کے ذکر میں مشغول ہوگئے (یعنی آپس میں یہ گفتگو کرنے لگے کہ مالداری و دولتمندی اچھی چیز ہے یا بری چیز!) رسول کریم ﷺ نے (ہماری یہ گفتگو سن کر فرمایا "اس شخص کا دولت مند ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور (جسم کی) صحت مندی، خدا سے ڈرنے والے (یعنی متقی و پرہیزگار) شخص کے لئے دولت مندی سے زیادہ بہتر ہے (اگرچہ وہ صحت مندی فقر و افلاس کے ساتھ کیوں نہ ہو) نیز شادمانی و خوش دلی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے (جس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا واجب ہے اور اس کے بارے میں قیامت کے دن بندہ سے سوال ہوگا، جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ۔" (احمدؒ)

مال و دولت مؤمن کی ڈھال ہے

⑧ وَعَنْ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ قَالَ كَانَ الْمَالُ فِيْمَا مَضٰى يُكْرَهُ فَاَمَّا الْيَوْمَ فَهُوَ تُرْسُ الْمُؤْمِنِ وَقَالَ لَوْلَا هٰذِهِ الدَّنَانِيْرُ لَتَمَنْدَلَ بِنَا هٰؤُلَاءِ الْمُلُوْكُ وَقَالَ مَنْ كَانَ فِيْ يَدِهٖ مِنْ هٰذِهٖ شَيْءٌ فَلْيُصْلِحْهُ فَاِنَّهٗ زَمَانٌ اِنِ احْتَاجَ كَانَ اَوَّلَ مَنْ يَّبْذُلُ دِيْنَهٗ وَقَالَ الْحَلَالُ لَا يَحْتَمِلُ السَّرَفَ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

"اور حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں مال کو برا سمجھا جاتا تھا (کیونکہ اس زمانہ کے لوگوں میں زہد و قناعت بہت زیادہ تھی، علاوہ ازیں اس وقت کے بادشاہوں اور حاکموں کی طرف سے اپنی رعایا کی بنیادی ضرورتوں کی فراہمی کا خاص انتظام ہوتا تھا اور لوگ بلا کسی سعی و کوشش کے اور بغیر کسی الجھن و پریشانی کے گھر بیٹھے قوت لایموت حاصل کر لیتے تھے، نیز اس سلسلے میں ان بادشاہوں اور حاکموں کے کسی

تعالیٰ ورویہ سے اپنے تئیں کوئی ذلت وخواری بھی محسوس نہیں کرتے تھے اس لئے روپیہ پیسہ کمانے اور مال و دولت حاصل کرنے کو برا سمجھا جاتا تھا، لیکن جہاں تک اس زمانہ کا تعلق ہے تو اب مال و دولت مسلمانوں کی ڈھال ہے (کیونکہ آج کل کے لوگوں میں زہد و قناعت کے جذبات مضمحل ہو گئے ہیں اور ضروریات زندگی کی احتیاج کا بہت زیادہ غلبہ ہو گیا ہے۔ علاوہ ازیں اب سلاطین و امراء اور حکومتوں کی طرف سے لوگوں کی کفالت کا کوئی نظم بھی باقی نہیں رہا ہے نتیجہ کے طور پر اگر کوئی شخص کسب و محنت کر کے مال حاصل نہ کرے تو اس کو اپنی ضروریات زندگی کی فراہمی کے لئے ان لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے جو مالی و اخلاقی مدد و اعانت سے زیادہ ذلیل و خوار کرتے ہیں پس اس صورت میں حلال مال مؤمن کے لئے بہت بڑی ڈھال ہے جس کے ذریعہ وہ نہ صرف حرام و مشتبہ معاملات میں پڑنے سے بچتا ہے بلکہ دنیادار امراء اور ظالموں کی مصاحبت و حاشیہ نشینی کی ذلت و خواری سے بھی اپنے آپ کو محفوظ رکھتا ہے! حضرت سفیانؒ نے یہ بھی فرمایا کہ "اگر (ہم لوگوں کے پاس) یہ درہم و دینار اور روپیہ پیسہ نہ ہوتا تو یہ (آج کل کے) سلاطین و امراء ہمیں ذلیل و پامال کر ڈالتے" نیز انہوں نے فرمایا "کسی شخص کے پاس اگر تھوڑا بہت بھی مال ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کی اصلاح کرے (یعنی اس تھوڑے سے مال کو یوں ہی ضائع نہ ہونے دے بلکہ تدبیر و ہنرمندی کے ساتھ اس کو کسی تجارت وغیرہ میں لگا کر بڑھانے کی سعی کرے یا یہ کہ اس کو بہت کفایت و قناعت کے ساتھ خرچ کرے تاکہ جلدی ختم نہ ہو جائے) کیونکہ ہمارا یہ زمانہ ایسا ہے کہ اس میں اگر کوئی محتاج و مفلس ہوگا تو (دنیا حاصل کرنے کی خاطر) اپنے دین کو اپنے ہاتھ سے گنوانے والا سب سے پہلے شخص وہی ہوگا" حضرت سفیانؒ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ "حلال مال، اسراف کا روادار نہیں ہوتا۔" (شرح السنۃ)

تشریح: حضرت سفیانؒ کے آخری قول کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص محنت و مشقت برداشت کر کے اور جائز وسائل و ذرائع سے جو کچھ کماتا ہے وہ بڑا پاکیزہ مال ہوتا ہے، لہٰذا اس کو چاہئے کہ وہ اپنے اس حلال و پاکیزہ مال کو فضول خرچیوں میں ضائع نہ کرنے بلکہ کفایت شعاری اور احتیاط کے ساتھ خرچ کرے، اور تھوڑا بہت پس انداز کرنے کی کوشش بھی کرے اور اس کی حفاظت کرے تاکہ وہ کسی فوری ضرورت کے وقت کسی کا محتاج نہ رہے اور قلبی اطمینان و استغناء کی وجہ سے اپنے دین کی سلامتی حاصل رہے۔ یا اس قول کے یہ معنی ہیں کہ محنت و مشقت اور جائز وسائل و ذرائع سے کمایا ہوا مال اتنا زیادہ نہیں ہوتا کہ اس کو فضول خرچیوں میں ضائع کیا جا سکے۔ بلکہ وہ بہت تھوڑا اور مختصر ہوتا ہے کہ جائز ضروریات زندگی کو بھی مشکل ہی سے پورا کر پاتا ہے۔

ساٹھ سال کی عمر، بڑی عمر ہے

(۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُنَادِيْ مُنَادٍ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَيْنَ اَبْنَآءُ السِّتِّيْنَ وَهُوَ الْعُمُرُ الَّذِيْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَ كُمُ النَّذِيْرُ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "اعلان کرنے والا (فرشتہ) قیامت کے دن (اللہ تعالیٰ کے حکم سے) یہ اعلان کرے گا کہ ساٹھ سال کی عمر والے لوگ کہاں ہیں (یعنی دنیا میں جن لوگوں نے ساٹھ سال کی عمر پائی، وہ اپنی عمر کا حساب دینے کے لئے اپنے آپ کو پیش کریں اور یہ عمر، وہ عمر ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: کیا ہم نے تم کو ایسی عمر نہیں دی جس میں نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کرے حالانکہ تمہارے پاس ڈرانے والا بھی آیا۔ اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: "ڈرانے والا" سے مراد یا تو اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایات یعنی قرآن مجید اور اس کے رسول ہیں، یا پھر اس سے مراد بڑھاپا اور موت ہیں، حاصل یہ کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اتنی طویل عمر عطا کی ہو اور آخرت کی طرف متوجہ ہونے کے اتنے زیادہ مواقع نصیب کئے ہوں وہ شخص اگر عقل و دانش سے کام لے کر اپنی آخرت کی بھلائی و کامیابی کے لئے کچھ نہ کر سکے اور عمر کا اتنا طویل عرصہ یوں ہی گنوا

کر اس دنیا سے چلا جائے تو اس سے زیادہ احمق و نادان اور اس سے زیادہ بد نصیب اور کون ہو سکتا ہے! لہٰذا ایسے شخص کو قیامت کے دن سخت جواب دہی کا سامنا کرنا پڑے گا اور وہاں کوئی اور عذر خواہی اس کے کام نہیں آئے گی۔

حسن عمل کے ساتھ عمر کی زیادتی درجات کی بلندی کا باعث ہے

(۱۵) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ شَدَّادٍ قَالَ اِنَّ نَفَرًا مِنْ بَنِیْ عُذْرَةَ ثَلٰثَةً اَتَوُا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَسْلَمُوْا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ یَّکْفِیْنِیْهِمْ قَالَ طَلْحَةُ اَنَا وَکَانُوْا عِنْدَهٗ فَبَعَثَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَعْثًا فَخَرَجَ فِیْهِ اَحَدُهُمْ فَاسْتُشْهِدَ ثُمَّ بَعَثَ بَعْثًا فَخَرَجَ فِیْهِ الْاٰخَرُ فَاسْتُشْهِدَ ثُمَّ مَاتَ الثَّالِثُ عَلٰی فِرَاشِهٖ قَالَ قَالَ طَلْحَةُ فَرَاَیْتُ هٰؤُلَاءِ الثَّلٰثَةَ فِی الْجَنَّةِ وَرَاَیْتُ الْمَیِّتَ عَلٰی فِرَاشِهٖ اَمَامَهُمْ وَالَّذِی اسْتُشْهِدَ اٰخِرًا یَلِیْهِ وَاَوَّلُهُمْ یَلِیْهِ فَدَخَلَنِیْ مِنْ ذٰلِكَ فَذَکَرْتُ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ذٰلِكَ فَقَالَ وَمَا اَنْکَرْتَ مِنْ ذٰلِكَ لَیْسَ اَحَدٌ اَفْضَلَ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ مُّؤْمِنٍ یُعَمَّرُ فِی الْاِسْلَامِ لِتَسْبِیْحِهٖ وَتَکْبِیْرِهٖ وَتَهْلِیْلِهٖ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن شداد کہتے ہیں: بنی عذرہ کے قبیلہ کے کچھ لوگ کہ جن کی تعداد تین تھی، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا (اور پھر وہ لوگ حصول دین کی خاطر اور خدا کی راہ میں ریاضت و مجاہدہ کی نیت سے حضور ﷺ کے پاس ٹھہر گئے۔ ان کی مالی حالت چونکہ بہت خستہ تھی اور وہ ضروریات زندگی کی کفالت خود کرنے پر قادر نہیں تھے لہٰذا) رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ کون ہے جو ان لوگوں کی خبر گیری کے سلسلے میں مجھے بے فکر کر دے؟ (یعنی آپ ﷺ نے صحابہؓ سے پوچھا کہ کیا تم میں سے کوئی شخص ایسا ہے جو ان لوگوں کی ضروریات زندگی کی کفالت اور ان کی خبر گیری و دلداری کی ذمہ داری برداشت کر سکے، تاکہ مجھے ان کا خبر گیراں بننے کی ضرورت نہ رہے اور میں ان کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں؟) حضرت طلحہؓ نے عرض کیا کہ میں اس ذمہ داری کو قبول کرتا ہوں! چنانچہ وہ تینوں حضرت طلحہؓ کے پاس رہنے لگے! (کچھ دنوں کے بعد) جب نبی کریم ﷺ نے کسی طرح ایک لشکر بھیجا تو اس (لشکر) کے ساتھ ان تینوں میں سے بھی ایک شخص گیا اور میدان جنگ میں (دشمنوں سے لڑتا ہوا) شہید ہو گیا، اس کے بعد حضور ﷺ نے ایک اور لشکر بھیجا، اس کے ساتھ دوسرا شخص گیا اور وہ بھی شہید ہو گیا اور پھر تیسرا شخص اپنے بستر پر اللہ کو پیارا ہو گیا (اور یہ شخص اگرچہ میدان جنگ میں شہید ہونے کا موقع نہیں پا سکا لیکن مرابط ضرور تھا، اور میدان جنگ میں دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے کی نیت بھی رکھتا تھا) راوی کہتے ہیں کہ حضرت طلحہؓ نے بیان کیا کہ (ان تینوں میں سے دو کی شہادت اور ایک کی قدرتی موت کے بعد ایک دن خواب میں) میں نے دیکھا کہ وہ تینوں جنت میں ہیں، نیز میں نے دیکھا کہ جو شخص اپنے بستر پر اللہ کو پیارا ہوا تھا وہ سب سے آگے ہے اور جو شخص دوسرے لشکر کے ساتھ جا کر شہید ہوا تھا، سب سے آخر میں ہے، چنانچہ (ان تینوں کو اس طرح ایک دوسرے کے آگے پیچھے دیکھ کر) میرے دل میں خلجان پیدا ہو گیا (کہ قاعدہ کے مطابق تو سب سے آگے اور نمایاں اس شخص کو ہونا چاہئے تھا جو پہلے خدا کی راہ میں شہید ہوا تھا، یا یہ کہ دونوں شہید ایک ساتھ برابر ہوتے کیونکہ دونوں شہید ہونے کی حیثیت سے یکساں مرتبہ کے مستحق تھے اور جو شخص اپنے بستر پر فوت ہوا تھا اس کو سب سے آخر میں ہونا چاہئے تھا، لیکن میں نے ان تینوں کو جس ترتیب کے ساتھ دیکھا وہ میرے لئے بڑی تعجب انگیز اور شک و شبہ میں مبتلا کرنے والی تھی) چنانچہ میں نے نبی کریم ﷺ سے اپنے اس خواب کا ذکر کیا! حضور ﷺ نے (وہ خواب اور اس پر میرا ردعمل سن کر) فرمایا۔ "تو پھر اس میں تمہارے شک و شبہ اور انکار کی باعث کون سی چیز ہے؟ (تم نے اپنے خواب میں ان تینوں کو جس ترتیب کے ساتھ دیکھا ہے وہ بالکل موزوں ہے) کیونکہ اللہ کے نزدیک اس مسلمان سے زیادہ افضل کوئی نہیں ہے جس نے اسلام کی حالت میں زیادہ عمر پائی اور اس کی وجہ سے اس کو خدا کی تسبیح و تکبیر اور تہلیل (اور دیگر تمام مالی و بدنی عبادتوں) کا زیادہ موقع ملا۔"

تشریح: ظاہر ہے کہ جس شخص نے بعد میں شہادت پائی اس کی عمر پہلے شہید ہونے والے کی عمر سے زائد ٹھہری، اور جب اس کی عمر زیادہ

ہوئی تو اس کے اچھے عمل بھی زیادہ ہوئے، لہٰذا پہلے شہید ہونے والے شخص سے اس کا افضل و برتر ہونا کسی شک و شبہ کا محل نہیں ہو سکتا، رہی اس شخص کی بات جو اپنے دونوں ساتھیوں کے بعد اپنے بستر پر فوت ہوا تو اس کی عمر گویا ان دونوں سے زائد ہوئی اور اسی اعتبار سے اس کے عمل بھی ان دونوں کے عمل سے زیادہ ہوئے، اس لئے وہ اپنے دونوں ساتھیوں سے کہ جو اگرچہ میدان جنگ میں شہید ہوئے تھے زیادہ افضل قرار پایا، لیکن اس کے بارے میں وہی توجیہہ مدنظر رہنی چاہئے جو دوسری فصل میں حضرت عبید ابن خالدؓ کی روایت کی تشریح میں بیان کی جا چکی ہے جس کی طرف یہاں بھی ترجمہ کے دوران بین القوسین اشارہ کر دیا گیا ہے کہ وہ شخص گو شہادت نہیں پا سکا تھا مگر مرابط ہونے اور جہاد کرنے کی صادق نیت رکھنے کی وجہ سے شہیدی کے مرتبہ کا حامل قرار دیا گیا۔

عبادت گزار زندگی کی اہمیت

(۱۱) وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اَبِیْ عُمَیْرَةَ وَكَانَ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ عَبْدًا لَوْ خَرَّ عَلٰى وَجْهِهٖ مِنْ يَوْمِ وُلِدَ اِلٰى اَنْ يَّمُوْتَ هَرِمًا فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ لَحَقَّرَهٗ فِیْ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَوَدَّ اَنَّهٗ رُدَّ اِلَى الدُّنْيَا كَيْمَا يَزْدَادَ مِنَ الْاَجْرِ وَالثَّوَابِ۔ رَوَاهُمَا اَحْمَدُ۔

"اور حضرت محمد ابن ابو عمیرہؓ جو رسول کریم ﷺ کے صحابہؓ میں سے ہیں، فرماتے ہیں کہ "اگر کوئی بندہ اپنی پیدائش کے وقت سے، بڑھاپے میں مرنے تک (اپنی پوری اور طویل زندگی کے دوران) صرف خدا کی طاعت و عبادت میں سرنگوں رہے تو وہ بھی اس (قیامت کے) دن (عمل کا ثواب دیکھ کر) اپنی اس تمام طاعت و عبادت کو بہت کم جانے گا اور یہ آرزو کرے گا کہ کاش اس کو دنیا میں پھر بھیج دیا جائے تاکہ اس کا اجر و ثواب زیادہ ہو جائے" (ان دونوں روایتوں کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے)۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ عمر کا طویل ہونا خدا کی بہت بڑی نعمت ہے بشرطیکہ اس لمبی عمر کو یوں ہی ضائع نہ کر دیا جائے بلکہ اس کو خدا کی اطاعت و عبادت، دین کی خدمت اور اچھے کاموں میں صرف کیا جائے! لہٰذا عمر جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر اعمال صالحہ بھی زیادہ ہوں گے اور اعمال صالحہ جتنے زیادہ ہوں گے اتنا ہی زیادہ اجر و ثواب بھی حاصل ہوگا جو قیامت کے دن سب سے بڑا سرمایہ ہوگا۔

چنانچہ عبادت گزار زندگی کی اسی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کوئی شخص اس دنیا میں پیدا ہوتے ہی، یا یہ کہ بالغ ہوتے ہی خدا کی طاعت و عبادت میں مصروف ہو جائے اور بڑھاپے کی عمر میں پہنچ کر وفات پانے کے وقت تک بس سجدہ و نماز ہی میں منہ کے بل پڑا رہے اور اس کی زندگی کا کوئی بھی لمحہ دنیاوی کام میں صرف نہ ہو تو وہ شخص بھی قیامت کے دن طاعت و عبادت اور اعمال صالحہ کے اجر و ثواب کی فضیلت و اہمیت دیکھ کر اپنی اس طویل عمر کی تمام طاعات و عبادات کو بہت کم جانے گا اور یہی آرزو کرے گا کہ کاش! مجھے طاعت و عبادت اور اچھے اعمال کرنے کا ارادہ اور موقع مل جائے اور مجھے دنیا میں واپس کر دیا جائے تاکہ میں وہاں زیادہ سے زیادہ عمل کر سکوں اور زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب لے کر یہاں آؤں۔

بَابُ التَّوَكُّلِ وَالصَّبْرِ

توکل اور صبر کا بیان

لغت میں وَكَلَ اُوْكُوْلُ کا لفظ آتا ہے جس کے معنی ہیں سونپ دینا، سپرد کر دینا، کسی پر بھروسہ کر کے کام چھوڑ دینا اس کا اسم وَكَالَتْ اور وِكَالَتْ ہے، اسی لفظ سے تَوَكُّلْ نکلا ہے جس کے معنی اپنے عجز و بیچارگی کو ظاہر کرنے اور دوسرے پر اعتماد و بھروسہ کرنے کے ہیں، اس کا اسم تُكْلَانْ ہے! اصطلاح شریعت میں توکل اس کو کہتے ہیں کہ بندہ اپنے معاملہ و کام کو خدا کے سپرد کر دے اپنی تدبیر و سعی کو ترک کر

دے اور اپنی ذاتی طاقت وقدرت سے بے پرواہ ہو کر تقدیر اور رضائے الٰہی پر کامل اعتماد کرے۔ یعنی اس بات پر یقین رکھے کہ اپنی تدبیرو سعی اور ذاتی طاقت و قدرت، خدا کی مشیت اور اس کے فیصلہ کو بدل نہیں سکتی، قسمت کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔ جو لکھا ہی نہیں گیا وہ رونما نہیں ہو سکتا۔

یوں تو توکل کا تعلق تمام امور اور معاملات پر ہوتا ہے۔ لیکن اکثر اس کا استعمال رزق کے بارے میں ہوتا ہے۔ اور بات بھی یہی ہے کہ توکل کا جو اصل مفہوم ہے وہ اس بات پر اعتماد و بھروسہ کر" ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے رزق کا ضامن ہے۔ حصول معاش کے لئے جائز و حلال ظاہری وسائل و ذرائع کو ترک کرنا گو توکل کے صحیح ہونے کی شرط نہیں ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ اصل اعتماد و بھروسہ ان وسائل و ذرائع پر نہ ہو۔ چنانچہ توکل کا تعلق اصل میں دل سے ہے اگر دل میں حق تعالیٰ کے ضامن ہونے کا یقین جاگزین ہو گیا تو توکل کا مفہوم پورا ہو جائے گا۔ گویا اعضاء عمل کو معطل کر دینا اور ہاتھ پاؤں ڈال کر اپاہج بن جانا توکل کے صحیح ہونے کے لئے لازم نہیں ہوگا اور نہ حصول معاش کے لئے ظاہری تدبیر دستی کرنا اس کے منافی ہوگا۔ رہی یہ بات کہ بعض زاہدان طریقت اور درویش صفت طالبان معرفت حصول معاش کے ظاہری اسباب و وسائل کو ترک کر دیتے ہیں تو ان کا وہ عمل محض ایک استثنائی حیثیت رکھتا ہے اور اس بات سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مقام توکل ثابت ہو جائے نفس زیادہ سے زیادہ ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہے اور نظر امید اسباب و ذرائع سے منقطع ہو جائے، نیز اس امر پر کامل یقین حاصل ہو جائے کہ ظاہری اسباب و ذرائع رزق پہنچنے کے لئے شرط کا درجہ نہیں رکھتے۔

بعض حضرات نے توکل کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ بندہ کا حق اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر اعتماد و یقین کے سبب حصول معاش کے اسباب و ذرائع اور کسب و عمل کی پابندیوں سے مطلق آزاد ہو جانا! لیکن یہ توکل کا وہ مقام ہے جو ابتدائی حالت میں اختیار کیا جاتا ہے یا "آزاد" ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ بندہ ان اسباب و وسائل اور کسب و عمل کے ساتھ ہر طرح کا قلبی تعلق و اعتماد ختم کر دے یعنی اپنے دل میں یہ خیال بھی نہ پیدا ہونے دے کہ ظاہری اسباب و وسائل اور کسب و عمل، رزق پہنچنے کے لئے حقیقی مؤثر و مسبب ہیں، چنانچہ جو بندہ توکل کے آخری مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے اور اس مقام کا منتہی ہوتا ہے اس کا اسباب و وسائل اور کسب و عمل کو اختیار کرنا، اس کے حق میں توکل کے منافی نہیں ہوتا، اس کو خدا کی رزاقیت پر کامل یقین و اعتماد اس وقت بھی حاصل رہتا ہے جب وہ اپنی روزی کے لئے اسباب و وسائل اور کسب و عمل میں مشغول ہوتا ہے اور اس وقت بھی اس کے اس یقین و اعتماد میں ذرہ برابر بھی رخنہ نہیں پڑتا جب وہ ان چیزوں کو بالکل ترک کر دیتا ہے، مثلاً اگر وہ (منتہی) کھجور کا پودا لگائے اور خرق عادت کے طور پر (یعنی خلاف عادت) وہ پودا اسی لمحہ بار آور ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت صناہی پر اس کا یقین و اعتماد اس صورت میں، اور اس صورت میں کہ کھجور کا پودا وہ، عادت و محمول کے مطابق کئی سال کے بعد پھل لائے یکساں ہوتا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی چیز اپنے دنیاوی اسباب و وسائل کے ذریعہ اور ظاہری عوامل و مسببات کی تربیت کے ساتھ وجود پذیر ہوتی ہے تو اس صورت میں صانع کی کمال قدرت کا مشاہدہ زیادہ یقین و اعتماد اور زیادہ پر تاثیر انداز میں ہوتا ہے کیونکہ اسباب کے بغیر یعنی خرق عادت کے طور پر جو چیز سامنے آتی ہے اس میں محض وہی ایک فعل ہوتا ہے، جب کہ ظاہری اسباب و وسائل کے ذریعہ ظاہر ہونے والی چیز کتنے ہی مضبوط و مربوط افعال و حالات اور کتنے ہی محکم احکام و قوانین قدرت کا مظہر ہوتی ہے، علاوہ ازیں ایک بات یہ بھی مدنظر رہنی چاہئے کہ اسباب و وسائل کو ترک کر دینا گویا، ان چیزوں کو معطل و بیکار بنا دینا ہے جن کو حق تعالیٰ نے انسان ہی کے لئے پیدا کیا ہے اور جن کو اختیار کرنا منشاء قدرت کے خلاف نہیں ہے۔

عنوان باب کا دوسرا جزء "صبر" ہے لغت میں "صبر" کے معنی ہیں رکنا، منع کرنا، نفس کو کسی چیز سے باز رکھنا، فارسی میں اس کو شکیبائی کہتے ہیں اور اصطلاح شریعت میں صبر اس کو کہتے ہیں کہ نیکی اور برائی کے درمیان کشمکش کے وقت اپنے نفس کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ نیکی کو اختیار کرے اور برائی سے باز رہے۔ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ فرماتے ہیں کہ صبر کا مفہوم ہے "ریاضت و مجاہدہ کے ذریعہ حظوظ نفس کے جال سے باہر آنا، اور نفس کو اس کی محبوب و مرغوب چیزوں سے باز رکھنے پر کار بند رہنا"۔

عوارف میں لکھا ہے کہ "صبر" کی جو اقسام ہیں ان میں سب سے اعلیٰ قسم وہ صبر ہے جو اللہ تعالیٰ کے تئیں کیا جائے بایں طور کہ اس کی طرف متوجہ و انابت. صدق و اخلاص کے ساتھ ہو، اس کی ذات و صفات اور کمال قدرت میں استغراق و مراقبہ دوامی ہو، اور نفس کی تمام خواہشات وخیالات کو یکسر منقطع کر دیا جائے۔ نیز بیان کیا کہ۔ "صبر" فرض بھی ہے اور نفل بھی، فرض صبر تو وہی ہے جو فرائض کی ادائیگی اور حرام چیزوں کے ترک کرنے پر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اور نفل صبر کی جو صورتیں ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں۔ ① فقر و افلاس اور شدائد و آلام پر صبر کرنا۔ ② کوئی صدمہ و تکلیف پہنچنے پر صبر کرنا۔ ③ اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کو چھپانا۔ ④ شکوہ و شکایت سے اجتناب کرنا۔ ⑤ باطنی احوال و کرامات کو چھپانا۔ واضح رہے کہ فرض اور نفل دونوں طرح صبر کی بہت اقسام اور صورتیں ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ بہت ہیں جو صبر کی تمام ہی اقسام پر عامل و کاربند نہیں رہ سکتے جیسا کہ بیان کیا گیا، اگرچہ صبر کی بہت اقسام ہیں اور ان کا اطلاق بہت سی صورتوں پر ہوتا ہے مگر عام طور پر اس کا اطلاق خصوصیت سے مصائب و آفات اور ناگوار و ناپسندیدہ امور کو انگیز کرنے پر ہوتا ہے، جیسا کہ "شکر" ایک وسیع المفہوم لفظ ہے اور اپنے اطلاق کے اعتبار سے اس کی بہت سی قسمیں ہیں مگر خاص طور پر اس کا استعمال حصول نعمت و رزق کی صورت میں ہوتا ہے۔

توکل اور صبر کے بارے میں کچھ مفید باتیں

جاننا چاہئے کہ جو چیزیں انسان کے لئے عبادت خداوندی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں ان میں سب سے سخت رکاوٹ معاشی زندگی کے تفکرات یعنی کھانے پینے اور دیگر ضروریات زندگی کی فراہمی کا فکر و خیال ہے، ظاہر ہے کہ انسان کا نفس اپنے وجود و بقاء کے لئے جن چیزوں کا محتاج ہے ان کی طرف اس کا رجحان اور مطالبہ ایک فطری تقاضا ہے، چنانچہ وہ بجا طور پر کہہ سکتا ہے کہ میں ہر چیز سے باز آیا، زہد و تقویٰ بھی اختیار کیا، دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے بھی کوئی سروکار نہیں رکھتا، لیکن ان چیزوں کا کیا علاج کروں جو میرے وجود و بقا کے لئے ضروری ہیں۔ جیسے کھانا پینا اور لباس وغیرہ! اور یہ بھی بالکل ظاہر بات ہے کہ یہ چیزیں یوں ہی حاصل نہیں ہوتیں، بلکہ ان کے حصول کے لئے کسب و عمل، جہد و سعی اور لوگوں کے ساتھ ربط و ضبط اور میل جول اختیار کرنا ضروری ہے پس شریعت نفس کے اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے وہ سب سے یقینی راہ دکھاتی ہے جس کو توکل کہا جاتا ہے، کیونکہ توکل بذات خود وہ واحد قوی ذریعہ ہے جس پر اگر انسان صدق و اخلاص کے ساتھ عامل ہو جائے تو خدا کی طرف سے ضروریات زندگی کی تکمیل خود بخود ہونے لگتی ہے اور اس راہ کو اختیار کرنے کی وجہ سے نہ صرف نفس کی تشویش رفع ہو جاتی ہے بلکہ کمال ایمان کا درجہ بھی نصیب ہو جاتا ہے، اس کے برخلاف توکل کو ترک کر دینے والا نہایت سخت تفکرات و اوہام میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ اس کو سکون و اطمینان کے ساتھ طاعت و عبادات کا موقع نصیب ہوتا ہے اور نہ اس اطاعت و عبادت میں حلاوت و لذت نصیب ہوتی ہے، اور روزی کا فکر و غم اس کو اس طرح پراگندہ خاطر اور پریشان حال بنا دیتا ہے کہ وہ کوئی بھی نیک عمل یقینی قوت و حالت کے ساتھ انجام نہیں دے سکتا، لہٰذا توکل کی راہ اختیار کرنا ہر شخص کے لئے لازمی امر ہے کہ اس کے بغیر وہ اعلیٰ مراتب تک پہنچنے کی طاقت نہیں رکھ سکتا، جیسا کہ ایک طویل حدیث میں جو آگے آئے گی فرمایا گیا ہے کہ۔ جو شخص اس بات کو پسند کرے کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ قوی ہو تو اس کو چاہئے کہ توکل کی راہ اختیار کرے۔ "اور توکل کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے تمام امور کا وکیل اور اپنی بھلائی و بہتری کا ضامن جان کر بس اسی پر اعتماد و بھروسہ کرے اور جانے کہ اللہ تعالیٰ نے قسمت میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ ہرگز معدوم نہیں ہوگا اور حکم الٰہی کسی بھی حالت میں ادل بدل نہیں سکتا، خواہ بندہ مانگے یا نہ مانگے، نیز اس بات پر یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی روزی کا ضامن ہے، جب کہ اس نے پیدا کیا ہے تو رزق بھی ضرور دے گا، چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا اور اس بات پر بھی قسم کھائی کہ۔ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ۔

پس غور کرنے کا مقام ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے وعدہ کی صداقت کے جزو ایمان ہونے کا اعتقاد

رکھتا ہے اگر وہ اس کے ضامن ہونے پر اعتماد نہ رکھے اور اس کے وعدہ پر باور نہ کرے تو اس کا ایمان کہاں رہے گا اور وہ کس طرح خدا کا بندہ کہلانے کا مستحق قرار پائے گا۔ ہر مؤمن کو چاہئے کہ وہ دنیا، دنیا کے مال و اسباب اور کسب وعمل کو محض حصول رزق کا ایک ظاہری وسیلہ و بہانہ اور سبب سمجھے، اس سے زیادہ اور کچھ نہ جانے، اور یہ یقین رکھے کہ حقیقی رزاق صرف اللہ تعالیٰ ہے، وہ اتنی بڑی قدرت کا مالک ہے کہ اس کے نزدیک ظاہری وسائل و اسباب کی چنداں اہمیت نہیں ہے وہ توکل و اعتماد کرنے والوں کو بے سبب و وسیلہ، اور بلا کسب وعمل بھی روزی پہنچاتا ہے، جیسا کہ فرمایا وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اسی طرح حصول معاش کے لئے وسائل و ذرائع کو اختیار کرنے اور کسب وعمل میں مشغول ہونے کو بھی خدا کی طرف سے مقرر کردہ نظام کائنات کا ایک سلسلہ اور رزق پہنچنے کا ایک ظاہری سبب جانے اس پر دل سے اعتماد و بھروسہ نہ کرے، اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اطمینان رکھے اور جانے کہ اگر کوئی کسب وعمل نہ کروں گا تو بھی اللہ تعالیٰ روزی پہنچائے گا، یہ توکل کا کم سے کم درجہ ہے جو ایمان کے لئے ضروری ہے اور عام مسلمانوں کا مرتبہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اس سے اعلیٰ درجہ تسلیم ہے، یعنی بندہ کا اپنے تمام معاملات خدا کے سپرد کر دینا، خدا کے علم پر کفایت کرنا اور اپنے دل میں کسی بھی طرح کا کوئی رد و بدل نہ رکھنا یہ اولیاء اللہ کا مرتبہ ہے اور وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے۔

ان باتوں سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہئے کہ حصول معاش کے لئے اسباب و ذرائع اختیار کرنا اور کسب وعمل میں مشغول ہونا توکل کے منافی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسباب و ذرائع اور کسب وعمل بھی نظام قدرت کا ایک حصہ ہے اور خدا کی طرف سے ایک حد تک انسان کو ان چیزوں کا مکلّف بھی قرار دیا گیا ہے، البتہ جو چیز توکل کے منافی ہے۔ وہ بس یہ ہے کہ حصول معاش کے ظاہری، اسباب و ذرائع اور کسب وعمل پر دل سے اعتماد نہ کیا جائے اور یہ نہ سمجھا جائے کہ رزق پہنچنے کا حقیقی سبب یہی چیزیں ہیں اگر انسان کوئی کسب وعمل نہ کرے اور محض خدا پر توکل کر کے بیٹھ جائے تو اس کو رزق پہنچ ہی نہیں سکتا، یہ عقیدہ و خیال ایمان کے منافی ہے اور اس کو شرک خفی کہا گیا ہے، لہٰذا جو شخص اسباب و ذرائع کو اختیار کرے اور کسب وعمل میں مشغول ہو لیکن اس کے دل کا اعتماد صرف خدا پر ہو تو وہ شخص بھی یقیناً متوکلین میں سے ہوگا، اگرچہ توکل کا اعلیٰ درجہ یہی ہے کہ بندہ اپنے ہاتھ پاؤں کو تمام اسباب و ذرائع سے دور رکھے اپنے تمام معاملات میں اللہ ہی پر اعتماد کرے اور اپنے تمام امور اسی کے سپرد کرے بشرطیکہ ہر حالت میں خواہ تنگی ہو یا فراخی، قوت ایمان کے سبب اللہ پر اس کا کامل اعتماد یکساں رہے، غیر اللہ سے امید منقطع رکھے اور اس راہ میں جو بھی رنج و مصیبت پیش آئے اس کو صبر و رضا کے ساتھ برداشت کر کے ریاضت و مجاہدہ اور عبادت میں مشغول ہو رہے اور جو شخص ان امور پر پوری طرح قادر نہ ہو سکے تو ان کے حق میں افضل یہی ہوگا کہ وہ دل سے خدا پر اعتماد رکھتے ہوئے ظاہری اسباب و ذرائع کو اختیار کرے اور کسب وعمل میں مشغول ہو۔ اسی طرح محض کسل و سستی اور عار کی وجہ سے یا بطور ریا ہاتھ پاؤں کو معطل کر دینا اور کسب وعمل سے باز رہنا قطعاً روا نہیں ہے کیونکہ اکثر انبیاء اور اولیاء کا یہی معمول رہا ہے کہ انہوں نے حصول معاش کے لئے ظاہری اسباب و ذرائع کو اختیار کیا اور کسب وعمل سے باز نہیں رہے کہ جو شخص کسب وعمل کی وجہ سے اپنی دینی زندگی میں کوئی نقصان اور اپنے باطنی احوال میں رخنہ پڑتا ہوا دیکھے تو اس کے لئے بہر صورت یہی ضروری ہوگا کہ وہ سب چیزوں سے تعلق منقطع کر کے بس ذکر و فکر اور ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہے تاکہ واصل بحق ہو۔

متوکل کو ایسے کام و ذریعہ سے باز رہنا کہ جس کے بغیر کاربر آری قطعاً ممکن نہ ہو اور سُنّت اللہ اسی کے مطابق جاری ہو، ہرگز روا نہیں ہے بلکہ حرام ہے، مثلاً کھانا ہاتھ کے ذریعہ کھایا جاتا ہے اور سُنّت اللہ اس کے مطابق جاری ہے کہ جو شخص، کوئی چیز کھانا چاہے اس کو ہاتھ سے اٹھا کر منہ میں ڈالے، اب اگر کوئی شخص متوکل یہ گمان کرے کہ اس چیز کو کھانے کے لئے ہاتھ کا ذریعہ اختیار کرنا توکل کے منافی ہے اور اس امید میں بیٹھا رہے کہ یہ چیز خود بخود (اٹھ کر منہ میں جائے گی تو کھاؤں گا، یہ توکل نہیں ہے بلکہ اس کو محض جنون و حماقت سے تعبیر کیا جائے گا، ایسے امور میں توکل کی کار فرمائی کی بس حد یہ ہے کہ یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ نے کھانا اسی لئے پیدا کیا ہے کہ اس کو کھایا جائے، سب

کا خالق ورزاق بھی وہی ہے اور یہ ہاتھ اس (عمل) کھانے کا سبب وذریعہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کیا ہے، بس ہاتھ کو کھانے کا ظاہری ذریعہ جان کر کھانے کے لئے استعمال کرے، لیکن دل سے اس پر اعتماد نہ کرے اور یہ جانے کہ جن لوگوں کے ہاتھ نہیں ہوتے ان کے کام بھی بہرحال سرانجام پاتے ہیں، جہاں تک کسی ایسے کام کا تعلق ہے کہ جس کی انجام دہی کا ذریعہ اگرچہ ہاتھ ہی ہے لیکن وہ ایسا قطعی ذریعہ نہیں ہے کہ اس کے بغیر کام انجام ہی نہ پاسکتا ہو جیسے سفر کے دوران خرچ اور زادراہ تھامنا وغیرہ، تو ایسی صورت میں ہاتھوں کو بطور ذریعہ استعمال کرنے سے باز رہنا روا ہو سکتا ہے کیونکہ ایسا ممکن اور کثیر الوقوع ہے کہ جو لوگ خرچ اور زادراہ لے کر نہیں چلتے ان کا سفر بھی پورا ہو ہی جاتا ہے، تاہم واضح رہے کہ زادراہ اور سفر خرچ لے کر چلنا توکل کے منافی ہرگز نہیں ہے۔ جب کہ اصل اعتماد وبھروسہ خدا پر ہو نہ کہ اس زادراہ اور سفر خرچ پر، بلکہ بقدر ضرورت سفر خرچ اور زادراہ لے کر چلنا سنت ہے اور سلف کے معمولات سے بھی ثابت ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کی ذات پر کامل اعتماد بھروسہ کے سبب سفر خرچ اور زادراہ وغیرہ نہ لینا تو متوکلین کے اعلیٰ درجات میں سے ہے۔

جو شخص عیالدار ہو اور اس کے اہل وعیال حالات کی تنگی پر صبر نہ کر سکتے ہوں، اور وہ اس بات کی اجازت نہ دیتے ہوں کہ وہ شخص توکل کے سبب کوئی کسب وعمل نہ کرے اور ذرائع سے اجتناب کرے۔

اپنے اہل وعیال کے لئے ایک سال تک کا اور اپنی ذات کے لئے چالیس روز تک کا بقدر ضرورت غذائی ضروریات کا سامان اکٹھا بھروا کر رکھ لینا توکل کے منافی نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص ازراہ توکل غذائی ضروریات کی چیزیں پہلے سے بھروا کر نہ رکھے اور سب کچھ ترک کردے بشرطیکہ اللہ پر اس کا پورا اعتماد واطمینان ہو تو یقین کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے وہ اعلیٰ درجہ کا حامل ہے. لیکن ظاہر ہے کہ یہ مرتبہ حاصل کرنے کے لئے بڑی زبردست قوت اور ہمت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا جس شخص کو اتنی قوت وہمت میسر نہ ہو اور اگر وہ غذائی ضروریات کا سامان اکٹھا بھروا کر نہ رکھنے کی صورت میں طاعت وعبادت میں اطمینان وسکون اور دل جمعی حاصل نہ کر سکتا ہو تو اس کے لئے یہی افضل ہوگا کہ وہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی غذائی ضروریات کے لئے غلہ وغیرہ اکٹھا بھروا کر رکھ لے۔

رنج وپریشانی اور بیماری کا گلہ شکوہ نہ کرنا اور جو شخص طبیب ومعالج نہ ہو اس کے سامنے بلاضرورت اپنے مرض کو ظاہر نہ کرنا توکل کے لئے شرط ہے۔

علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ توکل اسی شخص کو راست آتا ہے جو توحید آشنا اور زہد صفت ہو! اس موقع پر توحید سے مراد یہ ہے کہ بندہ یہ جانے کہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کردہ ہیں اور جانے کہ سب کا حقیقی محرک وعامل بس حق تعالیٰ ہے، اس کے علاوہ کوئی ذات ایسی نہیں ہے جس کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی جنبش نہ کر سکے، اور جہاں بھی جو کچھ بھی آتا جاتا ہے سب کا منبع ومصدر اسی ذات واحد کی مرضی ومشیت ہے، جس شخص کے دل پر یہ بات غالب آجائے گی اس کو بے اختیار توکل حاصل ہو جائے گا۔

یہ تو توکل کے بارے میں کچھ باتیں ہوئیں، اب "صبر" کے بارے میں جاننا چاہئے کہ صبر ایک ایسی راہ ہے جس کو اختیار کئے بغیر کسی مؤمن کے لئے کوئی چارہ نہیں ہے، کیونکہ ایمان کی سلامتی اور عبادت میں اطمینان وسکون کے ساتھ مشغولیت کا انحصار "صبر" ہی پر ہے! اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دنیا، اہل ایمان کے لئے آفات ومصائب اور رنج وآلام کے ایک گھروندہ کے سوا اور کچھ نہیں، مؤمن کی زندگی کا وہ کون سا لمحہ ہوتا ہے جس میں اس کو کسی نہ کسی طرح کی جسمانی اور روحانی اذیت وپریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا ہو؟ لہٰذا اس صورت میں ہر مؤمن پر واجب ہے کہ وہ صبر کی راہ اختیار کرے تاکہ اس کا ایمان بھی سلامت رہے اور طاعت وعبادت میں بھی اطمینان وسکون کے ساتھ مشغول رہ سکے، کیونکہ دل گرفتگی رنج خوری جزع وفزع اور تاسف وحسرت کے عالم میں عبادت پورے کیف ونشاط کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتی، علاوہ ازیں صبر کرنے والے کو دنیا وآخرت کی بے شمار بھلائیاں اور سعادتیں عطا کرنے کا بھی وعدہ کیا گیا ہے، مثلاً دشمنوں، اور مخالفوں کے مقابلہ پر اور دیگر مہمات میں فتح وکامرانی نصیب ہوتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ

لِلْمُتَّقِیْنَ دوسرے صبر کی وجہ سے بندہ اپنی مراد کو پہنچتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَتَمَّتْ کَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا تیسرے صبرو استقامت کی راہ پر چل کر لوگوں کی قیادت و امامت کا درجہ حاصل کیا جا سکتا ہے جیسا کہ فرمایا! وَجَعَلْنَا هُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا چوتھے صبر کرنے والا بندہ حق تعالیٰ کی طرف سے تعریف و توصیف سے نوازا جاتا ہے جیسا کہ فرمایا اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ پانچویں صابر بندوں کو بشارت دینے کا حکم فرمایا گیا ہے جیسا کہ فرمایا وَبَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ چھٹے صبر کرنے والے بندوں سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے جیسا کہ فرمایا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الصَّابِرِیْنَ ساتویں جو بندے صبر کرتے ہیں وہ جنت میں بلند تر درجات پائیں گے جیسا کہ فرمایا اُولٰٓئِكَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا آٹھویں، صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام کا اعزاز و شرف عطا ہوا ہے جیسا کہ فرمایا سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ اور نویں یہ کہ بندے صبر کرتے ہیں اور وہ بے حساب اور بے انتہا اجر و ثواب سے نوازے جائیں گے جیسا کہ فرمایا اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔

پس صبر اتنی بڑی فضیلت اور اتنا عظیم وصف ہے کہ اس پر کاربند رہنے کی ہر مؤمن کو کوشش کرنا چاہئے۔ اور اس کے حاصل کرنے کو نہایت اہم اور غنیمت جاننا چاہئے! اور "صبر" اصل میں یہ ہے کہ اپنے نفس کو جزع سے روکا جائے اور "جزع" اس کو کہتے ہیں کہ جب کوئی سخت حالت اور آفت و پریشانی پیش آئے تو اس پر اضطراب و گھبراہٹ کا اظہار کیا جائے اپنے عجز کا رونا رویا جائے۔

اور اس سختی و پریشانی سے بطریق قطع و حکم گلوخلاصی کا ارادہ کیا جائے! لہٰذا ان چیزوں کو ترک کرنا صبر کہلاتا ہے۔

صبر کا وصف حاصل کرنے کا نہایت مفید اور نفسیاتی طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی ایسی صورت حال پیش آئے کہ جس کی وجہ سے نفس اضطراب و بے قراری میں مبتلا ہونے لگے۔ اور طبعی طور پر رنج و اذیت محسوس ہو تو یہ سوچنا چاہئے کہ جو کچھ قسمت میں لکھا ہوا ہے وہ ہر حال میں پورا ہو کر رہے گا، اس کی وجہ سے جزع و فزع کرنا اور رونا، دھونا، شکوہ و شکایت کرنا ایک قطعی لاحاصل چیز ہے کہ ان باتوں سے اس صورت حال میں کوئی تغیر و تبدل، کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی، علاوہ ازیں صبر کا جو ثواب تلف ہوتا ہے وہ مزید نقصان ہے۔

یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اپنی حیثیت و حالت کے اعتبار سے صبر کی چار قسمیں ہیں ایک تو صبر وہ ہے جو نفس کو طاعت و عبادت کی استقامت و پابندی کی محنت و مشقت برداشت کرنے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے، دوسرا وہ صبر ہے جو گناہوں سے اجتناب کرنے کی صورت میں اختیار کیا جائے، تیسرا وہ صبر ہے جو دنیا کی زائد از ضرورت چیزوں سے قطع تعلق کر لینے کی صورت میں اختیار کیا جائے اور چوتھا صبر وہ ہے جو کسی دینی و دنیاوی آفت و مصیبت اور سختی و پریشانی کو برداشت کرنے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جو شخص صبر کی ان چاروں قسموں کو اختیار کر لے وہ طاعت و عبادت کی راہ پر سکون و استقامت کے ساتھ گامزن رہے گا، گناہوں سے محفوظ و مامون رہے گا، دنیا کی آفات و بلیات سے سلامتی اور آخرت کے عذاب سے نجات پائے گا، علاوہ ازیں بہت زیادہ اجر و ثواب سے نوازا جائے گا، اور جو شخص مذکورہ بالا صورتوں میں صبر کو اختیار نہیں کرے گا اور جزع و فزع کی راہ پکڑے گا وہ تمام نعمتوں سے محروم رہے گا اور اول تو وہ دل جمعی اور اطمینان و سکون کے ساتھ عبادت نہیں کر سکے گا اور کچھ اگر کرے گا بھی تو بے صبری کے گناہ اس کو کالعدم کر دیں گے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

توکل اختیار کرنے والوں کی فضیلت

① عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِیْ سَبْعُوْنَ اَلْفًا بِغَیْرِ حِسَابٍ هُمُ الَّذِیْنَ لَا یَسْتَرْقُوْنَ وَلَا یَتَطَیَّرُوْنَ وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "میری امت میں سے ستر ہزار لوگ بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے جو منتر نہیں کراتے، شگون بد نہیں لیتے ہیں اور (اپنے تمام امور میں جن کا تعلق خواہ کسی چیز کو اختیار کرنے سے ہو یا اس کو چھوڑنے سے) صرف

اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: ستر ہزار کی تعداد سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جو مستقل بالذات بغیر حساب جنّت میں داخل ہوں گے اس تعداد میں وہ لوگ شامل نہیں ہیں جو ان ستر ہزار لوگوں کے متبعین کی حیثیت سے ان کے ساتھ جنّت میں جائیں گے!! یہ وضاحت اس لئے کی گئی ہے تاکہ یہ روایت اس روایت کے منافی نہ رہے جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ بے حساب جنّت میں جانے والے ان لوگوں میں سے ہر ایک کے ساتھ ان کے ستر ستر ہزار متبعین بھی ہوں گے۔

"منتر نہیں کراتے" میں منتر سے مرادیا تو مطلق جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈا وغیرہ ہے۔ یا اس سے وہ منتر اور ٹونا ٹوٹکا مراد ہے جو کلمات قرآنیہ، ادعیہ ماثورہ اور اسماء الٰہی کے بغیر ہوں۔ اسی طرح "شگون بد نہیں لیتے" سے مراد یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کی طرح پرندوں کے اڑ جانے اور آواز وغیرہ سن کر ان سے شگون بد نہیں لیتے ہیں بلکہ یوں گویا ہوتے ہیں کہ اَللّٰھُمَّ لَاطَیْرَ اِلَّاطَیْرُكَ وَلَا خَیْرَ اِلَّا خَیْرُكَ وَلَا اِلٰهَ غَیْرُكَ اَللّٰھُمَّ لَا یَاتِی بِالْحَسَنَاتِ اِلَّا اَنْتَ وَلَا یَذْھَبُ بِالسَّیِّئَاتِ اِلَّا اَنْتَ۔

صاحب نہایہ نے کہا ہے کہ مذکورہ بالا اوصاف اولیائے کاملین کی خصوصیات میں سے ہیں کہ وہ پاک نفس لوگ دنیا کے اسباب و وسائل اور ان کے متعلقات سے بے اعتنائی برتتے ہیں اور دنیا سے تعلق رکھنے والے کسی بھی چیز کی طرف مائل و ملتفت نہیں ہوتے اور یہی درجہ ہے جو خواص کے لئے مخصوص ہے اور اس درجہ تک عوام کی رسائی نہیں ہوتی لیکن جہاں تک ان (عوام) کا تعلق ہے تو ان کے لئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ حلال اسباب و ذرائع کو اختیار کریں اور دوا وغیرہ کے ذریعہ علاج معالجہ کرائیں، البتہ اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین کرنے کی ہے کہ جو شخص کسی بیماری وغیرہ کی مصیبت میں مبتلا ہو اور وہ اس پر صبر کرے پھر دعا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کشائش و راحت کا منتظر و متمنی رہے تو یقیناً وہ شخص اولیاء و خواص میں سے شمار ہونے کا مستحق ہوگا اور جو شخص اس پر صبر کرنے پر قادر نہ ہو اور وہ اس بیماری و مصیبت سے گلو خلاصی پانے کے ظاہری اسباب و ذرائع اختیار کرنا چاہے تو اس کو اس بات کی اجازت دے دی جائے گی کہ وہ دعا تعویذ اور دوا وغیرہ کے ذریعہ اپنی اس بیماری و مصیبت کے دفعیہ کی سعی کرے۔

حاصل یہ کہ جو شخص اپنی طبعی حالت و کیفیات اور باطنی حیثیت کے اعتبار سے جس طرح کا ہوگا اس کے حق میں اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا اس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک موقعہ پر اپنا تمام مال و اسباب خدا کی راہ میں صرف کرنے کے لئے حضور کی خدمت میں پیش کیا تو آپ ﷺ نے ان کی اس پیش کش کو رد نہیں کیا کیونکہ آپ ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے کہ ان میں یقین و صبر کا وصف بدرجہ کمال موجود ہے اس کے برخلاف جب ایک اور شخص نے کبوتر کے انڈے کے برابر سونا لا کر حضور ﷺ کی خدمت میں لا کر پیش کیا اور کہا کہ میرے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے یہ جو کچھ بھی ہے خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے آپ کی نذر کرتا ہوں تو حضور ﷺ نے صرف یہ کہ اس سونے کو قبول نہیں فرمایا بلکہ اس پر سخت ناراض ہوئے یہاں تک کہ اس کو ایک دھپ بھی مارا۔ یہاں تک ملا علی قاریؒ کے منقولات کا ماحصل نقل کیا گیا۔

حضرت شیخ عبدالحق دہلوی نے یہ لکھا ہے کہ زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حدیث میں "منتر" کا جو ذکر کیا گیا ہے اس سے زمانۂ جاہلیت کے ٹونے ٹوٹکے اور مشرکانہ منتر مراد ہیں جن کا کتاب و سُنّت کی تعلیمات سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اور جن کو حضور ﷺ نے قطعاً روا نہیں رکھا تھا کیونکہ ان منتروں کی ساخت اور ان کے الفاظ و معانی کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں کہ ان کو اختیار کرنے والا شرک میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ بات کہ "منتر" سے زمانہ جاہلیت کے منتر مراد ہیں، حدیث کے الفاظ لایتطیرون سے بھی واضح ہوتی ہے کہ تطیر یعنی بدفالی لینا، زمانۂ جاہلیت کے اہل عرب کا خاص معمول تھا! پس جس طرح زمانہ جاہلیت کی دیگر مشرکانہ رسوم و عادات سے اجتناب ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے اسی طرح تطیر یعنی بدفالی لینے سے بھی قطعی پرہیز کرنا نہایت لازم ہے۔ بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ آج کے بہت سے مسلمان بھی بربناء جہل و نادانی بدفالی لینے کی برائی میں مبتلا ہیں باوجودیکہ زمانہ جاہلیت کی ایک مشرکانہ عادت رہی

ہے اور اگر اس بات سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو اس سے اجتناب کی ایک بڑی معقول وجہ یہ بھی ہے کہ بدفالی نہ لینے والے کو بڑی فضیلت کا حامل قرار دیا گیا ہے بایں طور کہ وہ ان لوگوں میں شامل ہوگا جو بغیر حساب جنت میں شامل کئے جائیں گے، نیز اس سے اجتناب ایک ایسا وصف بھی ہے جس کو توکل کے درجات میں سے شمار کیا جاسکتا ہے! اور اس سے بالاتر درجہ وہ ہے جو ہر طرح کے علاج معالجہ، جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈے اور دیگر تدابیر کو کلیۃً ترک کرنے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے اور جس کا مقصد حقیقی توکل کے مقام کو ثابت وظاہر کرنا ہوتا ہے، چنانچہ توکل کا متعارف مفہوم بھی یہی بیان کیا جاتا ہے اور اسی لئے صوفیہ نے "توکل" کی وضاحت یہی کی ہے کہ توکل کا مطلب ہے حق تعالیٰ کی رزاقیت پر کامل اعتماد و بھروسہ پر کے سبب کسب وعمل اور اسباب ووسائل کو مطلق ترک کر دینا۔ یہ دوسرا یا اوسط درجہ ہے جو خواص کا مرتبہ مانا جاتا ہے اس مرتبہ کے لوگ اس اجر و فضیلت کے مستحق قرار پاتے ہیں جس کا ذکر حدیث میں ہے بلکہ مزید برآں ایک اور عظیم الشان سعادت کی بشارت دی گئی ہے کہ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ اس کے بعد تیسرا درجہ وہ ہے جو اس مقام کے منتہی اور مقربین بارگاہ الٰہی کے لئے مخصوص ہے اس درجہ کے لوگوں کی ظاہری نظر میں اسباب وذرائع کلیۃً ساقط ہوتے ہیں کہ ان کے نزدیک ان کا عدم اور وجود دونوں برابر ہیں، وہ اگر اسباب وذرائع کو کسی حد تک اختیار بھی کرتے ہیں تو محض اظہار عبودیت اور مشیت الٰہی کی فرمانبرداری کے طور پر، اور اس حیثیت سے ان کا اسباب وذرائع کو اختیار کرنا ان کے حق میں عزیمت (الویت) کا حکم رکھتا ہے یہ مرتبہ اخص الخواص کا مرتبہ کہلاتا ہے اور وہ انبیاء و اولیاء ہیں کہ جو اپنی ذات کے اعتبار سے فانی اور خدا کے ساتھ باقی ہیں اور توکل کا یہی سب سے آخری مرتبہ بھی ہے اور اس کی اصل حقیقت بھی، نیز جو بندگان خاص اس مرتبہ تک پہنچ جاتے ہیں، ان کی فضیلت سب سے زیادہ اور ان کا اجر سب سے بڑا ہوتا ہے۔

مذکورہ مسئلے میں عالمگیری نے یہ قاعدہ کلیہ بیان کیا ہے کہ کسی نقصان وضرر اور تکلیف کو دور کرنے والے اسباب وذرائع تین طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ کہ جن کا موثر ہونا یقینی ہوتا ہے جیسا کہ پانی پیاس کو اور کھانا بھوک کو دور کرتا ہے دوسرے وہ اسباب جو ظنی ہوتے ہیں جیسے فصد کھلوانا، پچھنے لگوانا، مسہل لینا اور طب کے دوسرے قواعد وضوابط کہ مثلاً گرمی سے پیدا ہونے والے امراض میں ٹھنڈی دواؤں کے ذریعہ اور ٹھنڈ سے پیدا ہونے والے امراض میں گرم دواؤں کے ذریعہ علاج معالجہ کرنا، اور یہ چیزیں طبی نقطۂ نظر سے ظاہری اسباب کا درجہ رکھتی ہیں اور تیسرے وہ اسباب کہ جو موہوم ذریعہ ہوتے ہیں جیسے جسم کو داغنا، دعاؤں کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنا اور تعویذ گنڈا وغیرہ۔ پس جو اسباب وذرائع یقینی درجہ رکھتے ہیں ان کو ترک کرنا نہ صرف یہ کہ توکل کے لئے شرط نہیں ہے بلکہ اس صورت میں شرعی نقطہ نظر سے بھی حرام ہے جب کہ ان کو ترک کرنے کی وجہ سے موت کے واقع ہوجانے کا خوف ہو، اس کے برخلاف جہاں تک ان اسباب وذرائع کا تعلق ہے جو موہوم کی حیثیت رکھتے ہیں ان کو ترک کرنا ہی توکل کی شرط ہے کیونکہ رسول کریم ﷺ نے ایسے اسباب وذرائع کو ترک کرنے والوں کو "متوکلین" کے زمرہ میں شمار فرمایا ہے، رہی ان اسباب وذرائع کی بات جو ظنی ہیں اور جو اطباء و حکماء کے نزدیک ظاہری اسباب کا درجہ رکھتے ہیں تو ان کو اختیار کرنا یعنی طبی اصول وقواعد کے تحت علاج کرانا توکل کے منافی نہیں ہے۔ اس طرح ظنی اسباب، موہوم، اسباب، کی طرح تو توکل کے خلاف نہیں ہے اور ان کو ترک کرنا یقینی اسباب کو ترک کرنے کی طرح ممنوع نہیں ہے بلکہ بعض احوال میں اور بعض اشخاص کے حق میں ان کو ترک کرنا افضل ہوجاتا ہے۔ پس یہ ظنی اسباب گویا دو درجوں کے درمیان ایک معتدل درجہ ہے۔

② وَعَنْهُ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ عُرِضَتْ عَلَيَّ الْاُمَمُ فَجَعَلَ يَمُرُّ النَّبِيُّ وَمَعَهُ الرَّجُلُ وَالنَّبِيُّ وَمَعَهُ الرَّجُلَانِ وَالنَّبِيُّ وَمَعَهُ الرَّهْطُ وَالنَّبِيُّ وَلَيْسَ مَعَهُ اَحَدٌ فَرَاَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّ الْاُفُقَ فَرَجَوْتُ اَنْ يَكُوْنَ اُمَّتِيْ فَقِيْلَ لِيَ انْظُرْ فَرَاَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّا الْاُفُقَ فَقِيْلَ لِيَ انْظُرْ هٰكَذَا وَهٰكَذَا فَرَاَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّا الْاُفُقَ فَقِيْلَ هٰؤُلَاءِ اُمَّتُكَ وَمَعَ هٰؤُلَاءِ سَبْعُوْنَ اَلْفًا قُدَّامَهُمْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَتَطَيَّرُوْنَ وَلَا يَسْتَرْقُوْنَ وَلَا

يَكْتَوُوْنَ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ فَقَامَ عُكَاشَةُ بْنُ مِحْصَنٍ فَقَالَ اُدْعُ اللّٰهَ اَنْ يَّجْعَلَنِىْ مِنْهُمْ قَالَ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ مِنْهُمْ ثُمَّ قَامَ رَجُلٌ اٰخَرُ فَقَالَ اُدْعُ اللّٰهَ اَنْ يَّجْعَلَنِىْ مِنْهُمْ قَالَ سَبَقَكَ بِهَا عُكَاشَةُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ (حالت کشف یا خواب میں) میرے سامنے امتوں کو (ان کے انبیاء کے ساتھ) پیش کیا گیا (یعنی ہر نبی کو اس کی اُمت کے ساتھ مجھے دکھایا گیا) پس (جب ان انبیاء نے اپنی امتوں کے ساتھ گزرنا) شروع کیا تو (میں نے دیکھا) کہ ایک نبی کے ساتھ صرف ایک ہی شخص تھا (یعنی دنیا میں اس کی پیروی کرنے والا اس ایک شخص کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوا) اور ایک نبی ایسا تھا کہ اس کے ساتھ دو شخص تھے، ایک اور نبی گزرا تو اس کی معیت میں پوری ایک جماعت تھی اور پھر ایک نبی ایسا بھی گزرا کہ اس کے ساتھ ایک بھی شخص نہیں تھا (یعنی دنیا میں اس کی پیروی کسی ایک شخص نے بھی نہیں کی) اس کے بعد میں نے (اپنے سامنے) ایک بہت بڑا انبوہ دیکھا جو آسمان کے کناروں تک پھیلا ہوا تھا (اتنی بڑی امت دیکھ کر) میں نے امید باندھی کہ یہ میری اُمت ہوگی، لیکن مجھے بتایا گیا کہ یہ حضرت موسیٰ اور ان کی اُمت کے لوگ ہیں (کہ جو ان پر ایمان لائے تھے) پھر مجھ سے کہا گیا کہ ذرا آپ (ﷺ) نظر اٹھا کر تو دیکھئے، میں نے (جو نظر اٹھائی تو اپنے سامنے) دیکھا کہ ایک بڑا ہجوم بے پناہ ہے جو آسمان کے کناروں تک پھیلا ہوا ہے (میں اتنا بڑا انبوہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا اور خدا کا شکر ادا کیا) پھر مجھ سے کہا گیا کہ (آپ (ﷺ) اس انبوہ کو بس نہ سمجھئے، آپ (ﷺ) اس سے کہیں زیادہ لوگوں کو دیکھیں گے) ذرا ادھر ادھر یعنی دائیں بائیں بھی نظر گھما کر تو دیکھئے چنانچہ میں نے (دائیں بائیں نظر گھما کر) دیکھا تو (دونوں طرف) بے پناہ ہجوم تھا جو آسمان کے کناروں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے بعد (مجھ سے) کہا گیا کہ (آپ (ﷺ) کے سامنے اور دائیں بائیں آسمان کے کناروں تک جو انسانوں کا ایک بحر بیکراں نظر آتا ہے) یہ سب آپ (ﷺ) کی اُمت کے لوگ ہیں اور ان کے علاوہ (یعنی منجملہ ان لوگوں کے یا ان کے علاوہ مزید) ان کے آگے ستر ہزار لوگ ایسے ہیں جو جنّت میں بغیر حساب کے جائیں گے اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو نہ تو بدفالی لیتے ہیں، نہ منتر پڑھواتے ہیں اور نہ اپنے جسم کو دغواتے ہیں اور اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں۔ یہ سن کر، ایک صحابی عکاشہ ابن محصن کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ (یارسول اللہ ﷺ) اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ وہ مجھے ان لوگوں میں شامل فرما دے (جو خدا پر توکل کرتے ہیں اور بغیر حساب جنّت میں داخل ہوں گے) حضور نے دعا فرمائی "الٰہی عکاشہ" کو ان لوگوں میں شامل فرما دے" پھر ایک اور شخص کھڑا ہوا اور اس نے بھی عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ وہ مجھے ان لوگوں میں شامل فرما دے آپ ﷺ نے فرمایا "اس دعا کے سلسلہ میں عکاشہؓ تم پر سبقت لے گئے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "نبی" سے مراد "رسول" ہیں کہ جو خدا کا دین پہنچانے اور لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لئے اس دنیا میں مبعوث کئے گئے۔

جیسا کہ ترجمہ میں بین القوسین واضح کیا گیا، امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ "ستر ہزار" سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ ﷺ کی اُمت میں سے ستر ہزار لوگ وہ ہیں جو ان لوگوں کے علاوہ ہیں، اور اس سے یہ معنی بھی لئے جا سکتے ہیں کہ ان ہی لوگوں میں ستر ہزار لوگ ایسے بھی ہیں جو بغیر حساب جنّت میں داخل ہوں گے! اس دوسرے معنی کی تائید بخاری کے روایت کردہ ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ هٰذِهٖ اُمَّتُكَ وَيَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ مِنْ هٰؤُلَاءِ سَبْعُوْنَ اَلْفًا یعنی یہ آپ کی اُمّت کے لوگ ہیں اور ان میں سے ستر ہزار لوگ وہ ہیں جو بغیر حساب جنّت میں داخل ہوں گے۔

"نہ اپنے جسم کو دغواتے ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ بلاضرورت اپنے جسم کے کسی حصہ پر آگ کا داغ نہیں لیتے الا یہ کہ انہیں کوئی ایسی مجبوری پیش آجائے کہ دغوائے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو، تو یہ اور بات ہے، چنانچہ ضرورت و مجبوری کے تحت دغوانا بعض صحابہ سے بھی ثابت ہے ان میں سے حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ بھی ہیں جن کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ وہ لوگ مطلق نہیں دغواتے، خواہ انہیں اس کی کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو، کیونکہ وہ تقدیر و قضاء الٰہی پر راضی و مطمئن ہوتے ہیں، ان کا صرف خدا پر اعتماد و بھروسہ ہوتا ہے، وہ کسی آفت و مصیبت کو دفع کرنے کی تدبیر کرنے کی بجائے اس کی وجہ سے ایک خاص لذت محسوس کرتے ہیں اور اس

بات پر ان کو پورا یقین ہوتا ہے۔ کہ فائدہ اور نقصان پہنچانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس کے علاوہ ایسی کوئی ذات اور کوئی چیز نہیں ہے۔ جو حقیقی مؤثر ہو۔ پس وہ لوگ پاک نفس، گویا مرتبۂ مشہود پر فائز ہوتے ہیں کہ ان کی نظر میں ان کا اپنا وجود، عدم کے برابر ہوتا ہے اور نفس کی لذات و خواہشات کے اعتبار سے وہ فنا کا مقام اختیار کر لیتے ہیں۔

بعض شارحین نے یوں لکھا ہے کہ "نہ اپنے جسم کو دغواتے ہیں" کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ اول تو جسم کو دغوانے سے اجتناب کرتے ہیں لیکن اگر کسی مرض و تکلیف کی واقعی ضرورت و مجبوری کے تحت ان کو ایسا کرنا بھی پڑتا ہے تو ان کا فائدہ اور شفاء کا اعتقاد صرف اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے نہ کہ محض دغوانے پر۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ جسم پر داغ لینا ان اسباب میں سے ہے جو وہمیہ ہیں، نیز احادیث میں اس کی ممانعت منقول ہے لیکن اگر کسی بیماری و تکلیف کے دفعیہ کے لئے کوئی حاذق معالج دغوانے کو ضروری قرار دے اور اس کا کارگر ہونا یقینی امر ہو تو اس کی اجازت بھی ہے۔

"نہ منتر پڑھواتے ہیں" میں منتر سے مراد، منتر و افسوں اور جادو ہے کہ جس کے الفاظ و معنی قرآن و احادیث صحیحہ کے مطابق نہ ہوں اور ان کی وجہ سے شرک میں مبتلا ہو جانے کا خوف ہو، اسی طرح "نہ بدفالی لیتے ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ کسی جانور، خواہ وہ پرندہ ہو اور خواہ چرند جیسے کتا اور بلی وغیرہ، ان کے اڑنے، ان کی آواز، اور ان کے راستہ وغیرہ کاٹنے سے وہ لوگ کوئی بدفالی نہیں لیتے۔

حاصل یہ ہے کہ جن لوگوں کے بارے میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ وہ بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے وہ دراصل وہ لوگ ہیں جو اپنے ایمان و اعتقاد اور کردار و عمل کے لحاظ سے بہت پختہ و مضبوط ہیں کہ وہ کسی بھی ایسے عقیدہ اور ایسے عمل کو مطلقاً اختیار نہیں کرتے جو زمانۂ جاہلیت کے عقائد و اعمال سے مطابقت و مشابہت رکھتا ہے۔

اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ مذکورہ لوگوں کے سلسلے میں "ستر ہزار" کی تعداد کا ذکر ہے تو کیا ازابتدا تا انتہا اس اُمت محمدیہ میں ایسے لوگوں کی تعداد صرف ستر ہزار ہی ہوگی؟ جب کہ یقیناً اس وصف کے لوگ مذکورہ تعداد سے کہیں زیادہ ایک ہی زمانہ میں پائے جا سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ستر ہزار سے مراد کسی مخصوص عدد کو واضح نہیں کرنا ہے۔ بلکہ ستر ہزار کا عدد استعمال کرنے کا واحد مقصد ایسے لوگوں کی کثرت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

حدیث کے آخری جزء کے سلسلے میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دوسرے شخص کی درخواست قبول کیوں نہیں کی اور اس کے حق میں دعا کیوں نہیں کی؟ اس کے جواب دئے جا سکتے ہیں مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت ﷺ کو اس مجلس میں صرف ایک ہی شخص کے حق میں دعا کرنے کی اجازت دی گئی تھی اور چونکہ آپ عکاشہ ؓ کے حق میں دعا فرما چکے تھے اس لئے ان کے بعد کسی دوسرے شخص کے حق میں دعا کرنے کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ یا یہ کہ وہ دوسرا شخص اپنی باطنی حیثیت و حالت کے اعتبار سے اس مرتبہ کا اہل اور اس منزلت کا مستحق نہیں تھا اس لئے آپ ﷺ نے اس کے حق میں دعا نہیں فرمائی، لیکن اس کے بارے میں آپ ﷺ نے اس سے صراحت کے ساتھ یہ نہیں فرمایا کہ تم اس مرتبہ و منزلت کے اہل و مستحق نہیں ہو بلکہ اس کو ایک عام جواب دے دیا اور واضح فرمایا کہ عکاشہ ؓ کے حق میں دعا کرنے کا سبب ان کی طرف سے دعا کی عرض و التماس میں سبقت ہے! بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ شخص دراصل منافقین میں سے تھا اور ظاہر ہے کہ اس کی یہ حیثیت حضور ﷺ کے علم میں تھی اس لئے آپ ﷺ نے اس کے حق میں دعا نہیں فرمائی لیکن آپ نے ازراہ اخلاق و مروت اس سے یہ نہیں کہا بلکہ ایک مجمل جواب دے دیا۔ لیکن بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ عکاشہ ؓ کے حق میں دعا کرنا دراصل وحی خفی کے سبب تھا جس میں حضور کو مذکورہ دعا کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔

یہ قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ ایک اور روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ اس موقع پر دعا کی درخواست کرنے والے دوسرے شخص حضرت سعد بن عبادہ ؓ تھے جو مشاہیر صحابہ میں سے ہیں۔

نیز یہ ارشاد گرامی اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ نیکی کی راہ اختیار کرنے میں سبقت کرنی چاہئے اور اہل اللہ وبزرگان دین سے اپنے حق میں فلاح وسعادت کی دعا کی درخواست کی جانی چاہئے۔

مؤمن کی مخصوص شان

(۳) وَعَنْ صُهَيْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهٗ كُلَّهٗ لَهٗ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت صہیبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا مؤمن کی بھی عجیب شان ہے کہ اس کی ہر حالت اس کے لئے خیر و بھلائی کا باعث ہے اور یہ بات صرف مؤمن کے لئے مخصوص ہے کوئی اور اس کے وصف میں شریک نہیں ہے اور اس کو رزق وفراخی و وسعت، راحت، چین، صحت و تندرستی، نعمت ولذت اور طاعت وعبادت کی توفیق کی صورت میں خوشی حاصل ہوتی ہے تو وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے، بس یہ شکر ان کے لئے خیرو بھلائی کا باعث ہوتا ہے اور اگر اس کو (فقرو افلاس، مرض وتکلیف، رنج و الم اور آفات و حادثات کی صورت میں) مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے۔ پس یہ صبر بھی اس کے لئے خیرو بھلائی کا باعث ہوتا ہے۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ہر انسان اپنی شب و روز کی زندگی میں یا تو ایسی حالت سے دوچار ہوتا ہے جو اس کو رنج و تکلیف میں مبتلا کر دیتی ہے یا وہ ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ جس سے وہ خوشی و مسرت محسوس کرتا ہے ان دونوں حالتوں سے کوئی شخص خالی نہیں ہوتا، پس مؤمن کے لئے رنج و تکلیف میں مبتلا کرنے والی حالت صبر کا تقاضہ کرتی ہے اور خوشی و مسرت دینے والی حالت شکر کا، اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں مقام صبر و شکر، نہایت اعلیٰ ہیں اور بہت زیادہ اجر و ثواب کا باعث بنتے ہیں، اس طرح مؤمن گویا ہر حالت میں اعلیٰ مقام و مرتبہ اور بہت زیادہ اجر و ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اوپر حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ "اور یہ بات صرف مؤمن کے لئے مخصوص ہے" تو بظاہر مؤمن سے مراد "مؤمن کامل" ہے کیونکہ یہ کامل مؤمن کی ہی شان ہوتی ہے کہ وہ تنگی و سختی اور رنج و تکلیف کی حالت میں صبر کرتا ہے اور خوش حالی و مسرت کی صورت میں شکر گزار ہوتا ہے، اس کے برخلاف غیر کامل مؤمن کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگر اس کو ترفہ و خوش حالی اور خوشی و مسرت کے اسباب میسر ہو جاتے ہیں تو وہ مغرور ہو جاتا ہے اور خلاف شرع باتیں کرنے لگتا ہے۔ اور اگر تنگی و سختی اور رنج و تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو جزع و فزع، شکوہ شکایت اور کفران نعمت کرنے لگتا ہے۔ لہٰذا ہر مؤمن کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جس حالت میں بھی ہو اس کے مطابق اپنی کیفیت کا جائزہ لے اور دیکھے کہ وہ اپنے فکر و خیال اور قول و فعل کے اعتبار سے اس حدیث کے معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ اور پھر کامل مؤمن کہلانے کا مستحق ہے یا نہیں۔

کچھ خاص ہدایتیں

(۴) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَاَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيْفِ وَفِيْ كُلٍّ خَيْرٌ اَحْرِصْ عَلٰى مَا يَنْفَعُكَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجِزْ وَاِنْ اَصَابَكَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ اَنِّيْ فَعَلْتُ كَانَ كَذَا وَكَذَا وَلٰكِنْ قُلْ قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَا شَاءَ فَعَلَ فَاِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قوی مسلمان" ضعیف مسلمان سے بہتر اور خدا کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔ (یعنی جو مسلمان خدا کی ذات وصفات کے تئیں ایمان و اعتماد میں مضبوط ہوتا ہے اس پر پختگی کے ساتھ توکل و اعتماد رکھتا ہے ہر حالت میں نیکیاں و بھلائیاں اس کا مقصود ہوتی ہیں اور خدا کی راہ میں جہاد و ایثار کرتا ہے۔ یا یہ کہ جو مسلمان لوگوں کی صحبت و ہم نشینی اور ان کی طرف سے پیش آنے والی ایذا و تکلیف پر صبر کرتا ہے، مخلوق خدا کی ہدایت کے لئے کوشش کرتا ہے اور تقریر و تحریر اور درس و تعلیم کے

ذریعہ خیر و بھلائی پھیلانے میں مصرف رہتا ہے وہ اس مسلمان سے کہیں زیادہ بہتر اور خدا کے نزدیک کہیں زیادہ محبوب و پسندیدہ ہے جو ان صفات میں اس کا ہم پلہ نہیں ہوتا) اور ہر مسلمان (خواہ وہ قوی ہو یا ضعیف) اپنے اندر نیکی و بھلائی رکھتا ہے۔ (یعنی کوئی مسلمان نیک صفات سے خالی نہیں ہوتا ہر شخص میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور ہوتی ہے، کیونکہ تمام نیکیوں اور بھلائیوں کا اصل سرچشمہ بنیادی ایمان ہے اور بنیادی ایمان ہر مسلمان میں ہوتا ہے) جو چیز تمہیں (دین و آخرت کے اعتبار سے) نفع پہنچانے والی ہو اس کی حرص رکھو، اللہ تعالیٰ سے (نیک عمل کرنے کی) مدد و توفیق طلب کرو اور اس (طلب مدد و توفیق سے عاجز نہ ہو (کیونکہ اللہ تعالیٰ اس پر پوری طرح قادر ہے کہ تمہیں اپنی طاعت و عبادت کی توفیق عطا فرمائے بشرطیکہ تم اس کی استعانت پر سیدھی طرح قائم رہو۔ اور بعض حضرات نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ تم اس چیز پر عمل کرنے سے عاجز نہ رہو جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ اور ان کو ترک نہ کرو)۔ نیز اگر تمہیں (دین و دنیا) کی کوئی مصیبت و آفت پہنچے تو یوں نہ کہو "اگر میں اس طرح کرتا تو ایسا ہوتا (بلکہ زبان قال یا زبان حال سے) یہ کہو کہ "اللہ تعالیٰ نے یہی مقدر کیا تھا۔" لہٰذا جو کچھ بھی پیش آیا ہے قضاء و قدر الٰہی کے مطابق ہی پیش آیا ہے) اور اللہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔" اور یہ اس لئے کہ "اگر" کا لفظ (جب کسی چیز پر حسرت و پریشانی کے اظہار، تقدیر الٰہی کے ساتھ معارضہ و مقابلہ اور اپنی قوت و تدبیر پر اعتماد کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے تو) شیطان کے عمل دخل کا دروازہ کھول دیتا ہے (اور دل میں یہ غلط وسوسہ اور خیال سما جاتا ہے کہ ہر کام کا نتیجہ ہماری ہی تدبیر سے نکلتا ہے تقدیر الٰہی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: یہ کہنا کہ میں اگر فلاں تدبیر کر لیتا اور یہ کام اس طرح کر لیتا تو میں فلاں نقصان اور مصیبت سے بچ جاتا۔" اس لئے ممنوع ہے کہ ایسا کہنا بالکل لاحاصل ہے اور اس کا کوئی فائدہ نہیں، جو چیز جس طرح پیش آتی ہے وہ یوں ہی نہیں، بلکہ خدا کی مشیت اور اس کے حکم و فیصلہ کے مطابق پیش آتی ہے۔ جس کو تقدیر کا لکھا کہا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔ قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَا اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا (کہہ دو کہ ہمیں صرف وہی پہنچے گا جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے) لہٰذا "لَوْ" یعنی "اگر" کا لفظ کہنا اسی صورت میں ممنوع ہے جب کہ اس کا استعمال کسی ایسے جملہ میں ہو جس کا مقصد تقدیر الٰہی کے ساتھ معارضہ و مقابلہ ہو اور یہ اعتقاد ہو کہ تقدیر کوئی چیز نہیں، ہر چیز کا وقوع پذیر ہونا اس کے ظاہری اور مادی اسباب و وسائل پر منحصر ہے اگر یہ مقصد اور یہ اعتقاد نہ ہو تو پھر اس کا استعمال ممنوع نہیں ہوگا جیسا کہ قرآن میں یوں وارد ہوا ہے۔ "لَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِکُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ کُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ۔

یا ایک حدیث میں (جو باب الحج میں نقل ہو چکی ہے) آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

لَوْ اَنِّیْ اَسْتَقْبَلْتُ مِنْ اَمْرِیْ مَا اسْتَدْبَرْتُ اگر مجھ کو پہلے یہ معلوم ہوتا جو بعد کو معلوم ہوا..... الخ اسی طرح اور بہت سی روایتوں میں بھی "لَوْ" کا لفظ منقول ہوا ہے! لہٰذا معلوم ہوا کہ "لَوْ" یعنی "اگر" کے لفظ کی ممانعت کا تعلق ایسی بات سے ہے جس کا کوئی فائدہ نہ ہو اور جو تقدیر الٰہی کے معارض ثابت ہوتی ہے تاہم یہ واضح رہے کہ مذکورہ ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے نہ کہ نہی تحریمی کے طور پر! نیز اگر اس لفظ کا استعمال کسی ایسے جملہ میں ہو کہ جس کا مقصد کسی طاعت و عبادت کے فوت ہو جانے پر اظہار تاسف و حسرت سے ہو یا اس عبادت و طاعت سے اس معذوری و مجبوری کے اظہار و افسوس کے تئیں ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، اور مختلف احادیث میں جو یہ لفظ منقول ہوا ہے وہ اسی مفہوم پر محمول کیا جاتا ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ عبادت و طاعت کے فوت ہو جانے پر اظہار تاسف کرنا ثواب کا باعث بھی ہے اور اس کو ان چیزوں میں شمار کیا جانا ہی لائق ہے جو مستحب ہیں۔

چنانچہ امام رازیؒ نے اپنی کتاب مشیخت میں ابی عمرو سے نقل کیا ہے کہ جس شخص نے اپنی کسی دنیاوی چیز کے فوت و ضائع ہو جانے پر تأسف کیا تو وہ ایک ہزار سال کی مسافت کے بقدر دوزخ کے قریب ہو جاتا ہے اور جس شخص نے اپنے کسی دینی عمل اور کسی اخروی چیز کے فوت و ضائع ہو جانے پر تأسف کیا تو وہ ایک ہزار سال کی مسافت کے بقدر جنت کے قریب ہو جاتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

اللہ پر پوری طرح توکل کرنے کی فضیلت

⑤ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَوْاَنَّکُمْ تَتَوَکَّلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ حَقَّ تَوَکُّلِہٖ لَرَزَقَکُمْ کَمَا یَرْزُقُ الطَّیْرَ تَغْدُوْا خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ)

"حضرت عمر ابن خطابؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔"حقیقت یہ ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ پر توکل واعتماد کرو جیسا کہ توکل کا حق ہے تو یقیناً وہ تمہیں اسی طرح روزی دے گا جس طرح کہ پرندوں کو روزی دیتا ہے، وہ (پرندے) صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے (اپنے گھونسلوں میں واپس آتے ہیں۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: توکل کا حق یہ ہے کہ اول تو اس بات پر پورا یقین واعتقاد ہو کہ کسی بھی چیز کو وجود میں لانے والا اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ اور ہر موجودہ کو خواہ وہ جاندار یا غیر جاندار مخلوق ہو، یا رزق، کسی چیز کا ملنا ہو یا نہ ملنا ہو، ضرر ہو یا نفع ہو، غربت و افلاس ہو یا ثروت و مالداری ہو، مرض ہو یا صحت ہو، اور موت ہو یا حیات ہو، غرضکہ کوئی بھی چیز ہو، سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، اور سب چیزیں اسی کی طرف سے ہیں، پھر اس امر کا پختہ اعتقاد ہو کہ رزق کا ضامن بلاشک وشبہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اور پھر اس یقین واعتقاد کے ساتھ حصول معاش کی سعی وجہد میں اچھے طور طریقوں سے، اور مناسب ومعقول صورت میں مشغول ہو، یعنی کسب وکمائی میں زیادہ تعب ومشقت برداشت نہ کرے، حرص ولالچ میں مبتلا نہ ہو، ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے کی جدوجہد نہ کرے اور کمانے کی دھن میں غرق نہ ہو جائے کہ حلال و حرام کی تمیز بھی نہ کر سکے۔

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص کا گمان یہ ہو کہ "توکل" نام ہے کسب وعمل کے ترک کر دینے کا" اور ہاتھ پاؤں کو معطل کر دینے اور اپاہج بن کر) پڑے رہنے کا کہ جس طرح کسی کپڑے کو زمین پر ڈال دیا جائے تو، وہ، شخص نرا جاہل ہے! اور حضرت امام قشیریؒ کا قول یہ ہے کہ "توکل کا اصل مقام قلب ہے، اور حصول معاش کے لئے" حرکت وعمل ایک ظاہری فعل ہے جو توکل کے منافی نہیں ہے بشرطیکہ اصل اعتماد (اپنے کسب وعمل کے بجائے) محض اللہ تعالیٰ پر ہو، اسی لئے حدیث میں پرندہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور وہ اگرچہ اپنی روزی کی تلاش میں نکلتا ہے اور سارے جہان میں مارا مارا پھرتا ہے لیکن اس کا اصل اعتماد اللہ تعالیٰ ہی پر ہوتا ہے، نہ کہ اپنی طلب اور جدوجہد اور اپنی تدبیر وقوت پر لہٰذا اس سے واضح ہوا کہ انسان کا حصول معاش کے لئے معقول اور مناسب طریقہ پر جدوجہد اور سعی کرنا اللہ تعالیٰ پر اعتماد و بھروسہ کرنے کے منافی نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَکَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّۃٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَھَا اَللّٰہُ یَرْزُقُھَا وَاِیَّاکُمْ یعنی اور کوئی جانور اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتا بلکہ اللہ تعالیٰ ہی اس کو بھی اور تمہیں بھی رزق عطا کرتا ہے۔"

حاصل یہ کہ حدیث کا مفہوم اس امر سے آگاہ کرنا ہے کہ سعی وجدوجہد اور کسب وعمل حقیقت میں رزق پہنچانے والا نہیں ہے بلکہ رزق پہنچانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے اسی طرح حدیث کا مقصد یہ بھی نہیں ہے کہ انسان کو اپنی روزی کمانے کے لئے حرکت وعمل سے باز رکھا جائے کیونکہ اللہ پر توکل واعتماد کا تعلق دل سے ہے جو اعضائے ظاہری کی حرکت وعمل کے مطلقاً منافی نہیں ہے، گو بسا اوقات اعضا وجوارح کی حرکت اور کسی کسب وعمل کے بغیر بھی اللہ تعالیٰ رزق پہنچاتا ہے بلکہ توکل کی برکت تو یہاں تک ہوتی ہے کہ متوکل کو اپنا رزق لینے کے لئے حرکت بھی کرنا نہیں پڑتی بلکہ دوسرے حرکت کر کے اس تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق پہنچاتے ہیں جیسا کہ اس ارشاد ربانی کے عمومی مفہوم سے واضح ہوتا ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا۔

کہ جب کوے کے بچے انڈے سے باہر آتے ہیں تو بالکل سفید ہوتے ہیں اور کوا ان بچوں کو دیکھتا ہے تو وہ اسے بہت برے لگتے ہیں چنانچہ ان بچوں کو چھوڑ کر کوا چلا جاتا ہے، اور وہ تنہا پڑے رہ جاتے ہیں تب اللہ تعالیٰ ان کے پاس مکھی اور چیونٹیاں بھیجتا ہے جن کو وہ

بچے چن چن کر کھاتے ہیں، اور پرورش پاتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں تو اپنا رنگ بدل دیتے ہیں اور بالکل سیاہ ہو جاتے ہیں، پھر جب کچھ عرصہ کے بعد کوا ان بچوں کے پاس آتا ہے اور ان کو سیاہ رنگ کا دیکھتا ہے تو ان کو لے کر بیٹھ جاتا ہے اور ان کی پرورش کرنے لگتا ہے اس سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ بغیر حرکت وسعی کے بھی کسی طرح رزق پہنچاتا ہے، اس سلسلے میں کافی حکایتیں بیان کی جاتی ہیں لیکن یہ حکایت تو بہت ہی عجیب وغریب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روح قبض کرنے والے فرشتے عزرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا کسی کی روح نکالتے وقت تجھے رحم بھی کبھی آیا ہے؟ عزرائیل علیہ السلام نے کہا کہ ہاں اے میرے پروردگار! ایک موقع پر تو مجھے بہت ہی رحم آیا تھا، اور وہ اس وقت کا قصہ ہے جب کہ ایک کشتی ٹوٹ گئی تھی اور اس کے لوگ پانی میں غرق ہو گئے تھے لیکن کچھ لوگ ڈوبنے سے بچ گئے تھے اور کشتی کے باقی ماندہ تختوں پر تیر رہے تھے، انہی میں ایک عورت تھی جو ایک تیرتے ہوئے تختے پر بیٹھی ہوئی اپنے شیر خوار بچے کو دودھ پلا رہی تھی، جبھی تیرا حکم ہوا کہ اس عورت کی روح قبض کر لی جائے چنانچہ میں نے اس عورت کی روح قبض کر لی، لیکن اس کے بچے پر بہت رحم آیا جو اس دریا میں ایک ٹوٹے ہوئے تختے پر تنہا رہ گیا تھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہیں معلوم ہے اس بچے کا انجام کیا ہوا؟ میں نے اس تیرتے ہوئے تختے کو ایک جزیرہ کے کنارے لگ جانے کے حکم دیا جہاں اس نے بچہ کو ساحل پر ڈال دیا، پھر میں نے ایک شیرنی اس بچے کے پاس بھیجی جس نے اس کو اپنا دودھ پلا پلا کر پرورش کیا، جب وہ کچھ بڑا ہو گیا تو میں نے کچھ جنات متعین کر دیئے تاکہ وہ اس بچے کو آدمیوں کی بول چال اور رہن سہن کی تعلیم دیں، یہاں تک کہ وہ ایک مضبوط جوان ہو گیا اور پھر علم و فضل میں کمال حاصل کرتا ہوا علماء کی صف میں داخل ہو گیا، دولت و امارت سے بہرہ مند ہوا اور آخر کار سلطنت کے مرتبہ کو پہنچ کر تمام روئے زمین کا بادشاہ و حکمران بن گیا، تب وہ اپنی اصل حقیقت کو بھول گیا، روئے زمین پر چلنے والی اس کی مطلق العنانی اس کی انسانیت و عبودیت کی سب سے بڑی دشمن بن گئی اس نے عبودیت کے مرتبہ اور ربوبیت کے حقوق کو فراموش کر دیا اس کو یہ یاد نہ رہا کہ خدا تو وہ ذات ہے جس نے اس کو دریا کی لہروں سے زندہ بچا کر اپنی قدرت کے ذریعہ پرورش و تربیت کے مراحل سے گزارا، اور پھر اس مرتبہ تک پہنچایا کہ آج وہ تمام روئے زمین کا بادشاہ اور مطلق العنان حکمران بنا بیٹھا ہے، جانتے ہو وہ کون شخص تھا؟ وہ اس دنیا میں شداد کے نام سے مشہور ہوا ہے۔

بہرحال اہل ایمان کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ بہت رحیم و کریم ہے، وہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے، جب وہ اپنے دشمنوں کو رزق دیتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ان بندوں کو بھول جائے جو اس کے دوست اور محبوب ہیں۔

حصول رزق کے بارے میں ایک خاص ہدایت

(۶) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّهَا النَّاسُ لَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ اِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ اِلَّا قَدْ اَمَرْتُكُمْ بِهٖ وَلَيْسَ شَيْءٌ يُقَرِّبُكُمْ مِنَ النَّارِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ اِلَّا قَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ وَاِنَّ الرُّوْحَ الْاَمِيْنَ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَاِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رَوْعِيْ اَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا اَلَا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ وَلَا يَحْمِلَنَّكُمْ اسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ اَنْ تَطْلُبُوْهُ بِمَعَاصِي اللّٰهِ فَاِنَّهٗ لَا يُدْرَكُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ اِلَّا بِطَاعَتِهٖ۔ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ يَذْكُرْ وَاِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ لوگو! کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو تم کو جنت سے قریب کر دے اور دوزخ کی آگ سے دور کر دے علاوہ اس چیز کے جس (کو اختیار کرنے) کا حکم میں نے تمہیں دیا ہے اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو تم کو دوزخ کی آگ سے قریب کر دے اور جنت سے دور کر دے علاوہ اس چیز کے جس سے میں نے تمہیں منع کیا ہے، اور روح الامین۔ یا ایک روایت میں ہے کہ روح القدس (یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام) نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے (یعنی میرے پاس وحی خفی لائے ہیں)۔ کہ بلاشبہ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرتا جب تک کہ اپنا رزق پورا نہیں کر لیتا (یعنی جو شخص بھی اس دنیا میں آتا ہے وہ اپنے اس رزق کو پائے بغیر دنیا

سے نہیں جاتا جو اس کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کے مقدر میں لکھ دیا جاتا ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ نے اس طرف یوں اشارہ فرمایا ہے اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ رَزَقَکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ پس جب یہ معاملہ ہے کہ جو رزق مقدر ہو گیا ہے وہ ہر حال میں ملے گا تو) دیکھو، خدا کی نافرمانی سے ڈرتے رہو اور حصول معاش کی سعی وجدوجہد میں نیک روی اور اعتدال اختیار کرو (تاکہ تمہارا رزق تم تک جائز وحلال وسائل وذرائع اور مشروع طور طریقوں سے پہنچے نیز کہیں ایسا نہ ہو کہ رزق پہنچنے میں تاخیر تمہیں اس بات پر اکساوے کہ تم گناہوں کے ارتکاب کے ذریعہ رزق حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگو، حقیقت یہ ہے۔ کہ جو چیز خدا کے پاس ہے اس کو اس کی طاعت وخوشنودی ہی کے ذریعہ پایا جاسکتا ہے۔ اس روایت کو بغویؒ نے شرح السنۃ میں اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے لیکن بیہقیؒ نے و ان روح القدس کے الفاظ نقل نہیں کئے ہیں۔"

تشریح: حدیث کے ابتدائی جملوں کا مفہوم اس بات پر بصراحت دلالت کرتا ہے کہ وہ تمام باتیں جو انسانیت کو ابدی نفع پہنچانے والے امور اور نقصان کو دفع کرنے والے ذرائع سے روشناس کراتی ہیں صرف کتاب وسنت سے حاصل کی جاسکتی ہیں، جو باتیں اور جو چیزیں کتاب وسنت کی روشنی سے بے بہرہ ہوں وہ انسان کو صلاح وفلاح سے تو کیا ہمکنار کر سکتی ہیں ان میں اپنا وقت بھی صرف کرنا عمر کو بے فائدہ ضائع کرنا ہے۔

لفظ "روح" جان کے معنی میں آتا ہے اور اس سے "وحی" جبرئیل، اور عیسی علیہ السلام کے معنی بھی لئے جاتے ہیں، یہاں اس لفظ سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی ذات مراد ہے اور ان کی صفت "امین" کے ذریعہ بیان کرنا (یعنی ان کو روح الامین کہنا ان کی اس کمال دیانت داری کے سبب سے ہے جو خدا کے رسولوں تک علم ووحی پہنچانے میں ان کا وصف خاص ہے۔ اسی طرح روح القدس میں ان کی طرف قدس" (پاکی) کی نسبت ناموئی نجاست وکثافت سے ان کی کمال طہارت وپاکی کی بناء پر ہے۔

لفظ "اجملوا" اجمال سے نکلا ہے اور اس کے معنی ہیں روزی کی تلاش میں اعتدال اختیار کرنا! مطلب یہ کہ تم حصول معاش کی خاطر کئے جانے والے کسب وعمل اور سعی وجدوجہد میں نیکی ومیانہ روی اختیار کرو، طلب معاش میں ضرورت سے زیادہ مشقت ومحنت کرنا غیر مناسب بات ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں (تلاش رزق کا مکلف قرار نہیں دیا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ۝ مَآ اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنُ ۝۔

"میں نے جنات اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں میں ان سے رزق کا بالکل طالب نہیں ہوں اور نہ یہ قطعا چاہتا ہوں کہ وہ مجھ کو بھلائیں، حقیقت یہ ہے کہ رزاق تو صرف اللہ تعالیٰ ہے (اور) وہ بڑی زبردست قوت کا مالک ہے۔"

ایک موقع پر پروردگار نے یوں فرمایا ہے:

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْهَا ط لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا ط نَحْنُ نَرْزُقُكَ ط وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰی۔

"اور اپنے گھر والوں کو نماز پڑھنے کا حکم کرو اور اس پر صابر وقائم رہو! ہم تم سے روزی کے خواستگار نہیں ہیں (یعنی ہم تمہیں اپنی اور دوسروں کی روزی پیدا کرنے کا مکلف قرار نہیں دیتے) بلکہ ہم تمہیں روزی دیتے ہیں (اور حسن انجام انہیں کے لئے ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں۔"

حاصل یہ ہے کہ لفظ "اجملو" کے ذریعہ جو حکم دیا گیا ہے اس کا مفہوم اگر وہ مراد لیا جائے جو اوپر مذکور ہوا تو پھر یہ حکم اباحت کے لئے ہوگا، اور اگر اس لفظ کے یہ معنی مراد لئے جائیں کہ۔ "تم اپنا رزق حلال وجائز، وسائل وذرائع سے حاصل کرو، تو اس صورت میں یہ حکم وجوب کے لئے ہوگا، اس کی تائید بعد کی عبارت وَلَا یَحْمِلَنَّکُمْ الخ...... سے بھی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر حصول معاش کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے اور رزق پہنچنے میں تاخیر محسوس کرو تو اس کی وجہ سے مضطرب وپراگندہ خاطر نہ ہو جاؤ اور ایسا ہرگز نہ

ہو کہ روزی حاصل کرنے کے لئے حرام و مکروہ ذرائع اختیار کرنے لگو، مثل چوری ڈکیتی پر اتر آؤ، کسی کا مال ہڑپ کو لو، امانت میں خیانت کے مرتکب ہو جاؤ اور کچھ نہ سہی تو اپنی سیادت و حیثیت اور اپنی عبادت و دیانت کا اظہار کر کے ان چیزوں کو حصول رزق کا واسطہ بنالو، یا بیت المال جیسے مراکز سے اپنے حق اور اپنی حاجت سے زیادہ حاصل کرنے میں کوئی خرابی نہ سمجھو وغیرہ وغیرہ۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ رزق دیر سے کبھی نہیں پہنچتا جو کچھ پہنچے اور جس وقت پہنچے اصل رزق ہی ہے اور اسی طرح مقدر ہوتا ہے، پھر یہ کہ گناہ و معصیت کے ارتکاب سے رزق میں نہ تو وسعت ہوتی ہے اور نہ جلدی پہنچتا ہے، اسی قدر ملتا ہے اور اسی وقت پہنچتا ہے کہ مقدر میں جس قدر اور جس وقت پہنچنا لکھا جا چکا ہے، علاوہ ازیں مضطرب اور پراگندہ خاطر ہونے سے سوائے گناہ کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا، اور جو رزق گناہ کے ساتھ پہنچے وہ حرام ہوتا ہے۔ لہٰذا حصول معاش کی راہ میں اضطراب و بے چینی، اور گناہ و معصیت کی راہ اختیار کرنا کسی بھی طرح فائدہ مند نہیں اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

طیبیؒ نے لکھا ہے کہ "اجملوا" کے ذریعہ جو حکم دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مال کماؤ تو حسن و خوبی کے ساتھ کماؤ، یعنی کسی حال میں ایسا کوئی ذریعہ اور ایسا کوئی طریقہ اختیار نہ کرو جو شریعت کے خلاف ہو۔

لفظ اِستَبطأ اصل میں ابطاء (تاخیر ہونے) کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور حرف "سین" اظہار مبالغہ کے لئے ہے جیسا کہ قرآن نے ان الفاظ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ میں "استعفف" دراصل "عف" (باز رہنے) کے معنی میں ہے۔

اصل زہد کیا ہے؟

(۷) وَعَنْ اَبِيْ ذَرٍّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الزَّهَادَةُ فِي الدُّنْيَا لَيْسَتْ بِتَحْرِيْمِ الْحَلَالِ وَلَا بِاِضَاعَةِ الْمَالِ وَلٰكِنَّ الزَّهَادَةَ فِي الدُّنْيَا اَنْ لَا تَكُوْنَ بِمَا فِيْ يَدَيْكَ اَوْثَقَ بِمَا فِيْ يَدِي اللّٰهِ وَاَنْ تَكُوْنَ فِيْ ثَوَابِ الْمُصِيْبَةِ اِذَا اَنْتَ اُصِبْتَ بِهَا اَرْغَبَ فِيْهَا لَوْ اَنَّهَا اُبْقِيَتْ لَكَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَعَمْرُو بْنُ وَاقِدِ الرَّاوِيْ مُنْكَرُ الْحَدِيْثِ۔

"اور حضرت ابوذرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا دنیا سے زہد اختیار کرنا یہ نہیں ہے کہ حلال چیزوں کو حرام کر لیا جائے اور مال و اسباب کو ضائع کر دیا جائے بلکہ دنیا سے زہد اختیار کرنا یہ ہے (یعنی اس دنیا کے تئیں کامل و معتبر زہد یہ) کہ مال و دولت اور دیگر دنیاوی اسباب میں سے) جو کچھ تمہارے ہاتھوں میں ہے اس پر اس چیز سے زیادہ اعتماد و بھروسہ نہ کرو جو اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں میں ہے) نیز زہد یہ ہے کہ تم اس وقت کہ جب کسی مصیبت میں مبتلا ہو تو طلب ثواب کی خاطر اس مصیبت کی طرف کہ جو اگر تمہارے لئے باقی رہے زیادہ رغبت رکھو۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کے ایک راوی) عمرو ابن واقد، منکر الحدیث میں۔"

تشریح: حقیقی زہد کیا ہے اور زاہد کسے کہتے ہیں؟ اس بات کو حضور ﷺ نے وضاحت کے ساتھ بیان فرمادیا ہے چنانچہ اس ارشاد گرامی کے مطابق دنیا سے زہد اختیار کرنا اس چیز کا نام ہرگز نہیں ہے کہ محض دنیا کی نعمتوں اور لزتوں اور طبعی خواہشوں کو ترک کر دیا جائے جب کہ ایسا کرنا گویا ان چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لینا ہے جن کو خدا نے حلال کیا ہے اور یہ بات نہ صرف یہ کہ حقیقی زہد و تقویٰ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی بلکہ بذات خود ممنوع ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبَاتِ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ ان پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ کرو جن کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے علاوہ ازیں حضور ﷺ سے یہ ثابت ہی ہے کہ آپ ﷺ نے مرغوب ولذیذ چیزوں اور خدا کی اتاری ہوئی دنیاوی نعمتوں سے اجتناب نہیں کیا بلکہ جو چیز حاصل ہوئی اس سے فائدہ اٹھایا اور ظاہر ہے کہ حضور ﷺ سے زیادہ زہد و تقویٰ کس سے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جو نام نہاد صوفی اور جاہل محض ترک

لذات کو زہد و تقویٰ کا کمال سمجھتے ہوئے عمدہ و لذیذ کھانوں اور پھل و میوہ جات وغیرہ سے اجتناب کرتے ہیں اچھے اور نئے لباس اور اسی طرح کی دوسری نعمتوں کو ترک کرتے ہیں اور اس چیز کو زہد و تقویٰ" کا نام دیتے ہیں، وہ حقیقت میں یہ جانتے تک نہیں کہ زہد کس کو کہتے ہیں اور زاہد ہونے کا مطلب کیا ہے، اسی طرح زہد و تقویٰ یہ بھی نہیں ہے کہ خدا نے جو مال و دولت اور روپیہ پیسہ عطا کیا ہو اس کو یوں ہی ضائع کر دیا جائے یا اس کو غیر مصرف میں خرچ کر دیا جائے مثلاً یہ سوچ کر کہ میرے پاس جو مال و دولت ہے زہد و تقویٰ کی راہ میں رکاوٹ ہے اس کو لے جا کر دریا میں پھینک دے یا فقیرو، غنی، مستحق و غیر مستحق کی تمیز کے بغیر لوگوں میں بانٹ دے۔

حاصل یہ کہ نہ تو اس طرح کے ظاہری، زہد کا اعتبار ہے اور نہ یہ بات گوارا کرنے کے قابل ہے کہ دنیا کے ظاہری مال و اسباب سے اپنے ہاتھ کو بالکل خالی رکھے اور کوئی چیز کمانے اور اپنے پاس رکھنے کو تو زہد و تقویٰ کے خلاف جانے مگر معاشی ضرورت و احتیاج کے وقت دل غیر اللہ کی طرف متوجہ رکھے بلکہ اصل مدار و اعتبار قلب کے زہد پر ہے کہ دل ہر صورت میں صرف اللہ کی طرف متوجہ رہے اور اس میں دنیا اور دنیا کی کسی چیز کی کوئی محبت نہ ہو۔

"جو کچھ تمہارے ہاتھوں میں ہے " سے مراد یہ ہے کہ دنیاوی مال و اسباب، تدبیر و ہنر، کسب و عمل اور مادی اسباب و وسائل ہیں! اسی طرح "جو اللہ کے ہاتھوں میں ہے" سے مراد یہ ہے کہ وہ چیز اس کے ظاہری و باطنی خزانوں میں ہے۔ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا اصل اعتماد و بھروسہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر ہونا چاہئے۔ جو اس نے تمہیں رزق دینے اور تم تک اپنی نعمتیں پہنچانے کے بارے میں کیا ہے کہ وہ تمہیں اس طرح رزق دیتا ہے اور ایسی جگہ سے تم تک اپنی نعمتیں پہنچاتا ہے کہ تم اس کا گمان بھی نہیں کر سکتے۔! جو چیز تم اپنی سعی و تدبیر سے حاصل کرتے ہو اور جو مال وغیرہ تم اپنے کسب و عمل کے ذریعہ پیدا کرتے ہو اس کو یہ نہ سمجھو کہ واقعتا اس چیز کے حاصل ہونے اور اس مال کے ملنے کے صرف تمہاری تدبیر و سعی اور تمہارے کسب و عمل کا دخل ہے بلکہ یہ یقین رکھو کہ تم تک جو کچھ بھی آیا ہے وہ سب دراصل خدا ہی کی طرف سے اس کے وعدہ رزق کے مطابق آیا ہے، اگر خدا تمہیں کچھ بھی نہ دینا چاہتا تو تم لاکھ تدبیر و سعی کرتے اور کتنی ہی محنت و مشقت سے کماتے تمہارے ہاتھ میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ آ سکتی تھی پھر اس بات کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے تھا کہ تم نے ظاہری اسباب و وسائل کے ذریعہ جو کچھ کمایا اور حاصل کیا ہے اور تمہارے کسب و عمل کے نتیجہ میں جو بھی چیز تمہارے پاس آئی ہے کہ خواہ وہ جاہ و منصب ہو یا مال و زر، خواہ وہ صنعتی و تجارتی کاروبار ہو یا زمین و جائیداد ہو، بالفرض محال علم کیمیا ہی کیوں نہ ہو، یہ سب چیزیں ان نعمتوں اور فائدوں سے زیادہ دیرپا ہرگز نہیں ہو سکتیں جو خدا کے خزانہ قدرت میں موجود ہیں اور جو تمہیں ابھی نہیں ملی ہیں، کیونکہ تمہارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب تلف و فنا ہو جانے والا ہے اس کے برخلاف جو چیزیں اور نعمتیں خدا کے خزانوں میں ہیں، وہ سب ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

مَاعِنْدَ كُمْ يَنْفَدُ وَ مَاعِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ۔

"تمہارے پاس جو کچھ بھی ہے، سب فانی ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔"

حدیث کے آخری جزو، وَاَنْ تَكُوْنَ فِيْ ثواب المصيبة.....الخ کا مطلب یہ ہے کہ زہد یہ بھی ہے کہ تم دنیا کی راحت و چین اور آرام و آسائش کی طرف مائل و متوجہ نہ ہو اور دنیاوی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی خواہش و آرزو نہ رکھو بلکہ یہ جانو کہ دنیا کی نعمتیں اور لذتیں دراصل ان آفات اور بلاؤں میں مبتلا کرنے کا ذریعہ ہیں جو دینی اور اخروی، زندگی کو نقصان پہنچاتی ہیں! یہ اس لئے ضروری ہے تاکہ تمہارا دل دنیا کی طرف مائل نہ ہو اور تمہارا نفس دنیاوی چیزوں سے کوئی انس و تعلق نہ رکھے لہٰذا جب تم کسی دنیاوی مصیبت و آفت میں مبتلا ہو تو اس وقت مضطرب و پریشان حال اور شاکی ہونے کے بجائے اس مصیبت و آفت کو خوش آمدید کہو اور اس کے ذریعہ اجر و ثواب کے طلبگار بنو یہاں تک کہ اس وقت تمہارے دل میں اس مصیبت کی طرف اتنی زیادہ رغبت و اشتیاق ہو کہ جیسے وہ ابھی آئی نہیں ہے اور تم اس کے منتظر ہو۔

واضح رہے کہ ان الفاظ لو انہا بقیت میں لفظ بقیت دراصل لم یصب کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس جملہ کا واضح مفہوم جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ اجر و ثواب کی وجہ سے اس مصیبت کی طرف تمہاری رغبت، عدم مصیبت کی رغبت سے زیادہ ہونی چاہئے۔

بہر حال حضور ﷺ نے زہد کی مذکورہ دو صورتیں بیان کر کے یہ واضح فرمایا کہ کسی شخص میں ان دونوں صفات کا ہونا اس کے حق میں یہ کھلی ہوئی دلیل ہوگی کہ وہ زہد کے مقام پر فائز ہے دنیا اور دنیا کی چیزیں اس کی نظر میں کالعدم اور صرف آخرت اس کا مطلوب و مقصود ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ یوں تو بظاہر زہد کا مفہوم یہی ہے کہ دنیا سے بے رغبتی ہو، دنیاوی متاع و خواہشات جیسے مال و دولت اور جاہ و منصب وغیرہ کو ترک کیا جائے! لیکن حضور نے اشارہ فرمایا کہ زہد کا مرتبہ محض اس چیز سے کامل نہیں ہوتا تاوقتیکہ صبر و توکل کا مقام حاصل نہ ہو اور آخرت کی طرف رغبت و اشتیاق اس حد کو نہ پہنچ جائے کہ اس دنیا میں جو مصیبتیں اور بلائیں پہنچیں وہ آخرت کے اجر و ثواب کی تمنا میں محبوب و پسندیدہ بن جائیں اور ان کا پہنچنا، ان کے نہ پہنچنے سے زیادہ مرغوب ہو! اگر یہ مقام حاصل ہو جائے تو سمجھنا چاہئے کہ زہد کی صفت پوری طرح پیدا ہو گئی ہے، ورنہ بصورت دیگر (محض مال و دولت کو ترک کرنا اور دنیاوی لذتوں اور نعمتوں سے اجتناب کرنا) گویا اپنے مال کو ضائع کرنا اور حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لینا ہے۔

تمام تر نفع و نقصان پہنچانے والا اللہ ہے

⑧ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كُنْتُ خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ يَا غُلَامُ اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ وَاِذَا سَاَلْتَ فَاسْئَلِ اللّٰهَ وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰى اَنْ يَّنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ وَلَوِ اجْتَمَعُوْا عَلٰى اَنْ يَّضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ۔ (رواہ احمد والترمذی)

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن (سفر کے دوران) میں رسول کریم ﷺ کی سواری پر آپ ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا کہ آپ ﷺ نے (مجھے مخاطب کر کے) فرمایا! لڑکے! اللہ تعالیٰ کے تمام احکام (امر و نہی) کا خیال رکھو، اللہ تعالیٰ تمہارا خیال رکھے گا (اگر تم اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری کرتے ہوئے ان چیزوں پر عمل کرو گے جن پر عمل کرنے کا اسؓ نے حکم دیا ہے اور ان چیزوں سے اجتناب کرو گے جن سے اجتناب کرنے کا اس نے حکم دیا، نیز تم ہر وقت اور ہر معاملہ میں اسی کی رضا و خوشنودی کے طالب رہو گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ بھی تمہارا خیال رکھے گا بایں طور کہ تمہیں دنیا میں بھی ہر طرح کی آفات اور مصیبتوں سے بچائے گا اور آخرت میں بھی ہر عذاب و سختی سے محفوظ رکھے گا، جیسا کہ فرمایا گیا ہے و من کان للہ کان اللہ لہٗ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کا ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کا ہو جاتا ہے) اللہ تعالیٰ کے حق کا خیال رکھو گے تو تم اللہ تعالیٰ کو اپنے ساتھ پاؤ گے (یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی کو ہر لمحہ یاد رکھو گے، اس کے نظام قدرت میں غور و فکر کرو گے اور ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہو گے تو تم اس کی بے پایاں رحمتوں اور اس کے انعامات کو اپنے سامنے پاؤ گے) جب تم سوال کا ارادہ کرو تو صرف اللہ تعالیٰ کے آگے دست سوال دراز کرو، جب تم (دنیا و آخرت کے کسی بھی معاملہ میں) مدد چاہو تو صرف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو۔ اور یہ جان لو کہ۔ اگر تمام مخلوق (کہ خواہ عوام ہوں یا خواص، انبیاء ہوں یا اولیاء اور ائمہ دین ہوں یا سلاطین دنیا) مل کر بھی تمہیں نفع پہنچانا چاہیں (یعنی اگر بفرض محال یہ ساری مخلوق اس بات پر اتفاق کر لے کہ وہ سب مل کر تمہیں کسی دنیاوی یا اخروی معاملہ میں کوئی فائدہ پہنچادے تو ہرگز تمہیں نفع نہیں پہنچا سکے گی، علاوہ صرف اس چیز کے جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقدر میں لکھ دیا ہے اور اگر دنیا کے تمام لوگ مل کر بھی تمہیں کسی طرح کا کوئی نقصان و ضرر پہنچانا چاہیں تو وہ ہرگز تمہیں کوئی نقصان و ضرر نہیں پہنچا سکیں گے علاوہ صرف اس چیز کے جس کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقدر میں لکھ دیا

ہے، قلم اٹھا کر رکھ دیئے گئے اور صحیفے خشک ہو گئے۔" (احمدؒ و ترمذیؒ)

تشریح: "تو تم اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے پاؤ گے" کے معنی ایک یہ کہ جس کی طرف ترجمہ میں بھی بین القوسین اشارہ کیا گیا ہے، بعض حضرات کے مطابق یہ ہیں کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی یعنی اس کی عبادت وطاعت اور اس کے احکام کی فرمانبرداری پر پابندی کے ساتھ عمل پیرا ہو گے تو تمہیں اپنی حفاظت و پناہ میں رکھے گا اور تمہارے ساتھ معاملات میں مدد اور مشکل کشائی کرے گا اور تمہارے مقاصد و عزائم میں کامیابی عطا فرمائے گا (یا یہ کہ اس صورت میں تم اللہ تعالیٰ کی عنایت و مہربانی کو اپنے سامنے پاؤ گے کہ وہ تمہارے تمام معاملات میں تمہاری رعایت کرے گا اور طرح طرح سے تمہاری مدد واعانت کرے گا۔

ایک مطلب، جو بہت اونچے مقام کا ضامن ہے، یہ ہے کہ جب تم حق تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی، اس کی اطاعت و عبادت کی پابندی اور اس کی رضا و خوشنودی کی طلب میں مشغول و مستغرق رہو گے تو اس وقت تمہاری نگاہ معرفت اس کو اپنے سامنے اس طرح پالے گی کہ گویا وہ تمہارے سامنے موجود ہے اور تم مقام احسان اور کمال ایمان کے درمیان اس کا مشاہدہ کر رہے ہو اور بالکل ایسا محسوس کرو گے، جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو بایں حیثیت کہ اللہ کے سوا ہر چیز تمہاری نظر کے سامنے سے بالکل معدوم اور فنا ہو جائے گی، پس اس طرح تمہیں مراقبہ کی اصل کیفیت بھی حاصل ہوگی اور مقام مشاہدہ بھی نصیب ہوگا۔

"صرف اللہ کے آگے سوال دست دراز کرو" کیونکہ عطاء و بخشش کے تمام خزانے اسی کے پاس اور اسی کے دست قدرت میں ہیں اور دنیا و آخرت کی ہر وہ نعمت و راحت جو بندہ کو پہنچتی ہے اور ہر وہ بلا و سزا جس سے بندہ محفوظ رہتا ہے محض اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پہنچتی ہے یا دفع ہوتی ہے، پھر اس کی رحمت، صرف رحمت ہے نہ کہ اس میں کسی غرض کی آمیزش ہے اور نہ کسی علت و سبب کا دخل، نیز وہ جواد مطلق اور ایسا غنی ہے کہ نہ اس کے یہاں کسی چیز کی کمی ہے اور نہ وہ کبھی محتاج ہوتا ہے لہٰذا صرف وہی ذات اس لائق ہے کہ اپنی ہر امید اس سے وابستہ کی جائے اس کے عذاب کے علاوہ اور کسی سے خوف نہ کھایا جائے، اپنی ہر مشکل میں اور ہر مہم میں صرف اسی کے حضور مدد کی التجا کی جائے اور تمام معالات میں صرف اسی پر اعتماد کیا جائے۔ اسی لئے حضور ﷺ نے حکم دیا کہ جو کچھ بھی مانگنا ہو صرف خدا سے مانگو، اس کے علاوہ کسی اور کے آگے دست سوال دراز نہ کرو، کیونکہ کوئی اور، دینے یا نہ دینے اور نفع پہنچانے یا نقصان دور کرنے پر قادر ہی نہیں ہے، جو ذات خود اپنے کو نفع پہنچانے، یا اپنے نقصان کو دور کرنے اور اپنی موت و حیات کی مالک نہیں ہے وہ کسی دوسرے کو کیا نفع پہنچا سکتی ہے اور کیا نقصان سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ اسی طرح مذکورہ حکم میں اس طرف بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اپنی کسی بھی حالت میں اور کسی بھی وقت اللہ تعالیٰ کے آگے ہاتھ پھیلانے سے باز نہیں رہنا چاہئے کیونکہ ایک حدیث میں وضاحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا، اس پر اللہ تعالیٰ غضب ناک ہوتا ہے، علاوہ ازیں اپنے خالق کے آگے پھیلانا در حقیقت اس کے حضور اپنی عاجزی و بے کسی اور محتاجگی کا اظہار کرنا ہے جو عبودیت کی شان ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

اللّٰہ یغضب ان ترکت سؤالہ و ابناء آدم حین یسأل یغضب

اللہ تعالیٰ تو اس وقت خفا ہوتا ہے جب تم اس سے سوال نہ کرو، اور آدم کے بیٹے اس وقت خفا ہوتے ہیں جب کہ کوئی ان سے سوال کرے۔

"اور اگر تمام مخلوق مل کر تمہیں نفع پہنچانا چاہے..... الخ" کا مطلب یہ ہے کہ ہر نفع نقصان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جانو اور ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کرو، کیونکہ وہی نفع پہنچانے والا بھی ہے اور نقصان پہنچانے والا بھی، اور وہی دینے والا ہے اور وہی نہ دینے والا بھی! کسی ایک فرد بشر کا تو سوال ہی کیا ہے، اگر تمام روئے زمین کی ساری مخلوق مل کر بھی خدا کی مرضی و حکم کے خلاف کسی شخص کو کوئی نفع یا کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ اس شخص کو وہ نفع یا نقصان پہنچ جائے۔ الٰہیات کی بعض کتابوں میں بیان کیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ۔ "قسم ہے اپنی عزت و جلال کی" یقیناً میں اس شخص سے انقطاع کر لیتا ہوں جو میرے علاوہ کسی اور سے اپنی امید وابستہ کرتا ہے اور لوگوں کی نظر میں اس کو ذلت کی پوشاک پہنا دیتا ہوں، یعنی لوگوں کے سامنے اس کو ذلیل و خوار کر دیتا ہوں، اس کو

اپنے قرب سے محروم کر دیتا ہوں اور اپنے وصل سے دور کر دیتا ہوں، پس یقینی بات یہ ہے کہ میں اس کو حیرانی و پریشانی اور تفکرات کے اندھیروں میں پھینک دیتا ہوں! کیا وہ شخص اپنی مشکلات اور پریشانیوں کے وقت میرے علاوہ کسی اور سے امید رکھتا ہے جب کہ پریشانیاں اور مشکلات میرے ہاتھ میں ہیں؟ میں الحی القیوم ہوں! وہ شخص فکر و پریشانی کے عالم میں دوسروں کے دروازوں کو کھٹکھٹاتا پھرتا ہے، جب کہ تمام دروازوں کی کنجیاں میرے ہاتھ میں ہیں اور دروازے بند ہیں؟ میرا دروازہ ہر اس شخص کے لئے کھلا ہوا ہے جو میری طرف آئے اور مجھ سے دعا مانگے۔

"قلم اٹھا کر رکھ دیئے ہیں" سے مراد یہ ہے کہ جو احکام صادر ہوتے تھے سب لکھے جا چکے ہیں! اسی طرح "اور صحیفے خشک ہو گئے" سے مراد یہ ہے کہ قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے اور جس کے حق میں جو کچھ پیش آنا ہے وہ سب تقدیر کی کتاب میں لکھا جا چکا ہے اور وہ کتاب خشک ہو چکی ہے کہ اب اس پر قلم نہیں چلے اور جو کچھ لکھ دیا گیا ہے اس کے بعد اب کچھ نہیں لکھا جائے گا۔ حاصل یہ کہ اس دنیا میں جو بھی آتا ہے اور قیامت تک جو بھی آئے گا اس کی تقدیر و قسمت کے فیصلے لوح و محفوظ میں لکھے جا چکے ہیں، اور اس کام سے فراغت بھی ہو چکی ہے کہ اب کسی کے حق میں کچھ نہیں لکھا جائے گا۔ پس ہر شخص کی تقدیر و قسمت کے بہت پہلے لکھے جانے کو "قلم اٹھا کر رکھ دینے، اور صحیفوں کے خشک ہو جانے۔" سے تعبیر کیا ہے اور اس میں مشابہت کا پہلو یہ ہے کہ جس طرح کوئی کاتب جب کتاب کو مکمل لکھ کر فارغ ہو جاتا ہے تو قلم اٹھا کر رکھ دیتا ہے اور کتاب کو بند کر دیتا ہے اسی طرح کاتب تقدیر بہت پہلے ہی مخلوق کی تقدیریں لکھ کر فارغ ہو چکا ہے اور وہ صحیفہ کہ جس میں تقدیریں لکھی ہوئی ہیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لپیٹ دیا گیا ہے، اس میں اب کوئی تغیر و تبدل اور کوئی کمی بیشی ممکن نہیں ہے! اس کتاب کی ابتداء میں یہ حدیث گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس چیز کو پیدا کیا وہ قلم تھا پھر اس سے فرمایا کہ لکھو! قلم نے کہا کہ کیا لکھوں؟ فرمایا۔ "تقدیر لکھو" چنانچہ قلم نے وہ سب کچھ لکھ دیا جو اب تک وقوع پذیر ہو چکا ہے اور جو قیامت تک وقوع پذیر ہوگا۔ "اگر یہاں یہ اشکال پیدا ہو کہ یہ روایت کہ (قلم اٹھا کر رکھ دیئے گئے اور صحیفے خشک ہو گئے) قرآن کریم کی اس آیت یمحو اللہ مایشآء کے منافی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ محو و اثبات بھی دراصل انہی چیزوں میں سے ہے جو مقدر ہو چکی ہیں اور جن کو لکھنے کے بعد قلم رکھ دیئے گئے اور یہ صحیفے خشک ہو گئے کیونکہ قضا (یعنی وہ کلی احکام و فیصلے جو ازل سے اللہ تعالیٰ نے صادر فرما دیئے تھے) کی دو قسمیں ہیں ایک تو قضائے مبرم (کہ جو اٹل ہے اور جس میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں) اور دوسرے قضائے معلق (کہ جو اٹل نہیں ہے اور جس میں تغیر و تبدل ممکن ہے) علاوہ ازیں اس محو و اثبات کا تعلق لوح محفوظ، اور اللہ تعالیٰ کے علم سے ہے، یعنی یہ پہلے ہی سے لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے کہ فلاں چیز کو اس طرح مٹایا یا باقی رکھا جائے گا اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے پس اسی مفہوم کو اللہ تعالیٰ کی محو و اثبات کی نسبت کر کے بیان کیا گیا ہے جو در حقیقت مقدر امور میں "نہ تغیر کہلائے گا نہ تبدل۔"

اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس اللہ کے پاس دو کتابیں ہیں، ایک تو لوح محفوظ ہے کہ اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا اور دوسری کتاب وہ ہے جس میں فرشتے بندوں کے اعمال لکھتے ہیں اور محو و اثبات کا تعلق اسی کتاب سے ہے۔

بہر حال اس ارشاد گرامی میں یہ ترغیب ہے کہ بندہ کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل و اعتماد کرے رضائے مولیٰ پر راضی رہے اور اپنی تدبیر و سعی اور ذاتی قوت و طاقت کو حقیقی مؤثر ہرگز نہ جانے کیونکہ پیش آنے والی کوئی بھی چیز کہ خواہ وہ سعادت و مسرت ہو یا شقاوت و کلفت، تنگی و سختی ہو یا فراخی و وسعت، خوشحالی ہو یا بد حالی، نفع ہو یا نقصان، اور موت ہو یا حیات۔ ایسی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم و فیصلہ سے باہر اور اس قضا و قدر الٰہی کے مطابق نہ ہو جس کو کاتب تقدیر نے زمین و آسمان کی پیدائش سے بھی پچاس ہزار سال پہلے لکھ دیا ہے اور جس چیز کا وقوع پذیر ہونا لکھا جا چکا ہے وہ ہر حالت میں اور ہر صورت میں وقوع پذیر ہو کر رہے گی اس کو نہ انسانی حرکت و سکون کا نظام روک سکتا ہے اور نہ تدبیر و سعی! پس خواہ خوشی کی حالت پیش آئے یا ضرر و تکلیف کی، بہر صورت شکر ادا کرنا لازم ہے نیز اس بات کو اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ بندہ اپنے دشمن و مخالف، اپنی تکلیف و مصیبت اور ضرر و نقصان کے خلاف اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کا اسی

صورت میں مستحق ہوتا ہے جب کہ وہ ان چیزوں کی وجہ سے پیش آنے والے رنج والم پر صبر کرے اور کسی بھی حالت میں اپنی تقدیر و حالت کا شکوہ نہ کرے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنی کتاب "فتوح الغیب" میں بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ ہر مؤمن کے لئے لازم ہے کہ وہ اس حدیث کو اپنے دل کا آئینہ قرار دے اور اپنی تمام حرکات و سکنات میں اس کے مطابق عمل کرے، تاکہ دنیا و آخرت میں سالم و محفوظ رہے اور دونوں جہان میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب عزت و سرفرازی سے نوازا جائے بعض روایات میں ان الفاظ تجدہ تجاھک کے بعد یہ عبارت بھی نقل کی گئی ہے۔

تَعْرِفْ اِلَى اللّٰهِ فِي الرَّخَآءِ يَعْرِفُكَ فِي الشَّدَائِدِ. فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰهِ بِالرِّضَاءِ فِي الْيَقِيْنِ فَافْعَلْ فَاِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَاِنَّ فِي الصَّبْرِ عَلٰى مَاتَكْرَهُ خَيْرًا كَثِيْرًا وَاعْلَمْ اَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ وَالْفَرَجَ مَعَ الْكَرْبِ وَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا وَلَنْ يَغْلِبَ عُسْرٌ يُسْرَيْنِ۔

یعنی خوشحالی و شادمانی کی حالت میں نعمت شناسی اور طاعت حق کے ذریعہ) اللہ تعالیٰ کو پہچانو یعنی اس کی یاد سے غافل نہ ہو اور اس کی شکر گزاری کرتے رہو۔ اگر ایسا کرو گے تو اس کے بدلے میں یقیناً اللہ تعالیٰ بھی تمہیں تنگی و سختی کی حالت میں پہچانے گا، یعنی وہ تمہیں اس تنگی و سختی سے نمٹنے کی طاقت و قوت، اس سے گلو خلاصی کا راستہ اور حاجت براری کی نعمت عطا فرمائے گا (پس اگر تم یقین کے مرتبہ پر رضا و خوشی کے ساتھ خدا کی خاطر کوئی کام کر سکتے ہو تو اس کام کو یقیناً کرو (کیونکہ بلاشبہ وہ بہت بڑا کام ہے) اور اگر تم کوئی ایسا کام نہ کر سکو (اور نعمت کی شکر گزاری کا حق پوری طرح ادا نہ کر سکو) (تو جانو کہ) آفات و مصائب اور طبیعت کے خلاف پیش آنے والے امور پر صبر کرنا بھی نیکی و بھلائی اور بہت فضیلت و ثواب کا ضامن ہے (یعنی اصل چیز تو ہر حالت میں خواہ تنگی و سختی ہو، یا وسعت و خوشحالی اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی چیز پیش آتی ہے وہ یقیناً نعمت ہی ہوتی ہے اور خواہ ظاہر خواہ باطن کے اعتبار سے اس کے لطف کرم ہی کی ضامن ہوتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص شکر گزاری کا حق پوری طرح ادا نہ کر سکے تو پیش آنے والی تنگی و سختی پر صبر کرنا چاہئے کیونکہ یہ بھی ایک بڑی فضیلت رکھتا ہے) اور جان لو کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے جب کہ وہ اطاعت حق اور ترک معصیت پر صابر اور ثابت قدم رہے اور وسعت و کشادگی در اصل رنج الم کے ساتھ ہے (یعنی ہر تنگی و سختی کے بعد وسعت و کشادگی آتی ہے، اور رنج و غم کے بعد راحت و شادمانی کا دروازہ کھلتا ہے) اور بے شک عسرت و سختی کے ساتھ خوش حالی و آسانی بھی ہے (یعنی جب کسی آدمی پر سختی و تنگی آتی ہے تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ خوش حالی و آسانی بھی عطا فرماتا ہے) اور ایک سختی دو آسانیوں پر غالب نہیں ہو سکتی (یعنی اگر انسان کسی تنگی و سختی میں مبتلا ہو تو اس کو سمجھنا چاہئے کہ اس کے عوض دو آسانیاں پائے گا، ایک تو اسی دنیا میں کہ اللہ تعالیٰ ہر سختی کے بعد آسانی پیدا کرتا ہے اور دوسری آسانی آخرت میں بصورت اجر و ثواب حاصل ہوگی جیسا کہ مسلمانوں کی تاریخ سے ثابت ہے جب کہ وہ دنیا میں تنگی و سختی اور مصائب و آلام میں مبتلا ہوئے اور انہوں نے صبر و عزیمت کے ساتھ ان سخت حالات کو برداشت کیا تو اس کے بعد ان کو پہلے تو اس دنیا میں قدرتی مدد و نصرت کے ذریعہ فتح و کامرانی اور عزت و حشمت اور ترفہ و خوشحالی کی نعمت ملی اور پھر انہیں آخرت میں وہاں جنت کی قیمتی راحتیں، بلند مراتب و درجات، اور دیدار مولیٰ کی نعمت عظمیٰ حاصل ہوگی۔

انسان کی نیک بختی اور بد بختی

(۹) وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ سَعَادَةِ ابْنِ اٰدَمَ رِضَاهُ بِمَا قَضَى اللّٰهُ لَهٗ وَمِنْ شِقَاوَةِ ابْنِ اٰدَمَ تَرْكُهٗ اسْتِخَارَةَ اللّٰهِ وَمِنْ شِقَاوَةِ ابْنِ اٰدَمَ سَخَطُهٗ بِمَا قَضَى اللّٰهُ لَهٗ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" ابن آدم (انسان) کی نیک بختی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ اس پر راضی رہے اور ابن آدم کی بدبختی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے خیرو بھلائی کو مانگنا چھوڑ دے، نیز ابن آدم کی بدبختی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس کے مقدر میں لکھ دیا ہے وہ اس سے ناخوش و ناراض ہو

اس روایت کو احمدؒ و ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: حدیث کے پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی شقاوت و بھلائی اور اس کی نیک بختی کی علامت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے خیرو بھلائی مانگے اس کے آگے دست سوال دراز کرے اور اس کی بارگاہ کبریائی میں اپنی عرض و مناجات پیش کرے اور پھر اپنی تقدیر و قسمت پر بہر صورت راضی رہے اور یہ یقین رکھے کہ میرے ساتھ جو کچھ بھی پیش آیا ہے، یا جو کچھ بھی پیش آنے والا ہے وہ سب خدا کے حکم و فیصلہ کے مطابق ہے جو اس نے میرے مقدر میں لکھ دیا ہے اور جو ہر اعتبار سے میرے لئے بہتر ہے۔ اگرچہ خدا سے خیرو بھلائی مانگنے کی بات انسان کی نیک بختی کے ضمن میں نقل نہیں کی گئی ہے، لیکن بعد کی عبارت کو، کہ جس میں انسان کی بدبختی کا ذکر کیا گیا ہے مدنظر رکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ مراد یہی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے خیرو بھلائی مانگنے سے اجتناب کرنے سے انسان کی بدبختی قرار دینا اس امر کو واضح کرتا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ ہر لمحہ اپنی بھلائی اور اپنی بہتری کے لئے خدا کی طرف متوجہ اور اس سے ہمیشہ خیر کا طلب گار رہے۔

نیز جب آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ ابن آدم کو چاہئے کہ وہ ہر صورت میں قضاو قدر الٰہی پر راضی رہے۔ تو اس سے یہ وہم پیدا ہو سکتا ہے کہ گناہ کے علاوہ اور خلاف شریعت امور کا ارتکاب ہو جانے کی صورت میں بھی اس کو قسمت کا لکھا سمجھ کر اس پر راضی و مطمئن ہو جانا چاہئے، لہٰذا آپ ﷺ نے واضح فرمایا کہ انسان کو چاہئے کہ وہ ہر لمحہ اللہ تعالیٰ سے خیرو بھلائی ہی کا طالب رہے تاکہ وہ پاک ذات اس کو صرف خیرو بھلائی کی راہ پر لے جائے اور اس کو صرف پسندیدہ امور اختیار کرنے کی توفیق عطا فرماتا رہے، اور برائی کی راہ اور خلاف شریعت امور سے اس کی حفاظت کرتا رہے۔

واضح رہے کہ ہر صورت میں اور ہر حالت میں قضاو قدر الٰہی پر راضی ہونا بہت بڑی بات ہے اور اس مقام کا نام "افخم" یعنی مرتبہ عظمٰی ہے۔

یہ بات بتا دینا بھی ضروری ہے کہ قضاو قدر الٰہی پر راضی ہونے کو، کہ وہ اپنی تقدیر و قسمت کے خلاف ناراضگی و غضب ناکی کو ترک کرتا ہے، انسان کی سعادت و نیکبختی قرار دینا دو چیزوں کی وجہ سے ہے، ایک تو یہ کہ جو شخص قضائے الٰہی پر راضی رہتا ہے، اس کو سکون قلب، ذہنی فراغت و اطمینان، اور خاطر جمعی کی دولت نصیب ہو جاتی ہے اور یہ چیز ایسی ہے کہ اس کی وجہ سے انسان اپنے معاملات و کاروبار اور خاص طور پر حق تعالیٰ کی اطاعت و عبادت میں نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ مشغول رہتا ہے، چنانچہ جو شخص تقدیر پر اعتقاد نہیں رکھتا یا قسمت کے لکھے پر راضی نہیں ہوتا وہ ذرا ذرا سی مصیبت اور حادثات پر متفکر اور پراگندہ خاطر رہتا ہے، اور یہ ادھیڑبن اس کو اپنے مقاصد و معاملات اور طاعات و عبادات میں دل و دماغ کے سکون و اطمینان سے محروم رکھتی ہے کہ یہ مصیبت کیوں آگئی، فلاں حادثہ کیسے رونما ہو گیا اور یہ بات اس طرح کیوں نہ ہو گئی؟

دوسرے یہ کہ یہ چیز بندہ کو اس سبب سے اللہ تعالیٰ کے غضب و غصہ سے بچاتی ہے کہ وہ خدا کی لکھی تقدیر کے خلاف اپنی ناراضگی اور اپنے غصہ کا اظہار نہیں کرتا۔ اور تقدیر کے خلاف انسان کی ناراضگی و غصہ یہ ہے کہ وہ اس بات کا ذکر کرے اور اس چیز کو اپنے حق میں بہتر قرار دے، جس کو اللہ نے اس کے مقدر میں نہیں لکھا ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز خدا نے اس کے مقدر میں لکھ دی ہے وہ یقینی طور پر اس چیز سے بہتر اور اولیٰ ہے جس کا اچھا اور برا ہونا سرے سے یقینی ہی نہیں ہے۔

استخارہ یعنی اللہ تعالیٰ سے خیرو بھلائی طلب کرنے کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے تمام معاملات اور تمام امور میں اللہ تعالیٰ سے بہتری

اور اچھائی طلب کی جائے بلکہ یہ یقین واعتقاد رکھے کہ یہ انسان یہ جانتا ہی نہیں کہ اس کے حق میں کونسی چیز اچھی ہے اور کون چیز بری، یہ صرف خدا ہے جو اپنے بندوں کے حق میں اچھی اور بری چیز کو جانتا ہے، چنانچہ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ انسان کسی چیز کو اپنے حق میں بہتر جانتا ہے مگر حقیقت میں وہ چیز اس کے حق میں بری ہوتی ہے، یا کسی کی چیز کو اپنے لئے برا سمجھتا ہے مگر حقیقت میں وہ چیز اس کے حق میں اچھی ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔

عَسٰی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔

"یہ بالکل بعید نہیں ہے کہ تم کسی چیز کو (اپنے حق میں) بری سمجھو مگر حقیقت میں) وہ تمہارے لئے اچھی ہو، اور یہ بھی بعید نہیں ہے کہ کسی چیز کو تم (اپنے حق میں) اچھی سمجھو مگر (حقیقت میں وہ تمہارے لئے بری ہو، یہ صرف اللہ ہی جانتا ہے تم نہیں جانتے (کہ تمہارے حق میں کونسی چیز اچھی ہے اور کونسی چیز بری۔"

جب یہ یقین واعتقاد پختہ ہو جائے تو پھر اس یقین واعتقاد کے ذریعہ آگے کا درجہ اختیار کرے کہ اس دنیا میں اور ہماری زندگی میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے وہ سب اللہ کی طرف سے اور اس کے حکم وفیصلہ کے مطابق ہے اور جو بھی چیز اللہ کے حکم وفیصلہ کے مطابق ہوتی ہے وہ حقیقت اور انجام کے اعتبار سے خیر وبھلائی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی اس لئے وارد ہوا ہے کہ۔

الخیر بیدیک والشر لیس الیک (اے رب) خیر وبھلائی تیرے ہاتھ میں ہے اور برائی تیری طرف سے منسوب نہیں کی جاسکتی۔"

اور پھر یہ مستحب ہے کہ اگر کوئی اہم دینی یا دنیوی معاملہ درپیش ہو تو اس کے متعلق ذی علم اصحاب رائے اور مخلصین سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد استخارہ کیا جائے یعنی کارساز حقیقی اللہ تعالیٰ کی طرف حضور قلب کے ساتھ متوجہ ہو کر خیر وبھلائی کی دعا مانگی جائے، استخارہ میں کم سے کم چیز یہ ہے کہ یوں دعا مانگی جائے۔

اَللّٰهُمَّ خِرْلِی وَاخْتَرْلِی فَلَا تَكِلْنِیْ اِلٰی اخْتِيَارِیْ۔

"اے اللہ میرے حق میں بہتر فرما، اور جو چیز میرے لئے بہتر ہو رہی ہے اختیار فرما، پس مجھے میرے اختیار کے سپرد نہ فرما۔"

اور استخارہ کا کامل طریقہ یہ ہے کہ پہلے دو رکعت نماز پڑھے اور پھر استخارہ کی وہ دعا پڑھے جو بطور "مسنون دعا" مشہور ہے اور اسی کتاب کے گزشتہ صفحات میں نقل بھی کی جاچکی ہے۔

طبرانیؒ نے اوسط میں حضرت انسؓ سے یہ مرفوع روایت نقل کی ہے کہ مَاخَابَ مَنِ اسْتَخَارَ وَلَانَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ وَلَاعَالَ مَنِ اقْتَصَدَ۔

یعنی وہ شخص نامراد نہیں ہو سکتا جس نے استخارہ کیا، وہ شخص نادم وشرمندہ نہیں ہو سکتا جس نے مشورہ کیا اور وہ شخص محتاج نہیں ہو سکتا جس نے میانہ روی اختیار کی۔

بعض حکماء نے فرمایا کہ۔ جس شخص کو چار چیزیں حاصل ہو گئیں وہ چار چیزوں سے محروم نہیں ہو سکتا، جس شخص کو شکر گزاری کا مرتبہ حاصل ہو وہ (نعمتوں میں) اضافہ وزیادتی سے محروم نہیں رہے گا، جس شخص کو توبہ کی توفیق نصیب ہوگی وہ قبولیت سے محروم نہیں رہے گا جس شخص نے استخارہ کا راستہ اختیار کیا وہ بہتری وبھلائی سے محروم نہیں رہے گا، جس شخص نے مشورہ حاصل کیا وہ صحیح بات تک پہنچنے سے محروم نہیں رہے گا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

خدا پر کامل اعتماد کا اثر

(۱۵) عَنْ جَابِرٍ اَنَّهٗ غَزَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قِبَلَ نَجْدٍ فَلَمَّا قَفَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَفَلَ مَعَهٗ

فَادْرَ كَتْهُمُ الْقَائِلَةُ فِيْ وَادٍ كَثِيْرِ الْعِضَاهِ فَنَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَفَرَّقَ النَّاسُ يَسْتَظِلُّوْنَ بِالشَّجَرِ فَنَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَحْتَ سَمُرَةٍ فَعَلَّقَ بِهَا سَيْفَهُ وَنِمْنَا نَوْمَةً فَإِذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْعُوْنَا وَإِذَا عِنْدَهُ أَعْرَابِيٌّ فَقَالَ إِنَّ هٰذَا اخْتَرَطَ عَلَيَّ سَيْفِي وَأَنَا نَائِمٌ فَاسْتَيْقَظْتُ وَهُوَ فِيْ يَدِهِ صَلْتًا قَالَ مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّيْ فَقُلْتُ اللّٰهُ ثَلٰثًا وَلَمْ يُعَاقِبْهُ وَجَلَسَ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةِ اَبِيْ بَكْرٍ الْاِسْمَاعِيْلِيِّ فِيْ صَحِيْحِهِ فَقَالَ مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّيْ قَالَ اللّٰهُ فَسَقَطَ السَّيْفُ مِنْ يَدِهِ فَاَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السَّيْفَ فَقَالَ مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّيْ فَقَالَ كُنْ خَيْرَ اٰخِذٍ فَقَالَ تَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ لَا وَلٰكِنِّيْ اُعَاهِدُكَ عَلٰى اَنْ لَّا اُقَاتِلَكَ وَلَا اَكُوْنَ مَعَ قَوْمٍ يُقَاتِلُوْنَكَ فَخَلّٰى سَبِيْلَهُ فَاَتٰى اَصْحَابَهُ فَقَالَ جِئْتُكُمْ مِنْ عِنْدِ خَيْرِ النَّاسِ هٰكَذَا فِيْ كِتَابِ الْحُمَيْدِيِّ وَفِي الرِّيَاضِ۔

"حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ اس جہاد میں شریک تھے جو نجد کی اطراف میں ہوا تھا اور جب رسول کریم ﷺ جہاد سے فارغ ہوئے اور واپس ہوئے تو جابرؓ بھی آپ ﷺ کے ساتھ ہی واپس ہوئے (اسی سفر کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک دن) صحابہؓ دوپہر کے وقت ایک ایسے جنگل میں پہنچے جس میں کیکر کے درخت زیادہ تھے، چنانچہ رسول کریم ﷺ (صحابہؓ کے ساتھ) وہیں اتر پڑے اور تمام لوگ درختوں کے سایہ کی تلاش میں ادھر ادھر پھیل گئے (یعنی ہر شخص ایک ایک درخت کے نیچے چلا گیا اور اس کے سایہ میں کچھ دیر استراحت کی خاطر لیٹ گیا) رسول کریم ﷺ بھی کیکر کے ایک بڑے درخت کے نیچے فروکش ہوگئے اور اپنی تلوار کو اس درخت کی ٹہنی میں لٹکا دیا (حضرت جابرؓ کہتے ہیں) کہ ہم لوگ تھوڑی سی نیند لینے کی خاطر سو چکے تھے کہ اچانک ہم نے سنا کہ رسول کریم ﷺ ہمیں آواز دے رہے ہیں چنانچہ ہم لوگ (اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر) آپ ﷺ کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آپ لیٹے ہوئے ہیں اور وہیں آپ ﷺ کے) پاس ایک دیہاتی کافر موجود ہے، آنحضرت ﷺ نے (ہمارے جمع ہونے پر) فرمایا کہ یہ دیہاتی اس وقت جب کہ میں سو رہا تھا مجھ پر میری تلوار سوت کر کھڑا ہو گیا، اور جب میری آنکھ کھل گئی تو میں نے دیکھا کہ میری ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں ہے، اس نے مجھ سے کہا کہ اب تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ میں نے فوراً جواب دیا کہ میرا خدا مجھے بچائے گا۔ حضور ﷺ نے یہ بات تین مرتبہ کہی اور اس دیہاتی کو کوئی سزا نہیں دی، پھر آپ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ (بخاری، مسلم) اور اس روایت میں کہ جس کو ابوبکر اسماعیلیؒ نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے یہ الفاظ ہیں کہ اس دیہاتی نے (آنحضرت ﷺ پر تلوار سوت کر) کہا کہ اب تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا "اللہ بچائے گا" (یہ سنتے ہی) دیہاتی کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی حضور ﷺ نے تلوار کو اٹھا لیا، اور فرمایا کہ (اگر میں تمہیں قتل کرنا چاہوں تو بتاؤ کہ) اب تمہیں کون مجھ سے بچائے گا؟ دیہاتی نے جواب دیا آپ ﷺ تو بھلائی کے ساتھ گرفت کرنے والے ہیں (یعنی آپ ﷺ کی شان سے تو مجھے یہ امید ہے کہ میرے لئے انتقامی کاروائی نہیں کی جائے گی اور آپ از راہ لطف و کرم مجھے معاف کر دیں گے) حضور ﷺ نے فرمایا کہ اچھا اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بلاشبہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ گویا آپ ﷺ نے اس سے یہ فرمایا کہ اگر تمہیں میرے اوپر اتنا زیادہ اعتماد ہے تو پھر یقیناً یہ بات بھی اچھی طرح سمجھتے ہو گے کہ میری دعوت اسلام بالکل برحق اور مبنی بر صداقت ہے، اس صورت میں تو تمہیں چاہئے کہ کلمہ پڑھ لو اور مسلمان ہو جاؤ (دیہاتی نے کہا کہ مسلمان تو نہیں ہو سکتا البتہ آپ ﷺ سے یہ عہد ضرور کرتا ہوں کہ نہ میں خود آپ ﷺ سے لڑوں گا اور نہ ان لوگوں کا ساتھ دوں گا جو آپ ﷺ سے لڑیں گے۔ بہر حال آپ ﷺ نے اس دیہاتی کو چھوڑ دیا اور جب وہ دیہاتی اپنی قوم میں آیا تو کہنے لگا کہ میں تمہارے درمیان ایک ایسے شخص کے پاس سے آرہا ہوں، جو سب سے بہتر انسان ہے...... بخاری و مسلم کی مذکورہ بالا روایت انہی الفاظ کے اضافہ کے ساتھ کتاب حمیدی اور امام محی الدین نوری کی تصنیف "ریاض الصالحین" میں بھی منقول ہے۔"

تشریح: نجد لغت میں تو زمین کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو عام سطح سے بلند ہو، اور ویسے یہ جزیرۃ العرب کے ایک خاص علاقہ کا نام ہے

اور چونکہ یہ علاقہ ایک سطح مرتفع ہے اس لئے اس کو نجد کا نام دیا گیا ہے! ازمانہ قدیم میں "نجد ایک بہت مختصر علاقہ پر مشتمل تھا مگر موجودہ جغرافیہ میں جزیرۃ العرب کے سارے وسطی علاقہ کو نجد کہا جاتا ہے، جس کا انتہائی طول تقریباً آٹھ سو میل.... اور انتہائی عرض تقریباً سو دو سو میل ہے، یہ شمال میں بادیۃ الشام کے جنوبی سرے سے شروع ہو کر جنوب میں وادی الدوارس یا الربع انحالی تک اور عرضا "احساء" سے حجاز تک پھیلا ہوا ہے۔

"عِضَاہ" اس میں "عضَہ" کی جمع ہے اور جس کا اطلاق ہر اس درخت پر ہوتا ہے جو کانٹے دار ہو، اور مجمع البحار میں لکھا ہے کہ "عِضَاہ" کیکر کے درخت کو کہتے ہیں اور جو درخت عِضَاہ سے بڑا ہو اسکو سَمُرہ کہا جاتا ہے۔"

تقویٰ و پرہیزگاری اور رزق

(۱۱) وَعَنْ اَبِی ذَرٍّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنِّی لَاَ عْلَمُ اٰیَۃً لَوْ اَخَذَ النَّاسُ بِھَا لَکَفَتْھُمْ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ۔ (رواہ احمد وابن ماجۃ والدارمی)

"اور حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بلاشبہ میں ایک ایسی آیت جانتا ہوں کہ اگر لوگ (محض) اسی آیت پر عمل کریں تو ان کے حق میں وہی ایک آیت کافی ہو جائے (اور ان کو دیگر وظائف واوراد کی ضرورت نہ رہے) وہ آیت یہ ہے وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ (الآیۃ) یعنی جو شخص خدا سے ڈرے تو خدا اس کے لئے دنیا اور آخرت کے غموں سے) نجات کا راستہ پیدا کر دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے (تعب و مشقت اور فکر و تردد کے بغیر) رزق دیتا ہے جہاں وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔"

(ابن ماجہؒ، دارمیؒ)

تشریح: پوری آیت کہ جس کی طرف حضور ﷺ نے اشارہ فرمایا، یوں ہے۔

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا۔

"اور جو شخص خدا سے ڈرے تو خدا اس کے لئے نجات کا راستہ پیدا کر دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جہاں سے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا اور جو شخص (اپنے امور و معاملات میں) خدا پر توکل و اعتماد کرے تو وہ دونوں جہاں میں اس کے لئے کافی ہے، بے شک اللہ تعالیٰ اپنی مراد کو پہنچنے والا ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے اندازہ مقرر کیا ہے۔"

پس وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ سے حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ تک میں تو اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کے لئے دنیا و آخرت کے اس کے ان تمام امور و معاملات میں کافی ہو جاتا ہے جن سے وہ ڈرتا ہے اور جو اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہوتے ہیں بایں طور کہ اس کو ایسی تمام چیزوں سے محفوظ و مامون رکھا جاتا ہے۔

اور وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ وہ شخص اگر اللہ تعالیٰ پر اعتماد و بھروسہ کر کے (دنیا و آخرت کی نعمتوں کا طلبگار و متلاشی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے بایں طور کہ اس کو وہ نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ (بے شک اللہ تعالیٰ اپنی مراد کو پہنچنے والا ہے) سے مراد یہ ہے کہ وہ قادر مطلق اپنے احکام اور فیصلوں کو جاری اور نافذ کرنے والا ہے، یعنی اس کو ہر طرح کا حکم و فیصلہ جاری کرنے کے کلی اختیار بھی حاصل ہے اور وہ اپنے ہر حکم و فیصلہ کو نافذ کرنے کی پوری طاقت و قدرت بھی رکھتا ہے، کیونکہ جب یہ جان لیا گیا کہ از قسم رزق اور اس کے مانند ہر چیز تقدیر الٰہی اور توفیق خداوندی ہی سے تعلق رکھتی ہے کہ انسان جس چیز کی بھی خواہش و طلب رکھتا ہے وہ اس کے حکم و فیصلہ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، تو اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا کہ انسان قضا و قدر کے آگے سر تسلیم خم رکھے اور اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر توکل و اعتماد کرے۔

رزق دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے

⑫ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اَقْرَاَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ اَنَا الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنِ۔ رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ۔

"اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے مجھ کو یہ آیت سکھائی اِنِّیْ اَنَا الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنِ یعنی (اے انسان جان لے کہ) بلاشبہ میں ہی روزی دینے والا ہوں (اور) غالب طاقت والا ہوں۔" (ابوداؤدؒ ترمذیؒ) اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: اِنِّیْ اَنَا الرَّزَّاقُ قرأت شاذہ ہے، قرأت مشہورہ کے مطابق اس آیت کے الفاظ اصل میں یوں ہیں اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنِ (بلاشبہ خدا ہی رزق دینے والا ہے اور غالب طاقت والا ہے) حاصل یہ کہ جب رزق دینے والا اور غالب طاقت رکھنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے تو پھر لازم ہے کہ اس کی ذات کے علاوہ اور کسی پر قطعاً بھروسہ نہ کیا جائے اور اپنے امور کا بہتر کارساز و وکیل، اس کے علاوہ اور کسی کو ہرگز نہ سمجھا جائے۔"

کسب و کمائی کو اصل رازق نہ سمجھو

⑬ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ اَخَوَانِ عَلٰی عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَکَانَ اَحَدُھُمَا یَاْتِی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالْاٰخَرُ یَحْتَرِفُ فَشَکَا الْمُحْتَرِفُ اَخَاہُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَعَلَّکَ تُرْزَقُ بِہٖ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ ھٰذَا حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں دو بھائی تھے جن میں سے ایک تو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں رہا کرتا تھا (کیونکہ اس کے اہل و عیال نہیں تھے، اور وہ حصول معاش کی ذمہ داریوں سے بے فکر ہو کر طاعت و عبادت اور دینی خدمات میں مشغول رہا کرتا تھا، اس وجہ سے اس کے اوقات کا اکثر حصہ "بارگاہ رسالت میں حاضر باشی کے ذریعہ حصول علم و معرفت میں صرف ہوتا تھا) اور دوسرا بھائی کوئی کام کرتا تھا (یعنی حصول معاش کے لئے کسی ہنر و پیشہ کے ذریعہ کماتا تھا اور دونوں بھائی ایک ساتھ کھاتے پیتے تھے) چنانچہ کمانے والے بھائی نے اپنے دوسرے بھائی کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے شکایت کی (یعنی میرا بھائی نہ تو میرے کام کاج میں ہاتھ بٹاتا ہے اور نہ خود الگ سے کوئی کام کر کے کماتا ہے، اور اس طرح اس کے کھانے پینے کا خرچ مجھے ہی برداشت کرنا پڑتا ہے) حضور ﷺ نے (اس کی یہ شکایت سن کر) فرمایا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہیں اسی کی برکت سے رزق دیا جاتا ہو۔" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح غریب ہے۔"

تشریح: حضور کے جواب کا مطلب یہ تھا کہ تم یہی کیوں سمجھتے ہو کہ تمہیں جو رزق ملتا ہے وہ حقیقت میں تمہارے کمانے کی وجہ سے ملتا ہے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ تم اپنے اس بھائی کے ساتھ جو ایثار کا معاملہ کرتے ہو، اور اس کی معاشی ضروریات کا بوجھ برداشت کر کے جس طرح اس کو فکر و غم سے دور رکھتے ہو اسی کی برکت کی وجہ سے تمہیں بھی رزق دیا جاتا ہو، پس اس صورت میں شکوہ و شکایت کرنے اور اس پر احسان رکھنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ علم و عمل اور دینی خدمات کی طرف متوجہ رہنے اور زاد عقبی کی تیاری کے لئے دنیاوی مشغولیات کو ترک کرنا جائز ہے۔ نیز یہ حدیث اس امر پر بھی دلالت کرتی ہے کہ فقراء اور خاص طور پر اپنے ضرورت مند اور غریب اعزا و اقرباء کی خبر گیری کرنا اور ان کی معاشی ضروریات کی کفالت کرنا، رزق میں وسعت و برکت کا باعث ہے۔

توکل کی ہدایت

⑭ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ قَلْبَ ابْنِ اٰدَمَ بِکُلِّ وَادٍ شُعْبَۃٌ فَمَنْ اَتْبَعَ قَلْبَہُ الشُّعَبَ کُلَّھَا لَمْ یُبَالِ اللّٰہُ بِاَیِّ وَادٍ اَھْلَکَہُ وَمَنْ تَوَکَّلَ عَلَی اللّٰہِ کَفَاہُ الشُّعَبَ۔ (رواہ ابن ماجہ)

"اور حضرت عمرو ابن عاص ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بلاشبہ انسان کے دل کے لئے ہر جنگل میں ایک شاخ اور ایک گوشہ ہے۔ (یعنی انسان کے دل اور اس کی جبلت میں رزق کے اسباب وذرائع اور اس کے حصول کے تعلق سے طرح طرح کی فکریں اور غم ہیں) پس جس شخص نے اپنے دل کو ان شاخوں اور گوشوں کی طرف متوجہ رکھا (یعنی اس نے اپنے دل کو ان تفکرات اور غموں میں مشغول ومنہمک رکھا اور پراگندہ خاطری کا شکار ہوا) تو اللہ تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں کہ اس کو کس جنگل میں ہلاک کرے (یعنی جب وہ شخص خدا پر توکل واعتماد سے بے پرواہ ہو کر ساری توجہ اپنی ذاتی تدبیر وسعی اور تگ ودو میں مشغول رکھتا ہے تو پھر خدا کو کیا پرواہ کہ وہ کس طرح ہلاکت وتباہی میں مبتلا ہوتا ہے، اس دنیا سے کس مشغولیت میں رخصت ہوتا ہے اور کس حالت میں موت اس کو آدبوچتی ہے) اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ پر توکل واعتماد کیا (اور اپنے تمام امور اس کے سپرد کر دئے) تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام کاموں کی درستی کے لئے کافی ہو جاتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی مدد ورحمت اس کو دل ودماغ کی پراگندگی وپریشانی، ضروریات کی تکمیل کے لئے ادہر ادہر بھٹکنے، اور گوناگوں جسمانی محنت ومشقت کے تعب وغم سے نجات دیتی ہے (ابن ماجہؒ)

خدا پر بھروسہ

⑮ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ، قَالَ رَبُّکُمْ عَزَّوَجَلَّ لَوْ اَنَّ عَبِیْدِیْ اَطَاعُوْنِیْ لَاَسْقَیْتُھُمُ الْمَطَرَ بِاللَّیْلِ وَاَطْلَعْتُ عَلَیْھِمُ الشَّمْسَ بِالنَّھَارِ وَلَمْ اُسْمِعْھُمْ صَوْتَ الرَّعْدِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بزرگ وبرتر تمہارا پروردگار فرماتا ہے کہ اگر میرے بندے میری فرمانبرداری کریں، (یعنی میرے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں، اور میری رضا وخوشنودی کے خلاف کوئی کام نہ کریں تو یقیناً میں ان پر رات میں تو بارش برساؤں (تاکہ وہ راحت وچین کی نیند سوئیں) اور دن کو ان پر دھوپ کی چادر پھیلاؤں (تاکہ وہ اپنے کام وکاج میں مشغول رہ سکیں (اور خواہ رات ہو خواہ دن) ان کو بادل گرجنے کی آواز نہ سناؤں (تاکہ نہ تو ان کو نیند اور ان کے آرام میں خلل پڑے اور نہ وہ ڈرنے اور گھبرانے کی وجہ سے اپنے کام کاج میں کسی رخنہ اور نقصان سے دوچار ہوں۔" (احمد)

صبر وتوکل سے متعلق ایک حیرت انگیز واقعہ

⑯ وَعَنْہُ قَالَ دَخَلَ رَجُلٌ عَلٰی اَھْلِہٖ فَلَمَّا رَاٰی مَا بِھِمْ مِنَ الْحَاجَۃِ خَرَجَ اِلَی الْبَرِیَّۃِ فَلَمَّا رَاَتِ امْرَاَتُہُ قَامَتْ اِلَی الرَّحٰی فَوَضَعَتْھَا وَاِلَی التَّنُّوْرِ فَسَجَرَتْہُ ثُمَّ قَالَتْ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا فَنَظَرَتْ فَاِذَا الْجَفْنَۃُ قَدِ امْتَلَاَتْ قَالَ وَذَھَبَتْ اِلَی التَّنُّوْرِ فَوَجَدَتْہُ مُمْتَلِئًا قَالَ فَرَجَعَ الزَّوْجُ قَالَ اَصَبْتُمْ بَعْدِیْ شَیْئًا قَالَتِ امْرَاَتُہُ نَعَمْ مِنْ رَّبِّنَا وَقَامَ اِلَی الرَّحٰی فَذُکِرَ ذٰلِکَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَمَا اِنَّہُ لَوْ لَمْ یَرْفَعْھَا لَمْ تَزَلْ تَدُوْرُ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ۔ (رواہ احمد)

"اور حضرت ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص (کا واقعہ ہے کہ وہ ایک دن، اپنے گھر والوں کے پاس آیا (یعنی کہیں باہر سے آکر گھر میں (داخل ہوا) تو اس نے گھر والوں پر محتاجگی اور فاقہ وفقر کے آثار دیکھے، وہ (یہ دیکھ کر اپنے خدا کے حضور اپنی حاجات پیش کرنے اور یکسوئی کے ساتھ اس کی بارگاہ میں عرض ومناجات کرنے کے لئے جنگل کی طرف چلا گیا، ادھر جب اس کی بیوی نے یہ دیکھا (کہ شوہر کے پاس کچھ نہیں ہے اور وہ شرم کی وجہ سے گھر سے باہر چلا گیا ہے) تو وہ اٹھی اور چکی کے پاس گئی، چکی کو اس نے اپنے آگے رکھا (یا اس نے چکی کے اوپر کا پاٹ

نیچے کے پاٹ پر رکھا، اور یا یہ معنی ہیں کہ اس نے اس امید میں چکی کو صاف کیا اور تیار کر کے رکھ دیا کہ شوہر باہر سے آئے گا تو کچھ لے کر آئے گا اس کو پیس کر روٹی پکالوں گی) پھر وہ تنور کے پاس گئی اور اس کو گرم کیا، اس کے بعد خدا سے یہ دعا کی۔ الٰہی! (ہم تیرے محتاج ہیں، تیرے غیر سے ہم نے اپنی امید منقطع کر لی ہے، تو خیر الرازقین ہے، اپنے پاس سے) ہمیں رزق عطا فرما۔" پھر جو اس نے نظر اٹھائی تو کیا دیکھتی ہے کہ چکی کا گرانڈ آٹے سے بھرا ہوا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد جب وہ آٹا (گوندکر) تنور کے پاس گئی (تاکہ اس میں روٹیاں لگائے۔ تو تنور کو روٹیوں سے بھرا ہوا پایا (یعنی خدا کی قدرت نے یہ کرشمہ دکھایا کہ خود بخود اس آٹے کی روٹیاں بن کر تنور میں جالگیں یا یہ کہ آٹا تو اپنی جگہ چکی کے گرانڈ میں رہا، اور تنور میں غیب سے روٹیاں نمودار ہوگئیں) راوی کہتے ہیں کہ کچھ دیر بعد جب خاوند (بارگاہ رب العزت میں عرض و مناجات اور دعا سے فارغ ہو کر) گھر آیا تو بیوی سے پوچھا کہ کیا میرے جانے کے بعد تمہیں (کہیں سے) کچھ (غلہ وغیرہ) مل گیا تھا (کہ تم نے یہ روٹیاں تیار کر رکھی ہیں؟ بیوی نے کہا کہ ہاں! یہ ہمیں خدا کی طرف سے ملا ہے (یعنی عام طریقہ کے مطابق کسی انسان نے ہمیں نہیں دیا ہے بلکہ یہ رزق محض غیب سے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے) خاوند نے یہ سنا تو اس کو بہت تعجب ہوا اور وہ) اٹھ کر چکی کے پاس گیا (اور چکی کو اٹھایا تاکہ اس کا کرشمہ دیکھے) پھر جب اس واقعہ کا ذکر نبی کریم ﷺ کے سامنے کیا گیا تو آپ ﷺ نے (پورا قصہ سن کر) فرمایا "جان لو" اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر وہ شخص اس چکی کو اٹھا نہ لیتا تو وہ چکی مسلسل قیامت کے دن تک گردش میں رہتی اور اس سے آٹا نکلتا رہتا۔" (احمد)

تشریح: مذکورہ واقعہ کی صورت میں خدا کی قدرت کا جو کرشمہ ظاہر ہوا، وہ درحقیقت فقر و فاقہ پر صبر اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل اعتماد و توکل کرنے کا نتیجہ تھا! واضح رہے کہ یہ واقعہ کسی پچھلی امت کے کسی شخص کا نہیں ہے بلکہ اُمّت محمدی کے ایک فرد کا ہی ہے اور آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں پیش آیا تھا۔

رزق انسان کی تلاش میں رہتا ہے

(۱۷) وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَآءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الرِّزْقَ لَیَطْلُبُ الْعَبْدَ کَمَا یَطْلُبُہٗ اَجَلُہٗ۔ رَوَاہُ اَبُوْنُعَیْمٍ فِی الْحِلْیَۃِ۔

"اور حضرت ابو درداءؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رزق بندے کی اس طرح تلاش کرتا ہے جس طرح انسان کو اس کی موت ڈھونڈتی ہے۔" اس روایت کو ابو نعیم نے کتاب حلیہ میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ رزق اور موت دونوں کا پہنچنا ضروری ہے کہ جس طرح کہ اس بات کی کوئی حاجت نہیں ہوتی کہ کوئی شخص اپنی موت کو ڈھونڈے اور اس کو پائے بلکہ خود موت اس کے پاس ہر صورت میں اور یقینی طور پر آتی ہے، اسی طرح رزق کا معاملہ ہے کہ اس کو تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ جو کچھ مقدر میں ہوتا ہے وہ ہر صورت میں لازمی طور پر پہنچتا ہے، خواہ اس کو ڈھونڈا جائے یا نہ ڈھونڈا جائے۔ تاہم اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ڈھونڈنے کی صورت میں رزق نہیں ملتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حصول رزق کے لئے سعی و تلاش بھی تقدیر الٰہی اور نظام قدرت کے مطابق ہے البتہ جہاں تک قلبی اعتماد و بھروسہ کا تعلق ہے وہ صرف خدا کی ذات پر ہونا چاہئے نہ کہ سعی و تلاش پر! لہٰذا اس سلسلے میں صحیح راہ یہ ہے کہ اول انسان کو خدا پر توکل و اعتماد کرنا چاہئے اور یہ پختہ یقین رکھنا چاہئے کہ رزق کا ضامن اللہ تعالیٰ ہے۔ نیز اگر رزق ملنے میں کوئی رکاوٹ اور تاخیر ہو جائے تو اضطراب و بے چینی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے، پھر اس اعتقاد کے ساتھ اپنی ضرورت و حاجت اور ہمت و طاقت کے بقدر معتدل و مناسب طریقہ پر حصول معاش کی سعی و تلاش میں لگنا چاہئے کہ اصل رازق تو اللہ تعالیٰ ہے، لیکن یہ بھی طریقۂ عبودیت ہے کہ اپنا رزق حاصل کرنے کے لئے مناسب جدوجہد اور تلاش و سعی کی جائے۔

ملا علی قاری نے حدیث کے خاتمہ پر لکھا ہے کہ (یہی نہیں کہ جس طرح انسان کو اس کی موت کا پہنچنا یقینی ہے اسی طرح اس کے رزق کا بھی اس تک پہنچنا یقینی ہے) بلکہ انسان کو اس کا رزق اس کی موت سے بھی پہلے اور موت سے بھی جلدی پہنچتا ہے، کیونکہ جب کسی کی موت آتی ہے تو وہ اپنا رزق اس سے پہلے ہی پا چکا ہوتا ہے جس کو وہ اپنے مقدر میں لے کر اس دنیا میں آیا تھا، چنانچہ اگر غور کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے، نیز میرک ؒ نے منذری ؒ سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کو ابن ماجہ ؒ نے اپنی صحیح میں اور بزار نے بھی روایت کیا ہے، اور طبرانی ؒ نے بھی بہتر سند کے ساتھ اس کو نقل کیا ہے جس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اِنَّ الرِّزْقَ لَيَطْلُبُ الْعَبْدَ اَكْثَرَ مِمَّا يَطْلُبُهٗ اَجَلُهٗ اس سے بھی مذکورہ بالا بات کی تائید ہوتی ہے۔

ملا علی قاری ؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابو نعیم نے اپنی کتاب حلیہ میں بطریق مرفوع یہ بات بھی نقل کی ہے کہ لَوْ اَنَّ ابْنَ اٰدَمَ هَرَبَ مِنْ رِزْقِهٖ كَمَا يَهْرَبُ مِنَ الْمَوْتِ لَاَدْرَكَهٗ رِزْقُهٗ كَمَا يُدْرِكُهُ الْمَوْتُ (اگر انسان اپنے رزق سے بھی اس طرح بھاگے جس طرح وہ اپنی موت سے بھاگتا ہے تو یقیناً اس کا رزق بھی اس کو اسی طرح پالے جس طرح کہ اس کی موت اس کو پالیتی ہے۔

نبی کا لا مثال صبر

⑱ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْكِیْ نَبِيًّا مِنَ الْاَنْبِيَآءِ ضَرَبَهٗ قَوْمُهٗ فَاَدْمَوْهُ وَهُوَ يَمْسَحُ الدَّمَ عَنْ وَجْهِهٖ وَيَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن مسعودؓ نے بیان کیا کہ "گویا میں اس وقت بھی رسول کریم ﷺ کو دیکھ رہا ہوں کہ آپ ایک ایسے نبی کا قصہ بیان فرما رہے ہیں (اور اس کی صورت ہمیں بتا رہے ہیں) جن کو ان کی قوم نے مارا اور لہولہان کر دیا لیکن وہ نبی (بجائے اس کے کہ اپنی قوم کے تئیں بغض و نفرت میں مبتلا ہوتے، اور ان کے حق میں بد دعا کرتے، بلکہ صبر و تحمل کا دامن پکڑے ہوئے) اپنے چہرے سے خون پونچھتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے۔ اے اللہ میری قوم کو بخش دے یہ لوگ میری حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔" (بخاری ؒ و مسلم)

تشریح: "گویا میں اس وقت بھی دیکھ رہا ہوں" کے ذریعہ حضرت ابن مسعودؓ نے یہ واضح فرمایا کہ آنحضرت ﷺ کا مذکورہ قصہ بیان فرمانا مجھے اچھی طرح یاد ہے اور اس وقت بھی اس وقت کا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔

"میری قوم کو بخش دے۔" یعنی ان لوگوں سے اس معنی میں درگزر فرما کہ انہوں نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اور جو تکلیف پہنچائی ہے اس کی وجہ سے ان کو اس دنیا میں کسی عذاب میں مبتلا نہ کرنا اور ان کا نام و نشان نہ مٹا۔ یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ کفار کی بخشش و مغفرت کی دعا اس معنی میں ہرگز جائز نہیں ہے کہ ان کا شرک و کفر معاف ہو جائے اور اگر وہ اپنے کفر و شرک کے ساتھ مر جائیں تو عذاب آخرت میں مبتلا نہ ہوں۔

"یہ لوگ میری حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔" یہ الفاظ گویا ان نبی علیہ السلام کے کمال صبر و حلم اور حسن اخلاق و کردار کا مظہر ہیں کہ جو لوگ، ان کو سخت ترین تکلیف پہنچا رہے ہیں، جنہوں نے ان کو لہولہان کر رکھا ہے، اور جو لوگ اپنے نبی کو اذیت پہنچا کر سب سے بڑا گناہ کر رہے ہیں، انہی لوگوں کی طرف سے وہ نبی خدا کی بارگاہ میں یہ عذر بیان فرما رہے ہیں کہ ان لوگوں نے جو کچھ بھی کیا ہے محض اس وجہ سے کیا ہے کہ اللہ و رسول کے بارے میں ان کے دل و دماغ پر جہل کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جہل و نادانی کی وجہ سے کیا جانے والا گناہ اس گناہ کی بہ نسبت ہلکا ہوتا ہے جو علم و دانائی کے باوجود صادر ہو، اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ: وَيْلٌ لِّلْجَاهِلِ مَرَّةً وَّوَيْلٌ لِّلْعَالِمِ سَبْعَ مَرَّاتٍ "جاہل کے لئے ایک رسوائی و خرابی ہے اور عالم کے لئے سات رسوائیاں و خرابیاں ہیں۔

شیخ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ حدیث میں جن نبی علیہ السلام کا ذکر ہے وہ کون سے نبی علیہ السلام تھے اور ان کے ساتھ کیا قصہ پیش آیا تھا۔ لیکن بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ ان کی قوم کا یہ سلوک تھا کہ جب وہ ان لوگوں کو راہ ہدایت کی طرف بلاتے اور خدا کے حکم کی اتباع کی تلقین کرتے تو بدنصیب ان کو مارنے لگتے اور اس قدر مارتے کہ ان کا جسم لہولہان ہو جاتا، زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر پڑتے اور اسی حالت میں عرصہ تک زمین پر پڑے رہتے، پھر جب کچھ توانائی آتی تو اٹھ کھڑے ہوتے اور فریضۂ دعوت کی انجام دہی میں مشغول ہو جاتے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ان نبی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد خود اپنی ذات مبارک تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے واقعہ کو اجمال وابہام کے طور پر بیان فرمایا۔ یہ قول زیادہ صحیح ہے اور جنگ احد کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخالفین کے حق میں جو دعا فرمائی اس کے یہی الفاظ منقول ہیں۔

بَابُ الرِّيَاءِ وَالسُّمْعَةِ

ریا وسمعہ کا بیان

ریاء کی تعریف

"ریاء" رؤیت سے مشتق ہے اور "صراح" میں لکھا ہے کہ "ریاء" کے معنی ہیں اپنے آپ کو لوگوں کی نظر میں اچھا بنا کر پیش کرنا۔ اور عین العلم میں لکھا ہے کہ۔ ریاء کا مطلب یہ ہے اپنی عبادت و نیکی کا سکہ جمانا اور اس کے ذریعہ لوگوں کی نظر میں اپنی قدر و منزلت چاہنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ "ریاء" کا تعلق خاص طور پر ان چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے جو عبادت و نیکی کے ظاہری عمل کہلاتے ہیں اور جو چیزیں کہ از قسم عبادت نہ ہوں جیسے کثرت مال و متاع، علم و ذہانت کی فراوانی، اشعار وغیرہ کا یاد رکھنا اور نشانہ بازی کی مہارت وغیرہ تو ان میں دکھاوے کے لئے کئے جانے والے کام کو ریاء نہیں کہا جاتا بلکہ وہ افتخار و تکبر (ناز و گھمنڈ) کی ایک قسم کہلاتا ہے اسی طرح (نیکی و عبادت کے) ظاہری اعمال میں بھی اگر کوئی کام اس صورت میں لوگوں کو دکھانے کے لئے کیا جائے جب کہ اس کا مقصد عزت و جاہ کی طلب نہ ہو، جیسا کہ بعض مشائخ اپنے مریدوں کو تلقین و تعلیم، لوگوں کے دلوں کو نیک اعمال کی طرف مائل کرنے اور ان کو اتباع و پیروی کی طرف راغب کرنے کے لئے بعض اعمال اس طرح کرتے ہیں کہ لوگ ان کو دیکھیں تو یہ بھی حقیقت کے اعتبار سے ریا نہیں کہلائے گا اگرچہ ظاہر میں ان کا وہ عمل ریاکاری معلوم ہو اسی وجہ سے یہ کہا گیا ہے کہ رِيَاءُ الصِّدِّيقِينَ خَيْرٌ مِنْ إِخْلَاصِ الْمُرِيدِينَ یعنی اونچے درجہ کے مشائخ اور بزرگوں کا ریا مریدین کے اخلاص (یعنی عدم ریاکاری) سے بہتر ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ ریاء اصل میں اس چیز کا نام ہے کہ کسی شخص کی ذات میں واقعۃً کوئی صفت و کمال ہو اور وہ اپنے اس واقعی وصف و کمال پر لوگوں کے سامنے نمایاں کرے اور یہ خواہش رکھے کہ لوگ اس کے اس وصف و کمال کو جانیں تاکہ ان کی نظر میں قدر و منزلت اور عزت و وقعت حاصل ہو۔ پس جو شخص کسی ایسے وصف و کمال کو اپنی طرف منسوب کر کے لوگوں پر ظاہر کرے کہ جو واقعۃً اس کی ذات میں نہیں ہے تو اس کو ریاء نہیں بلکہ خالص کذب اور منافقت کہا جائے گا، اسی پر قیاس کر کے یہ کہا گیا ہے کہ غیبت اس چیز کا نام ہے کہ کسی شخص کی پیٹھ پیچھے اس کا وہ عیب بیان کیا جائے جو واقعتاً اس کی ذات میں موجود ہو، اور اگر اس کی طرف منسوب کر کے کوئی ایسا عیب بیان کیا جائے جو حقیقت کے اعتبار سے اس کی ذات میں نہیں ہے، تو اس کو افتراء اور بہتان کہیں گے۔

ریاء کی قسمیں

ریاء کی مختلف اقسام اور صورتیں ہیں، اور ان اقسام میں سب سے زیادہ بری اور نہایت قابل نفرین وہ قسم ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی

عبادت کا قصد اور حصول ثواب کا ارادہ قطعا نہ ہو بلکہ واحد مقصد لوگوں کو دکھانا اور ان کی نظر میں قدر و منزلت حاصل کرنا، جیسا کہ خالص ریا کار (بلکہ دھوکا باز) لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے کہ جب وہ لوگوں کے درمیان ہوتے ہیں تو نماز پڑھتے ہیں اور مختلف قسم کے اوراد و وظائف میں مشغول رہتے ہیں، لیکن جب تنہا ہوتے ہیں تو نہ نماز سے سروکار رکھتے ہیں اور نہ اوراد و وظائف سے، بلکہ ان بد نصیبوں کی حالت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ نماز میں بغیر پاکی اور وضو کے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں! ریا کاری کی یہ قسم ارذل ترین اور اللہ تعالیٰ کے سخت غضب و قہر کے نازل ہونے کا باعث ہے اور اس صورت میں کیا جانے والا کوئی بھی عمل قطعی باطل ہوتا ہے، بلکہ بعض حضرات نے تو یہاں تک کہا ہے اگر وہ عمل فرض ہو تو اس کا کرنا فرض کے ادا ہو جانے کے حکم میں نہیں ہوگا بلکہ اس کی قضا واجب ہوگی! دوسری قسم وہ صورت ہے جس میں کسی نیک عمل کرنے میں دونوں چیزیں ہوں یعنی ارادہ ثواب بھی اور ریا کاری بھی (دکھانے کی نیت)، لیکن ریا کا پہلو غالب اور ارادہ ثواب کا پہلو ضعف ہو، بایں حیثیت کہ اگر اس عمل کو کرنے والا تنہائی میں ہوتا تو اس عمل کو نہ کرتا، اور اس کا قصد اس عمل کے صدور کا باعث نہ ہوتا اور اگر بالفرض اس عمل کا ثواب کوئی نہ ہوتا تو بھی محض ریا کاری کا جذبہ ہی اس عمل کو اختیار کرنے کا باعث بن جاتا، اس قسم کا بھی وہی حکم ہے جو پہلی قسم کا ہے۔ تیسری قسم وہ صورت ہے جس میں کسی نیک عمل کو اختیار کرنے میں دونوں چیزیں یعنی ریا کاری کا جذبہ اور حصول ثواب کا ارادہ برابر ہوں، بایں حیثیت کہ اگر بالفرض وہ عمل ان دونوں چیزوں میں سے کسی بھی ایک چیز سے خالی ہوتا تو اس کو اختیار کرنے کا کوئی داعیہ پیدا نہ ہوتا بلکہ اس عمل کی طرف رغبت اسی صورت میں ہوتی جب کہ دونوں چیزیں ایک ساتھ پائی جاتی۔ اس قسم کے بارے میں بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نفع، نقصان، دونوں برابر ہوں، لیکن احادیث و آثار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ قسم بھی مذموم، اور اس صورت میں کیا جانے والا عمل بھی ناقابل قبول ہوتا ہے! اور چوتھی قسم وہ صورت ہے کہ جس میں کسی نیک عمل کو اختیار کرنے میں، ثواب کی نیت اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا ارادہ، راجح اور غالب ہو، اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قسم نہ تو محض باطل ہے اور نہ اس میں کوئی نقصان ہے، یا زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس صورت میں اختیار کیا جانے والا عمل نیت و ارادہ کے اعتبار سے ثواب اور عتاب دونوں کا یکساں طور پر باعث ہوتا ہے کہ ارادہ و نیت میں جس قدر اخلاص یا عدم اخلاص ہوگا اسی کے مطابق ثواب یا عتاب ہوگا، نیز اس صورت میں یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ قصد عمل میں ریا کاری کی جو آمیزش ہے، (جو اگرچہ ثواب کے ارادہ و نیت سے کمتر اور ضعیف ہے) وہ کب پیدا ہوئی ہے؟ اگر ریا کاری کی آمیزش ابتداء عمل میں ہوئی ہے تو یہ صورت زیادہ بری کہلائے گی، اور اگر عمل کے درمیان پیدا ہوئی ہے تو یہ صورت پہلی صورت سے کم برائی کی حامل ہوگی، اور اگر یہ عمل کرنے کے بعد آئی ہے، تو یہ صورت دوسری صورت سے بھی کم بری قرار دی جائے گی اور اس کی وجہ سے اختیار کیا جانے والا عمل باطل نہیں کہلائے گا۔

علاوہ ازیں ایک فرق یہ بھی ملحوظ رکھا جائے گا کہ ریا کاری کا وہ جذبہ اگر پختہ قصد و عزم کی صورت میں نمودار ہوا ہے تو اس میں زیادہ برائی ہوگی اور اگر محض ایک خیال کی صورت میں پیدا ہو اور اس خیال ہی کی حد تک محدود رہا، آگے کچھ نہ ہوا تو یہ صورت حال یقیناً زیادہ نقصان دہ نہیں کہلائے گی۔

بہر حال حقیقت یہ ہے کہ "ریا" ایک ایسا جذبہ ہے جس سے پوری طرح خلاصی نہایت دشوار ہے اور ہر حالت میں حقیقی اخلاص کا پایا جانا بہت مشکل، اسی لئے علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ کسی کے منہ سے اپنی تعریف سن کر خوش ہونا ریا کے پائے جانے کی علامت ہے، اسی طرح تنہائی میں کوئی عمل کرتے وقت بھی دل میں ریا کا خیال آجائے تو وہ بھی "ریا" ہی کہلائے گا۔ خدا اس سے اپنی پناہ میں رکھے اور بہر صورت اخلاص عطا فرمائے کہ اس کی مدد و توفیق کے بغیر اس دولت کا ملنا ممکن ہی نہیں ہے۔

علماء نے ایک خاص صورت و حالت اور بیان کی ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی شخص کوئی نیک کام کرے اور کسی عبادت و طاعت میں مصروف ہو اور لوگ اس کو وہ نیک کام اور عبادت و طاعت کرتا ہوا دیکھ لیں تو اس کو چاہئے کہ اس وقت اپنے اندر اس وقت اس بات پر خوشی و مسرت کے جذبات پیدا کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم اور لطف و عنایت سے نیک عمل کی توفیق عطا فرمائی اور لوگوں کی نظر

میں باعزت بنانے کا یہ سبب پیدا فرمایا کہ گناہوں اور عیوب کی تو پردہ پوشی فرمائی اور نیک اعمال واخلاق کو آشکارا فرمایا اور ان جذبات مسرت کے ساتھ یہ نیت وقصد رکھے کہ اگر میرے نیک عمل کے اظہار سے دین وطاعات کا چرچہ ہوتا ہے تو لوگ دین کی طرف راغب ہوں گے اور ان کے اندر بھی نیک اعمال کو اختیار کرنے کا داعیہ پیدا ہوگا۔ یہ چیز نہ صرف یہ کہ "ریا" کے حکم میں داخل نہیں ہوگی، بلکہ اس کو محمود ومستحسن بھی کہا جائے گا جیسا کہ اس سلسلے میں وارد احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ یہ مسئلہ بہت دقیق وپیچیدہ ہے اور اپنے اندر بہت تفصیل ومباحث رکھتا ہے، اگر اس کی تحقیق زیادہ وضاحت کے ساتھ جاننی ہو تو اہل اللہ اور عارفین کی کتابوں اور ان کے اقوال وملفوظات سے راہنمائی حاصل کرنی چاہئے، خصوصا مشہور کتاب "احیاء العلوم" اس سلسلے میں زیادہ بہتر رہبری کر سکتی ہے۔

سمعہ کا مطلب

سُمْعَةَ (سین کے پیش اور میم کے جزم کے ساتھ) کے معنی ہیں "وہ کام جو لوگوں کے سنانے اور شہرت حاصل کرنے کے لئے کیا جائے۔" عام طور پر اس لفظ کا استعمال ریا کے ساتھ ہوتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے "فلاں شخص نے یہ کام ریا وسمعہ یعنی دکھانے سنانے کے لئے کیا۔ گویا ریا کا تعلق تو حاسہ بصر (دکھانے) کے ساتھ ہوتا ہے اور سمعہ کا تعلق حاسہ سمع (سنانے) کے ساتھ۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

خدا صورت اور مال کو نہیں دیکھتا، دل کو دیکھتا ہے

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مال ومتاع کو نہیں دیکھتا (یعنی اس کی نظر رحمت وعنایت میں تمہاری صورتوں اور تمہارے اموال کا کوئی اعتبار نہیں ہے، کیونکہ اس کے نزدیک نہ تو اچھی یا بری صورت کی کوئی حیثیت ہے اور نہ مال ومتاع کی کمی یا بیشی کی کوئی اہمیت ہے) بلکہ وہ تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے (یعنی اس کے ہاں تو بس اس چیز کو دیکھا جاتا ہے کہ تمہارے دل میں یقین وصدق، اور اخلاص وغیرہ، یا نفاق اور ریا وسمعہ وغیرہ، اسی طرح اس کے نزدیک اچھے اور برے اعمال کا اعتبار ہے جس کے مطابق وہ تمہیں جزا وسزا دیتا ہے۔" (مسلمؒ)

غیر مخلصانہ عمل کی کوئی اہمیت نہیں

② وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَنَا اَغْنَی الشُّرَکَاءِ عَنِ الشِّرْکِ مَنْ عَمِلَ عَمَلًا اَشْرَکَ فِیْهِ مَعِیَ غَیْرِیْ تَرَکْتُهٗ وَشِرْکَهٗ۔ وَفِیْ رِوَایَةٍ فَاَنَا مِنْهُ بَرِیْءٌ هُوَ لِلَّذِیْ عَمِلَهٗ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرک کے تئیں تمام شرکاء سے نہایت زیادہ بے نیاز ہوں، یعنی دنیا کا دستور ہے کہ لوگ اپنے معاملات اور کاروبار میں ایک دوسرے کے اشتراک وتعاون کے محتاج ہوتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے شریک بنتے ہیں، نیز وہ اس شرکت وتعاون پر راضی ومطمئن بھی ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کے درمیان اس درجہ کی مفاہمت ہوتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک شریک متعلقہ معاملات وکاروبار میں اپنا پورا عمل دخل رکھتا ہے، لیکن میرا معاملہ بالکل جداگانہ ہے کہ میں علی الاطلاق خالق وحاکم ہوں، اپنے احکام وفیصلے اور اپنے نظام قدرت میں نہ تو مجھے کسی کے تعاون واشتراک کی

حاجت وضرورت ہے اور نہ مجھے یہ گوارا ہے کہ میرے بندے کسی کو میرا شریک قرار دیں، اور میرے لئے کئے جانے والے کسی بھی عمل میں میرے علاوہ کسی اور کو مدنظر رکھیں۔ یہاں تک کہ میرے نزدیک ان کے صرف اسی عمل کا اعتبار ہے جو وہ خالص طور پر میرے لئے کریں۔ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ذکر شرکاء کے ضمن میں کرنا یعنی خود اپنے کو ایک "شریک" کے ذریعہ تعبیر کرنا محض ان بندوں کے اعتبار سے ہے جو اپنے جہل اور اپنی نادانی کی وجہ سے اس کی ذات وصفات اور اس کی عبادت میں کسی دوسرے کو شریک کرتے اور اس طرح وہ خدا کو بھی ایک "شریک" کا درجہ (دیتے ہیں "نعوذ باللہ۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے اس بات سے اپنی بے نیازی اور ناخوشی کا اعلان فرمایا کہ کسی کو اس کا شریک قرار دیا جائے، چنانچہ ارشاد ہوا کہ، جو شخص (میری طاعت وعبادت کے طور پر) کوئی ایسا عمل کرے کہ جس میں وہ میرے ساتھ کسی دوسرے کو بھی شریک کرے تو میں اس شخص کو شرک کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہوں۔ اور ایک روایت میں ترکتہ وشرکہ کے بجائے) یہ الفاظ ہیں فانامنہ بری ھو للذی عملہ یعنی (جو شخص میری عبادت میں کسی دوسرے کو شریک کرتا ہے) تو میں اس سے اپنی بے نیازی وبیزاری ظاہر کرتا ہوں، وہ شخص یا اس کا وہ عمل اسی کے لئے ہے جس کے لئے اس نے وہ عمل کیا ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: اس حدیث کا ظاہری مفہوم اس بات کو واضح کرتا ہے کہ خالص ریاکاری کے جذبہ سے کیا جانے والا عمل تو باطل ہو ہی جاتا ہے لیکن اس عمل کا بھی کوئی فوت ہو جاتا ہے جس میں ریا کی آمیزش اور اس کا دخل ہو جائے۔ لیکن علماء نے کہا ہے کہ یہ حکم اس عمل کے بارے میں ہوگا جو ریا کی ان دو قسموں سے تعلق رکھے کہ یا تو اس عمل کو اختیار کرنے میں سرے سے ثواب کی نیت ہی نہ ہو یا ثواب کی نیت تو ہو مگر ریا کا قصد اس نیت پر غالب ہو اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس حدیث کا اصل مقصد خدا کے لئے کئے جانے والے کسی بھی عمل کو ریا کی آمیزش اور اس کے دخل سے پاک رکھنے کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کرنا اور اس کے امر سے لاپرواہی اختیار کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ تنبیہ وسرزنش کرنا ہے۔

دکھانے سنانے کے لئے عمل کرنے والوں کے بارے میں وعید

(۳) وَعَنْ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهِ وَمَنْ يُرَائِي يُرَائِي اللّٰهُ بِهِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت جندبؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص لوگوں کو سنانے اور شہرت حاصل کرنے کے لئے کوئی عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کا حال لوگوں کو سنائے گا (ذلیل ورسوا کرے گا) نیز جو شخص لوگوں کو دکھانے کے لئے کوئی عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ریاکاری کی سزا دے گا (یعنی قیامت کے دن اس سے کہے گا کہ اپنا اجر وثواب اسی سے مانگو جس کے لئے تم نے وہ عمل کیا تھا۔"

(بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: بعض حضرات نے کہا ہے کہ، حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کوئی نیک کام محض شہرت وناموری اور حصول عزت وجاہ کے لئے کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اس کے ان عیوب اور برے کاموں کو اپنی مخلوق کے سامنے ظاہر کردے گا جن کو وہ چھپاتا ہے، اور لوگوں کی نظر میں اس کو ذلیل ورسوا کردے گا، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی فاسد نیت اور بری غرض کو دنیا والوں پر آشکار کر دیتا ہے اور قیامت کے دن بھی اپنی مخلوق پر کھول دے گا کہ یہ شخص مخلص نہیں تھا، ریاکار تھا۔ اور بعض علماء نے یہ مراد بیان کی ہے کہ جو شخص اپنا کوئی عمل لوگوں کو سنائے گا یا وہ عمل لوگوں کو دکھائے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے اس نیک عمل کا ثواب صرف اس کو سنا اور دکھادے گا، دیگا نہیں، تاکہ وہ حسرت وافسوس زدہ رہے! یا یہ مراد ہے کہ جو شخص اپنا کوئی نیک عمل لوگوں کو سنائے گا، یا وہ عمل لوگوں کو دکھائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی نیت کے مطابق اس کا وہ عمل لوگوں کو سنا اور دکھادے گا، اور گویا اس کے اس عمل کا یہی اجر وثواب ہوگا جو اس کو اسی دنیا میں مل جائے گا اور آخرت کے اجر وثواب سے قطعاً محروم رہے گا۔

کسی عمل خیر کی وجہ سے خود بخود مشہور ہو جانا ریا نہیں ہے

④ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قِیْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَرَاَیْتَ الرَّجُلَ یَعْمَلُ الْعَمَلَ مِنَ الْخَیْرِ وَیَحْمَدُہُ النَّاسُ عَلَیْہِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ وَیُحِبُّہُ النَّاسُ عَلَیْہِ قَالَ تِلْکَ عَاجِلُ بُشْرَی الْمُؤْمِنِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ سے کسی پوچھنے والے نے پوچھا کہ مجھے اس شخص کے بارے میں بتایئے جو کوئی نیک کام کرتا ہے اور اس کی وجہ سے لوگ اس کی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ اور ایک روایت میں (لوگ اس کی تعریف و توصیف کرتے ہیں کے بعد) یہ بھی ہے کہ۔ اور وہ لوگ اس سے محبت کرتے ہیں! (ایسے شخص کا کیا حکم ہے اس کا اجر و ثواب کالعدم ہو جاتا ہے یا نہیں؟) حضور ﷺ نے (یہ سوال سن کر فرمایا کہ "لوگوں کا اس شخص کی تعریف و توصیف کرنا اور اس کو محبوب رکھنا در حقیقت اس کے حق میں مؤمن کے ذریعہ جلد ملنے والی بشارت ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "جلد ملنے والی بشارت" کا مطلب یہ ہے کہ ایک سعادت و بشارت تو وہ ہے جو باقی ہے اور آخرت میں ملے گی اور ایک سعادت و بشارت یہ ہے کہ جو جلد ہی یعنی اسی دنیا میں مل گئی ہے۔ حاصل یہ کہ اس شخص نے اپنے اس عمل خیر کا اصل ثواب آخرت میں پانے سے پہلے ایک اور اجر و ثواب اسی دنیا میں یہ پالیا کہ لوگوں نے اس کی تعریف و توصیف کی اور اس کو اپنا محبوب قلب و نظر بنالیا اور اس کے حق میں لوگوں کو یہ معاملہ گویا اس بات کی بشارت ہے کہ اس کا وہ عمل خیر مقبول ہو گیا اور وہ آخرت میں اجر و ثواب پائے گا۔

بہر حال حضور ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ یہ واضح فرمایا کہ اس شخص کا وہ عمل خیر کہ جس کی وجہ سے وہ دنیا والوں کی نظر میں قابل احترام اور محبوب بنا ہے "ریاء" نہیں کہلائے گا کیونکہ اس کو اس عزت و احترام اور محبت کے حاصل ہونے میں اس کے اپنے قصد و ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس عمل خیر کو اختیار کرنے میں اس کی نیت اور اس کا قصد و ارادہ، اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور ثواب آخرت کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا، یہ تو محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اس شخص کو اس دنیا میں بھی مذکورہ سعادت کی صورت میں اجر و ثواب عطا فرما دیا۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

شرک وریا کے بارے میں ایک وعید

⑤ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ بْنِ اَبِیْ فُضَالَۃَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا جَمَعَ اللّٰہُ النَّاسَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْہِ نَادٰی مُنَادٍ مَنْ کَانَ اَشْرَکَ فِیْ عَمَلٍ عَمِلَہٗ لِلّٰہِ اَحَدًا فَلْیَطْلُبْ ثَوَابَہٗ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ اَغْنَی الشُّرَکَاءِ عَنِ الشِّرْکِ۔ (رواہ احمد)

"حضرت ابوسعید ابن فضالہؓ رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہ جس کے آنے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے، لوگوں کو (حساب اور جزاد سزا کے لئے) جمع فرمائے گا، تو ایک اعلان کرنے والا فرشتہ یہ اعلان کرے گا کہ جس شخص نے اپنے اس عمل میں کہ جس کو اس نے خدا کے لئے کیا تھا، خدا کے سوا کسی اور کو شریک کیا ہو (یعنی جس شخص نے دنیا میں ریا کے طور پر کوئی نیک عمل کیا ہو) تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے اس عمل کا ثواب اسی غیر اللہ سے طلب کرے جس کو اس نے شریک کیا تھا کیونکہ خدا تعالیٰ شرک کے تئیں، تمام شریکوں سے نہایت زیادہ بے نیاز ہے۔" (احمدؒ)

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں لِیَوْمٍ میں حرف لام "جمع" سے متعلق ہے جس کے معنی ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو اس دن کے لئے جمع کرے گا کہ جس کا پیش آنا یقینی امر ہے اور اس دن کے آنے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے، اور یہ جمع کرنا اس کے لئے ہو گا کہ ہر ایک کو

اس چیز کے مطابق جزاو سزا دے جس کو اس نے دنیاوی زندگی میں اختیار کیا تھا۔ اس اعتبار سے یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ مابعد کے الفاظ کی تمہید کے طور پر ہے، تاہم اس کو "جمع" کا ظرف بھی قرار دیا جاسکتا ہے، اور اس کی تائید اس روایت کے مطابق الفاظ سے ہوتی ہے جو استیعاب میں نقل کی گئی ہے کہ اِذَا کَانَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَجْمَعُ اللّٰہُ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ لِیَوْمٍ لَا رَیْبَ فِیْہِ۔ الخ اس صورت میں "لیوم" کے لفظ کو ایسا مظہر کیا جائے گا جو مضمر کی جگہ واقع ہوا ہے اور جو اس مفہوم کو ظاہر کرتا ہے کہ جَمَعَ اللّٰہُ الْخَلْقَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ لِیَجْزِیَھُمْ فِیْہِ یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام مخلوق کو جمع فرمائے گا تاکہ اس دن سب کو جزاو سزا دے۔

ریاکاری کی مذمت

(۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّہٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ سَمَّعَ النَّاسَ بِعَمَلِہٖ سَمَّعَ اللّٰہُ بِہٖ اَسَامِعَ خَلْقِہٖ وَحَقَّرَہٗ وَصَغَّرَہٗ۔ رَوَاہُ الْبَیْہَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ جو شخص اپنے عمل کو لوگوں کے درمیان شہرت دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے اس "ریا" کارانہ عمل کو اپنی مخلوق کے کانوں تک پہنچادے گا۔ (یعنی جو شخص کوئی نیک کام کر کے لوگوں کو یہ سنائے گا کہ اس نے یہ کام کیا ہے، اور اس کے ذریعہ اس کا مقصد شہرت و عزت حاصل کرنا ہوگا اللہ تعالیٰ اس کی اس ریاکاری کو ظاہر کردے گا اور لوگوں کے کانوں تک یہ بات پہنچادے گا کہ یہ شخص ریاکار اور غیر مخلص ہے نیز (قیامت کے دن) اس کو رسوا کرے گا اور (دنیا و آخرت میں) ذلت و خواری سے دوچار کرے گا۔" اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

نیت کے اخلاص وعدم اخلاص کا اثر

(۷) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ کَانَتْ نِیَّتُہٗ طَلَبَ الْاٰخِرَۃِ جَعَلَ اللّٰہُ غِنَاہُ فِیْ قَلْبِہٖ وَجَمَعَ لَہٗ شَمْلَہٗ وَاَتَتْہُ الدُّنْیَا وَھِیَ رَاغِمَۃٌ وَمَنْ کَانَتْ نِیَّتُہٗ طَلَبَ الدُّنْیَا جَعَلَ اللّٰہُ الْفَقْرَ بَیْنَ عَیْنَیْہِ وَشَتَّتَ عَلَیْہِ اَمْرَہٗ وَلَا یَاْتِیْہِ مِنْھَا اِلَّا مَا کُتِبَ لَہٗ۔ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَرَوَاہُ اَحْمَدُ وَالدَّارِمِیُّ عَنْ اَبَانَ عَنْ زَیْدِ بْنِ ثَابِتٍ۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس شخص کی نیت محض آخرت کی طلب ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو غنی اور اس کی پریشانیوں کو جمع کر کے اطمینان خاطر بخشتا ہے نیز اس کے پاس دنیا آتی ہے لیکن اس کی نظر میں اس دنیا کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ یعنی کسی بھی علمی یا عملی کار خیر کو اختیار کرنے کے سلسلے میں جس شخص کی نیت اور اصل مقصد، محض رضائے مولی اور ثواب آخرت کی طلب ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو قدر کفایت پر قانع و صابر بنا کر اور زیادہ طلبی کی محنت و مشقت کے کشت و رنج سے بچا کر قلبی غنا عطا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس بات سے بے نیاز اور مستغنی ہو جاتا ہے کہ ریاکاری کے ذریعہ لوگوں سے مال وجاہ اور عزت و منفعت حاصل کر کے آخرت کا نقصان و خسران مول لے۔ نیز اللہ تعالیٰ حصول معاش اور ضروریات زندگی کی تکمیل کے سلسلے میں ان کی پریشانیوں، الجھنوں، اور ذہنی انتشار و تفکرات کو سمیٹ کر خاطر جمعی میں تبدیل کر دیتا ہے، بایں طور کہ اس کو ایسی جگہوں اور ایسے ذرائع سے اسباب معیشت مہیا فرما دیتا ہے جن کے بارے میں اس کو معلوم بھی نہیں ہوتا، اور اس کے معاملات کو اس طرح استوار فرما دیتا ہے کہ اس کا وہم و گمان بھی اس کو نہیں ہوتا، اور پھر ان تمام چیزوں کا مجموعی اثر یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کی نظر میں دنیا اور دنیا بھر کی نعمتیں اور لذتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں، وہ دنیا سے دامن بچاتا ہے اور دنیا اس کے قدموں میں کھنچی چلی آتی ہے، اس کی ضروریات زندگی اور معیشت کے وہ اسباب جو اس کے لئے مقدر ہیں، بغیر کسی محنت و مشقت کے، بغیر کسی سعی و کوشش کے، اور بغیر کسی ذلت و خواری کے اس کو حاصل ہوتے رہتے ہیں)۔ اور جس شخص کی نیت اور اصل مقصد، دنیا کی طلب ہو (یعنی جس شخص پر دنیا اس حد تک سوار ہو جائے کہ وہ اعمال خیر کو بھی محض دنیا کے حصول کا واسطہ بنانا شروع کر دے) تو اللہ تعالیٰ اس کا فقر و احتیاج، اس کی آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ اس کو لوگوں کے سامنے ہاتھ

پھیلانے کی ذلت وخواری میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ اپنے فقر و افلاس اور محتاجگی کو نظر آنے والی چیز کی طرح اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے؟ اور اس کو ہر معاملہ میں پراگندہ خاطر اور ذہنی انتشار و تفکرات کا شکار بنا دیتا ہے نیز دنیا بھی اس کو صرف اسی قدر ملتی ہے، جتنا کہ خدا نے اس کے لئے مقدر کر دیا ہے (ترمذیؒ) نیز احمدؒ اور دارمیؒ نے اس روایت کو ابانؒ سے اور انہوں نے زید ابن ثابتؓ سے نقل کیا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اعمال کے نتائج و آثار مرتب ہونے کا مدار نیت پر ہے، جس شخص کے پیش نظر صرف آخرت کا مفاد ہوتا ہے اور جو اپنے اعمال کے تئیں مخلص و صادق ہوتا ہے، وہ آخرت کی سعادتوں اور نعمتوں کا مستحق تو ہو ہی جاتا ہے، اس دنیا میں بھی اس کو اپنے تمام معاملات زندگی میں اطمینان و عافیت اور خاطر جمعی کی دولت حاصل رہتی ہے، نیز اس کو اس کا رزق نہایت آسانی اور آسودگی کے ساتھ پہنچتا ہے۔ اس کے برخلاف جو شخص محض دنیا کی طلب و چاہ رکھتا ہے اور اپنے اعمال کو وسیلہ آخرت بنانے کے بجائے دنیاوی مال وزر اور دنیاوی نعمتوں کا وسیلہ وذریعہ بناتا ہے اس کو آخرت میں تو اس کی سزا بھگتنی ہوگی، اس دنیا میں بھی اس پر اس برائی کا یہ وبال پڑتا ہے کہ وہ خاطر جمعی اور اطمینان وسکون کی دولت سے محروم ہو جاتا ہے، ہر وقت طرح طرح کی پریشانیوں اور مختلف تفکرات کی وجہ سے حیران و سرگرداں رہتا ہے، نیز اس کو وہ رزق تو ضرور ملتا ہے جو اس کے مقدر میں ہے، مگر اس کے حصول کے لئے بھی اس کو نہایت محنت ومشقت اور پریشانی وکشت برداشت کرنا پڑتی ہے۔

اخروی مقاصد کے لئے اپنے کسی نیک عمل کی شہرت پر خوش ہونا "ریا" نہیں ہے

(۸) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ بینما اَنَافِي بَیْتِی فِیْ مُصَلَّایَ اِذَا دَخَلَ عَلَیَّ رَجُلٌ فَاَعْجَبَنِی الْحَالُ الَّتِی رَاٰنِیْ عَلَیْهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَحِمَكَ اللّٰهُ یَا اَبَا هُرَیْرَةَ لَكَ اَجْرَانِ اَجْرُ السِّرِّ وَاَجْرُ الْعَلَانِیَةِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں اپنے گھر میں مصلے پر (نماز پڑھ رہا) تھا کہ اس وقت اچانک ایک شخص میرے پاس آیا، مجھے اس بات سے خوشی ہوئی کہ اس نے مجھے نماز پڑھنے کی حالت میں دیکھا ہے (تو کیا اس وقت میرا خوش ہونا "ریا" میں شمار ہوا یا نہیں؟) رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "ابوہریرہؓ! تم پر اللہ کی رحمت نازل ہو، تم دو ثواب کے مستحق ہوئے ایک تو پوشیدہ کا، اور دوسرا ظاہر ہونے کا۔" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ جو اس بات سے خوش ہوئے کہ اس شخص نے ان کو نماز کی حالت میں دیکھا، تو اس کا سبب حضرت ابوہریرہؓ کا یہ پاکیزہ جذبہ تھا کہ مجھے نماز پڑھتا ہوا دیکھ کر اس میں بھی اس وقت کی نماز کے تعلق سے میری اتباع کا داعیہ پیدا ہوگا اور یہ شخص بھی اسی طرح نماز پڑھے گا جس طرح میں پڑھ رہا ہوں۔ یا ان کی خوشی کا سبب یہ تھا کہ ان کی حالت نماز گویا ایک شخص کے سامنے نیکی کے راستہ کے اظہار و اعلان کا باعث بنی اور اس شخص کو اس وقت کی نماز کی طرف راغب کرنے کا ذریعہ بنی، اور جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔ من سن سنه حسنة فله اجرها و اجر من عمل بها انہیں بجا طور پر یہ خوش کن توقع ہوئی کہ جب یہ شخص نماز پڑھ لے گا تو اس کی نماز کا مجھے بھی ثواب ملے گا۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس موقع پر حضرت ابوہریرہؓ کا خوش ہونا اس طبعی خواہش کی تکمیل کے تئیں تھا جو شریعت کی نظر میں بھی پسندیدہ ہے، یعنی ہر انسان کی یہ طبعی خواہش ہوتی ہے کہ جب اس کو کوئی دیکھے تو وہ اچھی حالت میں ہو، کوئی بھی شخص یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ بری حالت میں دیکھا جائے اور ظاہر ہے کہ اس طبعی خواہش کی بنیاد ریا و سمعہ پر نہیں ہوتی بلکہ قلب سلیم کے تقاضہ اور پاکیزگی خیال پر ہوتی ہے، پس یہ بات اس ارشاد نبوی ﷺ کے عین مطابق ہے کہ من سرته حَسَنَتُهٗ وساءته سیئته فهو مؤمن نیز حق تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ۔ لہٰذا مؤمن کی شان ہی یہ ہے کہ وہ نیک اعمال و احوال کی توفیق حاصل ہونے پر خوش ہوتا ہے جس طرح کہ غیر مؤمن بہت زیادہ دنیاوی مال وزر حاصل ہونے پر خوش ہوتا

ہے ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کا خوش ہونا اس احساس شکر کے طور پر تھا کہ اس شخص کے ذریعہ مسلمانوں کے درمیان عبادت و توفیق کے ساتھ متعارف ہوا اور ایک نمازی کے طور پر جانا پہچانا گیا، ان لوگوں کے زمرہ میں شمار ہونے کا موقع نصیب ہوا، جو نماز جیسی اہم عبادت اور اسلام کے سب سے بڑے رکن کو قائم کرتے ہیں، اور ایک مسلمان اس بات کا گواہ بنا۔ یہ قول حدیث کے ان الفاظ، اجر السرو اجر العلانیة، کے مفہوم سے زیادہ قریب ہے۔

ریاکار دین داروں کے بارے میں وعید

(۹) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْرُجُ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ رِجَالٌ يَخْتِلُوْنَ الدُّنْيَا بِالدِّيْنِ يَلْبَسُوْنَ لِلنَّاسِ جُلُوْدَ الضَّانِ مِنَ اللِّيْنِ اَلْسِنَتُهُمْ اَحْلٰى مِنَ السُّكَّرِ وَ قُلُوْبُهُمْ قُلُوْبُ الذِّيَابِ يَقُوْلُ اللّٰهُ اَبِىْ يَغْتَرُّوْنَ اَمْ عَلَىَّ يَجْتَرِءُوْنَ فَبِىْ حَلَفْتُ لَاَبْعَثَنَّ عَلٰى اُولٰئِكَ مِنْهُمْ فِتْنَةً تَدَعُ الْحَلِيْمَ فِيْهِمْ حَيْرَانَ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "(میں تمہیں بتاتا ہوں) آخر زمانہ میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے جو دین کے نام پر دنیا کے طلب گار ہوں گے (یعنی دینی و اخروی اعمال کے ذریعہ (دنیا کمائیں گے) از راہ تملق و چاپلوسی اور اظہار تواضع لوگوں (پر اثر ڈالنے) کے لئے دنبوں کی کھال کا لباس پہنیں گے (تاکہ لوگ انہیں عابد و زاہد، دنیاوی نعمتوں سے بے پرواہ اور آخرت کے طلبگار سمجھ کر ان کے مرید و معتقد ہوں) ان کی زبانیں تو شکر سے زیادہ شیریں ہوں گی لیکن ان کے دل بھیڑیوں کے دل کی طرح ہوں گے (یعنی ان کی باتیں تو بڑی خوشگوار من پسند اور نرمی و ملائمت سے بھرپور ہوں گی ان کی تقریر و گفتگو سن کر لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ ہمارے بڑے ہمدرد و بہی خواہ اور غم خوار دوست ہیں اور ان کے دل میں دین و ملت کا بہت درد ہے، لیکن حقیقت یہ ہوگی کہ اپنے ذاتی اغراض و منافع کے لئے دوستی و دشمنی کرنے اور اہل تقویٰ اور دین و ملت کے حقیقی خدمتگاروں کو نقصان و تکلیف پہنچانے، اور دیگر بہیمانہ و حیوانی خصلتوں میں ان کے دل بھیڑیے کے دل کی طرح سخت اور شقی ہوں گے) اللہ تعالیٰ (ایسے لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لئے) فرماتا ہے۔ کیا یہ لوگ میری طرف سے مہلت دیئے جانے اور میرے ڈھیل دیئے دینے کے سبب سے مغرور ہوگئے ہیں، اور فریب میں مبتلا ہیں (یعنی کیا یہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ میں ان کا معین و مددگار ہوں اور اس دنیا میں انہیں جو کامرانیاں اور کامیابیاں نصیب ہیں وہ ان پر میری رحمت کے نازل ہونے کی بناء پر ہیں؟ کیا ان کو معلوم نہیں کہ ہم اس قسم کے لوگوں کو اسی طرح ڈھیل دیا کرتے ہیں؟ یا اس جگہ "اغترا" سے مراد اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرنا اور اپنے افعال بد سے توبہ نہ کرنا ہے اس صورت میں "یختروں" کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ لوگ میرے غضب اور میرے عذاب سے نہیں ڈرتے، اور کیا ان میں اتنی جرأت ہوگی ہے! کہ اعمال صالح کے ذریعہ اور دین کے نام پر لوگوں کو دھوکا دے کر گویا میری مخالفت پر کمربستہ ہیں؟) پس میں اپنی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں یقیناً ان لوگوں پر انہی میں سے فتنہ و بلا مسلط کردوں گا (یعنی انہی لوگوں میں سے ایسے امراء و حکام اور ایسے افراد و گروہ متعین کردوں گا جو ان کو آفات و مصائب اور طرح طرح کے نقصان و ضرر میں مبتلا کردیں گے۔) اور وہ آفات و مصائب بڑے سے بڑے دانشور و عقلمند شخص کو بھی (ان آفات و مصائب کو دور کرنے، ان پر آشوب حالات سے "گلو خلاصی پانے اور ان کے سلسلے میں کسی مناسب و موزوں اقدام و کاروائی کرنے سے" عاجز و حیران کردیں گے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یَخْتِلُوْنَ (خاء کے جزم اور تاء کے زیر کے ساتھ) کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ ان اعمال کے ذریعہ کہ جو آخرت کے لئے کئے جاتے ہیں، دنیا حاصل کریں گے۔ یا یہ کہ وہ لوگ دین کے بدلہ میں دنیا کمائیں گے، اور دینی و اخروی مفاد و مصالح پر دنیاوی اور مادی مفاد و منافع کو ترجیح دیں گے! اور زیادہ صحیح معنی یہ ہوں گے کہ۔ وہ لوگ دین کا لبادہ اوڑھ کر دنیا والوں کو دھوکا دیں گے، بایں طور کہ وہ دنیا کمانے کی خاطر اپنی ظاہری وضع قطع اور اپنے ظاہری اعمال و اخلاق کا ایسا دلفریب مظاہرہ کریں گے کہ دنیا والے ان کو سچا عابد زاہد اور دین

وملت کا مخلص ہی خواہ سمجھ کر ان کے ساتھ عقیدت و محبت رکھیں گے اور سادہ لوح مسلمان ان کے مرید و معتقد بن کر ان کر مراد پوری کریں گے۔ مثلاً وہ نماز، روزہ اور دیگر عبادات کے پابند نظر آئیں گے، اور اوراد و وظائف ذکر و شغل کی محفلیں سجائیں گے، اپنے ارد گرد زہد و تقویٰ کی دیواریں کھڑی کئے نظر آئیں گے، موٹے جھوٹے کپڑوں کا لباس پہنیں گے، دینداروں کی سی شکل و صورت بنائیں گے ان کی تحریر و تقریر، دین و آخرت کی تلقین و تعلیم موعظت و نصیحت کی باتوں، ملت کی بہی خواہی مسلمانوں کے مفاد اور باہمی ہمدردی و غمگساری سے پر نظر آئے گی، لیکن یہ تمام چیزیں صدق و اخلاص سے خالی ریا و سمعہ کے طور پر ہوں گی، جن کا واحد مقصد مسلمانوں کو بے وقوف بنا کر دنیا سمیٹنا، اور صرف ذاتی منافع حاصل کرنا ہوگا۔

پس ایسے لوگوں کی اس ریاکارانہ زندگی کے خلاف یہ خدائی تنبیہ بیان فرمائی گئی کہ انہیں اس گھمنڈ میں ہرگز نہ رہنا چاہئے کہ ان کی یہ دھوکا کی ٹٹی ہمیشہ ہمیشہ رہے گی اور وہ اپنی اس ریاکارانہ زندگی کی سزا اسی دنیا میں نہیں بھگتیں گے؟ خدا قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں ان لوگوں کو ضرور مزا چکھاؤں گا، انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ میرا غضب و قہر ان پر یقیناً نازل ہوگا، میں ان پر ایسے امراء و حکام مسلط کر دوں گا اور انہیں میں سے کچھ ایسے لوگ اور گروہ کھڑے کر دوں گا، جو ان کی ناؤ کو آفات و مصائب، ذلت و خواری، اور تباہی و بربادی کے بھنور میں ڈال دیں گے، ان کی ریاکارانہ زندگی کا پردہ چاک کریں گے اور ان کو ایسے ایسے فتنوں میں مبتلا کریں گے کہ وہ نجات کا کوئی راستہ نہیں پائیں گے، وہ اپنی اس خود ساختہ شان و شوکت، عزت و عظمت اور جاہ و منصب کو بچانے کے لئے جس قدر ہاتھ پاؤں ماریں گے اسی قدر ذلت و رسوائی اور تباہی و بربادی کے حلقے ان کے گرد تنگ ہوتے جائیں گے، اور بڑے بڑے دانشور، عقلمند لوگ بھی ان آفات و مصائب سے گلو خلاصی کا کوئی ذریعہ نہیں نکال پائیں گے۔

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى قَالَ لَقَدْ خَلَقْتُ خَلْقًا اَلْسِنَتُهُمْ اَحْلٰى مِنَ السُّكَّرِ وَقُلُوْبُهُمْ اَمَرُّ مِنَ الصَّبِرِ فَبِيْ حَلَفْتُ لَاُتِيْحَنَّهُمْ فِتْنَةً تَدَعُ الْحَلِيْمَ فِيْهِمْ حَيْرَانَ فَبِيْ يَغْتَرُّوْنَ اَمْ عَلَيَّ يَجْتَرِءُوْنَ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت ابن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے ایک ایسی مخلوق پیدا کی ہے جس کی زبان لشکر سے زیادہ شیریں ہے، اور جس کے دل ایلوے سے زیادہ تلخ ہیں، پس میں اپنی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں یقیناً ان پر ایسی بلائیں نازل کروں گا جو بڑے سے بڑے دانشور عقلمند شخص کو بھی حیران و عاجز بنا دیں گی، تو کیا وہ لوگ مجھے دھوکہ دیتے ہیں، یا مجھ پر جرأت و دلیری دکھاتے ہیں؟ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

میانہ روی کی فضیلت

(۱۱) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ شِرَّةً وَلِكُلِّ شِرَّةٍ فَتْرَةً فَاِنْ صَاحِبُهَا سَدَّدَ وَقَارَبَ فَارْجُوْهُ وَاِنْ اُشِيْرَ اِلَيْهِ بِالْاَصَابِعِ فَلَا تَعُدُّوْهُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "ہر چیز کے لئے حرص و زیادتی ہے اور پھر ہر حرص و زیادتی کے لئے سستی و سکی ہے۔ پس اگر عمل کرنے والے نے میانہ روی سے کام لیا اور اعتدال کے قریب رہا (اور اس نے افراط و تفریط سے اجتناب کیا) تو اس کے بارے میں امید رکھو (کہ وہ اپنی مراد پالے گا) اور اگر اس کی طرف سے انگلیوں سے اشارہ کیا گیا (یعنی اس نے طاعت و عبادت اور اوراد و وظائف کی مشغولیت اور دنیاوی نعمتوں و لذتوں میں اجتناب میں اس لئے مبالغہ و کثرت کو اختیار کیا کہ لوگوں میں عابد و زاہد مشہور ہو، اور پھر وہ لوگوں میں عابد و زاہد مشہور بھی ہو گیا) تو تم اس کو (عابد و زاہد اور صالح) شمار نہ کرو (کیونکہ در حقیقت وہ ریاکاروں میں سے ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: شِرَّۃٌ کے معنی ہیں نشاط رغبت اور حرص میں مبتلا ہونا۔ یہاں حدیث میں اس لفظ سے مراد کسی چیز میں افراط اور کسی کام میں حد سے زیادہ انہماک ہے اور "فترہ" کے معنی ہیں سستی و کمزوری اور کمی۔ مطلب یہ ہے کہ جو عابد ابتداءً طاعت و عبادت اور اوراد وظائف وغیرہ میں حد سے زیادہ مشغول و منہمک رہتا ہے وہ بعد میں سُست و کمزور ہو جاتا ہے اور اس کی طاعت و عبادت وغیرہ کم ہو جاتی ہے۔ اس بات کو اصولی انداز میں زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ کوئی انسان جب کسی چیز کو اختیار کرنا چاہتا ہے اور کوئی کام کرتا ہے تو شروع میں بہت زیادہ استغراق انہماک دکھاتا ہے اور اس قدر ذوق و شوق بلکہ حرص و لالچ میں مبتلا ہوتا ہے کہ اپنی بساط سے بڑھ کر محنت و مشقت اور اپنی طاقت و ہمت سے زیادہ مشغولیت اختیار کرتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعد میں جلد ہی سُست و کمزور پڑ جاتا ہے اور اپنے مقصد کی راہ میں تھکن بے دلی کا شکار ہو جاتا ہے۔ پس اگر کوئی عابد و زاہد اپنے اعمال و اشغال میں میانہ روی اختیار کرے۔ اور افراط و تفریط کی راہ سے بچ کر اعتدال کی راہ پر کہ جس کو صراط مستقیم کہا جاتا ہے گامزن رہے، تو اس کے بارے میں بجا طور پر امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہو جو کامل طور پر مراد پانے والے ہیں! لیکن اگر وہ افراط کی راہ پر چلا اور اس نے عبادت و طاعت اور دینی اعمال و اشغال میں اس حد تک غور کیا اور اپنی بے دینی زندگی کو اس طرح نمایاں کیا کہ وہ عابد و زاہد مشہور ہو گیا اور لوگ اس کی عبادت گذاری اور زہد و تقویٰ کی طرف اشارہ کرنے لگے تو اس کی طرف کوئی التفات نہیں کرنا چاہئے، اور اس کو نیک و صالح نہ سمجھنا چاہئے۔

واضح رہے کہ لفظ فارجوہ (اس کے بارے میں امید رکھو) اور لفظ ولا تعدوہ (اس کو عابد و زاہد شمار نہ کرو) کے ذریعہ ان دونوں قسم کے لوگوں کی عافیت کی طرف ایک مبہم اشارہ مقصود ہے کیونکہ کسی شخص کے اخروی انجام کا حقیقی علم بس اللہ تعالیٰ ہی کو ہو سکتا ہے اور اس کے بارے میں کوئی انسان آخری فیصلہ نہیں کر سکتا لہٰذا مذکورہ الفاظ کے ذریعہ یہ حدیث صرف یہ بتانا چاہتی ہے کہ جو شخص میانہ روی کا راستہ اختیار کرتا ہے، صحیح عمل کرتا ہے اور راہ راست سے بھٹکتا نہیں تو بظاہر اس کے بارے میں یہ امید رکھنی چاہئے کہ اس کی عاقبت سدھر گئی اور وہ نجات پا جائے گا اور اگر وہ ایسا نہیں کرے گا بلکہ افراط و تفریط کی راہ پر چل کر دنیاوی عزت و جاہ کا طلبگار ہوتا ہے اور گندم نما جو فروشی کا شیوہ اپنا کر فتنہ و فساد کے بیج بوتا ہے تو ظاہر میں اس کو فلاح یاب نہ سمجھو اور اس کا شمار مخلص دینداروں میں نہ کرو۔ رہی عاقبت کی بات تو وہاں کا انجام دونوں صورتوں میں غیر واضح ہے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ خاتمہ کس حالت میں ہو اور آخرت میں کیا معاملہ ہو گا ؎

حکم مستوری و مستی ہمہ بر خاتمہ است کس ندانست کہ آخر بچہ حالت گذرد

اگرچہ عاقبت کے بارے میں بھی امید ہی رکھنی چاہئے کہ رحمت باری نے جس جس شخص کو اطاعت و عبادت کی توفیق بخشی ہے اور راہ مستقیم پر گامزن کیا ہے اس کی عاقبت ضرور سنورے گی اور اس کا خاتمہ یقیناً ایمان و اخلاص پر ہو گا اس کی رحمت کاملہ کا دستور یہی ہے کہ نیکو کاروں کو بری راہ پر کم ہی لگایا جاسکتا ہے، جب کہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ بدکاروں کو بالآخر نیکی کی طرف کھینچ لیا جاتا ہے۔

شہرت یافتہ زندگی پر خطر ہے

⑫ وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بِحَسْبِ امْرِیءٍ مِنَ الشَّرِّ اَنْ يُشَارَ اِلَيْهِ بِالْاَصَابِعِ فِیْ دِيْنٍ اَوْ دُنْيَا اِلَّا مَنْ عَصَمَهُ اللّٰهُ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ انسان کی برائی کے لئے اتنا کافی ہے کہ دین یا دنیا کے اعتبار سے اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جائے۔ الا یہ کہ کسی کو اللہ تعالیٰ ہی محفوظ رکھے۔" (بیہقیؒ)

تشریح: دنیاوی اعتبار سے مشہور و معروف ہونا تو ظاہر ہے کہ آفتوں اور فتنوں میں مبتلا ہو جانے اور ایمانی امن و سلامتی کی راہ سے دور جا پڑنے کا سبب ہے ہی، لیکن اگر کوئی شخص اپنی زندگی کے اعتبار سے مشہور و معروف ہوتا ہے تو وہ بھی خطرہ سے خالی نہیں، کیونکہ اس صورت میں اس کے ریا کار ہونے کا گمان کیا جاسکتا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس شہرت کی وجہ سے اپنی قیادت و پیشوائی کی طلب و جاہ

میں، مبتلا ہو جائے یہ تمنا کرنے لگے کہ لوگ اس کو اپنا مشدا اور اپنی عقیدت واحترام کا مرکز بنالیں، اور اس طرح وہ شیطان کے بہکانے اور نفس امارہ کے اکسانے کی وجہ سے ان نفسانی خواہشات کی اتباع میں مبتلا ہو سکتا ہے جو ایسے موقعوں کی تاک میں رہتی ہیں! چنانچہ ایسے بندگان خدا کم ہی ہوتے ہیں جنہیں عوامی شہرت و ناموری حاصل ہوئی ہو اور وہ اس کے نتیجہ میں پیدا ہو جانے والی برائیوں سے محفوظ و مامون رہے، ہاں وہ بندگان خدا خاص کہ جنہیں اللہ تعالیٰ اپنا مقرب و محبوب بنالیتا ہے اور وہ صدیقیت کے مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں وہ تمام عالم کی شہرت و ناموری رکھنے کے باوجود اس کی برائیوں سے محفوظ رہتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اس بلند ترین مرتبہ پر فائز ہی اس وقت ہوتے ہیں جب کہ ان کے ظاہر و باطن سے تمام برائیاں مٹ چکی ہوتی ہیں اور ان کا نفس پوری طرح پاکیزہ ہو جاتا ہے، جیسا کہ مشائخ کرام کہتے ہیں کہ آخر مایخرج من رأس الصدیقین حب الجاہ۔

لہٰذا انسان کی بھلائی و بہتری اسی میں ہے اور ایمان و کردار کی سلامتی و حفاظت اسی صورت میں زیادہ ممکن ہے جب کہ وہ گوشہ نشینی و گمنامی اور یکسوئی کی زندگی کو شہرت کی زندگی پر ترجیح دے۔

"الا یہ کہ کسی کو اللہ تعالیٰ ہی محفوظ رکھے" حدیث کے اس جملہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شہرت و ناموری کا نقصان وہ اور برائی کا باعث ہونا اس شخص کے حق میں ہے جس کے ظاہر و باطن پر جاہ و اقتدار اور شہرت و ناموری کی طلب و خواہش کا سکہ رواں ہو، ورنہ تو بندگان خدا اس طلب و خواہش سے محفوظ و مامون اور اپنے ظاہر و باطن کے اعتبار سے مخلص و پاکباز ہوتے ہیں وہ اس بات سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ عوامی مقبولیت و شہرت اور جاہ و اقتدار بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہیں بلکہ خدا کی وہ نعمت ہیں جو وہ اپنے پاک نفس بندوں کو عطا فرماتا ہے جو ان چیزوں کے اہل و مستحق ہوتے ہیں اور جن کے حق میں وہ چیزیں فتنہ و برائی کا باعث بننے کی بجائے بلندئ درجات کا باعث بنتی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے بندگان خاص کی نسبت سے یہ فرمایا ہے کہ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۔

منقول ہے کہ حضرت حسن بصریؒ کی بے پناہ عوامی شہرت و مقبولیت دیکھ کر ایک شخص نے ان سے کہا کہ آپ تو لوگوں میں اس قدر مشہور و نمایاں ہو گئے ہیں! جب کہ آنحضرت ﷺ نے تو یہ فرمایا ہے کہ بحسب امرئ من الشر.....الخ؟ حضرت حسن بصریؒ نے جواب دیا کہ ارشاد گرامی ﷺ کا تعلق اس شخص سے ہے جو دین کے اعتبار سے بدعتی اور دنیا کے اعتبار سے فاسق ہو۔ (یعنی جو شخص دنیا میں مالداری و ثروت رکھتا ہے اور اس مالداری و ثروت کی وجہ سے مشہور معروف ہو، لیکن فسق و فجور میں مبتلا نہ ہو اور دین کے اعتبار سے کتاب و سُنت کی اتباع و پیروی کرتا ہو تو وہ شخص اس حکم میں داخل نہیں ہے۔ جو حضور ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے واضح ہوتا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

سمعہ کی مذمت

⑬ عَنْ اَبِی تَمِیْمَةَ قَالَ شَهِدْتُ صَفْوَانَ وَاَصْحَابَهٗ وَجُنْدَبٌ يُوْصِيْهِمْ فَقَالُوْا هَلْ سَمِعْتَ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ شَاقَّ شَقَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَالُوْا اَوْصِنَا فَقَالَ اِنَّ اَوَّلَ مَا يُنْتِنُ مِنَ الْاِنْسَانِ بَطْنُهٗ فَمَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ لَّا يَاْكُلَ اِلَّا طَيِّبًا فَلْيَفْعَلْ وَمَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ لَّا يَحُوْلَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ مِلْءُ كَفٍّ مِّنْ دَمٍ اَهْرَاقَهٗ فَلْيَفْعَلْ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابی تمیمہؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت صفوان اور ان کے ساتھیوں کی مجلس میں اس وقت حاضر ہوا کہ جب (مشہور اور جلیل القدر صحابی) حضرت جندبؓ (ابن عبداللہ ابن سفیان بجلی) حضرت صفوان اور ان کے ساتھیوں کو (ریاضت و مجاہدہ کی راہ مستقیم اختیار کرنے یا کثرت کے ساتھ عبادت کرنے یا طاعت میں میانہ روی اختیار کرنے اور ریا سمعہ و ریا اور حصول شہرت کی طلب و خواہش سے احتراز و اجتناب کرنے کی) نصیحت فرمارہے تھے۔ پھر حضرت صفوان اور ان کے ساتھیوں نے ان سے کہا کہ کیا آپ نے رسول کریم ﷺ

سے کچھ سنا ہے؟ (یعنی اگر آپ نے حضور ﷺ کی کوئی حدیث سنی ہے تو اس کو ہمارے سامنے بیان فرمایئے اور ہمیں ارشاد نبوی ﷺ سے بہرہ مند ہونے کا موقع دیجئے۔

حضرت جندبؓ نے یہ حدیث بیان کی میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ۔ "جو شخص سنائے گا (یعنی لوگوں کے سنانے اور شہرت حاصل کرنے کے لئے جو کوئی نیک کام کرے گا) تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو رسوا کرے گا۔ اور جو شخص مشقت ڈالے گا (یعنی اپنی ہمت وطاقت سے بڑھ کر کوئی کام کرنے کی صورت میں اپنے آپ کو تکلیف میں مبتلا کرے گا۔ یا کسی دوسرے شخص مثلاً اپنے خادم یا نوکر چاکر وغیرہ کو کسی ایسے کام پر مامور کرے گا، کہ جو اس کی ہمت وطاقت سے باہر ہو، ناقابل برداشت محنت ومشقت کی اذیت میں مبتلا کرے گا) تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن مشقت میں ڈالے گا۔" (یہ سن کر) انہوں نے (یعنی صحابہؓ نے آنحضرت ﷺ سے یا حضرت صفوان اور ان کے ساتھیوں نے حضرت جندبؓ سے کہا) کہ ہمیں (کچھ اور) نصیحت فرمایئے تو (حضور ﷺ نے یا حضرت جندبؓ نے) فرمایا۔ "انسان کی جو چیز سب سے پہلے گندی اور خراب ہوتی ہے وہ اس کا پیٹ ہے (یعنی جو چیز انسان کو سب سے پہلے زیادہ برائی میں مبتلا کرتی ہے سب سے پہلے دوزخ کی آگ کا مستوجب بناتی ہے اور آخرت میں سب سے پہلے دوزخ میں جانے اور عذاب بھگتنے کا باعث بنے گی وہ اس کا پیٹ ہے۔ پس جو شخص اس کی قدرت رکھتا ہو کہ اس چیز کے علاوہ اور کچھ اپنے پیٹ میں نہ پہنچائے جو حلال وجائز ہے تو بے شک اس کو ایسا ہی کرنا چاہئے اور جو شخص اس کی قدرت رکھتا ہو کہ اس کے اور جنت کے درمیان، ناحق بہایا جانے والا ایک چلو خون حائل ہو تو بے شک اس کو ایسا ہی کرنا چاہئے (کہ کسی کا ایک چلو بھی ناحق خون بہانے سے احتراز کرے۔" (بخاریؒ)

تشریح: حدیث کے آخری جزء کا مطلب یہ ہے کہ ناحق خونریزی ایک ایسی چیز ہے کہ جس کا زیادہ ہونا تو کجا اگر ایک چلو کے بقدر بھی ہو تو جنت میں جانے سے روکنے والی ہے! پس یہ بات عقل ودانائی سے بعید تر ہے، کہ ایسے برے، اور قابل نفرین فعل کا ارتکاب کیا جائے جو انسانیت کے منافی نہیں ہے بلکہ جنت میں داخل ہونے جیسی عظیم واہم سعادت سے محروم رکھنے والا بھی ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "حضرت صفوان" سے مراد صفوان ابن سلیم زہری ہیں جو مدینہ کے ایک نہایت جلیل القدر تابعی تھے اور جن کی شخصیت، علم ومعرفت کردار وعمل، زہد وتقویٰ، اور عبادت وریاضت کا ایک مثالی نمونہ تھی! بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے چالیس برس تک اپنا پہلو زمین سے نہیں لگایا اور عبادت گزاری کا یہ عالم تھا کہ سجدوں کی کثرت سے ان کی پیشانی میں سوراخ ہو گیا تھا، ان کے حالات میں یہ لکھا ہے کہ وہ امراء وسلاطین کا کوئی بھی انعام واکرام قبول نہیں کرتے تھے۔ غرضیکہ ان کے بہت زیادہ فضائل ومناقب بیان کئے جاتے ہیں۔

ریا کاری شرک کے مرادف ہے

(۱۴) وَعَنْ عُمَرَبْنِ الْخَطَّابِ اَنَّهٗ خَرَجَ يَوْمًا اِلٰى مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَجَدَ مُعَاذَبْنَ جَبَلٍ قَاعِدًا عِنْدَ قَبْرِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَبْكِىْ قَالَ مَا يُبْكِيْكَ قَالَ يُبْكِيْنِىْ شَىْءٌ سَمِعْتُهٗ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ يَسِيْرًا الرِّيَآءِ شِرْكٌ وَمَنْ عَادٰى لِلّٰهِ وَلِيًّا فَقَدْ بَارَزَ اللّٰهَ بِالْمُحَارَبَةِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْاَبْرَارَ الْاَتْقِيَآءَ الْاَخْفِيَآءَ الَّذِيْنَ اِذَا غَابُوْا لَمْ يُتَفَقَّدُوْا وَاِنْ حَضَرُوْا لَمْ يُدْعَوْا وَلَمْ يُقَرَّبُوْا قُلُوْبُهُمْ مَصَابِيْحُ الْهُدٰى يَخْرُجُوْنَ مِنْ كُلِّ غَبْرَآءَ مُظْلِمَةٍ۔ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِىُّ فِىْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ۔

"اور امیر المؤمنین حضرت عمر ابن الخطاب سے روایت ہے کہ وہ ایک دن رسول کریم ﷺ کی مسجد شریف (یعنی مسجد نبوی) میں تشریف لے گئے تو انہوں نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کے پاس بیٹھ کر روتا ہوا پایا، حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا کہ کیوں رو رہے ہو؟ (کیا حضور ﷺ کی جدائی رلا رہی ہے یا کسی آفت ومصیبت کے پیش آجانے کی وجہ سے رو رہے ہو اور یا ان کے علاوہ

کسی اور سبب نے تمہیں رونے پر مجبور کر دیا ہے؟) حضرت معاذؓ نے جواب دیا۔ "مجھے ایک بات کی یاد نے رلا دیا ہے۔ جس کو میں نے رسول کریم ﷺ سے سنا تھا میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ۔ "تھوڑا "ریا" (بھی) شرک ہے" (نیز آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ)۔ جس شخص نے خدا کے دوست سے دشمنی اختیار کی (یعنی اولیاء اللہ کو اپنے کسی قول و فعل کے ساتھ ناحق تکلیف پہنچائی یا ان کو غصہ دلایا) تو اس نے گویا خدا سے مقابلہ کیا اور اس کے ساتھ جنگ کی (اور ظاہر ہے کہ جس شخص نے خدا کے ساتھ مقابلہ آرائی کی اس کی تباہی و بربادی اور ذلت و رسوائی میں کوئی شبہ نہیں) یقیناً اللہ تعالیٰ، نیکوکاروں، پرہیزگاروں اور مخفی حال لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی ظاہری حالت تو اتنی خستہ اور عام نگاہوں میں اس قدر ناقابل توجہ ہوتی ہے کہ) جب وہ نظروں سے غائب ہوں تو ان کو پوچھا نہ جائے، اور جب موجود ہوں تو انہیں (کسی دعوت و مجلس میں) بلایا نہ جائے۔ اور اگر وہ بلائے بھی جائیں تو پاس نہ بٹھائے جائیں۔" (لیکن باطنی و روحانی طور پر ان کا مقام بہت بلند ہوتا ہے، چنانچہ، ان کے دل ہدایت کے چراغ ہیں (جن کے نور سے راہ راست پائی جاتی ہے) اور یہ لوگ ہر تاریک زمین سے نکل کر آتے ہیں (اس روایت کو ابن ماجہؒ نے اور شعب الایمان میں بیہقی نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: "تھوڑا ریا بھی شرک ہے" کا مطلب یہ ہے کہ ریاکاری اگر معمولی درجہ کی بھی ہو تو وہ بھی ایک بڑا شرک ہے۔" یا یہ کہ تھوڑا ریا شرک کی قسموں میں سے ایک قسم ہے۔ اور یہ چیز انسانی جبلت میں اس طرح پوشیدہ طور پر گھر کئے ہوئے ہے کہ اچھے اچھے لوگ اور مضبوط و پختہ ایمان والے بھی اپنے اعمال میں اس کی دخل اندازی کو پہچان نہیں پاتے اور کم ہی لوگ اس سے محفوظ رہتے ہیں، لہٰذا حضرت معاذؓ نے اپنے رونے کا ایک سبب تو اسی چیز کو بتایا کہ مجھ پر یہ خوف طاری ہے کہ کہیں غیر معلوم طور سے میرے اعمال پر بھی اس برائی کا سایہ نہ ہو، دوسرا سبب انہوں نے اولیاء اللہ کی ایذاء رسانی بتایا، یعنی انہوں نے گویا یہ بیان کیا کہ اکثر اولیاء اللہ اپنی اصلی حیثیت اور حقیقت کے اعتبار سے عام نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں، اور اپنی ظاہری حالت میں وہ ایک بہت معمولی درجہ کے مسلمان نظر آتے ہیں، ان کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کس بلند مقام پر فائز ہیں، اور خدا کی نظر میں ان کی کتنی بڑی حیثیت ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں (اللہ تعالیٰ فرماتا) ہے۔ اولیائی تحت قبائی لا یعرفھم غیر ھم اور ظاہر ہے کہ کوئی انسان اس بات سے خالی نہیں کہ وہ کسی مسلمان بھائی کے ساتھ کبھی بھی کوئی ایسی بدزبانی نہ کرے، جو گناہ کا باعث ہوتی ہے، لہٰذا حضرت معاذؓ نے بتایا کہ میں اس خوف سے رو رہا ہوں کہ مبادہ میں نے کسی مسلمان بھائی کے ساتھ قولاً یا فعلاً کوئی ایسا رویہ اختیار کیا ہو جو اس کے لئے اذیت کا باعث بن گیا ہو اور اس کی وجہ سے میں نے خدا کی ناراضگی مول لے لی ہو۔ گویا یہاں وَمَنْ عَادٰی لِلّٰہِ وَلِیًّا کے یہی معنی مراد لئے گئے ہیں۔

"نیکوکاروں" سے وہ لوگ مراد ہیں جو نیکی کرتے ہیں۔ اور نیکی کا مطلب یہ ہے اللہ تعالیٰ کی طاعت کرنا اور اس کی مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک اور احسان کرنا۔ چنانچہ اسی لئے بعض عارفین نے یہ کہا ہے کہ دین کا مدار احکام خداوندی کو (اعتقاداً اور عملاً) سب سے اہم اور قابل احترام جاننے اور مخلوق خداوندی کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آنے پر ہے۔

"پرہیزگاروں سے مراد وہ لوگ ہیں جو ہر طرح کے شرک سے بچتے ہیں، خواہ وہ شرک جلی ہو یا خفی شرک ہو، اور ہر اس چیز سے اجتناب و پرہیز کرتے ہیں جس کو خدا اور خدا کے رسول ﷺ نے ممنوع و حرام قرار دیا ہے، یا جو شریعت کی نظر میں نہایت ناپسندیدہ اور نہایت نامناسب ہے۔

"مخفی لوگوں" سے خدا کے وہ پاک نفس بندے مراد ہیں جو ظاہری وجہ، وضع و قطع اور رہن سہن کے اعتبار سے نہایت خستہ حالت میں رہتے ہیں اور معاشرہ کے لوگ (دنیادار) ان کو بہت کمزور و حقیر جانتے ہیں، مگر اپنے کردار و اخلاق باطنی احوال اور روحانی عظمت کے اعتبار سے نہایت بلند و بالا درجہ پر فائز ہوتے ہیں۔ یا وہ اہل اللہ مراد ہیں، جو دنیاداروں کی نظر سے پوشیدہ رہتے ہیں، اور ان کے درمیان رہن سہن نہیں رکھتے۔

"اِنَّ اللّٰہَ...... الخ" سے یہ جملہ استیناف ہے اور اس کے ذریعہ گویا "ولی" کی حقیقت بیان کرنا مقصود ہے چنانچہ پہلے تو نیکی، پرہیز

گاری اور اخفائے حال کی صفات کے ذریعہ اولیاء اللہ کی حقیقت بیان کی گئی اور پھر دنیاوالوں کے تعلق سے ان اولیاء اللہ کے تین احوال بیان کئے گئے کہ جب وہ کہیں باہر چلے جاتے ہیں اور سفر میں ہوتے ہیں تو کسی تقریب و مجلس آرائی کے وقت ان کی تلاش و جستجو نہیں ہوتی اور ان کا کوئی انتظار نہیں کیا جاتا، جب وہ موجود ہوتے ہیں تو ان کو اس مجلس و تقریب میں بلایا نہیں جاتا، اور اگر وہ اس تقریب و مجلس میں جاتے ہیں تو ان کو اہل مجلس نہ صرف یہ کہ کوئی اہمیت و وقعت نہیں دیتے بلکہ اپنے قریب بیٹھنے بھی نہیں دیتے اور انہیں پیچھے کہیں، دور بٹھلا دیتے ہیں۔ یہ گویا اس روایت کی تفصیل ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ رب اشعث اغبر لا یعبا بہ لو اقسم علی اللہ لابرہ، یعنی بعض ایسے لوگ بھی ہیں (بظاہر) پراگندہ بال و غبار آلودہ (خستہ حال) ہوتے ہیں اور ان کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی (لیکن خدا کے نزدیک وہ اتنا بلند مرتبہ رکھتے ہیں کہ) اگر وہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کر کے قسم کھالیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو سچا اور پورا کرے۔

"ان کے دل ہدایت کے چراغ ہیں" یعنی وہ پاک نفس لوگ راہ ہدایت کے مشعل بردار ہیں کہ وہ رہبری و پیشوائی کی اہلیت رکھتے ہیں اور ان کی اتباع کرنا راہ ہدایت پانے کی ضمانت ہے، پس وہ اس بات کے پوری طرح مستحق ہیں کہ ان کا لحاظ رکھا جائے اور وہ اس لائق ہیں کہ ان سے راہ ہدایت و راستی کی روشنی حاصل کی جائے۔

"ہر تاریک زمین سے نکل کر آتے ہیں" کے ذریعہ ان لوگوں کی مفلسانہ طرز زندگی، ان کے مکانات کی تیرگی و تاریکی اور خراب حالت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یعنی وہ لوگ اتنے مفلس و تہی دست ہوتے ہیں کہ اپنے گھر میں چراغ جلانے اور اپنے مکانات کو معمولی درجہ کا بھی قابل آسائش بنانے کے لئے اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے۔

اس حدیث میں یہ تنبیہ پوشیدہ ہے کہ اگر کسی عالم و صالح اور متقی شخص کی ظاہری حالت خراب و خستہ ہو تو ان کی ظاہری خستہ حالی اور ان کے لباس وغیرہ کی کہنگی و بوسیدگی سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے اور ان کی تعظیم و توقیر اور ان کے ادب و احترام کو ترک کر دینے کی غلطی نہ کرنی چاہئے کیونکہ کسی کے ظاہر کو دیکھ کر کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کا باطن درست ہے یا نہیں۔

خاکسار ان جہاں رابحقارت منگر ۔ توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

نیز یہ حدیث بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ محض فقر و افلاس، اور دنیاوی بے حیثیتی، کوئی فضیلت نہیں ہے جب تک کہ تقویٰ و پرہیزگاری اور باطن کی نورانیت حاصل نہ ہو۔

آخر میں ایک یہ بات بتادینی ضروری ہے کہ "ولی" اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جو متقی و پرہیزگار ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنْ اَوْلِيَآئُهُ اِلاَّ الْمُتَّقُوْنَ۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کے ولی وہی لوگ ہیں جو متقی و پرہیزگار ہوں) نیز شرح عقائد نسفی میں لکھا ہے کہ۔ "ولی وہ شخص ہے جو اپنی بساط بھر اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کا عرفان رکھتا ہو، طاعات و عبادات کا پابند ہو، گناہوں سے اجتناب کرتا ہو اور نفسانی لذات و خواہشات میں منہمک رہنے سے اعراض کرتا ہو۔

صدق واخلاص کی علامت

⑮ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ للّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا صَلَّى فِي الْعَلاَنِيَةِ فَاَحْسَنَ وَصَلَّى فِي السِّرِّ فَاَحْسَنَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى هٰذَا عَبْدِيْ حَقًّا۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بندہ جب کھلے طور پر (سب کے سامنے) نماز پڑھتا ہے اور خوبی کے ساتھ پڑھتا ہے (یعنی نماز کی تمام شرائط و واجبات سنن اور مستحبات کو ملحوظ رکھ کر پڑھتا ہے اور اسی طرح دیگر عبادات وطاعات بھی پورے آداب و شرائط کے ساتھ ادا کرتا ہے) اور جب پوشیدہ طور پر (یعنی تنہائی میں) پڑھتا ہے (تو اس وقت بھی اسی خوبی کے ساتھ پڑھتا ہے (جس خوبی کے ساتھ کہ سب کے سامنے پڑھتا ہے) تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا یہ بندہ صدق و راستی کا حامل ہے (کہ اس کی طاعت و عبادت ریاکاری

سے پاک ہے۔" (ابن ماجہؒ)

ریا کار لوگوں کے بارے میں پیشگوئی

(۱۶) وَعَنْ مُعَاذِ ابْنِ جَبَلٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَکُوْنُ فِیْ آخِرِ الزَّمَانِ اَقْوَامٌ اِخْوَانُ الْعَلَانِیَۃِ اَعْدَاءُ السَّرِیْرَۃِ فَقِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَکَیْفَ یَکُوْنُ ذٰلِکَ قَالَ ذٰلِکَ بِرَغْبَۃِ بَعْضِھِمْ اِلٰی بَعْضٍ وَرَھْبَۃِ بَعْضِھِمْ مِنْ بَعْضٍ۔

"اور حضرت معاذ ابن جبلؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔" آخر زمانہ میں ایسی قومیں اور جماعتیں بھی پیدا ہوں گی جو ظاہر میں تو دوست ثابت ہوں گی مگر باطن میں دشمنی کریں گے۔"

عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! ایسا کیونکر اور کس سبب سے ہوگا؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ایسا اس وجہ سے ہوگا کہ ان میں سے بعض، بعض سے غرض ولالچ رکھیں گے، اور بعض، بعض سے خوف زدہ ہوں گے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آخر زمانہ میں مسلمانوں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہوگی جو اپنی دنیاوی اغراض اور ذاتی مفاد کی تکمیل کے لئے منافقت اور ریا کاری کو اختیار کریں گے اور صدق واخلاص سے محروم رہیں گے نہ ان کی دوستی کا بھروسہ ہوگا، اور نہ ان کی دشمنی کا جس شخص وطبقہ سے ان کی کوئی غرض وابستہ ہوگی اس کی طرف رغبت والتفات رکھیں گے اور اس کے حق میں دوستی کا اظہار کریں گے۔ اگر کسی غرض ومفاد کا واسطہ درمیان میں نہیں ہوگا تو بیگانہ بن جائیں گے، بلکہ غرض ومفاد حاصل نہ ہونے کی صورت میں دشمنی وعداوت پر کمر بستہ ہو جائیں گے۔

اس سے واضح ہوا کہ شریعت کا جو یہ حکم ہے کہ مسلمان کی دوستی ودشمنی صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ہونی چاہئے تو مذکورہ لوگ اس مرتبہ سے گزرے ہوئے ہوں گے، کیونکہ ان کی دوستی ودشمنی کا تعلق اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے بجائے ذاتی اغراض فاسدہ اور مذموم مقاصد سے ہوگا چنانچہ جب وہ اپنے اغراض اور اپنے مفاد کے تحت کسی فرد یا جماعت کی طرف رغبت والتفات رکھیں گے تو اس کے تئیں دوستی والفت ظاہر کریں گے اور جب کسی وجہ سے کسی فرد یا جماعت کو ناپسند کریں گے تو ان کے خلاف بغض وعداوت ظاہر کریں گے۔

پس نہ تو لوگوں کے تئیں ان کی دوستی کا اعتبار ہوگا اور نہ ان کی عداوت کا، کیونکہ ان کی دوستی اور عداوت دونوں کی بنیاد، صدق واخلاص، اور پاکیزہ اغراض ومقاصد کے بجائے، ذاتی اغراض وخواہشات، اور نفع ونقصان پر ہوگی۔

دکھلاوے کا نماز روزہ شرک ہے

(۱۷) وَعَنْ شَدَّادِ ابْنِ اَوْسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ صَلّٰی یُرَائِی فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ صَامَ یُرَائِی فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِی فَقَدْ اَشْرَکَ۔ (رواھما احمد)

"اور حضرت شداد ابن اوسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔ "جس شخص نے دکھلانے کے لئے نماز پڑھی، اس نے شرک کیا، جس شخص نے دکھلانے کو روزہ رکھا اس نے شرک کیا، اور جس شخص نے دکھلانے کو صدقہ خیرات کیا اس نے شرک کیا۔" دونوں روایتوں کو احمدؒ نے نقل کیا ہے۔"

تشریح: حاصل یہ کہ ریا کاری کے تحت جو بھی نیک کام کیا جائے گا وہ شرک کے مرادف ہوگا اگرچہ اس کو شرک خفی کہا جائے گا، کیونکہ شرک جلی کا اطلاق علی الاعلان اور آشکارا طور پر بت پرستی کرنے پر ہوتا ہے رہی یہ بات کہ ریا کاری کو شرک خفی کس اعتبار سے کہا گیا ہے تو جاننا چاہئے کہ ریا کار جو نیک کام کرتا ہے وہ صدق واخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے نہیں کرتا بلکہ غیر اللہ کے لئے کرتا ہے اور جب اس نے کوئی نیک کام غیر اللہ کے لئے کیا تو گویا بت پرستی کی، اگرچہ وہ کھلی ہوئی بت پرستی نہیں ہے البتہ پوشیدہ طور پر بت پرستی کے مرادف ضرور

ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے۔ کل ماصدک عن اللہ فھو صنمک۔"

ملا علی قاری کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ ریا کا دخل روزہ میں بھی ہو سکتا ہے! اس اعتبار سے یہ حدیث گویا ان حضرات کے خلاف ایک دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ریا کا تعلق روزہ سے نہیں ہو سکتا، اور اس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ روزے کا مدار نیت پر ہے چنانچہ جس شخص کی نیت صحیح نہ ہو اس کے کھانے پینے سے رکنے کا کوئی اعتبار نہیں، اور ظاہر ہے کہ نیت میں ریا کاری یعنی دکھلاوے کا عمل دخل کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمارا کہنا یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ حقیقی معنی میں ریا، یعنی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی نیک کام اور کسی عبادت کا اس لئے قصد وارادہ کرتا ہے کہ اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرے مگر اس کے ساتھ ہی اس کی نیت میں یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ اس نیک کام اور عبادت کے ذریعہ اس کو شہرت حاصل ہو جائے، یا فلاں غرض پوری ہو جائے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی سے نہیں ہوتا، اور یہ الگ بات ہے کہ دونوں مقصد برابر ہوں یا ان میں سے ایک غالب ہو جیسا کہ ابتدائے باب میں تفصیل گزر چکی ہے پس معلوم ہوا کہ روزے میں بھی ریا کا عمل دخل ہو سکتا ہے۔

(۱۸) وَعَنْهُ اَنَّهُ بَکٰی فَقِیْلَ لَهٗ مَایُبْکِیْكَ قَالَ شَیْءٌ سَمِعْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ فَذَکَرْتُهٗ فَاَبْکَانِیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اَتَخَوَّفُ عَلٰی اُمَّتِیَ الشِّرْكَ وَالشَّهْوَةَ الْخَفِیَّةَ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَیُشْرِكُ اُمَّتُكَ مِنْ بَعْدِكَ قَالَ نَعَمْ اَمَا اِنَّهُمْ لَا یَعْبُدُوْنَ شَمْسًا وَلَا قَمَرًا وَلَا حَجَرًا وَلَا وَثَنًا وَلٰکِنْ یُرَاءُوْنَ بِاَعْمَالِهِمْ وَالشَّهْوَةُ الْخَفِیَّةُ اَنْ یُّصْبِحَ اَحَدُهُمْ صَائِمًا فَتَعْرِضُ لَهٗ شَهْوَةٌ مِنْ شَهَوَاتِهٖ فَیَتْرُكُ صَوْمَهٗ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت شداد ابن اوسؓ کے بارے میں منقول ہے کہ (ایک موقع پر وہ رونے لگے، پوچھا گیا کہ رونے کا سبب کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے اس بات نے رلایا ہے جو میں نے رسول ﷺ سے سنی تھی، اس وقت مجھے وہ بات یاد آگئی تو میں رونے پر مجبور ہو گیا، اور وہ بات یہ ہے کہ آپ (ﷺ) فرمایا کرتے تھے۔ میں اپنی اُمت پر شرک (یعنی شرک خفی) اور چھپی خواہشات سے خوف کھاتا ہوں۔

حضرت شداد کہتے ہیں کہ میں نے یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ کی اُمت آپ ﷺ کے بعد شرک میں مبتلا ہو جائے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ہاں! یاد رکھو، میری اُمت کے لوگ سورج کو نہیں پوجیں گے، چاند کو نہیں پوجیں گے، پتھر کو نہیں پوجیں گے اور کھلم کھلا بت پرستی نہیں کریں گے (یعنی وہ شرک جلی میں تو نہیں مبتلا ہوں گے) لیکن لوگوں کو دکھلانے کے لئے نیک کام کریں گے۔ (اور یہ شرک خفی ہے جس میں وہ مبتلا ہوں گے) اور چھپی خواہش یہ ہے کہ (مثلاً تم میں سے کوئی شخص روزہ کی حالت میں صبح کرے، اور پھر اس پر نفسانی خواہشات میں سے کسی خواہش کا غلبہ ہو جائے (جیسے کھانے کی خواہش غالب ہو جائے! یا جنسی خواہش جاگ اٹھے) اور وہ (اس خواہش کے غلبہ کی وجہ سے کھانا کھا کر یا ہم بستری کر کے) اپنا روزہ توڑ ڈالے (جب کہ شرعی طور پر قابل اعتبار کسی ضرورت و حالت کے پیش آنے کے بغیر روزہ توڑنا حرام ہے)۔" (احمدؒ، بیہقیؒ)

تشریح: مذکورہ خواہش کو "چھپی خواہش" اس اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ وہ روزہ کی نیت کے وقت گویا اس کے باطن میں پوشیدہ تھی، یعنی جب اس شخص نے روزہ کی نیت کی تھی اسی وقت اس نے اپنے نفس میں یہ خواہش چھپا رکھی تھی کہ اگر کوئی نفسانی تقاضا آیا تو روزہ توڑ دوں گا۔

واضح رہے کہ طیبیؒ نے تو "خواہش" سے مراد کھانے وغیرہ کو قرار دیا ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ "چھپی ہوئی خواہش" سے مراد نفسانی خواہشات میں سے خاص طور پر وہ نادر الوجود خواہش ہے۔ جو ہر وقت پیدا نہ ہوتی ہو، بلکہ کسی خاص موقع پر اور کسی خاص وقت پیدا ہو جاتی ہو، اور جب وہ خواہش سر ابھارتی ہو تو اس وقت اس کو پورا کرنے کا داعیہ طبعی طور پر اس طرح غالب آجاتا ہو کہ اس کی راہ میں کسی شرعی حکم کی مخالفت کا خوف بھی رکاوٹ نہ بناتا ہو، جیسا کہ روزہ کی مثال بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

فرمایا۔"

وَلَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَکُمْ۔" لیکن اس خواہش کی تکمیل کے لئے روزہ توڑنے والا یہ لحاظ نہ رکھے کہ میرے اس فعل کی وجہ سے خدا کے حکم کی صریح نافرمانی ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ از قسم عبادت وطاعت جو کام شروع کیا جاتا ہے وہ لازم ہو جاتا ہے اور اس کا پورا کرنا شرعا واجب ہوتا ہے۔

ریاکاری دجال کے فتنہ سے زیادہ خطرناک ہے

(۱۹) وَعَنْ اَبِی سَعِیْدٍ قَالَ خَرَجَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَتَذَاکَرُ الْمَسِیْحَ الدَّجَّالَ فَقَالَ اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِمَا ھُوَ اَخْوَفُ عَلَیْکُمْ عِنْدِیْ مِنَ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ فَقُلْنَا بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ الشِّرْکُ الْخَفِیُّ اَنْ یَّقُوْمَ الرَّجُلُ فَیُصَلِّیْ فَیَزِیْدُ صَلَاتَہٗ لِمَا یَرٰی مِنْ نَظَرِ رَجُلٍ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم لوگ آپس میں مسیح دجال کے فتنوں اور اس کے ابتلاء کا ذکر کر رہے تھے۔ کہ رسول کریم ﷺ آکر ہمارے درمیان تشریف فرما ہو گئے اور (پھر ہماری بات چیت سن کر) فرمانے لگے کہ کیا میں تمہیں اس چیز کے بارے میں نہ بتلاؤں جو میرے نزدیک (یعنی میری شریعت اور میرے طریق میں.... تمہارے حق میں مسیح دجال کے فتنہ سے بھی زیادہ خوفناک ہے (اور اس اعتبار سے اس کا لحاظ رکھنا اور اس سے اجتناب کرنا تمہارے لئے نہایت ضروری ہے) ہم نے عرض کیا کہ ہاں! یا رسول اللہ! اس چیز کے بارے میں ہمیں ضرور بتائیے) آپ ﷺ نے فرمایا وہ چیز شرک خفی ہے (اور شرک خفی اس چیز کو کہتے ہیں کہ) مثلاً ایک آدمی نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور نماز پڑھتا ہے اور اس نماز کے تمام ارکان یا بعض ارکان) میں (کیفیت یا کمیت کے اعتبار سے) غلو اور زیادتی کرتا ہے، محض اس لئے کہ کوئی شخص اس کو نماز پڑھتے دیکھ رہا ہے۔" (ابن ماجہ)

تشریح: "ریاکاری کی برائی کو دجال کے فتنہ سے زیادہ خوفناک اور پر خطر اس لئے فرمایا گیا ہے کہ دجال کے جھوٹے ہونے اور اس کی فتنہ انگیزیوں کو ظاہر کرنے کی نشانیاں اور علامتیں بہت ہیں اور بالکل کھلی ہوئی ہیں، جو صاحب صدق وایمان کی اس سے محفوظ رکھنے کے لئے کافی ہوں گی۔"

جب کہ ریاکاری کا معاملہ نہایت پوشیدہ ہے اور جس کی برائی وفتنہ انگیزی میں ہر عمل میں، ہر وقت اور ہر طرح سے معلوم نہیں ہو سکتی اور یہی وجہ ہے کہ اچھے اچھے لوگ بھی اس کے جال میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔"

ریاکاری شرک اصغر ہے

(۲۰) وَعَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ لَبِیْدٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَیْکُمُ الشِّرْکُ الْاَصْغَرُ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَا الشِّرْکُ الْاَصْغَرُ قَالَ الرِّیَآءُ۔ رَوَاہُ اَحْمَدُ وَزَادَ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ یَقُوْلُ اللّٰہُ لَھُمْ یَوْمَ یُجَازِی الْعِبَادَ بِاَعْمَالِھِمْ اِذْھَبُوْا اِلَی الَّذِیْنَ کُنْتُمْ تُرَاءُوْنَ فِی الدُّنْیَا فَانْظُرُوْا ھَلْ تَجِدُوْنَ عِنْدَھُمْ جَزَآءً اَوْ خَیْرًا۔

"اور حضرت محمود ابن لبیدؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔" (مسلمانو) بہت زیادہ خوفناک چیز کہ جس سے میں تمہیں ڈراتا ہوں، شرک اصغر (چھوٹے درجہ کا شرک) ہے۔" صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ اور وہ شرک اصغر کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ریا" اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ، اللہ تعالیٰ اس دن کہ جب وہ بندوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دے گا۔ (یعنی قیامت کے دن) ریاکاروں سے فرمائے گا کہ تم ان لوگوں کے پاس جاؤ جن کو دکھلانے کے لئے تم عمل کرتے تھے اور دیکھو کہ تمہیں ان کے پاس جزا۔ یا بھلائی ملتی ہے؟"

اخلاص عمل کا اثر

(۲۱) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَوْ اَنَّ رَجُلاً عَمِلَ عَمَلاً فِیْ صَخْرَۃٍ لاَّ بَابَ لَھَا وَلاَ کُوَّۃَ خَرَجَ عَمَلُہٗ اِلَی النَّاسِ کَائِنًا مَا کَانَ۔

"اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اگر کوئی شخص کسی ایسے بڑے پتھر کے اندر بھی کوئی نیک کام کرے کہ جس میں نہ تو کوئی دروازہ ہو، اور نہ کوئی روشن دان، تو اس کا وہ عمل لوگوں میں مشہور ہو جائے گا" خواہ وہ عمل کسی طرح کا ہو۔"

تشریح: "صخرۃ" اصل میں تو بڑے پتھر کو کہتے ہیں لیکن یہاں اس لفظ سے غار مراد ہے! اور ہو سکتا ہے کہ اس لفظ سے اس کے اصل معنی یعنی بڑا پتھر ہی مراد ہو، اس صورت میں کہا جائے گا کہ مذکورہ مفہوم میں اس لفظ کا استعمال بطور مبالغہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کوئی شخص پتھر کے اندر بھی گھس کر کوئی نیک کام کرے کہ جس میں نہ کوئی دروازہ ہوتا ہے اور نہ کوئی روشن دان، اور اس طرح اس پتھر کے اندر نہ تو داخل ہو کر اور نہ باہر سے جھانک کر دیکھا جا سکتا ہے کہ اندر کون شخص کیا کام کر رہا ہے تو اس صورت میں بھی وہ شخص اپنے اس نیک کام کے ساتھ لوگوں میں مشہور ہو جاتا ہے۔

کُوَّۃٌ یا کَوَّۃٌ اس سوراخ کو کہتے ہیں جو دیوار و چھت میں ہوتا ہے! بعض حضرات نے اس لفظ کی یہ تفصیل بیان کی ہے کہ اگر وہ سوراخ آرپار ہو تو اس کو کُوَّۃٌ (یعنی کاف کے پیش کے ساتھ) کہا جاتا ہے، اور اگر آرپار نہ ہو تو "کوۃ" (کاف کے زبر کے ساتھ) کہلائے گا، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر یہ لفظ حرف تاء کے ساتھ یعنی کوہ ہو تو اس کے معنی اس سوراخ کے ہوں گے جو چھوٹا اور تنگ ہو، اور اگر حرف تاء کے بغیر یعنی "کو" ہو تو اس صورت میں اس کے معنی اس سوراخ کے ہوں گے جو بڑا اور کشادہ ہو! اس روایت میں یہ لفظ چونکہ، حرف تا کے ساتھ ہے اس لئے یہاں اس کے معنی اس سوراخ کے ہوں گے جو چھوٹا اور آرپار ہو اور حدیث کے مفہوم کے اعتبار سے یہی معنی مناسب بھی ہیں۔

بہر حال، حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اچھے کام خواہ کتنے ہی پوشیدہ طور پر اور کیسی ہی تنہائی میں کیوں نہ کئے جائیں، اور اس بات کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے کہ وہ (اچھے کام) لوگوں کے علم میں نہ آئیں مگر پھر بھی وہ لوگوں پر عیاں ہو جاتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی مصلحت اگر خود اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ بندوں کے نیک عمل جو صدق و اخلاص کے ساتھ صادر ہوتے ہیں، لوگوں پر آشکارا ہوں، تاکہ ایک دوسرے کو اسی طرح نیک راہ اختیار کرنے کی ترغیب حاصل ہو تو پھر اس کی کیا ضرورت ہے کہ کوئی شخص اپنے نیک عمل کو ظاہر کرنے کے لئے ریاکاری کی حد تک پہنچ جائے اور اس کی قبولیت و ثواب سے خواہ مخواہ محروم رہے۔

یا حدیث کے یہ معنی ہیں کہ۔ مخلص بندہ کو چاہئے کہ وہ اپنے اچھے کاموں کو چھپائے اور اخلاص حاصل کرنے میں زیادہ سے زیادہ احتیاط و سعی کرے کیونکہ بندوں کے نیک عمل ایسی جگہوں سے بھی ظاہر ہو جاتے ہیں جہاں سے ظاہر ہو جانے کی ان کو خبر بھی نہیں ہوتی، اور جن کے آشکارا ہونے میں اس کے قصد و اختیار کو دخل بھی نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ ہر پوشیدہ اچھی یا بری عادت کو آشکارا کر دیتا ہے

(۲۲) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ کَانَتْ لَہٗ سَرِیْرَۃٌ صَالِحَۃٌ اَوْ سَیِّئَۃٌ اَظْھَرَ اللّٰہُ مِنْھَا رِدَاءً یُعْرَفُ بِہٖ۔

"اور حضرت عثمان ابن عفانؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جس شخص کے اندر کوئی اچھی یا بری عادت و خصلت چھپی ہوئی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس عادت و خصلت کو نمایاں کر دینے والی کوئی ایسی چیز پیدا کر دیتا ہے جس کے ذریعہ وہ شخص اس عادت و خصلت کے ساتھ شناخت کر لیا جاتا ہے۔"

نفاق کی برائی نہایت خوفناک ہے

۲۳ وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّمَا أَخَافُ عَلٰى هٰذِهِ الْأُمَّةِ كُلَّ مُنَافِقٍ يَتَكَلَّمُ بِالْحِكْمَةِ وَيَعْمَلُ بِالْجَوْرِ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ الْاَحَادِيْثَ الثَّلٰثَةَ فِي شُعَبِ الْإِيْمَانِ۔

"اور حضرت عمر ابن الخطابؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "میں اس اُمت (یعنی اُمت محمدیہ ﷺ) کے بارے میں جس چیز سے ڈرتا ہوں وہ ہر منافق (یعنی ریاکار یا فاسق) کا شر ہے جو باتیں تو علم وحکم اور موعظمت ونصیحت کی کرتا ہے، لیکن کام ظلم وزیادتی اور ناراستی کے کرتا ہے۔" ان تینوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: یہ ان لوگوں کی خصلت بتائی گئی ہے جو لوگوں کو دکھانے کے لئے باتیں تو بڑی اچھی اچھی کرتے ہیں مگر خود ان باتوں پر عمل کرتے نہیں اور اسی چیز کو نفاق کہا جاتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنی امت کے حق میں ایسے ہی لوگوں کے وجود اور اس بری خصلت سے ڈرتا ہوں کہ مبادا اس قسم کے لوگ میری اُمت میں پیدا ہو جائیں گے اور یہ بری خصلت اس اُمت محمدیہ کے درمیان راہ پاکر مسلمانوں کو فتنہ وفساد اور آلام ومصائب میں مبتلا کر دے۔

حسن نیت کی اہمیت

۲۴ وَعَنِ الْمُهَاجِرِ بْنِ حَبِيْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى إِنِّيْ لَسْتُ كُلَّ كَلَامِ الْحَكِيْمِ أَتَقَبَّلُ وَلٰكِنِّيْ أَتَقَبَّلُ هَمَّهُ وَهَوَاهُ فَإِنْ كَانَ هَمُّهُ وَهَوَاهُ فِيْ طَاعَتِيْ جَعَلْتُ صَمْتَهُ حَمْدًا لِّيْ وَوَقَارًا وَإِنْ لَّمْ يَتَكَلَّمْ۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت مہاجر ابن جیبؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں عقلمند ودانشور کی ہر بات کو قبول نہیں کرتا (یعنی میرا دستور یہ نہیں ہے کہ عالم وفاضل اور عقلمند ودانا شخص جو بات بھی کہے اس کو قبول کرلوں) بلکہ میں اس کے قصدوارادہ اور محبت ونیت کو قبول کرتا ہوں (یعنی یہ دیکھتا ہوں کہ اس نے جو بات کہی ہے وہ کس قصدوارادہ اور کس نیت کے ساتھ کہی ہے۔) پس اگر اس کی نیت ومحبت میری طاعت وفرمانبرداری کے تئیں ہوتی ہے تو میں اس کی خاموشی کو (بھی) اپنی حمد وثنا اور اس کے حلم و وقار کے مرادف قرار دیتا ہوں اگرچہ وہ کوئی بات نہ کہے۔" (دارمیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ خدا کے نزدیک محض گفتار کے غازی کی کوئی اہمیت نہیں ہے، وہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ بات کہنے والا دانش وحکمت سے قطع نظر اپنی نیت میں کتنا مخلص ہے۔ اگر وہ خدا کی اطاعت وفرمانبرداری کی نیت اور اپنے دل میں خدا کے احکام کی محبت وعظمت رکھتا ہے تو اس کی خاموشی بھی علم ووقار کا مایۂ افتخار اور خدا کے نزدیک مستحسن ومحمود قرار پاتی ہے کہ اگر وہ زبان سے کچھ نہ کہے تو بھی وہ ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ خدا کی حمد وثنا میں رطب اللسان ہے۔ اور اگر اس کی نیت خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری کی نہ ہو، اور اس کے دل میں احکام خداوندی کی عظمت ومحبت کا فقدان ہو تو اس کی ہر بات لغو اور ناقابل اعتناء قرار پاتی ہے، اگرچہ اس کے الفاظ ومعنی علم وحکمت سے کتنے ہی پر کیوں نہ ہوں کیونکہ اس صورت میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھا جاسکتا کہ وہ ریاکاری میں مبتلا ہے اور جو بھی بات کہہ رہا ہے، اس کا مقصد لوگوں کو دکھانا سنانا، اور اس کے ذریعہ شہرت وناموری حاصل کرنا ہے۔"

بَابُ الْبُكَاءِ وَالْخَوْفِ

رونے اور ڈرنے کا بیان

"بُكَاء" کے معنی ہیں رونا آنسو بہانا۔ اگر یہ لفظ مد کے بغیر، یعنی "بکا" ہو تو اس کا اطلاق کسی غم وحزن کی وجہ سے صرف آنسو بہنے پر

ہوتا ہے، اور اگر یہ لفظ مد کے ساتھ، یعنی بکاء ہو تو اس کا اطلاق آواز کے ساتھ رونے اور آنسو بہانے پر ہوتا ہے اور زیادہ مشہور مد کے ساتھ ہی ہے نیز ظاہر یہ ہے کہ عنوان بالا میں اس لفظ کا عام مفہوم مراد ہے یعنی رونا، خواہ خاموش آنسو بہانے کی صورت میں ہو یا بلند آواز کے ساتھ رونے کی صورت میں اسی سے تباکی کا لفظ نکلا ہے جس کے معنی ہیں رونے کی صورت بنانا، یہ تکلف رونا اور ان چیزوں کو کہ جن سے رونا آئے۔ مباد اور بیان کر کر کے زبردستی رونا! ابکاء بھی اسی لفظ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی کو رلانا۔

"خوف" کے معنی ہیں ڈرنا، دہشت کھانا۔ اسی لفظ سے اخافت اور تخویف ہے، جس کے معنی ہیں ڈرانا واضح رہے کہ "خوف" ایک خاص کیفیت و حالت کا نام ہے جو پیش آتی ہے۔

حاصل یہ کہ رونے اور ڈرنے سے مراد آخرت کے عذاب اور اللہ تعالیٰ کے عقاب و عتاب سے ڈرنا اور ان چیزوں کے خوف سے رونا گڑگڑانا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

زیادہ ہنسنا آخرت کی ہولناکیوں سے بے فکری کی علامت ہے

① عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ اَبُوالْقَاسِمِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَبَکَیْتُمْ کَثِیْرًا وَلَضَحِکْتُمْ قَلِیْلًا۔ (رواہ البخاری)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ابوالقاسم (محمد) ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر تم اس چیز کو جان لو جس کو میں جانتا ہوں تو یقیناً تمہارا رونا زیادہ اور ہنسنا کم ہو جائے (یعنی قیامت کے احوال اور اس کی ہولناکیاں، مبدأ و معاد کی حقیقت گنہگاروں کے تئیں اللہ تعالیٰ کا عتاب و عذاب یوم حساب کی شدت پرسش اور باری تعالیٰ کی صفات قہریہ وجلالیہ کو، جو خوف و مصیبت کا باعث ہیں جس قدر میں جانتا ہوں اور پھر ان چیزوں کے تعلق سے تمہارے انجام کار کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم ہے اور جس کی وجہ سے میرے دل پر ہر وقت غم و خوف طاری رہتا ہے اگر تم بھی ان سب چیزوں سے پوری طرح آگاہ ہو جاؤ تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خوف ہیبت کے مارے تم ہنسنا بھول جاؤ اور اپنا زیادہ وقت رونے اور غم کھانے میں صرف کرو، کیونکہ اس صورت میں تم رجا یعنی رحمت خداوندی کی امید کے مقابلہ پر عذاب خداوندی کے خوف کو زیادہ ترجیح دینے لگو گے)۔" (بخاری)

تشریح: اس ارشاد گرامی میں اُمت کے لئے ایک تنبیہ تو یہ ہے کہ اپنے اوپر گریہ طاری رکھنا چاہئے اور ان چیزوں کی یاد تازہ رکھنی چاہئے جو رونے ورلانے اور غم کھانے کا باعث ہوتی ہیں جیسے خوف خداوندی کا احساس اور عظمت و جلال حق کی حقیقت معلوم کرنا دوسری تنبیہ یہ ہے کہ جاہل و غافل لوگوں کی طرح بہت زیادہ ہنسنے اور راحت و چین اختیار کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عفو و مغفرت اور اس کی رحمت پر امید کی وجہ سے فی الجملہ راحت و چین اختیار کرنا ایک حد تک گنجائش رکھتا ہے۔

کسی کے اخروی انجام کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا

② وَعَنْ اُمِّ عَلَاءِ الْاَنْصَارِیَّةِ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهِ لَا اَدْرِیْ وَاَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ام العلاء انصاریہؓ کہتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ باوجودیکہ میں اللہ کا رسول ہوں لیکن خدا کی قسم یہ نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص کی عاقبت کا معاملہ غیر معلوم ہے کوئی نہیں جانتا کہ کون شخص کیا عمل کرے گا اور اس

کا آخری انجام کیا ہوگا؟ تاہم واضح رہے کہ انبیاء اور رسولوں اور خصوصاً سید المرسلین ﷺ کی عاقبت کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی کیونکہ ان حضرات کے بارے میں ایسی دلائل قطعیہ منقول ہیں جو واضح طور پر بتاتی ہیں کہ انبیاء خصوصاً حضور ﷺ کی عاقبت کا بخیر ہونا ایک یقینی امر ہے! لہٰذا حضور ﷺ کے اس ارشاد کہ میں یہ نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ کو اس مخصوص پس منظر میں رکھ کر دیکھنا چاہئے جس میں یہ حدیث حضور ﷺ نے ارشاد فرمائی تھی اور وہ یہ کہ ایک صحابی حضرت عثمان ابن مظعونؓ جو اونچے درجہ کے مہاجر صحابہ میں سے تھے، ان کا مدینہ میں انتقال ہوا اور خاص بات یہ کہ مدینہ میں مہاجرین میں سے سب سے پہلے جن صحابی کا انتقال ہوا ہے وہ یہی تھے چنانچہ حضور ﷺ نے اپنی ذاتی نگرانی میں ان کی تجہیز وتکفین کا انتظام فرمایا، ان کے جنازے کے ساتھ نہایت عزت وتکریم کا معاملہ کیا ان کی پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر اپنے سامنے بقیع میں ان کو سپرد خاک کرایا، اس موقع پر ایک خاتون، جو وہاں موجود تھیں اور حضرت عثمانؓ کے تئیں حضور ﷺ کی یہ محبت وعنایات دیکھ رہی تھیں کہنے لگیں "عثمان تمہیں جنت مبارک ہو کہ تمہاری عاقبت و انجام بخیر ہے" اس وقت حضور ﷺ نے ان خاتون کو سرزنش کی اور مذکورہ حدیث ارشاد فرمائی، لہٰذا اس حدیث کا مقصد دراصل حضور ﷺ کے سامنے ایک غیر موزوں بات زبان سے نکالنے کی جرأت وگستاخی پر بطریق مبالغہ سرزنش کرنا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ بات اس طرح بھی کہی جاسکتی ہے کہ حضور ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا تو ان الفاظ سے آپ ﷺ کی مراد ان کے حقیقی معنی نہیں تھے، بلکہ آپ ﷺ نے ان الفاظ کے ذریعہ بطور کنایہ یہ فرمایا کہ کسی دوسرے شخص کی عاقبت کے بارے میں کوئی یقینی بات کہنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا خود میرا معاملہ یہ ہے کہ اگرچہ میں خدا کا رسول ہوں اور میری عاقبت کا بخیر ہونا ایک یقینی امر ہے مگر چونکہ عاقبت کا معاملہ علم غیب سے تعلق رکھتا ہے اس لئے میں ازراہ ادب اپنی عاقبت کے بارے میں بھی تصریح نہیں کرسکتا اور یہ نہیں بتاسکتا کہ آخرت میں میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔

یا اس ارشاد گرامی کی مراد یہ ہے کہ اگرچہ میں خدا کا رسول ہوں لیکن کسی کی عاقبت اور انجام کار کے بارے میں تفصیل کے ساتھ مجھے بھی کچھ معلوم نہیں ہے کہ کون شخص دنیا میں کس انجام کو پہنچے گا اور آخرت میں کس احوال سے دوچار ہوگا کیونکہ اس طرح کے احوال کا تعلق غیب سے ہے اور غیب کی تفصیلی باتیں عالم الغیب (اللہ تعالیٰ) کے سوا کسی کو معلوم نہیں، گو اجمالی طور پر اتنا ضرور معلوم ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کی عاقبت بخیر ہے ملا علی قاری نے اسی احتمال کو صحیح لکھا ہے۔

ایک احتمال یہ بھی بیان کیا جاتا ہے۔ کہ مذکورہ ارشاد سے حضور ﷺ کی مراد یہ تھی کہ مجھے یہ نہیں معلوم کہ میں اس دنیا سے کس طرح رخصت ہوں گا اور میری موت کن حالات میں واقع ہوگی، آیا اپنی موت سے مروں گا یا کوئی شخص مجھے قتل کردے گا اسی طرح مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ جس طرح پچھلی امتوں پر خدا کا عذاب نازل ہوتا تھا اس طرح تم پر بھی کوئی ہلاکت خیز عذاب نازل ہوسکتا ہے یا نہیں؟

اور زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد گرامی اس آیت کریمہ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ کے نازل ہونے سے قبل کا ہے، چنانچہ پہلے تو عاقبت کے بارے میں ابہام تھا کہ کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی تھی۔ مگر اس آیت کے نازل ہونے کے بعد یہ ابہام دور ہوگیا اور یقین کے ساتھ یہ معلوم ہوگیا کہ آپ ﷺ کی عاقبت بخیر ہے۔

دوزخ کے بارے میں حضور ﷺ کا ایک مشاہدہ

(۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُرِضَتْ عَلَيَّ النَّارُ فَرَاَيْتُ فِيْهَا امْرَاَةً مِنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ تُعَذَّبُ فِيْ هِرَّةٍ لَهَا رَبَطَتْهَا فَلَمْ تُطْعِمْهَا وَلَمْ تَدَعْهَا تَاْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْاَرْضِ حَتّٰى مَاتَتْ جُوْعًا وَرَاَيْتُ عَمْرَو ابْنِ عَامِرِ الْخُزَاعِيِّ يَجُرُّ قُصْبَهُ فِي النَّارِ وَكَانَ اَوَّلَ مَنْ سَيَّبَ السَّوَائِبَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا معراج کی رات میں یا اور کسی موقعہ پر حالت خواب یا بیداری ہی میں میرے سامنے دوزخ کی آگ (دکھانے کے لئے) لائی گئی تو میں نے اس میں بنی اسرائیل کی ایک عورت کو (جلتے ہوئے) دیکھا (جو بنی اسرائیل کی اہل ایمان میں سے تھی) اس کو ایک بلی کے معاملہ میں عذاب دیا جارہا تھا جس کو اس نے باندھ چھوڑا تھا، نہ تو اس کو کچھ کھانے پینے کے لئے دیا کرتی تھی اور نہ اس کو کھولتی ہی تھی کہ وہ (چل کر) حشرات الارض (یعنی چوہوں وغیرہ) میں سے کچھ کھالے، اور آخر کار وہ بلی بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرگئی۔ نیز میں نے دوزخ میں عمرو ابن عامر خزاعی کو بھی دیکھا جو اپنی آنتوں کو دوزخ کی آگ میں کھینچ رہا تھا یہ وہ سب سے پہلا شخص تھا جس نے اونٹنی چھوڑنے کی رسم نکالی تھی۔" (مسلم)

تشریح: "سوائب" اصل میں "سائبۃ" کی جمع ہے اور سائبہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو زمانہ جاہلیت میں نذر وغیرہ کے لئے چھوڑی جاتی تھی، چنانچہ اہل عرب کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی اونٹنی سارے بچے مادہ ہی مادہ جنتی، یا کوئی شخص دور دراز کے سفر سے واپس آتا، اور یا کوئی مریض صحت یاب ہوتا تو وہ اونٹنی کو آزاد چھوڑ دیتے تھے کہ نہ تو اس پر سوار ہوتے اور نہ اس کا دودھ دوہتے، وہ جہاں چاہتی چرتی پھرتی، کوئی شخص اس کو اپنے گھاس پانی وغیرہ سے روکتا نہیں تھا، وہ لوگ اس کام کو ایک عبادت اور اپنے بتوں کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ جانتے تھے، اس رسم کو سب سے پہلے جس نے جاری کیا وہ عمرو ابن عامر خزاعی تھا۔ علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے بت پوجنے کی رسم نکالی اور بت پرستی کو تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا وہ بھی یہی عمرو ابن عامر تھا۔ بعض روایتوں میں یہ نام عمرو ابن عامر کے بجائے عمرو ابن لحی بیان کیا گیا ہے اور بظاہر یہ دونوں نام ایک ہی شخص کے ہیں عامر تو اس کے باپ کا نام تھا اور لحی اس کے دادا کا نام تھا یا اس کے برعکس تھا کہ باپ کا نام تو "لحی" اور دادا کا نام "عامر" تھا چنانچہ کسی روایت میں باپ کی طرف نسبت کر کے اور کسی روایت میں دادا کی طرف نسبت کر کے اس کا ذکر کیا گیا۔

کرمانی نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ابھی سے دوزخ میں ڈالے جاچکے ہیں اور وہاں عذاب بھگت رہے ہیں۔ تاہم یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس ارشاد گرامی کا تعلق اس بات سے ہے کہ آنحضرت ﷺ پر دوزخ کا وہ احوال منکشف کیا گیا جو قیامت کے دن پیش آئے گا اور آپ کو اس کی صورت دکھائی گئی کہ قیامت کے دن مذکورہ عورت اور عمرو ابن عامر کو دوزخ میں اس طرح ڈالا جائے گا اور ان کو اس طرح عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔

فسق وفجور کی کثرت پوری قوم کے لئے موجب ہلاکت ہے

④ وَعَنْ زَيْنَبَ بِنْتِ جَحْشٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلَيْهَا يَوْمًا فَزِعًا يَقُوْلُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَيْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ مِثْلَ هٰذِهٖ وَحَلَّقَ بِاَصْبَعَيْهِ الْاِبْهَامَ وَالَّتِيْ تَلِيْهَا قَالَتْ زَيْنَبُ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَنَهْلِكُ وَفِيْنَا الصَّالِحُوْنَ قَالَ نَعَمْ اِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت زینب بنت جحشؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول کریم ﷺ ان کے ہاں ایسی حالت میں تشریف لائے کہ جیسے بہت گھبرائے ہوئے ہیں! پھر فرمانے لگے کہ "اللہ کے سوا کوئی معبود عبادت کے لائق نہیں۔ افسوس صد افسوس عرب کے اس شر وفتنہ پر، جو اپنی ہلاکت آفرینی کے ساتھ قریب آپہنچا ہے۔ آج یاجوج ماجوج کی دیوار میں اس قدر سوراخ ہوگیا ہے۔ یہ کہہ کر آپ ﷺ نے انگوٹھے اور برابر والی انگلی کے ذریعہ حلقہ بنایا، حضرت زینبؓ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! کیا ہم اس صورت میں بھی ہلاک کر دیئے جائیں گے جب کہ ہمارے درمیان صالح وپاکباز لوگ موجود ہوں گے؟ کیا ہمارے درمیان خدا کے نیک بندوں کے وجود کی برکت ان فتنوں کے پھیلنے اور آفات وبلاؤں کے نازل ہونے میں رکاوٹ نہیں بنے گی؟ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں! تمہارے درمیان علماء اور بزرگان دین کی موجودگی کے باوجود تمہیں ہلاکت وتباہی میں مبتلا کیا جائے گا جب کہ فسق وفجور کی کثرت ہوگی (یعنی جب معاشرہ میں برائیاں بہت

پھیل جائیں گی اور ہر طرف فسق وفجور کا دورہ ہو گا تو ان برائیوں اور فسق وفجور کے سبب نازل ہونے والے فتنہ والام اور آفات کو صلحاء اور بزرگوں کی موجودگی اور ان کی برکت بھی نہیں روک سکے گی۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "شر" سے حضور ﷺ کی مراد اس فتنہ وفساد اور قتل وقتال کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا جس کی ابتداء مستقبل میں ہونے والی تھی اور جس کا شکار سب سے پہلے اہل عرب بننے والے تھے، چنانچہ قلب نبوت نے اہل اسلام کو افتراق و انتشار میں مبتلا کرنے والے جن واقعات کا بہت پہلے ادراک کر لیا تھا اور مذکورہ ارشاد کے ذریعہ گویا ان کے بارے میں پیش گوئی فرمادی تھی ان کی ابتداء خلیفہ ثالث حضرت عثمان ابن عفانؓ کے سانحہ شہادت سے ہوئی اور جن کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں اب تک جاری ہے، بعض حضرات نے یہ مراد بیان کی ہے کہ حضور ﷺ نے گویا اس طرف اشارہ فرمایا کہ جب اہل عرب کو اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سبب دشمنوں کے مقابلہ پر فتوح حاصل ہوں گی، دوسرے ملکوں پر غلبہ و اقتدار حاصل ہو گا اور مال و دولت کی ریل پیل ہو گی تو اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہو گا کہ لوگوں کے خلوص وللّٰہیت میں کمی آجائے گی، حکومت و اقتدار اور مال وزر سے رغبت و محبت پیدا ہو جائے گی، دنیا طلبی وجاہ پسندی اور خود غرضی کا عفریت باہمی مخالفت ومخاصمت اور افتراق و انتشار کے ذریعہ پوری ملت کو متاثر کر دے گا۔

"حلقہ بنایا" یعنی آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کے ذریعہ حلقہ بنا کر دکھایا کہ اس دیوار میں آج تک کبھی کوئی سوراخ نہیں ہوا تھا۔ لیکن آج اس میں اتنا بڑا سوراخ ہو گیا ہے جتنا کہ ان دونوں انگلیوں کے ذریعہ بنایا گیا حلقہ ہے۔ واضح رہے کہ اس دیوار میں سوراخ کا ہو جانا قرب قیامت کی علامات میں سے ہے جس طرح کہ عرب اور اہل عرب میں فتنہ وفساد کا بیج پڑ جانا اور برائیوں کا پھیل جانا بھی قیامت کے قریب آجانے کی ایک دلیل ہے اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے یاجوج ماجوج کی دیوار میں سوراخ ہو جانے کی بات کہہ کر گویا اس علاقہ سے اٹھنے والے ایک عظیم فتنہ اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو پہنچنے والے سخت نقصان کی طرف اشارہ کیا، چنانچہ تاریخ کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ حضور ﷺ نے جس فتنہ کی طرف اشارہ فرمایا تھا وہ چنگیزیت کی صورت میں اسی علاقہ سے اٹھا اور جس نے بڑی بڑی اسلامی حکومتوں کو نقصان پہنچایا یہاں تک کہ ہلاکو خاں کی سربراہی میں تاتاری ترکوں کے سیلاب نے اسلامی خلافت کو بہا ڈالا، خلیفہ معتصم باللہ کو قتل کیا بغداد کو لوٹ کر تباہ وتاراج کیا اور لاکھوں مسلمانوں کا خون بہایا اور پوری ملت اسلامیہ کو بڑی بڑی جہادوں سے دوچار کیا۔

لفظ "خَبَث" خ اور ب کے زبر کے ساتھ فسق وفجور اور کفر وشرک کے معنی میں ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس کے معنی بدکاری (زنا) کے ہیں! حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی جگہ آگ لگتی ہے بھڑک اٹھتی ہے تو پھر وہ ہر ایک چیز کو جلا ڈالتی ہے کیا خشک اور کیا تر، ہر ایک کو بھسم کر دیتی ہے، حلال اور حرام، پاک اور ناپاک جو بھی چیز اس شعلوں کی لپیٹ میں آتی ہے جل کر خاک ہو جاتی ہے، مؤمن اور کافر، موافق اور مخالف کسی کے درمیان فرق نہیں کرتی، جو شخص بھی اس کی زد میں آجاتا ہے راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے اسی طرح عذاب الٰہی کا معاملہ ہے کہ جب کسی ملک میں، کسی علاقہ میں اور روئے زمین کے کسی حصہ پر برائیوں کا دور دورہ ہو جاتا ہے، بدکاریاں عام ہو جاتی ہیں، فواحش کی کثرت ہو جاتی ہے اور فسق وفجور کا غلبہ ہو جاتا ہے اور اس کے سبب وہاں کے لوگوں پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے تو پھر کسی کی کوئی تخصیص نہیں رہ جاتی! بدکار اور سرکش لوگ تو تباہ برباد ہوتے ہی ہیں نیکوکار وپاکباز لوگ بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں یہ اور بات ہے کہ جب قیامت میں ساری مخلوق کو دوبارہ اٹھایا جائے گا تو اس وقت ہر شخص کے ساتھ اس کے عمل کے مطابق ہی سلوک ہو گا۔

ایک نسخے میں یہ لفظ خ کے پیش اور ب کے جزم کے ساتھ یعنی خُبث منقول ہے جس کے معنی فواحش اور فسوق کے ہیں! ویسے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔

خسف اور مسخ کا عذاب اس اُمت کے لوگوں پر بھی نازل ہو سکتا ہے

⑤ وَعَنْ اَبِیْ عَامِرٍ اَوْ اَبِیْ مَالِكٍ الْاَشْعَرِیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَيَكُوْنَنَّ مِنْ اُمَّتِیْ اَقْوَامٌ يَسْتَحِلُّوْنَ الْخَزَّ وَالْحَرِيْرَ وَالْخَمْرَ وَالْمَعَازِفَ وَلَيَنْزِلَنَّ اَقْوَامٌ اِلٰى جَنْبِ عَلَمٍ يَرُوْحُ عَلَيْهِمْ بِسَارِحَةٍ لَهُمْ يَاْتِيْهِمْ رَجُلٌ لِحَاجَةٍ فَيَقُوْلُوْنَ ارْجِعْ اِلَيْنَا غَدًا فَيُبَيِّتُهُمُ اللّٰهُ وَيَضَعُ الْعَلَمَ وَيَمْسَخُ اٰخَرِيْنَ قِرَدَةً وَّخَنَازِيْرَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ. رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ وَفِیْ بَعْضِ نُسَخِ الْمَصَابِيْحِ الْحِرَ بِالْحَاءِ وَالرَّاءِ الْمُهْمَلَتَيْنِ وَهُوَ تَصْحِيْفٌ وَاِنَّمَا هُوَ بِالْخَاءِ وَالزَّاءِ الْمُعْجَمَتَيْنِ نَصَّ عَلَيْهِ الْحُمَيْدِیُّ وَابْنُ الْاَثِيْرِ فِیْ هٰذَا الْحَدِيْثِ وَفِیْ كِتَابِ الْحُمَيْدِیِّ عَنِ الْبُخَارِیِّ وَكَذَا فِیْ شَرْحِهِ الْخِطَابِیِّ تَرُوْحُ عَلَيْهِمْ سَارِحَةٌ لَهُمْ يَاْتِيْهِمْ لِحَاجَةٍ. (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوعامرؓ یا حضرت ابومالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے (یعنی ابوعامرؓ یا ابومالکؓ نے) بیان کیا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "میری اُمت میں کچھ ایسے گروہ اور طبقے بھی پیدا ہوں گے جو، ریشمی کپڑے کو اور شراب کو اور باجوں کو حلال و جائز کر دیں گے اور ان میں سے کچھ لوگ بلند پہاڑ کے پہلو میں قیام کریں گے" یعنی وہ اپنے قیام کرنے کی جگہ ایسے مقامات پر بنائیں گے جو بلند و ممتاز اور نمایاں ہوں گے اور ان کی یہ ممتاز و نمایاں حیثیت دیکھ کر غریب و محتاج لوگ اپنی حاجتیں اور ضرورتیں لے کر ان کے پاس آیا کریں گے رات کے وقت ان کے مویشی (جو چرنے کے لئے گئے ہوں گے) پیٹ بھرے ہوئے واپس آیا کریں گے اور ان مویشیوں کو ان کا چرانے والا دودھ سے بھرا ہوا لے کر آئے گا لیکن جب کوئی شخص (محتاج) اپنی ضرورت لے کر ان کے پاس آئے گا اور یہ خواہش کرے گا کہ ان مویشیوں کے دودھ میں سے کچھ حصہ اس کی غذائی ضرورت پورا کرنے کے لئے لے جائے) تو وہ اس کو یہ کہہ کر ٹال دیں گے کہ کل ہمارے پاس آنا، اور پھر رات ہی میں اللہ تعالیٰ ان پر اپنا عذاب اس طرح نازل کرے گا کہ ان میں سے بعض پر تو پہاڑ کی چوٹی الٹ دے گا (تاکہ وہ اس کے نیچے دب کر تباہ و ہلاک ہو جائیں اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہے اور ان میں سے بعض کی صورتوں کو مسخ کر کے بندر اور سور بنا دے گا جو قیامت تک اسی شکل و صورت میں رہیں گے یا یہ کہ اس طرح کے بدکار لوگوں پر جو بھی عذاب نازل ہوگا وہ قیامت تک ان پر مسلط رہے گا۔" (بخاریؒ)

اور مصابیح کے بعض نسخوں میں "الخز" کے بجائے ح اور را کے ساتھ "الحر" ہے اور ح کے زیر اور را کے جزم کے ساتھ "الحر" کے معنی عورت کی شرمگاہ کے ہیں، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ زنا و بدکاری کو حلال و جائز کر دیں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ کا حا اور را کے ساتھ یعنی "الحر" نقل ہونا صحیح نہیں ہے بلکہ یہ کتابت کی غلطی ہے جو کاتب سے واقع ہو گئی ہے اصل میں یہ لفظ "خز" (یعنی خ اور ز کے ساتھ) ہی ہے۔ حمیدی اور ابن اثیر نے اس حدیث کے سلسلہ میں اس معنی کی تصریح کی ہے۔ نیز حمیدی کی کتاب میں امام بخاری ہی سے جو یہ روایت نقل کی گئی ہے اور اسی طرح خطابی نے شرح بخاری میں جو روایت نقل کی ہے ان دونوں میں (یروح علیھم بسارحۃ) کے بجائے یوں ہے تَرُوْحُ عَلَيْهِمْ سَارِحَةٌ لَهُمْ يَاْتِيْهِمْ لِحَاجَةٍ۔

تشریح: یا حضرت ابومالک اشعریؓ سے روایت ہے اس عبارت کے ذریعہ بخاری نے اس حدیث کو نقل کرتے ہوئے یہ شک و تردد ظاہر کیا ہے کہ اس حدیث کو یا تو حضرت ابوعامر اشعری نے نقل کیا ہے جو حضرت ابوموسیٰ اشعری کے چچا اور اکابر صحابہ میں سے ہیں یا اس روایت کو بیان کرنے والے حضرت ابومالک اشعری ہیں جن کو اشجعی بھی کہا جاتا ہے اور یہ بھی ایک مشہور صحابی ہیں! تاہم واضح رہے کہ کسی حدیث کے راوی کی حیثیت سے صحابہؓ کے بارے میں اس قسم کا شک و تردد اس حدیث میں طعن کا موجب نہیں ہوتا کیونکہ صحابہؓ سب ہی ثقہ اور عدل ہیں، لہٰذا وہ حدیث جس صحابی سے بھی منقول ہوگی صحیح ہوگی۔

"خز" (خ کے زبر اور ز کی تشدید کے ساتھ) اس خاص کپڑے کا نام ہے جو پہلے زمانے میں ریشم اور اون سے بنا جاتا تھا اس وقت یہ کپڑا

بہت مستعمل تھا یہاں تک کہ صحابہؓ اور تابعین بھی اس کو پہنتے اور استعمال کرتے تھے! لہٰذا علماء لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں خز کا ذکر کر کے مذکورہ کپڑے کے استعمال کی جو ممانعت ظاہر فرمائی گئی ہے وہ شاید اس بنا پر ہے کہ اس کپڑے کو پہننے سے اہل عجم (غیر دیندار اور عیش پرستوں) کی مشابہت پیدا ہوتی ہے علاوہ ازیں وہ کپڑا اپنی بناوٹ اور قیمت کے اعتبار سے ایک ایسا لباس تھا جس کو دولت مند، عیش پسند لوگ اور اہل اسراف استعمال کرتے تھے، دوسری بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ اس حدیث کا اصل محمول وہ "خز" ہے جو اگرچہ حضور ﷺ کے زمانہ میں رائج نہیں ہوا تھا مگر بعد میں اس کا رواج ہوا۔ جس میں صرف ریشم ہی ریشم ہوتا ہے اس اعتبار سے آپ ﷺ کا ارشاد بطور معجزہ، غیب (زمانہ مستقبل کی بات کی) خبر دینے کے طور پر ہوگا، اور اس مطلب کو تسلیم کرنے کی صورت میں "خز" پر "حریمہ" کا عطف تعمیم بعد تخصیص کے قبیل سے ہوگا۔

"معازف" کے معنی عود و طنبورہ وغیرہ جیسے باجوں کے ہیں اور یہ لفظ "عَزَف" یا "مِعْزَف" کی جمع ہے! ویسے "عزف" اور "عزیف" اصل میں جن کی آواز کو کہتے ہیں اور اس مخصوص آواز کو بھی کہتے ہیں جو رات کے وقت جنگل و بیابان میں سیٹیوں کے مشابہ سنائی دیتی ہے جس کو ہوا کی سرسراہٹ اور اس کی آواز سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اس اُمت میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے جو مختلف شکوک و شبہات پیدا کر کے دور از کار تاویلیں کر کے اور لغو و مہمل نظائر و دلائل کے ذریعہ ان چیزوں کو حلال کرلیں گے جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے مثال کے طور پر بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ مردوں کے لئے خالص ریشم کا کپڑا پہننا اور استعمال کرنا اس صورت میں حرام ہے جب کہ وہ بدن سے متصل ہو، یعنی اس کپڑے اور بدن کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ ہو، اگر وہ ریشمی کپڑا ابرے کے طور پر استعمال کیا جائے کہ بدن سے لگا ہوا جو کپڑا ہو وہ تو سوتی ہو اور اس کے اوپر کا کپڑا ریشمی ہو تو اس کے استعمال کی گنجائش ہے، یہ بات الگ ہے کہ اس قول کی تحقیق کیا ہے اور یہ کس مراد کو واضح کرتا ہے لیکن اگر اس قول کو بنیاد بنا کر مردوں کے لئے مطلق ریشمی کپڑا پہننے اور استعمال کرنے کو جائز قرار دے لیا جائے اور لوگ بلا تکلف حریر و دیباج جیسے خالص ریشمی کپڑے پہننے لگیں تو یہ کھلی ہوئی گمراہی ہوگی، چنانچہ یہی ہوا ہے کہ جب امراء اور عوام خالص ریشمی کپڑے استعمال کرتے اور ان سے کہا جاتا کہ مردوں کے لئے حریر و دیباج پہننا حرام ہے تو وہ یہی کہتے ہیں کہ اگر یہ حرام ہوتا تو فلاں عالم نے یہ بات کیوں کہی ہوتی اور فلاں فلاں بزرگ نے ریشمی کپڑا کیوں استعمال کیا ہوتا؟ اس طرح وہ لوگ ایک حرام چیز کو حلال جاننے اور سمجھنے کی نہایت سخت برائی اور گناہ میں مبتلا ہوئے۔ اسی طرح مزامیر کا معاملہ ہے کہ بعض علماء اور مشائخ کو سماع اور مزامیر سے تعلق رہا ہے جو اپنی جگہ پر ایک الگ بحث ہے اور اس کی تفصیل بہت طویل ہے اس بات سے قطع نظر کہ سماع و مزامیر سے ان کا تعلق کن حالات میں اور کن شرائط و پابندیوں کے ساتھ تھا، زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان کے قول و فعل کو غلط طور پر بنیاد بنا کر لوگوں نے کس قدر گمراہیاں پھیلائی ہیں اور راگ رنگ، باجے گاجے کی شیطانی مجلسوں کو "محفل سماع" کے نام پر شریعت کی حرام کردہ چیزوں کو نہ صرف حلال جانتے بلکہ ان کو نعوذ باللہ حصول ثواب کا ذریعہ ماننے کی گمراہی کو عام کیا گیا۔

واضح رہے کہ ابن ابی الدنیا نے مذکورہ روایت کو آلات لہو یعنی مزامیر کی مذمت میں حضرت انسؓ نے اس طرح نقل کیا ہے کہ

"یکونن فِیْ ھذہ الامۃ خسف و قذف و مسخ و ذلک او اشربوا الخمر و اتخذت القینات و ضربوا بالمعازف۔"

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ جب لوگ ان چیزوں کو حلال جان کر ان کو اختیار کریں گے تو خسف و مسخ جیسے عذاب خداوندی میں گرفتار کئے جائیں گے۔

"نص علیہ الحمیدی الخ" اس عبارت کے ذریعے مؤلف مشکوٰۃ نے حمیدی اور ابن اثیر کے قول کو بطور دلیل اختیار کر کے اس امر کی تائید کی کہ لفظ "الحر" (ح اور ز کے ساتھ) واقعۃً کتابت کی غلطی ہے اور صحیح لفظ "الخز" (خ اور ز کے ساتھ) ہی ہے، لہٰذا کسی کا یہ گمان کرنا کہ یہ لفظ حؔ اور رؔ کے ساتھ صحیح ہے حقیقت کے خلاف ہے! تاہم مؤلف نے فِیْ ھٰذَا الحدیث کے الفاظ کے ذریعے اس

طرف اشارہ کردیا ہے کہ یہ بحث صرف اس حدیث کے سلسلے میں ہے جو بخاری ؒ سے یہاں نقل کی گئی ہے، ویسے "الحر" کا لفظ ایک دوسری روایت میں منقول ہے جس کو ابوداؤد ؒ وغیرہ نے نقل کیا ہے چنانچہ طیبی ؒ نے اس حدیث کو اپنی شرح میں ذکر کیا ہے! لیکن بخاری ؒ کے مشہور شارح علامہ ابن حجر ؒ نے جو بات کہی ہے وہ مؤلف مشکوٰۃ کے مذکورہ قول کے منافی ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ بخاری ؒ کی اکثر روایتوں میں یہ لفظ ح اور ر کے ساتھ یعنی "الحر" ہی ہے۔ اگر اس بات کو تسلیم کرلیا جائے تو پھر یہ کہا جائے گا کہ اپنی جگہ پر دونوں روایتیں صحیح ہیں۔

"تروح علیھم بسارحۃ" میں "سارحۃ" تروح کا فاعل ہے اور یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ پہلی روایت (جس کو مؤلف مشکوٰۃ نے یہاں نقل کیا ہے) کے لفظ "بسارحۃ" میں حرف ب زائد ہے چنانچہ ترجمے میں اسی کو محفوظ رکھا گیا ہے، اسی طرح ان دونوں کتابوں (کتاب حمیدی اور بخاری کی شرح خطابی) میں "یاتیھم لحاجۃ" منقول ہوا ہے، یعنی ان دونوں کتابوں کی نقل کردہ حدیث میں اس جملے میں "رجل" کا لفظ نہیں ہے یا یہ مطلب ہے کہ ان دونوں نے بھی "رجل" کا لفظ نقل تو کیا ہے لیکن "لحاجۃ" کے بعد اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس اُمّت کے لوگوں کو بھی خسف اور مسخ کے عذاب میں گرفتار کیا جاسکتا ہے جیسا کہ گذشتہ امتوں کے لوگوں کی سرکشی اور بداعمالیوں کی وجہ سے ان کو اس عذاب میں مبتلا کیا گیا، لہٰذا وہ احادیث کہ جو اس بات کی نفی میں منقول ہیں اور جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ امت محمدیہ پر اس طرح کے عذاب نازل نہیں ہوں گے وہ یا تو اس اُمّت کے ابتدائی زمانہ پر محمول ہیں اور آخری زمانہ ان کے دائرہ مفہوم سے باہر ہے اور یا اجتماعی طور سے پوری اُمّت کے خسف ومسخ پر محمول ہیں، نہ کہ انفرادی طور سے بعض کے بارے میں نفی پر۔

عذاب الٰہی کا نزول

(٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَنْزَلَ اللّٰہُ بِقَوْمٍ عَذَابًا اَصَابَ الْعَذَابُ مَنْ کَانَ فِیْہِمْ ثُمَّ بُعِثُوْا عَلٰی اَعْمَالِہِمْ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابن عمر ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے تو وہ عذاب ہر اس شخص کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے جو اس قوم میں ہوتا ہے اور پھر (آخرت میں) لوگوں کو ان کے اعمال کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔" (بخاری ؒ ومسلم ؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب کسی قوم میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی وسرکشی، فسق وفجور، ظلم وعصیان، خدا کے دین اور خدا کے دین کو ماننے والوں کے ساتھ بغض ونفرت اور تمسخر واستہزاء اور وہ برائیاں حد سے زیادہ پھیل جاتی ہیں جو قہر خداوندی کو دعوت دیتی ہیں اور پھر اس کے نتیجے میں اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ تو وہ عذاب صالح وغیر صالح اور نیک وبد کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا بلکہ ہر اس شخص کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے جو اس قوم کے درمیان ہوتا ہے، اگرچہ کبھی اللہ تعالیٰ اپنے نیک وصالح بندوں کو اس عذاب سے محفوظ بھی رکھ لیتا ہے۔ لیکن تمام ہی لوگوں کا اس عذاب میں مبتلا ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ اخروی انجام کے تعلق سے بھی وہ تمام لوگ ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں کہ وہاں (آخرت میں) ہر شخص کے ساتھ اس کے اعمال ہی کے مطابق معاملہ ہوگا، جو شخص نیک وصالح رہا ہوگا اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا اور جو شخص بدکار وسرکش ہوگا وہ وہاں بھی عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔

اصل اعتبار خاتمہ کا ہے

(٧) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُبْعَثُ کُلُّ عَبْدٍ عَلٰی مَامَاتَ عَلَیْہِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابر ؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن ہر بندہ کو اسی حال پر اٹھایا جائے گا۔" (مسلم ؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو شخص جس حالت وحیثیت میں اس دنیا سے رخصت ہوگا اسی حالت میں قیامت کے دن اٹھے گا اور اس کا

اخروی انجام اسی کے مطابق ہوگا۔ اگر ایمان کی حالت میں مرا ہے تو ایمان ہی کی حالت میں اٹھے گا، اگر کفر کی حالت میں مرے گا تو کفر ہی کی حالت میں اٹھے گا، اگر طاعت و عبادت کی حالت میں مرا ہے تو طاعت و عبادت گذار بندے کی حیثیت میں اٹھے گا، اگر گناہ و معصیت کی حالت میں مرے گا تو نافرمان و گنہگار بندے کی حیثیت میں اٹھے گا، اسی طرح اگر خدا کے ذکر کی حالت میں مرے گا تو ذاکر بندے کی حیثیت میں اٹھے گا اور اگر ذکر خداوندی سے غفلت ولاپرواہی کی حالت میں مرے گا تو غافل ولاپرواہ بندے کے طور پر اٹھے گا۔ غرض یہ کہ قیامت کے دن اٹھنے اور آخرت میں فلاح یاب ہونے یا نامراد قرار دیئے جانے کا مدار خاتمہ پر ہے کہ کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا آخر کیسا گزرے اور اس کا خاتمہ کس حالت میں ہو جیسا کہ کسی نے کہا ہے ۔

حکم مستوری ومستی ہمہ بر خاتمہ است کس ندانست کہ آخر بچہ حالت گذرد

تاہم بعض عارفین نے کہا ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے تئیں حضوری و استغراق کا ملکہ حاصل کر لیتا ہے اور اس کے دل میں ذکر اللہ کا جوہر جگہ پالیتا ہے تو اگر موت کے وقت سختی و شدت کے سبب یا بیماری کے غلبہ اور بے تابی و اضطراب کی وجہ سے اس کے اندر استحضار و استغراق کی کیفیت میں کوئی کمی و کوتاہی راہ پاجائے تو یہ چیز اس کے حق میں نقصان دہ نہیں ہوگی بلکہ جسم سے روح کی جدائی کے بعد اس کی وہ حالت و کیفیت لوٹ آئے گی۔ لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ ذکر خداوندی اور تعلق مع اللہ میں وہ ملکہ و کمال حاصل کیا جائے جو بہر صورت سرمایہ نجات ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

انسان کی نادانی و غفلت کی ایک مثال

⑧ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَارَاَیْتُ مِثْلَ النَّارِ نَامَ هَارِبُهَا وَلَامِثْلَ الْجَنَّةَ نَامَ طَالِبُهَا۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (شدت و سختی اور ہولناکی کے اعتبار سے) میں نے دوزخ کی آگ کی مانند ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی کہ اس سے بھاگنے والا سوتا رہے اور (سرور و شادمانی کے اعتبار سے میں نے جنت کی مانند ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی کہ اس کا طلب کرنے والا سوتا رہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی طاقتور دشمن کو اپنے لئے مضرت رساں اور ہلاکت میں مبتلا کرنے والا جانتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اس دشمن کی طرف سے غافل نہیں رہتا اور اطمینان کی چادر تان کر سو نہیں جاتا بلکہ ہر وقت ہوشیار رہتا ہے اور جس قدر ممکن ہوتا ہے اس سے دور بھاگتا رہتا ہے! لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ دوزخ کی آگ، جو اپنی ہلاکت آفرینی، سختی و شدت اور ہولناکی کے اعتبار سے بڑے سے بڑے طاقتور دشمن سے بھی زیادہ ہلاکت و نقصان پہنچانے کے درپے ہے لوگ اس کی طرف سے غافل پڑے رہتے ہیں اور اس سے دور بھاگنے کی کوشش نہیں کرتے، اور اگر دور بھاگتے بھی ہیں تو عین بھاگنے کی حالت میں نیند و غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں! واضح رہے کہ دوزخ کی آگ سے دور بھاگنا اور اس کی طرف سے غفلت کا شکار نہ ہونا یہ ہے کہ انسان خدا شناسی و خدا ترسی کا راستہ اختیار کرے، گناہ و معصیت کو ترک کر دے اور طاعت و عبادت کو لازم کرے۔

اسی طرح دوسرے جزء کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی پسندیدہ و محبوب چیز کا طالب ہوتا ہے اور اس کو پوری طرح حاصل کرنا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اس چیز کی طلب و خواہش کی راہ میں کسی غفلت و سستی کا روادار نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہے اور وہ جتنی زیادہ سعی و کوشش کر سکتا ہے اس کے مطابق اس چیز کی طرف بھاگتا ہے اور اس کو پالینا چاہتا ہے، مگر کتنی عجیب بات ہے کہ جنت جو تمام

ترخوبیوں، راحتوں شادمانیوں اور سعادتوں کا مرکز و مجموعہ ہے اس کی طرف سے انسان کس قدر غافل ہے، اس کو پانے کی کوشش نہیں کرتا، اس کی طرف دوڑتا نہیں؟

واضح رہے کہ جنت کو پانا اور اس کی طرف دوڑنا یہ ہے کہ خدا اور خدا کے رسول کی رضا و خوشنودی کو ہر چیز پر مقدم رکھا جائے برائی کا راستہ چھوڑ کر نیکی کا راستہ اختیار کیا جائے اور طاعت و عبادت میں غفلت و سستی نہ کی جائے۔

ایک نصیحت، ایک آرزو

(۹) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ اَرٰی مَالَا تَرَوْنَ وَاَسْمَعُ مَالَا تَسْمَعُوْنَ اَطَّتِ السَّمَآءُ وَحُقَّ لَھَا اَنْ تَاَطَّ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ مَافِیْھَا مَوْضِعُ اَرْبَعِ اَصَابِعَ اِلَّا وَمَلَکٌ وَاضِعٌ جَبْھَتَہٗ سَاجِدًا لِلّٰہِ وَاللّٰہِ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِکْتُمْ قَلِیْلًا وَّلَبَکَیْتُمْ کَثِیْرًا وَمَا تَلَذَّذْتُمْ بِالنِّسَاءِ عَلَی الْفُرُشَاتِ وَلَخَرَجْتُمْ اِلَی الصُّعُدَاتِ تَجْاَرُوْنَ اِلَی اللّٰہِ قَالَ اَبُوْذَرٍّ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ شَجَرَۃً تُعْضَدُ۔ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو کچھ میں دیکھتا ہوں تم نہیں دیکھتے اور جو کچھ میں سنتا ہوں تم نہیں سنتے (یعنی قیامت کی علامتیں، قدرت کی کرشمہ سازیوں کی نشانیاں اور اللہ تعالیٰ کی صفات قہریہ وجلالیہ جس طرح میرے سامنے ہیں اور میں ان کو دیکھتا ہوں اس طرح نہ تمہارے سامنے ہیں اور نہ تم انہیں دیکھتے ہو، نیز احوال آخرت کے اسرار و اخبار، قیامت کی ہولناکیوں اور دوزخ کے عذاب کی شدت و سختی کی باتوں کو جس طرح میں سنتا ہوں، تم نہیں سنتے) آسمان میں سے آواز نکلتی ہے، اور اس میں سے آواز کا نکلنا بجا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے آسمان میں چار انگشت کے برابر بھی ایسی جگہ نہیں جہاں فرشتے خدا کے حضور اپنا سر سجدہ ریز کئے ہوئے نہ پڑے ہوں، خدا کی قسم اگر تم اس چیز کو جان لو جس کو میں جانتا ہوں تو یقیناً تم بہت کم ہنسو اور زیادہ رونے لگو۔ اور بستروں پر اپنی عوتوں سے لذت حاصل کرنا چھوڑ دو، اور یقیناً تم خدا سے نالہ و فریاد کرتے ہوئے جنگلوں کی طرف نکل جاؤ (جیسا کہ رنج اٹھانے والوں اور غموں سے تنگ آجانے والوں کا شیوہ ہوتا ہے کہ وہ گھروں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور صحرا صحرا جنگل جنگل گھومتے پھرتے ہیں تاکہ زمین کا بوجھ کم ہو اور دل کچھ ٹھکانے لگے)۔ "حضرت ابوذرؓ نے (یہ حدیث بیان کرکے ارادۂ حسرت و دردناکی) کہا کہ کاش! میں درخت ہوتا جس کو کاٹا جاتا!" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: لفظ "اطت" دراصل "اط" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں آواز نکالنا، پالان اور زین وغیرہ کا چرچرانا، اونٹ کا تعب کی وجہ سے بلبلانا! اس حدیث میں آسمان سے آواز نکلنے کی جو بات فرمائی گئی ہے اس کا مفہوم بالکل ظاہر ہے کہ فرشتوں کی کثرت و ازدہام اور ان کے بوجھ کی وجہ سے آسمان میں سے آواز نکلتی ہے جیسا کہ سواری کا جانور سواری کے بوجھ کی وجہ سے ایک خاص قسم کی آواز نکالتا ہے یا کسی تخت و پلنگ پر جب زیادہ لوگ بیٹھ جاتے ہیں تو وہ چرچرانے لگتا ہے! یا آسمان میں سے آواز نکلنے کا مطلب آسمان کا خدا کے خوف سے نالہ و فریاد کرنا ہے اور اس جملے کا مقصد یہ آگاہی ہے کہ جب آسمان ایک غیر ذی روح اور منجمد چیز ہوتے ہوئے اور مقدس ملائکہ کی قرارگاہ کی حیثیت رکھنے کے باوجود خوف الٰہی سے نالہ و فریاد کرتا ہے۔ تو انسان کہ جو جاندار ہے اور گناہ و معصیت کی آلودگی رکھتا ہے، وہ کہیں زیادہ اس لائق ہے کہ خوف الٰہی سے گریہ وزاری اور نالہ و فریاد کرے۔ یہ معنی حدیث کے اصل مقصد سے زیادہ قریب اور مناسب تر ہیں۔

"اپنا سر سجدہ ریز کئے ہوئے نہ پڑے ہوں" سے مراد فرشتوں کا اللہ تعالیٰ کی عبادت و تابعداری میں مشغول ہونا ہے! یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے تاکہ وہ بات بھی اس جملے کے دائرہ مفہوم میں آجائے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ ہر فرشتہ خدا کی عبادت و تابعداری میں مشغول ہے کہ کچھ تو قیام کی حالت میں عبادت گذار ہیں، کچھ رکوع کی حالت میں ہیں اور کچھ سجدے میں پڑے ہوئے ہیں یا یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ حضور ﷺ نے آسمان میں سے کسی خاص آسمان کا ذکر فرمایا ہے اور اس آسمان میں جو فرشتے ہیں وہ سب کے سب سجدہ

کی ہی حالت میں پڑے ہوئے خدا کی عبادت کر رہے ہیں۔

"صُعُدَات" اصل میں "صُعُدٌ" کی جمع ہے اور "صُعُدٌ" جمع ہے صَعِیْدٌ کی، جیسے طُرُقَاتٌ جمع ہے طُرُقٌ کی اور طرق جمع ہے طریق کی! "صعید" کے لغوی معنی مٹی، راستہ اور زمین کے بلند حصے کے ہیں اور یہاں حدیث میں اس سے مراد جنگل ہے۔

"کاش! میں درخت ہوتا" یعنی انسان ہونے کی حیثیت سے گناہوں اور برائیوں سے بچنا بڑا مشکل ہے، شیطان ہر وقت پیچھے لگا رہتا ہے نہ جانے کب اس کا داؤ چل جائے گا اور گناہ و معصیت کا ارتکاب ہو جائے۔ جس کی وجہ سے خدا کی ناراضگی اور اس کا عذاب مول لینا پڑ جائے گا! لہٰذا حضرت ابوذرؓ نے یہ آرزو ظاہر کی کہ کاش میں انسان نہ ہوتا تاکہ کل قیامت کے دن گناہوں کی آلودگی کے ساتھ نہ اٹھتا۔ اور جس طرح ایک درخت کو کاٹ ڈالا جاتا ہے تو وہ سرے سے مٹ جاتا ہے، اسی طرح میں بھی ہوتا کہ مجھے کاٹ کر پھینک دیا جاتا اور میں آخرت میں ندامت و شرمندگی اور عذاب سے بچ جاتا۔ واضح رہے کہ اس طرح کی غمناک اور درد انگیز آرزوئیں دوسرے بڑے بڑے صحابہؓ سے بھی منقول ہیں، مثلاً ایک صحابیؓ نے کہا تھا کہ کاش، میں بکری ہوتا جس کو لوگ کاٹ کر کھا جاتے ہیں۔ دوسرے صحابیؓ نے کہا کاش! میں پرندہ ہوتا کہ وہ جہاں چاہتا ہے بیٹھ جاتا ہے اور جہاں چاہتا ہے چلا جاتا ہے۔ اس پر کوئی فکر اور کسی چیز کا دباؤ نہیں ہوتا یہ سب مقدس صحابہؓ وہ تھے جن کو حضور ﷺ نے ان کی زندگی ہی میں جنّت کی بشارت دے دی تھی اور آخرت کے اعتبار سے ان کی عافیت کے بخیر ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا لیکن جب ان پاک نفس حضرات کے احساس اور فکر آخرت کا یہ حال تھا تو دوسروں کو کیا کہا جا سکتا ہے، اگرچہ مخبر صادق ﷺ کا وعدہ ہے کہ ہر مؤمن انشاء اللہ مغفرت و بخشش سے نوازا جائے گا اور اس کی عاقبت بخیر ہوگی لیکن بارگاہ بے نیازی کا خوف ہی کمر توڑے ڈالتا ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

کیا کیا نہ اپنے زہد واطاعت پہ ناز تھا   بس دم نکل گیا جو سنا بے نیاز ہے

حکیمانہ نصیحت

(۱۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ خَافَ اَدْلَجَ وَمَنْ اَدْلَجَ بَلَغَ الْمَنْزِلَ اَلَا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ غَالِیَةٌ اَلَا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ الْجَنَّةُ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص (اس بات سے) ڈرتا ہے (کہ اس کا دشمن رات کے آخری حصے میں دھاوا بولنے والا ہے) تو وہ رات کے پہلے ہی حصے میں اپنے بچاؤ کا راستہ اختیار کر لیتا ہے (تاکہ دشمن کی غارت گری سے محفوظ رہ سکے) اور جو شخص رات کے پہلے حصے میں بھاگنا شروع کر دیتا ہے وہ منزل تک پہنچ جاتا ہے، جان لو خدا کا مال بہت قیمتی ہے (جو نہایت اونچی قیمت چکائے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، اور وہ اونچی قیمت اس کی راہ میں جان و مال کی قربانی ہے) اور یاد رکھو، خدا کا مال جنّت ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "منزل" سے مراد مطلوب و مقصود کو حاصل کر لینا ہے! طیبیؒ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ان الفاظ کے ذریعے گویا رہرو آخرت کی مثال بیان فرمائی ہے کہ شیطان اس کی تاک میں ہے نفس اور اس کی باطل آرزوئیں اس شیطان کی مددگار ہیں اور اس طرح وہ اس شخص کی مانند ہے جس کا طاقتور اور عیار دشمن اس پر دھاوا بولنے کے لئے تیار کھڑا ہو اور انتظار کر رہا ہو کہ رات کا پچھلا پہر آئے تو تاریکی اور سناٹے میں اس پر حملہ کر کے اس کو غارت و تباہ کر دے، پس اگر وہ رہرو آخرت ہوشیار ہو جائے، راہ ہدایت پر ابتداء ہی سے چلنا شروع کر دے اور اپنے اعمال میں نیت کا اخلاص پیدا کر لے تو وہ یقیناً شیطان سے اور اس کے مکر سے محفوظ رہے گا۔ ورنہ وہ اتنا عیار دشمن ہے کہ جہاں ذرا سی غفلت دیکھتا ہے اپنے مددگاروں کو لے کر فوراً دھاوا بول دیتا ہے اور ہلاکت میں ڈال دیتا ہے! اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اس امر کی راہنمائی فرمائی کہ راہ آخرت پر چلنا نہایت دشوار، اور وہاں کی نعمتیں و سعادتیں حاصل کرنا سخت مشکل ہے، اس راستے میں ذرا سی غفلت و سستی بھی منزل کو دور سے دور کر دیتی ہے جب تک زیادہ سے زیادہ محنت و عمل اور سعی و کوشش نہیں کی

جاتی، وہ نعمتیں اور سعادتیں پوری طرح حاصل نہیں ہوسکتیں، چنانچہ آپ ﷺ نے "جان لو! خدا کا مال بہت قیمتی ہے" کے ذریعے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

حدیث کے آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مال یعنی جنت کی اگر کوئی قیمت ہوسکتی ہے اور اگر اس کو کسی چیز کے بدلے میں حاصل کیا جاسکتا ہے تو وہ خدا پرستی و خدا ترسی اور نیک اعمال کا سرمایہ ہے، اگر خدا کی جنت حاصل کرنا چاہتے ہو تو نیکی کے راستے کو اختیار کرو، برائی کے نزدیک بھی نہ بھٹکو، اور زیادہ سے زیادہ اچھے کام کرو۔ اسی مفہوم کی طرف اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان الفاظ کے ذریعے اشارہ فرمایا ہے۔

وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلاً۔

"اور جو اعمال صالحہ باقی رہنے والے ہیں وہ آپ کے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بھی ہزار درجے بہتر ہیں اور امید کے اعتبار سے بھی ہزار درجے بہتر ہے۔"

اور فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔"

ذکر اللہ اور خوف خداوندی کی فضیلت

(۱۱) وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَقُوْلُ اللّٰهُ جَلَّ ذِكْرُهٗ اَخْرِجُوْا مِنَ النَّارِ مَنْ ذَكَرَنِيْ يَوْمًا اَوْخَافَنِيْ فِيْ مَقَامٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ كِتَابِ الْبَعْثِ وَالنُّشُوْرِ۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "(قیامت کے دن) اللہ کہ جس کا ذکر بہت باعظمت ہے (دوزخ پر متعین فرشتوں سے) فرمائے گا کہ اس شخص کو دوزخ سے نکال لو جس نے ایک دن بھی (یعنی کسی ایک وقت بھی) مجھ کو یاد رکھا ہے، یا کسی موقع پر مجھ سے ڈرا ہے۔" (ترمذیؒ اور بیہقیؒ نے اس روایت کو کتاب البعث والنشور میں نقل کیا ہے)

تشریح: "اس شخص" سے مراد وہ مؤمن ہے جو مرتے وقت تک اخلاص کے ساتھ ایمان پر قائم رہا تھا لیکن گناہوں اور بدعملی کی وجہ سے دوزخ میں ڈال دیا گیا تھا۔

"یا کسی موقع پر مجھ سے ڈرا ہے" یعنی اس کی دنیاوی زندگی میں کوئی ایسا موقع آیا ہو جب وہ کسی گناہ میں مبتلا ہونے سے محض میرے خوف کی وجہ سے باز رہا ہو! چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى۔

"اور جو شخص (دنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا سو جنت میں اس کا ٹھکانا ہوگا۔"

طیبیؒ کہتے ہیں کہ ذکر اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے مراد وہ "ذکر" ہے جس میں زبان کے ساتھ دل بھی شریک ہو اور جس کو "اخلاص" کہتے ہیں، اخلاص کا مطلب ہے خلوص دل اور صدق نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو ایک جاننا اور ماننا! ورنہ یوں تو کافر بھی زبان سے اللہ کا ذکر کرتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان کے اس ذکر کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، کیونکہ ان کا دل خدا کی وحدانیت اور صدق و اخلاص سے قطعًا خالی ہوتا ہے اس بات کی تائید حضور ﷺ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ

مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ خَالِصًا مِنْ قَلْبِهٖ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔

"جس شخص نے خلوص دل کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جنت میں جائے گا۔"

واضح رہے کہ "خوف خداوندی" سے مراد وہ خوف ہے جس کی وجہ سے بندہ اپنے اعضاء جسم کو گناہوں سے باز اور طاعات وعبادات میں مشغول رکھے! ورنہ ایسے خوف کا کوئی اعتبار نہیں جو پیدا تو ہو مگر اس کی کار فرمائی اعضاء جسم پر ظاہر نہ ہو کہ نہ تو وہ گناہوں سے باز رکھے اور نہ طاعات وعبادات میں لگائے رکھے، بلکہ حقیقت میں اس کو "خوف خداوندی" نہیں کہا جا سکتا، اس کو تو "حدیث نفس" یعنی ایک ایسا وسوسہ اور ایک ایسی تحریک کہا جا سکتا ہے جو کسی ہولناک چیز کے اسباب و آثار دیکھنے کے وقت طبیعت پر طاری ہو جاتی ہے۔ اور جب وہ اسباب و آثار غائب ہو جاتے ہیں تو دل پھر غفلت میں پڑ جاتا ہے! مشہور بزرگ حضرت فضیلؒ نے بڑی حکیمانہ بات کہی ہے کہ "جب تم سے پوچھا جائے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہو؟ تو اس سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کر لینا چاہئے، کیونکہ اگر تم نے جواب میں کہا کہ نہیں، تو یقیناً کافر ہو جاؤ گے اور اگر کہا کہ ہاں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے! گویا حضرت فضیلؒ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ اصل میں خدا کا خوف تو وہی ہے جو اعضاء جسم کو گناہوں میں ملوث ہونے سے قطعی باز رکھے۔

بہرحال اس حدیث میں یہ بشارت ہے کہ جس مسلمان نے ایک بار بھی از راہ اخلاص خدا کو یاد کر لیا اور کسی ایک موقع پر بھی حقیقی معنی میں خدا کے عذاب کا خوف کھایا تو بالآخر وہ دوزخ کے عذاب سے نجات پائے گا بلکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کو دوزخ میں داخل ہی نہ کرے اور ابتداء جنت میں بھیج دے، بے شک يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ اسی کی صفت اور شان ہے۔

ایک آیت کا مطلب

(۱۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَهُمُ الَّذِيْنَ يَشْرَبُوْنَ الْخَمْرَ وَيَسْرِقُوْنَ قَالَ لَا يَا ابْنَتَ الصِّدِّيْقِ وَلٰكِنَّهُمُ الَّذِيْنَ يَصُوْمُوْنَ وَيُصَلُّوْنَ وَيَتَصَدَّقُوْنَ وَهُمْ يَخَافُوْنَ اَنْ لَّا يُقْبَلَ مِنْهُمْ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا "وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ" (وہ لوگ کہ جو دیتے ہیں اور جو کچھ کر دیتے ہیں یعنی از قسم زکوٰۃ وصدقات، ان کی حالت یہ ہے کہ ان کے دل لرزاں و ترساں ہیں یعنی ان پر یہ خوف طاری رہتا ہے کہ انہوں نے خدا کی راہ میں اور اس کے حکم کی اتباع میں جو کچھ خرچ کیا ہے وہ قبول بھی ہوگا یا نہیں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا یہ انفاق و ایثار شرائط و آداب کے مطابق واقع نہ ہو اور ہم الٹے وبال میں پڑ جائیں۔ اسی آیت کے متعلق آنحضرت ﷺ سے حضرت عائشہؓ کا سوال یہ تھا) کہ کیا یہ وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں (کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنا گنہگاروں ہی کا کام ہے) حضور ﷺ نے فرمایا "صدیق کی بیٹی! نہیں، یہ وہ لوگ نہیں ہیں جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اس کے باوجود وہ ڈرتے ہیں کہ ان کے اعمال کو (شائد) قبول نہ کیا جائے (اس کی دلیل آیت کے آخری الفاظ ہیں) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ یعنی یہی وہ لوگ ہیں جو نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں (بایں طور کہ طاعات وعبادات کی طرف ان کی رغبت بہت زیادہ ہوتی ہے اور وہ سبقت کر کے ان چیزوں کو حاصل کرتے ہیں)۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: حدیث میں جو آیت ذکر کی گئی ہے وہ آخر تک اس طرح ہے "وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رَاجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُوْنَ۔

اس آیت کے متعلق حضرت عائشہؓ کا خیال یہ تھا کہ اس میں جن لوگوں کے ڈرنے کا ذکر کیا گیا ہے ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو شراب

پیتے ہیں، چوری کرتے ہیں اور دوسری برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے انہی لوگوں کو ڈرنا چاہئے جو اس کی نافرمانی کرتے ہیں اور برائیوں میں مبتلا ہوتے ہیں! چنانچہ حضرت عائشہؓ نے اس کے بارے میں حضور ﷺ سے دریافت کیا اور حضور ﷺ نے ان پر واضح فرمایا کہ تمہارا یہ خیال صحیح نہیں ہے بلکہ حقیقت میں یہ آیت ان لوگوں کے متعلق ہے جو طاعات وعبادات کرتے ہیں اور اس کے باوجود اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور اس کی سب سے بڑی دلیل خود آیت کے آخری الفاظ ہیں۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا آیت میں دو قرائتیں ہیں، مشہور قراءت میں کہ جو قراء سبعہ کی قراءت ہے، یُؤْتُوْنَ کا لفظ ہے، جو "اِیتَاءٌ" کا فعل مضارع ہے اسی طرح لفظ آتَوْا ہمزہ کے مد کے ساتھ ہے جو "ایتاء" کا فعل ماضی ہے اور اعطاء بمعنی عطاء یعنی دینے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ ترجمے میں یہی معنی بیان کئے گئے ہیں اور دوسری قراءت میں کہ جو شاذہ ہے یہ لفظ یَاتُوْنَ مَا اَتَوْا پڑھا گیا ہے جو ایتان سے مشتق ہے اور جس کے معنی کام کرنے کے ہیں، اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ "وہ لوگ کہ جو کرتے ہیں اور جو کچھ کہ کرتے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ ان کے دل لرزاں وترساں ہیں" چنانچہ حضرت عائشہؓ نے جو سوال کیا وہ اس دوسری قراءت کے زیادہ مناسب ہے، لیکن نہ صرف یہاں مشکوٰۃ، بلکہ اصل کتاب مصابیح میں بھی یہ لفظ پہلی قراءت ہی کے مطابق منقول ہے جب کہ زیادہ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ دوسری قراءت کے مطابق ہو! یہ توطیبیؒ کے منقولات کا خلاصہ تھا جس کو انہوں نے تفسیر زجاج اور کشاف سے نقل کیا ہے! ملا علی قاری نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر اس لفظ کو آنحضرت ﷺ کی طرف قراءت شاذہ ہی کے مطابق منسوب کیا جائے تو بھی مراد یہ ہوگی کہ وہ لوگ کہ جو از قسم طاعات وعبادات کوئی عمل کرتے ہیں گویا اس سے وہ مراد نہیں ہوگی جو حضرت عائشہؓ نے یہ سمجھی تھی کہ "وہ لوگ جو از قسم معصیت کوئی عمل کرتے ہیں" اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اس لفظ سے عام عمل کہ خواہ وہ از قسم طاعت ہو یا از قسم معصیت، مراد ہے کیونکہ آیت کے آخری الفاظ اُولٰٓئِكَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ اس مراد کی تائید نہیں کرتے۔ حاصل یہ کہ حضور ﷺ کا ارشاد اَلَّذِیْنَ یَصُوْمُوْنَ الخ آیت کے الفاظ وَالَّذِیْنَ یَاْتُوْنَ مَا اَتَوْا کی واضح تفسیر وترجمانی ہے۔ خواہ ان الفاظ کا تعلق دونوں قرأتوں میں سے کسی سے بھی ہو، زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک قراءت کے مطابق الفاظ میں ایک طرح کی تغلیب ہے، لہٰذا مشہور قراءت کے تعلق سے یہ آیت جس طرح کے عمل کرنے والوں کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ مالی عبادت ہے جب کہ قراءت شاذہ کے مطابق اس آیت کا تعلق بدنی عبادت سے ظاہر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک قول یہ بھی ہے کہ مشہور قراءت کے مطابق جو الفاظ ہیں ان کی تفسیر میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ کہ جو اپنے نفسوں میں سے وہ چیز دیتے ہیں جو طاعات وعبادات میں سے ہے (یعنی محنت ومشقت برداشت کرکے نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں اور دوسری بدنی عبادتیں کرتے ہیں) اور جو اپنے (مال) میں سے (خدا کی راہ میں) نکالتے ہیں۔ یعنی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور صدقہ وخیرات دیتے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ ان کے دل لرزاں وترساں ہیں۔ اس تفسیر ووضاحت سے دونوں طرح کی عبادتیں اس آیت کے مفہوم میں داخل ہو جائیں گی۔

ذکر اللہ کی نصیحت وتلقین

⑬ وَعَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا ذَھَبَ ثُلُثُ اللَّیْلِ قَامَ فَقَالَ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اذْکُرُوا اللّٰہَ اُذْکُرُوا اللّٰہَ جَآءَتِ الرَّاجِفَۃُ تَتْبَعُھَا الرَّادِفَۃُ جَآءَ الْمَوْتُ بِمَا فِیْہِ جَاءَ الْمَوْتُ بِمَا فِیْہِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابی بن کعب بیان کرتے ہیں کہ جب دو تہائی رات گزر جاتی تو نبی کریم ﷺ (تہجد کی نماز کے لئے) اٹھتے اور فرماتے۔ "لوگو اللہ کو (اس کی وحدانیت ذات اور اس کی تمام صفات کے ساتھ) یاد کرو، اللہ کو (یعنی اس کے عذاب وثواب کو) یاد کرو (تاکہ تم اللہ کے تئیں خوف وامید کے درمیان رہو، اور ان لوگوں میں سے شمار کئے جاؤ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا زلزلہ آیا ہی چاہتا ہے (یعنی پہلا صور پھونکا ہی جانے والا ہے جس کے ساتھ ہی سب مرجائیں

گے) اس کے پیچھے پیچھے وہ بھی آرہا ہے جو پیچھے آنے والا ہے (یعنی پہلے صور کے بعد دوسرا صور بھی بس پھونکا ہی جانے والا ہے جس کی آواز پر سب دوبارہ زندہ ہو جائیں گے اور اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کر میدان حشر میں جمع ہو جائیں گے۔ غرض یہ کہ ان الفاظ سے حضور ﷺ کا مقصد قیامت کی یاد دلانا، اور آخرت کی طرف متوجہ کرنا ہے تاکہ یہ چیز طاعات و عبادات اور ذکر اللہ میں مشغول رکھنے کا باعث ہو) موت اپنے سے وابستہ تمام احوال کے ساتھ آیا ہی چاہتی ہے، موت اپنے سے وابستہ تمام احوال کے ساتھ آیا ہی چاہتی ہے (ان الفاظ کا مقصد بھی یہ تنبیہ کرتا ہے کہ غفلت چھوڑ کر ہوشیار ہو جاؤ، تمہاری موت تمہارے سر پر تیار کھڑی ہے اور ان تمام چیزوں کے ساتھ جو کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد واقع ہونے والی ہیں، آیا ہی چاہتی ہے۔" (ترمذی)

تشریح: "لوگو" کے ذریعے حضور ﷺ نے گویا ان لوگوں کو مخاطب فرمایا جو چین کی نیند سو رہے تھے اور تہجد کی نماز اور ذکر اللہ سے غافل تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے ان کو بیدار کیا تاکہ وہ لوگ ذکر اللہ اور تہجد کی نماز میں مشغول ہوں۔ پس اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ آخر تہائی رات میں اٹھنا اور ذکر اللہ و نوافل میں مشغول ہونا مستحب مؤکدہ ہے! ایک نسخے میں اُذْکُرُوا اللّٰہَ کے الفاظ تین مرتبہ نقل کئے گئے ہیں، گویا تیسری مرتبہ کے ان الفاظ کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں، اس کی عطا کی ہوئی راحتوں اور اس کی طرف سے پیش آنے والے ضرر و آلام کو یاد کرو۔

جَاءَتِ الرَّاجِفَةُ (زلزلہ آیا ہی چاہتا ہے) میں قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ الخ نیز اس جملے میں جاءت ماضی کا صیغہ اس زلزلے کے آنے (یعنی صور پھونکے جانے) کے یقینی امر ہونے کی بنا پر استعمال کیا گیا ہے اور مفہوم وہی ہے جو ترجمے کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے یعنی وہ وقت بس آیا ہی چاہتا ہے، لہٰذا موقع کی غنیمت جانو اور طاعات و عبادات کی طرف سبقت کر کے ایسی تیاری کر لو کہ اس کے احوال آسانی کے ساتھ گزر جائیں۔ اس ارشاد گرامی میں ایک لطیف نکتہ بھی پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ سونا، درحقیقت موت کا حکم رکھتا ہے جو پہلے صور پھونکے جانے کا اثر ہے اور بھاگنا دوسری مرتبہ صور پھونکے جانے کے حکم میں ہے، لہٰذا یہ دونوں چیزیں (یعنی سونا اور جاگنا، گویا قیامت کی علامت کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور قیامت کی یاد دلانے کی باعث ہیں۔

موت اور قبر کو یاد رکھو

(۱۴) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ خَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِصَلٰوۃٍ فَرَاَی النَّاسَ کَاَنَّھُمْ یَکْتَشِرُوْنَ قَالَ اَمَا اِنَّکُمْ لَوْ اَکْثَرْتُمْ ذِکْرَ ھَاذِمِ اللَّذَّاتِ لَشَغَلَکُمْ عَمَّا اَرَی الْمَوْتِ فَاَکْثِرُوْا ذِکْرَ ھَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتِ فَاِنَّہٗ لَمْ یَاْتِ عَلَی الْقَبْرِ یَوْمٌ اِلَّا تَکَلَّمَ فَیَقُوْلُ اَنَا بَیْتُ الْغُرْبَۃِ وَاَنَا بَیْتُ الْوَحْدَۃِ وَاَنَا بَیْتُ التُّرَابِ وَاَنَا بَیْتُ الدُّوْدِ وَاِذَا دُفِنَ الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ قَالَ لَہُ الْقَبْرُ مَرْحَبًا وَّاَھْلًا اَمَا اِنْ کُنْتَ لَاَحَبَّ مَنْ یَمْشِیْ عَلٰی ظَھْرِیْ اِلَیَّ فَاِذَا وُلِّیْتُکَ الْیَوْمَ وَصِرْتَ اِلَیَّ فَسَتَرٰی صَنِیْعِیْ بِکَ قَالَ فَیَتَّسِعُ لَہٗ مَدَّ بَصَرِہٖ وَیُفْتَحُ لَہٗ بَابٌ اِلَی الْجَنَّۃِ وَاِذَا دُفِنَ الْعَبْدُ الْفَاجِرُ اَوِ الْکَافِرُ قَالَ لَہُ الْقَبْرُ لَا مَرْحَبًا وَّلَا اَھْلًا اَمَا اِنْ کُنْتَ لَاَبْغَضَ مَنْ یَمْشِیْ عَلٰی ظَھْرِیْ اِلَیَّ فَاِذْ وُلِّیْتُکَ الْیَوْمَ وَصِرْتَ اِلَیَّ فَسَتَرٰی صَنِیْعِیْ بِکَ قَالَ فَیَلْتَئِمُ عَلَیْہِ حَتّٰی تَخْتَلِفَ اَضْلَاعُہٗ قَالَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِاَصَابِعِہٖ فَاَدْخَلَ بَعْضَھَا فِیْ جَوْفِ بَعْضٍ قَالَ وَیُقَیَّضُ لَہٗ سَبْعُوْنَ تِنِّیْنًا لَوْ اَنَّ وَاحِدًا مِّنْھَا نَفَخَ فِی الْاَرْضِ مَا اَنْبَتَتْ شَیْئًا مَا بَقِیَتِ الدُّنْیَا فَیَنْھَسْنَہٗ وَیَخْدِشْنَہٗ حَتّٰی یُفْضٰی بِہٖ اِلَی الْحِسَابِ قَالَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَۃٌ مِّنْ رِیَاضِ الْجَنَّۃِ اَوْ حُفْرَۃٌ مِّنْ حُفَرِ النَّارِ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نماز کے لئے (مسجد شریف میں) تشریف لائے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ گویا لوگ (آپس میں کسی بات پر) ہنس رہے ہیں، آپ ﷺ نے (ان کو اس طرح ہنستے ہوئے دیکھ کر) فرمایا۔ "خبردار! (تم پر کونسی غفلت طاری

ہے کہ اس طرح بے فکری کے ساتھ ہنسنے میں مشغول ہو) بلاشبہ اگر تم لذتوں کو فنا کر دینے والی چیز کا اکثر ذکر کرتے رہو تو وہ تم کو اس چیز (یعنی زیادہ ہنسنے اور غافل لوگوں کی طرح کے کلام و گفتگو) سے باز رکھے جس کو میں دیکھ رہا ہوں، اور وہ (یعنی لذتوں کو فنا کر دینے والی چیز) موت ہے پس تم لذتوں کو فنا کر دینے والی چیز یعنی موت کو بہت یاد کرو! حقیقت یہ ہے کہ قبر پر ایسا کوئی دن (یعنی ایسا کوئی وقت اور زمانہ نہیں گزرتا جس میں وہ (زبان قال یا زبان حال سے) یہ نہ کہتی ہو کہ "میں غربت کا گھر ہوں" (یعنی میں ایک ایسی دور دراز اور ویران و سنسان جگہ کی طرح ہوں جہاں جو بھی آجاتا ہے وہ اپنے عزیز و اقارب، اپنے متعلقین اور اپنے گھر والوں سے ناقابل عبور مسافت کی دوری پر جا پڑتا ہے۔ لہٰذا اے انسان! تجھ کو لازم ہے کہ تو دنیا میں اس طرح رہ جس طرح کوئی مسافر اپنے عزیز و اقارب اور گھر والوں سے دور مسافرت کی حالت میں ہوتا ہے) "میں تنہائی کا گھر ہوں" (یعنی ایک ایسا گھر ہوں جس میں تنہائی اور وحشت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا، ہاں جو لوگ اللہ رب العزت کی وحدانیت کا نور لے کر آتے ہیں وہ بے شک تنہائی محسوس نہیں کرتے کیونکہ وہی نور ان کا رفیق و دم ساز بن جاتا ہے) "میں خاک کا گھر ہوں" (یعنی میں اس مٹی کا گھر وندہ ہوں جو ہر جاندار کی اصل اور بنیاد ہے پس جس کی اصل اور جس کا مرجع مٹی ہو اس کی شان یہی ہے کہ وہ مسکین و خاک نشین رہے، تاکہ مٹی کے ساتھ اس کی مناسبت ہر وقت ہر وقت تازہ رہے) اور "میں کیڑوں مکوڑوں کا گھر ہوں" (پھر حضور ﷺ نے فرمایا) جب کسی مؤمن بندے کو دفن کیا جاتا ہے تو (جس طرح کہ کوئی خوش (اخلاق میزبان اپنے کسی عزیز مہمان کی آمد کے وقت کلمات ترحیب کے ذریعے اس کا استقبال کرتا ہے اسی طرح) قبر (بھی اس مؤمن بندہ کا استقبال کرتی ہے اور) اس سے کہتی ہے کہ خوش آمدید! تم ایک اچھی کشادہ، آرام کی جگہ اور اپنے ہی مکان میں آئے ہو! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم میرے نزدیک ان لوگوں میں سب سے زیادہ پیارے تھے، جو مجھ پر چلتے ہیں، پس آج جب کہ میں تم پر حاکم و قادر بنائی گئی ہوں اور تم میرے مجبور و مقہور ہوئے ہو تو تم عنقریب میرے اس نیک سلوک کو دیکھو گے۔ جو میں تمہارے ساتھ کروں گی یعنی میں تمہارے لئے کشادہ و فراخ ہو جاؤں گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ اس کے بعد وہ قبر اس بندے کے کشادہ و فراخ ہو جاتی ہے اور وہ کشادگی و فراخی اس کو اپنی حد نظر تک معلوم ہوتی ہے اور پھر اس کے لئے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ (جس میں سے وہ جنت میں اپنا ٹھکانا دیکھتا رہتا ہے، اسی دروازے سے گزر کر اس تک ٹھنڈی اور مشکبار ہوائیں آتی ہیں اور وہ جنت کے مکانات، حوریں، نہریں، میوے اور درخت اور دوسری روح افزا نعمتیں دیکھ دیکھ کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کرتا ہے) اور جب کوئی بندۂ فاسق یا کافر دفن کیا جاتا ہے تو (جس طرح کوئی شخص اپنے یہاں آئے ہوئے ناآشنا و غیر عزیز اور بن بلائے مہمان کے ساتھ بے رخی اور بے مروتی کا برتاؤ کرتا ہے اسی طرح (قبر (بھی اس کافر کو جھڑکتی ہے اور کہتی ہے کہ) نہ تو تیرا آنا مبارک اور نہ تو اچھی کشادہ آرام کی جگہ اور اپنے مکان میں آیا ہے! تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ تو میرے نزدیک ان لوگوں میں سب سے برا تھا، جو مجھ پر چلتے ہیں، پس آج جب کہ میں تجھ پر حاکم و قادر بنائی گئی ہوں اور تو میرا مجبور و مقہور ہوا ہے تو جلد ہی دیکھ لے گا کہ میں تیرے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا "اور پھر قبر اس کو دباتی ہے یہاں تک کہ اس کی پسلیاں ادھر کی ادھر ہو جاتی ہیں" ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے (ان پسلیوں کی صورت حال دکھانے کے لئے) اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کیا (اور بتایا کہ اس طرح قبر کے دبانے کی وجہ سے اس کافر کی پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں) اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس کافر پر ستر اژدھے مسلط کر دیئے جاتے ہیں (اور وہ ایسے اژدھے ہوتے ہیں کہ) اگر ان میں سے کوئی ایک اژدہا بھی زمین پر پھنکار مار دے تو وہ زمین، جب تک کہ دنیا باقی ہے سبزہ اگانے کے قابل نہ رہے، وہ اژدھے اس کافر کو کاٹتے اور نوچتے ہیں۔ (اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ اس بندہ کو (قیامت کے دن) حساب کے لئے نہ لے جایا جائے "حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا "اس میں کوئی شک نہیں کہ قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا آگ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "لذت کو فنا کر دینے والی چیز کو بہت یاد کیا کرو" یہ در حقیقت غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کے لئے ایک بڑی اور موثر نصیحت ہے، اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں کہ موت کو یاد کرنا غافل کے دل کو زندہ کرتا ہے، حضرت شیخ عارف باللہ مولانا نور الدین علی متقیؒ کے

بارے میں منقول ہے کہ وہ ایک تھیلی نما چیز بنا کر اپنے پاس رکھے رہتے تھے جس پر "موت" کا لفظ لکھا ہوتا تھا، جب کوئی شخص ان کا مرید ہوتا تو وہ اس تھیلی کو اس مرید کی گردن میں لٹکا دیتے تھے تاکہ اس کے دل پر ہر وقت یہ احساس طاری رہے کہ موت بالکل قریب ہے، دور نہیں ہے! حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ گویا اس طریقہ سے سالکین طریقت کی تربیت فرماتے تھے اور مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ کسی وقت غافل نہ ہوں اور بیداری کے ساتھ طاعت و عبادت اور ذکر اللہ میں لگے رہیں۔ اسی طرح ایک بہت نیک اور خدا ترس بادشاہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے اعیان سلطنت میں سے کسی ایک کو اس خدمت پر مامور رکھتے تھے کہ وہ ہر وقت ان کے پیچھے کھڑا رہے اور "الموت. الموت" کہتا رہے تاکہ دل کو خدا کی طرف سے غافل ہونے کا موقع ہی نہ ملے اور ہر طرح کی روحانی بیماری کا علاج ہوتا رہے۔

فَاِنَّهٗ لَمْ يَاْتِ الخ کے ذریعے گویا حضور ﷺ نے اس حکم کی حکمت بیان فرمائی ہے کہ موت کو بہت زیادہ یاد کرنا چاہئے۔

"اور میں کیڑوں مکوڑوں کا گھر ہوں" یعنی میں ایک ایسا مکان ہوں جس میں آنے والا انسان کیڑوں مکوڑوں کی خوراک بن جاتا ہے، پس اے انسان! تیرے لئے یہ بات کیسے مناسب ہو سکتی ہے کہ تو کھانے پینے کی چیزوں لذت اور عمدگی کا جویا ہو اور تیری خواہش وارادہ ایک ایسے جسم کو اعلیٰ قسم کے طعام و مشروبات کے ذریعے بنانے اور لذت پہنچانے میں منہمک ہو جس کو آخر کار فنا ہو جانا ہے اور حقیر کیڑے مکوڑے کی خوراک بننا ہے) ہاں جو چیز یہاں تیرے لئے فائدہ مند ہو سکتی ہے وہ صرف نیک عمل ہے، اگر اچھے اعمال کا سرمایہ لے کر میری آغوش میں آئے گا تو یقیناً تجھے فائدہ پہنچے گا! اسی وجہ سے قبر کو اعمال کا صندوق کہا گیا ہے! بعض حضرات نے حجر میں پیدا ہونے والے کیڑوں کے بارے میں یہ تحقیق بیان کی ہے کہ جب جسم میں سڑاند پیدا ہوتی ہے تو اس سڑاند اور بدبو سے کیڑے پیدا ہوتے ہیں اور اس جسم کو کھا کھا کر زندہ رہتے ہیں، پھر جب وہاں ہڈیوں کے ڈھانچہ کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہتا تو وہ کیڑے آپس میں ایک دوسرے کو کھانا شروع کر دیتے ہیں یہاں تک کہ آخر میں ایک کیڑا باقی رہ جاتا ہے اور پھر وہ بھی بھوک کی وجہ سے مر جاتا ہے! علماء نے لکھا ہے کہ قبروں میں کیڑے مکوڑوں کی خوراک بننے اور زمین کے کھانے سے انبیاء، شہداء اور اولیاء کے اجسام محفوظ رہتے ہیں، جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى الْاَرْضِ اَنْ تَاْكُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِيَآءِ اور شہداء کے حق میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ رہی بات ان علماء باعمل کی، جن کو اولیاء اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے تو جب شہداء کو یہ فضیلت حاصل ہے تو ان علماء کو بدرجہ اولیٰ حاصل ہوگی کیونکہ ان (کے قلم) کی سیاہی کی ایک بوند شہداء کے خون سے افضل ہے۔

"بندۂ فاسق" سے فسق و فجور میں اکمل ترین فرد، یعنی کافر مراد ہے۔ اس کا قرینہ مقابلہ کا لفظ "بندۂ مؤمن" ہے۔ نیز ایک قرینہ اس کے حق میں قبر کا یہ کہنا بھی ہے کہ "تو میرے نزدیک ان لوگوں میں سب سے برا تھا جو مجھ پر چلتے ہیں" اس کی تائید قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں "فاسق" سے کافر مراد لیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا علاوہ ازیں یہ بات بھی مدنظر رہنی چاہئے کہ قرآن و حدیث کا اسلوب اور معمول بھی یہی ہے کہ برزخ و آخرت کے بارے میں جب کوئی حکم و فیصلہ بیان کیا جاتا ہے تو اس کے دو ہی فریق ہوتے ہیں، ایک تو مؤمن اور دوسرا کافر جہاں تک فاسق مؤمن کا تعلق ہے اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا جاتا ہے اور یہ سکوت اختیار کرنا یا تو اس کی پردہ پوشی کے نقطہ نظر سے ہوتا ہے یا اس لئے کہ اس کو خوف و رجا کے درمیان رکھا جائے، نہ کہ اس کا مقصد اس کو دونوں مرتبوں (یعنی کفر و ایمان) کے درمیان ایک الگ تیسرے مرتبہ پر رکھنا ہے جیسا کہ معتزلہ نے غلط گمان کیا ہے۔

"اس کافر پر ستر اژدھے مسلط کر دیئے جاتے ہیں" میں "ستر" کا عدد یا تو تحدید کے لئے ہے کہ اس متعین تعداد میں اژدھے اس پر مسلط کئے جاتے ہیں، یا اس عدد سے "کثرت" مراد ہے۔ جس کا مقصد اس مفہوم کو ادا کرنا ہے کہ اس پر بہت زیادہ اژدھے مسلط کئے جاتے ہیں۔ ایک دوسری روایت سے اس دوسرے احتمال کی تائید ہوتی ہے جو کہ قبر میں کافر پر عذاب کئے جانے کے سلسلے میں منقول ہے اور جس میں فرمایا گیا ہے کہ کافر پر اس کی قبر میں ایک کم سو اژدھے مسلط ہوں گے۔

آخرت کے خوف نے آپ ﷺ کو جلد بوڑھا کر دیا تھا

(۱۵) وَعَنْ اَبِیْ جحیفة قَالَ قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَدْ شِبْتَ قَالَ شَيَّبَتْنِیْ سُوْرَةُ هُوْدٍ وَاَخَوَاتُهَا۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت ابوجحیفہؓ کہتے ہیں کہ جب صحابہؓ نے یہ عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ) آپ تو بوڑھے ہو گئے، یعنی بڑی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی آپ (ﷺ) پر بڑھاپے کے اثرات ظاہر ہو گئے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا "سورۂ ہود اور اس جیسی سورتوں نے مجھ کو بوڑھا کر دیا ہے۔" (ترمذیؒ)

تشریح: یعنی سورۂ ہود اور ان جیسی سورتوں میں قیامت اور آخرت کے عذاب کا بہت زیادہ ذکر ہے۔ ان کے مضمون دیکھ دیکھ کر اپنی اُمت کی طرف سے یہ غم مجھے کھائے جارہا ہے کہ نہ معلوم میری امت کے لوگوں کا کیا حشر ہوگا، یہی غم کھاتے کھاتے میرا یہ حال ہو گیا ہے۔

(۱۶) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ اَبُوْبَكْرٍ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَدْ شِبْتَ قَالَ شَيَّبَتْنِیْ هُوْدٌ وَالْوَاقِعَةُ وَالْمُرْسَلٰتُ وَعَمَّ يَتَسَاءَلُوْنَ وَاِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَذُكِرَ حَدِيْثُ اَبِیْ هُرَيْرَةَ لَايَلِجُ النَّارَ فِیْ كِتَابِ الْجِهَادِ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت ابوبکرؓ کہنے لگے کہ یارسول اللہ! آپ (ﷺ) تو (بہت جلد) بوڑھے ہو گئے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "ہاں! سورۂ ہود، سورۂ واقعہ، سورۂ مرسلات، عم یتساء لون اور اِذَا الشمس کورت (اور ان جیسی دوسری سورتوں) نے (کہ جن میں قیامت اور اس کے احوال کا ذکر ہے) مجھ کو (بڑی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی) بوڑھا کر دیا ہے۔" (ترمذیؒ)

اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت لایلج النّار الخ کتاب الجہاد میں نقل کی جا چکی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

صحابہؓ کا کمال احتیاط و تقویٰ

(۱۷) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اِنَّكُمْ لَتَعْمَلُوْنَ اَعْمَالاً هِیَ اَدَقُّ فِیْ اَعْيُنِكُمْ مِنَ الشَّعْرِ كُنَّا نَعُدُّهَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمُوْبِقَاتِ يَعْنِی الْمُهْلِكَاتِ۔ (رواہ البخاری)

"حضرت انسؓ نے (اپنے زمانے کے مسلمانوں کو مخاطب کر کے) فرمایا "تم ایسے کام کرتے ہو جو تمہاری نظر میں بال سے بھی زیادہ باریک ہیں لیکن ہم ان کاموں کو رسول کریم ﷺ کے زمانے میں موبقات یعنی ہلاک کرنے والے کاموں میں شمار کرتے تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ تم لوگ ایسے ایسے کام کرتے ہو اور ایسی ایسی چیزیں اختیار کرتے ہو جو تمہاری نظر میں بہت معمولی درجہ کی اور بہت حقیر ہیں، زیادہ سے زیادہ تم ان کو مکروہات میں شمار کرتے ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کام اور وہ چیزیں بڑی نقصان دہ ہیں، اور بڑی تباہی کی طرف لے جانے والی ہیں، چنانچہ رسول کریم ﷺ کے زمانے میں ہم لوگ ایسے کاموں کو بھی ان کاموں میں شمار کرتے تھے جو اخروی انجام کے اعتبار سے ہلاکت میں ڈالنے والے ہیں۔

صحابہؓ کا کمال احتیاط و تقویٰ

(۱۸) وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا عَائِشَةُ اِيَّاكِ وَمُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ فَاِنَّ لَهَا مِنَ اللّٰهِ طَالِبًا۔ (رواہ ابن ماجۃ والدارمی والبیہقی فی شعب الایمان)

"اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "عائشہؓ! تم اپنے آپ کو ان گناہوں سے بھی دور رکھو جن کو بہت معمولی اور حقیر سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان گناہوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک مطالبہ کرنے والا بھی ہے۔" (ابن ماجہؒ ۔ بیہقیؒ)

تشریح : ’’مطالبہ کرنے والا بھی ہے‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ ایسے گناہوں پر ایک طرح کا عذاب مقرر ہے جو ان گناہوں کے مرتکبین کو اپنی گرفت میں لیتا ہے پس گویا خود وہ عذاب اللہ تعالیٰ سے ایسے لوگوں کو اپنے حوالے کئے جانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور اللہ اس کے مطالبہ کو رد نہیں کرتا! اس اعتبار سے لفظ ’’طالبا‘‘ میں تنوین اظہار تعظیم کے لئے ہے اور جملے کے اعتبار سے طالباعظیما کے مفہوم میں ہے لہٰذا یہ بات کسی کے لئے بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ اس امر سے غافل رہے جیسا کہ اکثر لوگ ایسے ایسے چھوٹے چھوٹے کام کرنے کو کہ جو صغیرہ گناہ کے حکم میں ہوتے ہیں، بہت سہل جانتے ہیں اور ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ تو توبہ واستغفار کے ذریعے ان گناہوں کا تدارک کرتے ہیں اور نہ ان کی وجہ سے کسی خوف وڈر میں مبتلا ہوتے ہیں نیز وہ اس بات سے بھی غافل رہتے ہیں کہ کسی چھوٹے سے چھوٹے گناہ پر اصرار (یعنی اس کو بار بار کرنا اور اس سے اجتناب نہ کرنا صغیرہ گناہ نہیں رہتا، بلکہ گناہ کبیرہ کے حکم میں آجاتا ہے اور ویسے بھی ہر گناہ صغیرہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کی نسبت سے کبیرہ ہی ہے جس کا تھوڑا سا حصہ بھی بہت بڑا بن جاتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ کبھی کبیرہ گناہ کو تو معاف کر دیتا ہے اور صغیرہ گناہ پر عذاب دیتا ہے جیسا کہ اس کے ارشاد وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ سے مفہوم و مستفاد ہوتا ہے! جہاں تک قرآن کی اس آیت کریمہ کا تعلق ہے اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَاتُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے صغیرہ گناہوں کو تمہاری ان عبادتوں کے ذریعے دھوڈالیں گے جو گناہ کو مٹادیتی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ سرے سے گناہ سے اجتناب کرو خواہ وہ صغیرہ گناہ ہو یا کبیرہ! گویا اس آیت میں شرط کا تعلق محض کبیرہ گناہوں سے بچنے سے نہیں ہے جیسا کہ معتزلہ نے گمان کیا ہے بلکہ اس شرط کا تعلق مطلق گناہ سے ہے۔

ایک اور روایت میں کہ جس کو احمدؒ اور طبرانیؒ نے نقل کیا ہے، یہ فرمایا گیا ہے کہ ’’تم اپنے آپ کو چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بھی بچاؤ کیونکہ چھوٹے چھوٹے گناہوں کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو کسی کھائی میں اترے اور وہاں انہوں نے ایک ایک لکڑی کر کے ایندھن جمع کیا اور پھر اپنی روٹی پکائی (اسی طرح صغیرہ گناہوں کا مرتکب چھوٹے چھوٹے گناہ کر کے اتنے وبال جمع کر لیتا ہے کہ آخر اس کے پاپ کی ناؤ بھر جاتی ہے اور وہ غرق ہو جاتا ہے) اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ صغیرہ گناہ کرنے والے کو پکڑ لیتا ہے تو پھر اس کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰؓ سے کیا کہا

(۱۹) وَعَنْ اَبِیْ بُرْدَةَ بْنِ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ لِیْ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ هَلْ تَدْرِیْ مَاقَالَ اَبِیْ لِاَبِیْكَ قَالَ قُلْتُ لَا قَالَ فَاِنَّ اَبِیْ قَالَ لِاَبِیْكَ یَا اَبَا مُوْسٰی هَلْ یَسُرُّكَ اَنَّ اِسْلَامَنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَهِجْرَتَنَا مَعَهٗ وَجِهَادَنَا مَعَهٗ وَعَمَلَنَا كُلَّهٗ مَعَهٗ بَرَدَلَنَا وَاَنَّ كُلَّ عَمَلٍ عَمِلْنَا بَعْدَهٗ نَجَوْنَا مِنْهُ كِفَافًا رَاْسًا بِرَاْسٍ فَقَالَ اَبُوْكَ لِاَبِیْ لَا وَاللّٰهِ قَدْجَاهَدْنَا بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَصَلَّیْنَا وَصُمْنَا وَعَمِلْنَا خَیْرًا كَثِیْرًا وَاَسْلَمَ عَلٰی اَیْدِیْنَا بَشَرٌ كَثِیْرٌ وَاِنَّا لَنَرْجُوْا ذٰلِكَ قَالَ اَبِیْ لٰكِنِّیْ اَنَا وَالَّذِیْ نَفْسُ عُمَرَ بِیَدِهٖ لَوَدِدْتُ اَنَّ ذٰلِكَ بَرَدَلَنَا وَاَنَّ كُلَّ شَیْءٍ عَمِلْنَا بَعْدَهٗ نَجَوْنَا مِنْهُ كِفَافًا رَاْسًا بِرَاْسٍ فَقُلْتُ اِنَّ اَبَاكَ وَاللّٰهِ كَانَ خَیْرًا مِّنْ اَبِیْ۔ (رواہ البخاری)

’’اور حضرت ابو بردہؒ ابن ابی موسیٰ اشعریؒ (جو اونچے درجے کے تابعین میں سے ہیں) کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت عبداللہ بن عمرؓ مجھ سے کہنے لگے کہ تمہیں معلوم ہے، میرے والد (حضرت عمر فاروقؓ) نے تمہارے والد (حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ) سے کیا کہا تھا؟ حضرت ابو بردہؒ کہتے ہیں کہ میں نے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا۔ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا۔ میرے والد نے تمہارے والد سے کہا تھا کہ ابو موسیٰ کیا یہ بات تمہارے لئے خوش کن ہے کہ ہمارا اسلام جو رسول کریم ﷺ کے ساتھ (یعنی آپ ﷺ کی بعثت سے ملا ہوا تھا) ہماری ہجرت جو آپ ﷺ کے ساتھ تھی، ہمارا جہاد جو آپ کے ساتھ تھا اور ہمارے سارے اعمال (یعنی نماز، روزے، زکوٰۃ، حج اور اس طرح کے

دوسرے عباداتی اعمال) جو آپ ﷺ کے ساتھ تھے، وہ سب ہمارے لئے ثابت و برقرار رہیں اور ہم نے جو اعمال رسول کریم ﷺ کے بعد کئے ہیں وہ اگر ہم سے برابر سرابر بھی چھوٹ جائیں تو ہماری نجات کے لئے کافی ہیں تمہارے والد نے (یہ سن کر) میرے والد سے کہا کہ نہیں، خدا کی قسم ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے رسول کریم ﷺ کے بعد جہاد کیا ہے، نمازیں پڑھیں ہیں، روزے رکھے ہیں اور دوسرے بہت نیک اعمال (جیسے صدقہ وخیرات وغیرہ) کئے ہیں اور بہت سے لوگ ہمارے ہاتھوں پر (یعنی ہماری وجہ سے) مسلمان ہوئے ہیں اور یقیناً ہم (مذکورہ چیزوں) کا اجر و ثواب پانے کی امید رکھتے ہیں (جو ہمارے پہلے اعمال کے ثواب میں اضافہ ہی کریں گے) میرے والد (حضرت عمرؓ) نے کہا کہ (تمہاری بات صحیح ہے) لیکن میں تو قسم اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں عمر کی جان ہے۔ اس بات کو زیادہ پسند کرتا ہوں کہ ہم نے جو اعمال رسول کریم ﷺ کے ساتھ کئے ہیں وہ ثابت و برقرار رہیں اور جو اعمال ہم نے آپ ﷺ کے بعد کئے ہیں ان سے برابر سرابر چھوٹ جائیں۔ (حضرت ابوبردہؓ کہتے ہیں کہ یہ سن کر) میں نے حضرت ابن عمرؓ سے کہا کہ تمہارے والد، خدا کی قسم، میرے والد سے بہتر تھے۔" (بخاریؒ)

تشریح: "برابر سرابر چھوٹ جائیں" ان الفاظ کے ذریعے حضرت عمرؓ نے اپنے اس احساس کا اظہار کیا کہ ہم نے حضور ﷺ کے بعد جو اعمال اختیار کئے جو نیک کام کئے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کس زمرے میں رکھے گئے، آیا وہ قبول کئے گئے، یا ان کو ناقابل قبول قرار دے دیا گیا ہے، اس صورت میں ہماری یہ تمنا ہی بہتر ہے کہ ان اعمال کا نہ تو ہمیں کوئی نفع پہنچے نہ نقصان، نہ ان پر ثواب ملے اور نہ وہ عذاب کا موجب بنیں، گویا اگر وہ اعمال ہمارے لئے ثواب کا موجب نہیں بن سکتے تو خدا کرے وہ ہمارے حق میں عذاب کا سبب بھی نہ ہوں۔

طاعت ناقص ما، موجب غفراں نشود — راضیم گر مدد علت عصیاں نشود

چنانچہ ہم نے جو اعمال حضور ﷺ کے سایہ تربیت اور آپ ﷺ کی صحبت کی نورانیت کے سبب کئے ہیں اور بجا طور پر ان کی قبولیت کا گمان رکھتے ہیں، اگر وہی ثابت و برقرار رہیں تو زہے سعادت، اور جو اعمال ہم نے حضور ﷺ کے بعد کئے ہیں اور وہ نقص و خرابی سے خالی نہیں تھے، اگر ان سے ہم برابر سرابر بھی چھوٹ جائیں تو یہی بہت غنیمت ہے۔ حضرت عمرؓ کے اس احساس کی بنیاد دراصل اس حقیقت پر تھی کہ اتباع کرنے والا علم و عمل کے تئیں اعتقاد و اخلاص میں حجت و فساد کا خود ذمہ دار نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے متبوع کی ذمہ داری کے تحت ہوتا ہے، جیسا کہ مقتدی کی نماز کا معاملہ ہے کہ اس کی نماز کا صحیح ادا ہونا امام کی نماز کے صحیح ادا ہونے پر انحصار رکھتا ہے کہ اگر امام کی نماز صحیح ادا نہیں ہوئی تو مقتدی کی نماز بھی صحیح ادا نہیں ہو سکتی، اسی طرح مقتدی کی نماز کا فاسد ہونا امام کی نماز کے فاسد ہونے پر انحصار رکھتا ہے لہٰذا جو اعمال حضور ﷺ کی صحبت اور آپ ﷺ کی راہنمائی میں ادا ہوئے ان کا صحت و خوبی کے ساتھ ادا ہونا اور درجہ کمال تک پہنچنا شک و شبہ سے بالاتر ہے، اسی طرح جو عباداتی اعمال حضور ﷺ کے بعد وقوع پذیر ہوئے ان کا نیتوں کے تغیر اور حالات کی خرابی سے متاثر ہونا بعید از امکان نہیں، چنانچہ اس بات کا اقرار تو خود صحابہؓ کے ہاں ان الفاظ میں ملتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ہم نے ابھی آپ ﷺ کی قبر پر مٹی ڈالنے کے بعد اپنے ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے اور ہنوز آپ ﷺ کو سپرد خاک کرنے میں مشغول ہی تھے کہ ہم نے اپنے دلوں میں ایک بڑا تغیر محسوس کیا، اس کا مطلب یہ تھا کہ آفتاب نبوت کے غروب ہو جانے سے پوری کائنات پر جو اندھیرا پھیلا اس نے ان صحابہؓ کے قلوب کو بھی متاثر کیا اور انہیں محسوس ہوا کہ ہم زمانہ رسالت پناہ میں ایمان و اخلاص اور یقین و اعتقاد کے جس مقام پر تھے اب حضور ﷺ کے بعد اس مقام سے نیچے آ گئے۔ چنانچہ اگر حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا کہ حضور ﷺ کے بعد ہم نے جو عباداتی اعمال کئے، ان سے برابر سرابر بھی چھوٹ جانا ہمارے حق میں بڑا غنیمت ہے تو انہوں نے یقیناً بڑی عارفانہ بات فرمائی۔ واضح رہے کہ اس بات کا تعلق جب ان پاک نفوس سے جو جلیل القدر صحابہؓ تھے اور جو اپنے ایمان و اعتقاد اور عمل و کردار کے اعتبار سے پوری اُمت کے سب سے افضل فرد تھے تو ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے، اور ان کا کیا ٹھکانا ہو گا جو ان پاک نفوس کے بھی بعد اس دنیا میں آئے اور ان کی طاعات و عبادات عجب و غرور اور ریا وغیرہ

سے بھری ہوئی ہیں؟ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک پر اپنا فضل و کرم اور رحمت خاص کا سایہ کرے یعنی بدکاروں کو اپنے نیک بندوں کے طفیل میں حسن عاقبت سے نواز دے! ویسے تو بعض عارفین نے یہاں تک کہا ہے کہ وہ گناہ و معصیت جو بندے میں ندامت وشرمندگی اور ذلت و خواری کا باعث ہو اس طاعت و عبادت سے بہتر ہے جو خود بینی و خود نمائی اور تکبر و غرور میں مبتلا کر دے۔

روایت کے آخری جز یعنی حضرت ابوبردہؓ کے اس قول "تمہارے والد خدا کی قسم، میرے والد سے بہتر تھے" کا مطلب یہ ہے کہ جب تمہارے والد اتنی عظیم القدر ہستی ہونے اور اتنے زیادہ اعمال و فضائل کے حامل ہونے کے باوجود خوف و دہشت کے اس مقام پر تھے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ میرے والد سے کہیں زیادہ بہتر ہوئے، اور ان کا مرتبہ کہیں زیادہ بلند ہوگا، یا یہ مراد ہے کہ اس بات پر تعجب ہے کہ تمہارے والد باوجود یہ کہ میرے والد سے برتر و افضل تھے لیکن وہ آخرت کے معاملے میں اس قدر خوف زدہ تھے؟ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کا معاملہ بہت نازک ہے۔

نو باتوں کا حکم

(۲۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَنِیْ رَبِّیْ بِتِسْعٍ خَشْیَةِ اللّٰهِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَةِ وَكَلِمَةُ الْعَدْلِ فِی الْغَضَبِ وَالرِّضَا وَالْقَصْدِ فِی الْفَقْرِ وَالْغِنَا وَاَنْ اَصِلَ مَنْ قَطَعَنِیْ وَاُعْطِیَ مَنْ حَرَمَنِیْ وَاَعْفُوَ عَمَّنْ ظَلَمَنِیْ وَاَنْ یَّكُوْنَ صَمْتِیْ فِكْرًا وَنُطْقِیْ ذِكْرًا وَنَظْرِیْ عِبْرَةً وَاٰمُرَ بِالْعُرْفِ وَقِیْلَ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (رواہ رزین)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا (میرے رب نے مجھ کو نو باتوں کا حکم دیا ہے، ایک تو یہ کہ ظاہر و پوشیدہ ہر حالت میں اللہ سے ڈرا جائے (یعنی دل میں بھی خدا کا خوف سمایا ہوا ہو، اور ارتکاب معصیت سے اجتناب کی صورت میں اعضاء جسم پر بھی خوف خداوندی کا اثر ظاہر ہو، یا یہ کہ خواہ تنہائی ہو یا لوگوں کی موجودگی، ہر حالت میں وہی کام کرنا چاہئے جو خوف خداوندی کا مظہر ہو) دوسری بات یہ کہ سچ بولا جائے خواہ غصہ کی حالت ہو یا رضامندگی کی (یعنی بہت سے لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ جب کسی سے راضی و خوش ہوتے ہیں تو اس کی تعریف کرتے ہیں، اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور اس کے عیوب کو چھپاتے ہیں اور جب کسی سے غصے و ناراض ہوتے ہیں تو اس کی برائی کرتے ہیں اس کی ہر بات کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کے عیوب کو اچھالتے ہیں، یہ بات مناسب نہیں ہے، بلکہ یہ ہونا چاہئے کہ غصہ اور خوشی دونوں حالت میں اپنی زبان کو حد اعتدال پر رکھا جائے اور وہی بات کہی جائے جو حقیقت کے مطابق اور عین سچائی ہو)۔

تیسری بات یہ کہ فقر و غربت، اور ثروت و مالداری دونوں حالت میں میانہ روی اختیار کی جائے (یعنی خواہ فقر و غربت کی حالت ہو یا ثروت و مالداری کی، بہرصورت راہ اعتدال پر قائم رہا جائے کہ فقر و غربت کی حالت میں تو غصہ، تلخی اور جزع و فزع اختیار نہ کیا جائے اور ثروت و مالداری کی حالت میں تکبر و سرکشی اور اونچا اڑنے سے اجتناب کیا جائے یا یہ معنی ہیں کہ رزق اور ضروریات زندگی کی دوسری چیزیں بس اسی مقدار میں طلب کرے جو اعتدال کی حد تک ہو، نہ تو فقر و افلاس کی حد تک تنگی و سختی برداشت کرے اور نہ عیش و عشرت کی زندگی اختیار کرے) چوتھی بات یہ کہ میں اس شخص سے قرابت داری کو قائم رکھوں جو مجھ سے قطع تعلق کرے (یعنی مجھے ایک حکم یہ بھی دیا گیا ہے کہ اگر میرا کوئی عزیز و رشتہ دار مجھ سے بدسلوکی کرے اور قرابت داری کا تعلق ختم کرے تو میں اس کے ساتھ بھی حسن سلوک کروں اور اس کے ساتھ قرابت داری کو قائم رکھنے کی کوشش کروں، یہ بات آنحضرت ﷺ کے وصف علم و بردباری اور کمال تواضع و مروت کی آئینہ دار ہے) پانچویں بات یہ کہ میں اس شخص کو (بھی) اپنی عطاء و بخشش اور جود و سخاوت سے نوازوں جو مجھے (اپنے لین دین سے) محروم رکھے، چھٹی بات یہ کہ میں انتقام لینے کی طاقت و قوت رکھنے کے باوجود) اس شخص کو معاف کروں جو مجھ پر ظلم و زیادتی کرے، ساتویں بات یہ کہ میرا چپ رہنا عبادت کا ذریعہ ہو (یعنی جب میں خاموشی کی حالت میں ہوں اور کسی کے ساتھ بات چیت یا زبان کے ذریعے تبلیغ میں مشغول نہ ہوں تو اس وقت اللہ تعالیٰ کے اسماء صفات اس کی قدرت کی کرشمہ سازیوں اور اس کے کلام کے معانی و مطالب میں غور و فکر اور استغراق و انہماک

رکھوں، آٹھویں یہ کہ میرا بولنا ذکر اللہ کا مظہر ہو (یعنی جب میری زبان جاری ہو اور میں بولوں تو اللہ کی بات کروں کہ اس کا تعلق خواہ تسبیح وتحمید، اور تکبیر و توحید سے ہو یا تلاوت کلام اللہ، اور اس کے بندوں کو تعلیم و تلقین اور تذکیر و نصیحت سے) اور نویں بات یہ کہ میری نظر عبرت پذیری کے لئے ہو (یعنی جب میں خدا کی کسی مخلوق کی طرف دیکھوں تو میرا وہ دیکھنا عبرت حاصل کرنے کے لئے اور توجہ و ہوشیاری کے ساتھ ہو، نہ کہ نادانی و غفلت کے ساتھ، نیز میرے پروردگار نے مجھے یہ بھی حکم دیا ہے کہ میں بندگان خدا کو نیکی کی تلقین و تبلیغ کروں) اور ایک روایت میں "بالمعروف" کا لفظ ہے۔" (رزین)

تشریح: آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ ایک روایت میں "بالعرف" کے بجائے "بالمعروف" کا لفظ ہے اور دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی "اچھی بات"۔

رہی یہ بات کہ جب امر بالمعروف کا ذکر کیا گیا ہے تو نہی عن المنکر کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ امر بالمعروف کا لفظ عام ہے جس کے دائرہ میں نہی عن المنکر کا مفہوم بھی آجاتا ہے، چنانچہ جب صرف امر بالمعروف کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد پورا مفہوم ہوتا ہے یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔

واضح رہے کہ حضور ﷺ نے امر بالمعروف کے حکم کا جو ذکر فرمایا ہے وہ مذکورہ باتوں کے حکم کے علاوہ ہے اور یہ حکم جامعیت کا حامل ہے کہ اس کے دائرہ مفہوم میں خالق و مخلوق سے متعلق تمام ہی اچھی باتیں اور طاعات آجاتی ہیں جن کو حضور ﷺ نے تفصیل کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد پھر علیحدہ سے بطریق اجمال ذکر فرمایا۔

خوف الٰہی سے گریہ کی فضیلت

(۲۱) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ يَخْرُجُ مِنْ عَيْنَيْهِ دَمُوْعٌ وَاِنْ كَانَ مِثْلَ رَاْسِ الذُّبَابِ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ثُمَّ يُصِيْبُ شَيْئًا مِنْ حُرِّ وَجْهِهٖ اِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

"اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "ہر وہ بندۂ مؤمن جس کی آنکھوں سے خدا کے خوف میں آنسو نکلیں اگرچہ وہ آنسو مکھی کے سر کے برابر (یعنی بہت معمولی مقدار میں) کیوں نہ ہوں اور پھر وہ آنسو بہہ کر اس کے وجیہہ (خوبصورت) پر پہنچیں تو اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ کو حرام کر دے گا۔" (ابن ماجہ)

بَابُ تَغَيُّرِ النَّاسِ

لوگوں میں تغیر و تبدل کا بیان

تغیر کے معنی ہیں بدل جانا۔ یعنی ایک حالت کو چھوڑ کر دوسری حالت اختیار کر لینا! یہاں "لوگوں میں تغیر و تبدل ہو جانے" سے مراد مسلمانوں کی اس حالت کا بدل جانا ہے جو حضور ﷺ کے زمانے میں تھی، چنانچہ حضور ﷺ کے زمانے میں اہل ایمان کی حالت یہ تھی کہ وہ دین کے راستہ پر سختی سے قائم تھے، احکام سُنّت کا احترام تھا حق کے پیرو تھے دنیا سے بے رغبت تھے، دنیا کی چمک دمک یعنی مال و دولت، حشم و خدم، اور جاہ و منصب نے ان کے اندر حرص و لالچ، اور غرور و تکبر کے جراثیم پیدا نہیں کئے تھے شریعت کے پسندیدہ اعمال، اچھے خصائل و اطوار، بلند کرداری اور حسن اخلاق ان کی عادت ثانیہ تھی حق کی راہ میں سینہ سپر رہتے تھے، دل کی نورانیت اور باطن کی صفائی و پاکیزگی کے جوہر سے متصف تھے۔

لیکن حضور ﷺ کے بعد جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا لوگوں کے ان حالات میں تبدیلی آتی گئی یہاں تک کہ آخر زمانے میں ان کے حالات،

ومعاملات بالکل برعکس ہو جائیں گے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

قحط الرجال

① عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا النَّاسُ کَالْاِبِلِ الْمِائَۃِ لَا تَکَادُ تَجِدُ فِیْھَا رَاحِلَۃً۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "آدمی اختلاف حالات اور تغیر صفات کے اعتبار سے) ان سو اونٹوں کے مانند ہے جن میں سے تم ایک ہی کو سواری کے قابل پا سکتے ہو۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "راحلۃ" اس اونٹ کو کہتے ہیں جو تندرست وتوانا ہوتا ہے اور سواری وبار برداری کے کام کے لئے بہت اچھا اور پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لفظ میں حرف ت اظہار مبالغہ کے لئے ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں آدمی تو بہت ہیں جیسے اونٹ بہت ہوتے ہیں، لیکن جس طرح اونٹوں میں سے سواری اور بار برداری کے قابل چند ہی اونٹ نکلتے ہیں اسی طرح کام کے آدمی کہ جو نبی ﷺ کی صحبت ودریافت کے قابل ہوں اور صحبت دریافت کا حق ادا کر سکیں اور ان کے نیک مقصد میں ان کے معین ومددگار ثابت ہو سکیں، بہت کم ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ کا زمانہ اس اعتبار سے سب سے بہتر زمانہ تھا کہ اس میں کام کے لوگ زیادہ تھے پھر بعد کے زمانہ میں اگرچہ پہلے زمانہ کی بہ نسبت ایسے لوگوں کی تعداد کم تھی لیکن آنے والے زمانوں کے اعتبار سے وہ تعداد یقیناً زیادہ تھی اور پھر اس کے بعد کے زمانہ میں ایسے لوگوں کی تعداد اگرچہ دوسرے زمانے کی تعداد سے بھی کم تھی لیکن آنے والے زمانوں کے اعتبار سے یقیناً بہت زیادہ تھی۔

حدیث میں "سو" کا جو عدد ذکر فرمایا گیا ہے وہ تحدید وتعین کے لئے نہیں ہے بلکہ اظہار کثرت کے لئے ہے! حاصل یہ کہ لوگوں کے جنگل میں ایسی ہستی کا وجود کہ جس پر "مخلص عالم باعمل" کا اطلاق کیا جا سکے کیمیا کی طرح نایاب ہوتا ہے، اسی لئے ہر زمانہ کے ارباب حال یہ کہا کرتے ہیں کہ یہ زمانہ "قحط الرجال" کا ہے۔ حضرت سہل تستریؒ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک دن جب مسجد میں لوگوں کو اس کثرت کے ساتھ دیکھا کہ مسجد اندر اور باہر سے بھری ہوئی تھی تو فرمایا کہ "کلمہ گو یقیناً بہت ہیں لیکن ان میں مخلص لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس مفہوم کو اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں کئی موقعوں پر بیان فرمایا ہے۔

اہل اسلام کے بارے میں ایک پیشگوئی

② وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَکُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰی لَوْ دَخَلُوْا جُحْرَ ضَبٍّ تَبِعْتُمُوْھُمْ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَلْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی قَالَ فَمَنْ؟ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا یقیناً (آنے والے زمانوں میں) تم بالشت، بالشت کے برابر اور ہاتھ ہاتھ کے برابر ان لوگوں کے طور وطریق کو اختیار کرو گے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ گروہ گوہ یعنی سوسمار کے بل میں بیٹھیں گے (جو بہت تنگ اور برا ہوتا ہے) تو تم اس میں بھی ان کی پیروی کرو گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) وہ لوگ کہ جو پہلے گزر چکے ہیں اور جن کے طور طریقوں کو ہم اختیار کریں گے کیا وہ یہود ونصاریٰ ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا اگر وہ یہود ونصاریٰ نہیں ہیں تو اور کون ہیں؟ یعنی تم سے پہلے گزرے ہوئے جن لوگوں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے ان سے مراد یہود ونصاریٰ ہی ہیں۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "سنن"، سُنّت کی جمع ہے جس کے معنی طور اور طریقے کے ہیں، خواہ نیک طریقہ ہو یا برا طریقہ، یہاں اس لفظ سے ان خواہش پرست اور دین کو مسخ کر دینے والے لوگوں کا طور طریقہ ہے جنہوں نے اپنے نبی اور پیغمبر کے گزر جانے کے بعد اپنی نفسانی خواہشات اور جھوٹی اغراض کے تحت اپنے دین تک کو بدل ڈالا اور ان کا نبی و پیغمبر ان کے پاس خدا کی جو کتاب چھوڑ کر گیا تھا اس میں انہوں نے تحریف کر ڈالی اور ان کے احکام و مسائل میں کانٹ چھانٹ کر دی۔ بعض نسخوں میں یہ لفظ سین کے زبر کے ساتھ ہے۔

"بالشت بالشت کے برابر اور ہاتھ ہاتھ کے برابر" کا مطلب ہے بجمیع وجوہ ہر کام و معاملہ میں ان کی اتباع و پیروی کرنا اور ان کے تمام طور طریقوں کو اختیار کر لینا۔

دنیا میں بتدریج نیک لوگوں کی کمی ہوتی رہے گی

③ وَعَنْ مِرْدَاسٍ نِ الْاَسْلَمِيِّ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْهَبُوْنَ الصَّالِحُوْنَ الْاَوَّلُ وَالْاَوَّلُ وَيَبْقٰى حُفَالَةٌ كَحُفَالَةِ الشَّعِيْرِ اَوِ التَّمْرِ لَا يُبَالِيْهِمُ اللّٰهُ بَالَةً۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت مرداس اسلمیؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ نیک بخت و صالح لوگ یکے بعد دیگرے اس دنیا سے گزرتے رہیں گے اور بدکار و ناکارہ لوگ جو یا کھجور کی بھوسی کی طرح باقی رہ جائیں گے جن کی اللہ تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں ہوگی (یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسے لوگوں کی کوئی قدر و منزلت نہیں اور ان کے وجود کا کوئی اعتبار نہیں)۔" (بخاریؒ)

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

ایک پیشین گوئی جو صحیح ثابت ہوئی

④ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا مَشَتْ اُمَّتِيْ الْمُطَيْطَاءُ وَخَدَمَتْهُمْ اَبْنَاءُ الْمُلُوْكِ اَبْنَاءُ فَارِسَ وَالرُّوْمِ سَلَّطَ اللّٰهُ شِرَارَهَا عَلٰى خِيَارِهَا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب میری اُمّت کے لوگ تکبر کی چال چلنے لگیں گے اور بادشاہوں کے بیٹے کہ جو فارس و روم کے شہزادے ہوں گے، ان کی خدمت کریں گے (بایں طور کہ اللہ تعالیٰ اہل فارس و روم کے علاقوں اور شہروں کو مسلمانوں کے زیر نگیں کر دے گا اور وہ فتوحات حاصل کریں گے تو اس کے نتیجے میں ان علاقوں اور شہروں کے نہ صرف عام آدمی بلکہ بادشاہ و شہزادے بھی قیدی بنائے جائیں گے اور مسلمان ان سب کو بطور غلام اپنی خدمت پر مامور کریں گے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ اُمّت کے برے لوگوں کو بھلے لوگوں پر یعنی ظالموں کو مظلوموں پر) مسلط کر دے گا۔ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: یہ حدیث آنحضرت ﷺ کی نبوت کی دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے اس حدیث کے ذریعے ایک ایسی بات کی خبر دی جو آئندہ زمانہ میں وقوع پذیر ہونے والی تھی، اور آپ ﷺ نے بطور پیشگوئی جو بات فرمائی وہ "حرف بحرف" صحیح ثابت ہوئی، چنانچہ یہ بات اسلامی تاریخ کی ایک عین حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے فارس و روم کے علاقے فتح کر لئے وہاں کی بے شمار دولت مال غنیمت کے طور پر حاصل کی، ان علاقوں اور شہروں کے لوگوں کو قیدی بنایا اور بادشاہوں کی اولادوں تک کو غلام بنا کر ان سے خدمت و چاکری کرائی اور اس طرح سے ان کے اندر جب بڑائی کا احساس پیدا ہو گیا اور اخلاص کی جگہ جاہ و منصب اور مال و دولت کی محبت نے لے لی تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر ان لوگوں کو مسلط کر دیا۔ جنہوں نے حضرت عثمان غنیؓ کو قتل کیا تھا، یہاں تک کی بنی ہاشم جو کل تک مسلمانوں کی قیادت و سیادت کے امین سمجھے جاتے تھے اور جن کی خلافت و حکمرانی تمام عالم اسلام پر قائم تھی ان پر بنو امیہ کو مسلط کر دیا اور

بنو امیہ نے جو کچھ کیا وہ اسلامی تاریخ کی ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جس کو یہاں بیان نہ کرنا ہی مناسب ہے۔

مطیطاء کے معنی ہیں دونوں ہاتھ پھیلا کر اتراتے ہوئے (یعنی مغرورانہ چال) چلنا۔ اسی سے "مط" ہے جس کے معنی ازراہ نخوت وتکبر ناک بھوں سکیڑنے اور ابرو چڑھانے کے ہیں! لغت کی مشہور کتابوں قاموس صحاح اور صراح نیز مشکوٰۃ کے صحیح نسخوں میں لفظ اسی طرح ہے لیکن "مجمع البحار" اور اس کتاب کے بعض حواشی میں لکھا ہے کہ یہ لفظ دوسرے ط کے بعد بھی ی کے ساتھ منقول ہے۔ جو محذوف ہے یعنی "مطیطا" کے بجائے "مطیطی" ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس لفظ میں دوسرے ط کے بعد بھی حرف ی ہے بلکہ ایک معنی میں ہی رائج بھی ہے۔

قیامت کب قائم ہوگی

⑤ وَعَنْ حُذَيْفَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَقْتُلُوْا اِمَامَكُمْ وَتَجْتَلِدُوْا بِاَسْيَافِكُمْ وَيَرِثَ دُنْيَاكُمْ شِرَارُكُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ جب تم (مسلمان) اپنے (خلیفہ یا سلطان وحکمران) کو قتل کر دو گے، تمہاری تلواریں آپس ہی میں ایک دوسرے کی گردن اڑائیں گی اور یہاں تک کہ تمہاری دنیا کے وارث و والی، مکار لوگ ہو جائیں گے (یعنی سلطنت وحکمرانی ظالموں کے پاس پہنچ جائے گی اور مخلوق خدا کی زمام کار اور اقتدار کی باگ ذور بدکاروں اور فاسقوں کے ہاتھ میں آجائے گی) تو اس وقت قیامت قائم ہو جائے گی۔" (ترمذیؒ)

⑥ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَكُوْنَ اَسْعَدَ النَّاسِ بِالدُّنْيَا لُكَعُ بْنُ لُكَعٍ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ۔

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک کہ دنیا میں کثرت مال وزر اور اقتدار وحکمرانی کے اعتبار سے سب سے زیادہ نصیبہ ور وہ شخص نہ بن جائے گا جو احمق ہے اور احمق کا بیٹا ہے (یعنی جب دنیا میں بداصل، بدسیرت، اور بدکار لوگ سب سے زیادہ حکومت واقتدار اور مال ودولت کے مالک بن جائیں گے تو سمجھو کہ قیامت بس آنے ہی والی ہے) اس روایت کو ترمذیؒ نے اور کتاب دلائل النبوۃ میں بیہقیؒ نے نقل کیا ہے۔"

عیش وراحت کی زندگی دینی واخروی سعادتوں کی راہ میں رکاوٹ ہے

⑦ وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ كَعْبِ نِ الْقُرَظِيِّ قَالَ حَدَّثَنِيْ مَنْ سَمِعَ عَلِيَّ بْنَ اَبِيْ طَالِبٍ قَالَ اِنَّا لَجُلُوْسٌ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ فَاطَّلَعَ عَلَيْنَا مُصْعَبُ ابْنُ عُمَيْرٍ مَا عَلَيْهِ اِلَّا بُرْدَةٌ لَهٗ مَرْقُوْعَةٌ بِفَرْوٍ فَلَمَّا رَاٰهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَكٰى لِلَّذِيْ كَانَ فِيْهِ مِنَ النِّعْمَةِ وَالَّذِيْ هُوَ فِيْهِ الْيَوْمَ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ بِكُمْ اِذَا غَدَا اَحَدُكُمْ فِيْ حُلَّةٍ وَرَاحَ فِيْ حُلَّةٍ وَوُضِعَتْ بَيْنَ يَدَيْهِ صَحْفَةٌ وَرُفِعَتْ اُخْرٰى وَسَتَرْتُمْ بُيُوْتَكُمْ كَمَا تُسْتَرُ الْكَعْبَةُ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مِّنَّا الْيَوْمَ نَتَفَرَّغُ لِلْعِبَادَةِ وَنُكْفَى الْمُؤْنَةَ قَالَ لَا اَنْتُمُ الْيَوْمَ خَيْرٌ مِّنْكُمْ يَوْمَئِذٍ (رواہ الترمذی)

"اور حضرت محمد ابن کعب قرظیؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے اس شخص نے یہ حدیث بیان کی جس نے حضرت علیؓ سے اس کو سنا تھا (چنانچہ اس شخص نے بیان کیا) کہ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ "ایک دن ہم لوگ رسول کریم ﷺ کے ساتھ مسجد میں (یعنی مسجد نبوی میں یا مسجد قبا میں) بیٹھے ہوئے تھے کہ مصعب ابن عمیرؓ بھی وہاں آگئے اس وقت ان کے بدن پر صرف ایک چادر تھی اور اس چادر میں بھی چمڑے کے پیوند لگے

ہوئے تھے، رسول کریم ﷺ نے ان کو دیکھا تو رو پڑے کہ ایک زمانہ وہ تھا جب مصعبؓ کس قدر خوشحال اور آرام و راحت کی زندگی گذارتے تھے اور آج ان کی کیا ٹوٹی پھوٹی حالت ہے) پھر رسول کریم ﷺ نے (اظہار تعجب و حسرت کے طور پر فرمایا۔ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب کہ تم میں کوئی شخص صبح کو ایک جوڑا پہن کر نکلے گا اور پھر شام کو دوسرا جوڑا پہن کر نکلے گا، تمہارے سامنے کھانے کا ایک بڑا پیالہ رکھا جائے گا اور دوسرا اٹھایا جائے گا اور تم اپنے گھروں پر اس طرح پردہ ڈالو گے جس طرح کعبہ پر پردہ ڈالا جاتا ہے (یعنی حضور ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعے آنے والے زمانہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ جب تم پر خوشحالی و ترفہ کا دور آئے گا، اللہ تعالیٰ دنیا کے خزانوں کی کنجیاں تمہارے قدموں میں ڈال دے گا، تمہارے گھروں میں مال و اسباب کی فراوانی ہوگی تو تم دن میں کئی کئی مرتبہ جوڑے بدلو گے، صبح کا لباس الگ ہوگا، شام کا الگ، تمہارے دسترخوان انواع و اقسام کے کھانوں اور لذیذ و مرغوب اشیاء سے بھرے ہوں گے، تمہارے مکان راحت و آسائش اور آراستگی و زیبائش کی چیزوں سے پر رونق ہوں گے اور گویا تمہاری زندگی عیش و عشرت کا گہوارہ اور اسراف و تنعم کی آئینہ دار ہو جائے گی۔ تو بتاؤ اس وقت تمہارے دل کی کیا حالت ہوگی اور تم کیا محسوس کرو گے؟ بعض صحابہ ﷺ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) ہم اس دن (جب کہ خوش حالی و ترفہ کی نعمت سے بہرہ مند ہوں گے) آج کے دن سے (جب کہ ہم فقر و افلاس کی گرفت میں ہیں) بہتر حال میں ہوں گے۔ کیونکہ اس وقت ہم عبادت کے لئے (اپنی معاشی جدوجہد کی الجھنوں اور حصول رزق کے فکر سے) آزاد و فارغ ہوں گے اور ہمیں محنت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی (یعنی جب اس وقت ہمیں معاشی و اقتصادی طور پر خوش حالی حاصل ہوگی اور نوکر چاکر ہمارے سارے کام کاج کریں گے تو ہم ذہنی و جسمانی طور پر پوری طرح بے فکر و آزاد ہوں گے اور اس صورت میں طاعت و عبادت اور دینی خدمت میں پوری دل جمعی اور سکون کے ساتھ منہمک رہ سکیں گے) حضور ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا "ایسا نہیں ہے کہ اس وقت تم بہتر ہو گے) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم اس دن کی بہ نسبت آج کے دن زیادہ بہتر ہو۔" (ترمذیؒ)

تشریح: سیوطیؒ نے جمع الجوامع میں حضرت عمرؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک دن مصعب ابن عمیرؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت انہوں نے بکری کے چمڑے کا ایک تسمہ اپنی کمر کے گرد باندھ رکھا تھا، حضور ﷺ نے ان کو دیکھا تو (حاضرین مجلس سے) فرمایا کہ اس شخص کو دیکھو جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے منور کر دیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ میں نے اس کے ماں باپ کو اس حال میں دیکھا ہے کہ وہ اس کو اچھے سے اچھا کھانا کھلاتے تھے، اچھے سے اچھا کپڑا پہناتے تھے، میں نے اس کے بدن پر ایک ایسا لباس دیکھا ہے جو دو سو درہم کے عوض خریدا گیا تھا، (یعنی یہ وہ شخص ہے جو اپنی پچھلی زندگی میں نہایت عیش و عشرت اور راحت و تنعم کی زندگی گذارتا تھا، لیکن خدا اور خدا کے رسول کی محبت نے اس کو ایسی حالت پر پہنچا دیا ہے۔ جس میں تم اس کو اب دیکھ رہے ہو! اللہ کی بے انتہا رحمتیں نازل ہوں اس جلیل القدر ہستی پر جس کا نام مصعب ابن عمیرؓ ہے، قریش الاصل ہیں بڑے اونچے درجے کے صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے، مکہ سے ہجرت کی، گھر بار چھوڑا، دنیا کی ساری نعمتوں اور راحتوں کو ٹھکرا دیا، اور حضور ﷺ کی خدمت میں مدینہ آ گئے جیسا کہ خود حضور ﷺ نے شہادت دی ہے یہ اپنے اسلام سے پہلے کے زمانے میں مکہ کے بڑے مالداروں میں شمار ہوتے تھے نہایت خوش لباس و خوش طعام تھے، اچھے سے اچھا پہنتے اور اچھے سے اچھا کھاتے تھے۔ لیکن جب مسلمان ہو گئے تو سارے عیش و تنعم پر لات مار دی، خدا اور اس کے رسول کے عشق میں ایسے رنگ گئے کہ دنیا اور دنیا کی چیزوں سے نفرت کرنے لگے، زہد اختیار کر لیا، یہاں تک کہ غزوۂ احد کے موقع پر جام شہادت نوش کر کے واصل بحق ہو گئے، شہادت کے وقت ان کی عمر چالیس سال یا اس سے کچھ زیادہ تھی۔

حدیث سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ حضرت مصعبؓ کو دیکھ کر حضور ﷺ کا رو پڑنا، ان کی خستہ حالی کے تئیں رحم و شفقت کے جذبات کے تحت تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو کبھی اپنی قوم کی آنکھوں کا تارا تھا، عیش و راحت کی زندگی گذارتا تھا اور اب اس حالت کو پہنچ گیا ہے کہ بدن پر صرف ایک پیوند لگی چادر لپیٹے اپنا وقت گذار رہا ہے۔ لیکن یہ بات اس واقعہ کے منافی معلوم ہوتی ہے جس کا ذکر پیچھے بھی ایک روایت میں گزر چکا ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کو کھردری چارپائی پر

لیٹے ہوئے دیکھا جس کے بان کے نشانات آپ ﷺ کے جسم مبارک پر پڑ گئے تھے تو اس وقت رو پڑے انہوں نے آنحضرت ﷺ کی مشقت بھری زندگی کے ساتھ فارس و روم کے بادشاہوں کی زندگی کا موازنہ کیا۔ جو خدا کے سرکش و نافرمان اور باغی بندے ہونے کے باوجود عیش و عشرت کی زندگی گزارتے تھے۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا تھا کہ تم ابھی تک سوچنے سمجھنے کے اس مقام سے نہیں بڑھے ہو، بندۂ خدا! کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ ان (بادشاہان دنیا) کو بس دنیا کی نعمتیں ملیں اور ہمیں آخرت کی نعمتوں اور سعادتوں سے نوازا جائے؟ اولیٰ یہ ہے کہ حضرت مصعبؓ کو دیکھ کر حضور ﷺ کے رونے کو فرط مسرت سے رونے پر محمول کیا جائے کہ اپنی امت کے لوگوں کو دنیا سے زہد اختیار کر کے عقبیٰ کی طرف متوجہ دیکھ کر مارے خوشی کے آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اگر اس رونے کو غم و حسرت ہی پر محمول کیا جائے تو اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ آپ کا غم دراصل اس بات پر تھا کہ میری امت کے ان جیسے لوگوں کو ضروریات زندگی کی ایسی چیزیں بھی میسر نہیں ہیں جو دنیا ہی کے لئے ضروری نہیں ہیں بلکہ طاعت و عبادت میں معاون و مددگار بھی ہوتی ہیں جیسے بقدر ضرورت لباس وغیرہ! اس تاویل کی تائید حضور ﷺ کے ان الفاظ کیف بکم اذا غدا الخ اور انتم الیوم خیر منکم الخ سے بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ غریب و مفلس شخص کہ جو ضروریات زندگی کی بقدر کفایت چیزوں کا مالک ہو، غنی و مالدار شخص سے بہتر ہے، چنانچہ غنی و مالدار شخص حصول مال و زر کی جدوجہد میں زیادہ مشغولیت کی وجہ سے طاعت و عبادت کے لئے اتنا زیادہ قلبی و جسمانی فراغ و سکون نہیں رکھتا جس قدر کہ وہ غریب و مفلس شخص رکھتا ہے! اس اعتبار سے یہ حدیث درحقیقت صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ صبر و استقامت اختیار کرنے والا غریب و مفلس شخص شکر گذار مالدار سے زیادہ افضل ہوتا ہے۔ پس صحابہؓ جیسی ہستیوں کے تعلق سے کہ جو اُمت کے سب سے زیادہ مضبوط ایمان و عقیدہ اور کردار کے حامل تھے، مالداری کا یہ حال ہے تو غیر صحابہؓ کے تعلق سے اس کا کیا حال ہوگا، جو ان کی بہ نسبت ایمان و عقیدہ اور کردار و عمل میں کہیں زیادہ ضعیف ہیں۔ اس کی مؤید وہ حدیث بھی ہے جس کو دیلمیؒ نے فردوس میں حضرت ابن عمرؓ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے کہ (حضور ﷺ نے فرمایا) مَازُوِيَتِ الدُّنْيَا عَنْ اَحَدٍ اِلَّا كَانَتْ خَيْرَةً لَّهٗ بلکہ ملا علی قاریؒ نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ایک خاص بات یہ کہی ہے کہ عَنْ اَحَدٍ (اسی شخص) کا لفظ عام ہے کہ اس کے مفہوم میں مؤمن و غیر مؤمن سب شامل ہیں، لہٰذا دوزخ میں مالدار کافر کی بہ نسبت فقیر و مفلس کافر کا عذاب ہلکا ہوگا۔ اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ جب اس دار فانی میں فقر و افلاس نے کافر کو یہ فائدہ پہنچایا تو اس مؤمن کو دار التمرار (آخرت میں) کیسے فائدہ نہیں پہنچائے گا جو دنیا میں اپنے فقر و افلاس پر صابر رہا ہے۔

فسق و فجور کے دور میں دین پر قائم رہنے والے کی فضیلت

⑧ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْتِىْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ اَلصَّابِرُ فِيْهِمْ عَلٰى دِيْنِهٖ كَالْقَابِضِ عَلَى الْجَمَرِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِىُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ اِسْنَادُهٗ۔

"اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس وقت لوگوں کے درمیان اپنے دین پر صبر کرنے والا (یعنی دنیا سے اپنا دامن بچا کر دینی احکام کی حفاظت و پیروی کرنے والا) اس شخص کی مانند ہوگا جس کے اپنی مٹھی میں انگارہ لے لیا ہو۔ امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آخر زمانے میں جب برائی عام ہو جائے گی، فسق و فجور پھیل جائے گا، اور پورے معاشرہ میں بدکار لوگوں کا اس قدر غلبہ ہوگا کہ دین کی بات کرنے والے اور دینداروں کے مددگار معاون ڈھونڈھے نہیں ملیں گے، تو اس وقت دین کو اختیار کرنا اور ثابت قدمی کے ساتھ گامزن رہنا انتہائی دشوار اور سخت صبر آزما ہوگا جس قدر کہ کوئی شخص اپنی مٹھی میں انگارہ بند کر لے اور اس کی اذیت و تکلیف پر صبر تحمل کرے۔

کب زندگی بہتر ہوتی ہے اور کب موت؟

(۹) وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا کَانَ اُمَرَآءُ کُمْ خِیَارُکُمْ وَاَغْنِیَاؤُکُمْ سُمَحَاءُکُمْ وَاُمُوْرُکُمْ شُوْرٰی بَیْنَکُمْ فَظَهْرُ الْاَرْضِ خَیْرٌ لَّکُمْ مِنْ بَطْنِهَا وَاِذَا کَانَ اُمَرَاءُکُمْ شِرَارُکُمْ وَاَغْنِیَاءُکُمْ بُخَلاءُکُمْ وَاُمُوْرُکُمْ اِلٰی نِسَاءِکُمْ فَبَطْنُ الْاَرْضِ خَیْرٌ لَّکُمْ مِنْ ظَهْرِهَا۔ (رواه الترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب تمہارے قائد وسردار وہ لوگ ہوں کہ جو تم میں کے بہترین لوگ ہیں، تمہارے دولت مند لوگ سخی ہوں اور تمہارے معاملات باہمی مشوروں سے انجام پاتے ہوں (یعنی مسلمان ایک مرکز پر متحد ومتفق ہوں اور اپنے تمام معاملات وامور ایک رائے ہو کر طے کرتے ہوں) تو اس وقت زمین کی پشت تمہارے لئے زمین کے پیٹ سے بہتر ہوگی (یعنی ایسے مبارک زمانہ میں زندگی موت سے بہتر ہوگی کیونکہ اس صورت میں تمہیں کتاب وسنت کے مطابق عمل کرنے اور دین کی راہ پر چلنے کی توفیق نصیب ہوگی، اور ظاہر ہے وہ لوگ نہایت خوش بخت ہیں جنہیں حسن عمل کے ساتھ طویل زندگی ملے اور جب تمہارے قائد وسردار وہ لوگ ہوں جو تم میں کے بدترین (یعنی فاسق وفاجر اور ظالم لوگ ہیں تمہارے دولت مند لوگ بخیل ہوں اور تمہارے معاملات کی باگ دوڑ عورتوں کے ہاتھ میں ہو، تو اس وقت زمین کا پیٹ تمہارے لئے زمین کی پشت سے بہتر ہوگا (یعنی ایسے زمانہ میں مرنا، جینے سے بہتر ہوگا)۔ اس روایت کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ وہ معاشرہ بہت بدنصیب ہوتا ہے جس میں لوگ اپنے معاملات عورتوں کے سپرد کردیتے ہیں، درآنحالیکہ عورتیں مردوں کی بہ نسبت عقل اور دین دونوں میں کمزور اور ناقص ہونے کی وجہ سے اس طرح کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتیں، اسی لئے فرمایا شاوروھن وخالفوھن یعنی عورتوں سے مشورہ (ضرور کرلو لیکن کرو ان کی رائے کے خلاف، اسی طرح وہ مرد بھی عورتوں ہی کے حکم میں ہیں جو انہی جیسے احوال رکھتے ہیں یعنی جن مردوں پر جاہ ومال کی محبت کا غلبہ ہوتا ہے، جو یہ نہیں جانتے کہ کیا چیز دین کو نقصان پہنچاتی ہے، کون سا کام دین وشریعت کے خلاف ہے کسی بھی چیز اور کسی بھی معاملہ کا کیا انجام ہوسکتا ہے تو وہ بھی یقیناً عورتوں کی طرح عقل ودین دونوں کے اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں لہٰذا ایسے مردوں کو بھی اپنا مقتدا ورہنما بنانا اور اپنی زمام کار ان کو سونپ دینا پورے معاشرہ کو تباہی وخرابی سے دوچار کرنا ہے۔

حدیث کا ظاہری اسلوب یہ تقاضا کرتا ہے کہ جب پہلے جزء میں یہ فرمایا گیا ہے کہ تمہارے معاملات باہمی مشوروں سے طے پاتے ہوں تو دوسرے جز میں یوں فرمانا چاہئے تھا کہ تمہارے معاملات باہمی اختلاف رائے کا شکار ہوجاتے ہیں۔ لیکن اس طرح فرمانے کی بجائے یہ فرمانا کہ تمہارے معاملات کی باگ دوڑ عورتوں کے ہاتھ میں ہو۔ گویا اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ آپس میں پیدا ہونے والے اختلاف اور تنازعات عام طور پر عورتوں کی اتباع کرنے اور ان کے کہے پر چلنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

دنیا سے محبّت اور موت کا خوف مسلمانوں کی کمزوری کا سب سے بڑا سبب ہے

(۱۰) وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُوْشِكُ الْاُمَمُ اَنْ تَدَاعٰی عَلَیْکُمْ کَمَا تَدَعَی الْاَکِلَةُ اِلٰی قَصْعَتِهَا فَقَالَ قَائِلٌ وَمِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ یَوْمَئِذٍ قَالَ بَلْ اَنْتُمْ یَوْمَئِذٍ کَثِیْرٌ وَلٰکِنَّکُمْ غُثَآءٌ کَغُثَاءِ السَّیْلِ وَلَیَنْزِعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّکُمُ الْمَهَابَةَ مِنْکُمْ وَلَیَقْذِفَنَّ فِیْ قُلُوْبِکُمُ الْوَهْنُ قَالَ قَائِلٌ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْوَهْنُ قَالَ حُبُّ الدُّنْیَا وَکِرَاهِیَةُ الْمَوْتِ۔ (رواه ابوداؤد والبیہقی فی دلائل النبوة)

"اور حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "عنقریب ایسا وقت آنے والا ہے جب کفر وضلالت سے بھرے ہوئے لوگوں

کا گروہ آپس میں ایک دوسرے کو تم سے لڑنے اور تمہاری شان و شوکت کو مٹانے کے لئے بلائے گا جیسا کہ کھانے کے دسترخوان پر جمع ہونے والے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو کھانے کے قاب کی طرف متوجہ کرتے ہیں یعنی جس طرح کچھ لوگ جمع ہو کر کھانے کی محفل میں دسترخوان پر بیٹھتے ہیں تو وہ آپس میں ایک دوسرے کی طرف کھانے کے برتن سرکاتے رہتے ہیں، اور اس میں جو چیز ہوتی ہے اس کو کھانے کے لئے کہتے رہتے ہیں، چنانچہ وہ سب بلا تکلف اور بغیر کسی رکاوٹ کے ان برتنوں میں سے جو کچھ چاہتے ہیں لے لے کر کھاتے ہیں، اسی طرح کفر و ضلالت کے حامل لوگ تمہارے مقابلے پر جمع ہو کر آپس میں ایک دوسرے کو اکسائیں گے، بھڑکائیں گے اور آخر کار وہ تمہیں ہلاک کریں گے، تمہاری جائیدادیں تباہ کریں گے، تمہارے مال و اسباب لوٹیں گے اور تمہیں خانماں برباد کریں گے اس میں گویا (اس طرف اشارہ ہے کہ تم مسلمان ان دشمنان دین کے سامنے چارۂ تر کی طرح ہو جاؤ گے جس کا جی چاہے گا تمہیں نگل لے گا۔ کسی صحابیؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ (ان کا ہمارے خلاف جمع ہونا اور ہم پر غالب آجانا) کیا اس سبب سے ہوگا کہ اس وقت ہم کم تعداد میں ہوں گے؟ حضور ﷺ نے فرمایا نہیں ایسا اس وجہ سے نہیں ہوگا کہ تم کم تعداد میں ہوں گے، بلکہ اس وقت تمہاری تعداد تو بہت ہوگی، لیکن تمہاری حیثیت پانی کے اس جھاگ کی سی ہوگی جو دریا یا نالوں کے کناروں پر پائے جاتے ہیں (یعنی تمہارے اندر جرأت و شجاعت اور قوت کا فقدان ہوگا) اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہاری ہیبت اور تمہارا رعب نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں ضعف و سستی پیدا کر دے گا۔ کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارے دلوں میں ضعف سستی پیدا ہو جانے کا سبب کیا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "دنیا کی محبت اور موت سے بیزاری" (یعنی جب زندگی تمہارے لئے عزیز اور موت تمہارے لئے ناپسندیدہ ہو جائے گی تو تم دشمن کا مقابلہ کرنے اور بہادری کے جوہر دکھانے کے قابل نہیں رہ جاؤ گے) اس روایت کو ابوداؤدؒ نے اور بیہقیؒ نے کتاب دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے۔"

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

چند برائیاں اور ان کا وبال

(۱۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَا ظَهَرَ الْغُلُوْلُ فِيْ قَوْمٍ اِلاَّ اَلْقَى اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ وَلاَ فَشَا الزِّنَا فِيْ قَوْمٍ اِلاَّ كَثُرَ فِيْهِمُ الْمَوْتُ وَلاَ نَقَصَ قَوْمٌ الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِلاَّ قُطِعَ عَنْهُمُ الرِّزْقُ وَلاَ حَكَمَ قَوْمٌ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلاَّ فَشَا فِيْهِمُ الدَّمُ وَلاَ خَتَرَ قَوْمٌ بِالْعَهْدِ اِلاَّ سُلِّطَ عَلَيْهِمُ الْعَدُوَّ۔ (رواہ مالک)

"روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ جب کوئی قوم مال غنیمت میں خیانت کرنے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دلوں میں دشمن کا رعب و خوف پیدا کر دیتا ہے، جس قوم میں زنا کاری پھیل جاتی ہے اس میں (کسی وبا مثلاً طاعون وغیرہ کے پھیلنے یا اہل علم و دانش کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کی صورت میں) اموات کی زیادتی ہو جاتی ہے، جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے (یعنی اس کا تجارت پیشہ طبقہ کم ناپنے کم تولنے اور کم گننے جیسے عیب میں مبتلا ہو جاتا ہے) تو اس کا رزق اٹھا لیا جاتا ہے (یعنی اسکے رزق میں برکت ختم کر دی جاتی ہے یا اس قوم کے مقدر سے حلال رزق اٹھ جاتا ہے) جو قوم غیر منصفانہ اور ناحق احکام جاری کرنے لگتی ہے (یعنی جس قوم کے ارباب اقتدار) احکام و فیصلوں کے نافذ کرنے میں عدل و انصاف اور مساوات کو ملحوظ نہیں رکھتے یا جہل و نادانی کی وجہ سے غلط سلط فیصلے کرنے لگتے ہیں) تو ان کے درمیان خون ریزی پھیل جاتی ہے (یعنی اس قوم کے معاشرے میں ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں اور ایسے عوامل پھیل جاتے ہیں جو عام فتنہ و فساد اور خونریزی کا باعث بنتے ہیں) اور جو قوم اپنے عہد و پیمان کو توڑ دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر اس کے دشمن کو مسلط کر دیتا ہے۔"

(مالک)

باب فی ذکر الانذار و التحذیر

ڈرانے اور نصیحت کرنے کا بیان

مشکوٰۃ کے صحیح نسخوں اور اصل متون میں اوپر عنوان باب کی جگہ صرف باب کا لفظ لکھا ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ باب گزشتہ باب کے لواحق اور متعلقات پر مشتمل ہے، لیکن ابن ملک ؒ نے یہاں باب کا مذکورہ بالا عنوان قائم کیا ہے، ہم نے اسی کو نقل کیا ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

چند احکام خداوندی

① عَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ الْمُجَاشِعِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ذَاتَ يَوْمٍ فِيْ خُطْبَتِهِ اَلَا اِنَّ رَبِّيْ اَمَرَنِيْ اَنْ اُعَلِّمَكُمْ مَا جَهِلْتُمْ مِمَّا عَلَّمَنِيْ يَوْمِيْ هٰذَا كُلُّ مَالٍ نَحَلْتُهُ عَبْدًا حَلَالٌ وَاِنِّيْ خَلَقْتُ عِبَادِيْ حُنَفَاءَ كُلَّهُمْ وَاِنَّهُمْ اَتَتْهُمُ الشَّيٰطِيْنُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِيْنِهِمْ وَحَرَّمَتْ عَلَيْهِمْ مَا اَحْلَلْتُ لَهُمْ وَاَمَرَتْهُمْ اَنْ يُّشْرِكُوْا بِيْ مَالَمْ اُنْزِلْ بِهٖ سُلْطَانًا وَاِنَّ اللّٰهَ نَظَرَ اِلٰى اَهْلِ الْاَرْضِ فَمَقَتَهُمْ عَرَبَهُمْ وَعَجَمَهُمْ اِلَّا بَقَايَا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَقَالَ اِنَّمَا بَعَثْتُكَ لِاَبْتَلِيَكَ وَاَبْتَلِيَ بِكَ وَاَنْزَلْتُ عَلَيْكَ كِتَابًا لَا يَغْسِلُهُ الْمَاءُ وَتَقْرَءُهُ نَائِمًا وَيَقْظَانَ وَاِنَّ اللّٰهَ اَمَرَنِيْ اَنْ اُحَرِّقَ قُرَيْشًا فَقُلْتُ رَبِّ اِذًا يَثْلَغُوْا رَاْسِيْ فَيَدَعُوْهُ خُبْزَةً قَالَ اسْتَخْرِجْهُمْ كَمَا اَخْرَجُوْكَ وَاغْزُهُمْ نُغْزِكَ وَاَنْفِقْ فَسَنُنْفِقُ عَلَيْكَ وَابْعَثْ جَيْشًا نَبْعَثْ خَمْسَةً مِثْلَهٗ وَقَاتِلْ بِمَنْ اَطَاعَكَ مَنْ عَصَاكَ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت عیاض ابن حمار مجاشعی ؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ نے اپنے (جمعہ وغیرہ کے) خطبہ میں (یا کسی وعظ کے دوران فرمایا۔ (لوگو) سنو! میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں وہ باتیں بتادوں جو تم نہیں جانتے۔ (اس کے بعد آپ نے ان باتوں کے سلسلے میں اس طرح بیان فرمانا شروع کیا کہ) اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ جو مال میں نے اپنے کسی بندہ کو دیا ہے وہ حلال ہے یعنی کسی شخص کو جو مال واسباب جائز ذرائع سے حاصل ہوا ہے۔ وہ اس کے حق میں حلال ہے، کوئی اس کو اپنی طرف سے حرام قرار نہیں دے سکتا جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں قاعدہ تھا کہ لوگ بعض صورتوں میں اونٹوں کو خواہ مخواہ اپنے پر حرام کر لیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ میں نے تو اپنے سب بندوں کو باطل کے خلاف، حق کی طرف مائل پیدا کیا۔ لیکن یہ شیاطین تھے، جو ان (بندوں) کے پاس آئے اور ان کو ان کے دین سے پھیر کر گمراہی میں ڈال دیا اور ان پر وہ چیزیں حرام کر دیں جن کو میں نے ان کے لئے حلال کیا تھا (یعنی شیاطین نے ان لوگوں کو اس طرح گمراہ کر دیا کہ انہوں نے اپنے اوپر حلال چیزوں کو حرام کر لیا، اور ان ہی شیاطین نے ان کو حکم دیا (یعنی ان کے دل میں یہ گمراہ کن وسوسہ ڈالا) کہ وہ اس چیز کو میرے ساتھ شریک کریں جس کے غالب ہونے کی کوئی دلیل نازل نہیں ہوئی (یعنی جو لوگ بتوں کو پوجتے ہیں اور اس طرح عبادت میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔ ان کے پاس ان کے اس فعل کی کوئی معقول دلیل اور استحقاق نہیں ہے، یہ صرف شیاطین کے گمراہ کرنے کا اثر ہے کہ وہ ایسے ناروا کام میں مبتلا ہیں، اور یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین والوں پر نظر ڈالی (اور ان کو کفر شرک پر متفق اور ضلالت وگمراہی میں مستغرق پایا چنانچہ اللہ نے ان سب کو اپنا مبغوض وناپسندیدہ قرار دے دیا خواہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے (یعنی جب دنیا کے سارے لوگ کفر وشرک میں مبتلا ہو گئے اور محمد ﷺ کی بعثت تک سب کے سب گمراہی پر متفق ومجتمع تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے تو عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے سے انکار کیا اور عزیر علیہ السلام کی پوجا کرنے لگے، عیسیٰ ؑ کی قوم تین خداؤں کی قائل اور اس مشرکانہ عقیدہ کی حامل ہو گئی کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں وغیرہ وغیرہ تو اللہ تعالیٰ نے ان سب کو اپنا مبغوض ترین بندہ قرار (دیدیا)

علاوہ اہل کتاب کی اس جماعت کے (جو مشرک نہیں ہوئی بلکہ موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہوئے اصل دین پر قائم و ثابت قدم رہی، اس جماعت کے لوگوں نے نہ تو اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کی اور نہ اپنے دین کے احکام میں اپنی مرضی کے مطابق کوئی تبدیلی کی یہاں تک کہ جب حضرت محمد ﷺ اس دنیا میں مبعوث ہوئے تو ان پر ایمان لائے اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو مبغوض قرار نہیں دیا) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے آپ کو (اے محمد ﷺ) پیغمبر بنا کر دنیا میں اس لئے بھیجا ہے تاکہ میں آپ کو آزماؤں (کہ آپ ﷺ اپنی قوم کی ایذا رسانی پر کس طرح صبر کرتے ہیں) اور آپ کے ساتھ آپ کی قوم کو بھی آزماؤں (کہ آیا وہ لوگ آپ ﷺ پر ایمان لاتے ہیں یا آپ کے ساتھ کفر اختیار کرتے ہیں) اور میں نے آپ پر ایک ایسی کتاب نازل کی جس کو پانی دھو اور مٹا نہیں سکتا (یعنی عام طور سے کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب کو پانی سے دھویا جائے تو مٹ جاتی ہے لیکن وہ کتاب جو آپ ﷺ پر نازل ہوئی ہے) یعنی قرآن کریم ایسی نہیں ہے کہ اس کو کوئی پانی دھو اور مٹا دے بلکہ وہ ہر قسم کی تحریف اور تغیر و تبدل سے محفوظ ہے بایں طور کہ اس کو قیامت تک کے لئے دلوں میں محفوظ کر دیا گیا ہے اور اس کے احکام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی و جاری رکھا گیا ہے) آپ اس کتاب کو سوتے جاگتے (ہر وقت) پڑھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے مجھ کو یہ حکم دیا ہے کہ میں قریش کو جلادوں (یعنی اہل قریش میں سے جو لوگ ایمان نہیں لاتے ہیں اور کفر کی حالت پر قائم ہیں ان کو اس طرح تباہ و ہلاک کر دوں کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہے)" میں نے عرض کیا کہ میرے پروردگار قریش تو میرا سر کچل کر روٹی کی مانند (چوڑا) کر دیں گے (یعنی اہل اسلام کے مقابلہ پر ان کی طاقت اور تعداد بہت زیادہ ہے، میں ان سے کس طرح نمٹ سکوں گا اور کیسے ان پر غلبہ پاؤں گا) اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تم ان کو ان کے وطن سے نکال دو جس طرح کہ انہوں نے آپ ﷺ کو وطن بدر کیا تھا اور ان کے ساتھ جہاد کرو، ہم آپ کے جہاد کے سامان کا) انتظام کریں گے (یعنی آپ اور آپ کے رفقاء کو ایسی غیبی طاقت اور ہمت عطا کریں گے کہ اہل اسلام کی مٹھی بھر جماعت بھی ان کے لشکر جرار پر غالب آجائے گی) آپ اپنے لشکر والوں پر مال واسباب خرچ کیجئے۔ اگر آپ کے پاس مال واسباب نہیں ہوگا تو ہم دیں گے اور اس کا انتظام کریں گے، آپ ان کے خلاف اپنا لشکر بھیجئے ہم دشمن کے لشکر سے پانچ گنی زیادہ طاقت کے ساتھ آپ کی مدد کریں گے (چنانچہ جب بدر کی جنگ ہوئی اور مسلمان صرف تین سو کی تعداد میں کفر کے ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ معرکہ آرا ہوئے تو روایات میں آتا ہے کہ پانچ ہزار فرشتوں کا لشکر مسلمانوں کی مدد کے لئے آیا) اور جو لوگ آپ پر ایمان لائے اور آپ کے اطاعت گذار ہیں ان کو ساتھ لے کر ان کے خلاف جنگ کیجئے جنہوں نے آپ کی نافرمانی اور آپ ﷺ سے سرکشی کی ہے اور کافر ہیں۔" (مسلم)

تشریح: "حق کی طرف مائل پیدا کیا" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب لوگوں کو ایسی استعداد و صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا جو قبول حق و قبول طاعت کی راہ میں ان کی مددگار ہوتی! اس ارشاد میں گویا اس "فطرت اسلام" کی طرف اشارہ ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام (یعنی ہر بچہ قبول اسلام کی استعداد و صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے) لہٰذا اس جملہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ واقعۃً (بالفعل) مؤمن و مسلمان پیدا ہوئے تھے لیکن بعد میں شیطان کی گمراہی کی وجہ سے کافر ہو گئے۔ یا اس جملہ کے ذریعہ اس عہد کی طرف اشارہ ہے کہ جو میثاق کے دن تمام روحوں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا لیا تھا اور سب نے یہ اقرار کیا تھا کہ بے شک ہم سب آپ کو اپنا رب مانتے ہیں عہد و اقرار میں ان لوگوں کی روحیں بھی شامل تھیں جو اس دنیا میں آنے کے بعد اور شیطان کے گمراہ کر دینے کی وجہ سے اپنے اس عہد و قرار سے مکر گئے اور مؤمن و مسلمان رہنے کی بجائے کفر و شرک اختیار کر لیا۔

"سوتے جاگتے پڑھتے ہیں۔ کا مطلب کہ ایسا ملکہ اور عبور حاصل ہو گیا ہے کہ قرآن ہر وقت آپ ﷺ کے ذہن میں مستحضر رہتا ہے اور اکثر حالات میں آپ ﷺ کا مقدس و پاک نفس اسی کی طرف متوجہ و ملتفت رہتا ہے، لہٰذا آپ ﷺ نہ تو اس سے جاگنے کی حالت میں غافل رہتے ہیں اور نہ سونے کی حالت میں! یہ ایک عام محاورہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص کسی خاص کام میں مہارت و ملکہ رکھتا ہے اور زیادہ تر اسی میں منہمک و مستغرق رہتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ سوتے جاگتے یہی کام کرتا ہے۔ حاصل یہ کہ قرآن سوتے وقت آپ کے دل

میں رہتا ہے! لیکن ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے قلب مبارک کی نسبت سے یہ تاویل قطعاً غیر ضروری ہے کیونکہ آپ ﷺ کا دل تو ہر وقت ہی بیدار رہتا تھا سونے کی حالت میں بھی صرف آنکھیں سوتی تھیں اور دل پر کوئی غفلت طاری نہیں ہوتی تھی۔ لہٰذا اس جملہ کا صاف مطلب یہ ہے کہ سوتے کی حالت بھی قرآن سے آپ کا تعلق منقطع نہیں ہوتا، فرق صرف اتنا ہے کہ جاگنے کی حالت میں تو آپ ﷺ کی زبان اور دل دونوں پر قرآن شریف رہتا ہے اور سونے کی حالت میں صرف قلب مبارک پر جاری رہتا ہے! قرآن کا اعجاز تو یہاں تک ثابت ہے کہ جو پاک نفس لوگ کلام اللہ سے بہت زیادہ اور نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں ان کی زبان سوتے کی حالت میں بھی تلاوت کرتی ہے جیسا کہ بہت سے بزرگوں کے بارے میں منقول ہے کہ ان کو دیکھا گیا کہ وہ سو رہے ہیں لیکن زبان سے تلاوت جاری ہے اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز اور عجیب واقعہ وہ ہے جو بعض کتابوں میں منقول ہے کہ ایک شخص اپنے شیخ و مرشد کے ساتھ ہر روز سحر کے وقت قرآن کی دس آیتوں کا دور کیا کرتا تھا، جب شیخ کی وفات ہوگئی تو وہ شخص اپنی عادت کے مطابق سحر کے وقت اٹھا اور شیخ کی قبر پر حاضر ہوا اور وہاں دس آیتوں کی تلاوت کی، تلاوت سے فارغ ہو کر خاموش ہی ہوا تھا کہ اچانک قبر کے اندر سے اپنے شیخ کی آواز سنی کہ اپنی زندگی کے معمول کے مطابق انہوں نے دس آیتوں کی تلاوت کی اور اس کے بعد چھا گئی، پھر تو اس شخص نے یہ معمول بنالیا کہ روز سحر کے وقت قبر پر پہنچ جاتا دس آیتوں کی تلاوت کرتا اور قبر کے اندر سے اپنے شیخ کی آتی ہوئی آواز میں دس آیتوں کی تلاوت سنتا اور چلا آتا یہ سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا، ایک دن اس نے یہ واقع اپنے کسی دوست سے بھی بیان کر دیا اسی دن سے قبر کے اندر سے شیخ کی تلاوت کی آواز کا آنا بھی موقوف ہوگیا۔

قریش کو دعوت اسلام

(۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ فَصَعِدَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّفَا فَجَعَلَ يُنَادِيْ يَابَنِيْ فِهْرٍ يَابَنِيْ عَدِيٍّ لِبُطُوْنِ قُرَيْشٍ حَتّٰى اجْتَمَعُوْا فَقَالَ اَرَأَيْتَكُمْ لَوْ اَخْبَرْتُكُمْ اَنَّ خَيْلاً بِالْوَادِيْ تُرِيْدُ اَنْ تُغِيْرَ عَلَيْكُمْ اَكُنْتُمْ مُصَدِّقِيَّ قَالُوْا نَعَمْ مَاجَرَّبْنَا عَلَيْكَ اِلاَّ صِدْقًا قَالَ فَاِنِّيْ نَذِيْرٌ لَكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ فَقَالَ اَبُوْلَهَبٍ تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا فَنَزَلَتْ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَنَادٰى يَا بَنِيْ عَبْدِمَنَافٍ اِنَّمَا مَثَلِيْ وَمَثَلُكُمْ كَمَثَلِ رَجُلٍ رَاَى الْعَدُوَّ فَانْطَلَقَ يَرْبَأُ اَهْلَهُ فَخَشِيَ اَنْ يَسْبِقُوْهُ فَجَعَلَ يَهْتِفُ يَا صَبَاحَاهُ۔

"اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (یعنی اپنے قریب کے کنبہ والوں کو ڈرایئے) تو آپ کوہ صفا پر (جو خانہ کعبہ کے قریب ہے) تشریف لے گئے اور وہاں سے پکارنا شروع کیا۔ اے نبی عدی یعنی قریش کی تمام شاخوں کو (نام بنام) بلانا شروع کیا، چنانچہ جب (قریش کی تمام شاخوں کے) لوگ جمع ہوگئے تو آپ نے فرمایا "تم لوگ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ جنگل میں ایک لشکر آکر اترا ہے اور تمہیں تباہ و غارت کر دینا چاہتا ہے تو کیا تم مجھ کو سچا جانو گے ان سب نے (ایک زبان ہو کر) کہا۔ بیشک! کیونکہ ہمارا ہمیشہ کا تجربہ یہ ہے کہ تم نے جب بھی کوئی بات کہی ہے سچ کہی ہے تمہاری زبان سے ہم نے کبھی سوائے سچ کے کوئی بات نہیں سنی ہے "حضور نے فرمایا (اگر تم مجھے سچا سمجھتے ہو تو سنو کہ) میں خدا کی طرف سے تمہیں اس کے سخت ترین عذاب کے اترنے سے پہلے ڈرانے والا مامور ہوا ہوں (یعنی میں خدا کے رسول کی حیثیت سے تمہارے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرتا ہوں، اس کو قبول کرو، اگر تم اس دعوت کو قبول نہیں کرو گے اور مجھ پر ایمان نہیں لاؤ گے تو پھر میں تمہیں یہ خبر دیتا ہوں کہ تم پر خدا کا نہایت سخت عذاب نازل ہوگا)۔ ابولہب (جو حضور ﷺ کا چچا تھا اور جس کا نام عبدالعزی تھا یہ بات سن کر) بولا۔ سارے دن تیری تباہی ہو، کیا اسی لئے تو نے ہمیں اکٹھا کیا تھا (کہ ہم اتنی خراب باتیں سنیں)؟ اس پر یہ سورت نازل ہوئی تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ یعنی ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ برباد ہو جائے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ گستاخی کرنے کی وجہ سے تباہ برباد ہوگیا (بخاری و مسلم) اور

ایک روایت میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ " آنحضرت ﷺ نے آواز دیکر (قریش کو جمع کیا اور فرمایا) اے عبد مناف کے بیٹو! میری اور تمہاری حالت کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے دشمن کا لشکر (اپنی قوم پر حملہ آور ہونے کے لئے آتے ہوئے) دیکھا تو وہ اپنی قوم کو (اس دشمن کے قتل وغارت گری سے بچانے کے لئے چلا (تاکہ کسی پہاڑی پر چڑھ کر بلند آواز کے ذریعہ قوم کے لوگوں کو دشمن کے خطرہ سے آگاہ کردے) لیکن اس خوف سے کہ کہیں دشمن کا لشکر اس سے پہلے ہی اس کی قوم تک نہ پہنچ جائے اس نے وہیں سے چلا چلا کر یہ کہنا شروع کردیا۔"

تشریح: "بطن" کے اصل معنی تو پیٹ کے ہیں لیکن یہ گروہ یا شاخ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جو قبیلہ سے نیچے کا درجہ ہے "بطن سے نیچے کا جو درجہ ہوتا ہے اس کو فخذ کہتے ہیں! گویا عرب میں نسب کے بالائی درجہ کو تو "قبیلہ" کہتے ہیں اس کے بعد کے درجہ کو "بطن" اور اس کے بعد کے درجہ کو "فخذ" کہا جاتا تھا چنانچہ قریش" قبیلہ کا نام ہے جس کے مورث اعلی کا نام "نضر ابن کنانہ" تھے نضر ابن کنانہ کے بعد جو شاخیں چلیں ان کو "بطون" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور پھر بطون کے بعد کی شاخوں کو "افخاذ" کہا جاتا ہے۔ اصطلاحی الفاظ میں اس کا حاصل یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ "قبیلہ" بمنزلہ جنس کے ہے" "بطن" بمنزلہ نوع کے، اور "فخذ" بمنزلہ فصل کے ہے۔

"وادی" (جنگل) سے مراد حجاز کا وہ خاص علاقہ ہے جو مکہ سے شمالی جانب تقریبا سولہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور جس کو وادی فاطمہ کہا جاتا ہے یہ ایک نخلستانی علاقہ ہے اور یہاں کی زمین شاداب) اور قابل کاشت ہے اس وادی کا ایک قدیم نام "مرالظہران" بھی ہے۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان کا یہ پرانا راستہ اس طرف سے بھی گذرتا تھا۔

"ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں" میں ہاتھوں کے ٹوٹنے اور ہلاک ہونے سے مراد اس کی ذات کا ہلاک ہونا ہے، جیسا کہ قرآن نے ان الفاظ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ سے ثابت ہوتا ہے کہ عربی میں ذات کی ہلاکت کو ہاتھوں کی ہلاکت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے! بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس کے دونوں ہاتھوں سے مراد اس کے دونوں جہاں یعنی دنیا اور آخرت ہیں چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اس کے دونوں جہاں تباہ و برباد ہوگئے، وہ نہ یہاں کا رہا نہ وہاں کا! اور بعض حضرات نے یہ تحقیق بھی بیان کی ہے کہ خاص طور پر اس کے ہاتھوں کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے حاضرین کو اسلام کی دعوت پیش کرتے ہوئے عذاب خداوندی سے ڈرایا تو ابولہب نے اس وقت صرف مذکورہ بات کہنے ہی پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ اس نے اپنے ہاتھوں سے پتھر اٹھا کر آنحضرت ﷺ کو مارنا بھی چاہا تھا۔

"عبد مناف" قریش کی ان دو شاخوں کے جد اعلی کا نام ہے جو آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت سب سے مشہور اور مقتدر و غالب شاخیں تھیں۔ عبد مناف کے دو بیٹوں یعنی ہاشم اور عبد شمس سے جو شاخیں چلیں ان میں سے ایک یعنی ہاشم کی اولاد کو بنو ہاشم کہا جاتا ہے، اور یہی آنحضرت ﷺ کا خاندان ہے، اس خاندان کے ممتاز افراد میں حضور ﷺ کے علاوہ حضرت علیؓ اور حضور ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ ہیں۔ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ سے جو سلسلہ نسب چلا وہ "علوی" اور "عباسی" کہلاتا ہے، عبد مناف کے دوسرے بیٹے عبد شمس تھے، ان کی شاخ ان کے بیٹے امیہ سے چلی اور ان کا خاندان بنو امیہ کے اہم اشخاص میں حضرت ابوسفیانؓ، مروان اور سیدنا عثمان غنیؓ ہیں۔

"صباحاہ" اصل میں ایک ایسا لفظ ہے جو اہل عرب میں کسی خطرناک اور دہشت آمیز چیز سے ڈرانے کے لئے بولا جاتا ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ لفظ صباح "(صبح کے وقت) سے مشتق ہے اور عام طور پر دشمن، چونکہ صبح کے وقت حملہ آور ہو کر غارتگری کرتا ہے اس لئے کسی حملہ کے خطرہ کے وقت چوکیدار اور محافظ لوگ اس لفظ کے ذریعہ چیختے چلاتے ہیں تاکہ لوگ حملہ کے خطرہ سے آگاہ ہو کر اپنی حفاظت و مقابلہ کے لئے تیار رہیں! لہٰذا اس لفظ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ "لوگو! ہوشیار ہو جاؤ، قبل اس کے کہ دشمن تمہیں تباہ غارت کرنے کے لئے حملہ آور ہو اپنے بچاؤ کے لئے یہاں سے نکل جاؤ یا مقابلہ کے لئے تیار ہو جاؤ چنانچہ حضور ﷺ نے اہل قریش کے سامنے مذکورہ

مثال بیان کرکے گویا یہ فرمایا کہ "میں بھی تمہیں ایک ایسے ہی عذاب کے خطرہ سے آگاہ کررہا ہوں جو تمہیں تباہ وبرباد کردیگا لہٰذا قبل اس کے کہ وہ عذاب تم پر نازل ہو تم ایمان قبول کرکے اس عذاب سے اپنے آپ کو بچاؤ۔

(۴) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ دَعَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُرَيْشًا فَاجْتَمَعُوْا فَعَمَّ وَخَصَّ فَقَالَ يَا بَنِيْ كَعْبِ بْنِ لُؤَيٍّ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَا بَنِيْ مُرَّةَ بْنِ كَعْبٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَا بَنِيْ عَبْدِ شَمْسٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَا بَنِيْ عَبْدِ مَنَافٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَا بَنِيْ هَاشِمٍ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَا بَنِيْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اَنْقِذُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ يَا فَاطِمَةُ اَنْقِذِيْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ فَاِنِّيْ لَا اَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا غَيْرَ اَنَّ لَكُمْ رَحِمًا سَاَبُلُّهَا بِبِلَالِهَا۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِي الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ قَالَ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ اِشْتَرُوْا اَنْفُسَكُمْ لَا اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا يَا بَنِيْ عَبْدِ مَنَافٍ لَا اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا يَا عَبَّاسُ بْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ لَا اُغْنِيْ عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَيَا صَفِيَّةُ عَمَّةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَا اُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَيَا فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ سَلِيْنِيْ مَا شِئْتِ مِنْ مَالِيْ لَا اُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ..... (یعنی اپنے قریب کے کنبہ والوں کو ڈرایئے) تو نبی کریم ﷺ نے قریش کے لوگوں کو (آواز دیکر) بلایا جب وہ جمع ہوگئے تو آپ نے خطاب میں تعمیم بھی کی اور تخصیص بھی (یعنی ان کو ان کے دور کے جدا علی کے ناموں کے ذریعہ بھی مخاطب کیا خاص خاص لوگوں سے مخصوص خطاب بھی ہو جائے) چنانچہ آپ ﷺ نے ان سب کو (اس طرح) خطاب فرمایا اے کعب بن لوی کے بیٹو! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ (یعنی ایمان قبول کرو اور نیک عمل کرو تاکہ دوزخ کی آگ سے نجات پاسکو) اے مرہ بن کعب کے بیٹو! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ اے عبد شمس کے بیٹو! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ اے عبد مناف کے بیٹو! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ اے ہاشم کے بیٹو! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ اور اے (میری لخت جگر) فاطمہ! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچا اس لئے میں تمہارے حق میں خدا کی طرف سے از قسم عذاب کسی چیز کا مالک نہیں ہوں (یعنی میں تم سے کسی کو بھی خدا کے عذاب سے نہیں بچا سکتا) البتہ مجھ پر تمہاری قرابت کا حق ہے جس کو میں اس کی تری کے ساتھ تر کرتا ہوں (یعنی میرے اور تمہارے درمیان جو قرابت ہے اور اس کا جو حق مجھ پر ہے۔ وہ بس اتنا ہی ہے کہ میں اس دنیا کے معاملات میں تمہاری دیکھ بھال رکھوں، تمہارے ساتھ اچھا سلوک کروں اور اگر تم احتیاج وضرورت کی تپش محسوس کرو تو میں صلہ رحمی اور حسن سلوک واحسان کے چھینٹوں سے اس تپش کو ختم کرنے کی کوشش کروں) اس روایت کو مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔ اور جس روایت کو بخاری ومسلم دونوں نے نقل کیا ہے ان میں یہ الفاظ ہیں کہ (حضور ﷺ نے فرمایا۔ اے قریش کے گروہ اپنے آپ کو خرید لو (یعنی مجھ پر ایمان لانے اور خدا کی اطاعت وفرمانبرداری کے ذریعہ کفران نعمت ترک کرکے اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ) میں تم سے خدا کے عذاب میں سے کچھ بھی دور نہیں کرسکتا۔ اے (میرے چچا) عباس ابن عبد المطلب! میں آپ سے (بھی) خدا کے عذاب میں سے کچھ دور نہیں کرسکتا اور اے رسول اللہ کی پھوپھی صفیہ! میں آپ سے بھی) خدا کے عذاب میں سے کچھ دور نہیں کرسکتا۔ اور اے جان پدر) فاطمہ بنت محمدا میرے مال میں سے جو کچھ تو چاہے مانگ لے (میں دونگا) لیکن خدا کے کسی عذاب سے میں تجھ کو (بھی) نہیں بچاسکتا۔"

تشریح: "لوی" اصل میں تو لام کے پیش اور ہمزہ کے زیر کے ساتھ ہے لیکن کبھی ہمزہ واؤ سے بدل جاتا ہے اور آخر میں تشدید کے ساتھ یا آتی ہے اس طرح سے یہ نام لوی پڑھا جاتا ہے۔ لوی قریش کے ایک جد اعلی کا نام ہے جو غالب ابن فہر کے بیٹے تھے اور یہ وہی فہر ہیں جن کے بارے میں بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ قریش نضر ابن کنانہ کے بجائے انہیں کا لقب تھا اور اس اعتبار سے قریش کے سلسلہ نسب کی ابتدا گویا فہر ہی نام سے ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ قریش اصل میں لفظ "القرش" سے نکلا ہے جس کے معنی تجارت کے ہیں لیکن بعض حضرات کہتے ہیں کہ قریش اصل میں "قرش" سے نکلا ہے جس کے معنی ایک بڑی خطرناک مچھلی کے ہیں اور جس کو "کلب البحر" بھی کہتے ہیں مچھلی

پانی کے اندر جانوروں کو اپنے دانت سے تلوار کی طرح کاٹ دیتی ہے۔ "مرۃ ابن کعب بھی قریش کی ایک شاخ کے جد اعلی کا نام ہے! اپنی شاخ کے سلسلہ نسب میں "عبد مناف" کا نام "عبد شمس" سے پہلے آتا ہے کیونکہ وہ عبد شمس کے باپ تھے لیکن یہاں روایت میں ان کا ذکر "عبد شمس" کے بعد کیا گیا ہے۔ حضور ﷺ کے جداعلی ہاشم کے باپ بھی عبد مناف ہی تھے۔

"اے ہاشم کے بیٹو! ان الفاظ کے ذریعہ گویا حضور ﷺ نے اپنے چچاؤں اور چچاؤں کے بیٹوں، ان سب کو مخاطب فرمایا حاصل یہ کہ حضور ﷺ نے قریش کی تمام شاخوں کو جمع فرما کر دعوت اسلام پیش کی اور ان کو خدا کے عذاب سے ڈرایا، اور یہ ڈرانا اس حد تک تھا کہ اپنی اولاد کو بھی اس میں شامل فرمالیا! چنانچہ جگر گوشہ رسول حضرت فاطمہؓ جو تمام عالم کی عورتوں کی سردار ہیں اور ان پر دوزخ کی آگ حرام ہے ان کو خدا کے عذاب سے ڈرایا۔

"کسی چیز کا مالک نہیں ہوں" کا مطلب یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں عذاب دینے کا ارادہ فرمالیا تو میں اس پر قادر نہیں ہوں کہ تم سے اس عذاب کو کوئی حصہ بھی دفع کردوں، گویا حضور ﷺ کا یہ فرمانا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی بنا پر تھا کہ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ۔

"جس کو میں اس کی تری کے ساتھ تر کرتا ہوں" میں "تری" سے مراد قرابت داری کے تعلق کو قائم رکھنا اور ان قرابت داروں کے ساتھ احسان وحسن سلوک کرنا ہے۔ پس اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ میں اپنے قرابتداروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہوں، ان کے ساتھ امداد و تعاون کا معاملہ کرتا ہوں اور ان کو ظلم و نقصان سے بچاتا ہوں! نہایہ میں لکھا ہے کہ "بلال" اصل میں "بل" کی جمع ہے جس کے معنی تری کے ہیں اور اہل عرب اس قسم کے موقعوں پر تری کا اطلاق احسان اور حسن سلوک کرنے پر کرتے ہیں جیسا کہ "بیس" یعنی خشکی کا اطلاق قطع تعلق اور بد سلوکی کرنے پر کرتے ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انہوں نے دیکھا کہ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کے اجزاء تری کے ذریعہ ایک دوسرے سے منسلک اور جڑے ہوئے ہوتے ہیں جب کہ خشکی کا پیدا ہو جانا ان اجزاء کو ایک دوسرے سے علیحدہ اور جدا کر دیتا ہے تو انہوں نے بطور استعارہ تری کو وصل یعنی جوڑنے اور ملانے کے معنی میں اور خشکی کو منقطع کرنے اور توڑنے کے معنی میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔

آنحضرت ﷺ نے پورے قریش کو اور ان کے ساتھ اپنے خاندان والوں اور قریبی متعلقین کو جس انداز میں خدا کے عذاب سے ڈرایا وہ خدا کے حکم کی تعمیل میں اور مقصد کی عظمت کے لحاظ سے نہایت ہی سخت اور بہت ہی پرزور تھا اور اپنی بات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کرنے کے پیش نظر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ڈرانے کا حکم دیا اور آپ ﷺ نے سب کو جمع فرما کر ڈرا دیا ورنہ ان مخاطبین میں بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جن کی فضیلت اور جن کا جنت میں داخل ہونا بہت سی روایات سے ثابت ہے علاوہ ازیں جب اپنی اُمت کے دوسرے لوگوں کے حق میں آپ ﷺ کا شفاعت کرنا اور اس شفاعت کا قبول ہونا ایک یقینی امر ہے تو پھر خاص اقربا (جیسے حضرت عباسؓ، حضرت صفیہ، حضرت فاطمہ وغیرہ) کا معاملہ کہیں زیادہ خصوصی رحمت و شفاعت کا مستحق ہے لیکن جیسا کہ بتایا گیا ہے، یہ موقع بہر حال اس بات کا متقاضی تھا کہ خزانے کے فریضہ کو زیادہ اہم انداز میں ادا کیا جائے اور چونکہ خدا کی بے نیازی کا خوف ہر صورت میں باقی رہتا ہے اس لئے حضور ﷺ نے سارے مخاطبین کے ساتھ ان اقربا خاص سے بھی یہ فرمایا کہ تم لوگوں کو بھی خدا کے عذاب سے بچانے پر قادر نہیں ہوں اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ڈرانے کا یہ واقعہ پہلے کا ہے جب کہ ان خاص اقرباء کی فضیلت اور حضور ﷺ کی شفاعت کی بشارت بعد میں وارد ہوئی ہے۔

"میرے مال میں سے جو کچھ تو چاہے مانگ لے" اس جملہ کے بارے میں بعض حضرات کو سخت اشکال واقع ہوا ہے، ان کا کہنا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی اقتصادی زندگی جس تنگی و سختی اور فقر و افلاس سے بھری ہوئی تھی اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے آپ کے پاس مال

کہاں تھا خصوصاً مکہ کے قیام کے دوران تو آپ بہت سخت مصائب آلام میں مبتلا تھے، ایسی صورت میں حضرت فاطمہؓ سے آپ کے اس فرمانے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ از قسم مال جو بھی چیز تم چاہو مجھ سے مانگ سکتی ہو اور میں تمہیں وہ چیز دوں گا؟ لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو اس اشکال کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی، اول تو اس وجہ سے کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی (یعنی اور ہم نے آپ کو محتاج و مفلس پایا تو غنی (مالدار کر دیا) چنانچہ مفسرین کہتے ہیں کہ غنی و مالدار کر دیا) سے حضرت خدیجہؓ کے مال و دولت کی طرف اشارہ ہے جو ان کے ساتھ نکاح کے بعد حضور ﷺ کے قبضہ تصرف میں آیا اور آپ جس طرح چاہتے تھے اس مال و دولت کو خرچ کرتے تھے، لہٰذا معلوم ہوا کہ اس وقت حضور ﷺ بالکل تہی دست نہیں تھے، دوسرے یہ کہ "مال" کا اطلاق تھوڑے مال اور زیادہ مال دونوں پر ہوتا ہے پس یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی کہ آپ کے پاس از قسم مال، مطلق کچھ بھی نہیں تھا، اور تیسرے یہ کہ مذکورہ جملہ کا ہونا اسی صورت میں کب ضروری ہے جب کہ آپ کے پاس اس وقت مال موجود رہا ہو، اس جملہ کے ذریعہ آپ کی مراد یہ بھی تو ہو سکتی تھی کہ اگر میرے پاس کچھ مال و اسباب آیا اور خدا نے مجھے کچھ دیا تو تم اس میں سے جو چاہنا مانگ لینا وہ میں تمہیں دے دوں گا لیکن جہاں تک آخرت کی نجات کا تعلق ہے اس کا میری ملکیت و قدرت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور میں یہ چیز تمہیں دینے پر قادر نہیں ہوں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

اُمّت محمدیہ کی فضیلت

④ وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُمَّتِیْ هٰذِهٖ اُمَّةٌ مَرْحُوْمَةٌ لَيْسَ عَلَيْهَا عَذَابٌ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابُهَا فِی الدُّنْيَا الْفِتَنُ وَالزَّلَازِلُ وَالْقَتْلُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میری یہ اُمت اُمت مرحومہ ہے (یعنی دوسری امتوں کی بہ نسبت میری اُمت کے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت زیادہ ہے کیونکہ ان کے نبی کی شان بھی رحمۃ للعالمین ہے) اس اُمت پر آخرت میں عذاب نہیں ہوگا اور دنیا میں اس کا عذاب، فتنے، زلزلے اور ناحق قتل ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "آخرت میں عذاب نہیں ہوگا" کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں دائمی عذاب یا سخت عذاب جو کفار و مشرکوں کے لئے ہے اس اُمت پر نہیں ہوگا بلکہ اس کا عذاب یہ ہے کہ جو لوگ برے اعمال کرتے ہیں اور دین و شریعت کے راستہ پر نہیں چلتے ان کو سزا کے طور پر اس دنیا میں مختلف فتنوں، آفتوں، امراض اور طرح طرح کے مصائب و آلام میں مبتلا کر دیا جاتا ہے! یہ بات اس آیت کریمہ مَنْ يَّعْمَلْ مِنْكُمْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ کی مراد سے بھی واضح ہوتی ہے جس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے اور حدیث کے الفاظ عَذَابُهَا فِی الدُّنْيَا الخ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے حدیث خاص طور سے ان مسلمانوں کے حق میں ہے جو کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہیں کرتے! اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس حدیث کا روئے سخن اس اُمت کی ایک مخصوص جماعت یعنی صحابہ کرام کی طرف ہو مظہرؒ نے یہ کہا ہے کہ یہ حدیث نہایت پیچیدہ مفہوم کی حامل ہے کیونکہ اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی اُمت کے کسی بھی فرد کو آخرت میں عذاب نہیں دیا جائے گا خواہ وہ گناہ کبیرہ کرے یا جو چاہے کرتا پھرے! اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی و توفیق کے بغیر کچھ نہیں کہا جا سکتا سوائے اس سے کہ یہ تاویل کی جائے کہ یہاں اُمت سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے دوسرے احکام کی فرمانبرداری کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی بھی کامل پیروی کرے اور ان چیزوں سے پوری طرح پرہیز کرے جن کو اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

"دنیا میں اس کا عذاب..... کا مطلب یہ ہے کہ میری اُمت کے لوگ زمانہ کے جن حادثات سے دوچار ہوتے ہیں جیسے زلزلے آتے

ہیں اور جان ومال کو نقصان میں مبتلا کرتے ہیں، سیلاب آتے ہیں اور سخت تباہی پھیلاتے ہیں، لوٹ مار مچتی ہے اور مسلمانوں کے جان ومال کو نقصان پہنچتا ہے، یا اسی طرح کی دیگر آفتیں اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں، اور یہ سب چیزیں ان لوگوں کے گناہوں خطاؤں اور بد عملیوں کے کفارہ کا موجب بنتی ہیں اور آخرت میں ان کے درجات کی بلندی کا باعث ہوتی ہیں، اسی طرح جو کشت وخون اور قتل وقتال ان کے درمیان ہوتا ہے اگر اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ مسلمان کفار اور دین کے دوسرے دشمنوں جیسے بتدعین وغیرہ کے ہاتھوں قتل ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کا قتل ہونا خود موجب شہادت ہوتا ہے یعنی ان مسلمانوں کو شہید کا درجہ ملتا ہے جو ایک بہت بڑی سعادت ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مسلمان خود آپس میں لڑتے ہیں اور ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں تو دیکھا جائے گا کہ ان کا باہمی قتل وقتال اور کشت وخون کس بنا پر ہے، اگر ایسا ہے کہ دونوں فریق کسی ایسے معاملہ میں برسر جنگ ہوگئے ہیں جس کی حیثیت شرعی نقطہ نظر سے واضح نہیں ہے اور اشتباہ وتاویل کے سبب دونوں کا حق پر ہونا ثابت ہوسکتا ہے تو اس صورت میں کہا جائے گا کہ دونوں فریق سلامتی پر ہیں، اور ان میں سے کسی کو بھی ظالم قرار نہیں دیا جائے گا، اور اگر ان کا باہم برسر جنگ ہونا اور ایک دوسرے کا کشت وخون کرنا کسی ایسے معاملہ کی وجہ سے ہے جس کی حیثیت وحقیقت بالکل واضح ہے اور ایک فریق صریحا ظلم وزیادتی پر ہے تو جو فریق مظلوم ہوگا اس کو ماجور قرار دیا جائے گا۔

بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ عذاب قبر اس اُمت مرحومہ ومغفورہ کے خصائص میں سے ہے، یعنی مسلمانوں کو قبر کے عذاب میں اس لئے مبتلا کیا جاتا ہے کہ ان کے نامہ اعمال میں گناہ ومعصیت کی جو گندگی ہے اس کو عالم برزخ میں دھو دیا جائے اور وہ مسلمان عذاب قبر کی صورت میں اپنے گناہوں سے پاک وصاف ہوکر آخرت میں پہنچیں اور وہاں کے عذاب کا منہ نہ دیکھنے پائیں۔

مختلف زبانوں اور مختلف ادوار کے بارے میں پیش گوئی

(۵) وَعَنْ اَبِیْ عُبَیْدَةَ وَمَعَاذِبْنِ جَبَلٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ بَدَءَ نُبُوَّۃً وَّرَحْمَۃً ثُمَّ یَکُوْنُ خِلَافَۃً وَّرَحْمَۃً ثُمَّ مُلْکًا عَضُوْضًا ثُمَّ کَائِنٌ جَبَرِیَّۃً وَعُتُوًّا وَفَسَادًا فِی الْاَرْضِ یَسْتَحِلُّوْنَ الْحَرِیْرَ وَالْفُرُوْجَ وَالْخُمُوْرَ یُرْزَقُوْنَ عَلٰی ذٰلِکَ وَیُنْصَرُوْنَ حَتّٰی یَلْقُوا اللّٰہَ۔ رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ۔

"اور حضرت عبیدہ بن جراحؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ (جو دونوں اونچے درجہ کے صحابہ میں سے ہیں) رسول کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا یہ امر (یعنی دین اسلام) نبوت ورحمت کے ساتھ ظاہر ہوا (یعنی دین اسلام سب سے پہلے جس زمانہ میں ظاہر ہوا وہ زمانہ نزول وحی اور رحمت ونورانیت کا زمانہ ہے) پھر اس (دین اسلام) کا جو زمانہ آئے گے وہ خلافت ورحمت کا زمانہ ہوگا، پھر اس (دین اسلام) کا جو زمانہ آئے گا وہ کاٹ کھانے والی بادشاہت کا زمانہ ہوگا اور پھر اس (دین) کا جو زمانہ آئے گا وہ ظلم وجور، قہر وتکبر اور زمین پر فتنہ وفساد کا زمانہ ہوگا، اس وقت لوگ ریشمی کپڑوں کو جائز (جان کر استعمال) کریں گے، عورتوں کی شرمگاہوں کو اور شراب (کی تمام انواع واقسام) کو حلال قرار دیں گے۔ لیکن ان چیزوں کے باوجود ان کو رزق دیا جائے گا اور (کفار اور ان کے مخالفین کے مقابلہ پر) ان کی مدد کی جائے گی یہاں تک وہ (روز جزا) اللہ تعالیٰ سے جا ملیں گے (یعنی لوگ اگرچہ اتنی سخت بد عملیوں اور خدا کی نافرمانی میں مبتلا ہوں گے اور اس اعتبار سے وہ عذاب خداوندی کے مستوجب اور ہلاکت وتباہی کے مستحق ہوں گے۔ مگر حق تعالیٰ کی اس رحمت کے سبب کہ جو اُمت مرحومہ کے لئے مخصوص ہے ان کو یہاں عذاب میں مبتلا نہیں کیا جائے گا! اور اس میں شاید حق تعالیٰ کی کوئی حکمت پوشیدہ ہو مثلاً یہ کہ ان سے مخلوق خداوندی کے نظم ونسق اور انتظام مملکت کا وہ کام لیا جانا مقصود ہوگا جس کی اہلیت وصلاحیت وہی رکھیں گے یا یہ کہ اگرچہ لوگ خود فاسق وبدکار ہوں گے لیکن ان کے ہاتھوں دین کی اصلاح ودرستی کا کوئی کام انجام پانا مقدر ہوگا۔" اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔"

تشریح: لفظ "بَدَا" الف کے ساتھ ہے جس کے معنی ہیں "ظاہر ہوا" اور بعض نسخوں میں یہ لفظ ہمزہ کے ساتھ ہے جس کے معنی شروع ہونے" کے ہیں، اس صورت میں گویا ترجمہ یہ ہوگا کہ یہ امر یعنی دین اسلام) کا ابتدائی زمانہ وحی سے شروع ہوا اور ذات رسالت ﷺ کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے وقت تک باقی رہا۔

اس ارشاد گرامی اسلامی تاریخ کے ان ادوار اور زمانوں کے بارے میں پیشگوئی فرمائی گئی ہے جس سے مسلمانوں کا کارواں گزرایا گزرے گا۔ پہلا زمانہ تو وہ ہوگا جس میں دین اسلام کی ابتداء اور اس کا ظہور ہوا ہے اور جو نزول وحی کے وقت سے شروع ہوکر آنحضرت ﷺ کے آخر زندگی تک باقی رہا یہ زمانہ اسلام اور مسلمانوں کے حق میں سراسر رحمت و نورانیت اور خیر و سعادت کا زمانہ تھا ذات رسالت ﷺ کی موجودگی کی وجہ سے دین میں کسی رخنہ اندازی، احکام شریعت میں کسی ابہام و تشکیک، مسلمانوں کی نظریاتی و عملی زندگی میں کسی گمراہی و ضلالت اور عام حالات میں کسی فتنہ و فساد کے پیدا ہونے کا کوئی خوف تک نہ تھا! حضور ﷺ کے بعد جو زمانہ آیا وہ خلافت کا زمانہ تھا، حضور ﷺ کی صحبت و رفاقت سے فیض اٹھائے ہوئے اور ذات رسالت پناہ کے تربیت یافتہ افراد میں سے سب سے زیادہ افضل، سب سے زیادہ باعظمت اور ایمان و عمل کے اعتبار سے سب سے زیادہ کامل انسان حضور کے نائب و خلیفہ بنے، مسلمانوں کی زمام کار ان کے ہاتھوں میں آئی اور وہ دین و ملت کے معاملات کے والی و نگہبان بنے ان پاک نفس حضرات نے یکے بعد دیگرے مسند خلافت پر متمکن رہ کر جتنے دنوں تک مملکت و ملت کا نظم و نسق چلایا وہ پورا زمانہ گویا پھر ایک مرتبہ رحمت و نورانیت کا زمانہ رہا کہ خلفاء راشدین اللہ تعالیٰ کی رحمت کے طور پر مسلمانوں پر سایہ فگن اور خیر و برکت کے نزول کا باعث بنے رہے اور ان کے زمانہ میں نیکیوں اور بھلائیوں کا دور دورہ رہا مسلمان اخلاص و ایثار اور عمل کردار کی پختگی کا نمونہ بنے رہے اور ان کے طفیل میں یہ زمین عام طور پر امن و سکون اور) اطمینان و عافیت کا گہوارہ رہی۔ وہ زمانہ کہ جس کو خلافت و رحمت کا زمانہ کہا گیا ہے، تیس سال کے شب و روز پر مشتمل تھا ان تیس سالوں میں سے ساڑھے انتیس سال تو چاروں خلفاء راشدین کے مجموعی زمانہ خلافت کے ہیں اور باقی چھ ماہ کا عرصہ وہ ہے جس میں حضرت حسنؓ مسند خلافت پر متمکن رہے۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ حضور ﷺ کے وصال کے بعد ربیع الاول ۱۱ھ میں خلیفہ رسول مقرر ہوئے اور جمادی الثانی ۱۳ھ میں ان کی وفات ہوئی! حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے مرض الموت میں صاحب الرائے مسلمانوں کے مشورہ سے حضرت عمر فاروقؓ کو اپنا جانشین نامزد فرمادیا تھا، چنانچہ حضرت عمرؓ نے جمادی الثانی ۱۳ھ میں خلافت کا منصب سنبھالا اور آخر ذی الحجہ ۲۳ھ تک اس منصب پر فائز رہے، ۲۷ھ ذی الحجہ کو ایک نصرانی غلام ابولولوء (اصل نام فیروز) نے آپ کو نماز فجر کی) امامت کی حالت میں خنجر سے حملہ کر کے سخت زخمی کردیا تھا جس کی وجہ سے جانبر نہ ہوسکے اور یکم محرم ۲۴ھ کو فوت ہوکر مدفون ہوئے! حضرت عمرؓ نے اپنے آخری دنوں میں پانچ جلیل القدر اور ممتاز صحابہ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ، حضرت سعد ابن وقاصؓ، حضرت زبیر ابن عوامؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کو نامزد فرمادیا تھا کہ یہ حضرات آپس میں مشورہ کرکے اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنالیں، چنانچہ ان حضرات نے کافی غور و خوض اور باہمی مشورہ کے بعد حضرت عثمان ابن عفانؓ کو اپنا امیر اور تیسرا خلیفہ منتخب کرلیا۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت محرم ۲۴ھ سے شروع ہوئی اور ذی الحجہ ۳۰ھ تک رہی جب کہ اس ماہ کی ۱۸ تاریخ کو خلافت کے باغیوں اور بلوائیوں کی ایک بڑی جماعت نے آپ کو مکان میں محصور کرکے بڑی بے دردی کے ساتھ شہید کردیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ایک ہفتہ بعد ۲۵ ذی الحجہ ۳۵ھ کو حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ پر مدینہ منورہ میں عام بیعت ہوئی اور اس طرح وہ چوتھے خلیفہ مقرر ہوئے اور) اور رمضان ۴۰ھ کو ان کی خلافت کا دور ختم ہوا جب کہ عبدالرحمٰن ابن بلجم کے زخمی کردینے کی وجہ سے ان کی وفات ہوئی۔ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد لوگوں نے ان کے بڑے صاحبزادے حضرت امام حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کی خلافت قائم ہوئی، لیکن حضرت امیر معاویہؓ کی طرف سے آویزش جو سلسلہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں شروع ہوا تھا وہ ان کی وفات کے بعد اور زیادہ بڑھ گیا اور جب سیادت و امارت کے مسئلہ پر مسلمانوں میں افتراق و انتشار زیادہ بڑھنے لگا اور مخالف

فریقوں کے درمیان کشت وخون کا خطرہ زیادہ سنگین ہوگیا تو حضرت امام حسنؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کرلیا چنانچہ انہوں نے ربیع الاول ۴۱ھ تک کا تیس سالہ دور وہ زمانہ ہے جس کو اس حدیث میں خلافت ورحمت کا زمانہ فرمایا گیا ہے اور اس زمانہ میں ان خلفاء راشدین نے آنحضرت ﷺ کے نائب وخلیفہ ہونے کی حیثیت سے اخلاص ودیانت، اور عدل وانصاف کے ساتھ اور حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو مشعل راہ بنا کر دین اسلام کی خدمات انجام دیں، مسلمانوں کی مذہبی وسیاسی قیادت و سیادت کی ذمہ داریوں کو حسن وخوبی کے سات نبھایا اور اسلام کی عظمت وشوکت کا جھنڈا بلند کیا۔

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جس خلافت کی فضیلت اس حدیث میں بیان کی گئی ہے اور جو واقعتاً ذات رسالت ﷺ کی نیابت تھی اس میں امیر معاویہؓ کا کوئی حصّہ نہیں ہے کہ ان کا دور حکمرانی اس زمانہ سے الگ ہے۔ جس کو خلافت ورحمت کا زمانہ فرمایا گیا ہے۔

"عض" کے معنی کاٹنے کے ہیں اور "عضوض" (عین کے زبر کے ساتھ) اسی لفظ سے نکلا ہے جو مبالغہ کا صیغہ ہے اور ایک روایت میں ملو کا عضوضار (عین کے پیش کے ساتھ) منقول ہے جو عض (عین کے زیر کے ساتھ) کی جمع ہے اور جس کے معنی خبیث، شریر، اور بدخلق کے ہیں مطلب یہ ہے کہ "خلافت ورحمت" کے زمانہ کے بعد جو دور آئے گا وہ ملوکیت (بادشاہت) کا دور ہوگا اور ایسے ایسے لوگ ملک کے بادشاہ حکمران اور مسلمانوں کے سردار و حاکم بن بیٹھیں گے جن کے دلوں میں نہ خدا خوف اور مواخذہ آخرت کا ڈر ہوگا اور نہ مخلوق خدا کے تئیں ہمدردی ومروت اور عدل وانصاف کا احساس ہوگا اس لئے وہ اپنے مالک اور اپنی قوم کے لوگوں پر ظلم وجبر کریں گے ان کو ناحق سزاؤں اور عقوبتوں میں مبتلا کریں گے اور ان کو طرح طرح سے ستائیں گے۔ لیکن واضح رہے کہ یہ بات غالب واکثریت کے اعتبار سے کہی گی ہے یعنی اکثر بادشاہ حکمران ایسے ہوں گے، اور چونکہ شاذونادر پر حکم نہیں لگایا جاتا کہ اَلنَّادِرُ کَالْمَعْدُوْمِ اس لئے یہ اشکال پیدا نہیں ہوسکتا کہ حدیث میں خلافت راشدہ کے بعد کے حکمرانوں اور باشاہوں کے زمانہ کے بارے میں جو کچھ فرمایا گیا ہے، کیا اس کا اطلاق ان حکمرانوں کے رانوں پر بھی ہوتا ہے۔ جو عدل وانصاف، مذہب وملت کی خدمت گذاری اور خدا ترسی کے اوصاف سے پوری طرح آراستہ تھے؟ مثال کے طور پر حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کا دور حکمرانی ہے، انہوں نے جس عدل وانصاف کے ساتھ حکمرانی کی اور ان کا دور اسلام اور مسلمانوں کے حق میں جس طرح خیر وبھلائی کا باعث بنا اس کی بنیاد پر عمر ثانی کہا گیا ہے حاصل یہ کہ خلافت راشدہ کے بعد جن لوگوں نے مسلمانوں پر حکمرانی کی، اور جو لوگ بادشاہ بنے ان میں سے اکثر ایسے تھے جن کا دور حکمرانی مذہب وملت کے حق میں مفید ثابت ہوئے اور اپنے عوام کے لئے خیروبرکت اور راحت واطمینان کا باعث بنے وہ استثنائی حکم رکھتے ہیں۔

"ظلم وجور، قہر وتکبر اور زمین پر فتنہ وفساد کا زمانہ ہوگا" مطلب یہ ہے کہ آخر میں جو زمانہ آئے گا وہ اسلام اور مسلمانوں کے حق میں اور زیادہ سخت ہوگا، نااہل لوگ تخت حکومت پر بیٹھیں گے، ظلم اور زیادتی اور انتشار وبدامنی کا دور دورہ ہوگا، عام لوگوں کی جان ومال اور عزت آبرو غیر محفوظ ہوگی ہر طرف لوٹ مار، قتل وغارتگری کا بازار گرم ہوگا، اور انسانیت کو تباہ کرنے والی ہر طرح کی برائیاں روئے زمین پر پھیل جائیں گی۔ چنانچہ جیسا کہ ہم اپنے زمانہ میں دیکھ رہے ہیں یہ پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہورہی ہے، کیونکہ حکومت واقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آگیا ہے جو آئین جہانبانی سے ناواقف ہیں، جنہوں نے ظلم وجور کو اپنا شعار بنا رکھا ہے اور مسلم ممالک جہاں مذہب وملت کے اصولوں کی فرمانبرداری ہونی چاہئے وہاں طاغوتی طاقتیں برسر حکومت ہیں ظالم وجابر لوگوں نے زور زبردستی اور مکروفریب کے ساتھ اقتدار کے ایوانوں پر قبضہ کرلیا ہے وہ نہ قیادت وسیادت کے اصول وشرائط کو پورا کرتے ہیں، نہ اپنے عوام کی دینی ودنیاوی بھلائی وبہتری سے انہیں کوئی تعلق ہے وہ اپنے اقتدار کو باقی رکھنے کے لئے فتنہ وفساد کے بیج بوتے ہیں تباہ کن سازشیں کرتے ہیں، عوام پر نت نئے ظلم ڈھاتے ہیں جو بندگان خاص انہیں راہ راست دکھانا چاہتے ہیں ان کو طرح طرح کی صعوبتوں میں مبتلا کرتے ہیں، کلیدی عہدوں اور مناسب پر اہل ولائق افراد کی بجائے موقع پرست، خود غرض اور نااہل لوگوں کو فائز کرتے ہیں، علماء وصلحاء اور اکابرین دین، جو ہر طرح

کی عزت احترام کے مستحق ہوتے ہیں نہ صرف یہ کہ ان کی طرف کوئی توجہ والتفات نہیں کی جاتی بلکہ مختلف ذرائع اور اقدامات کے ذریعہ ان کی ہتک کی جاتی ہے۔ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی پاداش میں ان کو قید وبند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا جاتا ہے۔

اور یہ کہ تقریباً تمام ہی مسلم حکمرانوں نے دین کے دشمنوں کے خلاف تو جہاد کے فریضہ کو ترک کر دیا، البتہ اپنی حکمرانی کی خاطر اور ملک گیری کی ہوس میں خود مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو گئے اور اپنی تلواروں کو ان کے خوف سے رنگین کیا۔ اور اسی وجہ سے بعض علماء نے یہاں تک کہہ دیا کہ جو شخص ان حکمرانوں اور بادشاہوں کو عادل کہے گا وہ کافر ہو جائے گا۔

غرضیکہ ان حکمرانوں اور بادشاہ کی وجہ سے روئے زمین پر فتنہ وفساد روز افزوں ہوتا گیا خود غرضی، موقع پرستی، بدانتظامی، اور عام بدامنی وانتشار کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا، یہاں تک کہ تاریخ ایسے حکمرانوں کے سیاہ کارناموں سے شرمسار ہے جو مسلمان ہوتے ہوئے ان شہروں کو تاراج کرنے اور وہاں کے لوگوں کا قتل عام کا باعث بنے، جہاں بڑے بڑے اولیا، صلحاء اور مشائخ تھے، جہاں کمزور اور ضعیف لوگ بچے، اور عورتیں تھیں، اور جن کو قتل کرانے کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں تھی، مزید ستم یہ کہ اس شہر کے لوگ ملت حنیفہ سے تعلق رکھتے تھے، اور اہل سُنت والجماعت میں شامل تھے۔ اور ان کا قتل عام کرنے والے مدعی سلطنت اس بات کا اظہار کرتے تھے کہ ہم دین وشریعت کے حامی ومددگار ہیں، اور اہل علم وبزرگان دین کی تعظیم کرتے ہیں۔

علماء نے تو یہاں تک تصریح کی ہے کہ اگر مسلمان دشمنان دین کے کسی ایسے قلعہ کو فتح کریں جس میں ہزاروں اہل حرب اور دشمنان دین پائے جائیں لیکن ان ہزاروں میں کوئی ایک مجہول الحال ذمی بھی موجود ہو تو محض اس ذمی کی وجہ سے مفتوح قلعہ میں قتل عام کرنا ہرگز درست نہیں ہوگا۔ مگر وہ حکمران اور بادشاہ حشر کے دن آخر کیا جواب دیں گے جنہوں نے محض اپنے اقتدار اور اپنی بادشاہت قائم کرنے کے لئے مسلمانوں تک کا قتل عام کرایا ہے اور ان کے شہروں وآبادیوں کو چشم وزون میں تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہمارے نالائق ونا اہل مسلم حکمرانوں ہی کی وجہ سے ایسے ایسے فتنہ وفساد رونما ہوئے اسلامی سلطنتوں میں اس قدر تباہیاں آئیں اور اتنا زیادہ کشت وخون ہوا کہ روئے زمین پناہ مانگنے لگی، یہاں تک کہ حرمین شریفین بھی ان فتنہ وفساد سے محفوظ نہ رہ سکے اور ان مقدس شہروں میں اتنے تباہ کن اور بھیانک واقعات رونما ہوئے کہ قلم کو مجال بیان نہیں اور ان کی تفصیل کو ضبط تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں اور اپنے دین کا بہترین کارساز) اور اپنے نبی ﷺ اور اس کی اُمت کا حامی ومددگار ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آنے والا ہر سال، بلکہ ہر دن، اور بلکہ ہر لحہ، پہلے کی بہ نسبت بد سے بدتر ہی گزر رہا ہے۔

شراب کے بارے میں ایک پیشگوئی

⑦ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اَوَّلَ مَايُكْفَأُ قَالَ زَيْدُ بْنُ يَحْيَى الرَّاوِىْ يَعْنِى الْاِسْلَامَ كَمَا يُكْفَاءُ الْاِنَاءُ يَعْنِى الْخَمْرَ قِيْلَ فَكَيْفَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَقَدْ بَيَّنَ اللّٰهُ فِيْهَا مَابَيَّنَ قَالَ يُسَمُّوْنَهَا بِغَيْرِ اِسْمِهَا فَيَسْتَحِلُّوْنَهَا۔ (رواہ الدارمی)

"اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ۔ سب سے پہلے جس کام کو اوندھا کر دیا جائے گا۔ حدیث کے راوی حضرت زید ابن یحییٰؒ نے وضاحت کی کہ یعنی اسلام میں (سب سے پہلے جس کام کو اوندھا کر دیا جائے گا) جیسے برتن اوندھا دیا جاتا ہے وہ شراب ہوگی۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ! یہ کیونکر ہوگا جب شراب کے متعلق اللہ کے وہ احکام بیان ہو چکے ہیں جو سب پر ظاہر بھی ہو گئے ہیں؟ یعنی جب شراب کی حرمت نازل ہو چکی ہے اور نہایت سختی کے ساتھ مسلمانوں کو اس چیز سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس حرمت اجتناب کا یہ حکم اتنا واضح، اتنا عام اور اس قدر تاکید کے ساتھ ہے کہ سب مسلمان اس سے واقف وآگاہ ہو گئے ہیں تو

پھر ایسا کس طرح ہوگا کہ اس کا حکم بدل دیا جائے گا اور وہ مسلمانوں کو اسلام کی مخالفت کی راہ پر لیجائے گی؟ حضور نے فرمایا۔ "لوگ حیلوں اور بہانوں کے ذریعہ اس کو پینا شروع کردیں گے اور طریقہ یہ اختیار کریں گے کہ) اس کا نام بدل دیں گے اور اس کو حلال قرار دے لیں گے۔" (دارمی)

تشریح: "مَایُکفأُ" اصل میں لفظ "کفاء" کا صیغہ مجہول ہے، جس کے معنی ہیں برتن وغیرہ کو اوندھا دینا الٹ دینا تاکہ اس میں پانی وغیرہ جو بھی چیز ہو وہ گر جائے۔

"یعنی الْاِسْلَام" کے الفاظ حدیث کے ایک راوی زیدؒ نے بیان کئے ہیں اور ان میں بھی الاسلام سے پہلے "فی" کا لفظ تھا جو راوی سے ساقط ہوگیا ہے۔ کسی مجلس یا خطبہ میں حضور ﷺ شراب کا ذکر اور اس کا حکم بیان فرما رہے تھے کہ آپ ﷺ نے اس اثنا میں اول مایکفاء ارشاد فرمایا چنانچہ راوی نے اس ارشاد کو واضح کرنے کے لئے اس جملہ کی خبر، جو محذوف تھی، اپنے الفاظ الخمر کے ذریعہ بیان کی پس، "یعنی الخمر" کا لفظ بھی راوی کا ہے جو یہ مراد بیان کرتا ہے کہ اسلام میں جس چیز کو سب سے پہلے الٹ دیا جائے گا وہ شراب ہے۔ بہر حال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جب آخر زمانہ میں مسلمانوں کی دینی زندگی میں بہت الٹ پھیر ہو جائے گا اور مذہب کے ساتھ ان کا تعلق کمزور ہو جائے گا تو اس وقت حرام و ناجائز چیزوں میں سے سب سے پہلے جس چیز کا کھلم کھلا ارتکاب ہوگا اور اسلام کے احکام میں سے سب سے پہلے جس حکم کو ساقط کر دیا جائے گا وہ شراب اور اس کا حکم ہے کہ لوگ نہ صرف شراب نوشی اختیار کریں گے بلکہ مختلف حیلوں بہانوں اور تاویلوں کے ذریعہ اس کو حلال و جائز قرار دینے کی سعی بھی کریں گے، مثلاً اس کا نام بدل کر کسی ایسے مشروب کے نام پر رکھ دیں گے جس کا پینا جائز ہے، جب کہ حقیقت میں وہ شراب ہوگی، یا اس کو کسی دوسرا اجزاء جیسے شہد اور چاول وغیرہ کے ساتھ بنائیں گے اور کہیں گے کہ اسلام میں جس چیز کو "خمر" یعنی شراب کہا گیا ہے اور جس کا پینا حرام ہے وہ انگور کا پانی ہے کہ اس سے نشہ پیدا ہوتا ہے اور یہ مشروب چونکہ انگور سے نہیں بنایا گیا ہے اس لئے اس کو پینا حرام نہیں ہے، حالانکہ وہ نہیں جانیں گے کہ جو بھی چیز نشہ پیدا کرنے والی ہے وہ حرام ہے اور "خمر" کے حکم میں ہے۔

اور اس کو حلال قرار دے لیں گے۔" کی دو صورتیں ہوں گی، ایک تو یہ کہ وہ لوگ واقعتاً اس کو حلال جانیں گے، اس صورت میں وہ کافر ہو جائیں گے کیونکہ شریعت نے جس چیز کو وضاحت کے ساتھ حرام قرار دیا ہے اس کو حلال جاننا کفر ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اس کو واقعتاً حلال قرار نہیں دیں گے بلکہ اس کو اسی طرح کھلم کھلا پئیں گے اور یہ ظاہر کریں گے کہ گویا ہم حلال چیز پیتے ہیں، اس صورت میں ان پر کفر کا نہیں بلکہ فسق کا حکم لگے گا۔

اَلْفَصْلُ الثالثُ

مسلمانوں کے مختلف زمانوں کے بارے میں ایک پیشگوئی

⑦ عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ۔ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًا فَيَكُوْنُ مَاشَآءَ اللّٰهُ اَنْ يَّكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ يَكُوْنُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً فَيَكُوْنُ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ ثُمَّ سَكَتَ قَالَ حَبِيْبٌ فَلَمَّا قَامَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ كَتَبْتُ اِلَيْهِ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اُذَكِّرُهٗ اِيَّاهُ وَقُلْتُ اَرْجُوْا اَنْ تَكُوْنَ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ بَعْدَ الْمُلْكِ الْعَاضِّ وَالْجَبْرِيَّةِ فَسُرَّ بِهٖ وَاَعْجَبَهٗ يَعْنِيْ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيْزِ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِيْ دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ۔

"حضرت نعمان ابن بشیر حضرت حذیفہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تمہارے درمیان، نبوت کا

وجود اور اس کا نور اس وقت تک باقی رہے گا جب تک اللہ چاہے گا، پھر اللہ تعالیٰ (نبی کو اپنے پاس بلالینے کے ذریعہ) نبوت کو اٹھالے گا اس کے بعد نبوت کے طریقہ پر خلافت قائم ہوگی اور وہ اس وقت تک قائم رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ (یعنی تیس سال تک) پھر اللہ تعالیٰ خلافت کو بھی اٹھالے گا اس کے بعد کاٹ کھانے والی بادشاہت کی حکومت قائم ہوگی (یعنی ایسے لوگوں کی بادشاہت کا زمانہ آئے گا جو آپس میں ایک دوسرے کو اس طرح کاٹیں گے جس طرح کتے کاٹتے ہیں، اور وہ بادشاہت اس وقت تک قائم رہے گی جب تک اللہ چاہے گا، پھر اللہ تعالیٰ اس بادشاہت کو بھی اس دنیا سے اٹھالیگا اس کے بعد قہر تکبر اور زور زبردستی والی بادشاہت کی حکومت قائم ہوگی اور وہ اس وقت تک باقی رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اس بادشاہت کو بھی اٹھالے گا، اس کے بعد پھر نبوت کے طریقہ پر (یعنی عدل وانصاف کو پورے طور پر جاری کرنے والی، خلافت قائم ہوگی (اور اس "خلافت" سے مراد حضرت عیسیٰ اور حضرت مہدی علیہما السلام کا زمانہ ہے) اتنا فرما کر آپ خاموش ہوگئے۔"

حضرت حبیب ابن سالم نے (جو اس حدیث کے راویوں میں سے ایک راوی ہیں اور حضرت نعمان ابن بشیر کے آزاد کردہ غلام اور ان کے کاتب تھے، نیز ان سے حضرت قتادہؒ وغیرہ روایتیں نقل کرتے ہیں) بیان کیا کہ جب حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ مقرر ہوئے (اور انہوں نے نبوت کے طریقہ پر حکومت قائم کی) تو میں نے اس حدیث کی طرف ان کی توجہ مبذول کرنے کے لئے یہ حدیث لکھ کر ان کے پاس بھیجی اور اپنے اس احساس کا اظہار کیا کہ مجھ کو امید ہے کہ آپ وہی امیر المؤمنین یعنی خلیفہ، ہیں جس کا ذکر اس حدیث میں کاٹ کھانے والی بادشاہت اور قہر و تکبر اور زور و زبردستی والی بادشاہت کے بعد آیا ہے۔

وہ یعنی عمر ابن عبد العزیزؒ اس بات سے بہت خوش ہوئے اور اس تشریح نے ان کو بہت مسرور کیا (یعنی اس بات کی امید و آرزو نے ان کو بھی بہت خوش کیا کہ حدیث میں جس آخری خلافت کا ذکر کیا گیا ہے شاید اس کا اطلاق میرے زمانہ خلافت ہی پر ہو) اس روایت کو امام احمدؒ نے (اپنی مسند میں) اور بیہقیؒ نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے۔

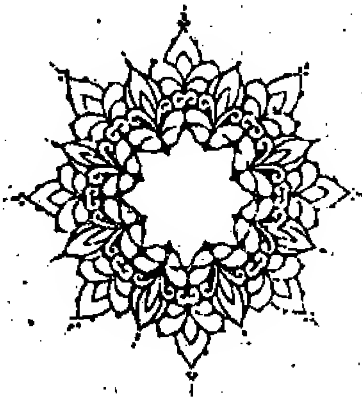

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب الفتن

فتنوں کا بیان

"فِتَن" اصل میں فِتْنَۃٌ کی جمع ہے جیسا کہ مِحَن مِحْنَۃٌ کی جمع آتی ہے فتنہ کے مختلف معنی ہیں مثلاً آزمائش وامتحان، ابتلا، گناہ، فضیحت، عذاب، مال و دولت، اولاد، بیماری، جنون، محنت، عبرت، گمراہ کرنا و گمراہ ہونا، اور کسی چیز کو پسند کرنا اور اس پر فریفتہ ہونا نیز لوگوں کی رائے میں اختلاف پر بھی فتنہ کا اطلاق ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ مشکوٰۃ کا وہ حصہ جو یہاں سے شروع ہو کر آخر تک ہے اس کو مؤلف نے کتاب الفتن کا نام دیا ہے اور اس کے ضمن میں مختلف ابواب قائم کئے ہیں، بظاہر اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، خصوصا، فضائل و مناقب کے ابواب کو کتاب الفتن میں شامل کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی، اگر یہ کہا جائے کہ ان ابواب میں جن مقدس ہستیوں یعنی ذات رسالت پناہ ﷺ اور خلفائے راشدین و اکابر صحابہ کرام کے فضائل و مناقب بیان کئے گئے ہیں ہم ان کی عظمت و برتری اور بزرگی کا اعتقاد رکھنے کے مکلف اور اس اعتقاد کو اپنے عمل سے ثابت کرنے کے امتحان و آزمائش میں مبتلا ہیں نیز ان کی ذات کے گرویدہ اور ان پر فریفتہ ہیں اور اس اعتبار کو ملحوظ رکھا جائے تو پوری کتاب میں جو کچھ منقول و مذکور ہے وہ سب اسی قبیل سے ہے اور اس صورت میں محض کتاب الفتن کی تخصیص لا حاصل ہوگی! بہر حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس موقع پر مؤلف مشکوٰۃ کے ذہن میں کیا بات تھی اور انہوں نے کن وجوہ کی بنا پر یہاں سے کتاب کے آخر تک کے حصہ کو کتاب الفتن کا نام دیا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حضور ﷺ نے قیامت تک ظاہر ہونے والے تمام فتنوں کے بارے میں پیشگوئی فرمادی تھی

(۱) عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَامَ فِيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَقَامًا مَاتَرَكَ شَيْئًا يَكُوْنُ فِيْ مَقَامِهِ ذٰلِكَ اِلٰى قِيَامِ السَّاعَةِ اِلَّا حَدَّثَ بِهِ حَفِظَهُ مَنْ حَفِظَهُ وَنَسِيَهُ مَنْ نَسِيَهُ قَدْ عَلِمَهُ اَصْحَابِيْ هٰؤُلَاۤءِ وَاِنَّهُ لَيَكُوْنُ مِنْهُ الشَّيْءُ قَدْ نَسِيْتُهُ فَاَرَاهُ فَاَذْكُرُهُ كَمَا يَذْكُرُ الرَّجُلُ اِذَا غَابَ عَنْهُ ثُمَّ اِذَا رَاٰهُ عَرَفَهُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ ہمارے درمیان کھڑے ہوئے جیسا کہ (وعظ و خطبہ کے لئے) کھڑے ہوتے ہیں (چنانچہ آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور وعظ کہا جس کے دوران آپ ﷺ نے ان فتنوں سے آگاہ فرمایا جو ظاہر ہونے والے تھے) پس از قسم فتنہ جو چیزیں اس وقت (یعنی زمانہ نبوی) سے لے کر قیامت تک وقوع پذیر ہونے والی تھیں ان سب کو ذکر فرمایا اور ان میں سے کوئی چیز (بیان کرنے سے) نہیں چھوڑی ان باتوں کو یاد رکھنے والوں نے یاد رکھا اور جو بھولنے والے تھے وہ بھول گئے (یعنی آپ ﷺ نے جن

فتنوں کا ذکر فرمایا ان کو بعض لوگوں نے تو یاد رکھا اور بعض لوگوں نے فراموش کر دیا، حضرت حذیفہؓ نے یہ بھی فرمایا کہ) میرے یہ دوست (یعنی صحابہؓ جو اس وقت بقید حیات ہیں) اس واقعہ سے (کہ آپ ﷺ نے اس دن اپنے خطبہ میں قیامت تک ظاہر ہونے والے فتنوں کا ذکر فرمایا تھا) واقف ہیں (لیکن ان میں سے بعض حضرات حضور ﷺ کی بیان فرمودہ ان باتوں کو جانتے ہیں اور بعض حضرات کو وہ باتیں تفصیل کے ساتھ یاد نہیں رہی ہیں کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ نسیان کا طاری ہو جانا انسانی خواص میں سے ہے اور جیسا کہ بیان کیا گیا میں بھی انہی لوگوں میں سے ہوں جو ان باتوں کو پوری طرح یاد نہیں رکھ سکے ہیں) لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جن باتوں کی خبر دی تھی اور جن باتوں کو میں بھول گیا ہوں اگر ان میں سے کوئی بات پیش آجاتی ہے تو میں اس کو دیکھ کر اپنا حافظہ تازہ کر لیتا ہوں جس طرح کہ جب کسی غائب شخص کا چہرہ نظر آجاتا ہے تو وہ چہرہ دیکھ کر اس شخص کو پہچان لیا جاتا ہے (یعنی عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص بہت عرصہ تک غائب رہتا ہے تو اس کی شخصیت ذہن سے اوجھل ہو جاتی ہے اور لوگ اسے بھول جاتے ہیں لیکن جب بھی وہ ظاہر ہو جاتا ہے اور اس کا چہرہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے تو اس کی بھولی ہوئی شخصیت فوراً یاد آجاتی ہے اور وہ شخص کے ساتھ پہچان لیا جاتا ہے، اسی طرح میرا معاملہ بھی یہ ہے کہ اس دن حضور ﷺ نے جو باتیں پیش گوئی فرمائی تھیں وہ تفصیلی طور پر میرے ذہن میں نہیں رہی ہیں لیکن جب ان باتوں میں سے کوئی بات پیش آجاتی ہے اور حضور ﷺ نے جن چیزوں کی خبر دی تھی ان میں سے کوئی چیز وقوع پذیر ہوتی ہے تو اس کو دیکھ کر میں فوراً پہچان لیتا ہوں یہ وہی بات ہے جس کی خبر حضور ﷺ نے دی تھی۔" (بخاری و مسلم)

قلب انسانی پر فتنوں کی یلغار

② وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ تُعْرَضُ الْفِتَنُ عَلَى الْقُلُوْبِ كَالْحَصِيْرِ عُوْدًا عُوْدًا۔ فَاَيُّ قَلْبٍ اُشْرِبَهَا نُكِتَتْ فِيْهِ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ وَاَيُّ قَلْبٍ اَنْكَرَهَا نُكِتَتْ فِيْهِ نُكْتَةٌ بَيْضَاءُ حَتّٰى يَصِيْرُ عَلٰى قَلْبَيْنِ اَبْيَضَ مِثْلُ الصَّفَا فَلَا تَضُرُّهُ فِتْنَةٌ مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَالْاٰخَرُ اَسْوَدُ مُرْبَادًا كَالْكُوْزِ مُجَخِّيًا لَا يَعْرِفُ مَعْرُوْفًا وَلَا يُنْكِرُ مُنْكَرًا اِلَّا مَا اُشْرِبَ مِنْ هَوَاهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "لوگوں کے دلوں پر فتنے اس طرح ڈالے جائیں گے جس طرح چٹائی کے تنکے ہوتے ہیں (یعنی جس طرح چٹائی میں تنکے ایک کے پیچھے ایک لگائے جاتے ہیں اسی طرح سے دلوں پر ایک کے بعد ایک فتنے ڈالے جائیں گے) پس جو دل ان فتنوں کو قبول کریگا اس میں سیاہ نکتہ ڈال دیا جائے گا اور جو دل ان فتنوں کو قبول کرنے سے انکار کرے گا اس میں سفید نکتہ پیدا کر دیا جائے گا پس انسان (ان فتنوں کے پیش آنے اور ان کے دلوں پر ان فتنوں کی تاثیر و عدم تاثیر کے اعتبار سے) دو قسموں میں بٹ جائیں گے (یا یہ کہ انسان کے دل مذکورہ اعتبار کے مطابق دو قسم کے ہو جائیں گے) ایک تو سفید مثل سنگ مرمر کے (کہ جس پر کوئی چیز اثر انداز نہیں ہوتی واضح رہے کہ اس تشبیہ میں محض سفیدی مراد نہیں ہے بلکہ سختی اور قوت کا اعتبار بھی ملحوظ رکھا گیا ہے) چنانچہ اس طرح کے دل پر کوئی بھی فتنہ اثر انداز اور مضرت رساں نہیں ہو گا جب تک کہ زمین و آسمان قائم و باقی ہیں (یعنی اس دل کی یہ کیفیت ہمیشہ باقی رہے گی) اور دوسرا راکھ کے رنگ جیسا سیاہ دل، اوندھے برتن کی مانند (کہ اس میں جو کچھ بھی ہو گر پڑے، مطلب یہ کہ اس طرح کا دل راکھ کی مانند سیاہ اور اوندھے برتن کی طرح ایمان و معرفت کے نور سے خالی ہو گا) چنانچہ اس طرح کا دل نہ تو نیک و اچھے اور مشروع کاموں کو پہچانے گا اور نہ برے کاموں کو برا جانے گا، وہ تو بس اس چیز سے مطلب رکھے گا جو از قسم خواہشات اس میں رچ بس گئی ہے اور جس کی محبت کا وہ اسیر بن چکا ہے۔ (یعنی وہ طبعی طور پر نفسانی خواہشات کا غلام ہو گا اور اچھی و بری کا امتیاز کئے بغیر ہر اس چیز کے پیچھے بھاگے گا جو اس کے نفس کو مرغوب ہو گی۔" (مسلم)

تشریح: "فتنوں" سے مراد بلاء و آفات اور وہ چیزیں ہیں جو انسان کے ذہن و فکر اور قلب و جسم کو تعب و تکلیف اور رنج و نقصان میں مبتلا

کرلیتی ہیں لیکن بعض حضرات نے "فتنوں" کی مراد، فاسد و گمراہ نظریات، باطل افکار اور نفسانی شہوت و خواہشات کو قرار دیا ہے۔

لفظ "عودا" تین طرح سے نقل کیا گیا ہے، ایک روایت میں عین کے پیش اور دال مہملہ کے ساتھ ہے اور جیسا کہ دوسری روایت سے بھی ثابت ہوتا ہے، یہی زیادہ مشہور ہے! اس صورت میں حدیث کے اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ دلوں میں فتنے اس طرح ایک کے بعد ایک دو آئیں گے جیسا کہ چٹائی بنتے وقت تنکے ایک کے بعد ایک داخل کئے جاتے ہیں، اس تشبیہ سے مراد دلوں پر فتنوں کا اس طرح پیش آنا ہے جس طرح چٹائی بننے والے کے سامنے تنکے یکے بعد دیگرے پیش ہوتے رہتے ہیں! اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس تشبیہ سے یہ مراد ہے کہ وہ فتنے دل پر اس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ دوسری روایات میں یہ لفظ عین کے زبر اور دال کے ساتھ (یعنی عوذا) ہے اس صورت میں یہ لفظ ان فتنوں سے خدا کی پناہ طلب کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ کسی گفتگو و کلام کے دوران کفر و معصیت کے ذکر کے بعد نعوذ باللہ یا معاذ اللہ کہا جاتا ہے۔ تیسری روایت میں یہ لفظ عین کے زبر اور دال مہملہ کے ساتھ (یعنی عودا) ہے اور اس سے مراد عود و تکرار ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ فتنے دل پر بار بار واقع ہوں گے۔ واضح رہے کہ پہلی روایت میں تو یہ لفظ منصوب اور مرفوع دونوں طرح نقل کیا گیا ہے اور دوسری و تیسری روایت میں صرف منصوب منقول ہے۔

"اشربھا" میں لفظ مشرب صیغہ مجہول کے ساتھ ہے! کہا جاتا ہے اُشْرِبَ فُلَانٌ حُبَّ فُلَانٍ یعنی فلاں شخص کے دل میں فلاں شخص کی محبت رچ گئی ہے، یا فلاں شخص کے دل میں فلاں شخص کی محبت کا فتنہ بیٹھ گیا ہے، یا فلاں شخص کے دل پر فلاں شخص کی محبت کا رنگ چڑھ گیا ہے جیسا کہ کسی کپڑے پر کوئی رنگ چڑھ جاتا ہے! چونکہ "شرب" کے اصل معنی پینے کے ہیں اس لئے کپڑے پر رنگ چڑھنے کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ گویا وہ کپڑا اس رنگ کو پیتا ہے اور اس میں رنگ جاتا ہے پس۔ "جو دل ان فتنوں کو قبول کرلے گا" کا مطلب یہ ہے کہ جس میں کجی ہوگی اور جس کا میلان و رجحان برائی کی طرف ہوگا اس میں وہ فتنے رچ بس جائیں گے اور گویا وہ دل ان فتنوں کو اس طرح قبول کرلے گا جس طرح کوئی سفید کپڑا کسی بھی رنگ کو فوراً قبول کرلیتا ہے۔

"نکتہ" اصل میں داغ کو کہتے ہیں اور اس نشان کے معنی میں آتا ہے جو لکڑی وغیرہ کے کریدنے اور چھونے سے زمین پر پیدا ہو جاتا ہے! نیز "نکتہ" کا لفظ "نقطہ" کے معنی میں بھی آجاتا ہے اور خاص طور سے اس نقطہ (دھبہ) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جو مخالف رنگ کی چیز میں ہو جیسے سفید چیز میں سیاہ نقطہ اور سیاہ چیز میں سفید نقطہ۔

حتی تصیر علی قلبین میں لفظ "تصیر" حرف ت کے ساتھ بھی ہے اور حرف ی کے ساتھ بھی! اگر یہ لفظ ی کے ساتھ یعنی "یصیر" پڑھا جائے تو اس صورت میں اس کی ضمیر انسان کی طرف راجع ہوگی جیسا کہ سیاق کلام سے مفہوم ہوتا ہے اور اگر اس لفظ کو ت کے ساتھ تصیر پڑھا جائے تو اس کی ضمیر قلوب کی طرف راجع ہوگی جو صریحا مذکور بھی ہے۔

"مرباد" م کے پیش اور ر کے جزم اور دال کی تشدید کے ساتھ، کے معنی خاکستر اور سیاہ رنگ کے ہیں "رُمد" کا لفظ بھی خاکستر رنگ کے معنی میں آتا ہے اور "ارمداد" کے معنی میں خاکستری رنگ کا ہونا۔

جب امانت دلوں سے نکل جائے گی

(۳) وَعَنْهُ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيْثَيْنِ رَأَيْتُ اَحَدَهُمَا وَاَنَا اَنْتَظِرُ الْاٰخَرَ حَدَّثَنَا اَنَّ الْاَمَانَةَ نَزَلَتْ فِيْ جَذْرِ قُلُوْبِ الرِّجَالِ ثُمَّ عَلِمُوْا مِنَ الْقُرْاٰنِ ثُمَّ عَلِمُوْا مِنَ السُّنَّةِ وَحَدَّثَنَا عَنْ رَفْعِهَا قَالَ يَنَامُ الرَّجُلُ النَّوْمَةَ فَتُقْبَضُ الْاَمَانَةُ مِنْ قَلْبِهٖ فَيَظَلُّ اَثَرُهَا مِثْلَ اَثَرِ الْوَكْتِ ثُمَّ يَنَامُ النَّوْمَةَ فَتُقْبَضُ فَيَبْقٰى اَثَرُهَا مِثْلَ اَثَرِ الْمَجْلِ كَجَمْرٍ دَحْرَجْتَهٗ عَلٰى رِجْلِكَ فَنَفِطَ فَتَرَاهُ مُنْتَبِرًا وَلَيْسَ فِيْهِ شَيْءٌ وَيُصْبِحُ النَّاسُ يَتَبَايَعُوْنَ وَلَا يَكَادُ اَحَدٌ يُؤَدِّى الْاَمَانَةَ فَيُقَالُ اِنَّ فِيْ بَنِيْ فُلَانٍ رَجُلًا اَمِيْنًا وَيُقَالُ لِلرَّجُلِ مَا اَعْقَلَهٗ وَمَا اَظْرَفَهٗ وَمَا اَجْلَدَهٗ وَمَا فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ اِيْمَانٍ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے ہم سے (امانت کے بارے میں اور فتنے کے زمانہ کے حوادث کے سلسلہ میں) دو حدیثیں (یعنی دو باتیں) بیان فرمائیں ان میں سے ایک کو تو دیکھ چکا ہوں اور دوسری کا منتظر ہوں (یعنی حضور نے پہلی بات جو یہ فرمائی تھی کہ امانت لوگوں کے دلوں کی گہرائی میں اتاری گئی ہے، اس کو گو میں نے دیکھ لیا ہے اور دوسری بات یعنی امانت کے اٹھ جانے کے مصداق کا منتظر ہوں) چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ہم سے بیان فرمایا کہ۔ امانت لوگوں کے دلوں کی گہرائی میں اتاری گئی پھر انہوں نے (اس امانت کے نور سے) قرآن کو جانا اور پھر انہوں نے سُنّت کو جانا۔" اس کے بعد آپ نے امانت کے اٹھ جانے (یعنی ایمان کے ثمرات و برکات کے اٹھ جانے اور اس میں نقص آجانے) کی حدیث بیان کی، چنانچہ فرمایا۔ آدمی (حسب معمول) سوئے گا اور امانت اس کے دل سے نکال لی جائے گی (یعنی اس کے ایمان کے بعض ثمرات و انوار ناقص و کم ہو جائیں گے) پس امانت کا اثر یعنی نشان (جو ایمان کا ثمرہ ہے) وکت کے نشان کی طرح ہو جائے گا (حاصل یہ کہ ایمان کا نور دھندلا اور اس کا اثر و ثمرہ ناقص ہو جائے گا) پھر جب وہ دوبارہ سوئے گا (اور زیادہ غفلت طاری ہوگی) تو اس کی امانت کا وہ حصّہ بھی ناقص کر دیا جائے گا اور نکال لیا جائے گا جو باقی رہ گیا تھا پس (اس کے دل میں) ایک مجل یعنی آبلہ جیسا نشان رہ جائے گا جیسا کہ تم آگ کی چنگاری کو اپنے پاؤں پر ڈال دو اور اس سے آبلہ پڑ جائے جو بظاہر پھولا اور اٹھا ہوا ہوگا لیکن اس کے اندر (خراب اور گندے پانی کے علاوہ) کچھ نہیں ہوگا۔ پھر (اس صورت حال کے بعد) لوگ صبح کو اٹھیں گے تو حسب معمول آپس میں خرید و فروخت کریں گے اور ان میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوگا جو امانت کو ادا کرے (یعنی شریعت کے حقوق ادا کرنے والا فرائض و واجبات کی تکمیل کرنے والا اور لوگوں کے حق میں کوئی خیانت و بددیانتی نہ کرنے والا کہیں دور دور بھی نظر نہیں آئے گا) یہاں تک کہ (امانت و دیانت میں کمی آجانے کے سبب یہ کہا جائے گا کہ فلاں قبیلہ (یا فلاں شہر و آبادی) میں (لوگوں کی کثرت کے باوجود) بس ایک شخص ہے جو امانت دار یعنی کامل الایمان ہے۔ اور زبردست سیاسی مہارت و چالاکی اور دنیاوی شان و شوکت کا حامل ہوگا) یا کہا جائے گا کہ وہ (اپنے دنیاوی کاروبار اور معاملات میں) کس قدر عقلمند و ہوشیار، کس قدر خوبصورت و دانا، خوشگوار اور زبان آور ہے اور کس قدر چست و چالاک ہے، حالانکہ اس کے دل میں رائی برابر بھی ایمان نہیں ہوگا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "امانت" سے مراد یا تو اس کے مشہور معنی ہیں یعنی کسی کے حق میں یا کسی کی ملکیت میں خیانت نہ کرنا یا وہ تمام شرعی ذمہ داریاں مراد ہیں جو ہر شخص پر عائد کی گئی ہیں یعنی تمام اسلامی احکام و تعلیمات کو ماننا اور ان پر عمل کرنا اور "امانت" کے یہ وہ معنی ہیں جو قرآن کریم کی اس آیت اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ میں مذکور ہیں۔ تاہم ان دونوں معنی کی اصل اور بنیاد ایمان ہے اس لئے زیادہ وضاحت کے لئے یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہاں "امانت" سے مراد "ایمان" ہے جیسا کہ خود حدیث کے آخری الفاظ و مافی قلبہ مثقال حبۃ من خردل من ایمان سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے۔ اسی طرح حدیث کے اس جملہ و لا یکاد احد یودی الامانۃ میں "امانت" کا جو لفظ ہے وہ بھی مذکورہ وضاحت پر مبنی ہے! پس حضور ﷺ نے جو دو حدیثیں بیان فرمائیں ان میں سے پہلی حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت و فلاح کے لئے ایمان و امانت کو نازل فرمایا اور اس کا مورد و محل قلب انسانی کو قرار دیا کہ پہلے ایمان کا نور اور جوہر انسان کے دل میں اترا اور راسخ و مستحکم ہوا جس نے کتاب ہدایت قرآن مجید اور سُنّت نبوی ﷺ پر عمل آوری کے راستہ کو منور کیا، چنانچہ انسان نے اسی نور ایمان کے سبب ان لافانی تعلیمات اور احکام و مسائل کو جانا اور سمجھا جو کتاب اللہ سے اخذ کئے گئے ہیں اور وہ احکام و مسائل خواہ فرض و واجب اور مسنون و مباح ہوں یا حرام و مکروہ، اور پھر اسی نور نے سُنّت نبی کی حقیقت و صداقت کو واشگاف کیا کہ زبان رسالت اور معمولات نبوی نے کتاب اللہ کی تعلیمات اور منشاء حق کی جو وضاحت و تفسیر بیان فرمائی اس کو بلا چون و چرا قبول کر کے عمل کی راہ کو استوار کیا گیا۔ یہاں یہ بات واضح ہوئی کہ حق تعالیٰ کی طرف سے نور ہدایت کا پیدا کیا جانا اور اس کے ذریعہ انسانیت عامہ کو نوازنے اور فلاح پہنچانے کا ارادہ فرمانا کتاب اللہ کو نازل کرنے اور رسولوں کو مبعوث کرنے سے پہلے تھا، یعنی پہلے تو اللہ تعالیٰ نے نور ہدایت کو پیدا کیا اور یہ ارادہ فرمایا کہ اپنے بندوں کو اس نور ہدایت کے ذریعہ سعادت و بھلائی کے بلند مقام پر پہنچانا ہے۔ اس کے بعد اس

نے اپنی کتاب کو دنیا میں نازل فرمایا اور اپنے پیغمبر اور رسول مبعوث فرمائے۔ پس نسل انسانی سے جن لوگوں کو اللہ تعالٰی کی عنایت وہدایت کا مورد و محل بننا نصیب ہوا اور جن میں اس نور ہدایت کو قبول کرنے کی توفیق واستعداد ودیعت ہوئی وہی خوش بخت کتاب و سُنّت سے بہرمند ہوتے ہیں۔ اس موقع پر ایک نکتہ اور بھی بیان کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ جو یہ فرمایا گیا ہے کہ۔ پھر انہوں نے قرآن کو جانا اور پھر انہوں نے سُنّت کو جانا۔ اس کے ذریعہ ایمان و امانت کے مرتبہ کی شان وحیثیت اور اس کی عظمت کو بیان کرنا بھی مقصود ہے کہ باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے نور ہدایت (یعنی ایمان کو نازل فرمایا اور قلوب انسانی میں اس کو ودیعت وراسخ فرما دیا تھا مگر پھر کتاب اللہ کے نازل کرنے اور اپنے پیغمبر ورسول کے مبعوث کرنے کے ذریعہ بھی اس کو مؤکد و مؤید کیا۔ بہرحال یہ وہ پہلی حدیث ہے جو حضور ﷺ نے صحابہؓ سے ارشاد فرمائی اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے اس کا مصداق اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا ہے باایں طور کہ حضور ﷺ کے زمانہ اور رفاقت حضوری میں صحابۂ کرام اس ارشاد گرامی کے عین مصداق تھے اور دوسری حدیث، کہ جس میں حضور ﷺ نے امانت کے کم ہوجانے اور اٹھ جانے کا ذکر فرمایا وہ حضور ﷺ کے مبارک زمانہ کے بعد کے لوگوں پر صادق آئی۔

"آدمی (حسب معمول) سوئے گا..... الخ" سے مراد یا تو حقیقۃً سونا ہے یا یہ جملہ اس کی غفلت و کوتاہی میں پڑ جانے سے کنایہ ہے! یعنی یاد الٰہی سے غافل آیات الٰہی سے بے خبر، قرآن مجید میں مدبر و تفکر سے بے پرواہ اور اتباع سُنّت میں کوتاہ ہوجانا۔ یہ دوسری مراد زیادہ واضح ہے کیونکہ ماقبل جملہ ثُمَّ السنۃ (اور پھر انہوں نے سُنّت کو جانا) کا مخالف مفہوم اسی مراد کا متقاضی ہے۔

"فیظل اثرہ مثل اثر الوکت" امانت کا اثر یعنی نشان وکت کے نشان کی طرح ہوجائے گا" پہلے یہ جاننا چاہئے کہ کسی چیز کا اثر وہ نشان کہلاتا ہے جو اس چیز کی علامت کے طور پر نمودار ہے اور اس چیز کا کچھ نہ کچھ حصہ اس کی صورت میں باقی رہے اور "وکت" عکسی چیز کے اس دھبہ کو کہتے ہیں جو اس چیز کے مخالف رنگ کی صورت میں نمودار ہوجائے جیسے کسی سفید چیز میں سیاہ نقطہ کا نمودار ہونا اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "وکت" اصل میں اس سفید نقطہ نما نشان کو کہتے ہیں جو آنکھ کی سیاہی میں پیدا ہوجائے۔ حدیث کے اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ دین وشریعت کی طرف سے غافل ہوجانے اور گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے دل میں (ایمان) کا نور کم ہوجائے گا اور وہ (غافل ہوجانے والا) جب اس صورت حال سے آگاہ ہوگا اور اپنے دل کی حالت وکیفیت میں غور وفکر کرے گا تو یہ محسوس کریگا کہ اس میں ایک نقطہ کی مقدار کے علاوہ نور امانت میں سے اور کچھ باقی نہیں رہا ہے! پھر جب وہ دوبارہ سو جائے گا۔" کے ذریعہ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب دین وشریعت سے غفلت کی نیند اور زیادہ طاری ہوجائے گی اور گناہوں کا ارتکاب زیادہ بڑھ جائے گا دل میں سے نور ایمان کا بقیہ حصہ بھی نکل جائے گا اور وہاں صرف مجل کے نشان کی طرح کی صورت میں رہ جائے گا واضح رہے کہ "مجل" کے معنی ہیں آبلہ پڑ جانا اور کام کرتے کرتے ہاتھ کی جو کھال سخت ہوجاتی ہے اور جس کو گھٹا بھی کہتے ہیں اس پر بھی مجل کا اطلاق ہوتا ہے۔ لہٰذا جس طرح انسان کے جسم کے کسی حصہ پر جو آبلہ پڑ جاتا ہے وہ اگرچہ اوپر سے ابھرا نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں اس کے اندر خراب اور گندے پانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اسی طرح جس شخص کے دل میں امانت کا وہ باقی اثر و نشان بھی نکال لیا جائے گا، تو اگرچہ وہ بظاہر بالکل صالح وکار آمد نظر آئے گا لیکن حقیقت میں اس کے اندر سعادت و بھلائی اور آخروی زندگی کو فائدہ پہنچانے والی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ مذکورہ وضاحت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وکت اور مجل نور امانت کے اس حصہ کی تمثیل ہے جو دل میں باقی رہ جاتا ہے گویا ان دونوں چیزوں کی مثال کے ذریعہ اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس دور میں اسلام کے نام لیواؤں میں ایمان ودین کی اس کمزوری کے باوجود ان کے دل میں ایمان وامانت کا نور کسی نہ کسی حد تک ضرور باقی رہے گا خواہ وہ وکت اور مجل کے نشان کی طرح ہی کیوں نہ ہو لیکن اس وضاحت پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے، وہ یہ کہ مجل کا نشان وکت کے نشان سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ لہٰذا کلام کے اسلوب کا تقاضا تو یہ تھا کہ پہلے مجل کے نشان کا ذکر کیا جاتا اور اس کے بعد وکت کے نشان کا ذکر ہوتا کیونکہ بعد کے درجہ کا نشان پہلے درجہ کے نشان سے کمتر اور ہلکا ہونا چاہئے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ "وکت" اگرچہ ایک بہت قلیل نشان ہوتا ہے مگر وہ "مجل" سے کمتر حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ "مجل ایک

خالی اور بالکل بیکار ہونے کی وجہ سے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا۔ لیکن یہ جواب زیادہ مضبوط نہیں ہے۔

ایک شارح نے اس بحث پر ایک دوسرے انداز سے روشنی ڈالی ہے ان کے منقولات کے مطابق اس دوسری حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جن اہل ایمان کے قوائے فکر و عمل پر غفلت و بے حسی طاری ہو جائے گی اور گناہوں کے ارتکاب کی صورت میں دین شریعت کے ساتھ ان کا تعلق نہایت کمزور پڑ جائے گا ان کے دلوں سے "امانت" جاتی رہے گی چنانچہ جب اس کا ایک حصہ زائل ہو جائے گا تو ان کے دلوں میں سے اس کا نور بھی زائل ہو جائے گا اور اس کی جگہ "وکت" کی طرح ظلمت و تاریکی پیدا ہو جائے گی اور اس کی مثال ایسی جیسے کسی چیز میں اس کا مخالف رنگ نمودار ہو جائے (مثلاً سفید چیز میں سفید رنگ کا نمودار ہو جانا) اور جب دین و شریعت کے تئیں غفلت و کوتاہی اور بڑھ جائے گی اور گناہوں کا ارتکاب پہلے سے بھی زیادہ ہو جائے گا تو نور امانت کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا اس میں سے کچھ اور زائل ہو جائے گا اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے جسم کے کسی حصہ پر مجل (یعنی آبلہ یا گھٹے کا نشان) اتنا گہرا اور اس قدر سخت ہوتا ہے کہ جلد زائل نہیں ہوتا، پس دوسری مرتبہ دل میں جو تاریکی پیدا ہوگی وہ پہلی مرتبہ پیدا ہونے والی تاریکی سے زیادہ پھیلی ہوئی اور گہری ہوگی۔ مذکورہ صورت حال کو اس مثال کے ذریعہ بیان فرمانے کے بعد پھر یہ فرمایا کہ قلب انسانی میں ایمان و امانت کے نور کا پیدا ہونا اور پھر نکل جانا یا دلوں میں اس نور کا جگہ پکڑنا اور پھر اس کے زائل ہو جانے کے بعد تاریکی کا آجانا ایسی تشبیہ رکھتا ہے جیسا کہ کوئی آگ کا انگارہ لے کر اس کو اپنے پیر پر ڈال لے اور انگارہ پیر کو جلا کر زائل ہو جائے اور پھر جلی ہوئی جگہ پر آبلہ پڑ جائے۔

ایک اور شارح نے یہ لکھا ہے کہ۔ اس ارشاد گرامی کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں امانت کا نور پیدا کیا تاکہ وہ اس کی روشنی میں فلاح کے راستہ پر چلیں اور دین و شریعت کے پیروکار بنیں، لیکن جب وہ لوگ اس نعمت سے بے پرواہ ہو جائیں گے، دین و شریعت کے تئیں غفلت و کوتاہی میں پڑ جائیں گے اور گناہوں کا ارتکاب کرنے لگیں گے تو اللہ تعالیٰ سزا کے طور پر ان لوگوں سے یہ نعمت واپس لے لیگا، بایں طور کہ ان کے دل میں سے امانت نکل جائے گی، یہاں تک جب وہ خواب غفلت سے بیدار ہوں گے تو محسوس کریں گے کہ ان کے قلب کی وہ حالت نہیں ہے جو امانت کی موجودگی میں پہلے تھی، البتہ ان کے دلوں میں اس امانت کا نشان باقی رہے گا جو کبھی وکت کی طرح ہوگا اور کبھی مجل کی طرح ہوگا۔ پس "مجل" اگرچہ مصدر ہے لیکن یہاں اس سے مراد نفس آبلہ ہے اور یہ (یعنی مجل) پہلے مرتبہ (یعنی وکت) سے کمتر درجہ ہے، کیونکہ "وکت" کے ذریعہ اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ اگرچہ امانت دل میں سے نکل جائے گی مگر نشان کی صورت میں اس کا کچھ نہ کچھ حصہ باقی رہے گا۔

حدیث کے آخری الفاظ —— حالانکہ اس کے دل میں رائی برابر بھی ایمان نہیں ہوگا، دونوں احتمال رکھتے ہیں یا تو اصل ایمان کی نفی مراد ہے، یعنی اس شخص کے سرے سے ایمان کا وجود ہی نہیں ہوگا، یا کمال ایمان کی نفی مراد ہے کہ ارشاد گرامی کے اس جزو کا حاصل یہ ہے کہ لوگ اس شخص کی عقل و دانائی کی زیادتی، اور چالاکی اور مہارت وغیرہ کی تعریف کریں گے اور اس کے تئیں تعجب تحسین کا اظہار کریں گے لیکن کسی ایسے شخص کی تعریف و توصیف نہیں کریں گے جس میں بہت زیادہ علم و فضل ہوگا اور جو عمل صالح کی دولت سے مالا مال ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل چیز ایمان اور پاکیزگی فکر و عمل ہے، اگر کسی شخص میں ایمان و پاکیزگی کی دولت نہ ہو تو خواہ وہ دنیا بھر کی تمام نعمتوں، کامرانیوں اور خوبیوں کا حامل ہو اس کی کوئی حقیقت نہ ہوگی اگرچہ دنیا والے اس کی کتنی ہی تعریف و تحسین کریں اور اس کی ان خوبیوں و کامرانیوں کی وجہ سے اس کو کتنا ہی برتر و بہتر جانیں، لہٰذا تعریف و تحسین اسی شخص کے حق میں معتبر ہوگی جو ایمان و تقویٰ کا حامل ہو۔

جب فتنوں کا ظہور ہو تو گوشہ عافیت تلاش کرو

(۴) وَعَنْهُ قَالَ كَانَ النَّاسُ يَسْاَلُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْخَيْرِ وَكُنْتُ اَسْاَلُهُ عَنِ الشَّرِّ مَخَافَةَ اَنْ يُّدْرِكَنِيْ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا كُنَّا فِيْ جَاهِلِيَّةٍ وَشَرٍّ فَجَاءَ نَا اللّٰهُ بِهٰذَا الْخَيْرِ فَهَلْ بَعْدَ هٰذَا الْخَيْرِ مِنْ شَرٍّ قَالَ نَعَمْ قُلْتُ وَهَلْ بَعْدَ ذٰلِكَ الشَّرِّ مِنْ خَيْرٍ قَالَ نَعَمْ فِيْهِ دَخَنٌ قُلْتُ وَمَا دَخَنُهٗ قَالَ قَوْمٌ يَّسْتَنُّوْنَ بِغَيْرِ سُنَّتِيْ وَيَهْدُوْنَ بِغَيْرِ هَدْيِيْ

تَعْرِفُ مِنْهُمْ وَتُنْكِرُ قُلْتُ فَهَلْ بَعْدَ ذٰلِكَ الْخَيْرِ مِنْ شَرٍّ قَالَ نَعَمْ دُعَاةٌ عَلٰى اَبْوَابِ جَهَنَّمَ مَنْ اَجَابَهُمْ اِلَيْهَا قَذَفُوْهُ فِيْهَا قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صِفْهُمْ لَنَا قَالَ هُمْ مِنْ جِلْدَتِنَا وَيَتَكَلَّمُوْنَ بِاَلْسِنَتِنَا قُلْتُ فَمَا تَأْمُرُنِيْ اِنْ اَدْرَكَنِيْ ذٰلِكَ قَالَ تَلْزَمُ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاِمَامَهُمْ قُلْتُ فَاِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ جَمَاعَةٌ وَلَا اِمَامٌ قَالَ فَاعْتَزِلْ تِلْكَ الْفِرَقَ كُلَّهَا وَلَوْ اَنْ تَعَضَّ بِاَصْلِ شَجَرَةٍ حَتّٰى يُدْرِكَكَ الْمَوْتُ وَاَنْتَ عَلٰى ذٰلِكَ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ يَكُوْنُ بَعْدِيْ اَئِمَّةٌ لَا يَهْتَدُوْنَ بِهُدَايَ وَلَا يَسْتَنُّوْنَ بِسُنَّتِيْ وَسَيَقُوْمُ فِيْهِمْ رِجَالٌ قُلُوْبُهُمْ قُلُوْبُ الشَّيَاطِيْنِ فِيْ جُثْمَانِ اِنْسٍ قَالَ حُذَيْفَةُ قُلْتُ كَيْفَ اَصْنَعُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ اَدْرَكْتُ ذٰلِكَ قَالَ تَسْمَعُ وَتُطِيْعُ الْاَمِيْرَ وَاِنْ ضُرِبَ ظَهْرُكَ وَاُخِذَ مَالُكَ فَاسْمَعْ وَاَطِعْ۔

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ لوگ تو (اکثر) رسول کریم ﷺ سے خیر و نیکی اور بھلائی کے بارے میں پوچھا کرتے تھے اور میں آپ ﷺ سے شر و برائی کے بارے میں دریافت کیا کرتا تھا اس خوف کی وجہ سے کہ کہیں میں کس فتنہ میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ (یعنی دوسرے صحابہؓ تو عبادت و طاعت کے بارے میں سوال کیا کرتے تھے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ نیک عمل اور اچھے کام کرسکیں، یا یہ کہ وہ لوگ آپ ﷺ سے اپنے رزق میں وسعت اور خوشحالی کی دعا کرتے تھے تاکہ انہیں اطمینان و فراغت حاصل ہو اور اپنی دنیا کو آخرت کی فلاح و کامیابی کا ذریعہ بنا سکیں لیکن ان کے برخلاف میرا معمول دوسرا تھا، میں حضور ﷺ سے گناہ اور برائیوں کے بارے میں پوچھا کرتا تھا کہ ان سے اجتناب کرسکوں یا یہ کہ ان فتنوں کے بارے میں پوچھتا تھا جو اس دنیا میں ظہور پذیر ہو سکتے ہیں اور جو نہ صرف اخروی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ ان کے برے اثرات دنیاوی خوشحالی اور رزق کی وسعت پر بھی پڑتے ہیں، اور پوچھنے کی بناء یہ خوف ہوتا تھا کہ کہیں میں ان فتنوں میں مبتلا نہ ہو جاؤں یا ان کے برے اثرات و اسباب مجھ تک نہ پہنچ جائیں چنانچہ اہل علم سے برائیوں کی واقفیت حاصل کرکے ان سے بچنے کی تدابیر اختیار کرنا ایک بہترین طریق ہے، اسی نے حکماء اور اطبا بلکہ بعض فضلاء نے اس طریق کو بطور اصول اختیار کیا ہے کہ ازالہ مرض کے سلسلہ میں پرہیز کو ملحوظ رکھنا، دوا استعمال کرنے سے زیادہ بہتر ہے نیز کلمہ توحید بھی اسی اصول کی طرف اشارہ ہے کہ پہلے ماسوی اللہ کی نفی کی گئی ہے اس کے بعد الوہیت کو ثابت کیا گیا) حضرت حذیفہؓ نے بیان کیا کہ (اپنی مذکورہ عادت کے مطابق ایک دن) میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم لوگ (اسلام) سے قبل جاہلیت اور برائی میں مبتلا تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے (آپ ﷺ کی بعثت کے صدقہ میں) ہمیں یہ ہدایت و بھلائی (یعنی اسلام کی روشنی عطا فرمائی) جس کی وجہ سے کفر ضلالت کے اندھیرے دور ہو گئے اور ہم گمراہیوں اور برائیوں کے جال سے باہر آ گئے) تو کیا اس ہدایت و بھلائی کے بعد کوئی اور برائی و بدی پیش آنے والی ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ہاں! (اس بھلائی کے بعد بھی برائی پیش آنے والی ہے)" میں نے عرض کیا۔ تو کیا اس برائی کے بعد پھر ہدایت و بھلائی کا ظہور ہو گا (کہ جس کی وجہ سے دین و شریعت کا پھر بول بالا ہو جائے)؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! اس برائی کے بعد پھر بھلائی کا ظہور ہو گا لیکن اس برائی کے بعد جو بھلائی آئے گی اس میں کدورت ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ اس بھلائی کی کدورت کیا ہوگی؟ آپ نے فرمایا۔ "(میں نے کدورت کی جو بات کہی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ) ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو میرے طریقہ اور میری روش کے خلاف طریقہ و روش اختیار کریں گے، لوگوں کو میرے بتائے ہوئے راستہ کے خلاف راستہ پر چلائیں گے۔ (اور میری سیرت اور میرے کردار کے خلاف سیرت و کردار اپنائیں گے) تم ان میں دین دار بھی دیکھو گے اور بے دین بھی۔ میں نے عرض کیا کیا اس بھلائی کے بعد پھر کوئی برائی پیش آئے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں! ایسے لوگ (پیدا) ہوں گے جو دوزخ کے دروازوں پر کھڑے ہو کر مخلوق کو (اپنی طرف) بلائیں گے) جو شخص ان کے بلاوے کو قبول کرکے دوزخ کی طرف جانا چاہے گا اس کو وہ دوزخ میں دھکیل دیں گے (یعنی جو شخص ان کے بہکاوے میں آکر ان گمراہیوں میں مبتلا ہو گا جو دوزخ کے عذاب کا مستوجب بناتی ہیں تو وہ دوزخ میں ڈال دیا جائے گا)"۔ میں نے عرض کیا کہ ان کے بارے میں وضاحت فرمائیے (کہ وہ کون لوگ ہوں گے، آیا وہ مسلمانوں ہی میں سے ہوں گے یا غیر مسلم ہوں گے؟) حضور ﷺ نے فرمایا۔ "وہ ہماری قوم (یا ہمارے ابناء جنس اور ہماری ملت کے لوگوں میں سے ہوں گے اور ہماری زبان میں گفتگو کریں گے (یعنی وہ لوگ عربی زبان رکھنے والے ہونگے یا یہ مراد

ہے کہ ان کی گفتگو قرآن وحدیث کے حوالوں سے مزین اور پند ونصائح سے آراستہ ہوگی اور بظاہر ان کی زبان پر دین ومذہب کی باتیں ہوں گی مگر ان کے دل نیکی وبھلائی سے خالی ہوں گے) میں نے عرض کیا کہ تو پھر میرے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟ (یعنی اگر میں ان لوگوں کا زمانہ پاؤں تو اس وقت مجھے کیا کرنا چاہئے؟) حضور ﷺ نے فرمایا۔ "کتاب وسُنّت پر عمل کرنے والے) مسلمانوں کی جماعت کو لازم جاننا اور ان کے امیر کی اطاعت کرنا (یعنی اہل سُنت کے راستہ کو اختیار کرنا اور اہل سُنّت کا جو امام ومقتدا ہو اس کی اطاعت ورعایت ملحوظ رکھنا) میں نے عرض کیا کہ اور اگر مسلمانوں کی کوئی (مسلمہ) جماعت ہی نہ ہو؟ اور نہ ان کا کوئی (متفقہ) امیر ومقتدا ہو، بلکہ مسلمان مختلف جماعتوں میں منقسم ہوں اور الگ الگ مقتداؤں کے پیچھے چلتے ہوں تو اس صورت میں مجھے کیا کرنا چاہئے؟) آپ ﷺ نے فرمایا۔ ایسی صورت میں تمہیں ان سب فرقوں اور جماعتوں سے صرف نظر کر کے یکسوئی اختیار کر لینی چاہئے، اگرچہ اس یکسوئی کے لئے تمہیں کسی درخت کی جڑ میں پناہ کیوں نہ لینی پڑے (جنگلوں میں چھپنا کیوں نہ پڑے اور اس کی وجہ سے سخت سے سخت مصائب وشدائد برداشت کیوں نہ کرنا پڑے اور ان جنگلوں میں گھاس پھوس کھانے پر قناعت تک کی نوبت کیوں نہ آجائے) یہاں تک اسی یکسوئی کی حالت میں موت تمہیں اپنی آغوش میں لے لے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

اور مسلم کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "میرے بعد ایسے امام (یعنی امیر بادشاہ اور قائد رہنما) ہوں گے جو عقیدہ وفکر اور علم کے (اعتبار سے) میری سیدھی راہ پر نہیں چلیں گے اور کردار وعمل کے اعتبار سے) میری روش اور میرا طریقہ نہیں اپنائیں گے (یا یہ معنی ہیں کہ وہ کتاب وسُنّت پر عمل نہیں کریں گے) اور اس زمانہ میں ایسے بھی پیدا ہوں گے جو روپ اور بدن تو آدمیوں جیسا رکھیں گے لیکن ان کے دل شیطانوں کے سے ہوں گے (یعنی وہ لوگ فسق وگمراہی، شقاوت وسخت دلی، شکوک وشبہات پیدا کرنے، فریب دینے، عقل کے نکمے ہونے اور فاسد خواہشات رکھنے میں انسانیت کی ساری حدوں کو پار کر جائیں گے اور اس اعتبار سے ان کی شکل وصورت آدمیوں جیسی ہونے کے باوجود ان کی سیرت اور ان کی باطنی شیطان کی سی ہوگی۔" حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ (میں نے یہ سن کر) عرض کیا کہ۔ یارسول اللہ اگر میں اس زمانہ کو پاؤں تو کیا کروں؟ آپ نے فرمایا۔ "مسلمانوں کا امیر ومقتدا جو کچھ کہے اس کی سننا اور امیر کی اطاعت کرنا (بشرطیکہ اس اطاعت کا تعلق کسی معصیت سے نہ ہو) اگرچہ تمہاری پشت پر مارا جائے اور تمہارا مال چھین لیا جائے (تب بھی سننا اور طاعت کرنا)"۔

تشریح: لفظ "شَرّ" سے مراد فتنہ، ارکان اسلام میں سستی وکوتاہی واقع ہو جانا، برائی کا غلبہ پالینا اور بدعت کا پھیلنا ہے! اور "خیر" سے مراد اس کے برعکس معنی ہیں۔

"ہم لوگ جاہلیت اور برائی میں مبتلا تھے۔" کے ذریعہ حضرت حذیفہؓ نے بعثت نبوی سے قبل کے زمانہ کی طرف اشارہ کیا جب توحید کا آفتاب جہالت کے بادلوں میں چھپا ہوا تھا، نبوت ورسالت کی روشنی نمودار نہیں ہوتی تھی اور احکام خداوندی پر عمل آوری کا راستہ نظروں سے اوجھل تھا۔ "فی جاھلیۃ وشر" میں وشَرّ کا لفظ عطف تفسیری ہے کہ اس لفظ کے ذریعہ جاہلیت کی وضاحت بیان کرنا مقصود ہے، یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس جملہ میں و شر کے بعد تخصیص" کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

"دخن" جس کا ترجمہ "کدورت" کیا گیا ہے، دخان (دھواں) کے معنی میں ہے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح فضا میں پھیلا ہوا دھواں صاف وشفاف چیزوں کو مکدر اور دھندلا بنا دیتا ہے اسی طرح اس وقت جو بھلائی سامنے آئے گی وہ بدی اور برائی کے گرد وغبار سے آلودہ ہوگی، بایں طور کہ لوگوں کے دلوں میں صفائی اور خلوص نہیں ہوگا جو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تھا، اور عقیدے صحیح اور اعمال صالح نہیں ہوں گے، امراء وسلاطین کا نظم مملکت اس عدل وانصاف پر مبنی نہیں ہوگا جو پہلے زمانہ میں پایا جاتا تھا مسلمانوں کے قائد ورہنما مخلص (بے غرض اور دین وملت کے سچے خادم نہیں ہوں گے، برائیوں کا ظہور ہوگا، بدعتیں پیدا ہوں گی بدکار لوگ نیکوکاروں کے ساتھ اہل بدعت، اہل سُنّت کے ساتھ خلط ملط رہیں گے۔

"تم ان میں دیندار بھی دیکھو گے اور بے دین بھی" کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ بھلائی اور برائی دونوں کے ساتھ خلط ملط رکھنے کی وجہ سے متضاد اور مختلف (اعمال و کردار اور طور طریقوں کے حامل ہوں گے؟ ان کی زندگی میں منکر (یعنی بری باتوں کا چلن بھی ہوگا اور معروف (یعنی اچھے کاموں) کا عمل دخل بھی ہوگا۔ پس یہ جملہ بھی اسی مفہوم کو واضح کرتا ہے جو ماقبل کے جملوں نعم و فیہ دخن و یستنون بغیر سنتی سے مراد لیا گیا ہے۔

بعض حضرات نے وضاحت کی ہے کہ اس ارشاد گرامی میں اسلام و ہدایت کی روشنی کے بعد پیش آنے والی جس پہلی برائی یا فتنہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے وہ فتنہ و فساد مراد ہے جو حضرت عثمان غنیؓ کے سانحہ شہادت کے وقت رونما ہوا اور پھر پیش آنے والی دوسری بھلائی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے مراد حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کا زمانہ خلافت ہے، نیز منھم و تنکر یعنی تم ان میں دیندار بھی دیکھو گے اور بے دین بھی۔" میں جن لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان سے وہ امراء و سلاطین مراد ہیں جو حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کے بعد حکمراں ہوئے، چنانچہ ان میں سے بعض ایسے حکمران گزرے جو اپنی ذاتی زندگی میں بھی اور اپنے نظام سلطنت میں بھی کتاب و سُنّت کی ہدایت کو رہنما بناتے تھے اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے تھے۔ یا یہ کہ ان میں سے بعض ایسے تھے جو کبھی تو اچھے کام کرتے تھے اور کبھی خواہشات نفسانی میں پڑ کر برے کام کرتے تھے، اس وقت ان کے سامنے آخرت کا مفاد اور دار آخرت کے لئے تیاری کا جذبہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ ان کا اصل مفاد اپنی ذاتی اغراض کو پورا کرنا اور ہر صورت اپنے اقتدار اور اپنی حکمرانی کو باقی رکھنا ہوتا تھا اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ پہلی برائی سے مراد وہ فتنہ و فساد ہے جو حضرت عثمان غنیؓ کے قتل کی صورت میں اور ان کے بعد رونما ہوا، اور دوسری بھلائی سے مراد وہ صلح صفائی ہے جو حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت حسنؓ کے درمیان ہوئی اور دخن یعنی کدورت سے مراد وہ افسوسناک واقعات، حادثات ہیں جو حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ میں بعض امراء کے ذریعہ رونما ہوئے۔ جیسے عراق میں زیاد کا فتنہ و فساد۔

جو دوزخ کے دروازوں پر کھڑے ہو کر بلائیں گے" یعنی ان مفاد پرست خود غرض اور گمراہ افراد کا ایک گروہ ہوگا جو لوگوں کو طرح طرح کے فریب اور مختلف لالچ اور بہلاووں کے ذریعہ گمراہی کی طرف بلائیں گے اور ان کو ہدایت و راستی سے دور رکھے گا۔ پس حضور ﷺ نے گمراہی کی دعوت دینے والوں کی دعوت کو اور جن کو دعوت دی جائے گی ان کی طرف سے اس دعوت کو قبول کئے جانے کو ایک ایسا سبب قرار دیا ہے جس کے ذریعہ دعوت دینے والے، دعوت قبول کرنے والوں کو جہنم میں دھکیل دیں گے اس طرح وہ لوگ ان کی مکرو فریب دعوت کا شکار ہو کہ جہنم میں پہلے جائیں گے، نیز آپ ﷺ نے گویا مکرو فریب کی تمام اقسام اور تمام صورتوں کو جہنم کے دروازوں کا قائمقام قرار دیا ہے۔

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہاں جن افراد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہی کی طرف بلائیں گے، ان سے وہ جاہ پسند اور حکومت و اقتدار کے طلبگار مراد ہیں جو ملک و قوم پر اپنا تسلط قائم کرنے اور اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے اپنے گروہ بنائیں گے اور عام لوگوں کو طرح طرح کے فریب دے کر اپنے گرد جمع کریں گے تاکہ ان کی اجتماعی طاقت کے ذریعہ ملی سیادت اور ملک و حکومت پر قبضہ کر سکیں، جیسا کہ خوارج اور روافض جیسے گمراہ فرقے اس ناپاک مقصد کے لئے پیدا ہوئے حالانکہ امارت و سیادت اور امانت و ولایت کی کوئی بھی شرط و خصوصیت ان میں موجود نہیں پائی جائے گی۔ ایک بات یہ بھی قابل وضاحت ہے کہ جو یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ دوزخ کے دروازوں پر کھڑے ہو کر لوگوں کو اپنی طرف بلائیں گے۔ تو دوزخ کے دروازوں پر کھڑے ہونا، مآل کار کے اعتبار سے فرمایا گیا ہے، یعنی گمراہی کی طرف ان لوگوں کے بلانے کا مآل کار چونکہ یہ ہوگا کہ جو لوگ ان کے بلانے پر ان کی طرف چلے جائیں گے وہ دوزخ کے عذاب کے مستوجب بنیں گے، اس لئے گمراہی کی طرف ان کے بلانے کو دوزخ کے دروزاوں پر کھڑے ہو کر بلانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پس یہ ارشاد گرامی اسلوب کے اعتبار سے قرآن کریم کی اس آیت کی طرح ہے کہ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا۔

مسلم کی روایت کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کسی ایسے ملک میں رہتے ہو جہاں مسلمانوں کا باقاعدہ نظم سلطنت قائم ہے اور

مسلمانوں کا امیر وامام موجود ہے گو وہاں کے سیاسی حالات میں تمہارے لئے کتنی ہی تنگی و سختی کیوں نہ ہو اور اس امیر و امام کی طرف سے تمہارے مال اور تمہاری جان کے تئیں ظلم ہی کیوں نہ ہوتا ہو یا تمہیں مارا پیٹا اور تمہارا مال و اسباب چھینا کیوں نہ جاتا ہو، تم اس امیر و امام کے خلاف علم بغاوت ہرگز بلند نہ کرنا اور فتنہ و فساد کے دروازے نہ کھولنا بلکہ صبر و تحمل کی راہ اختیار کئے رہنا، اور سخت سے سخت حالات میں بھی امام وقت سے بغاوت کر کے دین و ملت کے شیرازہ کو منتشر کرنے کا سبب نہ بننا رہی یہ بات کہ اگر وہ امیر و امام مشروع امور کے ارتکاب کا حکم دے؟ تو اس صورت میں مسئلہ یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے ہاں اگر ان مشروع امور کے ارتکاب کے لئے کہا جائے (کہ حکم عدولی کی صورت میں بھی اولی کو اختیار کرنے کا جواز باقی رہتا ہے (یعنی حکم عدولی کی صورت میں جان جانے کا خوف ہو تو غیر مشروع امر کا ارتکاب کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص جان کی بازی لگا کر بھی غیر مشروع امر کے ارتکاب سے انکار کرے تو یہ سب سے اچھی بات ہوگی، اور اس سب سے اعلیٰ درجہ کو اختیار کرنے کا جواز ہے)۔

آخر میں "فاسمع و اطع" کے الفاظ جو دوبارہ ارشاد فرمائے گئے ہیں ان سے اس حکم کو مؤکد کرنا مقصود ہے کہ اپنے کو امام وقت کی اطاعت سے علیحدہ نہ کیا جائے اور سرکشی و بغاوت کے ذریعہ ملک و ملت میں انتشار و تفریق کا فتنہ نہ اٹھایا جائے۔

اس سے قبل کہ فتنوں کا ظہور ہو، اعمال صالحہ کے ذریعہ اپنی زندگی کو مستحکم کرلو

⑤ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَادِرُوْا بِالْاَعْمَالِ فِتَنًا كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ يُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا وَيُمْسِيْ كَافِرًا اَوْ يُمْسِيْ مُؤْمِنًا وَيُصْبِحُ كَافِرًا يَبِيْعُ دِيْنَهٗ بِعَرَضٍ مِّنَ الدُّنْيَا۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" اعمال صالحہ میں جلدی کرو قبل اس کے کہ وہ فتنے ظاہر ہو جائیں جو تاریک رات کے ٹکڑوں کی مانند ہوں گے (اور ان فتنوں کا اثر ہوگا کہ) آدمی صبح کو ایمان کی حالت میں اٹھے گا اور شام کو کافر بن جائے گا اور شام کو مؤمن ہوگا تو صبح کو کفر کی حالت میں اٹھے گا، نیز اپنے دین و مذہب کو دنیا کی تھوڑی سی متاع کے عوض بیچ ڈالے گا۔" (مسلم)

تشریح: "اعمال صالحہ میں جلدی کرو" کی ہدایت کا حاصل یہ ہے کہ اس تغیر پذیر دنیا کو کسی ایک رخ پر قرار نہیں اور وقتی حالت کا بہاؤ ایک ہی سمت نہیں رہتا، اگر اب ایسے حالات ہیں جو عقیدہ و عمل کا رخ صحیح سمت رکھنے میں معاون بنتے ہیں تو بعد میں ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں جو فکر و نظریات اور عقیدہ و عمل کا سفر ٹھیک رخ پر جاری رکھتے ہیں زبردست رکاوٹ پیدا کردیں، اور ایسے میں کم ہی انسان ہوتے ہیں جن کے ذہن و فکر اور دل و دماغ ان حالات کی تاثیر سے محفوظ رہ پائیں اور جن کے اعمال صالحہ میں رکاوٹ نہ پیدا ہوتی ہو، پس جس شخص کو جو بھی موقع ملے اس میں اچھے کام اور نیک عمل کرنے میں جلدی کرنی چاہئے اور جس قدر بھی اعمال کئے جا سکتے ہوں کر لئے جائیں کیونکہ یہ کوئی نہیں جانتا کہ آنے والا وقت کیا فتنے لے کر آئے اور پھر اعمال صالحہ اختیار کرنے کا موقع بھی مل سکے یا نہیں۔

"فتنوں" کو اندھیری رات کے ٹکڑوں سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ آنے والے فتنوں کے بارے میں کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ وہ کب اور کیوں نمودار ہوں گے اور ان سے چھٹکارے کی راہ کیا ہوگی، لہٰذا ان آنے والے فتنوں سے پہلے ہی اعمال صالحہ کے ذریعہ اپنی دینی زندگی کو مضبوط و مستحکم بنالو، آنے والے وقت کا انتظار نہ کرو کیونکہ اس وقت دین و شریعت کے تعلق سے سخت ترین آفات و مصائب میں اس طرح گم ہو کر رہ جاؤ گے کہ نیک کام کرنے کا موقع ہی نہ پاسکو گے۔ وہ وقت لوگوں کے ذہن و فکر اور اعمال و کردار پر کتنا برا اثر ڈالے گا اور وہ فتنے کس قدر سریع الاثر ہوں گے اس کی طرف اشارہ فرمایا گیا کہ مثلاً آدمی جب صبح کو اٹھے گا تو ایمان (یعنی اصل ایمان یا کمال ایمان) کے ساتھ متصف ہوگا لیکن شام ہوتے ہوتے کفر کے اندھیروں میں پہنچ جائے گا! رہی یہ بات کہ "کفر" سے کیا مراد ہے، تو ہو سکتا ہے کہ اصل کفر مراد ہو، یعنی وہ شخص واقعۃً کفر کے دائرہ میں داخل ہو جائے گا یا یہ مراد ہے کہ وہ کفران نعمت کرنے والا ہو جائے گا، یا وہ کافروں کی مشابہت اختیار کرلے گا اور یا یہ کہ وہ ایسے کام کرنے لگے گا جو صرف کافر ہی کرتے ہیں۔

اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ جملہ کے معنی یہ ہیں کہ۔ مثلاً ایک شخص جب صبح کو اٹھے گا تو اس چیز کو حلال جانتا ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے، اور اس چیز کو حرام جانتا ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، لیکن شام ہوتے ہوتے اس کے ذہن و فکر اور اس کے عقیدے میں اس طرح انقلاب آجائے گا کہ وہ اس چیز کو حرام سمجھنے لگے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے اور اس چیز کو حلال سمجھنے لگے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ اسی پر جملہ کے دوسرے جزء یعنی۔ شام کو مؤمن ہوگا اور صبح کو کفر کی حالت میں اٹھے گا۔ کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے! اور حاصل یہ ہے کہ عام لوگ ان فتنوں کی وجہ سے دین و شریعت کے معاملات میں تذبذب و تردد کا شکار ہو جائیں گے اور نام نہاد دانشور و عالم اور دنیادار مقتداؤں کے پیچھے چلنے لگیں گے مظہرؒ نے کہا ہے کہ مذکورہ صورت حال کے کئی وجوہ واسباب اور مختلف مظاہر ہوں گے ایک تو یہ کہ مسلمانوں میں تفرقہ پڑ جائے گا اور وہ مخالف گروہوں میں بٹ جائیں گے، پس ان کے درمیان محض عصبیت اور بغض و عناد کی وجہ سے خونریزی ہوگی اور دونوں گروہوں کے لوگ اپنے مخالفین کے جان و مال کو نقصان پہنچانے اور ایک دوسرے کی آبروریزی کرنے کو حلال و جائز جانیں گے، دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے حاکم و امراء ظلم و جور کا شیوہ اپنالیں گے۔ چنانچہ وہ مسلمانوں کا ناحق خون بہائیں گے، زور زبردستی ان کا مال لیں گے زناکاری کریں گے، شراب پئیں گے اور دوسرے حرام امور کا ارتکاب کریں گے، لیکن ان کی ان صریح زیادتیوں اور بدکاریوں کے باوجود بعض لوگ یہ عقیدہ رکھیں گے اور دوسرے حرام امور کا ارتکاب کریں گے، لیکن ان بدعقیدگی کے اس فتنہ میں مبتلا کرنے والے وہ نام نہاد علماء ہوں گے جن کو "علماء سو" کہا جاتا ہے، ان کی طرف سے بے محابا ان امراء و حکام کے ان کاموں کے جواز کا فتویٰ دیا جائے گا جو وہ مسلمانوں کی خونریزی اور حرام امور کے ارتکاب کی صورت میں کریں گے، اور تیسرے یہ کہ عام مسلمانوں میں جہالت اور دین کی ناواقفیت کی وجہ سے جو برائیاں پھیل جائیں گی اور ان سے جن غیر شرعی امور کا صدور ہوگا جیسے خرید و فروخت کے معاملات اور دوسرے سماجی امور و تعلقات میں دین و شریعت کے احکام کی خلاف ورزی، ان کو حلال و جائز جانیں گے۔ اور حضرت شیخ عبدالحقؒ نے یہ لکھا ہے کہ مذکورہ صورت حال اس وجہ سے پیدا ہوگی کہ لوگ اپنے اغراض و منافع کی خاطر، دنیادار امراء و حکام اور اہل دولت و ثروت سے میل جول رکھیں گے، ان سے حاجت روائی کی امید میں ان کے ہاں گھستے پھریں گے، ان کی حاشیہ نشینی اور مصاحبت کو بڑا اعزاز سمجھیں گے، پس اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ان کے تابع محض اور جی حضوری بن جائیں گے اور ان کے خلاف شریعت امور و معاملات میں ان کی موافقت و تائید کرنے پر مجبور ہوں گے۔

"آدمی صبح کو ایمان کی حالت میں اٹھے گا الخ" کے ایک معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ۔ آدمی صبح کو اٹھے گا تو اپنے مسلمان بھائی کے خون اور مال و عزت کے حرام ہونے کا عقیدہ رکھنے کے سبب ایمان کی حالت میں ہوگا مگر شام ہوتے ہوتے اس کے اس عقیدے میں تبدیلی آجائے گی اور وہ اپنے مسلمان بھائی کے خون اور مال کو حلال سمجھنے لگے گا اور اس کے سبب وہ کافر قرار دیا جائے گا۔ یہ معنی اختیار کرنے کی صورت میں "فتنوں" سے مراد جنگ و قتال ہوگا! لیکن اس جملہ کے جو معنی پہلے بیان کئے گئے ہیں وہ حضور ﷺ کے ارشاد گرامی کے زیادہ مناسب ہیں۔

فتنوں کے ظہور کے وقت گوشۂ عافیت میں چھپ جاؤ

(٦) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَتَكُوْنُ فِتَنٌ اَلْقَاعِدُ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ الْقَائِمِ وَالْقَائِمُ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ الْمَاشِيْ وَالْمَاشِيْ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ السَّاعِيْ مَنْ تَشَرَّفَ لَهَا تَسْتَشْرِفُهُ فَمَنْ وَجَدَ مَلْجَأً اَوْ مَعَاذًا فَلْيَعُذْ بِهٖ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ يَكُوْنُ فِتْنَةٌ اَلنَّائِمُ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَقْظَانِ وَالْيَقْظَانُ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ الْقَائِمِ وَالْقَائِمُ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ السَّاعِيْ مَنْ وَجَدَ مَلْجَأً اَوْ مَعَاذًا فَلْيَسْتَعِذْ بِهٖ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "عنقریب فتنے پیدا ہوں گے (یعنی جلد ہی ایک بڑا فتنہ سامنے آنے والا ہے یا

یہ کہ پے بہ پے یا تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بہت زیادہ فتنوں کا ظہور ہونے والا ہے) ان فتنوں میں بیٹھنے والا، کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا، اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا اور چلنے والا سعی کرنے والے (یعنی کسی سواری کے ذریعہ یا پاپیادہ دوڑنے والے اور جلدی چلنے والے) سے بہتر ہوگا اور جو شخص فتنوں کی طرف جھانکے گا فتنہ اس کو اپنی طرف کھینچ لے گا! پس جو شخص ان فتنوں سے نجات کی کوئی جگہ (یا اس سے بھاگنے کا کوئی راستہ) یا پناہ گاہ پائے (اور یا کوئی ایسا آدمی اس کو مل جائے جس کے دامن میں وہ ان ان فتنوں سے پناہ لے سکتا ہو) تو اس شخص کو چاہئے کہ اس کے ذریعہ پناہ حاصل کرلے (یعنی اگر ان فتنوں سے بھاگنے کا کوئی راستہ مل سکتا ہو تو فتنوں کی جگہ سے نکل بھاگے یا کوئی ایسی جگہ اس کو معلوم ہو کہ جہاں چھپ جانے کی وجہ سے ان فتنوں سے پناہ مل سکتی ہو تو وہاں جا کر چھپ جائے اور یا اگر کوئی آدمی اپنے سایۂ عاطف میں پناہ دینے والا مل سکتا ہو تو پاس جا کر پناہ گزیں ہو جائے۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

اور مسلمؒ کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ (جب) کوئی فتنہ ظاہر ہوگا تو اس فتنہ میں سونے والا شخص (جو اس فتنہ سے غافل اور بے خبر ہو اور اس کے بارے میں اطلاعات نہ سنتا ہو) جاگنے والے (یعنی اس فتنہ کو جاننے اور اس کی خبر رکھنے والے سے بہتر ہوگا، جاگنے والا شخص (کہ خواہ وہ لیٹا ہوا ہو یا بیٹھا ہوا) کھڑا رہنے والے سے بہتر ہوگا اور اس فتنہ میں کھڑا ہونے والا شخص اس فتنہ میں سعی و کوشش کرنے والے سے بہتر ہوگا (یہاں سعی کا لفظ مشی یعنی چلنے والے کے معنی میں ہے، اور کسی چیز کی طرف چلنا، گویا اس چیز کے حق میں سعی و کوشش کرنے کے مترادف ہوتا ہے، صراح میں لکھا ہے کہ سعی کے معنی ہیں دوڑنا، جلدی کرنا، اور کسی چیز کے حق میں محنت و عمل کرنا پس اس فتنہ میں سعی کرنے والے سے مراد اس فتنہ میں مدد تعاون دینا اور اس کے حق میں سعی و کوشش کرنا، ہے) لہٰذا جو شخص اس فتنہ سے بھاگنے کا راستہ یا اس سے پناہ کی جگہ پائے تو اس کو چاہئے کہ وہاں جا کر پناہ حاصل کرلے۔"

تشریح: فتنہ میں بیٹھنے والا، کھڑے ہونے والے سے اس لئے بہتر ہوگا کہ کسی چیز کے پاس کھڑے (رہنے والا شخص اس چیز سے زیادہ قربت اور مناسبت رکھتا ہے، کہ وہ اس چیز کو دیکھتا بھی ہے اور سنتا بھی ہے جب کہ ادھر ادھر بیٹھا رہنے والا شخص اس چیز کو نہ دیکھتا ہے، نہ سنتا ہے لہٰذا فتنوں میں کھڑا رہنے والا شخص ان کو دیکھنے اور سننے کی وجہ سے کہ جن کو بیٹھا ہوا شخص نہیں دیکھے، سنے گا عذاب سے زیادہ قریب ہوگا! ہو سکتا ہے کہ اس جملہ میں "بیٹھنے والے شخص" سے مراد وہ شخص ہو جو اس زمانہ میں ظاہر ہونے والے فتنہ کا محرک نہ ہو بلکہ اس سے دور رہ کر اپنے مکان میں بیٹھا رہے اور باہر نہ نکلے "اور کھڑے ہونے والے" سے مراد وہ شخص ہو جس کے اندر اس فتنہ کے تعلق سے کوئی داعیہ اور تحریک تو ہو مگر فتنہ انگیزی میں متردد ہو۔

"جو شخص فتنوں کی طرف جھانکے گا الخ" کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان فتنوں کی طرف متوجہ ہوگا اور ان کے نزدیک جائے گا تو اس کی وہ توجہ اور نزدیکی اس کے ان فتنوں میں مبتلا ہو جانے کا باعث ہوگی، لہٰذا ان فتنوں کی برائیوں سے بچنے اور ان کے جال سے خلاصی پانے کی صورت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگی کہ ان فتنوں سے جتنا زیادہ دور رہنا ممکن ہو اتنا ہی زیادہ دور رہا جائے۔

(۷) وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهَا سَتَكُوْنُ فِتَنٌ اَلَا ثُمَّ تَكُوْنُ فِتَنٌ اَلَا ثُمَّ تَكُوْنُ فِتْنَةٌ اَلْقَاعِدُ خَيْرٌ مِّنَ الْمَاشِىْ فِيْهَا وَالْمَاشِىْ فِيْهَا خَيْرٌ مِّنَ السَّاعِىْ اِلَيْهَا اَلَا فَاِذَا وَقَعَتْ فَمَنْ كَانَ لَهٗ اِبِلٌ فَلْيَلْحَقْ بِاِبِلِهٖ وَمَنْ كَانَ لَهٗ غَنَمٌ فَلْيَلْحَقْ بِغَنَمِهٖ وَمَنْ كَانَتْ لَهٗ اَرْضٌ فَلْيَلْحَقْ بِاَرْضِهٖ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ مَنْ لَّمْ تَكُنْ لَهٗ اِبِلٌ وَلَا غَنَمٌ وَلَا اَرْضٌ قَالَ يَعْمِدُ اِلٰى سَيْفِهٖ فَيَدُقُّ عَلٰى حَدِّهٖ بِحَجَرٍ ثُمَّ لِيَنْجُ اِنِ اسْتَطَاعَ النَّجَاءَ اَللّٰهُمَّ هَلْ بَلَّغْتُ ثَلٰثًا فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ اِنْ اُكْرِهْتُ حَتّٰى يُنْطَلَقَ بِیْ اِلٰى اَحَدِ الصَّفَّيْنِ فَضَرَبَنِیْ رَجُلٌ بِسَيْفِهٖ اَوْ يَجِیْئُ سَهْمٌ فَيَقْتُلُنِیْ قَالَ يَبُوْءُ بِاِثْمِهٖ وَاِثْمِكَ وَيَكُوْنُ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عنقریب فتنوں کا ظہور ہوگا، یاد رکھو پھر فتنے پیدا ہوں گے اور یاد رکھو ان فتنوں میں سے ایک بہت بڑا فتنہ (یعنی مسلمانوں کی باہمی محاذ آرائی اور خونریزی کا حادثہ پیش آئے گا، اس فتنہ میں

بیٹھا ہوا شخص چلنے والے شخص سے بہتر ہوگا اور چلنے والا شخص اس فتنہ کی طرف دوڑنے والے شخص سے بہتر ہوگا۔ پس آگاہ رہو! جب وہ فتنہ پیش آئے تو جس شخص کے پاس (جنگل میں) اونٹ ہوں وہ اپنے اونٹوں کے پاس (جنگل میں) چلا جائے جس شخص کے بکریاں ہوں، وہ بکریوں کے پاس چلا جائے اور جس شخص کے پاس (اس فتنہ کی جگہ کہیں دور) کوئی زمین و مکان وغیرہ ہو وہ اپنی اس زمین پر یا اس مکان میں چلا جائے۔" (حاصل یہ کہ جس جگہ وہ فتنہ ظاہر ہو وہاں نہ ٹھہرے بلکہ اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں دور چلا جائے اور گوشۂ عافیت پکڑ لے یا اس فتنہ سے غیر متوجہ ہو کر اپنے کاروبار میں مشغول و منہمک ہو جائے) ایک شخص نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ۔ یارسول اللہ! مجھے یہ بتائیے کہ اگر کسی شخص کے پاس نہ اونٹ اور بکریاں ہوں اور نہ (کسی دوسری جگہ) کوئی زمین و مکان وغیرہ ہو (کہ جہاں وہ جاکر گوشۂ عافیت اختیار کرے اور اس فتنہ کی جگہ سے دور رہ سکے تو اس کو کیا کرنا چاہئے؟) حضور نے فرمایا۔ "اس کو چاہئے کہ وہ اپنی تلوار کی طرف متوجہ ہو اور اس کو پتھر پر مار کر توڑ ڈالے۔" (یعنی اس کے پاس جو بھی آلات حرب اور ہتھیار ہوں ان کو بے کار اور ناقابل استعمال بنا دے تاکہ اس کے دل میں جنگ و پیکار کا خیال ہی پیدا نہ ہو اور وہ مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کے اس فتنہ میں شریک ہی نہ ہو سکے! یہ حکم اس لئے ہے کہ جس لڑائی میں دونوں طرف سے مسلمان برسرپیکار ہوں اور ایک دوسرے کی خونریزی کر رہے ہوں، اس میں شریک نہیں ہونا چاہئے)۔ اور پھر اس شخص کو چاہئے کہ اگر وہ فتنہ کی جگہ سے بھاگ سکے تو جلد نکل بھاگے (تاکہ) وہ اس فتنہ کے اثرات سے محفوظ رہ سکے، (اس کے بعد آپ نے فرمایا) اے اللہ! میں نے تیرے احکام تیرے بندوں کو پہنچا دیئے۔ یہ الفاظ آپ ﷺ نے تین بار فرمائے! ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے یہ بتائیے کہ اگر مجھے مجبور کر کے (یعنی زور و زبردستی سے) لڑنے والے دونوں فریق میں سے کسی ایک فریق کی صف میں لے جایا جائے اور وہاں سے کسی شخص کی تلوار سے مارا جاؤں یا کسی کا تیر آکر مجھ کو لگے جو مجھے موت کی آغوش میں پہنچا دے (تو اس صورت میں قاتل اور مقتول کا کیا حکم ہوگا؟) آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تمہارا وہ قاتل اپنے اور تمہارے گناہ کے ساتھ لوٹے گا اور دوزخیوں میں شمار ہوگا۔" (مسلمؒ)

تشریح: علماء اسلام کے ہاں یہ ایک طویل بحث ہے کہ اگر افتراق و انتشار کا کوئی فتنہ ابھر آئے اور کچھ مسلمان دو فریق میں تقسیم ہو کر آپس میں جنگ و جدال کرنے لگیں تو اس وقت باقی مسلمانوں کا طرز عمل کیا ہونا چاہئے؟ اہل علم کی ایک جماعت کا یہ کہنا ہے کہ افتراق و انتشار اور مسلمانوں کی باہمی محاذ آرائی کی صورت میں کسی بھی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ قتل و قتال میں شریک ہو، بلکہ جب مسلمانوں کے دو فریق آپس میں جنگ و جدال کریں تو اس میں شامل ہونے سے احتراز کرنا اور دونوں فریق سے یکسوئی و غیر جانب داری اختیار کر کے گوشۂ عافیت پکڑنا واجب ہے۔ ان حضرات کی دلیل مذکورہ بالا ارشاد گرامی اور اس طرح کی دوسری احادیث ہیں، مشہور صحابی حضرت ابوبکرؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ کا مسلک بھی یہی تھا! حضرت ابن عمرؓ کا قول یہ ہے کہ خونریزی کی ابتدا خود نہیں کرنی چاہئے لیکن اگر کوئی خونریزی کرے تو اس کا دفیعہ کرنا لازم ہے۔ جمہور صحابہؓ اور تابعین کا مسلک یہ ہے اگر مسلمانوں میں باہمی پھوٹ پڑ جائے اور وہ ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو کر قتل و قتال کرنے لگیں تو اس فریق کی حمایت کرنی چاہئے جو حق و انصاف پر ہو اور جو فریق ظلم و ناانصافی کی راہ اختیار کئے ہوئے ہو یا مسلمانوں کے امام و سردار سے بغاوت کر کے ملی افتراق و انتشار کا سبب بن رہا ہو اس کے خلاف قتال کرنا چاہئے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو جائے گا اور بغاوت و سرکشی کرنے والوں کی ہمت افزائی ہوگی! اس مسلک کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا الخ۔ چنانچہ آیت کریمہ اس امر کو واضح طور پر ثابت کرتی ہے کہ جب مسلمانوں کے دو فریق باہمی قتل و قتال اور خونریزی میں مبتلا ہوں تو ان کے درمیان صلح و صفائی کرانی چاہئے، اور دونوں فریق کو اس فتنہ و انتشار سے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، لیکن اگر ان دونوں میں سے کوئی فریق دوسرے فریق کے تئیں حد سے تجاوز کرے اور اس فتنہ کو جاری رکھنے اور بھڑکانے میں مصروف رہے تو پھر اس فریق کے خلاف (کہ جو حد سے متجاوز اور فتنہ کو بھڑکانے کا باعث بن رہا ہو) تلوار اٹھانی چاہئے اور اس کے ساتھ قتال کرنا چاہئے تاکہ وہ راہ حق پر آجائے۔

"اپنے اور تمہارے گناہ کے ساتھ لوٹے گا" کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں، ایک تو یہ کہ اس شخص پر دو گناہ ہوں گے، ایک گناہ تو اس کے اس عمل کا کہ اس نے حقیقت میں تمہیں مارا، اور دوسرا تمہارا گناہ بایں اعتبار کہ اگر بالفرض تم اس کو مارتے اور اس کا گناہ تمہیں ہوتا تو گویا وہ گناہ بھی اس کے سر ڈال دیا جائے گا۔ پس ازراہ زجر و توبیخ اس امر کو واضح کیا گیا ہے کہ اس فتنہ میں کسی ایسے مسلمان کو قتل کرنے کا گناہ کہ جو اس جنگ سے بیزار ہو مگر مجبورًا اس میں شریک ہو گیا ہو الضاعف یعنی دو گناہوں کر سر پڑے گا۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس شخص پر دو گناہ ہوں گے، ایک گناہ تو اس بغض و عداوت کا کہ جو وہ مسلمانوں سے رکھتا تھا اور جس کے سبب تمہارا قتل ہوا، اور دوسرا گناہ تمہارے قتل کا جو اس سے سرزد ہوا۔

"اور وہ دوزخیوں میں شمار ہو گا" اس کے بعد دوسرا جملہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ۔ "اور تم جنتیوں میں سے ہو گے"، لیکن حضور ﷺ نے دوسرا جملہ ارشاد نہیں فرمایا کیونکہ مذکورہ پہلے جملہ سے یہ مفہوم خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔

(۸) وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُوْشِكُ اَنْ یَّکُوْنَ خَیْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمٌ یَّتْبَعُ بِھَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ یَفِرُّ بِدِیْنِہٖ مِنَ الْفِتَنِ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "عنقریب (ایسا زمانہ آنے والا ہے جب کہ) ایک مسلمان کے لئے اس کا بہترین مال بکریاں ہوں گی جن کو لے کر وہ پہاڑ پر بارش برسنے کی جگہ چلا جائے اور فتنوں سے بھاگ کر اپنا دامن بچالے۔" (بخاری)

تشریح: اس حدیث کا مطلب بھی یہ تلقین کرنا ہے کہ جب ایسے فتنے رونما ہوں جن سے مسلمانوں میں باہمی افتراق و انتشار اور جنگ و جدل کی وبا پھیل جائے اور ایسا ماحول پیدا ہو جائے جس میں دین کو بچانا مشکل ہو تو اس وقت نجات کی راہ یہی ہو گی کہ گوشۂ تنہائی اختیار کر لیا جائے اور جس قدر ممکن ہو سکے اپنے آپ کو دنیا والوں سے الگ تھلگ کر لے، چنانچہ فرمایا کہ ایسے میں سب سے بہتر صورت یہ ہو گی کہ ایک مسلمان بس چند بکریوں کا مالک ہو اور وہ ان بکریوں کو لے کر کہیں دور جنگل میں یا پہاڑ پر کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں کوئی چراگاہ اور پانی ملنے کا ذریعہ ہو، اور وہاں ان بکریوں کو چرا کر ان کے دودھ کی صورت میں بقدر بقاء حیات غذائی ضرورت پر قناعت کر کے اپنی زندگی کے دن گزارتا رہے، تاکہ نہ دنیا والوں کے ساتھ رہے اور نہ دین کو نقصان پہنچانے والے فتنوں میں مبتلا ہو۔

فتنوں کی پیش گوئی

(۹) وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَیْدٍ قَالَ اَشْرَفَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی اُطُمٍ مِنْ اٰطَامِ الْمَدِیْنَةِ فَقَالَ ھَلْ تَرَوْنَ مَا اَرٰی قَالُوْا لَا قَالَ فَاِنِّیْ لَاَرَی الْفِتَنَ تَقَعُ خِلَالَ بُیُوْتِکُمْ کَوَقْعِ الْمَطَرِ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت اسامہ ابن زیدؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ مدینہ کے ایک بلند مکان کی چھت) پر چڑھے اور پھر (صحابہ کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ "کیا تم اس چیز کو دیکھتے ہو جس کو میں دیکھ رہا ہوں"؟ صحابہؓ نے جواب دیا کہ نہیں! آپ نے فرمایا کہ حقیقت یہ ہے کہ میں ان فتنوں کو دیکھ رہا ہوں جو تمہارے گھروں پر اس طرح برس رہے ہیں جس طرح مینہ برستا ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: "اُطُم" پہاڑ کی چوٹی قلعہ اور بلند مکان کو کہتے ہیں اور "اٰطام" اس کی جمع ہے! یہاں اطام سے مراد مدینہ کے گرد واقع وہ فلک بوس مکانات اور قلعے ہیں جن میں وہاں کے یہودی رہا کرتے تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ ایک دن انہی قلعوں میں سے ایک قلعہ کی چھت پر تشریف لے گئے اور پھر مذکورہ بالا حدیث ارشاد فرمائی۔

"میں ان فتنوں کو دیکھ رہا ہوں الخ" کی وضاحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گویا اپنے نبی ﷺ کو اس وقت جب کہ وہ قلعہ کی چھت پر چڑھے، فتنوں کا قریب ہونا دکھایا تاکہ وہ ان فتنوں کے بارے میں آگاہ کر دیں اور لوگ یہ جان کر کہ ان فتنوں کا نازل ہونا مقدر ہو چکا ہے، ان سے بچنے کے طریقے اختیار کر لیں، اور اس بات کو آنحضرت ﷺ کے معجزات میں سے شمار کریں کہ آپ نے جو پیش گوئی فرمائی تھی وہ

بالکل صحیح ثابت ہوئی۔

ایک خاص پیش گوئی

⑩ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلَكَةُ اُمَّتِیْ عَلٰى يَدَیْ غِلْمَةٍ مِّنْ قُرَيْشٍ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میری اُمت کی ہلاکت قریش کے چند نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہے۔" (بخاری)

تشریح: اس حدیث میں "امت" سے مراد صحابہ کرام اور اہل بیت نبی ﷺ ہیں جو اُمت کے سب سے بہتر وافضل افراد تھے! اور لفظ "غِلْمَة" غلام کی جمع ہے جس کے معنی نوجوان کے ہیں اور صراح میں لکھا ہے کہ غلام کے معنی لڑکے کے ہیں! نیز واضح رہے کہ غلام کا لفظ اصل میں غلم اور اغتلام سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں شہوت کا جوش وغلبہ! بہرحال یہاں "غلمة" (نوجوانوں) سے مراد وہ چھوٹی عمر کے نوجوان ہیں، جو غیر سنجیدہ اور بیباک ہوتے ہیں، بڑوں، بزرگوں کا اداب واحترام نہیں کرتے اور اہل علم ودانش اور باوقار لوگوں کی عظمت کو ملحوظ نہیں رکھتے) پس آنحضرت نے اس ارشاد گرامی میں قریش کے جن نوجوانوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے ان سے، قریش سے نسلی تعلق رکھنے والے دین وملت کے وہ بدخواہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے جاہ (سلطنت اور ذاتی اغراض حاصل کرنے کے لئے حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو شہید کیا اور ان کی ہلاکت کا باعث بنے یا جنہوں نے اس وقت ملت میں افتراق وانتشار اور ظلم وبغاوت کا فتنہ پیدا کیا! نیز مجمع البحار میں لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ آنحضرت کے اس ارشاد گرامی کی روشنی میں ان لوگوں کو تعیّن وتشخص کے ساتھ جانتے تھے لیکن اس حدیث کو بیان کرتے وقت، فتنہ وشر انگیزی کے خوف سے ان لوگوں کے نام ظاہر نہیں فرماتے تھے اور وہ لوگ بنی امیہ کے عبداللہ ابن زیاد اور ان جیسے دوسرے نوجوان، حجاج ابن یوسف جو عبدالملک ابن مروان کا امیر الامراء بنا سلیمان ابن عبدالملک جیسے نوخیز اور ان کی اولاد میں سے دوسرے افراد تھے جنہوں نے اس حد تک فتنہ وفساد کا بازار گرم کیا کہ اہل بیت نبوی ﷺ کو بے پناہ مظالم کا شکار بننا اور جام شہادت نوش کرنا پڑا بڑے اونچے درجہ کے مہاجر اور انصار، صحابہؓ کرام کو بڑی مظلومیت کے ساتھ اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا اور ایسی ایسی خونریزیاں ہوئیں اور جان ومال کا اس قدر نقصان ہوا کہ زمین وآسمان کانپ گئے، چنانچہ ان لوگوں کے وہ سیاہ کارنامے تاریخ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

⑪ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَقَارَبُ الزَّمَانُ وَيُقْبَضُ الْعِلْمُ وَتَظْهَرُ الْفِتَنُ وَيُلْقَى الشُّحُّ وَيَكْثُرُ الْهَرْجُ قَالُوْا وَمَا الْهَرْجُ قَالَ الْقَتْلُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ (وہ وقت بھی آنے والا ہے جب) زمانے ایک دوسرے کے قریب ہوں گے، علم اٹھالیا جائے گا، فتنے پھوٹ پڑیں گے بخل ڈالا جائے گا اور ہرج زیادہ ہوگا۔" صحابہؓ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ "ہرج" کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا قتل۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: "زمانے ایک دوسرے کے قریب ہوں گے۔" کا مطلب یا تو یہ ہے کہ اس وقت دنیا کا زمانہ اور آخرت کا زمانہ ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں گے، اس صورت میں قیامت کا قریب ہونا مراد ہوگا! یا اس جملہ سے مراد زمانہ والوں میں سے بعض کا بعض کے ساتھ برائی اور بدی کے تعلق سے قریب ہونا ہے۔ یعنی اس زمانہ میں جو برے اور بدکار لوگ ہوں گے وہ ایک دوسرے کے قریب ونزدیک آجائیں گے، یا یہ مطلب ہے کہ خود زمانہ کے اجزاء بدی وبرائی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب اور مشابہ ہوں گے یعنی ایک زمانہ برائی اور بدی کا ماحول لئے ہوئے آئے گا اور اس کے بعد پھر دوسرا زمانہ بھی اسی طرح آئے گا، یا یہ مطلب ہے کہ ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں حکومتیں دیرپا نہیں ہوں گی اور مختلف انقلابات اور عوامل بہت مختصر مختصر عرصہ میں حکومتوں کو بدلتے رہیں گے! اور بعض

حضرات نے یہ مطلب بیان کیا کہ آخر میں جو زمانہ آئے گا اس میں لوگوں کی عمریں بہت چھوٹی چھوٹی ہوں گی، اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ جملہ دراصل گناہوں کے سبب زمانہ سے برکت کے ختم ہو جانے سے کنایہ ہو، یعنی آخر زمانہ میں جب کہ گناہوں کی کثرت ہو جائے گی۔ لوگ دین و شریعت کے تقاضوں اور خدا و آخرت کے خوف سے بے پرواہ ہو کر عیش و عشرت اور راحت و غفلت میں پڑ جائیں گے تو زمانہ میں سے برکت نکل جائے گی اور اس کے شب و روز کی گردش اتنی تیز اور دن و رات کی مدت اتنی مختصر محسوس ہونے لگے گی کہ سالوں پہلے گزرا ہوا کوئی واقعہ کل کی بات معلوم ہوگا اور ہر "وقت کی کمی" کا شکوہ سنج نظر آئے گا۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ آخر زمانہ میں وقت اس طرح جلدی گزرے گا کہ ایک سال ایک مہینے کے برابر اور ایک مہینہ ایک ہفتہ کے برابر اور ایک ہفتہ ایک دن کے برابر معلوم ہوگا۔

"علم اٹھا لیا جائے گا۔" کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں مخلص، باعمل اور حقیقی علم کے حامل علماء اٹھا لئے جائیں گے اور اس طرح حقیقی علم مفقود ہو جائے گا نیز مختلف علمی فتنوں کا اندھیرا اس طرح پھیل جائے گا کہ علماء سوء کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہوگا، اور ہر طرف ایسا محسوس ہوگا جیسے علم کا چراغ گل ہو گیا ہے اور جہالت و نادانی کی تاریکی طاری ہو گئی ہے۔

"بخل ڈالا جائے گا" مطلب یہ ہے کہ آخر زمانہ میں لوگوں میں بخل کی خصلت نہایت پختہ ہو جائے گی اور یہ چیز (یعنی بخل کی برائی) ایک عام وبا کی طرح پھیل جائے گی، نیز لوگ اس بخل کے یہاں تک تابع ہو جائیں گے کہ صنعت و حرفت والے اپنی صنعتی اشیاء کو بنانے اور پیدا کرنے میں بخل و تنگی کرنے لگیں گے اور مال کی تجارت و لین دین کرنے والے لوگ اپنے مال کو چھپا کر بیٹھ جائیں گے یہاں تک کہ ضروری اشیاء کو بھی فراہم کرنے اور دینے سے انکار کرنے لگیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ "بخل ڈالا جائے گا" سے لوگوں میں اصل بخل کا پایا جانا مراد نہیں ہے کیونکہ اصل بخل تو انسان کی جبلت میں پڑا ہوا ہے اور اس اعتبار سے یہ بات پہلے زمانہ کے لوگوں کے بارے میں بھی نہیں کی جا سکتی کہ ان میں سرے سے بخل کا وجود نہیں تھا! لیکن اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ نہیں کیا جا سکتا چونکہ اصل بخل انسان کی جبلت میں پڑا ہوا ہے اس لئے کوئی بھی شخص نہ پہلے زمانوں میں اس خصلت سے کلیۃً محفوظ رکھ سکتا ہے اور جیسا کہ اس آیت و من یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون سے واضح ہوتا ہے، ایسے پاک نفس انسان سے پہلے بھی گزرے ہیں اب بھی موجود ہیں اور آئندہ بھی موجود رہیں گے، یہ اور بات ہے کہ زمانہ کے اثرات کی وجہ سے ایسے پاک نفسوں کی تعداد ہر آنے والے زمانہ میں پہلے زمانوں سے کم ہوتی جائے۔

"ہرج" کے معنی ہیں فتنہ اور خرابی میں پڑنا! اور جیسا کہ قاموس میں لکھا ہے، جب یہ کہا جاتا ہے کہ ھرج النَّاسَ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ لوگ فتنے میں پڑ گئے اور قتل و اختلاط یعنی خونریزی اور کاموں کے خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے اچھے برے کی تمیز نہ کر سکنے کی آفت میں مبتلا ہو گئے! پس اس ارشاد گرامی "ہرج" سے مراد خاص طور پر وہ قتل و خونریزی ہے جو مسلمانوں کے باہمی افتراق و انتشار کے فتنہ کی صورت میں اور اچھے برے کاموں کی تمیز مفقود ہونے کی وجہ سے پھیل جائے۔

فتنوں کی شدت کی انتہا

(۱۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا تَذْهَبُ الدُّنْيَا حَتّٰى يَاْتِيَ عَلَى النَّاسِ يَوْمٌ لَا يَدْرِي الْقَاتِلُ فِيْمَ قَتَلَ وَلَا الْمَقْتُوْلُ فِيْمَ قُتِلَ فَقِيْلَ كَيْفَ يَكُوْنُ ذٰلِكَ قَالَ الْهَرَجُ الْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ فِي النَّارِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، (پوری دنیا اس وقت تک فنا نہیں ہوگی جب تک لوگوں پر ایسا دن (یعنی بدامنی و انتشار فتنہ و فساد کی شدت انتہا سے بھرا ہوا وہ دور) نہ آ جائے جس میں نہ قاتل کو یہ معلوم ہوگا کہ اس نے مقتول) کو کیوں قتل کیا اور نہ مقتول (یا اس کے ورثاء و متعلقین) کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کو کیوں قتل کیا گیا۔" پوچھا گیا کہ یہ کیونکر ہوگا (یعنی اس کی وجہ کیا ہوگی کہ قتل کا سبب نہ قاتل کو معلوم ہوگا نہ مقتول کو") آپ ﷺ نے فرمایا۔ "ہرج کے

سبب، نیز قاتل و مقتول دونوں دوزخ میں جائیں گے۔" (مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں لوگوں کے دل و دماغ سے فتنہ و فساد اور قتل و غارت گری کی برائی کا احساس اس طرح ختم ہو جائے گا کہ نہ تو قاتل بتا سکے گا کہ اس نے مقتول کا خون کس مقصد سے بہایا ہے اور نہ مقتول اور اس کے ورثاء و متعلقین کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کی جان کس دنیاوی غرض و مقصد کے تحت یا کس شرعی وجہ کی بناء پر ماری گئی ہے، ایسا اندھیرا پھیل جائے گا کہ بس شکوک و شبہات اور ذرا ذرا سے واہموں پر انسان کا قیمتی خون بے دریغ بہایا جانے لگے گا اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوگی کہ کون شخص حق پر ہے اور کون باطل پر، بلا تشخیص و تمیز جو جس کو چاہے گا گھاٹ اتار دے گا۔ موجودہ زمانے کے حالات کو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ مذکورہ صورت حال کا ظہور نہیں ہو گیا ہے۔

"ہرج کے سبب سے" کا مطلب یہ ہے کہ اس اندھے قتل و غارت گری کا باعث جہالت و نادانی کی وہ تاریکی ہوگی جو پورے ماحول کو فتنہ و فساد اور بدامنی سے بھر دے گی، شرارت پسندوں اور بلوائیوں کا عروج ہوگا، اخلاقی و سرکاری قوانین کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی۔ اچھے برے کاموں کی تمیز مٹ جائے گی، حق و باطل باہم خلط ملط ہو جائیں گے اور دل و دماغ سے انسانی خون کی حرمت کا احساس مٹ جائے گا۔

"دونوں دوزخ میں جائیں گے" سے یہ واضح ہوا کہ نیت کا فتور اس قدر عام ہو جائے گا کہ بظاہر مقتول اور مظلوم نظر آنے والا شخص بھی اپنے اندر ظلم و طغیان کا فتنہ چھپائے رہا ہوگا۔ اس کا مقتول و مظلوم ہونا اس وجہ سے نہیں ہوگا کہ وہ واقعۃً کسی ظالمانہ قتل کا شکار ہوا ہے بلکہ اس اعتبار سے ہوگا کہ وہ موقع پر چوک گیا اور خود وار کرنے سے پہلے دوسرے کے وار کرنے کا شکار ہو گیا۔ چنانچہ مذکورہ جملے کا مطلب یہ ہے کہ قاتل تو دوزخ میں اس لئے جائے گا کہ وہ واقعۃً قتل عمد کا گناہگار ہوا ہے اور مقتول اس وجہ سے دوزخ میں جائے گا کہ وہ خود بھی اس (قاتل) کو قتل کرنا چاہتا تھا اور اس کو تباہ و ہلاک کرنے کی خواہش اور ارادہ رکھتا تھا، اور چونکہ آدمی کسی گناہ کا عزم رکھنے کی وجہ سے بھی ماخوذ ہوتا ہے اس لئے اس کو بھی دوزخ کا مستوجب قرار دیا جائے گا، لیکن واضح رہے کہ یہ حکم جہالت کے طاری ہونے اور حق و باطل کے درمیان تمیز مفقود ہونے کی صورت کا ہے، ہاں اگر اس مقتول کی مذکورہ نیت و ارادہ کا تعلق جہالت و نادانی اور عدم تمیز سے نہ ہو بلکہ اس بات سے ہو کہ وہ بسبب اشتباہ، خطاء اجتہادی میں پڑ گیا ہو تو اس پر مذکورہ حکم کا اطلاق نہیں ہوگا! اس کی وضاحت یہ ہے کہ وہ (مقتول) اپنے قاتل کے تئیں جو عداوت و نفرت رکھے ہوئے تھا اور اس کو قتل کے ساتھ مقتول بھی مستوجب عذاب ہوگا لیکن اگر وہ (مقتول) اس جہالت و نادانی کی بنا پر نہیں بلکہ وہ از روئے دین و دیانت اس شخص یعنی قاتل کو قتل کرنے کا عزم رکھتا تھا۔ نیز اس عزم تک وہ دین و شریعت کے اپنے علم کی روشنی میں غور و فکر کرنے کے بعد اور نیت کے اخلاص کے ساتھ پہنچا تھا اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے اس عزم تک اس کا پہنچنا غیر صحیح کیوں نہ ہو، اس کو محض اس عزم کی وجہ سے مستوجب عذاب قرار نہیں دیا جائے گا کیونکہ اجتہاد اور صحیح نتیجے تک پہنچنے کی کوشش میں خطا کر جانے والا شخص عند اللہ ماخوذ قرآن میں دیا جاتا، واضح رہے کہ مذکورہ ارشاد گرامی اس مشہور اور صحیح مسلک کی دلیل ہے کہ جو شخص کسی گناہ کی نیت کرے اور اس نیت پر قائم رہے تو وہ گنہگار ہی کے حکم میں ہوگا، اگرچہ وہ اپنے اعضاء اور زبان سے عملی طور پر اس گناہ کا ارتکاب نہ کرے۔

پر فتن ماحول میں دین پر قائم رہنے والے کی فضیلت

(۱۳) وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِبَادَةُ فِي الْهَرْجِ كَهِجْرَةٍ إِلَيَّ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت معقل ابن یسار کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا" فتنے کے زمانہ میں (اور مسلمانوں کے باہمی محاذ آرائی اور قتل و قتال کے وقت پوری استقامت اور مداومت کے ساتھ دین پر قائم رہنے اور) عبادت و نیکی کرنے کا ثواب، میری طرف ہجرت کرنے کے ثواب

کی مانند ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ زمانہ نبوی میں فتح مکہ سے پہلے، دار الحرب سے ہجرت کر کے مدینہ آجانے اور آنحضرت ﷺ کی رفاقت وصحبت کا شرف رکھنے والے کو جو عظیم ثواب ملتا تھا اسی طرح کا عظیم ثواب اس شخص کو بھی ملے گا جو فتنہ وفساد کی جہالت وتاریکی سے اپنے کو محفوظ رکھ کر اور مسلمانوں کی باہمی محاذ آرائی سے اپنا دامن بچا کر مولےٰ کی عبادت میں مشغول اور اپنے دین پر قائم رہے۔

مظالم پر صبر کرو اور یہ جانو کہ آنے والا زمانہ موجودہ دور سے بھی بدتر ہوگا

(۱۴) وَعَنِ الزُّبَيْرِ بْنِ عَدِيٍّ اَتَيْنَا اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ فَشَكَوْنَا اِلَيْهِ مَانَلْقٰى مِنَ الْحَجَّاجِ فَقَالَ اصْبِرُوْا فَاِنَّهُ لَايَاتِیْ عَلَيْكُمْ زَمَانٌ اِلَّا الَّذِیْ بَعْدَهُ اَشَرُّ مِنْهُ حَتّٰى تَلْقَوْا رَبَّكُمْ سَمِعْتُهُ مِنْ نَبِيِّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت زبیر ابن عدیؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم لوگ حضرت انس ابن مالکؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے حجاج ابن یوسف کے مظالم اور ایذاء رسانیوں کی شکایت کی، انہوں نے فرمایا کہ صبر کرو اور ضبط وتحمل سے کام' کیونکہ آئندہ جو بھی زمانہ آئے گا وہ گزشتہ زمانے سے بدتر ہوگا (پس تمہیں کیا معلوم کہ آنے والے زمانے میں کیسے کیسے حکمراں وعمال ہوں جو شاید حجاج سے بھی زیادہ ظالم وجابر ثابت ہوں، اس لئے تم حجاج کے مظالم اور ایذاء رسانیوں پر صبر کرو، یہاں تک تم (روز آخرت) اپنے پروردگار سے ملاقات کرو (اور پھر تم دیکھنا کہ تمہارا پروردگار تمہارے ظالموں کو کس طرح عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ بات میں نے تمہارے پیغمبر ﷺ سے سنی ہے۔" (بخاریؒ)

تشریح: اس حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ہر آنے والا زمانہ گزشتہ زمانہ سے بدتر ہوگا، تو اس پر اس صورت میں اشکال واقع ہوگا جب کہ "آنے والے زمانہ" سے مراد بلا استثناء ہر آنے والا زمانہ ہو، اور اشکال یہ واقع ہوگا کہ حجاج ابن یوسف کے زمانہ کے بعد حضرت عمر ابن عبد العزیز کا زمانہ آیا، یا بعد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدیؓ کا زمانہ آئے گا تو کیا ان زمانوں پر بھی مذکورہ بات کا اطلاق ہوگا اور بلا استثناء یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہر آنے والا زمانہ حجاج کے زمانہ سے بھی بدتر ہوگا، ہاں اگر یہ بات استثناء کے ساتھ فرمائی گئی ہے تو پھر اشکال پیدا ہوگا، چنانچہ شارحین حدیث نے وضاحت کی ہے کہ آنے والے زمانوں کے بدتر ہونے کی خبر دینا اکثر واغلب کے اعتبار سے ہے، یعنی آنے والے زمانوں میں اکثر وغالب زمانے ایسے ہی ہوں گے جو پچھلے زمانہ سے بدتر ماحول میں سے بھرئے ہوں گے، نیز آنے والے زمانہ سے مراد حجاج کے زمانہ سے زمانہ دجال تک کے زمانے ہیں جن میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدیؓ کے زمانے مستثنیٰ ہیں، علاوہ ازیں اس حدیث کا اصل مقصود امت کے لوگوں کو تسلی دینا، ظلم وجور پر صبر کرنے کی تلقین کرنا، آنے والے زمانوں کے بارے میں باخبر کرنا، اور اس بات کی طرف راغب کرنا ہے کہ اپنے زمانہ کو غنیمت جان کر زیادہ سے زیادہ آخروی فائدے حاصل کرنے میں مشغول رہو، کیا خبر کہ آنے والے زمانوں میں کسی کو اتنا بھی موقع مل سکے یا نہیں۔

بعض حضرات نے اس وضاحت کو زیادہ مناسب کہا ہے کہ آنے والے زمانوں کے بارے میں جہاں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ تو مستثنیٰ ہے، باقی تمام زمانے، کسی نہ کسی اعتبار سے، کسی نہ کسی جگہ کے حالات کے مطابق اور کسی نہ کسی معاملہ میں ازروئے علم وعمل اور استقامت واخلاص دین پہلے زمانے سے بدتر ہی حالت کے حامل رہے ہیں یا حامل رہیں گے اور آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک سے بعد و دوری کا تقاضا بھی ہے کہ زمانہ جوں جوں آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک سے دور ہوتا جاتا ہے، اسی اعتبار سے بدی اور خرابی بڑھتی جاتی ہے، اور اس کا سلسلہ ذات رسالت ﷺ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا چنانچہ صحابہؓ تک نے، اپنی صفائی باطن اور پاکیزگی ونفس کے باوجود، آنحضرت ﷺ کو تدفین کے بعد اپنے قلوب کی حالت وکیفیت میں تبدیلی محسوس کی تھی۔ پہلے کے بعض بزرگوں کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ پہلے کسی وقت دل میں گناہ کا خیال پیدا ہو گیا اور

پھر وہ خیال جاتا رہا تو کہیں کافی مدت کے بعد جب وہی خیال پھر دوبارہ آیا تو اب آسانی کے ساتھ دفع ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ بہت غور کرنے کے بعد اس فرق کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ ظلمت، زمانہ نبوت کے نور سے اور زیادہ بعد زمانی ہوجانے کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے کیونکہ زمانہ نبوت کو گزرے جتنا زیادہ عرصہ ہوتا جاتا ہے برائی کی ظلمت اسی اعتبار سے زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

حضور ﷺ نے قیامت تک پیدا ہونے والے اس اُمت کے فتنہ پردازوں کے بارے میں خبر دے دی تھی

⑭ عَنْ حُذَیْفَةَ قَالَ وَاللّٰہِ مَا اَدْرِیْ اَنَسِیَ اَصْحَابِیْ اَمْ تَنَاسَوْا وَاللّٰہِ مَاتَرَکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ قَائِدِ فِتْنَةٍ اِلٰی اَنْ تَنْقَضِیَ الدُّنْیَا یَبْلُغُ مَنْ مَّعَهٗ ثَلٰثَمِائَةٍ فَصَاعِدًا اِلَّا قَدْ سَمَّاهُ لَنَا بِاِسْمِهٖ وَاِسْمِ اَبِیْهِ وَاِسْمِ قَبِیْلَتِهٖ۔
(رواہ ابوداؤد)

"حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے نہیں معلوم کہ میرے یہ رفقاء (یعنی صحابہ کرامؓ) بھول گئے ہیں یا وہ بھولے تو نہیں ہیں مگر اپنی بعض مصلحتوں کی وجہ سے ایسا ظاہر کرتے ہیں جیسے وہ بھول گئے ہیں، خدا کی قسم، رسول کریم ﷺ نے کسی بھی ایسے فتنہ پردازوں کو ذکر کرنے سے نہیں چھوڑا تھا جو دنیا کے ختم ہونے تک پیدا ہونے والا ہے اور جس کے تابعداروں کی تعداد تین سو تک یا تین سو سے زائد تک ہوگی، آپ ﷺ نے ہر فتنہ پرداز کا ذکر کرتے وقت ہمیں اس کا اور اس کے باپ کا اور اس کے قبیلے تک کا نام بتایا تھا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "فتنہ پرداز" سے مراد وہ شخص ہے جو فتنہ و فساد اور تباہی و خرابی کا باعث ہو، جیسے وہ عالم جو دین میں بدعت پیدا کرے دین کے نام پر مسلمانوں کو آپس میں لڑائے، اُمت میں افتراق و انتشار پیدا کر کے اسلام کی شوکت کو مجروح کرے اور جیسے وہ ظالم بادشاہ و امیر جو مسلمانوں کے باہمی قتل و قتال کا باعث ہو۔

"تین سو" کے عدد کی قید بظاہر اس لئے لگائی گئی ہے کہ کم سے کم اتنی تعداد میں آدمیوں کا کسی فتنہ پرداز کے گرد جمع ہوجانا اس فتنہ پرداز کی فتنہ پردازیوں کو پھیلانے، فتنہ و فساد کی کاروائیوں کو اثر انداز ہوجانے اور دین و ملت کو نقصان پہنچ جانے کے لئے عام طور پر کافی ہوجاتا ہے، اگر کسی فتنہ پرداز کے تابعداروں کی تعداد اس سے کم ہوتی ہے تو گو وہ انفرادی اور جزوی طور پر فتنہ پردازی میں کامیاب ہوجائے مگر اجتماعی طور پر اثر انداز ہونے کے قابل نہیں ہوتا۔

گمراہ کرنے والے قائد

⑮ وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا اَخَافُ عَلٰی اُمَّتِی الْاَئِمَّةَ الْمُضِلِّیْنَ وَاِذَا وُضِعَ السَّیْفُ فِیْ اُمَّتِیْ لَمْ یُرْفَعْ عَنْهُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت ثوبان کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی اُمت کے حق میں جن لوگوں سے زیادہ ڈرتا ہوں وہ گمراہ کرنے والے امام ہیں، (یاد رکھو) جب میری اُمت میں تلوار چل پڑے گی تو پھر قیامت تک نہیں رکے گی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "ائمہ" اصل میں امام کی جمع ہے اور امام قوم و جماعت کے سردار، پیشوا اور اس شخص کو کہتے ہیں جو لوگوں کو اپنے قول یا فعل یا عقیدے کی اتباع کی طرف بلائے! پس اس ارشاد کا مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی اور ملی حیثیت نیز ان کے دین کو سب سے

زیادہ نقصان پہنچانے والی اور تباہی کی طرف لے جانے والی جو چیز ہے وہ مسلمانوں کی قیادت و رہبری اور پیشوائی کرنے والے لوگوں کا گمراہ ہونا ہے کیونکہ انفرادی حیثیت میں کسی بھی شخص کے گمراہ ہونے کا نقصان اسی کی ذات تک محدود رہتا ہے لیکن قائد و پیشوا کی گمراہی کا نقصان و ضرر پوری قوم و جماعت کو متاثر کرتا ہے۔

"جب میری اُمت میں تلوار چل پڑے گی الخ" کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک دوسرے کے خلاف تلوار و طاقت آزمائی کی سیاست کی ابتداء ہو جائے گی اور باہمی مسائل و معاملات کو افہام و تفہیم اور دین و دیانت کی روشنی میں حل کرنے کی بجائے تشدد و خونریزی کے راستے کو اختیار کر لیا جائے گا تو پھر طاقت آزمائی اور تشدد و خونریزی کا وہ فتنہ قیامت تک ٹھنڈا نہیں ہوگا اور مسلمان کہیں نہ کہیں ایک دوسرے کے خلاف لڑتے رہیں گے۔ واضح رہے کہ حضور ﷺ نے اس ارشاد گرامی کے ذریعے اُمت میں خونریزی کی ابتداء ہو جانے کے جس خوف کی طرف اشارہ فرمایا تھا اس کا مصداق امیر المؤمنین حضرت عثمان غنیؓ کے واقعہ شہادت کی صورت میں سامنے آیا، چنانچہ اسلام میں سب سے پہلے مسلمان نے مسلمان کے خلاف جو تلوار اٹھائی اور خون بہایا وہ حضرت عثمانؓ کی شہادت ہے! اور پھر ان کے سانحہ شہادت کے بعد مسلمانوں میں باہمی خونریزی کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ آج تک باقی ہے جیسا کہ مخبر صادق ﷺ نے خبر دی ہے مسلمانوں کی بدقسمتی سے یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

خلافت راشدہ کی مدت کے بارے میں پیشگوئی

(۱۶) وَعَنْ سَفِيْنَةَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَلْخِلَافَةُ ثَلٰثُوْنَ سَنَةً ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا ثُمَّ يَقُوْلُ سَفِيْنَةُ اَمْسِكْ خِلَافَةَ اَبِيْ بَكْرٍ سَنَتَيْنِ وَخِلَافَةَ عُمَرَ عَشْرَةً وَعُثْمَانَ اِثْنَتَيْ عَشْرَةَ وَعَلِيٍّ سِتَّةً۔ (رواہ احمد والترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت سفینہؓ (جو آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے) کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ "خلافت کا زمانہ تیس سال کا ہوگا، اس کے بعد وہ خلافت بادشاہت میں بدل جائے گی"۔ حضرت سفینہ نے (یہ حدیث بیان کرنے کے بعد راوی سے یا عام لوگوں کو خطاب کر کے) کہا کہ حساب کر کے دیکھو (حضور ﷺ نے جو تیس سال کی مدت بیان فرمائی ہے وہ اس طرح ہوتی ہے کہ) حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا زمانہ دو سال، حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ دس سال، حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ بارہ سال اور حضرت علیؓ کی خلافت کا زمانہ چھ سال۔" (احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "خلافت" سے مراد خلافت حق ہے، یا وہ خلافت مراد ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک پسندیدہ اور جس کی بنیاد قرآن و سُنّت کی ہدایت اور رہنمائی اور دین و شریعت کے آئین حکمرانی کی اتباع پر ہو! چنانچہ اس خلافت کا صحیح مصداق حضور ﷺ کے بعد اول کی خلافت ہے جس کو "خلافت راشدہ" کہا جاتا ہے اور جس کی مدت تیس ہوئی ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ نے اپنی شرح مشکوۃ میں اس روایت کو نقل کرتے ہوئے "مُلْكًا" کے بعد "عَضُوْضًا" کا لفظ بھی نقل کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ خلافت کٹ کھنی بادشاہت میں بدل جائے گی، یعنی خلافت کا دور ختم ہو جانے کے بعد بادشاہت کا دور شروع ہو جائے گا اور بادشاہت بھی ایسی کہ لوگ اس کی سختیوں اور ظالمانہ کاروائیوں سے امن نہیں پائیں گے اور عدل و انصاف کا نظام اور دین پروری کا ماحول جیسا کہ ہونا چاہئے، جاری نہیں ہوگا، یہ اور بات ہے کہ اس دور کے حکمران گزرے ہوئے خلفاء کی جانشینی کا دعویٰ رکھنے کی وجہ سے اور مجازاً اس بادشاہت پر "خلافت" ہی کا اطلاق کریں اور اپنے کو خلیفہ کہلائیں اور گو ان کو امیر المؤمنین کہنا کوئی خلاف حقیقت بات بھی نہ ہو کیونکہ نظم مملکت اور ظاہری قانون کے مطابق وہ مسلمانوں کے امیر و حاکم بہرحال ہوں گے لیکن حقیقی خلافت کہ جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بس تیس سال تک رہے گی، چنانچہ خلفاء راشدین کہ جن کا دور خلافت حقیقی خلافت کا واقعی مصداق تھا، تیس ہی سال پر مشتمل ہے۔

شرح عقائد میں اس حدیث کے تعلق سے ایک اشکال وارد کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ حضور ﷺ نے "خلافت" کا دور صرف تیس سال فرمایا ہے جب کہ خلفاء راشدین کے بعد کے زمانے میں خلفاء عباسیہ بلکہ بنو امیہ میں سے بھی بعض خلفاء جیسے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت پر مسلمانوں کے تقریباً تمام ہی علماء اور اہل عمل وعقد کا اتفاق رہا ہے تو کیا ان کے دور خلافت کو "خلافت" نہیں کہا جاسکتا اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جس "خلافت" کی طرف اشارہ فرمایا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ خلافت کاملہ کہ جس میں دین وشریعت اور عدل وانصاف کے ذرا سی بھی آمیزش نہ ہو، تیس سال رہے گی، اس کے بعد کی خلافت کی شکل وصورت میں تبدیلی آجائے گی، ہاں کچھ دور ایسے بھی آئیں گے جس میں اس خلافت کے طرز کو اختیار کیا جائے گا ورنہ عام طور پر جو بھی خلافت قائم ہوگی وہ بس نام ہی کی خلافت ہوگی، اصل کے اعتبار سے بادشاہت ہوگی! واضح رہے کہ خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کا دور حکمرانی شروع ہوا جس کو انہوں نے اگرچہ "خلافت" ہی کا نام دیا مگر حقیقت میں وہ بادشاہت تھی، حضرت امیر معاویہؓ اس دور کے سب سے پہلے حکمران ہیں ان کا دور حکمرانی اگرچہ خلافت راشدہ کی طرح دین وملت کے حق میں حقیقی خلافت کا نمونہ نہیں رہا مگر ان کی خلافت وحکومت میں بادشاہت کی وہ تمام خرابیاں بھی نہیں تھیں جو ان کے جانشینوں کے دور حکومت میں پیدا ہوئیں نیز انہوں نے اپنے دور حکمرانی کو کسی نہ کسی حد تک خلافت راشدہ کے نہج پر رکھنے کی کوشش کی، لیکن ان کے بعد بنو امیہ کا اکثر دور حکمرانی مسلمانوں کی باہمی آویزش وخلفشار قتل وغارت گری، دین وشریعت کی صریح خلاف ورزی اور ظلم وناانصافی کی بہت زیادہ مثالوں سے بھرا ہوا تھا، اس دور کی ابتداء یزید ابن معاویہؓ سے ہوتی ہے، یزید کے بعد اس کا بیٹا، معاویہ ابن یزید حکمراں ہوا، اس کے بعد ولید ابن عبدالمالک، سلیمان ابن عبدالمالک، حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ، یزید ابن عبدالمالک، ہشام ابن عبدالمالک، ولید ابن یزید ابن عبدالمالک، ابراہیم ابن ولید ابن عبدالملک اور مروان ابن محمد ابن مروان بالترتیب یکے بعد دیگرے خلیفہ وحکمراں ہوتے رہے مروان ابن محمد ابن مروان، بنو امیہ میں سے آخری حکمراں تھا، اس کے بعد خلافت بنو امیہ سے نکل کر بنو عباس میں پہنچ گئی۔

حدیث کے راوی حضرت سفینہؓ نے تیس سال کا جو حساب بیان کیا ہے وہ تخمیناً ہے اور اس بات پر مبنی ہے کہ انہوں نے کسور کو بیان نہیں کیا، چنانچہ صحیح روایات اور مستند تاریخی کتابوں میں خلافت راشدہ کی تیس سالہ مدت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا زمانہ دو سال چار ماہ، حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کا زمانہ دس سال چھ ماہ، حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت کا زمانہ چند روز کم بارہ سال اور حضرت علی مرتضیٰؓ کی خلافت کا زمانہ چار سال نو ماہ رہا ہے۔ اس طرح چاروں خلفاء کی مجموعی مدت خلافت انتیس سال سات ماہ ہوتی ہے اور پانچ مہینے جو باقی رہے وہ حضرت امام حسنؓ کی خلافت کا زمانہ ہے، پس حضرت امام حسنؓ بھی خلفاء راشدین میں سے ہوئے۔

آنے والے زمانوں کے بارے میں پیشگوئی

(۱۷) وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيَكُوْنُ بَعْدَ هٰذَا الْخَيْرِ شَرٌّ كَمَا كَانَ قَبْلَهُ شَرٌّ قَالَ نَعَمْ قُلْتُ فَمَا الْعِصْمَةُ قَالَ السَّيْفُ قُلْتُ وَهَلْ بَعْدَ السَّيْفِ بَقِيَّةٌ قَالَ نَعَمْ تَكُوْنُ اِمَارَةٌ عَلٰى اَقْذَاءٍ وَهُدْنَةٌ عَلٰى دَخَنٍ قُلْتُ ثُمَّ مَاذَا قَالَ ثُمَّ يَنْشَاءُ دُعَاةُ الضَّلَالِ فَاِنْ كَانَ لِلّٰهِ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةٌ جَلَدَ ظَهْرَكَ وَاَخَذَ مَالَكَ فَاَطِعْهُ وَاِلَّا فَمُتْ وَاَنْتَ عَاضٌّ عَلٰى جِذْلِ شَجَرَةٍ قُلْتُ ثُمَّ مَاذَا قَالَ ثُمَّ يَخْرُجُ الدَّجَّالُ بَعْدَ ذٰلِكَ مَعَهُ نَهْرٌ وَنَارٌ فَمَنْ وَقَعَ فِيْ نَهْرِهٖ وَجَبَ اَجْرُهٗ وَحُطَّ وِزْرُهٗ وَمَنْ وَقَعَ فِيْ نَهْرِهٖ وَجَبَ وِزْرُهٗ وَحُطَّ اَجْرُهٗ قَالَ قُلْتُ ثُمَّ مَاذَا قَالَ ثُمَّ يُنْتَجُ الْمُهْرُ فَلَا يُرْكَبُ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ هُدْنَةٌ عَلٰى دَخَنٍ وَجَمَاعَةٌ عَلٰى اَقْذَاءٍ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلْهُدْنَةُ عَلَى الدَّخَنِ مَاهِيَ قَالَ لَا تَرْجِعُ قُلُوْبُ اَقْوَامٍ عَلَى الَّذِيْ كَانَتْ عَلَيْهِ قُلْتُ هَلْ بَعْدَ هٰذَا الْخَيْرِ شَرٌّ قَالَ فِتْنَةٌ عَمْيَاءُ صَمَّاءُ عَلَيْهَا دُعَاةٌ عَلٰى اَبْوَابِ النَّارِ فَاِنْ مُتَّ يَا حُذَيْفَةُ وَاَنْتَ عَاضٌّ عَلٰى جِذْلٍ خَيْرٌ لَّكَ مِنْ اَنْ تَتَّبِعَ اَحَدًا مِّنْهُمْ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) کیا اس خیر کے بعد شر پیدا ہوگا جیسا کہ اب سے پہلے شر کا دور دورہ تھا (یعنی جس طرح آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے کفر و شرک اور برائیوں کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور پھر آپ ﷺ کے نور نبوت نے بدی و برائی کی تاریکی کو ختم کر کے نیکی اور بھلائی کا اجالا پھیلایا، اسی طرح کیا خیر و بھلائی کے اس زمانے کے بعد شر و برائی کا زمانہ بھی آئے گا)۔ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں! (اس کے بعد پھر بدی و برائی کا زمانہ بھی آئے گا)" میں نے عرض کیا کہ پھر اس وقت بچنے کی کیا سبیل ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا "تلوار! (یعنی اس فتنہ سے حفاظت، تلوار آزمائی کے ذریعے حاصل ہوگی یا یہ مراد ہے کہ اس فتنہ سے بچنے کا راستہ یہی ہوگا کہ تم اس فتنہ کو پیدا کرنے والے لوگوں کا سر تلوار سے اڑادو) میں نے عرض کیا کہ پھر اس تلوار کے بعد اہل اسلام باقی رہیں گے (یعنی جب مسلمان بدی اور برائی کی طاقتوں کو ختم کرنے کے لئے تلوار اٹھائیں گے اور قتل و قتال کریں گے تو کیا اس کے بعد اس زمانے کے مسلمانوں میں اتنی طاقت و اجتماعیت باقی رہ جائے گی کہ وہ امانت و دیانت کے ساتھ اپنی سرداری و حاکمیت قائم کرلیں اور لوگ اس کی قیادت و امارت پر اتفاق کرلیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں! امارت یعنی حکومت و سلطنت تو قائم ہو جائے گی لیکن اس کی بنیاد فساد پر ہوگی اور صلح کی بنیاد کدورت پر ہوگی" میں نے عرض کیا کہ پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اس کے بعد گمراہی کی طرف بلانے والے لوگ پیدا ہوں گے۔ اگر اس وقت زمین پر کوئی خلیفہ یعنی امیر و بادشاہ ہو تو خواہ وہ تیری پیٹھ پر مارے ہی کیوں نہ اور تیرا مال کیوں نہ لے لے (یعنی وہ امیر بادشاہ اگرچہ تمہیں ناحق ستائے تم پر ظلم و ستم ڈھائے اور تمہارا مال و اسباب چھین لے (لیکن تم اس کی اطاعت سے منہ نہ پھیرنا (تاوقتیکہ وہ تمہیں خدا اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے خلاف کوئی کام کرنے کو نہ کہے اور یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے تاکہ دین و ملت میں افتراق و انتشار اور مملکت میں بدامنی و فساد پیدا نہ ہو) اور اگر کوئی خلیفہ یعنی امیر و بادشاہ نہ ہو تو تمہاری موت ایسی حالت میں آنی چاہئے کہ تم کسی درخت کی جڑ میں پناہ پکڑے ہوئے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اس کے بعد دنیا اور زیادہ فتنہ و انتشار اور برائیوں کی طرف بڑھتی رہے گی اور مسلمان بتدریج دینی و ملی طور پر اور دنیاوی اعتبار سے بھی زوال پذیر ہوتے رہیں گے، یہاں تک کہ حضرت مہدیؑ کے زمانہ میں) دجال کا ظہور ہوگا جس کے ساتھ پانی کی نہر ہوگی اور آگ (کی خندق) پس جو شخص اس کی آگ میں پڑے گا اس کا اجر ثابت و قائم ہوگا اور اس کے گناہ (جو اس نے پہلے کئے ہوں گے) دور ہو جائیں گے اور جو شخص اس کی نہر میں پڑے گا اس کا گناہ اس کے لئے بار دوش بنے گا اور اس کا اجر (جو اس نے اچھے عمل کر کے حاصل کئے ہوں گے) جاتا رہے گا۔ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا "گھوڑے کا بچہ جنوایا جائے گا اور وہ سواری نہیں دینے پائے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔"

"اور ایک روایت میں (امارت تو قائم ہو جائے گی لیکن اس کی بنیاد فساد پر ہوگی الخ کے بجائے یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا (کدورت پر صلح ہوگی (یعنی اس وقت لوگ ظاہر میں تو صلح صفائی کا راستہ اختیار کریں گے لیکن ان کے باطن میں کدورت ہوگی) اور وہ (کسی معاہدہ و فیصلہ پر) دلوں کی ناخوشی اور بخشش کے ساتھ متفق و مجتمع ہوں گے"۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! "کدورت پر صلح" سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے دل اس حالت پر نہیں ہوں گے جس پر پہلے تھے (یعنی جس طرح اسلام کے ابتدائی زمانے میں لوگوں کے دل بغض و کینہ سے صاف رہا کرتے تھے، وہ جو بات کہا کرتے یا جو معاملہ کرتے تھے اس میں صدق دلی شامل ہوتی تھی۔ اس طرح کے پاک و صاف دل اس وقت کے لوگوں کے نہیں ہوں گے کہ زبان سے کچھ کہیں گے، معاملہ کچھ کریں گے اور دل میں کچھ اور رکھیں گے۔ یا یہ مراد ہے کہ لوگوں میں باہمی صلح و صفائی ہو جانے کے باوجود ان کے دل اس طرح پاک و صاف نہیں ہوں گے جس طرح ایک دوسرے کے خلاف بغض و عناد میں مبتلا ہونے اور کدورت پیدا ہونے سے پہلے تھے"۔ میں نے عرض کیا کہ کیا اس بھلائی کے بعد کہ جو آپس کے نفاق و کدورت کے بعد مذکورہ باہمی مصالحت و مفاہمت کی صورت میں ظاہر ہوگی اور جو اگرچہ برائی کی آمیزش سے پوری طرح صاف نہیں ہوگی) کسی اور برائی کا ظہور ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں" اس کے بعد پھر برائی کا ظہور ہوگا اور وہ ایک ایسے

بڑے فتنہ کی صورت میں ہوگا جو اندھا اور بہرا ہوگا (یعنی وہ فتنہ لوگوں کی عقل و خرد اور نیکی و بدی کی قوت تمیز پر اس طرح اثر انداز ہو جائے کہ وہ حق اور سچائی کو نہ دیکھیں گے اور نہ سنیں گے گویا فتنہ کی طرف اندھے پن اور بہرے پن کی نسبت مجازاً ہے، اصل مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ لوگ اس فتنہ میں مبتلا ہو کر بدی اور برائی کی انتہائی حدوں تک پہنچ جائیں گے، اور اس کا نتیجہ، جیسا کہ آگے فرمایا جا رہا ہے، یہ ہوگا کہ) اس فتنہ کی طرف بلانے والے لوگ پیدا ہو جائیں گے (یعنی لوگ محض اس فتنہ میں مبتلا ہی نہیں ہوں گے بلکہ ایک ایسی جماعت بھی پیدا ہو جائے گی جو اس فتنہ کو ہوا دے گی اور دوسروں کے اس فتنہ میں مبتلا ہونے کا باعث بنے گی) اور اس جماعت کے لوگوں کا یہ عمل ایسا ظاہر کرے گا جیسے کہ وہ دوزخ پر کھڑے ہو کر مخلوق کو اس (دوزخ) کی طرف بلا رہے ہیں (چنانچہ بلانے والے اور ان کے بلاوے کو قبول کرنے والے، سب ہی دوزخ میں جائیں گے) پس اے حذیفہ! اس وقت تمہاری موت اگر اس حالت میں آئے کہ تم کسی درخت کی جڑ میں پناہ پکڑے ہوئے ہو تو یہ اس سے بہتر ہوگا کہ تم اہل فتنہ میں سے کسی کی اتباع و پیروی کرو"۔ (ابوداؤد)

تشریح: قتادہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے جس فتنہ سے بچاؤ کا ذریعہ تلوار کو قرار دیا تھا اس کا مصداق وہ لوگ ہیں جو حضور ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ خلافت میں اسلام سے پھر گئے تھے اور اپنے ارتداد بغاوت کے ذریعہ ایک بڑے فتنہ کا باعث بننے والے تھے لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نہایت تدبر و ہوشیاری کے ساتھ ان کی سرکوبی کی اور طاقت کے ذریعے ان کو دبایا۔

اَقْذَاءٌ اصل میں قذی کی جمع ہے اور قَذَاۃٌ کی جس کے معنی اس کیچڑ، کوڑے اور تنکے کے ہیں جو آنکھ میں یا پانی و شربت وغیرہ میں پڑ جائے۔ پس حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت امارت و حکومت تو قائم ہو جائے گی اور مسلمانوں کا امیر و خلیفہ بھی ہوگا لیکن لوگ اخلاص و حسن نیت کے ساتھ اپنی اس امارت و حکومت کے تئیں وفاداری نہ رکھیں گے بلکہ ان کے دلوں میں بغض و عداوت، عدم وفاداری اور مخالفت و مخاصمت کے جذبات ہوں گے، جیسا کہ اگر کسی کی آنکھ میں کوئی ریزہ یا تنکا پڑ جائے تو گو وہ باہر سے اچھی بھلی معلوم ہوتی ہو مگر اس کے اندر سخت سوزش اور دکھن ہوتی ہے اسی طرح وہ لوگ گو ظاہر میں اپنی امارت و حکومت کے وفادار و بہی خواہ نظر آئیں گے مگر ان کے اندر غیر وفاداری اور مخالفت و عداوت بھری ہوگی، اور قاضیؒ نے اس کے دوسرے معنی بیان کئے ہیں اور وہ یہ کہ اس وقت مسلمانوں کی حکومت و امارت تو قائم ہوگی لیکن وہ امارت و حکومت، بعض بدعتوں اور دین مخالف کاروائیوں کے ذریعے اپنی حیثیت کو بگاڑے رکھے گی۔

"ھدنۃ" مصالحت کے مفہوم میں ہے اور اصل میں اس کے معنی سکون و آرام اور فراغت کے ہیں اور دخن دخان کے مفہوم میں ہے جس کے معنی ہیں "دھواں" اس جملے "ھدنۃ علی دخن" (صلح کی بنیاد کدورت پر ہوگی) کا مطلب بھی وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا کہ اس وقت باہم مخاصمت و مخالفت رکھنے والے فریقوں کے درمیان جو مصالحت ہوگی وہ فریب و نفاق اور بدنیتی کے ساتھ ہوگی کہ اس اعتبار سے یہ جملہ ماقبل کے جملہ کو مؤکدہ کرنے کے لئے ہے! اور شارحین حدیث نے بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ کے اس ارشاد گرامی کا مصداق وہ مصالحت و مفاہمت ہے جو حضرت امام حسن اور حضرت امیر معاویہؓ کے سپرد کر دی تھی اور انہوں نے (یعنی امیر معاویہ نے) اپنی امارت و سیادت کو مستحکم کر لیا تھا! اس سے معلوم ہوا کہ بعض حضرات خصوصاً مورخین نے جو یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ امیر معاویہؓ، حضرت امام حسنؓ سے صلح و صفائی کر لینے کے بعد خلیفہ ہوئے تھے اس معنی میں صحیح نہیں ہے کہ امام حسنؓ واقعۃً حضرت امیر معاویہؓ کو خلافت کا اپنے سے زیادہ مستحق و اہل جانتے تھے اس لئے انہوں نے صلح کر کے ان کے حق میں خلافت سے دستبرداری دے دی تھی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کے سیاسی عناصر نے حضرت امام حسنؓ کے خلاف جس طرح کا ماحول بنا دیا تھا اور ان دونوں عظیم المرتبت شخصیتوں کی باہمی آویزش کی وجہ سے دین و ملت کو جو نقصان پہنچنے والا تھا، حضرت امام موصوف نے اس سے بچنے کے لئے بادل نخواستہ مصالحت کی اور اپنی خلافت و حکومت کو دین و ملت کے وسیع تر مفاد پر ترجیح دینے کے بجائے اس سے دستبرداری ہی کو بہتر سمجھا۔

"گمراہی کی طرف بلانے والے لوگ پیدا ہوں گے" کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے امراء اور ارباب حکومت میں سے ایسے لوگوں کی جماعت پیدا ہوگی جو لوگوں کو بدعت و گناہ کی طرف مائل کرے گی اور برائی کے راستے پر لگائے گی۔

"کسی درخت کی جڑ میں پناہ پکڑے ہوئے ہو" کے ذریعے اس امر کی تلقین کرنا مقصود ہے کہ ایسے نازک حالات اور اس طرح کے سخت دین مخالف ماحول میں تمہیں چاہئے کہ لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے کہیں گوشہ نشین ہو جاؤ اور اپنے آپ کو فتنہ وفساد سے بچا کر اپنی باقی زندگی کو کسی ایسی جگہ گذارو جہاں تک اس فتنہ کے برے اثرات تم تک نہ پہنچ سکیں یہاں تک کہ اگر تمہیں ان نازک حالات اور اس پر فتن ماحول سے دور رہنے کے لئے کہیں دور جنگل میں جا کر کسی درخت کی جڑ میں پناہ لینی پڑے اور وہاں اتنی سخت اور صبر آزما زندگی گذارنی پڑے کہ گھاس پھوس اور لکڑی چبانے تک کی نوبت آ جائے تو اس سے بھی دریغ نہ کرو۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ وَالَّا فَمُتْ کا تعلق وَاطِعْهُ سے ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اس امیر وبادشاہ کی طرف سے تمہارے حق میں کتنے ہی سخت حالات پیدا کر دیئے جائیں تم اس کی اطاعت وفرمانبرداری سے منہ نہ پھیرنا، کیونکہ اگر تم اس امیر وبادشاہ کی اطاعت نہیں کرو گے تو پھر تمہیں اور زیادہ شدید حالات میں اور کہیں زیادہ سخت اذیت کے ساتھ مرنا پڑے گا! نیز بعض نسخوں میں فمت کی بجائے قمت کا لفظ ہے جو لفظ قیام سے ماضی کا صیغہ ہے، اس صورت میں مطلب یوں ہوگا کہ اگر ایسا نہ ہو (یعنی تم اس امیر وبادشاہ کے ظلم وستم کی وجہ سے اس کی اطاعت وفرمانبرداری کرنے سے معذور ہو تو پھر) نکل کھڑے ہو اور کہیں دور جنگل میں جا کر کسی درخت کی جڑ میں پناہ لے لو (یعنی اس امیر وبادشاہ کے زیر حکومت علاقہ سے نکل جاؤ اور کہیں دوسری جگہ جا کر پناہ گزین ہو جاؤ)۔

"جس کے ساتھ پانی کی نہر ہوگی اور آگ کی خندق" کے بارے میں بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ دونوں چیزیں حقیقی نہیں بلکہ محض خیالی ہوں گی اور ان کا تعلق سحر وطلسم سے ہوگا (یعنی بظاہر نظر تو ایسا آئے گا کہ وہ دجال اپنے ساتھ پانی کی نہر اور آگ کی خندق لئے پھر رہا ہے لیکن حقیقت ان کے علاوہ کچھ اور ہوگی، جیسا کہ شعبدہ باز نظر بندی کر کے کچھ کا کچھ دکھا دیتے ہیں. چنانچہ آگے کی عبارت فمن وقع فِی فارۃ میں دجال کی طرف آگ کی نسبت سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ دونوں چیزیں محض جادوئی اور طلسماتی ہوں گی۔ اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس کے ساتھ پانی کی جو نہر ہوگی وہ نتیجہ وحقیقت کے اعتبار سے آگ ہوگی اور آگ کی خندق ہوگی وہ نتیجہ وحقیقت کے اعتبار سے پانی ثابت ہوگا۔ اور حضرت شیخ عبدالحق ؒ نے اس جملے کی تشریح میں یہ لکھا ہے کہ زیادہ صحیح بات تو یہی ہے کہ یہ عبارت حقیقی معنی پر محمول ہے، یعنی اس کے ساتھ واقعۃً پانی کی نہر اور آگ کی خندق ہوگی، لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ ان چیزوں سے مراد لطف وقہر اور وعدہ و وعید ہو، یعنی پانی کی نہر سے مراد تو یہ ہے کہ اس کے پاس اپنے متعلقین کے لئے زبردست ترغیبات ولالچ اور آسائش وراحت کے سامان ہوں گے اور آگ کی خندق سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے مخالفین ومنکرین کے لئے ڈرانے، دھمکانے اور مصیبت واذیت میں مبتلا کرنے کے ذرائع رکھے گا، پس جو شخص اس کی آگ میں پڑے گا الخ۔ کا مطلب یہ ہے جو شخص دجال کی موافقت وتابعداری نہیں کرے گا وہ اس کو آگ میں ڈالے گا اور طرح طرح کی سختیوں اور آلام میں مبتلا کرے گا) اور جو شخص اس کی آگ میں پڑے گا وہ خدا کے دین پر ثابت قدم رہنے اور خدا کی رضاء کی خاطر ہر مصیبت پر صبر کرنے کی وجہ سے بڑے بڑے اجر پائے گا اور اس نے پہلے جو گناہ کئے ہوں گے وہ دھل جائیں گے، اسی طرح جو شخص دجال کی موافقت وتابعداری کرے گا اس کو وہ پانی میں ڈالے گا (یعنی اس کو طرح طرح کی آسائش اور راحت زیادہ سے زیادہ دنیاوی فائدے پہنچائے گا، چنانچہ جو شخص اس کے پانی میں جائے گا وہ دنیاوی آسائش وراحت اور یہاں کی زندگانی کی محبت کے سبب اس پر ایمان لانے، اس کی اطاعت وفرمانبرداری کرنے کی وجہ سے سخت وبال مول لے لے گا اور اس نے پہلے جو اچھے کام کئے ہوں گے ان سب کا اجر ضائع ہو جائے گا۔

"ثم ینتج المھر" الخ میں لفظ ینتج انتج کا صیغہ مجہول ہے نہ کہ یہ "انتاج" سے ہے اور "نتج" کے معنی ہیں حاملہ کی خبر گیری کرنا یہاں تک کہ وہ جنے! جب کہ انتاج کے معنی ہیں ولادت کا وقت آ جانا! پس علماء نے لکھا ہے کہ یہاں "نتج" اصل میں تولید کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی لوگ اپنی گھوڑیوں کے ہاں بچہ ہونے کی تدابیر اختیار کریں گے اور بچہ جننے کے وقت گھوڑیوں کی دیکھ بھال اور خدمت کریں گے جیسا کہ دایہ کسی عورت کے ہاں ولادت کے وقت خدمت انجام دیتی ہے اور "مھر" کے معنی بچھڑے کے ہیں اور اگر

یہ لفظ "ۃ" کے ساتھ یعنی "مہرۃ" ہو تو اس کے معنی بچھڑی کے ہوتے ہیں! نیز "یَرْکَبُ" کے معنی ہیں سواری دینے کی عمر کو پہنچ جانا یا سواری کے قابل ہو جانا۔ بہر حال جو یہ فرمایا گیا ہے کہ لوگ اپنی گھوڑیوں سے بچے جنوانے کی تدابیر کریں گے تاکہ ان کو سواری کے کام میں لاسکیں لیکن جب ان کی گھوڑیاں بچے جنیں گی تو وہ بچے ابھی سواری کے قابل بھی نہیں ہونے پائیں گے کہ قیامت آجائے گی، تو اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کی طرف اشارہ کرنا ہے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت سے قیامت کے دن تک گھوڑوں کی سواری کا موقع ہی نہیں آئے گا اور یہ اس وجہ سے ہوگا کہ اس زمانے میں کفار کا وجود ہی نہیں ہوگا کہ جن سے جنگ کرنے کے لئے گھوڑوں کی سواری کی ضرورت پیش آئے۔ (لیکن یہ مراد لینا اور مذکورہ تاویل کرنا اس زمانے میں تو صحیح تھا جب کہ گھوڑوں کی سواری صرف میدان جنگ تک محدود رہتی تھی اور گھوڑے کا اصل مصرف کفار کے مقابلے پر لڑنے کے لئے ان کو استعمال کرنا سمجھا جاتا تھا، ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں یہ بات کچھ زیادہ وزن دار معلوم نہیں ہوتی) یا اس جملے کے ذریعے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ دجال کے ظاہر ہو جانے کے بعد سے قیامت آنے تک کا زمانہ طویل نہیں ہوگا، بہت مختصر ہوگا، گویا اس وقت سے قیامت آنے تک میں بس اتنا عرصہ رہ جائے گا ایک بچھڑے کے پیدا ہونے کے وقت سے اس سواری کے قابل ہونے تک کے درمیان لگتا ہے! یہ وضاحت نہ صرف یہ کہ زیادہ صاف اور قرین قیاس ہے بلکہ ان احادیث کے مفہوم کے مطابق بھی ہے جو اس سلسلے میں منقول ہیں۔

خلافت راشدہ کے بعد پیش آنے والے روح فرسا واقعات کے بارے میں پیشگوئی

(۱۸) وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ كُنْتُ رَدِيْفًا خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا عَلٰى حِمَارٍ فَلَمَّا جَاوَزْنَا بُيُوْتَ الْمَدِيْنَةِ قَالَ كَيْفَ بِكَ يَا اَبَا ذَرٍّ اِذَا كَانَ بِالْمَدِيْنَةِ جُوْعٌ تَقُوْمُ عَنْ فِرَاشِكَ وَلَا تَبْلُغُ مَسْجِدَكَ حَتّٰى يُجْهِدَكَ الْجُوْعُ قَالَ قُلْتُ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ تَعَفَّفْ يَا اَبَا ذَرٍّ قَالَ كَيْفَ بِكَ يَا اَبَا ذَرٍّ اِذَا كَانَ بِالْمَدِيْنَةِ مَوْتٌ يَبْلُغُ الْبَيْتُ الْعَبْدَ حَتّٰى اِنَّهٗ يُبَاعُ الْقَبْرُ بِالْعَبْدِ قَالَ قُلْتُ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ تَصْبِرُ يَا اَبَا ذَرٍّ قَالَ كَيْفَ بِكَ يَا اَبَا ذَرٍّ اِذَا كَانَ بِالْمَدِيْنَةِ قَتْلٌ تَغْمُرُ الدِّمَاءُ اَحْجَارَ الزَّيْتِ قَالَ قُلْتُ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ تَاْتِیْ مَنْ اَنْتَ مِنْهُ قَالَ قُلْتُ وَاَلْبَسُ السِّلَاحَ قَالَ شَارَكْتَ الْقَوْمَ اِذًا قُلْتُ فَكَيْفَ اَصْنَعُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنْ خَشِيْتَ اَنْ يَّبْهَرَكَ شُعَاعُ السَّيْفِ فَاَلْقِ نَاحِيَةَ ثَوْبِكَ عَلٰى وَجْهِكَ لِيَبُوْءَ بِاِثْمِكَ وَاِثْمِهٖ۔ (رواه ابوداؤد)

"اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن (کسی سفر کے موقع پر) میں گدھے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھا (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو اپنی سواری پر اپنے پیچھے بٹھا رکھا تھا، گویا یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم اور رفقاء کے ساتھ کس قدر تواضع و محبت اور حسن سلوک کا رویہ اختیار فرماتے تھے، نیز اس سے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی اس خصوصیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر قریب کا مقام حاصل تھا اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کو نہایت توجہ و ہوشیاری کے ساتھ سنتے اور اچھی طرح یاد رکھتے تھے بہر حال، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب ہم مدینہ کے گھروں سے (یعنی آبادی سے باہر) نکل گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوذر رضی اللہ عنہ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب مدینہ میں بھوک کا دور دورہ ہوگا (یعنی خاص طور پر تمہیں اس قدر اسباب معیشت حاصل نہیں ہوسکیں گے کہ تم اپنا پیٹ بھی بھر سکو، یا یہ کہ اس وقت مدینہ میں قحط پھیل جائے گا اور تم لوگوں کو کھانے کے لئے کچھ نہیں ملے گا یہاں تک کہ تم اپنے بستر سے اٹھ کر اپنی مسجد تک پہنچنے میں بھی مشکل محسوس کروگے اور بھوک کی شدت تمہیں سخت پریشانی اور اذیت میں مبتلا کردے گی (یعنی بھوک کی وجہ سے تم پر اس قدر ضعف غالب ہو جائے گا کہ تم اپنے گھر سے نکل کر نماز پڑھنے کے لئے مسجد تک جانے میں بھی سخت مشکل اور دقت محسوس کروگے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں (یعنی میں نہیں بتاسکتا کہ اس وقت کیا کروں گا، ہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہدایت فرمائیے کہ اس وقت مجھے کیا کرنا چاہئے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"ابوذرؓ پارسائی اختیار کرنا" یعنی اس بھوک پر صبر کرنا، ضبط وتحمل کے ساتھ اس سخت حالت کا مقابلہ کرنا، اپنے آپ کو حرام ومشتبہ مال سے محفوظ رکھنا، طمع ولالچ رکھنے اور کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے، اور مخلوق کے سامنے ذلت ورسوائی اختیار کرنے سے اجتناب کرنا) پھر آپ ﷺ نے فرمایا "ابوذرؓ! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب قحط یا کسی وبا کے پھیل جانے کی وجہ سے) مدینہ میں موت کی گرم بازاری ہوگی اور مکان (یعنی قبر) کی قیمت غلام تک پہنچ جائے گی (یعنی کثرت اموات سے یہ حال ہوگا کہ لوگوں کو اپنے مردے دفن کرنے کے لئے قبر کی جگہ ملنی مشکل ہوجائے گی اور ایک قبر کی جگہ، غلام کی قیمت کے برابر پہنچ جائے گی۔ چنانچہ آگے جملے کے ذریعے اسی بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ یوں فرمایا کہ یہاں تک کہ قبر کی جگہ، غلام کی قیمت کے برابر فروخت ہوگی۔ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں (آپ ﷺ ہی ہدایت فرمائیے کہ اس وقت مجھے کیا کرنا چاہئے؟) آپ ﷺ نے فرمایا "ابوذرؓ! صبر کا دامن ہرگز نہ چھوڑنا" اور پھر فرمایا ابوذرؓ! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب مدینہ میں قتل عام ہوگا اور اس کا خون احجار الزیت کو ڈھانک لے گا؟ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں (آپ ﷺ ہی فرمائیے، مجھے اس وقت کیا کرنا چاہئے؟) آپ ﷺ نے فرمایا "تم اس کے پاس چلے جانا، جس سے تم تعلق رکھتے ہو" میں نے عرض کیا کہ، تو کیا میں اس وقت ہتھیار باندھ لوں اور فتنہ پھیلانے والی جماعت کے خلاف برسرپیکار ہوجاؤں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اس طرح تو تم بھی جماعت کے شریک کار ہوجاؤ گے" میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ) پھر مجھے اس وقت کیا کرنا چاہئے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "اگر تمہیں خوف ہو کہ تلوار کی چمک تم پر غالب آجائے گی (یعنی تم یہ دیکھو کہ کوئی شخص تمہیں مار ڈالنے کے لئے اپنی تلوار سے تم پر وار کرنا چاہتا ہے) تو اس وقت تم اپنے کپڑے کا کونہ اپنے منہ میں ڈال لینا۔ تاکہ وہ تمہارا گناہ (یعنی تمہارے قتل کا گناہ) اور اپنا گناہ لے کر واپس ہو۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "تصبر" باب تفعل سے امر کا صیغہ ہے اور ایک نسخہ میں یہ لفظ مضارع کا صیغہ منقول ہے جو امر کے معنی میں ہے اس جملے کا حاصل یہ ہے کہ تم اس آفت وبلا پر صبر کرنا جزع وفزع سے اجتناب کرنا، تقدیر الٰہی پر راضی وشاکر رہنا۔ اور مدینہ سے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ "احجار الزیت" نواح مدینہ میں بجانب غرب ایک جگہ کا نام تھا، وہاں کی زمین نہایت پتھریلی تھی اور وہ پتھر بھی اس قدر سیاہ اور چمکدار تھے کہ جیسے کسی نے ان پر زیتون کا تیل مل دیا ہو، اسی مناسبت سے اس جگہ کو احجار الزیت کہا جاتا تھا! حضور ﷺ نے اس ارشاد گرامی "ابوذرؓ! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب مدینہ میں قتل عام ہوگا الخ" کے ذریعے بطور پیشگوئی اس خونچکاں واقعہ کی طرف اشارہ کیا جو مسلمانوں کے قتل عام کی صورت میں مدینہ منورہ میں پیش آیا اور واقعہ حرہ کے نام سے مشہور ہوا، مستند کتابوں میں اس واقعہ کی جو تفصیل مذکور ہے وہ اتنی لرزہ خیز، اتنی دردناک اور اتنی بھیانک ہے کہ نہ تو اس کو بیان کرنے کا زبان وقلم کو یارا ہے اور نہ کوئی آسانی کے ساتھ اس کو پڑھنے اور سننے کی تاب لاسکتا ہے! تاہم اجمالی طور پر اتنا بتادینا ضروری ہے کہ جب بدبخت یزید ابن معاویہ کی فوج نے میدان کربلا میں حضرت امام حسینؓ کو نہایت بے دردی کے ساتھ شہید کردیا تو پورے عالم اسلام میں زبردست تہلکہ مچ گیا اور یزید کے خلاف عام مسلمانوں میں نہایت نفرت کے جذبات پیدا ہوگئے ادھر اس کی بدکاریوں، بے اعتدالیوں اور بدمست زندگی کے واقعات نے اس کی طرف سے لوگوں کو پہلے ہی بدظن کر رکھا تھا چنانچہ اہل مدینہ نے متفقہ طور پر اس کی خلافت وحکومت سے بیزاری کا اظہار اور اس کے خلاف جہاد کا اعلان کردیا، جب یزید کو یہ معلوم ہوا تو اس نے مسلم ابن عقبہ کی کمان میں ایک بہت بڑا لشکر اہل مدینہ کو کچلنے کے لئے روانہ کیا، چنانچہ مسلم نے مدینہ پہنچ کر مغربی حرہ (یعنی حرہ الوبرہ) کی جانب سے شہر پر دھاوا بول دیا، گو اہل مدینہ نے بڑی بہادری اور بے جگری کے ساتھ یزید کی فوج کا مقابلہ کیا لیکن اول تو تربیت یافتہ فوج اور دیگر وسائل وذرائع کی کمی کی وجہ سے اور دوسرے مسلم ابن عقبہ جیسے ہوشیار وتجربہ کار کمانڈر کا مقابلہ نہ کرسکنے کی وجہ سے شکست کھا گئے پھر تو مسلم ابن عقبہ اور اس کی فوج نے شہر میں گھس کر قتل عام اور خونریزی کا بازار گرم کردیا اور قتل عام ولوٹ مار کا یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا، ہزاروں مسلمان نہایت سفاکی اور بے دردی کے ساتھ قتل کردیئے گئے جن میں صحابہ کرامؓ اور تابعین کی بھی بہت بڑی تعداد تھی، شہر مقدس اور مسجد نبوی ﷺ کی حرمت کو پامال کیا گیا اور

دیگر ناقابل بیان تباہیوں اور بربادیوں کا بازار گرم کیا گیا۔ صرف مدینہ ہی کی پامالی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے بعد یزید کی وہ فوج مکہ کی طرف روانہ ہوئی جہاں کے لوگوں نے بہت پہلے سے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کو خلیفہ تسلیم کر رکھا تھا، یزیدی لشکر نے مکہ مکرمہ میں بھی بے پناہ تباہی مچائی اور خانہ کعبہ تک کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ اسی سال یزید کی موت ہوئی۔

"تم اس کے پاس چلے جانا جس سے تعلق رکھتے ہو" کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت جو لوگ تمہارے دین و مسلک کے ہمنوا اور تمہارے خیالات و اعمال کے موافق ہوں ان کے پاس چلے جانا! اور قاضیؒ نے اس جملے کی یہ مراد بیان کی ہے کہ تم اپنے اہل و اقارب کے پاس چلے جانا اور یہ کہ اپنے گھر میں بیٹھ رہنا! اور طیبیؒ نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تم اپنے اس امام و امیر کی طرف رجوع کرنا جس کی تم اتباع و فرمانبرداری کرتے ہو۔ یہ مطلب زیادہ صحیح اور حضرت ابوذرؓ کے اس جملے "تو کیا میں ہتھیار باندھ لوں" کے زیادہ مناسب ہے۔

"اس طرح تم بھی جماعت کے شریک کار ہو جاؤ گے" کا مطلب، جو طیبی کے منقولات کی روشنی میں واضح ہوتا ہے، یہ ہے کہ ایسے موقع پر جب کہ فتنہ و فساد پھوٹ پڑا ہو اور قتل و خونریزی کا بازار گرم ہو مسلح اور ہتھیار بند ہونا گویا اس خونریزی میں شرکت کرنا اور فتنہ پردازی کے گناہ گاروں کی صف میں شامل ہونا ہے لہٰذا تم نہ ہتھیار باندھنا اور نہ کسی کے خلاف جنگ میں شریک ہونا بلکہ اپنے امام و مقتدا اور صلح جو و امن پسند لوگوں کے ساتھ رہنا یہاں تک کہ تم صلح جوئی اور امن پسندی کی راہ میں فلاح یاب ہو! لیکن اس وضاحت پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ ایک طرف تو حضرت ابوذرؓ کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنے امام و امیر کے ساتھ رہیں جو یقیناً اس وقت اس قتل و قتال اور خونریزی میں ایک فریق کی حیثیت رکھے گا دوسری طرف یہ حکم دیا گیا کہ وہ قتل و قتال سے دور رہیں، تو یہ دونوں باتیں ایک ساتھ کس طرح ممکن ہوں گی؟ اس کا جواب ابن ملکؒ نے اس طرح دینے کی کوشش کی ہے کہ شریعت کا حکم تو یہی ہے کہ اگر کوئی شخص ناحق اور از راہ ظلم، خونریزی کا ارتکاب کرنا چاہے تو اس کا دفاع کرنا اور اس کی فساد انگیزی کو طاقت کے ذریعے ختم کرنے کی سعی کرنا واجب ہے لیکن حضور ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ اس وقت، ہتھیار بند ہونا، گویا فتنہ پردازوں کی جماعت کا شریک کار ہونا ہے، تو اس کا اصل مقصد خونریزی کی برائی کو واضح کرنا اور اس کے تباہ کن اثرات کے خلاف آگاہ و متنبہ کرنا ہے! تاہم اس سلسلے میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اگر خونریزی و غارت گری کے لئے آنے والا دشمن اگر مسلمان ہو تو طاقت کے ذریعے اس کا دفاع کرنا اور اس سے لڑنا جائز ہے بشرطیکہ اس سے مقابلہ آرائی کی صورت میں فتنہ و فساد کے زیادہ بڑھ جانے کا خوف نہ ہو اور اگر وہ دشمن، کوئی غیر مسلم ہو تو پھر اس کا ہر ممکن ذریعے سے مقابلہ کرنا اور اس کے ساتھ ہر صورت میں لڑنا واجب ہے۔

"اپنے کپڑے کا کونہ اپنے منہ میں ڈال لینا" کا مطلب یہ ہے کہ اگر قتل و قتال کرنے والے لوگ تم پر حملہ بھی کریں تو تم ان سے نہ لڑو۔ بلکہ ان کے حملے کے وقت کسی بھی ذریعے سے اپنے آپ کو غافل اور غیر متعلق بنالو تاکہ تمہیں اس حملے سے خوف محسوس نہ ہو۔ اس سے گویا اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ تم ان لوگوں سے اس حالت میں بھی نہ لڑنا اور ان کے خلاف تلوار نہ اٹھانا جب کہ وہ تم سے لڑنا اور تمہیں قتل کرنا چاہیں بلکہ تمہارے لئے فلاح کا راستہ یہی ہوگا کہ اس وقت مظلوم بن جانا اور اپنے آپ کو ان کے ہاتھوں شہید ہو جانے پر تیار کر لینا کیونکہ وہ لوگ بہر حال مسلمان ہوں گے اور مسلمان کے خلاف تلوار اٹھانا جائز نہیں ہے، اگر وہ تمہیں قتل کریں گے تو وہ ان کا عمل ہوگا اور خدا خود ان سے نبٹ لے گا! بعض شارحین نے لکھا ہے کہ حضور ﷺ کے اس ارشاد کا اصل مقصد مسلمانوں کی باہمی خونریزی کی برائی اور اس سے بچنے کی فضیلت کو زیادہ سے زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کرنا ہے کہ چاہے اپنی جان سے ہاتھ بھی دھونا پڑے مگر کسی مسلمان کے خلاف ہتھیار اٹھانا گوارہ نہ کرنا چاہئے ورنہ جہاں تک مسئلہ کا تعلق ہے، یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ فتنہ کا سر کچلنے کے لئے اور ناحق خونریزی پر آمادہ شخص کا دفاع کرنے کے لئے لڑنا جائز ہے اگرچہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔

یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ واقعہ حرہ ۶۳ھ میں پیش آیا جب کہ حضرت ابوذرؓ کی وفات حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت کے

آخری زمانے میں ۳۲ھ میں ہو چکی تھی، پس آنحضرت ﷺ پر یہ تو منکشف ہو گیا تھا کہ مدینے میں ایسا المناک واقعہ پیش آئے گا لیکن یہ منکشف نہیں ہوا تھا کہ یہ واقعہ کب پیش آئے گا، چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت ابوذرؓ کو اس کے متعلق باخبر کیا اور گویا یہ وصیت فرمائی کہ اگروہ خونریزی تمہارے سامنے پیش آئے اور تمہاری زندگی اس وقت تک باقی رہے تو صبر و ثبات کی راہ اختیار کرنا اور اس خونریزی میں ہرگز شامل نہ ہونا جہاں تک بھوک کی حالت اور کثرت اموات کے واقعہ کا تعلق ہے تو ہو سکتا ہے کہ مدینہ والوں کو ان دونوں باتوں کا سامنا کرنا پڑا ہو اور حضرت ابوذرؓ کی زندگی ہی میں یہ دونوں پیشگوئیاں بھی پوری ہو گئی ہوں جیسا کہ عام الرماد میں پیش آنے والی صورت حال سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ قتل عام اور خونریزی کے فتنہ کی طرح یہ دونوں باتیں بھی حضرت ابوذرؓ کی وفات کے بعد ظاہر ہوئی ہیں۔

پُرفتن ماحول میں نجات کی راہ

(۱۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرِو ابْنِ الْعَاصِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ کَیْفَ بِکَ اِذَا اُبْقِیْتَ فِیْ حُثَالَۃٍ مِنَ النَّاسِ مَرِجَتْ عُھُوْدُھُمْ وَاَمَانَاتُھُمْ وَاخْتَلَفُوْا فَکَانُوْا ھٰکَذَا وَشَبَّکَ بَیْنَ اَصَابِعِہٖ قَالَ فَبِمَ تَاْمُرُنِیْ قَالَ عَلَیْکَ بِمَا تَعْرِفُ وَدَعْ مَاتُنْکِرُ وَعَلَیْکَ بِخَاصَّۃِ نَفْسِکَ وَاِیَّاکَ وَعَوَامَّھُمْ وَفِیْ رِوَایَۃٍ اِلْزَمْ بَیْتَکَ وَاَمْلِکْ عَلَیْکَ لِسَانَکَ وَخُذْ مَاتَعْرِفُ وَدَعْ مَاتُنْکِرُ وَعَلَیْکَ بِاَمْرِ خَاصَّۃِ نَفْسِکَ وَدَعْ اَمْرَ الْعَامَّۃِ۔ (رواہ الترمذی وصححہ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاصؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "اس وقت تم کیا کرو گے جب تم اپنے آپ کو ناکارہ لوگوں کے زمانے میں پاؤ گے، جن کے عہد و پیمان اور جن کی امانتیں خلط ملط ہوں گی اور جو آپس میں اختلاف رکھیں گے، گویا وہ لوگ اس طرح کے ہو جائیں گے یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے کے اندر داخل کیا" حضرت عبداللہ نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ آپ ﷺ مجھے ہدایت فرمائیے کہ اس وقت میں کیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "اس وقت تم پر لازم ہو گا کہ اس چیز کو اختیار کرو اور اس پر عمل کرو جس کو تم (دین و دیانت کی روشنی میں) حق جانو اور اس چیز سے اجتناب و نفرت کرو جس کو تم ناحق اور برا جانو، نیز صرف اپنے کام اور اپنی بھلائی سے مطلب رکھو اور خود کو عوام الناس سے دور کر لو"۔ اور ایک روایت میں یوں منقول ہے کہ "اپنے گھر میں پڑے رہو (بلاضرورت باہر نکل کر ادھر ادھر نہ جاؤ) اپنی زبان کو قابو میں رکھو، جس چیز کو حق جانو اس کو اختیار کرو اور جس چیز کو برا جانو اس کو چھوڑ دو، صرف اپنے کام اور اپنی بھلائی سے مطلب رکھو اور عوام الناس کے معاملات سے کوئی تعلق نہ رکھو"۔ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے۔"

تشریح: "حُثَالۃ" کے معنی ہیں چاول اور جو وغیرہ کا چھلکا، جس کو بھوسی کہتے ہیں اسی طرح کسی بھی چیز کے ناکارہ اور بے فائدہ حصے کو بھی حثالہ کہا جاتا ہے، پس "حثالۃ من الناس" سے مراد وہ لوگ ہیں جو انسانی و اخلاقی قدروں کے اعتبار سے ادنیٰ درجے کے ہوں، جو انسانیت کا جوہر نہ رکھنے کے سبب نہایت پست ہوں اور جو دین و آخرت کے اعتبار سے بالکل ناکارہ اور بے فائدہ ہوں۔

"جن کے عہد و پیمان اور جن کی امانتیں خلط ملط ہوں گی" کا مطلب یہ ہے کہ وہ بالکل بے اعتبار اور ناقابل اعتماد لوگ ہوں گے ان کے کسی عمل اور کسی قول کا کوئی بھروسہ نہیں ہوگا، ان کے کسی اقدام اور کسی معاملہ میں پختگی و استقلال نام کی کوئی چیز نہیں ہوگی، ان کے عہد و پیمان اور فیصلے لحہ بہ لحہ مختلف شکل و صورت میں بدلتے رہیں گے، دین و دیانت کے تقاضوں سے بے پرواہ ہوں گے اور امانتوں میں خیانت کریں گے۔

"اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے کے اندر داخل کیا" یعنی آپ ﷺ نے یہ سمجھانے کے لئے کہ وہ آپس میں کس طرح ایک دوسرے کی ہلاکت کے درپے ہوں گے، اور ان کے باہمی اختلاف و نزاعات کی کیا صورت ہوگی، اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے کے

اندر داخل کر کے دکھایا اور بطور مثال واضح فرمایا کہ جس طرح ان دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہیں اسی طرح ان کی اخلاقی وسماجی حیثیت اس درجے الجھی ہوئی اور ان کے دینی معاملات واعمال اس قدر خلط ملط ہوں گے کہ امین وخائن اور نیک وبد کے درمیان تمیز کرنا ممکن نہیں رہے گا۔

واضح رہے کہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے کے اندر داخل کرنا جس طرح باہمی اختلاف ونزاع کو بطور تمثیل بیان کرنے کے لئے ہوتا ہے اسی طرح کبھی دو چیزوں کے باہمی ربط واتصال اور اتفاق ویگانگت کو ظاہر کرنے کے لئے بھی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کر کے دکھایا جاتا ہے جیسا کہ مال غنیمت کی تقسیم کے بیان میں وہ حدیث گزری ہے جس میں حضور ﷺ نے مال غنیمت کے خمس کی تقسیم کے تعلق سے بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کے باہمی ربط واتصال اور ان کی ایک دوسرے کے ساتھ قربت ویکجائی کو ظاہر کرنے کے لئے بطور تمثیل اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کر کے دکھایا تھا! دونوں صورتوں پر اس تمثیلی عمل کا اطلاق معنوی طور پر بھی کوئی تضاد نہیں رکھتا بلکہ تشبیک کے جو اصل معنی ہیں، یعنی باہم مختلط ہونا، دو چیزوں کا ایک دوسرے میں داخل ہونا، وہ مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں پائے جاتے ہیں۔

"اپنی بھلائی سے مطلب رکھو اور خود کو عوام الناس سے دور کر لو" کا مطلب یہ ہے کہ پر فتن دور میں سب سے زیادہ ضرورت خود اپنے نفس کی اصلاح اور اپنے دین وکردار کی حفاظت کی ہوتی ہے، لہٰذا اس وقت تم بھی بس اپنے دین اور اپنی اخروی بھلائی کے کاموں کی تکمیل وحفاظت میں مشغول رہنا اور دوسرے لوگوں کی طرف سے کسی فکر وخیال میں نہ پڑنا۔ یہ حکم ایسے ماحول میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ پر عمل نہ کرنے کی ایک درجہ میں اجازت کے طور پر ہے جب کہ شریر وبدکار لوگوں کی کثرت اور ان کا غلبہ ہو اور صالح ونیک لوگوں کی طاقت بہت کم ہو۔

"اپنی زبان کو قابو میں رکھو" کا مطلب یہ ہے کہ جب پورے ماحول میں برائیوں کا دور دورہ ہو جاتا ہے اور شریر وبدکار لوگوں کے اثرات غالب ہوتے ہیں تو زبان سے اچھی بات نکالنا بھی ایک جرم بن جاتا ہے، لہٰذا تم اس وقت لوگوں کے احوال ومعاملات کے بارے میں بالکل خاموشی اختیار کئے رکھنا، کسی کی برائی یا بھلائی میں اپنی زبان نہ کھولنا تاکہ تمہاری بات کا برا ماننے والے لوگ تمہیں تکلیف وایذا نہ پہنچائیں۔

اس موقع پر ایک خاص بات یہ ذہن میں رکھنے کی ہے کہ پر فتن دور کے سلسلے میں ایک حدیث تو یہ ہے اور ایک حدیث پیچھے گزری ہے جس کو حضرت حذیفہؓ نے نقل کیا ہے، ان دونوں میں ایک طرح سے تضاد نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ اس حدیث میں تو آنحضرت ﷺ نے گویا حضرت عبداللہ ابن عمرو کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ اس پر فتن ماحول میں بھی لوگوں کے درمیان بود وباش رکھنے سے پرہیز نہ کریں اور دنیا والوں سے مکمل یکسوئی علیحدگی اختیار نہ کریں، نیز ان کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ صرف اپنے نفس کے تزکیہ واصلاح اور اپنی دینی زندگی کو سدھارنے سنوارنے لگے رہیں، عوام الناس کے معاملات سے کوئی سروکار نہ رکھیں اور ان کے حالات واعمال کے تئیں کوئی فکر نہ کریں۔ اس کے برخلاف آپ ﷺ نے حضرت حذیفہؓ کو یہ حکم دیا کہ وہ ایسے ماحول میں بود وباش نہ رکھیں اور لوگوں سے مکمل علیحدگی ویکسوئی اختیار کر کے کسی ویرانہ وجنگل میں چلے جائیں دونوں حدیثوں کے اسی ظاہری تضاد کو دور کرنے کے لئے علماء نے لکھا ہے کہ ایک صورت حال کے لئے اس دو طرح کے حکم کا تعلق دراصل شخصی حالت کی رعایت ومصلحت کے اعتبار سے ہے، یعنی آپ ﷺ نے ان دونوں میں سے ہر ایک کو وہ حکم دیا جو اس کی حالت وحیثیت کے مطابق تھا، جس میں اس کی اصلاح پوشیدہ تھی اور جس پر عمل کر کے وہ نجات وفلاح کی راہ پا سکتا تھا جیسا کہ مرشد ومصلح کا طرز اصلاح ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیرو اور مرید کے ذہن ومزاج اور اس کے طبعی وشخصی حیثیت وحالت کے مطابق ہی اس کو تلقین وہدایت کرتا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمروؓ جیسا کہ معلوم ہے نہایت اونچے درجے کے صحابی ہیں، ان کی زندگی پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ

انتہائی عظمت و فضیلت کے حامل تھے، منقول ہے کہ وہ اپنی جوانی کے دنوں میں بھی اتنے عابد و زاہد تھے کہ افطار کئے بغیر مسلسل روزے رکھا کرتے تھے، رات بھر سوتے نہیں تھے بلکہ عبادت الٰہی میں مشغول رہتے تھے، دنیاوی لذات و خواہشات سے اس قدر متنفر تھے کہ بیوی تک کی طرف کوئی رجحان نہیں رکھتے تھے! ایک دن ان کے والد محترم حضرت عمرو بن عاصؓ ان کو آنحضرت ﷺ کے پاس لے کر آئے اور ان کی اس عبادت و ریاضت کا حال بیان کیا، آنحضرت ﷺ نے ان کو اتنی سخت ریاضت اور اتنی زیادہ عبادت سے منع کیا اور حکم فرمایا کہ بلا افطار تین دن سے زیادہ روزے نہ رکھا کرو اور پوری رات کے بس تہائی یا چھٹے حصے میں شب بیداری کیا کرو، نیز آپ ﷺ نے ان کو یہ بھی نصیحت کی کہ اپنے بزرگوار باپ کی مرضی و منشاء کا ہمیشہ لحاظ رکھنا۔ چنانچہ حضور ﷺ کی اس وصیت و نصیحت کی بنا پر انہوں نے ملت میں تفرقہ و انتشار کے سخت ترین فتنے کے دور میں بھی اپنے والد بزرگوار سے علیحدگی و جدائی اختیار نہیں کی، جو حضرت امیر معاویہؓ کے مشیر اعلیٰ اور وزیر تھے، اور جیسا کہ حضور ﷺ نے ان کو حکم فرمایا تھا، وہ لوگوں کے معاملات و حالات سے بے پرواہ ہو کر اپنی ذات کی اصلاح اور اپنی استقامت کی طرف متوجہ رہتے، جب ان کے والد حضرت عمرو ان سے کہا کرتے کہ تم ہم میں سے ہونے کے باوجود ہم سے الگ الگ کیوں رہتے ہو، اور ہماری کاروائیوں میں کیوں شریک نہیں ہوتے؟ تو وہ جواب دیتے کہ "آپ لوگوں کے اچھے کاموں میں تو شریک ہوں لیکن ان کاموں میں خود کو شریک نہیں کر سکتا جو میرے نزدیک خدا اور اس کے رسول کی مرضی و منشاء کے منافی و ملی مفاد کے خلاف ہیں۔ نیز ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بڑے سے بڑے فتنے کے وقت بھی ان کے دل سے اہل بیت نبوی ﷺ کی عزت و احترام کا جذبہ کسی بھی طرح سے کم ہوا ہو، ان کا باطن ہمیشہ اہل بیت کی محبت و عظمت سے منور رہا۔

قیامت سے پہلے ظاہر ہونے والے فتنوں کی پیشگوئی

(۲۰) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ اِنَّ بَیْنَ یَدَیِ السَّاعَةِ فِتَنًا کَقِطَعِ اللَّیْلِ الْمُظْلِمِ یُصْبِحُ الرَّجُلُ فِیْهَا مُؤْمِنًا وَیُمْسِیْ کَافِرًا وَیُمْسِیْ مُؤْمِنًا وَیُصْبِحُ کَافِرًا اَلْقَاعِدُ فِیْهَا خَیْرٌ مِّنَ الْقَائِمِ وَالْمَاشِیْ فِیْهَا خَیْرٌ مِّنَ السَّاعِیْ فَکَسِّرُوْا فِیْهَا قِسِیَّکُمْ وَقَطِّعُوْا فِیْهَا اَوْتَارَکُمْ وَاضْرِبُوْا سُیُوْفَکُمْ بِالْحِجَارَةِ فَاِنْ دُخِلَ عَلٰی اَحَدٍ مِّنْکُمْ فَلْیَکُنْ کَخَیْرِ ابْنَیْ اٰدَمَ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَفِیْ رِوَایَةٍ لَهٗ ذُکِرَ اِلٰی قَوْلِهٖ خَیْرٌ مِّنَ السَّاعِیْ ثُمَّ قَالُوْا فَمَا تَاْمُرُنَا قَالَ کُوْنُوْا اَحْلَاسَ بُیُوْتِکُمْ وَفِیْ رِوَایَةِ التِّرْمِذِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِی الْفِتْنَةِ کَسِّرُوْا فِیْهَا قِسِیَّکُمْ وَقَطِّعُوْا فِیْهَا اَوْتَارَکُمْ وَالْزَمُوْا فِیْهَا اَجْوَافَ بُیُوْتِکُمْ وَکُوْنُوْا کَابْنِ اٰدَمَ وَقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ غَرِیْبٌ۔

"اور حضرت ابوموسیٰؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا "قیامت آنے سے پہلے فتنے ظاہر ہوں گے جو اندھیری رات کے ٹکڑوں کے مانند ہوں گے، ان فتنوں کے زمانے میں آدمی صبح کو ایمان کی حالت میں اٹھے گا اور شام کو کافر ہو جائے گا، شام کو مؤمن ہو گا تو صبح کو کفر کی حالت میں اٹھے گا۔ (ان فتنوں کے وقت) بیٹھا ہوا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہو گا اور چلنے والا شخص دوڑنے والے سے بہتر ہو گا! پس (جب تم ان فتنوں کا زمانہ پاؤ تو) اپنی کمانوں کو توڑ ڈالنا، کمانوں کے چلوں کو کاٹ ڈالنا اور اپنی تلواروں کو پتھر پر دے مارنا (یعنی ان کے دھار کو کند و بیکار کر دینا) اور جب تم میں سے کوئی شخص کسی کو مارنے کے لئے آئے تو اس کو چاہئے کہ وہ (حملہ آور کا مقابلہ کرنے اور اس سے لڑنے کی بجائے) آدم کے دو بیٹوں میں سے بہترین بیٹے کی مانند ہو جائے۔ (ابوداؤد) اور ابوداؤد کی ایک اور روایت میں خیر من الساعی (یعنی چلنے والا شخص دوڑنے والے سے بہتر ہو گا) کے الفاظ نقل کرنے کے بعد پھر یوں نقل کیا گیا ہے کہ صحابہؓ نے (یہ ارشاد گرامی سن کر) عرض کیا کہ تو آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ (یعنی ہمیں ہدایت دیجئے کہ اس وقت ہم کیا کریں اور ان فتنوں میں کس طرح زندگی گذاریں؟) آپ ﷺ نے فرمایا "تم اپنے گھروں کے ٹاٹ بن جانا" نیز ترمذیؒ کی روایت اس طرح ہے کہ حضور ﷺ نے فتنہ کے بارے میں یہ ہدایت فرمائی کہ "تم فتنوں کے زمانہ میں اپنی کمانوں کو توڑ ڈالنا اور ان کے چلے کاٹ ڈالنا، نیز گھروں میں پڑے رہنے کو لازم

کرلینا (یعنی اشد ضرورت کے علاوہ باہر نہ نکلنا اور اپنا سارا وقت گھروں میں گذارنے کے ذریعے لوگوں سے یکسوئی اختیار کئے رہنا تاکہ ان فتنوں کے برے اثرات سے محفوظ رہو) اور تم آدم کے بیٹے (ہابیل) کی طرح (مظلوم) بننا گوارہ کرلینا (لیکن دفاع کی خاطر بھی کسی پر تلوار نہ اٹھانا)۔ اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کر کے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح غریب ہے۔"

تشریح: "جو اندھیری رات کے ٹکڑوں کے مانند ہوں گے" کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے باہمی قتل وقتال اور خونریزی کی صورت میں وہ فتنے اتنے زیادہ ہیبتناک اور اس قدر شدید ہوں گے کہ دین وملت کا مستقبل تاریک تر نظر آنے لگے گا، اور اس وقت نیک وبد کے درمیان امتیاز کرنا اس طرح ناممکن ہو جائے گا جس طرح کہ اندھیری رات میں کسی کو شناخت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

"آدمی صبح کو ایمان کی حالت میں اٹھے گا الخ" کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے عقائد ونظریات اقوال واحوال اور طور طریقوں میں ساعت بساعت تبدیلی ہوتی رہے گی، کبھی کسی نظریہ وعقیدہ کے حامل ہوں گے، کبھی کسی کے، ایک وقت میں کوئی عہد وپیمان کریں گے اور دوسرے وقت میں اس سے منحرف ہو جائیں گے، کبھی دیانت وامانت پر چلنے لگیں گے اور کبھی بددیانتی وخیانت پر اتر آئیں گے کبھی سُنّت پر عمل کرتے نظر آئیں گے اور کبھی بدعت کی راہ پر چلتے دکھائی دیں گے، کسی وقت ایمان ویقین کی دولت سے مالامال ہوں گے اور کسی وقت تشکیک واوہام اور کفر کے اندھیروں میں بھٹکنے لگیں گے، غرض یہ کہ ہر ساعت اور ہر لمحہ تبدیلی پیدا ہوتی نظر آئے گی اور اس امر کا یقین کرنا دشوار ہوگا کہ کسی شخص کی اصل کیفیت وحالت کیا ہے۔

"بیٹھا ہوا شخص کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا الخ" کا اصل مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ جو شخص ان فتنوں سے جتنا زیادہ دور ہوگا وہ اس شخص سے اتنا ہی زیادہ بہتر ہوگا جو ان فتنوں کے قریب ہوگا! اس جملے کی تفصیلی وضاحت پہلی فصل میں کی جاچکی ہے۔

"کمانوں کے چلوں کو کاٹ ڈالنا" یہ حکم گویا پہلے حکم یعنی "اپنی کمانوں کو توڑ ڈالنا" کو مؤکد کرنے اور مقصد کو زیادہ سے زیادہ اہمیت کے ساتھ اور پرزور انداز میں بیان کرنے کے لئے ہے، کیونکہ کمانوں کے ٹوٹ جانے کے بعد ان کے چلے اگر باقی بھی رہیں تو وہ (کمانیں) قطعی کارگر نہیں ہوسکتیں، لہٰذا کمانوں کے توڑ دینے کے حکم کے بعد ان کے چلوں کو کاٹ دینے کا حکم، محض زور بیان اور تاکید حکم کے لئے ہے۔

"آدم کے دو بیٹوں میں سے بہترین بیٹے کی مانند ہو جائے" کا مطلب یہ ہے اس طرح آدم کے ایک بیٹے ہابیل نے مظلومیت کی موت کو گوارا کرلیا تھا لیکن اس نے آدم کے دوسرے بیٹے (یعنی اپنے بھائی قابیل کے جملے کا جواب نہیں دیا اور سارا ظلم اور تمام زیادتی اسی کے سر ڈال دی تھی، اسی طرح فتنوں کے وقت کوئی شخص تم پر حملہ بھی کرے اور تمہیں قتل بھی کردینا چاہے تو تم اس کا مقابلہ ہرگز نہ کرنا اور اس کے ہاتھوں مرجانے کو صبر وضبط کے ساتھ گوارا کرلینا، کیونکہ اگر تم اس کا مقابلہ کروگے تو اس کی وجہ سے فتنہ میں اور زیادہ شدت پیدا ہو جائے گی اور خونریزی بڑھ جائے گی، پس اس وقت اپنے حملہ آور کا مقابلہ کئے بغیر شہید ہو جانا، مقابلہ کرنے اور خونریزی میں کسی بھی طرح سے شرکت کر کے اپنی جان کو بچالینے سے کہیں زیادہ بہتر ہوگا۔

"تم اپنے گھروں کے ٹاٹ بن جانا" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کسی اچھے فرش، جیسے قالین وغیرہ کے نیچے جو ٹاٹ بچھا ہوتا ہے وہ ہمیشہ اور ہر وقت اپنی جگہ پڑا رہتا ہے اسی طرح تم بھی اپنے گھروں میں پڑے رہا کرنا اور مکان کی چار دیواری سے باہر نکل کر ادھر ادھر نہ جانا تاکہ تم اس فتنے میں مبتلا نہ ہوجاؤ اور اس کے اثرات تمہارے دین کو تباہ نہ کردیں! حاصل یہ کہ فتنہ انگیزی کی جگہ سے دور رہنا، لوگوں کے معاملات وکاروبار سے بے تعلقی ویکسوئی اختیار کرلینا، اور گوشہ عافیت میں پڑے رہ کر اپنے دین کی حفاظت کرنا، اس وقت نجات کی بہترین راہ ہوگی جب کہ مسلمانوں کے باہمی قتل وقتال، افتراق وانتشار اور مناقشت ومنافقت کا فتنہ پھیل جائے۔

فتنوں کے وقت سب سے بہتر شخص کون ہوگا؟

(۲۱) وَعَنْ اُمِّ مَالِكِ الْبَهْزِيَّةِ قَالَتْ ذَكَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِتْنَةً فَقَرَّبَهَا قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ خَيْرُ

النَّاسِ فِيْهَا قَالَ رَجُلٌ فِيْ مَاشِيَتِهِ يُؤَدِّيْ حَقَّهَا وَيَعْبُدُ رَبَّهُ وَرَجُلٌ اٰخِذٌ بِرَاسِ فَرَسِهِ يُخِيْفُ الْعَدُوَّ وَيُخَوِّفُوْنَهُ۔

(رواہ الترمذی)

"اور حضرت اُمِّ مالک بہزیہؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن جب) رسول کریم ﷺ نے فتنہ کا ذکر فرمایا اور اس کو قریب تر کیا تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! اس فتنے کے زمانے میں سب سے بہتر کون شخص ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس زمانے میں سب سے بہتر شخص وہ ہوگا جو اپنے مویشیوں (کی دیکھ بھال اور ان کے گھاس چارے کے انتظام) میں (مصروف) رہے، ان کا حق ادا کرے (یعنی ان پر جو زکوٰۃ اور شرعی ٹیکس وغیرہ واجب ہو، اس کو ادا کرے) اور اپنے رب کی بندگی میں مشغول رہے! اور وہ شخص بھی سب سے بہتر ہوگا جو اپنے گھوڑے کا سر (یعنی اپنے گھوڑے کی پشت پر سوار اس کی باگ) پکڑے (کھڑا) ہو اور دشمنان دین کو خوف زدہ کرتا ہو اور دشمن اس کو ڈراتے ہوں۔"

(ترمذیؒ)

تشریح: بَهْزِيه (بؔ کے زبر اور ہؔ کے جزم کے ساتھ) ابن امراء القیس کی طرف منسوب ہے، حضرت اُمِّ مالکؓ ایک صحابیہ ہیں اور حجازیہ کہلائی جاتی ہیں۔

"اور اس کو قریب تر کیا" کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جب اس فتنہ کا ذکر فرمایا تو اس بات سے باخبر کیا کہ وہ فتنہ بالکل قریب ہے اور سامنے آنے والا ہے! اور طیبیؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ نے اس فتنہ کو بہت تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا اور چونکہ یہ ایک عالم اسلوب ہے کہ جب کوئی شخص کسی کے سامنے کسی چیز کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے اور اس کی خصوصیات و علامات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت کے ساتھ واضح کرتا ہے تو گویا وہ اس چیز کو مخاطب کے ذہن، یا مشاہدہ کے قریب تر کر دیتا ہے، چنانچہ وہ (مخاطبہ اس چیز کو نہ صرف اپنے ذہن و خیال میں جاگزیں پاتا ہے بلکہ وہ خارج میں بھی ایسا محسوس کرنے لگتا ہے جیسے وہ چیز اپنی شکل و صورت کے ساتھ اس کے بالکل قریب موجود ہے۔

"جو شخص اپنے مویشیوں میں رہے" کا مطلب یہ ہے کہ اس فتنہ کے زمانے میں (جب کہ مسلمانوں کے باہمی قتل و قتال اور محاذ آرائی کا بازار گرم ہو جائے گا) فلاح یاب شخص وہی ہوگا جو فتنوں کی باتوں سے لاتعلق، اور دنیا والوں سے بیگانہ رہ کر اور گوشہ عافیت اختیار کر کے بس اپنے جائز کاروبار میں مشغول اور اپنے معاملات کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوگا، اس پر اس کے کاروبار اور معاملات کے تئیں شریعت کے جو حقوق عائد ہوتے ہوں ان کو ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرے گا اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ اور اس کی عبادت میں منہمک رہے گا۔ یہ ارشاد گرامی گویا قرآن کریم کی ان آیات فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ۔ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا اور وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

"جو اپنے گھوڑے کا سر پکڑے ہو الخ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اس فتنہ و فساد میں الجھنے اور آپس میں ہی ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونے کے بجائے، اپنی طاقت و توانائی ان لوگوں کے خلاف استعمال کرنے کی طرف متوجہ ہو جو دین اسلام کے اصل دشمن و مخالف ہیں اور ان سے نبرد آزمائی میں لگ جائے یہ چیز نہ صرف یہ کہ دین و ملت کی اصل خدمت ہونے کی وجہ سے اجر و ثواب کا مستحق بنائے گی بلکہ اس فتنہ سے بچانے کا بہترین ذریعہ بھی ثابت ہوگی۔

فتنہ کا ذکر

(۲۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَتَكُوْنُ فِتْنَةٌ تَسْتَنْظِفُ الْعَرَبَ قَتْلَاهَا فِي النَّارِ اللِّسَانُ فِيْهَا اَشَدُّ مِنْ وَقْعِ السَّيْفِ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "عنقریب ایک بڑا فتنہ ظاہر ہونے والا ہے جو پورے

عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا (اور اس کے بڑے اثرات ہر ایک تک پہنچیں گے) اس فتنہ میں قتل ہو جانے والے لوگ (بھی دوزخ میں جائیں گے، نیز اس فتنہ کے وقت زبان کھولنا (یعنی کسی کو برا بھلا کہنا اور عیب جوئی و نکتہ چینی کرنا) تلوار مارنے سے بھی زیادہ سخت مضر ہو گا۔" (ترمذیؒ، ابن ماجہؒ)

تشریح: اس فتنہ سے مراد باہمی قتل و قتال اور لوٹ مار کا وہ فتنہ ہے جو مختلف گروہ، حق و سچائی کو ثابت کرنے اور دین کا جھنڈا بلند کرنے اور حق و انصاف کی مدد کے لئے نہیں بلکہ محض جاہ اقتدار اور دولت و سلطنت حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرا ہوں گے اور آپس میں قتل و قتال اور لوٹ مار کا بازار گرم کریں گے جیسا کہ کسی ملک میں خانہ جنگی کے وقت ہوتا ہے کہ لوگ کسی پاک مقصد اور دینی فرض کے بغیر محض ذاتی اغراض و خواہشات اور دیگر غیر دینی اسباب و عوامل کے تحت اندھا دھند آپس میں ایک دوسرے کا خون بہانے اور ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے لگتے ہیں۔

اس وضاحت سے یہ بات بھی صاف ہو گئی کہ اس فتنہ کے مقتولین بھی دوزخ میں کیوں جائیں گے، چنانچہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جو شخص خانہ جنگی میں مبتلا ہو کر لوٹ مار کی خاطر کسی سے لڑے اور اس لڑائی کے دوران مارا جائے تو وہ نہ شہید کہلاتا ہے اور نہ اس کی موت کوئی با مقصد موت کہلاتی ہے بلکہ وہ ایک ایسی موت کے ہاتھوں مرتا ہے جو دین و شریعت کے تقاضوں اور اسلامی احکام کے خلاف جنگ وجدل کی صورت میں آتی ہے لہٰذا جس طرح ناحق خون بہانے والا قاتل دوزخ میں جائے گا اسی طرح وہ مقتول بھی دوزخ کی آگ کا مستوجب ہو گا۔

(۲۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سَتَکُوْنُ فِتْنَةٌ صَمَّاءُ بُکْمَاءُ وَعُمْیَاءُ مَنْ اَشْرَفَ لَهَا اِسْتَشْرَفَتْ لَهٗ وَاِشْرَافُ اللِّسَانِ فِیْهَا کَوُقُوْعِ السَّیْفِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "عنقریب گونگے، بہرے اور اندھے فتنے کا ظہور ہو گا، جو شخص اس فتنہ کو دیکھے گا اور اس کے قریب جائے گا، وہ فتنہ اس کو دیکھے گا اور اس کے قریب آجائے گا، نیز اس فتنہ کے وقت زبان درازی، تلوار مارنے کی مانند ہو گی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: فتنہ کو گونگا اور بہرہ کہنا، لوگوں کے اعتبار سے ہے، یعنی وہ فتنہ اتنا سخت اور اس قدر ہیبت ناک ہو گا کہ عام لوگ اس وقت حیران و سراسیمہ ہو کر رہ جائیں گے، نہ کوئی فریاد رس نظر آئے گا کہ جس سے کوئی شخص گلو خلاصی کی درخواست کر سکے اور نہ کسی کو نجات دلا سکے اور نہ کوئی ایسی راہ دکھائی دے گی جس کے ذریعے اس فتنہ سے نجات اور خلاصی پائی جا سکے۔ یا مطلب یہ ہے کہ اس فتنے کے وقت لوگ حق و باطل اور نیک و بد کے درمیان تمیز نہیں کریں گے۔ وعظ و نصیحت کو سننا اور اس پر عمل کرنا گوارہ نہیں کریں گے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی باتوں پر دھیان نہیں دیں گے، جو شخص ان کو نیک باتوں کی طرف بلائے گا اور زبان سے حق بات نکالے گا اس کو روحانی و جسمانی اذیتوں میں مبتلا کریں گے اور اس کے ساتھ نہایت تکلیف دہ اور پریشان کن سلوک کریں گے۔

"جو شخص اس فتنہ کو دیکھے گا الخ" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس فتنہ کی باتوں کی طرف متوجہ رہے گا اور ان لوگوں کی قربت و ہمنشینی اختیار کرے گا جو اس فتنہ کا باعث ہوں گے، تو اس شخص کا اس فتنہ سے محفوظ رہنا اور اس کے برے اثرات کے چنگل سے بچ نکلنا ممکن نہیں ہو گا، اس کے برخلاف جو شخص اس فتنہ سے دور اور فتنہ پردازوں سے بے تعلق رہے گا وہ فلاح یاب ہو گا۔

"زبان درازی تلوار مارنے کی مانند ہو گی" کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت چونکہ لوگوں میں تعصب و عداوت، ضد و ہٹ دھرمی اور حق کو قبول نہ کرنے پر اصرار بہت زیادہ ہو گا اس لئے وہ کسی کی زبان سے کوئی ایسی بات سننا بھی گوارا نہیں کریں گے جو ان کی مرضی و منشاء کے خلاف ہو گی۔ لہٰذا اس فتنہ میں زبان کھولنے والا گویا خون ریزی کو دعوت دے گا۔ اور یہ بات تو بالکل ظاہر ہے کہ بعض وقت زبان سے نکلا ہوا لفظ اپنی تاثیر کے اعتبار سے تلوار کی دھار سے بھی زیادہ سخت وار کر جاتا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

جراحات السنان لها التئام ولا يلتام ماجرح اللسان

"نیزے کے پھل کا زخم مندمل ہو جاتا ہے، لیکن زبان کے گھاؤ کو کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔"

چند فتنوں کے بارے میں پیشن گوئی

(۲۴) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا قُعُوْدًا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ الْفِتَنَ فَاَكْثَرَ فِيْ ذِكْرِهَا حَتّٰى ذَكَرَ فِتْنَةَ الْاَحْلَاسِ فَقَالَ قَائِلٌ وَمَا فِتْنَةُ الْاَحْلَاسِ قَالَ هِيَ هَرَبٌ وَحَرَبٌ ثُمَّ فِتْنَةُ السَّرَّاءِ دَخَنُهَا مِنْ تَحْتِ قَدَمَيْ رَجُلٍ مِنْ اَهْلِ بَيْتِيْ يَزْعَمُ اَنَّهُ مِنِّيْ وَلَيْسَ مِنِّيْ اِنَّمَا اَوْلِيَائِيَ الْمُتَّقُوْنَ ثُمَّ يَصْطَلِحُ النَّاسُ عَلٰى رَجُلٍ كَوَرِكٍ عَلٰى ضِلَعٍ ثُمَّ فِتْنَةُ الدُّهَيْمَاءِ لَاتَدَعُ اَحَدًا مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا لَطَمَتْهُ لَطْمَةً فَاِذَا قِيْلَ انْقَضَتْ تَمَادَتْ يُصْبِحُ الرَّجُلُ فِيْهَا مُؤْمِنًا وَيُمْسِيْ كَافِرًا حَتّٰى يَصِيْرَا النَّاسُ اِلٰى فُسْطَاطَيْنِ فُسْطَاطِ اِيْمَانٍ لَانِفَاقَ فِيْهِ وَفُسْطَاطِ نِفَاقٍ لَااِيْمَانَ فِيْهِ فَاِذَا كَانَ ذٰلِكَ فَانْتَظِرُوْا الدَّجَّالَ مِنْ يَوْمِهٖ اَوْ مِنْ غَدِهٖ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم نبی کریم ﷺ کی مجلس مبارک میں بیٹھے ہوئے۔ آپ ﷺ نے (آخر زمانہ میں ظاہر ہونے والے) فتنوں کا ذکر شروع فرمایا اور بہت سارے فتنوں کو بیان کیا، یہاں تک کہ فتنہ احلاس کا ذکر فرمایا۔ ایک شخص نے پوچھا کہ احلاس کا فتنہ کیا ہے (یعنی اس فتنہ کی کیا نوعیت ہوگی اور وہ کس صورت حال میں ظاہر ہوگا؟) آپ ﷺ نے فرمایا۔ "وہ بھاگنا، اور مال کا ناحق لینا ہے (یعنی اس فتنہ کی صورت یہ ہوگی کہ لوگ آپس میں سخت بغض وعداوت رکھنے اور باہمی نفرت ودشمنی کی وجہ سے ایک دوسرے سے بھاگیں گے، کوئی کسی کی صورت دیکھنے اور کسی کے ساتھ نباہ کرنے کا روادار نہیں ہوگا، ایک دوسرے کے مال کو زبردستی چھین لینے اور ایک دوسرے کا ہڑپ کر لینے کا بازار گرم ہوگا) اور پھر سراء کا فتنہ ہے، اس فتنہ کی تاریکی اور تباہی اس شخص کے قدموں کے نیچے سے نکلے گی (یعنی اس فتنہ کا بانی وہ شخص ہوگا) جو میرے اہل بیت میں سے ہوگا، اس شخص کا گمان تو یہ ہوگا کہ وہ (فعل وکردار کے اعتبار سے بھی) میرے اہل بیت میں سے ہے لیکن حقیقت یہ ہوگی کہ وہ) خواہ نسب کے اعتبار سے بھلے ہی میرے اہل بیت میں سے ہو مگر فعل وکردار کے اعتبار سے) میرے اپنوں میں سے (ہرگز) نہیں ہوگا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میرے دوست اور میرے اپنے تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو پرہیزگار ہوں۔ پھر اس فتنہ کے بعد لوگ ایسے شخص کی بیعت پر اتفاق کریں گے جو پسلی کے اوپر کولہے کی مانند ہوگا، پھر دہیماء کا فتنہ ظاہر ہوگا۔ اور وہ فتنہ اس امت میں سے کسی ایسے شخص کو نہیں چھوڑے گا جس پر اس کا طمانچہ، طمانچہ کے طور پر نہ لگے (یعنی وہ فتنہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہوگا کہ اُمت کے ہر شخص تک اس کے برے اثرات پہنچیں گے اور ہر مسلمان اس کے ضرر ونقصان میں مبتلا ہوگا) اور جب کہا جائے گا کہ یہ فتنہ ختم ہوگیا ہے تو اس کی مدت کچھ اور بڑھ جائے گی (یعنی لوگ یہ گمان کریں گے کہ فتنہ ختم ہوگیا ہے مگر حقیقت میں وہ ختم کی حد تک پہنچا ہوا نہیں ہوگا بلکہ کچھ اور طویل ہوگیا ہوگا، یہ اور بات ہے کہ کسی وقت اس کا اثر کچھ کم ہو جائے، جس سے لوگ اس کے ختم ہو جانے کا گمان کرنے لگیں لیکن بعد میں پھر بڑھ جائے گا) اس وقت آدمی صبح کو ایمان کی حالت میں اٹھے گا اور شام کو کافر ہو جائے گا (یعنی اس فتنہ کے اثرات سے لوگوں کے دل ودماغ کی حالت وکیفیت میں اس قدر تیزی کے ساتھ تبدیلی پیدا ہوتی رہے گی کہ مثلاً ایک شخص صبح کو اٹھے گا تو اس کا ایمان وعقیدہ صحیح ہوگا اور اس پختہ اعتقاد کا حامل ہوگا کہ کسی مسلمان بھائی کا خون بہانا یا اس کی آبروریزی کرنا اور یا اس کے مال واسباب کو ہڑپ کرنا ونقصان پہنچانا مطلقاً حلال نہیں ہے مگر شام ہوتے ہوتے اس کے ایمان وعقیدہ میں تبدیلی آجائے گی اور وہ اپنے قول وفعل سے یہ ثابت کرنے لگے گا کہ گویا اس کے نزدیک کسی مسلمان بھائی کا خون بہانا، اس کی آبروریزی کرنا اور اس کے مال وجائیداد کو ہڑپ کرنا ونقصان پہنچانا جائز وحلال ہے، اس طرح وہ جو صبح کے وقت مؤمن تھا شام کو اس عقیدے کی تبدیلی کی وجہ سے کافر ہو جائے گا، اور یہ صورت حال جاری رہے گی تاکہ لوگ خیموں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک خیمہ ایمان کا ہوگا کہ اس میں نفاق نہیں ہوگا اور ایک خیمہ

نفاق کا ہوگا کہ اس میں ایمان نہیں ہوگا! جب یہ بات ظہور میں آجائے تو پھر اس دن یا اس کے اگلے دن دجال کے ظاہر ہونے کے منتظر رہنا۔" (ابوداؤد)

تشریح: "فتنہ احلاس" سے مراد یہ ہے کہ وہ فتنہ عرصہ دراز تک قائم رہے گا اور اس کے اثرات اُمت کے لوگوں کو بہت طویل عرصے تک مختلف آفات اور پریشانیوں میں مبتلا رکھیں گے۔ واضح رہے کہ احلاس اصل میں حلس کی جمع ہے اور حلس اس ٹاٹ کو کہتے ہیں جو کسی عمدہ فرش جیسے قالین وغیرہ کے نیچے زمین پر بچھا رہتا ہے اور وہ ہمیشہ اپنی جگہ پر پڑا رہتا ہے۔ یا حلس اس کملی کو کہتے ہیں جو پالان کے نیچے اونٹ کی پیٹھ پر ڈالی جاتی ہے! پس اس فتنہ کو فتنہ احلاس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح کسی اچھے فرش کے نیچے کا ٹاٹ مستقل طور پر اپنی جگہ پڑا رہتا ہے وہاں سے اٹھایا نہیں جاتا، اسی طرح وہ فتنہ بھی لوگوں کو چھوڑنے والا نہیں، بلکہ برابر قائم رہے گا اور اس کے برے اثرات بہت دنوں تک لوگوں کو مبتلا رکھیں گے۔ یا یہ کہ اس فتنہ کو ظلمت وتاریکی اور برائی کے طور پر حلس سے تشبیہ دی گئی ہے اور یا یہ کہ اس فتنہ کو فتنہ احلاس فرما کر، اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ جس طرح ٹاٹ ہمیشہ بچھا رہتا ہے اور اس کو اپنی جگہ سے ہٹایا نہیں جاتا اسی طرح لوگوں کو بھی چاہئے کہ اس فتنہ کے دوران اپنے گھروں میں پڑے رہنے کو لازم کرلیں اور گوشہ نشینی اختیار کرلیں۔

لفظ فتنۃ السراء رفع کے ساتھ ہے اور اس اعتبار سے یہ لفظ "ھرب" پر عطف ہے، یعنی جب کسی نے آپ ﷺ سے یہ پوچھا کہ فتنہ احلاس کی نوعیت وصورت کیا ہوگی تو آپ ﷺ نے گویا یہ فرمایا کہ وہ فتنہ ہرب وحرب اور سراء کی صورت میں ہوگا ہرب اور حرب کے معنی تو اوپر ترجمے میں واضح کئے جاچکے ہیں، یعنی باہمی عداوت ودشمنی اور بغض ونفرت کی وجہ سے ایک دوسرے سے دور بھاگنا اور کسی کا مال لوٹ لینا۔ اور سراء کے معنی یہ ہیں کہ وہ فتنہ اندر ہی اندر اسلام کی بیخ کنی کرے گا، یعنی کچھ لوگ ایسے پیدا ہوجائیں گے جو ظاہر میں اسلام اور مسلمانوں کی ہمدردی کا دعویٰ کریں گے مگر باطن میں اسلام اور مسلمانوں کی تباہی وبربادی چاہیں گے اور اپنی اس ناپاک خواہش کی تکمیل کے لئے طرح طرح کی سازشوں کے جال پھیلا کر مسلمانوں کو فتنہ وفساد میں مبتلا کریں گے! نہایہ میں لکھا ہے کہ سراء سے کنکریلا پتھریلا میدان مراد ہے، اس صورت میں فتنہ سراء سے واقعہ حرا کی طرف اشارہ مراد ہوگا جو یزید کی حکومت میں ہوا اور اس کی وجہ سے اہل مدینہ کا قتل عام ہوا، سینکڑوں صحابہ اور تابعین کو جام شہادت نوش کرنا پڑا اور حرم محترم کی سخت بربادی ہوئی! یہ معنی اس صورت میں ہوں گے جب کہ سراء کو پوشیدہ کے مفہوم میں لیا جائے! اگر یہ لفظ سرور وشادمانی کے مفہوم میں ہو تو اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ وہ فتنہ ایسے حالات پیدا کردے گا جس میں عیش وعشرت کی چیزوں کی فروانی ہوجائے گی، اور لوگ اسراف وتنعم کے ذریعے راحت وآرام اور سرور وشادمانی کی زندگی میں پڑ کر خدا اور آخرت کے خوف سے بے نیاز ہوجائیں گے۔ یا یہ کہ اس فتنہ کی وجہ سے چونکہ اسلام اور مسلمانوں کی شوکت کو دھچکا لگے گا اور ملت اسلامیہ بہت زیادہ نقصان وتباہی میں مبتلا ہوجائے گی لہٰذا یہ صورت حال اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کے لئے خوشی وشادمانی کا باعث بنے گی۔ اور ایک نسخے میں "فتنۃ السراء" کا لفظ نصب کے ساتھ ہے، اس صورت میں اس کا عطف فتنۃ الاحلاس پر ہوگا اور معنی یہ ہوں گے کہ آپ نے فتنہ احلاس کا ذکر فرمایا اور اس کے بعد فتنہ سراء کا ذکر کیا۔

"مگر وہ میرے اپنوں میں سے نہیں ہوگا" کا مطلب یہ ہے کہ خواہ وہ میرے اہل بیت میں سے ہونے کا کتنا ہی گمان رکھے اور اگرچہ نسب اور خاندان کے اعتبار سے وہ واقعۃً میرے اہل بیت میں سے کیوں نہ ہو لیکن وہ اپنے طور طریقوں اور اپنے فعل وکردار کے لحاظ سے میرے اپنوں میں سے یقیناً نہیں ہوگا کیونکہ وہ میرے اپنوں میں سے ہوتا تو روئے زمین پر فتنہ وفساد کے ذریعے میری اُمت کو نقصان وضرر میں مبتلا نہیں کرتا۔ اس ارشاد گرامی کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ (یقیناً وہ تمہارے اپنوں میں سے نہیں ہے) یا یہ کہ اس جملے کا یہ مطلب ہے کہ وہ شخص خواہ نسب کے اعتبار سے میرے خاندان سے کوئی تعلق کیوں نہ رکھے لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ میرے محبوب اور دوستوں میں سے نہیں ہوگا کیونکہ میرا محبوب اور دوست صرف وہی مسلمان ہوسکتا ہے جو تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرے اور کبھی بھی ایسے قول وفعل کا ارتکاب نہ کرے جس سے اسلام اور مسلمانوں کو ذرہ برابر بھی نقصان پہنچ سکتا ہو۔

اس کی تائید حدیث کے اگلے جملے سے بھی ہوتی ہے۔

"جو پسلی کے اوپر کولہے کی مانند ہو گا" اس جملے کے ذریعے گویا اس شخص کو ذہنی و عملی کج روی اور غیر پائیداری کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ جس طرح اگر کولہے کی ہڈی کو پسلی کی ہڈی پر چڑھا دیا جائے تو وہ کولہا اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتا اور پسلی کی ہڈی کے ساتھ اس کا جوڑ نہیں بیٹھ سکتا اسی طرح اگرچہ لوگ اس شخص کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کو اپنا امیر و حکمراں تسلیم کر لیں گے لیکن حقیقت میں وہ امارت و سرداری کے لائق نہیں ہوگا کیونکہ وہ علم و دانائی سے محروم ہوگا، آئین حکمرانی سے بے بہرہ ہوگا، قوت فیصلہ کی کمی اور رائے کی کمزوری میں مبتلا ہوگا، پس اس کا کوئی حکم اور کوئی فیصلہ، محل موقع کے مطابق نہیں ہوگا اور جب یہ صورت حال ہوگی تو سلطنت و مملکت کا سارا نظام انتشار و بدامنی اور سستی و کمزوری کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

"پھر دہیما کا فتنہ ظاہر ہوگا" کے سلسلے میں پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جس طرح فتنة الاحلاس کے دونوں اعراب، یعنی رفع اور نصب ذکر کئے گئے تھے اور ان میں سے ہر ایک کے مطابق معنی بیان کئے گئے تھے، اسی طرح فتنة الدهيما میں بھی فتنہ کے لفظ کے دونوں اعراب، یعنی رفع اور نصب میں دھیماء (دال کے پیش اور ہا کے زبر کے ساتھ) اصل میں لفظ دھماء کی تصغیر ہے جس کے معنی سیاہی اور تاریکی کے ہیں اور یہاں تصغیر کا اظہار مذمت و برائی کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ حاصل یہ کہ فتنہ احلاس کے بعد جو فتنہ ظاہر ہوگا وہ اپنے اثرات کی ظلمت کی اور قتل و غارت گری کی شدت کے اعتبار سے ایک سیاہ اور تاریک شب کی مانند ہوگا، اور جس کی سیاہ رات کی تاریکی ہر شخص کو اندھیرے میں مبتلا کر دیتی ہے اس طرح اس فتنہ کی ظلمت ہر شخص کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوگی اور ہر ایک کے قوائے فکر و عمل پر تاریک سایہ بن کر چھا جائے گی۔

"تا آنکہ لوگ دو خیموں میں تقسیم ہو جائیں گے" کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ کے لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے، ایک گروہ تو خالص ایمان والوں کا ہوگا کہ جن میں کفر اور نفاق کا نام نہ ہوگا اور ایک گروہ خالص کفر والوں کا ہوگا اور ان میں ایمان و اخلاص کا نام نہ ہوگا۔ اور بعض حضرات نے یہاں فسطاط کا ترجمہ "خیمہ" کے بجائے "شہر" کیا ہے یعنی اس زمانے کے لوگ دو شہر یا دو ملکوں میں تقسیم ہو جائیں گے کہ ایک شہر یا ایک ملک میں صرف خالص مسلمان و اہل ایمان ہوں گے اور ایک شہر یا ملک میں خالص کافر ہوں گے! واضح رہے کہ "فسطاط" اصل میں تو خیمے کو کہتے ہیں لیکن "شہر" پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے اور حدیث میں اس لفظ کا استعمال گویا اس اسلوب کے طور پر ہے کہ ذکر تو محل (رہنے کی جگہ) کا ہو، لیکن مراد حال (یعنی رہنے والوں کی حالت و کیفیت) ہو پس "لوگ دو خیموں یا دو شہروں میں تقسیم ہو جائیں گے" کا حاصل یہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا کے لوگ واضح طور پر دو طبقوں میں تقسیم ہو جائیں گے، ایک طبقہ اہل ایمان کا ہوگا اور ایک طبقہ اہل کفر کا ہوگا، اور ان دونوں طبقوں کے لوگ خواہ دنیا کے کسی حصے اور شہر میں سکونت پذیر ہوں اس موقع پر ایک یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ایک خیمہ نفاق کا ہوگا کہ اس میں ایمان نہیں ہوگا۔ تو اس خیمہ (یا اس طبقہ) کے لوگوں میں سے ایمان کی نفی، یا تو اصل کے اعتبار سے ہے یعنی اس خیمہ کے لوگوں میں سرے سے ایمان نہیں ہوگا یا کمال ایمان کی نفی بھی مراد ہے یعنی اس خیمہ (یا اس طبقہ میں) ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ظاہر کے اعتبار سے ایمان رکھتے ہوں، مگر اہل نفاق کے سے اعمال اختیار کرنے، یعنی جھوٹ بولنے، خیانت کرنے اور عہد شکنی وغیرہ کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے مخلص اہل ایمان کے زمرے سے خارج ہوں گے۔

"دجال کے ظاہر ہونے کے منتظر رہنا" کا مطلب یہ ہے کہ جب فتنہ دہیما ظاہر ہو جائے تو سمجھنا کہ دجال کا ظہور ہوا ہی چاہتا ہے، چنانچہ اس فتنہ کے فوراً بعد دجال ظاہر ہوگا، اس وقت حضرت مہدی رضی اللہ عنہ دمشق میں ہوں گے، دجال دمشق کے شہر کو گھیر لے گا، پھر حضرت عیسی علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے اور دجال ان کے مقابلے پر اس طرح گھل جائے گا۔ جس طرح پانی میں نمک گھل جاتا ہے، حضرت عیسی علیہ السلام اس کو اپنے نیزے سے موت کے گھاٹ اتار دیں گے اور اس کی موت سے ان کو بہت زیادہ خوشی حاصل ہوگی۔

طیبیؒ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ "فسطاط" شہر یا خیمے کو کہتے ہیں جس میں لوگ جمع ہوتے اور رہتے ہیں! نیز حدیث کے اس آخری جزو سے (کہ جس میں فسطاط کا ذکر ہے) یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ فتنہ آخر زمانے میں ظاہر ہوگا لیکن علماء نے پہلے ذکر کئے گئے فتنوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھا اور کہا ہے کہ یہ فتنے کب ظاہر ہوں گے اور کون سے واقعات ان کا مصداق ہیں خصوصاً فتنہ سراء کے بارے میں تو مکمل سکوت اختیار کیا گیا ہے اور اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے کہ اہل بیت نبوی ﷺ میں سے وہ کون شخص ہے جس کو اس فتنہ کا بانی کہا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن زبیر کی شہادت کا سانحہ اور اس کی تفصیل

یہ بات تو طیبیؒ نے لکھی ہے لیکن بعد کے علماء میں سے حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس حدیث میں مذکورہ فتنوں کے مصداق کا تعین کیا ہے چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے "فتنہ احلاس" کے ذریعے جس فتنہ کی طرف اشارہ فرمایا تھا وہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی شہادت کی صورت میں ظاہر ہوا ہے جب کہ وہ یزید ابن معاویہ کی خلافت کے اعلان کے بعد اس کی بیعت سے گریز کر کے مع اہل و عیال مدینہ سے نکل گئے اور مکہ آ گئے تھے پھر جب ۶۲ھ میں یزید ابن معاویہ نے اپنے خلاف اہل مدینہ کی تحریک کو کچلنے کے لئے مسلم ابن عقبہ کی کمان میں شامیوں کی ایک بڑی فوج مدینہ کی طرف روانہ کی تو مسلم نے اس شہر مقدس میں پہنچ کر بڑی تباہی پھیلائی اور اہل مدینہ کا قتل عام کرایا" یہ واقعہ حرہ" کے نام سے مشہور ہے، مسلم نے شامیوں کی یہ فتح یاب فوج لے کر پھر مکہ کا رخ کیا، مسلم اگرچہ خود مکہ تک نہیں پہنچ سکا کیونکہ وہ راستے ہی میں مرگیا تھا، البتہ اس کی فوج حصین ابن نمیر کی سرکردگی میں مکہ پہنچ گئی اور اس نے ایک دن کی جنگ کے بعد مکہ کا محاصرہ کرلیا، حصین ابن نمیر نے کوہ ابن قیس پر منجنیق نصب کر کے خانہ کعبہ پر سنگ باری کا سلسلہ بھی شروع کردیا اس محاصرے اور سنگ باری کے دوران، کہ جس کا سلسلہ ایک ماہ سے بھی زائد عرصے تک جاری رہا، اہل مکہ کو بڑی سخت تکلیفوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، اتفاق کی بات کہ اسی اثناء میں دمشق میں یزید کا انتقال ہوگیا اور ابن نمیر نے اس خبر کو سن کر محاصرہ اٹھالیا اور اپنی فوج کو لے کر دمشق کی طرف واپس روانہ ہوگیا، اس کے بعد حضرت عبداللہ ابن زبیر کی خلافت نہ صرف پورے حجاز میں قائم ہوگئی، بلکہ عراق اور مصر تک کے لوگوں نے ان کی خلافت کو تسلیم کرلیا یہاں تک کہ یزید ابن معاویہ کے جانشین معاویہ ابن یزید کی تقریباً دو ماہ کی مختصر خلافت کے بعد (جب کہ اس کا انتقال ہوگیا تھا) تو حضرت عبداللہ ابن زبیر پورے عالم اسلام کے خلیفہ تسلیم کرلئے گئے لیکن پھر چھ سات ماہ کے بعد مروان ابن حکم نے اپنی سازشوں اور کوششوں میں کامیاب ہو کر شام پر قبضہ جمالیا اور دمشق میں اپنی خلافت کا اعلان کردیا، شام کے بعد مصر اور عراق بھی حضرت زبیرؓ کی خلافت سے نکل گئے اسی دوران مروان ابن حکم مرگیا اور اس کا بیٹا عبدالملک ابن مروان اس کا جانشین ہوا، عبدالملک نے زبردست جنگی طاقت کے ذریعے تقریباً تمام ہی علاقوں سے حضرت زبیرؓ کی خلافت کو ختم کردیا اور آخر میں حجاج ابن یوسف کی کمان میں ایک لشکر جرار مکہ مکرمہ کی طرف روانہ کیا اور ۷۲ھ کے ماہ رمضان میں حجاج نے شہر مکہ کا محاصرہ کرلیا اور کوہ ابوقبیس پر منجنیق لگا کر سنگ باری شروع کردی، اور محاصرہ سنگ باری کا یہ سلسلہ ذی الحجہ تک جاری رہا، اس عرصے میں اہل مکہ کو بڑی زبردست مصیبت و پریشانی اور تباہی کا سامنا کرنا پڑا حج کے دنوں میں کچھ عرصے کے لئے سنگ باری بند ہوگئی اور حج ختم ہوتے ہی یہ سلسلہ پھر شروع ہوگیا جس کا نشانہ براہ راست خانہ کعبہ تھا جہاں حضرت عبداللہ محصور تھے اور آخری مرحلے پر حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے خانہ کعبہ سے نکل کر محض چند ساتھیوں کے ہمراہ شامیوں کے اس عظیم لشکر پر حملہ کیا اور بڑی بہادری کے ساتھ لڑتے رہے جب وہ چند ساتھی بھی ایک ایک کر کے کام آ گئے اور خود ان پر دشمنوں نے چاروں طرف سے پتھروں اور تیروں کی بارش شروع کردی تو دنیا کا یہ عظیم الشان بہادر و متقی انسان داد شجاعت دیتا ہوا بڑی مظلومیت کے ساتھ جمادی الثانی ۷۳ھ کی ایک خوں آشام تاریخ میں اس طرح شہید ہوا کہ اس وقت میدان جنگ میں بہادری و شجاعت، زہد و عبادت اور بہت و شرافت کے علاوہ کوئی انسان ان کی مبارک لاش پر کف افسوس ملنے والا بھی موجود نہیں تھا۔ یہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی شہادت کا وہ واقعہ ہے جس کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے

فتنہ احلاس کا مصداق قرار دیا ہے۔

فتنہ مختار کی تفصیل

"فتنہ سراء" کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ کا کہنا یہ ہے کہ یہ فتنہ بھی مختار کے فتنہ وفساد کی صورت میں ظہور پذیر ہو چکا ہے۔ مختار وہ شخص تھا جس نے پہلے تو مکر وفریب کے ذریعے پھر باقاعدہ جنگ کر کے اہل عراق پر تسلط حاصل کر لیا تھا اور اپنی اس کاروائی کے لئے حضرت محمد بن الحنفیہ کی اجازت اور اہل بیت نبوی ﷺ کی تائید ونصرت کا دعوی رکھتا تھا۔ اس کا واقعہ بھی تھوڑی سی تفصیل کا متقاضی ہے۔ اس شخص کا اصل نام مختار ابن عبیدہ ابن مسعود ثقفی تھا، کوفہ (عراق) میں رہتا تھا اور شیعان علی میں سے تھا حضرت امام حسینؓ نے اہل کوفہ کی دعوت پر جب کوفہ جانا طے کر لیا اور پہلے اپنے چچازاد بھائی مسلم ابن عقیل کو وہاں بھیجا تاکہ وہ پوشیدہ طور پر کوفہ میں کام کر کے لوگوں سے ان کے نام پر بیعت لیں تو مسلم ابن عقیل کوفہ پہنچ کر اسی مختار ابن عبیدہ کے مکان پر فروکش ہوئے تھے پھر اس سلسلے میں جو کچھ پیش آیا اور حادثہ کربلا واقع ہوا وہ سب بہت مشہور واقعات ہیں! کربلا میں شہادت حسین کے سانحہ کے بعد کوفہ میں ایک جماعت "توابین" کے نام سے معرض وجود میں آئی جس کا سردار سلیمان ابن صرد تھا یہ جماعت کوفہ کے ان لوگوں پر مشتمل تھی جو یہ کہا کرتے تھے کہ ہم لوگوں کی بے وفائی کی وجہ سے حضرت امام حسینؓ کو کربلا میں جام شہادت نوش کرنا پڑا اور ہم اپنے اس جرم کا اعتراف کرتے ہوئے تائب ہوتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ اس جرم کی تلافی کے طور پر خون حسین کا انتقام لیں گے اور ہر اس شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے، جس نے قتل حسین میں ذرا بھی حصہ لیا ہے۔ مختار ابن عبیدہ چونکہ پہلے ہی سے اپنی مختلف سازشوں کے ذریعے عراق پر قبضہ جمانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس مقصد کے لئے قاتلان حسین کے خلاف لوگوں کے جذبات بھڑکا کر انہیں اپنے گرد جمع کر رہا تھا، اس لئے اس نے توابین کی جماعت سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کر لیا اور جماعت کے لوگوں اور ان کے ہمنواؤں کو جمع کر کے کہا کہ تمہارا سردار سلمان تو ایک پست ہمت آدمی ہے، لڑنے سے جان چراتا ہے، لہٰذا امام مہدی محمد بن الحنفیہ نے جو حضرت امام حسینؓ کے بھائی ہیں مجھے اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے، تم لوگ میرے ہاتھ پر بیعت کر لو اور خون حسین کا بدلہ لینے کے لئے میرے جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ، چنانچہ کوفہ کے وہ تمام لوگ جو شیعان حسین کہلاتے تھے، مختار کے ہاتھ پر بیعت ہونے لگے اس وقت عراق پر حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی خلافت کا قبضہ تھا اور کوفہ میں ان کی طرف سے عبداللہ ابن یزید گورنر تھے انہیں جب مختار کی سرگرمیوں اور اس کے حقیقی ارادوں کا علم ہوا تو انہوں نے مختار کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا، لیکن توابین کی جماعت کا سردار سلیمان ابن صرو بہرحال اپنی جنگی تیاریوں میں پہلے ہی سے مصروف تھا، وہ سترہ ہزار مسلح افراد کا لشکر لے کر عبداللہ ابن زیاد کے خلاف جنگ کرنے چلا جو کربلا میں حضرت امام حسینؓ کو شہید کرنے والی کارروائیوں کا تمام تر ذمہ دار تھا اور مروان ابن حکم کی طرف سے موصل میں بحیثیت گورنر تعینات تھا، پھر عین الوردہ کے مقام پر عبداللہ ابن زیاد کی فوجوں سے اس کا مقابلہ ہوا اور کئی دن کی جنگ کے بعد خود سلیمان ابن صرو اور جماعت توابین کے تمام بڑے بڑے سردار مارے گئے فوج میں سے جو لوگ باقی بچے وہ وہاں سے بھاگ کر کوفہ واپس آگئے، کوفہ میں مختار نے جیل سے (جہاں وہ قید تھا) ان لوگوں کو ہمدردی کا پیغام بھیجا اور تسلی دلائی کہ تم لوگ غم نہ کرو، اگر میں زندہ رہا تو خون حسین کے ساتھ تمہارے مقتولین کے خون کا بدلہ بھی ضرور لوں گا۔ اس کے بعد اس نے کسی ذریعے سے جیل کے اندر ہی سے ایک خط حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے نام مدینہ بھیجا جس میں یہ درخواست کی کہ عبداللہ ابن یزید گورنر کوفہ سے سفارش کر کے مجھے رہائی نصیب فرمائیں چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے گورنر کوفہ کو سفارشی خط لکھ دیا اور گورنر نے ان کی سفارش کی تکریم میں مختار کو اس شرط پر جیل سے رہا کر دیا کہ وہ کوفہ میں کوئی شورش نہیں پھیلائے گا اور اپنے گھر میں بیٹھا رہے گا۔ اس مکار نے جیل سے آنے کے بعد کوفہ والوں اور بالخصوص شیعان حسین پر یہ ظاہر کیا کہ یہ میری روحانی طاقت اور کرامت تھی جس نے جیل کے دروازے وا کرا دیئے اور میں باہر آگیا، ادھر کسی وجہ سے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے عبداللہ ابن یزید کو کوفہ کی گورنری سے معزول کر کے ان کی جگہ عبداللہ ابن مطیع کو مقرر کر دیا، مختار نے اس عزل ونصب کو بھی اپنی کرامت ظاہر کیا

اور پرانے حاکم کے کوفہ سے چلے جانے کے بعد تمام پابندیوں کو توڑ کر آزادانہ طور پر اپنی سازشی کارروائیوں میں مصروف ہو گیا۔ اس نے مکرو فریب اور عیاریوں کے ذریعے کوفہ والوں پر اپنی روحانی بزرگی و کرامت کا کچھ ایسا سکہ جمایا کہ لوگ دھڑا دھڑ اس کے مرید ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی جماعت حیرت انگیز طور پر ترقی کر گئی، کوتوال شہر نے اس کی جماعت کی ترقی اور اس کی سازشی تحریک سے گورنر کو مطلع کیا اور دارالامارۃ (گورنر ہاؤس) سے اس کے خلاف کاروائی کرنے کی تیاری بھی ہوئی مگر وقت گزر چکا تھا اور مختار نہایت عیاری کے ساتھ حکام کے ہاتھ لگنے سے بچ گیا اور روپوش ہو کر اپنی جماعت کو ایک باضابطہ فوج میں تبدیل کر دیا اور کوفہ پر قبضہ کرنے کے منصوبے کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔ ادھر اس نے محمد بن الحنفیہ کو پوری طرح شیشے میں اتار ہی رکھا تھا چنانچہ جب مختار نے کوفہ کے بعض دوسرے بااثر حضرات کو قاتلان حسینؓ کے خلاف بھڑکا کر اپنے ساتھ ملانا چاہا اور محمد بن الحنفیہ کی نیابت کا دعوی کیا اور ان لوگوں نے کچھ آدمیوں کو اس کے دعوی کی تصدیق کے لئے محمد بن الحنفیہ کے پاس بھیجا تو انہوں نے کہا کہ ہاں انحتار کا خون حسینؓ کا بدلہ لینے کی ہم نے اجازت دی ہے! اس تصدیق نے مختار کو بہت تقویت پہنچائی آخر کار ایک دن رات کے اندھیرے میں مختار نے اپنی جماعت کے مسلح افراد کے ساتھ خروج اختیار کیا اور کوفہ کے گلی کوچوں میں لڑائی چھڑ گئی، کافی سخت مقابلہ آرائی کے بعد سرکاری فوج کو شکست ہوگئی اور عبداللہ ابن مطیع گورنر کوفہ کو دارالامارۃ میں محصور ہونا پڑا اور پھر تین دن کے بعد وہ کسی نہ کسی طرح دارالامارۃ سے چھپ کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے مختار نے سرکاری دفاتر اور بیت المال پر قبضہ کر لیا اور کوفہ کے لوگوں سے محمد بن الحنفیہ کے نام پر بیعت لینے لگا اور پورے شہر پر اس کا تسلط قائم ہو گیا، کچھ ہی دنوں کے بعد کوفہ کے لوگ مختار کے خلاف ہو گئے مگر مختار نے بڑی چالاکی کے ساتھ ان پر بھی قابو پالیا اور پورے شہر میں اس طرح قتل عام کرایا کہ کوفہ کا کوئی بھی ایسا نہیں بچا جس میں سے ایک یا دو یا اس سے زائد آدمی قتل نہ کئے گئے ہوں، اس نے قاتلان حسینؓ سے بھی انتقام لیا اور جس جس نے میدان کربلا میں کوئی حصہ لیا تھا ان میں سے ہر ایک کا سر تن سے جدا کرا دیا ایک طرف تو وہ کوفہ پر تسلط پانے کے بعد دوسرے علاقوں پر قبضہ کرنے کی کاروائیوں میں مصروف رہا اور دوسری طرف حضرت علیؓ کی کرسی گھڑاگ کھڑا کر کے لوگوں کو اپنی غیر معمولی روحانی طاقتوں کا معتقد بنانے میں لگا رہا اور رفتہ رفتہ نبوت کے دعوؤں تک پہنچ گیا۔ جب حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کو معلوم ہوا کہ مختار نہ صرف یہ کہ کوفہ میں لوگوں کا قتل عام کر رہا ہے اور اہل کوفہ پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہا ہے اور دوسرے علاقوں کو بھی ہتھیانے کے منصوبے بنا رہا ہے، بلکہ یہ مشہور کرنے لگا ہے کہ میرے پاس جبرئیل امین آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لاتے ہیں اور میں بطور نبی مبعوث ہوا ہوں تو انہوں نے اس کے استیصال میں مزید تاخیر کرنا کسی طرح مناسب نہ سمجھا اور اپنے بھائی مصعب ابن زبیرؓ کو بصرہ کا گورنر مقرر کر کے مختار کے فتنہ کی سرکوبی کی مہم ان کے سپرد کی۔ چنانچہ حضرت مصعب اپنی فوج کو لے کر کوفہ کی طرف چلے، ادھر جب مختار کو اس فوج کشی کا علم ہوا تو وہ بھی اپنا لشکر لے کر کوفہ سے نکلا، دونوں فوجوں کا مدار انامی گاؤں کے قریب مقابلہ ہوا اور خوب زور و شور کی لڑائی ہوئی آخر کار مختار شکست کھا کر کوفہ بھاگا اور دارالامارۃ میں قلعہ بند ہو گیا۔ حضرت مصعب ابن زبیرؓ نے کوفہ پہنچ کر دارالامارۃ کا محاصرہ کر لیا، مختار سامان رسد کی کمی سے مجبور ہو کر قلعہ کا دروازہ کھول کر باہر آیا اور آخری مرتبہ مقابلہ کیا لیکن جلد ہی موت کے گھاٹ اتر گیا اور اس طرح کوفہ کا یہ فتنہ ختم ہو گیا۔

مروان کا قصہ

حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ اس کے بعد لوگ ایک ایسے شخص کی بیعت پر اتفاق کر لیں گے جو پسلی کی ہڈی کے اوپر کولہے کی مانند ہوگا۔ تو حضرت شاہ صاحب نے اس کا مصداق مروان ابن حکم کو قرار دیا ہے۔ مروان ابن حکم کی خلافت کا قصہ اگرچہ مختار کے فتنہ سے پہلے ہی ہو چکا تھا اور جس وقت حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی فوج نے اس کو کوفہ میں قتل کر کے اس فتنہ کی سرکوبی کی اس وقت مروان ابن حکم کا انتقال ہو چکا تھا اور بنو امیہ کی خلافت کا جانشین عبدالملک ابن مروان مقرر ہو چکا تھا لیکن اگر اس لفظی تقدیم و تاخیر سے صرف نظر

کر کے نفس حقیقت کو دیکھا جائے تو حضرت شاہ صاحب کے بیان کردہ اس مصداق کو صحیح ماننے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، یہ مروان ابن حکم ہی تھا جس نے معاویہ ابن یزید ابن معاویہ کے انتقال کے بعد پورے عالم اسلام پر حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی قائم ہو جانے والی خلافت کو چیلنج کیا اور مختلف سازشوں کے ذریعے دمشق میں اپنی خلافت پر بیعت کرنے کے لئے لوگوں کو مجبور کر دیا، چنانچہ بنو امیہ کے علاوہ شام کے دیگر قبائل بنو کلب اور عنان وطے وغیرہ نے اس کی خلافت پر اتفاق کر لیا، اور پھر اسی وقت سے افتراق وانتشار اور فتنہ وفساد کا سلسلہ شروع ہو گیا جس نے اسلام اور مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا اور ملی طاقت کو اس طرح منتشر کر دیا کہ کافی عرصے تک مسلمان آپس میں برسرپیکار رہے اور جس قوت کو دشمنان دین کے خلاف استعمال ہونا چاہئے تھا وہ مختلف علاقوں میں اپنے مسلمان بھائیوں کا خون بہانے کے لئے استعمال ہوتی رہی۔ مروان ابن حکم عیار وچالاک ہونے کے باوجود قوت فیصلہ، بصیرت وتدبر اور رائے ومزاج کے استقلال واستحکام جیسے وہ اوصاف نہیں رکھتا تھا جو ملی نظم ونسق اور مملکت کے سیاسی استحکام کے لئے اشد ضروری تھے، اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ جس زمانے میں معاویہ ابن یزید کی وفات کے بعد دمشق میں انتخاب خلیفہ کے متعلق اختلاف آراء اور شام میں بنو امیہ کے حامی مددگار وطاقتور اور مقتدر قبائل بنو کلب اور بنو قیس کے درمیان رقابتیں آشکارا ہونے لگیں تو مروان نے یہ دیکھ کر کہ نہ صرف عراق بلکہ شام کا بھی ایک بڑا حصہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی خلافت کو تسلیم کر چکا ہے، ارادہ کیا تھا کہ دمشق سے روانہ ہو کر حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی خدمت میں حاضر ہو اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان کی خلافت کا وفادار ہو جائے بلکہ اس نے سفر کا سامان بھی درست کر لیا تھا، لیکن اس دوران عبداللہ ابن زیاد دمشق آگیا جب اس کو مروان کے اس ارادے کا علم ہوا تو اس نے مروان کو باصرار اس ارادے سے باز رکھا اور اس بات پر ہموار کر لیا کہ وہ خلافت کے امیدوار کی حیثیت سے بیعت لینا شروع کر دے، چنانچہ مروان کی خلافت دراصل عبداللہ ابن زیاد کی کوششوں کا نتیجہ تھی اگر مروان میں مستقل مزاجی، رائے کی پختگی اور تدبر ودور اندیشی کا جوہر ہوتا تو وہ کسی قیمت پر ابن زیاد کی رائے نہ مانتا اور اپنے ارادے میں اٹل رہ کر حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی خدمت میں چلا جاتا اور اس کی وجہ سے جو فتنے پیدا ہوئے اور پوری ملت کو جس نقصان وضرر میں مبتلا ہونا پڑا شاید اس کی نوبت نہ آتی۔

فتنہ دہیما کا مصداق

فتنہ دہیما کے بارے میں حضرت شاہ صاحب کا کہنا یہ ہے کہ اس کے ذریعے حضور ﷺ نے ترکوں (تاتاریوں) کے اس قبضہ وتسلط کی پیشین گوئی فرمائی جس نے اسلامی شہروں کو تاراج کیا اور مسلمانوں کو سخت ترین تباہی وبربادی سے دوچار کیا، چنانچہ اس وقت جس جس نے ترکوں کی حمایت کی اور ان کے معاون بنے وہ منافقین کے زمرے میں شمار کئے گئے۔ یہ ساتویں صدی ہجری کے وسط کا واقعہ ہے جب کہ خلافت عباسیہ کا آخری فرمانروا مستعصم باللہ بن مستنصر اللہ بغداد کے تخت خلافت پر متمکن تھا، یہ انتہائی کم ہمت، بے حوصلہ اور غیر مدبر خلیفہ تھا اس نے اپنا وزیر موئد الدین علقمی کو بنا رکھا تھا جو نہایت متعصب اور بدباطن شیعہ تھا علقمی نے عہد وزارت پر فائز ہوتے ہی اپنی عیاریوں اور چالاکیوں سے خلیفہ کو عضو معطل بنا کر خود سیاہ وسفید کا مالک بن بیٹھا، اس کی شروع سے یہ خواہش تھی کہ کسی طرح عباسیوں کا نام ونشان ختم کر کے بغداد میں علویوں کی خلافت قائم ہو جائے اس خواہش کی تکمیل کے لئے اس نے ایک غیر ملکی طاقت یعنی تاتاریوں سے ساز باز کر لی اور چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں کو دعوت دی کہ تم اپنی فوج لے کر بغداد پر حملہ کر دو، میں نہایت آسانی کے ساتھ تمہیں بغداد کی خلافت اور اس کے زیر تسلط دوسرے علاقوں اور ممالک پر قبضہ کرا دوں گا، ہلاکو خاں کو شروع میں تو اس کی دعوت قبول کرنے میں تامل ہوا کیونکہ وہ اہل بغداد کی شجاعت وبہادری اور خلافت کی ہیبت سے مرعوب تھا لیکن جب علقمی نے مختلف حیلوں اور سازشوں کے ذریعے بغداد کی فوج کا بہت بڑا حصہ دور دراز کے علاقوں اور شہروں میں منتشر کرا دیا اور باقی ماندہ فوجیوں کے ذریعے شہر میں بعض اقدامات کرا کے لوٹ مار کا بازار گرم کرا دیا جس سے سخت ابتری اور انتشار پھیل گیا اور ہلاکو خاں کو معلوم ہو گیا کہ خلافت کی طاقت

بہت کمزور ہوگئی ہے اور خلیفہ کی فوج کسی بڑے حملے کو برداشت کرنے کے قابل نہیں رہی ہے تو ہلاکو خاں نے اس دعوت کو قبول کرنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کی، علقمی نے ایک چال اور اختیار کی اس نے بغداد کے شیعوں کی طرف سے ہلاکو خاں کو کثیر تعداد میں بغداد پر حملہ کرنے کی دعوت پر مشتمل خطوط روانہ کرادیئے جن میں یہ لکھا گیا تھا کہ ہمارے بزرگوں نے بطور پیشین گوئی ہمیں خبر دی تھی کہ فلاں سن میں فلاں تاتاری سردار بغداد و عراق پر قبضہ کرلے گا اور ہمارا یقین ہے کہ وہ فاتح سردار آپ ہی ہیں اس بات سے ہلاکو خاں کے ارادے کو اور تحریک ملی، ادھر خود ہلاکو خاں کے دربار میں ایک شیعہ نصیر الدین طوسی پہلے سے موجود تھا اور علقمی کی طرح وہ بھی عباسیوں کی خلافت ختم کرانے کے درپے تھے، اس نے بھی مختلف ترغیبات اور لالچ کے ذریعے ہلاکو خاں کے ارادے کو بہت تقویت پہنچائی۔

چنانچہ ہلاکو خاں نے پہلے تو ایک زبردست فوج ہراول دستے کے طور پر بغداد کی طرف روانہ کی جس کا مقابلہ خلیفہ کی کمزور فوج سے ہوا اور شروع میں اس فوج نے کچھ کامیابی بھی حاصل کی مگر انجام کار شکست سے دوچار ہوئی اور تاتاریوں کا ہراول دستہ کامیاب رہا، پھر ہلاکو خاں ایک بہت بڑی فوج لے کر بغداد کے اوپر چڑھ آیا اور شہر کا محاصرہ کرلیا، اہل شہر نے اس کا مقابلہ کیا اور پچاس روز تک تاتاریوں کو شہر میں گھسنے نہیں دیا۔ لیکن بغداد کے شیعوں نے صرف یہ کہ خفیہ طور پر ہلاکو خاں سے اپنے لئے امن و تحفظ کی ضمانت حاصل کرلی تھی بلکہ شہر کے حالات اور فوجی اطلاعات بھی ہلاکو خاں کو پہنچاتے رہے پھر علقمی نے ایک اور سازش کی، اس نے خلیفہ سے کہا کہ میں نے آپ کے لئے امن و تحفظ کی ضمانت حاصل کرلی ہے، آپ ہلاکو خاں کے پاس چلیں وہ آپ کے ساتھ اعزاز و تکریم سے پیش آئے گا اور مفاہمت کرکے آپ کو بغداد و عراق کا حکمراں باقی رکھے گا! خلیفہ علقمی کے بہکاوے میں آکر اپنے بیٹے کے ساتھ شہر سے نکل کر ہلاکو خاں کے لشکر میں پہنچا، ہلاکو خاں نے خلیفہ کو دیکھ کر کہا کہ آپ اپنے اراکین سلطنت اور شہر کے علماء و فقہاء کو بھی یہیں بلوا لیجئے، چنانچہ خلیفہ نے ان سب کو حکم بھیج کر وہاں بلوالیا، جب سب لوگ آگئے تو ہلاکو خاں نے خلیفہ کے سامنے ہی ان سب کو ایک ایک کرکے قتل کروادیا اس کے بعد ہلاکو خاں نے خلیفہ سے کہا کہ تم شہر میں پیغام بھیج دو کہ اہل شہر ہتھیار رکھ کر شہر سے باہر آجائیں، خلیفہ نے یہ پیغام بھی شہر میں بھیج دیا، اہل شہر باہر نکلے اور تاتاریوں نے ان کو قتل کرنا شروع کیا شہر کے تمام سوار پیادے اور شرفاء کھیرے ککڑی کی طرح کئی لاکھ کی تعداد میں کاٹ ڈالے گئے، شہر کی خندق ان کی لاشوں سے بھر گئی اور اس قدر خون بہا کہ اس کی کثرت سے دریائے دجلہ کا پانی سرخ ہوگیا، تاتاری لوگ شہر میں گھس پڑے عورتیں اور بچے اپنے سروں پر قرآن شریف رکھ کر نکلے مگر تاتاریوں کی تلوار سے کوئی بھی نہ بچ سکا اور ان ظالموں نے بغداد اور اس کے مضافات میں چن چن کر لوگوں کو قتل کیا، شہر بغداد میں صرف چند شخص جو کنوئیں اور دوسری پوشیدہ جگہوں میں چھپے ہوئے رہ گئے، زندہ بچے، باقی کوئی متنفس زندہ نہیں چھوڑا گیا، اگلے دن یعنی ۹ صفر ۶۵۶ھ کو ہلاکو خاں، خلیفہ مستعصم کو ہمراہ لے کر بغداد میں داخل ہوا اور قصر خلافت میں پہنچ کر دربار کیا، خلیفہ سے تمام خزانوں کی کنجیاں لے لیں، جتنے دفینے تھے سب حاصل کئے، پھر خلیفہ کو نظر بند کردیا گیا اور بھوکا پیاسا رکھا گیا، اس کے بعد جب ہلاکو خاں نے خلیفہ مستعصم کے مستقبل کے بارے میں اپنے اراکین سے مشورہ کیا تو سب نے رائے دی کہ اس کو قتل کردینا چاہئے لیکن بدبخت علقمی اور طوسی نے کہا کہ نہیں تلوار کو اس کے خون سے آلودہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کو نمدے میں لپیٹ کر لاتوں سے کچلوانا چاہئے، چنانچہ یہ کام علقمی ہی کے سپرد ہوا اور اس نے اپنے آقا مستعصم باللہ کو نمدے میں لپیٹ کر اور ایک ستون سے باندھ کر اس قدر لاتیں لگوائیں کہ خلیفہ کا دم نکل گیا، پھر اس کی لاش کو زمین پر ڈال کر تاتاری سپاہیوں کے پیروں سے رندوا کر پارہ پارہ اور ریزہ ریزہ کرادیا اور خود دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہا کہ میں علویوں کا انتقام لے رہا ہوں غرض یہ کہ بدنصیب خلیفہ کی لاش کو گور و کفن بھی نصیب نہیں ہوا اور اس طرح خاندان عباسیہ کی خلافت کا خاتمہ ہوگیا اس کے بعد ہلاکو خاں نے شاہی کتب خانہ کو بھی نہیں بخشا، جس میں بے شمار کتابوں کا ذخیرہ تھا، یہ تمام کتابیں دریائے دجلہ میں پھینک دی گئیں جس سے دریا میں ایک بند سا بندھ گیا اور بتدریج پانی ان سب کو بہا لے گیا، دجلہ کا پانی جو بغداد و مضافات کے مقتولین کے خون سے سرخ ہو رہا تھا اب ان کتابوں کی روشنائی سے

سیاہ ہو گیا اور عرصہ تک سیاہ رہا۔ تمام شاہی محلات کو لوٹ کر مسمار کر دیا گیا! مورخین نے لکھا ہے کہ اس وقت ہلاکو خاں کی فوج کے ہاتھوں بغداد اور مضافات بغداد میں جو قتل عام ہوا اس کے نتیجے میں ایک کروڑ چھ لاکھ مسلمان مقتول ہوئے۔ غرض یہ کہ وہ ایسی عظیم الشان اور ہیبت ناک خون ریزی اور بربادی تھی جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی اور اسلام پر ایک ایسی مصیبت آئی تھی کہ لوگوں نے اس کو قیامت صغریٰ کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اس سانحہ عظمیٰ کا سب سے زیادہ عبرت ناک پہلو یہ ہے کہ علقمی نے جس علوی خلافت کے قیام اور اپنی حکمرانی کی خواہش کے تحت اتنی عظیم الشان تباہی و بربادی کے اسباب پیدا کئے اور پورے عالم اسلام کو زبردست نقصان پہنچنے کا باعث بنا، اس کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ ہلاکو خاں نے کسی ہاشمی یا علوی کو خلیفہ و حکمراں بنانے کے بجائے اپنے آدمیوں کو عراق میں حاکم بنا دیا، علقمی نے بہت چاپلوسی ہلاکو خاں کے آگے رویا گڑ گڑایا اور لاکھ منت سماجت کی لیکن ہلاکو خاں نے اس کو اس طرح دھتکار دیا جس طرح کتے کو دھتکار دیتے ہیں کچھ دنوں تک تو علقمی غلاموں کی طرح تاتاریوں کے ساتھ ان کی جوتیاں سیدھی کرتا پھرا، آخر اپنی منافقت و غداری کا عبرتناک حشر دیکھ کر ناکامی و مایوسی کے غم سے بہت جلد مر گیا اس سانحہ کے بعد بغداد دار الخلافہ بھی نہیں رہا اور خلیفہ مستعصم باللہ کے بعد تین سال کا ایسا عرصہ گزرا جس میں دنیا میں کوئی خلیفہ نہیں تھا۔

زمانہ نبوی کے بعد عرب میں ظہور پذیر ہونے والے فتنہ کی پیشین گوئی

(۲۵) وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَيْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ اَفْلَحَ مَنْ كَفَّ يَدَهُ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "افسوس اور بدنصیبی عرب کی کہ برائی (کے فتنے کا ظاہر ہونا) قریب آ گیا، اس فتنہ میں وہی شخص نجات یافتہ اور فلاح یاب رہے گا جس نے اپنا ہاتھ روکے رکھا۔" (ابوداؤد)

تشریح: طیبیؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد گرامی کے ذریعے عرب کے اس فتنہ کی طرف اشارہ فرمایا جو حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت میں پیش آیا اور جس نے مسلمانوں کے باہمی افتراق و انتشار، خروج و بغاوت اور بدامنی و خانہ جنگی کی صورت میں نہ صرف حضرت عثمان غنیؓ کو جام شہادت نوش کرنے پر مجبور کیا بلکہ اس کا سلسلہ بعد میں حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کی آویزش کی صورت میں بہت دنوں تک جاری رہا اور اسلام اور مسلمانوں کو کافی نقصانات برداشت کرنا پڑے۔ لیکن ملا علی قاری کا کہنا یہ ہے کہ حضور ﷺ کے اس ارشاد گرامی کا مصداق حضرت امام حسینؓ کے خلاف یزید ابن معاویہ کی وہ کارروائی ہے جس کے نتیجے میں امام عالی مقام کربلا کے میدان میں شہید ہوئے۔ معنی کے اعتبار سے یہ قول زیادہ صحیح اور حدیث کے قریب تر ہے کیونکہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا سانحہ ایک ایسا فتنہ تھا جس کی برائی میں عرب و عجم میں سے کسی کو بھی کوئی شک و شبہ نہیں۔

فتنہ و فساد سے دور رہنے والا شخص نیک بخت ہے

(۲۶) وَعَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْاَسْوَدِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ السَّعِيْدَ لَمَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ اِنَّ السَّعِيْدَ لَمَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ اِنَّ السَّعِيْدَ لَمَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ وَلَمَنْ اُبْتُلِيَ فَصَبَرَ فَوَاهًا۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت مقداد ابن اسودؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ یقیناً نیک بخت وہ شخص ہے جو فتنوں سے محفوظ رکھا گیا ہو۔ یقیناً نیک بخت وہ شخص ہے جو فتنوں سے محفوظ رکھا گیا ہو۔ (گویا آپ نے بات کی اہمیت کو زیادہ موثر اور تاکیدی انداز میں بیان کرنے کے لئے یہ جملہ تین بار ارشاد فرمایا) اور یقیناً نیک بخت وہ شخص بھی ہے جو فتنہ میں مبتلا کیا گیا لیکن اس نے صبر و ضبط کا دامن پکڑے رکھا اور قابل افسوس وہ شخص ہے جو نہ فتنوں سے محفوظ رکھا گیا اور نہ اس نے صبر و ضبط اختیار کیا۔" (ابوداؤد)

تشریح: "واھًا" کے معنی ہیں افسوس، حسرت اور کبھی یہ لفظ عجب، یعنی خوشی ظاہر کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے! پس اگر یہاں یہ لفظ اظہار افسوس وحسرت کے معنی میں لیا جائے تو کہا جائے گا کہ "فواھًا" کا لفظ ماقبل جملہ یعنی لمن ابتلی فصبر سے الگ ہے اور ایک ایسے جملے کے ساتھ تعلق رکھتا ہے جو اگرچہ لفظوں میں مذکور نہیں ہے لیکن اس کا مفہوم مراد لیا گیا ہے، اس صورت میں پوری عبارت گویا یوں ہوگی کہ یہ اور قابل افسوس وہ شخص ہے جو فتنوں سے محفوظ نہ رکھا گیا ہو اور (فتنوں میں مبتلا ہونے کی صورت میں) اس نے صبر وضبط اختیار نہ کیا ہو" اس طرح ماقبل جملہ لمن ابتلی فصبر میں لفظ لمن کے لام کو مفتوح قرار دیا جائے گا۔ اور اگر یہاں "واھا" کے معنی عجب یعنی خوشی کو ظاہر کرنا، مراد ہوں تو اس صورت میں "فواھا" کسی علیحدہ جملے کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے نہیں ہوگا یا یہ کہ ماقبل جملہ لمن ابتلی فصبر سے جڑا ہوا سمجھا جائے گا اور اس جملے کا ترجمہ یوں ہوگا کہ فتنوں سے محفوظ رہنا اور (اگر فتنے میں مبتلا ہو جائے تو) صبر وضبط اختیار کرنا کتنی اچھی اور خوش کرنے والی بات ہے؟ چنانچہ بعض محدثین نے جو یہاں لمن ابتلی فصبر میں "لمن" کے لام کو زیر کے ساتھ پڑھا اور لکھا ہے اور اس کو "فواھا" کے متعلق کہا ہے تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہاں واھا کا لفظ عجب، یعنی اظہار خوشی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

چند پیشن گوئیاں

(۲۷) وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وُضِعَ السَّيْفُ فِيْ اُمَّتِيْ لَمْ يُرْفَعْ عَنْهَا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَلَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَلْحَقَ قَبَائِلُ مِنْ اُمَّتِيْ بِالْمُشْرِكِيْنَ وَحَتّٰى تَعْبُدَ قَبَائِلُ مِنْ اُمَّتِيْ الْاَوْثَانَ وَاِنَّهٗ سَيَكُوْنُ فِيْ اُمَّتِيْ كَذَّابُوْنَ ثَلٰثُوْنَ كُلُّهُمْ يَزْعُمُ اَنَّهٗ نَبِيُّ اللّٰهِ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَلَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِيْ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِيْنَ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَاْتِيَ اَمْرُ اللّٰهِ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"اور حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جب میری اُمت میں (آپس میں) تلوار چل جائے گی تو پھر قیامت تک امت کے لوگوں کے قتل وقتال سے باز نہیں رہے گی! اور اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک میری اُمت کے بعض قبائل مشرکوں کے ساتھ نہ جا ملیں گے، اور اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک میری اُمت کے بعض قبائل بتوں کو پوجنے لگیں گے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میری اُمت میں سے تیس جھوٹے (یعنی نبوت کا دعویٰ کرنے والے) ظاہر ہوں گے، ان میں سے ہر ایک یہ گمان کرے گا کہ وہ خدا کا نبی ہے جب کہ واقعہ یہ ہے کہ میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اور میری اُمت میں سے ہمیشہ ایک جماعت حق پر ثابت قدم رہے گی (یعنی عملی طور پر بھی اور علمی طور پر بھی دین کے صحیح راستے پر چلنے والی ہوگی اور دشمنان دین پر غالب رہے گی) اس جماعت کا کوئی بھی مخالف وبد خواہ اس کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا (کیونکہ اس جماعت کے لوگ دین پر ثابت قدم اور برحق ہونے کی وجہ سے خدا کی مدد ونصرت کے سایہ میں ہوں گے) تاآنکہ خدا کا حکم آئے۔" (ابوداؤدؒ، ترمذیؒ)

تشریح: حدیث کے پہلے جملے کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک دفعہ کو بعض مسلمانوں کی وجہ سے میری اُمت میں باہمی محاذ آرائی آپس میں قتل وقتال کی سیاست کو عمل ودخل کا موقع مل گیا تو پھر مسلمانوں کی باہمی خونریزی اور ایک دوسرے کے خلاف تشدد وطاقت کے استعمال کا ایسا سلسلہ شروع ہو جائے گا جو قیامت تک ختم نہیں ہوگا اور ہمیشہ میری امت کے لوگ کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی صورت میں اپنی ہی صفوں کے خلاف لڑتے رہیں گے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا بالکل صحیح ثابت ہوا اور حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے سے مسلمانوں کی جو باہمی محاذ آرائی شروع ہوئی تھی اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

"جب تک میری اُمت کے بعض قبائل مشرکوں کے ساتھ نہ جا ملیں گے"۔ حضور ﷺ کی اس پیشین گوئی کا کچھ حصہ تو آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد ہی سامنے آگیا تھا جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ابتدائی زمانہ خلافت میں عرب کے چند قبائل کچھ

شرپسندوں اور منافقین کے فریب میں آکر ارتداد میں مبتلا ہوگئے تھے اور کفر و شرک کی طاقتوں کے ساتھ مل گئے تھے، لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ کی فراست و دانش مندی اور قوت فیصلہ کی مضبوطی و اولوالعزمی نے ان مرتدین کا استیصال کر دیا تھا۔

"جب تک میری اُمت کے بعض قبائل بتوں کو پوجنے لگیں گے" میں بتوں کا پوجنا اگر حقیقی معنی میں مراد ہے تو کہا جائے گا کہ شاید آئندہ زمانے میں کوئی وقت ایسا بھی آئے جب مسلمانوں کے کچھ طبقے ایمان و اسلام کا دعویٰ رکھنے کے باوجود، واقعۃً بتوں کی پوجا کرنے لگیں۔ ویسے موجودہ زمانے میں بھی ایسے مسلمانوں کا وجود بہر حال پایا جاتا ہے جو قبر پرستی اور تعزیہ کی پرستش وغیرہ کی صورت میں اپنی پیشانیاں غیر اللہ کے آگے سجدہ ریز کرتے ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ اس جملے میں بتوں کو پوجنے والی بات اپنے حقیقی معنی پر محمول نہیں ہے بلکہ اس سے مجازی اور معنوی صورت مراد ہے تو پھر اس کے محمول کی بہت صورتیں ہو سکتی ہیں جو ہر زمانے میں پائی جاتی ہیں، ان میں سے ایک صورت مال و دولت اور جاہ و اقتدار وغیرہ کے حصول کو اپنی زندگی کا اصل مقصد اور اپنی امیدوں اور آرزوؤں کی واحد آماجگاہ بنا لینا ہے، اس صورت میں اس ارشاد گرامی کا ایک محمول وہ لوگ بھی ہیں جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

تعس عبد الدینار و عبد الدرھم۔

"درہم و دینار (یعنی مال و دولت) کے غلام ہلاک ہوں۔"

لفظ "خاتم" ت کے زیر اور زبر دونوں کے ساتھ آتا ہے۔ اور و انا خاتم النبیین کا جملہ نحوی قاعدہ کے اعتبار سے حال واقع ہوا ہے نیز لا نبی بعدی کا جملہ اپنے پہلے جملہ یعنی انا خاتم النبیین کی تفسیر و وضاحت کے طور پر ہے۔

"تا آنکہ خدا کا حکم آئے" میں "خدا کے حکم" سے مراد قیامت ہے یا دین کا اس طرح تسلط و غلبہ پا لینا مراد ہے کہ روئے زمین پر کفر کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہے۔ نیز حتی یاتی الخ کا جملہ، لفظ لا تزال سے متعلق ہے۔

ایک پیشن گوئی

(۲۸) وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ تَدُوْرُ رَحَی الْاِسْلَامِ لِخَمْسٍ وَّ ثَلٰثِیْنَ اَوْسِتٍّ ثَلٰثِیْنَ اَوْسَبْعٍ وَّثَلٰثِیْنَ فَاِنْ یُّھْلِکُوْا فَسَبِیْلُ مَنْ ھَلَکَ وَاِنْ یَّقُمْ لَھُمْ دِیْنُھُمْ یَقُمْ لَھُمْ سَبْعِیْنَ عَامًا قُلْتُ اَمِمَّا بَقِیَ اَوْ مِمَّا مَضٰی قَالَ مِمَّا مَضٰی۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعود نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "اسلام کی چکی پینتیس برس یا چھتیس برس یا سینتیس برس تک گھومتی رہے گی پھر اگر لوگ ہلاک ہوں گے تو اس راستے پر چلنے کی وجہ سے ہلاک ہوں گے جس پر چل کر پہلے لوگ ہلاک ہو چکے ہیں اور اگر ان کے دین کا نظام کامل و برقرار رہا تو ان کے دینی نظام کی تکمیل و برقراری کا وہ سلسلہ ستر برس تک رہے گا۔" (حضرت ابن مسعود کہتے ہیں کہ) میں نے یہ (سن کر) پوچھا کہ یہ ستر برس بقیہ میں سے ہوں گے یا اس عرصے سمیت ہوں گے جو گزرا (یعنی آپ ﷺ نے دین کے نظام کی تکمیل و برقراری کے لئے جس ستر سال کے عرصے کا ذکر فرمایا ہے آیا اس سے ستر سال کا وہ عرصہ مراد ہے جس کی ابتداء ۳۵ یا ۳۶ یا ۳۷ سال کا مذکورہ زمانہ گزرنے کے بعد ہوگی، یا وہ مذکورہ سال بھی اس ستر سال کے عرصے میں شامل ہیں اور اس کی ابتداء، اسلام کے ابتدائی زمانہ یا ہجرت کے وقت سے مراد لی گئی ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا (یہ مذکورہ سال بھی ان ستر سالوں میں شامل ہیں اور) ستر سال کا عرصہ اس عرصہ سمیت ہے جو (اسلام کے ابتدائی زمانہ یا ہجرت کے وقت سے اب تک) گزر چکا ہے"۔ (ابوداؤدؒ)

تشریح: "اسلام کی چکی گھومتی رہے گی" سے حضور ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ وہ زمانہ کہ جس میں دین کا نظام مستحکم و استوار رہے گا، احکام شریعت کی بھرپور حکمرانی ہوگی، مسلمانوں کے تمام دینی و دنیاوی معاملات قرآن و سنت کے مطابق خوش اسلوبی کے ساتھ چلتے رہیں گے اور دین و آخرت کی زندگی فتنہ و فساد سے محفوظ و مامون رہے گی، ۳۵ یا ۳۶ یا ۳۷ سال پر مشتمل ہوگا اور اس زمانے کی ابتداء ہجرت کے سال

سے ہے کہ اسلام کے ملی وسیاسی ظہور اور ملکی فتوحات کا سلسلہ سال ہجرت ہی سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کا سانحہ اسلام کی تاریخ کا وہ پہلا فتنہ ہے جس نے مسلمانوں کی دینی وملی زندگی کو سخت دھچکا لگایا اور اسلام کی سیاسی طاقت باہمی افتراق وانتشار کی وجہ سے بہت مضمحل ہوگئی، یہ فتنہ ۳۵ھ میں ظاہر ہوا، اس کے بعد ۳۶ھ میں جنگ جمل اور ۳۷ھ میں جنگ صفین کے فتنے پیش آئے، جس نے مسلمانوں کے دینی وملی نظام اور سیاسی استحکام کو ہلا کر رکھ دیا اور اس کے نہایت روح فرسا نتائج نکلے۔

واضح رہے کہ لخمس وثلثین اوست وثلثین او سبع وثلثین (۳۵ برس، یا ۳۶ برس یا ۳۷ برس) میں حرف او (بمعنی یا) تنویع کے لئے یا بل (بلکہ) کے معنی میں ہے۔

۳۵ یا ۳۶ یا ۳۷ کے تعین کے سلسلے میں ایک وضاحت تو وہ ہے جو اوپر بیان کی گئی یعنی ابتداء تو سال ہجرت سے شمار کی جائے اور انتہا حضرت عثمانؓ کی شہادت اور پھر جنگ جمل وجنگ صفین کو قرار دیا جائے تو بالترتیب ۳۵ھ، ۳۶ھ، اور ۳۷ھ کے واقعات ہیں لیکن اس بارے میں ایک احتمال یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ کلام اس سال ارشاد فرمایا تھا جب کہ آپ ﷺ کی زندگی کے چند ہی سال باقی رہ گئے تھے اور اگر ان چند سالوں کو خلفاء اربعہ کی مدت خلافت کے ساتھ جوڑا جائے تو ان سب کی مجموعی مدت اتنے ہی سالوں پر مشتمل ہے جو حضور ﷺ نے اس ارشاد گرامی میں ظاہر فرمائی۔ گویا اس قول کے مطابق ۳۵ یا ۳۶ یا ۳۷ سال کا ابتدائی سال تو اس کو قرار دیا جائے گا، جس میں حضور ﷺ نے یہ حدیث ارشاد فرمائی تھی اور ان سالوں کا آخری سال حضرت علیؓ کی خلافت کے سال آخر کو قرار دیا جائے گا، لہٰذا دین کے نظام کے استقرار وتکمیل سے اگر یہ مراد لیا جائے کہ ان مذکورہ سالوں میں دین پوری طرح محفوظ ومامون رہے گا کہ بدعت اور فکر وجمال کی لغزش تک کو دین میں راہ پانے کا موقع نہیں ملے گا اور ملک وملت کا کوئی بھی کام شارع کے حکم کے خلاف نہیں ہوگا تو پھر مذکورہ سالوں کے تعین کے سلسلے میں یہی وضاحت مناسب تر اور اولیٰ ہوگی اور اگر "دین کے استقرار وتکمیل" سے مراد لیا جائے کہ ملک وملت کے تمام انتظام فتنہ وفساد سے پاک ہوں گے، خلافت کا مسئلہ خوش اسلوبی اور اتفاق واتحاد کے ساتھ طے پاتا رہے گا اور مسلمانوں کے درمیان کوئی محاذ آرائی اور مخالفت وعناد کی صورت پیدا نہیں ہوگی تو پھر مذکورہ سالوں کے تعین میں وہ وضاحت مناسب تر ہوگی جو پہلے نقل کی گئی۔ ایک اور احتمال بھی بیان کیا جاتا ہے کہ مذکورہ سالوں کی ابتداء اس وقت سے لگائی جب کہ آنحضرت ﷺ پر وحی نازل ہونے کا سلسلہ شروع ہوا تھا یعنی نبوت کا پہلا سال اس صورت میں ۳۵ برس کی مدت کا اختتام حضرت عمرؓ کی خلافت کے اختتام پر ہوگا یہ احتمال اس اعتبار سے قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد دین وایمان کی سلامتی، سُنّت کی اتباع، جماعتی اتحاد واتفاق، مسلمانوں کی باہمی قلبی محبت ورواداری اور دین وملت کا اخلاقی وسیاسی استحکام جس زمانے میں بہت عمدہ اور نہایت خوبی کے ساتھ تھا وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ہی کی خلافت کا زمانہ تھا، حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ایک دو سال کے بعد ہی جو صورت پیدا ہوگئی اور دین وملت کے نظم واستحکام کے منافی جو حادثات وواقعات ظاہر ہونے شروع ہوئے وہی ان فتنوں کا باعث بنے جنگی حشر سامانیوں نے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو نہایت مکدر کر کے رکھ دیا۔

"پھر اگر لوگ ہلاک ہوں گے الخ" کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ سالوں میں دین وملت کے اخلاقی وسیاسی نظام میں استحکام واستقرار کے بعد اگر لوگ اپنے دینی وملی معاملات میں اختلاف وانتشار کا شکار ہو جائیں دین وآخرت کے امور میں سستی وکوتاہی کا شکار اور گناہ ومعصیت کا ارتکاب کرنے لگیں تو سمجھو کہ وہ اس خطرناک راستے پر پڑ گئے ہیں جس پر چل کر پچھلی امتوں کے لوگوں نے تباہی وبربادی اور ہلاکت مول لی تھی، چنانچہ پچھلی امتوں کے لوگ اسی لئے تباہ وبرباد اور ہلاک کر دیئے گئے تھے کہ انہوں نے کجروی اختیار کر لی تھی، حق سے دور ہٹ گئے تھے، شرعی احکام اور اپنے ملی معاملات میں اختلاف وانتشار کا شکار ہو گئے تھے، اپنے دین پر عمل کرنے اور اپنے پیغمبر کی تعلیمات کو ماننے میں سستی وکوتاہی اور لاپرواہی برتنے لگے تھے اور گناہ ومعصیت سے اجتناب نہیں کرتے تھے۔ واضح رہے کہ جو چیزیں

انسان کی ہلاکت و تباہی کا سبب بنتی ہیں اور جن کو اختیار کر کے کوئی شخص ہلاکت میں مبتلا ہوتا ہے یہاں ان ہی اسباب کو "ہلاکت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"اور اگر ان کے دین کا نظام کامل و برقرار رہا..... الخ" کا مطلب یہ ہے اگر مسلمان پہلے کی طرح اپنے امیر و خلیفہ کی اطاعت و فرمانبرداری پر قائم رہے، احکام شریعت اور دینی نظام کو برقرار رکھنے اور ان کی اتباع کرنے پر عامل رہے اور ملی اتحاد و اتفاق کے ذریعے اسلام کی شوکت کو بحال رکھنے میں مصروف رہے تو ان کے دو ملی اور سیاسی استحکام و برقراری کا سلسلہ ستر برس تک جاری رہے گا! اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ستر برس کی تحدید سے کیا مراد ہے؟ تو اس کا حقیقی مفہوم پوری وضاحت کے ساتھ سامنے نہیں ہے، تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ دینی و ملی نظام کے اخلاقی و سیاسی استحکام کے سلسلے میں جو بات پہلے ذکر کی جاچکی ہے کہ وہ (یعنی دینی و ملی استحکام) ۳۵ یا ۳۶ یا ۳۷ سال تک قائم رہے گا تو اسی کے اعتبار سے یہ بات کہی گئی ہے کہ مسلمانوں کے ملی و ملکی امور اور سیاسی و انتظامی معاملات آنے والے زمانہ کی بہ نسبت ان ستر سالوں میں زیادہ عمدگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پاتے رہیں گے۔

بہرحال اس حدیث کی تشریح میں یوں تو شارحین نے بہت زیادہ بحث کی ہے اور لمبی چوڑی باتیں لکھی ہیں لیکن قابل اعتماد اعتبار مسلک و عقیدے کے مطابق نیز حدیث کے الفاظ کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے مختصر طور پر جو تشریح بیان کی جاسکتی تھی وہ یہاں نقل کردی گئی ہے جو انشاء اللہ کافی ہوگی! لیکن اگر اسی اختصار کے ساتھ حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی کے ان منقولات و فرمودات کو بھی بیان کر دیا جائے جو اس حدیث کی تشریح سے تعلق رکھتے ہیں تو حدیث کے فرمودات اور اس کے مصداق کی کچھ اور وضاحت ہو جائے گی! چنانچہ شاہ صاحب کے مطابق جو حدیث کا حاصل اور مصداق یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ گویا آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ زمانہ ہجرت کے بعد اسلام کی پیش قدمی اور مسلمانوں کے حالات میں جو مضبوطی و استحکام پیدا ہوا ہے وہ ۳۵، ۳۶ سالوں تک یوں ہی چلتا رہے گا اور تمام دینی و ملی معاملات خوش اسلوبی کے ساتھ طے پاتے رہیں گے، پھر اسلام کے دائرہ میں کچھ اضطراب واقع ہو جائے گا اور باہمی افتراق و انتشار کی وجہ سے مسلمانوں کے دینی و ملی معاملات میں خرابی پیدا ہونی شروع ہو جائے گی، چنانچہ اس بگاڑ اور خرابی کی ابتداء ۳۵ھ سے ہوئی جب کہ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا، پھر ۳۶ھ میں مزید بگاڑ واقع ہوا جب کہ اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان محاذ آرائی ہوئی اور جس کو جنگ جمل کہا جاتا ہے اور اس کے بعد ۳۷ھ میں حالات بالکل ہی قابو سے باہر ہو گئے اور اسلام و مسلمانوں کو سخت نقصان و تباہی سے دوچار ہونا پڑا۔ جب کہ حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان بڑی خوف ناک جنگ، جنگ صفین کے نام سے ہوئی! اس کے بعد گویا حضور ﷺ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ مسلمانوں کے دینی اور ملی نظام میں اس خرابی کے واقع ہونے کے بعد اور باغیوں کے غالب آجانے اور خلیفہ برحق کی مغلوبیت کی وجہ سے اگر لوگ دینی و ملی نظام کو تباہ کرنے والے ان اعمال و اطوار کو اختیار کر کے ہلاک ہوں گے تو وہ اس راستے پر چلنے کی وجہ سے ہلاک ہوں گے جس پر پچھلی امتوں کے لوگوں نے چل کر اپنے آپ کو تباہ و برباد کر لیا تھا، چنانچہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ایسا ہی ہوا کہ حضرت امام حسینؓ کو نہایت مجبوری اور ناگواری کے ساتھ اپنی خلافت سے دست کش ہونا پڑا اور جس طرح ان کو گویا مغلوب ہونا پڑا جس کے نتائج آگے چل کر باہمی افتراق و انتشار اور جاہ و اقتدار کی خاطر ایک دوسرے کے خلاف قتل و قتال کی صورت میں رونما ہوئے اور اگر خلیفہ برحق کا اقتدار و تسلط قائم رہا اور باغیوں کو غالب آنے کا موقع نہ مل سکا تو مسلمانوں کا دینی و ملی نظام آنے والے زمانوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ عمدگی کے ساتھ چلتا رہے گا اور یہ نظام ستر برس تک یوں ہی قائم رہے گا۔

شہادت عثمان رضی اللہ عنہ

حدیث کے تشریح میں تین ایسے واقعات کا ذکر آیا ہے جو اسلامی تاریخ میں نہایت روح فرسا نتائج کے ساتھ یاد کئے جاتے ہیں اور جن کی طرف حضور ﷺ نے گویا پہلے ہی اشارہ فرمادیا تھا، یہ تینوں واقعات ہیں، شہادت عثمانؓ، جنگ جمل، اور جنگ صفین، ضروری

معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں واقعات پر مختصر انداز میں روشنی ڈالی جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے واقعہ اور اس کے پس منظر کو بیان کیا جاتا ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ اسلام کے تیسرے خلیفہ اور حضرت عمر فاروقؓ کے بعد مسلمانوں کے امیر و حکمراں بنے تھے! حضرت عمرؓ کے دور خلافت تک مسلمانوں کے عام دینی و سیاسی اور ملکی و ملی معاملات ایک مستحکم خلافت کے تحت عمدگی و خوبی کے ساتھ چلتے رہے اور ان عوامل و اسباب کو سر اٹھانے کا موقع نہیں ملا جو خلافت کے استحکام اور ملی نظم و اتحاد کے خلاف کسی محاذ آرائی کا باعث بنتے، حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت کا ابتدائی نصف حصہ بھی اسی نہج پر استوار رہا لیکن اس کے بعد کچھ ایسے اندرونی عوامل و اسباب پیدا ہو گئے اور اس کے ساتھ بعض ایسی بیرونی سازشیں حرکت میں آگئیں جن سے حضرت عثمانؓ کی خلافت کا استحکام ڈانواں ڈول ہو گیا اور ملک و ملت کے دینی و سیاسی معاملات پر حضرت عثمانؓ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی! حضرت عثمانؓ کے جہاں بے شمار اوصاف ان کی زندگی میں مابہ الامتیاز حیثیت رکھتے وہاں ان میں ایک بڑا وصف علم و مروت، چشم پوشی و درگزر اور خاص طور پر اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ حسن سلوک کا جذبہ بھی تھا، انہوں نے اخلاص نیت کے ساتھ اپنے ان عزیز و اقارب کو اونچے عہدوں اور مناصب پر فائز کیا جن کو وہ ان عہدوں کے لئے واقعۃً اور دیانۃً اہل اور مناسب جانتے تھے، نیز وہ چونکہ ذاتی طور پر بہت مالدار تھے اس لئے اپنے مال و دولت کے ذریعے اپنے عزیزوں کی خبرگیری رکھتے تھے اور ان کی مالی معاونت فرمایا کرتے تھے ادھر مسلمانوں کے ذہنی و فکری حالات میں بھی زمانہ کے تغیرات اور وسیع تر ماحول میں عام خلط ملط کے اثرات سے کافی حد تک تبدیلی آگئی تھی، چنانچہ کچھ مسلمانوں میں اور خاص طور پر ان مسلمانوں میں جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے، اور جو قدیم قبائلی و علاقائی عصبیت کی گرفت سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے تھے، یہ شکوک پیدا ہونے شروع ہو گئے کہ امیر المؤمنین اپنی خلافت کے ذریعے اپنے قبیلے اور اپنے خاندان کے لوگوں ہی کو منفعت پہنچا رہے ہیں۔ اگرچہ اس طرح کے لوگ ابھی بہت کم تھے اور عام لوگوں میں حضرت عثمانؓ کی طرف سے کوئی بدگمانی اور شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن عین اسی وقت عبداللہ ابن سبا نے اپنی مکر و سازش کا جال پھیلانے کا کام شروع کر دیا، عبداللہ ابن سبا شہر صنعاء کا رہنے والا ایک یہودی تھا اس نے حضرت عثمانؓ کی خلافت میں یہ دیکھ کر کہ مسلمان ہی دنیا کی سب سے فاتح قوم بن گئی ہے اور اس قوم کو بہت زیادہ مال و حشمت حاصل ہے، مدینہ میں آیا اور بظاہر مسلمان بن کر رہنے لگا، اس کا اصل مقصد محض دولت و حشمت کا حصول ہی نہیں تھا بلکہ وہ اپنے ذہن میں مسلمانوں کی طاقت کمزور کرنے اور اسلام کی شوکت و حشمت کو ختم کرنے کی سازش بھی پنہاں رکھتا تھا، چنانچہ وہ مدینہ میں اپنی اس سازش کی تکمیل میں مصروف ہو گیا، وہاں جب کچھ کامیابی نہیں ہوئی تو بصرہ پہنچا۔

بصرہ میں اس نے مختلف مکر و فریب اور ترغیبات و لالچ کے ذریعے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور طرح طرح کی بدعقیدگیوں کا پرچار شروع کیا، جب بصرہ کے گورنر کو اس کے حالات اور اس کی اصل حقیقت کا علم ہوا اور انہوں نے بازپرس کی تو وہاں اپنے حامیوں کی ایک جماعت چھوڑ کر کوفہ آگیا جہاں پہلے ہی سے ایک جماعت حضرت عثمانؓ اور ان کے عامل کے خلاف تھی یہاں عبداللہ ابن سبا کو اپنی سازش پھیلانے کا زیادہ موقع ملا اس کو ایک طرف تو اسلام سے مخالفت تھی دوسری طرف وہ حضرت عثمان غنیؓ سے کوئی ذاتی عداوت و عناد بھی رکھتا تھا اور ان سے انتقام لینے کی خواہش رکھتا تھا کچھ دنوں کے بعد اس کو کوفہ بھی چھوڑنا پڑا اور پھر دمشق پہنچ گیا دمشق میں اس کی دال زیادہ نہ گلی اور جلد ہی اسے یہاں سے بھی شہر بدر ہونا پڑا، یہاں سے نکل کر وہ مصر پہنچا اور وہاں اس نے زیادہ ہوشیاری اور اطاعت کے ساتھ کام شروع کیا، اور ایک باقاعدہ خفیہ جماعت کی تنظیم کی چونکہ وہ اہل بیت کی محبت اور حضرت علیؓ کے ساتھ تعلق کا دعوی بھی کرتا تھا لہٰذا اس فریب آمیز دعوی کے ذریعے مصر میں اس کو کامیابی حاصل ہوئی اور لوگوں نے اس کے گرد جمع ہونا شروع کر دیا یہاں بیٹھ کر اس نے اسلامی سلطنت کے ان تمام علاقوں سے رابطہ قائم کیا، جہاں جہاں وہ گیا تھا اور اپنے کچھ حامیوں کی جماعت چھوڑ کر آیا تھا، اپنے ان حامیوں کے ذریعے ایک طرف تو اس نے مختلف علاقوں سے اہل مدینہ کے پاس یہ شکایتیں پہنچوائیں کہ عثمانؓ کے عامل

اور گورنر اپنے اپنے علاقوں کے لوگوں پر سخت ظلم و ستم کر رہے ہیں دوسری طرف اس نے عام مسلمانوں میں حضرت عثمانؓ کی خویش پروری اور ان کے عاملوں اور گورنروں کے ظلم و ستم کے فرضی واقعات کا پروپیگنڈہ کر کر کے خلافت عثمانؓ کے خلاف ناراضگی اور شورش پیدا کردی، جب حضرت عثمانؓ کو اس شورش کا علم ہوا تو انہوں نے صورت حال کی طرف توجہ دی اور اپنے عاملین اور مشیروں کو جمع کر کے مشورہ کیا، کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ جو افراد یہ شورش پھیلانے کے ذمہ دار ہیں ان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کردیا جائے اور مجرمین کے ساتھ کوئی رعایت روا نہ رکھی جائے لیکن حضرت عثمانؓ نے اپنی مروت و بردباری کی وجہ سے اس مشورے کو قبول نہیں کیا اور یہ فرمایا کہ میں قرآن وحدیث کے حکم کے مطابق کسی شخص کو اس وقت تک قتل نہیں کر سکتا جب تک کہ علانیہ مرتد ہوتے نہ دیکھ لوں اور اس کا جرم ثابت نہ ہو جائے غرض معمولی تدابیر کے علاوہ سازشیوں کے خلاف کوئی سخت کارروائی نہیں ہوئی جس سے ان کے حوصلے اور بلند ہوگئے اور وہ نہایت زور وشور کے ساتھ اپنی تخریبی کارروائیوں میں مصروف رہے اور اکثر علاقوں خاص طور پر مصر میں شورش پسندوں کے گروہ کے گروہ تیار ہوگئے جن کو مدینہ پر دھاوا بولنے اور حضرت عثمانؓ کو قتل کردینے کی تربیت دی جانے لگی۔

ادھر عبداللہ ابن سبا کے لوگ مختلف علاقوں کے گورنروں و عاملوں کے خلاف جو فرضی شکایتیں اہل مدینہ کے پاس بھیجتے تھے ان کو اہل مدینہ صحیح سمجھ کر حضرت عثمانؓ سے ان گورنروں اور عاملوں کی معزولی کا مطالبہ کرتے تھے، مگر حضرت عثمانؓ کو تفتیش و تحقیق سے چونکہ معلوم ہو جاتا تھا کہ تمام شکایتیں فرضی ہیں اس لئے وہ ان گورنروں اور عاملوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مدینہ میں حضرت عثمانؓ اور ان کی حکومت کے خلاف بدگمانیوں اور شکایتوں کی ایک فضا بن گئی اور جا بجا خلیفہ وقت کی نسبت سرگوشیاں ہونا شروع ہوگئیں بلکہ لوگوں کی زبان پر علانیہ شکایتیں آنے لگیں، یہ وہ زمانہ تھا جب عبداللہ ابن سبا کے ایجنٹ تمام ممالک اسلامیہ اور تمام بڑے شہروں اور قصبوں میں پہنچ چکے تھے اور ان کے حامیوں کے گروہ ہر جگہ پیدا ہو چکے تھے جب اس نے دیکھ لیا کہ اس کی سازش آخری مرحلوں میں پہنچ گئی ہے، تمام علاقوں میں خلافت عثمانؓ کے خلاف بدگمانیوں اور شکایتوں کا جال پھیلا دیا گیا ہے اور ہر جگہ میرے حامیوں کی خاصی تعداد جمع ہوگئی ہے تو اس نے ہر ہر علاقے سے اپنے مسلح آدمیوں کی بڑی تعداد، چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں اور خفیہ طور پر مدینہ روانہ کی، اور پھر کچھ دنوں کے بعد مدینہ والوں نے دیکھا کہ باغیوں اور بلوائیوں کی ایک بڑی جماعت نعرہ تکبیر بلند کرتی ہوئی مدینہ میں داخل ہوگئی ہے۔ عبداللہ ابن سبا نے حضرت علیؓ کی محبت اور ان کو خلیفہ بنانے کا دعویٰ کر کے جن لوگوں کو اپنے گرد جمع کیا تھا ان تک اس نے حضرت علیؓ کا ایک جعلی خط بھی گشت کرایا تھا جس میں گویا انہوں نے باغیوں کی حمایت کا اعلان کیا تھا، چنانچہ بلوائیوں نے مدینہ پہنچ کر حضرت علیؓ سے مدد کی درخواست کی تو انہوں نے اس کی کسی بھی طرح سے مدد کرنے سے صاف انکار کردیا، انہوں نے ان سے اس بات کا انکار کیا کہ میں نے تم لوگوں کی حمایت کا اظہار کیا اور کہا کہ میں نے کبھی بھی تم لوگوں کو خط نہیں لکھا۔ حضرت علیؓ نے بلوائیوں کو ان کی سازش سے دور رکھنے کی بہت کوشش کی، دوسرے صحابہؓ نے بھی معاملے کو سلجھانے کی سعی کی، حضرت عثمانؓ نے بلوائیوں کے مطالبے پر مصر کے گورنر کو معزول بھی کردیا لیکن اصل تحریک کا مقصد ہی محض شورش و بغاوت پھیلانا تھا اس لئے بلوائیوں کے لیڈروں نے صورت حال کو معمول پر لانے اور شورش کو دبانے کی تمام تدابیر کو ناکام بنادیا، حضرت عثمانؓ نے یہ رنگ اور مدینہ کے گلی کوچوں کو بلوائیوں سے پر دیکھ کر مختلف بلاد اسلامیہ کے گورنروں کو خط لکھ کر امداد طلب کی، اور ان بلاد سے سرکاری فوجیں بلوائیوں کی سرکوبی کے لئے مدینہ کی طرف روانہ بھی ہوگئیں لیکن بلوائیوں نے ان فوجوں کے آنے سے پیشتر ہی حضرت عثمانؓ کے مکان کو گھیر کر ان کا محاصرہ کرلیا، اس موقع پر یہ ظاہر کردینا نہایت ضروری ہے کہ اس صورت حال کو بگاڑنے میں بڑا دخل مروان ابن حکم کا تھا جو حضرت عثمانؓ کا چچازاد بھائی اور ان کا امیر منشی ووزیر تھا، اس نے حضرت عثمانؓ کی مروت وچشم پوشی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی بداطواریوں، جعل سازیوں اور عوام مخالف اقدامات کے ذریعے عام مسلمانوں اور خصوصاً اہل مدینہ کو بہت زیادہ برہم کر رکھا تھا، اہل مدینہ نے اس موقع پر فائدہ ضرور اٹھانا چاہا کہ مروان کے خلاف وہ بھی بلوائیوں کے شریک حال ہوگئے لیکن ان کا مطالبہ صرف مروان کو

اس کے عہدے سے معزول کر کے اہل مدینہ کے سپرد کر دینے کا تھا اور اگر حضرت عثمانؓ اہل مدینہ کا مطالبہ مان لیتے تو شاید بلوائیوں کو اپنے اصل مقصد میں زیادہ کامیابی نہ ہوتی کیونکہ پھر مدینہ کے لوگ بلوائیوں کی حمایت ترک کر کے پوری طاقت سے ان کا مقابلہ کرتے لیکن حضرت عثمانؓ کی مروت نے گوارہ نہ کیا کہ وہ مروان کو اہل مدینہ کے حوالے کر کے ان کے ہاتھوں اس کے قتل ہو جانے کا منظر دیکھیں بہر حال جب بلوائیوں نے زیادہ شورش برپا کی یہاں تک کہ ان کے مکان میں پانی جانے تک پر پابندی عائد کر دی اور جب حضرت علیؓ و دیگر جلیل القدر صحابہؓ کو یہ معلوم ہوا کہ اب بلوائی حضرت عثمانؓ کے مکان کا دروازہ توڑ کر ان کو قتل کر دینا چاہتے ہیں تو ان سب سے اپنے صاحبزادوں اور دوسرے متعدد آدمیوں کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت پر معمور کیا، اور ان لوگوں نے بڑی جوان مردی سے بلوائیوں کا مقابلہ کر کے حضرت عثمانؓ کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا اور دروازے پر جم کر کھڑے ہو گئے، کچھ حضرات نے ان کے مکانوں کی چھتوں پر پہرہ دینا شروع کیا بلوائیوں نے یہ سوچ کر کہ باہر سے سرکاری فوجوں کی آمد سے پہلے بہت جلد حضرت عثمانؓ کا کام کسی نہ کسی طرح تمام کر دینا چاہئے یہ چال چلی کہ خفیہ طور پر ایک پڑوسی کے مکان میں گھس گئے اور دیوار پھاند کر حضرت عثمانؓ کے مکان میں داخل ہو گئے اس وقت حضرت عثمانؓ کے جو محافظین تھے ان میں سے کچھ تو کوٹھے پر چڑھے ہوئے باغیوں کی کوشش اور نقل و حرکت کی نگرانی کر رہے تھے، اور کچھ دروازے پر جمے ہوئے بلوائیوں کو اندر گھسنے سے روک رہے تھے، مکان کے اندر صرف عثمانؓ تھے اور ان کی زوجہ محترمہ حضرت نائلہ، بلوائیوں نے گھستے ہی حضرت عثمانؓ پر تلوار چلائی جو قرآن کریم کی تلاوت میں مصروف تھے، ان کی بیوی نے فوراً آگے بڑھ کر تلوار کو ہاتھ سے روکا، ان کی انگلیاں کٹ کر الگ جا پڑیں، پھر دوسرا وار ہوا جس سے حضرت عثمانؓ شہید ہو گئے ایک بلوائی نے آگے بڑھ کر ٹھوکریں ماریں جس سے آپ کی پسلیاں ٹوٹ گئیں، پھر تمام بلوائیوں نے زبردست ریلے کے ذریعے مکان کے اندر دھاوا بول دیا، گھر کا سارا سامان لوٹ لیا اور بڑی واہتری مچائی، یہ المناک حادثہ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ جمعہ کے روز ہوا تین روز تک حضرت عثمانؓ کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی، پورے شہر پر بلوائیوں کا تسلط تھا، آخر بعض حضرات نے کوشش کر کے تین دن کے بعد رات کے وقت ان کی نعش مبارک کو بغیر غسل کے دیئے ہوئے کپڑوں میں دفن کر دیا، نماز جنازہ حضرت جبیر ابن مطعمؓ نے پڑھائی اور حضرت عثمانؓ کی اس ہولناک اور مظلومانہ شہادت کے ذریعے ان کا دور خلافت ختم ہو گیا اور بدبخت یہودیوں کی ایک تباہ کن سازش کو کامیاب ہونے کا موقع مل گیا۔

جنگ جمل

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینہ میں قاتلین عثمانؓ اور بلوائیوں ہی کا دور دورہ تھا اس لئے سب سے پہلے انہوں نے اہل مدینہ کو ڈرا دھمکا کر انتخاب خلیفہ کے کام پر آمادہ کیا، عبداللہ ابن سبا نے چونکہ اپنی پوری سازش اور تحریک میں حضرت علیؓ کا نام اچھالا تھا اور ان ہی کی خلافت قائم کرنے کے نام پر لوگوں کو اپنے گرد جمع کیا تھا اس لئے قدرتی طور پر بلوائیوں کی کثرت حضرت علیؓ کو خلیفہ منتخب کرنے کی حامی تھی۔ اگرچہ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کی شہادت سے پہلے ہی خلافت کے باغیوں سے اپنے تعلق کا انکار کیا تھا اور ان کی مدد کی درخواست کو ٹھکرا دیا تھا لیکن جب بلوائیوں نے ان سے اصرار کیا ادھر انہوں نے اہل مدینہ کی بھی کثرت آراء اپنے بارے میں دیکھی تو وہ خلافت کا بار سنبھالنے کے لئے تیار ہو گئے، تاہم جب لوگ بیعت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے صفائی سے کہہ دیا کہ جب تک اصحاب بدرؓ مجھ کو خلیفہ نہ تسلیم کر لیں میں بیعت نہیں لوں گا، یہ سن کر ان لوگوں نے جہاں تک ممکن ہو سکا اصحاب بدرؓ کو جمع کر کے حضرت علیؓ کی خدمت میں لائے اور اس طرح ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہوئی۔ خلیفہ بننے کے بعد حضرت علیؓ کو سب سے پہلے جس مطالبے کا سامنا کرنا پڑا وہ حضرت عثمانؓ کے قصاص کا تھا، انہوں نے حضرت عثمانؓ کی زوجہ محترمہ سے قاتلوں کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے صرف دو اشخاص کا حلیہ بتایا لیکن ان کا نام نہ بتا سکیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ بلا تشخص

و تعین اور ثبوت فراہم ہوئے بغیر قاتلین عثمانؓ کو سزا کیسے دے سکتے تھے۔ اس لئے قصاص کے مطالبہ کو تسلیم کرنے میں رکاوٹ پیدا ہوگئی، جب لوگوں نے بالخصوص حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے صرف حضرت علیؓ سے اس مطالبہ پر اصرار کیا تو حضرت علیؓ نے کہا کہ میں قاتلین عثمانؓ سے قصاص ضرور لوں گا اور حضرت عثمانؓ کے معاملے میں پورا پورا انصاف کروں گا لیکن ابھی تک بلوائیوں کا زور ہے اور ادھر خلافت کا زور پوری طرح مستحکم نہیں ہوا ہے اس لئے فی الحال میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا، اطمینان اور استحکام حاصل ہونے کے بعد سب سے پہلے اسی معاملے کی طرف توجہ کروں گا۔ بس اسی جگہ سے حضرت علیؓ کے خلاف بدگمانی کی فضا پیدا ہونا شروع ہوگئی، مسلمانوں بالخصوص بنو امیہ کے لوگوں کو یقین ہوگیا کہ حضرت عثمانؓ کے قتل کا بدلہ نہیں لیا جائے گا اور قاتلان عثمانؓ مزے اڑاتے پھریں گے، ادھر سبائیوں نے اس خوف سے کہ کہیں حضرت علیؓ قتل عثمانؓ کے بدلے میں ہمیں سزا نہ دینے لگیں، اپنی سازش میں لگ گئے اور کوشش کرنے لگے کہ خلافت کو استحکام نصیب نہ ہو اور تمام مسلمان ایک دوسرے کے خلاف بدگمانی اور عداوت میں مبتلا ہو جائیں۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ حج کے لئے مکہ تشریف لے گئی تھیں وہاں سے مدینہ واپس آرہی تھیں کہ راستے میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کا سانحہ سن کر پھر مکہ لوٹ آئیں ان کو حضرت علیؓ کی خلافت کی خبر بھی ملی ساتھ ہی انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ قاتلان عثمانؓ کو سزا دینے میں تامل کر رہے ہیں، چنانچہ وہ مکہ آئیں اور لوگوں کو ان کی اس طرح واپسی کا حال معلوم ہوا تو وہ آ آکر ان کی سواری کے گرد جمع ہوگئے انہوں نے مجمع کے روبرو تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ میں خود خون عثمان کا بدلہ لوں گی۔ بنو امیہ کے تمام لوگوں اور مکہ کے عثمانی گورنر نے ان کی حمایت کا اعلان کیا، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ مدینہ سے مکہ آئے تو وہ دونوں بھی حضرت عائشہؓ کے ساتھ ہوگئے، کچھ عرصہ تیاریوں میں لگا اور پھر حضرت عائشہؓ اپنے تمام حامیوں کو لے کر بصرہ روانہ ہوئیں تاکہ وہاں سے فوجی امداد لے کر آگے کی کارروائی شروع کریں راستے میں کچھ لوگ ان سے جدا بھی ہوگئے، خود حضرت عائشہؓ نے ایک مقام پر یہ ارادہ کر لیا کہ اپنے ارادہ سے باز آکر واپس ہو جائیں مگر مسلمانوں کو باہم محاذ آرا کرنے پر سازشیوں کے جو لوگ متعین تھے انہوں نے کچھ ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ کارواں کو پھر آگے بڑھنا پڑا، بصرہ کے قریب پہنچ کر ام المؤمنین خیمہ زن ہوگئیں، گو امیر بصرہ نے ان کی مدد کرنے سے انکار کیا مگر عام لوگوں نے ان کی حمایت کی اور ان کے لشکر میں شامل ہوگئے، حضرت عائشہؓ اپنا وہ لشکر لے کر مقام امربد تک آپہنچیں، اس کے بعد امیر بصرہ بھی اپنا لشکر لے کر وہاں آگیا اور دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوگئے، دونوں کے درمیان جنگ ہوئی اور گورنر بصرہ کی فوج شکست کھا کر بھاگ کھڑی ہوئی اور اُمّ المؤمنینؓ وغیرہ کا بصرہ پر قبضہ ہوگیا۔ حضرت علیؓ کو جب یہ صورت حال معلوم ہوئی تو وہ ایک بڑا لشکر لے کر بصرہ روانہ ہوئے ادھر بعض دور اندیش اور صاحب بصیرت حضرات کی طرف سے اُمّ المؤمنینؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش ہونے لگی چونکہ اُمّ المؤمنینؓ اور حضرت علیؓ دونوں کے قلوب صاف تھے، اور دونوں ہی اس باہمی محاذ آرائی پر سخت دل گرفتہ تھے، اس لئے جب مصالحین نے دونوں کے دلوں سے ایک دوسرے کے خلاف بدگمانیاں دور کرا کے باہمی صلح وصفائی کا میدان ہموار کر لیا اور مصالحت یقینی ہوگئی تو عین موقع پر عبداللہ ابن سبا جو اپنے ساتھیوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ حضرت علیؓ کے لشکر میں موجود تھا اپنی پرانی یہودی سازش کے تحت متحرک ہوگیا اور جس دن صلح نامہ پر دستخط ہونے والے تھے اس کی صبح سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے پہلے سپاہیوں نے اچانک ام المؤمنینؓ کے لشکر پر حملہ کر دیا اور اس طرح دونوں طرف کی فوجیں اس بدگمانی میں پڑ کر کہ فریق مخالفت نے مصالحت کی کوشش ٹھکرا کر جنگ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے، باہم برسرپیکار ہوگئیں، اُمّ المؤمنینؓ نے اس موقع پر بھی جنگ رکوانے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لئے اونٹ پر ہودج میں بیٹھ کر میدان جنگ میں آئیں لیکن چونکہ دونوں طرف کے جذبات بھڑک اٹھے تھے اس لئے میدان جنگ میں ان کی بہ نفس نفیس آمد دونوں طرف سے جنگ کے شعلے کو بھڑکانے کا مزید سبب بن گئی جم کر لڑائی ہوئی اور جنگ کا سارا زور حضرت اُمّ المؤمنینؓ کے اونٹ کے ارد گرد رہا، اسی مناسبت سے اس جنگ کو جنگ جمل یعنی اونٹ کی لڑائی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے! سازشیوں کی سازش لوگوں کو بھڑکاتی رہی اور مسلمانوں کی تلوار اپنے ہی بھائیوں کا گلا کاٹنے میں مصروف رہی،

حضرت عائشہؓ نے آخری طور پر جنگ بند کرانے کی ایک اور کوشش کی لیکن عبداللہ ابن سبا کے لوگوں کی وجہ سے وہ کوشش بھی ناکام ہوگئی۔ اُم المؤمنینؓ کا اونٹ لڑائی اور کشت وخون کا مرکز بنا ہوا تھا۔ چاروں طرف سے حضرت عائشہؓ کے کجاوہ پر تیروں کی بارش ہو رہی تھی، اہل بصرہ پوری جان نثاری کے ساتھ ان تیروں کو اپنے اوپر لے رہے تھے اور اونٹ کے چاروں طرف لاشوں کے انبار لگ گئے، آخرش حضرت علیؓ کے لشکر والوں نے ایک زور کا دھاوا بولا اور ایک شخص نے موقع پا کر اونٹ کے پاؤں میں تلوار ماری اور چلا کر سینہ کے بل بیٹھ گیا اونٹ کے گرتے ہی اہل بصرہ منتشر ہوگئے اور جنگ ختم ہوگئی۔ اس جنگ میں حضرت عائشہؓ کی طرف سے لڑنے والوں کی تعداد تیس ہزار تھی جن میں سے نو ہزار آدمی میدان جنگ میں کام آئے۔ اس کے بعد اگلے دن حضرت علیؓ بصرہ میں داخل ہوئے تمام اہل شہر نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور بعد میں حضرت علیؓ نے اُم المؤمنینؓ کو پورے ادب واحترام کے ساتھ بصرہ سے روانہ فرمایا اور طرفین کے درمیان ہر طرح صلح وصفائی ہوگئی۔ یہ واقعہ ۳۶ھ کے وسط میں پیش آیا اور یہ یہودیوں کی گھناؤنی سازش کا دوسرا حملہ تھا جس سے اہل اسلام کو زبردست دھکا لگا اور مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

جنگ صفین

حضرت امیر معاویہؓ، حضرت عثمان غنیؓ کی طرف سے ملک شام کے گورنر مقرر ہوئے تھے۔ ان کا حضرت عثمانؓ سے خاندانی اور قرابتی تعلق بھی تھا۔ جب حضرت علیؓ نے دوسرے ملکوں اور شہروں میں خلافت عثمانی کے مقررہ گورنروں اور عاملوں کو سبکدوش کر کے اپنے معتمد لوگوں کو ان کی جگہوں پر بھیجا تو حضرت امیر معاویہؓ کی معزولی کا فرمان بھی صادر ہوا اور ان کا عہدہ سنبھالنے کے لئے سہل ابن حنیف کو روانہ فرمایا لیکن سہل ابن حنیف کو راستے ہی سے واپس ہونا پڑا اور وہ حضرت امیر معاویہؓ سے شام کی گورنری کا عہدہ سنبھالنے میں ناکام رہے۔ اس طرح یہ بات سامنے آگئی کہ حضرت امیر معاویہؓ نے گویا حضرت علیؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا ہے اور وہ بنو امیہ کے معتمد ہونے کی حیثیت سے خون عثمانؓ کے قصاص کے مسئلہ پر نہایت مضبوطی سے حضرت علیؓ کے مخالف ہیں، اس موقع پر پھر یہودیوں نے سبائیوں کی صورت میں سازش کا جال پھیلایا اور حضرت علیؓ وامیر معاویہؓ کے درمیان خلیج کو وسیع تر کرنے میں مصروف ہوگئے، یہاں تک کہ حضرت علیؓ حضرت امیر معاویہؓ کے خلاف ملک شام پر لشکر کشی کا ارادہ کرنے لگے، لیکن درمیان میں جنگ جمل کا واقعہ پیش آگیا، اس جنگ سے فارغ ہونے کے بعد حضرت علیؓ کے سامنے سب سے بڑا کام ملک شام کو قابو میں لانا اور امیر معاویہؓ سے بیعت لینے ہی کا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کوفہ کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور اس مسئلے کی طرف متوجہ ہوگئے اور شام کی طرف لشکر کشی کا کام شروع ہوگیا، ادھر حضرت امیر معاویہؓ کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بھی مقابلے کے لئے تیار ہوئے، کوفہ سے حضرت علیؓ کا لشکر روانہ ہوا اور دریائے فرات کو عبور کر کے اس پار خیمہ زن ہوا، ادھر دمشق سے حضرت امیر معاویہؓ کا لشکر نکلا اور حضرت علیؓ کے لشکر کا مقابلہ کرنے کے لئے چل پڑا پہلے دونوں لشکروں کے مقدمۃ الجیش کے درمیان مقابلہ ہوا، اس کے بعد دونوں طرف کی پوری فوجیں میدان جنگ میں پہنچ کر ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہوگئیں، حضرت علیؓ اپنی فوج کو کمان کر رہے تھے اور حضرت امیر معاویہؓ اپنے لشکر کے سپہ سالار تھے، پھر بعض حضرات نے مصالحت کی کوشش شروع کی لیکن سازشیوں کا جال چونکہ دونوں طرف پھیلا ہوا تھا اس لئے یہ کوشش ناکام ہوگئی اس کے بعد بمجبوراً لڑائی شروع ہوگئی، تقریباً ایک مہینے تک تو جنگ کا رخ بالکل انفرادی رہا اور باقاعدہ جنگ سے گریز کیا جاتا رہا۔ اس کے بعد ایک مہینے تک کے لئے یہ انفرادی لڑائی بھی معطل کر دی گئی اور اس عرصے میں مصالحت کی کوششیں پھر شروع ہوگئیں لیکن مصالحت کی یہ دوسری کوشش بھی کامیاب نہیں ہو سکی اور آخر کار یکم صفر ۳۷ھ سے جنگ کا آغاز ہوگیا، اور ایک ہفتے سے زائد تک بڑی خوفناک جنگ ہوتی رہی حضرت علیؓ کی فوج کا پلڑا بھاری تھا، اور جنگ کے آخری دن وہ مرحلہ بھی آگیا تھا کہ حضرت امیر معاویہؓ کو پوری طرح شکست ہو جاتی لیکن عین موقع پر امیر معاویہؓ کے مشیر خاص حضرت عمرو بن العاصؓ کی حکمت عملی نے فوری جنگ بندی کرا دی! اس

کے بعد فریقین نے یہ طے کر لیا کہ حکم کے ذریعے قرآن مجید کی روشنی میں صلح صفائی کر لی جائے۔
امیر معاویہؓ کی طرف سے حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت علیؓ کی طرف سے ابوموسی اشعریؓ کو ثالث بنانے پر اتفاق ہو گیا۔ گو آگے چل کر بعض اسباب و عوامل کی بنا پر جس کی تفصیل بہت طویل ہے، یہ ثالثی کامیاب نہیں ہوئی اور حضرت علیؓ و امیر معاویہ کے درمیان اس آویزش و اختلاف کا سلسلہ ختم نہیں ہوا لیکن یہ بھیانک جنگ، جو جنگ صفین کے نام سے مشہور ہوئی، مزید تباہی و بربادی اور خونریزی پھیلائے بغیر بند ہو گئی۔ اس جنگ نے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا اور اسلام کی شوکت کو زبردست دھکا لگا، بیان کیا جاتا ہے کہ اس باہمی محاذ آرائی کے دوران مجموعی طور پر ستر ہزار کے قریب مسلمان میدان جنگ میں کام آئے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

ایک واقعہ ایک پیشین گوئی

(۲۹) عَنْ اَبِیْ وَاقِدِ اللَّیْثِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا خَرَجَ اِلٰی غَزْوَةِ حُنَیْنٍ مَرَّ بِشَجَرَةٍ لِلْمُشْرِكِیْنَ كَانُوْا یُعَلِّقُوْنَ عَلَیْهَا اَسْلِحَتَهُمْ یُقَالُ لَهَا ذَاتُ اَنْوَاطٍ فَقَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اجْعَلْ لَنَا ذَاتَ اَنْوَاطٍ كَمَا لَهُمْ ذَاتُ اَنْوَاطٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سُبْحَانَ اللّٰهِ هٰذَا كَمَا قَالَ قَوْمُ مُوْسٰی اجْعَلْ لَنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَتَرْكَبُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ۔ (رواہ الترمذی)

"حضرت ابوواقد لیثیؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ (فتح مکہ کے بعد) جب غزوہ حنین کے لئے روانہ ہوئے تو (راستہ میں) آپ ﷺ کا گزر مشرکوں کے ایک درخت پر ہوا جس پر وہ (مشرک) اپنے ہتھیار لٹکایا کرتے تھے، اور پوجا کے طور پر اس درخت کے گرد طواف کرتے اور تعظیماً اس کی طرف منہ کر کے بیٹھا کرتے تھے) اس درخت کا نام ذات انواط تھا۔ (آنحضرت ﷺ کے ہمراہیوں میں ایسے مسلمانوں کی بھی تعداد شامل تھی جو نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور اسلامی احکام و شرائع اور دینی تعلیمات سے زیادہ واقفیت نہ رکھنے کی وجہ سے شرک بیزاری اور توحید میں کامل مرتبہ نہیں رکھتے تھے، انہی مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے اس درخت کو دیکھ کر) حضور ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! ہمارے لئے بھی کوئی ایسا درخت مقرر کر دیجئے جس پر ہم اپنے ہتھیار لٹکایا کریں اور اس کو ذات انواط کہا کریں جیسا کہ مشرکوں نے اس درخت کو اپنے لئے ذات انواط بنا رکھا ہے اور اس پر ہتھیار لٹکاتے ہیں۔ حضور ﷺ نے (ان لوگوں کی یہ عجیب و غریب خواہش سن کر ازراہ حیرت و تعجب) فرمایا کہ "سبحان اللہ (یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟) یہ بات تم ایسی کہہ رہے ہو جیسا کہ موسیٰ کی قوم (یہودیوں) نے (اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے) کہا تھا کہ ہمارے لئے بھی ایک ایسا معبود (یعنی بت) بنا دیجئے جیسا کہ کافروں کے معبود ہیں) تاکہ جس طرح وہ کافر اپنے بتوں کو پوجتے ہیں اسی طرح ہم اپنے اس بت کو پوجا کریں۔ پھر حضور ﷺ نے بطور تنبیہ یہ فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم ان لوگوں کے راستے پر چلنا شروع کرو گے جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔" (ترمذیؒ)

تشریح: "انواط" دراصل نوط کی جمع ہے جو مصدر ہے اور جس کے معنی لٹکانے کے ہیں، چونکہ اس درخت پر ہتھیار لٹکائے جاتے تھے اس لئے اس کا نام "ذات انواط" ہو گیا اور یہ نام اسی خاص درخت کا تھا۔
"جو تم سے پہلے گزرے ہیں" سے مراد گزشتہ امتوں کے لوگ یعنی یہود و نصاریٰ وغیرہ ہیں! حدیث کے اس آخری جملے کے ذریعے حضور ﷺ نے گویا ان لوگوں کے تئیں ناراضگی و بے اطمینانی کا اظہار فرمایا کہ اگر تم لوگ ایسی ہی بات کہتے اور کرتے رہے تو عجب نہیں کہ گمراہی اور حد سے بڑھ جانے کے اس راستہ پر جا پڑو جس کو پچھلی امتوں کے لوگوں نے اختیار کیا تھا اور خدا کے مبغوض بندے قرار

پائے تھے۔

چند فتنوں کا ذکر

(۳۰) وَعَنِ ابْنِ الْمُسَيَّبِ قَالَ وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ الْأُولٰى يَعْنِي مَقْتَلَ عُثْمَانَ فَلَمْ يَبْقَ مِنْ اَصْحَابِ بَدْرٍ اَحَدٌ ثُمَّ وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ الثَّانِيَةُ يَعْنِي الْحَرَّةَ فَلَمْ يَبْقَ مِنْ اَصْحَابِ الْحُدَيْبِيَةِ اَحَدٌ ثُمَّ وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ الثَّالِثَةُ فَلَمْ تَرْتَفِعْ وَبِالنَّاسِ طَبَاخٌ۔

(رواہ البخاری)

"اور حضرت ابن مسیبؒ سے (جو جلیل القدر تابعین میں سے تھے اور جنہوں نے چاروں خلفائے راشدین کا زمانہ پایا تھا) روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ "جب پہلا فتنہ (کہ جس سے پہلے اسلام میں کوئی فتنہ ظاہر نہیں ہوا) واقع ہوا یعنی حضرت عثمانؓ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا تو غزوہ بدر میں شریک ہونے والے صحابہؓ میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہا، پھر جب دوسرا فتنہ واقع ہوا یعنی حرہ کا واقعہ پیش آیا تو ان صحابہؓ میں سے کوئی باقی نہیں رہا جو صلح حدیبیہ (یعنی بیعت الرضوان) میں شریک ہوئے تھے پھر جب تیسرا فتنہ واقع ہوا تو اس کا خاتمہ اس حالت میں نہیں ہوا تھا کہ لوگوں میں قوت اور فربہی باقی رہی ہو۔" (بخاریؒ)

تشریح: "یعنی" کا لفظ اس روای کا ہے جس نے اس روایت کو حضرت ابن مسیب سے نقل کیا ہے، گویا اس راوی نے اس لفظ کے ذریعے وضاحت کی کہ حضرت ابن مسیب نے جس فتنہ کو ذکر کیا اس سے ان کی مراد کس فتنہ سے تھی"۔ فلم یبق الخ کے الفاظ ابن مسیب کے ہیں، جن سے مراد یہ ہے کہ اصحاب بدر اس وقت سے خدا کو پیارے ہونے لگے تھے جب کہ پہلا فتنہ، یعنی ۳۵ھ میں حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کا المناک سانحہ پیش آیا تھا اور پھر جب ۶۳ھ میں دوسرا فتنہ یعنی حرہ کی جنگ کا واقعہ پیش آیا تو اس وقت تک کوئی بھی بدری صحابی باقی نہیں رہا تھا! پس مذکورہ الفاظ کی مراد یہ نہیں ہے کہ اصحاب بدر حضرت عثمانؓ کی شہادت کے فتنہ میں مارے گئے تھے۔ اسی وضاحت کو بعد کے جملے میں بھی ان الفاظ پر منطبق کرنا چاہئے اور حاصل یہ کہ غزوہ بدر میں شرکت کی برکت کے سبب اللہ تعالیٰ نے بدری صحابہؓ کو محفوظ رکھا اور انہوں نے فتنے کا دوبارہ منہ نہیں دیکھا! اصحاب بدر میں سب سے آخر میں جن صحابی کا انتقال ہوا ہے وہ حضرت سعد ابن ابووقاص ہیں جو واقعہ حرہ سے چند سال پہلے انتقال کر گئے تھے۔

"حرہ" مدینہ کے ایک نواحی علاقے کو کہا جاتا تھا جہاں کی زمین سخت پتھریلی اور سیاہ رنگ کی تھی، یزید ابن معاویہ کی طرف سے جو لشکر مدینہ والوں پر چڑھ کر آیا تھا، اس کی جنگی کاروائیوں کی ابتداء اسی جگہ سے ہوئی تھی! اس واقعہ کی تفصیل پچھلے صفحات میں بیان کی جا چکی ہے۔

"طباخ" کے معنی ہیں مضبوطی، قوت، موٹاپا۔ اور کبھی یہ لفظ اپنے برعکس معنی کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے، مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو طباخ نہیں ہے یعنی اس کو عقل نہیں ہے، اس میں خیر و بھلائی نہیں ہے۔ حدیث کے اس آخری جملے سے مراد یہ ہے کہ جب وہ فتنہ ظاہر ہوا تو اس وقت لوگوں میں یعنی تابعین میں کوئی صحابی باقی نہیں رہا تھا۔ بعض حواشی میں لکھا ہے کہ ابن مسیب نے جس تیسرے فتنہ کی طرف اشارہ کیا، اس سے ابن حمزہ خارجی کا فتنہ خروج مراد ہے جو مروان ابن محمد ابن مروان ابن الحکم کے زمانے میں پیش آیا تھا۔ اور کرمانیؒ نے یہ لکھا ہے کہ اس تیسرے فتنہ سے مراد عبداللہ ابن زبیر اور اہل مکہ کے خلاف حجاج ابن یوسف کی وہ جنگ ہے جو عبدالملک ابن مروان کے زمانے میں ۷۳ھ میں ہوئی تھی اور جس کے نتیجے میں کعبہ اقدس کی بھی تخریب ہوئی تھی! لیکن یہ مراد اس صورت میں صحیح قرار نہیں پا سکتی جب کہ حدیث کے آخری جملے کے مطابق یہ کہا جائے کہ اس فتنے کے وقت دنیا میں کوئی صحابی موجود نہیں تھا کیونکہ حجاج ابن یوسف کی جنگ کے وقت تو صحابہؓ کی اچھی خاصی تعداد بقید حیات تھی، لہٰذا پہلی مراد ہی صحیح ہے۔

باب الملاحم

جنگ اور قتال کا بیان

مَلَاحِم، مَلْحَمَۃٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں معرکہ اور گھمسان کی جنگ کا موقع۔ اور اصل کے اعتبار سے یہ لفظ یا تو "لحم" سے نکلا ہے جو گوشت کے معنی میں آتا ہے، "لحمۃ" سے مشتق ہے جو کپڑے (یعنی بانے) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے! اگر مادہ اشتقاق "لحم" کو قرار دیا جائے تو قتل وقتال یا موقع قتال کو "ملحمۃ" سے تعبیر کرنا اس سبب سے ہوگا کہ قتل وقتال یا میدان جنگ میں مقتولین کے گوشت اور لوتھڑوں ہی کی کثرت نظر آتی ہے اور اگر یہ مانا جائے کہ "ملحمہ" کا لفظ "لحمہ" سے نکلا ہے تو پھر یہ کہا جائے گا کہ کسی بھی جنگ ومعرکہ آرائی یا میدان جنگ میں چونکہ لوگ آپس میں اس طرح گتھم گتھا ہوتے ہیں جس طرح کپڑے کا بانا اپنے تانے کے ساتھ گتھا ہوا ہوتا ہے اس لئے قتل وقتال اور موقع قتال کو "ملحمہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے! لیکن پہلی بات (یعنی "ملحمہ" کا لحم سے مشتق ہونا) زیادہ مناسب اور موزوں ہے، نیز "ملحمہ" کا لفظ لڑائی اور بڑے حادثے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور صراح میں لکھا ہے کہ "ملحمہ" کے معنی ہیں فتنہ اور بڑی جنگ۔

واضح رہے کہ اس باب میں ان مخصوص لڑائیوں اور جنگوں کا ذکر ہوگا جن کا تعلق متعین طور پر کچھ خاص گروہوں کی باہمی محاذ آرائی اور خاص جگہوں اور شہروں سے ہے۔ اس لئے ان لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا ذکر کرنے کے لئے یہ الگ باب قائم کیا گیا ہے اور باب الفتن میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ باب الفتن میں باہمی قتل وقتال اور محاذ آرائی کا جو ذکر ہوا ہے وہ عمومی نوعیت کا ہے اور اجمال وابہام کے ساتھ ہے۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

کچھ وہ چیزیں جن کا قیامت آنے سے پہلے وقوع پذیر ہونا ضروری ہے

① عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَقْتَتِلَ فِئَتَانِ عَظِيْمَتَانِ تَكُوْنُ بَيْنَهُمَا مَقْتَلَةٌ عَظِيْمَةٌ دَعْوَاهُمَا وَاحِدَةٌ وَحَتّٰى يُبْعَثَ دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ قَرِيْبٌ مِّنْ ثَلٰثِيْنَ كُلُّهُمْ يَزْعَمُ اَنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَحَتّٰى يُقْبَضَ الْعِلْمُ وَيَكْثُرَ الزَّلَازِلُ وَيَتَقَارَبَ الزَّمَانُ وَيَظْهَرَ الْفِتَنُ وَيَكْثُرَ الْهَرْجُ هُوَ الْقَتْلُ وَحَتّٰى يَكْثُرَ فِيْكُمُ الْمَالُ فَيَفِيْضَ حَتّٰى يُهِمَّ رَبَّ الْمَالِ مَنْ يَّقْبَلُ صَدَقَتَهٗ وَحَتّٰى يَعْرِضَهٗ فَيَقُوْلُ الَّذِیْ يَعْرِضُهٗ عَلَيْهِ لَا اَرَبَ لِیْ بِهٖ وَحَتّٰى يَتَطَاوَلَ النَّاسُ فِی الْبُنْيَانِ وَحَتّٰى يَمُرَّ الرَّجُلُ بِقَبْرِ الرَّجُلِ فَيَقُوْلُ يَالَيْتَنِیْ مَكَانَهٗ وَحَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَّغْرِبِهَا فَاِذَا طَلَعَتْ وَرَاٰهَا النَّاسُ اٰمَنُوْا اَجْمَعُوْنَ فَذٰلِكَ حِيْنَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِیْ اِيْمَانِهَا وَلَتَقُوْمَنَّ السَّاعَةُ وَقَدْ نَشَرَ الرَّجُلَانِ ثَوْبَهُمَا بَيْنَهُمَا فَلَا يَتَبَايَعَانِهٖ وَلَا يَطْوِيَانِهٖ وَلَتَقُوْمَنَّ السَّاعَةُ وَقَدِ انْصَرَفَ الرَّجُلُ بِلَبَنِ لِقْحَتِهٖ فَلَا يَطْعَمُهٗ وَلَتَقُوْمَنَّ السَّاعَةُ وَهُوَ يَلِيْطُ حَوْضَهٗ فَلَا يَسْقِیْ فِيْهِ وَلَتَقُوْمَنَّ السَّاعَةُ وَقَدْ رَفَعَ اُكْلَتَهٗ اِلٰى فِيْهِ فَلَا يَطْعَمُهَا۔ (متفق علیہ)

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ دو بڑے گروہ آپس میں نہ لڑلیں گے، ان دونوں گروہوں کے درمیان زبردست قتل وقتال ہوگا۔ اور دونوں کا ایک ہی دعویٰ ہوگا (اور قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی) جب تک بڑے زبردست مکار، فریبی اور فسادی لوگ پیدا نہ ہو جائیں گے جو خدا اور رسول ﷺ پر جھوٹ بولیں گے، ان کی تعداد تیس کے قریب ہوگی اور ان میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ ہوگا کہ وہ خدا کا رسول ہے (اور قیامت اس وقت تک قائم نہیں

ہوگی) جب تک علم نہ اٹھالیا جائے گا (اور قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی) جب تک زلزلوں کی کثرت نہ ہو جائے گی، زمانہ قریب نہ ہو جائے گا، فتنوں کا ظہور نہیں ہونے لگے گا اور ہرج یعنی قتل وقتال اور لوٹ مار کے واقعات میں اضافہ نہ ہو جائے گا (اور قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی) جب تک کہ تمہارے پاس مال ودولت کی اتنی کثرت نہیں ہو جائے گی کہ مالدار شخص خیرات لینے والے کی وجہ سے قلق اور پریشانی میں مبتلا ہو جائے، یہاں تک کہ وہ مالدار، جس شخص (کو صدقہ وخیرات لینے والا سمجھ کر اس) کے سامنے صدقہ وخیرات کا مال پیش کرے گا، وہ (غنائے قلبی کے سبب یا خود مالدار ہونے کی وجہ سے) یہ کہے گا کہ مجھے تمہارے اس صدقہ خیرات کے مال) کی ضرورت وحاجت نہیں ہے! (اور قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی) جب تک کہ لوگ وسیع اور لمبی چوڑی عمارتوں کے بنانے پر فخر نہ کرنے لگیں گے اور جب تک کہ آدمی کسی قبر کے پاس سے گزرتا ہوا یہ نہ کہنے لگے گا کہ کاش! میں اس کی جگہ ہوتا (اور قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی) جب تک کہ آفتاب مغرب کی طرف سے طلوع نہ ہوگا۔ چنانچہ جب آفتاب مغرب کی طرف سے نکلے گا اور لوگ اس کو دیکھیں گے تو سب ایمان لے آئیں گے (اور آخرت کا امر ظاہر ہو جائے گا) پس یہ وقت وہ ہوگا جب کسی بھی ایسے شخص کو اس وقت اس کا ایمان لانا نفع نہ دے گا جس نے اس دن سے پہلے ایمان قبول نہیں کیا ہوگا اور نہ کسی شخص کو اس وقت اپنے ایمان کی حالت میں نیک کام کرنا فائدہ پہنچائے گا اگر اس نے اس دن سے پہلے نیک کام نہیں کیا ہوگا۔ اور اس میں شک نہیں کہ قیامت اس طرح قائم ہوگی (یعنی پہلا صور کہ جو قیامت کی ابتدا ہوگی، اس طرح اچانک پھونکا جائے گا) کہ دو شخصوں نے (اپنا کپڑا خرید وفروخت کے لئے) کھول رکھا ہوگا اور وہ نہ اس کی خرید وفروخت کر چکے ہوں گے اور نہ اس کو لپیٹ کر رکھ سکے ہوں گے کہ اسی حالت میں قیامت آجائے گی۔ اور بلاشبہ قیامت اس طرح قائم ہوگی کہ ایک شخص اپنی اونٹنی کے دودھ کے ساتھ واپس آیا ہوگا (یعنی اونٹنی کا دودھ لے کر اپنے گھر آیا ہوگا) اور اس دودھ کو پینے نہ پایا ہوگا کہ قیامت آجائے گی اور بلاشبہ قیامت اس طرح قائم ہوگی کہ ایک شخص اپنے حوض کو لیپتا اور پوتا ہوگا (یعنی اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے لئے کوئی کنڈ وغیرہ بناتا یا اس کو درست کرتا ہوگا) اور وہ اپنے جانوروں کو اس حوض سے پانی نہ پلانے پایا ہوگا کہ قیامت آجائے گی اور بلاشبہ قیامت اس طرح قائم ہوگی کہ ایک شخص نے منہ میں رکھنے کے لئے لقمہ اٹھایا ہوگا اور وہ اس لقمہ کو کھانے نہ پایا ہوگا کہ قیامت آجائے گی۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "اور دونوں کا ایک ہی دعویٰ ہوگا" کا مطلب یہ ہے کہ آپس میں لڑنے والے وہ دونوں گروہ دین اسلام کا دعویٰ رکھنے والے ہوں گے اور ان دونوں گروہوں سے تعلق رکھنے والا ہر شخص مسلمان ہوگا یا یہ کہ وہ دونوں گروہ جو مسلمان ہوں گے حق پر دعویٰ کریں گے اور ان میں سے ہر ایک یہ گمان وعقیدہ رکھے گا کہ دین ودیانت اور اصول کے اعتبار سے بالکل صحیح راستہ وہی اختیار کئے ہوئے ہے، علماء نے لکھا ہے کہ اس ارشاد گرامی میں جن دو گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے ان سے حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے تابعدار ساتھی مراد ہیں۔ جیسا کہ حضرت علیؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کے لوگوں کے بارے میں فرمایا تھا کہ اخوا اننا بغوا علینا (یعنی وہ لوگ ہمارے بھائی ہیں جنہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کردی ہے) اسی طرح ایک روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ اس زمانہ میں (جب کہ حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے لشکر ایک دوسرے کے خلاف سرو آزما تھے) اور حضرت علیؓ کے لشکر کا ایک شخص حضرت امیر معاویہؓ کے ایک آدمی کو قیدی بنا کر حضرت علیؓ کی خدمت میں لایا، ایک دوسرے شخص نے اس قیدی کو دیکھ کر اس کی حالت پر تاسف کا اظہار کیا اور کہنے لگا کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ مسلمان پختہ اسلام کا حامل تھا! حضرت علیؓ نے یہ سنا تو ناگواری کے ساتھ فرمایا کہ تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ یہ شخص تو اب بھی مسلمان ہے! پس یہ حدیث خوارج کے قول کو باطل ثابت کرتی ہے جو کہتے ہیں کہ دونوں جماعتیں (یعنی حضرت علیؓ کے تابعدار بھی اور حضرت امیر معاویہؓ کے تابعدار بھی) کافر ہیں۔ اسی طرح اس حدیث کے ذریعے روافض کے اس قول کا باطل ہونا ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کے مخالف کافر ہیں۔

"ان کی تعداد تیس کے قریب ہوگی" اس طرح کی ایک حدیث گزشتہ باب میں گزری ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ ان کی تعداد تیس ہوگی

اور یہاں ان کی تعداد تیس کے قریب فرمائی گئی ہے؟ تو ہو سکتا ہے کہ پہلی حدیث میں آپ ﷺ نے متعین طور پر ذکر تو تیس کی تعداد کا فرمایا لیکن مراد یہی ہو کہ ان کی تعداد تیس کے قریب ہوگی یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پیچھے جو حدیث گزری ہے وہ یہاں نقل کی جانے والی حدیث کے بعد کے زمانے کی ہے، گویا اس بارے میں پہلے آپ ﷺ کے پاس جو وحی آئی تھی اور اس سے بطریق اجمال وابہام جو بات آپ ﷺ کو معلوم ہوئی وہ آپ ﷺ نے بیان فرمادی کہ ان کی تعداد تیس کے قریب ہوگی لیکن پھر بعد میں دوسری وحی کے ذریعے اس تعداد کو مقید و متعین فرمادیا گیا، چنانچہ اس وحی کے آنے کے بعد آپ ﷺ نے جو حدیث ارشاد فرمائی اس میں فرمایا کہ ان کی تعداد تیس ہوگی۔ اسی طرح تیس کی تعداد والی یہ حدیث اس روایت کے منافی نہیں ہے جس کو طبرانی نے حضرت ابن عمروؓ سے نقل کیا ہے کہ لا تقوم الساعة حتی یخرج سبعون کذابا کیونکہ حضرت ابن عمروؓ کی روایت کا مقصد محض ان جھوٹوں کی کثرت کو ظاہر کرنا ہے، ان کی کسی خاص تعداد کا بیان نہیں! یا یہ کہ ستر میں سے تیس تو وہ ہوں گے جو نبوت کا دعویٰ کریں گے، اور باقی جھوٹے وہ ہوں گے جو نبوت کا دعویٰ نہیں کریں گے، اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ستر کی جو تعداد ذکر فرمائی گئی ہے وہ تیس کے علاوہ ہو اور اس طرح سب کی مجموعی تعداد سو مراد ہو۔

"جب تک علم نہ اٹھالیا جائے گا" میں "علم" سے مراد وہ خاص علم ہے جو شریعت میں "نفع دینے والا علم" کہلاتا ہے اور وہ قرآن و حدیث اور ان کے متعلقات کا علم ہے، اور جس کو دین کا علم بھی کہا جا سکتا ہے، نیز "علم کے اٹھ جانے سے" مراد اہل سُنت والجماعت کے علماء کا اس دنیا سے رخصت ہو جانا ہے! چنانچہ جب علم کے حامل اور علم پہنچانے والے ہی اس دنیا سے اٹھ جائیں گے تو گویا علم ہی اس دنیا سے اٹھ جائے گا، پس آخری زمانہ کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس وقت مخلص و باعمل اور حقیقی عالم تو رخصت ہو جائیں گے اور دنیا میں جاہل و بے علم اور بدعتی لوگوں کی کثرت ہو جائے گی، اسی لئے کہا گیا ہے کہ ایک عالم کی موت عالم کی موت ہے۔

"جب تک کہ زلزلوں کی کثرت نہ ہو جائے گی" میں زلزلوں سے مراد یا تو حسی یعنی واقعی زلزلے ہیں کہ زمین کا ہلنا اور بھونچال کا آنا کثرت سے ہو جائے گا یا یہاں "زلزلے" کے لغوی معنی مراد ہیں کہ طرح طرح کی آفتیں و بلائیں نازل ہوں گی اور نت نئے حادثات انسان، جان و مال کو نقصان پہنچانے لگیں گے۔

"جب تک کہ زمانہ قریب نہ ہو جائے گا" سے حضرت امام مہدیؓ کے مبارک زمانہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے چونکہ اس وقت تمام روئے زمین امن وامان اور خوشی و مسرت کا گہوارہ بن جائے گا اور لوگوں کی زندگی نہایت اطمینان و سکون اور سرور و شادمانی کے ساتھ گزرے گی اس لئے وقت کی رفتار تیز تر معلوم ہوگی اور زمانہ بہت مختصر معلوم ہونے لگے گا جیسا کہ عیش و راحت کا زمانہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو بہت مختصر معلوم ہوتا ہے اور مصیبت و سختی کا زمانہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو بہت طویل معلوم ہوتا ہے۔

"ویکثر الھرج وھو القتل" میں وھو القتل کے الفاظ کسی راوی کے ہیں جس کے ذریعے انہوں نے لفظ ھرج کی وضاحت کی ہے کہ اس لفظ سے مراد قتل و قتال کا واقع ہونا ہے جو فتنے کے سبب وجود میں آئے گا۔

حتی یھم رب المال کے بارے میں کئی اقوال ہیں، ایک تو یہ کہ لفظ "یھم" کو حرف ی کے پیش اور ہ کے زیر کے ساتھ پڑھا جائے اور رب کو "یھم" کا مفعول ہونے کی بنا پر منصوب قرار دیا جائے، اس صورت میں "یھم" کا فاعل لفظ فقدان کو قرار دیں گے، من یقتل الصدقت کا مضاف محذوف ہے! یہ قول زیادہ مشہور ہے اور اس کے مطابق پوری عبارت کے معنی یہ ہوں گے کہ اس وقت جب کہ قیامت کا زمانہ قریب ہوگا) لوگوں کے پاس مال و دولت اور روپیہ پیسہ کی اس طرح فراوانی اور کثرت ہو جائے گی کہ صدقہ و خیرات کا مال لینے والے، صدقہ و خیرات کرنے والے کو ڈھونڈھے نہیں ملیں گے! یہاں تک کہ اس شخص کا ڈھونڈھنا سخت پریشانی اور قلق میں مبتلا کرے گا جو صدقہ و خیرات کے مال کو قبول کرلے یعنی مالدار شخص) کسی مفلس و فقیر شخص کو ڈھونڈھتا پھرے گا، تاکہ زکوٰۃ و صدقہ کا مال اسے دے سکے مگر پورے معاشرہ میں ضرورت مند و محتاج لوگوں کی کمی کے باعث مشکل ہی سے کوئی فقیر و مفلس اس کو مل پائے گا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "یھم" کو لفظ "ھم" (بمعنی قصد و ارادہ) سے مشتق قرار دے کر حرف ی کو زبر کے ساتھ اور ہ کو پیش کے

ساتھ پڑھا جائے، نیز "رب" کو مرفوع قرار دیا جائے اس صورت میں رب المال، یھم کا فاعل ہوگا اور من یقبل کا مفعول۔ اس طرح عبارت کے معنی یہ ہوں گے کہ (اس وقت جب کہ قیامت کا زمانہ قریب ہوگا تمہارے پاس مال و دولت کی بہت زیادتی ہو جائے گی) یہاں تک کہ ایک مالدار آدمی کسی ایسے شخص کی تلاش کا قصد کرے گا اور اس کو بہت ڈھونڈھے گا جو اس کے صدقہ وخیرات کا مال لے لے۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ لفظ "یھم" فعل متعدی ہے جس کے معنی غمگین کرنے کے آتے ہیں اس صورت میں حرف ی کو زبر کے ساتھ اور ہ کو پیش کے ساتھ پڑھا جائے اور رب کو منصوب قرار دیا جائے، اس طرح اس عبارت کے معنی یہ ہوں گے کہ کسی ایسے فقیر و مفلس کا پایا جانا کہ جو صدقہ وخیرات کا مال قبول کرے، مالدار شخص کو غمگین کرے گا۔

"جب تک کہ عمارتوں کے بنانے پر فخر نہ کرنے لگیں گے" یعنی لوگ محض رہائشی ضروریات کی تکمیل کے لئے یا کسی نیک مقصد کی خاطر لمبی چوڑی عمارتیں نہیں بنائیں گے بلکہ وہ فلک بوس اور محل نما عمارتیں محض اپنی شان و شوکت اور اپنی امارت کو ظاہر کرنے اور فخر و مباہات کی خاطر بنائیں گے جیسا کہ اس زمانہ میں ہو رہا ہے کہ مالدار اور رئیس لوگ بڑے بڑے مکانات بنانا فخر کی بات سمجھتے ہیں اور بڑی بڑی بلڈنگیں کھڑی کر کے اپنی جھوٹی شان و شوکت ظاہر کرتے ہیں! یہاں تک کہ وہ اس مقصد کے لئے عبادت گاہوں اور رفاہی عمارتوں اور قبرستانوں تک کو مسمار اور زمین دوز کرنے سے گریز نہیں کرتے اور ان کی جگہ پر اپنی عشرت گاہیں، سیر و تفریح کے مرکز اور رباغ باغیچے بناتے ہیں۔

"اور جب تک آدمی کسی قبر کے پاس سے گزرتا ہوا...... الخ" کا مطلب یہ ہے کہ یا تو دینی معاملات میں غم و فکر کی کثرت کی وجہ سے یا آفات اور بلاؤں کی زیادتی کی وجہ سے، قبروں کو دیکھ کر احساس دل اور آخرت میں یقین رکھنے والے لوگ یہ کہنا شروع کر دیں گے کہ کاش ہم اس دنیا میں نہ ہوتے اور ان قبروں میں پڑے ہوتے تا کہ ہمیں ان آفات اور بلاؤں کو دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

"جب تک کہ آفتاب مغرب کی طرف سے طلوع نہ ہوگا" اس بات (کہ سورج مغرب کی طرف سے نکلے گا) کی وضاحت انشاء اللہ آگے باب العلامات بین یدی الساعۃ میں ذکر ہوگی، اس موقع پر تو صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ جس دن آفتاب مغرب کی طرف سے طلوع ہوگا اس دن سے توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا، اس کے بعد سے کسی کی بھی توبہ قبول نہیں ہوگی جیسا کہ خود حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

"اس وقت اس کا ایمان لانا نفع نہ دے گا...... الخ" بعض حضرات نے اس عبارت کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ آفتاب جب مغرب کی طرف سے طلوع ہوگا تو اس وقت توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا پس اس وقت یا اس کے بعد کسی شخص کا ایمان لانا کہ جو اس دن سے پہلے ایمان نہیں لایا تھا اور کسی شخص کا نیکی کرنا کہ جس نے اس دن سے پہلے نیکی نہیں کی تھی، کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا واضح رہے کہ یہاں "نیکی" سے مراد توبہ ہے، یعنی جس طرح اس دن اس شخص کا ایمان لانا فائدہ مند نہیں ہوگا اسی طرح اس دن اس کا گناہوں سے توبہ کرنا بھی فائدہ مند نہیں ہوگا! اس سے معلوم ہوا کہ اَوْ كَسَبَتْ فِيْ اِيْمَانِهَا خَيْرًا میں لفظ اَوْ تنویع کے لئے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے گویا یہ فرمایا کہ اس دن نہ تو شرک سے توبہ کرنا کارآمد ہوگا اور نہ گناہوں سے توبہ کرنا کچھ فائدہ پہنچائے گا۔

"کہ دو شخصوں نے اپنا کپڑا کھول رکھا ہوگا" میں ان دونوں کی طرف کپڑے کی اضافت اس اعتبار سے ہے کہ ان میں سے ایک شخص (یعنی فروخت کرنے والا) تو اس کپڑے کا مالک ہی ہوگا اور جو دوسرا شخص (یعنی خریدار) ہوگا وہ چونکہ اس کپڑے کا طالب اور لینے والا ہوگا لہٰذا اس اعتبار سے کپڑے کی اضافت اس کی طرف بھی کر دی گئی ہے۔

حدیث کے آخری اجزاء کا ماحصل گویا یہ واضح کرنا ہے کہ قیامت اچانک آئے گی، تمام لوگ اپنے کاروبار میں مشغول و منہمک ہوں گے کہ یکایک قیامت کا پنجہ سب کو آدبوچے گا، کسی کو اتنی مہلت بھی نہیں ملے گی کہ اس نے کھانے کا جو لقمہ ہاتھ میں رکھ لیا ہے اس کو منہ ہی میں رکھ لے۔ واضح رہے کہ قیامت کے اچانک آنے سے مراد پہلے صور کا اچانک پھونکا جانا ہے، جس کی آواز سے سب لوگ مر جائیں گے، لیکن اس سے پہلے قیامت کی تمام علامتیں دیکھیں گے۔

بعض قوموں سے جنگ کی پیش گوئی

(۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تُقَاتِلُوْا قَوْمًا نِعَالُهُمُ الشَّعْرُ وَحَتّٰى تُقَاتِلُوا التُّرْكَ صِغَارَ الْاَعْيُنِ حُمْرَ الْوُجُوْهِ ذُلْفَ الْاُنُوْفِ كَاَنَّ وُجُوْهَهُمُ الْمَجَانُّ الْمُطْرَقَةُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک تم اس قوم سے جنگ نہ کرلو گے جن کی پاپوشیں بالدار چمڑے کی ہوں گی اور جب تک تم ترکوں سے جنگ نہ کرلوگے جن کی آنکھیں چھوٹی، چہرے سرخ اور ناکیں بیٹھی ہوئی ہوں گی، گویا ان کے منہ چمڑے کی تہ بہ تہ ڈھال کی طرح ہوں گے۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "ترکوں" سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا سلسلہ نسب یافث بن نوح سے چلا جاتا تھا ان لوگوں کے مورث اعلی کا نام ترک تھا اس سے پوری قوم کو ترک کہا جانے لگا۔ یہ وہی قوم ہے جس کو منگولین یا تاتاری بھی کہا جاتا ہے۔

"مَجَانٌّ" (میم کے زبر اور نون کے تشدید کے ساتھ) اصل میں "مِجن" (میم کے زیر کے ساتھ) کی جمع ہے جس کے معنی سپر، ڈھال کے ہیں اس قوم کے لوگوں کے منہ کو ڈھال کے ساتھ تشبیہ اس اعتبار سے دی گئی ہے کہ ان کے چہرے پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، نیز ان کے چہرے چونکہ گولائی کے ساتھ پھیلے ہوئے اور گوشت سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے گویا ان کے چہرے کی گولائی اور گوشت سے بھرے ہوئے ہونے کو مطرقہ یعنی اس ڈھال کے ساتھ تشبیہ دی جو تہ دار چمڑے کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔

(۳) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تُقَاتِلُوْا خُوْزًا وَكِرْمَانَ مِنَ الْاَعَاجِمِ حُمْرَ الْوُجُوْهِ فُطْسَ الْاُنُوْفِ صِغَارَ الْاَعْيُنِ وُجُوْهُهُمُ الْمَجَانُّ الْمُطْرَقَةُ نِعَالُهُمُ الشَّعْرُ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُ عَنْ عَمْرِو ابْنِ تَغْلِبَ عِرَاضَ الْوُجُوْهِ۔

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ تم خوز اور کرمان کے لوگوں سے جو کہ اہل عجم میں سے ہیں، جنگ نہ کرلو گے، ان لوگوں کے چہرے سرخ، ناک بیٹھی ہوئی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہوں گی اور چہرے اس طرح کے ہوں گے جیسے تہ بہ تہ چمڑے کی ڈھال ہوتی ہے اور ان کی پاپوشیں بالدار چمڑے کی ہوں گی۔" (بخاریؒ)

"اور بخاری کی ایک اور روایت میں جو عمرو ابن تغلب سے منقول ہے (ان کے چہرے سرخ ہوں گے کے بجائے) یہ الفاظ ہیں کہ ان کے چہرے چوڑے چکلے ہوں گے۔"

تشریح: "خُوْز" اس قوم کا نام ہے جو خوزستان میں رہتی ہے اور "کرمان" ایک مشہور شہر کا نام ہے جو فارس (ایران) میں واقع ہے۔

یہودیوں سے فیصلہ کن جنگ کی پیشین گوئی

(۴) وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَاتِلَ الْمُسْلِمُوْنَ الْيَهُوْدَ فَيَقْتُلُهُمُ الْمُسْلِمُوْنَ حَتّٰى يَخْتَبِئَ الْيَهُوْدِيُّ مِنْ وَّرَاءِ الْحَجَرِ وَالشَّجَرِ فَيَقُوْلُ الْحَجَرُ وَالشَّجَرُ يَا مُسْلِمُ يَا عَبْدَاللّٰهِ هٰذَا يَهُوْدِيٌّ خَلْفِيْ فَتَعَالَ فَاقْتُلْهُ اِلَّا الْغَرْقَدَ فَاِنَّهٗ مِنْ شَجَرِ الْيَهُوْدِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ مسلمان، یہودیوں سے نہ لڑیں گے چنانچہ (اس لڑائی میں) مسلمان یہودیوں کو بڑی مار ماریں گے (یعنی ان پر غالب آجائیں گے) یہاں تک کہ یہودی پتھر اور درخت کے پیچھے چھپتا پھرے گا اور وہ پتھر و درخت یہ کہے گا کہ اے مسلمان، اے خدا کے بندے! ادھر آ میرے پیچھے یہودی چھپا بیٹھا ہے اس کو مار ڈال۔ مگر غرقد (ایسا نہ کہے گا) کیونکہ وہ یہودیوں کا درخت ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "غرقد" ایک درخت کا نام ہے جو خاردار جھاڑی کی صورت میں ہوتا ہے، مدینہ کا قبرستان "جنت البقیع" کا اصل نام بقیع الغرقد اسی لئے ہے کہ جس جگہ یہ قبرستان ہے پہلے وہ غرقد کی جھاڑیوں کا خطہ تھا۔ حاصل یہ کہ جب مسلمان، یہودیوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ کریں گے اور ان پر غلبہ پالیں گے تو اس وقت ایک ایک یہودی درختوں اور پتھروں کے پیچھے چھپا پھرے گا تاکہ مسلمانوں کی مار سے بچ جائے مگر جس درخت یا پتھر کے پیچھے کوئی یہودی چھپا ہوا ہوگا وہ پکار کر مسلمانوں سے کہے گا کہ ادھر آکر دیکھو، میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے اس کا کام تمام کردو، البتہ اس وقت غرقد ایسا درخت ہوگا جو دوسرے درختوں کے برخلاف اپنے پیچھے چھپے ہوئے یہودی کو ظاہر نہیں کرے گا بلکہ اس کو پناہ دے گا اور مسلمانوں کو اس کا پتہ نہیں بتائے گا۔

رہی یہ بات کہ دوسرے درختوں کے برخلاف غرقد کا رویہ ایسا کیوں ہوگا تو ہوسکتا ہے کہ غرقد کو یہودیوں کے ساتھ کوئی خاص نسبت و تعلق ہوگا جس کی حقیقت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اس حدیث میں یہودیوں کے عبرتناک حشر کی جو پیش گوئی فرمائی ہے، آخر زمانے میں دجال کے ظاہر ہونے کے بعد پوری ہوگی، اس وقت یہودی دجال کے تابع اور فرمانبردار ہونے کی حیثیت سے اور اس کی مدد کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں گے لیکن مسلمان اپنے خدا کی مدد کے ساتھ یہودیوں کے فتنہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کردیں گے۔

ایک قحطانی شخص کے بارے میں پیشین گوئی

⑤ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَخْرُجَ رَجُلٌ مِّنْ قَحْطَانَ يَسُوْقُ النَّاسَ بِعَصَاهُ۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ قحطان میں سے ایک شخص پیدا نہ ہولے گا جو لوگوں کو اپنی لاٹھی سے ہانکے گا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: قحطان اس قوم کو کہا جاتا ہے جو اس زمانہ میں یمن سے عمان تک کے علاقے میں آباد تھی، یہ قوم دراصل ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے اس شاخ کی نسل ہے جس کے مورث قحطان تھے۔ چنانچہ اس نسل کے لوگوں کو قحطان کہا جاتا ہے، یمن کے لوگ اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

"جو لوگوں کو اپنی لاٹھی سے ہانکے گا" سے مراد اس شخص کا مکمل تسلط و اقتدار ہے کہ لوگ اس کی اطاعت و پیروی کریں گے۔ اس کو متفقہ طور پر اپنا سردار مانیں گے اور وہ شخص جابرانہ تسلط و تسخیر کے ذریعے ان لوگوں کو اس طرح اپنے قابو میں رکھے گا کہ کوئی بھی آدمی اس کی اطاعت سے انحراف کرنے کی ہمت نہیں کرے گا! اور ایک احتمال یہ ہے کہ یہاں "ہانکنے" سے مراد حقیقی طور پر ہانکنا ہو، یعنی وہ جن لوگوں پر غلبہ پالے گا ان کو اپنے عصاء کے ذریعے اس طرح ہانکتا پھرے گا، جس طرح کوئی گلہ بان اپنے جانوروں کو ہانکا کرتا ہے، نیز بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں حدیث میں جس قحطانی شخص کا ذکر کیا گیا ہے وہ شاید وہی شخص ہو جس کو اگلی حدیث میں جہجاہ کہہ کر ذکر کیا گیا ہے۔

⑥ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَذْهَبُ الْاَيَّامُ وَاللَّيَالِيْ حَتّٰى يَمْلِكَ رَجُلٌ يُّقَالُ لَهُ الْجَهْجَاهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ حَتّٰى يَمْلِكَ رَجُلٌ مِّنَ الْمَوَالِيْ يُقَالُ لَهُ الْجَهْجَاهُ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "دن و رات اس وقت تک تمام نہیں ہوں گے (یعنی اس وقت تک زمانہ کا اختتام نہیں ہوگا اور قیامت نہیں آئے گا) جب تک کہ وہ شخص مالک نہ ہوجائے گا یعنی لوگوں پر اقتدار و تسلط نہ پالے گا جس کو جہجاہ کہا جائے گا اور ایک روایت میں یوں ہے کہ جب تک موالی میں سے ایک شخص مالک نہ ہوجائے گا یعنی لوگوں پر اقتدار و تسلط نہ پالے گا جس کو جہجاہ

کہا جائے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: "موالی" مولیٰ کی جمع ہے جس کے معنی "غلام" کے ہیں۔ لفظ "جهجاه" بعض نسخوں میں تو دو ہ کے ساتھ منقول ہے اور بعض نسخوں میں آخری ہ کے بغیر یعنی "جهجا" منقول ہے۔

کسریٰ کے خزانہ کے بارے میں پیشین گوئی

⑦ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَتَفْتَحَنَّ عِصَابَةٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ كَنْزَ اٰلِ كِسْرٰى الَّذِيْ فِي الْاَبْيَضِ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت جابر ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "بلاشبہ مسلمانوں کی ایک جماعت آل کسریٰ کے خزانہ کو برآمد کرلے گی جو سفید محل میں ہے۔" (مسلمؒ)

تشریح: آل کسریٰ میں "آل" کا لفظ زائد ہے یا اس لفظ سے کسریٰ کے لواحقین، خاندان اور رعایا کے لوگ مراد ہیں! لفظ کسریٰ اصل میں "خسرو" کا معرب ہے اس زمانے میں فارس (ایران) کے بادشاہ کا لقب خسرو یا کسریٰ ہوتا تھا، جیسا کہ روم کے بادشاہ کو قیصر، چین کے بادشاہ کو خاقان، مصر کے بادشاہ کو فرعون، یمن کے بادشاہ کو قیل اور حبش کے بادشاہ کو نجاشی کہا جاتا تھا۔

"ابیض" ایک محل کا نام ہے جو مدائن میں واقع تھا اور جس کو اہل فارس سفید کوشک کہا کرتے تھے، اس شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے کے بعد اس محل کی جگہ ایک مسجد بنادی گئی تھی جو اب بھی ہے! نیز حضور ﷺ نے کسریٰ کے خزانہ کے برآمد ہونے کے بارے میں پیشین گوئی فرمائی تھی وہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں پوری ہوئی، اور فاتح مسلمانوں نے اس خزانے کو نکالا۔

فتح روم و فارس کی پیش گوئی

⑧ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلَكَ كِسْرٰى فَلَا يَكُوْنُ كِسْرٰى بَعْدَهٗ وَقَيْصَرُ لَيَهْلِكَنَّ ثُمَّ لَا يَكُوْنُ قَيْصَرُ بَعْدَهٗ وَلَتُقْسَمَنَّ كُنُوْزُهُمَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَسَمَّى الْحَرْبَ خُدْعَةً۔ (متفق علیہ)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "کسریٰ ہلاک ہوگیا، اس کسریٰ کے بعد اور کوئی کسریٰ نہیں ہوگا اور یقیناً قیصر (یعنی روم کا بادشاہ) بھی ہلاک ہوگا جس کے بعد کوئی اور قیصر نہیں ہوگا، نیز ان دونوں بادشاہوں کے خزانے خدا کی راہ میں تقسیم کئے جائیں گے۔ اور آنحضرت ﷺ نے جنگ کا نام دھوکہ اور فریب رکھا۔" (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "کسریٰ ہلاک ہوگیا" یہ جملہ خبریہ ہے، جس سے یہ مفہوم مراد ہے کہ عنقریب کسریٰ کا ملک تباہ و پامال ہو جائے گا۔" اس بات کو ادا کرنے کے لئے ماضی کا صیغہ اس اعتبار سے استعمال فرمایا گیا کہ اس بات کا وقوع پذیر ہونا ایک یقینی امر تھا یا ماضی کا صیغہ استعمال فرمانا دعا اور نیک فالی کے طور پر تھا۔

"کوئی اور کسریٰ نہیں ہوگا" یعنی آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جو کسریٰ تھا اس کے بارے میں آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ بس یہ آخری کسریٰ ہے، اس کے بعد کسی اور کو کسریٰ بننا نصیب نہیں ہوگا۔ واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بات اس وقت فرمائی تھی جب آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے دعوت اسلام پر مشتمل اپنا جو مکتوب گرامی کسریٰ کو ایک قاصد کے ذریعے بھیجا تھا اس کو اس کسریٰ نے ازراہ نخوت پھاڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔

"وسمی الحرب خدعة" (اور آنحضرت ﷺ نے جنگ کا نام دھوکہ اور فریب رکھا) یہ جملہ قال رسول اللہ الخ پر عطف ہے یعنی راوی نے حضور ﷺ کا ارشاد گرامی نقل کرنے کے بعد یہ کہا کہ وسمی الحرب خدعة حاصل یہ کہ جب حضور ﷺ نے یہ

بشارت بیان فرمائی کہ مسلمانوں کو قیصر و کسریٰ کے ملکوں پر فتح حاصل ہو جائے گی اور وہ ان کے اموال و جائیداد اور خزانوں پر قبضہ و تسلط پالیں گے تو سب کے ذہن میں یہی بات آئی ہوگی کہ یہ چیزیں جنگ کے بغیر حاصل نہیں ہوں گی، اور جنگ ایسی چیز ہے جو زیادہ تر دھوکہ اور فریب کی محتاج ہوتی ہے، اس لئے آپ ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو آگاہ فرمایا کہ جنگ کے موقع پر اس وہم میں نہ پڑ جانا کہ جنگی دھوکہ اور فریب، عہد شکنی اور خیانت اور بددیانتی کی قسم سے ہے، بلکہ اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا کہ دشمنوں کے ساتھ برسر جنگ ہونے کی صورت میں حکمت عملی کے طور پر ایسے فریب اور حیلوں کو اختیار کرنا ضروری ہو جاتا ہے جو جنگ کے جیتنے اور طاقت و مدد حاصل کرنے میں بڑا دخل رکھتے ہیں۔ مثلاً دشمن پر رعب ڈالنے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کے ذہن پر اپنی طاقت کی زیادتی اور اسلحہ جات کی برتری کا سکہ جمادیا جائے، اس مقصد کے لئے فرضی کارروائیوں اور جھوٹے سچے بیانات کا سہارا لیا جا سکتا ہے، یا میدان جنگ میں دشمن کی آنکھ میں دھول جھونکنے کے لئے میدان سے ہٹ جانا اور پیچھے لوٹ آنا تاکہ دشمن یہ سمجھے کہ مقابل لڑنے کی تاب نہ رکھنے کی وجہ سے میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے اور جب دشمن اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر غافل ہو جائے تو کسی طرف سے اچانک اس پر ٹوٹ پڑنا یہ اور اس طرح کی دوسری کارروائیاں ایسے حیلے ہیں جن کو جنگی حکمت عملی کے طور پر اختیار کرنے کی اجازت ہے لیکن واضح رہے کہ عہد شکنی کی کسی بھی حالت میں اجازت نہیں ہے، جو عہد و اقرار ہو جائے اس پر عمل کرنا بہرصورت ضروری ہے، کسی معاہدہ کو توڑنا ہرگز درست نہیں۔

لفظ "خدعة" اگرچہ خ کے پیش کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اور زبر کے ساتھ بھی، اس طرح دال کے جزم اور پیش کے ساتھ بھی نقل کیا جاتا ہے اور زبر کے ساتھ بھی، لیکن یہ لفظ خ کے زبر اور دال کے جزم کے ساتھ زیادہ فصیح ہے۔

⑨ وَعَنْ نَافِعِ ابْنِ عُتْبَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَغْزُوْنَ جَزِيْرَةَ الْعَرَبِ فَيَفْتَحُهَا اللّٰهُ ثُمَّ فَارِسَ فَيَفْتَحُهَا اللّٰهُ ثُمَّ تَغْزُوْنَ الرُّوْمَ فَيَفْتَحُهَا اللّٰهُ ثُمَّ تَغْزُوْنَ الدَّجَّالَ فَيَفْتَحُهُ اللّٰهُ۔ (رواہ مسلم)

"حضرت نافع ابن عتبہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "تم لوگ (میرے بعد) جزیرۃ العرب سے جنگ کرو گے اور اللہ تعالیٰ اس کو تمہارے ہاتھوں فتح کرائے گا، پھر تم فارس کی مملکت سے جنگ کرو گے اور اللہ تعالیٰ اس کو تمہارے ہاتھوں فتح کرائے گا، پھر تم روم کی مملکت سے جنگ کرو گے اور اللہ تعالیٰ اس کو تمہارے ہاتھوں فتح کرائے گا اور پھر (آخری زمانہ میں) تم دجال سے جنگ کرو گے اور اللہ اس پر نہیں فتح عطا فرمائے گا۔" (مسلمؒ)

تشریح: عالم عرب کا وہ خطہ جس کو "جزیرۃ العرب" سے تعبیر کیا جاتا ہے، قدیم جغرافیہ دانوں کے مطابق نجد حجاز (جس کے دو مقدس شہر مکہ اور مدینہ ہیں) یمامہ، یمن اور عروض پر مشتمل ہے اس خطہ کے جنوب میں بحر عرب، مشرق میں خلیج عربی اور خلیج عمان اور مغرب میں بحر احمر ہے، اس کے شمال میں دریائے فرات اس طرح بہتا ہے اس خطہ کے اس تنہا شمالی خشکی کے سرے کو بہت حد تک کاٹ دیتا ہے اور اس وجہ سے یہ خطہ گویا مجازاً "جزیرۃ العرب" کہلاتا ہے ورنہ اصل کے اعتبار سے یہ خطہ "جزیرہ نمائے عرب" سے موسوم کیا جاتا ہے، ویسے اہل عرب جزیرہ نما کو بھی توسعاً جزیرہ کہہ دیا کرتے ہیں۔

"جزیرۃ العرب سے جنگ کرو گے" کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت میری زندگی میں جزیرۃ العرب کے جو علاقے اسلام کی روشنی سے محروم رہ گئے ہیں، میرے بعد ان کی تاریکی بھی ختم ہو جائے گی، کچھ علاقے تو تبلیغ و اشاعت اسلام کے ذریعے کفر کے اندھیرے سے نکل آئیں گے اور باقی علاقے کے لوگوں سے تم جنگ کرو گے اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے ذریعے فتح پاؤ گے اس طرح ہر چار طرف اسلام کا جھنڈا سربلند ہو جائے گا اور پورے جزیرۃ العرب میں کوئی ایک کافر بھی باقی نہیں بچے گا۔

"دجال سے جنگ کرو گے...... الخ" کا مطلب یہ ہے کہ دجال جب ظاہر ہوگا تو اپنی طلسماتی طاقت اور مکر و فریب کے ذریعے بڑی اودھم مچائے گا اور کچھ ملکوں اور علاقوں پر قابو پالے گا لیکن جب تم اس کے مقابلے پر نکل کھڑے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اس کو مقہور و مغلوب کر دے گا اور جو ملک و علاقہ اس کے قبضے میں چلا گیا ہوگا وہ دوبارہ تمہارے تسلط و قبضہ میں آجائے گا، نیز وہ دجال حضرت

عیسی علیہ السلام کے ہاتھوں ہلاک ہو جائے گا جو مسلمانوں کی مدد کے لئے آسمان سے اتریں گے۔ واضح رہے کہ اس ارشاد میں حضور ﷺ کا خطاب تو صحابہؓ سے تھا مگر اصل روئے سخن اُمت کی طرف تھا۔

وہ چھ چیزیں جن کا قیامت سے پہلے وقوع پذیر ہونا ضروری ہے

(۱۵) وَعَنْ عَوْفِ ابْنِ مَالِكٍ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ وَهُوَ فِيْ قُبَّةٍ مِنْ اَدَمٍ فَقَالَ اُعْدُدْ سِتًّا بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ مَوْتِيْ ثُمَّ فَتْحُ بَيْتِ الْمُقَدَّسِ ثُمَّ مُوْتَانٌ يَاْخُذُ فِيْكُمْ كَقُعَاصِ الْغَنَمِ ثُمَّ اسْتِفَاضَةُ الْمَالِ حَتّٰى يُعْطَى الرَّجُلَ مِائَةَ دِيْنَارٍ فَيَظَلُّ سَاخِطًا ثُمَّ فِتْنَةٌ لَا يَبْقٰى بَيْتٌ مِنَ الْعَرَبِ اِلَّا دَخَلَتْهُ ثُمَّ هُدْنَةٌ تَكُوْنُ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ بَنِي الْاَصْفَرِ فَيَغْدِرُوْنَ فَيَاْتُوْنَكُمْ تَحْتَ ثَمَانِيْنَ غَايَةً تَحْتَ كُلِّ غَايَةٍ اِثْنَا عَشَرَ اَلْفًا۔ (رواہ البخاری)

"اور حضرت عوف ابن مالکؓ کہتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے دوران (ایک دن) میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ ﷺ چمڑے کے خیمے میں تشریف رکھتے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا (تم قیامت آنے سے پہلے چھ چیزوں کو شمار کرو (یعنی ان چھ چیزوں کو قیامت کی علامتوں سے جانو کہ قیامت آنے سے پہلے یہ چھ چیزیں ضرور واقع ہوں گی) ایک تو میری موت (کہ جب تک میں تمہارے درمیان موجود ہوں قیامت نہیں آئے گی) دوسرے بیت المقدس کا فتح ہونا (یعنی جب تک بیت المقدس مسلمانوں کے ہاتھوں فتح نہیں ہو جائے گا قیامت نہیں آئے گی) تیسرے عام وباء جو تم میں بکریوں کی بیماری کی طرح پھیلے گی، چوتھے لوگوں کے پاس مال و دولت کا اس قدر زیادہ ہونا کہ اگر ایک آدمی کو سو دینار بھی دیئے جائیں گے تو ان کو حقیر و کمتر جانے گا اور اس پر ناراض ہوگا (یعنی مال و دولت کی اس قدر ریل پیل ہوگی کہ کسی کی نظر میں بڑی سے بڑی رقم کو بھی کوئی اہمیت نہیں ہوگی) چنانچہ حضور ﷺ کی یہ پیش گوئی حضرت عثمان غنیؓ کے دور خلافت میں پوری ہوئی جب کہ مسلمانوں میں مال و دولت کی زبردست ریل پیل ہو گئی تھی، پانچویں فتنے اور آپس کی مخاصمت و مخالفت کا اس طرح پھوٹ پڑنا کہ عرب کا کوئی گھرانا نہیں بچے گا جس میں اس فتنے کے برے اثرات نہ پہنچیں، (علماء نے لکھا ہے کہ اس پیش گوئی کا مصداق حضرت عثمانؓ کا سانحہ شہادت ہے یا فتنہ سے مراد ہر وہ فتنہ اور برائی ہے جس کا ظہور حضور ﷺ کے بعد ہوا) اور چھٹے صلح جو تمہارے اور رومیوں کے درمیان ہوگی، پھر رومی عہد شکنی کریں گے اور تمہارے مقابلے کے اسی نشانوں کے تحت آئیں گے جن میں سے ہر نشان کے ماتحت بارہ ہزار آدمی ہوں گے۔" (بخاریؒ)

تشریح: "بیت المقدس" میں مقدس کا لفظ میم کے زبر، قاف کے جزم اور دال کے زیر کے ساتھ، مَجْلِس کے وزن پر مَقْدِس ہے لیکن مشکوٰۃ کے ایک نسخے میں یہ لفظ میم کے پیش، قاف کے زبر اور دال کی تشدید کے ساتھ مُعَظَّم کے وزن پر مُقَدَّس منقول ہے۔

"قُعَاص" مویشیوں کی ایک بیماری کو کہتے ہیں جو عام طور سے مویشی کے سینے میں ہوتی ہے اور اس کو فوراً ہلاک کر دیتی ہے۔ حضور ﷺ نے یہاں جس عام وباء کی پیش گوئی فرمائی اور اس کو بکریوں کی بیماری یعنی قعاص سے تشبیہ دی، اس سے مراد طاعون کی وہ وبا ہے جو حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ خلافت میں پیدا ہوئی اور اس کی وجہ سے صرف تین دن کے اندر ستر ہزار آدمی ہلاک ہوئے، اس وقت مسلمانوں کی فوجی چھاؤنی عمواس میں تھی جو بیت المقدس کے قریب واقع ایک جگہ ہے، اسی مناسبت سے اس وباء کو طاعون عمواس کہا جاتا ہے، یہ پہلا طاعون تھا جو اسلام کے زمانہ میں پھوٹا اور اس کے سبب اتنا سخت جانی نقصان ہوا۔

"بنی الاصفر" رومیوں کو کہا جاتا تھا کیونکہ یہ لوگ جس نسل سے تعلق رکھتے تھے اس کے مورث اعلیٰ روم بن عیص بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام کا رنگ زرد و مائل بسفیدی تھا، اور یہی جسمانی رنگت عام طور سے پوری قوم میں پائی جاتی تھی۔

"غایۃ" اس نشان یا جھنڈے کو کہتے ہیں جو فوجی سرداروں کے ساتھ ان کے دستوں اور لشکروں کی علامت کے طور پر ہوتا ہے اور بعض روایتوں میں یہ لفظ ی کے بجائے ب کے ساتھ یعنی "غابۃ" منقول ہے جس کے معنی جنگل اور درختوں کے جھنڈ کے ہیں اس

صورت میں کہا جائے گا کہ نشان اور جھنڈوں کی کثرت کی وجہ سے اس لشکر کو درختوں کے جھنڈ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور لشکر والوں کی تعداد ذکر کرنے کا مقصد لاؤلشکر کی زیادتی بیان کرنا ہے۔

رومیوں سے جنگ اور دجال کے قتل کی پیش گوئی

(۱۱) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَاتَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یَنْزِلَ الرُّوْمُ بِالْاَعْمَاقِ اَوْ بِدَابِقٍ فَیَخْرُجُ اِلَیْهِمْ جَیْشٌ مِّنَ الْمَدِیْنَةِ مِنْ خِیَارِ اَهْلِ الْاَرْضِ یَوْمَئِذٍ فَاِذَا تَصَافُّوْا قَالَتِ الرُّوْمُ خَلُّوْا بَیْنَنَا وَبَیْنَ الَّذِیْنَ سَبَوْا مِنَّا نُقَاتِلْهُمْ فَیَقُوْلُ الْمُسْلِمُوْنَ لَا وَاللّٰهِ لَانُخَلِّیْ بَیْنَكُمْ وَبَیْنَ اِخْوَانِنَا فَیُقَاتِلُوْنَهُمْ فَیَنْهَزِمُ ثُلُثٌ لَایَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ اَبَدًا وَیُقْتَلُ ثُلُثُهُمْ اَفْضَلُ الشُّهَدَآءِ عِنْدَ اللّٰهِ وَیَفْتَتِحُ الثُّلُثُ لَایُفْتَنُوْنَ اَبَدًا فَیَفْتَتِحُوْنَ قُسْطُنْطِیْنِیَّةَ فَبَیْنَمَا هُمْ یَقْتَسِمُوْنَ الْغَنَآئِمَ قَدْ عَلَّقُوْا سُیُوْفَهُمْ بِالزَّیْتُوْنِ اِذْ صَاحَ فِیْهِمُ الشَّیْطَانُ اِنَّ الْمَسِیْحَ قَدْ خَلَفَكُمْ فِیْ اَهْلِیْكُمْ فَیَخْرُجُوْنَ وَذٰلِكَ بَاطِلٌ فَاِذَا جَاؤُا الشَّامَ خَرَجَ فَبَیْنَا هُمْ یُعِدُّوْنَ لِلْقِتَالِ یُسَوُّوْنَ الصُّفُوْفَ اِذَا اُقِیْمَتِ الصَّلٰوةُ فَیَنْزِلُ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ فَاَمَّهُمْ فَاِذَا رَاٰهُ عَدُوُّ اللّٰهِ ذَابَ كَمَا یَذُوْبُ الْمِلْحُ فِی الْمَاءِ فَلَوْ تَرَكَهٗ لَانْذَابَ حَتّٰی یَهْلِكَ وَلٰكِنْ یَقْتُلُهُ اللّٰهُ بِیَدِهٖ فَیُرِیْهِمْ دَمَهٗ فِیْ حَرْبَتِهٖ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔" قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ رومی اعماق یا دابق میں آنہ دھمکیں گے اور پھر مدینہ والوں کا ایک لشکر ان کے مقابلے کے لئے نکلے گا جس میں اس دن یعنی اس وقت کے روئے زمین کے سب سے بہتر لوگ شامل ہوں گے، جب (لڑائی کے لئے) صف بندی ہوگی تو رومی یہ کہیں گے کہ ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان کہ جو ہمارے لوگوں کو قید کر کے لائے ہیں، جگہ خالی کر دو تاکہ ہم ان سے لڑیں (یعنی جن مسلمانوں نے اس سے پہلے ہمارے خلاف جہاد کیا اور ہمارے کچھ لوگوں کو قیدی بنا کر لے آئے ان مسلمانوں کو ہمارے مقابلہ پر لاؤ کیونکہ ہم تم سب مسلمانوں سے لڑنا نہیں چاہتے بلکہ بدلہ اتارنے کے لئے صرف ان ہی مسلمانوں سے لڑنا چاہتے ہیں۔ گویا رومی یہ بات اس لئے کہیں گے تاکہ مسلمان ان کی باتوں میں آکر اپنی اجتماعیت کھودیں اور باہمی تفریق کا شکار ہو جائیں) لیکن مسلمان ان کو جواب دیں گے کہ بخدا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، ہم تمہارے اور اپنے ان مسلمان بھائیوں کے درمیان جگہ خالی نہیں کر سکتے (یعنی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم ان مسلمان بھائیوں کو تو تمہارے مقابلہ پر لڑنے کے لئے آگے کر دیں اور خود ایک طرف ہو جائیں، اگر لڑیں گے تو ہم سب لڑیں گے اور ایک ساتھ لڑیں گے) چنانچہ سارے مسلمان رومیوں سے لڑنا شروع کر دیں گے اور (جب گھمسان کا رن پڑے گا) تو ان مسلمانوں میں سے ایک تہائی مسلمان پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑے ہوں گے، جن کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں کرے گا، اور ایک تہائی مسلمان جام شہادت نوش کریں گے، جو یقیناً اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین شہید قرار پائیں گے، اور باقی ایک تہائی مسلمان فتح یاب ہوں گے (یعنی اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مدد و نصرت کے ذریعے رومیوں کے مقابلے پر کامیابی عطا فرمائے گا اور ان کے ہاتھوں رومیوں کے شہروں کو فتح کرائے گا) ان مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کبھی فتنہ میں نہیں ڈالے گا۔

پھر مسلمان قسطنطنیہ کو فتح کر لیں گے (یعنی اس شہر کو کافروں کے قبضہ سے لے لیں گے) اور اس کے بعد اس وقت جب کہ وہ (مسلمان) مال غنیمت تقسیم کرنے میں مصروف ہوں گے اور اپنی تلواروں کو زیتون کے درختوں پر لٹکائے ہوئے ہوں گے اچانک شیطان ان کے درمیان یہ بات پھونک دے گا کہ (مسلمانو تم یہاں مصروف ہو جب کہ) تمہاری عدم موجودگی میں مسیح دجال تمہارے گھروں میں پہنچ گیا ہے۔ (اسلامی لشکر کے لوگ یہ سنتے ہی قسطنطنیہ سے) نکل کھڑے ہوں گے لیکن شیطان کی یہ خبر سراسر جھوٹی ثابت ہوگی، البتہ جب مسلمان شام پہنچیں گے تو پھر دجال ظاہر ہوگا) مسلمان اس سے لڑنے کی تیاری کریں گے اور صف بندی میں مشغول ہوں گے کہ نماز کا وقت آجائے گا (اور موذن تکبیر کہنے کے لئے کھڑا ہو چکا ہوگا) اتنے میں حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام (آسمان سے دمشق کی جامع مسجد کے منارے پر)

اتریں گے (پھر قدس آئیں گے) اور مسلمانوں کی امامت کریں گے۔ پھر خدا کا وہ دشمن یعنی دجال (جو اس وقت مسلمانوں کو گھیرے ہوئے ہوگا) جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھے گا تو اس طرح گھلنا شروع ہو جائے گا جس طرح نمک پانی میں گھلنے لگتا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کو اس حالت میں چھوڑ دیں اور قتل نہ کریں تو وہ سارا گھل جائے اور (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کئے بغیر) خود مرجائے، لیکن اللہ تعالیٰ (کی مشیت و مرضی چونکہ یہ ہوگی کہ اس کی موت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں واقع ہو اس لئے) اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے قتل کرائے گا، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام (مسلمانوں کو یا کافروں کو اور یا سب کو) دجال کا خون اپنے نیزے کے ذریعے دکھائیں گے (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام جس نیزے سے دجال کو قتل کریں گے اور جو اس کے خون سے آلودہ ہوگا اس کو لوگوں کو دکھائیں گے کہ دیکھو میں نے اس دشمن خدا کا کام تمام کر دیا ہے)۔" (مسلمؒ)

تشریح: "اَعْمَاق" اطراف مدینہ میں ایک جگہ کا نام تھا اسی طرح "دابق" مدینہ کے ایک بازار کا نام تھا! لیکن ایک قول جو زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ اس حدیث میں "مدینہ" سے مراد شہر حلب ہے جو ملک شام میں واقع ہے اور اعماق و دابق حلب و انطاکیہ کے درمیان دو مقامات کے نام ہیں۔ چنانچہ کتاب ازہار میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ "مدینہ" سے مدینۃ النبی (یعنی مدینہ منورہ) مراد لینا صحیح نہیں ہے کیونکہ حدیث میں جس زمانہ کے واقع کے بارے میں پیش گوئی فرمائی گئی ہے اس وقت مدینہ منورہ کسی طرح بھی تخریب کاری یا کسی اسلام دشمن حملہ سے بالکل محفوظ و مامون ہوگا بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ "مدینہ" سے مراد شہر دمشق ہے۔

"جن کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں کرے گا" سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ان لوگوں کی موت کفر کی حالت میں ہوگی اور وہ کبھی بھی عذاب سے نجات نہیں پائیں گے۔

"ان مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کبھی فتنہ میں نہیں ڈالے گا" کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسلمان اپنے جس ایمانی استقلال و عزیمت اور اسلامی شجاعت و بہادری کا ثبوت دیں گے اس کا انعام ان کو یہ ملے گا کہ اللہ تعالیٰ ان کو کبھی بھی کسی آفت و بلا میں نہیں ڈالے گا اور نہ جان و خون کی کسی آزمائش سے دوچار کرے گا! یا یہ کہ اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں کو کبھی بھی عذاب میں مبتلا نہیں کرے گا! پس یہ اس بات کی بشارت ہے کہ ان لوگوں کا خاتمہ بخیر ہوگا۔

"قسطنطنیہ" کے بارے میں زیادہ مشہور اور صحیح قول یہ ہے کہ اصل میں یہ لفظ "قُسْطُنْطِينَة" ہے لیکن بعض حضرات نے "قُسْطُنْطِينِيَّة" کو زیادہ صحیح کہا ہے، چنانچہ مشکوۃ کے اکثر نسخوں میں یہ لفظ اسی طرح ہے اور بعض نسخوں میں یہ لفظ اس طرح منقول ہے کہ آخری حرف ی پر تشدید نہیں ہے، بہر حال اردو میں یہ لفظ "قسطنطنیہ" لکھا پڑھا جاتا ہے۔

قسطنطنیہ، تاریخ کا ایک مشہور شہر ہے جو اپنے زمانہ میں رومیوں کا دار السلطنت تھا اور ان کے سب سے بڑے شہروں میں ایک بڑا شہر مانا جاتا تھا، یہ شہر قسطنطین بادشاہ کی طرف منسوب ہے جس نے اس کو ۳۳۰ء میں بسایا اور رومی سلطنت کا پایہ تخت قرار دیا تھا، اب اس شہر کو جو آبنائے فاسفورس کے کنارے واقع ہے استنبول کہا جاتا ہے اور ترکی کی مملکت میں شامل ہے! ترمذیؒ نے وضاحت کی ہے کہ یہ شہر صحابہؓ کے زمانہ میں فتح ہو گیا تھا اور تاریخی روایات کے مطابق، دوسری مرتبہ یہ شہر ۱۴۵۳ء میں عثمانی ترکوں کے ذریعے فتح ہوا اور اب تک اس پر مسلمانوں کا قبضہ ہے! لیکن اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائے گا، اور پھر آخری زمانہ میں جب کہ قیامت قریب ہوگی، مسلمان اس کو فتح کر لیں گے اور اسی زمانہ میں کانے دجال کا ظہور ہوگا۔

فَإِذَا جَاءَ الشَّامَ (جب مسلمان شام پہنچیں گے) میں "شام" سے مراد "قدس" ہے جس کو "بیت المقدس" کہا جاتا ہے چنانچہ بعض روایتوں میں اس کی تصریح بھی ہے اور اس وقت "بیت المقدس" ملک شام ہی کی حدود میں تھا، اب یہ فلسطین میں ہے جو ایک مستقل ملک ہے۔

"اور مسلمانوں کی امامت کریں گے" کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت نماز تیار ہوگی، اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام مسلمانوں کو نماز

پڑھائیں گے اور ان مسلمانوں میں حضرت امام مہدیؓ بھی ہوں گے! لیکن ایک روایت میں یہ ہے کہ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام امامت کرنے کے لئے حضرت امام مہدیؓ کو آگے بڑھائیں گے اور ان سے فرمائیں گے کہ اس نماز کی اقامت چونکہ تمہاری امامت کے لئے کہی گئی ہے اس لئے تم ہی نماز پڑھاؤ اس بات سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقصود اس طرف اشارہ کرنا بھی ہوگا کہ اب مسلمانوں کے امیر و امام چونکہ تم ہو اس لئے مجھے بھی تمہاری اتباع کرنا چاہئے، نہ کہ تم میری اتباع کروگے، میں مستقل طور پر امام و امیر بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں بلکہ میرا آنا صرف تمہاری مدد و معاونت اور تمہاری تائید و توثیق کے لئے ہے۔ چنانچہ حضرت مہدیؓ اس نماز کی امامت فرمائیں گے لیکن اس کے بعد نماز کی امامت برابر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کریں گے۔ اس صورت میں کہا جائے گا کہ حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے فَاَمَّهُمْ (اور مسلمانوں کی امامت کریں گے) تو یہ تغلیباً ارشاد فرمائے گئے ہیں، یعنی بعد میں چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی مسلمانوں کو نماز پڑھایا کریں گے، پس اس اعتبار سے اس وقت کی نماز کے بارے میں بھی فرمایا کہ وہ مسلمانوں کی امامت کریں گے۔ یا یہ کہ "امامت کریں گے" کے مجازی معنی مراد ہیں، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت مسلمانوں کے امام (حضرت مہدیؓ) کو امامت کے لئے کہیں گے۔

(۱۲) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اِنَّ السَّاعَةَ لَا تَقُوْمُ حَتّٰى لَا يُقْسَمَ مِيْرَاثٌ وَلَا يُفْرَحَ بِغَنِيْمَةٍ ثُمَّ قَالَ عَدُوٌّ يَجْمَعُوْنَ لِاَهْلِ الشَّامِ وَيَجْمَعُ لَهُمْ لِاَهْلِ الْاِسْلَامِ يَعْنِي الرُّوْمَ فَيَتَشَرَّطُ الْمُسْلِمُوْنَ شُرْطَةً لِلْمَوْتِ لَا تَرْجِعُ اِلَّا غَالِبَةً فَيَقْتَتِلُوْنَ حَتّٰى يَحْجُزَ بَيْنَهُمُ اللَّيْلُ فَيَفِيْءُ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ كُلٌّ غَيْرُ غَالِبٍ وَتَفْنَى الشُّرْطَةُ ثُمَّ يَتَشَرَّطُ الْمُسْلِمُوْنَ شُرْطَةً لِلْمَوْتِ لَا تَرْجِعُ اِلَّا غَالِبَةً فَيَقْتَتِلُوْنَ حَتّٰى يَحْجُزَ بَيْنَهُمُ اللَّيْلُ فَيَفِيْءُ هٰؤُلَاءِ كُلٌّ غَيْرُ غَالِبٍ وَتَفْنَى الشُّرْطُ ثُمَّ يَتَشَرَّطُ الْمُسْلِمُوْنَ شُرْطَةً لِلْمَوْتِ لَا تَرْجِعُ اِلَّا غَالِبَةً فَيَقْتَتِلُوْنَ حَتّٰى يُمْسُوْا فَيَفِيْءُ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ كُلٌّ غَيْرُ غَالِبٍ وَتَفْنَى الشُّرْطَةُ فَاِذَا كَانَ يَوْمُ الرَّابِعِ نَهَدَ اِلَيْهِمْ بَقِيَّةُ اَهْلِ الْاِسْلَامِ فَيَجْعَلُ اللّٰهُ الدَّبْرَةَ عَلَيْهِمْ فَيَقْتَتِلُوْنَ مَقْتَلَةً لَمْ يُرَ مِثْلُهَا حَتّٰى اِنَّ الطَّائِرَ لَيَمُرُّ بِجَنَبَاتِهِمْ فَلَا يُخَلِّفُهُمْ حَتّٰى يَخِرَّ مَيِّتًا فَيَتَعَادُّ بَنُو الْاَبِ كَانُوْا مِائَةً فَلَا يَجِدُوْنَهُ بَقِيَ مِنْهُمْ اِلَّا الرَّجُلُ الْوَاحِدُ فَبِاَيِّ غَنِيْمَةٍ يُفْرَحُ اَوْ اَيِّ مِيْرَاثٍ يُقْسَمُ فَبَيْنَاهُمْ كَذٰلِكَ اِذْ سَمِعُوْا بِبَاْسٍ هُوَ اَكْبَرُ مِنْ ذٰلِكَ فَجَاءَهُمُ الصَّرِيْخُ اِنَّ الدَّجَّالَ قَدْ خَلَفَهُمْ فِيْ ذَرَارِيْهِمْ فَيَرْفُضُوْنَ مَا فِيْ اَيْدِيْهِمْ وَيُقْبِلُوْنَ فَيَبْعَثُوْنَ عَشَرَ فَوَارِسَ طَلِيْعَةً قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ لَاَعْرِفُ اَسْمَاءَهُمْ وَاَسْمَاءَ اٰبَائِهِمْ وَاَلْوَانَ خُيُوْلِهِمْ هُمْ خَيْرُ فَوَارِسَ اَوْ مِنْ خَيْرِ فَوَارِسَ عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ يَوْمَئِذٍ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ "یقیناً قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ میراث کا تقسیم ہونا موقوف نہ ہو جائے گا" یعنی یا تو کفار کے مقابلہ میں مسلمانوں کے کثرت سے مارے جانے کی وجہ سے میراث کی تقسیم بند ہو جائے گی کیونکہ اس وقت جو تھوڑے بہت مسلمان بچیں گے ان کو اتنا ہوش کہاں ہوگا کہ وہ اپنے مرنے والے مورثوں کے ترکہ کی تقسیم کی طرف دھیان دیں یا شرعی احکام پر عمل آوری میں کوتاہی کے سبب لوگ میراث تقسیم کرنا بند کر دیں گے اور یا یہ کہ مرنے والے لوگ اپنے ذمہ اتنے قرض اور مطالبات چھوڑ جائیں گے کہ ان کی ادائیگی کرنے کے بعد ترکہ میں سے اتنا بچے گا ہی نہیں کہ اس کی تقسیم کی نوبت آئے) اور (جب تک کہ) مال غنیمت سے خوش ہونا نہ چھوڑیں گے (یعنی قیامت قائم ہونے سے پہلے ایک بات تو یہ ہوگی کہ میراث کی تقسیم نہ ہو پائے گی اور دوسری بات یہ ہوگی کہ مسلمان غنیمت کے مال سے خوش نہیں ہوا کریں گے، اور یہ خوش ہونا یا تو اس اعتبار سے ہوگا کہ مال غنیمت ملنا ہی بند ہو جائے گا اور جب مال ملے گا نہیں تو کوئی خوش کہاں سے ہوگا اور یا خوش نہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ جو لوگ مال غنیمت کی حفاظت و تقسیم کے ذمہ دار ہوں گے وہ خیانت و بددیانتی کا ارتکاب کرنے لگیں گے جس کی وجہ سے مال غنیمت ایماندار اور بادیانت لوگوں کے لئے کسی خوشی کا باعث نہیں ہوگا) پھر حضرت ابن مسعودؓ نے (ان دونوں) باتوں کی حقیقت کو واضح کرنے اور صورت واقعہ کو ظاہر کرنے کے لئے) بیان کیا کہ "دشمن یعنی کافر اہل شام سے لڑنے کے لئے فوج اور طاقت جمع کریں گے، ادھر مسلمان بھی ان کافروں سے مقابلہ کے لئے لشکر

اور طاقت جمع کریں گے۔ دشمن سے مراد رومی ہیں، چنانچہ مسلمان اپنے لشکر میں کچھ فوج منتخب کر کے آگے بھیجیں گے تاکہ وہ جنگ کرے اور مرجائے اور اگر واپس آئے تو فتح یاب اور غالب ہو کر آئے۔ پس دونوں طرف کے لشکر ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو جائیں گے (اور جنگ شروع ہو جائے گی) یہاں تک کہ دونوں لشکروں کے درمیان رات حائل ہو جائے گی (اور جنگ کو روک دے گی) نیز دونوں فریق اپنے اپنے ٹھکانوں میں واپس آجائیں گے اور ان میں سے نہ کوئی غالب و فتح یاب ہوگا (اور نہ کوئی مغلوب و مفتوح) البتہ دونوں طرف کی فوج کے وہ چیدہ اور منتخب دستے جو لڑنے کے لئے آگے گئے ہوں گے فنا کے گھاٹ اتر جائیں گے (یعنی دونوں طرف کے لشکروں نے اپنے جن چیدہ فوجیوں کو لڑنے کے لئے آگے بھیجا ہوگا وہ اس دن کی) جنگ میں کام آجائیں گے۔ اور باقی تمام فوجی اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس آجائیں گے، اس طرح اس دن کی جنگ میں دونوں فریق برابر سرابر رہیں گے، نہ کوئی غالب ہوگا نہ کوئی مغلوب) پھر (دوسرے دن) مسلمان ایک دوسرے لشکر کو منتخب کر کے آگے بھیجیں گے تاکہ وہ جنگ کرے اور مرجائے اور واپس آئے تو فتح یاب ہو کر آئے۔ پس دونوں طرف کے لشکر ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو جائیں گے یہاں تک کہ دونوں لشکروں کے درمیان رات حائل ہو جائے گی، اور دونوں طرف کی فوجیں اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس آجائیں گی ان میں سے نہ کوئی غالب ہوگا (نہ کوئی مغلوب) دونوں طرف کی فوج کے وہ چیدہ دستے جو لڑنے کے لئے آگے گئے ہوں گے فنا کے گھاٹ اتر جائیں گے، پھر (تیسرے دن) مسلمان ایک لشکر کو منتخب کر کے آگے بھیجیں گے تاکہ وہ جنگ کرے اور مرجائے اور اگر واپس آئے تو فتح یاب ہو کر آئے، پس دونوں طرف کے لشکر ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو جائیں گے، یہاں تک کہ شام ہو جائے گی اور دونوں طرف کے فوجی اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس آجائیں گے، ان میں سے نہ کوئی غالب ہوگا نہ کوئی مغلوب البتہ دونوں طرف کے وہ چیدہ دستے جو لڑنے کے لئے آگے گئے ہوں گے فنا کے گھاٹ اتر جائیں گے۔ اور پھر جب چوتھا دن ہوگا تو مسلمانوں کی باقی ماندہ فوج کفار سے جنگ کے لئے نکل کھڑی ہوگی اور اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں کفار کو شکست دلوائے گا۔ بہر حال (اس دن نہایت سخت اور خوفناک جنگ ہوگی اور) مسلمان جان توڑ کر لڑیں گے اور ایسا لڑیں گے کہ اس طرح کی لڑائی کبھی نہیں دیکھی گئی ہوگی، یہاں تک کہ اگر کوئی پرندہ لشکر والوں کے اوپر سے گزر جانا چاہے گا تو ان کو پیچھے نہیں چھوڑ پائے گا یعنی ان سے آگے نہیں گزر سکے گا کہ مر کر زمین پر گر پڑے گا (مطلب یہ کہ اس لڑائی میں اس کثرت سے لوگ مارے جائیں گے کہ پورا میدان جنگ لاشوں سے پٹا پڑا ہوگا اور اگر کوئی پرندہ ان لاشوں کے اوپر سے گزر کر جانا چاہے گا تو آگے نہیں جا پائے گا بلکہ لاشوں کے ناقابل برداشت بدبو کی وجہ سے مر کر گر پڑے گا یا یہ کہ وہ میدان جنگ اتنا وسیع اور طویل ہوگا کہ اگر کوئی پرندہ اس کے ایک سرے سے اڑ کر دوسرے سرے تک جانا چاہے گا تو نہیں جا پائے گا بلکہ اڑتے اڑتے تھک جائے گا اور مر کر گر پڑے گا) پھر جب ایک باپ کے بیٹے (یعنی کسی ایک خاندان یا کسی ایک سلسلے کے لوگ) کہ جن کی تعداد سو ہوگی اپنوں کو شمار کرنا شروع کریں گے تو ان میں سے صرف ایک ہی مل پائے گا (یعنی جنگ ختم ہونے کے بعد باقی ماندہ لشکر کے لوگ جانی نقصان کا جائزہ لینا شروع کریں گے، چنانچہ ہر شخص اپنے اقارب اور متعلقین کو شمار کرے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ اگر اس کے اقارب اور متعلقین سو کی تعداد میں جنگ میں شریک ہوئے تھے تو ان سو لوگوں میں سے ایک ہی شخص زندہ بچا ہے باقی سب کام آگئے ہیں، حاصل یہ کہ اس جنگ میں جانی نقصان اس کثرت سے ہوگا کہ زندہ بچ رہنے والوں کا تناسب سو میں ایک ہوگا) پس ایسی صورت میں (جب کہ مرنے والوں کی تعداد اس قدر بڑی ہوگی) کون سا مال غنیمت خوشی کا باعث ہوگا اور کونسی میراث تقسیم ہوگی؟ بہر حال مسلمان اسی حالت میں ہوں گے کہ اچانک ان کو ایک سخت لڑائی کی خبر معلوم ہوگی، جو پہلی لڑائی سے بھی زیادہ بڑی اور بھیانک ہوگی، پھر مسلمان یہ آواز سنیں گے (کہ جیسے کوئی اعلان کرنے والا اعلان کر رہا ہے کہ) ان کی عدم موجودگی میں ان کے اہل و عیال کے درمیان دجال پہنچ گیا ہے (یہ خبر سنتے ہی) وہ مسلمان اپنے ہاتھ کی چیزوں (یعنی مال غنیمت کی اشیاء کو کہ جو انہیں ملی ہوں گی) پھینک پھانک کر دجال کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور (پہلے) وہ اپنے دس سواروں کو آگے بھیجیں گے تاکہ دشمن کے بارے میں واقفیت بہم پہنچائیں۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ مسلمان جن سواروں کو آگے بھیجیں گے یقیناً میں ان کے اور ان کے باپ کے نام بھی جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا

ہوں کہ ان کے گھوڑے کس رنگ کے ہوں گے نیز وہ بہترین سوار ہوں گے، یا یہ فرمایا کہ وہ اس زمانہ کے روئے زمین کے بہتر سواروں میں سے ہوں گے۔" (مسلمؒ)

تشریح: "شُرْطَة" فوج کے اس جانباز دستہ کو کہتے ہیں جو لشکر کے بالکل آگے ہو اور اپنی جانیں تک قربان کر دینے کے عزم کے ساتھ میدان جنگ میں سب سے پہلے کود دے۔ "یتشرط" کا لفظ اسی سے مشتق ہے جو باب تفعل سے نکالا گیا ہے نیز یہ لفظ باب افتعال سے "یشترط" بھی نقل کیا گیا ہے بہرحال یہ جملہ لا ترجع الا غالبة اصل میں شرطه للموت کی صفت کاشفہ مبینہ موضحہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا لشکر اپنے جس جانباز دستہ کو آگے بھیجے گا اس کو یہ ہدایت ہوگی کہ وہ کسی بھی حالت میں دشمن کے مقابلے سے بھاگے نہیں بلکہ سخت سے سخت حالت میں بھی محاذ پر ڈٹا رہے، یہاں تک کہ دشمن کو فنا کے گھاٹ اتار کر سرخ رو لوٹے یا خود فنا کے گھاٹ اتر جائے۔

فیجعل اللّٰہ الدبرة علیھم میں لفظ "دبر" ادبار کا اسم ہے بعض روایتوں میں یہ لفظ "دابر" بھی منقول ہے، لیکن معنی کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ دونوں ہی سے مراد شکست اور ہزیمت ہے۔

"فَبِاَيِّ غَنِيمَةٍ" حرف ف تفریعیہ یا فصیحہ ہے اور طیبی نے لکھا ہے کہ یہ جملہ نحوی ترکیب کے اعتبار سے جزاء ہے شرط محذوف کی کہ پہلے تو مبہم طور پر فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ میراث کا تقسیم ہونا موقوف نہ ہو جائے گا اور مسلمان مال غنیمت سے خوش ہونا چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد جملہ کی وضاحت آگے کی عبارت عَدُوٌّ يَجْمَعُوْنَ الخ (دشمن یعنی کافر اہل اسلام سے لڑنے کے لئے فوج اور طاقت جمع کریں گے الخ) کے ذریعے کی، اور اس وضاحت کو مذکورہ صفت (یعنی بڑی بھیانک اور خوفناک جنگ ہونے اور اس میں اس قدر جانی نقصان ہونے) کے ساتھ مقید کیا کہ میراث اس لئے تقسیم نہیں ہوگی اور مسلمانوں کو مال غنیمت سے اس لئے خوشی نہیں ہوگی کہ جہاں اتنا زیادہ جانی نقصان ہوا اور اس قدر کثرت سے لوگ مارے گئے ہوں وہاں تقسیم کہاں اور خوشی کہاں؟

"طلیعه" کریمہ کے وزن پر ہے اور اس کے معنی اس شخص کے ہیں جس کو دشمن کی خبر لانے کے لئے آگے بھیجا جائے۔ چنانچہ ان دس سواروں سے مراد فوجی جاسوسوں کی وہ ٹکڑی ہے جس کو دشمن کے حالات، سازو سامان اور قوت و تعداد کی خبر لانے کے لئے دشمن کے ٹھکانوں کی طرف روانہ کیا جائے گا۔

حضور ﷺ کا یہ ارشاد "میں ان کے اور ان کے باپ کا نام جانتا ہوں الخ" اعجاز نبوت کی دلیل ہے، یعنی یہ آپ ﷺ کا معجزہ تھا کہ سیکڑوں سال بعد وقوع پذیر ہونے والے کسی واقعہ سے متعلق افراد کے نام اور ان کے باپ کے نام اور ان کے گھوڑوں کے رنگ تک کا علم حضور ﷺ کو تھا! نیز یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کی کلیات و جزئیات کو محیط ہے اور اس نے جس چیز کے بارے میں جس قدر مناسب جانا اس قدر علم اپنے رسول کو بھی عطا فرما دیا۔

کشت و خون کے بغیر ایک شہر کے فتح ہونے کی پیشگوئی

(۱۳) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ هَلْ سَمِعْتُمْ بِمَدِيْنَةٍ جَانِبٌ مِّنْهَا فِي الْبَرِّ وَجَانِبٌ مِّنْهَا فِي الْبَحْرِ قَالُوْا نَعَمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَغْزُوَهَا سَبْعُوْنَ اَلْفًا مِّنْ بَنِيْ اِسْحٰقَ فَاِذَا جَآءُوْهَا نَزَلُوْا فَلَمْ يُقَاتِلُوْا بِسَلَاحٍ وَلَمْ يَرْمُوْا بِسَهْمٍ قَالُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ فَيَسْقُطُ اَحَدُ جَانِبَيْهَا قَالَ ثَوْرُ بْنُ يَزِيْدَ الرَّاوِيْ لَا اَعْلَمُهٗ اِلَّا قَالَ الَّذِيْ فِي الْبَحْرِ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ الثَّانِيَةَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ فَيَسْقُطُ جَانِبُهَا الْاٰخَرُ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ الثَّالِثَةَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ فَيُفَرَّجُ لَهُمْ فَيَدْخُلُوْنَهَا فَيَغْنَمُوْنَ فَبَيْنَاهُمْ يَقْتَسِمُوْنَ الْمَغَانِمَ اِذَا جَآءَهُمُ الصَّرِيْخُ فَقَالَ اِنَّ الدَّجَّالَ قَدْ خَرَجَ فَيَتْرُكُوْنَ كُلَّ شَيْءٍ وَيَرْجِعُوْنَ۔ (رواہ مسلم)

"اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ نے (صحابہؓ سے) پوچھا کہ کیا تم نے کسی ایسے شہر کے بارے میں سنا ہے جس کے ایک طرف تو سمندر ہے اور ایک طرف جنگل ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! (ہم نے اس شہر کا ذکر سنا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا۔ "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد میں سے ستر ہزار آدمی اس شہر کے لوگوں سے جنگ نہ کرلیں گے! چنانچہ حضرت اسحاق کی اولاد میں سے وہ لوگ (جب جنگ کے ارادے سے) اس شہر میں آئیں گے تو (اس شہر کے نواحی علاقہ میں) پڑاؤ ڈالیں گے (اور پورے شہر کا محاصرہ کرلیں گے) لیکن وہ لوگ شہر والوں سے ہتھیاروں کے ذریعے جنگ نہیں کریں گے اور نہ ان کی طرف تیر پھینکیں گے بلکہ لا الٰہ الا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر کا نعرہ بلند کریں گے اور شہر کے دو طرف کی دیواروں میں سے ایک طرف کی دیوار گر پڑے گی" (اس موقع پر) حدیث کے راوی ثور ابن یزیدؒ نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے یہاں سمندر کی جانب والی دیوار کہا تھا (یعنی میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا، البتہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے یہاں یہ روایت کیا تھا کہ اس نعرہ سے سمندر کی طرف والی دیوار گر پڑے گی)۔ (بہرحال اس کے بعد حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ) پھر وہ لوگ دوسری مرتبہ لا الٰہ الا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر کا نعرہ بلند کریں گے تو ان کے لئے شہر میں داخل ہونے کا راستہ کشادہ ہو جائے گا اور وہ شہر میں داخل ہو جائیں گے پھر وہ مال غنیمت جمع کریں گے (یعنی شہر میں جو کچھ ہوگا اس کو اپنے قبضے میں لے لیں گے) اور اس مال غنیمت کو آپس میں تقسیم کر رہے ہوں گے کہ اچانک (ان کے کانوں میں) یہ آواز آئے گی کہ کوئی کہہ رہا ہے، دجال نکل آیا ہے! (یہ آواز سنتے ہی، وہ لوگ سب کچھ (یعنی مال غنیمت وغیرہ کو) چھوڑ چھاڑ کر (دجال سے لڑنے کے لئے) لوٹ پڑیں۔" (مسلم)

تشریح: آنحضرت ﷺ نے اس ارشاد میں جس شہر کا ذکر فرمایا اس کے بارے میں ایک شارح کا کہنا یہ ہے کہ وہ شہر روم میں واقع ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر سے "قسطنطنیہ" مراد ہے جس کا مسلمانوں کے ذریعے فتح ہونا قیامت کی علامتوں میں سے (ایک علامت ہے! لیکن ایک احتمال یہ ہے کہ وہ شہر قسطنطنیہ کے علاوہ کوئی اور شہر ہوگا کیونکہ قسطنطنیہ کا فتح ہونا جنگ وجدال اور کشت وخون کے ذریعے ہوگا جب کہ مذکورہ شہر کی فتح کا ظاہری سبب صرف تہلیل و تکبیر کے نعرہ کو بتایا گیا ہے۔

"حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد" سے مراد جیسا کہ مظہرؒ نے وضاحت کی ہے، شام کے لوگ ہیں جن کا سلسلہ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے صاحبزادے حضرت اسحاق علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے، اور وہ لوگ مسلمان ہوں گے اس سلسلہ میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ اس شہر کو فتح کرنے والے لوگوں میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد کے علاوہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے لوگ بھی ہوں گے جو حجاز (عرب) کے باشندے ہوں گے، یا ان کے علاوہ دوسرے مسلمان بھی شامل ہوں، اس صورت میں کہا جائے گا کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد کا ذکر اختصار کے پیش نظر اور دوسرے لوگوں پر ان کو فوقیت دینے کی بنا پر ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس شہر کو فتح کرنے والے لوگ صرف حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوں گے۔

"ہتھیاروں کے ذریعے جنگ نہیں کریں گے" کے بعد پھر یہ ارشاد کہ "اور نہ ان کی طرف تیر پھینکیں گے"، تعمیم کے بعد تخصیص کے طور پر ہے جس کا مقصد ہتھیاروں کے مطلق استعمال نہ ہونے کو تاکید کے ساتھ بیان کرنا ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِيْ

قرب قیامت کے وہ حوادث ووقائع جو یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہوں گے

(۱۴) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُمْرَانُ بَيْتِ الْمُقَدَّسِ خَرَابُ يَثْرِبَ وَخَرَابُ يَثْرِبَ خُرُوْجُ الْمَلْحَمَةِ وَخُرُوْجُ الْمَلْحَمَةِ فَتْحُ قُسْطُنْطِيْنِيَّةَ وَفَتْحُ قُسْطُنْطِيْنِيَّةَ خُرُوْجُ الدَّجَّالِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت معاذ ابن جبلؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "بیت المقدس کا پوری طرح آباد ہو جانا مدینہ منورہ کی خرابی کا باعث ہوگا،

اور مدینہ منورہ کی خرابی، فتنے اور سب سے بڑی جنگ کے وقوع پذیر ہونے کا سبب ہوگا اور اس سب سے بڑی جنگ کا وقوع پذیر ہونا قسطنطنیہ کے فتح ہونے کا باعث ہوگا اور قسطنطنیہ کا فتح ہونا دجال کے ظاہر ہونے کا سبب اور اس کی علامت ہوگا۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: بیت المقدس کی مکمل آبادکاری کو مدینہ منورہ کی تخریب کا سبب اس اعتبار سے قرار دیا گیا ہے کہ بیت المقدس اور اس کے علاقوں میں غیر مسلموں کا غلبہ ہو جائے گا اور وہ اس کے چپہ چپہ پر قابض و آباد ہو جائیں گے اور جب وہ دشمن خدا بیت المقدس پر چھا جائیں گے تو ان کی نظریں مدینہ منورہ پر پڑیں گی اور وہ اس پاک شہر کی تخریب کا منصوبہ بنائیں گے جس کی وجہ سے مدینہ کے سارے لوگ اپنے شہر سے نکل کر ان دشمنان دین سے جنگ کرنے میں مشغول ہوں گے۔

یہاں حدیث میں مدینہ منورہ کا ذکر اس کے قدیم نام "یثرب" کے ذریعے کیا گیا ہے! واضح رہے کہ لفظ "یثرب" اصل میں "ثرب" سے مشتق ہے جس کے معنی ہلاکت کے ہیں، یا یہ کہ "یثرب" مدینہ کا ایک گاؤں تھا جس کو یثرب نامی شخص نے بسایا تھا، اسی کا نام سارے شہر کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے مکہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمانے تک یہ شہر یثرب ہی کا کہلاتا تھا، ہجرت کے بعد حضور ﷺ نے اس کا نام بدل دیا اور یہ شہر مدینہ الرسول (یعنی رسول اللہ ﷺ کا شہر کہا جانے لگا، یہ معنی "المدینة" سے بھی ادا ہوتے ہیں، لہٰذا عام طور پر "المدینة" کہا جاتا ہے! یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "مدینہ" کو "یثرب" کہنے سے منع فرمایا گیا ہے تو پھر اس حدیث میں خود حضور ﷺ نے "یثرب" نام کیوں استعمال فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں مدینہ کو یثرب فرمانا، یثرب کہنے کی ممانعت نافذ ہونے سے پہلے کی بات ہے۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جن حوادث و وقائع کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب مذکورہ ترتیب کے مطابق یکے بعد دیگرے قیامت کے قریب واقع ہوں گے اور ان میں سے ہر ایک کا وقوع پذیر ہونا دوسرے کے وقوع پذیر ہونے کی علامت اور نشانی ہوگی اگرچہ اس کا وقوع پذیر ہونا مہلت اور تاخیر ہی سے کیوں نہ ہو۔

طیبیؒ نے کہا ہے کہ اگر یہ سوال پیدا ہو کہ اس حدیث میں تو فتح قسطنطنیہ کو دجال کے ظاہر ہونے کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ پہلے جو حدیث گزری ہے اس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان شیطان اچانک یہ اعلان کرے گا کہ تمہاری عدم موجودگی میں دجال تمہارے گھروں تک جا پہنچا ہے، اور جب مسلمان یہ اعلان سن کر دجال کی تلاش میں نکلیں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک جھوٹا اعلان تھا۔ پس ان دونوں حدیثوں میں تضاد کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں حضور ﷺ کا مقصد محض قسطنطنیہ کی فتح کو دجال کے نکلنے کی علامت قرار دینا ہے، کہ جب قسطنطنیہ فتح ہو جائے تو سمجھنا کہ اب دجال کا خروج ہوگا، دجال کا خروج کس طرح ہوگا اور مسلمانوں کو اس کے بارے میں کیسے معلوم ہوگا؟ پس حقیقت میں ان دونوں حدیثوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے! علاوہ ازیں شیطان کے اس جھوٹے اعلان کا تعلق دجال کے خروج سے کچھ نہیں ہوگا بلکہ وہ تو اس طرح کا جھوٹا اعلان صرف اس مقصد سے کرے گا، تاکہ مسلمانوں میں سراسیمگی اور بے اطمینانی پھیلا دی جائے اور وہ غنیمت کا مال تقسیم کرنے سے باز رہیں۔

جنگ عظیم، فتح قسطنطنیہ اور خروج دجال کی پیشگوئی

⑮ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَلْحَمَةُ الْعُظْمٰى وَفَتْحُ قُسْطُنْطِيْنِيَّةَ وَخُرُوْجُ الدَّجَّالِ فِيْ سَبْعَةِ اَشْهُرٍ۔ (رواہ الترمذی والبوداؤد)

"اور حضرت معاذ بن جبلؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جنگ عظیم کا واقع ہونا، قسطنطنیہ کا فتح ہونا اور دجال کا نکلنا، یہ سب سات ماہ کے اندر ہوگا۔" (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

تشریح: "جنگ عظیم" سے مراد، بعض حضرات کے نزدیک وہ جنگ ہے جس کے بارے میں پہلے فرمایا جا چکا ہے کہ لڑائی کے خاتمہ پر جب

لوگ اپنے عزیز و اقارب کے جانی نقصان کا جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ سو سے ایک زندہ بچا ہے اور باقی اموات کی آغوش میں چلے گئے ہیں۔ مگر زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ اس جنگ سے مراد اس شہر کی فتح ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اسمائے الٰہی کی برکت (یعنی تہلیل و تکبیر کے نعرہ کے ذریعے) فتح ہو جائے گا اور کشت و خون کی نوبت تک نہیں آئے گی جیسا کہ پیچھے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں گزرا۔

مذکورہ بالا تینوں چیزوں کے وقوع پذیر ہونے کے تعلق سے جو سات مہینے کی مدت ذکر فرمائی گئی ہے وہ ان دونوں شہروں اور فتنہ دجال کی طرف مسلمانوں کے متوجہ ہونے کے اعتبار سے فرمائی گئی ہے، ورنہ جہاں تک ان دونوں شہروں کے فتح ہونے کا اعتبار ہے تو مذکورہ جنگ عظیم اور فتح قسطنطنیہ کا وقوع پذیر ہونا یکے بعد دیگرے بغیر کسی تاخیر کے ہوگا اور ان دونوں کے بعد دجال کا خروج ہو جائے گا۔

(۱۶) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بَيْنَ الْمَلْحَمَةِ وَفَتْحُ الْمَدِيْنَةِ سِتُّ سِنِيْنَ وَيَخْرُجُ الدَّجَّالُ فِي السَّابِعَةِ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ هٰذَا اَصَحُّ۔

"اور حضرت عبداللہ ابن بسرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ "جنگ عظیم اور مذکورہ شہر یعنی قسطنطنیہ کے فتح ہونے کی درمیانی مدت چھ سال ہوگی اور ساتویں سال دجال نکلے گا" اس روایت کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث زیادہ صحیح ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جنگ عظیم فتح قسطنطنیہ اور خروج دجال، یہ تینوں واقعات سات سال کے اندر ہوں گے جب کہ پہلی حدیث میں اس مدت کو سات ماہ بیان کیا گیا ہے، اس اعتبار سے دونوں حدیثوں کے درمیان زبردست تضاد اور اختلاف ہے لہٰذا اس بات کو دھیان میں رکھنا چاہئے کہ تعارض بالکل ثابت ہے کہ ایک حدیث میں وضاحت کے ساتھ سات ماہ کی مدت بیان کی گئی ہے اور ایک حدیث سال کی مدت، اور دونوں حدیثوں کے مفہوم میں مطابقت پیدا کرنا ممکن نہیں ہے، اس صورت میں اس کے علاوہ اور کوئی طریق نہیں کہ ان دونوں حدیثوں کی حیثیت کو سامنے رکھ کر اس حدیث کو راجح قرار دیا جائے جو زیادہ صحیح ہو، چنانچہ علماء اور محدثین نے لکھا ہے کہ پہلی حدیث میں کلام کیا گیا ہے کیونکہ اس کے بعض راوی فن حدیث کی اصطلاح میں مجروح اور مطعون ہیں اور یہ دوسری حدیث بالکل صحیح ہے جیسا کہ خود امام ابوداؤدؒ نے وضاحت کی ہے، پس حاصل یہ نکلا کہ مذکورہ بالا تینوں واقعات کے وقوع پذیر ہونے کی درمیانی مدت، سات ماہ کے بجائے سات سال زیادہ صحیح ہے۔

(۱۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ يُوْشِكُ الْمُسْلِمُوْنَ اَنْ يُّحَاصَرُوْا اِلَى الْمَدِيْنَةِ حَتّٰى يَكُوْنَ اَبْعَدَ مَسَالِحِهِمْ سَلَاحُ وَسَلَاحُ قَرِيْبٌ مِّنْ خَيْبَرَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ وہ وقت آنے والا ہے جب مسلمانوں کا مدینہ میں محاصرہ کیا جائے گا، یہاں تک کہ ان کا دور ترین مورچہ سلاح ہوگا، اور سلاح خیبر کے نزدیک ایک مقام کا نام ہے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: لفظ "سلاح" سین کے زبر کے ساتھ ہے، لیکن اس بنا پر کہ یہ لفظ اسم موخر ہے اور اس کی خبر ابعد ہے، اس کو سین کے پیش کے ساتھ بھی نقل کیا جا سکتا ہے، علاوہ ازیں ایک نسخہ میں یہ لفظ دو زبر (تنوین) کے ساتھ اور ایک نسخہ میں حاء کے زبر کے ساتھ منقول ہے۔ بہر حال یہ ایک جگہ کا نام ہے جو خیبر کے پاس ہے اور خیبر مدینہ منورہ سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

حدیث کا مطلب یا تو یہ ہے کہ جب آخر زمانہ میں مسلمانوں کی کمزوری اور انتشار کا وقت ہوگا تو دشمنان دین و اسلام کے حوصلے اتنے بڑھ جائیں گے کہ وہ مدینہ منورہ تک کا محاصرہ کرنے اور وہاں کے مسلمانوں کو گھیر لینے کی کوشش کریں گے اور ان کا اقتدار خیبر تک آ جائے گا۔ یا یہ کہ اس وقت جب مسلمان دشمنوں کے تسلط و قبضہ سے نکلنے کے لئے اپنے اپنے ملکوں اور علاقوں سے بھاگ بھاگ کر مدینہ آئیں گے تو مدینہ اور سلاح کے درمیان جمع ہوں گے اور یا یہ کہ اس وقت اطراف عالم سے بھاگ کر آنے والے مسلمانوں میں سے کچھ تو وہ ہوں گے جو مدینہ منورہ میں آ جائیں گے اور کچھ وہ ہوں گے جو اس مقدس شہر کی حفاظت و نگہبانی کی خاطر اس کے گرد مورچے بنائیں گے،

اور ان مورچوں پر ڈٹے رہیں گے، چنانچہ ان مورچوں میں سب سے دور جو مورچہ ہوگا وہ سلاح کے مقام پر ہوگا یہ معنی حدیث کے آخری الفاظ کی مناسبت سے زیادہ صحیح ہیں۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کے بارے میں ایک پیشگوئی

(۱۸) وَعَنْ ذِی مِخْبَرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ سَتُصَالِحُوْنَ الرُّوْمَ صُلْحًا اٰمِنًا فَتَغْزُوْنَ اَنْتُمْ وَهُمْ عَدُوًّا مِّنْ وَّرَاءِ کُمْ فَتَنْصُرُوْنَ وَتَغْنِمُوْنَ وَتَسْلَمُوْنَ ثُمَّ تَرْجِعُوْنَ حَتّٰی تَنْزِلُوْا بِمَرْجٍ ذِیْ تَلُوْلٍ فَیَرْفَعُ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ النَّصْرَانِیَّةِ الصَّلِیْبَ فَیَقُوْلُ غَلَبَ الصَّلِیْبُ فَیَغْضَبُ رَجُلٌ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ فَیَدُقُّهٗ فَعِنْدَ ذٰلِكَ تَغْدِرُ الرُّوْمُ وَتَجْمَعُ لِلْمَلْحَمَةِ وَزَادَ بَعْضُهُمْ فَیَثُوْرُ الْمُسْلِمُوْنَ اِلٰی اَسْلِحَتِهِمْ فَیَقْتَتِلُوْنَ فَیُكْرِمُ اللّٰهُ تِلْكَ الْعِصَابَةَ بِالشَّهَادَةِ۔

(رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ذی مخبرؓ (جو آنحضرت ﷺ کے خادم اور نجاشی بادشاہ حبشہ کے بھتیجے تھے) کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "مسلمانو! وہ وقت آنے والا ہے جب تم رومیوں (یعنی عیسائیوں) سے ایک ایسی مصالحت کرو گے جو با امن صلح ہوگی (یعنی طرفین میں سے کسی کو بھی مصالحت شکنی اور بدعہدی کا خوف نہ ہوگا) اور پھر (اس مصالحت اور معاہدہ کے تحت) تم اور رومی باہم مل کر اپنے علاوہ ایک اور دشمن کے خلاف جنگ کرو گے چنانچہ (خدا کی طرف سے اس دشمن کے خلاف) تمہیں مدد ونصرت دی جائے گی، تم غنیمت کا مال حاصل کرو گے اور تم سلامت رہو گے (یعنی تمہارا جانی ومالی نقصان نہیں ہوگا) اس کے بعد جب تم (اس دشمن کو شکست دے کر) واپس ہو گے تو تم اور وہ رومی ایک ایسی جگہ پڑاؤ ڈالو گے جو سر سبز وشاداب ہوگی اور جہاں ٹیلے ہوں گے، وہاں عیسائیوں (یعنی رومیوں) میں سے ایک شخص صلیب بلند کر کے کہے گا کہ صلیب کا غلبہ ہوا ہے (یعنی وہ عیسائی یہ دعویٰ کرے گا کہ اس جنگ میں صلیب کی برکت سے فتح حاصل ہوئی ہے) اس بات پر مسلمانوں میں سے ایک شخص غضب ناک ہو جائے گا (کیونکہ وہ اس بات کو مسلمانوں کے ایمان وعقیدہ کے خلاف جانے گا کہ اس فتح وغلبہ کو خدا اور اس کے دین کے بجائے کسی اور چیز کی طرف منسوب کیا جائے) چنانچہ وہ مسلمان اس صلیب کو توڑ ڈالے گا اور اس وقت رومی نہ صرف عہد کو توڑ دیں گے اور مصالحت کو ختم کر دیں گے بلکہ (مسلمانوں کے خلاف) جنگ کے لئے اپنے لوگوں کو جمع کر لیں گے" بعض راویوں نے یہ الفاظ اور نقل کئے ہیں کہ "اس کے بعد مسلمان بھی اپنے ہتھیاروں کی طرف لپکیں گے (یعنی ان رومیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے) اور ان سے جنگ کریں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی اس جماعت کو شہادت کی فضیلت وعظمت عطا فرمائے گا۔" (ابوداؤدؒ)

حبشیوں کے بارے میں ایک ہدایت

(۱۹) وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اتْرُكُوا الْحَبَشَةَ مَا تَرَكُوْكُمْ فَاِنَّهٗ لَا یَسْتَخْرِجُ كَنْزَ الْكَعْبَةِ اِلَّا ذُوالسُّوَیْقَتَیْنِ مِنَ الْحَبَشَةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت عبداللہ ابن عمروؓ، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "تم حبشیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کرو تاکہ وہ تم سے کچھ نہ کہیں اور تم سے تعرض نہ کریں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کعبہ کا خزانہ ایک حبشی ہی نکالے گا جس کی دونوں پنڈلیاں چھوٹی چھوٹی ہوں گی۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: حدیث کے آخر میں جس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کا تعلق آخر زمانہ سے ہے جب کہ قیامت بالکل قریب ہوگی اس وقت اہل حبشہ کو غلبہ حاصل ہوگا اور ان کا بادشاہ اپنا لشکر لے کر مکہ پر چڑھ آئے گا اور کعبۃ اللہ کو ڈھادے گا اور اس خزانہ کو نکال لے گا

جو خانہ کعبہ کے نیچے مدفون ہے، چنانچہ حدیث میں، کعبہ کے خزانہ کو نکالنے والے جس حبشی کا ذکر کیا گیا ہے اس سے یا تو حبشہ کا بادشاہ مراد ہے، یا پھر پورا لشکر مراد ہے! نیز "خزانہ" سے مراد وہ پورا خزانہ ہے جو کعبہ اقدس کے نیچے مدفون ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ "خزانہ" سے مراد وہ مال اسباب ہے جو نذر کے طور پر وہاں آتا ہے اور خانہ کعبہ کا خادم اس کو جمع کرتا ہے۔

واضح رہے کہ یہاں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ایک حبشی خانہ کعبہ کا خزانہ نکال لے گا یا ایک اور روایت میں یوں فرمایا گیا ہے کہ ایک حبشی خانہ کعبہ کو تباہ و برباد کر دے گا، تو یہ بات قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ حَرَمًا اٰمِنًا (امن و امان والا حرام) کے خلاف اور معارض نہیں ہے کیونکہ حبشیوں کے ذریعے خانہ کعبہ کی تخریب و تباہی کا یہ واقعہ قیامت کے قریب پیش آئے گا جب کہ روئے زمین پر کوئی شخص اللہ اللہ کہنے والا نہیں رہے گا۔ اور اٰمِنًا کے معنی یہ ہیں کہ کعبۂ اقدس قیامت تک مامون و محفوظ رہے گا، لہٰذا جب روئے زمین پر اللہ اللہ کہنے والوں تک کا کوئی موجود نہ رہے گا اور جب قیامت ہی آجائے گی تو پھر اور کیا چیز باقی رہ جائے گی کہ کعبہ بھی باقی رہے۔ ویسے یہ بات بھی بجائے خود وزن دار ہے، لیکن بعض حضرات نے ایک اور وضاحت بیان کی ہے اور اس کو زیادہ صحیح کہا ہے، اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو جو "امن والا حرم" قرار دیا ہے تو اس کے غالب احوال کے اعتبار سے قرار دیا ہے یعنی خانہ کعبہ کی اصل حقیقت تو یہی رہے گی کہ وہ "باامن حرم" کے طور پر ہمیشہ ہر قسم کی تخریب کاری اور پلیدگی سے محفوظ و مامون رہے گا، مگر کبھی کبھار ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا سخت حادثہ واقعہ پیش آجائے جس سے اس کی تخریب کاری ہو چنانچہ کعبہ کی تاریخ میں ایسے حادثات پہلے بھی پیش آچکے ہیں جنہوں نے اس کو نقصان پہنچایا جیسا کہ حضرت ابن زبیرؓ کے زمانے میں عبدالملک ابن مروان کی خلافت کی طرف سے اہل مکہ کے خلاف حجاج ابن یوسف کے حملے کے دوران خانہ کعبہ کی سخت تخریب ہوئی یا قرامطہ کا واقعہ پیش آیا کہ اس نے خانہ کعبہ کو نقصان پہنچایا، بس اگر زمانہ آئندہ میں بھی کعبہ اقدس کی تخریب کا پیش آنے والا کوئی واقعہ پیش آئے تو وہ واقعہ حَرَمًا اٰمِنًا کے خلاف نہیں ہوگا! یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ باامن حرم قرار دینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کو حکم فرمایا کہ جو بھی شخص اس مقدس شہر اور حرم محترم میں آئے اس کو امن و عافیت عطا کرو اور یہاں کسی کے ساتھ بھی تعرض نہ کرو۔ چنانچہ منقول ہے کہ جب زندیقوں کی جماعت قرامطہ کا سردار فساد و تباہی مچا چکا اور لوگوں کے قتل و غارت گری اور شہریوں کو لوٹ مار سے فارغ ہوا تو ایک دن کہنے لگا کہ اللہ کا یہ فرمان کہا گیا کہ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (یعنی جو بھی شخص اس حرم محترم میں داخل ہوا اس کو امن و عافیت حاصل ہوگئی؟) اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو جواب دینے کی توفیق عطا فرمائی، اس نے کہا کہ قرآن کریم کے اس ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی شخص کبھی بھی مکہ واہل مکہ اور خانہ کعبہ کی تخریب اور نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا بلکہ اس فرمان الٰہی کی مراد یہ حکم دینا ہے کہ جو شخص حرم محترم میں داخل ہو جائے اس کو امن و عافیت عطا کرو اور اس میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے ذریعے کسی کے ساتھ تعرض نہ کرو۔

(۲۵) وَعَنْ رَجُلٍ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ دَعُوا الْحَبَشَةَ مَا دَعُوْكُمْ وَ اتْرُكُوا التُّرْكَ مَا تَرَكُوْكُمْ۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

"اور نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ میں سے ایک شخص سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "تم حبشیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو جب تک کہ وہ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑے رکھیں اور ترکوں کو بھی ان کے حال پر چھوڑ دو جب تک کہ وہ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑے رکھیں۔" (ابوداؤدؒ، نسائیؒ)

تشریح: یہاں ایک یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے تو یہ حکم دیا ہے کہ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً (یعنی مشرکین سے قتال کرنا چاہئے وہ جہاں کہیں بھی ہوں) پس جب اس حکم میں عموم ہے تو حبشیوں اور ترکوں کے بارے میں حضور ﷺ نے یہ کیوں فرمایا ہے کہ تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، یعنی ان پر حملہ نہ کرو اور ان کے ملکوں اور شہروں پر چڑھائی سے گریز کرو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حبشہ اور ترک کا معاملہ اس آیت کے عمومی حکم سے خارج اور مخصوص استثنائی نوعیت رکھتا تھا کیونکہ جغرافیائی پوزیشن کے اعتبار سے یہ دونوں ملک اس

زمانے کی اسلامی طاقت کے مرکز سے بہت دور دراز فاصلے پر واقع تھے اور اسلامی چھاؤنیوں اور ان ملکوں کے درمیان دشت و بیابان کا ایک ایسا دشوار گذار سلسلہ حائل تھا جس کو عام حالات میں عبور کرنا ہر ایک کے لئے ممکن نہیں تھا، لہٰذا حضور ﷺ نے اس بنا پر مسلمانوں کو حکم دیا کہ ان دونوں ملکوں کے خلاف کوئی اقدامی کاروائی نہ کی جائے اور ان لوگوں سے اس وقت تک کوئی تعرض نہ کیا جائے جب تک کہ وہ خود تم سے چھیڑ نہ نکالیں، پس اگر وہ تمہارے خلاف جارحیت کا ارتکاب کریں اور اپنی فوج و طاقت جمع کر کے مسلمانوں کے شہروں اور اسلامی مراکز پر چڑھ آئیں تو اس صورت میں ان کے خلاف نبرد آزما ہو جانا اور ان کے ساتھ جنگ و قتال کرنا فرض ہوگا۔ یا ایک بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ حضور ﷺ نے جو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اسلام کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے جب کہ اسلام اور مسلمانوں کے پاس اتنی طاقت اور اس قدر ذرائع نہیں تھے کہ وہ اتنے دور دراز علاقوں تک اسلام کی پیش رفت کو بڑھاتے، چنانچہ بعد میں جب مذکورہ آیت نازل ہوئی اور اسلام کو طاقت میسر ہو گئی تو حضور ﷺ کا یہ حکم منسوخ قرار پا گیا۔

ترکوں کے متعلق پیش گوئی

(۲۱) وَعَنْ بُرَيْدَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَدِيْثٍ يُقَاتِلُكُمْ قَوْمٌ صِغَارُ الْاَعْيُنِ يَعْنِي التُّرْكَ قَالَ تَسُوْقُوْنَهُمْ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ حَتّٰى تُلْحِقُوْهُمْ بِجَزِيْرَةِ الْعَرَبِ فَاَمَّا فِي السِّيَاقَةِ الْاُوْلٰى فَيَنْجُوْا مَنْ هَرَبَ مِنْهُمْ وَ اَمَّا فِي الثَّانِيَةِ فَيَنْجُوْا بَعْضٌ وَيُهْلِكَ بَعْضٌ وَ اَمَّا فِي الثَّالِثَةِ فَيُصْطَلَمُوْنَ اَوْ كَمَا قَالَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"حضرت بریدہ اسلمیؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ سے اس حدیث کے سلسلے میں جس کا شروع یہ ہے کہ "تم سے ایک چھوٹی آنکھوں والی قوم یعنی ترک قوم جنگ کرے گی" یہ بھی روایت کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا "تم اس قوم کے لوگوں کو تین بار دھکیل دو گے (یعنی تم ان پر غالب آؤ گے اور ان کو شکست دے کر بھاگنے پر مجبور کرو گے) یہاں تک کہ تم ان کو جزیرۂ عرب (کی سرحد کے پار) تک دھکیل دو گے۔ جب تم ان کو پہلی مرتبہ شکست دے کر بھگاؤ گے تو بھاگ کھڑے ہونے والے لوگ اپنی جان بچا لیں گے، جب دوسری مرتبہ شکست دے کر بھگاؤ گے تو ان میں سے کچھ تو اپنی جان بچا کر نکل جائیں گے اور کچھ موت کے گھاٹ اتر جائیں گے، لیکن جب تیسری مرتبہ شکست دے کر بھگاؤ گے تو اس وقت وہ جڑ سے ختم ہو جائیں گے یعنی یہ تیسری شکست ان کا بالکل خاتمہ کر دے گی۔ یا اس کے مانند فرمایا۔

(ابوداؤدؒ)

تشریح: "یعنی الترک" کے الفاظ راوی کے ہیں خواہ وہ صحابی یا تابعی! یعنی یا تو خود حضرت بریدہ نے یا ان سے روایت کرنے والے تابعی نے قوم صغار الاعین (چھوٹی آنکھوں والی قوم) کے بارے میں یعنی الترک کے ذریعے وضاحت کی اس قوم سے مراد ترک قوم ہے۔

"جزیرۃ العرب" جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، اس وقت کے جغرافیائی نقشہ کے مطابق حجاز، یمامہ اور یمن کے علاقوں کا نام تھا، اس علاقے کو "جزیرۃ العرب" اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ وہ تقریباً چاروں طرف سے پانی سے گھرا ہوا ہے اس کے جنوب میں بحر عرب، مشرق میں خلیج عربی اور خلیج عمان، مغرب میں بحر احمر اور اس کے شمال میں دریائے فرات ہے۔

اَوْ كَمَا قَالَ (یا اس کے مانند فرمایا) یہ جملہ کسی حدیث کو بیان کرنے کے بعد اس صورت میں کہتے ہیں جب کہ حدیث بیان کرنے والا یہ گمان کرتا ہے کہ حدیث کے معنی تو پوری طرح یاد ہیں جس کو میں نے بیان کر دیا ہے، البتہ حدیث کے اصل الفاظ پوری طرح یاد نہیں ہیں۔ گویا یہ جملہ حدیث کے راوی کے کمال احتیاط پر دلالت کرتا ہے۔

بصرہ کے متعلق پیش گوئی

(۲۲) وَعَنْ اَبِيْ بَكْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَنْزِلُ اُنَاسٌ مِنْ اُمَّتِيْ بِغَائِطٍ يُسَمُّوْنَهُ الْبَصْرَةَ عِنْدَ نَهْرٍ يُقَالُ لَهُ دِجْلَةُ يَكُوْنُ عَلَيْهِ جِسْرٌ يَكْثُرُ اَهْلُهَا وَيَكُوْنُ مِنْ اَمْصَارِ الْمُسْلِمِيْنَ وَاِذَا كَانَ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ جَاءَ بَنُوْ

قَنْطُوْرَآءَ عِرَاضُ الْوُجُوْهِ صِغَارُ الْاَعْيُنِ حَتّٰى يَنْزِلُوْا عَلٰى شَطِّ النَّهْرِ فَيَتَفَرَّقُ اَهْلُهَا ثَلٰثَ فِرَقٍ فِرْقَةٌ يَاْخُذُوْنَ فِيْ اَذْنَابِ الْبَقَرِ وَالْبَرِّيَّةِ وَهَلَكُوْا وَفِرْقَةٌ يَاْخُذُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ وَهَلَكُوْا وَفِرْقَةٌ يَجْعَلُوْنَ ذَرَارِيَّهُمْ خَلْفَ ظُهُوْرِهِمْ وَيُقَاتِلُوْنَهُمْ وَهُمْ شُهَدَآءَ۔ (رواہ ابوداؤد)

"اور حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "میری اُمت کے لوگ ایک پست زمین پر پہنچ کر قیام پذیر ہوں گے اور اس جگہ کا نام بصرہ رکھیں گے، وہ جگہ ایک نہر کے قریب ہوگی جس کو دجلہ کہا جاتا ہوگا، اس نہر پر پل ہوگا، بصرہ میں رہنے والوں کی آبادی بہت بڑھ جائے گی اور اس کا شمار مسلمانوں کے (بڑے) شہروں میں ہوگا اور پھر جب زمانہ آخر ہوگا تو قنطورا کی اولاد اس شہر کے لوگوں سے لڑنے کے لئے آئے گی، ان کے منہ چوڑے چکلے اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہوں گی، وہ لوگ نہر کے کنارے اپنا پڑاؤ ڈالیں گے اور (ان کو دیکھ کر) شہر کے لوگ تین حصوں میں تقسیم ہوجائیں گے ایک حصہ تو بیلوں کی دموں اور جنگل میں پناہ حاصل کرے گا (یعنی یہ وہ لوگ ہوں گے جو حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے سے کترا کر اپنی کھیتی باڑی کے کاموں میں مشغول ہوجائیں گے اور بیل وغیرہ ڈھونڈنے کا بہانہ لے کر ادھر ادھر ہوجائیں گے تاکہ دشمن کے حملے سے اپنی جان بچاسکیں یا یہ کہ وہ لوگ اپنے اہل وعیال اور مال واسباب کو جمع کر کے جنگلوں میں چلے جائیں گے تاکہ حملہ اور دشمن کی نقصان رسانی سے محفوظ رہیں) حالانکہ وہ لوگ موت وتباہی کے گھاٹ اتر کر رہیں گے (یعنی وہ اپنی اس حیلہ سازی کے باوجود دشمن کی زد سے محفوظ نہیں رہ پائیں گے کیونکہ حملہ آور مشرک، دشمنی اور فتنہ وفساد کی جو آگ بھڑکائیں گے وہ اس طرح کے حیلوں بہانوں سے ٹھنڈی یا محدود نہیں ہوگی) اور دوسرا حصہ قنطورا کی اولاد سے اپنی جانوں کے لئے امان طلب کرے گا مگر ان لوگوں کو بھی موت اور تباہی کے گھاٹ اترنا پڑے گا اور تیسرا حصہ وہ ہوگا جو اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کو پیچھے چھوڑ کر (یعنی اپنے اہل وعیال سے بے پرواہ کر اور ان کی محبت سے اپنا دامن چھڑا کر حملہ آور کے مقابلے پر ڈٹ جائے گا یا یہ کہ وہ لوگ اپنے بال بچوں کو اپنے پیچھے لے کر محاذ پر جائیں گے اور وہاں) دشمنوں سے لڑیں گے اور ان میں سے اکثر مارے جائیں گے جو شہادت کے مرتبہ کو پہنچیں گے۔" (ابوداؤدؒ)

تشریح: "بصرہ" با کے زبر اور زیر دونوں کے ساتھ اور صاد کے جزم کے ساتھ ہے، نیز یہ لفظ صاد کے زبر اور زیر کے ساتھ بھی منقول ہے۔ "دجلہ" (دال کے زبر اور زیر دونوں کے ساتھ) اس علاقہ کا مشہور دریا ہے جس کے کنارے پر مشہور شہر بغداد واقع ہے۔

حلبی نے حاشیہ شفا میں لکھا ہے کہ بصرہ کی با، زبر، زیر اور پیش تینوں حرکتوں کے ساتھ ہے، نیز یہ وہ شہر ہے جس کو حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں عتبہ ابن غزوان نے آباد کیا تھا اور شہر میں کبھی بھی بت پرستی نہیں ہوئی۔

حدیث میں بصرہ سے مراد بغداد ہے

حدیث میں جس واقعہ کی پیش گوئی فرمائی گئی ہے اس میں صریحًا "بصرہ" کا ذکر ہوا ہے، لیکن علماء نے لکھا ہے کہ اس سے "بغداد" مراد ہے، اور بغداد مراد لینے کی دلیل یہ ہے کہ دریائے دجلہ کی گزر گاہ بصرہ نہیں بلکہ بغداد ہے اور اس دریا پر جس پل کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی بغداد ہی میں ہے [علاوہ ازیں بغداد کا شہر آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں اس طرح کا شہر نہیں تھا جیسا کہ اب ہے بلکہ اس زمانہ میں اس جگہ منتشر طور پر کچھ قریئے اور دیہات تھے جو بصرہ کے مضافات میں سے شمار ہوتے تھے اور ان کی نسبت بصرہ ہی کی طرف جاتی تھی، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے گویا معجزہ کے طور پر، ان دیہاتی علاقوں کے ایک بڑے شہر میں تبدیل ہوجانے کی پیش خبری بیان فرمائی اور بصیغہ مستقبل یہ فرمایا کہ وہ اسلامی شہروں میں سے ایک بڑا شہر ہوگا اور کثیر آبادی پر مشتمل ہوگا یہ بات محض تاویل کے درجے کی نہیں بلکہ اس کی پشت پر تاریخی دلیل بھی ہے، چنانچہ تاریخ میں یہ کہیں نہیں ہے کہ ترکوں نے کبھی بصرہ پر حملہ کیا ہو اور ان کے اور مسلمانوں کے درمیان کشت وخون، کی وہ صورت پیش آئی ہو جس کی طرف حضور ﷺ نے اس حدیث میں ارشاد فرمایا، البتہ بغداد پر ترکوں (تاتاریوں نے) ضرور حملہ کیا ہے جو آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کے زمانہ کا واقعہ ہے جس کی کچھ تفصیل تاریخی کتابوں سے اخذ کر کے ہم نے مظاہر حق

جدید کی پچھلی قسط میں بھی بیان کی ہے، پس واضح ہوا کہ حدیث میں "بصرہ" کا ذکر محض اس سبب سے ہے کہ بغداد کی بہ نسبت "بصرہ" زیادہ قدیم شہر ہے اور وہ دیہات و مواضع کہ جہاں بغداد کی تعمیر ہوئی اور یہ عظیم شہر بنا "بصرہ" ہی کی طرف منسوب تھے اور یہ وہ "بصرہ" تھا جو بعد میں بھی بغداد کی شہر فصیل کے باہر ایک چھوٹی سی آبادی کی صورت میں تھا اور اس سمت شہر کے دروازہ کو اسی نام کی مناسبت سے باب البصرہ کہا جاتا تھا۔ لہٰذا حضور ﷺ نے "بغداد" کے ذکر کے لئے گویا اس شہر کے جزوی نام کے ذکر پر اکتفا فرمایا، یا یہ کہ یہاں اصل مراد تو "بغداد البصرہ" کا ذکر تھا مگر مضاف کو حذف کر کے صرف "بصرہ" کے ذکر پر اکتفا فرمایا گیا جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت کو واسئل القریة میں اللہ تعالیٰ نے صرف قریہ کا ذکر فرمایا ہے جب کہ اس سے مراد اہل قریہ ہیں۔

اس صورت میں حدیث کے ابتدائی جز کا حاصل یہ نکلا کہ میری اُمت میں سے کچھ لوگ دریائے دجلہ کے کنارے اپنا پڑاؤ ڈالیں گے اور اس جگہ کو اپنا مرکزی شہر بنائیں گے، یہاں تک کہ وہ چھوٹی سی جگہ ایک ایسے شہر میں تبدیل ہو جائے گی جس کا شمار مسلمانوں کے بڑے بڑے شہروں اور اسلامی مراکز میں ہوگا اور یہ وہ شہر ہے جس کو بغداد کہا جاتا ہے اس موقع پر یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ تاریخ میں بغداد کو جو عظمت و اہمیت اور مرکزیت حاصل ہوئی اور وہ جتنا عظیم شہر بنا اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے حضور ﷺ نے لفظ "امصار" استعمال فرمایا، امصار اصل میں مصر کی جمع ہے اور بڑے شہر کو کہتے ہیں اس سے نیچے کی آبادیوں کو بالترتیب "مدینہ"، "بلدہ" اور "قریہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

"قنطورا کی اولاد" سے مراد ترک قوم ہے۔ اس قوم کے وارث اعلی کا نام قنطورا تھا، اس لئے پوری ترک قوم کو "قنطورا کی اولاد" سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

"اور دوسرا حصہ اپنی جانوں کے لئے امان طلب کرے گا" کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس پیش گوئی کا مصداق خلیفہ مستعصم باللہ اور اس کے حوالی موالی تھے، جیسا کہ مظاہر حق جدید کی پچھلی قسط میں اس کی تفصیل بھی گزر چکی ہے، جب ہلاکو خاں (ترکوں یعنی تاتاریوں کے سردار) نے اپنی بے امان فوج کے ساتھ بغداد پر حملہ کیا تو خلیفہ مستعصم باللہ نے اپنے لواحقین اور درباریوں کے ساتھ ہلاکو خاں کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اور اہل شہر کی جانوں کی امان طلب کی، لیکن کسی کو بھی امان نہیں ملی اور خلیفہ سمیت سارے لوگ ہلاک و تباہ کر دیئے گئے اور ہلاکو خاں کے فوجیوں نے ایک ایک آدمی کو چن چن کر مار ڈالا۔

ایک شارح نے لکھا ہے کہ اگر یہ بات صحیح ہے کہ حضور ﷺ نے اس حدیث میں "بصرہ" کے ذکر سے "بغداد" مراد لیا تھا کیونکہ اس زمانہ میں موجودہ بغداد کا علاقہ "بصرہ" کے مضافاتی قریوں اور دیہات کی صورت میں تھا اور حضور ﷺ نے جزوی نام پر پورے نام کا اطلاق کرتے ہوئے گویا "بغداد البصرہ" کے ذکر کے بجائے صرف "بصرہ" کا ذکر فرمانا کافی جانا تو اس صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ حضور ﷺ کی یہ پیش گوئی پوری ہو چکی ہے کہ حضور ﷺ کے فرمانے کے مطابق مسلمانوں نے دریائے دجلہ کے کنارے بغداد کا شہر بسایا، اس کو ترقی اور عظمت سے ہمکنار کیا، وہ مسلمانوں کا ایک مرکزی اور بہت بڑا شہر بنا، پھر ترکوں نے اس پر حملہ کیا اور اس حملہ کے نتیجے میں اہل شہر کا تقریباً پورا حصہ ان ترکوں کے ہاتھوں کشت و خون کی نذر ہو گیا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس حدیث میں "بصرہ" سے مراد بغداد نہیں بلکہ بصرہ کا موجودہ شہر ہے، تو پھر یہ کہا جائے گا کہ حضور ﷺ کی مذکورہ پیش گوئی ابھی پوری نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ کسی آنے والے زمانہ میں اس شہر کے مسلمانوں کو مذکورہ پیش گوئی کے مطابق کسی اسلام دشمن طاقت کے حملہ و جارحیت کا شکار ہونا پڑے، کیونکہ جہاں تک پچھلے زمانہ کا تعلق ہے، تاریخ سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ بصرہ پر بھی کسی اسلام دشمن طاقت نے اس طرح کا حملہ کیا ہو اور وہاں کے مسلمانوں کو اس طرح کشت و خون کا سامنا کرنا پڑا ہو جس طرح کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

"ان میں سے اکثر مارے جائیں گے جو شہادت کے مرتبہ کو پہنچیں گے" یعنی اس شہر کے مسلمانوں کا تیسرا حصہ ان لوگوں پر مشتمل ہوگا جو غازی مجاہد فی سبیل اللہ ہوں گے اور اس سخت طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے نہایت جاں نثاری اور حوصلہ و استقامت کے ساتھ

میدان میں آجائیں گے اور قبل اس کے کہ دشمن اہل اسلام پر حاوی اور غالب ہو جائے، اس سے لڑکر خدا کی راہ میں اپنی جان دے دیں گے، پس وہ لوگ شہید ہوں گے اور کامل شہادت کا مرتبہ پائیں گے، ان میں سے جو لوگ زندہ بچ جائیں گے ان کی تعداد بہت تھوڑی ہوگی اس موقع پر ایک اور شارح نے کہا ہے کہ یہ حدیث گرامی آنحضرت ﷺ کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے کیونکہ سب کچھ اس طرح واقع ہوا جس طرح کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بغداد پر ترکوں کے حملے کی جو پیش گوئی فرمائی تھی وہ ماہ صفر ۶۵۶ھ میں حرف بحرف پوری ہوئی، اس وقت تاتاری ترکوں نے ہلاکو خاں کی سربراہی میں بغداد کو جس طرح تاراج کیا، مسلمانوں کا جس کثرت اور بے دردی سے خون بہایا، شہر کے محلات و مکانات حتی کہ کتب خانوں اور علمی مراکز کو جس طرح جلا کر راکھ کر دیا اور اس آگ کے شعلوں نے جس طرح پورے عالم اسلام کو متاثر اور کمزور کیا وہ ایک ایسا سانحہ ہے جس کی تفصیل بیان کرنے سے زبان و قلم قاصر ہیں۔

بصرہ کے متعلق ایک پیش گوئی

(۲۳) وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا اَنَسُ اِنَّ النَّاسَ يُمَصِّرُوْنَ اَمْصَارًا وَاِنَّ مِصْرًا مِنْهَا يُقَالُ لَهُ الْبَصْرَةُ فَاِنْ اَنْتَ مَرَرْتَ بِهَا اَوْ دَخَلْتَهَا فَاِيَّاكَ وَسِبَاخَهَا وَكَلَاءَهَا وَنَخِيْلَهَا وَسُوْقَهَا وَبَابَ اُمَرَائِهَا وَعَلَيْكَ بِضَوَاحِيْهَا فَاِنَّهُ يَكُوْنُ بِهَا خَسْفٌ وَقَذْفٌ وَرَجْفٌ وَقَوْمٌ يَبِيْتُوْنَ وَيُصْبِحُوْنَ قِرَدَةً وَخَنَازِيْرَ۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے (ان کو مخاطب کر کے) فرمایا۔ "انسؓ! لوگ کچھ نئے شہر بسائیں گے اور ان شہروں میں ایک شہر کا نام "بصرہ" ہوگا پس اگر تم اس شہر کے پاس سے گزرو یا اس شہر میں جاؤ تو اس کے اس علاقے کے قریب بھی جانا جہاں کھاری زمین ہے، نہ ان جگہوں کے قریب جانا جن کو کلاء کہا جاتا ہے، اسی طرح وہاں کی کھجوروں، وہاں کے بازار، وہاں کے بادشاہوں اور سرداروں کے دروازوں سے بھی دور رہنا، صرف اس شہر کے کنارے کے حصے میں کہ جس کو ضواحی کہا جاتا ہے پڑے رہنا! کیونکہ (جن جگہوں پر جانے سے تمہیں منع کر رہا ہوں) وہاں، زمین میں دھنسا دیئے جانے، پتھر برسائے جانے اور سخت زلزلوں کا عذاب نازل ہوگا، نیز ان علاقوں میں ایک ایسی قوم ہوگی جس کے افراد (ایک دن) رات میں عیش و راحت کی نیند سوئیں گے، لیکن جب صبح اٹھیں گے تو ان کی صورتیں بندر اور سور جیسی ہوں گی۔"

تشریح: "سِبَاخ" اصل میں "سبخه" کی جمع ہے، جس کے معنی اس زمین کے ہیں جو کھاری اور بنجر ہو کہا جاتا ہے کہ "سباخ" بصرہ کے اس علاقہ کا نام بھی ہے جہاں کی زمین کھاری اور بنجر ہے! اسی طرح "کلاء" کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بھی بصرہ کے بعض مقامات کا نام ہے۔

"ضواحی" ضاحیه کی جمع ہے، جس کے معنی شہر کا کنارہ اور شہر کی نواحی بستیاں ہیں! ویسے "ضاحية البصرة" بصرہ کی ایک نواحی بستی کا نام بھی ہے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ "ضواحی" سے مراد بصرہ پہاڑ ہیں چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حضرت انسؓ کو بصرہ کے ضواحی میں پڑے رہنے کا جو حکم دیا وہ دراصل گوشہ نشینی اور کنارہ کشی اختیار کرنے کے حکم میں تھا۔

"ان کی صورتیں بندر اور سور جیسی ہوں گی" یعنی وہ قوم خدا کی نافرمانی اور سرکشی اور اپنی بداعتقادی اور عملی گمراہیوں کی وجہ سے اس عذاب میں مبتلا کی جائے گی کہ اس قوم کے جو لوگ جوان ہوں گے وہ بندر کی صورت کے اور جو لوگ بوڑھے ہوں گے وہ سور کی صورت کے ہو جائیں گے، پس اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسخ و خسف جیسے عذاب الٰہی اس اُمّت میں بھی جائز الوقوع ہیں کیونکہ اگر اس طرح کے عذاب کا واقع ہونا سرے سے غیر ممکن ہوتا تو ان سے ڈرانے اور ان کے واقع ہونے کی جگہوں پر جانے سے روکنا، بالکل بے فائدہ ہوتا اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ احادیث میں اس طرح کے عذاب کی وعید فرقہ قدریہ کے بارے میں منقول ہے اور اسی بنا پر بعض شارحین نے یہ کہا ہے کہ اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ حدیث میں مذکورہ مقامات فرقہ قدریہ کے لوگوں کا مسکن ہوں گے کیونکہ اس اُمّت سے جن لوگوں پر مسخ و خسف کا عذاب نازل ہوگا وہ دراصل تقدیر الٰہی کو جھٹلانے والے لوگ ہوں گے۔

لفظ "کَلَاَّء" کاف کے زبر اور لام کی تشدید ومد کے ساتھ بھی منقول ہے، اور جیسا کہ اوپر بتایا گیا، یہ بصرہ میں ایک مقام کا نام ہے اور ایک شارح نے کہا ہے کہ اس سے مراد بصرہ کے ساحلی علاقہ کی وہ جگہ ہے جہاں جہاز اور کشتیاں لنگر ڈالتی ہیں اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ کلاء سے مراد بصرہ کا وہ علاقہ ہے جہاں جانوروں کی چراگاہ ہے، اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ بعض نسخوں میں یہ لفظ لام کی تشدید اور مد کے بغیر منقول ہے جس کے معنی گھاس اور سبزہ کے ہیں ایک شارح نے لکھا ہے کہ ان جگہوں پر مسخ وخسف کے عذاب کے نازل ہونے کی وجہ شاید وہاں کے لوگوں کی خباثت اور سرکشی ہوگی، اسی طرح وہاں کی کھجوروں سے دور رکھنے کا مقصد ان کھجوروں کے باغات میں جانے سے روکنا ہے کیونکہ شاید ان باغات کا ماحول اور وہاں کے اثرات دین وایمان اور عزت وآبرو کو نقصان پہنچانے کا خوف رکھتے ہوں، نیز وہاں کے بازار، دینی احکام سے غفلت ولاپرواہی یا لہو ولعب اور خرید وفروخت کے معاملات میں بے ایمانی اور وہاں کے امراء حکام کے دروازوں پر ظلم وناانصافی کے چلن کی وجہ سے ان سے دور رہنے کا حکم دیا گیا۔

واضح رہے کہ مشکوٰۃ کے اصل نسخے میں لفظ رواہ کے بعد جگہ خالی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مشکوٰۃ کے مولف کو اس حدیث کے صحیح ماخذ کا علم نہیں ہوگا، لیکن جزری نے اس حدیث کے ماخذ کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے رواہ ابو داؤد ومن طریق لم یجزم بہا الراوی بل قال لا اعلم الاعن موسی ابن انس عن انس ابن مالک یعنی اس روایت کو ابوداؤدؒ نے ایک ایسی سند کے ساتھ نقل کیا ہے جس کے ایک راوی کے بارے میں انہوں نے بے یقینی کا اظہار کیا ہے، بلکہ انہوں نے (اس راوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ جو اس سند میں داخل ہے) کہا ہے کہ میں اس راوی کو نہیں جانتا، ہاں انہوں نے اس حدیث کا راوی موسی ابن انس کو ذکر کیا ہے جنہوں نے اس کو حضرت انس ابن مالکؓ سے نقل کیا ہے! پس حدیث کے ماخذ اور اس کے راوی کو اس طرح سے بیان کرنا ابہام اور اشتباہ پر دلالت کرتا ہے! موسی ابن مالک انصاریؒ بصرہ کے قاضی اور تابعین میں سے ہیں۔

بصرہ کے ایک گاؤں کی مسجد کی فضیلت

(۲۴) وَعَنْ صَالِحِ بْنِ دِرْهَمٍ يَقُوْلُ انْطَلَقْنَا حَاجِّيْنَ فَاِذَا رَجُلٌ فَقَالَ لَنَا اِلٰى جَنْبِكُمْ قَرْيَةٌ يُقَالُ لَهَا الْاُبُلَّةُ قُلْنَا نَعَمْ قَالَ مَنْ يَضْمَنُ لِيْ مِنْكُمْ اَنْ يُصَلِّيَ لِيْ فِيْ مَسْجِدِ الْعَشَّارِ رَكْعَتَيْنِ اَوْ اَرْبَعًا وَيَقُوْلُ هٰذِهٖ لِاَبِيْ هُرَيْرَةَ سَمِعْتُ خَلِيْلِيْ اَبَا الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَبْعَثُ مِنْ مَسْجِدِ الْعَشَّارِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ شُهَدَاءَ لَا يَقُوْمُ مَعَ شُهَدَآءِ بَدْرٍ غَيْرُهُمْ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَقَالَ هٰذَا الْمَسْجِدُ مِمَّا يَلِي النَّهْرِ وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ اَبِي الدَّرْدَاءِ اِنَّ فِسْطَاطَ الْمُسْلِمِيْنَ فِيْ بَابِ ذِكْرِ الْيَمَنِ وَالشَّامِ اِنْشَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔

"اور حضرت صالح ابن درہم تابعیؒ کہتے ہیں کہ ہم حج کے لئے (بصرہ سے مکہ) گئے تو وہاں (کسی جگہ) ایک شخص (یعنی حضرت ابوہریرہؓ) کو کھڑے دیکھا، انہوں نے ہم سے پوچھا کہ کیا تمہارے شہر کے نواح میں ایک بستی ہے جس کو ابلہ کہا جاتا ہے ہم نے کہا کہ ہاں ہے انہوں نے کہا کہ تم میں سے کون شخص اس کا ذمہ لیتا ہے کہ وہ میری طرف سے مسجد عشار میں دو رکعت، بلکہ چار رکعت نماز پڑھے اور یہ کہے کہ اس نماز کا ثواب ابوہریرہ کو پہنچے میں نے اپنے یار صادق ابوالقاسم (محمد) ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ مسجد عشار سے قیامت کے دن شہداء کو اٹھائے گا اور بدر کے شہداء کے ساتھ ان شہداء کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوگا (قیامت کے دن بدر کے شہداء کے ساتھ جو شہداء اپنی اپنی قبر سے اٹھیں گے وہ اسی مسجد کے شہداء ہوں گے، یا یہ کہ قیامت کے دن مرتبہ کے اعتبار سے شہداء بدر کے ہمسر ان شہداء کے علاوہ اور کوئی شہید نہیں ہوگا۔ اس روایت کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور کہا کہ یہ مسجد بصرہ کے اس نواحی حصے میں ہے جو دریائے فرات کی طرف ہے اور حضرت ابودرداء کی حدیث ان فسطاط المسلمین الخ کو ہم انشاء اللہ تعالیٰ یمن وشام کے ذکر کے بیان میں نقل کریں گے۔"

تشریح: "اُبلّہ" ایک مشہور بستی کا نام ہے جو بصرہ کے قریب واقع ہے۔ "عشار" ایک مسجد کا نام ہے جو ابلہ میں ہے، حصول برکت وسعادت کی خاطر لوگ اس مسجد میں نماز پڑھنے آتے ہیں۔

"مسجد عشار کے شہداء" کے بارے میں یہ وضاحت نہیں ہوتی کہ آیا ان شہداء کا تعلق کسی گذشتہ اُمت کے لوگوں سے ہے یا اسی اُمت کے لوگوں سے ہے؟ بہرحال اس حدیث سے ان شہداء کی عظمت وفضیلت کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ بدر کے شہیدوں کے ہم پلہ وہم رتبہ ہیں، پس معلوم ہوا کہ جب وہ مسجد اس قدر شرف وفضیلت رکھتی ہے تو اس میں نماز پڑھنا یقیناً بہت بڑی فضیلت اور بہت بڑے ثواب کی بات ہے۔ اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فضیلت رکھنے والی جگہوں اور عمارتوں میں نماز پڑھنا اور عبادت کرنا بہت زیادہ فضیلت وسعادت کے حصول کا ذریعہ ہے، نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بدنی عبادت (جیسے نماز روزہ) کا ثواب کسی کو بخشنا جائز ہے خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ اور وہ ثواب اس کو پہنچتا ہے، چنانچہ اکثر علماء کا یہی مسلک ہے، ویسے مالی عبادت (جیسے صدقہ وخیرات وغیرہ کا ثواب بخشنا تو تمام ہی علماء کے نزدیک جائز ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضرت عمرؓ فتنوں کا دروازہ کھلنے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے

(۲۵) عَنْ شَقِيْقٍ عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ كُنَّا عِنْدَ عُمَرَ فَقَالَ اَيُّكُمْ يَحْفَظُ حَدِيْثَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْفِتْنَةِ فَقُلْتُ اَنَا اَحْفَظُ كَمَا قَالَ قَالَ هَاتِ اِنَّكَ لَجَرِئٌ وَكَيْفَ قَالَ قُلْتُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِتْنَةُ الرَّجُلِ فِيْ اَهْلِهِ وَمَالِهِ وَنَفْسِهِ وَوَلَدِهِ وَجَارِهِ يُكَفِّرُهَا الصِّيَامُ وَالصَّلٰوةُ وَالصَّدَقَةُ وَالْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْىُ عَنِ الْمُنْكَرِ فَقَالَ عُمَرُ لَيْسَ هٰذَا اُرِيْدُ اِنَّمَا اُرِيْدُ الَّتِيْ تَمُوْجُ كَمَوْجِ الْبَحْرِ قَالَ قُلْتُ مَالَكَ وَلَهَا يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِنَّ بَيْنَكَ وَبَيْنَهَا بَابًا مُغْلَقًا قَالَ وَيُكْسَرُ الْبَابُ اَوْ يُفْتَحُ قَالَ قُلْتُ لَا بَلْ يُكْسَرُ قَالَ ذٰلِكَ اَحْرٰى اَنْ لَّا يُغْلَقَ اَبَدًا قَالَ فَقُلْنَا لِحُذَيْفَةَ هَلْ كَانَ عُمَرُ يَعْلَمُ مَنِ الْبَابُ قَالَ نَعَمْ كَمَا يَعْلَمُ اَنَّ دُوْنَ غَدٍ لَيْلَةً اِنِّيْ حَدَّثْتُهُ حَدِيْثًا لَيْسَ بِالْاَغَالِيْطِ قَالَ فَهِبْنَا اَنْ نَسْاَلَ حُذَيْفَةَ مَنِ الْبَابُ فَقُلْنَا لِمَسْرُوْقٍ سَلْهُ فَسَاَلَهُ فَقَالَ عُمَرُ۔ (متفق علیہ)

"حضرت شقیق تابعیؒ، حضرت حذیفہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا۔ "ہم (ایک دن) حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر تھے کہ انہوں نے ہم سے پوچھا کہ تم میں سے کسی شخص کو رسول کریم ﷺ کی وہ حدیث یاد ہے جو آپ ﷺ نے فتنہ کے سلسلے میں ارشاد فرمائی ہے، میں نے کہا کہ مجھے یاد ہے اور بالکل اس طرح یاد ہے جس طرح آپ ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے (یعنی میرے حافظہ میں وہ حدیث کسی کمی وبیشی کے بغیر حرف بہ حرف محفوظ ہے) حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ "اچھا، وہ حدیث بیان کرو، تم روایت حدیث میں بہت دلیر ہو، جو کچھ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے اس کو نقل کرو اور اس کی کیفیت بیان کرو۔ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے بیان کیا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "آدمی کا فتنہ (یعنی اس کی آزمائش اور ابتلا) اس کے اہل وعیال میں ہے، اس کے مال میں ہے، اس کے نفس میں ہے، اس کی اولاد میں ہے اور اس کے ہمسایہ میں ہے! اس کے اس فتنہ کو (اور اس فتنہ کے سبب وہ جو گناہ کرتا ہے، اس کو روزے، نماز، صدقہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دور کر دیتے ہیں"۔ حضرت عمرؓ نے (یہ حدیث سن کر) فرمایا کہ میرا مدعا اس فتنے سے نہیں تھا، میں تو اس فتنہ کے بارے میں سننا چاہتا تھا جو سمندر کی موجوں کی طرح جوش مارے گا؟ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین! بھلا آپ کو اس فتنہ سے کیا تعلق؟ آپ کے اور اس فتنہ کے درمیان تو ایک بند دروازہ حائل ہے۔ یعنی اس فتنہ کا آپ کو کیوں فکر ہے، اس کے برے اثرات آپ تک تو پہنچیں گے نہیں کیونکہ اس فتنہ کا ظہور آپ کی زندگی کے بعد ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ وہ دروازہ کہ جس سے فتنہ نکلے گا توڑا جائے گا (یعنی اس کو اس طرح توڑا جائے گا یا کھولا جائے

گا؟ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے جواب دیا کہ "دروازہ کھولا نہیں جائے گا بلکہ توڑا جائے گا (یعنی اس کو اس طرح توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا جائے گا کہ پھر اس کا بند ہونا یا اس کا قابل مرمت ہونا ممکن نہیں ہوگا" حضرت عمرؓ نے (یہ سن کر) فرمایا "اس دروازے کے بارے میں (کہ جو کھولا نہیں جائے گا بلکہ توڑا جائے گا) زیادہ قرین حقیقت بات یہ ہے کہ وہ کبھی بند ہی نہ ہو" حدیث کے راوی حضرت شقیقؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت حذیفہؓ سے پوچھا کہ کیا حضرت عمرؓ اس سے واقف تھے کہ دروازہ سے مراد کون ہے؟ حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ ہاں! حضرت عمرؓ اس سے واقف تھے جیسا کہ وہ اس بات سے واقف تھے کہ کل کے دن سے پہلے رات آئے گی (یعنی جس طرح ہر شخص یقینی طور پر جانتا ہے کہ کل آنے والے دن سے پہلے رات کا آنا ضروری ہے اسی طرح حضرت عمرؓ یقینی علم رکھتے تھے کہ دروازہ سے مراد کون ہے) اور اس میں شک نہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ سے وہ حدیث بیان کی جس میں غلطیاں نہیں ہیں۔ حضرت شقیقؒ کہتے ہیں کہ (اس کے بعد) ہمیں حضرت حذیفہؓ سے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ دروازے سے مراد کون ہے، البتہ ہم نے حضرت مسروقؒ سے عرض کیا (جو وہاں موجود تھے) کہ آپ حضرت حذیفہؓ سے پوچھ لیجئے، چنانچہ انہوں نے حضرت حذیفہؓ سے پوچھا تو حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ دروازے سے مراد حضرت عمرؓ ہیں، یعنی حضرت عمرؓ کی ذات ایک ایسے دروازے کی طرح ہے جس نے اس اُمت اور اسلامی مملکت میں فتنہ وفساد کے در آنے کو روک رکھا ہے، ان کے بعد فتنوں کا دروازہ کھل جائے گا۔" (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "تم روایت حدیث میں بہت دلیر ہو" حضرت حذیفہؓ کے بارے میں حضرت عمرؓ کا یہ جملہ ان کے اظہار ناگواری کا بھی احتمال رکھتا ہے اور ان کے اظہار تحسین کا بھی یعنی ایک احتمال تو یہ ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے چونکہ اور صحابہؓ کی موجودگی میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ میں حضور ﷺ کی حدیث کو بعینہ یاد رکھتا ہوں اور اس بارے میں میرا حافظہ بہت قوی اور قابل اعتماد ہے اس لئے حضرت عمرؓ کو ان کی یہ بات ناگوار ہوئی، پس انہوں نے اس ناگواری کو ظاہر کرنے کے لئے فرمایا کہ تم بڑے عجیب قسم کے دلیر ہو؟ آخر تمہیں ایک ایسی بات کا دعویٰ کرنے کی جرأت کیسے ہوگئی جس کو نہ میں جانتا ہوں اور نہ یہاں موجود دوسرے صحابہؓ جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں، اچھا اگر تمہیں اپنے حافظہ پر ایسا ہی ناز ہے تو سناؤ کہ حضور ﷺ نے کیا فرمایا تھا؟ یہ تو پہلا احتمال ہوا، دوسرا احتمال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس جملے کے ذریعے دراصل حضرت حذیفہؓ کی تحسین وتائید فرمائی، یعنی انہوں نے گویا یہ فرمایا کہ میں تمہارے دعوے کی تصدیق کرتا ہوں، کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم آنحضرت ﷺ سے اس اُمت میں پیدا ہونے والے فتنوں اور ظاہر ہونے والی برائیوں کے بارے میں بڑی جرأت اور دلیری کے ساتھ سوالات کیا کرتے تھے اور اکثر و بیشتر حضور ﷺ سے پوچھتے رہتے تھے، لہٰذا تمہیں یقیناً فتنہ کے بارے میں حضور ﷺ کے ارشادات کا زیادہ علم ہوگا اور اس سلسلے کی حدیث پوری طرح یاد ہوگی، ہمیں وہ حدیث ضرور سناؤ کہ حضور ﷺ نے کیا فرمایا۔

"آدمی کا فتنہ اس کے اہل وعیال میں ہے الخ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کا تعلق مختلف چیزوں جیسے اہل وعیال، اور مال ودولت وغیرہ سے قائم کیا، پھر اس کو ان چیزوں کے حقوق پہنچاننے اور ان حقوق کو ادا کرنے کا ذمہ قرار دے کر ایک طرح کی آزمائش سے دوچار کیا ہے لیکن یہ انسان کی غفلت ونادانی ہے کہ وہ اپنی اس ذمہ داری کی رعایت ملحوظ نہیں رکھتا اور جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں ان کی ادائیگی میں کوتاہی وتقصیر کرتا ہے، ان متعلقہ چیزوں کے سلسلے میں خدا نے اس کو جو حکم دیا ہے اس کی خلاف ورزی کرتا ہے اور ان چیزوں کی وجہ سے نہ صرف گناہ اور ممنوع امور کے ارتکاب کا وبال اپنے سر لیتا ہے بلکہ خود کو تعب ورنج اور مشقت وایذا میں گرفتار کرتا ہے لہٰذا اس صورت میں انسان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ حقوق کی ادائیگی میں جو کوتاہی اور گناہوں کا جو ارتکاب اس سے ہوتا ہے اس کے ازالہ اور کفارہ کے لئے اچھے کام جیسے نماز، روزہ اور صدقہ وخیرات وغیرہ کرتا رہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ یعنی بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو مٹادیتی ہیں۔

"میرا مدعا اس فتنہ سے نہیں تھا" یعنی جب حضرت عمرؓ نے لوگوں سے پوچھا کہ تم میں سے کس شخص کو فتنہ کے سلسلے میں

آنحضرت ﷺ کی حدیث یاد ہے، تو ان کا یہ پوچھنا دو مفہوم کا احتمال رکھتا تھا، ایک یہ کہ فتنہ سے ان کی مراد وہ امتحان و آزمائش ہو جس میں انسان کو اولاد و مال وغیرہ کے تعلق سے مبتلا کیا گیا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ الخ اور دوسرے یہ کہ فتنہ سے ان کی مراد باہمی قتل و قتال اور افتراق و انتشار ہو۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے سوال کا تعلق اس دوسرے مفہوم سے تھا، یعنی انہوں نے اس حدیث کے بارے میں پوچھا تھا جس میں حضور ﷺ نے باہمی قتل و قتال اور افتراق و انتشار کے فتنہ و فساد کا ذکر فرمایا تھا، لیکن حضرت حذیفہؓ نے یہ سمجھا کہ حضرت عمرؓ پہلے مفہوم سے متعلق حدیث کے بارے میں پوچھ رہے ہیں اور اسی لئے انہوں نے اس کے مطابق حدیث بیان کی، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میرے پوچھنے کا مدعا یہ فتنہ نہیں تھا، میری مراد اس فتنہ کے بارے میں حضور ﷺ کی حدیث سننا تھا جو باہمی قتل و قتال اور آپس میں ایک دوسرے کے خلاف جنگ و محاذ آرائی کی صورت میں اس اُمت پر سیاہ بادل کی صورت میں چھا جائے گا اور اس کے برے اثرات تمام مسلمانوں کو سخت مصائب و پریشانی میں مبتلا کر دیں گے۔

"آپ کے اور اس فتنہ کے درمیان تو ایک بند دروازہ حائل ہے" بند دروازہ سے مراد حضرت عمرؓ کے وجود با مسعود کی طرف اشارہ کرنا تھا، جیسا کہ حدیث کے آخری الفاظ سے اس کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے، چنانچہ حضرت حذیفہؓ کے جواب کا مطلب یہ تھا کہ آپ جس فتنہ کے بارے میں پوچھ رہے ہیں وہ ابھی دور ہے، کیونکہ جب تک اس اُمت میں آپ کا وجود باقی ہے وہ فتنہ راہ نہیں پائے گا ہاں جب آپ اس دنیا سے اٹھ جائیں گے تو وہ فتنہ در آئے گا اور اُمت میں راہ پا جائے گا۔

"وہ دروازہ توڑا جائے گا یا کھولا جائے گا؟" یعنی آیا وہ دروازہ اتنا سخت اور مضبوط ہو گا کہ بغیر توڑے اس کو کھولا نہیں جا سکے گا یا اتنا کمزور اور ہلکا ہو گا کہ آسانی کے ساتھ اس کو کھول دیا جائے گا۔ واضح رہے کہ کسی دروازہ کو توڑنے اور اس کو کھولنے میں فرق ہوتا ہے، ایک دروازہ تو وہ ہوتا ہے جس کو توڑے بغیر آمد و رفت کا راستہ بنانا ممکن نہیں ہوتا جب وہ دروازہ ٹوٹ جاتا ہے تو پھر اس کا بند ہونا ممکن نہیں ہوتا، اس کے برخلاف جو دروازہ صرف کھولا جاتا ہے اس کو بند کرنا ممکن ہوتا ہے، چنانچہ یہاں "بند دروازہ" تمثیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے جس کا مقصد یہ تشبیہ دینا ہے کہ فرض کرو کہ دو گھر ہیں جن کے درمیان ایک دیوار حائل ہے اور اس دیوار میں ایک بند دروازہ ہے، اس دیوار کے ایک طرف کا گھر فتنہ و فساد کا مسکن ہے اور دوسری طرف کے گھر میں امن و عافیت کا رہن سہن ہے اور اس بند دروازہ کی وجہ سے فتنہ و فساد کو کوئی راہ نہیں ملتی کہ وہ امن و عافیت کے گھر میں در آئے اور اس گھر کے امن و سکون کو تہ و بالا کر دے پس حضرت عمرؓ کی حیات فتنوں کے روکے رکھنے والے بند دروازے کے مماثل اور ان کی موت، ان فتنوں کے دروازے کھل جانے کی مماثل ہوئی، اس طرح اس دروازے کے توڑے جانے کو ان کے قتل کے ساتھ اور اس دروازے کے کھولے جانے کو ان کی قدرتی موت کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔

قسطنطنیہ کا فتح ہونا، قیامت کے قریب ہونے کی علامت ہو گا

(۲۶) وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ فَتْحُ الْقُسْطُنْطِيْنِيَّةِ مَعَ قِيَامِ السَّاعَةِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ۔

"اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ "قسطنطنیہ کا فتح ہونا، قیامت کے قریب ہو گا" اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تمت بالخیر

الحمد للہ کہ کتاب مظاہر حق جدید کی کتابت "کتاب الصید و الذبائح" سے شروع ہو کر "باب الملاحم" پر ختم ہو رہی ہے اور انشاء اللہ العزیز "باب اشراط الساعۃ" سے مظاہر حق جدید جلد پنجم کی کتابت شروع ہو گی۔

وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین